
شعر و ادب … شعراء

نئی دہلی

۱۹...ء

جلد اول

چوتھا شمارہ

...حمید صدیقی

دفتر

...نئی دہلی ۱۳

۶۱۹۰...

...سالانہ ۱۰ روپے

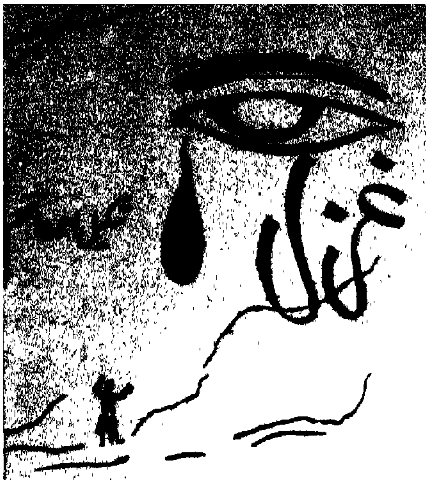
...کسی ذریعہ سے وصول ... خط و کتابت کرنے کی ... نہیں ہے۔ کسی مضمون کو ... ایڈیٹر کو اختیار ... کو محفوظ رکھنے کا ... ہے۔

...شائع شدہ مضامین "واقعات" ... شائع کرنے کی عام ...

...کے فیصلے کا ... کسی عدالت مجاز کو ہوگا

...حمید صدیقی

...دہلی ۶



غزل

عاصم

...

جیسیں ... جو ...

خوشی ختم ہوئی تم کو جہاں جہاں سے ملے

خود آشنائی کے اس عہد بدترین میں تم

جو ڈھونڈتے ہو خدا آشنا کہاں سے ملے!

سنائیں اب کسے روداد خونچکاں اپنی

یہاں تو زخم بہاروں میں باغباں سے ملے

کچھ اس طرح رخ جاناں پہ جم گئیں نظریں

بچھڑ کے جیسے کوئی اپنے کارواں سے ملے

نثار اس پہ دو عالم کی راحتیں عاصم

بطور خاص جو غم ان کے آستاں سے ملے



تلاش معاش

دور دیرینہ آدمی کے واسطے فکر معاش

سخت مشکل کام ہے دنیا میں روزی کی تلاش

پیٹ بھرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں لوگ

کیسے کیسے ڈھنگ سے اپنا شکم بھرتے ہیں لوگ

اک مصور تھا انھیں افکار میں ڈوبا ہوا

سوچتا تھا ان کو لائے کیسے کاغذ پر بھلا

ذہن میں خاکے کئی ابھرے کئی شکلیں بنیں

سب کو ٹھکراتا رہا اس کا دماغ نکتہ بیں

باغ کی جانب اٹھیں اس کی نگاہیں ناگہاں

تاڑ پر چڑھتے ہوئے اک شخص کو دیکھا وہاں

اس نے سوچا تھی اسی تصویر کی مجھ کو تلاش

ہوگی یہ آئینہ دار سعی تحصیل معاش



پتھر کے دیوتا

ناوک حمزہ پوری

کوئی درویش کی صدا کی طرح

کوئی پتھر کے دیوتا کی طرح

قید زنجیر بندگی میں کوئی

عرش پر ہے کوئی خدا کی طرح

باطل و حق ہیں معرکہ آرا

آج بھی دشت کربلا کی طرح

زندگی قید بامشقت ہے!

عمر ہے مدت سزا کی طرح

ہو گئی ہیں مسرتیں عنقا!

زیست سے سایۂ ہما کی طرح

زندگی نے وفا نہ کی ناوک

شوخ و طرار بیسوا کی طرح

واقعات نئی دہلی

8/09

83466

بہت بڑا امتحان

بالآخر صدر جمہوریہ ہند نے مرکزی کابینہ کی سفارش پر لوک سبھا کو توڑنے اور از سر نو انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ اب عوام کو ایک مرتبہ پھر اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمائندے چننے کا موقع ملے گا۔

صدر جمہوریہ ہند کا اعلان کسی کے لئے بھی حیران کن نہیں ہے بلکہ توقع کے عین مطابق ہے۔ پارلیمانی حلقوں اور ان سے باہر بھی اس حد تک پیش گوئی کی جانے لگی تھی کہ جس دن (۲۷ دسمبر کو) ریڈیو سے اطلاع نشر کی گئی کہ وزیر اعظم ہند قوم کے نام اپنا پیغام نشر کریں گی۔ تو ہر شخص نے سمجھ لیا کہ مسز گاندھی نئے انتخابات کا "مژدہ" سنانے والی ہیں۔ اور واقعتاً ایسا ہی ہوا۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں گے اس اعلان سے امید و بیم کی وہ حالت ختم ہو گئی جو اب تک ملک میں مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی۔

بلاشبہ پارلیمنٹ کو توڑنے اور از سر نو انتخابات کرانے کا فیصلہ ایک غیر معمولی فیصلہ ہے لیکن آئینی اعتبار سے صحیح اور سیاسی اعتبار سے ایک دلیرانہ اقدام ہے۔ موجودہ حکومت چاہتی تو ۱۹۷۲ء تک برسر اقتدار رہ سکتی تھی کیونکہ ممبروں کی اکثریت کا اسے تعاون حاصل تھا اور عدم اعتماد کی کئی تحریکیں نامنظور کی جا چکی تھیں۔ لیکن تنظیمی کانگریس اور اس کے ساتھی گروپوں نے سرکاری کارکردگی میں قدم قدم پر جو رکاوٹیں پیدا کیں ان سے وزیر اعظم نے محسوس کیا کہ ان حالات میں ملک میں سماجی انقلاب لانا ممکن نہیں ہے [illegible] حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ انتخابات کا خطرہ مول لیں اور [illegible] پالیسیوں کا [illegible] کے لئے احتساب کرائیں جو بہرحال طاقت [illegible] ہیں۔ اندرا سرکار کے اس اقدام کا مخالف جماعتوں [illegible] خیر مقدم کرنا چاہیے تھا [illegible] ہونا چاہیے تھا کہ انہیں اس حکومت کے خلاف کسی "عدم اعتماد" منانے کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ صدر جمہوریہ ہند نے خود "نئی سرکار" کو جیسا کہ وہ اس حکومت کو کہتے ہیں ہٹانے اور اس سے بہتر حکومت قائم کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخالف جماعتوں کے لئے صدر کا اعلان ایک طرح سے "بم" کا ثابت ہوا انہیں توقع نہ تھی کہ اتنی جلدی انتخابات کا اعلان کر کے انہیں عوامی مواخذہ کے لئے مجبور کر دیا جائے گا۔ ان جماعتوں کے جو بیانات سامنے آئے ہیں ان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اب اپنی بے حقیقتی کا احساس ہو رہا ہو۔ اور وہ اپنے "کارناموں" کے ساتھ عوام کے سامنے جانے سے گھبرا رہی ہوں۔ شاید اپنے دل کی تسکین کے لئے انہوں نے یہی صورت بہتر سمجھی کہ اندرا سرکار اور صدر جمہوریہ ہند دونوں کو مطعون کر کے پارلیمنٹ توڑنے اور از سر نو انتخابات کرانے کے اقدام کو غیر اخلاقی اور غیر آئینی قرار دیا جائے لیکن یہ اقدام نہ غیر آئینی ہے اور نہ غیر اخلاقی بلکہ جمہوریت اور آئین کی منشا کے عین مطابق ہے۔ برسر اقتدار حکومت جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو اگر محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں کو بروئے کار نہیں لا سکتی تو اسے عوام کے سامنے جانے کا حق ہے۔

بعض جماعتوں اور لیڈروں نے "نگران حکومت" کا سوال بھی اٹھایا ہے کہ جب تک انتخابات ہوں موجودہ حکومت برسر اقتدار نہ رہے۔ بلکہ کوئی اور "نگران حکومت" قائم کی جائے اس مطالبہ میں بھی کوئی جان نہیں ہے اس لئے کہ جمہوریت کے طور طریقوں میں ہم نے جن ممالک کی پیروی کی ہے وہاں بھی اس قسم کی "نگران حکومت" کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اور نہ کبھی مخالف جماعتوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہی کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں خاتمہ جنگ کے بعد برطانیہ میں جب لیبر پارٹی مخلوط حکومت سے الگ ہوئی تو انتخابات کے دوران اس نے چرچل گورنمنٹ کے برسر اقتدار رہنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح امریکہ میں انتخابات کے دوران صدر کو ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ خود ہمارے یہاں اس سے قبل جو انتخابات عمل میں آئے ہیں ان میں کسی نے "نگران حکومت" کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ پھر اس مرتبہ کیوں؟

انتخابات کا سارا انتظام الیکشن کمیشن کے ہاتھ میں ہے جو ایک خود مختار ادارہ ہے اور اس خود مختار ادارہ سے کسی کو اس قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ وہ جانبداری سے کام لے گا۔ انتخابات یقینی ہے کہ غیر جانبدارانہ اور آزادانہ ہوں گے اور عوام کو [illegible] اپنا ووٹ استعمال کرنے کا موقع ملے گا [illegible] ملک میں حکومت بنا سکیں گے۔ انہیں صرف [illegible] پالیسیوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس وقت واضح [illegible] کی حامل جماعتیں ہمارے سامنے ہیں ایک وہ جو ملک کو [illegible] لے جانا چاہتی ہیں اور ایسی حکومت قائم کرنے کی کوشش [illegible] میں عوام کو پست رکھنے کا زیادہ سے زیادہ امکان رہے گا۔ اور دوسری طرف وہ سوشلسٹ طاقتیں ہیں جو ایک ایسی سوشلسٹ جمہوریت کے قیام کی متمنی ہیں جس میں نابرابری اور عوامی استحصال کو ختم کیا جائے مگر ان نظریات کے ساتھ ساتھ عام ووٹروں کو ہر پارٹی کا ماضی کا کردار بھی سامنے رکھنا ہوگا اور عمل کی کسوٹی پر کسنا ہوگا کہ کس پارٹی نے کس حد تک اپنے وعدے پورے کئے اور کس حد تک وہ انہیں پورا کرنا چاہتی ہے۔

ووٹروں کے لئے ایک اور غور و فکر کی بات یہ ہے کہ اگر ووٹ آپس میں اس حد تک تقسیم ہو جائیں کہ کوئی پارٹی قطعی اکثریت میں آ کر حکومت قائم نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہوا تو کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہو سکے گی۔ اور مخلوط حکومت قائم کرنے کے لئے ہر پارٹی "ہمخیال" جماعتوں کی محتاج رہے گی اور اس "ہمخیالی" کو اگر تنظیمی کانگریس پر جو سوشلسٹ اصولوں کی علمبردار ہے اور جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی پر منطبق کیا جائے تو اس کے معنی "موقع پرستی" کے علاوہ کچھ نہیں جس کی کامیابی اس دل بدلی کے زمانہ میں محض عارضی ہے اس "ہمخیالی" کا نتیجہ ہم یوپی، بہار اور دوسری ریاستوں میں دیکھ چکے ہیں اور اس وقت بھی کہیں کہیں دیکھ رہے ہیں۔ [illegible] کے انتخابات ہمارے لئے ایک سبق ہیں جہاں ۳۳ پارٹیوں نے انتخابات میں حصہ لیا تھا لیکن عام ووٹروں نے دو کے علاوہ سب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ ہندوستان میں بھی بہت سی پارٹیاں ہیں۔ کچھ اکیلے ہی میدان میں کودیں گی اور کچھ [illegible] کر کے سامنے آئیں گی۔ کاش ووٹر اپنی صوابدید سے کام لیں اور دیکھیں کہ موجودہ حالات میں کونسی پارٹی ان کی امنگوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے [illegible] ملک کو [illegible] گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ان کے لئے اپنی مرضی کی [illegible] نئی حکومت کے چننے کا اور ملک کی [illegible] کو ختم کرنے کا موقع بہم پہنچایا [illegible] سرمایہ دار گروپ نے ملک [illegible] ایک بہت بڑا امتحان ہے [illegible]





وزیر اعظم کی پریس کانفرنس

پہلا دھماکہ

"کوئی بھی شخص جو کسی ہندو یا مسلمان کا قتل کرے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

لوک سبھا کی برخاستگی کے بعد مسز اندرا گاندھی نے ۲۹ دسمبر کو وزیر اعظم کی حیثیت سے جب کہ انہوں نے وضاحت کی جو پہلی پریس کانفرنس طلب کی اس میں ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو زیر بحث نہ آیا ہو۔ ایک طویل عرصے بعد پہلی ایک تاریخی پریس کانفرنس تھی جسے طلب کرنے کا فیصلہ شاید فوری طور پر کیا گیا کیونکہ اخباری نمائندوں کو دعوت نامے وقت کے وقت جاری کئے گئے تھے۔

پریس کانفرنس ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ وگیان بھون کا کمیٹی روم تقریباً دو سو ہندوستانی اور غیر ملکی نامہ نگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے مائیکروفون ان کے سامنے رکھے تھے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اور ٹیپ ریکارڈنگ کے محکمے کے کارکن مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

اخباری نکتے بڑی دور کی کوڑی نکال کر لاتے ہیں وزیر اعظم کی ساڑھی کے رنگ سے لیکر ان کے پارلیمانی حلقے تک کے بارے میں سوالات پوچھ ڈالے۔ مسز گاندھی سلک کی ساڑھی زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ ملے جلے رنگ گلابی، زیتونی اور سبز رنگ کی ساڑھی۔

وزیر اعظم پر انگریزی میں سوالات کی بوچھاڑ ہوئی۔ اور لگاتار ۹۳ سوالات پوچھ ڈالے گئے۔ مگر ہندی میں صرف دو۔ سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے ۲۰ برس بعد بھی ہندی کی اس بے قدری پر رونا آیا۔ دراصل یہ ہندی والوں کے کٹر پن اور "دیگر زبانوں سے نفرت کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ جنوبی ہند والوں کو چھوڑیئے شمالی ہند تک میں "اردو دشمن" پالیسی اپنا کر ہندی والوں نے ہندی کو برسوں پیچھے پھینک دیا۔ بلکہ صورت حال ایسی ہے کہ شاید انگریزی ہمیشہ راج کرے گی۔

وزیر اعظم ہند نے اس پریس کانفرنس میں جو کچھ فرمایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آئین ہند میں بنیادی ترمیم چاہتی ہیں تاکہ ان سوشلسٹ اقدامات کو بروئے کار لایا جا سکے جو موجودہ حالات میں ضروری ہیں آئین میں ترمیم کا ایک طریقہ آئین ساز اسمبلی طلب کرنے کا تھا لیکن وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ آئین میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے لوک سبھا کو توڑ کر از سر نو اس کے انتخابات کرانا مناسب سمجھا گیا۔

پارلیمنٹ کی برخاستگی اور از سر نو انتخاب کا اعلان بڑی اہمیت کا حامل ہے ایک نامہ نگار نے پوچھا یہ اعلان (۲۷ دسمبر) رات ہی کو کیوں کیا گیا۔ کیا اس وقت اعلان کے لئے کوئی شبھ گھڑی تھی؟ لیکن وزیر اعظم نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ "میں تو ہمیشہ سے ہی شروع سے خلاف رہی ہوں۔ بچپن سے اس کے خلاف ہوں"



میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ میں نے عوام پر چھوڑ دیا ہے کہ فیصلہ اس بات کا غلط ... کہ کسی بھی جمہوریت میں آخری جج عوام ہی ہوتے ہیں۔



مجھے یقین ہے کہ عوام ہمارے حق میں فیصلہ کریں گے۔



ہم جانتے ہیں کہ ہمارا ہر نیا قدم اپنے ساتھ نئی مشکلات لائے گا لیکن پھر بھی ہمیں آگے بڑھنا ہوگا، مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور مسائل کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔

نہیں ہوا پھر اسمرتبہ کیوں ایسا ہوا۔؟

وزیر اعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں اقلیتی مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ اور مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اسے آپ ایک فرقہ پرست جماعت سمجھتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بیچ کی بات بھی کہی کہ اسکا مقابلہ صرف اقلیتوں کی جائز شکایات کو دور کر کے کیا جا سکتا ہے۔ صرف مسلم لیگ ہی کیا فرقہ وارانہ بنیاد پر جو بھی تنظیم معرض وجود میں آرہی ہے یا آچکی ہے اسکا مقابلہ اس فرقہ یا طبقہ کو مطمئن کر کے کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ جماعتیں دیگر دیں آرہی ہیں تو اسکی وجہ اسکے علاوہ کچھ نہیں کہ آزادی کے ۲۳ برس بعد بھی اقلیتوں کی شکایات کو دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔

اردو کے بارے میں تو خود وزیر اعظم نے تسلیم کیا کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا انھوں نے کہا کہ "اردو کی ترقی و ترویج کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا"۔ وہ اور انکی حکومت کیا کریگی یہ انھوں نے نہیں بتایا لیکن انھوں نے جو کچھ کہا اور جس انداز میں کہا اس سے انکے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے اسی دلیری سے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا جس دلیری کے ساتھ انہوں نے دوسرے مسائل کے سلسلہ میں اٹھایا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اردو

اس لئے اب تبدیلی کا اس میں کوئی سوال نہیں"۔ لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا کہ تمام اہم فیصلے رات ہی کو ہوتے ہیں۔ بات بالکل صحیح ہے۔ پاکستان میں ایوب صاحب رات ہی کو انقلاب لائے تھے۔ عراق کے مرحوم قاسم نے بھی رات ہی کو اپنے ٹینکوں سے چڑھائی کی تھی ہر جگہ رات ہی میں انقلاب آیا ہے۔ خود ہمارے ملک میں آزادی کا آفتاب ۱۹۴۷ء میں رات کو بارہ بجے آیا تھا اور اگر اسمرتبہ بھی رات ہی کو "انقلاب" کا اعلان کیا گیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

وزیر اعظم کو اپنی پارٹی کی کامیابی پر پورا بھروسہ ہے اسی لئے جب اُن سے پوچھا گیا کہ دوبارہ آپ وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوں گی تو انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا "امید تو ایسی ہی رکھتی ہوں"۔ اور چونکہ انہیں اپنی کامیابی پر یقین ہے۔ اپنے ووٹروں پر بھی یقین ہے اس لئے انہوں نے اس بات کی تردید کردی کہ وہ بریلی کا اپنا انتخابی حلقہ بدل رہی ہیں۔

وزیر اعظم نے اس پریس کانفرنس میں کئی باتیں صاف کہیں) ایک یہ کہ انکی پارٹی لوک سبھا کی تمام سیٹوں (۵۲۰) پر اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔ اور وہ کسی پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ نہ کرے گی۔ یہ بھی کہا کہ لوک سبھا کے انتخابات کے ساتھ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات نہیں ہونگے۔ البتہ بنگال کے انتخابات کا امکان ہے جہاں اس وقت صدر کی حکومت قائم ہے۔

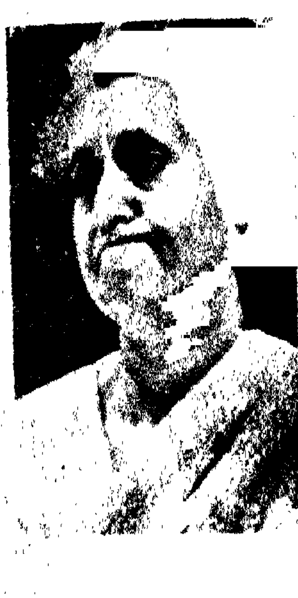
کشمیر میں محاذِ استصواب رائے کے بارے میں وزیر اعظم نے وضاحت سے کہدیا کہ اگر آئینی آزادیوں کو علیحدگی پسندانہ مقاصد کی عمل آوری کے لئے استعمال کیا گیا تو اسے برداشت نہ کیا جائے گا وزیر اعلیٰ کشمیر صادق صاحب بھی اس قسم کی وارننگ دے چکے ہیں

ایک اہم بات وزیر اعظم نے اپنی حکومت کے بارے میں کہی اور ان لوگوں کو دنداں شکن جواب دیا جو کہتے ہیں کہ انتخاب تک "ایک قومی نگراں حکومت" قائم ہونی چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ انکی حکومت کو برخاست شدہ پارلیمنٹ کا پورا اعتماد حاصل تھا اسی لئے اس حکومت کے مستعفی ہونے اور اسکی جگہ کوئی اور حکومت بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تک کے انتخابات میں کبھی ایسا



ہمیں بڑھتی ہوئی غریبی اور بیروزگاری کیخلاف کچھ کرنا ہی ہوگا۔

واقعات نئی دہلی



مسلم لیگ جیسی جماعتوں کا مقابلہ مسلمانوں کی جائز شکایات کو دور کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔



* ہمیں کل کے ہندوستانیوں کا مستقبل سنوارنا ہے :
مگر اس کا حق نہ ملے۔

مسلم یونیورسٹی کے بارے میں وزیر اعظم نے جو کچھ کہا وہ روشن خیال طبقوں کی توقعات سے بہت کچھ کم ہے۔ وہ یونیورسٹی میں ایسی تبدیلیاں چاہتی ہیں جو انکے بقول وقت کے مطابق ہوں انہوں نے کہا کہ "یہ تبدیلیاں خود مسلمانوں کے حق میں ہیں" مگر تبدیلیاں تو بہت پہلے ہو چکی ہیں۔ یہ کتنی بڑی تبدیلی ہے کہ یونیورسٹی کورٹ کے دروازے غیر مسلموں کے لئے کھول دیئے گئے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کے عملے اور طلبا کی تعداد میں تیس فی صدی سے زیادہ غیر مسلم ہیں اور میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں میں تو ان کا تناسب ۴۰ فی صدی سے بھی زیادہ ہے۔ اب اگر اس کے اقلیتی اور اقامتی کیریکٹر کے بارے میں چند تحفظات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو اس پر اعتراض کیوں ؟ کیا چھ کروڑ کی اقلیت کو یہ بھی حق نہیں کہ وہ کسی ایک یونیورسٹی پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکے کہ یہ ہماری یونیورسٹی ہے۔

یقین ہے وزیر اعظم تمام حالات کو سمجھتی ہونگی اور یہ بات بھی ان کے ذہن میں ہوگی کہ اگر یونیورسٹی میں اور تبدیلیاں کی گئیں اور اسے دوسری یونیورسٹیوں کی سطح پر لے آیا گیا تو مسلمان قوم کی ریڑھ کی ہڈی کو سخت تکلیف پہونچے گی جنہوں نے اس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی۔

بہر نوع وزیر اعظم کی پریس کانفرنس ایک طرح سے "پالیسی بیان" کی پریس کانفرنس تھی اس سے سمجھنے والوں کو اپنی سمجھ کے لئے اور آئندہ انتخابات میں کوئی فیصلہ کرنے کے لئے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ اسے ہم مخالف جماعتوں کے خلاف وزیر اعظم کا پہلا دھماکہ بھی کہہ سکتے ہیں جس کے بڑے دور رس نتائج نکلیں گے۔ ••

مغربی بنگال

وہی رفتار بے ڈھنگی

بنگال میں بدستور قتل و غارت گری اور بم اندازی کے واقعات جاری ہیں۔ اور پولیس کو وسیع اختیارات دیئے جانے کے باوجود صورت حال میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ خود وزیر اعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں تسلیم کیا کہ بنگال کے حالات ابھی تک معمول پر نہیں آئے ہیں۔ اسے بنگال پولیس کی ناکامی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑی بنگال پولیس کی ناکامی کیا ہوگی کہ وہ ابھی تک ان آٹھ یا گیارہ لاشوں کا معمہ بھی حل نہ کر سکی جو ۲۰ نومبر کو ضلع ۲۴ پرگنہ کے براسات میں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس ایس، ایم گھوش نے اعلان کیا تھا کہ میرے ریٹائر ہونے سے پہلے پہلے یہ معمہ حل ہو جائے گا۔ لیکن وہ ۲۰ نومبر کو ریٹائر ہو گئے اور معمہ اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حکومت نے پولیس کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے کیا کیا ہے۔

کچھ ماہ قبل بعض پولیس افسروں اور ریاستی نظم و نسق سے تعلق رکھنے والے دوسرے ذمہ داروں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جب تک پولیس کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ شبہ میں جسے چاہے پکڑ سکے اس وقت تک حالات درست نہیں ہوں گے۔ ان افسروں کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی لیکن وہی رفتار بے ڈھنگی بدستور اب بھی موجود ہے۔ خبر ہے کہ پولیس نے اس قانون کے تحت پانچسو آدمی بھی نہیں پکڑے۔ شاید اسلئے کہ پولیس لوگوں کو پکڑنے کے مقابلہ میں انھیں شوٹ کرنے سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ گذشتہ نو مہینے کے صدر راج میں اس نے ۴۵ نام نہاد نکسلیوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔

صدر راج کے نو ماہ پورے ہو رہے ہیں اور اب تحلیل شدہ بنگال "مجلس قانون ریاست بنگال" معرض وجود میں آنے والی ہے۔ وزیر اعظم نے اشارہ دیا ہے کہ لوک سبھا کے انتخابات کے ساتھ ساتھ بنگال میں بھی انتخابات عمل میں آئیں گے۔ شاید اس کے بعد حالات سُدھر جائیں بشرطیکہ بنگالیوں نے مشرقی بنگال کے اپنے بنگالی بھائیوں سے سبق لیا جنہوں نے سب پارٹیوں کو ختم کر کے صرف ایک پارٹی (عوامی لیگ) کو چن لیا۔

گجرات

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا

لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات کی خبریں سنکر گجرات میں بھی سابق ریاستی حکمرانوں کی سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اور وہ لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آرہے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق ان کی طرف سے "ہم خیال" سیاسی جماعتوں کے ساتھ "عظیم گٹھ جوڑ" کی باتیں ہونے لگی ہیں تاکہ وہ اور انکے "ہم خیال" کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔ ان "ہم خیال" جماعتوں میں سب سے پہلے انکی نظر سنڈیکیٹ کانگریس پر پڑی ہے جو اس وقت گجرات کے سرکردہ اور با اثر لیڈروں کی "ہمہ گیر پیمانے پر بے وفائی" سے سخت پریشان ہے اور جس کی کشتی حقیقی معنوں میں بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ خبر ہے سرکردہ سنڈیکیٹی جن میں مرارجی ڈیسائی اور ہتیندر ڈیسائی (وزیر اعلیٰ گجرات) شامل ہیں۔ سابق حکمرانوں کے دست تعاون کو "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" سمجھ رہے ہیں اور اسکی قیمت بھی وہ دینے کے لئے تیار ہیں ایک قیمت یہ ادا کی جا رہی ہے کہ گجرات سنڈیکیٹ کانگریس سوراشٹر سے چھ پارلیمانی سیٹوں میں سے تین سے سابق حکمرانوں کے حق میں دستبردار ہو گئی ہے ایک سیٹ سریندر نگر کی ہے جہاں سے مہاراجہ دھرنگا دھرا کھڑے ہوں گے، بھاؤ نگر کی سیٹ مہاراجہ [illegible] کو ملے گی اور جونا گڈھ کی سیٹ سے پوربندر کے مہارانا نٹ ور سنگھ جی میدان میں آئیں گے۔ (وہ سوراشٹر کے حکمرانوں کی کونسل کے چیئرمین ہیں) یہ ابتدا ہے آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے اور کن کن سیٹوں سے سنڈیکیٹ کانگریس دستبردار ہوتی ہے۔ خود مسٹر ڈیسائی کی سیٹ خطرہ میں ہے۔ ••

واقعات نئی دہلی



ہمارے پڑوسی

سیلون

بحر ہند کا گوہر

شہاب پرویز

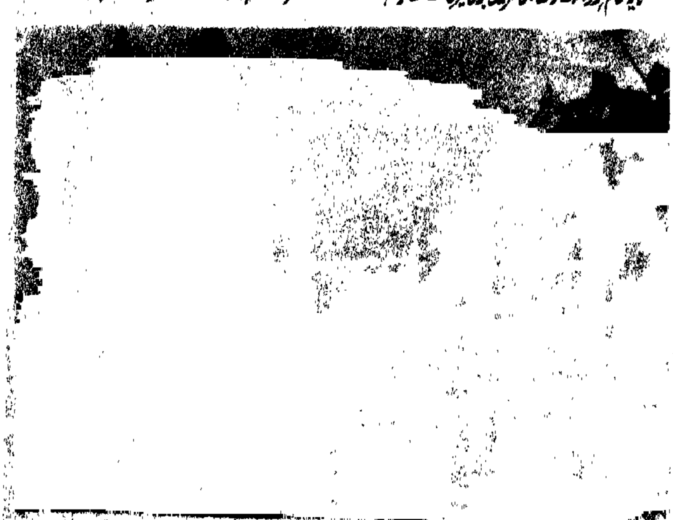
سیلون کا جزیرہ ہندوستان کے عین جنوب میں بحر ہند میں واقع ہے اور اپنے حسن فطرت کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں کچھ بڑی خوبصورت تصویریں ابھرتی ہیں۔ اور یہ تصویریں ہیں ناریل اور چائے کے باغوں کی حسین پہاڑوں کے دامن میں بہتے ہوئے آبشاروں کی اور جھرنوں کی، گہرے نیلے دریاؤں اور خوب صورت جھیلوں کی۔ میری عرصے سے خواہش تھی کہ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھوں، خدا نے میری یہ آرزو پوری کر دی، اور گزشتہ ماہ مجھے تین ہفتے سیلون میں گزارنے کا موقع ملا مجھے یہ لکھتے ہوئے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ میں نے سیلون کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔

کولمبو ایئرپورٹ پر اترتے ہی صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی تازگی بخش جھونکوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ سارا آسمان برسات کے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں کولمبو کا جدید ایئرپورٹ حال ہی میں کینیڈا کی امداد سے تعمیر کیا گیا ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ ہوائی اڈے کے ارد گرد دور دور تک ناریل کے باغات ہیں۔ یہاں سے جو سڑک شہر جاتی ہے وہ غالباً انہیں باغات کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ راستہ میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کیبن لگے ہیں جہاں گرم گرم چائے ہر وقت تیار ملتی ہے ساتھ ہی اناناس اور کیلے کے انبار بھی نظر آتے ہیں۔ ان سرسبز درختوں میں چھپی ہوئی ان کیبنوں کی سرخ سرخ چھتیں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کولمبو قدامت اور جدت کا بڑا حسین سنگم ہے۔ یہاں سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جدید طرز کے عالیشان ہوٹل ہیں۔ بڑی بڑی فرموں اور فضائی کمپنیوں

[illegible]

کے دفتر ہیں۔ اسی علاقے میں ایس۔ آئی۔ ٹی کا سینٹر بھی ہے جو حال ہی میں کھولا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ایس آئی ٹی اے فضائی کمپنیوں کے ٹیلی کمیونی کیشن نظام کا مخفف ہے۔ یہاں تو اسی علاقے میں پارلیمنٹ کی بلند عمارت ہے اور کچھ نئی نئی کئی منزلہ عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ شہر میں کچھ قدیم وضع کی عمارتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ سیلون کے باشندے بھی اپنی زندگی کے کچھ ایسے ہی دور سے گزر رہے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی روایات اور پرانی قدروں سے پیار ہے اور نئی پود زمانے کے نئے تقاضوں کو اپنانے کے لئے بے چین نظر آتی ہے مگر بے حد احتیاط اور قناعت کے ساتھ۔ یہاں مغربی تہذیب کا تباہ کن سیلاب ایک مضبوط بند سے ابھی تک رکا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے سیلون کی خواتین کی سادگی ان کے نمایاں وقار اور رکھ رکھاؤ سے ہوا۔ سنجیدہ مزاج اور تعلیم یافتہ نوجوان خواتین اپنے ملک کی ترقی کے لئے مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں اور جہاں خواتین میں جذبہ عمل کا یہ عالم ہو وہ ملک ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرتا ہے۔

کولمبو سیلون کا دارالحکومت ہونے کے ساتھ مغرب اور مشرق کے آبی راستے پر ایک بہت اہم بندرگاہ بھی ہے۔ اس کے سمندر میں ہر وقت جہازوں کی ایک بڑی تعداد رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے۔ یہ لوگ خود کو "مور" نسل کے بتاتے ہیں اور تاجر پیشہ ہیں۔ انہیں اپنے ملک کی اکثریت کے برابر حقوق حاصل ہیں اور کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ شہر میں بڑی خوبصورت مساجد بھی ہیں۔ جن میں نماز بڑی پابندی سے ادا ہوتی ہے۔ اس شہر میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی یہاں کے عوام کی شہری اصولوں سے آگہی اور ضبط و نظم بسوں کے اڈوں پر، بازاروں میں، ریلوے اسٹیشن پر، تفریح گاہوں، باغوں اور پارکوں میں بد تہذیبی اور ناشائستگی کا چھوٹا سا مظاہرہ بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ ایک قوم کے لئے باعث بڑے فخر کی بات ہے کہ یہاں کا سرکاری مذہب بدھ مت اور سرکاری زبان سنہالی ہے اور یہ



تالی اور خوبصورتی بی ایک ہے۔ یہاں ہوٹلوں کا معیار بھی
حوصلہ افزا ہے۔ ہوٹل کا معیار بھی بڑی حد تک آنکھوں کو بھاتا ہے اسی وجہ سے سیاحوں کو یہاں آ کر کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کولمبو سے ستر میل مشرق کی طرف یعنی سیلون کے عین وسط میں سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار چھ سو فٹ کی بلندی پر کینڈی Kandy کا شہر واقع ہے۔ کولمبو سے یہاں تک تین گھنٹے کا سفر ہے۔ راستہ بیحد دلکش اور پرفضا ہے۔ کولمبو شہر سے نکلتے ہی دور دور تک پانی میں دھان کے ہرے ہرے کھیت نظر آتے ہیں۔ جا بجا چھوٹے بڑے ندی نالے اور انکے کناروں پر آباد دیہاتی بستیاں شاندار کیف منظر پیش کرتی ہیں۔ گاڑی جوں جوں آگے بڑھتی ہے پہاڑیاں بلند ہوتی جاتی ہیں بعض جگہوں پر ٹرین گھنے جنگلوں اور لمبی لمبی سرنگوں میں سے گذرتی ہے کینڈی کا شہر کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ یہاں تار کول کی بل کھاتی پہاڑی سڑکوں پہ بسیں اور کاریں دوڑتی پھرتی ہیں حتیٰ کہ ایک اونچی پہاڑی چوٹی تک بھی کار جا سکتی ہے۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں ایک نہایت خوبصورت جھیل ہے جسکے دوسرے کنارے پر بودھوں کا ایک عظیم الشان مندر ہے۔ اس میں مہاتما بدھ کا مقدس دانت رکھا ہوا ہے۔ شہر سے چار میل دور سرسبز قطعات اور گھنے جنگل کے درمیان کینڈی کی سادہ مگر دلکش عمارتیں واقع ہیں جو کئی میل کے حلقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں کا ماحول پسندیدہ اور قابل قدر ہے۔ ہم نے یہاں بے شمار طالب علموں کو اپنی درسگاہوں میں داخل ہوتے اور باہر آتے دیکھا۔ ان کے چہروں پر بلا کی سنجیدگی اور متانت تھی۔ اور علم کی راہ میں ان کا ہر قدم جیسے نپا تلا اٹھ رہا تھا۔

کینڈی کے پرفضا شہر میں ایک بے مثال نباتاتی باغ بھی ہے جس میں دنیا بھر کے درخت پھول اور پودے موجود ہیں۔ اس باغ کی خوبصورتی کیا بیان ہو بس روش روش رنگوں کا ایک سیلاب موجزن ہے۔ خیابان خیابان خوشبو کی لہریں رواں ہیں۔ ہوا کے ہر جھونکے میں عجیب قسم کی لطافت ہے۔ یہاں دھوپ نکلتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قوس قزح پھولوں کے رنگ اپنے دامن میں بھرنے آئی ہو اور جب دھند چھا جاتی ہے تو جیسے نیلگوں آسمان کے سائے اسرار فضاؤں میں بکھیر دیتی ہے۔ انھیں باغوں کے اردگرد گھیرے مٹیالے رنگ کا ایک دریا بہتا ہے جس سے یہاں کے حسن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

کینڈی سے ۔۔ میل دور سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر سیلون کا سب سے خوبصورت مقام نوریلیا

جب کولمبو سے کینڈی تک کا راستہ تو دلکش تھا ہی مگر کینڈی سے نوریلیا تک پہاڑی راستہ خالق حقیقی کی صناعی کا وہ شاہکار ہے کہ زبان و قلم میں اسکے بیان کی طاقت نہیں ہیں نے بے شمار پہاڑی مقام اور راستے دیکھے ہیں مگر جو دلفریبی اور دلآویزی یہاں پائی جاتی ہے وہ اور کہیں نہ تھی۔ پوری رہگزر آبشاروں دریاؤں اور چشموں سے پٹی پڑی ہے کہیں دور پہاڑوں پر سے پانی سیال چاندی کی مانند گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو کہیں ریلوے لائن کے بالکل ساتھ ساتھ پتھریلی گذرگاہوں پر بہنے والے خوبصورت اور چمکدار جھرنے نشیب کے بڑے دریاؤں سے ہمکنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکی دل موہ لینے والی سریلی جھنکاروں سے ساری فضا سُر ساگر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے بعض جگہ تو ایسے خوبصورت منظر دکھائی دیتے ہیں کہ انسان دم بخود رہ جائے۔ یہ راستہ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے چائے کے باغات کا سہانا منظر بھی پیش کرتا ہے۔ پہاڑوں پر رنگ لانے والی ساون کی اودی گھٹاؤں میں ان باغوں کے اندر عورتیں، بچے چائے چنتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں بلندیوں پر درختوں کے جھنڈوں میں جا بجا بے حد خوبصورت کاٹیج بھی بنے ہوئے ہیں۔ غرض ان پہاڑوں کے آغوش میں خدا نے حسن فطرت کے وہ ناقابل فراموش جلوے بکھیرے ہیں کہ نگاہ ایک پل کو بھی ان سے غافل نہیں ہونا چاہتی۔ یہ خطہ دنیا کے حسین ترین خطوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ٹرین کا سفر جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے نوریلیا کے شہر تک پانچ میل کا راستہ بذریعہ کار طے کرنا پڑتا ہے۔ جو حسن فطرت کے پرستاروں کے لئے مزید دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ نوریلیا کا شہر بس کیا کہوں کہ کیسا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا سے الگ تھلگ کوئی اور ہی جہان ہے۔ صاف ستھرا نکھرا نکھرا... جیسے شبنم سے دھویا گیا ہو۔ پرسکون وادیاں۔ خوابیدہ درخت... نہ جانے کن خیالوں میں گم۔ وہ بلند و بالا چوٹیاں جن پر ہمہ وقت گہری کہر چھائی رہتی ہے کہیں جھیلیں تو کہیں ننھے ننھے آبی راستے۔ ہر طرف پھولوں کے رنگ اور غنچوں کی خوشبو۔ خنک اور معطر ہوا کا ہر جھونکا روح کے لئے تازگی کا پیغام لاتا ہے۔ اس شہر کی سڑکوں پر بھی کاریں چلتی ہیں۔ اسطرح سیاح اسکے گردونواح کی سیر تھوڑے وقت میں اچھی طرح سے کر سکتے ہیں۔ نوریلیا میں تین دن قیام کے بعد اس کی دلنشین یادلئے ہم کولمبو واپس آئے اور راہ کی ہر آبشار سے میں نے پھر یہاں آنے کا وعدہ کیا۔

سیلون قدرتی وسائل اور خام اجناس سے مالا مال ہے یہاں کی مشہور ترین برآمدی اشیاء چائے اور ناریل ہے۔ نہایت



جھیل کینیڈی میں نہایا ہوا ایک گلاب

عمدہ قسم کی چھوٹی الائچی بھی یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ پھلوں میں انناس، کیلا مشہور ہیں۔ چھالیہ پیدا کرنے والے ممالک میں سیلون غالباً سرفہرست ہے۔ یہاں کے لوگ سیدھے سادے ملنسار اور خلیق ہیں۔

سیلون کی موجودہ حکومت کو اگرچہ بے شمار مسائل کا سامنا ہے مگر وہ پورے خلوص اور دیانت سے انھیں حل کرنے میں مصروف ہے بیرونی زرمبادلہ کی دقت کے باعث سامان تعیش کی درآمد پر مکمل پابندی ہے اور سیلونی قوم اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی حکومت سے مکمل تعاون کر رہی ہے۔

سیلون میں تین ہفتے گذارنے کے بعد ہم بادل ناخواستہ سنگاپور اور بنکاک وغیرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم صبح کی پکی چاول میں کولمبو پہ آتے تھے، اور نصف شب کی موسلا دھار بارش میں یو۔ ٹی۔ اے کا طیارہ ہمیں لے کر سنگاپور کی طرف پرواز کر گیا سیلون بہت دور رہ گیا مگر اس حسین جزیرے کی سحر انگیز یادیں دل و دماغ پر انمٹ نقش بن کر ثبت ہو گئیں۔ ٭٭

[illegible]





یادیں

جو خروشچیو کے ذہن میں ابھی زندہ ہیں

کبیر کوثر

ماسکو کے مضافاتی علاقہ میں ایک ایسے گوشہ نشین کی طرح میں زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں، جو محض اپنے پہرہ داروں سے گفتگو کر سکتا ہے جو اسے عوام سے اور عوام کو اس سے علیحدہ رکھنے کے لئے تعینات کئے گئے ہیں۔"

ان الفاظ کے ساتھ سابق وزیر اعظم روس نکیتا خروشچیو نے اپنی گذشتہ زندگی کی کہانی شروع کی ہے۔ اس یادداشت یا سوانح عمری کو اس لئے کہانی کے نام سے موسوم کیا گیا کہ خروشچیو نے صاف اور واضح الفاظ میں اس کتاب کے مصنف ہونے سے انکار کر دیا ہے لیکن مغربی پریس اور روس کے بارے میں با وثوق اطلاعات رکھنے والے ماہرین نے اصرار کیا ہے کہ یہ کتاب نکیتا خروشچیو کی ہی لکھی ہوئی ہے اس کتاب کا مقدمہ لکھنے والے ایڈورڈ کرینک شا نے خروشچیو کی جانب سے اسکی تردید پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ موجودہ حالات میں سابق وزیر اعظم اسکے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

خروشچیو اگرچہ عنفوان شباب سے ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں لیکن ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۴ء تک وہ روس کے عظیم ترین رہنما ہی نہیں رہے بلکہ دنیا کے ان گنے چنے آدمیوں میں شمار کئے جاتے تھے جن کے معمولی اشارے پر قیامت خیز ہنگامے جنم لے سکتے تھے۔ خروشچیو اس اعتبار سے بھی اہم ترین شخصیت قرار دیئے گئے ہیں کہ انھوں نے اسٹالن جیسے عظیم انسان کے روس پر چھائے ہوئے تصور کو خاک میں ملا ڈالا۔ انھوں نے اسٹالن کے سیاہ کرتوتوں کی اسوقت مذمت کی جب روس کی اکثریت اپنے آنجہانی ڈکٹیٹر کے خلاف ایک لفظ سُننے کی بھی روادار نہ تھی۔ خروشچیو کو اقتدار کی کرسی سے ہٹاتے وقت الزامات کی ایک طویل فہرست انکے سپرد کی گئی تھی۔ ان میں ہندوستان دوستی کا بھی ایک الزام تھا۔ نکیتا نے ہندوستان اور چین کی جنگ کے دوران ہندوستان کو مگ جہاز فراہم کرکے چین کے کیونسٹوں کے علاوہ روس کے چین نواز کیمونسٹ عناصر کو بھی اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

بہرحال ۱۹۶۴ء کے بعد وہ گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ چھ سال کے بعد روس کی سرکاری خبر رساں ایجنسی "تاس" کو ان کا تذکرہ محض اس لئے کرنا پڑا کہ اُسے اُنکی وہ تردید شائع کرنا تھی جس میں انھوں نے مذکورہ کتاب سے اپنی لاعلمی اور سراسر بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ ایک "بیان" بہ مصنف اس بات پر مُصر ہے کہ اس نے یہ کتاب نہیں لکھی دوسری جانب کتاب شائع کرنے والے ادارے جن میں مشہور رسالہ لائف (LIFE) پیش پیش ہے سیکڑوں ماہرین سے اپنی شہادتیں دلا رہے ہیں جنکا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب خروشچیو نے لکھی ہے ولیکن روس میں قیدی

کی حیثیت سے زندگی گذارنے والا یہ ضعیف اور بیمار انسان بھی جو اپنی جان بچانے کی خاطر اس کا مصنف ہونے سے انکار کرے۔ بہرحال ابھی یہ معاملہ تصفیہ طلب ہے اور مستقبل ہی اس متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

خروشچیو نے اس کتاب میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۲ء تک رونما ہونے والے واقعات [illegible] ہیں جو سامراللاف، جوزف اسٹالن وغیرہ قسط وار شائع کر رہے ہیں۔

کامریڈ نکیتا خروشچیو کے خیال میں جوزف اسٹالن خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا لیکن اس کی شخصیت میں بیک وقت خوبیاں اور خرابیاں دونوں جمع تھیں۔ کامریڈ اسٹالن ایک ایسا ڈکٹیٹر تھا جو روسی عوام کو اپنا تابع فرمان بنانے سے زیادہ انکو اپنی ذات سے خوف زدہ رکھنا چاہتا تھا۔ انہوں نے تحریر کیا ہے:۔

"کامریڈ اسٹالن سے میری ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی جب میں پارٹی کانگریس کے چودھویں اجلاس میں شرکت کی غرض سے ماسکو گیا ہوا تھا۔ اس وقت میں اپنی ماں کے دی ہوئی دینی تعلیمات اپنے ذہن و دماغ سے نکال کر پھینک چکا تھا۔ میں ان دنوں دو بچوں کا باپ تھا میری پہلی بیوی ۱۹۲۰ء میں قحط کا شکار ہو کر داعی اجل کو لبیک کہہ چکی تھی۔ اور میں نینا کو اپنا رفیق حیات ثانی بنا لیا تھا۔ ماسکو پہونچنے کا مقصد پارٹی کانگریس کے اجلاس میں اس لئے قبل از وقت پہونچ گیا کہ اگلی صفوں سے اسٹالن کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر سکوں۔

۱۹۳۰ء کے دوران جب میں ماسکو انڈسٹریل اکیڈمی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا مجھے سمارا کے علاقہ میں مشترکہ زرعی فارموں کو چندے کی شکل میں جمع کیا ہوا روپیہ پہونچانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ سمارا میں پہونچتے ہی میں نے غربت و کسمپرسی کے وہ مناظر دیکھے جو سے میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ کاشتکار قحط سالی اور غلہ کی کمیابی کی وجہ سے بھیڑ بکریوں کی طرح مر رہے تھے۔ مجھے وہ لمحات اچھی طرح یاد ہیں جب میں نے کچھ کسانوں کو روپیہ لانے کی خوشخبری دی لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر خوشی کی کوئی کرن نمودار نہیں ہوئی۔ وہ صاف طور پر ان لوگوں نے کہا:۔

"ہمیں روپیہ کی ضرورت نہیں۔ نہ ہم کاشت کاری کے لئے [illegible] چاہتے ہیں بلکہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ہمیں کھانے کے لئے غلہ فراہم کیا جائے۔"

بعد کی رپورٹوں نے مجھے مشترکہ کاشت کاری کی زبوں حالی اور ابتری سے روشناس کرایا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسٹالن کا نافذ کیا ہوا یہ حکم بہت سی حکمتوں سے خالی تھا اور اس طریقہ کار نے سارے علاقہ کو اناج سے محروم کر دیا ہے۔ یوکرین جہاں کا میں رہنے والا تھا اسٹالن کے اس حکم سے اتنی بری طرح متاثر ہوا کہ ہزاروں آدمی فاقہ کشی کی وجہ سے موت کو لبیک کہتے رہے لیکن کسی میں جرأت نہ ہوئی کہ وہ کامریڈ اسٹالن کو اس طریقہ کار کی خرابیوں اور بدعنوانیوں سے آگاہ کر سکے۔ یہ وہ طریقہ کار تھا جس کے تحت ایک انگوٹھا چھاپ کاشتکار (فارم کے لیڈر) کے سامنے بقیہ کسان ایسے تھراتے تھے جیسے چھرے کے سامنے کوئی بکرا کانپنے لگتا ہے۔

انڈسٹریل اکیڈمی میں اسٹالن کی بیوی میرے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میری اس کی یہی جان پہچان اسقدر مفید ثابت ہوئی کہ ۱۹۳۴ء میں مجھے ماسکو کا پارٹی لیڈر چن لیا گیا۔ اگرچہ اسٹالن کی اس بیوی نادیہ نے جو سوتیلانہ کی ماں تھی ۱۹۳۲ء میں خودکشی کر لی تھی لیکن میرے لئے اسکی مخلصانہ سفارش اسٹالن کے ذہن میں آخر وقت تک منقش رہی اور جب پارٹی کے بیشتر سربراہ اسٹالن کے عتاب کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے میں نادیا کی وجہ سے زندہ و سلامت رہا۔ اسٹالن کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کسی سے محبت کرتا تھا نہایت لغویات ہے لیکن اپنی زندگی کی آخری سانس تک وہ میری عزت کرتا رہا، اس کا مجھے اعتراف ہے۔

اسٹالن نے لینن جیسے روس کے معمار اعظم کی بیوی اور بہن سے کبھی مشفقانہ برتاؤ نہیں کیا۔ اسٹالن کی موت کے بعد ہمیں ایک خفیہ کمرے سے ایک لفافہ دستیاب ہوا جس میں لینن کا تحریر کیا ہوا ایک نوٹ موجود تھا۔ اس نوٹ میں لکھا ہوا تھا کہ اسٹالن نے اس کی بیوی کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا اس لئے اس نے اسٹالن سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کا رفیق بنا رہنا چاہتا ہے تو اسکی بیوی سے معافی مانگ لے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن اسٹالن نے مجھے ٹیلیفون پر ماسکو کے غسل خانے اور پاخانے صاف رکھنے کا حکم دیا تھا کسی نے اس سے راجدھانی میں پھیلی ہوئی گندگی کے بارے میں شکایت کی تھی۔ لہذا بلگانن کی معیت میں جو بعد میں روس کے وزیراعظم ہوئے مجھے اس مسئلہ کو سلجھانا ہی پڑا۔



خروشچیو اور اسٹالن ۔ دو کامریڈ

۳۴ء میں ہی مجھے ایک اور ٹیلیفون کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ ٹراٹسکی کے ماننے والوں میں سے کسی نے لینن گراڈ کے پارٹی لیڈر سرجی کیروو کو قتل کر دیا ہے۔ بس پھر کیا تھا اسٹالن کی خفیہ پولیس نے اپنے چیف کے اشارے پر تقریباً دس لاکھ

اسطالن —— کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے

پارٹی ممبروں کو قتل کروا دیا اور ایسے ان گنت لوگوں کا بھی صفایا کروا دیا جن کا پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسکے علاوہ تقریباً پانچ لاکھ بے وجہ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور اس دور کی بیشتر پارٹی کے عہدے داروں کے دامن قتل کے داغ تھے۔ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پہلا فرض ہے کہ ہم ان تمام مقتولوں کی یاد کو دوبارہ تازہ کریں اور ان سے اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کریں تاکہ اس خون ناحق کی خیالی تلافی ہوسکے۔

۱۹۴۳ء کی جنگ عظیم ثانی کے دوران یوکرین میں اتنا ہولناک قحط پڑا کہ لوگوں نے انسانوں کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہزاروں آدمی روزانہ مرنے لگے لیکن اسٹالن نے یوکرین میں غلہ پہنچانے کا کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ اور جب میں نے بالمشافہ اس قحط کی داستان اسے سنائی تو اس نے کہا کہ یوکرین میں غلہ کی افراط ہے اور تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے ایسی اطلاعات پہونچائی جا رہی ہیں۔

اپنے آخری دنوں میں اسٹالن عجیب بے تکی اور مجنونانہ حرکتوں کا ارتکاب کرنے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حکومت کے تقریباً فیل ہو جانے کی وجہ سے روس میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسٹالن اپنے مخصوص آدمیوں کے ساتھ وقت گزاری کیا کرتا تھا۔ اُس نے اِن دنوں اپنے ساتھیوں کے دو گروپ بنا دیئے تھے۔ کبھی اس گروپ کے آدمیوں کو بُلا لیتا کبھی اُس گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ دن بھر بیٹھا ہوا گفتگو کرتا رہتا یا تفریحی مشاغل میں منہمک رہتا۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ کریملن کی لائبریری میں گزارتا یا پھر کریملن ہی میں بنے ہوئے سینما ہال میں امریکی فلم دیکھ کر ان پر نکتہ چینیاں کرتا رہتا اس طرح کبھی کبھی رات کے دو بج جاتے۔ اور پھر وہ کہتا کہ آؤ کھانا کھالیں حالانکہ یہ سونے کا وقت ہوتا اور ہمیں نیند لینے کی یوں بھی ضرورت تھی کہ صبح ہوتے ہی اپنے متعلقہ فرائض کی انجام دہی بھی کی جائے لئے اتنی ہی ضروری تھی جتنی کہ اسٹالن کے ساتھ شب باشی۔ اس کے باوجود سب کو ہی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر کہنا پڑتا کہ ہاں ابھی بھوک ہیں اور کھانا کھانے کے لئے چلتے ہیں۔ اب کریملن سے یہ قافلہ اسٹالن کے مضافاتی گھر کی جانب روانہ ہو جاتا۔ ہر شب وہ مختلف راستے سے اپنے مکان کی جانب جاتا۔ کسی کو کبھی کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کب وہ کس راستے سے اپنے گھر جائے گا۔ کھانے کے وقت وہ کبھی بھی کسی پلیٹ کی جانب پہل نہیں کرتا۔

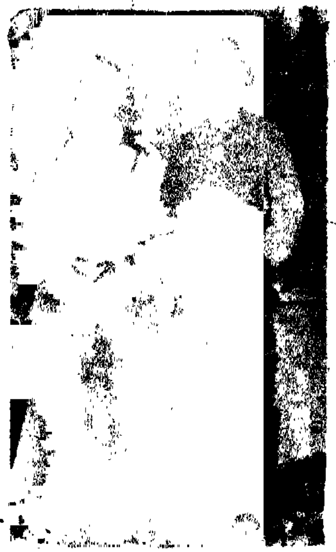
اسے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا کہیں اس کے کھانے میں زہر نہ ملا دیا گیا ہو۔ اسی لئے وہ اپنے پسندیدہ کھانے کی پلیٹ پہلے کسی افسر کی جانب بڑھاتا اور جب وہ افسر اس میں سے لقمہ لینے کے بعد کچھ دیر تک کسی شکایت کا اظہار نہ کرتا تو اسٹالن اس میں سے کھانا شروع کر دیتا۔

اسٹالن کو اونگھنے والے لوگوں سے سخت نفرت تھی اسی لئے ہم دن میں تھوڑی دیر سو لیتے تاکہ اس کے لئے ناگواری کا باعث نہ بن سکیں۔ کھانے کے دوران اسٹالن خود بھی زیادہ شراب پیتا اور اپنے ساتھیوں کو بھی ڈٹ کر پلاتا تھا اس لئے بیریا، مالنکوف، مکویان وغیرہ چپکے سے شراب لانے والے ساقیوں سے درخواست کرکے رنگین پانی منگوا لیا کرتے تھے تاکہ اسٹالن کی خوشنودی بھی حاصل کر سکیں اور زیادہ شراب پینے سے بھی بچ جائیں

> **اگرچہ مجھے اس کی عظمت کا اعتراف ابھی تک ہے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر وہ زندہ ہوتا اور میرے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہوتی تو میں اس کے جرائم کیخلاف مقدمہ چلا کر اسے معقول سزا دلواتا لیکن افسوس ہے کہ موجودہ روسی حکومت ایکبار پھر اسی شخص کی عقیدتوں کے راگ الاپنے میں مشغول ہو گئی ہے۔**

بہرحال اسٹالن جیسا بلانوش اس کے خاص رفیقوں میں اور کوئی نہ تھا وہ شراب پی کر اتنا بدمست ہو جاتا تھا کہ اپنے معزز اور باوقار ساتھیوں کا مذاق اُڑانے لگتا۔ انھیں ذلیل کرنے میں اسے مزہ آنے لگتا تھا۔ ایک بار اُس نے مجھے گوپک رقص کرنے کے لئے کہا اور بدرجہ مجبوری مجھے اسکے احکام کی تعمیل میں سر تسلیم خم کرکے یہ ذلت گوارا کرنا پڑی۔

زندگی کے آخری دنوں میں اس کی حالت سال بسال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اُسے کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا بقول خود اسے اپنی ذات پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی موت سے اتنا خائف رہنے لگا تھا کہ اس کے ذہن میں سوائے اس ایک خیال کے اور کچھ باقی ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اتنا گم صم رہتا کہ ایک بار وہ اپنے دیرینہ ساتھی بلگانن کا نام بھی بھول گیا۔ اپنی زندگی کے



خروشچیو اور کیوبا کے کاسترو

آخری نئے سال کے جشن پر اس نے اپنی بیٹی سویتلانہ کو مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے ناچنے پر مجبور کیا۔ اور جب اس نے اس حکم کی تعمیل میں کچھ ذلت محسوس کی تو اسٹالن نے اس کی چوٹی پکڑ کر اُسے مہمانوں کے سامنے دھکا دیدیا۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ حاضرین کے سامنے سکتے کے عالم میں کھڑی ہوئی وفورِ غم سے آنسو بہا رہی تھی اسکی آنکھیں غصے کے مارے انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اسٹالن نے پھر بھی اسے معاف نہیں کیا۔ وہ نشے میں اس بری طرح چور تھا کہ آگے بڑھ کر اسے پشت کی جانب سے دھکیل کر رقص کے فرش پر لے آیا۔

ان دنوں اس کی مجنونانہ حرکتیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ بلگانن نے جو اکثر اس کے ڈنر پر مدعو رہتا مجھ سے ایک روز کہا۔

” خروشچیو ہم لوگ اسٹالن کے کھانے کی میز پر ایک دوست کی طرح شریک تو ہوتے ہیں لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ واپسی پر وہ اپنے گھر لوٹے گا یا اسے جیل خانہ میں ٹھونس دیا جائے گا۔“ اگرچہ مجھے اسکی عظمت کا اعتراف ابھی تک ہے۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر وہ زندہ ہوتا اور میرے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہوتی تو میں اس کے ان جرائم کے خلاف مقدمہ چلا کر اسے معقول سزا دلواتا لیکن مجھے افسوس ہے کہ موجودہ روسی حکومت ایک بار پھر اسی شخص کی عقیدتوں کے راگ الاپنے میں مشغول ہو گئی ہے جو ہزاروں اور لاکھوں بیگناہوں اور معصوموں کے قتل عام کا ذمہ دار تھا۔

آزاد ہندوستان کے آزاد بھکاری



بھیک مانگنا
ہمارا پیدائشی حق ہے

ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد جس چیز پر سب سے پہلے کسی غیر ملکی کی نظر جاتی ہے وہ ہیں یہاں کے بھکاری۔ یہاں کی غربت، یہاں کے بھکاری اور ان کی طرف عام لوگوں کا رویہ دیکھ کر غیر ملکیوں کو ایسا ذہنی جھٹکا لگتا ہے کہ کئی روز تک ان کا ذہن اس مسئلے میں ہی الجھا رہتا ہے۔ امریکا اور دوسرے دولت مند ملکوں کے بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو زندگی میں پہلی بار اس قسم کی غربت اور انسانی بیچارگی دیکھتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں پچاس لاکھ سے زیادہ بھکاری ہیں جو کسی چھوٹے موٹے ملک کی کل آبادی کے برابر ہیں۔ صرف بمبئی میں پچاس ہزار فقیر ہیں اور ویسے کلکتہ اس معاملے میں بمبئی سے دو ہاتھ آگے ہی ہے۔ کلکتہ اور بمبئی کے بعد مدراس اور حیدرآباد کا نمبر آتا ہے اور پھر دارالحکومت دہلی کا۔ ہم نے بمبئی اور کلکتے سے دہلی آنے والے بہت سے لوگوں کو چاروں طرف دیکھنے کے بعد حیرت سے کہتے سنا ہے "ارے یہاں تو ایک بھی فقیر نظر نہیں آ رہا ہے" یعنی اب ہندوستانیوں کے لیے فقیروں کی بہتات غور طلب مسئلہ نہیں ہے بلکہ کسی جگہ ان کا نظر نہ آنا حیرت کی بات ہے۔

آزادی کے بعد جہاں ہندوستان کی دوسری صنعتوں نے ترقی کی وہاں بھیک مانگنے کی صنعت نے بھی خوب ترقی کی۔ عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے ہو تو بھلا ہندوستانی عوام کا یہ محبوب پیشہ کیوں نہ ترقی کرے۔ ملک نے پچھلے بیس سال میں خوب ترقی کی۔ ملک کی دولت میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہوا اور آہستہ آہستہ تمام دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آ گئی۔ ان نئے دولت مندوں کو زیادہ سے زیادہ نفع چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ نفع تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب سو آدمیوں کا کام ایک مشین سے کرایا جائے۔ آدمیوں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ جہاں سیٹھوں کی دولت میں اضافہ ہوا، وہاں فقیروں اور بھک منگوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ اس میں اضافہ کا باعث شہر میں روزگار کا لالچ بھی ہے جو ہر روز ہزاروں گاؤں والوں کو شہر کی جانب کھینچتا ہے۔ لیکن شہر میں روزگار کہاں؟ یہاں تو آدمی کا کام بھی مشینیں کرتی ہیں۔ مجبوراً یہ ہزاروں بے روزگار لوگ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب ہی لوگ مجبوری کی وجہ سے بھیک مانگتے ہیں۔ جی نہیں، ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی کمائی کے عادی بن چکے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں، بھیک مانگنا جن کا خاندانی پیشہ ہوتا ہے۔ بھیک کی روٹی پر ہی ان کا بچپن گزرتا ہے اور خود بھی بڑے ہو کر بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج بھی ایسے بہت سے گروہ موجود ہیں جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر دور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں اور ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ یہ لوگ اس دھندے کو باقاعدہ کاروبار کی طرح چلاتے ہیں اور اپنی دولت کے بل پر سماج میں باعزت شہری بن کر رہتے ہیں۔ پھر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو محنت مزدوری کرنا چاہتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ مزدوری سے زیادہ بھیک مانگنے میں کمائی ہو جاتی ہے تو اس نفع بخش پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں۔

بھکاریوں کی ایک قسم اور بھی ہے جنہیں ہم پارٹ ٹائم بھکاری کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم میں وہ بچے شامل ہیں جو دن میں جوتا پالش کرتے ہیں اور رات کو بھیک مانگتے

[illegible]



"تیرے دوار کھڑا بھگوان۔ بھگت بھر دے رے جھولی": ہمارے فقیر لوگوں کے مذہبی اعتقادات اور توہم کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

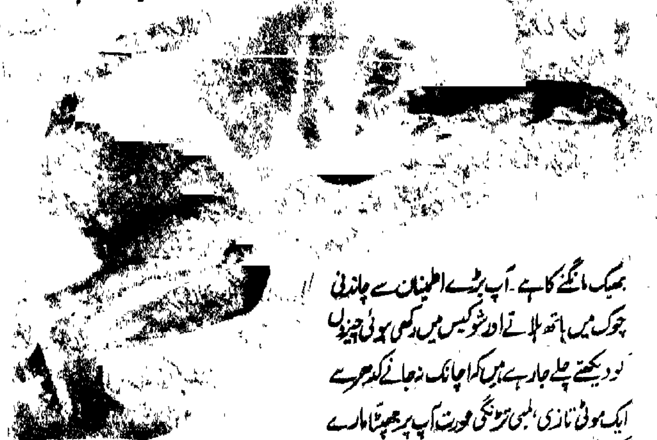
ہیں یا دو جوڑوں میں عورت مرد بیٹھتے ہیں اور شام کو کسی ہوٹل کے باہر ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جوان بھکاری جوڑوں میں کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو دونوں وقت بھیک مانگتی ہیں اور رات کو پیشہ کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو بھیک مانگنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ ان بھکاریوں کے بھیک مانگنے کے نت نئے طریقے ہیں۔ آپ بس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوچ رہے ہیں کہ جلدی سے گھر پہنچیں اور کھانا کھا کر آرام کریں۔ اچانک بس میں ایک لڑکا داخل ہوگا اور سب کے ہاتھ میں ایک ہینڈ بل تھماتا چلا جائے گا جس پر ہندی، اردو اور انگریزی میں اس لڑکے کی بپتا لکھی ہوگی۔ عام طور پر ان ہینڈ بلوں کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ لڑکے کے ماں باپ مر گئے ہیں، دو بہنیں ہیں، لڑکا ان کی شادی کرنا چاہتا ہے اور اب ان کے جہیز کے لیے چندہ جمع کرتا پھر رہا ہے۔ نیچے کسی پٹواری یا کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے تصدیقی دستخط ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں تو لوگ اس قسم کے ہینڈ بلوں سے متاثر ہوتے تھے اور اس لڑکے کی بہنوں کا جہیز تیار کرانے میں دل کھول کر دان دیتے تھے۔ لیکن جب یہ 'جہیز' کا چکر روز کا معمول بن گیا تو لوگوں نے دان دینا بند کر دیا۔ پھر بھی بہت سے سیدھے سادے لوگ آج بھی اس پھانسے میں آ جاتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ طریقہ 'جھنڈوں' کے ذریعے بھیک مانگنے کا ہے۔ آپ بڑے اطمینان سے چاندنی چوک میں ہاتھ ہلاتے اور شو کیس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اچانک نہ جانے کدھر سے ایک موٹی تازی، لمبی تڑنگی عورت آپ پر جھپٹا مارے گی اور آپ کے سینے پر جھنڈا گاڑ دے گی۔ جی ہاں میں اسے جھنڈا گاڑنا ہی کہوں گا، کیوں کہ میں خود بھی کئی مرتبہ اس چڑھائی کا شکار ہو چکا ہوں۔ پن میں لگا ہوا جھنڈا کچھ اس انداز سے سینے پر لگایا جاتا ہے کہ پن کپڑوں سے گزرتی ہوئی سینے میں اتر جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ درد سے بے چین ہو کر چیخ ماریں، آپ کے آگے ایک ڈبہ کر دیا جائے گا۔ کیوں کہ اب جھنڈا آپ کے سینے پر گڑ چکا ہے اس لیے یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ دان ضرور دیں (یاد رکھیے ۲۵ پیسے سے کم دان قبول نہیں کیا جائے گا)۔ کچھ دیر بعد جب آپ کے حواس قابو میں آ جائیں گے اور آپ جھنڈا اکھاڑ کر دیکھیں گے تو آپ کو پتہ لگے گا کہ جھنڈا تو صرف ایک لال رنگ کے کاغذ کا ٹکڑا ہے اور اس کا تعلق کسی سوسائٹی سے نہیں ہے۔ چوں کہ اب مجھے اس قسم کے حملوں کا کافی تجربہ ہو چکا ہے، اس لیے اب جیسے پھرتی سے مجھ پر حملہ کیا جاتا ہے اسی پھرتی سے میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ اس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یا تو پن بازو میں اتر جاتی ہے اور یا پھر قمیص کا کوئی گوشہ پھاڑتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے۔

فقیروں کی ایک قسم ہے جو میرے بس سٹینڈ کے اڈے پر کھڑی ہوتی ہے۔ ایسے بس اڈوں پر جہاں بہت لمبی لمبی لائنیں لگی رہتی ہیں۔ یہ لوگ لائن کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک سروے کرتے رہتے ہیں، اور چند ہی گھنٹوں میں یہ اتنا کما لیتے ہیں جتنا ایک مزدور تمام دن کی محنت کے بعد بھی نہیں کما سکتا۔ دہلی میں فوارے کے بس اڈے پر ایک دس بارہ سال کی لڑکی ہے جو بھیڑ کے وقت دو گھنٹے کے اندر اندر چھ سات روپے کما لیتی ہے۔ یہ لوگ ہر شخص کی نفسیات سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان جوڑوں کا پیچھا یہ لوگ کبھی نہیں چھوڑتے۔ کالج میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں عام طور پر ان کی چرب زبانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "بابو جی تمہاری جوڑی بنی رہے۔ جلدی سے شادی ہو جائے۔ دونوں امتحان میں پاس ہو جاؤ۔ وغیرہ وغیرہ" نوجوان جوڑا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کہیں کسی نے سنا تو نہیں۔ پھر جھینپ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ لڑکا اپنی پینٹ میں ہاتھ ڈالتا ہے اور لڑکی اپنا پرس کھولتی ہے۔ دونوں ایک ساتھ فقیر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور فقیر اس دوہرے فائدے پر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اگر بابو نے بہت ہی سفید چمک دار کپڑے پہن رکھے ہیں تو فقیر لڑکا بار بار بابو کے کپڑے چھوتا ہے۔ بابو گھبرا کر گرد لگے میلے ہاتھوں کے داغ سے بچانے کے لیے پیسہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔

لیجیے اسٹیشن پر ایک بہت ہی خاص قسم کے فقیر بھی دیکھ لیجیے۔ ان فقیروں کو دیکھ کر آپ قطعاً نہیں



ہندوستان کا مستقبل
کل کا ہندوستانی جوان پھر بھیک مانگتا ہے اور رات کو جہاں ٹھکانا ملتا ہے سو جاتا ہے۔



مستقبل کی فکر سے آزاد — بس مل گیا کھانا، مل گیا گھر ہے

لہ سکتے کہ یہ فقیر ہیں۔ اچھے خاصے کپڑے پہنے ہوئے ایک بڑے میاں آپ کے پاس آئیں گے اور آپ کو ایک کونے میں لے جا کر بتائیں گے کہ کس طرح ان کی جیب کٹ گئی اور اب انھیں گھر جانے کے لیے کچھ پیسے چاہئیں۔ قدرتی بات ہے کہ دہلی جیسے شہر میں جہاں ہر وقت جیبیں کٹا کرتی ہیں، آپ ان کی بات کا یقین کرلیں گے اور ہمدردی میں انھیں صرف بس کا کرایہ ہی نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی پیسے دے دیں گے۔ آپ کو اپنی بے وقوفی کا احساس اس وقت ہوگا جب تین چار دن بعد پھر وہی بوڑھا آکر آپ کو وہی پرانی کہانی سنائے گا۔

دہلی میں ڈیفنس کالونی، ساؤتھ ایکسٹنشن اور آس پاس کے علاقے دولتمند لوگوں سے آباد ہیں صبح کو دفتر جانے کے لیے یہ لوگ لنک، روڈ سے گزرتے ہیں۔ صبح کو دس بجے دفتر کے اوقات میں کاروں کی لائن لگ جاتی ہے اور یہی حال شام کو پانچ بجے ہوتا ہے اس سڑک پر ان اوقات میں ایک بوڑھا فقیر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ فقیر نہ تو کوئی آواز لگاتا ہے اور نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے۔ بس اس کے سامنے ایک کے بعد ایک گاڑی رکتی ہے اور اس میں سے کوئی ہندوستانی میم صاحب یا صاحب بہادر اس کے پیالے میں پیسہ گراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھیک اصل میں اس فقیر کو نہیں دیتے بلکہ اپنے ضمیر کو دیتے ہیں جو ہر وقت اندر بیٹھا بیٹھا ان کی ناجائز حرکتوں پر شور مچاتا رہتا ہے یہ رشوت دینے کے بعد ان کا ضمیر آرام سے سو جاتا ہے اور وہ تمام دن اطمینان سے چور بازاری، منافع خوری، اسمگلنگ اور ہر طرح کی جائز و ناجائز حرکت کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کے فقیر ہندوستان کے سب سے زیادہ سیکولر باشندے ہیں۔ عام ہندوستانیوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ عام طور پر آپ کسی فقیر کو دیکھ کر یہ نہیں بتاسکتے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر ابھی ایک فقیر دہلی کے برلا مندر کے باہر کھڑا نظر آرہا ہے تو کچھ دیر بعد وہ جامع مسجد کے دروازے پر نمازیوں کے انتظار میں بیٹھا نظر آئے گا۔ اگر علاقہ ہندوؤں کا ہے تو فقیر بھجن گائے گا، اگر مسلمانوں کا ہے تو نعت اور اگر عیسائیوں کا ہے تو پاک مریم اور پاک بیٹے کے نام پر بھیک مانگے گا۔ جب تک بھیک دیتے رہیں بھکاری کے لیے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب برابر ہیں۔

فقیر لوگوں کے مذہبی اعتقادات اور توہم کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر انھیں طرح طرح سے بیوقوف بنا کر پیسہ لوٹتے ہیں۔ بہت سے سادھو نما فقیر ناگ دیوتا کو ساتھ لیے گھومتے ہیں۔ اگر آپ دینے سے انکار کریں گے تو دھمکی دیتے ہیں کہ رات کو ناگ دیوتا آپ کے پاس آئے گا۔ عام طور پر کچے عقیدے کے لوگ خوفزدہ ہو کر ناگ دیوتا کو کچھ نہ کچھ بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

دہلی کے ایک سینما گھر کے باہر ایک بوڑھا فوجی اپنی حرکتوں سے لوگوں کو خوش کرکے پیسے بٹورتا ہے۔ یہ بوڑھا پرانا سا فوجی ڈریس پہنے اور سر پر ٹوٹی ہوئی لوہے کی کیپ لگائے، اپنے ڈنڈے کو فرضی بندوق بنائے سنیما ہال کے سامنے پریڈ کرتا رہتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھ کر ہنستے ہیں اور کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں۔

بھکاریوں کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف سماج نے ابھی زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی الگ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بذاتِ خود معاشرے کے دوسرے مسائل کی پیداوار ہے۔ غربت، بے روزگاری، روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی اس قسم کے مسائل ہیں جو زیادہ تر بھکاریوں کو جنم دیتے ہیں۔

بمبئی میں بھکاریوں کے لیے ایک گھر بنایا گیا ہے جس میں صرف ایک ہزار بھکاریوں کے لیے گنجائش ہے جب کہ اس وقت بمبئی میں پچاس ہزار سے زائد بھکاری ہیں۔ اس گھر میں انھیں درزی، بڑھئی، موچی اور اس قسم کے دوسرے کام سکھائے جاتے ہیں۔

دہلی میں بھی اس قسم کا ایک سینٹر کنگس وے کیمپ کے پاس کھولا گیا ہے۔ اس کیمپ میں بھی ایک ہزار آدمیوں کی گنجائش ہے۔ یہاں فی بھکاری ۶۰ روپے مہینہ خرچ کیا جاتا ہے لیکن جب بھکاری یہاں سے باہر نکلتا ہے تو ایک بار پھر بھکاری بن جاتا ہے۔ جس سماج میں پڑھے لکھے، صحت مند لوگوں کے لیے روزگار نہیں ہے وہاں ان بھکاریوں کو کیسے روزگار مل سکتا ہے!

ایک سوال یہ ہے کہ لوگ بھیک دیتے ہی کیوں ہیں جب کہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کرکے وہ اس شخص کو فائدہ پہنچانے کی بجائے الٹا نقصان پہونچا رہے ہیں؟ کیا



"بابو ایک پیسہ دے دے"
ہندوستان میں بھکاری چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ان کا بھیک دینا مسئلے کا حل نہیں ہے؟ اصل میں لوگ بھیک یا تو نرم دل ہونے کی وجہ سے دیتے ہیں یا پھر اپنے ضمیر کو رشوت دینے کے لیے۔ بعض لوگوں کو بھیک دینے کی عادت سی پڑ جاتی ہے اس لیے وہ عادت سے مجبور ہو کر بھیک دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے دوستوں یا جان پہچان والوں کے سامنے فقیروں کو بھیک دینے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ بھیک دینا ان کے لیے ایک طرح کا 'STATUS SYMBOL' بن جاتا ہے۔ بہت سے سیٹھ ساہوکار، بنیے، کوئی کالا دھندا کرنے سے پہلے بھگوان سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ان کا کام پورا ہوگیا تو وہ اتنے فقیروں کو کھانا کھلائیں گے یعنی اس طرح وہ بھگوان کو رشوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ مذہبی تعلیمات سے متاثر ہو کر بھیک دیتے ہیں اور عام طور پر بھیک دینے کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے بھیک دیکر اپنے سب پاپ دھو لیے۔ اب انھیں ایک بار پھر پاپ کرنے کی کھلی چھوٹ ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے فلمی گلوکار جیسے محمد رفیع اور لتا وغیرہ اپنی سریلی آوازوں میں گا گا کر اس پیشے کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک فلمی گانا ہے "تو ایک پیسہ دے گا وہ دس لاکھ دے گا" اتنا بڑا انعام تو آپ کو کسی لاٹری میں بھی نہیں مل سکتا۔ آرام سے یہاں ایک پیسہ دیجئے اور بھگوان کے پاس دس لاکھ لیجئے۔ کیسے ہے نہ بزنس نفع بخش! کیا اتنا نفع آپ کو کسی دوسرے بزنس میں ہو سکتا ہے؟ ●●

دنیا دوربین کی نظر میں

اسپین

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے

ایک مرتبہ پھر خبروں میں کیتھولک اسپین کا نام آنے لگا ہے۔ شاید اس لئے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ اسپین میں آٹھ سو برس مسلمانوں نے حکومت کی لیکن حکومت گئی تو وہاں سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ ان کے آثار تک مٹا دیئے گئے۔ جو قوم اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے۔ علامہ اقبال مرحوم اسپین گئے تو وادی الکبیر دریا کے کنارے (جس کے قریب ہی مسجد قرطبہ واقع ہے) کھڑے ہو کر صرف پرانے زمانے کا خواب دیکھ کر رہ گئے۔

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اسپین نے گزشتہ تین چار سو برس میں بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں اور یہ تو ہماری اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ نام نہاد جمہوریت پسندوں اور ڈکٹیٹر فرانکو کے درمیان سخت جنگ لڑی گئی۔ ۳ سال کی خانہ جنگی کے بعد بالآخر فرانکو کامیاب ہو گئے۔ اور یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو نئی مملکت اسپین کا قیام عمل میں آیا۔ (جو کیتھولک مذہب کی مملکت ہے۔) حکومت کے سربراہ اور سب کچھ جنرل فرانکو تھے۔ اور آج بھی وہ اس کے سب کچھ ہیں۔ اور گزشتہ ۳۱ برس میں کسی کو ان کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کی جرأت نہیں ہوئی ہے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "آسمان رنگ بدل رہا ہے" اور باسک (BASQUE) کے شمالی حصے کے چار صوبوں کی علیحدگی پسند کمیونسٹ دہشت پسندوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ میڈرڈ سے ۱۳۰ میل دور برگوش کے شہر میں دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے الزامات میں ۱۶ دہشت پسندوں کے خلاف جو مقدمات شروع کئے گئے۔ ان سے حالت اور خراب ہو گئی ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دہشت پسند پچھلے دنوں ایک جرمن ڈپلومیٹ

باقی صفحہ ۔۔۔ پر



ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن جیسے بڑے بڑے ڈکٹیٹر ایک ایک کر کے وقت کی گرد میں دب گئے لیکن بوڑھے فرینکو کی حکومت آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ فرینکو اپنے جرنیلوں کے ساتھ۔

یو حن بہل کو بطور یرغمال اغوا کر کے لے گئے اور اعلان کر دیا کہ اگر ان کے آدمیوں کو نہ چھوڑا گیا اور مقدمات واپس نہ لئے گئے تو یوحن بہل کو قتل کر دیا جائے گا۔ علیحدگی پسندی کی تحریک کی جڑیں بڑی گہری معلوم ہوتی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اسپین کا کوئی ایسا بڑا شہر نہیں تھا کہ جہاں ہڑتالیں، مظاہرے اور پولیس کے ساتھ تصادم نہ ہوئے ہوں۔

جنرلیسمو فرانکو کے حامیوں نے شاید مخالفوں کو مرعوب کرنے کے لئے پلازا دی اورینٹ (PLAZA DE ORIENT) پر پانچ لاکھ کی تعداد میں جمع ہو کر زبردست مظاہرہ کیا۔ اور جنرل فرانکو کے حق میں نعرے لگائے۔ ان کا خاص نعرہ تھا "خدا ہمیں کمزور حکومت سے بچائے"۔ جنرل فرانکو بالکونی پر آئے مظاہرین کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ شاید وہ مطمئن تھے کہ علیحدگی پسندی کا مقابلہ وہ اپنی "فلینگ اسپینولا" نامی پارٹی سے وابستہ محنت کش طبقہ کی مدد سے کر سکیں گے۔ فلینگ اسپینولا انکی وہ پارٹی ہے جسمیں انھوں نے اپنی کامیابی کے بعد تمام "قومی تحریکوں" کو مدغم کر دیا تھا۔ لیکن طاقت کا خواہ کتنا ہی بڑا مظاہرہ کیوں نہ کیا جائے "ہر کمالے را زوالے"۔ ایک تاریخی حقیقت ہے جنرل فرانکو ۳۱ برس ڈکٹیٹر کی حیثیت سے حکومت کر چکے ہیں۔ اب انکی سیاست بوڑھی ہو چکی ہے وہ خود بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ۷۸ سال کی عمر میں اگر فوجی وردی پہن کر عوام کے سامنے آجاتے ہیں تو انکی ہمت کی بات ہے۔ لیکن اور چند دن دیکھ لیجئے یہ "ہمت" خود بخود ختم ہو جائیگی انقلابی طاقتیں خواہ وہ کسی قوم یا طبقہ کی ہوں جب ابھر کر سامنے آتی ہیں تو کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسپینیوں میں انقلاب لانے کا جذبہ پیدا ہوا ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ان میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ بقول اقبال

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب



میڈرڈ میں پانچ لاکھ اسپینیوں نے ڈکٹیٹر فرانکو کی فاشسٹ حکومت کی حمایت میں مظاہرہ کیا۔ دالحکومت فرانکو کا گڑھ ہے لیکن باقی تمام ملک ان کا دشمن ہو چکا ہے۔

پولینڈ

گوشت نہیں ریفریجریٹر کھاؤ

ہندوستان والے بڑے صابر وشاکر لوگ ہیں کہ بیس گنی مہنگائی ہو جانے کے باوجود اسے خاموشی سے برداشت کر رہے ہیں لیکن ہر ملک والے ایسے نہیں ہوتے، کم از کم پولینڈ کے لوگوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایسے نہیں ہیں۔ ادھر کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ادھر انہوں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ پولینڈ کے لوگ بڑے بیف (گائے کا گوشت) خور ہیں بیف کے بغیر ان کا نکڑا انہیں نہیں ٹوٹتا۔ اسکی قیمت میں ۲۶ فی صدی کے اضافے سے وہ سخت مشتعل ہو گئے۔

اسی طرح کوئلے کی قلت میں دس سے بیس فیصدی تک اور قہوہ کی قیمت میں ۹۲ فیصدی کا اضافہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

ایک طرف قیمتوں میں اضافہ اور دوسری طرف یہ اعلان کہ اُجرتیں نہیں بڑھیں گی۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ وہاں مزدوریوں بچے کہ پاگل ہو گئے۔ حکومت نے انکی توجہ ہٹانے کے لئے ایسی چھوٹی مشینوں اور آلات کی قیمتوں میں کمی کی جو گھروں میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً ٹیلی ویژن سیٹ، کپڑا دھونے کی مشینیں اور ریفریجریٹر وغیرہ — بہت سے "پولستانیوں" کے لئے یہ بات



پولینڈ کے سابق وزیراعظم گوملکا

بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی ان سے کہے کہ روٹی گوشت نہیں "ریفریجریٹر کھاؤ"۔

یاد ہوگا پولینڈ وہی ملک ہے جس پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے حملہ کیا تھا اور دنیا کی دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی تھی اس کا رقبہ ۱۲۱۰۱۳۱ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۴۹۷۶۹۲۶ ہے لیکن اب تین کروڑ سے کیا کم ہو گی یہ وسطِ یورپ میں واقع ہے اور مشرق میں اس کی سرحدیں روس سے، مغرب میں جرمنی سے اور جنوب میں چیکوسلاواکیہ سے ملتی ہیں۔ شمال میں بحر بالٹک ہے۔ اسی بحر بالٹک کی بندرگاہ ڈینزگ سے اس مرتبہ بغاوت کا آغاز ہوا۔ اور پھر گڈینیا، اسٹیٹن (STASTANE) اور دوسرے شہروں میں ہنگامے پھیل گئے۔

پولینڈ کی زبردست اکثریت کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل ہے اور وہ یوم کرسمس بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ مناتے ہیں۔ اجتماعی ڈنر کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور دوسری تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کرسمس سے صرف گیارہ دن قبل قیمتوں میں اضافہ ان کے لئے فوری اشتعال کا باعث بنا۔ اور وزیراعظم ولاڈس لاگوملکا کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔

مسٹر گوملکا اپنے ملک کے بڑے ہر دلعزیز لیڈر رہے ہیں۔ وہ ایک پولش کسان کے بیٹے ہیں جو امریکہ میں ترک وطن کر گیا تھا لیکن مایوس ہو کر (چیکوسلاواکیہ کے دبچیک کے والد کی طرح) واپس آگیا۔ اسٹالن کے زمانے میں انہیں جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن جب "اسٹالینزم" کا دور ختم ہوا تو پولینڈ پر روس کی گرفت ڈھیلی ہونے پر ۱۹۵۶ء میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ وہ ایک قومی ہیرو کے طور پر جیل سے باہر آئے۔ وہ ایک ایسے "پول" تھے جو تمام پولوں کے لئے سب کچھ تھے۔ مخالف کمیونسٹ سمجھتے تھے کہ وہ ایک ایسی تحریک کے لیڈر ہیں جس کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے۔ اصلاح پسندوں کے خیال میں وہ ڈیموکریٹک سوشلزم کی راہ پر چل رہے تھے اور کمیونسٹ انہیں "ٹوٹتے ہوئے کمیونسٹ نظام کا بچانے والا لیڈر" سمجھتے تھے غرضیکہ ہر طبقۂ خیال کے لوگ ان سے خوش تھے اور وہ مسلّم طور پر ایک قومی لیڈر تھے۔ پھر یکایک یہ انقلاب کیسے آگیا اور ۶۵ سالہ گوملکا اور ان کے ساتھی کیوں گدی چھوڑنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلا واقعہ ۱۹۵۸ء میں اس وقت ہوا جب انھوں نے انیسویں صدی کے ایک ایسے ڈرامہ پر پابندی لگا دی جو روس کے خلاف تھا۔ اس پر طلباء میں خاص طور سے جوش پیدا ہوا اور ان کے اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا۔ طلباء میں یہودی طلباء دوسروں سے زیادہ پیش پیش تھے۔ یہودیوں کی مخالفانہ سرگرمیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سابق وزیرِ داخلہ مسٹر لاموزر نے انکے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کی تھی جس کی وجہ سے ۲۵ ہزار یہودیوں میں سے جو جنگ کے بعد پولینڈ میں باقی رہ گئے تھے پندرہ ہزار ترکِ وطن کر گئے۔ مسٹر گوملکا نے وزیرِ داخلہ کو الگ کر دیا لیکن یہودیوں کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ خود گوملکا کی بیوی کلم یہودی ہے نتیجہ میں حکومت کی جڑیں کمزور ہوتی رہیں۔ اور اس امر کے باوجود کہ وہ سیاسی میدان میں بہت حد تک کامیاب ہوئے اور انھوں نے پولینڈ کی سیاست میں روسی مداخلت کو کافی کم کرنے کے لئے روسی لیڈروں کو رضامند کر لیا۔ اقتصادی بے چینی ان کے لئے مصیبت بن گئی سیاسی مخالفین اور یہودیوں کو جو ذمہ دار عہدوں سے بڑی تعداد میں ہٹائے جانے کے بعد سماجی زندگی میں کافی دخیل ہیں عوام کو بھڑکانے کا موقع مل گیا اور مسٹر گوملکا مستعفی ہونے کے لئے مجبور ہو گئے۔

نئے سربراہ مسٹر ایڈورڈ گیرک مقرر کئے گئے ہیں جو دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کے مقابلہ میں زیادہ لکھے پڑھے اور زیادہ اعتدال پسند ہیں لیکن وہ سخت بھی ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے طلباء کے ہنگاموں کے دوران انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر مظاہرین نے ان کے کوئلہ کی کانوں والے شہروں میں داخل

طلعات نئی دہلی



پولینڈ کی سڑکوں پر ٹینک دوڑ رہے ہیں۔ عوام کا نعرہ ہے "ہمیں روٹی چاہیئے مشینیں نہیں۔"

ہونے کی کوشش کی تو ان کے سر کچل دیئے جائیں گے۔

مسٹر گیبرک کے مغربی ممالک کے لوگوں کے ساتھ ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ جب انکی تیرہ برس کی عمر تھی وہ اپنے والدین کے ساتھ فرانس چلے گئے تھے اور اس کے بعد وہ ۲۰ برس تک فرانس اور بلجیم میں رہے اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد اپنے وطن واپس آئے۔ دیکھنا ہے کہ وہ اب اپنے ملک کے باشندوں کی امنگوں کا کس طرح ساتھ دیتے ہیں جو غذائی قیمتوں میں اضافے سے سخت بے چین ہیں۔ ▪▪

اومان

عربوں کی بدقسمتی

اومان جنوب مشرقی عرب کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ گذشتہ جولائی میں سلطان قبوس نے اپنے والد سلطان سعید کو معزول کر کے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ عوام نے اس کا خیر مقدم کیا اس لیے کہ سلطان سعید اپنے مظالم کے لیے کافی بدنام ہو گئے تھے۔ نئے سلطان نے بہت سی اصلاحات جاری کی ہیں اور وہ عوام کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن وہ اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوں گے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے کیوں کہ اومان کے سب سے جنوبی صوبے ظفر میں گوریلوں کی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری ہیں۔ ان چھاپہ ماروں کو روس اور چین دونوں ملکوں کی طرف سے فوجی امداد مل رہی ہے۔ ان گوریلوں میں جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے، اومان کے باشندوں کے علاوہ جنوبی یمن کے قبائلی بھی شامل ہیں۔ پورے علاقے کی دیہی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔ گوریلا لیڈر محمد احمد غاسانی ہیں اور ان کے تیس کے قریب لیفٹیننٹ ہیں جن کی گوریلا تربیت چین میں ہی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ تین سو کے قریب گوریلوں کو چینی انسٹرکٹروں نے تربیت دی ہے۔ یہ گوریلے اپنے آپ کو "عوامی آزاد فوج" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ان کا مقصد اومان کی سلطانیت کو ختم کر کے پورے جنوبی عرب خاکنائے پر کنٹرول کرنا ہے۔ کسی وقت یہ گوریلے صرف پرانی قسم کی بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح تھے لیکن اب وہ جدید ہتھیاروں سے مسلح ہیں جن میں ہلکی بھاری توپیں بھی شامل ہیں۔

ایک بڑے خطرے کے پیشِ نظر سلطان قبوس نے اپنے ۴۸ سالہ چچا طارق بن تیمور کو جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، واپس بلا کر وزارتِ عظمیٰ ان کے سپرد کر دی ہے تاکہ گوریلا باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔ اگر ایسا ہوا تو ایک مرتبہ پھر اومان کی سرزمین بھائیوں بھائیوں کے خون سے رنگین ہوگی۔

عربوں کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں اکثر اختلافات رہتے ہیں اور اختلافات نہ ہونے کی صورت میں خود اندرونِ ملک ہی خانہ جنگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اومان کے معاملات میں بڑی طاقتیں بھی ملوث نظر آتی ہیں کیوں کہ یہ ریاست خلیجِ فارس اور خلیجِ عدن کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں سب سے بڑی ہے اور اومان کے شمال میں رودبارِ ہرمز سے مغربی یورپ کے ساتھ تجارت کا بہت بڑا راستہ ہے۔



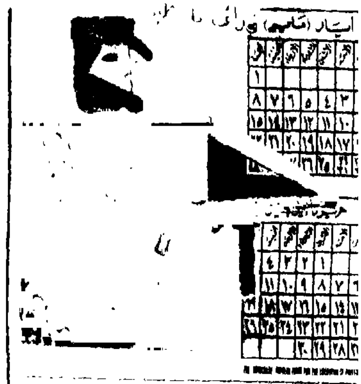
سلطان قبوس فوج کا معائنہ کر رہے ہیں

اسرائیل

مجاہدین کا ہوّا

بیت اللحم میں دو ہزار زائرین جمع ہوئے اور رات کی دعائیہ سروس میں شرکت کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ اس سے قبل زائرین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، لیکن کچھ اسرائیل کی پابندیوں سے اور کچھ اسرائیل میں غیر یقینی حالات کی بنا پر ان کی آمد پر اثر پڑا ہے۔۔۔ بیت اللحم وہ جگہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی تھی یہ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی مقدس جگہ ہے۔ پہلے یہ اُردن کے کنٹرول میں تھی لیکن اب اسرائیل کے قبضے میں ہے۔

اسرائیل نے کرسمس کے دن اس علاقے کی ناکہ بندی کر دی اور صرف انھیں لوگوں کو وہاں جانے دیا جنھیں سرکاری طور پر پاس دیے گئے تھے، ساتھ ہی ایک ہیلی کوپٹر پرواز کرتا رہا تاکہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ حادثہ کا ڈر اُسے عرب مجاہدین کی طرف سے تھا جنھوں نے اسرائیلیوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اسرائیل اپنے ظلم و ستم سے ان کی سرگرمیوں کو دبانا چاہتا ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ آزادی کی کسی بھی تحریک کو جتنے زیادہ ظلم و ستم کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی، وہ اتنی ہی زیادہ ابھری۔ اسرائیل میں بھی حکومت کے مظالم کے ساتھ ساتھ یہ تحریک ابھر رہی ہے اور اس نے سب سے زیادہ کوئی اور نہیں بلکہ وہاں کے وزیرِ دفاع موشے دایان پریشان نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ اب سوچنے لگے ہیں کہ عربوں کے ساتھ سمجھوتہ ہونا چاہیے تاکہ غیر یقینی حالات ختم ہوں۔ پچھلے دنوں انہوں نے نہر سویز کے علاقے میں امن قائم کرنے کے لیے اچھی خاصی معقول تجویز پیش کی تھی لیکن وزیرِ اعظم مسز گولڈا مائر اور ان کے ہمنواؤں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ گذشتہ ماہ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ اسرائیل کو امن کی بات چیت میں بھی حصہ لینا چاہیے جو ڈاکٹر گنار یارنگ۔۔۔



"نیا سال، نئی امیدیں، نئی کامیابیاں"۔ فلسطینی بچوں کے بنائے ہوئے کیلنڈر کا ایک صفحہ

نمائندہ اقوام متحدہ کی وساطت سے ہو رہی ہے۔ اس بات چیت میں شرکت کے حامی امریکا میں مامور اسرائیلی سفیر جنرل یٹ زک رابین بھی ہیں جو ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی فوجوں کے چیف آف اسٹاف تھے۔ وہ خاصا سیاسی ذہن رکھتے ہیں اور وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار بھی ہیں۔

اسرائیل کے چند ذمہ داروں کی یہ ذہنی تبدیلی ایک خوش آئند تبدیلی کہی جا سکتی ہے لیکن سرپھروں کو اب بھی وہاں بالادستی حاصل ہے جن کی اصلاح میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اور عرب مجاہدین کی طویل جنگِ آزادی بالآخر انھیں جھکنے پر مجبور کر دے گی۔

جرمنی

ایک شہر کے دو ٹکڑے

ایک ملک کے دو ٹکڑے ہم نے سنے تھے لیکن ایک شہر کے دو ٹکڑے آپ کو صرف برلن میں نظر آئیں گے۔ چھ فٹ اونچی دیوار دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ ساتھ گھومیے آپ کو جرمنوں کی بے بسی پر رونا آ جائے گا۔ آپ حیرت سے سوچنے لگیں گے کیا یہ وہی قوم ہے جو اپنے آپ کو "آریائی" کہہ کر سب سے افضل بتاتی تھی اور جو ہٹلر کی قیادت میں آج سے اکتیس برس قبل طوفان کی طرح اٹھ کر یورپ پر چھا گئی تھی اور جس کی شروع کی ہوئی جنگ کے نتیجے میں پانچ کروڑ انسانوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا (ان میں ۱۷،۱۲۰،۰۰۰ میدانِ جنگ میں ہلاک ہوئے تھے)۔ جرمن قوم کی یہ تباہ حالی ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہے جو ہٹلری پالیسی پر عمل کرنے والوں کو اپنا گرو مانتے ہیں۔

دونوں حصوں میں دیوار کے پیچھے آپ کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف زندگی نظر آئے گی۔ گزشتہ ۲۵ برس میں دونوں حصوں میں بہت بڑا فرق ہو گیا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ دونوں حصوں کے درمیان ابتدا میں جو کشیدگی تھی وہ ابھی تک موجود ہے۔ لیکن یہ کشیدگی ان بڑی طاقتوں کی پیدا کردہ ہے جو فاتح کی حیثیت سے جرمنی میں داخل ہوئی تھیں۔ عوام یہ کشیدگی پسند نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ جب مغربی جرمنی میں ولی برانت کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے مشرق کے ساتھ مصالحت کرنے کا نعرہ لگایا تو عوام نے اس کو اس حد تک کامیاب کرایا کہ وہ فیڈرل ڈیموکریٹک پارٹی کے تعاون سے حکومت قائم کرنے کی پوزیشن میں آ گئی اور کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی جس کے ہاتھ میں گزشتہ ۲۰ سال سے اقتدار تھا حزبِ اختلاف کی پوزیشن میں آنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ ولی برانت چانسلر بنے اور وزارت خارجہ فیڈرل ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر والٹر شیل کو سونپی گئی۔ ولی برانت اور والٹر شیل کی جوڑی نے ایک سال کے عرصے میں مشرق کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔ ولی برانت ماسکو گئے، وارسا گئے اور مشرقی جرمنی کے وزیر اعظم ولی اسٹوف



ولی برانت اور وزیر خارجہ والٹر شیل



ایک سال کے اندر اندر ولی برانت مغربی جرمنی کے نوجوانوں کا محبوب ترین لیڈر بن گیا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس تصویر سے ہو سکتا ہے۔

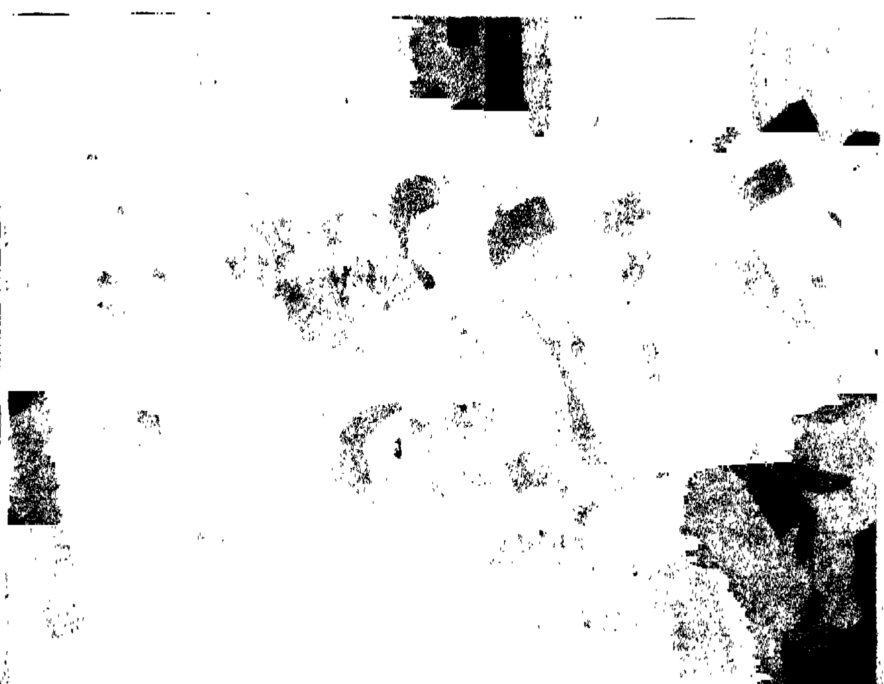
کل ہند
مسلم سیاسی اجتماع



انڈیا مسلم سیاسی کنونشن کے صدر بدالدین طیب جی
نش ، ۱۹۰۷ء - ہندوستان کے مشہور قومی رہنما اور
ین غنل کانگریس کے تیسرے صدر بدرالدین طیب
کے پوتے ہیں۔ آپ بمبئی اور آکسفورڈ میں تعلیم
ل کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں شامل
گئے۔ طیب جی انڈونیشیا، ایران، جرمنی اور جاپان
ہندوستان کے اسفیر رہ چکے ہیں۔ آپ کچھ عرصہ کے
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ
ہیں۔

کل ھند مسلم سیاسی کنونشن (ایمپوکس) منعقدہ دہلی کو اگر ہم فرقہ پرست عناصر کا اجلاس نہیں کہہ سکتے تو موجودہ بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں اسے کوئی دانشمندانہ قدم بھی نہیں گردانا جا سکتا۔ آج جب تمام ترقی پسند طاقتیں (اندرا کانگریس) سمیت ایک ہو کر فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں سے لڑ رہی ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے مواقع نہیں فراہم کرنا چاہئیں جن کا سہارا لے کر فرقہ پرست طاقتیں سیاسی مفاد حاصل کر سکیں۔ اسی قسم کے کنونشنوں سے جن سنگھ سوتنترا اور سنڈیکیٹ جیسی جماعتوں کو یہ کہنے کا موقع ملجائیگا کہ اگر وہ فرقہ پرست ہیں تو کیا ہوا مسلمان بھی تو فرقہ پرست ہیں۔ اس وقت موقعہ ہے کہ ہم جذبات سے کام لینے کی بجائے سیاسی شعور سے کام لیں۔ کم از کم ایکبار آگے بڑھتی ہوئی سیکولر اور ترقی پسند طاقتوں کو آزمائیں۔ اور انھیں پوری آزادی کیساتھ کچھ کرنیکا موقع دیں۔ موجودہ سیاسی ماحول میں علیحدہ سیاست کی بات سیاسی خودکشی کے ہم معنیٰ ہوگی۔ اور اس سے صرف جن سنگھ اور سوتنترا جیسی فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کو فائدہ پہنچے

آل انڈیا
مسلم سیاسی
کنونشن کا
ایک منظر



گا۔ جو نہ صرف مسلمان دشمن ہیں بلکہ عوام دشمن بھی ہیں اور جو سرمایہ داروں اور راجاؤں کے ہاتھ کا کھلونا بن چکی ہیں۔

اس کنونشن کے دعوت نامے میں تحریر کیا گیا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کے مشترک بنیادی ملی مسائل نیز شہری زندگی میں ان کی فلاح و بہبود اور گذشتہ ۲۳ برس کے تلخ تجربات کی روشنی میں ان کے مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر مستقبل کے لیے بہتر تدابیر کی نشاندہی کے لیے یہ کنونشن بلایا جا رہا ہے۔

۱۹۶۴ء میں بھی تقریباً انہی اغراض و مقاصد کے تحت مسلم مجلسِ مشاورت کے قیام کے سلسلے میں لکھنؤ میں ہندوستان کے مسلم دانشوروں کا اجلاس ہوا تھا۔ بات ایک ہی تھی کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کو ان کا جائز مقام دلانے میں مدد و معاون ثابت ہوں۔ مسلم مجلسِ مشاورت اگرچہ ایک غیر سیاسی تنظیم تھی اور اس کے پرچم تلے سبھی اہلِ درد جمع ہوئے تھے لیکن نتائج کے لحاظ سے یہ تنظیم کامیاب نہ ہو سکی۔ اور ملک میں فرقہ پرست جماعتوں کا اثر و اقتدار کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا۔ آج نئی کانگریس کی تنظیم مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ حقیقی معنوں میں ہندوستان کو ایک جمہوری ملک بنانے کی خواہش مند ہیں۔ ایسا ملک جس میں فرقہ پرستی کا نام و نشان نہ ہو۔ ایک ایسا ملک جس کے باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور ایک ایسا ملک جو امن و سلامتی کے ساتھ اقتصادی ترقی کے منازل طے کرتا ہوا ساری دنیا کے لیے مشعلِ ہدایت بن سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات پیدا کرنے کی جدوجہد میں مسلمانوں کو تو کیا ملک کے کسی بھی طبقے اور فرقہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی لیے ایمپوک کے سربراہوں سے ایسی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں کہ وہ دانشمندی سے کام لے کر نئی کانگریس کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بن سکیں گے۔

۱۹ر دسمبر ۷۰ء کو رننگ روڈ نئی دہلی کے ایک آڈیٹوریم میں ایمپوک کا اجلاس تلاوتِ کلامِ پاک سے شروع ہوا۔ اس کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا خطبۂ افتتاحیہ پڑھا گیا۔ موصوف اپنی علالت کی وجہ سے بذاتِ خود شرکت سے معذور رہے۔ خطبۂ افتتاحیہ میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی بے چینی، افراتفری اور سیاسی بے اصولیوں کو دیکھ کر کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس ملک میں سوا دو چیزوں کے باقی سب موت کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔ اور یہ دو چیزیں تعصب و نفرت (خواہ کسی فرقے سے ہو یا ذات برادری یا مخالف و حریف سے) اور دولت و حکومت حاصل کرنے کی جدوجہد ہیں۔ پورے ملک میں چور بازاری اور رشوت ستانی عام ہو چکی ہے افراد اور اقلیتیں اتنی غیر یقینی صورتِ حال میں زندگی گزار رہی ہیں کہ وہ کبھی کبھی انگریزوں کے دورِ غلامی کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ اقلیتوں کو اپنے حال سے زیادہ مستقبل سے مایوسی ہو چکی ہے۔

موجودہ سیاسی حالت میں یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ مسلم سیاسی کنونشن مسلمانوں اور ملک کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس وقت حکومت کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنا لینا بہت بڑی سیاسی بھول ہوگی اور اس سے بلاشبہ جن سنگھ اور دوسری رجعت پسند طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

اس خطبۂ افتتاحیہ میں انھوں نے فرمایا کہ "اس وقت ہمارا ملک تباہی کے عمیق غار کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ملک کے تمام فرقے، ان کی زبانیں، مذہب، کلچر، امنگیں، آرزوئیں کچھ بھی ہوں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، حتیٰ کہ خدا کے منکر، سب ایک ایسی کشتی میں سوار ہیں جس میں ایک بڑا سوراخ ہو چکا ہے۔ اگر یہ کشتی ڈوب گئی تو نہ کوئی مذہب بچ سکے گا اور نہ کوئی پارٹی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش ہونے کی بجائے اس میں اپنا پورا وزن ڈال کر صورتِ حال میں ایسی تبدیلی پیدا کریں کہ ماحول پر انسان دوستی اور حب الوطنی کے عناصر غالب ہو سکیں۔ اور ساری قوم دولت اور کرسی کے ذاتی مفاد سے بالاتر ہو جائے۔"

خطبۂ افتتاحیہ کے بعد محمد ذوالفقار اللہ صاحب نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ڈیلی گیٹوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ تقسیمِ ہند کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس تقسیم میں اور بھی کئی سیاسی پارٹیوں کا ہاتھ تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلمانوں پر نت نئے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کے مسائل سلجھنے کی بجائے روز بروز الجھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ جن سنگھ اور آر ایس ایس کے پھیلائے ہوئے فتنہ و فساد کے خلاف حکومتِ وقت کوئی مؤثر اقدام نہ کر سکی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ذوالفقار اللہ صاحب نے کہا کہ جنوبی ہندوستان کے برعکس شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا، خصوصاً یو پی کے ایک کروڑ مسلمان شمالی ہندوستان میں چھائی ہوئی تعصب کی فضا سے بُری طرح متاثر ہیں۔

کنونشن کی صدارت سابق آئی سی ایس افسر جناب بدرالدین طیب جی نے کی۔ انھوں نے خطبۂ صدارت میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک کا شکوہ کیا وہیں ملک کی یک جہتی اور سلامتی کے لیے مسلمانوں کو منظم رہنے کی دعوت دی۔ موصوف نے کنونشن کی غرض و غایت پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کرنے والے کسی بھی طرح فرقہ پرستی کے ملزم قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اگر عام سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے مطالبات کے لیے جدوجہد کرتیں اور ان کو ملک میں جائز حقوق دلوانے میں مؤثر اقدام کرتیں تو اس کنونشن کے انعقاد کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی۔ طیب جی نے فرمایا کہ پارٹیوں کی کارگزاریوں اور عمل سے ہی ان کی جانچ ہو سکتی ہے۔ نام اور لیبل سے ان کو فرقہ پرست قرار دے دینا بے انصافی ہے۔ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک نہیں ہے۔ یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور تمام پسماندہ طبقوں کا مشترکہ ملک ہے اس لیے تمام قوموں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کا مساوی حق ہے۔ لیکن حقوق بھیک مانگنے سے نہیں ملا کرتے۔ ان کے حصول کے لیے جدوجہد درکار ہے۔ اس لیے اپنے دفاع کے لیے تمام پسماندہ طبقوں کو تیار ہو جانا چاہیے۔ وہ ان کا مشترکہ

بھی حشرات الارض جیسا ہو کر رہ گیا۔ قومی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں۔ پنڈت نہرو جیسی عظیم ہستی انھیں حل نہ کر سکی اس لیے ہمیں مضبوط قدموں سے ایسے راستوں پر چلنا ہے جو منزل تک پہونچنے کی مہم کو آسان بنا دیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی ترقی میں ملک کی فلاح اور بہبود کا راز مضمر ہے۔ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اوقاف، مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ، ان کی تعلیم، ان کے مذہب اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر موصوف نے کہا کہ ہمیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے ایک نئے مستقل آزاد ادارہ کا قیام عمل میں لانا ہوگا جسے ہم آل انڈیا پولٹیکل کنسلٹیٹو کمیٹی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔

ایپوک کے شرکاء میں جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کے لیڈر بخشی غلام محمد ایم پی، مغربی بنگال خلافت کمیٹی کے صدر ملا جان محمد، کانگو کے مولوی عبدالغنی ڈار ایم پی، ہیم سینا کے بابو شام سندر کے علاوہ مدھیہ پردیش کے رہنما، عوامی تنظیم بہار، اتحاد المسلمین آندھرا پردیش، میسور، تامل ناڈو، اور مغربی بنگال کی مسلم لیگ اور آل انڈیا شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کے نمائندوں نے شرکت کی خصوصی مہمانوں میں دلی کے سابق میئر نورالدین احمد، سابق جسٹس سنہا اور بی شام سندر وغیرہ جیسے لوگ شامل تھے۔

ایک تجویز کے ذریعے طیب جی نے ایک ایسا متحدہ محاذ بنانے کا خیال ظاہر کیا جس میں پسماندہ طبقات کے عناصر بھی شامل ہوں تاکہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے جدو جہد کی جا سکے۔ یہ تجویز بھاری اکثریت سے پاس ہو گئی۔ اس تجویز میں صدر کو اس متحدہ محاذ کی تشکیل کے لیے ایک مسلم پولیٹکل کنسلٹیٹو کمیٹی بنانے کا اختیار دے دیا گیا۔ دوسرے دن اس کمیٹی کے ممبران کو صدر نے نامزد کر دیا جس میں مندرجہ ذیل صاحبان شامل ہیں:

صلاح الدین اویسی ایم ایل اے اور اسمٰعیل بیگ (آندھرا) خلیل احمد اور یعقوب یونس (بہار) شیخ محمد یحییٰ (دہلی)، غلام محمد اے میمن (گجرات)، ڈاکٹر حبیب اللہ نہال ناظر، شبیر احمد اسی اصلاحی نقشبندی (مہاراشٹر) نواب محمد صابر قلی خاں اور مولانا مسعود احمد صدیقی (مدھیہ پردیش) ایم۔اے۔ قیوم قریشی (میسور) منظور عالم اور احمد بخش (راجستھان)، ڈاکٹر جلیل فریدی اور محمد ذوالفقار اللہ (یوپی) سید محمد زیدی (بمبئی)، کو اس کمیٹی کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ یہ کمیٹی مارچ ۱۷ء میں حیدرآباد میں ہونے والے سیشن کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔

اس کنونشن میں دو غیر مسلم حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ بابو شام سندر بھیم سینا کے نیتا نے انتہائی تلخ انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم حال اور ماضی کے اچھوت ہیں اور اگر آپ لوگ متحد ہو کر جدو جہد کرنے سے معذور رہے تو مستقبل میں آپ کی حیثیت بھی ہم اچھوتوں جیسی ہو جانا یقینی ہے۔"

الہ آباد کے سابق جسٹس شوہری سنہا نے فرمایا کہ حالات حاضرہ کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہو کر شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہئیں۔

ایک دوسرے ریزولیوشن کے ذریعے مسلم عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ مسلم اقلیت، پسماندہ طبقات اور دیگر کمزور لوگوں کی معاشی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالت سدھارنے کے لیے جہاں سے بھی اور جو امداد بھی حاصل ہو سکے اس کے لیے سر توڑ کوشش کریں۔

۲۰ تاریخ کو اس دو روزہ کنونشن کا آخری اجلاس ہوا، اس میں ایپوک نے ایک تجویز پاس کی جس میں انتخابات کے موجودہ طریقہ کار میں ایسی تبدیلی کرنے کا مطالبہ کیا جو مسلمانوں کو ان کے تناسب آبادی کے اعتبار سے پارلیمنٹ وغیرہ میں نمائندگی دے سکے۔

ایک دوسری تجویز میں مسلمانوں کے چند خصوصی مطالبات کا تذکرہ کیا گیا جس میں سے ایک مطالبہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، پنجاب، ہریانہ اور دلی میں اس کا صحیح اور جائز مقام دلانا تھا۔ دوسرے مطالبات میں مسلمانوں کو فوج، پولیس اور دیگر محکمات میں آبادی کے تناسب سے ملازمتیں فراہم کرنا، علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم ادارہ تسلیم کرنا، فرقہ وارانہ فسادات کو سختی سے کچل دینا اور مجرموں کو ایسی سزا دینا کہ دوسروں کے لیے عبرت کا موجب بن سکے اور ان افسروں سے جو فساد کو ہوا دیتے ہیں باز پرس کرنے کے علاوہ ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان بھر میں درسی کتابوں سے ایسے حصے حذف کر دیے جائیں جو فرقہ وارانہ کشمکش اور اختلافات پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کی تجویز بھی پاس کی گئی۔

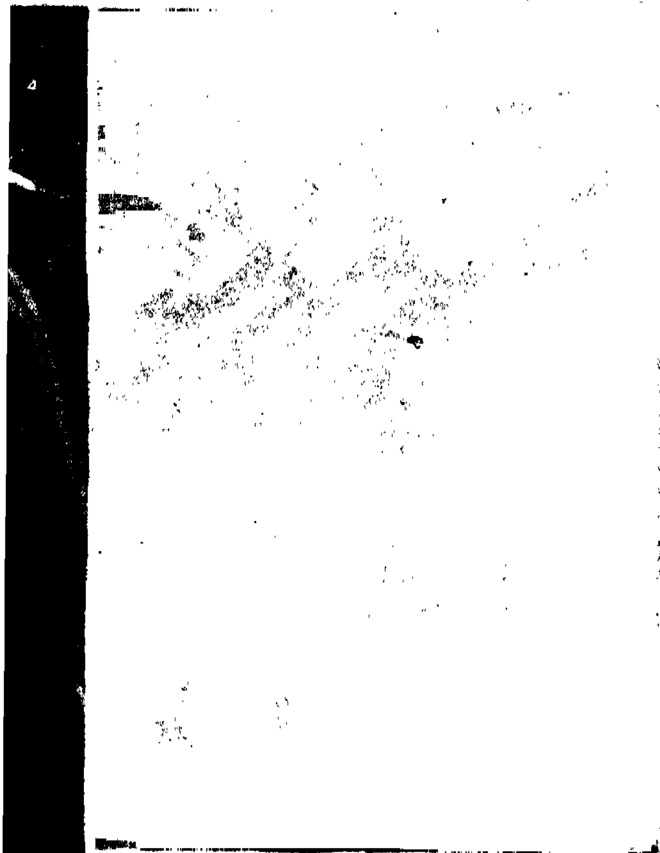
صدر کنونشن بدرالدین طیب جی نے پاس شدہ تجاویز پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایپوک انتخابات میں حصہ نہیں لے گی لیکن عام مسلمانوں کے رجحانات کا اظہار کرے گی تاکہ مسلمانوں کے ووٹ رائیگاں نہ جا سکیں۔ البتہ یوپی میں مسلم مجلس کو انتخابات لڑنے کا حق حاصل ہوگا اور مسلم مجلس شمال میں مسلم لیگ کے خلاف اپنے امیدوار کھڑے کرنا چاہے گی تو اسے اس کی اجازت ہوگی۔

بہر حال مسلمانوں کا یہ کنونشن سابقہ روایات سے زیادہ کامیاب رہا اور شرکاء نے اس نکتہ کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدو جہد میں فرقہ پرستانہ ذہنیت کو داخل نہ ہونے دیں گے اور ضرورت پڑنے پر سوائے آر ایس ایس اور جن سنگھ کے تمام ان پارٹیوں سے تعاون کریں گے جو ان کے مسائل کو سلجھانے میں ان کی ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

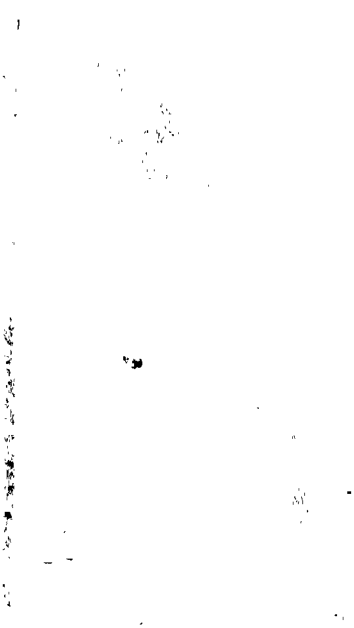
اس کنونشن کی کارروائی پر جن اصحاب نے تنقید کی ان میں پی۔ ایس۔ پی کے چیئرمین این۔ جی گورے بھی ہیں۔ انھوں نے اس کنونشن کو آر ایس ایس کی طرح فرقہ پرستی کا زہر پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس کنونشن کی تجاویز منظور کر لی گئیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ریاست کے اندر ایک نئی ریاست دے دی جائے گی۔

بہر حال اگر مسلم پولیٹکل کنونشن کا مارچ میں ہونے والا سیشن کسی ایسے نتیجے پر پہونچ گیا جس پر عمل کرنے سے ہندوستان کے آئندہ انتخابات میں ایسی پارٹی برسر اقتدار آ سکی جو بلا لحاظ قوم، مذہب اور فرقہ سارے ملک میں اقتصادی خوش حالی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے والی ہو تو ہندوستان کی تاریخ میں اس کنونشن کا ذکر جلی حروف میں کیا جا سکے گا۔ ●●

کیمرے کی



دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں روس کے کزاق نوجوانوں نے بہت خوبصورت رقص پیش کیے۔ یہ نوجوان آل انڈیا یوتھ فیڈریشن کی دعوت پر ہندوستان آئے ہوئے ہیں اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں پروگرام پیش کریں گے۔



صدر گری کی عمر دس سال کم

پچھلے دنوں صدر وی وی گری آریویدک علاج کے لیے کیرالا گئے تھے۔ دہلی آکر انہوں نے بیان دیا کہ علاج کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی عمر دس سال کم ہو گئی ہے۔ اتنا زیادہ چست اور تندرست انہوں نے اپنے آپ کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ تصویر میں کیرالا سے واپسی پر ہوائی جہاز سے نیچے اتر رہے ہیں۔

کوڑے گھوڑے کی طرح خوبصورت

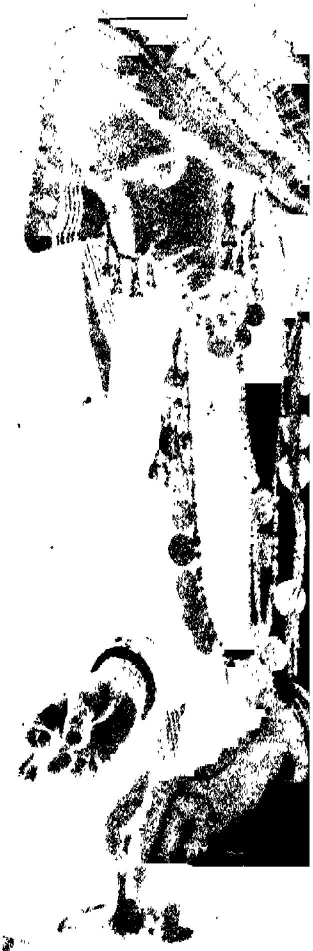
برمی رقاصاؤں کا ایک گروپ آج کل ہندوستان کا دورہ کر رہا ہے۔ اب تک یہ دہلی اور بمبئی میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ اس کا ارادہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں رقص کے پروگرام پیش کرنے کا ہے۔

تاک جھانک



دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت

وزیراعظم کے اعلان نے ایک بار پھر ملک کی قسمت کا فیصلہ عوام کے ھاتھ میں دیدیا ہے۔ اب یہ عوام کا فرض ھے کہ وہ اپنے ووٹ کا استعمال دانشمندی سے کریں

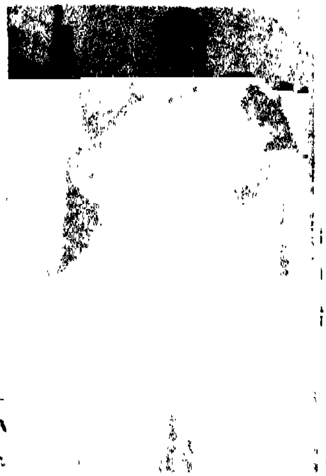


آپ بھی گولڈ میڈل حاصل کرسکتے ھیں۔ میونخ میں ھونیوالے اولمپک کھیل کے سونے اور چاندی کے میڈل مختلف سائزوں میں تمام بینکوں میں بیچے رھے ھیں۔ یعنی پیسہ خرچ کرکے کوئی بھی سونے کا تمغہ حاصل کرسکتا ہے۔

"پوپ کا پاپ"۔ پوپ پال نے پچھلے مہینے ایشیا اور آسٹر
کچھ ممالک کا دورہ کیا۔ منیلا میں پوپ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔
سی جگہ ان کیخلاف مظاھرے کیے گئے۔ سڈنی (آسٹریل
کیرالا سے یورپ بھیجی جانیوالی نرسوں کے سکینڈل
میں پوپ کے خلاف مظاھرہ کیا گیا۔

"میں موٹا نہیں ھوں"۔ آرتھر آرمی ٹیج برطانیہ کا سب سے زیادہ موٹا آدمی ہے۔ موٹاپے سے تنگ آکر آرتھر نے علاج اور سخت پرھیز کے ذریعے اپنا وزن ۲۵۰ کلو وزن سے ۱۶۸ کلو تک گھٹا لیا۔ وہ اپنا وزن ۱۱۲ کلو تک گھٹانے کا ارادہ رکھتا ہے





"ھیرو کی موت"

دھلی کی اشیا گیلری میں "آج کا آرٹ" سے عنوان سے تصویروں کی نمائش ھوئی جس میں ھندوستان کے مشہور آرٹسٹوں کی تصاویر نمائش کیلئے رکھی گئیں اور یہ تصویر مشہور آرٹسٹ پکاسو چوھان کی بنائی ھوئی ہے۔



مہاراجاؤں کو شان و شوکت چھوڑنی ہوگی۔ آزاد ہندوستان میں سب برابر ہیں

مہاراجاؤں

کے پریوی پرس

آئین اور سپریم کورٹ

سلیمان صابر

سابق حکمرانوں کے بارے میں سپریم کورٹ نے جو فیصلہ دیا ہے اس سے پورے ملک میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے اور موافقین و مخالفین میں پوری شدت کے ساتھ قلمی جنگ جاری ہے بعض حلقوں کا خیال تھا کہ حکومت پارلیمنٹ کے اسی اجلاس میں سابق حکمرانوں کے پریوی پرسز اور دیگر مراعات کو ختم کرنے کے لئے کوئی نیا بل لائے گی۔ جو بدلے ہوئے حالات میں یقیناً پاس ہو جائے گا لیکن شاید اس بنا پر اس نے کوئی عاجلانہ اقدام نہیں کیا کہ مبادا پھر کوئی قانونی سقم باقی رہ جائے اور سپریم کورٹ کو ایک مرتبہ پھر مداخلت کا موقع مل جائے۔

یہ اقدام یقینی طور پر اسلئے بھی نہیں کیا گیا کیونکہ سپریم کورٹ نے سابق حکمرانوں کی پریوی پرسوں کو ان کی جائداد تسلیم کیا ہے۔ جائداد کا معاملہ بنیادی حقوق میں آتا ہے جن میں حکومت کو ترمیم کا حق نہیں اس کے بارے میں سپریم کورٹ اس سے قبل حکومت کے خلاف فیصلہ دے چکی ہے پس کوئی قدم اٹھانے سے قبل حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام پہلوؤں کا قانونی جائزہ لے۔ اور اس بات کا خیال رکھے کہ آئین کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اسی لئے اس نے کوئی قدم نہ اٹھایا اور اس نے ایسا کر کے بہت اچھی پالیسی اختیار کی۔ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے اگرچہ اعلان کیا کہ انکی حکومت سابق حکمرانوں کو حاصل شدہ مراعات ختم کرنے کی پابند ہے لیکن کہا کہ "یہ مراعات آئین کے اندر رہتے ہوئے ختم کی جائیں گی"۔

آئین کا یہ احترام جمہوریت کی بقا اور اس کے استحکام کی نشانی ہے۔ وزیر اعظم نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کا کوئی برا نہیں مانا بلکہ اسے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ سنا اور دوسرے خواہ کچھ کہیں اور کسی طرح بھی انکے اور انکی حکومت کے اقدامات کا مذاق اڑائیں لیکن انہوں نے یہی کہا کہ "میں اسے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتی"۔

اس لئے کہ یہ وزیر اعظم کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں تھا نہیں سابق راجوں مہاراجوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ یہ پوری قوم کا اور ایک سوشلسٹ سماج کے اصول کا معاملہ تھا اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی کسی سوسائٹی یا سماج نے قدیم بندھنوں کو توڑ کر ان سے نکلنے کی کوشش کی ہے اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

سپریم کورٹ یا کسی بھی عدالت کو کسی فرد یا جماعت کے جذبات و احساسات سے کبھی سروکار نہیں۔ کسی طرح کوئی جج یا حاکم عدالت کسی شخص سے خواہ کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ رکھتا ہو اگر قانون کے ضابطے اسکے موافق نہیں جاتے تو وہ اس کے حق میں کبھی فیصلہ نہیں کرے گا۔ ہم نے ایسے قاضیوں اور حاکموں کے قصے تاریخ میں پڑھے ہیں جنہوں نے قانون کے احترام میں بیٹوں اور اپنے عزیزوں کو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا ہے۔

سابق حکمرانوں کے معاملہ میں بھی قانون نے ان کا ساتھ دیا اور وہ جیت گئے۔ اگر قانونی خامیاں نہ ہوتیں تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ اور صدر کی طرف سے جو حکم جاری ہوا سپریم کورٹ اسے کبھی غیر قانونی قرار نہ دیتی۔

چیف جسٹس مسٹر ہدایت اللہ اور ججوں کی اکثریت کا کہنا تھا کہ "پریوی پرسز کا حق سابق حکمرانوں کو محض ان اقرار ناموں اور معاہدوں کے ذریعہ نہیں ملا جو انکے ساتھ کئے گئے تھے بلکہ دستور ہند کی دفعہ ۲۹۱ کے تحت بھی انھیں یہ حق حاصل ہے۔ چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی کہا کہ "چونکہ آئین کی دفعہ ۲۹۱ کے تحت ان پریوی پرسز کی ادائیگی "مجموعی فنڈ" (CONSOLIDATED FUND) سے عمل میں آئیگی۔ اس لئے یہ "امداد" کی تعریف میں آتی ہے اور جائداد کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے جن میں حکومت ترمیم کرنے کی مجاز نہیں ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ چیف جسٹس کے اس فیصلہ کی روشنی میں جب تک حکومت بنیادی حقوق میں تبدیلی کا [illegible]

سابق حکمرانوں کے لیڈر ڈاکٹر کرنی سنگھ (آف بیکانیر)



اختیار حاصل نہ کرے اسوقت تک وہ پریوی پرسز کو ختم کرنے کے سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اس مطلب کا ایک بل پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ممبر مسٹر ناتھ پائی کی طرف سے پارلیمنٹ میں پہلے سے پیش ہے لیکن نہیں معلوم کن وجوہ کی بنا پر وہ پارلیمنٹ کے سابق اجلاس میں زیر بحث نہ آسکا۔ اور آئندہ بھی زیر بحث آئے گا یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

کچھ پرجوش قسم کے سوشلسٹ جو غالباً قانونی باریکیوں کو نہیں سمجھتے سپریم کورٹ کے فیصلے سے بہت مایوس نظر آتے ہیں۔ اس کا اظہار نجی بات چیت سے بھی ہوتا ہے اور ان خطوط سے بھی جو روزانہ اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ "سپریم کورٹ کے فیصلہ پر مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں نے اس دن روٹی نہیں کھائی۔" ایک اور صاحب کا خیال ہے کہ "سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ حکومت کے ترقی پسندانہ اقدامات کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے۔ اسے فوراً کوئی دوسرا حکم جاری کرنا چاہئیے۔"

یہ عوام کی باتیں ہیں خود پارلیمنٹ کے ممبروں نے جوش و جذبات سے مغلوب ہوکر فیصلہ معلوم ہونے کے فوراً بعد حکومت پر زور دیا کہ وہ سپریم کورٹ میں ایسے ججوں کو مقرر کرے جو سوشلسٹ نظریات کے حامل ہوں۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ لیکن وزیر اعظم نے اس قسم کی تمام باتوں کو سُنا اور ہنس کر ٹال دیا۔ صرف اتنا کہا کہ "ہم سابق حکمرانوں کی مراعات ختم کرنے کی پالیسی کے پابند ہیں۔ دستور کے اندر رہتے ہوئے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا جائے گا۔"

جذبات سے مغلوب اشخاص جو سوشلسٹ نظریات کے حامل ہیں یا ان کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں آج وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ پر چیں بجبیں ہوسکتے ہیں لیکن جذبات ٹھنڈے ہونے پر کل وہ محسوس کریں گے کہ اگر عدالت کو اور خاص طور پر سپریم کورٹ کو اتنی آزادی حاصل نہ ہو کہ وہ ایگزیکیٹو کے کسی فیصلہ کو منسوخ کرسکے تو اس ملک میں تاراج پھیل جائے گا۔ اور یہاں سب کچھ ہوگا لیکن جمہوریت نہ ہوگی۔ تمام سنجیدہ اور دانشور طبقے اس بات پر متفق ہیں کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ عدلیہ کی برتری کا مظہر ہے اور اس بات کی نشانی ہے کہ ایگزیکیٹو کے مطلق العنانہ احکام ملک کی سب سے بڑی عدالت میں چیلنج سے مبّرا نہیں ہیں۔

واقعات نئی دہلی

یہ طبقے جہاں اس بات کے حامی ہیں کہ سابق حکمرانوں کی مراعات ختم ہونی چاہئیں کیونکہ وہ جمہوریت کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتیں وہاں ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ حکومت کو بنیادی حقوق میں ترمیم کا کوئی حق نہیں ہونا چاہئیے۔ اور یہ بات بڑی افسوسناک ہوگی کہ محض سابق حکمرانوں کی خاطر وہ بنیادی حقوق میں ترمیم کرنے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا ہوا تو اس سے صرف سابق حکمران ہی نہیں بلکہ ملک کے ۵۵ کروڑ کے قریب باشندے متاثر ہوں گے۔ ایک خیال یہ ہے کہ اگر بنیادی حقوق میں حکومت کو ترمیم کرنے کا حق مل گیا تو ہندوستان کے آئین میں کچھ باقی نہ رہ جائے گا۔ ہندوستان کے آئین کا اگر آج دنیا میں احترام کیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ اسکے تحت ہر شخص کو بنیادی حقوق حاصل ہیں جن میں عقیدہ اور مذہب کی آزادی اور اسی قسم کے دوسرے حقوق شامل ہیں یہ حقوق اگر ایگزیکیٹو کے رحم و کرم پر رہ گئے تو ملک میں جمہوری سماج کے لئے زبردست خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ اس لئے کہ کسی وقت بھی ایسی حکومت برسر اقتدار آسکتی ہے جو کسی فرد اور کسی کمیونٹی کے بنیادی حقوق کی قائل ہی نہ ہو۔ جن رہنماؤں نے ہندوستان کا آئین وضع کیا وہ بڑی دوربین نظر رکھتے تھے انہوں نے اس آئین میں ایسی بندشیں رکھ دیں کہ مطلق العنانیت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے تاکہ اگر کبھی ایسی پارٹیاں بھی برسر اقتدار آجائیں جو رجعت پسند تنگ نظر اور مذہبی جذبات سے متاثر ہونے والی ہوں تب بھی آئین کا احترام اپنی جگہ باقی رہے اور تمام فرقے اور طبقے برابر کی حیثیت سے اس ملک میں رہ سکیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "دستور ہند کے تحت اس ملک میں ایسا نظام حکومت قائم کیا گیا ہے کہ کوئی فرد کسی کمیونٹی کے اور کوئی کمیونٹی کسی فرد کے حقوق کو پامال نہ کرسکے۔ تاآنکہ ایسا کرنا بہت ضروری ہو اور اس کے لئے اہم وجوہ موجود ہوں۔

پریوی پرسز کو ختم کرنے کا بل جو لوک سبھا میں منظور ہوچکا تھا خواہ راجیہ سبھا میں صرف ایک ہی ووٹ سے نامنظور کیوں نہ ہوا ہو وہ بہرحال ملک کی پارلیمنٹ میں نامنظور ہی سمجھا جائے گا ایسی صورت میں اچھا تھا کہ صدر کی طرف سے حکم جاری کرنے میں عجلت سے کام نہ لیا جاتا اور سپریم کورٹ سے مشورہ کرلیا جاتا لیکن یہ بھی ایک اچھی بات ہوئی۔ سپریم کورٹ نے اپنا یہ حق تسلیم کرالیا کہ اسے آئین کی وضاحت کرنے کا اختیار حاصل ہے علاوہ ازیں آنے والی حکومتوں کے لئے اس بات کا ایک انتباہ بھی ہے کہ وہ مطلق العنانہ پالیسی سے احتراز اور تمام فرقوں اور طبقوں کے اُن بنیادی حقوق کا احترام کریں جو انکو حاصل ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ "عظیم مغلوں یا برطانوی تاج کو جو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا وہ صدر کو وراثت میں مل گیا ہے"۔ یہ اقتدار اعلیٰ جمہوریت میں کسی فرد یا کسی جماعت کو حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف اداروں میں تقسیم ہوتا ہے اگر یہ اس طرح سے تقسیم نہ ہو اور عوام کو کچھ بنیادی حقوق حاصل نہ ہوں یا ان حقوق میں پارلیمنٹ کو ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل ہو تو پھر جمہوریت کی جگہ ملک میں ڈکٹیٹر شپ لے لے گی اور جو پارٹی برسر اقتدار آجائے گی وہ اپنی من مانی کرسکے گی جس دن ایسا ہوا وہ دن ملک کی تاریخ میں ایک تاریک اور بہت ہی افسوسناک دن ہوگا ان حالات میں اب سوال یہ ہے کہ سابق حکمرانوں کو صرف خاص کی قسمیں اور انہیں حاصل کچھ غیر جمہوری مراعات کس طرح ختم کی جائیں۔

اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ملک میں ایک اور آئین ساز اسمبلی از سر نو منتخب ہو جو ہندوستان کے لئے نئے حالات کے مطابق کوئی نیا آئین وضع کرے اور یا پھر سابق حکمرانوں کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں اور باہمی بات چیت کے ذریعے کوئی ایسا حل نکالا جائے جس سے سابق حکمران بھی مطمئن ہوسکیں اور جمہوری اور سوشلسٹ سماج کے تقاضے بھی پورے ہوجائیں۔

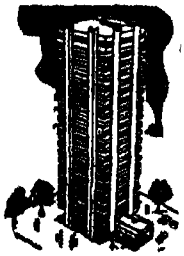
جہاں تک معلوم ہے سابق حکمران بات چیت اور بقول خود "قربانی" کردینے اور اپنی مراعات سے محروم ہونے کے لئے تیار ہیں لیکن ظاہر ہے سپریم کورٹ کے فیصلہ سے وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط سمجھ رہے ہیں۔ اور اس لئے انکی شرطیں پہلے کے مقابلہ میں کچھ سخت ہی ہوں گی۔ اگرچہ سابق حکمرانوں کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ "جو چیز مناسب اور معقول ہوگی ہم اسے منظور کرلیں گے۔ خواہ اس سے ہمیں نقصان ہی کیوں نہ پہونچے"

سابق حکمرانوں کے رویہ میں یہ تبدیلی ایک خوش آئند تبدیلی ہے جس سے فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ اور دوستانہ فضا میں تمام مسائل طے ہونے چاہئیں۔ بلاشبہ سابق حکمرانوں کا ماضی جہاں تک عوام کا تعلق ہے کچھ اچھا نہیں رہا ان کے ظلم و ستم کی داستانیں تاریخ ہند میں سیاہ دھبے کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن کسی انتقامی کارروائی سے جسے پھر سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے حالات میں تناؤ پیدا ہوجائے گا اور یہ بات ملک کے مفاد کے خلاف ہوگی۔



دھلی ڈائری

لال قلعہ سے قطب مینار تک



دلی کے بازار کسی زمانے میں دنیا کے ارزاں ترین بازار ہونے کے علاوہ ایمانداری، خوش نمائی اور خوش خلقی کا گہوارا سمجھے جاتے تھے۔ بیرونی سیاحوں نے یہاں کے بازاروں پر سیر حاصل تبصرے کیے ہیں اور ان کی خوبیوں کو نہایت اچھے پیرایے میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن آج دلی کے بازار تین چار سو برس قبل تو کیا آزادی کے قبل کے بازاروں سے بھی مختلف ہیں۔ جو خوبیاں ان بازاروں کے بارے میں بیان کی گئی ہیں وہ سراسر برائیوں اور بدعنوانیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

جہاں تک ان بازاروں میں فروخت ہونے والی اشیا کے ارزاں ہونے کا سوال ہے وہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ یہاں عام طور پر تمام اشیا کے نرخ گاہک کی صورت اور لباس کو دیکھ کر بتائے جانے کا عام رواج ہے۔ یہی دستور حکیم ڈاکٹر جیسے معزز پیشہ وروں کا ہے جو مریض کی صورت اور لباس دیکھ کر ہی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ آج دلی دنیا کا سب سے مہنگا شہر ہے۔ کل کی سرائیں، جہاں قیام کے علاوہ طعام بھی مفت فراہم کیا جاتا تھا، اب ایسے ہوٹلوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں جہاں شب گزاری کے لیے اوسطاً کم از کم پچاس روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ پرانی دلی کے معمولی ہوٹلوں سے لے کر نئی دلی کے اشوکا اور اوبے رائے کانٹی نینٹل میں ایک کمرے کا یومیہ کرایہ آٹھ روپے سے چار سو روپے یومیہ تک پہونچ چکا ہے۔ ان ہوٹلوں میں فروخت ہونے والی ہر چیز بازار سے دوگنی یا سہ گنی قیمت پر فروخت کی جاتی ہے۔ ۲۰ پیسے کے سوڈے کی قیمت اشوکا ہوٹل میں ایک روپیہ سے کم نہیں۔ اسی طرح جامع مسجد کے اطراف شفاف ہوٹلوں میں جو کھانا شکم سیر ہو کر تین روپیہ میں کھایا جاتا ہے کناٹ پلیس میں دس روپے اور اوبے رائے کانٹی نینٹل میں ۲۰ روپے میں بھی نہیں کھایا جا سکتا۔ طعام و قیام کے علاوہ عام اشیا کا بھاؤ دلی کے تمام بازاروں میں مختلف ہے۔ کسی معمولی ہوٹل میں چائے کی پیالی کی قیمت پچیس تیس پیسے ہے لیکن نئی دلی میں اسی ایک پیالی کی قیمت کہیں کہیں تین روپے تک پہونچ جاتی ہے۔ سبزی منڈی میں فروخت ہونے والی سبزی اور پھل قدم قدم پر اپنے بھاؤ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی پھل اور سبزیاں نئی دلی پہونچ کر دوگنی قیمتوں میں فروخت کی جاتی ہیں یہی حال گوشت کا بھی ہے۔ گرمیوں کی شدت کے دوران ایک آنے کلو ملنے والا برف ایک روپیہ کلو بھی ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پان اور ماچس کی قیمتوں میں بھی تفاوت ہے۔ کناٹ پلیس میں پان کھانے والے ایک گاہک کو اپنی جیب بقدر تیس پیسے کے ہلکی کرنی پڑتی ہے جب کہ یہی پان چاندنی چوک میں دس پیسے میں مل جاتا ہے۔ نرخوں کی اس تبدیلی کا اثر اجنبیوں کے لیے تو کیا بسا اوقات خود دلی کے رہنے بسنے والوں کے لیے ایک ایسا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے جس کی تفصیلات میں جانے کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔

الغرض انسانی ضروریات سے متعلق جملہ اشیا کے نرخ دلی کے مختلف بازاروں میں مختلف ہیں جس کا جو جی میں آتا ہے نرخ مقرر کر کے اشیائے ضروری فروخت کرتا رہتا ہے۔ پولیس، حکومت اور دیگر متعلقہ محکمہ جات کے افسران اس اندھیر گردی کے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس گریز کے اسباب ایسے راز ہیں جنھیں سربستہ نہیں کہا جا سکتا۔

دنیا بھر میں گراں ترین مارکیٹ ہونے کے علاوہ یہاں کے بازاروں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ڈالڈا، مونگ پھلی کا تیل، [illegible]، چاول، مٹی کا تیل، کوئلہ جیسی چیزیں یک لخت دم بازاروں سے غائب ہو جاتی ہیں اور خریداروں کو مجبور ہو کر ان کے منہ مانگے دام دینا پڑتے ہیں۔ ہند پاک جنگ کے دوران ان بازاروں میں کچھ ایسے گل کھلے کہ دنیا بھر میں سراسیمگی پھیل گئی کئی آدمیوں کو پیر کے روز شام کے وقت گیہوں کی روٹی کھاتے وقت گرفتار کر لیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو ایک بوتل مٹی کا تیل لے جانے کی سزا پچاس ساٹھ روپے کے قریب بھگتنا پڑی۔ سنیچر کو چاول کھانے کی پاداش میں پولیس چوکیوں کے چکر لگانے پڑے۔ کئی غیر ملکی نمائندے ان گرفتار شدگان سے ان کی گرفتاری کی یہ وجہ سُن کر چکرا گئے کہ وہ گیہوں کی روٹی کھا رہے تھے۔ بہت بڑے کنبے والے اس دوران بیس پچیس کلو گیہوں آٹا یا چاول لاتے ہوئے اپنے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے بجائے تہاڑ جیل کی چکیاں چلانے کے لیے پہونچا دیے گئے۔

اور اب بھی موسم گرما میں ماوا، ربڑی اور ایسی ہی دودھ کی بنی ہوئی چیزیں فروخت کرنا اور ان کا خریدنا مساوی جُرم قرار دیا جاتا ہے۔

ان ہی بازاروں میں شراب کا بازار بھی ہے۔ شراب منگل اور جمعہ کے علاوہ عموماً تہواروں اور پہلی تاریخ کو بند کر دی جاتی ہے۔ شراب کے اوقات دوکانداری کے مقررہ اوقات سے آدھ گھنٹہ زیادہ ہیں۔ لیکن ان مقررہ اوقات کے علاوہ دلی کے ہر کوچہ و بازار میں شراب ملتی ہے گانجا ملتا ہے، چرس ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ممنوعہ دنوں میں بھی خفیہ دکانوں پر عام نرخوں سے چار روپے سے دس روپیہ زیادہ پر ہر جگہ شراب کی بوتلوں کی خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ یہ چور بازار کے بیوپاری دن رات اسی تگ و دو میں مصروف ہیں کہ دلی

باقی صفحہ ۴۲ پر

واقعات نئی دھلی

ہاشم حسن سعید (ایم اے عثمانیہ)

اردو مطالبات کا باب

مردم شماری

اردو سماج کی تشکیل جدید کا سنہری موقع

ﺭستان میں مردم شماری کا زمانہ سر پر آپہونچا ہے
۱۹۷ء سے ملک بھر میں مردم شماری کا کام شروع
۔اس موقع پر ہندوستانی عوام کے بارے میں سترہ
ﺑات حاصل کی جائیں گی جنکا تعلق نام، عمر، مذہب
ں، تعلیم اور پیشہ وغیرہ سے ہے اس مردم شماری
ں ملک کی صحیح آبادی کا اندازہ کیا جاسکے گا ،
یا جائے گا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے
ں کی تعداد کیا ہے۔ یوں تو تمام کی تمام مسلمہ
یلئے یہ مردم شماری بڑی اہمیت کی حامل ہے
ی کی بنا پر ہر زبان کا لسانی موقف متعین ہوگا
ﺭ خاص اردو کے لئے اس کی بہت اہمیت ہے
ﺭسے یہ اردو بولنے والوں کے لسانی شعور کا
ے اور اسی کے نتیجہ پر سارے اردو معاشرہ کی تشکیل
نحصار ہے۔ ہمیں حکومت سے بہت سی شکایتیں
یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ مرکزی حکومت یا علاقائی
ں لسانی مصیبت کا شکار ہیں اور اردو کو ملک بدر
منصوبے پر عمل کر رہی ہیں۔ ملک کی مختلف
یاں اور مدارس سے اردو تعلیم کی سہولتیں ختم
ی ہیں۔ اور اردو بولنے والوں کے ساتھ حصول ملازمت
ﺭمیں ناانصافی کی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ اور اسی
دوسری شکائتیں بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن
پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل
ذمہ داری حکومت پر کم اور اردو داں طبقہ پر زیادہ

عائد ہوتی ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ ہم اپنے بچوں کو بصد ناز و افتخار انگلش میڈیم مدارس میں داخل کراتے ہیں بالخصوص ایسے مشن اسکولوں میں جہاں اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے بھی نہیں پڑھائی جاتی چنانچہ جب یہی بچے اسکول سے نکل کر کالجوں میں پہنچتے ہیں تو الف کا نام بھالا نہیں جانتے اور مجبوراً انھیں ہندی یا کوئی اور زبان ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھنا پڑتی ہے۔ اگر کالجوں میں اردو پڑھنے والے طلبار کی تعداد گھٹ رہی ہو یا کسی کالج سے اردو تعلیم کی سہولت ختم کی جا رہی ہے تو اس کے لئے ہم کسی صورت میں حکومت یا ارباب یونیورسٹی کو ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے۔ ہمارا لسانی شعور مردہ ہو چکا ہے اور ایک طرح سے ہم لسانی احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو لکھنے پڑھنے والے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلوانے اور اردو کو اپنی مادری زبان ظاہر کرنے میں جھجکتے ہیں اور اپنی اس جھجک اور احساس کمتری کی تاویلات مختلف طریقے پر پیش کرتے ہیں۔ ہم میں اس اخلاقی جرأت کی بڑی کمی ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ حق و صداقت کے لئے آواز بلند کریں اور دستور کے تحت جو حقوق اور مراعات ہمیں حاصل ہیں ان سے استفادہ حاصل کریں وہاں تو سیاسی مصلحتوں یا ذاتی مفادات کے تحت کچھ نہیں کرتے اس کی بجائے بعد میں حکومت پر جا بے جا اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات یا نعرہ بازیوں کا مقصد اپنے آپ کو اردو کا سچا ہی خواہ ظاہر کر کے سوائے سستی شہرت حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ہمارے اس رجحان سے اردو کو جتنا نقصان پہونچ رہا ہے اتنا اردو کے بدترین مخالفین اور کٹر "جن سنگھیانہ" ذہنیت رکھنے والے افراد سے بھی پہونچنے کی توقع نہیں — من جملہ اور شکایتوں کے ہماری ایک بڑی شکایت حکومت سے یہ ہے کہ اردو کو اردو کی جنم بھومی میں سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں پس و پیش اور تردد کیا جا رہا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ۵۴ کروڑ کے اس آبادی والے ملک میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ایک قریبی اندازے کے مطابق ۱۲½ کروڑ ہے اردو کی کوئی علیحدہ ریاست نہیں ہے۔ کشمیر میں بھی جس کو خاص اردو کا علاقہ سمجھا جاتا تھا اب آہستہ آہستہ وہاں کی مقامی زبانیں کشمیری، ڈوگری وغیرہ سر اٹھا رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان ہی میں سے کوئی ایک اردو کو بے دخل کر کے وہاں کی مستقل علاقائی زبان کی حیثیت اختیار کر لے۔

اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد دہلی، اتر پردیش، بہار مدھیہ پردیش، اڑیسہ، میسور، اور آندھرا پردیش میں موجود ہے اور اردو کو کم از کم ان علاقوں کی دوسری علاقائی زبان بننا چاہیے۔ لیکن ایسا اس لئے نہیں ہو سکا کہ گذشتہ مردم شماری کے موقع پر اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے اپنی مادری زبان اردو کی بجائے ہندی لکھوائی تھی جس کے نتیجہ میں تقریباً ہر ریاست

ہیں ان کا لسانی موقف متاثر ہوگیا اور وہ کسی جگہ اکثریت میں نہیں رہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سارے ہندوستان میں اُردو کو اپنی مادری زبان لکھوانے والوں کی تعداد صرف سوا کروڑ ہے۔ ظاہر ہے غلطی ہماری اپنی ہے اسلئے حکومت سے گلہ شکوہ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا ہے

آج جبکہ ہندوستان میں پھر مردم شماری ہونے والی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں اور اس غلطی کا اعادہ نہ ہونے دیں جو پچھلی دفعہ ہم سے ہوئی تھی۔ ہم یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ اردو کا مستقبل حکومت کے ہاتھ میں نہیں صرف ہمارے ہاتھ میں ہے ہم ہی چاہیں تو اُردو کو مٹا سکتے ہیں اور اگر مرٹ رہی ہو تو بچا سکتے ہیں۔ اب ہمارا، ہمارے علمی اداروں اور ادبی انجمنوں کا فرض ہے کہ رائے عامہ کو متحرک کرنے کے لئے اپنے تمام تر اختلافات اور ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر ایک مشترک پلیٹ فارم سے "مردم شماری میں اُردو مادری زبان لکھوانے" کی مہم منظم طریقے پر چلائیں۔ اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کریں۔ اسی طرح ہماری پچھلی غلطیوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور اسی میں اُردو کی بقا، ترقی اور سلامتی ہے۔ اب ہم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا "اُردو ریاست کا خواب" اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جب کہ ہم میں سے ہر ایک شخص جوان، بچہ، بوڑھا، مرد، عورت بلا استثنا وقت مردم شماری میں اپنی مادری زبان "اردو" لکھوا دے۔

اس سلسلے میں شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں کہ مردم شماری کا پہلا مرحلہ "خانہ شماری" ہے جس کے تحت تمام مکانوں اور رہائش گاہوں کا نئے سرے سے شمار کیا جائے گا اور نو تعمیر شدہ مکانات کی نمبر اندازی کی جائے گی۔

ہر مکان میں کتنے خاندان رہتے ہیں اور ہر خاندان کتنے افراد پر مشتمل ہے اس کی تفصیلات معلوم کی جائیں گی یہ کام جو مردم شماری کی بنیاد ہے ۱۵ر دسمبر سے شروع ہو کر ۳۱ر دسمبر تک تکمیل پا جائے گا۔ خانہ شماری میں شامل ہونے والے کارکن تمام مکانات پر سہولت کی غرض سے پنسل کوئلہ یا تارکول سے کوئی نشان بنا دیا کرتے ہیں اور مردم شماری کے موقع پر صرف ان ہی مکانات کے افرادِ خاندان کا شمار کیا جاتا ہے جن پر خانہ شماری کرنے والوں نے کوئی نشان بنایا ہو۔ اس لئے ہمیں چوکس رہنا چاہئے کہ ہمارا مکان کہیں شمار ہونے سے رہ نہ گیا ہو۔ اگر دسمبر کی ۲۸ر تاریخ تک ہمارے مکان پر کوئی نشان نہ دکھائی دے تو ہم سمجھ لیں کہ اس بار ہمارا شمار "مردم شماری" میں ہونے والا نہیں ہے، اس کی اطلاع فوراً ہی مردم شماری آفیسر کو دینا چاہئے نیز مردم شماری کے وقت جو انفرادی پرچہ (Individual - slip) ہر فرد کو دیا جاتا ہے اس کی خانہ پری میں خاص احتیاط برتی جائے۔ اگر شمار کنندہ اپنا کوئی غلط مشورہ ہم پر مسلط کرنا چاہتا ہے تو اس کی رپورٹ اسی وقت متعلقہ عہدہ داروں کو کی جائے۔ یہ اور اسی قسم کی شکایات کے انسداد کے لئے اور "مردم شماری میں اُردو اپنی مادری زبان لکھوائیے" کی تحریک باقاعدہ طور پر چلانے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ایک جامع اور منظم پروگرام ترتیب دیں۔ اس پروگرام کے چند اہم خد و خال یہ ہیں انھیں خطوط پر ہم کام کر کے اپنے لسانی شعور کے بیدار ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں:

۱۔ ہر ریاست میں شہروں اور اضلاع کی تمام انجمنیں اور ادارے متحد ہو کر ایک مرکزی مردم شماری کمیٹی یا رابطہ کمیٹی کے تحت محلہ واری اساس پر کام کریں۔

۲۔ مردم شماری کے موقع پر جہاں کہیں ناانصافی ہوئی ہو وہاں کمیٹی کے ارکان پہونچ کر فوری معاملہ ...

۳۔ "اُردو مادری زبان لکھوائیے" مہم کے ... اخباروں میں کم از کم ہفتے میں دو بار اعلان ... جائیں اور یہ کام ابھی سے شروع ہونا چاہئے

۴۔ اس سلسلے میں کثیر تعداد میں ورقیے ا... کر سینما ہالوں اور پبلک مقامات پر تقسیم ... یہ ورقیے صرف اُردو ہی میں نہ ہوں بلکہ ہند... اور مقامی زبانوں میں بھی شائع کئے جائیں۔

۵۔ اگر ممکن ہو تو سینما سلائیڈز کے ذریعے ... انتظام کریں۔

۶۔ بڑے بڑے پوسٹر شہروں کی گنجان آ... حصوں میں نمایاں جگہ پر چسپاں کئے جائیں۔

۷۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اور اُردو کے بہی خواہوں سے درخواست کی ... کی مالی اعانت فرمائیں۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تجاویز جو ہمار... ہیں کس حد تک عملی جامہ پہنتی ہیں۔ یہ تو وقت ... کرے گا یہ ہوائی قلعے ثابت ہوتی ہیں یا اُردو دا... خوابیدہ شعور کو مہمیز کر کے اُردو معاشرے کی ... کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔



خاموشی سے بس گھما کر چڑیا گھر لے چلو — ورنہ .....

نیتاجی زندہ ہیں؟

ناوک حمزہ پوری

آج ایسا کون ہے جو ہندوستان کے لائق فرزند سپوت اور جنگِ آزادی کے جانباز سپاہی نیتاجی سبھاش چندر بوس سے ناواقف ہوگا۔ انکی روپوشی ابتک ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ اُن کی موت و حیات کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا دشوار ہے ویسے انکی موت کی تحقیقات کے لیے مقررہ کمیشن کے سربراہ جنرل شاہ نواز خاں نے ۱۹۵۶ء میں انکی موت کی تصدیق کردی تھی۔ اور تاریخ کا یہ باب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا سا لگتا تھا لیکن حالات نے کروٹ لی اور اب پھر از سرِ نو پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب جی ڈی کھوسلا کو اس امر کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے اپنا کام شروع بھی کردیا ہے۔

اس کمیشن کے سامنے ابتک جنرل شاہ نواز خاں، ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا، نیتاجی کے بڑے بھائی سریش چندر بوس اور کئی دوسرے لوگوں کے بیانات ہوچکے ہیں۔

اس راز سے اب پردہ اٹھا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جہاز کے حادثے میں نیتاجی کی مبینہ موت کے بعد انگریزی سرکار نے امریکہ کے خفیہ محکمہ سے اس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کو کہا تھا اور مذکورہ محکمہ نے انگلش سرکار کو معلومات فراہم کی تھیں نیز یہ کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے بھی اپنے خفیہ محکمہ کے لوگوں کو تحقیقات کے لیے جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں میں بھیجا تھا۔ آخر یہ ساری رپورٹیں کہاں ہیں اور کیوں نہیں کھوسلہ کمیشن کے سامنے رکھ دی جاتیں؟ ایسا کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے جاتے جاتے اس سے متعلقہ کچھ فائلیں جلا ڈالی تھیں لیکن کچھ کا مطلب ساری فائلیں نہیں ہوتا۔ باقی ماندہ کاغذات ہی کمیشن کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل اپنے دو معتبر آدمیوں پرپھل چندر سین اور برلا پر شلو چالیہا کو نیتاجی کا پتہ چلانے کے لئے بھیجا تھا۔ تو کیا اس وقت تک خود پنڈت نہرو کو نیتاجی کی موت کا یقین نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں نے کیا پتہ لگایا۔ پنڈت جی تو اب نہیں ہیں۔ لیکن یہ دونوں حضرات موجود ہیں کیا یہ قوم کے سامنے اپنی تحقیقات کا خلاصہ رکھ سکیں گے؟

نیتاجی کے ساتھ رضاکار کی حیثیت سے کام کئے ہوئے ایک شخص کے پالی گوسوامی نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے نیتاجی کو الٰہ آباد کے خسرو باغ میں سادھو کے بھیس میں ایک بار دیکھا تھا۔ کیا یہ حقیقت ہے۔؟

شری پرن سین گپتا نے روزنامہ "امرت بازار پتریکا" میں اپنے ایک مضمون میں دعویٰ کیا ہے کہ انھیں تین اشخاص نے فوٹوؤں کے ساتھ یہ خبر دی ہے کہ نیتاجی زندہ ہیں ان میں سے ایک پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔

نیتاجی کی موت کی خبر ٹوکیو ریڈیو سے ان کی مبینہ موت کے پانچ دن بعد کیوں نشر کی گئی۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس سے جنرل میک آرتھر جیسا شخص بھی شبہ میں پڑ گیا تھا اور انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بذریعہ تار اپنے اس شبہ کی اطلاع بھی دی تھی۔

۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کے لندن "سنڈے آبزرور" میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "نیتاجی کی موت کی کہانی پر شبہ ظاہر کرنے کی بے انتہا گنجائش موجود ہے" اس سلسلے میں صورت حال کا پتہ لگانے کی کوئی کوشش نہ ہوئی۔

۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء کے "امرت بازار پتریکا" میں چنتامنی نام کے ایک شخص نے ایک ریڈیو نشریہ شائع کرایا تھا جسکے متعلق اس نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ پیغام خود نیتاجی نے ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو منچوریا سے نشر کیا تھا۔ پیغام کچھ اس طرح بتایا گیا ہے "میں سبھاش چندر بوس بول رہا ہوں، جے ہند! اپنی روپوشی کے بعد میں یہ تیسری بار اپنے ہندوستانی بھائی بہنوں سے مخاطب ہوں، عنقریب بھارت کو آزادی مل جائے گی اور اس کے بعد ہی میں سودیش لوٹ آؤں گا۔"

کچھ لوگ مانتے ہیں کہ منچوریا سے نیتاجی روس چلے گئے اس بات کو اس خبر سے تقویت ملتی ہے کہ روس میں ہندوستانی سفیر مسز لکشمی پنڈت سے نیتاجی کی ملاقات ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ جب وجے لکشمی پنڈت نے ایک مجلس میں یہ کہنا شروع کیا کہ میں ایک ایسے راز پر سے پردہ اٹھانے والی ہوں جسکو سن کر سارے لوگ غرق حیرت ہوجائیں گے تو پنڈت نہرو نے انھیں ڈانٹ کر چُپ کرا دیا۔

۱۹۴۸ء میں روس کے اپنے ایک سفر سے واپس آنے پر پنڈت نہرو نے ایک حکم جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ساری عوامی عمارتوں سے نیتاجی کی تصویریں ہٹادی جائیں۔ یہ حکم کس بنا پر تھا۔؟

پریس ٹرسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا (جو برن میں ہندوستانی سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری رہ چکے ہیں) نے بتایا ہے کہ انھیں یہ خبر ملی ہے کہ نیتاجی سائبیریا کی روسی جیل میں ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا نے اس امر کا انکشاف بھی کیا ہے کہ پیکنگ کے ہندوستانی سفارتخانے کے ایک افسر بریگیڈیر ٹھیکر کا عہدہ صرف اس لئے گھٹا دیا گیا ہے کہ اس نے دو قوم پرست چینیوں سے گفتگو کی اور بھارت سرکار کو اپنی یہ رپورٹ بھیجی کہ نیتاجی روسی قید خانے میں زندہ ہیں اور ہندوستان آنا چاہتے ہیں۔

شری ہری وشنو کامتھ نے کمیشن سے درخواست کی ہے کہ وہ تحقیقات میں تائی وان سے مدد لے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ تائی وان نے انکی درخواست پر تائی پیہہ میں نیتاجی کی جہاز کے حادثہ میں مبینہ موت کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ اور انھیں مطلع کیا تھا کہ تحقیقات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا: تائی وان کے غیر ملکی معاملے کے ایک افسر مسٹر لن نے انھیں ۱۹۶۶ء میں آگاہ کیا کہ کوئی ایسا حتمی ثبوت نہیں ملا کہ اس تاریخ کو تائی پیہہ میں حادثہ رونما ہوا۔

ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا نے کہا ہے کہ انھیں یہ پختہ خبر ہے کہ ۱۹۴۶ء کے موسم سرما سے لیکر ۱۹۵۰ء تک نیتاجی سائبیریا کی جیل میں تھے۔ اس کے بعد نیتاجی کے متعلق انھیں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

نیتاجی کے بڑے بھائی سریش چندر بوس نے بتلایا ہے کہ شاہ نواز کمیشن کے وہ ایک ممبر تھے اور اس کمیشن کی رائے سے انھوں نے اختلاف کیا تھا لیکن جب کمیٹی نے ان کی رائے کو کوئی

باقی ص ۴۳ پر

آر۔ ایس۔ ایس کے رہنما اور جنگِ آزادی

محمد شاہد عظیم

ہمارے قومی قائدین کے خلاف ہندو فرقہ پرستوں کا بنیادی الزام یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کا بٹوارہ قبول کر کے ملک سے بیوفائی کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی غیر ضروری طور پر دلجوئی کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کو بگاڑنے کا تعلق ہے گاندھی جی کو ملزم نمبر اگردانا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری قیادت نے جداگانہ انتخاب کے اصولوں کو مان کر فاش غلطی کی جس کے نتیجے میں مسلم فرقہ پرستی کی ہمت افزائی ہوئی لیکن گاندھی جی پر تنقیدیں کرتے ہوئے بعض تاریخی حقائق کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ آنجہانی گوپال کرشن گوکھلے ہی تھے جنھوں نے سو سال قبل ۱۸۷۰ء میں مارلے منٹو اصلاحات کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے اصول کو سب سے پہلے تسلیم کیا تھا۔ دوسرے لوکمانیہ تلک تھے جنھوں نے ۱۹۱۶ء میں انھیں خطوط پر چلتے ہوئے لکھنؤ پیکٹ کی تائید کی تھی۔ لکھنؤ میں کانگریس سیشن کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "مسلمانوں کو اپنے طور پر حکومت چلانے کے اختیارات دیے جانے چاہئیں، اس طرح ہماری جدوجہد تین طرفہ نہیں رہے گی جیسی کہ آج ہے۔"

یہ بات واقعی حیرتناک ہے کہ گاندھی جی کو اپنے مذموم حملوں کا نشانہ بنانے والے فرقہ پرست گوکھلے اور لوکمانیہ تلک کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ آر ایس ایس کے سرسنچالک گولوالکر مسلمانوں کو بنیادی طور پر اس لیے فرقہ پرست قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں اس بات کو بھلا دیا گیا ہے کہ وہاں جداگانہ انتخاب کسی مطالبے کے بغیر کرایا گیا تھا۔ یہ انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" والی پالیسی کا ایک حصہ تھا صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے اپنے تمام مقبوضہ علاقوں میں اس حربے کو استعمال کیا تھا۔ مثلاً سیلون میں بدھسٹوں اور ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بدھسٹوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو جداگانہ انتخاب کا اختیار دیا گیا تھا۔

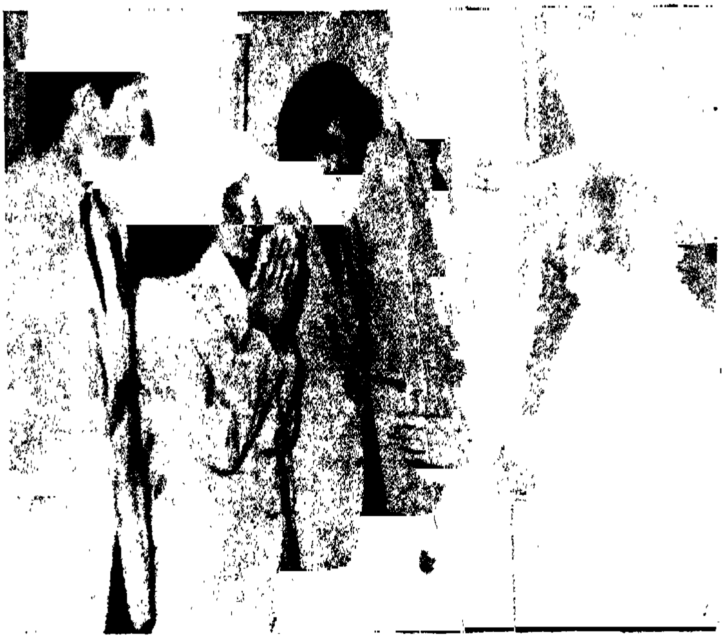
بقول ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو وہ بنیادی مجرم ہیں جنھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جس کے نتیجے میں ملک کا بٹوارہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ فرقہ پرست تقسیم کی ساری ذمہ داری گاندھی جی کے سر تھوپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جب کہ آخر وقت تک انھوں نے اس تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر لوہیا اس بات میں ایقان رکھتے تھے کہ اگر ان میں سے کسی ایک فرد نے بھی خواہ وہ پٹیل ہوں یا نہرو، گاندھی جی کا ساتھ دیا ہوتا تو کبھی بھی وہ تقسیم کو قبول نہ کرتے۔ بادشاہ خاں نے ایک جگہ اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں، جس میں خود انھوں نے شرکت کی تھی، راجہ جی اور سردار پٹیل ہندوستان کی مجوزہ تقسیم کے سلسلے میں دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بادشاہ خاں نے اس موقع پر یہ اعتراض کیا تھا کہ جناح اپنے مطالبے پر اٹل ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ علاقے کر رہیں گے جب کہ کانگریس نے ایسا کوئی موقف اختیار نہیں کیا ہے۔ دراصل یہی وہ تذبذب تھا جو بعد میں ہندوستان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

شری۔ کے۔ ایم۔ منشی کا کہنا ہے کہ وہ تمام افراد جو کبھی اکھنڈ بھارت کے کٹر حامی تھے تقسیم کے مطالبے کی تائید میں محض سردار پٹیل کی تاویلات کی بنا پر انھیں اپنے خیالات بدلنے پڑے اور انگریزوں نے قیام پاکستان کا مطالبہ مان لیا۔ گاندھی جی کے قاتل گوڈسے نے قیام پاکستان کے واقعے کا ایک ڈرامے کی حیثیت سے ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی کو اس کا "ویلن" قرار دیا ہے۔ گوڈسے کو آر۔ ایس۔ ایس سے یہ شکایت ہے کہ جب ملک کی تقسیم ہو رہی تھی تو اس وقت آر۔ ایس۔ ایس۔ نے اپنی آواز کیوں نہیں بلند کی۔ آر۔ ایس۔ ایس کو لازم تھا کہ وہ انگریزوں سے لڑے لیکن گوڈسے نے یہاں ایک بات کو بھلا دیا ہے کہ آر ایس۔ ایس۔ کی ایسی کوئی روایت نہیں ہے کہ اس نے کبھی انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لیا ہو۔ ہندو فرقہ پرستوں کی استعداد کا ذکر کرتے ہوئے نیتا جی سبھاش چندر بوس نے اپنی کتاب "ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی" میں ایک جگہ یوں لکھا ہے کہ "ہندو مہاسبھا دیگر مسلمانوں کی طرح صرف پرانے قوم پرستوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس سے ایسے ہزاروں افراد بھی وابستہ ہیں جو کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینے سے ڈرتے ہیں، تاہم وہ اپنے لیے ایک محفوظ پلیٹ فارم چاہتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ پرست تنظیموں کے اضافے سے دونوں فرقوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔"

نیتا جی کا یہ اقتباس آج خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ ان دنوں بعض فرقہ پرست نیتا جی سے اپنے گہرے خلوص کا اظہار کر رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی دعویٰ ہے کہ تمام قومی قائدین میں نیتا جی ان سے زیادہ قریب ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس خلوص کی بنیاد گاندھی جی اور نیتا جی سبھاش چندر بوس کے نظریات پر رکھی گئی ہے۔ نیتا جی کے سیاسی نظریات اگرچہ مہاتما گاندھی سے الگ رہے ہیں، تاہم جہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کا تعلق ہے دونوں کا عام رویّہ یکساں رہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستوں کی مہاتما گاندھی سے مخاصمت تقسیم ملک ہی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ مہاتما گاندھی کے فرقہ وارانہ اتحاد کی پالیسی کی بنا پر ۱۹۲۰ء سے ہی ان پر تنقیدیں کی جاتی رہی ہیں۔ ایسی تنقیدیں خود ویر ساورکر نے کی تھیں۔ گاندھی جی نے عام سیاسی بیداری کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ناگزیر قرار دیا تھا۔ ہندوستان کی تحریک جدوجہدِ آزادی کو مہاتما گاندھی نے جو اہم عطیہ دیا ہے وہ عام سیاسی بیداری ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نیتا جی اس نقطۂ نظر میں جہاں مہاتما گاندھی کے ہم خیال تھے وہیں ویر ساورکر نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ غرض اس حقیقت کا واضح طور پر اظہار کیا جا سکتا ہے کہ جدوجہدِ آزادی کی تحریک کے دوران فرقہ پرستوں کا رویّہ منفی رہا اور آج آزادی کے بعد وہ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کر کے سیاسی طور پر اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ●●

ایک جائزہ

بنکاک میں چھٹے ایشیائی کھیل



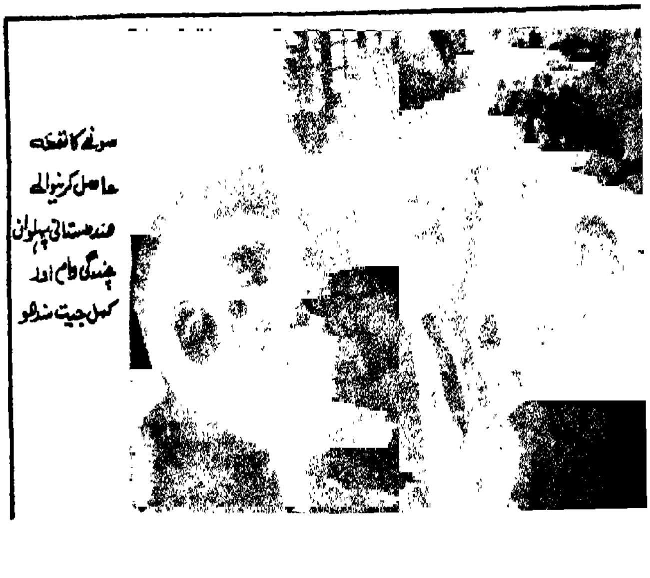
ایشیائی کھیلوں میں گولڈ میڈل جیتنے والی پہلی ہندوستانی لڑکی کمل جیت سندھو اور دوسرے ہندوستانی کھلاڑی راشٹرپتی بھون میں صدر گری کے ساتھ۔

پچھلے دنوں ایشیا کے تمام لوگوں کی نظریں بنکاک کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں چھٹے ایشیائی کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے اس مرتبہ کافی کھیلوں میں حصہ لیا تھا۔ اس لئے کھیل میں ہندوستانیوں کی دلچسپی ایک قدرتی امر تھا۔

اولمپک کھیلوں میں پاکستانی ہاکی ٹیم کی فتح کے بعد سے ہی ہندوستانی کھلاڑیوں نے ایشیائی کھیلوں کے لئے تیاری شروع کر دی تھی، اپنے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لینے کا اس سے اچھا موقعہ ہندوستانی ہاکی ٹیم کو اور کہاں مل سکتا تھا۔ چنانچہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بنکاک میں ہندوستان کا کھیل پاکستان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک بار پھر قسمت نے ہندوستانی کھلاڑیوں کا ساتھ نہیں دیا۔

بنکاک کا ہاکی اسٹیڈیم ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دونوں طرف سے حلق پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے جا رہے تھے کھیل شروع ہونے کے بعد کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اور واقعی کھیل تھا بھی ایسا ہی شاید پچھلے دس سال میں اولمپک اور ایشیائی کھیلوں میں ہاکی کا اتنا عمدہ کھیل دیکھنے کو نہ ملا ہو، دونوں ٹیمیں برابر کا کھیل، کھیل رہی تھیں۔ ایک طرف پاکستان کے مشاق اور تجربہ کار کھلاڑی تھے اور دوسری طرف ہندوستان کے نوجوان اور پھرتیلے کھلاڑی۔ ستر منٹ تک کھیل چلتا رہا لیکن کوئی ٹیم گول نہیں کر پائی۔ دونوں طرف سے کوشش تو بہت ہوئی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پندرہ منٹ کے زائد وقفے کے باوجود کوئی گول نہ ہو سکا اس لیے پندرہ منٹ اور دیے گئے لیکن کھیل ختم ہونے سے دو منٹ پہلے وہ لمحہ بھی آ گیا جس نے گولڈ میڈل کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ پاکستان کا سینٹر فارورڈ، رشید پٹھان تیزی کے ساتھ گیند لیکر آگے بڑھا اور تقریباً تین گز دور سے گول کر دیا اور تمام پاکستانی کھلاڑی مغرب کی طرف رُخ کر کے سجدے میں گر پڑے۔

گول نے ہار اور جیت کا فیصلہ تو ضرور کر دیا لیکن اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ بہتر کھیل کس ٹیم کا تھا۔ سچائی یہ ہے کہ دونوں ٹیموں نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اور ان کے کھیل کو ہندوستان میں نہیں بلکہ صرف کھیل کے میدان ہی میں دیکھا جا سکتا تھا



سونے کا تمغہ حاصل کرنے والے ہندوستانی پہلوان چنگی رام اور کمل جیت سندھو

تاہم ایک بات طے ہے کہ ہندوستانی ہاکی ٹیم نے یہاں میکسیکو اولمپک سے زیادہ بہتر کھیل کا مظاہرہ کیا۔

ہندوستان ہاکی کا گولڈ میڈل تو نہ حاصل کر سکا لیکن دوسرے بہت سے کھیلوں میں اس کے کھلاڑیوں نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کمل جیت سندھو نے چار سو میٹر کی دوڑ میں سونے کا تمغہ جیت کر ایشین کھیلوں میں تمغہ جیتنے والی پہلی ہندوستانی عورت ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ہندوستانی باکسر ہوا سنگھ نے غیر متوقع طور پر ہیوی ویٹ باکسنگ میں سونے کا تمغہ حاصل کیا، جبکہ دوسرے ہندوستانی باکسر منو سوامی نے پاکستان کے سلمیر کو ہرا کر فیدر ویٹ میں چاندی کا تمغہ جیتا۔

ہندوستانی فٹ بال ٹیم نے بھی اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ مرڈیکا میں کمزور کھیل کے بعد فٹ بال ٹیم نے ہمیں بہت نا امید کر دیا تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ مرڈیکا کے بعد کوچ پاشا نے نئے کھلاڑیوں پر بہت محنت کی۔ ہندوستان نے تھائی لینڈ کے ساتھ (۲-۲) برابر کیا۔ پھر جنوبی ویٹ نام کو ۲-۵ سے ہرایا۔ اس کے بعد مرڈیکا چیمپئن انڈونیشیا کو ۰-۳ سے ہرایا۔ لیکن ایشین چیمپئن برما سے ۰-۲ سے ہار گئی۔ اس کے بعد ہندوستانی ٹیم نے اولمپک کے میزبان ملک جاپان کو ہرا کر

مہندر سنگھ ـ سنہری چھلانگ





دھلی میں پروین کمار کو ان کے چاھنے والوں نے کندھے پر اٹھالیا

کانسے کا میڈل حاصل کر لیا۔

ہندوستان میں شاید زیادہ تر لوگ واٹر پولو کے نام تک سے واقف نہ ہوں۔ اس کے باوجود ہندوستان نے اس کھیل میں بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کر کے کانسے کا تمغہ حاصل کیا۔

کشتیوں کے نتائج بھی کچھ زیادہ بُرے نہیں رہے۔ چندگی رام نے سونے کا تمغہ، جیت سنگھ نے چاندی کا اور ادم پرکاش، مختیار سنگھ اور نیتر پال نے کانسے کے تمغے حاصل کئے۔

جہاں ایک طرف ہم نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں وہاں دوسری طرف بہت سی ناکامیاں بھی ہمارے حصے میں آئیں۔ ہماری باسکٹ بال ٹیم بری طرح ناکام ہوئی۔ ہماری سائیکلنگ ٹیم جس کا بہت شور تھا مذاق بن گئی۔

کل ملا کر ہندوستان نے ۶ سونے کے ۹ چاندی کے اور ۱۰ کانسے کے تمغے حاصل کئے۔ اس طرح ہندوستان کا نمبر پانچواں رہا۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی کھلاڑیوں نے پہلی بار ہاکی اور کشتی کے علاوہ دوسرے کھیلوں میں بھی بہت سے تمغے حاصل کئے۔

حاصل کردہ تمغے

ملک	سونے کے	چاندی کے	کانسے کے
جاپان	۷۴	۴۷	۲۳
جنوبی کوریا	۱۸	۱۳	۲۳
تھائی لینڈ	۹	۱۷	۱۳
ایران	۹	۷	۷
ہندوستان	۶	۹	۱۰
اسرائیل	۶	۶	۵
ملیشیا	۵	۱	۷
برما	۳	۲	۷
انڈونیشیا	۲	۵	۱۳
سیلون	۲	۲	۰
فلپائن	۱	۹	۱۲
تائیوان	۱	۵	۱۲
پاکستان	۱	۲	[illegible]
سنگاپور	۰	۶	[illegible]
کمبوڈیا	۰	۲	[illegible]
جنوبی ویت نام	۰	۰	۲

اس نے مجبور ہو کر تیرہ سو روپے میں کلکتہ فروخت کر دیا

آج سے لگ بھگ تین سو سال پہلے تیرہ سو روپے میں کلکتہ کا تمام علاقہ فروخت کرنے والے شخص کے خاندان کے کچھ افراد کس مپرسی کی حالت میں ایک نزدیکی بستی پارہی شاہ میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کے پاس پہننے کے لئے چیتھڑے اور رہنے کے لئے پرانے زمانے کے ایک شومندر کا کھنڈر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک بزرگ نے جس کا نام لکشمی کانت ودیا دھر تھا انگریزوں کی جعل سازی اور دباؤ کے زیر اثر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں کلکتہ کا علاقہ تیرہ سو روپے میں فروخت کر دیا تھا۔

یہ علاقہ ودیا دھر کے پردادا کو شہنشاہ اکبر نے حسن خدمات کے صلہ میں عطا کیا تھا اور اسے موجہدار (مجموعہ دار) کے منصب سے بھی نوازا تھا۔ اس علاقے میں کالی گھاٹ، گوبند پور اور ستانتی تین گاؤں شامل تھے۔

ودیا دھر نے حکمت عملی سے اس جاگیر کے جنگلوں کو کٹوا کر رہائش کے لئے مکانات بنوائے اور پوجا پاٹ کے لئے شومندر۔ اس کے علاوہ تجارت کے لئے ایک تجارتی منڈی کی بھی بنیاد رکھی۔ اس منڈی کی عمارتیں مکمل ہونے کی خبر قرب وجوار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ تجارت پیشہ لوگوں نے جوق درجوق اس منڈی کی طرف رخ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ منڈی روئی کی خرید و فروخت کا مرکز بن گئی۔

ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندے ہندوستان میں اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے۔ اسی عرصہ میں کمپنی کا ایک ملازم جس کا نام جوب چارنوک تھا اس منڈی کی شہرت سن کر سیاح کی حیثیت سے یہاں وارد ہوا۔ دریائے ہگلی کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے چارنوک کی عقابی نظریں بھانپ گئیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہونے کی صورت میں یہ منڈی ان کی قسمت بنا دے گی۔

ذہن میں ساری تجویز کا خاکہ تیار کر کے چارنوک واپس مدراس چلا گیا اور وہاں کمپنی کے دوسرے سربراہوں کے ساتھ اس خصوص میں مفصل بحث کی۔

جنوبی ہند میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان کچھ عرصے کے لئے لڑائیاں بند ہو گئیں تو چارنوک ۲۴ اگست ۱۶۹۰ء کو ستانتی جا پہنچا۔

کلکتہ کی تاریخ ۲۴ اگست ۱۶۹۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ چارنوک ۱۰ جنوری ۱۶۹۳ء کو فوت ہو گیا تھا لیکن اسے اس بات سے بہت سکون حاصل ہوا کہ اس نے اس علاقے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاؤں جمانے کے لئے زمین ہموار کر دی ہے۔

ستانتی کو قبضہ میں لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا اگلا قدم اس کے نواحی علاقوں میں اپنے پیر پھیلانا تھا۔ ان تجاویز کو مدنظر رکھ کر کمپنی کی بنگال کونسل نے لندن میں ڈائریکٹروں کو ۲۴ دسمبر ۱۶۹۳ء کو ایک مراسلہ ارسال کیا جس میں درج تھا "چارنوک کی وفات نے یہاں ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے اس علاقے پر پورا قبضہ کرنے کے تمام ذرائع ختم ہو چکے ہیں خاص کر نواب کے دیوان کی موجودگی میں یہ بات ناممکن ہے۔ اگرچہ کوششیں جاری ہیں کہ کسی طرح ستانتی کے گردونواح کی بستیوں کو دو ہزار روپے سالانہ ادھار پٹے پر لے لیا جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو امید واثق ہے کہ ستانتی گاؤں کی اہمیت بڑھ جائے گی اور کمپنی کے سالانہ مالیہ میں اضافہ ہو جائے گا۔ حال ہی میں ستانتی کی منڈی سے جو محصول وصول ہوا وہ دو سو روپے ماہوار ہے جب کہ اس سے پہلے کبھی تیس روپے سے زیادہ رقم حاصل نہیں ہوئی۔"

بنگال کونسل کے اس مراسلے کے جواب میں لندن سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے لکھا۔

"ستانتی کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر اطمینان ہوا لیکن اس سلسلے میں اس حکم کا اجرا ہو گا کہ آئندہ کمپنی کا کوئی ملازم زمین کے لین دین سے سروکار نہ رکھے ایسا کام بورڈ آف ڈائریکٹرز کی رضامندی بغیر غیر قانونی ہو گا۔ کمپنی آئندہ ان حرکات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھے گی۔"

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ کلکتہ کے پرانے علاقے کے مالکان رائے چودھری اور کمپنی کے کارندوں کے درمیان دوستانہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے علاقے کی چپہ بھر زمین سے بھی دستبردار ہونا پسند نہ کرتے تھے۔

اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے رائے چودھری ودیا دھر انگریزوں کے جال میں پھنس گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ ستانتی کا علاقہ آنے والے دنوں میں کلکتہ کے نام سے انگریزی سامراجیت کا دوسرا مرکز بنے گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال برانچ کے ایک سربراہ کی لکھی ہوئی ڈائری مورخہ ۲ مارچ ۱۶۹۸ء کے مندرجہ ذیل واقعات سے تمام حالات کا صحیح نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

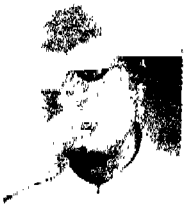
"انتہائی کوششوں کے باوجود ودیا دھر اپنی زمین کا کوئی حصہ بھی کمپنی کے نام بیع کرنے کے لئے تیار نہیں ہو رہا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ زمین اس نے اپنے بزرگوں سے وراثت میں حاصل کی ہے جو ان کی حسن خدمات کے صلے میں انہیں مغل بادشاہ نے جاگیر کی شکل میں دی تھی۔

جب ودیا دھر کسی صورت میں بھی اس علاقے کو بیچنے پر رضامند نہ ہوا تو انگریز سوداگروں نے صوبے کے گورنر عظیم الشان کے بیٹے شہزادہ فرخ سیر کو اٹھارہ ہزار روپے نذرانہ دے کر جوار کی زمین کو بیع کرا لینے کا حکم نامہ حاصل کیا۔ اس حکم نامے کو دیکھ کر ودیا دھر رائے چودھری کے پاس زمین بیچنے کے سوا دوسرا چارہ نہ رہا۔ اور پھر مجبوراً یہ زمین جس پر آج کلکتہ آباد ہے اس نے تیرہ سو روپے کی حقیر رقم کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دی۔"

بعض مبصرین کا خیال ہے کہ یہ حکم نامہ جعلی تھا کیونکہ کمپنی کے کبھی بھی ڈائریکٹر نے شہزادہ فرخ سیر سے ملاقات نہیں کی اور کسی شہزادہ کو دلی کے شہنشاہ وقت کی موجودگی میں ایسا فرمان جاری کرنے کا استحقاق نہ تھا۔

.....

محبت کی دیوی وینس کو رام کرنے کا انسانی منصوبہ



منظور احمد سوز
(ایم اے)

اس دور میں انسانی ذہن زمین کی حدود سے نکل کر دیگر اجرام فلکی پر بھی اپنے لئے نئی نئی رہائش گاہیں تلاش کر رہا ہے یہ تگ و دو کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب اگر انسان کی موجودہ تخریب کارانہ ذہنیت میں تلاش کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ وہ مستقبل کی اس عالم گیر ایٹمی تباہی سے خوفزدہ ہے جو وہ خود اس دنیا پر لانے کا تہیہ کر چکا ہے اور اس سے بچنے کے لئے وہ ابھی سے نئی نئی پناہ گاہیں تلاش کر رہا ہے۔ ہاں اگر اس جدوجہد کو اس کی سلامت روی پر محمول کیا جائے تو دنیا کی بڑھتی ہوئی بے تحاشا آبادی اور زمین کی تنگ دامانی بھی اس کا جواب ہو سکتا ہے۔

چاند کی تسخیر اس منزل کی طرف انسان کا پہلا قدم تھا لیکن یہ سعی ناکام ثابت ہوئی۔ انسان کا گمان تھا کہ چاند پر زندگی کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گی مگر سرزمین چاند پر تو زندگی کی بنیادی علامات کا بھی فقدان نظر آیا، نہ وہاں ہوا ملی اور نہ پانی۔ حد نظر تک سنسان و ویران چٹیل پہاڑیاں تھیں یا لق و دق ریگزار یا پھر شہاب ثاقب کی وہ ہولناکیاں تھیں جو شگاف نما غاروں کی صورت میں نظر آئیں۔ الغرض یہ انسانی قافلہ بے نیل مرام ہی زمین پر واپس آیا۔

اب انسان کی مریخ پر نظر ہے اور چاند کو سنگ میل بنا رہا ہے، لیکن مریخ کے متعلق تو ماہرین فلکیات اس صدی کی ابتدا میں ہی یہ فیصلہ صادر کر چکے ہیں کہ بے شک کبھی مریخ پر نہ صرف زندگی کے آثار ہی موجود تھے بلکہ وہ زندگی شاید اس ارضی زندگی سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ زندگی تھی —— مگر اب تو یہ تمام سیارہ برف کی لپیٹ میں ہے اور اس پر ہزارہا سال سے عصر برفانی مسلط ہے۔ وہاں اب زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں اور نہ اب زندگی کے قیام کا کوئی امکان ہی باقی رہا ہے۔ مگر انسانی فطرت قدرت سے ہار ماننے کو کبھی تیار نہیں ہوئی اور نہ وہ آج ہی آمادہ ہے۔

چنانچہ امریکی یونیورسٹی، واشنگٹن کے ممتاز پروفیسر ڈاکٹر میتھیو نارٹن نے چند ہفتے قبل ہی "ویسٹرن اسپیس کانگریس" میں سیارہ وینس پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ان امکانات کا انکشاف کیا ہے کہ وینس (زہرہ) کو بھی انسان کے لئے قابل بود و باش بنایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نارٹن کا کہنا ہے کہ یہ سیارہ سورج سے اپنی قربت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر آتا ہے اس لئے اس وقت اس کی حدت حرارت نقطۂ جوش [Boiling Point] پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قیامت کی گرمی میں زندگی کی بقا ممکن نہیں۔ مگر ان کے نظریے کے مطابق اس حدت کو اعتدال پر یقیناً لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نارٹن نے اپنے اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ فی الوقت یہ سیارہ گھنی کاربن ڈائی آکسائڈ سے گھرا ہوا ہے اور اس کی موجودہ ناقابل برداشت حرارت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ گیس اس سیارے کی حدت کو اس کی سطح پر ہی مقید رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سیارہ کی بلند ترین فضا میں برف کے ذرات بھی پائے جاتے ہیں۔ سیارے کی فضا کا یہ نقطۂ انجماد ہی ڈاکٹر نارٹن کی امیدوں کا مرکز ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اس خنک فضائی طبق میں اگر انسان کوئی کائی نما پودا پیدا کر دے تو یہ نباتات ایک ایسے قدرتی عمل کی ابتدا کر دے گی جو بالآخر اس سیارہ کی غیر معمولی حرارت کو اعتدال پر لے آئے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک عام بات ہے کہ پودوں کی زندگی کا انحصار کاربن ڈائی آکسائڈ پر ہوتا ہے کیونکہ وہ اس گیس سے ہی کاربن کو بطور غذا حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پودوں میں اس گیس کی تحلیل صرفی کا خاصہ بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر نارٹن کے قول کے مطابق اگر انسان اس خنک فضائی طبق میں یہ کائی نما پودا پیدا کر دیتا ہے تو یہ نباتات نہ صرف اپنی ضرورت کے مطابق اس گیس سے اپنی غذا حاصل کرنا شروع کر دیگی بلکہ اس کی قوت تحلیل صرفی کے نتیجے میں اس گیس کا دوسرا جزو آکسیجن پراگندہ ہو کر فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی جگہ بھی لینا شروع کر دے گا۔ جو دراصل بقائے انسانی کا ضامن ہے اور جس کی پودوں کو ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ابتدا میں یہ کائی نما نباتات اپنے مسلسل البتہ جسم کے اعتبار سے معمولی اثر و نفوذ کے مطابق نہایت قلیل مقدار میں اپنی غذا قبول کرے گی۔ باقی ماندہ زائد کاربن سیارہ کی سطح پر جمع ہوتا رہے گا۔

مگر اس نظریے کے مطابق اس انسانی کوشش کی کامیابی پر ایک اور قدرتی عمل "فوٹو سنتھسس" کی بھی از خود ابتدا ہو جائے گی، یعنی گھاس سورج کی روشنی کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ کو کاربوہائیڈریٹس میں بھی بدل دیتی ہے جو گھاس کو خود بخود بڑھانے والا ایک اہم مادہ ہے۔ چنانچہ یہ کائی نما نباتات یا گھاس بھی اسی طرح کاربوہائیڈریٹ پیدا کرے گی اور دن بدن اس کا حجم بڑھتا چلا جائے گا۔ الغرض یہ خود کار سلسلے ایک طرف تو اس کائی نما نباتات کی افزائش کا موجب ہوں گے اور دوسری طرف یہ بڑھتی ہوئی نباتات —— کاربن ڈائی آکسائڈ سے زیادہ سے زیادہ کاربن بطور غذا حاصل کرے گی اور اسی نسبت سے آکسیجن کی مقدار بھی بڑھتی اور پیدا ہوتی چلی جائے گی ——

ڈاکٹر نارٹن کے نظریے کے مطابق جب اس متذکرہ بالا تحلیلی انتشار سے کاربن ڈائی آکسائڈ کا وجود رفتہ رفتہ فنا ہو گا تو وہ دائمی حدت و حرارت جو سیارے کی سطح پر مقید تھی آزاد ہو کر فضا میں بلند ہو گی اور انجام کار برف کے ذرات سے ٹکرا کر ان کو بارش کی شکل میں سیارہ پر برسائے گی۔ ان بارشوں کی ابتدا ہوتے ہی اس سیارے کی سرزمین پر قسما قسم کی روئیدگیاں جنم لیں گی اور ممکن ہے کہ ہمارے اس صنعتی دور میں ہی یہ تمام سیارہ سرسبز و شاداب ہو جائے۔

پروفیسر نارٹن کا خیال ہے کہ اس انقلاب کے نتیجے میں جو آب و ہوا اس سیارہ پر پیدا ہو گی وہ منطقہ حارہ کے علاقوں کی مانند ہو گی —— پھر کیا ہے اس سیارہ پر کھیتیاں لہلہائیں گی۔ پھل پھول مہکیں گے۔ سبک رو دریا گنگنائیں گے اور گھنے اور تاریک جنگل باہم سرگوشیاں کریں گے اور محبت کی دیوی وینس یوں انسان پر اپنی بے پایاں محبت نچھاور کرنے پر مجبور ہو گی ——

[illegible]



خرگوش

ایک جرمن کہانی

ترجمہ
سید آل رسول

ماسٹر زیڈلاک نے اوائل نومبر میں ایک خرگوش خریدا اور بیوی سے بولے:۔ کرسمس آنے کو ہے، اسے خوب کھلاؤ پلاؤ تاکہ موٹا ہو جائے اور تہوار کے موقع پر اس کے مزے دار کباب بن سکیں۔

یہاں پر ماسٹر زیڈلاک نے تاکہ کہا تھا یا نہیں اسکے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ خود ان کی بیوی نے خرگوش خریدنے کے دوسرے دن یہ بات مجھے بتائی تھی۔

زیڈلاک کی بیوی بہت مہربان خاتون تھیں اور ہر مہمان کی دل وجان سے خاطر مدارات کیا کرتی تھیں۔ ہر وقت کام میں جٹی رہتی تھیں۔ گھر کا سارا کام کاج' اٹھائی دھری' جھاڑو برتن، صفائی، غرض خانہ داری کا ہر کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں اور کیا مجال کہ کسی کام میں ذرہ بھر چوک تو ہو جائے۔ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر اور انتہائی سلیقے سے انجام پاتا تھا۔ پھر صفائی کا تو یہ عالم تھا کہ میرا خیال ہے اگر کپڑوں، برتنوں، جوتوں اور دوسری چیزوں کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ یقیناً اپنی مالکہ کو "پیاری اماں" کہہ کر خطاب کیا کرتے۔

[illegible]

ان کے یہاں کوئی بچہ نہ تھا لیکن خرگوش کے آنے کے بعد یہ کمی پوری ہو گئی تھی۔ وہ خرگوش کے متعلق بہت کچھ کہا کرتی تھیں۔ اس کی اچھل کود، شوخیاں، فرمانبرداری اور مسخرے پن کی باتیں ان کی گفتگو کا دلچسپ موضوع تھا۔ خصوصاً یہ بات کہ وہ ان کی ایک ہی سیٹی پر کس طرح دوڑا چلا آتا ہے، یا یہ کہ وہ ان کی آنکھوں کے اشارے تک سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح خرگوش سے متعلق تمام کام اور اسکی پھیلائی ہوئی گندگی کو بھی وہ اس کی دلچسپیوں کی خاطر برداشت کر لیتی تھیں۔ یہ جانور ان کے لئے بچوں کے کھلونے کی سی حیثیت رکھتا تھا جس کے نت نئے کھیل کبھی ختم ہی نہ ہوتے تھے۔

خرگوش کے رہنے کے لئے لکڑی کا ایک صندوق نما ڈربہ بنایا گیا تھا اور غذا کے لئے باورچی خانے کی جوٹھن مقرر کر دی گئی تھی۔ یہ جوٹھن زیڈلاک کے دسترخوان پر عموماً دوپہر کے کھانے کے بعد کافی مقدار میں بچ جایا کرتی تھی۔

خرگوش موٹا ہونے لگا۔ اس کا پیٹ نکل آیا تھا۔ اور گلے پھول گئے تھے۔ خاتون کا کہنا تھا کہ اب جوں ہی ماسٹر زیڈلاک اس تیار جانور کو دیکھتے ان کی رال ٹپک پڑتی اور وہ خواہ مخواہ منہ چلانے لگتے۔ دوسری طرف یہی پانی آنسو بن کر بیوی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگتا جب وہ یہ سوچتیں کہ آنے والے تیوہار تک پیارے خرگوش کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

خرگوش کے موٹاپے کو دیکھ کر خاتون دل ہی دل میں خوش ہوتیں۔ وہ اس کو بہر حال خانہ داری کی ایک اہم جنس

تی تھیں جس کی دیکھ بھال پر انکو ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا
س کے ساتھ ہی کرسمس کے کبابوں کا مسئلہ انکی خانہ
ی زندگی کا ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا — خاتون زیڈلاک
ہاں صرف پیٹ ہی نہ تھا جس کو بھرنے کی ضرورت
ہے بلکہ ان کے سینے میں ایک دل بھی دھڑکتا تھا جس
حساسات بھرے ہوئے تھے شکم اور دل کے نزاع نے
ن کے ذہن میں شدید کشمکش پیدا کر دی۔ پیٹ نے جس
سے اتنی بڑی امید لگا رکھی تھی وہی بات دل کے لئے
ن ناامیدی کا باعث بنی ہوئی تھی۔

ماسٹر زیڈلاک نے ذبح کی تاریخ بھی مقرر کر دی
ں نے اپنے مالک مکان کے بڑے لڑکے کو جسے جنگ میں
ں کارنامے دکھانے پر کئی تمغے انعام میں بھی مل چکے تھے
ابے کے فرائض انجام دینے کی دعوت دی جو بڑی خندہ
شانی سے قبول کر لی گئی۔

خرگوش کے انجام کا آخری فیصلہ ہونے کے ساتھ ہی
اتون کا رویہ یک لخت بدل گیا، اب انھوں نے خرگوش
و برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ بے چارے جانور کو عام
لور سے "کم بخت" کہا جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس
ں تمام دنیا کی برائیاں بھی نظر آنے لگیں۔

"تمام گھر سڑا رکھا ہے، نہ دن کو چین ہے نہ رات کو
ارام، ساری رات صندوق میں پڑا خرخراتا رہتا ہے کم بخت
لوگوں کی نیند حرام کر رکھی ہے مردود نے۔ ایندھن کی الگ
کمی ہے اور اس نابکار کے ڈربے میں ڈھیروں لکڑی لگی
ہوئی ہے۔ پیٹو بھی تو کمبخت غضب کا ہے بھلا آج کل
ترکاریوں کے لئے ڈنٹھل کہاں میسر ہیں کہ اس کی روز
بھری جا سکے — اچھا ہی ہے کہ کرسمس آئے اور یہ
منحوس جلدی سے دفع ہو۔"

رہا گوشت کا معاملہ جس کے بارے میں خود
خاتون نے پہلے کئی بار بڑے یقین کے ساتھ اس کے وزن
کے متعلق اپنا اندازہ پیش کیا تھا، سو اب اسکے بارے میں
بھی اب یہ کہا جانے لگا کہ پہلا اندازہ غلط تھا، بھلا اس میں
گوشت رکھا ہی کہاں ہے بس دیکھنے بھر کا ہی پھولا پھلا ہے
لیکن میں نے محسوس کیا کہ جب بھی خاتون جانور کا تذکرہ غذا
کے طور پر کرتی تھیں ان کی آواز غیر معمولی طور پر پھنسی پھنسی
سی محسوس ہوتی تھی۔

بے چارہ جانور بھی اپنی مالکہ کے اس عجیب و غریب
رویئے اور تلون مزاجی سے الجھن میں پڑ گیا۔ ایک طرف وہ
اس غیریت آمیز رویئے پر کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ دوسری
جانب اس کو اپنی مالکہ کا گزشتہ سلوک اور ان کی بھلائیوں
کا احساس اور شدید صورت اختیار کر گیا اب وہ کسی قیمت پر
بھی ان تمام احسانات کا بدلہ چکا دینا چاہتا تھا۔

ہوا بھی ایسا ہی — اس نے، جی ہاں خرگوش
نے، وہی کیا جو اس اضطراری دور میں ایک ماہر نفسیات
خرگوش کو کرنا چاہئے تھا۔ ویسے میرا خیال ہے اگر کوئی
دوسرا خرگوش بھی ہوتا تو شاید وہ بھی اس کے سوا اور
کچھ نہ کرتا —

"اس نے خاتون زیڈلاک کی انگلی میں کاٹ کھایا"
مسّاۃ لہک کر بولیں — "یہ دیکھو آج تو اس منحوس
نے میری انگلی میں کاٹ کھایا — موا مردم خور —"

لیجئے اقدام قتل کا مقدمہ تیار ہو گیا۔ فرد جرم بھی عائد
کر دی گئی، ملزم کے خلاف موت کا فیصلہ سنانے کا پورا
پورا اخلاقی و قانونی جواز فراہم ہو گیا۔

دوستی کا وہ رشتہ جو مہربان مالکہ اور جانور کے درمیان
قائم ہوا تھا خود جانور کی ہی غلطی سے ٹوٹ گیا۔ آخر اس نے
اتنا بڑا جرم کیوں کیا؟ جی ہاں! اس نے مالکہ کی انگلی چبائی
تھی۔ جرم بہر حال جرم ہے اور اس کی ایک سزا بھی ہے
بس خرگوش کے کباب بن گئے — انصاف بہر حال
انصاف ہے۔

خاتون مجھ سے خرگوش کے انجام کے بارے میں گفتگو
کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت ضبط سے کام
لے رہی ہیں، اور اپنے جذبات مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی
ہیں لیکن اندر کی کشمکش سے ان کا لہجہ بار بار کھسیانا سا
ہو جاتا تھا۔ آخر ایک ایسی ہی کھسیانی ہنسی ہنستے
ہنستے ان کے آنسو نکل آئے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگیں،
"کیسا موٹا خرگوش تھا۔"

کھال سوکھنے کے لئے دھوپ میں پھیلا دی گئی۔ اسکی
بھی ایک قیمت تھی، نعمت خانے کے لحاظ سے جانور پر کم موٹا
ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا لیکن یقین جانیئے تقریب میں
اس نے کافی سے زیادہ ہونے کا ثبوت دیا۔ رہا مفید ہونا
تو اس بات کا ثبوت تو بے چارہ اس وقت بھی الگنی سے
ٹنگا ہوا دے رہا ہے۔

اب گھر جانور کی بدبو سے نہیں سڑتا اور نہ کسی کے
خرخرانے سے گھر والوں کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ رہی ایندھن
کی کمی تو ڈربہ موجود ہے لیکن ڈربے پر کسی نے کلہاڑی نہیں
چلائی۔ ایندھن کی سخت قلت کے دنوں میں بھی ڈربہ بدستور
ڈربہ رہا۔ آپ کو علم ہے ڈربہ کیوں برقرار رہا؟ —

"ماسٹر زیڈلاک نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ پھر ایک خرگوش
خریدیں گے۔"

لیکن میں سوچتا ہوا کیا خاتون زیڈلاک اس مرتبہ
بھی جانور پر کوئی فرد جرم عائد کر سکیں گی؟ خواہ وہ انکی
انگلی میں کاٹ ہی کیوں نہ کھائے!

واقعات نئی دھلی

ایران۔ قدیم ترین تہذیب و تمدن کا گہوارہ

حال ہی میں ہارورڈ کے ماہرینِ آثار قدیمہ نے جنوب
مشرقی ایران کے ایک بلند ٹیلے تی یحیٰی کی کھدائی کے بعد
انکشاف کیا ہے کہ ایران میں تہذیب و تمدن کے آثار دنیا کے
تمام ممالک سے ایک ہزار سال قبل موجود تھے اس کھدائی
میں ایک ایسی عمارت برآمد ہوئی ہے جس میں ۱۲ فیٹ چوڑے
اور ۲۱ فیٹ لمبے ۵ کمرے موجود ہیں۔ بظاہر یہ اس دور
کے کسی دفتر کی عمارت خیال کی جاتی ہے۔ یہاں کچھ ایسی
• تختیاں پائی گئی ہیں جن میں غلے کا حساب درج ہے۔ یہ
ایک منزلہ عمارت مٹی کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی اور اس میں
بے شمار مٹی کی بنی ہوئی کنالیاں پائی گئی ہیں جو غالباً غلہ
رکھنے کے مقصد سے اس عمارت میں رکھ دی گئی تھیں۔

میسوپوٹامیہ میں ۳۵۰۰ قبل مسیح کے آثار قدیمہ
سب سے پرانے تہذیب و تمدن کے آثار سمجھے جاتے رہے ہیں
لیکن ایران کی اس حالیہ کھدائی نے ظاہر کر دیا ہے کہ
ایران میں تہذیب اور تمدن اس دور سے بھی ایک ہزار برس
پہلے اپنے عروج پر تھا۔

ہارورڈ کے ماہرین آثار قدیمہ ان لکڑی کی تختیوں پر
لکھی ہوئی زبان کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہیں اگر
ان پر لکھی ہوئی عبارتیں سمجھ لی گئیں تو آج سے ساڑھے چار
ہزار سال قبل کے نظام حکومت کے طریق کار کو سمجھ لینا
مشکل نہ ہوگا۔ بہر حال ان ماہرین نے دعویٰ کیا ہے کہ
وہ مارچ ۱۹۷۱ء میں اپنی فائنل رپورٹ پیش کر دیں گے۔

کچھ اِدھر کی کچھ اُدھر کی

دانشوروں کی پیدائش

روس کے سائنسدانوں نے بتایا ہے کہ دنیا میں دانشوروں کی اکثریت ایسے وقت پیدا ہوئی ہے جب ان کے والد کی عمر ۳۸ اور ماں کی عمر ۲۷ برس کی تھی۔ اس سلسلے میں تحقیقات کے لیے انھوں نے تقریباً پانچسو مشہور اور عظیم ہستیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا۔

دلّی یونیورسٹی میں مے نوشی

ایک سرسری جائزے کے مطابق دلّی یونیورسٹی کے ۷۰ فی صدی طلبا اور ۲۶ فی صدی طالبات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ موقع ملنے پر شراب نوشی سے نہیں چوکتے۔ اس جائزے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ یونیورسٹی کے ۹۰ فیصدی طلبا نے کسی نہ کسی موقعہ پر ضرور شراب چکھی ہے۔ اس اطلاع کے بموجب یہ طلبا، وقت گزاری کے لیے شراب نوشی کا شغل اختیار کرلیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اپنے دوست احباب کے ساتھ پیتے ہیں لیکن جو گھروں میں اپنے کنبے کے ساتھ پیتے ہیں ان کی تعداد معدودے چند ہی ہے۔

امریکی انصاف

ایک امریکی عدالت اپیل نے ایک ایسے قیدی کی، جو بنک میں ڈاکہ زنی کے جرم میں جیل کی سزا بھگت رہا ہے یہ کہہ کر اپیل منظور کرلی کہ جس جج نے اُسے ۲۸ سال کی سزا دی ہے اس کا دماغی معائنہ کرایا جائے۔ یہ محض سوئے اتفاق ہے کہ وہ جج اب اس دنیا کو خیر باد کہہ چکا ہے لہٰذا قیدی کی استدعا کے بموجب اب اس کے مقدمہ کا فیصلہ وہی جج کرے گا جس کے بارے میں ڈاکٹروں کی یہ رپورٹ آجائے کہ وہ ذہنی طور پر درست ہے۔

ماؤ کے نعرے

اندھرا پردیش کے وزیر داخلہ نے ودھان سبھا کو بتایا کہ وساکھاپٹنم کے ساحلوں پر نمودار ہونے والی چند آبدوز کشتیوں پر ماؤزے تنگ کے نعرے لکھے ہوئے پائے گئے۔ انھوں نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ سالِ رواں میں نکسلائیٹوں نے ۶۳ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود ان کے گروہ کے ۱۹ دہشت پسند پولیس کا مقابلہ

واقعات نئی دھلی

کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً مارے گئے۔

کتّے اور بلّی کی دوغلی نسل

انگلستان کے شہر ہانسٹن کے لے ٹٹ نے کتّے اور بلّی جیسے جانوروں سے جو ایک دوسرے کی دشمنی کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہیں ایک دوغلی نسل تیار کرکے ساری دنیا کو محوِ حیرت کردیا ہے۔ اس دوغلی نسل کے بچے ڈیٹ کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ ان کا اگلا حصّہ کتّے جیسا اور پچھلا بلّیوں جیسا ہے۔ سر کتّے سے مشابہت رکھتا ہے اور پاؤں بلّی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کی آواز بھی کتّوں کے بھونکنے اور بلّی کے میاؤں میاؤں کرنے کی درمیانی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔

افزائشِ نسل کے خلاف انوکھی مہم

مثل مشہور ہے کہ نیک کاموں کی ابتدا گھر سے ہونی چاہیے۔ اس کہاوت کے تحت راجستھان کے ضلع چتوڑ گڑھ کے افسروں نے طے کیا ہے کہ وہ زیادہ بچے پیدا کرنے کے خلاف نعرہ لگانے سے قبل خود اپنا آپریشن کرائیں گے۔ چنانچہ تمام ایسے افسران جو دو یا دو سے زیادہ بچوں کے والدین ہیں جلد ہی آپریشن کرالیں گے تاکہ عوام ان کے بتائے ہوئے راستے پر برضا و رغبت چل سکیں۔

منی اسکرٹ کے بعد منی کتّے

چھوٹا کنبہ، چھوٹی کار، چھوٹا گھر اور چھوٹے ریڈیو کے اس دور میں کوئنس لینڈ کے ایک کتّے پالنے والے شخص نے چھوٹے کتوں کی ایسی نسل پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ جن کا وزن سوا تین سو گرام سے زیادہ نہیں ہے اور انھیں سبزی لانے والے تھیلوں یا عورتوں کے ویلنٹی بیگ میں رکھ لیا جاتا ہے۔ ان کتوں کی اونچائی ۱۵ اور لمبائی ۲۰ سینٹی میٹر کے قریب ہے۔ ابھی تک اس نسل کے لیے کوئی نام تجویز نہیں کیا جا سکا ہے۔

وزارت کی لاٹری

بہار میں ایس۔ وی۔ ڈی کے ۱۱ آزاد ممبران ودھان سبھا کو چیف منسٹر شری کرپوری ٹھاکر نے ان میں سے ایک وزیر چن لینے کی اجازت دے کر وزارت سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا۔ ان آزاد ممبران نے قرعہ اندازی کے ذریعہ شری جے رام گری کو وزارت کے لیے چن لیا۔

تبدیلیٔ جنس کی ہوا

لندن سے موصول شدہ اطلاعات کے تحت عورتوں اور مردوں میں تبدیلیٔ جنس کی ہوا بُری طرح پھیل گئی ہے یورپ کے پرائیوٹ ہسپتالوں میں ایسے آپریشن کی فیس اٹھارہ ہزار روپیہ ہے۔ سالِ رواں میں تقریباً سات مرد تبدیلیٔ جنس سے صنفِ نازک کی صف میں شامل ہوچکے ہیں۔ ۴۵ مرد اور عورتیں اسی غرض سے ہسپتال میں داخل ہیں۔ دس مرد اپنا اندراج انتظار کرنے والوں کی فہرست میں کراچکے ہیں اور تقریباً بیس آدمیوں پر تجربے کیے جارہے ہیں۔

کتّے نے مالک پر فائر کردیا

۲۷ سالہ سسوموسیٹو سارے ٹوکیو میں اپنی نشانہ بازی کی وجہ سے ماہر شکاری تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کی مہارت نے ہی انھیں اپنے کتّے سے زخمی کرادیا۔ وہ چاولوں کے کھیت میں بطوں کا شکار کرنے کے دوران اپنی رائفل کو ایک جھاڑی سے ٹکا کر ناشتہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کے شکاری کتّے نے ان کے اسلحے پر حملہ کرکے رائفل کا ٹریگر دبادیا۔ بندوق سے نکلی ہوئی گولی سیٹو کی کمر میں لگی۔ کہا جاتا ہے کہ گولی کا زخم مندمل ہونے میں ایک ماہ کا عرصہ لگ جائے گا۔

خدائی اولاد بننے کے لیے اولاد کشی

میڈرڈ میں مغربی جرمنی کے ایک ۵۹ سال کے باشندے نے اپنی ۴۱ سال کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد ۱۸ اور ۱۵ برس کی بیٹیوں کو بھی چھری سے ذبح کر ڈالا۔ پولیس کی باز پرس کے دوران اس نے بتایا کہ وہ "خدائی اولاد" نام کی مذہبی تحریک سے وابستہ ہے۔ اس نے اپنی اولاد اور اپنی بیوی کو خدا کے نام پر اس لیے ذبح کردیا کہ اس قربانی سے اُسے خدا کی اولاد بن جانے کا مرتبہ حاصل ہوجائے گا۔



واقعات [illegible]

ہرے رام ہرے کرشنا

شری کرشن کی جنم بھومی سے ہزاروں میل دور مغربی ورجینیا میں ۳ سو ایکڑ پر پھیلے ہوئے رقبہ میں زندگی اسی ماحول کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے جو آج سے چار پانچ ہزار سال پیشتر شری کرشن کی موجودگی میں ورنداون یا گوکل پر چھایا ہوا تھا۔ یہاں امریکی کرشنا بھگت گائیں چراتے ہیں اور عورتیں گوپیوں کی طرح دودھ دوہتی ہیں۔ ریڈیو ٹیلی وژن کا تصور اس جگہ بے معنی ہے۔ ہارمونیم، ستار، رباب، بربط اور پیانو کی بجائے بانسری بجائی جاتی ہے اور اس کالونی میں یہی واحد موسیقی پیدا کرنے والا آلہ ہے۔ سال میں



بھگوان کرشن کا ایک جاپانی چیلہ

ایک بار رتھ یاترا ہوتی ہے۔ یہاں کے رہنے والے شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کے علاوہ گوشت کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ساری کالونی کے باشندے بین الاقوامی کرشنا جاگرتی سوسائٹی ISKON کے ممبر ہیں۔ اس سوسائٹی کے بانی ہندوستان کے باشندے شری اے۔ سی بھکتی ویدانتا سوامی پربھوپادا ہیں جن کا صدر مقام بمبئی ہے۔ 'اسکان' کا قیام ۱۹۶۶ء میں عمل میں آیا اور جلد ہی اس کی شاخیں کناڈا، جاپان، جرمنی، انگلستان اور امریکا جیسے سرمایہ دار اور تہذیب کے علمبردار ملکوں میں قائم ہو گئیں اور مغربی ورجینیا میں متذکرہ بالا کالونی بنا دی گئی جسے چار ہزار برس قبل کے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر کہنا چاہیے اس تحریک نے چار سال کے اندر ان ممالک میں پچاس مندر تعمیر کر ڈالے۔ اسکان میں پانچ سو سے زیادہ کرشن بھگت داخل ہو گئے۔ یہ سب کے سب دنیا کی مادی راحتوں کو تج چکے ہیں اور ان میں اور ہپیوں میں صرف یہی امتیاز ہے کہ ہپیوں کے برعکس یہ لوگ جنسی ملاپ، نشہ اور گوشت کو اپنی زندگی کے معمولات سے خارج کر چکے ہیں۔

اکتوبر میں اسکان کے پیرو ہندوستان آئے ان میں سے ۲۰ تو براہِ راست بمبئی پہونچے اور ۵ کلکتے ہوتے ہوئے دلی آئے۔ ان کے عقائد کے تحت شری کرشن کا نام وردِ زبان کر لینے سے دنیا کی تمام تکالیف دور ہو جاتی ہیں، انسان مایا کے جال سے نکل آتا ہے اور مادی عیش و آرام کی خواہشات سے نجات پا لیتا ہے۔ رنگ، نسل، ذات، پات اور مذاہب کی قید و بند سے آزاد ہو کر وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی گزارتا ہے جو کسی کے لیے باعثِ آزار نہیں ہوتی۔ یہ لوگ شری کرشن کے پھیلائے ہوئے دھرم کو مانتے تو ہیں لیکن اس پر مکمل پابندیوں کے ساتھ عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ انھیں شری کرشن کے بیشتر اصولوں اور ان کے بتائے ہوئے زندگی کے راستوں پر چلنے سے خوشی اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اسکان کے گرو کے بقول اور سفید فام چیلوں کے عقیدوں کے مطابق شری کرشن دین دھرم اور مسلک و

ذہب کے بندھنوں سے آزاد تھے۔ وہ ساری دنیا کے
یے مساوی طور پر ہستی عظیم ہیں۔ ایسی ہستی جس کے نام
ی مالا جپنے سے ہی تمام دکھ اور درد کافور ہو جاتے ہیں۔
ام جھگڑے، اختلافات، فسادات، آپس کی کش مکش
ر بغض و عناد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر مغربی طاقتیں شری
رشنا کے اصولوں کو احترام کی نظروں سے دیکھیں تو
اری دنیا میں امن و سلامتی کی فضا قائم ہو جائے گی۔
ن الاقوامی خرخشوں اور اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا
سل انسانی اپنے اصل مقصد کی جانب لوٹ جائے
ی اور یہ دنیا نمونۂ ارم بن کر تمام بنی نوع انسان کے
صائب کا مداوا کرے گی۔ کرشن بھگتی ہی تمام امراض
کے لیے مسیحائی کا کام کر سکتی ہے۔ ان چیلوں کا خیال
ہے کہ جب انھیں

ہرے کرشنا، ہرے کرشنا، کرشنا کرشنا ہرے ہرے

ہرے راما، ہرے راما، راما راما ہرے ہرے

ا منتر پڑھنے سے دنیاوی تفکرات سے نجات مل کر اطمینان
ال اور مکمل سکون حاصل ہو جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں
ہ مغرب کی مادہ پرست آبادی کو اس مہا منتر سے فائدہ
اصل نہ ہو۔

اکتوبر میں بمبئی شہر میں چوپاٹی کے مقام پر بھارت
سادھو سماج کا سیشن ہوا جس میں امریکا سے آئے
ہوئے ہرے کرشنا ڈیلی گیشن کے ۲۰ افراد بھی شریک
ہوئے۔ ان کا لباس، اطوار طریق، چہرہ مہرہ بالکل سادھوؤں
یسا تھا اور انھوں نے اپنے نام بھی بدل کر ہندوؤں جیسے
کھ لیے ہیں۔ جب ان لوگوں سے ان کے پرانے نام دریافت
کیے گئے، تو انھوں نے ماضی کی یادوں کے جھروکے کھولنے
سے انکار کر دیا۔ کسی نے بھی اپنے اصل نام نہیں بتائے
لبتہ نئے نام بتاتے رہے۔ اور جب ٹائمس آف انڈیا کے
یک نمائندے کے۔ آر۔ سندر راجن نے ادھیکاری نام کے
ایک امریکن سے دریافت کیا کہ اس کے پاس ہندوستان
یں چھائی ہوئی غربت اور اس کے باعث پھیلی ہوئی بے اطمینانی
کا کیا حل ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ
ہندوستان امریکا سے کہیں زیادہ دولتمند ملک ہے چونکہ
یہ لارڈ کرشنا کا ملک ہے۔ ایسا ملک جہاں اتنی عظیم ہستی
پیدا ہوئی کبھی بھی غریب نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس نے بتایا

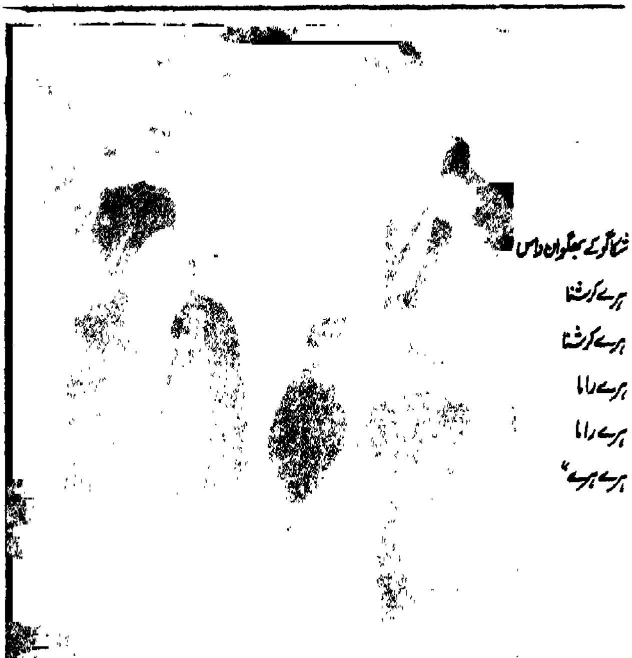
کہ امریکا، کناڈا، برطانیہ اور مغربی جرمنی کے ۱۲ شہروں
کی سڑکوں پر لوگ روزانہ جلوس کی شکل میں شری کرشن کے
نام کی مالا جپتے ہوئے نکلتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ مستقبل
قریب میں دنیا کے ایک ایک شہر کی فضا میں یہ نام گونجنے لگے گا۔

دلی کی سڑکوں پر بھی نومبر کے اوائل میں ایسے چار
امریکی اور ایک جاپانی سادھو زرد لباس میں ملبوس، پیشانی
پر صندل لگائے اور سر پر لمبی چوٹی لیے نمودار ہوئے۔
کلکتہ کی راہ سے دہلی آنے والے یہ کرشن جی کے بھگت
ہردوار جا رہے تھے۔ انھوں نے بھی ہرے رام ہرے کرشن
کے نعرے لگائے اور جہاں کہیں کوئی مجمع ان کو دیکھ کر
جمع ہو جاتا تو ان پانچوں سادھوؤں کی منڈلی میں سے
ایک سادھو نکل کر اس مجمع کو اس مہا منتر کے گنوں کی
تفصیل بتاتے ہوئے سمجھاتا کہ ان کا مشن تمام مذاہب
کی یک جہتی پر قائم ہے اور وہ ساری دنیا کی سیاسی،
معاشی، سماجی اور اقتصادی تحریکوں کو ایک پرچم کے
تلے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو کر رہیں گے اور یہ پرچم
کرشن جاگرتی کا پرچم ہوگا۔ دلی میں ان سادھوؤں پر انگریزی
روزنامہ پیٹریاٹ کی نمائندہ پورنیما شکلا نے اپنے ایک
مضمون میں تحریر کیا ہے کہ یہ بات ان کی سمجھ سے باہر ہے
کہ شری کرشنا کے ان عقیدتمندوں نے سارے ملک کا
چکر لگانے کے باوجود بندرابن یا گوکل کی سمت رخ


دہلی کی سڑکوں پر

نہیں کیا۔ انھوں نے سابق ہپیوں کی اس تحریک کے
مستقبل کی جانب اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے لکھا
ہے کہ انھیں یقین نہیں کہ یہ لوگ اس راستے پر مستقل مزاجی
سے چلتے رہیں گے۔

بہرحال ہندوستان کی لادینی حکومت کے زیر سایہ یہ
امریکا سے آئے ہوئے معدودے چند افراد ہندو دھرم کو
تقویت پہونچانے اور ہندو سماج کو پھر سے اپنے پرانے
راستے پر گامزن ہونے کی تلقین میں مصروف ہیں اور ان
کی نظر میں ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کا علاج محض
روحانیت ہے جس کا جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی
واسطہ نہیں۔ ان کا مشن ہی یہ ہے کہ ہندوستان سائنس کو
چھوڑ کر محض ہرے رام ہرے کرشنا جپ کر اپنی عظمتوں کا
پرچم بلند کر سکتا ہے۔ ●●



ماقتباسات نقوش دہلی

ڈھول کا پول

از
آموس توتولہ



آموس توتولا کا شمار اب نائیجیریا کے مشہور ادیبوں اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی اور اس نے ساری کامیابیاں صرف اپنی محنت کے بل پر حاصل کیں۔ بچپن میں وہ اتنا غریب اور محتاج تھا کہ تعلیم کے معمولی اخراجات بھی برداشت کرنا اس کے لئے دشوار تھا۔ چنانچہ اس نے تعلیم جاری رکھتے ہوئے کھیتوں میں مزدوری شروع کر دی۔ پھر وہ بازاروں میں لکڑی بیچتا تھا۔ اس کے بعد مزید ترقی کی تو کوکو اور اخروٹ وغیرہ بیچنے لگا۔ اور اس طرح اپنی تعلیم کے مراحل پورے کر لئے۔

اس نے بعد میں خود تجارت شروع کی تو اس کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ وہ بہت سے ناولوں اور مختصر کہانیوں کا مصنّف ہے۔ استعمار کے خلاف اس کے ناولوں نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ زیرِ ترجمہ قصہ بھی ایک "جادوگر طبیب" کی کہانی ہے۔ جس کا تعلق ایک خاص قبیلے سے تھا اور اس قبیلے میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہ کہانی افریقی سماج کو استحصال پسندوں کی ریشہ دوانیوں پر متنبہ کرتی ہے اور حریت اور آزادی کی روح پھونکنے کا باعث ہے۔

ایک گاؤں میں ایک نوجوان رہتا تھا جس کا نام "اجالی" تھا۔ اس کے باپ کی ملکیت میں ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اور اجالی اس کے کاموں میں اپنے باپ کی مدد کیا کرتا تھا۔ لیکن جب باپ ایک دم بوڑھا ہو گیا اور کام کرنے کے قابل نہ رہا تو اجالی کو مجبوراً اس کھیت میں تنہا کام کرنا پڑا۔

پھر اجالی نے شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ بہت ہی غریب تھا اس لئے کسی مناسب اور بہتر لڑکی سے رشتہ کی بات بے سود تھی کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جو شادی کے سلسلے میں اس کی مالی مدد کر سکے۔ چنانچہ ایک ساہوکار کے یہاں پہونچ کر اس نے اپنے آپ کو گروی رکھ دیا، اس کے بدلے میں اسے جو کچھ ملا اُسے اس نے ایک لڑکی سے اپنی شادی میں لگا دیا۔

شادی کو ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کا باپ بیمار پڑ گیا۔ مرض جان لیوا ثابت ہوا اور چار دن کے اندر باپ داغِ مفارقت دے گیا۔ اجالی کے پاس ایک دمڑی بھی نہیں تھی وہ اپنے باپ کے جنازے کے اخراجات کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ مجبوراً اسے ایک دوسرے ساہوکار کے پاس جانا پڑا اور اس نے اپنے آپ کو دوبارہ گروی رکھ کر کچھ پیسے حاصل کئے۔ ان پیسوں کو اس نے اپنے باپ کے جنازے کے اخراجات میں لگا دیا۔

اب اجالی دو مختلف ساہوکاروں کے پاس گروی ہو چکا تھا۔ چنانچہ اپنا قرض چکانے کے لئے وہ ایک ساہوکار کے یہاں صبح سے دوپہر تک کام کیا کرتا تھا اور دوسرے ساہوکار کے یہاں دوپہر سے سورج ڈوبنے تک۔ اس طرح اس کا سارا دن ان دونوں ساہوکاروں کا قرض چکانے میں گزر جاتا تھا۔ چونکہ اس کے پاس اس کے بعد کام کے لئے کوئی وقت نہیں بچتا تھا اس لئے اپنے کھانے کپڑے کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کر پاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلسل فاقوں پر مجبور ہو گیا اور اس کی حالت دیکھ کر گاؤں والے بھی اس پر ترس کھانے لگے۔

ایک دن اس کے ایک پڑوسی کے دل میں خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ اجالی کو لے کر قبیلے کے اس جادوگر طبیب کے پاس گیا جو بڑی شہرت کا مالک تھا تاکہ اس سے اس غریب کے معاملہ میں مشورہ کرے اور وہ اسے اس غربت سے نجات دلانے کی کوئی ترکیب بتا سکے۔

اجالی کسی پس و پیش کے بغیر اس کے ساتھ جادوگر کے گھر چلا گیا۔ جادوگر نے اجالی کی پوری کہانی سنی اور پھر اسے مشورہ دیا کہ اگر تم اپنی غربت دور کرنا چاہتے ہو تو ایک کام کرنا ہوگا، نو بھیڑیں خریدو اور نو ہی ٹوکرے۔ پھر ساری بھیڑوں کو ان ٹوکروں میں بند کر کے آدھی رات کے وقت اپنے باپ کی قبر کے اوپر رکھ آؤ، اور دیکھنا اس عمل کے فوراً بعد واپس اپنے گھر لوٹ آنا، پھر جب تم سویرے قبر پر دوبارہ جاؤ گے تو تمہیں بڑی حیرت ہوگی۔ کیونکہ وہاں قبر کے پاس خالی ٹوکروں کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھیڑوں کو تمہارے باپ نے قبول کر لیا ہے۔ اس کے بعد ان خالی ٹوکروں کو اپنے گھر واپس لے کر چلے آنا اور انہیں اپنے کمرے میں بحفاظت رکھ لینا۔ چند دنوں کے بعد تم کو ایک اور حیرت کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ ان تمام ٹوکروں میں ایک دن صبح سویرے تمہیں چاندی سونے کے سکے بھرے ملیں گے۔ یہ وہ سکے ہوں گے جنہیں تمہارا باپ ان بھیڑوں کے بدلے میں واپس کرے گا جو اس نے لے لی تھیں۔ دراصل تمہارا باپ ہی تمہارے فقر و فاقے کا اصل سبب ہے۔ کیونکہ تم نے اب تک اس کی قبر پر کوئی چڑھاوا نہیں چڑھایا تھا ظالم تو نے اب تک اس کے نام پر کوئی بھیڑ بھی ذبح نہیں کی۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم ان نو بھیڑوں کی بھینٹ چڑھا دو تمہاری ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔

ساری رام کہانی اجالی نے صبر کے ساتھ سنی اور جادوگر طبیب کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا آیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی بیوی دوڑی ہوئی آئی۔ "طبیب نے کیا کہا ہے؟"

"ایک ترکیب بتائی ہے جس سے ہم اس فقر و فاقہ سے نجات پا سکتے ہیں!"

پھر اجالی نے جادوگر طبیب کے ساتھ اپنی گفتگو اور اس کے مشوروں کی تفصیلات بتائیں۔ اور آخر میں جب اس نے کہا

ہمارے پاس اتنی رقم کہاں ہے کہ نو بھیڑیں خرید سکیں تو اس کی بیوی نے گھبرا کر کہا "تو کیا واقعی ہم بھوکوں مر جائیں گے ہم نے دو ساہوکاروں کے پاس اپنے آپ کو گروی کر رکھا ہے، اب اگر مزید رقم کے لئے تیسرے ساہوکار کے پاس بھی خود کو گروی کر دوگے تو کبھی اس مصیبت سے نجات نہ پاؤ گے۔ لیکن مصیبت سب سے بڑی یہ ہے کہ اس زندگی سے نجات پانے کا واحد ذریعہ بھی یہی ہے کیونکہ اسی طرح ہمیں اتنی رقم مل سکتی ہے جس سے ہم نو بھیڑیں خرید کر ان کا چڑھاوا چڑھا سکیں۔"

اپنی بیوی کی ساری باتیں سن کر اجائی نے گہری سانس لی اور پھر اس سے پوچھا۔ "اگر میں خود کو تیسرے ساہوکار کے پاس گروی رکھ دوں تو پھر چند لقموں بھر جو میں باقی وقت میں کمالیا کروں وہ کہاں سے ملے گا؟ کیونکہ پھر تو کام کا کوئی بھی وقت باقی نہیں رہے گا!"

بیوی نے کہا "ابھی اس کی فکر نہ کرو کیونکہ کچھ دن تک ہم کسی بھی حالت میں گزر بسر کر سکتے ہیں۔"

دوسرے دن اجائی کی بیوی ایک ساہوکار کے پاس گئی، جس نے اسے دس پونڈ دیے۔ پھر وہ اپنے شوہر کو لے کر بازار بھیڑیں خریدنے گئی تو بدقسمتی سے اتنی رقم میں کسی طرح نو بھیڑیں نہیں مل سکیں، بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ صرف چھ بھیڑوں کی قیمت کے برابر ہو سکی۔

اجائی سخت پریشان ہوا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر نامراد گھر واپس آ گیا۔

بیوی نے ایک نیا مشورہ دیا، نو بھیڑیں نہیں ملتیں تو کیا ہوا! دس پونڈ میں جتنی بھی بھیڑیں اور خالی ٹوکرے ملتے ہیں انھیں خرید لیا جائے اور انھیں کو تمہارے باپ کی قبر پر چڑھا دیا جائے۔ پھر تم اپنے باپ سے درخواست کرو کہ وہ انھیں قبول کر لے۔ اور اس سے وعدہ کرلو کہ جب بھی موقع ملے گا تم باقی تین بھیڑیں بھی چڑھا دوگے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر یہ رقم اسی طرح ہمارے گھر میں رہی تو یہ سب ختم ہو جائیگی اور پھر کبھی ہم یہ بھینٹ نہ چڑھا سکیں گے اور کبھی اس زندگی سے ہمیں نجات نہ ملے گی۔"

اجائی کو اپنی بیوی کا یہ مشورہ پسند آیا چنانچہ چھ بھیڑیں خریدی گئیں۔ اور انھیں چھ ٹوکروں میں وہ اپنے باپ کی قبر پر رکھ آیا پھر قبر پر کھڑے ہو کر اس نے وعدہ کیا کہ جوں ہی اسے مزید رقم کہیں سے ملی وہ پہلی فرصت میں باقی تین بھیڑیں بھی چڑھا دے گا۔

صبح تڑکے ہی اٹھ کر اجائی اور اس کی بیوی دونوں اپنے باپ کی قبر پر پہونچے، بھیڑیں وہاں نہیں تھیں اس لئے انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ ان کی نذر قبول ہو گئی ہے۔ اور اب بہت جلد ان کے بُرے دن ختم ہونے والے ہیں۔

خالی ٹوکرے لے کر دونوں اپنے گھر آ گئے اور انھیں اجائی نے اپنے کمرے میں بڑی حفاظت سے رکھ دیا، پھر میاں بیوی ان ٹوکریوں کے بھر جانے کا انتظار کرنے لگے، دونوں روزانہ صبح سویرے انھیں کھول کر دیکھتے کہ ان کے باپ نے نذر کے بدلے اس میں سونا چاندی بھری یا نہیں! انتظار میں کئی مہینے گزر گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھر ایک سال پورا ہو گیا اور ٹوکرے جوں کے توں خالی تھے۔ ان کی حالت پہلے سے بھی دگرگوں ہو چکی تھی۔ اور کئی کئی دن کے مسلسل فاقے کرنے پڑ رہے تھے۔

اجائی نے ایک دن اپنی بیوی پر سارا غصہ اتارا "میں نے تم سے پہلے ہی دن کہا تھا کہ دس پونڈ لے کر ہم گھر چلیں کیونکہ ان سے نو بھیڑیں نہیں خریدی جا سکتی تھیں۔"

لیکن بیوی ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی، اس نے کہا کہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم ایک مرتبہ پھر جادوگر طبیب کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ اب ہم اور زیادہ محتاج کیوں ہو گئے ہیں۔"

اجائی جادوگر کے پاس آیا اور اپنی ساری رام کہانی سنانے کے بعد اس سے مزید مشورہ کیا۔ جادوگر نے جواب میں پہلے تو ایک لمبی آہ بھری اور پھر کہا: "جب تک تم باقی تین بھیڑیں بھی نذر نہ کروگے تمھاری مصیبتیں دور نہیں ہو سکتیں"۔

اجائی یہ سن کر گھر واپس چلا آیا اور پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا "تم تو جانتی ہی ہو کہ اب ہمارے پاس ایک دھیلا بھی نہیں پھر ہم اتنی رقم کہاں سے لا سکتے ہیں کہ تین بھیڑوں کی بھینٹ چڑھا سکیں"۔

پھر اجائی اچھل کر بولا۔ ایک صورت میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ میں آدھی رات کو اپنے باپ کی قبر کھود کر اس سے ملاقات کروں اور اس سے پوچھوں کہ جب تم مرے تھے اس وقت بھی ہمارے پاس ایک دمڑی نہیں تھی پھر تم ہم سے اتنی بڑی نذر کا مطالبہ کیوں کرتے ہو"؟

"اگر میرے باپ نے یہ کہا کہ مزید تین بھیڑوں کی نذر کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔"

چنانچہ اس تجویز کے مطابق اجائی نے آدھی رات کے اندھیرے میں تین خالی ٹوکرے لئے اور اپنے باپ کی قبر پر پہونچ گیا پھر اس نے دو ٹوکروں میں اس طرح مٹی بھری کہ دور سے دیکھنے والے کو معلوم ہو کہ اس میں بھیڑ ہی ہوگی اور تیسرے میں چاقو کھول کر خود چھپ گیا اور بھیڑیں لینے کے لئے اپنے باپ کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

جب رات ڈھلنے لگی اور دو بجے کا وقت ہوا تو جادوگر طبیب قبر کے پاس آیا، اس کے ساتھ اس کے بعض ملازم بھی تھے۔ ملازموں نے تینوں ٹوکرے اٹھائے اور انھیں جادوگر طبیب کے گھر پہونچا دیا۔ یہ ٹوکرے اس کے خاص کمرے میں رکھے گئے اور جوں ہی ملازم باہر نکلے طبیب نے ان میں بھیڑوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

دو ٹوکرے تو اسے مٹی سے بھرے ملے لیکن تیسرا ٹوکرا جونہی اس نے کھولا اجائی اچھل کر اس میں سے باہر نکلا چاقو کھلا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا۔

جادوگر اسے دیکھ کر پیچھے ہٹا اور ممیانے لگا۔

"لیکن تم آج بچ کر نہیں جا سکتے، اچھا تو تم ہی میرے مردہ باپ ہو! جلدی کرو اور آج ہی رات مجھے اس فقر و فاقہ سے نجات دلاؤ۔" اجائی نے گرج کر کہا۔

"لیکن میں تمھارا مردہ باپ مطلق نہیں ہوں"!

نہیں نہیں تم میرے مردہ باپ ہو اتم مجھے میری غربت سے نجات دلانے کی طاقت رکھتے ہو اور آج رات ہی تمھیں یہ کام کرنا پڑے گا۔"

پھر اجائی نے گرج کر کہا "فوراً وہ جگہ بتا دو جہاں تم نے اپنی دولت چھپا کر رکھی ہے"۔ اور یہ کہتے کہتے اس نے جادوگر کی گردن پکڑ لی، وہ اس پر چھرا پھیرنے ہی والا تھا کہ جادوگر نے اپنی ساری دولت کا اسے پتہ بتا دیا۔ اجائی سارا مال لیکر اپنے گھر واپس آ گیا۔

اس کی بیوی نے جب اُسے دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔ "اجائی تمھارے باپ نے کیا کہا، ہم اس زندگی سے کب نجات پائیں گے"۔ اور اجائی نے چلا کر جواب دیا۔

"کل ہم اپنا سارا قرض چکا دیں گے، آج رات جادوگر طبیب میرا مردہ باپ بن گیا تھا"!!!

بقیہ دو دینوں کی نظر میں

سے بات چیت کی۔ روس اور پولینڈ کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کیے اور مشرقی جرمنی کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے کوشش کی اور کر رہے ہیں۔ مشرقی جرمنی کے ساتھ انھوں نے کم از کم بیس برس کے تعطل کو توڑا اور یہ کہہ کر بات چیت سے انکار نہیں کیا کہ اس کا مطلب مشرقی جرمنی کی حکومت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنے عمل سے یہ تسلیم کر لیا کہ مشرقی جرمنی بھی ایک کروڑ ۰۰ لاکھ افراد کی ایک قوم ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (مغربی جرمنی کی آبادی چھ کروڑ کے قریب ہے) اس سے بین الاقوامی اور امن پسند دنیا میں مغربی جرمنی کا وقار بڑھ گیا۔ خود اندرونِ ملک انھوں نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دل جیت لیے لیکن ایسے بھی ہٹلرانہ خیالات کے حامل مخالف عناصر ہیں جو ولی برانٹ کو اقتدار سے محروم کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ فیڈرل ڈیموکریٹک پارٹی کے تین ممبروں اور دو سابق وزراء کی "دل بدلی" سے ولی برانٹ کی بنڈسٹاغ (پارلیمنٹ) میں بارہ کی اکثریت اب صرف چھ کی اکثریت رہ گئی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چند دنوں میں کیا صورت ہوگی۔ لیکن چونکہ وفاقی جرمنی کا بنیادی دستور خاصا پیچیدہ ہے اور عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ہندوستان میں ہے۔ اس لیے یقیناً ولی برانٹ کی حکومت برقرار رہے گی

حالات کا اقتضا ہوا تو "وسط مدتی" انتخابات کرانے کے لیے عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اور اگر واقعی یہ انتخابات ہوئے تو یوں سمجھیے وہ "نیشنل ڈیموکریٹکوں" کے لیے موت کا وارنٹ ہوں گے کیوں کہ عوام اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ طاقت کا توازن کسی چھوٹی سی پارٹی کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

یہ جرمنی کا ہی معاملہ نہیں۔ جہاں کہیں بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے والی کوئی چھوٹی اور بے اثر جماعت پہونچے گی وہ سیاسی عدم استحکام کا باعث ہوگی۔ شاید پاکستانی عوام نے اُسے سب سے پہلے سمجھا۔ اور امید ہے کہ ہندوستان والے بھی آئندہ وسط مدتی انتخاب میں اسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کریں گے۔ ●●

بقیہ۔ نیتاجی زندہ ہیں؟

اہمیت نہیں دی تو انھوں نے اپنی رائے کو ایک کتابچہ کی شکل میں الگ سے چھپوایا۔ اور وہ کتابچہ رجسٹری کے ذریعہ پنڈت نہرو کو بھجوایا لیکن انہوں نے اس کی وصولیابی کی رسید تک نہ دی۔ انھوں نے مزید الزام لگایا ہے کہ تائی پیہہ کے حادثہ کے ساتھ نیتاجی کی موت کی کہانی کو شاہنواز کمیشن نے اس لئے جوڑ دیا کہ اسے "ایسا کرنے کا حکم تھا"

مغربی بنگال سرکار کے ایک سابق افسر شری ایس۔ ایم گوسوامی نے جانچ کمیشن کو بتایا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دلی میں ان سے کہا تھا کہ "نیتاجی انھیں ۱۹۴۸ء میں ماسکو میں ملے تھے"۔ نیتاجی نے ان سے کہا تھا کہ وہ۔ (رادھاکرشنن) ان کے (نیتاجی) ہندوستان جانے کا بندوبست کریں۔ شری گوسوامی کے بیان کے مطابق رادھاکرشنن نے کہا تھا "میں نے افسران اعلیٰ سے اس بارے میں گفتگو کی تھی لیکن انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ یہ بات ظاہر کی جائے"۔

شری گوسوامی نے مزید دعویٰ کیا کہ جب رادھاکرشنن بی۔ سی رائے کی موت پر بنگال آئے اس وقت وہ ہندوستان کے صدر تھے اور اسوقت بھی انہوں نے نجی گفتگو میں اپنے اس بیان کی تصدیق کی تھی۔

اِن حالات میں یہ کہنا کہ دراصل کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ قبل از وقت ہوگا۔ پوری قوم کھوسلہ کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ کا انتظار کرے گی۔ فی الحال صورتِ حال یہ ہے کہ اگر یہ صحیح بھی ہو کہ فارموسا کے تائی پیہہ ہوائی اڈے پر ہونے والے مبینہ ہوائی حادثہ میں نیتاجی کی موت واقع ہو گئی تھی تب بھی پوری قوم اس بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اور اس شبہ کا دور ہو جانا ضروری ہے۔

بقیہ:۔ لال قلعہ سے قطب مینار تک

میں شراب ممنوع قرار دے دی جائے تاکہ ان کا یہ سیاہ دھندا انھیں لکھ پتی سے کروڑپتی بنا دے۔ بہر حال یہ بدعنوانیاں تو غیر سرکاری حلقوں سے متعلق تھیں۔ جہاں تک سرکاری حلقوں کا تعلق ہے انھوں نے بھی اپنے تجارتی کاروبار میں مہنگائی کے دیوتاؤں کو سر پر بٹھا لیا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں آپ ریلوے پارسل بھیجنے کی بجائے اگر خود ٹرین کے ذریعے سفر کر کے پارسل پہونچا آئیں تو زیادہ نفع میں رہیں گے۔ ڈی۔ ٹی۔ یو۔ کی بسوں میں سفر کرتے وقت بھی آپ سے اکثر و بیشتر زیادہ کرایہ لیا جاتا ہے۔ چاہے آپ دس پیسے کی مسافت کا سفر کریں یا پانچ پیسے کی، آپ سے دس پیسے ہی وصول کیے جائیں گے۔ دلّی دودھ سپلائی کرنے والی اسکیم آپ کو بھینس کے دودھ کے داموں پر دودھ کا پوڈر سپلائی کرنے اور خالص گھی اور مکھن کی جگہ ناریل کا تیل ملا ہوا گھی انھیں داموں میں فروخت کرنے پر کبھی نادم یا شرمندہ نہ ہوگی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ دلّی کے بازاروں کی سب سے بڑی لعنت 'کیو' ہے۔ جدھر دیکھیے، جہاں جائیے، آپ کو کیو سے سابقہ پڑے گا۔ علی الصباح سرکاری ڈیری ہو یا کسی اہیر کی ذاتی دکان، آپ کو دودھ خریدنے کے لیے کیو سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ ریلوں، بسوں، حتیٰ کہ چار سیٹوں والی اسکوٹروں میں جگہ حاصل کرنے کے لیے بھی آپ کیو سے نجات نہیں پا سکتے ہیں۔ خریداروں کے اس کیو کے علاوہ اگر آپ بجلی پانی کے بل ادا کرنے جائیں تو بھی آپ کو کیو میں کھڑے ہو کر انتظار کی آگ میں تپنا پڑے گا

——— بہر حال بقول مرحوم جمال عبدالناصر انتظار انسان ہی کیا قوموں کی زندگی کم کر دیتا ہے۔ اور کیو میں کھڑے ہو کر کسی چیز کو خریدنے والا انسان روپے کے ساتھ اپنے خون کو پسینہ کر کے ہمیشہ گھاٹے ہی میں رہتا ہے۔

جہاں تک دلّی میں رہائش کے لیے کرایہ پر مکانات لینے کا سوال ہے اس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ چند علاقوں میں آپ کو بغیر پگڑی ادا کیے مکان کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ پرانی دلّی سے قطع نظر کناٹ پلیس میں ایک عظیم الشان عمارت کی قیمت اور اسی عمارت میں ایک کمرے کو کرایے پر حاصل کرنے کے لیے پگڑی کی رقم تقریباً برابر ہی ہو جاتی ہے۔ پرانی دلّی میں مکانات کرایہ پر حاصل کرنے کے لیے اگر پگڑی دینا ایک بغیر لکھا ہوا قانون ثابت کیا ہے تو نئی دلّی میں کرایہ اتنا مہنگا ہے کہ ایک برساتی یا ایک کمرہ دو ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم پر ملنا ممکن ہی نہیں۔

بہر حال اس شہر میں جہاں جمنا بہتی ہے دیگر اشیاے ضروری کی گرانی کا کیا ذکر، پانی بھی سیر ہو کر پینے کے لیے دس پیسہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ●●

آسان کیلنڈر

				جنوری اکتوبر	مئی	اگست	فروری مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر
۲۲	۱۵	۸	۱	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
۲۳	۱۶	۹	۲	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
۲۴	۱۷	۱۰	۳	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ
۲۵	۱۸	۱۱	۴	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۲۶	۱۹	۱۲	۵	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۲۷	۲۰	۱۳	۶	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
۲۸	۲۱	۱۴	۷	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS R. N. NO. 19869/70

JANUARY 1971
(FIRST HALF)

WAQIAT

REGD. NO. D 629
TELEPHONE : 618885



واقعات دنیا — ۸۰ء میں

آج کا نوجوان — بے چین کیوں؟



واقعات

نئی دہلی

جنوری ۱۹۷۱ء

نصف دوم

دوسرا سال ـــــــ پانچواں شمارہ

مُدیر

عبدالوحید صدیقی

صدر دفتر

ڈی ۱۰۰، نظام الدین ایسٹ ۔ نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

ایک کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے ۔ سالانہ ۸ روپے

مضامین' نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے وصول ہوں' ان کے سلسلہ میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مُدیر کو کلی اختیار ہے۔
مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

واقعات میں شائع شدہ مضامین "واقعات نئی دہلی" کے حوالے سے شائع کرنے کی عام اجازت ہے۔

انتظامی اور اداراتی امور متنازعہ کے فیصلہ کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا

مدیر، طابع اور ناشر عبدالوحید صدیقی
مطبع پربھات آفسیٹ پریس، دریا گنج دہلی

غزل

ملے جو منزلِ دار و رسن تو کیا ہوگا — حیات اوڑھ کے نکلے کفن تو کیا ہوگا
جو راز راز میں اب تک رہا مرے ہم راز — کُھلا وہ راز سرِ انجمن تو کیا ہوگا
کسی سے آہ جو سُلجھانے سے نہیں سُلجھی — تمہاری زلفِ شکن در شکن تو کیا ہوگا
سفر سے پہلے مسافر کو سوچ لینا ہے — سفر میں آئی جو یادِ وطن تو کیا ہوگا
ابھی تو چاک گریباں ہیں تیرے دیوانے — ترا بھی چاک ہوا پیرہن تو کیا ہوگا
ابھی تو آپ چھڑاتے ہیں اپنے دامن کو — سنبھل گیا مرا دیوانہ پن تو کیا ہوگا
یہ سوچنا ہے گرفتار ہونے سے پہلے — قفس میں آیا خیالِ چمن تو کیا ہوگا
جنونِ عشق میں چھوئے جو اپنے ہاتھوں سے — مرا دماغ تمہارا بدن تو کیا ہوگا

بکھر گیا جو نہ پاکر کبھی منوّر کو
تمہارے ہاتھ پہ خونِ سخن تو کیا ہوگا

رُباعیات

نقی شاعر (باقری)

لکھتا ہے صنم کے دل میں "گیتا نجلی" — پتھر میں اتارتا ہے نازک سی کلی
دراصل' چبا رہا ہے' لوہے کے چنے — اوروں کو جو بانٹتا ہے مصری کی ڈلی

کاغذ کی یہ ناؤ ہے جو میں کھیتا ہوں — اکتا کے کتاب دور رکھ دیتا ہوں
الواحِ وجود پر ابھرتے ہیں نقوش — آنکھوں کو کبھی جو بند کر لیتا ہوں

سُلگے ہوئے ہوں دیدۂ پُرنم جیسے — شعلے کو ملے برف کا سنگم جیسے
ہیں اپنے مزاج میں بہم آتش و آب — تلوار کی دھار پر ہو شبنم جیسے

اداریہ

واقعات نئی دہلی

حقیقی جمہوری اور مستحکم حکومت کی ضرورت

پچھلے شمارے میں ہم نے لکھا تھا کہ وسط مُدّتی انتخابات عام ووٹروں کے لیے بڑا امتحان ہیں. حالات جو رُخ اختیار کر رہے ہیں اُن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے. رجعت پسند قوتیں جس شدّ و مَد سے میدان میں اتری ہیں اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ اس بار مسز گاندھی کو اقتدار سے محروم کر کے ہی دم لیں گی.

چار سیاسی جماعتوں کا گٹھ جوڑ اسی مقصد سے عمل میں لایا گیا ہے ورنہ ان جماعتوں کے درمیان پالیسی کے لحاظ سے کوئی قدر مشترک نہیں ہے. نجلنگپا کانگریس نے اپنے دس نکاتی پروگرام سے جو حقیقی معنوں میں ایک سوشلسٹ پروگرام تھا، ابھی تک اپنی دستبرداری کا اعلان نہیں کیا ہے اور اسی طرح سمیکت سوشلسٹ پارٹی بدستور سوشلسٹ اصولوں کی علمبردار ہے جن میں سرمایہ دارانہ اصولوں کی کوئی گنجائش نہیں. اس کے باوجود اگر یہ دونوں جماعتیں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے ساتھ مل گئی ہیں جو واضح طور پر فرقہ وارانہ اور سرمایہ دارانہ پالیسی کی حامل ہیں اور ملک کو آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف گھسیٹنا چاہتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گٹھ جوڑ محض انتخابات جیتنے کی خاطر کیا گیا ہے. یہ ایک منفی پالیسی اور موقع پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ـــــ اقتدار کی بھوک ان جماعتوں کو ستا رہی ہے اور اس بھوک میں وہ اپنے بنیادی اصولوں تک کو بھول گئی ہیں

اس گٹھ جوڑ کے جواز میں اپوزیشن کانگریس کے لیڈر ایسے لایعنی بیانات دے رہے ہیں کہ ان سے ہم کیا خود ان کی پارٹی کے کارکنوں کی بڑی تعداد مطمئن نہیں ہے. اس کا ثبوت گجرات اور میسور میں مخالف کانگریس سے بہت سے ذمہ دار کارکنوں کی بغاوت ہے. یہ کارکن محسوس کرتے ہیں کہ ان کی جماعت نے محض اقتدار کی خاطر اپنے اصولوں کو قربان کر دیا لہٰذا اب اس جماعت میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے.

مخالف کانگریس کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ عوام کے روبرو جانے کی اس میں ہمت نہیں ہے کیونکہ اس کانگریس کے رہنماؤں کی اصل کانگریس سے الگ ہو کر ... چیف الیکشن کمشنر نے اندرا نواز کانگریس کو ہی اصل کانگریس قرار دیا ہے. علیحدگی کی وجہ یہ ہے کہ مسز گاندھی اور اُن کے ہمنوا کانگریسی لیڈر کانگریس کے منظور شدہ ترقی پسندانہ پروگراموں کو تیز رفتاری کے ساتھ عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے. ان ہی پروگراموں کو لے کر اب اپوزیشن کانگریس کے لیڈر عوام کے روبرو جائیں تو سخت مشکل میں پڑ جائیں گے. اسی لیے اب انھوں نے فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کا سہارا لیا ہے تاکہ عام ووٹروں کے جذبات سے کھیل کر اپنا مطلب حاصل کر سکیں. یہ ان لیڈروں کی زبردست شکست ہے.

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ عام ووٹروں کے جذبات سے کھیل سکیں گے؟ ہمارا خیال ہے کہ جمہوریت کے بیس برس کے عرصے میں عام ووٹروں میں کافی پختگی آگئی ہے اور انھوں نے اپنے ووٹوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے. یہ بات ہم پریوی پرسز کے معاملہ پر عوام کے ردِّعمل کا اندازہ لگا کر کہہ رہے ہیں. پریوی پرسز کے معاملے پر کسی بچے سے پوچھ لیجیے، یہی کہے گا کہ جمہوریت میں آخر شہری شہریوں میں فرق کیوں کیا جائے ـــ یہ محض ۵ کروڑ روپے سالانہ کی رقم کا سوال نہیں ہے جسے چرن سنگھ (لیڈر بی، کے، ڈی) کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اصول کا معاملہ ہے. اصول یہ ہے کہ جمہوریت میں سب برابر ہیں اور سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں لیکن "گٹھ جوڑی لیڈروں" کو سابق حکمرانوں کا تو غم کھائے جا رہا ہے ان کروڑوں عوام کی انھیں کوئی فکر نہیں جن میں سے لاکھوں کو دو وقت خشک روٹی بھی نہیں ملتی.

بلاشبہ جمہوریت کا بڑا منشا تبدیلی ہے کیوں کہ تبدیلی حکمران طبقہ کو جامد ہونے سے روکتی ہے. امریکہ اور برطانیہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں ایک جماعت ڈو ٹرم کے بعد مشکل ہی سے برسرِ اقتدار رہتی ہے لیکن وہاں حالات ایسے نہیں ہیں کہ کسی غیر مستحکم حکومت کے برسرِ اقتدار آجانے کا اندیشہ ہو، اسی لیے بلا تکلّف لوگ کسی ایک یا دوسری پارٹی کے حق میں ووٹ دیتے ہیں لیکن یہاں ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا. کانگریس کے علاوہ کوئی جماعت اپنی دو ٹوک پالیسی کے ساتھ سامنے نہیں بلکہ کھچڑی بن کر رہ جاتی ہیں سامنے آئی ہیں. کیا ایسی "کھچڑی" کو کامیاب کر کے کوئی مضبوط حکومت بنائی جا سکتی ہے. اور کیا اس قسم کی "کھچڑی حکومت" ملک و قوم کی خدمت اور بین الاقوامی دنیا میں ملک کے وقار کو قائم رکھ سکتی ہے جبکہ اس میں شامل جماعتیں بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہوں.

اسی لیے ہم نے کہا کہ آنے والے انتخابات ہمارا بہت بڑا امتحان ہیں. ہر ووٹر کو اس میں سوجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا اور اقلیتوں کو خاص طور پر دیکھنا ہوگا کہ ان کے ووٹ تقسیم ہو کر بیکار ضایع نہ ہو جائیں. طاقتی توازن میں ان کے ووٹوں کی بڑی اہمیت ہے

ہمیں خوشی ہے کہ مسلم لیگ اور مسلم مجلس جیسی مسلم جماعتوں نے فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتوں سے الگ رہنے اور سیکولر طاقتوں کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا ہے. اس سے مرکز میں ایک مضبوط حکومت کے قیام میں مدد ملے گی. مسز گاندھی کی حکومت کی جو خامیاں رہی ہیں وہ بے شک ہمارے سامنے ہیں. مثال کے طور پر اُردو ـــ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں ان کی کمزور پالیسی. لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر آئندہ انتخابات میں کانگریس زیادہ طاقتور بن کر سامنے آئی تو وہ یقیناً اقلیتوں کے جائز مطالبات کا ازالہ کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کی پوزیشن میں ہوگی کم از کم مسز گاندھی کی ذات سے ہمیں ایسی ہی امید ہے.

تمام اقلیتوں اور دوسرے سیکولرسٹوں کو بھی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انھیں اس وقت نقلی جمہوریت اور حقیقی جمہوریت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہے. پہلی ام نہاد جمہوریت میں اصل اقتدار مالداروں اور مفاد پرستوں کے ہاتھوں میں رہے گا اور حقیقی جمہوریت میں طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہوں گے ـــ وہی حکومت کو منتخب کریں گے اور ان ہی کے لیے یہ منتخبہ حکومت کام کرے گی. اس قسم کی عوامی اور مضبوط حکومت ہم اسی وقت بنا سکتے ہیں کہ ہم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائیں بلکہ متحد ہو کر اس جماعت کو کامیاب کرائیں جس نے سیکولر جمہوریت کے اصولوں کو بروئے کار لانے اور اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے کا عزم کیا ہے. ■■

۱۹ء
ایک جائزہ



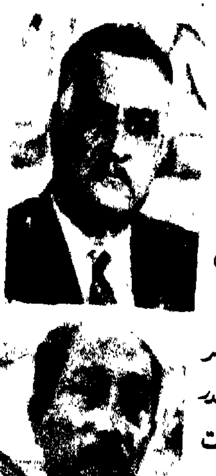
۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو غروب ہو جانے والے سورج کی پہلی کرن نے جب اگلے دن ۱۹۷۰ء کی آمد کا اعلان کیا تو بین الاقوامی دانشوروں نے نئے سال کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے نئی دنیا کے لئے امن و سکون کا سال قرار دیا۔ سائنس دانوں، دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں نے نئے سال کے ساتھ نئی نئی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں لیکن کوئی بھی امید بر نہ آئی۔ سیاسی اعتبار سے ۱۹۷۰ء جمود کا سال تھا۔ ۱۹۶۷ء میں چھینا ہوا عربوں کا علاقہ اسرائیلیوں کے ہی قبضہ و اقتدار میں رہا۔ ہندوستان سے لیا ہوا ہزاروں مربع میل کا علاقہ چین کے پاس ہی رہا۔ ویت نام اور کمبوڈیا وغیرہ میں خون کے دریا بہتے رہے اور اقوام متحدہ شیر قالین لبوں پر قفل لگائے ہوئے سال بھر خاموش بیٹھے رہے۔

لیکن ۱۹۷۰ء بین الاقوامی تاریخ میں کئی حادثات کی وجہ سے ضرور اہم سال قرار دیا جائے گا۔ اس سال کربلا کے معرکہ کی تاریخ اردن میں دہرائی گئی۔ ہزاروں عربوں نے آپسی کشمکش اور باہمی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کی جان لے کر تمام دنیا خصوصاً اسرائیل پر واضح کر دیا کہ وہ ابھی تک عرب اتحاد کا ڈھونگ رچا رہے تھے۔ اس سرزمین سے اٹھنے والے ہوائی جہازوں کے ہائی جیکنگ کے فتنہ نے روس اور امریکا کی افواج کو تیسری عالم گیر جنگ کے مورچوں پر اکٹھا کر دیا لیکن صدر ناصر نے اپنی حکمتِ عملی سے مشرقِ وسطیٰ کو آگ اور خون کے شعلوں سے بچاتے ہوئے خود اپنی جان اسی مورچے پر توڑ دی۔

اردن کی خانہ جنگی اور صدر ناصر کی غیر متوقع موت نے عرب ممالک کی امنگوں پر سرد لہر دوڑا دی۔ ڈاکٹر جارج حبش اور لیلیٰ خالد کی نادانی ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ بنا گئی۔ جنرل ڈیگال بھی اس سال فرانس کو یتیم بنانے کے لئے دائی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اگست ۱۹۷۰ء میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان پہلا عارضی سمجھوتہ ہوا جسے نومبر میں مزید نوّے روز کے لئے توسیع دے دی گئی۔

ہندوستانی سپریم کورٹ نے حکومت کے دو فیصلوں کو خلافِ قانون قرار دیا جن میں ایک تو بنکوں کے قومیانے کے بارے میں تھا اور دوسرا صدر کا وہ حکم جس کے تحت والیانِ ریاست سے تمام مراعات واپس لے لی گئی تھیں۔ بہر حال بنکوں کو قومی ملکیت قرار دے دیا



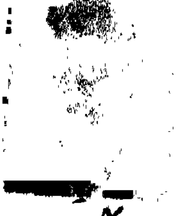
صدر ناصر کی موت عالمِ عرب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی المیہ ہے۔



بہرحال مصر کے نئے صدر انور سادات نے صدر ناصر کی کمی کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے۔

واقعات نہرعلی

چارلس ڈیگال کی موت نے تاریخ کے ایک باب کو بند کر دیا۔ ڈیگال نے اپنی پوری زندگی لڑتے ہوئے گزار دی۔ لیکن ان کی موت بہت پر سکون ہوئی۔





پاکستان میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے۔ پاکستان کے عوام نے نئے ترقی پسند لیڈروں کو کامیاب کر کے ثابت کر دیا کہ پاکستان کے عوام میں اب کافی سیاسی شعور پیدا ہو گیا ہے



گیا لیکن والیانِ ریاست سے اپنا معاملہ چکانے کے لئے شریمتی اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ کو شکست کر دینے کے اعلان سے پارلیمانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پارلیمنٹ کو قبل از وقت توڑ دینے اور ساٹھ دن کے اندر نئے چناؤ کرانے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ ملک میں غربت، بدامنی اور بدظنوانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ حزبِ مخالف ان کی ہر ممکن مخالفت پر اتر ہوا ہے اور وہ پارلیمنٹ میں اپنے حمایتی اور موجودہ تعداد کی قلت کی وجہ سے ملک کی خوش حالی اور اقتصادی ترقی کے لئے کوئی بھی قدم نہیں اٹھا سکتیں۔ فرقہ پرست اور سرمایہ نواز طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ انہی عناصر نے مئی میں بھیونڈی اور جلگاؤں جیسے صنعتی شہروں کو فرقہ پرستی کے شعلوں سے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

جلگاؤں کے فرقہ وارانہ فساد کی شاید دنیا بھر میں کہیں مثال نہ مل سکے جہاں بغیر اسباب و علل خون کی ہولی کھیلی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے ماہ مئی نے اس واقعہ کو جنم دے کر ہندوستانی جمہوریت کے تابناک رخ پر سیاہی پھیر دی۔

ہندوستان میں ۱۹۷۰ء نے کئی نئی تحریکوں کو جنم دیا اور یہ سب کچھ مارچ میں مغربی بنگال کی جمہوری حکومت کے خاتمہ اور صدر راج کے بعد ہوا۔ مغربی بنگال وارداتوں کا مرکز بن گیا۔ نکسلائیٹ تحریک نے شدت اختیار کر لی اور کوئی دن ایسا نہ گیا جب قتل و خون، لوٹ اور غارتگری کی خبریں کلکتہ کے نام سے اخبارات میں شائع ہونے سے رہ گئی ہوں۔

اس کے علاوہ زمینوں پر غیر قانونی قبضہ مکانوں اور دکانوں کا کرایہ ادا نہ کرنے کی تحریکیں مغربی بنگال سے عبور کر ملک بھر میں پھیل گئیں۔

صدر کانگریس جگجیون رام اور وزیر اعظم کے کھیتوں تک پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ملک بھر میں اس ذہنیت کو کچلنے کے لئے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ان تحریکوں میں عورتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۷۰ء میں جلسہ اور جلوس اپنا سابقہ ریکارڈ توڑ گئے۔ خود راجدھانی میں اتنے جلوس اور اتنے جلسے ہوئے کہ یہ شہر جلوسوں کے نام سے پکارا جانے لگا۔ نئی بات یہ ہوئی کہ نیتاؤں علی الخصوص شریمتی گاندھی کو جلسہ طلب کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی اس کے بجائے خود جلسوں نے ان کے گھر پر آ کر ان سے تقریر کرنے کو کہا۔ شاید اتنی ہولعززی کی اور دوسری مثال کہیں بھی ملنا مشکل ہو جائے جب لوگوں نے خود جلوس کی شکل میں اپنے رہنما کے گھر جا کر اس سے تقریر کرنے کی درخواست کی ہو۔

اسی سال کیرالا بھی اسمبلی توڑ کر دوسرے الیکشن کر ڈالے۔ یوپی میں دوسری حکومت بنی۔

بہرحال ۱۹۷۰ء ہندوستان میں ہماہمی کا سال رہا ہے اور اس سال نے اپنے بطن سے ایسے کئی مسائل کو جنم دیا جو ہندوستان کے مستقبل کے لئے خوش آیند قرار



لیبیا۔ مصر اور سوڈان کی فیڈریشن بنی تو صدر ناصر کی موت کے بعد ان کا یہ خواب پورا ہو گیا جو انہوں نے ساری زندگی دیکھا۔ بعد میں اس فیڈریشن میں شام اور لبنان بھی شامل ہو گئے۔

جارج حباش کے اشارے پر تین جہازوں کا اغوا کر کے اردن کے ریگ زار میں کھڑا کر دیا گیا۔ دنیا ایک بار پھر تیسری جنگ عظیم کے دہانے پر جا پہنچی لیکن صدر ناصر کی حکمت عملی نے دنیا کو ایک اور بھیانک جنگ سے بچا لیا۔



لیلیٰ خالد اپنی بہادری اور ہمت کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ دنیا بھر کے نوجوان لیلیٰ خالد کے کارناموں سے سبق لیتے ہیں





شرقی پاکستان میں اس صدی کا سب سے بڑا طوفان آیا جس میں ایک اندازے کے مطابق ۹ لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔
تصویر میں بھولا جزیرے کے بھوکے بچے روٹی مانگ رہے ہیں



سامراجی طاقتوں کے اشارے پر شاہ حسین نے اردن میں خون کی ندیاں بہادیں۔
۲۵ ہزار سے زائد فلسطینی جوانوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام کیا گیا۔
لاکھوں لوگوں کو ایک بار پھر بے گھر کر دیا گیا۔

دیئے جا سکتے ہیں علی الخصوص پارلیمنٹ کو نئے چناؤ کی خاطر توڑ دینے سے ہندوستان کے شاندار مستقبل کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔

۱۹۷۰ء نے اگرچہ ہندوستان کو عالمی شہرت یافتہ سائنسداں، سر سی۔ وی۔ رمن سے محروم کر دیا لیکن اس سال ڈاکٹر ہرگوبند کھرانہ نے وسکانسن یونیورسٹی میں ایک نئے سائنسی انکشاف سے ساری دنیا کے سائنس دانوں کو متحیر کر دیا۔ ڈاکٹر کھرانہ نے بتایا کہ وہ انسانی خون سے ایک ایسے عنصر کی تلاش میں کامیاب ہو چکے ہیں جس پر انسانی نسل کی پیداوار کا انحصار ہے۔ اس تلاش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مصنوعی طور پر انسانی نسل کی افزائش ممکن ہو جائے گی اور یہی عنصر بڑھتی ہوئی آبادی کو بریک لگانے کے سلسلہ میں بھی ممد و معاون ثابت ہو سکے گا۔

بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ان گنت نقصانات میں سر فیروز خاں نون، ڈیگال، ناصر کے علاوہ ممتاز فلسفی برٹرینڈ رسل کی تلافی بھی ناممکن ہے۔

مشرقی پاکستان میں اس سال دوبار خوفناک سیلاب اور طوفان نے قیامت برپا کر دی۔ خصوصاً ۱۲ نومبر کو آنے والے ہولناک طوفان نے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے۔ لاکھوں انسان مر گئے اربوں روپے کا نقصان ہو گیا۔ انسانی تباہی اور بربادی کے اس اندوہ ناک المیہ نے ساری دنیا کو تھوڑے عرصہ کے لئے متحد کر دیا۔

ہندوستان نے اس المیہ سے نپٹنے کے لئے پاکستان کو دو کروڑ روپے کے علاوہ ہر قسم کے تعاون کی پیش کش کی۔ پاکستان میں اسی سال قیام مملکت کے بعد بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات عمل میں لائے گئے۔ مشرقی پاکستان سے ہندوستان نواز شیخ مجیب الرحمن اور مغربی پاکستان سے ہندوستان دشمن ذوالفقار علی بھٹو نے اکثریت کی طرف دوڑ حاصل کی۔

برطانیہ اور سیلون میں بھی عام انتخابات ہوئے اول الذکر مملکت نے ہیتھ اور موخر الذکر نے مسز بندرا نائیکے جیسے متضاد مزاج والی ہستیوں کو وزیر اعظم چنا۔ دونوں ممالک دولت مشترکہ کے ممبر ہیں۔ وزیر اعظم ہیتھ نے جنوبی افریقہ کو ہتھیاروں کی امداد دے کر افریشائی ممالک کو اپنا دشمن بنا لیا جبکہ مسز بندرا نائیکے نے حکومت اسرائیل سے

اس وجہ سے سفارتی تعلقات توڑ دیئے کہ اس نے عربوں کے مقبوضہ علاقے دینے سے انکار کر دیا۔ امریکہ میں بھی اسی سال عام انتخابات عمل میں لائے گئے۔

ایجادات اور مہمات کے اس دور میں امریکا نے ۷۴۷ جمبو جیٹ کے روپ میں ایک اڑتے ہوئے شہر کو پیش کیا جبکہ روس نے ایک خود کار گاڑی چاند پر پہونچا دی۔

لیکن ان تمام واقعات اور حادثات سے قطع نظر اقوام متحدہ کی وہ ۲۵ سالہ برسی ہے جو اسی سال دھوم دھام سے منائی گئی جبکہ یہ ادارہ اپنی گزشتہ زندگی میں امن و انصاف قائم کرنے کی بجائے بین الاقوامی قزاقوں کی سرپرستی میں چمک رہا ہے۔



احمد آباد کے بعد بھیونڈی اور جلگاؤں میں ایسے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے کہ سارے ملک کی گردن شرم سے جھک گئی۔ ہزاروں لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی

آج کا طالب علم
ایک سیاسی طاقت

(سیدہ فہیم)



سیدہ فہیم ـ گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد میں فنون کی طالبہ ہیں۔

"آج کا طالب علم بے چین ہے، وہ تخریب پسند ہے، اسے توڑ پھوڑ، بھوک ہڑتال یا گھیراؤ کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں سوجھتا۔ آج کے طالب علم کا اخلاق تباہ ہوگیا ہے، وہ استادوں کی عزت کرنا نہیں جانتا، وہ شراب جوا اور عیاشی کو نئی تہذیب کا ایک جز سمجھتا ہے۔"

یہ وہ جملے ہیں جو آئے دن ہماری نظروں کے سامنے اخبار کی سرخیوں کی صورت میں آتے ہیں یا پھر "دیش بھگت" نیتا انھیں اپنی تقاریر میں دہراتے رہتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے طالب علم کو مورد الزام ٹھہرا دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ طلبار کی اس تباہی اور افراتفری میں خود ان کا کتنا بڑا ہاتھ ہے وہ اس بے چینی کا سدباب کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ صرف تنقید کرنا جانتے ہیں بیماری کا علاج ان کے پاس نہیں۔

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ آج کل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں طلبار مختلف تحریکوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ ہڑتالیں کرتے ہیں۔ کالج کی عمارتوں کو آگ لگاتے ہیں بسوں اور ریلوں کو نذر آتش کرتے ہیں۔ نعرہ بازی کرتے ہیں اور اکثر اوقات یہ بھی نہیں جانتے کہ آیا وہ حق پر ہیں یا موقع پرست سیاست دانوں کا شکار بن رہے ہیں۔ اس بے چینی اور افراتفری کی فضا کو ختم کرنے کے لئے ہم بزرگ سیاستدانوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ سیاستداں اکثر طلبار کو ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں یا پھر تعلیم کو سیاست سے الگ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔ سیاست کو تعلیم سے دور رکھنے کی بات عموماً ساری دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں بہت سنی جا رہی ہے۔ اب ہمیں سوچنا یہ ہے کہ واقعی کیا یہ ممکن بھی ہے ؟ موجودہ دور میں سیاست زندگی کے ہر شعبے میں بری طرح دخیل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں جو بظاہر تو ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن آپس میں ان کا ایک نامیاتی رشتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تعلیم بھی زندگی کا ایک پہلو ہے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں مثلاً سیاست تہذیب اور مذہب سے اس کا ان دیکھا لیکن گہرا رشتہ ضرور ہے۔ جو لوگ سیاست سے تعلیم کو دور رکھنے کی بات کہتے ہیں وہ بکواس کرتے ہیں اور یہاں ان کی جہالت سے کوئی بحث نہیں۔ ہماری درسگاہوں کی طرف دیکھئے ملک بھر میں کتنے ایسے اسکولس، کالجس، اور یونیورسٹیاں ہیں جن کے نام گاندھی، نہرو، آزاد یا پٹیل کے ناموں سے موسوم ہیں سیاسی لیڈروں کے ناموں سے کسی درسگاہ کو موسوم کرنے کا فعل ہی سیاست سے تعلیم کے گہرے رشتے کا بیّن ثبوت ہے۔

مذکورہ بالا بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا ہم طلبار کی موجودہ بے چینی کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں ؟ یہ طے شدہ بات ہے کہ سیاست سے تعلیم کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ کرنا چاہیئے کیونکہ موجودہ دور میں سیاسی سوجھ بوجھ ایک طالب علم کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ خود تعلیم۔

کسی بھی جمہوری نظام میں سیاسی سوجھ بوجھ بہر حال انتہائی اہم جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمہوری حکومت کا تعلق عوام کی مرضی سے ہوتا ہے اور خود عوام درسگاہوں سے منسلک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک جال سا بنا ہوا ہے جسے ٹٹولا جائے تو سیاست آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ طلبار کو صحت مند سیاست کی طرف راغب کرائیں تاکہ وہ اقتدار اور شہرت کے بھوکے موقع پرست نیتاؤں کا شکار نہ ہو سکیں۔ یہ نیتا صرف اپنی غرض کی خاطر طلبار کو استعمال کرتے ہیں اور ان کے ناپختہ ذہنوں کا ناجائز



فرہنچ طلبا نشانہ ... فیس کا ... کا استعمال کرتے ہیں



پیرس میں کمیونسٹ انقلابی نوجوانوں اور پولیس کے درمیان جنگ

[illegible]

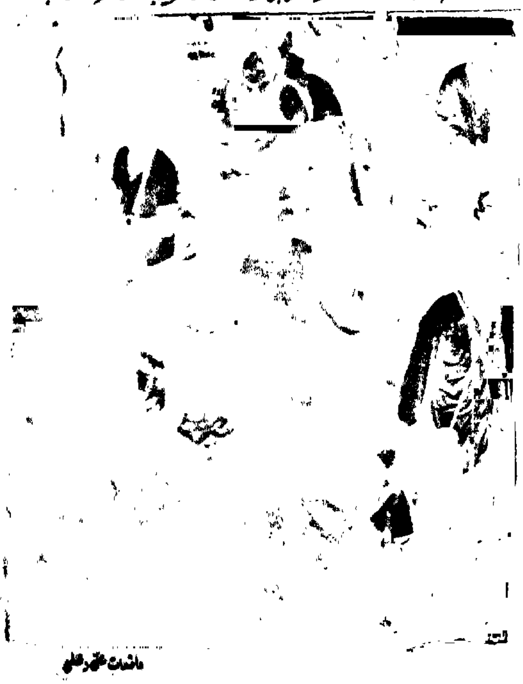
فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ طلبار کو اکثر مذہب زبان اور علاقہ واریت کے نام پر بھڑکاتے ہیں نتیجہ میں انتشار پھیلتا ہے لاٹھی چارج ہوتا ہے، آنسو گیس استعمال کی جاتی ہے گولیاں چلتی ہیں، بھوک ہڑتالیں ہوتی ہیں یا پھر گھراؤ کیا جاتا ہے، دیش کا کروڑوں روپے کا نقصان ہوتا ہے طلبار کی تعلیم پر بہت برا اثر پڑتا ہے لیکن یہ نیتا اہم شخصیتوں کے مالک بن جاتے ہیں چنانچہ یہ طلبار نہیں ہیں جو موجودہ بے چینی کلچر انتشار کے ذمّہ دار ہیں بلکہ یہ وہ موقع پرست نیتا ہیں جو طالب علم کے کاندھے پر بندوق رکھ کر شکار کھیل رہے ہیں۔ وہ طلبار کو اپنی اور اپنی پارٹی کی پبلسٹی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ لہذا ہماری تنقید کا رخ طلبار کی طرف ہونے کے بجائے موقع پرست سیاست دانوں کی طرف ہونا چاہئے۔ ہم نے اصل مسئلے کو سمجھا ہی نہیں اسی لئے ہم ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ امریکا کے گٹار نواز باب ڈیلن (Bob Dylon) نے اسی بات کو خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

Come Mothers and Fathers
throughout the land
And donot criticize what
you donot understand
Your sons and daughters are
beyond your command

ہمارے بزرگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور کی روح کو نہیں سمجھا۔ موجودہ صدی دراصل ایک عبوری دور ہے اور اس کے خاتمے کے بعد انسان کو کوئی نہ کوئی منزل مل جائے گی۔ یہ انتشار، یہ ہنگامہ، یہ افراتفری، یہ بے چینی دراصل امن اور سکون کی منزل پانے کے لئے ہے۔ ہر دور میں انسان نے امن کے لئے جدوجہد کی ہے فرق صرف جدوجہد کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جو لوگ طلبار پر تنقید کرتے ہیں وہ اکثر پرانی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے ساتھ ایک محدود سا نظریۂ حیات لئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں تہذیب و تمدن کے جو اقدار ہوتے ہیں وہ بھی موجودہ معاشرے کی قدروں سے میل نہیں کھاتے۔ آج جو جوان میں اور تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ ایٹمی دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے ذہنوں پر نہ تو دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں کا اثر ہے اور نہ ہی سرد جنگ (COLD WAR) کے مضر اثرات کا۔ یہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جو ٹکنالوجیکل سائنس کی ترقیات کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے انسان نے اپنے قدم چاند پر رکھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آج کا نوجوان صرف اس لئے بے چین ہے کہ ہماری زندگی بڑی بے رنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ جو لوگ دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے واقف ہیں وہ امن کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور ایک بین الاقوامی معاشرہ چاہتے ہیں جس میں تمام ممالک کے لوگ مل جل کر رہ سکیں اور مزید جنگ کے خطرات کو ٹالا جا سکے



ہپی طلبار لمبے لمبے بال اور عجیب سا درویشانہ لباس انہیں دوسرے طلبار سے ممتاز کرتا ہے۔



ہپیوں کا ایک میلہ —

ہپی جو سماج کے ہر اصول سے بیر رکھتے ہیں۔



ہم تبدیلی چاہتے ہیں



ہم انقلاب چاہتے ہیں

ابھی جوانی نے ان تمام تصورات کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن جو لوگ کہ جوان ہیں ان کی ذہنی کیفیت بالکل مختلف ہے وہ اس بے رنگ سی مشینی زندگی سے پریشان ہیں جس نے انھیں ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ انھیں بھی سکون کی تلاش ہے لیکن اسے پانے کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے اس سے یہ واقف نہیں اس لئے ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ آج کل کے نوجوان طلبار انہی مشکلات سے دوچار ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نوجوان طلبار کے مسائل کو نوجوانوں کے نقطۂ نظر سے ہی سمجھنے کی کوشش کریں۔

چند سال پہلے الٰہ آباد کے کسی کالج میں ایک سمپوزیم کے دوران اوماشنکر جوشی نے بڑی خوبصورت بات کہی تھی۔ ان سے پوچھا گیا تھا کہ آج کل کے نوجوان کو کونسی چیز بے چین کئے ہوئے ہے؟ ان کا جواب تھا۔

"یہی کہ وہ نوجوان ہے!"

یہ بات بہت زیادہ دلچسپ ہے کہ دنیا کی موجودہ صورتحال نے نوجوان طلبار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ طلبار کا ایک گروپ ہپی ازم (Hippeism) کی تائید میں ہے اور دوسرا گروپ انقلابیوں پر مشتمل ہے۔

ہپیوں نے موجودہ انسانی تہذیب کے اقدار کو چیلنج کیا ہے۔ وہ سوچنے سمجھنے اور محنت کرنے کے فعل کو غیر ضروری اور تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ سوچتا ہوا ذہن ان کے پاس زہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ موجودہ اور پر تصنع اور ریاکارانہ زندگی سے بےزار ہیں۔ ایسے طلبار کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بہت نظر آتے ہیں۔ ان کے لمبے لمبے بال اور عجیب سا اور دلیشانہ لباس انھیں دوسرے طلبار سے ممتاز کرتا ہے۔

ہپی طلبار دراصل بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ بھوک غریبی اور بے روزگاری کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان تمام برائیوں کو ختم کرنے کی طاقت ان میں نہیں اس لئے وہ اس دنیا کو ہی بھلا دینا چاہتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت وہ نشہ آور چیزیں مثلاً گانجہ، افیون، چرس، حشیش وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی اس بیمار ذہنیت کے باوجود وہ موجودہ معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں ہیں لیکن تبدیلی لانے کا راستہ بہت زیادہ مبہم ہے۔ وہ فرد اور اس کی انفرادیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور خود اپنے آپ کو پڑھنے اور سمجھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تبدیلی خود اپنے آپ کو بدلنے کے بعد لائی جاسکتی ہے اور یہ تبدیلی تشدد یا جبر کے بجائے محبت کے اصولوں پر عمل کر لائی جانی چاہیئے۔ اسی لئے اکثر ان کا نعرہ ہوتا ہے۔ "محبت —— نہ کہ جنگ"

انقلابی طلبار بھی پورے معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں لیکن وہ یہ تبدیلی انقلاب کے ذریعے لانا چاہتے ہیں چاہے پھر وہ خونی انقلاب ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے طلبار ہندوستان میں نکسلائیٹ تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ موجودہ طبقاتی نظام سے نالاں ہیں۔ اس نظامِ حکومت سے موجودہ لیڈروں نے انھیں دھوکہ دیا ہے۔ ان سے کئے گئے وعدے وفا نہیں ہوئے، ان طلبار نے کئی ممتاز لیڈروں کے مجسمے توڑ ڈالے۔ ان کا یہ فعل ایک عجیب سی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ وہ موجودہ موقع پرست لیڈروں سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے ماضی کے لیڈروں کے مجسمے توڑتے ہیں کیونکہ موجودہ نیتا انہی بزرگ لیڈروں کے نام پر قسمیں کھاتے ہیں اور دھوکہ دیتے ہیں۔ انھیں ان لیڈروں سے کوئی شکایت نہیں جن کے وہ مجسمے توڑتے ہیں۔ اس طرح کی پیچیدہ ذہنی کیفیت انھیں پریشان کئے رہتی ہے اور وہ پھٹ پڑتے ہیں۔ ایڈورڈ شیلس (EDWARD SHILS) نے ہندوستانی طلبار کی موجودہ افراتفری پر سروے کرنے کے بعد لکھا ہے کہ طلبار وائس چانسلر پر، کلکٹر پر، پولیس افسروں اور ان کے مکانات پر، بس ڈرائیوروں پر، ڈاک خانوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملے کرتے ہیں۔

اس افراتفری اور بے چینی کے ذمہ دار یقیناً وہ بوڑھے سیاستداں ہیں جو اپنی سیاسی اغراض کے لئے طلبار کو استعمال تو کرتے ہیں لیکن حکومتی مشنری میں ان کے دخل کو پسند نہیں کرتے اور تعلیم کو سیاست سے دور رکھنے کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ موجودہ نوجوان طلبار کی نسل ایک سیاسی طاقت بن کر دنیا کے ہر حصے میں نمودار ہوئی ہے یہ طلبار مزید دھوکہ کھانا نہیں چاہتے بلکہ حکومتی پالیسیوں میں ایماندارانہ دخل چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کے مختلف ملکوں میں اور خود ہندوستان میں اٹھارہ سال کی عمر میں ووٹ دینے کا حق کے نظریہ کی تائید کیجا رہی ہے —— یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کیونکہ جمہوریت نام ہے عوامی حکومت کا نہ کہ بوڑھے لوگوں کی حکومت کا۔

اگر آج کے نوجوان طلبار کو حکومت اور سیاست میں بہتر طور پر حصہ لینے کی اجازت دی گئی تو ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ موجودہ افراتفری میں کسی قدر کمی واقع ہو۔

اسرائیلی درندے اور مجاہدینِ فلسطین



بن غازی (لیبیا) سے جناب شعیب نگرامی نے ازراہِ کرم قارئین "واقعات" کی آگاہی کے لئے حرب اسرائیل آویزش پر ایک **حقیقت پسندانہ** تبصرہ ارسال کیا ہے جسے شکریہ کیساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے

(ادارہ)

اب اسرائیل اور مغربی سامراجیوں کے ہر حملے کا جواب فلسطین، مصر، شام، لیبیا اور سوڈان کے عوام ایک ہو کر دیں گے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کی تقسیمِ فلسطین سے متعلق قرارداد انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کے سب سے بڑے "ڈاکے" کا نقشِ اول تھی۔ یہ قرارداد بیسویں صدی کے سب سے بڑے المیہ کی ابتداء تھی۔ اس ظالمانہ فیصلے نے لاکھوں ماؤں کی گودوں کو ویران کر دیا ہزاروں دلہنوں کے سہاگ کو اجاڑ دیا بیکڑوں پھول جیسے معصوم بچوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی۔ یہ قرارداد فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کے متعلق نام نہاد اس برطانوی شہنشاہیت کے وعدہ کا سرکاری اعلان تھی جس کی عظمت و سطوت کا سفینہ ۵۶ء میں نہر سویز میں تہہ آب ہو گیا۔ اور جس کے غرور کا جنازہ عدن کے حریت پسندوں نے نکالا۔ اور اب جس کی نام نہاد حریت و آزادی کے دعوے کی دھجیاں شمالی آئرلینڈ کے عوام اڑا رہے ہیں۔ عالمی ادارہ کی مذکور قرارداد کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے نقشہ سے ایک امن پسند قوم مٹی اور اس کی جگہ اسرائیل کی شکل میں ظلم و استبداد، اور دہشت انگیزی اور تشدد نے سر اٹھایا صیہونیت نے فلسطین میں قدم جمانے کے بعد اپنے گمراہ کن پروپیگنڈہ سے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اب فلسطین نام کی کوئی چیز دنیا میں نہیں باقی رہی، اب اصل مسئلہ عرب، اسرائیل سرحدوں پر ہونے والی جھڑپوں کا ہے۔ رہے فلسطینی عوام تو ان کا مسئلہ خود عربوں کا پیدا کردہ ہے کیونکہ عرب حکومتیں ان دس لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کو اپنی سرزمین پر بسانے کے لئے تیار نہیں ہیں صیہونیت اور سامراج نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مشرقِ وسطیٰ میں کوئی بھی ایسا فلسطینی نہیں ہے جو اپنی اس سرزمین کو واپس جانا چاہتا ہے جہاں اس نے آنکھیں کھولیں! اور بچپن و جوانی کا دور بتایا۔

اسرائیل کی ہیبرو یونیورسٹی میں ریاضیات کے سابق پروفیسر مسٹر "ماشوبر" لکھتے ہیں کہ صیہونی حکام نے اپنی مظلومیت کی تصویر کشی کر کے عالمی رائے عامہ کو اس حقیقت سے دور رکھنے کی کوشش کی کہ خیموں میں بسنے والے دس لاکھ فلسطینی پناہ گزین اپنے گھروں کو جانے کے لیے بے تاب ہیں! اور وہ اپنی زمین کی حفاظت اور جائز حقوق کے لیے اپنے خون کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ پروفیسر ماشوبر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اسرائیل نے اب تک عربوں پر جتنی بار بھی حملے کئے ان کا اہم مقصد فلسطینی عوام کی اس مسلح جد و جہد کو ختم کرنا تھا جو ۱۹۵۵ میں شروع ہو چکی تھی، کیونکہ اسرائیلی حکام کے لئے اصل خطرہ مسلح جد و جہد ہے۔ یہ وہ خطرہ ہے جس نے تل ابیب کے حکام کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں اور اس بڑھتی ہوئی مسلح جد و جہد کے سامنے اسرائیلی لیبنٹ اور پارلیمنٹ کے ممبر قومی اتحاد ہرگز قائم نہیں رکھ سکتے۔ جون ۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ نے اس مسلح جد و جہد کو ایک نئی زندگی بخشی فلسطینی عوام جو اقوام متحدہ کی جانب سے مایوس ہو چکے ہیں اور جن پر یہ راز منکشف ہو چکا ہے کہ اس متمدن دنیا میں جنگل کے قانون کا بول بالا ہے۔ انہوں نے اپنے ۴۸ء کے لگے ہوئے زخموں کا علاج خود کرنے کا فیصلہ کیا ہے فلسطینی پناہ گزین جو اب تک عالمی خیرات پہ



یپام بم کا شکار یہ معصوم نہ صرف اپنا گھر بار بلکہ
پنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھی محروم ہو گیا ہے



فلسطینی مجاہدین جنہیں آج ایک نہیں بلکہ دو دو دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے
ایکطرف اگر اسرائیل و امریکہ ہیں تو دوسری طرف اُردن، لبنان اور خود انکی آپس کی پھوٹ

ںوں میں زندگی گذارا کرتے تھے اب انہوں نے ہتھیار
ٹھاکر عالمی رائے عامہ سے اپنے وجود کو تسلیم کروالیا ہے۔

فلسطینی حُریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے
ں اسرائیلی حکام کو ہراکر رکھ دیا ہے جنہیں ۶۷ء کی
ح نے مست کر رکھا تھا۔ اور جو عربوں کے گھٹنے ٹیکنے کا
ہانا خواب دیکھ رہے تھے۔ تل ابیب کے حکام عارضی
ح کے نشہ میں یہ بھول گئے کہ انھوں نے اس قوم کو للکارا
ہے جو سر دھڑ کی بازی لگانا خوب جانتی ہے۔

اسرائیل کی گمراہ کن پروپیگنڈہ مشینری ایک بار پھر
رکت میں آئی اور حُریت و آزادی کے ان متوالوں کو "تخریب
سند" اور "دہشت پسند" جیسے خطابوں سے نواز کر دنیا
ہ سامنے ان کی مقدس جدوجہد کو رسوا کرنے کی کوششیں شروع
ردیں۔ اور دوسری جانب اسرائیل کے جنگ باز حکام نے
ں تحریک آزادی کو جو بقول ممتاز برطانوی صحافی "مائیکل آدمز"
دسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں کے خلاف یورپین قوتا
مجاہد جیسے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ "ناپام" بموں کو نشانا
بنا، چنانچہ ۱۹ نومبر ۶۸ء کو "الکرامۃ" نامی گاؤں کے فلسطینی
او گزینوں پر جو سوتے ہوئے تھے اردن کی فوج نے ایک طرف توبھاری
وپں سے گولہ باری کی اور دوسری جانب اسرائیلی طیاروں
آسمان سے جھونپڑیوں میں رہنے والے نہتے بوڑھوں اور بچوں پر

آگ کی بارش کی۔ اس شرمناک فوجی کارروائی میں سیکڑوں
شہیدوں نے اپنے خون سے حریت و آزادی کے پودے کی
آبیاری کی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے جسے عالمی رائے
عامہ کا ضمیر کہا جاتا ہے، اس انسانیت سوز حرکت کی مذمت



میں کب
واپس
گھر جاؤں گا

کی اور اسے اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی قرار دیا
لیکن اسرائیلی حکام نے جو ہر قسم کی اخلاقی اور انسانی قدروں
کو پامال کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں اعلان کیا کہ اگر
فلسطینی حریت پسندوں کی سرگرمیاں جاری رہیں تو وہ
اس سے بھی بڑی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کریں گے۔ چنانچہ
۱۵ فروری ۶۹ء کو اسرائیلی فوجیں دریائے اردن کے
پار پناہ گزینوں کے ۲۰ گاؤں پر حملہ آور ہوئیں ایک بار پھر
سیکڑوں نہتے انسان خون میں نہا گئے اور ستر ہزار سے زائد
بے گھر خیموں سے بھی محروم ہوگئے۔

اسرائیل کی یہ وحشیانہ حرکتیں فلسطینیوں کے حریت
و آزادی کے جذبہ کو دبانے میں بُری طرح ناکام رہی ہیں۔
بلکہ ان حرکتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے حُریت پسندوں
نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کردیا۔ اور انہوں نے اسرائیل کے
اندر گھس کر تل ابیب کے حکام کے وطنی اتحاد کو برقرار رکھنے
کے خواب کو خاک میں ملادیا۔ فلسطینی عوام کی مسلح جدوجہد
"مارو اور بھاگو" کے مرحلے سے گذر کر "مارو اور جمے رہو"
کے مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کا نتیجہ
حیفا۔ عفولہ۔ خضیرہ۔ نامی شہروں کی تباہی ہے۔
فلسطینی فدائیین نے اس مرحلہ میں داخل ہو کر "وادی بیسان"
نامی اسرائیلی نوآبادی کے باشندوں کا دن کا سکون اور رات
کی نیندیں چھین لی ہیں۔ ●●

حالات حاضرہ

انڈین یا ہندوستانی



ساھتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ
بنگالی مصنف آنند شنکر رے

اس مضمون کے مصنف جناب آنند شنکر رے (۶۶ سال) کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام مل چکا ہے وہ ایک مشہور بنگالی مصنف ہیں، اور اب تک ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں وہ ۱۹۵۱ء میں آئی سی ایس سے ریٹائر ہوئے تھے۔

چند سال پہلے کی بات ہے، لندن میں میرے ایک دوست کی یہودی بیوی نے کہا تھا کہ "سامی نسل سے دشمنی یورپ والوں کی ایک دائمی بیماری بن چکی ہے۔"

اس خاتون کا غمزدہ چہرہ اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ اسی طرح کا غم اس وقت میرے دل پر بھی چھا جاتا ہے جب مجھے مجبور ہوکر کہنا پڑتا ہے کہ "مسلم دشمنی کا احساس سرزمین ہند کا ایک دائمی مرض بن چکا ہے" لوگ اب حفاظت کے لئے نہ گاندھیائی فلسفہ کے ماننے والوں پر اعتماد کرتے ہیں، اور نہ پولیس پر اور ہر فرقہ وارانہ فساد کے موقعہ پر ایک چیخ فضا میں بلند ہوتی ہے کہ فوج کو حفاظت کے لئے بلاؤ۔

انگریز اب ہندوستان میں موجود نہیں اس لئے ہم اپنی مصیبتوں کا الزام ان پر نہیں لگا سکتے۔ اور نہ اسکا ہمیں حق پہنچتا ہے کہ انکی پالیسی کو ہر وقت کوستے رہیں۔ خود اپنے لاینحل مسائل کی ذمہ داری سے اگر ہم بچنا بھی چاہیں تو نہیں بچ سکتے برسوں سے پاکستان میں ہندو کشی کا کوئی واقعہ نہیں ہوا، اس لئے ہم اس ملک کو بھی موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں فسادات آئے دن کے معمولی واقعات کی بنا پر پھوٹ پڑتے ہیں، اور یہ ساری قتل و غارت گری ہندوستان کی سرزمین پر ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ فساد ہمیشہ مسلمان شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں کے فسادات میں در اصل پاکستان کا ہاتھ ہے لیکن ان دعوؤں کو کبھی ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ثبوت اور دلیل نہیں تو ایسے دعوے صرف مسترد ہی کیے جا سکتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کے دعوے کرتے ہیں وہ خود کسی حادثہ کی ذاتی طور پر تحقیقات نہیں کرتے۔ اور نہ اس کی تفصیلات میں جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انکی رسائی سرکاری دستاویزات تک کبھی نہیں ہوتی اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ باتوں کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ہند میں مسلم دشمنی کا جذبہ اور فروغ پاتا ہے۔

دستور کے تحت ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر ملازمتوں کا کوئی مقررہ کوٹہ نہیں ہے اور نہ مذہب کی بنیاد پر الگ رائے دہندگی کا طریقہ باقی ہے اس لیے ہندوستان میں مسلمان اپنے آپ کو ایک غیر منفعت بخش پوزیشن میں پاتے ہیں۔ کمپیٹیشن سخت ہے۔ انھیں تعلیم میں پسماندگی کی بنیاد پر کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ نوجوان مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی مرضی سے ترکِ وطن کرکے پاکستان چلا جاتا ہے۔ جو اپنا گھر بار چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ گھر میں بیٹھ کر آنسو بہاتے رہیں میں بھی ان لوگوں کے لئے روتا ہوں لیکن ابتک اس صورت حال کا کوئی علاج مجھے نظر نہیں آیا میرے خیال کے مطابق فرقہ کی بنیاد پر ملازمتوں کا کوٹا متعین کرنا ایک غلط طریقہ ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں صلاحیت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ خود میں اپنی نوجوانی میں اس طرح کے امتیاز کا شکار ہوا ہوں

تاریخ کے مختلف ادوار میں دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح کی صورت حال پیدا ہو چکی ہے۔ ایک دور تھا جب برطانوی پارلیمنٹ کیلئے یہودی اور کیتھولک عیسائیوں کا انتخاب ناممکن سی بات تھی۔ لیکن صرف اس وجہ سے انہوں نے جدوجہد ترک نہیں کی۔ انہوں نے زراعت، بینکنگ، تجارت، صنعت اور دستکاری کو فروغ دیا کیونکہ ان میدانوں میں انھیں پسپا کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مصائب اور دشواریاں جنکا وہ ایک زمانے تک شکار رہے، بعد میں چل کر ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئیں۔

مذہب کی بنیاد پر ملازمتوں میں الاٹمنٹ اور الگ رائے دہندگی کا طریقہ اب ہندوستان میں نافذ ہونے والا نہیں ہے۔ بعض مسلمان اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا۔ لیکن یہ خواب سے زیادہ کچھ نہیں، اور اس کا حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہیں، کیونکہ اس بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونی چاہیئے کسی کا مذہب اس کے لئے نہ ملازمت کی ضمانت بنے اور نہ اس بنیاد پر کسی کو ملازمت سے محروم کیا جائے۔

اس ملک میں خون خرابہ کا سب سے بڑا سبب گائے ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد گائے کا ذبیحہ اور اس کے گوشت کی فروخت کئی ریاستوں میں خلافِ قانون قرار دے دی گئی ہے۔ اگر یہ بات مسلمانوں کی مرضی سے انجام پاتی تو کبھی حادثہ کا باعث نہ بنتی، لیکن فیصلہ یک طرفہ کیا گیا ہے۔ ایک جمہوری ملک میں اکثریت کا ووٹ ہی قیمت رکھتا ہے، اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اقدام غیر جمہوری طریقہ پر کیا گیا ہے۔ لیکن ان روایات کے مطابق جو کہ [illegible] جمہوری ملکوں میں رکھا جاتا ہے کہ جو امور مذہب سے متعلق ہوں ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ووٹوں کی اکثریت سے بھی زیادہ کچھ باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ [illegible] بھی برتی جاتی ہے۔ [illegible]

"پاکستان کی تشکیل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان خالص ہندوؤں کا وطن ہو گیا ہے، اگر اس سے مسلمانوں اور دوسروں کو خارج کر دیا جائے تو انڈین کی اصطلاح بے معنی بن کر رہ جاتی ہے۔!"

قانون منظور کرے جس کے تحت مچھلی کھانا ممنوع قرار پا جائے تو یہ اقدام غیر جمہوری نہیں ہوگا لیکن اسے جمہوری روح کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے مغربی بنگال میں جانور ذبح کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔

مسجد کے سامنے باجہ بجانے پر بھی کم خون خرابہ نہیں ہوا ہے حال ہی میں سپریم کورٹ نے رولنگ دی تھی کہ عام سڑک پر باجہ بجانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ اس رولنگ پر ہندوؤں کو اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی مسلمانوں کو ناراضگی۔ اسی بات پر کلکتہ میں ایک فساد بھی ہو گیا لیکن سوال یہ ہے کہ کچھ لوگ عام سڑک پر ہی ہی، مسجد کے سامنے اور وہ بھی خاص طور سے نماز کے وقت باجہ کیوں بجاتے ہیں؟ مغربی بنگال میں اب بھی اس سلسلے میں مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جاتا ہے۔

اردو زبان ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔ اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر بنایا اور پروان چڑھایا۔ یہ زبان کسی ایک فرقہ کی تخلیق کبھی نہیں تھی۔ پنجاب اور یو پی میں بہت سے ہندوؤں کی مادری زبان اردو ہے، پھر ہندی کے لئے اردو کو قربانی کا بکرا کیوں بنایا جاتا ہے جس طرح سے اس زبان کو گزشتہ بیس سال میں نظر انداز کیا گیا ہے اس کے نتیجہ میں اس اندیشے کو تقویت ملی ہے کہ یہ زبان ملک میں ہمیشہ کے لئے کچل دی جائے گی اس اندیشہ کو مبالغہ آمیزی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ غیر حقیقی نہیں ہے۔

پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کا ایک بندھن بنگالی زبان ہے اور دوسرا اُردو۔ اگر یہ دونوں بندھن بھی توڑ دیئے جائیں تو ہندوستان اور پاکستان ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد آباد کے ہندو اس ترغیب کا شکار ہو گئے کہ چونکہ مسلمانوں کے لئے پاکستان نام کا ایک ملک بنا دیا گیا ہے اسلئے ہندوستان میں ان کے قیام کے لئے کوئی جواز نہیں۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے، جس کا جواب بیس سال پہلے دستور ہند نے بھی دیا تھا اور گاندھی جی کی شہادت بھی اس کا جواب تھی لیکن ۲۰ سال کی طویل مدت کے بعد یہ سوال پھر اٹھایا گیا ہے اور وہ بھی ناقابلِ تصور تشدد کے ساتھ!

کیا ایک عام ہندوستانی کو پھر یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کا نام "انڈیا" رکھا گیا ہے۔ ہندوستان نہیں ہم نے اپنے ملک کے دروازے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

لئے کھول دیئے ہیں، اور اس لئے اسے سیکولر ملک قرار دیا گیا ہے ہم ایک ایسی قومیت میں یقین رکھتے ہیں جو مختلف اعتقادات کی حامل ہو اور جس کی زبانیں بھی مختلف ہوں، ایسی ہی ایک قوم کی تعمیر کا ارادہ تھا جس کے لیے ہم نے جنگ لڑی تھی۔ ہر ہندوستانی باشندہ کو ہم اس کی دعوت دیتے ہیں کہ اس ملک کی ترقی اور استحکام کی جدوجہد میں وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو۔ ہماری قومی تہذیب ایک رنگا رنگ تہذیب ہے، جس کے لئے مسلمانوں نے اور دوسروں نے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا ہے! اور ہماری معیشت مشترک ہے، جس میں مسلمانوں کو بھی قیمتی کردار ادا کرنا ہے۔

ہم مسلمانوں کے بغیر انڈین نہیں ہو سکتے، ہمارا "انڈین" ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہوں، اس ملک میں مسلمان بھی باقی رہیں، اگر وہ یہاں سے چلے جاتے ہیں تو پھر ہم صرف "ہندوستانی" باقی رہ جائیں گے۔ اور ہمارے ملک کا نام ہندوستان ہو جائے گا قطعی طور پر یہی وہ چیز ہے جس کا پاکستان خواہشمند ہے۔

ہمارے ہندو فرقہ پرستوں کی نظر میں یہ بات زیادہ قابلِ احترام ہے کہ ہندوستانی قومیت کی قسم کھائی جائے لیکن جب وہ اس ملک کو انڈیا یا بھارت کہہ کر پکارتے ہیں تو ان کے دل و دماغ میں یہ نام ایک ایسے ملک کا ہوتا ہے جو صرف ہندوؤں کا ملک ہے، وہ مسلمانوں کو غیر ہندوستانی قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہندو نہیں ہیں۔ انکی نظروں میں ہندو ہی صرف سچے انڈین ہیں۔ یہ الجھاؤ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ یہی ایک نام مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ معنی ایک ا[...] سے متضاد ہیں۔ "ہندو" ایک ایسی اصطلاح ہے جو بہتو[...] کو اپنے سے خارج کر دیتی ہے، جبکہ "انڈین" کی اصطلاح کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ ہندو ازم ایک مذہب ہے، لیکن انڈ[...] ایک ملک ہے، جس میں اس کے تمام باشندے شامل ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ ایک مرتبہ پھر واضح اور غیر مبہم الفا[...] میں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ کہ اس ملک کا نام "ا[...] رکھا گیا ہے اور یہ تمام مذہب کے ماننے والوں کا ملک ہے[...] حقیقت قطعی طور پر یہی ہے، اور اس کے باوجود کہ ملک کا[...] حصہ اس سے جدا ہو گیا تھا۔ "انڈیا" کے عوام "انڈی[...] میں صدیوں سے "انڈین" رہے ہیں، اور انھیں "انڈیا نا[...] کرنے کی از سرِ نو کوئی ضرورت نہیں، اور خاص طور سے ا[...] وجہ سے بھی کہ ایک علیحدگی پسند حصہ نے اپنا نام پاکستان[...] لیا ہے۔ ★



چلتا پھرتا چاکلیٹ۔
برازیل کی تتلی جس سے چاکلیٹ کی خوشبو آتی ہے اس کا رنگ بھی چاکلیٹی ہوتا ہے۔

جدید امریکا کے حقیقی معمار

امریکن نیگرو

شاہد صدیقی



امریکن گاندھی۔ مارٹن لوتھر کنگ قتل کیے جانے سے کچھ دیر پہلے اپنے ہوٹل کی بالکونی پر کھڑے ہیں۔

پندرہویں صدی کے ساتھ یوروپ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بہت سی نئی دریافتیں ہوئیں۔ ترقی کے نئے راستے ڈھونڈے جانے لگے۔ علم و ادب، آرٹ و سائنس غرض کہ ہر میدان میں یوروپ آگے بڑھنے لگا۔ وہ وقت تھا جب "نئی دنیا" کی تلاش شروع ہوئی۔ یوروپی جہاز رانوں نے ایشیا اور افریقہ تک پہونچنے کے سمندری راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ حالانکہ ایشیا، اور افریقہ کی بہت سی قومیں امریکا کے سمندری راستے سے واقف تھیں اور گیارہویں صدی میں یوروپین جہاز راں وکنگ بھی انجانے میں امریکا دریافت کر چکا تھا لیکن جدید یوروپ کے لئے امریکا کی دریافت کولمبس نے کی۔

کولمبس نے امریکا ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا اور وہاں یوروپ کے لوگوں کی پہلی بستی ۱۶۲۰ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد کثیر تعداد میں یوروپ سے لوگ امریکا منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ ۱۷۶۳ء تک امریکا میں "گوروں" کی ۱۳ مختلف کالونیاں بن چکی تھیں۔ ۱۷۸۱ء میں جارج واشنگٹن کی قیادت میں برطانیہ سے جنگ کے بعد ان ۱۳ کالونیوں نے آزادی حاصل کر لی اور ۱۷۸۹ء میں جارج واشنگٹن کی صدارت میں متحدہ حکومت بنائی۔ اس سال سے امریکا کی ترقی اور خوشحالی کے دور کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں آج امریکا دنیا کا سب سے طاقتور، سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے۔

کیا یہ ساری ترقی اور دولت یوروپ کے "گوروں" کی عقلمندی اور محنت ہی کا نتیجہ ہے؟ کیا امریکا کو امریکا بنانے میں صرف اس قوم کا ہاتھ ہے جو آج اس پر حکومت کر رہی ہے؟

نیویارک کی یہ بلند و بالا عمارتیں اور واشنگٹن کے یہ عظیم الشان محل کس نے بنائے؟ ان سب سوالات کا جواب بہت آسان ہے۔ ان سوالات کا جواب سوشل ہسٹری کا کوئی بھی معمولی طالب علم دے سکتا ہے۔ یہ محل، یہ عمارتیں، یہ کارخانے یہ مشینیں ان کالے غلاموں کی محنت کا نتیجہ ہیں جنکو لاکھوں کی تعداد میں یوروپین "گورے" اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں لاکھوں افریقی بھیڑ بکریوں کی طرح امریکا لیجائے گئے۔ مذہب اور انسانیت کے ان جھوٹے علمبرداروں نے ان غلاموں سے جانوروں کی طرح کام لیا۔ یہ ان لوگوں کی ہی دن رات کی محنت کا نتیجہ تھا کہ چند ہی سال میں امریکا کے بنجر علاقے اور گنجان جنگل سرسبز و شاداب کھیتوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان غلاموں سے چوبیس گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور عام طور پر انھیں زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ کسی گورے کے لئے کسی کالے کا قتل کر دینا قانوناً جائز تھا۔ عام طور پر گورے نوجوان جوانی کا پہلا تجربہ نیگرو لڑکیوں ہی پر کرتے تھے۔ نیگرو بچوں کو بہت چھوٹی عمر ہی میں ان کے ماں باپ سے چھین کر کسی غلاموں کے سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا۔ ویسے بھی غلاموں کو کسی طرح کی شادی شدہ زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

ظلم اور بربریت کا یہ سلسلہ تقریباً دو سو سال تک چلتا رہا۔ انیسویں صدی کے ساتھ دنیا بھر میں صنعتی دور کا آغاز ہوا۔ نئی نئی صنعتیں ترقی کرنے لگیں۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی، گاؤوں کی جگہ بڑے بڑے شہر وجود میں آنے لگے۔ صنعتی ترقی میں امریکا بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا لیکن امریکا میں یہ صنعتی ترقی جنوبی صوبوں کے مقابلے شمالی صوبوں میں زیادہ



بلیک پینتھر تحریک کے لیڈر جو مارکس کے فلسفے کو ہی امریکہ کی تمام برائیوں کا حل تصور کرتے ہیں۔

تیزی سے ہوئی۔

جلد ہی شمالی صوبے امریکا کے صنعتی صوبے بن گئے کیونکہ زیادہ تر کھیتی باڑی جنوبی صوبوں میں ہوتی تھی اس لیئے بیشتر سیاہ غلام بھی جنوب میں ہی تھے۔ شمالی صوبوں میں کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ کیونکہ نیگرو گوروں کے زرخرید غلام ہوتے تھے اس لیے وہ اپنے مالک کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے انیسویں صدی میں جب کہ دنیا کافی ترقی کر چکی تھی افریقہ سے نئے غلام منگانا بھی کافی دشوار تھا ان سب وجوہات کی بنا پر شمال کے گوروں نے غلاموں کو آزاد کرنے کی مانگ شروع کر دی تاکہ یہ غلام جنوب کے کھیتوں کو چھوڑ کر ان کے کارخانوں میں کام کر سکیں، اور کارخانوں میں مزدوروں کی قلت کسی طرح ختم ہو جائے۔ جنوب کے گورے غلاموں کو آزاد کرنے کے سخت مخالف تھے کیونکہ انھیں کھیتوں میں کام کرنے کے لیئے غلام چاہیئے تھے اسی مسئلے کی بنیاد پر ۱۸۶۰ء میں ابراہیم لنکن کے دور صدارت میں شمالی اور جنوبی صوبوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شمالی صوبوں کی قیادت لنکن خود کر رہے تھے۔ ایک سال کی خانہ جنگی کے بعد شمالی صوبے فتح یاب ہوئے اور تمام غلاموں کو آزاد کر دیا گیا۔

یہ آزادی امریکن نیگرو کو بہت مہنگی پڑی۔ ایک تو یہ آزادی برائے نام تھی اور نیگرو کا امریکن معاشرے میں اب بھی وہی پہلے جیسا مقام تھا۔ اسے اب بھی کولھو کے بیل کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے اب مالک ان کے مرنے یا جینے کی زیادہ فکر نہیں کرتے تھے۔ پہلے مالک ان کی صحت کا خیال رکھتے تھے اور کم از کم پیٹ بھر کھانے کو ضرور دیتے تھے تاکہ کہیں غلام مر نہ جائے اور ان کا نقصان نہ ہو جائے لیکن اب مالک کو فکر نہ تھی کہ ان کے غلام مر رہے ہیں یا جی رہے ہیں۔ کیونکہ اب یہ کرائے کے نوکر تھے اور ایک نوکر کے مرنے پر انکو دوسرا نوکر مل سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ نیگرو شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے اور انھوں نے کارخانوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے آزادی کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور آہستہ آہستہ اپنی ایک کے بعد ایک بات منوانے میں کامیاب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے قانونی برابری کا حق حاصل کر لیا اور صدر جانسن کے دور حکومت میں ووٹ ڈالنے کا برابر حق بھی حاصل کر لیا لیکن یہ سب تو کاغذ پر ہوتا رہا۔ حقیقت آج بھی بہت مختلف ہے آج بھی امریکن نیگرو کو معاشرے میں برابری کا حق حاصل نہیں۔ معاشرے ہی میں کیا قانونی طور پر بھی امریکن نیگرو وہاں کے گوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ امریکن پولیس اور امریکن گورے ان لوگوں پر طرح طرح کے ظلم توڑتے ہیں اور قانون بیٹھا تماشہ دیکھتا رہتا ہے۔ جب صدیوں سے پسے ہوئے لوگ کوئی جوابی کارروائی کرتے ہیں تو پورا امریکن پریس اور امریکن عوام چیخ اٹھتے ہیں

آج کا امریکن نیگرو بہت بدل چکا ہے آج کا امریکن نیگرو کل کا "انکل ٹام" نہیں ہے جو مالک کا ہر ظلم خاموشی سے برداشت کر لیا کرتا ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کے قتل کے بعد پرامن حل کا دور بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج کا امریکن نیگرو جان چکا ہے کہ یہ گھی سیدھی انگلی سے نکلنے والی نہیں۔ ان میں ایک نئی بیداری جنم لے رہی ہے انھیں اپنے بڑے پن، اپنی صلاحیتوں اور اپنی طاقت کا ایک نیا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ امریکن نیگرو جان گیا ہے کہ آج امریکا جو کچھ بھی ہے اس کی ہی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ آج امریکن نیگرو بہترین شاعر، آرٹسٹ، مصنف، موسیقار، سائنس داں، اور کھلاڑی پیدا کر رہا ہے۔ آج امریکہ میں جتنا بھی فن جنم لے رہا ہے وہ زیادہ تر ان ہی کالوں کا مرہون منت ہے۔ خاص طور پر امریکن کھیل اور موسیقی کے میدان میں تو نیگرو پوری طرح چھایا ہوا ہے لیکن سب سے بڑی تبدیلی جو آج امریکن نیگرو میں پیدا ہوئی ہے وہ ہے اس کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ۔ کل تک نیگرو صرف پٹنا ہی جانتے تھے لیکن آج وہ طاقت کا جواب طاقت سے دے رہے ہیں۔ آج ان کے لیڈر انھیں امن اور شانتی کا پیغام دینے کی بجائے خون اور گولی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ آج ان کی زبان پر حضرت عیسیٰ اور گاندھی کا نام نہیں بلکہ ماؤ اور شی گیوارا کا نام ہے۔

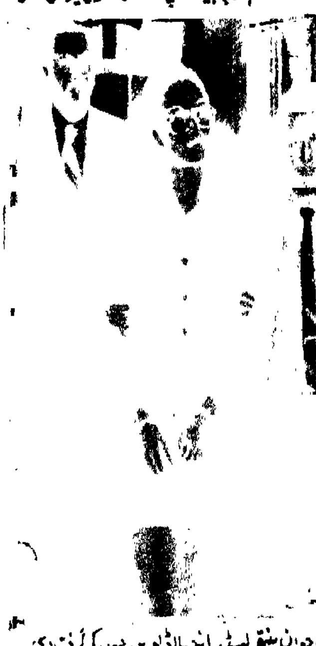
کینیڈی اور جونسن کے دور صدارت میں حالات پھر بھی اتنے زیادہ خراب نہیں تھے لیکن آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ نکسن نے شروع ہی سے کالوں سے کوئی ہمدردی نہیں دکھائی۔ نکسن کے خیال میں نیگرو تشدد کا راستہ اپنا کر



بیکس — تعلیمی اور معاشی میدان میں آگے بڑھ کر ان کالوں کے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے

غلطی کر رہے ہیں۔ انھیں انتظار کرنا چاہیئے وقت اپنے آپ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔

اس وقت امریکن نیگروؤں میں چار تحریکیں کام کر رہی ہیں پہلی تو وہ ہے جس کے خیال میں نیگرو کو گوروں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے اور اپنے مسائل کا کوئی پرامن حل



نوجوان پینتھر لیڈر۔ انجیلا ڈیوس جس کی گرفتاری نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔

...چاہیئے۔ مارٹن لوتھر کنگ کی موت کے بعد سے ...
...ہیں یقین رکھنے والوں کی تعداد کافی کمزور ہو گئی ہے
...ہے علی جاہ محمد کی بلیک مسلم تحریک۔ اب سے دو
...ال پہلے اس تنظیم نے بہت زور پکڑا تھا لیکن یہ اب
...تی کمزور پڑ گئی ہے۔ تیسری تحریک ہے نوجوان لیڈر
...سن کی تحریک جو بہت تیزی سے زور پکڑ رہی ہے۔
...ے کہنا ہے کہ کالوں کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے
... اور غیر قانونی دونوں ہی طریقے استعمال کرنے چاہئیں
...ان کہنا ہے کہ گیارہ فیصد کی اس اقلیت کے لئے
...ت سے جھگڑا مول لینا مناسب نہیں کیونکہ ایسا کیا تو
...کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ نسلی فسادات میں زیادہ تر
...ہی مارے جاتے ہیں کیونکہ پولیس اور قانون بھی

...ا ہی کا ساتھ ہے۔ اس لئے فسادات کے بعد یہ بھی الزام ہی
...ساتھ دیتا ہے۔ اور ان نیگروؤں پر ظلم و ستم کا ایک نیا
...لہ شروع ہو جاتا ہے۔ جیکسن کا کہنا ہے کہ نیگرو کے لئے
...بڑھنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ تعلیمی
...عاشی میدان میں اپنی حیثیت کو منوائے۔ نیگرو کے لئے
...ی تعلیم حاصل کرنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ ہر میدان میں



...ادی کی دیوار — ایک نیگرو نے اپنے کمرے کی دیوار پر
...تصویر بنا رکھی ہے۔

اداروں کو یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ گوروں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ دوسری طرف نیگرو کو معاشی میدان میں ترقی کرنی ہوگی اس کے لئے جیکسن نے بہت سے دلچسپ طریقے نکالے ہیں۔ ان کی جماعت کے کچھ لوگ کسی بھی فیکٹری یا فرم میں جا کر معلوم کرتے ہیں کہ وہاں کتنے نیگرو کام کر رہے ہیں، اگر وہاں نیگرو ملازمین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے تو وہ اس فرم کے مالکان کو الٹی میٹم دیدیتے ہیں کہ اگر ایک مقررہ تاریخ تک مزید کالوں کو نوکری نہیں دی جاتی تو تمام نیگرو اس فرم یا فیکٹری کا مکمل بائیکاٹ کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ کار ان علاقوں میں زیادہ کامیاب رہتا ہے جہاں نیگرو آبادی زیادہ ہے جیکسن نے اس طریقے سے کافی کامیابی حاصل کی ہے۔ اور وہ ہزاروں کالوں کو نوکری دلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ دکانیں جو نیگرو فیکٹریوں کا بنایا ہوا مال نہیں رکھتیں اس بات پر مجبور کی جاتی ہیں کہ وہ نیگرو فیکٹریوں کا مال رکھیں۔ تمام نیگرو یہ کوشش کرتے ہیں کہ صرف ایسی ہی چیزیں خریدیں جو نیگرو فیکٹریاں بنا رہی ہیں جیکسن نے اس اقتصادی بائیکاٹ کے ذریعے بہت سی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا روپیہ نیگرو بینکوں میں جمع کرائیں۔

یہ طریقہ کار استعمال کر کے انھوں نے ایک بینک کی کل رقم کو چند مہینوں کے اندر اندر پچاس لاکھ ڈالر سے دو کروڑ بیس لاکھ ڈالر تک پہونچا دیا۔ ان بینکوں سے کالوں کو بزنس شروع کرنے کے لئے قرض دیے جاتے ہیں جیکسن کا اپنی مانگیں منگوانے کا یہ طریقہ نیگروؤں میں کافی مقبول ہو رہا ہے اور آہستہ آہستہ سارے امریکا میں پھیل رہا ہے جیکسن کے خیال میں کالوں کو برابری اسی وقت مل سکے گی جب وہ گوروں کو یقین دلا دیں گے کہ ان کے بغیر امریکا کا چلنا مشکل ہے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ہر نیگرو اپنی جگہ یہ سوچ لے کہ اسے آگے بڑھنا ہے۔ اور اپنی حیثیت کو ہر میدان میں منوانا ہے۔ "جب کالے بے روزگار ہوتے ہیں تو انھیں سست اور کاہل کہا جاتا ہے، جب گورے بے روزگار ہوتے ہیں تو اسے پوری سوسائٹی کا مسئلہ کہا جاتا ہے" جیکسن کے خیال میں سوچنے کے اس ڈھنگ سے سیاست کے ذریعے نہیں لڑا جا سکتا اس سے لڑنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کوئی نیگرو ڈاکٹر ڈاکٹری اس لئے نہ کرے کہ اسے کچھ دولت چاہیئے۔ بلکہ اس لئے کرے کہ اسے کچھ کر دکھانا ہے اور اس طرح اپنی قوم کا نام اونچا کرنا ہے۔ کوئی نیگرو قانون اس لئے نہ پڑھے کہ اسے جج بننا ہے بلکہ اس لئے پڑھے کہ اسے انصاف مانگنا ہے۔ کوئی نیگرو ٹیچر کسی اسکول میں پڑھانے اس لئے نہ جائے کہ اسے چند ڈالروں کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے جائے کہ اسے علم کی شمع روشن کرنی ہے۔ خود علم حاصل کرنا ہے اور اپنے ملک کے دوسرے لوگوں کو علم کی دولت سے مالامال کرنا ہے۔"

ایک تیسری تحریک جو بہت تیزی سے امریکن نیگروؤں میں پھیل رہی ہے وہ ہے بائیں بازو کی انتہا پسند بلیک پینتھر تحریک۔ یہ لوگ اپنے کو مارکسسٹ کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں امریکن نیگرو اور ساری دنیا کے غریبوں کی اصل دشمن سامراجیت اور سرمایہ داری ہے۔ امریکن نیگرو کو نہ صرف امریکن گوروں سے لڑنا ہے بلکہ امریکن سامراجیت اور امریکن سرمایہ داری سے



بھی جنگ کرنی ہے اس جنگ میں وہ ان گورے نوجوانوں کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں جو ان کے ہم خیال ہیں۔ امریکا میں کمیونزم بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کی مقبولیت صرف کالوں ہی کے درمیان نہیں بلکہ گورے نوجوانوں کے درمیان بھی ہے۔ ویسے تو امریکا میں درجنوں تحریکیں جنم لے رہی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت بلیک پینتھر تحریک کو حاصل ہوئی ہے۔ بلیک پینتھر کے معنی ہیں کالا تیندوا۔ یہ لوگ امریکن پولیس کو سور کے لقب سے حاصل کرتے ہیں۔ انکے خیال میں امریکن سوسائٹی درست نہیں ہوسکتی جب تک کہ امریکن گوروں کو مار مار کر انسان نہ بنا دیا جائے۔ اس جماعت کا طریقہ کار ہندوستانی نکسلیوں کے طریقے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ یہ لوگ حکومت کی مختلف عمارتوں کو بم سے اڑا دیتے ہیں موقع ملنے پر پولیس والوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ گوری پولیس میں خوف و ہراس پھیلا کر اسے ناکارہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اب تک یہ لوگ بیس سے زاید گورے پولیس والوں کا قتل کر چکے ہیں۔

ان حملوں سے گھبرا کر پچھلے دنوں نیویارک کی پولیس نے ایک جلوس نکالا جس میں انھوں نے مانگ کی کہ انھیں ان لوگوں سے نپٹنے کی کھلی چھوٹ دی جائے۔

بلیک پینتھر صرف توڑ پھوڑ کی کارروائی ہی نہیں کرتے ہیں ان لوگوں نے امریکا بھر میں مختلف اسکول کھولے ہیں جہاں انھیں صحیح تعلیم دی جاتی ہے۔ روز صبح ہزاروں کی تعداد میں نیگرو بچوں کو ناشتہ فراہم کیا جاتا ہے۔ سڑک پر آوارہ گردی کرنے والے بچوں کو پکڑ کر کسی فائدہ مند کام پر لگایا جاتا ہے بلیک پینتھر تحریک کے اور بھی بہت سے پروگرام ہیں لیکن اس کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد سے اس کے پروگرام کافی ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔

امریکن حکومت نے بلیک پینتھر تحریک سے گھبرا کر اس کے لیڈروں اور کارکنوں پر ظلم و تشدد کے دروازے کھول دیئے سیکڑوں بلیک پینتھروں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ ان پر جھوٹے اور بے بنیاد مقدمے چلائے گئے۔ قانون کو بالائے طاق رکھ کر جیل میں ان پر ہر طرح کے ظلم توڑے گئے۔ لیکن لگتا ہے کہ ظلم و بربریت کا یہ سلسلہ اب زیادہ دن جاری نہ رہ سکے گا کیونکہ بیشتر امریکن نیگرو اور بہت سے گورے نوجوان انکے ساتھ ہیں۔ پچھلے دنوں اس تحریک کی لیڈر اور نوجوان حسینہ انجیلا ڈیوس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ انجیلا ڈیوس ان چند خوش نصیب کالوں میں سے ایک ہے جسے بچپن ہی سے یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس نے فلاسفی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد کانٹ کے فلسفے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ انجیلا شروع ہی سے مارکس کے فلسفے سے متاثر تھی۔ اس نے مارکس لینن اور دوسرے سوشلسٹ فلسفیوں کا بہت تفصیلی مطالعہ کیا۔ انجیلا نے مارکسزم کسی جوش سے متاثر ہو کر نہیں اپنایا بلکہ اس نے مارکسزم کو پوری طرح سمجھنے کے بعد یہ راستہ اختیار کیا۔ انجیلا کو (UCLA) یونیورسٹی میں جونیئر پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی گئی جسے اس نے قبول کر لیا۔ لیکن یونیورسٹی کی جماعت منتظمہ نے اسے اس لئے نوکری سے علیحدہ کر دیا کہ وہ کمیونسٹ تھی۔

طالب علموں اور استادوں کے سخت احتجاج پر انجیلا کو واپس بلا لیا گیا۔ جس وقت انجیلا نے اپنا پہلا لیکچر دیا اس وقت تقریباً دو ہزار طالب علم اور استاد موجود تھے چند ہی دنوں میں انجیلا یونیورسٹی کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز استاد بن گئی۔ لیکن ایک سال بعد پھر گورننگ باڈی نے انجیلا کو اس بنا پر علیحدہ کر دیا کہ وہ طالب علموں میں کمیونز

انجیلا کو شروع ہی سے بلیک پینتھروں سے ہمدردی تھی اور وہ ان کی تمام میٹنگوں میں شامل ہوتی تھی انھیں جذبات کی بجائے دماغ سے کام کرنے کی تلقین کرتی تھی اور صحیح مشورے دیتی تھی۔ پچھلے دنوں اسے تین پینتھروں کو عدالت سے فرار کرانے کی سازش میں حصہ لینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا

کہا جاتا ہے کہ ڈیوس دو ہینڈ گن، ایک رائفل اور ایک شوٹ گن عدالت میں لائی۔ سترہ سال کی ایک اور نوجوان لڑکی جوناتھن نے یہ ہتھیار عدالت کے اندر پہونچائے۔ ابھی عدالت کی کارروائی شروع ہی ہوئی تھی کہ جوناتھن نے بندوق دکھا کر تینوں پینتھروں کو آزاد کرا لیا ساتھ ہی وہ پانچ گوروں کو جس میں جج بھی شامل تھا اپنے ساتھ لے گئے۔ انکو ایک وین میں لیجایا جا رہا تھا کہ پولیس اور پینتھروں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا جس سے دو پینتھر، جج اور نوجوان لڑکی جوناتھن مارے گئے۔

انجیلا ڈیوس کو کچھ دن کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔

اس وقت بلیک پینتھر تحریک کے زیادہ تر بڑے لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں۔ لیکن توڑ پھوڑ کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

امریکن حکومت کالوں کو تو ظلم و تشدد سے دبا سکتی ہے لیکن اس کے لئے گورے تشدد پسندوں سے نپٹنا بہت مشکل ہوگا

امریکا میں ماؤ کے پیروکاروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے لیکن آنے والے چند برسوں میں یہ خطرہ نازک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکن حکومت اس خطرے سے کیسے نپٹے گی۔

بظاہر اس مسئلے کا بجز اس کے اور کوئی حل نظر نہیں آتا کہ کالوں کو بھی امریکن معاشرے میں برابری کا حق دیدیا جائے ان کو معاشرے میں وہی جگہ دی جائے جو گوروں کو حاصل ہے انکے معاشی اور تعلیمی حالات کو سدھارا جائے۔ ورنہ آج کی یہ چنگاری کل بھڑکتا ہوا شعلہ بھی بن سکتی ہے۔

قارئینِ
واقعات کیلئے خوشخبری

قارئین کے اصرار پر ہم نے واقعات کی ضخامت میں ایک کاپی (۸ صفحات) کے اضافے کا فیصلہ کیا ہے لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

واقعات جیسے بلند معیار پرچے کے لئے یہ اضافہ ایک بھاری بوجھ ہے اور اس کی تلافی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ قارئین اس کی توسیع اشاعت کے لئے بھرپور کوشش کریں۔

ہم نے یہ اضافہ اس لئے کیا ہے کہ قارئین تک زیادہ سے زیادہ موضوعات پر زیادہ سے زیادہ معلومات پہنچا سکیں ہمیں یقین ہے قارئین اور ایجنٹ حضرات ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔

(منیجر واقعات)

(سلسل)

خروشچیو کی گمشدہ ڈائری کے اوراق

کبیر کوثر



دوسری جنگ عظیم نے سب سے زیادہ نقصان روس کو پہنچایا۔ جنگ کے اختتام کے بعد معلوم ہوا کہ روس اپنے سوا دو کروڑ شہریوں، فوجیوں اور دانشوروں سے محروم ہو چکا ہے۔ اس عظیم نقصان کی وجہ اسٹالن اور ہٹلر کا وہ صلحنامہ تھا جو ۱۹۳۹ء میں ہوا اور جس کی رُو سے دونوں ملکوں نے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ صلح نامہ اسٹالن نے صیغۂ راز میں رکھا تھا اور دونوں فریقوں کے دستخطوں کے ایک روز بعد جب میں اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیل کر اسٹالن کے مضافاتی مکان پر مع شکار کے پہنچا تو کھانے کی میز پر اسٹالن نے اپنے رفقائے کار سے کہا:

"کامریڈز ہٹلر کے وزیر خارجہ وون ربن ٹراپ اپنے ساتھ روس، جرمنی دوستی کا عہدنامہ لے کر آئے تھے جس پر ہٹلر کے دستخط موجود تھے۔ میں بھی اس معاہدہ پر دستخط کر چکا ہوں۔" تھوڑی دیر شغلِ شراب میں منہمک رہنے کے بعد اسٹالن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بدمستی کے عالم میں کہا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو احمق بنانے کے کھیل میں مصروف ہیں۔ ہر ہٹلر کا خیال ہے کہ انہوں نے مجھے بے وقوف بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے انہیں احمق بنا دیا ہے۔"

اسٹالن کے اس انکشاف نے ہم سب کو چونکا دیا۔ چونکہ یہ صلح نامہ روس کی خودکشی کے مترادف تھا۔ ایک طویل خاموشی اور بھیانک سناٹا اُس کھانے کی میز پر پھیلا ہوا تھا۔ اسٹالن کو جب یہ احساس ہوا کہ اس کے ساتھی اس کی اس بے وقوفی سے متاثر ہیں۔ تو اس نے ایک بار پھر خاموشی کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔

" انگریز اور فرانسیسی ہٹلر کے 'پہلے مغرب کو تباہ کر دو پھر مشرق کی جانب رُخ کرو' والے منصوبے کے شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے ہی جرمنی کی طاقت کو کچل کر رکھ دیں گے۔"

اگرچہ اسٹالن نے اس صلح نامہ پر دستخط کر کے تاریخ عالم میں ایک عظیم غلطی کا ارتکاب کیا تھا لیکن بقول اس کے کمیونسٹ پارٹی کے ممبران کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے اس عہدنامہ پر دستخط کئے تھے۔ بہرحال جرمنی کی فسطائی قوت سے روس کی اشتراکی حکومت کا یہ پیمانِ وفا اتنے صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا کہ کبھی بھی پارٹی سطح پر افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر بحث و مباحثہ نہیں ہوا۔

اسی دوران اسٹالن سے ایک اور عظیم غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے فن لینڈ کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی سرحدوں پر متعینات کی ہوئی فوجوں کو جنوب سے ہٹا کر شمالی سرحدوں پر جمع کرے۔ تاکہ روس کا دوسرا عظیم شہر لینن گراڈ فن لینڈ کی فوجوں کے توپخانے کی زد سے محفوظ ہو جائے۔ لیکن فن لینڈ کے انکار پر اُس نے فوج کشی کا حکم دے دیا۔ فن لینڈ کی اس جنگ نے جو ۱۹۴۰ء کے دوران ہوئی دس لاکھ روسی

[illegible]

●

...روشچیو کی خودنوشت
...ریخ حیات کی دوسری
... حاضر ہے۔ جس کے
... سے میں خود خروشچیو
... ہے کہ انہوں نے
... لکھی۔ مغربی اخبارات
... دعوی ہے کہ یہ داستان
... روشچیو ہی کی ...
... ان کے پاس خروشچیو
... کی لکھی ہوئی
... ربط داستان
... موجود ہیں جو ان کے
... روس
... شکل لی گئی ہیں۔
... سچ ہے اور کیا جھوٹ
... نہیں جا سکتا
... اس ڈائری نے تمام
... میں تہلکہ مچا دیا

●

افواج کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن لینڈ جیسی معمولی طاقت کے ہاتھوں اتنا عظیم نقصان اٹھانے جانے پر تمام دُنیا کی نظروں میں روسی فوجی طاقت کا بھرم کھل گیا۔ سٹالن اپنی اس حماقت پر اتنا چراغ پا ہوا کہ اس نے محکمہ دفاع کے کیسار Commissar وار شیلوو کو کریملن میں بُلانے کے بعد اس سے اپنا فوجی لباس اتار دینے کو کہا۔

وار شیلوو نے اس حکم کی تعمیل کی بجائے کہا:

" روسیوں کے اس عظیم نقصان کا باعث تم ہو اور تمہارا طفلانہ فیصلہ ہے۔ ہمارے بہترین جرنیلوں کی موت کی ذمہ داری تمہارے ہی کاندھوں پر ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کھانے کی میز پر رکھے ہوئے ایک گوشت کے ٹکڑے کو پلیٹ سے اٹھا کر میز پر پسل کر رکھ دیا۔

روس پر جرمنی کے حملے کے دوران مجھے یوکرین میں پولٹ بیورو کا نمائندہ بنا دیا گیا تھا۔ جرمنی کے حملہ سے قبل اسٹالن پر ہٹلر کا بے پناہ خوف طاری تھا اور وہ اپنے نیالوں کے محل میں بیٹھا ہوا یہ توقع کرتا رہتا تھا کہ جرمن فوج اس پر حملہ نہیں کرے گی۔ اس لئے جب ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمنی فوج نے رُوس پر حملہ کیا تو اسٹالن نے رُوسی فوج کے کمانڈروں کو جوابی حملہ کرنے سے روک دیا موت کا بگل بج چکا تھا لیکن وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ حملہ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

یوکرین کے سبزہ زاروں پر جب نازی بھیڑیوں نے آگ اور خون کے دریا بہا دیئے اور نہتے یوکرینی باشندے جرمنی کے ٹینکوں کے تلے سبزے کی طرح کچلے جا رہے تھے میں نے اسٹالن کو صورتِ حالات سے مطلع کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے حکم دیا گیا کہ میں ریاستی دفاعی محکمہ کی کمیٹی کے رکن جارجی مالنکوف سے بات کروں۔ میں نے مالنکوف کو جرمنی کے شدید حملہ اور یوکرین کی بے لبسی سے مطلع کرتے ہوئے فوج طلب کی اور اسلحہ مانگے۔

ٹیلیفون پر جواب دیتے ہوئے مالنکوف نے کہا " تمہیں یوکرین کی فیکٹریوں کی بنائی ہوئی کلہاڑیوں، تلواروں اور نیزوں پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔"

میں یہ جواب سُنکر حیران ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم جرمنی کے ٹینکوں پر نیزوں سے حملہ کریں

مالنکوف نے یہ جواب دیتے ہوئے ٹیلیفون رکھ دیا کہ مٹی کے تیل کی بوتلوں میں آگ لگا کر ٹینکوں پر پھینکنا شروع کر دو"

اور جب نازی افواج کریملن سے کچھ دُور رہ گئیں تو اسٹالن پر اتنا خوف طاری ہوا کہ وہ خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں پناہ لینے لگا اور مارے غصے کے ان جنرلوں کے خاندانوں کو سائبیریا پہونچانے لگا جو حملہ آوروں کے قیدی بن چکے تھے اس پر ہٹلر کا اتنا خوف چھایا کہ اس نے سرکاری کاغذوں پر دستخط کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور اپنے سایہ سے بھی لرزنے لگا۔ ۱۹۴۲ء میں جب خارکوف کے مقام پر ڈولاکھ روسی فوج کے سپاہی اور افسران نازی افواج کے ہتھیاروں کی بھینٹ چڑھ گئے تو اس نے کئی جنگی روسی افسران کو اس نقصان کا ذمہ دار قرار دیکر موت کے آغوش میں پہونچا دیا۔ اُنہی دنوں اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر بات کرتے ہوئے کہا۔

" خرد شیچو، تمہیں یاد ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم میں ایسی ہی غلطی کی بنا پر زارِ روس نے ایک جنرل کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا تھا"

میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب میرا وقت بھی آپہنچا جواب میں اس سے کہا،

" کامریڈ اسٹالن مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ اور زار نے واقعی اسے پھانسی پر لٹکا کر انصاف کیا تھا۔ چونکہ میزا نیکوف غدار تھا۔ خارکوف کے معرکہ میں پہلے ہی صلاح دے چکا تھا کہ وہاں سے فوج کی بڑی تعداد ہٹالی جائے"۔

بہر حال میری جان بچ گئی۔

اسٹالن گراڈ میں جب نازیوں کا جھنڈا ڈیڑن مارا گیا اور جنگ کی ہوا کا رُخ بدلتا ہوا صاف صاف معلوم ہونے لگا تو اسٹالن نے زخمی اور مُردہ نازی سپاہیوں کی لاشوں کو اکٹھا کر کے بجائے دفن کرنے کے جلا دینے کا حکم دیدیا۔

نپولین کہا کرتا تھا کہ دشمنوں کی لاشوں کو نذرِ آتش کرنے ... ایک پسندیدہ خوشبو پھوٹ کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے لیکن مجھے نپولین کے اس خیال سے اتفاق نہیں۔ مجھے ج... عظیم ثانی پر لکھی ہوئی روسی تاریخوں سے بھی اتفاق نہیں جن... رُوسی افواج کے دلیرانہ اور سرفروشانہ کارناموں کا ذکر... اور نہ مجھے اتحادیوں کے اُن کارناموں سے اتفاق ہے جن... ذکر ان اوراق پر کئے جاتے وقت اصلیت سے قطع نظر ... کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسٹالن پر حقائق روزِ روشن کی طر... واضح تھے اس نے ان پر تنہا اپنے غسلخانے ہی میں غور ک... لیکن محفلوں اور مجلسوں میں شرکت کرتے ہوئے وہ ا... پر جھوٹ کے کثیف اور دبیز غلاف چڑھا دیا کرتا تھا۔ چنا... جب برطانیہ اور امریکہ سے غذائی اور دفاعی کمک کے قافل... روس کی سرزمین پر آنا شروع ہوئے تو اس نے ایک ہی سا... میں آئزن ہاور کی تعریف کرتے ہوئے صدر ٹرومین ک... مذمت بھی کی۔

میں اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا ج... میں نے زو خوف کی زبانی ہٹلر کی موت کی خبر سنکر اسٹا... کو مُبارکباد پیش کی تھی۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے بڑے تلخ لہجہ میں کہا تھا،

" کامریڈ، فضول باتیں سُننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے"

گویا اُسے رُوس کی فتح کامل کا یقین تھا لیک... میں بخوبی جانتا ہوں کہ جنگ کے دوران وہ اسقدر خو... اور ہراساں تھا جس کا تصور بھی اس کے حواریین ... بعید تھا۔

**

میں اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب میں نے زو خوف کی زبانی ہٹلر کی موت کی خبر سنکر اسٹالن کو مبارکباد پیش کی تھی۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔" کامریڈ فضول باتیں سننے کیلئے میرے پاس وقت نہیں ہے"

مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئی ریاست کا ظہور



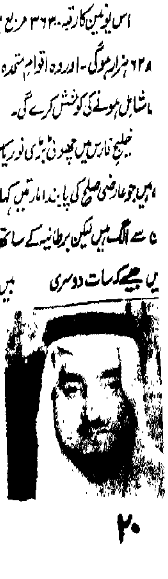
بحرین کے شیخ عیسیٰ تہران کے
نیاوران محل میں
شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کے ساتھ

مشرقِ وسطیٰ میں ایک اور عرب ریاست عنقریب
وجود میں آنے والی ہے۔ یہ ریاست خلیج فارس کے علاقہ
ئم ہوگی۔ اور ابتداء میں تین موجودہ امارتوں یعنی (۱)
ابی (۲) قطار (۳) دوبئی پر مشتمل ہوگی۔ اس کے قیام کا
ن سال رواں کے اختتام سے قبل ہی کر دیا جائے گا۔ جبکہ
نوی فوجیں اس علاقہ کو خالی کریں گی۔

پانچ دوسری امارتوں (۱) شارجہ (۲) عجمان (۳) ام القوین
) راس الخیمہ اور (۵) فجیرہ۔ فی الحال دفاع اور امور خارجہ
مجوزہ ریاست سے تعلق رکھیں گی اور باقی معاملات میں آزاد
ہیں گی۔

اس یونین کا رقبہ ۳۶۳۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ۲
۲۲۸ ہزار ہوگی۔ اور وہ اقوام متحدہ اور عرب لیگ کے اداروں
ں شامل ہونے کی کوشش کرے گی۔

خلیجِ فارس میں چھوٹی بڑی نو ریاستیں ہیں جن میں سات
ہیں جو عارضی صلح کی پابند امارتیں کہلاتی ہیں۔ قطار اور بحرین
ن سے الگ ہیں لیکن برطانیہ کے ساتھ اُن کے بھی ایسے ہی معاہدے
یں جیسے کہ سات دوسری ہیں۔ برطانیہ کے ساتھ سب



شہزادہ فاہد
ابن عبدالعزیز
سعودی عرب کے
نائب وزیر اعظم اور
وزیر خارجہ

سے پہلا معاہدہ ۱۸۲۰ء میں ہوا تھا جبکہ ان امارتوں نے اس پابندی کو قبول کیا تھا کہ وہ بحری قزاقی نہیں ڈالیں گی۔ دراصل اس زمانہ میں برطانیہ اس علاقے کو اور پورے ایشیا کو لوٹ رہا تھا۔ جس کے جواب میں اس علاقے کے لوگ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں پر حملے کرتے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں برطانیہ اور ان کے درمیان مستقل امن کا معاہدہ ہوا اور اس کے بعد برطانیہ اپنے تسلط کو مضبوط کرتا رہا۔ نتیجہ میں ۱۸۹۲ء میں ایک اور خصوصی معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کے تحت ان امارتوں کے امور خارجہ کو برطانیہ نے قطعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ان کی آزادی پوری طرح سلب کر لی گئی۔ اور اتنی سخت پابندیاں عائد کی گئیں کہ برطانیہ کے علاوہ ان امارتوں کو کسی اور کے ساتھ خط و کتابت تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ وہ کسی غیر ملکی ایجنٹ کو اپنے یہاں بلا سکتی تھیں اور نہ انھیں برطانیہ کے علاوہ کسی اور ملک کے حق میں اپنے کسی علاقہ سے دستبردار ہونے یا اسے فروخت کرنے کی آزادی تھی۔

لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ حالات بدلے اور بین الاقوامی دباؤ سے حکومت برطانیہ جہاں اپنے دوسرے بیرونی مقبوضات چھوڑنے کے لئے مجبور ہو گئی۔ وہاں اس نے ۱۹۷۱ء کے اختتام تک خلیج فارس کے علاقہ کو بھی خالی کرنے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ کے اس اعلان سے قدرتی طور پر چھوٹی چھوٹی امیروں کو اپنے تحفظ کی فکر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے اور اس علاقے کے مستقبل پر غور و خوض کیا۔ انھوں نے اس علاقے کے تحفظ کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ برطانیہ نے اپنا اعلان جنوری ۱۹۶۸ء میں کیا تھا اور مارچ ۱۹۶۸ء میں ان امیروں نے اپنی ایک فیڈریشن قائم کرنے کی داغ بیل ڈال دی۔ اس میں قطار اور بحرین کو بھی شامل کیا گیا تھا لیکن یہ محض ایک برائے نام یونین تھی۔ جب بھی حکمران کوئی ٹھوس پروگرام طے کرنے کے لئے جمع ہوئے وہ کسی فیصلہ پر نہ پہونچ سکے۔ کیونکہ ان میں باہم بد اعتمادی پائی جاتی تھی۔ اور کوئی بھی اپنے ذاتی مفادات اور اپنی مطلق العنانیت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہر حکمران محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنی امارت کا بادشاہ ہے۔ لیکن اب جوں جوں برطانوی انخلاء کا وقت قریب آرہا ہے ان امارتوں میں اپنے تحفظ کا احساس بڑھ رہا ہے اور علاقہ کی اہمیت کے پیش نظر وہ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگی ہیں۔

اس علاقہ کی اہمیت یوں تو ہمیشہ ہی رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ مشرق و مغرب کے درمیان اہم تجارتی گزرگاہ رہا ہے۔ لیکن تیس چالیس سال کے عرصہ میں جب سے کہ اس علاقہ میں تیل برآمد ہوا ہے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق دنیا میں تیل کا جتنا ذخیرہ ہے اس کا ساٹھ فی صد اسی علاقہ میں موجود ہے۔ جس پر صرف بڑے ممالک ہی کی نہیں بلکہ چھوٹے ممالک کی بھی نظریں ہیں۔ باقی صفحہ پر

واقعات نئی دہلی

مشرق وسطیٰ

آتش فشاں

"آپ کس ایئر لائن کے جہاز سے تشریف لائے" اسرائیلی وزیر اعظم مسز گولڈا مائر نے سکوت کو توڑتے ہوئے اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندہ ڈاکٹر گنار یارنگ سے دریافت کیا۔

"ال آل" سے"— ڈاکٹر یارنگ کا جواب تھا۔

ڈاکٹر یارنگ اپنے خاص مشن پر نیویارک سے یروشلم پہنچے تھے۔ اور وزیر اعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر اور وزیر خارجہ مسٹر ابا ایبان سے بات کر رہے تھے۔ عام طور پر ملاقاتوں میں اسی قسم کی باتوں سے سکوت ٹوٹتا ہے۔ ہم لوگ جب کوئی مسئلہ نہ ہو تو موسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

"آج سردی بہت ہے۔ اس مرتبہ خشک سردی پڑ رہی ہے" ایک شخص بولے گا اور فوراً دوسرا سپر ڈال دے گا۔ "جی ہاں اسی لئے اس مرتبہ بیماریاں زیادہ ہیں۔ جسے دیکھو بخار میں پڑا ہے" اسرائیلی وزیر اعظم کو شاید "موسم" اپنے خلاف نظر آیا اس لئے انھوں نے موسم کی نہیں بلکہ ہوائی جہاز کی بات پوچھی اور جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر یارنگ اسرائیلی کمپنی کے جہاز سے آئے ہیں تو خوش ہو کر بولیں "جی ہاں یہ بڑی محفوظ کمپنی ہے اس کا کوئی طیارہ "ہجیک" نہیں ہوا۔ لیکن کوئی طیارہ "ہجیک" ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن عربوں کے خیال میں ڈاکٹر یارنگ کا "ہجیکنگ" (اغوا) ضرور ہو گیا۔ نیویارک سے یروشلم تک ۴۴۱۲ میل کا ان کا آنا جانا محض اس لئے تھا تاکہ "امن مذاکرات" کے طریقہ کار کے بارے میں اسرائیلی ذمہ داروں کے ساتھ بات چیت کر لی جائے۔ اسرائیلیوں کو بات چیت کے اصل مقصد کے مقابلے میں اس کے طریقۂ کار کی زیادہ فکر ہے۔ اس بارے میں نیویارک میں بھی بات چیت ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر یارنگ کو اس کے لئے یروشلم بلایا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا۔ اس کی توضیح اسرائیلی لیڈر ہی کر سکتے ہیں۔

لیکن اس کے علاوہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسرائیل شاید اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا لیکن اس کی کیا اہمیت ہے دنیا والے جانتے ہیں امریکہ پشت پناہی نہ کرے تو طاقت کا سارا بھانڈہ پھوٹ جائے۔ "امن مذاکرات" سفیروں کی سطح پر ہو رہے ہیں اور آج کل مان ہٹن میں اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کی ۳۸ ویں منزل ان مذاکرات کا مرکز ہے۔ ڈاکٹر یارنگ کا دفتر یہیں واقع ہے۔ عرب ممالک چاہتے ہیں کہ یہ مذاکرات نیویارک میں سفیروں کی سطح پر ہی ہونے چاہئیں تاکہ اسرائیل پر ایک طرح کا بین الاقوامی دباؤ رہے جبکہ اسرائیل چاہتا ہے کہ وہ قبرص، روڈز، کریٹ یا بحیرہ روم کے کسی اور علاقہ میں ہوں اور ان میں سفیروں کے بجائے وزراء خارجہ



انور السادات نے عوام سے پوچھا " کیا آپ جنگ سے تھک چکے ہیں" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا "نہیں نہیں ہم لڑتے رہیں گے"

مصر لیبیا اور بالمشافہ گفتگو ہو لیکن عرب بالمشافہ گفتگو کے لئے تیار نہیں کیونکہ وہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔

"تازہ اطلاعات کے مطابق اسرائیل تیار ہو گیا ہے کہ اگر بات چیت نیویارک میں جاری رہتی ہے تو جاری رہے لیکن اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ عربوں کا کہنا ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے قبل اسرائیل کو تمام مقبوضہ عرب علاقے خالی کر دینے چاہئیں لیکن اسرائیل کا کہنا ہے کہ جب تک اسرائیل کی مستقل اور محفوظ سرحدیں طے نہ کی جائیں گی اس وقت تک وہ ان علاقوں کو خالی نہ کرے گا۔

ڈاکٹر گنار یارنگ اس امید میں اسرائیل آئے تھے کہ شاید وہاں کوئی ٹھوس چیز مل سکے گی۔ لیکن عرب حلقوں کے مطابق وہ "خالی ہاتھ" آئے ہیں اور اسرائیل نے اپنی وہی پرانی تجاویز دہرا دیں جن کا وہ بار بار اعلان کرتا رہا ہے بات چیت میں وقت گذر رہا ہے اور جنگ بندی کے خاتمہ کا وقت قریب آرہا ہے۔ آئندہ ماہ کی پانچ تاریخ کو وہ ختم ہو جائے گی۔ اسی لئے بعض حلقوں میں فکر و تشویش کے ساتھ پوچھا جا رہا ہے کہ کیا اسمیں مزید توسیع ہو گی۔ ؟ متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر مسٹر انور سادات اعلان کر چکے ہیں



گنار یارنگ، گولڈا مائر اور ابا ایبان یروشلم میں

کہ وہ مزید توسیع صرف اسی صورت میں قبول کریں گے بات چیت میں کوئی ٹھوس اور مثبت پیش رفت عمل میں آئے اسلئے کہ وہ جنگ بندی کی حالت جاری رکھ کر عربوں کو حالت پر قناعت کرنے کا عادی نہیں بنانا چاہیے۔

بات کسی حد تک صحیح ہے جب اسرائیل نے مقبوضہ علاقے جنگ ہی کے ذریعے حاصل کئے ہیں تو یہ جنگ دوبارہ کیوں نہ لڑی جائے۔ غالباً انور سادات اسی اصول پر اپنا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اور وہ ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

گذشتہ ہفتہ انہوں نے دریائے نیل کے ڈیلٹا میں تانتا میں جو تقریر کی اس سے انکے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے بارہ ہزار کے جلسہ میں اعلان کیا "مقبوضہ علاقوں کے بارے میں اسرائیل سے کوئی مصالحت نہیں ہو گی، ہم انچ زمین نہیں چھوڑیں گے، یہ لڑائی ہمارے کھیتوں، ہماری فیکٹریوں، ہمارے شہروں، قصبوں اور سڑکوں پر لڑی جائے گی۔" ایسے ہی عزم کا اظہار عام مصریوں نے بھی کیا۔ سادات نے جب ان سے پوچھا "کیا آپ لڑائی سے بیزار ہیں، کیا آپ واقعی لڑائی سے تھک گئے ہیں" اور تمام حاضرین نے بلند آواز سے جس نے پوری فضاء کو گونجا دیا جواب دیا "ہم لڑیں گے ہم لڑیں گے"۔ "سادات تو ہماری رہنمائی کر کہ ہم آزادی سے ہمکنار ہوں"

ہیئے کہ مشرق وسطیٰ آج بھی ایک آتش فشاں ہے کب پھٹ پڑے ■ ■

ملیشیا

مینڈکوں کی لڑائی

ات سے کوئی ملک خالی نہیں، ملیشیا میں بھی لوگ بقائل رہا۔ کہتے ہیں جب مینڈکوں میں لڑائی ہوتی نہ کوئی آفت آتی ہے؟ پچھلے دنوں کوالالمپور سے ال مشرق میں پچاس مینڈکوں کے درمیان سخت ڑائی ہوگئی ــ اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ کمک کی ضرورت محسوس کی گئی اور جلد ہی لڑنے والے کی تعداد تین ہزار تک پہونچ گئی۔ یہ جنگ دو جاری رہی اور جب صلح ہوئی تو میدان جنگ میں ولاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

س قسم کی لڑائیاں ملیشیا میں عام طور پر نظر آیا ہے۔ جانور شناسوں کا کہنا ہے کہ یہ جوڑے جوڑے ملنے زمین حاصل کرنے کی جنگ ہے ــ انسان کے لئے لڑتا ہے تو مینڈک کو کس نے روکا ہے۔ تو ہم پرست ملیشیائیوں کا کہنا ہے کہ یہ لڑائیاں فت کا پیش خیمہ ہوتی ہیں، ثبوت میں یہ لوگ ہیں کہ ۱۹۴۰ء میں مینڈکوں کی لڑائی ہوئی تو ہوں نے ملایا پر حملہ کیا۔ اسی طرح دہشت پسند سٹوں کے خلاف جب ۱۲ سالہ جنگ شروع ہوئی ں سے قبل ۱۹۴۸ء کے اوائل میں کیدہ کے مقام ڈک باہم لڑے تھے۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں جب بنیاد پر فسادات بھڑکے تو اس سے پہلے پینانگ یب مینڈکوں کی جنگ ہوئی تھی۔ پس جب گزشتہ رمیں سنگی سی پت میں مینڈکوں کی جنگ کی خبر ملی ہم پرستوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ملک پر کوئی آفت نے والی ہے اور واقعی یہ آفت آگئی اور اسی ماہ س کا اتنا زبردست طوفان آیا کہ ملک کی تاریخ بھی نہیں آیا تھا۔ ۱۶۰ اشخاص اس طوفان کے میں ہلاک ہوگئے اور دو لاکھ سے زائد گھر سے بے گھر ئے اور بارش کے پانی میں ایسے گھرے کہ ان کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ کوالالمپور تک کو خطرہ پیدا ہوگیا اس لئے کہ شہر میں بہنے والے دو دریاؤں میں زبردست طغیانی آگئی اور ان کا پانی پھیل گیا ــ عبدالرزاق وزیر اعظم ملیشیا نے ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیا، اور انہوں نے ساری توجہ مصیبت زدوں کی مدد کی طرف لگا دی اور بہت سے دوسرے ممالک نے بھی امداد دی ــ

لیبیا

قزافی کو مطمئن کرنا ہوگا

مغربی ممالک کے تقریباً تمام شہرت یافتہ رسائل اور اخبارات جو لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں مشرق وسطیٰ کے بارے میں کچھ ایسا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ عرب ممالک کو اسی طرح باہم لڑایا جائے جس طرح کہ وہ اب تک لڑتے رہے ہیں۔ انور سادات کے بارے میں انہوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ وہ عرب کاز کے مقابلہ میں خود اپنے ملک کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں اور اسی لئے وہ امن چاہتے ہیں۔ کرنل قزافی کے بارے میں ان کا پروپیگنڈا ہے کہ ان کے اندر حد سے زیادہ امنگ ہے اور وہ عبدالناصر کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ مقصد شاید یہ ہے کہ انور سادات اور قزافی میں اختلافات پیدا کیا جائے جو وفاقی یونین کے چار ملکوں میں سے دو اہم ملکوں کے سربراہ ہیں (باقی دو ملک سوڈان اور شام ہیں)

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ کرنل قزافی اسرائیل کے معاملہ میں بہت سخت پالیسی کے حامل ہیں۔ نہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ امن مذاکرات پر یقین رکھتے ہیں ایسی حالت میں اگر کوئی مفاہمت ہوگی جس کا امکان بہت کم ہے، تو یقیناً انور سادات قزافی کو اعتماد میں لیں گے۔ عرب یونین کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔

قزافی جنہوں نے ریگستان میں ایک خانہ بدوش خاندان کے خیمہ والے گھر میں جنم لیا بڑا آزاد ذہن رکھتے ہیں۔ آہنی عزم کے مالک نہ ہوتے تو صرف ۲۰ برس کی عمر میں اپنے ملک کے سربراہ نہ بن سکتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں شاہ ادریس اول کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد صرف پندرہ ماہ میں انہوں نے ملک میں بڑے بڑے انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان ہی میں ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تیل کی غیر ملکی ۳۳ کمپنیوں پر جو لیبیا میں تیل نکالتی ہیں ٹیکس لگا کر ملک کی قومی آمدنی میں ۳۳ کروڑ ڈالر کا اضافہ کر دیا۔ غیر ملکی بینکوں کو بھی انہوں نے قومی ملکیت میں لے لیا۔ اور ۶۰ فی صدی غیر ملکی بیمہ کمپنیوں کو ضبط کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ بہت سی سماجی اصلاحات بھی جاری کیں، مثلاً شراب بندی کی اور نائٹ کلبوں کی لعنت کو ختم کیا۔ نیز وہیلس کے ہوائی اڈے سے چھ ہزار امریکی فوجیوں کو بھگا دیا۔ اور ۲۵ ہزار اطالوی نو آباد کاروں کو نکالا جو مقامی آبادی کی لوٹ کھسوٹ کر رہے تھے۔

لیبیا آج عرب ممالک میں اسی طرح مالدار ملک سمجھا جانے لگا ہے جس طرح سعودی عرب کو سمجھا جاتا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کو نہر سویز کے بند ہونے سے جو نقصان ہو رہا ہے اسکی تلافی کرنے میں لیبیا بھی ہاتھ بٹاتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب لیبیا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے تحت آزاد ہوا۔ (اس وقت تک اٹلی کی تولیت میں تھا) تو اسکے بجٹ کے نقصان کو پورا کرنے کے لئے برطانیہ اور امریکہ کروڑوں پونڈ اور ڈالر کی امداد دیتے تھے۔ اور اس کے بدلے میں دونوں ملکوں نے یہاں اپنے فوجی اڈے قائم کئے لیکن ۱۹۵۹ء میں تیل کی برآمد کے بعد اس کی سالانہ آمدنی ایک ارب ۲۰ کروڑ ڈالر تک پہونچ گئی ہے جبکہ اخراجات صرف ۴۳ کروڑ ہیں۔ باقی روپے سے لیبیا دل کھول کر دوسرے عرب ملکوں کی امداد کرتا ہے۔ شام کے صدر حافظ الاسد سے مسٹر قزافی ملنے کے لئے گئے تو ایک کروڑ ڈالر کا چیک انکے لئے چھوڑ آئے۔

لیبیا شمالی افریقہ کی مملکت ہے۔ اس کا رقبہ ۶،۷۹،۳۵۸ مربع میل اور اسکی آبادی (۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق) ۱،۳۸۰،۰۰۰ ہے۔ آزادی کے بعد سنوسی مذہبی فرقہ کے رہنما محمد ادریس المہدی السنوسی کو بادشاہ بنایا گیا وہ ۱۹۲۲ء سے جلاوطن تھے ■ ■



کرنل قزافی ۔ جو اسرائیل کے معاملے میں بہت سخت پالیسی کے حامل ہیں

واقعات نئی دہلی

اسرائیل

بایاں بازو کامیاب

اسرائیل نے گذشتہ ستمبر میں امن کے مذاکرات سے [illegible]ی اختیار کی تھی لیکن اب دوبارہ بات چیت میں شریک [illegible]نے کے لئے تیار ہوگیا ہے۔ کچھ اس لئے کہ امریکہ کی طرف سے [illegible] ڈالا گیا اور زیادہ اسلئے کہ خود اندرون ملک بائیں بازو کی [illegible] کی طرف سے زور دیا گیا کہ اسرائیل کو [illegible] میں حصہ [illegible] چاہیئے۔ اس سوال پر اسرائیلی کابینہ میں بڑی طویل بحث [illegible]۔ ایک گروہ جس میں نائب وزیر اعظم ایگل ایلن وزیر خارجہ [illegible]بان اور وزیر خزانہ پنہاس سا پیر جو وزیر اعظم کے دائیں [illegible] ہیں جلد از جلد بات چیت میں شمولیت کا حامی تھا اور [illegible] گروہ جس کی قیادت وزیر اعظم گولڈا مائر کرتی تھیں اور [illegible] کابینہ کے شعبہ خاص اسرائیل گہیلی شامل تھے اسبات پر مصر تھا [illegible]ت چیت سے قبل متحدہ عرب جمہوریہ کو نہر سویز کے علاقہ سے [illegible] اپنی تنصیبات ہٹالینی چاہئیں۔ وزیر دفاع موشے دایان [illegible]ن کے بین بین تھے۔



بات چیت [illegible] فیصلہ۔ اسرائیلی [illegible] کیا۔ [illegible] وزیر اعظم گولڈا مائر اور ایلن [illegible] ہوئے نظر آرہے ہیں

واقعات شٹھور [illegible]

بالآخر پارلیمنٹ میں معاملہ گیا اور اسرائیلی سینٹ (پارلیمنٹ) نے ۴۰ کے مقابلہ میں ۸۰ ووٹوں سے شرکت کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ اس سے قبل مسز گولڈا مائر نے اعلان کیا تھا کہ انکی سرکار بات چیت میں شرکت کے لئے تیار ہے لیکن اسکے لئے شرط یہ ہے کہ:۔

۱: امریکہ اسرائیل کی فوجی اور اقتصادی امداد کا طویل مدتی پروگرام بنائے۔

۲: وزیر خارجہ امریکہ مسٹر راجرس اپنی اس تجویز کو واپس لیں کہ "غیر واقعی ٹکڑوں" کے علاوہ اسرائیل سب عرب مقبوضہ علاقے خالی کردے۔

امریکہ پچاس کروڑ ڈالر کی فوجی امداد جس میں خاص طور پر جیٹ فائٹر، الیکٹرونک سامان اور ٹینک شامل ہوں گے دینے کے لئے تیار ہوگیا لیکن مقبوضہ عرب علاقوں کی واپسی کی تجویز کو واپس لینے سے انکار کردیا۔

اسرائیل بات چیت میں حصہ لینے کے لئے بہرحال تیار ہوگیا۔ اور بائیں بازو کو دائیں کی شدت پسند پالیسی کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی۔

فلاحی اقدام

۶۰ لاکھ کا ٹرسٹ

ایک ایسے وقت جبکہ نظام حیدرآباد کسی ریاست کے حکمران نہیں ہیں انکی طرف سے ساٹھ لاکھ کے فلاحی ٹرسٹ کا قیام ایسا لیبرانہ اقدام ہے جس کا ان تمام طبقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا جو ملک کے کسی طبقے کو پسماندہ یا پچھڑا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ ٹرسٹ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کام کرے گا۔ اور ان کے لئے عام اور اخلاقی تعلیم کا بندوبست کرے گا۔

نظام حیدرآباد کو یہ قدم اٹھانے کی ترغیب شاید اسلئے ہوئی کہ سابق ریاست حیدرآباد یا تلنگانہ کے علاقہ کے مسلمان آزادی کے ۲۳ سالہ دور میں زندگی کے تمام شعبوں خاصکر تعلیمی شعبے میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ملازمتوں میں صنعت و حرفت اور تجارت میں اور دوسرے تمام شعبوں میں انکی پسماندگی ظاہر و نمایاں ہے، ہاں "رکشا پلر وں" کے "شعبہ" کو اگر اسے واقعی شعبہ کہا جا سکتا ہے تو انہوں نے خوب ترقی کی ہے اور صرف حیدرآباد کے ۲۵ ہزار رکشا پلروں میں اپنی تعداد کو ۲۳ ہزار تک پہونچا دیا ہے۔

لیکن یہ حالت صرف حیدرآباد آندھرا کے دوسرے علاقوں تک ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسری ریاستوں کے بیشتر حصوں میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے مسلم تنظیمیں اس کمی کو دور کرنے میں بڑا رول ادا کر سکتی تھیں لیکن انہیں باہم دست و گریباں ہونے ہی سے فرصت نہیں ہے۔ یوں الگ الگ کافی شور مچاتی ہیں۔ اور قراردادیں بھی منظور کرتی ہیں۔ لیکن اگر اس طرح شور مچانے یا قراردادیں پاس کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا تو اب سے بہت پہلے حل ہو چکا ہوتا۔ اس کے لئے تو ٹھوس اور تعمیری اقدام کی ضرورت ہے اور ان مسلم تنظیموں کے پاس اسی چیز کی کمی ہے۔

نظام حیدرآباد کا اقدام ان تنظیموں کے لئے ایک سبق ہے۔ قدرت جس سے چاہے کام لے۔ یہ تنظیمیں جو مسلمانوں کی خدمت کا بڑا دم بھرتی ہیں۔ دیکھتی رہیں اور نواب برکت علی خاں اپنا کام کر گئے۔ حقیقتاً انہوں نے بڑا بنیادی کام کیا ہے۔ جو بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

اس ٹرسٹ کا دائرہ اگرچہ حیدرآباد تک ہی محدود نہیں ہے لیکن ظاہر ہے یہ پورے ملک کی ضرورتوں کی کفالت نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات پر بھی مخیر حضرات سامنے آئیں اور اس قسم کے ٹرسٹوں کی داغ بیل ڈالیں جو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی طرف توجہ دیں۔ نظام حیدرآباد نے ایک راہ دکھائی جس کی سب جگہ پیروی کی جانی چاہئے دوسری کمیونٹیوں میں بھی اس قسم کے ادارے موجود ہیں جو فلاحی کاموں میں مصروف ہیں وہ زیادہ تر تعلیم کی طرف توجہ دے رہے ہیں اور خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کئی کئی اسکول اور کالج چلا رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے طور پر اپنی کمیونٹی کی جہالت و ناخواندگی کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسلم کمیونٹی کے لئے بھی فلاحی ادارے قائم کئے جا سکتے ہیں اور انہیں چلانے کے لئے

ملاٹمت سے مدد لی جا سکتی ہے۔

بلاشبہ اس سلسلہ میں حکومت پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں لیکن ساری ذمہ داریاں حکومت پر ہی چھوڑ دینا اپنی کمزوری کا اظہار کرنا ہے۔ اپنی ہمت سے جو طبقے آگے بڑھتے ہیں انہیں سب طرف سے مدد ملتی ہے، حکومت بھی انکی مدد کرتی ہے اور خدا کی طرف سے بھی مدد ملتی ہے۔ خدا انکی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔

غالباً نظام حیدرآباد نے اسی اصول کے پیش نظر ایک قدم بڑھایا ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس سے بڑے کام نکلیں گے اور تعلیمی میدان میں یہ دوسری جگہوں کے لئے ایک مشعل راہ ثابت ہوگا۔

آر۔ ایس۔ ایس

زور گھٹ رہا ہے

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے نیتاؤں کے ذہن و دماغ پر "گرو دکشنا" کے موقع پر جمع ہونے والے چندے کی کمی کی وجہ سے بڑی سخت چوٹ پڑی ہے۔ اور وہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے سنگھاسن ڈولنے لگے ہیں۔ نئی دلی اور پرانی دلی میں کام کرنے والی ۲۷ شاخوں نے گذشتہ سال سوا سات لاکھ روپیہ جمع کیا تھا جبکہ اس سال یہ رقم ساڑھے پانچ لاکھ تک بھی نہ پہونچ سکی۔ ۱۹۶۲ء میں ان شاخوں نے دس لاکھ روپیہ اکٹھا کر لیا تھا اور شاید یہی سال آر ایس ایس کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد سے اس کا زور دلی میں گھٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ۶۲ء میں جمع کردہ رقم ۱۹۷۰ء میں نصف ہوکر رہ گئی۔ ملامت کے اثرات کو کم کرنے میں جن سنگھ کے نیتاؤں کی من مانی کارروائیوں کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دلی کے اس حکم نامہ کا بھی ہاتھ ہے جس کے ذریعے اس جماعت کی فوجی مشقوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اس کمزوری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ آر ایس ایس کے نیتاؤں نے چیلنج کیا تھا کہ اگر انکی جماعت پر کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی گئی تو دس ہزار سویم سیوک اس حکم کے خلاف مظاہرہ کریں گے لیکن حکم نافذ ہونے کے بعد ایسا کوئی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔

ناگپور جو اس جماعت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے اس سال گرو



گرو گولوالکر ـــــ ہنگاموں کے دلدادہ

پردا کے موقع پر اپنی دیرینہ روایات کو قائم نہ رکھ سکا۔ اور شاید دلی کے لئے بھی ایسے خفیہ احکامات صادر ہوئے جس کے نتیجہ میں اس سال یہاں آر ایس ایس کے باوردی نوجوان سڑکوں پر پریڈ کرتے جلوس کی شکل میں دکھائی نہیں دیئے۔ جماعت کے سرکردہ نیتا گرو گولوالکر کی علالت اور حکومت کے سخت رویہ کے تحت گرو دکشنا پر بھینٹ کی جانے والی شردھانجلی نے ثابت کر دیا کہ راجدھانی میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے قلعے کی دیواروں میں جگہ جگہ شگاف پڑنا شروع ہو چکے ہیں۔

پنجاب اور یوپی میں بھی محسوس ہو رہا ہے کہ جماعت کا زور روبہ انحطاط ہے۔ پنجاب میں اکالی جن سنگھ اتحاد نے آر ایس ایس کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لئے اکالی جیسے اپنے بدترین مخالف سے اتحاد جن سنگھ کی کمزوری یا بے نظریاتی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس اتحاد کے خاتمہ اور وزارت کے ٹوٹنے کے بعد جن سنگھ کے ممبر کانگریس کی صفوں میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ گرو پردا کے موقع پر جمع ہونے والا چندہ گذشتہ سال کے مقابلہ میں دو لاکھ روپیہ کم ہوا۔

اسی طرح یوپی میں ایس۔ وی۔ ڈی میں داخل ہو جانے کے بعد جن سنگھ نے اپنے پیروں پر آپ ہی کلہاڑی ماری ہے یوپی کے ایک سرکردہ جن سنگھی رہنما نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اگلا سال ان کے لئے موت اور زیست کی کشمکش لے کر آنے والا ہے۔ میرٹھ ڈویژن سے موصول ہونے والی خفیہ اطلاعات کے تحت گذشتہ سال کے مقابلہ میں روزانہ پریڈوں میں حصہ لینے والوں کی تعداد چالیس فیصد کم ہو چکی ہے۔ اگرچہ گرو پردا کے موقع پر گذشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال پانچ ہزار روپیہ زیادہ جمع ہوئے ہیں لیکن جونہی ایس وی ڈی کا مورچہ ٹوٹے گا آر ایس ایس کی کمزور دیواریں بھی منہدم ہو جائیں گی۔

لیکن راجستھان، مدھیہ پردیش، بہار میں گرو پردا کے موقع پر کافی چندہ اکٹھا ہوا اور اس کی وجہ ان ریاستوں کے وہ والیان ریاست ہیں جو آنے والے الیکشن میں کانگریس سے آخری مورچہ لینے کے لئے سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ گوالیار کی راج ماتا اور اُن کے تحت جگر جن سنگھ میں شامل ہو چکے ہیں۔ والیان ریاست اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے سارا زور لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ اُن کے اقتدار حاصل کرنے کی آخری جنگ ہے۔ اسی لئے ان صوبوں کے راجہ مہاراجہ اور دیگر عناصر جو کانگریس حکومت میں اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے نہ رہ سکیں گے۔ جن سنگھ کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن ان صوبوں میں جن سنگھ اور آر ایس ایس کا بڑھتا ہوا زور اتنا خطرناک نہیں جتنا پنجاب، دلی، ہماچل پردیش اور ہریانہ جیسے شمالی علاقوں میں ہو سکتا ہے اور انہی علاقوں میں دونوں جماعتیں نڈھال ہو رہی ہیں جس کا لازمی اثر دوسرے صوبوں پر پڑے گا۔

صوبے

مدھیہ پردیش

باسی کڑھی میں اُبال

آج کل سابق حکمراں بڑے سرگرم نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں پتہ چلا کہ سابق حکمراں پریوی پرس کے معاملے پر حکومت کے ساتھ کوئی باعزت سمجھوتہ کرنے کے حق میں ہیں اگر انہیں مناسب معاوضہ مل جائے تو وہ پریوی پرس سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں صرف چھوٹے حکمراں ہی شامل تھے، ان کی آواز پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ کیونکہ بڑے

واقعات [illegible]

سابق حکمرانوں کا رویہ سخت ہے وہ کانگریس کو سبق دینا چاہتے ہیں۔
اس طبقہ کی قیادت راج ماتا گوالیار، بیگم بھوپال، اور پٹیالہ کا رد ھا اور جیر گڑھ کے سابق حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ عظیم انتخابی گٹھ جوڑ کے حق میں ہیں۔ بہت سے حکمرانوں کی نظریں جن سنگھ پر ہیں۔ لیکن کچھ دوسرے ہیں جو سیاسی پارٹیوں خاص کر جن سنگھ کے ساتھ کسی گٹھ جوڑ کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ میدان سیاست میں اکیلے ہی آگے بڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ریاستی اسمبلی کے ۲۹۶ حلقوں میں سے ۱۰۰ حلقے سابق ریاستوں میں واقع ہیں اور اگر وہ متحد ہو کر آگے بڑھیں تو طاقتی توازن ان کے ہاتھ میں آسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں راج ماتا سندھیا کی مثال دیئے جاتے ہے جنہوں نے کانگریس کے خلاف تحریک چلاکر ۱۹۶۷ء میں اپنے علاقہ میں ایک کے علاوہ باقی تمام سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اُس وقت اگر مسٹر ڈی۔ پی مصرا مہاراجہ ریوا کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہتے جن کے علاقہ میں کانگریس نے ۸ سیٹیں حاصل کیں، تو مدھیہ پردیش میں کانگریس کبھی اکثریت میں نہ آسکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ "حکومت" چھن جانے کے باوجود ابھی تک سابق حکمران اپنی سابق "رعایا" میں کافی اثر رکھتے ہیں اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ سابق ریاستوں کے لوگ آزادی کے وہ فائدے حاصل نہ کر سکے جن کی وہ توقع کر رہے تھے تاہم حکمران کانگریس کو توقع ہے کہ اُسے سب ہی سابق حکمرانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں ہوگا۔ متعدد با اثر حکمران کانگریس کے ساتھ بھی ہیں کیونکہ انھیں بہرحال احساس ہو گیا ہے کہ عدم سادات زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتی اور جلد یا بدیر انھیں اپنی تمام مراعات سے محروم ہونا پڑے گا اس لئے اچھا یہ ہے کہ حکمران جماعت کے ساتھ تلخی پیدا نہ کی جائے۔
تاہم کچھ میں جن کی باسی کڑھی میں ابال آیا ہوا ہے اور پرانی "سلطنت" کے خواب انھیں ستانے لگے ہیں۔

گجرات

سنگباری۔ پاگل پن

گجرات سنڈی کیٹ کانگریس کا گڑھ کہا جاتا تھا لیکن جب سے اس کانگریس نے جن سنگھ اور سوتنتر پارٹیوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔ یہ گڑھ ٹوٹ گیا ہے۔ اور سرکردہ واقعات نئی دہلی

کانگریسی کارکن جن میں بعض وزراء، ممبران اسمبلی اور اضلاع کے کارکن شامل ہیں، کانگریس میں آکر مل گئے ہیں ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ جس پارٹی میں چاہے شامل ہو جائے کسی پر کسی قسم کا دباؤ نہیں۔ اسمبلیوں تک میں دل بدل ہوتی ہے تو یہ عام ممبروں کی دل بدلی ہے۔



پتھروں کی بوچھاڑ میں

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے گجرات سنڈی کیٹ کانگریس کے کچھ سرپھرے لوگ اس پر خوش نہیں ہیں۔ اور وہ اپنے دل کے جلے پھپھولے تشدد کے ذریعہ پھوڑنا چاہتے ہیں اور یہ تشدد بھی کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ خود وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے ساتھ۔ سورت میں وزیر اعظم کے بھرے جلسے میں ان بے وقوفوں نے سنگباری شروع کر دی۔ اور یہ بھول گئے کہ اس سے خود ان کی جماعت کو نقصان پہنچے گا۔ کیونکہ بہرحال اتنی بات سے تو بھی واقف ہو گئے ہیں کہ جمہوری فیصلہ پولنگ بوتھوں پر ہوا کرتا ہے۔ پتھروں کے ذ[illegible]یں، پتھر تو پاگل مارا کرتے ہیں۔

مگر وزیر اعظم کی ہمت قابل داد ہے۔ پتھروں کی بارش میں وہ تقریر کرتی رہیں۔ اور لوگوں کو بتاتی رہیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ اور انہوں نے کیوں الیکشن کرائے ہیں۔ مسز گاندھی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑی آہنی عزم کی خاتون ہیں۔ اور ان کا یہی عزم ان کی عظیم الشان کامیابی کی نشاندہی کرتا ہے۔

کشمیر

سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

کشمیر میں محاذ استصواب پر پابندی لگا دی گئی ہے اور اس کے لیڈروں کو ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔ جمہوریت کے زمانے میں اس قسم کی پابندی بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی انسان کو اپنی مرضی کے خلاف بھی کام کرنے پڑتے ہیں۔ صادق صاحب بڑی نرم پالیسی کے آدمی ہیں اور اس پالیسی کے لئے اکثر وہ نکتہ چینی کا نشانہ بھی بنے ہیں لیکن انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی اور ایک جمہوریت پسند کی حیثیت سے محاذ استصواب رائے کو الیکشن میں حصہ لینے تک کی اجازت دے دی، حالانکہ بعض حلقوں کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ ایسی جماعت کو الیکشن لڑنے کی اجازت کیسے دے دی گئی جو اس آئین ہی کو نہیں مانتی جس کے تحت انتخابات لڑے جا رہے ہیں۔ لیکن صادق صاحب سب کچھ سنتے رہے اور انھوں نے محاذ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ حقیقتاً انھوں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ لیکن جب پانی سر سے گزرنے لگا تو اسے حلق میں جانے سے روکنے کے لئے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ علیحدگی پسندی کا پروپیگنڈہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے اور بڑھنے کی اجازت نہ دی جا سکتی تھی۔ لیکن اچھا ہوتا اسے کچھ دن اور برداشت کر لیا گیا ہوتا، اس لئے کہ علیحدگی پسندوں کا حال پتلا ہو چلا تھا اور علیحدگی کی باتیں سنتے سنتے خود کشمیری عوام نے ان کو الگ کرنے کی بات سوچ لی تھی، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔ اس کا احساس غالباً محاذ والوں کو ہو گیا تھا اسی لئے انھوں نے سخت زبان میں بولنا شروع کر دیا تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ الیکشن میں حصہ بھی نہ لیں اور اپنے آدمیوں میں سرخرو بھی رہیں۔ خدا معلوم کیا کیا بولے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو ریاست بدر ہو گئے یا سنٹرل جیل پہونچ گئے اور الیکشن میں مقابلہ پر آنے سے بچ گئے۔ یہی ان کا مقصد تھا۔ یوں کہیے ریاست بدری بھی محاذ کے لیڈروں کی لاج رکھنے کا ذریعہ بن گئی۔ اس کے لئے انھوں نے صادق صاحب یا حکومت کشمیر کا شکریہ ادا نہ کیا تو بڑی ناشکری کی بات ہوگی

کیمرے کی تاک جھانک

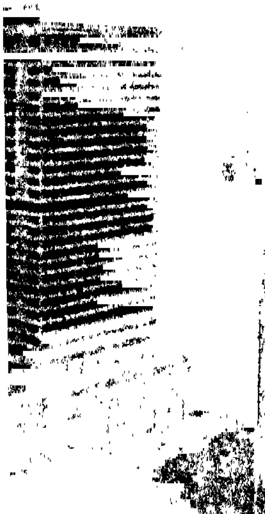




کینیڈا کے جوان اور کنوارے وزیراعظم ٹروڈیو نے ہوائی جہاز
وزیر اعظم اندرا گاندھی کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ یہ ہار
تھے۔ ٹروڈیو کامن ویلتھ کی میٹنگ میں شرکت کیلئے سنگاپور جاتے ہوئے



پانچ جوکر:۔ جی نہیں یہ ہیں سیاسی سرکس کے پانچ رنگ ماسٹر۔ (بائیں سے دائیں) ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ (سنڈیکیٹ) شری روی راؤ (ایس۔ایس۔پی) شری اٹل بہاری باجپئی (جن سنگھ) چارج فرنانڈیز اور راج نرائن سنگھ (ایس۔ایس۔پی)



بمبئی میں جلد ہی ساڑھے چار کروڑ
شیراٹن ہوٹل کا افتتاح ہو
سب سے زیادہ ماڈرن ہوٹل ہوگا



دہلی میں جشن جمہوریہ کی تیار
ہیں۔ راشٹرپتی بھون اور شاہ
بنایا جا رہا ہے۔ تصویر میں دیکھ



کھلاڑی اور فلم اسٹار بھی سیاست میں :- ہندوستان میں سیاست صرف نواب راجاؤں اور دولت مند لوگوں کا مشغلہ ہے۔ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو آپ کہیں سے بھی الیکشن کا ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ فلمی ستاروں کے پاس بھی کافی مقدار میں فالتو پیسہ ہے۔ اس لئے سننے میں آیا ہے کہ تقریباً آدھے درجن فلمی ستارے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ مہاراشٹر میں الیکشن لڑنے کیلئے شیو سینا کے 'باس' بال ٹھاکرے کا آشیرواد ضروری ہے۔ دائیں سے بائیں :- دھرمیندر، راجندر کمار، بال ٹھاکرے، آئی۔ ایس۔ جوہر اور منوج کمار







سامراج کی قبر بنے گی، ایشیا کی دھرتی پر :
دھلی میں برطانیہ کے وزیر اعظم ایڈورڈ ہیتھ کا استقبال "ہیتھ واپس جاؤ" کے نعروں سے کیا گیا۔
جگہ جگہ برطانیہ کے جنوبی افریقہ کو ہتھیار دیئے جانے کے خلاف مظاہرے کیئے گئے۔ پالم ہوائی اڈہ کے باہر نوجوان طالب علم مظاہرہ کر رہے ہیں۔

ڈھائی کلو کا آلو :-
سی۔ آر۔ جانسن نے اپنے باغ میں عام آلو کے بیج سے ڈھائی کلو کا یہ آلو پیدا کیا ہے۔۔

حسینۂ عالم کی شادی :- ہندوستانی لڑکی حسینۂ عالم ریتا فیریا کے عشق اور شادی کی افواہیں کافی دن سے اڑ رہی تھیں۔ ہر روز ایک نئے عشق کی افواہ اڑائی جاتی تھی ریتا نے پچھلے دنوں ڈاکٹر ڈیوڈ پاول سے شادی کر کے افواہیں اڑانے والوں کے منہ بند کر دیئے۔

ویسٹ انڈیز کی طرف

عابد علی



ہندوستان کا آخر کار کپتان کون بنے گا، ویسٹ انڈیز جانے والی ہندوستانی کرکٹ ٹیم میں کن نئے کھلاڑیوں کو شامل کیا جائے گا، کیا [illegible] کھلاڑی جیسے درانی، جے سمہا، سردیسائی [illegible] کو ایک بار پھر کھیلنے کا موقع دیا جائے گا، کیا [illegible] والے ہندوستانی کھلاڑیوں کو ٹیم میں شامل کیا جائے گا؟ کنٹریکٹر اور انجینئر کی غیر موجودگی میں وکٹ کیپر کون ہوگا؟ اور نہ جانے اسی طرح کے کتنے سوالات تھے جنھوں نے کرکٹ کے شائقین کے ذہنوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہا تھا [illegible] اڑائی جا رہی تھیں۔ بہرحال [illegible] سب متفق تھے کہ اگر پٹودی اپنے کو [illegible] تو اس سے عہدہ [illegible] کوئی نہیں [illegible] سلیم درانی اور دلیپ سردیسائی بیچ میں [illegible] کچھ زیادہ اچھے کھیل کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ اس لئے اس کی جگہ بمبئی کے کپتان اور ہندوستان کے نائب کپتان اجیت واڈیکر کو ہندوستانی ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔

یہ اہم فیصلہ [illegible] دسمبر کو بمبئی میں سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ میں کیا گیا۔ میٹنگ میں صرف چار آدمی یعنی چیئرمین وجے مرچنٹ، [illegible] کوپل ناتھ اور جگا دال موجود تھے۔ پانچویں ممبر دتا رائے طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے میٹنگ میں شامل نہ ہو سکے۔

کپتانی کا فیصلہ وجے مرچنٹ کے کاسٹنگ ووٹ نے کیا کیونکہ باقی ممبران اس معاملے میں آدھے آدھے بٹے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں وجے مرچنٹ پر بہت سے الزامات بھی لگائے جا رہے ہیں اور یہ افواہ بھی سننے میں آئی ہے کہ پانچویں ممبر یعنی دتا رائے نے استعفیٰ دینے کی دھمکی دی ہے۔

بہرحال نئے کپتان واڈیکر کا انتخاب ایک حد تک ٹھیک رہا ہے۔ پٹودی کافی عرصے تک ہندوستان کے کپتان رہے۔ انھوں نے کل ۳۹ ٹیسٹ میچ کھیلے ہیں جن میں سے ۳۶ میں وہ خود کپتان رہے۔ کنٹریکٹر کے زخمی ہونے پر وہ ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے کپتان بنے۔ اس وقت پٹودی دنیا کا سب سے کم عمر کپتان تھا۔

واڈیکر ہندوستان کا سولہواں کپتان ہے۔ اس سے پہلے سی کے نائیڈو، نواب آف پٹودی (سینیئر)، لالہ امرناتھ، وجے ہزارے، ونو منکڈ، غلام احمد، [illegible] ادھیکاری، دتا گائیکواڑ، پنکج رائے، رام چند، ناری کنٹریکٹر، نواب آف پٹودی (منصور علی خان) اور چندو بورڈے ہندوستان کے کپتان رہ چکے ہیں۔

۱۲ جنوری کو مدراس میں کرکٹ کنٹرول بورڈ نے باقی ہندوستانی ٹیم کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ٹیم کا انتخاب بہت سوجھ بوجھ اور عقلمندی سے کیا گیا جہاں ایک طرف نئے کھلاڑیوں کو موقع دیا گیا وہیں دوسری طرف بہت سے پرانے کھلاڑیوں کو بھی واپس بلا لیا گیا ہے

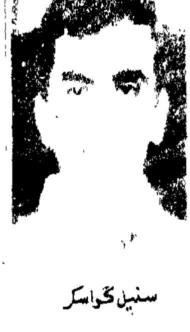
نئے کھلاڑیوں میں حیدرآباد کے جینتی لال، کرشنا مورتی، گوونداراج، بمبئی کے سنیل گواسکر اور کلکتہ کے جی جی بھوڑی، سلیم درانی، جے سمہا، اور سردیسائی پر ایک بار پھر کنٹرول بورڈ نے نظر عنایت کی اور انھیں ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔

ویسے تو ٹیم پوری طرح متوازن ہے لیکن اگر کمی ہے تو وہ تیز گیند پھینکنے والے کی لیکن اس کو کیا

واقعات نئی دہلی



اشوک منکڈ



سنیل گواسکر



سلیم درانی

کیا جائے کہ ہندوستان تیز گیند پھینکنے والے عنقا ہیں ———

اس وقت ٹیم میں تین بہت عمدہ اوپننگ بلے باز موجود ہیں یعنی گواسکر جینتی لال اور منکڈ۔ ویسے تو جے سمہا، سارڈیسائی اور عابد علی بھی اوپن کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ درمیان میں کھیلیں تو زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ دونوں وکٹ کیپر نوجوان اور پھرتیلے ہیں۔ کرشنا سورتی کی عمر ۲۳ سال ہے جبکہ پی جی جوشی کی عمر ۲۲ سال۔ پرسنا، راگھون بیدی اور درانی کا شمار دنیا کے بہترین اسپنروں (Spinners) میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سولکر اور جے سمہا بھی انکے اچھے معاون ثابت ہوں گے۔ نئی گیند گووندراج اور عابد علی کے ہاتھ میں دی جا سکے گی۔ دونوں درمیانی رفتار سے تیز گیند پھینک لیتے ہیں۔

ٹیم اگلے مہینے ویسٹ انڈیز کے لئے روانہ ہو جائیگی اس سے پہلے تمام کھلاڑیوں کو دس روز تک مکمل ٹریننگ دی جائے گی۔

ٹیم کا مختصر تعارف : ————

اجیت واڈیکر (کپتان) پیدائش یکم اپریل ۱۹۴۱ واڈیکر کا شمار ہندوستان کے بہترین بلے بازوں میں ہوتا ہے واڈیکر بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرتے ہیں۔ واڈیکر تیز کھیلنے والوں میں ہے۔ واڈیکر کا بلّہ بالکل کسی آرٹسٹ کے برش کی طرح گھومتا ہے ہک لگانے میں واڈیکر کا جواب نہیں۔ واڈیکر بہت عمدہ سلپ فیلڈر بھی ہے پہلی مرتبہ واڈیکر کو ۶۷-۱۹۶۶ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف میچ میں کھیلنے کا موقع دیا گیا اسی وقت سے اس نے ہندوستانی کرکٹ ٹیم میں اپنے لئے مستقل جگہ بنالی ہے اب تک وہ ٹیسٹ میچوں میں ایک سنچری اور دس آدھی سنچریاں بنا چکا ہے۔

ایس وینکٹا راگھون عمر ۲۵ سال نائب کپتان :۔ مدراس کا دبلا پتلا اور پھرتیلا نوجوان وینکٹا راگھون بہت عمدہ آف اسپنر ہے پہلی بار نیوزی لینڈ کے خلاف ۱۹۶۵ میں ٹیسٹ ٹیم میں شامل کیا گیا۔ اب تک ۱۴ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے جنمیں اس نے ۱۱۸۳ رن دیکر ۴۰ وکٹ لئے بلاشبہ راگھون اس وقت ہندوستانی ٹیم کا سب سے عمدہ



ہندوستان کے نئے کپتان اجیت واڈیکر

فیلڈر ہے۔ عام طور پر گلی اور ... میں فیلڈنگ کرتا ہے موقع پڑنے پر پیس ... بنا لیتا ہے۔

سلیم درانی عمر ۳۶ سال ...۔ راجستھان کا چھریرا دبلا پتلا اور خوبصورت آل راؤنڈر ہے۔ سلیم درانی ٹیم کا سب سے زیادہ معمر کھلاڑی ہے۔ درانی کا شمار ہندوستان کے بہترین آل راؤنڈروں میں ہوتا ہے۔ درانی بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرتا ہے اور جب جم جاتا ہے تو چھکوں اور چوکوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ درانی جیسے ہی فیلڈ میں اترتا ہے کھیل میں جان آجاتی ہے اسکور بورڈ تیزی سے چلنا شروع ہو جاتا ہے وہ بہترین آف اسپنر بالر ہے۔ درانی اس سے پہلے بھی ویسٹ انڈیز جا چکا ہے اور اسے وہاں کی پچوں کا کافی تجربہ ہے ہمیں یقین ہے کہ درانی ویسٹ انڈیز میں بہترین بلے باز اور بالر ثابت ہوگا۔

ایم۔ ایل جے سمہا عمر ۳۱ سال :۔ جے سمہا ٹیم کا سب سے زیادہ تجربہ کار کھلاڑی ہے۔ اب تک ۳۶ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ میں انگلینڈ میں ٹیسٹ میچ کھیلا۔ ۱۹۶۷ میں جے سمہا کو ٹیم سے نکال دیا گیا تھا لیکن پھر اسے دوبارہ آسٹریلیا بلا لیا گیا تھا۔ جے سمہا میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ کئی سال سے حیدرآباد کا کپتان ہے۔ بہترین بلے باز ہے۔ حالات اور وقت کے مطابق تیز اور دھیما کھیل کھیلنے پر قادر ہے۔ نئی گیند کا بھی اچھا استعمال کر لیتا ہے۔ پرانی گیند سے عمدہ آف بریک بالنگ کرتا ہے جے سمہا عمدہ فیلڈر بھی ہے۔ اب تک تین سنچریاں اور بارہ آدھی سنچریاں بنا چکا ہے۔

دلیپ سارڈیسائی۔ عمر ۳۰ سال۔ بمبئی کا یہ عمدہ بلے باز کسی زمانے میں ہندوستان کا اوپننگ بلے باز تھا۔ لیکن اب مناسب یہ ہوگا کہ یہ درمیان میں کھیلے۔ بورڈے اور بورڈے کی غیر موجودگی میں درمیان کا کھیل سنبھالنے والا اب اور کوئی بلے باز موجود نہیں ہے۔ سارڈیسائی بھی دوسری بار ویسٹ انڈیز جا رہا ہے۔ اب تک اکیس ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے۔ ایک ڈبل سنچری، دو سنچری اور سات آدھی سنچریاں بنا چکا ہے۔

ای۔ اے۔ ایس پرسنا عمر ۳۰ سال :۔ پرسنا کا شمار دنیا کے بہترین آف اسپنر بالروں میں ہوتا ہے۔ پرسنا درمیانی قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک ہے، اچھا فیلڈر اور بیٹس مین بھی ہے۔ اس دفعہ ہندوستانی ٹیم کی سب سے بڑی امید پرسنا ہی ہے۔ اب تک ۲۰۵۷ رن دیکر ۱۱۲ وکٹ لے چکا ہے۔

سیّد عابد علی عمر ۲۹ سال :۔ حیدرآباد کا آل راؤنڈر ہے۔ اچھا اوپننگ بلے باز اور گیند پھینکنے والا ہے۔ بہترین فیلڈر اور بہت چست اور پھرتیلا کھلاڑی ہے۔ اب تک ۱۲ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے جن میں اس نے کل ۵۳۰ رن بنائے۔ ۶۲۶ رن دے کر ۲۱ وکٹ لے چکا ہے۔

اشوک منکڈ عمر ۲۵ سال :۔ بمبئی کا یہ نوجوان کھلاڑی اپنے وقت کے بہترین آل راؤنڈر ونو منکڈ کا لڑکا ہے عمدہ بلے باز ہے۔ کافی تیز کھیل کھیلتا ہے آف اسپنر بالر بھی ہے اور اچھا فیلڈر بھی۔ اب تک سات ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے جن میں اس نے کل ۶۲۲ رن بنائے۔

بشن سنگھ بیدی عمر ۲۴ سال :۔ دہلی کا بائیں ہاتھ سے گیند پھینکنے والا اسپن بالر ہے پہلی مرتبہ ویسٹ انڈیز کے خلاف ۶۷-۱۹۶۶ میں کھیلا۔ ہماری تمام امیدیں بیدی اور پرسنا ہی سے وابستہ ہیں اسپنروں کے اس جوڑوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ بیدی اب تک ۱۹ میچوں میں ۱۷۹۸ رن دے ... وکٹ لے چکا ہے۔

ایکناتھ سولکر۔ عمر ۲۲ سال :۔ بائیں ہاتھ سے کھیلتا ہے لیکن خراب حالت میں ہاتھ روک کر کھیلنے پر بھی قادر ہے درمیانی رفتار کی تیز گیند اور اسپن گیند دونوں ہی پھینک لیتا ہے۔ سولکر ان نوجوان کھلاڑیوں میں سے ہے جن کا شمار آئندہ ہندوستان کے بہترین کھلاڑیوں میں ہوگا۔ اب تک پانچ ٹیسٹ میچ کھیل چکا ہے۔

واقعات نئی دہلی

وشواناتھ عمر ۲۱ سال: وشواناتھ کا شمار ان خوش نصیب کھلاڑیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ میں سنچری بنائی۔ بہت تیز کھیل کھیلتا ہے اس کے باوجود کہ بہت دبلا پتلا اور چھوٹے قد کا ہے وشواناتھ بہت ہی طاقتور شاٹ لگاتا ہے۔ اب تک چار ٹیسٹ کھیلے ہیں جن میں کل ۳۳۴ رن بنائے ہیں ایک سنچری اور دو آدھی سنچریاں بنا چکا ہے اس حساب سے وشواناتھ کے کھیل کا اوسط ٹیم میں شامل دوسرے تمام ٹیسٹ کھلاڑیوں سے بہتر ہے۔

جینتی لال عمر ۲۲ سال: حیدرآباد کا نوجوان کھلاڑی ہے۔ بہت عمدہ بلے باز ہے۔ طاقتور شاٹ لگاتا ہے پہلی بار ٹیسٹ ٹیم میں شامل کیا گیا ہے۔

گووندراج عمر ۲۳ سال: گووندراج بھی حیدرآباد ہی کا رہنے والا ہے اور اچھا بالر ہے۔ گووندراج کافی عرصہ سے کرکٹ ٹیسٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے پچھلے دنوں راجی ٹرافی اور دلیپ ٹرافی میچوں میں بہت عمدہ بالنگ کی۔

سنیل گواسکر عمر ۲۱ سال: بہت عمدہ بلے باز ہے پچھلے دنوں انٹر یونیورسٹی کے لئے کھیلتے ہوئے ۳۲۷ رن بنائے۔ اس طرح اس نے اجیت واڈیکر کا ۳۲۴ رن کا ریکارڈ توڑ دیا۔ یقیناً گواسکر بہت عمدہ ٹیسٹ کھلاڑی ثابت ہوگا۔

کرشنا مورتی عمر ۲۴ سال: کرشنا مورتی اچھا وکٹ کیپر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا بلے باز بھی ہے اس لئے اندازہ ہے کہ ٹیم میں پہلا انتخاب اسی کا ہوگا۔ حیدرآباد کے لئے کھیلتے ہوئے کافی اچھی وکٹ کیپری اور بلے بازی کا مظاہرہ کیا

جی جی ہوبلی عمر ۲۵ سال: بنگال کا یہ نوجوان بھی اچھا وکٹ کیپر ہے۔ شاید فاروق انجینئر اور کندرن کی کمی کو پورا کر دے۔ جی جی ہوبلی کو ابھی اپنی بیٹنگ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔



ڈیورینڈ فٹ بال ٹورنامنٹ

—— صلاح الدین شاکر ——

کھیل ہیں کھیل فٹ بال کا۔ اس میں اصل طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ "فٹ بال بڑی پاور"۔ دلی گیٹ پر میں دو اشخاص کے درمیان یہ گفتگو دور تک سنتا چلا گیا۔ فٹ بال کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے بحث نہ کی ہو۔ فٹ بال کا کھیل کہاں سے شروع ہوا۔ اس کا میدان کتنا بڑا ہوتا ہے۔ اس کھیل نے کیسے ترقی کی، کون کون سے لوگ اس کھیل میں آگے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چند منٹ کے اندر اندر انہوں نے سب پر تبصرہ کر ڈالا یہ دونوں معمولی کام کرنے والے ورکر تھے لیکن فٹ بال کا شوق انہیں روز دلی گیٹ کی طرف کھینچ کر لے جاتا تھا۔ دلی گیٹ کا پورا ماحول آج کل "فٹ بالی" ہے۔ کیونکہ کارپوریشن اسٹیڈیم کے سو فٹ لمبے اور ۵۰ فٹ چوڑے میدان میں آج کل ڈیورینڈ کھیلے جا رہے ہیں۔ ہر طبقہ خیال کے لوگ ان کھیلوں کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں اور پورا اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ بھیڑ کا صحیح اندازہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب شام پانچ بجے کھیل کے خاتمہ پر لوگ قطار در قطار باہر نکلتے اور پورے علاقہ میں پھیل جاتے ہیں۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری دلی دلی گیٹ پر سمٹ آئی ہو۔ فضا پر ایک عجیب فٹ بالی چھائی ہوتی ہے۔ فٹ بال کے علاوہ اس ماحول میں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ غمگین سے غمگین کا غم بھی فٹ بال کے چھکوں میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔

اس کارپوریشن کے میدان میں کچھ دن پہلے دلی کلاتھ ملز ٹورنامنٹ کھیلے گئے۔ اچھی خاصی ٹیموں نے ان میں حصہ لیا۔ تماشائیوں کی بھیڑ بھی ہر شام تک آئی لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی تھی۔ ڈیورینڈ سے اس کا کیا مقابلہ!

ڈیورینڈ، ڈیورینڈ ہے جو اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے یہ ٹورنامنٹ ملک میں سب سے قدیم ٹورنامنٹ ہیں۔ بڑی بڑی



ڈیورینڈ کپ

نامور ٹیموں نے اس ٹورنامنٹ اور پورے ملک کا نام روشن کیا ہے جو چند لوگ اس زمانے کے کھیل دیکھنے والے باقی ہیں ان کا دل آج کے مقابلوں کو دیکھ کر نہیں بھرتا۔ کیونکہ کھیل کا معیار پچھلے برسوں میں بڑھا نہیں گھٹا ہے۔

ڈیورینڈ ۱۸۸۸ء میں یعنی آج سے پورے ۸۲ برس قبل شروع ہوئے تھے انہیں شروع کرنے کا اعزاز اس وقت کے حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کے سیکریٹری مورتمر ڈیورینڈ کو حاصل ہے۔ وہ فٹ بال کے اس کھیل کو جو برطانیہ میں انگلش اسکولوں سے شروع ہو کر مختلف ممالک میں پھیل رہا تھا اسے ہندوستان میں بھی فروغ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کھیل کے شائقین کے تعاون سے اسکا انتظام کیا اور ایک خوبصورت اور قیمتی کپ تیار کرا کر مقابلے شروع کر دیئے ٹورنامنٹ کو ان ہی کے نام پر ڈیورینڈ ٹورنامنٹ کا نام دیا گیا۔ اور کپ کے بارے میں طے کیا گیا کہ جو ٹیم تین سال تک لگاتار اسے اٹھائے گی اسے مستقل طور پر اپنے پاس رکھ سکے گی۔ ہائی لینڈ انفنیٹری سب سے پہلی ٹیم تھی جو ۱۸۹۳ء، ۹۴ء اور ۹۵ء میں لگاتار کپ اٹھا کر اسکی حقدار بنی اس کے بعد، ۱۸۹۷ء، ۹۸ء، ۹۹ء میں مسلسل کامیاب ہو کر بلیک واچ نے اس کپ کو حاصل کیا۔ سر مورتمر ڈیورینڈ نے دو مرتبہ کپ مہیا کر دیا! ور تیسری بار فٹ بال کے شائقین نے اسکا انتظام کیا۔

بعد ازاں جب سر ڈیورینڈ ہندوستان میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے تو طے کیا گیا کہ یہ ایک چیلنج کپ ہوگا جس پر



(بشکریہ شنکر ویکلی)

الیکشن کمیشن نے اعلان کیا ہے کہ دو بیلوں کی جوڑی کا نشان اندرا کانگریس کو دیا جائیگا۔



صلاح الدین شاکر

ی ملکیت نہ ہوگا۔ اسطرح موجودہ ڈیورینڈ کپ ستر سال پرانا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں صرف فوجی ٹیمیں ہی ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے بعض غیر فوجی ٹیموں اس میں شریک کیا جاتا تھا اور آج فوجی محکمے کے زیر انتظام چلنے کے باوجود اس پر غیر فوجی ٹیموں کا غلبہ ہے۔ گزشتہ ۲۰ کے عرصہ میں صرف تین مرتبہ فوجی ٹیموں کو ٹائیٹل جیتنے کا موقع

جیسا کہ اوپر ذکر آیا۔ ڈیورینڈ کے مقابلے ۱۸۸۸ء میں شروع ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۱۳ تک پابندی سے جاری رہے لیکن ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہونے پر مسلسل چھ سال بند رہے۔ ۱۹۲۰ء میں سلسلہ پھر شروع ہوا جو ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔ اور ایک مرتبہ پھر (دوسری جنگ عظیم) نے ان کھیلوں میں رکاوٹ پیدا کر دی ۱۹۴۵ء میں ختم ہو چکی تھی لیکن شاید سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔

حالات میں کچھ استحکام پیدا ہوا تو فٹبال کے شائقین کو کچھ اطمینان ہوا اور ۱۹۵۰ء میں پھر ڈیورینڈ شروع کر دیئے گئے۔



۱۹۶۱ء تک ان کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۶۲ء میں چین کے حملے کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر ان میں تعطل پیدا ہو گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ تعطل صرف ایک برس جاری رہا اور ۱۹۶۳ء سے پھر باقاعدگی کے ساتھ سلسلہ جاری ہوا تو وہ آج تک جاری ہے

ہر سال عام طور پر دسمبر یا جنوری میں یہ ٹورنامنٹ شروع ہوتے ہیں اور ایک ماہ کے قریب جاری رہ کر راجدھانی میں اچھی خاصی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ تقریباً ایک سو ٹیمیں شامل ہونے کی خواہش مند ہوتی ہیں لیکن کانٹ چھانٹ کے بعد نصف کے قریب مقابلوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ دلی سے نصف درجن کے قریب ٹیمیں اس ٹورنامنٹ میں حصہ لیتی ہیں لیکن عام طور پر دوسرے یا زیادہ سے زیادہ تیسرے راؤنڈ میں ہتھیار ڈال دیتی ہیں سیٹی کلب بڑے دھوم دھڑکے سے اٹھا تھا۔ لیکن اس مرتبہ جس بری طرح سے پٹا ہے اسے دیکھ کر امید کم ہی نظر آتی ہے کہ وہ آئندہ ابھر سکے گا۔ سب سے بڑا سوال پریکٹس کا ہے کشمیری گیٹ کے بڑے بڑے میدان بس اڈے نے ہضم کر لئے۔ اور دوسری جگہوں پر بھی اچھے اچھے میدانوں کی کتر بیونت کر کے دلی ایڈمنسٹریشن نے انھیں ٹیکسی اسٹینڈوں کی نذر کر دیا۔ کھلاڑی جائیں تو کہاں جائیں۔ دیسے سب لوگ شور مچاتے رہتے ہیں کہ — "اپنی صحت بناؤ"۔ مگر صحت یوں خالی کہہ دینے سے تھوڑا ہی بنتی ہے۔ اس کے لئے بڑے اہتمام کی ضرورت ہے۔ فٹ بال میں اب تک بنگال سب سے آگے تھا۔ گذشتہ ۲۰ برس کا نتیجہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس تبہ بنگال کی ٹیموں نے ہی کپ اٹھایا۔ اور چھ مرتبہ جنوبی ہند کی ٹیموں نے اس پر قبضہ کیا۔ شمالی ہند والے بیچارے منہ تکتے رہے اور اس میدان میں پھسڈی رہ گئے لیکن اب پنجاب نے سر نکالا ہے۔ شاید پنجاب والے "فٹ بال بابی پادٔ" کی کہاوت کو صحیح کر دکھانا چاہتے ہیں۔ پنجاب والے کافی تنومند لوگ ہوتے ہیں پھر وہ کیوں پیچھے رہیں۔ سال گذشتہ بارڈر سیکورٹی فورس نے کپ اٹھایا۔ اور اس سال بھی وہ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

لیکن یو پی کیا کر رہا ہے؟ وہ حکومتیں بدلنے میں لگا ہے۔ نو کروڑ کی آبادی والی ریاست اور وہاں ایک ٹیم ایسی نہیں جو دلی میں سیکنڈ یا تھرڈ راؤنڈ تک بھی کھیل جائے۔ یہ یو پی کے کھیل کے کرتا دھرتاؤں کے منہ پر بہت بڑا چپت ہے۔ ریاستی حکومتوں کی کھیلوں سے یہ عدم دلچسپی ہمارے آگے نہ بڑھنے اور فٹ بال کے میدان میں ہندوستان ہی سے نہیں بلکہ یوگوسلاویہ، بلغاریہ اور ایران جیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے پیچھے رہ جانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ■ ■

ہندی فلمیں کہاں جا رہی ہیں



نیم عریاں ڈانس اور چند بیہودہ گیت ۔ یہ ہماری ہندی فلموں کا طرۂ امتیاز ہیں ۔

• سنگم ۔ آیا موسم پیار کا ۔ آئی ملن کی بیلا ۔ آن بلو سجنا ۔ پھر وہی دل لایا ہوں ۔ دل دیکے دیکھو ۔ زندگی ہے پیار سے" جیسے عنوانات کے ساتھ ایک نیم برہنہ جوڑے کی تصویر پوسٹرز وغیرہ پر دیکھ کر ہی صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل فلموں میں سوائے بازاری قسم کے عشق اور رومان کے کسی دوسرے پہلو کو اہمیت نہیں دی جاتی ۔ ان فلموں میں قدم قدم پر جذبات میں ہیجان اور سنسنی پھیلانے والے "بول رادھا بول سنگم ہوگا کہ نہیں" جیسے جنسیاتی گیت رہی سہی کسر پوری کر دیتے ہیں ۔ بیشتر فلموں میں زندگی کو محض جنسیاتی زاویۂ نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پریم کتھا کے علاوہ اور کسی موضوع سے واقف ہی نہیں ۔ عموماً دو نوجوانوں میں ایک دوشیزہ کو حاصل کرنے کے لئے جنگ چھڑ جاتی ہے اور یہ دونوں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے ذرائع اور وسائل اختیار کرنے سے نہیں چوکتے ۔ لیکن ہیرو کے لئے منصفانہ اور ایماندارانہ ذرائع وقف کر دیے جاتے ہیں جبکہ ولین دنیا بھر کے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے ۔ ہر فلم میں یہ جوڑا خوبصورت ہی دکھایا جاتا ہے اور ہر کہانی میں عاشق اور رقیب ایک دوسرے کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں پوری کہانی ان دونوں کی ایک عورت کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں ختم ہو جاتی ہے ۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہیروئین خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہتی ہے اگر اس نے بہت کیا تو وہ بین یا اس انگیز



ایک عاشق ایک محبوبہ اور ایک ویلن، کچھ اچھل کود اور ایک درجن گانے ۔ فلم کا یہ پوسٹر آپکو یہ سب کچھ دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے

ں سے اپنا دل بہلا لیا یا پھر سینوں کے علاوہ بنا شروع کر دیں۔ والدین اس عشق بازی سے ذیادہ نرمت برتتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ انسانی زندگی میں سدھار اور اصلاح لئے فلم انڈسٹری بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے نگہ ہندوستان تقسیم ہو گیا ملک میں انقلاب کے سیکڑوں ار سے بہہ گئے اور آج بظاہر قوم کے سامنے داخلی اور نی مسائل پہاڑوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بے روزگاری ، فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ ہندوستان کی سرحدوں کی یلغار سے متاثر ہیں۔ سارا ملک نیم فاقہ کشی کی میں مبتلا ہے۔ صنعتی ترقی پر بریک لگ چکا ہے۔ قتل و چوری کے واقعات سے اخبارات بھرے نظر آتے ہیں۔ ں میں پھیلی ہوئی افراتفری نے تعلیم کے میدان کو جنگ کا مورچہ بنا دیا ہے۔ اس ہنگامی دور میں لوگوں کو ائے حصول معاش کے اور کوئی مشغلہ ہی نظر نہیں آتا شق کے بازاروں میں شیخ سعدی کا یہ شعر ہر خریدار کے سازد عام ہے ۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

ن ہندوستانی فلم پر اس انقلاب کا کوئی اثر نہیں۔ ۹۰ فیصدی دل میں محض عشق و عاشقی ، چند نیم برہنہ ڈانس اور دس بارہ ی ہیجان پھیلانے والے گانوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور مر واقعہ ہے کہ ہندوستان کے سماج کو عاشقی اور نامرادی مذموم فضائیں لا کھڑا کرنے میں اس فلم انڈسٹری کا ہاتھ ہے۔ حکومت اور برسراقتدار پارٹیوں کے علاوہ می اداروں نے فلم انڈسٹری کے اس قاتلانہ اور قوم شانہ رویہ پر کبھی بھی کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا ہندوستانی وں پر کھوسلا تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی فائینل رپورٹ انتہائی مایوسانہ لہجہ میں تحریر کیا ہے کہ :۔

" ہندوستانی فلموں میں عام طور پر ایسے مناظر کی اسی کہانی ہے جنکا تعلق زیادہ تر شہری زندگی سے رہتا ہے ، جہاں محض عاشق اور رقیب ، ہیرو اور ولین ں پائے جاتے ہیں ـــــ فلموں میں ہیرو کا رول ادا نے والے عموماً حسین و جمیل ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ زیور علم سے آراستہ ہوتے ہیں لیکن کسی پیشے یا ملازمت سے

واقعات فلمی دھلی

ان کا کوئی واسطہ یا تعلق نہیں دکھایا جاتا ہے۔

ساری داستان ایک لڑکی سے شادی کرنے کی جدوجہد میں ختم ہو جاتی ہے۔ داستان کا خاتمہ ہیرو کی فتح اور ولین کی شکست پر ہوتا ہے۔ اس طرح تقریباً ساری انڈسٹری ہیر رانجھا ، لیلیٰ مجنوں ، شیریں فرہاد ، رومیو جولیٹ کے مسائل کے علاوہ اپنے کیمرے کا رخ ملک کے دیگر مسائل کی جانب کرنے سے پرہیز کرتی ہے

اس مسئلے پر ہندوستان کے مشہور پروڈیوسر اور ڈائریکٹروں سے بات کیجئے تو کچھ پروڈیوسروں کو چھوڑ کر جنہوں نے سماجی مسائل پر فلمیں بنائیں اور جن کی یہ فلمیں زیادہ تر فلاپ ہوئیں ، باقی پروڈیوسروں کا جواب یہ ہوگا کہ عام طور پر رنگین فلم بنانے پر ساٹھ ستر لاکھ کا سرمایہ لگانا پڑتا ہے سیاہ اور سفید فلموں کا مارکیٹ گر چکا ہے اس لئے رنگین فلموں کے لئے اتنے عظیم سرمایہ کو کسی ایسی کہانی پر لگا دیا جائے جسے عوام ناپسند کریں تو اس کا لازمی نتیجہ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ ہوگا۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ فلم بین حضرات سوائے چند خاص ہیرو اور ہیروئنوں کے کسی اور کو پسند نہیں کرتے اور یہ مقبول عام ایکٹر ۵ سے دس لاکھ اور کبھی کبھی پندرہ لاکھ روپے پر بھی کام کرنے سے گریز کرتے ہیں

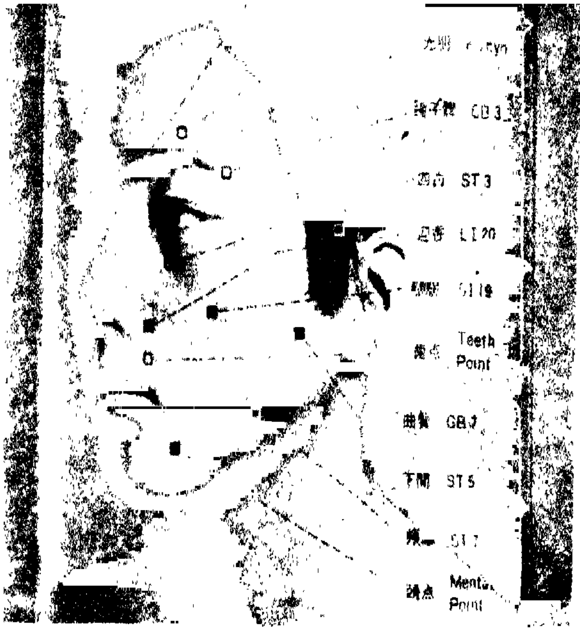
کہانی پر پوری فلم کے سارے خرچ کا ۰ فیصدی سے زیادہ صرف ہوجاتا ہے۔ باقی روپیہ فائنانسر اور ڈسٹیبوٹر کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ فلم بنانے والے کے تذبذب کا یہ عالم ہے کہ بلالحاظ مذہب و ملت ہر پروڈیوسر مہورت نکالنے پر مجبور ہے جبکہ اکثر و بیشتر یہ مہورت بھی دھوکہ دیجاتی ہے اور پروڈیوسروں کو مجبوراً فلموں کو ڈبوں میں بند کرکے مفلسی اور گمنامی کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے یہ پروڈیوسر کثیر اصلاحی فلموں کی ناکامی کا حوالہ دے کر آپ کو بتائیں گے کہ جب فلم دیکھنے والے ہی عشق و عاشقی بوسہ بازی اور نیم برہنہ رقص کو پسند کرتے ہیں تو اس میں فلم انڈسٹری کا کیا قصور ہے کیونکہ بہر حال یہ انڈسٹری ہے یونیورسٹی نہیں۔

لیکن قوم اور ملک کے مذاق کو بگاڑ کر عیش و عشرت میں زندگی گزارنے والے یہ چند فلم کار ہندوستان کی اخلاقی اقتصادی اور سماجی ترقی کی راہ میں پتھروں کی طرح حائل ہیں اس قدر نقصان عظیم کا باعث ہیں جسے سارے



ملک کے سدھار کرنے والے بھی پورا کرنے سے معذور ہیں

ہندوستانی معاشرے کے مکمل طور پر برہنہ ہو جانے سے قبل صرف ایک ہی ٹھوس قدم کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ فلم انڈسٹری کو قومیا لیا جائے اور ملک میں ایسی صاف ستھری فلمیں دکھائی جائیں جن سے عزائم اور حوصلوں کے قلعے تعمیر ہو سکیں ، نئی زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے اور نوجوانی کے بہتے ہوئے دھاروں کا رخ عاشقی اور رومان کی جانب سے پھیر کر قوم کی ترقی اور خوشحالی کی جانب کر دیا جائے جس کی آج کے ہندوستان کو اتنی ہی شدید ضرورت ہے جتنا کہ جان کی سلامتی کے لئے سانس ضروری ہے۔ ■



اکوپنکچر طریقۂ علاج جاپان اور چین میں عام ہے۔ یہ وہاں کا ہزاروں سال پرانا طریقۂ علاج ہے۔ آجکل پھر اکوپنکچر پر کافی ریسرچ کی جارہی ہے۔ اور اسے ماڈرن بنانے کی طرف توجہ دی جارہی ہے

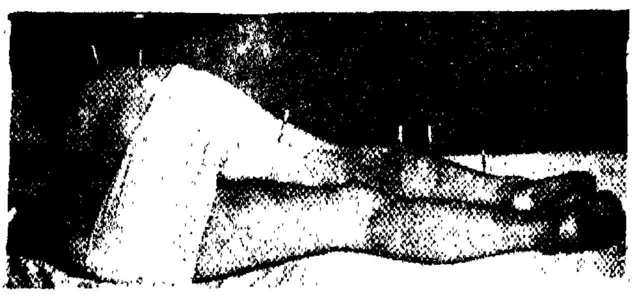
اکوپنکچر

پانچ ہزار سال پرانے طریقۂ علاج کا احیاء

نظریاتی اعتبار سے "اکوپنکچر" طریقۂ علاج اس بنیادی نقطہ پر قائم ہے کہ کسی کے جسم کے بھی مرض یا درد کو دور کرنے کے لئے اس سے دور کسی عضو میں چند لمبی میٹر گہری سوئیاں چبھا دینے سے درد یا مرض دفع ہوجاتا ہے۔ اسی طرح دس یا گیارہ مرتبہ اگر جسم کے مناسب حصوں پر سوئیاں چبھانے کا عمل جاری رکھا جائے تو مرض یا درد ہمیشہ کے لئے دفع ہوجاتا ہے۔ ہمدرد کے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن ریسرچ تغلق آباد کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالجلیل نے اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جسے ہندوستان کے اسٹینڈرڈ ویکلی نے گذشتہ سال شائع کیا تھا۔

آج سے پانچ ہزار سال قبل چین کے شہنشاہ نے اپنے خصوصی طبیب سے اس طریقۂ علاج پر روشنی ڈالنے کی خواہش کی تھی۔ چین کی مشہور کتاب نائی چنگ میں شہنشاہ کی اس خواہش کا تذکرہ درج ہے۔ درد وں اور امراض کو رفع کرنے کا یہ طریقہ علاج چین اور جاپان میں تو عام ہے ہی لیکن ان ممالک کے علاوہ یورپ کے کئی ممالک بشمول روس اور امریکہ کے کئی حصوں میں بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

علاج کا یہ طریقہ منفی اور مثبت کے اصولوں کے علاوہ پانچ عناصر، لکڑی، آگ، خاک، دھات اور آب پر مبنی ہے۔ جو چیز بھی عالم وجود میں ہے اسمیں منفی اور مثبت کے دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ انھیں چینی زبان میں "ین" اور "یانگ" کہا جاتا ہے۔ ین کو تاریکی اور مفعول قرار دیا جائے تو یانگ کو روشنی اور فعالی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مرد یانگ اور عورت ین سمجھی جاتی ہے۔ جسم کے بیرونی حصوں کو یانگ اور اندرونی حصوں کو ین کے اصطلاحی نام دیئے گئے ہیں۔ اکوپنکچر دو لفظوں سے بنا ہے۔ "اکو" سوئی کو "پنکچر" چھید کو کہتے ہیں۔ طریقہ کار سے ناواقف کو اس علاج میں اس لئے کشش نہیں محسوس ہوتی کہ متاثرہ عضو کو چھوڑ کر غیر متاثرہ جسمانی حصے میں سوئیاں چبھو دینے سے مرض کا رفع ہوجانا اتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کامیابی میں یقین نہیں لاسکتا۔ لیکن ڈاکٹروں، طبیبوں اور چند ایسے مریضوں کو جو ان امراض کا شکار رہے ہیں۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ تلی پر ورم آجانے سے شانے کے عین وسط میں شدید درد محسوس ہونے لگتا اور مریض محسوس کرنے لگتا ہے کہ اسکے کاندھے میں کسی نے باریک سی سوئی چبھو دی ہے لیکن اصل وجہ اس کے طحال کی خرابی ہے جس کا اثر کاندھوں نے محسوس کیا۔ قلب کا دورہ پڑنے کے بعد مریض اپنے بائیں بازو میں تکلیف محسوس کرتا ہے یا دانتوں کی تکلیف کا اثر آنکھوں پر یا نزلہ زکام کا اثر بالوں پر، دانتوں اور آنکھوں پر محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ



اکوپنکچر عجیب وغریب طریقۂ علاج ہے۔ اس علاج میں جسم کے مختلف حصوں میں خاص قسم کی سوئیاں اتار دی جاتی ہیں۔ مرض کے مطابق کئی روز تک یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ اور مریض جلد ہی شفایاب ہوجاتا ہے

واقعات نئی دہلی



ڈاکٹر عبدالجلیل انسٹیٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیکل ریسرچ کے ڈائرکٹر ہیں۔ حال ہی میں اکوپنکچر طریقہ علاج کا مطالعہ کرنے کیلئے جاپان تشریف لے گئے تھے۔

مغربی اقوام پر اسرائیل کا غلبہ

آج فلسطین کے قضیہ میں اسرائیل و مغربی ممالک
کا گٹھ جوڑ اگر چہ کھٹکتا ہے لیکن حیرت ناک ضرور ہے۔ وہ
سیاسی نظریاتی اور معاشی پالیسیوں کے اعتبار سے
یک جان دو قالب بن چکے ہیں اور اکثر انہیں مذکورہ
ماڈل پر دونوں فریقوں کے جائزے لئے جاتے رہے
ہیں۔ لیکن اگر ان پہلوؤں سے قطع نظر کچھ دیر کے لئے دونوں
کے تعلقات کا مذہبی میدان میں جائزہ لیا جائے تو بلاشبہ
حیرت انگیز تلخ حقیقتوں کی واضح تصویر ہمارے سامنے
آ جائے گی جنکو یا تو دونوں بھول چکے ہیں یا پھر پس پشت
ڈال کر قربان کر چکے ہیں۔ آج سبھی مغربی ممالک جن کی بیشتر
عوام دینِ مسیحی کی پیرو ہیں کسی نہ کسی بہانے سے یہودی
اسرائیل سے ہمدردی رکھتی ہیں، ان تلخیوں میں اضافہ
اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب کلیساؤں کی دلی
ہمدردیاں قاتلینِ مسیحؑ کے حق میں پائی جاتی ہیں۔ یاد
رہے کہ آج کلیسا نے یہود کو قتلِ مسیح سے بے گناہ قرار دیا
ہے۔ اس جائزہ کی صداقت و ایمان داری میں دونوں
مذہب کی مقدس کتب "بائبل" اور "تلمود" سے بڑھکر
کوئی اور ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا ——————

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہودی قوم نے اپنی سرشت کے
مطابق حضرت عیسیٰؑ سے بے اندازہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن
اس کے بدلے میں حضرت مریم عذراؑ اور حضرت مسیحؑ کی
تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا حق احسان شمار
کیا۔ پیدائشِ مسیحؑ سے آسمان کی جانب دعوت تک
دونوں ماں بیٹے اپنے احسان کشوں کے ظلم و تعدی کا
نشانہ بنے رہے۔ سارے احسانوں کا بدلہ مذہبی عناد
سے دیا گیا اور سارا عناد انکی مذہبی کتاب "تلمود" کے احکام
کے عین بموجب تھا۔ چنانچہ تلمود میں محسن یہود کی تعریف
ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

یسوع ناصری تیل و ایندھن کی دہکتی ہوئی جہنم ہے
اس کی ماں ایک سپاہی "پانڈارا" سے ملوث
ہو کر (نعوذ باللہ) حاملہ ہوئی تھی۔ نصرانیوں کے عبادت
خانے گندگی خانے ہیں اور نصرانی پیشوایانِ دین
بھونکنے والے کتے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ درج ہے: "عیسیٰ دینِ یہودی کا مرتد
ہے اور بتوں کی پرستش کرنے والا ہے، نیز ہر مسیحی خدا
اور یہود کا دشمن ہے۔"

یہود کی مذہبی تنظیم "سنہوری" جو اپنے عقائد میں حد
سے زیادہ متشدد تھی، اس نے ہی حضرت عیسیٰ کے لئے
سولی دیئے کا فتویٰ صادر کیا تھا اور والئ سلطنت
"پیلاطس" پر زور دیا تھا کہ حضرت یسوع کو سولی پہ
چڑھایا جائے لیکن اس نے ان کی مانگ
کو رد کر دیا اور صاف الفاظ میں
اعلان کر دیا کہ "میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں ——
کوئی برائی نہیں پاتا۔" (لوقا۔ ۲۳-۷) اور اگر ایسا کیا گیا
تو اس بیگناہ کے خون سے قطعی بری الذمہ ہونگا۔" (متی
۲۷ع) اس اعلان پر یہودی برانگیختہ ہو کر چلانے لگے کہ
ہمارے ناموس کی حفاظت اسی صورت میں ممکن ہے جب
اس کو قتل کیا جائے کیونکہ یہ خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی ہے"
(یوحنا۔ ۱۹:۷) آخر کار گروہ ہنگامہ کرنے لگے اور مطالبہ کرنے
لگے کہ "اسے سولی پر چڑھاؤ، اسے سولی پر چڑھاؤ" (لوقا ۲۳)
اس وقت اس نے ان کو ظاہرین کے سپرد کر دیا تاکہ وہ
اسے پھانسی دے دیں" (یوحنا: ۱۹:۱۶) تب انھوں نے
نہایت بے دردی سے کوڑے مارنا شروع کئے آخر کار انہیں
لہولہان سولی پر چڑھا دیا اور وہ بے تحاشہ چیخ رہے تھے،
"اس کا خون ہماری نسلوں کے لئے ہے"

علاوہ ازایں قرونِ ماضیہ کے یہودی پیشوایانِ دین
کی وصیتیں اور احکام بھی کم حیرتناک نہیں ہیں جو مسیحیوں کے
خلاف کینہ پروری اور بغض و عداوت کا بیّن ثبوت ہیں۔
لطف یہ ہے کہ کوئی مخفیہ احکامات یا خیالات کی شکل میں
نہیں بلکہ عام اور پُر زور نصیحتیں جس سے یہی پیشوا واقف
ہیں۔ ملاحظہ ہو تلمود کا ایک مقدس حکم: "ہر یہودی پر
واجب ہے کہ وہ دن میں تین مرتبہ نصاریٰ پر لعنت کرے
اور خدا سے انکی حکومت اور ملک کی ہلاکت کی دعا کرے"
یہودیوں کا فریضہ ہے کہ وہ مسیحیوں کے ساتھ ایک گندے
ذلیل ترین جانور کا سا سلوک کریں" آگے چل کر نفرت
انتہا پر پہونچ کر قتلِ عام کی ترغیب دیتی ہے۔ تلمود ہی کے
الفاظ ہیں:۔
"مسیحیوں کو قتل کرنا ایسا کارنامہ ہے جس پر خدا

ایا نوازشیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی یہودی کسی وجہ سے بچے قتل پر قادر نہ ہو تو اس کے ذمہ یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے مواقع کی جستجو میں رہے جنھیں پا نکو الا کرنا ممکن ہوسکے۔

اے اژدھوں کی اولاد

دوسری جانب دینِ مسیحیؑ کے مطالعہ کے وقت حضرت عیسیٰ کے ان الفاظ و القاب کی گونج سنائی دیتی ہے جن سے یہودیوں کی ساری عیاری و مکاری کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ ملاحظہ ہوں انجیل کے الفاظ: ۲۳" تباہی و بربادی ہو تمھارے لئے اے یہودیو! تم انبیاءؑ کی قبروں کی تزئین و آرائش کرتے ہو، تم کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے آباؤ اجداد کے وقت ہوتے تو انبیاء کرام کے قتل میں شریک نہ ہوتے، اس طرح تم خود اپنے متعلق گواہی دیتے ہو کہ تم انبیاء کے قاتل ہو۔ تم اپنے آباؤ اجداد کی مثل ان اعمال کا دوسرا پلڑہ ہو! اے زہریلے سنپولو! اے اژدھوں کی اولاد! تم جہنم سے بھاگ کر کہاں جاؤگے؟ تمھارے پاس انبیاء کرام اور صلحاء عظام صحائف لے کر بھیجے جاتے ہیں تو تم انکو قتل کر ڈالتے ہو یا سولی پر چڑھا دیتے ہو۔ ان کو بستیوں سے نکال دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے ہو! کیا اس لئے؟ کہ ہابیل سے لے کر زکریا بن برخیا تک ہر پاکباز و متقی کا خون تمھارے لئے نام لکھ دیا جائے؟"

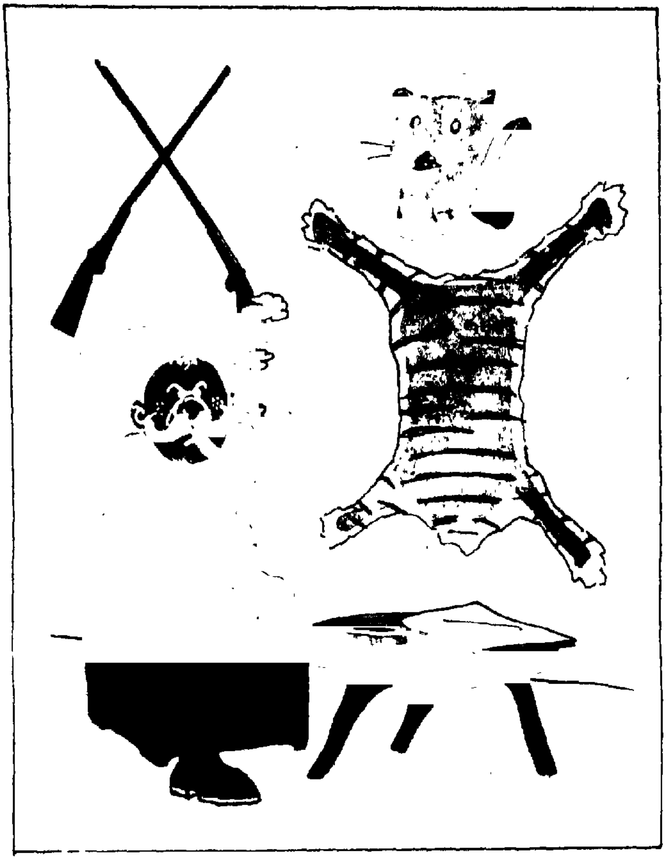
(انجیل: ۲۳) آگے یہی انجیل مقدس ان الفاظ میں لعنت کناں ہے۔ متی ۲۵: "دور ہو جا اے ملعون قوم! تیرا ٹھکانا وہ ہمیشہ ہمیش کی جہنم ہے جو ابلیس اور اس کے پیروؤں کی لئے دہکائی گئی ہے، میں بھوک سے تڑپتا رہا اور تم سے ایک ٹکڑا نہ دیا گیا، پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور تم سے ایک قطرہ پانی نہ دیا گیا، میں لاوارث و بے سہارا ہوا تو تم سے دلاسہ تک نہ کی گئی، میرے تن پر کپڑا نہ تھا لیکن تم سے ایک چیتھڑا نہ دیا جاسکا۔۔۔ دور ہو جاؤ ملعونو!

سب سے حیران کن یہودیوں کی یہ روایت و رواج ہے کہ ان کی کوئی بھی خوشی خواہ وہ تہوار کی شکل میں ہو یا ذاتی زندگی سے متعلق، اس وقت تک نامکمل ہوتی جب تک ایسے مواقع کے مخصوص پکوانوں میں کسی مسیحی کے خون کی آمیزش نہ کیا جائے۔ یا ایسا ممکن نہ ہونے پر کم سے کم ایک مسیحی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا عزم مصمم اس کا قائم مقام سمجھا جاتا ہو کیا اس "پرستش" خونریزی سے مسیحی اقوام ناواقف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم ان کو مطلع کرنے کی خیرخواہی انجام دیتے ہیں، اگر وہ اس پر یقین کرنے میں متامل ہوں تو تلمود سے سن لیں: "ہمارے دو خونی مواقع ایسے ہیں جن سے ہمارا معبود یہوہ خوش ہوتا ہے جن میں سے پہلی ہماری عید ہے جس میں انسانی خون کی آمیزش والے کھانے چلتے ہیں، دوسرا موقع ہمارے بچوں کے ختنہ پر منائی جانے والی خوشیاں۔" مذکورہ عید اول ہر سال عموماً مارچ کی چوتھی تاریخ کو منائی جاتی ہے "اسکوبوریم" کہتے ہیں اس میں خاص طور پر بالغ آدمی کے خون کی شرط ہے۔ دوسری عید "فصح" کہلاتی ہے جو اوائل اپریل میں منعقد کی جاتی ہے اس میں دس سال سے کم عمر کے بچوں کے خون کی خصوصی شرط ہے اس میں قربانی کا جو وحشتناک طریقہ مستحسن ہے وہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں جس میں بچہ کو لٹا کر اس کے جسم کو نوکیلے ہتھیاروں سے گود کر خون جمع کیا جاتا ہے تاکہ تہواری کھانوں میں مزید لذت پیدا کی جاسکے۔ اس وحشیانہ رسم کی تصدیق قرون وسطیٰ کے متعدد مؤرخوں نے بھی کی ہے۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یورپ سے یہودیوں کے اخراج کا سبب ان کی خفیہ خونریزی تھی جس میں وہ اپنی مذہبی رسومات کے لئے مسیحی بچوں کو چرا کر ان کی پوشیدہ قربانی کو زیادہ مرغوب خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے صفحات میں لاکھوں مسیحیوں کے خونِ ناحق کی سرخی تر و تازہ ملے گی جو محض اختلاف مذہب کی بنا پر یہودیوں کے ہاتھوں نہایت سفاکانہ طریقے سے ذبح کر ڈالے گئے۔ یہود و نصاریٰ کے مذہبی عناد کے سلسلے میں تاریخ کے جو اوراق رہنمائی کرتے ہیں انکی روشنی میں یہود نے ۲۶۶ء میں سرزمینِ فلسطین پر لاکھوں مسیحی مردوں، عورتوں اور بچوں کو سڑکوں پر ذبح کر ڈالا پھر اس خونریزی نے ایک دلچسپ مشغلہ کی صورت اختیار کرلی، مثلاً ۱۱۵ء اور عہد "حاخام" "اکیبا" میں ۲ لاکھ مسیحیوں کے سر تن سے جدا کئے گئے۔ ۲ لاکھ چالیس ہزار نفوس "لیبیا" میں تہہ تیغ ہوئے تقریباً ۲ لاکھ انسانی جانیں ۱۱۲ء میں قبرص کے علاقوں میں ضائع کی گئیں۔ ۶۱۵ء میں یہودی حکمرانِ وقت نے حاخام (یمونا) کی سازشوں میں آکر ملک کے ہر عیسائی کو قتل کروادیا اس دوران قبرص میں عیسائیوں کے سر سڑکوں پر کچلے جانے والی کی مانند کاٹے گئے۔ اور ہزاروں معصوم بے گناہوں کو کتوں کی طرح ان کی بستیوں سے دھتکار دیا گیا۔ انھیں والدت کا رستا ہوا ناسور تھا جو ایک عرصۂ دراز گزرنے کے بعد مندمل نہ ہوسکا تھا اور اس کی تیسویں نے فتح بیت المقدس کے وقت عیسائی پیشوایانِ مذہب کو حضرت عمرؓ کے سامنے یہ فریاد کرنے پر مجبور کردیا کہ فتح کے بعد آپ کو مکمل اختیار ہے لیکن اگر آپ ناپاک ذلیل یہودیوں کو سرزمینِ قدس سے نکال دینے کا وعدہ فرما لیں تو ہم بے چون و چرا آپ کی حکمرانی تسلیم کرلیں گے اور قلعہ آپ کے سپرد کردیں گے۔

خود تاریخ دینِ مسیح کا ایک تاریک ترین دور بھی ہے جس پر ہر عیسائی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور اس بھیانک دور کا تصور ایک کپکپی پیدا کردیتا ہے جب ایک ہی دین کے پیرو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے نام پر اپنے بھائیوں کے خون سے چلو بھرنے میں منہمک تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یورپ ہی نہیں بلکہ ساری کائنات خونی غسل کر رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے ذرا مشکل ہی سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ تاریخی خونریزی ان کے موجودہ "حلیفوں" کی ہی کرشمہ سازی تھی۔ یہ بلاشبہ یہود کی سازش تھی تاکہ ان کی طاقت کا شیرازہ بکھیر کر اپنی بالادستی قائم کرسکیں اور دینِ مسیحی میں من مانے طور پر مداخلت کرسکیں۔

دورِ حاضر میں یہودی بالادستی

آج عربوں کے مقابل عیسائیت اور یہودیت کے اتحاد کو اگرچہ اس سائنٹیفک دور میں مذہبی آزادی، روشن خیالی اور وسعت قلبی کے نادر نمونے کا نام دیا جاتا ہے لیکن انھیں اقوام میں بہت سے ایسے اہل بصیرت و دانش بھی ہیں جو اپنے ماضی کی تلخیوں کو حال کی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر فراموش کرنے پر آمادہ نہیں۔ مسیحیت کی حمایت میں اسرائیل کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں پلٹ کر نکل نہیں سکتے۔ وہ اس اتحاد و دوستی کے دلفریب پردہ میں اپنی مذہبی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی غلامی کی بھیانک تصویریں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ آج جن سنپولوں کو دودھ پلا کر اپنی قوم دوسرے کے گھروں میں چھوڑ رہی وہ کل اژدہے بن کر ان کی اپنی قوم کو بھی ڈسنے میں قطعاً کوئی تکلف نہ برتیں گے۔ وہ اچھی طرح واقف ہیں



یہودی قوم کا نعرہ اس وقت نیل سے فرات تک
س کے ذہن میں مقدس تلمود کے یہ احکام بھی نقش
ہیں۔ تلمود کے واضح الفاظ میں: "ہر یہودی پر
ہے کہ وہ پورے روئے زمین پر دوسری قوموں کی
ت اکھاڑ پھینکنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دے
رف یہودیوں کا ہی غلبہ و سلطنت ساری اقوام پر
کے لئے قائم ہو جائے۔ خواہ اس کے لیے جنگ ضروری
ین جیسے دنیا کی ہلاکت۔۔۔"

ان مقدس الفاظ کا اثر آج کی دنیا میں بڑھتا
ے بڑھتا دیکھ کر ہر یہودی کے عقیدے میں مزید
ں اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بھولے نہیں
، جب صرف تین سو یہودیوں کو ساری دنیا پر حکمراں
یپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ حکمراں انکی خفیہ تنظیم
زنیت کی ترویج و ترقی کے ذریعے اپنے مقاصد کے
ا میں منہمک ہے اس تنظیم کے سربراہ کا انتخاب
ہی خفیہ طور پر ہوتا ہے۔ اور منتخب سربراہ حضرت
و حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت کا وارث حقیقی سمجھا
ہے۔ جرمنی کا ایک یہودی سابق وزیر ""
"ہے صریح الفاظ میں کہتا ہے "تین سو ایسی اہم
یتیں ہیں جن کے درمیان نہ صرف یورپ بلکہ
ں دنیا کے سائل حکومت محدود ہیں۔"

صیہونی تنظیم صرف عرب ممالک کیلئے ہی سم قاتل نہیں
اپنے آقا مغربی عوام کی فہم و فراست میں بھی
ی طرح اندر ہی اندر کام کر رہی ہے اپنے نظریات و
جراثیم ان کے ذہنوں میں بھر دینے کی ہر ممکن
ں کر رہی ہے۔ امریکی دانشور بنجامین فرینکلن
نے والی تباہی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کو ان
سے آگاہ کیا ہے۔

"یہودی ایک زبردست تباہی ہیں کیونکہ جس
ں انھوں نے پڑاؤ ڈالا وہاں اخلاقی پستی بدکرداری
رتی و سیاسی خیانت کا بازار گرم ہو گیا۔ اگر ہم
ریکا میں یہودیوں کے داخلے پر دستوری پابندی
ئی تو سو سال سے کم عرصے میں ہماری قوم ہولناک
ل میں پھنس کر لرزہ خیز حوادث سے دوچار ہو جائے
یاں تک کہ وہ ہماری خون پسینہ کی کمائی ہوئی
آزادی اور نظام حکومت کی دھجیاں بکھیر دیں گے
اگر ہم نے ان کے قیام امریکا پر آئینی پابندی نہ
لگائی تو وہ دن دور نہیں جب ہماری اولاد کھیتوں اور
بے کار خانوں میں یہودیوں کی غلام بن جائے گی۔ وہ اپنی
جان کی بازی لگانے پر مجبور ہوں گے تاکہ ان کے مالکوں
کی جھولیاں بھر سکیں۔ اور ان کے ڈھانچوں پر یہودی عشرت
گاہیں بن سکیں۔"

فرینکلن کی دور اندیشی اس وقت اور بھی اہمیت
اختیار کر لیتی ہے جب اس کے ساتھ امریکا میں فراہم کیے
ہوئے حالیہ اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے۔ ان اعداد و شمار
کے مطابق اس وقت امریکا میں ساری ملکی معیشت پر حیرت
ناک یہودی غلبہ ہو چکا ہے، جب کہ امریکی آبادی میں یہودی
تناسب صرف ۲ فی صد ہے لیکن امریکی تجارت میں یہ ،،
فی صد تک غالب ہے، ملک کے عظیم ترین سرمایہ داروں میں
اکثریت یہودی ہے۔ اسی طرح صنعت و حرفت کے
میدان میں بھی انھیں مکمل فوقیت حاصل ہے۔ اسکے علاوہ
امریکی زراعت میں ۹۵ فی صد کا تناسب یہودیوں کو حاصل ہے
اور یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ سیاست پر انکا سو فی صد
کنٹرول ہو چکا ہے۔ اس حیثیت سے امریکا اور بیشتر مغربی
ممالک اپنی قومی انفرادیت کھو کر دنیا کے روبرو یہودی کو صیہونی
ایجنٹ اور ڈھنڈورچی بن کر رہ گئے ہیں۔ امریکی سیاست
میں وہی پالیسی یا اصول زندہ رہ سکتا ہے جس کو یہودیوں
کی سب سے بڑی امریکی "موثر تنظیم" زندہ رہنے کی
اجازت دے دے۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ بھی کسی مسئلہ پر فیصلہ
کرنے سے پہلے ان پالیسی ساز یہودیوں کی رائے کو مدنظر
رکھنے پر مجبور ہے۔ اس پہلو سے امریکا کے عظیم ترین باشندے
یہودی بالواسطہ طور پر دنیا کے ایک بڑے حصے کی زمام
سلطنت پر قبضہ کر چکے ہیں۔

کیا ان تلخ ترین حقائق سے امریکی اور مغربی عوام
کوئی عبرت حاصل کر سکیں گے؟ (الشہاب)



دنیا میں مقدس عصمت فروشی کا رواج

یونس آگاسکر
(ایم اے)

ماہرین انسانیات وسماجیات کی تحقیق کے مطابق دنیا میں فحاشی اور عصمت فروشی کی ابتدا مذہب کی آڑ میں ہوئی۔ دنیا کے قدیم ترین لٹریچر کے مطالعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں ایسی عورتوں کی موجودگی لازم ہوتی تھی جو پجاریوں اور مسافروں کی دلبستگی کا سامان مہیا کر سکیں اور اس خدمت کو حصول ثواب کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یونان کے شہر کورنتھ کے قلعے میں افرودایت (Afrodite) کے مندر میں ایک ہزار سے زائد "مقدس اچھوتیاں" مندر کی خدمت کے لئے وقف رہا کرتی تھیں۔ بابل کے شہر ارِیخ میں اشتار دیوی کے مندر میں بھی بکثرت عورتیں خدمتِ خلق کے لئے ہمیشہ موجود رہتی تھیں۔ اسی قسم کا رواج ایشیا کے مختلف حصوں، شمالی و مغربی افریقہ، جزیرۂ قبرص اور روم و مصر وغیرہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ ایشیا میں ہندوستان اس سلسلے میں دیگر ممالک سے کافی آگے تھا۔

ڈاکٹر جے۔ جی۔ فریزر کی تحقیق کے مطابق اس ناپاک عقیدے اور رواج کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے پہل مواصلت و مباشرت کا طریقہ دیوتاؤں کی دین سمجھ کر دیوی دیوتاؤں ہی سے منسوب کر دیا گیا۔ عقیدہ یہ تھا کہ انسانی و حیوانی افزائش نسل اور فصل کی شادابی کے لئے دیوتاؤں نے یہ بات دنیا والوں کو



سکھا دیا۔ اس عقیدے کے تحت لوگ دیوی دیوتاؤں کے استھان میں جا کر مباشرت کرنے لگے۔ مدتِ دراز کے بعد جب لوگ تہذیب سے آشنا ہوئے اور انفرادی شادی بیاہ کا طریقہ رائج ہوا تو بلا امتیاز اختلاط کو مذموم سمجھا جانے لگا اور فحاشی کا کسی حد تک انسداد ہو گیا۔ لیکن چونکہ پرانا عقیدہ مر نہیں سکتا تھا نیز پجاریوں اور صاحب اقتدار مردوں کو ہوس رانی کا چسکا پڑ چکا تھا اس لئے مذہب کی آڑ میں عورتوں کے ذریعے مندروں اور عبادت گاہوں میں "مقدس عشوہ فروشی" کو رواج دیا گیا۔

مختلف ملکوں میں ان عصمت فروش عورتوں کے مختلف نام ہوتے تھے۔ روما میں "وسٹا کی کنواریاں" (Vesta Virgins) کہلاتی تھیں۔ یونان میں ان کا نام "ہاروڈیول" (Herodules) تھا۔ بابل میں "کادِشتو" (Kadishto) کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ ہندوستان میں دو تہذیبوں کے ملاپ سے "مرلیاں اور دیوداسیاں" کہلائیں اور مسیحی دنیا میں نن (Nuns) ہو گئیں۔

ترغیبات جنسی از نیاز فتحپوری صفحہ ۱۰۲

غرض دنیا کے تمام مذاہب میں اور خصوصاً بابل، مصر اور یونان والوں میں قحبہ خانوں اور جسم فروشی کو موقر درجہ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ پروہت اور مذہبی رہنما درباری رقاصاؤں کو دیوتاؤں کی دلبستگی کے لئے ملازم رکھ کر نچواتے تھے۔ قدیم یونان میں محبت کی دیوی وینس (Venus) کے مندر رقاصاؤں اور ان کے خریداروں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ مصر کے "رامسس" اور "اوسی رس" دیوتاؤں کے مندر کی رقاصاؤں کے عریاں رقص تہواروں اور جلوسوں کی خصوصیت ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں دیوداسیاں ہوا کرتی تھیں جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہودیت اور نصرانیت میں بھی اسلام سے پہلے اس قسم کی گھناؤنی جنسیت کا رواج تھا۔

بقول نیاز فتحپوری جب امتدادِ زمانہ کے باعث (مذہبی) رہنماؤں کا اثر زیادہ قوی ہو گیا تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس طریقۂ عصمت فروشی سے متنفر ہوئے جاتے ہیں یہ تبلیغ شروع کی کہ جو شخص دیوی دیوتاؤں کے استھان پر کوئی چیز چڑھا دیتا ہے خواہ وہ عصمت و عفت ہی کیوں نہ ہو اسے بہت نفع ہوتا ہے اور عورت کی قوتِ تولید بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ آہستہ آہستہ اس عقیدے کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم قوموں میں عورتوں کے لئے یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ عمر بھر میں کم از کم کسی ایک اجنبی مرد کو ملتفت ہونے کا موقع دیں اور اس مقصد کے لئے عبادت گاہوں خصوصاً دیویوں کے مندروں کو مرکز بنا لیا گیا۔ مثلاً بابل میں ہر عورت کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ کسی غیر مرد کو اپنا جسم بیچ کر اپنی کمائی زرخیزی و فصل کی دیوی میلتا (My Litta) کے مندر کو نذر کے طور پر دے۔ اس سلسلے میں نوجوان اور خوبصورت عورتیں جلد ہی خریدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں جب کہ بعض کو ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

مورخ وسیاح ہیروڈوٹس کے الفاظ میں "بابل والوں میں ایک نہایت شرمناک رواج یہ ہے کہ ہر عورت کا جو اس ملک میں پیدا ہو فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ افرودیت (Afrodite) دیوی کے مندر میں جا کر بیٹھے اور آزادانہ مردوں سے ملے چنانچہ اس مندر میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد ایسی نظر آتی ہے جو اپنی چوٹیوں میں پھول گوندھے ہوئے بیٹھی رہتی ہیں اور غیر مرد ان کو دیکھتے ہوئے [illegible] سے گزرتے رہتے ہیں اور جس پر نظر انتخاب پڑتی ہے ٹھہر جاتے

الانصاف نئی دہلی

ہیں۔ جو عورت ایک دفعہ بیٹھ جاتی ہے پھر اسے اس وقت تک جانے کی اجازت نہیں ملتی جب تک کوئی غیر محرم اس کی گود میں چاندی کا سکہ پھینک دے۔

جب مرد چاندی کا سکہ گود میں ڈال دیتا ہے تو وہ اپنے منہ سے یہ الفاظ نکالتا ہے "ملیتا دیوی تیرا بھلا کرے" تب عورت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتی کہ وہ نقرئی سکہ کتنا بڑا ہے۔ جب وہ گود میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس کے لینے سے انکار کرنا اصولاً جرم ہے کیونکہ وہ سکہ متبرک ہو جاتا ہے۔ جو عورتیں حسین ہوتی ہیں وہ بہت جلد چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں، جو بدصورت ہوتی ہیں ان کو زیادہ مدت صرف کرنی پڑتی ہے اور تین تین چار چار دن تک وہاں پڑی رہتی ہیں۔"

ہیروڈوٹس کے بیان کردہ رواج سے ملتی جلتی رسوم کا وجود کلدانیہ میں می لتا، فنیقہ اور قرطاجنہ میں اشتار ایران میں متھرا، یونان میں وینس اور ہندوستان میں سوریہ و شیو کے مندروں میں پایا جاتا تھا۔ ہندوستان میں البتہ عام عورتیں اس طرح علانیہ فحاشی کی مرتکب نہیں ہوا کرتی تھیں۔ صرف درباری رقاصائیں اور مندر کی دیوداسیاں غیر مردوں سے مواصلت اختیار کرتی تھیں۔

دیوداسیوں کا ذکر ویدک اور بدھ مت سے قبل کی مذہبی کتابوں میں نہیں ملتا۔ لیکن ساتویں صدی میں ہوین سانگ کی آمد سے قبل یہ روگ مذہبی حلقوں میں سرایت کر چکا تھا۔ ہوین سانگ نے بھی اس قسم کے مندروں کا ذکر کیا ہے جن میں دیوداسیاں بڑی تعداد میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھیں۔ ان میں ملتان کا سوریہ مندر خاص شہرت رکھتا تھا۔ مذہبی ہدایتوں سے مملو "بھوشیہ پران" کے مطابق جنت کے حصول کا آسان طریقہ یہ تھا کہ ایک ناچنے والی لڑکی سورج دیوتا کے مندر کے لئے وقف کر دی جائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کو ناچ گانا سکھا کر سورج دیوتا کے مندر کو حصول جنت کی آرزو میں وقف کر دیا کرتے تھے۔

یوں بھی ہوتا تھا کہ غریب ماں باپ بھوک سے مجبور ہو کر اپنی اولاد کو پجاریوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی اوہام پرست ماں باپ لڑکی کو منحوس خیال کر کے مندر کی خدمت پر مامور کر دیتے تھے اور یہ لڑکیاں بھی بعد میں دیوداسیاں بنائی جاتی تھیں لیکن عموماً مندروں کی یہ دیوداسیاں فاحشہ عورتوں یا طوائفوں کے خاندانوں سے چنی جاتی تھیں۔

انیسویں صدی کے سیاح "ایب ڈُوبیس" نے جنوبی ہند میں رائج ایک خاص "طریقہ انتخاب" کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب مورتی کو کسی تہوار کے موقعے پر باہر نکال کر گشت کرایا جاتا تھا تو پجاری یاتریوں اور زائرین کے درمیان جا کر خوبصورت لڑکیوں کو ان سے مانگا کرتے تھے۔ اس سیاح کے قول کے مطابق لوگ طوعاً و کرہاً اس پر آمادہ ہو جاتے تھے لیکن بعض لوگ انکار بھی کر دیا کرتے تھے۔

دیوداسیوں کی تاریخ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے اس گھناؤنے رواج کو فروغ دینے میں پجاریوں سے زیادہ راجاؤں کا ہاتھ تھا۔ مندروں کی آمدنی میں اضافہ کر کے حکومت کے خزانۂ عامرہ میں اضافہ کرنا ان کا مقصد ہوتا تھا چنانچہ ان دیوداسیوں کا کام تہواروں اور تقریبات کے موقعوں پر دیوتاؤں کے سامنے رقص کرنا، گانا اور زائرین کو زیادہ سے زیادہ بھکشا دینے پر آمادہ کرنا ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں لوگوں کی دل بستگی کرنا بھی ان پر لازم تھا۔

اسی طرح وہ ناٹکوں وغیرہ میں پارٹ ادا کر کے بھی پیسے کمایا کرتی تھیں۔ دیگر اوقات میں انہیں پجاریوں اور امراء کے بستروں کی زینت بھی بنا پڑتا تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عہد وسطیٰ میں بعض دیوداسیوں کا امیر کبیر اور انتہائی معزز عورتوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔ انکی اتنی عزت تھی کہ وہ راجاؤں کے محلوں میں جا کر ان کے ساتھ خورد و نوش میں بھی شریک ہو سکتی تھیں۔

دیوداسیوں کے سلسلے میں سورج دیوتا کے مندر خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ ان دیوداسیوں کی تعداد سے مندر کی شان اور دولت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے وقت سومنات کے مندر میں (یہ شیو دیوتا کا مندر تھا اور آج بھی اپنی نئی شکل میں اسی جگہ قائم ہے) پانچ ہزار دیوداسیاں تھیں جو رات دن مورتی کے سامنے گاتی بجاتی رہتی تھیں۔ عہد وسطیٰ کی ایک تحریر کے مطابق صرف گجرات میں ۲۰ ہزار دیوداسیاں مختلف مندروں میں دیوتاؤں کی خدمت پر مامور تھیں۔

اگرچہ دیوداسیوں کو سماج میں کافی عزت حاصل تھی لیکن تعلیم یافتہ برہمن طبقہ اس رواج کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسلام کے زیر اثر کے بعد آہستہ آہستہ اس رسم کا دائرہ محدود ہو گیا۔ صرف وجے نگر میں یہ رواج فروغ پاتا رہا لیکن انگریزی دور میں سارے ہندوستان سے دیوداسیوں کا وجود تقریباً ختم ہو گیا۔ صرف گوا میں جہاں پرتگالیوں کا اثر و اقتدار قائم تھا یہ گھناؤنی رسم آزادی کے بعد بھی جاری رہی چنانچہ بمبئی کی اکثر نرتکیاں اور اونچے درجے کی طوائفیں گوا کی دیوداسیوں کی نسل سے ہیں۔ گوا کی آزادی کے بعد ملک کے دیگر حصوں کی طرح گوا بھی اس لعنت سے پاک ہو رہا ہے



اسوقت کے انتظار میں۔ جب دنیا سے یہ لعنت دور ہوگی

ارجک سنگھ — ایک نومولود جماعت

۲۰ فیٹ سپیس پر لگا ہوا ارجک سنگھ کا وسیع و عریض بورڈ اتنے جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ شاید یہ اعزاز کسی بھی سیاسی پارٹی کے بورڈ کو حاصل نہ ہو۔ ارجک سنگھ ہندوستان کے پسماندہ طبقات کے دانشوروں کا ایسا ادارہ ہے جو بقول ان کے بانی شری رام سروپ ورما سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور نہ وہ ارجک سنگھ کو پارٹی کہنے کے حق میں ہیں۔ شری ورما نے اس ادارہ کو یکم جون ۱۹۶۸ء کو قائم کیا۔ اس ادارے میں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے علاوہ تقریباً تمام پارٹیوں کے مقتدر رہنما پارلیمنٹ کے ارکان، صوبائی اسمبلی کے ممبران شریک ہیں۔ ارجک سنگھ کی سب سے بڑی مخالف یہی دونوں جماعتیں (جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی) ہیں۔ اور خود ارجک سنگھ برہمن ازم کا سخت ترین دشمن ہے۔ ادارے کے قواعد وضوابط کے تحت برہمن ازم کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جبکہ خود برہمنوں سے اسکو اسی طرح کوئی بیر نہیں ہے جیسے مہاتما گاندھی کو انگریزی حکومت سے اختلاف کے باوجود انگریز قوم سے کوئی پرخاش نہ تھی۔

ارجک سنگھ سماج میں مساوات لانے کی مہم لے کر قائم ہوا ہے۔ اس کے نزدیک ذات پات اور بھید بھاؤ ملک و قوم کے لئے ایسی عظیم رکاوٹ ہے جو ہندوستان کو کبھی بھی ترقی کی منازل پر نہیں پہونچنے دے گی۔ دراصل یہ معاشرتی ادارہ ہے، انسان اور انسان کے درمیان مساوات قائم کرنے کے علاوہ مزدور کی عظمت و حرمت کا قائل ہے۔ مزدوروں میں کسی بھی قسم کی تخصیص کا قائل نہیں جو عزت دماغی اور ذہنی مزدور کی ہے اس کا حق دار جسمانی محنت کرنے والا مزدور بھی ہونا چاہیئے۔ مزدور اور مزدور میں پائی جانے والی سماجی نابرابری کا استیصال ہونا ملک اور قوم کے لئے خوشحالی کا راستہ ہموار کرسکتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام سیاسی رہنما جو سماجی عدم مساوات کے مخالف ہیں جیسے ایس۔ایس۔پی۔ بی۔کے۔ڈی، کانگریس اور ریپبلکن پارٹی کے سرکردہ ممبران ارجک سنگھ میں شامل ہوچکے ہیں۔ شری مہاراج سنگھ بھارتی ایس۔ایس۔پی کے ممبر لوک سبھا ارجک سنگھ کے مرکزی دفتر کے انچارج ہیں۔ شری مہاراج سنگھ جو پیشے کے اعتبار سے کسان ہیں تقریباً ساری دنیا کے دورہ کے بعد مختلف ممالک میں کاشتکاری اور زراعت کے تجربات سے استفادہ کرکے ہندوستان کے زراعتی مزدوروں کے لئے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ عملاً سارے ہندوستان میں اس نوزائیدہ جماعت کی شاخیں قائم ہوچکی ہیں لیکن بہار، یوپی، مدھیہ پردیش، ہریانہ وغیرہ میں جماعت بڑی سرگرمی سے کام کررہی ہے اور یہ وہ علاقے ہیں جہاں جسمانی مزدوروں کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ انھیں کم تر اور چھوٹا سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں اس جماعت کے لگ بھگ ۲۰ ہزار سرگرم کارکن ہیں۔ لفظ ارجک کا مطلب ایک ایسا پیشہ ور فرقہ ہے جس کے ۹۵ فیصدی افراد روزی کمانے کے لئے جسمانی محنت میں مشغول ہیں۔

اس جماعت کی فیس ممبری ۲۵ پیسے ہے لیکن نذرانے اور پیشکش کی صورت میں وصول ہونے والی رقومات سے جماعتی تنظیم اور اخبار کے مصارف برداشت کرلئے جاتے ہیں۔ جون ۱۹۶۸ء میں قائم ہونے والی اس جماعت نے اتنے قلیل عرصے میں تقریباً سارے ملک میں اپنی شاخیں قائم کرکے گذشتہ سال کے ماہ مارچ سے ایک ہفت روزہ ہندی ارجک بھی نکالنا شروع کردیا ہے جو اس جماعت کا سرکاری آرگن ہے۔ لکھنؤ میں جماعت کے چیرمین شری موتی رام کا قیام ہے جو یوپی بی، کے، ڈی کے سیکریٹری بھی ہیں۔

جماعت کے بانی شری رام سروپ ورما بیس سال سے سوشلسٹ پارٹی میں کام کررہے ہیں وہ ۱۹۵۷ء میں یوپی اسمبلی میں ممبر چنے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں یوپی کی ایس، وی، ڈی میں وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں۔ شری ورما نے ۱۹۴۸ء میں بی۔اے کرنے کے بعد کانپور کی سوشلسٹ پارٹی میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کردیا خود وہ کرمی (KURMI) نام کے پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو، ہندی، انگریزی زبانوں سے کماحقہ واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ انھوں نے سیاسی زندگی میں کارہائے



شری مہاراج سنگھ بھارتی۔
سوشلسٹ پارٹی کے ایم پی اور ارجک سنگھ کے دفتر کے انچارج

نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے خون اور پسینہ ایک کیا۔ آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے اپنے تعلیمی ارتقاء کو نظرانداز کردیا اور اس کا پھل انھیں یہ ملا کہ سماج میں انکی وہ حیثیت نہیں جو اعلیٰ ذات کے ان ہی جیسے ہندوؤں کی ہے۔ شری ورما کو یہ بات کھٹکتی رہی اور انھیں اس احساس کمتری نے اس منزل پر پہونچا دیا جہاں سے وہ ارجک سنگھ کے بانی ہوکر ذات پات کو ہندوستان سے ختم کرنے کا منصوبہ لے کر پھر خاردار راہوں سے انجانے مسافر کی طرح منزل کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ ان کے احساس، شعور اور ادراک کو جس چیز نے سخت مجروح کیا وہ ملک میں تمام منافع کی چیزوں پر برہمنوں کا قبضہ تھا۔ ایک برہمن جب چاہے شودر ہوسکتا ہے، وہ مچھلی اور گوشت کی تجارت کرسکتا ہے، سڑکیں صاف کرسکتا ہے، مچھیرا بن سکتا ہے، زراعت، کاشتکاری، چمڑا سازی اور دیگر صنعتوں میں غرض کہ جہاں بھی اسے منافع کی راہیں دکھائی دیں اس کے لئے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک ہریجن جو کسی مہتر کے یہاں پیدا ہوا ہو یا جس نے کسی چمار یسوڑ کے گھر میں جنم پایا تا عمر ہریجن کی حیثیت سے ہی رہے گا۔ اگر وہ حلوائی کی دوکان کھولتا ہے تو تمام اعلیٰ ذات کے لوگ اس کا بائیکاٹ کردیتے ہیں اسے کسی اعلیٰ اور معزز پیشہ کو اختیار کرنے کا حق تو ہے لیکن اس کے اس حق کی حمایت کرنے والا اور اس کے ساتھ تعاون کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح ملک میں جہاں

مزدوری کرنے والے کروڑوں انسان سماجی عدم مساوات کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ انکی امنگیں اور حوصلے پست کئے جاچکے ہیں۔ آواگون کے عقیدے نے انہیں واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جنم کے بُرے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ارجک سنگھ اسی لئے آواگون میں یقین کرنے والے تمام طبقوں کا کٹر مخالف ہے اور اس جماعت کے نزدیک جب تک آواگون کا عقیدہ ختم نہ ہوگا اور ذات پات کے مدارج قائم رہیں گے ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔ چونکہ جب تک سماج میں معاشرتی مساوات کا پرچم پوری طرح بلند نہ ہوگا وہ اقتصادی اور سیاسی ارتقاء کے صحیح مفہوم سے ناآشنا اور محروم رہے گا۔ جماعت کے خیال میں سماج کو انسانی جسم کے چار حصوں کی طرح تسلیم کر کے تقسیم کیا جانا اقتصادی ترقی کی راہوں میں خار دار جھاڑیاں بچھا دینے کے مترادف ہے چونکہ انسان کے ذہن و دماغ کا جو درجہ ہے وہ برہمن کے لئے مخصوص ہے اور جو ہاتھوں کو عظمت اور طاقت حاصل ہے وہ کھتری کے لئے وقف کر دی گئی ہے۔ انسان کے معدہ کو ویش سے تعبیر کیا گیا ہے اور نچلے حصے یعنی پاؤں وغیرہ کو شودر قرار دیکر سارے سماج کو چار حصّوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ شری مہاراج سنگھ نے کہا کہ دماغ کو ہر قسم کی آزادی دیدی گئی ہے وہ بھیک مانگ کر بھی گزارا کرے تو اس کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاتھوں کو کاٹ کر کھانے کمانے کے ذرائع مہیا کر دیئے گئے اور اس کے اس بہیمانہ فعل کو دلیری اور جرأت کے کارناموں میں جگہ دی جاتی ہے اور معدہ کو انسانی ضروریات زندگی کے ہیر پھیر، چور بازاری، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، کے بعد بھی اہمیت حاصل ہے لیکن انسان کا نچلا حصہ جتنی محنت کرتا ہے جسقدر مشقت کا کام کرتا ہے اسے اتنا ہی حقیر اور کم تر سمجھا جاتا ہے اور اسے اس کے کئے ہوئے کام کی اس اُجرت کا دسواں حصہ بھی نہیں ملتا جو دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں اسکا پیدائشی حق بن چکا ہے۔ سماج میں نہ اس کی کوئی عزت ہے اور نہ کوئی مقام ہے۔

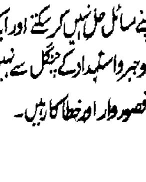
ارجک سنگھ سارے ملک کی واحد جماعت ہے جو معاشرے میں پھیلی ہوئی اس ناانصافی کا استیصال کرنے کے لئے میدان میں آچکی ہے۔ لیکن یہ جماعت جمہوری دستور میں یقین رکھتی ہے اور رائے عامّہ کو ہموار کرنے کے بعد ہی اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسے ایک ایسے محل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو محض دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک ستون انسان اور انسان کے درمیان سماجی مساوات کی نمائندگی کرتا ہے اور ذات پات کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ دوسرا ستون جسمانی محنت کرنے والے مزدوروں کے لئے اسی عزت اور احترام کا خواہاں ہے جو کسی پروفیسر، سائنس داں، انجینیر یا تنظیمی کام کرنے والے دانشور کو حاصل ہے۔

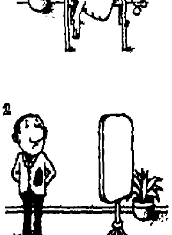
ارجک سنگھ کے نظریات کے تحت معاشرہ میں جب تک مکمل سماجی مساوات کا قیام عمل میں نہیں آتا اقتصادی سماجی، معاشی، صنعتی زراعتی، اور سائنسی ترقی کا آنا خواب و خیال کی بات ہے۔ شری مہاراج سنگھ بھارتی کے خیال میں دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں ذات، پات کے جھگڑوں کی موجودگی میں صنعتی ترقی ہوئی ہو۔ لہٰذا سماج سے ان فرسودہ اور دقیانوسی مدارج کو نکال باہر کرنا ہی ہندوستان کی ترقی اور خوش حالی کا موجب بن سکتا ہے تمام ملکوں کیطرح ہندوستان کا ثقافتی ڈھانچہ بھی سماجی، معاشی تہذیبی ہے اس میں اس قدر اونچ نیچ ہے کہ ایک اعلیٰ طبقہ ہمالیہ کی طرح سرفراز اور سربلند ہے جبکہ نچلا طبقہ اتنا ہی پست اور نیچا ہے جتنا بحر ہند کا کوئی عمیق حصہ ہو سکتا ہے۔ جب تک یہ اونچائی اور یہ نیچائی یہ پستی اور بلندی قائم ہے سماج کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح معاشی ڈھانچے میں پائی جانے والی ناانصافیاں دراصل اسی سماجی ناانصافی کا نتیجہ ہیں اور جب تک کسی ملک اور قوم کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی اسے جابر اور ظالم قومیں ہمیشہ تختۂ مشق بناتی رہیں گی اور سیاسی شعبوں میں کام کرنے والے مٹھی بھر افراد عیش و عشرت میں زندگی گزارتے رہیں گے۔ اور ان تینوں کے گٹھ جوڑ کا سب سے بُرا اثر تہذیب و تمدن کے عنصر پر ہی پڑے گا جو انسانی زندگی کا سب سے پسندیدہ پہلو ہے۔ شری رام سروپ ورما کے بقول یہ ادارہ جہاں بانی اور ملک گیری کی حرص و آز کے ہر جذبہ سے پاک ہے اور اس کے قیام کا مقصد انسانی فلاح و بہبود کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ جماعت سیاسی منافقتوں اور تفرقوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتی اور نہ مزدوروں پر کئے جانے والے ظلم و تشدد کو گوارہ کر سکتی ہے۔

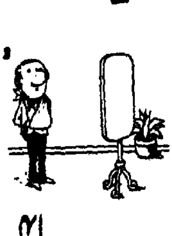
اس جماعت نے مزدوروں کو انکا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اسی غرض سے ارجک سنگھ اس بات کا قائل ہے کہ ہر فرد اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتا ہے اور اسے پیشے کے اعتبار سے بلند اور پست سمجھنے کی ذہنیت کو کچلنا ہے تاکہ سائنس کے ادراک اور عصرِ حاضر کے تکنیکی ارتقاء میں ہندوستان اپنا صحیح رول ادا کر کے ایک عظیم ملک کا درجہ حاصل کر سکے۔

بہر حال ہندوستانی سماج میں پھیلے ہوئے ذات پات کے جراثیم کا استیصال کرنے والی یہ ڈھائی برس کی نومولود جماعت اگرچہ سیاسی پارٹی ہونے سے انکار کرتی ہے لیکن دنیا جانتی ہے کہ آج سیاست کی عمارت کی بنیادیں معاشی اور اقتصادی مسائل پر ہی قائم ہیں، اور ہندوستان کے پسماندہ طبقے اقتصادی اور معاشی آزادی کو ہی سیاسی آزادی سمجھ کر ارجک سنگھ کے پرچم تلے جمع ہو کر پرامن طریقوں سے وہی کچھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں جو دہشت پسند نکسلائیٹ سارے نظام کو درہم برہم کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ارجک سنگھ جمہوریت کا دلدادہ ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پرامن ذرائع استعمال کرنے میں یقین رکھتا ہے، اس کا خیال ہے اگر بالغ رائے دہندگان جمہوری ذرائع سے اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے اور ایک عظیم اکثریت ہو کر بھی خود کو جبر و استبداد کے چنگل سے نہیں چھڑا سکتے تو وہ خود ہی قصور وار اور خطا کار ہیں۔

1


2


3


سقراط

ترجمہ و تلخیص۔ سید عارف نعمانی



تاریخ عالم میں تین عظیم فلسفیوں کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کے میلانات کو نئی سمتوں میں موڑ دیا اور انسان کی زندگی اور اس کے مقدر پر فکر انگیز نظر ڈالی۔ یہ عظیم فلسفی سقراط' افلاطون اور ارسطو ہیں۔ سقراط کا شمار تمام صاحب بصیرت اور دانائے راز مفکروں میں سرفہرست آتا ہے۔ سقراط ۴۶۹ ق م میں ایتھنس کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق م میں زہر کا پیالا پی کر ابدی نیند سو گیا۔

ایک دن یونان کی ایک فوج اپنے کیمپ میں آرام کر رہی تھی کہ ایک سپاہی جو اپنی بہادری اور عظمت کے لئے مشہور تھا اچانک سڑک پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ تقریباً چوبیس گھنٹے تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ اس کے سب دوست اس کے اطراف جمع ہو گئے۔ آخر میں جب اسے ہوش آیا تو اس کے تمام دوستوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے دوستوں نے اس کے ظاہر میں کوئی تبدیلی نہیں پائی مگر اس کا باطن بدل گیا تھا۔ یہ سپاہی سقراط کے علاوہ اور کوئی نہ تھا

سقراط کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات ملی ہیں۔ سپاہی بننے سے پہلے وہ ایک سنگ تراش تھا اور اسکی ماں ایک دایا تھی۔ سقراط بے حد بدصورت تھا۔ اس کے شانے پھیلے ہوئے اور آنکھیں ڈراؤنی تھیں۔ اس کا جسم بھی بے ڈول اور غیر متناسب تھا۔ وہ یونان میں اپنی بدصورتی کے لئے مشہور تھا مگر پھر بھی لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ اسکی دماغی صلاحیتوں کے دل سے قائل تھے اور اسکی عقل و فراست کی داد دیتے تھے۔ سقراط ایتھنس کے گلی کوچوں میں ننگے پیر لوگوں کو عقل و منطق کی باتیں بتاتا پھرتا تھا۔ اس کی باتوں میں جدت اور تازگی پاکر نوجوان اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے مگر کبھی کبھی سقراط کی کڑوی باتوں اور تیکھے سوالات سے لوگ جھلا اٹھتے تھے۔

اہل یونان کو ڈلفک آریکل (یونان کی ایک عورت جو پیشن گوئی کرنے کے لئے مشہور تھی) سے بڑی عقیدت تھی ڈلفک آریکل عوام کے تمام پیچیدہ سوالات کا صحیح اور فوری جواب دینے میں مہارت رکھتی تھی۔ یونان کے ذہین ترین لوگ بھی ڈلفک آریکل سے رائے مشورہ کیا کرتے تھے' ایک دن چیری فان نے ڈلفک آریکل سے سوال کیا کہ تمام یونان میں اس وقت سب سے زیادہ عقلمند آدمی کون ہے۔ ڈلفک آریکل نے فوراً سقراط کا نام لے کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

سقراط کی بیوی نہایت چڑچڑی اور غصہ ور تھی۔ اسے ہمیشہ سقراط سے یہ شکایت رہی کہ وہ اپنے گھر اور بیوی بچوں کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر گلی کوچوں میں فضول باتیں کرتا پھرتا ہے۔ سقراط بڑا صابر واقع ہوا تھا۔ وہ ہر کڑوی بات کو پی جاتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس کی بیوی نے غصہ کی حالت میں اس کے سر پر ایک بڑا مٹی کا برتن دے مارا۔ جب برتن ٹوٹ گیا اور سقراط کا سارا جسم پانی میں نہا گیا تو سقراط نے مسکرا کر اپنی بیوی سے کہا بجلیاں اور گرگڑاہٹیں تو بہت ہوئیں مگر پانی کم برسا؟

سقراط سڑکوں' گلیوں' ورزش گاہوں اور مارکیٹوں میں اپنا وقت گزارتا جہاں اسے سیکڑوں مرد اور عورتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا۔ وہ ان کو عقل و حکمت کی ساری باتیں سمجھا دیتا تھا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ اور درویشانہ تھی۔ سسلی کے رئیس گھرانے کے لوگ اپنے بچوں کو اسکے پاس بھیج دیتے تھے تاکہ وہ سقراط کے طور طریقوں کو سیکھیں سقراط بغیر معاوضے کے ان بچوں کو درس دیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں سادگی اور اچھے اخلاق کی تلقین کرتا تھا۔ حالانکہ سقراط نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ کوئی مدرسہ یا ادارہ بھی نہیں چلایا پھر بھی اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین استادوں میں ہوتا ہے۔

وہ بے حد امانت دار تھا اس کے قول اور فعل میں بھی

یں پھایا گیا۔ اس نے لوگوں کو امانت داری اور سچائی کی
مانی اور تزکیہ نفس کو بے حد اہم قرار دیا۔ اس نے پرانی
ت کی مذمت کی اور شخصیت پرستی کا مذاق اڑایا۔ وہ
سوالات کے ذریعہ لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا کرتا تھا۔
علمی تحقیقات کا طریقہ نکالا اور الفاظ کی تعریف و تشریح
اپنے وقت کے تمام داناؤں اور مفکروں سے بحث و
ذکر کے یہ ثابت کر دیتا تھا کہ وہ سب بیوقوف ہیں جو
عانی تسکین کی تلاش و جستجو میں گم ہو کر وہ اکثر اپنے گھریلو
ت سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ یونان کے تمام فلسفی اور مفکر
سے حسد کرنے لگے۔ سقراط ان سے کہا کرتا تھا وہ جو
ں کی پرستش میں لگے ہوتے ہیں وہ سب کے سب باطل
وتے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا تو صرف ایک ہے۔ اور
الق عبادت ہے۔

اس نے اپنے شاگردوں سے کہا "تمہاری اصل زندگی
ری باطنی صفائی میں ہے۔ تم اپنے جسم سے زیادہ اپنی
ی حفاظت کرو۔ وہ بے وقوف ہیں جو اپنے جسم کی پروا
یں۔ جسم تو فانی چیز ہے مگر روح غیر فانی ہے۔
حقیقی مسرت اچھے کپڑے پہننے اور اونچے محلوں میں
سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ حقیقی مسرت تو خدا کی بندگی
ں کی عبادت کا نام ہے۔" وہ اکثر لوگوں سے کہا کرتا کہ
زار اور شہرت و دولت کے پیچھے نہ بھاگیں بلکہ سچائی
بائی کو اپنائیں۔"

سقراط کی تعلیمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے پرانے
ے درہم برہم ہو کر رہ گئے۔ اور یہ بات اس دور کے
ں کو اچھی نہ لگی۔ انہوں نے سقراط پر الزام لگایا کہ وہ
یں خطرناک خیالات کا پرچار کر رہا ہے اور ایتھنس
ؤں کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔

سقراط پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے خاص حریفوں میں
ں لی سن اور اینی ٹس کے نام قابل ذکر ہیں۔ اینی ٹس
دش تھا وہ سقراط کا جانی دشمن تھا۔ سقراط مجرم
یا اور حراست میں لے لیا گیا۔ سینٹ کے ۲۸۰ ممبروں
ٹ دیا کہ سقراط کو پھانسی پر لٹکا یا جائے۔ بقیہ ۲۲۰
نے سقراط کی طرفداری کی۔ عدالت میں سقراط نے
سب کچھ جو میرے لئے ہو رہا ہے یہ محض ایک
ں نہیں ہے" اور پھر عوام سے مخاطب ہو کر اس

نے کہا "دوستو! میں تم سے ایک گزارش کرتا ہوں۔ جب
میرے بچے بڑے ہو جائیں اور وہ سچائی اور ایمانداری کو
چھوڑ کر دولت اور اقتدار کی طرف بھاگیں تو انہیں ایسی
ہی سزا دو جیسی آج مجھے دی جا رہی ہے۔

اگر سقراط سچائی اور ایمانداری پر اٹل نہ رہتا تو وہ آسانی
سے اپنی جان بچا سکتا تھا۔ کیونکہ ایتھنس کے قانون کے
مطابق اسے یہ رعایت اور موقعہ بھی دیا گیا تھا کہ وہ پھانسی
کی سزا سے بچنا چاہے تو جلاوطن ہو جائے۔ مگر سقراط نے
جلاوطن ہونے کو اچھا نہیں سمجھا۔ کریٹو اور افلاطون نے
جیلر کو رشوت دی اور گزارش کی کہ وہ سقراط کو جیل سے بچ
نکلنے کا موقعہ دے مگر سقراط کو یہ بات بھی اچھی نہ لگی۔ وہ
موت سے بے خوف تھا۔ مقدمے کی سماعت کے خاتمے
کے بعد اپنے شاگردوں سے اس نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے
کہ ہم یہاں سے کوچ کر جائیں۔ میں موت سے ہم آغوش ہو
جاؤں گا۔ اور تم زندہ رہو گے۔ موت اچھی ہے یا زندگی یہ
خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک ماہ تک سقراط کو جیل میں رکھا گیا۔ جیل میں اکثر
وہ شعر کہا کرتا تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں خدا کی عظمت
اور بزرگی کے گیت گائے۔ اگر وہ اسطرف دھیان دیتا تو آج
وہ دنیا کا عظیم شاعر کہلاتا۔

افلاطون نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "فیاڈو" میں
سقراط کی زندگی کے آخری دن کا حال لکھا ہے۔ "سقراط
کے تمام شاگرد اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے
بے اختیار آنسو جاری تھے۔ اس کی بیوی بھی اپنے شیرخوار
بچے کے ساتھ وہاں پہنچی اور بے تحاشا رونے پیٹنے لگی۔

سقراط نے اپنے شاگرد کریٹو کی طرف دیکھا اور بڑے
اطمینان سے کہا "کریٹو تم میری بیوی کو اس کے گھر پہنچا دو۔"
کریٹو اس کی بیوی کو تسلی دلاتا ہوا باہر لے گیا۔ سقراط نے
اپنی زندگی کی آخری رات بھی حسب معمول بڑے اطمینان
سے گزار دی۔ وہ دیر تک اپنے شاگردوں کو روح کی ابدیت
کے بارے میں بتلاتا رہا۔ اس کے شاگرد کریٹو نے اس سے
پوچھا کہ اس کی موت کے بعد اسے کس طرح دفن کیا جائے۔
سقراط نے مسکرا کر کہا "تم مجھے جس طرح چاہو دفن کر دینا۔
تم میرے جسم ہی کو دفن کر سکتے ہو میری روح کو نہیں۔"

سقراط نے موت کی بڑی جامع تعریف کی ہے۔ اس
نے موت کو تمام تکالیف کا خاتمہ قرار دیا ہے۔ وہ سمجھتا
کہ موت ایک نئی اور تازہ زندگی کا آغاز ہے۔ موت ایک
چھٹکارا ہے۔ یہ روح کے جسم سے الگ ہونے کا نام ہے۔"

آخر وہ وقت آپہنچا جب سقراط کو زہر کا پیالہ پی کر
ہمیشہ کے لئے سو جانا تھا۔ جیلر نے اسے ایک زہر کا پیالہ دیا
خود جیلر بھی اس منظر کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ دیر تک منہ پھیر
کھڑا روتا رہا۔ سقراط کے تمام شاگرد بے اختیار رونے لگے۔
سقراط کا ایک دوست لکھتا ہے "ہمیں اس وقت ایسا
محسوس ہو رہا تھا کہ ہم یتیم ہو رہے ہیں اور ہمارا باپ ہم سے
ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہا ہے۔ جیل میں موجود ہر شخص رونے
لگا مگر سقراط تھا کہ خاموش اور مطمئن تھا۔ اس پر کسی قسم کا
خوف یا جذبہ طاری نہ ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے شاگردوں
سے کہا "میں نے اپنی بیوی کو اسی لئے بھیج دیا کہ وہ اس منظر کو
برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔ پھر اس نے کہا۔ میں نے سنا
ہے کہ کسی کی موت کے وقت رونا پیٹنا ٹھیک نہیں ہے۔"
اس کے شاگرد یہ سن کر اور بھی بے اختیار رونے لگے۔ سقراط
بڑی لاپرواہی سے زہر کا پیالہ پی گیا اور پھر ادھر ادھر ٹہلنے لگا
مگر بہت جلد ہی اس کے پیر وزنی ہو گئے اور وہ پلنگ پر
لیٹ گیا۔ کپڑے سے اس کے چہرے کو ڈھانپ دیا گیا تھا مگر
سقراط نے اپنے چہرے سے کپڑے کو ہٹاتے ہوئے اپنے عزیز
شاگرد کریٹو سے کہا "کریٹو میں نے ایسکلی پس سے ایک
مرغی قرض لی تھی۔ تم میری موت کے بعد میرے اس قرض
کو چکا دو۔" کریٹو نے روتے ہوئے سقراط سے پوچھا "میرے
آقا کیا آپ کی اور بھی کوئی خواہش ہے؟" مگر سقراط نے کوئی
جواب نہ دیا۔ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔



ملی جلی شادیاں - ایک دھوکہ ہیں

اس میں شک نہیں کہ شریکِ حیات تلاش کرنا ہمیشہ سے دنیا بھر کے انسانوں کا ذاتی مسئلہ رہا ہے۔ اور جب کسی مجنوں، رانجھا یا رومیو نے کسی لیلیٰ، ہیر یا جولیٹ کو اپنا رفیقِ زندگی بنانا چاہا تو سماج کے قانون اور مذہب نے اس کی راہ میں سیکڑوں دیواریں کھڑی کر دیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شریکِ حیات کا انتخاب یا شادی کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اگر اس کا بنیادی مقصد صرف عیش و مسرت کی زندگی بسر کرنا اور ایک دوسرے کے جنسی جذبات کی بلا روک ٹوک تسکین پہونچانا قرار دیا جائے تو ہمیں اسکو ذاتی مسئلہ ماننے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ساتھ ہی ہم اگر دنیا کے تہذیب و تمدن کے ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ عہدِ قدیم میں انسان جبکہ بالکل جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور غذا کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا اور اس صورت میں جبکہ حلال اور حرام کی کوئی تمیز اور حد مقرر نہیں ہوئی تھی اور نہ سوسائٹی میں کوئی ایسا قانون تھا جسے نکاح یا شادی کا نام دیا جا سکے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کا انسان بھی جانوروں کی طرح اپنے جذبۂ شہوانی کو پورا کرتا ہوگا۔ پھر آج کے ایٹمی دور کے انسان اور عہدِ قدیم کے اس غیر متمدن انسان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ جس طرح وہ اپنے جذبۂ شہوت رانی کی تکمیل میں کسی بھی قید و بند کو گوارہ نہیں کرتا تھا اسی طرح ہم بھی کسی ضابطۂ اخلاق کو ماننے کے لئے تیار نہیں لیکن اس ضمن میں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ گرچہ بظاہر اس کی حیثیت ذاتی اور انفرادی ہے لیکن اس کا اثر اجتماعی معاشرہ اور خاندان پر پڑنا لازمی ہے۔ اور اگر یہ حقیقت ہے تو ہمیں اس کا پورا پورا حق ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کی بہتری اور بہبودی کی خاطر کوئی مناسب ضابطۂ اخلاق مقرر کریں جو ایک طرف انکی امنگوں کی راہ میں حائل نہ ہو اور دوسری طرف انھیں جنسی آوارگی اور بے راہ روی سے روکنے میں مفید ثابت ہو۔

اوپر جن افسانوی کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نزدیک شادی یا نکاح کا مفہوم عشق و محبت کے سوا کچھ اور نہ تھا اور وہ ہماری طرح شادی کو ایک سماجی ضرورت یا مقدس فرض ہرگز نہیں سمجھتے تھے ورنہ سماج کے مرتب کردہ اصول و قواعد اور مذہبی و شرعی احکام کو راستہ کی رکاوٹ یا بندش سمجھ کر کبھی بھی بغاوت پر آمادہ نہیں ہوئے۔

فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں ملی جلی شادیاں آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے عام ہیں اور ثبوت کے طور پر مغل شہنشاہ اکبر اور دیگر نوابوں راجاؤں اور امیروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق مختصراً اتنا ہی عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہندوستان میں ملی جلی شادیوں کا عام رواج کبھی نہیں رہا اور جہانتک شہنشاہ اکبر کی شادی کا تعلق ہے جس طرح ان کا قائم کردہ مذہب "دینِ الٰہی" کی حیثیت سیاسی مذہب سے زیادہ نہیں تھی ٹھیک اسی طرح اسی زمانے کی زیادہ تر ایسی شادیاں ملکی مصلحت کے پیشِ نظر کی جاتی تھیں اور ہم ایسی شادیوں کو "سیاسی شادی" کے علاوہ اور کوئی نام دینے سے مجبور ہیں۔ باقی رہ گئے نواب، امراء اور راجے مہاراجے تو ان کی شادیوں میں نہ کسی ذہنی بیداری یا سیاسی شعور کو دخل تھا اور نہ کسی سماجی سدھار کا جذبہ تھا، بلکہ زیادہ تر شادیوں کی وجہ انکی حد سے بڑھی ہوئی عیش پرستی تھی۔

فاضل مضمون نگار کے لکھنے کے مطابق راجہ رام موہن رائے، چترنجن داس اور سر سید احمد خاں نے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی شادی کی غرض سے تبدیلیٔ مذہب اور ملی جلی شادیوں کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن جہانتک راقم الحروف کو معلوم ہے کہ ان بزرگوں کے زمانے میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ اور ان لوگوں نے ایسی شادیوں کی کبھی بھی ہمت افزائی نہیں کی۔ البتہ ہندوؤں میں ستی کے رواج، بیوہ کی دوسری شادی، انگریزی تعلیم سے نفرت اور سماج سدھار کے دوسرے کام اور دیگر بہت سی خرابیوں اور برائیوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔

ہمارے مضمون نگار کا یہ بھی کہنا ہے کہ آزادی سے پہلے ہندوستان کے پڑھے لکھے اور اونچے طبقہ میں اس قسم کی شادیاں عام ہو چکی تھیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح، ہمایوں کبیر اور سابق چیف جسٹس ہدایت اللہ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ واضح رہے کہ ان شادیوں کے پس پشت کچھ تو انگریزی تہذیب کا اثر، مخلوط تعلیم کا نتیجہ اور بہت کچھ ان کی پسند کو دخل تھا۔ جہاں تک قبولِ عام کا سوال ہے عام لوگوں نے کبھی بھی بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا اور کسی مذہب و فرقہ نے اس کی حمایت کی۔

یہ سچ ہے کہ آزادی کے بعد ماحول میں کافی تبدیلی آگئی ہے اور بہت حد تک اونچ نیچ کا امتیاز ختم ہو گیا اور اس طرح اونچی اور نیچی ذات میں شادیوں کو ایک حد تک فروغ ہوا۔ لیکن ہندو مسلم شادیوں میں کمی آگئی۔ جہاں تک اونچی اور نیچی ذات میں شادیوں کا تعلق ہے اس کی پہلی وجہ تو وہی مخلوط تعلیم اور زمانہ کے بدلے ہوئے حالات اور مذہبی احکام سے بیگانگی تھی۔ دوسری بڑی وجہ چھوت چھات سے کنارہ کشی اور ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کی ایک وحدت۔

واقعات نئی دھلی

نفرت میں کمی تھی۔ ان نوجوانوں کی شادیاں
م روشن خیالی اور قومی یکجہتی کا جذبہ کارفرما
تقسیم ملک کی وجہ سے جوان نوجوانوں میں
ا گیا تھا اس کے خاتمہ کا اثر جیسا کہ مضمون
ا ہے۔ برعکس کے حقائق اس بات کے
ہندو مسلم شادیاں تو ضرور ایک بار پھر ہونی
نے لگیں لیکن اب حالات اور زمانہ بدل
یم ہند سے پہلے عموماً ہندو لڑکیاں مسلمان
سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا پسند کرتی
زیادہ تر مسلمان لڑکیاں ہندو نوجوانوں
یات بننا باعث فخر سمجھتی ہیں۔ اس کی اصل
نوجوانوں کی حقیقت پسندی، روشن خیالی
تی نہیں بلکہ فرقہ واریت اور سیاسی مصلحت
صوصیات ہیں۔

بانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان تمام
نے جنکا ذکر پہلے گزر چکا ہے ہندو لڑکیوں
ت شادیاں کی تھیں جب ملک کا بٹوارہ
اور نہ جانے جبلپور، کشمیر اور پونہ کی کہانی
اپر دہرائی جا چکی ہوتی۔
ئ گواہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ایسی
دی فرقہ بھی عام طور پر نوٹس نہیں لیتا تھا۔
یاں کسی ہندو مسلم فساد کا باعث بنا کرتی تھیں
کے بعد ایسی ملی جلی شادیاں جس میں اتفاق
رو مذہب سے تعلق رکھتی ہو اور لڑکے کا
اسلام سے ہو۔ عام مسلمانوں کی عزت
ری اور ان کے مال و متاع کی تباہی کی
نے ہیں۔

بھول جائیے شرمیلا ٹیگور اور جنتی گوپا کی تازہ
رے سامنے موجود ہیں جنھوں نے نہ صرف
خوشی سے بلکہ اپنے خاندان کی رضامندی
اشارے پر شادیاں کیں۔ لیکن اس کے باوجود
ن رکھنے والے لیڈروں اور دیگر فرقہ پرستوں
دقوم کی بے عزتی قرار دے کر بھولے بھالے
انے کی کوشش کی اور فرقہ وارانہ فضا کو
ٹنے کی کوشش کی اور اس طرح نہ جانے
نئی دہلی

کتنے نوجوان ہیں جنکا علم سوائے خدا کے کسی کو بھی نہیں جو اپنی تمناؤں کے جنازے اپنے کاندھوں پر لئے گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہاں کی سیاسی فضا انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اپنی تمناؤں کی تکمیل میں کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ اور اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خواہ فلم ایکٹرس نرگس ہو یا مصری لڑکی ساجدہ توفیق، انھوں نے جب ہندو نوجوانوں سے شادیاں کیں تو نہ ہی گروگولوالکر جی نے کچھ فرمایا اور نہ کسی مسلم لیڈر نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ گروجی کی خوشی تو صحیح معنوں میں ان کی خوشی اور آشیرواد کا اظہار ہے، لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کی خموشی کو سیاسی حالات کا تقاضہ یا احساسِ کمتری کے سوا اور کیا سمجھا جائے۔

آج کی فضا میں ایسی شادیوں کی مخالفت اور مذہبی نقطۂ نظر سے شادیوں کی حمایت کو بلاشبہ قدامت پرستی سے موسوم کیا جائے گا کیونکہ مغرب کی حد سے زیادہ مادّی نظریوں نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی طور پر نقصان پہونچانے کے ساتھ ساتھ انکی اخلاقی قدروں اور جسمانی صحت کو بھی تباہ کر ڈالا ہے۔ وہ روشن خیالی اور حقیقت پسندی کے دھوکہ میں عصمت و عفت نیز پاکیزگی کا تصور تک بھلا بیٹھے ہیں۔ پھر بھی ہم اس پیغام کو جسے خدا نے اپنے نیک بندوں کے ذریعہ ہم تک پہونچایا ہے جتنی جلد تسلیم کرلیں ہمارے لئے اور ہماری آئندہ نسلوں اور تمام بنی نوعِ انسان کے لئے بہتر ہوگا جسکی قرآن حکیم نے یوں وضاحت کی ہے۔

"ایمان والوں سے کہدو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں اور اپنے آرائش کی نمائش سے پرہیز کریں، ماسوا اُن حصّوں کے جو ضروری ہیں۔ اور انھیں پیروں کو پٹکنے سے منع کردو تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس حرکت سے چھپے ہوئے آراستہ عضو نمایاں ہوجائیں۔ اور اے ایمان والو! تم سب خدا کی طرف رجوع کرو تاکہ تم زندگی میں کامیاب رہو۔"

محمد نظام الدین۔ کراچی

مکرمی تسلیم۔

واقعات کا تیسرا شمارہ میرے سامنے ہے۔ یہ اپنے اگلے دونوں شماروں سے بہتر اور دلفریب ہے اور یقین ہے کہ اسی طرح آئندہ کا ہر شمارہ اپنے گزشتہ شماروں سے بہتر اور افضل ہوگا۔ خدا آپ کا حوصلہ اور بلند کرے اور وہ دن جلد آئے جب میں واقعات کو ایک ہفت روزہ جریدے کی شکل میں دیکھ سکوں!

دراصل ہما کے کالم میں جب میں نے واقعات کا اشتہار دیکھا تو ہما کی طرح اس رسالے کا بھی مستقل خریدار بننے کا میں نے ارادہ کرلیا، یہ سوچ کر کہ محترم عبدالوحید صدیقی صاحب کی ادارت میں جب ہما جیسا لاثانی رسالہ نکل سکتا ہے تو بے شک واقعات کا ہر شمارہ بھی اپنی مثال آپ ہوگا، اور مجھے واقعات کا تیسرا شمارہ ملنے کے بعد اسکا وثوق ہوگیا۔

جناب شاہد صدیقی کا مضمون "ملی جلی شادیاں" بے حد پسند آیا، موجودہ معاشرت میں ایسے مضامین کی اشد ضرورت ہے جو ہمارے دلوں سے کدورت اور ذہنوں سے تنگ نظری اور تعصّب کے رجحان کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اگر اسی طرح کے مضامین کا سلسلہ آئندہ بھی چلتا رہے تو یقیناً قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ بنگلا کہانی کا ترجمہ "الو کا علاج" بھی خوب ہے سلیم عادل صاحب کا شکریہ۔ اگر وہ اسیطرح دوسری زبانوں کی بہترین تخلیقات ہمیں فراہم کرتے رہے تو یقیناً ہمیں مستفیض ہونے کا بہتر موقع ملیگا۔

"دنیا بھر کی خبریں"... میں سائنسی خبروں کی کچھ کمی محسوس ہوئی۔ دراصل یہ سائنس اور ٹکنولوجی کا زمانہ ہے۔ لوگ سائنسی خبروں کو بڑی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس لئے آپ ایسی خبریں زیادہ سے زیادہ چھاپیں۔ نسیم انصاری۔

محترمی۔ خلوص بیکراں،

واقعات کے تینوں شمارے اپنی آب و تاب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ثابت ہوئے۔ اردو میں پندرہ روزہ رسالے کی جو کمی تھی وہ آپ نے پوری کردی۔ آپ کی تعریف کروں یا واقعات کی ؟ دلی مبارکباد قبول فرمایئے تیسرے تازہ شمارے میں شاہد صدیقی کا مضمون "ملی

جل شادیاں" بہت ہی معلومات آفریں ہے۔ جاوید عالم اور عینی گوہا کی مشترکہ تصویر اردو داں طبقہ میں پہلی مرتبہ دیکھی گئی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر مضمون تشنگی کو اور بڑھاتا ہے۔ بھیونڈی کے بھیانک فساد پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا کہ چاہیئے تھا۔ خوب سے خوب تر واقعات کو بنانے جایئے۔
مجید آزاد۔ شیخ حمید الزماں۔

محب مکرم۔ تسلیم

کل اتفاقاً بک اسٹال پر پندرہ روزہ واقعات کا تیسرا شمارہ رکھا ہوا دیکھا۔ اسے اٹھا کر سرورق الٹتے ہی آں محترم کے اسم مبارک پر نظر پڑی۔ میں نے دوکاندار سے اور شمارے طلب کئے مگر صرف دوسرا اور تیسرا شمارہ ہی دستیاب ہو سکا جنھیں لے کر چلا آیا۔ رات کو فرصت میں دونوں شمارے شروع سے آخر تک دیکھ ڈالے اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات اور واقعات نے دل کی خاک کو کرید لیا ہے اور جو دل لگی آپ نے اٹھا رکھی ہے اس میں سے دھواں پیدا ہو کر واقعات کے صفحات پر چھایا ہوا ہے اور خوش قسمتی سے اسمیں چار سو پھیل جانے کی اہلیت بھی ہے۔ واقعات کی خوبیوں کے متعلق سردست صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ:
"عرشہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است۔"
ساحر بھوپالی۔

تسلیمات!

چورنگی کراسنگ کے بک اسٹال سے 'واقعات' خریدا تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد محسوس کرتا ہوں کہ "واقعات" نے مجھے خرید لیا۔

عید کے ایک روز پہلے تک میں نے بارہا کوشش کی کہ اگلا شمارہ حاصل کر لوں۔ بار بار اپنے گھر سے جیت پور روڈ کی بک سٹال اور چورنگی کی بک اسٹال پر گیا مگر ہر بار ناکام رہا حالانکہ ان ہر دو جگہ کا فاصلہ میرے گھر سے ۹ میل دوری پر ہے اور واقعات کی قیمت سے کئی گنا واقعات کو پانے کے لئے خرچ کر چکا ہوں۔ گھر سے بازار کی طرف سفر کرتے ہی جیب میں ہاتھ جانا شروع ہو جاتا ہے اور مجھ جیسا فقیر جو کا نسہ بھر کے لے جاتا ہے اور جب تک خالی نہ ہو جائے ٹھکانے پر لوٹتا ہی نہیں۔

بہت دنوں سے ایک ایسا اخبار پڑھنے کا تمنائی تھا جیسا واقعات کا پہلا شمارہ پڑھ کر محسوس ہوا۔ اب جب تک دوسرا شمارہ ہاتھ میں نہ آجائے میری یہ تمنا تشنۂ کام ہی رہے گی۔ تمنا ہی جو ٹھہری۔
صوفی سورج پرکاش پلوی۔ بنگال

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔

"ہما اور ہدیٰ" جیسے انتہائی معیاری ڈائجسٹ نکال کر بانئے اردو ادب میں جو بے مثال کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ آپ کی بے لوث ادبی خدمات کو فراموش کرنا ادب فراموشی ہی نہیں بلکہ احسان فراموشی بھی ہوگی۔ ہماری آنے والی نسلیں یقیناً آپ پر فخر کریں گی۔ اردو میں ڈائجسٹوں کی شکل میں اتنے نایاب مہر دینے کے بعد اب 'واقعات' کی صورت میں ایک نہایت معیاری سیاسی اور ادبی جریدہ نکالنا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ واقعی صاحب! صحرا میں پھول کھلانا کوئی آپ سے سیکھے، پتھر کو کاٹ کر ہیرے نکالنا آپ ہی جیسے جگر اردو کے فدائین کا کام ہے۔ میری تمام تر نیک خواہشات آپ کے حوصلۂ ادبی کے ساتھ ہیں۔
یوسف جمال۔ راج گنج پور

مکرمی۔ السلام علیکم

'واقعات' کے تینوں شمارے پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ آپ نے کروڑوں اردو دوستوں کے دل کی پکار سن لی ہے۔ جو بھی واقعات دیکھتا ہے پڑھے بغیر نہیں رہتا اور جب پڑھ لیتا ہے تو سرا ہے بغیر نہیں رہتا اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ ہر چھوٹے بڑے مقام پر یہ ملنے لگا ہے اور یہ کیفیت ایسے وقت کی ہے جب کہ واقعات صرف ڈیڑھ ماہ کا نومولود ہے۔ اس سے اس کے تابناک مستقبل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ دعا ہے کہ 'واقعات' ہمارے دلوں کی دھڑکن بن کر سدا زندگی کا پتہ دیتا رہے۔!!
والسلام۔ یعقوب سروش

محترمی تسلیم۔

آج واقعات کا دوسرا شمارہ کتابی دنیا سے خریدا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کاغذ اچھا لگا یئے کیمرے کی تاک جھانک میں نئی تصویریں چھاپئے۔ میں آپ کی صحافت کا اس وقت سے معترف ہوں جب آپ نے 'نئی دنیا' نکالا تھا۔ میں آپ کو بابائے صحافت کے لقب سے یاد کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے آپ پڑھنے والوں کے لئے بھی ایک صفحہ رکھئے اور پڑھنے والوں سے موضوع پر مضامین بھی لکھوائیے۔ ہمارے لیڈر "ہماری جماعت" کا سلسلہ بند نہ کیجئے۔ فلموں پر تبصرہ مضمون بھی ٹھیک ہے مگر آخری صفحوں پر یہ سلسلہ رکھئے۔ "کیمرے کی تاک جھانک" شروع کے صفحات پر رکھئے، قاری جو واقعات اخبار میں روز پڑھ لیتا ہے وہ دیکھنا بھی چاہے گا۔ "واقعات" میں سب سے پہلے تصاویر ہی چھپیں تو بہتر ہے۔
شفیق احمد۔ لکھنؤ



عجیب وغریب

فارسی کا شاعر رداغی جس نے شراب کی تعریف م ۱۰۰ جلدوں پر مشتمل ایک خوبصورت نظم لکھ اس نظم میں ۱۰ لاکھ سے زائد اشعار تھے۔

رُداغی کے بارے میں ایک عجیب و دلچسپ بیہ ہے کہ اس کے یہاں ایک ہی تاریخ میں م لڑکے، تین پوتے اور دو پڑپوتے پیدا ہوئے رداغی پیدائشی اندھا تھا۔

●

واقعات نئی



سمرسٹ ماھم

محمد سعد اللہ

یکس کیلیڈا کو میں ملاقات سے پہلے ہی ناپسند تھا۔

ہلی جنگ عظیم ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ اور بحری ں پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ جگہ ملنی مشکل تھی اس لئے ر جو انتظام کر دیتے اسی کو غنیمت سمجھنا پڑتا تھا کسی رہ کیبن ملنا ممکن ہی نہ تھا اس لئے جب مجھے ایسا بلا جس میں صرف دو مسافروں کے لئے برتھیں۔ تو شکر ادا کیا لیکن جب مجھے اپنے ہمسفر کا نام معلوم ہوا ل بیٹھ سا گیا۔ پہلے تو چودہ دن تک ایک کیبن میں کسی کے ساتھ سفر کرنا ہی میرے لئے سوہانِ روح تھا مان فرانسسکو سے کوبے (جاپان) جا رہا تھا لیکن دہ افسوس نہ ہوتا اگر میرے ساتھی کا نام اسمتھ یا ہوتا۔

جب میں جہاز پر سوار ہو کر اپنے کیبن میں داخل ہوا نے فرش پر مسٹر کیلیڈا کا سامان بکھرا ہوا دیکھا۔ اسکی ی ہیئت مجھے اچھی نہ لگی۔ سوٹ کیس پر بہت سے چپکے ہوئے تھے اور سامان کا صندوق بہت بڑا س نے اپنی آرائش کا سامان کھول کر بازار سا لگا رکھا تمات نئی دھلی

رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مونیشور کوٹی "(مشہور آرائشی اشیا بنانے والے) کی بہت بڑی سرپرست تھی۔ "کوٹی" کے عطریات، تیل، ہیر واش، اسنو وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔ ابنوسی کے برشوں پر اس کا مونوگرام سنہری الفاظ میں ثبت تھا۔

میں نے مسٹر کیلیڈا کو کبھی پسند نہیں کیا۔

میں سگریٹ نوشی کے کمرے میں گیا اور تاش منگوا کر پیشنس (تاش کا ایک کھیل جو تنہا کھیلا جاتا ہے) کھیلنے لگا میں نے کھیل شروع ہی کیا تھا کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہا کہ کیا وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ میرا نام فلاں ابن فلاں ہے۔ "میں میکس کیلیڈا ہوں" اس نے آگے کہا اور مسکرایا جس سے اس کی چمکدار سفید بتیسی ظاہر ہو گئی۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

" اوہ ہاں میرا خیال ہے کہ ہم ایک ہی کیبن میں ہم سفر ہیں"۔

" میں اس کو خوش قسمتی سمجھتا ہوں کیونکہ ہمیں کس کے ساتھ رکھ دیا جائے گا ہم جان بھی نہیں سکتے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ انگریز ہیں تو میری خوشی کی حد نہ رہی۔ مجھے یہ بہت پسند ہے کہ ہم انگریز باہری دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ سفر کریں۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہونگے"۔

" کیا آپ انگریز ہیں؟"

" ہاں! کیا آپ کے خیال میں میں کسی امریکی کی طرح لگتا ہوں، میں ہڈیوں تک انگریز ہوں"۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے مسٹر کیلیڈا نے اپنی جیب سے ایک پاسپورٹ نکالا اور میری آنکھوں کے سامنے لہرا دیا۔ بچارے کنگ جارج کی رعایا میں کیسے بھانت بھانت کے لوگ شامل ہیں۔ مسٹر کیلیڈا ایک چھوٹے قد گٹھیلے جسم، داڑھی مونچھ صفاچٹ، سیاہی مائل جلد کا آدمی تھا۔ ایک بڑی سی چونچ جیسی ناک چہرے پر چپکی ہوئی تھی۔ آنکھیں پرنم اور بڑی بڑی تھیں۔ کالے کالے لمبے اور گھونگھریالے بال تھے، وہ بے تکان اور روانی سے باتیں کئے جاتا تھا۔ کثرت سے حرکات سے کام لیتا تھا جس میں انگریزوں جیسی کوئی بات نہ تھی۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ اگر اس کے پاسپورٹ کی چھان بین کی جائے تو شاید یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اس کی پیدائش انگلستان کے بند آسمان کے نیچے نہیں بلکہ کسی کھلے نیلے آسمان کے نیچے ہوئی ہوگی۔

" آپ کیا پینا پسند کریں گے؟" اس نے دریافت کیا میں نے اس کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ شراب بندی کا زمانہ تھا۔ اور ظاہر میں جہاز بالکل "خشک" نظر آتا تھا۔ مسٹر کیلیڈا نے ایک پراسرار مسکراہٹ پھینکی۔

" وسکی سوڈا۔ یا خشک مارٹینی؟ بس آپ حکم دیجئے"۔

اپنی ہر جیب سے اس نے ایک ایک بوتل نکال کر میرے

سامنے میز پر رکھ دی۔ میں نے مارٹینی پسند کی۔
اس نے اسٹیوارڈ کو بلا کر ایک برف کا مگ اور دو گلاس لانے کا حکم دیا۔

"ایک بہترین کاک ٹیل۔" میں نے کہا۔

"اوہ! جہاں سے یہ آئی ہے وہاں اور بہت ہے۔ اگر جہاز پر آپ کا کوئی دوست ہو تو اس سے بلا تکلف کہہ دیجئے کہ آپ کا ہمسفر دنیا بھر کی شرابیں پلا سکتا ہے۔"

مسٹر کیلیڈا بہت باتونی تھا۔ اس نے سان فرانسسکو اور نیویارک کے حالات سنائے۔ پھر ڈرامے، فلم و سیاست پر تبصرے کئے۔ وہ حب الوطن بھی تھا۔ اس کے نزدیک یونین جیک قابلِ احترام شے ہے۔ لیکن جب اُسے کوئی اسکندریہ یا بیروت کا آدمی لہرائے تو یہ مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کی شان کچھ کم لگتی ہے۔ مسٹر کیلیڈا بہت بڑا واقف کار تھا لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو جائے اس نے مجھے بے تکلف کرنے کے لئے کسی قسم کا تکلف یا آداب کا لحاظ نہیں رکھا۔

میں نے مسٹر کیلیڈا کو پسند نہیں کیا۔

اُس کے آتے ہی میں نے تاش کی گڈی ایک طرف سرکا دی تھی لیکن اب یہ خیال کرکے کہ ہماری بات چیت ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے میں نے اپنا تنہا کھیل پھر شروع کر دیا۔

"تین چار پر" ! مسٹر کیلیڈا نے کہا۔

"پیشنس" کے کھیل میں اس سے زیادہ برہمی کی کوئی بات نہیں ہوتی کہ جب آپ کھیل رہے ہوں تو آپکے پتہ دیکھنے سے قبل ہی کوئی آپ کو یہ بتائے کہ جو پتہ آپ نے اٹھایا ہے اُسے کہاں رکھا جائے۔

"یہ آرہا ہے۔ یہ آرہا ہے"۔ وہ چلایا "دہلا غلام پر!"

اپنے دل میں جھنجھلا کر میں نے کھیل ختم کر دیا۔ اس نے تاش کی گڈی لی۔

"کیا آپ "کارڈ ٹرک" پسند کرتے ہیں؟"

"نہیں، میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔"

"اچھا تو میں آپ کو صرف یہ ایک بتاؤں گا۔"

اس نے مجھے تین بتائیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ میں کھانے کے کمرے میں جاؤں گا تاکہ ٹیبل پر جگہ حاصل کر سکوں۔"

"اوہ آپ فکر نہ کریں!" میں نے آپ کے لئے کھانے کی جگہ حاصل کر لی ہے۔ میں نے سوچا کہ جب کہ ہم ایک ہی کیبن میں ساتھ رہ رہے ہیں تو کیوں نہ ہم ایک ہی ٹیبل پر کھانا کھائیں؟"

میں نے مسٹر کیلیڈا کو پسند نہیں کیا۔

نہ صرف میں اس کے ساتھ ایک کیبن میں رہنے اور دن میں تین مرتبہ ایک ہی ٹیبل پر اس کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے مجبور رہا۔ بلکہ بغیر اسے ساتھ لئے عرشہ پر گھومنا بھی میرے لئے مشکل ہو گیا۔ اُس سے چھٹکارا پانا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ ہر شخص اس کو دیکھ کر اتنا ہی خوش ہوتا ہے جتنا وہ اس شخص کو دیکھ کر، اپنا گھر ہوتا تو آپ گردن پکڑ کر اسے گھر سے باہر کر دیتے، دروازہ بند کر دیتے۔ اسے صاف سنا دیتے کہ وہ بے ضرورت ملاقاتی ہے۔ لیکن یہاں کیا کیا جا سکتا تھا؟

وہ بہت جلد گھل مل جانے والا آدمی تھا۔ اور تین دن کے اندر ہی اسکی سارے جہاز سے جان پہچان ہو گئی وہ ہر بات کا انتظام کرنے کو تیار رہتا تھا، کھیلوں کا انتظام، نیلام کا انتظام، انعامات کے لیے رقومات کا انتظام وہ کرتا۔ وہ ہر جگہ، ہر موقعہ پر موجود رہتا۔ یقیناً وہ جہاز پر سب سے ناپسندیدہ شخص تھا۔ ہم اس کو "ہمہ داں" نہ صرف اس کے پیچھے بلکہ اس کے منہ پر بھی کہہ دیتے تھے، وہ اس کو اپنی تعریف سمجھتا تھا لیکن کسی موقعہ پر تو وہ بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ زیادہ وقت وہ ہمیں اپنے رحم و کرم پر رکھتا۔ وہ دلدار، پُر مذاق، چرب زبان اور جھکی تھا۔ وہ ہر بات کو ہر شخص سے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے زیادہ فخر کی وجہ سے ہر شخص اس کی رائے سے اختلاف رکھتا تھا۔ وہ کسی موضوع کو اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک گھما پھرا کر آپ کو اپنا ہم خیال نہ بنا لیتا۔ اس بات کا امکان کہ وہ غلطی کر سکتا ہے، اس کے ذہن میں کبھی نہ آتا۔ وہ خود کو ایسا آدمی سمجھتا جو "ہمہ داں" ہے۔

ہم اکثر ڈاکٹر کے ٹیبل پر بیٹھا کرتے۔ مسٹر کیلیڈا یہاں بھی اکثر اپنا رنگ جما لیتا کیونکہ ڈاکٹر ایک سست قسم کا آدمی تھا اور میں بالکل غیر جانبدار۔ صرف ایک ہی آدمی

ہمارے ٹیبل پر ایسا تھا جو مسٹر کیلیڈا کی طرح خود رائے تھا اور اسے کیلیڈا کی ہمہ دانی پر فوراً غصہ آجاتا تھا۔ یہ مسٹر ریمزے۔ ریمزے امریکی قونصل خانے میں ملازم تھا۔ اور کوبے (جاپان) میں متعین تھا۔ وہ مغرب وسطیٰ (امریکہ) کا رہنے والا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اپنے تیار شدہ کپڑوں کے اندر وہ کچھ پھولا پھولا سا لگتا تھا۔ وہ ہوائی جہاز سے نیویارک اپنی بیوی کو لینے گیا تھا جو ایک سال سے گھر پر ہی تھی۔ اور اب اپنی سروس پر رجوع ہونے کے لئے لوٹ رہا تھا۔

مسز ریمزے ایک بہت ہی خوبصورت عورت تھی جس کے طور طریقے بڑے ہی دلکش تھے۔ قونصل کی نوکری کم تنخواہ کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ سادے لباس میں رہتی تھی لیکن اُسے مناسب ڈھنگ سے کپڑے پہننے آتے تھے۔ اس نے ہر ایک کو اپنی سادگی سے متاثر کر رکھا تھا۔ جو خوشنما پودے کے پھول کی طرح جھانکتی دکھائی تھی۔

ایک شام ڈنر کے وقت اتفاق سے بات چیت کا موضوع، موتیوں کی طرف مڑ گیا۔ اس وقت اخبارات میں جاپانی نقلی موتیوں کا زور و شور سے چرچا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ یقینی طور پر یہ اصلی موتیوں کی قدر گھٹا دیں گے۔ اس وقت بھی وہ کافی اچھے ہیں اور تجربات کے بعد تو وہ مکمل ہو جائیں گے۔

مسٹر کیلیڈا اپنی عادت کے مطابق فوراً اس نئے موضوع میں دخل انداز ہو گیا۔

اُن نے ہم کو وہ سب سُنا ڈالا جو موتیوں کے بارے میں تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ریمزے بھی موتیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا لیکن وہ اس "ہمہ داں" سے کرکے اُلجھنے کا موقعہ پا کر چُپ نہ رہ سکا اور پانچ منٹ کے اندر ہم گرماگرم بحث کے طوفان میں پھنس چکے تھے۔ اس سے قبل بھی مسٹر کیلیڈا کو جوش و خروش کے ساتھ بحث کرتے دیکھ چکا تھا لیکن اس موقع کی طرح اس کو آپے سے باہر کبھی نہ دیکھا تھا۔ آخر کار ریمزے کی کسی بات نے ڈنک مار دیا کیونکہ اس نے ٹیبل پر زور سے مکا مار کر چیخا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں میں جاپان اسی لئے جا رہا ہوں کہ جاپانی نقلی موتی
واقعات نتیجہ ھلو

غور معائنہ کروں میں اسی کاروبار میں ہوں
واقف کار یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں موتیوں کے
جو کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک نہیں ہے۔"
لئے نئی خبر تھی کیونکہ مسٹر کیلیڈا نے
ولی کے باوجود کبھی یہ نہ بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے
تھا کہ وہ جاپان کسی تجارتی معاملے کے سلسلہ
ہا ہے اُس نے ٹیبل کے گرد نیم مندی کر دیکھا
بھی ایسا نقلی موتی نہیں بنا سکیں گے کہ جسے
ہر فن آدھی آنکھ سے بھی دیکھ کر پہچان نہ سکے۔"
نے ریمزے کی بیوی کے گلے کے موتیوں کے ہار کی

ہ کیا۔
میری بات پر یقین کیجئے مسٹر ریمزے کہ آپکے گلے
قیمت کسی بھی وقت ایک پائی بھی کم نہ ہوسکیگی۔"
ریمزے اپنی انکساری کی وجہ سے شرمندہ سی
ہار کو اپنے لباس کے اندر کھسکانے لگی۔
ے آگے جُھکا، اُس نے ہم سب پر نظر ڈالی۔ اسکی
ب شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔
"مسز ریمزے کا ہار بہت ہی اچھا ہے؟ ہے نا؟
ں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا" مسٹر کیلیڈا
میں نے دل میں کہا وہ اصلی موتی کا ہی ہے"
یں نے اسے خود نہیں خریدا، کیا تم مجھے بتاؤگے
خیال میں اس کی کیا قیمت ہوگی۔"
ہ بیوپاری بھاؤ سے یہ تقریباً پندرہ ہزار ڈالر کا
ن اگر تم نے اسے نیویارک کے ففتھ ایونیو کے
ری سے خریدا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی
ہ اسے تیس ہزار ڈالر میں خریدا ہو۔"
یمزے سنجیدگی سے مسکرایا۔
تمہیں یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ مسز ریمزے نے یہ ہار
سے روانگی سے ایک دن پہلے وہاں کے ایک
نٹ اسٹور سے صرف اٹھارہ ڈالر میں خریدا ہے۔"
مسٹر کیلیڈا کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔
بکواس! یہ ہار نہ صرف اصلی ہے بلکہ اتنے سڈول
کی لڑی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"
کیا تم شرط لگاتے ہو؟ میں تم سے سو ڈالر کی شرط
ہوں کہ یہ نقلی ہیں۔"

"منظور"

"اوہ ایلمر تم شرط مت لگاؤ" مسز ریمزے نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اسکی آواز میں ارتعاش تھا

"کیوں کیا میں شرط نہیں لگا سکتا؟ اس طرح آسانی سے حاصل ہونے والے پیسے کو گنوانے والا تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا۔"

"لیکن اس کا ثبوت کس طرح دیا جا سکتا ہے" وہ بولی "مسٹر کیلیڈا کے مقابلے میں تو میرے صرف الفاظ ہیں۔"

"مجھے اس ہار کو غور سے دیکھنے دیجئے۔ اگر وہ نقلی ہوں گے تو میں فوراً بتا دوں گا میں سو ڈالر گنوانا پسند نہیں کرتا" مسٹر کیلیڈا نے کہا۔

"ڈیئر اسے اتار دو۔ اور اس "ہمہ داں" کو جی بھر کر دیکھ لینے دو۔"

ایک لمحہ کے لئے مسز ریمزے تذبذب میں پڑ گئی اس نے اپنا ہاتھ آنکڑے پر رکھ لیا۔

"میں اس کو کھول نہیں سکتی" وہ بولی "مسٹر کیلیڈا آپ میری بات پر یقین کر لیجئے۔"

مجھے ایک دم شک ہوا کہ کوئی منحوس بات ہونے والی ہے۔ لیکن میں خاموش رہا۔

ریمزے اچھلا "اس کو کھولوں گا" اس نے ہار اتار کر مسٹر کیلیڈا کو دیا۔ مسٹر کیلیڈا نے اپنی جیب سے ایک محدب شیشہ نکالا اور غور سے لڑی کا معائنہ کیا اس کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہار واپس کیا اور کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر مسز ریمزے کے چہرے پر جا پڑی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے وہ بس بے ہوش ہونے والی ہو۔ وہ پھیلی ہوئی اور سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی اسکی نگاہوں میں ایک بے بس سی التجا تھی اتنی صاف کہ مجھے تعجب ہوا کہ اس کا شوہر اسے کیوں نہ دیکھ سکا۔

"مسٹر کیلیڈا کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ ایکدم بے چین سا ہو گیا۔ کوئی بھی اس کی اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

"میں غلطی پر تھا" اس نے دھیرے سے کہا۔ "یہ بہت ہی اچھی نقل ہے لیکن بے شک جیسے ہی میں نے اسے اپنے شیشہ میں دیکھا مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ اصلی موتی کا نہیں ہے میرا خیال ہے کہ اس کی اٹھارہ ڈالر ہی قیمت مُناسب ہے۔"

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور اس سے سو ڈالر کا نوٹ نکال کر بغیر کچھ کہے ریمزے کے حوالے کر دیا۔

"میرے دوست۔ شاید تم کو اس بات سے یہ سبق ملے کہ ہر بات میں ہمہ دانی جتانا ٹھیک نہیں ہے۔" ریمزے نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ مسٹر کیلیڈا کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔

ہر کہانی کی طرح یہ کہانی بھی جلد ہی سارے جہاز پر پھیل گئی۔ یہ ایک پُر مذاق موضوعِ گفتگو بن گیا کہ جناب "ہمہ داں" خود اپنے دام میں آ گئے۔ مسز ریمزے کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اسلئے وہ اپنے کیبن میں چلی گئی تھی۔

دوسری صبح میں اٹھا اور شیو کرنے لگا مسٹر کیلیڈا بستر پر پڑا سگریٹ کے مرغولے بناتے ہوئے چھت کو گھور رہا تھا۔ اچانک ایک سرسراہٹ کی آواز آئی میں نے دیکھا کہ دروازے کے نیچے کی درز سے فرش پر ایک لفافہ سرکا دیا گیا ہے میں اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا میں نے لفافہ اٹھایا۔ اس پر میکس کیلیڈا کا نام موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا میں نے اسے اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ کس کی طرف سے ہے" اس نے لفافہ چاک کیا "اوہ"۔ لفافہ کے اندر سے خط کے بجائے سو ڈالر کا ایک نوٹ نکلا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے لفافہ پھاڑ کر باریک ٹکڑے کئے اور کھڑکی کی راہ سمندر میں ڈال دیئے۔

"کوئی بھی شخص بیوقوف نظر آنا پسند نہیں کرتا" اسنے کہا

"کیا وہ موتی اصلی تھے؟"

"اگر میری کوئی خوبصورت بیوی ہوتی تو میں خود کوبے میں رہ کر اُسے نیویارک میں ایک سال تک تنہا چھوڑنا پسند نہ کرتا۔"

اس وقت پہلی مرتبہ میرے دل نے مسٹر کیلیڈا کو ناپسند نہیں کیا۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور سو ڈالر کا نوٹ احتیاط سے اس کے اندر رکھ لیا۔ ▲▲

بقیہ: نئی ریاست کا ظہور

خود اس علاقہ کے ان اہم ممالک ایران، عراق اور سعودی عرب کے اپنے مفادات ہیں۔ جو قدرتی طور پر اس علاقہ پر اپنا اثر قائم رکھنے یا کم سے کم ایسی یونین کے قیام کے خواہاں ہیں جو ان کی دوست ہو۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہر ملک ضبط و تحمل سے کام لے رہا ہے۔ اور اسرائیلی پریس کا یہ پروپیگنڈہ کہ ایران اور عرب ریاستیں باہم ٹکرا جائیں گی۔ کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ شط العرب کے مسئلہ پر بھی جس پر ایران اور عراق میں اختلاف ہے زیادہ کشیدگی نہیں بڑھی ہے۔ ہر ملک یہ محسوس کر رہا ہے کہ برطانیہ کے انخلاء کی صورت میں اس علاقہ میں ایسی مملکت قائم ہونی چاہیئے جو اپنا دفاع خود کرنے کے قابل ہو۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کی بناء پر گزشتہ ماہ سعودی عرب کے دوم نائب وزیر اعظم و وزیر داخلہ شہزادہ فاہید ابن عبدالعزیز لندن پہنچے اور برطانوی ذمہ داروں سے بات چیت کی افتتاحی اجلاس میں برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہوم نے بھی شرکت کی۔ ایک ہفتہ کی بات چیت کے بعد جو اعلانیہ جاری کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعودی عرب اور برطانیہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ خلیج فارس (جسے عربوں نے اب خلیج عرب کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے) کی امارتوں کی ایک فیڈریشن کے قیام کے سلسلہ میں تیز رفتاری کے ساتھ اقدامات کئے جائیں۔

ادھر ایران کی بھی خواہش ہے کہ خلیج فارس کی امارتوں آزاد ہوں اور وہ سب ایک فیڈریشن میں شامل ہو جائیں۔ پچھلے دنوں بحرین کے حکمران عیسیٰ بن سلمان آل خلیفہ جب ایران کے دورہ پر گئے تھے تو ان کا وہاں بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ حالانکہ پچھلے دنوں تک بحرین پر ایران اپنی حکمرانی کا دعویٰ رکھتا تھا اور حکمران خاندان سے جو کویت کا خاندان ہے اس کے تعلق خوشگوار نہ تھے۔ (بحرین پر ۱۷۸۱ء تک ایران ہی کا قبضہ تھا) شاہ ایران نے عیسیٰ بن سلمان کو اپنے محل میں مدعو کیا اور خلیج فارس کے مستقبل پر اہم گفتگو کی۔

بحرین خلیج فارس کے مغربی ساحل پر دوسری چھوٹی چھوٹی امارتوں کے مقابلہ میں سب سے بڑی ہے یہ کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے جن میں بعض کا رقبہ تین اور چار میل سے زیادہ نہیں ہے سب سے بڑا جزیرہ بحرین کا ہے جو ۳۰ میل لمبا اور ۱۰ میل چوڑا ہے مجموعی رقبہ ۲۳۱ مربع میل ہے اور آبادی (۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق) ۱۸۲۲۰۳ ہے ان میں نصف وہاں کے اصل باشندے ہیں، جو شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی جن میں حکمران خاندان بھی شامل ہے سُنی ہیں۔

بحرین اور قطر بھی اگر معاہدہ کی پابند سات امارتوں کے ساتھ مل جائیں تو اس علاقہ میں ایک اچھی خاصی مملکت قائم ہو سکتی ہے جو رقبہ میں اردن کے برابر اور آبادی ۴½ لاکھ ہوگی لیکن اگر بحرین نے ایک الگ آزاد ریاست کی حیثیت سے رہنا پسند کیا تو اگرچہ رقبہ کے لحاظ سے زیادہ فرق نہ پڑے گا لیکن آبادی نصف رہ جائے گی۔ تاہم جو کچھ ہو بحرین مجوزہ ریاست میں شامل ہو یا الگ رہے خلیج فارس میں نئی اور ایسی مملکت کا معرض وجود میں آنا لازمی ہے جو مستحکم ہو اور جو برطانوی افواج کے چلے جانے کی صورت میں پیدا ہونے والے طاقتی خلا کو پورا کر سکے۔

اس نئی یونین کی فوج فی الحال برطانیہ ہی کی نیابت میں قائم ہوگی وہی اسے ٹریننگ بھی دے گا۔ اور برطانوی افسران ہی مقرر کئے جائیں گے لیکن آزادی کا جو جذبہ ان امارتوں کے لوگوں میں موجود ہے اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ بہت جلد وہ دن آئے گا جب وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں گے اور انہیں برطانوی افسروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

●●

بقیہ: اکوپنکچر

انسانی جلد کے ٹھیک نیچے رگوں کا جال بچھا ہوا ہے جو جسم کے سارے حصوں کو ایک دوسرے سے مربوط کئے رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم کے اندر کے اعضاء کسی نہ کسی طرح جسم کی اوپری جلد سے واسطہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جسم کے کسی حساس حصہ کے اندر جب ایک سوئی چبھا دی جاتی ہے تو نظام اعصاب کے ذریعہ دماغ کے مرکزی حصہ کے زیریں رگوں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور جب دوران خون ایک بار پھر اُسی سوئی کی طرف بڑھتا ہے تو اُس عرصہ میں سُوئی سے متاثرہ حصہ اپنا اصل توازن قائم کر لیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سر کے درد کا علاج گدی کے دبانے سے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پیشانی پر بام لگانے سے اکثر سر کے درد میں کمی ہو جاتی ہے۔

جن چینی طبیبوں نے اس طریقہ علاج کو جاری کیا ان کے نظریہ میں ساری دُنیا کا دارومدار ین۔ یانگ کی تقابلی کشمکشوں پر ہے منفی اور مثبت قوتوں کے عمل اور ردِ عمل سے ساری کائنات کا وجود ہے۔ منفی کے اندر مثبتی اور مثبت کے اندر منفی عناصر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ان کے خیال میں انسانی جسم اور دماغ ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں جسم کے کسی حصہ کی فوری تکلیف کا احساس صرف دماغ ہی کو ہوتا ہے۔ چنانچہ اکوپنکچر کے عمل سے دماغ کو ہی متاثر کیا جاتا ہے۔ اور جسم کے اندر جگہ جگہ پنکچر کر دینے سے منفی اور مثبت طاقتوں میں کشمکش پیدا ہو جانے سے اندرونی حصوں کا توازن برابر ہو کر مرض رفع ہو جاتا ہے۔ جدید ریسرچ نے بتایا ہے کہ انسانی جسم پر اکوپنکچر آپریشن کے لئے ہزار سے زیادہ نقطے ہیں جہاں سوئیاں چبھو کر مختلف امراض پر قابو پا لیا جاتا ہے۔

عرق النساء کے مریض کو آڑا لٹا کر اس کی ایک ٹانگ پر چار چھ جگہ اکوپنکچر کر دیا جاتا ہے چھوٹی بڑی سوئیاں تقریباً ۲۰ منٹ کے لئے ایک ہی حالت میں چبھی رہتی ہیں۔ الٹا سوئیوں کے جلد کے اندر داخل ہوتے ہی مریض کو سکون مل جاتا ہے۔ اگر وہ اس عمل سے سات مرتبہ گزر جائے تو یہ مرض عمر بھر کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال آج سے پانچ ہزار برس پہلے اس چینی طبیب نے اپنے شہنشاہ سے کہا تھا کہ اکوپنکچر ایک ایسا طریقہ علاج ہے جو جسم کے کمزور حصہ کو طاقتور حصوں سے حاصل کی ہوئی توانائی بخش کر نظام اعصاب کے توازن کو قائم رکھتا ہے۔ اور اس توازن کے غلط ہو جانے کی وجہ سے امراض پیدا ہوتے ہیں اور درد رونما ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اکوپنکچر کو رائج کرنے کے لئے ڈاکٹر عبدالجلیل کو جاپان کے اکوپنکچر انسٹی ٹیوٹ روانہ کرنے کا فیصلہ جولائی ۱۹۷۱ء میں کیا گیا تھا۔ اگر ڈاکٹر موصوف اس طریقہ کار کو رائج کرنے میں کامیاب ہوئے تو ہندوستان کے غریب مریضوں کا اس ارزاں علاج سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کی توقعات وابستہ رکھنا واجب ہے۔



نکسن عربوں کی نظر میں

واقعات نئی دہلی

اے اسرائیل

حریفِ امن و اماں شر پسند اسرائیل
نظر سے گر گیا، دنیا میں جو...

میں تیرے خواب کی تاویل کہہ رہا ہوں آج
یہ سُن کر سخت بھیانک ہے خواب...

رہے گا خواب پریشاں ہر ایک خواب ترا
بجھا نہ پائے گا ہرگز تو...

وہ ضرب ہند پہ آئی جو ضرب مصر پہ تھی
گر اہلِ مصر ہوئے قتل...

ہیں اک مزاج صحارا و راجپوتانہ
ہیں ایک رنگ بہم رود گنگ...

کشاں کشاں وہیں پہونچیں گے ہند کے فرزند
جہاں جہاں انھیں آواز...

جو سامراج ہے بدنام شاطری کے لیے
اُسی کے حکم کی کرتا ہے...

جہاں میں ہوتا ہے جو جنگ و قحط و بیماری
پسارتا ہے تو اُس ہی کے...

کر انتخاب کہ آگے ہے تیرے جنگ و امن
مثالِ آتشِ نمرود...

فضائے امن کے بارے میں تجھ کو قیل و قال
فضائے امن ہے مستی...

تجھے یہ چاہیے اپنی خطا پہ نادم ہو
سنبھل شتاب کہ باقی...

وہ دیکھ پرچمِ جمہور لہلہاتا ہے
وہ دیکھ زمزمہ خواں ہے بشر کی فکر جمیل

ادم ...

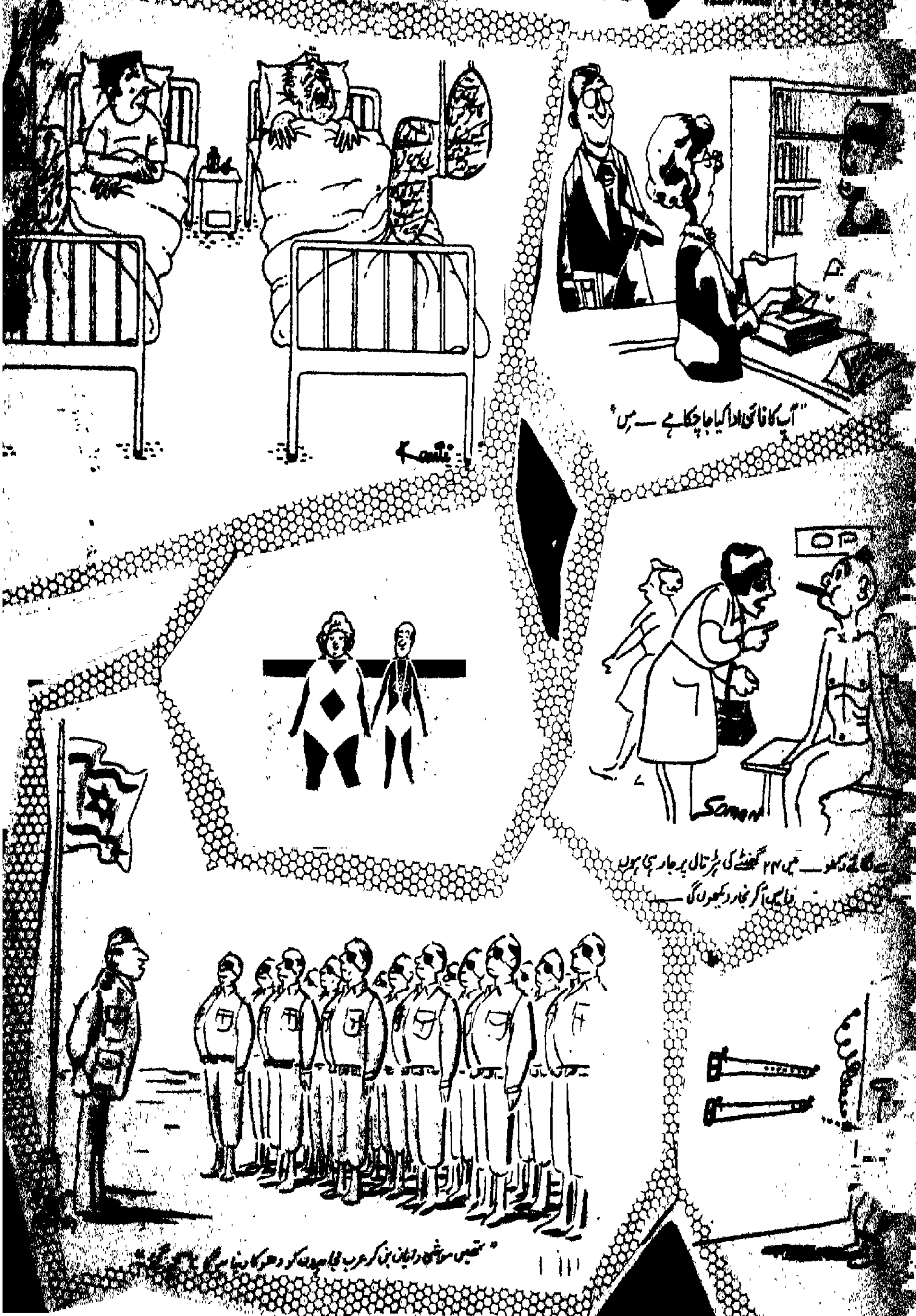
آرہی ہے پھر الکشن کی بہار
جن صروں پر ووٹ کے بولے گے وار
گھر سے نکلے گا ہر اک سرمایہ دار
ہاتھ میں چنبل لیے دیوانہ وار
لو بدھوے کے جھنڈا آئیں گے
ووٹروں کے سامنے گھگھیائیں گے
ہر طرف تقدیر کی ہوگی بہار
موسمی لیڈر پہ آئے گا نکھار
نعرہ بازی سے فضا گونجے گی پھر
پھر اپیلیں ہوں گی ہر جا منتشر
شیخ جی پنڈت کے گھر پھر جائیں گے
برہمن مُلّا سے ملنے آئیں گے
خان صاحب شیخ سے ٹکرائیں گے
رام جی بھی شام سے رو جائیں گے
ہر طرف گڈی اُڑے گی نوٹ کی
جان سے قیمت بڑھے گی ووٹ کی
وہ جنھیں فاقہ کشوں سے ہے گریز
مفلسوں کے در پہ ہوں گے سجدہ ریز
خوب راموکو ملے گا روزگار
در پہ تیتی کے لگے گی روز کار
جھونپڑی میں ہوگی پھر دیپاولی
پھر نظر آئے گی جوڑی بیل کی
اک درانتی اور گندم کا نشاں
فاقہ مستوں کا بنے گا ہم زباں
کوئی آئے گا ...
... میں پھر کوئی ملائے گا دیے
... کے پھر ...
... انتخاب

از ـــ قلیج رمانی

JANUARY 1971
(SECOND HALF)

WAQIAT

REGD NO.
TELEPHONE





واقعات
نئی دہلی

ذُلفی
تا
ذوالفقار علی
بھُٹّو

*

پاکستان کا
مُستقبل
؟

نئے چراغ جلانے

نئے چراغ جلاؤ بہت اندھیرا ہے
چمن کو تند ہواؤں نے آ کے گھیرا ہے
فساد و ظلم کا افلاس کا بسیرا ہے

ہیں مشتعل در و دیوار مشتعل راہیں
کہیں ہے بھوک کہیں پیاس اور کہیں آہیں

عوام خوش ہیں، نہ دہقان کو مسرت ہے
خوشی سے جینے کی محنت کشوں کو حسرت ہے
دلوں میں رنج ہے ذہن و نظر کو حیرت ہے

نہ علم و فن، نہ ترقی کی راہ ہے کوئی
نہ اہلِ فکر، نہ عالی نگاہ ہے کوئی

دلوں میں جذبۂ ایثار ہو اگر بیدار
تو کھیتوں میں ہو غلّے کی خوب پیداوار
ہو صنعتوں میں ترقی تو ہے وطن کا وقار

نہ تنگ آ کے کوئی خودکشی کو نکلے گا
حمید بن کے ہر انساں وطن پہ جاں دے گا

نہ علم و فن کی کبھی ملک میں کمی ہوگی
نہ بھوک ہوگی یہاں اور نہ تشنگی ہوگی
دلوں میں مہر و محبت کی روشنی ہوگی

"نئے چراغ" اگر پیار کے جلائیں گے
ہر ایک دکھ پہ مصیبت پہ فتح پائیں گے

درد کے طوفان جب تھم جائیں گے
جب اندھیرے ظلم کے چھٹ جائیں گے
ہر طرف خوشیوں کے بادل چھائیں گے
زندگی سے سارے غم مٹ جائیں گے
جب خوشی کے گیت ہم تم گائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جب بدل دے گا زمانہ اپنی خو
جب نہ ہوگا امتیازِ رنگ و بو
جب بہے گا یوں نہ غنچوں کا لہو
جب نہ کلیوں کی لٹے گی آبرو
پھول جب ایسے نہ مسلے جائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جب نہ اجڑیں گی دلوں کی بستیاں
جب نہ ہوں گی ظلم کی خرمستیاں
جب نہ ہوں گی غم کی چیرہ دستیاں
اوج پر جب ہوں گی ساری پستیاں
جب دلوں سے نفرتیں مٹ جائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

زیست پر ہوں گے نہ سائے موت کے
بجھ نہ پائیں گے جب آشا کے دیے
کوئی ترسے گا نہ روٹی کے لیے
بلبلائیں گے نہ بچے بھوک سے
جب نہ یوں انساں کو انساں کھائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جھومتی لہراتی آئے گی بہار
ہر طرف برسے گی جب رم جھم پھوار
جب نہ تولا جائے گا سکوں میں پیار
جب نہ ارباب وفا یوں ہوں گے خوار
سب مرادیں اپنی اپنی پائیں گے
آئیں گے وہ دن یقیناً آئیں گے

جب فریبِ نظر یاد آئے
زندگی کے قدم ڈگمگائے

بھول کر بھی جو ہم مسکرائے
مدتوں ہم نے آنسو بہائے

غم تھے جتنے بھی اپنے پرائے
دل نے کتنی خوشی سے اٹھائے

ان بہاروں سے دھوکا نہ کھانا
یہ ہیں صیاد و گلچیں کے سائے

ان کا دامن سجایا ہے میں نے
میرے آنسو بہت کام آئے

چھا گیا ہے خرد کا اندھیرا
کوئی شمعِ محبت جلائے

لوٹ کر سارے اہلِ چمن کو
یہ بہارِ چمن پھر نہ آئے

اک خطائے محبت پہ ہم تو
دل نے کُل زندگی زخم کھائے



غزل

تم نہیں تو کوئی شادابی بہاروں میں نہیں
کیف نظروں میں نہیں لذت نظاروں میں نہیں

رنگ پھولوں میں نہیں تابش ستاروں میں نہیں
جب سے تابانی مرے دل کے شراروں میں نہیں

ماہ و انجم سے سنواری تھی جنھوں نے یہ زمیں
روشنی کی اک کرن ان کے مزاروں میں نہیں

کس قدر خوش رنگ ہیں میرے دلِ بسمل کے زخم
پھول کھلتے ہیں مگر ایسے بہاروں میں نہیں

پی گئے اک جام میں ساری انا، ساری خودی
اب من و تو کے وہ جھگڑے بادہ خواروں میں نہیں

خود ہی منزل، خود ہی رہرو، خود ہی یہ کارواں
میں ہی میں ہوں اور کوئی رہگزاروں میں نہیں

کتنے خرمن پھونک ڈالے کتنے گھر ویراں کیے
پھر بھی گرمی کم محبت کے شراروں میں نہیں

کیا سنے گا وہ کہ ہیں بے سود ناقوس و اذاں
قلب کی آواز ان اونچی پکاروں میں نہیں

روح کے زخموں سے رستا ہے لہو اب تک نظامؔ
باسلیقہ کوئی میرے چارہ کاروں میں نہیں

نظام اٹاوی

فروری ۱۹۷۲ء
نصف اوّل
ل ——— اٹھائیسواں شمارہ
مُدیر
عبدالوحید صدیقی
صدر دفتر
ی ۱۰ ، نظام الدین ایسٹ ، نئی دہلی ۱۳
ٹیلیفون ——— ۶۱۹۰۹۵
کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپے

ئین کار ——— امی روز ——— بہزاد راہی
—— طابع و ناشر، عبدالوحید صدیقی ——
ہ مدشو آفسیٹ پرنٹرز، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی

خود کشی کی دوسری کوشش

پاکستان کے صدر جناب ذوالفقار علی بھٹو آجکل تعلقات توڑنے کی سیاست پر عمل کر رہے ہیں جس رفتار سے بنگلا دیش کو تسلیم کرنے والے ملکوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اسی رفتار سے ان ملکوں کی تعداد بھی بڑھ رہی جن سے پاکستان قطع تعلق کر رہا ہے۔ اگر تعلقات شکنی کی یہ رفتار جاری رہی تو نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کتنے ملکوں سے پاکستان کے سفارتی تعلقات باقی رہ جائیں گے۔

ایسا لگتا ہے کہ پاکستان تعلقات شکنی کی اس مہم پر اپنی مرضی سے عمل نہیں کر رہا ہے بلکہ دنیا کی کچھ طاقتیں اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اسکو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ ہر اس ملک سے سفارتی تعلقات منقطع کرے جو بنگلا دیش کو تسلیم کرے۔ اگر پاکستان کوئی طاقتور ملک ہوتا یا سیاسی اعتبار سے ایسا ملک ہوتا جس کی دوستی دنیا کے ملکوں کے لئے اہمیت رکھتی تو اس کی موجودہ روش قابل فہم تھی۔ لیکن ان دونوں باتوں سے پاکستان محروم ہے۔ اس لئے پاکستان کی موجودہ روش خود کشی کی دوسری کوشش تو کہی جا سکتی ہے عقلمندی اور معاملہ فہمی کی بات نہیں قرار دی جا سکتی۔

اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ امریکا اور چین کے آسرے پر پاکستان نے جنگ کی راہ اختیار کی تھی۔ اسے امید تھی کہ یہ دونوں ملک جنگ میں اس کی بھرپور مدد کریں گے۔ امریکا کے ساتویں بیڑے کی خلیج بنگال میں آمد بھی پاکستان کو امریکی امداد کا یقین دلانے کی ایک چال ہی تھی۔ لیکن پاکستان اور پوری دنیا نے دیکھ لیا کہ چین اور امریکا کی حمایت اور ان دونوں ملکوں کے امداد کے وعدے فریب محض کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ اس لئے اگر اب بھی پاکستانی حکمرانوں کو یہ امید ہو کہ ان دونوں ملکوں کی مدد سے وہ حقیقتوں کو بدل دینگے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اب بنگلا دیش کی آزاد حیثیت کو ختم کرنا ناممکن ہے۔

شیخ مجیب کی رہائی کے بعد یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ پاکستان میں اب جنرلوں کی سیاست کا خاتمہ ہو جائے گا اور جمہوری ذہن کو تقویت حاصل ہوگی لیکن بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج بھی پاکستان کے حکمرانوں کا ذہن نہیں بدلا ہے۔ اس روش کے نتیجے میں پاکستان مزید کمزور ہوگا اور برصغیر میں امن و سلامتی کے امکانات مزید تاریک ہو جائیں گے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ "تعلقات شکنی" کی موجودہ سیاست سے پاکستان بنگلا دیش پر اپنے حق کو زندہ رکھ سکے گا لیکن اس حق کو زندہ رکھنے کے سلسلے میں پاکستان کو جو نقصانات ہونگے وہ اس فائدے سے کہیں زیادہ ہیں۔ پاکستان کی تمام توانائیاں جنگی تیاریوں پر صرف ہونگی، ملک کے اندر بے چینی کا عالم رہے گا، صنعتی اور اقتصادی ترقی کی راہیں مسدود ہوں گی، بین الاقوامی برادری میں اس کے دوستوں کی تعداد بھی گھٹ جائے گی اور ان سب کا نتیجہ "ذہنی ڈھاک کے تین پات" کی شکل میں نمودار ہوگا۔

پاکستان کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ سیاست کی دنیا میں کوئی بھی کسی کا مستقل دوست یا مستقل دشمن نہیں ہوتا۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ چین اور امریکا کی دشمنی کا خاتمہ بھی اب قریب آرہا ہے۔ اس لئے اگر آج امریکا اسکا دوست ہے تو کل مخالف بھی بن سکتا ہے، اور اگر آج چین ہندوستان سے دشمنی رکھتا ہے تو کل چین اور ہندوستان کے درمیان دوستی بھی ہو سکتی ہے —— ان حالات میں پاکستان کے لئے بہتر صورت یہی ہوگی کہ وہ چین اور امریکا کے مفادات پر اپنے مفادات کو قربان نہ کرے اور اسے ہزاروں دشواریوں اور مصائب سے دوچار ہونے کے بعد کل جو راستہ اختیار کرنا ہے وہی راستہ آج اختیار کر لے۔ اب برصغیر میں امن و سلامتی کا انحصار بنگلا دیش، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نفرت و حقارت کے جذبات کے خاتمے پر ہے۔ ان ہی جذبات کے نتیجے میں پاکستان کے بے رحم فوجی حکمران خود کشی کر چکے ہیں، اور اب پاکستان کے نام نہاد دوست صدر بھٹو کی قیادت میں پاکستان سے سیاسی خود کشی کی راہ پر چلنے کی توقعات قائم کئے ہوئے ہیں —— کاش پاکستان کے عوام ان چالوں کو سمجھیں اور اپنے خوش آئند مستقبل کے لئے بنگلا دیش کی حیثیت کو تسلیم کر کے برصغیر میں امن و سلامتی کے نئے دور کا آغاز کرنے والوں کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے پر تیار ہو جائیں۔ ••

شاہ مہندرا کا انتقال

یوں تو دنیا میں آج بھی سب سے زیادہ بادشاہ ہیں لیکن نیپال کے بادشاہ بیر بکرم شاہ دیوا دنیا کے واحد عوامی بادشاہ تھے، اور انکے عوامی بادشاہ بننے میں ہندوستان کا جو کردار رہا ہے اسے شاید کبھی نہ بھلایا جا سکے گا۔

شاہ مہندرا کے والد شاہ تربھون راناؤں کے چنگل میں بُری طرح پھنسے ہوئے تھے اور وہ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد اپنے محل کی چہار دیواری میں قیدیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے لیکن ہندوستان کی بے لوث امداد کے ذریعے انہوں نے راناؤں کے چنگل سے نجات حاصل کی اور انکی موت کے بعد مہندرا کو عوام کے قریب آنے کا موقع ملا۔

شاہ مہندرا نے ۳۵ سال کی عمر میں ۱۹۵۵ء میں تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے بعد ناطرفداری کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا اور اپنی پسماندہ ریاست کو انتہائی دانشمندی کے ساتھ پسماندگی سے نکالنے کی کوششیں کیں۔ انھوں نے اپنے ملک میں بہت سے سماجی اور اقتصادی انقلابات برپا کئے اور بادشاہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے عوام کو جاگیردارانہ نظام کے چنگل سے نجات دلائی۔ یہی وجہ ہے کہ نیپال کے عوام کو اپنے بادشاہ سے بے انتہا محبت تھی اور انکے انتقال پر انھوں نے اس طرح غم منایا جیسے انکے خاندان کا سربراہ اٹھ گیا ہو۔

شاہ مہندرا کی جگہ پر انکے بڑے بیٹے شاہ برندرا نے نیپال



کی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ چونکہ وہ جدید تعلیم سے لیس ہیں اور جدید دور کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں اس لئے امید ہے کہ نیپال میں تعمیرات کا جو عمل شاہ مہندرا نے شروع کیا تھا وہ شاہ برندرا کی قیادت میں جاری رہے گا۔ ••

آسام کے وزیر اعلیٰ کا استعفیٰ

آسام میں ریاستی اسمبلی کے لئے کانگریسی امیدواروں کے انتخابات کے سوال پر اچانک شدید اختلاف رائے پیدا ہونے کے نتیجے میں وزیر اعلیٰ مسٹر ایم ایم چودھری نے استعفیٰ دے دیا اور ایڈ ہاک پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر مسٹر سرت چندر سنہا نے نئے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ریاست کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ مسٹر چودھری نے کئی اصولوں کی بنا پر استعفیٰ دیا۔ وہ پردیش کانگریس کی جگہ پر ایڈ ہاک کمیٹی کی تقرریوں کے مخالف تھے اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ پردیش الیکشن کمیٹی انکے ۱۰ ساتھی وزیروں کو ٹکٹ دینے سے گریز کرے۔ لیکن انکی طاقت اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی دونوں باتوں کو منوا سکتے۔ اس لئے انھوں نے جھگڑے کو طول دینے کی بجائے کھلاڑیوں کی اسپرٹ سے کام لیتے ہوئے اپنا استعفیٰ دے دیا۔

مسٹر چودھری کے نظریات سے کوئی اختلاف کرے یا اتفاق، لیکن ان کے اس اقدام کی ہر شخص تعریف کرے گا کہ انھوں نے اپنی کمزوری کو محسوس کر لینے کے بعد آسام میں سیاسی بے چینی کے لئے راہ ہموار نہیں کی بلکہ ان لوگوں کے لئے میدان چھوڑ دیا جو ان سے زیادہ طاقت ور تھے۔ انھوں نے یہ ایک اچھی جمہوری مثال قائم کی ہے۔ اس سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو جمہوریت میں اپنی طاقت کم ہو جانے کے باوجود اکثریت کے فیصلے کو نہیں مانتے اور اقتدار کے لئے ملک کی سیاسی فضا تک کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ ••

مدھیہ پردیش میں تبدیلی

مدھیہ پردیش میں بھی آسام ہی کی طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر شکلا نے آسام کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ایم ایم چودھری کی طرح اخلاقی جرات کا ثبوت دینے میں قدرے پس و پیش کیا۔ وہ بار بار دہلی آئے، انھوں نے مرکزی قیادت کو کسی طرح سے منانے کی کوشش کی اور جب انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ انکی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوگی تو وہ مجبوراً مستعفی ہو گئے۔

اب مسٹر شکلا کی جگہ پر مسٹر پی سی سیٹھی رُتبے کے اعتبار سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے وزیر اعلیٰ بن گئے ہیں اور ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اسمبلی کے انتخابات ہیں۔ جن سنگھ سے لوہا لینا ہے جو مدھیہ پردیش میں راج ماتا گوالیار کی مدد سے برسرِ اقتدار آنے کے دعوے کر رہی ہے۔ مسٹر سیٹھی نے جو مرکز میں وزیر مملکت برائے پیٹرولیم و کیمیکلز تھے وزارتِ اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد امید ظاہر کی کہ کانگریس مدھیہ پردیش اسمبلی کی ۲۹۶ نشستوں میں سے ۲۰۰ پر قبضہ کرے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جن سنگھ کا اگر یہ خیال ہے کہ وہ ریاستی حکومت پر قبضہ کر لے گی تو وہ خوابوں کی دنیا میں رہتی ہے۔

لیکن مسٹر شکلا اور انکے حامیوں کی طرف سے کانگریسی امیدواروں کی انتخابی مہم کو ناکام بنانے کی کوشش کے امکانات کی موجودگی میں انھیں بڑی دانشمندی اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ ••

پھول اور کانٹے

- دیسی شراب کی کافی دوکانیں کھولی جائیں — ایک اخباری سُرخی
  — تاکہ لوگ نقلی شراب پی کر مرنے کی بجائے اصلی شراب پی کر مرا کریں۔
- فرقہ پرستوں سے بچو — قوم کو اندرا جی کا انتباہ۔
  — لیکن فرقہ پرستی تو اس ملک میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور وبا سے خدا ہی بچا سکتا ہے خود انسان کے لئے وبا سے بچنا محال ہے۔
- دہلی کارپوریشن کا بجٹ سوشلزم سے کوسوں دور — ایک اخباری سُرخی۔
  — جن سنگھ نے کب سوشلزم کا دعویٰ کیا ہے جو اسکے بجٹ کے غیر سوشلسٹ ہونے کی شکایت کی جاتی ہے۔
- پنجاب کے ۴۵ کانگریسی امیدواروں کا فیصلہ —
  — ہم الیکشن نہ لڑیں گے۔!
- دو ماہ کے اندر روزگار — مدھیہ پردیش سرکار کی نئی اسکیم۔
  — خیال رہے کہ دو ماہ کے بعد ریاستی اسمبلی کے انتخابات بھی ختم ہو جائیں گے۔
- چرن سنگھ نے بی کے ڈی کو توڑنے کی تحریک کی تردید کی ہے — ایک خبر۔
  — شاید انھیں آخری رسوم کی ادائگی کا انتظار ہے۔
- مرارجی ڈیسائی نے پاکستان کے ٹوٹنے کا الزام نکسن اور چاؤ این لائی پر لگایا ہے۔
  — لیکن اس میں ہندوستان کا کیا نقصان ہوا۔؟
- دلائی لاما تبت میں رائے شماری کرانے کے حق میں۔
  — لیکن ماؤزے تنگ تو اس کے حق میں نہیں ہیں۔
- وزیر اعظم ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد کابینہ میں ردّ و بدل کریں گی۔
  — لیکن بہتوں کی نیند ابھی سے حرام ہو گئی ہے۔
- جی ڈی برلا نے امریکی امداد کی منسوخی کا خیر مقدم کیا ہے
  — اب وہ زیادہ رقم دے کر زیادہ منافع کما سکیں گے۔

آتش زدہ جہاز کے کپتان

ذوالفقار علی بھٹو

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو — جنہیں پیار سے بچپن میں انکے والدین زلفی کہتے تھے، ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو لاڑکانا (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ انکے والد سر شاہ نواز خاں بھٹو اپنے صوبے کے سب سے بڑے زمینداروں میں سے ایک تھے۔ وہ دو سال (۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء) بمبئی کی حکومت میں وزیر کے عہدے پر مامور رہے اور اس کے بعد جوناگڑھ کے دیوان مقرر کئے گئے جو ۱۹۴۹ء میں ریاست کے ہند میں ادغام تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مسٹر بھٹو کے والدین پاکستان ترک وطن کر گئے۔

مسٹر بھٹو نے ایک دولت مند گھرانے میں جنم لیا تھا۔ اسی ماحول میں انکی پرورش ہوئی اور اعلیٰ سطح پر انکی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں ہوئی لیکن بعد میں انھیں بمبئی کے کیتھیڈرل اینڈ جان کونن اسکول میں داخل کر دیا گیا جو دولتمندوں کا اسکول سمجھا جاتا تھا۔

بھٹو خاندان کئی برس بمبئی میں رہا اور بمبئی کی رنگین زندگی میں اسے گھلنے ملنے کا خوب موقع ملا۔ اعلیٰ حلقوں میں اس خاندان کے افراد کا ملنا جلنا تھا۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے مسٹر بھٹو امریکا بھیجے گئے۔ برکلے (کیلیفورنیا) یونیورسٹی سے انھوں نے گریجویشن لیا اور اس کے بعد کرائسٹ چرچ کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے، بعد ازاں لنکنس ان سے قانون کی ڈگری لی اور کچھ عرصے تک انھوں نے ساؤتھمپٹن یونیورسٹی انگلینڈ میں بین الاقوامی قانون کا مطالعہ کیا اور پھر ۱۹۵۳ء میں کراچی واپس آگئے جہاں ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی لیکن وکیل کی حیثیت سے انھوں نے کوئی خاص مقام پیدا نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ انھیں وکالت سے کم اور سیاست سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اور ایک دولت مند فرد کی حیثیت سے انھیں اس میدان میں آگے بڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی ———

سیاست کے لئے انھیں ایک اچھا موقع اس وقت مل گیا جب ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب خاں نے ملک میں مارشل لاء کا اعلان کیا اور ایک نئی حکومت بنائی۔ اس حکومت میں مسٹر بھٹو کو وزیر تجارت کی حیثیت سے شامل کیا گیا اسوقت انکی عمر صرف تیس برس تھی ——— اور دوسرے تمام وزیروں میں سب سے کم عمر تھے ——— اس کے بعد وہ کئی عہدوں پر مامور رہے ——— قومی تعمیرات نو اور اطلاعات و امور کشمیر ——— صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں وزیر خارجہ بنایا گیا جب وہ ایک پاکستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کرنے کے لئے دہلی آئے۔

وزیر خارجہ کی حیثیت سے انھیں اس بات کا کریڈٹ حاصل ہے کہ انھوں نے چین کے ساتھ دوستی کی۔ ہندوستان کے معاملے میں انکا رویہ بہت سخت تھا۔ ۱۹۶۵ء میں ۲۲ دن کی جنگ کے بعد جب تاشقند میں جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تو انکی طرف سے اس معاہدے کی مخالفت کی گئی اس پر ان کے اور صدر ایوب کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی نتیجے میں مسٹر بھٹو وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ کچھ دن خاموش رہے، ۱۹۶۷ء میں پھر سیاست میں آئے اور صدر ایوب خاں کے خلاف کھل کر نکتہ چینی کی ——— پہلے مسلم لیگ کے سرگرم ممبر تھے، اس کے سکریٹری جنرل بھی رہ چکے تھے۔ لیکن اس مرتبہ انھوں نے بائیں بازو کی پیپلز پارٹی کے نام سے ایک نئی پارٹی قائم کی۔ یہ پارٹی یکم دسمبر ۱۹۶۷ء کو قائم کی گئی اور مسٹر بھٹو نے اپنی پارٹی کے مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے ہے " اسلام ہمارا عقیدہ ہے جمہوریت ہماری پالیسی ہے اور ہم عوام کے اقتدار اعلیٰ پر یقین رکھتے ہیں "

دو سال بعد انھیں عوام کو تشدد کے لئے بھڑکانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور تین ماہ کی جیل کاٹی۔ اس سے انکی شہرت اور ہو گئی اور جب رہا ہوئے تو عوام نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ——— صدر ایوب خاں خاص طور پر اپنے لڑکے کے کرتوتوں کی بنا پر بہت بدنام ہو چکے تھے۔ مسٹر بھٹو کو موقع مل گیا اور انھوں نے صدر ایوب کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ انھیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا انھوں نے حکومت کی باگ ڈور صدر یحییٰ خاں کے سپرد کر دی۔

صدر یحییٰ خاں نے سول حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کرائے جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان کی ۱۶۹ سیٹوں میں سے ۱۶۷ سیٹیں ملیں اور مغربی پاکستان کی ۱۴۴ سیٹوں میں ۸۵ سیٹیں (بھٹو کی پیپلز پارٹی) کو حاصل ہوئیں ——— لیکن ان انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کا اجلاس کبھی نہ بلایا جا سکا ——— بھٹو صاحب کی مہربانی سے مشرق و مغرب کا تنازعہ شروع ہوا، اور ایسا شروع ہوا کہ مشرقی پاکستان آزاد "بنگلادیش" میں تبدیل ہو گیا۔

مسٹر بھٹو بہت پرجوش اور چالاک سیاستدان ہیں لیکن انکی طبیعت میں ابھی کچا پن موجود ہے۔ کبھی وہ بڑے خوش خلق اور بامروت نظر آتے ہیں اور کبھی نہایت تند خو اور بدمزاج ——— کبھی ہندوستان سے دوستی کی باتیں کہتے ہیں اور کبھی ایک ہزار سال تک لڑنے کا اعلان کرنے لگتے ہیں۔

حصول اقتدار کی ہوس انکے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے صدر کے عہدے پر پہونچنے کے لئے جہاں کہ وہ پہونچنا چاہتے تھے وہ آج اپنے آپ کو مبارکباد دے سکتے ہیں اس لئے اگر سابق صدر یحییٰ خاں شیخ مجیب الرحمٰن سے کوئی مصالحت کر لیتے تو بھٹو صاحب کبھی بھی اپنے ملک کے صدر نہ بن سکتے تھے۔ یہ ان ہی کی ذات تھی کہ جس نے یحییٰ مجیب ——— بات چیت کو کامیاب نہ ہونے دیا اور دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

کل وہ اس بات کے بھی روادار نہ تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کو منظور کر لیں۔ لیکن آج پورا پاکستان انکے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔

بھٹو صاحب اب اپنے ملک مغربی پاکستان کے صدر ہیں انکا برسوں کا خواب پورا ہو گیا ہے لیکن خود انکے بقول وہ ایک ایسے جہاز کے کپتان بنائے گئے ہیں جس میں آگ لگی ہوئی ہے جو برباد ہو چکا ہے اور جس کے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔

دیکھیں وہ اس "ڈوبتی نیا" کو کیسے پار لگاتے ہیں ——— اسکا انحصار انکی صلاحیتوں پر ہے۔

واقعات نئی د

ذلفی — تا — ذوالفقار علی بھٹو — چند یادیں

بھٹو خاندان کئی برس بمبئی میں رہا اور بمبئی کی رنگین زندگی میں اسے گھلنے ملنے کا خوب موقع ملا — خود مسٹر بھٹو کے مخصوص دوستوں میں مسٹر پیلو مودی کا نام سرفہرست ہے — (مسٹر مودی آجکل ہند پارلیمنٹ کے ممبر ہیں)

مسٹر مودی اپنے یار ذلفی کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں یہ ان ہی کی زبانی سنئے۔ پچھلے دنوں جب ایک صحافی نے ان سے مسٹر بھٹو کے بارے میں انٹرویو لیا تو بولے۔

" ارے وہ ذلفی شراب اور لڑکیوں کا رسیا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بچہ تھا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹا ہے — پورے دو برس۔ بہت چیخ کر بولتا تھا۔ کافی شائستہ نظر آتا تھا۔ پرجوش و متحرک۔ دراصل وہ میرے ایک چچازاد بھائی کا دوست تھا۔ یہ ۱۹۳۸–۳۹ء کی بات ہے۔ اس وقت ہم دونوں بمبئی کے ایک ہی اسکول میں تھے یعنی کیتھڈرل اسکول میں۔ لیکن میری اس کی دوستی اس وقت ہوئی جب وہ سینئر کیمبرج کر رہا تھا۔ اور پھر ہم دونوں گہرے دوست بن گئے۔ گھنٹوں ہم بیٹھے رہتے۔ اور اپنی زندگی، اپنے مستقبل اور سیاست پر گفتگو کیا کرتے۔

(مسٹر پیلو مودی اس موقع پر اپنا البم اٹھا لائے جو خود ان کے اور مسٹر بھٹو کے فوٹوؤں سے بھرا تھا اور جو ان کے نوجوانی کے دنوں کی یاد دلاتا تھا)

اور پھر انھوں نے بات چیت کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ وہ جناح نواز تھا اور میں نہرو نواز۔ ان تمام برسوں میں میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ بڑا فراخدل اور باوفا تھا اور انتہائی جاہ طلب۔ — ہم بمبئی کے ولنگڈن کلب کے تالاب کے کنارے بیٹھے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔"

مسٹر پیلو مودی اپنے دوست کے بارے بتاتے بتاتے چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئے۔ وہ ماضی کے اس زمانے میں کھو گئے تھے جو انھوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ گزارا تھا۔

کہنے لگے — اس کے بعد کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ہم روم پارٹنر بن گئے۔ سینئر کیمبرج کے امتحان میں بھٹو کچھ زیادہ ذہین ثابت نہ ہوا لیکن یونیورسٹی میں پہونچ کر وہ بہت ذہین نکلا۔ اسکی یادداشت بڑی زبردست تھی۔ وہ ہر بات کو یاد رکھتا تھا — سیاسی کتابوں کا بہت مطالعہ کرتا اور جو کچھ پڑھتا اس سے اپنے دلائل کو وزن دار بنانے میں کام لیتا۔ وہ ملک کی تقسیم کے حق میں تھا کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ پاکستان میں اسے ابھرنے کے مواقع زیادہ ملیں گے۔ میں نے پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان واپس پہونچنے کے سات سال بعد وہ وزیر کے عہدے پر پہونچ جائے گا۔ اسے صدر بننے کے لئے بیس برس کا عرصہ لگا۔"

"مسٹر بھٹو کی اور عادتیں کیا تھیں"؟ مسٹر پیلو مودی سے سوال کیا گیا۔

"مجھے یاد ہے بھٹو فرصت کے اوقات کا بڑا دلدادہ تھا" — مودی صاحب نے جواب دیا۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ صبح ساڑھے سات بجے ہم دونوں ولنگڈن پہونچ جاتے۔ ٹینس کھیلتے، مشروبات سے لطف اندوز ہوتے اور ایک بجے تک سوئمنگ پول میں تیرتے رہتے۔ دوپہر کا کھانا کھاتے اور پکچر دیکھنے چلے جاتے، وہاں سے پھر کلب چلے جاتے واپس آکر گھر والوں کے ساتھ ڈنر لیتے اور اس کے بعد چہل قدمی کے لئے نکل جاتے۔ ہم بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں ۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک ساتھ رہے۔ کیا خوب زمانہ تھا۔

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہوا زمانہ "

" ان کی کچھ اور خصوصیتوں پر کچھ روشنی ڈالیں مودی صاحب " نامہ نگار نے کہا۔

"وہ بڑا خوش پوش لڑکا تھا" مودی صاحب سگریٹ کا کش لگا کر بولے " طبیعت میں بڑی نفاست پسندی تھی۔ بڑا صاف ستھرا اور سلیقے کا ڈریس زیب تن کرتا۔ دوسروں سے بھی چاہتا تھا کہ لباس کے معاملے میں باسلیقہ رہیں۔ سن ۴۵ء ۴۶ء کی بات ہے جب ہندوستان کی کرکٹ ٹیم انگلستان جا رہی تھی تو اس نے اپنے والد کو اس بات کے لئے رضامند کرلیا کہ وہ تمام کھلاڑیوں کے لئے عمدہ سوٹ تیار کرا دیں تاکہ سب کھلاڑی طرحدار نظر آئیں۔ وہ خود کرکٹ کا شوقین تھا اور مشتاق علی



۱۹۴۶ء — بھٹو اور پیلو مودی بمبئی کے ولنگڈن کلب میں ٹینس کھیلنے کے بعد —

کھلاڑی تھا۔"

پیلو موڈی اور بھٹو بمبئی میں کچھ زیادہ فاصلے پر نہ رہتے
ایک دوسرے کی پرائیویٹ زندگی میں دخیل تھے۔
ت ایک دوسرے سے پوشیدہ نہ تھی کہنے لگے۔
بھی بھی مسرف نہیں رہا۔ جتنی رقم اس کے پاس ہوتی
کم خرچ کرتا تھا۔ ہاں من موجی ضرور تھا۔ ایک شب
پینے اور قہوے کی ایک پیالی لینے کے لئے کیلی فورنیا
دور برکلے سے کار میں پہنچا اور واپس آیا۔"
کے پاس کار تھی؟" نامہ نگار نے سوال کیا۔

میں وہ ہمیشہ میری کار استعمال کرتا تھا۔" پیلو موڈی
یہ۔ لیکن وہ میرے دوسرے دوستوں کی طرح رہتا تھا"
کی ایک اور خوبی مسٹر پیلو موڈی نے یہ بتائی کہ "وہ بڑا نقال
بسروں اور دوستوں کی بہترین نقل اتارتا تھا۔ لیکن
کے معاملے میں بڑا محتاط تھا اور اپنے دوستوں کے دوستوں
ستی نہ کرتا تھا۔"

ودی صاحب نے فرمایا: "ابھی آزادی کو زیادہ زمانہ نہ
زلفی پاکستان کے معاملے میں کچھ مایوس سا نظر آنے
دن کہنے لگا: "پاکستان ناکام ہو گیا ہے۔" میں نہیں
اس نے یہ بات کیوں کہی اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ
نظریات کب اس کے ذہن میں آئے۔ غالباً وہ
ن کے سوشلسٹ نظریات کے پروپیگنڈے سے متاثر
ہوا ہو گا۔

" زلفی کرشنا مینن کا بڑا مداح تھا اور کہتا تھا کہ اقوام متحدہ میں انھوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے اس سے ہندوستان کی کافی اہمیت بڑھی ہے اور دنیا اس کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ بہرحال اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود زلفی نے مسٹر کرشنا مینن کا رول ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ میں اس نے اپنے ملک کی طرف سے جو رول ادا کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

کیلیفورنیا اور برکلے کے بعد مسٹر بھٹو کے ساتھ مسٹر پیلو موڈی کا رابطہ قائم نہ رہا لیکن یونہی سرسری طور پر چار مرتبہ ملاقات ضرور ہوئی۔ انکی آخری ملاقات ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ کو ہوئی تھی، فرمانے لگے:۔

" میں نے محسوس کیا کہ اس میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور میری توقعات کے مطابق ہی وہ چل رہا ہے — وہ ہمیشہ اینٹی ....." موڈی صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ رک گئے اور نامہ نگار سے بھی کہا کہ وہ اپنا قلم روک لے — انھوں نے کہا کہ آگے کے الفاظ "آف دی ریکارڈ" ہیں — یہ "آف دی ریکارڈ" الفاظ کیا ہو سکتے ہیں ہر شخص بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے۔ یعنی — "اینٹی ہندوستان" —— اور پھر موڈی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ جیسے انھیں زلفی کی کوئی بات یاد آگئی ہو۔ فرمایا:۔



۱۹۴۵ء — زلفی بمبئی کے اپنے مکان کھیا سیتن میں آرام کرتے ہوئے

" زلفی کو اپنے گھر والوں کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ اسکے اندر محبت کے بڑے جذبات تھے۔ کبھی کبھی وہ اس لئے محبت کرتا تھا کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ لیکن ایک لڑکی کی طرف اسکا بڑا رجحان تھا۔ میرا خیال ہے وہ اسکو کبھی نہیں بھولا — اس کے والدین اس معاملے میں قطعی مخالف تھے — لیکن۔" موڈی صاحب نے فرمایا "یہ لڑکی مشہور فلم اسٹار نرگس نہیں تھی جس کے ساتھ اکثر بھٹو کا نام جوڑ کر انکے رومانی قصے گڑھے گئے ہیں۔"

" خود فلم اسٹار نرگس کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" ایک صحافی نے جب نرگس سے پوچھا "کیا آپ کے اور مسٹر بھٹو کے درمیان خصوصی تعلقات تھے"!

" جی بالکل نہیں — وہ اکثر و بیشتر اسٹوڈیو آیا کرتا تھا۔ اس وقت جب میں شوٹنگ میں حصہ لیتی تھی۔ لیکن جونہی وہ آتا، بیگم پارہ (اس وقت وہ مشہور فلم اسٹار تھی) اور میں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تمسخر کی ہنسی ہنستے اور ذوالفقار کو برا بھلا کہتے۔"

" مگر آپ کے اور بھٹو کے بارے میں بڑی دلچسپ کہانیاں سننے میں آئی ہیں۔" صحافی نے کہا۔

"جی ہاں بہت سی کہانیاں ہیں" نرگس بولی "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ میرے ساتھ اسے اس سے زیادہ لگاؤ تھا جو نوجوانوں کو ہر لڑکی دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ فلمی دنیا میں یہ شاید اس وقت کی میری بڑھتی ہوئی شہرت تھی جس نے اسکو متوجہ کر لیا۔ ہم اکثر ایک ہی پارٹی میں شامل ہوتے تھے اس لئے دوست بننا قدرتی تھا۔ وہ دلچسپ اور دل پسند لڑکا تھا لیکن شرمیلا تھا۔ دراصل یہ اسکا بھائی یا چچازاد بھائی سکندر تھا جو مجھے پریشان واقعات کرتا رہتا۔"



ء ۱۹ میں لاس اینجلز میں لی ہوئی ایک تصویر ——— بھٹو اپنے ہندوستانی دوستوں کے ساتھ

کرتا تھا اور ہروقت میرے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ کہتا "تم مجھ سے شادی نہ کروگی تو خودکشی کرلوں گا"۔

خانگی زندگی کے بارے میں نرگس بولی۔ میرے ملنے جلنے والوں میں کسی کو بھی اسکی خانگی زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیل معلوم نہ تھی (وہ کرکٹ کلب یا ولنگڈن کلب زیادہ جاتا تھا۔) البتہ ایک ملنے والے نے یہ مشکوک سی اطلاع ضرور دی کہ ذُلفی کے تین چار سوتیلے بھائی ہیں جو اس سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ گانے والی کا لڑکا ہے"۔

"کیا نوجوان بھٹو کے بارے میں آپ کا اندازہ تھا کہ وہ مستقبل میں کیا بننے والا ہے"؟!

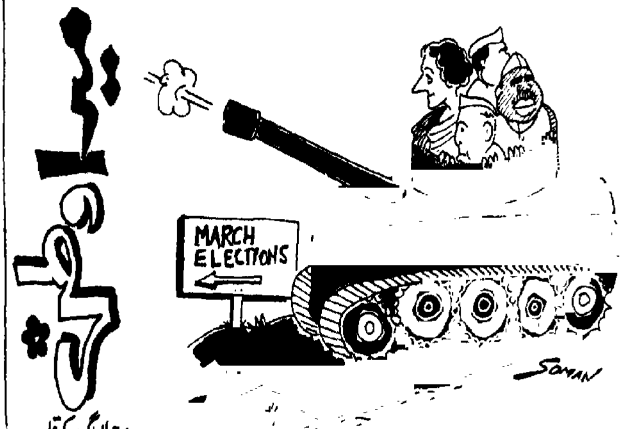
مجھے کبھی اسکا اندازہ نہ ہوا۔ بھٹو کی جو نئی شکل میرے سامنے ہے میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑے زمیندار کا لڑکا ہے شہزادوں جیسی طبیعت پائی ہے۔ گھوڑ دوڑ، کاک ٹیل پارٹیاں، شکار اور رقص یہ اس کی دلچسپیاں تھیں۔ مجھے معلوم ہے وہ ہر سنیچر کو ایک نئی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ رقص کرتا تھا۔ اس کے والد جوناگڑھ کے دیوان تھے اور وہ دولت میں کھیلتا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ کسی دولت مند خوب صورت عورت سے شادی کرے گا۔ اپنے والد کے کاروبار میں لگ جائے گا۔ خوبصورت سکریٹریز رکھے گا اور ایک دولتمندانہ رنگین زندگی گزارے گا"۔

"آپ کی بھٹو سے ملاقات کب ہوئی"؟ نرگس سے پوچھا گیا اور انھوں نے جواب میں کہا:۔

"میری اس سے ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی جب میری عمر ۱۴ برس تھی اور فلمی دنیا میں داخل ہی ہوئی تھی۔ میری ماں مشہور فلم اسٹار بتو کی سہیلی تھی جس نے ذوالفقار کے بھائی یا چچا زاد بھائی امداد علی بھٹو سے شادی کرلی تھی۔ انکے صحیح رشتے کا کبھی پتا نہ چلا۔ امداد کے بھائی سکندر اور بھٹو ہماری جماعت کا حصہ بن گئے۔ پکنک پارٹی ہو یا شکار پارٹی یا فلم بینی۔ ہم سب ساتھ رہتے تھے۔

اور پھر نرگس بولی "تقسیم کے بعد اسکا خاندان پاکستان چلا گیا اور اس کے بعد اسکا خیال بھی ذہن میں نہ آیا تا آنکہ میں نے دیکھا کہ اخبارات میں بھٹو کا بڑا نام آرہا ہے۔ پہلے مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی لڑکا ہے جسے میں جانتی ہوں ـــــ وہ اسوقت کتنا بدل گیا ہے۔

••



(جہاں گرد کے قلم سے)

آئندہ مارچ میں ہونے والے گیارہ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کی تیاریاں زور وشور سے جاری ہیں۔ لیکن اس بات کو کانگریس کے بدترین مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہوا کا رخ کانگریس کی طرف ہے۔ اس رُخ کو بدلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا جارہا ہے، جس کی کامیابی کے زیادہ امکانات نہیں ہیں، لیکن الیکشن میں سب کچھ ممکن ہے۔

ایک بار پھر جن سنگھ نے اپنی قسمت جاگیردارانہ نظام کے محافظوں سے وابستہ کردی ہے حالانکہ جن سنگھ کے غازی آباد اجلاس میں منظور شدہ تجاویز سے سیاسی مبصروں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات کے نتائج سے سبق لے گی، لیکن جس پارٹی کی بنیادوں ہی میں خرابی موجود ہو وہ اپنے راستے کو کیسے بدل سکتی ہے۔

جن سنگھ کو بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں کامیابی کے سب سے زیادہ امکانات نظر آرہے ہیں۔ بہار میں ذات پات کی تفریق اور فرقہ واریت کے سہارے پر جن سنگھ آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ راجستھان اور مدھیہ پردیش میں کانگریسیوں کی باہمی پھوٹ اور جاگیرداروں کی مدد سے وہ ترقی کے منازل طے کرنا چاہتی ہے لیکن یہ سہارے زیادہ مضبوط نہیں ہیں کیونکہ کانگریس لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات میں ان سہاروں کی کمزوری کا واضح ثبوت پیش کر چکی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانگریس مسز اندرا گاندھی کی عوامی مقبولیت اور حالیہ جنگ میں پاکستان کی شکست سے پورا فائدہ حاصل کرے گی، لیکن ہندوستان کی انتخابی سیاست بڑی نازک ہے اور اکثر وبیشتر اصولوں ونظریات پر جذبات وتعصبات حاوی ہوجاتے ہیں، اس لئے کانگریس کو انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ حالیہ جنگ میں ہندوستان کی جیت نے کانگریس کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے، لیکن اس جنگ کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کی شدت کو بھی کم نہ سمجھنا چاہئے۔ گرانی بڑھی ہے، منافع خوری میں اضافہ ہوا ہے ضروریاتِ زندگی کی بہت سی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی نے عوامی اذہان کو متاثر کیا ہے۔ مخالف پارٹیاں بھی شکست خوردگی کے سنگین احساس میں مبتلا ہیں۔ ان حالات میں وہ امن وقانون کے لئے مسائل پیدا کرسکتی ہیں اور تھوڑی سی غفلت کے نتیجے میں ہوا کا رُخ بدل سکتا ہے۔

اسوقت کسی بھی ریاست میں کانگریس کے مقابلے پر کوئی بڑی سیاسی طاقت نہیں ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ سیاسی طاقت اچانک بنتی اور بگڑتی ہے۔ جن سنگھ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے فن میں تمام پارٹیوں سے زیادہ مہارت رکھتا ہے اور انتخابات سے پہلے وسوسوں کے ذریعے بے چینی پیدا کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرتا اس لئے ریاستی حکومتوں بالخصوص مرکزی حکومت کو جن سنگھ کی چالوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔

انتخابات کے دوران جن سنگھ کی مہم کا کیا رخ ہوگا اسکا اندازہ اسکے لیڈروں کے اخباری بیانات سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ ہم ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے کسی جماعت سے کسی قسم کا بغض نہیں رکھتے۔ لیکن ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جن سنگھ فرقہ وارانہ فضا کو خراب کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے کیوں نہ ابھی سے انکا انتظام کرلیا جائے تاکہ شکست خوردہ عناصر کوئی شرارت نہ کرسکیں۔

••

مولانا محمد علی جوہر



بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(سلیمان ہندی)

۴ جنوری کا سورج حسبِ معمول طلوع ہوا اور واقعات کے ناگزیر نتائج کو اپنے دامن میں سمیٹ کر غروب ہوگیا شب کی سیاہ چادر نے دن بھر کے ہنگاموں پر پردہ ڈال دیا۔ مگر جب اس کی بے چین روح نے ان ہنگاموں، واقعوں اور متفرق پروگراموں پر نظر ڈالی ہوگی تو اسے تعجب خیز حیرانی سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ کہ آج دن بھر میں برصغیر کے کروڑوں عوام میں سے چند ہی لوگوں نے اس عظیم ہستی کی ناقابلِ فراموش خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جس نے اپنی تمام عمر اور تمام صلاحیتیں ملک و ملت کی سربلندی اور اس کے وقار کے لئے وقف کردی تھیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح چٹانوں میں انگلی سے سوراخ کرکے پانی کی دھار نہیں نکالی جاسکتی اسی طرح ہمارے قومی اور ملی کشت زار کو اپنے خونِ دل سے سینچنے والی شخصیتوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی تاریخِ آزادی اور تحریکِ حریت کے وہ جیوٹ اور کڑیل سپاہی جن کو ہم علی برادران کے نام سے جانتے ہیں نہ صرف اپنی جراتِ گفتار کے باعث ہمارے احساس پر چھائے ہوئے ہیں بلکہ جذبۂ اخلاص و ایثار کی وجہ سے تاقیامت بھلائے نہیں جا سکتے۔

"مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرنے کی سب سے زیادہ ذمے داری علی برادران پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے کانگریس میں داخل ہوکر نہ صرف امن پسند ہندوؤں کو تحریکِ آزادی میں شامل کرلیا بلکہ مسلمان فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ بھی کیا۔"
ولیناتھل شرل۔

مولانا محمد علی جوہر اور انکے برادرِ بزرگ مولانا شوکت علی کے جذبۂ حریت کا تجزیہ کرنے کے لئے اگر ہم اس دور کے حالات کا جائزہ لینے کی خاطر تاریخ کے صفحات الٹیں تو تین اسباب خاص طور سے سامنے آئیں گے جن کے باعث علی برادران کی جنگِ آزادی اور تحریک خلافت نے جنم لیا تھا۔

اگرچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں نے پوری طرح حصہ لیا تھا مگر تاریخ شاہد ہے کہ دیگر برادرانِ وطن کی بہ نسبت مسلمانوں نے زیادہ قربانیاں دیں۔ اس کی خاص وجوہات یہ تھیں کہ انگریزوں نے فریب اور مکاری سے کام لے کر تختِ اقتدار پر قبضہ جمالیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی متاعِ گم گشتہ کو حاصل کرنے کے لئے ایک فیصلہ کن معرکہ سرانجام دیا۔ مگر قیادت کی ناکامی اور اجتماعی شعور کے فقدان کی وجہ سے یہ عظیم الشان جدوجہد تاریخ کے صفحات پر نہ صرف "غدر" کے نام سے محفوظ رہی بلکہ باغیوں کی قیادت اور سلطنتِ انگلشیہ سے غداری کی وجہ سے انکو بے پناہ جانی اور مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

چنانچہ ردِ عمل کے طور پر مسلمانِ ہند من حیثیت القوم انگریزوں کے خلاف ہوگئے، اور یہ طے کیا کہ انگریز سامراج کی خدمت کرنا یا انگریزی تعلیم حاصل کرنا انگریزوں سے تعاون کے برابر ہے۔ اس کے برعکس دیگر قوموں نے حالات سے سمجھوتہ کرکے انگریزی تعلیم حاصل کی اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوکر انکے اقتدار کو مستحکم کرنے کا باعث بنے۔ ان رجحانات کی وجہ سے کچھ عرصے بعد مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں دیگر قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے سرسید مرحوم اور انکے ساتھی نواب محسن الملک نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ سیاست کی پُرخار راہوں سے بچتے ہوئے مستقبل کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ بدقسمتی سے اس تحریک کو مسلمانوں کے ایک طبقے کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسرا سبب حکومتِ وقت کی پالیسی (پھوٹ ڈالو اور راج کرو) تھی۔ اس پالیسی کے تحت انھوں نے ہر دو فرقوں کی مذہبی کمزوریوں کا پتا لگایا اور انھیں ایک دوسرے کے درپئے آزار کردیا۔ تیسرا سبب زبان کا مسئلہ تھا۔ انگریزوں کے خریدے ہوئے ابن الوقتوں نے "ہندی قومی زبان ہوگی" کی تحریک شروع کردی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک طبقے میں اُردو کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے۔

الغرض ان اسباب کے مطالعے کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ دور نہ مسلمانوں کے لئے سازگار تھا نہ ہندوؤں کے لئے مفید۔ ان حوصلہ شکن حالات اور پُرآشوب دور میں ۱۸۷۸ء کے اواخر میں مولانا محمد علی کا ظہور ہوا۔ آپ میں شروع ہی سے تعلیمی استعداد و قابلیت اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھی۔ اس لئے عمر کے بیسویں سال میں امتیازی نمبروں سے بی۔ اے کیا اور یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔ اگرچہ آپ کے بھائی مولانا شوکت علی کا خیال انکو آئی۔ سی۔ ایس

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی مرحوم کے ساتھ



آفیسر بنوانے کا تھا۔ اس غرض سے انھوں نے آبائی جاگیر فروخت کرکے انکو آکسفورڈ بھی روانہ کیا۔ مگر محمد علی کی طبیعت ان مضامین میں نہیں لگی۔ مولانا محمد علی انگریزی تحریر و تقریر میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ذہن و قلب بھی حساس پایا تھا اسلئے ہر مسئلہ اور مضمون میں ایسے نکتے پیدا کرتے کہ سننے والے بے ساختہ جھوم اٹھتے۔

لندن سے ڈگری لے کر لوٹنے کے بعد نواب آف رام پور کے اصرار پر آپ ریاست میں افسر تعلیمات رہے۔ اس کے بعد بڑودہ کے کنور فتح سنگھ نے نوساری ضلع کی کمشنری عطا کی جہاں انھوں نے نئے سرے سے انتظام کرکے کافی نام کمایا مگر دوران ملازمت کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ آپ نے ملازمت سے توبہ کی اور اپنی توجہ حالات کے مطالعے کے بعد ملک و ملت کی تعمیر پر مرکوز کردی کیونکہ آپ انگریزی صحافت میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے اسلئے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے ۱۰ جنوری ۱۹۱۰ء میں کلکتے سے "کامریڈ" نکالا۔ اس اخبار کی پالیسی اور ادارتی خوبیوں سے متاثر ہو کر بہت سے انگریز بھی خریدار بن گئے۔ مگر مالی وسائل کی کمی اور بی اماں کی وفات کے بعد ۱۹۳۶ء میں یہ اخبار بند ہو گیا۔ جب حالات موافق ہو گئے تو پھر اخبار کے اجرا کا خیال آیا۔ چنانچہ دوسرا اخبار دہلی سے بنام "ہمدرد" نکالا جس نے لوگوں میں بیداری پیدا کرکے حالات کے خلاف جدوجہد پر ابھارا۔ مگر حکومت کی معاندانہ پالیسی کے خلاف مضمون لکھنے کے جرم میں اخبار کو ضبط کرکے محمد علی کو گرفتار کرلیا گیا۔

جب آپ چھندواڑہ جیل میں تھے تو امرتسر میں جلیانوالا باغ کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ اس جانگسل حادثے نے عوام کو اتنا برفروختہ کردیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ جب پانچ سال بعد آپ رہا ہوئے تو سیدھے امرتسر پہونچے جہاں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ علی برادران تشریف لارہے ہیں تو نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں اسٹیشن روانہ ہوئے اور انھیں جیپ میں بٹھا کر پنڈال تک لائے۔ جلسہ گاہ میں پہونچتے ہی صدر اجلاس پنڈت موتی لال نہرو نے آپ حضرات کا استقبال کیا اور تقریر کی دعوت دی۔ جلیانوالا باغ کے حادثے سے آپ دل گرفتہ تھے ہی، شیدائیانِ آزادی کے سامنے ایسی تقریر کی کہ سارا پنڈال لوگوں کے نعروں سے گونجنے لگا۔ آپ نے کہا:۔

"آزادی کے لئے ہمیں پھر جیل جانا چاہئے۔ تلک کو نظر بند ہونا چاہئے۔ مسز اینی بسنٹ کو پھانسی پر چڑھنا چاہئے مگر ان وحشیانہ مظالم کا خاتمہ ہونا چاہئے جو انگریز جلادوں نے اس باغ میں انجام دیئے ہیں"

یہ تقریر ایک ایسی یادگار اور پُر اثر تقریر تھی جس نے تمام لوگوں کو محمد علی کا عاشق اور شیدائی بنا دیا۔ اسکے بعد آپ مسلم لیگ کے جلسے میں گئے وہاں بھی ایسی ہی تقریر کی اور لوگوں کو اجتماعی جدوجہد پر ابھارا۔ اسی سال یعنی دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں تحریک ترکِ موالات کا پروگرام منظور ہوا اور قیادت کے لئے مہاتما گاندھی کا انتخاب ہوا۔ انھی دنوں میں اسلامی ممالک پر انگریزوں کی جارحیت اور مداخلت کی وجہ سے بمبئی، کراچی اور دیگر صوبوں کی خلافت کانفرنسوں میں انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کا ریزولیوشن منظور ہوا۔

ونسٹائل شرل لکھتا ہے۔

"مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمے داری علی برادران پر عائد ہوتی۔ انھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر نہ صرف امن پسند ہندوؤں کو تحریک آزادی میں شامل کرلیا بلکہ مسلمان فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ بھی کیا۔"

ان تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز سامراج برادران کی سرگرمیوں کو بالکل ناپسند کرتا تھا۔ لہٰذا والٹیر کے مقام پر ان دونوں بھائیوں کو جبکہ وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ دورہ کررہے تھے یکایک ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کرلیا گیا۔

رہا ہونے کے بعد مولانا محمد علی کو آل انڈیا کانگریس نے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسے کے لئے بطور صدر منتخب کیا آپ نے دورانِ صدارت انتہائی بردباری اور توازن کے ساتھ ہندو اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر منزلِ آزادی کی طرف پیش رفت شروع کی مگر انگریزوں کی دیرینہ سازش کی بدولت



مولانا محمد علیؒ بیت المقدس میں مسجد عمرؓ کے صحن کے ایک حجرے میں دفن ہوئے۔ یہ انکا آخری فوٹو ہے

چنانچہ ہندو مسلمان دونوں نے انگریزوں کا بائیکاٹ کرنے کی مہم شروع کی۔ کراچی میں خلافت کانفرنس میں دیوبند، فرنگی محل اور دیگر اسلامی مدارس کے تقریباً پانچسو علماء نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا کہ انگریزوں سے تعاون اور انکی ملازمت حرام ہے۔

اس اعلان کے بعد مسلمان شہریوں کے علاوہ پولیس اور فوج نے بھی اپنے استعفیٰ نامے روانہ کرکے قومی اور ملی بیداری کا ثبوت دیا۔ مزید برآں مہاتما گاندھی کے ساتھ علی برادران نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کرکے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کیا۔

ان دوروں کے موقعوں پر آپ کی شعلہ بار تقریروں اور پراثر بیانات نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے اجلاس اور مشہور لیڈر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سرگرمیاں حکومت کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگیں۔ ان تحریکوں اور سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مشہور انگریز صحافی

ہندو اور مسلمان نہ صرف ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے بلکہ سوامی شردھانند کی جاری کردہ شدھی سنگھٹن تحریک کے بلا ایک دوسرے سے بدگمان بھی ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا محمد علی کو بہت دکھ ہوا۔ انھوں نے ہندو لیڈروں کو سمجھایا، آ کے واسطے دیئے مگر وہ باز نہ آئے بلکہ جلیانوالا جیل میں جہاں ہندو مسلم اسیرانِ آزادی ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے سوامی شردھانند نے اعلان کیا:۔

"اگر مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھانے سے آزادی مل سکتی ہے تو میں ایسی آزادی پر غلامی کو ترجیح دوں گا۔"

انگریزوں کا وار کامیاب رہا اور سوامی جی دیگر قیدیوں سے قبل ہی رہا ہو گئے اور رہا ہوتے ہی شدھی سنگھٹن کی تحریک زور سے شروع کردیا۔ ان حالات سے محمد علی بہت ہی دل گرفتہ ہوئے مگر وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آئے چنانچہ آخر جدوجہد کے طور پر انھوں نے دہلی میں اتحاد کانفرنس منعقد کی اور ہر دو فریقوں کو ایک میز پر اکٹھا کیا۔ اس کانفرنس

بقیہ صـ ۴۵ پر

مستقبل کی جنگ کیا خشکی کے مقابلے میں سمندر میں زیادہ لڑی جائے گی؟

بحری بیڑوں کو بڑھانے کے لیے امریکا اور روس کی دوڑ

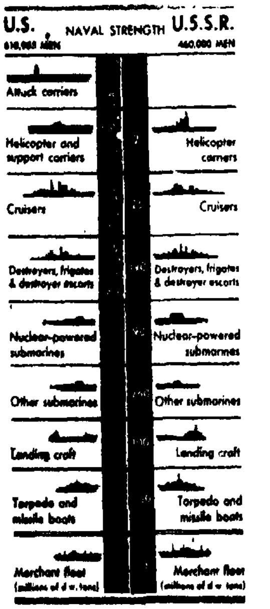


امریکا کے محکمہ سراغرسانی کے ذریعہ امریکی حکومت
ا ایسے روسی بحری جہاز کی تصویریں ہاتھ لگی ہیں جو
دو میں زیر تعمیر ہے۔ یہ نصف کے قریب بن چکا ہے
ا ہے مکمل کیا جا رہا ہے۔ تصویروں سے ظاہر ہوتا
یہ حملہ کرنے والی فوجوں اور جنگی ساز و سامان کو لے
والا جہاز ہے۔ روس کے پاس اس وقت ایسا کوئی
میں ہے جبکہ امریکا کے پاس ایسے ۱۴ جہاز ہیں۔
اگر روس کے پاس ایسے جہاز نہیں ہیں تو اس کا مطلب
ا ہے کہ وہ انہیں بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا
ں روس کی اب تک کی پالیسی دفاعی رہی ہے اور
نے اپنے بحری بیڑے کی تنظیم بھی اسی بنیاد پر کی ہے۔
جبکہ ایسا بحری بیڑا تیار کر لیا ہے جو مکمل طور سے
اکا دفاع کر سکتا ہے اس نے حملہ کرنے والے جہازوں
رف توجہ دی ہے۔ اسے امریکا روس کی پالیسی میں
بڑی تبدیلی سمجھ رہا ہے اور اسے اب روس کے
ل کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔

حملہ کرنے والے جہازوں کے بغیر بھی روس کا
ا بیڑہ بہت طاقتور ہے اور نفسیاتی اعتبار سے اسکی
ت اس کی اصل طاقت سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اسکی
روس کی دوسری سرگرمیاں ہیں جن میں وہ امریکا سے
ہے۔ شلاً ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک
نے والے میزائلوں میں وہ امریکا کے مقابلے میں اد
ن کی نسبت سے آگے ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس کے
ا ایسے ۱۵۰ میزائل ہیں۔ روس کے بحری بیڑے میں

اضافہ ۱۹۶۱ء سے یعنی اس وقت سے شروع کیا گیا جب امریکہ نے بحر منجمد شمالی میں اپنی ایٹمی آبدوزیں ان علاقوں میں بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں سے روس کے بڑے بڑے نشانے ان کی زد میں تھے۔ کیوبا کے "میزائل کرائسس" نے روس پر یہ بات ظاہر کر دی کہ بحریہ کی کتنی اہمیت ہے۔ دس سال سے بھی کم مدت میں روس نے اپنے بحریہ کو اتنا مضبوط بنا لیا ہے کہ اس نے جنوب اور شمال دونوں طرف سے نالوٹ ممالک کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا ہے۔ شمالی اوقیانوس میں اس وقت نالوٹ کے ایک جہاز کے مقابلے میں روس کے چھ جہاز ہیں۔ اسی طرح بحر روم میں امریکا کے چھٹے بحری بیڑے کے جہازوں کے مقابلے میں روسی جہازوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ امریکہ کے چالیس اور روس کے ساٹھ جہاز اس وقت بحر روم میں ہیں۔ ظاہر ہے اس سے نہ صرف ترکی، یونان اور اٹلی کو تشویش ہے بلکہ یوگوسلاویہ بھی پریشان ہے۔ اس لیے کہ مشرق وسطیٰ کی جنگ کی صورت میں روسی بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر کسی یوگوسلاوی بندرگاہ کو اپنے کنٹرول میں لینے کی کوشش کریں گے جو ان کے اڈے کے طور پر کام دیگا۔

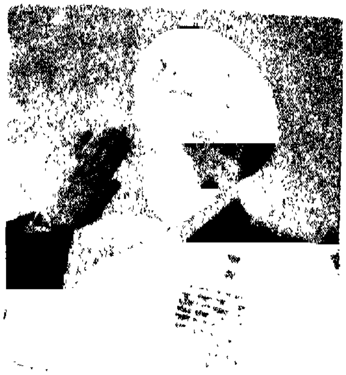
اسوقت صورت یہ ہے کہ روس کے جنگی جہاز اکثر و بیشتر مصری اور شامی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک کے خیال میں ان کا خاص مقصد اسرائیل کو فضائی حملوں سے باز رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ اسکندریہ اور لیبیا کی سرحد کے درمیان وہ نئی بحری سہولتیں مہیا کر رہے ہیں۔ جنگ کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ اسرائیل کی ناکہ بندی کر دیں جس سے کہ وہ مغرب کی طرف سے ممکنہ امداد سے محروم ہو جائے، خواہ اس کے نتیجہ میں امریکا کے چھٹے بحری بیڑے سے اس کی ٹکر ہی کیوں نہ ہو جائے۔



امریکہ و روس کی بحری قوت ——— ایک موازنہ

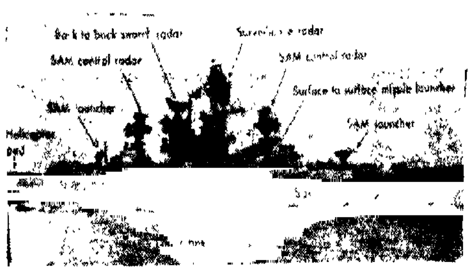
آسکر وائلڈ
ایم آئی ساجد

● محبت کا راز موت کے راز سے زیادہ عظیم الشان ہے
● اگر کوئی خاتون اپنی غلطیوں میں دل کشی پیدا نہیں کر سکتی تو وہ صرف عورت ہے۔
● میں انتخاب کرتا ہوں اپنے دوستوں کا خلوص کے لحاظ سے۔ اپنے ملاقاتیوں کا سیرت کے لحاظ سے اور اپنے دشمنوں کا ذہانت کے لحاظ سے۔
● وہ شخص جو شادی کرنا چاہتا ہے اسے یا تو سب کچھ جاننا چاہئے یا کچھ بھی نہیں۔
● شادی کی یہ خصوصیت کس قدر عجیب ہے کہ وہ مکر و فریب کی زندگی کو دونوں کے لئے ضروری بنا دیتی ہے
● دنیا کے بدترین کام ہمیشہ بہترین نیت کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔
● کہنے کے قابل ہمیشہ وہی چیزیں ہوتی ہیں جن کو ہم بھلا دیتے ہیں۔
● ایک بات صرف اس بناء پر صحیح قرار نہیں دی جا سکتی کہ کسی نے اس کے لئے جان قربان کر دی ہے۔
● جھوٹ کا مقصد صرف دل کشی و مسرت پیدا کرنا ہے اس لئے ایک جھوٹا انسان معاشرے کی بنیاد ہے۔
● کہنے کے قابل وہی باتیں ہیں جنہیں ہم بھول جاتے ہیں جس طرح وہی باتیں کرنے کے قابل ہیں جن پر دنیا تعجب کرے۔
● خلوص ہر حال میں برا ہے۔ جب تک تھوڑا ہے خطرناک ہے اور بڑھ جائے تو ہلاک۔
● اعادہ جوانی کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ پھر جوانی کی حماقتوں کی تکرار کی جائے۔
● ہم کرتے ہیں غلطیاں اور ان کا نام رکھتے ہیں تجربہ
● ادب اور صحافت میں کیا فرق ہے۔ صرف یہ کہ ادب کوئی پڑھتا نہیں اور صحافت پڑھنے کے قابل نہیں
● عورتوں کو سمجھو۔ ان سے لطف اٹھانے کی صورت یہ ہے کہ انھیں صرف دیکھو۔ انکی سنو نہیں۔



روسی بحریہ کے چیف مارشل گورشکو

واشنگٹن کو خلیج فارس اور بحر ہند میں بھی روسی بحری بیڑوں کی سرگرمیوں پر تشویش ہے۔ امریکی محکمۂ خارجہ اور محکمہ دفاع کے افسروں کا خیال ہے کہ جلد یا بدیر ہندوستان حالیہ ہند پاک جنگ میں روسی امداد کے بدلے کے طور پر بحر ہند میں روسی بحری بیڑے کیلئے ہندوستانی ساحل پر بحری سہولتیں مہیا کر دے جیسے کہ مصر نے کی ہیں (ہندوستان نے جسے اپنے بحری بیڑے پر فخر ہے۔ اس قسم کی سہولتیں مہیا کرنے سے انکار کیا ہے۔)



روسی بحری کروزر کرسٹا۔۲ جس میں خود کار میزائل لگے ہوئے ہیں بحر ہند میں امریکی ساتویں بیڑے کو ان روسی جہازوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

بحر ہند میں روس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر ہی امریکا نے فیصلہ کیا ہے کہ بحرالکاہل میں موجود اسکا ساتواں بحری بیڑا اکثر اوقات بحر ہند کا گشت کیا کریگا۔ لیکن اس فیصلے سے جاپان پریشان ہے کیونکہ بحرالکاہل سے ساتویں بحری بیڑے کے چلے آنے سے اسکا دفاع خطرے میں پڑ جائے گا۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی خطرہ ہے کہ چین کی سرزمین خاص کے قریب روسی بحری بیڑے کی موجودگی چین کو اپنا بحری بیڑا اور زیادہ طاقتور بنانے کے لیے اکسا سکتی ہے۔ اور اس طرح جاپان کو مزید خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

روس کی یہی بڑھتی ہوئی بحری سرگرمیاں ہیں جنھوں نے گذشتہ سے پیوستہ ہفتے صدر نکسن کو کانگریس سے دفاعی مقاصد کے لیے اور زیادہ فنڈ مخصوص کرنے کا مطالبہ کرنے کے لیے مجبور کیا۔ کسی زمانے میں برطانیہ سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ تیسرے درجے کی طاقت بن کر رہ گئی ہے۔ امریکا اور روس اس سے کہیں زیادہ آگے چلے گئے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے بڑے موثر بحری بیڑے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں لگے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ـــــ کس لیے؟

کیا مستقبل کی لڑائی خشکی کے مقابلے میں سمندر میں زیادہ لڑی جائے گی؟ اس وقت خود امریکا کے دروازے پر روس کا چیلنج موجود ہے۔ روس نے امریکا کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر کم از کم پانچ نئی آبدوزیں لگا رکھی ہیں جو کسی وقت بھی لمبی مزائلوں سے امریکا کو نشانہ بنا سکتی ہیں۔ ■



شیخ

مجیب الرحمٰن کی جیل کی کہانی خود ان کی زبانی



شیخ مجیب الرحمٰن نے فاتحانہ واپس بنگلادیش پہونچکر ڈھاکا میں اخباری نمائندوں کو جو بیان دیا اس میں انہوں نے اپنی نو ماہ کی قید تنہائی کی تفصیل بتائی. ذیل میں ہم امریکی رسالہ نیوز دیک کے نامہ نگار سائمن ڈرنگ کی رپورٹ کے اقتباسات درج کر رہے ہیں جو اس نے شیخ مجیب الرحمٰن سے انٹرویو لے کر اپنے رسالہ کو ارسال کی ـــــ اس انٹرویو میں شیخ مجیب کی نو ماہ کی کہانی خود ان ہی کی زبانی سنیے۔

"جسمانی طور پر میرے ساتھ کبھی بدسلوکی نہیں کی گئی صرف ذہنی تکلیف مجھے پہونچائی گئی. مجھے قید میں ڈالنے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر انہوں نے مجھے زیادہ ستایا تو میں اپنی زندگی ختم کر ڈالوں گا. غریب افسران جو میری نگرانی پر مامور تھے انہیں حالات کا کچھ علم نہ تھا. وہ اندر آیا کرتے اور مجھے سلام کیا کرتے، میں وہاں بیٹھ جاتا اور کہتا "بہتر ہے جو چاہتے ہو تم میرے ساتھ کرو. اسکے علاوہ تم میرے لیے کر بھی کیا سکتے ہو"

سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مجھے اتنے طویل عرصہ تک قید تنہائی میں رکھا گیا. باہری دنیا سے میرا کوئی تعلق نہ تھا. نہ مجھے اخبارات ملتے تھے، نہ کتابیں اور نہ اپنے خاندان والوں کے خطوط. ۲۷ ر دسمبر تک میں ہر چیز سے محروم تھا. کوٹھری میں ہمیشہ تاریکی ہوا کرتی تھی، پورے نو ماہ تک سوائے ان سرکاری افسروں کے جو میری دیکھ بھال پر مامور تھے یا ان لوگوں کے جنہوں نے مقدمہ میں حصہ لیا میں کسی اور سے ملاقات نہ کر سکا میں سابق پاکستانی صدر یحییٰ خاں سے بھی نہیں ملا اور رہائی کے بعد صرف بھٹو سے ملاقات ہوئی.

میرے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا وہ کوئی مناسب مقدمہ نہ تھا. یہ محض ایک ڈھونگ تھا یہ دراصل میرا "کورٹ مارشل" تھا اور ان لوگوں نے اپنے اس منصوبہ کو ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکانا چاہتے تھے. مقدمہ کی سماعت بند کمرے میں ہوئی ایک فوجی بریگیڈیر عدالت کا چیرمین تھا اور اس میں دو کرنل ایک ونگ کمانڈر، ایک بحری کمانڈر اور ایک ڈسٹرکٹ سیشن جج شامل تھا. مقدمہ چھ ماہ تک چلا. یہ ایک جھوٹا مقدمہ تھا. میں نے صاف کہدیا تھا کہ میں اپنے مقدمہ کی پیروی نہیں کروں گا، میں نے انہیں بتایا کہ چونکہ یحییٰ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں اور انہوں نے ہی یہ مقدمہ چلانے کا حکم دیا ہے اس لیے مقدمہ کی پیروی کرنا اور صفائی پیش کرنا بے کار ہے وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ میں غداری کا مرتکب ہوں اور اس کی مجھے سزا ملنی چاہیئے میں نے عدالت سے کہا "میری طرف سے مقدمہ کی پیروی

مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے

فوجی ہیلی کاپٹر نے مجھے راولپنڈی کے باہر ایک بنگلے میں پہونچادیا

اور صفائی پیش کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا آپ لوگ یحییٰ کو پیغام پہونچادیں کہ وہ جو چاہیں کریں"۔ "یہ مقدمہ محض ڈہونگ ہے اور اس کا مقصد دنیا کو دھوکا دینا ہے"۔

اس کے بعد اچانک مقدمہ کی کارروائی رک گئی اور مجھے بتایا گیا کہ میرا جرم ثابت ہوگیا ہے اور مجھے پھانسی دی جائے گی لیکن بنگال میں پاکستانی فوجوں کی شکست تک کوئی بات سامنے نہ آئی۔ جب جنگ ——— ختم ہوچکی اور بھٹو برسر اقتدار آگئے تو یحییٰ خاں نے کہا وہ مجھے پھانسی کے تختہ پر لٹکانا چاہتے ہیں۔ یہ اس دن کی بات ہے جس دن کہ پاکستانی فوجوں نے مشرقی بنگال میں ہتھیار ڈالے تھے۔ بھٹو نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، پاکستانی جنگی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان کے قبضہ میں ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ بھٹو نے مجھے بچانے کی کوشش کی اور خدا نے مجھے بچایا۔

یحییٰ کے منصوبہ کو روکنے کی بھٹو کی کوششوں کے باوجود ایک شب کو جیل کے اندر مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ مسٹر بھٹو نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے جو میری حفاظت پر مامور تھا، مل کر مجھے وہاں سے نکلوایا۔ وہ مجھے صبح ۳ بجے جیل سے نکال کر لے گیا اور ایک اور مکان میں خاموشی سے منتقل کرنے سے قبل چومیانوالی سے ۱۴ میل کے فاصلے پر تھا دو دن تک مجھے اپنے گھر میں رکھا۔ وہ مجھے تین چار دن کے لیے اس مکان میں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک فوجی ہیلی کوپٹر آیا اور اس نے مجھے راولپنڈی سے باہر ایک بنگلے میں اُتار دیا۔ وہاں میری رہائی تک فوجی سپاہی میری نگرانی پر مامور تھے۔

جس دن میں اس بنگلے میں پہنچایا گیا میرے پہرداروں نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے آیا ہے۔ مجھے کچھ گمان نہ تھا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے لیکن جب مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا تو میں نے وہاں مسٹر بھٹو کو بیٹھے ہوئے دیکھا وہ میرا انتظار کر رہے تھے میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہاں کس طرح پہنچے؟" انھوں نے جواب دیا "میں اب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر ہوں"۔

میں سنکر بولا "بہت خوب۔ یہ بتایئے کہ میں آزاد ہوں یا نہیں، اگر آزاد ہوں تو بات چیت کے لیے تیار ہوں ورنہ نہیں"۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں آزاد ہوں لیکن ساتھ ہی پوچھا کہ کیا میں چند دن اور انتظار کر سکتا ہوں۔ میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور ہم دونوں بیٹھے اور باتیں کیں۔ ہم نے تمام پُرانے مسائل پر بات چیت کی اور ان باتوں پر بھی جن کی وجہ سے یہ مسائل پیدا ہوئے اور اس کے بعد مسٹر بھٹو نے مجھ سے اپیل کی کہ میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان کچھ نہ کچھ تعلق قائم رکھوں۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک میں یہ نہ معلوم کر لوں کہ کیا کچھ ہو چکا ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے ضروری ہے کہ میں اپنے لوگوں سے ملوں ان کی باتیں سنوں اور دیکھوں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ۲۷ر دسمبر تک یعنی جب مسٹر بھٹو سے میری ملاقات ہوئی میں نے نہ تو کوئی ریڈیو سنا تھا اور نہ کوئی اخبار پڑھا تھا لیکن قید تنہائی کے دوران بھی میں جانتا تھا کہ میرے ملک میں کیا ہو رہا ہے اس لیے کہ میں اپنے عوام کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں ہمیشہ اس بات سے آگاہ رہا کہ میرے عوام میری پشت پر ہیں ——— میں جانتا تھا کہ خدا میری مدد کرے گا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ جھوٹ اور سچائی کے درمیان جنگ کے درمیان جھوٹ کو پہلی بار فتح ہوتی ہے لیکن بالآخر فتح سچائی ہی کی ہوتی ہے۔

یہی وہ احساس تھا جس سے میں زندہ اور رہا۔ میں اتنے مہینوں میں اپنی قید تنہائی کے دوران نہیں رویا، میں اس وقت بھی نہیں رویا جب نے میرے خلاف مقدمہ چلایا لیکن جب یہاں واپس اور اپنے حیرت انگیز "سونار بنگلا" کو دیکھا تو میں اپنے ساتھیوں کی طاقت سے آگاہ تھا، مجھے اپنی قیادت کے حدود اربعہ کا بھی علم تھا، طالب علموں کے محاذ سے بھی آگاہ تھا، مزدور محاذ کو بھی جانتا تھا مجھے علم تھا کہ وہ کس طرح ایک ایک قدم لڑیں گے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان مہینوں میں کیا کچھ ہوا ہے حالانکہ میں بالکل اکیلا تھا اور تصورات کی دنیا میں کھو جانے کے علاوہ میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔



مرد آہن

شیخ

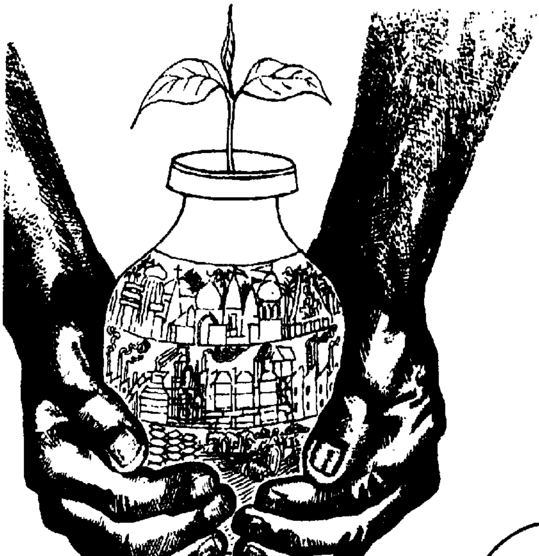
مجیب

الرحمٰن

ہمارا اتحاد

صرف جنگ کے نام پر ہی نہیں
بلکہ بنیادی آدرشوں کے لئے ہونا چاہیئے"

— اندرا گاندھی



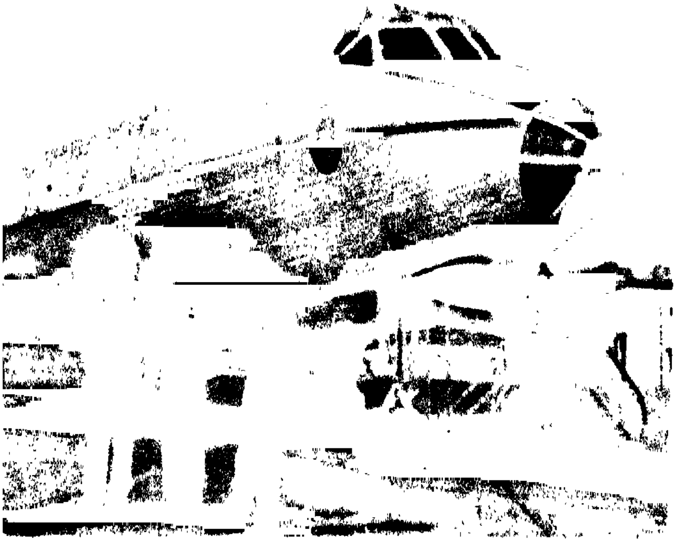
اِس قسم کے پودے کی پوری دیکھ بھال ہونی چاہیئے تاکہ یہ خوب پھلے پھولے۔

جوانوں نے جس لڑائی کو میدانِ جنگ میں جیتا ہے اسے ہر شہری کو گھریلو محاذ پر جاری رکھنا ہے۔

آؤ! پھوٹ ڈالنے والوں اور خصوصی مراعات کے اجارہ داروں کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔

آؤ! قوم کے اتحاد اور ہر ایک کے لئے سماجی انصاف کے واسطے جدوجہد کریں۔

ہندوستانی فضائیہ



(سید اطہر الدین)

ایک معلومات افزا جائزہ

آئی۔ اے۔ ایف (انڈین ایرفورس یا ہندوستانی فضائیہ) یکم اپریل ۱۹۳۳ء کو وجود میں آئی۔ یہ ۵ افسران اور ا سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستانی فضائیہ نے قابلِ قدر کارنامے انجام دیے۔ ہندی فضائیہ نے ۲۲ اعزازات (ڈی۔ ایف۔ سی) حاصل کئے۔ آئی۔ اے۔ ایف کے کارناموں کے باعث اس کا رتبہ بڑھا کر اس کو آر۔ آئی۔ اے۔ ایف (رائل انڈین ایرفورس شاہی ہندی فضائیہ) بنا دیا گیا۔ اب ہندی فضائیہ برطانوی فضائیہ کا ایک بازو تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آر۔ آئی۔ اے۔ ایف کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ ہندوستان میں موجود رہا جبکہ دوسرے حصے کو پاکستان بھیج دیا گیا۔ تقسیم کے وقت ۹ میں سے دو اسکویڈرن پاکستان کے حصے میں آئے، اور ہندی فضائیہ کو ۷ اسکویڈرن ملے۔ اگلے چند مہینوں تک دونوں فضائی بیڑے رفیوجیوں کے انخلا میں مصروف رہے۔

ابھی بہتا ہوا خون خشک بھی نہ ہو پایا تھا۔ ابھی جلتے ہوئے گھروں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا کہ پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے مقابلے کے لئے آر۔ آئی۔ اے۔ ایف نے انڈین ایرلائنز کے اشتراک سے پیادہ افواج کشمیر پہونچائیں۔ لیکن فضائیہ نے براہِ راست جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو رائل انڈین ایرفورس کے نام سے رائل کا لفظ ہٹا دیا گیا۔ اب یہ انڈین ایرفورس تھی۔ یکم اپریل ۱۹۵۴ء کو ایرمارشل گبیہ کی جگہ پر اوّلین ہندوستانی ایرمارشل سبرتو مکرجی کا تقرر ہوا۔

ایشیا میں ہندوستانی فضائیہ پہلا فضائیہ تھا جس نے اپنی افواج میں جیٹ طیارے شامل کئے۔ اوّلاً ویمپائر خریدے گئے بعدازاں یہ سلسلہ جاری رہا اور ہندی فضائیہ میں طوفانی، میٹرس، کینبرا ایمبار، ہنٹر، نیٹ اور روسی مگ ۲۱ وسکھو ۲۲ شامل کئے گئے۔

۱۹۵۰ء میں ایچ اے ایل (ہندوستان ایرونا ٹکس

مگ ۔ ۲۱ جو ہندوستانی فضائیہ کا سب سے عمدہ لڑاکا طیارہ ہے۔



لمیٹڈ، بنگلور نے برطانیہ سے لائسنس حاصل کرکے نیٹ طیاروں کی تخلیق کا آغاز کیا۔ بعدازاں ایچ ایف ۲۴ مروت وایچ جے ٹی ۱۴ کیرن بنائے گئے۔ ایچ اے ایل تاسک نے روس سے ۵۰۔۴ مشینیں بنانے کا لائسنس حاصل کرکے مگ ۲۱ کی تخلیق

ی۔ اب مگ ۲۱ میں اہم تبدیلیوں کے بعد مگ ۲۱ ایم کی تخلیق جاری ہے۔ ڈکوٹا کی جگہ سی ۱۱۹ فیئر چائلڈ پیکٹ کیری بس اور اے این ۱۲ بھاری باربردار طیارے بنائے گئے ایچ اے ایل کان پور ایچ ۴۸، ایورو طیارے بنا رہا ہے۔

۱۹۵۴ میں فضائیہ کا ہیلی کوپٹر بازو قائم کیا گیا اس مقصد کے لئے اوّلاً ایس ۵۵ وایس ۶۲ اور بعدازاں



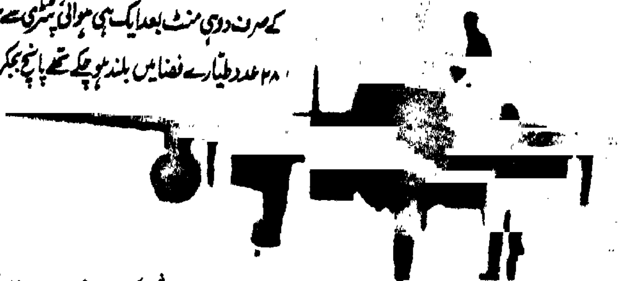
لئے کانگو بھیجے گئے۔ کٹانگا گورنمنٹ کے خلاف اقوام متحدہ کی درخواست پر کینبرا بمباروں کا ایک اسکویڈرن بھی بھیجا گیا تھا۔

جنگ کا دوسرا دور ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندی فضائیہ کو اولاً اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اور ہمارے دلیر



سے اعانت کی درخواست کی گئی۔

نیٹ بنام سیبرہ ہوابازوں کو دیئے گئے احکا کے صرف دو ہی منٹ بعد ایک ہی ہوائی پٹری سے ۲۸ عدد طیارے فضا میں بلند ہو چکے تھے پانچ بجکر



منٹ سے ۶ بجے تک دشمن کی بّری افواج پر ۲۸ حملے کئے گئے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ پاکستانیوں کو اپنے ۱۳ ٹینکوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ جلد ہی پاک فضائیہ اپنی بّری افواج کی حفاظت کے لئے چھمب کی فضاؤں میں منڈلانے لگی۔ ہی مقابلے کے دوران ہم کو دو ویمپائر طیاروں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دو دن تک کوئی فضائی جنگ نہ لڑی جاسکی دو دن بعد چھمب کی فضاء میں ایک بار پھر دونوں ممالک کے طیارے ایک دوسرے کے مقابلے پر تھے۔ اس بار مقابلہ پاکستان کے سیبر اور ہمارے 'حقیر' نیٹ طیاروں کے درمیان تھا چند منٹوں کی اس جنگ کے بعد سیبر طیارہ اپنے عقب میں دھوئیں کی لکیر بناتا تیزی سے زمین کی طرف گر رہا تھا۔ طیارے کے دیو پیکر جسم کو شعلوں نے گھیر







بیل ماڈل حاصل کئے گئے۔ لیکن یہ سبھی طیارے بلند پرواز کے قابل نہ تھے چینی خطرے کے پیش نظر ایسے ہیلی کاپٹروں کی ضرورت تھی جو کافی بلندی پر پرواز کرسکیں اس مقصد کے حصول کے لئے روسی ایم آئی ۴ وفرانسیسی ایلوئیٹ III بی ہیلی کاپٹر خریدے گئے۔ ان ہیلی کاپٹروں کے لئے قابل پرواز بلندی ۱۹ ہزار فٹ ہے۔ فرانس کی اعانت سے ایچ اے ایل ایک ہیلی کاپٹر کی تخلیق میں مصروف ہے۔ ہندی فضائیہ کے طیارے روز ہی بیہ کے ہوائی مستقر پر اُترتے ہیں جو کہ دنیا کا بلند ترین مستقر ہے۔

۱۹۶۵ء تک ہندی فضائیہ نے جنگ کا ذائقہ نہ چکھا تھا۔ اس دوران اس کا عمل سیلاب و دیگر تباہ کاریوں کے دوران امدادی اُڑانوں تک محدود تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۰ء میں ہندوستانی ہوا باز اقوام متحدہ کی مدد کے

ہوابازوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ کمتر اسلحہ جات کے باوجود اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ بہتر نتائج حاصل کرسکتے ہیں۔ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو صبح ۴ بجے جبکہ وادیٔ کشمیر کہر کا غلاف اوڑھے خوابِ خرگوش کے لطف اٹھا رہی تھی۔ پاکستان نے ٹینکوں کے ذریعہ چھمب پر حملہ کر دیا جغرافیائی مشکلات کے باعث ہمارے ٹینکوں کا اکھنور سے آگے جانا ممکن نہ تھا۔ پاک حملے کو ناکام بنانے کے لئے ہندی فضائیہ

تھا۔ دوسری طرف اسکویڈرن لیڈر ٹریور کیلر فوز سے کئے اپنے حقیر نیٹ کے ساتھ تیز رفتاری سے اپنے مستقر کی سمت گامزن تھے۔ اس طرح نیٹ اور سیبر کی پہلی ہی لڑائی میں ٹریور کیلر نے ویر چکر اور حقیر نیٹ نے 'دیو مار' کا اعزاز حاصل کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور سیبر گرا کر اپنے دو جہازوں کا بدلہ لے لیا گیا۔

نیٹ دراصل ایک برطانوی جہاز ہے جس کو شاہ

ہ اور نیٹو ممالک کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن شاہی
ہ نے حقیر جثے کے باعث اس چھوٹے سے جہاز کو ناقابل
قرار دے کر اس کی تخلیق ختم کر دی صرف چند جہاز
للاویہ اور فن لینڈ کو دیئے گئے شاہی فضائیہ اور
الک کی نظر میں محدود دائرہ عمل کا یہ چھوٹا سا جہاز
ہ آواز سے تیز رفتار دیوہیکل طیاروں کے مقابلے
ل جنگ وبیکار تھا۔ ہندوستانی ماہرین نے اپنی
بائی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس جہاز کی تخلیق
ہ لائسنس کی درخواست کی تو اسپر کڑی نکتہ چینی کی
ٹ کی تخلیق کو ضیاع زر و ضیاع وقت کہا گیا لیکن
فابلے کے بعد جیٹ طیارے اپنی اہمیت ثابت کر چکے تھے۔
، ایل بنگلور میں بننے والے ۳۱ فیٹ طویل اور ۲۴ فیٹ
(پروں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک) اور ۶۶۵۰
وزن والے اس یک نشستی طیارے کی رفتار ۶۹۵ میل
ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت اسکا کم وزن اور اکی
ماری کے ساتھ بلند ہونے کی صلاحیت ہے۔ یہ ایک منٹ
ہزار فیٹ کی بلندی تک پہونچ سکتا ہے اور زیادہ سے
پچاس ہزار فیٹ کی بلندی تک پرواز کرنے کی صلاحیت
ہے۔ ۲۰ ہزار فیٹ کی بلندی پر اسکا دائرہ عمل ۱۰۰ میل
میل جاکر لوٹنے کی صلاحیت) ہے لیکن ۴۰ ہزار فیٹ سے
واز کے لئے دائرہ عمل صرف ۲۴۰ میل رہ جاتا ہے۔ اسکے
عمل میں زائد ٹنکیاں لگا کر اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔
ہیں ۳۰ ملی میٹر دہانے کی دو توپیں نصب ہیں جو کافی طویل
ے تک گولے پھینک سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پانچسو پاؤنڈ
دو بم یا ۱۳ انچ قطر کے ۱۲ راکٹ لیجانے کی صلاحیت
رکھتا ہے۔

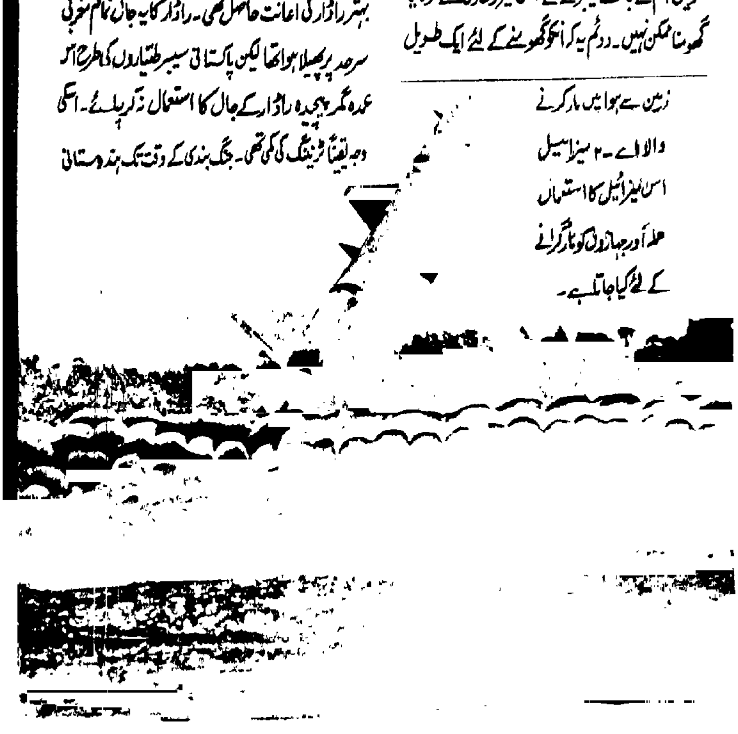
امریکی ایف ۸۶ سیبر نیٹ سے بہتر طیارہ ہے ۴/۱ ۳۷
طویل اور ۳۹ فیٹ عریض، اس جہاز کا وزن ۱۱۱۲۵ پاؤنڈ
ٹ سے دوگنا) ہے۔ اس کے بھاری وزن کے باعث اسکی
۶۷۸ میل فی گھنٹہ اور فضا میں بلند ہونے کی صلاحیت
ار فیٹ فی منٹ (نیٹ سے نصف ہے) یہ ۵۵ ہزار فیٹ
دی تک پرواز کر سکتا ہے۔ اسکا دائرہ عمل ۱۵۵ میل تک
اس میں ۵۰ انچ دہانے کی چھ مشین گنیں اور ہوا سے ہوا میں
لے والے دو سائڈ ونڈر میزائل لگے ہوئے ہیں۔ اسکے
یہ پانچسو پاؤنڈ کے دو بم یا ۵ انچ قطر کے چھ عدد راکٹ

لیجانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے سیبر کی بالادستی ظاہر ہے اسکا دائرہ عمل نیٹ سے کافی وسیع ہے اسلئے یہ کافی طویل فاصلے تک جاکر بمباری کر سکتا ہے۔ اسلحہ جات کے میدان میں بھی سیبر نیٹ سے بہتر ہے۔ اس میں لگے ہوئے سائڈ ونڈر میزائل ایک بار داغے جانے کے بعد اپنے آگے اڑنے والے طیارے کے انجنوں سے نکلنے والی گرمی کا تعاقب کرتے ہیں۔ انجنوں سے نکلنے والی حرارت انکی رہنمائی کرتی ہے۔ اگر اگلا طیارہ کسی سمت مڑتا ہے تو یہ میزائل اس کے تعاقب میں اسی سمت مڑ جاتے ہیں اور آخر کار طیارے کو تباہ کر کے دم لیتے ہیں۔

ایک بار داغے جانے کے بعد ان میزائیلوں سے بچنا ناممکن ہے۔ اس لئے نیٹ طیارے ہمیشہ سیبر طیاروں پر پشت سے حملہ کرتے ہیں اور حتی الامکان سیبر کے سامنے یا بازوؤں کی طرف نہیں آتے، اسطرح سیبر طیاروں کو اپنے میزائیلوں کے استعمال کا موقع ہی نہیں مل پاتا۔ نیٹ کے کم وزن اور تیزی سے بلند ہونے کی صلاحیت نیٹ کو فوقیت دلاتے ہیں عام طور پر ہندپاک تنازعات کے دوران فضائی جنگیں بہت کم بلندی پر ہوئیں۔ کم بلندی پر نیٹ ہلکا ہونے کے باعث تیزی سے دائیں بائیں گھوم سکتا ہے اور موقع پڑنے پر انتہائی سرعت کے ساتھ فضا میں بلند ہو سکتا ہے، جبکہ اپنے بھاری اور طویل جسم کے باعث سیبر کے لئے اتنی تیز رفتاری سے مڑنا یا گھومنا ممکن نہیں۔ دوئم یہ کہ انکو گھومنے کے لئے ایک طویل فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ نیٹ طیارے کے لئے یہ دوری سیبر سے مقابلتاً کم ہے۔ جب بھی نیچی پروازوں کے دوران نیٹ سیبر پر پشت سے وار کرتے ہیں تو سیبر کے طیارچی انتہائی سرعت کے ساتھ سیبر کو فضا میں بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مقابلے کے لئے کھلی فضا اور طویل فاصلہ بہم ہو سکے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نیٹ کے بلند ہونے کی رفتار سیبر سے دوگنی ہے اور انکی یہ بھول ہی انکی تباہی کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ نیٹ جلد ہی انکو جا لیتے ہیں اور نیٹ کی توپوں کے شعلے ان کو زمین بوس کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نیٹ طیارے نیچی پروازوں کے دوران اپنے حقیر جسم اور کم وزن کے باعث خود سے بہتر طیارے کا بآسانی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن بلندی پر ہونے والی جنگوں کے دوران نیٹ دیگر طیاروں کے سامنے حقیقتاً مچھر ہی ہیں۔ (نیٹ GNAT کا اردو ترجمہ مچھر یا ایسا ہی دیگر حقیر تنکا ہے۔)

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندی فضائیہ کے پاس نیٹ طیاروں کے علاوہ کینبرا، ہنٹر، گرگان، مسٹیر، طوفانی ویمپائر اور مگ ۲۱ جہاز تھے۔ مگ۔ ۲۱ کے علاوہ یہ سبھی پرانے قسم کے طیارے ہیں۔ اس کے مقابلے پر پاک فضائیہ سیبر طیاروں کے علاوہ بی ۵۷ کینبرا اور ایف ۱۰۴ اسٹار فائٹر طیاروں سے لیس تھی جو کہ بہتر طیارے ہیں۔ اسکے علاوہ پاک فضائیہ کو ہم سے بہتر راڈار کی اعانت حاصل تھی۔ راڈار کا یہ جال تمام مغربی سرحد پر پھیلا ہوا تھا لیکن پاکستانی سیبر طیاروں کی طرح اس عمدہ مگر پیچیدہ راڈار کے جال کا استعمال نہ کر پائے۔ اسکی وجہ یقیناً ٹریننگ کی کمی تھی۔ جنگ بندی کے وقت تک ہندوستانی



زمین سے ہوا میں مار کرنے
والا اے۔ ۲ میزائیل
اس میزائیل کا استعمال
حملہ آور جہازوں کو مار گرانے
کے لئے کیا جاتا ہے۔

۱۔ واقعات نئی دہلی

دہلی ڈائری



۲۶ جنوری کو ۲۲ واں یوم جمہوریت بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ ہر سال ہی یہ دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن اس مرتبہ جوش و خروش پہلے سے زیادہ تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہندوستان کے پڑوس میں "بنگلا دیش" کے نام سے ایک نیا جمہوری دوست ملک ابھر کر سامنے آیا ہے۔

اس جمہوریت کی پریڈ کو دیکھنے کے لیے تقریباً دس لاکھ انسانوں کا جم غفیر انڈیا گیٹ پر جمع تھا۔ بہت سے لوگ رات ہی کو پہونچ گئے تھے۔ ساری رات شہر میں چہل پہل رہی اور رات بھر اسکوٹر اور موٹر گاڑیاں انڈیا گیٹ تک تماشائیوں کو ڈھوتی رہیں۔ ایک انسانی سمندر تھا جو حد نظر تک انڈیا گیٹ پر نظر آتا تھا۔

فوجی پریڈ میں زیادہ تر وہ فوجی دستے تھے جو حالیہ جنگ میں حصہ لے چکے تھے اور کامیاب و کامراں واپس لوٹے تھے۔ مسٹر وی وی گری نے وجے چوک پر جہاں سلامی کا اسٹیج بنایا گیا تھا سلامی لی۔ اس سے پہلے راج پتھ پر سلامی کا چبوترہ ہوا کرتا تھا۔

یوم جمہوریت کی اس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ وزیر اعظم نے جنگ میں مرنے والوں کی یاد میں انڈیا گیٹ پر "امر جوان جیوتی" جلائی۔ جونہی وزیر اعظم نے اس یادگار پر پھول مالا چڑھائی، ۵۰ فوجیوں پر مشتمل دستہ نے اپنی بندوقیں الٹی کر دیں۔

پریڈ میں فوجی دستوں کے علاوہ بورڈر سکیورٹی فورس، سینٹرل ریزرو پولیس، ہوم گارڈز، سول ایمرجنسی فورس، دلی فائر بریگیڈ، این سی سی، اور پورے گرلز اسکاؤٹس نے بھی حصہ لیا، بیل گاڑیاں، موٹر گاڑیاں اور ہاتھی بھی پریڈ میں نظر آتے تھے۔ سب سے دل چسپ سرکس کے کھلاڑیوں کی ٹولیاں تھیں جو اپنے کرتب دکھا کر تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر رہی تھیں۔

جو جھانکیاں یوم جمہوریت کے اس جلوس میں شامل کی گئیں ان میں بنگلا دیش کی جھانکی عجیب تھی۔ جھانکی کیا یہ ایک ڈراما سا تھا جو وجے چوک پر کھیلا گیا اور اس میں کئی سو ایکٹروں نے حصہ لیا۔ ان میں 'بنگلا دیش کے شہری' مکتی باہنی کے سپاہی، پناہ گزیں انڈین ڈاکٹر اور نرسیں، رضاکار، پاکستانی اور ہندوستانی فوجیں شامل تھیں۔ لیکن جو ڈرامہ پیش کیا گیا اسے صرف وہی لوگ صحیح طور پر دیکھ سکے جو وجے چوک کے حلقوں میں اپنی نشستیں لئے ہوئے تھے۔ دور کے تماشائیوں کے لیے اس کا دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس ڈرامے کی بعض باتیں ایسی تھیں جنہیں سنجیدہ طبقوں نے شامل پریڈ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ ایک باوقار قوم کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنی جمہوریت یا فتح کا جشن بھی باوقار طریقہ پر ہی منائے۔ لیکن پتا نہیں کیوں نہیں اس کا مشورہ قبول نہیں کیا گیا۔

ہندوستان کی آزادی سے متعلق جھانکی خاصی دل چسپ تھی۔ اس میں بہت سے مرد عورتیں اور بچے حصہ لے رہے تھے۔ اور ایسے ہی نعرے لگا رہے تھے جیسے کہ آزادی کی تحریک کے دوران لگائے جاتے تھے پیچھے پیچھے برطانوی سپاہی چل رہے تھے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ڈانڈی مارچ کرنے والے بہت سے والنٹروں نے آجکل کے ٹی ٹاپ کی پوشاک کو کیوں ترجیح دی؟

پرانے قلعے میں بھی تین دن تک آواز اور روشنی کے ذریعہ خاص پروگرام پیش کیا گیا۔ اس میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے لے کر بنگلا دیش کی آزادی تک کی جھانکیاں پیش کی گئیں اور پرانے قلعے کے کھنڈرات نے آواز و روشنی کے امتزاج سے ایک ایسی کہانی بیان کی جو تماشائیوں کے عام طریقوں کے ذریعے نہیں بیان کی جا سکتی تھی۔ ■

آرزوؤں کا شہر

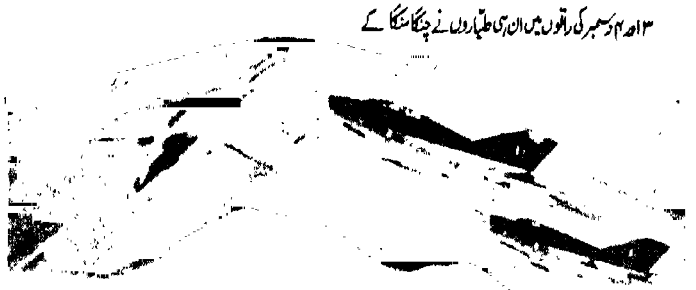
دہلی میں میٹروپالیٹن کونسل کے انتخابات کی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے آجکل اخبارات میں جو اشتہارات شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں راجدھانی کو آرزوؤں کا شہر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اشتہارات دہلی والوں کو تو خیر کیا گمراہ کر سکیں گے شہر کی حالت ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن دہلی سے باہر رہنے والے



مسز گاندھی بھارت رتن کا اعزاز حاصل کرنے کے فوراً بعد راشٹرپتی بھون میں

ہوابازوں کی دلیری کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے اس طیّارے کا طول ۱۹۰ فیٹ اور پروں کی چوڑائی ۱۲۴ فیٹ ہے۔ یعنی یہ طیارہ بوئنگ ۷۰۷ طیّارے سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ یہ اپنے شکم میں ۱۶ ٹن وزن جس میں ایک بھرا ہوا فوجی ٹرک بھی شامل ہے لیکر پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنے دیو پیکر جسم اور سست رفتاری کے باعث یہ طیّارہ پندرہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے پاکستانی لڑاکا طیّاروں اور طیّارہ شکن توپوں کے لیے سہل ترین نشانہ تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستانیوں کیلئے خطرناک ترین طیّارے بھی تھے کیونکہ ایک ہی اڑان کے ذریعے وہ دشمن پر ۱۶ ٹن وزنی بموں کی بارش کرتے تھے جو کہ عام طیّاروں کے ذریعے لیجائے جانے والے بموں سے متعدد گنا زیادہ ہے۔

۳ اور ۴ دسمبر کی راتوں میں ان ہی طیّاروں نے چٹاگانگ کے



پیٹرول کے ذخیروں کو آگ کی نذر کیا۔ بعد ازاں انہی طیّاروں نے چھمب کے علاقے میں دشمن پر ٹنوں آتش گیر مادّہ برسایا۔ اسطرح باربرداری کے ان طیّاروں نے دور دراز علاقوں تک بمباری کرنے والے بھاری بمبار طیّاروں کی جگہ پوری کی، حالانکہ فضائیہ کا یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا لیکن یہ امر مزید باعثِ حیرت ہے کہ دورانِ جنگ کسی بھی اے این ۱۲ طیارے کو خراش تک نہیں آئی۔ یقیناً اسکا سبب ہمارے ہوابازوں کی عمدہ ٹریننگ اور بہترین ہوابازی کی صلاحیت ہے۔

۳ دسمبر کی یخ بستہ شام۔ سورج کی آخری کرنیں سرزمین ہند کو الوداعی بوسہ دے رہی تھیں اور سیاہ رات نے اپنے پر پھیلانے شروع کردیے تھے کہ اچانک شمال ہندوستان میں دور دور تک سائرن چیخنے لگے۔ پاکستانی لڑاکا اور بمبار طیارے ہندوستان کے ۱۲ ہوائی اڈوں پر بمباری کر رہے تھے۔ اچانک پاکستانی ہوائی حملے کی خبر نہ صرف ہندوستانی عوام بلکہ اعلیٰ افسران و حکام پر بجلی بن کر گری۔ عرب اسرائیل جنگ کا نقشہ ہر شخص کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وزیراعظم انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ کلکتے سے دہلی روانہ ہوئیں۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک جبکہ وزیراعظم نے قوم کے نام پیغام نشر کیا، حملوں سے ہونے والی تباہی سے متعلق پوری معلومات حاصل نہ ہو سکیں تھیں۔ وزیراعظم کی پریشانی انکی آواز سے ہویدا تھی۔

آہستہ آہستہ بمباری سے متعلق اطلاعات ملنا شروع ہوئیں اور سنجیدہ چہروں پر مسکراہٹیں لوٹ آئیں۔ پاکستانی اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام ہو چکے تھے۔ پاکستانیوں کے مقاصد واضح تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اچانک حملہ کر کے ہماری فضائیہ کو نقصان پہونچایا جائے۔ بیشتر جہاز زمین پر کھڑے کھڑے تباہ کر دیے جائیں۔ ہوائی پٹریوں کو تباہ کر کے ہوائی مستقروں کو ناقابلِ عمل اور فضائیہ کو مفلوج کر دیا جائے۔ لیکن پاکستانی ایک مقصد میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ رات کو ساڑھے گیارہ بجے سے ہندی فضائیہ نے جوابی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔ پاکستان کے آٹھ ہوائی مستقروں پر تمام رات بمباری جاری رہی۔ اسمیں سرگودھا اور چکلالہ جیسے سرحدی ہوائی اڈے بھی شامل تھے اور مسرور (کراچی) اور ملتان جیسے دور دراز ہوائی مستقر بھی۔ پاکستانی فضائیہ نے اولین نشانہ ہوائی پٹریوں کو بنایا تھا، لیکن وہ کسی بھی ہوائی پٹری کو ناقابلِ عمل نہ بنا سکے اور نتیجتاً ہوائی اڈوں پر موجود طیاروں کو مفلوج کر کے اگلے حملے میں ان کو زمین پر ہی تباہ کرنے کے مقصد میں پاکستانی فضائیہ کامیاب نہ ہو سکی۔ پاک فضائیہ کے طیارے جب دوسرے حملے کے لئے ہندوستانی اڈوں پر آئے تو ان کے استقبال کے لئے ہندوستانی طیارے ہوا میں موجود تھے۔

جنگ کے اوائل میں پاک فضائیہ نے زوردار حملے کئے لیکن انکا زور گھٹتا گیا اور جنگ کے اواخر میں ہندی فضائیہ کا پلڑا بھاری تھا۔ بنگلا دیش میں موجود پاک فضائیہ کے ۱۰ طیارے اولین چند ایام کے دوران ہی تباہ کر دیے گئے تھے اور بنگلا دیش کی فضاؤں پر پوری طرح ہمارا قبضہ تھا۔ ہمارے طیارے بغیر کسی روک ٹوک کے بنگلا دیش کی فضاؤں میں اڑتے۔ انکا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ مغربی سرحدوں پر ہمارے طیاروں نے کراچی جیسے دور دراز علاقوں پر بمباری کر کے پیٹرول کے ذخیروں میں آگ لگادی۔ ہماری فضائیہ نے چھمب، شکرگڑھ اور دوسرے علاقوں میں بری افواج کو بھرپور تعاون دیا۔

جنگ کے دوران مشرقی اور مغربی سرحدوں پر ہمارے طیّاروں نے ۴ ہزار حملے کئے۔ جنگ کے دوران دونوں سرحدوں پر روزانہ ۵۰۰ سے زائد حملے کئے۔ جنگ بندی تک ہماری فضائیہ نے پاک فضائیہ کے ۹۴ طیارے جن میں مراج اور اسٹار فائٹر بھی شامل ہیں زمین بوس کر دیے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے طیّاروں نے ۱۴۶ ٹینک تباہ کئے۔ ۳۷ ریل گاڑیوں پر حملے کئے ۶ ریلوے مارشلنگ یارڈ نیست و نابود کر دیے۔ ملتان کے پیٹرول صاف کرنے کے کارخانے اور سکھر کے سوئی گیس کے پلانٹ شعلوں کی نذر کر دیے۔ بنگلا دیش کے تقریباً سب اڈوں کو ناکارہ بنا دیا گیا۔ ۵۰ سے زاید توپ لگی اور دیگر اقسام کے اسٹیمر اور کشتیاں پانی کی گود میں سلادی گئیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بنگلا دیش کی آزادی اور مغربی سرحدوں پر ہماری کامیابی فضائیہ کے بغیر ممکن نہ تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر ہماری فضائیہ بنگلا دیش میں موجود پاک فضائیہ کے تمام طیّاروں کو تباہ نہ کر پاتی تو ہمارے سست رفتار جاسوس طیّارے بنگلا دیش کی فضاؤں میں آزادانہ پرواز کر کے فوجی ٹھکانوں اور فوجی ورسدی قافلوں سے متعلق اہم اطلاعات بہم نہ پہونچا سکتے تھے۔ پاک فضائیہ کی غیر موجودگی کے باعث ہمارے باربردار طیّاروں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چھاتا بردار افواج ڈھاکا کے قرب و جوار میں اتاری گئیں۔ پاک فضائیہ کی موجودگی میں یہ اقدام یقیناً خودکشی کا باعث ہوتا اور سیکڑوں ندی نالوں کی سرزمین بنگلا دیش کی آزادی اتنے قلیل عرصے میں نہ مل پاتی۔

شاباش! ہندوستانی فضائیہ کے دلیر ہوا بازو۔ ہندوستانی عوام کا تم کو سلام۔ تم ہماری سلامتی، وقار اور آزادی کے ضامن ہو۔ تم کو بنگلا دیش کے سات کروڑ عوام کا سلام جن کے آزادی کے خوابوں میں تم نے حقیقت کا رنگ بھرا۔ تم کو انسانیت کا سلام کیونکہ تم نے حق کے لئے لڑ کر ظلم کو شکست دی۔ ہماری دعا ہے۔

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ ●●



ہوا اور پانی کے درمیان ہوائی کرتبوں کا ایک منظر۔ اس جنگ میں ہماری بحری ایرفورس (وکرانت) نے اہم رول ادا کیا۔

کرسکتے ہیں۔ مگ ۲۱ میں نصب راڈار ۳۰ میل کے دائرے میں قابل عمل ہے۔ مگ کے مقابلے میں ایف ۱۰۴ اسٹار فائٹر تیز رفتار امریکی لڑاکا بمبار طیارہ ہے۔ اس کی رفتار ۱۵۲۰ میل فی گھنٹہ اور دائرہ عمل ۲۲۰۰ میل ہے۔ مگ ۲۱ کی طرح اسٹار فائٹر کی ناک میں ایک توپ نصب ہے۔ اس کے علاوہ اس میں دو ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل بھی نصب ہیں۔ موقع پڑنے پر یہ بمباری بھی کرسکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی ۴ بم لیجانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن مگ ۲۱ کے مقابلے میں اسٹار فائٹر کو زمینی عملے سے زیادہ تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ مراج ۳ ای بھی ایف ۱۰۴ کی طرح لڑاکا بمبار طیارہ ہے۔ عرب اسرائیل جنگ کے دوران ان طیاروں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ان طیاروں کے ذریعے اسرائیل نے اچانک حملہ کرکے مصری فضائیہ کو تباہ و برباد کردیا تھا۔ اس کی رفتار ۱۵۰۰ میل فی گھنٹہ اور دائرہ عمل ۸۶۰ (مراج ۳) سے ۲ ہزار (مراج ۵) میل ہے۔ اس میں ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے اے ایس ۳۰ میزائل سے لیس ہیں۔ اطلاعات کے مطابق پاک فضائیہ کے پاس ۱۲۵ اسٹار فائٹر۔ ۲۵ مراج ۳ اور ۳۰ مراج ۵ طیارے ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسٹار فائٹر اور مراج ۳ و ۵ مگ ۲۱ سے قدرے تیز رفتار طیارے ہیں لیکن انکا دائرہ عمل مگ ۲۱ سے بہت وسیع ہے۔ اس کے علاوہ دونوں طیارے بمباری کے فرائض بھی انجام دے سکتے ہیں جبکہ مگ ۲۱ مخصوص مزاحم طیارہ ہے لیکن نیٹ کی طرح مگ ۲۱ کی کارگزاری بھی ہوا بازوں پر منحصر ہے۔ ماہر ہاتھوں میں یہ بآسانی اسٹار فائٹر اور مراج کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ حالیہ جنگ میں اس امید کو ہندوستانی ہوا بازوں نے سچ کر دکھایا۔ ایچ اے ایل ناسک مختلف ترمیموں کے بعد مگ ۲۱ ایم طیارے کی تخلیق میں مصروف ہے جس میں مگ ۲۱ کی زیادہ تر خامیاں مثلاً محدود دائرہ عمل کو دور کردیا جائے گا۔

سکھوئی ۷ (ایس یو ۷) ایک روسی لڑاکا بمبار طیارہ ہے۔ ہندوستان کے پاس ایک اطلاع کے مطابق اس قسم کے ۱۴۰ طیارے ہیں۔ یہ طیارے خصوصاً زمینی حملے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اس کی رفتار ۱۰۸۵ میل اور دائرہ عمل ۳۰۰ میل ہے۔ اس میں ۳۰ ملی میٹر دہانے کی دو توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ۵۵ ملی میٹر کے ۳۸ راکٹ (ہر بازو پر ۱۹ عدد) یا دو ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل اور ایک ہزار پاؤنڈ وزنی پانچ بم بھی لیجاسکتا ہے۔ اس کے بلند ہونے کی رفتار ۳۰ ہزار فیٹ فی منٹ ہے اور یہ ۵۵ ہزار فیٹ کی بلندی تک بآسانی پرواز کرسکتا ہے۔ ایس یو ۷ پاکستان کو ملے ہوئے مگ ۱۹ لڑاکا بمبار طیاروں سے بہتر طیارہ ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق ہند فضائیہ میں ان طیاروں کی تعداد ۱۴۰ ہے۔

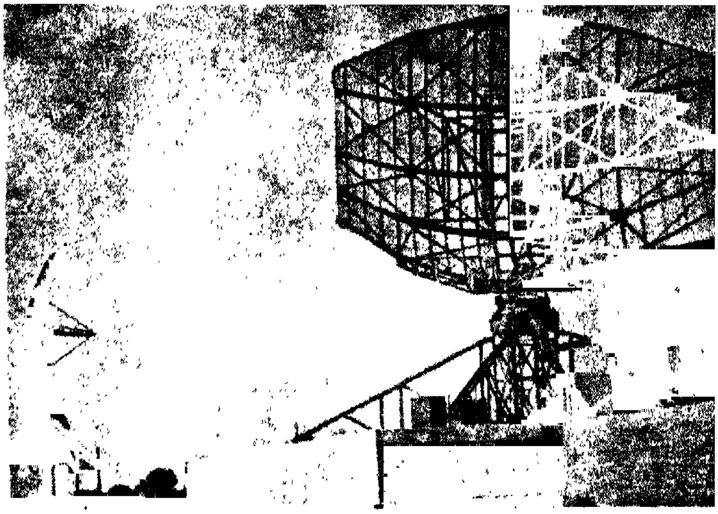
ہاکر ہنٹر ایف ۵۶ یہ برطانوی لڑاکا اور بمبار طیارہ ہے۔ اس یک نشستی طیارے کی رفتار ۷۱۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ اس میں ۴ عدد ۳۰ ملی میٹر دہانے کی توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہزار پونڈ وزنی ۲ بم، ۳۰ انچ قطر کے ۲۴ یا دو انچ قطر کے ۳۷ راکٹ لیجانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اسکا دائرہ عمل ۳۲۵ میل ہے۔ زائد پیٹرول ٹنکیوں کے ذریعے اسکو ۵۵۰ تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ یہ ۱۷۲۰۰ فیٹ فی منٹ کی رفتار سے ۵۲ ہزار فیٹ تک بلند ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق ہندی فضائیہ کے پاس ۸۰ ہاکر ہنٹر ہیں۔

ایچ۔ ایف ۲۴ ماروت:۔ ایک خود ساختہ ہندوستانی لڑاکا بمبار طیارہ ہے جو کہ ایچ اے ایل بنگلور میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ متحدہ عرب جمہوریہ اور ہندوستان کے اشتراک کا نتیجہ ہے۔ ۶۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے اس طیارے کا دائرہ عمل ۴۲۰ میل ہے۔ آٹھ ہزار فیٹ فی منٹ کی رفتار سے بلند ہوکر یہ ۵۲ ہزار فیٹ کی بلندی تک پرواز کرسکتا ہے۔ اس میں ۳۰ ملی میٹر دہانے کی ۴ توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ۴۸ ہوا سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ اور ۴ ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل یا ایک ہزار پاؤنڈ وزنی ۴ بم لیجانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور موقع کے مطابق اس یک نشستی طیارے میں مزید ایک سیٹ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے پاس ان طیاروں کا ایک اسکویڈرن ہے۔

کینبرا:۔ ایک دو نشستی بمبار طیارہ ہے جسمیں ۲۰ ملی میٹر دہانے کی ۴ توپیں نصب ہیں۔ ۵۷۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والا یہ طیارہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی ۶ بم لیجانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ہزار فیٹ کی بلندی پر پرواز کرسکتا ہے۔ ہندی فضائیہ کے پاس تین اسکویڈرن بی ۱۲ کینبرا طیارے ہیں۔ یہ طیارہ اولاً برطانیا نے بنایا، بعد ازاں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اسی طیارے کو بی ۵۷ کینبرا کے نام سے تیار کیا۔ پاک فضائیہ کے پاس امریکا سے ملے ہوئے بی ۵۷ بمبار طیاروں کے دو اسکویڈرن ہیں۔

مندرجہ بالا طیاروں کے علاوہ پاکستان نے آئی ایل ۲۸ قسم کے ایک اسکویڈرن طیارے چین سے حاصل کئے ہیں۔ یہ ایک پرانی قسم کا بمبار طیارہ ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکا دائرہ عمل کینبرا بمبار طیاروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس بمبار طیارے کو حاصل کرنے کے بعد پاکستان دور دراز علاقوں تک بمباری کرسکتا ہے جبکہ اس سے قبل محدود چند ہوائی مستقروں تک ہی پاکستانی طیاروں کی پہونچ تھی۔

ہندوستانی فضائیہ نے بمباری کے لئے جو طیارے استعمال کئے وہ یقیناً اپنی جگہ ایک جنگی کارنامہ ہے۔ ہندی فضائیہ کے پاس تقریباً ۳۰ عدد اے این ۱۲ باربرداری کے جہاز ہیں ان میں سے ایک اسکویڈرن طیارے بمباری کے لئے استعمال کئے گئے۔ اے این ۱۲ کو بمباری کے لئے استعمال کرنیوالے



راڈار۔ جس کے ذریعے دشمن کے حملہ آور جہازوں کا پتا لگتا رہتا ہے۔

فضائیہ کا اسکور ۷۳ طیارے اور ۱۲۰ ٹینک تھا جبکہ ہمکو صرف ۳۸ طیاروں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگ میں حاصل کردہ اہم فتوحات اور نمایاں جنگی کارناموں کے پیشِ نظر ہندی فضائیہ کے سربراہ کا عہدہ ایر مارشل سے ترقی دے کر ایر چیف مارشل کر دیا گیا۔ ارجن سنگھ ہندوستان کے اولین ایر چیف مارشل ہوئے۔

حالیہ جنگ:۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد فضائیہ کی نشوونما جاری رہی۔ جدید تیز رفتار طیارے حاصل کئے گئے۔ فضائیہ کی اعانت کے لئے راڈار لگائے گئے۔ متعدد نئے ہوائی مستقر تعمیر کئے گئے تاکہ فضائیہ کو دور دور تک پھیلایا جا سکے اور کسی اچانک فضائی حملے سے کم سے کم نقصان ہو۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو پاکستانی آمروں نے نہتے بنگالی عوام پر مشین گنوں کے دہانے کھول دیئے۔ آزادی کے بدلے انکو موت دی گئی۔ پاک فضائیہ کے طیاروں نے شہروں اور دیہی بستیوں پر بمباری کی۔ اپنی جان کی سلامتی کے لئے لاکھوں کی تعداد میں بنگالی عوام ہند کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگے۔ دنیا نے محسوس کیا برصغیر پر ایک بار پھر جنگ کے بادل چھا رہے ہیں۔ مہاجرین کی آمد جاری رہی لیکن بڑی طاقتیں آنکھیں موندے رہیں۔ نتیجتاً دونوں ممالک کی افواج آمنے سامنے تھیں۔ پاک فضائیہ کے طیارے ہماری سرحدوں کی خلاف ورزیاں کر رہے تھے۔ فضائیہ کو سرحدی خلاف ورزی کرنے والے طیاروں کو مار گرانے کا حکم دیا گیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو چار پاک سیبر طیاروں نے معمول کے مطابق مشرقی سرحد عبور کی۔ چار نیٹ طیاروں کو مزاحمت کا حکم دیا گیا۔ نیٹ طیاروں نے سیبر طیاروں کو کلکتے سے تیس میل شمال مشرق میں جا لیا۔ نیٹ نے ایک بار پھر اپنے خطاب "دیومار" کو ثابت کر دکھایا۔ تین سیبر طیاروں کو تباہ کر دیا گیا جبکہ چوتھا طیارہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمارے تمام طیارے صحیح سلامت لوٹ آئے۔ جنگ سے قبل ہی سفر کے مقابلے میں تین کا اسکور کچھ برا نہ تھا۔

۱۹۷۱ء سے قبل ہندوستانی فضائیہ کتنے طیاروں پر مشتمل تھی۔ اس سوال کا بالکل صحیح جواب دینا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر ملک کی فوجی طاقت ایک اہم راز ہوتی ہے جو کہ منظرِ عام پر آنا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود دنیا کے مختلف ادارے مختلف ممالک کی افواج کی تفصیلات شائع کرتے رہتے ہیں جو کہ بڑی حد تک صحیح ہوتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ہندوستان کی فضائیہ ۴۵ اسکویڈرن پر مشتمل ہے۔ ایک اسکویڈرن میں آٹھ سے چوبیس تک طیارے ہو سکتے ہیں۔ لیکن خیال ہے کہ ہندی فضائیہ کے ایک اسکویڈرن میں طیاروں کی تعداد ۱۶ ہے۔ اس طرح ہندوستان کے پاس طیاروں کی کل تعداد ۷۲۰ ہوئی جبکہ اسکویڈرن میں ریزرو طیارے بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں پاکستانی فضائیہ ۲۲ اسکویڈرن پر مشتمل ہے۔ اگر پاک فضائیہ کے ایک اسکویڈرن میں بھی طیاروں کی تعداد ۱۶ مان لی جائے تو پاک فضائیہ کے پاس کل ۳۵۲ طیارے ہوئے۔ برطانوی ادارے دی انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز (جو کہ صحیح اعداد و شمار کی اشاعت کے لئے مشہور ہے) کے دیئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستانی فضائیہ ۹۰ ہزار افراد اور ۶۲۵ جنگی (لڑاکا بمبار اور مزاحم (INTERCEPTOR) جہازوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستانی فضائی عملہ کی تعداد ۱۵ ہزار اور جنگی جہازوں کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ اس میں ۲۰ میراج ۵۔ ۳ طیارے شامل ہیں جو کہ جنگ سے کچھ عرصہ قبل پاکستان نے فرانس سے حاصل کئے تھے۔ ونگ کمانڈر موہن سنگھ کے اندازے کے مطابق جنگی طیاروں کے علاوہ ہندی فضائیہ کے پاس تقریباً ۳۰۰ ٹرانسپورٹ طیارے اور ۲۵۰ ہیلی کاپٹر ہیں۔ ہندوستانی فضائیہ میں طیاروں کی کل تعداد (جنگی۔ باربردار۔ ہیلی کاپٹر، ٹریننگ اور دیگر طیارے) ۱۵۵۰ ہے۔ آیئے ہند و پاک فضائیہ کے طیاروں کا تفصیلی جائزہ لیں۔

نیٹ اور سیبر کا مقابلہ ہم اس سے قبل ہی دیکھ چکے ہیں۔ مختلف اطلاعات کے مطابق جنگ کے آغاز تک ہندی فضائیہ کے پاس ۱۵۰ نیٹ اور پاک فضائیہ کے پاس ۱۰۸ سیبر طیارے تھے۔

مگ ۲۱ بمقابلہ میراج اور اسٹار فائٹر

مگ ۲۱ ہندی فضائیہ کا عمدہ ترین طیارہ ہے۔ یہ ایک روسی مزاحم (INTERCEPTOR) طیارہ ہے جو ہر قسم موسم میں قابلِ عمل ہے۔ ہندوستانی فضائیہ کے علاوہ یہ طیارہ کیوبا، چیکوسلواکیا، فن لینڈ، مشرقی جرمنی، ہنگری، انڈونیشیا، عراق، شمالی ویت نام، مصر اور یوگوسلاویا کی فضائیہ میں بھی شامل ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ہندوستانی فضائیہ کے پاس ۱۲۰ مگ ۲۱ طیارے ہیں۔ روس سے ۲۵۰ طیارے بنانے کا لائسنس حاصل کر کے ایچ اے ایل ناسک کانپور حیدرآباد میں مگ ۲۱ طیارے تیار کئے جا رہے ہیں۔ ۴۷ فیٹ طویل اور ۲۵ فیٹ عریض اس یک نشستی طیارے کا وزن (بغیر ہتھیار) ۱۷ ہزار پاؤنڈ ہے۔ ۳۶ ہزار فیٹ کی اونچائی پر یہ ۱۳۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر سکتا ہے۔ اس کا دائرۂ عمل ۳۵۵ میل ہے اس میں ایک یا دو ۳۰ ملی میٹر بار کی توپ اور دو عدد ایٹول میزائل لگے ہوئے ہیں۔ میزائل کی غیر موجودگی میں دونوں بازوؤں پر ۵۵ ملی میٹر قطر کے ۱۶ راکٹ لگائے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی بم بھی لیجا سکتا ہے۔ اس کے بلند ہونے کی رفتار ۳۰ ہزار فیٹ فی منٹ ہے اور یہ ساٹھ ہزار فیٹ کی بلندی تک پرواز

ں پر یقین کریں گے اور جن سنگھ والے ان کہانیوں
ریاستوں میں سیاسی فائدہ کے لیے استعمال
. حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں روزگار کی حالت
ئی ہے. کرپشن طویل شب فراق کی طرح بڑھا ہے.
ر غلاظت شباب پر ہے. جھونپڑیوں اور جھگیوں کی
ھی اضافہ ہوا ہے. سب کے لیے تعلیم تو ہے لیکن
ن اور ایڈمنسٹریشن کے اسکولوں میں تعلیم کا معیار
گرا ہے. خوبصورت بستیوں کے قلب میں بھی غلاظتوں
رطے ہیں، پرانی اور گندی بستیوں کا تو ذکر ہی کیا.
سنگھ ایڈمنسٹریشن نے چند فواروں اور چند پارکوں
کے خوب چرچے کیے ہیں لیکن انہوں نے تمام دوسر
فراموش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ
یشن کے انتخابات کے ذریعہ بہرحال ظاہر ہوگا. ■

...ب شراب کیوں پیتے ہیں؟

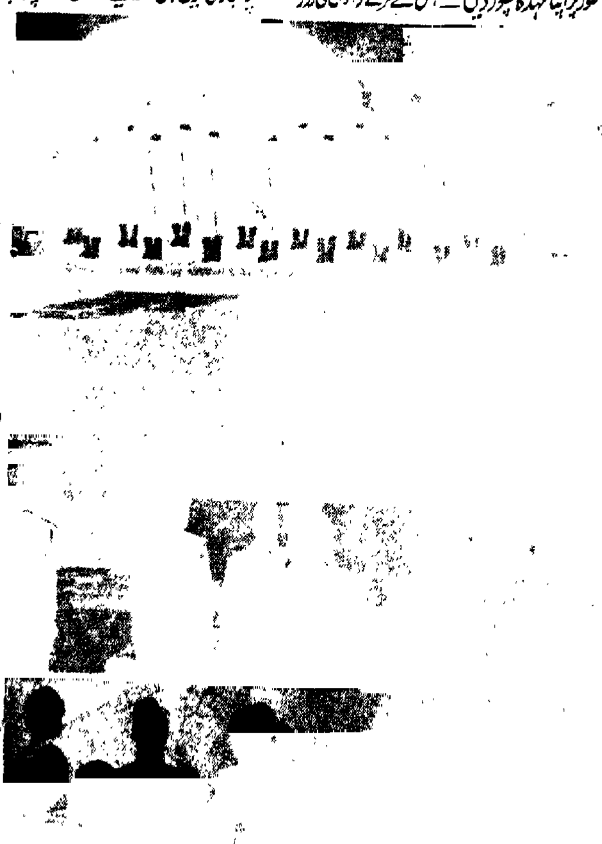
رامن رکشا کھینچتا تھا لیکن اس کی اکلوتی بیٹی
یڈی کہتی تھی کیونکہ ڈیڈی کہلانا رامن کا پیدائشی حق
یک بار اس کی جھگی کے قریب سے گزر کر بس اسٹینڈ
ہوئے مرکزی سکریٹریٹ کا ایک سکشن آفیسر جو اپنے
ادر جن پیوؤں اور گڈیوں کا ڈیڈی ہے، رامن کی اکلوتی
و "ڈیڈی ٹاٹا" کہتے سن کر چونک پڑا تھا اور اس کے
پر چوٹ لگی تھی کہ ایک غلیظ رکشا والا بھی ڈیڈی کہلانا
. اور اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب
پیوؤں اور گڈیوں سے کہہ دے گا کہ وہ اسے ڈیڈی ک
کریں. اسے ڈیڈی سے نفرت ہو گئی تھی.
یہی رامن گذشتہ ہفتہ گھر واپس نہیں آیا اور اس
لڈی، اپنے ڈیڈی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ــــ
تے روتے سو گئی ــــ اپنے ڈیڈی کو بھول گئی ــــ
اور صرف ایک ہی رامن نہیں درجنوں رامنوں نے
وڑی دیر کے لیے غم حیات کو بھول جانے کی آرزو میں آٹھ
نے دیکر پورا ایک گلاس چڑھا کر خود کو موت سے ہمکنار
رلیا. ایک سو کے قریب رامن ابدی نیند سو گئے، شور
پا کہ تحقیقاتی کمیشن مقرر کرو. یہ کمیشن مقرر ہو گیا ہے.
ن کمیشنوں کی رپورٹوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ سب کو معلوم

تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا تھا لیکن اس کی رپورٹ سرد خانہ
میں دب کر رہ گئی.

ناجائز شراب کا کاروبار بند نہ ہونا تھا نہ ہوا ــــ
آئندہ بھی اس کے بند ہونے کا امکان نہیں. دلچسپ بات
یہ ہے کہ یار لوگوں نے اس حادثہ کو سیاسی پروپیگنڈہ کا
ذریعہ بنا لیا ہے. جن سنگھ والے اس کا الزام کانگریس پر
عاید کر رہے ہیں اور کانگریس والے یہ کہہ رہے ہیں کہ جن سنگھ
ان اموات کا ذمہ دار ہے. کانگریس والوں کی بات ایک
حد تک سمجھ میں آتی ہے کیونکہ ایڈمنسٹریشن جن سنگھ کے ہاتھ
میں ہے لیکن جن سنگھ کی صفائی اپنی نااہلیت پر پردہ ڈالنے
کے علاوہ کچھ نہیں ــــ ایک دفعہ ریل کے ایک حادثہ
میں آنجہانی لال بہادر شاستری جو اس وقت ریلوے منسٹر تھے
اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے لیکن یہاں ایکسائز کے محکمہ
کے انچارج جن سنگھی ایگزیکٹو کونسلر مسٹر شبھ کے کان پر
جوں تک نہیں رینگی ــــ کیا اچھا ہو کہ وہ خود ہی "باعزت"
طور پر اپنا عہدہ چھوڑ دیں ــــ اس سے مرنے والوں کی روحوں
کو سکون ہو نہ ہو دلی والے ضرور سکون محسوس کریں گے ■

گاندھی کے اصولوں کی موت

ہندوستان کی تاریخ میں ۳۰ جنوری کو بھی
بڑی اہمیت حاصل ہے. یہی وہ دن تھا جب بابائے
قوم مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا. اس دن مہاتما
گاندھی کی سمادھی پر پھول مالائیں چڑھائی گئیں پرارتھنا
ہوئی اور مہاتما گاندھی کے دل پسند گیت گائے گئے.
گاندھی سدن میں جو کچھ دن پہلے تک "برلا ہاؤس"
تھا اور جہاں مہاتما گاندھی کو ابدی نیند سلایا گیا تھا اس
موقع پر خاص تقریبات ہوئیں.
ہر سال ہی یہ تقریبات ہوتی ہیں اور ہم لوگ ان کو
منانے کے بڑے پابند ہیں. کاش ان تقریبات کی پابندی
کے ساتھ ساتھ ہم مہاتما گاندھی کے ان اصولوں کی بھی
پابندی کریں جن کے لیے انھوں نے اپنی جان دی! ■



۳۰ جنوری کو صدر گری گاندھی سمادھی پر راشٹرپتا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

فیشن
عورتوں
نفسیاتی
ضرورت



مجیب الرحمٰن



موجودہ دور کی ایجادات اور ترقی نے انسانوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے جس کی وجہ سے انکے معیارِ زندگی میں بہت بڑا فرق آگیا ہے۔ وہ قدیم رسم و رواج کے بندھن سے آزاد ہو کر ماڈرن طرزِ زندگی یا نئے طور طریقے اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے ذہن و دماغ میں قدیم خیالات و نظریات فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اور حال و مستقبل کی تمام نئی چیزیں انکی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں مرد ماڈرن تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر نئی شاہراہ پر گامزن ہیں وہیں نئی روشنی کی عورتیں اور لڑکیاں بھی ان سے کہیں آگے ہیں۔ خاص طور پر لباس کے معاملے میں عورتیں بالکل ہی ماڈرن لباس کی غلام بن چکی ہیں۔ اسکول کالج اور دفاتر میں کام کرنے والی ماڈرن لڑکیاں، منی اسکرٹ، سلیکس، ہپی ڈریس اور دیگر چست لباسوں پر فریفتہ ہیں۔ اسیطرح بالوں کے سنوارنے اور غازہ پوڈر سے اپنے چہرے کی آرائش و زیبائش کی بری طرح دلدادہ ہیں۔

یہاں نفسیاتی طور پر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ شوقین عورتیں کس کیلئے بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ کیا وہ بذاتِ خود اپنے آپ کیلئے بنتی سنورتی ہیں یا اپنے شوہر کے لئے، یا ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ عمدہ اور ماڈرن لباس پہن کر اپنی ہم جنسوں کے سامنے اپنے آپ کو اجاگر کریں اور فخر محسوس کریں اور یہ کہ آخر کونسی عورت خوبصورت ہے؟ کیا عورتوں کو واقعی اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے دل کی تسلی کے واسطے بناؤ سنگار پر کافی محنت و مشقت اور کثیر مالی خرچ کریں۔ چنانچہ یہ سوالات دنیا کے ماہرینِ نفسیات کے نزدیک مستقل موضوعِ بحث بن چکے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان عورتوں کی عقل و دانائی سمجھنے کے لئے بحث چھڑ گئی ہے کہ آخر کونسی نئی باتیں اور اسباب ہیں جو عورتوں کے خیالات و افکار پر غالب ہو کر انھیں زیب و زینت اور عمدہ لباس اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

مسٹر جان براؤن (JOHN BROWN) ان ماہرینِ نفسیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس بحث میں حصہ لیا تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ شادی کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ تقریباً پندرہ سال زندگی گزار چکا تھا۔ اس کے تمام عادات و اطوار سے میں واقف ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ حسبِ معمول میں سارا دن کام کرنے کے بعد تھکا ماندہ شام کے وقت اپنے گھر لوٹا لیکن اس روز میری بیوی

اق سے گھر میں نہیں تھی جو میرا استقبال کرتی جیسا کہ وہ روزانہ ایک
ریب مسکراہٹ سے کیا کرتی تھی اور میرے تینوں بچے مجھ سے بے پروا
لیویژن دیکھنے میں مشغول تھے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان
ڈن کو ڈسٹرب کروں، لہٰذا میں خاموشی کے ساتھ اپنی لائبریری
کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا ہاتھ بڑھا کر ایک
تاب اٹھائی اور اسے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ پھر میرے دل
ں خیال پیدا ہوا کہ میری کب گھر لوٹے گی اور کب شام کا کھانا
یار کرے گی جب کہ مجھے اس رات کو بے انتہا کھانے کی خواہش
سوس ہو رہی تھی۔ اس سوچ میں ایک گھنٹا یا دو گھنٹے گزر گئے
اں تک کہ گھر کے دروازے کے قفل میں کنجی گھمانے کی آواز سنائی
ی۔ میں نے سمجھ لیا کہ بیوی گھر واپس آگئی ہے۔ پھر میں نے بچوں کا
شور اور اونچی ہنسی کی آواز سنی اس شور کا سبب معلوم کرنے
لئے میں اپنی کرسی سے اٹھ کر باہر آیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی
ینوں بچوں کے درمیان گھری ہوئی مکان کے صحن میں کھڑی ہے
ہ خوش ہو ہو کر ماں کے پہنے ہوئے لباس کی تعریف کر رہے ہیں
ور بچوں کے ان تعریفی کلمات سے ماں بھی خوش ہو رہی ہے۔ پھر
یں نے محسوس کیا کہ میری بیوی میرے قریب آرہی ہے قبل اس
ے کہ میں اس سے کوئی سوال کروں اس نے مجھ سے سوال کیا کہ۔
"میرے لباس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"
اس وقت میں سوچنے پر مجبور ہوا کہ حقیقتاً میری بیوی اس
ات ان عورتوں کی طرح بدل چکی ہے جو اس کی سہیلیاں ہیں اور
ن کے ساتھ وہ گھومتی پھرتی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میری بیوی
س قدر بدل جائے گی۔ میں پہلی بار اپنی بیوی میں بناؤ سنگار دیکھ
ہا تھا۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو سفید اور سنہرے باریک
اروں سے اوپر کی طرف باندھ رکھا ہے اور اس کی پلکوں پر
ہ کدار سیاہ لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ دونوں ہونٹ قرمزی رنگ
سے رنگے ہوئے تھے یہی رنگ اس کے اسکرٹ کا بھی تھا جس میں
س کا پورا بدن چھپا ہوا تھا کیونکہ یہ لباس سلیپنگ سوٹ کی
رح اس کی گردن سے لے کر دونوں پاؤں سے ذرا اوپر تک
نا ہوا تھا۔

اِدھر میرے شریر بچے میرے ارد گرد میرے جواب کا انتظار
کر رہے تھے جو کچھ ان کی ماں نے اپنے بارے میں مجھ سے پوچھا تھا
وہ بہ نفسِ نفیس خود اپنے سر، چہرے اور لباس کی آرائش و زیبائش
کے متعلق میری رائے جاننے کے لئے بیتاب تھی، لیکن میرے
جواب نہ دینے پر ان سب کی امیدیں منقطع ہو گئیں، پھر

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے سوال کیا۔ "یہ تم نے اپنے آپ کو کیا
بنا لیا ہے ڈارلنگ؟!" اس نے جواب دیا "کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو
میری ماڈرن وضع قطع کو جس کے لئے میں نے مکمل چار گھنٹے صرف کئے
ہیں تاکہ میں تمہارے سامنے اپنی خوبصورتی کا اظہار کروں، لہٰذا
برائے مہربانی کچھ بھی میرے متعلق کہو۔" میں نے جواب دیا "کیا تم نہیں
جانتی ہو کہ میں نے تم سے شادی بغیر کسی بناؤ سنگار کے کی ہے
اور تمہیں کچھ یاد ہے کہ جب میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہوئی تھی
تو تم چھوٹی سی نوخیز لڑکی تھیں اور ایک معمولی سا صاف اسکرٹ
پہنا کرتی تھیں، چنانچہ تمہاری وہی تصویر اب تک میرے خیالات
میں باقی ہے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میرے لئے بناؤ
سنگار کرو۔"

اس واقعے سے مسٹر جان براؤن نے ثابت کیا کہ عورتیں بناؤ
سنگار اور لپ اسٹک مردوں کو خوش رکھنے اور تعریفی کلمات سننے
کیلئے کیا کرتی ہیں، اور لباس تو عورتوں کے لئے ایک ایسا سمندر ہے
جس میں وہ بلا سوچے سمجھے ڈبکی لگا کر غرق ہو جاتی ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات نے یہ ثابت کیا ہے کہ عورتیں آرائش
اور تزئین پہلے اپنی ہم جنسوں کو خوش کرنے کے لئے کرتی ہیں پھر وہ یہ
ارادہ کرتی ہیں کہ شوہر ان کے چمکدار بالوں، خوبصورت لباسوں
اور چہرے کے میک اپ کی تعریف کریں۔ اس وجہ سے اس شوہر
اور بیوی کے ازدواجی تعلقات اچھے نہیں رہتے جو اپنی بیوی کو خوش
رکھنے کے لئے اس قسم کی نفسیاتی چیزوں کو نہیں پہچانتا۔ اسی
طرح بعض ماہرین نے یہ ثابت کیا ہے کہ عورتیں میک اپ یا
بناؤ سنگار صرف اپنے واسطے یا اپنے شوہر کے واسطے نہیں کرتیں
بلکہ ان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے عمدہ اور ماڈرن
لباس پر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے درمیان فخر محسوس کر سکیں
اس طرح وہ نہ صرف اپنے شوہر کے منہ سے تعریفی کلمات سننا
چاہتی ہیں بلکہ ان عورتوں سے بھی اپنی تعریف سننے کی تمنی رکھتی
ہیں جو لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوتی ہیں۔

بہر کیف میک اپ اور تکلفات کے سلسلے میں سبھی عورتیں
یکساں نہیں ہوتیں ان میں بھی اختلاف ہے کیونکہ ایک عورت وہ ہے
جسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر حسن و جمال عطا کیا ہے، اس قسم
کی عورتیں میک اپ اور بناؤ سنگار کا بالکل اہتمام نہیں کرتیں
کیونکہ وہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتیں۔
دوسری متوسط درجے کی عورتیں ہیں جو آرائش زیب و زینت
کا اہتمام کرتی ہیں اور تیسری وہ عورتیں ہیں جو حسن و جمال

سے محروم ہیں، چنانچہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بے انتہا بناؤ سنگار
اور میک اپ کا خیال رکھتی ہیں کیونکہ درحقیقت وہ ایسا کرنے پر
مجبور ہیں۔ اسی طرح ایک تعلیمیافتہ مہذب عورت ہے جو اپنے
میک اپ کے لئے ماڈرن لباس اور جدید آرائش و زیبائش کا سامان
بہت کم استعمال کرتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ شوہر کو خوش
رکھنے اور اسکا دل موہ لینے کے دوسرے بہت سے طریقے موجود
ہیں جو میک اپ کے مقابلے میں مردوں کے دلوں پر زیادہ گہرا اثر
چھوڑتے ہیں۔ اگر تعلیمیافتہ عورتیں زیادہ میک اپ وغیرہ کا
اہتمام نہیں کرتیں تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کے
صحیح لطف سے محروم ہیں۔ اس پوائنٹ پر بہت سے محققین
نے بیان کیا ہے کہ عورتوں کے اندر اصل چیز انکی نسوانیت اور
ذکاوت ہے۔ یہی دونوں چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کو ان کی



طرف راغب کرتی ہیں اور خوبصورتی بھی عورتوں کی ایک بیش بہا
دولت ہے جس کی طرف مرد طبعی طور پر راغب ہوتا ہے لیکن یہ حُسن
اسی وقت تک مردوں کے لئے پرکشش ہے جب تک کہ اس کے پیچھے
کوئی عیب اور برائی پوشیدہ نہ ہو۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ عورتوں
کی نسوانیت، صحیح تعلیم و تربیت اور بات کرنے کا خوبصورت
انداز ہی اصل جوہر ہے جو عورت کی شخصیت کو ابھارتا ہے
اور خوبصورت چہرہ تو محض نسوانیت کی تصویر کا ایک فریم ہے
ماہرینِ نفسیات کے نزدیک دوسرا موضوع عورتوں کا جادو ہے
یعنی ساحرہ عورتیں۔ چنانچہ لفظ سحر اور اس کے اسباب کے
معنی کی وضاحت میں محققین نے ایک طویل بحث کی ہے انھوں نے
تشریح کی ہے کہ لفظ سحر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ جو چیز حیرت



(سلیم عرفانی)

...مان طلاق عورت اور پورے سماج کے ساتھ ناانصافی

مسلم پرسنل لا کی بحث یوں تو اسی دن شروع ہوگئی تھی
، دن ہندو کوڈ بل منظور کیا گیا تھا اور ہندو خواتین کو طلاق و وراثت
رہ کے حقوق سے نوازا گیا تھا، لیکن اب اس بحث میں کافی شدت
ہوگئی ہے اور نہ صرف اخبارات کے کالموں تک محدود ہے بلکہ
نین کے جلسوں اور دانشوروں کے سیمیناروں تک جا پہونچی ہے۔
کی ایک بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکثریت روزِ اول سے یہ
البہ کرتی رہی ہے کہ یا تو دونوں فرقوں ـــ ہندو۔ مسلمان ـــ
لئے ایک مشترکہ سول کوڈ ہو یا پھر مسلم پرسنل میں ایسی تبدیلی کی
ئے کہ اس میں اور ہندو کوڈ میں کوئی خاص فرق نہ رہے اور بقول
مسلم خواتین کو انکے وہ حقوق مل سکیں جن سے انھیں اب تک
رم رکھا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے مطالبے میں
ت بھی خود حکومت کے ذمے داروں نے پیدا کی ہے ـــ جگہ جگہ
نین کے جلسے طلب کئے گئے ہیں جن میں نام نہاد ترقی پسند خواتین
شامل کیا گیا اور ان سے اپنے مطلب کے ریزولیوشن پاس
ئے گئے ـــ بڑے پیمانے پر پچھلے دنوں پونا میں کانفرنس کا انعقاد
میں آیا جس میں ملک کے طول و عرض سے تعلیمیافتہ خواتین اور خاص
سے خواتین ٹیچروں کو مصارف ادا کرکے مدعو کیا گیا اور مسلم پرسنل لا
تبدیلی کے حق میں قرار دادیں منظور کرائی گئیں۔

پونا کانفرنس کے بعد ہی دلّی میں ہندو مسلم دانشوروں اور
دں کا ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں ایک یورپین مستشرق نے
شرکت کی۔ اس سیمینار میں چند کو چھوڑ کر باقی سب نے مسلم پرسنل لا
تبدیلی کرنے پر زور دیا۔ بعض ایسے بھی تھے جو مسلم خواتین کیساتھ
ردی کے جوش میں حد سے تجاوز کر گئے اور انھوں نے مسلم شریعت
پر ایسے ناروا حملے کئے جنہیں کوئی بھی پسند نہیں کر سکتا۔

ان کانفرنسوں اور سیمیناروں کا خاص مقصد ایسی فضا پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے جس سے مسلم پرسنل لا میں حکومت کے لئے ترمیم کے متعلق کوئی قدم اٹھانا آسان ہوجائے۔ حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ وہ کسی خاص فرقے کے معاملات میں اس وقت تک دخل نہیں دے گی جب تک کہ خود اس فرقے کے افراد کسی تبدیلی کا مطالبہ نہ کریں یہی وجہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ خود کچھ آزاد خیال مسلمان "آگے آجائیں" تاکہ حکومت مذہبی امور میں مداخلت کے الزام سے بچ جائے، اور لاٹھی ٹوٹے بغیر سانپ مرجائے۔ کوئی تعجب نہیں کہ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں اسکے لئے ایک بل بھی پیش کردیا جائے اور حکومت کی طرف سے اس کی حمایت کیجائے۔

لیکن اگر ایسا کیا گیا تو اس سے معاملات سلجھنے کی بجائے اور الجھ جائیں گے۔ عاجلانہ اقدام کے کبھی بھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے ـــ روشن خیالی یا جدیدیت کو باہر سے نہیں ٹھونسا جاسکتا بلکہ اسکی نشو ونما خود ایک فرقے کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں ہوتی ہے اور اس کے لئے طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات ماننی ہوگی کہ یہاں شادی اور طلاق کے بعض مسائل جو اس وقت رائج ہیں ان میں کہیں کہیں ترمیم کی ضرورت ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم خود اس بات کا جائزہ لیں کہ قرآن اور سنّت کی روشنی میں پرسنل لا میں کیا تبدیلیاں ہوسکتی ہیں؟

سب سے اہم مسئلہ طلاق کا ہے۔ طلاق بعض حالات میں ناگزیر ہوجاتی ہے، لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ اگر ایک مرد ایک ہی وقت میں تین طلاقوں کی گردان کرڈالے تو وہ طلاق ہوجائے گی۔! ممکن ہے کسی زمانے میں ایسا کرنا قرینِ مصلحت رہا ہو لیکن آج کے حالات میں یہ طریقۂ عمل عورت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ طلاق دینے والے مرد کے ساتھ اور پورے سماج کے ساتھ بے انصافی ہے ـــ

> آج کل مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مسئلہ بڑی شد و مد سے زیرِ بحث ہے۔ یہ ایک اہم سماجی مسئلہ ہے جس پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان کالموں میں ہم اپنے قارئین کے خیالات شائع کریں گے، خواہ ہم ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔ آپ بھی اپنے خیالات سے نوازیے ـــ مدیر

شادی ایک مقدس معاہدہ ہے اسے کسی کو یکطرفہ طور پر بلا سوچے سمجھے توڑنے کی اجازت نہ دی جانی چاہیئے۔ طلاق کے اس آسان طریقۂ عمل نے ہزاروں اشخاص کی زندگیاں اجیرن کردی ہیں اور بہت سے مسلمانوں کے گھر تباہ ہوگئے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہمارے علماءِ کرام اس مسئلے پر غور کریں اور ایسی ترمیم کو منظور کرلیں جس سے کہ ایک بیوی ہر وقت اپنے اوپر طلاق کی لٹکی ہوئی تلوار سے محفوظ رہ سکے۔

دوسرا اہم مسئلہ تعدّدِ ازدواج کا ہے۔ اسلام میں کہیں بھی ایک سے زیادہ شادی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ بعض شرائط کے تحت مخصوص حالات میں محض اجازت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر ہوں لیکن افسوس پروپیگنڈا اس طور پر کیا جارہا ہے جیسے ہر مسلمان کے گھر میں چار چار بیویاں بیٹھی ہیں۔

اس قسم کے پروپیگنڈے کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ تعدّدِ ازدواج کے سلسلے میں ہم خود ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرلیں کہ دوسروں کو شکایت یا مداخلت کا موقع نہ ملے۔ مثلاً یہ کہ دوسری شادی کرنے کے لئے کسی کونسل یا مجلس سے اجازت لینا ضروری قرار دے دیا جائے اور وہ خاص ضرورتوں کے پیشِ نظر دوسری شادی کی اجازت دے۔

تعدّدِ ازدواج کی اجازت حقیقتاً لامحدود جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لئے دی گئی ہے لیکن پھر بھی دوسری شادی پر مکمل پابندی مناسب نہیں کیونکہ اس سے جہاں جنسی بے راہ روی کو فروغ ملے گا وہاں یہ طریقہ بھی ناپسندیدہ ہے کہ ایک شخص کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی کھلی چھٹی حاصل رہے۔

تعدّدِ ازدواج اور طلاق کے معاملات کے علاوہ بعض دوسری باتوں پر بھی قرآن و سنت کی روشنی میں نظرِ ثانی کی جاسکتی ہے، اور ایسا ضرور کیا جانا چاہیے تاکہ مسلم پرسنل لاء کے خلاف جو پروپیگنڈا ہورہا ہے اس کا سدِباب ہوسکے۔ اگر خود ہمارے دانشور، فقہا اور علماء سر جوڑ کر بیٹھیں تو پرسنل لا کو ہم خود اس طرح ایک جدید پرسنل لاء بنا سکتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہم حکومت کو پرسنل لا میں ترمیم کرنے سے روک سکیں گے اور اگر ہم اپنی بات پر اڑے رہے اور ہم نے خود کوئی قدم نہ اٹھایا تو جو حالات پیدا کئے جارہے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں کرنے کے لئے خود حکومت قدم اٹھائے گی جسکے لئے اس نے فضا کو ہموار کرنا شروع کردیا ہے۔

مستقبل و سیاست

جنگ کب ہوگی؟

صدر مصر مسٹر انور السادات نے گذشتہ سال اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۱ء کا سال ایک فیصلہ کن سال ہوگا جس کے دوران اسرائیل کے ساتھ تنازعہ یا تو پرامن طور پر حل ہوجائے گا یا پھر مصر اس کے ساتھ جنگ کریگا. سادات اپنی ان دونوں باتوں میں سے کسی پر پورے نہ اترے۔ نہ وہ پرامن طریقہ پر اسرائیل کے ساتھ اپنے تنازعات نمٹا سکے اور نہ جنگ کرنے کی ہمت ہوئی۔

کہتے ہیں گذشتہ سال دسمبر میں وہ خاموشی سے ماسکو پہونچے تاکہ روس سے معلوم کرسکیں کہ کیا وہ اسی طرح مصر کی حمایت کرے گا جس طرح اس نے ہندوستان کی مدد کی ــــ لیکن خفیہ حلقوں کے مطابق روس نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ اور ظاہر ہے روس کی امداد کے بغیر مصر اپنی جدید ترقی کے باوجود اس قابل نہیں ہے کہ اسرائیل کا مقابلہ کرسکے۔

انور السادات کی گول مول یعنی نہ امن کی نہ جنگ کی پالیسی ہے۔ اس لیے مصر کے عوام اکتا گئے اور انہوں نے ہنگامہ آرائی شروع کردی. کالج کے طلباء نے خاص طور پر زیادہ اودھم مچایا اور انھوں نے انور السادات کو پالیسی کی وضاحت کرنے پر مجبور کردیا۔

چنانچہ سادات نے ایک گھنٹہ تک ریڈیو ٹیلیویژن پر تقریر کی اور کہا کہ: "میں نے اور میرے مشیروں نے دسمبر میں اسرائیل کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا. لیکن چونکہ برصغیر ہندوپاکستان میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے اس لیے اس فیصلہ پر عمل نہ کیا جاسکا۔"

سادات کا کہنا تھا کہ ہندپاک جنگ نے روس اور امریکا کے درمیان بین الاقوامی رقابت پیدا ہوگئی ہے۔ اور امریکا کو ہندوستان میں اپنی پالیسی کی ناکامی پر جو خفت ہوئی ہے اسے مٹانے کے لیے وہ اسرائیل کی پشت پناہی کرنے میں زیادہ سرگرم ہوگیا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ایک طرف امریکا نے اسرائیل کی سرگرمی کے ساتھ پشت پناہی کی اور دوسری طرف روس دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا تو اس کا نتیجہ مصر اور دوسرے عرب ممالک کی تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

امریکا مشرق وسطیٰ اور اسرائیل کی حمایت میں کتنا سرگرم ہے۔ یہ اس نے اسرائیل کو ۱۸ فینٹم طیارے مہیا

کرنے کا فیصلہ کرکے ظاہر کردیا........

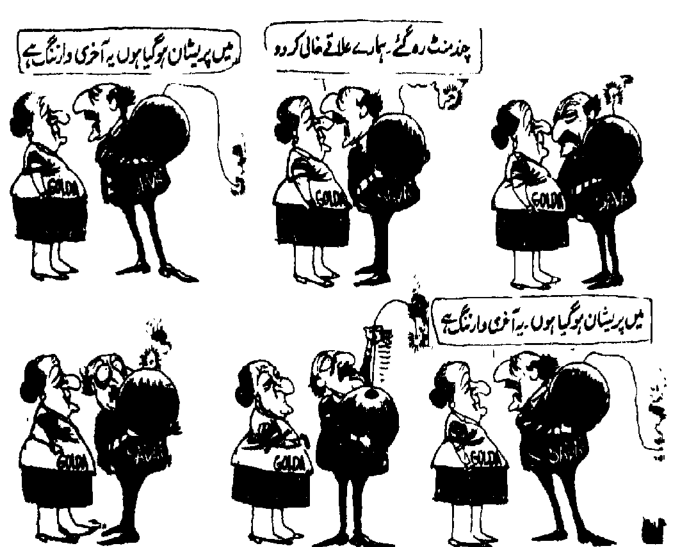
اور اس معاملہ میں دونوں ملکوں کے درمیان بظاہر تعلقات کشیدہ نظر آنے لگے تھے۔ لیکن وزیر اعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر امریکا گئیں اور کامیاب لوٹیں اور انور السادات ماسکو گئے اور ناکام واپس آگئے۔

اب خبر ہے کہ سادات پھر ماسکو جانے والے ہیں تاکہ روس کو ایک مرتبہ پھر زیادہ امداد دینے کے لیے رضامند کرسکیں. اسرائیل کے خلاف ان کے اقدام کا انحصار زیادہ تر روس ہی پر ہے۔ لیکن کیا روس مشرق وسطیٰ میں جنگ کی اجازت دیدے گا؟ کیا وہ اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کے لیے رضامند ہوسکتا ہے جسے قائم کرانے میں وہ بھی پیش پیش تھا۔؟

انور سادات اندرون ملک عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جن طلباء نے "نہ جنگ نہ امن" کی پالیسی کے خلاف احتجاج کیا تھا ان سے بھی انھوں نے ملاقات کی ہے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وزراء میں ردوبدل کیا ہے اور ۷۱ سالہ وزیر اعظم محمود فوزی کی جگہ ۵۱ سالہ عزیز صدقی کو وزیر اعظم مقرر کیا ہے۔ جو ایک انقلاب پسند اور ہارورڈ یونیورسٹی کے تربیت یافتہ انجینئر ہیں. اس سب کارروائی سے انکا مقصد گرتے ہوئے اعتماد کو بحال کرنا ہے لیکن وہ آخر کب تک اس طرح اپنے اس اعتماد کو قائم رکھ سکیں گے؟

عرب ممالک کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے وسائل سے کبھی فائدہ نہ اٹھایا. مغربی ممالک نے انہیں اس طرح عیش و عشرت میں پھنسادیا کہ انہیں ملک کی تعمیر کا کبھی خیال ہی نہ آیا. ان کی موٹر کا کوئی پرزہ خراب ہوگیا تو انہوں نے اس کار کو ریت میں پھینک کر دوسری کار درآمد کرنے کو اپنی دولتمندی کی نشانی سمجھا اور اس پر فخر کیا لیکن کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ ایسی موٹر گاڑیاں اندرون ملک تیار کرانے اور ان کی مرمت کرنے کے لیے اپنے نوجوانوں کو انجینئر بنائیں۔

قدرت نے انہیں پٹرول کی نعمت سے نوازا ہے. وہ اپنے ان وسائل سے کیا کچھ نہیں کرسکتے لیکن ان کی عیش پرستی اور "جارحانہ قوم پرستی" انہیں کچھ نہیں کرنے دیتی ــــ وہ ایک بندوق کے لیے بھی روس کی طرف دوڑتے ہیں ــــ جب تک وہ ہتھیاروں میں خودکفیل نہ ہونگے اور اپنی مدد کے لیے روس یا کسی اور ملک کی طرف دوڑتے رہیں گے یہ امر مسلمہ ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے. صدر انور سادات اگر چاہتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء کا سال حقیقی معنوں میں ایک فیصلہ کن سال ثابت ہو تو انہیں ملک کو ہر میدان میں خودکفیل بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے. خالی خولی دھمکیاں دینے اور اپنے عوام کو "فیصلہ کن سال" کا نعرہ دے کر فریب میں مبتلا کرنے سے اسرائیل سے مقبوضہ علاقے حاصل نہ کرسکیں گے!



گولڈا مائر اور سادات - سادات کی ہر روز دی جانے والی دھمکیاں ٹائمز کے کارٹونسٹ کی نظر میں

بھول جاتی ہے کھیل تو پھر کھیل ہے۔

لیکن جب جنگ ختم ہوگئی اور اس کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں نکلا تو پھر کھیل کی سوجھی اور ڈیورینڈ کو ملک کی خوشی دوبالا کرنے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اور اسے شروع کردیا گیا۔ ہاں بیبولڈ مکرجی ٹورنامنٹ جو ڈیورینڈ ہی کے زیراہتمام ہوتا ہے اور جس میں اسکولوں کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں، ضرور جنگ کی زد میں آگیا اور اسے ترک کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا۔

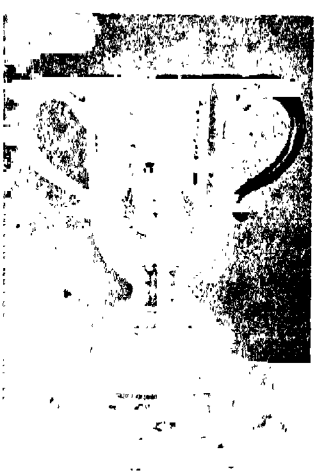
ابتداً اس ٹورنامنٹ کا مقصد شملہ میں سرکاری ملازموں میں کھیل کی سرگرمیوں کا شوق پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ عملاً یہ ٹورنامنٹ برطانوی فوجی ٹیموں اور مقامی ٹیموں کے درمیان مقابلوں کا ٹورنامنٹ بن گیا۔ دونوں بڑی لڑائیوں کی مدت کے علاوہ ڈیورینڈ شملہ میں برابر جاری رہا۔ اور ۱۹۴۰ تک یوں سمجھئے ڈیورینڈ کپ پر انگریز فوجی ٹیموں کو اجارہ داری حاصل رہی۔ ۱۹۴۰ء میں پہلی بار محمڈن اسپورٹنگ نے یہ کپ جیتا جبکہ اتفاق سے اس برس پہلی بار یہ ٹورنامنٹ دلی میں کھیلا گیا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد کافی مدت تک کھیل شروع کرنے میں دقتیں پیش آئیں لیکن بہرحال ٹورنامنٹ کمیٹی کے اسسٹنٹ سکریٹری شری ایس ڈی سنہا اور اس وقت کے محکمہ دفاع کے سکریٹری کی کوششوں سے ۱۹۵۰ء میں یہ ٹورنامنٹ شروع ہوگیا۔

دلی میں اس کے دوبارہ آغاز اور اس کی مقبولیت سے ظاہر ہوا کہ ابھی اس کے ساتھ عوام کی دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ اسوقت اس ٹورنامنٹ کی کوئی فوجی نوعیت موجود نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کا انتظام محکمۂ دفاع کی مدد سے ہوتا ہے ورنہ اس میں حصہ لینے والی ٹیموں میں غیر فوجی ٹیموں ہی کا غلبہ ہے۔

ڈیورینڈ ٹورنامنٹ کے بعد ملک میں کئی ٹورنامنٹ شروع ہوئے۔ مثلاً ۱۸۹۱ء میں رووَرس فٹبال ٹورنامنٹ کے بعد ۱۸۹۳ء میں آئی۔ ایف۔ اے شیلڈ کا آغاز ہوا۔ دونوں علی الترتیب بمبئی اور کلکتہ میں کھیلے جاتے ہیں۔ ڈی۔ سی۔ ایم اور نیشنل ٹورنامنٹ حال کی پیداوار ہیں

لیکن دونوں کوئی اچھا معیار حاصل نہ کرسکے۔ اول الذکر ایک کاروباری ادارہ کے زیرِانتظام کھیلا جاتا ہے جس میں ظاہر ہے کاروباری مفادات کو سامنے رکھا جاتا ہے اور عوام سے روپیہ بٹورنے کے لیے چند برس سے "تہران کلب" کی ٹیم کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ سب سے بڑی اور افسوسناک خامی اس ٹورنامنٹ میں یہ دیکھنے میں آئی کہ اس میں جانبداری سے کام لیا جاتا ہے اور ٹیموں کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے۔ محمڈن اسپورٹنگ کیساتھ اس برس جو بے انصافی کی گئی اور جس طرح انہوں نے محمڈن کے حق میں گول کا فیصلہ دیکر پھر اسے واپس لے لیا وہ سب پر ظاہر ہے۔ اسی قسم کی خامیاں اگر اس ٹورنامنٹ میں دیکھنے میں آئیں تو وہ دن دور نہیں جب



یہ ٹورنامنٹ اپنی جاذبیت قطعی طور پر کھو بیٹھے گا۔

اس کے برعکس ڈیورینڈ کا کاروباری نقطۂ نظر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے ملک میں فٹبال کی حوصلہ افزائی کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ ڈیورینڈ کا ہی طفیل ہے کہ اس نے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک فٹبال کے کھلاڑی پیدا کردیئے اور ان کا معیار اچھا خاصا بلند کردیا۔ اسکا ثبوت ۱۹۷۰ء میں بنکاک میں ملا جہاں ہندوستانی ٹیم نے ایشیائی کھیلوں میں حصہ لے کر کانسی کا تمغہ جیتا

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان ایشیا بھر میں فٹ بال کا چیمپین تھا لیکن اس کے بعد اس کا معیار کافی حد تک گر گیا جس پر کھلاڑی حلقوں میں تشویش کا اظہار کیا گیا۔ بنکاک کے ایشیائی کھیلوں میں کم سے کم اس بات کا ثبوت مل گیا کہ کھیل کا معیار اب گر نہیں رہا ہے بلکہ بڑھ رہا ہے اور اس معیار کو بڑھانے میں ڈیورینڈ فٹ بال ٹورنامنٹ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس وقت فٹ بال میں ہندوستان ایشیا میں تیسرے نمبر پر ہے

ڈیورینڈ کا کپ ایک خوب صورت کپ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ملک کی سب ہی ٹیمیں خواہش رکھتی ہیں اور اس کے لیے پورا زور بھی لگاتی ہیں۔ سر ڈیورینڈ نے جب یہ ٹورنامنٹ شروع کیا تھا تو انہوں نے طے کیا تھا کہ جو ٹیم تین سال تک لگاتار اسے اٹھائے گی مستقل طور پر اسے رکھ سکے گی۔ بالی فیلڈ سب سے پہلی ٹیم تھی جو ۱۸۹۳ء ۱۸۹۴ء ۱۸۹۵ء میں لگاتار کپ اٹھا کر اسکی حقدار بنی اس کے بعد ۱۸۹۷ء ۹۸ اور ۹۹ء میں مسلسل کامیاب ہو کر بلیک واچ نے اسے حاصل کیا۔ سر موٹمر ڈیورینڈ نے دو مرتبہ کپ مہیا کردیا اور تیسری بار فٹ بال کے شائقین نے اس کا انتظام کیا۔

سر موٹمر ڈیورینڈ جب ہندوستان میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے تو طے پایا کہ یہ ایک چیلنج کپ ہوگا جس پر کسی کا حقِ ملکیت نہ ہوگا اور اس طرح موجودہ ڈیورینڈ کپ ستر سال پرانا ہے۔ گذشتہ دس برس کی مدت میں اس کپ کو جو ٹیمیں حاصل کرتی رہی ہیں انکے نام یہ ہیں۔

موہن بگان (۱۹۵۹ء)، موہن بگان ویسٹ بنگال (۱۹۶۰ء) آندھرا پولیس (۱۹۶۱ء)، ۱۹۶۲ء میں ٹورنامنٹ نہیں ہوا، موہن بگان (۱۹۶۳ء)، موہن بگان (۱۹۶۴ء)، موہن بگان (۱۹۶۵ء)، گورکھا بریگیڈ (۱۹۶۶ء)، ایسٹ بنگال (۱۹۶۷ء)، بارڈر سیکورٹی فورس (۱۹۶۸ء)، گورکھا بریگیڈ (۱۹۶۹ء) اور ایسٹ بنگال (۱۹۷۰ء)۔

اس سال دیکھئے ٹرمہ کس کے نام نکلتا ہے۔ ■

بیشتر ڈالے وہ سحر ہے۔ لیکن ساحرہ عورت کیا چیز ہے اور اسکا کیا مفہوم ہے یہ ایک اہم سوال ہے۔ بعض ماہرین نے کہا ہے کہ عورتوں کی خوبصورتی کا معیار مختلف ہے کیونکہ ایک ملک کی خوب صورتی کا معیار دوسرے ملک کی عورتوں کی خوبصورتی کے معیار سے بالکل الگ ہے۔ اسی طرح ایک زمانے کا معیار دوسرے زمانے سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اسکیمو عورتوں کے حُسن کا معیار خطِ استوا کے علاقے کے معیار سے بے انتہا مختلف ہے۔ اسی طرح ساحرہ عورتوں کے تذکرے قدیم تاریخی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ اس سحر کے بارے میں ایک رومانی مزاج شاعر LEMARTIN (لیمارٹن) کہتا ہے کہ وہ عورت جو موسمِ بہار کے کھلے ہوئے پھول کی مانند ہو وہ ساحرہ ہے کیونکہ اس کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیئے اس کے علاوہ اور کسی دوسری صفات کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ پھر یہ کہ عورتوں کا جادو آخر کہاں چھپا ہوتا ہے۔ کیا انکی خوبصورتی میں جادو ہے یا ذکاوت میں یا انکی باتوں میں یا مسکراہٹ میں جبکہ یہ تمام صفات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور کوئی شخص اس بات کا تعین نہیں کر سکتا کہ عورت کے جسم میں کس جگہ جادو بھرا ہوتا ہے وہ صرف کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر اتنا بتا سکتا ہے کہ یہ جادوگر عورت ہے۔

ایک انگلش شاعر رابرٹ براؤننگ (ROBERT-BROWNING) جو ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا تھا وہ ساحرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عورت کی ظاہری خوبصورتی کا نام سحر ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو خریدی نہیں جا سکتی۔ وہ ایک ایسا باریک کپڑا ہے جسے عورت لپیٹ کر پوشیدہ رکھتی ہے، یا وہ سحر عورت میں ایک نرم تکیہ ہے یا سریلی میوزک ہے یا عورتوں کی وہ حسین مسکراہٹ ہے جس کی وجہ سے مرد ان کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں یا وہ باریک آواز ہے جسے مرد ایک مرتبہ سننے کے بعد خواہش کرتا ہے کہ کاش میں اس آواز کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دیتا لہٰذا ایسی مختلف صفات عورتوں میں موجود ہیں جن کی وجہ سے انھیں ساحرہ کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ابراہیم لنکن نے عورت کے جادو کے متعلق کہا ہے کہ عورت کا سحر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لئے کہ زندگی ہبہ کی گئی ہو بلکہ زندگی ایک ایسی اہم چیز ہے جس کے لئے سحر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے ساحرہ وہ عورت ہے جو اس سے بہت زیادہ عطا کرتی ہے جو وہ دوسروں سے حاصل کرتی ہے اور یہی عورتوں کا جادو ہے



دِلّی کی فضا ایک مرتبہ پھر "فٹ بالی" ہوگئی ہے شام کو دلی گیٹ پر پہونچیے آپ کو ایک انسانی سمندر نظر آئے گا۔

یہ کون لوگ ہوں گے؟ وہ جو کارپوریشن اسٹیڈیم سے میچ دیکھ کر باہر آئیں گے۔ اس وقت اس علاقے میں آپ کے لیے پیدل چلنا مشکل ہوگا۔ یہ سب لوگ فٹبال کے رسیا ہیں۔ اپنے تمام غموں کو بھلا کر اسٹیڈیم پہونچتے ہیں اور بڑے شوق سے کھیل دیکھتے ہیں۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی۔ دولت مند بھی غریب بھی اور متوسط درجے کے وہ لوگ بھی جو نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔

اب سے ۸۴ برس پہلے اس وقت کے محکمہ خارجہ کے سکریٹری مورتر ڈیورینڈ نے جب فٹبال کا یہ ٹورنامنٹ شروع کیا تھا جو بعد میں ان ہی کے نام سے موسوم ہوا تو انہیں یہ اندازہ نہ ہوگا کہ جس برطانوی کھیل کو وہ اس ملک میں شروع کر رہے ہیں وہ کتنی مقبولیت حاصل کرے گا۔ ۱۸۸۸ء میں جب انہوں نے شملہ میں ڈیورینڈ کو شروع کیا تھا تو اس میں صرف چھ ٹیمیں شریک ہوئی تھیں لیکن اب کم سے کم چالیس ٹیمیں اس میں حصّہ لیتی ہیں۔

یہ ٹیمیں تقریباً سب ہی ریاستوں سے آتی ہیں۔ شمال سے، جنوب سے، مشرق سے اور مغرب سے۔

بنگال ہمیشہ فٹ بال میں آگے رہا ہے۔ وہاں کی بہترین ٹیمیں ٹورنامنٹ میں حصہ لیتی ہیں اور بہت صاف ستھرا کھیل کھیلتی ہیں جنوبی ہند کی ٹیمیں بھی بنگال کی ٹکر کی ہیں اور بعض اوقات بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کرتی ہیں اسی طرح بمبئی اور گوا کی ٹیمیں ہیں انہوں نے بھی اس ٹورنامنٹ میں نام پیدا کیا ہے اور اب پنجاب بھی فٹ بال کے میدان میں کودا ہے لیکن پنجاب والوں کا کھیل دوسرے علاقوں کی ٹیموں کے برابر صاف ستھرا نہیں۔ پنجاب کی بعض ٹیمیں تو برطارت کھیلتی ہیں اور محض "فٹ بال بائی پاور" پر یقین رکھتے ہوئے طاقت کے بل بوتے پر ہی کپ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

یوپی جو کسی زمانے میں تعلیم میں اور کھیل میں بلکہ سب ہی کاموں سے آگے ہوتا تھا، اب ہر میدان میں پیچھے جا پڑا ہے۔ فٹ بال کی اب تک کی جو ٹیمیں یوپی کے مختلف علاقوں سے آئی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دوسرے راؤنڈ تک چلی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یوپی اور دلی والوں کا اس معاملہ میں سمجھوتا ہے۔ سیاست میں سارے ملک کی رہنمائی اور کھیل میں سارے ملک سے پھسڈی۔

ہر برس کی طرح اس برس بھی ڈیورینڈ فٹ بال ٹورنامنٹ گذشتہ دسمبر میں شروع ہونے والا تھا لیکن جنگ نے روک لگا دی۔ جنگ شروع ہو جائے تو قوم ہر چیز

واقعات نئی دہلی ۷

۱۹۷۱ء کا تحفہ

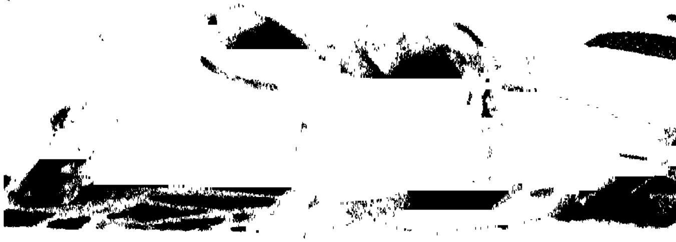
ہاٹ پینٹ



جدید حیات اور جدید زندگی ہپیوں اور بی فری اور تحریک آزادی نسواں کا شکار ہو گئی ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء منی اسکرٹ سے ہاٹ پینٹ کی طرف رواں دواں ہے۔ انسانی فطرت اور انسانی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ جلد اکتا جاتی ہے۔ قدیم روایات قدیم اصول اور قدیم باتیں جدید حیات اور نئی روشنی میں ماند پڑ جاتی ہیں۔ انسانی ذہن سدا سے بے چین رہا ہے اور امریکی طرز حیات اور برق رفتاری حیات نے امریکی نازنینوں اور حسن کو منی اسکرٹ کے بعد ہاٹ پینٹ سے آشنا کر دیا ہے۔ سان فرانسسکو، لاس اینجلس اور دیگر امریکی شہروں میں ہاٹ پینٹ ہی ہاٹ پینٹ نظر آیا کرتے ہیں۔ خوب سے خوب تر اور خوب رو بننے کی تمنا سدا سے امریکی عورتوں کو رہی ہے اور اسی لئے ہاٹ پینٹ مقبول ہو گیا ہے جسمانی حسن اور جسمانی خد و خال اور جسمانی خطوط کا بھرپور مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔ امریکی طرز زندگی سنہ ۱۹۷۲ء تک پہنچتے پہنچتے اتنی بے قابو اور گمبھیر ہو چکی ہے کہ اب ہر آن اور ہر دم فیشنوں اور لباسوں اور کپڑوں کی تراشی میں فرق ہو جاتا ہے۔ پیرس اور سان فرانسسکو میں فیشن پرست ہر دم تنوع اور تبدیلی چاہتے ہیں اور عورت ذات کو حسین سے حسین تر دیکھنے اور ان کی لذت کوشی نے عورت کو بالکلیہ برہنہ کر دیا ہے۔ یوں بھی عورت طبعاً حسن نما اور خوشامد پسند ہوا کرتی ہے نکھرنے اور بننے سنورنے کا خیال ہمیشہ سے اسکی جبلت رہا ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں امریکی فضاؤں میں پھرتی ہوئی یہ عورتیں، ہاٹ پینٹوں میں زندگی کا نیا انداز پیش کر رہی ہیں، امریکا، فرانس، لندن، قاہرہ، ٹوکیو اور دیگر متمدن اور جدید تہذیب یافتہ شہروں میں منی اسکرٹ نے وقت کا ساتھ نہیں دے رہا ہے اور اس کی جگہ ہاٹ پینٹ نے لے لی ہے۔ امریکی رسالے اور امریکی مخصوص پرچے ایسی عورتوں کی تصاویر سے بھرے پڑے ہیں۔ ہپی ازم۔ تحریک آزادی نسواں بی فری تحریک دراصل مغربیت کی مادیت سے پیدا ہوئی ہیں اور سنہ ۱۹۷۲ء تک ان تحریکات نے امریکی حیات کو ایسا مسموم بنا دیا ہے کہ جدید تہذیب اپنے ہی ہاتھوں لائی ہوئی مصیبتوں میں گرفتار ہو چلی ہے۔ انسان فطرتاً جمالیاتی ذوق کا حامل ہے اس کی آنکھیں حسن کو بھرپور دیکھنے کی متلاشی رہتی ہیں۔ مردوں نے معاشرہ میں عورتوں کو خوبصورت سے خوبصورت لباسوں میں ملبوس کر کے اپنی انا کو تسکین دینی شروع کر دی ہے۔ پیرس، لندن، نیویارک اور لاس اینجلیس کے ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں لباس وضع کرنے والوں نے عورتوں سے منی اسکرٹ چھین کر اسے ہاٹ پینٹ پہنا دیئے جدید تہذیب ایل۔ ایس۔ ڈی گولیوں کو نگلنے والی گمنام لے کر گھومنے اور بدمستی کا خلاصہ بن گئی ہے اس کا ذمہ دار آج کا انسان اور اس کا بے چین ذہن ہے۔ ہپی ازم، بی فری ازم اور جدید نوجوانوں کی نشہ آور نسل وقتی قرار کا فلسفہ حیات اختیار کرنے والی نئی نسل آج کی تہذیب کا نمونہ ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء اپنی جلو میں ان تہذیبی ناسوروں اور مکروہ صورتوں کو لے کر آیا ہے۔

آج کا انسان عقلیت اور روحانیت سے محروم ہو کر تہذیب کے چکر کے مصداق قدیم ادوار کی طرف پلٹ رہا ہے۔ حد سے زیادہ (POSH) زندگی، زندگی کا ULTRA MODERN ہونا اور جدید روشنی میں جسموں کو رنگنا، انہیں داغدار بنانا اور غیر ذمہ دارانہ زندگی، روایات سے منحرف ہو کر والدین کی نافرمانی کرنا اور نشہ آور اور مسکرات کا استعمال اور جدید زندگی گزارنے والی خواتین کا جدید نقطہ نظر اور فطری اصولوں سے انحراف اور فطری قوانین کی حدبندیوں کو توڑنا دراصل اپنے مادی وجود کو کیڑے لگانا ہے۔ ہاٹ پینٹ بے ترتیب بال اور رنگ برنگے کپڑے، سستی نشہ آور اشیاء کا استعمال اور حد سے زیادہ جنسی اختلاط تہذیب کی ترقی نہیں ہے بلکہ تہذیب کی معکوسی ترقی کا پہلو ہے۔ تعلیم اور جدید مغربیت سماج میں عورتوں کو برہنہ کر چکی ہے۔ نئی نسل بے فکری کی زندگی سے عبارت ہے اور سنہ ۱۹۷۲ء تیزی سے نت نئے مسائل اور نت نئی تحریکات سے بے چین انسانوں کے ذہن کو اور بھی بے چینیاں عطا کر رہا ہے۔ ★

محمد عبدالحفیظ







نیض احمد فیض

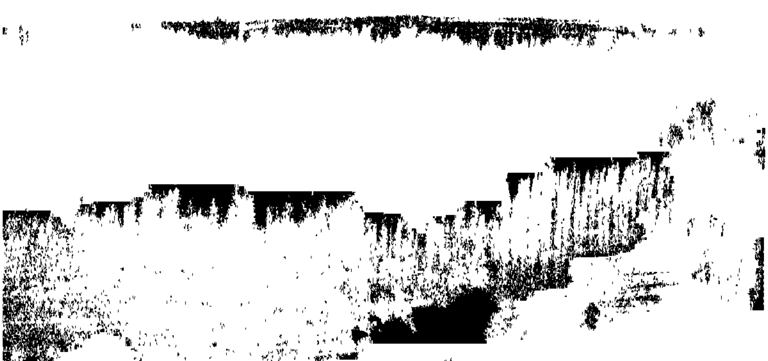
ے لِ بے تاب ٹھہر

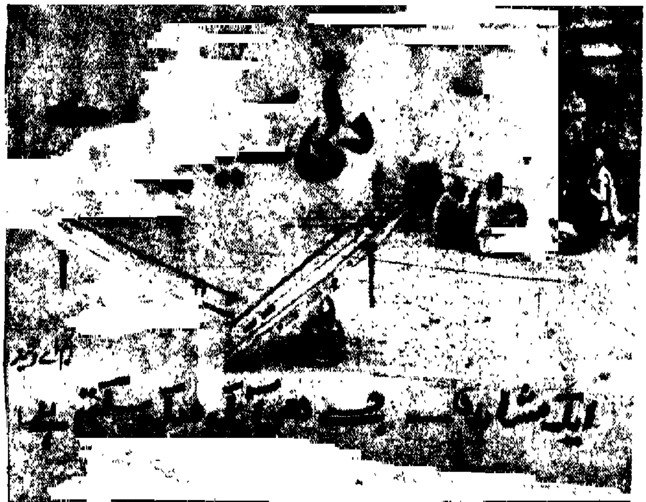
، دلِ بے تاب ٹھہر!
تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیِ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی ڈھل جائے گی
یہ گرانباریِ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی
چھنکتی ہی رہے





دہلی کا موسم سرما بھی ایسا ہی روح فرسا ہے جیسا کہ جان لیوا موسم گرما، لیکن اہلِ ثروت کے لئے نہ سردی باعثِ کلفت ہے اور نہ گرمی وجہ مصیبت۔ موسم گرما میں عیش و راحت کے وسائل پنکھے، فریج، کولر اور ایرکنڈیشنڈ مکانات دیکھنا ہے تو جل کر بھسم ہو جاتا ہے اور سردی بیچاری ساری رات باہر سے کنڈی کھٹکھٹاتی رہتی ہے اور صبح ہوتے ہی آفتاب سے شرما کر چلی جاتی ہے جیسے اسے رسوائی کا ڈر ہو۔

سرما میں سرمایہ داروں کے لئے لطف و عیش کی محفلیں ہیں اور شراب و کباب کی سرمستیاں، ان کے لئے سردی جشن بہاراں کا ساماں مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن یہ دہلی کی چالیس لاکھ کی آبادی جس میں سروے کے مطابق تیس لاکھ انسانوں کو پسماندہ اور غریب قرار دیا گیا ہے" انکے لئے سردی کیا ہے؟ ایک قیامت! یہ فقیر، یہ پھیری والے، یہ ریڑھی والے، مزدور، دھوبی، رکشا چلانے والے اور دوسرے فلاکت زدہ انسان سردی کیسے کاٹتے ہیں؟ کسی رات سڑکوں اور گلیوں میں جاکر چکر لگائیے، آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا! جگہ جگہ آپ کو پانچ پانچ چھ چھ افراد پر مشتمل گروپ ملیں گے جو کوڑا کباڑ جلا کر اس کے ارد گرد ایسے بیٹھے ہوئے ہوں گے جیسے آتش شادمانی کا جشن منا رہے ہوں۔ دہلی کے ہر علاقہ میں ایسے لاتعداد آتش کدے ملیں گے جہاں لوگ ہاتھ پھیلائے ہوئے سردی کی آفت سے پناہ مانگ رہے ہوں گے، کچھ ہوں گے جو بے سُرے گیت، مذاق، دل لگی اور بے تکی باتیں بگھار رہے ہوں گے مگر انہیں کبھی شکوہ نہیں ہوتا کہ "ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے" جیسے جیسے رات گذرتی جاتی ہے دن بھر کی جسمانی تھکاوٹ نظری اور فطری آرام کو طلب کرتی ہے چنانچہ غشی طاری ہوتی ہے لیکن جب تم سردی پھر بے پاؤں آکر سوار ہو جاتی ہے مجبوراً خاطر داری میں اُٹھ کر آتشکدہ میں کچھ ضیافتی کباڑ ایندھن جھونکنا پڑتا ہے تاکہ اس بن بلائے مہمان کو جلد رخصت کیا جاسکے۔ پھر کچھ گرمی آتی ہے، دن کی تھکاوٹ اپنا معاوضہ مانگنے لگتی ہے۔ بہر حال اجیر کو کچھ نہ کچھ اُجرت ضرور دینی پڑتی ہے اگر نہ دو تو کہیں کل سے کام چھوڑ دے اور ہیلتھ آفیسر سے نمٹنا پڑے اور لینے کے دینے پڑ جائیں، غشی طاری ہوتی ہے اور وہ بے حسی کی گود میں پھر سے پہونچ جاتا ہے۔
"لمبی ہے شام غم مگر شام ہی تو ہے"

لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس بے زبان جسم کا ہم ہمیشہ استحصال کرتے رہیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں، اگر آپ حق پورا نہیں دیتے تو حکومت جسم کے افسروں دل و دماغ کو رشوت دینی پڑے گی، چنانچہ دیسی شراب، چرس، بھنگ وغیرہ سے انکی تواضع کیجاتی ہے "مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو" غرضیکہ اس بیچارے کو ہر وہ جتن کرنے پڑتے ہیں جو ایک عاشق سر بگریباں کو برضائے معشوق، تاکہ آنے والے کل کے لئے بھی اس کو خدمت پر آمادہ رکھ سکے اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے، یہ رت جگا اور جشن آتش شادمانی کہاں مناتے ہیں تو اس کا جواب سننے سے پہلے آپ یہ بتا دیجئے کہ رات کے وقت جب بسیں نہیں چلتیں تو یہ بس اسٹاپ، پانی کے پیاؤ اور پل کے نیچے کی سڑکوں کے فٹ پاتھ کس مصرف میں لائے جائیں گے، ایسی جگہوں میں نئی دہلی اسٹیشن کے پُل کو خاص شہرت حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خاندانوں نے وہاں سال کے بارہ مہینوں کے لئے اپنا ٹھکانا بنا لیا ہے میں نے وہاں ایک سے پوچھا، رات کو تم یہاں کیوں رہتے ہو؟ تو پھر ہم جائیں کہاں! اس نے برجستہ جواب دیا، میں نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا۔ کارپوریشن نے بہت سے رین بسیرے بنائے ہیں، تم ضرور پولیس کے آدمی ہو! اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کو بمشکل تمام سمجھایا کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی دُکھ دینے کے لئے پوچھ رہا ہوں پھر اس نے ایک وجہ بتائی "وہاں کمبلوں میں بہت جوئیں ہیں" اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کارپوریشن نے بے گھر لوگوں کے لئے رات گذارنے کو تھوڑا بہت انتظام کیا ہے اس نے رین بسیرے قائم کئے ہیں جن کی کُل تعداد اکیس ہے ان میں سے گیارہ تو سال کے بارہ مہینے کھلے رہتے ہیں اور دوسرے دس صرف سردیوں کے چار مہینے استعمال ہوتے ہیں، یہ عارضی رین بسیرے ٹین کی چھت کے ہیں مستقل رین بسیروں میں سے بھی صرف پانچ رین بسیروں کا خرچ کارپوریشن اٹھاتی ہے جبکہ دیگر چھ خیراتی ادارے لائنس کلب، بھارت سیوک سماج اور عیسائی مشنری کی طرف سے چلتے ہیں۔ یہ رین بسیرے ۷ بجے شام کو کھُل جاتے ہیں اور صبح ۷ بجے بند ہو جاتے ہیں، فرش پر ٹاٹ بچھا ہوتا ہے۔ جب کوئی ضرورت مند آتا ہے تو اسے ایک یا دو کمبل دیئے جاتے ہیں۔ پانی کا مفت انتظام ہے اور بیمار پڑنے پر فوراً دواخانے میں داخل کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ مرض دوسرے تک تجاوز نہ کر جائے اسکی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

رین بسیروں میں تقریباً پانچ ہزار افراد کی گنجائش ہے ہر ایک میں کم سے کم پچاس افراد سو سکتے ہیں اور جو عارضی ہیں انہیں ایک ہزار تک کی تعداد کھپ سکتی ہے۔ میں نے ۲۶ رات کو تقریباً آٹھ رین بسیرے دیکھے جو کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے جن میں مزید کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ فضا بیڑی کے دھوئیں سے بوجھل تھی جسمانی بدبو اور سانس سے خارج شدہ ہوا نے سانس لینا دو بھر کر دیا، جو ناقابل برداشت تھا، تازہ ہوا کے آنے کے لئے بہت کم جگہ تھی اور جس وقت میں پہونچا تو ہوا باہر پھینکنے والا آلہ بھی بے حرکت تھا غالباً وہ بھی سردی سے متاثر تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے کسی بند کمرے میں جانوروں کو ٹھونس دیا گیا ہو۔ لیکن شاید لوگ جانور بننا اس لئے پسند کرتے ہیں کہ باہر وہ سردی کی پکڑ میں آجائیں گے۔

ابھی چند دن قبل یہ سردی تین جانیں لے چکی ہے۔ اور انمیں ایک تو اچھا خاصا نوجوان تھا ـــــ بڑی امیدیں لے کر یوپی کی کسی جگہ سے آیا تھا لیکن وہ اپنی ساری امیدیں اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو گیا ـــــ اور نہ جانے کتنے ہیں جو سردی بھر یا گرمی، موسم برسات ہو یا موسم خزاں ـــــ مرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی ـــــ یہ ہندوستان ہے جہاں سب لوگوں کو یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہیں ـــــ اور جہاں سب کو آگے بڑھنے کے یکساں مواقع میسر ہیں۔

مجھے میرے ہمسایوں سے بچاؤ

(شوکت حریم)



کون آیا تھا۔ کیوں آیا تھا؟

ان ہی دو سوالوں کا جواب دے دے کر تھک چکی ہوں اور اب تو یوں لگتا ہے کہ اگر یہ سوال اب کسی نے مجھ سے کیا تو میں اسکا سر توڑ دوں گی یا اپنا سر پیٹ لوں گی۔ انتہا ہو گئی ہے ماشاءاللہ ہمارا خاندان بھی بہت بڑا ہے، کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی آتا نہ ہو۔ گھر میں کالج میں پڑھنے والے بھی ہیں۔ لڑکوں کے دوست بھی آتے ہیں اور لڑکیوں کی سہیلیاں بھی۔ اب ہم اپنے ہمسایوں کو کہاں تک بتائیں کہ بھئی فلاں شخص تھا۔ ہمارے یہاں آنے والوں کے نام تک انھیں ازبر ہو گئے ہیں۔ میں کالج سے گھر لوٹتی ہوں تو مجھے پوری رپورٹ مل جاتی ہے فلاں فلاں آیا تھا۔ کس وقت آیا اور کس وقت گیا ——
کیوں آیا؟ ——

اور ہاں کچھ اسی پر اکتفا نہیں۔ محلے بھر کی خبریں بھی مجھے پہونچائی جاتی ہیں۔ "اس کونے والے گھر میں آج اتنے مہمان آئے۔ سامنے والے گھر میں ایک اس حلیے کا آدمی آیا۔ نیچے والوں کے یہاں عجیب وضع قطع کے لوگ آکر ٹھہرے ہوئے ہیں، اور وہ پیچھے گھر میں جو لڑکی ہے نا وہ بہت مغرور ہے۔ اپنے جوڑے ہی میں مگن رہتی ہے ہر روز ایک نیا اسٹائل بنا ہوتا ہے۔ غور سے دیکھو تو کچھ زیادہ خوبصورت نہیں رنگ بھی سانولا ہے مگر دور سے اچھی لگتی ہے۔ اونھ، ہمیں کیا اچھی ہے تو اپنے لئے۔ اور ہاں وہ جو سامنے آدمی ہے نا۔ وہ بڑا بدمعاش ہے چھجے پر ہی کھڑا رہتا ہے چوبیس گھنٹے۔ کونے کے گھر والے تو بڑے نیک اور پارسا ہیں۔ انکی لڑکی بھی بے پردہ ہے اور بہو بھی۔ لڑکا بھی آوارہ ہی سا ہے دس بار تو مجھے دیکھ کر مسکرایا، دو ایک بار سلام بھی کیا۔ شکل نہیں دیکھتا اپنی۔ جی چاہتا ہے تو جوتے صبح کو لگاؤں اس کی چاند پر اور تو جوتے شام کو لگاؤں۔ چڑیمار کہیں کا۔"

یہ سب باتیں میں سنتی رہتی ہوں اور ہوں ہاں کرتی رہتی ہوں بارہا میں نے اپنی ان کرم فرما کو سمجھایا بھی کہ تمہیں یہ کیا روگ لگ گیا ہے کہیں کوئی آئے کوئی جائے تمہیں کیا۔

میرے گھر پہونچتے وہ بھی آنکھیں نچاتی مل جاتی ہیں اور میں گونگے کا گڑ کھائے ہوں ہاں کرتے انھیں لاکھ ٹالنے کی کوشش کرتی ہوں مگر وہ یہ بتانے پر مصر ہیں کہ وہ جو دائیں طرف کی گلی میں پہلا گھر ہے اس گھر کی عورت کو تو پلنگ توڑنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے، روزانہ اسکا میاں صبح دفتر جانے سے پہلے جھاڑو دے کر جاتا ہے اور جس روز ناغہ ہو جائے تو غریب کی شامت ہی آجاتی ہے بے چارے کو نوکری بھی دھونا پڑ جاتا ہے —— بے چارہ۔ مجھے تو اس پر بڑا ترس آتا ہے اور آرام طلب عورت کے برابر میں جو عورت رہتی ہے نا اس کے گھر میں سب سے زیادہ سامان ہے، ویسے دیکھنے میں تو ایسے نہیں لگتے نہ جانے کہاں سے دولت پھٹ پڑی ہے ان پر۔ اور مارے جلن کے اس نے اپنے ہی ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ لیا۔

چوتھے والی ہے نا، اس کے برابر میں سید صاحب رہتے ہیں سید ویدتو خاک ہی ہوں گے، بنے ہوئے سید لگتے ہیں، کہیں بہو پڑھانے جاتی ہے بیٹیاں بھی پڑھتی ہیں کوئی بی اے میں ہے کوئی ایم اے میں سب بے پردہ سب بال کٹوائے مٹکتی پھرتی ہیں۔ کہنے کو سید ہیں نیک ہیں۔ بھلا بے پردہ عورتیں بھی کہیں اچھی ہوتی ہیں ساتی بتا رہی تھی کہ انکی لڑکیاں تو دن بھر ناولیں پڑھتی ہیں۔ بھلا کوئی ناول بھی لڑکیوں کے پڑھنے کی چیز ہے۔"

اور یہ ٹیپ ریکارڈ مجھے روز ہی سنا پڑتا۔ وہ تو اپنا ذہن ہلکا کر کے رخصت ہو جاتی ہیں اور میں بوجھل ذہن اور تھکے ہوئے جسم کو ذرا آرام پہونچانے کے لئے سونے کی کوشش کرتی ہوں مگر اللہ بھلا کرے ہمارے ہمسایوں کا، کیا مجال جو میری آنکھ لگے۔ دن بھی کبھی ایک کا بچہ دروازہ پیٹ جاتا ہے کبھی دوسرے کا۔ چھری دیدو، قینچی دیدو، ماچس دیدو اور پھر چھری لے لو قینچی لے لو، یہ اپنی ماچس لے لو۔ یا اللہ اگر یہ چیزیں لی تھیں تو ذرا دیر اور رک جائیں اس کھٹ کھٹ سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور سر پکے پھوڑے کی مانند دکھنے لگتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ ذہن میں یہ مصرعہ ابھرتا ہے کہ ؎

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مگر نہ شاعر کو نوحہ گر ملا اور نہ مجھے نصیب ہو گا۔ پھر دل چاہتا ہے کہ اللہ میاں سے لڑائی کروں۔ آخر اس نے کیوں مجھے اچھے ہمسائے نہیں دیئے۔ ٹھیک تو ہے ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے ہم نے اپنی زندگی میں بیسیوں مکان بدل لئے مگر ہمسایہ اچھا کبھی نہ ملا۔ ایسا اچھا ہمسایہ کہ جسے ہم اللہ کی رحمت قرار دیتیں ہمارے لئے تو یہ ہمسایہ نزلہ خاں ہی ثابت ہوا اس وقت مجھے راشد کی امی یاد آجاتیں، وہ بھی ہماری پڑوسن تھیں۔

ہر چوتھے روز بات بے بات لڑنا ان کا کام تھا۔ کبھی بچوں پر لڑائی ہو جاتی کبھی ہلدی مرچوں پر —— جس نے یہ چیز مانگی تھی تم نے نہیں دی —— بے چاری میری امی —— لڑائی سے کوسوں دور بھاگنے والی۔ بھلا اس کا مقابلہ کیا کرتیں۔ وہ لڑتی رہتیں میری امی روتی رہتیں۔ میرا جی چاہا کرتا تھا کہ اسکا منہ نوچ لوں۔ میری امی سے لڑتی ہے۔ مگر میں بس یہ سوچ کر ہی رہ جاتی۔

ایک دفعہ ہمارے پڑوس میں فرحت کی امی آکر رہی تھیں۔ بس انھیں ۲۴ گھنٹے ایک ہی وہم کھائے جاتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے یہاں پتھر پھینکتے ہیں۔ اب بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ ہمارا کوئی دماغ خراب ہے کہ اور کچھ نہیں تو پتھر ہی پھینکنے لگے۔

اور زاہدہ کی امی تو اور بھی عجیب تھیں۔ انھیں بس یہی دیکھنے کی لگن کہ کون کس سے ملتا ہے اور کیوں ملتا ہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھیں کہ

نگارِ دانش

...کی جدید انتظامی شکل



کہ کابینہ پورے طور پر صدر کے ماتحت ہوتی ہے۔ صدر ہی وزیروں کو مقرر کرتا ہے اور وہی برخاست کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ کابینہ کے ممبروں یا وزیروں کا انتخاب کانگریس یا پارلیمنٹ سے نہیں ہوتا بلکہ وزرا پورے طور پر صدر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ وزرا نہ تو مجلسِ قانون ساز کے ممبر ہوتے ہیں اور نہ وہ اس کی کارروائیوں میں حصّہ لیتے ہیں اور نہ انھیں قانون ساز جماعت میں ووٹ دینے کا حق ہے۔

امریکا میں اگر اس "مطلق العنانیت" کو برداشت کرلیا گیا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہاں کے وفاقی نظام میں ریاستوں کو خود مختاری حاصل ہے، گورنر تک عوام کے منتخب شدہ ہوتے ہیں صرف قومی مسائل ہی میں مرکزی حکومت کو غلبہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں عوام کا جمہوری شعور انتہا کو پہونچا ہوا ہے لیکن دوسرے مقامات پر جہاں کہیں بھی صدارتی نظامِ حکومت کو ترجیح دی گئی ہے وہ حقیقی معنوں میں ڈکٹیٹرشپ میں تبدیل ہوگیا۔ مثال کے طور پر پاکستان کے سابق صدر ایوب خان نے اپنے ملک میں صدارتی نظام کی داغ بیل ڈالی اور اپنی صوابدید کے مطابق اپنے وزرا کو جو الیکشن سے دور رہے تھے منتخب کرلیا۔ (موجودہ صدر

ہندوستان میں ایک صدر کو قانونی اعتبار سے اگرچہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ محض معمولی اختیارات ہی استعمال کرسکتا ہے۔ حقیقی اختیارات صرف کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں جسکا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وزرا، سربراہِ مملکت کے ذریعے مقرر نہیں ہوتے بلکہ انھیں وزیر اعظم مقرر کرتا ہے اور انکے لئے لازم ہے کہ وہ ملک کی قانون ساز جماعت کے منتخب شدہ ممبر ہوں اور انکا تعلق اکثریتی پارٹی سے ہو۔ اگر کسی جگہ ایک پارٹی اکثریت میں نہ ہو تو دوسری جماعت سے ملکر ایسی مخلوط جماعت قائم کرنے کی کوشش کیجاتی ہے جو ایوان کے اعتماد کے ساتھ نظم و نسق چلا سکے۔

اس نظامِ حکومت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ قانون ساز اور انتظامی شعبوں میں مفاہمت اور یگانگت رہتی ہے۔ جبکہ صدارتی حکومت میں ہر وقت ٹکراؤ کا امکان رہتا ہے امریکا میں آج کل قانون ساز جماعت یعنی امریکی کانگریس اور صدر کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ کانگریس میں ڈیموکریٹک پارٹی کی اکثریت ہے جبکہ صدر نکسن ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں (حالیہ جنگ میں ڈیموکریٹک پارٹی کا رجحان ہند کے حق میں تھا اور صدر نکسن کا پاکستان کی طرف۔ اس

شیخ مجیب الرحمٰن نے پارلیمانی نظام کو کیوں ترجیح دی

(سلیمان صابر

شیخ مجیب الرحمٰن سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے صدارت پر وزارتِ اعلیٰ کو کیوں ترجیح دی"؟

جواب میں انھوں نے کہا: "مجھے عوام پر اعتماد ہے"

شاید لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے ملک میں صدارتی انتظامیہ بنائیں گے اور اس طرح وسیع اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ امریکا جیسے بعض ممالک میں صدارتی انتظامیہ کا نظامِ حکومت قائم ہے۔ اس نظام میں انتظامیہ بہت حد تک پارلیمنٹ یا قانون ساز جماعت کی باز پرس سے آزاد ہوتی ہے سربراہِ مملکت برائے نام اختیارات کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کے اختیارات حقیقی اور اصلی ہوتے ہیں۔ مثلاً امریکی صدر کو وسیع اختیارات حاصل ہیں اور وہ انھیں پورے طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ کانگریس کے پاس کئے ہوئے قوانین کو نامنظور کرسکتا ہے اور بیرونی اور خارجی پالیسی کو پوری طرح کنٹرول کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ صدارتی نظامِ حکومت جمہوریت کے باوجود ایک طرح سے مطلق العنان نظامِ حکومت ہے۔ اس مطلق العنانیت کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے

بھٹو بھی انہی میں سے ایک تھے) اور اس طرح وہ پاکستان کے آمرِ مطلق حکمراں بن گئے۔ ایک ڈکٹیٹر اور ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ پورا نظامِ حکومت انکے اشارۂ چشم و ابرو کا محتاج بن کر رہ گیا۔ انکی جگہ صدر یحییٰ خاں آئے تو وہ بھی ایک مطلق العنان حکمراں بن کر بیٹھ گئے اور جیسا کہ پاکستان کی پیپلز پارٹی کے ایک سرکردہ لیڈر نے کہا:

"جمہوریت کا گلا گھونٹ کر رکھدیا گیا ہے"

اور جو مظاہرہ اپنے آخر دنوں میں انھوں نے کیا اسے لکھتے ہوئے تو قلم لرزتا ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے صدارتی نظام کی جگہ جس پارلیمانی نظامِ حکومت کو ترجیح دی ہے اسکا سربراہِ انگلستان کیطرح ایسا بادشاہ بھی ہوسکتا ہے جو وراثتاً چلا آرہا ہو، اور ایک صدر بھی ہوسکتا ہے جسے عوام نے منتخب کیا ہو، جیسا کہ

کشمکش کی بنا پر امریکی اخبارات میں بڑی دلچسپ رپورٹیں شائع ہوئیں اور ایک کالم نویس نے تو صدر کی خفیہ میٹنگوں کی کارروائی چھاپ کر ساری دنیا میں اچھی خاصی سنسنی پیدا کردی تھی)

لیکن بہرحال پارلیمانی نظام کی بھی بہت سی خرابیاں ہیں مثلاً یہ کہ اس میں ہر چیز کا انحصار ووٹوں پر ہوتا ہے، حکومت مستحکم نہیں ہوتی، وزیروں کو اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اگلے الیکشن میں ہار نہ جائیں اسلئے وہ بہت سے کاموں کو الیکشن جیتنے اور ووٹروں کو خوش رکھنے کی غرض سے کرتے ہیں۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اصل اقتدار اکثریتی پارٹی کے چند لیڈروں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے اور وہ جسطرح چاہتے ہیں حکومت کو چلاتے ہیں اور جسکو چاہتے ہیں عہدے دیتے ہیں

۳۶ واقعات نئی دہلی

ارح حکومت چند لوگوں کا کھلونا بن کر رہ جاتی ہے اور وہ
یتم سے دل نشین نعرے لگاکر عوام سے ووٹ حاصل
نے کی کوشش کرتے ہیں۔

دونوں طرز ہائے حکومت کی اچھائیوں اور برائیوں کو
ِ نظر رکھا جائے تو اسی نتیجے پر پہونچا جائے گا کہ خواہ کسی
ہ کا بھی نظامِ حکومت قائم ہو اس کی کامیابی کا زیادہ تر
ہار عوامی شعور پر ہے۔ بنگلا دیش کے عوام اپنے شعور
س حد تک ثبوت دیتے ہیں اسکا جواب آنے والے زمانے
ے گا۔ فی الوقت بنگلا دیش کے عوام کی ۹۸ فیصدی
یت عوامی لیگ اور اس کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو
صل ہے اور اسی لئے شیخ صاحب نے پارلیمانی نظام
وست کو منتخب کرتے وقت یہ کہا ہے کہ:۔

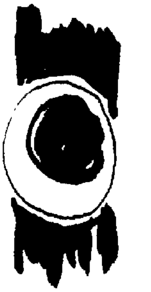
"مجھے عوام پر اعتماد ہے"۔

اس نظام کی بنیاد اسلامی جمہوریت پر بھی رکھی جاسکتی
ی اور اسکا بنگلا دیش کے لوگوں کو حق تھا کیونکہ ان کی
کثریت مسلمان ہے، لیکن وہاں ایک کروڑ غیر مسلم بھی ہیں۔
بنیاً اسی لئے بنگلا دیش کی حکومت نے ہندوستان کی پیروی
کرتے ہوئے جمہوریت کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کو بھی اپنی حکومت
کی بنیادی پالیسی قرار دیا ہے اور مذہب کی بنیاد پر شہریوں
میں کسی قسم کا امتیاز کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس
سے وہاں کی اقلیت میں اعتماد پیدا ہوگا اور باہمی یگانگت
مستحکم ہوگی جس سے آخر میں خود حکومت کی بنیادیں مضبوط
ہوں گی۔

●●







انسانی زندگی پر ستاروں کی گردش کا کافی اثر پڑتا ہے۔
اس موضوع پر کافی تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ جدید سائنس
بھی اس حقیقت سے منکر نہیں کہ شب و روز کی گردش کے نتیجے میں
موسموں کی تبدیلی وغیرہ کا انسان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوئی
غیب داں نہیں ہیں، غیب کا حال تو صرف خدا کو معلوم ہے۔ ہم تو
صرف اپنی معلومات کی بنا پر یہ پیش گوئی شائع کر رہے ہیں۔



یکم فروری سے ۱۴ فروری تک ۱۴ دن آپ کے لئے
کیسے ہوں گے ؟۔ آپ اپنے نام کا پہلا حرف دیکھ کر معلوم کر لیجئے۔

ا ع ل م ن :۔ امتحان میں کامیابی۔ کاروبار میں منافع۔
عزیزوں سے امداد ملنے کی امید۔ جمعہ کا دن بہت مسرت بخش ثابت
ہوگا۔ مرض سے نجات ملے گی صحت میں مزید خرابی پیدا نہ ہوگی۔

ب پ م :۔ کاروبار میں گھاٹا۔ دوستوں سے فائدے کی امید
نہیں۔ گھر میں نئے مسائل سفر میں فائدے کا امکان۔ مالی حالت
جوں کی توں رہے گی۔ گھریلو تعلقات میں سدھار پیدا ہوگا۔ نیا کاروبار
نہ کریں گھاٹے کا امکان ہے۔

ہ ح ھ و :۔ محبت میں کامیابی۔ افکار گھٹیں گے۔ کاروبار
میں منافع ہوگا۔ گھر میں لڑائی جھگڑے کا اندیشہ۔ صحت خراب
رہ سکتی ہے۔ کوئی خوشخبری ملنے کا امکان۔ کسی پرانے شناسا سے
ملاقات۔ حکام سے فائدہ پہونچے گا۔

ث س ش ص :۔ یہ ۱۴ دن آپ کے لئے ملے جلے اثرات کے
حامل ہیں۔ کاروبار میں ترقی ہوگی۔ دوستوں اور عزیزوں سے راحت
ملے گی۔ مالی حالت بھی بہتر رہے گی کوئی خوشخبری ملے گی۔ سینچر کو
سفر نہ کریں بچھڑے ہوئے ساتھی کی خبر ملے گی لیکن کسی کی جدائی
کی خبر بھی ملے گی۔

و ڈ ر ڑ ع :۔ محبت میں کامیابی۔ نئے مسائل پیدا ہوں گے، مگر
دشمن کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہوگی۔ بیوی بچوں سے راحت
ملتی رہے گی کاروبار میں نقصان ہوگا۔ صحت بھی خراب رہے گی

ژ چ ج خ غ ف :۔ صحت میں سدھار مگر گھریلو حالات جوں
کے توں رہیں گے۔ دشمن نقصان پہونچانے کی کوشش کرے گا مگر ناکام
رہے گا۔ قرض ادا ہونے کی صورت نکلے گی۔ محبت میں کامیابی کا امکان
آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ صحت کا خیال رکھیں۔

ت ٹ ق ک گ :۔ بیماری سے نجات ملے گی۔ اتوار بدستور
پریشانیوں کا دن ہوگا لیکن سب بگڑے کام بنیں گے۔ کاروبار میں
فائدہ ہوگا۔ صحت میں کوئی خاص قابلِ ذکر تبدیلی نہ ہوگی۔ مجموعی طور
پر یہ ۱۴ دن آپ کے لئے کسی خاص اور قابلِ ذکر واقعے سے یکسر
خالی ہوں گے۔

●●

پہلا ہفتہ ملے جلے اثرات کا حامل ہے۔
ز ظ ض ے :۔ آمدنی میں اضافہ۔ خرچ بھی ضرورت سے زیادہ
ہوں گے۔ دوستوں سے راحت ملے گی۔ ملازمت میں ترقی کے امکانات
نئے لوگوں سے تعلقات میں فائدہ پرانے تعلقات بھی مفید نتائج
کے حامل ہیں۔ محبت میں ناکامی یقینی ہے۔ یہ ۱۴ دن آپ کے
لئے ملے جلے اثرات کے حامل ہیں۔





مدینہ کی ایک یادگار ادبی محفل

عشاء کی نماز کے بعد میں مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلا ہی تھا کہ "باب المجیدی" پر صدر بزم اردو جناب سید احمد مدنی صاحب پر نظر پڑی چند روز پہلے بزم کے جنرل سکریٹری جناب صابر القاسمی شہید کی جانب سے آج بزم اردو کے زیرِ اہتمام غالب و اقبال کی یاد میں منعقد ہونے والی مجلس میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اردو زبان سے ہمارا جو رشتہ ہے اس کی موجودگی میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہیں یا کوئی دوسرا اردو دوست گہوارۂ اردو سے ہزاروں میل دور میسر آنے والی کسی اردو مجلس سے اس طرح غائب ہو جائے کہ اسے یاد دہانی کی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن یہ صدر بزم اور دوسرے اراکین کی احتیاط پسندی کا اعلیٰ معیار ہے کہ وہ ہمارے استقبال کے لئے باب حرم تک آگئے تھے۔ جیسا کہ صدر بزم نے بتایا کہ یادِ غالب وقت پر اس لئے نہیں منائی جا سکی کہ حج کی مشغولیتیں اجازت نہیں دے سکیں۔ چنانچہ جب تاخیر ہو گئی تو مناسب یہی سمجھا گیا کہ اقبال اور غالب دونوں کی یادیں ایک ساتھ ہی جمع کر لی جائیں ۔۔۔ ابھی جلسے کی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی میں نے موقع غنیمت جان کر صدر بزم سے درخواست کی کہ وہ اس وقفے میں مجھے بزم اردو کے دفتر اور لائبریری کی ایک جھلک دکھا دیں جسے انتہائی مشغولیت کے باوجود موصوف نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا اور مجھے ساتھ لے کر نیچے اتر آئے۔ پہلی نظر میں ہمارے سامنے جو چیزیں آئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک لمبی خوبصورت سی میز پر کچھ کاغذات۔ ایک ٹائپ رائٹر اور دوسری چیزیں اور ایک تختی نظر آئی جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "صابر القاسمی شہید جنرل سکریٹری بزم اردو مدینہ منورہ" اس کے مقابل والی دوسری میز پر سید احمد مدنی صدر بزم اردو مدینہ کی تختی اپنے لوازمات کے ساتھ نظر آئی۔ اور دروازے کے مقابل جو میز لگی ہوئی تھیں اس پر یہ الفاظ سایہ کر رہے تھے: "مولانا محمد عبد الملک جامعی نگرانِ اعلیٰ بزم اردو" فرش پر حسین قالین، خوب صورت سی چاندنی تقریباً ایک درجن نفیس کرسیاں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ گویا پورے ماحول میں نفاست اور لطافت رچی بسی ہوئی تھی۔ میں ابھی انہی چیزوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ مدنی صاحب نے ہماری توجہ کتابوں کی طرف دلائی۔ جب تک ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہ صرف دفتر ہی نہیں بلکہ قابلِ قدر لائبریری بھی ہے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر جانب کتابیں نظر آئیں جو دیواروں سے لگی الماریوں میں سلیقے کے ساتھ سجی ہوئی تھیں۔ وقت اتنا تنگ تھا کہ مجھے کتابوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا یاد نہیں رہا، ویسے میرا اندازہ ہے کہ ۸۰۰ سے زیادہ اور ۱۰۰۰ سے کم ہی ہونگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اراکین بزم خاص طور پر بانی و صدر جناب سید احمد مدنی صاحب کے لئے بے ساختہ دل سے دعائیں نکلیں۔ شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اردو کی یہ پذیرائی ایک ایسا موثر جملۂ تسلی ہے جو اپنے گہوارہ میں اردو کو دم توڑتا دیکھ کر رو دینے والی آنکھوں سے آنسو خشک کرتا ہے اور اس امید کو یقین بنایا جا سکتا ہے کہ بلا ئیں لاکھ ہوں لیکن بین الاقوامی سطح پر اردو کو جو قبولِ عام حاصل ہو رہا ہے اسے روکنا ناممکن ہے اور اردو دشمن طاقتوں کے سر غرور پاش پاش ہونے میں اب دیر نہیں ہے۔

ابھی ہم نے لائبریری پوری طرح دیکھی بھی نہیں تھی، اطلاع ملی کہ وقت ہو گیا ہے حاضرین انتظار میں ہیں اور جلسے کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ جلسے کا انتظام موسم کی مناسبت سے اوپر فراخ چھت پر کیا گیا تھا۔ ہم فوراً اوپر پہونچے۔ حاضرین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اکثر اسلامک یونیورسٹی کے طلباء نظر آئے، شہر کے بھی لوگ تھے اور کچھ حجاج بھی۔ ایک حسین اجتماع تھا، اسٹیج کے دائیں بائیں "یادِ غالب اور یادِ اقبال" کے خوبصورت کتبے آسمانِ اردو کے آفتاب و ماہتاب کی یاد دلا رہے تھے۔ تختِ صدارت پر متمکن حضرت مولانا خلیق الرحمٰن نعمانی صاحب مظاہری کی شخصیت تھی۔ اسٹیج سکریٹری کی جگہ خالد نعمانی صاحب جلوہ فرما نظر آئے پروگرام کی ریکارڈنگ کا بھی اچھا انتظام تھا۔

جلسے کی کارروائی سلسلے وار چلی۔ تلاوت کے بعد محترم سوختہ صاحب نے اقبال مرحوم کی نعت اپنے دلآویز انداز میں پیش کی۔ خطبۂ افتتاحیہ

صدرِ بزم جناب سیّد احمد مدنی صاحب نے پیش کیا جس کے بارے میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ دل سے نکلے ہوئے سچے جذبات اور دعوتِ عمل پر مشتمل یہ خطبہ مدینہ منورہ کی بزمِ اُردو کے شایانِ شان تھا۔ اس جاندار خطبے کے بعد ایک صاحب نے اقبال کی زبان میں غالب کو خراجِ تحسین پیش کر کے ایسی قابلِ تحسین مثال پیش کی کہ جس نے اہلِ نظر کو کافی متاثر کیا۔ یہ تنبیہ تھی ان کم نگاہوں کو جو اُردو کو آفاقیت سے نکال کر جغرافیائی حدود میں مقید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُردو کی ناخدائی میں ہر دو معزز شخصیتوں کی منفرد لیکن مشترک خدمات ہمیں یہی درس دیتی ہیں۔ یہ وہی نظم تھی جس میں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کی زبان سے یہ دو مصرعے نکلے اور ہر اُردو داں کی زبان پر رواں ہو گئے ؂

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

جمالی صاحب کا مقالہ (میرا پسندیدہ شاعر) اقبال کی شخصیت اور شاعری سے متعلق دلچسپی سے سنا گیا۔ مقالات کے بعد مرحومین کا منتخب کلام پیش کیا گیا۔ اس دور میں مدثر حسین جوہر صدیقی، عبدالجلیل صاحب سوختہ اور حجاز میں اُردو کے عظیم نکتہ شناس اور نکتہ آفرین شاعر صوفی غلام محمد صوفی صاحب حیدرآبادی بہت کامیاب رہے۔ محترم حافظ محمد امین زاہد صاحب نے اقبال کے کچھ فارسی اشعار اور اس کی تشریح اچھے انداز میں پیش کی۔

مشاعرے کا دور مختصر لیکن مثالی رہا۔ جوہر صدیقی صاحب نے محترم جناب افقر موہانی صاحب کی غزل پیش کی جو موصوف نے غالب کی یاد میں منعقد ہونے والی اس مجلس کے لئے خاص طور پر ارسال کی تھی ظاہر ہے کہ غالب کی ہی نذر کی گئی تھی۔ حافظ نے اس مرصع غزل کے تین اشعار آپ کے لیے محفوظ کر لینے میں پوری مدد کی، لیجئے سن لیجئے ؂

مٹانے کے لئے مرہ زبانیں اور بھی تو ہیں
نظر بد دور پامالِ خزاں اردو زباں کیوں ہو
لپیٹ کیسی کہاں کی چادرِ گل شمعِ تربت کیا
جو تم پیر رشا ہو اس کا اتنا بھی نشاں کیوں ہو
مرے خونِ وفا کی سرخیاں جبیں نہ ہوں افقر
کسی کا ہو گا افسانہ وہ میری داستاں کیوں ہو

عبدالجلیل صاحب سوختہ کے اشعار اور ترنم دونوں ہی دادِ تحسین کے قابل ہیں چنانچہ انھوں نے اپنی حسین غزل کے ہر شعر پر داد وصول کی غزل کے یہ چار مصرعے اب تک لوحِ ذہن پر مرتسم ہیں۔

دل کے تاروں کو چھو گیا ہے کوئی
ذکرِ چنگ و رباب رہنے دو
روزِ محشر کہے گا ربِ جلیل
سوختہ بے حساب رہنے دو

ملاحظہ کیا آپ نے۔ نام اور تخلص بیک وقت دونوں سے کتنی چابکدستی سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ ایک اور صاحب کے یہ دو اشعار مجھے کافی پسند آئے مجلس کا حال نہیں کہہ سکتا لیکن میں انھیں بھلا نہیں سکتا حالانکہ صاحبِ کلام کا نام ایسا ذہن سے نکلا کہ ہزار کوشش کے باوجود یاد نہیں آ سکا۔ اشعار یہ تھے ؂

ارے او میری جانب مسکرا کے دیکھنے والے
ترا ہی نام ہے مرقوم ہر تارِ گریباں پہ!
میرا خونِ جگر شامل ہے تعمیرِ گلستاں میں!
میرے اشکوں کا بھی احسان ہے فصلِ بہاراں پہ



مسجدِ نبوی کا
حسین و جمیل منبر

صوفی غلام محمد صاحب صوفی اس دور کے آخر میں تشریف لائے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں آپ کی شخصیت شعر و ادب میں بھی اتنی ہی منفرد ہے جتنی اور دوسرے میدانوں میں خوش گو بھی ہیں اور خوش بیان بھی۔ آپ بھی یہ چند اشعار سن لیں ؂

وسعتِ کون و مکاں میں بھی سمائے نہ بنے
دل کی پہنائی میں بھی آپ سے آئے نہ بنے
کوئی دکھلائے ہمیں لاکھ بنا کر خود کو
وہ بگڑ کر جو بنے کوئی بنائے نہ بنے
سب یہ کہتے ہیں کہ صوفی بھی صنم پوجا ہے
نقشِ بر حق تو بھلا ہم سے مٹائے نہ بنے

مشاعرے کے دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ہر شاعر نے مرحومین (غالب اور اقبال) ہی کی شہو زمینوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ مشاعرے کے بعد صدرِ جلسہ جناب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نعمانی نے اپنے اختتامیہ کلمات میں جلسے کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی تحسین فرمائی اور ساتھ ہی بزمِ اُردو کے اراکین کو جو صحرائے عرب میں گلِ اُردو کی آبیاری کر رہے ہیں انکی کوششوں پر مبارکباد دیتے ہوئے بیش بہا مشوروں سے نوازا۔

آخر میں محترم جناب عبدالسلام فارانی کی معیت میں جملہ حاضرین نے سفینۂ اُردو کے ان ناخداؤں کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا کی۔ غفر اللّٰہ لهما۔ اس کے بعد صدرِ بزم جناب سید احمد مدنی صاحب نے مہمانوں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے مجلس کے اختتام کا اعلان کیا۔

اس طرح رات کے دو بجے ہم مجلس سے یہ جذبہ لے کر لوٹے کہ اس جلسہ اور بزمِ اُردو کا ذکر ہند و پاک کی ہر علمی مجلس میں پہنچا کر محبانِ اُردو سے درخواست کریں گے کہ وہ اس ادارے کی ترقی و بقاء کیلئے کسی ممکن تعاون سے دریغ نہ کریں اور خاص طور پر کتابوں کے عطیے سے اُردو لائبریری کی توسیع میں بھرپور حصہ لیں۔ امید ہے کہ ہماری آواز دردمند دلوں تک پہنچے گی۔ مندرجہ ذیل پتوں پر ڈاک سے کتابیں روانہ کی جا سکتی ہیں:-

۱۔ سیّد احمد مدنی۔ صدرِ بزمِ اُردو۔
۲۔ صابر القاسمی شہید جنرل سکریٹری۔

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۰، مدینہ منورہ
سعودی عربیہ

ہندوستانی زندگی میں مسلمانوں کا حصّہ

مذہبی، نسلی اور لسانی رواداری کے آدرش ہمارے آئین کا حصّہ ہیں

ہندوستان میں زندگی کا بمشکل ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس پر اسلامی طرزِ فکر اور ثقافت کی کچھ چھاپ نہ ہو۔ یہ چھاپ جتنی گہری ہے اتنی ہی گوناگوں بھی ہے۔ فنون اور فنِ تعمیر میں، صنعت اور سماجی تنظیم میں، زبان اور فلسفے میں، موسیقی اور ادب میں، تعلیم اور آدابِ مجلس میں مسلمانوں کا حصّہ نمایاں ہے۔

سرزمینِ ہند پر مسلمانوں کی بے شمار یادگاریں ہیں جو ایک عام سیاح کو اس ملک کے روایتی جذبۂ رواداری کی یاد دلاتی ہیں عربی اور فارسی کے الفاظ بہت سی ہندوستانی زبانوں میں رائج ہیں جدید ہندوستانی ثقافت موٹے طور پر ایک ایسا امتزاج پیش کرتی ہے جس میں مسلمانوں اور دوسرے لوگوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یہ امتزاج ساتویں صدی میں اسلام کی آمد سے شروع ہوا۔ اس سرزمین پر بادشاہوں اور شہنشاہوں کے آنے سے بہت پہلے ہندوستان میں ترغیب و تحریک کے ذریعے اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی تھی۔ ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کا رابطہ پہلے پہل ساتویں صدی میں قائم ہوا تھا جبکہ وہ کچھ عرب تاجروں کے طور پر اس ملک کے مغربی ساحل پر آئے۔

شہنشاہ اکبر، تاج محل کے معمار شاہ جہاں، حیدر علی اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ جیسے فراخدل بادشاہوں اور خواجہ معین الدین چشتی جیسی صاحبِ بصیرت اور ضدار سیدہ شخصیتوں نے مسلمانوں کو ہندوستانی سماج میں جذب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ انھیں اس ملک کی تاریخ میں قدر و عزت کا مقام حاصل ہے۔ زبانوں نسلوں اور عقائد کے سطحی اور مصنوعی اختلاف کی تہہ میں دلوں اور دماغوں کا یہ بنیادی اتحاد ہندوستان کی زندگی میں ایک زوردار لہر کی طرح جاری و ساری ہے۔ قوم پرستی اور سیکولرازم کی قوتوں کو مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں زبردست تقویت ملی۔ ۱۸۸۵ء میں قائم کی ہوئی تمام مذاہب اور عقائد کے ہندوستانیوں کی غیر مذہبی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ بے شمار روشن خیال مسلمان رہنما اور سرکردہ مذہبی شخصیتیں وابستہ رہی ہیں۔ ہندوستان کی قومی تحریک کی رہنمائی کرنے والی سرکردہ شخصیتوں میں حکیم اجمل خاں۔ مولانا محمد علی۔ مختار احمد انصاری۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ خان عبدالغفار خان۔ آصف علی اور رفیع احمد قدوائی۔ بدرالدین۔ طیب جی اور محمد رحمت اللہ پیش پیش تھے اور کئی سڑکوں، لائبریریوں، مارکیٹوں اسکولوں اور سرکاری عمارتوں کے نام ان ہستیوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

ملک کی تقسیم سے بھی ہند کے کروڑوں مسلمانوں کا عقیدہ متزلزل نہ ہوا کیونکہ وہ اپنی مادرِ وطن کی یک جہتی میں یقین رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مشترکہ ثقافت اور سیکولرازم کے آدرش انھیں ان قوتوں سے زیادہ عزیز تھے جو انھیں آپس میں بانٹ دینے کے لئے کوشاں تھیں ــــــ ہندوستان کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ یہ ایک سیکولر ملک ہے۔ آزادی سے قبل کی شام کو جواہر لال نہرو نے کہا تھا: "ہمارا مذہب خواہ کچھ بھی ہو ہم سب بھارت ماتا کے بیٹے ہیں اور سب برابر ہیں۔ ہم فرقہ پرستی یا تنگ نظری کو بڑھنا پسند نہیں کر سکتے کیونکہ ایسی کوئی قوم بڑی نہیں بن سکتی جسکے لوگوں کے نظریات و اعمال تنگ نظری پر مبنی ہوں۔"

مذہبی، نسلی اور لسانی رواداری کے آدرش ہمارے آئین کا حصّہ ہیں جس کو ساری قوم متبرک سمجھتی ہے۔ یہ جدید ہندوستان کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ اسے مرتب کرنے والوں میں کم سے کم ۴۵ مسلمان تھے اور دیگر مذہبوں کے باقی رکن تھے۔

اس آئین نے ہندوستان کے تمام شہریوں کو قانون کی نظر میں برابر کا درجہ دیا ہے اور انھیں فکر و اظہار، عقیدے اور مذہب اور عبادت کے یکساں مواقع اور آزادی دی ہے۔

انڈونیشیا اور بنگلادیش کے بعد دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہندوستان میں ہے۔ پاکستان چوتھے نمبر پر ہے۔ وسعت کے اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی عراق، سیریا، ایران، مصر اور سعودی عرب کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے ہندوستان میں ہندوؤں کے بعد مسلمان دوسرا سب سے بڑا فرقہ ہیں۔

غیر ملکی حکومت سے آزادی کے حصول کے بعد قوم کے اندر نئی طاقت اور تیز رفتار ترقی کے لئے ایک نئی قوت اور زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو نئی نئی آزمائشوں اور بے پناہ مواقع سے بھرپور تھا۔ آج سے ۲۵ برس قبل جبکہ یہ عظیم کام شروع ہوا، اس وقت سے مسلمان سرگرمی کے ساتھ اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ قومی زندگی میں وہ کئی کلیدی اور ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین جو ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھی تھے پہلے جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور بعد میں صدر ہوئے۔ ایک اور نامور شخصیت جسٹس ہدایت اللہ ہندوستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں ہندوستان کی پارلیمنٹ میں کئی مسلمان ممبر ہیں جو مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہیں۔ وزراء کی مرکزی کونسل میں دو مسلمان جناب فخر الدین علی احمد اور جناب معین الحق چودھری کیبنٹ منسٹر ہیں، مسٹر شاہ نواز خان اور پروفیسر نور الحسن وزیرِ مملکت اور مسٹر آر۔ ایچ محسن اور مسٹر محمد شفیع قریشی دو نائب وزراء ہیں۔ صوبائی اسمبلیوں اور وزارتوں میں کئی مسلمان ممبر اور وزیر ہیں۔ دو صوبوں کے وزیرِ اعلیٰ مسلمان ہیں۔ راجستھان کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر برکت اللہ خاں ہیں اور جموں و کشمیر کے سید میر قاسم۔ ایک اور اہم شخصیت مسٹر علی یاور جنگ مہاراشٹر کے گورنر ہیں۔

سارے ملک میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی سروسوں میں اگرچہ مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کی نمائندگی بہت کم ہے لیکن پھر بھی بہت سے مسلمان اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ متعدد مسلمان غیر ممالک میں ہند کے سفیر اور ڈپلومیٹ کی حیثیت سے مامور ہیں۔

فنونِ لطیفہ۔ ادب۔ فلم۔ موسیقی۔ رقص۔ ڈراما۔ تعلیمات اور مسلح افواج کے شعبے میں قومی اعزازات حاصل کرنے والوں کی فہرست میں ایسے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل ہے جنھوں نے کسی نہ کسی میدان میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔

پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے مذہبی اداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دنیا بھر کے مسلم ممالک کے طلباء ہندوستان آتے ہیں۔ ہندوستان اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ یہاں اسلامی فلسفے، طرزِ فکر اور ثقافت پر بہترین لائبریریاں موجود ہیں۔

سیکولرازم کا نظریہ کوئی منفی نظریہ نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی حالیہ جنگ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہاں سیکولرازم کی بنیادیں اتنی گہری ہیں کہ مذہب کے نام پر وہ ہل نہیں سکتیں۔ اپنے ملک کی علاقائی یکجہتی کی حفاظت میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑائی لڑی ہے۔ سیکولرازم کے اصول پر ایک آزاد اور خود مختار ملک بنگلادیش کے قیام نے دو قوموں کے نظریے کی بنیاد تک کو ہلا کر رکھ دیا ہے کا

آپ کے خطوط

کیا ہندوستانی مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے؟

محترمی! آداب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے آج تک کے حالات کا عمیق نظروں سے جائزہ لیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس برِصغیر کے مسلم ذہن اور سیاسی شعور کا ترکیبی عنصر صرف مذہب ہی نہیں ہے بلکہ عقیدے۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ آبادی DEMOGRAPHY حالات کے تقاضوں اور سیاسی امکانات اور اس کے نتائج سے مل کر تشکیل پایا ہے۔ ہندوستان کے براعظمی سماج میں اسلام کی ابتدار۔ ارتقار۔ پھیلاؤ اور مدوجزر کی بوقلمونی مسلم ذہن اور سیاسی شعور کے خدوخال کے تعین کے لیے حالات کے ایک انوکھے چوکھٹے کا کام دیتی رہی ہے۔ اسلام ہندوستان میں ہند ثقافتی تہذیبی اور تخلیقی اکائیوں سے گذشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے مقابلہ کر رہا ہے۔ لیکن ابھی تک نہ تو اسلام نے پوری طرح فتح پائی ہے۔ اور نہ مقامی اکائیاں اسے اپنے اندر جذب کر سکی ہیں۔

چنانچہ ہندوستان میں اسلام اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ ایک ہندوستانی مظہر بن گیا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں اس برِصغیر کے لیے مذہب یا فرقے کے نام پر علیحدہ سیاسی تنظیمیں نہ صرف ہمالیہ جیسی بڑی غلطی ثابت ہوئی ہیں بلکہ آج کے سیکولر سوشلسٹ اور جمہوری ہندوستان کے مزاج اور تنوع کے پس منظر میں اور بھی فرسودہ نظریۂ حیات اور غیر حقیقت پسندانہ اندازِ فکر ہے۔

اس برِصغیر کی تقسیم اسی نظریہ کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اگر دوبارہ اس قسم کے خطرناک رجحانات کو نشوونما کا موقع فراہم کیا گیا تو پھر ایک بار مسلم شعور و اندازِ فکر کے دیوالیہ پن اور مسلمان قوم کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔

اگر ہم بیسویں صدی کے مسلم دانشوروں اور مفکروں (طیب جی اور مولانا آزاد سے لے کر عابد حسین تک) کے قومی احساسات اور سیاسی تصورات کا تنقیدی جائزہ لیں تو بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ ہندوستانی سماج کے متنوع کردار کے معنی و مطلب خوب سمجھتے تھے۔ اس ضرورت کا بھی انھیں پوری طرح احساس تھا کہ اس براعظمی تنوع کے اندر ہی ایک "مسلم منزل" MUSLIM DESTINY کا نقشہ ترتیب دینا ہے۔ ان مفکرین کا خیال تھا کہ اگرچہ امت داخلی طور پر جسدِ واحد INTEGRATED SOCIETY ہے لیکن اسے سماج کے دوسرے غیر مسلم اجزار سے اتحاد کرتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مدینہ منورہ میں رسول اللہ نے SOCIAL CONTRACT کی اساس پر نہ صرف یہودیوں اور کافروں سے تعاون کرنا منظور کیا تھا بلکہ اور آگے بڑھ کر مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان اس تعاون عمل کو امتِ واحدہ INTEGRATED AND ONE COMMUNITY سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن آج مسلم ذہن و شعور کٹر فرقہ پرستوں اور سیاسی جارحیت پسندوں کی طاقت آزمائیوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عہدِ حاضر کی بے رحم تاریخی سچائی "اقلیت پسندی" اور علمی روح کے واضح تقاضوں سے صلح کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مختصر یہ کہ اس انتہائی برق رفتاری سے بدلتے حالات اور سائنسی دور میں مسلم قوم علیحدہ سیاسی تنظیم کے ذریعہ حاصل ہونے والے "تحفظات"۔ "عنایات" اور احساسات کے سہارے اپنی "منزل" تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ آج تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اکثریت کے ساتھ تعاون عمل کرتے ہوئے سائنسی تکنیک عقلیت پسندی تجرباتی علوم اور جمہوری نظام کو اپنے اندر جذب کریں اور اپنی جدتِ طبع کا مظاہرہ کریں اور اس طرح یہ ممکن ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہ سہی دارالامان ضرور بن جائے گا۔

ایم عزیز حسین۔ ایم ایس سی بھونیہ

محترمی جناب!

ہندوستانی مسلمانوں کو کیا الگ سیاسی جماعت بنانی چاہیے؟

یہ سوال بے حد پیچیدہ ہے۔ اور چند صاحبان اِس سوال کو قیامِ پاکستان کے پلڑے پر رکھ کر پرکھتے ہیں لیکن حقیقی طور پر وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ قیامِ پاکستان کے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اب کی حالت سے بہت بہتر تھی۔ چاہے وہ آبادی کے لحاظ سے ہو یا سیاسی، سماجی یا اقتصادی حالت میں۔

ہمیں اس وقت یہ نہیں سوچتے رہنا چاہیے کہ آیا ہم الگ سیاسی جماعت کا قیام عمل کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم میں اب بھی اچھا سیاسی شعور ہے، اور اگر ہم ہمت سے کام لیں تو ہندوستانی سیاسی جماعتوں میں کسی ایک اچھی سیکولر جماعت کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اور اسی جماعت میں شامل ہو کر ہم اس کے اصولوں کی حدود میں رہ کر ہی ملک و قوم کی خدمت کریں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اقلیت ہوتے ہوئے بھی اکثریت میں شمار کیے جانے لگیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ان جماعتوں میں سے کس جماعت کا انتخاب کریں۔ اس کا جواب آپ کو گذشتہ درمیانی مدت کے پارلیمنٹ الیکشن میں کانگریس کی کامیابی کی صورت میں ملے گا۔ ہر خاص و عام جانتا ہے کہ اس پارٹی کو کامیاب کرنے میں اقلیتوں خاص کر مسلم اقلیت نے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی۔ میرا مطلب اس پارٹی کا ہند دگپنڈا کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ جسے ہر ایم پی (بشرطیکہ وہ کامیاب ہوا ہو) سے لے کر وزیرِ اعظم ہند تک تسلیم کرتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا سیاسی جماعتیں مسلم نمایندگی قبول کریں گی۔ اس کا جواب ملک کے عوام دے سکیں گے۔ ہر جماعت اقلیت کو اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے خاص کر

مسلم اقلیت کو۔ یہاں تک کہ جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعت بھی اپنے چند خاص اصولوں کے تحت اپنی جماعت میں مسلم نمائندگی لے رہی ہے۔ اگر ہم مسلمان چاہیں تو اس جماعت میں ہی قدم جما سکتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلے گی، فرقہ وارانہ کشیدگی اور کشمکش بڑھے گی۔ علیحدگی پسند سیاست کو تقویت ملے گی جس سے ملک میں انتشار و خلفشار بڑھے گا۔ اور ہمارے اندر ہندوستانیت کا جذبہ کبھی نہ ابھر سکے گا۔ اس وقت ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

ہر فرقے میں رجعت پسندوں کا گروہ موجود ہے یہ گروہ اپنے فرقے کے لوگوں کو قومی دھارے سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے۔ اس قبیل کے لوگوں کی طرف سے ہی علاحدہ سیاسی جماعت کی بات کہی جاتی ہے۔

سیکولرازم، سماجی برابری، معاشی انصاف اور یکساں مواقع کے اصول ہمارے سیاسی نظام کی بنیاد ہیں۔ ان اصولوں پر چل کر ہی مختلف فرقوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اصولوں کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھیں اور پھر اپنے فکر و عمل کو اس کے مطابق ڈھالیں تاکہ اپنے اپنے مفادات کی خاطر مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں کھڑی کریں۔ ضرورت فرسودہ اندازِ فکر کو بدلنے کی ہے۔

کے۔ ڈی۔ ناگپال۔ پنڈی گڑھ۔

مکرمی تسلیم!

میرے خیال میں مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمان کا مسئلہ اتنا زیادہ سیاسی نہیں ہے جتنا کہ معاشی اور تعلیمی ہے۔ اس مسئلہ کا حل بھی سیاست میں نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج کے دور میں اور خاص طور پر جمہوریت میں بغیر سیاست کو سمجھے اور جانے خوشگوار شہری زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایک جمہوریت میں جہاں سیاسی اکثریت کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔ کوئی بھی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاسی طور پر اپنے کو اقلیت بنا کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی قومی اقلیت اس وقت ہی قومی زندگی میں کوئی بہتر رول ادا کر سکتی ہے جبکہ وہ تعلیمی اور معاشی طور پر بہتر ہو۔

ہندوستانی مسلمانوں کو ایک علیحدہ معاشی اور تعلیمی تنظیم کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن ایک علیحدہ سیاسی جماعت ان کو کسی بھی طرح سے فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

زیادہ تر مسلمان غریب ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ مزدور اور دستکار ہیں لیکن ہندوستان میں صرف مسلمان ہی غریب اور پسے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کی ۸۰ فیصد آبادی غریبی اور معاشی استحصال کی شکار ہے۔ ہر سیاسی جماعت معاشرے کے کسی طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ غریب اور مزدور پیشہ اور استحصال کے شکار مسلمانوں کو ایسی جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیے جو غریبوں اور مزدوروں کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں۔ مسلمانوں کو نہ صرف ان جماعتوں میں شامل ہونا چاہیے بلکہ ان جماعتوں کی لیڈرشپ اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہیے کیونکہ مسلمان دوہرے استحصال کا شکار ہیں۔ معاشی، معاشرتی اور مذہبی۔ اس حالت میں مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے حقوق کے لیے لڑیں بلکہ دوسرے طبقوں اور مذہبوں کے کروڑوں پسے ہوئے لوگوں کو بھی راستہ دکھائیں۔ اس طرح مسلمان ایک سیاسی اقلیت نہیں بلکہ سیاسی اکثریت کا حصہ بن جائیں گے۔ کسی بھی جمہوریت میں اقلیت سے اکثریت کا بننا ہی سیاسی کامیابی کہلاتی ہے۔ ہر سیاسی جماعت ہر وقت ہر کام اقلیت سے اکثریت بننے کے لیے کرتی ہے۔

دوسری طرف بہت سے دولت مند مسلمان بھی ہیں۔ جن کی نمائندگی دوسری بہت سی جماعتیں زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہیں۔ اگر مسلمان سیاسی طور پر اپنے کو پوری قوم سے الگ کر لیں تو وہ ہمیشہ کے لیے ایک سیاسی اقلیت تو بن سکتے ہیں لیکن اکثریت نہیں۔ اس طرح کچھ وقت کے لیے وہ منفی رول ادا کر کے ہو سکتا ہے کہ کچھ مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن اس قسم کے منفی اور PRESSURE POLITICS زیادہ دن تک کامیاب نہیں رہتی اور ایسی سیاسی جماعتیں بہت جلد تمام سیاسی جماعتوں کا اعتبار کھو دیتی ہیں۔

اس لیے میرے خیال میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ تعلیمی اور معاشی تنظیمیں بنانے کا ہے نہ کہ سیاسی جماعتیں۔ اگر مسلمان تعلیم یافتہ ہوں گے تو انھیں ان حقوق کو حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ تعلیمی اور معاشی طاقت ہی ہے جس کے بل پر مٹھی بھر یہودی دنیا کی سیاست پر کنٹرول رکھتے ہیں۔

محمد واحد۔ جے پور

مکرمی تسلیم

میں واقعات بڑے شوق سے پڑھا کرتا ہوں۔ آپ نے جس موضوع پر قارئین کی رائے دریافت کی ہے۔ اس کے تحت میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ آج کا دور سیاست کا دور ہے ہمارے ملک میں بہت سی سیاسی جماعتیں یا پارٹیاں کام کر رہی ہیں جن کا الگ الگ منشور بھی ہے۔ انتخابات سے قبل سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو جو سبز باغ دکھاتی ہیں وہ صرف فرضی ہوا کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے لے کر آج تک سیاسی جماعتوں کی حکومتیں چاہے وہ صوبائی ہوں یا مرکزی مسلم مسائل کو سلجھائی کیا بلکہ الجھاتی ہی چلی گئیں۔ مثال کے طور پر اردو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہی لیا جائے کہ ان کے ساتھ کتنی ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ فرقہ پرست جماعتیں تو مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہیں۔ اگر ہمیں اپنی ہستی اور تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنا ہے اور اس ملک میں باعزت طور پر رہنا ہے تو یہاں ملک گیر پیمانہ پر ایک سیاسی جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے ملی اور ملکی اتحاد کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس کے ذریعہ سیاسی و مذہبی بیداری لائی جا سکتی ہے۔ آج کا مسلمان اپنے کو بھول کر سبھی پارٹیوں میں منقسم ہو گیا ہے جہاں اس کے ذاتی مفاد کچھ حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن قومی فلاح و بہبود کی بات وہ سوچ تک نہیں سکتا۔ آج بھی ملک کے اندر کچھ مسلم سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن یا تو ان کا نظم و نسق ڈھیلا ہے یا مسلمانوں کا ابھی اس طرف رجحان نہیں۔ مسلمانوں کی بدحالی کم کرنے میں ایک مسلم سیاسی جماعت اہم رول ادا کر سکتی ہے

ابو بشر خاں، بمبئی

جناب ایڈیٹر صاحب! آداب

کیا ہندوستانی مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی جماعت

ضرورت ہے ؟

یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اس کے حق میں اور
کے خلاف بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال
ہندوستانی مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی جماعت کی
ضرورت نہیں۔ ملک میں ایک ایسی پارٹی کی تنظیم کرنا
جو ایک مذہبی فرقے کے مفاد کو تقویت پہنچانا چاہتی
سیکولرازم اور جمہوریت کی اسپرٹ کے منافی ہے۔
ایک ایسی سیاسی جماعت جس کی رکنیت صرف
ہی فرقہ تک محدود ہوگی۔ سو فیصدی فرقہ پرست
جماعت ہوگی۔ علاوہ ازیں اس کا ردِ عمل دوسرے
فرقوں میں بھی ہوگا۔ مسلمانوں کی طرح اگر وہ لوگ
بھی اپنے اپنے فرقے کے مفادات کی خاطر مذہب کی
بنیاد پر الگ الگ سیاسی جماعتیں بنالیں تو ملک میں
...ن حکومت میں حصہ لینے کے لیے سوچا۔

مسلمان کہیں بھی ہوں ایک ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی
یوپی والوں کا ہی نہیں مسلمانانِ ہند کا قومی سرمایہ
کیرلا ہو یا کشمیر سب مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی سے
روحانی تعلق ہے۔

"فیشن ایک سماجی برائی ہے" محمد رضی الدین کا مضمون
غور طلب ہے جو سماج کے لیے تباہ کن اور گمراہ کن
... انھوں نے سنجیدگی سے تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھ
کر ایک اہم مسئلہ پر توجہ دی ہے۔ اسی طرح اگر آیندہ
ان کی انگلی ایسے ہی دوسرے مسائل پر جائے گی
تو اچھا ہوگا۔ مثلاً جہیز، شادی، رسم و رواج، تعلیمِ نسواں
وغیرہ۔ ان کا مضمون سماجی اصلاح کے لیے کارآمد ہے۔
لکھنے والوں کی واقعات ضرور ہمت افزائی کرے۔

"داؤدی بوہرا" میں اگر وسیع النظری پھیل جائے تو
مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مگر مسلمان ہیں کہ متفق
ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کاش وہ جلد ہی سنبھل جائیں۔

واقعات کو آپ لے نئے دھارے پر لے جانے کی کوشش
کی ہے۔ مگر آپ کے ستارے "نئے دور کے لیے زیب نہیں
دیتے۔ آپ کے ستارے چمکیں گے تو خوشی حاصل ہوتی ہے
اور مدھم پڑ جائیں تو فکر لاگو ہوتی ہے اس لیے بند
کر دینا بہتر ہے۔

طنز و مزاح کا سلسلہ کافی مزاحیہ ہے۔ عبد البصیر نعیمی

کا قلم بالکل صحیح راہ پر چل رہا ہے۔ اس لیے عورتوں کو
ان کی باتیں سننا چاہئیں۔ اسلام میں کسی پر زیادتی کی
اجازت نہیں ہے۔ ہر ایک کے حقوق برابر بانٹ دیئے گئے
ہیں۔

آپ نے اس کے ساتھ ساتھ فلم کے لیے بھی ایک صفحہ
رکھا ہے۔ بہت مسرت ہوئی۔ فلم ایک برائی کے ساتھ ساتھ
تفریح ہے۔ اگر اس صفحہ پر آئندہ فلم کی حقیقت پر روشنی
ڈالیں تو اچھا ہوگا۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں عام معلومات
کے لیے بھی ایک صفحہ مخصوص کریں۔ راسود عبدالجلیل —

نیا ہندوستان اور مسلمان

مکرمی! السلام علیکم

سہ روزہ دعوت، دہلی مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں میرے مضمون نیا ہندوستان اور مسلمان (واقعات دسمبر نصف دوم) پر تنقید کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ میں نے جماعت کے تعلق سے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور یہ کہ فرقہ پرستی جماعت کا شیوہ نہیں۔ اس کے ثبوت کے طور پر احمد آباد اور بہار کی مثالیں دی گئیں ہیں۔ جہاں ریلیف کا کام کرتے ہوئے جماعت نے ہندو اور مسلمان میں تفریق نہیں برتی۔ جماعت کا یہ رویہ قابلِ ستائش ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے مضمون میں جماعت کا یہ مثبت پہلو نہ لا سکا۔

لیکن مجھے یہ کہنے دیجیے کہ اس طرح یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جماعت اسلامی بہت زیادہ سیکولر یا غیر فرقہ پرست آرگنائزیشن ہے۔ میں نے جو بھی لکھا وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھا۔ میں نے کئی لوگوں سے انٹرویوز لیے۔ جماعت کے تعلق سے ان کی رائیں معلوم کیں۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ جماعت اسلامی کی وجہ سے فرقہ پرستی کو تقویت پہنچتی ہے اور ہندو فرقہ واریت کے لیے جواز پیدا ہوتا ہے۔ جماعت کے وسیع لٹریچر سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں۔ لیکن اس تعلق سے لوگوں کی اور خصوصاً مسلمانوں کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں کو اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے۔ کیا واقعی یہ لوگ سیکولرزم اور سوشلزم پر یقین رکھتے ہیں۔

تنقید نگار نے اس بات کا دعویٰ تو کر دیا کہ جماعتِ اسلامی جمہوریت پر یقین رکھتی ہے، لیکن بڑی ہوشیاری سے میرے مضمون کا وہ حصہ حذف کر گئے جہاں میں نے مولانا مودودی کی اس تقریر کا حوالہ دیا تھا جس میں انھوں نے سیکولرزم، قوم پرستی اور جمہوری اصولوں کی نفی کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان کی جمہوریت پسندی کے تعلق سے کوئی ٹھوس دلائل بھی نہیں دیئے کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی نے جو کچھ کہا تھا وہ سب لغو تھا؟ یا اب جماعت نے کوئی نئی پالیسی اپنائی ہے ؟

اس کے علاوہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے مقصد پر ذرا غور کیجیے۔ اور آج کے موجودہ ہندوستان کی عمومی حالت پر نظر ڈالیے۔ آج کا مسلمان ان گنت معاشی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل سے دوچار ہے۔ ایسی فضا میں خلافت کی طرز پر اسلامی حکومت کا قیام کیا ممکن ہے؟ اور کیا ایسی حکومت آج کے مزاج کے مطابق ہو سکتی ہے۔ ظہیر محسن۔ اورنگ آباد

جماعتِ اسلامی فرقہ پرست نہیں

مکرمی و محترمی! آداب عرض

واقعات کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ جو ایک قوس و قزح بن کر نگاہوں کے سامنے چکر لگانے لگا صفحہ اول سے آخر تک تمام رنگینیاں بھری ہوئی ہیں۔ واقعات کا ٹائیٹل بھی حسین ہے۔ آپ کا اداریہ یک طرفہ نظر آتا ہے۔ شاید یہ حکومت کے خوف سے ہو۔ کیونکہ آپ نے دوسرا رُخ چھپا رکھا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر۔ کیونکہ اس میں صرف یحییٰ خان کی بنگالیوں پر بربریت کا رونا رویا ہے۔ مگر بے قصور اور معصوم غیر بنگالیوں پر جو مظالم بنگالیوں نے ڈھائے ہیں انھیں پردۂ راز میں رکھا ہے۔ پاکستان میں نام کو تو اسلام ہے مگر اب بنگلا دیش میں اسلام کا نام لینے کے لیے بھی یہاں کے لوگ شرمائیں گے۔ مسلمانوں کو افسوس ہونا چاہیے کہ وہ اب بھی متحد نہیں ہوتے جبکہ چین اور امریکا مل سکتا ہے۔

دہلی کی ڈائری" کو مستقل عنوان کے طور پر رکھیے۔

شاید آپ نے گوتم گاندھی کا دیس' سیاسی پارٹیوں کا تعارف بند کردیا ہوگا۔ مگر اس کے بجائے اگر کچھ دلچسپ عنوانات رکھے جائیں تو بہتر ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت، خواتین کا صفحہ سائنس وغیرہ۔

پھول اور کانٹے" بے حد پسند آیا۔ خدارا اس کو کبھی بلند نہ کیجیے۔ اس کے لیے ایک صفحہ کی بجائے دو صفحات ہوں تو اور بہتر ہے۔ "انکار و اقرار" "مشرقِ وسطیٰ" کی زبان میں اور زیادہ لچک روانی اور جوش رہے تو دلچسپ رہے گا۔

ظہیر محسن نے جو ایک وسیع خیالات اور مسلمانوں کے لیے ترقی پسند بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنی ترقی پسندی اور وسیع نظری کو اور زیادہ وسیع کرنے کے لیے اپنے مضمون نیا ہندوستان اور مسلمان" میں جماعت اسلامی اور جن سنگھ کو ایک صف میں اس لیے کھڑا کیا ہے کہ توازن برقرار رہے۔ جماعت جو ایک فلاحی جماعت ہے سیاست سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ ایک سیاسی اور فرقہ پرست پارٹی جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس سے بے دھڑک موازنہ کیا ہے۔ اس کی پالیسی جمہوری نہیں ہے اس لیے وہ جمہوری حکومت میں حصہ نہیں لیتی۔ اور پاکستان میں جمہوری حکومت ہی کہاں تھی۔ اور وہاں سیکولرزم اور سوشلزم کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال صحیح طریقے سے کرکے اس جماعت کے فرقہ پرست اصولوں کو سیکولر اصولوں میں بدل سکتے ہیں۔

کیا یہ ملک وقوم کی خدمت نہیں؟ اور کیا قوم و ملک کی خدمت کرنے کے لیے الگ سیاسی جماعت کا قیام ضروری ہے۔ سراج۔ع۔غ۔ (رنگ پلی)

کچھ "واقعات" کے بارے میں

السلام علیکم:۔

واقعات کا معیار آپ نے تقلیدی حد تک بلند کیا ہے۔ لئے ہم اردو صحافت کا درخشندہ شاہکار سمجھتے ہیں کاش اس کی دیکھا دیکھی اور بھی پرچے اپنے معیارِ صحافت کو بلند کرسکیں۔ کامیابی کے لیے مبارکباد قبول فرمایئے۔

تقی شاد بھاگلپور

محترم بھائی! عقیدتیں

دسمبر ۱۹۷۱ء کے واقعات کا نصف دوئم بے حد پسند آیا۔ اس مرتبہ کی خوشگوار تبدیلیاں کافی حسین بھی ہیں اور اہم بھی اسے دیکھنے اور پڑھنے کے بعد تاخیر کی ساری تھکن جاتی رہی۔ لیکن پیاس بڑھ بھی گئی۔ اس لیے کہ اس میں مزید تبدیلیوں کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔

خلوص کار — فاروق راہب

محترم صدیقی صاحب — السلام علیکم

واقعات کا دوسرا روپ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ امید کہ۔ واقعات اسی طرح علم وادب اور خبروں کا خزانہ بن کر ناظرین کے لیے دلچسپی کا مظاہرہ کرے گا۔

خدا سے دعا ہے کہ واقعات روز افزوں ترقی کرے آمین۔

عاصی — محمد سرور خاں اندرون پھاٹک

مکرمی جناب منیجر صاحب؛ سلام مسنون

دسمبر نصف دوم کا واقعات نظر نواز ہوا۔ واقعات پہلے سے کہیں زیادہ عمدہ، بلند اور جاذب نظر نظر آیا تمام مضامین تعریفوں کی حدوں سے بھی زیادہ بلند اور اونچے ہیں۔ خاص کر محمد رضی الدین صاحب نے فیشن ایک سماجی برائی ہے" کے اندر ہر ایک پہلو کو اجاگر کرکے اس کے بُرے اثرات اور تباہ کن نتائج کا خوب جائزہ کیا ہے۔ جناب عبد البصیر صاحب نعیمی کا مضمون "مسلم خواتین اور موجودہ سماج" جدید تہذیب اور نئی روشنی کی دلدادہ عورتوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے سیاسی اور مذہبی فرقوں پر معلومات افزا مضامین کا سلسلہ اسی طرح برابر قائم وجاری رکھیے۔ گویا واقعات کا ہر شمارہ یہ کہتا ہوا اپنے قاری کے پاس پہنچتا ہے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

خیر اندیش العبد محمد منصور احمد قاسمی (بہار)

مکرمی محترمی! تسلیم

واقعات اب بڑا ہی خوبصورت، دیدہ زیب اور معیاری ہوگیا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ گذشتہ شمارے میں مسلمانوں کے بوہرا طبقہ پر مضمون معلوماتی اور چونکا دینے والا تھا۔ نئے انداز کو یہاں مقامی علمی وادبی حلقے میں سراہا جارہا ہے۔

محمد شاہد عظیم (حیدرآباد)

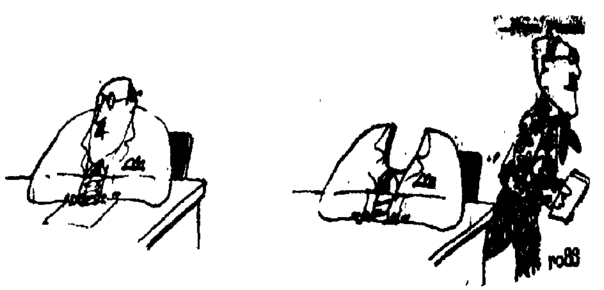
لانا محمد علی جوہر

جو تقریر کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندو مسلم
قدر حامی تھے۔ انھوں نے کہا۔
لُ ہندو میرے گھر والوں کی توہین کرے یا بی اماں پر
ے تو نہ میں عدالت میں جاؤں گا نہ اس سے بدلہ
ر اس صورت حال کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ ہماری تفرقہ
ے انگریزوں کا فائدہ ہو رہا ہے۔" مگر افسوس اتنے
ر کے باوجود بھی مِلاپ نہ ہو سکا۔
لانا محمد علی کی آخری تقریر جو انھوں نے لندن میں
رکانفرنس میں ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے



ندس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا مزار ــــ

رگی کی حالت میں کی تھی اس بات کا پتا دیتی ہے کہ ان کی
رطبیعت غلام ملک میں زندہ رہنے کی بجائے آزاد دیار
ں مرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ آخر کار قدرت کو بھی ان کی
پسند آئی اور کانفرنس کے اختتام کے بعد ۴ جنوری
ء کو آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور آپ
ت کو لندن سے بیت المقدس میں لیجا کر سپردِ خاک کیا گیا۔
ے ملت پہ ہے تیری موت کی تابندگی
کہ ہو گئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار
مولانا جوہر آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، اور نہ انکی یاد
نے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے
ملت اپنے اکابرین کی خدمات کو فراموش کرتی ہے زمانہ بھی
نظرانداز کر دیتا ہے۔ ●●



بلا تبصرہ

بقیہ ـــ مجھے میرے ہمسایوں سے بچاؤ

سب لوگ انھیں سامنے بٹھا کر انکی پوجا کرتے رہیں۔ ہم جہاں کسی اور ہمسائے کے یہاں آئے یا گئے یا کسی اور سے زاید تعلقات بڑھائے تو انکا منہ پھول گیا۔ ان کے یہاں جاؤ، میرے یہاں کیوں آئی ہو۔ ان سے ملو۔ مجھ سے مل کر بھلا تمہیں کیا ملے گا۔؟ میں تمہاری کیا لگتی ہوں۔

مسز دِدانی بھی ہماری ایک ہمسائی تھیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ نہ جانے زندہ ہیں یا مر گئیں۔ بہرحال محلے بھر میں لڑائی کروانے میں وہ ماہر تھیں۔ ہر روز کسی نہ کسی گھر میں وہ لڑائی کرا دیتیں اور پھر صلح صفائی کرانے بھی خود ہی پہونچ جاتیں۔ تیری نند نے یوں کیا۔ تیری بھاوج نے یہ کہا۔ اس کی ساس یہ کرتی ہے تیرا میاں ایسا ہے۔

بس لگائی بجھائی کر کے تماشا دیکھتیں اور پھر کٹنی بن کر باتیں بنانے لگتیں۔ میں نے یوں تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو یہ کہا تھا اور اس لئے کہا تھا۔

ایک اور ہماری ہمسائی ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھیں ہم احتراماً خالہ بی کہا کرتے تھے۔ بس کچھ نہ پوچھئے خالہ بھابی کا حق انھوں نے یہ ادا کیا کہ مجھے زندگی سے بیزار کر دیا۔ نہ میرے بغیر انکی کبھی کوئی شاپنگ ہوتی تھی نہ میرے مشورے کے بغیر انکی کوئی تقریب انجام کو پہونچتی تھی۔ ان کے بچے اسکول میں داخل کرانے جاؤں تو میں، ان کے اسکولوں میں جب بھی جلسے میلے ہوں تو بھی خالہ کے بجائے مجھے ہی بچوں کے ساتھ جانے کا فریضہ انجام دینا پڑے۔ ان کے یہاں کوئی مہمان آئے تو مجھے اس سے ضرور ملنا چاہئے۔ بس اللہ سے دبے لفظوں شکایت بھی کرتی کہ اے خدا اگر یہ مجھ پر اتنی ہی فریفتہ ہیں تو تو نے مجھے انہی کے گھر پیدا کر دیا ہوتا تاکہ میں خالہ بی اور کام آتی۔ میں اکیلی ہی نہیں بلکہ میرے پورے گھر سے وہ اسی طرح کام لیتی ہیں ذرا انکار کرو یا تساہل برتو، تو بس ایک دم سیخ پا ہو جاتی ہیں، میں تو تم پہ اپنی جان بھی قربان کر دوں اور تم میرے لئے آنا ذرا سا بھی کام نہیں کر سکتے۔

ان کے تجربے سے میں نے ایک سبق حاصل کیا کہ پڑوسیوں سے کبھی زیادہ ربط و ضبط نہ بڑھانے چاہئیں اور پاس رہتے ہوئے اجنبیوں کی طرح گزرنے ہی میں عافیت ہے۔ اگر کوئی مجھے اکل کھرّا کہے تو کہے، مغرور سمجھے تو سمجھے۔ کوئی سچ پوچھے تو میں ہمسایوں سے عاجز آگئی ہوں۔ جب ایک نئی کالونی میں منتقل ہوئے تو سوچا تھا کہ شاید یہاں کچھ اچھے لوگ مل جائیں گے مگر یہاں آکر تو یہی جی چاہا کہ میں اس کالونی کو بھی چھوڑ جاؤں۔ اس کالونی کو جس کی خوبصورتی پہ میں فدا ہو گئی تھی۔ صاف ستھری اور ہوادار خوبصورت فلیٹس پر مشتمل۔ بالکل جدید انداز کی۔ امریکی اسٹائل کی بنی ہوئی یعنی بالکل فری اسٹائل۔ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے دوسرے گھروں کے صحن، برآمدوں اور خوابگاہوں تک میں جھانک لیجئے، جو پردہ کرنا چاہے وہ یا تو نقاب ڈال لے یا پیٹھ موڑ کر بیٹھ جائے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں کہتا کیونکہ ہر گھر کی ہر گھر سے برابر کی بے پردگی ہے لہٰذا کون کسے کہے۔ ہر شخص اپنے فلیٹ میں مطمئن ہے کسی کا کسی چیز میں ساجھا نہیں۔ یہاں کی زندگی کتنی مطمئن ہوتی اگر یہاں کے لوگوں کے ذہن روشن اور دل کشادہ ہوتے۔ کوئی کسی کے یہاں آئے کوئی کسی کے یہاں جائے۔ کوئی اکیلا آئے۔ اکیلا جائے۔ پردہ کرے یا بے پردہ رہے۔ بھلا کسی کو کیا۔ خواہ مخواہ خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اب دو ہی حل ہیں کہ یا تو یہ کالونی چھوڑ جاؤں یا تہجد پڑھ کر یہ دعا مانگنا شروع کر دوں کہ مجھے میرے ہمسایوں سے بچاؤ۔ ●●



شمن کھانہ منڈپال بمبئی میں ۱۹۷۰ء کی فلموں کے سلسلے میں بھارت اور اُروشی ایوارڈ پانے والے اداکار سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان۔ بہترین چائلڈ ایکٹر کا ایوارڈ پانے والے رشی کپور (بائیں طرف) کے ساتھ

فلمی دنیا

دو بوند پانی

نیا سنسار کی ایسٹ مین کلر فلم "دو بوند پانی" سنسر نے پاس کردی ہے اور اسی ماہ ریلیز کیجا رہی ہے۔ خواجہ احمد عباس اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور افسانہ نگار ہیں۔ گانے کیفی اعظمی اور اور بال کوی بیراگی کے ہیں۔ سمی گریوال۔ مدھو چندا۔ جلال آغا کے ساتھ ہی خواجہ صاحب روایت کے مطابق ایک نیا چہرہ کرن کمار پیش کر رہے ہیں۔

ننھی کلیاں

راجا فلمز کی ننھی کلیاں سنسر سے پاس ہوگئی ہے۔ ڈائریکٹر رتن دیپ چوپڑا کی اس فلم کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک گھوڑا اس فلم کا ہیرو ہے اور تین کمسن بچے راجا۔ راجو اور رانو اس فلم کی جان ہیں۔ اداکاروں میں چاند عثمانی۔ مراد۔ رشید خان۔ سندیپ اور رینا بھی شامل ہیں۔ یہ فلم آج کل ہی میں ریلیز ہونے والی ہے۔

پڑوسی

ہمسایہ فلم کی پڑوسی بھی سنسر سے پاس ہوگئی ہے۔ پرتھوی راجکپور، ریحانہ سلطان اور دلیپ راج نے اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ معاون اداکار دھومل۔ نیلم۔ سلوچنا چٹرجی اور جانی وسکی وغیرہ ہیں۔ جگدیش پنت اس فلم کے افسانہ نگار، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہیں۔ موسیقی روی کی اور گانے پردیسی اور اسد بھوپالی کے ہیں۔ یہ فلم جلد ہی پردہ سیمیں پر آنے والی ہے۔

عادل رشید کی موت

گزشتہ ۳ جنوری کو ناناوتی ہسپتال بمبئی میں اُردو کے صاحب طرز افسانہ نگار عادل رشید کا انتقال ہوگیا۔ وہ صرف ۵۲ سال کے تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور چھ بچے چھوڑے ہیں۔ عادل رشید کو جوہو کے قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی کیونکہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے انھیں گہری وابستگی تھی ــــ خواجہ احمد عباس۔ کرشن چندر۔ جاں نثار اختر۔ حسرت جے پوری۔ لیش چوپڑا اور ایس۔ ایم۔ ساگر نے انھیں سپرد خاک کیا۔

عادل رشید ۱۵۰ ناولوں کے خالق تھے۔ ان کا پہلا ناول "روپ" تھا جس کے کئی ایڈیشن اردو اور ہندی میں شائع ہوئے اور آخری ناول "دل کی کہانی" تھا۔ گیسٹ ہاؤس، حسینہ اور مالہ کے آنسو کی کہانیاں عادل رشید ہی نے لکھی تھیں۔

اے جی فلمز کی آئندہ فلم کے لئے وہ اسکرین پلے اور مکالمے لکھ رہے تھے۔ یہ فلم ان کے ناول "برباد آشیانہ" کی بنیاد پر بن رہی تھی۔ انتقال سے پہلے وہ اپنے ناول "ارچنا" کی بنیاد پر خود اپنی فلم تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے جس کے لئے ریحانہ سلطان کو سائن کرلیا گیا تھا لیکن موت نے انھیں اس کی اجازت نہ دی۔

مرحوم کے سینے میں محبت بھرا دل تھا۔ وہ انتہائی ملنسار اور بے تکلف انسان تھے افسوس کہ آج وہ ہمارے درمیان سے اٹھ چکے ہیں۔

حسد کی آگ

فلم اسٹاروں میں حسد کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس جذبے کے اظہار کی بدترین مثال گزشتہ ۲۳ جنوری کو بمبئی میں اسوقت دیکھنے میں آئی جب ۱۹۷۰ء کی فلموں کے لئے ۱۸ ویں نیشنل ایوارڈز کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس وقت تقریب میں راجکپور اور دتی کو چھوڑ کر باقی تمام بڑے بڑے فلمسٹار شریک نہیں ہوئے۔ بی۔ این سرکار کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ۔ ستیہ جیت رے کو بہترین ڈائریکٹر اور اسکرین پلے رائٹر ایوارڈ۔ سنجیو کمار، ریحانہ سلطان اور رشی کپور کو بالترتیب بہترین ایکٹر، بہترین ایکٹرس اور بہترین چائلڈ ایکٹر ایوارڈ دیے گئے۔ مرکزی وزیر اطلاعات شریمتی نندنی ستپتی نے یہ ایوارڈ تقسیم کئے۔ ●●



فلم "دستک" کا ایک منظر جس میں بہترین اداکاری کے لیے سنجیو کمار اور ریحانہ سلطانہ کو اس سال کا اروشی ایوارڈ دیا گیا۔

کشمیر ۔ عزائم

جمہوریہ ہند کے ایک حصّہ کے طور پر جموں و کشمیر ریاست نے گذشتہ ۲۲ برس میں بہت کچھ ترقّی کی ہے مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ۔ چناں چہ وزیرِ اعلیٰ **سید میر قاسم** نے اس کام کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا ہے جو ہمارے سامنے ہے مثلاً :-

* زرعی میدان میں چو طرفہ توسیع
* خشک سالی سے مقابلہ کرنے کے لیے آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ
* بے روزگاری کی صورتِ حال سے سختی سے نمٹنا
* فنِ باغبانی کی ترقی
* بڑے پیمانے پر بجلی سپلائی کو بہتر بنانا
* چار سو دیہات میں بجلی پہونچانا
* صنعتی میدان میں منصوبہ بند ترقی
* چھوٹی صنعتوں میں چار سو نئی یونٹیں قائم کرنا
* جنگلات کی صنعت میں سرکاری سیکٹر کی توسیع
* دستکاری کو ترقی دینا
* تعلیمی سہولتوں کی اس طور پر توسیع کہ ۶ سے ۱۱ سال تک کے تمام بچے مستفید ہو سکیں ۔
* اپنے عوام کے پسماندہ طبقوں کی حالت کو بہتر بنانا

آیئے اس یومِ جمہوریت اور نئے سال میں ہم عہد کریں کہ ہم انتھک کام کریں گے اور ان مقاصد اور دوسرے کاموں کے حصول کے لیے جو ہمارے سامنے ہیں ، اپنی زندگی کو وقف کر دیں گے !

REGISTERED WITH THE REGIS R OF NEWSPAPERS IN NO.

FEBRUARY
FIRST HALF

WAQIAT

REGD. NO. D 629
TELEPHONE : 615095



واقعات

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

• دنیا اکیسویں صدی میں

• افغانستان — ایک کوہستانی



وقارِ مادرِ ہندوستان

بس اہل دل سے عزمِ کامراں کی بات کرو
نہ کم نصیبوں سے بختِ جواں کی بات کرو

ہے اچھے اچھوں کے چہروں پہ زردئ افلاس
کہاں ہے حسن جو حسنِ بتاں کی بات کرو

اسی کی خاک سے پیدا ہوئے اسی پہ مٹو
وقارِ مادرِ ہندوستاں کی بات کرو

ہنسا کئے اب نہ زمانے کو اپنی وحشت پہ
خدا کے واسطے امن و اماں کی بات کرو

بھلادو دل سے یہ بغض و عناد کے قصّے
بس اب حسابِ دلِ دوستاں کی بات کرو

جیئو تو حق کے لئے اور مرو تو حق پہ مرو
رہِ وفا میں نہ سود و زیاں کی بات کرو

نہ اٹھ سکا جو فرشتوں سے بھی ازل کے دن
کرو تو بس اُسی بارِ گراں کی بات کرو

بنا دو عزم سے گلزار آتشِ نمرود
سقر میں رہ کے نہ باغِ جناں کی بات کرو

تڑپ دکھا دو زمانے کو دردِ فرقت کی
قفس کو لے اڑو جب گلستاں کی بات کرو

کمند بس ڈال بھی دو بڑھ کے بامِ رفعت پر
اگر ہو مرد تو عزمِ جواں کی بات کرو

عروجِ آدمِ خاکی کا یہ زمانہ ہے
بے خودی ہو اور لامکاں کی بات کرو

کہیں نہ خود کو رہِ جستجو میں کھو دینا
سمجھ کے سوچ کے اس بے نشاں کی بات کرو

ہے باقی لغزشِ آدم سے شانِ آدم کی
نہ مجھ سے طاعتِ کرّو بیاں کی بات کرو

نہ جھک سکے گا سرِ عشق سجدہ گاہوں میں
جو فخرِ سجدہ ہے اس آستاں کی بات کرو

مٹا سکے گا نہ مجھ کو جہاں کا کوئی غم
نہ مجھ سے بخششِ صاحبقراں کی بات کرو

نتیجہ ایک ہی نکلے گا دردِ فرقت کا
یہاں کی بات کرو یا وہاں کی بات کرو

نہ چھیڑو قصۂ عیشِ جہاں کہ دل ہے اُداس
بس اب تو لذتِ دردِ نہاں کی بات کرو

کبھی نہ چھوڑیں گے ہم مادری زباں اپنی
کمالِ عزم سے اُردو زباں کی بات کرو

نوازتا ہے تمہیں اب کلامِ ساحر کو
کبھی تو بھولے سے اس کے بیاں کی بات کرو

ساحر بھوپالی

غزل

غنچہ غنچہ چاک بداماں
گلشن کا اللہ نگہباں

وہ آئے ہیں آج پشیماں
ضبطِ مسلسل تیرے قرباں

میری فطرت میں خودداری
اُن کا تغافل نازکا خواہاں

مجھ کو خوشی دو یا تم غم دو
وہ بھی احساں یہ بھی احساں

وہ دن بھی اب یاد رہیں گے
حاصل تھا جب کیفِ بہاراں

کوئی یہ پوچھے مجھ کو ڈبو کر
پھر کس سے ٹکرائے گا طوفاں

انساں کو احساس نہیں ہے
گر گئی کتنی قیمتِ انساں

دیکھ کے جس کو حیرت سی ہے
تیرا ادب اور شانِ شغلوا

منظور ادیب

...نغمات
نئی دہلی

فروری سنہ ۱۹۸۱ء
نصف اوّل دوم
سال ـــــ ساتواں شمارہ

مدیر
عبدالوحید صدیقی

صدر دفتر
۱۰۹ نظام الدین ایسٹ ـ نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵
ایک کاپی کی قیمت ۵۰ پیسے سالانہ ۱۸ روپے

مضامین نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے وصول ہوں اُن کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مدیر کو کلی اختیار ہے۔

مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

نغمات میں شائع شدہ مضامین "واقعات" نغمات دہلی" کے حوالے سے شائع کرنے کی عام اجازت ہے۔

انتظامی اور ادارتی امور متنازعہ کے فیصلے کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا۔

پرنٹر پبلشر اور ناشر عبدالوحید صدیقی
مطبوعہ (آفسیٹ) پریس دہلی ۶

ایک تیر سے دو شکار

اخبارات و جرائد میں پہلے کچھ دنوں سے لاہور ہوائی اڈے پر ہندوستانی ہوائی جہاز کی تباہی کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔ یہ اس امر کا مظہر ہے کہ یہ کوئی معمولی نہیں بلکہ بڑا سنگین واقعہ تھا جس کا دنیا نے سخت نوٹس لیا۔ پاکستان اس واقعے کے لیے صرف ان دو کشمیریوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے جنھیں اب ہوائی قزاق کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے لیکن ہندوستان ہی نہیں بلکہ خود پاکستان میں بھی ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو پاکستان کی لاتعلقی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ان کا یقین ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقہ کی طرف سے یہ کارروائی جمہوری حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کی گئی ہے۔ کم از کم مشرقی پاکستان کے باشندوں کا یہی خیال ہے عوامی لیگ کے مختلف لیڈروں کی طرف سے جو بیانات دیے گئے ہیں ان میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ آمریت پسند لوگ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور جو واقعہ پیش آیا ہے وہ آمریت کا شاخسانہ ہے۔

اس واقعے کے گہرے اور دور رس نتائج کو سامنے رکھا جائے اور اس بات کو نہ بھلایا جائے کہ سامراجی طاقتیں کبھی اپنے بڑے حلقۂ اثر کو بڑھانے اور دوسرے ممالک کے نظم و نسق پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کرتی ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ لاہور کے واقعے کا تانا بانا بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

آخر یہ واقعہ ایسے وقت ہی کیوں پیش آیا جب ہندوستان میں تمام تاریخ کے سب سے بڑے انتخابات عمل میں آنے والے ہیں۔ کہیں اس کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا تو نہیں ہے کہ ایک طرف پاکستان میں جمہوری حکومت کے قیام میں رکاوٹ ڈالی جائے اور دوسری طرف ہندوستان میں ان رجعت پسند اور عوام دشمن طاقتوں کو برسرِ اقتدار لایا جائے جو سامراجی طاقتوں کا آلۂ کار بننے اور ملک کو سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ ڈگر پر ڈالنے کے لیے بے چین ہیں۔ اس کا اشارہ بڑودہ اور احمد آباد کے ان حالیہ ہنگاموں سے ملتا ہے جو لاہور کے واقعے کے نام پر برپا کیے گئے۔

مقصد شاید اندرا سرکار کو یہ کہہ کر بدنام کرنا تھا کہ وہ ہوائی ڈکیتیوں تک کو روکنے کی اہلیت نہیں رکھتی، لیکن دنیا کو معلوم ہے کہ اندرا سرکار نے اس ہوائی ڈکیتی کے خلاف جو سخت اور مضبوط قدم اٹھایا اتنا مضبوط شاید کوئی اور حکومت نہ اٹھا سکتی تھی۔ سوتنتر پارٹی کے مسٹر مسانی تک بول اٹھے تھے کہ اندرا سرکار نے جو کچھ کیا، صحیح کیا۔ پاکستان کے خلاف یہ کتنی سخت کارروائی ہے کہ ہندوستانی علاقے میں اس کی تمام فوجی اور غیر فوجی پروازوں پر پابندی لگا دی گئی یہ پابندی اتنی موثر اور پاکستانی معیشت پر اتنا اثر ڈالنے والی ثابت ہوئی کہ دوسرے ہی دن میں حکومتِ پاکستان چیخ پڑی اور ہندوستان سے اپیل کرنے لگی کہ اپنے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کرو۔

یہی نہیں بلکہ اسلام آباد میں تمام غیر ملکی سفراء کو طلب کر کے ان سے بھی ہندوستانی اقدام کی شکایت کی گئی اور الزام لگایا گیا کہ ہندوستان صورتِ حال کو کشیدہ بنا رہا ہے۔ یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے لگا۔ اس شکایت کا مقصد شاید بین الاقوامی دنیا میں ہندوستان کے خلاف ماحول پیدا کرنا تھا لیکن اس میں پاکستان کو منہ کی کھانی پڑی کیونکہ اکثر ممالک نے ہوائی جہاز کے اغوا اور اس کی تباہی کی مذمت کی ہے اور اس کے لیے پاکستان کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی ٹرانسپورٹ فیڈریشن نے جو ۸۰ ملکوں کے شہری پرواز کے ڈھائی لاکھ ملازمین کی انجمن ہے وارننگ بھی دی ہے کہ اگر پاکستان نے ہند کے جائز مطالبات کو منظور نہ کیا تو فیڈریشن پاکستان کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہوگی۔

عالمی رائے کو پاکستان کے خلاف کر دینا حکومتِ ہند کی پالیسی کی بہت بڑی کامیابی ہے لیکن اس کامیابی کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی مختلف پارٹیوں نے اس قومی مسئلہ کو اپنی پوزیشن بنانے کا ذریعہ بنا لیا اور عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں لگ گئیں۔ بعض فرقہ پرست جماعتوں نے تو انتہائی خطرناک طور پر فرقہ وارانہ جذبات کو بھی مشتعل کرنا شروع کر دیا لیکن یقین ہے کہ وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ عوام کو خوب معلوم ہے کہ عین انتخاب کے موقع پر ایسی حرکت اس لیے کی گئی ہے کہ ہندوستانی عوام کا شیرازہ بکھر جائے۔ افراتفری میں رجعت پسند اور پست فطرت عناصر پالا مار لے جائیں اور ملک کو آگے کی بجائے پیچھے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

جہاں تک ہند اور پاکستان کے عوام کا تعلق ہے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت خاص طور پر مشرقی پاکستان کے حالیہ انتخابات میں جہاں عوام نے عوامی لیگ پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا جو ہند کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی خواہش مند ہے۔ یہاں ہندوستان میں بھی پاکستانی عوام کے تئیں خیر سگالی کے جذبات موجود ہیں جن کا اظہار مشرقی پاکستان کے طوفان زدہ لوگوں کی امداد کی صورت میں ہو چکا ہے۔

دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے بے چین ہیں لیکن آمریت پسند اور سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں کھیلنے والے عناصر ان کو قریب آنے سے روک رہے ہیں، اور ایسی کارروائیوں میں مصروف ہیں جن سے دونوں ملکوں میں زیادہ سے زیادہ کشیدگی پیدا ہو۔ ہوائی جہاز کا معاملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی نظر آتا ہے اور اس کے پیچھے ہم بہت بڑی سازش دیکھ رہے ہیں جس سے ہند کے ہر باشندے کو ہوشیار و خبردار رہنے کی ضرورت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جذبات کی رو میں بہہ کر غلط راہ پر پڑ جائیں۔

اس وقت سب سے بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ ملک کو رجعت پسندوں اور جمہوریت دشمنوں سے بچایا جائے اور ان جماعتوں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں جو ملک میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کر کے اسے ترقی کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مسز گاندھی نے ملک کے سامنے جو سوشلسٹ پروگرام پیش کیا ہے اگر اسے عمیق نظر سے دیکھا جائے اور اس پر توجہ دی جائے تو کسی فرد کو بھی اپنی راہ متعین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

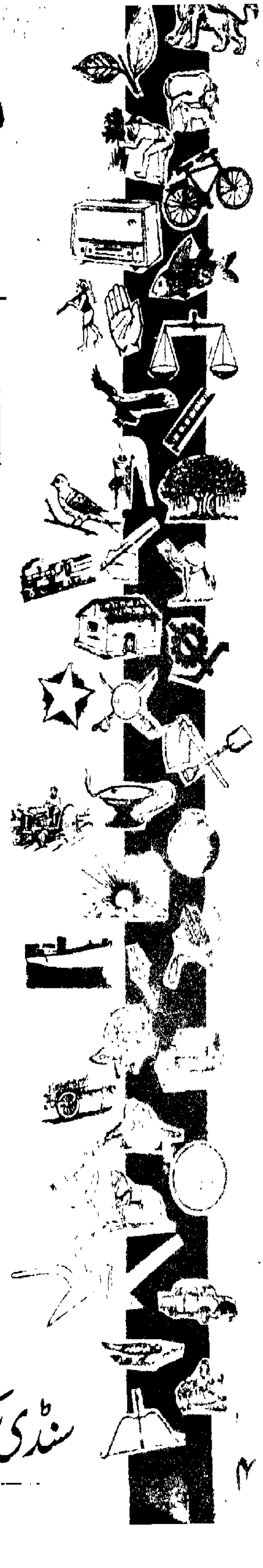
اُدھر پاکستان میں بھی یقین ہے کہ جلد یا بدیر عوامی اور جمہوری حکومت ہی برسرِ اقتدار آئے گی کیوں کہ عوامی نمائندوں کو اب زیادہ الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر پاکستان میں اچھے اور سمجھدار لوگ برسرِ اقتدار آئے اور ادھر ہندوستان میں مضبوط و پائدار حکومت قائم ہوئی تو یقین رکھنا چاہیے کہ نہ صرف یہ کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خوشگوار و مستحکم ہو جائیں گے بلکہ دونوں مل کر برصغیر کو پائدار امن کے ساتھ ترقی کی اس منزل پر پہونچا دیں گے جہاں اسے دیکھ کر دوسرے سب ممالک کو رشک آئے گا۔ •

روٹی کپڑا اور مکان

عام آدمی کی بُنیادی ضرورت

سیاسی پارٹیاں کیا کہتی ہیں!

ان کے الیکشن مینی فیسٹو



روٹی کپڑا، اور مکان :-

یہ عوام کی ایسی بنیادی ضرورت ہے کہ جو کوئی بھی اس کا نعرہ لگاتا ہے جنتا اس کا دم بھرنے لگتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے شاید اسی نفسیات کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے انتخابی مینی فیسٹو تیار کئے ہیں اور مخالف پارٹیوں نے جن میں "چار جماعتی گٹھ جوڑ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایسے لمبے چوڑے وعدے کئے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ بس یہ برسر اقتدار آئے اور ملک میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔

یہ چار جماعتی گٹھ جوڑ بھی خوب ہے۔ اسے بعض لوگ "ساجھے کی ہنڈیا" کہہ کر پکارتے ہیں جو کبھی کبھی کیا ہمیشہ ہی چوراہے پر پھوٹا کرتی ہے۔ اس میں دراڑ تو اسی وقت پڑ گئی جب یہ گٹھ جوڑ جسے نجلنگپا دیسائی اینڈ کو "عظیم اتحاد" کے نام سے پکارتے ہیں اپنا مشترکہ مینی فیسٹو جاری کرنے میں ناکام رہا۔

"یہ عظیم اتحاد" اس لئے عمل میں لایا گیا ہے تاکہ اندرا سرکار کو کسی طرح ہٹا کر اس پر قبضہ کیا جائے اور "چوں چوں کا مربہ" قسم کی ایسی ہی ملی جلی سرکار قائم کی جائے جیسی کہ اس وقت یو۔پی میں قائم ہے۔

اس عظیم اتحاد کی جن چار پارٹیاں۔ سنڈیکیٹ کانگریس۔ سوتنتر جن سنگھ اور سوشلسٹ۔ شامل ہیں مشترکہ پالیسی کیا ہوگی اور ان کا کم سے کم پروگرام کیا ہوگا اس کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا۔ ہاں ہر پارٹی نے اپنا الگ انتخابی مینی فیسٹو جاری کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش ضرور کی ہے۔

ان میں جن سنگھ پارٹی سب سے آگے نظر آتی ہے۔ بلاشبہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ کسی دن زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آ ہی جائے گی۔ لیکن سامنے کی بات یہ ہے کہ مستقبل قریب میں اس کے برسر اقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں اسی لئے اس نے لوک سبھا کی کل سیٹوں پر اپنے امیدوار کھڑے نہیں کئے

اس کا فوری مسئلہ ہے کہ کس طرح وہ اپنی پوزیشن کو برقرار رکھے اور اگر ہو سکے تو اسے کچھ بہتر بنائے۔ اسی لئے وہ لمبے چوڑے دعووں اور پرکشش وعدوں کے ساتھ میدان میں اتری ہے۔

اس کا دوسرا مقصد دائیں بازو کی سب سے زیادہ طاقتور جماعت بن کر ابھرنا ہے تاکہ تمام رجعت پسند طاقتیں اقتدار کے لئے صرف اسی کی طرف دیکھیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسے اپنا تعاون دیں۔ اس لئے اس نے اپنے مینی فیسٹو میں عوام سے بڑے لمبے چوڑے وعدے کئے ہیں اور اعلان کیا ہے کہ کام جاننے والے تمام لوگوں کو تین سال کے اندر اور باقی تمام لوگوں کو پانچ سال کے اندر کام مہیا کر دے گی۔ دس سال کے اندر اندر ہر خاندان کو مکان بھی دیا جائے گا۔ پسماندہ طبقوں کو اوپر اٹھانے کے لئے کام کیا جائے گا۔ اور ایسے ایسے کام کئے جائیں گے کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیا کریں گے۔ ہر آدمی کو ہر چیز کی چھوٹ دی جائے گی۔

سنڈیکیٹ کانگریس کے دو رُخے لیڈروں کی دوغلی پالیسی

واقعات نئی دہلی

یہ جماعت عوام کو بیوقوف بنانے کیلئے سوشلزم کا ڈھونگ رچا رہی ہے

اس نے بڑے پرشکوہ انداز میں غربت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا ہے تاکہ اس کے خیال کا ایک بہلا نیا ہندوستان وجود میں آسکے۔ لیکن جن سنگھ نے امریکا میں تربیت یافتہ جن ماہرین اقتصادیات سے اپنے مینی فیسٹو کا مسودہ تیار کرایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ غربت اور بے روزگاری کا کوئی ٹھوس حل پیش نہیں کرسکا۔ بے روزگاری کا ایک حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ ملک میں نیوکلر پروگراموں کو بڑھا دیا جائے یعنی کہ ایٹم بم بنائے جائیں۔ بے روزگاروں کی ایک بڑی تعداد اس میں کھپ جائے گی۔ یہ ہوائی اور خیالی بات نہیں تو اور کیا ہے۔؟

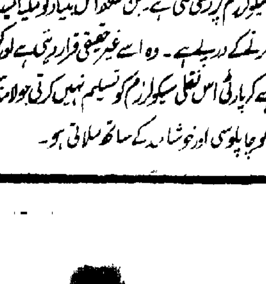
دراصل جن سنگھ پارٹی کا خاص مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے غربت اور بے روزگاری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جس طرح کہ کسی وقت ہٹلر نے برسراقتدار آنے کے لئے ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مینی فیسٹو کا انداز بالکل ہٹلرانہ ہے اور یہ دلچسپ بات ہے کہ جن سنگھ ہر چیز کو "بھارتیانے" کے لئے بے چین ہے۔ اس نے ہٹلری پروگرام کو "بھارتیانے" کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ہٹلر نے جرمن عوام سے بڑے بڑے وعدے کئے تھے انھیں زیادہ روزگار اور زیادہ اجرتوں کا یقین دلایا تھا اور یہ اعلان کرکے عوام کے جذبات سے کھیلا تھا کہ معاشی ترقی چند سرمایہ داروں اور وزیروں کا کام نہیں ہے جو اپنے آدمیوں کو پرمٹ اور لائسنس جاری کرتے ہیں بلکہ عوام کو چاہئے کہ وہ ترقیاتی منصوبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔

ہٹلرانہ انداز میں ایسی ہی باتیں جن سنگھ پارٹی کی طرف سے بھی کہی گئی ہیں لیکن ہٹلر وعدے کرکے سب باتیں بھول گیا تھا۔ جن سنگھ بھی یہی سب کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ صرف یہ کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور مغلوں کی خدمت کے لئے بے چین ہے بلکہ ملک کو بین الاقوامی اجارہ داروں کے چنگل میں پھنسا دینا بھی چاہتا ہے۔ وہ "غیر ملکی امداد ختم کرو" کا تو نعرہ لگا رہا ہے لیکن زور دے رہا ہے کہ "عالمی سرمایہ مارکیٹ سے قرض لو"

یہ عالمی سرمایہ مارکیٹ کیا ہے۔ امریکی سرمایہ داروں کا ادارہ ہے۔ اسی ادارے کو جن سنگھ پارٹی ملک سونپ دینا چاہتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ جن سنگھ پارٹی اس دستور پر بھی کلہاڑا چلا دینا چاہتی ہے جو ملک کے دانشوروں اور قانون دانوں نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ اس دستور کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی گئی ہے۔ جن سنگھ اس بنیاد کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہے۔ وہ اسے غیر حقیقی قرار دیتی ہے اور کہتی ہے کہ پارٹی اس نقلی سیکولرزم کو تسلیم نہیں کرتی جو لامذہبیت کو چاپلوسی اور خوشامد کے ساتھ ملاتی ہو۔



اے۔ بی۔ باجپئی۔ صدر بھارتیہ جن سنگھ

عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں

گویا جن سنگھ کے خیال میں آج کل کے سیکولرزم کا نام "چاپلوسی" ہے۔ چاپلوسی اور خوشامد کس کی۔۔۔ اقلیتوں کی اور خاص کر مسلمانوں کی۔ وہ ان سب کو ڈنڈے کے زور سے ایک رنگ میں رنگ دینا چاہتا ہے۔

ایس۔ ایس پی۔

چار پارٹی گٹھ جوڑ میں شامل دوسری پارٹی۔۔۔ ایس۔ ایس پی ہے۔ اس کے بانی آنجہانی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا تھے۔ وہ سوشلزم کے علمبردار تھے لیکن نہرو دشمنی کے جذبے سے بعض اوقات ان کا رویہ ایسا ہو جاتا تھا کہ خود سوشلسٹوں کو اس پر اعتراض ہوتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے



یہ نہیں کہا تھا کہ اگر نہرو جی نے سوشلزم کو اپنایا تو ان کی دشمنی میں سوشلزم ہی کو خیرباد کہہ دیں۔

لیکن ڈاکٹر لوہیا کے جانشینوں کی اندرا دشمنی آج اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جس دن سے اندرا جی نے سوشلزم کا نعرہ لگایا ہے ان سوشلسٹوں نے سوشلزم ہی سے منہ موڑ لیا اور سوشلزم کے دشمنوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر ڈالا۔

سمیکت سوشلسٹ پارٹی۔۔۔ اور جن سنگھ کسی زمانہ میں آگ اور پانی تھے، اور دونوں کا میل ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن آج دونوں ایک دوسرے کی بلائیں لے رہے ہیں۔۔۔ زبان کے معاملے میں یہ جماعت جن سنگھیوں سے پہلے ہی آگے تھی لیکن اب اقلیتوں کے معاملے میں بھی اس نے جن سنگھیوں اور آر ایس۔ ایس والوں کی زبان میں بولنا شروع کر دیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ ملک کی فرقہ پرست طاقتوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔۔۔ یہ تنبیہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ آر ایس ایس اور جن سنگھ کی جارحانہ فرقہ پرستی کو کی جانی چاہیے تھی کیونکہ یہ ان جماعتوں کی جارحانہ فرقہ پرستی ہی ہے جو فرقہ وارانہ امن و صلح کے ماحول کو خراب کر رہی ہے اور جس نے ہزاروں بے گناہوں کو خون میں نہلایا۔

آج کل کے الیکشن کے زمانے میں ملک میں یہ پراپیگنڈا

واقعات نئی دہلی

...ٹ پارٹی جیسی ...والی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے

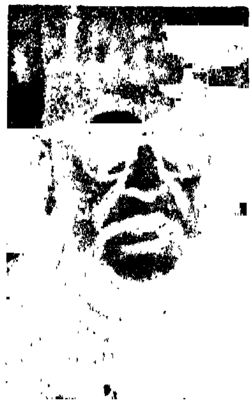
ام کر رہی ہے اور اس نے احمد آباد اور جموہ
ن کو تباہ کر ڈالا جہاں سنڈیکیٹی حکومت اپنی
ی ڈینگیں مارا کرتی ہے۔
اس پارٹی فساد انگیز مذہبی کتابوں کو رائج کرنے
ر دہ اردو کو دوسری زبان تسلیم کرنے کے خلاف
ن کے لیے سوشلسٹ پارٹی جو اپنے آپ کو
وادارانہ جماعت کہتی ہے، فرض تھا کہ جن سنگھ کو
نا۔ لیکن وہ جن سنگھ کی پیٹھ ٹھونک کر اٹھا مسلمانوں
ار ہی ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے شکار نہ ہوں —
رس بھی کیا چیز ہے انسان سب کچھ بھول جاتا ہے
بٹ کانگریس۔

ہ سنڈیکیٹ کانگریس کا جائزہ لیں کہ وہ کتنے
،۔ مگر اس کا پانی تو یوپی میں معلوم ہو گیا —
ت کر دیا کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد وہ رائے عامہ
ہا کرتی پروا کرتی تو منی رام کے انتخاب میں
بعد مسٹر ٹی۔ این۔ سنگھ — گدی پر نہ بیٹھے
جماعت جمہوریت کو بچانے کے لئے دوسری جماعتوں
لے رہی ہے۔ لیکن خود جمہوریت کے پرنچے اڑانے
بت محسوس نہیں کرتی۔ اسے ہم اس کی دو رنگی
تعبیر کر سکتے ہیں۔

ں کی دوسری دو رنگی یہ ہے کہ اپنے مینی فیسٹو میں
یقین دلاتی ہے کہ وہ پریوی پرس کو ختم کرنے کی
اپر قائم ہے لیکن مناسب طریقے سے کے الفاظ
دری طرف سابق حکمرانوں کو بھی خوش کر دیتی ہے

۔(

بال بھی بیکا نہ ہو اور رہے راضی رہے صیاد بھی"
ندیر عمل رہتی ہے لیکن اسے شاید معلوم نہیں
ہندوستان کے لوگ بڑے چالاک ہو گئے ہیں۔ دو رنگی پالیسی
احال اس چمگادڑ جیسا ہوتا ہے جو پرندوں میں
ویشیوں میں مویشی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔
... اعلان کیا ہے کہ اس کا خاص



شری گپتا
اندرا کو ہٹاؤ — دیش کو بچاؤ

مقصد ملک میں جمہوری، سوشلسٹ اور سیکولر سوسائٹی قائم کرنا ہے لیکن اس نے اس امر کی توضیح نہیں کی کہ وہ سابق حکمرانوں، سرمایہ داروں اور جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی سے مل کر جو سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کی حمایت کرنے کی پابند ہیں کس طرح اور کس قسم کی سوسائٹی قائم کر سکے گی۔

سنڈیکیٹ کے مینی فیسٹو کی ابتداء سیاسی صورتِ حال کے جائزے سے ہوتی ہے۔ یہ عجیب فریب ابتداء ہے۔ غیر منقسم کانگریس نے کبھی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا۔ اس بار ایسا اس لیے کیا گیا کہ حکمراں کانگریس کو جی بھر کر مطعون کیا جا سکے۔ سنڈیکیٹ نے اندرا سرکار پر یہ الزام لگایا کہ وہ کمیونسٹوں اور فرقہ پرستوں کا تعاون حاصل کر رہی ہے اور تخریبی طاقتوں کو بڑھاوا دے رہی ہے — یہی نہیں بلکہ خارجہ پالیسی میں روس کی مداخلت کا الزام لگایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ ایسی پالیسی اختیار کرے گی جو حقیقی معنوں میں غیر جانب دار ہو گی۔

زرعی اصلاحات کے سلسلے میں سنڈیکیٹ نے صرف ایک جملہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا ہے کہ "ہم جو پہلے وعدے کر چکے ہیں ان کے مطابق کام کریں گے" پہلے کیا وعدے

لیے گئے تھے ان کی تلاش کا کام خود کسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے — آخر سارا کام ایک جماعت ہی کیوں کرے!

اقلیتوں کے بارے میں سنڈیکیٹ نے جو پالیسی اپنائی ہے وہ بھی انتہائی حیرت انگیز ہے۔ احمد آباد، بھیونڈی جلگاؤں، رانچی اور دوسرے مقامات پر جو کچھ ہوا ہے اس کا مینی فیسٹو میں کوئی تذکرہ نہیں۔ لیکن اس کے برعکس سنڈیکیٹ ناراض ہے کہ ماضی قریب میں — اقلیتوں کے خوف و خدشات کو پارٹی کے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے افسوسناک رجحانات دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہا گیا کہ "کانگریس (سنڈیکیٹ) نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خطرات کو محسوس کیا ہے اور اس نے ہمیشہ اس کے خلاف جدوجہد کی ہے" لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اب سنڈیکیٹ نے اس جدوجہد کو اور تیز کرنے کے لیے جن سنگھ کے ساتھ



اشتراک کر لیا ہے"۔ اس کے برعکس اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ "علیحدگی پسندانہ رجحانات جو فرقہ پرست جماعتوں اور بعض سیکولرزم کی دعویدار پارٹیوں کے ذریعہ پیدا کیے جا رہے ہیں ان سے اقلیتوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا"۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ نے اقلیتوں اور خاص کر مسلمانوں کو بھارتیانے کا جو نعرہ بلند کیا ہے اس پر وہ قطعی خاموش ہے۔ شاید اس لیے کہ دوستی میں فرق آ جائے گا۔

اقتصادی پروگراموں کے بارے میں بڑے لمبے چوڑے دعوے کیے گئے ہیں کہ دس لاکھ رہائشی گھر سالانہ بنائے جائیں گے لیکن ان گھروں کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا جنھیں ملک کی پوری معیشت پر اجارہ داری حاصل ہے — سنڈیکیٹ اپنے لمبے چوڑے معاشی پروگراموں کے لیے روپیہ کہاں سے لائے گا، یہ اس نے کہیں نہیں بتایا۔ (بشکریہ: واقعات نئی دہلی)

قسم کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے لیے سنڈیکیٹ کے پاس وقت نہیں ہے۔

سوتنتر پارٹی

سوتنتر پارٹی پہلے کوئی اپنا انتخابی مینی فیسٹو شائع کرنا نہ چاہتی تھی، بلکہ اس نے آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی (سنڈیکیٹ) کی ۲۸ جون ۱۹۷۰ء کی قرارداد کی بنیاد پر ہی الیکشن لڑنے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ اس قرارداد میں نہ صرف یہ کہ سوشلزم اور سیکولرزم بلکہ غیر منقسم کانگریس کے دس نکاتی پروگرام کے حوالہ جات بھی نظر انداز کر دیے گئے تھے۔ لیکن کہتے ہیں خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ بدلتا ہے۔ جن سنگھ نے اپنا انتخابی مینی فیسٹو جاری کیا تو سوتنتر پارٹی بھی کب پیچھے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی ایک مینی فیسٹو شائع کر ڈالا۔ لیکن جیسا کہ سوتنتر لیڈروں نے تسلیم کیا ہے۔ یہ مینی فیسٹو کم اور ووٹ طلب کرنے کی اپیل زیادہ ہے جو سنڈیکیٹ کانگریس کے پروگرام کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہے۔



سوتنتر پارٹی کے مسانی

"امریکہ کی غلامی ہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی ہوگی۔"

نجلنگپا جی اس کے لئے مسانی اور اتکا جی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے بڑی اچھی دوستی نبھائی۔ تاہم ووٹر اس دوستی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کیونکہ سوتنتر پارٹی کا اصل چہرہ بھی خواہ اُسے کتنا ہی چھپایا جائے ان کے سامنے ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ سوتنتر پارٹی کے پردے کے پیچھے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی چوکڑی جمی بیٹھی ہے۔ لیکن پارٹی کے صدر مسٹر مسانی فرماتے ہیں کہ "ان کی پارٹی ایک انقلابی پارٹی ہے" کیسے اِسے۔ اس کی تشریح انھوں نے نہیں فرمائی۔

لیکن اس لحاظ سے واقعی اسے انقلابی پارٹی مان لینا چاہئیے کہ سنڈیکیٹ اور جن سنگھ کے ساتھ مل کر وہ سوشلسٹ پارٹی کی پالیسی میں انقلاب لے آئی۔

سنڈیکیٹ کانگریس کی طرح سوتنتر پارٹی الفاظ کے گورکھ دھندے پر یقین نہیں رکھتی بلکہ اس کی دوٹوک پالیسی یہ ہے کہ وہ نجی جائداد کو بنیادی حق مانتی ہے اور اس بات کے خلاف ہے کہ پریوی پرس کو ختم کیا جائے یا دولت مندوں کی لاکھوں کروڑوں کی جائداد پر ہاتھ ڈالا جائے۔ ان کے خیال میں یہ ایک جمہوریت پسندانہ اقدام ہے کیونکہ اگر راجے مہاراجے اور دولت مند ختم ہو گئے تو غریب کسانوں کے قانونوں اور سرکاری ملازمین کے پروویڈنٹ فنڈ کی بھی خیر نہیں۔

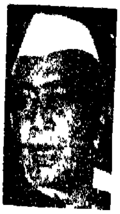
سنڈیکیٹ کانگریس کی طرح سوتنتر پارٹی کے مینی فیسٹو کی بنیاد بھی ان لمبے چوڑے وعدوں پر ہے جو عوام سے کئے گئے ہیں۔ بے روزگاروں کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ پانچ برس میں ان کے لئے دس ارب روپے خرچ کئے جائیں گے اور صنعت کاروں کو دس برس میں ۱۲۰۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ روپیہ کہاں سے اکٹھا کیا جائے گا۔

"عوام کی جیبیں کترنے کا ارادہ تو نہیں؟"

بھارتیہ کرانتی دل

بھارتیہ کرانتی دل چار جماعتی گٹھ جوڑ میں شامل نہیں ہے۔ لیکن یوپی میں ایک دل کے ایک نمبر کی حیثیت سے وہ عملاً گٹھ جوڑ سے الگ بھی نہیں ہے۔ وہ بھی جائداد کی ملکیت کو بنیادی حق مانتی ہے اور آئندہ بھی اسی پالیسی پر قائم رہنا چاہتی ہے۔ سوتنتر پارٹی کی طرح بی کے ڈی نے بھی چھوٹی جائداد کے مالکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ملکیت کے اس حق میں ردّوبدل کی مخالفت کریں۔

اس نے کمیونزم کا ہوّا بھی کھڑا کیا ہے اور عوام کو اس خطرے سے آگاہ کیا ہے کہ کمیونسٹ اور ان کے ساتھی جائداد کے حق کو چھیننے کے لئے دستور میں ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔



چرن سنگھ — وزارت عظمیٰ کے خواب۔

بی کے ڈی بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے اور سیکٹر میں توسیع کرنے کے خلاف ہے۔ وہ سنڈیکیٹ کی طرح سوشلزم کی بات نہیں کرتی بلکہ ہر ایسے نظام کے خلاف ہے جس میں وسائل اور ان کی تقسیم پر سرکار کا کنٹرول ہو۔ وہ مزدوروں کو ان کی ہڑتال کا حق بھی نہیں دینا چاہتی۔ وہ سرمایہ دارانہ طرز حکومت کی حامی ہے اور



بھارتیہ کرانتی دل کے پرکاش ویر شاستری "مزدوروں کے دشمن"

نظام چاہتی ہے جیسا کہ امریکا میں ہے۔ اس میں وہ سوتنتر پارٹی سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ اور دلچسپ یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کسانوں کی کہتی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ اس کے ووٹر کسان ہیں۔ لیکن اس بار اسے معلوم ہو جائے گا کہ کسان اس کے ساتھ ہیں۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی

یہ لیجیے یہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ جو اپنی انتہا پسندی میں آگے نظر آتی ہے۔ اس کی تنقید سے کوئی پارٹی نہ بچی۔ اس نے کانگریس کو بخشا اور نہ چار جماعتی گٹھ جوڑ کو۔ کمیونسٹ پارٹی پر بھی لے دے کی ہے اور ہر سیاسی پارٹی پر بھی۔ صرف اکالیوں پر مہربانی کی ہے کہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔ شاید پنجاب میں ان سے کوئی معاملہ ہوا ہوگا۔

واقعات نئی دہلی

اس پارٹی نے بھی بے روزگاری کو اپنے مینی فیسٹو کی بنیاد بنایا ہے اور اس بات پر تشویش ظاہر کی ہے کہ ملک میں ایک کروڑ بیس لاکھ بے روزگار ہیں جن میں پندرہ لاکھ تعلیم یافتہ (بشمول ۱۶ ہزار انجینئر) شامل ہیں۔



مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے جیوتی باسو
کسی کو ووٹ دو لیکن کسی فرقہ وارانہ جماعت کو نہیں"

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بے روزگاری کے اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے اس پارٹی نے کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا ہے کہ۔

"اندرا گاندھی کا یہ اعلان ایکشن اسٹرنٹ ہے کہ ہر سال پانچ لاکھ ملازمتیں نکالی جائیں گی اور کوئی سلامتی ایسی نہیں ہوگی جس پر ایک شخص کو سو روپیہ ماہوار سے کم مل رہا ہوگا"

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی پر عوام کو اعتراض ہو سکتے ہیں لیکن بہرحال یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ فرقہ پرست جماعت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے مینی فسٹو میں پچھلے برسوں میں ہونے والے فسادات پر اپنی گہری فکر و تشویش ظاہر کی ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کو بھارتیانے کا نعرہ لگا کر ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

> مارکسی پارٹی نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ کسی ایسی پارٹی کے حق میں ووٹ نہ دیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر فرقہ پرستی کی حامی ہو۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی گورنروں کے عہدوں کے خلاف ہے اور چاہتی ہے کہ ریاستوں میں گورنری حکومت کا طریقہ ختم ہو۔ وہ لامرکزیت اور ریاستوں کی خودمختاری کی حامی ہے اور ملک میں ایک ایسا دیہاتی طرز حکومت کا قیام عمل میں لانا چاہتی ہے جس میں آزادانہ طور پر ریاستیں شریک ہوں۔

کمیونسٹ پارٹی

کمیونسٹ پارٹی بھی ریاستی خودمختاری اور انھیں زیادہ اختیارات دینے کی حامی ہے لیکن قومی ایکتا کی قیمت پر نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کے لئے آئین میں اس طرح کی ترمیم ہونی چاہئے کہ ملک کی بنیادی یکجہتی متاثر نہ ہو۔ کمیونسٹ پارٹی کی یہ تجویز بھی قابل لحاظ ہے کہ دیہاتی کونسلوں کے ممبروں کی تعداد اس طور پر مقرر کی جائے کہ وہ لوک سبھا یا اسمبلیوں کے منتخب شدہ ممبروں کی تعداد دس فیصد سے زیادہ نہ ہو نیز وزرا، علما اور وزیر اعلیٰ اسی لوک سبھا اور متعلقہ اسمبلی کا ممبر ہو۔



کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر راؤ نے اندرا کو ووٹ دو"



کے ساتھ قریبی دوستی اور تعاون رکھا جائے۔ نیز معاہدہ تاشقند کے تحت ہند پاک تعلقات کو بحال کرنے کی جدوجہد کو جاری رکھا جائے اور چین کے ساتھ بھی تعلقات میں اس وقت جو تعطل ہے اسے ختم کیا جائے۔

کانگریس

ان سب پارٹیوں کے درمیان کانگریس ہے اس کا مقابلہ دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں سے تعلق رکھنے والی جماعتوں سے ہے۔ گویا اسے بیک وقت دو محاذوں پر انتخابی جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ لیکن اسکی اصل جنگ دائیں بازو کے انتہا پسندوں ہی سے ہے جو نظام حکومت کی بنیاد اور جمہوری قدروں کو بدلنے کے درپے ہیں اور ہر طور طریقہ اپنا کر ملک کو ڈکٹیٹری کی طرف لے جانے کے خواہاں ہیں۔ مقابلہ اس لئے زیادہ سخت ہے کہ تنگ نظری اور قدامت پسندوں کی تمام طاقتیں محض اس ایک مقصد سے جمع ہو گئی ہیں کہ کسی طرح اندرا سرکار کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔

اندرا سرکار پر عوام کو اعتماد و یقین ہے اور یہ اعتماد و یقین بینکوں کے قومیانے، راجاؤں کے پریوی پرس اور ایسے ہی دوسرے اقدامات سے اور مستحکم ہو گیا ہے۔ لیکن سنڈیکیٹ والوں کی علیحدگی کے باوجود کانگریس اپنے وعدوں اور حکومت کی کارکردگی کے درمیان فرق کو دور نہیں کر سکی ہے جس کی وجہ سے بے چینی کا پیدا ہونا ضروری تھا لیکن عوام نے خود یہ بات پسند کی کہ کانگریس نے بڑی دلیری سے اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو تسلیم کر لیا۔ اس سے اسکا وقار گرا نہیں بلکہ آئندہ کے لئے اس نے عوام کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ

سوتنتر پارٹی بھی "انقلابی پارٹی" بن گئی

پارٹی نے اقلیتی فرقوں کے تحفظ کے لئے تمام قانونی اور انتظامی اقدامات پر زور دیتے ہوئے فرقہ وارانہ سرگرمیوں پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔ خارجی امور میں اس نے کہا ہے کہ روس اور دوسرے سوشلسٹ ممالک

جو جماعت خود اپنی خامیوں کو تسلیم کرلے وہ یقیناً اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتی ہے۔ ذمہ داریوں کو محسوس نہ کرتی تو وقت سے پہلے انتخابات نہ ہوتے۔

دوسری جماعتوں کی طرح کانگریس نے اپنے مینی فسٹو

واقعات نئی دہلی

[redacted]مانوں کیلئے صرف وعدے ہی وعدے - لیکن الیکشن کے بعد!!!



جگو بھائی — "میں نے انکم ٹیکس ادا کر دیا۔"

میں نے لمبے چوڑے وعدے نہیں کئے۔ بلکہ بڑی متوازن پالیسی اختیار کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے اسے عملی جامہ پہنانے کا ارادہ بھی رکھتی ہے — یوں کوئی لوگوں سے کہہ دے کہ میں چاند کو زمین پر لے آؤں گا تو اس سے کیا حاصل ہوگا —؟

کانگریس نے اپنے مینی فیسٹو میں عوامی بیداری کا ذکر کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اقتصادی اور سماجی ترقی کا ایک حقیقی انقلابی پروگرام ہی نئے چیلنج کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے آئین میں ایسی ترمیم کا بھی اعلان کیا ہے کہ قدامت پسند ہی نہیں بلکہ عدالتیں بھی اس کے ترقی پسندانہ اقدامات میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

کانگریس نے کہا ہے کہ "ہماری کوشش ہوگی کہ ایسی آئینی راہیں نکالی جائیں کہ سماجی انصاف کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں پر غالب آیا جا سکے"



کانگریس سوشلسٹ طرز کے ایسے نظام کو مستحکم کرنا چاہتی ہے جس میں اقتصادی نابرابری ختم ہو سکے۔ مثلاً وہ چاہتی ہے کہ نظام معیشت کو اس طرح منتقل کیا جائے کہ

اس سے دولت اور پیداوار کے ذرائع و وسائل کے ارتکاز کی راہ ہموار نہ ہو اور یہ بات عوامی فلاح کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

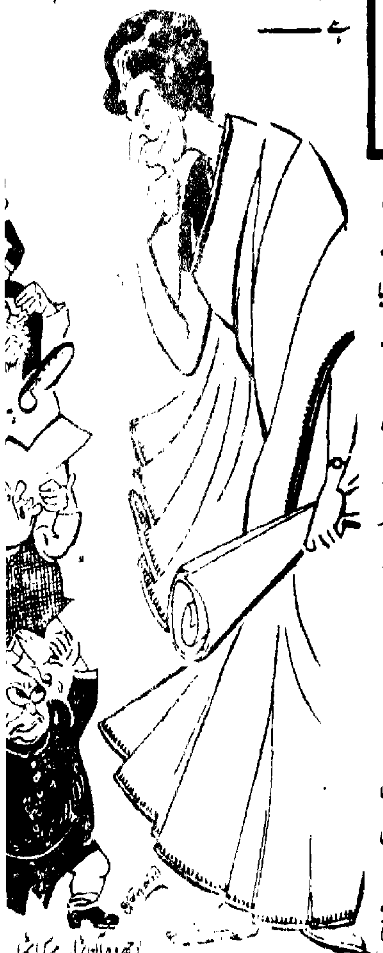
> اقلیتوں کے بارے میں کانگریس نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان کے حقوق اور ان کے مفاد کے تحفظ کی پابند ہے" اس نے ان فسطائی طاقتوں کی مذمت کی ہے جو مذہبی عصبیت نسلی برتری اور علاقائی جذبات کو ہوا دے کر عوام کے جائز مطالبات کو کچلنے کی کوشش میں ہیں۔

اردو کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ "اس زبان کو وہ جگہ دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے جس سے کہ اب تک اسے محروم رکھا گیا ہے" ملازمتوں کے بارے میں انھیں یقین دلایا گیا ہے کہ "اقلیتوں کے ساتھ برتے جانے والے امتیازات کے تدارک کی کوشش کی جائے گی"

ان سب پروگراموں کی تعمیل کے لئے وزیر اعظم چاہتی ہیں کہ کانگریس کو بھاری اکثریت میں کامیاب کیا جائے تاکہ وہ مستحکم حکومت قائم کر سکیں اور کسی گروپ کے دباؤ کے بغیر اپنی پالیسیوں پر عمل کر سکیں — پالیسیوں پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقتاً ایک مضبوط حکومت ہو۔ اب عام ووٹروں میں اس کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔

ڈی ایم کے اور اکالی دل

کی طرف سے بھی الیکشن مینی فیسٹو جاری کئے گئے ہیں جن میں بعض باتیں مشترک نظر آتی ہیں — دونوں جماعتیں ریاستوں کو زیادہ وسیع اختیارات دینے کی حامی ہیں (ایسی ہی مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی خواہش ہے) ڈی ایم کے نے خاص بات ہندی کے بارے میں کہی ہے۔ وہ یہ کہ خواہ کچھ ہو ہندی کے لئے اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں — یہ ہندی والوں کی شدت پسندی کا نتیجہ ہے — یہ شدت پسندی ہی ہے جو بعض اوقات ... کراتی ہے — کانگریس نے بیان ... اختیار کی ہے جو تمام دوسری پارٹیوں کے ... کی جاتی ہے —



ادھر وہ آن پڑا ہے کہ اٹھا

بھارتیہ کرانتی دل مزدوروں کو ہڑتال کا حق دینے کے خلاف

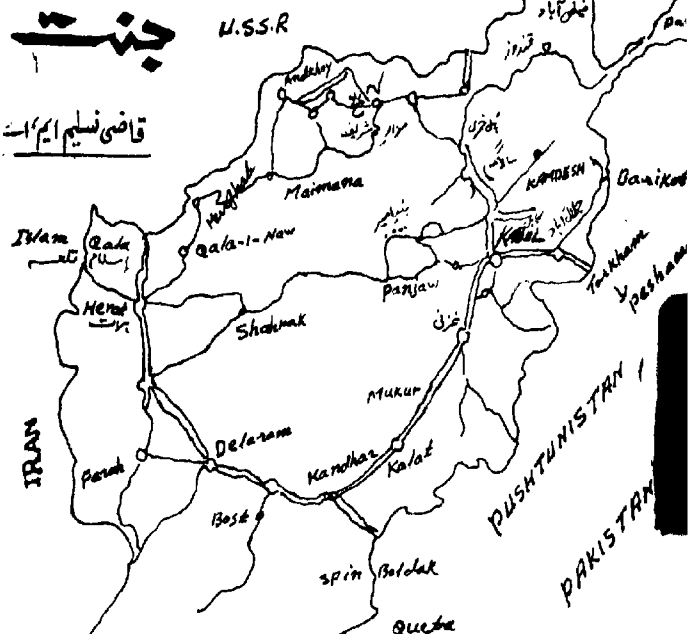


ایک کوہستانی جنت

قاضی نسیم ایم اے



جدید افغانستان کے بانی
شاہ محمد ظاہر شاہ



"اے سرزمین وطن! اے خاک پاک کابل! طویل
مدت سے تیری جدائی مجھے مرغ بسمل کی طرح تڑپا رہی ہے۔
تیرے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، جھومتے مرغزار، رنگا رنگ گلوں
سے پُر وادیاں، کوہستانوں کی برف پوش چوٹیاں جن کی سفیدی و
پاکیزگی دیکھ کر کوہ قاف کی پریاں بھی رشک کرتی ہیں، تیری بلقل
کرتی ہوئی، مستی و شباب کا نغمہ گاتی کوہستانی ندیاں، بلندیوں
سے گرتے دودھ جیسے صاف و شفاف آبشار، اور ابلتے بلوریں
چشموں کا تصور کر کے وہ کون بدبخت ہوگا جو تیری محبت میں
بیقرار نہ ہو جائے، ۔ وہ کون ناشکرا بندہ ہوگا جو قدرت کی ان
رنگینیوں اور عطا کردہ نعمتوں کو دیکھ کر بارگاہ خداوندی میں سجود
نہ ہو جائے۔

آہ! وہ کابل کی کشادہ سڑکیں اور تنگ بازار، شوخیاں کرتے
ہوئے گلاب جیسے تر و تازہ بچے، سر شام سڑکوں پر پھسلتی کاریں
سکرٹ میں ملبوس جابجا تھرکتی حسینائیں، یہ دورِ جدید کے چلتے
پھرتے بُت ان کے گداز بازو، متناسب جسم، نقرئی کھنکتی آوازیں

بقعہ نور ریستورانوں سے ابھرتی ہوئی موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنیں چھلکتا
شباب، کھنکتے جام، لڑکھڑاتے قدم، بہکتی آوازیں، فلک شگاف
قہقہے۔ اور کہیں کہیں سر تاپا قدیم افغانستان کی برقعہ پوش،
متحرک اور جیتی جاگتی تصویریں۔ یہ تمام مناظر اور میرا ملک میرا

عزیز وطن، مشرق و مغرب، جدید و قدیم کا سنگم، ہاں وہی
میرا وطن آج مجھے شدت سے یاد آ رہا ہے۔
وہی وطن جہاں بچپن کے ایام میں نے گزارے،
طفلانہ شوخیاں کیں اور جوانی میں قدم رکھتے ہی عشق و محبت



افغانستان کے
وزیر اعظم کی
رہائش گاہ



لے والہانہ رسیلے لیمے گا ئے۔ ہاں وہی وطن آج مجھے یاد آرہا ہے۔ اے وطن عزیز! تیری عظمت کو سلام۔ اے ارضِ پاک اب مجھے تابِ جدائی نہیں۔ میں تیری طرف دوڑا آرہا ہوں تاکہ تیری مقدس خاک کو عقیدت سے اپنی پیشانی پر لگالوں۔"

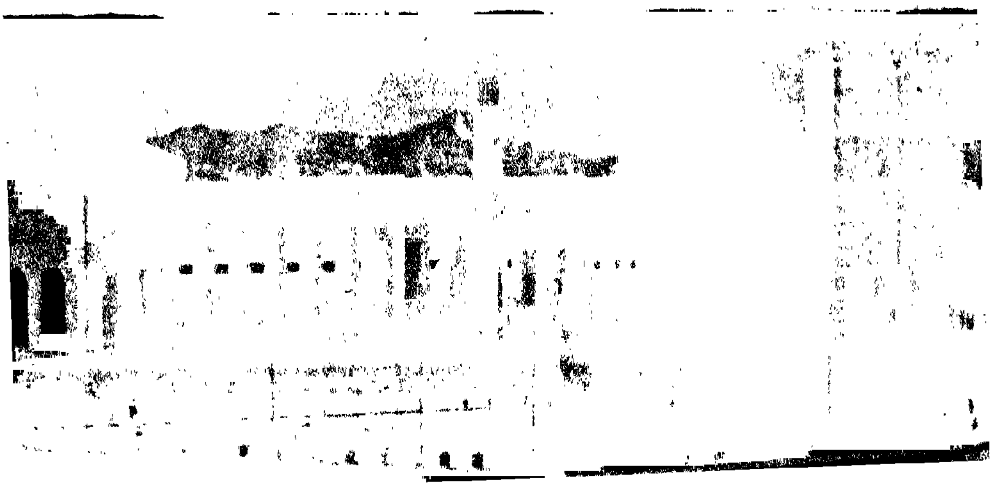
یہ ہے ہندوستان سے روانگی سے قبل لکھا ہوا ایک افغان طالب علم عبدالستار مُقروال کی ڈائری کا ورق جو تین سال سے کولمبو پلان کے تحت یہاں زیر تربیت تھا۔ یہ سطور وطن سے حقیقی محبت کی ترجمان ہیں جن کے ہر ہر لفظ سے حب الوطنی جھلکتی ہے۔ انھیں پڑھنے کے بعد ایک اجنبی کے دل میں افغانستان کی سیاحت کا جذبہ فطری طور پر سر اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آیئے ہم بھی اس جنت کی سیر کریں۔

افغانستان کی کوہستانی، خشک آب وہوا نہایت ہی صحت بخش ہے۔ یہاں پر انواع واقسام کے لذیذ ترین پھلوں کی بہتات ہے، جن میں قندھاری سیب دُنیے زمین پر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہاں کے انگور، تربوز، خربوزے، شفتالو اور توت اپنی مثال آپ ہیں۔ توت تازہ بھی کھایا جاتا ہے اور خشک بھی۔ اسے سکھا کر آٹے کی طرح پیس کر لیا جاتا ہے جو بعد میں جم کر سخت ہو جاتا ہے جسے "تلخان" کہتے ہیں۔ یہ برسوں خراب نہیں ہوتا برف کے ساتھ اس کی شیرینی بہت ہی مزہ دیتی ہے۔ یہ زود ہضم اور بہت ہی مقوی ہوتا ہے۔ ایک انگریز کہتا ہے کہ ایسی جمی ہوئی سخت غذا ہی شاید افغانوں کو مضبوط اور سخت مشقّم کا جنگجو بناتی ہے۔ خشک میوہ جات میں بادام، پستہ، کشمش، اخروٹ اور چلغوزے بھی افراط سے ہوتے ہیں۔ قالین بافی یہاں کی مشہور ہے۔ زیادہ تر عورتیں ہی کھلے میدانوں اور گھروں میں یہ کام کرتی ہیں۔ یہ قالین جو نہایت ہی گراں داموں فروخت ہیں، یہ صرف خوبصورت ہی نہیں ہوتے بلکہ بیحد پائیدار بھی ہوتے ہیں۔

بہار کا موسم یہاں مارچ سے اگست تک ہوتا ہے۔ ان ہی ایام میں ایران کی طرح جشنِ نوروز یہاں بھی نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ افغانستان کا سال ۲۱ مارچ میں اسی روز سے شروع ہوتا ہے۔ موسم گرما جون سے اگست تک، نومبر اور موسم سرما دسمبر سے فروری تک ہوتا ہے اوسط ۰ اُسے بھی کم ہے۔ سیاحت کے لئے ما کے آخر تک کا موسم مناسب ہے۔

افغانستان کے تاریخی مقامات، سرسبز برفپوش پہاڑ، اس کے ریگستانی علاقہ میں چلتے کے کارواں، مختلف تہذیبوں کے آثار، اُن کا اور پھر موجودہ زمانے کا اُبھرتا ہوا جدید افغا کے لئے ایک ایسی طلسماتی کشش اپنے کہ وہ اس کی جلوہ سامانیوں میں گم ہو کر

افغانستان جانے کے لئے ہر چہار ط راہیں مسدود ہیں، اندرونِ ملک بھی ریلوے نہیں ہے خشکی کے راستے بس یا کار سے سے ہی سفر کیا جاسکتا ہے۔ کابل یہاں کا د اور موجودہ فرمانروا اعلیٰ حضرت شاہ ظاہر اگر ہندوستان سے خشکی کے راستہ

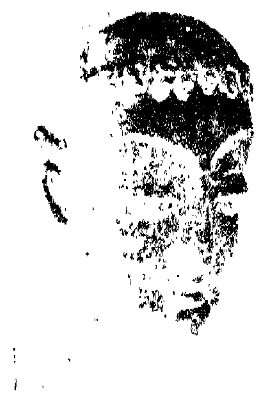


پشاور، اور درۂ خیبر کو عبور کر کے تورخم و جلال
دیئے ہم کابل پہنچ سکتے ہیں کوئٹہ کی سمت سے قندھار
دستے ہوئے کابل تک راستہ جاتا ہے، اور اگر ایرانی
سے کابل جانا ہو تو افغانی سرحد اسلام قلعہ سے ہرات
مار ہوتے ہوئے کابل تک راستہ ہمیں لے جائے گا
عان شمار نے جو کابل انٹرنیشنل ایرپورٹ کے ریڈیو
نجینیرنگ سے منسلک ہیں میرے سوالات کے تسلی بخش
دیئے۔ انھوں نے کہا: "افغان آریانہ" افغانستان کی
وس ہے۔ دیگر ممالک سے رابطہ قائم رکھنے کے علاوہ
لک کے بڑے بڑے شہروں کو بھی یہ سروس ایکدوسرے
ی ہے۔ ہندوستان، ایران، پاکستان، روس اور
ویکیہ کی ہوائی سروسیں یہاں سے ہو کر گذرتی ہیں۔
یان سروسوں کے ذریعہ، امرتسر، دہلی، تہران، دمشق،
کراچی، تاشقند، ماسکو اور پشاور کے درمیان آمد و رفت
مقامی ہوائی سروس قندھار، ہرات، مزار شریف،
رکست کے درمیان اپنی خدمت انجام دیتی ہے۔
یانہ ائرلائن کا بکنگ آفس کابل ہوٹل کی عمارت میں
جگہ نئے ہوائی اڈے کچھ تو بن چکے ہیں اور کچھ ابھی زیر
ی۔
احوں کی سہولت کے لئے وزارتِ اطلاعات نے

مشہور مقامات کی سیر کے لئے بسوں کا خاص انتظام کر رکھا ہے۔ قابلِ دید مقامات کی سیر کے لئے کابل میں ٹیکسی موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ ٹیکسی کا میٹر یہاں برائے نام ہے اور ڈرائیور اپنی مرضی کے مطابق کرایہ طلب کرتے ہیں ملٹری کیمپ اور چند مخصوص مقامات کے علاوہ فوٹو گرافی پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ یہاں کی مصنوعات میں قالین مشہور ہیں۔ کراکلی (پوستینی) کوٹ، جیکٹ، ٹوپیاں، پائیدار چرمی جوتے، کشیدہ کاری کی رنگین ٹوپیاں، واسکوٹ، ہینڈلوم کپڑا، اسٹائیف کے بنے مٹی کے خوب صورت برتن، قیمتی پتھر، مقامی طرز کے

نقرئی زیورات، پرانی بندوقیں اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں ایک اجنبی کے لئے کشش کا باعث ہیں۔ کراکلی، ٹوپی، کوٹ اور جیکٹ کافی مہنگے داموں فروخت ہوتے ہیں۔ امریکی خواتین پوستین سے بنے جیکٹ زیادہ پسند کرتی ہیں۔

بزکشی یہاں کا مقبول ترین قومی کھیل ہے جو گولف کی طرح وسیع میدان یا وادی میں گھوڑوں پر سوار ہو کر دو ٹیموں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ اس خطرناک کھیل میں کبھی کبھار زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے حقیقتاً یہ بہادری اور جرأت کا مظاہرہ ہے۔ دوسرے کھیل نیزہ بازی اور پیغ



افغانستان میں
قدیم دور کے
کے نشانات
آج بھی پائے
جا سکتے ہیں







ہ کابل
یر کرنے
آتے ہیں
ری طرح
ر رہتے ہیں

شی ہیں جو گھوڑے پر سوار ہو کر ہی کھیلے جاتے ہیں۔

یہاں پر عام تعطیل کا دن جمعہ ہے اور جمعرات کو صف روز چھٹی رہتی ہے۔ رمضان کی پہلی تاریخ، عید الفطر ین روز، عید قربان چار روز، عید میلاد النبی اور عاشورہ رم ایک ایک روز کی مذہبی تعطیلات ہیں۔ ۲۱ مارچ کو شن نوروز سے افغانستان کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ اس دن گارنگ پروگرام، رقص، اونٹوں کی جنگ اور مویشیوں کی ائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ درخت کی شاخوں اور پھولوں ے مکانات کی آرائش کی جاتی ہے۔ اگست میں جشنِ استقلال نایا جاتا ہے تین روز تمام دفاتر اور اسکول و کالج بند رہتے ہیں ے میں بڑے پیمانے پر آتشبازی ہوتی ہے۔ قومی نمائش منعقد جاتی ہے اس میلہ میں مقامی مصنوعات اور ہاتھ کی بنی دئی چیزیں رکھی جاتی ہیں دور و نزدیک سے سمٹ کر عوام بل کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں یکم ستمبر کو یوم پختونستان نایا جاتا ہے۔ ۱۴ر اکتوبر شاہ ظاہر شاہ کی سالگرہ کا دن ہے س روز خصوصیت سے بزکشی کا مظاہرہ وسیع میدان میں وتا ہے۔

یہاں امریکی، روسی، ایرانی اور انگریزی فلمیں بھی آتی ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی فلموں کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلمی نغمے حد سے زیادہ مقبول ہیں۔ کابل میں تو ایک سینما گھر ایسا ہے جہاں پر صرف مار دھاڑ اور دارا سنگھ کی ہی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ پامیر، زینت، کابل ننداری اور بہزاد وغیرہ یہاں کے سینما گھر ہیں۔ کابل میں انٹرنیشنل، اسکائے، اسپورٹس، گولف اور فرینچ کلب ہیں۔ خیبر ہوٹل میں ہفتہ میں ایک دو بار رقص کا پروگرام بھی ہوتا ہے۔ اسپنسر زار اور کابل ہوٹل کا شمار شہر کے بہترین ہوٹلوں میں ہوتا ہے خیبر میں مغربی طرز کے کھانے بھی تیار ہوتے ہیں۔

قندھار، مزار شریف، بامیان، جلال آباد اور دوسرے علاقوں میں جابجا ریسٹوران اور چھوٹے چھوٹے چائے خانے کثرت سے ہیں۔ افغان بغیر دودھ کی ہلکی چائے پیتے ہیں۔ افغانستان انواع و اقسام کے پلاؤ کے لئے مشہور ہے یہاں کی مشہور ڈشوں میں بولانی، آشک اور بریانی عمدہ کھانے ہیں سیخ اور کباب تنوری نان سے کھائے جاتے ہیں ہلکی چائے کثرت سے پی جاتی ہے۔ کابل کے قریب "باغ بالا" مقامی کھانوں کے لئے مشہور ہے۔ صحت بخش آبی ذخائر چشموں کی صورت میں ہر جگہ موجود ہیں کابل سے تھوڑے سے فاصلہ پر لغمان کا پانی صحت بخش سمجھا جاتا ہے۔

افغانستان کا مقامی وقت انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ یوروپی و امریکی ڈاکٹر مقامی ڈاکٹروں کے دوش بدوش بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دواؤں کی دکانیں ہر وقت کھلی ملتی ہیں جہاں تمام انگریزی ادویات آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

کابل افغانستان کا دارالسلطنت ہے۔ جو ایک زرخیز وادی میں آباد ہے۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت ہی خوش گوار ہے موسم گرما میں ۸۰ ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر رہتا ہے جبکہ موسم سرما میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ اس کا شمار وسطی ایشیا کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں مشہور "شاہراہ ریشم" کے ذریعہ افغانستان سے تجارت ہوتی تھی۔ اس وقت یہ ہندوستان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا اور دنیا کے مصروف ترین تجارتی شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ظہیر الدین بابر کا مقبرہ آج بھی یہاں اپنی شان



دو افغان بچے



نورستانی کا ایک بازار



کا اعلان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ قدیم کابل میں رنگا بازار صدہا چیزوں سے سجے نظر آتے ہیں۔ آثار قدیمہ اور ایک عام شخص دونوں کے لئے یہ شہر یکساں کا باعث ہے۔ دوسری اور تیسری صدی کے بہت بدھ کے آثار کابل کے اطراف میں دکھائی دیتی ہیں۔ کابل میوزیم افغانستان کے مختلف ادوار کے قدیم فن نقاشی کے ساتھ بدھ و یونانی آرٹ بھی موجود ہے۔ اعلیٰ اور قیمتی نوادرات کے ہاتھی دانت پر نقاشی کے اعلیٰ ترین نمونے اور طرح طرح ان کا ذخیرہ قابل دید ہے۔ باغ دارالامان کو کابل جدید کہا جاتا ہے۔ باغ چہل ستون، باغ ریش خورنہ پارک زرنگار اور بہترین تفریحی مقامات ہیں مقبرۂ نادر شاہ کے علاوہ مسجد پل خشتی، مسجد شیر پور اور مسجد شاہ شمشیر دیکھنے سے تعلق ہیں مزارات میں پسران خواجہ عبداللہ انصاری اور درگاہ شیر ولی شہر کے متبرک مقامات میں سے ہیں۔ کابل میں بازاروں اور چوراہوں پر ٹریفک کی تیز رفتاری اور حادثات کے بجا بجا یہ تختیاں لگی نظر آتی ہیں "دیر رسیدن بہتر است از نہ رسیدن"

کابل کے مغرب میں ۱۹ کلو میٹر دور بلندی پر خوبصورت اور مقام باغ پغمان ہے۔ موسم گرما میں کاروں اور بسوں سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ یہاں کی صحت بخش آب و ہوا اور دلکش منظر ہر کسی کو یہاں آنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کابل سے ۶۰ کیلو میٹر پر کوہستانی آبادی استالیف کے عقب میں کوہ ہندوکش کی چوٹیاں قدرت کا شاہکار ہوتی ہیں۔ بیگرام کی کشادہ سطح مرتفع اس کے دامن میں قدیم طرز کے نیلے رنگ کے مٹی کے برتن یہاں صدیوں سے بنتے چلے آرہے ہیں۔

کابل سے ۵۲ میل پر تانگی گھارو ایک مقام ہے یہاں سے ایک نیا راستہ جلال آباد سے پشاور تک سرنگوں سے ہوتا ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا جاتا ہے جو کہ تین ہزار فٹ نشیبی علاقوں سے جاملتا ہے۔ دریائے کابل کا حسین آبشار "ماہ پار" کے نام سے یہاں پر ہی گرتا ہے۔

کابل سے ۱۲۴ کیلو میٹر کے فاصلہ پر "سالانگ" ہے۔ کوہ ہندوکش کا یہ نہایت ہی دشوار گذار اور پُر پیچ علاقہ ہے دنیا کی طویل اور بلند ترین سرنگ جو کہ گیارہ ہزار فٹ لمبی ہے عقل انسانی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

جلال آباد کابل سے ۱۴۵ میل پر آباد ہے جو پاکستان کے سرحدی شہر پشاور کا ہمسایہ ہے۔ پشاور سے تنگ اور خمدار راستہ تین ہزار فٹ کی بلندی پر جلال آباد تک جاتا ہے سردیوں میں موسم نہایت اچھا اور قابل برداشت ہوتا ہے۔ گرمی قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ دو تین گھنٹوں کی مسافت طے کر کے بذریعہ بس ایک سیاح کابل اور ہندوکش کی بلندیوں میں سوئیوں کی طرح چبھنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے بھاگ کر یہاں کی خوشگوار فضاء میں سکھ کا سانس لے سکتا ہے۔

مزار شریف بلخ صوبہ کا دسطی شہر ہے۔ یہاں فیروزی رنگ سے بنی ایک عالیشان مسجد اور فیروزی نقش و نگار سے مزین ایک عظیم المرتبت بزرگ کا مقبرہ ہونے کی وجہ سے یہ متبرک شہر مانا جاتا ہے۔ افغانیوں کے عقیدے کے مطابق اس عالیشان گنبد میں جو مزار ہے وہ آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی اور داماد خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کا ہے (حالانکہ حضرت علیؓ کا مزار عراق کے شہر کوفہ میں ہے) درگاہ کے احاطہ میں ہزاروں سفید کبوتر ہیں۔ یہ مشہور زیارت گاہ مزار سخی کے نام سے مشہور ہے افغان عام طور پر "ترا قسم حضرت سخی است" کہتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ سالانہ جشن کے موقعہ پر چند خوش نصیب نابینا یہاں سے بینائی لیکر لوٹتے ہیں جب کسی کی بینائی واپس لوٹ آتی ہے اور وہ خوشی سے چلا اٹھتا ہے تو فوراً مجمع اس پر ٹوٹ پڑتا ہے اور جب تک اس کے بدن کا پیرہن تار تار نہ ہو جائے اس وقت تک اُس غریب کی جان آفت میں رہتی ہے کیونکہ اس کے پیرہن کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا لوگ بطور تبرک حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

بلخ کو "اُم المدین" کہا جاتا ہے یہ مزار شریف سے صرف تیرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ شہر زمانہ قدیم کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔ یہاں اب صرف کچھ کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں جن میں "محراب نوبہار" اور بُدھ کے استوپ ہیں۔ سولھویں صدی کے تیموری عہد کی کچھ تاریخی یادگاریں، درخشاں ماضی کی یاد دلاتی ہیں۔ خواجہ محمد پارسا کی مسجد ان ہی نوادرات میں سے ایک ہے۔ احمریں محرابوں اور مینا کاری کے ٹائیلوں سے بنی ہوئی اس مسجد کو دیکھنے کے بعد کوئی بھی بیساختہ تعریفی کلمات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پُل خمری ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو کہ ٹیکسٹائل انڈسٹری کا مرکز مانا جاتا ہے۔ یہاں سے دو الگ الگ راستے قندوز اور بلخ کو جاتے ہیں۔

پُل خمری سے ۱۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر سُرخ کوتل ہے۔ یہاں پر پہلی صدی عیسوی کا ایک کشانی مندر کھنڈر کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ پہاڑی چٹانوں کو تراش کر بڑے بڑے زینے بنائے گئے ہیں جو ایک آتشکدہ تک جاتے ہیں۔ جسے

کشان شہنشاہ کنشک نے بنوایا تھا۔ حال ہی میں فرانسیسی آثارِ قدیمہ کے مشن کے تحت انھیں کھود کر نکالا گیا ہے۔

قندھار افغانستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے اسے یونان والے Arachosia کے نام سے پکارتے تھے سکندر نے یہ شہر محافظ فوجی دستوں کے لئے بنوایا تھا۔ اور جس کا نام اس نے Alexandra of Arachosia رکھا تھا۔ افغانستان کی جدید شہنشاہیت نے یہیں جنم لیا جسکی ابتداء ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ درانی سے ہوئی۔ یہاں پر ایک عالیشان مسجد میں آنحضرتؐ کا لبادہ بطور تبرک رکھا ہوا ہے۔ قندھار میں دیگر آثارِ قدیمہ کے علاوہ "چہل زینہ" یعنی چالیس سیڑھیاں ہیں جو ایک ہی چٹان میں تراشی گئی ہیں۔ یہ زینے ایک محراب تک جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس محراب پر شہنشاہ بابر نے سولہویں صدی میں اپنی فتوحات بطور یادگار کندہ کرائی ہیں۔ اوپر پہنچنے پر ارگنداب کے میدان و آثارِ قدیمہ اور جدید قندھار کا نظارہ نہایت ہی دلکش دکھائی دیتا ہے۔

قندھار سے دو سو کیلومیٹر پر افغانستان کا ایک ترقی پذیر اور دلکش گوشہ لشکرگاہ بُست کے نام سے مشہور ہے یہی اس ملک کا وہ علاقہ ہے جہاں پہلے پہل اسلام کی روشنی ساتویں صدی عیسوی میں نمودار ہوئی۔ گیارھویں صدی میں سلطان مسعود غزنوی نے اپنا عالیشان قصر یہیں پر دریائے ہیلمند کے کنارے تعمیر کرایا تھا۔ اس نے موسم سرما کے لئے اپنی فوج کا ہیڈ کوارٹر اور ایک فیل خانہ بھی یہاں پر بنوایا تھا، جسے چنگیز خان نے تیرھویں صدی میں تہ و بالا کر دیا۔ اب بھی سلطان مسعود کا یہ عالیشان محل اس کے دربار کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ آج یہ لشکرگاہ بُست آبپاشی کے ایک بڑے جدید ترین پروجیکٹ کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے جو اس صوبہ کا قلب بھی ہے۔ سیّد عثمان خان نے بتایا کہ پہاڑ پر ایک بلند محراب ہے جہاں زیرِ زمین سات طبقات پر مشتمل ایک تہہ خانہ ہے جو بندی خانہ یا جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کے ۳۲ طبقات تھے۔ مگر صدیاں گزر جانے کے بعد مٹی اور ملبہ سے پُر ہو کر اب صرف سات طبقات باقی رہ گئے ہیں۔

ھرات جنوب مغرب میں افغانستان کا ایک اہم شہر ہے۔ سکندر نے اسپر یورش کے بعد موجودہ ہرات کے پہلو میں ایک شہر ارتکانا (Artakna) کے نام سے بسایا تھا۔ مسلم سلاطین کے دور میں خراسان اس کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ اسے پہلے چنگیز خان نے تباہ و برباد کیا اور پھر تیمور لنگ نے بھی کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کا تیموری دورِ ہرات کا سُنہرا دور کہا جاتا ہے۔ جس کی گواہی آج بھی اس کے کھنڈرات، مساجد کے بلند و بالا مینار، دیگر یادگاریں، دستاویزات اور مخطوطات دے رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس دور کی یاد دلاتی ہیں جب نقاشی اور فنِ خطاطی، ادبیات، نفاست و شائستگی معراجِ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ یہاں پر بہت سے مزارات ہیں۔ اس لئے ہرات کو اولیاءِ عظام کا شہر کہا جاتا ہے۔ جن میں سے خواجہ عبداللہ انصاریؒ، سلطان میر عبدالواحد شہیدؒ، شیخ احمد زندہ فیل احمد جامؒ، خواجہ غلطان دلیؒ۔ بابا عبداللہ کوہیؒ، امام فخرالدین رازیؒ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسی جلیل القدر ہستیاں یہاں پر استراحت فرما ہیں۔ جامع مسجد ہرات اتنی خوبصورت اور دلفریب ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے انسانی ہاتھوں نے نہیں بلکہ فرشتوں نے آراستہ کیا ہے۔ ہرات میں گلاب کثرت سے ہوتے ہیں اور ہر طرف خوبصورت پھول کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہرات کی زمین سے مصوّر، نقاش، موسیقار اور مشہور ہستیاں جنم لیتی ہیں۔ مشہور مصوّر بہزاد اور ایک شاعر و بزرگ ہستی مولانا جامیؒ یہیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہرات سے قریب ہی جام ہے جہاں پر ۲۰۰ فٹ بلند منقش و نگار اور قرآنی آیات سے مزین ایک مینار ماضی کی عظمت کا اعلان کر رہا ہے۔ ایران کی سرحد کے قریب فرح ایک مقام ہے جہاں مہدی موعود کا مزار ہے۔ مہدویہ طریقت و مسلک سے تعلق رکھنے والے کافی لوگ ہندوستان میں بھی ہیں چشت افغانستان کا وہ مقام ہے جس سے سلسلہ چشتیہ منسوب کیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی بہت سی بزرگ ہستیاں استراحت فرما ہیں۔

بامیان وادی بُدھ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اہم تاریخی مقامات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ وادی کابل سے ۸۰ میل کی دوری پر جنوب مغرب میں کوہ بابا اور کوہ ہندوکش کے برف پوش کوہستانی علاقہ کے درمیان ہے واقع یہاں کا نظارہ قابلِ دید ہے۔ زور و شور سے رواں دواں کوہستانی دریاؤں میں لذیذ قسم کی مچھلیاں "تقا" اور "ٹراوٹ" پائی جاتی ہیں۔ مہاتما بُدھ کے دنیا کے سب سے بڑے دیو قامت مجسمے یہاں پر ایستادہ ہیں۔ یہ مجسمے ۱۷۰ فٹ او فٹ بلند ہیں اور ایک دوسرے سے ۴۰۰ گز کی دوری واقع ہیں۔ چٹانوں کی عجیب و غریب قدرتی بناوٹ نے دلکش ترین مقام بنا دیا ہے۔ یہ وادی بُدھ تہذیب کا پ صدی سے لیکر چھٹی صدی تک گہوارہ رہی ہے۔ ہزار بُدھ بھکشو ان گپھاؤں کی خانقاہوں میں رہتے تھے او ہزار ہا اس مذہب کے پیرو ہر چہار جانب سے کھنچے ان مورتیوں کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ حال ہی میں بھارت سرکار اور حکومت افغانستان میں ان آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لئے ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے مصا دونوں حکومتیں مشترکہ طور پر برداشت کریں گی۔

وادی بامیان سے ۳۰ کیلومیٹر دور مغرب میں پہ پر گہرے نیلے رنگ کے تالاب ہیں جن کا پانی نہایت صاف و شفاف ہے۔ حضرت علیؓ سے منسوب کر کے ان کا "بند امیر" رکھا گیا ہے۔ یہاں پر ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں یہ پانی کہاں گہرائیوں میں غائب ہوتا چلا جاتا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔

افغانستان کا نہایت ہی خوبصورت مشرقی نورستان ہے یہ پہلے کافرستان کے نام سے مشہور تھا کیونکہ یہاں کافر قبائل آباد تھے۔ جو بت پرست تھے مگر اس علاقہ پر امیر عبدالرحمٰن کی فوج کشی کے بعد یہ تما داخلِ اسلام ہو گئے اور اس کا نام بدل کر نورستان یع land of light رکھ دیا گیا۔ نورستانی اپنی طرزِ رہائش اور وضع قطع کے ساتھ بلندیوں پر بنے ہو مخصوص قسم کے چوبی مکانات کی وجہ سے ہر نو وارد کو د نظارہ دیتے ہیں۔ نورستان کی سیر کے لئے افغان ٹور آرگنائزیشن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

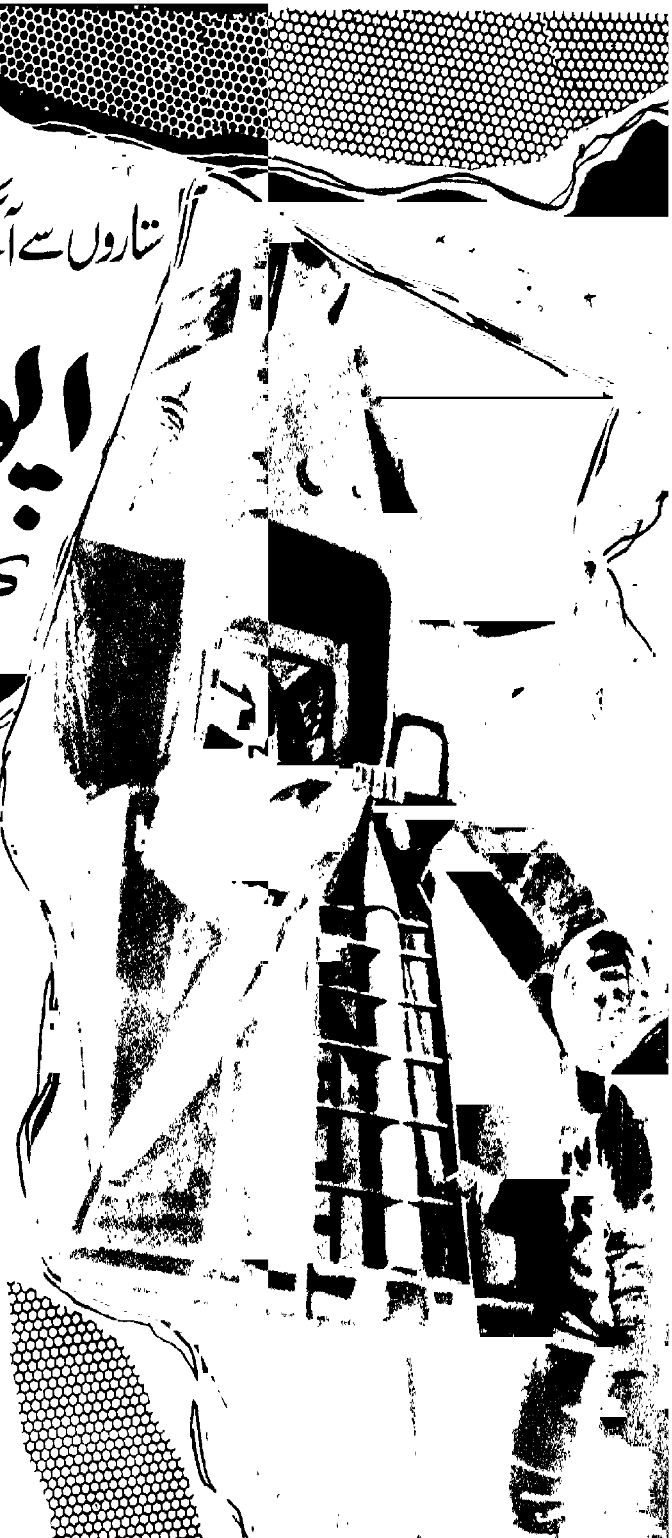
اس ملک کے قابلِ رشک مناظر سے لطف اند ہو کر دلوں کے تار مسرت سے جھنجھنا اُٹھتے ہیں بیکڑ د اونٹوں سے ترتیب دیئے ہوئے کوچی خانہ بدوش ہزارہ قبائل کے قطار اندر قطار گزرتے ہوئے کاروانو کا منظر اور صدائے جرس کے ساتھ اُٹھنے والی رسیلی نغمو کی لے انسان کو طلسماتی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ بلاشبہ یہ کوہستانی خطۂ ارض قدرت کا ایک ایسا حسین شاہکار ہے جسے دستِ قدرت نے عروسِ نو کی طرح خود سنوارا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اپولو ۱۴

کی مشن کامیاب

محمد سلیمان صابر



اپالو-۱۴ کے خلاباز چاند کی سطح پر اپنے سائنسی آلات اور اس کے چٹانی نمونوں کی باربرداری کے لئے دو پہیوں والی ایک گاڑی اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کی مدد سے وہ پچھلے خلا بازوں کی نسبت زیادہ تیزی سے کام کر سکے۔

خلا بازوں نے اس گاڑی کے کئی نام رکھے ہیں۔ وہ اسے رکشا۔ وھیل بیر۔ اور کیڈی کارٹ کہتے ہیں بعض صورتوں میں الیومینیم کی یہ گاڑی ان سب سے مشابہ ہے لیکن پھر بھی ان سے مختلف ہے۔ امریکی خلائی ایجنسی نے اس کا نام "ماڈیولر اکویپمنٹ ٹرانسپورٹر" (ایم۔ای۔ٹی) رکھا ہے۔

خالی حالت میں زمین پر اسکا وزن ۲۰ پونڈ ہے۔ آلات وغیرہ لاد کر اس کا وزن ۹۰ پونڈ بنتا ہے لیکن چاند کی سطح پر جہاں زمین کے مقابلے میں صرف ۱/۶ کششِ ثقل پائی جاتی ہے۔ اس گاڑی کا وزن آلات لادنے کے بعد بھی تقریباً ۱۵ پونڈ رہا اور یہ چاند کے ماحول کے مطابق چاند کے چٹانی نمونوں کے ۶ پونڈ اٹھا سکی۔

اس کا ہینڈل اس ڈھنگ سے بنایا گیا تھا کہ خلا بازوں کے دباؤ بھرے دستانوں والے ہاتھوں سے اسے چلایا جا سکے اسے کھینچنے میں صرف ایک پونڈ کے قریب قوت استعمال ہوتی ہے۔

گاڑی کی ہر ایک جانب پلاسٹک کا ایک ایک تھیلا اور اس کے پیچھے کی طرف دو پلاسٹک کے تھیلے لگے تھے جن میں خلا باز چاند کی سطح پر سے چٹانوں کے ٹکڑوں کو چن چن کر ڈالتے جاتے تھے۔ اس گاڑی کی چھت پر ایک ایسا تھیلا رکھا ہوا تھا جس میں ہر ایک ٹکڑے کو الگ الگ لپیٹنے کے لئے ریپر تھے۔

گاڑی میں متعدد کیمرے رکھنے کے لئے بھی جگہ بنائی گئی تھی۔ کھدائی کی کدال اور بیلچے بھی تھے تاکہ کھدائی سے سطح کی ساخت اور اس کے آپس میں جڑے اور چپکے رہنے کے خواص کا پتہ لگایا جا سکے۔

چاند کی اہمیت اسی وقت سے ہے جب ہمارے آباؤ اجداد نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا۔ ابتدائی عہد کے لوگ چاند کی تبدیلیوں سے وقت کا اندازہ لگاتے تھے۔ اب بھی کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض متمدن اقوام نے اس کی پرستش کی ہے۔ لونا اور سیلین دو رومن اور یونانی نام ہیں جو چاند دیویوں کے لئے عام طور پر مستعمل ہیں۔ شاعروں نے اس کی خوب صورتی کے ترانے گائے ہیں اور اپنے معشوق کو چاند سے تشبیہہ دی ہے۔ آج بھی گلیوں میں بچے گاتے پھرتے ہیں:۔

؎ میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے

خلا کے بارے میں لکھنے والے مصنفین چاند تک بے شمار سفروں کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔

زمانہ قدیم میں لکھنے والے اپنی کہانیوں کے ہیروؤں کے کرداروں کو پرندوں یا ہواؤں کے ذریعے چاند پر پہنچاتے تھے۔



ایک مصنف نے تو اپنے ہیرو کو راکٹوں کے ذریعے اچھالنے کا تخیل پیش کیا تھا۔

پس یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انسان نے خلائی پرواز کے لئے اپنے اولین نشانے کے طور پر چاند کو منتخب کیا۔ زمین سے ڈھائی لاکھ میل دور ہونے کے باوجود خلا میں یہ ہمارا قریب ترین پڑوسی ہے۔

چاند زمین سے کہیں چھوٹا ہے۔ اس کا قطر صرف ۲۱۶۰ میل ہے جبکہ زمین کا قطر ۷۹۹۰ میل ہے۔ اس کی کشش ثقل زمین کی کشش ثقل کے مقابلے میں صرف ۱/۶ ہے اور اس کے اندر کوئی کرہ ہوا نہیں ہے۔ جس سے گزر کر خلا باز پیراشوٹ کی مدد سے نیچے اتر سکے۔

چاند پر درجہ ہائے حرارت میں انتہائی شدت پائی جاتی ہے۔ سورج کی روشنی میں وہاں درجۂ حرارت ۲۲۰ ڈگری فارن ہائٹ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور اسی طرح سائے میں وہ صفر سے ۲۴۰ ڈگری نیچے چلا جاتا ہے۔

امریکا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے چاند کو سر کیا اور امریکی خلا بازوں نے اس کی اس سطح کو روند کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ چاند کے سفر کے سلسلے میں امریکا کا پہلا قدم مرکری پروجیکٹ تھا۔ اس سے ہمیں یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ خلا باز خلا میں کس طرح کام کر سکتا ہے اور وہ اپنے خلائی جہاز پر کس طرح کنٹرول کر سکتا ہے اور کس طرح اسے بہ حفاظت مدار میں واپس لا سکتا ہے۔

دوسرا قدم جیمنی تھا جو نسبتاً بڑا خلائی جہاز تھا اور جس میں دو خلا باز کئی دن تک مدار میں گھوم سکتے تھے۔

ان خلائی جہازوں کے ذریعے اس بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہو گئیں کہ خلا میں کس طرح کام کیا جا سکتا ہے اور مدار میں کس طرح دو خلائی جہازوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ دو خلائی جہازوں کا جوڑ ہی حقیقت میں چاند کے مشن کی کامیابی کی کنجی ہے۔ دو خلائی جہازوں کے خلا میں جڑ جانے کے تجربے کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ چاند گاڑی کو چاند پر سے اٹھانے کے بعد کمان گاڑی سے ملایا جا سکتا ہے اور خلا باز پھر سے اپنے خلائی جہاز میں واپس آ سکتے ہیں۔ کمان گاڑی خلائی جہاز کا وہ اصلی خول ہے جس میں خلا باز چاند کے قریب تک اور پھر وہاں سے زمین پر واپس آنے کا سفر کرتے ہیں۔

امریکی منصوبے کا آخری قدم اپالو تھا

اپالو ۱۴ چاند کی سطح پر اترتے ہوئے

یہ منصوبہ خلا بازوں کو ارضی مدار میں بھیجنے سے شروع کیا گیا۔ زمین کے گرد پروازوں سے خلا باز اپنے قمری راکٹوں سے آشنا ہوئے اور بہت سے ان کاموں کا انھیں تجربہ ہوا جو انھیں چاند کے سفر کے دوران انجام دینا پڑے۔

اپولو ۱۰ تک مختلف تجربات ہوتے رہے اور اس کے بعد بالآخر چاند کو سر کرنے کا وقت آ گیا۔ اپولو ۱۱ نے جس کے ذریعے ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو آرم اسٹرانگ چاند کی سطح پر پہنچے خلائی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور خلائی تاریخ کا دوسرا سنہری باب اس وقت لکھا گیا جب ۱۹ نومبر ۱۹۶۹ء کو اپولو ۱۲ کے ذریعے امریکا دوسری بار انسان کو چاند پر اتارنے میں کامیاب ہوا۔

گزشتہ اپریل میں اپولو ۱۳ کا مشن ناکام رہا جب خلا باز چاند پر نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس لحاظ سے کامیاب تھا کہ خلائی جہاز کو جبکہ وہ اپنے سفر کا دو تہائی حصہ طے کر چکا تھا زمین پر اتار لیا گیا۔ اور اب اپولو ۱۴ کے ذریعے عظیم کامیابی حاصل کی گئی، جب دو امریکی خلا باز پہلے خلا بازوں کے مقابلے میں زیادہ وقت تک چاند پر رہنے کے بعد واپس آ گئے۔ یہ خلا باز ہیں ۴۷ سالہ نیوی کیپٹن ایلن بی شیپرڈ اور ۴۰ سالہ ایڈگر ڈی مچل۔ تیسرے خلا باز ۳۷ سالہ ایئر فورس میجر اسٹوارٹ اے روسا تھے جو چاند سے کوئی ۷۰ میل (۱۱۲ کلومیٹر) کی بلندی پر چاند کے بیضوی مدار میں اپنی کمان گاڑی (KITTY HAWK) میں گھومتے رہے اور جہاز پر رکھے ہوئے حساس آلوں اور کیمروں کے ذریعے چاند کی تصویر

ا چاند پر اترنے کے مقامات اور چاند کی سطح
ں کے متعلق صحیح اور تفصیلی پیمائش کرتے رہے
یپ کنیڈی سے ۳۱ فروری کو ۴:۰۳ بجکر ۳۲ منٹ
لا تھا۔ لیکن گھنے بادلوں کی وجہ سے اس کے
منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ تاہم چاند پر اترنے سے
ا پوری کر لی گئی۔

بازمیں جو سائنسی آلات رکھے گئے تھے ان کے
سیع کھوج اور ایسے ارتقائی تجربے کئے گئے جو
فلکی کرے میں نہیں کئے گئے تھے ان خلا بازوں
نے کے مقام کا نام زمانہ وسطیٰ کے ایک اطالوی
فشہ کش کے نام پر ”فرا مورو“ رکھا گیا۔

لیا جاتا ہے کہ یہ خطہ ایک سائنسی خزانہ ہے اور یہ
ندرونی گہرائیوں سے نکلے ہوئے چٹانی ٹکڑوں کے
بارے گہرے طور پر بکھری ہوئی ہے۔ اس خطے
ا ربانز اپنے ساتھ لائے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے
بھا جائے گا کہ وہ کتنے پرانے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
قدیم ہوں جتنا کہ خود یہ نظام شمسی ہے۔

پرڈ اور مچل بالترتیب پانچویں اور چھٹے خلا باز ہیں
وم ہیں۔ وہ اپنے ساتھ سامان ڈھونے کی دو
لی ایک گاڑی میٹ (MET) بھی لے گئے تھے جسے
ام بھی دیا گیا ہے اس مدد سے وہ چاند پر سائنسی
ہرے فلیں۔ کھدائی اور چھیدنے کے آلات بآسانی
سے دوسری جگہ لے جاسکے اور اسی کی مدد سے انھوں
چٹانوں کے جمع کئے ہوئے ٹکڑے چاند گاڑی تک

پرڈ اور مچل ۵ فروری کو صبح ۴ بج کر ۲۴ منٹ
یں۔ٹی) پر چاند کی سطح پر اترے اور پھر صبح ۹ بجے
ی این ٹیریس (ANTARES) سے نکل کر چاند کی سطح
یقی کام شروع کر دیا۔ ۴½ گھنٹے تک چہل قدمی
نے کے بعد وہ چاند گاڑی میں پہونچ گئے اور دوسرے
روری صبح ۵ بجکر ۱۵ منٹ (ای۔ایس۔ٹی) پر
اند گاڑی سے باہر آئے اور چاند پر ۴½ گھنٹے تک
ام میں مصروف رہے۔ بعد ازاں چاند گاڑی میں
ر چاند کی سطح پر پرواز کرتے ہوئے اپنے ساتھی روسا
، اور زمین کی طرف ان کی واپسی شروع ہوگئی۔

شیپرڈ اور مچل چاند کی سطح پر اترے تو انھوں نے وہاں ایک رنگین ٹیلی ویژن کیمرہ نصب کر دیا تھا جس کی مدد سے امریکا میں ٹیلی ویژن پر انکی کارروائی کو دیکھا جاسکا۔

خلا بازوں کو اس مرتبہ ایسے خطے میں اتارا گیا جو زیادہ چٹانی تھا۔ ۶ فروری (ہفتہ) کو وہ ۴۰۰ فیٹ اونچے ایک مخروطی شکل کے دہانہ آتش فشاں کی طرف بڑھے لیکن زمینی کنٹرول نے انھیں زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیا کیونکہ انکے دل کی حرکت تیز ہوگئی تھی۔ تاہم خلا بازوں نے چاند کے بہت سے ٹکڑے اور پتھر جمع کرکے گاڑی میں رکھ لئے۔

چاند پر خلا بازوں کا کام ۶ فروری بروز ہفتہ کو ختم ہوگیا۔ اس کے بعد وہ اپنی چاند گاڑی کے ذریعے کمان گاڑی سے آملے۔ چاند گاڑی جب کمان گاڑی سے آکر ملی تو سرنگ کے ذریعے خلا باز اس میں پہونچ گئے اور چاند سے لائے ہوئے ٹکڑے بھی اس میں پہونچا دیئے۔ بعد میں چاند گاڑی کو چھوڑ دیا جو چاند پر گر کر ختم ہوگئی۔

منگل کے دن صبح ۲ بجے (ہندوستانی وقت) خلا باز وسط بحر الکاہل میں اتر گئے اور اس طرح ان کا نو دن کا سفر پورا ہوگیا۔ اس سفر کے نتیجے میں بہت سی نئی معلومات حاصل ہوں گی جن سے آئندہ کے پروگراموں میں بڑی مدد ملے گی۔ سائنسداں اور ماہرین دراصل یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ چاند پر کون کون سی دھاتیں مل سکتی ہیں اور کیا ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے ہم جہاں تک زندگی کا سوال ہے، یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ وہاں عام حالات میں انسان زندہ رہ سکے۔ انتہائی کم اور انتہائی زیادہ درجۂ حرارت میں جو چاند پر رہتا ہے انسان کا زندہ رہنا ممکن ہی نہیں۔

چاند کے بعد دوسرا مستقل قریب ترین پڑوسی زہرہ ہے، پھر بھی بہت دور ہے۔ جب وہ ہمارے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے تو زمین سے اس کا فاصلہ چاند کے مقابلے میں سو گنا یعنی ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ میل ہوتا ہے۔ بعید ترین سیارہ پلوطان ہے جو کبھی بھی تین ارب بیس کروڑ میل سے زیادہ قریب نہیں آتا۔ بین السیاراتی خلائی جہاز جتنی قوت رفتار کے ساتھ اس وقت بھیجا جاسکتا ہے اتنی رفتار سے اگر پلوطان پر آنے جانے کا سفر اختیار کیا جائے تو ہمیں تقریباً پوری زندگی ختم ہو جائے گی۔


لوئی شیفرڈ اور لڑکیاں


لوئی مائیکل اور خاندان


جان روزا اور بچے

لیکن ان طویل فاصلوں کے باوجود ایک دن ایسا آئے گا جب انسان نظام شمسی کے پورے علاقے میں سفر کر سکے گا۔ اس صدی کے اختتام سے قبل انسان شاید مریخ کا سفر کر چکا ہوگا اور غیر انسان بردار خلائی جہاز مشتری اور شاید عطارد اور زحل تک پہونچ چکا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کبھی ستاروں تک پہنچ سکے گا!۔ جو ستارہ زمین کے سب سے زیادہ نزدیک ہے وہ بلاشبہ ہمارا سورج ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ انسان جو تصور کرتا ہے اسے کر بھی سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوگا۔ اس میں ایک صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصہ لگ سکتا ہے۔ لیکن ستارے انتظار کریں گے اور جب انسان اپنی مہم کے لئے تیار ہوگا وہ اپنے گردش کرنے والے سیاروں کے ساتھ وہاں موجود ہوں گے لیکن پھر بھی انسان دیکھے گا کہ یہ ستارے ہی کائنات کا اختتام نہیں ہیں۔ بلکہ ؎

”ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“ ●●

واقعات نئی دہلی

دنیا دوربین کی نظر میں

اسرائیل میں رہنے والے عربوں کو عرب غدار اور اسرائیلی جاسوس سمجھتے

عرب بچوں کو ۲۵۶ گھنٹے بائیبل کی تعلیم دی جاتی ہے اور صرف ۳۰ گھنٹے قرآن کی تعـ

اسرائیل

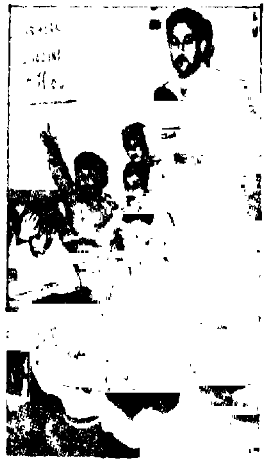
عرب دوسرے درجے کے شہری

اسرائیل کی تیس لاکھ کی آبادی میں عربوں کی تعداد صرف چار لاکھ ہے۔ کہنے کو سرکاری طور پر انھیں مساوی سماجی اور سیاسی حقوق دئے گئے ہیں لیکن عملاً وہ ان حقوق سے محروم ہیں یہودی شہری تک یہ نہیں کہہ سکتے کہ عربوں سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کیا گیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انھیں بہتر طبی سہولیات حاصل ہیں۔ اور انھیں ہمسایہ عرب ملکوں کے مقابلے میں زیادہ اجرتیں ملتی ہیں لیکن سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے وہ دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔

ایک اسرائیلی عرب نے جو سرکاری ملازم تھا اور جسے شاید اسرائیلی پروپیگنڈے کے لئے ہندوستان بھی بھیجا گیا تھا اپنی حکومت کی تعریف کرنے کے باوجود پرائیویٹ ملاقات میں اقرار کیا کہ اسرائیل میں انکے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ ایک اور اسرائیلی عرب نے کہا "بعض اوقات میں سوچا کرتا ہوں ہم نہ حقیقی عرب ہیں اور نہ حقیقی اسرائیلی کیونکہ عرب ممالک میں ہمیں غدار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسرائیل میں کہا جاتا ہے کہ ہم جاسوس ہیں"

تعلیم کے معاملے میں بھی اسرائیل میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہودی ہائی اسکولوں میں تاریخ کی کتابوں میں ۹۴ فیصدی یہودی تاریخ کا ذکر ہے جبکہ عرب اسکولوں میں عرب تاریخ کو صرف ۱ فیصدی جگہ دی گئی ہے۔ غیر مذہبی یہودی اسکولوں میں ۴۹۰ نصابی گھنٹے بائبل اور یہودی روایات کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ اسلام کا ان میں تذکرہ نہیں جبکہ عرب اسکولوں میں ۲۵۶ گھنٹے بائبل اور یہودی روایات کی تعلیم کے لئے اور صرف ۳۰ گھنٹے قرآنی تعلیم کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود تعلیمی سرگرمیوں کے جائزے سے



ایک عرب اسرائیلی اسکول

ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلی اساتذہ عرب نوجوانوں کے قومی احساسات پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہے ہیں۔ اور وہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان ثقافتی فرق کو ختم نہیں کر سکے ہیں۔ خود اسرائیلی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق عرب نوجوانوں میں ۴۴ فیصدی ایسے ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ اسرائیل کو ایک الگ مملکت کی حیثیت سے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جبکہ انکے والدین میں اس خیال کے حامیوں کی تعداد صرف ۳۰ فیصدی ہے۔ اسرائیل عرب بچوں کو مسخ تاریخ پڑھا کر انکے ذہنوں کی صفائی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا اثر الٹا پڑ رہا ہے اور یہودیوں کے تئیں ان کے دلوں میں زیادہ نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ ذہنوں کی صفائی اصل میں مسخ شدہ تاریخ پڑھانے سے نہیں ہوتی بلکہ اکثریت کے عمل سے ہوتی ہے۔ اقلیت سے تعلق رکھنے والے نوجوان خواہ کتنی ہی مسخ شدہ تاریخ پڑھ لیں جب عملی میدان میں وہ محسوس کریں گے کہ وہ امتیازی سلوک کا شکار ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی اور وہ یہی سوچیں گے کہ اس مملکت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن شاید اسرائیل اس بنیادی بات کو محسوس نہیں کرتا۔

مشرق وسطیٰ

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں بھاگتے

متحدہ عرب جمہوریہ سے جنگ بندی میں مزید [illegible] ماہ کی توسیع منظور کر لی ہے۔ اس سے قبل دو ہفتے کے اندر امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس انور سادات کے نام تین مراسلے بھیج چکے تھے جن میں یقین دلایا گیا تھا کہ ڈاکٹر گنار یارنگ کی [illegible] میں امن کی جو بات چیت ہو رہی ہے اس میں امریکہ بھی مدد دے گا نیز اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل او تھانٹ نے سلامتی کونسل کو پیش کردہ اپنی رپورٹ میں کہا کہ بات چیت میں کسی قدر پیش رفت عمل میں آئی ہے۔ وزیر خارجہ امریکی کی یقین دہانی اور سکریٹری جنرل اقوام متحدہ کی رپورٹ کے بعد انور سادات ایک ماہ کی توسیع منظور کرنے پر رضامند ہو گئے [illegible] کے ذریعہ کا مظاہرہ [illegible]

[illegible] کی بات [illegible]

خود اقوام متحدہ کے سکریٹری [illegible] نے اپنی رپورٹ میں بڑی محتاط پُر امیدی کا اظہار کیا ہے اس کی وجہ صاف ہے، کہ اسرائیل نے جو سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے اس میں وہ تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں ہے — ۱۹۶۷ء کی چھ دن کی جنگ میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے ابھی تک اس کے دماغ کو خراب کیا ہوا ہے۔

انور سادات نے تو یہ پیشکش بھی کی کہ اگر اسرائیل نہر سوئز کے علاقے سے جزوی طور پر بھی اپنی فوجیں ہٹا لے تو وہ نہر کو دوبارہ کھول سکتے ہیں۔ لیکن اسرائیل کے پاس

۶۷ء کی کامیابی نے اسرائیل کا دماغ خراب کردیا ہے

اقوام متحدہ باعزت سمجھوتہ کرانے کی صلاحیت سے محروم ہے

تمام ۔۔ات کا ایک ہی جواب ہے یعنی "امن کا معاہدہ"۔ امن کے معاہدہ کی رٹ اسرائیل نے اس لیے لگا رکھی ہے تاکہ وہ دنیا کو دھوکا دے سکے کہ وہ امن پسند ہے۔ اور عربوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ امن کے معاہدہ سے اس کا اصل مقصد اپنی جارحیت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ وہ پہلے اعلان کرچکا ہے کہ وہ بیت المقدس سے دستبردار نہیں ہوگا وہ دوسرے بہت سے



انور السادات
"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"

علاقوں پر بھی اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے عرب ... ان چالوں کو سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بات چیت نہیں کرنا چاہتے

کیا آپ اپنے ... ان کی واپسی ... سے سودے بازی کریں گے ... مرے گئے ہوں ... اسرائیل حملہ آور ہے اس نے ... عرب علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اور اب ... اپنی امن پسندی کا ڈھنڈورا پیٹ کر ان علاقوں کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہے۔

انور سادات نے ایک ماہ کی مزید توسیع منظور کرلی ہے لیکن یقین نہیں ہے کہ بات چیت میں کوئی پیش ...

کو متحدہ عرب جمہوریہ کو واپس کرنے کی جو تجویز پیش کی ہے کیا وہ عربوں اور امن پسند دنیا کو منظور ہوگی۔ کم از کم موجودہ حالات میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عرب ممالک ڈاکٹر کنار یارنگ کی اس ذلت آمیز تجویز کو منظور کرلیں گے۔ یہ دراصل پوری اسرائیلی جارحیت کی تصدیق کرنے کے مترادف ہے۔

جنگ بلاشبہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ جنگ دنیا پر بڑی تباہی لاتی ہے صرف چھ دن میں دس لاکھ مصری پناہ گزین بن گئے تھے۔ جان و مال کا جو زبردست نقصان ہوا وہ ... سے الگ تھا۔ لیکن ہر قوم اپنی آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کردیتی ہے اور عرب بھی اس کے لیے تیار ہیں۔ ... سمجھوتے کا بھی خیر مقدم کریں گے۔ لیکن ... قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ باعزت سمجھوتہ کرانے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ جنگ بندی میں ایک ماہ یا دو ماہ یا اس سے بھی زیادہ کی توسیع ... تب بھی یہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا ... کہ لاتوں کے بھوت کبھی باتوں سے نہیں مانا کرتے لیکن اس بات کا کیا علاج خود عرب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ گزشتہ ہفتہ عمان میں جو کچھ ہوا وہ عربوں کی یکجہتی کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

عربوں کو شاید معلوم نہیں کہ وہ صرف ایک محاذ پر جنگ لڑ سکتے ہیں بہ یک وقت دو محاذوں پر نہیں گھر ... مضبوط نہ ہوا تو وہ اسرائیل کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

برطانیہ

"نام" ہی سلکہ

اب برطانیہ بھی اعشاری نظام

برطانیہ میں بھی اعشاری نظام رائج

نے اپنا خصوصی نظام ختم کردیا۔ اعشاری نظام اختیار کرلیا لیبر حکومت نے ۱۹۶۶ء میں کیا تھا تاکہ برطانیہ کامن ... میں اپنا اہم رول ادا کرسکے اس درمیان برطانوی عوام کو یہ ... کرنے کے لئے تیار کیا جاتا رہا۔ پرانی عادتیں اور پرانی چیزیں ... سے چھوٹتی ہیں۔ ہندوستان میں اعشاری نظام ... لیکن آج تک لوگ آنے پائیوں کو نہ بھولے برطانیہ میں صرف شلنگ کو ختم کیا جارہا ہے پنس کی ... ایک پونڈ میں ۲۴۰ پنس کے بجائے ۱۰۰ پنس ہوا جیسے کہ ایک روپے میں سو پیسے۔

نئے ... تانبے، چاندی اور تین کلائے کے سکے ہوا انھیں لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے دو ملین پونڈ سے زیادہ ... ڈالر کی رقم خرچ کی گئی ہے۔ ۹۵۰ شہروں میں پوسٹروں کی ... کی گئی اور اعشاری نظام کی رہنمائی کے پمفلٹوں کی ... تقسیم کی گئیں۔ ٹیلی ویژن پر ... بی بی سی کی نشر ... عوام کو بھایا گیا کہ ہمارے بڑے بڑے ... سادے سادے نظام کو کتنا پیچیدہ بنادیا، اور اس کے ... کے ... انگیز طریقہ استعمال کئے گئے ... مارگریٹ اب بھی کہتی ہیں کہ "میں اس نظام کو کبھی نہ سمجھ سکوں گی"۔

گنتی کے جو بادشاہ اس وقت دنیا میں رہ گئے ہیں ان میں ایک برطانیہ کا بادشاہ شامل ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اگر وقت آیا جب دنیا میں بادشاہت کا بالکل ہی خاتمہ ہوا تب بھی بادشاہ ضرور رہیں گے۔ ایک تاش کا بادشاہ دوسرا برطانیہ کا برطانیہ کے بادشاہ کے موجود رہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ... نہیں ہیں کہ جو مرضی میں آیا کر ڈالا اور جس پر چاہا گولی ... وہ اصل میں نام کا بادشاہ ہے اور اصل طاقت عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہے۔

جو رہی سہی مراعات برطانوی بادشاہ کو حاصل تھیں وہ اب واپس لی جارہی ہیں جنگلی جانوروں اور جنگلات سے متعلق ایک بل برطانوی پارلیمنٹ میں زیر بحث آیا جس کے تحت ملکہ برطانیہ بعض ان مراعات سے محروم ہوجائے گی جن میں سے ایک ...

واقعات نئی دہلی

وھیل مچھلی کی دُم پر سے ملکۂ برطانیہ کا حق ختم



بلد مرا انسیجو ایلز بیٹھ کارسٹ میں ملبوس

ایسی ہیں جواسے ۱۳ ویں صدی سے حاصل تھیں۔ ان میں اس کا ایک خاص حق یہ ہے کہ کوئی بھی وھیل مچھلی جو ساحل برطانیہ پر آجائے گی۔ اس کی دم ملکہ کی ہوگی۔

عام طور پر روایت یہ رہی ہے کہ وھیل مچھلی کا سر بادشاہ کا ہوتا ہے۔ دم ملکہ کی اور اس کا باقی حصہ مچھیرے کا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مچھلی کی جو ہڈی شاہی کارسیٹ (ایک قسم کی پیٹی جو یورپین عورتیں کمر کے نیچے سے چھاتی تک اپنی پوشاک کے نیچے لگاتی ہیں) کے لئے استعمال ہوتی ہے وہ وھیل مچھلی کی دم میں ہی ہوتی ہے۔ لیکن لارڈ چانسلر نے ملکہ کو یقین دلایا ہے کہ قانون کے تحت جو حق انھیں صدیوں سے حاصل ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے کہ کورسیٹ میں استعمال ہونے والی ہڈی وھیل مچھلی کی دم میں نہیں بلکہ سر میں ہوتی ہے۔

دراصل پارلیمنٹ کے ممبران خصوصی حقوق کے ان سات صفحات کو قانون کی کتاب سے نکالنا چاہتے ہیں جنھیں نکالنے کی سفارش ۱۹۶۵ء میں قائم کردہ کمیشن نے کی تھی۔ یہ مراعات آج کے جمہوری دور سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ فرانس کی جب ایک ایکٹرس وھیل مچھلی کی ہڈی سے بنی کارسیٹ پہن سکتی ہے تو برطانیہ میں اس خصوصی مچھلی کی ہڈی کو ملکہ برطانیہ کے لئے مخصوص رکھنے سے کیا فائدہ۔!

یوگینڈا

سونے کے ساتھی

یوگینڈا کے ... کہتے ہیں کسی زمانے میں جنرل امین اور اوبوٹے باہم شیر و شکر ... کی سمگلنگ ...

جنرل امین نے اپنا اقتدار مضبوط



تھے۔ جنرل امین اوبوٹے کا دایاں بازو تھے اور دونوں نے مل کر قبائلی خانہ جنگی کے چیلنج کا مقابلہ کیا تھا۔ عام طور پر امین سونے کے جوڑی دار کہا جاتا تھا۔ کیونکہ مشہور تھا کہ دونوں



امین باتیں اور اوبوٹے — جب دونوں مل کر سونے کی اسمگلنگ کرتے تھے۔



یوپی

دوسری ریاستوں کی طرح یوپی میں بھی انتخابی بخار ...ا ہے۔ لیکن وہاں ایک اور بخار بھی موجود ہے اور ...وزارتی بخار۔ سننے میں کہ اس کا سخت دورہ بی ...ا کے مسٹر چرن سنگھ اور ان کے ساتھیوں پر پڑا ہوا ... اور مسٹر چرن سنگھ کے بارے میں تو خبر ہے کہ وہ ...زارت اعلیٰ "وزارت اعلیٰ" کا نعرہ لگاتے ہیں جن ...ھا ایک دل کی منڈلی سخت پریشان ہے۔ ان دو

کہتا ہے کہ مسٹر ٹی این سنگھ پر جب عوام نے بے اعتمادی کا اظہار کر دیا تو وہ اپنی کرسی سے کیوں چپکے ہوئے ہیں۔ دونوں گروپوں کے درمیان اس کشمکش نے اتنا طول کھینچا ہے کہ اس کا قدرتی طور پر الیکشن پر اثر پڑ رہا ہے اور تقریباً تمام حلقوں میں کانگریس مخالف ووٹوں کا تقسیم ہونا ناگزیر ہے۔ کانگریس کو امید ہے کہ ووٹ بٹ جانے کی وجہ سے ... لیکن کم ... جہاں ... اپنے اپنے امیدوار کھڑے کئے ہیں۔ ان میں خوب لڑائی ہوگی اور نتیجہ کانگریس کو پہنچے گا۔ دراصل ہر پارٹی کے اور اس پارٹی کے ممبروں کے اپنے اپنے مفاد ہیں کہ الیکشن کی نفاست ملحوظ نہیں باپ اور بیٹے اور بھائی بھائی الیکشن میں مقابلے پر آتے ہیں

لڑ رہی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر رام سبھگ سنگھ، مسز تارکیشوری سنہا اور مسٹر کے۔بی سہائے شامل ہیں۔ کانگریس ان تینوں سنڈیکیٹ لیڈروں کو شکست دے سکتی تھی اگر وہ کمیونسٹ پارٹی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ انتخابی مصالحت کر لیتی۔ لیکن اس قسم کی مصالحت نہ ہونے کی بنا پر سنڈیکیٹ لیڈروں کی کامیابی کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

مسز تارکیشوری سنہا کے مقابلے پر آٹھ امیدوار ہیں ان میں کانگریس کے مسٹر دھرم بیر سنگھ اور پی۔ایس۔پی کے مسٹر رام ... پرشاد شامل ہیں۔ ڈاکٹر رام سنگھ کے مقابلے میں پورے ایک درجن پہلوان انتخابی کشتی لڑ رہے ہیں اور ان میں کانگریس کے مسٹر اے۔پی۔ شرما اور کمیونسٹ پارٹی کے مسٹر سورج پرشاد شامل ہیں۔ مسٹر کے۔بی سہائے کا مقابلہ پانچ امیدواروں سے ہے جن میں کمیونسٹ پارٹی کے مسٹر چترا نرائن سنہا اور کانگریس کے مسٹر ... چار شامل ہیں۔ ووٹوں کی بڑے پیمانے پر تقسیم سنڈیکیٹ لیڈروں کی کامیابی کا باعث بنے گی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس نے جان بوجھ کر کمیونسٹ پارٹی اور پی ایس پی سے کوئی مصالحت نہیں کی کیونکہ وہ سنڈیکیٹ لیڈروں کو پھر ایوان میں لانا چاہتی ہے۔ مخالف لیڈر ایوان میں نہ ہوں گے تو کیا مزہ رہے گا گالیاں کھانے میں بھی مزہ آتا ہے۔ اور پھر مسز تارکیشوری کی "گالیاں" کہ بہت سے ممبر یہ گالیاں کھانا بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

... تے جاگتے چرن سنگھ کا خواب

...یر اعظم" نہیں تو کم از کم وزیر اعلیٰ تو بنوں

...نہ پہلے جن سنگھی لیڈر مسٹر واجپئی لکھنؤ پہنچے تھے ...بے نیل مرام واپس آنے ... ایک ... جو ...گئی ہے وہ دور نہ ہو سکی ... بی کے ڈی والوں کا



یہ تو پھر بھی الگ الگ پارٹیاں ہیں جو بھان متی کے کنبہ کی طرح ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ لیکن کب تک یہ جمع رہیں گی یہ بعض چار دن کی چاندنی ہے اور پھر اندھیری رات ۔۔۔

یوپی آبادی کے لحاظ سے ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے لوک سبھا کی ریاست ۔۔۔ اس لئے وہاں امیدواروں کی تعداد بھی زیادہ ہونا لازمی ہے ۔۔۔ ۱۹۶۷ء میں امیدواروں کی تعداد ... تھی لیکن اس مرتبہ ... میدان میں جن میں آزاد ممبروں کی بھرمار ہے یعنی ... جبکہ ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں یہ تعداد ۱۹۰ تھی ۔۔۔ لیکن شاید یہ لوگ اتنی زیادہ تعداد میں اس لئے آئے ہیں تاکہ سرکاری خزانے کی مدد کر سکیں ۔۔۔ ضمانتیں واپس لینے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔ ■

بہار

بہار میں سنڈیکیٹ کی بڑی بڑی توپیں الیکشن



تارکیشوری ۔۔۔ کتنے شیریں ہیں تیرے لب ......

بہر نوع بہار کا الیکشن دلچسپ ہوگا۔ وہاں زیادہ تر ووٹ ذات برادریوں کی بنیاد پر طلب کئے جائیں گے۔ یوپی میں بھی یہ بدعت موجود ہے لیکن اتنی نہیں جتنی کہ بہار میں ہے۔

واقعات نئی دھلی

تارا کیشوری سنہا کی گالیاں مخالفین کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہیں

وہاں ہر آدمی اپنی ذات برادری پر جان دیتا ہے۔ کانگریس نے سب سے زیادہ یعنی ۷۴ امیدوار کھڑے کئے ہیں۔ سنڈی کیٹ جن سنگھ اور سوشلسٹ پارٹی ہر ایک پارٹی نے سولہ سولہ امیدوار میدان میں لائی ہے جبکہ کمیونسٹ پارٹی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی نے علی الترتیب ۱۱ اور ۱۲ امیدواروں کو ٹکٹ دیے ہیں۔

کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیاں اپنی پوزیشن کو بہتر بنا سکتی ہیں بشرطیکہ باہمی تعاون سے کام کریں اور اسی طرح جن سنگھ کو امید ہے کہ اس کی پوزیشن بھی بہتر ہو جائے گی۔ اگر اس کے دو ممبر بھی کامیاب ہو گئے تو یوں سمجھئے اس کی تعداد سو فیصدی بڑھ جائے گی یعنی اس کے دو ممبر ہو جائیں گے۔ برخاست شدہ لوک سبھا میں اس کا صرف ایک ہی ممبر تھا۔

پارٹیوں کے متحدہ محاذ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا تھا لیکن اس مرتبہ نہ تو ۱۴ پارٹیوں والا محاذ ہی موجود ہے اور نہ ہی قدیم کانگریس باقی ہے۔ سب کے ٹکڑے ہو گئے۔ کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں گرا۔ ریاست کی پالیٹکس کا نقشہ ہی بدل گیا۔ الگ الگ محاذ بن گئے اور الگ الگ گروپ۔ اس گروپ بندی میں ظاہر ہے اس بار بھی کسی ایک یا دوسری پارٹی کے اکثریت

ایر فورس کی گیارہ بٹالین بھی امن و انتظام کے سوا کرنے کے لیے موجود رہیں گی۔ ریاست کی ۶۱ ہزار پولیس علاوہ ہے۔ اتنی پولیس فورس اور فوج کے باوجود اگر قائم نہ رہ سکا تو یہ نظم و نسق کی بہت بڑی کمزوری ہو جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے، وزیر اعظم مستحکم حکومت کے قیام کی جو اپیل بنگال کے شہر

کیا موجودہ حالات میں بنگال میں انتخابات ممکن ہیں؟

بنگال

تشدد اور قتل و غارتگری کے باوجود اگر بنگال میں لوک سبھا کے ساتھ ساتھ اسمبلی کے وسط مدتی انتخابات عمل میں آتے ہیں تو اس کا اعزاز مسز گاندھی کی جمہوری پالیسی کو ملنا چاہیئے۔ بنگال کے حالات ایسے ہیں کہ بہت آسانی سے انتخابات ملتوی کئے جا سکتے تھے لیکن مرکزی حکومت نے ایسا نہیں کیا اور بنگال کو ایک مرتبہ پھر اپنی نئی حکومت چننے کا موقعہ دیا۔

۱۹۶۹ء کے انتخابات میں ووٹروں کو کانگریس یا ۱۴

میں آنے کا امکان نہیں۔ یعنی پھر وہی جوڑ توڑ والی حکومت بنے گی جیسی کہ پہلے بنی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بنگال والوں کی بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔

کانگریس کو امید تھی کہ بنگلا کانگریس کی امداد اور اشتراک سے شاید کچھ ابھار دل ادا کر سکے گی لیکن دونوں جماعتوں میں کوئی مصالحت نہیں ہوئی۔ ممکن ہے سنڈی کیٹ کانگریس اور بنگلا کانگریس کے درمیان کوئی مصالحت ہو جائے۔ آجکل سنڈیکیٹ نے مصالحت کرنے میں ریکارڈ مات کر رکھا ہے۔ کام کا کوئی اور ریکارڈ قائم نہ کر سکی تو سمجھوتوں کا ہی سہی۔ بے جان جماعت سمجھوتے نہ کرے گی تو کیا کرے گی۔

لیکن یہ اچھی بات ہے عوام میں تشدد کے واقعات کی مذمت کی جا رہی ہے اور اسی لئے مارکسی کمیونسٹ پارٹی جو تشدد اور اپنی انتہا پسندی کے لئے بدنام ہے، غیر مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ حکومت نے طے کیا ہے کہ وہ الیکشن کے دوران ہر حالت میں امن و انتظام برقرار رکھے گی۔ اس مقصد کے لئے ریاست کے تمام اضلاع اور سب ڈویژن ہیڈ کوارٹرس میں فوجی دستے پہونچ گئے ہیں۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی اس طرح فوج کی تعیناتی کے خلاف ہے لیکن عوام اس سے مطمئن ہیں خاص طور پر اس لئے کہ عام طور پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ مقامی پولیس میں مارکسی کمیونسٹ ورکر گھس گئے ہیں۔ جب ان کی حکومت تھی انھوں نے اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لئے نہ جانے کیا کیا کر ڈالا تھا۔ فوج کے علاوہ بورڈ سیکورلٹی فورس کی نو اور سنٹرل

تھی اسے انھوں نے توجہ سے سنا ہے، یقین ہے ان کا موافقانہ ہوگا۔ مسلم لیگ جس نے اب اپنا نام بدل لیگ کر دیا ہے، اس سلسلے میں اہم رول ادا کرے گی سے حلقوں میں طاقت کا توازن اس کے ہاتھ میں ہے۔ بنگال میں مسلم ووٹروں کی تعداد ۷۲ لاکھ ہے۔

میسور

میسور سنڈی کیٹ کانگریس کا گڑھ نجلنگپا جی جو میسور کے سابق وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے کہ میسور میری جیب میں ہے لیکن اب ان کے "جیب" سے نکل رہی ہے۔ وزیر ٹرا مسٹر محمد علی اور وزیر قانون مسٹر کے پٹا سوامی نے وزیر اعلیٰ مسٹر ویریندر پاٹل کے چھکے چھڑا تھے کہ اب سنڈی کیٹ کانگریس سے بڑے عہدہ داروں کی علیحدگی سے ان پر بجھ ہو گئی۔ اور ان کی رفتار و گفتار میں وہ آ رہی جو کسی وقت پائی جاتی تھی۔

اور جب سے یہ مطالبہ شروع ہوا۔ اعتماد کا ووٹ حاصل کر و پاٹل جی کی رات تو ہو گئی ہے۔ وہ اپنی وزارت کو بچانے کے پیر مار رہے ہیں۔ سرکاری ملازمین اور



اجے مکرجی ـــــ مقابلہ سخت ہے

(اشاعت نئی دہلی)

اور پاٹل کی راوت کی نیند حرام

ہونے کا اعلان کیا ہے۔ زرعی مزدوروں ... اجرت پر ... روپیہ کردی ہے، دس ایکڑ زمین تک ... ان کیا ہے۔ دیہات میں بے روزگاروں کو روزگار کے لئے "لینڈ آرمی" تیار کررہے ہیں اور اس بات تک نہیں کررہے ہیں کہ سرکاری خزانہ پر اس ... کروڑ روپیہ سالانہ کا بار پڑے گا۔ لیکن اس کے ... مخالف ہی چل رہی ہے اور بالکل وہی حالت ... ہے جو گجرات میں پیدا ہوگئی ہے۔

... عام خیال پیدا ہوگیا ہے کہ مخالف پارٹیوں ... پارٹی ایسی نہیں ہے جو مرکز میں اپنی مضبوط ... قائم کرسکے۔ یوپی کی طرح وہی دو ... ایک ... کا ... اس کا وہی حشر ہوگا جو آج یوپی میں ہو ... نظر

... رہا ہے اس خیال نے تمام باشعور لوگوں کو کانگریس (حکمران) کا حامی بنا دیا ہے۔ اور وہ اسی کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے کام کررہے ہیں۔ کانگریس ہی وہ واحد جماعت ہے جس نے ... تمام ... سیٹوں کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کئے ہیں ... کو کامیاب ہونے کے لئے بڑے اچھے مواقع حاصل ہیں۔

راجستھان

راجستھان کے دو سابق حکمراں انتخابی میدان میں کود ... پہلے ... غلط فہمی تھی کہ ... وہ جنتا کو ... [illegible] ... گی۔ لیکن ... [illegible] ... ہونا ... [illegible] ... ہوتی تھی وہ آزادی ... جمہوریت کے دور میں ختم ... کرسامنے

وزیر اعلیٰ سکھاڈیا نے بڑے فخر سے کہا راجستھان میں اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر جو پچھلی لوک سبھا کے الیکشن میں عوام مہاراجہ بھرت پور پر جان دیتے تھے لیکن آج وہ مہاراجہ بھرت پور کا نام تک نہیں لیتے۔ مسٹر سکھاڈیا نے ایک دن میں دس جلسوں میں تقریریں کیں۔ ہر جلسہ میں پانچ ہزار سے پندرہ ہزار تک کی حاضری رہی۔ یہ اندرا کانگریس کے حق میں عوام کے زبردست رجحان کا ثبوت ہے۔

سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر ووٹروں کو توڑنے کی کوشش میں ہے چنانچہ بعض حلقوں میں ووٹر خریدنے کے بھی پروگرام بن رہے ہیں۔ بعض حلقوں میں مختلف طبقوں کے ووٹ کاٹنے کے لئے اسی طبقہ کے ایک امیدوار کو پیسہ دے کر کھڑا کیا گیا ہے لیکن آجکل کے ووٹر ہر چال سے واقف ہیں اس لئے امید نہیں کہ سابق حکمرانوں اور سرمایہ داروں کا طبقہ ان چالوں میں کامیاب ہوسکے گا۔ یقین ہے کہ پارلیمنٹ کی ... سیٹوں میں سے کانگریس کو دوسری تمام پارٹیوں سے زیادہ سیٹیں ملیں گی۔

●

عوام سرمایہ داروں اور راجے مہاراجوں کی چال پہچان گئے ہیں

... [illegible] ... بجائے ... [illegible] ...

... [illegible] ...

کسی امیدوار کا نام ... [illegible] ... ہے ... کامیاب کرنے کا انہوں نے عزم کرلیا ہے۔

مسائل

مختلف ریاستوں میں الیکشن کی سرگرمیاں جاری ہیں لیکن جیسا الیکشن کا نکھار ہونا چاہئے وہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے تاہم ہر گروپ اور ہر پارٹی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آرہی ہے۔ جگہ جگہ سیاسی اتحاد قائم ہورہے ہیں اور بڑے بڑے ... نے اتحاد ... کا اعلان کیا ہے۔

پچھلے الیکشنوں میں اکثر حلقوں میں سیدھی ٹکر ہوتی تھی اور ایک ... کو ... کرنے کے لئے صرف دو یا تین امیدوار ہوا کرتے تھے لیکن ... بہت کم ... مقابلے ہیں۔ بلکہ ... [illegible] ... امیدوار میدان ... [illegible] ... "... " والی مثل ... صحیح ثابت ہورہی ہے۔

امیدواروں نے الیکشن کے میدان میں ... [illegible] ...

ملاقات نفع دہلی



ایک اور گپ

اچھے سیٹھ

الیکشن کا بخار — جیوتشیوں کا دھندا زوروں پر

بیان کی ہیں۔ کسی کو قوم کا غم ستا رہا ہے۔ کوئی حکمراں کانگریس کو سبق دینا چاہتا ہے اور کوئی محض اس لئے انتخاب لڑ رہا ہے کہ اس کی پوزیشن اونچی ہو جائے گی اور وہ اپنے نام کے آگے سابق ایم ایل اے یا ایم پی کے الفاظ لکھ سکے گا۔

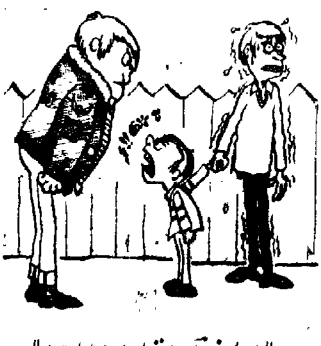
ہر شخص کے اپنے اپنے اغراض ہیں جن کی بنیاد پر وہ انتخاب لڑ رہا ہے۔ سابق حکمرانوں کے اغراض تو ظاہر ہیں۔ متعدد ممتاز سابق حکمراں یا تو آزاد امیدوار ہیں یا سوتنتر یا جن سنگھ جیسی جماعتوں کے ٹکٹوں پر کھڑے ہوئے ہیں جو سرمایہ داروں کے مفاد کی نگراں ہیں۔ یہ سابق حکمراں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر بلا تخصیص مذہب و ملت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں، خود اپنے امیدواروں کی مدد کر رہے ہیں یا ان جماعتوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں جو ان کے کاز کی حمایت کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر بیگم ساجدہ سلطان سابق حکمراں بھوپال جن سنگھ کے امیدوار مسٹر بھانو پرکاش سنگھ سابق حکمراں نرسنگھ گڑھ کی الیکشن مہم میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے، جب کہ ان کے صاحبزادے نواب پٹوڈی گوڑ گاؤں میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے ہیں۔

غرض جس شخص کو جس جگہ اپنا مفاد محفوظ نظر آیا ہے اس نے وہیں اپنا تعلق پیدا کر لیا۔ ان سیاسی جماعتوں تک نے جن کی بنیادی پالیسیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں محض اس لئے گٹھ جوڑ کر لیا ہے کہ کسی طرح حکمراں کانگریس کو اقتدار سے محروم کر سکیں۔ زیادہ تر یہ گٹھ جوڑ ان جماعتوں کے مابین ہوئے ہیں جو حکمراں کانگریس کی سوشلسٹ پالیسیوں سے خائف ہیں جن کو وہ برسر اقتدار آنے کے بعد بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ لیکن عام طور پر یقین کیا جا رہا ہے کہ گٹھ جوڑ کامیاب نہیں ہوں گے۔ یوپی، بہار، ہریانہ اور راجستھان وغیرہ سے آنے والی اطلاعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقتاً اندرا سرکار کے حق میں ایسی فضا بن گئی ہے کہ دوسری جماعتوں کے کارکنوں کو اکثر مقامات پر جلسے منعقد کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ہر جگہ اندرا گاندھی نے نئی روشنی لائی ہے یہ کے نعرے سننے میں آتے ہیں، جن سے ہر جگہ فضا گونجتی رہتی ہے۔

جوتشیوں کا دھندا آج کل بہت چل رہا ہے، اور خاص طور پر جو الیکشن کی پیش گوئیاں کرنے کے ماہر ہیں، بے فکری کے ساتھ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ اندرا سرکار کے امیدواروں کے مقابلے میں تمام مخالف پارٹیوں کے امیدوار خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

بچوں کی بزرگوں سے شکایت



حال ہی میں نیوجرسی میں تعلیم پانے والے دس سالہ بچوں سے محکمہ تعلیم نے دریافت کیا کہ اپنے بزرگوں سے انہیں جو شکایات ہیں ان کی تفصیل پیش کریں۔ پھر کیا تھا ہر بچہ دس دس بارہ بارہ صفحات پر اپنی شکایات لکھ کر لایا۔ تمام شکایات کا بغور معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمام بچوں کو اپنے والدین سے کم و بیش ایک درجن مندرجہ ذیل شکایات ہیں۔

۱: بزرگ ہمیشہ درس دیتے ہیں کہ وعدہ خلافی نہ کی جائے، جبکہ وہ خود اپنے کئے ہوئے سو فیصدی وعدوں کو جان بوجھ کر فراموش کر جاتے ہیں اور جب انکو یاد دلایا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ انھوں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔

۲: بزرگ ان باتوں کو خود نہیں کرتے جن کے لئے وہ ہمیں حکم دیتے ہیں، مثلاً اپنی چیزیں ٹھیک جگہ پر رکھو، ہمیشہ سچ بولو۔ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو۔

۳: والدین بچوں کو وہ لباس نہیں پہننے دیتے جو وہ خود پہننا چاہتے ہیں۔ بچوں کے لباس کے بارے میں ہمیشہ اپنی رائے کو مقدم رکھتے ہیں جبکہ خود اپنے لباس کے بارے میں کبھی بچوں سے رائے نہیں لیتے۔ چاہے وہ اس لباس میں کتنے ہی بھدے کیوں نہ لگ رہے ہوں۔

۴: یہ لوگ کبھی ہماری بات اطمینان اور سکون سے نہیں سنتے بلکہ پوری بات ختم ہونے سے پہلے ہی مشورے دینے لگتے ہیں۔

۵: ہم لوگوں کی غلطیوں پر سزا دینا انھوں نے اپنا فرض بنا لیا ہے، جبکہ خود اپنی غلطیوں پر وہ کبھی بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔

۶: بچوں کے معاملات میں ہمیشہ دخل اندازی کرتے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی بچہ انہیں صحیح مشورہ بھی دے تو اس کی گوشمالی کر دیتے ہیں۔

۷: بچوں کی پسند کو وہ کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے اور ان کے ہر فعل و عمل کو نادانی پر محمول کرتے ہیں۔

۸: ہمیں اُن باتوں سے منع کرتے ہیں جو بقول خود وہ اپنے بچپن میں کرتے رہے تھے۔

۹: کبھی معمولی بات پر سخت سزا دیتے اور کبھی بھاری غلطی کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

۱۰: ہم سے کہتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کے بعد گھر سے مت نکلو اور خود شام ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔

۱۱: ہمیشہ پیسے کی اہمیت جتاتے رہتے ہیں اور خود پیسے کو ہاتھ کا میل کہتے ہیں۔

۱۲: والدین کہتے ہیں کہ کسی کی برائی کرنا اچھی بات نہیں جبکہ ان کا زیادہ وقت دوسروں کی برائی میں

کیمرے کی تاک جھانک

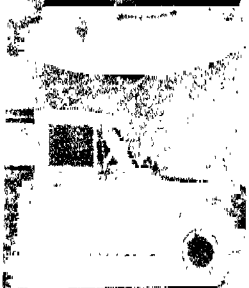


...میں فاشزم پھر جنم لے رہا ہے ۔ فاشسٹ مسولینی کے چیلے ایک بار پھر سر اٹھا رہے ہیں ۔ ان فاشسٹ نوجوانوں نے پچھلے دنوں اٹلی کے کئی شہروں میں فساد برپا کر دیئے ۔ کئی جگہ کمیونسٹوں اور فاشسٹوں کے درمیان باقاعدہ جنگ ہوئی

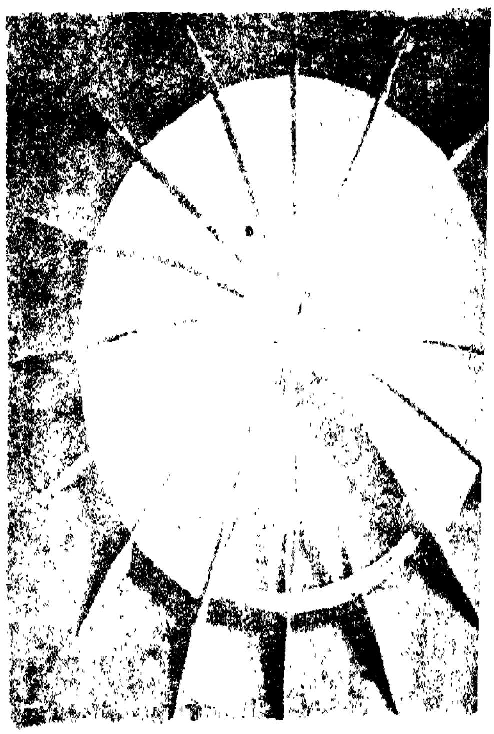


ھندوستانی کرکٹ ٹیم سے
بمبئی کے سانتا کروز ھوائی

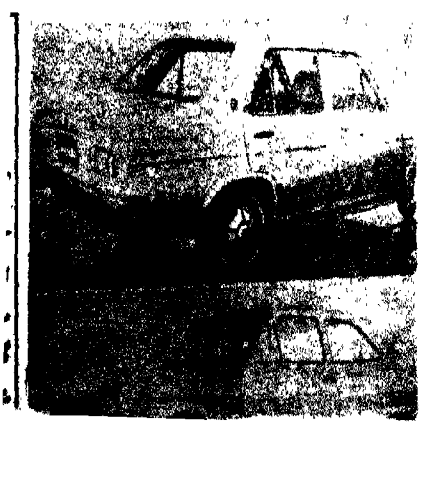




سستی کاروں کے ماڈل ۔
بہت سے ملکوں نے پیش کش کی ہے کہ وہ ھندوستان کے لئے سستی کار بنانے کو تیار ھیں۔
(۱) رینالٹ GR ۔ فرانس
(۲) فیئٹ ۱۲۷ اٹلی
(۳) داٹسن ۱۲۰۰ جاپان
(۴) فورڈ ایسکورٹ امریکہ
(۵) واکس ویگن ۔ جرمنی



تال کٹورا باغ میں
...ب سے بڑا ڈھکا ھوا
...ا بن رہا ھے۔
...کہ ... م ایک
...جر
...بھیا







مرنے سے پہلے مسکراہٹ — پچھلے سال ہالی وڈ میں مشہور فلم ایکٹریس شیرن ٹ
حاملہ تھی، اور دوسرے سات لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ قتل کے الزام میں کافی طویل
بعد دو لڑکیوں ربن ونکل اور سوزن اٹکنز (مسکراتے ہوئے) کو سزائے موت اور تیسری لڑ
کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ تینوں فیصلہ سننے کے بعد عدالت سے نکلتے ہوئے۔



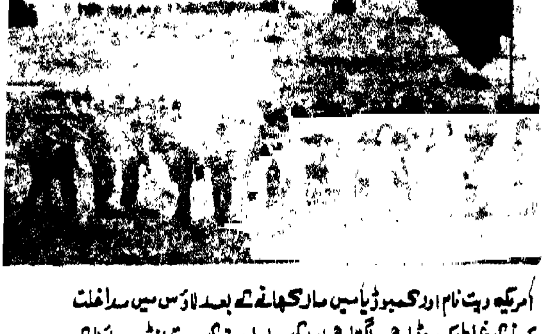
کا دورہ شروع کر دیا ہے۔ ویسٹ انڈیز کے لئے روانہ ہونے سے قبل
ستانی ٹیم کے کپتان، جیت واڈیکر اپنے گھر والوں کے ساتھ



پچھلے دنوں امریکی ادیب ایڈگر سنو چین گئے تو انہوں نے ماؤزے تنگ
اور ان کے دستِ راست لن پیاؤ سے ملاقات کی۔ ماؤ کے دائیں طرف
لن پیاؤ اور بائیں طرف سنو کھڑے ہیں۔







امریکہ ویت نام اور کمبوڈیا میں مار کھانے کے بعد لاؤس میں مداخلت
کرنے کی غلطی کر بیٹھا ہے۔ لگتا ہے امریکی سامراجیت کی موت اندھا بنا کے





ن ڈیزائنر نے
ایک نئی قسم
ہے جس کا نام
(HOT) یعنی
سردی کے
لگوں کیا تھا
تکہ اس گرم
ھ ...

ڈائری

الیکشن کے رنگ

ں الیکشن کا ہنگامہ آرائیاں شروع ہو گئی ہیں۔ ہوا
ہنگامہ آرائیوں کی لپیٹ میں ہے۔ دلی تو خیر ملک
ہے اور اندرا سرکار کا صدر مقام بھی اس سے
کی روشنی پھیلانا چاہتی ہیں۔ اب تک الیکشن سے
میں دیواری پوسٹروں تک محدود تھے۔ یہ پوسٹر اب بھی
ہے۔ رنگ برنگ کے دلچسپ پوسٹر۔ کوئی مولانا ان
قسم کھا رہا ہے تو کوئی کسی امیدوار کے بارے میں
دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چھوڑ رہا؟
دنی چوک کے حلقے سے ایک صاحب جن سنگھ
ں پر رکھ کر بندوق چلا رہے ہیں۔ لیکن ان پوسٹر
ساتھ اب جگہ جگہ جلسے بھی شروع ہو گئے ہیں۔
روں کی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ٹریفک
ہنگامہ۔ مگر جلسہ کرنے والوں کو اس سے کیا مطلب
یکسر مختلف ہے۔
ں میں پچھلے الیکشن میں جن سنگھ نے بالا مارا تھا۔ لیکن
لے لوگ کے پیچھے چلے پڑ رہے ہیں۔ ... اس
رنا میں بے بس ہو کر رہ گئے ہیں ... کی
دی جا رہی ہے تاکہ عوام اس کی بات سن سکیں
نہیں کہ ہم نے تین چار برس جن سنگھ کی بات مان لی

چاندنی چوک میں بچے بچے کی زبان پر نعرہ ہے

بچھڑا گائے نشانی ہے
آئی نئی جوانی ہے
سبھدرا جوشی جانے گی
اب دودھ میں کتنا پانی ہے



سبھدرا جوشی ۔۔۔ جنگ آزادی کی بہادر خاتون جس نے ملک سے فرقہ پرستی کی جڑیں اکھاڑنے کا عزم کر لیا ہے

انہیں ... کا ... پارٹی کتنے پانی میں ہے۔ اور ان کی قدر کیا ہے۔
اس کے ... کا سوال ... دوسرے کو ... جلسوں میں تقریریں کیں اور لوگوں ... ان کے اعلان کردہ ... دیا۔ اور اعلان کیا کہ وہ کانگریس کو ... گے۔
یہاں کی پوسٹ ... جو ... صاف ... سب ... اپنا ... کانگریس کے ... دیکھ کر ... ہوتی ہے کہ عام ووٹر جن سنگھ کی اس چال کو اچھا سمجھ گئے ہیں کہ انہیں کوئی بات سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ ان کا کھانے والوں کو کھا دیتے ہیں۔
اس حلقے سے کانگریس کی امیدوار مسز سبھدرا جوشی ہیں۔ جنگ آزادی کی بہادر خاتون جس نے ملک سے فرقہ پرستی کی جڑیں اکھاڑنے کا عزم لیا ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس ... ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور ان کا ... وہ جی اور دل سے ایسے خائف ہیں جیسے شیر سے بکری۔ سبھدرا جی جدھر جاتی ہیں لوگ انہیں پھولوں سے لاد دیتے ہیں۔ دوسرے حلقوں میں بھی کانگریس کے امیدواروں کی یہی حالت ہے۔ اس ... فضا بالکل ہی بدلی ہوئی ہے جسے دیکھ کر خود کانگریسی ... بھی حیران ہیں۔

اس کے مقابلے پر سنڈیکیٹ کی حالت بالکل پتلی ہے۔ عام ... کو معلوم ہی نہیں کہ اس کا بھی کوئی امیدوار ہے۔ دراصل جن سنگھ ان کے امیدوار اس کے امیدوار ہیں۔ جن سنگھ کے سامنے اس نے بالکل ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

رہی سوشلسٹ پارٹی۔ تو جس طرح سوشلسٹ ممبر لوک سبھا میں خواہ مخواہ شور کر کے اپنی اہمیت جتاتے ہیں ویسی اس کی الیکشن مہم بھی ہے۔ شور زیادہ اور اندر سے کچھ نہیں۔ ... اسکوٹر ادھر سے ادھر دوڑتا نظر آتا ہے۔ اور ایک شور مچانے والا اس پر بیٹھ کر شور مچاتا چلا جاتا ہے۔ جو سب کو ایک لکڑی سے ہانکتا ہے۔ کبھی کانگریس میں کیڑے نکالتا ہے اور کبھی اپنے سوشلزم کی لاج رکھنے کے لئے جن سنگھ کو برا بھلا کہہ دیتا ہے۔ لیکن جب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ یو۔پی اور بہار میں جن سنگھ کے ساتھ کیوں گٹھ جوڑ کر لیا تو فوراً اپنا اسکوٹر بھگا کر لے جاتا ہے۔

سوتنتر پارٹی کا بھی کوئی نشان کہیں نظر نہیں آتا۔ نہ کوئی سوتنتر لیڈر نظر آتا ہے۔ جیسے کہ یہ سب لیڈر اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے ہوں۔ ہاں اگر کوئی نظر آتا ہے تو وہ ہیں سوتنتر پارٹی کے صدر مسٹر مسانی کی بیوی جو مہاجر گروہ کی سوتنتر، کسی آزاد، کسی سنڈیکیٹ یا کسی جن سنگھی کی حمایت میں نہیں بلکہ کانگریس کی امیدوار مسز سبھدرا جوشی کی حمایت میں ہیں۔ اب مسٹر مسانی چراغ تلے اندھیرا کہہ سکتے ہیں۔ اپنی اہلیہ کو ... سیاسی اعتبار سے اپنا ہم خیال نہ بنا سکے تو وہ اور کیا تیر ماریں گے؟

یوں کہئے اصل مقابلہ کانگریس اور جن سنگھ ہی میں ہے۔ دونوں کی طرف سے بڑی بڑی توپیں انتخابی مہم میں حصہ لے رہی ہیں۔ لیکن عوام اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ جن سنگھ کی توپیں ناکارہ ہو چکی ہیں۔ اب تو کانگریس کی جدید توپیں اپنا کام کریں گی اور دہلی سے ... کا بیڑہ پار لگائیں گی۔

ف

لڑکیوں کا محبوب اداکار

راجیش کھنہ

(فلمی سیمی کے قلم سے)



دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکا لی دیکھ لی!

راجیش کھنہ آج کل مقبول ترین ستاروں میں شمار ہونے لگا ہے۔ دو تین سال پہلے ہی کی بات تو ہے کہ جہاں کہیں دیو آنند کی پکچر ریلیز ہوئی۔ جوان لڑکیوں اور عمر رسیدہ عورتوں کے غول کے غول سینما ہال پر ٹوٹ پڑے۔ جس لڑکی کے منہ سے سنئے، دیو آنند کی تعریف۔ کہا جاتا تھا کہ دیو آنند لڑکیوں کا محبوب ستارہ ہے۔ لڑکیاں ہی اس کی زیادہ پکچر دیکھتی ہیں۔

لیکن صاحب جب سے راجیش کھنہ نے فلمی میدان سنبھالا ہے، جوان لڑکیوں کو تو آپ ایک طرف چھوڑیئے، بوڑھی عورتیں بھی دل و جان سے راجیش پر فدا ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے کہ ایک محترمہ جن کی عمر تقریباً ۵۵ سال تو ضرور ہی ہوگی راجیش کھنہ کی ہر ہر ادا پر دل و جان نثار کئے دے رہی تھیں۔ ان کے خیال میں جب راجیش آنکھیں نیچی کرکے اوپر اٹھاتا ہے تو پورے پیسے وصول ہو جاتے ہیں۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ پونا کے [illegible] اسکولوں میں پڑھائی بالکل بند رہی۔ لڑکیوں کا عجیب حال تھا کوئی کسی درخت کا سہارا لئے اداس کھڑی ہے تو کوئی ڈیسک پر سر رکھے سسک رہی ہے کوئی گھٹنوں میں سر دیئے

بلک رہی ہے۔

وجہ یہ تھی کہ کہیں سے انھوں نے سن لیا تھا کہ راجیش کی کار پونا سے بمبئی آتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی ہے ہائے! نہ جانے ان کے محبوب راجیش کا کیا ہوا؟ —— سونے پر سہاگا یہ کہ استاد اور پرنسپل بجائے ان پر ناراض ہونے کے انھیں طرح طرح سے تسلیاں دے رہے تھے۔ اس لئے کہ راجیش ان کا بھی تو محبوب تھا۔!

کسی بھی فلمی ہیرو کے لئے اتنی عزت اور دلوں میں اتنی جگہ سہگل کے بعد سننے میں نہیں آئی۔

راجیش اس وقت کا سب سے ہر دلعزیز ہیرو بنا ہوا ہے۔ سہارنپور کے ایک وکیل صاحب جو فلموں کے بہت زیادہ مخالف ہیں۔ انھوں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ راجیش کی ہر فلم دیکھ سکتی ہیں۔

بمبئی کے سنڈے نیوز سروس کی کئی لڑکیاں راجیش کا فوٹو اپنی ڈائری میں رکھتی ہیں اور فرصت کے لمحے میں انکی ڈائری کھل جاتی ہے۔

راجیش کھنہ کے والد کے انتقال پر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو آکر خبر دی کہ ان کے سسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ لڑکی اداس بھی ہوئی اور شرم سے پانی پانی بھی ——

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تو بیکی اپنی بیویوں کو چڑاتے ہیں۔ بہت سے نوجوان اور بچے راجیش کھنہ اسٹائل کرتے پہن کر ایسے فخریہ انداز میں چلتے ہیں گویا وہ بھی راجیش بن گئے۔

ان تمام باتوں سے بڑھ کر جو بات ہے وہ شاید آپ کو سنتے ہی اچھی نہ لگے اور شاید آپ اس پر یقین بھی نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سی آزاد خیال لڑکیوں نے راجیش کا نام اپنی کلائی پر، کاندھے پر اور سینے تک پر کھدوالیا ہے جب ان لڑکیوں سے کہا گیا کہ کل جب تمھاری شادی ہوگی تو یہ نام دیکھ کر تمھارا شوہر ناراض نہیں ہوگا؟۔ تو جواب میں انھوں نے کہا ——

"ایسے چھوٹے دل والے آدمی سے شادی ہی کون کریگا"

کچھ لڑکیوں کے پاس نما لاکٹ میں راجیش کی تصویر لٹکی ہوئی ہے "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی"

"کیا آپ نے کبھی پہلے بھی کسی ہیرو کی اتنی چاہت سنی تھی"!

جب راجیش کھنہ سے دریافت کیا گیا کہ "کیوں راجیش تمہیں معلوم ہے یہ سب کچھ؟" تو راجیش نے کہا۔

"سب کچھ تو نہیں لیکن پھر بھی بہت کچھ سن رکھا ہے"

راجیش سے پوچھا گیا ——

"یہ سب سن کر آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے" راجیش اپنی عادت کے مطابق سر جھکا کر مسکراتا ہے اور آہستہ سے کہتا ہے۔

"اچھا!"

"اچھا تو ہے مگر کیسا اچھا؟ میرا مطلب ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ لوگوں کے دلوں پر اس طرح راج کریں گے!"

راجیش کا جواب تھا ——

"ایسا بھی کوئی جان پایا ہے؟"

"اچھا آپ نے اپنی کامیابی کی امید تو ضرور کی ہوگی! کیا آپ کو امید تھی کہ آپ اتنے کامیاب ہوں گے" راجیش نے بتایا کہ ——

"ایسا بھی نہیں تھا۔ ہاں کچھ کرنے کی خواہش ضرور تھی لیکن اس کے ساتھ خوف بھی تھا کہ کہیں لوگوں کو پسند نہ آیا تو ——؟"

"اچھا اگر ان دیوانی لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی سامنے آکر ملے تو کیا کروگے؟"

"لڑکیوں سے تو میں بہت گھبراتا ہوں!"

"اگر کوئی لڑکی آکر آپ سے کہے کہ آپ کا فوٹو میرے لاکٹ میں ہے یا میرے بازو پر آپ کا نام کھدا ہے تو آپ کیا کریں گے؟"

"کہوں گا دیوی جی آپ کی ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ میں تو ایک معمولی سا انسان ہوں۔ پھر بھی جو کچھ ملا ہے اس پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر گزار ہوں۔ مجھے جو کچھ فلمی دنیا میں آکر ملا اسے محفوظ رکھنے کے لئے جی توڑ کوشش کروں گا"

راجیش کو شہرت فلم ارادھنا کے بعد سے ملی۔ اسکے بعد اس نے آنند اور سفر جیسی سنجیدہ آرٹسٹک فلموں میں عمدہ اداکاری کر کے اپنی دھاک بٹھا دی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ راجیش کی شہرت اور مقبولیت میں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں سے زیادہ اس کی خوبصورت پرسنالٹی کا ہاتھ ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ راجیش دیوانند کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں تک غیر سنجیدہ اور کھلنڈرے نوجوان Play Boy ٹائپ اداکاری کا تعلق ہے، ہم راجیش کا موازنہ دیوکمار سے کر سکتے ہیں۔ لیکن سنجیدہ اور جذباتی اداکاری میں راجیش دیوکمار سے کہیں آگے ہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ جذبات دلیپ کمار نے بھی راجیش کی اداکاری کو سراہا ہے۔

راجیش اگر اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا صحیح اور مناسب استعمال کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا فن روپے اور دولت کے دھارے میں بہہ جائے۔

بہرحال یہ ایک خوش آئند علامت ہے کہ دو والی اداکاروں میں جیتندر اور اس قسم کے دوسرے اداکاروں کی جگہ راجیش کھنہ، سنجیو کمار اور لچ ساہنی جیسے اداکاروں نے لی ہے۔

یہ تینوں ڈرامائی اداکاری کی بجائے قدرتی اداکاری کرتے ہیں۔ ان تینوں کی مقبولیت اس بات کی نشانی ہے کہ اب عوام فن اور تھیٹر میں تمیز کرنے لگے ہیں۔ اگر سفر، خاموشی اور بھون شوم جیسی فلموں کا سلسلہ جاری رہا تو جلد ہی ہندی فلمیں بھی بنگالی فلموں کی طرح بین الاقوامی فلموں میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنالیں گی۔

آنیوالی فلم

کٹی پتنگ

"کٹی پتنگ" کی کہانی کچھ اسطرح ہے۔ ہیروئن کی شادی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے گھر سے بھاگ کر اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ محبوب دھوکے باز نکلتا ہے جب وہ گھر واپس آتی ہے تو بارات واپس جا چکی ہوتی ہے۔" اسکا بدنصیب ماموں صدمے کی وجہ سے ملک عدم پہنچ چکا ہوتا ہے۔ عموماً ہندی فلموں کی ہیروئن جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے تو ہدایت کار پہلے ہی سے ہر ندی کنارے کوئی دھوبی یا کوئی دوسرا آدمی متعین کر دیتا ہے تاکہ جب ہیروئن پریشانیوں سے گھبرا کر خودکشی کرنے لگے اسے فوراً بچا لیا جائے اور فلم آگے چل سکے۔ گلشن نندہ ——

واقعات نئی دہلی



اپنی بہانی میں مدد کا سہارا نہ لیا بلکہ ریلوے اسٹیشن کا سہارا لیا ہے جہاں ہیروئن کی ملاقات ایک پرانی سہیلی سے ہوتی ہے۔ یہ سہیلی بھی مصیبت کی ماری ہے اسکا شوہر اسے اپنی ایک نشانی دینے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنی سسرال نینی تال اپنی بچی کے ساتھ جاتی ہے کہ اس کی ملاقات ہیروئن سے ہو جاتی ہے جب ہیروئن کی پریشانی کے بارے میں جانتی ہے تو اسکو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کر لیتی ہے۔ ہندوستانی فلموں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہیروئن کے سامنے صرف بمبئی نینی تال، شملہ اور اوٹی جیسے ہی راستے ہیں۔ نہیں ہندی فلم والے اپنی ہیروئن کو بنگلور حیدرآباد یا مدراس کب جانے دیں گے۔

اسطرح ہیروئن نینی تال کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ نینی تال جانا فلم کے کیمرہ مین کے لئے خودکشی کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن ہیروئن پر تو دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ بہت پہلے شاعروں نے کہا تھا کہ عشق کی آگ میں جل کر جب خوشبو آہیں بھرتی ہے تو شہر میں لو چلنے لگتی ہے۔ اگر آج وہ ہوتے تو "کٹی پتنگ" دیکھ کر ضرور کہتے کہ جب ہیروئن پر غم کا پہاڑ ٹوٹتا ہے تو ریل کے حادثے ہوتے ہیں۔"

"کٹی پتنگ" میں جب ریل کا حادثہ ہوتا ہے تو، ہیروئن کی سہیلی اس وقت تک نہیں مرتی جب تک وہ ہیروئن سے وعدہ نہیں لے لیتی کہ وہ اس کی سسرال اسکے یتیم بچے کی ماں بن کر جائے گی۔ نتیجہ کے طور پر ہیروئن اپنی بیوہ سہیلی کے روپ میں اسکی سسرال چلی جاتی ہے۔ راستے میں ہیروئن کو ہیرو مل جاتا ہے جو بدمعاش ٹیکسی ڈرائیور سے ہیروئن کی حفاظت کرنے کے لئے پہلے ہی سے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ہیرو وہی شخص ہے جسکے ساتھ ہیروئن کی شادی فلم کے شروع میں ہو رہی تھی لیکن مصنف کی آسانی کے لئے اس نئے زمانے میں ہیرو اور ہیروئن نے شادی سے پہلے ایک دوسرے کی ایک جھلک تک نہ دیکھی تھی۔ ادھر ساس سسر نے بھی ابھی اس بہو کا فوٹو تک نہ دیکھا تھا جسکا بہروپ بھر کر ہیروئن نینی تال آئی تھی، ہیروئن کے پیچھے پیچھے فلم کا ولین بھی نینی تال پہنچ گیا پھر خوب مار پیٹ ہوئی اور دیکھنے والوں کی پتنگ کٹ گئی۔

لیکن اپنے خاص انداز کو اگر وہ بار بار دہراتا رہیگا تو مستقبل میں اسکو اعتراضات کا سامنا کرنا پڑیگا...... ہیروئن آشا پاریکھ اور دوسرے کردار اپنے اپنے رولوں میں بس ٹھیک ہیں.....!

پروڈیوسر اور ہدایت کار شکتی سامنت کی کٹی پتنگ

برمن نے آنند بخشی کے تین گیتوں "پیار محبت ہے" "پیار دیوانہ ہوتا ہے" اور "جس گلی میں تیرا گھر نہ ہو بالما" کی دھنیں کافی رسیلی بنائی ہیں۔ یہ گانے فلم کے ریلیز ہونے سے پہلے ہی کافی مقبول ہو چکے ہیں۔ گانوں اور موسیقی کے شوقین فلم کو راہول دیو برمن کی عمدہ دھنوں کے لئے دیکھ

قطرہ اور سمندر

(ایک شامی کہانی) ترجمہ: سید آل رسول

معمولی سی اس عمارت کے ایک کمرے میں وہ آدمی رہتا تھا تنہا۔۔ بالکل تنہا۔ کسی سے بھی اس کا میل جول نہیں تھا۔ نہ وہ کہیں جاتا اور نہ اس کے پاس کوئی آتا۔

چند سال پہلے کی بات ہے اس کی ٹانگوں میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ شروع میں یہ تکلیف اگرچہ معمولی تھی، لیکن انجام کار اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا اور وہ چلنے پھرنے کی طاقت سے محروم ہو گیا۔ اب وہ ایک جامد چٹان کی طرح تھا جس کے لئے زندگی میں کوئی لطف اور کشش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

شروع شروع میں جب مرض معمولی تھا تو وہ لاٹھی کے سہارے گھوم پھر سکتا تھا لیکن جب تکلیف نے شدت اختیار کی تو وہ لاٹھی کی بجائے بیساکھیوں کے سہارے چلنے لگا اور جب اس کی بھی سکت نہ رہی تو اس نے بیساکھیاں ایک طرف پھینک دیں اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ جب حرکت کرنے کی حاجت محسوس ہوتی تو زمین پر گھسٹ گھسٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا تھا۔

وہ پورا دن گوشۂ تنہائی میں گزار دیتا۔ اپنے گرد و پیش کی زندگی کے شور و شغب کو کان لگا کر سنتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کہیں دور، بہت دور کی دنیا سے آنے والی آواز پر کان لگائے بیٹھا ہے۔ وہ ان آوازوں کو سنتا اور سنتے سنتے اس کی کشادہ پیشانی پر غصے کی شکنیں نمایاں ہو جاتیں جن میں مایوسی اور ناامیدی کے ساتھ ساتھ بدگمانی کا رنگ بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسے ان لوگوں پر غصہ آتا تھا جو چلنے کی طاقت رکھتے تھے اور زندگی کی رنگینیوں، رونق اور چہل پہل سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ ان کا یہ رشک آہستہ آہستہ حسد میں تبدیل ہوتے لگا تھا۔

کوئی بھی اس کے پاس نہ پھٹکتا تھا اس لئے کہ وہ ایک ایسے بچھو کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو اپنے سوراخ میں رینگتا رہتا ہے۔ دم کو اکڑائے گھومتا رہتا ہے اور جب زہر پھیلا کر ڈنک پیٹھ سے ٹکرا جاتا ہے تو اس کے غیظ و غضب اور جوش انتقام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس آدمی نے تھوڑی بہت پونجی جمع کر رکھی تھی جس میں سے وہ روکھی سوکھی روٹی کھا کر وقت گزار رہا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر سوچتا کہ اگر یہ پونجی ختم ہو گئی تو پھر کیا ہوگا۔۔۔؟

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا اور دروازہ بند کر کے ایک خوددارانہ اور باعزت موت کا انتظار کرے گا۔ وہ اسی نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا کہ اسے باہر سے موسیقی کی دھنیں سنائی دیں جن کے ساتھ ساتھ گیتوں اور نعروں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے یہ آوازیں کافی بلند تھیں۔ اسے "شباب" اور "یوم شباب" کے الفاظ واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی غیر مرئی قوت اسے کمرے سے باہر نکلنے پر ابھار رہی ہے۔ وہ رینگتا ہوا باہر چھجے پر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے بازار میں نوجوانوں کا ایک زبردست جلوس چلا آ رہا ہے۔ ہشاش بشاش نوجوان بڑے ہی جوش و خروش سے رجزیہ نغمے اور شعر پڑھتے ہوئے آ رہے ہیں۔ ہاتھوں میں صندوقچیاں اٹھا رکھی ہیں اور آسودہ حال لوگوں سے چندہ جمع کرتے ہوئے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

"یہ یوم شباب ہے۔"

"جو کچھ آپ نوجوانوں کی خاطر دیں گے وہ نوجوانوں کی بہبود کے لئے ہوگا۔ وہ نوجوانوں کی بھلائی کے لئے ہے۔ اس سے نوجوانوں کی حالت بہتر بنائی جائے گی۔ آج کے جوان کل کے وارث ہوں گے۔ انہی کے زور بازو پر قوم و ملک کی عظمت و شوکت کا دار و مدار ہے۔"

اور اس آدمی نے ہجوم پر پھر ایک نظر ڈالی اور بڑبڑانے لگا۔

"نوجوان۔۔۔ ہنہ۔۔۔ نوجوان۔ بھلا مجھے ان سے کیا تعلق، بلکہ تمام انسانوں سے کیا واسطہ۔ سب سے مجھے ملا ہی کیا ہے۔ ان سے کیا ملا ہے۔ انکار، نفرت، حقارت۔۔۔ اس کے سوا اور کیا؟ اب تو مجھے انہیں سے کچھ ملے گا۔"

وہ دوبارہ اپنے گوشۂ تنہائی کی طرف پلٹنا چاہتا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔

مگر سورج کی روشنی میں کئی حسین رنگ نمایاں اور مہکے مہکے باد نسیم کے جھونکے فضا میں خوشبوئیں بکھیر رہے تھے۔ اسے یہ دلکش اور پرکیف منظر بہت اچھا لگا اور وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ پھر غیر ارادی طور پر دیوار کی طرف رینگنے لگا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا۔

نوجوانوں کے گیت فضا میں برابر گونج رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگ رگ میں ایک انجانی لہر دوڑ رہی ہے اور معاً وہ اپنے ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اسے اپنا گزرا ہوا شباب یاد آ گیا۔ شاداب بارونق اور نورانی چہرہ، مضبوط اور طاقتور جسم، توانائی اور جوش سے بھرپور اور سب سے بڑھ کر جوش جوانی سے چھلکتی ہوئی زندہ دلی۔ اسے یاد آنے لگا کہ عہد شباب میں اپنے گرد و پیش کی رونق اور زندگی کی چہل پہل اسے کس قدر بھلی معلوم ہوتی تھی اور اس سے کس درجہ محظوظ ہوا کرتا تھا۔

موسیقی اور گیتوں کی آوازیں رک گئی تھیں اور اب فضا خاموش تھی۔ مگر وہ مسلسل دور افق کو دیکھ رہا تھا جیسے بیتے ہوئے دنوں کی تلاش کر رہا ہو۔

اچانک آسمان پر ایک سفید بادل نمودار ہوا جو فضا میں یوں تیر رہا تھا جیسے کوئی حسینہ موجوں سے کھیلتی ہوئی گزر رہی ہو۔

آدمی بادل کو دیکھتے ہی چونک پڑا۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ کیا واقعی یہ بادل ہے۔۔۔؟ مگر بادل

ہے اور دل کش انداز میں نہیں اڑا کرتے۔ آدمی
وہ غور سے اسے دیکھنے لگا اور جلد ہی اسے معلوم ہو گیا
ل نہیں بلکہ سفید کبوتروں کا ایک غول ہے جو کبھی
تا ہے کبھی نیچے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں۔ اس غول
ان سے فضا میں ایک عجیب و غریب حسن پیدا ہو گیا تھا
وہ بڑے اشتیاق سے کبوتروں کے اس غول کی
یاں دیکھتا رہا۔ کبوتر مسلسل اڑ رہے تھے اور وہ
سا دیکھے جا رہا تھا۔ اسے وہ دائرے بے حد دل کش
ہے تھے جو کبوتر فضا میں اڑتے ہوئے بنا رہے تھے
اڑتے وہ کبھی یوں اکٹھا ہو جاتے کہ ایک ہی کبوتر کی
معلوم ہونے لگتی۔ وہ اس منظر میں بالکل کھو گیا۔

کبوتر یونہی اڑتے رہے اور فضا میں دائرے
تے رہے۔ جب وہ ایک چکر پورا کر لیتے تو فوراً ہی دوسرا
شروع کر دیتے۔ وہ سوچنے لگا۔

یہ بار بار چکر کیوں کاٹ رہے ہیں۔ کیا انھیں کوئی
یں اوا کرنا ہے۔

پھر خود ہی جواب دینے لگا۔ "ہاں اس وسیع
نات کی ہر شے اپنا چکر مکمل کرنے پر مجبور ہے۔۔۔ ہر فرد
اپنا کردار ادا کرنا ہی ہے"۔

پھر اسے نوجوانوں کے اس جلوس کا خیال آیا۔ کیا یہ
وس بھی مختلف افراد کا ایک مجموعہ نہیں ہے؟۔ تمام افراد
ایک ہی مقصد کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ کیا انسانی کبوتروں
یہ بھی ایک غول نہیں جو زندگی کے میدان میں اپنا چکر کاٹ
رہا ہے۔؟ آدمی نے سر جھکا لیا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

"اور میں۔ میرا غول کہاں ہے۔۔۔؟ اور اس غول
ں میرا کیا مقام ہے"!

اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور اسے تنہائی کا احساس
شدت سے ہونے لگا۔ کسی گہرے احساس کی شدت سے
س کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ کسی نامعلوم شے کی رغبت اور
رزو کا احساس تھا۔ کسی ایسی شے کی رغبت کا جو بہت
ی مشکل الحصول دکھائی دیتی ہو۔

کبوتروں کا غول افق کی پہنائیوں میں اڑ رہا
رہا تھا۔

تکیے کے سہارے لیٹ کر اس دلچسپ منظر کو بڑے
وق و تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا
ہے کہ ایک ننھا سا کبوتر غول سے بچھڑ گیا ہو پھر وہ پھڑپھڑاتا ہوا زمین پر آگرتا ہے۔

یہ ننھا سا کبوتر اس کے بالکل پاس ہی گرا تھا۔ وہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ تڑپ تڑپ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمین سے بدقت تھوڑا اٹھتا پھر نیچے آگرتا۔ بہت جلد وہ نڈھال ہو گیا اور زمین پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔

آدمی تیزی سے رینگتا ہوا اس کے پاس گیا۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اس نے محسوس کیا کہ کبوتر زندہ ہے۔ پرندے کے دل کی دھڑکنوں کی تپیدہ لہریں اٹھ اٹھ کر آدمی کے ہاتھ کو گرما رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ بے چارہ اڑان کی کثرت سے تھک کر چور ہو گیا ہے۔۔۔ وقتی بے ہوشی ہے۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گا"

بڑی تیزی سے اس نے کبوتر کو سائے میں ڈال دیا پھر وہ رینگتا ہوا کچھ دیر کے لئے اندر گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کا برتن اور روٹی کے ٹکڑے تھے۔ وہ پرندے پر جھکا۔ اسے کھلانے پلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی یہ کوشش کارگر ہوئی۔ پرندہ سنبھل گیا تھا اور اب وہ برتن سے خود ہی پانی پی رہا تھا۔ اور روٹی کے ٹکڑے کھا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کبوتر پنجوں کے بل کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا وہ اب کچھ اچھل بھی سکتا تھا ایکدفعہ پھر برتن کی طرف گیا۔ کچھ اور کھایا اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر یہی ہوتا رہا۔ آدمی ننھے کبوتر کو برابر دیکھے جا رہا تھا۔ چند لمحے کے بعد اسے اپنے پاس سے ہوا کے تیز جھونکے کی مانند کوئی چیز گزرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے بالکل قریب ہی۔۔۔ یہ کبوتروں کا غول تھا۔

ننھے کبوتر میں ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اچھلنے اور پھڑپھڑانے لگا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ جیسے اپنے غول کو رکنے کے لئے کہہ رہا ہو تاکہ وہ بھی اس میں پھر جا ملے۔ کچھ دیر چھپے پر سکون رہا۔ کبوتر سنبھلنے کی برابر کوشش کر رہا تھا اور آدمی اسے بڑے اشتیاق اور تجسس سے دیکھ رہا تھا۔

کبوتروں کا غول جونہی دوبارہ مکان کے پاس سے گزرا تو کبوتر نے جان توڑ کر ایک سپاٹا بھرا اور پھر سے اڑ کر اس میں شامل ہو گیا اور کچھ ہی لمحے بعد وہ ان میں پہلے ہی کی طرح سے گھل مل چکا تھا۔

آدمی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پہلوؤں میں رشک کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ ایسا رشک جو اس نے کئی برسوں سے محسوس نہیں کیا تھا، خوشی میں ڈوبا ہوا رشک۔ اس نے قریب المرگ ننھے سے کبوتر کی جان بچائی تھی اور اسے اپنے ساتھیوں میں جا ملنے میں مدد دی تھی۔

اچانک موسیقی اور گیتوں کی آوازیں پھر سنائی دیں فضا فلک شگاف نعروں سے فلک گونج رہا تھا۔ نوجوانوں کا عظیم الشان گروہ پھر "یوم شباب" کے نعرے لگا رہا تھا۔ آدمی نوجوانوں کی ٹولی کو دیکھنے لگا اور بڑے غور سے موسیقی اور گیت اور نعرے سننے لگا۔

"یہ یوم شباب ہے۔ جو پیسہ آپ نوجوانوں کی خاطر دیں گے وہ نوجوانوں کی بہبود پر خرچ ہوگا۔ وہ نوجوانوں کے فائدے کے لئے ہوگا۔۔۔ نوجوانوں کے زور بازو پر قوم و ملک کی عظمت و شوکت کا دار و مدار ہے۔۔۔"

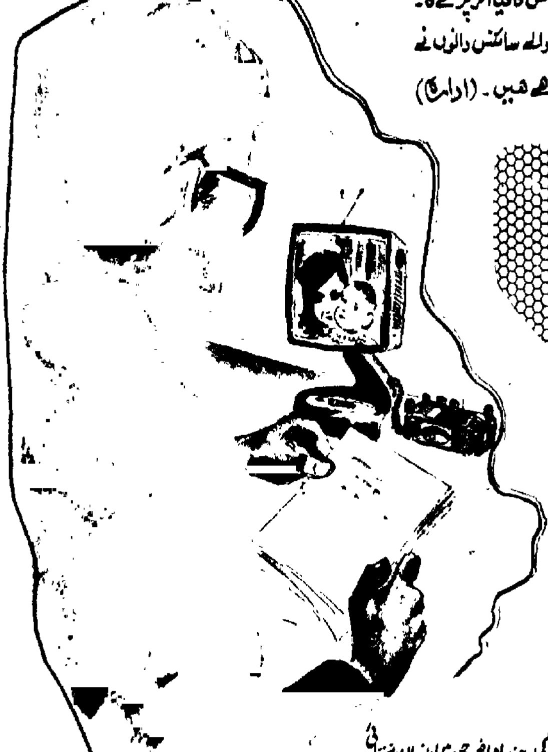
اس نے اپنے اندر ایک زبردست ارتعاش محسوس کیا ایسا ارتعاش جس سے وہ متزلزل ہو گیا۔ ایک نیا احساس اس کی رگ رگ میں رواں دواں تھا۔ مسرت و شادمانی اور جوش و زندہ دلی کا ایک عظیم سیلاب۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نوجوانوں کے جلوس کو دیکھ کر اس کا عہد شباب لوٹ آیا ہے۔ کیا وہ بھی باقی انسانوں کی طرح ایک انسان نہیں۔ اسے زندگی سے لطف اندوز ہونے کا حق نہیں؟ کیا اسے اپنا فرض ادا نہیں کرنا ہے؟۔

اسی لمحے اس کی نظریں بیساکھیوں کی طرف اٹھ گئیں جو زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں مکڑی نے جالے تان دیئے تھے۔ وہ رینگتا ہوا بیساکھیوں کی طرف بڑھا۔ بڑی دقت کے بعد وہ ان کے سہارے کھڑا ہو سکا اور انھیں اپنی بغلوں میں دبا کر وہ یوں چلنے لگا جیسے ایک ننھا سا بچہ چلنے کی پہلی کوشش کرتا ہے۔

وہ چلنے لگا۔۔۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔۔۔ وہ دروازے تک پہنچ گیا۔ اور جیسے ہی وہ دروازے تک پہنچا نوجوانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جلوس اس کے دروازے پر آگیا۔ بڑی سرعت کے ساتھ وہ اس جلوس میں شامل

گھر بیٹھے تمام چیزوں کی خرید و فروخت کر لیا کریں گے

صدی میں دنیا کا کیا نقشہ ہوگا؟ ہماری تہذیب و معاشرے پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ھرنت میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی؟ مستقبل پر گہری نظر رکھنے والے سائنس دانوں نے لات کا بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ جس کا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)



دنیا

یسویں صدی میں

صابر علی

ادیں صدی میں انسان اپنی قسمت کا خود مالک عروج و زوال اس کے اختیار میں ہوگا۔ سالمائی توڑ یہ وہ اپنی نسل کی افزائش پر قادر ہوگا، صنف، جلد، ر وقامت جسمانی سکت، اعصابی قوت اور دماغی ان تمام کی نوعیت قبل از وقت حسب منشا تعین کی یادداشت کے کمپیوٹر اور انسانی قوت حافظ کو ایک کرسی کے ذریعے باہم مربوط کر دینے سے اس کی دماغی نی وسعتوں اور تجرباتی صلاحیتوں کو کہیں زیادہ عظیم ش بنایا جا سکے گا۔ جذبات پر کنٹرول پانے کے لئے ایسی دوائیں دستیاب ہو سکیں گی جن سے ایک بانہ قوتوں میں ضعف پیدا ہوگا تو دوسری طرف اس یت پذیری اور سماجی فلاح و بہبود سے متعلق رجحانات مل ہوگا۔

اسلی طریقہ علاج کی ترقی سے امراض قلب، کینسر نسل انسان کی دیگر بہت سی قدیم مہلک بیماریاں جڑ بنیاد سے ختم ہو جائیں گی۔ چند امراض جن میں انسان انتہائی لاغر اور ناتواں ہو جاتا ہے اور جن کی تکلیف انتہائی ناقابل برداشت ہوتی ہے ان کا علاج ڈنا (DNA) کی چند حیات بخش متناسب خوراکوں سے کیا جا سکے گا۔ اوسطاً انسان کی عمر میں بیس برس کا اضافہ ہو جائیگا۔ آدمی معمر ہو جانے کے باوجود کمسن نظر آئے گا۔ وہ اس وقت سے کہیں زیادہ چست اور پھرتیلا ہوگا۔ کہن سالی اور قوت حافظہ کی کمزوری کے مابین جو چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یکسر ناپید ہو جائے گا۔

تبدیلیٔ اعضاء کا علم انسانی ساخت کو ایک نیا استحکام بخشے گا۔ انحطاط پذیر اعضاء اور بے وقت موت کا ایک نیا بدل تلاش کر لیا جائیگا۔ ہر انسان کے ناکارہ اور بوسیدہ اعضاء، دل، جگر، گردے، پھیپھڑے کے اسپتال میں ایک آپریشن کے ذریعہ دوسرے تندرست قدرتی اعضاء یا مصنوعی اور دیرپا میکانکی اعضاء سے تبدیل کیا جا سکے گا۔ مصنوعی ہاتھوں اور پیروں کو ایک کمپیوٹر کے ذریعہ دماغ سے منسلک کر کے ان میں تحریک پیدا کی جا سکے گی۔ اور ایسے اعضاء کو استعمال کرنے والا حسب منشا ان میں حرکت پیدا کر کے ہر قسم کا کام انجام دے سکے گا۔

آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ یہ ساری باتیں کسی دیوانے کی بڑ ہیں۔ نہیں بلکہ یہ تو ان سائنسدانوں کے اقوال ہیں جو انسانی معاشرے کا دماغ سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً اس لئے بھی ہم ان کے دعوؤں کو بے بنیاد قرار نہیں دے سکتے کیونکہ کسی نہ کسی حد تک وہ عملی کسوٹی پر بھی کھرے ثابت ہو چکے ہیں۔ آج بہت سے امریکی، فیل پیکر، خود مکتفی شہروں میں جنہیں "میگا اسٹرکچرز" کہا جاتا ہے۔ رہتے، کام کرتے اور زندگی کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کے کمرے، کام

الی کیلئے نہ اسکول جانے کی ضرورت اور نہ کالج۔ گھر بیٹھے تعلیم حاصل کیجئے

کے دفاتر، دکانیں اور دوسری مقامات اتنی بلندی پر رکھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی باہر کی دنیا سے بیحد مختلف ہے۔ بہت سے لوگ شر کیپر زمیں دو سو منزلہ یا اس سے بھی زیادہ بلندی پر ستا رکھتے ہیں۔ یہ بہت سی قطاروں والی عمارتیں ایک سازنجیر کی متعدد کڑیوں سے باہم مربوط ہیں۔ بہت سے دیکھے چبوترے بنے ہوئے پلیٹ فارم نما شہر میں بھی سکتے ہیں جس کے نیچے ٹریفک کی آمد و رفت کا بہترین انتظام ہے۔ یہ زمین دو منزلہ شہر کے دونوں طرف لاپرین روڈ ملا ہوا ہے۔ سطح زمین سے ہموار سڑک کے دونوں کناروں پر دو فٹ پاتھ ہیں۔ اطراف کے پہلو بہ پہلو تا حدِ نظر ہری گھاس کی پٹیاں چلی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آلودیافتہ حرارت کے زیر سایہ دھوپ سینکنے کا لطف بھی حاصل ہے۔ ان محرابی شکل کی عمارتوں میں پورے سال ہمہ وقت اور کام کرنے کے لئے معیاری آب و ہوا اور ماحول دستیاب ہے۔

بہرحال سائنسدانوں کے خیال کے مطابق ۲۱ ویں صدی کی زندگی کے ہر شعبے پر کمپیوٹر کا عمل دخل ہوگا۔ میونسپلٹیوں، لائبریریوں، ہوٹلوں، اسکولوں، اور دیگر اطلاعاتی مرکزوں پر اعصابی جال کی طرح کمپیوٹری نظام محیط ہوگا۔ اور ان بے شمار اور لاتعداد کمپیوٹروں کا سلسلہ ایک مرکزی کمپیوٹر سے جڑا ہوگا۔ عوام تقریباً اپنے ہر کام کیلئے کمپیوٹر کا استعمال اسی بے تکلفی سے کر سکیں گے جیسے کہ آج وہ ٹیلی ویژن کا استعمال کرتے ہیں۔ مرکز سے جڑے ہوئے کمپیوٹر انفرادی مکانوں کو عوامی خدمات پیش کریں گے۔ انسان نما مشینیں، جن کے اندر کمپیوٹر فٹ ہوں گے۔ اور انسانوں کی طرح ہی جن کے ہاتھ اور انگلیاں ہوں گی۔ وہ برشوں اور پانی کھینچنے والے نالیوں کی مدد سے گھر کی صفائی کا کام انسانی ہاتھوں کے مقابلہ میں بہتر طور پر انجام دے سکیں گی۔

باورچی خانہ پورے طور پر خودکار بن چکا ہوگا۔ گھر کی مالکہ ہفتے کے لئے ایک مرتبہ فہرست طعام مرتب کرے گی۔ غذائی اشیا مناسب جگہوں پر رکھ دے گی اور اپنا تیار کردہ پروگرام چھوٹے سے کمپیوٹر کو کھلا دے گی۔ میکانکی ہاتھ ان اوقات میں طے شدہ پروگراموں کے تحت مختلف چیزوں کو ترکیب دیں گے، پکائیں گے اور گھر والوں کو پیش کر دیں گے۔ ضروری اشیا خریدنے کے لئے شاپنگ کرنا عہد رفتہ کی بات ہو چکی ہے۔ گھر کی مالکہ ٹائپ فون (وہ فون جس کے ذریعے آنکھوں سے اوجھل اشیاء دیکھنے کا کام لیا جاتا ہے) کا سوئچ مقامی سپر مارکیٹ پر گھماتی ہے۔ چیزوں کو دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ ہر ایک کا نرخ معلوم کرتی ہے۔ اور پھر گھر بیٹھے بیٹھے اپنی ضرورت کی تمام اشیاء خودکار پاسکٹوں کے ذریعہ منگا لیتی ہے۔

لین دین اور خرید و فروخت میں کیش اور چیک کا استعمال بالکل اٹھ جائے گا۔ تمام کاروبار کی بنیاد جمع خرچ کے ایک ایسے نظام پر ہوگی جو اول تا آخر کمپیوٹروں کے ذریعہ اختتام پذیر ہوگا۔ دکانوں، گوداموں، خریدنے اور فروخت کرنے والوں کے مکانوں کے کمپیوٹر بینک کے کمپیوٹر سے باہم مربوط ہوں گے۔ اور وہ اکاؤنٹس کے سارے فرائض از خود انجام دیں گے۔ ملازم کو تنخواہ دینے کی صورت یہ ہوگی کہ آفس کا کمپیوٹر اس کے بینک کے حساب میں اس کی تنخواہ جمع کرا دے گا۔ اور وہ جب بھی کہیں سے کوئی چیز خریدے گا تو اسٹور کمپیوٹر اس کے بینک کے کمپیوٹر کو فوری طور پر ہدایت دے گا کہ اس کے حساب سے اتنی رقم وضع کر لی جائے۔

کمپیوٹری طریقہ تعلیم کا ایسے ہی رواج ہو جائے گا، جیسے کہ آج کلاس روم میں پڑھایا لکھایا جاتا ہے۔ اس کا تلفظ بہت ہی واضح اور صحیح ہوگا۔ درجہ بندیوں کے تکلفات ناپید ہو جائیں گے۔ اور ہر لڑکا اپنی صلاحیت کے مطابق اپنی تعلیمی رفتار جاری رکھ سکے گا۔ کمپیوٹر کے اندر نصب شدہ معلم مشینیں بچوں کو حساب اور گرامر سکھائیں گی۔ انہیں پڑھنے اور لکھنے کا طریقہ بتائیں گی۔ اور ہر وقت ان کی غلطیوں کی اصلاح کریں گی۔ اونچی کلاسوں کے لڑکے صرف جزوی تعلیم کے لئے ہی اسکول جایا کریں گے۔ اور باقی تعلیم وہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ حاصل کریں گے جن کا تعلق ایک ہوگا۔

چار برس کی عمر سے بیس برس کی عمر تک تعلیم لازمی قرار دے دی جائے گی جن میں کم از کم دو سال کے بچے بھی شامل ہیں۔ بہت سے کالج محض "ایجوکیشن سروس سینٹر" کی حیثیت سے باقی رہ جائیں گے۔ اور ان بالغوں کے لئے پورے سال کھلے رہیں گے جو کہ خود کو بدلتی ہوئی ذمہ داریوں کا اہل بنانے کے لئے یا انفرادی تسلی اور تشفی کے لئے دوبارہ تربیت حاصل کرنا یا اپنا تعلیمی معیار بلند کرنا چاہیں گے۔ لائبریری خدمات اور تجارتی تعلیمات گھر بیٹھے بیٹھے کمپیوٹر کے پھیلے ہوئے جال کے ذریعے حاصل کی جا سکیں گی۔ وہ لڑکا جسے کسی موضوع پر معلومات فراہم کرنی ہوں۔ وہ چند کلیدی لفظوں کو کمپیوٹر میں رکھ دیگا اور چند سیکنڈ کے اندر ایک کامل و مکمل فہرست ٹیلی ویژن کے پردے پر نمودار ہو جائیگی۔ اور پھر فہرست کے مخصوص آئیٹموں پر دباؤ ڈالنے سے مطلوبہ مضمون کی صحیح شکل یا اس کا مکمل حوالہ تحریری شکل میں اس کے سامنے ظاہر ہوگا۔

مصنوعی سیاروں کی مدد سے ہر گھر عالمگیر نظام اطلاعات، تعلیمات اور تفریحات سے بہرہ ور ہو سکے گا۔ ٹیلی ویژن کے طویل و عریض پردے جو بانسلی کمرے کی پوری ایک دیوار کو گھیرے ہوئے ہوں گے۔ مختلف رنگوں میں ہمارے سامنے ٹھوس تصویریں (طول عرض اور عمق رکھنے والی تصویریں) پیش کریں گے۔ کوئی مخصوص خبر جسے پردہ ٹیلی ویژن پر آپ ایک بار دیکھ چکے ہوں۔ کمپیوٹر سے درخواست کر کے آپ دوبارہ بھی اسے دیکھ پاسکیں گے۔ وائڈ فون (پکچر فون) کی مدد سے آن کے آن میں کسی بھی آدمی سے کتنے ہی فاصلے پر بالمشافہ گفتگو کا لطف حاصل کیا جا سکے گا۔

کام کی فطرت و ماہیت تبدیل ہو جائیگی۔ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کی پیداوار اور ہر قسم کے فرائض کی انجام دہی خودکار مشینوں اور کمپیوٹر کے ذریعے ہوگی۔ زراعتی کام از اول تا آخر آٹومیٹک ہوگا۔ کاشتکار بہت کم رہ جائیں گے۔ تقریباً صرف دو فیصد آدمیوں کی ضرورت باقی رہے گی، جو نگرانی کی حیثیت سے سارا کام کمپیوٹر سے لیں گے۔ انسان نما ریکیٹر اور دوسری آٹومیٹک مشینیں ایک ایکڑ زمین سے اتنا غلہ پیدا کر سکیں گی جتنا آج ہم بیس تیس برس پیشتر تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس میں مزدور طبقہ اپنے فن و پیشے میں طاق اور ماہر ہوگا۔ یہ صنعت و حرفت کی تیز رفتار تبدیلیاں اس بات کی متقاضی ہوں گی کہ ہر انسان اپنی روزی روٹی کمانے کے لئے ایک سے زیادہ یا تین چار پیشوں کے اندر پوری مہارت رکھتا ہو۔ اوسطاً ہر انسان اپنی پہلی تہائی عمر تعلیم حاصل کرنے میں، دوسری تہائی کام کرنے میں اور آخری تہائی اپنی محنت و مزدوری کے پھل حاصل کرنے میں صرف کرے گا۔

پورے ہفتے میں کام کے اوقات مجموعی طور پر تیس گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اور فرصت کے اوقات سے لطف اندوز ہونا ہی پورے وقت کے ایک پیشے کی شکل اختیار کر لے گا۔ فرصت کے

امراضِ قلب، کینسر، جراثیمی اور انسان کی دیگر بہت سی مہلک بیماریاں جڑ سے ختم ہو جائیں گی

اکثر و بیشتر اوقات ہر گھر میں کمپیوٹر کے رنگا رنگ پروگرام سننے میں صرف کیے جائیں گے جن کے ذریعہ ہر خاندان کو مفت تعلیم، بہترین تفریح اور معیاری موسیقی میسر ہوگی۔ بیرون خانہ سرگرمیوں جیسے پکچروں، ناٹکوں، سرکسوں اور تھیٹروں وغیرہ کی مانگ ہی گھٹ جائے گی، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ۲۱ ویں صدی کے اس خوشحال اور فارغ البال معاشرے میں اوقات فرصت کا معنی خیز استعمال ایک مسئلہ بن جائے گا۔

یہ ہے آپ کی ۲۱ ویں صدی کا نقشہ جسے ہمارے بہت سے ماہر سائنسدانوں نے پیش کیا ہے۔ تاہم دوسرے کئی دانشوروں نے اس صدی کے تاریک ترین پہلوؤں پر بھی توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آنے والی صدی میں فرصت کے اوقات گزارنا ہی ایک مشکل مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے علاوہ سینکڑوں ناقابل حل مسائل ہوں گے، جن سے عہدہ برا ہونا انسان کے بس سے باہر کی بات ہوگی۔ انہیں اندیشہ ہے کہ قبل از وقت ایک ایسا مستقبل انسان پر آن پڑے گا جس کے واسطے وہ ہنوز آمادہ نہ ہوں گے۔ ایک ایسا ترقی پذیر اور خود سر مستقبل جو پوری سوسائٹی کو مکمل طور پر تہہ و بالا کر کے رکھ دیگا۔ انہیں خطرہ ہے کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور ذرائع اطلاعات کی تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں انسان کے شخصی اور انفرادی طریقۂ عمل میں ایک قسم کا عدم استحکام اور بے ثباتی پیدا ہو جائیگی۔ نئی اخلاقی قدروں کے عروج و ارتقاء سے ہماری زندگی کے اندرونی و بیرونی دونوں پہلو بہت تیزی سے متاثر ہوں گے۔ افراد ناقابل بیان حد تک اپنے ماحول کے ساتھ معقولیت پسندانہ طرز عمل کے نااہل ہوں گے۔ ان کے اندر اتنی صلاحیت نہ ہوگی کہ تیز گام تبدیلیوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر سکیں۔

بصیرت رکھنے والے سائنسداں جب انسان، اس کی مربوط مشینوں اور کمپیوٹر زدہ معاشرے کے نتائج و عواقب پر غور کرتے ہیں تو ان کے سامنے طرح طرح کے خدشات و خطرات اپنا سر اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ بڑھتے ہوئے لاشخصی رجحانات، اور انسان کی روز افزوں محرومیوں و ناکامیوں کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں کمپیوٹرسی کھاتہ نویسی کا نظام اگر آپ کے حساب میں کوئی غلطی کر دے تو آپ اسے کیسے باور کرا سکیں گے کہ تم نے ایسا کیا ہے یا آپ ایک ایسی کمپیوٹر کو کیسے یقین دلا سکیں گے کہ میرے ساتھ ایک بدسلوکی [illegible] ہوئی تھی جس کو فوری طور پر ہسپتال پہنچنا تھا۔

اور اس بنا پر اپنی کار کی رفتار تیز کرنے پر مجبور تھا۔ اس سماجی تنظیم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی جس میں وہ ذمہ دار کہ درپردہ پوشی کے شخصی حقوق بری طرح پامال ہو جائیں گے۔ اور سرکاری بینک پر ہر شخص کی آمدنی، خرچ، بینک بیلنس اور اس کی ٹیکسوں میں ادا کی ہوئی رقم کو ہر خاص و عام کے لیے طشت از بام کر دیں گے۔ کئی ایک ماہرین نے تو بڑے افسردہ لہجہ میں یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ اس وقت اقتدار صرف چند برسر آوردہ لوگوں تک محدود ہوگا جو ایک ایسے بے شعور اور بے دماغ انبوہ کے اوپر حکمرانی کریں گے جنکو دوائیں پلا پلا کر تھیٹر اور سرکس دکھا دکھا کر مسرور و مطمئن رکھا جائے گا۔

۲۰ ویں صدی کی تکمیل میں صرف تیس برس باقی رہ گئے ہیں۔ اور آنے والی صدی کے آثار و علامات بتدریج ہمارے سامنے آتے جا رہے ہیں، سائنسی، صنعتی، اطلاعاتی، تعلیمی اور زراعتی انقلابات کا ظہور اتنے دھماکہ خیز انداز میں ہو رہا ہے جس سے انسانی سماج کا ڈھانچہ اور اس کی تمام خاندانی قدریں تیزی سے بدلتی جا رہی ہیں۔

پچھلے دس برسوں میں علم الحیات میں جو عظیم انقلاب آیا ہے، اس نے انسان کو ایک ایسے عہد کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے جو کہ انتہائی اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ماہرین علم الحیات زندگی کے چار بنیادی کیمیاوی عناصر کا پتا لگا چکے ہیں جو کہ ڈنا (DNA) کے اندر یکجائی طور پر پائے جاتے ہیں۔ (یہ ایک پیچیدہ سالمہ ہے جو تولیدی اسرار و رموز کا حامل تصور کیا جاتا ہے) اور اسطرح وہ تحقیق کے سربستہ راز میں ایک شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آج سائنسداں اسی راز اور معمے کی عقدہ کشائی میں سرگرم عمل ہیں۔ اور جس وقت وہ یہ تخلیقی راز معلوم کر لیں گے تو بنی نوع انسان حیات کا راز داں بن جائے گا۔ وہ تخلیقی قوت کا مالک بن جائیگا۔ مشہور و معروف امریکی کیمسٹ، ڈاکٹر چارلس کا کہنا ہے کہ "زندگی کی کیمیا اب ہمارے دسترس میں ہے، لیکن میرا یہ نظریہ ہے کہ صرف نظام ہائے حیات کی جزوی کیمیا گری میں کامیاب ہو کر ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں، جبکہ نیوکلیر انرجی کا انکشاف ہوا تھا یا ۱۹۶۱ء کی بہ نسبت جبکہ خلائے بسیط میں پہلا انسان بھیجا گیا تھا، ہم کوئی زیادہ نمایاں کام انجام نہ دے سکیں گے۔ ٹیسٹ ٹیوب میں تولیدی عناصر کو باہم مجتمع کر دینے کی اہمیت [illegible] بھی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور اقتصادی اثرات مرتب ہوں گے، وہ ایٹامک انرجی کے انکشافات اور خلائے بسیط کی تسخیر کے سامنے بالکل ٹھنگنے اور بونے نظر آئیں گے۔"

الغرض آنے والی صدی میں ہماری زندگی آج کی زندگی سے قطعی طور پر مختلف ہوگی۔ اس صدی میں زندگی کے ہر شعبے پر کمپیوٹروں کا کنٹرول ہوگا۔ وہ کمپیوٹر جو تعلیم یافتہ ہوں گے، جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی کر سکیں گے۔ اور وہ صدی جس میں انسان: "مخلوق سے خالق" بن جائے گا۔

اسی لیے امریکہ کے شہرۂ آفاق ماہر معاشیات "کینتھ باؤلڈنگ" جو کہ آنے والی صدی کے بارے میں کافی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، بہت ہی پرزور الفاظ میں کہتے ہیں کہ "اگر انسان کو آئندہ بھی زندہ رہنا ہے تو اسے آنے والے صرف ۲۵ برس کے اندر خود کو اپنے انداز فکر کو اس حد تک بدل دینا ہوگا جتنا کہ اس نے گذشتہ ڈھائی ہزار برسوں میں تبدیل کیا ہے۔"

ہمایوں قدیر



سنا ہے کہ پچھلے دنوں انگلستان کی پارلیمنٹ میں جوتا چل گیا۔ یہ امر ہمارے لئے باعثِ اطمینان اور فخر ہونا چاہئے کہ اب ہماری جمہوریت کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھ گئی ہے۔۔۔ گو ہم نے انگلستان کی طرزِ جمہوریت کو گلے لگانے میں جتنی جلد بازی کا اظہار کیا تھا اتنی ہی تاخیر انگلستان نے ہماری "جمہوری سوغات" کو اپنانے میں لگائی، تاہم دیر آید درست آید کے مصداق آخر کار دنیا میں جمہوریت کے سب سے بڑے ٹھیکیدار انگلستان کو ہماری برتری کا اقرار کرنا ہی پڑا۔

جس دن ہم نے اپنے ملک کے لئے جمہوریت کا انتخاب کیا تھا اسی دن سے دنیا کے لئے ہمارا چیلنج یہ رہا ہے کہ ہم ایک ایسی مثالی جمہوریت قائم کریں گے جو پہلے کبھی بھی عالم وجود میں نہ آئی ہو۔ اور خدا گواہ ہے کہ ہم جھوٹ کبھی نہیں بولتے ۔۔۔ ہمارے تو اکثر دیو مالائی تصور کی بنیادیں ہی اس مقولے پر رکھی گئی ہیں کہ :-

"جان جائے پر وچن نہ جائے"

دنیا اب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گئی ہے کہ جمہوریت اور جوتے بازی کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ جہاں بھی جمہوریت ہوتی ہے (نام نہاد نہیں) وہاں جوتے بازی کا ہونا لازمی امر ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ جوتے بازی جمہوریت کی مقدار کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔ گویا جس ملک میں جتنی زیادہ جوتے بازی ہوتی ہے وہ ملک اتنا ہی جمہوری ہے۔

دنیا میں اگرچہ اب تک سیکڑوں ممالک نے جمہوری ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی جمہوریت کو پرکھنے کے لئے اس خالص جمہوری پیمانے کا استعمال کرتا حالانکہ اس کی اہمیت ہر دور میں تسلیم شدہ رہی ہے۔ یہاں

یہ سہرا بھی ہمارے سر اسی طرح خود بخود بندھتا ہے جس طرح دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا۔

ہمارے ایوانہائے قانون ساز سے جب جوتے بازی کی دل نشین، دل افروز اور جمہوریت بخش صداؤں کی بازگشت ساری دنیا میں پھیلتی ہے تو ہم کو کیسا سرور اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے اور دنیا کے سامنے ہمارا سر فخر کے ساتھ بلند ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی وہی لگا سکتے ہیں جن کے یہاں جمہوریت ہوتے ہوئے بھی جوتے بازی نہیں ہے۔

وہ مناظر کتنے دلربا ہوتے ہیں جب اپنے جائز مطالبات کو منوانے کے لئے ہم اپنے ہاؤس کے چیرمین یا اسپیکر پر بڑے خلوص و محبت کے ساتھ جوتوں کی بارش شروع کر دیتے ہیں یا جب اپنی "جمہوری مانگوں" کی مخالف جماعتوں کے ارکان کی تواضع نو ایجاد گالیوں اور پاؤں کے جوتوں سے کی جاتی ہے۔ گویا اس طرح ہمارے قانون ساز اداروں کے ممبران اپنے برادرانہ تعلقات اور آپسی بھائی چارے کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ بات مصدقہ ہے کہ ہمارے ملک میں جوتا سب سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز شے ہے۔ آئے دن کی پرخلوص جوتے بازی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے عوام اور خواص سب جوتے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔

اب اگر کوئی بے بصیرت شخص یہ سوال کرنے لگ جائے کہ آخر ہم جوتے سے اسقدر محبت کیوں کرتے ہیں تو اس سوال کے ایک نہیں بلکہ سیکڑوں جواب موجود ہیں۔

جوتے کی مقبولیت کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ دیگر ملکوں کی بہ نسبت سستے، اچھے، مضبوط اور بہت بڑی تعداد میں بنتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ زندگی بھر انسان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور موقع پڑنے پر اک ذرا میں اپنی موروثی جگہ تبدیل کر کے یعنی پیر سے ہاتھ میں آجانے کی صلاحیت اپنے اندر بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ زمانہ قدیم کی طرح ہاتھ میں ڈنڈا یا لاٹھی رکھنے کا رواج تو اب ختم ہو چلا ہے لیکن موقع پڑنے پر یہ لاٹھی کا نہایت عمدہ بدل ثابت ہو سکتے ہیں۔

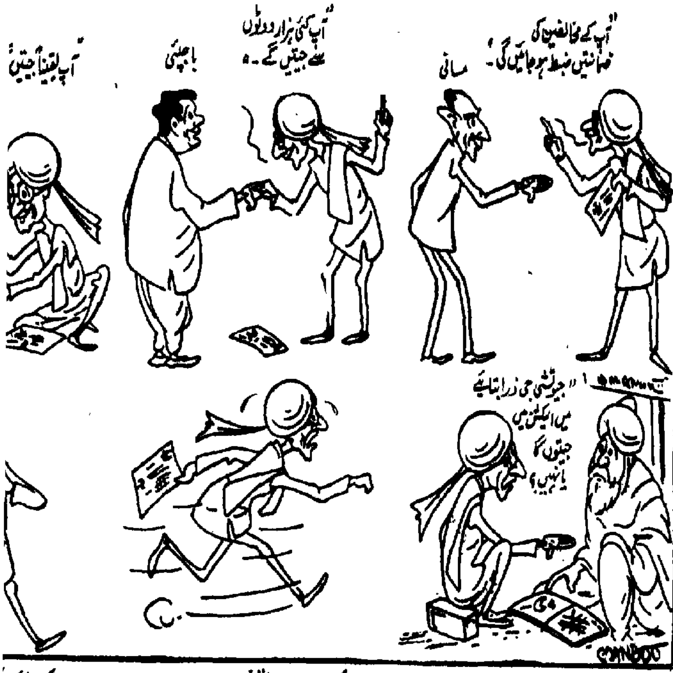
چوتھے یہ کہ یہ ایسے موثر ہتھیار کا رول ادا کرتے ہیں جس کی کوئی جامع تعریف ہی متعین نہیں کی جا سکتی۔

پانچویں یہ کہ مخالف کے سر پر ان کو دے مارنے کے بعد جائے وقوع سے ننگے پیر بھاگ نکلنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔

سنا ہے کہ ننگے پیر چلنے سے صحت بنتی ہے لہٰذا ہم ہر وقت اس تاک میں رہتے کہ کب جوتے بازی کی نوبت آئے اور ہم کو جوتا چھوڑ کر بھاگنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح ہم اپنی صحت کو بہتر بنا سکیں۔ یقین کیجئے کہ جوتا چھوڑ کر بھاگنے میں ہماری بزدلی یا پست ہمتی کو قطعی دخل نہیں ہوتا ۔۔۔ بلکہ یہ جو اکثر ایک دوسرے پر جوتے اچھال کر ہم راہِ فرار اختیار کرتے ہیں تو اس کے پس پشت بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ ہم اپنی صحت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔۔۔ ہمارے قانون ساز اداروں کے ارکان خاص طور پر اس طرف رجوع رہتے ہیں کیونکہ حقیقی معنوں میں ملک کا سارا بوجھ انہیں کے کاندھوں پر ہوتا ہے لہٰذا اگر ان کی صحت اچھی نہ ہوگی تو پھر وہ اس بارگراں کے متحمل کیوں کر ہو سکیں گے۔

جوتے کی افادیت کا اظہار اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ اپنی مانگوں کو بلا چون و چرا تسلیم کرانے اور اپنے مخالفوں کے منہ کو بند رکھنے کے معاملات میں اب تک کے تجربات کی رو سے یہ بے مثال ثابت ہو چکا ہے۔

کیونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جوتا اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں لہٰذا دنیا کی ساری جمہوری مملکتوں سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ جوتے کے فروغ کے لئے جلد سے جلد ممکنہ کوششیں شروع کر دیں۔ اگر دنیا کی جمہوری مملکتیں یہ چاہتی ہیں کہ دنیا میں جمہوریت پھلے پھولے اور پروان چڑھے تو وہ سب سے پہلے جوتے بازی کو اپنے ملک میں عام کریں اور پھر عالمی سطح پر ایک "جوتا وفاق" کا قیام عمل میں لائیں۔ ہم دل سے



مرارجی بھائی اور جیوتشی (بشکریہ شنکر)

کہہ سکتے ہیں کہ مجوزہ جوتا وفاق دنیا کے موجودہ پیچیدہ لاینحل مسائل کا حل ہوں۔ جوتا بجاتے پیش کر دے گا کہ دنیا کے سارے رجعت پسند انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور بالآخر انکو جمہوریت ہی کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔

اب آخر میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوری مملکت ہونے کے ناطے ہم اپنی حکومت کو چند مخلصانہ مشورہ جوتا بازی کے فروغ کے سلسلے میں دینا چاہتے ہیں کیونکہ موجودہ جوتے بازی کی رفتار انتہائی درجہ سست اور غیر اطمینان بخش ہے اگر ہم نے اس طرف خاص توجہ نہ دی تو ڈر ہے کہ وہ دوسرے ممالک جو ہماری دیکھا دیکھی اپنے یہاں ابھی جوتے بازی کا آغاز ہی کر رہے ہیں ہم سے آگے نکل جائیں گے اور ہم باوجود اس پرافادیت نسخے کے موجود ہونے کے پچھلی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔ چنانچہ ہم اپنی حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل طریقوں کو اپنا کر جوتے کو ملک میں فروغ دے اور اپنے جمہوریت نواز ہونے کا ثبوت بہم پہنچائے۔

۱۔ جوتے کو قومی نشان کا درجہ دیا جائے اور اس کو صد درجہ لائق عزت و تکریم گردانا جائے اور اس کی بے عزتی کرنے والوں کے لئے سخت ترین سزائیں مقرر کی جائیں۔

۲۔ جوتے بازی سکھانے کے لئے ملک بھر میں جا بجا ٹریننگ اسکول کھولے جائیں جہاں باقاعدہ فن جوتا بازی کی تعلیم ملک کے عام شہریوں اور خصوصاً قانون ساز اداروں کے ممبران کو دی جائے تاکہ وہ اس فن کے داؤ پیچ سے کما حقہ طور پر واقف ہو سکیں۔ بلکہ اس ضمن میں خصوصاً ایک جوتا بنوایا جائے جو قانون ساز اداروں کے ممبران ہی کے لئے وقف ہو اور اس کی خصوصیات یہ ہوں کہ یہ بآسانی پاؤں سے کسی بھی وقت اتارا جا سکے۔ ایوان میں اچھالنے پر خوب اونچائی تک جا سکے اور مخالف کا سر پھوڑنے کے سلسلے میں بے مثال کارکردگی سرانجام دے سکے۔

۳۔ جوتا بازی کے باقاعدہ مقابلے منعقد کئے جائیں جس سے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں جوتے کے تئیں عزت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو سکے اور ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو قومی ہیرو قرار دیا جائے تاکہ ہمارے طلباء ان کی تقلید میں ماہر جوتے باز بننے کی کوشش اسی طرح کریں جس طرح آج فلمی ہیرو کی تقلید میں فلمی ہیرو بننے کی کرتے ہیں۔

۴۔ ملکی اور صوبائی سطحوں پر باقاعدہ حکومت کے ایک جز کی حیثیت سے محکمہ جوتا کھولا جائے اور اس کا قلمدان وزارت کسی ماہر جوتے باز ممبر پارلیمنٹ یا اسمبلی کو مقرر کیا جائے۔ اس طرح وزیروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ان کے لئے ایک نئے محکمہ کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔

۵۔ سرکاری نوکریاں دیتے وقت اس شرط کو ملحوظ رکھا جائے کہ امیدوار جوتے بازی کے فن سے بخوبی واقف ہو بلکہ سرکاری ملازمتوں کے لئے اشتہار ہی اس قسم کے دیئے جائیں:-

"ضرورت ہے ایک ماہر انجینیر کی جو جوتے بازی کے فن میں بھی طاق ہو اور وقت آنے پر اپنے جوتے سے مخالف کا سر پھوڑنے میں کمال رکھتا ہو

نوٹ:- امیدواروں میں باہم جوتے بازی کا مقابلہ کرایا جائے گا اور جیتنے والے ہی کو بطور انجینیر نوکری دی جائے گی۔"

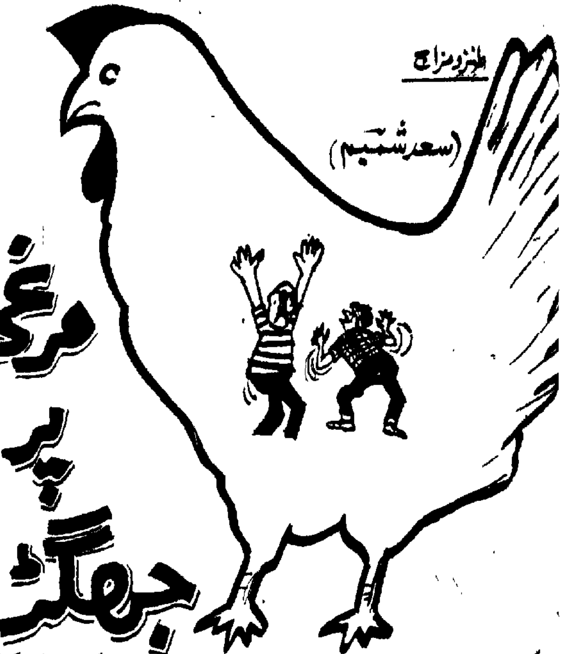
۶۔ ابتدائی درجات میں اسکول کے بچوں کو ملکی زبان کے ساتھ فن جوتا بازی کی ابجد سے واقف کرانا بھی لازمی قرار دیا جائے۔

۷۔ جوتے بازی کے محاسن پر قومی اور یونیورسٹی سطح پر لیکچروں اور سیمیناروں کا انعقاد کیا جائے جس سے عوام کے ذہن میں جوتے کی خوبیاں بخوبی رچ بس جائیں اور وہ کسی بحث کے موقع پر جوتے کی برتری کو ثابت کرنے کے لئے خاطر خواہ دلائل دے سکیں

طنز و مزاح

(سعد شمیم)

مرغی پر جھگڑا



اس دردبھری داستان کا آغاز اس وقت ہوا جب میں انجینئر صاحب سے ایک نہایت معمولی سی بات پر جھگڑ بیٹھا۔ یہ جھگڑا بس اس قسم کا تھا کہ میں نے ان کی طرف منہ کرکے چار باتیں بلند آواز میں کہہ ڈالیں اور انھوں نے میری صورت دیکھ کر ان باتوں کا جواب دے دیا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں میں بول چال بند۔ شریف آدمیوں سے یہی توقع ہوتی ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ جہاں تک ٹیکنیکل اور سائنٹفک امور کا تعلق ہے۔ میں ان میں بالکل کورا ہوں۔ ویسے تو میں ہر موضوع پر دھواں دھار بحث کرسکتا ہوں لیکن جہاں کوئی ایسی ویسی بات نکل آئے جس میں سائنس کو دخل ہو تو میں چاروں شانے چت نظر آتا ہوں، سائنسی اصطلاحوں میں باتیں کرنے والے لوگ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتے ہیں۔ حالانکہ آج کل مجھے اس صنف میں کچھ دسترس حاصل ہوگئی ہے۔ جسے سائنس کہتے ہیں۔ مثلاً خراب بلب کو ہولڈر سے بخوبی نکال لیتا ہوں اور اس کی جگہ نیا بلب لگا بھی دیتا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ فوراً ہی اسے جلا کر دکھا بھی دیتا ہوں کہ بالکل صحیح فٹ کیا گیا ہے۔ میں انجینئر صاحب کی اس ایجاد پر تو اب تک انگشت بدنداں ہوں جس کے ذریعے وہ خراب بلب کو ٹھیک کرکے پھر استعمال کے قابل بنا لیتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی اس عجیب و غریب ایجاد کو ضرور پیٹنٹ کرالیں، لیکن وہ عجیب صوفی منش طبیعت کے مالک ہیں، ہنس کر ٹال دیا۔ سُنتے ہیں، نیوٹن اور آئن سٹائن بھی ایسی ہی لاابالی طبیعت کے مالک تھے۔

میں ان کا پڑوسی ہوں۔ سنی سُنائی باتوں پر یقین کرنا میں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ لیکن ان کے کارناموں کو دیکھ کر بھی یقین کرنا مشکل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں انھیں انجینئر صاحب کہا کرتا ہوں۔ یہی شخص میرے جانے پہچانے تھے۔ بلکہ دوست تھے۔ جانے پہچانے تو خیر اب بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑا آرام تھا بس یوں سمجھئے کہ ان غیر یقینی اور غیر ضروری چیزوں پر سر کھپانے کی ضرورت مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ریڈیو خراب ہوا ان کے سر پہ تھوپ دیا۔ سلائی کی مشین نے احتجاج کیا تو انجینئر صاحب کے گھر بھجوا دیا۔ گھر کا کوئی پوائنٹ خراب ہو گیا تو انھیں بلا کر لے آیا۔ میرے لئے فکر کی کوئی بات نہ تھی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن اب یہ میری نااہلی اور ناعاقبت اندیشی کے سوا اور کیا تھا کہ میں اپنی بیوی کی اس بات پر یقین کر بیٹھا کہ انجینئر صاحب کی بیوی اکثر میری بیوی کی مرغی کو پکڑ کر ڈربے میں بند کر دیتی ہے اور اسے انڈا دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اور اسی بات پر میں ان سے جھگڑ بیٹھا۔

جھگڑا مول لے کر میں نے اچھا نہیں کیا تھا یہ تو میں بخوبی جانتا تھا لیکن اس کی مزید تصدیق یوں ہو گئی کہ تیسرے ہی روز غسل خانے کا بلب فیوز ہو گیا، ہر چند کہ میں نے اس بلب کی جگہ کامیابی سے نیا بلب لگا دیا لیکن بہت پچھتایا کہ کاش اتنے دنوں میں انجینئر صاحب سے فیوز بلب کو ٹھیک کرنے کا نادر طریقہ ہی سیکھ لیتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

مشکل سے چند روز گذرے ہوں گے کہ ایک روز صبح صبح جب میں نے اپنے ریڈیو سیٹ کا سوئچ دبایا تو وہ دہائی دینے لگا غور سے سُنا تو پتہ چلا کہ اس نے عام دنیا کی نشریات کی خبریں لانا ترک کر دیا ہے اور کسی اور ہی سیارے سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے۔ میں سیاروں کی مخلوق کی زبان نہیں سمجھتا۔ ناچار زندگی میں پہلی بار ریڈیو سمیت "عمر دراز ریڈیو سروس" کی دکان پر گیا اور دل ہی دل میں اپنے ریڈیو کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے ہوئے کہا "یہ خراب ہے"

"بتایئے کیا خرابی ہے اس میں؟" عمر دراز صاحب نے اس طرح کہا جیسے چیلنج کر رہے ہوں کہ دکھا دیجئے کوئی خرابی تو جانیں!

"پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ کوئی اسٹیشن نہیں پکڑتا"

"کوئی اسٹیشن نہیں؟"

"جی نہیں! دیکھئے نا۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔ اور جب میڈیم ویو سے شارٹ ویو بدلتا ہوں تو "کھڑاک" کی ایک گرجدار آواز آتی ہے۔ جیسے میری پڑوسن کا بڑا کتا بھونکتا ہے۔ پھر جب شارٹ ویو سے میڈیم ویو بدلتا ہوں تو دھڑاک دھڑاک کی آواز آتی ہے جیسے میری پڑوسن کا چھوٹا کتا بھونکتا ہے اور پھر جب سیلون لگانے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ سیٹیاں بجاتا ہے جیسے ان کتوں کے ڈر سے میرا خارش زدہ کتا۔۔"

"ارتھ استعمال کرکے دیکھا آپ نے؟" انھوں نے میری چٹ پٹی تشبیہوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور ان تینوں زخمی کتوں کا گلا دبا دیا۔ میں نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

"جی؟ ارتھ یعنی زمین؟ وہ کیا؟"

"آپ ارتھ بھی نہیں جانتے؟ کس کا ریڈیو ہے یہ؟ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔"

"حضرت! آپ تو ناحق برہم ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ پوری بات سن کر کہنے لگے۔

"میں نے دیکھ لیا ہے۔ ریڈیو سیٹ ٹھیک ہے۔ ذرا پرانا ہو گیا ہے۔۔ لے جایئے لیکن ارتھ استعمال کرنا نہ

بھولیے اور ہاں - ویلو بدلتے وقت والیوم کم کر دیا کریں ورنہ وہ ایس اے نفیس تھری والا والو ہے نا - وہ فیوز ہو جائے گا اس وقت آوٹ آف سٹاک ہے ۔"

گریمر کے لحاظ سے ہر جملے کے تین حصے ہوتے ہیں۔ فاعل۔ فعل اور مفعول۔ مگر دکاندار صاحب کے جملے کا جو حصہ میں پوری طرح سمجھ سکا وہ صرف فعل تھا یعنی صرف یہ پتہ چلا کہ کچھ ہو جائے گا۔ مزید کچھ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی میں نے جھٹ ریڈیو سیٹ بغل میں دبایا اور پیچھے مڑا۔

"اجی سنئے! ذرا ٹھہریئے" پیچھے سے آواز آئی "بل تو چکاتے جایئے۔"

"کیسا بل؟"

انھوں نے جواب دینے کی زحمت نہ کی اور میرے ہاتھ میں ایک کیش میمو تھما دیا "دس روپے۔"

"یہ دس روپے کیسے؟" میں نے مری ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔

"جناب! یہ تو ریڈیو دوکان پر لانے کا چارج ہے۔"

بل ادا کرنا پڑا۔

ایک دن نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر ایک دوست کے بہکانے پر ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خریدی۔ میرا دوست جو میٹرک میں کئی بار فیل ہو چکا ہے، پرانی چیزوں کی خرید و فروخت کا بڑا تجربہ رکھتا ہے۔ اس موٹر سائیکل کے بارے میں اس نے کہا۔

"بھئی سچ پوچھو تو جو مزہ سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل میں ہے، نئی میں کہاں ـــ؟ اگر تھوڑے تھوڑے وقفے پر موٹر سائیکل خراب نہ ہو تو آدمی بھول ہی جاتا ہے کہ یہ موٹر سائیکل ہے یا بائیسکل۔ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ میڈ اِن جرمنی ہے۔" اس نے یہ بھی نصیحت کی کہ موٹر سائیکل کو کبھی ورکشاپ نہ بھیجنا لیکن اس کے بدلے میں مجھے کیا کرنا تھا یہ نہ میں نے پوچھا نہ اُس نے بتانے کی زحمت کی۔

موٹر سائیکل چلانا کیسے سیکھا یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ مختصراً صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ تین مہینوں کی انتھک کوشش کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ موٹر سائیکل پر دفتر جا سکوں۔ تفریح کی تفریح بھی تھی اور پیسے کی بچت بھی۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دفتر جاتے ہوئے ایک دن بیچ راستے میں موٹر سائیکل نے دم توڑ دیا۔ لاکھ کک مارا، سارا لے کر دوڑا، چند لونڈوں سے دھکا لگوایا لیکن سٹارٹ نہیں ہوئی۔ دفتر کا وقت ہو چکا تھا۔ نزدیک ہی ایک ورکشاپ تھی۔ میں نے اپنے دوست کی نصیحت کو نظر انداز کیا اور موٹر سائیکل کو ہانکتا ہوا اور خود ہانپتا ہوا وہاں پہنچا۔ ایک دبلے پتلے سے لڑکے نے آ کر میرے ہاتھ سے موٹر سائیکل لے لی۔ میں نے کہا "دیکھو۔ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ سٹارٹ نہیں ہوتی۔"

اس نے ایک دو کک ماری پھر پوچھا "کل رات آپ نے اسے بارش میں چھوڑ دیا تھا۔"

میں نے جواب دیا "واہ۔ مفت کی ہے جو بارش میں چھوڑوں گا۔ ؟ میاں اپنے کمرے میں رکھتا ہوں۔"

"پھر اس پر پانی کس نے پھینکا؟" اس نے تشخیص کی۔ "کاربوریٹر میں پانی چلا گیا ہے۔"

"خیر۔ جو ہوا سو ہوا۔" میں نے نامانوس لفظ سے پہلو بچاتے ہوئے کہا "اسے جلدی سے ٹھیک کر دو۔"

"شام کو لے جایئے گا۔"

میں چونکا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن جب اُسے اپنی موٹر سائیکل کو دوسری موٹر سائیکلوں کے انبار میں بے دردی سے دھکیلتے ہوئے دیکھا تو میری رگِ شفقت پھڑک اٹھی۔ میں نے للکار کر کہا۔

"میاں ذرا سنبھال کے۔ تم نے تو اتنی ہی دیر میں میری بنی موٹر سائیکل پ...." میں نے لفظ "پ" پر اتنا زور دیا کہ جملہ پورا کرنا یاد ہی نہ رہا۔ اس دبلے پتلے لڑکے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر موٹر سائیکل کی طرف۔ پھر میری طرف پھر موٹر۔ شاید وہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ میری عمر زیادہ ہے یا موٹر سائیکل کی۔ میں فوراً اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کھسک گیا۔

شام کے وقت موٹر سائیکل واپس کرتے ہوئے اور پیسے لیتے ہوئے اسی دبلے پتلے لڑکے نے کہا "سپارک پلگ بدلوا لیجئے گا۔"

مجھے اس کا صبح کا سلوک نہیں بھولا تھا۔ میں بھڑک اٹھا "ابھی پرسوں ہی تو بدلوایا ہے اور تم آج کہتے ہو.... بدلنا پڑے گا۔" باوجود کوشش کے میں اس چیز کا نام ذہن میں نہ رکھ سکا جس کے بارے میں وہ کہہ رہا تھا کہ بدلوا لینا۔

"دیکھئے صاحب! موٹر سائیکل پرانی ضرور ہے لیکن چیز اچھی ہے بہت دن سروس دے گی بس آپ اس کے کچھ پرزے بدلوا دیجئے۔"

میں نے اس کی تجویز پسند کی۔ کہا "اچھا دیکھو تم مجھے ایک کاغذ پر ان تمام پرزوں کے نام لکھ کر دے دو۔"

وہ بولا "ٹھیک ہے۔ آپ لکھئے میں بولتا ہوں پسٹن رنگ، سائیلنسر، گیئر باکس میں کاؤنٹر گیئر، بیٹری ـ یہ سب تو بڑی چیزیں ہوئیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ مثلاً سپارک پلگ اور ہاں ڈائنامو کا آرمیچر کوائل جل گیا ہے۔"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا جھلا کر کہا "تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ بکواس کرتے ہو۔" میں نے قلم جیب میں رکھا اور کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔

اب تک تو میں جانتا تھا کہ موٹر سائیکل میں صرف چار چیزیں ہوتی ہیں ہینڈل، سیٹ، انجن اور پہیے کسی پانچویں چیز کی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن نہ جانے وہ کیا کیا بکے جا رہا تھا۔ ضرور مجھے دھوکا دینا چاہتا تھا۔ میرے دوست نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ آہ! ایسے میں انجینئر صاحب سے دوستی قائم ہوتی تو فکر کی بات ہی نہ تھی۔ میں نے دل ہی دل میں مستری کو بہت کوسا جس کی وجہ سے....

چند دن خیریت سے گزرے۔ اس کے بعد تجربے کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ موٹر سائیکل کو کچھ ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس کے روگ کا صحیح علاج اس کا فیملی ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے میں اس کے پچھلے مالک کے پاس پہنچا اور کہا۔

"دیکھئے! اس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ ہر روز ایک نئی خرابی!" میں نے مبالغے سے کام لے کر اپنے بیان کو موثر بنانے کی کوشش کی۔

"کیا خرابی ہے؟"

"میں ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ ویسے کچھ ہے ضرور کیونکہ جب بھی کسی اونچے نیچے راستے پر ڈالتا ہوں تو ـ تو ـ میرا مطلب ہے ذرا مہربانی کر کے آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔"

میں نے موٹر سائیکل ایک نہایت خراب سڑک پر ڈال دی۔ ایک چھوٹے سے گڑھے کے اوپر سے گزرتے ہوئے میں نے منہ پھیر کر پوچھا "غور کیا آپ نے؟" "نہیں؟" "اچھا دیکھئے اس بار ٹھیک سے دیکھئے میں اس گڑھے میں لے چلتا ہوں۔ دیکھا۔؟"

باقی صفحہ 41



حکیم بدھن نے گھر بسایا

بہزاد لکھنوی

حضرات آپ نے آج تک حرام خور اور حلال خور تو بہت دیکھے ہوں گے، لیکن شاید جوڑ خور کم ہی ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ اس لئے کہ یہ شرف خورش خاص مقدر والوں کے حصہ میں ہی آتا ہے۔ تو جناب حکیم بدھن ایسی ہی قسمت ایسا ہی مقدر لے کر آئے تھے۔ تین عدد جوڑوں کو نوش فرمانے کے بعد اب بھی "الجوع الجوع" کی صدائیں لگا رہے تھے۔ پہلا لقمہ تو آٹھ دس برس کے بعد حلق سے نیچے اترا تھا۔ دانت کچھ کم تیز تھے لیکن دوسرا اور تیسرا لقمہ تو دو دو سال کے اندر ہی حلق سے ایک دم نیچے اتر گیا ۔۔۔ اور اب بھائی کا یہ عالم تھا کہ:۔

"پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں"

ان کی اس عجیب و غریب صفت کے باعث شہر کی ہر لڑکی کا باپ انکا نام نامی سنکر کانوں پر ہاتھ دھر لیا

کرتا۔ اب اس غریب حکیم بدھن کا باپ تھا تو میں۔۔۔ بھائی تھا تو میں چچا تھا تو میں۔ دوست تھا تو میں ملازم تھا تو میں۔ چنانچہ میرے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ میں ان کی بھوک کا کوئی انتظام کروں۔ لیکن جناب میں نے جس کسی سے بھی کہا، اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا کہ:۔

"بھیا بہزاد تمہارا بہت بہت شکریہ لیکن معاف کرنا مجھے تم سے انکار کرنا پڑ رہا ہے۔ حکیم بدھن میں کوئی عیب نہیں ہے۔ ماشاءاللہ کماؤ ہیں خوبصورت ہیں عزت دار ہیں حسب نسب میں کھرے ہیں لیکن ان کا پہرہ عورت کے حق میں اچھا نہیں ہے"

جب میں نے ان کے اس انکار پر مزید گفتگو شروع کی تو وہ بولے۔

"اچھا بھیا استخارہ تمہارے سامنے دیکھے لیتا ہوں" انھوں نے فوراً تسبیح نکال کر استخارہ لیا۔ استخارہ منع آیا۔ اب وہ بولے:۔

"اب کیا کہتے ہو بھیا بہزاد"؟

میں نے کہا "بھائی! میں اتنی اتنی باتوں پر اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں"۔

وہ بولے:۔ "ارے بھیا بالفرض اگر میں اقرار بھی کر لوں تو میرے گھر والے قیامت ڈھائیں گے۔ حکیم بدھن کی جوڑ خوری ہر طرف مشہور ہو چکی ہے"۔

میں نے برابر والوں کے علاوہ کچھ کمتر لوگوں میں بھی بات چلائی، لیکن ہر طرف سے یہی جواب ملا۔

"جیتے جی تو ہم اپنی لڑکی کو کفن نہیں پہنا سکتے"

اب بتائیے میں کرتا تو کیا کرتا۔ ادھر حکیم بدھن کا یہ عالم تھا کہ صبح فیکٹری میں آتے ہی پہلا سوال یہ ہوتا:

"کہو بھیا! کہیں کوئی بات بنی؟" ۔۔۔۔ میں ان کا دل رکھنے کو کہہ دیتا:۔

"وہ لوگ سوچ رہے ہیں"

حکیم بدھن کی اس طلب سے ہر شخص آگاہ تھا اور کئی صاحبان بھی حکیم بدھن کو بے وقوف بنا کر جانے کا کرایہ وصول کر رہے تھے۔ کبھی کوئی آ کر یہ کہہ دیتا کہ سارا گھر راضی ہے صرف خالہ اڑنگا لگا رہی ہیں۔ ان کے لئے جانا ضروری ہے دو روپے کرایہ کے دیدو۔ کوئی کہتا تھا کوئی کچھ۔ حکیم بدھن غریب سب سمجھتا تھا لیکن بدھو بن جاتا تھا۔ ایک دن مجھے اپنی میز پر بلا کر بولے:

"یار بہزاد! اب تو یہ شتم تمہارے ساتھ گزر رہا ہے۔ رات کمبخت کاٹے نہیں کٹتی۔ تم کو اس کا علم ہے میں آوارہ نہیں ہوں۔ اگر آوارگی پر اتر آؤں تو کمی نہیں ہے۔ مجھے تو ایک شریک حیات چاہیئے شریک نشاط نہیں"

میں نے کہا "بھائی بدھن مجھے تمہاری الجھن کا مکمل احساس ہے۔ گھبراؤ نہیں جلد یا بدیر کوئی صورت ضرور نکلے گی"

مرد باید کہ ہراساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

وہ میری بات سے چپ تو ہو جاتا تھا لیکن آئے دن لگا رہتا تھا خریداروں سے بھی اب وہ کم التفاتی برتنے لگا واقعات نئی د...

ایک دن صبح جو فیکٹری میں گئے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دور سے تین بار آنکھ ماری اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں جا کر ان کی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی حکیم بدھن نے ایک چوکور کاغذ نکالا اور کہا۔

"اس کو پڑھو یار اور مجھے بتاؤ کیا کروں؟"

میں نے اس کاغذ کو کھولا۔ تحریر صاف زنانی تھی مضمون کچھ یوں تھا۔

"اجی لے! تم کون ہو روز صبح صبح کہاں جایا کرتے ہو۔ صاف صاف لکھو تو میں تم کو اپنا حال سناؤں۔ اس کا جواب لکھ کے لاؤ۔ دیوار سے ملا ہوا ایک لنگر تمہیں نظر آئے گا اس میں باندھ دینا۔ لیکن ذرا اِدھر اُدھر دیکھ کر۔ دن کے دس بجے آجانا۔"

میں نے کہا: "یار یہ تحریر کہاں ملی؟"

بولے: "بھیا کیا بتاؤں۔ میں روز گھر سے چھپیداروں کے تکیے کی طرف ہوتا ہوا فیکٹری آتا ہوں۔ آج ابھی ابھی ایک مکان کی پشتی دیوار سے یہ چوکور کاغذ ایک ڈھیلے میں بندھا ہوا میرے سامنے اوپر سے آ کر گرا۔ میں نے جھک کر اٹھایا اور اوپر نظر کی تو بھیا کیا بتاؤں۔ مر گیا تمہارا حکیم بدھن ہائے ہائے صرف ایک جھلک دیکھی تھی لیکن برا حال ہو گیا۔ وہ جلوہ ایکدم سے غائب ہو گیا۔ گلی تم کو معلوم ہے، بالکل سنسان رہتی ہے۔ میں نے وہ ڈھیلا کھول کر پھینک دیا اور اسکو پڑھ کے حیران رہ گیا۔"

میں نے کہا: "مبارک ہو، میں نہ کہتا تھا جلدی ہی تمہارا ارمان پورا ہو جائے گا۔"

وہ بولے: "یار ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ ہاں ذرا جواب تو لکھو لیکن خدا کے لئے ہاتھ روک کر۔ تمہارا جناتی خط ہے جو جنات ہی پڑھ سکتے ہیں انسان تو پڑھ نہ پائیں گے۔"

یہ کہہ کر کئی مرتبہ حکیم بدھن کا قہقہہ گونجا۔ میں نے کاغذ نکال کر سامنے رکھا اور حکیم بدھن نے بولنا شروع کیا۔

"میرا نام حکیم بدھن ہے۔ پاٹے نالے پر رہتا ہوں۔ بیوی مر چکی ہے، جو خدمت بھی ہو جان و دل سے حاضر ہوں۔"

میں نے ہاتھ روک کر ہر لفظ علیحدہ علیحدہ لکھ کر دیا۔ حکیم بدھن نے اس کی چوکور تہہ کرنے کے بعد گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ حکیم بدھن نے یہ تین گھنٹے کیونکر گزارے، میں بیان نہیں کر سکتا۔ اتفاق سے دس بجے تک کوئی خریدار بھی نہیں آیا۔ ٹھیک دس بجے حکیم بدھن باہر نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے فرنگی محل کے پل کی طرف چل دیے۔ کوئی ایک گھنٹے میں واپسی ہوئی۔ چہرہ مارے خوشی کے دمک رہا تھا۔ آتے ہی مجھ سے بولے۔

"یار جب میں پہنچا تو ایک ڈور میں بندھا ہوا لنگر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے ڈور کو تھام کر ایک ہلکی سی جھٹکی دی اور پرچہ باندھ دیا۔ لنگر فوراً اوپر کھینچ لیا گیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں دیوار کے اوپر ایک چہرہ نظر آیا۔ بھیا بہزاد کیا بتاؤں کیا حسن تھا۔ میں نے آج تک ایسی صورت نہیں دیکھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، کتابی چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ غضب ڈھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک برقِ ستم مجھ پر گرا گئی کہ ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جب کوئی راہ گیر گزرتا تو میں زمین کی طرف جھک کر اس طرح دیکھنے لگتا گویا کوئی چیز گر گئی ہو اور میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کوئی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ چہرہ پھر دیوار پر نمودار ہوا اور لنگر نیچے لٹکا دیا گیا۔ اس میں یہ کاغذ بندھا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ کھول کر ہاتھ میں لے لیا اور ڈور کو جھٹکی دی۔ لنگر پھر اوپر کھینچ لیا گیا۔ میں نے یہ کاغذ کھولا تک نہیں۔ یہاں سیدھا تیر کی طرح آیا ہوں۔ بھیا ذرا کھول کر پڑھو تو۔ دیکھو کیا نوشتۂ تقدیر ہے۔"

میں نے اس کاغذ کو کھولا۔ کاغذ پر جا بجا عطر لگا ہوا تھا جس کے ہرے ہرے دھبے نمایاں تھے۔ خط کا مضمون اس طرح سے تھا۔

"حکیم صاحب، میں بہت دکھیاری عورت ہوں۔ اگر آپ واقعی میری مدد کر سکتے ہوں تو مجھ سے اقرار کیجیے۔ ورنہ خدا کیلئے میرے ساتھ کھیلنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ اس خط کا جواب دوپہر کو ڈیڑھ بجے تک مجھے مل جانا چاہیئے۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔ ڈیڑھ بجے والے خط کا جواب چار بجے آ کے لے جائیے گا۔"

میں نے کہا: "استاد تمہاری تو منہ مانگی مراد پوری ہو رہی ہے۔ بولو کیا جواب لکھوں۔"

میں نے کاغذ سامنے رکھ لیا۔ وہ بولے:

"لکھو! میں خدا کی قسم کھا کر لکھ رہا ہوں کہ اگر میری جان بھی تمہارے کام آئے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ تم مجھ پر قطعی اعتبار کر سکتی ہو۔ انشاء اللہ مجھ سے دغا نہ پاؤ گی۔

تمہارا غلام۔ حکیم بدھن۔"

میں نے کہا: "واہ بیٹا ابھی سے خطِ غلامی لکھے دیتے ہو۔" وہ قہقہہ مار کر بولے:

"یار اگر غلام سے گرا ہوا کوئی اور لفظ ہوتا تو وہ بھی میں لکھوا دیتا۔"

میں نے اپنی جان پر کھیل کر صاف صاف خط لکھا ورنہ میرا خط تو جیسا ہوتا ہے میں ہی جانتا ہوں۔ حکیم نے خط لیتے ہی کہا۔

"استاد چلو ذرا امین آباد حضرت گنج کی سیر کر آئیں اس فیکٹری میں تو وقت کاٹے نہیں کٹے گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "اس دوپہر میں تفریح کی سوجھی ہے، کچھ پاگل ہوئے ہو۔"

وہ بولے: "استاد تم کسی پر عاشق ہو تو تم کو بیقراری کا پتہ چلے۔"

میں نے کہا: "یہ عشقِ یک نظری آپ ہی کو مبارک رہے جنابِ والا۔"

نالائق نہیں مانا۔ مجھے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور ایک جاتے ہوئے تانگے کو آواز دے کر اس پر بیٹھ گئے۔ نخاس سے امین آباد اور امین آباد سے حضرت گنج، حضرت گنج سے چھتر منزل ہوتے ہوئے نخاس کی واپسی میں بہرطور وقت کٹ گیا۔

ڈیڑھ بجنے میں کچھ منٹ تھے جب حکیم بدھن نے تانگا فرنگی محل کے پل پر چھوڑ دیا اور مجھے لئے ہوئے چھپیداروں کے تکیے کی طرف روانہ ہوئے۔ گلی کے آغاز پر مجھے اسی جگہ چھوڑا جہاں اس مکان کی پشتی دیوار صاف نظر آ رہی تھی۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ حکیم بدھن نے جاتے ہی وہ رقعہ لنگر میں باندھ دیا اور میرے پاس چلے آئے۔ ہم دونوں فیکٹری پہنچے جہاں تین چار خریدار ایک ساتھ موجود تھے۔ میں اور حکیم دونوں کام میں لگ گئے۔ آخری خریدار کو میں سودا دے کے کہ حکیم بدھن ٹھیک سوا چار بجے چل دیے۔ کوئی آدھ گھنٹے میں واپس آ کر بالکل میرے برابر آ کر بیٹھ گئے۔ اس

آخری خریدار مال لے کر جا رہا تھا اس کے جاتے ہی صاحب نے ایک کاغذ نکالا۔ یہ کاغذ بجائے پرزہ نے کے کافی بڑا تھا۔ غالباً کسی اسکول کی کاپی سے یا گیا تھا۔ میں نے کھولا۔ لکھا تھا۔

"حکیم صاحب آپ کے خط نے مجھے دوسری زندگی ی ہے۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ نے ی میری مدد کردی اور مجھ کو اس مشکل سے نکال لیا سا تا عمر آپ کی لونڈی بنی رہوں گی۔ اب میری بت کا حال غور سے سنیے:

میرے ابو جانی کا نام منجو صاحب ہے اور وہ نوکری کام چوک میں کرتے ہیں مشہور آدمی ہیں، ان سے بہتر رنگریز ہر میں کوئی اور نہیں ہے۔ میں بدنصیب ان کی سب سے بڑی ی ہوں میری ماں کا میری پیدائش کے بعد انتقال ہو گیا رے والد نے دوسری شادی کر لی جن سے دو بھائی اور دو بہنیں اور ہیں۔

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو میری شادی میرے اللہ دار بھائی کے ساتھ کر دی گئی۔ لیکن میری بدنصیبی کہ ... میرا دولہا جب بارات کے ساتھ جا رہا تھا تو میرے شوہر جس گھوڑے پر وہ دولہا بنے ہوئے سوار تھے، وہ گھوڑا آتش بازی کی وجہ سے بھڑکا اور وہ زمین پر گر پڑے اور گرتے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ میں بدنصیب جلی کنواری ہی بیوہ ہو گئی۔ میرے ابو جانی پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ انکے خاندان میں بیوہ کا عقد نہیں کرتے بلکہ برا سمجھتے ہیں میری دو پھوپیاں بھی جوانی میں بیوہ ہو کر گھر بیٹھی رہیں یہاں تک کہ مر گئیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں بیوہ ہو گئی اور آدھے راستے ہی سے میرا ڈولا واپس آ گیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میرے اوپر کیا بیتی ہو گی۔

دو سال کے بعد میرے والد کو انکے خاص دوستوں نے مجبور کیا کہ وہ میرا عقد پھر کر دیں اس لئے کہ میں دراصل کنواری ہی ہوں اور ہو گی کا ٹیکہ خواہ مخواہ میرے ماتھے پر لگ گیا ہے۔ وہ راضی تو نہیں البتہ مجبور ہو گئے۔ اب کے میری شادی ایسے وثیقے دار کے ساتھ کی گئی جن کی پہلی بیوی مر چکی تھیں اور دو اولادیں تھیں۔ وہ بارات لے کر گھر آئے۔ نکاح ہوا اور نکاح ہوتے ہی، میری بدنصیبی ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ فوراً اسپتال پہونچائے گئے جہاں پہونچتے ہی انھوں نے مجھ کو تین طلاقوں کے علاوہ طلاقنامہ میرے والد کے پاس بھجوا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں منحوس ہوں اور واقعی طلاقنامہ پر دستخط کرتے ہی ان کا درد ایک دم سے جاتا رہا۔ اب حکیم صاحب میرے منحوس ہونے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔!

چنانچہ اس واقعہ کو پانچ برس ہو گئے ہیں، میں اپنے گھر میں بھی منحوس سمجھی جاتی ہوں۔ برادری میں منحوس اور محلے بھر میں منحوس۔ لوگ میرے سائے سے بچتے ہیں۔ میں اوپر کے ایک کمرے میں تنہا زندگی کے دن گزار رہی ہوں میرے بھائی اور بہنیں میرے سائے سے بھاگتے ہیں۔ کہنے جانے والے کہتے ہیں مجھے گھر کا بچا کچا کھانے کو دیا جاتا ہے اور پہننے کے لئے چھوٹی بہنوں کی اترن۔ میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں، موت مانگتی ہوں اور مجھے نہیں آتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ بولئے! آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھیے کہ دو شوہروں کو کھا چکی ہوں، نگل چکی ہوں، میں منحوس ہوں میرے دل بہلنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ میں اس دیوار سے گلی کا نظارہ کرتی رہوں۔ میرے پاس کوئی آتا نہیں ہے اور نیچے جانے کا حکم نہیں ہے۔ گلی سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بہل جاتی ہوں۔ آپ کو کئی مہینوں سے مسلسل صبح ادھر سے گزرتے دیکھ کر خدا جانے مجھے کیونکر ہمت ہوئی کہ میں نے آپ کو رقعہ لکھا۔ اب میری عزت آپ کے ہاتھ ہے۔ اس خط کا جواب مجھے کل مل جانا چاہیے خواہ وہ انکار ہی میں کیوں نہ ہو۔ آپ کے انکار سے میرا دل ٹوٹنے کا نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا ہے۔"

حکیم بدھن نے خط ختم ہوتے ہی کہا۔

"استاد لکھو!" میں نے کہا۔

"یار تم جلد بازی سے کام نہ لو۔ پہلے سوچ سمجھ لو بھائی منجو صاحب رنگریز کو تم بھی پہچانتے ہو میں بھی پہچانتا ہوں وہ انتہائی بدمزاج، بدزبان اور منہ پھٹ آدمی ہے۔ سربازار کسی کی عزت اتار لینا اس کے آگے کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ صاحب کمال رنگریز نہ ہوتا تو شاید۔ دنیوں کو تنا تا پھلتا،" حکیم بدھن نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"پھر جناب شاعر صاحب آپ کا مقصد کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مقصد صرف اتنا ہے کہ اس خط کا جواب لکھوانے سے پہلے سوچ لو کہ کس مزاج کے آدمی سے پالا پڑا ہے۔"

وہ میری بات سے جھلا گئے اور ناک پر انگلی رکھ کر مٹک کر بولے۔

"اوئی اللہ میں کیا مردوں میں آئی۔ اجی تم اپنا فلاں دل کو ادھر ہی رکھو۔ میں ایسے ایسے منجو صاحب نہ جانے کتنے بڑے گھر بھگا چکا ہوں۔ یہ ہیں کیا پدی کیا پدی کا شوربہ ہے؟"

میں نے ان کی اشیم دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھیا خفا ہونے کی بات کیا ہے۔ میں نے تو ذرا سی بات تم کو سمجھائی تھی۔"

وہ اسی تیور کے ساتھ بولے۔

"گویا میں اندھا تھا اور جناب مجھے سمجھا رہے تھے اجی حضرت لکھیے جو میں لکھوا رہا ہوں!"

میں خاموش ہو گیا اور کاغذ پر قلم رکھ کر میں حکیم بدھن کی طرف دیکھنے لگا۔

"لکھو! پیاری بیگم۔ تمھارا پورا پورا حال پڑھ کر میں تمھارا اور بھی گرویدہ ہو گیا۔ تم بڑی اسیدھی اور نیک عورت ہو۔ تم اگر واقعی مجھ پر بھروسہ کرنے کا وعدہ کرو اور اس کی قسم کھاؤ کہ جیسا میں کہوں گا تم ویسا ہی کرو گی۔ تو میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے پندرہویں دن تم اس مصیبت سے نجات پا جاؤ گی۔ میں اپنی جان، مال، عزت آبرو سب تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ ہمیشہ کیلئے تمھارا
حکیم بدھن"

میں نے اس مضمون کو صاف صاف ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے لکھ دیا۔ حکیم بدھن مجھ سے خط لے کر چلے گئے اور تقریباً سات بجے فیکٹری میں آئے۔ میں گھر جانے کے لئے آخری چائے کی پیالی پی رہا تھا۔ آتے ہی میرے ہاتھ میں ایک کنجی پکڑاتے ہوئے بولے۔

"بھیا کل صبح بجائے فیکٹری آنے کے تم سیدھے منجو صاحب رنگریز کے مکان چلے جانا۔ ان کے مکان سے بالکل ملے ہوئے مکان میں بالو صاحب مختیار رہتے ہیں۔ اجی وہی بہرے بالو صاحب! سمجھ گئے؟"

میں نے گردن ہلادی۔ وہ بولے۔

"وہ نیچے کے مکان میں کرائے پر رہتے ہیں۔ انھیں کے مکان کا اوپر کا حصہ خالی ہے۔ ان کے اور منجو صاحب کے دروازوں کے درمیان زینے کا دروازہ ہے جس میں قفل لگا ہوا ہے۔ تم اس کنجی سے قفل کھول لینا۔ ایک مزدور بھی پکڑلے جانا اور اوپر کا کمرہ جس کے سامنے تھوڑا سا صحن ہے۔ ایک طرف باورچی خانہ غسل خانہ اور پاخانہ ہے، صاف کرالینا۔ میں ابھی ابھی اس کا پیشگی دو ماہ کا کرایہ دے کر آرہا ہوں۔ میں نے کرائے پر لے لیا ہے"

میں نے کہا۔ "تو کیا پاٹے نالے والا مکان چھوڑ رہے ہو؟!"

وہ بولے: "یار تم بھی بڑے گاؤدی ہو۔ پاٹے نالے والا مکان کیوں چھوڑ دوں گا۔ یہ تو میں نے مصلحتاً لیا ہے (میرے کان کے پاس منہ لگا کر) اس کمرے کی دیوار اور اس کمرے کی دیوار ایک ہی ہے جس میں زہرہ جبیں مشتری شمائل غنچہ دہن رہتی ہے"

میں نے کہا۔ "اور جس کا نام بھی عاشق نامدار کو معلوم نہیں"

وہ چڑ کر بولے: "اجی تم کو اس سے کیا؟ مذہب عشق میں نام و نشان کی قید نہیں ہے"

میں نے کہا۔ "بہتر ہے۔ انشاء اللہ میں مزدور کو وہاں صفائی کے لئے چھوڑ کر یہاں آجاؤں گا"

وہ بولے: "یار بہزاد تم مجھے کھا جاؤ گے اگر تم کو ایک بات بتادوں"

میں نے کہا۔ "تو پھر کھا جانے دو۔ تمہارا نقصان کیا ہے!"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے:

"یار وہ کمرہ آسیب زدہ مشہور ہے۔ کوئی کرائے پر لیتا ہی نہیں ہے۔ خود مالک مکان کالے صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مکان آسیب زدہ ہے تم کیا کرو گے لے کر، وہاں کوئی ٹکتا ہی نہیں ہے"

میں نے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا کہا؟"

بولے۔ "میں نے کہا کہ میں تو صرف کنکوا اڑانے کی مشق اس بالاخانے پر کروں گا۔ دن بھر رہوں گا رات کو خالی رہے گا۔ تب وہ راضی ہوگئے اور مجھے مکان کی کنجی حوالے کی۔ لیکن یار دو مہینے کا ایڈوانس کرایہ بھی لے لیا۔ آدمی چالاک ہے۔"

صبح سویرے ہی میں ایک مزدور کو لے کر جب اس بالاخانے کا دروازہ کھولنے لگا تو ابو صاحب شیدا باہر ہی کھڑے تھے۔ مجھ سے بولے:

"اجی بہزاد —— یہ تم اس بھوت خانے میں کہاں جارہے ہو بھیا"

میں نے کہا "حکیم بدھن نے کنکوے بازی کی مشق کے لئے اسے کرائے پر لیا ہے۔ دن بھر کنکوا اڑائیں گے۔ رات بھر خالی رہے گا"

وہ بولے: "خیر کوئی بات نہیں ہے لیکن میری طرف سے حکیم بدھن سے کہہ دینا کہ ہرگز ہرگز اس کمرے میں رات کے وقت قیام نہ کریں"

میں بہت اچھا کہتا ہوا اوپر چڑھا۔ یہ زینہ ایک صحن میں نکلتا تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جس کے ایک جانب باورچی خانہ، غسل خانہ اور پاخانہ تھا۔ صحن سے ملحق ایک کمرہ تھا جو کافی بڑا تھا اور ایک بغلی کوٹھری۔ مکان بہت صاف اور ہوادار تھا۔ مزدور کو بھی صرف گرد و غبار ہی جھاڑنا تھا وہاں کوڑا کرکٹ نام کو نہیں تھا۔ میں مزدور کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ آدھے گھنٹے میں اس نے پوری صفائی کردی میں نے اس کو مزدوری دی اور زینے کو مقفل کرتا ہوا جب چائے خانے پہونچا تو حکیم بدھن میرے بری طرح سے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی بولے۔

"صفائی ہوگئی؟"

میں نے کہا "یار وہاں کوڑا کرکٹ نام کو بھی نہیں تھا۔ صرف گرد و غبار تھا۔ بھیا مکان بے حد صاف ستھرا تھا"

وہ بولے: "پڑوس کی برکت ہے شاعر صاحب"

میں نے کہا۔ "اب تو تمہیں وہاں کی ہر شے ہری ہی ہری نظر آئے گی"

انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑاتے ہوئے کہا: "یہ پڑھو! میں نے بھی اب تک پڑھا نہیں ہے تمہارا پڑھنا میرے لئے مبارک ہوتا ہے" میں نے لے کر پڑھنا شروع کیا۔

"میرے اچھے حکیم صاحب! آپ کے خط نے میرے مردہ جسم میں جان ڈال دی ہے۔ میں آپ کی بے حد شکرگزار ہوں میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ آپ جو کچھ کہیں گے میں اس کے خلاف بالکل نہیں کروں گی۔ خواہ میرے خیال میں وہ بات صحیح نہ ہو۔ میں تمام زندگی آپ کی لونڈی بن کر آپ کے قدموں میں رہنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ میں منحوس ہوں"

آپ کی ازلی کنیز——

پیاری بیگم——

حکیم صاحب نے خط کا مضمون سنتے ہی بھاؤ بتا بتا کر ناچنا شروع کردیا۔ اس وقت خریدار بھی دو چار ہی تھے۔ مالک چائے خانہ بنّا صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب آج تو آپ بڑے بڑے ناچنے والوں کو مات کئے دے رہے ہیں"

وہ بولے: "اجی بنّا صاحب آج میں بے حد خوش ہوں اس لئے رقص کر رہا ہوں۔ ذرا دو پیالوں میں ایک ایک چھٹانک بالائی ڈال کر بھجوا دیجئے تو"

چائے پیتے ہی حکیم بدھن نے کہا۔

"بہزاد بھیا۔ خدا تمھیں سلامت رکھے، ذرا لکھو تو"

"پیاری بیگم۔ تمہارا محبت نامہ کیا تھا میرے لئے آب حیات تھا۔ میں بھی محبت کا بھوکا ہوں۔ محبت مجھے آج تک نصیب ہی نہیں ہوئی۔ تم آج سے اپنے کو کبھی منحوس نہ سمجھنا اور نہ لکھنا۔ تمہارے دشمن منحوس ہوں گے۔ میں نے تمہارے بالکل برابر والا بالاخانہ جو بھوتوں کا کوٹھا کہلاتا ہے کرائے پر لے لیا ہے۔ تم گھبرانا نہیں مجھ سے بڑے بھوت نہیں ہوں گے جو وہاں قابض ہیں۔ تم اس دیوار پر کھڑی ہونے کی کوشش کرو جو اس مکان اور بالاخانے کے صحن میں حائل ہے یعنی پردے کی دیوار۔

انشاء اللہ اب خود باتیں ہوں گی۔ اپنے گھر میں سنانے کا وقت مجھے بتادو۔ میں آج دوپہر تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔

تمہارا غلام —— حکیم بدھن"

میں نے کہا: "یار یہ لفظ غلام لکھتے ہوئے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا"

وہ بولے —— "بھیا یہ لکھنؤ ہے۔ یہاں تو آرسی مصحف کے وقت سالیاں کہلواتی ہیں" بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام ہوں"

میں نے کہا "پھر بھی اس قدر گراؤ ابتداء سے اچھا نہیں ہے"

وہ ہنس کر بولے ... میں نے ...
سلام ... پیغام ... غلام ...

میں نے کہا "واہ بیٹا"

وہ بولے "ابھی چھوڑو یہ مذاق۔ ذرا جلدی سے فیشن والی گلی میں جو دوکان ہے چھمو صاحب کی وہاں سے دو نواڑی پلنگ، دو دریاں، دو چاندنیاں، دو گاؤ تکیے ایک اگالدان لے کر بالاخانے پہونچ لو۔ میں یہ خط دیتا ہوا کورے گھڑے، صراحیاں اور آبخورے اکبری دروازے سے لیتے ہوئے پہونچتا ہوں"

میں فوراً روانہ ہوگیا۔ جب چھمو صاحب کو پتہ بتا کر بالاخانے پہنچا تو حکیم بدھن گھڑے صراحیاں اور آبخورے لئے ہوئے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ کنجی میرے پاس تھی۔ ہم دونوں اوپر سامان رکھ ہی رہے تھے کہ ٹھیلے پر نواڑی پلنگ اور دریاں وغیرہ بھی آگئیں۔ حکیم بدھن نے ٹھیلے کے مزدوروں کی مدد سے کمرے میں دریاں اور چاندنیاں بچھوائیں۔ پلنگ دونوں جانب لگنے سے کمرہ خاصا بھلا معلوم ہونے لگا۔ مجھے پلنگ پر بٹھا کر حکیم بدھن نے کہا۔

"استاد اب صبح سویرے چائے خانے میں پھیرا کرتے ہوئے یہاں آجایا کرو"

میں نے کہا "اور خریداروں کا کیا ہوگا؟"

بولے۔ اس کا انتظام میں کروں گا۔ دن کے دس بجے تک میں خریداروں کے آرڈر لے آیا کروں گا"

میں نے کہا "اچھی بات ہے"

وہ بولے "ذرا میں اپنے خط کا جواب لے آؤں یہی وقت دیا ہے"

یہ کہہ کر حکیم بدھن چلے گئے۔ معاملہ کچھ دور کا نہیں تھا۔ کوئی پندرہ منٹ میں اکڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے میں سمجھ گیا کہ جواب لے آئے ہیں۔ میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے کر کھولا۔ لکھا تھا۔

میرے دل و جان کے مالک حکیم صاحب! تم نے غضب کر دیا کہ بھوتوں والا بالاخانہ کرائے پر لے لیا — مجھے ہول ہو رہی ہے۔ خدا نہ کرے تم پر کچھ ہو جائے لیکن دیکھو شام کو یہاں کبھی قیام نہ کرنا۔ دن بھر کوئی بات نہیں ہوتی ہے ابھوت حملہ نہیں کرتے۔ اب سنو!

ابا جانی صبح سات بجے اپنی گھڑی لے کر چوک چلے جاتے ہیں اور رات کو آٹھ بجے آتے ہیں۔ میری سوتیلی ماں بہری ہیں۔ جب تک کوئی چیخ چیخ کر نہ کہے وہ کچھ سنتی ہی نہیں ہیں۔ خدا کرے اور بہری ہوجائیں۔ میرے دونوں بھائی مٹرگشتے ہیں۔ ابوجانی کے جاتے ہی گھر سے گوشت ترکاری دے کر نکل جاتے ہیں۔ مارے مارے پھرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے نہیں ہیں۔ دوپہر میں آکر ابوجانی کو کھانا پہنچا کر خود کھانا کھا لیتے ہیں اور پھر دن بھر کے لئے غائب ہوجاتے ہیں۔ میری دو بہنیں برابر میں خالہ جان (ان کی خالہ) کے یہاں جا کر سینا پرونا سیکھتی رہتی ہیں اور وہاں کام کاج کرتی ہیں۔ شام کے وقت آتی ہیں۔ یہاں بالکل سناٹا رہتا ہے۔ میری تمہاری گفتگو سننے والا کوئی نہیں ہے۔ پردے کی دیوار ذرا اونچی ہے۔ میں اینٹیں جمع کرکے چبوترہ بنا رہی ہوں۔ دن کے دو بجے تک اگر چبوترہ بن گیا تو دیوار پر کھڑی ہوجاؤں گی"

تمہاری۔ پیاری بیگم۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ حکیم بدھن کا بُرا حال تھا۔ وقت گزاری کے لئے پریشان تھے۔ اتنے میں ان کا ملازم چائے کا اسٹو، پیالیاں اور چائے شکر لے کر آگیا۔ چائے کا دور شروع ہوگیا۔

حکیم بدھن رہ رہ کر گھڑی دیکھنے لگے۔ نوکر چائے بنا کر پلٹ کر نالے گیا اور وہاں سے کھانا لے کر تقریباً ایک بجے پلٹا۔ حکیم بدھن سے کھانا بھی صحیح طور پر کھایا نہیں گیا۔ میں تو مزے سے کھاتا رہا۔ کھانے کے دوران میں نے کہا۔

جناب حکیم صاحب قبلہ! کیا مرضِ عشق میں بھوک بھی اڑ جاتی ہے"

وہ جل کر بولے —

"جی نہیں مرضِ عشق میں آدمی اتنا کھاتا ہے جتنا ایک ہاتھی"

میں نے کہا "سبحان اللہ کیا تحقیق ہے"

وہ جل کر بولے۔

"یار ایک تو مجھ سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے دوسرے تم مجھے الگ جلا رہے ہو"

کھانا ختم ہوتے ہی نوکر کو روانہ کرنے کے بعد حکیم بدھن نے مجھ سے کہا۔

"یار تم کمرے میں چھپ جاؤ — کہیں تمہیں دیکھ کر وہ خفا نہ ہوجائیں"

میں لیٹے لیٹے کیا ہی تھا (؟) ... چہرہ دیوار پر ابھرا یقین مانئے بلا کا حسن تھا۔ عجیب کشش اور معصومیت تھی اس چہرے میں۔ حکیم بدھن کا دیکھتے ہی برا حال ہوگیا۔

میں دروازے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ یہ اتنی آہستہ ہو رہی تھی کہ سوائے کھسر پھسر کے میرے پلے کچھ پڑ نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی حکیم کی ملتجیانہ صدا سنائی دے جاتی تھی اور کبھی ساقہ کی دلبرانہ صدا۔ میں کوفت کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ خدا جانے کب تک گفتگو ہوتی رہی غالباً میں سو گیا تھا۔ حکیم بدھن نے مجھے جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا۔

"یار بہزاد میں تو اب بالکل ہی مر گیا"

میں نے کہا "بھیا کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ اچھے خاصے بحمد اللہ زندہ سلامت موجود ہو"

"یار مرنے سے میرا مقصد تھا بری طرح فریفتہ ہونا یار تم شاعر کہلاتے ہو۔ ایسا سادہ محاورہ سمجھ میں نہیں آتا"

حکیم بدھن مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

میں نے کہا "یہ محاورے بازی چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا بھگانے کا ارادہ ہے"

حکیم بدھن کا چہرہ ایک دم غصے سے لال ہوگیا اور بولے "کہیں شریف لوگ کسی کی بہو بیٹی کو بھگاتے ہیں جو میں بھگاؤں گا"

میں نے کہا — پھر ان ساقہ کے حصول کی کیا صورت ہوگی۔ تم تو دیکھ چکے ہو۔ آخر تمہیں چلانے کے لئے کوئی شکل نکلے گی یا نہیں؟ کیا پیام دلاؤگے ان کے والد کو!"

بولے "یار وہ بڑا ضدی آدمی ہے۔ بقول تمہارے زبان کا بھی پھوہڑ اور ہاتھ کا بھی خراب۔ وہ میرا خیال ہے مانے گا نہیں"

میں نے پوچھا "پھر!"

بولے "یار مجھے کوئی نسخہ لکھنا پڑے گا۔ نسخہ سمجھ میں آگیا ہے بتاؤں گا نہیں۔ میرے ساتھ چلو اب شام کو پانچ بجے سے پہلے وہ جلوہ نظر نہیں آنا ہے"

میں مکان میں قفل لگا کر حکیم بدھن کے ساتھ نکلا حکیم بدھن سیدھے نخاس پہونچے۔ سار ... اسکول کے سامنے کپڑے والوں کے ... تھے۔ حکیم بدھن نے ایک دوکان سے پانچ گز چھوٹ کا سرخ کپڑا خریدا اور

(باقی آئندہ)

ڈھائی گز جیسا اور تین گز کا بنارسی دوپٹہ۔

میں نے حیرت سے پوچھا: "یہ کپڑا کیا ہوگا؟"

وہ بولے: "دلہن کا سوٹ بنے گا۔"

میں نے پوچھا: "کس کی دلہن کا؟"

بولے: "حکیم بدھن کی دلہن۔" یہ کہہ کر ایک بے اختیار قہقہہ مارتے ہوئے بولے۔

"یار بہزاد تم بھی یوں ہی رہے۔ بھیا میرے نسخے کی تم نے ابھی چند ہی دوائیں دیکھی ہیں۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ اور بال سیدھے علی حسن درزی کے چلو آج سے پانچویں دن مجھے یہ جوڑا تیار ملنا چاہیئے۔"

میں کیا کہتا۔ عدیا گبھرن کی گلی میں علی حسن درزی کی دوکان پر کپڑے پہونچ گئے۔ منہ مانگی مزدوری طے ہو گئی۔ اب حکیم بدھن مجھے لئے ہوئے سیدھے قصائیوں کی مسجد گئے۔ میں حیران حیران ان کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ مسجد کے پیش امام ایک صوفی جی تھے۔ ان سے آج سے پانچویں دن ظہر و عصر کے درمیان نکاح پڑھنے کا وعدہ لے کر آگے بڑھے۔ اب ان کا رخ مخصوص خریداروں کے گھر کی طرف تھا۔

بھیا ندرت، جناب اختر، جناب تاباں، جناب تیر کے مکانوں پر دس دس منٹ ٹھہر کر ان سے وعدہ لیا کہ وہ آج سے پانچویں دن یعنی جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان بالاخانے پر پہونچ جائیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا اور میں نے کہا۔

"یار یہ کیا ترکیب کر رہے ہو؟"

بولے: "دیکھتے جاؤ۔ ابھی مجھ سے پوچھو نہیں۔"

وہاں سے سیدھے امین آباد کا رخ کیا۔ دیانہال پارک سے لب جھنڈے والا کے قریب نصیر الدین فوٹو گرافر کو بھی بالاخانے جمعرات کے دن بلا کر پلٹے اور ٹھیک پانچ بجے بالاخانے پہونچ گئے، جہاں جلوہ پہلے ہی سے منتظر تھا۔ مجھے کمرے میں دھکا دے کر پھر کھسر پسر شروع ہو گئی۔ میں تو یہ مطلع پڑھتا رہا۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

شام ہوتے ہی حکیم بدھن اور میں بالاخانے سے سیدھے چلے خانے پہنچ گئے۔ غریبوں کے آنگن پر چوں کی صورت ممد بنا صاحب نے دیئے۔ اب میرا کام شروع ہو گیا۔ میں نے تو بالاخانے جانے سے انکار کر دیا۔ حکیم بدھن صبح سے شام تک بالاخانے پر پڑے رہنے لگے لیکن پٹھے نے مجھے ذرہ برابر بھی کسی معاملہ کی بھنک تک نہ دی۔

جمعرات کے دن صبح سویرے ہی سویرے حکیم بدھن میرے گھر آ گئے اور مجھے لئے ہوئے سیدھے بالاخانے پہونچے۔ ناشتہ بالاخانے ہی پر تیار ہوا۔ حکیم بدھن نے خود اپنے ہاتھوں کا کمال دکھایا۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ مجھے لے کر زینے سے نیچے اترے۔ منو صاحب زرگر کے دروازہ پر شکرم کھڑی تھی اور منو صاحب ساٹن کی پھولدار شیروانی میں عجیب سے لگ رہے تھے۔ شکرم میں زنانی سواریوں کو چڑھا کر منو صاحب نے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ اور خود شکرم کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ میں نے کہا۔

"یہ کیا۔ کیا گھر میں کوئی نہیں رہا جو باہر سے مقفل کر گئے؟"

بولے: "نہیں۔ گھر میں وہ جان جہاں، دل آرام، مہ لقا، فتنہ انگیز، سراپا قیامت موجود ہے۔ خدا غارت کرے اسکو۔ ان کو منحوس سمجھ کر چھوڑ گیا ہے۔ یہ سارا گھر ایک شادی میں گیا ہے اور رات کو دس بجے پلٹے گا۔"

میں نے پوچھا: "کیا تم کو اس پروگرام کا پہلے ہی سے علم تھا؟"

وہ بولے۔ "ہاں مجھے انھوں نے پہلے بتا دیا تھا، اور دیکھو میں تو علی حسن کے ہاں سے جوڑا اور پھول والی گلی سے پھولوں کا گہنا لینے جا رہا ہوں۔ رمضانی (ملازم) ایک سیڑھی لے کر آئے گا تم اس کو لے کر اوپر ایک طرف رکھ دینا۔"

میں نے کہا: "استاد نقل اور چھوارے نہ بھولنا۔"

بولے: "واللہ خوب یاد دلایا۔ مجھے تو خیال بھی نہیں رہا تھا۔"

حکیم بدھن گلی کے نکڑ تک پہونچے ہوں گے کہ رمضانی ایک سیڑھی لئے ہوئے آیا۔ میں نے سیڑھی اس سے لے کر اسے رخصت کر دیا۔ میں نے جوں ہی سیڑھی ایک طرف رکھی کہ ایک آواز آئی۔

"اے حکیم صاحب!"

میں نے کہا: "حکیم صاحب کام سے گئے ہوئے ہیں۔ میں بہزاد بول رہا ہوں بلا ساشلہ!"

وہ بولیں: "آداب عرض ہے بھائی بہزاد۔ آپ کا اکثر وہ بہت ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میرا واحد دوست ہے۔"

میں نے کہا: "یہ ان کی بندہ نوازی ہے۔"

وہ بولیں: "اے بھائی! مجھے تو یقین نہیں آتا ہے جو کچھ حکیم صاحب نے مجھ سے کہا ہے اس پر۔"

میں نے کہا: "بھابی آپ خدا کے لئے یقین کر لیجئے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ جو کہتا ہے اسکو پورا کرتا ہے۔"

وہ بگڑتی ہوئی بولیں: "یہ آپ نے مجھے بھابی کیسے کہا بہزاد صاحب؟"

میں نے کہا: "اب نہیں تو تھوڑی دیر بعد مجھے اسکے کہنے کا حق ہو جائے گا۔"

وہ ٹھنک کر بولیں: "اے آپ مذاق کرتے ہیں۔ دیکھئے جیسے ہی وہ آ جائیں ذرا آپ زور زور سے رمضانی رمضانی پکاریئے گا۔ میں سمجھ جاؤں گی کہ وہ آ گئے ہیں۔"

کوئی گیارہ بجے حکیم بدھن لدے پھندے ہوئے پہونچے۔ کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرنے کے بعد بولے۔

"یار اب اس قیامت کو کیونکر بلاؤں؟"

میں نے کہا: "قیامت کو میں آواز دیئے دیتا ہوں۔" میں نے رمضانی رمضانی زور زور سے کئی بار پکارا۔ اتنے میں اوپر سے آواز آئی۔

"اے کیا آ گئے وہ بھائی بہزاد؟"

میں نے کہا: "جی ہاں!"

حکیم بدھن نے فوراً کہا: "بیگم میں سیڑھی ادھر لگا رہا ہوں۔ ادھر تم چبوترے پر کرسی رکھ کر آ جاؤ اور سیڑھی کے ذریعے ادھر اتر آؤ۔ میں بہزاد کو ہٹائے دے رہا ہوں۔"

آواز آئی: "اے ان سے کیا پردہ۔ میں تو انکو بھائی کہتی ہوں۔"

حکیم بدھن نے دیوار سے سیڑھی لگا دی اور وہ حکیم بدھن کی قیامت سیڑھی سے اترتے ہوئے ادھر آ گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ آپ یقین جانیے ایسا سڈول جسم

[illegible] نے کم رکھی تھی۔ کپڑے انتہائی بوسیدہ اور پرانے تھے۔ حکیم بدھن سے کہا۔

"بیگم کمرے میں جاکر پہلے جوڑا بدل لو۔ پھولوں کا گہنا پہن لو۔ کپڑے کے نیچے آئینہ۔ کنگھا، تیل کی شیشی اور عطر کی شیشی ایک دفتی کے ڈبے میں موجود ہے۔ ایک بجے میرے مہمان آجائیں گے۔"

یہ کہہ کر حکیم بدھن باہر چلے گئے اور ایک مزدور کے ذریعہ دو دریاں، دو چاندنیاں، اور ایک گاؤ تکیہ لے کر آگئے۔ ہم دونوں نے مل کر فرش کمرے کے آگے صحن میں بچھا لیا۔ تقریباً ایک بجے چاروں خریدار آگئے اور ان کے پیچھے ہی صوفی جی بھی تشریف لے آئے ان کے ہاتھ میں نکاح نامے کا روغنی کاغذ دبا ہوا تھا۔ صوفی جی کے بیٹھتے ہی حکیم بدھن بولے۔

"حضرات میں ایک نکاح کر رہا ہوں۔ جن مساۃ کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے وہ بالغ ہیں۔ عمر بیس اکیس سال کی ہوگی۔ ان کے والد مر چکے ہیں لہٰذا بھائی بہزاد کی وکالت اور بھیا ندرت اور تاباں کی گواہی میں یہ نکاح صوفی صاحب پڑھائیں گے۔ میرے ایجاب و قبول کے گواہ بھائی احقر اور نیر ہوں گے۔ ہاں بھائی بہزاد تم ندرت اور تاباں کو لے کر ایجاب و قبول کروالو۔"

مجھے کرنا ہی کیا تھا۔ کمرے کے درمیانی دروازے کے پاس جاکر میں نے کہا۔

"مساۃ پیاری بیگم۔ بنت منجھو صاحب، ہم نے آپکا نکاح سید مرتضیٰ حسین عرف حکیم بدھن ولد عالی جناب حکیم اولاد حسین سے بالعوض مہر چھ ہزار روپے سکہ رائج الوقت، کر دیا۔ آپ کو قبول ہے"؟

اندر سے آواز آئی۔

"مجھے قبول ہے۔"

تین بار ایجاب و قبول کے بعد صوفی جی کے پاس آیا۔ انھوں نے خطبۂ نکاح پڑھنے کے بعد حکیم بدھن سے کہا۔

"سید مرتضیٰ حسین عرف حکیم بدھن ولد جناب حکیم اولاد حسین صاحب۔ ہم نے آپ کا نکاح نامہ مساۃ پیاری بیگم بنت جناب منجھو صاحب کے ساتھ بالعوض مہر چھ ہزار روپے سکہ رائج الوقت کر دیا۔ آپ نے قبول کیا؟"

حکیم بدھن کے تین بار اقرار کے بعد دعا ہوئی۔ میں نے چھوارے لٹا دیئے۔ اس کے فوراً بعد ہی ایک گروپ فوٹو نصیر الدین فوٹو گرافر نے کھینچا جس میں درمیان میں دولہا دلہن اور اِدھر اُدھر ایک گواہ اور دو وکیل تھے۔ فوٹو کے بعد سب نے حکیم بدھن کو بڑھ بڑھ کر مبارکباد دی اور رخصت ہو گئے۔ چلتے وقت حکیم بدھن نے صوفی جی کو کیا نذر کیا مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ پھر ان سب کے جاتے ہی حکیم بدھن نے کہا۔

"بھیا کسی مزدور پر یہ دریاں، چاندنیاں اور گاؤ تکیے تم چھمو صاحب کی دوکان پر پہنچا دو اور چائے خانے چلے جاؤ۔ ٹھیک پانچ بجے پہونچ لینا۔"

میں چلا گیا۔ شام کے پانچ بجے جب میں پلٹ کر یہاں آیا تو بھابی سیڑھی پر چڑھ کر اپنے گھر میں اتر رہی تھیں اور انھوں نے اپنے پرانے کپڑے پھر پہن لئے تھے۔

میں نے انکے جانے کے بعد کہا۔

"بھیا مبارک ہو تمہارا داغِ یتیمی دھل گیا۔" وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولے۔

"استاد زندگی میں ایک جملہ تم نے شاعرانہ بولا ہے۔ ورنہ جیسے تم سوکھے سہمے شاعرانہ مزاج کے آدمی ہو وہ میں ہی جانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "خیر اپنی دریافت تو اپنے پاس ہی رکھو اس یک روزی نکاح سے کیا فائدہ ہوگا تم کو۔ ؟ کیا یہ دیوار بازی ہر روز رہے گی۔"

وہ بولے۔ "تم دیکھتے جاؤ۔ میں اپنی اسکیم قبل از وقت کبھی ظاہر نہیں کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بہتر ہے، اپنی اسکیم کو اپنے قلب مبارک کے گوشے ہی میں محفوظ رہنے دو۔"

ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ عام طور پر چودہ دوپہر حکیم بدھن زیر سایہ دیوار ایستادہ رہتے۔ اور انکی زوجہ محترمہ بالائے دیوار ایستادہ رہتیں۔ کھسر پھسر ہوا کرتی اور یوں دن تمام ہو جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حکیم بدھن اپنا گھر بسائیں گے کیونکہ بھابی کے والد منجھو صاحب ذکر بلا کے بدزبان، ہتھ چھٹ اور بلانے بے دربال قسم کے آدمی تھے۔ حکیم بدھن کو بھی میں نے اس تمام ہفتے فکرمند ہی دیکھا۔ چائے خانے میں وہ کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن مجھ سے بولے۔

"کل صبح تم بانکے مہتاب کے گھر چلے جانا۔ وہ تم کو منجھو صاحب کے گھر لیجائیں گے۔ تم اپنے ساتھ نکاح کا گروپ فوٹو اور نکاح نامہ لیتے جانا۔"

میں نے کہا "استاد مجھے کیوں گالیاں کھلوانے کا ارادہ کر رہے ہو۔ منجھو کم از کم مجھے بخشنے والا نہیں ہے۔"

وہ بولے۔ "استاد تم مجھ پر اعتماد کرو۔ انشاء اللہ تم کامیاب ہی پلٹو گے۔ تم کو صرف اتنا معلوم ہے کہ بانکے مہتاب علی فیکٹری کے مستقل گاہک ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ تمہاری بھاوج پیاری بیگم کے سگے نانا ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں چلا جاؤں گا۔"

صبح بجائے فیکٹری جانے کے میں سیدھا بانکے مہتاب علی صاحب کے ہاں پہنچا۔ لکھنؤ میں اس دور میں یہی ایک بانکے باقی رہ گئے تھے جن کی دھونس ہر شخص مانتا تھا۔ حالانکہ آج تک بانکے مہتاب علی نے کوئی شورہ پشتی، کوئی دھن دھونکڑی کہیں نہیں کی تھی۔ شاعر تھے اور لٹھ مار شاعر۔ وہ گھر پر میرے منتظر تھے۔ ساٹن کی پھولدار شیروانی، اسی کپڑے کی دو پلی ٹوپی اور چوڑی دار پائجامے میں ان کا بھاری بھرکم جسم بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا روغنی ڈنڈا تھا جس پر چاندی کی شام چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"آؤ بھیا بہزاد میں تمہارا ہی منتظر تھا۔ آج پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ اس بدمعاش منجھو کے ہاں چل رہا ہوں۔ میں زندگی میں کبھی نہ جاتا۔ لیکن حکیم بدھن نے مجھے مجبور کر دیا۔"

میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ گلیوں گلیوں کوئی پندرہ منٹ میں منجھو صاحب کا مکان آگیا۔ برابر کا بالاخانہ بند تھا۔ غالباً حکیم بدھن نہیں آئے تھے۔ ان کی آواز پر دروازہ کھلا اور منجھو صاحب کا چہرہ بانکے مہتاب علی کو دیکھتے ہی اتر گیا۔ وہ گھبرا سے گئے اور بولے۔

"حضور نے بڑا کرم فرمایا۔ میں ابھی بیٹھک کھولتا ہوں۔"

کوئی دو منٹ کے بعد بیٹھک کھل گئی۔ [illegible]

پلنگ اور تیمی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں ایک کرسی پر بانکے مہتاب علی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"منجھو! میں زندگی میں پہلی بار تمہارے یہاں آیا ہوں اس مرتبہ مجھ سے ہوش میں رہ کر گفتگو کرنا۔ میں انسان کو انسان بنانا جانتا ہوں۔"

منجھو صاحب نے کہا۔

"آپ میرے بزرگ ہیں میری کیا مجال کہ آپ کے سامنے گردن بھی اٹھا سکوں۔ انشاء اللہ جو کچھ ارشاد ہوگا اس کی تعمیل ہوگی۔"

وہ بولے۔ "اور اگر نہ ہوگی تو آج یہ ڈنڈا ہوگا اور دوسرے کا سر۔"

منجھو صاحب کے چہرے پر بھی غصے کے آثار رونما ہوئے لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"ارشاد۔"!

بانکے نے کہا۔ "تم میرے زبردستی کے داماد ہو۔ میں نے خوشی سے تم کو اپنی بیٹی نہیں دی تھی۔"

منجھو صاحب نے دبی زبان سے کہا۔

"حضور وہ بات تو پرانی ہو چکی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "تمہارے لئے پرانی ہوگی میرے لئے وہ ہمیشہ ہی نئی رہے گی۔ تم کو معلوم ہے کہ میرے خاندان میں بھی بیوہ کا دوسرا عقد جائز نہیں ہوتا۔ وہ تا زندگی میکے یا سسرال میں شوہر کے نام پر بیٹھی رہتی ہے۔"

منجھو بولے۔ "جی ہاں میرے خاندان کی بھی یہی آن ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "میرے پہلے داماد کے انتقال کے بعد میری اکلوتی بیٹی جانی بیگم گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ کل دو سال ہی گزرے تھے کہ تم نے خدا جانے کیونکر اس کو دیکھ لیا اور اس کی خالہ کے ذریعے سے اس کو ہموار کیا اور اس کی خالہ کے گھر پر بغیر میری اطلاع کے تم نے میری بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔"

منجھو صاحب نے کہا۔ "حضور یہ پرانی باتیں آپ کیوں دہرا رہے ہیں۔ ان بے چاری کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔ اس گفتگو سے ان کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔"

بانکے نے کہا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو سنتے جاؤ۔ اور یاد رکھو جو بیاہ کرتا ہے اس دنیا میں اس کو ویسا ہی پھل ملتا ہے۔ بالکل ویسا ہی۔"

منجھو نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

بانکے نے کہا۔ "سمجھ جاؤ گے۔ میری مرحوم بیٹی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام پیاری بیگم ہے۔ جو میری نواسی ہے۔ میرا خون ہے۔ میری مرحوم بیٹی کی نشانی ہے۔"

منجھو بولے۔ "بحمداللہ موجود ہیں۔ میں پردہ کرائے دیتا ہوں۔ حضور مل لیں۔"

وہ بولے۔ "مل لوں گا۔ جلدی نہیں ہے۔ سنتے جاؤ میرے سننے میں آیا ہے کہ تم نے اس کا ایک نکاح کیا اور وہ بارات کے دن ہی بیوہ ہو گئی۔ پھر اپنی خاندانی آن توڑ کر تم نے اس کا دوسرا نکاح کیا۔ اور وہ بھی دو گھنٹوں کے بعد طلاق پر تمام ہو گیا۔"

منجھو بولے۔ "جی ہاں۔ بدنصیب لڑکی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "اس کے بعد میری نواسی میری اکلوتی بچی کی واحد نشانی، تمہارے ہاں منحوس قرار دے کر ایک کمرے میں قید تنہائی کی زندگی گزار رہی ہے۔ تم اس کو جوٹھا کھانا اور پہنے ہوئے کپڑے دیتے ہو۔ اس سے کوئی بات کرنے کا روادار نہیں ہے۔ اس کا تم کو کیا حق ہے۔"!

منجھو بولے۔

"جناب والا۔ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ اس کو سب کے سب ہی منحوس خیال کرتے ہیں۔ خاندان بھر میں کوئی اس کی پرچھائیں کا بھی روادار نہیں ہے۔ میں سب کے دل کیونکر بدل سکتا ہوں۔"

بانکے نے کہا۔ "اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب سنو! تم اس کا نکاح کرنے پر تیار ہو یا نہیں۔"

منجھو صاحب نے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

بانکے نے کہا۔ "بہتر ہے۔ جس طرح اس کی ماں نے بغیر اپنے باپ کی مرضی کے تمہارے ساتھ خود نکاح کر لیا تھا اسی طرح اگر پیاری بیگم کرے تو تم کو کوئی عذر ہوگا۔"؟

وہ بولے۔ "جناب والا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔"

بانکے نے کہا۔ "اور اگر ایسا ہو گیا ہو تو۔"؟

منجھو کے چہرے پر فیظ کے آثار جھلکنے لگے اور بولے

"ایسا ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو گیا ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "جس طرح میں نے اپنی لڑکی کے معاملے میں تمہارے ساتھ کوئی فساد نہیں کیا۔ تم کو بھی اپنی لڑکی کے معاملے میں ایسا ہی کرنا ہوگا۔"

وہ بولے۔ "جناب آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "تو سنو! تمہاری لڑکی یعنی میری نواسی پیاری بیگم نے اپنا عقد خود حکیم بدھن کے ساتھ کر لیا ہے۔" اب تم کیا کہتے ہو۔؟

منجھو نے غصے میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "نکاح کر لیا ہے، حکیم بدھن کے ساتھ۔ اس کا ثبوت دیجئے مجھے کوئی عذر نہیں۔ زبانی باتوں کا میں قائل نہیں ہوں۔ رہے حکیم بدھن۔ ان کو میں خوب جانتا ہوں۔ گو صاحب سلامت نہیں ہے، آدمی اچھے اکھاڑ اور خاندانی ہیں۔"

بانکے مہتاب علی نے جو سے نکاح نامہ لے کر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کو پڑھو!" منجھو صاحب نے اس نکاح نامے کو پڑھنے کے بعد کہا۔

معاف فرمائیے گا۔ اس قسم کے نکاح نامے جتنے آپ کہیے میں آپ کو بنا کر دکھا دوں۔ گواہ یقیناً سب کے سب شریف ہیں، معتبر ہیں، قاضی بھی معتبر ہیں، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ پیاری بیگم بنت منجھو صاحب کسی اور عورت کا نام نہیں ہو سکتا، میری ہی بیٹی کا نام ہے۔ قاضی اور گواہ صرف نام سنتے ہیں صورت نہیں دیکھتے۔"!

بانکے مہتاب علی نے مجھ سے مانگ کر گروپ فوٹو کو سامنے رکھا اور کہا۔

"اب اس تصویر میں دیکھ لو۔ دلہن میری نواسی، اور میری بیٹی پیاری بیگم ہی ہے یا کوئی اور ہے۔"

گروپ فوٹو دیکھ کر منجھو صاحب کا چہرہ اتر گیا اور وہ بولے۔

"بے شک یہ تصویر اس نامشدنی ہی کی ہے۔ لیکن یہ نکاح کیونکر ہوا۔ کب ہوا۔ کس جگہ ہوا۔ جب کہ پیاری بیگم ایک

باقی صفحہ پر

[illegible] ہوا۔ بھلا یہ نکاح جس [illegible] بیگم جس طرح بھی ہاں کر گئی۔ [illegible] ہوکہ دیکھ میری بیٹی نے نکاح کر لیا تھا میری بے اتفاقی ان کو صدمہ پہونچایا تھا میرے قلب کو دکھ دیا تھا۔ وہی صورت تمہارے سامنے آرہی ہے منجھو اس دنیا میں جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی پھل اس کو ملتا ہے۔ جس طرح میں نے صبر کیا اسی طرح تم بھی صبر کرو میں اس کا نانا اسے لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ کر دو میں اس کے شوہر کے گھر اسے پہونچا دوں۔"

منجھو صاحب نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

"بہتر ہے ڈولی بلوا لیجئے، میں اس ناشدنی کو آپ کے حوالے کر دوں۔ لیکن اس سے کہہ دیجئے کہ وہ اس گھر سے اب ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے۔"

بانکے نے کہا۔ "میں نے بھی اپنی بیٹی یعنی تمہاری بیوی سے یہی الفاظ کہلوائے تھے۔ بالکل یہی الفاظ۔"

ڈولی منٹوں میں آ گئی۔ اور بانکے مہتاب علی اپنی نواسی کو لئے ہوئے سیدھے حکیم بدھن کے گھر پاٹے نالے پہونچ لئے۔

"یوں حکیم بدھن صیاد بروزن بہزاد نے اپنا گھر بسایا۔"

بقیہ:- مرغی پر جھگڑا

نہ جانے انھوں نے کچھ دیکھا یا نہیں مگر مجھے تو وہ سب نظر آگیا جو آج تک کبھی نہ دیکھا تھا اور اگر ذرا سی کوشش کرتا تو شاید جنت یا دوزخ بھی دیکھ لیتا۔ آخر میں صرف اتنا ہو سکا کہ کچھ لوگ مجھے ایک رکشے پر سوار کرا رہے ہیں۔ قسطوار سے آدمی میرا سر رکشے پر رکھتا ہے تو کوئی دوسرا پاؤں ادھر۔

جب ہوش میں آنے پر میں نے اپنی ایک آنکھ کھولی چونکہ دوسری پر پٹی بندھی تھی، تو دیکھا میرے سرہانے بیٹھی مری بیوی آنسو بہا رہی ہے۔ میں نے غور کیا کہ ایک زبان ہی ایسا عضو رہ گیا ہے جسے میں اپنی مرضی کے مطابق ہلا سکتا تھا میں اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لئے اپنی بیوی پر [illegible]۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ خواہ مخواہ اتنی چھوٹی سی بات پر انجینئر صاحب ..."

میرا مطلب سمجھتے ہوئے اس نے کہا "ٹھیک کہتے ہیں آپ ہم نے بیکار کا جھگڑا مول لیا اور پھر وہ مرغی بھی آج مر گئی ہے۔"

"مر گئی کمبخت؟ چلو اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ میں اب ان سے معافی مانگ لوں گا۔"

سامنے سے انجینئر صاحب وارڈ میں داخل ہوئے میرے قریب پہنچ کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے معذرت خواہ لہجے میں کہا۔ معاف کر دیجئے مجھے۔ دراصل غلطی میری ہی تھی یعنی سراسر زیادتی تھی۔"

نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل بات یہ ہے میں ذرا اس لئے حاضر ہوا تھا کہ دفتر میں مجھ پر چارج شیٹ لگا ہے۔ آپ میرا ایک کام کر دیجئے۔ ذرا جلدی سے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اور میرا ریڈیو سیٹ میری موٹر سائیکل سب آپ کے بغیر....."

"سب ٹھیک ہو جائے گا گھبرانے کی بات نہیں۔"

اس طرح دو شریف آدمیوں میں پھر میل ہو گیا۔

بقیہ:- قطرہ اور سمندر

بجز یہ اس میں بالکل گھل مل گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی جس میں اس کی تمام نقدی پونجی کا باقی ماندہ حصہ موجود تھا۔ اس نے وہ تھیلی چندے کی صندوقچی میں ڈال دی۔

اب وہ کمرے میں دروازہ بند کر کے عالم مایوسی میں موت کا انتظار نہیں کرے گا۔ اب وہ محنت کرے گا جینے کے لئے اور اپنا کردار ادا کرنے کے لئے۔ اب وہ محبت کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوگا۔

وہ بھی ایک ننھا سا کبوتر تھا جو ہلاک ہونے ہی کو تھا اور جسے اب نئے سرے سے زندگی مل چکی تھی۔

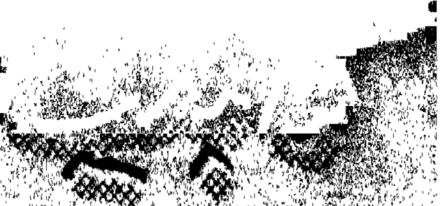
جلوس کے نعروں اور گیتوں میں اب اس کی آواز بھی شامل تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی عظیم خانوادۂ بشریت کا ایک فرد ہے۔ ایک جزو ہے۔

اور قطرہ سمندر میں مل کر بے کراں ہو گیا تھا۔



چلو اے برف سی ٹھنڈی ہواؤ

چلو اے برف سی ٹھنڈی ہواؤ
تم اتنی سنگدل ہرگز نہیں ہو
کہ جتنا وہ جو مطلب پورا کر کے
کسی سے واسطہ بالکل نہ رکھے
تمہارے سرد دانتوں میں بھی آتی
نہ زہریلی چبھن ہے اور نہ تیزی
سبب یہ ہے نظر آتی نہیں ہو
ہوا کرتی ہو تم تکلیف دہ گو
تنا بو تن تنا بو تن تنا بو
اٹھو مل کر خوشی کے گیت گاؤ
دغا اور دوستی ہے دھوکے بازی
محبت اور الفت بے وقعتی
تنا بو تن تنا بو تن تنی ہے
مسرت ہی مسرت زندگی ہے
فضا اے آسمان ٹھنڈک سی بھر کے
تو اتنا قابلِ نفرت نہیں ہے
کہ جتنا کوئی ایسا شخص جس نے
بھلا ڈالے ہوں سب احسان کسی کے
جلا دیتا ہے گو ندیوں کے سینے
تو اتنا سرد بھی لیکن نہیں ہے
کہ جتنا کوئی ایسا دوست جس نے
دیے ہوں توڑ سارے رشتے ناطے
تنا بو تن تنا بو تن تنا بو
اٹھو مل کر خوشی کے گیت گاؤ



...ماؤں بہارِت ہوں وہ محرومِ نظر ہوں میں
...دوری بجھا ہوا وہ چراغِ رہگزر ہوں میں
مجھے گھیرے ہوئے ہے ہر طرف بادل اندھیرے کا
نظر آتا نہیں، ہاں نام سنتا ہوں سویرے کا

...نور و ظلمت الگ سے میں نے پائی ہے
...پہلے چاند تھا اب میرا گھر تاریک گھاٹی ہے
مگر پھر بھی غنیمت ہے، نشیبِ زندگی اپنا
کہ رستہ پتھروں میں ڈھونڈ لیتی ہے ندی اپنا

...جب شمعِ تصورِ زینتِ فانوس کرتا ہوں
...آنچل کی ہوا سے رنگ تک محسوس کرتا ہوں
دکھا دیتی ہے رنگِ گلستاں پھولوں کی بو مجھ کو
بتا دیتی ہے بن، دوشیزگی کی گفتگو، مجھ کو

...صور میں، زمینِ رقص خود ہموار ہوتی ہے
...میں سر دھنتا ہوں جب پازیب کی جھنکار ہوتی ہے
جوانی جلوہ گر پاتا ہوں، خوشبو میں پسینے کی
میں چھو کر دیکھ سکتا ہوں نزاکت آبگینے کی

...نقابِ رُخ اُلٹ کر جلوۂ بیتاب دیکھا ہے
...کھلی تھیں اپنی آنکھیں میں نے جب یہ خواب دیکھا ہے
پلک پر کس طرح تنتے ہیں لمحے، جانتا ہوں میں
گھڑی کیا ہے؟ گھڑی کی نبض تک پہچانتا ہوں میں

...کسی کے دل کی بات آئی ہوئی خوشبو سے کہہ دوں گا
...سحر کی اوس ہے، یا شام کی ہیں چھو کے کہہ دوں گا
تنفس کی حرارت، صبح کا پیغام دیتی ہے
مرے ناخن کی خنکی، خود نویدِ شام دیتی ہے

...ہوائے ہی مجھے ... احساس ہوتا ہے
...مرے ہی پاس ہوتا ہے
...سے ... ہے محبت ہے
...کی جگہ آنکھوں میں اب ... ہے
...

FEBRUARY 1971
(SECOND HALF)

WAQIAT

TELEPHONE





"کیا جوتا پھینکنے والے صاحب مہربانی کرکے دوسرا جوتا بھی پھینکیں گے؟"



نکسلائٹ! ڈاکٹر پہلے مجھے دیکھ لو۔ میں نے ایک دستی بم نگل لیا ہے۔



تمہارا دوست جانسن؟ اُف وہ کس قدر لذیذ تھا۔!

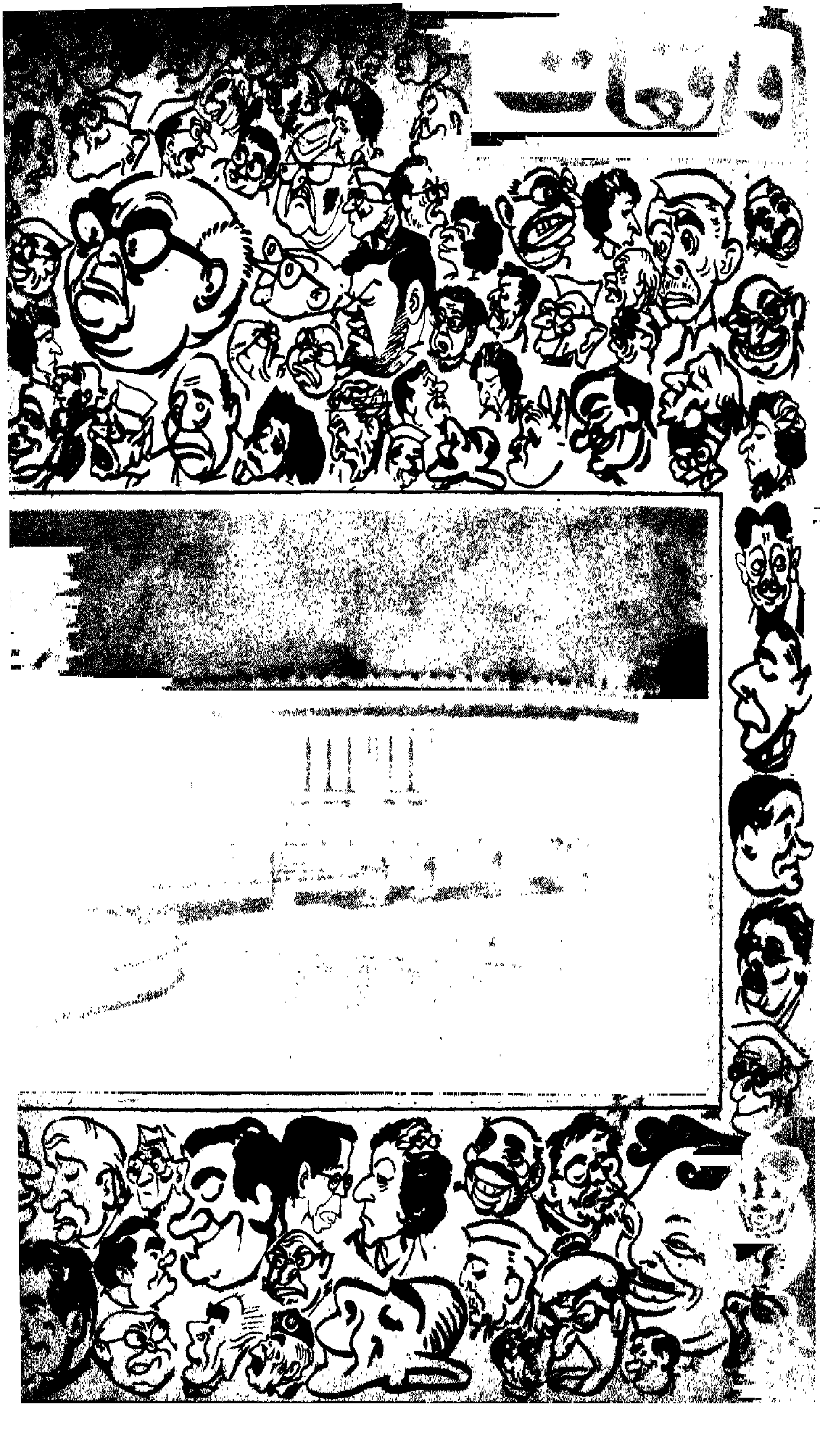


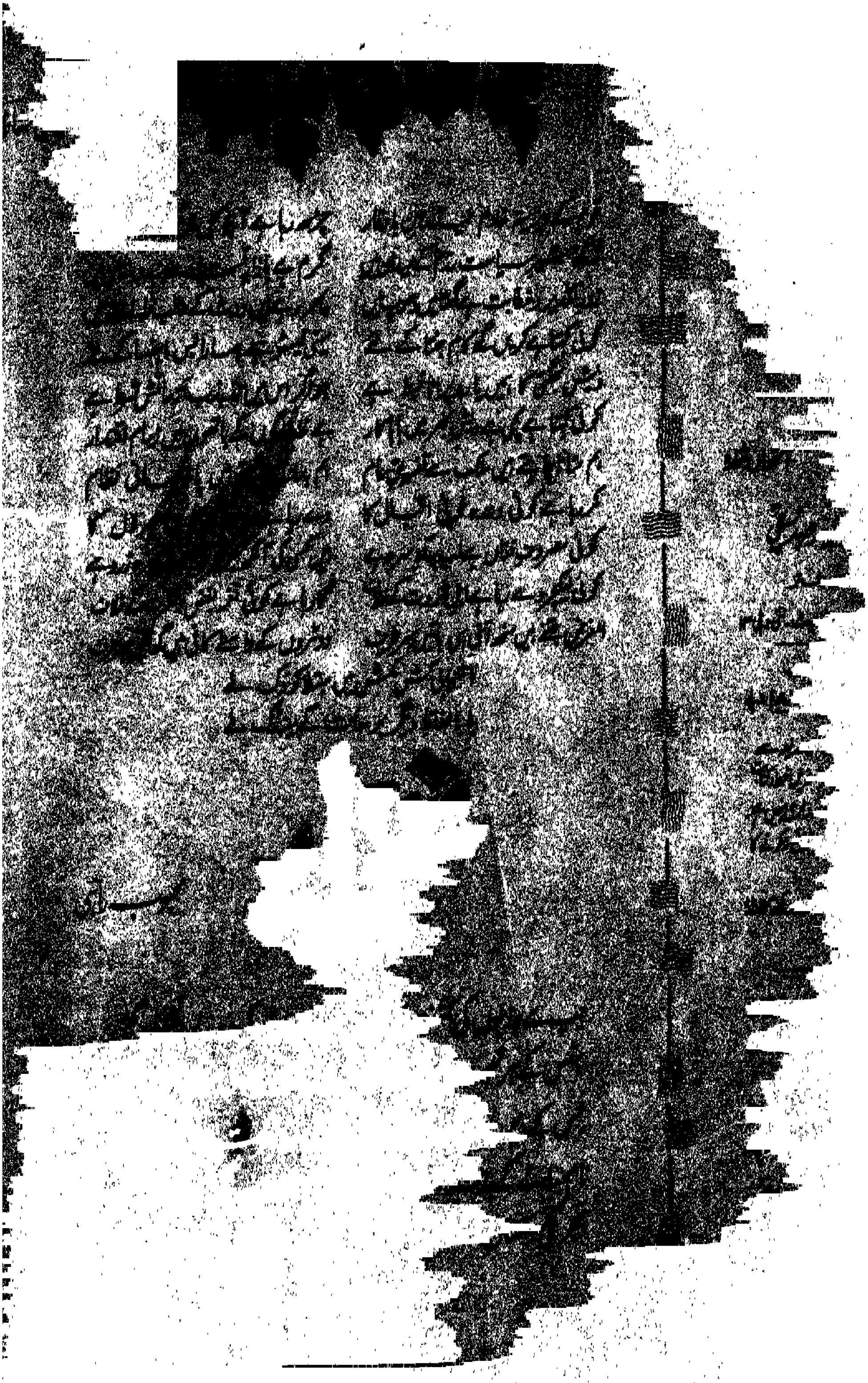
ارے یہ کون کم بخت!
پردہ پکڑ کے آگے
کھڑا ہو گیا؟



ارے یار میرے تو مزے
ہو گئے۔ اس سال بھی

واقعات





عوام کی نظر میں

نئی حکومت پر

لوک سبھا کے عام انتخابات ختم ہو چکے ہیں اور اگر چند ریاستوں میں باقی ہیں تو وہ دس مارچ تک ختم ہو جائیں گے اور پھر سب کی توجہ وزارت سازی کی طرف منعطف ہوگی۔ عام ووٹروں نے نئی کانگریس کے حق میں جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ زمام اقتدار ایک مرتبہ پھر اسی جماعت کو سونپی جائے گی اور مسز گاندھی جن کا کانگریس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے انتخاب یقینی ہے، نئی طاقت اور نئے اختیارات کے ساتھ اپنی نئی حکومت بنا سکیں گی۔

دراصل نئی کانگریس کی اس کامیابی کا تمام تر سہرا مسز گاندھی کے سر ہے جنہوں نے سوشلزم کے اپنے پیغام کے ذریعے پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک نئی روح پھونک دی۔ ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس طرح بہت بڑی اکثریت کی حمایت حاصل کر لیں۔

اس کے مقابلے میں رجعت پسند فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ سنڈیکیٹ کانگریس کا گٹھ جوڑ خود اس کی اپنی کمزوری کا باعث بن گیا۔ اجلاس لکھنؤ میں جب مسٹر مرار جی ڈیسائی نے فرقہ پرستوں اور سرمایہ پرستوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے حق میں تجویز پیش کی تھی تو یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ اس قسم کا گٹھ جوڑ ان کی مزید کمزوری کا باعث ہوگا۔ شاید انہوں نے گٹھ جوڑ کا فیصلہ کرتے وقت محض اکثریتی فرقے کی خوشنودی کو سامنے رکھا اور اقلیتی فرقوں کے حقوق اور ان کے تحفظات کو یکسر بھلا دیا گئے۔ نتیجہ وہ ملک کی ایک بڑی اقلیت کی حمایت سے محروم ہو گئے جس کا ... عام ہے۔

ہندوستان اس وقت ملک کی نظریں نئی حکومت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی حکومت برسر اقتدار آئے عوام بجا طور پر اس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی ترقی کے لئے ٹھوس اور مثبت اقدام کرے گی۔ کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس نے لمبے چوڑے وعدے نہ کئے ہوں۔ لیکن اب عوام محض وعدوں پر نہیں جی سکتے۔ وہ اب ہر جماعت کا عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ووٹنگ میں انہوں نے اسی بات کو پیش نظر رکھا ہے۔ جمہوری شعور کی یہ بیداری ایک خوش آئند بیداری ہے اس سے جمہوریت مضبوط ہوگی۔

مسز گاندھی کی مقبولیت اور نئی کانگریس کی اہمیت اگر پچھلے دنوں میں بڑھی ہے تو اس کا سبب وہ عملی اقدامات ہی ہیں جو قومی معیشت کے سلسلے میں اندرا سرکار نے کئے ہیں۔ سابق حکمرانوں کے پریوی پرسوں کو ختم کرنے سے متعلق اقدام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا جو بدقسمتی سے رجعت پسندوں اور سرمایہ پرستوں کی پیدا کردہ رکاوٹوں کے باعث نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ جس پر قدرتی طور سے باہمی کشمکش شروع ہوئی اور نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو سکے اور ایسی حکومت کا قیام عمل میں آ سکے جو عوام کی حقیقی نمائندہ ہو۔

اگر عوام ایک رجعت پسند اور سرمایہ نواز حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو قائم کریں انہیں اس سے کون روک سکتا ہے لیکن آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حکمراں کانگریس ہی اپنی نئی حکومت قائم کرے گی اور اس مرتبہ زیادہ طاقت اور زیادہ اختیارات کے ساتھ حکومت بنائے گی جس سے کہ وہ اپنی سوشلسٹ پالیسیوں کو بآسانی بروئے کار لا سکے۔ اور اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدامات کر سکے۔

اس وقت حقیقت یہ ہے کہ ملک میں اقتصادی اور معاشی مسائل کو اولیت حاصل ہے اور تمام سیاسی اور دوسرے مسائل پس پشت جا پڑے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بنگال تک میں جہاں تشدد اور قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے عوام کی بے چینی کا اصل سبب معاشی مسائل ہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری، گرانی، اچھے رہائشی مکانات کی قلت اور اسی قسم کے دوسرے مسائل ہیں جن کی وجہ سے تخریب پسندوں کو اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع مل گیا اور بنگال کا امن خطرے میں پڑ گیا۔ ایسی ہی بے چینی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی موجود ہے اگر بڑھنے دیا گیا تو بنگال کی طرح وہاں بھی خطرناک نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یہ نئی حکومت کا کام ہوگا کہ عوام کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ دی جائے تاکہ معاشی بے چینی کو دور کیا جا سکے۔

عوام اب ایسی حکومت کے متمنی ہیں جو ان کے معاشی مسائل حل کر سکے اور ان کی وہ مشکلات دور ہو سکیں جو آج ملک کی کمر توڑ گرانی کی بنا پر انہیں پیش آ رہی ہیں۔

نئی حکومت اور نئی پارلیمنٹ کو جن اہم معاشی مسائل پر توجہ دینا ہوگی ان میں سے چند یہ ہو سکتے ہیں۔

1. روزگار کے زیادہ مواقع مہیا کر کے عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانا۔
2. ضروری اشیاء کی قیمتوں کو مستحکم کر کے آمدنی میں اضافہ کرنا
3. تعلیم کی بہتر سہولتیں مہیا کرنا۔
4. زیادہ سے زیادہ رہائشی مکانات کا انتظام کرنا۔
5. علاج معالجہ کی زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ضروری قدم اٹھانا۔

نئی کانگریس نے ان تمام سہولتوں کے لئے وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ مسز گاندھی کی سربراہی میں ان مقاصد کے حصول کے لئے عملی اقدامات بھی کئے ہیں۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہئے کہ ایک مستحکم حکومت بنانے کی صورت میں وہ اور زیادہ بہتر اقدامات کر سکے گی اور اقتصادی اور معاشی نابرابری کو جو آج مختلف طبقوں میں پائی جاتی ہے ختم کرنا اپنا بنیادی مقصد بنا لے گی۔

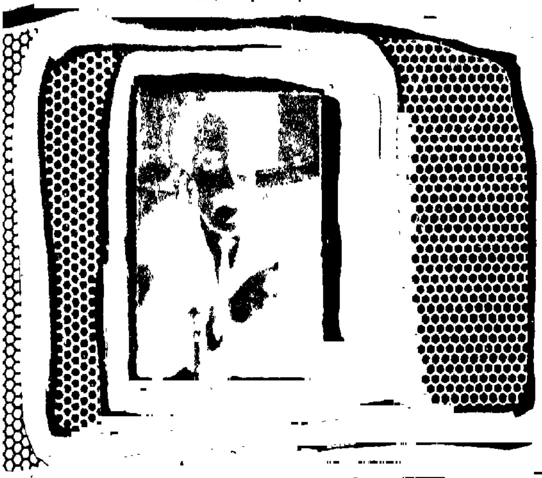
ان ہی مسائل کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مسائل بھی ہیں جنہیں صرف معاشی و اقتصادی نابرابری ہی کی شکایت نہیں بلکہ یہ بھی شکایت ہے کہ ان کی تعلیمی اور ثقافتی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اب جبکہ اقلیتوں اور خصوصاً مسلم اقلیت نے مسز اندرا گاندھی اور نئی کانگریس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے، انہیں یقین ہے کہ نئی کانگریس ان وعدوں کو پورا کرے گی جو اس نے الیکشن مینی فیسٹو میں کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو کے بارے میں یقین دلایا گیا ہے کہ اردو کو اس کا وہ جائز مقام دلایا جائے گا جسے وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکی ہے۔

جائز مقام کیا ہے؟ اس کی وضاحت کی جانی چاہئے

باقی صفحہ پر

اسرائیل ابتک ماضی کی دنیا میں ہے۔ یہ ۱۹۶۷ء نہیں ۱۹۷۱ء ہے

صدر انور سادات سے انٹرویو



مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے بارے میں اسرائیل اور عربوں کے موقف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسرائیل سمجھتا ہے اس نے عربوں کو شکست دی ہے اس لئے اسے اپنی مرضی کے مطابق شرائط پیش کرنے کا حق ہے جب کہ عربوں کا کہنا ہے کہ انھیں صرف ایک معرکے میں شکست ہوئی ہے لیکن وہ جنگ نہیں ہارے ہیں۔ یہ بات صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور سادات نے حال ہی میں نیوز ویک کے سینیر ایڈیٹر مسٹر آرنوڈ ڈی بورچ گریو سے کہی۔

نیوز ویک ایک امریکی میگزین ہے اور اس پر یہودی سرمائے کا غلبہ ہے۔ انور سادات نے کہا کہ۔

"چونکہ اسرائیل کا بنیادی موقف غلط ہے اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بھی غلط ہے"

مسٹر آرنوڈ نے مسٹر سادات سے جو سوالات کئے اور انھوں نے ان کے جو جوابات دیئے وہ حسب ذیل ہیں۔

سوال۔ تب نیا بنیادی موقف کیا ہونا چاہیئے۔؟

جواب۔ اگر وہ امن چاہتے ہیں تو ہم بھی امن کے خواہاں ہیں لیکن کیا ایسی صورت میں امن قائم ہو سکتا ہے جب کہ ایک فریق دوسرے فریق کے علاقے پر قابض رہے۔ امن صرف انصاف کی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے۔

سوال۔ مسز مائر (وزیر اعظم اسرائیل) دوسرے امور پر بات چیت کرنے سے قبل نہر سوئز کو پھر سے کھولنے کے بارے میں کسی بھی تجویز پر بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ لیکن وہ نہر سوئز کے علاقے میں شہری زندگی کو معمول پر لانے پر زور دیتی ہے اور کہتی ہے کہ جنگی تیاریاں کم ہونی چاہئیں۔ کیا یہ ایسی تجویز نہیں ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔؟

جواب۔ وہ حالت کو معمول پر لانے کی بات تو کرتی ہیں لیکن انہیں ہمارے اپنے ملک کے شہریوں کے بارے میں بولنے کا کیا حق ہے۔ کیا امریکا دریائے مسی سپی کے علاقے میں حالات کو معمول پر لانے کے متعلق کسی غیر ملکی طاقت سے بات چیت کرے گا۔ نہر سوئز مصریوں کی ہے اور اسرائیلی اسٹیٹ کے قیام سے بہت قبل اس کی تعمیر عمل میں آچکی تھی۔ یہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے۔

سوال۔ کیا آپ کی تجویز میں اسرائیلی جہازوں کی آزادانہ آمد و رفت کی اجازت دی گئی ہے۔؟

جواب۔ جی ہاں۔ مسٹر یارنگ کو ہماری طرف سے جو میمورنڈم پیش کیا گیا ہے اس میں ہم نے اس پر اظہار رضامندی کیا ہے لیکن اس سے قبل اسرائیل کو اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت اپنی تمام ذمے داریاں پوری کرنا ہوں گی۔

سوال۔ اسرائیل کہتے ہیں کہ امن کے بغیر وہ قبضہ نہیں چھوڑیں گے، اور آپ کہتے ہیں کہ مقبوضہ عرب علاقوں کے انخلا سے قبل کوئی امن نہیں ہوگا۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ اسرائیل کے حقیقی ارادوں کا پتہ لگانے کے لئے امن کے معاہدے کی شرط منظور کرلیں اور پھر دیکھیں کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرتا ہے یا نہیں۔

جواب۔ اگر آپ اقوام متحدہ کی قرارداد کو غور سے پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ معاہدہ امن کا آغاز ہے۔ ہم اس کے پابند ہیں لیکن ابھی تک دوسری جانب سے اس کی عمل آوری کے منتظر ہیں۔ صرف ہم ہی کو تمام وعدوں کا پابند کیوں کیا جائے۔ اس نفسیاتی بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جزوی انخلا سے اسرائیل کے مبینہ نیک ارادوں کا پتہ چل جائے گا۔ ساری دنیا کی آزادانہ جہاز رانی کے لئے نہر سوئز کو کھول دیجئے اور اس کے بعد مسٹر یارنگ پورے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک ٹائم ٹیبل بنا سکتے ہیں۔ جنگ بندی میں مبینہ وقت تک کی مزید توسیع قبول کرلوں گا۔ اس کے بعد ہم مستقل امن کے لئے قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اسرائیلیوں کے معاملہ میں مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنی فتحیابی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ اگر حقیقی معنوں میں امن چاہتے ہیں تو ہم بھی اس کے لئے تیار ہیں۔

سوال۔ جزوی انخلا کا مطلب کیا ہے۔؟

جواب۔ جزوی انخلا کا مطلب العریش کے عقب تک پیچھے ہٹ جانا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسرائیل ماضی کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ یہ ۱۹۷۱ء ہے ۱۹۶۷ء نہیں۔

اسرائیلی نام نہاد فوجی ماہرین ہماری نئی فوج کے بارے میں نہیں جا

سوال۔ اگر وہ اسرائیلی فوجیں نہر کے پیچھے ہٹ گئے تو اس کے بدلے میں آپ کیا رعایت دیں گے۔

جواب۔ میں ۶ ماہ کے اندر اندر نہر سوئز کو بین الاقوامی تجارت کے لئے کھول دینے کی گارنٹی دوں گا۔ اس بات کی بھی گارنٹی دوں گا کہ آبنائے طیران میں آزادانہ جہاز رانی ہوگی اور وہاں اسی طرح بین الاقوامی فوج تعینات رہے گی۔ اس فوج میں چار بڑی طاقتیں شامل ہوں یا کوئی ملک بھی شامل ہو۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں۔ ہماری ایک نرم پالیسی ہوگی اور ہم کسی بھی ایسی تجویز پر بحث کرنے کے لئے تیار ہوں گے جس سے کہ اس حصہ ارض میں امن قائم ہو سکے۔ مگر سمجھوتہ ان تمام عرب علاقوں کے بارے میں ہونا چاہئے جن پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ کسی ایک یا دوسرے علاقے کے لئے نہیں۔

سوال۔ بعض فوجی ماہرین کا کہنا ہے کہ آنے والے کئی برس تک مصری فوجوں کی اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ اسرائیلیوں کو ان سے کوئی خطرہ محسوس ہو۔ اور آپ کے کچھ نکتہ چیں کہہ رہے ہیں کہ جنگ بندی کی توسیع کی ۷ مارچ کی تاریخ مقرر کر کے آپ اسرائیلیوں کے ساتھ چوتھی جنگ کے قریب ہو رہے ہیں، جسے آپ جیت نہیں سکتے۔ اس بارے میں آپ کا کیا جواب ہے؟

جواب۔ اس قسم کے نام نہاد ماہرین ہماری نئی فوج کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جو بھی صدمہ ہمیں برداشت کرنا پڑے گا اور جو بھی قیمت اور قربانی دینا پڑے گی ہم دیں گے۔ آپ کا کسی بھی طاقت کے ساتھ مقابلہ ہو عوام کے عزم و ارادے کو بدل نہیں سکتے۔

ویت نام میں دس سال کے بعد آپ امریکی اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر اسرائیل ہمارے علاقے خالی نہیں کرے گا تو ہم اپنے علاقوں کو خالی کرانے کے لئے ہر وہ قیمت ادا کریں گے جس کی ضرورت ہوگی۔

سوال۔ اسرائیلیوں نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ دوبارہ جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے فائرنگ شروع کی تو اس کا مطلب غالباً بڑے پیمانے پر انتقامی کارروائی ہوگا۔ پس کیا مصری گولہ باری کا مطلب چوتھی مرتبہ جنگ کا آغاز نہیں ہوگا؟

جواب۔ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جو تیسری مرتبہ جنگ شروع کی تھی وہ ابھی تک جاری ہے۔ اسرائیلیوں نے ہمارے ملک پر بمباری کی اور آگ لگا دینے والے بم گرائے۔ ان حملوں میں

واقعات مقاوشی

اس کے ۱۰۰ ہوائی جہاز تک حصہ لیتے تھے اور وہ ۲۴ گھنٹے میں ۱۰ گھنٹے حملے کرتے تھے۔

جو امریکی بم انھوں نے گرائے ان کی روزانہ قیمت پانچ لاکھ سے دس لاکھ ڈالر تک پہونچتی تھی اس کی اس بمباری میں عارضی جنگ بندی سے رکاوٹ پڑ گئی ہے۔ وہ ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس طرح امن قائم نہیں ہو سکتا۔

سوال۔ کیا آپ کو اپنے اوپر اعتماد ہے کہ آپ اب اس پوزیشن میں ہیں کہ نہر سوئز کو پار کر کے دوسری طرف اپنے قدم جما سکیں؟

جواب۔ میں اس بارے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں یہ فوجی معاملہ ہے جسے بتایا نہیں جا سکتا۔

سوال۔ کیا یہ صحیح ہے کہ نہر سوئز کے علاقے میں آپکی میزائل تنصیبات کا تمام انتظام مصریوں کے ہاتھ ہے۔

جواب۔ جی ہاں یہ صحیح ہے۔ نہر سوئز کے علاقے میں روسیوں کے بارے میں اسرائیل نے جو کچھ کہا وہ بالکل غلط تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا ہمارے لئے جنگ کرے۔

سوال۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات بڑی اہم ہے کہ آپ صفائی کے ساتھ اس امر کی وضاحت کر دیں کہ امن کے معاہدے کے لئے آپ کس رعایت کے لئے تیار ہوں گے۔

جواب۔ اگر اسرائیل اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت ہمارے علاقے واپس کر دیتا ہے تو اس علاقے کے ہر اسٹیٹ کی جن میں اسرائیل بھی شامل ہے سیاسی آزادی اور اس کے علاقائی تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں جس پر ہم قائم رہیں گے۔ تسلیم شدہ سرحدوں کے اندر اسرائیل کی علاقائی سالمیت کی ضمانت چار بڑی طاقتوں کی طرف سے دی جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضمانت دی جائے گی کہ اسرائیل کو نہر سوئز اور آبنائے طیران میں جہاز رانی کی آزادی حاصل ہوگی لیکن ان سب باتوں کے لئے ضروری ہوگا کہ فلسطینیوں کے مسئلے کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے۔

سوال۔ فلسطینی مسئلے کے بارے میں کافی الجھاؤ پایا جاتا ہے اس تجویز پر آپ کا کیا اعتراض ہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو مالی معاوضہ دے دیا جائے اور اردن دریا کے مغربی علاقے اور غزہ میں اس بات کے لئے عام رائے شماری ہو کہ کیا فلسطینی اپنی ایک الگ ریاست کے خواہاں ہیں یا وہ اردن کے ساتھ وفاق چاہتے ہیں اور یا اردن کے ایک لازمی حصے کے طور پر رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

جواب۔ فلسطینیوں کے بارے میں میں کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن معاوضہ اور ریفرنڈم کے ذریعے مسئلے کو حل کرنا ایک نامناسب طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ وہاں فلسطینیوں کو خود اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

سوال۔ آپ کہہ چکے ہیں کہ آپ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں کیا خاص بات موجود ہے۔

جواب۔ گولڈا مائر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ امن صرف اسی وقت قائم ہوگا جب وہ تل ابیب سے قاہرہ تک اپنی کار میں کچھ شاپنگ کرنے کے لئے جا سکیں گی۔ یہ ان کا ایک خواب ہے جو وہ احساس فتح کے بنیاد پر دیکھ رہی ہیں۔

جہاں تک سفارتی تعلقات کا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر امریکا چین کی علاقائی سالمیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات قائم نہیں ہیں۔ سفیروں کا تبادلہ ایک ٹیکنیکل معاملہ ہے۔ اصل سوال جھگڑا کا ہے جس کے بارے میں ہر قوم خود اپنا فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن اسرائیل کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ ہوتا رہا ہے کہ ا... نے یہ کہا تھا۔ میں اسرائیل کی علاقائی سالمیت کو تسلیم نہیں کروں گا یہ ایک جھوٹا پروپیگنڈہ ہے اور اس کا مقصد رائے عامہ کو مخالف بنانا ہے۔

سوال۔ دو سال قبل جب میں نے صدر ناصر سے پوچھا تھا کیا وہ ریگستان سینائی سے اسرائیلیوں کی واپسی کے جواب میں اس بات کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ شرم الشیخ میں چار بڑی طاقتوں کے فوجی دستے تعینات کئے جائیں۔ تو انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس بات کی نفی میں جواب دیا تھا۔ لیکن اس معاملے پر آپ کی پوزیشن بالکل بدلی ہوئی ہے۔

جواب۔ میں نے اس تجویز کو محض اس مقصد سے قبول کیا ہے کہ اس علاقے میں پائیدار امن قائم ہو سکے۔ عام مصری اسے پسند نہ کریں گے اسی وجہ سے صدر ناصر اس کے خلاف تھے۔ لیکن میں ایک خطرہ مول لوں گا۔ اور اگر اس کے بعد بھی عالمی رائے عامہ ہمارے طرز عمل کو نہیں سمجھتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے پوری کوشش کر کے دیکھ لی۔

اگر اسرائیل ان ضمانتوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے جو انھیں پیش کی گئی ہیں تو اس کی ذمے داری ہمارے

بیادِ آزاد

وقار انبالوی

آرامگاہ مولانا آزاد

کیا کیا گزر گیا ہے نگاہوں میں کچھ نہ پوچھ
آیا ہے جب زباں پہ کبھی نامِ بوالکلام

اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی ہے بات
وہ دِن۔ خدا گواہ، تھے ایامِ بوالکلام

ہر شیخ کو تھا حلقہ بگوشی پہ اُس کی فخر
ہر برہمن کے لب پہ تھا۔ ہوں رامِ بوالکلام

اُس کی زباں کا رَس تھا طلسمِ قلوب رَس
اُس کے بیاں کا نام تھا، الہامِ بوالکلام

اُس کے قلم میں سحرِ حیاتِ جدید تھا
پیغامِ نو بہار تھا پیغامِ بوالکلام

علم اُس کی پیش گاہ سے وابستہ رُوز و شب
فکر۔ اِک غلامِ بندۂ بے دامِ بوالکلام

وہ گفت گو کہ شہد و شکر سے خراج گیر
وہ ہاؤ ہو کہ زلزلہ، اقدامِ بوالکلام

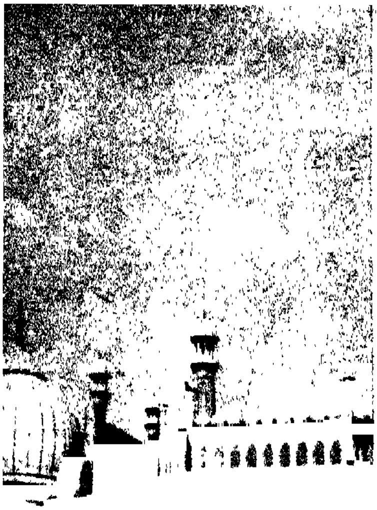
مغرب میں بوالکلام فرنگی کے دِل کا درد
مشرق میں دردِ دل کی دوا نامِ بوالکلام

طوفانِ عزم و شوق کہ رُکتا نہ تھا کہیں
سیلابِ بے پناہ کہ ابرامِ بوالکلام

ملت کے بے ستوں کا جگر سوز کوہکن
شیرینِ حریت فقط انعامِ بوالکلام

آج اس کے ہر کمال سے اِنکار عام ہے
وہ صبح بوالکلام تھی، یہ شام بوالکلام

موضوعِ ذکر بزمِ رفیقانِ عصر میں
احسانِ بوالکلام نہ اکرامِ بوالکلام



جامع مسجد اور اس کے ارد گرد

محمد افضل خان

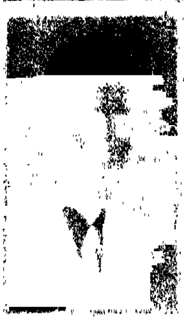
اگر آپ دہلی کی پرانی تہذیب کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں تو آئیے کچھ دیر کے لئے مٹیا محل پر چہل قدمی کریں۔ رنگ برنگے ہوٹل، رنگ برنگی دکانیں۔ رنگ برنگے ٹھیلے اور رنگ برنگے لوگ آپ کا استقبال کرینگے۔ ذرا سنبھل کر چلیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کے سوٹ بوٹ کو دیکھ کر فقرہ چست کرے "ابے ہیرو کہاں جا رہا ہے"۔ اور آپ خواہ مخواہ اس سے جھگڑ کر اپنی درگت نہ بنوا لیں۔

یہ علاقہ اور یہاں کے لوگ بڑے عجیب ہیں۔ آپ کو یہاں ہر قسم کا آدمی مل سکتا ہے۔ کلرک بھی، آفیسر بھی، بزنس مین بھی اور دکاندار بھی۔ کارخانہ دار (جنھیں یہاں کرخندار کہا جاتا ہے) بھی، چرس افیون کا دھندا کرنے والے بھی، شریف بھی، بدمعاش بھی، اچکے بھی، جیب کترے بھی، اٹھائی گیرے بھی غرض آپ کو جس قسم کے بھی آدمی کی ضرورت ہو وہ آپکو یہاں مل سکتا ہے۔ مگر یہاں کے لوگ ہیں سب سے الگ تھلگ۔ انکی تہذیب بھی الگ ہے۔ لباس بھی اور رہن سہن بھی۔ خاص طور پر ان کی بولی سے آپ بہت زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں

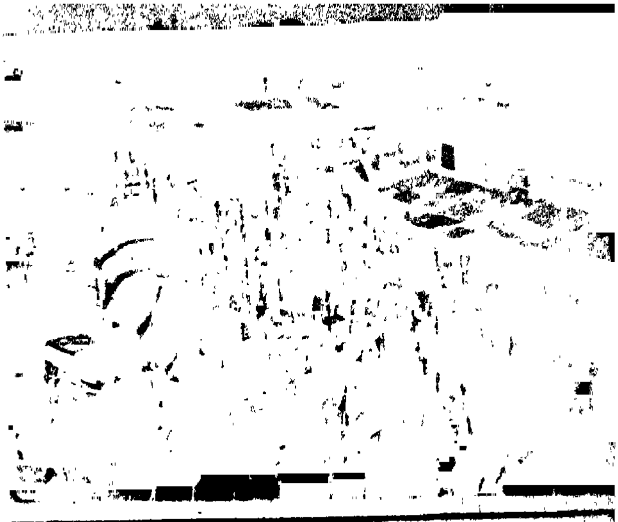
ڈھیلے ڈھالے گھیردار شلوار یا رنگ برنگا تہمد جس پر جگہ جگہ ماڈرن آرٹ کی جھلک ملے گی۔ ڈھیلی ڈھالی قمیض جس کی جیب کا اوپری حصہ سفید ہونے کے باوجود کالا ہوگا۔ جیب کے اندر کاغذوں اور رومال کی ملی جلی گڈی۔ جس کے بیچ سے جیب اپنا تو ازن کھو کر ایک طرف کو لٹک رہی ہوگی۔ سر کے بالوں سے بے نیاز۔ مگر اتفاق سے بال ہوں بھی تو ایسے جیسے چیل کا گھونسلا۔ آنکھیں سرمے سے آباد لیکن بے رونق، بڑی بڑی تلوار کٹ مونچھیں۔ کچھ ہاتھ کے ٹھیلوں پر سامان سجائے بیچ رہے ہوں گے۔ کچھ چلم میں ٹکّل لئے سڑک کے ادھر ادھر بیٹھے حسرت بھری نگاہوں سے سڑک پر چلتے لوگوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ یا بیڑی ہونٹوں میں دبائے چلم کے اندر بکھرے سیبوں کو اٹھا کر انھیں اپنے تہمد سے رگڑ رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ کچھ ہوٹلوں کے اوپر دوکاندار کی حیثیت سے۔ کچھ گاہکوں کی حیثیت سے، غرض آپ کو زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہر طرف نظر آئیں گے۔

دیکھئے ایک ایسا ہی آدمی اپنے ہاتھ ٹھیلہ پر (جس میں سیکڑوں پیوند لگے ہوئے ہیں اور جس کی لکڑی پانی سے گل چکی ہے) کھرنیاں بیچ رہا ہے۔ کھرنی گھڑی کو ہی بھی الگا آ جلیا ہے۔" چار آنے میں چھٹانک" پھر خواہ سکے دہ بار کی کھرنیاں لو" ہر آواز کے ساتھ پانی کا چھینٹا کھرنیوں پر ملنا ابھی نہیں بھولتا۔ اس کے باوجود کہ کھرنی والا چیخ چیخ کر کھرنی کا بھاؤ بتا رہا ہے مگر ایک اس سے سوال کرے گا "کیوں پہلوان کھرنیاں کیا بھاؤ بیچ رہا ہے جی" اور کچھ ناک بھوں چڑھا کر ایک دو کو چکھنے کے بعد وہ سیر بھر کھرنیاں لیکر آگے بڑھ جائے گا۔ ملک کلو باٹ اور نئے پیسے چلتے برسوں ہو گئے، مگر انکے لئے تو وہی سیر اور آنے سب کچھ ہیں۔ ان کا کلو گرام اور نئے پیسوں کوئی تعلق نہیں۔

ایسے ٹھیلے والے اور خوانچے والے آپکو ہر طرف نظر آئیں گے انکی سب سے بڑی دشمن میونسپلٹی کی گاڑی ہے میونسپلٹی کی گاڑی کے نام سے ان بیچاروں میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اور اپنے خوانچے اور ٹھیلے لے کر کسی نہ کسی تنگ گلی کے اندر گھس جاتے



محمد افضل خان



جامع مسجد کا کباڑی بازار

اس علاقہ میں آپکو امیر بھی ملیں گے اور غریب بھی۔ اور درمیانی طبقے کے لوگ بھی۔ غریب بیچارہ ایک وقت روٹی اور دوسرے وقت بھوک سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرکے اپنے بستروں میں گھس کر صبح کا انتظار کرتے ہیں۔ درمیانی طبقے کے لوگ دونوں وقت اپنا پیٹ کسی نہ کسی طرح بھر لیتے ہیں۔ اور امیر؟ ـــــ وہ انڈے اور مرغیاں کھاتے ہیں۔ شام کو جگادری کی بوتل کے ساتھ شغل کرتے ہیں۔ گھوڑوں کی ریسوں میں پیسہ ہارتے ہیں یا جیتتے ہیں۔ مینڈھوں کی لڑائیوں میں شرطیں لگاتے ہیں۔ اور شام کو گھر آکر بچوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اور بیوی کی پٹائی کرتے ہیں۔

آیئے آپکو ایک ایسی گلی میں لیکر چلیں جہاں تقریباً سارے ہی ایسے لوگ رہتے ہیں۔ جیسے ہی آپ اس گلی کے اندر گھسیں گے آپ کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لینا پڑیگا۔ اگر اتفاق سے اس گلی کے سرے پر نل بھی ہو تو واہ وا۔ آپ کو اس گلی کے اندر کیچڑ کی قالینیں بھی ملے گی۔ گلی کے اندر دونوں طرف نالیاں ہوں گی۔ جنکا گندہ پانی آزادی کے ساتھ گلی کے بیچ میں چہل قدمی کرتا نظر آئیگا۔ ان نالیوں کو کبھی کبھار کوئی بھنگی صاف کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر مایوسی کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ اور بغیر انکو صاف کئے ناکام واپس لوٹ جاتا ہے۔ گلی کے اندر جگہ جگہ سبزی اور ترکاری کے چھلکے بھی پڑے نظر آئیں گے جن کو گھروں سے بڑی بے نیازی کے ساتھ گلی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ کچھ بہت سارے بچے (جن کے جسم پر کپڑا نام کی کوئی شئے مشکل سے ملے گی اور اگر ملے گی بھی تو بے انتہا گندی اور بوسیدہ جسکا کئی جگہ سے پھٹا ہونا بہت ضروری ہے۔) نظر آئیں گے۔

یہ بچے غل مچا رہے ہوں گے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپکو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کچھ گلی ڈنڈا، کچھ گیند بھولداری اور کچھ کانچ کی گولیاں کھیل رہے ہیں۔ ان بچوں کے منہ سے گالیاں اتنی روانی کے ساتھ بہتی ہیں جیسے نل کے پائپ سے پانی۔ اکثر و بیشتر ایسی گلیوں میں چند عورتیں بھی لڑتی جھگڑتی نظر آئیں گی۔ پہلے طعنے کشی سے ابتدا ہوتی ہے۔ پھر کچھ گالیوں وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے میدان جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس جنگ میں بعض عورتوں کی چوٹیوں کے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور کچھ کے چہروں پر ناخونوں کی خراشیں نظر آنے لگتی ہیں۔ بچے اس جنگ میں ایک اہم پارٹ ادا کرتے ہیں اور اپنی ماؤں یا بہنوں کا پورا پورا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر جب کسی بچے کی والدہ محترمہ یا بہن صاحبہ کسی سے پٹنے لگتی ہیں۔ تو یہ بچے بڑے زور و شور سے رونے لگتے ہیں۔ اور چیختے چلاتے اپنے والد صاحب کو بلانے کے لئے کارخانے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور نوبت مردوں کی لڑائی تک پہنچ جاتی ہے۔ دو چار کے سر پھٹتے ہیں۔ کچھ کے ہاتھ اور کچھ کے پاؤں ٹوٹتے ہیں۔ معاملہ پولیس تک پہنچتا ہے۔ مگر عدالت تک کبھی نہیں پہنچتا۔ کیونکہ چند معزز لوگ (جو جرمیں یا افیون کا کاروبار کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر تھانے یا حوالات کی سیر کرتے رہتے ہیں) اپنی جان پہچان اور رسوخ سے دونوں حریفوں میں صلح نامہ کرا دیتے ہیں۔ اور یہ حریف اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو بھول کر فوراً گلے لگ جاتے ہیں۔ عورتوں کے اندر کچھ روز کشیدگی چلتی ہے۔ مگر پھر وہی میل جول اور وہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں جو لڑائی سے پہلے ہوا کرتے تھے۔

تہوار کے موقعوں پر ان لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ مزدور رات اور دن محنت کرکے تہوار کیلئے پیسہ کمانے کی سوچتا ہے۔ اور ہفتہ بھر پہلے سے جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے مالک کو گھڑی گھڑی بتاتا رہتا ہے "میاں کرخندار دیکھنا ہمارا خیال رکھنا۔ تہوار کا سر ا ہے۔ چاروں لڑکوں اور تینوں لڑکیوں کے کپڑے لتے بنوانے ہیں۔ گھر والی کا بھی جوڑا بنوانا ہے۔ اللہ پھر تہوار پر خرچہ پانی کو بھی تو چاہیئے گا " کرخندار تنگ کر کہتے ہیں" اب جب میں تجھ سے پہلے ہی کہے چکا ہوں کہ تیرے کو نوا نکل نکل دونگا تو پھر کیوں بک بک کر رہا ہے۔" کاریگر ہنس کر کہتا ہے "نہیں کرخندار جی تو ذرا دھیان دلوا رہا تھا"

تہوار کے دن یہ بڑے عجیب رنگ میں ہوتے ہیں۔ نا آلون کا باریک کرتا جس کے گلے پر سنہری کڑھی ہوئی بیل۔ اس کے نیچے بنا ہوا بنیان لیکنی کلر تہمد جس کے دونوں طرف کے سرے نیچے کو لٹکے ہوئے۔ پھٹے ہوئے پیروں کے اندر سنہری کام دار پشاوری چپل۔ آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل۔ مونچھوں پر کاجل اور تیل کا میک اپ۔ بالوں سے بے نیاز سر پر چپڑا ہوا تیل۔ کاندھوں پر دو بچوں کو بٹھائے دو کے ہاتھوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے نظام الدین کا میلا دیکھنے جاتے ہیں۔ سرخ رنگ کے مخمل کے کپڑوں پر سیدھا سفید برقعہ (جو کسی زمانے میں سفید رہا ہوگا اور جس کو کبھی دھونے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی) پیروں میں چاندی کی پازیب۔ ایک بچے کو گود میں لئے چھن چھن کرتی ہوئی ان کی بیوی بھی پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں۔ ایک ریڑھے میں بیٹھ کر نظام الدین پہنچ جاتے ہیں۔ سارے دن بچوں کے منبرے میں پتنگ بازی کرتے ہیں۔ باہر حلوہ پراٹھا، جلیبی، کباب سے شوق فرماتے ہیں۔ مہینے بھر کے کمائے ہوئے پیسوں کو چار پانچ گھنٹے میں خرچ کرکے خوشی خوشی واپس گھر لوٹ جاتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی اس بات کی فکر نہیں کرتے کہ کل کیا ہونا ہے۔

کچھ لوگ جن میں بوڑھے زیادہ شامل ہوتے ہیں زندگی کی رنگ رلیوں سے سبکدوش ہو کر سیاست میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کیوں کہ جوانی کے ساتھ سارے عیش تو چلے جاتے ہیں۔ اب بڑھاپے میں کیا کریں۔ سیاست ایک دلچسپ تفریح ہوتی ہے تاش چوپسی یا شطرنج کی محفلوں کے اندر ملک کی سیاست پر گفتگو کی جاتی ہے۔ ایک بڑے میاں فرماتے ہیں "میاں شدو تم نے اور کچھ بھی سنا۔ وہ اندرا گاندھی ہے نا! اس نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا ہے۔ اور اب ووٹ دوبارہ پڑیں گے" شدو پہلوان جو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ مگر

واقعات دہلی

چونکہ کسی کی ایکٹنگ کرتے تھے اور جواب دیتے تھے "اماں خلیفہ! کمالات کرتے ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کل تو میں اٹنڈ کیا تھا میں نے پارلیمنٹ کو بالکل ثابت دیکھا۔ پھر اندرا گاندھی نے رات ہی رات میں اسے کیسے توڑ دیا؟ وہ تو بڑی جاندار عمارت تھی۔ اور اگر توڑ بھی دیا تو ووٹ دینا کیوں پڑیں گے؟"

بنگالی پہ بھی ان محفلوں میں کافی بحث و مباحثہ ہوتا ہے کیا ٹائم آگیا ہے نقلی گھی پچپن روپے بک رہا ہے۔ ہائے ہائے کیا زمانہ تھا۔ روپے کا دھڑی بھر گھی لیا کرتے تھے۔ وہ بھی دیسی — میاں ہم کیا جانیں یہ ڈالڈا کیا ہوتا ہے۔ انگریز گیا تو ڈالڈا یہاں چھوڑ گیا۔ دیسی گھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ان بوڑھوں کو اپنی جوانی پر اور اپنے زمانے پر اور اپنی تہذیب پر بڑا ناز ہے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی ان سب مشغلوں کو یاد کر کر کے ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں یا پھر مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شاید خدا سے شکایت کرنے یا اپنے گناہوں کی معافی مانگنے۔

الیکشن کے دنوں میں یہاں کی سیاست بھی عروج پر ہوتی ہے۔ برساتی مینڈک جگہ جگہ سے سمٹ کر پرانی دلی کے ان علاقوں میں گھس جاتے ہیں اور اپنی سیاسی چالوں اور چکنی چپڑی باتوں سے پہلے ان سیدھے سادے لوگوں کا دل موہ لیتے ہیں اور بعد میں ووٹ۔ آخر ان لوگوں کو لائسنس دلوانے کا، شراب یا پوست کا ٹھیکہ دلوانے کا۔ ان کے نئے گھر بنوانے کا، نوکری دلوانے کا، گھروں کے اندر فلش کی ٹٹی اور نل بجلی لگوانے کا لالچ دیتے ہیں اور انکو بچوں کی طرح بہلا پھسلا کر ووٹ لینے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آخر میں کچھ نہیں تو "ووٹ دو اور نوٹ لو" کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے غریب لوگوں میں جمہوریت کا جنازہ نوٹوں کی شکل میں بہت جلد نکل جاتا ہے۔ ان علاقوں سے کوئی بھی لیڈر روپیہ خرچ کر کے کارپوریشن سے پارلیمنٹ کے دروازے تک بآسانی پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ اسکے پاس خرچ کرنے کو بلیک کا پیسہ ہو۔

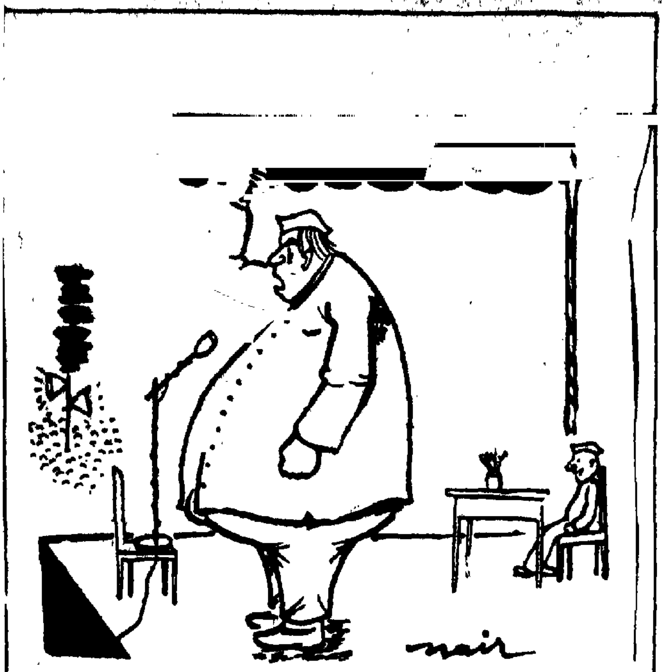
بعض دفعہ یہیں کے رہنے والوں کو الیکشن کا شوق چرانے لگتا ہے۔ اور وہ بھی سیاست کو کشتی کا اکھاڑا سمجھ کر مقابلہ کے لئے کود پڑتے ہیں۔ چند شاطر اور چھچھے قسم کے لوگ ایسے لوگوں کو جنکے پاس تھوڑی بہت جائداد یا تھوڑا بہت پیسہ ہوتا ہے۔ چڑھا کر الیکشن میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایسے لیڈروں کی لیڈری الیکشن کے ختم ہونے پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ لیڈر صاحب اپنا مکان بھی گروی رکھ چکے ہیں اور اپنی بیوی کے زیور بھی۔ ستم یہ کہ ان کی ضمانت بھی ضبط ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی تقریریں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں پچھلے چناؤ میں ایک ایسے ہی لیڈر صاحب الیکشن میں کھڑے ہوئے، جو اسٹیج پر کھڑے ہو کر جانوروں کی اور عورتوں کی آوازوں کی نقل کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی ناچنے بھی لگتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو ہنسا کر ووٹ لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر الیکشن کے بعد بھی لوگ ہنس رہے تھے۔ ان کی ایکٹنگ پہ نہیں ان کی بے وقوفی پر اور انکے رونے پر۔

ایک عرصہ ہو گیا۔ دلی بہت ترقی کرتی جا رہی ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے ہمارے لیڈروں نے دلی کو خوبصورت بنانے کے لئے بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں۔ نئی دلی کو اور نیا بنایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ فوارے، تالاب، پارکنگ شیڈ اور سڑکیں بنائی جا رہی ہیں۔ رہنے کے لئے کوارٹر بنائے جا رہے ہیں، خوبصورت بنگلے اور پارکوں سے نئی دلی کو سجایا جا رہا ہے۔ مگر پرانی دلی آج بھی ویسی ہی ہے جیسی پچاس برس پہلے تھی۔ پرانی دلی میں خاص طور پر جامع مسجد کے اندرونی علاقوں میں آج بھی گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں آج بھی وہاں شکستہ مکان نظر آتے ہیں۔

وہ لیڈر اور وہ نیتا جو ہر الیکشن میں ان گندی گلیوں میں گھس کر ان شکستہ مکانوں کی چوکھٹوں پر پہنچ کر ووٹوں کی بھیک مانگتے ہیں۔ اپنی مرادیں بر آنے کے بعد ان گلیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ الیکشن سے پہلے ان شریف اور سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور پھر یوں منہ موڑ لیتے ہیں، جیسے ان سے کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ جبکہ وہ ڈاکٹر جو کسی الیکشن میں کھڑا ہونے جا رہا ہو۔ الیکشن سے پہلے مریضوں کو دیکھنے کی کوئی فیس نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ ان کے گھروں پر جانے کی فیس بھی ختم کر دیتا ہے۔ مگر الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد ہی سے اپنی فیس دوگنی کر دیتا ہے۔ تاکہ الیکشن سے پہلے کا حساب چکتا کرے۔

آخر ان لوگوں پر توجہ کیوں نہیں دی جاتی۔ کیا اس لئے کہ یہ لوگ غریب ہیں۔ اپنا حق نہیں لے سکتے۔ بلیک مارکیٹنگ نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ ان کو سماج کے اوپر ایک بدنما داغ بتاتے ہیں۔ ملک کے اوپر ایک بدنما دھبا کہتے ہیں۔ مگر ان کو بدنما داغ بنانے میں کس کا ہاتھ ہے۔ ہمارے لیڈروں کا، ہماری گورنمنٹ کا، یا خود ہمارے اپنے نظام کا......... ■

واقعات نئی دہلی



"کیوں کہ یہ ملک کا سب سے بڑا چناؤ حلقہ ہے اس لئے اس کا نمائندہ صرف میں ہی ہو سکتا ہوں۔"

سوال :۔ مسٹر جناح کیا آپ کبھی کانگریس میں نہیں تھے ؟
جناح :۔ "میں کبھی پرائمری اسکول میں بھی تھا"

(ظفر اللہ خان)

شگوفے

صحافیوں کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ طرح طرح کے سوالات کر کے عظیم رہنماؤں کا قافیہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ہر ایک رہنما کو اپنی زندگی میں سیکڑوں صحافیوں کے تلخ و شیریں سوالات کی بوچھار سننی پڑتی ہے۔

ذہین صحافی گھما پھرا کر ایسے سوالات بھی کر بیٹھتے ہیں کہ سیاستداں سیاست بھول کر اپنے دل کے پوشیدہ خیالات کو عریاں کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی چند سوالات جو عالم صحافت کے درخشاں صحافیوں نے دوران ملاقات یا کسی پریس کانفرنس کے وقت عالم سیاست کے چند حسین ترین بتوں سے کئے ہیں۔ پیش ہیں۔ دیکھئے تو سہی اہل دل نے کیسی کیسی گلفشانیاں کی ہیں۔



ظفر اللہ
خان

مہاتما گاندھی۔ بابائے قوم ——————

گاندھی جی جب ایک کانفرنس کے سلسلے میں لندن پہونچے تو ایک برطانوی اخبار کے متعصب نمائندے نے ان کے نیم عریاں جسم اور سادہ لباس پر نظر ڈالتے ہوئے بطور طنز ان سے سوال کیا۔

س۔ ہندوستانیوں نے آپ کو ہی اپنی نمائندگی کے لئے کیوں منتخب کیا ہے۔ کیا آپ سے بہتر نمائندہ انھیں نہیں مل سکتا تھا۔

گاندھی جی نے جواب دیا۔

"شاید یہ بات ہو کہ ان کی نظر میں مجھ جیسا حقیر آدمی ہی برطانیہ والوں کے مقابلے میں بھاری ہو"

س۔ کیا آپ عورت کو کمزور سمجھتے ہیں؟۔

ج۔ عورت کو مرد سے کمزور سمجھنا ایک غلطی ہے اور مردوں کی ناانصافی کا ثبوت ہے۔ اگر طاقت سے مراد صرف حیوانی طاقت ہے تو پھر یقیناً عورت مرد سے کمزور ہے، اور اگر طاقت سے مراد اخلاقی قوت ہے تو عورت مرد سے کئی گنا اعلیٰ اور برتر ہے۔ اس میں ایثار کا جذبہ بھی مرد سے زیادہ ہے۔ اس میں قوت برداشت بھی بہت ہوتی ہے۔

عورت کے بغیر مرد کا وجود ممکن نہیں اور اگر عدم تشدد ہماری



آزادی کی جنگ کا سب سے بڑا اصول ہے تو مستقبل عورت کے ہاتھ ہے۔

قائد اعظم۔ محمد علی جناح

جناح جب لندن میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے تو ایک مسلم صحافی نے انھیں مخاطب کر کے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

س۔ مسٹر جناح! کیا آپ کبھی کانگریس میں نہیں تھے؟

جناح کا جواب بھی تلخ تھا۔

ج۔ "میں کبھی پرائمری اسکول میں بھی تھا"

پاکستان بن جانے کے بعد ڈھاکہ میں ایک صحافی نے قائد اعظم سے پوچھا۔

س۔ "پاکستان کی قومی زبان کونسی ہے؟"

ج۔ پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔ مملکت کی سرکاری

"اندرا جی ایک کلی کی طرح ہیں — ابھی اس کلی کو نکھرنا ہے، اس کلی کو کھلنا ہے اس کلی کی آبیاری کیجئے — اس کو پانی پہنچائیے" — (شیخ عبداللہ)

"اسلام محبت کا مذہب ہے، اخوت کا مذہب ہے، امن و سلامتی کا مذہب ہے۔
قوت اور صلابت کا مذہب ہے، ترقی اور فضیلت کا مذہب ہے"۔۔۔۔۔ (شاہ فیہ

محمد علی جناح

زبان بھی ظاہر ہے، اُردو ہی کو ہونا چاہیئے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے اور اسے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک سمجھا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اُردو میں صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ پایا جاتا ہے اور اُردو ہی دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں سے قریب تر ہے۔

شیخ محمد عبداللہ

س۔ "آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کس شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں؟"

ج۔ علامہ اقبالؒ سے۔ میں علامہ سے ملاقاتیں بھی کر چکا ہوں۔ ان کے کلام نے مجھے ایک نیا پیغام دیا ہے۔ میرے جذبات کو جھنجھوڑا ہے۔

س۔ "اُردو کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟"

ج۔ میں اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا کیونکہ مسلمان تو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر ملک کا مسلمان اُردو نہیں بولتا۔ نہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے نہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ عبدالرحیم اُردو کا نہیں ہندی کا شاعر تھا اور دیا شنکر نسیم ہندی کے نہیں اردو کے شاعر تھے۔ میں لسانی مسئلے کو مذہب سے جوڑنا نہیں چاہتا۔

س۔ ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟

ج۔ اندرا جی ایک کلی کی طرح ہیں۔ ابھی اس کلی کو نکھرنا ہے اس کلی کو کھلنا ہے ۔۔۔۔۔ اس کلی کی آبیاری کیجئے اسکو پانی پہونچایئے۔ ۔۔۔۔۔

عصمت انونو

ترکی کے سابق وزیر اعظم اور صدر موجودہ قائد حزب اختلاف جن پر عرصہ دراز سے اسلام دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔

س۔ کیا آپ سیاست میں مذہب کا دخل ضروری سمجھتے ہیں

ج۔ نہیں میں یہ نہیں چاہتا۔ میں اس معاملے میں ایک دوسری رائے رکھتا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب کا سیاست سے تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ اسے عیسائی عقیدہ کہہ سکتے ہیں یا کوئی اور ۔۔۔ میں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اس کی پیشانی پر یہی لکھا نظر آیا۔

س۔ "آپ نے یہ خیال کہاں سے اخذ کیا۔"؟

ج۔ دیکھئے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انھوں نے معاشرے کے افکار بدلے۔ نظریات بدلے ضابطۂ اخلاق بدلا۔ اجتماعی نظام بدلا اور ایک سیاسی انقلاب برپا کیا پھر خلافتِ راشدہ کے عہد میں اسلام کا اجتماعی نظام ق رہا، پھر ملوکیت کا دور دورہ ہوا اور مذہبی پروہتوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوئیں کے دور میں ہم ان خرابیوں سے صرف اسی صورت میں ره سکتے ہیں کہ مذہبی گروہ کو برسرِ اقتدار نہ آنے دیں

س۔ آپ کو معلوم ہے کہ ترکی میں احیائے قوم کی تحریک اٹھی ہے، کیا یہ اس بات کی علامت نہیں کہ قوم آپ کی مذہب دشمن پالیسی کو قبول نہیں کیا۔

ج۔ چند پاگلوں کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو ہم نے جو نئی نسل تیار کی ہے وہ پوری قوت سے مزاحمت

س۔ کیا آپ ترکی میں اشتراکیت لانا پسند کریں گے

ج۔ میری یہ خواہش ہے کہ میرے ہم وطنوں کی حالت بہتر ہو۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔

سلیمان ڈیمریل ۔ وزیر اعظم جمہوریہ ترکی۔

س۔ ڈیمریل صاحب! آپ انتخابات سے خوف کھاتے ہیں؟

ج۔ خوف کس بات کا۔ اگر ہم عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں عوام کے سامنے جاتے ہوئے خوف گھبراہٹ کیوں محسوس ہو۔ انتخابات تو ہماری اصل قوت ان کے ذریعے سیاسی آب و ہوا اور موسم کا اندازہ رہتا ہے سے بڑھ کر یہ کہ انتخابات یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ کے اصل حکمراں عوام ہیں۔ ایک شخص، ایک پارٹی یا چند خا نہیں ہیں۔"

س۔ آپ کے ملک میں پریس کو بڑی آزادی ہے۔ کیا اگر

"سوشلزم کا جوہر یہ ہے کہ ایک ایسا ترقی یافتہ اور ترو تازہ معاشرہ پیدا کیا جائے جس میں دولت کی تقـ
عادلانہ بنیادوں پر ہو اور جس سے تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں" (جیب بورقیـ

پتا نہیں ہے کہ بعض اخبارات بیرونی قوتوں
فوں میں کھیلتے ہوئے ملک کے مفاد کو نقصان پہنچاتیں
بے شک پریس کی مکمل آزادی کی وجہ سے بعض اخبارات
ی داری کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مگر جب دوسرے اخبار
ے سامنے صحیح اور مستند تصویر پیش کرتے ہیں تو عوام جان
یں کہ کونسا اخبار ذمہ دار ہے اور کونسا غیر ذمے دار۔
ین ہے میرے ملک کا کوئی صحافی اپنی قوم کے خلاف آلۂ کار
بن سکتا۔ ایسا سوچنا اور کہنا تو میری قوم اور میرے وطن کی
ن ہے۔ میں جانتا ہوں پریس کا ایک حصہ ہماری پالیسیوں کا
ف ہے لیکن اگر کبھی ملک کی سالمیت اور حفاظت کا مسئلہ پیدا
و سارا پریس متحد ہو کر وطن کی حفاظت کرے گا۔



ملک کے وزیر اعظم سلیمان ڈیمریل
جسٹس پارٹی کے نشان گھوڑے کے ساتھ

۔ کیا آپ کے ملک میں اشتراکیت کے پھیلنے کا خطرہ نہیں ہے
۔ ہم عوام کو بتا چکے ہیں کہ اشتراکیت قبول کرنے کا مطلب
ہے کہ وہ خاندانی نظام سے دستبردار ہو جائیں گے۔ انھیں
ذاتی ملکیت سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ تمام آزادیاں قربان
نی ہوں گی۔ جمہوریت کو خیرباد کہنا ہوگا اور ایک جابرانہ
ام کے تحت زندگی بسر کرنی ہوگی۔
اگر عوام یہ سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں تو وہ
وقعے اشتراکیت کو گلے لگالیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے
ملک کے عوام ایسا احمقانہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے۔
س۔ طلبار کا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا ٹھیک ہے یا نہیں؟
صحت مند سیاسی سرگرمیاں کسی اعتبار سے بری نہیں
بار کو آگے چل کر قوم اور ملک کے معاملات طے کرنے ہوں گے اس

سے انھیں سیاسی شعور اور تربیت کی ضرورت ہے علم اور تجربے
کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔
ہمارے ہاں زیادہ تر یونیورسٹیاں مکمل طور پر آزاد ہیں۔
علم آزاد فضا ہی میں برگ و بار لاتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ
طلبا اور اساتذہ ملکی مسائل پر تحقیق کرتے ہیں اور ہمارے
سامنے ٹھوس حل پیش کرتے ہیں ہمیں ان کی صلاحیتوں کو قومی
ترقی اور سیاسی صحت مند زندگی کے لئے استعمال میں لانا چاہئے۔

حبیب بورقیبہ۔ سربراہ تیونس

س۔ "آپ جس دستوری سوشلزم" کا دعویٰ کرتے ہیں اسکی تفصیل کیا ہے؟"

ج۔ سوشلزم کا جوہر یہ ہے کہ ایک ایسا ترقی یافتہ اور ترو تازہ معاشرہ پیدا کیا جائے جس میں دولت کی تقسیم عادلانہ بنیادوں پر ہو اور جس سے تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں۔ دستوری سوشلزم جس کو ہم نے اختیار کر رکھا ہے اس کے بارے میں فیصلہ نتائج کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم اپنی اقتصادیات کو بڑھا رہے ہیں اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ انھیں اجتماعی انصاف کی طرف ترقی دے رہے ہیں۔ اجتماعی انصاف ہی باشندگان ملک کے اندر جذبہ و ارادہ پھونک سکتا ہے اور ان کے اندر وہ فراواں جوش و ولولہ بھر سکتا ہے جو پیداوار کو وافر مقدار تک ترقی دے سکے۔ اسی چیز کو ہم دستوری سوشلزم کہتے ہیں۔ اس کی رو سے بیک وقت تقسیم کے نظام میں بھی عدل قائم رہتا ہے اور پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ بات ۔۔۔ دلیل کی محتاج نہیں ہے اس لئے کہ انسان فطرتاً عدل اور اطمینان سے محبت رکھتا ہے اور جب انسان یہ دیکھے کہ تمام معاملات انصاف کے ساتھ چل رہے ہیں اور وہ ظلم و غبن کے شر سے محفوظ ہے تو اس کی کارکردگی اور جوش و جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے لگتا ہے، اس کے نتیجے میں پیداوار میں خود بخود اضافہ ہوتا ہے اور تمام انسانوں کا معیار زندگی معقول حد تک بلند ہو جاتا ہے۔

شاہ فیصل۔ سربراہ مملکت سعودی عرب

س۔ کیا نئی زندگی کے نئے تقاضوں کی روشنی میں اسلام کی تشریح یا اس کے نظام میں کوئی تبدیلی درکار ہے؟

ج۔ اسلام محبت کا مذہب ہے اخوت کا مذہب ہے

واقعات کے آئندہ شمارہ میں

مشہور و مقبول افسانہ نگار

واجدہ تبسم

کا تازہ ترین افسانہ

چاندی کا تخت

ملاحظہ فرمایئے

رجسٹریشن آف نیوز پیپرایکٹ کے رول نمبر ۸ کے مطابق پندرہ روزہ واقعات نئی دہلی کی تفصیل

(۱) مقام اشاعت:۔	نئی دہلی
(۲) وقت اشاعت:۔	پندرہ روزہ
(۳) پرنٹر کا نام:۔	عبدالوحید صدیقی
قومیت:۔	ہندوستانی
(۴) پبلشر کا نام:۔	عبدالوحید صدیقی
قومیت:۔	ہندوستانی
پتہ:۔	ڈی۔ ۱۔ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳
(۵) ایڈیٹر کا نام:۔	عبدالوحید صدیقی
قومیت:۔	ہندوستانی
پتہ:۔	ڈی۔ ۱۔ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳

ان افراد کے نام اور پتے جو اخبار کے مالک شراکت دار یا کل سرمایہ کے ایک فیصد سے زائد کے حصہ دار ہیں۔
عبدالوحید صدیقی۔ ڈی۔ ۱۔ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی ۱۳
میں عبدالوحید صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ متذکرہ بالا تفصیل میرے علم و ذہن کے مطابق صحیح ہے۔

پبلشر کے دستخط
عبدالوحید صدیقی

امن و سلامتی کا مذہب ہے، قوت اور صلابت کا مذہب ہے، ترقی اور فضیلت کا مذہب ہے۔ جس کو اسلام عزیز ہو اور اس کی نصرت و عزت عزیز ہو اسکے لئے راستہ واضح ہے اور جو تحریف کرنا چاہتے ہیں اور اسلام سے وہ چیزیں منسوب کرنا چاہتے ہیں جن سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ مسلمان خدا کے منکر ہیں۔

ابوالکلام آزاد اور غبارِ خاطر

حمیرا صدیقی (ایم۔ اے)

علمی اور ادبی حیثیت سے مولانا آزاد کا اُردو ادب میں ایک الگ مقام ہے۔ ادب اور صحافت کی تاریخ میں ان کی جگہ زبان کے ممتاز ترین انشا پردازوں کے ساتھ ہے۔ ان کی تحریروں میں انفرادیت کے ساتھ سرسید، شبلی، ٹیگور، محمد علی اور اقبال کے ادبی، علمی اور مذہبی افکار کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔

اس بات سے شاید کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا نے اُردو ادب کو نئے نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ ان کی آواز اور لہجے میں انفرادیت اور انانیت کی وہ کھنک ہے جو اس دور کے کسی ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔ اس انانیت نے ان میں سچائی اور خلوص اور ان کی شخصیت میں عظمت پیدا کر دی ہے۔ دنیا ان کی نگاہوں میں ایک کفِ دست سے بھی مختصر اور ایک ایسا چٹیل میدان ہے جس کی ہر راہ سے وہ واقف اور ہر روش سے آشنا ہیں۔ واقعات نئی دہلی

اسی خود اعتمادی نے ان کی تحریر اور اسلوب میں وہ انشا پردازانہ رنگ بھرا ہے جو ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی یہ مخصوص طرزِ تحریر "سوانح سرسید" "افسانۂ ہجر و وصال" اور اس طرح کے دیگر انشا پردازانہ رنگ کے مضامین میں خاص طور سے نظر آتی ہے۔"

مولانا کا دوسرا طرزِ تحریر خطیبانہ کہا جا سکتا ہے جو الہلال اور البلاغ کے اکثر مضامین کی خصوصیات ہیں۔

غبارِ خاطر مولانا کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں اپنے محترم رفیق اور دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھے تھے۔ اور جیسا کہ اس کتاب کے دیباچے میں درج ہے کہ مکاتیب نجی کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے، اور چونکہ یہ خطوط مولانا کی زندگی کی ایک مختصر مدت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس لئے جب تک مولانا کے اور مکاتیب سامنے نہ آجائیں۔ اُردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ان کا

مقام متعین کرنا مشکل ہے۔

مولانا کے خطوط میں روزمرہ کی سادگی ا

کی چاشنی نہیں ہے۔ ان خطوط میں مولانا نے عو

رشتہ توڑ لیا ہے۔ مکاتیب غالب کی طرح ان

مراسلہ کو مکالمہ نہیں بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ

ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو اسیری کے زمانے

ذوقِ نگارش کی تسکین کے لئے لکھے گئے تھے ا

اس بات کا خیال بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی شائع ہو

مکتوب الیہ تک پہونچیں گے۔ اس لئے اس میں ا

کی خود کلامی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس لئے ان ہ

موازنہ کسی دوسرے مکاتیب سے کرنا ٹھیک نہ

خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکث

اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس ط

دل میں ہوتا ہے اسی طرح صفحۂ قرطاس پر بکھر جا

اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر ڈ

دیتا ہے تو شاید زیادہ ٹھیک رہے گا۔ غبارِ خاطر

اگر اس روشنی میں کیا جائے تو مولانا آزاد کی نفس

بہت سے گوشے اس آئینے میں بے نقاب ہو جائیں

غبارِ خاطر میں غالب اور سرسید کی ساد

شبلی اور آزاد کی مرصع نگاری اور رنگینی، نذیر احم

کی متانت اور سنجیدگی۔ مہدی افادی اور نیاز کی

اور جمالیاتی تشنگی۔ اقبال کے فکر کی گہرائی اور معنو

کے منفرد اسلوب نگارش میں گھل مل گئی ہے۔ اس

نہیں کہ غبارِ خاطر بعض حیثیتوں سے مکتوب نگار

سے الگ بھی ہے۔ انشا اور مکتوب نگاری کے لح

اس کا درجہ اتنا بلند نہیں جتنا خود نوشت اور ادب

کے لحاظ سے بلند ہے۔ اس میں رعنائی اور لطافت

دونوں موجود ہیں۔ اس کی نثر میں شعر کی ساری ا

سموئی ہوئی ہیں۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر محمد حسن ۔

اسلوب کے لحاظ سے تخیل کا آذر کہا ہے جو ہزار دا

تراشتا اور لاکھوں صنم آراستہ کرتا ہے۔

غبارِ خاطر کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے ک

خطِ غبار سے مولانا کی واردات قلب اور نفسیات

لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں مولانا کی فطرت کی تص

نظر آتی ہے، اور ان کی مشکل پسندی، غمگینی اور ا

[illegible] مزاج، انانیت اور [illegible] کائنات اور تماشائے فطرت۔ مذہب اور فلسفے کے مسائل سب پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ادب اور زندگی کی کوئی بھی راہ ہو مولانا تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل ہیں وہ کسی ایسی عمومیت سے مفاہمت نہیں کر سکتے جو ان کے خصوصی انفرادیت کے سانچے میں نہ ڈھل سکے۔ وہ معمولی سی معمولی باتوں میں بھی اپنے لئے ایک امتیاز پیدا کر لیتے ہیں۔ سیدھی سادی بات بھی عمومی انداز میں نہیں کہہ سکتے۔ قید کی پابندیوں میں اپنے ذوقِ نگارش کا بیان بھی اسی انداز سے ختم کرتے ہیں۔

"لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا
کبھی بالِ کبوتر سے۔ ہمارے حصے میں عنقا آیا۔"

اسی طرح سونے جاگنے اور کھانے پینے میں بھی ان کا مسلک تقلید نہیں اجتہاد ہے۔ مثلاً اپنے خطوط میں سونے اور جاگنے کے اوقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ساری دنیا سے الٹی چال میرے حصے میں آئی۔ دنیا کے سونے کا وقت جو سب سے بہتر ہے وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں اور میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت اندوز ہوتا رہوں۔"

جلوت سے بیزاری اور خلوت سے لگاؤ فطری چیز ہے اس کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں جلوت سے زیادہ خلوت سے لگاؤ تھا۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے اس لئے خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے۔ مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنے کام جوئیوں میں الگ گوشہ [illegible]

[illegible] حقیقت کی [illegible] چونکہ وہ انہیں ایک طرح کی تنہائی اور بے چارگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے سوز و گداز کو اس شاعرانہ انداز بیان میں بیان کرتے ہیں۔

"جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے۔ ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔"

ان کے خیالات کی طرح ان کی خودی کا درجہ بہت اونچا تھا۔ ان کے دل پر کچھ بھی گزر جائے دوسروں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ اور انتہائی کرب و اذیت کی حالت میں بھی ان کے وقار اور تمکنت میں فرق نہ آتا تھا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ان کی اہلیہ کی موت ہے جو ان کے ایامِ اسیری میں ہوئی تھی۔ دیکھئے اس حادثے کو کس خودداری اور وقار کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

"جیلر اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے۔ جوں ہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ شروع ہوتی ہے دل دھڑکنے لگتا ہے کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی، اس لیے جب تک ایک آدمی اندر آ کر کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ساری ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

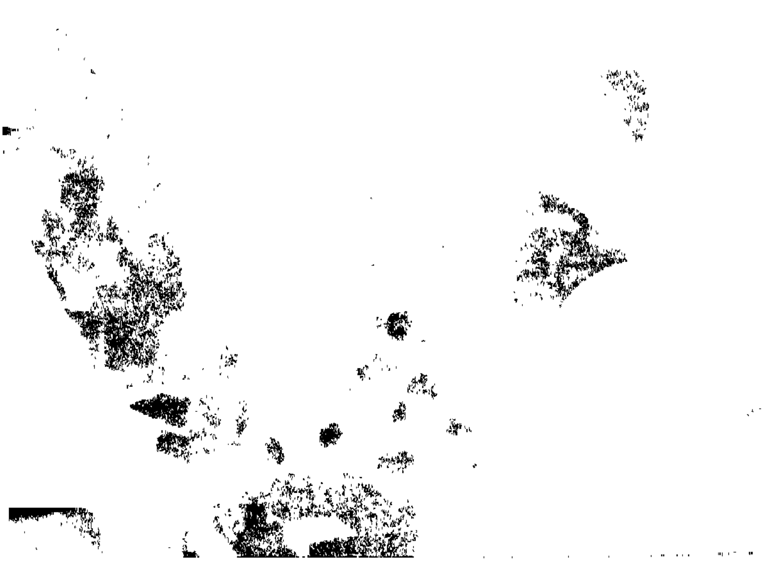
غرض مولانا نے اپنی انفرادیت، انانیت اور دماغ [illegible] کرنے کا [illegible] واقعات زندگی مولانا زندگی کے ازدواجی تعلقات اور مظاہر کو بھی گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کا اندازہ غبار خاطر کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۳ر ستمبر ۴۳ء کے خط میں موسیقی سے اپنے شغف اور ہندوستان میں فن موسیقی کے کمالات اور اس کی تاریخ تفصیل سے بیان کی ہے۔ یہ مولانا کے شوق کا نیا پہلو ہے۔ ایک مکتوب میں اپنے شاعرانہ وجدان کو اس وارفتگی سے بیان کرتے ہیں۔

"رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا، اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے ان ہی آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔۔۔۔ رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی چاندنی اور اپریل کی بھیگی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔"

انشاء اور مکتوب نگاری کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے غبارِ خاطر کے مکاتیب زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اگر خطوط سے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے تو یقیناً ان اوراق کے غبار میں مولانا کی شخصیت بڑی حد تک بے نقاب نظر آتی ہے۔ اس میں علم و خیالات کی رفعت، فضا اور ادب و آرٹ کے وہ نمونے ملتے ہیں جو مولانا کو ایک بڑا آرٹسٹ اور ایک بلند پایہ ادیب، ایک عظیم مفکر و فلسفی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

فرخ رو پارسا

ایران کی خاتون وزیر تعلیم



۱۹۶۸ء میں شاہ ایران اور شاہ بانو ہندوستان آئے۔ دہلی میں وزیر اعظم اندرا گاندھی اور مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے ساتھ۔

فرخ رو پارسا کا نام ہندوستانیوں کے لئے نیا ابھی ہے لیکن ایران میں بہت کم لوگ اس نام سے ناواقف ملیں گے۔ یہ نام ہے ایران کی خاتون وزیر تعلیم کا جنہوں نے معلمی استانی کے درجے سے ترقی کر کے ایرانی کابینہ میں وزارت تعلیم کا ممتاز اور اہم عہدہ حاصل کیا ہے۔ فرخ رو پارسا شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کی ماں ہیں جن میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ لڑکے کی عمر ۲۲ برس ہے اور لڑکیاں بالترتیب ۱۳، ۱۷، ۲۰ برس کی ہیں۔ ان کے شوہر احمد پارسا ایرانی فوج میں ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں۔

وہ اپنی وزارتی اور گھریلو ذمے داریوں کو اس خوش اسلوبی سے نباہتی ہیں کہ ان کی زندگی نئے ایران کی لڑکیوں کے لئے نمونہ بن گئی ہے۔

شادی شدہ عورت کو سب سے زیادہ دلچسپی گھر، بچوں سے اور شوہر سے ہوتی ہے۔ لیکن وزارت کی عظیم ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد انہیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جن سے انہیں والہانہ محبت ہے فرصت کے چند لمحات گزار سکیں۔ انہوں نے ایران کی خاتون صحافی مریم خوانزی سے حال ہی میں ایک انٹرویو میں بڑی حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ۔

ان کے ۲۴ گھنٹوں میں سے پندرہ گھنٹے وزارتی مصروفیتوں میں گھر سے باہر اور بال بچوں سے دور گزرتے ہیں۔ گھر میں وہ بمشکل ۹ گھنٹے رہ پاتی ہیں۔ ان میں سے بھی دو گھنٹے اشد ضروری دفتری کام کاج کے لئے اچانک مجھے پڑھنے پڑ جاتے ہیں۔ تقریباً پانچ گھنٹے سونے میں صرف ہوتے ہیں۔ شوہر اور بچوں کے ساتھ رہنے کے لئے صرف دو گھنٹے کی مہلت ملتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ۔

"تاہم میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کو کسی وقت بھی نظر انداز نہ ہونے دوں۔ لیکن بسا اوقات سینما جاتے وقت یا دوسرے تفریحی پروگراموں یا ضیافتوں وغیرہ میں جب میں ان کا ساتھ نہیں دے پاتی تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔"

وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے

اس خاتون وزیر سے انٹرویو لینے والی خاتون صحافی کا دوسرا سوال قدرتی طور پر ان کی شادی کے بارے میں تھا۔ وہ فطری طور پر یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ کیا انکی شادی کسی رومانس کا نتیجہ تھی۔

"عورت وزیر بننے کے بعد بھی عورت ہی رہتی ہے"

جواب دیتے ہوئے اگر فرخ رو پارسا کے رخساروں کی سرخی ذرا گہری ہو گئی تو اسے ماضی کی خوشگوار یادوں کا اثر ہی سمجھنا چاہئے۔ تاہم انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ ان کی شادی کسی رومانس کا نتیجہ تھی۔ جواب میں وہ اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں گویا ہوئیں۔

"وقت بھی کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ اب میری شادی کو ۲۸ برس ہو چکے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہماری شادی کی تہہ میں کوئی ایسی بات تھی۔" پھر وہ ٹھہر کر کہنے لگیں۔

"میں اور وہ [ان کے شوہر احمد پارسا] دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ پڑوسی ہونے کے باعث ہم اور ہمارے والدین ایک دوسرے سے تھوڑی واقف تھے۔ ہمارے تعارف کو سات برس ہو چکے تھے کہ مجھے ٹیچر ٹریننگ کالج میں اور احمد کو ملٹری کالج میں داخل ہونا پڑا۔

جب وہ فارغ التحصیل ہو کر لوٹا تو میں بھی ڈگری لے چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں ہماری شادی ہو گئی۔

شادی شدہ زندگی کے ان ۲۸ برسوں کا بڑا حصہ میں نے ملازمت میں گزارا ہے۔ ۱۴ برس تک میں رضا شاہ کبیر اسکول میں استانی رہی۔ پھر ۶ برس تک اسی اسکول میں ہیڈ مسٹریس رہی۔ لیکن آج کل کے مقابلے میں ان دنوں میرا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ وزیر بننے کے بعد اب مجھے یہ آسانی ہے کہ دو گھنٹے روزانہ گھر پر وزارتی کام کر سکتی ہوں۔

جب میں طالب علم تھی تو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ میں وزیر تعلیم بھی بن سکتی ہوں۔ اس وقت میں یہی سوچتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ہیڈ مسٹریس بن سکوں گی۔

ہاں تو میں ایک عرصے تک [illegible]

وہ ہیڈ مسٹریس بننے کا خواب دیکھتی تھیں لیکن وزیر تعلیم بن گئیں

ے آرائشِ گیسو کیلئے بھی وقت نہیں ملتا اور درزی میری وعدہ خلافی کا عادی ہو چکا ہے

یں لیڈی ڈاکٹر بنوں یا ٹیچر۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے میڈیکل یونیورسٹی
ہ ڈاکٹری کی سند لی تھی لیکن فالتو وقت میں بچوں کو پڑھایا کرتی
ی اس میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ بالآخر میں نے استانی کا پیشہ
ختیار کر لیا۔ کیونکہ اس طرح مجھے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت
زارنے کا موقع ملتا تھا جو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

میرے وزیر بننے سے میرے شوہر مطلق پریشان نہ
ئے۔ وہ بہت خوش ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ یا تو عورتیں
ھر کے باہر مطلق کام نہ کریں۔ اور اگر کام کریں تو مردوں کی
رح اعلیٰ عہدوں تک پہنچیں۔"

"شوہر اور بیوی دونوں گھر سے باہر کام کرتے ہوں تو
ھر کا ماحول کس طرح خوشگوار رہ سکتا ہے۔؟" اس کا جواب
ہوں نے یوں دیا۔

"میں اور میرے شوہر کبھی اپنی دفتری مصروفیات کو گھر
ے معاملات میں مخل نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ میں اور میرے شوہر
ھر میں قدم رکھتے ہی اپنے دفتری عہدے اور پوزیشن کو بالکل بھول
اتے ہیں اور عام زن و شوہر کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔
چوں کی پرورش کا بوجھ ہم مل کر اٹھاتے ہیں اور اس ذمے داری
و مساوی طور پر انجام دیتے ہیں۔

میاں بیوی کے جھگڑے

دوسرے گھر والوں کی طرح ہمارے درمیان بھی اختلافات
وتے رہتے ہیں۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی ہمارے درمیان اکثر
ختلاف رائے ہوتا ہے۔ مثلاً میرے شوہر اکثر بچوں کی ضد کے
امنے جھک جاتے ہیں اور ان کی بات مان لیتے ہیں جب کہ میں
یسا کرنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن بالعموم ہم میں سے ایک فریق
وسرے کی بات مان لیتا ہے اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم
پنے بچوں کے سامنے کبھی اختلاف رائے کا اظہار نہیں کرتے اور
ہ کبھی اس بات کا بچوں کو پتہ چلنے دیتے ہیں۔
مجھے گھرداری میں اور گھر سے باہر کام کرنے میں یکساں
ور برابر کی مسرت ہوتی ہے۔

پسندیدہ خوراک

لیکن میرا تفریحی مشغلہ کھانا پکانا ہے۔ مجھے بچپن سے کھانا پکانا
بہت پسند ہے۔ میں مچھلی سے انواع و اقسام کے اچھے اچھے کھانے
تیار کر سکتی ہوں جن کو میرا سارا کنبہ بڑے شوق سے کھاتا ہے
انھیں مربے اور میٹھی چٹنیاں بھی بہت پسند ہیں، چنانچہ میں اکثر
یہ چیزیں تیار کرتی رہتی ہوں جو بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں۔
انھیں بھی (ناشپاتی کی ایک قسم) کا مربہ بہت پسند ہے جو
میں اکثر تیار کرتی رہتی ہوں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتی کہ
اعلیٰ درجے کا کھانا پکا لیتی ہوں۔ لیکن میں اپنی طرف سے
کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔"

سب سے وقت کی کمی کا اس وقت بڑا شدید احساس
ہوتا ہے جب مجھے آرائشِ گیسو کے لئے جانا پڑتا ہے یا لباس
کی تیاری کے لئے درزی کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میں نے
آرائشِ گیسو کے لئے ایک عورت کو مخصوص کر رکھا ہے۔ مجھے اس کام
کے لئے صبح سویرے ۶ بجے کا وقت ہی ملتا ہے کیونکہ گھر کے کام
کاج اور وزارت کی ذمے داریاں ایسی ہیں کہ دوسرا کوئی وقت مل
ہی نہیں سکتا۔ جہاں تک درزی کا تعلق ہے وہ وعدہ
پورا نہ کرنے اور پروگرام منسوخ کرتے رہنے کا عادی ہو چکا ہے
میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت
اور دوروں میں ریڈی میڈ۔ سلے سلائے کپڑے خرید لوں لیکن
اگر ضرورت پڑے تو میں اپنا لباس خود بھی تیار کر سکتی ہوں۔
ادھڑے ہوئے کپڑوں کو سینے کا سارا کام اب بھی میں خود ہی کرتی
ہوں۔ گھر کے سب لوگوں کے کپڑوں میں بٹن بھی میں خود ہی
ٹانک لیتی ہوں۔"

تقریبات

جب بھی میرے شوہر کو مجھے چھیڑنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں
"کیا آپ ایک منٹ کے لئے اپنی وزارت کو چھوڑ کر میرا یہ بٹن
لگا دیں گی۔"؟

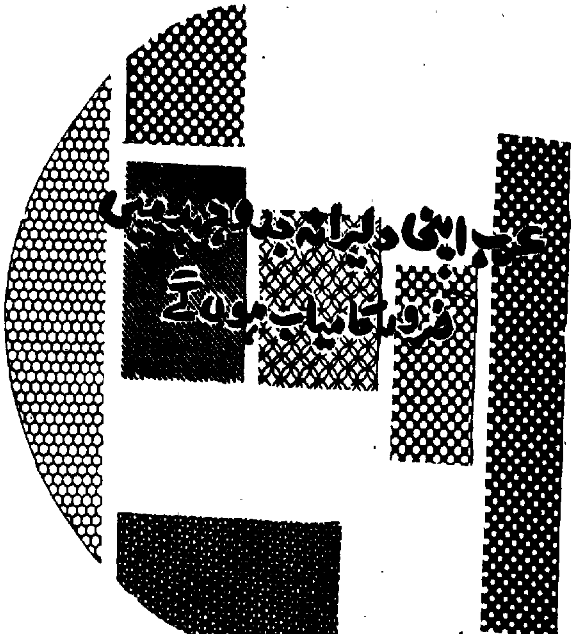
مجھے اتنا وقت نہیں ملتا کہ تقریبات میں یا دعوتوں اور ضیافتوں
میں اپنے شوہر کے ساتھ جا سکوں۔ لیکن ہم دونوں اس بات کی
انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ پندرہ دن میں کم از کم ایک بار ساتھ
کھانا کھا سکیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی اعلیٰ درجے
کے ہوٹل میں یا تہران کے کسی پرسکون فرحت بخش مقام پر تفریح
کے لئے جائیں اور چند لمحے فراغت اور سکون کے ساتھ گزاریں
لیکن اس وقت بھی کچھ لوگ مل جاتے ہیں جو اس بات کا احساس
نہیں کرتے کہ ہمیں چند لمحے سکون سے گزار لینے دیں۔ یہ لوگ ہماری
کھانے کی میز پر آ جاتے ہیں اور مجھ سے یا میرے شوہر سے اہم
امور پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ غرض ہمیں چین نہیں لینے
دیتے ―― جب میں رضا شاہ کبیر اسکول
میں ٹیچر تھی اور اس کے بعد جب میں ہیڈ مسٹرس ہو گئی تو مجھے
ایک عجیب پریشانی کا سامنا تھا۔ میرے بچے بھی اسی اسکول
میں پڑھتے تھے۔ ہر وقت وہ ہم سے شکایت کرتے کہ اگر وہ تعلیم
پر توجہ نہیں کرتے اور ان کا تعلیمی نتیجہ خراب ہوتا ہے تو انھیں
سزا ملتی ہے اور جب وہ محنت کرکے پڑھتے ہیں اور اچھے نمبر
حاصل کرتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی ماں ہیڈ مسٹرس ہے
اس لئے انکو اچھے نمبر ملے ہیں۔ جب تک میں اس اسکول میں
رہی مجھے اس دشواری کا سامنا رہا۔

اب جب میں وزیر بن گئی ہوں تو لوگ میرے شوہر کو
اور دوسرے رشتہ داروں کو ہر وقت پریشان کرتے رہتے ہیں
اور سمجھتے ہیں کہ ان پر دباؤ ڈال کر وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے
مسائل کو میرے ذریعے طے کرا لیں گے۔ جو لوگ میرے شوہر سے
اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ
میرے شوہر میرے دفتری فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں
اور میں ایک فرمانبردار مشرقی بیوی کی مانند ان کی ایسی تمام باتوں
کو مان لیتی ہوں۔

اگرچہ میرے شوہر فوجی افسر ہیں لیکن میرے مکان
میں فوجی نظم و ضبط کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں
کہ اس کے فوجی افسر ہونے کی وجہ سے گھر میں بڑا نظم و ضبط
ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس میرا شوہر بہت نرم دل ہے اور
بچوں کے بہت زیادہ قریب ہے۔ میرے مقابلے میں میرا شوہر
بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا ہے، تاہم اتنا ضرور ہے
کہ ہم سب لوگوں کو صبح ۶ بجے بستر سے اٹھا دیتا ہے۔ چھٹیاں
میں بھی وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اگر وہ
ایسا نہ کرتا تو شاید آج یہ عہدہ اور یہ پوزیشن مجھے حاصل نہ ہوتی

...ہوں اور میرے شوہر فوجی، لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی ہم اپنے عہدے کو بھول جاتے ہیں

ملاقات: نفیسہ ملی



ماہ جنوری کا عرب کیلنڈر

یکم جنوری ◀ اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی برائے مشرق وسطی بذریعہ ہوائی جہاز نیویارک پہونچتے ہیں اور عرب اسرائیل مذاکرات امن کے لئے میں تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

۲ جنوری ◀ صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور السادات ایک بڑی پریس کانفرنس میں اعلان کرتے ہیں کہ وہ جنگ بندی میں مزید توسیع کی اجازت نہیں دیں گے تاآنکہ سلامتی کونسل کی قرارداد کو جامہ عمل پہنانے کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا جائے۔

۳ جنوری ◀ عراق میں ناخواندگی دور کرنے کے لئے پندرہ سالہ مہم کا افتتاح دس اور پینتالیس سال کے اشخاص کے لئے تقریباً ۵۰۰ مرکز کھولے گئے ہیں جہاں تعلیم حاصل کرنے والے بارہ ہزار اشخاص کی گنجائش ہے۔ بغداد اور نواحی علاقوں کے لوگوں کو ٹیلی ویژن پر بھی درس دیے جائیں گے۔

۴ جنوری ◀ اسرائیل میں زبردست جنگی بجٹ پیش کیا جاتا ہے جس میں ۱۳ ارب ۳۰ کروڑ اسرائیلی پونڈ کی رقم جنگی مقاصد کے لئے مخصوص رکھی جاتی ہے۔ اسرائیل کا مجموعی خسارہ ایک ارب ۳۰ کروڑ ڈالر سے بڑھ کر ایک ارب ۴۴ کروڑ ڈالر تک پہنچ جائے گا۔

—— صدر نکسن کے مشرق وسطی میں طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لئے اسرائیل کو یقین دلایا کہ وہ اسرائیل کو برابر ہتھیار مہیا کرتا رہے گا۔

—— متحدہ عرب جمہوریہ نے مختلف ممالک کی راجدھانیوں کو اپنے ایلچی روانہ کئے تاکہ انھیں مشرق وسطی کے حقیقی حالات سے آگاہ کیا جا سکے۔

—— عراق نے اپنی فوج کی پچاسویں سالگرہ منائی اور صدر احمد حسن البکر نے فوج سے سلامی لی۔

۶ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ کے پارلیمانی مشن نے جس کی قیادت ڈاکٹر لبیب شقیر کر رہے تھے نئی دہلی میں صدر وی وی گری سے ملاقات کی اور ان کے روبرو مشرق وسطی کے حالات کی وضاحت کی۔

۷ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ۔ لیبیا۔ سوڈان اور شام کی مجوزہ فیڈریشن کے وزراء تعلیم کا دو روزہ اجلاس دمشق میں شروع ہوا۔

۸ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ اور اردن کے درمیان تجارتی معاہدے کے تحت دونوں ملک ایک دوسرے کو جو برآمد کرتے ہیں اسے ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۱۰ جنوری ◀ عرب لیگ کے زیر اہتمام ٹرپولی میں عرب موسیقی کانفرنس کا انعقاد —— کسی عرب ملک میں منعقد ہونے والی اپنی نوعیت کی یہ پہلی کانفرنس تھی۔

—— عرب لیگ کے سیکریٹری جنرل مسٹر عبد الخالق نے پہلی عرب ٹیکسٹائل نمائش کا افتتاح کیا۔ اس نمائش میں متحدہ عرب جمہوریہ۔ شام۔ سوڈان۔ تیونس۔ عراق اور لبنان نے شرکت کی۔

۱۳ جنوری ◀ سوڈان اور کویت کے لیڈروں نے تمام عرب علاقوں کے فوری طور پر مکمل انخلا کا مطالبہ کیا۔ صدر سوڈان نے میجر جنرل نمیری کے چار روزہ دورہ کویت کے بعد تک جاری کیا گیا۔ اس میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا برطانیہ خلیج فارس کے علاقے کو خالی کر دے اور اس کے باشندوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرے۔

—— سوویت روس کے صدر مسٹر پدگورنی قاہرہ

۱۵ جنوری ◀ اسوان بند کا افتتاح عمل میں اسی دن مرحوم صدر ناصر کا یوم پیدائش بھی تھا۔

۱۶ جنوری ◀ متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیر مسٹر نے مشرق وسطی سے متعلق اقوام متحدہ کے نمائندے گنار یارنگ سے ملاقات کی اور انھیں مشرق وسطی کے میں عرب موقف سے آگاہ کیا۔

۱۸ جنوری ◀ سعودی عرب نے خود اپنی سرکاری نیوز ایجنسی شروع کی جو خصوصی طور پر مشرق وسطی کے میں صحیح خبریں مہیا کرے گی۔

—— عرب شہری فضائیہ کی کونسل نے ہوائی جہازوں کی ہائی جیکنگ کی مذمت کی اور کہا کہ یہ غیر قانونی ہیں۔ یہ کونسل نے جس کا ایک ہفتے تک قاہرہ میں اجلاس رہا تمام عرب ریاستوں پر زور دیا ہے کہ مستقبل میں ہوائی جہازوں کے اغوا کی وارداتوں کو روکنے کے لئے مؤثر اقدامات کریں۔

—— صدر سوویت روس مسٹر پدگورنی نے اپنے میں امید ظاہر کی کہ عرب لوگ اپنی دیرینہ جدوجہد میں کامیاب ہوں گے۔

—— عرب لیگ کے ہیڈکوارٹر میں پہلی عرب انشو

افتتاح ہوا جس میں تمام عرب ممالک کے ۳۵ انشورنس کمپنیوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ عرب لیگ کے سکریٹری جنرل مسٹر عبدالخالق حسونہ نے بیمہ کے میدان میں عربوں کے درمیان اشتراک و تعاون پر زور دیا۔

۲۰ جنوری ◀ تریپولی چارٹر میں شامل چار ممالک متحدہ عرب جمہوریہ سوڈان۔ لیبیا اور شام۔ کی چوٹی کانفرنس قاہرہ میں شروع ہوئی۔

نئی دہلی میں ہند اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان تجارتی بات چیت کا آغاز ہوا۔

۲۱ جنوری ◀ تریپولی چارٹر میں شامل ممالک کا بند کمرے میں اجلاس۔

صدر فرانس مسٹر پومپیڈو نے کہا کہ "اسرائیل ان علاقوں کو خالی کرنے کا پابند ہے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔

۲۲ جنوری ◀ بیروت میں انکشاف ہوا کہ فلسطینی فدائین کی جاسوسی کرنے کے لئے اسرائیل نے ایک جال بچھا رکھا ہے جس میں خاص طور سے عورتوں کو بھرتی کیا گیا ہے۔

۲۳ جنوری ◀ تیونس کے صدر مسٹر حبیب بورقیبہ نے واشنگٹن میں وزیر خارجہ مسٹر راجرس سے کہا کہ "اگر جلد از جلد فلسطینی مہاجرین کے مسئلے کا کوئی منصفانہ حل معلوم نہ کیا گیا تو مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن ممکن نہیں۔"

کویت میں عام انتخابات شروع۔

چلی کے صدر ڈاکٹر ایس۔ ایلنڈے نے مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنے ملک کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے عربوں کے موقف کی حمایت کی۔

۲۴ جنوری ◀ لیبیا کے وزیر اعظم کرنل معمر القذافی نے اعلان کیا کہ جلد ہی صدر کے انتخاب کے لئے عام رائے شماری ہوگی۔

اردن کی قومی معیشت کے وزیر عمر نابلسی کی قیادت میں اردن کا ایک تجارتی وفد نئی دلی پہنچا اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو بڑھاوا دینے کے لئے ہندوستانی افسروں سے بات چیت کی۔

۲۵ جنوری ◀ حبشہ کے شہنشاہ ہیلا سلاسی نے عرب استوں کی حمایت کا اعلان کیا۔

—— کرنل قذافی کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ وہ عہدۂ صدارت کے انتخاب میں کھڑے ہوں گے۔

۲۶ جنوری ◀ پولینڈ نے اعلان کیا کہ وہ عربوں کے موقف سے پوری طرح ہمدردی رکھتا ہے اور وہ عرب عوام کی حمایت کرے گا۔

—— اردن نے سلامتی کونسل کے صدر کو سات نکاتی تجاویز پیش کیں جن میں عرب علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔

۲۷ جنوری ◀ عرب لیگ نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ اسرائیل ہیبرون (خلیل) کے شہر کو یہودیوں کے شہر میں بدل دینا چاہتا ہے اور وہاں اس نے بڑی تعداد میں یہودیوں کو بسانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ عرب ملکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ تمام ممالک کو اسرائیل کے اس ناپاک منصوبے سے باخبر کریں۔

—— کویت کے حکمراں نے شیخ جابر الاحمد الصباح کو نئی حکومت بنانے کی ہدایت کی۔ انتخاب کے نتیجے سے معلوم ہوا کہ قومی اسمبلی کے پچاس ممبروں میں پندرہ نئے ممبر منتخب ہوئے۔

۲۸ جنوری ◀ یروشلم کے مشیر نے اعلان کیا ہے کہ اسرائیل اردن کے مقبوضہ مغربی کنارے کے مزید دیہات کو بیت المقدس میں شامل کر کے اسے اور وسعت دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

—— وزیر اعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر نے طالب علموں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل ہرگز ان علاقوں کو خالی نہیں کرے گا جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔

—— سعودی عرب کے وزیر تجارت نے جدہ میں اعلان کیا کہ حکومت نے سعودی عرب میں صنعتی سیکٹر کو ترقی دینے کے لئے نئے اقدامات کئے۔ باہر سے منگائی جانے والی بہت سی خام اشیاء، مشنری اور فالتو پرزوں پر کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔

دنیا دوربین کی نظر میں

پاکستان میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا

پاکستان

پاکستان میں گورنر مشرقی پاکستان مسٹر ایس ایم احسن کی برطرفی اور آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کا غیر معینہ عرصے کے لئے التوا تعجب خیز نہیں ہے۔ ابتداء ہی میں صدر پاکستان جنرل یحییٰ خاں نے شرط لگا دی تھی کہ اگر ۱۲۰ دن کے اندر آئین تیار نہ ہوا تو اسمبلی توڑ دی جائے گی اور پھر از سر نو انتخابات کرائے جائیں گے لیکن اسمبلی کے اجلاس شروع ہونے سے پہلے ہی یہ پتہ چل گیا کہ مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ اور مغربی پاکستان کی پیپلز پارٹی اور دوسری پارٹیوں کے درمیان بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ شیخ مجیب الرحمان۔ صدر عوامی لیگ بضد ہیں کہ جو بھی آئین تیار ہوگا وہ ان کے چھ نکات کی بنیاد پر تیار ہوگا جبکہ مغربی پاکستان کی پارٹیاں جن میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ قیوم گروپ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہتی ہیں کہ اگر مجیب الرحمان کے چھ نکات کی بنیاد پر آئین تیار ہوا تو ملک کی سالمیت ختم ہو جائے گی اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے گی جس پر کہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ لہٰذا وہ اس معاملہ میں شیخ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گی اور اسمبلی کا بائیکاٹ کر دیں گی۔ ان چھ نکات کا مقصد صوبوں کو مکمل خودمختاری دینا اور مرکز کو تمام کلیدی اختیارات سے جن میں ٹیکس لگانے کا اختیار بھی شامل ہے محروم کرنا ہے۔

پچھلے دنوں جب شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر بھٹو کی ملاقات کے پروگرام کا اعلان ہوا تھا تو یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کی بڑی پارٹیاں باہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گی اور ان بنیادوں پر مصالحت ہو سکے گی جن پر کہ آئین کی تیاری عمل میں آئے گی۔ لیکن یہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے لیڈر اپنے بنیادی اختلافات کو دور نہ کر سکے۔ شاید یہ اختلافات دور ہو بھی نہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ شیخ مجیب الرحمان نے جس بنیاد پر الیکشن جیتا اس پر وہ قائم رہنے کے پابند ہیں یوں بھی جب ۳۰۰ ممبروں کی قومی اسمبلی میں انھیں ۱۶۰ سیٹیں حاصل ہوں تو ان کا رویہ قدرتی طور پر سخت ہونا چاہئے۔ طاقت خود بخود رویہ سخت بنا دیتی ہے مگر دوسری طرف مغربی



صدر یحییٰ خان — جو نہیں چاہتے کہ پاکستان میں عوامی حکومت قائم ہو

پاکستان میں مسٹر بھٹو کی بھی اپنی طاقت ہے۔ ان کی پارٹی کو ایوان اسمبلی میں مغربی پاکستان کی تمام دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں زیادہ یعنی ۸۱ سیٹیں حاصل ہیں۔

دونوں پارٹیوں کے رویہ میں تھوڑی لچک ہوتی تو مفاہمت کوئی مشکل نہ تھی لیکن ہر ایک پارٹی اپنے اپنے موقف پر سختی سے قائم رہی، اور نتیجہ میں صدر پاکستان کو اسمبلی کا اجلاس عرصہ غیر معینہ کے لئے ملتوی کر دینا پڑا یہی نہیں بلکہ مشرقی پاکستان کے گورنر کی جگہ جو صرف چھ دن پہلے اسلام آباد میں صوبائی گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد صدر یحییٰ کا پیغام خیر سگالی شیخ کے نام لے کر گئے تھے لفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ محمد یعقوب خاں کو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا ہے سابق گورنر مسٹر ایس۔ ایم احسن نے شیخ مجیب الرحمان کو ایک باوقار سیاستدان قرار دیا تھا شاید اسی کی سزا انھیں مل رہی ہے کہ وہ اپنے عہدہ سے الگ کر دیئے گئے۔

قومی اسمبلی کے غیر معینہ عرصے کے لئے التوا کا قدرتی طور پر مشرقی پاکستان میں سخت رد عمل ہوگا اور مظاہرے اور احتجاجی جلسے ... تشدد کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں جہاں بھاشانی جیسے انتہا پسند لیڈر موجود ہوں وہاں کیا کچھ ممکن نہیں لیکن اگر ایسا ہوا تو مشرقی پاکستان کے رہنما ایک جمہوری حکومت قیام میں مزید تاخیر کا سبب بنیں گے اور موجودہ حکمرانوں کو اسمبلی کا اجلاس اور زیادہ دنوں تک ملتوی رکھنے کا عذر مل جائیگا

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کے لئے اس بات پر افسوس ضرور ہے کہ پاکستان میں عوامی جمہوریت کے قیام میں بعض چند لیڈروں کے سخت رویہ کی بنا پر تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن یہ پاکستان کا اپنا اندرونی معاملہ ہے ہندوستان کو اس میں کسی نوعیت سے بھی ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ صدر یحییٰ نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کی جو ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہیں وہ ایک بالکل بے جوڑ بات ہے اصل وجہ وہی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیڈر الگ الگ راستوں پر چل رہے ہیں۔ اور ایسی صورت حال صرف اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اقتصادی ترقی کی دوڑ میں مشرقی پاکستان پیچھے رہ گیا ہے اور زیادہ فائدہ مغربی پاکستان اور مغربی پاکستان میں بھی صرف پنجاب کے لوگوں کو پہنچا ہے۔ اقتصادی امور میں نابرابری سے مختلف علاقوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی ہے اسے آج کل کے اس مادی دور میں مذہبی رشتوں کا حوالہ دے کر دور کرنا ممکن نہیں ہے اگر آج مشرقی پاکستان میں حالات ناموافق ہیں تو اس کی تمام تر ذمہ داری مغربی پاکستان کے ان حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے ... اور اقتصادی ترقی میں اس کا حصہ نہ لیا۔ اور نتیجہ میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ اس مطالبہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مارشل لا کے تحت پولیس اور فوج کی طاقت سے اسے کچھ عرصے کے لئے دبا دیا جائے۔ پاکستان میں ایک وفاقی حکومت ہی دونوں حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک رکھ سکتی ہے۔

ترکی

۱۹۴۶ء میں جب امریکی بحری جہاز مسوری استنبول پہنچا تو امریکی ملاحوں کی وہ آؤ بھگت ہوئی کہ اس سے پہلے کسی کی نہ ہوئی تھی۔ اپنی ضرورت کی جو چیزیں وہ خریدتے

یہ امریکی بیڑے کا قحبہ خانہ نہیں ہے

ان سے اس کی قیمت تک نہ لی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں طوائفوں نے بھی ان کے لئے اپنے دروازے مفت کھول دیئے تھے۔

بات یہ تھی کہ گزشتہ ۳۰۰ برس کے دوران ترکی کے ساتھ تیرہ جنگیں لڑنے کے بعد روس ایک مرتبہ پھر باسفورس اور درہ دانیال کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا۔ بیس برس تک امریکیوں کی خوب خاطرداری ہوتی رہی۔ اور امریکہ نے اس محبت کا جواب ۵ ارب ڈالر کی فوجی اور اقتصادی امداد کی صورت میں دیا۔ دونوں ملکوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی اور دونوں اس حد تک شیر و شکر ہو گئے کہ جب امریکا نے اشارہ دیا تو ترکی نے ۱۹۵۰ء میں ڈھائی ہزار فوجیوں پر مشتمل اپنا ایک بریگیڈ کوریا بھیج دیا۔



طلباء امریکہ کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے۔

لیکن ۱۹۶۹ء تک جب امریکا کا بحری جہاز فورسٹال استنبول پہنچا تو فضا بالکل بدل چکی تھی۔ امریکی مخالف ہجوموں نے کئی امریکی ملاحوں کو باسفورس کے پانی میں پھینک دیا اور ترک خواتین نے ان تختیوں سے امریکی جہاز کا استقبال کیا جن پر لکھا تھا "استنبول چھٹے امریکی بحری بیڑے کا قحبہ خانہ نہیں ہے"۔

ابھی پچھلے چند ہفتوں میں امریکی دفاتر، امریکی مکانات اور امریکی تنصیبات پر بم پھینکے گئے۔ دو ہفتے قبل انقرہ کے نزدیک پانچ ترک نوجوانوں نے ایک امریکی ہوا باز کو اغوا کر لیا اور ۱۷ گھنٹے بعد اسے چھوڑا۔ ایسی ہی اور بھی بہت سی وارداتیں ہو رہی ہیں جن میں بتایا جاتا ہے "انقلابی تحریک نوجوانان" کے آدمی ملوث ہیں۔

وزیراعظم سلیمان دیمرل ان انقلاب پسندوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرتے جھجکتے ہیں کہ مبادا ظلم و زیادتی کے لئے بدنام ہو جائیں اور ان کا بھی حشر ہو جو وزیراعظم عدنان مینڈریس کا ہوا تھا۔ (انھیں پھانسی دیدی گئی تھی)

اسرائیل

اسرائیل سرحدوں میں رد و بدل کی شرط کے ساتھ مقبوضہ عرب علاقے خالی کرنے کے لئے تیار ہے لیکن بیت المقدس کو خالی کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سے اقوام متحدہ دو بار اسرائیل کے ساتھ بیت المقدس کے الحاق کے خلاف احتجاج کر چکی ہے اور گذشتہ ہفتہ سکریٹری جنرل او تھانٹ نے پھر شکایت کی لیکن اسرائیل کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگتی۔ اس نے بیت المقدس کو اسرائیل کے نظم و نسق میں لے لیا ہے۔ اور علانیہ عالمی رائے کو ٹھکرا رہا ہے۔

اپنے قبضہ کو اور مضبوط کرنے کے لئے اس نے بیت المقدس میں بہت بڑے پیمانے پر تعمیرات کے ناپاک منصوبہ پر عمل شروع کر دیا ہے۔ گذشتہ ہفتے اسرائیل کے وزیر تعمیرات زیو شریف نے اعلان کیا کہ حکومت شہر کے تین نواحی علاقوں میں ایک لاکھ اشخاص کیلئے مکانات تعمیر کرے گی۔ یہ بھی کہا "حکومت اسرائیل اس بات کا عزم کئے ہوئے ہے کہ یروشلم (بیت المقدس) ہر حالت میں ایک یہودی شہر رہے"۔

جن مقامات پر مکانات تعمیر ہو رہے ہیں ان میں ۲۸۰۰ فٹ بلند نبی سموال نامی پہاڑی بھی شامل ہے۔ یہاں دس ہزار مکانات کی تعمیر کا منصوبہ ہے۔ کہتے ہیں صلیبی جنگ لڑنے والوں نے پہلی بار اسی پہاڑی سے شہر کو دیکھا تھا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء میں یہ پہاڑی اردن کا ایک مورچہ تھی۔ جہاں سے اردنی توپوں نے نئے یروشلم کے یہودی علاقہ پر گولے برسائے تھے۔ اسرائیل اب اس پہاڑی پر مکانات تعمیر کر کے گولہ باری کے خطرے کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہتا ہے۔

مزید تین ہزار مکانات اس علاقہ میں تعمیر کئے جا رہے ہیں جو گورنمنٹ ہاؤس کے نام سے موسوم ہے اور جہاں کسی زمانے میں برطانوی انتداب کا صدر مقام تھا۔ فرانسیسی پہاڑی اور فرنچ ہل پر ۲۰۰۰ مکانات تعمیر کے بعد یہودی خاندانوں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے متعدد علاقوں میں بھی مکانات تعمیر ہو رہے ہیں جن میں یہودیوں کو بسایا جائیگا اور چند مکانات عربوں کو دے دیئے جائیں گے۔ چار لاکھ ایکڑ زمین جن میں سے بیشتر عربوں کی ملکیت ہے مکانات کی تعمیر کیلئے حاصل کر لی گئی ہے۔

[illegible] انتہائی تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے کہ اس [illegible] کی ضرورت نہیں سمجھی جلد ہی جس کی [illegible] پیدا ہو گئی ہے۔ گذشتہ ہفتہ [illegible] مظاہرہ کیا اور نعرے لگائے [illegible] خوبصورت بھی کیوں نہ بنایا



اسرائیل کی تعمیر کردہ نئی عمارتیں

اسرائیل چاہتا ہے کہ بیت المقدس ایک یہودی شہر میں بدل [illegible]

واقعات ڈھیر علی

ئے "مطالبہ یہ تھا کہ مکانات کے پہلے نقشے تیار کراؤ، پھر تعمیر شروع کرو۔ لیکن حکومت کا واضح جواب یہ ہے کہ امن مذاکرات اسرائیلی توقعات سے زیادہ تیزی کیساتھ بڑھ رہے ہیں پھر مکانات کی تعمیر بھی نہ تیز ہو۔ اصل میں صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر سادات کی نئی پالیسی نے اسرائیل کو ڈپلومیٹک اعتبار سے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔۔۔

اسرائیل چاہتا ہے کہ امن مذاکرات کا کوئی نتیجہ نکلنے سے قبل وہ بیت المقدس کو ایک یہودی شہر میں تبدیل کر دے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اسی لئے وہ دھڑا دھڑ عمارتیں تعمیر کر کے یہودیوں کو بسا رہا ہے لیکن کیا دنیائے عرب، دنیائے اسلام اور انصاف پسند دنیا اس بات کو تسلیم کرے گی کہ بیت المقدس پر اسرائیل کا ناجائز قبضہ باقی رہے؟۔

مشرق وسطیٰ!

مشرق وسطیٰ کی صورت حال کے بارے میں صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور السادات نے نیوز ویک کے سینیئر ایڈیٹر آرنوڈ ڈی بورچ گریو کو جو طویل انٹرویو دیا ہے اس کا بیشتر حصہ اسی اشاعت میں درج کیا جاتا ہے۔ اس انٹرویو کی ابھی متحدہ عرب جمہوریہ کی طرف سے تصدیق ہونا باقی ہے۔ لیکن اگر مسٹر انور السادات نے ایڈیٹر نیوز ویک کے مطابق جو کچھ کہا وہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ سے متعلق

عرب علاقے خالی نہ کئے گئے تو ایک جنگ اور لڑی جائے گی۔

متحدہ عرب جمہوریہ کی پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔

مرحوم صدر ناصر اسرائیل کو نہر سوئز یا آبنائے طیران میں جہاز رانی کی آزادی اور شرم الشیخ میں اقوام متحدہ یا چار بڑے ممالک کے فوجی دستوں کو متعین کرنے پر رضامند نہ تھے۔ لیکن انٹرویو سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر انور السادات اس کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ اسرائیل ان تمام عرب علاقوں کو خالی کر دے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلہ کو مناسب طور پر حل کرنے کے لئے قدم اٹھائے۔

یہی نہیں بلکہ مسٹر سادات اس حد تک آگے چلے گئے ہیں کہ انھوں نے تمام پناہ گزینوں کی ان کے اصلی مقامات میں واپسی کا مطالبہ ترک کر دیا ہے اور فلسطینیوں کو معاوضہ دینے اور غزہ اور دریائے اردن کے جنوبی علاقے میں ایک مناسب تجویز قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ خود فلسطینیوں کی اس بارے میں رائے لے لی جائے۔

شاید انھوں نے یہ پالیسی اس لئے اپنائی ہے تاکہ دنیا پر اسرائیل کے ناپاک ارادے ظاہر ہو جائیں اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اسرائیل معاہدہ امن کی جو رٹ لگا رہا ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے اور حقیقت میں وہ نہ امن چاہتا ہے اور نہ ان علاقوں کو خالی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ دراصل اسرائیل اپنے احساس ... میں بھی ... اندھا ہو رہا ہے۔

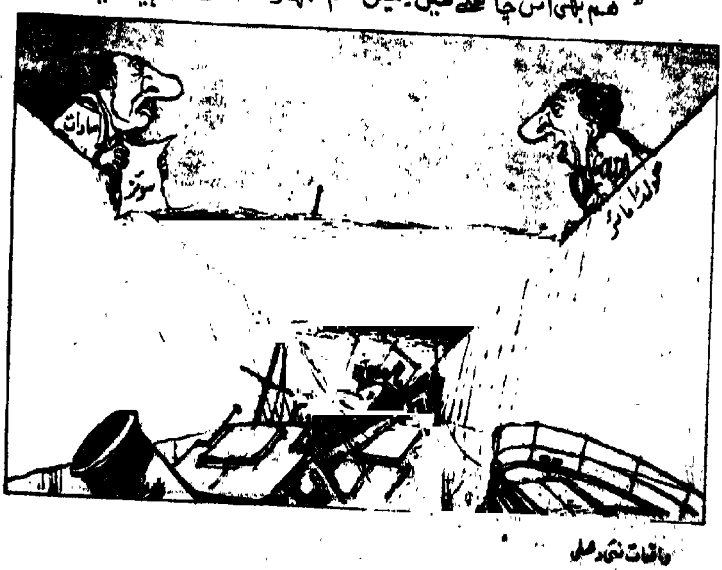
اور اسے غلط فہمی ہے کہ وہ عرب فوجوں کو اسی طرح شکست دے سکتا ہے جس طرح کہ اس نے ۱۹۶۷ء میں انھیں شکست دی تھی۔ لیکن مسٹر سادات کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کی فوجیں پہلے کے مقابلے میں کہیں ... ہیں اور وہ اسرائیل سے ٹکر لے سکتی ہیں۔ لیکن یہ ٹکر لینے ... یا ناکام ہونے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ آزادی اور علاقائی ... کے تحفظ کا سوال ہے۔ جس کیلئے کمزور سے کمزور قوم بھی قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں تمام ... قوموں کے لئے ویٹ نام کے باشندوں کی جنگ آزادی ... ہے۔ وہ دس سال سے امریکہ جیسی بڑی طاقت سے ... رہے ہیں اور عظیم نقصانات کے باوجود انھوں نے آج ... شکست تسلیم نہیں کی وہ اپنی غلامی پر اپنی موت کو ترجیح ... یہی حال ہم مشرق وسطیٰ کے عرب عوام میں بھی دیکھ رہے ...

مگر یہ اچھا ہے کہ مسٹر انور السادات نے ڈپلو... مار دینے کی پالیسی اپنائی ہے اور انھوں نے تاش کے ... میز پر ڈال دیئے ہیں۔ دیکھنا اسرائیل اب کیا نئی چال ... اور کن بنیادوں پر امریکہ اسکی مدد جاری رکھتا ہے۔ ... واضح ہے کہ اس نے مقبوضہ عرب علاقے خالی نہ کئے ... بیت المقدس شامل ہے تو مشرق وسطیٰ میں ایک ... لڑی جائے گی اور اس وقت ان ممالک کی ہمدردیاں ... کے ساتھ ہوں گی جو اب تک اسرائیل کا دم بھرتے ہیں ... کے سامنے اس وقت صرف ایک مسئلہ ہے اور وہ ... وہ کہتے ہیں "میں ایک وقت میں صرف ایک مسئلہ ... ہوں، جبکہ مرحوم ناصر بیک وقت بہت سے مس... سکتے تھے کیونکہ ان کے اپنے ذہن کے لئے ایک ... تھا۔ لیکن میں صرف اسرائیل سے نمٹنے کی کوشش ... اور اسرائیل سے نمٹنے کا انھوں نے یہ انداز اختیا... پہلے اسے ڈپلومیٹک میدان میں شکست دے دی ... کے بعد ضرورت پڑے تو اسے میدان جنگ میں ...

آئرلینڈ

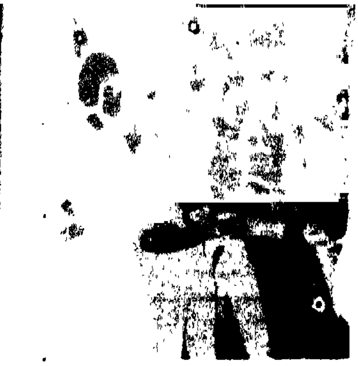
مشہور ہے انسان جیسا بوتا ہے ویسا ...

"ہم بھی امن چاہتے ہیں۔ لیکن ہم تمہارے علاقے خالی نہیں کریں گے۔" گولڈا مائر



ملاقات نتیجہ خیز

...ب کے نام پر فسادات روزی کا معمول بن گئے ہیں





لینڈ کی لڑائی بڑے پیمانہ پر گوریلا جنگ میں تبدیل نہ ہو جائے۔ بیلفاسٹ کے ایک ایڈیٹر نے وارننگ دی ہے کہ آنے والے مہینوں میں اور زیادہ تشدد کا امکان ہے۔ اور اگر کسی چیز کا امکان نہیں ہے تو وہ ہے امن و امان" ——



امراج کا جہاں جہاں غلبہ رہا وہاں اس نے لوگوں کو ی مذہب کی بنیاد پر اور کبھی زبان کی بنیاد پر —— اؤ اور حکومت کرو" کی بنیادی پالیسی بنالی۔ اسا سی بنیاد پر ہندوستان کے دو ٹکڑے کرائے گئے۔ لیکن آج ا اپنے گھر میں مذہب کی بنیاد پر ایسے جھگڑے ہو رہے ہیں انے کی تاریخ سامنے آگئی ہے کہ جب پروٹسٹنٹ اور یک دوسرے کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔

مالی آئرلینڈ میں مذہبی بنیاد پر جھگڑے دو سال کے ہیں رہیں ہوئے ہیں معمولی معمولی بات پر جذبات اتنے ہانے ہیں کہ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ ٹ کے شہر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آج وہ رنج و غم ن کر رہ گیا ہے۔ اور وہاں کے باشندے مسرت و شادمانی ا ہو چکے ہیں اب سے چند ہفتے پہلے اس وقت تشدد ات شروع ہوئے جب برطانوی فوجوں سے پر ایک کار سے ایک پانچ سالہ کیتھولک لڑکی ٹکرا کر جاں بحق ہو ب گیا تھا کیتھولک ہجوم نے برطانوی فوجیوں پر سنگباری ا اور انکی گاڑیوں کو جلا ڈالا یہی نہیں بلکہ کیتھولک ے نے گھات لگا کر فائرنگ شروع کر دی —— دوسرے دن ی علاقوں میں بھی دہشت زدگی پھیل گئی اور گیارہ اشخاص کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

الت اس درجہ خطرناک ہے کہ شبہ ہے کہ کہیں شمالی آئر

اٹلی

اٹلی میں فسطائی جماعتیں پھر سر اٹھا رہی ہیں۔ نئی فسطائی جماعت کے لیڈر ہیں جارجیا المیرانتے۔ انہوں نے اپنے چیلوں کے ایک جلسۂ عام میں کہا کامریڈ اور ساتھیو! ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اب صرف ہمارا ہی خون نہیں بہے گا" اور یہ فسطائی لیڈر کی خالی خولی دھمکی ہی نہیں تھی بلکہ جس وقت وہ دھمکی دے رہا تھا اسی وقت جنوبی اٹلی کے ایک شہر میں بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے مظاہرین پر دستی بم پھینکا گیا جس کے نتیجے میں ایک سوشلسٹ ہلاک اور ۱۲ زخمی ہو گئے۔ میلان کے ایک ۸۰ سالہ وکیل نے مسولینی کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں پچاس سال پہلے کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔ کالی قمیصیں اور ڈنڈے کا رکھ پھر نظر آنے لگے ہیں صرف کاسٹر آئل کی کمی ہے۔ جو مسولینی کے جوان اپنے دشمنوں کے گلوں میں زبردستی ڈالا کرتے تھے"

یہ نئی فسطائی جماعت اگرچہ اب سے بیس سال قبل قائم ہوئی تھی اور ۹۵۲ ممبروں پر مشتمل پارلیمنٹ میں اسے ۲۷ سیٹیں حاصل ہیں لیکن اس کی اصل سرگرمیاں وہ ہیں جن کے پروگرام خفیہ بنتے ہیں اور جن پر پارٹی کے پانچ ہزار سے دس ہزار تک تربیت یافتہ جوان عمل کرتے ہیں۔

ان جوانوں نے تشدد کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اگرچہ مذکورہ فسطائی جماعت ان نوجوانوں سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ المیرانتے اور اس کے ساتھی ان لوگوں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں، مدد کرتے ہیں۔ المیرانتے جن کی عمر اس وقت ۵۶ سال ہے مسولینی کی کابینہ میں شامل تھے فسطائیوں نے ۱۹۷۱ء میں دورنگی پالیسی اختیار کی ہے۔ ان کا ایک بازو پارلیمنٹ میں ہے جو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے اور ان کا دوسرا بازو سڑکوں پر ہنگامے برپا کرتا ہے اور قتل و غارتگری میں حصہ لیتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اٹلی میں فسطائیوں کا غلبہ ہونے والا ہے۔ عام لوگ فسطائی دہشت پسندوں کو علیحدگی پسند پاگل کہتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ ان کی جمہوریت دشمن سرگرمیاں کامیاب نہیں ہوں گی۔

اطالوی وزیر اعظم امیلو کولمبو نے گذشتہ ہفتے اپنی کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبروں کے روبرو جو تقریر کی اس میں انہوں نے کہا۔

"ہمیں یقین ہے کہ ایک ملک جس کے دستور کی بنیاد فسطائیت کے خلاف جنگ پر رکھی گئی ہے فسطائیت کے احیاء کے امکان سے باخبر و ہوشیار رہے گا"

حکومت اٹلی فسطائی تحریک سے باخبر ہے اور عوام بھی باخبر ہیں۔ وہ فسطائیت کے خطرناک نتائج دیکھ چکے ہیں اور دوبارہ اس کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ ——

عام لوگ فسطائی دہشت پسندوں کو علیحدگی پسند پاگل کہتے ہیں

واقعات نئی دہلی



...جو جماعتیں عوام کی سماجی اور معاشی ترقی کا کوئی پروگرام نہیں رکھتیں

...وہ بھولے بھالے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرتی ہیں!

مسائل

فرقہ وارانہ ہنگامے

الیکشن کی ہلچل ختم ہو گئی۔ بعض پہاڑی اور برفیلے علاقوں کے علاوہ سبھی جگہوں کے عوام نے نئی حکومت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ انتخابات مجموعی طور پر پُرامن رہے البتہ کہیں کہیں ہنگامہ آرائیاں ہوئیں — ہندوستان جیسے پسماندہ اور ناخواندہ ملک میں اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں تعجب خیز نہیں ہیں۔

لیکن تعجب خیز بات اس وقت ہوتی ہے جب ان ہنگامہ آرائیوں کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے۔ جمہوریت کے قیام کے بعد سے عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ الیکشن کے موقعے پر معمولی معمولی تنازعات کو فرقہ وارانہ نوعیت دے دی جاتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اسی قسم کی مذموم کوشش کی گئی اور علی گڑھ جیسے مقامات پر اچھے خاصے بڑے پیمانے پر ہنگامہ برپا کیا گیا۔

اس قسم کی حرکتیں اصل میں وہ جماعتیں کرتی ہیں جو عوام کی سماجی اور معاشی ترقی کا کوئی پروگرام نہیں رکھتیں — وہ بھولے بھالے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکاتی اور فرقہ وارانہ نفرت کی بنیاد پر ووٹ حاصل کرتی ہیں، کہیں کہیں انھیں کامیابی بھی ہو جاتی ہے —

لیکن اطمینان کی بات ہے کہ اب عوام میں خود بخود ان کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور وہ یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ سرمایہ پرست طبقوں کی چالیں ہیں جو ملک کی دولت کے بڑے حصے پر کالے ناگ بنے بیٹھے ہیں وہ اس لئے فسادات کراتے تاکہ عوام ان سے اپنا حصہ طلب نہ کر سکیں اور انھیں اپنا "دیوتا" سمجھتے رہیں۔

الیکشن میں بہت ہی دل خوش کن مثالیں بھی سامنے آئیں، مثلاً بیشتر حلقوں میں ہندو مسلمانوں اور ہر طبقے کے لوگوں کو کاندھے سے کاندھا ملا کر مشترکہ امیدوار کی حمایت میں دیکھا گیا۔ اس سے ان چند ہنگاموں کی تلافی ہو جاتی ہے جو فرقہ پرستوں اور تنگ نظروں نے کرائے۔ آخر میں کامیابی ان ہی لوگوں کو ہوگی کیونکہ جو پارٹی بھی اپنی جیت کی بنیاد فرقہ وارانہ ہنگاموں پر رکھتی ہے وہ حقیقت میں اپنی کمزوریوں کا اظہار کرتی ہے اور زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنی موت آپ مر جائے گی یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ فسطائیت کا نہیں۔ آنے والے انتخابات کے نتائج سے مرنے والی کچھ جماعتوں کا اندازہ ہو سکے گا۔ ■■

بنگال

دہشت پسندوں کی شکست

بنگال میں مقررہ پروگرام کے مطابق انتخابات عمل میں آئے۔ اگر نہ آتے تو حقیقت میں یہ ان عناصر کی کامیابی ہوتی جو



جیوتی باسو — ایک ہفتہ میں تین قاتلانہ حملے

انتخابات پر یقین نہیں رکھتے۔ مسز گاندھی نے بالکل سچ کہا تھا کہ تشدد پسند عناصر سے بہرحال مقابلہ کرنا ہوگا خواہ اس وقت مقابلہ کیا جائے یا بعد کو۔ اور یہ بہتر ہے کہ اسی وقت دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ بنگال میں انتخابات تشدد پسند عناصر کی بہت بڑی شکست ہے اور مسز اندرا گاندھی کی بہت بڑی کامیابی کہ انہوں نے دہشت گردی کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس سے مسز اندرا گاندھی اور کانگریس دونوں کا وقار بڑھ گیا۔ اور اب یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نئی کانگریس کو اطمینان بخش کامیابی حاصل ہوگی۔ یوں بھی بنگال میں کانگریس کی بدنام حکمرانی کی تمام تر ذمہ داری ان کانگریسیوں پر ہے جن کا تعلق سنڈیکیٹ کانگریس سے ہے ان کی علیحدگی کے بعد عوام میں کانگریس کے تئیں ایک اعتماد کی نئی فضا پیدا ہو گئی ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں عوام کی بہت بڑی تعداد بائیں بازو کی ان پارٹیوں سے بدظن ہو گئی جن کے اقتدار کے دوران عوام کی امنگیں پوری نہ ہو سکیں ان پارٹیوں میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے پچھلے الیکشن میں کامیابی کی بنا پر اسمبلی میں اس نے ۸۰ سیٹیں حاصل کی تھیں (بائیں بازو کی سب سے بڑی پارٹی

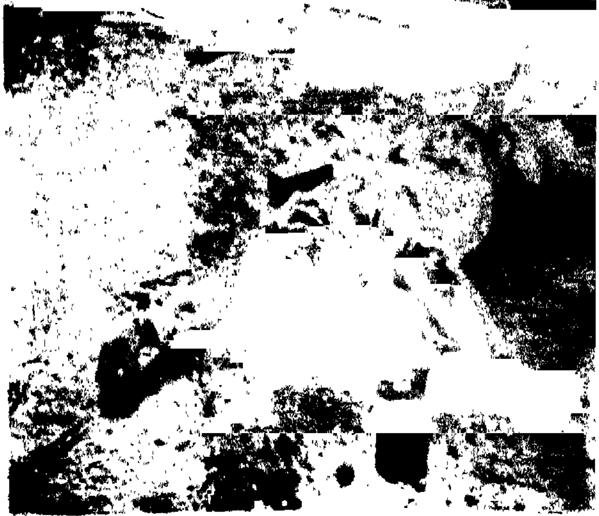


اجائے بابو — سیٹ خطرے میں

...عوام اب اِن سرمایہ داروں اور ملک دشمن عناصر کی چالوں کو سمجھ گئے ہیں

(واقعات نئی دہلی)

میں پولیس اور فوج کے سائے تلے انتخابات



بنگال ـــ انقلاب؟ یا دہشت پسندی ـــ

ی تھی لیکن اس مرتبہ اس نے تشدد پسندی کا جو
اپنایا اس سے اس کی پوزیشن گر گئی ۔ دیکھنا یہ ہے
جائیگا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔



ہندوستان میں الیکشن کے پوسٹر لگے تھے تب
لندن بازار کے پوسٹر لگ رہے تھے ـــ

الیکشن کے بعد مغربی بنگال میں جہاں اسوقت صدارتی حکومت ہے خواہ کوئی جماعت بھی حکومت قائم کرے اس کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ ریاست میں امن وانتظام کی طرف توجہ دے اور اس غیر یقینی حالت کو ختم کرے جو دہشت گردی اور قتل وغارتگری کی بنا پر پیدا ہو گئی ہے ۔ جو حکومت بھی اس مقصد میں کامیاب ہوگی وہ عوام کا دل جیت لے گی۔ کیونکہ یہ عوام نہیں بلکہ چند سر پھرے لوگ ہیں جو جمہوریت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں ما رکسسٹ کمیونسٹ شاید سب سے زیادہ جیتیں یا سب سے زیادہ جیتی پارٹی ہو گی جو علانیہ انتقامی کارروائیوں کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

آندھرا

تلنگانہ کے لئے ریفرینڈم

آندھرا کے علاقہ تلنگانہ میں تلنگانہ کی ایک علیحدہ ریاست کی بنیاد پر الیکشن لڑا جا رہا ہے۔ تلنگانہ کمیٹی کا کہنا ہے کہ یہ الیکشن

آندھرا میں الیکشن علیحدہ تلنگانہ کی بنیاد پر

واقعات نئی دہلی

ایک معنی میں تلنگانہ ریاست کے بارے میں استصواب رائے ہے۔ اس علاقہ سے لوک سبھا کی چودہ سیٹیں ہیں اور کمیٹی نے سب پر اپنے امیدوار کھڑے کئے ہیں اگر اس کے دس امیدوار بھی کامیاب ہو گئے جیسا کہ تلنگانہ تحریک کے لیڈر ڈاکٹر چنا ریڈی کو یقین ہے کہ کامیاب ہو جائیں گے تو ان کے قول کے مطابق حکومت کے پاس تلنگانہ ریاست قائم نہ کرنے کا کوئی عذر نہیں رہے گا۔

نئی کانگریس نے بارہ سیٹوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے ہیں۔ جن سنگھ کمیونسٹ پارٹی اور مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے دو دو اور سنڈیکیٹ کانگریس، ایس ایس پی اور ریپبلکن پارٹی نے ایک ایک امیدوار کھڑا کیا ہے۔ گویا مقابلہ صرف کانگریس اور تلنگانہ کمیٹی میں ہے اور آثار وقرائن سے پتا چلتا ہے کہ تلنگانہ کمیٹی مرکز سے ٹکر لے رہی ہے۔ علیحدہ ریاست کا نعرہ عوام کیلئے ایسا جاذب توجہ ہے کہ وہ اسکے خلاف کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں پچھلے دنوں میگھالیہ اور ہماچل پردیش کی جو نئی ریاستیں قائم ہوئیں اس سے تلنگانہ کے باشندوں میں بھی ایک الگ ریاست کیلئے جوش بڑھ گیا ہے۔ اور جب پرائیویٹ طور پر یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مسز گاندھی بھی الگ تلنگانہ کی حامی ہیں تو ان کی مقبولیت میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔

جہاں تک آندھرا کے باقی حصوں کا تعلق ہے وہاں پولنگ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نئی کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوگی۔ اس علاقہ سے کانگریس نے ۲۵ سیٹوں پر انتخاب لڑے ہیں۔

یوپی

دوستی راس نہ آئی

یوپی کے ۵۴ اضلاع میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جو طوفانی دورہ کیا اس سے انتخاب کی عام فضا نئی کانگریس کے حق میں پہلے ہی ہو چکی تھی اور اب پولنگ بوتھوں پر جو نظارے دیکھنے میں آئے ان سے اندازہ ہوا کہ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی اس سب سے بڑی ریاست میں مسز گاندھی کی کوششیں بیکار نہ جائیں گی۔

یوپی میں مُسلم ووٹ فیصلہ کُن ووٹ ہوگا



اندرا گاندھی رائے بریلی کے ایک جلسے میں عورتوں سے مخاطب ہیں۔

توقع یہ ہے کہ لوک سبھا کی ۸۵ سیٹوں میں سے کانگریس ۵۵ سیٹوں پر قبضہ کرے گی۔ اگرچہ پارٹی کے ذمہ دار عہدیداروں کا اندازہ ہے کہ اس کے ۸۰ امیدواروں میں ۶۰ اور ۶۵ کے درمیان کامیاب ہو جائیں گے۔

سیاسی شاہدین دوسرا نمبر جن سنگھ کو دے رہے ہیں ان کے اندازے کے مطابق جن سنگھ پندرہ سیٹوں پر کامیاب ہوگا لیکن حکمراں کانگریس کے حلقوں پر اسے دس سیٹوں سے زیادہ نہ مل سکیں گی۔ برخاست شدہ لوک سبھا میں اس کے دس ممبر تھے۔ سنڈی کیٹ کانگریس کو کسی جگہ تقویت نہیں دی جا رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اگر اس کی سات [illegible] جائیں تو یہ اس کی بڑی کامیابی ہوگی۔

بی۔ کے۔ ڈی کا حال اس سے بھی برا ہے دو چار سیٹوں سے زیادہ شاید ہی لے سکے۔ سنڈی کیٹیوں اور جن سنگھیوں کے ساتھ مسٹر چرن سنگھ کو دوستی راس نہیں آئی۔ البتہ ایس ایس پی کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ اسے یقین ہے کہ اس کے ۴۴ امیدواروں میں سے ۲۵ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صرف یقین ہی یقین ہے باقی کچھ نہیں۔

انتخابات کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے اس کے پیش نظر قبل از وقت کہا جا سکتا ہے کہ یوپی کی کھچڑی حکومت کی خیر نہیں۔ دراصل انتخابات شروع ہونے سے قبل ہی یہ حکومت ٹوٹ جانی چاہئے تھی اس لئے کہ اس حکومت میں شامل ہونے کے باوجود ۴۴ حلقوں میں جہاں امیدوار کھڑے کرنے کے سلسلے میں چار جماعتوں میں مصالحت ہو گئی تھی بی کے ڈی نے اپنے الگ امیدوار کھڑے کر ڈالے۔ اس بغاوت پر بی۔ کے۔ ڈی کو موجودہ حکومت سے خارج کر دینا چاہئے تھا لیکن اس کے باوجود اگر سنڈی کیٹ اور اس کی ساتھی جماعتیں خاموش ہیں تو محض اس لئے کہ اس سے حکومت کا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا اور پانچوں پارٹیوں کی مخلوط سیاسی موت ہو جاتی لیکن قریب المرگ بیمار کو آکسیجن دے دے کر کب تک زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ آخر وہ اللہ کو پیارا ہوگا اور اسی طرح یوپی کی پانچ پارٹیوں والی حکومت بھی جلد ہی "ملک عدم" کی طرف کوچ کر جائے گی۔

یوپی کے الیکشن کے بارے میں یہ بتانا خالی از اہمیت نہیں ہے کہ اس پر مسلم ووٹ بے حد اثر انداز ہوں گے۔ اس ریاست میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی ۱۴٫۵ فیصدی ہے اور مغربی اضلاع میں ۲۵ اور بعض جگہ اس سے بھی زیادہ تک پہونچ جاتی ہے۔ ■■

مدھیہ پردیش

فرقہ پرستوں کے قلعے ٹوٹ گئے

ہر جگہ کی طرح مدھیہ پردیش میں بھی فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے گٹھ جوڑ کے تار پود بکھرے نظر آ رہے ہیں۔ کانگریس کو بڑی تشویش تھی کہ یہاں سرمایہ داروں اور سابق راجوں مہاراجوں کی بڑی بڑی توپیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں جو کانگریس کے سوشلزم کی دیوار کو ڈھا کر ہی دم لیں گی۔ لیکن مسز گاندھی نے جو مورچہ سنبھالا اور الیکشنی محاذ پر پہونچیں تو مخالفین کی تمام مورچہ بندیوں میں دراڑ پڑ گئی۔ حد یہ کہ گوالیار تک میں جو وجے راجیہ سندھیا اور ان کے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ لڑکے مادھو راؤ سندھیا کا گڑھ تھا وہاں بھی لوگوں نے "کانگریس کی جے" کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔

جن سنگھ اور اس کی ساتھی جماعتوں کی طرف سے کانگریس کے خلاف خاص پروپگنڈا یہ ہے کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئی تو وہ حقوق ملکیت کو سلب کر لے گی۔ مسٹر اٹل بہاری باجپائی اور دوسرے جن سنگھی لیڈروں نے ووٹروں کو خوفزدہ کیا کہ کانگریس ان کے مکانات تک چھین لے گی۔

وزیر اعظم کے خلاف خاص طور پر پروپگنڈا کیا جا رہا

باقی صفحہ ۲۸ پر

مدھیہ پردیش میں بھی فرقہ پرستوں کو دن میں تارے نظر آ رہے ہیں



چرن سنگھ

کی
تاک جھانک



پچھلے دنوں
لاس اینجلز امریکہ
میں ایک زبردست زلزلہ
آیا جس میں ۵۰ سے زائد
آدمی ہلاک اور ۱۰۰۰ سے زائد
زخمی ہوئے ■





ابدو ایکٹروں کے درمیان ایک اور ایکٹر ـــ
ں آباد ضلع ٹانڈہ کی دیوار پر کانگریس کا ایک پوسٹر ■

طویل غیر حاضری کے بعد ہالی وڈ کی فلم اسٹار الزبتھ ٹیلر
ایکبار پھر فلمی دنیا میں واپس آگئی ہے۔ ٹیلر پچھلے کافی دن سے بیمار تھی ■



"بنگال مرنا جانتا ہے' جھکنا نہیں۔"
مشرقی پاکستان کے مقبول لیڈر
شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو اور یحییٰ کی
مانگوں کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا ہے۔
مجیب الرحمٰن کی مقبولیت کا اندازہ
آپ اس تصویر سے لگا سکتے ہیں ■

مسز گاندھی اور نئی کانگریس پر مکمل اظہار اعتماد

سوشلزم اور سیکولرزم کی عظیم فتح

لوک سبھا کے انقلاب انگیز نتائج

اندرا گاندھی زندہ باد۔

سوشلسٹ اور سیکولر ہندوستان زندہ باد۔

آنجہانی جواہر لال جو نہ کر سکے وہ ان کی پیاری بیٹی نے کر دکھایا۔ پنڈت نہرو کی آتما خوش ہوئی ہوگی کہ انکی پیاری بیٹی اس ملک کو وہ ملک بنا رہی ہے جس کا خواب خود انہوں نے دیکھا اور جسے پورا کرنے کے لیے وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہ تھے جیسا کہ ان کے بعد ان کی حقیقی جانشین ان کی بیٹی نے کیا۔

— اندرا گاندھی ہندوستان کی پیاری بیٹی ہیں۔ ہم انہیں سلام کرتے ہیں۔ پورا ہندوستان سلام کرتا ہے۔

غیر منقسم کانگریس کا سرمایہ پرستوں اور اجارہ داروں نے کیا حال بنایا وہ جماعت کو اور ملک کو کس طرف لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایسا ہندوستان بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو نہ مہاتما گاندھی کا ہندوستان تھا اور نہ جواہر لال نہرو کا — مسز گاندھی نے سیاست کے "ٹھیکیداروں" سے بغاوت کی اور انتہائی جرأت سے کام لے کر اپنا الگ راستہ بنایا۔ نتیجہ میں سرمایہ پرست رجعت پسند الگ ہو گئے اور وہ کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہو گئی جو اپنے پیچھے ایک صدی سے کچھ کم عرصہ کی تاریخ رکھتی تھی اور جس نے برطانیہ جیسی طاغوتی طاقت سے ٹکر لے کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔

یہیں سے ملک کی سیاست میں ایک عجیب انقلاب آیا اور دو واضح نظریات کی جنگ شروع ہو گئی۔ ایک نظریہ تھا سوشلزم اور سیکولرازم کا نظریہ۔ یعنی یہ کہ اس ملک میں دولت کی مساوی تقسیم ہو، غربت و افلاس کا خاتمہ ہو۔ اور بلاتخصیص مذہب و ملت اس ملک میں — سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں ذات پات، نسل یا مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہ کیا جائے وغیرہ — اور دوسرا نظریہ تھا۔ رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کا — کانگریس کا یہ گروپ نہیں چاہتا تھا کہ ایک طبقے کو جو بے جا مراعات حاصل ہیں اور مختلف شعبہ ہائے پر اسے جو اجارہ داری ملی ہوئی ہے اس سے وہ محروم ہو جائے۔

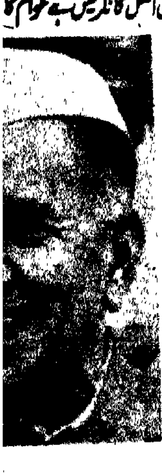
پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر دونوں جگہ ان دو نظریات کے درمیان ٹکر ہوتی رہی۔ تمام رجعت پسند طاقتیں ایک جگہ مجتمع ہو گئیں۔ اخبارات کی بڑی تعداد بھی جن پر سرمایہ داروں کا پہلے ہی اثر تھا پوری طرح ان کے کنٹرول میں آگئی۔ نتیجے میں مسز گاندھی کی حکومت کے لئے اپنے ترقی پسندانہ



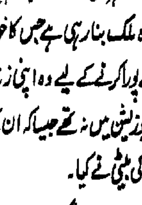
ہندوستان کے روشن مستقبل کو

اقدامات کو روبہ عمل لانا ممکن نہ رہا۔ اور جب ریاست کے پریوی پرسز کو ختم کرنے میں ... تو اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ ... اعتماد حاصل کیا جائے۔

اور اب مسز گاندھی کی سربراہی میں ... جو حقیقت میں اصل کانگریس ہے عوام کا ...



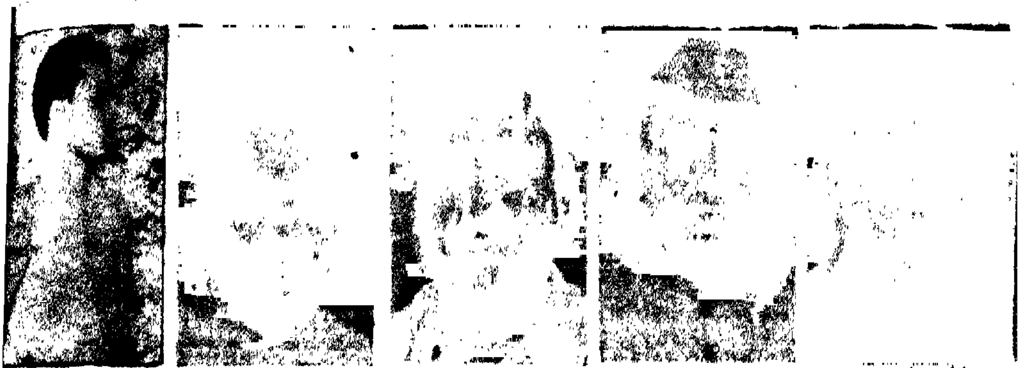
فخرالدین علی احمد



جگجیون رام

ہندوستان کی پیاری بیٹی اندرا گاندھی کو ادارہ واقعات کی جانب سے

...خواہ مسلم اقلیت نے نئی کانگریس کو کامیاب کرکے دم لیا



شفیع قریشی — وائی۔ بی چوہان — جنرل شاہنواز — دنیش سنگھ — بی۔ پی موریہ

ہندوستان کے نئے معمار

...در حاصل کیا اس کی توقع خود نئی کانگریس کے ...ا نہ تھی۔

...زم اور سیکولرزم کے اصولوں کو ناکام بنانے ...بڑی چالیں چلی گئیں۔ سیاسی گٹھ جوڑ عمل میں ...سرمایہ لٹایا گیا۔ فرقہ وارانہ نفرت پھیلائی ...لسانی جذبات برانگیختہ کئے گئے لیکن عام ووٹروں ...ور اتنا بیدار ہو چکا تھا کہ "عوام دشمن" طاقتیں ...ہ نہ کرسکیں۔

...پاکستانی عوام کی سیاسی بصیرت کی مثالیں دے ...یاں کہ عوام نے دو الگ الگ حصوں میں دو مخصوص ...پنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا وہ اب محسوس کریں گے ...عوام بھی کچھ کم سیاسی بصیرت نہیں رکھتے۔ ...نے رجعت پسندوں اور موقع پرستوں کا قلع قمع ...ہیں ایسا سبق دیا کہ آئندہ انھیں عوام کے ...لیلنے کی جرأت نہ ہوگی۔

...تخابات سے ایک بات یہ سامنے آئی کہ اب عوام ...ور اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ جو بھی ان کی امنگوں ...وٹ بنے گا وہ اسے اپنی راہ سے ہٹا دیں گے۔ ...یتی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

مسٹر مرارجی ڈیسائی کی شخصیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟ پنڈت نہرو کے ساتھی اور مہاتما گاندھی کے چیلے۔ لیکن ان کی کوئی آواز عوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکی ——— وہ اپنی جماعت کی شکستہ عمارت کے ایک ستون کے طور پر باقی رہ گئے ——— پہلے کے مقابلہ میں بہت ہی کم اکثریت کے ساتھ۔ لیکن ان کے بڑے بڑے ساتھی لڑھک گئے۔ انکے مضبوط ستون ٹوٹ گئے۔ خود سنڈی کیٹ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ (سابق وزیر) کو اندرا سرکار سے بغاوت کا "انعام" مل گیا۔ انہوں نے وزارت عظمی کا خواب دیکھا تھا لیکن وہ لوک سبھا میں اپنی سیٹ تک نہ لے سکے۔

اشوک مہتہ "عظیم سوشلسٹ" تھے لیکن جن سنگھیوں سے سازباز کی تو عوام نے انھیں سطح سیاست سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا۔ مادھو لیمایے اور جارج فرنانڈس جنھیں اپنے سوشلزم پر بڑا ناز تھا جب تنگ نظروں اور فرقہ پرستوں سے جاکر ملے تو انھیں عوامی سزا مل گئی۔ عوام نے ایسے لیڈروں کو اپنی نمائندگی کے قابل نہ سمجھا جو ظاہر میں سوشلسٹ ہوں لیکن موقع ملنے پر سرمایہ پرستوں کے ساتھ گٹھ جوڑ بھی کر ڈالیں۔ مسز کرپلانی اور مسز تارکیشوری سنہا کے نام کس نے نہیں سنے۔ کہتی تھیں کہ کسی عورت ہی کے ہاتھ میں زمام اقتدار دینی ہے تو ہم میں سے کسی کو دو۔ لیکن عوام نے انھیں بھی اپنی راہ سے ہٹا دیا۔

ڈاکٹر سوشیلا نائر جن کے کندھے پر مہاتما گاندھی ہاتھ رکھ کر چلتے تھے۔ جب انہوں نے مہاتما گاندھی کے اصولوں کو بھلا دیا تو عوام بھی انھیں بھول گئے۔ ان کی شخصیت کو بھول گئے۔ ایسی ہی شخصیت ایس کے پاٹل کی تھی، لیکن انھیں بھی ٹھکرا دیا گیا۔ سب ایسے لوگوں کو ٹھکرا دیا گیا جو عوام کو چھوڑ کر سرمایہ داروں کے ساتھ مل گئے تھے۔

سوتنتر پارٹی کے مسٹر مسانی جن کی اپنی شخصیت تھی اور جن کا اپنا حلقۂ اثر تھا لوک سبھا کے لئے منتخب نہ ہوسکے۔ اسی طرح مسٹر چرن سنگھ جن کی سیاست "ایسی لوٹا سیاست" تھی جسکا کوئی پیندہ نہ تھا عوام نے اسے لڑھکا دیا خدا جانے وہ کہاں جاکر پہونچے۔ ان کی پوری پارٹی کا صفایا ہوگیا۔ اسیطرح سوشلسٹ پارٹی کا وجود مٹ گیا۔ عوام نے کسی کو نہ بخشا جو ترقی پسندی کی راہ میں آیا اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔

عام انتخابات میں یہ مسز اندرا گاندھی اور نئی کانگریس کی زبردست کامیابی ہے جسکا قدرتی طور پر ان ریاستوں پر اثر پڑے گا جہاں اقتدار سنڈی کیٹی گٹھ جوڑ

حکومت کا کام ہے کہ وہ عوام سے کیے ہوئے وعدے پورے کرے

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں • تو ہائے گل پکار میں چلا

کے ہاتھ میں ہے۔ خاص طور سے یوپی اور بہار میں۔ اڑیسہ میں پہلے ہی اثر پڑ چکا ہے۔ جہاں اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی کے روپ میں آ رہی ہے۔ یوپی میں کچوڑی حکومت ہے جو اب زیادہ ٹکنے والی نہیں۔ بہار کی وزارت بھی چند دنوں کی مہمان سمجھئے۔ اور دِلّی کے جن سنگھی ایڈمنسٹریشن کی عمر بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ——

یوں کہیئے لوک سبھا میں انقلاب کیا آیا پورے ملک میں انقلاب آگیا۔ ایک پرامن انقلاب جس میں سرمایہ پرست و تنگ نظر رجعت پسند فرقہ پرست خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ نہ آر۔ ایس۔ ایس والوں کی چلی اور نہ شیو سینا جیسی جارح تنظیموں کی۔ خدا جانے سابق جنرل کریاپا کس طرح شیو سینا کے چکر میں پھنس گئے تھے۔ اب روتے ہوں گے کہ آخری عمر میں مٹی خراب کی۔

مسٹر پرکاش ویر شاستری کی شکست بھی بڑی عبرتناک ہے وہ مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے تھے اب خود انکی اور انکی پارٹی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ایسے فرقہ پرست اور تنگ نظروں کے لئے یقین ہے آئندہ زمین تنگ ہوتی جائے گی۔ (ان کے مقابلے پر مسٹر بی پی موریہ کامیاب

انہوں نے انکی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا اور نئی کانگریس کو کامیاب بنا کر دم لیا۔

اب جبکہ کانگریس نے عوام کا اعتماد حاصل کر لیا ہے اور اسے مرکزی حکومت بنانے کا اختیار مل گیا ہے یہ اس کا کام ہے کہ وہ عوامی جذبات کا احترام کرے اور ان وعدوں کو پورا کرے۔ جو اس نے تمام طبقوں سے جن میں اقلیتیں بھی شامل ہیں، کئے تھے۔ اس نے وعدے پورے کئے، غریب عوام کی حقیقی خدمت کی تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی عوام اس پر اعتماد نہ کریں۔ اور یقین ہے کہ وہ وعدے پورے کرے گی اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ اصل طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ جنکا سیاسی شعور اب بیدار ہو چکا ہے۔

نہیں معلوم ہارنے والے لیڈروں کی حالت کیا ہے لیکن وہ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کی ہمدردی کر سکتے ہوئے ہیں)

الغرض عوام نے نئی کانگریس اور مسز گاندھی پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور بلا امتیاز مذہب و ملت کیا —— اقلیتوں اور خاص کر مسلم اقلیت نے دل کھول کر نئی کانگریس کی مدد کی اور اگرچہ فرقہ پرست جماعتوں نے مسلم نمائندے کھڑے کر کے ان کے ووٹ کاٹنے کی کوشش کی۔ لیکن

اور یہ شعر گنگنا سکتے ہیں ؎

"آ عندلیب مل کے کریں آہ و

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں

فروری ۱۹۷۱ء

ہمیں افسوس ہے کہ راجدھانی

پر اس پکھواڑے کے واقعات کی اشا

تمام پریس انتخابی پوسٹروں اور پمفلٹ

مصروف رہے کہ کاپیوں کی طباعت

ہولی" کی چھٹیوں کی بنا پر بھی ڈاک کی

روز کی تاخیر کا امکان ہے۔

دریں اثنا ر عام انتخاب کے

شروع ہو گئے جس نے ملک کی سیا

ملک کی سیاست میں ایک ایسا انقل

۲۳ سالہ تاریخ میں اس سے قبل کبھ

ایک ایسے وقت جبکہ "واقعات

چھپ چکی ہیں عوامی انتخابات اور ان

دوررس نتائج سے اگر قارئین محرو

یہ ہوتا کہ وہ ملک کی سیاست کے ایک

رہ جاتے۔ لہٰذا ہم شمارے میں چار صف

ہیں تاکہ انقلاب انگیز انتخابات کے

سے وہ واقف ہو سکیں —— ان چار ص

بنا پر قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا

نامساعد حالات کی بنا پر جن

پکھواڑے کے "واقعات" کی اشاعت

کے لئے ہم اپنے قارئین سے معذرت خ

کوشش ہوگی کہ ہمارے قارئین انتظ



مسٹر بلراج مدھوک
جنہیں عوام نے بھاری یا لیا



راج نرائن



پاٹل



تارکیشوری سنہا

جو ستون گر گئے

ی۔ کے۔ ڈی اور سوشلسٹ پارٹی کا صفایا ہو

میں فریزیئر سے پھر لڑوں گا

محمد علی کا بیان



فریزیئر — گھر والوں کے ساتھ



محمد علی کلے

مکہ بازوں کی دنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ۱ کا جوش ہر وقت ان کے چہروں سے عیاں رہتا محمد علی کلے اور فریزیر کے درمیان جب کے شرائط نامہ پر دستخط ہوئے تب ہی دونوں کچھ میں آگئے تھے اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں دونوں میں زوقت ہی مقابلہ شروع نہ ہو جائے۔ وہ تو کہیئے محمد علی کلے کی تحمل مزاجی کام آگئی ورنہ اسی وقت دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ لیکن بہرحال ۸ مارچ کو یہ دو دو ہاتھ ہوئے اور مقابلہ میں محمد علی شکست کھا گئے۔

ان کے کیریر کی یہ پہلی شکست تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے ۲۹ مقابلوں میں حصہ لیا اور ہر ایک میں کامیاب رہے حد یہ کہ تین سال کی پابندیوں کے بعد جب انہیں مقابلہ میں حصہ لینے کی اجازت ملی تو انہوں نے مشہور مکہ باز جیری کومیری کو تیسرے راؤنڈ ہی میں ناک آؤٹ کر دیا۔

لیکن محمد علی فریزیر سے ناک آؤٹ نہیں ہوئے بلکہ ۹ کے مقابلے میں صرف ۲ پوائنٹ سے ہار گئے۔ کشتی یا مکہ بازی میں اتنے پوائنٹ کی ہار کوئی بڑی ہار نہیں۔ اسی لئے محمد علی کلے نے حوصلہ نہیں ہارا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ فریزیئر سے پھر لڑیں گے۔

محمد علی نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ میں مقابلہ سے مطمئن ہوں۔ مطمئن ہونا بھی چاہیئے۔ برابر کی ٹکر تھی صرف دسویں راؤنڈ میں پہنچ کر فریزیر ان پر غالب آسکا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ ان کا جبڑا اس کے مکہ کی زد میں آگیا۔

مکہ بازی کا یہ مقابلہ نیویارک کے میڈیسن اسکوائر میں ہوا جہاں بیس ہزار سے زائد تماشائی موجود تھے۔ ٹیلی ویژن سے مقابلہ دیکھنے والوں کی تعداد شامل کر لی جائے تو وہ تین کروڑ پہنچتی ہے۔

دونوں مکہ بازوں کو پچیس پچیس لاکھ ڈالر ملیں گے۔ لیکن ہر ایک سے بھاری ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ پندرہ لاکھ وفاقی خدمت اور ۲½ لاکھ ریاستی حکومت وصول کرے گی اور اس طرح ہر مکہ باز کو پاس ۷½ لاکھ ڈالر رہ جائیں گے۔

دونوں مکہ باز نیگرو ہیں۔ دونوں جنوب کے علاقے میں پیدا ہوئے اور اتفاق سے دونوں جنوری میں۔ البتہ فریزیر محمد علی سے دو سال بعد پیدا ہوئے۔ محمد علی کا سال پیدائش ۱۹۴۲ء ہے۔

دنیا کی نظریں اب ان کے آئندہ کے مقابلہ پر لگی ہوئی ہیں۔

ہندوستانی ٹیم کی پہلی شاندار کامیابی

نواب صاحب کرکٹ سے علیحدہ ہو کر ریاست میں ہو گئے۔ واڈیکر ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے نئے کپتان بنے گئے اور ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر روانہ ہو گئی۔ طرح کی قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہندوستان اس مرتبہ ضرور اپنی کئی سال پرانی خواہش کرے گا۔ یعنی پہلی بار ویسٹ انڈیز کو ہرانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کر ہاتھی مر کر سوا لاکھ کا رہتا ہے۔ یعنی ویسٹ انڈیز کی ٹیم ان دنوں رہی لیکن پھر بھی ہندوستانی ٹیم سے بہتر ہے۔ ہندوستانی ٹیم ویسے ہاری تو دنیا کی ہر ٹیم سے ہے لیکن ویسٹ انڈیز کے علاوہ اور سب کو ایک آدھ مرتبہ ہرانے میں بھی ضرور کامیاب ہوئی۔

پورٹ آف اسپین میں کھیلا جانے والا یہ دوسرا ٹیسٹ ہندوستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان کھیلے جانے والوں کا سلور جوبلی میچ تھا اور سلور جوبلی کے موقع ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے اپنی ایک بہت پرانی تمنا پوری ویسٹ انڈیز کی اس ہار کی دو وجوہات ہیں پہلی تو یہ کہ آج ویسٹ انڈیز کی ٹیم وہ نہیں جو دو یا تین سال پہلے تھی۔ جب ہندوستانی بلے باز ہال اور گرفتھ کی گیندوں کے سامنے پکے ہوئے آموں کی طرح گرا کرتے تھے۔ آج وہاں کی ٹیم میں سوبرس، کنہائی اور لائیڈ کے علاوہ دوسرا کوئی قابلِ ذکر کھلاڑی نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف ہندوستان کو واڈیکر کی شکل میں ایک بہت ہی عمدہ اور جری کپتان مل گیا ہے۔ ہندوستان کے بلے باز اور بالر دونوں ہی آج کل فارم میں ہیں۔ سرڈیسائی نے پہلے ٹیسٹ میں ڈبل سنچری ماری اور دوسرے ٹیسٹ میں بھی سنچری ماری گواسکر اور سولکر نے بھی بہت ہی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا درانی اور واڈیکر بھی پیچھے نہیں رہے۔ یعنی دونوں بوڑھے کھلاڑی اور نوجوان کھلاڑی بہتر سے بہتر کھیل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اس میچ کی فتح کا زیادہ تر کریڈٹ وینکٹ راگھون اور درانی کو جانا چاہئے۔ دونوں ہی نے دوسری اننگز میں بہت عمدہ بالنگ کی۔ اگر ہمارے کھلاڑی اسی طرح کے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرتے رہے تو یقیناً وہ پہلی بار ویسٹ انڈیز سے ربر جیتنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔







لدریسی صاحب کا مزار ہے۔ اس مزار کی یہ خصوصیت
رگد ہے سہو جاتے ہیں رلا شاہ صاحب کے مزار کے
ہیں۔ اور کمال یہ کہ غلاظت نہیں پھیلاتے۔



-جیوتی بین مہتا —
ہندوستان کی واحد عورت
ہیں جو خطرناک سے خطرناک جانوروں
سدھا سکتی ہیں۔
جیوتی بین خوفناک اجگر، مگرمچھ اور
چیتے راجو کے ساتھ۔

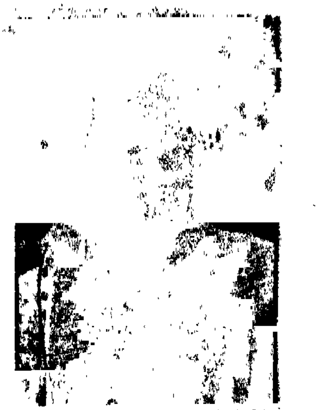


گر ہمت ہو تو
کیا نہیں ہو سکتا۔
بمبئی کا یہ نوجوان
دونوں ہاتھ نہ
ہونیکے باوجود
بھی اپنی روٹی آپ
کماتا ہے۔
نقلی ہاتھ کی
مدد سے یہ دن
رات غبارے بیچتا ہے
اور شام کو اپنی محنت
کی کمائی سے
پیٹ بھر کر روٹی کھاتا
ہے۔



یورپ میں آجکل دھات سے بنے ہوئے
لباس بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ بشرطیکہ آپ
انھیں لباس ماننے کو تیار ہوں۔





باجپئی

گمتو ماتا کی گود سے راج ماتا کی گود میں

ہے کہ وہ ملک کو روس کا آلۂ کار بنا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لئے سابق حکمرانوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ سابق مہاراجا اودے پور بھگوت سنگھ کو راجپوت حلقوں میں خوب گھمایا گیا اور وزیر اعظم کے خلاف دل کھول کر پروپیگنڈا کیا گیا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنا زیادہ مخالفانہ پروپیگنڈا ہوا مسز گاندھی کی اتنی ہی مقبولیت بڑھی۔ بھوپال میں جن سنگھ نے سابق حکمراں مہتاج ساجدہ سلطان سے امداد لینے کی کوشش کی لیکن کام نہ بنا۔ جب ساجدہ سلطان نے مسٹر بھانو پرکاش سنگھ سابق مہاراجا نرسنگ گڑھ کی حمایت میں تاجروں اور ریٹائرڈ سرکاری ملازمین کو عمل میں طلب کیا تو ان سے صاف کہہ دیا گیا کہ بھوپال کے مسلمان کسی ایسی جماعت کی حمایت نہیں کر سکتے جو "انڈیا نائزیشن" کے پردے میں فرقہ وارانہ نفرت و حقارت پیدا کر رہی ہے اور اقلیتوں کے استیصال پر تلی ہوئی ہے۔

ساجدہ سلطان کے مقابلے میں سینئر بیگم آف بھوپال شہ بانو میمونہ سلطان نے کانگریسی امیدوار کے حق میں اپیل کی جس کا اچھا اثر پڑا۔ کانگریسی امیدوار ڈاکٹر ایس ڈی شرما کو اپنی کامیابی کا یقین ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی کانگریس کے حق میں پلڑا بھاری نظر آ رہا ہے اور عوام کا کہنا ہے کہ الیکشن کے نتائج حیرت انگیز نکلیں گے۔



کہئیے یہ نئے فیشن کا بشرٹ کیسا رہا؟۔



نہیں نے بالکل سچ کہا تھا کہ یہاں کے عوام میرے پیچھے ہیں"



جیسے ہی الیکشن جیتوں گا سب سے پہلے اس بنیے کے بچے سے پوچھوں گا جس نے لوک سبھا کے ٹوٹتے ہی مجھے ادھار دینا بند کر دیا تھا۔



فلم ایکٹریس جینتی لالا جی بھی الیکشن لڑ رہی ہیں۔ انہیں ایک کہانی کار جو اُن کی تقریریں لکھے، ایک گلوکار جو ان کے لئے گانے گاتے اور ایک ڈائرکٹر، جو انہیں ڈائرکشن دے، کی ضرورت ہے۔

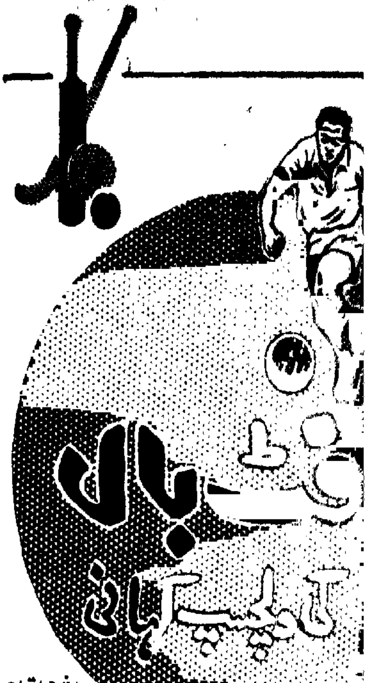


۔ مہربانی کر کے آپ یہ ہار واپس کر دیں۔ کیونکہ آدھے گھنٹے بعد ایک اور امیدوار بھی آنے والا ہے ــــــ"



واقعات نئی دہلی

روم میں دشمن کی کھوپڑی سے فٹ بال کھیلی جاتی تھی



اشتیاق احمد
انصاری

فٹبال جسے آج کے دور میں بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہے کب؟ کہاں؟ اور کسطرح وجود میں آیا۔ اس کی کہانی کافی دلچسپ ہے اور یقین ہے کہ "واقعات" کا مطالعہ کرنے والے اسے پسند کریں گے۔

اٹلی:۔ میں یہ دستور تھا کہ جشن فتح مناتے وقت وہ لوگ دشمنوں کے سروں کو تن سے جدا کر کے انہیں ٹھوکر مار کر ایک طرف سے دوسری طرف لے جاتے تھے۔ اور اس کھیل کا نام انھوں نے "کالیشور" CALISHWAR رکھا تھا

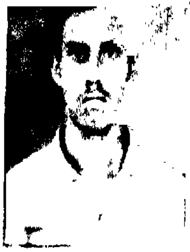
جاپان:۔ جاپانیوں نے اس کھیل کو چودہ سال پہلے کھیلنا شروع کیا عام تہواروں اور تقریبوں میں یہ کھیل آٹھ آٹھ کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاتا تھا اور اسکا نام "کیمیاری" CAMIARE رکھا گیا تھا۔

روم:۔ رومیوں میں بھی یہ کھیل عام تھا جس کو وہ لوگ ہرماسٹم HARMASTAM کہتے تھے۔

چین:۔ کہا جاتا ہے کہ چین کے ایک بادشاہ "اوال" O WALL پر ایک مرتبہ کسی کتے نے حملہ کیا اس نے غصے میں کتے کو لات ماردی تو وہ تقریباً بیس گز کی دوری پر جا گرا، اس وقت سے بادشاہ کو یہ خبط ہو گیا کہ وہ آس پاس رکھی ہوئی چیزوں پر ٹھوکر مار کر لطف اندوز ہونے لگا۔ اسطرح بادشاہ نے کچھ ہی دنوں میں بیشمار قیمتی چیزوں کو توڑ ڈالا۔ چنانچہ درباریوں کو فکر لاحق ہوئی کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کیجائے جو نرم بھی ہو اور سستی بھی۔ پہلے تو ایک پتھر کے گولے کو آزمایا گیا مگر جب اس پر ٹھوکر مارنے سے پیر کی انگلیوں کو تکلیف ہونے لگی تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کی جگہ لکڑی کا گولا وجود میں آیا۔ مگر جب یہ بھی حسب خواہ نہ ہوا تو بلیڈر کے چمڑے کی گیند بنائی گئی۔ یہ دو ہزار دو سو سال قبل کی بات ہے جب دنیا کے کسی ملک میں اس کھیل کا تصور بھی نہ تھا اس زمانے میں چینی اسے "سوچو" کے نام سے یاد کرتے تھے جس میں گیند کو ٹھوکر مار کر گول پوسٹ میں ڈالا جاتا تھا۔ گول پوسٹ لکڑیوں کے بنے ہوتے تھے جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے چین میں یہ کھیل فوجی مشق کا ایک ضروری حصہ تھا۔ آہستہ آہستہ یہ کھیل عام شہری کھیلنے لگے۔ لوگ اسکو سڑکوں پر کھیلتے۔ دکاندار اور دوسرے لوگ اپنی دکانیں اور کام بند کر کے اس کھیل میں شریک ہو جاتے اسطرح یہ ایک عوامی کھیل بن گیا۔ اور اس سے کاروبار میں رخنے پڑنے لگے۔ اکثر حکومت کے افسروں کو موقع پر پہنچ کر اسے بند کرنا پڑتا تھا۔ اس کھیل کے متعلق ضروری باتیں درج ذیل ہیں۔

انگلستان:۔ کہتے ہیں کہ گیارھویں صدی میں انگلینڈ پر ڈنمارک نے قبضہ کر لیا اور پچاس سال تک اسے اپنے ماتحت رکھا اس درمیان میں ڈنمارک والوں نے انگلینڈ کے باشندوں کیساتھ بہت برا برتاؤ کیا جس سے انگریزوں کے دلوں میں ڈنمارک والوں سے بے پناہ نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی۔ انگلینڈ والوں نے کئی بار غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد کی لیکن ناکام رہے۔ لیکن بالآخر وہ وقت آگیا جب انھوں نے ڈنمارک والوں کو مار بھگایا۔ اپنا ملک آزاد کرا لینے کے بعد بھی انکے دلوں میں نفرت بھری ہوئی تھی۔ ایک دن زمین کھودتے ہوئے کچھ انگریز مزدوروں کو مردے کی ایک کھوپڑی ملی۔ اور یہ سوچ کر کہ یہ کسی ڈنمارک سپاہی کی ہے۔ نفرت سے اسے ٹھوکر ماردی اور وہ کھوپڑی لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے مزدوروں نے بھی یہی سمجھا اور ٹھوکر ماردی۔ اسطرح اس کھوپڑی میں ٹھوکریں لگنا شروع ہو گئیں۔ یہ عمل انکی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ پھر عام انگریز بھی اس میں ٹھوکریں مارنے لگے اسکی شہرت اتنی بڑھی کہ لوگ اپنی تفریح کے لیے جانوروں کی جھلی کے غبارے بنا کر ٹھوکریں مارنے میں لطف لینے لگے۔

دور حاضر میں فٹبال:۔ موجودہ زمانے میں فٹ بال بہترین مقبول کھیل تصور کیا جانے لگا ہے لوگ اسے آسانی سے کھیل سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل اسکی ابتدا انگلستان کی سرزمین پر ہوئی۔ یہ دلچسپ کھیل پہلے انگلستان کے امیروں نے کھیلنا شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں عوام، طالبعلم، جہازراں، مزدور، انجینئر ہر قسم کے لوگ دلچسپی لینے لگے۔ اسکی مقبولیت وہاں سے نکل کر دوسرے ممالک میں بھی پہنچی یہ بھی صرف برطانیہ ہی وہ ملک ہے جہاں اس کھیل نے کسی حد تک اختیار تھا۔ مختلف جگہوں پر مختلف قوانین کے تحت فٹبال کھیلا جانے لگا۔ فٹ بال کا ایک اہم ادارہ انگلستان میں قائم کیا گیا اور اسکا سرپرست "ڈیچ ہرشن" ATCH HARISHAN ہوا جو ایک بینک میں کام کیا کرتا تھا۔ ہرشن نے اس کھیل کیلئے کچھ بین الاقوامی قوانین بنائے جس کے تحت یہ کھیل کھیلا جانے لگا۔ اس دور میں انگلش فٹبال ایسوسی ایشن دنیا کی سب سے



اشتیاق احمد
انصاری

جو محمدن اسپورٹنگ
کلب کلکتہ میں کھیلتے
ہیں۔



بڑی فٹبال کی انجمن تھی۔ اسی لئے۔ ای ایف۔ اے E.F.A. کو اس کھیل کا رہبر اول کہنا بہتر ہوگا۔ انگلش ایف۔ اے نہیں چاہتی تھی کہ بیرونی ممالک کے لوگ اس کے بنائے ہوئے قوانین کو ترک کریں اس لئے مجبور ہو کر (E.I.F.A.) کو منظور نہ کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی ای ایف۔ اے کو اپنا ایک وفد ۱۹۰۵ء میں برنی کانفرنس میں بھیجنا پڑا۔ اس کانفرنس میں وفد بھیجنا اس لئے ضروری ہوگیا تھا کہ ایک اچھے فٹ بال فیڈریشن کی تشکیل ہوجائے اور (E.F.A.) کے سالہا سال کے تجربات سے اس فیڈریشن اور یورپ کے دوسرے مقامات کے کھیلنے والے اداروں کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ ای۔ ایف۔ اے۔ کی تنظیم نے (E.I.F.A.) کو تسلیم کرلیا اور اس سے منسلک ہوگئی۔ لنکاسا کے ڈان اونفال کو۔ F.A. کا صدر چنا گیا۔ اس اتحاد نے فٹبال کو نئی زندگی بخشی۔ اب اس کھیل میں ہر جگہ بڑے بڑے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ جن میں سے چند خاص کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے

ورلڈ کپ :۔ فٹبال کی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت ورلڈ کپ کو حاصل ہے۔ اس میں فٹبال کے بہترین کھلاڑیوں کو کھیل دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں تمام دنیا کے شوقین اور پیشہ ور (PROFESSIONAL) کھلاڑی حصہ لے سکتے ہیں۔ ورلڈ کپ کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ ابھی تک کوئی ملک اس کپ کو تین بار حاصل نہیں کرسکا تھا لیکن اس سال اس روایت کو توڑنے کا سہرا برازیل کے سر رہا۔ اس کپ کو اب تک مندرجہ ذیل ممالک نے حاصل کیا ہے۔ یوروگے، اٹلی، برازیل، انگلینڈ۔

اولمپک گیمس :۔ اولمپک گیمس کے مقابلے میں صرف شوقین کھلاڑی ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ اس لئے اس کھیل کو دیکھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ ابتک روس، یوگوسلاویہ، ہنگری اور جرمنی اسمیں اپنے معیاری کھیل کا مظاہرہ کرچکے ہیں۔

یورپین کپ :۔ اس کپ میں صرف یورپ کی مقامی ٹیمیں ہی حصہ لیتی ہیں۔ اسکے اکثر کھلاڑی پیشہ ور ہوتے ہیں۔ اس کپ کو مسلسل پانچ بار جیتنے کا سہرا ریل میڈرڈ کے سر ہے۔

ایف۔ اے کپ :۔ یہ انگلینڈ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کچھ دنوں پہلے فٹ بال کی دنیا کا خاص مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی آتے ہیں۔ یہ مقابلہ فٹبال ایسوسی ایشن انگلینڈ کے زیر اہتمام ہوتا ہے اس لئے یہ کپ بھی اس سے منسلک ہے۔



ایشیائی گیمس :۔ اس مقابلے میں صرف براعظم ایشیا کے ممالک ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ اس مقابلے میں انڈونیشیا، چین، جنوبی کوریا اور ہندوستانی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔

آغاخاں گولڈکپ :۔ یہ پاکستان کا سب سے اہم مقابلہ ہے اس میں صرف پاکستان کی محدود ٹیمیں ہی حصہ نہیں لیتیں، بلکہ انڈونیشیا، تھائی لینڈ، سیلون اور ہندوستان کی مشہور ٹیمیں بھی شریک ہوتی ہیں۔ اب کچھ دنوں سے ہندوستانی ٹیم اس میں شرکت نہیں کررہی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں کلکتہ کی مشہور ٹیم محمڈن اسپورٹنگ نے اپنے زبردست حریف انڈونیشیا کو ایک گول کے مقابلے میں چار گول سے شکست دیکر خوبصورت ٹرافی حاصل کی تھی۔ اس کھیل میں محمڈن اسپورٹنگ کے انٹرنیشنل کھلاڑی رحمت اللہ کو ہیٹ ٹرک مارچنٹ کا خطاب ملا (جوان دنوں پاکستان کی محمڈن اسپورٹنگ کے کوچ ہیں)

مردیکا ٹورنامنٹ :۔ ملایا کے وزیراعظم تنکو عبدالرحمٰن ہر سال ملایا کے یوم آزادی کے موقع پر اس ٹورنامنٹ کا انتظام کرتے ہیں۔ مردیکا کے معنی ملایا کی زبان میں آزادی کے ہیں۔ اسی لئے اس ٹورنامنٹ کا نام مردیکا ٹورنامنٹ رکھا گیا۔

ڈیورنڈ کپ :۔ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا کپ ہے۔ اسکی ابتدا ۱۸۸۸ء میں ہوئی اب تک جن ٹیموں نے اس پر قبضہ کیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ محمڈن اسپورٹنگ، موہن بگان، ایسٹ بنگال، حیدرآباد پولیس، مدراس ریجمنٹل سینٹر۔ یہ مقابلہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں ہر سال ہوا کرتا ہے۔

اودرس کپ :۔ اسکی ابتدا ۱۸۹۱ء میں ہوئی اسکے مقابلے بمبئی میں ہوتے ہیں۔ یہ بمبئی کا سب سے مشہور ... اس میں سب سے اچھا ریکارڈ حیدرآباد پولیس کا ہے۔ ... بعد محمڈن کا نمبر آتا ہے۔ موہن بگان بھی اس کپ کو ... حاصل کرچکی ہے۔ اس سال بھی اس خوبصورت کپ کو ... بگان نے ہی حاصل کیا ہے۔

چین کے بادشاہ کو چین ...
پر ٹھوکر مارنے کا خبط ...
اس خبط نے ہی چین ...
فٹبال کے کھیل کو جنم د...

آئی۔ ایف۔ اے شیلڈ :۔ اس کا آغاز ۱۸۹۳ء میں ... اس مقابلے میں ہندوستان کی مشہور و معروف ٹیمیں ... لیتی ہیں۔ اس شیلڈ پر سب سے زیادہ قبضہ موہن بگان ... اور ایسٹ بنگال کا رہا ہے۔ اور بعض اوقات محمڈن ... اسے اپنے قبضے میں کیا ہے۔ لیکن بنگال میں فٹبال کا ... جتنا بلند تھا اب اتنا ہی پست ہوتا جارہا ہے اور گ... دو سال سے نہ لیگ کے فائنل اور نہ شیلڈ کے فائن... ہوسکے۔

نیشنل فٹبال :۔ اس ٹرافی کا آغاز ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ ... اسے سنتوش ٹرافی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس ٹر... پندرہ ہزار روپے لاگت آتی ہے۔ یہ سنتوش کے را... من متھرا رائے چودھری کی یاد میں آئی۔ ایف۔ اے۔ ... پیش کی تھی۔

شری کرشنا گولڈ کپ :۔ یہ کپ بہار ... سابق وزیر شری کرشنا کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ ... بہار کے دارالسلطنت پٹنہ میں ہر سال ہوا کرتا ہے ... کپ کو بارہ بار جیتنے کا سہرا محمڈن اسپورٹنگ کلک... سر ہے۔

دہلی کلاتھ ملز ٹورنامنٹ :۔ دہلی کلاتھ ملز ٹورن... کے کھیل دہلی میں ہوا کرتے ہیں۔ اس میں بھی ہندوستان ... مشہور و معروف ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ اس کپ کو محمڈن ...

سگریٹ

صحتِ انسانی کی دشم

سگریٹ دیکھنے میں تو چھوٹی، نازک اور دلکش ہوتی ہے مگر اس میں تقریباً تین سو مختلف اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ ان اجزاء میں بہت سی ایسی گیسیں اور رقیق مادے ہوتے ہیں جو صرف پھیپھڑوں کے لیے ہی نقصان دہ نہیں ہوتے بلکہ گلے، اعصاب اور دیگر بافتوں کے لئے بھی سخت نقصان دہ ہوتے ہیں۔



ذہنی انتشار یا کسی چھپے ہوئے جذبے کے اظہار اور تسکین کے لئے انسان نے جو طریقے اب تک استعمال کئے ہیں ان میں سگریٹ نوشی کو صفِ اول پر شمار کیا جاسکتا ہے۔ سگریٹ نوشی کسی شخص کی انفرادی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ایک عام ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے یعنی رسم و رواج کا لازمی جزو بن جانے کی وجہ سے لوگ اسے

صرف ضرورتاً ہی نہیں بلکہ رسم کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ تقریباً تمام اقوام میں ہمیشہ سے کوئی ایسی چیز ضرور مروج رہی ہے جو فرد اور معاشرہ کی عام ضرورت کو پورا کرتی رہی ہو۔ مثلاً چین میں "جنگ سنگ" نامی بوٹی کا رواج اس قدر عام ہوگیا تھا کہ وہ تبادلۂ اشیاء کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اسی طرح پاک و ہند میں پان اور تمباکو کا

رواج ہوا اور یورپی اقوام میں شراب نوشی کی وبا عام ہوگئی۔

اگر اقوامِ عالم کے رہن سہن اور اطوار پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی ہر قوم نشے کے استعمال کی عادی رہی ہے جو اس کے نقصان دہ تھی، مگر پھر بھی اس کا ترک کرنا

لئے محال رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک میں زندگی جس قدر سہل اور نمائشی ہوگئی ہے اسی قدر زندگی کے مسائل اور پُر پیچ ہوگئے ہیں۔ مثلاً امریکا کے سات کروڑ سگریٹ نوش افراد سے اگر سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لئے کہا جائے تو انکی ذہنی حالت اس وقت کیا ہوگی؟ اس کا جواب سرجن لوتھر کی اس رپورٹ سے ملتا ہے جو اس نے سگریٹ نوشی کے مضر اثرات کے بارے میں پیش کی ہے۔ اس رپورٹ میں اس نے بیشتر شبہات کو رد کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بلاشک وشبہ سگریٹ نوشی "انسانی بقا" کی دشمن ہے" لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ سگریٹ نوشی کا ترک کر دینا ایک عالمگیر مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اور اس رجحان کو ختم کرنے کے لئے حکومت اور عوام نے جو مہم شروع کی ہے وہ بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو کم کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جاسکتا تھا وہ کیا جا رہا ہے اور سگریٹ کے ضرر رساں اجزا کو ہر طرح ختم کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ برطانیہ میں تو حال ہی میں یہ تجربات کئے جا رہے ہیں کہ اصلی تمباکو کے بجائے ایسی تالیفی یا مصنوعی تمباکو کا استعمال شروع کیا جائے جو زہریلے جز نکوٹین سے قطعی مبرا ہو۔

۱۹۶۲ء میں رائل کالج آف فزیشن برطانیہ نے اپنی رپورٹ تیار کی تھی اس میں سگریٹ کو انسانی صحت کا دشمن قرار دینے کے ساتھ ساتھ بہت سی مہلک بیماریوں کا سبب بھی قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ میں جنرل لوتھر کی رپورٹ کی طرح چونکہ یہ بات وثوق سے نہیں کہی گئی تھی کہ سگریٹ نوشی "انسانی بقا" کے لئے سم قاتل ہے۔ اس لئے برطانیہ میں کچھ عرصے تک تو رائل کالج آف فزیشن کی رپورٹ سامنے رہی مگر پھر رفتہ رفتہ عوام نے اس کو بھلا دیا۔ اس کے بعد جب امریکا کے محکمہ صحت نے اموات کا شہر بہ شہر تفصیلی گوشوارہ پیش کیا اور ماہرین صحت نے خیال ظاہر کیا کہ اموات میں یہ اضافہ سگریٹ نوشی کی بنا پر ہے تو سرجن لوتھر کی سرکردگی میں سیکڑوں ڈاکٹروں کا بورڈ اس سلسلے میں تحقیق کرنے کے لئے سرگرداں ہوگیا چنانچہ اس بورڈ نے جب پچھلے چالیس سال میں ہونے والی اموات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ۱۹۶۲ء میں پانچ لاکھ سگریٹ نوش حضرات اس کی مختلف بیماریوں کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ اس اعتبار سے یہ بھی دیکھا گیا کہ جوں جوں سگریٹ نوشی میں اضافہ ہوتا گیا اسی اعتبار سے شرح اموات بھی بڑھتی گئی۔ مثلاً ۱۹۱۰ء میں امریکا میں ۱۳۸ سگریٹ فی کس سالانہ کا اوسط آتا تھا مگر یہ اضافہ ہوتے ہوتے ۱۹۶۱ء میں فی کس ۳۹۸۶ سگریٹ سالانہ پیے جانے لگے اور یوں بتدریج اموات میں بھی اضافہ ہوتا رہا جس کا اندازہ درج ذیل جدول سے ہوسکتا ہے اس گوشوارہ میں بتایا گیا ہے کہ صرف پھیپھڑوں کے سرطان سے مرنے والوں کی تعداد کا تناسب ذیل کے مطابق رہا ہے۔

۱۹۳۲ء	۳۰۰۰ افراد
۱۹۴۰ء	۲۲۶۰۰ افراد
۱۹۵۲ء	۴۰۰۰۰ افراد
۱۹۶۲ء	۵۷۸۰۰ افراد

اس جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دس سال میں اموات کا تناسب تقریباً دس گنا ہوگیا ہے۔ چنانچہ برطانیہ میں جب ایسے ہی اعداد و شمار جمع کئے گئے تو معلوم ہوا کہ پچھلے دس سال میں سگریٹ نوشی میں اضافے کے ساتھ ساتھ سگریٹ پینے والوں کی اموات میں بھی سات گنا اضافہ ہوا ہے

سگریٹ نوشی کی تاریخ۔

امریکا میں سگریٹ نوشی کی تاریخ کی ابتدا سولہویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے جب کہ اسپین کے لوگوں نے پائپ کے ذریعے تمباکو کا استعمال شروع کیا۔ وہ تمباکو آج کل کے تمباکو سے زیادہ تیز ہوتی تھی یعنی اس میں نکوٹین کی مقدار بہت زیادہ ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں تقریباً ۱۵۹۰ء میں انگلستان کی سرزمین پائپ کے وجود سے واقف ہوئی اور امراء و روسا نے اس کو تہذیب کا ایک نشان قرار دیتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور یوں سترھویں صدی ہوتے ہوتے تمباکو اعلیٰ طبقے کے محدود حلقے سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی۔ پھر تمباکو نوشی کی مختلف شکلیں نکلیں جن سے رفتہ رفتہ سگریٹ وجود میں آیا۔ ویسے سب سے پہلے سگریٹ بنانے کا سہرا اسپین کے لوگوں کے سر ہے جب کہ جنگ کریمیا سے واپس آنے والے سپاہی اس کو انگلستان لائے تھے۔ پھر اٹھارہویں صدی عیسوی میں سگریٹ نوشی برطانوی اور یور[پی]
رواج کا ایک ضروری حصہ بن گئی۔ اس کے بعد [سگریٹ] کے علاوہ سگار بھی بننے لگے اور انھوں نے خواص میں بہت مقبولیت حاصل کی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے جہانگیر کے [عہد] میں تھامس مور تحفہ کے طور پر سگار لے کر ہندوستان [آیا] اور جہانگیر کو پیش کئے۔ جہانگیر کو سگاروں کی خوشبو [اتنی] پسند آئی کہ اس نے انکا استعمال شروع کر دیا۔ اس [زمانے] کے حکمار نے تمباکو کو گلے کی نالیوں کے لئے انتہائی [مضر] قرار دیا اور مشورہ دیا کہ اگر اس کو براہ راست نہ پیا جا[ئے تو] اسکے مضرت رساں اثرات بہت کم ہو جائیں گے چنانچہ [اس] کے مضرت رساں اثرات کو کم کرنے کے لئے حقہ ایجاد کیا گیا [جس میں] پانی میں تمباکو کے دھوئیں کے بعض اجزا رشامل ہو جا[تے ہیں] اور تمباکو کا دھواں براہ راست منہ تک نہیں آتا۔ یہ [حقے کا] رواج عام ہونا شروع ہوا اور وہ رفتہ رفتہ رسم و [رواج] کا ایک حصہ بن گیا۔ اسی زمانے میں سگار بھی مستعمل [رہے] لیکن ان کا استعمال محدود ہی رہا۔ انیسویں صدی [میں] سگریٹ انگلستان سے منگائے جاتے رہے مگر بیسویں [صدی] کے شروع میں ہندوستان کے خود ساختہ سگریٹ فر[وخت] ہونا شروع ہوگئے۔

سگریٹ کے اجزائے ترکیبی کی ضرر رسانی:۔

سگریٹ دیکھنے میں تو چھوٹی، نازک اور دلکش ہے مگر جب سائنس دانوں نے اس کے اجزاء کی جا[نچ] کی تو معلوم ہوا کہ اس کے دھوئیں میں ۳۰۰ مختلف اجزا[ء] ہوتے ہیں۔ ان اجزاء میں مختلف گیسیں اور رقیق ماد[ے] شامل ہیں۔ ان میں نو مختلف گیسیں ایسی ہوتی ہیں جو [انسان] کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہیں۔ یہ گیسیں چھوٹے [چھوٹے] قطرات سے مل کر بنتی ہے جو انچ کے چالیس لاکھویں [حصے] کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ قطرات پھیپھڑوں کی دیواروں کی [اور] گلے کی نالیوں پر جم جاتے ہیں اور ان کے لئے نقصا[ن کا] باعث ہوتے ہیں۔ تمباکو میں بعض گیسیں نشہ آور ہو[تی ہیں] جو سگریٹ نوشی کو عادت بنانے کا باعث ہوتی ہیں۔

سگریٹ کے سب سے بڑے جز کا نام نکوٹین [ہے] اس کی مقدار کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ [ایک] سگریٹ کے ذریعے ایک سے تین ملی گرام تک انسانی

کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ جو لوگ دیر تک دھویں کو کشید کرتے ہیں وہ ۹۰ فی صد نکوٹین جذب کر لیتے ہیں اور جو لوگ فوراً ہی دھواں باہر نکال دیتے ہیں وہ صرف ۱۰ فیصد نکوٹین جذب کرتے ہیں۔ نکوٹین کا اثر براہ راست قلب و دوران خون، باضمی نظام اور گردوں کے عمل پر ہوتا ہے خون کے دباؤ میں زیادتی، نبض کا تیز چلنا بھی اسی اثر کے تحت ہوتا ہے۔ منہ کا لعاب SALIVA جو ہاضمہ کے لئے مددگار ثابت ہوتا ہے سگریٹ کی نکوٹین اس میں شامل ہو کر اس کے باضمی اثر کو کم کر دیتی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ زیادہ سگریٹ نوشی کرنے والے حضرات کا ہاضمہ بہت سست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے حضرات ثقیل یا مرغن غذاؤں کے ہضم نہ کر سکنے کی شکایت بھی کیا کرتے ہیں۔ سرطان زا کے مادے اور سنکھیا کے بعض مرکبات کی موجودگی سرطان جیسے مہلک مرض کا باعث بنتی ہے۔

سگریٹ کا استعمال :۔

کسی شے کا ضرر رساں یا سودمند ہونا اس کے مختلف افعال اور ان کے نتائج پر منحصر ہوتا ہے اور جب تک ان سب پر روشنی نہ ڈالی جائے کوئی حتمی فیصلہ ناممکن بھی ہے اور بے اثر بھی۔ سگریٹ کے مضر ہونے کا دارو مدار بہت کچھ اس کے استعمال کرنے کے طریقے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ محققین نے سگریٹ پینے والے مختلف اشخاص کا جائزہ لے کر یہ معلوم کر لیا ہے کہ کثرت سے سگریٹ استعمال کرنے والے لوگ متعدد بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سگریٹ نوشی کے عادی لوگ سگریٹ نہ پینے والے لوگوں کے مقابلے میں قبل از وقت موت کا بہت زیادہ شکار ہوتے ہیں، جبکہ سگار اور پائپ پینے والوں کی شرح اموات کم و بیش نہ پینے والوں کے برابر ہوتی ہے یا دوسرے معنوں میں اس میں بہت معمولی سا فرق پایا جاتا ہے

بیماریاں اور نقصانات :۔

لوتھر کی رپورٹ کے مطابق سگریٹ نوشی کے مضر اثرات میں پھیپھڑوں کے سرطان کا نمبر سرفہرست ہے۔ اس سلسلے کی جانچ اور تجربات کے لئے جب سرطان کے مریضوں کی جانچ پڑتال اور ان کی پچھلی زندگی پر نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ ان میں ستر فیصد سگریٹ نوش تھے۔ یہ اعداد و شمار صرف امریکا اور برطانیہ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اعداد و شمار کے ذریعے ہی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

دوسرا موذی مرض جو سگریٹ نوشی سے لاحق ہوتا ہے وہ کھانسی اور بلغم کا سانس کی نالیوں میں جم جانا ہے۔ ڈیورن اور ہل کے تجربات کے مطابق ۲۵ سگریٹ روزانہ پینے والے ایسے افراد شرح اموات میں تین گنا اضافہ کر دیتے ہیں چنانچہ صرف برطانیہ میں ۱۹۶۲ء میں ۱۵۰۰۰ سگریٹ نوشی کرنے والے حضرات اس مرض کا شکار ہو کر جان بحق ہوئے

رائل کمیشن آف فزیشن کی رپورٹ کے مطابق سگریٹ کا دھواں سانس کی نالیوں کے لئے ضرر رساں ہوتا ہے اور اور سگریٹ پینے والے نہ پینے والوں کی نسبت ۷ فیصد زیادہ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں یا ان امراض میں مبتلا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ ان بیماریوں کے علاوہ تپ دق اور ناسور معدہ (PEPTIC ULER) کا خطرہ بھی ۴ فیصد بڑھ جاتا ہے۔ نفاخ (EMPHYSEMA) کا امکان سگریٹ کی بنا پر ۱۳ گنا بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ امریکا میں عام طور پر سگریٹ نوشی کرنے والے ۷ فیصد افراد اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔

دل کی بیماریوں کا بھی ایک بڑا سبب سگریٹ نوشی ہے اس لئے کہ نکوٹین کے اثر سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے چنانچہ سگریٹ نہ پینے والے عام آدمی کا دل ایک منٹ میں جتنی مرتبہ دھڑکتا ہے سگریٹ پینے والے شخص کا دل نکوٹین کے اثر سے اس سے ۱۵ تا ۳۵ مرتبہ زیادہ دھڑکتا ہے۔ ہیمنڈ اور ہارن کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ دل کی بیماری کا خطرہ سگریٹ نوشی سے پختہ عمر کے لوگوں میں ۳ گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

عورتوں پر تجربات میں سگریٹ نوشی کے مضر اثرات کے مطالعے کے بعد جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عورتیں جو مستقلاً سگریٹ کی عادی ہوتی ہیں ان کے یہاں پیدا ہونے والے بچوں کا وزن ان عورتوں کے بچوں کی بہ نسبت بہت کم ہوتا ہے جو سگریٹ کبھی کبھی پیتی ہیں یا بالکل نہیں پیتیں۔ ایک مشاہدہ کے مطابق ان کے بچے وزن میں ۲۵۰۰ گرام کم ہوتے ہیں۔

اب تک تو سگریٹ نوشی کے ان مضر اثرات کا بیان کیا گیا ہے جو براہ راست سگریٹ نوشی کرنے والوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے نقصانات بھی ہیں جو جان و مال دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً امریکا میں ایک سال میں آگ کے حادثے ۱۸ فی صد سگریٹ کے ٹکڑے کو بے احتیاطی سے پھینک دینے کی وجہ سے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ۱۲۷۴ جانیں تلف ہوئیں۔ امریکا کی میٹرو پولیٹن لائف انشورنس کمپنی میں اس کے گاہکوں میں ۱۶ فیصد حادثات سگریٹ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

سگریٹ سے متعلق دوسرے پہلو کو نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ سگریٹ نوشی کا ایک بڑا اور نمایاں فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دماغی الجھنوں کو کم کرتی ہے اور تھکے ہوئے دماغ کو سکون بخشتی ہے۔ چنانچہ اس کے عادی جب تھکن محسوس کرتے ہیں تو جلد جلد سگریٹ پیتے ہیں اس کے نہ پینے سے ان کی کارکردگی پر اثر پڑتا ہے اور وہ اور تساہلی محسوس کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ معاشرتی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مختلف لوگ اس کو مختلف حالات کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ غور و فکر کے وقت اسے پیتے ہیں یا کھانے کے بعد اس کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سگریٹ عام ضرورت سے رسم و رواج کا جزو بن گیا ہے۔

امریکا میں ایک مشاہدہ کے دوران معلوم ہوا کہ زندگی میں سکون سے محروم ایسے بے چین لوگ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جن کی شخصیت بے اور کام کرنے کی صلاحیت بھی ان میں پینے والوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ سگریٹ نہ پینے والے عموماً خاموش سنجیدہ اور علیحدگی پسند قسم کے لوگ ہوتے ہیں جبکہ پینے والے اکثر ہنگامہ پسند، یار باش، کثیر الاحباب پسند ہوتے ہیں۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایسے لوگ جلد جلد نوکریاں بدلتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے نفسیاتی پہلو کے مدنظر فوائد یا نقصانات ہیں وہ کسی حالت میں بھی اس سے ہونے والی بیماریوں اور نقصانات پر سبقت نہیں اس کے علاوہ اس کے نقصانات کے پیش نظر فوائد کو با آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے ایسی حالت امر نہایت ضروری ہے کہ سگریٹ نوشی کے رجحان کرایا جائے یا کوئی دوسرا نعم البدل وجود میں جو ضرر رساں نہ ہو۔

(پُراسرار کہانی)



جمان نیروڈ

یونانی مصور کے کاغذ زمین پر بکھر گئے۔ ان میں سے ایک کاغذ پر اس شبک سی لڑکی کی تصویر بنی تھی ـــــ یعنی موت کی لکیر

دخانی جہاز ترکی کے ساحل پر ٹھہرا تو ہم سب نیچے اترے۔ مسافر زیادہ نہ تھے۔ ہم دو دوست تھے اور ایک کھاتے پیتے خاندان کے چار افراد، ماں باپ، ایک بیٹی اور اس کا خاوند۔

اور ہاں ایک بات میں بھول ہی گیا۔ جب ہم ساحل پر آنے کے لئے کشتی میں سوار ہو رہے تھے، تو ہل پر ایک یونانی نوجوان ملا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اسی کشتی میں آ گیا تھا۔ اس کی بغل میں دبے ہوئے چند کاغذات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مصور ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، چہرہ زرد تھا اور سیاہ آنکھیں کسی غار میں سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پہلے پہل تو میں نے اس کی باتوں میں بڑی دلچسپی لی جس کی وجہ اس کی شائستہ کلامی اور مقامی حالات سے واقفیت تھی، لیکن جلد ہی اکتا گیا۔ دراصل وہ باتیں بہت کرتا تھا اور یہ باتیں زیادہ تر فضول سی ہوتی تھیں۔

سب سے اچھے وہی چار افراد تھے ـــ ماں باپ بڑے خوش مزاج تھے، بیٹی بڑی شائستہ مزاج ـــ سبک سی لڑکی اور اس کا خوبصورت شوہر بھی بڑے بااخلاق نظر آتے تھے۔

وہ سنگی پہاڑی اسی دبلی پتلی لڑکی کی خوشنودی کیلئے گرمیاں گزارنے آئے تھے۔ شاید وہ لڑکی بیمار تھی، کیونکہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خطرناک بیماری کے بعد صحت یاب ہو رہی ہے یا کوئی خوفناک مرض اپنا منہ کھولے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چلتے چلتے وہ اپنے شوہر کے کندھے پر جھکتی اور سستانے کیلئے کسی جگہ بیٹھ جاتی اور جب وہ اپنی نحیف سی آواز میں باتیں کرتی تو اس کا حلق خشک ہو جاتا، جسے تر کرنے کیلئے وہ تھوڑا سا کھانستی۔ اس کی کھانسی خشک تھی، جب وہ کھانستی، تو اس کے ساتھی لڑکھڑا سے جاتے۔ مجبوب شوہر رحم بھری نظروں سے دیکھنے لگتا اور وہ بھی اس کی طرف اس طرح دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو "مجھے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں!"

اس یونانی کی سفارش پر جو جلد ہی ہم سے رخصت ہو گیا تھا، ہم پہاڑی کے اوپر ایک ہوٹل میں کچھ دنوں کو ٹھہر گئے۔ ہوٹل کا مالک فرانسیسی تھا اور اس نے عمارت کو بڑی خوبصورتی سے سجا رکھا تھا۔

ناشتہ ہم سب نے ایک ساتھ کیا اور جب دوپہر کی گرمی بڑھ گئی تو ہم پہاڑی کے اوپر چلے گئے جہاں صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں سے ہم وادی کا نظارہ کر سکتے تھے۔

ابھی ہم وہاں بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ وہی یونانی مصور آ گیا۔ اس نے قریب آ کر آہستہ سے ہمیں سلام کیا ادھر اُدھر دیکھا اور چند قدم پر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ـــ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے کاغذات پھیلائے اور کوئی خاکہ کھینچنے لگا۔

اوپر سے ماں اور باپ کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے لڑکی کے بے جان چہرے کیطرف دیکھا اور ایک بار پھر تصویر پر نظر ڈالی ان میں ذرا برابر فرق نہ تھا۔

"میرا خیال ہے وہ ہماری طرف پیٹھ کر کے اس لئے بیٹھا ہے کہ ہم وہ خاکہ نہ دیکھ سکیں۔" میں نے کہا۔

"ہم دیکھ کر بھی کیا کریں گے۔" میرے ساتھی پال نے جواب دیا۔ "دیکھنے کے لئے دوسری چیزیں جو ہیں چھوڑو بلا۔"

"معلوم ہوتا ہے وہ ہماری تصویریں بنا رہا ہے اس قصے کو جانے دو۔ دیکھنے کے لئے واقعی ہماری نظروں کے سامنے بہت کچھ تھا۔ یہ جگہ دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور مسرت افزا جگہ ہے۔ کم از کم اس وقت میں یہی سمجھتا تھا۔

اگر میں اپنی زندگی کے تیس دن وہاں گزار لیتا، تو بقایا زندگی کبھی یہ نظارے نہ بھول سکتا لیکن اب بھی وہ ایک دن جو ہم نے وہاں گزارا تھا، کبھی فراموش نہ کر سکونگا۔"

ہوا ہیرے کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ اتنی نرم اتنی پیاری کہ جسم کی ساری طاقتیں اور روح کے سارے گوشے اس کی لطافت میں جھومتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ دائیں طرف سمندر سے اس پار نوکدار چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور بائیں طرف تھوڑے فاصلے پر یورپ کا ساحل جھلملا رہا تھا۔ پڈوس میں "آرچیلاگو" کے نو جزیروں میں سے ایک جزیرہ جو اپنے تن پر سرو کے درختوں کا جنگل اٹھائے، خاموش چوٹیوں کے درمیان ایک دلکش خواب کی طرح کھڑا تھا، ان لوگوں کیلئے پناہ گاہ تھا جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہوں۔

پہاڑی کے گرد پھیلا ہوا پرامن سمندر یوں نظر آرہا تھا جیسے اس میں کئی رنگ گھول دیئے گئے ہوں — دور فاصلے پر یہی سمندر دودھ کی طرح سفید نظر آتا تھا — جہاں سے نیچے پانی کا رنگ گہرا سبزی مائل اور نیلا تھا۔ بالکل صاف شفاف نگینے کی طرح جو اپنی خوبصورتی پر نازاں ہو۔ لہریں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دوڑتی ہوئی آتیں اور زور سے پہاڑی کے پاؤں کے ساتھ ٹکراتیں۔ بڑے بڑے جہاز نہیں نظر نہ آتے تھے، صرف دو چھوٹی چھوٹی کشتیاں ساحل کے ساتھ ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں ان میں سے ایک دخانی کشتی تھی، ملاحوں کے جھونپڑے جتنی بڑی۔ دوسری میں تقریباً بارہ چپو تھے اور جب ملاح ان چپوؤں کو اٹھاتے، تو پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ان سے ٹپکنے لگتا۔ لمبی لمبی مچھلیاں کشتیوں کے درمیان سے ابھرتیں اور دور تک پانی کی سطح پر تیرتی چلی جاتیں۔ نیلے آسمان پر سے سورج کی کرنیں زمین پر اس طرح آرہی تھیں جیسے فرشتے زمین اور آسمان کے مابین فاصلے کی پیمائش کر رہے ہوں۔

یہ پہاڑی پھولوں کے تختوں سے اٹی ہوئی تھی۔ ان پھولوں کی خوشبو سے ہوا عطر بیز تھی۔ سمندر کے قریب کافی ہاؤس سے آرکسٹرا کی آواز مدھم سی صاف شفاف ہوا کے دوش بدوش پر تیرتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس منظر کا تاثر ابدی تھا۔ ہم سب خاموشی سے قدرت کے ان خوبصورت مناظر کا مشاہدہ کر رہے تھے اور ہماری روحیں جنت کی اس تصویر پر فریفتہ ہو چکی تھیں۔ نازک اندام لڑکی اپنا سر شوہر کے سینے پر رکھے اور اپنی سڈول ٹانگیں گھاس پر پھیلائے نہ جانے کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے بیضوی چہرے پر ہلکا سا رنگ آرہا تھا اور چند ہی لمحوں بعد اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے — اس کا محبوب شوہر سمجھ گیا وہ جھکا اور اس کے آنسوؤں سے اپنے ہونٹ تر کرنے لگا۔ ماں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور میرا دل بھی بھر آیا۔

"میں یہاں ضرور اچھی ہو جاؤں گی۔" لڑکی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "یہ جگہ کتنی مسرت انگیز ہے!"

"خدا بہتر جانتا ہے میرا یہاں کوئی دشمن نہیں، لیکن اگر ہوتا، تو میں ضرور اُسے معاف کر دیتا۔" اس کا باپ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

سب خاموش ہو گئے۔ قدرت کے ان مسحور کن نظاروں نے جیسے ہمیں سلا دیا اور ہم پر مدہوشی سی طاری ہو گئی۔ اس مدہوشی کے عالم میں پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ یونانی مصور اٹھا، اپنے کاغذات تہہ کئے اور سر کو ہلکا سا خم دیکر چلا گیا۔

اور پھر کئی گھنٹے بعد جب فاصلے کی ہر چیز دھندلا سی نظر آنے لگی اور جنوب کی سمت ڈوبتے ہوئے سورج کا سرخ عکس سمندر کے پانی سے اٹھکیلیاں کرنے لگا، تو اس کی ماں نے ہمیں یاد دلایا کہ واپس چلنا چاہیئے۔ جہاں ہم اٹھے اور ہوٹل کی طرف جانے والی پگڈنڈیوں سے نیچے اترنے لگے ہم بچوں کی طرح اچھل اچھل کر چل رہے تھے۔

ہوٹل کے برآمدے میں پہنچ کر ہم نے کرسیاں منگوائیں، اور وہیں براجمان ہو گئے۔ دفعتہً نیچے سے کسی کے جھگڑنے کی آواز سنائی دی۔ جھانک کر دیکھا تو وہی یونانی مصور ہوٹل کے مالک سے بحث کر رہا تھا۔ یونہی دل بہلانے کے لئے ہم ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ تم کیا حرکتیں کرتے ہو، اگر مجھے اور مہمان نہ ملے تو کیا کرونگا۔"

میرے ساتھی پال نے وہاں پہنچتے ہی پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب، آپ لوگ کیوں لڑ رہے ہیں اور یہ کون صاحب ہیں؟"

"میں اسکا نام نہیں جانتا، ہم اسے شیطان کہہ کر پکارتے ہیں۔" ہوٹل کے مالک نے جواب دیا۔

"شیطان! کیوں؟"

"یہ کام ہی ایسے کرتا ہے، دیکھئے تصویریں بناتا ہے، تو صرف مُردوں کی۔ یہاں جب بھی کوئی شخص مرتا ہے، اس کے پاس مرنے والے کی مکمل تصویر موجود ہوتی ہے۔ یہ پہلے ہی سے تصویر بنا لیتا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی۔"

میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کی ماں کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ لڑکی کا شوہر ایک ہی جست میں مصور کے پاس پہنچ گیا اور اسے دھکا دیکر وہ کاغذ چھین لئے جنہیں اس نے بغل میں داب رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر میں بھی نیچے بھاگا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ کاغذ زمین پر بکھر گئے تھے اور ان میں سے ایک پر اسی سبک سی لڑکی کا خاکہ بنا ہوا تھا، جسے میں اوپر چھوڑ آیا تھا۔ عین اسی وقت اوپر سے ماں کی چیخ پھر سنائی دی اور پھر باپ کی سسکیاں۔ میں گھبرا گیا اور گھٹنوں کے بل جھک کر تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔

اوپر سے ماں اور باپ کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے لڑکی کے بے جان چہرے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر تصویر پر نظر ڈالی۔ ان میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔



مختلف زمانوں میں

شادی میں مساوات کی تلاش

زمانۂ ماقبل تاریخ میں شادی میں کفو (مساوات) کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب معاشرہ مختلف طبقوں میں بٹ گیا۔ لیکن ابتدائی دور میں جبکہ تمام لوگ ایک ساتھ رہتے اور شکار کھیل کر پیٹ بھرتے تھے، ان میں باہم کسی قسم کا تفاوت یا امتیاز نہیں تھا۔ ہر انسان کا ذریعہ معاش شکار کرنا اور اسے بھون کر کھانا تھا۔ اس دور میں نہ تو کوئی سرمایہ دار تھا اور نہ کوئی مزدور، نہ کوئی غلام تھا اور نہ کوئی آقا۔ پوری کی آبادی ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہتی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں شادی کے وقت کفو کی تلاش کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن اس کے بعد بنی نوع انسان نے جب اپنے دوسرے دور کا آغاز کیا، جانوروں کی پرورش اور زراعت کے طور طریق سے واقفیت حاصل کی، تو انسان اور انسان کے درمیان اونچ نیچ کی بنیاد پڑ گئی۔ مالدار اور غریب کی پہچان ہوئی۔ رعیت اور حاکم کے الفاظ وجود میں آئے۔ جو لوگ ابتک کھیتی و چرواہی کے فن سے ناواقف تھے اور شکار ہی پر گزر بسر کرتے تھے۔ ان کو یہ چرواہے اور کاشت کار حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اس طبقے میں بھی جو لوگ نسبتاً دولت مند تھے۔ وہ اپنے ہم پیشہ غریب بھائیوں کو اپنے سے کمتر و فروتر تصور کرنے لگے۔ یہیں سے غلامی کی رسم شروع ہوئی اور بتدریج اس کو فروغ حاصل ہوتا گیا۔ اب "اونچے لوگ" نیچے لوگوں کے ساتھ شادی کرنے سے احتراز کرنے لگے۔ چرواہوں اور کسانوں نے جھڑی ماروں اور شکاریوں سے ازدواجی تعلقات پر پابندی لگادی۔ غلام اور آزاد کی شادی ممنوع قرار دیدی گئی۔

شادی میں مساوات کی اس تلاش نے بعض

سوڈان اور کانگو میں باپ کی شادی بیٹی سے اور بھائی کی شادی بہن سے کردی جاتی تھی

شخص کسی شودر عورت کے ہونٹوں کو بوسہ دے، خود کو اس سے ملوث کرے اور اُس
رت سے صاحبِ اولاد ہو جائے تو اس کی شدھی کی کوئی صورت نہیں" ——— منو

بانی بکہ مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔ مثال کے
جمہوریۂ سوڈان اور جمہوریۂ کانگو میں پائے جانے
زاندی قبیلے کے فرمانرواؤں میں باپ کی شادی
ے اور بھائی کی شادی بہن سے کر دی جاتی تھی۔
عام لوگوں سے ازدواجی تعلق قائم کرنے
و اپنی بے عزتی اور نقصان سمجھتے تھے جمہوریہ سوڈان
لوک نام کا ایک قبیلہ ہے جس میں ابھی ماضی
ب تک شہزادیوں کی شادی صرف اس بنا پر جائز نہ
ی کی جاتی تھی کہ اس کا کوئی کفو نہیں ہو سکتا۔ اور
ی قسمت کی ماری شہزادی حاملہ ہو جاتی تو اُسے فوراً
ل کر دیا جاتا تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں ——— اسلام سے پہلے عربوں
حسب نسب کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اپنی لڑکیوں
شادی اپنے ہم رتبہ و ہم نسب لوگوں میں ہی کرتے تھے
اہلِ عرب اپنی بیٹیوں کی شادی میں کفو کا کتنا خیال
تے تھے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔
ی اموی حکومت میں عقیل بن علفہ نامی ایک دیہاتی شاعر
ایک دن وہ عثمان بن حیان کے پاس گیا جو ان
ں والی شہر تھے۔ اس نے عثمان سے کہا "اپنی بیٹی
یرے سے عقد کر دو"۔ اس پر وہ بولا "کیا آپ میری کسی
ان اونٹنی سے شادی کرنا چاہتے ہیں"۔ عثمان نے کہا
عقل تو نہیں ہو گئے"۔ اس نے کہا "یہ آپ نے کیا فرمایا"
اس پر عثمان نے اپنا جملہ دہرایا۔ عقیل نے جواب دیا
نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ اگر آپ کسی نوجوان اونٹنی سے
شادی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے بسر و چشم تسلیم ہے ورنہ
معذور سمجھئے۔

شہری معاشروں میں ——— شہری زندگی
رتقا کے ساتھ، مختلف طبقوں کے درمیان اختلاف
امتیازات کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ کبھی ایسا قانون

بنایا گیا جس کی رو سے مطلقاً اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں کے
درمیان ازدواجی تعلقات پر پابندی کر دی گئی۔ اور
کبھی یہ پابندی صرف ایک طرف لگائی گئی یعنی اونچے
خاندان کی عورت اور نیچے خاندان کے مرد میں شادی
نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس کے برعکس اونچے خاندان کے
مرد کو مکمل آزادی تھی۔ وہ حسبِ منشا نیچے خاندان کی
عورت سے شادی کر سکتا تھا۔ بہر حال قانون خواہ کچھ بھی
رہا ہو لیکن عام لوگ اپنے سے ادنیٰ طبقے والوں سے شادی
کرنے کو معیوب سمجھتے رہے ہیں۔ اور ان کی حتی المقدور
کوشش یہی رہی ہے کہ اپنے حسب نسب میں رشتہ
طے پا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ رسم و رواج کے بندھن
کو توڑ کر جو لوگ شادی کر لیا کرتے تھے، ان سے ان
کے طبقے والے ناراض ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں وہ نفرت
اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ہندوستان میں ——— قدیم ہندوستان
(دورِ ویدی) کے زمانے میں اگرچہ کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا
جس سے اس امر کی نشاندہی ہو سکے کہ اس وقت مختلف
طبقوں کے درمیان شادی جائز نہیں تھی لیکن پھر بھی ہندو
ازم کے تمام مفکرین بین الطبقاتی شادی کو نفرت کی نگاہ
سے دیکھتے آئے ہیں۔ بالخصوص برہمنوں کا طبقہ غیر برہمنوں
سے ازدواجی تعلق کو قطعی طور پر حرام سمجھتا ہے چنانچہ مشہور
ہندو مفکر منو لکھتا ہے "جو برہمن گمراہ ہو کر شودر عورت
سے شادی کر لیتا ہے اس کا پورا خاندان شودر
ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی برہمن شودر عورت سے تنہائی میں
ملنے کے بعد برہمن باقی نہیں رہتا۔ اس عورت سے جو
اولاد ہو گی وہ بھی شودر ہی ہو گی"۔ ایک دوسرے مقام
پر یوں لکھتا ہے "جو شخص کسی شودر عورت کے ہونٹوں
کو بوسہ دے، خود کو اس کے ساتھ ملوث کرے اور اس
عورت سے صاحبِ اولاد ہو جائے تو اس کی شدھی کی

کوئی صورت نہیں ہے"۔

قدیم چین میں ——— قدیم چین میں شیہہ (SHIH)
اور شو (SHU) طبقوں کے درمیان شادی ممنوع
تھی۔ اور یہ ممانعت چونکہ اختلافِ نسب کی بنیاد پر تھی
اس لئے کوئی شخص سیاسی یا اقتصادی طور پر کتنا
ہی ممتاز کیوں نہ ہو جائے لیکن اس سے سماج یا معاشرہ
قطعی طور پر متاثر نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ اس رواج کی خلاف
ورزی کرتے تھے انھیں عام لوگ قابلِ نفرت و ملامت
سمجھتے تھے۔ کافی دنوں تک تو ایسی شادی کے خلاف
قانون بھی نافذ تھا۔ نیز ایک قانون ایسا بھی بنایا گیا
جس کی رو سے بدکار، ایکٹر اور سازندے شریف لڑکیوں
سے شادی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ ایسے لوگ اگر کسی شریف
لڑکی سے شادی کر لیتے تو ان کو سو کوڑوں کی سزا دی
جاتی تھی۔ نیز اگر لڑکی والے لڑکے کی حیثیت سے
واقف ہوتے تو یہی سزا لڑکی کے سرپرست کو بھی
بھگتنی پڑتی تھی۔ ایک طرف تو یہ سزا تھی اور دوسری
طرف بحکمِ سرکار عقد فوراً توڑ دیا جاتا اور لڑکی کو اس
کے خاندان والوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

قدیم روم میں ——— قدیم روما میں بھی ایک قانون
کے ذریعے سربرآوردہ اور عام لوگوں میں ازدواجی رشتہ
ممنوع تھا۔ اسی طرح ایک قانون اس مفہوم کا بھی نافذ
تھا جس سے آزاد شدہ لوگوں اور خاندانی آزاد لوگوں
کے مابین شادی طے نہیں کی جا سکتی تھی۔ بعد میں
اگرچہ یہ قانونی پابندیاں اٹھا لی گئیں لیکن عملی طور پر
اس پر برابر عمل درآمد ہوتا رہا۔

قدیم جرمنی میں ——— آزاد اور غلام کا رشتہ
جرمنوں کے یہاں بھی ناجائز تھا۔ یہاں کے قانون کے
مطابق اگر کوئی آزاد آدمی کسی باندی سے عقد کر لیتا
تو بطورِ سزا اس کی آزادی سلب کر لی جاتی تھی اور

واقعات فقہ و علمی

منی میں غلام سے شادی کرنے والی عورت کو بھی غلام بنا دیا جاتا تھا

اس کے برعکس کبھی اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے نکاح کر لیتی تو اسکو اپنی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ جرمنی میں رواج یہ تھا کہ اگر کوئی لڑکی اپنے والدین کی خواہش کے برخلاف کسی غلام سے رشتہ ازدواج استوار کرنا چاہتی تو فرمانروائے وقت اسکو تلوار اور تکلا پیش کرتا۔ اگر وہ تلوار لے لیتی تو اس پر ضروری تھا کہ اسی تلوار سے اس غلام کی گردن اڑا دے۔ اور اگر تکلا قبول کرتی تو وہ آزادی سے محروم کر دی جاتی تھی۔

قانونِ حمورابی مذکورہ بالا قوانین اور پابندیوں کے برخلاف قانونِ حمورابی، آزاد اور غلام کے درمیان رشتے کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس قانون کے مطابق، غلام خواہ کسی عام آدمی کا ہو یا قصرِ شاہی کا، وہ کسی بھی آزاد عورت سے شادی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اور اس عقد سے عورت کی حریت پر بھی کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ اس قانون کی کچھ ذیلی دفعات بھی تھیں۔ مثال کے طور پر غلام کے آقا کو اس عورت کی اولاد سے خدمت لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ غلام کی وفات کے بعد عورت جو کچھ میکے سے لاتی تھی، اس کی بلا شرکتِ غیر مالک ہوتی تھی۔ غلام کی میت میں جو جائداد وہ بناتی تھی، اسکو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایک حصے کی مالک عورت اور اس کی اولاد ہوتی تھی اور دوسرے حصے کا مالک غلام کا آقا۔

اسلام میں باوجود اس بات کے کہ اسلام طبقاتی امتیازات کا قائل نہیں ہے پھر بھی فقہائے امت نے بوقتِ شادی میاں بیوی کے درمیان کفو کو لازم قرار دیا ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ شادی کے لئے کفو کی شرط غیر ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شادی بہر صورت صحیح ہے خواہ شوہر، بیوی کا ہم نسب و ہم رتبہ ہو یا نہ ہو۔ وہ اپنی تائید میں اِنَّ المُؤمِنُونَ اِخوَۃٌ (یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی آیت پیش کرتے ہیں۔ نیز الناس سواسیۃ کاسنان المشط لا فضل لعربی علی العجمی الا بالتقوی (تمام لوگ کنگھے کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔ معیار فضیلت صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہے) کی حدیث بھی ان کے قول کی تصدیق کرتی ہے۔ ان علماء نے اپنے موقف پر ایک عقلی دلیل بھی دی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر شریعت کفو کا اعتبار کرتی تو قوانین تعزیرات کے اندر بھی اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ شریعت اس بات میں بہت ہی زیادہ احتیاط برتتی ہے لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ شریف آدمی کو فاسق آدمی کے بدلے اور عالم کو جاہل کے قصاص میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور جب قانونِ تعزیرات میں اس کا اعتبار نہیں تو شادی میں بدرجۂ اولیٰ اس کا اعتبار نہیں ہونا چاہئے۔

اس ضمن میں شیعوں کے مشہور امام، ابو جعفر محمد بن الحسن لکھتے ہیں: "نکاح کے معاملے میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو ہے۔ جیسے کہ تعزیرات کے باب میں وہ کفو ہیں۔ حسب نسب کا اختلاف بے معنی اور لغو ہے، چنانچہ اگر ایک مسلمان کسی مسلمان لڑکی کے بارے میں پیغام بھیجے اور پیغام بھیجنے والے کے پاس اتنی وسعت بھی ہو کہ وہ عورت کے نان نفقہ کا کفیل ہو سکتا ہے نیز وہ صحیح العقیدہ اور نیک اطوار ہو، فسق و فجور کا مرتکب نہ ہو تو صرف اس بنا پر کہ وہ خاندانی حیثیت سے حقیر اور مال و دولت کے لحاظ سے غریب ہے، لڑکی والے کو شادی سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو اللہ اور اسکے رسول کی سنت کا مخالف ہوگا۔"

مسئلہ سابق حدوم فرماتے ہیں: "تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اسلام میں ایک سیاہ فام حبشی بھی ہاشمی خلیفہ کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔"

لیکن جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ شادی میں کفو کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ شادی چند در چند مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ اور ان مصالح و مقاصد کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جبکہ میاں بیوی کے درمیان قابلِ لحاظ حد تک یکسانیت و قرب ہو۔ نیز عام لوگ ان لوگوں سے رشتہ قائم کرنا جو وجاہت نسبی اور اقتصادی لحاظ سے ان کے ہم رتبہ نہ ہوں مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ایسے رشتے کو وہ ننگ کا باعث اور عار تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ امام سرخسی کا قول ہے "نکاح میں کفو کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ معاملہ ساری عمر کے لئے ہوتا ہے۔ باہمی صحبت میل محبت ایک ساتھ زندگی بسر کرنا اور بہت سے نئے رشتے وجود میں لانا، شادی کے مقاصد میں داخل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی تکمیل دو ہم حیثیت میاں بیوی کے درمیان ہو سکتی ہے۔ اگر کسی اونچے آدمی کی شادی کسی نیچی عورت سے کر دی جائے تو بجائے بیوی کے وہ عملی طور پر اس کی ایک کنیز بن کر رہ جائے گی اور یہ بیوی کی توہین ہے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تب تو عورت کی اور بھی توہین ہے۔ اس لئے بوقتِ عقد ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔"

جو علماء مساوات (کفو) کو شرط مانتے ہیں، ان میں بھی کافی اختلاف ہے کیونکہ یہ تو ایک اضافی چیز ہے۔ کم سے کم مساوات اور زیادہ مساوات کے درمیان بیشمار درجات و مراتب ہیں جن کی تشریح و تعیین نہایت ہی دشوار ہے۔ لیکن اس مقام پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ کفو کی شرط کے قائل ہیں وہ تمام تر پابندیاں صرف مردوں پر عائد کرتے ہیں۔ یعنی مرد کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت کی حیثیت کا ہو لیکن اس کے برخلاف عورت پر

واقعات نیچے دیکھیں

ور ان بندشوں میں جذبہ ہات بھی قربان کرنے کے قابل ہے کیونکہ اس شادی کو بھی باطل قرار نہیں دیتے جو سراسر غیر کفو میں ہوتی ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ کفو کا مطالبہ لڑکی اور اس کے سرپرستوں کا حق ہے لہٰذا اگر وہ اپنے حق سے خود دستبردار ہو جاتے ہیں تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہرحال فقہائے اسلام کے یہ دو نظریے ہیں ایک نظریہ وہ ہے جو حسب نسب کو کوئی اہمیت اور وقعت نہیں دیتا اور دوسرا وہ ہے جو سابقہ رواج و رسوم کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرتا ہے لہٰذا یہ دونوں ہی نظریئے اسلام کے اندر معمول بہ رہے ہیں چنانچہ اسلامی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن الحسین نے ایک انصاری کی ام ولد (کنیز) سے شادی کر لی تھی جب عبدالملک بن مروان نے اس ضمن میں آپ کو ملامت کی تو آپ نے جواب دیا کہ "اسلام ایک ایسا جوہر ہے جو ہر کمی اور نقصان کی تلافی کر دیتا ہے۔ اگر ایک مسلمان کسی مسلم باندی سے شادی کر لے تو اس میں کوئی شرم و عار کی بات نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی باندی اور اپنے غلام کی عورت سے شادی کی تھی۔" اس پر عبدالملک نے آپ کی تحسین و تعریف کی تھی۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ "قبیلہ بنی سلیم کے چند بادیہ نشین حالات کے زیر اثر روحار میں آکر بس گئے۔ یہاں کے ایک سردار نے ان میں سے کسی کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور دونوں طرف کی رضامندی سے یہ رشتہ طے پا گیا۔ روحار میں محمد بن بشیر نامی ایک خارجی بھی رہتا تھا۔ اسے اس رشتے پر بڑا تاؤ آیا۔ گھوڑے کی باگ سنبھالی، اور والی شہر، ابراہیم بن ہشام کے پاس آکر اس معاملہ کی شکایت کی۔ اس پر ابراہیم نے روحار کے مسلمانوں کے نام ایک تحریر لکھی جس میں میاں بیوی کے درمیان فوری تفریق کے علاوہ سردار کیلئے دو سو کوڑوں کی سزا تجویز کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کے سر، داڑھی اور بھنوؤں کے بال مونڈ دیئے جائیں۔ اس فیصلے سے خوش ہو کر محمد بن بشیر نے ابراہیم کی انصاف پسندی اور عدل گستری کی تعریف میں ایک نظم بھی کہی تھی۔

آزاد اور غلام کا رشتہ

سم فقہاء نے آزاد آدمی اور غیر کی باندی کے درمیان اور اسی طرح آزاد عورت اور غیر کے غلام کے درمیان عقد کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس ذیل میں فقہ کی مشہور کتاب "النہایہ" میں فقیہ ابو جعفر محمد بن الحسن لکھتے ہیں "آزاد مرد اگر آزاد عورت سے شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو کسی دوسرے کی کنیز سے بھی عقد کر سکتا ہے لیکن شادی سے پہلے اس کے آقا سے اجازت لینی ہو گی، اور تھوڑا بہت جو مہر ٹھہرے اس کو بھی ادا کرنا پڑے گا۔ مالک سے اجازت حاصل کرنے کے بعد جب باندی سے شادی کرے گا تو اس سے جو اولاد ہو گی وہ آزاد سمجھی جائے گی بشرطیکہ آقا نے غلامی کی شرط لگائی ہو، اور جب وہ آقا کی مرضی سے اس سے شادی کرے گی تو اس کی اولاد آزاد ہو گی، ہاں اگر آقا نے اولاد کی غلامی کی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے تو دوسری بات ہے

جدید معاشرہ: نئے معاشرہ میں شادیوں پر لگائی ہوئی تمام پابندیاں تقریباً ختم کی جا چکی ہیں۔ رسم غلامی کی جڑ ہی کاٹ دی گئی تاکہ آزاد اور غلام کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں اس مفہوم کے قانون بن گئے ہیں جن سے مختلف طبقات کے درمیان حائل شدہ تفریقات و امتیازات کی دیواریں منہدم ہو گئی ہیں۔ آج ہر انسان قانون کی نگاہ میں ایک ہی حیثیت اور رتبے کا مالک ہے۔ نئے قوانین میں تمام ہموطنوں کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے اس بات کی مکمل طور پر توضیح کر دی گئی ہے کہ کسی کو سرزبان، مذہب یا رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی قسم کی بالادستی و برتری حاصل نہیں ہو سکتی، اس قسم کے قانون صرف یورپی ممالک ہی میں نہیں بلکہ بلا تفریق اشتراکی و غیر اشتراکی دونوں قسم کے ممالک میں نافذ ہیں۔ حالانکہ ماضی قریب تک وہ طبقاتی اونچ نیچ کے زبردست حامی رہے ہیں۔

ہندوستان میں ۱۸۷۲ء میں ایک قانون کے ذریعے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو باہم شادی کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ اس طرح ۱۹۵۵ء میں جو قانون پاس کیا گیا اس میں بھی ازدواجی تعلق کے بارے میں ہر شخص کی آزادی اور خود مختاری کا احترام کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جاپان نے بھی ایک دستور منظور کیا جس میں اس بات کی تصریح تھی کہ کسی بھی جاپانی کو کسی دوسرے جاپانی پر حسب نسب، مال و دولت، یا مذہب و عقیدہ کی بنیاد پر فضیلت و فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

تاہم اس نئے دور میں بھی بہت سی ایسی ماڈرن قومیں ہیں جہاں نسلی و جنسی امتیاز پر بدستور عمل ہو رہا ہے اور ازدواجی تعلقات کے اندر اس کی خصوصیت سے پاسداری کی جاتی ہے۔ دراصل اس طریقہ کار کو معاشرے کا بالادست طبقہ اپنی حکمرانی و بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت ہی موثر سمجھتا ہے۔

مثال کے طور پر جرمنی میں ہٹلر کے تیسرے فرمان کی رو سے تمام جرمن لوگ ساری دنیا کی قوموں کے مقابلے میں خود کو اعلیٰ و افضل تصور کرنے لگے، اس کے فوراً بعد جرمن اور غیر جرمن شادی پر کلیتاً پابندی لگادی گئی تاکہ جرمنوں کی نسل خلط ملط نہ ہو جائے، اور پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جرمن نژاد یہودیوں اور غیر یہودیوں کی بھی شادی روک دی گئی نیز یہاں کا حکمران طبقہ صرف آپس میں شادی کر سکتا تھا لیکن ہٹلر کے زوال کے ساتھ ہی اس کے نافذ کردہ تمام عائلی قوانین کے تار و پود بھی بکھر گئے۔

متحدہ امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں آج بھی، کالے اور گورے کے باہمی رشتے پر قانونی پابندی ہے اور اس قانون کا امریکی باشندے بڑا احترام کرتے ہیں۔ امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں جہاں کالے زیادہ تعداد میں رہتے ہیں۔ اس قانون پر بڑے شد و مد سے عمل کیا جاتا ہے۔ متحدہ امریکہ کی مغربی ریاستوں میں جہاں زرد رنگ چینی اور جاپانی بکثرت رہتے ہیں۔ وہاں ایک دوسرے قانون کے ذریعے گوروں اور زرد رنگ والوں کے درمیان بھی شادی کرنے پر پابندی عائد ہے۔

جنوبی افریقہ کی ان ریاستوں میں، جہاں پر گوری اقلیت قابض ہے۔ ۱۹۴۹ء میں قانون بنا کر گوروں اور غیر گوروں کے ازدواجی تعلقات پر روک لگادی گئی۔ اس قسم کا کوئی بھی رشتہ اگر طے پا جائے تو سرکار کو اسے توڑ دینے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر حکمران طبقے کا کوئی فرد دیدہ دانستہ قانون شکنی کا مرتکب ہو تو اس کے لئے سخت سے سخت سزائیں متعین ہیں۔

واقعات منظر دہلی

آکھیٹ

۱۹۰۰ء میں میری عمر ۲۳ سال تھی۔ علی گڑھ کالج میں ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ مگر میرا گھوڑا دو مرتبہ اس ٹٹی کو کودنے میں ناکام رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوا جان نے چھوٹے صاحب، بڑے صاحب، ننھے صاحب، کالے صاحب، گورے صاحب غرضیکہ ہر قسم کے صاحب لوگوں سے سعی و سفارش کر کے مجھے ایک سرکاری محکمے میں نمک خوارِ سرکار بنا ہی دیا۔ اپنے عہدے کے فرائض کی انجام دہی کے لئے مجھ پر لازم تھا کہ شمالی ہندوستان کے ایک ایسے وحشتناک صحرائی اور پہاڑی حصے میں گھوڑے کی پیٹھ پر لدا ہوا مارا مارا پھرا کروں جسکا کچھ حال اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے سنا دینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے میری داستان کے ماحول سے کسی قدر آشنا ہو جائیں۔

شمالی ہندوستان میں ہمالیہ کے سربلند سلسلے کا دامن سیکڑوں میل لمبے چوڑے جنگل ہیں۔ اس قدر گھنے کہ سورج کی روشنی بمشکل ان کے اندر پہونچ پاتی ہے اور اس قدر مرطوب کہ گرم موسم کی جلتی ہوئی دوپہر میں آپ یکایک اس جنگل کے اندر داخل ہوں تو مارے سردی کے کانپنے لگیں۔

خدا کی اس سرزمین پر صبح صادق کی ہلکی روشنی اور گلابی

واقعات نئی دھلی

جاڑوں کی موسم گیارہ مہینے قائم رہتی ہے۔ سرکاری اصطلاح میں دامن ہمالہ کے ان جنگلوں کو "ترائی" کہتے ہیں۔ اور واقعی یہ اسمِ صفت ہے بھی اس جنگل کی دنیا کا صحیح نام۔

اس خطے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قدرت نے وہاں اپنی نعمتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ پہلو بہ پہلو۔ زہر اور شہد۔ سرسبزی و شادابی، قدرتی مناظر کا حسن روح پرور۔ حسین پرندوں کے ساحرانہ نغمے۔ یہ سب ایک طرف اور دوسری طرف کروڑوں حشرات الارض۔ سانپ، بچھو، شیر، ہاتھی، اژدھے، دلدلیں، بیماری کے جراثیم، زہریلے کانٹے اور ہر وہ چیز جو انسان کی جان کی دشمن ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے اپنی قوتِ تخلیق کے سارے خزانے خوب ہی دل کھول کر ان جنگلوں میں لٹائے ہیں — خوبی کمال اور کثرت، تینوں چیزیں موجود ہیں۔ نعمت ہو یا لعنت ہر چیز میں کثرت مقدار و تعداد سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ سبزہ اور قدرتی مناظر، دریا، جھیلیں، حسین اور خوش گلو پرندے اتنے ہیں کہ شمار سے باہر۔ اسی طرح سانپ، شیر اور خونخوار جانور اتنے ہیں کہ ان کی تعداد اندازے سے باہر۔ القصہ لعنتوں اور نعمتوں کے اس ہجوم میں جو انسان اپنی زندگی کے بارہ مہینے گزار دے اور پھر وہ اس طرح داستان کو بیان کرنے کے لئے زندہ بھی رہے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں۔

سرکاری پروانہ آیا تو مجھے یاد ہے کہ ابا جان بہت ہی خوش ہوئے لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ اپنی قسمت پر لعنت بھیجتے گھر سے نکلے۔ کام ہمارا یہ تھا کہ ہم ان جنگلوں میں بارہ مہینے دورہ کرتے رہیں اور دورے کا حال یہ تھا کہ دو چار ملازم اور ایک ماتحت ہمارے ساتھ اور ہم۔ ایک خیمہ۔ دو گھوڑے (جن میں سے ایک کو ایک دفعہ شیر کھا گیا) ایک رائفل ایک معمولی بندوق۔ جنگل میں جہاں دس پانچ گز زمین کھلی ہوئی پائی ڈیرا لگوا دیا۔ خیمے کے چاروں طرف خندق، خندق کے چاروں طرف آگ روشن تاکہ خونخوار درندے خیمے پر حملہ نہ کر سکیں۔ خیمے کے اندر ہم ایک پلنگ پر جس کے چاروں پائے پانی سے بھری ہوئی ناندوں میں رکھے جاتے تھے تاکہ زہریلے جانور بستر پر نہ آ سکیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک یہ حال ہوتا تھا کہ ہم پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں فرش پر قدم نہیں رکھ سکتے۔ ایک بندوق ہماری گود میں رکھی ہوئی ہے۔ باہر خیمے کے گرد شیر دہاڑ رہے ہیں۔ سو سو، دو دو سو ہاتھیوں کا گلہ چکر لگا رہا ہے۔ دو چار ریچھ گھوم رہے ہیں۔ یہ تو باہر کا حال ہے اور اندر — خیمے کے اندر فرش پر سانپ دوڑ رہے ہیں۔ دو، چار، چھ، دس، ناچ رہے ہیں۔ ہماری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ جسم پر ٹھنڈا پسینہ ہے۔ ہاتھ قابو میں نہیں۔ پانی کی صراحی پاس رکھی ہے۔ ہر پانچ منٹ میں حلق کو تر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغرب کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک یہ حال رہتا تھا۔ آفتاب کی پہلی شعاع جنگل کی الجھی ہوئی شاخوں میں داخل ہوئی اور رات کا یہ تماشا ختم ہوا۔ جنگل کے تمام خوفناک ایکٹر اسٹیج سے رخصت ہو کر اپنے اپنے ٹھکانے لگے۔ اور صبح صادق کی روح پرور فضا میں خوش گلو پرندوں نے اپنے گیت شروع کر دیے۔

بارہ مہینے اللہ کی زمین پر راقم الحروف کی زندگی اسی طرح گزری۔ غور کیجیے! قصہ مختصر یہ جگہ تھی یہ سال تھا یہ ماحول تھا جہاں ایک عجیب و غریب واقعہ مجھ پر گزرا۔

جنگل کی سرحد پر پیلی بھیت کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام ہے کشیا تھا۔ جنگل کے مصائب سے

کیونکہ گاؤں میں اس آبادی کے پاس بالکل نہ تھی [illegible] دیکھ بھال وہ چار دن تک لڑکر اپنے فرسودہ اعصاب کو آرام دیتا تھا۔ اس طرح آکر ٹھہرنے اور دم لینے کی ایک وجہ یہ بھی کہ کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ انسانوں کی کچھ غذا میسر آ جاتی تھی۔ ویران جنگلوں میں تو سوائے سوکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی جھیلوں اور آلوؤں کے کچھ نصیب ہی نہ ہوتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ دودھ کا ایک قطرہ میسر نہ آسکتا تھا۔ حالانکہ ان جنگلوں کا ہر کاشتکار دو دو سو گائے بھینسیں پالتا تھا اور ان کے گلے جنگلوں میں پھرتے رہتے تھے۔ لیکن خدا کی اس انسان صورت جنگلی مخلوق کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ دودھ بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔ کٹیما نا قریب کے اضلاع سے دودھ آتا رہتا تھا اور جب میں وہاں مقیم ہوتا تو خدا کی یہ نعمت مجھے بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں دودھ کی طرف جو رغبت ہوگی وہی اب جوانی میں مجھے کٹیما آنے کے لئے بیتاب کرتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جنت کی کسی نہر کا بہاؤ آسمان سے زمین کی طرف ہو گیا ہے اور گویا اس نہر کا خالص دودھ کٹیما میں اللہ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جب میرا کیمپ کٹیما کی طرف آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ بستی کے اندر سخت طاعون پھیلا ہوا ہے چنانچہ میرا خیمہ بستی سے کچھ فاصلے پر لگایا گیا عموماً شام کو قبل مغرب میں اپنے کیمپ میں خیمے کے سامنے کچی سڑک کے پاس کرسی بچھا کر بیٹھا کرتا تھا۔ انسان کے ہم صورت جنگل کے جانور جو اکا دکا اس طرف گزرتے تھے ان کی صورتیں بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ اس مشغلے میں تنہائی کے اوقات کٹ جاتے تھے۔ اب داستان شروع ہوتی ہے۔

ایک دن شام کو حسب معمول سر راہ بیٹھا ہوا تھا میرا منہ گاؤں کی طرف تھا۔ کچی سڑک پر جو خشک تالاب کے اندر سے گزر کر گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ میں نے ایک شخص کو آتے دیکھا۔ آٹھ مہینے مجھے اس جنگل میں گزر چکے تھے اس سے پہلے اس وضع اور صورت کا انسان میں نے یہاں نہ دیکھا تھا اس لئے قدرتاً کچھ تعجب پیدا ہوا۔ جب وہ صاحب میرے قریب سے گزرنے لگے تو بے اختیار میں نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔

"السلام علیکم"

وہ میری آواز سن کر میرے قریب آکر رک گئے نہایت شائستہ اور شیریں زبان میں انھوں نے سلام کا جواب دیا میں نے کہا۔

"تشریف رکھئے" اور وہ بے تکلفی سے خالی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ داستان کا سلسلہ بڑھاؤں ذرا ان کا حلیہ بھی سن لیجئے۔

حلیے کے متعلق کیا اس قدر کہنا کافی نہ ہوگا کہ یہ صاحب اتنے حسین اور خوش رو تھے کہ میں نے اپنی عمر میں ان سے زیادہ حسین آدمی نہیں دیکھا۔

مردانہ حسن کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھا جو میں نے نہایت میلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا آج تک وہ تصویر میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔ وضع قطع بھی دیکھ لیجئے پاؤں میں ادھ مسل کی پھٹی ہوئی سلیم شاہی جوتی۔ چوڑی دار پاجامہ میلا اور پھٹا ہوا باریک ململ کا کرتا جس پر لکھنؤ کی چکن بنی ہوئی تھی۔ مگر نہایت میلا اور بوسیدہ۔ سر پر دوپلی ٹوپی وہ بھی میلی۔ سر پر چھوٹے چھوٹے پٹے، بالوں میں تیل اور مانگ نکلی ہوئی۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں لیکن داڑھی ندارد دامنہ میں پان، آنکھوں میں ہلکا سا سرمہ۔

یہ ان کی تصویر ہے۔ میں نقاش یا مصوّر ہوتا تو رنگ اور مو قلم سے کاغذ پر کھینچ دیتا۔ ان کا بال بال میری نظر میں محفوظ ہے۔ میں نے کہا۔

"حضرت آپ جیسا آدمی یہاں کہاں"؟ کہنے لگے۔

"کیوں مجھ میں آپ نے کیا خاص بات پائی"؟ میں نے کہا "حسن اور شائستگی جو اس ویرانے میں عنقا ہے" مسکرا کر کہنے لگے۔

"کیسی غلط بات آپ فرماتے ہیں۔ حسن کی موجودگی سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے، اسی طرح جس طرح خدا ہر جگہ موجود ہے۔ آپ نے ترائی کے بھینسوں، ریچھوں، ہاتھیوں اور سانپوں میں حسن کو نہیں دیکھا"؟

میں نے کہا۔ "یہ سب صحیح، مگر اس اجاڑ میں آج پہلی ہی دفعہ تصوّف کے یہ موتی بکھرے ہوئے دیکھے ہیں" یہ مسکرا کر کہنے لگے۔

"اگر کان نہ سنیں، آنکھیں نہ دیکھیں تو کیا اس دلیل پر ہم موتی کے وجود سے انکار کر دیں گے بھائی صاحب"! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے۔

"بدصورت سے بدصورت مرد اور بدصورت سے بدصورت

[illegible]

فرض ان سے [illegible] کر معلوم ہوا کہ حضرت کوئی غیر معمولی انسان ہیں۔ وسیع مطالعہ اور تجربہ پر گفتگو۔ بہت سی باتیں ہوتی رہیں مگر وقت کم تھا انھوں نے کہا کہ مغرب سے پہلے ان کی واپسی ضروری ہے اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

دوسرے دن وہ کوئی پانچ بجے آ گئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ وطن اور مکان کہاں ہے۔ کہنے لگے۔

"سامنے گاؤں میں رہتا ہوں کئی سال ہو گئے زراعت سے معاش پیدا کرتا ہوں۔ فرصت کے اوقات میں جنگل کی سیر کرتا رہتا ہوں"۔

چاہتا تھا کہ پوچھوں آخر اس ویرانے میں وطن کیوں بنایا۔ مگر ابتدائی ملاقات میں کچھ ہمت نہ ہوئی۔ وہ ہر روز آنے لگے اور ہر روز ان کے نت نئے کمالات اور جوہر مجھ پر آشکار ہونے لگے۔ شاعر تھے اور پھر سخن فہم۔ ہزار ہا شعر اردو فارسی کے ان کو یاد تھے۔ کھانا نہایت نفیس پکاتے تھے، جیسا کہ انھوں نے پکا پکا کر کھلایا آج تک کبھی نصیب نہ ہوا۔ یا تو یہ حال تھا کہ سوائے سوکھے آلو اور سوکھی مچھلی پر جسم و جان کے تعلق کا انحصار تھا یا یہ عیاشیاں" کہ وہ روز کھانا پکانے کا کچھ سامان روانہ کراتے اور بریانی کباب مرغ اور قسم قسم کے میٹھے کھانے بیٹھ کر پکاتے۔ خود بھی مزے لے لے کر کھاتے اور مجھے بھی اتنا کھلاتے کہ کھاتے کھاتے لیٹ جاتا۔ شطرنج خوب۔ خوب نہیں بلکہ استادانہ کھیلتے تھے۔ علمی حالت بہت بلند تھی جس مسئلے پر گفتگو کرتے تھے کم از کم مجھے تو زبان کھولنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

تین چار ہی دن میں کچھ ایسے بے تکلف ہو گئے کہ تم اور تو تک نوبت آ گئی اور خدا بے تکلفی رہی تو پٹنے والی زہرہ اور الٰہ آباد کی چھپن چھری اور کلکتے کی گوہر کے تذکرے ہونے لگے۔ اس سلسلے میں پتہ چلا کہ موسیقی سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ گاتے بھی خوب ہیں۔

میں سوچتا تھا کہ خدا کی شان دیکھو اس ویرانے میں جہاں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے تھے یہ مافوق الانسان نظر آیا۔

ایک دن کہنے لگے: "میاں تم جانتے ہو کہ دنیا میں خدا کی دو بہترین نعمتیں ہیں" میں نے کہا "کیا"؟ کہنے لگے۔

واقعات [illegible] دہلی

"ایک نفیس حسین عورت اور ایک نفیس لذیذ غذا"
مگر وہ کہنے لگے۔ "اس الو کے پٹھے نے جس کا نام انسان ہے کبھی یہ نہ جانا کہ ان دو نعمتوں سے مستفیض کیونکر ہونا چاہیے۔ عورت کو بچہ پیدا کرنے کی مشین یا اپنی نفس پرستی کا آلہ بنا لیا اور اچھی غذاؤں کو اس گنوارپن کے ساتھ کھانا شروع کیا کہ بدہضمی ہونے لگی۔ اب ضعفِ باہ اور ضعفِ معدہ کے نسخے تلاش کرتا پھرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید مرد کی فطرت ہی یہ ہے" تو کہنے لگے۔

"کیا بکواس کرتے ہو، فطرت بھی کبھی غلط ہو سکتی ہے۔ فطرت کا نام کیوں لیتے ہو۔ جس کو تم جیسے گدھے فطرت کہتے ہیں وہ درحقیقت تمہارا آوارہ اور بے کار نفس ہے" اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ عورت اپنا بدلہ تم سب سے ضرور لینے والی ہے۔ ایک لطیفہ سناؤں۔ ان جنگلوں میں ایک وحشی قوم آباد ہے۔ تعداد تو زیادہ نہیں، یہی کوئی دس بارہ ہزار نفوس ہیں مگر ان کے تمدن میں مرد و عورت کی حیثیت بالکل منقلب ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی قوم میں ہر عورت برہمن ہے اور ہر مرد چمار۔۔۔ یعنی میاں بیوی اور باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھا نہیں سکتے، ایک دوسرے کے برتن استعمال نہیں کر سکتے۔ عورت کے لیے مرد نجس العین ہے۔ یہ اس بغاوت کی بدترین صورت ہے۔"

ان کی گفتگو کا یہ ایک نمونہ میں نے پیش کیا۔ ان کی دعوت میں کئی ہفتے تک کمشیا میں ٹھہرا رہا۔ بہت چاہا کہ وہ شہر میں میرے ساتھ چلیں یا کسی رات میرے خیمے میں قیام کریں لیکن اس پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے۔

چند روز کے لیے میں جنگلوں میں چلا گیا۔ پھر ان کی یاد کا ستایا ہوا کمشیا آیا۔ جس دن میں آیا اس کے دوسرے دن صبح کو وہ آئے۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں خلافِ معمول خیمے کے فرش پر بیٹھا ہوا دفتر کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میرا پیشکار سامنے بیٹھا تھا۔ میں عموماً سانپوں کے ڈر سے فرش کی نشست کم پسند کرتا تھا۔ لیکن اس دن حساب کتاب کے بہت بڑے بڑے رجسٹر دیکھنے تھے اس لیے ان کو پھیلا کر سامنے رکھنے کے لیے فرش پر بیٹھنا پڑا تھا۔ وہ آئے اور وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ یکایک میرا پیشکار اٹھ کر بھاگا۔ "سرکار سانپ۔۔۔ سانپ"

"ارے کہاں۔ کدھر؟" میں نے کہا۔

"کتاب کے نیچے۔۔۔ کتاب کے۔۔۔ اس کو نہ چھوڑیے" پیشکار بدحواس ہو رہا تھا۔ میں بھی اٹھ کر بھاگا اور بھاگ کر خیمے کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

یہ حضرت اس تمام شور و شر میں بیٹھے رہے۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ قائم تھی جو ہمیشہ ان کے چہرے پر کھیلتی رہا کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لیے بھاگو، بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو" مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی کتاب کو اٹھایا۔ بھورے رنگ کا ایک پتلا ڈیڑھ ہاتھ لمبا سانپ پھنکار مار کر ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں مبہوت اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بے تکلف ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ سانپ نے پلٹ کر ان کے ہاتھ کی پشت پر پے در پے تین جگہ کاٹا۔ تینوں جگہ خون نکلنے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے انہوں نے اس کا سر توڑ کر جسم سے الگ کر لیا اور اس کو خیمے سے باہر پھینک کر اپنے کرتے کے دامن سے اپنے ہاتھ کا خون صاف کرنے لگے۔

"بہت زہریلی قسم کا تھا یہ سانپ۔ ہم لوگ اس کو سینگ کہتے ہیں۔ ذرا دیکھنا کسی ملازم سے کہو کہ اس کے سر کو کچل کر کہیں دور پھینک دے۔"

وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے یہ ہدایات جاری فرما رہے تھے اور میں ان کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"جاؤ۔ جاؤ بہت جلدی ڈاکٹر صاحب کو لاؤ۔" میں نے پیشکار سے کہا۔

"جی نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ خون نکل گیا زہر بھی نکل گیا۔" انہوں نے اس قدر اطمینان سے فرمایا کہ مجھے غصہ آ گیا۔

"عجیب الو ہو تم۔ سانپ کا زہر کوئی ایسی چیز ہے جسے تم ہضم کر جاؤ گے۔ انسان ہو یا کوئی دیو بھوت۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"خیر جانے دو۔ ہوش میں آؤ۔ یہاں آ کر بیٹھو اور پسینہ پونچھو۔ انسان بنو۔ کہہ تو دیا تم سے کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر ہی نہیں ہوا کرتا۔"

"دس منٹ میں تم لمبے لمبے لیٹ جاؤ گے۔ شاید اپنی جوانی پر اکڑ رہے ہو" وہ مسکرا رہے تھے۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ میں عادی ہو گیا ہوں۔ ہزاروں دفعہ سانپوں نے کاٹا ہے۔ اب کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔"

"سانپ کاٹے اور اثر نہ ہو! تم باولے ہو، یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"پاگل نہ تم ہو نہ میں ہوں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ دیکھو خود تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ اچھا اب باورچی کو بلاؤ تو میں بریانی پکانے کا انتظام کروں۔"

آج تک میں حیران ہوں کہ وہ قصہ کیا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے ان کو کوئی دوا ایسی معلوم ہو یا کوئی عمل یا تعویذ ایسا ہو جو ان کو سانپ کے زہر سے محفوظ رکھتا ہو۔ بہت پوچھا، بہت اصرار کیا، لڑا، جھگڑا، خوشامد کی مگر اس اللہ کے بندے نے کچھ بھی نہ بتایا کہ یہ بھید کیا ہے۔

ایک دن میں اور وہ بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ان جنگلوں کے زہریلے جانوروں کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے۔

"تم نے کبھی یہاں کے بچھو بھی دیکھے ہیں؟"

میں نے کہا "دیکھے تو نہیں مگر سنا ہے کہ ظالم ایک ایک بالشت لمبے ہوتے ہیں اور بے حد زہریلے۔"

کہنے لگے "میں تمہیں دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے سر سے ٹوپی اتاری اور اس کو سامنے فرش پر لوٹ دیا۔ میں کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہوا۔ میں سانپ سے زیادہ بچھو سے ڈرتا ہوں۔ اور وہ بچھو جو ان کی ٹوپی میں سے نکلا۔۔۔ ۔۔۔ اللہ محفوظ رکھے۔ دس انچ سے تو کم نہ ہوگا۔ میں اٹھ کر بھاگا۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لیے اٹھاؤ اس کو۔ میرا تو دم فنا ہو رہا ہے۔"

مسکراتے ہوئے انہوں نے اس کا ڈنک پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر اپنی ٹوپی میں رکھ کر ٹوپی سر پر رکھ لی۔

"ہو نہ ہو یہ کوئی عمل یا تعویذ ہے۔" میں نے کہا "کچھ بھی ہو۔ تمہیں بتانا ہوگا۔ اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گا۔ آج تم نہیں یا میں نہیں۔ بتاؤ۔" میں ان کے سر ہو گیا۔

کہنے لگے "بیٹھو ذرا دم لو، بات سنو۔ میرے سر ہونے سے کیا فائدہ۔ کچھ ہو تو بتاؤں کہ کیسا عمل اور کیسا تعویذ۔ میں نماز تک نہیں پڑھتا۔ اللہ کا نام لینا ہی دشوار

ہے بھلا اُلو اور گوہ کا کیا ذکر ہے۔ میں بیچارہ سارى عمر کان دادو ہوں۔ سہ ہوائی، میں کیا جانوں پیروں کی کرامات؟"
میں نے کہا، "میں تو نہ مانوں گا، کچھ تو ضرور ہے۔
سانپ کا زہر تم پر اثر نہیں کرتا، ایسے خوفناک بچھو کو تم سر پر رکھے پھرتے ہو۔" قطع کلام کر کے کہنے لگے۔
"سنو سنو تم نے کبھی خوف کے فلسفے پر غور نہیں کیا۔
انسان کے تمام محسوسات میں سب سے قوی ہے۔ پیر فقیر، حاکم سب اسی سے کام لیتے ہیں۔ خوف نہ ہو تو دنیا میں کوئی کسی کا محکوم نہ رہے۔ یہ سب لمبی لمبی داڑھیوں والے اپنے ہاتھ پر بیعت کراتے ہیں لوگوں سے پجواتے ہیں۔ گلے میں ہار ڈلواتے ہیں یہ سب اسی جنس کے سوداگر ہیں۔ دلوں میں خوف پیدا کر کے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ اپنی زندگی کی ترکیب سے خوف کے عنصر کو نکال دو پھر دیکھو دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مرعوب نہ کر سکے گی۔ سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزا کو شامل سمجھتے ہو، وہ درحقیقت زہر کے اندر موجود ہی نہیں بلکہ خود تمہارے اندر ہیں۔ اپنے اندر کو ان اجزا سے پاک کر لو پھر سانپ کے منہ میں انگلی ڈال دو ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا کہ میں ہوں سمجھے؟"
"خاک بھی نہ سمجھا" میں نے کہا، "سمجھوں تو جب جب تم سمجھنے کی کوئی بات کہو۔ خوف کا ایک عجیب فلسفہ نکال کر لائے ہو۔ خوف تو فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے۔"
"نہیں۔ غلط! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خوف فطرت انسانی کا ایک جزو ہے۔ شیر خوار بچہ بالکل بےخوف ہوتا ہے۔ سانپ کا منہ اس کے منہ پر رکھ دو۔ آگ کی طرف اس کا ہاتھ لے جاؤ، کبھی خوفزدہ نہ ہوگا۔ مگر جب شعور آئے گا تو وہ یہ دیکھے گا کہ آگ سے سب ہی ڈرتے ہیں، سانپ سے خوفزدہ ہیں، خوف کے جراثیم اس کے دماغ میں جگہ پا جائیں گے اور اس کی فطرت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔"
"عجیب سنکی ہو" میں نے کہا، "ساری دنیا کے علوم سے اور انسان کی صدیوں کی تحقیقات سے انکار کر کے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں اصل حالات معلوم کر کے رہوں گا۔ آج نہ سہی کل سہی۔"
غرض کہ ہر روز ان سے اسی طرح تو تو میں میں ہوتی تھی مگر اللہ کا بندہ کبھی نہ کھلا۔ کبھی اس نے ایک حرف ایسا نہ کہا جس سے پتا چلتا کہ سارا کیا ہے۔ وہ جس قدر ٹالتا

میری کرید بڑھتی۔ آخر ایک دن یہ مسئلہ حل ہو گیا۔
"آج کے دن سے تم میرے تعمیل ہو۔ اب تم کو میرے ہی پاس رہنا ہے۔ بعنت بھو کھیتی اور کاشت کاری پر۔ میں جہاں جاؤں میرے ساتھ رہو۔ ابھی دوپہر سے پہلے بیچ کر تمہارا سب سامان منگوائے لیتا ہوں۔"
یکایک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ نہایت سنجیدہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکن، آنکھوں میں ایک قسم کی چمک، آواز میں لچک کی بجائے کرختگی۔ یہ رنگ میں نے اب تک دیکھا ہی نہ تھا۔ کہنے لگے "مذاق اور دل لگی سے قطع نظر، ایک بات میری سن رکھو، وہ یہ کہ میری تمہاری دوستی کی پہلی اور مستحکم شرط یہ ہے کہ کبھی مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہارے پاس رہوں یا کبھی ایک شب بھی تمہارے پاس گزاروں۔ میری تمہاری دوستی دن بھر کی ہے وہ بھی جب تم کھیتی آؤ۔ میں کون ہوں، کہاں رہتا ہوں، کیا کرتا ہوں، اس سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں جس دن تم نے ان باتوں کی تلاش شروع کی ہمارا تمہارا یارانہ ختم۔ اسی دن ہم تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت! یہ خوب سمجھ لو۔! اب چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔"
میں نے پہلے کبھی ان کی یہ حالت نہ دیکھی تھی، کچھ مرعوب سا ہو کر حیران رہ گیا۔
ایک دن کہنے لگے "تمہیں مچھلی کے شکار کا بھی شوق ہے؟"
میں نے کہا "شوق تو ہے مگر میرے پاس سامان نہیں ہے۔"
"کہنے لگے "سامان میں سب لیتا آؤں گا۔ یہاں ایک پہاڑی چشمے میں آج کل مچھلیاں بہت ہیں، کل تمہیں فرصت ہو تو چلیں۔"
چنانچہ دوسرے دن وہ آئے مچھلی پکڑنے کی ڈنگیں اور کانٹے اور چارہ سب لے کر آئے میرے کیمپ سے دو میل کے فاصلے پر جنگل کے اندر وہ ندی تھی۔ ہم دونوں کنارے پر جا بیٹھے کانٹے پانی میں ڈال دیئے۔ مچھلیاں تو بہت تھیں مگر کانٹے کو نہ لگتی تھیں۔ گھنٹا دو گھنٹے انتظار کر کے میں اکتا گیا۔
کہنے لگے "کبھی تم نے ہاتھ سے بھی مچھلی پکڑی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ کمر کمر پانی میں گھس گئے۔ میں کیا بتاؤں۔ میں نے دیکھا کہ ایک لمحے کے اندر سینکڑوں مچھلیاں بڑی اور چھوٹی۔ ان کے چاروں طرف کودنے لگیں اور وہ ان کو ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر کنارے پر پھینکنے لگے۔ مچھلیاں اس طرح ان کی طرف آتی تھیں جس طرح مقناطیس کے ٹکڑے

کی طرف کھنچ کر لوہا اور میں حیران و ششدر رہ گیا۔
آخر وہ ندی سے باہر آئے۔ میں نے کہا۔
"قسم ہے تمہیں اپنے خالق کی۔ یہ کیا جادو کیا تم نے اصل حال بتاؤ مجھے۔" ہنسنے لگے۔
"چھوٹی چھوٹی خفیف باتیں بھی جن کو انسان نہ سمجھے کس قدر بڑی اور اہم بن جاتی ہیں۔ تم جب اس فن سے واقف ہی نہیں تو سمجھو گے کیا خاک۔"
میں نے کہا "مرد خدا پانی کو بچا کر مچھلیاں پکڑتے میں نے لوگوں کو دیکھا ہے اور بھی بہت سی ترکیبیں معلوم ہیں مگر اس طرح مچھلیوں کو آزادی سے جسم پر لپٹتے ہوئے میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔"
کہنے لگے۔ "ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے اور سنا ہی کیا ہے بچے ہو۔ لو چلو اب مچھلیوں کو جل کر پکائیں۔"
ایک دفعہ شیروں اور اسی قسم کے خونخوار جانوروں کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے کہ۔
"اگر تم شیر سے خوف نہ کرو تو وہ تم سے خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ خوف کے فلسفے کو سمجھ لو پھر تم میری حرکتوں پر ذرا بھی متعجب نہ ہو گے۔ تم نے سنا ہو گا کہ لوگ شیر کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں اور ایسی تصویریں تو بہت دیکھی ہوں گی۔ پھر کیا یہ لوگ ہر ایسا کرتے ہیں جادوگر ہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شیر کے دل میں خوف پیدا کر دیتے ہیں اور اپنے دل سے نکال دیتے ہیں۔"
خدا کے لئے کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ کل کو کہنے لگو گے کہ میں خود شیر بن سکتا ہوں، ہاتھی کی صورت اختیار کر سکتا ہوں۔ یہ طلسمِ ہوشربا کی داستانیں۔ جو کچھ تمہیں آتا ہے وہی سکھا دو مجھے۔"
ایک دن وہ میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے میرا پیشکار روتا ہوا آیا اور کہا کہ اس کی اکلوتی لڑکی کو طاعون ہو گیا ہے اور وہ بستی میں پڑی ہے۔ شطرنج چھوڑ کر یہ حضرت کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔
"چلو میں دیکھتا ہوں۔" مجھ سے کہا کہ "تم بھی چلو" میں نے عذر کیا۔ ہنسنے لگے۔
"پھر وہی خوف۔ جب تک خوف تمہارے دل میں جگہ نہ پائے گا طاعون کبھی غالب نہیں آ سکتا۔ لوگ طاعون میں مبتلا ہو کر اس لئے مرتے ہیں کہ طاعون کے نام سے ڈرتے

ہیں۔ خوف الٰہی کی جان لیوا سے نہ کر طاعون "

میں ان کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ وہ یہ کہہ کر بستی کی طرف چل دیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کیا تم نے؟ کیا حال ہے مریضہ کا؟"

کہنے لگے۔ "برا حال ہے۔ میں کرتا بھی تو کیا۔ نہ طبیب نہ ڈاکٹر۔ خدا کرے بے چاری تندرست ہو جائے۔ اکلوتی اولاد ہے۔"

دوسرے دن صبح کو میں نے اپنے پیشکار سے پوچھا تو اس نے کہا کہ رات بھر میں لڑکی کا بخار بھی اتر گیا۔ اور گلٹیاں بھی غائب ہو گئیں۔ میں نے دریافت کیا کہ دوا بھی کچھ دی تھی۔ کہنے لگا۔ "دوا تو کچھ بھی نہیں دی البتہ تھوڑا سا گڑ پانی میں گھول کر پلایا تھا اور یہ کہہ گئے تھے کہ تھوڑا تھوڑا گڑ کھاتی رہے۔" تھوڑی دیر بعد یہ حضرت آئے تو میں نے کہا۔

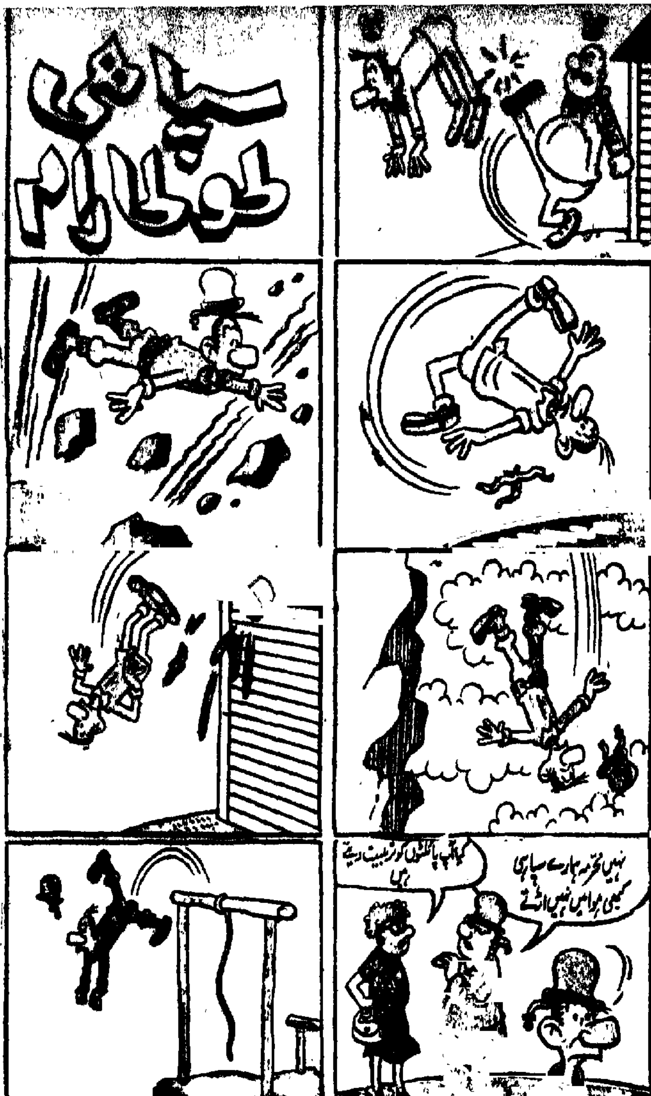
"کیوں جی یہ کیا شعبدہ دکھایا تم نے۔ گڑ کھلا کر طاعون کا علاج؟" کہنے لگے۔

"یوں بھی ہوتا ہے علاج۔ آج میں شطرنج کا ایک نیا نقشہ سوچ کر آیا ہوں۔ لاؤ تو ذرا بساط۔"

اس شخص نے میرے دماغ میں اتنے الجھیڑے ڈال دیے تھے کہ میری عقل ان الجھنوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ حیران بھی تھا چڑ جاتا بھی تھا۔ غصہ بھی آتا تھا۔ مگر کرتا کیا۔؟ بحث کروں تو وہ الٹا مجھ ہی کو بے وقوف بنا دیتے تھے۔

میں روحانیات۔ کرامات اور معجزوں کا قائل نہیں مادیت اور دہریت کی طرف جھکا ہوا ہوں۔ والد کبھی کبھی میری موجودگی میں اپنے ہم عمر دوستوں کو اس قسم کے قصے سنایا کرتے تھے تو میں ان کی بیوقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا شعبدہ بازوں کے شعبدے بہت سے دیکھے تھے ہر ایسی کرامت کو ان شعبدوں میں شامل کر کے سمجھ لیا کرتا تھا کہ پیر جی یا شاہ صاحب نے ابا جان کو خوب احمق بنایا۔ مگر اس شعبدے باز نے تو میرے چھکے چھڑا دیے۔ یہ تو آج تک مجھے یقین نہیں کہ اس شخص کی غیر معمولی حرکتیں کوئی روحانی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر کچھ ایسا چکرا گیا ہوں کہ جھٹلا بھی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اس شخص کی پوری تاریخ معلوم کی جائے۔ اس کے ماضی و حال سے کچھ اس کی کیفیات کا اندازہ کیا جائے۔ ایک دن صبح کو وہ آئے۔ شام تک



میرے پاس رہے۔ حسب معمول مغرب سے پہلے رخصت ہو کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ آج تو ان کا پتہ نشان معلوم کر ہی لینا ہے۔ کہاں جاتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ جب وہ سو دو سو قدم آگے بڑھ گئے تو میں نے اپنے سائیس سے کہا کہ گھوڑا لیکر ان کے پیچھے پیچھے چلے اور خود ایک لکڑی ہاتھ میں لیکر انکے پیچھے چل دیا۔

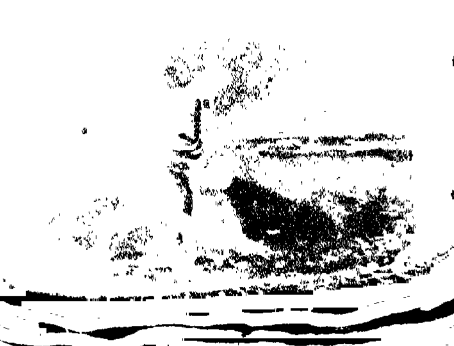
کھلے ہوئے میدان میں وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کہیں لوٹ کر نہ دیکھ لیں۔ بہر حال وہ چلتے چلتے خشک تالاب کے پاس پہنچے اور چونکہ وہ کچی سڑک اس خشک تالاب کے اندر ہو کر گزرتی تھی۔ وہ تالاب کے نشیب میں میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے اپنی رفتار کو ذرا تیز کر دیا۔ لیکن جب میں تالاب کے کنارے پہنچا تو سڑک خالی تھی اور وہ غائب تھے جنگل نہ تھا جس میں وہ ادھر ادھر نکل گئے ہوں۔ پہاڑیاں نہ تھیں۔ غار نہ تھے کوئی آبادی نہ تھی جہاں وہ چھپ رہتے کھلا ہوا میدان اور خشک تالاب کھلی ہوئی کچی سڑک جو میرے خیمے سے سیدھی گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ پھر وہ کہاں غائب ہو گئے۔ ؟

یہ سوالات ہیں جو آج تک تشنہ جواب رہے۔ ان کو تلاش کرنے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کہاں کہاں آدمی نہ دوڑائے۔ اس گاؤں کا ایک ایک گھر چھان مارا کھٹیا کے ایک ایک آدمی سے دریافت کر لیا جنگلوں میں ڈھونڈھ لیا لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن۔ آخری دفعہ میں نے اس خشک تالاب کے کنارے ان کو دیکھا اور پھر کبھی نہ دیکھا یہ واردات میری زندگی کا ایک عجیب معمہ ہے۔ ■

انوکھا قیدی

رات کو جیل میں، دن کو سرکاری ڈیوٹی پر

از
جان نیبٹ
ترجمہ
شفیع عمران ممتاز



اڈریسی فرانس کا ایک خوبصورت ساحلی شہر ہے۔ جہاں ہر سال ملک بھر سے لوگ گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ ۱۹۸۸ء کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں سے نکل کر سمندر کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ تیرنے میں مصروف تھے اور کچھ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بیٹھے گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

صبح کے سورج کی کرنیں سمندر کی لہروں سے ٹکرا رہی تھیں اور ساحل پر کھڑی ہوئی بلند و بالا عمارتوں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دیواروں پر پیلا رنگ کر دیا گیا ہو۔

علی الصباح حسب معمول ہوٹل کا بیرا "ایندرسونٹ" کو جگانے جب ان کے کمرہ میں داخل ہوا، تو وہ وہاں نہیں تھے۔ وہ سونٹ کو ڈھونڈتا ہوا غسل خانہ میں پہنچا اور یہ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی کہ ایندر سونٹ کی برہنہ لاش خون میں لت پت اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ آدھا جسم ٹب کے اندر تھا اور آدھا ٹب کے باہر جھول رہا تھا۔ سر کے آر پار گولی کا سوراخ تھا اور ان کے کپڑے ایک پوٹلی کی شکل میں بندھے ان کے پاس ہی پڑے تھے۔ بیرا بدحواسی کے عالم میں سیدھا ہوٹل کے منیجر کے پاس بھاگا اور پھر کچھ ہی دیر بعد پیرس کے مشہور محکمۂ سراغرسانی کے ہیڈکوارٹر میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

پیرس کے ہیڈکوارٹر "سورت" (suret) نے اپنے سب سے ہوشیار اور مشہور آفیسر لی ڈرو "DRAO" کو ایک ٹیلیگرام کر کہا کہ وہ جلد سے جلد اڈریسی پہنچ جائے اور ایندر سونٹ کے قاتل کو پکڑ کر عدالت کے سامنے کھڑا کر دے۔ لی ڈرو اس وقت اڈریسی سے صرف دو میل دور ایک گاؤں لی ہاور کسی کام سے گیا ہوا تھا۔

ROBERT LEDRAO پیرس کے محکمۂ سراغرسانی کا ایک نوجوان محنتی اور ذہین ممبر تھا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے فرانس بھر میں مشہور تھا۔

اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ صرف پاؤں کا نشان دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ کس کے قدم کے نشان ہیں اس کے علاوہ سگریٹ کی راکھ سونگھ کر تمباکو کی قسم اور سگریٹ کا نام بتا دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ آج تک جتنے بھی قتل و خون کے کیس لی ڈرو کے ذمے کئے گئے ان کے قاتلوں کو پکڑنے میں اسے کبھی بھی ناکامی نہیں ہوئی۔ جس کیس کو لی ڈرو کے ذمہ کیا جاتا تھا۔ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ قاتل ضرور پکڑا جائیگا کیسا ہی ہوشیار اور چالاک قاتل کیوں نہ ہو۔ لی ڈرو کے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا اس کے انہی کارناموں کی وجہ سے ملک کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام تھا اور وہ قوم کا ہیرو سمجھا جانے لگا تھا۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی اس بار لی ڈرو جانتا تھا کہ وہ اتنا ذہین اور ہوشیار نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ایک سست معمولی سے کام پر زیادہ وقت لگانے والا اور چھوٹے سے چھوٹے کو بڑی محنت اور جانفشانی سے کرنے والا شخص تھا جب کوئی کیس اس کے ذمے کیا جاتا تو وہ اس کمرہ کا جہاں قتل ہوا ہو بغور معائنہ کرتا لاش کے آس پاس پڑی ہر چیز کو اپنے قبضہ میں کر لیتا چاہے وہ کوئی دھاگہ ہو یا ماچس کی جلی ہوئی تیلی حتیٰ کہ سگریٹ کے گل کو نہ چھوڑتا اور اس کی دوسری عادت یہ تھی کہ وہ لاش ۵۰ فٹ کے فاصلے تک ہر مربع فٹ کا فوٹو لیتا لاش کے جسم کے ہر عضو کا الگ الگ زاویئے سے فوٹو لیتا ایسا وہ اس لئے کرتا تھا کہ وہ زیادہ ذہین اور ہوشیار نہ تھا اسی لئے وہ معمولی معمولی چیزوں پر توجہ دیتا اور ان معمولی چیزوں پر ریسرچ کیا کرتا۔ مثال کے طور پر اگر لاش کے پاس ایک بٹن بھی مل جائے تو وہ اس کے بارے میں گھنٹوں سوچتا کہ یہ بٹن کس کا ہوگا اور اس کے شناسا لوگوں میں کون کون لوگ اس قسم کے بٹن استعمال کرتے ہیں اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے وہ بعض وقت بڑے بڑے مجرموں اور قاتلوں کو سزائے موت دلا چکا تھا۔ اس کے علاوہ لی ڈرو جانتا تھا کہ اگر اس کے افسروں کو پتہ چل جائے کہ وہ کتنا سست ہے اور معمولی سے معمولی چیز پر کس طرح گھنٹوں غور و فکر کرتا ہے تو یقیناً اس کی ساکھ کو دھکا پہنچے اس لئے وہ ہمیشہ اپنی رپورٹ کو بڑھا چڑھا کر اور جہاں تک ہو سکے بہتر طریقے پر پیش کرنے کی کوشش کرتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بات معلوم کرنے کے لئے اس نے دس گھنٹے لگا دیئے۔ تو وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا کہ وہ فوراً اس خیال پر پہنچ گیا۔ یہ بات اس کے افسروں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ اور اس طرح ان کا یقین ہو جاتا کہ لی ڈرو واقعی ایک ذہین سراغرساں ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو غریب لی ڈرو کو ایک ایک کیس پر رات رات بھر جاگنا پڑتا تھا بعض وقت وہ صرف تین گھنٹے ہی سویا کرتا تھا اور اس طرح اسے ہفتہ میں اوسطاً صرف ۲۰ گھنٹے سونا نصیب ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔

[illegible]

۲۴ گھنٹے قتل و خون کے بارے میں سوچتے رہنے
اُسے خواب بھی اسی قسم کے آنے لگے تھے۔ بعض وقت
اب میں دیکھتا کہ وہ خود کسی کا خون کر رہا ہے اور فوراً
ار کر نیند سے بیدار ہو جاتا اور اپنی تحقیق میں جٹ جاتا

لی ڈرو، اڈریس پہنچا۔ تو اپنی عادت کے مطابق
ایک چیز کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ جب اس نے مونٹ
اش کے پاس پڑی ہوئی کپڑوں کی پوٹلی کو کھولا تو حیرا
ے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ کپڑوں میں کئی سوفرانک بندھے
تھے۔ لی ڈرو سوچنے لگا کہ قاتل اگر پیسوں کے لئے
کرتا تو یہ کئی سوفرانک اپنے ساتھ ضرور لیجاتا۔ اسکے
مونٹ کوئی مالدار آدمی بھی نہیں تھا۔ صرف معمولی سا
مین تھا۔ اسی سوچ میں وہ گھنٹوں کھویا رہا۔ پھر اس
کیمرے کی مدد سے اس نے لاش سے۔ وہاں کے
لے تک کے کئی سو فوٹو لے ڈالے۔ اور حسب عادت ان
رشتے اپنے قبضے میں کرلی۔ وہ ان کاموں میں اتنا گم
کہ اسے خبر تک نہ ہوئی کہ کب رات ہو گئی۔ رات ہوتے
لیڈرو گھر نہیں لوٹا۔ بلکہ ایک لالٹین کی مدد سے
ن بین میں مصروف رہا۔

وہ لالٹین ہاتھ میں لئے سمندر کے کنارے پھیلی
ی ریت پر قدموں کے نشان ڈھونڈنے لگا۔ یکایک
کے قدم رک گئے۔ اس کو جس چیز کی تلاش تھی وہ
مل گئی۔ سامنے قدموں کا اک سلسلہ نظر آیا جو حمام کی
ت سے آرہا تھا اور دور تک چلا گیا تھا۔ لیڈرو کو سمجھنے
دیر نہ لگی کہ یہ نشانات قاتل کے ہیں۔ پھر اس نے ان
وں کے نشانوں کے بے حساب فوٹو لے لئے۔

اس کام میں لیڈرو رات بھر منہمک رہا۔ اور
دوسرے دن پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ گیا۔ جہاں سب لوگ
بے چینی سے اس کا اور اس کی رپورٹ کا انتظار کر رہے تھے۔

"میں نے مجرم کا پتہ لگا لیا ہے" یہ کہتے ہوئے لیڈرو
نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اور ایک کے بعد دوسری
چیزیں جن میں تصویریں بھی شامل تھیں۔ بتلانے
متعلقہ افسران چیزوں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے
کچھ دیر بعد لیڈرو نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں
نا شروع کیا۔

"ان تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ قاتل کے بائیں
پاؤں کا انگوٹھا نہیں ہے۔ اور بلاشبہ یہ قدموں کے نشان
اسی شخص کے ہیں جس نے مونٹ کا خون کیا ہے" لیڈرو
کہے جا رہا تھا۔ اور محکمہ سراغرسانی کے افسر دم سادھے
سن رہے تھے۔ اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا
معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اب کوئی انوکھی اور حیران کن
بات کہنے والا ہے۔

کچھ دیر کے وقفے کے بعد لیڈرو اپنے بائیں پیر
کے جوتے کی ڈوریاں کھولنے لگا۔ سب لوگ حیرت سے آنکھیں
پھاڑے لیڈرو کو دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں گھڑی کی ٹک
ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جب لیڈرو نے جوتا الگ کیا تو سب کی آنکھیں حیرت و
استعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت سے کبھی
لیڈرو کو دیکھتے اور کبھی اس کے بغیر انگوٹھے بائیں پیر
کو اور کبھی اُن تصویروں کو جن میں قاتل کے پاؤں کے
نشان تھے۔ کچھ دیر بعد لیڈرو نے افسروں کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا "میں مونٹ کا قاتل ہوں۔ میں نے ہی مونٹ
کو قتل کیا ہے۔"

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ فوٹوؤں سے لیڈرو
کے پاؤں اور ہاتھوں کا مقابلہ کیا گیا اور اُسے مونٹ
کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

دوسرے دن ایڈریس اور پیرس کے اخباروں
میں جب یہ خبر شائع ہوئی تو سارے ملک میں ایک
سنسنی سی پھیل گئی۔ ہر گلی کوچے میں اسی موضوع پر
بحث کی جا رہی تھی۔ لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوبے
ہوئے آپس میں لیڈرو کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے
دوسرے دن لیڈرو کو عدالت کے سامنے پیش کر دیا
گیا اور مکمل تحقیقات کرنے کے بعد اسے مونٹ کے قتل کے
الزام میں عمر قید کی سزا کا حکم دے دیا گیا۔

لیکن ایک سوال رہ رہ کر لوگوں کے دل میں اٹھ
رہا تھا کہ لیڈرو نے مونٹ کو قتل کیوں کیا ہوگا؟ محکمہ
سراغرسانی کے حکام، اس کے دوست احباب، عزیز
اقارب یہ سوال جب بھی اُس سے پوچھتے، وہ یہی کہتا
"میں نہیں جانتا، مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

آخر کار عدالت کے کہنے پر فرانس کے بڑے بڑے
ڈاکٹروں کو بلا کر لیڈرو کا معائنہ کرایا گیا۔

کئی گھنٹے کی جانچ کے بعد ڈاکٹروں کی مشترکہ
رائے یہ تھی کہ "لیڈرو دماغی کمزوری کے مرض ——
(Mental Illness) میں مبتلا ہو گیا ہے۔ جب بھی یہ
کمزوری اس پر غالب ہوتی ہے۔ وہ بڑے خوفناک قسم کے
کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس نے مونٹ کا خون
اسی دماغی کمزوری کے غالب آجانے کی وجہ سے کیا ہے۔"

یہ بیماری صرف رات کے وقت ہوتی ہے اور دن
کی روشنی میں یہ بالکل اسی طرح رہتا ہے جس طرح تمام
لوگ رہتے ہیں۔

جب عدالت پر یہ ظاہر ہوا کہ لیڈرو نے جان بوجھ
کر یا کسی ذاتی مفاد کے لئے مونٹ کا خون نہیں کیا بلکہ
دماغی بیماری کی وجہ سے ایسا ہوا تو عدالت نے دوسرا
فیصلہ سنایا۔

"لیڈرو صرف رات کو قید رکھا جائے گا اور دن
میں آزاد رہے گا اور ہمیشہ کی طرح اپنا کام انجام دیا کریگا۔
کیونکہ وہ ایسی بیماری میں مبتلا ہے جو صرف رات کو
ہوتی ہے۔"

اس اعلان کے بعد لیڈرو کو رہا کر دیا گیا لیکن
صرف دن کے لئے رات ہوتے ہی وہ خود بخود جیل خانے
میں چلا جایا کرتا۔

اس دوران لیڈرو نے کبھی بھی کوئی ایسی حرکت
نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ وہ خونی ہے۔ یا دماغی مریض
ہے۔ وہ اپنا فرض بخوبی نبھاتا رہا اور کئی قاتلوں کو پکڑ
کر عدالت کے حوالے بھی کیا۔ لیکن شام کو چھ بجے کے
بعد وہ اپنے تمام سرکاری اور غیر سرکاری کام چھوڑ
سیدھا جیل چلا جایا کرتا۔ اگر کبھی اُسے آنے میں دیر
ہو جاتی یا وہ بھول جاتا تو پولیس خود اسے لاکر قید خانے
میں بند کر دیتی تھی۔ صرف رات بھر کے لئے دوسری صبح
اُسے پھر چھوڑ دیا جاتا۔

لیڈرو یوں ہی اپنی زندگی کے شب و روز
کاٹتا رہا۔ آخر کار ۷۱ سال کی عمر میں ۱۹۳۶ء کی
ایک رات اس کا انتقال اسی قید خانے میں ہو گیا۔

اس طرح فرانس کی تاریخ کا عجیب و غریب
قیدی جو صرف رات کا قیدی تھا۔ نہ صرف رات
کے قید سے بلکہ زندگی کی قید سے بھی آزاد ہو گیا۔ ●●

قرض کی جیت

سید عبداللہ قادری



اسپین کی سرزمین پر مسلمانوں کی عظمت کا چراغ گل ہو چکا تھا اسپین کے وحشی عیسائی مسلمانوں ہی کے خون کے پیاسے نہیں بنے ہوئے تھے بلکہ ان کی وحشت و بربریت سے خود ان کے ہم مذہب بھی محفوظ نہیں رہے تھے اسپین میں مسلمانوں کو چن چن کر ذبح کیا گیا تھا لیکن پھر بھی چند خوش نصیب مسلمان ان درندوں سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور شہزادہ مسعود جس کے آباؤ اجداد کئی صدی تک یورپ کے اس ملک پر حکومت کرتے رہے تھے ان ہی معدودے چند خوش نصیب نوجوانوں میں سے ایک تھا۔

اسپین میں مسلمانوں کی شکست کے بعد ایک عرصے تک بقیۃ السیف اسپینی مسلمانوں کی تلاش جاری رہی تھی۔ اسپینی فوج کے سپاہی ان کی تلاش کے لئے دور دراز اور دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑیوں میں گشت کرتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود بعض مسلمان ساحل بحر تک پہونچنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اور اگر حسنِ اتفاق سے انھیں آبنائے جبل الطارق کے پار شمالی افریقہ کے ساحل تک لیجانے والا کوئی جہاز مل جاتا تھا تو ان کی جان بچ جاتی تھی۔

شہزادہ مسعود بھی اسی امید پر غیر مانوس اور غیر آباد راستوں کو طے کرتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہ سفر ایک کمزور اور تھکے ہوئے گھوڑے کے ذریعے طے کر رہا تھا

ایک رات جب مسعود ایک ایسے مقام سے گزر رہا تھا جہاں وہ بظاہر خود کو عیسائی درندوں سے محفوظ سمجھتا تھا گھوڑے سے اترا اور اسے ایک درخت سے باندھ کر خود آرام کرنے کی غرض سے زمین پر لیٹ گیا۔ سفر کی تھکان کے باعث فوراً ہی اسے نیند آگئی۔

ابھی مسعود کو سوئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چند غیر معمولی آوازوں نے اسے بیدار کر دیا۔ چاند اپنی پوری درخشانیوں کے ساتھ چمک رہا تھا اور اس کی روشنی میں آس پاس کی پہاڑیاں ایک دل کش منظر پیش کر رہی تھیں۔ اگرچہ فضا پر کامل سکوت طاری تھا لیکن کبھی کبھی ایک پہاڑی کی طرف سے آنے والی چیخوں کی آواز فضا کے اس سکوت و سکون کو درہم برہم کر دیتی تھی۔

مسعود کو ان ہی چیخوں نے بیدار کیا تھا۔ لیکن اب پھر ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی تھی اور مسعود سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی اس نے چیخوں کی آواز سنی تھی؟ یا کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا؟

ابھی مسعود کسی نتیجے پر نہ پہونچنے پایا تھا کہ فضا میں چیخوں کی آواز پھر بلند ہوئی اور مسعود ایک لمحے توقف کئے بغیر اس پہاڑی کی طرف چل پڑا جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی۔ فضا پر اب پھر خاموشی چھا گئی تھی مگر مسعود کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ قریب ہی کوئی انسانیت سوز واقعہ رونما ہو رہا ہے۔ دفعتاً ایک بار پھر چیخیں بلند ہوئیں اور انھیں کی رہنمائی میں وہ ایک ایسے غار کے دہانے پر پہونچ گیا جس کے اندر سے بات چیت اور کبھی کبھی کسی عورت کی مظلومانہ چیخوں کی آواز آ جاتی تھی۔ وہ غار کے دہانے پر کھڑا ہو کر اندر کے حالات کا اندازہ کرنے لگا۔

"مغرور حسینہ!" کسی مرد نے اپنی کرخت آواز میں کہا۔ "اپنی ضد سے باز آ جاؤ۔ اب تمہارے لئے میری گرفت سے نکلنا ممکن نہیں ہو سکتا۔"

"ظالم کتے!" ایک عورت کی آواز آئی۔ "تجھے ایک مظلوم لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ یاد رکھ خدا میری مدد کرے گا اور تو میری زندگی میں میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اب کوئی قوت بھی تمہیں میری گرفت سے نجات نہ دلا سکے گی، اور اگر تم اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہیں تو میرا خنجر تمہارے سینے میں تیرتا ہوا نظر آئے گا۔" مرد نے کہا۔

"اپنی عزت کی حفاظت کے لئے میں جان دیدینے کو ایک معمولی بات سمجھتی ہوں۔ آگے بڑھو اور اس خنجر کو میرے سینے میں پیوست کر دو۔" لڑکی نے جواب دیا۔

اب مسعود پورے واقعہ کو سمجھ چکا تھا اور اس کے لئے مزید تاخیر ناممکن تھی۔ وہ چاند کی روشنی میں دبے پاؤں غار کے اندر گیا۔ غار میں ایک فوجی سردار ایک حسینہ کے روبرو کھڑا اپنا خنجر تول رہا تھا کہ مسعود نے اپنی تلوار سے اس پر حملہ کر دیا۔ اسی لمحے اس سردار نے بھی

اپنا خنجر حسینہ پر چلایا جو حسینہ کے سینے میں پیوست تو نہ ہو سکا لیکن وہ زخمی ضرور ہو گئی۔

مسعود نے اپنا تلوار کا وار کر کے اس حسینہ کی جان بچالی تھی اگرچہ وہ زخمی ہو جانے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھی لیکن فوجی سردار ہلاک ہو چکا تھا مسعود نے جھک کر بے ہوش پڑی ہوئی حسینہ کو دیکھا تو اچانک اس کی زبان سے نکلا

"یہ تو صوفیہ ہے۔ ڈیوک آف نارمن کی لڑکی صوفیہ اس ظالم سردار کی بیٹی جس نے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔"

اور اس تصور کے ساتھ ہی مسعود کو وہ زمانہ بھی یاد آگیا جب وہ شہزادے کی حیثیت سے صوفیہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اور جب یہ دونوں بچپن کے دور سے گزر کر جوانی کی منزلوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ وہ اپنے دل میں صوفیہ کی محبت کا ایک جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔

لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ اب مسعود شہزادہ نہیں بلکہ ایک بے یار و مددگار نوجوان تھا اور صوفیہ ایک ایسے عیسائی سردار کی بیٹی تھی جس نے اسپین کی اسلامی حکومت کو تباہ کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ اس لئے مسعود سوچ رہا تھا کہ اسے صوفیہ کے ساتھ ہمدردی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اُسے اسی حال میں چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ بہر حال اس وقت صوفیہ مظلوم ہے اور ایک مسلمان کو کسی حال میں بھی مظلوم کی حمایت سے دست کش نہ ہونا چاہیئے۔

یہ سوچ کر مسعود نے مقتول عیسائی سردار کے لبادہ سے صوفیہ کے زخم کو صاف کر کے اس پر پٹی باندھی اور بے ہوشی کی حالت میں اُسے اٹھا کر کسی نہ کسی طرح گھوڑے پر بٹھایا اور صبح کے قریب ایک گاؤں کی سرائے میں جا پہونچا۔

اب صوفیہ کو ہوش آگیا تھا۔ اس نے مسعود کو اپنے قریب بیٹھا ہوا دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "میں اس وقت کہاں ہوں اور اس فوجی سردار کا کیا حشر ہوا جو مجھے فریب دے کر لے آیا تھا۔" اور مسعود نے اس پر تمام صورت حال واضح کرنے کے بعد کہا۔

"اب تم شہر کے قریب ہو آسانی کے ساتھ اپنے گھر واپس جا سکتی ہو۔ ہاں میں تم سے اس بات کی امید ضرور رکھتا ہوں کہ تم کسی کو بھی اس نواح میں میری موجودگی کی اطلاع نہ دو گی۔"

لیکن مسعود! صوفیہ نے کہا۔ "اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میری زندگی میں کوئی شخص بھی، خواہ وہ میرا باپ ڈیوک آف نارمن ہی کیوں نہ ہو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔"

مسعود بچپن ہی سے صوفیہ کے ساتھ والہانہ محبت کرتا تھا اور خود صوفیہ کا دل بھی مسعود کی محبت سے خالی نہیں تھا کہ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال نے حالات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ انقلاب حکومت کے دوران میں ان دونوں کے میل جول کے تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے اور انھیں مستقبل میں ایک دوسرے سے ملنے اور جوانی کے سنہرے خوابوں کی تکمیل کی کوئی توقع باقی نہ رہی تھی۔ لیکن جس طرح صوفیہ کو مسعود کے احسان نے حیرت میں ڈال دیا تھا، اسی طرح مسعود بھی صوفیہ کی بات سنکر متحیر ہو گیا تھا۔ اس نے صوفیہ کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ بدلے ہوئے حالات میں اسے اپنی خواہش کی تکمیل پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن انجام کار اسے صوفیہ کے اصرار سے مجبور ہو جانا پڑا اور وہ اسے اس کے گھر تک پہونچانے پر رضامند ہو گیا۔

ابھی سورج کی روشنی اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ مسعود صوفیہ کو گھوڑے پر بٹھائے اور خود اس کی باگ پکڑے ہوئے شہر میں داخل ہوا۔ لیکن ـــــ وہ ڈیوک کے محل کے قریب پہنچا ہی تھا کہ محافظ سپاہیوں نے اسے پہچان لیا اور تلواریں لئے ہوئے اس کی طرف بڑھے مگر صوفیہ نے فوراً ہی انھیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"بزدلو! ایک ایسے شخص پر جو تنہا تمہارے درمیان کھڑا ہوا ہے اور جس نے میری جان بچا کر تم سب پر احسان کیا ہے تمہیں تلوار اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

صوفیہ کئی روز سے لاپتہ تھی اور جب تلاش کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا تو یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس ہنگامی صورت حال میں کسی مسلمان نے اسے قتل کر دیا ہے اس لئے اس وقت اسے زندہ و سلامت دیکھ کر محل کے خدام نے ڈیوک کو اطلاع دی اور ابھی سپاہیوں اور صوفیہ کے درمیان بات چیت جاری تھی کہ ڈیوک بھی وہاں پہونچ گیا اور صوفیہ سے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد مسعود اور صوفیہ کو ساتھ لے کر محل میں چلا گیا۔

ڈیوک صوفیہ اور مسعود کی محبت سے اچھی طرح واقف تھا اور مسعود کے احسان نے اس کے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ اس لئے اس نے مسعود کو شکر گزاری کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسعود! محبت سلطنت کے اختلافات سے بالاتر ہے اس میں شک نہیں ہے کہ میں نے اس ملک سے مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے لیکن تم نے میری بیٹی کی جان اور آبرو بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور تم دونوں کے درمیان محبت کا جو رشتہ قائم ہے اسے توڑ دینا اب میرے قابو سے باہر ہے اس لئے میں صوفیہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ میں تمہاری حفاظت کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں لیکن اگر صوفیہ رضامند ہو اور تم میری ریاست میں رہنے پر آمادہ نہ ہو تو میں تمہیں حفاظت کے ساتھ باہر بھیجنے کا انتظام بھی کر سکتا ہوں۔"

ڈیوک کے طرز عمل نے مسعود کو بہت زیادہ متاثر کیا اب اس کی محبت کے رنگین خوابوں کے پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بیحد ممنون ہوں صوفیہ کی جان بچا کر میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا ایک انسانی فرض انجام دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ابھی ساحل کے قریب اسی سرزمین پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک آخری معرکہ برپا ہوگا، مجھے اس معرکہ میں شریک ہونا چاہیئے میں اس میں شریک ہونگا اور اگر زندہ رہا تو واپس آکر صوفیہ سے ملوں گا۔ فی الحال میں صوفیہ اور آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔"

ڈیوک مسعود کی یہ درخواست سن کر حیران رہ گیا لیکن وہ اسے مسترد بھی نہیں کر سکتا تھا اس نے مسعود کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"مسعود! جس قوم میں تم جیسے بہادر نوجوان پیدا ہو سکتے ہیں وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔"

اور اب پھر مسعود اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ ــــ

[illegible] بال

[illegible] پولیس کی ہے ... ہے۔

شاستری [illegible] اس کے کھیل نہایت ہی ... جہاں ہوتے ہیں۔ اس ٹورنامنٹ میں کلکتہ کی بھی ٹیمیں اور دوسری ریاستوں کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ اب تک زیادہ کامیابی محڈن ہی کو حاصل ہوئی ہے۔

جہاں اس کھیل میں اتنے بڑے بڑے ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں وہیں ان ٹورنامنٹوں نے اچھے اچھے کھلاڑی بھی پیدا کئے۔ ان کھلاڑیوں میں سب سے زیادہ شہرت برازیل کے پیلے کو حاصل ہے۔ یہ فٹ بال کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ پیلے کے ایک ہزار گول کرنے پر برازیل کی حکومت نے اسکے نام کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس پر پیلے کی تصویر شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ چند مشہور کھلاڑیوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

ایبرڈ (یوگوسلاویہ) آٹوالوف (روس) بیگ (یوگوسلاویہ) جارج الاڈ یورو چس، لائنول سانچز (چلی) گلیمر، رین سٹوس، زٹو، امریلیڈو، پیلے، واوا، ڈی ڈی، گورنچا، نیکاس، (برازیل) شوٹ، لاسہ سکیمولارٹ، شیٹر (چیکوسلاواکیہ) سوسا، ولیم مائینر (یوروگوے) گروسکس، اسلیوسل (ہنگری) تا سن گولکیپر، (روس) گرپولڈ (اٹلی) رتن غلاورس، اسٹینلی میفونز (انگلینڈ) نیاس سلا (برازیل) اسپلیٹر (مغربی جرمنی)

چند مشہور ہندوستانی کھلاڑی :- میوہ لال، لطیف، رحیم، سلیم، جمعہ خاں، عثمان، حافظ رشید (حمید جادوگر) چنی گوسوامی، پی کے بنرجی، جرنیل سنگھ، یوسف خاں، نعیم، حبیب، تھنگا راج، مصطفیٰ، سرمد خاں، سردار خاں، پیپتا، گھوسٹو پال، سعادت اللہ، اپالا راجو، راجندر موہن، مترکی اسی پرشاد، جان، الطاف، لطیف، امتنا (جسے اس سال پدم بھوشن کا خطاب ملا) عابد حسین، فخری (جو ان دنوں انگلستان میں ہے)

بقیہ:- ایڈیٹوریل

حامیانِ اُردو چاہیں گے کہ جس ریاست میں بھی اُردو بولنے اور پڑھنے والے موجود ہیں ان کو اس کی تعلیم کی پوری سہولتیں دی جائیں اور یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، پنجاب اور دلی جیسے علاقوں میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ

دیا جائے تاکہ سرکاری سطح پر اس کی اہمیت کو محسوس کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں قومی سماج میں جس میں سرکاری ملازمتیں بھی شامل ہیں اقلیتوں کو کتنا حصہ ملنا چاہئے اسکی طرف بھی دھیان دیا جائے، اور سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ امن وانتظام رکھنے کے لئے مرکزی حکومت اپنی ریزرو فورس کو اتنا مضبوط بنا دے کہ وقت ضرورت یہ ہر ریاست میں فوری طور پر امن وامان قائم کر سکے اور اسے قائم بھی رکھ سکے۔

نئی حکومت کی یہ اہم داخلی ذمہ داریاں ہوں گی جن کو پورا کر کے وہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی اپنی پوزیشن کو مستحکم بنا سکے گی کیونکہ اس صورت میں کسی کو اس ملک کی بدامنی، قتل وغارت گری یا یہاں کی غربت وافلاس کے نام پر بین الاقوامی دنیا میں اسے بدنام کرنے کی جرات نہ ہو سکے گی۔

ان توقعات کے ساتھ ہم مرکز میں قائم ہونے والی ہر نئی حکومت کا خیر مقدم کریں گے اور اگر مسز گاندھی کو حکومت قائم کرنے کا موقع ملا۔ جسکا ہمیں یقین ہے تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکیں گے کہ وہ کانگریس کی اعلان کردہ پالیسیوں کو بروئے کار لائیں گی اور اپنے ووٹروں کو کسی طرح مایوس نہ کریں گی۔

بقیہ:- انور سادات سے انٹرویو

اوپر عائد نہیں ہوگی۔

سوال۔ آپ کے خیال میں امریکا کیا کچھ کر سکتا تھا جو اس نے نہیں کیا۔

جواب۔ امریکی نظم ونسق حقیقت میں امن کی کنجی ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں کہ ہمارے نیک ارادوں کے بارے میں اسرائیل کو مطمئن کر سکے۔ آپ نے ناز ونعم میں پال کر اسرائیل کی عادت کو بگاڑ دیا ہے۔ آخر امریکہ اسرائیل کے ساتھ اپنے دوسرے اتحادیوں سے مختلف سلوک کیوں کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے جنگ شروع نہیں کی تھی اور اس نے سینائی سے اسرائیلیوں کو نکالنے میں مدد کی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں بھی ہم نے جنگ شروع نہیں کی ہمارے تین شہروں کو مکمل طور پر برباد کر دیا گیا ہے۔ اگر امریکا کو اب بھی انصاف کا کوئی احساس ہے تو وہ مشرق

[illegible] حملہ کر سکتا ہے۔"

سوال۔ آخر میں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسرائیل کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے کہ آپ کا مقصد اب یہ نہیں ہے کہ جزوی صلح کے بعد ایسا طریقہ عمل اختیار کیا جائے کہ اسے تباہ کیا جا سکے۔

جواب۔ آپ الٹی باتیں کر رہے ہیں اصل میں تو یہ ہم ہیں جنہیں کہ اسرائیل کے ارادوں کے بارے میں مطمئن کرنا ہوگا۔

بقیہ:- دنیا دور بین کی نظر میں

فرانس

لیجئے اب ججوں نے بھی احتجاج اور مظاہرے شروع کر دیئے۔ اسکی مثال فرانس کے ججوں نے پیش کی ہے گذشتہ سے پیوستہ ہفتہ فرانس کے بائی کورٹوں کے تقریباً ایک ہزار جج اپنی اپنی عدالتیں بند کر کے پیرس میں جمع ہوئے اور حکمراں گولسٹ پارٹی کے نئے سکریٹری جنرل دین تو اسینی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا۔ تو اسینی نے ججوں پر الزام لگایا تھا کہ پانی باند کے نوجوان ایجی ٹیٹروں کو وہ سخت سزائیں نہیں دے رہے ہیں اور اسطرح اپنی "بزدلی" کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ججوں نے سیکریٹری جنرل کے ان الفاظ کو اپنی سخت توہین سمجھا اور اپنا ایک احتجاجی جلوس نکال ڈالا۔

دل چسپ بات یہ تھی کہ جب "نرم طرز عمل" اختیار کرنے کیلئے ججوں پر تو اسینی نکتہ چینی کر رہے تھے تو فرانس کے ہائی سکول کے طلبہ اس بات کے خلاف احتجاج کر رہے تھے کہ ایک پولیس مین کے منہ پر طمانچہ مارنے کے الزام میں ایک نوجوان کو چھ ماہ کی سزا کیوں دی گئی۔ (بعد میں یہ سزا معاف کر دی گئی)

ججوں اور وکیلوں کی طرف سے جو زبردست احتجاج کیا گیا اس سے تو اسینی معافی مانگنے کیلئے مجبور ہو گئے اور صدر جارج پومپیدو کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے ججوں پر لگائے گئے تمام الزامات کو واپس لے لیا۔

فرانس میں کہنا چاہئے ابھی عدلیہ کا بڑا وقار ہے حقیقتاً یہ عدلیہ ہی ہے جس کے سہارے جمہوریت کی دیوار کھڑی رہ سکتی ہے ورنہ اگر یکطرفہ جائے کہ اس دیوار کو گرنے [illegible]

واقعات [illegible]

اب نہ [illegible] کی آنکھ [illegible]
ایسے لگے [illegible]
[illegible]
[illegible] محبت ہے

الفت کو [illegible]
حسن والوں کی [illegible]
استغنا کی [illegible]
[illegible] رنگوں سے محبت کی

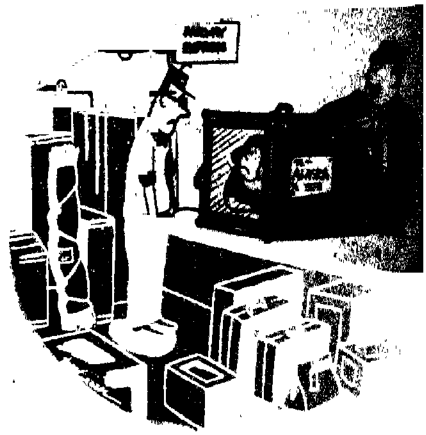
وہ ترے عارض و لب برگ گل تر جیسے
وہ تری چشم [illegible]
اس رہتا ہے مرے [illegible]
[illegible] ہے مرے [illegible]

[illegible]
[illegible] الفت کی [illegible]
[illegible] اب محبت [illegible]
داغ الفت کو کبھی نقش دل [illegible] کروں

MARCH 1971
(FIRST HALF)
WAQIAT
REGD. NO. D
TELEPHONE 919099



مگر اس کے بلند قامت قبیلہ کیسے نظر نہیں آیا؟

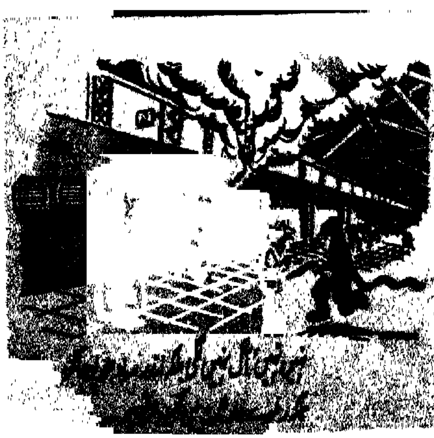




ہمارے گھر کا دروازہ کہاں ہے



شکر ہے وہ ہماری لائبریری میں آگ نہیں لگا سکتے





واقعات

ایک اہم امتحان کا آغاز

• اسرائیل کی وزیراعظم گولڈا مائر سے انٹرویو



اب جھکے گا سر شرم کی ہوائیں چلا دو — ہو گئی اب سرخرو [illegible]
پھر سے جھوم جاؤ گی ہندوستاں کی آبرو — [illegible]

ہو گئی ہے سرخرو بھارت کی بیٹی اندرا

کوئی راجہ ہے نہ اب اس دیش میں کوئی غلام — راج ہے [illegible]
یہ زمیں یہ آسماں سب کے ہیں سب کے صبح و شام — [illegible]

ہو گئی ہے سرخرو بھارت کی بیٹی اندرا

اپنے ہیں سب کارخانے اپنے سب ادارے ہیں — آزادی ہے کاشتکاروں کی مدد [illegible]
دیش کے ہر ایک منصوبے کو ہم پورا کریں — کام میں ہم کو سرخرو کیا ہے [illegible]

ہو گئی ہے سرخرو بھارت کی بیٹی اندرا

پھوٹ اور نفرت کے ہر ہر جال کو کر دیں ہم گل — ایکتا اور آشتی کا اب بچھا لیں کوئی جل
مطمئن ہو کر نہ بیٹھیں اب جہاں میں ایک پل — ہم کو رکھنا ہے خبر [illegible] کی

ہو گئی ہے سرخرو بھارت کی بیٹی اندرا

اندرا گاندھی کی طاقت کو بڑھائیں دوستو — اپنی اپنی ذمہ داری کو نبھائیں دوستو
گیت سب کر دیش بھگتی کے سنائیں دوستو — ہم کبھی ہاریں نہ بازی عزم و استقلال کی

ہو گئی ہے سرخرو بھارت کی بیٹی اندرا

حاصلِ مطالعہ

وہ جنہیں [illegible] سے محبت بھی ہے [illegible]
ہم سے کس طرح کر سکتے ہیں بیکار [illegible]
[illegible]

اداریہ — واقعات نگار علی

شرارت پسند عناصر سے ہوشیار

حالیہ انتخابات نے یہ حقیقت ظاہر کردی ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں کافی مضبوط ہوگئی ہیں۔ عوام نے فرقہ پرستی مذہبی تنگ نظری اور فسطائی رجحانات کو مسترد کردیا ہے اور اس جماعت پر اپنے کلی اعتماد کا اظہار کیا ہے جس نے سیکولر جمہوریت کو مضبوط بنانے کا اعلان کیا تھا۔ یہ جماعت تھی کانگریس۔ اب اسے پھر وہی مستحکم پوزیشن حاصل ہوگئی ہے جو پنڈت نہرو کے زمانے میں حاصل تھی۔ بلکہ اس لحاظ سے وہ زیادہ مضبوط ہے کہ اسے ہمیشہ کے مقابلے میں زیادہ عوامی ووٹ ملے ہیں۔

کانگریس کی اس کامیابی میں سب ہی طبقوں کا ہاتھ ہے لیکن اقلیتوں نے بالخصوص اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسکا اقرار خود صدر کانگریس مسٹر جگجیون رام اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ تمام اقلیتیں کانگریس کو کامیاب بنانے کے لئے متحد ہوگئیں اور انھوں نے مکمل طور سے اپنے آپ کو اس جماعت سے وابستہ کرلیا۔

اس کی وجہ کیا تھی اور انھوں نے کیوں اس جماعت کی آواز پر لبیک کہا۔ اس لئے کہ اس جماعت کی طرف سے انھیں چیلنج یا ان کو دھمکیاں نہیں ملیں۔ انھیں نفرت کے پھندے نہیں دیئے گئے۔ بلکہ انھیں محبت کا پیغام ملا۔ مساوات کا نعرہ ان کے کانوں میں گونجا۔ انھوں نے یہ آواز سنی کہ سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف ہمارے آئین کی بنیاد ہے۔ سب ہندوستانی سب برابر ہیں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا۔ اور کانگریس نے حلف اٹھایا تھا یہ کہ وہ سب اقلیتوں کے حقوق و انصاف کی حفاظت کرے گی۔"

یہ سب کے دلوں کو لگنے والی آواز تھی۔ اقلیتوں کے دلوں کو خاص طور پر لگی اور انھوں نے مکمل طور پر کانگریس کا ساتھ دیا۔ نتیجے میں کانگریس ایک مضبوط جماعت بن کر سامنے آئی۔

فرقہ پرستوں نے الیکشن کے دوران ہی شرارتیں شروع کردی تھیں اور ان مقامات پر جہاں کانگریس نے عوامی نمائندگی کیلئے کسی اقلیتی فرد کو نامزد کیا تھا انھوں نے فرقہ وارانہ جذبات برانگیختہ کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا تھا۔ علی گڑھ کا ہنگامہ اسی منصوبے کی ایک کڑی تھا۔ بدقسمتی سے لوگ جذبات میں بہہ گئے۔ اس حد تک بھی غنیمت تھا لیکن ودھایک دل کے کارندوں نے سی۔ بی گپتا جیسے ودھایکی لیڈروں کے اشتعال انگیز بیانات سے اشارہ پاکر جو اودھم بازی کی اور جس طرح باعزت شہریوں کی عزت کو خاک میں ملایا۔ وہ یوپی کی کمزور حکومت کی پیشانی پر انمٹ کلنک کا ٹیکا ہے۔ علی گڑھ کا اثر مراد آباد پہنچا۔ وہاں بھی فرقہ پرستوں نے مذہبی جذبات بھڑکا کر ووٹ لینے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہوگئے۔ برہانپور (مدھیہ پردیش) اور دیگر مقامات کے ہنگاموں کو بھی فرقہ پرستوں کی سازش قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور یہ سب باتیں ایسی ہیں جس پر صرف ریاستی حکومتوں کو نہیں بلکہ مرکزی حکومت کو بھی سخت نوٹس لینا چاہیے۔

کانگریس نے اپنے مینی فیسٹو میں واضح طور پر کہا ہے کہ "اس کا مقصد محض حکومت کی باگ ڈور سنبھالے رہنا نہیں ہے بلکہ حکومت حاصل کرنے سے اسکا مقصد یہ ہے کہ عوام کی زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔" لیکن اگر فسادات ہوتے رہے اور ملک کے ایک بہت بڑے طبقے کو وقتاً فوقتاً تباہ و برباد کیا جاتا رہا تو کیا اسکی حالت بہتر ہوسکے گی۔ یہ اقلیتیں بھی بہرحال عوام ہی کا ایک حصہ ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ امن و امان کے مسئلے کو دوسرے تمام معاملات کے مقابلے میں فوقیت دی جائے اور اسے صرف ریاستی حکومتوں پر نہ چھوڑا جائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی آئینی الجھن پیدا ہو تو اسے کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ خود کانگریس کے مینی فیسٹو میں کہا گیا ہے کہ جمہوریت کے چلنے کا مقصد یہ ہے کہ آئینی عوام کے مقصد کو پورا کرنے میں رکاوٹ بننے والے ہر عمل کو ختم کیا جائے۔ اس لئے اقتصادی بہبودی کے لئے پہلے بھی تبدیلیاں کی جاچکی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ سماجی انصاف کے راستے میں جو اڑچنیں آتی ہیں انھیں دور کرنے کے لئے ایسی مزید ترمیمیں کی جائیں۔"

اقتصادی بہبودی کے لئے تبدیلیاں بلاشبہ ضروری ہیں مگر انکا نفاذ اسی وقت ممکن ہے جب ملک میں امن و امان بھی ہو اور ہندوستانی سماج کا ہر حصہ جارحانہ بالادستی سے محفوظ رہے۔ فسطائی عناصر الیکشن میں ناکام ہوکر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ انھیں اگر ڈھیل دی جائے گی تو وہ سیکولر جمہوریت کی بنیاد کو کمزور کرنے کے اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اندرا گورنمنٹ روز اوّل سے فسطائی عناصر کی حرکتوں کو دبانے کے حق میں تھی لیکن شاید اس لئے وہ کوئی مؤثر قدم نہ اٹھاسکی کہ وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھتی تھی مگر حالیہ انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں کہہ سکتی پوری قوم نے اس پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں اس لئے نئی حکومت عوامی فلاح و بہبود اور سماجی انصاف کے سلسلے میں جو بھی اقدامات کرے گی ان کا خیر مقدم کیا جائیگا۔

لوک سبھا میں زبردست اکثریت حاصل کرنے کے بعد کانگریس گورنمنٹ کی ذمّے داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ عوام متوقع ہیں کہ جس طرح انھوں نے اس حکومت پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے اسی طرح وہ بھی اپنی نئے دار یوں سے عہدہ برآ ہوگی اور بلا کسی جھجک کے ان طاقتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے میدان میں آئے گی جو خود کانگریس کے بقول۔

"جمہوری اور سماج وادی مقاصد کی بنیادوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور مختلف طبقوں کے مذہبی جنون، نسلی برتری اور توسیع پسندی کے جذبات کو بھڑکا رہی ہیں۔"

اگر نئی حکومت ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکی اور اقلیتوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرسکی جسکے لئے کانگریس اپنے منشور کے تحت پابند ہے تو ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ ملک جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

ہماری آنکھیں جنت کے اس نمونے کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں۔



وزیراعظم اسرائیل

مسز گولڈا مائر سے انٹرویو!

پچھلے شمارے میں نیوز ویک کے جو ایک امریکی میگزین ہے] سینئر ایڈیٹر مسٹر آرنلڈ ڈی بورچ گریو کے ساتھ متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر انور سادات کا ایک انٹرویو شائع ہو چکا ہے جس سے عربوں کی پالیسی کی وضاحت ہوتی ہے۔ آج کی اشاعت میں وزیراعظم اسرائیل مسز گولڈا مائر کے ساتھ اسی ایڈیٹر کے انٹرویو کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے اور معلوم ہو سکے کہ اسرائیل کس طرح اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔

ڈی بورچ گریو: مصر نے پہلی بار ایک امن سمجھوتے پر دستخط کرنے اور اسرائیل کو ایک آزاد ریاست تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ ماضی میں ہمیشہ آپ نے کہا ہے کہ مصر کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار امن کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ کیا مسٹر سادات نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔؟

مسز مائر: ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ایک اہم تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ اگر اس بنیاد پر فریقین آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوں تو اور بھی زیادہ اہم باتیں ظہور میں آئیں گی لیکن ایک رکاوٹ باقی رہ گئی ہے جو ہمیں امید ہے دور کی جا سکے گی۔ یہ رکاوٹ ہے مصر کی طرف سے بات چیت سے قبل پیشگی شرطیں۔ ہم کسی بھی امن کی بات چیت کے لئے کوئی شرط نہیں لگاتے اور اس طرح ہم پیشگی شرطیں منظور بھی نہیں کرتے۔

س۔ انور سادات کے بیان کو آپ نے حوصلہ افزا قرار دیا ہے اس کے علاوہ آپ کا اور کیا موافقانہ ردعمل ہے۔

جواب۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم تمام معاملات پر بامقصد بات چیت کرنے اور ان سرحدوں تک پیچھے ہٹنے کے لئے تیار ہیں جو محفوظ اور تسلیم شدہ ہیں۔

س۔ سادات امن کے معاہدہ میں جن باتوں کے لئے تیار ہیں وہ انہیں پورا کرنے کا عہد کرتے ہیں اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی مقبوضہ علاقوں سے واپسی کا وعدہ کریں اگرچہ وہ آپ کے حق میں معمولی سرحدی ردوبدل کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر رہے ہیں۔ ان حالات میں کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ آپ دنیا کو بتا دیں کہ محفوظ و تسلیم شدہ سرحدوں سے آپ کا منشا کیا ہے۔

ج۔ سادات سینائی اور غزہ کے علاقے کا مکمل انخلا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک تمام مقبوضہ علاقے خالی نہ کئے جائیں گے پائدار امن نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سرحدی ردوبدل منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

س۔ مشرق وسطیٰ میں ایسے حالات ہیں کہ ایک اور جنگ شروع ہو سکتی ہے جس میں امریکا اور روس ملوث ہو سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا دنیا کو یہ معلوم کرنے کا حق نہیں ہے کہ آپ کس جگہ اپنی نئی سرحدیں قائم کرنا چاہتی ہیں۔

ج۔ فرض کیجئے کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہم کہاں اپنی سرحدیں چاہتے ہیں تب بھی اس سے جنگ کیسے رک جائے گی تاوقتیکہ مصر ان نئی سرحدوں کے بارے میں ہم سے بات چیت کرنے کے لئے تیار نہ ہو

س۔ کیا عرب یہ جاننے کا حق نہیں رکھتے کہ ان کے کتنے علاقے پر آپ قبضہ رکھنا چاہتی ہیں۔

ج۔ بلاشبہ انہیں حق ہے لیکن براہ کرم اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ علاقوں کو قبضے میں رکھنے کا سوال نہیں بلکہ محفوظ سرحدیں حاصل کرنے کا سوال ہے۔

س۔ اگر عرب ممالک ڈاکٹر یارنگ (اقوام متحدہ کے نمائندے) کے ذریعے آپ سے امن کا نقشہ طلب کریں تو کیا اس پر آپ کو اعتراض ہے۔

ج۔ کیا آپ کو کسی ایسے مقدمے کا علم ہے جس میں امن و امان چاہنے والے فریقوں نے ایک دوسرے کو دیکھنے سے انکار کیا ہو۔

س۔ طلاق شدہ جوڑے کے بارے میں آپ کیا کہیں گی کیا وہ اپنے وکیلوں کے ذریعے بات نہیں کرتے۔

ج۔ طلاق کے بارے میں کون بات کر رہا ہے ہم تو شادی کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔

س۔ کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ جب سرحدوں کا معاملہ سامنے آئے گا تو اس پر آپ براہ راست بات چیت کریں گی۔؟

ج۔ میں کہنا چاہوں گی کہ یہی بہترین طریقہ ہے لیکن اگر اس معاملہ پر ڈاکٹر یارنگ کے ذریعے بالواسطہ بات چیت ہو رہی ہے تو اس پر بھی ہمیں اعتراض نہیں۔ تاہم [illegible]

[illegible]

واضح وشتعل مسائل پر ہم کس طرح بالواسطہ طور پر بات چیت کر سکیں گے۔

س۔ آپ کہتی ہیں کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر واپس نہیں جائے گا۔ لیکن کیا ان سرحدوں کی بنیاد پر آپ بات چیت کے لئے تیار ہیں۔

ج۔ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں فریق بیٹھیں اور ایسی سرحدوں کے بارے میں بات چیت کریں جو محفوظ و تسلیم شدہ ہوں۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان اسرائیل کی جو سرحدیں تھیں وہ تسلیم شدہ اور قطعی نہیں تھیں اگرچہ ہم اس پر مطمئن تھے۔ لیکن عربوں کی طرف سے اس پوری مدت میں کہا جاتا رہا کہ اسرائیل کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ لیکن اب وہ ان ہی سرحدوں پر زور دے رہے ہیں جن کے بارے میں پہلے کہتے تھے کہ یہ ہماری سرحدیں نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں مناسب ہے کہ ہم بیٹھیں اور اپنی سرحدوں کا کوئی نقشہ تیار کریں۔

س۔ جو آپ کہتی ہیں کہ آپ کی نئی سرحدیں ۱۹۶۷ء کی سرحدیں نہیں ہوں گی اور نہ ہی وہ موجودہ جنگ بندی لائن کی سرحدیں ہوں گی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سرحدیں کہیں درمیان میں ہوں گی۔

ج۔ صریحاً ایسا ہے۔

س۔ لیکن اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آپ اپنے ذہن میں بڑی تبدیلیاں لئے ہوئے ہیں۔

ج۔ جب وہ ہمارا نقشہ دیکھیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ یہ چھوٹی تبدیلیاں ہیں یا بڑی۔ ہم وہی کر سکتے تھے جو مصریوں نے کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اپنا نقشہ بناتے اور پیش کر دیتے کہ اسے قبول کرو یا مسترد کرو۔ بہت سے لوگ اسے الٹی میٹم کہتے ہیں۔ ہم نے اس قسم کا الٹی میٹم نہیں دیا۔ ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور گفتگو کا مطلب ہمیشہ "دو اور لو" ہوتا ہے۔ بعض جگہ سرحدی تبدیلی بالکل معمولی ہوگی اور دوسرے مقامات پر بڑی تبدیلیوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

س۔ مخصوص و متعین علاقوں کے بارے میں سوالات کا جواب نہ دے کر آپ یہ تصور پیدا کر رہی ہیں کہ آپ اپنے نئے نقشے کے بارے میں باہم متفق نہیں ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے۔

ج۔ سرحدوں سے متعلق بات چیت شروع ہونے کے بعد ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر نئے نقشے کے بارے میں ہماری تجاویز پیش کی جائیں گی۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

س۔ کیا آپ اس امر کی وضاحت کر سکتی ہیں کہ محفوظ و قابل دفاع سرحدوں سے آپ کا کیا مطلب ہے۔

ج۔ یہ ایسی سرحدیں ہیں کہ اگر ہم پر دوبارہ حملہ ہو تو ہم حفاظت کر سکیں۔ یہ ایسی سرحدیں ہوں گی جو حملوں کو روک سکیں گی۔

س۔ سادات نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ اپنی فوجوں کو سینائی میں العریش کے عقب تک لے جائیں تو وہ نہر سوئز کو کھول دیں گے جس میں تمام ممالک کو جن میں اسرائیل بھی شامل ہے جہاز رانی کی اجازت ہوگی اور وہ بحر طیران میں بھی جہاز رانی کی اجازت دیں گے۔ کیا سادات کی اس تجویز سے آپ دلچسپی رکھتی ہیں؟

ج۔ آزاد جہاز رانی سے یقیناً ہمیں دلچسپی ہے۔ لیکن ڈاکٹر یارنگ کو انھوں نے جو جواب دیا ہے اس میں انہوں نے ۱۸۸۸ء کے معاہدۂ قسطنطنیہ کی شرط لگائی ہے۔ علاوہ ازیں ماضی میں انہوں نے اس قسم کی آزادی کو ختم کر دیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے عمل کی تردید معلوم ہوتی ہے جس پر واضح طور سے بات چیت ہونی چاہئے۔

س۔ نہر سوئز کے علاقے سے جزوی واپسی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج۔ سادات نے جزوی واپسی کی تجویز اپنے اس بیان سے پہلے نشر کی تھی کہ ہمارے ساتھ وہ معاہدۂ امن کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اب ہم جزوی واپسی کی نہیں بلکہ امن کے معاہدے کی بات چیت کر رہے ہیں۔ خود مصر کی طرف سے بھی یہی بات کہی جا رہی ہے۔

س۔ موشے دایان (وزیر دفاع) نے حال ہی میں کہا تھا کہ شرم الشیخ کے بغیر کسی معاہدے کے مقابلے میں وہ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ معاہدے کے بغیر شرم الشیخ کو اپنے پاس رکھیں۔ خود آپ کی لیبر پارٹی کے پلیٹ فارم سے گزشتہ انتخابات سے قبل یہ بات کہی گئی کہ شرم الشیخ میں اسرائیل کی موجودگی کا تعلق علاقائی تسلسل کے ذریعہ ایلات کی بندرگاہ سے ہے کیا آپ کی حکومت آج بھی اسی موقف پر قائم ہے۔

ج۔ اسرائیلی حکومت نے کسی نقشے کی قطعی حدود تیار نہیں کی ہیں۔ جوں ہی سرحدوں کے بارے میں بات چیت شروع ہوگی یہ نقشہ تیار کر لیا جائے گا۔ ہم مصریوں کی کسی بھی تجویز پر غور کریں گے۔

س۔ کیا شرم الشیخ میں اسرائیلی فوجوں کے بجائے متبادل تجویز کے طور پر اسرائیل یہ بات تسلیم کر سکتا ہے کہ وہاں بین الاقوامی فوج تعینات رہے۔

ج۔ محفوظ و تسلیم شدہ سرحدوں کے مقابلے میں ہماری رائے میں کوئی بھی متبادل تجویز مناسب نہیں ہے۔ اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۵۷ء میں اس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ جب تک حالات معمول پر آئیں شرم الشیخ میں بین الاقوامی فوج رہے گی لیکن ۱۹۶۷ء میں صورتِ حال قطعی طور پر معمول پر نہیں تھی جب کہ ناصر نے سیٹی بجائی اور اقوام متحدہ کی فوج وہاں سے چل دی۔

س۔ لیکن اس کی ضمانت سلامتی کونسل کی طرف سے نہیں دی گئی تھی جہاں چار بڑی طاقتوں کو ویٹو کا اختیار حاصل ہے۔

ج۔ امن کے معاہدے پر متفق ہونے اور سرحدوں کا تعین کرنے کے بعد ہم کسی بھی اضافی ضمانت پر بات چیت کرنے کے لئے تیار رہیں گے جو پیش کی جائے گی۔

س۔ قاہرہ کا کہنا ہے کہ آپ نے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کے بدلے میں سینائی خالی کرنے کی ڈاکٹر یارنگ کی تجاویز مسترد کر دی ہیں۔

ج۔ ہم نے کوئی تجویز مسترد نہیں کی۔ ہم نے صرف الٹی میٹم کو مسترد کیا ہے۔ یعنی ان شرائط کو جو مفاہمت امن کے بدلے میں قاہرہ کی طرف سے لگائی گئیں۔ یہ بات چیت کا طریقہ نہیں ہے۔

س۔ کیا اردن کے مغربی کنارے پر آپ کی نظریں ہیں۔

ج۔ کسی چیز پر ہماری نظریں نہیں ہیں۔ یہ تاثر قطعی طور پر مضحکہ خیز ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی ایک سہانی صبح کو اسرائیل نے طے کیا کہ وہ زیادہ علاقے کا خواہشمند ہے اور اس لئے اس نے جنگ شروع کر دی۔

س۔ اگر مغربی کنارے پر آپ کی نظریں نہیں ہیں تو آپ ہیبرون میں یہودی خاندانوں کو کیوں بسا رہی ہیں۔

ج۔ میں اس ترکیب سے پوچھے گئے سوال کا جواب نہیں دوں گی۔

س۔ تب پھر کیوں آپ ہیبرون میں یہودی خاندانوں کو بسا رہی ہیں۔؟

ج۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہیبرون کس کے حلقۂ اختیار میں رہے گا ایک یہودی کیوں یہ محسوس کرے کہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جو اس کے لئے ممنوع ہے۔ ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ ہیبرون اردن کو واپس ہو جائے گا تو کیا وہاں یہودیوں

کو نہیں رہنے دیا جائے گا۔ جس طرح کہ چار ہزار عرب اسرائیل میں آباد ہیں۔ ہیبرون کا یہودیوں کے ساتھ ایک تاریخی تعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء تک جب کہ ان پر حملے ہوئے اور وہ قتل کئے گئے وہ وہاں صدیوں رہتے آئے تھے۔

س۔ مقبوضہ علاقوں میں آپ کی نئی بستیوں کے بارے میں عرب سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی توسیع پسندی کی علامت ہیں آپ اس زمین پر کیوں اپنی بستیاں بسا رہی ہیں جو آپ کی ملکیت نہیں ہے۔

ج۔ عرب بہت سی باتیں کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ اسرائیل ان سے چھین لیا گیا ہے۔ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے کہ ہم نے عربوں سے زمین چھینی ہے۔ اس بات کو نہ بھولئے کہ اردن نے مشرقی یروشلم (بیت المقدس) پر ۱۹۴۸ء میں طاقت کے ذریعہ قبضہ کیا تھا۔ جو یہودی شہری زندہ بچ گئے تھے ان سب کو وہاں سے نکال دیا گیا ہم اس اصول پر صاد نہیں کر سکتے کہ اردنی علاقے میں یہودی نہیں رہنے چاہئیں۔

س۔ کیا معاہدے کی صورت میں آپ نئی بستیوں کو مسمار کر دیں گی

ج۔ آپ یہ فرض کر رہے ہیں کہ کوئی یہودی سرحد کی دوسری جانب نہیں رہ سکتا۔ میں اس طرح کے مفروضے کو تسلیم نہیں کرتی اور میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اردن کے ساتھ ہماری سرحدیں کہاں رہیں گی۔

سوال۔ اسرائیل کا اعلان یہ ہے کہ وہ گولان کی پہاڑیوں کو خالی نہیں کرے گا۔ کیا اس اعلان کا اطلاق شامی شہر القنیطرہ اور گولان کے میدانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جن پر آپ کا قبضہ ہے۔

ج۔ میں آپ کے لئے نقشہ تیار نہیں کر سکتی جب ہم شام سے بات چیت کریں گے تو سرحدوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے گا۔

س۔ آپ کہتی ہیں کہ آپ کو علاقے سے نہیں بلکہ سلامتی کے ساتھ دلچسپی ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہر چیز طے ہو چکی ہے آپ کن علاقوں کو مستقل طور پر غیر فوجی علاقوں میں منتقل کرنا پسند کریں گی۔

ج۔ ہم غیر فوجی سرحدوں کو منظور کریں یا نہ کریں یہ ایسا معاملہ ہے جس پر گفتگو ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن مصر ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم سینائی اور غزہ کو خالی کر دیں اور اپنی پرانی سرحدوں پر واپس چلے جائیں اس کے بعد وہ برابر برابر کے فاصلے پر غیر فوجی علاقے قائم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اس سے ہم کہاں پہونچ جائیں گے۔

س۔ وزیر خارجہ امریکا مسٹر راجرس نے جو پلان پیش کیا ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے!

ج۔ راجرس کے پلان میں پہلے سے سرحدی تبدیلیوں کا ذکر ہے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ سرحدوں کے مسئلے پر بات چیت ہونی چاہئے۔

س۔ آپ کسی عرب ملک کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے پر بھروسہ نہیں کر رہی ہیں ایسی صورت میں امن کا سمجھوتہ ہونے تک عبوری دور میں اگر سلامتی کونسل کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے چار بڑی طاقتوں کی طرف سے ضمانت دیجائے تو آپ کے خیال میں وہ مؤثر کیوں نہیں ہے۔

ج۔ ہم کسی سے کسی رعایت کے طالب نہیں ہیں۔ ہر ملک کی اپنی سرحدیں ہوتی ہیں اور وہ انکی حفاظت کا ذمے دار ہوتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اوپر کوئی نگرانی رکھے اور ہمارے تحفظ کا ذمے دار ہو۔ یہ بات ہم نے ڈاکٹر یارنگ سے بھی کہہ دی ہے لیکن امن کے قطعی سمجھوتے پر بات چیت مکمل ہو جانے کے بعد ہم اضافی تحفظات سے متعلق کسی بھی دوسری تجویز پر غور کریں گے۔

س۔ اگر جنگ میں توسیع نہ ہوئی (مصر نے جنگ بندی میں توسیع سے انکار کر دیا ہے) اور مصریوں نے نہر سوئز کے پار گولہ باری شروع کر دی تو کیا آپ محسوس کرتی ہیں کہ آپ کے پاس اتنی طاقت موجود ہے کہ نہر سوئز کے علاقے میں مصریوں کے میزائلی تنصیبات کو ناکارہ بنا دیں۔

ج۔ ہم اس بات سے مطمئن ہیں کہ صورت حال سے نمٹنے کی ہم اتنی ہی صلاحیت رکھتے ہیں جتنی کہ پہلے رکھتے تھے لیکن ہم جنگ نہیں چاہتے۔ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہمیں یقین ہے کہ مصری بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے کیونکہ جنگ سے وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔

س۔ کیا آپ کی فوجی کارروائیاں نہر سوئز کے علاقے تک محدود رہیں گی۔

ج۔ میں سرحدیں متعین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اسی طرح اپنے فوجی منصوبوں کو بھی ظاہر نہیں کر سکتی۔

س۔ سادات کہتے ہیں کہ ان کے خیال میں فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلے کا مناسب حل یہ ہوگا کہ انہیں سادات ریفرنڈم کے ذریعے غزہ اور مغربی کنارے کے علاقوں میں اس بات کے لئے ریفرنڈم کیا جائے کہ کیا وہ الگ فلسطینی ریاست کے خواہشمند ہیں یا وہ اردن کے ساتھ وفاقی نظام میں منسلک ہونا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ قطعی الحاق پسند کریں گے۔ اسرائیل کو واپسی کا مطالبہ تنگ کر دیا گیا ہے۔ اس بارے میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔

ج۔ ہمارا کہنا ہے کہ تسلیم شدہ سرحدوں کے باہر جو لوگ رہتے ہیں وہ کسی بھی طریقے سے اپنے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ بحیرۂ روم اور عراقی سرحد کے درمیان تین ریاستوں کی گنجائش ہے دوسری ریاست اگر اپنے آپ کو اردن یا فلسطین یا اردن فلسطین یا فلسطین وارڈن پکارتی ہے تو اس سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے۔ لیکن اگر اس علاقے میں امن دائم قائم رکھنا ہے تو تیسری مملکت ممکن نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسی مملکت جس میں ایک اور جنگ کے جراثیم موجود ہیں

س۔ لیکن کیا آپ اس قسم کے ریفرنڈم کو مسترد کرتی ہیں جسے سادات نے ایک مناسب حل قرار دیا تھا۔

ج۔ سادات کے ساتھ آپ کی ملاقات کے چند دن بعد صدر یوگوسلاویہ نے قاہرہ کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کے بعد جو اعلانیہ جاری کیا گیا تھا اس میں اس بات کی ضرورت پر زور دیا گیا کہ فلسطینیوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ یہی نہیں بلکہ مادر وطن میں حقوق کی بحالی کے لئے ان کی جدوجہد کی بھی حمایت کی گئی۔

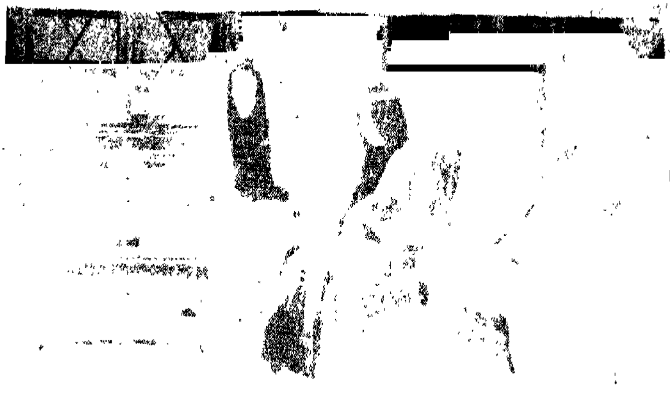
س۔ اس اعلانیے کا اور جو کچھ کہ سادات نے مجھ سے کہا ضروری نہیں ہے کہ اسکا ایک دوسرے پر انحصار ہو۔

ج۔ اگر فلسطینی عوام کی طرف سے بولتے ہیں جیسے عرفات حبش اور دیگر لوگ ان سب کے خیال میں اسرائیل اور اردن ایک ہی ہیں اور انکا ایک ہی علاقے سے مطلب ہے۔

س۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ عمان کی حکومت کسی ایسے سمجھوتے پر دستخط کر دے گی جس کے تحت اسرائیل کے حق میں بیت المقدس سے دستبرداری دی گئی ہو۔

ج۔ میں عمان کے بارے میں نہیں کہہ سکتی۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں وہ یہ کہ مشرقی یروشلم (بیت المقدس) اردن کی حکمرانی میں وہاں کے باشندوں کی مرضی سے نہیں آیا تھا بلکہ اس طرح آیا تھا کہ ہر اس یہودی کو جو زندہ بچ گیا تھا وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نسلوں سے وہاں آباد تھے۔

قضیہ فلسطین کے متعلق جمہوریہ لیبیا کے وزیر اعظم کرنل معمر القذافی سے ایک اہم انٹرویو



کرنل معمر القذافی (بائیں طرف) شاہ سعود اور مرحوم صدر ناصر کے ساتھ

ترجمہ و تلخیص: شعیب نگرامی (مقیم بن غازی)

لیبیا کے انقلاب کے جواں سال لیڈر اور وزیر اعظم کرنل معمر القذافی نے تونس کا سرکاری دورہ ختم کرنے کے بعد تونس کی افریقن نیوز ایجنسی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مسئلہ فلسطین کا واحد حل عربوں کی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کر کے غاصب دشمن کے خلاف برسر پیکار ہونا ہے۔

نوجوان سربراہ حکومت نے عرب اسرائیل تنازعہ کو قومی جنگ میں تبدیل کرنے کے متعلق اپنے ملک کے منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے کہا اس منصوبے کو تیار کرنے کے سلسلے میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ اسرائیل نہ تو صرف فلسطین پر اکتفا کرے گا اور نہ اس کی وسعت پسندانہ پالیسی کے لئے مقبوضہ عرب علاقے کافی ہیں۔ اسرائیل در حقیقت ایک وسعت پسندانہ منصوبے پر عمل کر رہا ہے جس کا مقصد آہستہ آہستہ پورے عرب ممالک کو ہڑپ کر جانا ہے۔

۲۔ اقوام متحدہ کے بارہ ممالک جنہیں چھوٹے اور بڑے ممالک کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ سب کے سب بائیس سال گزر جانے کے باوجود مسئلہ فلسطین کو حل نہ کر سکے اور اس پورے عرصے میں براہ راست نقصان اٹھانے والے عرب اور صرف عرب رہے۔

۳۔ اسرائیل فوجی نقطۂ نظر سے کوئی ایسا معجزہ نہیں جس کو قابو میں کرنا بس کے باہر ہو۔

۴۔ اسرائیل اور اس کے حلیفوں کو عربوں کی متحدہ طاقت کا بخوبی اندازہ ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے

واقعات نئی دھلی

کہ عربوں کی یہ طاقت بکھری ہوئی ہے اور عربوں کو خود اپنی اس طاقت کا اندازہ نہیں جس کے تصور سے دشمن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۵۔ مسئلہ فلسطین کا واحد حل دشمن کے خلاف قومی پیمانے پر اعلان جنگ ہے اور اس کے لئے عربوں کی بکھری ہوئی طاقت کو یکجا کرنا بہت ضروری ہے۔ نیز یہ کہ دشمن کے خلاف یہ جنگ دفاعی نہیں بلکہ صولی ہونی چاہئے۔ کیونکہ دشمن عرب سرزمین پر قابض ہے دفاعی جنگ تو اس صورت میں لڑی جاتی ہے جس وقت دشمن وطن کی سرحدوں کے باہر ہوتا ہے

۶۔ عرب اس وقت فوری طور پر ایک ہزار جنگی جہاز پانچ ہزار ٹینک اور دس لاکھ فوجی بآسانی مہیا کر سکتے ہیں اور یہ طاقت جو مستقبل میں بڑھائی بھی جا سکتی ہے دشمن کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہی ہے کہ یہ جنگ قومی پیمانے پر لڑی جائے ورنہ بکھری ہوئی طاقت صفر کے برابر ہوگی۔

نوجوان لیبیائی وزیر اعظم نے فرانس سے "میراج" ساخت کے لڑاکا طیاروں کے خریدے جانے اور ان طیاروں کو مستقبل میں مشرق وسطیٰ کی کسی جنگ میں استعمال کئے جانے سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ فرانس سے لڑاکا طیاروں کے خریدنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنی تمام قومی ذمے داریوں سے دستبردار ہو گئے جن اسلحوں کو ہم پیسے دے کر خریدیں گے ان کے استعمال میں ہم بالکل آزاد ہیں اور دنیا میں صرف میراج طیارے ہی نہیں ہیں اگر ضرورت پڑی تو خدا نے ہمیں اتنی قدرت دی ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے مزید سستے نرخوں پر جنگی ضرورت کا سامان خرید سکیں۔

وزیر اعظم کرنل معمر القذافی نے مشرقی عرب ممالک اور مغربی عرب ممالک۔ تیونس، الجزائر، مراکش کے درمیان لیبیا کے محل وقوع اور اس کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم مشرق و مغرب کے عرب ممالک کے درمیان نقطۂ نظر ہیں اور ہم تمام عرب ممالک کے سامنے تعاون اور محبت کا ہاتھ اس امید پر بڑھاتے ہیں کہ عربوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم ہو سکے۔

لیبیائی سربراہ کرنل معمر القذافی نے اپنے انٹرویو کے آخر میں تیونس کے عوام کہ مسئلہ فلسطین اور عرب اتحاد سے دلچسپی کو سراہتے ہوئے کہا کہ تیونس پر مجھ کو فخر ہے کیونکہ اس نے ماضی میں فرانسیسی سامراج کے چنگل میں پھنسنے کے باوجود اپنے عربی اور اسلامی کردار پر دھبہ نہیں آنے دیا اور تیونسی عوام نے سامراج کے ظلم و ستم کے باوجود دین حنیف • اسلام کو حرز جان بنائے رکھا اور اس کے احکام پر عمل پیرا رہے اور اب بھی ہیں۔

شعیب نگرامی

پاکستانی خواتین

شفیق احمد صدیقی

"پاکستانی خواتین نے اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر لانے کے لئے بہت مخصوص قدم اٹھائے ہیں" یہ الفاظ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علیخاں کی اہلیہ بیگم لیاقت علیخان نے جو پچھلے دنوں بھی دورے پر ہندوستان آئی تھیں ایک انگریزی اخبار کی خاتون جرنلسٹ سے کہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا۔ "اس وقت بھی ہماری خواتین ہندوستانی خاتونوں سے پیچھے ہیں۔ اب سے پچاس سال پہلے گاندھی جی نے عورتوں کو برابر کے حقوق دلانے کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن پاکستانی خواتین میں اپنے حقوق و فرائض حاصل کرنے کا جذبہ تقسیم کے بعد ہی ابھرا اور پھر ابھرتا ہی گیا۔"

بیگم رعنا لیاقت علیخاں پاکستان کی ممتاز خواتین میں سے ایک ہیں جن کی شخصیت صرف پاکستان کی سرحدوں تک ہی محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی آپ کا نام جانا پہچانا ہے۔ ہم بیگم خان کی سیاسی زندگی کو پنڈت جواہرلال نہرو کی ہمشیرہ مسز وجے لکشمی پنڈت کی زندگی سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مسز پنڈت کو ہندوستان کی پہلی خاتون سفیر بننے کا شرف حاصل ہے۔ مسز پنڈت کو چار بڑے ملکوں۔ انگلینڈ، امریکا روس اور فرانس میں ہندوستان کے سفیر کا عہدہ کامیابی سے سنبھال چکی ہیں اور اقوام متحدہ کی صدر بھی رہ چکی ہیں۔

اسی طرح بیگم خان کو بھی پاکستان کی پہلی خاتون سفیر بننے کا شرف حاصل ہے۔ وہ بارہ سال تک غیر ممالک میں اپنے ملک کی سفارتی نمائندگی کر چکی ہیں۔ انھوں نے کچھ دنوں تک اقوام متحدہ میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کی ہے۔ بیگم خان کے علاوہ پاکستان کی دو اور خاتونوں کو غیر ممالک میں اپنے ملک کی سفارتی نمائندگی کرنے کا شرف حاصل ہے ان میں سے ایک شائستہ چودھری ہیں جو برازیل میں اور دوسری شہزادی سلطانہ ہیں جو ماریشس میں پاکستان کی سفیر رہ چکی ہیں۔

اب سے ٹھیک ۲۲ سال پہلے بیگم خان نے پاکستانی خواتین کے وقار کو بلند کرنے کے لئے ایک سماجی انقلاب لانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں بیگم خان نے ایک جماعت "پاکستان وی مینس نیشنل گارڈ" بنانے کا اعلان کیا تھا۔ موصوفہ کے ایک اشارے پر پاکستانی عورتوں میں مردوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا جوش و ولولہ اُبل پڑا اور اب پاکستان کے ہر شعبے میں عورتیں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہسپتالوں میں نرسیں اسکولوں میں استانیوں کے علاوہ عورتیں پولیس۔ وکالت اور ایگزیکیٹو میں بھی اونچے عہدوں پر معمور ہیں اور بڑی جرأت اور خوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

"وی مینس نیشنل گارڈ" کے علاوہ خواتین کی اور بہت سی جماعتیں وجود میں آچکی ہیں اور رفتہ رفتہ وجود میں آرہی ہیں جنکا مقصد مستورات کو ہر طرح کی تربیت دینا اور اُن میں ترقی کا جذبہ پیدا کرنا بے سہارا اور بیواؤں کی مالی امداد کرنا اور انھیں دستکاری سکھانا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں بیگم خان کی سرپرستی میں ایک اور جماعت "آل پاکستان وی مینس ایسوسی ایشن" وجود میں آئی۔ یہ جماعت اب تک قائم ہے اور پاکستانی خواتین کی ترقی اور بہبودی کے لئے ایک اہم رول ادا کر رہی ہے بہت سے ادارے۔ اسکول، ہسپتال بیگم خان کی اس جماعت کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ یہ جماعت وقتاً فوقتاً بہت چیریٹی شو اور تفریحی ڈراموں کی مدد سے کثیر رقم جمع کرلیتی ہے جو جماعت کی سرپرستی میں چلنے والے اداروں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ جماعت کی ممبر بھی جماعت کو مقررہ چندہ دیتی ہے۔ جماعت کی اقتصادی حالت بہت اچھی ہے۔

پاکستانی عورتیں کسی طرح بھی مردوں سے پیچھے نہیں اب ان میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا شعور پوری طرح بیدار ہوگیا ہے۔ تعلیم یافتہ خاتونوں نے ملک کی سیاست میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس وقت بھی سیاست کے میدان میں ان کے قدم بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ پاکستان کی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں بھی وہ اپنے علاقے کے عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے انتخاب میں ۱۳ خواتین قومی اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔

پاکستانی خواتین نے پرانے اور دقیانوسی رسم کا خاتمہ کر کے نئے اور ترقی یافتہ دستوروں کو اختیار کر لیا

(اقتباسات قومی دہلی)



بیگم لیاقت علیخان۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی بیوہ، پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی صدر رہ چکی ہیں۔ نیدرلینڈ اور اٹلی میں پاکستان کی سفیر بھی رہیں۔



پاکستانی عورتیں فیشن کے معاملہ میں بھی کسی سے کم نہیں۔



پی۔آئی۔اے کی ایئر ہوسٹس

بر ہوسٹس کا یہ لباس پاکستانی اور ہندوستانی خواتین میں کافی مقبول ہوا

آنے والی نسلوں کے لئے ایک مفید ٹانک سے بھی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں گے۔ اس وقت بھی جب کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا یا کوئی قانون انھیں ناپسند ہوتا ہے کراچی، اسلام آباد، لاہور اور ڈھاکہ جیسے بڑے شہروں میں خواتین کے جلوس اور مظاہرے عام ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں جب فیملی لاء بل زیر غور تھا انھوں نے قومی اسمبلی کو گھیراؤ کر لیا تھا۔ حکومت بل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن پاکستانی خواتین کی متحدہ آواز کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑا اور ان کے مطالبے کے مطابق حکومتِ پاکستان کو بل منظور کرنا پڑا۔ اسی دن سے وہ بل قانون بن گیا تھا۔ اس بل کے تحت خواتین کو ناپسندیدہ شوہروں سے طلاق لینے کا حق جائز قرار دیا گیا ہے۔

بیگم خان نے بتایا کہ تقسیم کے بعد ۹۰ فیصدی پاکستانی خواتین بے پڑھی لکھی تھیں اور پانچ فیصدی تعلیم یافتہ تھیں صرف دو فیصدی تعلیم یافتہ کہلائے جانے کی مستحق تھیں۔ ان کوششوں اور جد و جہد کے بعد پاکستانی خواتین کی توجہ تعلیم کی طرف دلائی گئی۔ اب بھی ۷۰ فیصدی خواتین ایسی ہیں جنہیں پڑھانے اور لکھنے سکھانے کی ضرورت ہے۔ گاؤں میں رہنے

والقات نقش و علی

والی عورتوں میں تعلیم عام کرنے کے لئے حکومت پاکستان بہت ٹھوس قدم اٹھا رہی ہے اس لئے لڑکیوں کے لئے جونیئر اور ہائر سکنڈری تک تعلیم مفت کر دی گئی ہے۔ پاکستانی سربراہوں کا خیال ہے کہ ان کے ملک کی آئندہ نسل سو فیصدی تعلیم یافتہ ہو گی۔

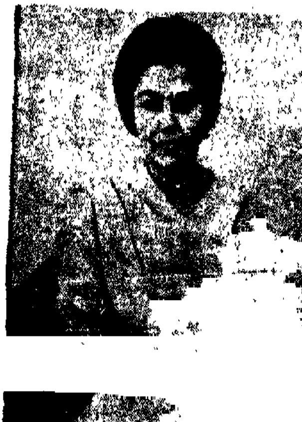
بیگم خان نے بتایا کہ آل پاکستان ویمنس ایسوسی ایشن شادی شدہ ان پڑھ عورتوں کی توجہ تعلیم کی طرف دلاتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بہت سی بال بچے دار عورتیں چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ مدرسے میں پڑھتی لکھتی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ایک سروے کے مطابق پاکستان میں طلبا ر کی آدھی سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۶۵ فیصدی گریجویٹ عورتیں ہیں۔ پاکستانی تعلیم یافتہ خواتین میں زیادہ تر نرسیں اور استانیاں بننا چاہتی ہیں۔ اسپتالوں اور اسکولوں کے علاوہ بھی دوسرے اداروں، مجلسوں اور دفتروں میں وہ اپنے پیر مضبوطی سے جماتی جا رہی ہیں۔

اس وقت پاکستان میں تقریباً ستر ہزار مستورات سرکاری اور غیر سرکاری اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جن میں زیادہ تر مجسٹریٹ۔ وکیل۔ انجینئر۔ منصف اور بینک ایگزیکیٹیو ہیں۔ محکمۂ پولیس میں بھی تین گزیٹڈ عہدوں پر سرفراز ہیں۔ ۳۴ سالہ کنیز فاطمہ کراچی شپ ایسوسی ایشن، کی صدر ہیں۔ انیسہ غلام علی "آل پاکستان لیڈی ٹیچرس یونین" کی صدر ہیں۔ نوکری کرنے والی خواتین میں ۳۰ فیصدی غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شادی ان کی ترقی میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے جس سے وہ منزلِ مقصود تک کامیابی سے نہیں پہونچ پاتیں یہی وجہ ہے کہ نوکری کرنے والی خاتونیں کسی خاص کیریر میں ایک اہم مقام بنا لینے کے بعد شادی کرتی ہیں۔

پاکستان میں شادیاں بزرگوں کے ذریعے طے ہوتی ہیں، جو بیگم خان کی نظر میں ایک قابل احترام طریقہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ محبت کی شادیاں زیادہ عرصے تک کامیاب نہیں رہتیں۔ اور ان کے نتائج نہایت تباہ کن ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تعلیم یافتہ خواتین کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے لیکن پھر بھی کچھ تنگ نظر نوجوان زیادہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو نظر میں نہیں لاتے۔ ان کا خیال ہے کہ زیادہ تعلیم یافتہ لڑکیاں ان کی بیویاں بن کر ان کے اشاروں پر نہیں چل سکتیں۔

پاکستانی خواتین میں جدید فیشن کی وبا بہت تیزی سے



ہند و پاک کی مشہور ادیبہ

ہاجرہ مسرور



زبیدہ آغا کا شمار پاکستان کے چوٹی کے مصوروں میں ہوتا ہے۔ آپ ماڈرن آرٹ میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔

پھیل رہی ہے۔ سڑکوں پر لڑکیاں نئے نئے فیشن کے لباس میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ فیشن میں یورپ کو بھی پیچھے چھوڑ گئی ہوں۔ بہت سی تعلیم یافتہ اور فیشن پرست عورتوں نے فیشن اسکول کھول رکھے ہیں جہاں لڑکیوں کو موجودہ فیشن کی تربیت دی جاتی ہے۔

پاکستان میں برقعے کا عام دستور نہیں رہا۔ صرف پرانے خیالات کی عورتیں ہی برقعہ پہنتی ہیں، نئی روشنی کی لڑکیاں برقعہ پہننا جہالت سمجھتی ہیں۔ شلوار اور چوڑی دار پاجامے کو انہوں نے نئی شکل دیدی ہے۔ وہاں دوپٹہ اوڑھنے کا دستور بھی دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔



امریکہ اور امریکی کانگریس یہودیوں کے اشاروں پر ناچتی ہے

—(محمد ولی رحمانی)—

اقلیت کا اکثریت پر اثر انداز ہونا۔ بظاہر تو ناممکن معلوم ہوتا ہے مگر امریکا جیسے مضبوط ملک میں یہ ناممکن چیز ممکن ہوگئی ہے اور وہاں کے یہود امریکی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو اتنا منظم کر لیا ہے کہ وھائٹ ہاؤس ان کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ امریکی انتظامیہ انکے مفاد کے خلاف حرکت میں آسکتی ہے — امریکا کے یہود تجارت، صنعت اور علم و سائنس پر چھائے ہوئے ہیں — دولت حاصل کرنا انکا پرانا پیشہ ہے اور امریکا سے نکلنے والے اخبارات میں سے ستر فیصدی کی پالیسی انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی سیاست پر انھیں، قابو حاصل ہے۔

لیکن امریکا میں یہودیوں کو یہ مقام بڑی محنت کے بعد حاصل ہوا۔ آج کے حالات نصف صدی سے زیادہ کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ دنیا کے سب سے اہم ملک میں موثر پوزیشن حاصل کرنے کی یہودی تاریخ ۱۸۹۰ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۸۹۰ء تک امریکا کے یہودیوں کی تاریخ بعد کی تاریخ سے مختلف ہے۔

۱۸۹۰ء سے پہلے بھی امریکا میں یہودی آباد تھے مگر انھیں سیاسی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ تجارت میں حصہ لیتے تھے مگر سیاسی پوزیشن صفر کے برابر تھی۔ ان کی ساری تنظیمی صلاحیت دینی کاموں کو چلانے پر صرف ہوا کرتی تھی۔ اس وقت امریکا میں یہودیوں کی تین دینی جماعتیں تھیں۔ انجمن محافظین متجددین اور ارفوزوکس۔ یہ تینوں اپنے خیالات کے مطابق یہودی مذہب کی حفاظت و اشاعت کا کام کر رہی تھیں۔

متجددین کے گروپ کو دینی حلقے میں اہمیت حاصل تھی اور مرکزیت بھی۔ وہ نئے حالات میں یہودی مذہب کو مقبول بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ماضی کے ساتھ اس کا رویہ سرسلانہ یا گریز کا نہیں تھا۔ یہ گروپ چاہتا تھا کہ ماضی کے قابل فخر سرمایہ اور قدیم دینی ماخذ کی پوری حفاظت کے ساتھ نئے ماحول میں یہودیت کو ترقی دی جائے اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ لوگ اسے قبول کر سکیں — لیکن یہ تینوں جماعتیں دینی خدمت کے نام پر امریکی سماج میں ضم ہوتی جارہی تھیں اور سیاست سے بالکل الگ ہونے کے نتیجے میں یہودیوں کی قومی حیثیت گھٹتی جارہی تھی۔

۱۸۹۰ء میں امریکا کے یہود کو باہر سے تازہ غذا ملی۔ یہ غذا ان افراد کی شکل میں تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ مشرقی یورپ سے ... واقعات ملی ...

سے امریکا آرہے تھے اور تیس سال کے عرصے میں جن کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی۔ یہ آنے والے علم وفن کی دولت سے لیس اور تجارت وسیاست کی تکنیک سے پورے طور پر واقف تھے۔ ان کی نفسیات وہی تھی جو عام طور پر ایک تارک وطن کی ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں مظلومیت کا احساس تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوت کی کمی نے انہیں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا۔ ان میں جدوجہد کا بھرپور جذبہ اور زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کی تڑپ تھی اور اپنے قومی وجود اور قومی تشخص کے لئے بے پناہ تعصب۔

ان لوگوں نے امریکا پہونچ کر سب سے پہلے تجارت پر قبضہ کیا اور مذکورہ تینوں تنظیموں کو قوت پہونچانے کے ساتھ انھوں نے دولت اور علم کے ذریعے امریکی سیاست پر قابو پانے کی کوشش شروع کردی۔ قومی وجود کو منوانے کے لئے مختلف قسم کی انجمنیں اور تنظیمیں بنیں۔ ۱۸۹۸ء میں امریکی صیہونی تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کے ذریعے دنیا بھر کے یہودیوں اور خصوصاً صیہونی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ بعد کی تاریخ نے امریکا کے یہودیوں کی انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہونے والی اس تنظیم کی اہمیت کو مان لیا جس نے تمام امریکی یہودیوں میں سیاسی بیداری اجتماعی کوشش اور قومی جدوجہد کی روح پھونک دی تھی

اس تنظیم کے سہارے امریکا کے یہودیوں نے جمہوریت کے نام پر نعرہ لگایا کہ امریکا کی حیثیت ایک گلدستے کی ہے جس میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ہر قوم اپنی تہذیب تمدن، دینی حیثیت اور قومی وجود کو برقرار رکھتے ہوئے امریکی ترقی میں حصہ لے رہی ہے ـــــ خوش قسمتی سے امریکا اور یورپ کے بعض اہم مفکرین نے یہودیوں کے اس انداز فکر کی پوری تائید کی اور انہیں کامیاب شہری بنے اور شہریوں کے حقوق دلوانے میں پورا سہارا دیا جس کے نتیجے میں امریکی سیاست نے امریکی یہودیوں پر اپنا دروازہ کھول دیا۔

۱۹۰۶ء میں امریکن یہودی کونسل کی تشکیل ہوئی یہ امریکا میں یہودیوں کی سب سے بڑی انجمن تھی جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ کونسل نے یہود کے مفاد کے لئے کئی اہم کام کئے۔ اس کی نگرانی میں "یہودی پروپیگنڈہ ڈپارٹمنٹ" قائم ہوا جس کے ذریعے یہودیوں کی مظلومیت کا احساس اور

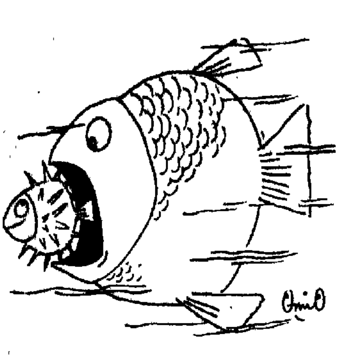
باقیات صفحہ [illegible]

ان کے حقوق کی بحالی کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوا اور مظلومیت کے سہارے وہ مضبوط قوم کی شکل میں ابھرنے لگے۔ امریکا کے یہودیوں کی قوت اس وقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ یہود کے آزاد اور خود مختار وطن کا نقشہ تیار کرنے لگے۔ انھوں نے امریکا اور برطانیہ کی حکومت کو نہ صرف اس تخیل سے آگاہ کیا بلکہ اس مقصد کے لئے انکی ہمدردی بھی حاصل کی۔ برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالفور کے مشہور "اعلان" (۱۹۱۷ء) میں امریکا کے یہودیوں کو بڑا دخل تھا جس اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ "فلسطین کو یہودیوں کا آزاد قومی وطن بنایا جائے گا"

یہودی مردوں کی تحریکوں نے عورتوں کو بھی متاثر کیا ۱۹۲۲ء میں یہودی عورتیں بھی میدان عمل میں آگئیں اور صیہونی عورتوں کی تنظیم "حداسہ" بنی جس نے عورتوں میں تعلیم اور قومی کاموں میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لینے کا جذبہ پیدا کردیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۹۰ء کے بعد یہودیوں کی غیر معمولی ذہنی بیداری کا عہد ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک بہت ساری تنظیمیں اور انجمنیں بنیں۔ متعدد تحریکیں چلائی گئیں لیکن ان انجمنوں اور تحریکوں کے افراد ذہنی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے کبھی نہیں الجھے۔ ہر انجمن اپنا کام کرتی رہی اور دوسری انجمن کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع بھی دیتی رہی۔ جس کے نتیجے میں آج بھی پرانی اور نئی تمام انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں تصادم نہیں ہمدردی اور مفاہمت کا جذبہ ہے مختلف طرح کی ان تنظیموں کے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ قومی حیثیت سے بلندی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب یہ انجمنیں اور تنظیمیں اپنے اپنے دائرۂ کار میں سرگرم عمل رہیں۔

یہودیوں نے محسوس کیا کہ جب تک امریکی عوام کی ہمدردی حاصل نہ کیجائے اور امریکا کی حکومت پر گہرا اثر نہیں ہو صرف دولت کے ذریعے عالمی سطح پر یہودیوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے انھوں نے پروپیگنڈے کے ذرائع پر قابو پانا شروع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں بڑے پیمانے پر "یہود خبر رساں ایجنسی" بنائی پھر نہایت تیزی اور بڑی چابکدستی کے ساتھ صحافت پر چھانے لگے۔ ریڈیو اسٹیشن قائم کئے معیاری اخبارات نکالے اور اہم اخبارات کو خرید لیا۔ امریکا سے آج کل جتنے بھی اخبارات نکلتے ہیں وہ یا تو یہودیوں



کی ملکیت ہیں یا ان کی پالیسی پر یہود اثر انداز ہیں جس کی بڑی وجہ یہودی فرموں کے اشتہارات ہیں۔ اخبارات کی اصل آمدنی اشتہارات سے ہوا کرتی ہے۔ کسی بھی اخبار کا اشتہار کے بغیر چلنا مشکل ہے۔ تجارت پر قابض ہونے کی وجہ سے عام طور پر اشتہارات یہود کے قبضے میں ہیں۔ اگر کوئی اخبار یہودیوں کے مفاد کے خلاف کچھ لکھنے کی ہمت کرتا ہے تو یہودی فرمیں اشتہار دینا بند کردیتی ہیں۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات پروپیگنڈہ کے ان اہم ذرائع یہود کے قبضے سے بیک وقت انھیں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بڑی آسانی سے اپنی بات پوری دنیا میں پھیلا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ذریعے امریکا کی سیاست پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ امریکا کا کوئی بھی ذمے دار اپنی بات عوام تک پہونچانے کے لئے ان ذرائع کا ہی سہارا لیتا ہے خصوصاً الیکشن کے موقعے پر انکی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے امریکا کا ہر ذمے دار اپنی ضرورت کے تحت یہود سے معاملہ کرنے پر مجبور سا ہے اور تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ ہر نمائندے کو اپنے حق میں جھکانے کی قوت رکھتے ہیں۔

نصف صدی سے زیادہ کی جدوجہد کے نتیجے میں امریکا کے یہود کے پاس دولت، پروپیگنڈے کی صلاحیت اور مختلف طرح کی سیاسی ثقافتی انجمنیں اور علم وسائنس کی قوت ایسا ہتھیار ہے جس کی وجہ سے وہ امریکی سیاست پر گہرا اثر رکھتے ہیں اور امریکا کے راستے سے دنیا بھر کے ممالک کی پالیسی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور ساری دنیا کے یہودیوں کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔

امریکا میں بسنے والے یہود تعداد کے اعتبار سے نہایت کمزور اقلیت ہونے کے باوجود اکثریت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں۔



چاندی کا تخت

واجدہ تبسم

"لکھو بیٹی۔"

"پتہ نہیں ان بوڑھی آنکھوں کو کب تیرا سہرا اور چاند ایسی دلہن دیکھنا نصیب ہو.... یہاں تو ہر دن موت سے قریب تر ہو رہی ہوں۔ تو ایک بار چند روز کے لئے ہی سہی آجا......"

اماں بولتی رہیں ـــــ ان کے گلے میں رہ رہ کر پھندے سے پڑتے رہے۔ آنسو پی پی کر، بہا بہا کر جب وہ خط مکمل کروا چکیں تو آس بھرے لہجے میں بولیں۔

"بیٹی اس کا جواب کب تک آجائیگا۔ ؟"

"جواب ـــــ؟" میں نے حلق میں پھڑپھڑاتے دل کو بڑی مشکل سے قابو میں کر کے کہا ـــ "یہی کوئی بارہ پندرہ دن میں اماں ـــــ"

"اماں ـــــ" میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ "یہ سلا کھیل اب مجھ سے نہیں کھیلا جاتا ـــــ تم جو ہر پندرہ دن کو ایک خط پاتی ہو وہ میری طرف سے ہوتا ہے اور جو جواب تم لکھواتی ہو وہ تمہارے بیٹے تک نہیں پہنچ سکتا ـــــ کیونکہ اماں آج تک مرنے والوں تک کوئی ہرکارہ ایسا پیدا نہیں ہوا جو خط پہنچا سکے۔ میرا صبر مت آزما اماں ـــــ تمہارا بیٹا، تمہارا شہزادہ وہ تمہاری زندگی کا اکلوتا اور آخری سہارا جنگ میں کام آچکا ہے۔ اسے خط لکھواتی رہو گی۔ اس کی دلہن کے لئے جوڑے سی سی کر رکھتی رہو گی لیکن وہ اس جگہ جا چکا ہے اماں جہاں تمہارے آنسو اور آہیں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔

لیکن ـــــ لیکن میں نے اماں کے کمزور ناتواں اور دکھوں سے بوجھل جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اپنے پہلو میں لوٹتے دل کو مسوس کر پھر سے ذرا بشاشت سے کہا۔

"اماں خطوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ تم اتنی بے کل کیوں ہو جاتی ہو۔ اس کا دنیا میں سوائے تمہارے کوئی ہے ؟ پھر وہ تمہیں یاد نہ کرے گا تو اور کیسے کریگا۔؟"

"ارے نہیں بیٹیا ـــ" وہ جھلائے ہوئے مگر پیار سے لبریز لہجے میں بولیں ـــــ "ان آجکل کے چھوکروں کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ چار یار دوستوں میں مل بیٹھے اور یہ بھی بھول گئے کہ کوئی ماں بھی ہے....؟"

"ارے نہیں اماں تم غلط سوچتی ہو۔ یوسف ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ"

اب بیٹا تو اسکی طرف سے نہیں بولے گی تو کون بولے گا۔ ویسے تو ہمیشہ اس سے خود جھگڑتی رہی لیکن جہاں میں نے کچھ کہا مجھے ادبدا کر اس پہ پیار آیا ـــــ ہاں بیٹیا یہ بھی یاد سے لکھ دینا کہ منہ دکھائی میں تو اپنی دلہن کو انگوٹھی پنہائے گا یا کلائی پر گھڑی باندھے گا ؟ مجھے تو ایک ایک چیز جوڑنی ہی ہے ـــــ وقت پر ایک دم سے سوجھا بھی نہیں ـــــ یاد سے پوچھ لینا بیٹی....

"ہاں اماں ـــــ" میں نے سر جھکا لیا ـــــ اور کچھ کہنا ہے ـــــ؟"

نا بیٹیا ـــ اب کیا لکھنا ہے؟ اور جو پوچھے تو اتنا لکھوانا ہے کہ آسمان جتنا جتنا کاغذ بھی کافی نہ ہو۔ یہ ماں کا دل ہے نا بیٹیا ـــــ اس کے پیار اور ممتا کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔"

میں اٹھنے لگی تو اچانک انہیں جیسے پھر کچھ یاد آگیا ـــــ "بیٹیا یہ بھی پوچھ لینا کہ آج کل تو نیا زمانہ ہے۔ نئے نئے فیشن نکلے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو سہاگ کا سرخ جوڑا پڑھتا تھا۔ اب تو گلابی، نارنجی اور سفید تک چڑھنے لگے ہیں۔ اپنی پسند کا رنگ بتلادے"

وہ ان دیکھی دلہن ـــــ وہ پھولوں بھری سہاگن جو وقت سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔ اماں اسے کون سا رنگ سجے گا ـــــ؟ نہ دولہا ہے نہ دلہن ـــ اماں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے۔ اس راز کو پالتے پالتے مجھے تو ہو جائیگی........ مگر میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"اطمینان رکھو اماں۔ میں سب لکھ دوں گی"

اور اپنے کمرے میں آکر میں سسک پڑی ـــــ

اماں بے چاری کے نصیب بھی کیا نصیب تھے ؟ بچپن سے غریبی میں گزر بسر ہوئی ـــــ جوانی آنے پر ماں باپ نے اپنی ہی حیثیت دیکھ کر شادی کر دی۔ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک معمولی سی بیماری میں میاں اللہ کو پیارے ہو گئے ـــــ یوسف باپ کی موت کے دو ماہ بعد دنیا میں آیا ـــــ جوان بیوہ کا اکلوتا سہارا ـــــ غریبی کے ہاتھوں نوکری ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب وہ ہمارے در پر پہنچی ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ کئی ننھی ننھی جانوں کو چھوڑ کر میری امی موت کو اپنا چکی تھیں ـــــ بڑے بچے تو کیسے بھی پل ہی جاتے ہیں۔ ایسا بچہ جس نے ماں کے سینے کے گرم اور نرم زندگی بخش لمس کو محسوس تک نہ کیا ہو جس نے ابھی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہ ہو۔ اک دم بھری پری دنیا میں تنہا رہ جائے تو ـــــ یکا یک اس ملک خدا کے ساتھ ساتھ ہم سب بچوں کی ذمہ داری آپڑی جو ـــــ زینت بی بی کو اماں کی طرح بھی اپنا لیا.....

کی پناہوں میں اور ایک دودھ پیتا چھوٹا سا بچہ تھا ـــــ چھوٹے بچے بھلے سے دوسروں کے ہوں ان کو ایک ایسی عورت ہی بہت سے پال سکتی ہے جس کے اپنے دل کو ممتا کی کلپ لگی ہوئی ہو۔ مگر زینت بی نے تو کچھ زیادہ ہی کر دکھایا۔ اپنے نسبتاً بڑے بیٹے کو انھوں نے اوپر کے دودھ سے لگا دیا اور اپنے نئے مالکوں کی بچی کو اپنے سینے سے لگا لیا ـــــ راتوں کی نیندیں، دن کا چین حرام کر کے اپنے جسم کا خون پلا پلا کر انھوں نے گھر والوں سے صرف ایک ہی التجا کی ـــــ

"غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں ـــــ میں بھی انسان ہوں خطاؤں کی پوٹ ـــــ لیکن میرے کسی قصور پر مجھے اس گھر سے نہ نکالا جائے۔ اس بچی سے جدا نہ کیا جائے۔ اس کے بغیر جی نہ سکوں گی ـــــ

میں نے اس کے لئے نو مہینے کا وہ کرب نہیں جھیلا جسے جیت کر ایک ماں جنت کی خالق بنتی ہے، لیکن میں نے اسے جوانی نذر کی ہے جو ایک عورت کا سب سے خوبصورت سرمایہ ہوتی ہے ـــــ"

اور یہ حقیقت تھی کہ میری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر، وقت بے وقت کی روں روں، ٹل ٹل پر اپنا چین لٹا کر، انہوں نے اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کو غمناک اُجالے عطا کئے تھے ـــــ اور وہ جو سارے گھر کی محض "زینت بی" تھی ـــــ ان دو ننھے منے ہونٹوں کی جنہوں نے پہلی بار بولنا سیکھا تو "اماں" ہی سیکھا ـــــ شروع سے آخیر تک صرف اماں ہی اماں تھی ـــــ اور وہی ایک ہستی اماں جیسے خوبصورت خطاب کی مستحق ہو سکتی ہے جو کسی معصوم کی تکلیف پر اپنی آنکھیں نم کرے ـــــ اور یہاں تو اماں نے جیسے ساری زندگی بھر کے لئے میری خاطر آنسوؤں کا ٹھیکہ لے لیا تھا ـــــ

میں جب شعور کی ہوئی اور ایسی چاہنے والی ماں کا اصل روپ دیکھا اور جانا تو میرا دل درد و کرب سے بھر سا گیا۔ ان کی وہ چھوٹی سی اندھیاری کوٹھری ـــ جھلنگی چارپائی جس لائٹ سامان سے دھلی چادر بچھا صاف ستھرا بستر ـــ میں نے پہلی بار جب عزیز بی کا میز کھٹکھٹا کر دیکھا تھا تب پہلی بار اپنے ماں باپ ماں سے جدا [illegible]

بھاری وعدہ کیا تھا۔

اماں جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو تمھیں چاندی کے تخت پر بٹھاؤں گی ـــــ خوب نرم نرم ریشمی روئی بھرا گدا ـــــ اس پر ریشمی چادر ـــــ ساری دنیا آنکھیں گی تو دیکھے گی اور حیرت سے پوچھے گی بھئی یہ چاندی کے اس شاندار تخت پر کون بیٹھا ہے ـــــ اور میں سب کو فخر سے بتاؤں گی ـــــ یہ میری اماں ہے"

اماں بڑے پیار سے ہنس پڑی تھیں۔ مسکرا کر بولی تھیں۔

"اور میرا یوسف میرے لئے کچھ نہیں کرے گا ـــــ ؟"

"کرے گا کیسے نہیں ـــــ وہ بڑا ہو کر تمہارے لئے گھر میں ایک چاند جیسی بہو لائے گا ـــــ پھر اپنے گھر میں خوب سارے ننھے ننھے بچے ہوں گے اور مارے شور کے تم بوکھلا بوکھلا کر ان کے پیچھے بھاگو گی ......

یہ خواب ایک ساتھ اماں نے اور میں نے دیکھا تھا ـــــ لیکن خواب کی تعبیر یہ تھی کہ اماں کا جوان بیٹا جنگ میں مارا جا چکا تھا اور وہ آس بھری نامراد ماں ہر پندرہ دن میں اپنے جگر گوشے کو ایک خط لکھواتی تھی کہ میرے اعضا جھک گئے ہیں ـــــ سر پر سورج سا یہ فگن ہے ـــــ دکھوں اور غموں نے وقت سے پہلے ہی جوانی کو الوداع کہہ دی ہے ایسے میں آنکھوں کی ایک ہی تمنا ہے کہ تجھے دولہا بنا دیکھیں ـــــ"

اماں مجھے یوسف سے کسی بھی طرح کم نہ چاہتیں ورنہ یوسف کی جدائی شاید انھیں مار ہی ڈالتی ـــــ انھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتی ہیں۔ اور میں تو خیر خدا کے بعد انہی کے سہارے زندہ رہی تھی۔ ایسے میں میرے لئے یہ کیسے کرب کی بات تھی کہ پچھلے کئی سال سے اس راز کو پالے جا رہی تھی ـــــ لگتا تھا دل میں پھوڑا ہو جائیگا اور یہ بوجھ کسی دن یوں بڑھے گا کہ میرا دل پھٹ جائیگا ـــــ میں اس دن کے بارے میں سوچتی جب ایک المناک سے دن، ایک خط آیا تھا ـــــ جس نے کسی یہ اطلاع دی تھی کہ یوسف میدان جنگ میں کام آ گیا ـــــ مگر میں ضبط اور حوصلے سے کام لے کر کبھی دل اماں کو بتا دیتی کہ اماں تم نے جو ایک پودا لگایا تھا وہ بھری جوانی کی بھری بہار میں منہ موڑ گیا ہے اور اب زندگی بھر کے لئے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں، تو شاید

وہ وجود کو سہتے سہتے پتھر بن چکی تھیں یہ وار بھی سہہ ہی جاتیں ـــــ لیکن میں خود ہی یہ قدم نہ اٹھا سکی ـــــ اور میں نے ایک بڑے جرم کا فیصلہ کر لیا ـــــ

"میں زندگی بھر ـــــ اماں کی زندگی بھر اس راز کو پالوں گی کہ یوسف مر چکا ہے"

یوسف اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ اماں کو کچھ روپے بھی بھجواتا تھا ـــــ یہ مرحلہ میرے لئے سب سے کٹھن تھا ـــــ میں پچیس روپے ماہانہ آخر کہاں سے لاؤں گی ـــــ ؟ بہرحال یہ منزل طے کرنی تھی۔ میں اماں کی طرف سے خط لکھتی ـــــ ان بے چاری کو تو لکھنا پڑھنا آتا ہی نہ تھا ـــــ وہ جو کہتیں، میں لکھتی جاتی۔ پھر یوسف کی طرف سے بھی میں خود ہی جواب لکھ کر پوسٹ کر دیتی ـــــ یوسف کی زندگی میں مخصوص فوجی نمبر والے خط آتے تھے، ممکن ہے اماں تاڑ جائیں کہ اب خط ویسے نہیں ہوتے تو اب میں خط کاپی میں رکھ کر انھیں سنایا کرتی ـــــ

ہر مہینے بڑے جتن سے منی آرڈر کرتی اور اماں انگوٹھا لگا کر وہ روپے وصول کرتیں اور خوش ہو ہو کر خرچ کرتیں ـــــ

"اے بیٹی ـــــ اب کی بار چاندی کی پازیب خرید لیں گے ـــــ دلہن سارے میں چھم چھم کرتی گھومے گی تو گھر میں بڑی رونق لگے گی"

"بیٹا اب کے سے ناک کی نتھ بنوا لیں گے۔ نتھ نہ ہو تو دلہن کے نور نہیں کھلتا ـــ روپ ـــ نہیں اترتا"

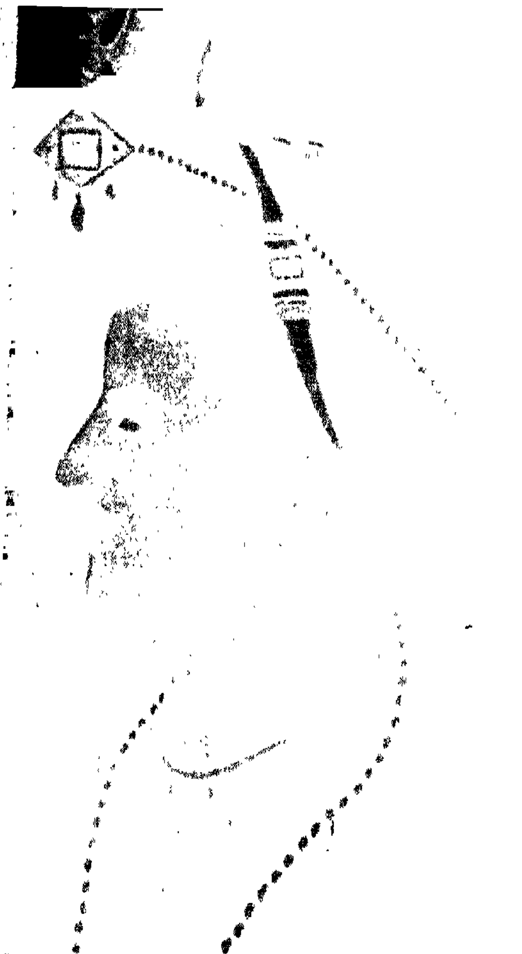
"بیٹی اب کے کنگن ... کنگن نہیں تو ..."

میں سوچتی میری شادی ہو جائے گی تو کون اس راز کو پالے گا ـــــ ؟ پھر سوچتی اماں کو اپنے ساتھ ہی اپنی سسرال لے کر کیوں نہ چلی جاؤں ـــــ ؟ لیکن ہم کیا سوچتے ہیں۔ وقت کچھ اور کرتا ہے ـــــ میری شادی کی بات ابھی پکی ہوئی بھی نہ تھی کہ اماں کو نمونیہ ہو گیا اور آخری بلاوا آ گیا ـــــ

شاید مرنے والوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ہماری آخری گھڑی ہے ـــــ اس دن جب اماں کی اکھڑی اکھڑی سانسیں چل رہی تھیں تو انہوں نے مجھ سے

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

جب سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد سرنگاپٹم لوٹا گیا



عدیل عباسی
چڑیاکوٹ

حضرت میوستان شاہ کی دعاؤں کی برکت سے حیدر علی کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والا فرزند مادرِ وطن کا جیالا سپوت 'شمعِ آزادی کا پروانہ' ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ' انسانیت خلوص اور خوش اخلاقی کا نمونہ' اعلیٰ سیاست داں' بیمثال دلیر بہادر اور شجاع شیرِ میسور ابوالفتح علی سلطان ٹیپو نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم میں انگریزی افواج سے دست بدست جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور بھارت کی دھرتی کو اپنے خون سے سرخرو کر دیا۔

ٹیپو سلطان جیسی عظیم ہستیاں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ قابلِ احترام ہے وہ سرزمین جہاں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔

سرنگاپٹم کے آخری محاصرے سے پہلے تین لڑائیوں میں انگریزوں کو ہر محاذ پر سلطان کے مقابلے میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ شرمناک پسپائی نصیب ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ٹیپو سلطان کو سامراجیوں کی فوجیں کبھی نہیں ہرا سکیں۔ بلکہ نظام مرہٹوں اور خود اُس کے غدار امرا اور وزرا نے اُسے شکست دی۔ ان غداروں میں میر صادق پورنیا' میر قاسم علی اور میر عالم کے نام سرِفہرست ہیں۔ انہیں غداروں کی بدولت جس لڑائی کو اُس نے میدانِ جنگ میں جیت لیا قلعہ کی چہار دیواری کے اندر ہار گیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد تہذیب اور شائستگی کے جھوٹے نام نہاد علمبردار انگریزوں نے جس طرح لوٹ اور غارتگری کا بازار گرم کیا اُسے سن کر دل لرز جاتا ہے۔ سرنگاپٹم کے زوال کے بعد وہاں کی معصوم اور بے گناہ رعایا پر اس قدر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے کہ اس کے آگے ہلاکو کے جور و تشدد بھی ماند پڑ گئے۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کی شب میں سرنگاپٹم پر جو مصیبت آئی اُس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ شہر میں مشکل سے کوئی مکان بچا ہو جو لُوٹا نہ گیا ہو۔

قلعہ کی تسخیر کے بعد جو مالِ غنیمت انگریزوں کے ہاتھ لگا اس کی تفصیل "ماڈرن میسور" کے مصنف نے یوں بیان کی ہے۔

"مالِ غنیمت کے تقسیم کرنے پر جو جماعت مامور تھی وہ محل کی دولت دیکھ کر حیران و ششدر ہو گئی۔ آنکھیں تعجب سے چُندھیا گئیں۔ لاکھوں جواہرات کے علاوہ سونے اور چاندی کی سلاخیں زیورات اور نہایت قیمتی اور نایاب چیزیں محل کے اندر رکھی ہوئی تھیں۔ زنانہ حصہ کے سوا محل کی تمام عمارت اور دربار کا کمرہ ان چیزوں کے لئے استعمال میں لایا گیا تھا۔

جواہرات مقفل صندوقوں میں تھے جو محل کے اندر تاریک کمروں میں رکھے ہوئے پائے گئے۔ یہ جواہرات جن صندوقوں میں تھے اُن پر حیدر علی اور سلطان کی مہریں ثبت تھیں اسی طرح سونے کی سلاخیں اور زیورات جن کی خوبصورتی بیان میں نہیں آ سکتی ایک دوسری جگہ سربمہر صندوقوں میں رکھے ہوئے ملے۔ زیورات میں بازو بند انگوٹھیاں گلوبند اور سری آرائش کی بے شمار چیزیں تھیں۔ اوپر کے کمرے میں چاندی کی سلاخیں اور اُس سے بنی ہوئی چیزوں کے ذخیرے تھے۔ ایک جگہ دو ہودے تھے جو پورے پورے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ بہت سے چاندی کے بڑے بڑے طبق تھے جن میں ہیرے اور دوسرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ہتھیار ایک کمرے میں تھے۔ ان میں کئی بندوقیں اور تلواریں تھیں جن میں سونا اور جواہرات لگے تھے ہاتھی دانت کے دروازے اور دوسری کئی قیمتی بڑی بڑی اشیا بھی محل کے اندر پائی گئیں۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ نہایت قیمتی نجم

باقی صفحہ پر

اور بے شمار بیش قیمت قالین بھی تھے۔

نہایت عمدہ ململ، ساٹن، ریشم، شال اور دوسرے قیمتی کپڑوں کے گٹھڑ بندھے ہوئے رکھے تھے۔ جن کا اندازہ کیا گیا کہ پانچ سو اونٹ ان کے اٹھانے کے واسطے درکار ہوں گے۔

مالِ غنیمت میں رو پہلی اور دوسرے شیشے ہر آنکھ کیلئے موزوں اور مختلف قد و قامت کے آئینے اور لاتعداد تصاویر تھیں اور اس قدر کانچ اور چینی کے ظروف تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑی دوکان ہے۔

ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں نہایت قرینے سے کتابیں رکھی گئی تھیں۔ بعض کتابوں کی جلدیں ہیرے اور جواہرات سے مرصع تھیں۔ ایک اور کمرے میں نہایت ہی قیمتی ہودہ اور تخت رکھا ہوا تھا۔

محل سے ملحق بیس اناج کے ذخیرے اور سات گودام تھے ان میں چاول اور گرم مسالا بھرا ہوا تھا۔ ایک گودام میں گیارہ سال پرانے چاول رکھے ہوئے تھے جو نہایت عمدہ حالت میں محفوظ تھے۔ قلعہ میں ایک ہزار توپ، پانچ لاکھ گولیاں، بارہ ہزار گولے اور ساٹھ ہزار بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان توپوں میں ۵۱ توپیں انگریزی ساخت کی تھیں۔ باقی سلطانی کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں ان کے متعلق جب تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ساخت کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

اس مالِ غنیمت میں سے ٹیپو سلطان کی ایک تلوار جنرل ہیرس کو بطورِ انعام دی گئی اور دوسری لارڈ ولزلی کو۔۔

اس کے علاوہ لارڈ ولزلی کو ایک ہیروں کا جھومر اور تھوڑے سے زیورات تحفۃً بھیجے گئے۔ سلطان کی پگڑی اور ایک تلوار لارڈ کارنوالس کو بطور تحفہ بھیجی گئی۔ مالِ غنیمت میں جنرل ہیرس کے حصہ میں ایک لاکھ بیالیس ہزار نو سو دو اشرفیاں آئیں جن کی قیمت موجودہ شرحِ تبادلہ سے پندرہ لاکھ روپے ہوتی ہے۔

قلعہ کی بے پناہ دولت اور مال و زر کے بارے میں ناظرین نے ایک تاریخی بیان ملاحظہ کیا۔ اس لوٹ کھسوٹ اور بربریت میں شامل میجر پرائس کی زبانی بھی کچھ حالات سنئے۔ میجر نے چشم دید واقعات قلمبند کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"سرنگا پٹم کے مشہور قلعہ کو فتح کرنے کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا کہ جواہرات، روپیہ اور سامان کو (جس کی مجموعی قیمت ۲۵ لاکھ پونڈ تھی) موقع پر ہی تقسیم کر لیا جائے۔ جس افسر نے جس قدر خدمت کی ہے اس کا لحاظ اور اندازہ لگا کر اُسے مالِ غنیمت میں حصہ دے دیا جائے۔ اس تقسیم کے لئے ایجنٹ مقرر کئے گئے۔ میں بھی ان میں تھا۔ قلعہ کی دولت دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں یکھا نہیں جاتا تھا کہ اتنی ناقابلِ یقین دولت اور لاتعداد زر و جواہر قلعہ میں کہاں سے آ گئے۔ مختلف قسم کے پارچہ جات اور طرح طرح کی قیمتی اور نادر اشیا، سونے چاندی کے ظروف، جواہرات اور موتیوں کے بے مثل و لاجواب ذخیرے سامنے کھلے پڑے تھے۔ ہماری عقل حیران تھی۔ فردِ حساب بھی تیار نہ کر سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیرونی دروازوں سے ہمارے سپاہی اور توپ خانوں کے لوگ گھس آئے تھے اور کافی مال لے کر فرار ہو گئے۔

شہر میں بھی ہمارے افسروں نے خوب لوٹ مار کی بیسوں گھروں میں جا کر روپیہ پیسہ چھین لیا۔ ڈاکٹر ملٹن کے ہاتھ ۷۴ نمبر کی رجمنٹ کے ایک سپاہی نے نہایت معمولی رقم میں پرانے اور کپڑے فروخت کئے جن میں اس قدر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ اُن کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک ہندوستانی جوہری نے چالیس ہزار پونڈ لگایا تھا اور بعض زیوروں کی قیمت کا اندازہ لگانے سے جوہری بھی قاصر تھے۔ اس سپاہی نے یہ کپڑے ایک گھر سے چرائے تھے۔ پھر اپنی رجمنٹ کے ایک ڈاکٹر کے ہاتھ نہایت معمولی رقم کے عوض بیچ دیئے۔

لارڈ ہیرس کے ڈھیر میں ایک وہ ہار بھی تھا جس کی قیمت (۱۳۵۰۰) تیرہ ہزار پانچ سو پونڈ بتلائی جاتی ہے۔

سر زیرڈ کو اس کے حصہ میں ایک انگشتری ملی جس کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی مگر اس نے اس وقت غصہ میں آ کر اُسے پھینک دیا کہ یہ تو رنگا ہوا شیشہ ہے۔ ایک سپاہی نے اٹھا کر پانچ ہزار روپے میں فروخت کیا۔

ٹیپو سلطان نے ایک تخت بے مثل ساخت کا بنوایا تھا جو خالص سونے کی چادروں کا تھا۔ اُس کے پشتہ پر ایک ہما کی تصویر بنی ہوئی تھی جو سونے اور جواہرات کی تھی۔ تخت چار سونے کے شیروں کی پشت پر قائم تھا۔ اس تخت کے ٹکڑے کر کے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے اٹھارہ سو پونڈ ہر شخص کے حصہ میں آئے۔ تخت کی چھت جنرل گانٹ کے ہاتھ ۲۵۰۰ پونڈ میں فروخت کر دی گئی جو اس کے بعد مِن گنی قیمت پر علیحدہ ٹکڑوں کی صورت میں بیچی گئی۔

اس تخت کے سامنے کے دو شیر جو ٹھوس اور خالص سونے کے تھے بادشاہ کو ولایت بھیج دیئے گئے اس کے ساتھ کچھ ہیرے جواہرات اور قیمتی ہتھیار بھی روانہ کئے گئے۔

یہ تو افسروں اور حاکموں کو ملا۔ ہر سپاہی کو جنہیں پرائیوٹ کہا جاتا ہے تقریباً چھ چھ پونڈ تو ضرور مل گئے لیکن انہوں نے ذاتی طور پر کافی روپیہ لوٹا۔ بہت سے یورپین سپاہیوں نے کئی کئی ہزار کے جواہرات بیچے اور پھر اپنی نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ بعض سپاہیوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک شراب کی بوتل کی خاطر کئی کئی سو روپے کی مالیت کے جواہرات کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے۔

سپاہیوں کو بطورِ انعام تمغے بھی دیئے گئے تھے۔ خاص بات جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ان تمغوں کے ایک طرف تو سرنگا پٹم کے فتح ہونے کی تاریخ درج تھی اور دوسری طرف دریائے کاویری میں ایک کھاتے ہوئے شیر کی تصویر تھی جس کو ایک جارج ایک گھوڑے پر بیٹھا ہوا نیزہ سے مار رہا تھا۔"

اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ ہمارے ہیرو شہید سلطان ٹیپو کو انگریز بھی شیرِ میسور ہی نہیں بلکہ شیرِ ہندوستان تسلیم کرتے تھے

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بیان کر کے میں اس لرزہ خیز داستان کو ختم کر دینا چاہتا ہوں جو یقیناً ناظرین کے لئے تعجب خیز ہوگا اگرچہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

سلطانی محل کے ایک وسیع کمرے میں ایک خوشنما قالین پڑا ہوا تھا۔ قالین پر ایک خوبصورت اور دلفریب جھاڑی بنی ہوئی تھی جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک نہایت تندرست اور خونخوار شیر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے پتوں کی آڑ میں ایک شکاری ہاتھ میں بندوق لئے شیر پر نشانہ لگا رہا تھا۔ شکاری کے سر پر ایک فلیٹ ہیٹ تھی شیر اس شکاری کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔

ایک صاحبِ حال بزرگ فقیرانہ لباس میں سلطان کی طلب پر اسی کمرے میں داخل ہوئے۔ بزرگ بہت انہماک سے دیر تک قالین کو دیکھتے رہے۔ پھر سلطان اور بزرگ کے درمیان کچھ دیر تک گفتگو ہوئی۔ سلطان بزرگ سے بے حد متاثر ہوا۔ جب بزرگ رخصت ہو کر جانے لگے تو ٹیپو سلطان نے اُن سے نہایت عاجزی اور انکساری سے ایک سوال پوچھا۔

"حضرت! کچھ میری قسمت کے بارے میں بتاتے جائیے"

"تمہاری قسمت؟ اس قالین پر نقش ہے"۔ بزرگ نے نرم لہجے میں جواب دیا اور چلے گئے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس قالین پر جو نقش تھا وہ صرف ٹیپو سلطان کی قسمت کا نقش نہیں تھا بلکہ وہ سارے بھارت کے مقدر کا نقش ثابت ہوا۔

واقعات فتح دہلی

کوشش اور جدوجہد کامیابی کی کنجی ہے

محمد سلیمان صابر

علامہ اقبال نے کہا تھا۔ ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

لیکن اگر کوئی طبقہ خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہے اور اپنی خوبیوں کو اجاگر نہ کرسکے تو کیا وہ اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے۔؟ جمہوریت کے اس دور میں اگر کوئی جماعت یا طبقہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کی بڑی حد تک ذمے داری خود اسی جماعت یا طبقے پر عائد ہوتی ہے۔

کوشش اور جدوجہد ہماری کامیابی کی کنجی ہے۔ خدا اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے۔ جو لوگ کوشش کرتے ہیں اور اپنی مدد آپ کرتے ہیں خدا بھی انکی مدد کرتا ہے۔

ہندوستان کی جمہوریت میں اقلیتوں اور خاص کر مسلم اقلیت کو بہت سی شکایات ہیں۔ ان میں کچھ صحیح بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر شکایت کرنے والوں نے خود اپنی خامیوں کا جائزہ نہ لیا تو وہ اپنے ساتھ بڑی زیادتی کریں گے۔

جمہوریت میں سب کو یکساں حقوق دیئے گئے ہیں اور ملک کے عوام نے حالیہ انتخاب میں ثابت کر دیا ہے کہ وہ مذہبی شدت پسندی کے خلاف، اور ایسی سیکولر جمہوریت کے حامی ہیں جن میں سب طبقوں اور فرقوں کی یکساں حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہو۔ اب ان بہت سے طبقوں اور فرقوں میں جو بھی کوشش اور جدوجہد کرے گا اس کا پھل پائے گا۔ جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے گا پیچھے رہ جائے گا اور اپنا کوئی مقام پیدا نہ کرسکے گا۔ بے شک مقابلہ سخت ہے لیکن باصلاحیت اور باہمت لوگ کبھی اپنی ہار نہیں مانتے بلکہ مقابلے میں انھیں مزہ آتا ہے۔ ہم نے کسی ایسے شخص کو اپنے حق سے محروم نہیں دیکھا جو صاحبِ صلاحیت اور پرخلوص ہو اور جو مسلسل جدوجہد کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتا ہو۔

ایسی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت لوگ سامنے آئے اور انہوں نے پوری قوم کی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تاریخ کے اس دور کو چھوڑ دیجئے جب مسلمان اس ملک میں حکمراں تھے انگریزی حکومت اور آزادی کے ۴۳ سالہ دور میں بھی ایسی مسلم شخصیتیں ابھریں جنہوں نے ملک کی قیادت میں نمایاں حصہ لیا۔ کیا ہندوستانی قوم ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسی شخصیتوں کو کبھی بھلا سکتی ہے۔

رفیع احمد قدوائی جنہیں بچھڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے احترام میں ہندوستانی آج بھی اپنی گردن جھکا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس جیسا ایڈمنسٹریٹر آج تک کوئی اور نہیں ہوا۔

یہ تو ہوئی بڑی اور ممتاز شخصیتوں کی بات ایک معمولی شخص بھی بشرطیکہ وہ باصلاحیت ہو اور اپنے اندر حقیقی جذبۂ خدمت رکھتا ہو، دوسروں میں ممتاز ہو سکتا اور انھیں اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں ناردرن ریلوے میں ملتا ہے۔ پورے ڈویژن میں مسلمان ملازموں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے (اور یہ افسوسناک بات ہے) لیکن اس کے باوجود ڈویژن میں کسی جگہ چلے جایئے کوئی ریلوے ملازم ایسا نہیں ملے گا جو آفتاب احمد صدیقی کے نام سے واقف اور ان کا گرویدہ نہ ہو۔

طویل القامت اور چھریرا بدن مسٹر صدیقی جنکی عمر تقریباً ۴۸ سال ہے دور سے جانے پہچانے جاسکتے ہیں۔ معمولی انکوائری کلرک ہیں (اب غالباً سپروائزری پر پروموشن ہو چکا ہے) لیکن انکا یہ معمولی عہدہ ریلوے ملازمین کی قیادت کرنے کی انکی اہلیت میں رکاوٹ نہیں بن سکا۔



ملازمین کے حقوق کے لئے لڑنے پر ڈھائی سال معطل رہنے کے بعد صدیقی صاحب بحال ہوئے تو ریلوے ملازمین نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔

آفتاب احمد
صدیقی



انھیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ معطلی اور تنزلی کا بھی شکار ہوئے لیکن کبھی مایوس و ہراساں نہ ہوئے اور نتیجے میں ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ انھوں نے بلاتخصیص مذہب و ملت اپنے محکمے کے تمام ملازمین کی پرخلوص خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا اور یہ اسی خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج اس ڈویژن کا ہر ملازم صدیقی پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ باصلاحیت لوگوں کی کسی بھی طبقے میں کمی نہیں ہے۔ ابھرتے نوجوان ہر جگہ نظر آئیں گے۔ اگر یہ نوجوان آگے آئیں اور خلوص و راستبازی کے ساتھ دوسروں کی خدمت کریں تو ہر شعبۂ زندگی میں وہ ایک قائدانہ رول ادا کر سکتے ہیں۔

کسی اقلیتی فرد کے ابھر کر سامنے آنے سے صرف ٹریڈ یونین ہی کو استحکام نہیں ملتا بلکہ قومی یکجہتی جیسے مقاصد کو بھی اس سے بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے اور عملی طور پر ان تنگ نظروں کو جواب ملتا ہے جو ملک کو ہندو مسلمانوں کے دو الگ الگ خانوں میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجھے مسٹر صدیقی کے ہمراہ مذکورہ ریلوے ڈویژن کے ایسے حصوں میں جانے کا موقع ملا ہے جہاں نہ صرف یہ کہ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والا کوئی ملازم نظر نہ آیا بلکہ اس علاقے کی آبادی میں بھی مسلم اقلیت ختم ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں نے صدیقی کو پھولوں سے لاد دیا اور ان کا عظیم الشان جلوس نکالا۔ سب لوگ قومی یکجہتی کے جذبے سے سرشار تھے۔

یہ لوگ ۴۷ء ۱۹ کے زمانے کو بھی یاد کرتے چلے گئے وہ روتے اور کہتے تھے کہ جو کچھ ہوا برا ہوا۔ ہم سب پر شیطان غالب آگیا تھا۔ آؤ اب اس شیطان کو بھگائیں اور پھر سے اپنی دنیا بسائیں ۔

عوام کا یہ احساس اس امر کا مظہر ہے کہ جذبات ہمیشہ برانگیختہ نہیں رہتے۔ شیوسینا۔ آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا جیسی فرقہ پرست جماعتیں کتنے عرصے سے جذبات کو بھڑکا رہی ہیں۔ کہیں کہیں وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں لیکن خوشی کی بات ہے کہ ان کا اثر محدود ہو رہا ہے۔ مہاراشٹر جیسے علاقے میں جہاں فرقہ پرستوں نے اودھم مچا رکھی تھی عوام نے ان کی جارحانہ فرقہ پرستی کی پالیسی کو مسترد کر دیا۔

مسٹر صدیقی جنکا اوپر ذکر آیا وہ جب اپنے ایک بھائی (پھوپھی زاد) کو جو ۴۷ء ۱۹ کے قتل عام سے بچ گیا تھا اور ایک عرصے سے گمنامی میں رہ کر کسی پسماندہ طبقے کے ایک گھر میں پل بڑھ رہا تھا لینے کے لئے بھٹنڈہ گئے تو وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے آنسوؤں کے ساتھ اس لڑکے کو ان کے حوالے کیا۔ "حوالگی" کے اس جلسے میں سب ہی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ۴۷ء ۱۹ کے ان واقعات پر بے حد پشیمان تھے جن میں صدیقی کے پھوپھا حافظ وہاج صاحب (اس وقت کے اسٹیشن ماسٹر بھٹنڈہ کے ہیڈ کلرک) کو اور انکے بارہ افراد خاندان کو شہید اور انکی پیاری بیٹی مسعودہ بیگم کو اغوا کیا گیا تھا۔ (مسعودہ بیگم کی ایک لمبی کہانی ہے جو چند سال قبل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ مسعودہ بیگم انتقال کر چکی ہے اور اس کا مزار صدیقی کے وطن مالوف نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہے) اس قسم کا رجحان طبع عمومی طور پر پیدا ہو رہا ہے۔ اسی دلی میں ایک فرقہ پرست لیڈر جسے "بھارتیانے" کا نعرہ لگانے پر پھولوں سے لاد دیا جاتا تھا پچھلے دنوں پولیس کی مدد سے اپنی جان بچا کر بھاگا، اس کی کار جلتے جلتے بچی۔

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والوں کے خلاف بڑھتے ہوئے اس جذبے سے اگر استفادہ کیا جائے اور اقلیتی افراد خواہ وہ کہیں ہوں آگے آکر قائدانہ رول ادا کریں تو وہ عملی طور پر قومی یکجہتی کے کام کو تقویت پہونچائیں گے۔

قومی یکجہتی کا مقصد ناراض ہو کر الگ ہونے یا ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد الگ بنانے سے حاصل نہیں ہوگا بلکہ باہم گھلنے ملنے اور ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے سے ہوگا۔

پچھلے چند برسوں میں کتنی ہی یکجہتی کانفرنسیں منعقد کی گئیں لیکن وہ سب بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ ان کے مقابلے میں اکیلے صدیقی نے اپنے ڈویژن کی پوری فضا کو بدل دیا۔ اسی

مسلمانوں اور دوسرے پس ماندہ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر تعلیمی، معاشی اور سیاسی میدان میں اپنی جگہ بنائیں حکومت یا کسی دوسرے کی مدد کا انتظار نہ کریں۔ اپنے اخلاق اور خلوص سے وہ سب کو اپنا گرویدہ بنا سکتے ہیں

طرح اگر دوسرے سرکاری ملازمین میں سے بھی اقلیتی افراد ابھریں اور اکثریت سے تعلق رکھنے والے ذمّے دار لوگوں کے ساتھ تعاون سے کام کریں تو ان تمام ملازمین کی اصلاح ہو سکتی ہے جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انکے ذہن صاف نہیں ہیں۔

قومی یکجہتی کا ابتدائی کام اسکولوں اور کالجوں سے ہی شروع کئے جانے کی ضرورت ہے جہاں اس بات کی نگرانی رکھی جائے کہ کوئی کلاس کسی طبقے کی نمائندگی سے محروم نہ ہو۔ ملے جلے طبقوں اور فرقوں کے نوجوان طلباء میں جو دوستی ہوگی وہ کبھی ٹوٹنے والی نہ ہوگی۔ کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں کسی دوسرے طبقے یا فرقے کے طلباء کی عدم نمائندگی حقیقت میں فرقہ وارانہ بداعتمادی کی فضا پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندو مسلم طلباء کی مشترکہ زندگی سے ان کے ایک دوسرے کے قریب آنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں ذکر آیا ہے کسی بھی فرقے کے افراد کو اس بات کا انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ کوئی دوسرا اسکی مدد کرے گا۔

جمہوریت کے اس دور میں ہر طبقے اور ہر فرقے کو اپنی جگہ خود بنانی ہے اور اسے یہ عزم کرنا ہے کہ کسی کا انتظار کئے بغیر وہ ہر بدمنظر نقش کہن کو مٹا دے گا۔ نوجوانوں کی دنیا اگر بیدار ہو جائے تو وہ ملک و قوم کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ نوجوانوں کا انداز فکر تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مُفت مشورے اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے ہو سکتی ہے۔

خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے

....کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خُوشی ہے کہ اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

پُر مسرّت دن



70/242

داقعات نئی دہلی

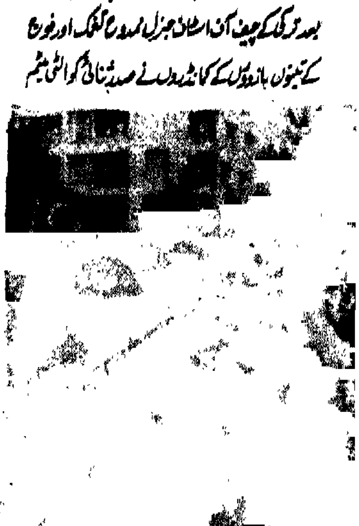
ترکی میں ایکبار پھر جمہوریت کا جنازہ نکل گیا

دنیا دوربین کی نظر میں

ترکی

ترکی کے صدر سعادت شنائی نے نہت ارم کو نئی حکومت بنانے کی ذمّے داری سونپی ہے۔ وہ ترکی کے نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں اور قانون کے سابق پروفیسر ہیں جسٹس پارٹی سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس سے مستعفی ہو گئے ہیں تاکہ ایک غیر جانبدار حکومت بنا سکیں۔

اس تبدیلی کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل امن و انتظام قائم رکھنے میں ناکام ہو گئے تھے پارلیمنٹ میں انکی اکثریت بہت کم ہو گئی تھی بعض اوقات صرف ایک کا فرق رہ جاتا تھا نتیجے میں ملک کے اندر تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوتا گیا اور جب پچھلے دنوں امریکی فضائیہ کے چار افسروں کا اغوا کر کے چار لاکھ ڈالر تاوان کا مطالبہ کیا گیا تو صورت حال اور بگڑ گئی۔ حکومت نے اغوا کرنے والوں سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برخلاف پولیس اور فوج نے راجد صافی کے کالج کیمپسوں کو چھان مارا۔ اغوار کرنے والے اتنے گھبرا گئے کہ انھوں نے چاروں امریکی افسروں کو چھوڑ دیا اگرچہ اس تلاش اور طلباء کے ساتھ تصادم میں تین جانیں گئیں۔ لیکن ان امریکی افسروں کی رہائی ڈیمرل کو نہ بچا سکی۔ چار ہی دن بعد ترکی کے چیف آف اسٹاف جنرل ممدوح گلک اور فوج کے تینوں بازوؤں کے کمانڈروں نے صدر شنائی کو الٹی میٹم



استنبول میں طالبعلموں اور فوج کے درمیان ایک جھڑپ



ترکی کے سابق وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل

دیا کہ "یا تو مضبوط و مستحکم حکومت بناؤ جو کمال آتاترک کے اصلاحی کام کو جاری رکھ سکے ورنہ فوج اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لے گی"۔

فوجی کمانڈروں کی طرف سے جو میمورنڈم صدر کو پیش کیا گیا اس میں الزام لگایا گیا کہ "پارلیمنٹ اور حکومت اقتصادی اور سماجی بے چینی کا باعث بنی ہے اور اس نے ملک کو انارکی کے دہانے پر پہونچا دیا ہے"۔ جس وقت ریڈیو سے یہ میمورنڈم براڈکاسٹ ہو رہا تھا اس وقت بھی انقرہ کے کلیدی مقامات پر فوج کھڑی ہوئی تھی اور پورے شہر کو اس نے گھیر رکھا تھا۔

۴۶ سالہ سلیمان ڈیمرل خاموشی کے ساتھ مستعفی ہو گئے انھیں پھر سے نئی حکومت بنانے کا موقع دیا گیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ نئی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں ۷۰ سالہ عصمت انونو کا بھی نام آیا وہ کمال آتاترک کے قریبی رفقاء میں سے ہیں لیکن بعض سیاستدانوں کا کہنا ہے کہ ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی اچھی باتیں کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ بالآخر نہت ارم کو نئی حکومت کی تشکیل کا کام سونپا گیا ہے۔ یقین ہے وہ نئی حکومت تشکیل کر سکیں گے۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ نئی حکومت کی پالیسی امریکا کے ساتھ دوستی کی رہے گی اور ناٹو کے مفادات کو بھی نقصان نہیں پہونچے گا۔ فوجی افسران بھی یہی چاہتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ملک میں روس نواز طاقتیں ابھریں۔ ان طاقتوں کو دبانے کے لئے وہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی حد تک جانے کو تیار ہیں۔

فوجیوں نے ۱۹۶۰ء میں بھی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا جب انھوں نے ڈیمرل کے پیش رو عدنان مینڈریس پر جبر و تشدد اور بدعنوانیوں کا الزام لگا کر انھیں عہدے سے ہی نہیں ہٹایا بلکہ ـــــ پھانسی کے تختے پر بھی لٹکا دیا تھا سلیمان ڈیمرل فوجیوں کی اس دھینگا مشتی کو دیکھ چکے تھے وہ مستعفی نہ ہوتے تو انکا بھی یہی حشر ہو سکتا تھا اور اس صورت میں ترکی کافی دنوں کے لئے جمہوریت سے محروم ہو جاتا۔ انھوں نے خاموشی سے استعفیٰ دیکر جمہوریت کو بچا لیا۔ ■

اسرائیل

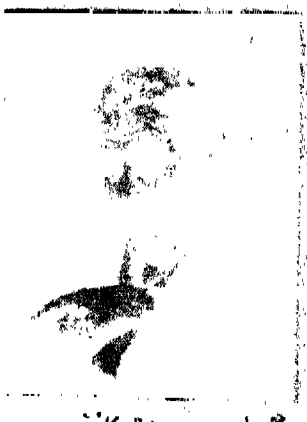
یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اسرائیل طاقت کے نشے میں چور ہے اور اب امریکا کی بات بھی سننے کو تیار نہیں جس نے اسے پال پوس کر موٹا کیا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر زعم ہے اور اسی لئے وہ کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ مسٹر راجرس (وزیر خارجہ امریکا) تک کی تجاویز اس نے مسترد کر دیں۔

اسرائیل سمجھتا ہے کہ میدان جنگ میں عرب اسے شکست نہیں دے سکتے۔ ۱۹۶۷ء کی چھ دن کی جنگ میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی اس نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے اسی لئے وہ علانیہ عالمی رائے عامہ کو ٹھکرا رہا ہے اور جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

لیکن دوسری طرف متحدہ عرب جمہوریہ کی بھی تیاریاں کچھ کم نہیں ہیں۔ چھ دن کی جنگ میں اسے جو زبردست نقصان پہنچا تھا روس نے اس کی تلافی کر دی ہے۔ سب سے زیادہ ہوائی جہازوں کا نقصان ہوا تھا لیکن اب روس کی مدد سے متحدہ عرب جمہوریہ کا فضائی بیڑہ ۴۵۰ جیٹ طیاروں پر مشتمل ہے۔ اس میں پچاس نئے مگ۔ ۲۱ قسم کے طیارے شامل ہیں۔ بحر روم کے کنارے سوویت روس نے راڈار نصب کیا ہے تاکہ اسرائیلی جنگی سرگرمیوں کا پتہ لگتا رہے۔ حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ نے اسرائیل کی جو آبدوزیں بحر روم میں ڈبوئی ہیں غالباً ان کا پتا لگانے میں بھی اسی راڈار سسٹم سے مدد ملی۔

علاوہ ازیں دفاعی نظام میزائیل اڈے قائم کر کے مضبوط بنایا گیا ہے۔ حال ہی میں ۲۰ نئے میزائیل اڈے قائم

اسرائیل طاقت کے نشہ میں چور ـ عرب ممالک تر نوالہ نہیں



گولڈا مائر ـــــ طاقت کا نشہ

کئے گئے ہیں جہاں اس وقت زمین سے ہوا میں مار کرنے والے سام ـ ۶ قسم کے ۱۸۰ روسی میزائیل نصب ہیں ۲۴۰ سام ۳ قسم کے میزائیل ہیں جو زیادہ ماڈرن اور زیادہ خطرناک ہیں۔

اس دفاعی نظام یا دوسرے الفاظ میں ہوائی چھتری کے نیچے ایک لاکھ مصری فوج نہر سوئز کے علاقے میں تعینات ہے جو جدید ترین اسلحے سے لیس ہے۔ ان طیاروں میں ۵۰۰ روسی ساخت کے اور ۳۵۰ چیکوسلاواکیا کے ٹینک شامل ہیں ایک ہزار چھوٹی بڑی توپیں بھی نصب ہیں جن میں سے تین درجن روسی ساخت کی اتنی بڑی توپیں ہیں جو مصر کے ۱۸ میل اندر کے علاقے سے دو سو پونڈ وزن کے گولے اسرائیلی محاذ پر پھینک سکتی ہیں۔ ایسی اطلاعات بھی ہیں کہ مصریوں کو زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائیل بھی مل گئے ہیں جو ۲۰ سے ۴۰ میل تک کی دوری تک ۵۰۰ پونڈ وزن کے مہلک گولے پھینک سکتے ہیں۔

بارہ ہزار روسی ماہرین بھی مختلف محاذوں پر مصری فوجوں کو ضروری ہدایات دینے کے لئے موجود ہیں۔ گویا متحدہ عرب جمہوریہ جنگ کے لئے پوری طرح لیس ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ امن کی تلاش میں اس حد تک آگے چلا گیا ہے کہ صدر ناصر کے زمانے میں شاید ہی جا سکتا تھا۔

اس پر بھی اسرائیل اکڑا ہوا ہے اور رٹ لگا رہا ہے کہ وہ مقبوضہ عرب علاقے خالی نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ اسکے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ وہ طاقت کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ مضبوط سمجھتا ہے اور اگرچہ اس کی فوجوں کی تعداد جو متحدہ عرب جمہوریہ کے بالمقابل جمع ہیں صرف ۷۵ ہزار ہے ـــ لیکن اسے اعلیٰ قسم کے ٹینکوں اور ہوائی بیڑے کی مدد حاصل ہے ٹینکوں کی تعداد ۱۲۵۰ اور ہوائی جہازوں کی تعداد ۵۱۲ ہے جس میں حال ہی میں ۱۲ امریکی فینٹم طیارے شامل کئے گئے ہیں (اس قسم کے ۱۰۰ اور ۱۰۰ کا طیارے امریکا سے حاصل کئے جانے والے ہیں)

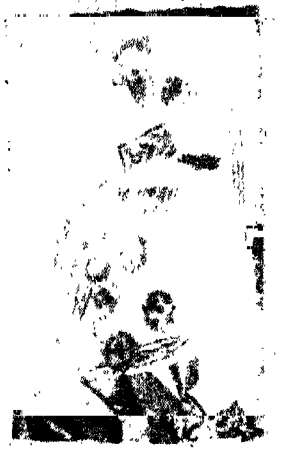
اسرائیلی اور دوسرے مغربی مبصرین کہتے ہیں کہ اسرائیلی ہوا باز دنیا میں اعلیٰ قسم کے تجربے کار ہوا باز سمجھے جاتے ہیں جبکہ روسی ہوا بازوں کو ۲۵ برس سے میدان جنگ میں آنے کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت اسرائیلی طیارچیوں کو نچی پرواز کے ساتھ بمباری کرنے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے تاکہ وہ متحدہ عرب جمہوریہ کے میزائیل تنصیبات کو تباہ کر سکیں۔

اپنی اسی فضائی طاقت پر بھروسہ کرکے ایک اسرائیلی ڈپلومیٹ نے پچھلے ہفتے کہا " میں سمجھتا ہوں مصریوں کو ہم تقریباً ایک ماہ کا موقع دیں گے۔ اس مدت میں ہم دیکھیں گے کہ مصریوں کی طرف سے مصالحت کیلئے کیا قدم اٹھایا جاتا ہے اور اسکے بعد انھیں بنیل کے خودرں میں ملبوس ہمارے ٹرکوں کیلئے جگہ چھوڑ دینی ہوگی۔"

اس قسم کی روش ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیل ایک اور جنگ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اور یہ جنگ ایسا نظر آتا ہے کہ ہو کر رہے گی۔ صدر شام جناب حافظ الاسد کا کہنا ہے کہ "عرب مقبوضہ علاقے جنگ کے بغیر خالی نہیں ہونگے"۔ یقیناً اسی خطرہ کے پیش نظر انہوں نے اس بات کو منظور کر لیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور شام کی فوجیں ایک ہی کمان میں رہیں۔ دوسرے عرب ممالک بھی اپنی فوجوں کو ایک ہی کمان میں لے آئیں تو وہ ایک مضبوط دشمن کا مقابلہ بآسانی کر سکتے ہیں۔ اسوقت اسرائیل کو غلط فہمی یہ ہے کہ اردن و شام یا کوئی اور عرب ملک مصر کی مدد نہیں کرے گا یہی وجہ ہے کہ وہ متحدہ عرب جمہوریہ کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ اور دوسرے عرب ملکوں کے خلاف بھی اس کی جارحانہ کارروائیاں شروع ہو گئی ہیں جو کچھ ہو اسرائیل کو اس بار معلوم ہو جائے گا کہ متحدہ عرب جمہوریہ تر نوالہ نہیں ہے۔

حبشہ

حبشہ کے شمالی صوبہ ایری ٹیریا میں شہنشاہ حبشہ کے خلاف جنگ جاری ہے۔ حبشہ کی حکومت اس صوبہ کے



حبشہ کے شاہ ـــ ہیل سلاسی

محاذ آزادی کو ڈاکوؤں کا گروہ کہتی ہے۔ ہر حکومت حریت پسندوں کو اسی قسم کا نام دیتی ہے۔ لیکن حبشہ کی حکومت ایری ٹیریا کے حریت پسندوں کو خواہ کچھ کہے وہ آزادی کا تہیہ کر چکے ہیں۔

ایری ٹیریا کے محاذ آزادی کی تنظیم بارہ برس پہلے عمل میں آئی تھی۔ اس کے ممبروں کی بڑی تعداد عدن میں ٹریننگ حاصل کرتی ہے۔ بہت سے چین میں بھی تربیت حاصل کرتے ہیں اور بحر احمر گویا ایک ہزار میل لمبی سوڈانی سرحد پار کرکے ایری ٹیریا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

محاذ آزادی میں مسلمان اور عیسائی دونوں ہی شامل ہیں لیکن عملاً اب وہ عربوں کی ہی تنظیم بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کا صدر مقام دمشق (شام) میں ہے۔

حبشہ کی حکومت نے ایری ٹیریا میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر رکھا ہے اور اس صوبہ کی بیس لاکھ کی آبادی پر فوج کی حکمرانی تھوپ رکھی ہے۔ لیکن اس قسم کے اقدامات آزادی کے جذبہ کو نہیں دبا سکتے۔

تین ماہ قبل آزادی چاہنے والوں کے خلاف جارحانہ کارروائی بھی شروع ہو گئی اور ویٹ نام کے طرز پر تقریباً دو سو دیہات کی "قلعہ بندی" کی گئی۔ لیکن چھاپہ ماروں کے حوصلے پست نہ کئے جا سکے۔

ایری ٹیریا جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے، ۱۸۸۵ میں ایک اطالوی نوآبادی بنا لیا گیا تھا اور ۱۹۴۱ تک اس پر اٹلی کا تسلط رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایری ٹیریا کو اقوام متحدہ کے فیصلے نے اس کی خود مختاری قائم کئے

...سلاسی کا جبر و تشدد حریت پسندوں کے ارادوں کو نہیں بدل سکتا





جنرل اسٹینر

سوڈان کے زخمی باغی



محاذ آزادی کے کچھ مجاہد عمل کرتے ہوئے۔

ہوئے حبشہ کے حوالہ کر دیا لیکن ۱۹۶۲ء میں حبشہ نے اپنے یکطرفہ فیصلہ کے تحت اس کی خود مختاری کو ختم کر دیا۔ اور اسے اپنے دوسرے صوبوں کے برابر حیثیت دیدی۔ اسکا قدرتی طور پر سخت ردِ عمل ہونا تھا چنانچہ اس علاقہ کے لوگوں نے آزادی کی تحریک شروع کر دی۔ محاذ آزادی کا جسکے لڑنے والے سپاہیوں کی تعداد تین ہزار ہے پورے دیہی علاقہ پر اثر ہے لیکن کنٹرول نہیں ہے۔ حبشہ کے ایک بریگیڈیر جنرل نے حال ہی میں کہا کہ "یہ چھاپہ مار محض گھات لگا کر حملہ کرنے کے ماہر ہیں۔ کسی ایک جگہ جم کر ودمنٹ نہیں لڑ سکتے۔" لیکن وقت آئیگا جب وہ جم کر بھی لڑیں گے اور اپنی آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔ شہنشاہ ہیل سلاسی کا جبر و تشدد حریت پسندوں کو ان کے مقصد کے حصول سے نہیں روک سکتا۔ شہنشاہیت زیادہ دن نہیں چل سکتی ●

سوڈان

سوڈان کے ۴۱ سالہ جنرل جعفر نمیری کو جنوب کے ساٹھ لاکھ کالوں کی بغاوت کا سامنا ہے۔ (شمال میں ۱۰ لاکھ عرب اور تیس لاکھ کالے ہیں) جنوب کے لوگ خود مختاری کا مطالبہ کر رہے ہیں کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ نظام حکومت میں شمال کے عرب انہیں حقیقی اختیارات دینے والے نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۶ء میں آزاد ہونے پر ۸۰۰ سرکاری ملازمتوں میں سے ۷۹۶ پر شمال والوں نے قبضہ کر لیا۔ گزشتہ دسمبر سے جنوب کے تین صوبوں میں حکومت کے خلاف گوریلا جنگ جاری ہے اور اسے دبانے کے لئے پوری طاقت استعمال کیجا رہی ہے۔ یوگینڈا کی سرحد کے قریب باغیوں کے ایک اڈے پر بمباری کی گئی جس کے نتیجے میں ایک ہزار شہری ہلاک و مجروح ہو گئے۔

جنوب کے باغی ہر جگہ کے باغیوں کی طرح باہر سے مدد لے رہے ہیں۔ ایک خبر ہے کہ اسرائیل نے پیراشوٹ کے ذریعے ان باغیوں کو اسلحے کی امداد دی ہے۔ سوڈان اسرائیل کے خلاف عرب محاذ میں شامل ہے اس لئے یہ قدرتی تھا کہ سوڈان کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے باغیوں کو مدد دے۔ علاوہ ازیں حبشہ بھی بالواسطہ طور پر باغیوں کی مدد کر رہا ہے۔ حبشہ سوڈان سے اس لئے ناراض ہے کہ وہ ایری ٹیریا کے باغیوں کو سوڈان کی سرحد پار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

پچھلے دنوں تک ایک جرمن نژاد فوجی رالف اسٹینر نے بھی جنوبی سوڈانیوں کی بڑی مدد کی ہے۔ وہ ہند چینی، الجزائر اور بیافرا میں لڑ چکا ہے۔ اس نے تیرہ ماہ تک جنوبی سوڈانیوں کو حکمراں عربوں کے خلاف لڑنے کی ٹریننگ دی۔ ایک ملاقات میں اس نے کہا کہ "یہ لوگ آپس میں تو خوب لڑتے ہیں لیکن جب عربوں سے مقابلہ ہو تو اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔"

گزشتہ سال کے آخر میں یوگینڈا کی حکومت اسٹینر کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی جب وہ جنگ کے علاقے سے باہر چھٹی منا رہا تھا۔ تین ماہ یوگینڈا کی جیل میں رکھ کر حکومت نے اسے سوڈانی حکام کے حوالے کر دیا اب وہ خرطوم کی جیل میں ہے جہاں جلد ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ مشرقی جرمنی کے تقریباً پچاس ماہرین جو سوڈانی حکومت کو اس کی سلامتی کے بارے میں مشورے دے رہے ہیں اس کے خلاف مقدمہ تیار کر رہے ہیں۔ اسٹینر کو شاید پھانسی دیدی جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ جو کچھ ہو اگر جنوبی سوڈانیوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے کی طرف توجہ نہ دی گئی تو شاید موجودہ بے چینی دور نہ ہو سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی عدم مساوات کا جب لوگوں کو احساس ہو جائے تو مذہبی رشتہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔



"ارے یہ سب شادی سے پہلے کے چونچلے ہیں ذرا شادی ہو جانے دو پھر دیکھنا یہی اسے منّو کی اماں کہہ کر پکارے گا۔"

واقعات قلم و علی



پاکستان

مسٹر جناح کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے

پاکستان بٹوارے کے دہانے پر

۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد مسٹر جناح نے کہا تھا "اگر ہم نے اپنے آپ کو پہلے بنگالی، پنجابی اور سندھی کہنا شروع کر دیا اور بعد میں مسلمان اور پاکستانی تو پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا"۔

مسٹر جناح کی یہ پیشگوئی صحیح ہوتی نظر آرہی ہے۔ اور دنیا کا پانچواں سب سے زیادہ گنجان آبادی والے ملک پاکستان کا دو حصوں میں بٹ جانا یقینی سمجھا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے تسلیم شدہ واحد لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کا اعلان ہے کہ —

"پاکستان جس صورت میں کہ اب تک قائم تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اس بارے میں سمجھوتہ کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی"۔

ابتدا میں شاید سمجھوتہ کی کوئی صورت نکل سکتی تھی کیونکہ شیخ نے اپنے چھ نکاتی پروگرام کے تحت مکمل آزادی کا نہیں بلکہ سیاسی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن پیپلز پارٹی کے صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے دباؤ میں آکر صدر یحییٰ خاں نے جو روش اختیار کی اور جس طرح مشرقی پاکستان کے مارشل لاء حکام کی طرف سے احکام جاری کئے گئے ان کی بنا پر شیخ کا صدر بھی ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کا شہری نظم و نسق کو ہاتھ میں لینا اور نیم فوجی دستوں کو جنہیں مارشل لاء حکام نے فوراً کام پر واپس آنے اور بصورت دیگر— فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کی دھمکی دی تھی۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کی ہدایت دینا اس امر کا مظہر ہے کہ اب وہ مغربی پاکستان سے کٹ کر اپنی دنیا الگ بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت وہ مشرقی پاکستان کے عملی حکمراں ہیں اور شہری نظم و نسق ان ہی کی ہدایت کے مطابق چل رہا ہے۔ حکمراں طبقہ کے خلاف کسی قوم کے اتنے مستحکم اتحاد کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔

صدر یحییٰ خاں بھاگم بھاگ ڈھاکہ پہونچے ہیں جہاں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت کی ہے۔ انکی کوشش ہے کہ مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکا تو مشرقی پاکستان کے عوام اور وہاں تعینات ۶۰ ہزار فوج کے درمیان جسکا زیادہ حصہ مغربی پاکستانیوں پر مشتمل ہے — تصادم ناگزیر ہے۔ اسے خانہ جنگی قرار دیا جا سکتا ہے جس پر ایک پڑوسی ملک کی حیثیت سے ہندوستان کو یقیناً تشویش ہوگی۔

مشرقی پاکستان میں ایسے حالات کیوں پیدا ہوئے اور شیخ مجیب الرحمٰن یا دوسرے بنگالی لیڈروں کو الگ ہو جانے کا جذبہ کیوں پیدا ہوا اس کا اگر عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا اس کی تمام تر ذمہ داری مغربی پاکستان کے حکمراں طبقے پر ہے۔ مشرقی پاکستان کو شکایت ہے کہ پاکستان کو ملنے والی غیر ملکی امداد کا ستر فیصدی حصہ مغربی پاکستان میں خرچ کیا جاتا ہے جبکہ مشرقی پاکستان کی ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ کی آبادی کے مقابلہ میں مغربی پاکستان کی آبادی صرف پانچ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ غیر ملکی امداد ہی نہیں بلکہ ۸۰ فیصدی درآمدی سامان بھی مغربی پاکستان ہی میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں سرکاری ملازمتوں میں ۸۵ فیصدی اور فوج میں ۹۰ فیصدی مغربی پاکستان کا حصہ ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں جو دنیا سے



شیخ مجیب الرحمٰن ووٹ ڈالتے ہوئے



"ہم بنگال میں سیکولر جمہوری سوشلسٹ حکومت کا قیام عمل میں لائیں گے۔"
(مجیب)

کا حکم چل رہا ہے اور عملاً مشرقی پاکستان یا "بنگلادیش" کے اصل حکمراں وہی ہیں۔

یحییٰ خاں نے ۲۵ مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا ہے لیکن آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید عوامی لیگ اس میں شامل نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے اجلاس کا بائیکاٹ مسٹر بھٹو کی پارٹی نے کیا تھا اور اس بار شیخ ناراض ہیں۔

اس قسم کے اعلانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ طاقت کے ذریعہ اگر کوئی قوم دوسرے لوگوں پر اپنا غلبہ رکھ سکتی تھی تو برطانیہ کی عظیم سلطنت جس میں سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا،

ن ترین آباد علاقوں میں سے ایک ہے (۱۴۰۰ سو اشخاص
ن میل) غربت وافلاس کا دور دورہ ہے۔ یہ تو تھی مشرقی
ان کو مغربی پاکستان سے شکایت۔ لیکن خود مغربی پاکستان
صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کو اور ہندوستان سے
رنے والے لوگوں کو شکایت ہے کہ ہر شعبۂ زندگی پر
چھائے ہوئے ہیں اور وہ کسی کو اپنے مقابلے میں نہیں
رتے، حتیٰ کہ سرکاری ملازمین میں بھی دوسروں کے ساتھ
رتا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان کے لوگوں کی بے چینی ابھی دبی
ہے لیکن مشرقی پاکستان میں جو غبار عرصہ سے جمع ہو رہا
؛ دھماکا بن کر پھٹ پڑا ہے

صدر ایوب۔ مشرقی پاکستان کی اس بے چینی کو
ے کیلئے دبانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن دو سال
رقی پاکستان کے ساتھ اپنی بے توجہی کی بنا پر ہی انہیں
ہدے سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔

صدر یحییٰ خاں ان کے جانشین بنے۔ اگرچہ وہ ایک
لعنان حکمراں ہیں لیکن معقول ذہن رکھتے ہیں اور اسی
وں نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یقین دلایا کہ
ق میں ان کا حصہ دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ اسی مقصد
وں نے گذشتہ دسمبر میں انتخابات کرائے۔ لیکن انھیں یہ
ی کہ شیخ مجیب الرحمن کے حامی اتنی بڑی تعداد میں کامیاب
گے۔ ان کا خیال تھا کہ عوامی لیگ ۳۱۹ کے ایوان میں
پاکستان کیلئے ۱۶۹ الاٹ شدہ سیٹوں میں سے
سے زیادہ ساٹھ فیصدی سیٹیں لے سکے گی اور اسطرح
پاکستان کے نمائندے مشرقی پاکستان کے چالیس فی
نمائندوں کے ساتھ مل کر ملک کا نظم ونسق چلا سکیں گے۔

لیکن عوامی لیگ نے چھ نکاتی پروگرام کا جو نعرہ دیا اس نے مشرقی پاکستان کے تقریباً سب ہی باشندوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور مغربی پاکستان بہ الفاظ دیگر پنجاب کی گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لئے پوری قوم نے متحد ہو کر عوامی لیگ کے ۱۶۷ امیدواروں کو کامیاب کرا یا۔

دوسری طرف مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی ابھر کر سامنے آئی۔ اور اس نے مغربی پاکستان کی ۱۴۴ سیٹوں میں سے ۸۳ سیٹوں پر قبضہ کر لیا۔ دونوں پارٹیوں کی پالیسیوں میں بعد المشرقین ہے۔ اسی لئے انتخابات کے نتائج سامنے آنے کے فوراً بعد یہ خدشات پیدا ہو گئے تھے کہ پاکستان کے دونوں حصے ایکساتھ نہ رہ سکیں گے۔

انہی خدشات کے پیش نظر ۴۲ سالہ مسٹر بھٹو مشرقی پاکستان پہنچے تاکہ ۴۸ سالہ شیخ مجیب الرحمن سے بات چیت کر کے سمجھوتہ کی کوئی صورت نکال سکیں، لیکن وہ انھیں موم نہ کر سکے۔ شیخ نے اپنے چھ نکاتی پروگرام میں تبدیلی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ "میں اپنے اس پروگرام کو مغربی پاکستان پر نہیں تھوپ رہا ہوں، البتہ بنگلادیش کے لوگ اس کے حقدار ہیں اور وہ اپنے اس حق کو حاصل کر کے رہیں گے۔"

اس چھ نکاتی پروگرام کو کامیاب بنانے کیلئے شیخ مجیب الرحمن نے عدم تعاون کی تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان پر تفصیل سے اسکی خبریں نہیں آ رہی ہیں لیکن جو بھی اطلاعات مل رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری شعبوں میں کام کرنے والے تمام لوگ شیخ کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ عدالتوں تک میں شیخ مجیب الرحمن



مشرقی بنگال میں ہر روز لاکھوں لوگ شیخ مجیب الرحمن کی حمایت میں مظاہرہ کر رہے ہیں۔ شیخ نے الزام لگایا ہے کہ فوج نے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے

تحلیل نہ ہو جاتی۔ اسی لئے پاکستان کی سالمیت بھی طاقت کے سہارے قائم نہیں رکھی جا سکتی بلکہ بنگالیوں اور سب صوبوں کے باشندوں کے دلوں کو بدلنے اور سب کو مطمئن رکھنے کے بعد ہی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ علاقائی عصبیت صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان اور دنیا کے ہر حصہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ جب بھی کسی علاقے یا صوبے کی حق تلفی یا اس کے ساتھ بے انصافی ہوگی علیحدگی کا مطالبہ ابھر کر سامنے آ جائیگا۔ ●

ریخ کی سب سے مہنگی لڑائی





پٹائی دونوں ہی کی ہوئی۔
اوپر محمد علی کلے۔ ہسپتال میں
نیچے فریزیر انٹرویو دیتے ہوئے



محمد علی کلے
لڑائی سے پہلے

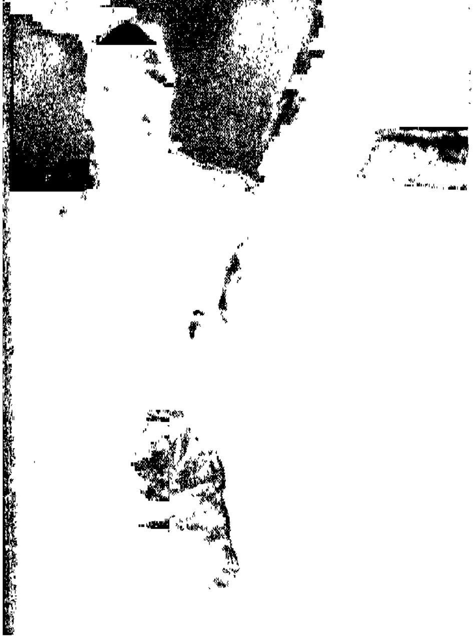


فریزیر — جو پہلے قصائی تھا لیکن اب
خالی وقت میں گانے گاتا ہے۔



پہلی بار کلے کے
چہرے پر اتنی
چوٹ آئی۔
کلے لڑائی کے
بعد اپنے ٹرینر
براؤن کیساتھ

واقعات نمود علی





یہاں کلے کی ہمت جواب دے گئی

فریزیئر شدید ترین چوٹ لگنے کے
باوجود کلے سے مقابلہ کرتا رہا۔





باکسنگ کے اس تاریخی مقابلہ کے بعد
کلے نے کہا کہ میں فریزیئر سے پھر مقابلہ کروں گا۔

لڑائی کے بعد فریزیئر اور کلے۔ فریزیئر کے منہ اور دانتوں سے خون بہہ رہا ہے۔





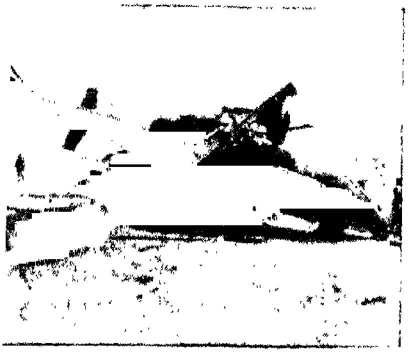


پچھلے دنوں برطانیہ کے شہزادہ فلپ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن فجی کے دورے پر گئے جب ان کی یاٹ فجی کے ساحل پر پہنچی تو ۳۰ فجینیوں نے آگے بڑھ کر اسے کندھے پر اٹھا لیا اور ساحل پر لے آئے۔ یہ اس لئے کیا گیا تاکہ پانی میں چلنے سے ان کے پاؤں نہ بھیگ جائیں ۔

امریکہ' وی
غلطی کر بیٹھ
ہو رہے ہ
پچھلے دنوں
کانگریس کے



بمبئی کے مچھیروں نے ماھم کے ساحل پر ایک ۲۵ فٹ لمبی ۴ فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی مچھلی پکڑی۔ یہ مچھلی رھا منوڈرن قسم میں سے ھے اور ۵۰ فٹ کی لمبائی تک بڑھ سکتی ھے



لاؤس میں امریکہ کا تباہ شدہ ھیلی کوپٹر ——— فسطائیت کا



ایک امریکی سائنس داں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ھے جس سے رات کے اندھیرے میں بھی دیکھا جا سکتا ھے اپنی طرف آنیوالی روشنی کو ۴۵۰۰۰ گنا زیادہ کر دیتا ھے۔ ھندوستانی حساب سے اس آلہ کی قیمت تقریباً ۲۸ ہزار روپے ھے ۔



جن سنگھ سے جب کچھ نہ بن پڑا تو اس نے فسادھی کرادیئے۔ علی گڑھ ان فسادات کا نشانہ بنا۔



ھر روز درجنوں ہندوستانی برطانیہ میں داخل ہونے سے روک دیئے جاتے ھیں یہ ھندوستانی افریقہ سے آنیوالے برطانوی شہری ھیں۔ تصویر میں کچھ ھندوستانی لندن میں مظاھرہ کر رہے ھیں



دہلی میں پارلیمنٹ کے اجلاس سے دو دن پہلے کانگریس پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں شری
اندرا گاندھی کو متفقہ طور پر پارٹی لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ تصویر میں وائی۔ بی۔ چوہان تقریر کر رہے
پیچھے مسز گاندھی اور جگ جیون رام بیٹھے ہیں



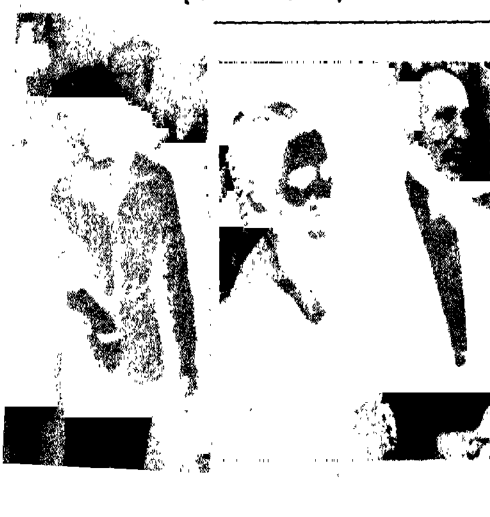
...مداخلت کرنے کے بعد لاؤس میں مداخلت کرنے کی
...کے درجنوں ہیلی کوپٹر اور ہوائی جہاز تباہ
...میں پیچھے ہٹ رہی ہیں
...مداخلت کیخلاف احتجاج کے طور پر کسی نے امریکی
...) اڑا دیا۔



روسی سائنس داں پروفیسر گراسیمو نے تیمور لنگ کی
کھوپڑی کی مدد سے اس کا چہرہ تیار کیا ہے۔ اوپر
تیمور لنگ کی کھوپڑی۔ نیچے اس کا خیالی چہرہ



"مجھے اپنے ہارنے کا افسوس نہیں
ہے افسوس ہے تو اندرا کے جیتنے کا۔"
(تارکیشوری سنہا)



دنیا کے سب سے زیادہ
شہرت یافتہ کنوارے
کینیڈا کے ۴۵ سالہ
وزیر اعظم ٹروڈو تھے
لیکن پچھلے دنوں ان کی
شادی ۲۲ سالہ حسینہ
مارگریٹ سے ہو گئی۔



پارلیمنٹ

چوتھی لوک سبھا کا اجلاس جب ختم ہو رہا تھا تو مسٹر ایس ایم بنرجی نے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا "پھر ملیں گے اگر خدا لایا" اس وقت دراصل وسط مدتی انتخاب کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اور یہ یقین نہ تھا کہ سب ہی ممبران دوبارہ منتخب ہو کر آجائیں گے لیکن یہ یقین بھی نہ تھا کہ بڑی بڑی توپیں لڑھک جائیں گی۔ گذشتہ جمعہ کو جب پانچویں لوک سبھا کا اجلاس شروع ہوا تو ایس۔ ایم بنرجی تو موجود تھے لیکن آنکھیں رام سبھاگ سنگھ (سنڈیکیٹ)۔ این جی رنگا (سوتنتر)، مسٹر ایس۔ ایم۔ ودیدی، ایس۔ پی بہاچہ رنانا، ایس (ایس۔ ایس۔ پی) ایس۔ کے پاٹل اور مسز تارکیشوری سنہا (دونوں سنڈیکیٹ) جیسے مشہور ممبران کو دیکھنے کیلئے ترس رہی تھیں۔ لوک سبھا کا "چہرہ" بالکل بدل گیا تھا۔ پارٹیوں کے لحاظ سے بھی کہ بعض کا بالکل وجود ہی مٹ گیا اور عمر کے لحاظ سے بھی کہ پہلے سے زیادہ نیا خون آگیا۔ تقریباً نصف ممبران ایسے ہیں جن کی عمر چالیس سے کم ہے۔ کرپلانی جیسے بوڑھوں نے پہلے ہی انتخاب نہ لڑا تھا۔ شاید انھیں ہوا کے رخ کا احساس ہو گیا تھا۔ اور کچھ کو عوام نے ان کے گھروں میں بٹھا دیا۔ ہاں سیٹھ گوبند داس کو چھوڑ دیا۔ غالباً اس لئے کہ ان کے ذریعہ حلف دلوانا تھا۔ وہ ۴۸ برس سے جبلپور کے حلقہ سے مسلسل منتخب ہو کر آرہے ہیں۔ یہ چوتھا موقع تھا کہ انھوں نے معمر اور سینیر ممبر کی حیثیت سے اسپیکر کے فرائض انجام دیئے اور ممبروں سے حلف اٹھوایا۔ پہلے دن ۴۷۶ ممبروں نے حلف لیا اور باقی نے پیر کے دن (ہفتہ اتوار دو دن چھٹی)

پانچویں لوک سبھا جو اس بار منتخب ہو کر آئی ہے اسکی نوعیت پچھلی لوک سبھاؤں کے مقابلہ میں بالکل مختلف ہے۔ پہلی تین لوک سبھاؤں میں بھی کانگریس کو دو تہائی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن اس میں ایسے ممبر بھی تھے جو سوشلزم یا سماجی انصاف پر یقین نہ رکھتے تھے۔ کم سے کم ایک دو جن سابق حکمران پارٹی میں شامل تھے جنھوں نے ہمیشہ ہر ترقی پسندانہ پروگرام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں جبکہ کانگریس دو تہائی اکثریت حاصل نہ کر سکی، قدامت پسندوں کو اور زیادہ غلبہ حاصل رہا اور کانگریس پارٹی "غریبی ہٹاؤ" سے متعلق اپنے دس نکاتی پروگرام کو بھی بھول گئے اور ان تمام وعدوں کو بھی جو الیکشن مینی فیسٹو میں کئے گئے تھے۔ نتیجہ میں کانگریس تقسیم ہو گئی اور اسکی بڑی لمبی کہانی ہے، مختصر یہ کہ قدامت پسند رجعت پسند اور سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والے ایک طرف ہو گئے اور کانگریس سوشلسٹ پروگرام کو اپنانے والے دوسری طرف۔ عوام نے آخر کار انکو چن لیا۔

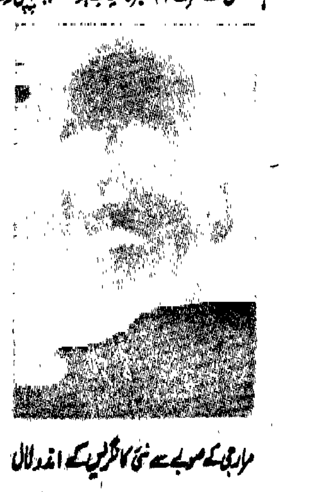
دوسرے الفاظ میں کانگریس ٹکٹ پر آنیوالے تمام ممبران ایک واضح پروگرام کی بنیاد پر منتخب ہوئے ہیں اور وہ الیکشن مینی فیسٹو میں کئے گئے تمام وعدوں کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ وہ اپنے تمام وعدوں کو پورا کریں گے اس کی توقع اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اس بار کانگریس پارٹی میں انقلابی ذہن رکھنے



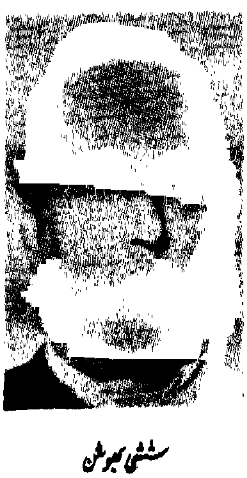
صدر دی۔ وی گری، موہن کمار منگلم کو وزارت کا حلف دلا رہے ہیں

والے ممبروں کا غلبہ ہے۔ جن پر یقین ہے کہ وہ اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں ہوں گے۔

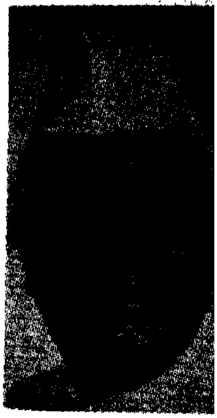
دوسری طرف حزب اختلاف کا ڈھانچہ بھی بالکل بدل گیا ہے۔ مخالف ممبروں کی تعداد گھٹ کر پہلے کے مقابلہ ایک تہائی رہ گئی ہے اور اسکا اثر دائیں بازو کی پارٹیوں پر پڑا ہے۔ سنڈیکیٹ کانگریس، جن سنگھ اور سوتنتر پارٹیوں کی نمایاں حیثیت بالکل ختم ہو گئی۔ بالخصوص سنڈیکیٹ کانگریس جو اپنے ۶۵ ممبروں کے ساتھ چند ماہ تک لوک سبھا کے مطابق پہلی تسلیم شدہ حزب اختلاف کی حیثیت سے چھائی رہی برا حال بنا۔ وہ ۱۶ سیٹوں سے زیادہ نہ لے سکی۔ اور مخالف جماعتوں میں پانچویں نمبر پر پہنچ گئی۔ جو تھا نمبر جن سنگھ کو ملا نے دعویٰ کیا تھا کہ ملک میں متبادل حکومت صرف وہی بنا سکتی ہے اس کے صرف ۲۲ ممبر کامیاب ہوئے جبکہ پچھلی لوک



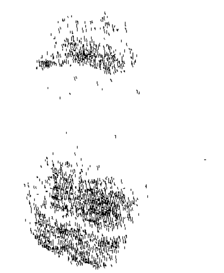
مرارجی کے صوبے سے نئی کانگریس کے اندولال



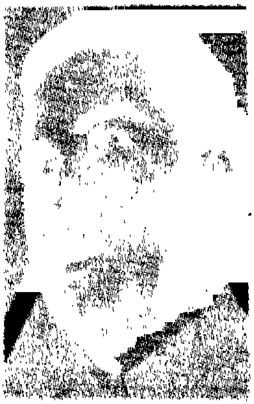
سشی بھوشن



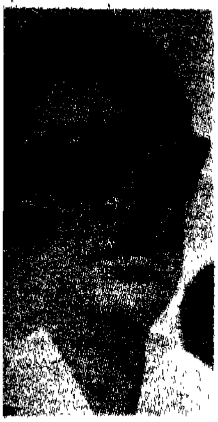
راج بہادر



ایچ۔ آر۔ گوکھلے



معین الحق چودھری



سدھارتھ شنکر رے

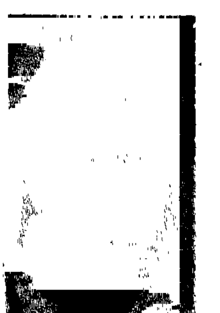
اس کے ممبروں کی تعداد ۳۴ تھی۔ اور ان ۲۲ کامیاب ہونے والے ممبروں میں بھی گیارہ مدھیہ پردیش کے مدھیہ بھارت کے علاقہ سے کامیاب ہونے والے ممبر شامل ہیں۔ یعنی سابق ریاستوں کے گڑھ سے۔ دلی میں جن سنگھ کا "دیپک" بالکل گل ہوگیا۔ عوام نے اس کی پالیسی اور طریقہ عمل کو قطعی طور پر مسترد کردیا۔ راجدھانی کو جن سنگھ "اپنا ایک مضبوط قلعہ" سمجھتا تھا۔ یہ "قلعہ" بالکل مسمار ہوگیا اور وہ ایک سیٹ بھی حاصل نہ کرسکا۔

سوتنتر پارٹی صرف ۸ ممبروں کو کامیاب کراسکی جبکہ پچھلی لوک سبھا میں اس کے ممبروں کی تعداد ۳۵ تھی —

ایس ایس پی، جن کے ۱۱ ممبر پچھلی لوک سبھا میں اودھم مچایا کرتے تھے۔ اس کے ٹکٹ پر صرف ۳ ممبر کامیاب ہوسکے۔ جن سنگھیوں اور رجعت پسندوں و تنگ نظروں کے ساتھ ناپاک گٹھ جوڑ کرنے پر سوشلزم کی دعویدار اس جماعت کو عبرت ناک سزا مل گئی۔ "اندرا ہٹاؤ" نعرہ کا جواب مل گیا۔ بی کے ڈی کی حیثیت تو بالکل ہی ختم ہوگئی۔ پہلے بھی کوئی حیثیت نہ تھی پھر بھی دس چار ممبر تھے۔ لیکن اس بار اسکا صرف ایک ممبر آگیا اور وہ بھی علی گڑھ میں فساد اور فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کے بعد۔ یوں کہیئے کہ دائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والی تمام جماعتوں کا "بیڑا" غرق ہوگیا۔ اس کے برعکس بائیں بازو کی پارٹیوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی پوزیشن کو برقرار رکھا ہے بلکہ اسے بہتر بنایا ہے۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے مخالف پارٹیوں میں سب سے زیادہ یعنی ۲۵ سیٹیں حاصل کی ہیں جبکہ کمیونسٹ پارٹی نے ۲۴ پر قبضہ کیا۔ اور ۲۳ سیٹیں ڈی ایم کے کو ملیں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جمہوری پارٹیوں کی مجموعی تعداد ۷۲ ہے جبکہ دائیں بازو کی جماعتوں کے صرف پچاس ممبر ہیں پچھلی لوک سبھا میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مخالف ممبروں کا غلبہ تھا اور انکی تعداد ڈیڑھ سو سے اوپر تھی۔ لوک سبھا کے ڈھانچہ کی اس تبدیلی سے ایوان کی کارکردگی میں یقیناً فرق آئیگا۔ حکومت "غریبی ہٹاؤ" کے اپنے پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے کیلئے تیزی سے کام کریگی۔ البتہ عام تماشائی ایک بات سے محروم رہیں گے۔ یہ کہ وہ پچھلی مارکیٹ کے ان نظاروں کو نہ دیکھ سکیں گے جو پچھلی لوک سبھا میں دیکھنے میں آتے تھے۔ ●



کمیونسٹ پارٹی (مارکسٹ) کے اے۔ کے گوپالن جو حزب مخالف کی سب سے بڑی پارٹی کے لیڈر منتخب کئے گئے



تحریک آزادی کی عظیم مجاہدہ سبھدرا جوشی



مکل بنرجی

ہنگامہ آرائیاں اور ظلم و تشدد ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا

کی جیت ہے، سیکولر جمہوریت کے ان اصولوں کی جیت ہے جنکی بنیاد پر اس ملک کا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے۔ رجعت پسند اور قدامت پرست پارٹیاں اس ڈھانچہ کو گرانے پر تلی ہوئی تھیں، لیکن عوام نے انکا کان پکڑکر ہندوستان کے مطلع سیاست سے انھیں اس طرح باہر نکال پھینکا جسطرح دودھ میں سے مکھی کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ تقریباً سب ہی پارٹی لیڈروں نے اپنی شکست کو تسلیم کرلیا ہے لیکن نجلنگپا جی اب بھی "جمہوریت کو زندہ رکھنے کیلئے" اپنی جماعت کو مضبوط بنانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ لوابعجبی نہیں تو کیا ہے۔ ●

صوبے

یوپی

یوپی میں سنی رام کے ضمنی انتخابات میں مسٹر ٹی۔ این سنگھ (وزیراعلیٰ) کی ناکامی اس بات کا ثبوت تھا کہ اس ریاست میں سنڈیکیٹ کانگریس پر عوام کو اعتماد نہیں ہے۔ ٹی۔ این سنگھ کو اسی وقت مستعفی ہوجانا چاہئے تھا جب انھیں عبرتناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ دل کی پارٹیوں نے انھیں مارکوٹ کر ان کی کرسی پر بٹھائے رکھا۔ شاید انھیں توقع تھی کہ وہ لوک سبھا کے الیکشن میں اپنی حقیقت عوام سے منوالیں گے چنانچہ الیکشن پر اس مقصد کے لئے بڑی بڑی چالیں چلی گئیں، جگہ جگہ ہنگامے کرائے گئے، فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کیا گیا، ذات پات کے جھگڑے اٹھائے گئے، علی گڑھ اور مرادآباد وغیرہ میں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا۔ ہریجنوں اور پسماندہ لوگوں کو ووٹ دینے سے روکا گیا۔ ٹی۔ این سنگھ نے گمراہ کن بیانات دیے اور اپنی مطلب براری کے لیے فرقہ وارانہ اشتعال پھیلایا۔ لیکن۔

• الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ہے

لوک سبھا کی ۸۵ سیٹوں میں سے سنڈیکیٹ صرف ایک سیٹ لے سکی عوام نے جن سنگھیوں اور سرمایہ پرستوں کے ساتھ ساز باز کرنیوالی



جن سنگھ کی پشت پناہ، گوالیار کی راج ماتا

جو جن سنگھ کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان کی کامیابی میں جن سنگھ کے سیاسی نظریہ کو کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح سوتنتر پارٹی کے آٹھ ممبروں کی کامیابی سابق حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی سرپرستی کی مرہون منت ہے۔ اسکے آٹھ ممبروں میں سے صرف تین راجستھان سے کامیاب ہوئے ہیں جو سابق رجواڑوں کا گڑھ ہے۔

ان تمام پارٹیوں کی سرمایہ دارانہ اور رجعت پسندانہ پالیسی کو عوام نے مسترد کردیا۔ کے کے برلا اور ٹاٹا جیسے سرمایہ داروں کو بھی قبول نہ کیا جو آزاد امیدوار کے طور پر کھڑے ہوئے تھے، وہ بیچارے اپنی ضمانتیں تک نہ بچا سکے۔ اصل میں ملک کا رجحان سوشلزم کی طرف ہے، ایسی معیشت کی طرف ہے جس میں سب ساجھے دار ہوں۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو اب عوام برداشت نہیں کرسکتے۔ کانگریس نے ان تمام بے انصافیوں کو ختم کرنے اور ملک میں ایسا سماج لانیکا وعدہ کیا جس سے عدم مساوات کو بڑی حد تک ختم کیا جاسکے تو عوام اسکے پیچھے آگئے۔ کانگریس کی جیت حقیقت میں سوشلسٹ نظریات



...ولنگ کے نتائج
...یک سبق ہیں

...بھا کے حالیہ الیکشن کے نتائج ان جماعتوں
...ے ہیں جو عوام میں رجعت پسند و قدامت پرست مشہور
...عتوں نے کامیابی حاصل کرنے کیلئے باہم گٹھ جوڑ
...یہ گٹھ جوڑ خود انکی موت کا سبب بن گیا۔ پارلیمنٹ
...تی دل کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اسکا صرف ایک ممبر
...ا، مگر کسی سیاسی نظریہ کی بنا پر نہیں بلکہ دھینگا
...گڑھ میں فساد برپا کرانے کے نتیجے میں۔ ایس ایس
...یک صفایا ہوگیا اور اس کے ۱۰ ممبروں میں سے
...ہ گئے۔

...ی کیٹ کانگریس جس کے ممبروں کی تعداد پچھلے
...ھی اس کے صرف سولہ ممبر کامیاب ہوسکے اور
...ی تو ہیں جن میں خود پارٹی لیڈر ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ
...یں لڑھک گئے۔ جو پارٹی حکومت کی باگ ڈور
...کے خواب دیکھ رہی تھی وہ ایوان میں ایک مؤثر حزب
...ی نہ بن سکی۔ اس پارٹی کی یوں سمجھیے کہ سیاسی موت
...ی۔

...ن سنگھ اقتدار کے لحاظ سے مقابلتاً زیادہ لوٹے ہیں
...اور اس کے صرف ۱۱ ممبر کم آئے ہیں یعنی ۳۳ کی جگہ
...ی اگر کامیاب ہونے والے ممبروں پر نظر ڈالی جائے
...وا کہ اسکا صرف ایک محدود علاقہ میں اثر ہے۔
...سکے ۱۰ ممبر مدھیہ پردیش کے اس علاقہ سے کامیاب
...ے جو ایک زمانے میں مدھیہ بھارت کے نام سے موسوم
...ے چار سیٹیں راجستھان سے لی ہیں۔ مدھیہ پردیش
...ی سیٹیں سابق راجواڑوں کے اثر میں تھیں

...لنگپا جی خدا انہیں لے ڈوبی۔ سنڈیکیٹ کی کمر لوٹ گئی

واقعات و تبصرے

ٹی این سنگھ بدستور وزیر اعلیٰ ــــ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی



سی۔بی۔گپتا

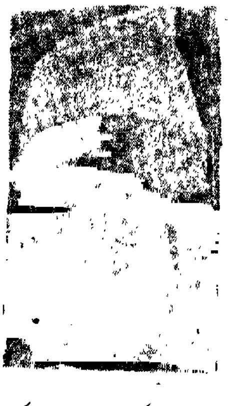
ڈنڈے تو بہت چلائے لیکن....

اس کنڈم جماعت کو بالکل مسترد کر دیا ما ایسی صورت میں مسٹر ٹی۔این۔سنگھ کو ایک منٹ بھی اپنی گدی پر نہ رہنا چاہئے تھا اور انھوں نے اس کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن ان کے "ہمدردوں" یا کہیے خود اپنے مفادات کی حفاظت کرنے والوں نے انھیں پھر ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ انھیں مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے عہدے پر بدستور کام کرتے رہیں اور اپنی بے اصولی حکومت کو برابر قائم رکھیں ــ شاید مسٹر نجلنگپا کے الفاظ میں ایسا "جمہوریت کو مضبوط بنانے" کے لئے کیا گیا ہے۔ لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی، مسٹر ٹی۔این۔سنگھ کو بہرحال عوام کے روبرو جانا ہوگا کیونکہ وہ انتخابات میں کامیاب ہوئے بغیر چھ ماہ سے زیادہ وزیر اعلیٰ نہیں رہ سکتے۔ عوام ایک مرتبہ انھیں "رجیکٹ" کر چکے ہیں دوسری مرتبہ بھی یقیناً ان پر اظہار بد اعتمادی کریں گے اور اس وقت وزارت کے کوچے سے انھیں بہت بے آبرو ہو کر نکلنا ہوگا۔ اس وقت نکل آتے تو راجیہ سبھا میں انکی پچھلی سیٹ موجود تھی۔ خاموشی سے آکر اس پر بیٹھ جاتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ٹی۔این۔سنگھ کو خود کنڈم پارٹیوں کی "فٹبال" بننے میں مزہ آرہا ہے۔

گجرات

سنڈی کیٹ وزیر اعلیٰ مسٹر ہتیندر ڈیسائی الیکشن سے پہلے اپنی سنڈی کیٹی حکومت کو بچانے کی کوششوں میں مصروف تھے کابینہ میں ریکارڈ توڑ اضافہ اسی لئے کیا گیا تھا تاکہ کسی طرح حکومت بچ سکے۔

دوران الیکشن بھی ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے گئے اور ایسے شرپسندوں کی خدمات حاصل کی گئیں جو پوری ریاست میں خوف و دہشت پھیلا سکیں۔ ان میں آر۔ایس۔ایس کے والنٹیر پیش پیش تھے۔ ایک نوجوان دھیرج لال پٹیل کو جو ایک معروف کمیونسٹ لیڈر کا لڑکا تھا دن دھاڑے اس لئے قتل کر دیا گیا کہ وہ مسٹر مرارجی کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے چوکھا والا کی حمایت میں الیکشن پروپگنڈہ کر رہا تھا۔ ان سب حرکتوں کا مقصد سنڈی کیٹی امیدواروں کو کامیاب کرانا تھا۔



ہتیندر ڈیسائی حکومت خطرے میں ــــ

تشدد کے واقعات صرف سورت تک محدود نہیں رہے جہاں سے مسٹر مرارجی الیکشن لڑ رہے تھے بلکہ بڑودہ اور احمد آباد میں بھی ایسی ہی متشددانہ سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں ــ بڑودہ میں آر۔ایس۔ایس کے والنٹیروں نے پی۔ایس۔پی کے امیدوار ایس۔بھٹ کے الیکشن آفس کو لوٹ لیا اور احمد آباد میں بھی انھوں نے ایسا ہی کیا جس سے کہ اکثریتی فرقے کا فرقہ پرست طبقہ تک بدظن ہو گیا نتیجے میں ایک لکھ پتی سرمایہ دار بے کشن ہری ولبھ داس کے مقابلے میں آزاد امیدوار یاجک کامیاب ہو گئے۔

راجکوٹ میں سوتنتر پارٹی کے لیڈر مسٹر مسانی کو جو جن سنگھ کے ساتھ انتخابی گٹھ جوڑ میں شامل تھے آر۔ایس۔ایس کے والنٹیروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس لئے کہ یہ والنٹیر جن سنگھ کے امیدوار کو کامیاب کرانا چاہتے تھے۔ مسانی ہار گئے۔ لیکن کانگریس نے گجرات میں لوک سبھا کی نصف سیٹوں پر قبضہ کر لیا اور سنڈی کیٹ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ابھی سنڈی کیٹ ہی کی حکومت قائم ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب میسور کی طرح گجرات میں بھی سنڈی کیٹ کا قلعہ ٹوٹ جائے گا۔

میسور

میسور مسٹر نجلنگپا کا دیش ہے۔ وہاں انکی پارٹی کی حکومت قائم تھی۔ ہر قسم کے وسائل اس پارٹی کو حاصل تھے لیکن جب ایک ماہ قبل تین وزیروں محمد علی، کے۔پٹا سوامی اور وسنت راؤ ایل پاٹل نے استعفے دے کر اپنے اضلاع گلبرگہ، میسور اور بیجاپور میں کانگریس کے لئے کام کرنا شروع کیا تب ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔

میسور کے عوام نے لوک سبھا کی ستائیس کی ستائیس سیٹیں کانگریس کو دے کر ثابت کر دیا کہ وہ جن سنگھی یا سوتنتری سیاست کو پسند نہیں کرتے ان جماعتوں کے ساتھ سنڈی کیٹ کے گٹھ جوڑ کی مخالفت کی گئی تھی لیکن نجلنگپا کی غدارانہ سیاست ڈوبی اور میسوری عوام نے انھیں ایسی سزا دی کہ وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہندوستان کی پالیٹکس میں میسور کے عوام نے سیاسی سوجھ بوجھ کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

الیکشن کی انقلاب انگیز نوعیت کا جو نتیجہ ظاہر ہونا تھا وہ ۱۵ مارچ کو اسمبلی کے اجلاس کے پہلے ہی دن ظاہر ہو گیا جب ناراض ممبروں نے وزیر خزانہ کو بجٹ پیش کرنے نہ دیا اس کے بعد ۱۸ مارچ کو اس وقت ظاہر ہوا جب وزیر اعلیٰ مسٹر ویریندر پاٹل کو اس لئے مستعفی ہونا پڑا کہ انکی پارٹی کے بیس ممبر کانگریس پارٹی سے جا ملے۔

مسٹر نجلنگپا کے لئے یہ خبر بڑی اندوہناک تھی لیکن وہ کیا کر سکتے تھے کہنے لگے "ویریندر پاٹل نے حالات کے مطابق ٹھیک ہی کیا ہوگا" مگر ساتھ ہی اپنی شکست تسلیم نہیں کی بلکہ اعلان کیا

جن سنگھی اور سوتنتری سیاست ناکام ہو گئی

انقلاب

وزارتِ اعلیٰ کی چاٹ کرسی سے نہیں اٹھنے دیتی



"ارے بھائی کتنی بار بولا کہ اخبار میں تمہارا نام نہیں ہے۔ کامراج اور سنجیوا ریڈی



ویریندر پاٹل
..... مستقبل کی فکر

کرو میں اپنی جماعت کو مضبوط بناؤں گا۔ اس لئے کہ وہ ہندوستان میں جمہوریت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید ان کے خیال میں اس وقت ڈکٹیٹری کا دور دورہ ہے۔ میسور سے کانگریس نے سب کی سب سیٹیں لے لیں۔ یہ اس کی ڈکٹیٹری یا زبردستی نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسروں کو تو کانگریس مساوات کا سبق دیتی ہے اور کہتی ہے مل بانٹ کر کھاؤ اور یہاں ساری سیٹیں اکیلے ہی ہضم کر لیتی ہے۔ نجلنگپا جی واقعی ہمدردی کے قابل ہیں۔ ■■

بہار

بہار میں بھی سینکٹ ودھایک کی پارٹیوں کے مسلح غنڈے پوری ریاست میں گھومتے رہے اور انھوں نے بہت سے مقامات پر جبر و تشدد سے کام لیا۔ پولنگ سے دو ہفتے قبل ہی دہشت زدگی پھیلانا شروع کر دی تھی۔ دربھنگہ میں جن سنگھی جاگیرداروں نے تین کمیونسٹوں، دو ہریجنوں اور ایک مسلمان ورکر کو بندوق کا نشانہ بنا دیا۔ پولنگ کے دوران پولنگ بوتھوں پر قبضہ کر لیا۔ جیپ گاڑیوں میں مسلح غنڈے مختلف علاقوں میں گھومتے اور ووٹروں کو خوفزدہ کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود لوک سبھا کی ۵۳ سیٹوں میں سے سنڈی کیٹ کو صرف تین، پرجا سوشلسٹ پارٹی اور جن سنگھ کو صرف دو دو سیٹیں مل سکیں۔



رام سبھاگ سنگھ
لیڈری بھی گئی —

سنڈی کیٹ لیڈروں میں صرف ایس۔ این مصرا کامیاب ہو سکے جبکہ مسز تارا کیشوری سنہا اور ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ جیسے لیڈر جو سنڈی کیٹ کانگریس کے ستون سمجھے جاتے تھے کانگریس کے غیر معروف امیدواروں کے مقابلے میں ہار گئے۔ اس ہار کے بعد پرجا سوشلسٹ وزیر اعلیٰ مسٹر کرپوری ٹھاکر کو مستعفی ہو جانا چاہئے تھا لیکن مفت میں پیغمبری مل جائے تو کون چھوڑتا ہے۔ عوام کی نظر میں کچھ ہوں مگر وزیر اعلیٰ تو کہلا رہے ہیں۔ حالانکہ سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جارج فرنانڈیس کی ہدایت ہے کہ چونکہ عوام نے ودھایک دل کی سیاست کو مسترد کر دیا ہے اس لئے ہمیں ان دلوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن کرپوری ٹھاکر اب کرا اپنی کرسی سے چپٹے ہوئے ہیں۔ وزارت اعلیٰ کی چاٹ انہیں کرسی سے اٹھنے نہیں دیتی بلکہ اسے اور مضبوط کرنے کے لئے انھوں نے غنڈوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے جو الیکشن کے بعد بھی ہنگامہ آرائیوں میں مصروف ہیں۔ دربھنگہ میں ایک جن سنگھی ہجوم نے بہت سے مسلمانوں کی دوکانیں پولنگ کے بعد بھی نذر آتش کیں۔ ان مسلمانوں کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اس علاقے کے ایک کمیونسٹ امیدوار کی حمایت میں ووٹ دیئے تھے۔

لیکن اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں اور ظلم و تشدد ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا۔ غنڈہ گردی چلنے والی نہیں۔ ودھایک دل کی حکومت کی زندگی اب چند دن کی معلوم ہوتی ہے اور اب اس کا حشر بھی وہی ہونے والا ہے جو میسور میں سنڈیکیٹی وزارت کا ہوا ہے۔ ■■

بنگال

بنگال میں ایسے وقت انتخابات کرانا جبکہ وہاں تشدد

میں اپنی جماعت کو مضبوط بناؤں گا۔ نجلنگپا کے دو زخم

ملاقات انور علی

بنگال میں ایک مرتبہ پھر کانگریس برسر اقتدار آئے گی

کا دور دورہ تھا اور قتل وغارت گری کے واقعات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، اندرا گورنمنٹ کا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ غالباً اسی جرأت مندی کا کانگریس کو یہ صلہ ملا کہ وہ اسمبلی میں دوسری سب سے بڑی جماعت بن کر سامنے آئی۔ پچھلی اسمبلی میں اس کے صرف ۴ ممبر تھے جبکہ نئی اسمبلی میں اس کے ۱۰۵ ممبر کامیاب ہوئے۔ پہلی بڑی پارٹی مارکسی کمیونسٹ پارٹی ثابت ہوئی جس نے ۱۱۱ سیٹوں پر قبضہ کر لیا اور اگر اس کے محاذ میں شریک دوسرے ممبروں کو شامل کر لیا جائے تو اس کی تعداد ۱۲۴ تک پہونچتی ہے۔ لیکن حکومت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ۲۸۰ کے ایوان میں کسی ایک یا دوسری پارٹی کو کم از کم ۱۴۱ ممبروں کی حمایت حاصل ہو۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر جیوتی باسو چاہتے تھے کہ انھیں حکومت بنانے کا موقع دیا جائے لیکن گورنر نے ان کے اس مطالبے کو منظور نہیں کیا۔ کیونکہ کانگریس کے علاوہ بنگلا کانگریس، کمیونسٹ پارٹی، فارورڈ بلاک اور مسلم لیگ وغیرہ کے ممبر بھی ہیں جو مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ریاست میں غیر مارکسی حکومت قائم ہو۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۵۳ بنتی ہے اگر ان کا باہم سمجھوتہ ہوا



جیوتی باسو
عوام نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا ہے

جیسا کہ یقین ہے ہو جائے گا تو بنگال میں ایک مرتبہ پھر کانگریس زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے گی۔ یہ مسز گاندھی کی زیر قیادت کانگریس کی بہت بڑی کامیابی قرار دی جا سکتی ہے۔ لوک سبھا کے الیکشن میں بھی کانگریس نے اپنی پوزیشن کو بیحد مضبوط بنایا ہے۔ ۴۰ سیٹوں میں سے ۲۰ مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے حاصل کی ہیں اور ۱۴ کانگریس نے۔ باقی ۶ میں سے ۲ کمیونسٹ پارٹی نے اور ایک ایک بنگلا کانگریس، پرجا سوشلسٹ پارٹی، انقلابی سوشلسٹ پارٹی اور مسلم لیگ نے۔ سنڈی کیٹ کانگریس کا اس ریاست میں بھی برا حال ہوا۔ ریاستی اسمبلی کے لئے اس نے اپنے ۲۳۰ امیدوار کھڑے کئے لیکن صرف ۲ کامیاب ہو سکے جبکہ لوک سبھا کے لئے اس کے ۳۰ امیدواروں میں سے ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ کہتے ہیں اپنی پارٹی کی اس زبردست اور عبرتناک شکست سے نجلنگپا پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے دو وقت کھانا نہیں کھایا اور جب انھوں معلوم ہوا کہ انکی پارٹی کے روح رواں اتلیا گھوش اپنی ضمانت بھی نہ بچا سکے تو دیر تک اپنے آنسو پونچھتے رہے۔

■■



کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرارجی بھائی

یوسفِ بے کارواں

مسٹر ایس، کے پاٹل ــ لوک سبھا کا الیکشن ہار گئے انہوں نے کہا چلو یہ اچھا ہوا برا نہ ہوا، کیونکہ اگر میں کامیاب ہو جاتا تو ہاؤس میں میرا برا حال ہوتا۔ کہتے ہیں جب ایک لومڑی انگور کے کسی خوشے کو توڑ نہ سکی تو اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ انگور کھٹے ہیں۔ مسٹر پاٹل بھی لومڑی کی طرح اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن یہ مسٹر ڈیسائی کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہو گئی انھوں نے یہ تصور کیا ہے کہ انھیں لوک سبھا کے منددیں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ بے چارے اگر وہاں حال سے بے حال ہو گئے تو انھیں کون دلاسا دے گا۔

بےحالی جن کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۵۱۸ سیٹوں میں جن کے لئے انتخابات لڑے گئے مسٹر ڈیسائی کی پارٹی صرف ۱۶ نشستیں حاصل کر سکی۔ اس سے تو برخاست شدہ ایوان ہی غنیمت تھا کہ ۶۵ سیٹوں پر ان کے سنڈی کیٹی ممبر براجمان تھے۔ انتخابات سے انھوں نے بڑی بڑی آسیں لگائی تھیں آدھی سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کے لئے جن سنگھیوں اور سوتنترپرستوں سے گٹھ جوڑ بھی کئے تھے۔ لیکن سہ

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔

اتنی سیٹیں بھی نہ مل سکیں کہ برا حال بننے سے بچ سکتے سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور دقیانوسی کانگریس کی لاش پہ رونے کے لئے مرارجی بھائی کو اکیلا چھوڑ دیا ــ یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔

کم از کم ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ کو آنا چاہئے تھا ــ وہ اپوزیشن کے لیڈر تھے۔ برطانیہ میں اپوزیشن لیڈر کا درجہ وزیر اعظم کی ٹکر کا سمجھا جاتا ہے۔

رام سبھاگ سنگھ بھی اپنے عمل و کردار سے کچھ ایسا ہی طرز اختیار کئے ہوئے تھے جیسے وہ کم سے کم مستقبل کے وزیر اعظم ہوں۔ لیکن یہ انھوں نے کیا کیا کہ عین موقعے پر دغا دے گئے لوگ اب ان کے فربہ اور نیچے ہی نیچے پھیلے ہوئے جسم کو دیکھنے سے محروم رہیں گے۔ جسم بھی چھوڑیئے وہ جب زمین کو "جمین" اور غریب کو "گریب" بولتے تھے اور ایسوسی ایشن کو "ایسوسی ایسن" تو لیجئے لسانیت کے پھولوں سے پورا ایوان معطر ہو جاتا تھا ہائے ہائے انھوں نے ڈیسائی کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اور اگر ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ نہ آئے تو یہ تارا کیشوری سنہا کو کیا ہو گیا۔ وہ تو ڈیسائی جی کی بڑی پرانی رفیق تھیں، ہر وقت کا ساتھ تھا حتیٰ کہ وزارت خزانہ تک میں ساتھ رہا ــ ایک وزیر تو دوسرا نائب وزیر۔ انھوں نے اس نازک وقت پر کیوں بے وفائی کی ــــ یوں بھی تارا کیشوری ایوان کی جان تھیں۔ ان کے دم سے ایوان کی رونق تھی۔ جب بولتیں تو انکے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ کانگریسی انکی گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہوتے تھے اور ڈیسائی کی گردن اکڑ جاتی تھی۔ لیکن اب یہ بہار کے دن اجڑ گئے۔ دونوں کے دونوں غائب ہو گئے بالکل ایسے جیسے کسی کے سر سے سینگ غائب ہو گئے ہوں۔ اور یہ کتنا غضب ہے کہ خود گئے تو گئے "اسوک مہتہ" کو بھی لے گئے امریکی طرز کی سوشلزم کے "بابائے آدم"۔ انکی خشخشی داڑھی والا چہرہ ڈیسائی کے لئے ایک سہارا تھا۔ سنٹرل ہال میں وہ جب سگار سلگاتے تو ان کا چرچل کا موڈ بن جاتا تھا۔

انھیں بھی چھوڑیئے یہ آخر سوچیتا کرپلانی اور ڈاکٹر سوشیلا نائر کو کیا ہوا؟ یہ دونوں تو بڑی سنجیدہ خواتین تھیں کم از کم ان ہی کو ڈیسائی صاحب کے حال پہ رحم آنا چاہئے تھا کہ بے چارے اتنے بڑے ایوان میں اکیلے رہ جائیں گے اور اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا انکی اس بے وفائی پہ ہم سخت احتجاج کرتے ہیں۔ اور ڈیسائی بھائی کی بے کسی پہ اپنے قیمتی آنسو بہاتے ہیں۔

ڈیسائی صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ بالکل نہ گھبرائیں اور ہمارا خیال ہے کہ وہ گھبرائیں گے بھی نہیں کیونکہ وہ ہم [illegible]

باقی ص ۴۶

(طنزیہ)

قصہ میرے چار جنموں کا



ناوک حمزہ پوری

یہ کہنا کہ آپ مجھے نہیں جانتے بے وقوفی ہی نہیں حماقت ہوگی۔ کیونکہ راجا ہو یا پرجا۔ امیر ہو یا فقیر۔ نیتا ہو یا جنتا۔ سب کے سب نہ صرف یہ کہ میرے واقف کار بلکہ عاشق زار ہیں۔۔۔ ویسے میں بتا تا چلوں کہ میرا نام پیسہ ہے۔ جی ہاں پیسہ۔ ایک ایسا پرکشش نام جس کی قوتِ مقناطیسی سب کو اپنی طرف کھینچے لئے جاتی ہے۔ ہر آدمی کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے پاس روپیے ہوں۔ مثل بھی مشہور ہے کہ :

"جس کے پاس نہیں ہو پیسہ، اس کا جگ میں جینا کیسا"

اگر آپ کی عمر دس پندرہ سال سے کم ہے تو پھر مجھے آپ سے کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ آپ ٹھہرے نابالغ۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کو کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو بہ لحاظِ عمر تو بالغ ہوتے ہیں لیکن دوسرے کئی اعتبارات سے کورے نابالغ ہی رہ جاتے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ممکن ہے آپ کو اپنی بات سمجھانے میں مجھے دقت ہو۔ ویسے اگر آپ کو دلچسپی ہو تو میرے پچھلے جنموں کا حال آپ کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تناسخ پر میرا عقیدہ ہے۔ دور کیوں جایئے سنا ہے چچا غالب بھی تناسخ کے قائل تھے۔

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ کی عمر پندرہ برس کی بھی ہے تو آپ میرے پچھلے جنم میں بھی ضرور میرے شناسا رہے ہوں گے۔ میرا پرانا روپ۔ پرانا پیسہ۔ ایک انچ قطر والا۔ آٹھ آنے بھر وزن والا۔ میری وہ شکل و صورت کئی جگوں تک برقرار رہی۔

ریشن کارڈ ہوا تو ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مسرت ہوئی تھی۔ آزادی کا ماحول پاکر انگوٹھے کا نشان لگانے والے کونسل کی ممبری سے وزارت کی کرسی تک پر براجمان ہوئے۔ سبنے سیٹھ جی اور نیتا دھنوان ہو گئے تو میری بھی کچھ امید بندھی کہ اب کچھ پھلنے پھولنے کا موقع مجھے بھی ملے گا۔ لیکن ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ میرا جو جنم ہوا تو میں پہلے سے بھی چھوٹا تھا سنتا ہوں کہ وجہ ماہرین کا خیال ہے نا کہ اپنے دیش میں انسانوں کو مقوی غذا نصیب نہیں اور نتیجے میں دن بدن نسل خراب ہوتی جارہی ہے۔ ناٹے ٹھونٹھے۔ لاغر و کمزور لوگ اور یہی حالت اگر سو دو سو سال برقرار رہی تو اپنے ملک میں صرف آدمی نما گدھے ہی رہ جائیں گے۔۔۔ عقل سے عاری انداز یہ ہے کہ میری نسل بھی کچھ یونہی متاثر ہوئی ہوگی۔ ورنہ میں چھوٹا کیسے ہوتا۔ پھر بھی صبر کیا کہ جانے دو بلا سے چھوٹا ہوں۔ شکل و صورت تو باپ داداؤں سے ملتی جلتی ہے۔

میری داستان بڑی دردناک ہے جناب۔ کہیں آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں۔ معاف کیجئے یہ اس لئے پوچھا کہ اکثر لوگوں کو دوسروں کی مصیبتوں کا احساس کم ہی ہوتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر ایک انسان دوسرے انسان کو کیوں چھرا گھونپتا۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کیوں گولی مار دیتا۔۔۔ سچی۔ آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ مجھ سے جان پیسے سے بھی بُرا۔ بلکہ پیسے کا جنا۔ معذرت خواہ ہوں جناب۔ آپ بھی آدمی ہی ہوں گے شاید !۔ میں سارے آدمیوں کو نہیں کہتا۔ لیکن کچھ لوگ تو واقعی پیسے کے بنے ہوتے ہیں۔

بات سے بات یاد پڑتی ہے۔ اب جب گولی کا ذکر چھڑا ہے تو عرض ہے کہ اب کے پھر جب میرا جنم ہوا تو میرے سینے پر ایک بڑا سوراخ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے چھاتی پر گولی ماردی ہو اور وہ صاف آر پار ہو گئی ہو۔ پتہ نہیں یہ بھی نسل کی خرابی کا نتیجہ تھا یا کچھ اور۔ ہاں سنا ہے کہ اٹیمی ذرات کے اثر سے بھی نسل انسانی متاثر ہوئی ہے۔ اخبار پڑھ تو نہیں سکتا لیکن جب لوگ اسے پڑھتے ہوتے ہیں تو ان کی جیب میں چپکا بیٹھا سنتا رہتا ہوں۔

سنا ہے کئی بچے ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کے کان ہیں تو آنکھ نہیں، پاؤں ہیں تو ہاتھ ندارد۔ لوگ ایسے موقعوں پر خدا کی قدرت کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں سنتا ہوں تو ہنسی آجاتی ہے۔ کرنی اپنی تصور خدا کے سر۔ بیچارا خدا۔ وہ اس کے علاوہ اور کیا کرتا ہے کہ آپ ببول لگائیں تو ببول اگا دے اور آم لگائیں تو آم پھیلا دے۔ پتہ نہیں اپنی ہی ایجادات کو اپنی ہی تباہی کے لئے انسان کیوں استعمال کرتا ہے۔۔۔؟ لیکن چھوڑیئے ان ظالموں، جاہلوں کو۔ مجھے تو اپنی فکر ہے۔

وائے بر حالِ من۔ اس بار جو پھر میرا نیا جنم ہوا تو میں خود اپنے آپ کو پہچان بھی نہ سکا۔ یہ پیسہ تھا یا پیسے کا بچہ۔ دل کا زخم تو بھر آیا تھا لیکن احساس زخم پھر سے ہرا ہو گیا۔ کیا بتاؤں ایسا چھوٹا سا۔ اتنا ذرا سا کہ بس جیسے عورتوں کی بندیا۔ شرم آتی ہے اپنا حال بیان کرتے ہوئے لیکن ایک بار پھر آدمیوں کی حالت کو دیکھ کر دل مضبوط کیا۔ معاف کیجئے گا۔ اب آپ کی برادری میں بھی شرم و حیا، لوک لاج نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ یہ سوچ کر کھلے بندوں گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ اب تک پھر بھی ایک بات کا اطمینان تھا یعنی یہ کہ شکل و صورت میں کچھ بھی زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ چہرے پر وہی سرخی، شریانوں میں ویسا ہی خون۔

خون کا ذکر چل نکلا تو خیال آتا ہے کہ خون کا سفید ہونا بھی مشہور ہے۔ سر گریبان میں ڈال کر ذرا غور کیجئے تو سہی۔ آپ کے بھائی بندوں میں بھی کئی ایسے نکل آئیں گے جن کا خون آپ کو سفید معلوم ہوگا۔ میرے ساتھ یہ سانحہ بھی عظیم ہی رہا ہوا۔ یعنی موجودہ جنم میں میرا خون بھی سفید ہو گیا۔ شکل گھٹ گئی صورت چوپٹ ہو گئی۔ آہ کیسا خوبصورت گول سا چہرہ چوکور ہو کر چوپٹ ہو گیا ہے۔ باقی ص ۳۷ پر

شناشی

سید عارف نعمانی

کلاسیکل رقص اور قدیم روایات کا پرستار ـــ منی پور



سبز سے بھرے کھیت اور گنگناتے ہوئے جھرنے حسین تحفوں سے مالا مال پرسکون جنگل اور ان گنت جھرنوں سے بھرا یہ علاقہ منی پور کا ہے جو ہمالہ کی گود میں شمال مشرقی حصے میں واقع ہے۔ سیاح جو اس علاقے کی سیر کے لئے آتے ہیں اس کے بے پناہ حسن سے مسحور ہو کر جاتے ہیں۔

منی پور کا یہ علاقہ ۸۰۰۰ مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ مشرق اور جنوب میں برما اور مغرب میں آسام اور ناگا لینڈ سے گھرے ہوئے اس علاقے کی آبادی سات لاکھ اسی ہزار ہے۔ اس کا پایۂ تخت امپھال ہے اور یہاں کے لوگوں کی زبان منی پوری اور آسامی ہے۔

اس پہاڑی علاقے کے لوگ اپنا تعلق مہابھارت کے پانڈوؤں سے جوڑتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق مہابھارت کا ہیرو ارجن ایک دفعہ انجانے طور پر خاندان کے اصولوں کو توڑ کر اپنی تیر کمان لینے کے لئے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اس کا بھائی "یدھشٹر" اور بیوی "دروپتی" (جو سات بھائیوں کی مشترکہ بیوی تھی) بیٹھے ہوئے تھے۔ ارجن کو اس طرح مخل ہونے کے جرم میں بارہ سال تک کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔

ارجن مشرقی پہاڑوں میں چلا آیا جہاں اس کی ملاقات شہزادی الوپی سے ہوئی۔ ارجن الوپی کو اپنا دل دے بیٹھا مگر وہ چند ماہ بعد مہندرا پور چلا گیا جہاں اس کی شادی وہاں کے ایک راجا بادھیترا دھن کی بیٹی چترن گرداسے ہو گئی ان کا پہلا بیٹا ببرو بھن پہلا آریا راجا بنا۔ اس نے چند بڑی صوبے فتح کئے اور ناگا علاقے (آج کا ناگالینڈ) پر حملہ کیا جو ناگا راجا نے بغیر مقابلہ کئے اپنی سلطنت جو "منی" کے نام سے مشہور تھی اس کے ماتحت کر دی اس دن سے آج تک اس علاقے کو منی پور کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

منی پور میں لوگ قدیم روایتوں اور اصولوں کے پرستار ہیں۔ منی پور کے قبائلی متھی کے نام سے مشہور ہیں۔ مضبوط دل اور جسم کے یہ قبائلی کافی لمبے ہوتے ہیں۔ زراعت انکا خاص پیشہ ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کے مرد عورتوں کی بہ نسبت بڑے لاابالی اور کاہل ہوتے ہیں۔



متھی سماج میں عورتوں کو اچھا مقام حاصل ہے۔ یہاں کی عورتیں کھانے پکانے، سینے پرونے اور کپڑے بنانے میں مشغول رہتی ہیں۔ یہ عورتیں بہت کم شرماتی ہیں۔ ریشمی اور سوتی ساریاں یہاں کی عورتوں کا محبوب لباس ہے۔

عورتوں کو رنگریزی کے فن میں کمال حاصل ہے۔ ان عورتوں کو زیورات پہننے کا بھی بڑا شوق ہے۔ یہاں کی غریب سے غریب عورت بھی سونے کے زیورات میں لدی ہوئی نظر آتی ہے۔ عورتیں فطرتاً بڑی فیاض اور مہمان نواز واقع ہوئی ہیں چندہ اور خیرات کے معاملے میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔ ایک دفعہ جب سبھاش چندر بوس جی نے اپنی آزاد ہند فوج کی تنظیم کے لئے ان عورتوں سے چندہ دینے کی اپیل کی، تو انھوں نے فوراً اپنے سونے چاندی کے زیورات سبھاش جی کی نذر کر دیے۔ نیتا جی نے پہلی دفعہ اس علاقے میں ہی عورتوں اور مردوں پر مشتمل اپنی فوج کی تنظیم کی تھی۔

منی پور کے لوگ ہندو مذہب کو مانتے ہیں۔ ان کا مشہور تہوار "لائی ہوراؤبہ" کے نام سے مشہور ہے۔ جو بڑی شان و شوکت سے علاقے بھر میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار میں علاقے کی تمام عورتیں اپنے قبائلی لباس پہن کر رقص و سرود کی محفلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتی ہیں۔

منی پور کی قدیم تاریخی داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ یہاں متھی خاندان کے ایک راجا کی تخت نشینی کے وقت ایک جھگڑا ہو گیا تھا اور پوری ریاست پر مشکل آپڑی تھی۔ ایسے وقت میں لوگ اپنی تمام خوشیوں کو بھلا کر ملک کے دفاع کے لئے دل و جان سے تیار ہو گئے تھے۔

ایک مختصر سی جنگ کے آخر میں جب ان کے بادشاہ کو پھر اقتدار حاصل ہو گیا تو اس خوشی کے موقع پر ریاست بھر میں ایک جشنِ مسرت منعقد ہوا۔ اس جشن میں پہلی بار منی پور کے مرد اور عورتوں نے ایک تاریخی رقص پیش کیا تھا آج بھی منی پور میں ہر سال اس تاریخی واقعے کی یاد میں ایک شاندار جشن منعقد ہوتا ہے اور منی پور کے ان شہیدوں کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے علاقے کی آزادی کے لئے جان دی تھی۔

منی پور کی عورتیں فنِ رقص کی باریکیوں کو خوب سمجھتی ہیں اور مختلف قسم کے رقص جانتی ہیں۔ یہاں رقص کو ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔

واقعات نئی دہلی

بقیہ۔ قصہ میرے چار جنموں کا

ہاں تو محترم! ——— لیکن ذرا رک جائیے۔ اب تک میرا تخاطب صرف مردوں کے لئے ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ عورت ہوں۔ ایسی حالت میں ایک آدھ تخاطب آپکے لئے بھی ہونا ضروری تھا۔ ناراض نہ ہوں۔ یہ چوک صرف جذبات کی رو میں بہہ جانے کی وجہ سے ہو گئی ہے ورنہ ہم عورتوں کی زیادہ عزت کرتے آئے ہیں۔ ہم تو سیتا رام کہنے کے عادی ہیں رادھے کرشن کو سمجھنے والے ہیں۔ ویسے ذرا آپ ہی غور فرمائیے کہ ایک ساتھ دونوں کو مخاطب کرنے لیعنی۔ محترم، محترمہ بولنے یا لکھنے میں کتنی دقت ہوتی ہے۔ عقلمند نکلے تو انگریزی والے ہی۔ ان لوگوں نے ایک "کامن جینڈر" بھی بنا ڈالا۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ مخنث ہوں۔ نہ عورت، نہ مرد۔ معاف کیجئے آپ کی دل شکنی میرا مقصد نہیں تھا۔ لیکن یہ بات تو آپ کو بھی ماننی چاہیئے کہ ملک کے لوگوں میں نامردی/بزدلی گھر کرتی جا رہی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو مادرِ وطن کے اتنے بڑے بڑے خطوں پر دشمنوں کا قبضہ اب تک کیسے بنا رہ سکتا تھا۔

ہاں تو محترم یا محترمہ، جو کچھ بھی آپ ہوں۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب تک تو صرف شکل و صورت کی بات ہوئی قدر و قیمت کی نظر سے بھی مجھے انسانوں نے آسمان سے اتار کر زمین پر پھینک دیا ہے۔ لیکن آدمی بھی عجیب الٹی کھوپڑی والا ہے جب بھی قیمتوں کا ذکر کرتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ قیمتیں آسمان کو چھوتی جا رہی ہیں۔

معاشیات کے عالم جانتے ہیں کہ کوٹلیہ کے وقت میں مجھ (ایک پیسے کے) بدلے آپ دو سیر شکر، ڈھائی سیر چاول یا گیہوں اور آدھ من نمک خرید سکتے تھے۔ یہاں تک کہ گھی بھی ایک پیسے کا دو سیر مل جاتا تھا۔

منی پور کے مرد دھوتی اور قمیص پہن کر، اور عورتیں اپنے روائتی اسکرٹ میں جب قطار در قطار رقص کرتی ہیں تو یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

چند رقص ایسے بھی ہیں جن کے دوران عورتیں منظوم داستانیں سناتی ہیں۔ ایسا ہی ایک رقص "بوگالی" ہے جو ایک قدیم کہانی پر مشتمل ہے۔ یہ ایک شہزادی کا المیہ ہے جو ایک عام آدمی سے محبت کرنے لگی تھی۔

منی پور قدرت کے مناظر اور ہمارے ملک کی پرانی تہذیب اور کلچر کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ میں اسے "دیوتاؤں کا ملک" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

میری یہ قدر و قیمت تقریباً ستره سو سال تک یعنی ۱۳ویں یا ۱۴ویں صدی تک قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے آپ لوگوں نے میری شان میں بٹہ لگانا شروع کر دیا۔ اور آج تو یہ حال ہے کہ آپ ہی کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ مجھے جیب میں رکھ کر ذرا بازار گھوم آئیں۔ میرے بدلے آپ کونسی چیز خرید سکتے ہیں۔ جس دوکاندار سے آپ کچھ مانگیں گے وہ چاہے آپ کو سچ مچ جھاڑو نہ مارے لیکن محاورے والا جھاڑو ضرور مار دے گا۔ اور آخر کار جب مایوس ہو کر آپ لوٹیں گے تو جی میں آئے گا کہ چلو اور کچھ نہ بن سکا تو بھکاری ہی کو دے ڈالوں۔ ویسے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے لینے سے انکار کر دیگا ممکن ہے ابھی انکار کرے لیکن ذرا اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کیجیے گا۔ آپ کو لگے گا جیسے وہ زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔ ایک خطرہ اور ہے۔ ممکن ہے آپ اسے جیسے ہی پیسہ تھما کر آگے بڑھیں وہ آپ کو دعاؤں کے بدلے کوئی موٹی سی گالی دے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ذرا تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے نکل جایئے گا۔

مصیبت یہیں ختم ہو جاتی تو صبر کر لیتا۔ چلو نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے لیکن ایک خوفناک خطرے کی بو مجھے مل رہی ہے آپ دیکھ لیجئے گا۔ ایک دن یہ انسان میرا وجود مٹا کر ہی دم لے گا۔ ہاں ہاں! میں نے آدمیوں کو بہت دیکھا پرکھا ہے تعمیر سے کہیں زیادہ تخریب میں اس کی دلچسپی ہے۔ ■■

موت کا جشن

موپاساں

زندگی میں کئی قسم کے مکانات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، پتھر اور لکڑی کے مکانات۔ لیکن ایک مکان اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر مجھے اب تک یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ کوئی عظیم عمارت نہ تھی، معمولی سا ایک منزلہ مکان تھا، تین کھڑکیوں والا، بظاہر ایک ایسی معمّر اور کوتاہ قد عورت کی طرح جس نے سر پر ٹوپی پہن رکھی ہو سفید دیواروں اور سرکنڈے کی چھتوں پر کائی جم چکی تھی اور چاروں طرف درخت سبز جھاڑیاں اور پھولوں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ درخت اور پودے مکان میں رہنے والوں نے لگائے تھے سبھی چھوٹے صحن میں جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس سڑک پر چونکہ گاڑیوں کی آمد و رفت نہ تھی، اس لئے زیادہ راہ گیر ادھر نہیں جاتے تھے۔ مکان کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی تھیں، کیونکہ یہاں رہنے والوں کو روشنی کی زیادہ پروا نہ تھی۔ وہ کھڑکیاں اس لئے بھی نہیں کھولتے تھے کہ انھیں تازہ ہوا کا شوق نہ تھا۔ وہ لوگ جو پھولوں اور سبزے کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں فطرت کے مناظر میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ تو صرف سیاح اور شاعر لوگ ہیں جنھیں خدا نے حُسنِ فطرت کے لئے چشم بصیرت دی ہے۔ رہے عام لوگ، تو وہ فطری حسن کے وجود سے واقف بھی نہیں ہوتے۔ وہ اس چیز کی کیا قدر جانیں جو انھیں افراط سے ملتی ہے۔ ویسے بھی جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے اُسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی جو ہماری دسترس میں ہے۔

یہ چھوٹا سا مکان ہرے بھرے درختوں کی جنت ارضی میں واقع تھا۔ ان درختوں کی شاخوں پر آزاد منش چڑیوں کے گھونسلے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن مکان میں رہنے والے... اف! کس قدر بے بس اور بندھا جکڑا مکان تھا یہ۔ سرد دیوار میں تو اس جگہ سے بالخصوص ٹھنڈ، اداسی اور وحشت ٹپکتی تھی۔

میں نے پہلی بار یہ مکان اس وقت دیکھا جب بہت عرصہ پہلے ایک کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا۔ اس مکان کا مالک ایک کرنل تھا اور میں اس کی بیوی اور لڑکی کے لئے ایک خط لے کر اس جگہ آیا تھا۔ وہ وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ لمحے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ذرا چالیس برس کی ایک نحیف و ناتواں خاتون کا تصوّر کیجئے جو خوف و اضطراب سے آپ کی طرف دیکھ رہی ہو، آپ ایک اجنبی بے ضرر نوجوان ہیں، پھر بھی وہ آپ سے خوفزدہ ہو۔ آپ کے پاس کوئی چاقو، پستول یا بندوق نہیں، آپ اخلاق و تواضع سے مسکرا رہے ہیں لیکن وہ مسلسل ڈرے جا رہی ہو اور پھر اس کے ہونٹ ہلتے ہیں۔

"جناب میں کس سے متعارف ہونے کی مسرت حاصل کر رہی ہوں؟" بات کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی ہے۔

تو صاحب یہ سارا قصّہ تھا۔ جواب میں میں نے اپنا تعارف کرایا۔

خوف اور حیرت کی جگہ عارضی خوشی نے لے لی وہ تیز لہجے میں بولی۔

"اچھا، اچھا" ان الفاظ کی بازگشت سے ہال کمرہ گونج اٹھا۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور وہاں سے اندرونی حصے کی طرف۔ تھوڑی دیر بعد مکان میں سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔

پانچ منٹ بعد میں مہمان خانے میں نہایت نرم اور آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف ابھی تک لفظ "اچھا" کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ سیلن اور بجری کے کچے چمڑے کی بو آ رہی تھی۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے جن پر مکھیاں بیٹھی تھیں۔ دیوار پر ایک راہب کی روغنی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کے شیشے کا ایک کونہ ٹوٹ گیا تھا۔ راہب کی تصویر کے ساتھ ساتھ گھر کے دوسرے لوگوں کی تصویریں بھی لٹک رہی تھیں۔ میز پر سوئیاں، دھاگے کا گولا اور ایک نامکمل موزہ پڑا تھا جسے ابھی بنا جا رہا تھا۔ کاغذ کے بنے ہوئے سلائی کے چند نمونے بھی تھے۔ ساتھ والے کمرے میں خوفزدہ اور حیران و ششدر دو عورتیں فرش پر سے اسی قسم کے نمونے جمع کر رہی تھیں۔ ان میں سے عمر رسیدہ خاتون بولی۔

"معاف کیجیے یہاں خاصی گندگی ہے"

مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک فرش پر کاغذ کے نمونے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی طرح کمرے کا دروازہ بھی شرمندہ نظر آتا تھا کیونکہ ایک انچ دو انچ کھلتا، پھر بند ہو جاتا۔ آخر دروازہ کھلا اور انیس بیس برس کی ایک دبلی پتلی لڑکی اندر آئی۔ اس نے بہت معمولی کپڑے پہن رکھے تھے چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا۔ لمبی ناک پر چیچک کے داغ اور سرخ سرخ آنکھیں۔ عورت اسے دیکھتے ہی بولی۔

"یہ میری لڑکی ہے"

میرا تعارف کرایا گیا۔ کاغذی نمونوں کی تعداد پر میں نے تعجب ظاہر کیا تو ماں اور بیٹی نے اپنی نظریں جھکا لیں

داستانیں نئی دہلی

خاتون نے کہا۔

"میرے شوہر کی تنخواہ زیادہ نہیں ہم دوسروں کی بنائی ہوئی چیزیں نہیں خرید سکتے یہاں سٹیشن کے پاس ہر سال ایک میلہ لگتا ہے ہم اس میلے میں سے کپڑا گوٹا وغیرہ خرید لیتے ہیں اور سال بھر خود کام کرتے ہیں۔"

"لیکن اتنے کپڑے آپ کریں گی کیا؟ آپ تو صرف دو ہیں۔"

"اوہ آپ سمجھے نہیں یہ کپڑے پہننے کے لئے نہیں، یہ تو میری بیٹی کے جہیز میں دیئے جائیں گے۔"

"امّی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، نہ معلوم یہ کیا سمجھیں گے میں شادی نہیں کروں گی۔ جی ہاں میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" لڑکی نے بظاہر ملامت کی، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ شادی کے ذکر سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے اور آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد چائے، بسکٹ، مکھن اور جام سے میری تواضع کی گئی۔ سات بجے ہم نے کھانا کھایا ساتھ والے کمرے سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ خاتون نے بتایا۔

"یہ میرے شوہر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک سال سے ہمارے پاس رہتے ہیں کسی سے نہیں ملتے بہت شرمیلے ہیں ملازمت میں ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی، اس وجہ سے مایوس ہو گئے ہیں۔ کوئی دن میں خانقاہ چلے جائیں گے۔"

کھانے کے بعد مجھے کپڑے دکھائے گئے جن پر کرنل صاحب کے چھوٹے بھائی نے پھول بوٹے بنائے تھے۔ لڑکی بھی مجھ سے ذرا بے تکلف ہو گئی اور اس نے مجھے تمباکو کی ایک تھیلی دکھائی جو اس نے اپنے والد کے لئے تیار کی تھی میں نے مصنوعی تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تعریف کی اس پر لڑکی ذرا شرمائی اور پھر ماں کے کان میں کچھ کہا ماں اچھل پڑی اور مجھ سے دوسرے کمرے میں چلنے کی درخواست کی۔ وہاں بھر بڑے صندوق اوپر تلے رکھے تھے خاتون بولی۔

"یہ میری بیٹی کا جہیز ہے، یہ سب ہم نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔"

ان صندوقوں کا سامان دیکھنے کے بعد میں نے اپنے میزبانوں سے اجازت چاہی۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں وقتاً فوقتاً ان کے ہاں آتا رہوں گا۔

واقعات نئی دہلی

وقت گزرتا چلا گیا اتفاق سے میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ سات برس بعد ایک مقدمے کے سلسلے میں دوبارہ اس قصبہ میں گیا تو کرنل صاحب کی بیوی اور بیٹی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہاں پہونچنے پر انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ ماں پہلے کی نسبت بہت کمزور ہو گئی تھی اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور وہ فرش پر بیٹھی کپڑا کاٹ رہی تھی بیٹی پرانے صوفے پر آلتی پالتی مارے کشیدہ کاری میں مصروف تھی، پہلے کی طرح ان کمروں میں ہلکی ہلکی نمی کی بو تھی چاروں طرف کاغذ کے مختلف نمونے بکھرے ہوئے تھے۔ پادری کی تصویر کے پاس کرنل کی ایک تصویر لٹک رہی تھی، ماں بیٹی دونوں ماتمی کپڑوں میں ملبوس تھیں صاف نظر آتا تھا کہ کرنل صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بیوہ خاتون نے پچھلے واقعات سنانے شروع کئے۔ باتیں کرتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ہم برباد ہو گئے ہیں" یہ کہہ کر وہ رکی "آپ جانتے ہیں کہ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب ہم دنیا میں اکیلے ہیں۔ خانقاہ والوں نے میرے شوہر کے بھائی کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ بہت زیادہ شراب پینے لگے تھے۔ مایوسی کی وجہ سے انھوں نے اور زیادہ پینی شروع کر دی ہے۔ سوچتی ہوں ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں اور ان سے مدد مانگوں۔ کیا کروں؟ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ ہمارے صندوقوں کے قفل توڑ چکے ہیں۔ سارا جہیز انھوں نے فقیروں میں بانٹ دیا۔ دو صندوق تو بالکل خالی ہو چکے ہیں یہی حال رہا تو میری بیٹی کا سارا جہیز غائب ہو جائے گا۔"

"امّی یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں،" لڑکی نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ کیا سمجھیں گے...... میں شادی نہیں کروں گی یقین مانئے میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔" یہ کہہ کر وہ چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اس کی آنکھوں سے ابھی تک امید جھلک رہی تھی۔ اس اثنا میں ایک کوتاہ قد آدمی دبے پاؤں برآمدے میں سے گزرا میں سمجھ گیا کہ وہ کرنل صاحب کا چھوٹا بھائی ہے۔

ماں اور بیٹی دونوں بدل گئے تھے۔ بیٹی تو بالکل مرجھا گئی تھی اور یوں نظر آتا تھا جیسے بیوہ خاتون اس کی ماں نہیں بڑی بہن ہے۔ خاتون پھر بولی۔

"میں ڈپٹی صاحب کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہ بات پہلے بھی کہہ چکی ہے۔ میں ان سے کہوں گی کہ اب وہ ہماری چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے ہیں۔ ہم جو چیز بناتے ہیں، وہ لے کر لوگوں میں خیرات کر دیتے ہیں پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں کہ ثواب ملے گا۔ لیکن میری بیٹی کا کیا ہوگا اس کا جہیز کہاں سے آئے گا۔"

لڑکی کا رنگ پھر سے اڑ گیا۔ لیکن اس مرتبہ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

"مجھے پھر سارا سامان تیار کرنا پڑے گا خدا جانے کہاں سے آئے گا یہ سامان، ہم بہت غریب لوگ ہیں، اس دنیا میں ہمارا کوئی نہیں۔"

"ہاں اس دنیا میں ہمارا واقعی کوئی نہیں ہم بالکل اکیلے ہیں۔" لڑکی نے بھی وہی بات دہرائی۔

ایک سال اور گزر گیا، قسمت کی بات ہے ایک مرتبہ پھر مجھے اس مکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو خاتون سیاہ ماتمی لباس میں صوفے پر بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ قریب ہی اس کے شوہر کا چھوٹا بھائی زرد رنگ کا ایک میلا سا کوٹ پہنے بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ اچھلا اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر میں خاموش رہا، پھر آہستہ سے پوچھا۔

"یہ آپ کیا بن رہی ہیں؟"

اونی جیکٹ ہے، سوچتی ہوں مکمل ہو جائے تو پادری صاحب کے پاس لے جاؤں۔ آجکل میں بیٹی کے جہیز کی ساری چیزیں پادری صاحب کے پاس رکھتی ہوں ان سے بہت ڈر لگتا ہے ہر چیز لے کر بھاگ جاتے ہیں" اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا اور اپنی لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی جو میز پر رکھی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"اب میں دنیا میں بالکل اکیلی ہوں"

یہ میں نے نہیں پوچھا کہ اس کی بیٹی کہاں گئی پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ غم زدہ خاتون نئے ماتمی لباس میں تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا اور جب جانے کے لئے اٹھا تو وہ لڑکی مجھ سے ملنے نہیں آئی نہ میں نے اس کی ملائم آواز سنی نہ اس کے قدموں کی نرم آہٹ۔

میں سمجھ گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

انقلاب کے بعد مصری خواتین ترقی کی راہ پر

شخصی حکومت کے خاتمہ کے بعد مصر میں عورت کے کردار اور اس کی کامیابیوں کی داستان

۱۹۵۲ء کے مصری انقلاب کے بعد جس میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور مصر کے نوجوان فوجی افسروں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مصری عورت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، کیونکہ اس انقلاب کے بعد یہاں عورتوں کو ووٹ دینے کے حق سے لے کر عوامی زندگی میں اہم عہدوں پر فائز ہونے تک کے حقوق ملے۔

صدر ناصر کے دور میں ان کی کابینہ میں ایک خاتون وزیر ڈاکٹر حکمت ابوزید بھی شامل تھیں اور غالباً یہ اس ملک میں کسی عورت کو حاصل ہونے والا سب سے بڑا عہدہ تھا لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے اہم عہدے ایسے ہیں جن پر عورتیں فائز ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سہیزہ القلما‌ئی مصر کے طباعت و اشاعت کے مرکزی ادارہ کی چیئرمین ہیں۔ کریم السعید وزارت تعلیم و ثقافت کی انڈر سیکریٹری رہ چکی ہیں اور زبیدہ مرزوقی اسکندریہ کے شعبہ سماجی بہبود کی سابق ڈائرکٹر کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔

ان معروف و مشہور شخصیتوں کے علاوہ بہت سی دوسری خواتین بھی ملک کے اونچے عہدوں پر فائز ہیں، مثلاً فاطمہ عنان سکنڈری تعلیم کی ڈائرکٹر جنرل، اور احسان بدران شعبہ اعداد و شمار کی ڈائرکٹر جنرل ہیں۔

انکے علاوہ بھی ڈائرکٹر جنرل کے تین دوسرے بڑے عہدے اور خواتین کی سماجیات اور سائنسی امور کی مشیر کا عہدہ بھی خواتین ہی کے پاس ہے۔

ایڈمنسٹریشن سے تعلق رکھنے والی کئی خواتین اور تین علاقوں کی سکریٹریوں کو وزارت تعلیم کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدوں پر ترقی دی جانے والی ہے، ملنے بڑے عہدوں پر عورتوں کی ایک خاص تعداد کی موجودگی کے بعد اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ علاقائی سرویوں میں عورتیں بڑی تعداد میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

وزارت تعلیم کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر امید ہے کہ مستقبل قریب میں صنف نازک کو مزید اہم ذمہ داریاں سونپی جائیں گی۔ وزارت تعلیم و ثقافت میں خواتین ملازمین کی تعداد اس وقت ۶۲۳۱۳ ہے یا کل ملازمین کا ۴۰ء۴ فیصدی۔ انکی اکثریت تعلیمی اداروں میں کام کرتی ہے۔ ایسی خواتین کی تعداد ۴۹۳۴۲ ہے، یا ۵ء۷ فیصدی جبکہ ۲۵ء۱ فیصدی یعنی ۵۶۹ خواتین اعداد و شمار سے متعلق عام اداروں میں کام کرتی ہیں۔

عام سکنڈری تعلیمی مراکز میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۲۴ء۰ فیصدی یعنی ۳۵۲۹ خواتین پر مشتمل ہے جبکہ ٹیچنگ ٹریننگ سنٹروں میں یہ تعداد ۹۳۲ یعنی ۴۳ء۸ فیصدی ہے۔ لیکن ٹکنیکل تعلیم کے میدان میں یہ شرح کافی کم ہے۔ یہاں خواتین ملازمین کی تعداد ۱۵۵۴ یعنی ۱۲ء۴ فیصدی ہے۔

عملی انجینیرنگ کے میدان میں کئی نئے چہرے سامنے آئے ہیں جن میں صنعتی سلامتی کے ادارہ کی سربراہ سفینہ الحو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ متحدہ عرب جمہوریہ میں ایک خاص موڑ کی نشان دہی کرتا ہے۔ انجینیرنگ کے میدان میں دوسری ممتاز شخصیت مردینہ رحمت کی ہے جو زیر تعمیر یونٹوں کی الکٹرک منصوبہ بندی کی مکمل انچارج ہیں ظاہر ہے کہ اتنی ذمہ داری کا کام انقلاب سے پہلے کسی بھی عورت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس میدان میں دوسری اہم شخصیت انجینیر عائدہ کی ہے وہ شپ یارڈ پلاننگ کی اکزیکیٹو انجینیر ہیں۔ اس طرح کے علمی کام جو اب تک صرف مردوں کے سپرد ہوتے تھے، اب ان کی ذمہ داریاں عورتوں کو بھی دی جانے لگی ہیں۔ ایسی سربراہ شخصیتوں میں ڈاکٹر عائدہ سراتی کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مصر کی پہلی خاتون ہیں جن کے سپرد اسکندریہ میں دوا ساز کمپنی کے کیمیائی شعبہ کی سپروائزری کی ذمہ داری ہے۔ انھوں نے اپنی سابقہ ذمہ داری سے نمٹنے کا پوری اہلیت کیساتھ مظاہرہ کیا اور اس لئے اب انھیں طبی ضروریات کا سپروائزر بنا دیا گیا۔ یہ واقعہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال امین کو وزارت صحت میں لیبورٹریز کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔

سیاسی صلاحیت

۱۹۵۲ء کے انقلاب کا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں عورت کے حقوق میں اضافہ کر دیا گیا اس کے نتیجہ میں عورت کو اس کا حق دیا گیا ہے کہ وہ انتخابی مہم میں برابر کا حصہ لے سکتی ہے اور نہ صرف قومی سرگرمیوں میں شریک ہو سکتی ہیں بلکہ قومی اسمبلی کی ممبری کے لئے امیدوار بھی بن سکتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ اسے دستور کے مطابق مساویانہ حقوق اور جملہ ذمہ داریاں حاصل ہیں تو مصری خواتین کی مزید ہمت افزائی ہوئی اور انھوں نے پوری شدت کے ساتھ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

بعد میں سوشلسٹ یونین کی تشکیل ہوئی اور قومی زندگی میں مصری خاتون کا وجود زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا۔ اس نے تمام ترقیاتی کاموں میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور قومی تعمیر کے کاموں میں بہت جلد مردوں کے شانہ بشانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔

وزارت سماجی معاملات میں ڈاکٹر حکمت ابوزید کی شرکت نے عرب تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور عورتوں نے فرداً اہم عہدوں کے لئے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔

ماہنامہ ... دہلی

نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے لئے عورتوں نے بڑی تعداد میں داخلہ لینا شروع کیا بلکہ اپنی سیاسی امنگوں کو پورا کرنے کے لئے بھی انھوں نے قدیم روایات کی دیواریں توڑ دیں۔

ہر علاقہ اور محلہ میں عورتوں کی ایسوسی ایشنیں قائم ہیں اور وہ اپنی صنف کے لئے نمایاں کارنامے انجام دے رہی ہیں۔ ان ایسوسی ایشنوں نے سماجی سرگرمیوں اور خاص طور سے مصیبت زدہ خاندانوں کے لئے ریلیف کے کاموں اور معذور فوجی افراد کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔

مصر میں عورتوں نے اپنے انفرادی وجود کا مظاہرہ ۱۹۱۹ء کے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا اور ۱۹۵۲ء کے انقلاب سے ان کی سیاسی اور سماجی امنگوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ اب ملک میں ایک ہزار سے زیادہ مقامی ایسوسی ایشنیں عورتوں کی قائم ہیں اور ایک سو سے زیادہ خواتین کی سوسائٹیاں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔ انقلاب سے پہلے ملک میں جتنی بھی عورتوں کی تنظیمیں تھیں وہ بنیادی طور پر فنڈ جمع کرنے تک اپنی ساری صلاحیتیں محدود رکھتی تھیں۔ لیکن اب یہ تنظیمیں ہر میدان میں متحرک ہیں اور کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔

اس حیثیت سے مصری خاتون ملک کی تمام سماجی اور تنظیمی اصلاحات کے لئے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

جون ۱۹۶۷ء کے بعد ان تنظیموں نے قومی پسپائی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری قوم کو آمادہ کرنے میں زبردست کردار ادا کیا اور اپنی تمام تر توجہات شہیدوں کے خاندانوں کی مدد، پناہ گزینوں کی آبادکاری ان کے لئے بہتر کاموں کی تلاش اور ان کے بچوں کو تعلیم و تربیت مہیا کرنے میں لگا دیں۔ اب مصری عورتوں نے اسکا فیصلہ کیا ہے کہ ان پناہ گزینوں اور جنگ میں کام آنے والوں کے خاندانوں کو بہتر مواقع دینے اور انکی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ایک قومی فنڈ کی تشکیل کی جائے۔

صحت کے مراکز

۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد ملک کے مختلف علاقوں میں صحت کے مراکز قائم کرنے میں ان خواتین نے زبردست کام کئے ہیں۔ ۱۹۵۲ء تک ملک میں ایسے مراکز کی تعداد [illegible] سے زیادہ نہیں تھی لیکن اب صرف شہروں میں ایسے ۲۰۵ [illegible]

مراکز ہیں۔ اس کے علاوہ تمام دیہی علاقوں میں بھی صحت کے مناسب مراکز قائم ہیں اور ان مراکز کی خدمات تیس لاکھ سے بھی زیادہ بچوں کو حاصل ہیں۔ تنہا ۱۹۵۹ء میں گھروں پر جا کر ان مراکز کے زچگی کے اسٹاف نے ۵۶۰۰۰ ماؤں کی دیکھ بھال کی، اس کے علاوہ انھوں نے حاملہ عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال بھی گھروں پر جا کر کی۔ یہ صحت کے مراکز اور انکی سہولتیں دیہی علاقوں کو بھی مساویانہ طور پر حاصل ہیں۔

کمیونٹی ہیلتھ سروسز کے ڈائرکٹر کی رپورٹ کے مطابق دیہاتوں میں اس طرح کے مراکز کی تعداد ۱۹۵۲ء تک ۲۲۲ تھی لیکن اب دیہاتوں میں یہ تعداد بڑھ گئی ہے اس میں صحت کے مراکز کی تعداد ۵۰۸ ہو گئی ہے اور کمیونٹی یونٹس کی تعداد ۱۲۰۰ ہو گئی ہے۔ ان مراکز میں ہر طرح کی سہولتیں دی جاتی ہیں اور وہ جدید ترین اوزار سے لیس ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں ان مراکز اور یونٹوں نے ۲ لاکھ ۵۵ ہزار بچوں کی دیکھ بھال کی ان میں ۳ لاکھ ۲۸ ہزار ولادتیں ہوئیں۔

نرسنگ کے میدان میں ترقی۔

فطری طور پر صحت پر زیادہ زور دینے کا نتیجہ نرسنگ کی بہتر سہولتوں کی شکل میں نکلے گا، چنانچہ ۱۹۵۹ء میں اس کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا۔ اس وقت تک ایسے کالجوں یا اداروں کی تعداد جو اس میدان میں تربیت دیتے تھے صرف ۱۸ تھی ان میں سے ایک ہیلتھ وزیٹرس کے لئے ۹ نرسوں کے لئے اور آٹھ زچگی کی سہولتوں کے لئے تھے۔ ان اداروں میں داخلے کے لئے صرف پرائمری درجے تک تعلیم ضروری تھی۔

لیکن اب نہ صرف اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے اداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے بلکہ ان کے معیار تعلیم میں بھی بہت فرق آگیا ہے۔

تازہ اعداد و شمار کے مطابق متحدہ عرب جمہوریہ میں میڈیکل کالجوں کی تعداد ۶ ہے اور ان میں ایک ہزار ۲ سو گیارہ طلبا اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بارہ اسکول قائم ہیں جن میں طالبات کی تعداد ۱۵۰۶ ہے نرسنگ کی تعلیم کے لئے ۲۲ کالج ہیں جن میں ۱۸۹۹ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ انکے علاوہ ۱۹ سب میڈیکل کالج ہیں اور ۱۹ ہی سب میڈیکل ٹریننگ سنٹرز ہیں جن میں علی الترتیب ۵۹۰ اور ۱۴۴۱ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ یہ تعداد ان کالجوں یا اداروں کے علاوہ ہے جو پرائیویٹ نگرانی میں چلتے ہیں۔

اس سال ان اداروں سے تعلیم مکمل کر کے نکلنے والی طالبات کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

۱-	اسسٹنٹ نرس	۴۵۰
۲-	اسسٹنٹ ڈیلیوری انچارج	۵۰۶
۳-	میڈیکل اٹنڈنٹس	۴۳۹

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ

عورتوں کو مساوی حقوق دیے جانے کے بعد انقلابی حکومت نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کئی کالج کھولے اور ان کا الحاق عین شمس یونیورسٹی سے کر دیا۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ادارے قائم کرنے کی پہلے بھی کئی کوششیں کی جا چکی تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۴ء میں ایک ٹریننگ سینٹر قائم کیا گیا تھا۔ اس سینٹر میں طالبات کی ٹریننگ تین سال تک ہوتی تھی اور اس کے بعد انھیں ڈپلوما دیا جاتا تھا۔ اس ڈپلوما کے ذریعہ وہ پرائمری اسکولوں میں ٹیچر بن سکتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں یہ ادارہ بڑھا دیا گیا اور اسکا الحاق عین شمس یونیورسٹی کے ساتھ کر دیا گیا۔

اور اس کے بعد لڑکیوں کی تعلیم میں بڑے پیمانے پر ترقی ہوئی اور تعلیم کے میدان میں انھیں لڑکوں کے برابر لانے کی کوشش کی گئی۔

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں سب سے قابل ذکر اقدام یہ تھا کہ ملک کی مذہبی یونیورسٹی الازھر میں لڑکیوں کو داخلہ کی اجازت دی گئی۔ اسوقت الازھر کے تحت ایک مسلم گرلز کالج قائم کر دیا گیا ہے جس میں ضروری مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔

کبھی الازھر روایات میں شدت سے جکڑا ہوا تھا۔ لیکن اب یہاں لڑکیوں کو طب، زراعت، انجینیرنگ اور دینیات سب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے مثال تاریخی واقعہ ہے۔

(طنزیہ)

ہمارا مقصد حیات

حیدر راحت چکلہ بینوی

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش چھ کروڑ ہے۔ آزاد ہندوستان کے سیاسی دستور کے مطابق انھیں ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں کی مانند برابر کی مراعات حاصل ہیں اور وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی صلاحیت کے مطابق ابھر سکتے ہیں موجودہ دور میں تو وہ بام ترقی کی انتہائی بلند سطح کو چھو بھی چکے ہیں یعنی صدر جمہوریہ کے عہدہ پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ مرکز کے وزراء میں بھی آپ کو چند جانی پہچانی صورتیں نظر آجائیں گی۔ اس کے علاوہ تجارتی منڈیوں میں بھی ان سیٹھوں پر ضرور نظر جائے گی۔ جن کی پیشانی پر سجدہ کے نشان نمایاں ہیں۔ رہے نوکری پیشہ حضرات تو اگر آپ صوبائی اور مرکزی گزٹوں کی ورق گردانی کریں گے تو جناب محمد علی یا جناب احمد محمود وغیرہ کی اچھی خاصی تعداد مل جائے گی۔ ہاں ہم مسلمان آزاد ہندوستان میں اپنی خفیہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا مقام قائم کر چکے ہیں اور انشاءاللہ بہت جلد ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کی مانند ابھریں گے۔ چمکیں گے — چونکہ دستور ہند نے ہمیں برابری کا درجہ دیا ہے۔ لیکن ؟

یہ شیخ صاحب ہیں۔ ہائر سیکنڈری پاس۔ اگر آپ ان سے ملیں تو ان کے پاس سینما کے متعلق ایک مکمل کتابچہ تیار ملے گا۔ اب تک انھوں نے کتنی ساری فلمیں دیکھی ہیں۔ کون سے کردار کس فلم میں ابھرے ہیں۔ فلم اسٹاروں کی زندگی کے حالات۔ ان کا ذوقِ طبع اور ان میں مسلمان آرٹسٹ کس طرح اپنا نام روشن کر رہے ہیں۔ بتائیے کیا یہ ایک اہم کارنامہ نہیں ہے۔

میرے ایک پڑوسی ارشد حسین صاحب ہیں۔ ان کی بیگم سینما بینی کو روحانی اور جسمانی علاج سمجھتی ہیں۔ جمشید پور کی فضا مکدر ہے کچھ لوگوں کی پیشانی پر فکر و تردد کے شکن ہیں اور محترمہ رکشہ پر سوار کوٹھے کو سینما رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے ان کے حالیہ دونکوں کے نام منے اور راجن ہیں۔ اصل نام شاید کچھ اور ہیں لیکن میں کیا سارا محلہ انھیں منے اور راجن ہی کہہ کر جانتا ہے۔ اور پھر خدا جھوٹ نہ بلائے ہمارے ایک بزرگ نے آزادیٔ نسواں کی مثال اس طرح قائم کی ہے کہ خود تو یاروں کے ساتھ سینما بینی کا شوق پورا کر لیتے ہیں اور ان کی اہلیہ محترمہ ایک عزیز کے ساتھ فلموں میں جایا کرتی ہیں یعنی محرم اور غیر محرم کا سوال صرف حج کے لیے جائز ہے۔

عید کی آمد آمد ہے ہر مسلم آبادی میں مسلمانوں کا اژدہام ہے، نوجوان، بوڑھے ہر سائز کے بچے اور کالے پیلے اجلے برقعے، پریشان حال، بوکھلائی صورت یوں نظر آئیں گے گویا حشر کے میدان میں جمع ہوں — خدا خدا کر کے عید آئی، جگمگاتے کپڑوں، خوش پوشوں اور رنگین اغوائی توس قزح کے درمیان نماز عید ختم ہوئی پھر تو گویا تانتا بندھ گیا ملنے ملانے والوں کا، بے فکروں، فلم دشمنوں کا اور تان وہاں جا کر ٹوٹی جہاں کوئی افادی پہلو نہیں۔ زندگی کا ایک حسین موقع ایک انتہائی حسین عکس چھوڑ کر آنکھ جھپکتے غائب ہو گیا لیکن اپنے پیچھے شہر شہر میں کروڑوں روپے کے مزار چھوڑ کر۔

وہ دیکھیے ایک بارات گزر رہی ہے یا غنا یدر بسم بسم اللہ ہے۔ نصف درجن فٹ ٹولی بینڈ باجوں کی بھنڈی پٹاخے اور نوشہ کے سر پر موہال، دیگ کھنکنانے لگے چوڑیاں بجنے لگیں، گیتوں کے فوارے چھوٹنے لگے اور شادی کے مقدس رشتہ میں دو روحوں کا اتصال ہو گیا لیکن اس طرح کہ اس کے تیسرے ہی دن ایک نوشہ بہادر جن کے ہاتھوں پر حنا کا رنگ ابھی تازہ ہی تھا میرے پاس تشریف لائے اور دس روپے کا سوال پیش کیا تاکہ وہ دسہرہ کے موقع پر سسرال میں اپنی شان امارت دکھا سکیں۔

میرا چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے۔ وہ روزانہ مجھ سے بحث کرتا ہے کہ میں اسے صرف چار آنے یومیہ دیتا ہوں جبکہ اس کے ساتھیوں میں بہت سارے سو سو کے نوٹ جیب میں رکھتے ہیں۔ عموماً لڑکوں ہی کے لیے ٹریلین ٹری کاٹن اور ٹری اول کپڑے ملوں نے تیار کیے ہیں۔ جبکہ میرے بھائی صاحب سوتی کپڑوں میں اسکول جاتے ہیں میں کوشش کرتا ہوں کہ انھیں حضرت محمد اورنگزیب اور مولانا آزاد وغیرہ کی سادگی دکھا کر مرغوب کروں لیکن وہ تو ایک ہی رٹ جانتے ہیں کہ وہ زمانہ اور تھا یہ زمانہ اور ہے — گویا قیمتی لباس، پاکٹ میں بڑے چھوٹے نوٹ، ایک عدد سائیکل اور تفریح یہی آج کے طالب علموں کا، مسلمان طالب علموں کا اصولِ تعلیم ہے۔ گار جین جس طرح بھی ہو پورا کریں ورنہ عن بزم تو بعد میں پہلے خود ہی جہنم میں چلے جائیں گے۔

میرے محلے میں بہت سے ایسے گھرانے بھی ہیں جہاں فقر و فاقہ کو مصلحتاً نہیں بلکہ مجبوراً راہ دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی جو میں ان کے بچوں کو بلکتے، ان کی عورتوں کو گریہ زاری کرتے دیکھتا ہوں تو خود کو ملعون و مطعون کرنے لگتا ہوں۔ کھانے کا مزہ جاتا رہتا ہے۔

آج سے دس سال قبل اس شہر میں مسلمانوں کی ہزارہا کوٹھیاں تھیں۔ کروڑوں کا کاروبار تھا۔ ان کی امارت اور دولت پر حکام شہر بھی ایمان لے آتے تھے۔ آج نصف سے زیادہ مکانات بک چکے ہیں۔ دولت اس طرح غائب ہو رہی ہے جیسے دھوپ چھاؤں۔ کاروبار کی پالیسی ٹھپ ہے اگ اوگھ رہا ہے سو بٹ گئے تو پانچ ابھر رہے ہیں۔ اور مسلمان اسی حال میں مست ہیں۔ دنیاوی رسم و رواج

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

پاس بلایا اور رک رک کر بڑی مشکل سے بولیں . . .
"بیٹا تو جنتی ہے ـــــ تجھ ایسی بیٹیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ تو نے میرے لئے وہ کیا جو پیٹ کی بیٹی بھی نہ کرتی . . . .

" اماں میں تمہارے پیٹ ہی کی بیٹی ہوں اماں" سسک کر بولی ـــــ تم نے مجھے زندگی دی تھی اماں۔ اپنا خون پلایا تھا ـــــ اور اولاد کسے کہتے ہیں اماں۔؟
" نہیں بیٹا ـــــ پیٹ کی اولاد بھی اتنا نہیں کر سکتی جو تو نے کیا ـــــ بیٹا . . . . وہ کراہ کر بڑے آنسو بھرے لہجے میں . . . . . بہت رک رک کر بول رہی تھیں ـــــ " بیٹا جس دن یوسف کی موت کا خط آیا، میں ساتھ والے کمرے میں صفائی کر رہی تھی اور تو بھی کر میں باورچی خانے میں ہوں۔ بڑے ماموں کو تو نے خط سنایا اور کہا ـــــ ماموں میاں ـــــ اماں کو یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ رو رو کر جان سے چلی جائیں گی ـــــ

اماں . . . . میں چیخی ـــــ مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا . . . . " میں نے سوچا جب میری بیٹی، میری جاں مجھے دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تو مجھے بھی اس راز کو پالنا ہی ہوگا۔ اور میں نے بھی اپنی وہی پرانی روش قائم رکھی۔ مرنے والا تو جان سے گیا، مگر تیرے لئے میرا دل کیسے کیسے تڑپتا تھا بیٹی ـــــ لیکن اگر میں کہہ دیتی کہ مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ یوسف نہ رہا۔ تو تو مجھے غمگین نہ دیکھ پاتی اور میں تیرے آنسو نہ دیکھ پاتی . . . . . .

میں پتھر کی مورت بنی سن رہی تھی اور وہ رک رک کر کہے جا رہی تھیں ۔
" میں نے وہ سب زیور دراصل تیرے لئے خرید خرید کر رکھے ہیں بیٹی ـــــ پیسہ تو اٹھ ہی جاتا ہے بیٹی، اس سے زیادہ تیز رفتار شے میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دیکھ قدموں آنے والا تیزی سے جانے والا ہے کہ کارن میرا بیٹا مجھ سے چھٹا!
سوچتی تھی میری بیٹا جو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر میرا بھرا رہی ہے۔ اسے فضول نہ گنواؤں ـــــ
میرا آخری وقت ہے بیٹا . . . تیرے سامنے تیری
[illegible]

بقیہ: ہمارا مقصد حیات

آپس کے اختلافات اور مزاج کے کڑوا پن نے انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ ایک طرف ماضی کی شاندار روایات اور دوسری طرف تباہی اور افلاس کا نقشہ ـــــ بتائیے مسلمان کیا کریں۔ کیا اسی حالت میں مست و بیخود رہ کر ماضی اور مستقبل کو بھول کر بیٹھ جائیں یا پھر انہیں کچھ کرنا بھی ہے ۔ اور کیا کرنا ہے۔ اس کے متعلق ہمارے وہ رہبران ملت دماغ سوزی کریں جن کے دل میں قوم کا درد ہے جو ہمارے لیے جی رہے ہیں اور ہمارے لیے مرنا پسند کرتے ہیں۔

آج سنیچر ہے یعنی قسمت آزمائی کا ہفتہ۔ وہ دیکھیے وہ قسمتوں پر شیں جا رہی ہیں ہر رنگ اور ہر سائز کی ۔ لنگیوں میں ملبوس ہمارے بھاری جہاد کو جا رہے ہیں۔ ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کتابوں کا اسلحہ ہے۔ جن میں گھوڑوں کی نسل اور شجرہ حسب و نسب کو بیان کیا گیا ہے اور وہ بڑے طمطراق کے انداز میں پھولوں اور گجروں کی سیج سجانے میدان جنگ میں رواں ہیں۔ قسمت ہی تو ہے۔ ایک غلام سلطان ہند ہو سکتا ہے ۔ تو وہ کیوں نہیں لیکھ کے لاکھ ہو سکتے ہیں ـــــ زندگی داؤں پر لگانے کا نام ہے۔ اس لیے آئیے ہم آپ بھی ریس میں شریک

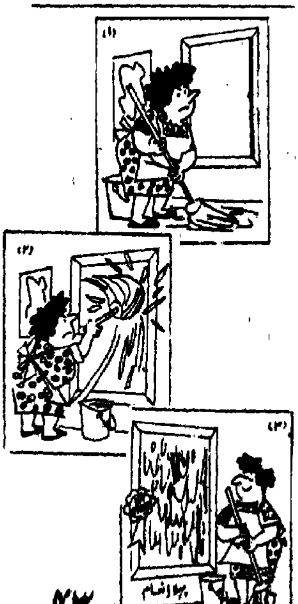
زندگی ہے۔ خدا کیسے میری دعا پوری نہ کریگا ۔ وہ تجھے ہر خوشی سے نوازے گا بیٹی . . . . . تیری ایک آرزو تھی بیٹی کہ مجھے چاندی کے تخت پر بٹھائے گی ۔ تو نے تو مجھے اس تخت طاؤس پر بٹھایا ہے بیٹی جسے دل کہتے ہیں . . . . . . میں اس دل کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں بیٹا . . . . .
اور اٹھنے کی کوشش میں اماں جو آگے کو ہونے لگیں تو لڑکھڑا کر پیچھے کو آ پڑیں ـــــ پھر وہ کبھی نہ اٹھ سکیں ۔

میں رونا چاہتی ہوں تو مجھے اماں کی وہ بات یاد آتی ہے ـــــ " میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی ـــــ " میں آنسو ضبط کرنا چاہتی ہوں ـــــ کر بھی لیتی ہوں۔ لیکن روتے ہوئے دل کو کیسے منع کروں ـــــ ؟

ہو کر اپنی قسمت کو داؤں پر لگا دیں ۔ جی ہاں ـــــ آئیے بھی!
وہ دیکھیے، موذن مسجد کے کنگرے پر نمودار ہو کر اللہ اکبر اللہ اکبر پکار رہا ہے اور ہمیں آپ کو خالق دو جہاں کے دربار میں حاضری کی دعوت دے رہا ہے لیکن سچ پوچھیے تو

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یعنی ہم لوگ زندگی کے دوسرے اہم فریضوں میں اس قدر مشغول ہیں کہ اتنا وقت کہاں کہ چودہ سو سالہ پرانے گھسے پٹے سبق کو دہرانے مسجد میں حاضری دیں۔ نتیجہ ظاہر ہے مسجدیں ویران ہو رہی ہیں اور ہم لوگ دور سے ہی ان کے کنگروں کو دیکھ کر صبر و شکر کر لیتے ہیں ـــــ بہرکیف یہ چند باتیں میں نے اس لیے گوش گزار کر دی ہیں تاکہ آپ بھی گواہ رہیں کہ میں نے بحیثیت مسلمان اپنا حق ادا کر دیا۔ اور ان تمام خوبیوں کو آپ کے سامنے پیش کر دیا جنھیں میں ایسے جراثیم کا نام دیتا ہوں، جو ہمیں گھن کی طرح کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے خدا نہ کرے وہ دن دور نہیں جب ہم ہم نہ رہیں گے، اچھوتوں کی آبادی میں زبردست اضافہ کا باعث بن جائیں گے ۔ ◆◆





آسیب

احمد صغیر صدیقی

میں آپ کے سامنے اس وقت جو داستان بیان کر رہا ہوں وہ ایک انتہائی ناقابل یقین قسم کی ہے میں جانتا ہوں کہ اسے پڑھ کر بہت سے لوگ یقیناً برا سا منہ بنائیں گے ان تمام باتوں کے جاننے کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس میں ذرا سا بھی جھوٹ شامل نہیں ہے۔ یہ واقعہ پچھلے دنوں کا ہے جب ان دنوں میں مکان نمبر ۵ اسٹریٹ نمبر ۲۲ میں رہا کرتا تھا۔ یہ مکان کوئی پچھلے دو برسوں سے "آسیب زدہ" مشہور تھا۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ مکان تھا بھی عجیب! اس کے چاروں طرف کسی زمانے میں جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا ان دنوں باغ تو غائب ہو چکا تھا البتہ چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ ضرور موجود تھے۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا اور شہر کے ایک کونے میں واقع ہونے کے باعث ادھر عام طور سے لوگوں کا گزر بھی کم تھا۔ مکان اندر سے کافی وسیع تھا اور کسی زمانے میں کسی بڑے رئیس کا خاندان اس میں آباد ہوا کرتا تھا۔ استداد زمانہ کے ہاتھوں اس کے ورثا اس کو بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اب یہ ایک بیوہ متمول عورت کی ملکیت تھا۔ دو سال قبل اس میں رہنے والے کرائے دار کی موت کے بعد سے ہی اسے آسیب زدہ سمجھا جانے لگا تھا اور بعد کے تمام کرائے دار اسے دو ہی دن رہنے کے بعد چھوڑ گئے تھے۔ آخر ہماری لینڈ لیڈی نے مجبور ہو کر اسے بورڈنگ ہاؤس میں تبدیل کر دیا۔ تب سے مجھے اور میرے دوست کو ملا کر کوئی پانچ چھ آدمی اس میں الگ الگ کمرے کرائے پر لے کر رہ رہے تھے۔ مکان میں اندر کی جانب ایک وسیع ہال تھا جہاں سے اوپری منزل کیلئے سیڑھیاں موجود تھیں میں اور میرا دوست ہارون ایک ساتھ رہتے تھے۔ بلاشبہ ہمارے کمرے الگ الگ تھے لیکن ایک دوسرے کے پاس ہر وقت ہمارا آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔

شروع شروع میں جب ہم وہاں شفٹ ہو کر پہنچے تو اکثر ہمارے درمیان مکان کا آسیب ہی موضوع گفتگو رہتا تھا۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ رہنے والے کرائے داروں کے ہاتھوں کہیں سے ایک آسیبی قسم کی کتاب بھی لگ گئی۔ جسے وہ اکثر پڑھ کر ہم کو سنایا کرتے تھے محض ڈرانے کے لئے۔ ان تمام اصحاب کے درمیان میری شخصیت خاصی جاذب توجہ تھی۔ کیوں کہ بھوت وغیرہ کے بارے میں شاید میری معلومات ان سب سے زیادہ تھیں۔

اس مکان میں رہتے ہوئے اگر کبھی رات کے وقت کسی کے ہاتھ سے کوئی شیشہ وغیرہ گر کر ٹوٹتا تو ہم سب یوں کھڑے رہ جاتے جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ آسیب کا خوف کچھ ایسا ہی ہم سب کو گھیرے ہوئے تھا۔

اس حالت میں ہم نے کوئی ایک مہینا گزارا پھر آہستہ آہستہ ہمیں یقین ہونے لگا کہ آسیب وغیرہ کے قصے سب جھوٹے ہیں اور مکان بالکل صاف ستھرا ہے۔

پھر اچانک وہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کے بارے میں سوچ کر مجھے اس وقت بھی پسینہ آنے لگتا ہے۔

رات کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اور معمول کے مطابق اس رات بھی میں ہارون کے ہمراہ باغ میں پائپ پینے نکل گیا تھا۔ دراصل مجھے اور ہارون کو افیم پینے کی بھی لت تھی۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو صرف ہم دونوں تک ہی محدود تھا۔ ویسے ہم لوگ انتہائی مہذب قسم کے افیونی تھے۔ افیون پینے کے دوران ہم لوگ اکثر جادو ٹونے بھوت وغیرہ کی باتیں کیا کرتے تھے کبھی کبھی ہمارا موضوع سخن سائنس بھی بن جاتی تھی کیونکہ ہارون سائنس کا گریجویٹ تھا اور شہر میں اس کی ڈاکٹری اچھی خاصی چل رہی تھی۔

اس رات بھی معمول کے مطابق ہم نے اپنے پائپ میں تمباکو کے ساتھ افیون کی ایک گولی بھری اور اس کے خوشگوار اثرات میں گم ہو کر اپنی عجیب باتوں میں منہمک ہو گئے۔ باتوں ہی باتوں میں ہارون نے سامنے اندھیرے پر نظر جماتے ہوئے کہا "کیوں راشد تمہارے خیال میں دنیا کی سب سے ڈراؤنی شے کیا ہوگی۔" یہ سوال عجیب سا تھا۔ ہزاروں چیزیں ڈراؤنی ہو سکتی ہیں۔ تیز بہتے ہوئے دریا میں کسی ڈوبتی ہوئی عورت کی چیخیں انتہائی ڈراؤنی ہوتی ہیں۔ اندھیری اور سنسان رات میں کسی بھوت کی آمد بھی خاصی خوفناک ہو سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ معذرت کے سے انداز میں میں نے کہا۔

"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں"

"ہوں" ڈاکٹر ہارون نے ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ "خود میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی کونسی شے ہو سکتی ہے۔ ویسے تو ہزاروں چیزیں ہیں لیکن کسی ایسی شے کا ذکر کرو جو ہر شے سے زیادہ ڈراؤنی ہو میرے بس میں بھی نہیں"

"تو پھر چھوڑو۔ ہٹاؤ۔ اس قصے کو خواہ مخواہ رات!"

ڈر گئے تھے" میں نے جھلا کر کہا۔ دراصل مجھے ہارون کی موجودگی میں بھی باہر خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ جواب میں اس نے پائپ کو منہ سے لگا کر ایک اور کش لیا۔ پھر دھواں اگلتے ہوئے بولا "خدا جانے آج کیوں میرے دماغ میں طرح طرح کے بھیانک خیالات امڈے چلے آ رہے ہیں۔ سچ جانو اگر میں ادیب ہوتا تو آج ضرور ایک انتہائی خوفناک کہانی لکھ ڈالتا۔"

"ہوں" میں نے پھر جھلا کر کہا۔ "بہرحال تم ادیب نہیں ہو۔ براہِ کرم اس فضول قصے کو ختم کرو۔ افیون پی کر ایسی باتیں سوچنے سے نیند خراب ہونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

پھر میرے اصرار پر وہ واپس ہو گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے الوداع کہا۔ پھر دروازہ بھیڑ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ کپڑے پہننے کے بعد میں نے معمول کے مطابق لیمپ سرہانے رکھا اور قریب پڑی ایک کتاب اٹھا کر بستر میں گھس گیا۔ لیٹ کر میں نے کتاب کھولی لیکن دوسرے ہی لمحے گھبرا کر میں نے اسے دور پھینک دیا۔ یہ یقیناً میرے پڑوسی کی شرارت تھی۔ کمبخت اپنی بھوتوں کی کتاب میرے کمرے میں ڈال گیا تھا۔

پھر میں نے لیمپ کی بتی نیچی کر دی اور اسے پیچھے رکھ دیا۔ میرا کمرہ اب مکمل طور پر تاریک تھا۔ میں نے چادر تان کر سونے کی کوشش شروع کر دی لیکن فضول، طرح طرح کے ڈراؤنے قصے یاد آنے لگے تھے۔ میں نے سخت قسم کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے دم سادھے پڑا رہا اور تب یکایک میرا دل بڑے زوروں سے دھڑکا۔ یوں لگا جیسے کوئی شے چھت پر سے میرے اوپر آ گری ہو۔ دوسرے لمحے مجھے اپنے جسم پر زبردست دباؤ سا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی میرے سینے پر چڑھ بیٹھا ہو۔ پھر اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ سکوں، دو سخت ہاتھوں نے میرا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

میں کسی طرح بھی کوئی بزدل شخص نہیں ہوں۔ جسمانی اعتبار سے بھی میں کمزور نہ تھا۔ البتہ حملہ اچانک ہوا تھا جس نے مجھے گھبرا دیا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں بعد جونہی میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے گلے پر جکڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے مروڑ دیا۔ نتیجتاً میرے حملہ آور کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میری رکی ہوئی سانس پھر سے چل پڑی۔ پھر مجھ میں اور میرے حملہ آور میں ایک سخت قسم کی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ اس اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس میرے ہاتھ پیر چل رہے تھے۔ نظر نہ آنے والا حملہ آور بار بار میرے ہاتھوں سے پھسل رہا تھا۔ شاید اس کا سارا جسم ننگا تھا۔ اسے قابو میں کرنا میرے لئے سخت مشکل ہو رہا تھا کیونکہ شاید وہ بے انتہا پھرتیلا تھا۔

ہم میں کوئی دس پندرہ منٹ انتہائی سخت مقابلہ جاری رہا۔ سچ پوچھئے تو میں پسینے میں بری طرح نہا چکا تھا۔ جگہ جگہ میرے جسم پر خراشیں بھی پڑ گئی تھیں اور اس نے جا بجا مجھے نوچنے اور کاٹنے کی بھی کوشش کی تھی۔

اس انتہائی تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد آخرکار میں نے محسوس کیا کہ میرا مقابل بھی تھک رہا ہے۔ پھر چند ہی لمحوں میں میں نے اسے بستر پر دے مارا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ میری ہی مانند وہ بھی بری طرح ہانپ رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے اس کی چلتی ہوئی سانسیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کے سینے پر چڑھ کر میں نے سوچا اب کیا کرنا چاہئے۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ میرا سلکن رومال تکیے کے نیچے ہوگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنے تلے دبے ہوئے حملہ آور کو سنبھالا اور جھٹکے سے تکیے کے نیچے سے رومال کھینچ لیا۔

چند لمحوں کی مزید جدوجہد کے بعد میں اس کے دونوں ہاتھ باندھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب میرے پاس صرف ایک کام رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ میں نیچے رکھے ہوئے لیمپ کو اٹھا کر اسٹینڈ پر رکھ دوں اور بتی اونچی کر کے دیکھوں کہ یہ حملہ آور ہے کون؟ مجھے خوشی تھی کہ میں نے کسی کو مدد کیلئے بلائے بغیر اسے قابو میں کر لیا تھا۔

میں اس پر چڑھے ہی چڑھے تھوڑا سا آگے کو کھسکا اور ہاتھ بڑھا کر سرہانے رکھے ہوئے لیمپ کو جھٹکے سے اٹھا لیا۔ اوپر رکھ کر میں نے دوسرے ہاتھ سے بتی اونچی کر دی۔ یکایک تمام کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ پھر میں نے نظریں گھما کر جونہی اپنے حملہ آور کی جانب دیکھا مجھ پر قیامت بیت گئی۔ میرا خیال تھا کہ میرے منہ سے یقیناً ایک خوفناک چیخ نکلی ہوگی جس نے سارے مکان کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔

مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دیا تھا۔ یہ ایک انتہائی ڈرا دینے والی حقیقت تھی۔ کوئی شے کوئی مخلوق یقیناً میرے جسم تلے دبی ہوئی تھی۔ کوئی ایسی شے جسے میری آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔

اس کی سانسیں مجھے اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ برابر جدوجہد کئے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی تھے اور پیر بھی۔ اس کی چکنی جلد کو بھی اپنے ہاتھوں سے محسوس کر رہا تھا اور سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ وہ میرے نیچے کسی پتھر کی مانند پڑا ہوا تھا۔۔۔ لیکن۔ میرے خدا میں اسے دیکھنے سے قطعی معذور تھا۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار اور نادیدہ مخلوق تھی۔ کسی دوسری دنیا کی مخلوق۔

مجھے حیرت ہے کہ میں بے ہوش کیوں نہ ہوا۔ خوف اور دہشت کے تاثر نے یکایک مجھے دوگنی قوت بخش دی تھی۔ میری گرفت اس پر اور سخت ہو گئی حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے تلے دبا ہوا نادیدہ جسم درد سے لرزنے لگا ہو۔

اسی وقت دھماکے سے دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ہارون دوڑتا ہوا میری جانب لپکا۔ "راشد، راشد کیا ہوا؟"

"اوہ۔ ڈاکٹر" میں نے اسے دیکھتے ہی کہا "خدا کیلئے جلد آؤ۔ مجھ پر خدا جانے کس شے نے حملہ کر دیا تھا۔ میں اسے پکڑے ہوئے ہوں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔"

جواب میں ہارون کے چہرے پر عجیب و غریب تاثر ابھرا۔ شاید وہ میری باتوں پر سخت متعجب ہو گیا تھا۔ بہرحال میرے کہنے پر وہ چند قدم آگے بڑھ کر میرے قریب آیا۔ اسی لمحے دیگر مکین بھی اندر آ گئے اور سب کے سب مجھے پاگلوں کی طرح گھورنے لگے۔

"ہارون وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو" میں پاگلوں کی مانند چیخا۔ میرا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ "خدا کے واسطے میری مدد کرو۔ مجھ میں دم نہیں کہ میں اسے زیادہ دیر تک پکڑے رہ سکوں۔"

"راشد!" آگے بڑھ کر ہارون نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے آج تم نے بعد میں اور زیادہ پی لی ہے۔"

"کیا بکتے ہو" میں چلایا۔ "اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا مگر مجھے تو دیکھو میں آخر کیوں لرز رہا ہوں۔ وہ جدوجہد میں مصروف ہے۔ ادھر آؤ۔ اسے چھو کر دیکھو۔۔۔ ہاں چھو کر دیکھو" میں نے اسے اکسایا۔

میرے چیخنے پر اس نے اپنے ہاتھ بڑھا کر ادھر رکھ دیئے جدھر میں نے اس سے کہا تھا۔ وہاں غالباً اس نادیدہ شے کا چہرہ رہا ہوگا۔

دوسرے لمحے ڈاکٹر کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ اس نے

تم کچھ کہیں بھاگ جاتے کہ کوئی لڑکا گیا ہو۔
اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ کوئی شے میرے نیچے دبی ہے کوئی نادیدہ شے۔

اس نے بھاگ کر سامنے لٹکی ہوئی رسیاں اٹھائیں پلنگ کے ساتھ باندھنے لگا چند ہی سکنڈوں میں اس نادیدہ مخلوق کو سر سے پیر تک اس نے پلنگ کے ساتھ جکڑ دیا۔ پھر مجھ سے بولا "اب تم اسے چھوڑ کر ہٹ جاؤ وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا۔"

دوسرے اشخاص تماشائیوں کے مانند رہیں دیکھتے رہے ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب انھیں بھی ہارون جیسا تجربہ ہوا تو ان میں سے ہر ایک کمرے سے نکل کر یوں بھاگے جیسے ان کے پیچھے کوئی بلا لگ گئی ہو۔ اب کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہمیں قرار دے سکتا۔

پھر ہم نے وہ پلنگ ہٹا کر ایک کونے میں رکھ دیا پلنگ سے چپکی ہوئی مخلوق یقیناً چودہ پندرہ برس کے لڑکے کے وزن کے برابر رہی ہوگی۔

رسیوں میں جکڑ جانے کے بعد بھی وہ شے برابر آزاد ہونے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی نتیجۃً تمام بستر بری طرح ہل رہا تھا۔ یہ ایک کھلا ہوا ثبوت تھا بستر پر کسی شے کسی نادیدہ مخلوق کی موجودگی کا۔ یہ منظر کچھ ایسا خوفناک تھا کہ سوائے ہارون کے، مکان کے دوسرے لوگ ایک ایک کرکے وہاں سے کھسک گئے حتیٰ کہ صرف ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ دنیا میں اپنی نوعیت کا شاید یہ پہلا واقعہ ہے" ہارون نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور انتہائی خوفناک بھی" میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک" اس نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن اگر ہم دلائل کی روشنی میں دیکھیں تو یہ واقعہ کچھ ایسا عجیب بھی نہیں۔ ممکن ہے ایسی مخلوق بھی موجود ہو جو دیکھی نہ جا سکتی ہو مثال کے طور پر ہوا ہی کو لے لو۔ ہوا کو ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن محسوس کرتے ہیں۔"

"مگر ہوا سانس نہیں لیتی ... اور یہ شے تو یقیناً ہمارے ہی مانند ہے۔"

"ہوں" اس نے سوچتے ہوئے کہا "ہمیں اس بارے میں کافی چھان بین کرنی پڑے گی۔"

رات بھر ہم نے رتجگا کر کے گزاری ہمارے قریب ہی نادیدہ مخلوق بستر سے جکڑی ہوئی پڑی تھی۔

صبح ہوتے ہی ہمیں تمام ہمسایوں نے گھیر لیا ہر شخص اس نادیدہ قیدی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

وہ نادیدہ مخلوق یقیناً حالت بیداری میں تھی کیونکہ بستر اسکی حرکت سے ہل رہا تھا۔ وہ آزاد ہونے کے لئے متواتر جدوجہد کر رہی تھی۔

رات بھر ہم دونوں دوست سوچتے رہے تھے کہ آخر کس طرح معلوم کیا جائے کہ مخلوق کی شکل کیسی ہے؟ ہم نے کئی بار اس کے بدن پر ہاتھ پھیر کر بھی دیکھا جس سے ہمیں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کے نقش و نگار یقیناً انسانوں جیسے ہی ہوں گے جسمانی بناوٹ بھی انسان ہی کے مانند تھی سوائے اسکے کہ عام آدمی کے مقابلے میں اسکے ہاتھ پیر ذرا چھوٹے تھے لیکن یہ معلومات ناکافی تھیں۔ آخرکار ہارون نے ایک عجیب ترکیب سوچی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم پلاسٹر آف پیرس کا استعمال کریں تو شاید اس کے صحیح نقوش کا علم ہو سکے مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ پلاسٹر آف پیرس چڑھاتے وقت وہ حرکت ضرور کرتا جس سے صحیح شکل نہ آنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے طے کیا کہ اسکا سانچا لیتے وقت اسکو بیہوش کر دیا جائے۔

اچھی طرح سوچنے کے بعد ہم نے طے کیا کہ ڈاکٹر ایکس کو اس کام کے لئے طلب کیا جائے۔ ڈاکٹر ایکس ایک ماہر معالج تھے۔ انھوں نے جب پہلی بار اسے چھوا تو خوف سے ان کا رنگ تبدیل ہو گیا پھر نارمل ہونے میں انھیں کوئی آدھ گھنٹا لگ گیا معمول پر آتے ہی انھوں نے کام شروع کر دیا۔ اس نادیدہ مخلوق کو کلوروفارم کے ذریعے بیہوش کرنے کے بعد ہم نے اس کے جسم سے رسیاں کھول دیں اور ایک بلائے ہوئے موڈلر کے ذریعے پلاسٹر آف پیرس میں اس کا ڈھانچا تیار کیا جانے لگا کوئی پانچ منٹ بعد نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ پلاسٹر میں آنے والی شبیہہ کچھ ایسی گھناؤنی اور ڈراؤنی تھی کہ کچھ نہ پوچھئے ایسا لگتا تھا جیسے شیطان کی تصویر کھینچ گئی ہو چہرہ اتنا بھٹا اور ڈراؤنا تھا کہ دیکھنے سے ہول آتا تھا ہاتھ اور جسم یقیناً بھرے بھرے تھے اور لمبائی میں اس کا جسم چار فٹ کے قریب تھا مجموعی طور پر اس شکل کو کسی خبیث کی شکل سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔

اس کارروائی کے بعد اب مسئلہ یہ تھا کہ آخر اس کا کیا کیا جائے۔ ابھی تک تو ہم نے اسے پروہ رازہی میں رکھ چھوڑا تھا لیکن زیادہ عرصے تک اسے چھپائے رکھنا ممکن نہ تھا یہ ہمیں ابھی معلوم نہ تھا کہ اس خوفناک مخلوق کو آزاد کر دینا کو سخت قسم کے عذاب سے دوچار کر دینا ہوگا۔

ہم سب کا خیال تھا کہ اسے ختم کر دینا ہی مناسب ہوگا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آخر یہ کام انجام کون دے گا؟ وہ یقیناً ایک بدنما انسان تھا لیکن تھا تو انسانوں ہی میں سے لاکھ نادیدہ سہی ہم روزانہ اس مسئلے پر غور کرتے مگر لاحاصل۔ ہمارے دوسرے پڑوسی اسی مخلوق کی باعث ایک ایک کرکے مکان چھوڑ رہے تھے جس پر ایک روز ہماری لینڈ لیڈی سے جھگڑا بھی ہوا۔ وہ اپنے نقصان کا ذمہ دار ہمیں ٹھہرانے لگی جس پر میں نے کہا۔ کہ ذمے دار ہم نہیں بلکہ تم ہو۔ یہ مکان تمہارا ہے اور یہ مخلوق بھی اسی مکان میں ہے۔ رہا اسے ہٹانے کا مسئلہ تو تم ہی ہٹوا سکتی ہو تو ہٹوا دو۔ میری بات پر اس نے کئی آدمیوں کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اس نادیدہ شے کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیں مگر ڈر کے مارے ادھر آنے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہو سکا۔ مجبوراً بڑھیا عورت چیخ چلا کر خاموش ہو گئی۔

اس تمام قصے کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ ہم آخر تک یہ نہ سمجھ سکے کہ آخر اس مخلوق کی غذا کیا تھی؟ ہم نے دنیا بھر کی چیزیں اسکے قریب لا کر رکھیں لیکن اس نے کسی شے کو آخر تک ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ اسکی حرکات و سکنات اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ بھوک سے بلک رہا ہے۔ اس معاملے میں ہم خود کو بے حد مجبور پا رہے تھے۔ راتوں کو ہمیں نیند بھی نہ آتی تھی۔ میں جب بھی یہ سوچتا کہ وہ بھوک سے مر رہا ہے تو نہ جانے کیوں مجھے اپنے دل میں اس کے لئے بیحد دکھ کا احساس ہوتا۔

پھر ایک دن صبح جب ہم نے اسے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ ہاتھوں سے محسوس کرنے پر ہمیں پتہ چلا کہ اس کا جسم اکڑ چکا ہے دل کی حرکت بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

اسی دن ہم نے ویران باغیچے کے ایک گوشے میں ایک گہرا گڑھا کھود کر اس کی لاش دبا دی۔ ایک لاش جسے ہم محسوس تو کر سکتے تھے لیکن ہماری آنکھیں جسے دیکھنے سے قاصر تھیں اس نادیدہ مخلوق کے جسم کا چربہ ڈاکٹر ایکس کے میوزیم میں آج بھی موجود ہے۔

(خیال ماخوذ)



سجاد حیدر کا نام اُن افسانہ نویسوں میں سرِ فہرست آتا ہے جنہوں نے اردو ادب کو نئی بنیادوں پر استوار کیا پرانی روش سے ہٹ کر طرحِ نو ڈالی اور اردو افسانے کو نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالا —
زیرِ نظر انشائیہ کا تعارف انکے اپنے لفظوں میں پڑھیے

—— ادارہ



ہندوستان کی رقاصہ

سجّاد حیدر

۱۹۱۷ء [illegible] جب میں قسطنطنیہ پہنچا تو اسی ہفتہ میں وہاں کے ایک ادبی رسالہ میں خالدہ صالح کا یہ شاہکار ادب شائع ہوا۔ ترکوں نے اسکا لطف اٹھایا ہوگا اور داد دی ہوگی۔ مگر اتفاق کہ ایک ادبیات کا دلدادہ ہندوستانی بھی اس وقت وہاں پہنچا اور اس کی نظر سے یہ مضمون گزرا اس [illegible] نے بھی اس قدر سرور کیا کہ میں نے بذریعہ ایک سپاس نامہ کے ہندوستان کی طرف سے خالدہ صاحبہ خانم کی خدمت میں یہ استعجاب آمیز خراجِ تحسین پیش کیا اور حیرت ظاہر کی کہ ایک ترکی خاتون جس نے کبھی اس ملک کو خواب میں بھی نہیں دیکھا کس طرح یہاں کے مناظر یا لوگوں کے جذبات کا ایسا صحیح [illegible] نقشہ کھینچ سکی ——

میں اس ترجمے کو پیش کرتا ہوں مگر کیا اصل مضمون کا شائبہ بھی اس میں مل سکتا ہے؟ حاشا ——

میں ہندوستان کی سب سے زیادہ حسین رقاصہ تھی۔ میرا نازک جسم سانولا سلونا تھا جس پر چریرا سلونا پن کے صاف و شفاف اور نرم موتی دمکتے تھے۔ میری پیروں ہندوستان کے چیتوں کی پھرتیلی اور سیاہ ناگ کی حرکتوں سے زیادہ فسوں کار تھی میری [illegible] اس زہریلے سانپ کی طرح بل کھاتی تھی جو جتنا زیادہ زہریلا ہو اتنا ہی دلنشین طریقے سے لہراتا ہے۔

میں ایک مخلوق تھی جس نے شعر و حرکت کو اپنے تمام بدائع اور نیرنگی کے ساتھ اپنے جسم میں جمع کر رکھا ہے۔ میرے ننگے پاؤں کے گھنگرو میری ہر ٹھوکر پر، میرے کھلے گیسو کبھی اٹھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ بندھے میرے تمام آہنگِ رقص میں لفظ کار و مترنم ہو کر شریک ہوتے تھے۔ دنیا کا تمام عشق، نیچر کی تمام رعنائی، تمام خوبصورتی میرے رقص میں، کبھی جلا دینے والی کبھی ساکت کر دینے والی اداؤں کے ساتھ کانپتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر میرا سر اس کی ایک جنبش ایک اشارے میں میرے سانولے جسم پر جو شعر و آہنگ کی جان تھا۔ لمبے لمبے سیاہ ریشمی چمکدار بال بکھر جاتے تھے، میری آنکھیں، میرے ابروئے خمدار کے نیچے وہ ایسی بڑی اور روشن آنکھیں تھیں جیسی ان غزالوں کی ہوتی ہیں جو گرمیوں میں جنگل کے محفوظ ترین گوشہ میں پانی پینے کے لئے جھکتے جھجکتے آتے ہیں ——

میرے ان مستی مالیدہ ہونٹوں میں سے جو نہایت گرم ملک میں کھلے ہوئے قرنفل کے پھول کی طرح تھے، صاف شفاف موتیوں کی لڑی چمکتی تھی ——

سارا ہندوستان مجھے رقص کی دیوی سمجھ کر پرستش کرتا تھا میں بڑے بڑے راجاؤں کے سامنے ناچ چکی تھی، ناچتے وقت موتیوں، یاقوتوں اور جواہرات کی جھڑ لگتی بارش ہوتی تھی کہ میرے ہر ٹھپکے کے ہر تار میں وہ پروئے جا سکتے تھے۔

مگر میں پھر بھی خوش نہ تھی، میری روح میں ایک بارد نقطہ تھا جس تک نہ میرے حسین جسم کا حسن اور نہ اس فسونکار اور گرم مملکت کی گرمجوشی پہنچ سکتی تھی۔

ان جہنم کی طرح گرم دنوں میں بھی جنگل میں ہاتھی، گینڈے، غزال اور بارہ سنگھے اور کچھار میں شیر بھی آپس میں لڑنا یا کلیلیں کرنا بھول جاتے ہیں۔ یہ نقطہ خنک ہی رہتا۔ تمام زمین سے جس وقت شعلے نکلتے ہوتے اور آسمان سے لپٹیں آ آ کر تمام جانداروں کو جھلستی ہوتیں، میں اس نقطہ بارد کی سردی میں ٹھٹھرتی ہوتی اس لیے کہ عورت کی روح کا یگانہ آفتاب یعنی عشق میری روح پر پرتو فگن نہیں ہوا تھا اس لئے کہ محبوب کی نگاہوں کے چمکدار تارے صرف جن سے عورت کے روح کی فضائے تاریک منور ہوتی ہے، ابھی تک سیاہ بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک دن میں شیوجی کے مندر میں گئی کہ اس تاریکی اور برودت کی جو میری روح پر طاری تھی ان سے شکایت کروں اور التجا کروں کہ وہ روشنی اور

گرمی مجھے بخشیں ———

مندر کی تنہائی تلے سے ایک نازک اندام نوجوان جس کی آنکھیں آتش سیاہ کی طرح چمک اور حرارت برسا رہی تھیں میری طرف آتا نظر آیا۔ اس کے قیافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مقدس برہمن ہے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ اس کی آنکھوں کی چمک میں بلا کی حرارت تھی۔ اسی لمحہ میں اس کی روح کی سیاہ چمکدار کھڑکیوں میں سے میری روح کے بارد نقطہ پر ایک آفتاب عشق نمودار ہوا اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس ہمنی اقلیم کے تمام ذرات میں ایک موانست پیدا ہو گئی۔ آسمان اپنے ستاروں کے ساتھ فضا اپنے لامتناہی طول کے ساتھ۔ زمین اپنے جنگلوں اپنے ذی روح مخلوقات اپنے تمام شاندار دریاؤں اور پہاڑوں کے ساتھ بیدار ہو گئی۔ اور میری روح میں آفتاب عشق سے اس طرح حرارت پیدا ہوئی کہ اس کا ایک ذرہ بھی بارد نہ رہا ———

غرضیکہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دنیا کی ہر شے کو اور مجھے ایک روح افزا آتش گرم کر رہی تھی۔ مگر اس نے اپنی روح کے بجھے ہوئے شرارے سے مجھے اور ایک عالم کو حرارت دیکر اپنی روح کی کھڑکیوں کو اپنی متین پلکوں سے بند کر لیا اور نکلا چلا گیا۔ وہ تو نکل چلا مگر میری زندگی ان گرمیوں کی آتش ریز راتوں میں زمین کے گرم سینہ پر محوم اور تپ زدہ زندگی تھی۔ دنیا کا سینہ اس عشق سے دھڑک رہا تھا جس کے درختوں اور جنگلوں میں ہر قسم کی مخلوق بستہ فتراک تھی۔ اور اب میں بھی ہر تنفس اور لمحۂ حیات میں دنیا کی ہم آہنگ تھی ———

میں ہر روز مندر کے دروازے تک جاتی تاکہ بھکاریوں کی طرح اس کی ایک نگاہِ غلط انداز کا دان اس سے مانگوں مگر وہ ہرگز ہرگز میری طرف نہ دیکھتا ———

بے نظیر ہیرے دلربایانہ سبزی سے چمکنے والے زمرد آنکھوں کو خیرہ کرنے والی رنگ کے یاقوت وہ موتی و جواہرات جو سنگدل معشوقوں کو موہ لیں اور ان کی نظر التفات خرید لیں یہ سب اس کی ایک نظر کے سامنے میرے نزدیک ہیچ و بے رنگ تھے۔ اس نظر کے سامنے جس سے اس نے تمام کائنات کو آفتاب عشق سے سوزاں و فروزاں کر دیا تھا۔ ان ہیرے جواہرات کو میں "شیو جی" کے مندر پہ لے گئی اور دیوتا کے قدموں پر میں نے انکو بکھیر کر نچھاور کر دیا کہ وہ اپنے پجاری کا ایک گوشۂ چشم میری طرف پھیر دے۔ ایک ذرہ آتش مجھے دلا دے، مگر میں اِک نظر اِک نوازش کو بھی ترسا کی۔

گرمی کی ایک شام تھی، خشک زمین میں ایسے دراڑے پڑے ہوئے تھے جیسے کسی کا پیاس سے منہ کھل گیا ہو۔ دنیا گرمی سے کباب ہو رہی تھی اس وقت میں مندر کے دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ زرد غبار سے آسمان ایک ایسا سنہری گیند معلوم ہوتا تھا جو گرمی سے پگھل رہا ہو۔ اس سنہری گیند میں وہ چاندی کی آنکھیں ایک ایک کر کے کھلنی جھپکنی شروع ہوئیں۔ دور سے جنگل کے ہیبتناک درندوں کی آوازیں، دھاڑیں سنائی دیتی تھیں۔ مندر سے ایک کالا ناگ بل کھاتا ہوا نکلا اور چلا گیا۔ چاند ایک سنہری تھال کی طرح درختوں کی سیاہ شاخوں پر سے نکل رہا تھا کہ میں نے اس کے پاؤں کی آہٹ سنی۔ جونہی وہ مندر کے دروازے کے قریب آیا میں اس کی طرف بڑھی اور میں نے اس سے منتیں کیں کہ میرے ساتھ چلے وہ تھوڑی دیر ٹھٹکا، چاروں طرف دیکھا۔ اس تنگ مقام سے خشک میدان کی طرف اور اس کے بعد جنگل کے تاریک اور تناور درختوں کی طرف چاندنی کی روشن لکیر جا رہی تھی، وہ بھی اس پر پڑ لیا میں اس کے پیچھے پیچھے تھی ہر چیز پر خاموشی اور مدہوشی طاری تھی ———

میدان میں پہونچ کر وہ ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ———

"اے عورت! بول کیا تو اپنی زینت، اپنے حسن اپنی جوانی کے بل پر کیا اس گناہ و فسوں کار کے بل پر جو روح کو پھندے میں پھنسا لیتا ہے میرے دل کو بھسلانا چاہتی ہے۔ میری روح پر اب تک کسی لذت نفس کا دھبہ نہیں لگا ہے وہ پاک و صاف ہے ———

تیری آنکھوں سے لامتناہی جذبات عشق کی لپٹ میری روح کی گہرائیوں کی طرف آ رہی ہے میرے شباب کی بشری آرزوؤں کو جنھیں میں نے اب تک روکا تھا بھڑکا رہی ہے۔ تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟" ———

چاند اس وقت سیاہ جنگلوں کے عین اوپر آ چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے ہمارے عشق کو جلا کرنے کے لئے ایک سنہری مشعل بھیجدی ہے۔ میں نے اس کا جواب نہ دیا صرف زرد باریک ریشم کے دوپٹے کو اوڑھے ہوئے جس کی کامدانی پر چاند کی شعاعیں فسولہ ڈر رہی تھی میں نے



اندرا جی سے ملنے گئے تھے۔ وہاں سے
اس حالت میں واپس آئے ہیں۔
میں نے انہیں زیادہ جھکنے سے منع کیا تھا

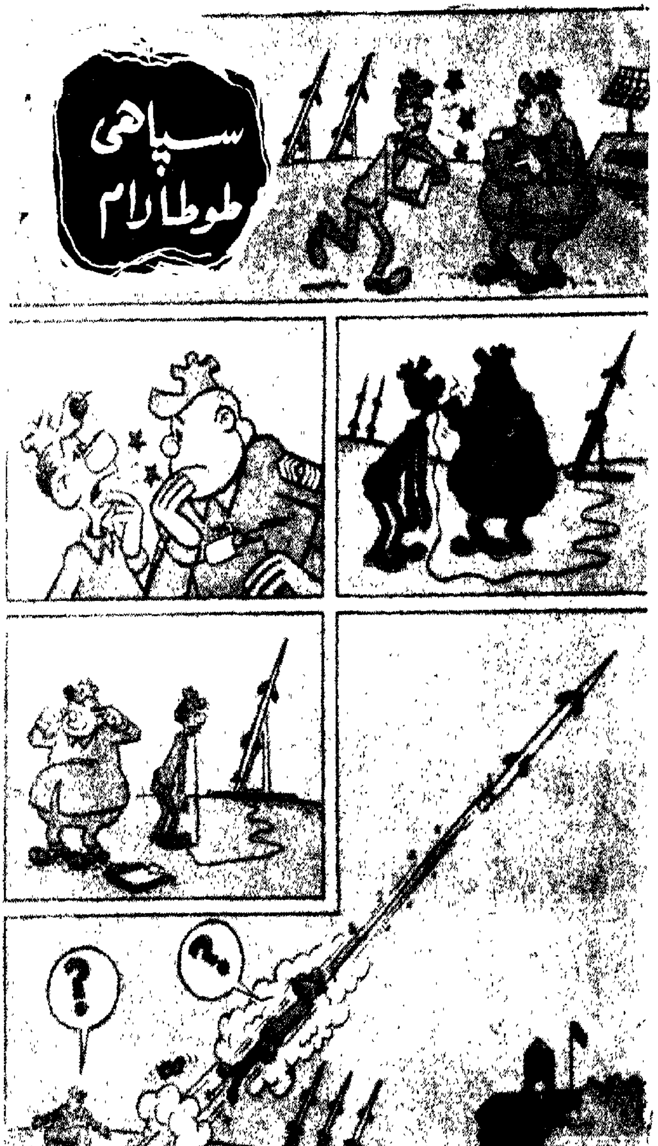
اس کے سامنے اپنا بہترین استادانہ ناچ ناچا اور زبان رقص سے اپنی حکایت عشق کہی۔ اس وقت چمکدار لباس میں میرا جسم، میرے بازو اور جسم ہی نہیں میری روح بھی بلیغ و آہنگ دار تجلیات کے ساتھ اس کے حضور میں رقص کر رہی تھی ———

میں اس وسیع میدان میں چاند کی زرد اور تنہا روشنی میں ایک چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی، یا ایک بسنتی پری بنی ہوئی تھی اور میں اپنی روح کے تمام درد و آلام تمام حسرت اضطراب، اپنے اوضاع کے اشعار سے (زبان سے نہیں) اس سے کہہ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سیاہ آنکھوں کی تابش سے اس کی روح، اس کا دل میری طرف آ رہا ہے، قریب آ رہا ہے، اور قریب آ رہا ہے۔ ———

لیکن عین اس وقت ڈراؤنی آوازیں مجھے سنائی دیں میں نے سر پھرا کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک غول ایک خوفناک مخلوق کا جن کے چہرے سیاہ جن کی آنکھیں شعلہ تھیں ننگے پاؤں ننگے سر میری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے، ان کی نظروں میں قہر و غضب، ان کی آواز میں تہدید اور ڈپٹ بڑھتی جاتی تھی، وہ میری طرف اور بڑھے چاندنی کے سکوت اس میں سے ایک سوکھی ہوئی ڈراؤنی آواز نے کہا ———

"ایک پاکباز آدمی کو اس نے بہکایا ہے۔ اس کی نحوست روح شیطانی ہے، اسکو اس کے جسم میں سے نکالو اور آگ میں ڈال دو!" ———

بقیہ:- مرارجی بھائی





کے آدمی ہیں۔ جس شخص نے چالیس برس سے چینی کو ہاتھ نہ لگایا ہو وہ کتنے عزم محکم کا مالک ہو سکتا ہے۔ آپ خود سوچئے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی کمزوری کو تسلیم کرنے والے شخص ہیں اور ایسا شخص حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

انتخابات سے قبل ہی انھوں نے اپنی کمزوری کا احساس کر لیا تھا اور اسی لئے جن سنگھیوں اور دوسرے موقع پرستوں کے کندھوں پر بندوق چلانے کی ٹھانی تھی۔ نشانہ غلط ہو گیا تو کیا ہوا۔ یہ پہلا نشانہ تھا دوسرا نشانہ خود وہ پارلیمنٹ میں لگا سکتے ہیں۔ دوسروں کا سہارا لینے کی اب انھیں عادت پڑ گئی ہے۔ جن سنگھیوں نے سابق راجوں مہاراجوں اور سوشلزم کے دشمنوں کی مدد سے ۲۲ سیٹوں پر قبضہ کر لیا ہے اپنے ۱۶ ممبروں کو ۲۲ جن سنگھیوں سے ملا دیں، وہ بخوشی مل جائیں گے اس لئے ان کے گرو گول والکر نے انھیں مشورہ دیدیا ہے کہ ڈیسائی کے پیچھے چلو۔ ۱۶ اور ۲۲ مل کر ۳۸ ہو جائیں گے۔ پھر ۳۸ کے اس کریلے کو نیم چڑھا بنانے کے لئے تین نام نہاد سوشلسٹوں کی چاشنی اس میں شامل کر دیجئے۔ "دارو ئے تلخ" بن جائے گی جو یقیناً "دافع مرض" یعنی کہ ایوان کی خاموشی کی بیماری کو دور کرنے والی ہو گی۔ ۴۱ کی تعداد اتنی اودھم چوکڑی مچانے والی ہے کہ اندراجی کے لئے کام کرنا مشکل کر سکتی ہے۔

ویسے پچاس ممبروں کی تسلیم شدہ اپوزیشن بنانا ہو تو آٹھ کی بھیک سوتنتر پارٹی سے مانگی جا سکتی ہے۔ مسانی اور رنگا میں سے کوئی بھی ان آٹھ ممبروں کی قیادت سنبھالنے کے لئے ایوان میں نہیں ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ صدر سوتنتر پارٹی اپنے ممبروں کو ڈیسائی بھائی کی قیادت میں دینے پر کوئی بھی اعتراض نہیں کریں گے۔ امریکی نواز مرامریکی نواز سے مل جاتا ہے۔ یہ تعداد ۴۹ تک پہونچے گی۔ ایک کی کمی ہو گی تو واحد جن سنگھی (بی۔ کے۔ ڈی) کو ملا کر یہ کمی پوری ہو سکتی ہے یا کسی سابق راجہ مہاراجہ یا کسی کا بھی دست تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے ایک ووٹ لینا کیا مشکل کام ہے اس طرح یہ باقاعدہ اپوزیشن قائم ہو جائے گی جس کے لیڈر مسٹر ڈیسائی ہوں گے۔

اپوزیشن کے اس قیام پر ہم مسٹر ڈیسائی "زندہ باد" کا نعرہ بلند کر سکتے ہیں۔ وزارت عظمیٰ نہ ملی تو کیا ہوا وزارت عظمیٰ کی ٹکر کا عہدہ تو مل گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ایس۔ کے۔ پاٹل منیں گے تو انھیں اپنا بیان واپس لینے پر غور کرنا پڑے گا۔

واقعات نئی دھلی

اور ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ کے پیروں کے نیچے سے تو اوپر کھیئے زمین ہی نکل جائے گی۔ اس لئے کہ پچھلی پارلیمنٹ میں سب سے انھوں نے ڈیسائی کو ہاتھ پکڑ کر پیچھے کر دیا تھا اور کہا تھا کہ۔

"اپوزیشن کی لیڈرشپ کا حقدار صرف میں ہوں۔" اب سنیں گے اگر ڈیسائی اپوزیشن لیڈر بن گئے تو انھیں اپنا حق یاد آئے گا لیکن۔ "اب پچھتائے کا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

بہار جا چکی نقشِ بہار باقی ہے



...بند گئے کا یہ سوئٹر ہی ٹھیک ہے۔ ہارنے کے بعد ...کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔



روز کسی نہ کسی کا کھیت چر جاتا ہے۔ کمبخت مار مار کر چرن سنگھ بنا دوں گا۔



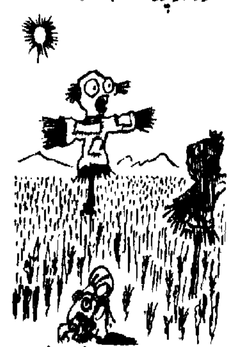
وہ جیوتشی تو انتخابات کا نتیجہ نکلنے سے ایک دن پہلے ہی بھاگ گیا۔



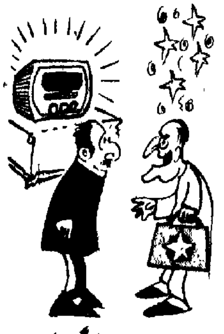
جب تک میری ناک ٹھیک نہیں ہو گی نہیں جاؤں گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ناک کٹ گ...



بند کر دو یہ ریڈیو۔



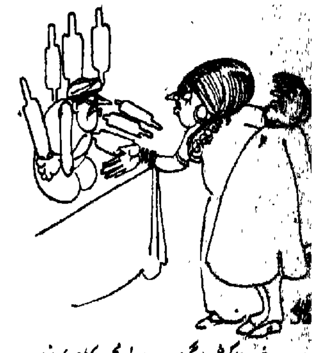
ہم بھی اس علاقہ میں اندرا کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔



دن میں تارے نظر آ گئے تو کیا ہوا۔ تارا تو ہمارا انتخابی نشان ہے۔



بے چارے راجہ صاحب کی ضمانت ضبط ہو گئی۔



میرا شوہر الیکشن ہار گیا ہے۔ اسلیے مجھے لکڑی کا نہیں بلکہ لوہے کا بیلن چاہیے۔



الیکشن ہارنے سے پہلے میں تمہاری عمر کا تھا تو صرف فلمی اداکاراؤں کی تصویریں لگایا کرتا تھا



اب آپ الیکشن ہار چکے ہیں۔ میرا تو نوٹوں کا ہار واپس کر دیجیے۔



...بند ہو کر......



آپ اس وقت تک لوک سبھا میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جب تک مجھے مخالفین کے جلسوں میں ٹماٹر پھینکنے کا معاوضہ نہیں دیں گے۔



میاں دس سال روزگار کے دفتر پر رہا ہوں۔ میرا نام سب سے اوپر لکھیے۔

قدم قدم پہ فریب

گھٹا اٹھی کہ اٹھا اہل کی چمنیوں سے دھواں
برس رہی ہیں یہ بوندیں کہ آنسوؤں کے گہر
جو گلشنوں میں سرِ شاخ مسکراتے ہیں
یہ پھول ہیں یا زخم ہائے قلب و جگر

زمین لالہ بہ داماں تو ہو گئی ! لیکن
یہ رنگ خونِ شہیدانِ آرزو تو نہیں
لرز رہی ہے جو سرخی افق کے دامن پر
کسی کے جذبۂ معصوم کا لہو تو نہیں

رچی ہوئی ہے ہواؤں میں نغمگی ! لیکن
کسی سسکتی ہوئی روح کی پکار نہ ہو
شفق کے رنگ میں گھلتی ہوئی یہ قوسِ قزح
کسی کے دامنِ عصمت کا کوئی تار نہ ہو

بہار آئی ہے دامن میں رنگ و بو لے کر
کہ تمہارے وعدہ کا تازہ پیام آیا ہے
فضائیں چار طرف مستیوں کے گھیرے ہیں
کہ زہر رنج و الم کا غبار چھایا ہے

یہ کیا جگہ ہے [illegible] ہے یارو
یہاں حیات [illegible] ہے اک جستجو کو
ہر اک [illegible] قدم قدم پہ فریب
[illegible] نظام آنے کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

کفیل الرحمٰن نشاط

نیا چناؤ نئی کانگریس نیا منشور — نیا نظام نئی زندگی [illegible]
امینِ عزتِ ہندوستاں تمہیں سمجھا — بالاتفاق تمہیں [illegible]

تمہارے دورِ قیادت میں یہ دھیان رہے — عروسِ ہند کا ملبوس [illegible]
کلی کلی نہ ہو بغض و نفاق کا چرچا — جو خلفشار رہا پہلے [illegible]

کوئی یہ کہہ نہ سکے ہند کے گلستاں میں — بہارِ لالہ و گل کی جگہ [illegible]
کوئی یہ کہہ نہ سکے ناروا تشدد میں — نہیں ہے ہند کے [illegible]

کرو یہ عہد کہ فتنہ پسند عنصر کا — بنامِ شانتی و امن [illegible]
کرو یہ عہد کہ فرقہ پرست طبقے کا — مزاج قوتِ یکجائی [illegible]

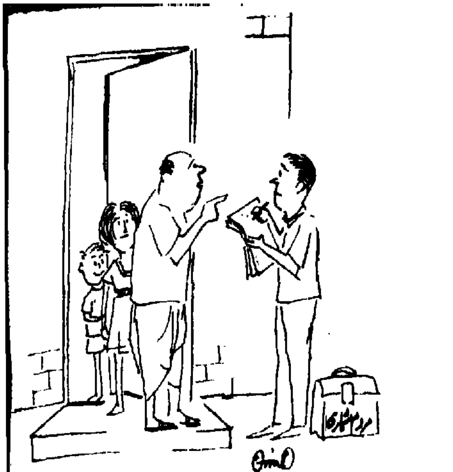
[illegible] اب لہو کی ارزانی — کسی کی مانگ کا [illegible]
جبینِ عدل جھکے گی [illegible] کے لئے — کوئی [illegible]

[illegible] فراست پسند اہلِ وطن — خلوص [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible] ہندوستاں کے گلشن میں — [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

MARCH 197 **WAQIAT** REGD. NO.
(SECOND HALF) NEW
TELEPHONE



"ذرا ایک منٹ رک جائیے ـــــ خاندان میں
ایک اور فرد کا اضافہ ہونے والا ہے۔"



...شروع کرنے سے پہلے جب میں انجینئر تھا تو تین مہینے تک ان کی کوٹھی کے چکر
... لیکن ملاقات نہیں کر سکا۔

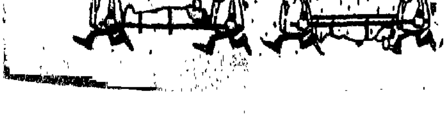


"فرزیر نے علی کو ہرا دیا!" . . . . . . کتنے ووٹ سے



...کر رہے ہیں کہ گھر کا بڑا (Head) کون ہیں.





واقعات
نئی دہلی

کیا شام، مصر اور لیبیا کی نئی فیڈریشن زیادہ دیر قائم رہ سکے گی؟

(ڈاکٹر ذاکر حسین کی دوسری برسی کے موقع پر)



قول و عمل



وسطیٰ کی سیاست میں نیا موڑ!

بلک حلقوں میں امریکی وزیر خارجہ کے دورۂ مشرق
ت دی جا رہی ہے اور بعض حلقوں میں یہ سمجھا جا رہا ہے
یقے میں مشرقِ وسطیٰ کا سیاسی بحران دور کیا جا سکے
رائیل کا شروع سے جو رویہ رہا ہے اور ۱۹۶۷ء کی
اس رویے میں جو سختی آئی ہے اس کے پیشِ نظر
کامیابی کی زیادہ امید کا اظہار نہیں کیا جا رہا ہے خود
سے اپنا دورہ شروع کرنے سے قبل کہا تھا کہ اس
انقلاب کی توقع نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے اس
اتفاق کیا کہ اس سے سمجھوتے کی راہ معلوم کرنے کے عمل
ال ہوگی جس کا سلسلہ پہلے سے موجود ہے۔
وتے کی راہ معلوم کرنے کا عمل گزشتہ ۳ برس سے
ین نتیجہ آج تک صفر ہی رہا ہے۔ یارنگ مشن کو بڑی
ات کے ساتھ شروع کیا گیا تھا لیکن ۴۰ مہینے
کے بعد ڈاکٹر یارنگ کو بے نیل مرام ہی ماسکو واپس
ن وہ اپنے ملک سویڈن کے سفیر ہیں۔ یارنگ
کامی کی اصل وجہ اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور وزیر
ل مسز گولڈا مائر کا اسرائیلی پارلیمنٹ میں (...)
کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں پر واپس
ے گا۔

سے قبل چار بڑے ممالک (امریکہ، روس ...
... [illegible]

بعد ڈاکٹر یارنگ کی سربراہی میں جو بات چیت ہو رہی تھی اس میں تعطل پیدا ہو گیا۔

اس تعطل کا نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلنا چاہیے تھا لیکن ہم اسے مسٹر انور سادات (صدر متحدہ عرب جمہوریہ) کا سیاسی تدبر کہیں گے کہ انھوں نے نہایت ضبط و تحمل سے کام لیا اور میدانِ جنگ میں اسرائیل کو للکارنے سے قبل جس کی وہ یقیناً صلاحیت رکھتے ہیں سفارتی سطح پر اسرائیل کو شکست دینا ضروری سمجھا۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے سفارتی نمائندے بھیجے تاکہ وہ انھیں عربوں کے موقف سے آگاہ کریں اور بتائیں کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور دوسرے عرب ممالک پائیدار امن کی کتنی خواہش رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عربوں کے حق میں اچھا نکلا اور دنیا کے بڑے اور بااثر ممالک نے انور سادات کی امن پسندانہ پالیسی کی تائید و حمایت کی اور نہر سویز کی واگذاری سے متعلق انکی تجاویز کو مناسب و معقول قرار دیا۔ خود امریکہ میں محسوس کیا گیا کہ انور سادات کے عزائم جارحانہ نہیں ہیں بلکہ وہ حقیقی معنوں میں امن چاہتے ہیں۔ غالباً اسی احساس کے پیشِ نظر امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس نے جو سینٹو (سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کے اجلاس میں شرکت کے لئے انقرہ گئے تھے عرب ممالک (متحدہ عرب جمہوریہ، اردن اور لبنان) اور اسرائیل کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ایک مرتبہ پھر بذاتِ خود فریقین کے سربراہوں سے ملاقات کر سکیں اور مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی بحران کو ختم کرنے کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔

لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسٹر راجرس کے دورے کا کیا نتیجہ نکلے گا کیونکہ جب تک ... یارنگ مشن کا احیاء

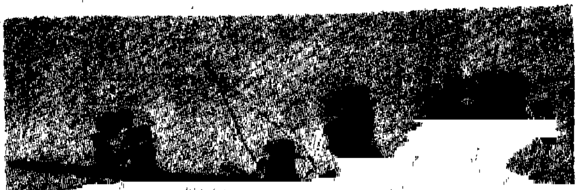
مکمل ہو جائے اور ایک مرتبہ پھر مذاکرات و بات چیت کی الجھنوں میں پھنسا دیا جائے۔

لیکن کیا مسٹر انور سادات اسے منظور کریں گے؟ اس سے قبل وہ اعلان کر چکے تھے کہ مشرقِ وسطیٰ کا حل اسی اپریل میں نکلنا چاہیے لیکن اپریل بھی گزر گیا اور معاملہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے اب مئی کا مہینہ بھی آہستہ آہستہ گزر رہا ہے اور ابھی کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ اسرائیل کے رویے میں کوئی تبدیلی ہوگی — شاید اس وقت تک تبدیلی نہ ہو جب تک وہ محسوس نہ کر لے کہ عربوں کی طاقت اس سے زیادہ ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ اور عربوں کی طاقت اسرائیل سے کچھ کم نہیں ہے لیکن ان کے باہمی افتراق نے اس طاقت کو دشمن کے مقابلے میں کم کر دیا ہے اور اب مسٹر علی صبری کی برطرفی کے بعد ظاہر ہو گیا ہے کہ خود متحدہ عرب جمہوریہ میں بھی دو گروپ موجود ہیں جو ایک دوسرے کی پالیسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ مگر گروپ کس ملک میں نہیں ہوتے اسرائیل میں بھی گروپ ... پارٹی بازی کی جماعتیں ہیں لیکن وہ سب قومی مسائل میں متحد ہیں جبکہ اس کے برعکس عربوں کی گروپ بندی اتنی ... ہے کہ وہ قومی مسائل میں بھی ایک دوسرے سے الگ ... ہیں ان کی یہی کمزوری ان کی شکست کی اصل وجہ ہے۔

بہرنوع مسٹر راجرس کے دورے سے مشرقِ وسطیٰ کی سیاست میں نیا موڑ آیا ہے اور امن پسند دنیا یہ دیکھنے کی منتظر ہے کہ امریکی وزیر خارجہ مشرقِ وسطیٰ کے بحران کو حل کرنے اور نہر سویز کو کھلوانے کے لئے کیا ٹھوس قدم اٹھاتے ہیں۔ —

بلو پیٹک جنگ میں انور السادات کی شاندار فتح

مصر کے پاس دنیا کے سب سے زیادہ تیز رفتار طیارے



صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور سادات نے نہر سویز کو دوبارہ کھولنے اور اسرائیل و عرب ممالک کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کے لئے کچھ تجاویز پیش کی تھیں۔ وہ ان تجاویز کو اسرائیل سے منظور کرانے میں ناکام رہے لیکن ایک عرب یونین کے قیام سے متعلق اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ دو ہفتے ہوئے ایک معاہدے پر شام کے صدر جنرل حافظ الاسد اور لیبیا کے سربراہ کرنل معمر القذافی کے ساتھ دستخط کر دیئے۔ عنقریب اس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

ایک اور کامیابی انور سادات کو یہ ہوئی کہ دنیا کی مختلف جانب سے انہوں نے اپنے ہمدرد پیدا کر لئے اور سب کو معلوم ہو گیا کہ مشرقِ وسطیٰ میں موجودہ صورتِ حال کی ذمہ داری اسرائیل پر ہے جو کسی حالت میں مقبوضہ عرب علاقے خالی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اسرائیل کی اس ہٹ دھرمی اور قیامِ امن سے اس کی عدم دلچسپی کے پیش نظر متحدہ عرب جمہوریہ کے لئے اپنی طاقت میں اس حد تک اضافہ کرنا ضروری تھا کہ وہ کسی بھی اچانک حملے کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ گزشتہ ماہ مسٹر انور سادات نے روس کا دورہ کیا اور روسی لیڈروں سے مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر بات چیت کی۔ اس کے بعد سے روس کی طرف سے متحدہ عرب جمہوریہ کو برابر ہتھیار مل رہے ہیں ان میں انتہائی جدید قسم کے ہوائی جہاز اور میزائل شامل ہیں۔

روس نے ایک نیا جنگی ہوائی جہاز تیار کیا ہے جس کا نام دیا گیا ہے اور جسے ناٹو کے ممالک "فاکس بیٹ" کہہ کر ... ہیں۔ یہ مزاحمت کرنے والے ہوائی جہاز ہیں جو آواز کی رفتار سے تین گنا زیادہ یعنی دو ہزار میل گھنٹے کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں اور ۸۰ ہزار فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں (دنیا کے سب سے زیادہ تیز اڑنے والے طیارے ہیں) یہ امریکہ کے مشہور فینٹم طیاروں کی بلندی پرواز سے ۲۰ ہزار فیٹ ... ہے (حال ہی میں اسرائیل نے امریکہ سے ۱۲ فینٹم طیارے خریدے ہیں)

یہ پہلا موقع ہے کہ روس نے مگ ۲۳ قسم کے طیارے ملک سے باہر بھیجے ہیں۔ اس سے قبل روس نے مگ ۲۱ کے ... طیارے متحدہ عرب جمہوریہ کو دیئے تھے کہ ... گزشتہ ... جنگ میں ہوائی جہازوں کا جو نقصان ہوا تھا اس کی تلافی ہو سکے۔ ... کے پاس ... روس نے ... مگ ۲۱ طیارے ...



[illegible]

... کے ذریعہ انہوں نے ایسے لڑاکا طیارے بھی دیے ہیں جن سے بمبوں میں کام لیا جا سکتا ہے۔ نانو کے ممالک میں انہیں "فلیگن" کا نام دیا گیا ہے۔ مگ-۲۳ کی طرح یہ طیارے بھی پہلی بار ملک سے باہر بھیجے گئے ہیں۔ یہ آواز کی رفتار سے ڈھائی گنا زیادہ یعنی ۱۵۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ ۶۰ ہزار فیٹ بلندی تک پرواز کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ فلوگر قسم کے طیارے ہیں جو فینٹم فائٹر طیاروں کے برابر رفتار کے ساتھ اور اتنی ہی اونچائی پر اڑ سکتے ہیں جو امریکا نے اسرائیل کو مہیا کیے ہیں۔

ان لڑاکا ہوائی جہازوں کے ساتھ ساتھ زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل بھی متحدہ عرب جمہوریہ کو مہیا کیے گئے ہیں۔ ایس۔ اے۔ ۴ قسم کے میزائل انتہائی جدید میزائل ہیں جو بڑی تیزی کے ساتھ فضائے آسمانی میں مار کرتے ہیں۔ اسوان بند اور اسوان سے ۱۲۵ میل شمال کی جانب میزائل نصب کیے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ ایک موثر دفاعی نظام کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایس-۲ اور ایس-۳ بحری جہاز کے ذریعہ سوئز کی بندرگاہ میں بھیجے جا رہے ہیں۔ راڈار کا انتظام الگ ہے۔ پی-۱۵ راڈار سسٹم جو مصر کو مہیا کیا گیا ہے اتنا ہی جدید اور اتنا ہی طاقتور ہے جتنا کہ امریکی راڈار ہے۔ اس کا رینج ۲۰۰ میل ہے۔ اس نظام کے ذریعہ متحدہ عرب جمہوریہ کو بہت پہلے سے اسرائیلیوں کے ہوائی حملے کا پتہ لگ جائے گا۔ اب تک ایسا نہ تھا۔

روس کی طرف سے متحدہ عرب جمہوریہ کی اتنے بڑے پیمانے پر امداد سے یہ مرتبہ تھا کہ اسرائیل خوف زدہ ہو گئے اور اپنی تشویش کا اظہار کیا جو انھوں نے کیا کہ "مصر میں ہتھیاروں کے ذریعہ صورت حال سنگین ہو گئی ہے" لیکن اسرائیل افسروں نے اس سے زیادہ کسی اور تشویش کا اظہار نہیں کیا کہ اس صورت میں [illegible]

[illegible]



علی صبری کی برخاستگی

مسٹر سادات اگر مرحوم صدر کا دایاں بازو تھے تو علی صبری بایاں بازو تھے۔ بایاں اس لئے بھی تھے کہ وہ بائیں بازو کے خیالات کے حامل تھے۔ روس کے گہرے دوست اور امریکا کے کٹر دشمن۔ ایک ایسے وقت جب کہ امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس امریکا کے دورے پر آنے والے تھے ان کی برخاستگی پر کسی کو تعجب نہ ہوا۔

یہ بھی کہا گیا کہ عرب فیڈریشن کے قیام پر اختلافات کی بنا پر مسٹر صبری کو برخاست کیا گیا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہوتی، عرب اتحاد کے کون عرب لیڈر خلاف ہوگا۔ اصل میں یہ ہے کہ وہ خود امریکا کے خلاف تھے اور کسی امریکی لیڈر سے بات چیت کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔

الاہرام کے ایڈیٹر مسٹر ہیکل جو مرحوم صدر ناصر کے معتمد خاص تھے، کچھ دنوں سے زور دے رہے تھے کہ مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنا ہے تو امریکا کو ہموار کرو۔ شاید امریکا ہی کو ہموار کرنے کے لئے مسٹر علی صبری کو سبکدوش کیا گیا ہے۔ اسرائیل میں اس برخاستگی پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس سے مصری لیڈروں اور امریکی وزیر خارجہ کے درمیان بات چیت پر خوشگوار اثر پڑے گا لیکن اسرائیل نے [illegible] سیٹا اور ڈھیلی [illegible]" کی جو پالیسی اختیار کی ہے اس [illegible] یقین ہے کہ مشرق وسطیٰ کا بحران ختم نہ ہوگا۔ وقت کے ثبوت کبھی باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ اور ابھی دیکھنا کہ اس پر روس کا کیا ردعمل رہتا ہے جس نے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کو اس قابل کیا ہے کہ وہ اسرائیل جیسی طاقت سے جسے امریکا کی بھرپور حمایت حاصل ہے ٹکر لے سکے۔

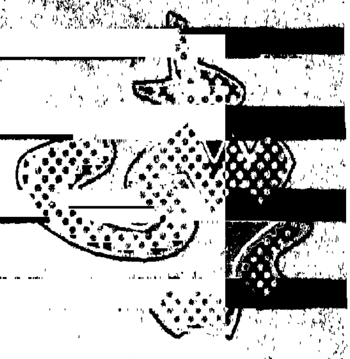
نے "محفوظ و تسلیم شدہ سرحدوں" کی جو رٹ لگا رکھی ہے ابھی پر برابر قائم ہے اور روس کی طرف سے مصر کو جدید قسم کے ہتھیاروں کی سپلائی کے باوجود اس کی پالیسی نہیں بدلی ہے اس لئے کہ اسرائیلیوں کو یہ یقین ہے کہ جدید قسم کے جو لڑاکا طیارے روس نے مصر کو مہیا کیے ہیں ان سے مصری زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔

اسرائیل کے ایک سابق ایئر فورس کمانڈر میجر جنرل ایزر ویزمین نے کہا کہ: رفتار کی اس وقت بلاشبہ اہمیت ہے جب آپ کہیں پہنچتے یا واپس کرتے ہیں لیکن مقابلے میں زیادہ رفتار کام نہیں آتی بلکہ کم رفتار پر مقابلہ ہوتا ہے اور اس طرح اسی ہزار فیٹ کی بلندی سے مگ نہیں گرائے جاتے۔ میں مگ-۲۳ حاصل کرنے سے صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگا۔

[illegible] اسرائیل کا خیال ہے کہ امریکا [illegible] ہتھیاروں کی کمی کو امریکا ضرور پوری کر دے گا۔ "پچھلے دنوں صدر مسٹر نکسن نے کہا کہ۔

"اگر روس کی طرف سے مصر کو ہتھیاروں کی سپلائی جاری رہی تو وہ اور زیادہ اسلحہ اسرائیل کو مہیا کریں گے اور مشرق وسطیٰ میں طاقت کا توازن بگڑنے نہ دیں گے"

اسلحے کی یہ دوڑ مشرق وسطیٰ میں ایک نئی جنگ کا خطرہ اندر ہی اندر پک رہا ہے نہ جانے وہ کب پھٹ پڑے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ اس مرتبہ عرب ممالک اسرائیل کے لئے تر نوالا ثابت نہیں ہوں گے بلکہ اسے ایک بڑی طاقت سے ٹکر لینا ہوگی اور وہ علاقے خالی کرنا ہوں گے جن پر اس نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ اسرائیل امن سے کبھی ان علاقوں کو خالی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن وہ وقت آ گیا ہے کہ طاقت کے ذریعہ ان علاقوں کو خالی کرنے کے لئے قدم اٹھایا جائے۔



چودہ سالہ فرانکوئیس دوولیئر کا نام تاریخ میں جب اس بات کے لئے یقیناً روشن رہے گا کہ اس نے بحیرۂ کیریبین کی ہیٹی نامی چھوٹی سی ریاست کو جو مغربی کرۂ ارض کی جنت بن سکتی تھی جہنم میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی موت کی خبر عوام نے اور خاص طور سے جلاوطن لوگوں نے سنی تو وہ خوشی سے ناچ اٹھے۔

ہیٹی کی آبادی اس وقت ۴۹ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور ان میں اکثریت کالوں کی ہے۔ کالوں کی تعداد اس لئے بڑھی کہ ۱۴۹۲ء میں جب کولمبس نے اس جزیرے کو معلوم کیا تھا تو اس کے بعد جنگوں اور دوسرے اسباب کی بنا پر وہاں کے اصل باشندے ریڈ انڈین ختم ہو گئے اور ۱۵۱۰ء میں جب اس کا احساس ہوا تو انہوں نے شاہ اسپین سے جس کا اس پر تسلط تھا افریقہ کے کالے غلاموں کو لاکر وہاں پر بسانے کی اجازت طلب کر لی۔ ۱۸۰۴ء میں غلاموں کی بغاوت نے اسے کالوں کی پہلی جمہوریت میں تبدیل کر دیا لیکن جمہوریت میں تبدیل ہونے کے بعد یہ جزیرہ بدامنی کا شکار رہا جس کے نتیجے میں مغربی کرّے کا یہ جزیرہ جو کبھی کسی زمانے میں فرانس کی سب سے زیادہ زرخیز نو آبادی خیال کیا جاتا تھا بنجر زمین میں تبدیل ہو گیا۔ فرانکوئیس دوولیئر کا چودہ سالہ دور حقیقی معنوں میں خوف و دہشت زدگی کا دور تھا جس میں ہر شخص سہما سہما رہتا تھا کہ نہ جانے کب اس پر ظلم کیا جائے۔ یہ جمہوریت نہیں بدترین ڈکٹیٹر شپ تھی۔ فرانکوئیس دوولیئر جسے عام طور پر "پاپا ڈاک" کہہ کر

۱۹ سالہ جین کلاڈ ۔ ہیٹی کا نیا صدر

پکارا جاتا تھا ایک میڈیکل ڈاکٹر تھے۔ اس جزیرے میں ایک موقع پر کوڑھ کی بیماری پھیلی جس میں اسی فیصدی لوگ مبتلا ہوئے اور پاپا ڈاک نے علاج معالجے میں نام پیدا کر کے لوگوں کے دل جیت لئے۔ وہ ۱۹۴۱ء میں مملکت کے وزیر صحت بنائے گئے اور بعد ازاں ۱۹۵۷ء میں فوج کی مدد سے عہدۂ صدارت پر قبضہ کر لیا۔

لیکن ابھی انہوں نے بمشکل اپنے عہدے کا چارج لیا تھا کہ پاپا ڈاک ایک "کالے نیشنلسٹ" سے کالے ہٹلر میں تبدیل ہو گئے۔ انہوں نے ہٹلر کی طوفانی فوج کی طرح "ٹون ٹون میکاؤٹس" نامی دستہ تیار کیا جس نے جزیرے میں ایسی خوف و دہشت پھیلائی کہ ہزاروں لوگ مملکت چھوڑ کر بھاگ گئے۔ "پاپا ڈاک" نے وہ چیز ایسے لوگوں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا جن سے خطرہ تھا کہ وہ اقتدار چھیننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے اپنے ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا اور ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فولادی خود اور گہرے رنگ کے چشموں میں ملبوس دستے کا ہر سپاہی ہیٹی کے باشندوں کے لئے خوف و دہشت کا نشان بن گیا۔

پاپا ڈاک نے عوام پر اپنا غلبہ رکھنے کے لئے جادو کا بھی خوب استعمال کیا جس پر عام طور پر جزیرے کے سب ہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے دیہی علاقوں کے جادوگروں کو جو اپنے اپنے علاقوں کے بڑے تھے اپنے دربار میں طلب کیا اور انہیں

جین کلاڈ کی بڑی بہن سیمون ۔ ۱۹۷۱

اعتماد میں لے کر پروپیگنڈا کرایا کہ "وہ ایک غیر معمولی ... کا مالک ہے"۔ جیسے فخر سے پاپا ڈاک کہا کرتا تھا کہ "میرے دشمن مجھے ختم نہیں کر سکتے اس لئے کہ میں ... سے بنا ہوا انسان نہیں ہوں"۔

یہ سب ڈھونگ اس لئے رچایا گیا کہ ہیٹی کے ۳۶ صدروں میں سے ۲۳ کو قتل کر دیا گیا یا اقتدار سے اتار دیا گیا تھا۔ اسی لئے اس نے ایک طرف یہ ... پھیلایا اور دوسری طرف خوف و دہشت کی فضا پیدا کر دی۔ ایک بار تو اس کے ... نے بغاوت کی تو

[illegible]

[illegible] نے جزیرے سے ہٹانے کی کوشش کی اور اس کے لیڈر کو ہلاک کر دیا گیا تو پاپا ڈوک نے اس کا سر کٹوا کر اپنے محل میں منگوا لیا۔ کہتے ہیں اپنے محل کے تہہ خانے میں وہ قیدیوں کو خود ایذائیں پہنچایا کرتا تھا۔ اس کے محافظین کی تعداد پانچ سو تھی اور وہ جب کسی سے بات کرتا تو اس کی میز پر بھرا ہوا پستول رکھا رہتا تھا۔

ایک طرف پاپا ڈوک ہر وقت اپنی حیثیت کو مضبوط بنانے اور اسے محفوظ رکھنے میں مصروف تھا، اور اس وقت تک جب تک زندہ رہا "تاحیات صدر" رہنے کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف ہیٹی مغربی نصف کرہ میں سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ بنا رہا۔ اس کی غربت اور پسماندگی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہاں کے ۹۰ فیصدی لوگ یا بے روزگار ہیں یا انھیں بہت کم روزی ملتی ہے۔ فی شخص آمدنی مغربی نصف کرہ میں سب سے کم یعنی صرف ۵۰ ڈالر سالانہ کی آمدنی ہے۔ عمر کا اوسط بھی صرف ۳۳ برس اور تعلیم صرف سات سے دس فیصدی تک۔ یہاں دو چیزیں زیادہ ہیں شرح پیدائش اور بچپن میں شرح اموات۔ تقریباً پچاس فیصدی بچے پانچ برس کی عمر کو پہونچنے سے قبل ہی چل بستے ہیں۔

ان کے آخری دنوں میں حالت کچھ بہتر ہونے لگی تھی اور معاشی ترقی کا پھر سے آغاز ہو رہا تھا کہ اس کی جانشینی کے سوال پر رقابتوں کی وجہ سے اثر پڑنے کا اندیشہ ہونے لگا ہے۔ پاپا ڈوک کے ۱۹ سالہ بیٹے "جین کلاڈ" کو باپ کی وصیت کے مطابق صدر بنا دیا گیا ہے اور اس نے اپنے عہدے کا حلف بھی اٹھا لیا ہے لیکن میدان میں دوسرے لوگ بھی ہیں۔ خود جین کلاڈ کی تیس سالہ بہن میری ڈینس ہے جو عام طور سے "ماڈ ڈوک" کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے باپ سے بڑی مشابہ ہے۔ صرف اسی کی ایک شخصیت تھی جو پاپا ڈوک کے مقابلے کھڑی ہونے کی جرأت کر سکتی تھی۔ [illegible] باپ کی [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] شادی کر لی اور اس وقت فرانس میں اپنی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بریگیڈیئر جنرل کلاڈ [illegible]

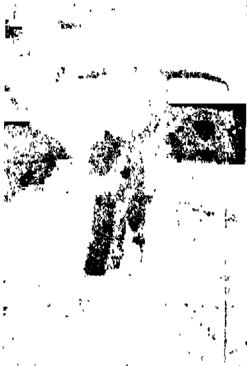
[illegible] کرنل [illegible] [illegible] [illegible] میں سب سے چالاک سیاست داں "میڈم ڈوک" ہی ہے جو اپنے باپ کی آخری زندگی میں اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ باہمی رقابتوں کے پیش نظر ہی ڈومینکن ریپبلک نے جس کی سرحدیں ہیٹی سے ملتی ہیں اپنی بارہ ہزار فوجیں جمع کر دی ہیں اور امریکی بحری بیڑہ بھی بحر کیریبین میں چکر لگا رہا ہے تاکہ اگر کیوبا کی طرف سے جو ہیٹی سے صرف پچاس میل دور ہے مداخلت ہو تو اس سے نپٹا جا سکے۔ خود امریکا اس "جزیرائی مملکت" پر بیس برس (۱۹۱۵-۳۵ء) تک حکومت کر چکا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب امریکا کو یقین ہو گیا کہ اس کے مفادات محفوظ رہیں گے تو اس نے اس جزیرے کو آزاد کر دیا۔ پاپا ڈوک نے چالاکی یہ کی تھی کہ اس نے اپنی رعایا پر گو وحشیانہ مظالم توڑے لیکن اس نے امریکی مفادات کو نقصان نہیں پہونچایا نتیجہ میں امریکی امداد حاصل کرتا رہا۔ لیکن آج امریکا کو اندیشہ ہے کہ ۱۹ سالہ "جین کلاڈ" شاید اس کے مفادات کا تحفظ نہ کر سکے اور جانشینی کے سوال پر کہیں خانہ جنگی شروع نہ ہو جائے اسی لئے اپنی فوجوں کو ہوشیار کر رہا ہے اور انتظامی بیڑہ سمندر میں گشت لگا رہا ہے۔

اٹلی

والدین بچوں کو فروخت کر دیتے ہیں

لیبر قوانین کی خلاف ورزی ہندوستان اور ایشیائی ممالک ہی میں نہیں یوروپین ممالک میں بھی ہوتی ہے۔ اٹلی میں پندرہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کام پر لگانا منع ہے لیکن دس گیارہ سال کے بچوں سے بھی وہاں کام لیا جاتا ہے اور ان کے والدین انھیں مالکوں کے ہاتھ کچھ عرصے کے لئے فروخت کر دیتے ہیں۔

ایک اطالوی خاتون نے جو پولیس میں ملازم تھی اتاموا کے قریب ایک فارم میں گیارہ اور تیرہ سال کے بچوں کو کام کرتے دیکھا۔ وہ [illegible] گھنٹے اپنے مالک کی گائیں چراتے تھے اور انھیں بہت ہی گھٹیا اور معمولی قسم کا ایسا کھانا دیا جاتا تھا جس سے کہ وہ صرف زندہ رہ سکیں۔ ان کے سونے کا انتظام ایک اصطبل میں تھا۔ جہاں وہ چٹائی پر سوتے تھے۔ گیارہ سال کے بچے کو



ایک کم عمر بچہ جو اپنے خاندان کو پالنے کے لئے دن [illegible] محنت کرتا ہے

اس کے والدین نے ۲۳ ڈالر اور بڑے بیٹے کو [illegible] ماہانہ میں ایک سال کے لئے بیچ دیا تھا۔

ہندوستان کی طرح اٹلی میں بھی بچوں سے [illegible] ایک پرانی روایت رہی ہے۔ ۱۸۸۰ء میں مزدوروں کی تہائی تعداد ۱۲ سال سے کم عمر کے بچوں پر مشتمل تھی اور اب بھی پورے ملک میں تقریباً پانچ لاکھ بچے [illegible] زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ بچے فارموں، کارخانوں اور [illegible] تعینات ہیں اور اس آزادی سے کام کرتے ہیں کہ کبھی وزارت محنت کا کوئی آدمی انھیں آ کر پکڑ سکے۔

مالکان بڑے چالاک لوگ ہیں جب کبھی چھاپہ [illegible] وہ ان بچوں کو چھپا دیتے ہیں۔ اقتصادی لحاظ سے پسماندہ جنوبی اٹلی میں چھوٹے بچے گڈریے ہیں، کھیتوں پر [illegible] ہیں، ماہی گیری کی صنعت میں کام آنے والی رسی [illegible] شمالی [illegible] کی دوکانوں پر کام کرتے ہیں اور انگور کے باغ میں انگور توڑتے ہیں۔ کہیں کہیں ان بچوں کے قد اتنے چھوٹے ہیں کہ انھیں انگور توڑنے کے لئے اسٹول پر [illegible] پڑتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ بچے قانونی طور پر کام کرنے کے اہل ہوتے ہیں تو مالکان انھیں نکال باہر کرتے ہیں اس لئے کہ اس وقت مالکان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ انھیں پورے پیسے دینا ہوں گے۔

لیبر قوانین کی یہ خلاف ورزی عام لوگ ہی [illegible] کر رہے ہیں بلکہ خود وزارت محنت کی چہار دیواری [illegible] ہے۔ یہاں ایک کمیونسٹ لیڈر نے [illegible]

• ایک عرب میں ایک ساتھی نے ... کے خلاف عزت کے دفتر گیا۔ ہم نے ... ایک پرائیویٹ کینٹین سے قہوہ منگانے ... جو لڑکا یہ قہوہ لے کر آیا اس کی عمر ... برس ہوگی۔"

امریکا

امریکن عورتیں بھی اسقاط حمل کی دوڑ میں شامل

لیجیے امریکا میں بھی اب اسقاطِ حمل پر بحث چھڑ گئی۔ ایک طبقہ ہے جو چاہتا ہے کہ اسقاط حمل کے معاملے میں زیادہ سختی نہیں ہونی چاہیے۔ اور پرانے قانون کے تحت جو پابندی لگائی گئی ہے کہ صرف ماں کی صحت کو خطرہ ہونے کی صورت ہی میں حمل گرایا جا سکتا ہے، یہ ختم ہونی چاہئے اور عورتوں کو حمل گرانے کی مکمل اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن دوسری طرف اسقاط حمل کے خلاف بہت سے گروپ اور جماعتیں میدان میں آگئی ہیں اور انھوں نے پرانے قانون میں ترمیم کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے ان میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں فرقوں کے لوگ شامل ہیں۔ خود صدر نکسن نے اس بات کی سختی کے ساتھ مخالفت کی کہ ایک عورت کو اس کی مرضی کے مطابق حمل گرانے کی اجازت دی جائے۔

یہ بحث اس لیے شروع ہوئی کہ واشنگٹن میں ہائی کورٹ بنچ نے ۲ کے مقابلے میں ۵ ووٹ سے ایک ڈاکٹر ملن وولیا کے حق میں فیصلہ دیا۔ انھوں نے آزادانہ طور پر ایک عورت کا حمل گرایا تھا جس پر انھیں عدالت سے سزا ملی۔ اس سزا کو ختم کرنے کے لئے ہائی کورٹ سے یہ دلیل دی گئی کہ پرانا قانون مبہم ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ عورت کی زندگی کے لئے کب خطرہ پیدا ہو سکتا ہے اس وجہ سے ایک ڈاکٹر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے معلوم ہو سکے کہ اسقاطِ حمل کے کسی معاملے میں وہ کسی جرم کا مرتکب ہو رہا ہے کہ نہیں۔

دوسرے ججوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایک ڈاکٹر آپریشن کرنے سے قبل ماں کی جسمانی صحت اور ذہنی کیفیت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔" ایک جج ... نے اس میں ان الفاظ کا اضافہ کیا کہ "... یہ ثبوت دینا حکومت کی ذمے داری ہوگی کہ اسقاط حمل کے وقت ماں کی زندگی خطرے میں نہیں تھی۔



امریکن ایکٹریس ڈینو اتے جو اسقاط حمل کے حق میں ہے

اس وقت سپریم کورٹ میں نصف درجن ایسے مقدمات زیر سماعت ہیں جن میں اسے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا عورت کو اس کی مرضی کے مطابق حمل گرانے کی اجازت نہ دینے سے اس کے ذاتی حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے؟

ہماری جدید تہذیب نے بھی کیا کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ دراصل یہ روحانیت کی دنیا سے نکل کر کلیتاً مادیت کی دنیا کو اپنانے کا نتیجہ ہے جس میں ہر چیز کو دو اور دو چار کی ارتھمیٹک سے ناپا جانے لگا ہے اور کھلی "نسل کشی" کو "سائنسی بحث" کا موضوع بنا لیا گیا ہے۔

ویٹیکن

ہمیں آرٹسٹک ٹی ڈھنگ پسند نہیں

مغرب کے "آوارہ گرد" آج کل ساری دنیا میں پھیلے نظر آتے ہیں۔ کوئی ہپی کے نام سے موسوم ہے کوئی موسیقار کے نام سے۔ یہ لوگ آوارہ گردی کرتے ہیں، گاتے بجاتے اور مست رہتے ہیں۔ پوشاک کی ان کے مذہب میں کوئی قید نہیں کبھی مرد زنانہ لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں اور کبھی عورتیں مردانہ لباس میں۔ وہ کبھی کوٹ پہنتے ہیں اور کبھی کرتے پاجامے میں رہتے ہیں۔ ہاف پینٹ ہو یا نیکر جو ان کے ہاتھ آئے گا پہن کر چل دیں گے۔ انھوں نے اپنی شکلیں بھی عجیب بنائی ہیں۔ بال یا تو ترشواتے نہیں یا اگر ترشواتے ہیں تو ایسے آرٹسٹک ڈھنگ سے کہ بعض اوقات اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس صنف کی مخلوق ہیں۔



پوپ پال نوجوان ہپیوں کیساتھ

ایسی ہی مخلوق سے تعلق رکھنے والے تقریباً ساٹھ برٹش نوجوانوں نے ویٹیکن میں پوپ اعظم سے ملاقات کی۔ انھوں نے ان نوجوانوں کی "آرٹسٹک شکلوں" پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھیں اس لئے بھی ناپسندیدگی ہوئی کہ گروپ میں شامل لڑکیاں اپنے اونچے کوٹوں کے نیچے ہاف پینٹ (نیکر کے مشابہ) پہنے اپنی عریانیت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ نیم عریاں رہنے والے آوارہ گردوں کے اس گروپ کے ساتھ پوپ کی ملاقات پر اطالوی اخبارات کافی ناراض ہیں۔ روم کے دائیں بازو کے ایک اخبار نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہم نہیں چاہتے ہیں کہ ہر کس و ناکس کو پوپ نے برہنہ رہنے والے گروپ کے لوگوں کو شرفِ ملاقات بخشا ہے۔"

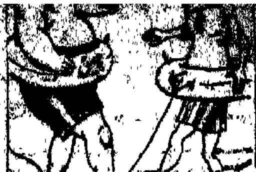
لیکن دوسری طرف "آوارہ گردوں" نے پوپ کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا اور ایک موسیقار جان سینڈرسن نے پوپ سے کہا:

"آپ اگر مانع حمل گولیوں پر پابندی کا اختیار رکھتے ہیں تو فوج میں لازمی بھرتی کو کیوں نہیں روک سکتے؟ آپ تمام کیتھولک لوگوں کو کیوں ہدایت نہیں کرتے کہ وہ جنگ میں حصہ نہ لیں۔ آپ اطالوی فوج کو کیوں ختم نہیں کراتے؟"

"یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔" عزت مآب پوپ نے جواب دیا۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگ پاپائے اعظم کو جنت دوزخ کا مالک سمجھتے تھے لیکن آج اس کی ذات بھی نکتہ چینی سے بچی ہوئی نہیں ہے۔ •

ملاقات ...



(تائیوان)

جنرل کائی شیک کی نیند حرام

چین کے بارے میں امریکی پالیسی میں جو نرمی آئی ہے اس سے فارموسا کی حکومت بڑی پریشان نظر آتی ہے اور جنرل چیانگ کائی شیک کی تو نیند ہی حرام ہو گئی ہے۔ دراصل جنرل جو سرزمین خاص کے ۳۴ لاکھ مربع میل کے علاقے سے نکل کر فارموسا (تائیوان) کے ۱۴ ہزار مربع میل کے علاقے پر قناعت کئے ہوئے ہیں ابھی تک آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ایک دن آئے گا جب وہ سرزمین چین کے اسّی کروڑ کے قریب انسانوں کی قسمت کے مالک بنیں گے۔ (فارموسا کی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ کی آبادی اس کے علاوہ ہے)

فارموسا اصل چین سے تقریباً سو میل کی دوری پر واقع ہے۔ سمندر درمیان میں نہ ہوتا تو چیانگ کائی شیک کو امریکا جا کر ہی پناہ لینی پڑتی۔ لیکن سمندر چیانگ کائی شیک کے کام آ گیا اور کمیونسٹوں کی کامیاب یلغار کے بعد وہ اس بڑے جزیرے میں اپنی حکومت قائم کر کے بیٹھ گئے۔ اپنی حکومت قائم کر لینے میں کوئی ہرج نہ تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو چین کا مالک و مختار سمجھتے ہیں اور اس بات کے لئے امریکا کی تعریف کرتے رہے ہیں کہ اس نے کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ کا ممبر نہیں بننے دیا۔

لیکن اب جو امریکا نے پلٹا کھایا اور یہ محسوس کر کے کہ چین کے تعاون کے بغیر جنوب مشرقی ایشیا میں امن نہیں رہ سکتا تو اس سے "محبت کی پینگیں" بڑھانے کی بات سوچی اور "پنگ پانگ" کی ٹیم بھیج کر اس کا آغاز بھی کر دیا تو چیانگ کائی شیک کا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔

جو ممالک چیانگ کائی شیک کو پرانا قوم پرست مانتے ہوئے ان کا احترام کرتے ہیں وہ بھی امریکا کی پالیسی سے پریشان ہیں۔ مثلاً جاپان کے وزیر خارجہ مسٹر کیچی آئچی نے کہا کہ:

"کمیونسٹ چین کے ساتھ بالفعل تعلقات کے باوجود حکومت جاپان نیشنلسٹ چین ہی کو عوامی حکومت تسلیم کرتی ہے"۔ جاپان نے نیشنلسٹ چین کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے اس لئے شاید ابھی تک اس کے دل میں چیانگ کائی شیک کا احترام ہے ورنہ اس وقت ان کی جو پوزیشن ہے وہ سبھی سمجھتے ہیں۔

امریکا بھی انکی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور اس لئے اب اس نے انکی پروا کئے بغیر چین کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ پنگ پانگ ٹیموں کے آنے جانے کے بعد یہ یقینی ہے کہ صدر امریکا مسٹر نکسن بھی چین کے دورے پر جائیں گے اور ماؤزے تنگ کے مہمان بنیں گے۔ امریکی پالیسی اگرچہ ابھی تک واضح طور پر سامنے نہیں آئی لیکن بعض حلقوں کے مطابق اب امریکا اس موڈ میں ہے کہ دونوں چینوں کو الگ الگ ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے اور یقین ہے کہ کمیونسٹ چین بھی اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ بشرطیکہ سلامتی کونسل میں اسے مستقل سیٹ مل جائے جو آجکل اس سیٹ پر فارموسا گورنمنٹ قابض ہے حالانکہ چین کا حق ہے جو ایک بڑا ملک ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام کے وقت پانچ بڑے ملک تسلیم کئے گئے تھے ان میں ایک چین بھی تھا۔ سلامتی کونسل کی سیٹ کا مسئلہ اصل مسئلہ ہے اگر اس پر مصالحت ہو گئی تو امریکا اور چین ایک دوسرے کے بہت قریب آ جائیں گے

■

واقعات عالم

”کارِ عقلمنداں“

[illegible] الیکشن کے دوران ایک اشتہار شائع ہوا جس کا عنوان تھا۔ ان سے بچئے:—

[illegible] کہ یہ ہیضہ پھیلاتی ہے۔
[illegible] کہ یہ ملیریا پھیلاتا ہے۔
[illegible] کہ یہ پلیگ پھیلاتا ہے۔
[illegible] کہ یہ پھوٹ پھیلاتا ہے۔

[illegible] والوں نے ان میں سے کسی سے بچنے کی کوشش نہیں کی [illegible] میٹروپولیٹن کونسل کے حلقوں میں سے ۳۰ حلقوں کے [illegible] نے انھیں ووٹ دے کر اپنے اوپر مسلط کر لیا حالانکہ گزشتہ [illegible] سال کا جو تلخ تجربہ رہا اس کے پیش نظر انھیں بھلا دینا چاہئے تھا۔ مگر دلی والے ایسا معلوم ہوتا ہے بڑے [illegible] ہیں، پچھلی باتوں کو بھول جاتے ہیں اور آزمودہ [illegible] کو ہی ”کار عقلمنداں“ سمجھتے ہیں۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دلی کے شہریوں نے [illegible] بالواسطہ طور پر فیملی پلاننگ کو اپنا لیا ہے۔ عام مذکورہ [illegible] اگر ڈائرکٹ نہیں تو انڈائرکٹ طور پر فیملی پلاننگ [illegible] آبادی کم کرنے والے بنیادی مقصد کو تقویت پہونچاتی [illegible] یہی وجہ ہے کہ دلی میں جن سنگھ کی کامیابی سے [illegible] کو خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن خاندانی منصوبہ [illegible] کو ضرور ہوئی ہوگی۔ گزشتہ چار سال کے دوران جن سنگھ [illegible] پالیسی پر عمل کرتا آرہا ہے اور اس نے ہمیشہ اس مقصد [illegible] پیش نظر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر گلی کوچوں کے [illegible] از سر نو تعمیر کرانے تو نالیوں کو بالکل نہیں چھیڑا بھلا [illegible] کی پرورش گاہیں ختم ہو جائیں۔ انھیں ختم نہیں کیا [illegible] کر انھیں اور گہرا کر دیا گیا تاکہ [illegible] کے تناسب سے بڑھ سکے۔

[illegible] کہ یہ پیدا ہونے کی طرف [illegible] والے علاقوں میں [illegible]

چوہے دانوں کی سپلائی بند کر دی گئی تاکہ چوہوں کی ”نسل کشی“ نہ ہو سکے اور انسانی نسل کشی میں ان سے مدد لی جا سکے۔ یہ کتنا عظیم مقصد ہے کم از کم خاندانی منصوبہ بندی کے افسروں کے نقطۂ نظر سے۔ حیرت ہے کہ ابھی تک ان افسروں نے ”عظیم مقصد“ والوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے کسی جلسے کا انتظام نہیں کیا۔

جن سنگھ والے کیوں اور کیسے کامیاب ہو گئے جب کہ وسط مدتی پارلیمنٹری انتخابات میں انکا بالکل کچومر نکل گیا تھا اس کا زیادہ تر کریڈٹ کانگریس کی باہمی پھوٹ اور حد سے زیادہ خود اعتمادی کو جاتا ہے۔ خود اعتمادی کی حالت یہ تھی کہ مقامی لیڈروں نے شاید مسٹر جگ جیون رام کے علاوہ کسی اور بڑے لیڈر کو راجدھانی کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لئے مدعو نہیں کیا اکیلے ہی بھاڑ پھوڑنے میں لگے رہے۔ وزیر اعظم بھی نہیں آئیں۔ ممکن ہے انھوں نے کانگریس کی باہمی رقابتوں اور ٹکٹوں کی غلط تقسیم سے متاثر ہو کر ہی معاملہ مقامی لیڈروں پر چھوڑ دیا ہو تاکہ کم سے کم ان ”مقامیوں“ کو جو کہتے پھرتے

[illegible] پائی جاتی ہیں۔

دلی کے کانگریسیوں کی اپنی باہمی رقابتوں اور اپنے اوپر حد سے زیادہ بھروسے کا نتیجہ مل گیا اور جن سنگھ کے مردہ جسم میں انھوں نے از سر نو جان ڈال دی۔

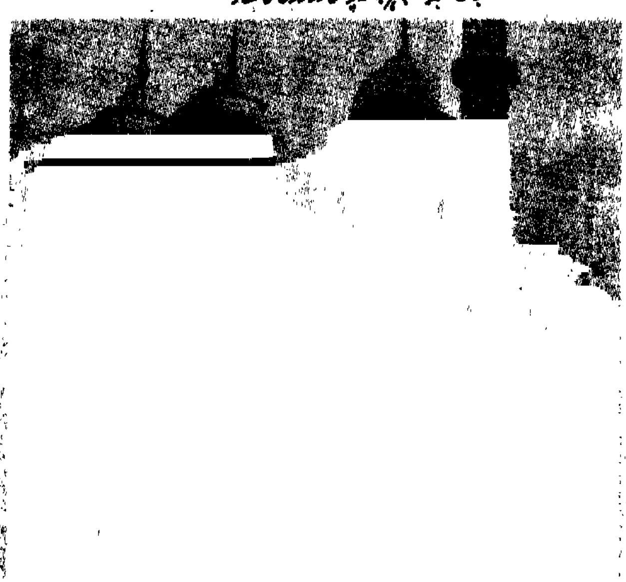
اس سے بھی برا نتیجہ ملا سنڈیکیٹ کانگریس کو جو اپنے آپ کو اصل کانگریس کہتی ہے اور [illegible] دفتر پر قبضہ جمائے ہوئے ہے وہ ایک بھی سیٹ نہ لے سکی۔ کمیونسٹ بھی صرف ایک سیٹ پر قناعت کر کے بیٹھ گئے اور ایس ایس پی۔ پی ایس پی اور سوتنتر کا تو بالکل صفایا کر دیا گیا۔ چھوٹی پارٹیوں کی دو وکروں نے بالکل چھٹی کر دی، جس پارٹی کی واضح پالیسی نہ ہوگی اسکا یہی حشر ہوگا رام چرن اگروال، پریم ساگر گپتا اور خوب رام جاجریا جیسی مقامی شخصیتیں جو گویا دلی کی بڑی بڑی توپیں تھیں اوندھی ہو گئیں۔

”یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے“

اب دیکھنا ہے کہ از سر نو زندہ ہو کر جن سنگھ کیا کرے گی—؟ وہی کرے گی جو اس کے دل میں ہے۔ لیکن اگر اس نے عوام کے جذبات کا خیال نہ کیا اور محض ”خاندانی منصوبہ بندی“ کے مقصد ہی کے لئے کام کرتا رہا تو جو بیماریاں پھیلیں گی انکی لپیٹ میں آئے بغیر وہ بھی نہیں رہ سکتا اور اس کا حشر وہی ہوگا جو سنڈیکیٹ یا ایس ایس پی کا ہوا۔ یعنی

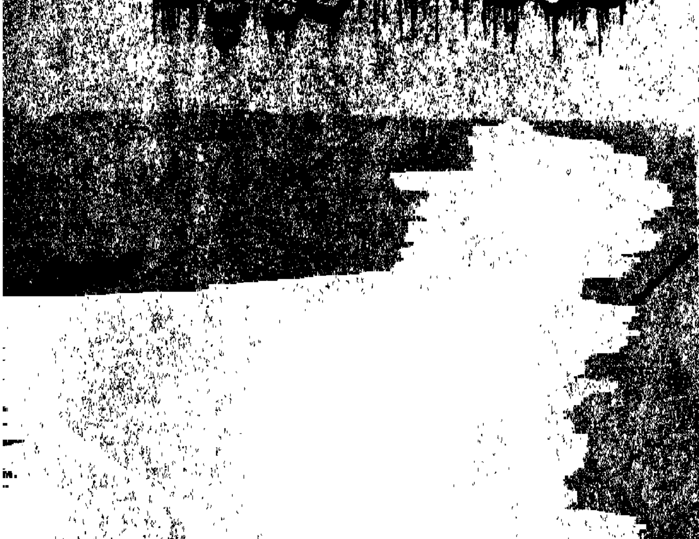
”پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں“

جامع مسجد کے باہر برقعہ پوش ووٹروں کی قطار





محوِ رقص فرنیچر



برطانیہ کے پوپ آرٹسٹ ایلن جونز نے نائیٹر گلاس سنگ اور چمڑے کی مدد سے عجیب و غریب فرنیچر بنایا ہے۔ لندن کی ایک فنی گیلری میں جب اس فرنیچر کی نمائش کی گئی تو دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔

فرنیچر کے ہر پیس کی قیمت ۲ ہزار پونڈ (۴۰ ہزار روپے) تھی۔ تمام فرنیچر منٹوں میں بک گیا۔ اس فرنیچر کی خوبی یہ ہے کہ یہ فرنیچر خوبصورت لڑکیوں کی شکل میں بنا ہوا ہے۔

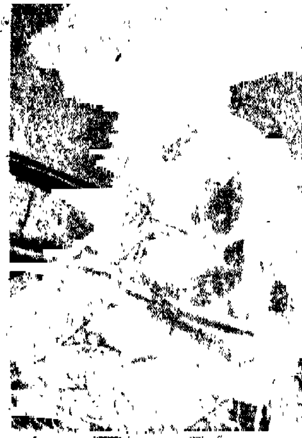
آپ دفتر سے تھکے ہارے آئیں تو آپ کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوگی۔ اطمینان سے کوٹ اور ہیٹ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر لٹکا دیجئے پھر آرام سے ایک دوسری بہت ہی خوب صورت لڑکی کی پیٹھ پر بیٹھ جائیے۔ لڑکی کو قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لڑکی ذرا سی جھک جائے گی تاکہ آپ آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ سکیں۔

اگر میز کے اوپر کا شیشہ چار ہاتھوں پاؤں پر کھڑی ہوئی لڑکی کی کمر پر رکھ دیجئے اور مزے سے کھانا کھائیے۔ ایلن جونز کا بنایا ہوا اس طرح کا فرنیچر کے اوپر بہت سے نمونے چند منٹوں میں فروخت ہوگیا اور اب اس کے پاس اس کے فرنیچر کے لاکھوں روپے کے آرڈر موجود ہیں۔

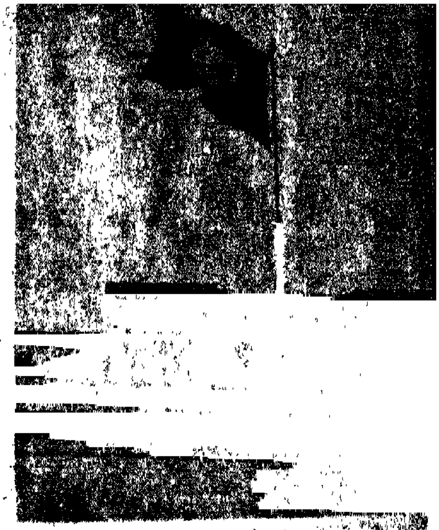
برطانیہ کی کچھ عورتوں نے آرٹسٹ جونز کے گھر کے باہر جمع ہو کر اس فرنیچر بنانے کے خلاف مظاہرہ کیا۔



۔۔۔تی فوج کے کیپٹن بلال جنگی تیار۔۔۔
فوج نے جیسور پر قبضہ کرلیا تھ۔۔۔



آج بنگلا دیش کا بچہ بچہ ظلم وستم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنی جان بچانے کیلئے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ ہاتھوں میں بندوق اٹھالے۔

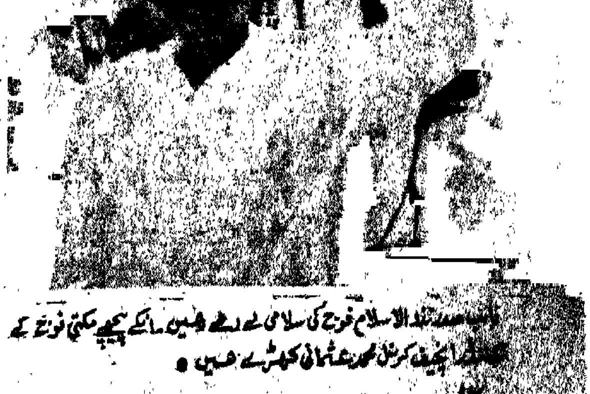


کلکتہ میں پاکستان کے نائب سفیر جناب حسین علی نے بنگلا دیش حکومت سے اپنی وفاداری کا اعلان کردیا اور سفارتخانے کی عمارت پر بنگلا دیش کا جھنڈا لہرا دیا۔

بنگلادیش کے عوام آخر دم تک لڑتے رہیں۔۔۔



بائیں سے دائیں۔ سیف‌الاسلام۔ وزیر اعظم تاج‌الدین۔۔۔ کیپٹن منصور علی اور اے۔ ایچ قمر الزمان۔



۔۔۔ سیف‌الاسلام فوج کی سلامی لے رہے ہیں۔ انکے پیچھے مکتی فوج کے کمانڈر انچیف کرنل محمد عثمانی کھڑے ہیں۔



[illegible]
دشمنوں سے لڑتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ درد سے بے چین لڑکھڑاتا ہوا ہیڈ کوارٹر کی طرف آ رہا ہے۔ کرب سے اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا۔ ایک ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے میں ٹوپی۔ اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ کر نوجوان نے بندوق اپنے ایک ساتھی کو دے دی۔ اور وہ خود زمین پر گر کر ختم ہو گیا۔

نوجوان نے اتنی محنت اس لئے کی تھی کہ اس کی بندوق دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اور اسکے بعد اسکے ساتھی آزادی کے لئے اس بندوق سے لڑتے رہیں۔ ●



...کستان میں جمہوریت کا قتل



بنگلا دیش کے پہلے نائب صدر جناب نذر الاسلام مجیب نگر میں عہدہ کا حلف لینے کے بعد غیر ملکی نامہ نگاروں کو انٹرویو دے رہے ہیں ●



بنگلا دیش کی حکومت نے باقاعدہ طور پر ...یا۔ وزیر اعظم تاج الدین احمد حلف لینے کے بعد دنیا ...ہ نامہ نگاروں کے ساتھ ●

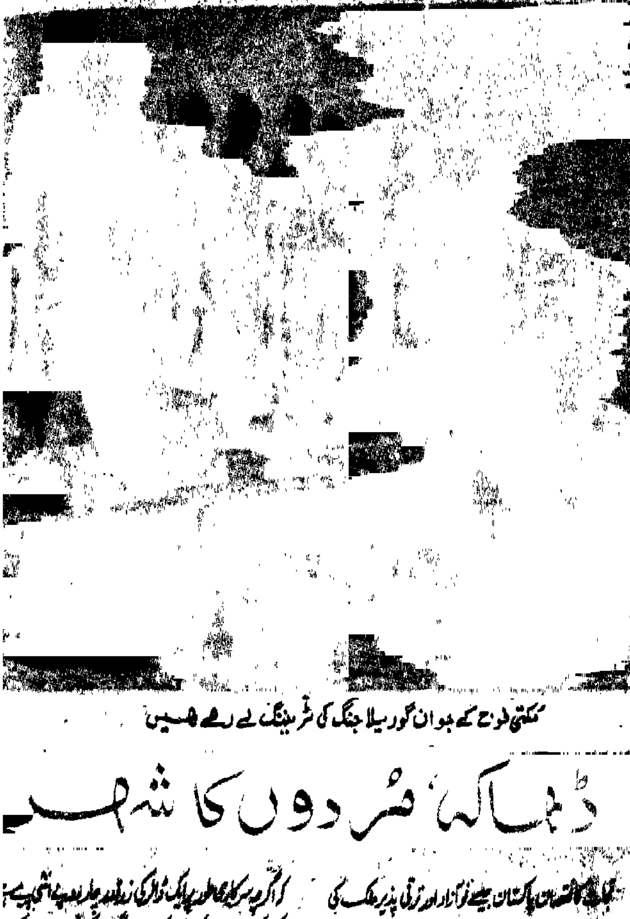
مشرقی [illegible] میں [illegible] گوریلا جنگ شروع ہو [illegible]

پاکستانی

مشرقی بنگال میں پاکستانی فوج نے صورت حال پر قابو پا لیا ہے اور تقریباً سب علاقوں پر اس کا کنٹرول ہو گیا ہے۔ اگر پاکستانی ریڈیو کی نشریات پر یقین کر لیا جائے تو اس وقت وہاں حالات معمول پر آ چکے ہیں اور بہت سے علاقوں میں ریل ٹرک اور دریائی آمدورفت بھی شروع ہو چکی ہے۔

لیکن خود پاکستانی نشریات میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ کہیں کہیں شرپسند اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ دراصل یہ وہ آزادی پسند لوگ ہیں جنہوں نے مشرقی بنگال کو آزاد کرانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اس مقصد کے لئے اب انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی ہے۔ یہ لوگ اپنی کمین گاہوں سے نکلتے ہیں اور گھات لگا کر پاکستانی فوج کے دستوں پر حملہ کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اگر کہیں موقع ملا تو سڑک اور ریل کے پلوں کو بھی برباد کر جاتے ہیں اور اس طرح پاکستانی فوج کے لئے مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔

آزادی پسندوں نے اگر یہ سرگرمیاں جاری رکھیں تو لڑائی بڑا طول کھینچ سکتی ہے اور تاریخ ہمارے سامنے ہے اس قسم کی لڑائیاں برسوں چلتی رہی ہیں۔ پاکستان کا خزانہ ایسی طویل جنگ برداشت نہیں کر سکتا۔ ابھی سے اطلاعات مل رہی ہیں کہ اس کی معیشت پر بھاری بوجھ پڑ رہا ہے۔ روزانہ تقریباً ایک کروڑ روپے کا خرچہ ہے اور تقریباً بیس کروڑ روپے ماہانہ [illegible] کی برآمدی



مکتی فوج کے جوان گوریلا جنگ کی ٹریننگ لے رہے ہیں

ڈھاکہ مُردوں کا شہر

تجارت کا نقصان پاکستان جیسے غیر آزاد اور ترقی پذیر ملک کی استطاعت سے بہت زیادہ اور ناقابل برداشت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی راہ میں بہت سی اقتصادی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور وہ بین الاقوامی دنیا میں اپنی ساکھ کھو بیٹھے گا۔ ابھی سے اس کی معیشت بری طرح متاثر ہو رہی ہے اور اس کے زرمبادلہ کا محفوظ ذخیرہ ایک ارب ڈالر سے گھٹ کر صرف چھ کروڑ ڈالر رہ گیا ہے۔ اس سے بین الاقوامی مارکیٹ میں پاکستانی روپے کی قیمت گر گئی ہے جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے

کہ اگرچہ سرکاری طور پر ایک ڈالر کی زرمبادلہ چار روپے [illegible] ہے لیکن کھلے بازار میں ایک ڈالر کی قیمت گیارہ پاکستانی روپے تک پہنچ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی بینک نے پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے سکے کی زرِ قدر میں کمی کر دے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے اور [illegible] کہ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔

مشرقی بنگال کے حالات سے پاکستان کی [illegible]
[illegible]

گرفتہ ہے ہمیں کسی وجہ سے اُنھوں نے تقسیم کے نتیجے میں بہت سے بسنے والے پر انسانیت کا خون بہایا ہے اور نہتے عوام کو بربریت کا نشانہ بنائے گئے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے اخبارات جن میں جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا کے اخبارات بھی شامل ہیں اس قتل و غارت گری کی مذمت کر رہے ہیں۔ آسٹریلیا کے ۵۰ دانشوروں اور ماہرین نے مشرقی پاکستان میں قتل عام کی مذمت کی ہے۔ ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ کے بیان کے مطابق ایسے مرنے والوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔ لئے بڑے پیمانے پر خونریزی کا ذکر کرتے ہوئے برطانوی لیبر پارٹی کے ایک اور ممبر مسٹر ڈگلس مان نے کہا کہ پاکستانی حکمرانوں کو مشرقی بنگال کے لوگوں سے دلچسپی نہیں بلکہ صرف وہاں کی زمین سے دلچسپی ہے وہ اس زمین کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔"

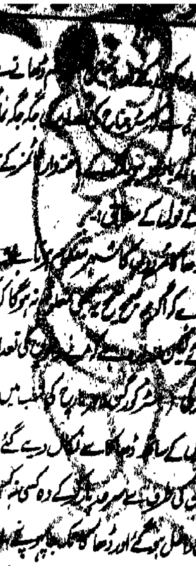
برطانوی پارلیمنٹ کے یہ وہ ممبران ہیں جو حال ہی میں مشرقی پاکستان کی سرحد کا دورہ کر کے گئے ہیں اور انھوں نے مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزینوں سے بات چیت کی ہے اور ان کے بیانات لئے ہیں۔

شرنارتھیوں کے بیانات کسی حد تک مبالغہ آمیز ہو سکتے ہیں لیکن نہتے شہریوں کی ہلاکت سے خود پاکستان منکر نہیں ہے۔ پاکستان ریڈیو کے ایک نشریے میں تسلیم کیا گیا کہ شہری لوگ بھی ہلاک ہوئے ہیں اگرچہ اس کی ہولناکی کو گھٹانے کے لئے یہ کہا گیا کہ:

"اگر وہ ہلاک ہوئے ہیں تو اتفاقیہ طور پر ہلاک ہوئے ہوں گے ورنہ فوج نے جان بوجھ کر کسی شہری کو گولی نہیں ماری ہے۔"

لیکن فوج نے کس حد تک خوف و دہشت پھیلایا، یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ ڈھاکا کی ایک ایک چھت پر پاکستانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ جب اس سلسلے میں بنگالیوں کے تاثرات معلوم کئے گئے تو انھوں نے بڑی صفائی سے کہا کہ:

"ہم جانتے ہیں کہ پاکستان ختم ہو چکا ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ جھنڈے فوجیوں کو ہماری طرف آنے سے روک دیں گے۔"



[illegible] ڈھاکا نے سے باہر کچھ ... کا دوسرا [illegible] جگہ جگہ نمائش کی گئی ہے۔ اس [illegible] تعداد [illegible] کے نامہ نگار ... دوسرے [illegible] کے قول کے مطابق ...

"ڈھاکا [illegible] کا شہر ... الزام لگایا ہے کہ اگر ... نہ ہوگا کہ کتنے آدمی ہلاک ہوئے ہیں لیکن ... کی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی ... کی طلب میں دوسرے نامہ نگاروں کے ساتھ ڈھاکا سے نکال دیے گئے تھے لیکن ہندوستان کی طرف سے سرحد پار کر کے وہ کسی نہ کسی طرح مشرقی بنگال میں داخل ہو گئے اور ڈھاکا تک جا پہنچے (وہ پہلے امریکی نامہ نگار ہیں جو ڈھاکا پہنچے) ان کا کہنا ہے کہ:

"شہر کی پندرہ لاکھ آبادی میں سے کم از کم نصف بھاگ گئی ہے" اور اگر بھاگ جانے والے واپس بھی آ جائیں جیسا کہ پاکستان ریڈیو کی نشریات میں دعویٰ کیا گیا ہے تب بھی شہر میں وہ چہل پہل شاید برسوں تک نہ ہو سکے گی جو کبھی زمانے میں وہاں رہتی تھی۔ بڑی بڑی اہم صنعتیں جو بڑی تیزی سے ترقی کر رہی تھیں ختم ہو گئیں ان ہی میں سے ایک فلمی صنعت ہے جو بالکل تباہ ہو چکی ہے۔

آزادی پسند بنگالیوں کے رہنما اس وقت صرف ایک مسئلہ ہے اور وہ ہے مشرقی بنگال کو آزاد کرانا اور بنگلا دیش کے نام سے جو آزاد مملکت قائم کی گئی ہے اسے دنیا سے تسلیم کرانا۔

انھیں اس وقت عرب اور دوسرے مسلم ممالک سے شکایت ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے اس قتل عام پر خاموش ہیں اور انھیں شاید ہندوستان سے بھی شکایت ہوگی کہ اس نے ابھی تک بنگلا دیش کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا، کیونکہ اگر بنگلا دیش کی حکومت کو تسلیم کر لیا جاتا تو ... کھل کر امداد دیا جا سکتی تھی جس کی آزادی کے لئے ضرورت ہے۔

حال ہی میں کچھ نامہ نگار جب ہندوستان کی سرحد پار کر کے "بنگلا دیش" کے سرحدی علاقوں کا دورہ کر [illegible]

فوج کے لیڈروں [illegible]

"ہمارے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے ... کی کمی ہے۔"

مکتی فوج کے پاس اس وقت مجموعی طور پر ... ہزار رائفلیں ہیں ... کے استعمال ... جدید ہتھیار ... مشین گنیں، اسٹین گنیں اور سب مشین گنیں شامل ہیں۔ کچھ افسروں اور جوانوں کے پاس ایسے ہتھیار بھی ہیں جنھیں وہ ممالک کے ہتھیاروں سے بہتر بتاتے ہیں۔ مکتی فوج والے پاکستانی ... مشرقی پاکستان ... مشرقی پاکستان اور مجاہدین ... سے لئے ہوئے ہیں یہی مکتی فوج کے ہتھیار ہیں۔

اس کے مقابلے میں پاکستانی فوجوں کی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے جسے بھاری توپ خانے کا جنھیں تین میل کے فاصلے تک ۲۵ پونڈ وزنی تک کا گولا پھینکنے والی توپیں شامل ہیں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی مدد حاصل ہے۔ علاوہ از ایں ... ملک دریائی راستوں پر ٹرینیں بھی اس کی مدد کر رہی ہیں ... ٹرانسمیٹروں کے ذریعے پاکستانی فوج کے درمیان رابطہ بھی قائم رہتا ہے جبکہ مکتی فوج کو یہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔

لیکن اس کے باوجود وہ پاکستانی فوج کے ساتھ ٹکر لے رہی ہے اور گوریلا جنگ شروع کر کے اس نے پاکستانی حکمرانوں کو سخت مشکل میں مبتلا کر دیا ہے۔ جو سیلاب آزادی کا جوش اور آرزو مشرقی بنگال کے لوگوں میں ابھر آیا ہے اسے بندوق کی گولیوں سے دبایا نہیں جا سکتا، بنگالیوں کے دل جیت کر ہی اسے ... جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے پاس اس وقت سب کچھ ہے مگر حکمت نہیں ہے۔ سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اگر گزشتہ اگست ستمبر تک جنرل یحییٰ خان مشرقی بنگال کے سیاسی لیڈروں سے کوئی مصالحت کرنے میں ناکام رہے تو وہ مشرقی بنگال کو ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھیں گے کیونکہ اس کے بعد پاکستان کے وسائل اس جنگ کو اور طویل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

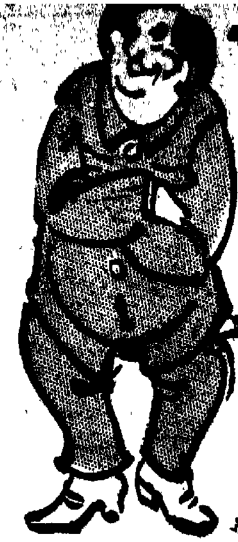
پاکستان بنگلادیش کو ایک سال سے زیادہ اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سک

۱۵

۱۰۱

انقلابی کے قلم سے ۔

چیئرمین ماؤ سی تونگ سے ایک خیالی انٹرویو



انقلابی ۔ چیئرمین ماؤ کو انقلابی کا لال سلام مشرق لال ہو چکا ہے اور طاقت بندوق کی نال سے نکلتی ہے ۔

ماؤ ۔ لال سلام ۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرے ذہن میں کیا ہے ۔

انقلابی ۔ طاقت اور حکومت عوام کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے ۔

ماؤ ۔ ہاں یہ میری ہی ایک انقلابی کہاوت ہے ۔

انقلابی ۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا چیئرمین کہ تمام انقلابی گروہوں کو تمام انقلابی گروہوں کے انقلاب کا سواگت کرنا چاہیئے ۔

ماؤ ۔ بالکل کہا تھا ۔

انقلابی ۔ چاہے انقلاب کو وقتی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے ۔

ماؤ ۔ بالکل !!!

انقلابی ۔ کیونکہ آخر میں فتح انقلابی عوام ہی کی ہوتی ہے اس لئے آپ نے امریکا میں نیگرو تحریک کی حمایت کی تھی ۔؟

ماؤ ۔ کرنی ہی چاہیئے تھی ۔

انقلابی ۔ اور انگولا اور موزمبیک کی عوامی تحریک کی بھی ۔؟

ماؤ ۔ بلاشبہ ۔

انقلابی ۔ آپ سیاست اور ملکی معاملات میں مذہب کی مداخلت کے بھی خلاف ہیں ۔

ماؤ ۔ ہاں ! کیونکہ مذہب عوام کے لئے افیم کا کام کرتا ہے جیسا کہ مارکس نے کہا ہے ۔

انقلابی ۔ اور آپ فوجی ڈکٹیٹر شپ کے بھی خلاف ہیں ۔

ماؤ ۔ ہاں ، کیونکہ میں چیانگ کائی شیک کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کا مقابلہ کرنا پڑا تھا ۔

...

انقلابی ۔ پھر ان حالات میں چیئرمین آپ پاکستان کی حکومت کی حمایت کس طرح کر سکتے ہیں جو فوجی بھی ہے اور جس کی بنیاد بھی مذہب پر قائم ہے ۔؟

ماؤ ۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ سوال در سوال کرنا ایک غیر عوامی حرکت ہے لیکن پھر بھی میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا ۔

انقلابی ۔ شکریہ چیئرمین !

ماؤ ۔ اچھا تو اب آپ مجھے بتایئے کہ دنیا کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت کونسی ہے ۔؟

انقلابی ۔ مجھے معلوم نہیں چیئرمین ، ویسے میرے خیال میں یا تو ویت کانگ یا پھر پاتھٹ لاؤ ۔

ماؤ ۔ بکواس ۔ دنیا کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ہے ۔

انقلابی ۔ وہ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے ۔

ماؤ ۔ وہ پارٹی ہی چائنا پر حکومت کر رہی ہے ۔

انقلابی ۔ اس حساب سے چائنا دنیا کا سب سے زیادہ انقلابی ملک ہے ۔

ماؤ ۔ بالکل ٹھیک ! اب بتاؤ کیا پاکستان چائنا کا دوست نہیں ہے ۔؟

انقلابی ۔ بالکل ہے ۔

ماؤ ۔ ہماری دوستی کی وجہ سے ہمارا کچھ انقلاب چھوٹ کر پاکستان کو بھی لگ جاتا ہے ، اسی لئے پاکستانی حکومت ترقی پسند ہے ۔!

انقلابی ۔ کیوں !!!

ماؤ ۔ اور وہ سب لوگ جو پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں وہ ری ایکشنری ہیں ، امریکا کے ایجنٹ ہیں ۔

انقلابی ۔ روس بھی ؟ ۔

ماؤ ۔ روس امریکا کا ہی نہیں سی ۔ آئی ۔ اے کا بھی ایجنٹ ہے ۔

انقلابی ۔ عوامی تحریکیں بھی ۔؟

ماؤ ۔ بالکل ۔ وہ تحریکیں جو ترقی پسند حکومت کے خلاف ہوں ، وہ بھی ۔

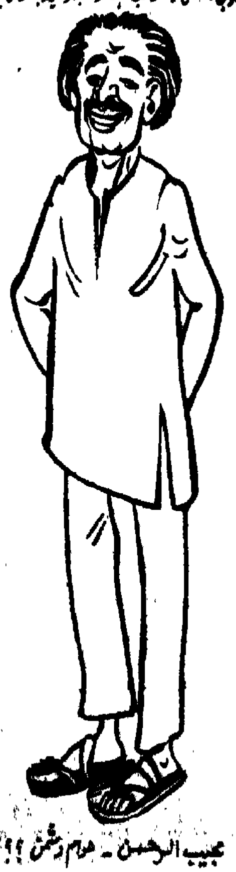
انقلابی ۔ لیکن آپ نے تو دنیا بھر کی ان تمام تحریکوں کی مدد کا وعدہ کیا تھا ، جو اپنے حقوق کے لئے لڑ رہی ہیں ۔

ماؤ ۔ بالکل ٹھیک ۔

انقلابی ۔ لیکن آپ ایسے ملک کی حمایت کیسے کر سکتے ہیں جہاں کمیونسٹ پارٹیوں پر پابندی لگی ہو اور جہاں کمیونسٹوں کو جیل میں سڑایا جا رہا ہو ۔

ماؤ ۔ تم بے وقوف ہو ۔ وہ نقلی کمیونسٹ ہیں ۔

انقلابی ۔ اس کا مطلب ہے مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی سی آئی



عجیب الرحمن ۔ عوام دشمن ؟؟؟

ماتبات مقدھلی



ماؤ کا عزیز شاگرد
یحیٰی خان

لے کے ایجنٹ ہیں۔

ماؤ۔ بالکل ہیں، اگر وہ بنگلا دیش کے عوام کی مدد کر رہے ہیں تو پکے سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔

انقلابی۔ جنرل یحیٰی خان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ماؤ۔ جنرل نہیں، کامریڈ یحیٰی خاں۔

انقلابی۔ معاف کیجئے گا چیرمین۔ کامریڈ خان، یعنی ہمیں ملانا بھاشانی کے خلاف کامریڈ خان کی مدد کرنی چاہیئے۔

ماؤ۔ بالکل۔

انقلابی۔ لیکن پاکستان ایک مذہبی ملک ہے۔

ماؤ۔ جو مذہبی ملک چین کا دوست ہو مذہبی ملک نہیں رہتا۔

انقلابی۔ یعنی، اسرائیل، امریکا اور دوسرے تمام ملک بھی۔۔۔؟

ماؤ۔ بالکل چائنا سے دوستی کر کے وہ بھی انقلابی بن سکتے ہیں۔

ماؤ۔ اسے بھی یہ کہنا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں طاقت بندوق کی نال سے۔۔۔

انقلابی۔ جی ہاں بندوق کی نال سے نکلتی ہے یحیٰی خاں اس بات کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔

ماؤ۔ ہاں یحیٰی میرے ہوشیار طالب علموں میں سے ہیں۔

انقلابی۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے بنگالی عوام بھی آپ کو اپنا گرو بتاتے ہیں، ہزاروں نوجوان آپ کا نام لے کر اپنی جانوں کی قربانی دے دیتے ہیں۔

ماؤ۔ وہ بھی میرے اچھے طالب علموں میں سے ہیں لیکن ان کی بندوقیں ابھی بنی ہوئی نہیں ہیں۔

انقلابی۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ امریکا بنگلا دیش کا ساتھ دے رہا ہے۔

ماؤ۔ ہاں کیونکہ امریکا عوام دشمن ہے۔

انقلابی۔ لیکن آپ نے امریکا کی ٹیبل ٹینس کا تو زبردست سواگت کیا ہے۔؟

ماؤ۔ اگر ہم کسی امریکی ٹیم کو ہرا سکتے ہوں تو اُسے بلانے کی اجازت ہے۔

انقلابی۔ تو آپ فٹبال کی ٹیم کو ملک میں گھسنے کی اجازت

ماؤ۔ کبھی نہیں۔

انقلابی۔ اور ہندوستانی کرکٹ ٹیم کو؟

ماؤ۔ ہم غلاموں کے کھیل نہیں کھیلتے۔

انقلابی۔ لیکن ٹیبل ٹینس بھی تو۔۔۔

ماؤ۔ ٹیبل ٹینس نہیں بلکہ پنگ پانگ، ہم نے اس کا چینا کر لیا ہے اس لئے اب یہ ہمارا کھیل ہے بلکہ ہمارے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں سال پہلے چائنا کے لوگ مرغی کے انڈوں سے پنگ پانگ کھیلتے تھے۔

انقلابی۔ چیرمین بہت بہت شکریہ، ہم نے آپ سے بہت سی قیمتی باتیں سیکھیں۔ دنیا میں انقلاب کا پیمانہ یہ ہے کہ انقلاب چین کا دوست ہے یا نہیں۔

کوئی بھی ملک چین سے دوستی کر کے انقلابی بن سکتا ہے۔ اگر چین کے کسی دوست ملک کے عوام ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں تو وہ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔

ماؤ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ میرے خیالات کو اپنے عوام دشمن انقلاب دشمن سرمایہ دار، رجعت پسند اخبارات میں شائع کر سکتے ہیں تاکہ عوام کو پتہ لگ جائے کہ چین ان کا دشمن نہیں دوست ہے

انقلابی۔ لال سلام کامریڈ۔

ماؤ۔ لال سلام۔



چینی وزیر اعظم چو این لائی کا پاکستان کا دورہ کرنیکا ارادہ ہے ـــــ ایک خبر



جب سے بھوٹان نے منظر عام پر تیزی سے ابھرنا شروع
کیا ہے اٹھارہ ہزار مربع میل رقبہ پر پھیلے ہوئے
اس چھوٹے سے ملک کی خوبصورت جنگلات اور پہاڑوں
کا وسیع سلسلہ بھوٹان کو سیاحوں کیلئے تعطیل گاہ اور
یہاں کی سبزہ زار بہت پرکشش بنا دیتا ہے نظر والیاں
یہاں کی تہذیب، تمدن، مذہب اور تاریخ بین الاقوامی
سیاحوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ ۴۴ ہزار فٹ بلند
چومولاری پہاڑی جسے پہاڑوں کی ملکہ کے خطاب سے
پکارا جاتا ہے بھوٹان کے خوبصورت نظارہ کی نگہبان
صدیوں تک رہی ہے گیارہویں صدی میں تبت کے لاما لوگ
نے اس ملک کو زیر نگیں کیا۔

برسوں کی غلامی کے بعد بھوٹان کے باشندوں نے تبت
کی غلامی سے نجات حاصل کی۔ اس غلامی سے چھٹکارا پانے
کے بعد بھوٹان بقیہ دنیا سے تقریباً اپنا رابطہ توڑ چکا تھا
لیکن آج کا بھوٹان ہند چین کشمکش سے متاثر
ہوکر اپنی سلامتی اور آزادی کے تحفظ کی خاطر ہندوستان سے
سیاسی معاشی اور تجارتی تعلقات پیدا کر چکا ہے۔
جگمے دورجی شاہ بھوٹان کے والد کی عقابی نظروں نے
تبت میں چین کی ریشہ دوانیوں کے پس پشت بھوٹان کی
آزادی پر چھائے ہوئے خطرات کو محسوس کرتے ہوئے
۱۹۴۹ء میں ہندوستان سے دوستی اور امن و اتحاد
کا معاہدہ کیا۔

چین کی حکومت کی جانب سے کئے جانے والے
دوستی کے دعوے اور بھوٹان کو دعوت دئیے جانے والے گروہوں
وفدوں کی امداد شاہ کو متاثر نہ کر سکی۔ ہندوستان کے
ان کی اس قربانی سے متاثر ہو کر دوستی اور اتحاد کے ناطے
بھوٹان کے ترقیاتی پروگرام میں حصہ لینا شروع کیا۔
ہزاروں بھوٹانی طالب علموں کو صنعت و دستکاری، زراعت،
انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا اور
ہندوستان نے کثیر رقم بھوٹان کی ترقی اور
خوشحالی کے منصوبوں کے لئے وقتاً فوقتاً
روانہ کیا۔
دس سال کے قلیل عرصے میں بھوٹان کے شب و روز

بھوٹان

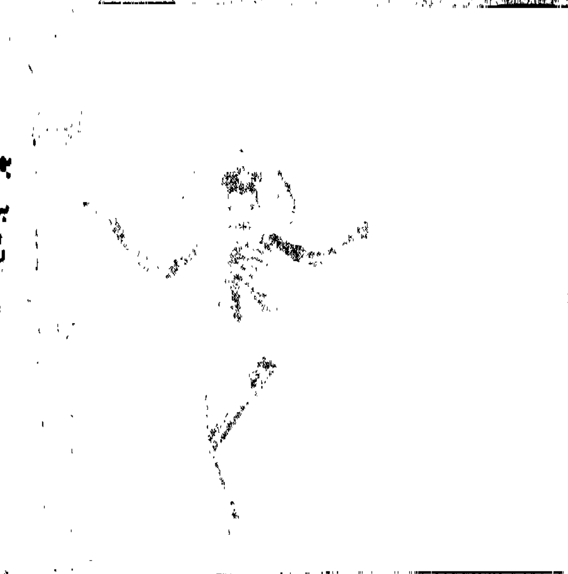
ہندوستان کی آسمان

میں انقلاب آچکا ہے۔ اب وہاں وسیع اور کشادہ سڑکوں
کے جال بچھ چکے ہیں، جگہ جگہ پوسٹ آفس کھل چکے ہیں
ہوائی اڈے، تار گھر اور ٹیلیفون جیسی چیزیں اب
بھوٹان میں عجوبہ نہیں سمجھی جاتیں۔ اسکولوں میں ہزاروں
ہزار طالب علم ہر سال تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور تقریباً
ہزار طلباء اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک

خصوصاً ہندوستان میں اپنے ملک کے مستقبل کو شاندار
بنانے کے لئے ہنر سے واقفیت کے لئے ہر سال روانہ
کئے جاتے ہیں۔
تھمپو جسے آجکل بھوٹان کا دارالحکومت بنا دیا
گیا ہے نئی دنیا کا شہر معلوم ہوتا ہے آج سے دس سال
قبل تھمپو کے شہریوں کے لئے پختہ سڑکیں، فون، گھر

بوڑھیں اکثر دیکھنے والے جانے بعید طرز کی
عمارتوں کا مجموعہ محل تھا لیکن شہرات
تمام سہولتوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے اور نت نئے
ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے پیش نظر یہ قیاس کیا
جاسکتا ہے کہ آنے والے دس برسوں میں اسے
بین الاقوامی شہروں کی فہرست میں درج کر لیا جائے
گا۔ عصر جدید کی تعلیمی، سائنسی اور سماجی ترقی کے
باوجود لاماؤں کا اثر آج بھی بھوٹانی سماج پر اتنا ہی
گہرا ہے جتنا ہزار سال قبل تھا۔ سماجی یا سیاسی
کوئی بھی جلسہ جلوس ہو لاماؤں کا ان میں شرکت
کرنا ضروری ہے۔ ذاتی اور سرکاری تقریبات میں آج
بھی ان سے دعائیں لی جاتی ہیں۔ انھیں مذہبی پیشوا
کی حیثیت دی جاتی ہے اور انکی عزت و توقیر کرنے
میں شاہ و گدا سب ہی پیش پیش نظر آتے ہیں۔

بھوٹان
بدھ مت
لوگ
ایک مذہ
رقص کر
ھیں



بھوٹان کی سرسبز پہاڑیوں، گنجان اور سرسبز
وادیوں، لاماؤں کی پراسرار شخصیتوں میں سب سے
عظیم ترین ہستی وہاں کے شاہ جگمے دورجی ہیں جو بادشاہوں
میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جگمے دورجی جیسا روشن خیال
عاقل، جمہوریت پرست اور بہبود پسند بادشاہ نہ کسی دور
میں پیدا ہوا اور نہ شاید مستقبل میں ایسے انقلابی
بادشاہ کے معرض وجود میں آنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

نیا بھوٹان دوسرے الفاظ میں موجودہ
بادشاہ کا ہی تحفہ ہے۔ جگمے دورجی نے اپنے باپ کے
استوار کئے ہوئے ہندوستان سے تعلقات کو اور
بھی مضبوط بنایا۔ سیاسی گتھیوں سے نجات دلانے
کے لئے انھوں نے بھوٹان میں قومی اسمبلی
قائم کی اور خود اپنے اختیارات کو کم کر دینے
... ...
... ...
... ...
... ...

اس کے علاوہ انھوں نے اسمبلی کو ایک ایسے

غیر معمولی طاقت سے نوازا یعنی سونگ ڈو اپنے کسی
بھی اجلاس میں معمولی اکثریت سے پاس کی گئی تجویز
کے ذریعے بادشاہ کو معطل کرسکتی ہے۔ دوسرا عجیب
غریب طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ بادشاہ کو ہر
تیسرے سال سونگ ڈو سے اعتماد کا ووٹ حاصل
کرنا ہوگا۔ اس طرح مطلق العنانی کو بنیادوں سے
اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔

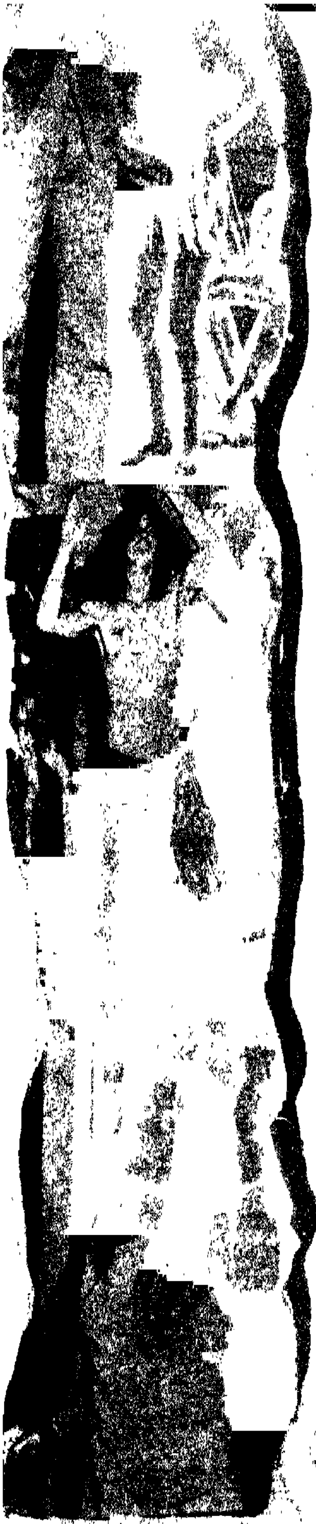
۱۹۷۰ء میں بھوٹان کو اقوام متحدہ کی رکنیت
پیش کی گئی لیکن بادشاہ نے اس پیشکش کو یہ
کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ ابھی بھوٹان اس قابل نہیں
ہوا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں اپنا صحیح کردار
نبھا سکے۔ چیر ملک سال بعد میں بھوٹان اس
قابل ہو سکے ... ۲۱ واں ممبر بن جائیگا۔

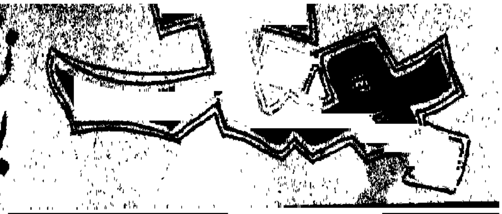
۱۹۶۲ء میں چین کے بھوٹان پر حملہ کر لینے
کے منصوبے سے واقف ہو کر بادشاہ نے سترہ برس
کی عمر سے زیادہ والے ہر بھوٹانی شہری کے لئے
فوجی تربیت لازمی قرار دے کر اپنے ملک کی دفاعی

حیثیت اتنی مضبوط کر لی کہ چین کی فوجیں پیش قدم
آگے نہ بڑھا سکیں۔

بادشاہ اور ولی عہد اکثر و بیشتر ایک ہی کھلی
جیپ میں کھیتوں، سڑکوں اور جنگلوں میں گھومتے
پھرتے ہیں۔ ان کی سلامتی اور حفاظت کے لئے کوئی گارڈ
متعین نہیں ہے۔ ہر شہری کسی بھی وقت پر ان سے مل
سکتا ہے۔

شاہانہ ترک و احتشام کو ترک کر دینے والے شاہ
بھوٹان نے سونگ ڈو کے ذریعے اپنی ماہانہ تنخواہ تین
ہزار روپے مقرر کی ہے جبکہ وہاں کابینہ کے وزیروں
کو تقریباً ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے۔
بھوٹان کے جگمے دورجی وانگ چک ایک ایسے
عظیم انسان ہیں جو عوام سے زیادہ انقلاب پسند اور
شہنشاہیت کے دشمن کہلائے جانے کے مستحق
سمجھے گئے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں بلاشبہ وہی ایک ایسے
فرمانروا ہیں جو بیک وقت بادشاہ بھی ہیں اور عایا
بھی





نشہ آور بوٹی

انسانی ذہن پر اس کے اثرات

میرا ایک غیر ملکی دوست جو کہ ڈاکٹر تھا اپنی بیوی اور لڑکے کے ساتھ میرے پاس چند دن کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ وہ بھنگ پینے کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے اپنے ایک دوست کے ذریعے بھنگ کا انتظام کیا۔ میرے لڑکے کو بھنگ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی لیکن کیونکہ بھنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لئے اس نے ہر شخص کو عام خوراک سے پانچ یا چھ گنا زیادہ بھنگ دے دی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی بھنگ پیتے ہی لمبے لیٹ گئے۔ ڈاکٹر نے بالکل مدہوش ہونے سے پہلے بھنگ کے اثرات بتانا شروع کر دیئے۔ بدقسمتی سے میرے پاس اس وقت ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا ورنہ ہم ڈاکٹر کے تاثرات پوری طرح نوٹ کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ڈاکٹر نے رنگوں، آوازوں، روشنی اور آواز کے متعلق بہت سی عجیب باتیں بتائیں۔ دوسری طرف اس کی بیوی صرف مسکراتی رہی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کی آواز سن رہی تھی جو بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ وہ خود بھی اس کی باتوں میں اضافہ کر سکتی ہے لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

یہ واقعہ پروفیسر نریندر ناتھ وِگ نے سنایا جنہیں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (W.H.O) کی طرف سے ہندوستان میں بھنگ کی پیداوار اور اس کے اثرات کے بارے میں ریسرچ کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وِگ کے علاوہ ایک دوسرے ہندوستانی نگھانت راٹھوڈ بھی ذہن اور جسم پر بھنگ کے اثرات کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہیں۔

دنیا میں بہت کم علاقے ایسے ہیں جہاں بھنگ کا پودا اُگ سکتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار اور استعمال نامعلوم زمانے سے ہے۔ ہندوستان میں یہ دہلی کے آس پاس اور بنگال کے تالابوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی اور افریقہ میں بھی اس کی پیداوار ہوتی ہے۔ لاطینی امریکہ کے کچھ علاقوں میں بھی اس کا استعمال اور پیداوار ہوتی ہے۔ امریکہ اور تمام یورپ میں اس کی پیداوار پر پابندی لگی ہوئی ہے ویسے بھی وہاں کی زمین اور آب و ہوا اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس کا پودا بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ پودے میں پھول اور پتے دونوں ہی ہوتے ہیں۔ جڑ کے علاوہ پودے کا تمام حصہ کام میں لایا جاتا ہے۔

حشیش، بھنگ، گانجا، چرس، مریجوانا اسی پودے کے مختلف نام ہیں۔ ان کے علاوہ پودے کے اوپری پھول والے حصے سے ایک قسم کا تیل بھی خارج ہوتا ہے جسے جمع کر کے سکھا لیا جاتا ہے۔ یہ تیل سوکھی ہوئی شکل میں چرس کہلاتا ہے۔ بھنگ کھائی بھی جا سکتی ہے اور پی بھی جا سکتی



چارلس — شفق بیگ

[illegible] الکحل [illegible]
کے [illegible] ہے۔

ڈاکٹر راتھوڑ نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ انہیں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی طرف سے چرس اور گانجے وغیرہ پر تحقیقات کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر راتھوڑ اب تک کئی شہروں کا دورہ کر چکے ہیں۔ دہلی اور کلکتے کے علاوہ وہ چندی گڑھ، لکھنؤ، امرتسر، مدراس، بنگلور اور جے پور بھی گئے۔ دہلی میں انہیں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے کافی مدد ملی۔ ان شہروں میں وہ پٹرول، وکروں، ڈاکٹروں، سادھوؤں، پاگل خانے کے پاگلوں، غرضیکہ ہر طبقے کے آدمیوں سے ملے۔

ڈاکٹر راتھوڑ نے اپنے تجربے کے بعد بتایا کہ اگرچہ بھنگ وغیرہ کی فروخت پر ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں پابندی لگی ہوئی ہے لیکن پھر بھی یہ ہر جگہ بآسانی دستیاب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ اس کا استعمال آیورویدک دواؤں میں بھی کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ یہ جنسی طاقت کو بڑھاتی ہے۔

راجپوتانہ میں خوشی اور تہوار کے موقعوں پر بھنگ کا استعمال عام ہے۔ سکھوں میں چونکہ سگریٹ پینا منع ہے اس لئے پنجاب میں یہ زیادہ تر کھائی جاتی ہے یا پھر گھونٹ کر پی جاتی ہے۔ پنجاب میں اس سے بہت مزیدار ٹھنڈائی بنائی جاتی ہے۔

بنگال میں دیوالی اور شیوراتری کے موقع پر بھنگ اور دوسری نشہ آور چیزیں نندی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں غریب مزدور



لگے دم مٹے غم

لوگ دن بھر کی تھکن اتارنے کے لئے شام کو بھنگ پیتے ہیں۔ بھنگ عام طور پر اکیلے بیٹھ کر نہیں پی جاتی بلکہ چار پانچ آدمی گھیرا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہتی ہیں اور چلم ان کے درمیان چکر لگاتی رہتی ہے اور وہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ سب بھنگ کے نشے میں دنیا کے تمام دکھ درد نہ بھول جائیں۔

دوسری طرف یورپ اور امریکہ کے ہپی ہیں جو مغرب کی زندگی سے گھبرا کر نروان حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کی طرف آتے ہیں۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نشہ کرنے سے روح کی شانتی اور نروان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے، یہ شانتی مصنوعی اور وقتی ہوتی ہے۔ آج تک کوئی بھی ہندوستانی سادھو یا فقیر بھنگ وغیرہ کے نشے سے نروان حاصل نہ کر سکا۔

یہ تو ابھی پوری طرح کہنا کہ بھنگ اور چرس وغیرہ کے اثرات بُرے ہوتے ہیں مشکل ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ یہ الکحل کے نشوں سے کم مضر ہیں۔ چوہوں اور خرگوشوں پر تجربے کرنے سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں ان کے بچوں پر اس کے کسی قسم کے مضر اثرات نہیں ہوتے البتہ بھنگ وغیرہ کا زیادہ استعمال کرنے والے ہر وقت نشے کی سی کیفیت میں رہتے ہیں اور ان کو معمول کے مطابق زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔



بھنگ کا پودا

میں کون ہوں؟

میرا نصب العین کیا ہے

اطہر رضا
بلگرامی

میرا نام پانچ سالہ منصوبہ ہے۔ میں ہر ملک میں کسی نام سے مشہور ہوں۔ منصوبہ میرا خاندانی نام ہے اور یہی میری عمر بھی ہے۔ میری عمر پانچ سال ہوتی ہے۔ یعنی ایک بھائی اپنے پانچ سالہ پیریڈ کے بعد دوسرے کو جانشین بنا دیتا ہے۔ ہم سب بھائیوں کا نصب العین عوام کو خوشحال و خرم اور بلند معیار زندگی عطا کرنا ہے۔ ہم اسی مقصد کی تکمیل میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے ملک نے مجھے ۱۹۵۱ء میں بلایا اور یہی نصب العین دے کر بٹھایا۔ اس لئے آج اکیس سال کے عرصے میں بھائی نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مقصد کے حصول کی انتہائی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم سب کس طرح اور کہاں تک کامیاب ہوئے اس کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے اپنا مختصر سا تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ پھر میری اس رام کہانی میں کہیں کچھ اجنبیت کا احساس نہ ہو۔

میرا خاندان عالمی ہے۔ میں ہر فرد میں، ہر ملک میں رہتا ہوں اور جہاں تک پورے کائناتی نظام میں تعمیری و تخریبی دونوں طور سے موجود ہوں۔ انگلینڈ، امریکہ، روس، جرمنی اور جاپان جو آج ترقی و خوشحالی کے ایک بلند مقام پر فائز ہیں اور جنہوں نے قلم کی نب سے لے کر کار تک تمام ضروریات زندگی کی اشیاء پیدا کر کے نہ صرف اپنے بلکہ تمام ممالک کے عوام کی ضروریات و خواہشات کی تسکین کا خیال رکھا ہے۔ ان ممالک کا احساس دلایا میرے ہی عمر بھائیوں نے ہے۔ بلکہ اگر ایسا بھی ممکن ہوا یہ میری ہی حوصلہ افزائی سے انسان چاند پر قدم رکھنے میں کامیاب ہوا ہے اور یہ میری ہی کرشمہ سازی ہے کہ ایک ملک کی چاند گاڑی بغیر کسی انسانی وجود کے چاند پر پہنچ کر وہاں تمام مراحل انجام دینے میں کامیاب ہوئی ہے جو انسان کا کام تھا۔

الغرض وہ میں ہوں جس کی بدولت آج انسان خواب کو حقیقت میں بدلنے کے قابل بنتا جا رہا ہے اور اپنی آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھ کر دشت امکاں کو بھی ایک نقش پا سے زیادہ نہیں سمجھتا ہے۔ دوسری بات میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ۱۹۳۰ء کی امریکہ کی معاشی بدحالی مجھ سے غفلت برتنے کا ہی نتیجہ تھی اور آپ کے ملک میں بھی قصباتی طبقہ جس معاشی بدحالی کا شکار نظر آتا ہے اور ایک بے چینی و مایوسی زندگی گزار رہا ہے وہ درحقیقت مجھے ہی نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ مجھ سے ہی الگ الگ رہنے کا انجام ہے ــــ آپ مجھے اور قریب سے پہچانئے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کے شعور میں رچا بسا ہوں تو آپ کو ضرور تعجب ہوگا، لیکن ٹھہریئے میں آپ کو احساس دلاتا ہوں۔ آپ نے اکثر و بیشتر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ وہ شخص کتنا سلیقہ مند ہے، کیسا منظم دماغ پایا ہے۔ کیسی ہوشمندی اور سوجھ بوجھ سے کام کرتا ہے۔ اپنے مستقبل کا کتنا خیال ہے۔ حال پر کیسی گہری نگاہ ہے، اس کا گھر کتنا صاف ستھرا رہتا ہے۔ تمام اشیاء زندگی کتنی صاف ستھری اور سلیقے سے رکھی رہتی ہیں۔ تمام افراد کس طرح خوش و خرم اسی کے ساتھ اپنی تمام ضروریات زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہر شخص میں کس قدر وقت کی پابندی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے تمام کاموں اور فرائض کو کیسا باقاعدہ رکھتا ہے۔ ذمہ داریوں کے اس احساس نے محنت و جفاکشی اور ایک مسلسل جد و جہد کے جذبے کو کس قدر بیدار کر دیا ہے۔ ہر فرد اپنی آمدنی اور پیداوار کو بڑھانے میں منہمک نظر آتا ہے تاکہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ ضروریات و خواہشات کو پورا کر کے زمانے کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا رہے یا اس کے برعکس آپ یہ دیکھتے ہیں کہ اس گھر میں کیسی بدحالی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر فرد کا مزاج الگ الگ۔ کسی کو کسی کے کام یا ذمہ داری سے کوئی سروکار نہیں۔ اس گھر میں آمدنی اور خرچ کا کوئی اندازہ نظر نہیں آتا۔ اگر پیسے آ گئے تو وقتی طور پر شاہانہ ٹھاٹ ورنہ مصیبت تو ہر کس و ناکس کے سامنے ہے۔ اس گھر میں افراد کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ بس ہر شخص کی نگاہ حال پر ہے۔ اپنی ضروریات کا احساس ہے لیکن ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، جس طریقۂ کار کو اپنانا پڑتا ہے جس ہوشمندی اور سلیقے کی ضرورت پڑتی ہے وہ نہیں ہے۔ اس لئے جب پیسے آ گئے تو اپنی چند ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے قابل ہو گئے ورنہ پھر ہر فرد افسردہ، پریشان اور منتشر المزاج نظر آتا ہے۔

تو جناب یہ سب کس کا پرتو ہے۔ خیالات و نظریات کی ہم آہنگی افراد کی احساس ذمہ داری، باہوش ذہنیت، تعمیری رجحانات، بلند نصب العین کے ساتھ جد و جہد، وقت کے تقاضوں کا احساس وغیرہ، نہ جانے ایسے کتنے آلۂ کار کی سرگرمیوں کا ایک مجموعی نتیجہ ہی تو ہے جن کے مناسب یا غیر مناسب استعمال کو دیکھ کر آپ کسی گھر کو خوشحال یا بدحال بتانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے تمام آلۂ کار مجھ سے الگ کسی تنظیم کے تحت کام کرتے ہیں ــــ؟ جی نہیں یہ میں ہی ہوں جس کا سہارا لے کر ایک انسان اپنی تمام ضروریات زندگی، جیسے کھانا، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت، آرام و آسائش کی تمام اشیاء کا ایک طرف اور ان کی تسکین کے ذرائع جیسے آمدنی، تعلیم گاہوں، بازاروں، آمد و رسل و رسائل کی سہولتوں، اشیاء کی دستیابی وغیرہ کا دوسری طرف مطالعہ کرتا ہے اور پھر یہ طے کرتا ہے کہ کن ضروریات کو مقدم رکھ کر پہلے پورا کیا جائے اور کن کو بعد میں، یا کن ضروریات کی تسکین کو یا کن ضروریات کو کم کر کے دوسری ضروریات یا دوسرے اخراجات کو پورا کیا جائے۔ جو ... [illegible]

کانگریس میں ناپسندیدہ عناصر کی شمولیت کا خ

مسائل

رجعت پسندی و فرقہ پرستی

لوک سبھا کے انتخابات میں کانگریس کو جو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اس کے بعد یہ سمجھا گیا کہ رجعت پسند عناصر کا ملک سے خاتمہ ہو گیا۔ لیکن دلی کارپوریشن کے حالیہ انتخابات اس امر کے مظہر ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے اس کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ چار ریاستی انتخابات میں وہ کسی حد تک کمزور ضرور ہوئے ہیں لیکن ان کا استیصال نہیں ہوا ہے۔ ضلع کانگریس کمیٹیوں کے صدروں اور سکریٹریوں کی دہلی کانفرنس میں بولتے ہوئے انہوں نے تمام کانگریسیوں سے اپیل کی کہ وہ پہلے سے متحد ہو کر رجعت پسندوں کا قلع قمع کریں۔

مسز گاندھی نے بجا طور پر ان بہت سے لوگوں پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا جو کانگریس میں شامل ہونے کے لئے بے چین ہیں، ایک ہی رات میں کسی کے نظریات نہیں بدل سکتے۔ اس لئے اگر شکوک و شبہات پیدا ہوں تو یہ قدرتی بات ہے کانگریس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے ہیں لیکن بلا روک ٹوک داخلے کی اجازت دینے سے ہمیشہ ایسے ناپسندیدہ عناصر کی شمولیت کا خطرہ رہے گا جو صحیح معنوں میں کانگریس کے اصولوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں صدر کانگریس مسٹر سنجیوا ریڈی کی یہ تجویز قابل توجہ ہے کہ کانگریسی کارکنوں کی ٹریننگ کے لئے مختلف علاقوں میں مرکز کھولے جائیں تاکہ انہیں کانگریس کے اصولوں سے واقفیت حاصل ہو سکے اور وہ اپنی قومی جماعت کا پیغام صحیح طریقے سے گھر گھر پہنچا سکیں۔ نظم و نسق سے متعلق معمولی سے معمولی عہدے کی ٹریننگ ہوتی ہے پھر سیاسی کارکنوں کی ٹریننگ کیوں نہ ہو۔ انکی ٹریننگ سے نہ صرف پوری جماعت کو استحکام حاصل ہوگا بلکہ سوسائٹی سے رجعت پسندی اور فرقہ پرستی کو بھی ختم کیا جا سکے گا۔

صوبے

بنگال

پناہ گزینوں کے ساتھ لوٹ کھسوٹ

مشرقی بنگال سے پناہ گزینوں کے جو قافلے چلے آ رہے ہیں انکی وجہ سے مغربی بنگال کی معیشت پر اثر پڑنا لازمی ہے اس لئے کہ انتظام کیا گیا تھا۔ اکثر پناہ گزین مغربی بنگال میں آ چکے تھے پہلا یہ ریاست خوراک کے معاملے میں مرکز کی محتاج تھی اب پناہ گزینوں کی آمد کے بعد خوراک کی مزید قلت ہوگی مگر خوراک مرکز سے اور دوسری زیادہ خوراک پیدا کرنے والی ریاستوں سے حاصل کیا جا سکتی ہے۔ لیکن یہ اتنا زیادہ تشویشناک مسئلہ نہیں اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے پریشان حال لوگوں کی پریشانی میں اور اضافہ کیا جا رہا ہے۔

لڑائی کے نتیجے میں اور مشرقی پاکستان سے بے شمار تعداد میں لوگوں کے بھاگنے کی بنا پر پاکستانی کرنسی کی اب کچھ کوئی قیمت ہی نہیں رہی ہے اور خود غرض اور منافع خور لوگوں نے پناہ گزینوں کو جو پاکستانی کرنسی لے کر آئے ہیں انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا ہے خبر ہے کہ بعض منافع خور اور اخلاقی مجرموں نے پاکستان کے سو سو روپے کے نوٹ صرف دس دس روپے میں خرید لئے ہیں۔ اس صورت حال کو چیک کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے مرکزی حکومت سے ریزرو بینک کو یہ ہدایت دینے کی اپیل کی ہے کہ وہ سرحد پار کرکے آنے والوں کی سہولت کے لئے کرنسی تبدیل کرنے کا انتظام کرے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ عام سرحدی اضلاع میں کرنسی تبدیل کرنے کے مرکز قائم کئے جائیں تاکہ پناہ گزینوں کو کوئی پریشانی نہ ہو۔

ایسا ہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو مشرقی پاکستان میں پٹ سن کی کاشت کرتے تھے۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں کارخانے بالکل تباہ ہو گئے ہیں اور عام پٹ سن کی پیداوار کا ملک کر سکنا مشکل ہے اس لئے زیادہ پٹ سن ہندوستان کی مارکیٹوں میں ہی آئے گا۔ منافع خور بیوپاری بھی [illegible] کا ارادہ رکھتے ہیں بلکہ بعض علاقوں میں دکھائے بھی ہیں اور [illegible] کا مال [illegible] روپے من خرید کیا ہے۔

اگر حکومت نے اس سلسلے میں کوئی قدم [illegible]



مشرقی پاکستان سے آنے والے لاکھوں پناہ گزین روٹی، کپڑے اور مکان کی تلاش میں

منافع خوروں نے پناہ گزینوں کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا

یوپی کے اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والوں کی کوئی قدر نہیں

نکی کو اس کا تجربہ ہے ... سے ... کا ... بنگال کے کسانوں پر بھی برا اثر پڑے گا اور وہ تباہ ہو جائے

یوپی

اونچی دوکان پھیکا پکوان

یوپی آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی اور رقبے کے لحاظ سے ملک کی دوسری سب سے بڑی ریاست ہے لیکن اس کے باوجود یہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں بڑی پسماندہ ہے یعنی اونچی دوکان اور پھیکا پکوان" کی مثل اس ریاست پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس ریاست کے تقریباً ۹ کروڑ باشندے دوسری ریاستوں کے مقابلے میں غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔ فی کس سالانہ آمدنی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کم ہے ۶۸-۱۹۶۷ء میں فی کس آمدنی صرف ۴۹۸ روپئے تھی جبکہ پنجاب کی فی کس آمدنی ۸۲۸ روپئے اور پورے ملک کی آمدنی اوسطاً فی کس ۵۵۱ روپئے تھی۔ اس ریاست کی جو بری حالت ہے اس پر بلٹس نے اپنے خطبے میں بڑے اچھے انداز میں کہا ہے:۔



مسٹر ... اب دیکھئے ترپاٹھی جی کیا کرتے ہیں۔

• ریاست اس وقت پسماندگی کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اس کی بچتیں بھی کم ہیں، وسائل کم ہیں، سرمایہ کاری بھی کم ہے اور اس کی وجہ سے معیار زندگی بھی پست ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک طرف ریاست کی زرعی پیداوار کو نہ بڑھایا جائے گا اور دوسری طرف دیہی صنعتوں کا جال نہ پھیلایا جائے گا تاکہ فالتو لوگ زرعی میدان سے نکل کر ان صنعتوں میں لگ جائیں اس وقت تک ریاست دوسری ریاستوں کی سطح پر نہیں آسکتی۔

زرعی اور صنعتی میدانوں میں اگر یوپی ابھی تک اطمینان بخش طور پر ترقی نہیں کر سکا تو اس کی بڑی وجہ اس ریاست میں سیاسی عدم استحکام رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں ایسی حکومتیں برسر اقتدار آئی ہیں جنہیں ہمیشہ اپنی کرسی کو بچانے کی فکر رہی ہے اور انھوں نے عوامی فلاح کا کوئی کام نہیں کیا نتیجے میں ریاست کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے اور جو ریاست تمام ریاستوں کے مقابلے میں آگے سمجھی جاتی تھی پیچھے رہ گئی۔ حد یہ ہے کہ تعلیم کے معاملے میں بھی اس ریاست کو دوسروں سے پیچھے سمجھا جاتا ہے۔ اب یوپی کے اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والوں کی کوئی قدر باقی نہ رہی۔

اب ایک عرصے کے بعد یوپی میں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی ہے لیکن ظاہر ہے اس کی کارگزاریاں اتنی جلدی سامنے نہیں آسکتیں، البتہ اس کے انداز بتا رہے ہیں کہ وہ ریاستی ترقی کے سلسلے میں تیز رفتاری سے کام کرنا چاہتی ہے۔ صنعتی ترقی کے لئے قرضہ حاصل کرنے کی پالیسی بھی اس نے جاری کی ہے، اسے اس کی اسی پالیسی کا ایک حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ زرعی میدان میں بھی بہت سے ترقی پسندانہ اقدامات کئے جانے کا منصوبہ ہے۔ اب توقع ہے کہ یوپی کی ریاست بھی جلد دوسری ریاستوں کی سطح پر آسکے گی۔

تامل ناڈو

ریاستی خودمختاری کا مطالبہ

وزیراعلیٰ مسٹر کروناندھی "ریاستی خودمختاری" کے حامی

ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ اخبار "مراسلی" میں جو خود انھوں نے شروع کیا تھا ڈی۔ ایم۔ کے چیرمین کی حیثیت میں اپنی پارٹی کے ممبروں کے نام کھلے خطوط لکھ رہے ہیں ایک خاص مقصد کے لئے اس طرح تحریک چلا کر انھوں نے ایک نئی مثال قائم کی ہے۔

ان کے کھلے خطوط میں الفاظ مختلف ہوتے ہیں لیکن انکا بنیادی مقصد ایک ہی رہتا ہے یعنی "جب تک ریاستی خودمختاری حاصل کرنے کے مقصد میں کامیابی نہ ہوگی اس وقت تک ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔" اور مسٹر کروناندھی ریاستی حکمراں پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ سمجھتے ہیں کہ "ریاستی خودمختاری" کی لڑائی کوئی معمولی نہیں ہے یہ لڑائی لڑنے پر قطعی ممکن ہے کہ آج جو لوگ خود وہ سینٹ جارج میں کرسیوں پر قابض ہیں کل انھیں پالاکوٹ کے جیلخانے کی کوٹھریوں میں رہنا پڑے۔ (اسی جگہ ۱۹۶۰ء میں ہندی کے خلاف ایجی ٹیشن کے دوران مسٹر کروناندھی کو قید کیا گیا تھا)

مسٹر کروناندھی اپنے کارکنوں کو ڈی۔ ایم۔ کے کی ممبری بڑھانے پر زور دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی گلی کوئی محلہ اور کوئی گھر ایسا باقی نہ رہے جہاں ڈی۔ ایم۔ کے کا آدمی موجود نہ ہو۔

ڈی۔ ایم۔ کے۔ کے ممبروں کی تعداد اگرچہ دس لاکھ ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ "یہ کافی نہیں ہے کم از کم اس سے تین گنی زیادہ تعداد ہونی چاہیئے۔"

مسٹر کروناندھی اپنے عوام کو ایسے ہی الفاظ میں للکار رہے ہیں جیسے شیخ مجیب الرحمٰن نے "بنگلا دیش" کے لوگوں کو للکارا تھا۔ "خراب سے خراب صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہو اگر تم امید رکھو کر نتیجہ بہترین نکلے گا۔"

اپنے ایک حالیہ خط میں جسکا عنوان تھا "کیا آپ یا میں سوتے رہیں گے" انھوں نے کہا "اگرچہ ہمیں ایسی توقعات رکھنی چاہئیں لیکن مرکز کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے کسی سمجھوتے پر پہونچنے کے بارے نا امید ہوں" اور پھر دوسرے ہی خط میں لکھتے ہیں کہ ہمیں آج ہی سے کام شروع کر دینا چاہئے۔ ▬

ماقات نئی دہلی

ہندوستانی کرکٹ کا ہیرو سنیل گواسکر

(شاہد صدیقی)

فٹ بال کے بعد ہندوستان کا سب سے مقبول کھیل کرکٹ ہے۔ جو مقبولیت کرکٹ کو حاصل ہے وہ شاید ہاکی کو بھی نہیں۔ ویسے لوگ کرکٹ کم کھیلتے ہیں لیکن اس میں دلچسپی زیادہ لیتے ہیں۔ جہاں کہیں ہندوستان میں کرکٹ کا کھیل شروع ہوتا ہے ریڈیو اور اخباروں کے دفتروں کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر ہوتا ہے کہ اسکور کیا ہو گیا۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ممبروں کو تازہ اطلاع سے مطلع رکھا جاتا ہے ورنہ خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں ممبر اجلاس چھوڑ کر گھوم جا کر کمنٹری نہ سننے لگ جائیں۔ کرکٹ کی اس مقبولیت کے باوجود ہندوستانی کرکٹ ٹیم کا شمار دنیا کی بہت اچھی ٹیموں میں نہیں ہوتا۔

کرکٹ کے میدان میں ہمیشہ ہی سے انگلینڈ، آسٹریلیا اور اور ویسٹ انڈیز چھائے رہے ہیں۔ یہ ملک کسی تیسرے ملک کو اپنے ساتھ کا درجہ نہیں دیتے تقریباً پچھلے دس سال سے ویسٹ انڈیز کرکٹ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔ ویسٹ انڈیز کے نوجوان سپنرز کا مقابلہ ... ملاقات [illegible]



سنیل گواسکر ـــــــ سنہرا مستقبل

اور کنہائی جیسے فلیمبوائنٹ بازی بیک کے دہاں اس کے بالر ہال، گرفتھ اور گلکرسٹ کا شمار دنیا کے سب سے تیز گیند پھینکنے والوں میں ہوتا تھا۔

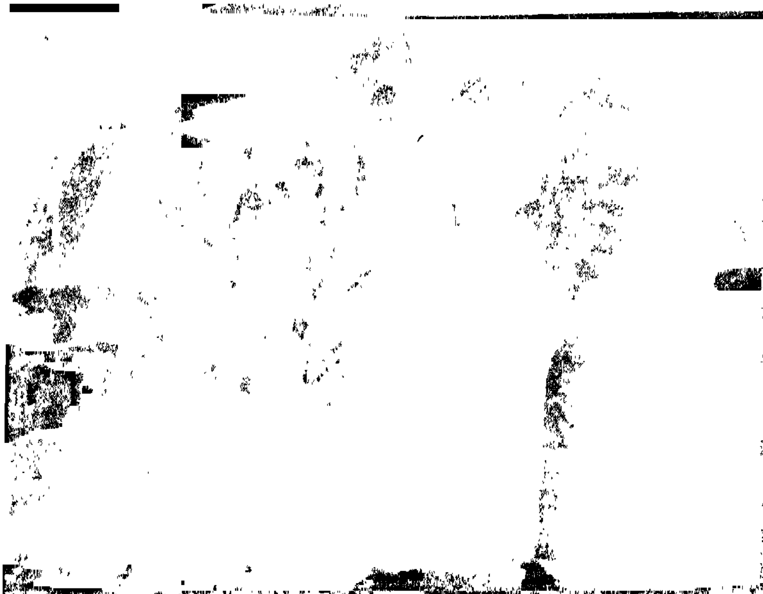
ہندوستان دنیا کی تمام کرکٹ ٹیموں کو تقریباً ایک آدھ میچ میں ضرور ہرا چکا تھا لیکن ویسٹ انڈیز کے مقابلے میں کبھی جاتی تمام میچ ہار گئی تھی۔ ویسے تو ہندوستانی کرکٹ ٹیم ہندوستان سے باہر نکلنے کے بعد عام طور پر جیتنا سرے سے بھول ہی جاتی ہے۔ ہندوستانی ٹیم چاہے کتنی بھی مضبوط ہو اور غیر ملکی ٹیم چاہے کتنی بھی کمزور حالت میں کیوں نہ ہو ہار ہندوستان ہی کے حصے میں آتی تھی اس لئے جب پچھلے مہینے ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلی بار ربڑ جیتا تو حیرت اور خوشی ایک فطری چیز تھی۔

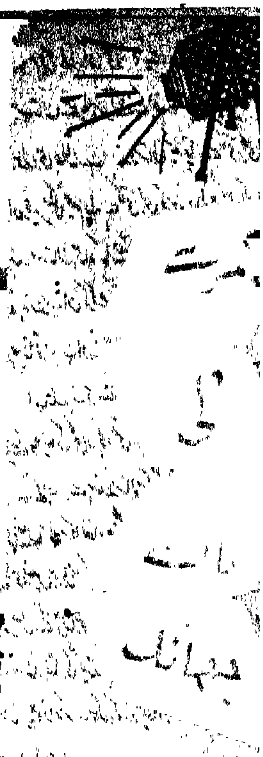
اب تک ہندوستان کی ناکامی کی وجہ ٹیم میں تیز گیند پھینکنے والوں کی کمی رہی تھی۔ دوسری طرف کنٹریکٹر کے زخمی ہونے کے بعد سے ہندوستان کو کوئی مناسب اوپننگ بھی نہیں مل سکا تھا۔ تیز گیند پھینکنے والوں کی کمی تو اب بھی پوری نہیں ہوئی لیکن اب ہمیں عابد علی اور گوبند راج دو ایسے بالر مل گئے ہیں جن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے حالانکہ دونوں درمیانی رفتار کی گیند پھینکتے ہیں لیکن پھر بھی نئی گیند کا استعمال کافی اچھے ڈھنگ سے کر کے دو تین وکٹ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس نئے سب سے بڑی کمی جو پوری ہوئی وہ اوپننگ بلے باز کی تھی۔ سنیل گواسکر ہمیں ایک ایسا اوپننگ بلے باز مل گیا جو آتے ہی کرکٹ کی دنیا میں ستارے کی طرح چمکنے لگا۔ یہ ۲۱ سالہ نوجوان کھلاڑی ایک مکمل اوپننگ بلے باز ہے

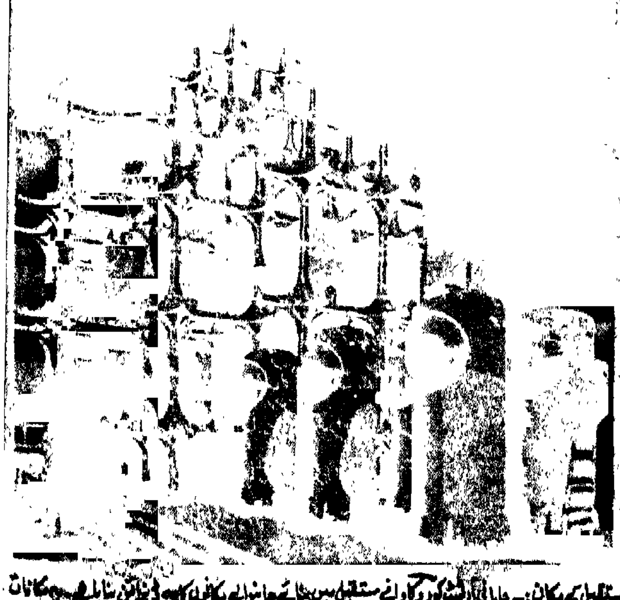
دہلی میں مسز گاندھی سے بات کرتے ہوئے سنیل گواسکر، کپتان اجیت واڈیکر اور بشن سنگھ بیدی ـــــــ







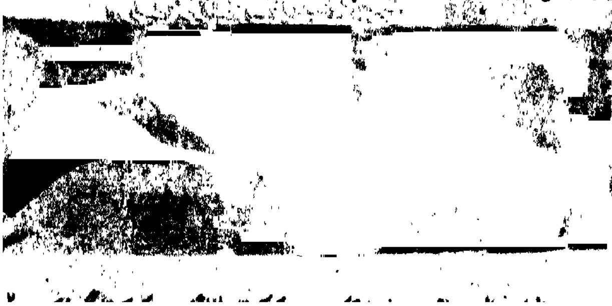
[illegible] دیوار چین [illegible] امریکی [illegible] ٹیبل ٹینس ٹیم کے دورۂ چین [illegible] امریکہ اور چین کے درمیان تعلقات میں خوشگوار باب کا اضافہ کیا ہے۔ اب سننے میں آ رہا ہے کہ [illegible] دورہ کریں گے۔ تصویر میں امریکی ٹیبل ٹینس ٹیم دیوار چین پر۔



[illegible] ۔ برطانیہ کا ڈیزائنر گیرالڈ سکاٹ نے لال جرابے [illegible] کا نام ہے۔ "چیرمین ماؤ"



مستقبل کے مکان:۔ جاپانی آرکیٹکٹ کوروکاوا نے مستقبل میں بنائے جانے والے مکانوں کا یہ ڈیزائن بنایا ہے جو مکانات فیکٹری میں تیار ہوں گے۔ اس مکان کا ڈیزائن چند گھنٹوں میں تبدیل کیا جا سکے گا اور دوسری جگہ کھڑا کر سکیں گے

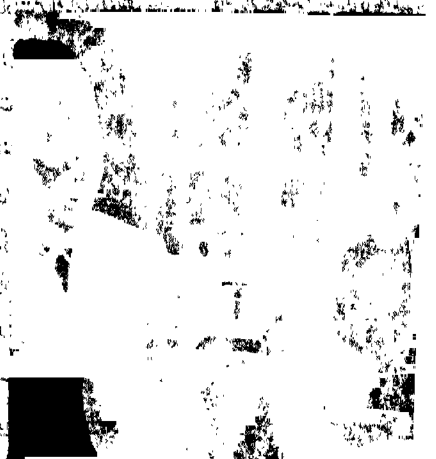






سمراٹ اشوک، سمراٹ شاہجہاں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اب جمبو جیٹوں کا دور شروع ہو گیا ہے۔ انڈین ایئر لائنز نے تین جمبو جیٹ خریدے تھے جن میں سے دو ہندوستان پہنچ چکے ہیں۔ ایک کا نام سمراٹ اشوک اور دوسرے کا سمراٹ شاہجہاں ہے۔ اوپر کی تصویر میں جمبو سمراٹ اشوک اور اس کا اندرونی منظر





واشنگٹن میں تین لاکھ امریکنوں نے ویتنام، کمبوڈیا اور لاؤس میں امریکی ظلم و ستم کے خلاف مظاہرہ کیا۔ تصویر میں ایک امریکی سپاہی وہائٹ ہاؤس کے سامنے ... جنگ میں اس کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی اور اب بیساکھی کی مدد کے بغیر چل پھر نہیں سکتا



بچوں میں بچہ ــ ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن آج بھی بہت ہی کم عمر کے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے انگلینڈ میں بچوں کی ایک ٹرین "چھک چھک" کا افتتاح کیا اور پھر خود ہی ٹرین میں سوار ہو کر اسے چلانا شروع کر دیا۔



ہندوستان کے تیسرے صدر

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی مختصر سوانح حیات

(دوسری برسی کے موقع پر)

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی وفات کے ۲ سال بعد آج سے ۷۴ سال قبل ۸ فروری ۱۸۹۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد محترم یوپی سے آکر مقیم ہو گئے تھے۔ اوائل عمری میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اپنے آبائی وطن فرخ آباد لوٹ آئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے موسوم ہے، داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنے تعلیمی شوق، ذہانت، حسن تقریر اور قومی جماعتوں کی امداد کے لئے مشہور تھے۔ کالج میں وہ نہ صرف علمی ذوق و شوق کے لئے مشہور تھے بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ کی سرپرستی میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لوگوں کی تحریک پر انگریزی سرکار کے اثر سے آزاد خالص نیشنلسٹ مقاصد کے لئے ایک قومی "دانشکدہ" جامعہ ملیہ اسلامیہ" قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (آج کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے اساتذہ اور طالب علموں کی ایک مختصر سی جماعت اس تحریک سے متاثر ہوئی اور کالج چھوڑ کر اس قومی تعلیم گاہ کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں بھی جن کی عمر اس وقت ۲۳ سال تھی ایم اے میں پڑھتے تھے، اس جماعت کے ایک فرد تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا عقیدہ تھا کہ "ہندوستان کے قومی احیاء کا دور وہی لوگ شروع کر سکیں گے جو ہندوستان میں اپنی قسم کی بنے والی تعلیم کے سانچے میں ڈھلے ہونگے"۔

چنانچہ وہ علی گڑھ سے اقتصادیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرنے کے شوق اور علم کی تلاش میں جو ہندوستان کے کلچر اور تصورات کے عین مطابق ہو، جرمنی گئے۔ وہ وہاں تین سال تک رہے۔ اسی زمانہ میں یورپ کے آرٹ، ادب اور موسیقی سے انہیں دلچسپی ہوئی۔ برلن یونیورسٹی نے معاشیات میں تحقیقی مطالعے کے سبب انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ ۱۹۲۶ء میں وہ ہندوستان واپس آئے۔ اس وقت انکی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بنائے گئے اور یہ ادارہ علی گڑھ سے دلی منتقل کر دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۲۲ سال تک فائز رہے۔

انھوں نے اور ان کے رفقاء کار نے سادہ زندگی بسر کرنے کا عہد کیا تاکہ یونیورسٹی کی مالیات پر بوجھ نہ پڑے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کار کی کوششوں کے نتیجہ میں جامعہ ملیہ کا شمار ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہونے لگا۔

۱۹۳۷ء میں جب مہاتما گاندھی نے ملک کے سامنے بنیادی تعلیم کا مسئلہ پیش کیا تو انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو بنیادی تعلیم پر قومی کمیٹی کی سربراہی سنبھالنے کا کام سونپا تاکہ تعلیم کا ایک ایسا نظام وضع کیا جائے جو اس ملک کے کثیر شہریوں کی ضروریات اور صلاحیتوں کے مطابق ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نظام کی تعمیر میں نہ صرف اہم حصہ لیا بلکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بھی ایک پیش رو یونیورسٹی اور تعلیمی تجربہ گاہ کا ایک مرکز بنا دیا۔

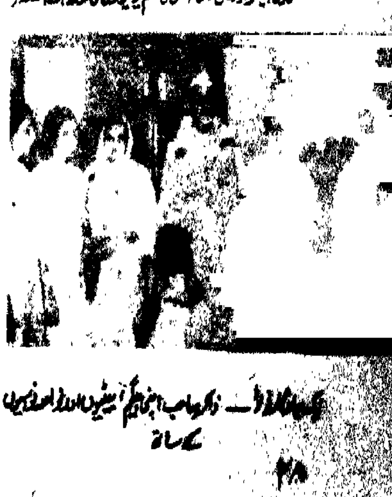
ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۴۸ء تک تعلیمی کمیٹی کے صدر رہے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اُن کی تصانیف میں افلاطون کی "ریاست" کا اردو ترجمہ، کیپٹلزم کی تنقید، اقتصادیات اور تعلیم پر ترجمے اور بچوں کے لئے بہت سی بنیادی کتابیں شامل ہیں۔

گو ڈاکٹر ذاکر حسین نے سرگرم سیاست سے پرہیز کیا تاکہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو قومی دانشکدہ (جامعہ) کے کام میں لا سکیں لیکن ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے پر آمادہ کیا۔ آٹھ سال تک فائز رہے، اس عہد میں مسلم یونیورسٹی کو جو فروغ ہوا وہ ناقابل فراموش ہے۔ آپکی خدمات کو کئی تعلیمی اور کمیشنوں میں شامل یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن اور ... حاصل کیا گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کو ایک ممتاز دانشور ... پہلے ۱۹۵۲ء میں پھر ۱۹۵۶ء میں دو بار راجیہ سبھا ... ۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر مقرر کئے گئے۔ اس ... تک فائز رہے۔ انھوں نے اس عہدے پر بھی ... علیم ... کی خدمات انجام دینے کا سلسلہ جاری ... یونیسکو میں ہندوستان کی نمائندگی کی اور ... اس ادارے کے ایگزیکٹو بورڈ کے رکن ... ڈاکٹر ... حاصل تھا



ڈاکٹر صاحب جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شیخ الجامعہ



۱۹۵۵ء — ڈاکٹر صاحب اپنی بیگم، بیٹیوں اور نواسیوں کے ساتھ

اور یہ [illegible]

ایک مرتبہ انہوں نے [illegible] بچوں کو طرح

اسکالرز اور طالب علموں کی ایک نہایت زرخیز جماعت [illegible] اور تعلیم یافتہ سماج کا ذمہ دار رکن تصور کیا جانا چاہیئے جنہیں سوچنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے بغیر کا خوف کھانے سے انکار کرنے عقائد پسندی سے اجتناب کرنے حتیٰ کہ غلطی کرنے تک کی آزادی ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں ماہر تعلیم کے طور پر ان کے عمل کی یہی وسیع النظری ایک تحریک کی شکل میں جاری رہی۔

۱۹۶۲ء میں وہ جمہوریہ ہندوستان کے نائب صدر چنے گئے۔ بحیثیت چیئرمین راجیہ سبھا کے طور پر انہوں نے اپنے بے پناہ علم و دانش اور غیر جانبداری اور شرافت کے ذریعہ ایوان کا مکمل اعتماد اور احترام جیت لیا۔ انہوں نے ایشیا، افریقہ اور مغرب کے کئی ممالک کا دورہ کیا۔ قوم کے لئے ان کی عظیم خدمات کے عملی احترام کے طور پر ۱۹۶۳ء میں انہیں ملک کے سب سے بڑے خطاب بھارت رتن سے نوازا گیا۔

پانچ سال تک نائب صدر کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں ان سے صدر جمہوریہ کے انتخاب میں حصہ لینے کی درخواست کی گئی جسے انہوں نے بادل ناخواستہ منظور کیا۔ ۱۹۶۷ء کے اس صدارتی انتخاب سے پہلے اور اس کے دوران فرقہ پرست عناصر نے جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا اور جو نعرے لگائے انہیں کوئی سنجیدہ اور شائستہ ہندوستانی فراموش نہیں کر سکتا۔ ملک کی متعدد ریاستوں میں کانگریس کو عبرتناک شکست ہو چکی تھی۔ صدارتی انتخاب میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سبا راؤ بطور امیدوار سامنے آگئے تھے۔ جن کی پشت پناہی ملک کے مختلف با اثر طبقات رجعت پسند عناصر کر رہے تھے، اور یہ شخص بہ آسانی فیصلہ کر سکتا تھا کہ مقابلہ نہایت حوصلہ شکن اور ہمت شکن ہے خصوصاً اسلئے کہ ذاکر صاحب ایک مسلمان تھے۔ ایسے ملک میں جہاں سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ اڑتالیس کروڑ غیر مسلم رہتے ہیں اور جن کے فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے کی مکروہ کوشش باہم عروج پر پہونچ چکی تھیں لیکن ان تمام مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کے سیکولر دوست عوام کی خواہش کا احترام کیا۔ اور جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ "انتخاب لڑوں گا" اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھاری اکثریت سے جمہوریہ ہند کے صدر چنے گئے۔ اس موقع پر اپنی انتہائی اثر انگیز تقریر میں انہوں نے کہا کہ "سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور یہاں کے لوگ ان کا کنبہ ہیں"۔ اپنے دو سالہ صدارتی دور میں ڈاکٹر صاحب کی اہمیت اور اصولوں کی پابندی ان کی ذی شان اور باوقار شخصیت ان کے واقعات ۔۔۔

اعلیٰ ذوق سلیم، ان کے شعور اور انسان دوستی کے اوصاف نے وطن کے اس بلند ترین منصب کو ایک نئی شان بخشی اور انہوں نے عوام کے ہر طبقے سے خراج تحسین حاصل کئے یہاں تک کہ ان سے بھی جنہوں نے انتخاب صدارت کی مہم میں ان کی شدید مخالفت کی تھی۔ خراج، محبت و ستائش حاصل کیا۔

یہ تھی اس عظیم دانشور، محب وطن، صداقت کے پیکر، جنگ آزادی کے بہادر جرنیل، اعلیٰ اخلاق کے نمونے اور انسانی شرافت کے بہترین وارث کی داستان حیات۔

آخرکار ساری زندگی ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے بعد ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو ہندوستان کا یہ مایۂ ناز فرزند اس دنیا سے اُٹھ گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اُن عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جو کبھی نہیں مرتے، جن کی یاد عوام کے دل میں ہمیشہ قائم رہتی ہے پورا ملک ڈاکٹر صاحب کی برسی ہر سال اسی جوش و خروش کے ساتھ مناتا رہے گا اور انکی شخصیت پر عقیدت کے پھول چڑھاتا رہیگا۔ ● ●

گواسکر دوسرے [illegible] سے کھیلتے [illegible] بہت [illegible] بولر کے کھیلنے میں گواسکر [illegible] میں کوئی نئی بات نہیں ہے گواسکر جب اسکول کی ٹیم میں کھیلتا تھا تب ہی ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ایک عظیم کھلاڑی [illegible]

۶۶-۱۹۶۵ء میں گواسکر نے [illegible] کرکٹ ٹورنامنٹ میں حصہ جب اس نے [illegible] کے خلاف کھیلتے ہوئے ۲۴۶ رن بنائے اور آؤٹ نہیں ہوا۔ اس کے ساتھی [illegible] نے ۲۰۳ رن بنائے اس طرح دونوں نے اوپننگ وکٹ کی [illegible] ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ [illegible] کے خلاف کھیلتے ہوئے سنیل نے ۲۲۲ رن بنائے [illegible] کے خلاف [illegible] رن بنائے [illegible] کے اسکولی لڑکوں کی ٹیم ہندوستان آئی تھی کے خلاف کھیلتے [illegible] دوسرے [illegible] میں ۵۵ اور ۵۰ رن بنائے۔

[illegible]

۶۹-۱۹۶۸ء میں [illegible] میں جنوبی [illegible] کے خلاف کھیلتے ہوئے سنیل نے ۲۴۷ رن بنائے [illegible] اس سے اگلے میچ میں ویسٹ زون کے خلاف کھیلتے ہوئے بہت ہی مشکل حالات میں سنیل نے [illegible] رن بنائے اور وہ آؤٹ نہیں ہوا۔

اسی سال کے شروع میں یونیورسٹی کرکٹ میں گجرات کے خلاف کھیلتے ہوئے سنیل نے [illegible] رن بنائے [illegible] کر کے [illegible] نے ۲۲۲ رن بنا کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا گواسکر کا اپنے اوپر اعتبار اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے واڈیکر کا ۲۲۲ رن کا ریکارڈ پلان کے تحت اور باقاعدہ حساب لگا کر توڑا اور ۲۴۷ رن بنا کر اس نے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔

گواسکر کو کرکٹ کھیلنے کی باقاعدہ تربیت نہیں ملی اس نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے۔ اس کے چچا مادھو منتری اپنے زمانے کے بہت عمدہ کھلاڑی رہ چکے ہیں لیکن اس نے آج تک کوئی خاص [illegible] لی۔ اس میں گواسکر نے کرکٹ کھیلنا اپنی غلطیوں سے سیکھا ہے۔ اس نے جو [illegible] کی پھر کبھی اسے نہیں دہرایا اس کے علاوہ وہ دوسرے [illegible] کو بہت غور سے دیکھا کرتا تھا اور ان کی ایک ایک غلطی کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا تھا۔

گواسکر کے پاس کرکٹ کے تمام پچھلے ریکارڈ محفوظ ہیں اور وہ تمام اچھے کھلاڑیوں کی سوانح بھی پڑھ چکا ہے جن سے اس نے بہت سے سبق حاصل کئے ہیں۔

ویسٹ انڈیز میں چوتھے ٹیسٹ میچ میں گواسکر صرف ایک رن بنا کر آؤٹ ہو گیا۔ ویسٹ انڈیز کا تیز گیند پھینکنے والا ڈورسٹ [illegible] کی طرف گیند پھینک رہا تھا گواسکر نے [illegible] گیند پر [illegible] لگا دیا اور کیچ آؤٹ ہو گیا۔ آؤٹ ہونے کے بعد گواسکر کو بڑا افسوس ہوا تھا اس نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا۔

"[illegible] نے اس سے ایک سبق سیکھا ہے وہ یہ کہ کبھی باہر کے گیند کی طرف مت دیکھو۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گواسکر کس طرح اپنی ہر غلطی سے ایک سبق سیکھتا ہے۔ یقیناً اگر گواسکر نے اپنی اس عادت کو برقرار رکھا تو بہت جلد اس کا شمار بریڈمین، ہیملٹن، ہوبز اور سوبرس جیسے عظیم بیٹسمینوں میں ہونے لگے گا۔

گواسکر کو ویسٹ انڈیز میں جس طرح کھیل کا مظاہرہ کیا اس پر [illegible] کرکٹ کلب نے ایک [illegible] پیش کی۔ ویسٹ انڈیز کے کرکٹ کے [illegible] گواسکر کے دیوانے ہو گئے ہیں وہاں بچے بچے کی زبان پر گواسکر کا نام ہے۔ ویسٹ انڈیز کے کپتان سوبرس نے کہا کہ گواسکر کا شمار یقیناً بہت جلد ہی دنیا کے بہترین بلے بازوں میں ہونے لگے گا۔

ہندوستان کی اس شاندار کامیابی میں جہاں گواسکر اور دوسرے کھلاڑیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہاں ٹیم کے کپتان اجیت واڈیکر کا حصہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ویسٹ انڈیز کے کپتان سوبرس نے واڈیکر کی قیادت کی بڑی تعریف کی۔ واڈیکر دوسرے کپتانوں کی طرح کھلاڑیوں سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان میں پوری طرح گھل مل گیا۔ اس نے تمام کھلاڑیوں کو اپنے اعتماد میں لیا انکی بہت افزائی کی اور ان میں اعتماد پیدا کیا۔ اگر واڈیکر ان میں اعتماد پیدا نہ کرتا تو شاید گواسکر اور [illegible] جیسے نوجوان کھلاڑی اتنے عمدہ کھیل کا مظاہرہ نہ کر پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ واڈیکر کی قیادت میں ہندوستانی ٹیم مستقبل میں بھی اسی طرح [illegible] کامیابیاں حاصل کرتی رہے گی۔

وہ ایک لمحہ

فائز چشتی
ایم اے، بی ایڈ (عثمانیہ)



[illegible]
پی رہے تھے [illegible] دوست مقبول [illegible]
ان دوستوں میں سے ہے جن پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔
وہ ایک ہر دلعزیز استاد ہے جس نے [illegible] اساتذہ
اور طلباء میں ہر دلعزیز رہا۔ اس کی قابلیت اور تدریسی صلاحیتوں
کا معترف ہونے کے باوجود مجھے اس کی بعض عادتوں
اور کمزوریوں سے شکایت تھی۔ وہ رومان کا دلدادہ تھا۔ اس کی
رنگین مزاجی نے اس کے ساتھ کئی رومانوں کو وابستہ کر رکھا تھا۔

اورینٹ ہوٹل میں میری اس سے ملاقات کافی عرصے
بعد ہوئی تھی۔ میں اس ملاقات پر مسرور تھا۔ چائے نوشی کے
دوران وہ نہایت خاموش اور سنجیدہ رہا۔ میرے لئے اس کی یہ
سنجیدگی تعجب خیز تھی۔

"مقبول میرے دوست۔" میں نے کہا "آج تم غیر معمولی طور
پر سنجیدہ نظر آرہے ہو۔ بات کیا ہے پیارے، کہیں پھر کسی رومان
کے چکر میں تو نہیں ہو۔"

"نہیں چشتی صاحب۔" مقبول نے خلاء میں دیکھتے ہوئے
کہا۔ "رومان کا لفظ تو میرے لئے ایک خواب بن کر رہ گیا ہے
اب کوئی رومان نہیں، کوئی رومان نہیں۔ میں رومانوں کی دنیا
سے بہت دور نکل آیا ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے، کس کی یاد تمہیں اس وقت بے چین
کئے دے رہی ہے۔؟"

"یقین مانئے چشتی صاحب۔" مقبول نے کہا "کسی کی
یاد نہیں، ہاں یاد ہے تو صرف وہ ایک لمحہ جس نے میری زندگی
بدل دی۔ آہ وہ ایک لمحہ۔ میں اسے زندگی بھر بھول نہ سکوں گا۔"

"مقبول" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک لمحہ کیا میں
تو سمجھتا ہوں کہ کئی یادگار لمحات تمہاری زندگی میں آ چکے ہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ایسے لمحات کے عادی ہو گر پتہ نہیں
دوست ایسے لمحات خود بخود تمہارے لئے پیدا ہو جاتے ہیں
یا تم خود ایسے حالات پیدا کر لیتے ہو۔ خواہ بات کچھ ہو مگر میاں
مقبول تم ہو بڑے رنگین مزاج۔"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" مقبول نے بڑا مانتے ہوئے
کہا۔ "تم میری رنگین مزاجی سے واقف ہو نا۔ اسی [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] کے [illegible] ہوئے چلے گئے۔ انھوں نے [illegible] سرپرستی سے [illegible] نہ کر سکے۔ میری زندگی ایک کڑی آزمائش [illegible] ۔ میں ایک [illegible] کی طرح کالج کا رخ [illegible] میری [illegible] ہوگا [illegible] رہا۔ لیکن [illegible] اس [illegible] نے میری زندگی بدل دی۔ میری زندگی میں انقلاب آگیا۔ اب میرے نزدیک عورت ایک قابل احترام ہستی بن گئی ہے۔ میں اب وہ مقبول نہیں ہوں جو کسی زمانے میں تھا۔"

"یہ تو بہت نہایت اچھی خبر ہے۔ کچھ تفصیلات تو بتاؤ آخر اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا ہو گیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اگر تم تفصیلات سننا چاہتے ہو لیکن وعدہ کرو کہ یہ بات صرف تمہاری حد تک ہی محدود رہے گی افسانہ نہ بنا ڈالو گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو سنو!" اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور کش لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"تم جانتے ہی ہو کہ کن حالات میں، میں فرحت نگر پہنچا لیکن بہت جلد فرحت نگر میں حالات میرے موافق ہو گئے اور میں سکون و اطمینان کے ساتھ درس و تدریس کے کام میں مصروف رہا۔ چند مہینے گزر گئے مگر کوئی خاص بات پیش نہیں آئی۔ ایک دن میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا مقبول صاحب! میری ایک عزیزہ نے تمہاری شہرت سن لی ہے، وہ تم سے میٹرک کے امتحان کی تیاری میں مدد لینا چاہتی ہے اگر کچھ وقت دے سکو تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا: "جناب میں لڑکیوں کو پڑھانا نہیں چاہتا۔ ہاں اگر آپ لڑکوں کو پڑھانے کے لئے فرمائیں تو میں خدمات پیش کر سکتا ہوں۔"

"کیوں بھلا؟" انھوں نے پوچھا: "تم لڑکیوں کو پڑھانے میں تامل کیوں کر رہے ہو؟"

"دیکھئے" میں نے کہا۔ "میرا اپنا خیال ہے ایسے [illegible] آپ کے اور میرے سامنے کئی [illegible] گزر چکے ہیں کہ کس [illegible] لڑکیوں کو پڑھانے آتے ہیں اور حالات کچھ اس طرح [illegible] لگا دیتے تھے [illegible] میری [illegible] نہیں ہوئی۔"

"واہ صاحب واہ" میرے دوست نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کیا یہ قاعدہ کلیہ والی بات ہے۔ کیا سب ہی پڑھانے والے ایسے ہوتے ہیں یا سب ہی پڑھنے والی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟ نہیں صاحب بات کچھ بھی نہیں، یہ تو اپنے اپنے کردار اپنی اپنی افتاد طبع اور اپنے اپنے ماحول پر منحصر ہے۔ میں جس خاتون کا ذکر کر رہا ہوں، تم سے بڑے فخر سے کہوں گا کہ وہ ایک اونچے کردار کی خاتون ہے لیکن وہ ستم رسیدہ بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ایک بیوہ ہے۔ چار سال ہوئے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے پانچ سالہ لڑکے احسان کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے۔ میٹرک پاس کر کے وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے لڑکے احسان کے مستقبل کو سنوار سکے۔ اس لئے دوست انکار نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری رہنمائی میں وہ صرف پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کا مستقبل، احسان کی زندگی اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں انکی اس گفتگو سے بےحد متاثر ہوا اور غور کرنے کے لئے کچھ مہلت مانگی۔ امتحان کے صرف دو مہینے رہ گئے تھے، دو دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ آخر کار میں نے پڑھانے کا فیصلہ کر لیا، صرف اس معصوم بچے کے مستقبل کے لئے۔ یہ خاتون اگر کسی قابل ہو سکے تو اپنے بچے کے مستقبل کو سنوار سکے گی۔ میں نے اپنے دوست کو اپنے اس فیصلے کی اطلاع دیدی۔

دوسرے دن میں اپنے دوست کے ساتھ اس خاتون کے گھر گیا، تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں آئیں۔ میں نے انھیں دیکھا اور چند لمحوں تک حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ایسا حسن تو میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی دیکھا ہو۔ اس کے حسن میں بلا کی سادگی تھی، عجیب قسم کی شان و تمکنت تھی، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اس کے حسن کی تعریف کرنے کے لئے۔ بے اختیار میں اس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میرے دوست نے تعارف کروایا۔ اس خاتون کا نام عارفہ تھا۔ تھوڑی دیر رسمی باتیں ہوئیں۔ عارفہ نے کہا: "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی ماسٹر صاحب کہ آپ نے [illegible] سے مجھے پڑھانے کا فیصلہ کیا ہے [illegible] احسان کی زندگی [illegible] سکوں گی [illegible] ہوں ورنہ سچ تو یہ ہے ماسٹر صاحب کہ اب زندہ رہنے کی خواہش بھی نہیں ہے۔" اس کی خوبصورت آنکھوں سے موتی جیسے آنسو ڈھلکنے لگے۔

"دیکھو عارفہ" میں نے بےتکلفی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میں رات کو ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک پڑھایا کروں گا، اب امتحان کے لئے بہت کم دن رہ گئے ہیں جب تیاری کرنا ہی ہے تو سنجیدگی سے کیوں نہ شروع کیا جائے؟"

اس نے جواب دیا۔ "آپ جس وقت اور جب تک چاہیں پڑھا سکتے ہیں میں اس کے لئے تیار ہوں واقعی بہت کم دن رہ گئے ہیں۔"

غرض دوست! اس طرح میں نے عارفہ کو پڑھانا شروع کیا۔ عارفہ بڑی ذہین اور محنتی تھی اور میرا تو تجربہ ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں زیادہ ذہین اور محنتی ہوتی ہیں۔ رات کو ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک اور کبھی کبھی ایک بجے رات تک میں اسے پڑھاتا اور وہ پڑھتی رہتی۔ فضول باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت تھا اور نہ اس کے پاس۔ مجھے اس وقت ایک ہی دھن تھی کہ عارفہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے۔ میں جو کہ بقول آپ کے رنگین مزاج واقع ہوا تھا اپنی رنگین مزاجی کو بھول گیا۔ میں اس کے ملکوتی حسن سے غیر معمولی طور پر متاثر ضرور ہوا مگر میرے دل میں اس کے متعلق کسی قسم کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ پتہ نہیں یہ اس کے حسن کا رعب تھا یا کچھ اور ...؟

دن گزرتے گئے۔ امتحانات کا مرحلہ بخوبی طے ہو گیا۔ چند ہفتوں بعد نتیجہ نکلا، عارفہ نے امتحان پاس کر لیا تھا۔ اس دن میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس سے قبل کئی لڑکوں کو میں نے پڑھایا اور وہ کامیاب بھی ہو گئے تھے مگر عارفہ کی کامیابی سے جو خوشی مجھے ہوئی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ میری محنت ٹھکانے لگی اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ میں کامیابی کی مبارکباد دینے عارفہ کے گھر گیا اور اسے اس کی کامیابی پر [illegible]

باقی صفحہ [illegible] پر

...آپ کے احسانات میں کبھی نہیں بھول سکتی
آپ نے مجھے اور احسان کر کے ایک نئی زندگی دی ہے
بس اس قدر عرض ہے کہ آپ کے احسانات کا احساس
...آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں بتائیے جب کہ بے بس ہوں
ہوں اگر میری زندگی آپ کے کسی کام آ سکی تو اسے
...خوش نصیبی سمجھوں گی۔" اس نے ایک بند لفافہ میری
طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر صاحب اس حقیر نذرانے
کو قبول کیجئے۔" میں نے وہ بند لفافہ اس کو لوٹا دیا

"...عارفہ! تمہاری کامیابی ہی میرا پورا پورا معاوضہ
ہے اور معاوضے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے
...میں کہا۔
"ماسٹر صاحب میں آپ کا یہ احسان نہ بھول سکوں گی۔"
...اور میرے مشورے پر اس نے ہندی پڑھنا شروع
...ایک سال کے اندر ہی اس نے دو امتحانات امتیاز
...سے پاس کر لئے۔ اس کے چند ہی دنوں بعد میرا تبادلہ
...ساگر ہو گیا، اور شستی صاحب، وہ ایک منحوس
...دن جب مجھے تبادلے کا حکم ملا، آہ وہ منحوس دن ایں
...دن گا۔ میرے اندر کا ایک عرصے سے سویا ہوا
...جاگ اٹھا۔ دل بے قرار ہو کر یہ خیال آنے لگا کہ
...تمہارا ادھوری رہتا اگر تم کسی چیز کی خواہش کرو
...ممکن ہے کہ تمہیں نہ ملے، حالات خواہ کیسے ہی
...ہمیشہ رہے، ہوا جو تم نے چاہا۔ مغرور سے مغرور
...خود سر عورت بھی آخر کار تمہاری آغوش کی زینت
...لیکن یہ کیا۔ کیا عارفہ کے لئے تمہارے دل میں
...نہیں۔ کوئی خواہش نہیں۔ سوچو کیا تمہیں عارفہ
...کی عادت سے ہے پھر تم اس سے محروم
...کیا تمہارا جذبہ حسن سے مرعوب ہو گیا
...کے بلند کردار سے اتنے متاثر ہو کہ تم اپنا ہاتھ
...ہمت نہیں کر سکتے ہو کیا تمہیں اپنی قوت بازو کی
...بھول گئے۔
...اس طرح میرے نفس نے مجھے گمراہی پر اکسانے
...کی۔

...کی اطلاع پاتے ہی بہت متاثر معلوم ہوتی تھی، اس کی آنکھیں
آبدیدہ ہو گئیں۔
"عارفہ" میں نے کہا۔ "میں خدا حافظ کہنے کے لئے
آیا ہوں، بھول تو نہ جاؤ گی مجھے؟"
"ماسٹر صاحب، میری نس نس آپ کی احسان مند
ہے۔ میں آپ کے احسانات کا بدلہ اس دنیا میں کسی صورت
میں بھی نہیں دے سکتی بھلا کوئی اپنے محسن کو بھول سکتا ہے
اگر میں اپنی جان اور اپنا سب کچھ بھی قربان کر دوں تو آپ
کے احسانات کا بدلہ نہ ہو سکے گا۔" اس سے ضبط نہ ہو سکا
اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"عارفہ ایسی باتیں نہ کرو۔" میں نے کہا۔ شیطان
نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ "یہ رونا بند کرو میں تمہیں مسکراتا ہوا چہرہ
دیکھنا چاہتا ہوں، ہاں میری ایک خواہش تم پوری کر سکو
تو میں سمجھوں گا کہ تم واقعی میرا احسان مانتی ہو اور کسی وقت
میرے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہو۔"
"وہ کیا ماسٹر صاحب؟" عارفہ نے بڑے اشتیاق
سے پوچھا۔ "جلد بتلائیے میں آپ کی ہر خواہش کو پورا کروں گی"
میں نے کاغذ کا ایک پرزہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جس
میں لکھا تھا۔
"صرف ایک یادگار بوسہ"
تحریر پڑھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ نفرت کی ایک
لکیر اس کے چہرے پر پیدا ہوئی، آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس
نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔
"ماسٹر صاحب، آپ بھی دوسرے مردوں کی طرح
ہیں۔ آپ میں اور دوسرے مرد بھیڑیوں میں کوئی فرق
نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک بلند انسان سمجھتی تھی۔ آخر آپ
بھی اسی کمینے پن پر اتر آئے۔"
میں اس سے متاثر ہوا مگر میرے نفس نے کہا
"یہی وقت ہے ایسی باتیں نہ سوچنے کا۔ ورنہ یاد رکھو تم اس
سے کبھی آنکھیں چار نہ کر سکو گے۔"
میں نے کہا۔ عارفہ دیکھو ذرا ناحق کی بات
...میں نے ایک بے ضرر سی خواہش کا اظہار کیا
تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری ہر خواہش پوری کرو گی... تمہارا

...صاحب اچھا ...تم نے ...یا ...
جاتا ہوں۔"
میں جونہی کرسی سے اٹھا۔ عارفہ جھپٹ کر میرے سامنے
آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرے سے ایسا معلوم
ہو رہا تھا جیسے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ دبی آواز میں اس نے کہا۔
"ماسٹر صاحب لیجئے میں آ گئی ہوں اپنی خواہش پوری
کر لیجئے۔" میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر
رکھ دیئے۔ اس کے ہونٹ سرد اور بے جان تھے مگر میں نے
ایک طویل بوسہ لے لیا۔
"عارفہ۔ تمہارا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "تمہارے اس
احسان کو میں بھی زندگی بھر نہ بھول سکوں گا اور یہاں سے جا کر
میں کل شام تک پھر آ جاؤں گا۔" میں وہاں سے روانہ ہو گیا، وہ کمرہ
میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر گھوم رہا تھا۔
دوسرے دن میں شام تک واپس خوش خوش گھر پہنچا۔ میرا
قیام عارفہ ہی کے یہاں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے کہا۔
"عارفہ غالباً تم کل رات سو نہ سکی ہو گی۔ بھئی میں تو سو
نہیں سکا۔"
"واہ کیوں؟" عارفہ نے کہا۔ "میں تو خوب سوئی تھی اور پھر
دن میں بھی سوتی رہی۔"
"نہیں عارفہ تم غلط کہہ رہی ہو تم اب بھی نہ سو سکو گی اور
مجھے یقین ہے کہ تم رات میں ایک اور دو بجے کے درمیان میرے
پاس آؤ گی۔"
"کیوں! میں تو نہیں آؤں گی، مجھے نیند آ رہی ہے خوب
سوؤں گی۔" عارفہ نے خود اعتمادی سے کہا۔
"تم آؤ گی عارفہ۔ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور آؤ گی۔" میں
نے بھی خود اعتمادی سے کہا۔
"نہیں نہیں ماسٹر صاحب" اس نے رونا شروع کیا۔
"اتنی کمینگی پر نہ اتریئے، آپ کی ایک بات میں نے مان لی تھی
اب آپ آگے نہ بڑھیئے۔ خدا کے لئے گناہوں کے اتھاہ غار میں نہ
دھکیلئے، آپ کیوں میری عزت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں
ایک بدنصیب عورت ہوں، مجبور ہوں، بے کس ہوں، کیا اس لئے
آپ میری مجبوریوں سے میری اصلاح نہ کی سے فائدہ اٹھانا چاہتے
ہیں۔ نہ، نہ ماسٹر صاحب ایسا نہ کیجئے خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے
...آپ کو ایسا نہ کبھی سمجھتی تھی میں آپ کو اپنا بھائی اور بیٹا سمجھا تھا

برائے پیہم

محبت کے موسم کا آغاز ہو چکا تھا چٹیل میدان مرغزار بن چکے تھے اور دور دور تک پھیلتے ہوئے رنگین گلزار ارم کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ پھولوں کی عطر بیزی سے ساری فضا مہک اٹھی تھی جہاں رنگ برنگ کے پھولوں کی بہتات نے وادی برتران کو عروس نو کی مانند حیا و نور کی چادر میں لپیٹ دیا تھا وہیں مرغانِ چمن کی سریلی اور بیباک چہکار نے زندگی کے نغمے بکھیر دیئے تھے گویا کہ زندگی اپنی بھرپور شوخی اور تقدیس کے ساتھ وادی میں جلوہ فگن تھی۔ اس رنگ و نور کی جلوہ نمائی سے فائدہ اٹھا کر کیوپڈ اپنا تیر کمان میں جوڑ رہا تھا اور بھولے بھالے انسان کو عشق کے تیروں سے چھلنی کر رہا تھا۔

سازگار فضا پاکر کیوپڈ نے والی برتران اور اُسکے رفیقوں کو بھی دریائے عشق میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

والی برتران اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے محل کے ایک بہت خوبصورت اور سجے ہوئے کمرے میں بیٹھا تھا جس کی کھڑکیوں سے صحن چمن کا بھرپور نظارہ ہوتا تھا۔ نگاہیں نظارۂ چمن میں مصروف تھیں، زبانیں بحث و تکرار میں اور دماغ پرانی باتیں یاد دلانے میں معاون بن رہا تھا۔

اس چھوٹی سی نشست میں مختلف الخیال لوگ شامل تھے۔ کچھ معزز خواتین بھی شامل تھیں اور موضوعِ بحث تھا عشق۔ کچھ کا خیال تھا کہ عشق زندگی میں صرف ایک بار ہوتا ہے ــــ اور اس خیال کی تائید میں خواتین آگے آگے تھیں۔ لیکن کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بھی مرض کی طرح عشق بھی زندگی میں کئی بار رونما ہو سکتا ہے۔ یہ خیال ان لوگوں کا تھا جو عشق و محبت کا کھیل بار بار کھیلے جانے کے قائل تھے۔ بظاہر اس منطقی دلیل میں کسی بحث کی گنجائش نہیں تھی پھر بھی خواتین کا جو اکثر حقیقت سے زیادہ خوابوں کی دنیا میں گم رہتی ہیں کہنا تھا کہ محبت کا ایک جذبہ ہے جو صرف ایک بار روشناس ہوتا ہے اور جب محبت کی بجلی کسی کے دل پر گرتی ہے تو اس کا دل جل کر راکھ ہو جاتا ہے پھر وہ چاہے بھی تو کوئی جذبہ اور امنگ اس میں نہیں پیدا کر سکتا۔

والی برتران نے جو کئی معاشقے کر چکا تھا اسکی تردید کرتے ہوئے کہا ــــ "یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایک بار جذبۂ محبت سے متاثر ہونے کے بعد بھی انسان اپنے کو کسی دوسری ہستی کو مرکزِ محبت بنا سکتا ہے۔ مجنوں اور فرہاد لیلیٰ اور شیریں کا خیال چھوڑ کر دوسری لڑکیوں سے دل لگانے کی کوشش کرتے تو ایک نئی زندگی کا لطف اٹھا سکتے تھے۔ لیکن انہیں تو جینے سے زیادہ مرنا پسند تھا



وہ احمق تھے، وہ چاہتے تو پوری زندگی ایک کے بعد ایک عشق کر کے گزار سکتے تھے۔ عشق اور شراب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک بادہ نوش اپنی تسکین کے لئے ایک کے بعد جام اپنے ہونٹوں سے لگا سکتا ہے اسی طرح ایک عشق کا مارا بھی شرابِ عشق کے جام پر جام لنڈھا سکتا ہے۔ کچھ ایک محبوب کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ ایک سے زیادہ محبوب تلاش کر لیتے ہیں۔ ہر انسان کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔"

یہ مباحثہ اور طویل ہو جاتا، اگر ایک شریکِ محفل کی تجویز سے وہ سب کو اپنا ثالث نہ بنا لیتے۔ ایک بوڑھے نیک دل ڈاکٹر کو اتفاقِ رائے سے ثالث بنا لیا گیا جس نے فیصلہ دیا کہ والی برتران کی رائے سو فیصدی درست ہے کہ یہ سب اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔

اس نے کہا: "ویسے آپ جانتے ہیں، دنیائے عشق میں میرا تجربہ تو صفر کے برابر ہے۔"

اس پر پوری محفل نے کھل کر قہقہے لگائے۔ سب کے خاموش ہونے کے بعد ڈاکٹر نے کہا:

"جب عشق و محبت کا ذکر چل رہا ہے تو اس وقت ایک حقیقی عشق کی داستان آپ حضرات کے گوش گزار کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مسلسل پچیس سال کے عرصہ تک یہ عشق ایک نوجوان عورت اور ایک مرد کے درمیان چلتا رہا اور عاشق ہو کر مرد کے بجائے عورت تھی کبھی جواب محبت کا سنہری تاج سر کی زینت نہ کر سکی، یہاں تک کہ اس کی زندگی نے اس سے بے وفائی کی اور ابدی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔"

والی برتران کی بیگم نے اپنے خوبصورت ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا:

"آفریں ہے!! اس طرح کا عشق تو افسانوں میں ملتا ہے۔ وہ کون خوش نصیب تھا جس کی زندگی میں کسی نے اپنی چاہت کا رنگ بھر دیا تھا؟"

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

"وہ خوش نصیب موسیو شاکے ہے۔ آپ اسے جانتی ہیں، وہی دوا فروش جس کی دکان سے آپ دوائیں منگواتی ہیں۔ اور اس عورت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گی جو ہر سال کرسیاں بننے آپ کی حویلی میں آیا کرتی تھی۔ وہ شاکے سے بے اندازہ محبت کرتی تھی۔ اپنی پوری زندگی اس کے فراق میں کاٹ کر گزشتہ سال وہ اس جہان سے رخصت ہو گئی ...... اور شاکے پر اس کی موت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آہ!! کیسے افسوس کا مقام ہے۔"

تمام عورتوں کا جوش و خروش پھیکا پڑ گیا۔ ان امیر عورتوں کو توقع تھی کہ یہ داستانِ محبت کسی ریاست کے خوبصورت اور عالی وقار شہزادے یا شہزادی کے متعلق ہو گی۔ انہیں ان لوگوں کی محبت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے داستان جاری رکھی۔

گزشتہ سال اس کو دیکھنے کے لئے بلایا گیا۔

اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ میرے اور گربے سپادری بھی آ پہونچا اس نے کمزور لہجے میں کہا کہ وہ ہم دونوں کو اپنی وصیت کی تعمیل کرانے کے لیے مختار کرنا چاہتی ہے اور وصیت کی رو سے اس کی ساری املاک اس کی موت کے بعد دوا فروش شاگے کو پہنچتی تھی۔ ہم کو صد درجہ تعجب ہوا۔ کہاں ایک کرسیاں بننے والی کہاں ایک دواخانے کا مالک۔ جب میں نے سوال کیا کہ تم اپنے کسی رشتہ دار کے نام وصیت کیوں نہیں کرتیں، تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے اپنی داستانِ حیات کہہ سنائی۔ اس کی یہ داستان مختصر ایک داستان نہیں بلکہ درد و فغاں اور کرب کا مسلسل چکر ہے جس میں اس کی زندگی پورے پچپن سال تک گردش کرتی رہی۔

ضعیف کرسیاں بننے والی نے اپنی داستانِ زندگی سناتے ہوئے کہا کہ اس کے ماں باپ کرسیاں بننے کا کام کرتے تھے۔ وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا بچپن غلیظ کپڑوں میں روکھی سوکھی کھا کر گزرا۔

ماں باپ کے پاس ایک گھوڑا گاڑی اور ایک کتا تھا۔ وہ مختلف قصبوں میں گھومتے اور کرسیوں کی مرمت کرتے۔ جب کام کے لیے جاتے تو اس ننھی سی بچی کو گھوڑا گاڑی کے پاس چھوڑ دیتے، یہ وہاں اکیلی کھیلا کرتی اور کتا گاڑی وغیرہ کی نگرانی کرتا۔ اس کے ماں باپ جب کام سے فارغ ہوتے تو اس کے پاس آجاتے۔

اس کا باپ بڑے غصیلے مزاج کا تھا، اس کی ماں بھی اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ جب کبھی وہ اس ننھی سی بچی کو بے دردی سے مارتا تو اس کی ماں بھی اُسے بچا نہیں سکتی تھی۔ غرض اس کے کان پیار اور محبت کے الفاظ سے ناآشنا تھے۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں ادھر سے اُدھر ڈھونے کا کام کرنے لگی۔

یہ لڑکپن کا دور تھا اور اسی دور میں بچے اپنے ہم جولی تلاش کر کے ان کے ساتھ کھیلتے کودتے ہیں۔ جن گلیوں اور محلوں میں روز کا آنا جانا تھا وہاں کے لڑکوں سے اسکی دوستی ہو گئی۔ وہ ان کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتی لیکن شریف اور ذی عزت گھرانوں کے لڑکوں کے ساتھ ایک

[illegible] کرسیاں بننے والی لڑکی [illegible] ساتھ کھیلنا۔ ایک بات تھی۔ ان کے والدین انہیں اس کے ساتھ کھیلتے دیکھتے تو ان کا کان پکڑ کر گھروں میں لے جاتے۔ یہ دیکھ کر اس کا ننھا سا، نازک دل ٹوٹ جاتا۔ اس نے شریف اور ذی عزت خاندانوں کے نونہالوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا جب وہ گلیوں سے گزرتی تو لڑکے اس پر پتھر مارا کرتے۔ لیکن کبھی کبھار کچھ رحمدل عورتیں اس پر ترس کھا کر اسکو کچھ دے دیتیں اور وہ اس کو اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیتی۔

گیارہ سال کی عمر میں اس کو وہ حادثہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی پلٹ کر رکھ دی۔ ایک دن وہ اس قصبے کی پشت پر واقع قبرستان کے قریب سے گزر رہی تھی، اچانک اس کی نظر ایک چھوٹے سے لڑکے پر پڑی جو ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ یہ شاگے تھا جو اسی قصبے میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو اس کے خیال میں قابلِ رشک زندگی کے مالک تھے اور کبھی کسی مصیبت سے دوچار نہیں ہو سکتے تھے وہ اس کے قریب پہنچی، لڑکے کا چہرہ روتے روتے سُرخ ہو گیا تھا۔ بال بے ترتیب ہو گئے تھے اور آنکھیں سوج گئی تھیں جن سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا۔ وہ یہ عالم دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے اسکو پچکارا اور اپنی قمیص کے پھٹے ہوئے دامن سے اس کے آنسو پونچھے اور منہ صاف کیا۔ شاگے نے اس کو بتایا کہ اس کے ایک بھائی نے اس کے ذاتی لیارڈ (فرانسیسی سکّے) چرا لئے ہیں اور جب اس کی ماں کو پتہ لگے گا تو وہ اس کا منہ تمانچوں سے لال کر دے گی۔

"اچھا !! ان لوگوں کی دولت بھی کم ہو جاتی ہے! کیا دو سکّے کم ہونے سے بھی ان کی زندگی میں فرق پڑتا ہے" اس نے اپنے دل میں کہا ———

لیکن جلد ہی جذبۂ حیرت پر جذبۂ ہمدردی غالب آگیا اور اس نے اپنے سارے سکّے اپنی جیبوں میں سے نکال کر اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ یہ سکّے اس نے کئی دنوں میں جمع کئے تھے۔ بغیر ہچکچاہٹ کے اس نے وہ پونجی لے لی اور پیسے گننے میں مشغول ہو گیا۔ وہ رونا بھول چکا تھا اور خوشی سے کھلکھلا رہا تھا۔ اس کو خوش دیکھ کر لڑکی بھی خوشی سے جھوم اٹھی اور ایک فوری

جذبے کے تحت اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کے گالوں کو چوم لیا۔ لیکن چونکہ لڑکا کھوئی ہوئی رقم کے بدلے میں یہ پیسے پا کر بے حد خوش تھا اور پیسوں کو گننے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس کو اس کا احساس تک نہیں ہوا۔ اس عدم توجہی نے اس کی ہمت بڑھائی اور اس نے شاگے کے گلے میں اپنی میلی، لیکن پیار بھری باہیں ڈال دیں۔ اور اس کو زور سے بھینچ لیا۔ مگر فوراً ہی اس کو کچھ خیال آیا اور وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

اس کے ننھے سے دماغ میں کیا خیالات چکرا رہے تھے؟ ——— کیا وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس لڑکے پر دل و جان سے فدا ہو گئی ہے اور اس نے اپنی تمام پونجی قربان کر کے اسے اپنا بنا لیا ہے ——— یا یہ خیالات اس کے دل میں موجزن تھے کہ اس نے ایک لڑکے کو پہلا محبت بھرا بوسہ دیا تھا !! لیکن یہ ایسا راز تھا جو دل کی گہرائی میں جذبے کے مخملی غلاف کے اندر پوشیدہ ہر جوان دل میں ہوتا ہے اور جس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مہینوں تک قبرستان کے قریب کا موڑ اور اس کا چہرہ اس لڑکی کے خیالات میں بسا رہا اور وہ اس سے ایک بار پھر ملنے کی تمنا کرتی رہی اور ——— اس کے لئے اس نے کچھ پیسے چرائے کبھی کچھ کرسیوں کی بنائی کی مزدوری میں سے اور کچھ دوسرے سلف میں سے۔ جب وہ قبرستان کے قریب کے اسی موڑ پر پہونچی تو اس کی میلی کچیلی قمیص کی ایک جیب فرانک کے سکوں سے بوجھل تھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی وہاں ملتا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور جب وہ تھکے قدموں سے واپس ہو رہی تھی تو بازار سے گزرتے وقت اس کی نگاہ شاگے کے باپ کے دواخانہ پر پڑی۔ اس کو شاگے دواخانہ کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کے سر پر دو بجلی کے قمقمے روشن تھے انکی روشنی کا عکس اس کے خوبرو اور دلکش چہرے پر پڑ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے دل میں محبت کا دریا اُمنڈ پڑا، اس کو بے ساختہ پیار کرنے کی خواہش کو وہ دل میں دبا کر رہ گئی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہاں سے چل پڑی۔

دن گزرتے گئے اس دن کے بعد سے اس سے ملاقات

...لڑکی دواخانے میں نظر آنے لگی ...

ایک سال کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن جب وہ
...بڑے باغ سے گزر رہی تھی تو اس کو شاکے اپنے
...کے ساتھ کرکٹ کھیلتا ہوا نظر آیا، وہ اس کی طرف
...دوڑی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پام کے درخت
...میں لے گئی، اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں
...شدت سے بھینچ کر اسے پیار کیا کہ اس کی چیخ نکل
...شاید وہ اس کی گرم جوشی کو سمجھ نہیں سکا تھا لڑکی
...کر اپنی جیب میں سے مٹھی بھر کر پیسے نکالے اور
...دیدیے۔ لڑکے نے اپنا ڈر اور ہچکچاہٹ فراموش کر کے
...لینے شروع کر دیے۔ کل تین فرانک اور بیس سینٹ
...تھی۔ وہ خوشی سے کھلکھلا پڑا، لڑکی کو مزید حوصلہ
...اسکو اپنے سے لپٹا کر دیر تک اس کے ہونٹ اور رخسار
...میں چومتی رہی۔

اس دن کے بعد سے اس کی طرف سے اجازت
...جتنا دل چاہے اس کو پیسوں کے عوض پیار کر سکتی
...آئندہ چار سال تک اس کا یہ معمول جاری رہا۔ وہ
...یونجی لاتی اور شاکے نہایت صفائی سے بوسوں
...اسے اپنی جیب کی نذر کر لیتا۔

...سال پر سال گزرتے گئے اسکو اپنے ماں باپ کے
...کام کاج کے لئے دور دراز کے شہروں اور قصبوں میں
...نا تھا۔ اب وہ اپنے محبوب سے سال بسال میں
...تی اور وہ بھی اس کے لئے بے قراری سے اپنے دن
...اگر کسی سال وہ تھوڑی بھی کم رقم لے کر آتی تو وہ
...ترا و نظروں سے گھورتا جیسے وہ اس کی ازلی
...کنیز ہو۔ وہ گلوگیر آواز میں اپنی غریبی کا ذکر کرتی
...وعدہ کرتی کہ آئندہ سال اسکو زیادہ رقم فراہم کریگی
...شاکے کا غصہ دھیما پڑ جاتا اور وہ اس کو پیار و
...کی حسین وادیوں کی رنگینی میں اپنے ساتھ غرق کر لیتی۔
دو سال گزرنے کے بعد ایک مرتبہ جب وہ شاکے
...میں آئی تو اسے پتہ لگا کہ شاکے ایک دوسرے شہر
...پڑھنے چلا گیا ہے۔ وہ مایوس ہو گئی لیکن اس نے
...کو سنبھالا دیا اور بڑی دانشمندی اور سوجھ بوجھ
...سے کام لے کر اس نے شاکے کے والد کو اس بات پر
...کر لیا کہ آئندہ چھٹیوں میں جب وہ اسے گھر لائے تو
...اسٹیشن سے واپسی میں اس کی طرف سے گزرے۔

لڑکی کے ماں باپ نے قصبے کے مغربی کنارے پر ایک مختصر سی جھونپڑی بنائی تھی وہی اس کا عارضی گھر تھا۔

شاکے کی چھٹیاں ہوئیں اور اس کا باپ اسے اپنے ساتھ لے کر قصبے کے مغربی کنارے سے آبادی میں داخل ہوا وہ جھونپڑی سے باہر آ کر سڑک پر کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد شاکے کا باپ ایک دراز قد اور خوبصورت نوجوان کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ وہ نوجوان شاکے تھا۔ دو سال کے عرصے میں وہ بالکل بدل گیا تھا، پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا جسم پر ایک قسم کی یونیفارم تھی جس میں پیتل کے سنہری بٹن لگے ہوئے تھے۔ یونیفارم نے اس کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔

لڑکی نے اس کی طرف مشتاق نظروں سے دیکھا اس کی نظروں میں پیار ہی پیار تھا۔ شاکے کی اور اسکی نظروں کا تصادم ہوا —— لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے لڑکی کے چہرے پر سے اس طرح نظریں ہٹالیں جیسے سر راہ کسی اجنبی پر پڑ گئی ہوں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ لڑکی کے دل کو زبردست دھکا لگا۔ ساری دنیا اس کے آگے اندھیری سی ہو گئی وہ جھونپڑی میں گھس کر چارپائی پر اوندھے منہ گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کئی بار وہ شاکے کے دواخانے اس امید کے ساتھ گئی کہ کہیں اس کو مغالطہ نہ ہوا ہو اور شاکے سے کچھ بات چیت ہو سکے لیکن شاکر نے اس کی طلب کی ہوئی دوائیں جو اس نے ملاقات کی غرض سے خریدی تھیں حوالے کیں اور اس سے دکانداری کے علاوہ کوئی بات چیت نہیں کی۔ وہ شکست خوردہ ہو کر واپس چلی آئی۔

ہر سال وہ گھر آیا کرتا اور وہ اس کو قصبے میں مختلف جگہوں پر آتے جاتے دیکھتی لیکن اتنا حوصلہ نہ ہوتا کہ اس کو روک کر کچھ بات چیت کر سکتی۔ شاکے غیروں کی طرح اس کے قریب سے ہو کر نکل جاتا۔

وقت گزرتا گیا، زمانے کی تہیں گہری ہوتی گئیں۔ لڑکی کے ماں باپ انتقال کر گئے اور اس نے ان کا کام سنبھال لیا۔

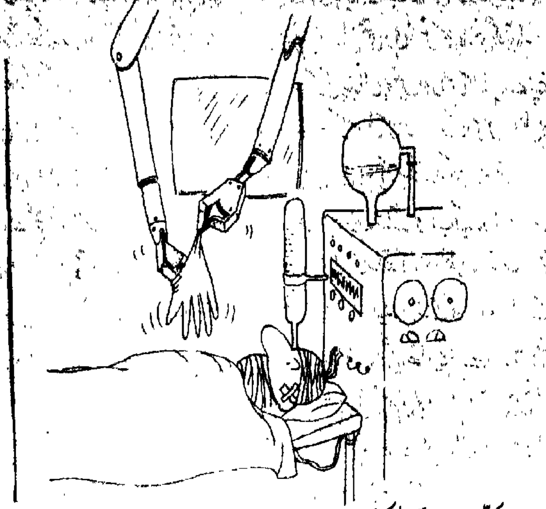
ایک دن قصبے میں داخل ہونے پر اس نے شاکے کو ایک نوجوان عورت کے ساتھ اپنے دواخانے سے باہر نکلتے دیکھا جو اس کے بازوؤں کا سہارا لئے ہوئے تھی وہ اس کی بیوی تھی۔ اسی رات اس کرسی بننے والی نے اپنے آپ کو دریا میں غرق کر دیا، اتفاق سے ایک شرابی وہاں سے گزر رہا تھا اس نے اس کو کھینچ کر باہر نکالا اور دواخانے میں لے گیا تا کہ شاکے اسے طبی امداد دے سکے۔ نوجوان شاکے ڈریسنگ گاؤن پہنے اوپری منزل سے نیچے آیا۔ اس نے اس کے گیلے کپڑے اتارے اور اس کے جسم کی مالش کی، سارا عمل اس نے اسطرح کیا جیسے کسی انجان کے ساتھ ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کو ہوش آ گیا اور موت کا سایہ اس پر سے ہٹ گیا۔ شاکے نے اس سے ترش لہجے میں کہا ——

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ جانتی نہیں خودکشی کرنا بڑا گناہ ہے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا"

اس کی آواز سن کر لڑکی نے بڑی تقویت محسوس کی، اس کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھول دیا۔ وہ بہت دنوں تک مسرور رہی کہ اس کے محبوب نے عرصہ بعد اس سے کلام کیا تھا۔ لڑکی نے شاکے سے اصرار کیا لیکن اس نے اپنی زحمت کی کوئی فیس نہیں لی۔

"اس کی تمام زندگی اسی طرح گزر گئی۔ وہ اس کے تصورات میں کھوئی کام کرتی رہتی۔ اس نے اس کے دواخانے سے دوائیاں خریدنی شروع کر دیں۔ اس طرح اسکو قریب سے دیکھنے اور بات چیت کرنے کا موقع مل گیا۔ اس طرح بھی وہ اسکو پیسے دینے کے قابل تھی"

"جیسا کہ میں نے داستان کے شروع کہا کہ گزشتہ موسم بہار میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔ اس کو زندگی بھر اپنی محبت کا کوئی صلہ نہیں ملا لیکن اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور کبھی اف نہیں کی۔ اپنی دردناک کہانی سنانے کے بعد اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اس کی عمر بھر کی کمائی اور املاک اس ہستی کو پہنچا دوں جس کے غم محبت میں وہ پچپن سال کی عمر تک شمع کی طرح پگھلتی رہی۔ اس نے صرف اسی لئے محنت کی تھی کہ وہ اس کے لئے کچھ ایسی چیز چھوڑ جائے جس کی بدولت وہ اس کے مرنے کے بعد اس کو یاد رکھ سکے۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے جن کے ادا ہونے کے بعد موت کا تیز سوا



اکیسویں صدی کے ڈاکٹر ـــــ

" صبح بخیر ـــــ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ "

[illegible]
شاید پادری کو اس کی [illegible] کے اخراجات کے لئے [illegible] ہے۔

دوسری صبح میں مسٹر اور مسز شاگے کے گھر ان سے ملاقات کرنے پہنچا۔ وہ اپنا ناشتہ ختم کر رہے تھے۔ دونوں بیٹھے تھے اور بہت خوش و مطمئن ہو رہے تھے۔ چہروں سے خود پسندی اور آسودگی کی جھلک رہی تھی۔ انھوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور کافی پینے کو دی جو میں نے قبول کر لی پھر میں نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے اس کرسی والی کی داستان جذبات سے لبریز آواز میں شروع کی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے دل پگھل جائیں گے، شاید آنسو بھی نکل آئیں۔

جیسے ہی شاگے نے یہ سنا کہ "ایک آوارہ" "ایک کرسی بننے والی" "ایک خانہ بدوش" عورت اس کی پاکیزہ محبت میں مبتلا تھی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے اس کا وقار مٹی میں مل گیا ہو ــــ جیسے کسی شریف پر کیچڑ اچھال دی گئی ہو۔

اس کی بیوی نے غضب آلود لہجے میں کہا۔ "اس فقیرنی کی یہ مجال! ــــ یہ ہمت؟؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاگے کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر پھرنے لگا ــــ وہ بڑبڑایا ــــ

"کیا اس سے بھی زیادہ کوئی کمینی حرکت ہو سکتی ہے مگر افسوس جب وہ زندہ تھی، اگر اس وقت مجھے معلوم ہو جاتا تو میں اس کو قید کرا دیتا، میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ کبھی چھوٹ نہیں سکتی تھی۔"

میں چپ بیٹھا رہا، نہ میری سمجھ میں کچھ آ رہا تھا اور نہ کچھ بول سکتا تھا۔ لیکن مجھے اپنا کام مکمل کرنا تھا ــــ

"اس نے اپنی ساری املاک آپ کو ورثے میں سونپنے کی وصیت کی تھی جس کی مالیت تین ہزار فرانک ہے، چونکہ جو کچھ میں نے ابھی سنایا آپ کو ناگوار لگا ہے اس لئے شاید آپ یہ رقم غریبوں کو خیرات کر دینا چاہیں گے۔" میں نے کہا۔

دونوں میاں بیوی نے میری طرف خاموش اور حیران [illegible] سے دیکھا۔ میں نے رقم کی تھیلی جیب سے باہر نکالی [illegible] کر دی۔ پھر میں نے دریافت کیا۔

"آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

مادام شاگے نے بولنے میں پہل کی

"وہ...... چونکہ یہ مرنے والی کی وصیت تھی اس لئے اس کی روح کو تکلیف پہونچے گی اگر ہم اسے ٹھکرا دیں گے۔"

"اس کی مدد سے ہم اپنے بچوں کی زندگی شاندار بنا سکیں گے۔" اس کے شوہر نے بے شرم ہو کر کہا۔

"جیسا آپ چاہیں" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"خیر بہر حال یہ ہمیں دے دیجئے کیونکہ اس نے آپ سے ایسا کرنے کے لئے کہا تھا، ہم کوشش کریں گے کہ اسے کسی نیک مقصد کے لئے استعمال کریں۔"

میں نے رقم ان کے حوالے کر دی، سر خم کر کے تعظیم دی اور رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن شاگے میرے پاس آیا اور غیر شائستہ لہجے میں بولا۔ "وہ عورت اپنی گاڑی بھی تو چھوڑ کر مری ہے آپ نے اس کا کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں، اگر خواہش ہو تو لے جاؤ۔"

"یہی میں بھی چاہتا تھا۔" اس نے بات پوری کی اور چل دیا ــــ

میں نے اسے آواز دے کر واپس بلایا ــــ

"اس نے ایک بوڑھا گھوڑا اور دو کتے بھی چھوڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تمھیں ان کی ضرورت نہیں؟"

اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ "بالکل نہیں ــــ واقعی میں ان کا کیا کروں گا؟"

"بیچ دینا اگر چاہو۔"

وہ زور سے ہنسا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے ہاتھ ملا لیا، میں کیا کر سکتا تھا؟ ایک ہی بستی میں ایک ڈاکٹر اور ایک دوا فروش کے درمیان عداوت ٹھیک نہیں۔ میں نے کتے رکھ لئے اور پادری نے بوڑھا گھوڑا۔ گاڑی سے شاگے نے خوب نفع کمایا۔ اس نے اس کو فروخت کر دیا اور اس رقم سے ایک مل کے شیئر خرید لئے۔

صرف یہی ایک گہری اور سچی محبت ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی۔"

ڈاکٹر نے نظریں اوپر اٹھائیں تو دیکھا وہاں [illegible] کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ دنیا میں عشق میں اپنا سب کچھ نثار [illegible] صرف عورت ہی کا تا [illegible] ہے"



مکرم مرزا

"اگر تو مجھے ایک ہانگی مع چاندی کی زنجیروں کے بلیدان کر دے گا تو میں تجھے تیرا خاندانی منتر بتا دوں گا جس سے تو دوبارہ اصلی جون میں آ کر دیوتاؤں کے پاکھر میں پہنچ جائے گا۔"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے پولیس کی ملازمت نئی نئی اختیار کی تھی۔ ٹریننگ کے بعد ہی میرا تبادلہ ریاست بھوپال کے ایک چھوٹے سے قصبے چیل کھیڑی میں کر دیا گیا۔ میں پولیس کی جیپ میں دیہاتی کچی سڑک پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ میرے پاس چرن سنگھ سپاہی بیٹھا ہوا تھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور بیٹھا بڑی بے دلی سے جیپ چلا رہا تھا اور غالباً سرکاری جیپ ہونے کے باعث نکلتے وقت پولیس والوں کی مخصوص گالیاں بھی بک رہا تھا۔ میں بالکل نیا تھا اس لئے شاید میری پروا نہ تھی۔ [illegible] چیل کھیڑی [illegible] واقعات [illegible]

[illegible]

کے شمال میں ایک جگہ سے جیپ گزری تو ان سنگھ [illegible] نے پہلا واقعہ بتایا جسے سنکر [illegible] ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسی طرف کی جانب جا کر روک دی جہاں میں نے فائر کیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اس پر فائر کیا ہوگا۔ یہ شنکر کی لاش ہے اسی کو آپ بڑا بندر سمجھے ہوں گے۔"

میں نے اس سمت دیکھا اور خوف سے میرے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہاں ایک بڑے سے پتھر کو تراش کر ایک شکل بنائی گئی تھی جس کے گلے میں ہار پڑے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سندور لگا ہوا تھا اور آس پاس بہت سے ناریل اور ایسی ہی چیزیں موجود تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں پوجا پاٹ ہوتی ہے۔ میں نے ڈانٹ کر ڈرائیور سے کہا۔

"اپنے راستے چلو، یہ کہاں لے آئے۔" کیونکہ وہ دونوں غیر مسلم تھے اس لئے میں نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گیا۔ راستے بھر اس بندر کی شکل اور شنکر کی لاش کی شکل میری آنکھوں میں گھومتی رہی۔ کچھ دیر بعد ہی پولیس چوکی آگئی میں چارج لینے میں مصروف ہو گیا اور رات کی تھکن سے جلد ہی سو گیا۔ پھر علاقے کی دیکھ بھال میں ایسا کھویا کہ کچھ خیال ہی نہ رہا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک دن جب میں پرانے فائل دیکھ رہا تھا تو ایک رپورٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ رپورٹ یہ تھی۔

اندراج نمبر ۱ سالانہ اطلاعات پولیس چوکی قصبہ چیل کھیڑی بھوپال اسٹیٹ

مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۵۰ء - نو واقعات۔	رائے

"گھسی شیام داس، بالغ، غیر مسلم، ساکن قصبہ چیل کھیڑی کی اطلاع کے مطابق شنکر داس ولد شیو داس عمر اٹھارہ برس بندر روپ دن سے لاپتہ ہے اس کی ماں صدمے سے پاگل ہو گئی ہے نیز بندروں سے ایک بہت بڑا بندر اس قصبے میں لائی گئی ہے اور بار بار شنکر کی ماں شنکر کہہ کر مخاطب کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میرا بیٹا بندر بن گیا، اصلی روپ میں آگیا ہے۔"

[illegible] بندر کی [illegible] آسمان کی طرح [illegible] بندر شانتی کے گھر کی کھڑکی پر لٹکا رہتا ہے شانتی کے گھر والے سخت خوفزدہ ہیں۔"

اس رپورٹ کو پڑھ کر مجھے ایک بار پھر اطمینان سے دو چار ہونا پڑا کیونکہ راستے میں یہی بندر والا واقعہ پیش آیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا میرے ذہن میں شنکر کی لاش، اس بندر کی شکل، پھر رپورٹ کے واقعات اور شانتی کا نام گردش کر رہا تھا۔ میں نے بوڑھے اردلی کو آواز دی، وہ آیا تو میں نے اس سے ان واقعات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔

"صاحب میں نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ شنکر پہلے آدمی تھا پھر بندر بن گیا، وہ اسی کی لاش ہے جسے آپ نے راستے میں دیکھا تھا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ اکثر لوگوں کو شنکر کبھی کبھی اصلی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ دوسری ایک عجیب بات یہ بھی مشہور ہے کہ اگر کوئی جوان لڑکی شنکر کی لاش پر اکیلی چلی جائے تو اس مورتی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہیں اور جیسے ہی کوئی دوسرا وہاں جاتا ہے خشک ہو جاتے ہیں۔ ایسی جوان لڑکیاں جو عشق میں ناکام ہو جاتی ہیں وہ اگر شنکر کی لاش پر ناریل چڑھا جاتی ہیں، اور ایک بار عشق میں ناکام ہونے والی ایک لڑکی نے خودکشی بھی کر لی تھی درخت سے لٹک کر۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بتا سکا۔

اس کے بیان سے میری تجسس اور بڑھی چنانچہ میں نے سوچا قصبے میں جا کر کسی پرانے بوڑھے سے اس بات کی معلومات کروں گا۔ یہ سوچ کر [illegible] پولیس چوکی قصبے کے باہر تھی [illegible] گشت کرتا ہوا جا رہا تھا میں ٹہلتا ٹہلتا لاش تک جا پہنچا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا [illegible] نہ تھا۔ اب میں نے اطمینان سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ایک بڑے پیپل کے درخت کی چھاؤں میں شنکر کی لاش بنی ہوئی تھی۔ ایک بڑے پتھر کو تراش کر بندر کی شکل بنائی گئی تھی اگر نقش و نگار بہت ہی بھونڈے بنے ہوئے تھے شکل بھی زیادہ واضح نہ تھی لیکن دور سے دیکھ کر مجموعی تاثر بہت ہی متاثر کن تھا۔ آس پاس جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے پیپل کا ایک ہی درخت تھا درخت کی جڑیں اوپر سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ ہوا سے درختوں کے پتے اس طرح ہل رہے تھے جیسے بہت سے لوگ تالیاں بجا رہے ہوں۔ پہلے تو اس بات کا بھی خیال آیا لیکن ایسی کوئی بات نظر نہ آئی میں یونہی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا قصبے میں پہنچ گیا۔ یہ واقعہ انگریزوں کے دور

اس وقت تک بستی والوں سے بہت سی باتیں ... کی باتیں سنا کرتے تھے میرے سامنے منظر ... جو ... سخت خوف زدہ ہوگئے اور چاروں طرف سے سلاموں کی بارش ہونے لگی، میں نے مسکرا مسکرا کر سب کے سلام کا جواب دیا، بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا پھر آہستہ آہستہ مکھیا کے گھر پہنچا۔ اسے پہلے سے میرے آنے کی اطلاع مل گئی تھی، اس نے میرا استقبال کیا اور مجھے گھر میں لے آیا۔ پھر اور لوگ ... گئے۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، مکانات چھ سات سو کی تعداد میں ... چھوٹے ایک منزلہ کھپریلوں کے بنے ہوئے تھے، لوگ سب خوشحال معلوم ہوتے تھے کیونکہ زیادہ تر لوگ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے۔ مکھیا با اخلاق آدمی تھا آبادی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، گنتی کے مسلمان گھرانے تھے خیر کچھ دیر رسمی بات چیت کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا کہ میں ... کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مکھیا میرا مدعا سن کر خاموش ہوگیا اور دیر تک ... گھورتا رہا پھر ایک سرد آہ بھری، اس کی بوڑھی آنکھوں سے ... آنسو بہہ نکلے جلدی آنسو پونچھ کر اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سرکار شاید میں اس قصبے میں واحد آدمی رہ گیا ہوں جس کے سینے میں یہ کہانی پوشیدہ ہے۔ قصبے کے لوگ اکثر مجھ سے یہ کہانی سننے کی فرمائش کر چکے ہیں لیکن میں ہمیشہ ٹالتا رہا ہوں، اور میں کبھی بھی اس کہانی کو نہ سناتا کیونکہ جو بھی سنے گا اس کا دل ہمیشہ خوف کے ... سے ... گا میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو میں آپ سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ آپ بھی نہ سنیں تو بہتر ہے" میرے سخت اصرار پر وہ راضی ہوگیا، اس نے کہا۔

"کیونکہ قصبے کے بہت سے لوگ اس کہانی کی فرمائش کر چکے ہیں اس لئے آج رات آپ ہماری چوپال میں آجائیے تاکہ سب ایک ساتھ سن لیں۔"

حالانکہ میں بہت گھبراہٹ میں تھا مگر میں رات کو آنے کا وعدہ کر کے واپس آگیا۔ رات کھانا کھا کر میں نے اسلحہ کو ساتھ لیا۔ ... قصبے کی چوپال جا پہنچا۔ میرے خیال میں سردیوں کے موسم ... چوپال میں جلتی آگ کے گرد بیٹھ کر کوئی پرانی کہانی ... کے مخصوص انداز میں سننا ایک ایسی آسائش ہے جو ... بڑے سے بڑے ہوٹل یا کلب میں حاصل نہیں ہو سکتی یہ قدرت کا عطیہ ہے جو اس نے اپنی ... لوگوں کو ودیعت کیا ہے۔

چوپال میں بیٹھ کر بھڑکتی آگ سے ٹکراتی ہوئی، لرزتی ہوئی سی آواز کا تاثر، وہ کسی بھی آہٹ پر چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھنا اور گاؤں والوں کا بات بات پر ہوکارا دینا۔ اُف میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ وقفے وقفے سے گرم کی چائے کا دور، وہ حقوں کی گڑگڑاہٹ، وہ گاؤں والوں کا بھولے انداز میں تبصرہ۔ میں اس تاثر کو بیان نہیں کر سکتا۔ ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی گاؤں کا کوئی سادہ نوجوان ہوتا۔ خیر آمدم بر سر مطلب — مکھیا نے حقے کی گہری گڑگڑاہٹ کے بعد کہنا شروع کیا۔

"اس قصبے میں مہاراج کا گھرانا شاید سب سے قدیم تھا اور غالباً سب سے زیادہ خوشحال بھی۔ ایک بڑے مکان کے علاوہ کافی زمین بھی تھی۔ مہاراج کے سات لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں سب بیٹے بہت گورے چٹے اور خوب صورت تھے، اصل برہمن تھے اس لئے نسل کا اثر اب تک قائم تھا۔ مہاراج بہت زندہ دل، خوش مزاج یار باش اور علاقے کے مشہور شکاری تھے شکار کی وجہ سے بڑے بڑے انگریزوں سے انکی دوستی تھی، آئے دن ناچ رنگ کی محفلیں منعقد ہوتیں، قہقہے پہ قہقہے اس گھر سے بلند ہوتے رہتے پورا قصبہ انکو رشک کی نگاہ سے دیکھتا رہتا لیکن حسد کبھی کسی نے نہ کیا کیونکہ گھر کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا۔ وہ ان کا گھر نہیں بلکہ قصبے کے سارے لوگوں کا گھر تھا، میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا لیکن ساری باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں، میں بھی اکثر ان کے گھر جاتا اور ناچ وغیرہ دیکھتا تھا۔ لیکن افسوس اس گھر کو لوگوں کی نظر ... دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھرا ہوا گھر کھنڈر میں تبدیل ہوگیا جہاں سے کبھی شہنائیوں کی آوازیں اٹھتی تھیں وہاں سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ سب کیوں ہوا کیسے ہوا؟ اس کے پیچھے ایک پرانی روایت ہے جو مہاراج کے گھر سے وابستہ چلی آرہی ہے۔

لوگ کہتے تھے کہ مہاراج کی نسل ہنومان جی کی اولاد سے ہے (ہنومان جی ہندوؤں کے بندر نما دیوتا ہیں) کیونکہ ایک دن رام اور راون کی لڑائی کے بعد ہنومان جی کو آدمی بن کر دنیا کی سیر کرنے کا خیال آیا، انھوں نے کڑی تپسیا کے بعد شری بھگوان سے آشیرواد لی اور آدمی کی جون میں آگئے، جب خوب سیر کرلی تو دوبارہ اپنی اصلی جون یعنی بندر کی شکل میں آنے کے لئے منتر پڑھنا شروع کر دیا لیکن افسوس وہ منتر بھول چکے تھے انھوں نے بھگوان سے بہت پرارتھنا کی مگر انھیں منتر یاد نہ آیا، کیونکہ بھگوان ناراض ہو چکے تھے، اس واقعے کے بعد سے انکی اولاد ہمیشہ اس منتر کو یاد کرنے کی کوشش کرتی آئی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی، اسی طرح مہاراج کے دماغ پر بھی یہی کہانی سوار تھی، وہ دور دور سے مشہور سادھوؤں کو بلاتے اور ان سے طرح طرح کے منتر پوچھتے اسی طرح کوئی مشہور سادھو مہاراج کے گھر مہمان ہوئے، مہاراج نے انکی بہت آؤ بھگت کی، آخر میں سادھو جی نے مہاراج سے کہا۔

"اگر تو مجھے ایک ہاتھی مع چاندی کی زنجیروں کے بلی دان کر دے گا تو میں تجھے تیرا خاندانی منتر بتا دوں گا جس سے تو دوبارہ اصلی جون میں آکر دیوتاؤں کے پاکھنڈ میں پہنچ جائے گا اور امر ہو جائے گا۔"

یہ سنتے ہی مہاراج نے انکو ہاتھی بلی دان کرنے کا وعدہ کر لیا، سادھو جی تو یہ کہہ کر اور اپنا اتا پتا بتا کر رخصت ہو گئے لیکن اس خوشحال گھرانے کی تباہی کی بنیاد ڈال گئے، مہاراج کو سب نے سمجھایا کہ اس گھرانے پر رحم کھاؤ کیونکہ وہ ہاتھی اور چاندی کی زنجیریں خریدنے کے لئے گھر بار اور زمینیں بیچنے والے تھے لیکن لوگوں کے لاکھ سمجھانے پر بھی نہ مانے اور ایک روز پوری زمین اور گھر بیچ دیا اور زناروں کے بال بچوں کو لے کر جھونپڑی میں جا بسے لیکن بھگوان کی کرنی ایسی ہوئی کہ جس دن ہاتھی آس گاؤں میں آیا ... دیکھتے ... کالرا پھیل گیا، دیکھتے ہی دیکھتے قصبے کے ... گھرانوں کا نام و نشان مٹ گیا مہاراج کا سب سے پہلے ہاتھی مرا پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب ختم ہو گئے، صرف مہاراج کا چھوٹا بچہ ... تنہا زندہ رہے باقی سب

قصبہ کے لوگوں کو اب بھی کبھی کبھی بندر کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جب کوئی رات کو اس لاٹ کے پاس سے گزرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دکھی ہچکیاں لے لے کر سرگوشی میں رو رہا ہو——۔

ایک ہی دن میں ختم ہو گئے، جب کالرا ختم ہوا تو تین چوتھائی آدمی بچے تھے۔ میرے گھر میں بھی چار موتیں ہوئیں۔

کالرا ختم ہونے کے بعد مہاراج کی بیوی اور شنکر بیچارے ایک جھونپڑی میں رہنے لگے۔ شنکر کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال ہو گی، بہت خوب صورت جوان نکل رہا تھا لیکن اس کے دماغ پر بھی بس ایک ہی بھوت سوار تھا کہ کسی طرح وہ منتر اسے معلوم ہو جائے، وہ سادھو جی کے پاس بھی پہونچا لیکن وہ بھی کالرا میں ختم ہو چکے تھے، کیونکہ مہاراج کے تعلقات نواب صاحب تک تھے اس لئے انھوں نے ترس کھا کر شنکر کو پندرہ سال کی عمر ہی میں سب رینجر کی جگہ دے دی جس سے دونوں ماں بیٹے کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے۔

مالک مکان کا نام رام داس تھا اس کی ایک لڑکی تھی شانتی، جو واقعی حسین تھی، ایک گھر میں رہنا تھا دونوں کا میل جول بڑھنا قدرتی بات تھی، دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی سال میں شنکر ایک کڑیل جوان بن گیا اور شانتی جوان ہو کر کامنی بن گئی شنکر ترقی کر کے رینجر بن گیا، دونوں کی ملاقاتیں اب چوری چھپے ہونے لگیں، اکثر لوگ دونوں کو پنگھٹ پر باتیں کرتے دیکھتے لیکن نظریں بچا جاتے کیونکہ شنکر بہت شریف لڑکا تھا اور پھر رینجر کی حیثیت سے سرکاری افسر بھی تھا اس لئے لوگوں پر اس کا اثر بھی تھا۔

ان دونوں کی محبت بڑھتی رہی شانتی کے والدین بھی بہت خوش تھے، لڑکے میں کیا کمی تھی، لیکن افسوس اس گھرانے پر ایک دن شنکر اچانک غائب ہو گیا، شنکر کی ماں سخت پریشان تھی، ایک ہفتے بعد شنکر واپس آیا لیکن اس کی حالت عجیب تھی، کپڑے پھٹے ہوئے، داڑھی بڑھی ہوئی اور جوتے غائب تھے، اسے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے ماں نے چھاتی پیٹ لی لیکن وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ سب سے خوش ہو کر کہہ رہا تھا مجھے اپنا خاندانی منتر مل گیا ہے۔ میں عنقریب اپنی جون میں جا کر مہاتما بن جاؤں گا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں عنقریب ہنومان کی جون میں اس قصبے میں آؤں گا اور شانتی کو بیاہ کر لے جاؤں گا، میرے ساتھ برات میں سب دیوتا ہوں گے۔ سندری کا ناچ ہو رہا ہو گا اور راجا اندر تخت پر ہوں گے۔ پھر اس نے بہت ہی خوفناک قہقہہ لگایا اس کی باتوں سے شانتی کے گھر والے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ وہ اسی طرح بڑبڑاتا ماں کو روتا چھوڑ کر جنگل کی سمت پاگلوں کی طرح بھاگ گیا۔

کئی دن گزر گئے اس کا کچھ پتا نہ چلا، اس کی جگہ پر دوسرا رینجر بھی آ گیا، ماں روتے روتے ادھ مری ہو گئی لیکن وہ نہ آیا۔ پھر ایک دن قصبے کے لوگوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا، شنکر کی ماں پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی اور لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ میرا بیٹا ہنومان بن گیا ہے میں اسے جنگل میں دیکھ کر آئی ہوں اور وہ یہاں بھی آئے گا۔

بڑھیا کی باتیں سن کر سب کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کے صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور پاگل ہو گئی ہے۔ اس خیال سے کہ شنکر کو ڈھونڈھ کر لائیں بہت سے لوگ جنگل میں شنکر کی تلاش کو نکل گئے لیکن دن بھر کی تلاش کے باوجود شنکر کا کوئی پتا نہ چلا، آخر تھک ہار کر لوگ بیٹھ گئے، شنکر کی ماں پاگلوں کی طرح بکتی اور قہقہے لگاتی رہتی۔ دن بھر گلیوں میں گھومتی رہتی اور رات کو کہیں پڑ جاتی۔

ایک دن قصبے والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا، شنکر کی ماں قصبے کے پنگھٹ پر ایک بڑے بندر کے ساتھ بیٹھی اس سے اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے وہ شنکر ہی ہو، بندر بڑے پیار سے اس کی گود میں سر ڈالے بیٹھا تھا۔ سارے قصبے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، لوگ اس بندر کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اس کی حرکات بالکل آدمیوں کی طرح تھیں، وہ ماں سے اس طرح لپٹا بیٹھا تھا جیسے واقعی چھوٹا بچہ ہو، لوگ دور سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے شانتی کے گھر والے بھی آ کر یہ تماشا دیکھنے لگے شنکر کی ماں لوگوں سے خوش ہو ہو کر کہہ رہی تھی۔

”لوگو! میرا بیٹا ہنومان بن گیا ہے۔ یہ تمھارا دیوتا ہے آؤ اس کی پوجا کرو تمھیں سورگ مل جائے گا ورنہ تم سورگ باشی ہونے سے محروم رہ جاؤ گے۔“

لوگ بڑی حیرت اور خوف سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ بندر جسامت میں آدمی کے برابر تھا، اتنی جسامت کا بندر کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا دوسرے مہاراج کے گھرانے سے وابستہ روایت کا بھی اثر تھا کہ لوگ گم صم کھڑے تھے۔ اسی دوران بندر کی نظر شانتی پر پڑی اس نے خوش ہو کر دانت نکال دیے اور تیزی سے دو تین چھلانگیں لگا کر شانتی کے پاس پہونچ گیا۔ لوگ دہشت سے چیخ کر دور بھاگے لیکن اس دوران بندر شانتی کا لہنگا پکڑ چکا تھا وہ بیچاری مارے خوف کے گنگ کھڑی تھی۔ پھر لوگوں نے ایک اور منظر دیکھا بندر شانتی کا لہنگا پکڑے منہ سے عجیب قلیں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ دیکھنے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہے۔ شانتی کے بھائی ہمت کر کے آگے بڑھے اور انھوں نے لاٹھیوں سے اس پر حملہ کر دیا۔ بندر چیختا ہوا دوڑ کر ماں سے چپٹ گیا اور اس نے اس طرح بندر کو چھپایا جیسے وہ واقعی اس کا بچہ ہو۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بد دعائیں دے رہی تھی اور اپنا لہنگا پھاڑ پھاڑ کر بندر کا زخم صاف کر رہی تھی لوگ اس واقعے سے اتنے بوکھلائے کہ ان دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے آئے۔ وہ زمانہ سخت سردی کا تھا۔ شام کو لوگوں نے دیکھا کہ شنکر کی ماں پھٹے کپڑوں کے ساتھ روتی ہوئی شانتی کے گھر آئی اور رو رو کر اپنے بیٹے سے شانتی کی شادی کر دینے کو کہنے لگی۔

شانتی کے گھر والوں نے دروازہ بند کر دیا لیکن وہ مسلسل دہلیز پر سر مار رہی تھی اور شانتی کے باپ کو اپنے پرانے تعلقات یاد دلا کر فریاد کر رہی تھی، سخت سردی کا زمانہ تھا لوگ جلد ہی سو رہے رات کے اندھیرے میں نہ جانے کب تک غریب بڑھیا کی درد بھری صدائیں اور التجائیں گونجتی رہیں صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ بڑھیا کا سر خون میں لت پت شانتی کی دہلیز پر پڑا ہوا ہے بڑھیا کی حسرت آمیز لاش عجب انداز میں پڑی ہے۔ اور وہ بندر اپنا سر محبت سے بڑھیا کی گود میں رکھے بیٹھا ہے۔ شانتی کے گھر والے اور دوسرے لوگ اس منظر کو دیکھ کر اتنے خوفزدہ ہوئے کہ کوئی گھر سے نکلا ہی نہ تھا لوگ کھڑکیوں میں سے جھانکتے رہے۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے بندر کی دلدوز چیخیں سنیں۔“

مکھیا نے یہاں اپنی کہانی کو چھوڑا اور اپنی آنکھوں سے دیر تک آنسو پونچھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ آگ کو گھور رہا تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً سب ہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے لیکن مجمع پر موت کی سی خاموشی طاری تھی صرف انگاروں کے چٹخنے کی آواز ضرور آ رہی تھی۔ بہت دیر بعد مکھیا کی آواز بلند ہوئی۔

”میں بھی اس زمانے میں اچھا خاصا ہو گیا تھا اس بندر کی چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سعادت مند بچہ اپنی ماں کی موت پر آنسو بہا رہا ہے بہت دیر تک یہ آوازیں آتی رہیں پھر ایسا محسوس ہوا جیسے بندر چیختا ہوا جنگل کی طرف جا رہا ہو پھر کچھ دیر بعد آواز مدھم ہوتی گئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ بندر اور

برسات کی لاشیں دونوں غائب ہیں۔ جب بھی مرس کی لاش بیٹھے مل کر بہت سے لوگ گروہ کی شکل میں ان کی بیاں تھی پھر بیٹھ گئے لیکن تلاشیں بیکار ہو گئیں لاشیں نہ ملی بندر بھی نظر نہ آیا ان واقعات سے شانتی کے گھر والے جھلائے کہ وہ بندر کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اور چلے گئے۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ بندر تنہا واپس آیا اور گھر کے قریب ایک درخت پر خاموش اور اداس بیٹھ گیا اور پھر اس راستے کو دیکھتا رہا جہاں سے قصبے کی عورتیں پانی بھرنے آیا کرتی تھیں لیکن اس دن قصبے کی کوئی عورت پانی لینے نہیں گئی سو مرد ہی ڈرتے ڈرتے پانی لینے گئے اور جلدی جلدی پانی لے کر چلے آئے اس دن سے بندر کو کسی نے نہیں دیکھا دوسرے دن بھی یہی ہوا تیسرے دن بندر کا سراغ پا گئی اور قصبے کی لڑکیاں بھی پنگھٹ پر پانی بھرنے جانے لگیں۔ بندر پر کہنے جانے والی لڑکی کو یوں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے شانتی کا انتظار ہے کیونکہ اس قصبے میں ہوتی تو آتی اس کے گھر والے تو اسے لے کر غائب ہو گئے تھے۔

پھر کچھ دن لوگوں نے ایک اور ہی منظر دیکھا کہ بندر رکھشا ہوتی۔ قصبے کے مرد عورت بچے سب ہی اس کے کریا کرم میں شریک ہوئے اور یہ کہانی دور دور تک مشہور ہو گئی۔ قریب کے گاؤں کے ایک سنگ تراش نے اس کی سمادھی پر ایک بڑے پتھر کو تراش کر اس کی لاٹ بنائی جب ہی سے شنکر دیو کی لاٹ کی پوجا ہوتی ہے۔

ادھر کچھ دنوں بعد شانتی کے گھر والے بھی واپس آ گئے لیکن شانتی ان کے ساتھ نہ تھی معلوم ہوا کہ دوسرے گاؤں میں ان لوگوں نے اس کی شادی کر دی ہے پھر ایک دن شانتی بھی اپنے شوہر کے ساتھ آئی، جب شانتی کا ڈولا شنکر کی لاٹ کے قریب سے گزرا تو سب نے دیکھا کہ مورتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں نے شانتی کو دیکھا تو شانتی وہ شانتی نہیں رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گھل کر جلد ہی ختم ہو گئی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی جوان لڑکی اس لاٹ پر اکیلی جاتی ہے تو شنکر دیو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں بعض لوگوں کو اکثر شنکر دیو نظر بھی آ جاتے ہیں قصبے کے لوگوں کو اب بھی کبھی کبھی بندر کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ جب کوئی رات کو اس لاٹ کے پاس سے گزرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دکھی ہچکیاں لے کر سرگوشی میں رو رہا ہو۔

شانتی کے گھر کی چھت پر اداس بیٹھا رہے وہ سب کو تکر تکر دیکھتا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے لیکن بالکل خاموش رہتا منہ سے ایک آواز تک نہ نکالتا اس دن کے بعد کسی نے اس کی آواز پھر نہ سنی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اب وہ بہت دبلا نظر آنے لگا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن سے اس نے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ لوگ بھی اب اس بات کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ شانتی کے گھر کی چھت پر بیٹھا سب کو دیکھتا رہتا اور آنسو بہاتا رہتا لوگ اپنے کاموں میں مشغول رہتے، سات آٹھ دن تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا آخر دن نڈھال ہو کر چھت پر لیٹ گیا اور اسی دن شام کو چھت سے لڑھکتا ہوا نیچے عین اسی جگہ گرا جہاں پر پاگل بڑھیا نے جان دی تھی۔ جب لوگوں نے قریب جا کر دیکھا تو اس کا دم نکل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

لوگوں نے بڑی عقیدت سے اس کی لاش اٹھائی اور برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے اس کو جلا دیا گیا۔ شنکر کے نام ہی سے اس کا کریا کرم ہوا اور پورے احترام سے اس کی تمام

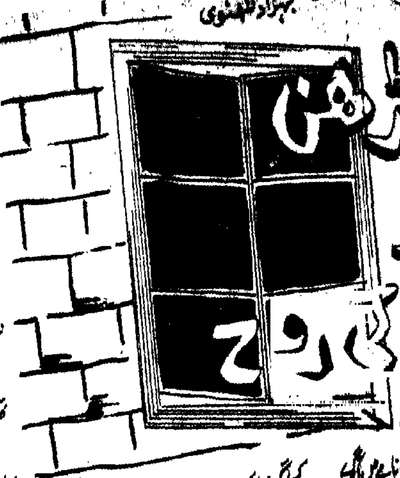




"کیا خوب تماشا ہے"

بہزاد لکھنوی

حکیم بدھن اور بیروں کی روح



...یر اکبر آبادی مرحوم نے اپنے برسات نامے میں آگرے
...رسات کا منظر کھینچا ہے۔ آپ یقین مانئے اب سے
...برس قبل لکھنؤ کی برسات کا بھی یہی عالم تھا۔
...ات جھڑی ایک ایک ہفتے لگی رہتی تھی۔ گلیاں لکھنؤ
...لی کارگزاریوں کے باعث اتنی کیچڑ سے بھری ہوتیں
...ر آدمیوں کا پھسل کر گرنا ضروری ہوتا تھا۔ پختہ
...پر بھی گڑھوں کی وہ بہتات ہوتی تھی کہ ان میں پانی
...ا اور سیہ پانی یکوں اور تانگوں کی بدولت پیدل
...ول کے کپڑوں کو بغیر داغدار کئے مانتا نہ تھا۔ اس
...میں ہر کاروبار بالکل معطل ہو جایا کرتا تھا۔ یہی حال
...ا کا بھی تھا۔ مشاعرے یکلخت بند ہو جاتے تھے۔ شعرا
...کے باعث اپنے اپنے گھروں میں دبکے پڑے رہتے تھے۔
...ہاں اگر کوئی شعر زدہ پہونچ گیا تو بیٹھک آباد ہو گئی۔
...ہو گئی شعر خوانی، اور اس شعر خوانی کو بریک اس وقت
...تا جب بارش ذرا تھم جائے۔ جہاں سامع یا شاعر بغیر
...پڑھے یا سنے اپنے گھر کو بھاگ نکلتا تھا۔
باوجود اس عالم کے بھی حکیم بدھن کی بیٹھک روزانہ
...سے کھلتی تھی۔ میں نماز فجر کے بعد خواہ آندھی ہو یا طوفان
...رش ہو یا دھوپ۔ ایک نیکر پہن کر برساتی پہن لیتا بغل میں
...اور پاجامے کو تہہ کر کے دبا لیتا اور پرانی چھتری لگا کر
...ریلے پر پہنچ جایا کرتا۔
مجھے بعض اوقات اس پابندی سے بڑی تکلیف ہوتی
لیکن مجبور تھا حکیم بدھن کا حکم تھا کہ بیٹھک ہر حال میں
اوقات مقررہ پر

کھلے گی خواہ کام ہو یا نہ ہو۔ ان کا ارشاد تھا کہ موت اور خریدار
کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ لہٰذا میں بتا صاحب کے چائے خانے
میں پہونچ کر بھیگی ہوئی برساتی اور چھتری ایک جانب ٹانگ
دیتا تھا اور آڑ میں جا کر نیکر اتارنے کے بعد کرتا اور پاجامہ
پہن کر اپنی میز پر پہونچ جایا کرتا تھا۔ جہاں میرا مقررہ گرما گرم
ناشتہ میرے سامنے لگا دیا جاتا تھا۔
میرے پہونچنے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد حکیم بدھن کا
ورود مسعود ہوا کرتا تھا۔ حکیم بدھن آدمی خوش پوش تھے سفید
جامدانی کے انگرکھے اور پاجامے پر ایک ہلکا سا داغ بھی برداشت
نہیں کر پاتے تھے۔ وہ اس شان سے چائے خانے پہونچتے تھے کہ
سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ چھتری اور
برساتی خلاف وضعداری سمجھ کر کبھی استعمال نہیں فرماتے تھے
اور چھتری اور برساتی کے بغیر گھر سے چائے خانے تک خراماں
خراماں آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کرمچ کا اٹیچی کیس ہوتا
تھا جس پر برساتی کا خول تھا۔ وہ پانی میں شرابور چائے خانے
میں داخل ہوتے اور سیدھے اس آڑ میں چلے جاتے جہاں میں
کپڑے بدلا کرتا تھا، وہاں وہ اٹیچی سے تولیہ نکالتے
سارا جسم خشک کرتے پھر دودھ جیسے دھلے ہوئے کپڑے
پہن لیتے آئینہ اور کنگھا نکال کر بال بناتے اور سیاہ رنگ کا
پمپ پہن کر بیٹھک میں داخل ہو کر اپنی میز پر بیٹھ جاتے
اور مستانہ لہجہ میں کہتے۔
"بھئی بہزاد واللہ برسات کا موسم بھی کیا مزے کا ہوتا
ہے سبحان اللہ"

خریدار کا پتہ ہے اور نہ کسی کام کا۔ بس خالی بیٹھے گپیں
مارا کرو" وہ کہتے۔
"ارے بھائی موت اور خریدار کا کوئی ٹھیک نہیں ہے
کب آ جائے۔ یار میرے تم تو برسات میں نئے نئے مضامین
سوچتے رہا کرو اور ان کو ایک کاغذ پر نوٹ کرتے رہو، اور
جوں ہی برسات ختم ہوا ان ہی مضامین کو غزلوں میں محفوظ کر
دیا کرو۔ مشاعرہ دنگ رہ جایا کرے گا"
اس گفتگو کے بعد ان کا مشہور قہقہہ شروع ہوتا
تھا جو چند منٹ تک جاری رہتا۔
جس زمانے کا واقعہ لکھ رہا ہوں اتفاقاً ایک ہفتے
سے مسلسل جھڑی لگی ہوئی تھی۔ شہر کی گلیوں میں سیلابی پانی
بھر آیا تھا۔ لکھوری اینٹ کے بنے ہوئے مکانات دھڑا دھڑ
گر رہے تھے۔ میں روزانہ اس عالم میں آنے سے تنگ آ گیا تھا
دن بھر مفت کی چائے اور حکیم بدھن کی داستانیں بے کیف
ہونے لگی تھیں۔ ایک دن میں حکیم بدھن سے شکوہ کرنے کا
ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک تانگا چائے خانے کے سامنے آ کر
رکا۔ اس میں سے ایک پچاس پچپن سالہ بزرگ بھیگے بھاگے
اترے اور دروازے ہی سے بولے۔
"کیا حکیم بدھن قبلہ یہاں تشریف فرما ہیں"؟
حکیم بدھن آواز سن کر چونکے اور بولے۔
"جی ہاں حاضر ہوں۔ کیا چچا نبو صاحب ہیں"؟
وہ بولے "ہاں بھیا میں نبو ہوں۔ تانگے والے کو رخصت
کر دوں تو آؤں"
چند منٹ کے بعد ان کی ٹین کی پیٹی تانگے والے نے
چائے خانے کے اندر رکھ دی۔ جس کو دیکھ کر حکیم بدھن نے
تانگے والے سے کہا۔
"تانگے والے اس پیٹی کو یہاں لے آؤ"
پیٹی کے ساتھ ساتھ نبو صاحب اندر داخل ہوئے
سر سے پیر تک بُری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ حکیم بدھن ان کو
دیکھ کر سروقد تعظیماً کھڑے ہو گئے، اور بولے
"چچا اس آڑ میں تشریف لیجا کر کپڑے تبدیل کر لیجئے
پیٹی کی چابی مجھے عطا ہو میں کپڑے نکال دوں"
نبو صاحب نے چابی حکیم صاحب کو دیدی۔ حکیم صاحب
نے ایک چکن کا کرتا پاجامہ اور تولیہ نکال کر سامنے...

اور پھر نو صاحب نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے۔ اس اثنا میں حکیم بدھن ایک پرتکلف ناشتے اور چائے کا آرڈر دے چکے تھے۔ نو صاحب کے بیٹھتے ہی ناشتہ پیش کر دیا گیا۔ حکیم صاحب نے مجھے بھی اشارے سے بلا لیا۔ اور بولے۔

"بھائی بہزاد یہ میرے چچا جناب نو صاحب ہیں، اور والد صاحب قبلہ کے بہترین دوست۔ ان کے گھر بھر کا علاج صرف والد مرحوم ہی کرتے تھے۔ آپ بہت بڑے زمیندار ہیں اور انجکین سے بارہ میل کے فاصلے پر آپ کی بہت بڑی زمینداری ہے" میں نے کہا۔

"میں مل کر بہت مسرور ہوا"

حکیم بدھن نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"چچا یہ بڑے مشہور شاعر بہزاد لکھنوی ہیں اور میرے بہت مشہور ہیں۔ ان کے بغیر نہ میں کوئی کام کرتا ہوں اور نہ کہیں باہر جاتا ہوں"

نو صاحب نے چائے کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نام سن چکا ہوں۔ اللہ زندہ رکھے" چائے اور ناشتے کے بعد بولے۔

"بدھن میاں۔ ہمارے ہاں تو بارش کا نام نہیں ہے میں جس تم سے ملنے کے لئے جب چلا تو بارش کا تخیل تک نہ تھا۔ بنصرا اسٹیشن آتے ہی بارش نظر آئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا چار باغ اترا تو بارش انتہائی زوروں پر تھی۔ بند ہونے کی امید ہی نہ تھی اپنا اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ تمہارا پتہ سب یاد تھا گھر پہنچا تو معلوم ہوا تم یہاں پر ملو گے۔ تمہارے گھر میں روک رہی تھیں لیکن میں سیدھا یہاں آ گیا"

حکیم بدھن نے کہا "آپ کو واقعی بڑی زحمت ہوئی۔ خیریت" وہ بولے۔

"خیریت ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ تخلیہ ہو تو میں تم کو بتاؤں میری عقل کام نہیں کر رہی ہے اور بے حد پریشان ہوں"

حکیم بدھن نے کہا "چچا تخلیہ تو موجود ہے۔ رہے بہزاد تو ان سے میں کوئی بات چھپا کر رکھتا ہی نہیں۔ اگر آپ مجھ سے علیحدگی میں بھی کچھ کہیں گے تو میں ان سے مشورہ کرنے پر مجبور ہوں گا یہ میرے پرانے ساتھی اور جگری دوست ہیں"

نو صاحب نے کہا "اگر یہ بات ہے تو کوئی نقصان نہیں سنو! تمہارے بھائی تحسن کی شادی کو ماشاء اللہ سے آٹھ برس گزر گئے ہیں"

حکیم بدھن نے کہا "میں تو شریک تھا شادی میں ماشاء اللہ آپ نے بڑی شان سے شادی کی تھی"

نو صاحب نے کہا "ہاں بھیا بس اللہ نے کرا دی۔ میری ایک ہی اولاد ہے۔ اب اس کی شادی میں بھی بخل کرتا تو کمال ہی ہوتا۔ ہاں تو بھیا آٹھ سال سے مجھے اور تمہاری چچی کو یہ کوفت کھائے جا رہی تھی کہ تحسن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہو رہی ہے، میری نسل کا خاتمہ ہوا جا رہا ہے"

حکیم بدھن نے کہا "بے شک بڑے افسوس کا مقام ہے"

نو صاحب بولے "میں نے اور تمہاری چچی نے کوئی منت کوئی مراد باقی نہیں چھوڑی۔ کوئی پیر کوئی فقیر ایسا نہیں چھوڑا جس کے پاس میں خود نہ گیا ہوں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پارسال اتفاقاً ایک جوگی ہمارے گاؤں میں آیا اور ٹھاکر جے کشن جی کے ہاں ٹھہرا۔ اس کی شہرت ایک دم سے گاؤں میں پھیل گئی۔ کئی آدمیوں کے کام اس کے گنڈے سے بنے"

حکیم بدھن نے حیرت سے کہا "اچھا؟"

وہ بولے "ہاں بھیا۔ میرا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن جب ٹھاکر صاحب خود میرے پاس آئے اور بولے کہ چل کر مہاراج سے گنڈا لے لیجئے تو میں چلا گیا۔ اس جوگی نے مجھے ایک گنڈا سوت کے تاگے کا دیا اور بولا۔

"اس کو استری کے گلے میں پہنا دو"

میں نے لیا۔ گھر آ کر بے دلی کے ساتھ تمہاری چچی کو دے دیا انھوں نے بھی انتہائی نفرت اور بے دلی کے ساتھ وہ گنڈا دلہن کے گلے میں ڈال دیا۔ بات گئی گزری ہو گئی لیکن جب دوسرے ہی مہینے حمل کے آثار پیدا ہوئے تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اللہ اللہ کر کے نویں مہینے ایک لڑکا پیدا ہوا"

حکیم بدھن نے خوش ہو کر کہا "اللہ مبارک کرے"

نو صاحب نے کہا۔ "اللہ تم کو بھی مبارک کرے بچہ بے حد خوب صورت اور توانا پیدا ہوا۔ میرے خاندان میں کبھی اتنا وزن دار اور حسین بچہ نہیں ہوا تھا۔ سارے اعزہ مجھے مبارکباد پر مبارکباد دینے لگے۔ لیکن دلہن روز بروز بے حد کمزور ہونے لگی۔

حکیم بدھن نے کہا "اچھا کوئی عمدہ قسم کی دوا دیجئے میوہ جات استعمال کرائیے۔ انشاء اللہ دلہن جلد ہی پھبک جائیں گی"

نو صاحب نے کہا "بھیا میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی ہے۔ تم کو معلوم ہے اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود ہے بہتر سے بہتر غذائیں، پھل، میوہ جات استعمال کرا رہا ہوں لیکن دلہن روز بروز کمزور ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ ہر وقت ڈری ڈری سہمی سہمی رہتی ہیں۔ سب کے سامنے کچھ نہیں کھاتی ہیں کھانا اندر کمرے میں رکھوا لیتی ہیں اور وہیں کھاتی ہیں"

حکیم بدھن نے کہا "اور وہ کھانا وغیرہ سارا کھا لیتی ہیں بچتا تو نہیں ہے!"

وہ بولے۔ بھیا پلیٹیں تو ایسی صاف ملتی ہیں جیسے کسی نے دھو دی ہوں۔ یہی حیرت ہے۔ بعض اوقات تو غذا اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دو تین آدمی کھا لیں اور بچ بھی رہے مثلاً حلوے کا پورا کونڈا رکھ دیا جاتا ہے کہ اس میں سے تھوڑا سا نکال کر استعمال کر لیں گی باقی رکھا رہے گا لیکن صبح کو وہ پورا کونڈا صاف دھویا ہوا نظر آتا ہے"

حکیم بدھن نے کہا "حیرت ہے"

نو صاحب بولے "حیرت کی اور بھی باتیں ہیں۔ دلہن کا دودھ بالکل خشک ہو گیا ہے۔ میں نے اناؤں کو بلوایا اناؤں کی کیا کمی۔ سب کاشتکار بسے ہوئے ہیں۔ ان کی بیویاں آنا شروع ہو گئیں۔ لیکن ایک عجیب بات دیکھی عورت نے جوں ہی لڑکے کے منہ میں دودھ دیا ایک چیخ ماری اور کہا۔

"اس کے منہ میں تو دانت ہیں سینہ چبائے لیتا ہے"

"لڑکے کا منہ کھول کر دیکھا گیا۔ دانت تو کیا مسوڑوں کا صحیح پتہ نہیں۔ ڈیڑھ مہینے کا بچہ ہے"

حکیم بدھن نے کہا۔ "تو اس عورت نے ڈھونگ کیا"

نو بولے "پہلے تو میں بھی یہی سمجھا کہ یہ بات ہو گی لیکن بیس پچیس عورتوں نے یہی کہا اور قسمیں کھائیں تو پھر مجھے اس انہونی کا یقین کرنا پڑا"

حکیم بدھن بولے "بچہ بھی بغیر دودھ کے کمزور"

نو بولے "کمزور؟ ابھی وہ تو پہلوان ہو رہا ہے ڈیڑھ ماہ کا بچہ ہے لیکن گردن ادھر ادھر نچوتی گھما کر دیکھتا نظر سے نظر ملاتا ہے"

حکیم بدھن نے کہا "چچا آپ کی گفتگو سن کر تو میں حیرت میں ہوں"

وہ بولے "میں نے کئی عاملوں کو بلایا۔ تعویذ باندھے لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا ہے سارے گاؤں

س واقعے کی شہرت ہوگئی ہے۔"
حکیم بدھن بولے۔" مجھے بے حد افسوس ہے۔ سوچ
رہا ہوں آخر کیا کیا جائے۔"
وہ بولے۔" سنو بھیا۔ تمہاری چچی بھی جب تحسن پیدا ہوا
ہے تو کچھ کھاتی پیتی نہیں تھیں۔ تمہارے والد اللہ بخشے آئے
اور پندرہ دن میرے ہاں ٹھہر کر انھوں نے علاج کیا تھا اور
تمہاری چچی درست ہوگئی تھیں۔ تم بھی آخر اسی باپ کے
بیٹے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے تم کو مکمل طب پڑھائی تھی
تھی کہ تم ان کے مریضوں کے نسخے بھی لکھتے تھے اور ان کا علاج
بھی کرتے تھے۔"
حکیم بدھن نے کہا۔" جی ہاں مجھے یہ پیشہ پسند نہیں تھا
میں نے ترک کر دیا۔"
وہ بولے۔" تو تم میرے ہمراہ بادل پور (زمینداری) چلو
وہاں پندرہ دن قیام کرو اور اپنی بھاوج کا علاج کرو۔
تمہاری چچی نے مجھ سے کہا تھا کہ دلہن کا علاج صرف حکیم
بدھن ہی کر سکتے ہیں۔"
حکیم بدھن نے کہا۔" چچا مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے
لیکن میری طبابت کی مشق چھوٹی ہوئی ہے۔ دوسرے میں یہاں
جو کام کر رہا ہوں پندرہ دن کی عدم موجودگی میں بالکل ختم ہو کر
رہ جائے گا۔"
وہ بولے۔" تمہارا تمام نقصان اور ہرجہ میں ادا کر دینے کو تیار ہوں
تم کو چلنا پڑے گا اور آج رات ہی کی گاڑی سے ہمیں یہاں سے
روانہ ہونا ہے۔"

چلئے جناب آگئی شامت۔ مجھے حکیم بدھن نے دس
دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔
" تم ابھی گھر چلے جاؤ اور یہ روپے دے کر کہہ دو کہ تم پندرہ
یوم کے لئے میرے ساتھ جا رہے ہو۔ اگر زیادہ وقت لگا تو اور
رقم منی آرڈر کے ذریعے پہونچ جائے گی۔"
میں نے کہا۔" بھیا یہ تم کیا کہہ رہے ہو میری رائے
میں تو مجھے یہاں چھوڑ جاؤ۔ تمہاری عدم موجودگی میں فیکٹری
کی دیکھ بھال کے لئے ایک آدمی ہونا ہی چاہیئے۔"
حکیم بدھن نے کہا۔" عالی جناب مولانا بہزاد صاحب
لکھنوی آپ مجھے کوئی مشورہ نہ دیں۔ میں اپنے معاملات کا
خود ذمہ دار ہوں۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے اور بس۔
دا قعات

سامان کی کوئی ضرورت نہیں حتیٰ کہ کپڑوں کی بھی۔ بادل پور
میں آپ کے لئے کپڑے پاجامے سل جائیں گے۔"
حکیم بدھن جب کبھی مجھے تعظیمی انداز میں مخاطب کرتے
تھے میں سمجھ جاتا تھا کہ یہ مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ چنانچہ
تاب دم زدن ہی نہ تھی گھر گیا۔ روپے حوالے کئے اور پلٹ
ہی واپس آیا۔
بارش خیر سے تھمی ہوئی تھی لیکن مطلع بے حد غلیظ تھا۔
میری واپسی پر حکیم بدھن موجود نہیں تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد
ایک تانگے پر لدے پھندے واپس آئے۔ سامنچی اور ہولڈال
کے علاوہ ایک ناشتے دان میں اس وقت کا کھانا تھا۔
نبو صاحب، حکیم بدھن اور میں نے وہ کھانا چائے خانے ہی
میں کھایا۔ ناشتے دان وہیں چھوڑ کر حکیم بدھن نے تانگا
منگوایا اور ہم تینوں آدمی اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ چار باغ سے
کان پور کے لئے گاڑی چار بجے چھوٹتی تھی۔ حکیم بدھن نے
مجھے دو روپے دیتے ہوئے کہا۔
" تین ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے اجگین تک کے خرید لو۔"
چلئے جناب سیکنڈ کلاس میں ہم تینوں بیٹھ گئے۔ گاڑی چھوٹی
اور تیس میل کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ ٹھیک
ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ اجگین اترے۔ واقعی بنتھرے کے بعد
سے بارش کا کہیں نام تک نہ تھا۔ فضا میں ابھی خاصی گرمی
تھی۔ اجگین اترتے ہی ایک مضبوط یکہ نبو صاحب کو دیکھتے ہی
بڑھا۔ یکے والے نے سامان پیچھے باندھ لیا۔ ایک سیٹ پر نبو صاحب
دوسری پر حکیم بدھن اور یکے والے کے پاس میں بیٹھ گیا۔
بادل پور اجگین سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ سڑک
نیم پختہ تھی۔ راستے میں تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ راستے بھر
حکیم بدھن نبو صاحب سے پرانی باتیں اور تذکرے کرتے رہے
مجھے چونکہ ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خاموش ذہن ہی
ذہن میں شعر کہتا رہا۔ یکہ تقریباً آٹھ بجے رات کو ایک بڑی
سی حویلی کے سامنے پہونچ کر رکا۔ کئی ملازم دوڑ پڑے۔
ہاتھوں ہی ہاتھوں سامان ایک بڑے سے دالان میں رکھ دیا
گیا جہاں متعدد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور کئی عدد پلنگ
بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے لئے فوراً لوٹوں میں پانی اور
صابن آگئے۔ ملازمین تولئے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں نے
اور حکیم بدھن نے منہ ہاتھ دھو کر فراغت پائی ہی تھی کہ
ایک ملازم چائے کی ٹرے لئے ہوئے آموجود ہوا۔ اس میں

کچھ لوازمات بھی تھے جن کو حکیم بدھن نے الگ کرنے کے
بعد ایک پیالی اپنے لئے تیار کی اور ایک مجھے دیتے ہوئے
انھوں نے کہا۔
" دیکھا چچا نبو صاحب کا گھر۔ بہت بڑے زمیندار ہیں
اور بڑی آن بان اور رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔"
ہم دونوں چائے پی ہی رہے تھے کہ نبو صاحب اندر
سے آکر بولے۔
" حکیم صاحب تمہاری چچی تم سے ملنے کے لئے بے چین
ہیں۔ چائے پی چکے ہو تو چلو۔"
حکیم صاحب نے ہاتھ سے پیالی رکھ دی اور اندر چلے
گئے۔ میں نے چائے کے بعد لیٹنے کا ارادہ کیا اور چارپائی پر
دراز ہوگیا۔ بستر قیمتی اور بے حد صاف تھا۔ میں لیٹتے ہی
نیند محسوس کرنے لگا۔ اتنے میں حکیم بدھن ایک بچے کو
گود میں لئے ہوئے باہر آئے۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ بچہ
کسی طرح بھی دو ڈھائی سال سے کم کا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اتنا بھاری
اور گداز تھا کہ میں نے حکیم بدھن کے چہرے پر بدباؤ کے آثار دیکھے
اور کلا بے حد حسین تھا۔ نقوش تیکھے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں ستواں
ناک اور پتلے پتلے ہونٹ۔ میں نے بچے کو دیکھ کر چٹکی بجائی میں حیران
رہ گیا جب بچے نے قہقہے پر قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ پوری بھاری
بھرکم آواز کے ساتھ۔ حکیم بدھن نے کہا۔
" یہ ہے چچا نبو صاحب کا پوتا۔ اس کی عمر بمشکل دو ماہ
ہوگی۔ لیکن ماشاء اللہ۔"
میں نے کہا۔" بھئی دونا تم ٹھیک جا رہے ہو۔"
حکیم اس کو لٹانے جا رہے تھے کہ وہ بیٹھ گیا اور گردن
گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
اتنے میں نبو صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور بولے۔" اس
کو اندر بھجوا دو حکیم صاحب۔"
حکیم صاحب نے بچے کو ایک نوکر کے سپرد کر دیا اور اس
کے جانے کے بعد بولے۔
" چچا معاملہ اتنا پراسرار ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے
میں نے اس وقت بھابی کو سرسری طور پر دیکھا ہے۔ صبح نہار منہ
نبض دیکھوں گا اور قارورہ رکھوا لیجئے گا۔"
اتنے میں نبو صاحب کے صاحبزادے تحسن صاحب باہر سے
آگئے اور آتے ہی حکیم بدھن سے لپٹ گئے۔
تحسن صاحب کی رنگت سیاہی مائل تھی نقش بھی بے حد

... [illegible] ... برس کی ہوگی ... ان تجن صاحب کے بالکل برعکس ... کوئی مشابہت تو ہونی چاہیے تھی۔

تجن صاحب اور حکیم بڈھن کی بچپن کی دوستی تھی۔ بیٹھتے ہی گلے شکوے شروع ہو گئے۔ اتنے میں نبو صاحب نے آکر ان سے کہا

"تجن اب تم دوست کو سنبھالو۔ میں اندر جا رہا ہوں اور اب باہر نہیں آؤں گا۔ خبردار ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے"

ان کے جاتے ہی تجن صاحب کے چند مصاحبین آگئے۔ سب کے سب قصباتی تھے۔ تاش نکل آئے کورٹ پیس شروع ہو گئی۔ تاش کے بعد کھانا آیا۔ کھانا بہت پرتکلف تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر اتنی جلدی اتنی اقسام کیسے تیار ہو گئیں۔ کھانے کے بعد میں تو لیٹ گیا لیکن حکیم بڈھن کی راگ داری شروع ہو گئی جس سے ... پڑتی۔ خدا جانے یہ راگ داری کی محفل کب تک جاری رہی۔

صبح سات بجے جب میں ... کرنے کے لئے اٹھا تو میرے برابر کے پلنگ پر حکیم بڈھن اور ان کے برابر تجن صاحب سو رہے تھے میں نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ حکیم اٹھ بیٹھے۔ غالباً ملازم کو معلوم تھا۔ بیڈ ٹی آگئی۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ تجن صاحب کو ملازم نے بمشکل ہشیار کیا۔ وہ غالباً دیر تک سونے کے عادی تھے۔ حکیم بڈھن کے نام پر چونکے اور کلی کرکے ہی چائے نوشی میں مشغول ہو گئے۔

سات نہیں بجنے پائے تھے کہ ناشتہ آگیا۔ ناشتہ بھی کافی پرتکلف تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد نبو صاحب ادھر آئے اور حکیم بڈھن کو لے کر اندر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد ایک ملازم میرے لئے نیا کرتا پاجامہ لے کر آیا نا ثبارات ہی میں سلوایا گیا تھا۔ زمینداری کے بھی کیا ... تھے۔ میں نے غسل کیا، کپڑے بدلے، اور بالوں میں تیل لگا رہا تھا کہ حکیم بڈھن واپس آگئے۔ نبو صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ "چچا مجھے بیحد پریشان ہو رہے ہیں ... کو کوئی مرض نہیں ہے، نبض بالکل درست ہے اور ... میں کسی ... خرابی کا پتہ نہیں چلتا۔ میری ناچیز ... بھوک کا شکار ہیں۔ خدا نہ پوچھنے سے یہ ...

... صاحب نے ... کہا۔ خدا نہ پوچھے ... آخر کتنی غذا دلہن کو دی جائے۔ ارے میکو غذا دلہن کے کمرے سے کھانے کی سینی یہاں لے کر آؤ۔"

تھوڑی ہی دیر میں ایک بڑی سینی لئے ہوئے ملازم باہر آیا۔ نبو صاحب نے سینی کا سرپوش اٹھایا اس میں چار بڑے پیالے اور تین طشتریاں رکھی ہوئی تھیں۔

وہ بولے "بھیا بڈھن ان چار پیالوں میں سے ایک میں اچھوانی تھی۔ دوسرے میں خالص دودھ۔ تیسرے میں مرغ کا شوربہ اور چوتھے میں بکری کی یخنی۔ ان تین طشتریوں میں، ایک میں پلاؤ۔ ایک میں میٹھے چاول اور ایک میں تلے ہوئے انڈے تھے۔ روٹیاں بھی غالباً پانچ تھیں۔ خود دیکھ لو ہر پیالہ اور پلیٹ صاف ہے روٹی کا ایک چھلکا تک باقی نہیں ہے۔ اگر دلہن نے نہیں کھایا تو آنا کھانا گیا کہاں؟ میں نے ضد میں آنا زیادہ کھانا رکھوانا شروع کیا ہے۔"

حکیم بڈھن پھٹی پھٹی آنکھوں سے سینی اور خالی برتنوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"چچا معاملہ بے حد پراسرار ہے، سمجھ کام نہیں کرتی۔ آپ ایک کام کریں۔ گھر میں جا کر چچی جان سے یہ کہیں کہ میں اپنے پوتے کو عسکری بھیا کے پاس لئے جا رہا ہوں۔ مجھے جہاں تک یاد ہے عسکری میاں آپکے چچازاد بھائی ہیں اور گاؤں کے اس کنارے پر حویلی ہے۔ یا کہیں اور کا بہانہ کر کے پوتے کو گھر سے ہٹا دیجئے۔ میں بھابی سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں"

نبو صاحب نے کہا "تمہیں ٹھیک یاد ہے حکیم صاحب کہ عسکری بھیا کی حویلی اس کنارے پر ہے۔ میں بہت دنوں سے گیا ہی نہیں ہوں۔ ارے میکو بہل گاڑی جوت دے۔"

تھوڑی ہی دیر میں بہل گاڑی جت کر آگئی اور نبو صاحب پوتے کو گود میں اٹھائے اس پر بیٹھ گئے۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ گاڑی کی روانگی سے دس منٹ کے بعد حکیم صاحب نے ناشتے کا بھی حکم دیا۔ تجن صاحب نے کچی نیند سے اٹھنے کے باعث ناشتہ نہیں کیا تھا ناشتہ آگیا۔ حکیم صاحب وہ سینی لئے ہوئے اندر زنان خانے میں چلے گئے اور تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد واپس آکر بولے۔

"یار میرا جو خیال میں نے قائم کیا تھا وہ تقریباً درست نکلا۔ بھابی کے سامنے جونہی میں نے ناشتہ رکھا وہ مریضوں کی طرح کھانے لگیں جب سیر ہو گئیں تو مجھ سے بولیں۔

"وہ حکیم صاحب میں کچھ بتا نہیں سکتی اور نہ کوئی انہیں ... تم کسی طرح میرے کمرے کے برابر والے کمرے میں بیٹھ کر رات کے وقت اصلاح جانچو کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور خود دیکھ لو ... کردوں تک کہ اسکی خبر نہ ہو یہ خیال رکھنا۔"

میں نے کہا "آخر تفصیل کھل کر نہیں بتائی دلہن نے؟"

وہ بولے "یار بے حد خوفزدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس نے انتہائی سرگوشی میں یہ بات مجھ سے کہی ہے۔"

میں نے کہا "پھر؟"

بولے "اچھا آج ہی آج رات میں اور تم برابر والے کمرے میں جا کر یہ تماشہ دیکھیں گے۔ تمہارے سامنے کہنے کی بھی اجازت لینا ہو گی"

میں خاموش رہا۔ فاعلاتن فاعلاتن والا شخص ان سب باتوں سے گھبراتا ہے۔ اسکی سمجھ میں سوائے ردیف اور قافیے کے کچھ آتا ہے اور نہ آنے کا امکان ہوتا ہے۔ کوئی تقریباً دو گھنٹے کے بعد نبو صاحب اپنے پوتے کے ہمراہ تشریف لائے اور اندر چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا بھی لاجواب تھا۔

کھانے کے بعد ہی حکیم بڈھن اور نبو صاحب دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے تا دیر باتیں ہوتی رہیں۔ میں لیٹ کر طلسم ہوشربا کی ایک جلد پڑھنے لگا۔ نبو صاحب کے پاس پورا کا پورا دفتر تھا۔ شام کو چائے پر بھی حکیم بڈھن نے مجھے کچھ نہ بتایا اور میں نے بھی نہیں پوچھا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ حکیم بڈھن تجن صاحب اور انکے مصاحبین کے ساتھ گپ شپ لڑاتے رہے اور رات کے کھانے کے بعد پھر نغمہ سرائی میں مشغول ہو گئے لیکن مجھ سے اتنا کہہ دیا۔

"سونا نہیں"

میں نے وقت گذارنے کے لئے پھر ہوشربا اٹھا لی۔ تقریباً بارہ بجے محفل برخاست ہوئی۔ سب کے چلے جانے کے بعد مجھے حکیم بڈھن نے اشارہ کیا۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ انہوں نے حویلی کی پچھلی جانب رخ کیا۔ حویلی کی پشت پر ایک دروازہ تھا جو غالباً ملازمین کے لئے تھا دروازے پر خود نبو صاحب کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق ملازمین تک کو خبر نہیں ہے کہ تم آ رہے ہو۔ ذرا دبے پاؤں چلنا"

ہم تینوں دبے دبے پاؤں ایک دالان میں پہنچے اور وہاں سے ایک بغلی دروازے سے ایک کمرے ... پہنچے

بقیہ صفحہ ... پر

اس وقت تک فرحاں نہیں کرتے جب تک وہ اپنی تمام مقدم ضروریات جیسے، کھانا، کپڑا اور مکان کو پورا کرتے رہنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر لیتے۔ یا وہ لوگ بھی قابلِ تعریف ہیں جو اپنی ضروریات کی تسکین کے محدود وسائل رکھتے ہوئے تعلیم و ہنر پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے ہیں تاکہ آج کا خرچہ کل کی مستقل آمدنی بن جائے اور اس وقت پھر اپنی دیگر ضروریات کو آسانی سے پورا کیا جاسکے۔ میں وہ ہوں جس کی ہدایت پر چل کر ایک انسان جائز اور ناجائز اخراجات میں تمیز کرتا ہے اور اپنے گھر میں ہمیشہ کچھ اس طرح کی ہدایت دیتا رہتا ہے کہ دیکھو یہ چیز احتیاط سے خرچ کرنا۔ برسات شروع ہو رہی ہے اس لئے غذا کا اور اسی طرح کی تمام اشیاء کا بندوبست کر لو جو برسات میں ناممکن بن جاتا ہے یا جس کی دستیابی مشکل بن جاتی ہے۔ اس بار اس لڑکے کو اس طرح کی ٹریننگ دلواؤں گا، تاکہ ملازمت میں اسے آسانی ہو۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی میں ہی ہوں جس کی بدولت آپ اپنے گھر والوں کی بیماری پر فکر کرتے ہیں، وقت سے پہلے ہر تقسیم ... فکر مند ہوتے ہیں اور پورا کرنے وقت آگیا ہے کہ ... نہیں ہے جیسے نہ جانے کتنے جملوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اب آپ سمجھے کہ کس طرح میں انسان کے شعور میں رچا بسا ہوں۔

انسان کو چھوڑیے میں تو ہر ذی روح میں موجود ہوں۔ میں آپ کو آپ کے مشاہدے ہی سے سمجھاؤں گا کہ کس طرح میں ہر ذی روح کی طبیعت و طینت میں بسا ہوں۔ آپ نے مکڑی کو جالا بنتے تو دیکھا ہی ہوگا، چیونٹیوں کی لمبی قطار پر نظر پڑی ہی ہوگی اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کس طرح وہ اپنے رزق کا ایک ایک دانا منہ میں احتیاط سے رکھے دیوار پر چڑھتی اور گرتی رہتی ہیں اور یہ بھی آپ کے مشاہدے ہی کی بات ہے کہ گرمیوں میں چڑیاں کس طرح ایک ایک تنکا جمع کرتی ہیں، گھونسلا بناتی ہیں اور کا مناسب ذخیرہ جمع کر کے پرسکون برسات گزارتی ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ مکڑی کی اس نفیس صنعت کاری، چیونٹیوں کی اس فوجی تنظیم اور چڑیوں کی اس دور اندیشی و مستقل مزاجی کے پس پشت کون کارفرما ہے۔ جناب یہاں بھی میری ہی روح کارفرما ہے۔

اس تعارف کے بعد اب آیئے میں اپنی کارگزاریوں کی رام کہانی سناؤں۔ میری یہ رام کہانی آپ کی سرگرمیوں کی داستان ہے، آپ ہی کی کہانی ہے اور آپ ہی کے ماحول میں بیٹھ کر سنا رہا ہوں۔

میرا نصب العین جیسا ابھی آپ نے سنا، عوام کو خوش و خرم اور بلند معیارِ زندگی عطا کرنا رہا ہے جس کا سیدھا تعلق انسان کی ضروریات اور خواہشات کی تسکین سے ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی انسان کو دو وقت کی روٹی جیسی اہم اور مقدم ضرورت کو پورا کرتے نہیں دیکھتے تو فوراً مفلس و غریب کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور اس کا معیارِ زندگی نہایت پست قرار دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب کسی شخص کو اپنی ہر ضرورت و خواہش، جیسے اچھا کھانا، اچھی صحت، اچھی تعلیم، اچھا مکان، عیش و آرام کی ساز و سامان کی فراہمی، وغیرہ کو پورا کرتے دیکھتے ہیں تو فوراً خوشی و خرمی کا طغرہ عطا کر دیتے ہیں، ایک بلند معیارِ زندگی کا حامل قرار دے دیتے ہیں۔ اسی نظریے کو ملک کی نگاہ سے دیکھئے۔ وہ ملک جو اپنے عوام کی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتا غریب ملک کہلاتا ہے، اور جو ہر ضرورت کو مہیا کرنے، زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تسکین کا سامان پیدا کرے ترقی یافتہ ملک کہلاتا ہے۔ امریکہ، روس، جرمنی، جاپان، انگلینڈ وغیرہ اسی لئے ترقی یافتہ ملک کہلاتے ہیں کہ وہ اپنے عوام کی تمام ضروریات کو پورا کرتے رہنے کی طاقت رکھتے ہیں اور اس کے برعکس آپ کا ملک اس لئے غریب ہے کیونکہ وہ اپنے عوام کی تمام ضروریات کو ایک طرف، مقدم اور اہم ضروریات کو بھی پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اور اسی لئے عوام ایک پست معیار زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

الغرض ضروریات و خواہشات کی تسکین ہی خوشی و خرمی اور بلند معیارِ زندگی کا پیمانہ ہے۔ جو شخص جتنی ضروریات و خواہشات کی تسکین پر قدرت رکھتا ہے اس کو اسی قدر غریب یا متوسط یا امیر کبیر کہا جاتا ہے۔ جب ملکی نظر سے دیکھتے ہیں تو پھر اسی قدر غریب یا ترقی یافتہ ملک کہہ دیتے ہیں۔

ہماری تمام سرگرمیوں کے پس پشت چاہے وہ ہر طرح کے کارخانوں کے قیام کی شکل میں ہوں، یا زراعت کی تمام تر ترقی کی شکل میں، چاہے وہ تعلیمی اداروں کے قیام کی شکل میں ہوں یا ریلوں کا جال، بجلی کے دیو ہیکل کھمبے، فولادی بھٹیوں یا ڈیم کی شکل میں ہوں یا اسپتالوں اور سماجی خدمات کے اداروں کی شکل میں ہوں، یہی مقصد چھپا ہوتا ہے کہ عوام اپنی بڑھتی ہوئی خواہشات و ضروریات کو پورا کرتے رہیں اور ایک خوش و خرم زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔

اب ایک بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کی تسکین کیسے کر سکتا ہے؟ انسان اپنی ضروریات و خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وسائل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ایک جانور بھی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے تمام دن شکار کی تلاش میں نکلتا ہے۔ انسان تو ضروریات و خواہشات کا مجسمہ ہے۔ ایک کو پورا کرتا ہے تو دوسری کو جنم دیتا ہے اور یہ سلسلہ اس کی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔

لیکن انسان کے ساتھ ظلم یہ ہے کہ اس کی ضروریات و خواہشات جس تیزی سے بڑھتی ہیں اسی تیزی سے اس کو پورا کرنے کے ذرائع نہیں بڑھ پاتے۔ دنیا میں تمام ہنگامے، تمام گہما گہمی اور تمام زندگی کے آثار بس اسی مقصد کی وضاحت ہی تو کرتے ہیں کہ انسان کس طرح لاتعداد ضروریات و خواہشات کو محدود ذرائع سے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسی لاتعداد ضروریات اور محدود ذرائع کی جدوجہد سے ہی تو ایک انسان میں، ایک ملک میں اور پوری دنیا میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں کہ اگر انسان کے پاس ضروریات و خواہشات نہ ہوں تو پھر ساری دنیا کیسی ساکت و جامد نظر آئے گی۔ اسی طرح جس طرح دن بھر کام کرنے اور رات کو اپنی آخری خواہش کو پورا کر کے ایک انسان سکون سے سو جاتا ہے، اس وقت جو ایک خواہش پوری کرنی نہیں ہوتی اس لئے رات میں کتنا سکوت نظر آتا ہے۔

ہر خواہش اور ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسکا ذریعہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ کھانے کی خواہش پوری کرنا ہے تو غذائی اشیاء پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ تعلیم کی خواہش پوری کرنی ہے تو جب ادارے قائم کرنا ہوں گے۔ گھر تعمیر کرنا ہوگا ہے تو اس سے متعلق تمام ساز و سامان حاصل کرنا ہوگا۔ اس طرح جو خواہش جنم لیتی ہے اس کی تسکین کے لئے مناسب ذریعہ تلاش کرنا ہوتا ہے، اسی کو مختصر میں ہم یوں کہہ دیتے ہیں جو انسان یا جو ملک جتنا پیدا کرتا ہے گویا وہ ضروریات کی تسکین کی ضمانت دیتا ہے۔ اگر کسی ملک کی پیداوار خواہ وہ کارخانوں کی پیداوار ہو یا زراعت کی، سماجی خدمات کی شکل میں ہو یا تمام سہولتوں کی شکل میں، اگر بڑھتی رہتی ہے تو وہ گویا اپنے عوام کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تسکین کا باعث ہوتا ہے، یعنی ہر ممکن پیداوار اور ہر ممکن سہولت کی دستیابی زیادہ سے زیادہ ضروریات کی تسکین کا ذریعہ اور خوش حالی و بلند معیارِ زندگی کا پیمانہ ہے۔

میرا جو نصب العین ہے اسکا مقصد یہی ہے کہ ملک میں پیداوار اور سہولتیں اتنی بڑھ جائیں کہ یہاں کے عوام زیادہ سے زیادہ ضروریات کو پورا کرنے کے قابل بن جائیں۔ میری تمام سرگرمیاں جن کا میں نے ہلکا سا تذکرہ کیا اسی مقصد کے اندر گھوم رہی ہیں،





... کے لئے ... پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مناسب ... مناسب ... رکھتے ہیں اپنے گھر کے تمام افراد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر بڑھانے اور مناسب ... استعمال میں لانے کے لئے ... رہتے ہیں، اسی طرح میں بھی ملک کے وسائل پر نگاہ رکھتا ہوں ... کے مناسب استعمال کا ہر وقت خیال رکھتا ہوں، آبادی ... پر نگاہ رکھتا ہوں اور وقت کی ضرورت کے مطابق دوسرے ... سے بھی مدد لیتا ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح وقت پڑنے پر آپ اپنے پڑوسی سے کوئی چیز مانگ لیتے ہیں۔ آپ کا ملک تو آپ کے گھر کا ایک بڑا روپ ہے اس لئے جو کچھ آپ اپنے گھر کی ترقی و خوشحالی کے لئے کرتے ہیں وہ گویا پورے ملک کی خوشحالی و ترقی کے لئے کرتے ہیں۔ اب اگر آپ اپنے گھر کو خوشحال نہیں بنا سکتا تو ملک کو ... نہیں بنا سکتا۔ جو شخص اپنے اور اپنے گھر کے تمام افراد کی ضروریات کو پورا کرنے کا طریقہ ... کے ذرائع اور تمام ... استعمال میں نہیں لاتا وہ گویا ملک کی پیداوار ... ہیں ... کا نتیجہ ہے ... پریشانی ... کے معیار زندگی کو متاثر کر رہا ہے۔

آپ اپنے ملک کے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ... نے گزشتہ ... برس کے عرصے میں کون کون سی سہولتیں آپ کے لئے پیدا کی ہیں۔

تعلیم کی سہولت موجود، بجلی کی طاقت فراہم ... سڑکیں ... اور ملک ... کا رخانے کھولنے کے لئے ... قرض دینے والے بینک موجود، مناسب ٹریننگ دینے والے محکمے اور کالج دستیاب۔ زراعت کی ترقی کے لئے سہولت ... کی سہولت، ... مشورے کی سہولت، زرعی مشینوں اور ان کو استعمال میں لانے کے سلسلے میں مناسب ٹریننگ دینے والے ادارے وغیرہ سبھی موجود ہیں۔ ان سب کا مقصد یہی ہے کہ آپ ... پیدا کریں، جتنا چاہیں پیدا کریں اور اپنی ضرورت ... ہوئے بلند معیار زندگی گزاریں۔ آپ جتنی پیداوار ... سہولت سے فائدہ اٹھائیے اور ... لیجئے۔

یہ تمام سہولتیں آپ کے لئے ہیں، آپ کی ضروریات ... کے لئے ہیں اور ... بنا کر خوابوں کو حقیقت ... ہیں۔

اور قسم دیتی ہوں آپ میرے بارے میں کوئی بات مت سوچئے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"عارفہ، فضول ہے، سب فضول۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا تم نے میرے لئے جان دینے کا وعدہ کیا تھا آج میں وہی تمہاری جان مانگ رہا ہوں۔ سیدھا۔ کیوں کیا تھا وعدہ؟"

"ماسٹر صاحب میں اپنے وعدے سے پھری نہیں تھی۔" بولی۔

لیجئے میری جان، نکالئے خنجر، کیجئے وار، بے ریوالور تو چلائیے گولی، اگر میں اُف کروں تو تھوکئے میرے منہ پر۔ مگر آپ جو چاہتے ہیں وہ قیامت تک نہ ہوگا۔"

"قیامت دور ہے عارفہ۔ ابھی صرف ۹ بجے ہیں، تین گھنٹے بعد تم خود قیامت بن کر میرے پاس آؤگی اور ضرور آؤگی، تم سونہ سکوگی۔ جاؤ۔"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ہرگز نہیں آؤں گی۔"

وہ روتی ہوئی چلی گئی۔

میں بستر پر دراز اس کا انتظار کرنے لگا۔ شیطان پورا بھرپور وار مجھ پر کر چکا تھا۔ نیک و بد کی تمیز مجھ میں نہ تھی۔ عارفہ کی التجائیں اور اس کے آنسو مجھے متاثر نہ کر سکے، میں اب صرف اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی ایک بج چکا تھا۔ آخر میری قوت ارادی ناپاک ہی، کام کر گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ عارفہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں خاموش لیٹا رہا وہ میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی، وہ رو رہی تھی، میرے سینے پر اس نے اپنا سر رکھ دیا اور سسکیوں میں کہا۔

"تم جادوگر ہو، پتا نہیں تم نے کیا جادو کر دیا ہے مجھ پر میں کل سے ایک لمحے کے لئے سو نہ سکی، کیا ہونے والا ہے پتا نہیں ہے۔ جو بھی ہوگا ہونے دو۔ میں تمہاری امانت ہوں۔"

اس کی آواز ہیجان انگیز اور جوشیلی ہوتی گئی۔

"اٹھو تمہارے احسانوں کا بدلہ چکانے آئی ہوں۔ لے لو اپنے احسانوں کا بدلہ مگر گن کر، پھر شکایت نہ رہے تمہیں۔ لو بدلہ، یہ دیکھو میرے گال، میرے ہونٹ، سینہ، سب تمہارے سامنے ہیں، لو بدلہ، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو لگاؤ۔ نوچ لو بوٹیاں میری۔ بولو اب خون میرا پیوگے۔"

میرا سر گھوم گیا۔ میرا ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے مجھے ملامت کی۔ تف ہے تمہاری زندگی پر جو تم معلم قوم کہلاتے ہو۔ یہ صلہ کر رہے ہو۔ اسی بیکسی کے لرزتے پر تم قوم کے نونہالوں کو سنوارنے اور ان کا مستقبل بنانے کا دعویٰ کرتے ہو۔ تم پیشۂ تدریس کے مقدس دامن پر ایک بدنما داغ ہو کیا ایک شریف بیوہ اور بے کس عورت پر ظلم کرنا مردانگی ہے۔ اس ناپاک خیال کے دل میں آنے سے قبل موت کیوں نہ آ گئی تمہیں۔ کیوں ایک غریب کی زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو کیا اسی لئے تم نے اسے پڑھایا کہ وہ آئندہ ویشیا بن کر سوسائٹی کے لئے ناسور بن جائے اور اس معصوم انسان کا مستقبل تاریک ہو جائے۔ سنبھل جاؤ اب بھی وقت ہے ورنہ یاد رکھو دنیا کبھی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔"

"کیا دیکھ رہے ہو" عارفہ نے جھنجھوڑ کر کہا۔ "اٹھو دیر کیا ہے۔ بجھا لو پیاس۔ پوری کر لو اپنی ناپاک خواہش۔"

اس نازک لمحے میں میرے ضمیر نے مجھے سنبھال لیا۔ اس ایک لمحے میں اگر ضمیر نے مجھے سنبھالا نہ دیا ہوتا۔ آج میں عارفہ کو اپنا منحوس چہرہ دکھانے کے قابل نہ ہوتا۔ کیا وہ مجھے معاف کر سکتی تھی۔ میں اٹھا میرا لہجہ ندامت سے بھرپور تھا۔

"عارفہ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے نفس کے ہاتھوں ایک بار چکا تھا، شیطان مجھ پر تسلط پا چکا تھا۔ واقعی میں بہت کمینہ ہوں۔ عارفہ مجھ سے زیادہ کر بدبخت اور کمینہ کون ہوگا۔ میں نے تمہارا دل دکھایا، میں نے تمہارے خلوص کو ٹھکرایا مجھے معاف کر دو عارفہ۔ میری۔ بہن۔"

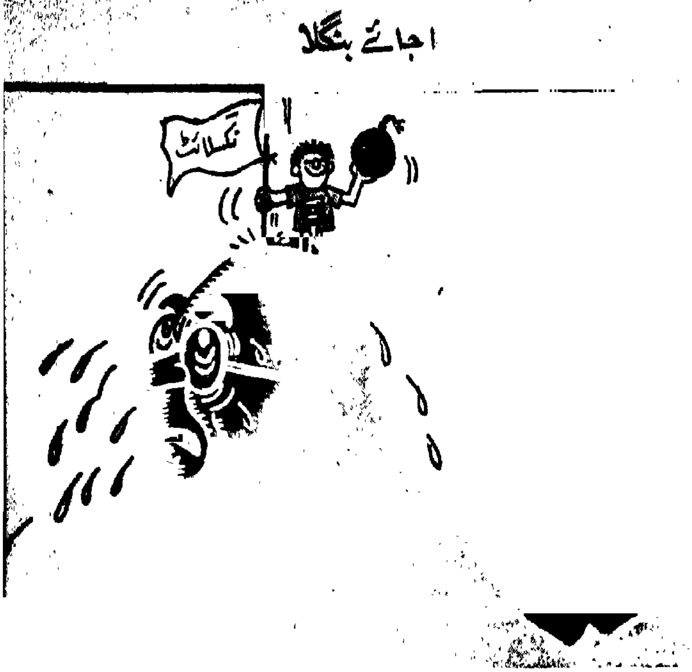
میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ حیرت سے اس نے میری طرف دیکھا، میری اس اچانک تبدیلی پر اس کی حیرانی بالکل بجا تھی۔ میں نے پھر کہا۔

"بہن یقین کرو میں اب وہ مقبول نہیں رہا۔ تم نے میری زندگی بدل دی ہے، تم نے مجھے نیکی کا راستہ دکھایا ہے اور میں تمہارا احسان مند ہوں۔ خدا را میری غلطی کو معاف کر دو معاف کر دو بہن۔"

"بھیا" اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر کمرے سے بھاگ گئی۔

"دوست یہی وہ ایک لمحہ تھا جس نے مجھے حیوان بننے سے روک لیا، یہ لمحہ میرے لئے یادگار ہے۔"

جب ہم اورینٹ ہوٹل سے اٹھے تو میں متاثر ہوا تھا یہ قصہ سن کر، مقبول کے چہرے پر ... رہی تھی، مصیبت یہ آن کا ملازم ہوا گر میں نے اس کی ... اور بے ساختہ پیشانی چوم لی۔



نکسلیوں نے بنگال میں اپنی تحریک کی دوسری سالگرہ منائی

جو صاحب نے کہا "اسکے بعد پورے کمرے کو دیکھا ہے
حسن نے ایک گمشدہ اینٹ نکالی ہے۔ اس وقت دلہن بیچ کر
لئے ہوئے تھی۔ بچی کے پاس بیٹھی تھیں کسی کو کانوں کان
خبر نہیں۔ وہ اینٹ یہ ہے جو میں نے محض رضا کو پکڑ کر نے
کیلئے پھینکی ہے۔ میں دیوار گیری کا لیمپ بجھا کر جانا چاہتا ہوں۔ فقط"
نجو صاحب کے جاتے ہی لیمپ بند ہو گیا۔ پچھلا جب
سنانے لگا۔ ابھی کچھ دیر ہونے کے باعث مجھے اختلاج سا
محسوس ہونے لگا۔ اتنے میں حکیم بدھن نے آہستگی کیساتھ
وہ اینٹ کھسکائی اور سیدھا ہاتھ پکڑ کر میرا منہ اس سوراخ
کے پاس کر دیا۔ میرے برابر ہی حکیم بدھن بھی دیکھ رہے
تھے کہ اینٹ سے پیدا شدہ خلا کافی تھا۔

میری نظر کے سامنے ایک کمرے کا منظر تھا جس میں دو
پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ ایک پر اچھے نقوش کی دبلی پتلی عورت
بیٹھی تھی۔ سہمے سہمے انداز میں دوسرے پلنگ کی جانب دیکھ
رہی تھی جس پر تنجی کا بچہ سویا ہوا تھا۔ پلنگ سے ملے ہوئے ایک
تخت پر ایک بڑی سی سینی رکھی ہوئی تھی۔ اندر کے دیوار گیری
لیمپ کی روشنی میں پورا کمرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

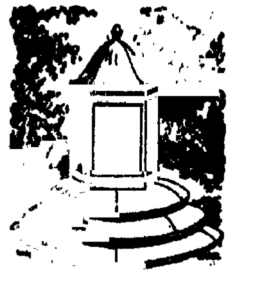
یکایک پلنگ پر لیٹے ہوئے بچے نے لوٹنا شروع کیا۔
عورت خوف کے مارے ایک طرف دبک گئی۔ وہ لڑکا لوٹتے
لوٹتے ایک بھیانک قسم کے سیہ فام بندر نما انسان میں تبدیل
ہو گیا۔ جس کے دو دانت بڑے ڈراونے انداز میں باہر کو نکلے ہوئے
تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس سینی کو کھولا اور یکے بعد دیگرے
ایک ایک چیز کو کھانے لگا۔ اسکے منہ سے نکلنے والی چپڑ چپڑ کی
آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ اسکا عالم یہ تھا کہ ایک
پیالے کا سالن کھانا کھا کر اسکو زبان سے صاف کر دیتا تھا
یہاں تک کہ وہ سارا کھانا کھا گیا۔ میں اور حکیم بدھن دم سادھے
ہوئے اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہے تھے۔ کھانا کھا
چکنے کے بعد اس نے دانت نکال کر عورت کو جھپکی دی۔ عورت
ٹھٹک کر اور بھی کنارے ہٹ گئی۔ اس نے پھر لوٹنا شروع کیا یہاں
تک کہ اسکی شکل ایک بچے کی سی ہو گئی اور وہ سوتا ہوا
معلوم ہونے لگا۔ عورت نے گھبرا کر پاس رکھا ہوا
پانی اس الٹے پلنگ پہ ڈالا پانی سے اسکے اعصاب
پر جو اثر ہوا حقیقت کہ اسکے اڑے
بستر بھی گیلا ہو گیا۔ وہ پلنگ پہ بچے کی
طرح لیٹ گیا۔ حکیم بدھن نے وہ اینٹ اس جگہ

پر جھکا دی اور مجھے کان میں کہا۔
"یہ کام ہو گیا"
مجھے تو راستہ یاد نہیں تھا حکیم بدھن نے رہنمائی کی اور
جب ہم صحن کے پچھلے دروازے پر پہنچے تو نجو صاحب بیٹھکر

چھوٹتے ہی انھوں نے پوچھا۔
"کیسا رہا بدھن؟"
حکیم بدھن نے کہا "سمجھ کام ہو گیا" میں نے سوچا تھا
تقریباً آدمی نکلا۔ کل صبح انشاء اللہ تمھیں سب پتہ ہو گی۔
(باقی آئندہ)

دلچسپ و عجیب

حساس بچے۔

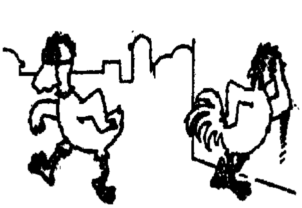


انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کا مقبرہ۔

۳۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو انگریزی کے ایک رسالے میں خبر شائع ہوئی کہ بائرن کے کتے کی قبر پر ایک بہت عمدہ مقبرہ بنا ہوا ہے جبکہ لارڈ بائرن کی قبر معمولی سی ہے۔

انگلینڈ کے کچھ اسکولی بچوں کو یہ بات بہت بری لگی اور انھوں نے اپنے طور پر چندہ جمع کر کے بائرن کی قبر پر بہت عمدہ مقبرہ بنوا دیا۔

پردہ نشین مرغیاں۔



مراکش کے ایک گاؤں میں مرغیوں کو مرغوں کی نظر سے بچانے کے لئے وہاں کے لوگ مرغیوں کو نقاب پہنا دیتے ہیں۔ یہ بے چارے مرغے دن رات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے۔

۱۸۵ بچوں کا کنوارا باپ۔



جوان وسنٹے گومیز ۲۷ سال تک وینی زویلا کا ڈکٹیٹر رہا (۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۵ء تک) اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جیسا ظالم آدمی نہ تو کبھی پیدا ہوا اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہوگا۔ حالانکہ وہ ساری زندگی کنوارا رہا اس کے باوجود خود اس کا کہنا تھا کہ وہ ۱۸۵ بچوں کا باپ ہے۔ ملک کی ہر چوتھی عورت کم از کم ایک رات اس کی خلوت گاہ میں ضرور گزار چکی تھی۔

جن کو زنداں کی [illegible] کی طرح
خون میں ڈوبے ہوئے دل پہ [illegible]
اب ابھرنے ہیں تو ویران جزیروں کی طرح
زلف و رخسار کی خلوت میں کبھی رہ رہ کے
ہم تڑپے ہیں اکثر [illegible] کی طرح
وہ ترا غم ہو ترا پیار کہ یادیں تیری
دل میں ہر چیز ہے محفوظ خزینوں کی طرح
اس کو زنداں کے مصائب سے ہراساں نہ کرو
جو گلستاں میں بھی رہتا ہے اسیروں کی طرح
اب ترا پیار بھی جن کو نہ مٹا پائے گا
دل پہ وہ داغ ہیں ہاتھوں کی لکیروں کی طرح
ہم نے ہر دور کے ہونٹوں کو تبسم بخشا
خاک ہو کر بھی چمکتے رہے ہیروں کی طرح

ناوک حمزہ پوری

گلشن ہے شعلہ شعلہ بیاباں ہے آگ آگ — یوں کس ستم ظریف نے کھیلا ہے اب کے پھاگ
شعلے لپک رہے ہیں شبستانِ عشق میں — دستِ ہوس نے لوٹ لیا حسن کا سہاگ
منہ پر ہے رام رام ، ہے زیرِ بغل چھری — ہے ان کے قول و فعل میں ربطِ ازل سے لاگ
چاروں طرف ہے زہر کا دریا رواں دواں — ہر سمت ہے دھواں دھواں ہر سو ہے آگ آگ
تاراج شہرِ مہر و مروت ہوا ہے یوں — ایثار بے نشان ہے ، عنقا ہے اب تیاگ

کب کی ہوئی ہے صبح نکل آیا آفتاب
ناوک نہیں ہے وقت یہ سونے کا اب تو جاگ

قطعات

غزل

اختر بستوی

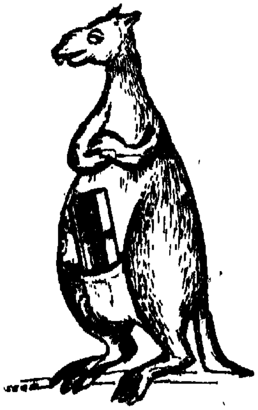
دور ہے منزلِ تطہیرِ محبت اب تک
ذہن میں اب بھی چھپا بیٹھا ہے احساس گناہ
یوں بھی جاتا ہے تری سمت ابھی میرا خیال
جیسے بک جائے کسی جانب ہوس آلود نگاہ

حسنِ فطرت سے نکھر جاتا ہے حسنِ اجسام
رنگِ رخسار کو کرتا ہے فزوں رنگِ چمن
چاندنی سحر طرازی کا سبب بنتی ہے
تیری آنکھوں میں ہوا کرتی ہے جب عکس فگن

[illegible] شعور کی تخریب بھی بن جائے گی
حسن تا فیلڈ کی آرائش و زینت کی ہنا
[illegible] کرتے ہیں [illegible]
[illegible]

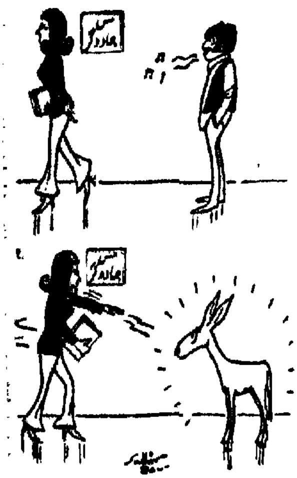
ہم گشتگانِ ظلمتِ شب دیکھتے رہے
نورِ سحر کو شکل بہ لب دیکھتے
کھلتے رہے جہاں پہ رموزِ حیاتِ نو
خاموش ہم مآلِ طرب دیکھتے
ہے آج پہلا کہ تحریکِ ربطِ شوق
پیہم اضطرابِ دل کا سبب دیکھتے
ہے کون شکوہ سنجِ غمِ روزگار آج
یہ ناقدانِ نامِ ادب دیکھتے
کیسا ستم ہوا ہے زمیں اہلِ درد پہ
سوئے فلک سیر [illegible]
وحشت کے بعد کوئی بھی [illegible]
ناوک [illegible]

July 1981
(FIRST HALF)
WAQIAT
REGD. NO. D
TELEPHONE :





جلسہ میں لوگوں کی کمی فیملی پلاننگ کی وجہ سے ہے۔





"منسٹر صاحب جب کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو ایک آدھ ہفتے کی چھٹی لے لیتے ہیں۔"






NEW DELHI
نئی دہلی

اردو [illegible]

یہ گماں تھا کہ ترے واسطے پیاری اردو — تری تعظیم بھی عزت کی علامت ہوگی
اور ہوگا ترے اوصاف دروں کا چرچا — تری جانب نگراں چشم حکومت ہوگی

یہ تصور تھا کہ ارباب وطن کے وعدے — شاید اس بار صداقت کے پیامی ہونگے
یہ تخیل تھا کہ نفرت کے پرانے قصے — بھول کر پیار و محبت کے پیامی ہونگے

یہ یقیں تھا نئے انصاف پسند دیش پرست — تجھ کو بخشیں گے ترا گمشدہ عالی منصب
یہ توقع تھی بدلتے ہوئے کہنہ تیور — تجھ کو دیدینگے زبانوں میں خالی منصب

پر حسیں خواب کی تعبیر حسیں مل نہ سکی — خاک میں مل گیا معصوم امنگوں کا شباب
تری قسمت تجھے انصاف کہیں مل نہ سکا — ترے گلزار میں کھلتے رہے کانٹوں کے گلاب

تری الفت کے وہ جن تھے تو الیکشن کیلئے — تری تقدیر تو منظور نظر ہو نہ سکی
تو وہ بیوہ ہے کہ ارباب سیاست کیلئے — اک کھلونا تو بنی پیار نگر بن نہ سکی

باعث ناز تھی چکبست[1] و فراق[2] کی لیکن — چشم ہندو نے اسے آج مسلماں سمجھا
جس کی ناموس کے نگراں تھے ہنود و مسلم — آج صد حیف اسے بغض کا عنوان سمجھا

جن کے ہاتھوں میں ہو لاریب ترقی و بقا — تنگ دل تنگ نظر ہوں تو بچے گی کیسے
اپنے ہی دیس میں ارباب عنایت کے طفیل — زہر کے جام ملینگے تو پیئے گی کیسے

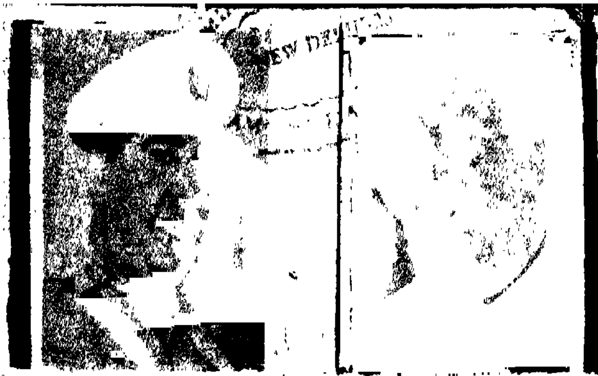
[1] برج نارائن چکبست لکھنوی اردو کے معروف شاعر۔ [2] نوبت رائے نظر اردو کے قابل قدر ادیب و شاعر۔

غزل

وصی سیتاپوری

ایک خوشبو ترے دامن کی ہوا لگتا ہے — ہر شے میں آنے کا انداز نیا لگتا ہے
عاشق صبر طلب ہو گی کبھی سنتے ہیں — [illegible] کا پھولوں کی قبا لگتا ہے
تجھ سے ہی ایک محبت کی [illegible] — [illegible]
دل [illegible] — [illegible]
دست گل [illegible] — [illegible]
فصل گل [illegible] — [illegible]
[illegible]

باغی اور غدار کون ہے؟



بانگلادیش کی تحریکِ آزادی کو اب دو ماہ ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں وہاں فوج کے ہاتھوں جو قتلِ عام ہوا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ بعض مبصروں کے اندازے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دس لاکھ تک پہونچ گئی ہے اور بعض کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ہے۔ تعداد جتنی بھی ہو یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ اپنی آزادی اور خودمختاری کے بارے میں بنگالیوں نے جو کچھ کہا تھا اُسے کر دکھایا اور فوج کے ہاتھوں عوام کا قتلِ عام ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکا۔

بنگالی عوام کے اس قتلِ عام پر پاکستان نے پہلے پردہ ڈالنے کی کوشش کی، اخباری نمائندوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور خبروں پر سنسر لگا دیا۔ لیکن اب جبکہ دنیا پاکستانی فوجوں کے مظالم سے واقف ہو گئی ہے اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ نہتے بنگالی عوام کس طرح امریکی اور چینی ہتھیاروں کا نشانہ بنایا گیا، تو اس نے سارے الزامات بنگالیوں پر تھوپنا شروع کر دیے کہ انھوں نے پہلے غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع کیا تھا اور اس کے جواب میں فوج کارروائی کرنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔

پاکستانی فوجی حکمرانوں کا یہ عذر "عذرِ لنگ" سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اولاً اسلئے کہ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بات چیت کے اختتام تک مشرقی بنگال میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی خبر سامنے نہیں آئی اور ثانیاً اس لئے کہ کسی ایک برائی کو دوسری برائی کے لئے وجہِ جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر بالفرض کچھ بنگالی چند غیر بنگالیوں کے قتل کے ذمے دار بھی ہوں تو یہ کہاں کا انصاف ہے ان کی غیر دانشمندانہ حرکت کی وجہ سے دوسرے بے گناہ لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے اور اتنے بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا جائے کہ دنیائے انسانیت کانپ اٹھے۔

بانگلادیش کے حریت پسندوں کی اگر مکتی فوج میدان میں آئی تو محض مجبوراً آئی ورنہ شیخ مجیب الرحمٰن اس تحریک کو عدم تشدد کی بنیاد پر شروع کرنا چاہتے تھے لیکن پاکستانی فوجوں کے جبر زیادہ تشدد نے ... مرتا کیا نہیں کرتا کے اصول پر بنگالی عوام کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا اور وہی بنگالی جنھیں فوج کے لئے نااہل سمجھا گیا تھا ہتھیار بند ہو کر سامنے آ گئے۔

انکی گوریلا جنگ کی تفصیلات روزانہ اخبارات میں آ رہی ہیں۔ گھات لگا کر پاکستانی فوج پر حملے کرنا۔ ریل کی پٹریوں کو اکھاڑنا اور ریلوں کو تباہ کرنا، حمل و نقل اور مواصلاتی نظام کو خراب کرنا اور اسی قسم کی دوسری رکاوٹیں کھڑی کرنا ان کا روزانہ کا معمول بن گیا ہے۔ بظاہر یہ اچھی باتیں نہیں ہیں کیونکہ یہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے ملک کی معیشت کو تباہ کرنا ہے، لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ملک کی معیشت تو اسی دن تباہ ہو گئی تھی جس دن صدر یحییٰ خاں کے حکم سے جنرل ٹکا خاں نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تھی۔ اور عوام کے خلاف فوجی کارروائی شروع کی تھی۔

اس وقت مشرقی بنگال کے لوگ اپنی ہر چیز کو بھول گئے ہیں اور انھیں صرف اپنی آزادی اور خودمختاری کی بات یاد رہ گئی ہے۔ اپنی آزادی اور خودمختاری کے لئے انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا تہیہ کر لیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آزادی اور خودمختاری ہی انکی زندگی کی بنیاد ہے۔

ان کے اس عزم و ارادے نے انھیں دلیر بنا دیا ہے اور اپنے دیش کو آزاد کرانے کے لئے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔

پاکستان کے فوجی حکام ان حریت پسندوں کو غدار، باغی اور تخریب کار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہر حکمراں اپنے مخالفین کو اسی قسم کے ناموں سے پکارتا ہے، لیکن اگر جمہوریت کے معنی ایسی حکومت کے ہیں جو عوام کے ذریعے منتخب ہوئی ہو اور وہ عوام سے حاصل کردہ اختیارات کے تحت عوام کے لئے کام کرے تو حقیقت میں ایسی حکومت وہ ہے جس نے شیخ مجیب الرحمٰن کو صدر مان کر چند روز قبل مجیب نگر کے آم کے ایک باغ میں حلف لیا تھا، اور غدار وہ ہیں جو اس حکومت کے وفادار نہیں ہیں اور جو اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر عوامی حکومت کے اختیارات کو غصب کئے ہوئے ہیں۔

دراصل عوام کی اکثریت کے منتخب کردہ نمائندوں کو اختیارات منتقل نہ کرنا اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہی آئینی اور جمہوری حکومت سے بغاوت اور غداری کرنا ہے، اور روزِ روشن کی طرح واضح حقیقت سے کوئی خیرہ چشم ہی انکار کر سکتا ہے کہ انتخابات میں پاکستانی عوام کی اکثریت نے شیخ مجیب الرحمٰن اور انکی پارٹی کی عوامی لیگ کو پاکستان کی زمامِ حکومت سونپ دی اور آئینی طور پر انھیں پورے پاکستان کا سربراہ بنا دیا۔ ایسی حالت میں شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کو باغی، غدار اور شرپسند کہنا ڈھٹائی اور زیادتی کی نہایت گھناؤنی مثال ہے۔ یقیناً ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا گیا ہے کہ

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

ہندوستان میں اگر حریت پسندوں کی حکومت کے لئے ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ وہ عوامی حکومت ہے اور اسے پاکستانی عوام کی اکثریت کا پوری طرح اعتماد حاصل ہے۔ اسی لئے عمومی طور پر مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس حکومت کو تسلیم کیا جائے تاکہ بانگلادیش کی عوامی اور جمہوری حکومت کی کھل کر امداد کی جا سکے۔

وزیرِ اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے حالیہ بیانات اس

باقات ذہنی وطن

میں صرف خدا، اپنے عوام اور صرف اپنے سامنے جواب دہ ہوں ۔ سادات

راجرس کا دورۂ مشرق وسطی

امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس اپنی پوری پارٹی کے ساتھ آئے مشرق وسطی کے پانچ ملکوں کا دورہ کر کے واپس چلے گئے۔ ان پانچ ملکوں میں متحدہ عرب جمہوریہ، سعودی عرب، اردن، اسرائیل اور لبنان شامل تھے۔ ہر جگہ ان کا شاندار استقبال ہوا اور شاہ اردن نے خود اپنی گاڑی چلا کر انھیں عمان کی سیر کرائی۔ صرف لبنان میں ان کے خلاف مظاہرہ ہوا لیکن یہ بہت معمولی مظاہرہ تھا۔ شاید اس لئے کہ حکومت کی طرف سے وارننگ دی گئی تھی کہ ہنگامہ برپا کرنے والوں کو موقع پر ہی گولی مار دی جائے گی۔

اس کے علاوہ بیروت میں صورت حال ایسی دوستانہ تھی کہ مسٹر راجرس لبنانیوں کے ہجوم میں بالکل گھل مل گئے اور انھوں نے ایک جگہ بیٹھے ہوئے نوجوان سے اپنے جوتے پر پالش کرائی۔

متحدہ عرب جمہوریہ کے ساتھ امریکہ کے سفارتی تعلقات نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں کی فضا بڑی دوستانہ تھی۔ راجرس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔

اپنے اس دورے کے بعد مسٹر راجرس نے خود محسوس کر لیا کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور دوسرے عرب ممالک تنازعہ کو طے کرنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں اور ان کا رویہ واضح اور لچکدار ہے جبکہ اسرائیل کا رویہ بہت سخت ہے۔ انھوں نے اسرائیل کی امور خارجہ سے متعلق کمیٹی کی طرف سے دیئے ہوئے ایک لنچ میں صاف کہہ دیا کہ اسرائیلی کابینہ کی پالیسی "بے لوچ" ہے۔ یہی نہیں بلکہ وضاحت کی کہ "مصریوں نے اپنی پالیسی بالکل واضح کر دی ہے جبکہ اسرائیلی حکومت کی پالیسی غیر واضح ہے۔"

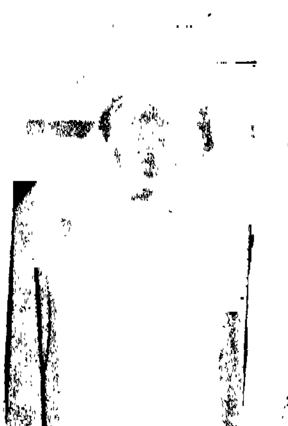
انھوں نے اسرائیلیوں کو خبردار کیا کہ وہ "محفوظ و تسلیم شدہ" سرحدوں کی جو رٹ لگا رہے ہیں۔ وہ دوسروں کیلئے "غیر محفوظ" ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انھیں چاہیئے کہ وہ اپنی پالیسی میں لچک پیدا کریں تاکہ سمجھوتہ کی کوششوں میں پیش رفت ہو سکے۔ انھوں نے اسرائیلیوں کی یہ بات تسلیم کی کہ "امن کے لئے رضامند ہونے میں خطرات ہیں" لیکن ساتھ ہی انتباہ کیا کہ "رضامند نہ ہونے کی صورت میں اس سے بھی زیادہ خطرات موجود ہیں۔"

راجرس کے اس دورہ کا مقصد اگرچہ عمومی طور سے سمجھوتہ کے لئے مناسب فضا پیدا کرنا تھا لیکن خاص طور

انور سادات

آهنی انسان

ناصر کی وفات کے بعد ۵۳ سالہ انور سادات نے ابھی عہدۂ صدارت سنبھالا ہی تھا کہ ولیم راجرس (وزیر خارجہ امریکہ) نے مشرق وسطی کے ایک ماہر سے دریافت کیا "یہ عجیب شکل وشباہت کا کس قسم کا شخص ہے؟" دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا جواب انہیں اس وقت ملا جب خود انہوں نے مشرق وسطی کا دورہ کیا۔ مصری عوام بھی اس کی شخصیت سے زیادہ متاثر نہ تھے۔ طبقۂ امراء میں تو ان کے گہرے رنگ کا کبھی کبھی مذاق بھی اڑایا گیا۔ ان کی والدہ سوڈانی ہیں۔ لیکن ان کا رنگ کیسا ہی ہو انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بڑے آہنی انسان ہیں۔ انہوں نے مصریوں ہی سے نہیں ساری دنیا سے اپنی شخصیت کا لوہا منوا لیا۔



سادات ۔ نماز پڑھتے ہوئے

وہ بڑے صابر و شاکر اور خدا پرست ہیں۔ بڑے نمازی ہیں جس کی شہادت ان کی پیشانی کے گٹے سے ملتی ہے۔ ایک زمانہ میں انہیں اسلامک کانگریس کا سکریٹری جنرل بھی بنایا گیا تھا۔

ان کی بڑی خوشگوار گھریلو زندگی ہے۔ انکی پہلی بیوی ڈیلٹا والے گاؤں ہی میں رہتی ہے جس سے بیس سال سے اوپر کی تین لڑکیاں ہیں اور سب شادی شدہ ہیں۔ انکی دوسری اینگلو مصری بیوی جہاں آرا تین لڑکیوں اور ایک لڑکے (جمال) کی ماں ہیں، وہ ان ہی کے ساتھ قاہرہ میں رہتی ہیں

مشرقی کنارے پر مصر کے قبضہ کے بعد بھی نہر سویز کھولی جاسکتی ہے

سے شرم الشیخ اور نہر سویز کی واگذاری کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ شرم الشیخ بحر احمر کی کلیدی چوکی ہے اس اہم مقام پر اسرائیل اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ خلیج عقبہ پر اس کا کنٹرول رہ سکے جبکہ متحدہ عرب جمہوریہ اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اسی طرح نہر سویز کا معاملہ ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ نہر سویز کے مشرقی کنارے کا دعویدار ہے۔ اور اپنے اس مطالبہ پر قائم ہے کہ اسرائیلیوں کے پیچھے ہٹنے اور مشرقی کنارے پر مصر کی حفاظتی فوجوں کے پہنچ جانے کے بعد ہی نہر کو کھولا جاسکتا ہے۔ اسکے علاوہ اسے کھولنے کی کوئی اور شکل نہیں لیکن اسرائیل کا مطالبہ ہے کہ اسرائیلیوں کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد بھی مصری فوجیں مشرقی کنارے پر نہیں آسکتیں۔ وہ امریکہ سے اس بات کا صریح وعدہ لینا چاہتا ہے کہ اگر مصریوں نے نہر سویز سے متعلق سمجھوتہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی فوجیں اور مزائل مشرقی کنارے پر پہنچا دے تو امریکہ اس کی مدد کرے گا۔

مسٹر راجرس نے اسرائیلی لیڈروں سے باتیں کیں اور آخر میں ایسا ظاہر ہوا ہے کہ اسرائیلی اس بات کے لئے رضامند ہیں کہ مصر اپنے ایک معمولی پولیس فورس کو نہر پار تعینات کردے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ایک بین الاقوامی فورس سے متعلق سمجھوتہ کے لئے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ فوج اس علاقہ میں امن قائم رکھنے کیلئے تعینات کی جائے گی مسٹر راجرس کا اسرائیلیوں کے اس طرز عمل سے اتنا حوصلہ بڑھا کہ انھوں نے اپنے نائب مسٹر جوزیف سسکو کو دوبارہ قاہرہ بھیجا تاکہ اسرائیلی تجاویز سے انور سادات کو باخبر کیا جاسکے۔

مشرقی وسطیٰ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اگرچہ ابھی بہت سے مسائل سامنے آئیں گے اور بہت سی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ لیکن ڈپلومیٹک دنیا میں فریقین کی پالیسیوں میں معمولی تبدیلی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس لحاظ سے مسٹر راجرس کہہ سکتے ہیں کہ ان کا دورہ کامیاب رہا لیکن شاید مسٹر راجرس کو مشرق وسطیٰ کا دورہ کرنے اور اسرائیلی لیڈروں سے خود آکر بات چیت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کی ایک معمولی سی وارننگ بھی اسرائیلیوں کے نخرے ڈھیلے کرسکتی ہے اس لئے کہ یہ امریکہ ہی ہے جس کے بل بوتے اسرائیل کود رہا ہے اور اپنی پالیسی بدلنے میں لیس و پیش ہے۔ امریکہ اگر آج اسرائیل کی امداد بند کردے تو دوسرے ہی دن اسرائیل کو عالمی رائے عامہ کے ٹھکرانے کی جرأت نہ ہوگی۔

متحدہ عرب جمہوریہ میں "انقلاب"

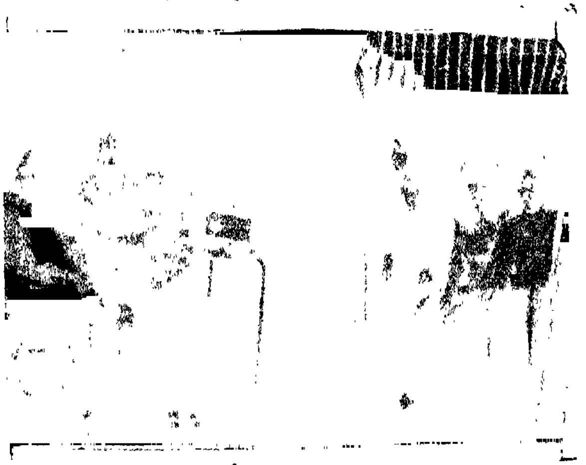
ایک طرف مسٹر راجرس مشرق وسطیٰ کا دورہ کررہے تھے۔ اور دوسری طرف متحدہ عرب جمہوریہ میں سنسنی خیز اقدامات کئے جارہے تھے۔ مسٹر راجرس کی آمد سے صرف دو روز قبل مسٹر علی صبری نائب صدر کو ان کے عہدہ سے

کی عمر ۶۴ برس ہے۔

سادات بڑے اعتدال پسند سمجھے جاتے تھے لیکن اپنے آٹھ وزیروں کو جس طرح انہوں نے سبکدوش کیا اس سے ان کے آہنی ارادوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جس دن انہوں نے یہ اقدام کیا، ان کی بیوی کی سالگرہ اور ان کی بیٹی کی شادی کی سالگرہ کی تقریب تھی جسے انہوں نے ملتوی کردیا۔ شاید وہ قبل از وقت اقدام کرنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے۔

دراصل خود ان کی صدارت خطرہ میں تھی۔ دو ہفتہ قبل وزیر داخلہ نے ایسا جال پھیلایا تھا کہ سادات ریڈیو پر تقریر نہ کرسکیں۔ وہ ریڈیو اسٹیشن گئے جہاں سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس مین تعینات تھے۔ سادات نے تقریر کا پروگرام منسوخ کرکے مخالفین کی اسکیم فیل کردی۔ اور اس کے بعد ایسا بھرپور وار کیا کہ ان کے تمام نکتہ چین رو دیئے۔ انہوں نے اپنی حیثیت کو منوالیا۔

ناصر کے بعد بلاشبہ متحدہ عرب جمہوریہ کو ایک بہت بڑے سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن اس بحران کے نتیجہ میں سادات کی جو مضبوط و با اثر شخصیت ابھری ہے اس سے یقین ہے خود مملکت کو استحکام ملے گا۔ اور اسرائیل کی یہ خوشی محض عارضی ثابت ہوگی کہ مصر کے داخلی انتشار سے عربوں کا محاذ کمزور ہوگیا ہے۔



اپنے خاندان کے ساتھ

[illegible]

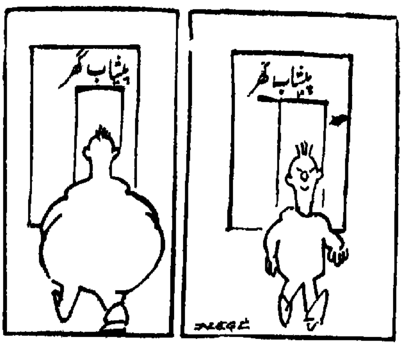
[illegible] ہو گیا اور جب راجرس کا دورہ ختم ہو گیا تو مسٹر صبری کے دوسرے متعدد ساتھیوں کو نہ صرف یہ کہ ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا بلکہ انھیں جیل میں ڈال دیا گیا ان میں وزیر داخلہ مسٹر شعراوی جمعہ، قومی اسمبلی کے اسپیکر مسٹر لبیب شقیر اور دوسرے وزرا اور اعلیٰ فوجی افسران شامل ہیں مسٹر علی صبری کے متعلق مشہور تھا کہ وہ روس نواز ہیں اور امریکہ سے بات چیت کرنے تک کے روادار نہیں جبکہ مسٹر سادات میں ایک طرح کی لچک پائی جاتی ہے اور مشرق وسطیٰ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے امریکی مخالفت کم کرنے کے حق میں ہیں۔ اسی لئے پہلے دن جب مسٹر صبری اپنے عہدہ سے الگ کئے گئے تو یہ محسوس کیا گیا کہ مسٹر راجرس کے دورے کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے۔ تاکہ بات چیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن بعد کو خود مسٹر سادات کے بیان سے ظاہر ہوا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ انور سادات کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی منظم سازش کی گئی تھی جس کے سربراہ مسٹر علی صبری تھے۔

دراصل مسٹر صبری کے دل میں مسٹر سادات کیلئے اس وقت سے مخالفانہ جذبات موجود تھے جب ناصر کے بعد ان کو صدارت کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ناصر کے زمانہ میں دونوں نائب صدر تھے اور دونوں ہی صدارت کے لئے اُمیدوار تھے۔ انور سادات کامیاب ہو گئے اور صبری ناکام ہو گئے۔ اور اس کے بعد کوئی ایسا موقع نہ آیا کہ جو مخالفانہ جذبات ان کے دل میں تھے انھیں وہ ظاہر کر سکیں۔ مصر، لیبیا، اور سوڈان کے مجوزہ فیڈریشن کے قیام سے متعلق بات چیت کے دوران انھیں یہ موقع مل گیا اور عرب سوشلسٹ یونین کی ۱۵ ممبروں پر مشتمل سینٹرل کمیٹی کے بھرے جلسے میں انھوں نے اپنے صدر کی مخالفت کر ڈالی۔ وہ انور سادات سے پوچھنے لگے کہ "اس فیڈریشن کے لئے رضامند ہونے کے لئے آپ کو کس نے اختیار دیا تھا"۔ جلسہ کی کارروائی کی تفصیلات سامنے نہیں آئیں لیکن ایسا معلوم ہوا کہ جلسہ میں کافی [illegible] ہوئی اور سادات محفل کا رنگ دیکھ کر خاموش ہو گئے لیکن جب پانچ دن بعد حلوان شہر میں یوم مئی کی ایک تقریب میں تقریر کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے مسٹر علی صبری کو نظر انداز کر دیا۔ جو جلسہ میں دوسرے ممتاز اشخاص کے ساتھ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ سادات نے نہایت غصہ میں جیسے کہ انکی پیلی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں، حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا "میں صرف خدا، اپنے عوام اور خود اپنے سامنے جوابدہ ہوں"۔ یہ گویا مسٹر علی صبری کے ان سوالات کا جواب تھا جو انھوں نے عرب سوشلسٹ یونین کے جلسہ میں اٹھائے تھے۔ دوسرے ہی دن انھوں نے مسٹر علی صبری کو ان کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ مسٹر صبری عرب فیڈریشن کے اس لئے خلاف تھے کہ اس قسم کا تجربہ اس سے قبل جب شام و مصر کا الحاق عمل میں آیا تھا ناکام ہو چکا ہے علاوہ ازیں فیڈریشن میں لیبیا کی شمولیت انھیں اس لئے بھی ناپسند تھی کہ وہاں کے سربراہ معمر القذافی ایک قدامت پسند مسلمان ہیں جو کمیونزم سے نفرت کرتے ہیں۔ اختلاف کی یہ وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ صدر ناصر کے جانشین بنتے بنتے رہ گئے۔ انھیں اقتدار کی ہوس نے مارا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاریوں اور ان کے جیل میں پہونچا دیئے جانے کے باوجود متحدہ عرب جمہوریہ میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس صدر انور سادات کے حق میں مظاہرے کئے گئے اور مظاہروں پر پابندی نہ لگائی جاتی تو شاید ابھی ان کا سلسلہ جاری رہتا۔ عوام کسی ایسی شخصیت کو خواہ وہ کتنی ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو پسند نہیں کرتے جو اقتدار کی بھوکی ہو۔ علی صبری نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں اسی لئے انھوں نے اپنے آپ کو عوام کی ہمدردیوں سے محروم کر لیا لیکن انور سادات نے یہ اعلان کر کے کہ وہ آئندہ عہدۂ صدارت کے لئے کھڑے نہیں ہوں گے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اقتدار کے بھوکے نہیں ہیں۔ اور ان کا یہی ایثار ان کی ہر دلعزیزی میں اور زیادہ اضافہ کا باعث ہوا ہے۔

دیکھنا ہے کہ داخلی انتشار کے باوجود وہ مشرق وسطیٰ سے متعلق بات چیت کے اس سلسلہ کو کس طرح آگے بڑھاتے ہیں جو مسٹر راجرس کے دورۂ مشرق وسطیٰ سے شروع ہوا۔







...رین نے سعودی عرب اور کویت کی تجاویز منظور کر لیں

...نہ ہوتا۔ لیکن تیل نے جو سیال سونے کے نام سے مشہور ہے ...علاقے کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

موجودہ پروگرام کے مطابق برطانیا ۱۹۷۱ء کے اختتام تک ...روہ بٹالین فوج اور اپنے بحری و فضائی بیڑوں کو اس علاقے ...ہٹالے گا جس کی وجہ سے ایک طاقتی خلاء پیدا ہو جائے گا جسے ...پر کرنے کے لئے فی الحال کوئی طاقت وہاں نظر نہیں آتی۔ صرف امریکی جہازوں پر مشتمل ایک بیڑہ بحرین میں نظر آتا ہے اور ...یہی جہاز بھی خلیج فارس کا چکر لگاتے اور بصرہ (عراق) کی ...بندرگاہ پر آتے جاتے رہتے ہیں۔

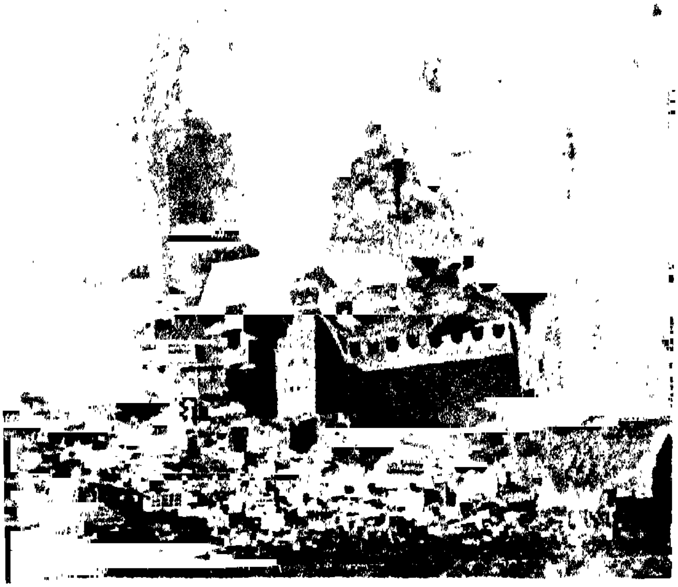
سب سے بڑی امارت بحرین کی ہے جس کی آبادی ۱۹۰ ہزار ہے ...اور رقبہ ۲۱۳ مربع میل ہے، یہی ریاست برطانوی فوجوں کا مرکز ...ہے اور یہیں امریکا کے چھوٹے چھوٹے بحری بیڑے کا صدر مقام ...ہے۔ تیل صاف کرنے کا کارخانہ جو دنیا کے بڑے کارخانوں میں ...سے ایک ہے، اسی بحرین میں واقع ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا ...میں تعینات امریکی فوجوں کی ضرورتیں اسی کارخانے سے پوری ...ہو جاتی ہیں۔ کچھ جنوب کی جانب قطار کی امارت ہے جہاں روزانہ ...تین لاکھ ستر ہزار بیرل تیل نکلتا ہے، اس کی آبادی تقریباً ...ایک لاکھ ہے۔

ابوظہبی کی امارت جس کی آبادی صرف ۶۰ ہزار ہے ...دنیا کی مالدار ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اس میں روزانہ ...دو لاکھ بیرل تیل برآمد ہوتا ہے جس سے سالانہ ۱۵۰ کروڑ روپے ...کی آمدنی ہوتی ہے۔

دوبئی اپنی تجارت کے لئے مشہور ہے اور سونے کی اسمگلنگ کا بھی مرکز ہے۔ اس کی آبادی ۶۰ ہزار ہے لیکن یہاں کے اصل باشندے ۲۰ ہزار ہیں، باقی باہر کے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ یہاں تقریباً ایک لاکھ بیرل روزانہ تیل نکلتا ہے اور ابھی اس ...میں اور اضافے کا امکان ہے۔

دوسری امارتیں اور ان کی آبادی اس طرح ہے:۔
شارجہ ۔ ۳۲ ہزار ۔ ۲۔ عجمان ۔ ۴۲۰۰ ۔ ۳۔ ام القوین ۳۷۰۰ ۔ ۴۔ راس الخیمہ ۔ ۲۴ ہزار ۔ ۵۔ فجیرہ ۔ ۹ ہزار۔
ایک شخص یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ

آخر الذکر کی امارت جس کا رقبہ ...۴۰ مربع میل ہے اپنی ...۹ ہزار کی آبادی کے ساتھ کس طرح اپنی ... کے ...
باقاعدہ ...



باوجود فجیرہ کے سلطان چاہتے ہیں کہ وہ خود مختار رہیں۔ ایسے ہی جذبات دوبئی کے شیخ کے ہیں، اور شیخ رشید چاہتے ہیں کہ تجارتی لحاظ سے ان کی امارت کو جو بہت اہمیت حاصل ہے وہ باقی رہے۔ ایک سال سے پورٹ رشید میں جہاز آتے جاتے ہیں اور وہاں مال لادنے اور چڑھانے کی سہولتیں حاصل ہیں۔

دوبئی شہر میں ۴ غیر ملکی بینک ہیں اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کے نمائندے رہتے ہیں۔ لیکن ابوظہبی میں زیادہ بڑی بندرگاہ تعمیر ہو رہی ہے اور ایک ہوائی میدان بھی بنایا جا رہا ہے سڑک کی تعمیر کے بعد دوبئی سے صرف ۹۰ منٹ میں ابوظہبی پہنچا جا سکے گا۔

دوبئی کے دوسری جانب صرف ۱۲ میل دور شارجہ کی امارت بھی اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔ ان امارتوں کے شیخوں میں باہمی رقابتیں موجود ہیں جو انکی یونین کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ دوبئی کے ایک باشندے نے کہا کہ:۔

"باہر کے ایک شخص کو یہ رقابتیں بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوں گی لیکن انکے اختلافات کی جڑیں صدیوں پرانی ہیں اور ان کا تانا بانا ان کے قبائلی اختلافات سے جا کر ملتا ہے۔"

۱۸۲۰ء سے قبل جبکہ برطانیا نے اس علاقے کو اپنی نگرانی میں لیا خلیج فارس کا ...ساحلی علاقہ ...کے لئے جنت تھا، ان کے تعمیر کردہ پرانے قلعوں کی بنیادیں جو ابھی تک نظر آتی ہیں اس زمانے کو یاد دلاتی ہیں۔

اس علاقے میں ۱۶ ویں صدی عیسوی میں پرتگالی تاجر بڑے سرگرم تھے اور تجارتی تحفظ کے لئے کئی قلعے تعمیر کئے گئے تھے اس سے قبل زیریں خلیج فارس کے بارے میں بہت کم معلوم تھا۔ اسی سال کے آخر میں راس الخیمہ میں ... کی تیس انچ لمبی اور ۱۸ انچ چوڑی ایک تختی برآمد ہوئی جو شاید کسی قبر کا کتبہ ہے، اس سے اس علاقے کی پرانی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۲۰ء میں برطانیا نے راس الخیمہ میں بحری ڈاکوؤں کے بیڑے کو جلا ڈالا اور ساحلی علاقوں میں قبائلی لیڈروں کے ساتھ معاہدے کئے۔ ان ہی کی وجہ سے ٹروشیل کوسٹ (معاہدہ پابند ساحل) کی اصطلاح اختراع کی گئی۔

تیل کی دریافت سے قبل تک یہ علاقہ بہت پسماندہ رہا اس سے قبل مختلف امارتوں کے شیخ اس بات پر لڑتے تھے کہ اس کے علاقے سے ریت اٹھا کر سرحدی تبدیلی کیوں کی گئی یا کسی نخلستان پر قبضہ کیوں کیا گیا، ... سرحدی حقوق ... دست و گریباں ...رہتے ہیں۔

[illegible] کی سماجی حالت بہت
[illegible] اور ضابطے ابھی تک
[illegible] اب بھی شادی شدہ عام [illegible]
[illegible] قبول کرنا لڑکی [illegible] نہ پانی کی
[illegible] ہیں۔

شیخ راشد کے [illegible] ڈاکٹر [illegible] طاہر نے بتایا کہ خلیج
پرس نے بہت کم [illegible] بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی
ہے۔ انہوں نے کہا کہ پانچ برس قبل آپ کسی شخص سے اس کی
[illegible] کے بارے میں تحقیقات نہ کر سکتے تھے لیکن آج
شیخ راشد کی [illegible] نے ہسپتال کے ایک حصے کو خود ساز سامان
[illegible] کیا ہے۔

[illegible] طاہر [illegible] ہیں جن کی بھاری ابروؤں کے
بالوں کا سلسلہ [illegible] پھیلا ہوا ہے اپنی آرام کرسی پر
ٹیک لگائے ہوئے:۔

"میں سمجھتا ہوں ان اختلافات کے باوجود جو آپ دیکھ رہے
ہیں فیڈریشن کا قیام اب یقینی ہے۔"

"ذرا دیکھیے مشترکہ یورپین مارکیٹ میں شامل ہونے
کے لئے برطانیہ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ بولے
"ہماری مشکلات تو پھر بھی بہت کم ہیں۔"

لیکن دوسرے کچھ لوگ ہیں جو فیڈریشن کے بارے میں
اتنے زیادہ پر امید نظر نہیں آتے۔ بعض مشاہدین یہ سمجھتے ہیں کہ
شیخوں کے درمیان رقابتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا ختم ہونا
ممکن نہیں ہے اس کے برعکس یہ ممکن ہے کہ جو چند بڑی ریاستیں
ہیں وہ چھوٹی ریاستوں کو ہضم کر لیں۔

زیر تحفظ ریاستوں اور امارتوں کے درمیان اختلافات
کی پیچیدگی میں سعودی عرب اور ایران کے علاقائی مطالبات
سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایران جس کی فوجوں کی
تعداد ایک لاکھ [illegible] ہزار ہے خلیج فارس کے علاقے میں سب
سے زیادہ طاقتور ملک ہے اس لئے برطانیہ کی واپسی کے بعد
وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے مطالبات پر قائم رہ سکتا ہے تاہم
[illegible] اطمینان [illegible] ہے کہ ایران خاموشی کے ساتھ چھوٹی امارتوں
سے اپنے تعلقات بڑھا رہا ہے۔

[illegible] گزشتہ شاہ ایران کے اس اعلان پر اطمینان
[illegible] کیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کے اس فیصلے کے بعد کہ بحرین



اب تریپاٹھی جی ۱۳ اور نئے وزیروں کا اضافہ کریں گے کیونکہ گیانی جی نے انکو بتایا ہے کہ ان کا لکی نمبر ۵۱ ہے۔

اپنا نظام حکومت خود چلانا چاہتا ہے ایران اس علاقے پر سے
اپنے حق سے دست بردار ہو گیا ہے۔

دوبئی کے ایک ممتاز شخص نے کہا۔ ہمارے ایک جانب
ایرانی ہیں اور دوسری جانب عرب ہیں۔ اور اس سبب سے
ہم محسوس کرتے ہیں کہ برطانیہ کی واپسی کے بعد ہم محفوظ رہیں گے
کیونکہ عربوں کی طرف سے ہمارے اوپر قبضہ کرنے کی کوئی بھی کوشش
ایرانیوں کو مداخلت کرنے کی دعوت دینے کے مترادف ہوگی۔

واقعات فیچر سروس

...تم کی نئی ... کا دیس



مسائل

کانگریس
عوامی تحریک

لوک سبھا کے انتخابات کے موقع پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نئی کانگریس کوئی الگ تھلگ جماعت نہیں بلکہ ایک عوامی تحریک بن چکی ہے۔ اس الیکشن میں نئی کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور مخالف جماعتوں کی بڑی بڑی توپیں لڑھک گئیں یہاں تک کہ ان ریاستوں تک میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہوئی جو سنڈیکیٹ کانگریس کا گڑھ سمجھی جاتی تھیں۔ دلی میں نئی کانگریس نے جن سنگھ سے تمام ساتوں سیٹیں چھین لیں۔ ملک کے مطلع سیاست پر بس نئی کانگریس ہی کا نام چھایا ہوا تھا۔

لیکن دلی کارپوریشن کے انتخابات میں کانگریس کا جو حال ہوا اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ جن سنگھ نے نہ صرف یہ کہ اقتدار کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ اس مرتبہ دو اور زیادہ سیٹیں حاصل کرلیں۔

اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں، مثلاً کانگریسی لیڈروں کے باہمی اختلافات اور باصلاحیت اور معتمد نمائندوں کا کھڑا نہ کیا جانا۔ لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریسی کارکن بے پرواہ ہو کر بیٹھ گئے، انہیں غلط فہمی تھی کہ کانگریس کے حق میں جو ہوا چلی تھی وہ بدستور موجود ہے۔ اس لئے عوام کو کانگریس کے پروگرام سے زیادہ واقف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برعکس جن سنگھ نے بہت بڑے پیمانے پر انتخابی مہم چلائی اور اس نے کانگریس کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عوام ان کے گمراہ کن پروپیگنڈے میں آ گئے، اور کانگریس اقلیت میں رہ گئی۔

دلی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہندوستان کا دل ہے اس لئے یہاں کے حالات سے پورا ملک متاثر ہوگا۔ کارپوریشن کے انتخابات کے نتائج سے بھی پورے ملک میں کانگریس

واقعات منہ کو ...

نئے وقار کو دھچکا لگا۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ بروقت اقدام کیا جائے اور تمام کانگریسی کارکن جماعتی مقصد کیلئے کام کریں۔

کانگریس کے نئے جنرل سیکریٹری کے الفاظ میں کانگریس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسے عوامی تحریک میں تبدیل کر دیا جائے اور وہ اسی حیثیت سے زندہ رہے اور ترقی کرے۔

ظاہر ہے کانگریس عوامی تحریک کے طور پر صرف اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب ایک طرف کے اس بے لوث کارکن سامنے آئیں، اور دوسری طرف برسراقتدار ہونے کی صورت میں کانگریس اپنے ان تمام وعدوں کو پورا کرے جو اس نے اپنے منشور میں عوام سے کئے تھے۔ اب وہ دن گئے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ عوام کی یادداشت بہت کم ہوتی ہے اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کس جماعت نے کیا کہا تھا۔ اب ووٹر لوگ ان لوگوں سے زیادہ ہوشیار ہیں جو اپنے آپ کو کارکن یا لیڈر کہتے ہیں۔ جوں جوں تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا ہے عوام میں سیاسی بیداری آگئی ہے۔ اور وہ اپنے ووٹ کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں، اور آئندہ جوں جوں تعلیم کا دائرہ وسیع ہوگا ووٹروں کو اپنی اہمیت کا اور زیادہ اندازہ ہوتا جائے گا پس اگر کانگریس چاہتی ہے کہ ایک عوامی تحریک کے طور پر زندہ رہے اور اسی لحاظ سے ملک کی سیاست پر چھائی رہے تو اسے عوام کے جذبات کا اور ان سے کئے گئے وعدوں کا لحاظ رکھنا ہوگا اور اگر وہ اپنے فرائض کو بھول گئی تو عوام بھی اسے بھول جائیں گے۔ ●●

گجرات
سنڈیکیٹ کے دم خم

گجرات سنڈیکیٹ کانگریس کا قلعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ قلعہ بھی مسمار ہوگیا۔ وزیراعلیٰ مسٹر ہتیندر ڈیسائی نے اقتدار



ہتیندر ڈیسائی

اپنے ہاتھ میں رکھنے کیلئے جتن کئے اور ممبروں کو مختلف کمیٹیوں کے چیرمین بنا دینے کے لالچ دیئے لیکن ان کی نہ چلنی تھی نہ چلی اور رفتہ رفتہ اتنے ممبران کی پارٹی سے کٹ گئے کہ ان کے لئے برسراقتدار رہنا ممکن نہ رہا۔ پارٹی کے چھ ممبروں کے الگ ہوجانے کے بعد ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۶۸ رہ گئی جبکہ مخالف ممبروں کی مشترکہ طاقت ۸۱ تک پہونچ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء کے انتخاب کے بعد مسٹر ڈیسائی کی وزارت کو ہمیشہ خطرہ بنا رہا اور اگر وہ کسی طرح اپنی اکثریت بنائے رہے تو محض سیاسی چالبازیوں اور ممبروں کو لالچ دیکر۔ لیکن کاغذ کی ناؤ آخر کب تک چلتی، وہ وقت آہی پہونچا جب گورنر مسٹر شری من نراین نے مرکز کو لکھ بھیجا کہ :۔

گجرات میں اب صدر راج قائم کر دیا جائے کیونکہ ڈیسائی وزارت کے دن اب ختم ہوگئے۔

مسٹر ہتیندر ڈیسائی کو در اصل اسی وقت الگ ہوجانا چاہئے تھا جب احمد آباد میں اور ست ... دوسرے علاقوں میں بکا قتل عام ہوا تھا ... کا خون تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ وزارتِ اعلیٰ کی گدی سے الگ ہونے سے انکار کر دیا اور اگر کسی وقت وہ تیار ہوئے تو انکی پشت پناہی کے لئے دوسرے ڈیسائی (مرارجی بھائی)۔ احمد آباد پہونچ کر ڈیرہ ڈال دیا، لیکن آخر یہ کب تک کب تک، خوش قسمتی سے ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ مسٹر ہتیندر ڈیسائی خود ہی الگ ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔

یاست میں اب یہ وہاں صدارتی راج قائم ہوگا اور اسکے بعد دوسرے نئے انتخابات عمل میں آئیں گے کوئی پارٹی بھی برسر اقتدار آنے کے قابل نہیں یہ یقینی ہے کہ سنڈی کیٹ برسر اقتدار نہیں آئے گی۔ بہت ممکن ہے کہ جب تک انتخابات عمل میں آئیں سنڈی کیٹ کا کوئی وجود ہی نہ رہے اسلئے کہ بمبئی میں صدارتی سوال پر مسٹر نجلنگاپا جی نے جو ڈرامہ کھیلا ہے اس سے لیڈر بڑے ناراض ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ صادق علی کو گنتی پر شمار کیا گیا اور الزام سہاک سنگھ کی پشت میں چھرا گھونپا گیا ہے۔

آسام

بنگال کی طرح آسام میں بھی مشرقی بنگال سے اجڑے ہوئے لوگوں نے پناہ لی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدقسمتی سے دریائے برہم پتر کی وادی کے متعدد شہروں میں ہنگامہ اور تشدد کے واقعات ہوئے ہیں اور ان پر قابو پانے کیلئے گوہاٹی تیز پور اور نوگاؤں وغیرہ شہروں میں اضافی پولیس روانہ کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لمڈنگ جنکشن پر نیم فوجی قسم کے والنٹیروں اور آسام کے آرٹسٹوں کی ایک کلچرل جماعت کے درمیان تصادم ہوگیا۔ آرٹسٹوں کا گروپ "آسوم ساہتیا سبھا" کے جلسے میں شرکت کے بعد واپس آرہے تھے۔ شبہ ہے کہ جن نوجوانوں نے یہ ہنگامہ برپا کیا وہ اسی مقصد کے لئے متعین کئے گئے تھے۔

وزیر اعلیٰ کی طرف سے فوری اقدام کے نتیجے میں ہنگامہ زیادہ نہیں بڑھا لیکن اس سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں تک امن و انتظام کا تعلق ہے اس وقت پورے ملک کو ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے اور سنجیدہ عناصر سے یہ توقع کی جارہی ہے کہ وہ امن و امان قائم رکھنے میں تمام امن پسندوں کے ساتھ تعاون کریں گے۔ وزیر اعظم اور تمام دوسرے سرکردہ سیاسی لیڈروں نے بروقت انتباہ کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس موقع پر صرف پاکستانی ایجنٹ ہی بدامنی پیدا کر سکتے ہیں۔ بدامنی سے پاکستان کے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور جو قتل و غارتگری پاکستانی فوجوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے اسکے لئے وجہ جواز پیدا ہوگی۔

راجستھان

گٹھ جوڑ نے مارا

لوک سبھا کے الیکشن کے موقع پر رجعت پسند و فرقہ پرست جماعتوں کا جو "عظیم اتحاد" عمل میں آیا تھا اب اس کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔ سوتنتر پارٹی اس "عظیم اتحاد" کے ٹولے کی سب سے بڑی ایکٹر تھی وہی اب اس سے الگ ہوگئی ہے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ جنوری کے الیکشن میں وہ کسی کے ساتھ گٹھ جوڑ نہیں کرے گی۔

سوتنتر لیڈر راج ماتا گایتری دیوی اس بات سے سخت ناراض ہیں کہ "عظیم اتحاد" میں شامل پارٹیوں نے سوتنتر پارٹی کی قیمت پر اپنی پوزیشن مضبوط کی ہے۔ انھوں نے جن سنگھ کو خاص طور سے اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا جس نے لوک سبھا کے الیکشن کے دوران راجستھان سے اپنی پوزیشن کو بہتر بنالیا۔ ایس۔ ایس۔ پی بالکل ختم، اور کانگریس کی پوزیشن مضبوط ہوگئی۔ سوتنتر پارٹی کے سات ممبر تھے اس مرتبہ صرف دو رہ گئے، جبکہ جن سنگھ نے اپنی طاقت کو تین گنا کر لیا یعنی دو سے بڑھ کر اس مرتبہ اس کی تعداد پانچ تک پہونچ گئی۔

راج ماتا کا خیال ہے کہ اگر سابق حکمراں جن کا تعلق سوتنتر پارٹی سے ہے جن سنگھ کی پشت پناہی نہ کرتے تو وہ ایک سیٹ بھی نہ لے سکتا تھا اس کے برعکس سوتنتر پارٹی کی بڑی بڑی توپیں لڑھک گئیں۔ حد یہ ہے کہ مہاراجہ بھرت پور جنکا کہنے ہیں کہ اپنی سابق ریاست میں بڑا اثر ہے اور جنہوں نے پچھلے الیکشن میں مسٹر راج بہادر کو ہرایا تھا اس بار کامیاب نہ ہو سکے۔

سوتنتریوں کو گٹھ جوڑ نے مارا جو ایک "بے جوڑ میل" تھا اس کے ٹوٹنے سے حکمراں کانگریس کے حلقے بہت خوش ہیں کیونکہ راجستھان میں آئندہ الیکشن میں اور بھی زیادہ مضبوط جماعت کی حیثیت سے سامنے آئے گی۔

مدھیہ پردیش

باسی کڑھی میں ابال

سابق وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش مسٹر ڈی، پی مصرا کے گروپ کی باسی کڑھی میں یہ ابال آیا ہے کہ انہوں نے ایس، سی شکلا وزیر اعلیٰ کے گروپ کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری کر دی ہیں، اور یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ پردیش کانگریس کمیٹی کی بجائے ریاست کی ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کر دی جائے مسٹر مصرا پر چھ سال تک ممبر شپ کے لئے کھڑا ہونے کی پابندی ہے لیکن وہ دور سے بیٹھے تار کھینچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شکلا حکومت کا تختہ الٹ دیں، مسٹر شکلا بھی ان چالوں کو سمجھتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے ایڈہاک کمیٹی کی تجویز کو بے ہودہ بتایا ہے جبکہ مصرا جی کا کہنا ہے کہ یہ تجویز خود کانگریس کے مفاد میں ہے کیونکہ اسی طرح وہ عوام کی حمایت حاصل کر سکے گی۔

ایک مصرا گروپ مد مقابل ہے اور دوسرے پر کھیوں شکلا جی کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے اور جب سے انھوں نے سابق ایڈیٹر شری ... دشنار کو اسد ... پر لیا ہے کہ انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں الزام لگایا

باقی صفحہ پر



بنگلہ دیش سے آنیوالے رفیوجی

"یہی ہٹاؤ" مجھکو ووٹ دو "ہندوستان مردہ باد" - بھٹو

— آداب عرض ہے بھٹو صاحب

— (سید ھا ہاتھ اوپر اُٹھا کر) ہندوستان مردہ باد

— جی ؟ ؟ کیا فرمایا آپ نے ؟

— آپ کے آداب کا جواب دیا ہے۔

— لیکن آپ نے تو "ہندوستان مردہ باد" کا نعرہ لگایا ہے

— جی ہاں میں روز صبح اُٹھتے ہی کھانا کھانے سے پہلے کھانا کھانے کے بعد شام 'دوپہر' سہ پہر، سونے سے پہلے، کسی سے ملتے وقت یہی کہتا ہوں ۔

— یعنی یہ آپ کے سلام کرنے کا طریقہ ہے۔

— آپ بالکل ٹھیک سمجھے ۔

— پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات پر آپ کے کیا

کو حکومت بنانے کا حق کس طرح پہنچتا ہے ؟

بھٹو — بالکل اسی طرح جس طرح کہ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں گوری اقلیت کو کالی اکثریت پر حکومت کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ (پھر اچانک گڑ بڑا کر) اوہ معاف کیجئے گا میں کچھ غلط بول گیا تھا۔ پاکستان پر حکومت کرنا ہمارا بنیادی حق ہے ۔ ہم ہی لوگوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ ہم نے اسے اپنے خون سے سینچا ہے۔ مستقل ۲۲ سال سے ہندوستان سے جنگ کر رہے ہیں ۔

انقلابی — چونکہ اب آپ کی جماعت قانون ساز اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت ہو گی اس لئے پاکستان کے اگلے وزیر اعظم آپ ہی بنیں گے ۔

پاکستان کے خون سے رنگا ہوا ہے اسلئے اب مشرقی پاکستان کی ان سے بہتر نمائندگی کوئی اور نہیں کر سکتا۔

انقلابی — بجا فرمایا میں پوری طرح سمجھ گیا !!

بھٹو صاحب آپ نے الیکشن سے پہلے اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ اگر آپ ملک کے وزیر اعظم بن گئے تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کشمیر کو آزاد کرا لیں گے ۔ اب آپ اپنے اس بیان پر کچھ تبصرہ کریں گے

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو سے

اِنقلابی کا انٹرویو



خیالات ہیں ؟

— آئین ساز اسمبلی کا اجلاس فوراً بلایا جانا چاہئیے اور سب سے بڑی جماعت ہونے کی بنا پر ہماری جماعت سے حکومت بنانے کی درخواست کرنی چاہئیے

— لیکن سب سے بڑی جماعت تو عوامی لیگ ...

— (بات کاٹ کر) قطعاً نہیں کیونکہ عوامی لیگ کو غیر قانونی جماعت قرار دیا جا چکا ہے اس لئے اب اس نام کی کسی جماعت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

— لیکن عوامی لیگ کو ملک کے آدھی سے زائد عوام کی حمایت حاصل تھی جبکہ آپ کو ایک چوتھائی لوگوں کی بھی حمایت حاصل نہیں۔ ان حالات میں آپ

بھٹو — یقیناً۔

انقلابی — میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول فرمائیے۔

بھٹو — شکریہ ۔

انقلابی — ان حالات میں مشرقی بنگال کی نمائندگی کون کریگا کیونکہ جناب نور الامین کے علاوہ تمام نمائندے عوامی لیگ سے تعلق رکھتے تھے ۔

بھٹو — ٹکا خان ۔

انقلابی — لیکن ٹکا خان مشرقی بنگال کی نمائندگی کس طرح کر سکتے ہیں۔ ان کا تعلق بھی تو مغربی پاکستان سے ہی ہے ۔

بھٹو — پہلے تھا۔ اب ان کے جسم کا رواں رواں مشرقی

بھٹو — ہم نہ صرف کشمیر بلکہ جوناگڑھ سے حیدر آباد، فیروز پور، گورداس پور، امرتسر، ترکی پور اور مغربی بنگال وغیرہ وغیرہ کو بھی آزاد کرا لیں گے۔

انقلابی — وغیرہ وغیرہ سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

بھٹو — یعنی کہ باقی ہندوستان ۔

انقلابی — آپ وزیر اعظم بننے کے بعد کس طرح سوشلسٹ حکومت قائم کریں گے ؟ آپ کی جماعت کے زیادہ تر لیڈر

"پروفیسر بلراج مدھوک میرے پسندیدہ لیڈر ہیں" بھٹو

حالات نئی دہلی

ہمارے شہروں میں عورتیں کتنی محفوظ ہیں؟

پچھلے سال اپنے ایک بیان میں بنگال کے گورنر
تی دھون نے کہا تھا کہ کلکتے کی سڑکوں پر عورتیں لو
دہلی اور کسی بڑے شہر کی سڑکوں سے زیادہ محفوظ ہیں۔
کہ اس بیان پر کافی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ ہر شخص
اپنے شہر کی طرفداری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ
ثابت کر رہا تھا کہ اس کے شہر میں عورتیں زیادہ
محفوظ ہیں لیکن شاید شری دھون نے ٹھیک ہی کہا تھا
کلکتے میں عورتیں کسی اور شہر کی نسبت زیادہ محفوظ
ہیں اور وہاں ان کی زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ اس کی
چاہے جو بھی وجہ ہو اس حقیقت کو جھٹلانا ذرا مشکل ہے۔
آیئے ہم ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کو ایک ایک
کر کے لیں اور دیکھیں کہ وہاں عورتوں کے ساتھ کیسا
سلوک کیا جاتا ہے۔

دہلی:- سب سے پہلے ہم اس سلسلہ میں اپنے شہر دہلی ہی کو لیتے ہیں جو اس معاملہ میں سب سے زیادہ بدنام ہے۔ زیادہ تر عورتیں جو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی گھوم چکی ہیں ان کا کہنا ہے کہ دہلی سے زیادہ بدتمیزی انہیں کہیں دیکھنے کو نہیں ملی پچھلے دنوں دو ہندوستانی لڑکیاں جنھوں نے اپنا زیادہ تر وقت غیر ممالک میں گزارا تھا دہلی کے ایک بہت مہنگے ہوٹل میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں کہ بیرے نے ان کے سامنے ایک پلیٹ رکھ دی پلیٹ میں ایک پرچہ رکھا تھا جس پر لکھا تھا "کیا ہم دوست نہیں بن سکتے؟" بیرے نے بتایا کہ یہ پرچہ اگلی میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے دیا ہے۔ لڑکیوں نے پرچہ پڑھ کر پھاڑ دیا اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر ہوٹل سے باہر نکل آئیں۔ وہ دونوں آدمی بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے اور ان کی کار کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکیاں بمشکل ان سے پیچھا چھڑا پائیں۔ اس کے بعد انہیں کبھی شام کے بعد کسی ہوٹل میں جانے کی ہمت نہ ہوئی یہ اپنی قسم کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے اس قسم کے واقعات دہلی میں ہر وقت ہر جگہ اور ہر لڑکی کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں۔

۱۹۹۸ء میں نئے سال کے موقع پر دہلی میں جو کچھ ہوا اس سے تو زیادہ تر لوگ واقف ہیں ہی۔ کناٹ پلیس میں چور مردوں کی ٹولیوں نے کاروں میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کو پکڑ لیا۔ ان کی گھڑیاں اتار لیں، عورتوں کے



عورتوں کے ساتھ سب سے زیادہ بے ہودگی دہلی میں ہوتی ہے

بمبئی میں ہر سال ۱۵۰۰ افراد لڑکیوں کے چھیڑنے کے الزام میں گرفتار کیے جاتے ہیں ——— !

بلاوز اتار لیے ساڑیاں پھاڑ ڈالیں اور بھی جتنی بے ہودگیاں کی جا سکتی تھیں کیں۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ اس غنڈہ گردی میں دہلی پولیس نے اپنا حصہ بھی خوب بٹایا یہ اور بات ہے کہ بعد میں آدھے درجن افسروں کو برخواست کر دیا گیا۔

۳ ستمبر ۱۹۶۹ کو بین الاقوامی نوجوانوں کے میلے کے موقع پر رابندر رنگ شالہ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ نوجوانوں نے دہلی یونیورسٹی کی کچھ لڑکیوں کو گھیر لیا۔ ان کے بلاؤز پھاڑ دیئے کئی لڑکیوں کو زخمی تک کر دیا گیا۔ پوری دنیا سے آنے والے نوجوان مہمانوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا گیا۔ اس موقع پر بے ہودگی کی ایک خاص وجہ وہ غیر ملکی جوان بتائے جاتے ہیں جو تقریباً برہنہ حالت میں ادھر اُدھر بے ہودگیاں کرتے پھر رہے تھے۔ اسی اودھم بازی کا یہ نتیجہ ہوا کہ دہلی میں ہر سال ہونے والا یہ میلا ختم کر دیا گیا۔ اور اب شاید اس قسم کے میلے کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہو۔

عورتوں اور لڑکیوں کو سب سے زیادہ پریشانی کا سامنا ڈی۔ ٹی۔ یو بسوں میں سفر کرتے وقت ہوتا ہے۔ بس میں چڑھتے وقت مرد عورتوں کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں انھیں دھکے دیئے جاتے ہیں چٹکیاں بھری جاتی ہیں اور اسی قسم کی دوسری بے ہودہ حرکتیں کی جاتی ہیں اس وقت چونکہ ہر شخص بس میں چڑھنے کی فکر میں ہوتا ہے اس لئے نہ تو کوئی دوسرا شخص ان لوگوں کو کچھ کہتا ہے اور نہ لڑکی ہی احتجاج کر پاتی ہے۔ اگر مصیبت کی ماری کوئی لڑکی ان لوگوں کی بدتمیزی کا کوئی جواب بھی دے تو الٹی اسی کی مصیبت آ جاتی ہے۔

پچھلے دنوں ڈی۔ ٹی۔ یو کی بس میں سفر کرتے ہوئے ایک لڑکے نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کے چٹکی بھر لی، لڑکی نے غصے میں آ کر اس لڑکے ایک تھپڑ رسید کر دیا، لڑکا خاموش کھڑا غصے میں اس لڑکی کو گھورتا رہا کسی شخص نے بھی آگے اس لڑکی کی مدد نہ کی۔ کچھ دفتر سے آنے والے ادھیڑ عمر پنجابی باؤوں نے اس لڑکی ہی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جیسا کہ اس عمر کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے فوراً اس زمانے کی باتیں چھیڑ گئیں جب کسی لڑکی کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مرد پر ہاتھ اٹھائے۔ دو چار دل پھینک قسم کے نوجوانوں نے گندے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ بس سے اترنے سے پہلے وہ نوجوان لڑکی کی طرف بڑھا، بہت اطمینان سے اس کے گال پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا اور پھر اسی اطمینان سے بس سے اتر گیا۔ نہ کسی نے اسے روکا اور نہ کسی نے اسے کچھ کہا۔ ایک ساٹھ ستر برس کے لگ بھگ پنجابی بزرگ نے مسکرا کر کہا:-

"واہ کیا نہلے پر دہلا دیا ہے!"

چھیڑ چھاڑ تو ہر شہر میں ہوتی ہے لیکن یہ دہلی کی بدقسمتی ہے کہ یہاں لوگ اس بدتمیزی کو روکنے کی بجائے اس سے محفوظ ہوتے ہیں۔

پولیس کا کہنا ہے کہ عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ۱۹۶۸ء کے بعد سے بڑھی ہے جب سے چوڑی دار پاجامے، کرتے اور اسکرٹ وغیرہ کا رواج ہوا ہے۔ عورتوں کے ساتھ بدتمیزی بھی بڑھ گئی ہے۔ زیادہ تر حالات میں اس بدتمیزی کی ذمے دار خود لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ نیچے گلے کی قمیص، بنی ناف کر نیچی ساڑیاں خطرے کو دعوت دیتی ہیں۔ سیدھے سادے کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے واقعات کم پیش آتے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں جسمانی چھیڑ چھاڑ کے ۱۱۸ واقعات پولیس کے سامنے لائے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ تعداد کم ہو کر ۷۰ رہ گئی لیکن ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۵۵ ہو گئی۔ چھیڑ چھاڑ اور بے ہودگی کے زیادہ تر واقعات چاندنی چوک۔ قرول باغ اور جن پتھ جیسے بھیڑ بھاڑ کے علاقوں میں پیش آتے ہیں۔

پچھلے دنوں دہلی میں ایک غیر ملکی خاتون کو بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ وہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ کناٹ پلیس کے ایک سینما میں فلم دیکھنے گئیں، اندھیرا ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خاتون کو اپنے جسم پر ایک ہاتھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ غصے میں خاتون نے ہاتھ کو ایک طرف جھٹک دیا کچھ دیر بعد ہاتھ پھر اپنی جگہ واپس آ گیا وہ غیر ملکی خاتون اٹھ کر باہر نکل آئی اور فلم دیکھے بغیر ہی گھر واپس چلی گئی۔ اس خاتون کا کہنا ہے کہ کلکتہ اور بمبئی میں اس کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش نہیں آئے۔ دہلی میں وہ جدھر نکلتی ہے لوگ اسے بھوکی نظروں سے گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے تک فقرے کسنے سے باز نہیں آتے۔ یہ صرف اسی خاتون کا تجربہ نہیں ہے بلکہ غیر ممالک سے آنے والی زیادہ تر خواتین کا تجربہ ہے۔

اس بے ہودگی کی ایک خاص وجہ وہ ہپی ہیں جو دن رات دہلی کی سڑکوں اور پارکوں میں پڑے بوس و کنار میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندوستانی ہر غیر ملکی کو ہپی سمجھ

دہلی میں بے ہودگی پھیلانے میں سڑکوں پر بوس و کنار کرنے والے ہپیوں کا کافی ہاتھ ہے ——— !

کر اس سے بھی شروع کر دیتے ہیں۔ دہلی میں اس بڑھتی ہوئی بے راہ روی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کلکتے اور بمبئی کے مقابلے میں زیادہ پابندیاں ہیں۔ کلکتے میں ہاتھ پکڑے ہوئے سڑکوں پر گھومتے نوجوان جوڑے عام نظر آئیں گے جبکہ دہلی میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ یہاں نوجوان ایک دوسرے سے دو فیٹ دور چلتے ہیں اور اگر غلطی سے ہاتھ پکڑ بھی لیتے ہیں تو لوگ انھیں مریخ سے اتری ہوئی مخلوق سمجھ کر گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔

بمبئی ——— زیادہ تر غیر ملکی عورتیں آپ کو بمبئی کی تعریف ہی کرتی ملیں گی۔ نہ تو انھیں وہاں ٹیکسی ڈرائیور پریشان کرتے ہیں اور نہ لوگ گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ فقرے کسنے میں بمبئی بھی پیچھے نہیں ہے لیکن یہ فقرے ایک حد کے اندر ہی رہتے ہیں — غیر ملکی عورتوں کے علاوہ ہندوستانی عورتوں کی بھی یہی رائے ہے۔ دفتر کی ٹائپسٹ لڑکیاں، نرسیں، کالج جانے والی لڑکیاں شادی شدہ گھریلو عورتیں، سب ہی کی رائے ہے کہ معمولی چھیڑ چھاڑ کے علاوہ عام طور پر وہ بمبئی کی سڑکوں پر محفوظ ہی رہتی ہیں شام کو اکیلے گھومنے یا فلم دیکھنے کے لئے جانے میں انھیں کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان کے اس دوسرے بڑے شہر میں صرف شریف اور مہذب مرد ہی رہتے ہیں، ان کی اس شرافت کی وجہ بمبئی پولیس کا اچھا اور سخت انتظام ہے۔ ہر بھیڑ بھاڑ والی جگہ پر سادہ کپڑوں میں پولیس کے آدمی گھومتے رہتے ہیں جو سڑک چھاپ مجنوؤں کو ان کی ذرا سی بھی نازیبا حرکت پر گرفتار کر لیتے ہیں۔

بمبئی پولیس ایکٹ کے سیکشن ۱۱۰ کے مطابق ان لوگوں کو نہ صرف چھیڑ چھاڑ بلکہ گندے فقرے کسنے پر بھی سزا دی جاتی ہے۔ عام طور پر ان لوگوں کو جرمانہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن زیادہ بدمعاشی کرنے پر جیل کی ہوا بھی کھلا دی جاتی ہے۔

ہر سال بمبئی پولیس تقریباً ۱۵۰۰ افراد کو لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے لے کر جبر و زیادتی تک کے الزام میں گرفتار کرتی ہے۔ یہ بات کافی تشویشناک ہے کہ پچھلے چند برسوں سے زور زبردستی کے کیسوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

بمبئی میں اس بے راہ روی کی ایک خاص وجہ ہندوستان بھر سے آنے والی وہ لڑکیاں ہیں جو ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہوئی بمبئی چلی آتی ہیں۔ عام طور پر ان کے پاس کافی روپے یا پھر گھر سے بھاگے ہوئے [illegible] ہوتی ہیں۔ گاڑی سے اترتے ہی یہ اپنے کسی پسندیدہ فلمی ستارے کا پتہ معلوم کرتی ہیں۔ عام طور پر کافی عرصے تک ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچنے کے بعد ان کی منزل یا تو کوٹھا ہوتا ہے یا پھر کسی فلم میں ایکسٹرا کا رول۔ اب بمبئی پولیس نے اس معاملے میں بھی کافی انتظامات کر لئے ہیں۔ ہر ریلوے اسٹیشن پر پولیس والے مقرر کر دیے گئے ہیں جو اس قسم کی لڑکیوں کو پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے جاتے ہیں جہاں انھیں ایک زوردار لیکچر دیا جاتا ہے اور پھر واپس گھر بھیج دیا جاتا ہے۔

بہرحال عورتوں کو بمبئی پولیس کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ بمبئی جیسا خطرناک شہر بھی ہندوستان کے دوسرے شہروں کی بہ نسبت ان کے لئے کافی محفوظ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہاں ابھی تک کلکتے کے رابندر سروبار، یا دہلی کے نئے سال کے جشن جیسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

کلکتہ ——— اصل بحث چونکہ کلکتے ہی سے شروع ہوئی تھی اس لئے اگر ہم واپس کلکتے آ جائیں تو بہتر رہے گا۔ کلکتے میں پیش آنے والے رابندر سروبار کے واقعے نے عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ کلکتہ عورتوں کے لئے قطعی غیر محفوظ ہے، جبکہ معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ رابندر سروبار کے واقعے کے چاروں طرف ایسی سیاسی دھند چھائی ہوئی ہے کہ اس میں سے گزر کر یہ دیکھنا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ بہت مشکل ہے۔ اس واقعے کی تحقیقات کرنے والے کمیشن نے رپورٹ دی تھی کہ زیادہ تر واقعات کو اخبارات نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، ورنہ اصل میں چند معمولی سے واقعات پیش آئے تھے۔

بہرحال اس ایک واقعے کو چھوڑ کر عام طور پر کلکتے کی سڑکوں پر عورتیں دہلی اور بمبئی کی سڑکوں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہیں، اور اگر وہاں کے گورنر شری شانتی دھون یہ بات کہتے ہیں تو کسی کو قطعاً ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ وہ سیاسی ماحول ہے جو ہمیں کلکتے کے علاوہ ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں مل سکتا یہاں لوگوں کے ذہن پر نکسلائیٹ بھوت اس طرح سوار رہتا ہے کہ وہ کسی اور نئے جھگڑے یا بیہودگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں کے لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی سیاسی بھوک ان کی جنسی بھوک پر حاوی رہتی ہے۔

کلکتے میں رہنے والی ۲۹ سالہ جرمن خاتون مسز کرسٹل اوجھا کا کہنا ہے کہ وہ عام طور پر شام یا رات کے وقت بھی اپنے آپ کو کلکتے کی سڑکوں پر محفوظ سمجھتی ہیں۔ اگر کوئی فقرے بھی کستا ہے تو وہ گندے ہونے کی بجائے مذاق والے ہوتے ہیں جیسے ان کے اپنے ملک میں لڑکے کسا کرتے ہیں۔

کلکتہ میں عورتوں سے زیادہ غیر محفوظ ہیں

۲۶ سالہ مس شکلا مکرجی جو ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہیں کہتی ہیں کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد بھی بلا جھجک سڑک پر نکل جاتی ہیں۔ وہ کافی بھیڑ بھاڑ والی ٹراموں اور بسوں میں بھی سفر کرتی ہیں۔ عام طور پر لوگ عورتوں کو دیکھتے ہی اپنی سیٹ انھیں دیدیتے ہیں اس لئے سفر کرتے وقت انھیں پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

۲۲ سالہ طالب علم مس سبے شری رائے کا کہنا ہے کہ بس یا ٹرام میں اگر لوگ ان کے جسم کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ انکا پیر کچل دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کلکتے میں لوگ فوراً لڑکی کی مدد کو آ جاتے ہیں، اگر لڑکی ذرا بھی شور مچا دے تو ان مجنوؤں کے لئے جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مس سبے شری، لندن، روم، لکھنؤ، بمبئی اور دہلی بھی گھوم چکی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ دہلی میں لوگ لڑکی کی مدد کرنے کے بجائے اس پر ہنستے ہیں۔

کلکتے میں ساڑی یا سیدھا سادا لباس پہننے والی لڑکیاں عام طور پر محفوظ رہتی ہیں، لیکن بہت زیادہ فیشن ایبل اور امیر گھرانوں کی لڑکیاں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کے قہر کا بھی نشانہ بنتی ہیں۔ ان پر طرح طرح کے فقرے کسے جاتے ہیں، ان کے فیشن اور دولت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مس اوشا تریا کے مطابق کلکتے میں دولت مند ہونا کوئی شان کی بات نہیں۔ بلکہ دولت مند لوگ شرمندہ اور چھپے چھپے پھرتے ہیں دولت مند لوگوں کو ہر محفل میں منٹوں میں نکو بنا دیا جاتا ہے۔

ہم یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کے لئے کلکتہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں محفوظ ہے، یہاں عورتوں سے زیادہ مرد غیر محفوظ ہیں۔ پولیس اور نکسلائیٹ دونوں کا عتاب مردوں پر ہی نازل ہوتا ہے عورتیں اس سے محفوظ ہی رہتی ہیں۔ ●●



نجیب کی آواز

نازش پرتاپگڑھی

دوستو یہ بھیانک سیہ بدلیاں
صبح کے نام پر صرف تاریکیاں
کتنی بہنوں کے آنچل ہوا ہو گئے
کتنی مانگوں سے سیندور پونچھا گیا
زردیاں چھا گئیں کتنے رخساروں پر
کتنے نورس شگوفوں کو موت آگئی
ہر طرف سسکیوں کی صدائیں ہیں اب
ممتا جل گئی بھوک کی آگ میں
قدسیوں سے بھی پاکیزہ تر عصمتیں
ماں کی تقدیس پر دام لگنے لگے
سبز کھیتوں پہ ہے بیوگی کا سماں
جس سے گذرے تھے مر مر کے ہم دوستو

کھو گئی جھلملا کر افق پر کرن
زندگی کے لئے صرف دار و رسن
کتنی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے
کتنے سینوں میں چھالے ٹپکنے لگے
کتنی زلفوں کی مہکاریاں کھو گئیں
کتنے بچوں کی کلکاریاں کھو گئیں
ہر طرف تیز شعلے بھڑکنے لگے
لوریوں کے کلیجے دھڑکنے لگے
خوابگاہ ہوس کار میں آگئیں
بیٹیاں آج بازار میں آگئیں
اور کلیاں بنیوں کے گھر آگئے
گھوم کر پھر اُسی راہ پر آگئے

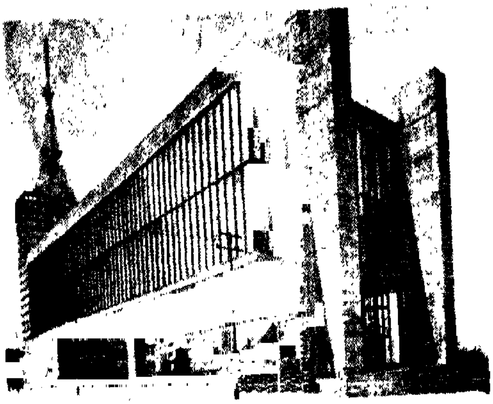
دوستو یہ بھیانک، سیہ بدلیاں
کھو گئی جھلملا کر افق پر کرن
جس کو رہبر سمجھتے رہے آج تک
آئی منزل تو ثابت ہوا راہزن

قید میں تا بکے حسنِ فکر و عمل
کب تک آخر بیابانوں سے ہم تن ڈھکیں
دوستو جاگنے کی گھڑی آگئی
جاگ اٹھو شہر میں گاؤں میں، کھیت میں
حریت کی صدائیں ابھرتی رہیں
ہر قدم اور آگے ہی بڑھتے رہو
اپنی سانسوں سے شعلے اگلتے رہو
مسکراتے رہو موت کی گود میں
ہم نے مانا کہ ہر سمت ہے تیرگی
مشعلِ عزم لے کر اٹھو دوستو!
قوتیں چھین لو ظلم کی، جور کی
جاگنے ہی کو ہے آفتابِ سحر

کب تک اپنوں کے ہاتھوں لٹے جائینگے
پیٹ سے دوروں سے کب تک بھرے جائینگے
حشر در گام، طوفاں بکف جاگ اٹھو
اور میدان میں صف بہ صف جاگ اٹھو
چھن چھناتی رہیں آہنی بیڑیاں
سن سناتی رہیں آتشیں گولیاں
اپنے سینوں میں پالے رہو زلزلے
گیت گاتے رہو پھانسیوں کے تلے
ہم نے مانا کہ خوابیدہ ہے قافلہ
دل میں پیدا کرو زیست کا حوصلہ
اس تباہی کے دھارے کا رخ موڑ دو
مردہ چاند اور ستاروں کو اب توڑ لو

یہ بھیانک سیہ رات ڈھل جائیگی
مدھ ہو جلنے تیز اپنا جوشِ جنوں
صبحِ رخشاں کے ذوقِ نمو کے لئے
چاہیئے اور سر اور جسم اور خوں





ساؤپالو میوزیم کی بلند و بالا عمارت

ساؤپالو کا آرٹ میوزیم

برازیل کے شہر ساؤپالو کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت اس شہر کی آبادی چوّن لاکھ تیس ہزار ہے اور بین الاقوامی سطح پر آٹھویں نمبر کی آبادی والا شہر شمار ہوتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ اگلے بیس سال میں یہاں کی آبادی ٹوکیو اور نیویارک کے بعد تیسرے نمبر پر پہنچ جائے گی کیونکہ یہاں ہر سال بھاری تعداد میں لوگ باہر سے آکر آباد ہو رہے ہیں۔

ساؤپالو کا آرٹ میوزیم فن مصوری کا گرانقدر خزانہ ہے۔ اس نایاب میوزیم کو ساؤپالو کے ایک لارڈ چاٹو نے ۱۹۴۷ء میں قائم کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مصوری قوم کا قیمتی سرمایہ ہے۔ قیام میوزیم کے ابتدائی مراحل میں لارڈ چاٹو نے ایک اطالوی مصور پیٹرو ماریا باردی کی خدمات حاصل کیں۔ وہ بذات خود ایک دولت مند انسان تھا اور اس وقت تیس اخباروں، اُنیس میگزینوں، بائیس ریڈیو اور پندرہ ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کا مالک تھا۔ اپنے مشن کو پھیلانے کے لئے لارڈ چاٹو نے اپنے وسیع ذرائع کا دل کھول کر استعمال کیا۔ عوام اور سرکار کا تعاون بھی حاصل کیا۔ نادرات کی خریداری میں حکومت برازیل نے ہر ممکن مالی امداد دینا شروع کر دی۔ وہ فطرتاً تیز انسان تھا ایک مختصر عرصے میں ہی نیویارک کے تمام آرٹ بازاروں پر چھاتا چلا گیا اور امریکا کا کوئی بھی میوزیم نوادرات کی خریداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

لارڈ چاٹو کی ایک انتھک لگن نے میوزیم کو حیرت انگیز ترقی دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میوزیم کی عمارت بھی تبدیل ہوتی رہی۔ اس ترقی نے ساؤپالو کے شہریوں کو کافی متاثر کیا اور عوام نے لاکھوں ڈالر چندہ جمع کر کے میوزیم کی اپنی عمارت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نئی عمارت کا نقشہ مصور باردی کی مطلقہ بیوی لینا بو نے بنایا۔ لارڈ چاٹو کی موت سے ٹھیک ایک سال بعد ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء کو اس نئی عظیم



لڑکی غسل کی تیاری میں



مصور منش کا شاہکار "منگنی"

مشہور ہندوستانی آرٹسٹ

حسین

ساؤ پالو جارہے ہیں

ساؤ پالو کی آرٹ آرگنائزیشن ہر سال دنیا کے ایک یا دو بہترین آرٹسٹوں کو نمائش کے لئے ساؤ پاؤ بلاتی ہے۔ اسی سال اس آرگنائزیشن نے ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ محمد فدا حسین اور بین الاقوامی شہرت کے مالک پکاسو کو ۱۴ ستمبر سے شروع ہونیوالی نمائش میں حصہ لینے کیلئے بلایا ہے۔ آرٹسٹ کا ساؤ پاؤ بلایا جانا ایک بہت بین الاقوامی اعزاز ہے۔

حسین نے پچھلے دنوں رامائن پر کچھ تصویریں بنائی تھیں انکا خیال ہے کہ وہ یہی تصویریں نمائش میں پیش کریں گے۔ کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں بھی دسہرا منایا جارہا ہوگا۔

عمارت کا افتتاح ہوا۔ دور سے دیکھنے پر یہ عمارت چار عظیم ستونوں کے درمیان لٹکا ہوا ایک خوبصورت مستطیل نظر آتی ہے عمارت کے اندر تصاویر آویزاں کرنے کے لئے مخصوص تعمیرات کی گئی ہیں۔

ساؤ پالو کا آرٹ میوزیم موجودہ صدی کی دین ہے اس لئے اس میں کلاسیکل، قرون وسطیٰ، اور علوم و فنون کے احیاء کے زمانے کی نمائندگی برائے نام ہے۔

وینس کے مشہور اسکول مصوری ٹیشین (TITIAN) کے دو اعلیٰ شاہکار میوزیم کی زینت ہیں۔ ان میں سے ایک مصور رافائیل (RAPHAEL) کی بنائی ہوئی مسیح کی شبیہ ہے اور دوسری منٹیگنا مصور (MANTEGNA) کی بنائی ہوئی سینٹ جیروم (JEROME) کی شبیہ ہے ان بیش قیمت شاہکاروں کے بعد چند اور نسبتاً کم درجے کے قدیم اعلیٰ مصوری کے نمونے ہیں جن میں سولہویں صدی عیسوی کی ایک تصویر بعنوان "منگنی" قابل ذکر ہے۔ جس میں مصور کوینٹن میٹسی (QUENTIN METSY) نے ایک جوان شوہر کے اپنی بدصورت اور مالدار بوڑھی بیوی سے ہمآغوش ہونے کے تاثرات کی عکاسی کی ہے۔

میوزیم کے ذخیرے میں مخصوص اسکول مصوری کے نمائندہ مصوروں کے جو شاہکار کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ بنام زمانہ ابرہنہ پرست مصور رینوا (RENOIR) کے بہت سے اعلیٰ شاہکار اس کی زینت ہیں۔ ان تمام مشہور تصاویر میں ۱۸۷۰ء کی بنائی ہوئی ایک تصویر خصوصاً قابل ذکر ہے جس میں اس نے اپنی پہلی محبوبہ لیسے تریہوت کو غسل کی تیاری کرتے ہوئے کینواس پر اتارا ہے۔

مشہور مصور مینٹ کی موت سے آٹھ سال قبل ۱۸۷۵ء میں اس کے قریبی دوست مصور مارسلین ڈیلیبوٹن نے اس کی ایک شاہکار تصویر بنائی تھی۔ یہ پینٹنگ اعلیٰ فن کا نمونہ ہے۔ تصویر میں مینٹ اپنے مخصوص خدوخال سے زندہ نظر آتا ہے اور اس کی مخصوص کشادہ پیشانی نمایاں نظر آتی ہیں۔ دوستی کا یہ گرانقدر ہدیہ میوزیم کا ہوا ہے۔

دیگر اعلیٰ مصوروں کے شاہکاروں میں سیزاں (CEZANNE) کی بہت سی پینٹنگ میوزیم میں ہیں۔ سیزانے تصوراتی مصوری کے اسکول سے تعلق ہے۔ سیزانے کی تمام پینٹنگس میں ۱۸۶۶ء کا بنایا ہوا تصوراتی نیگرو خاکہ قابل ذکر ہے جسکو دیکھنے کے بعد تو اسکول کے مصوروں کے زوال کے اسباب پر روشنی پڑ مصور پال گاگن (PAUL GAUGUIN) کی ایک اہم بھی میوزیم کی زینت ہے۔ یہ مصور کا اپنا ذاتی عکس ۱۸۹۶ء میں خود پال گاگن نے بنایا تھا۔ اس تصویر وہ ایک ضعیف و نادار مصور نظر آتا ہے جس کی حالت کر کے ہر انسان کا دل بھر آتا ہے۔

مصور ویلارڈ (VUILLORD) منظر کشی استادوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی ہر پینٹنگ میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے پیرس حسین ایکٹریس کا بیڈروم پینٹ کیا ہے۔ یہ بھی میوزیم میں موجود ہے۔

مصور شہزادی لاتریک (LAUTREC) کی تصویر کی تخلیق کار تھی۔ ویاد (VIAUD) نام کا ایک شخص کا قریبی دوست تھا جس کو شہزادی نے اپنے اپارٹمنٹ کی نگہداشت پر مامور کر رکھا تھا۔ شہزادی ویاد کو بہت پسند کرتی تھی۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لئے اس نے ۱۹۰۱ء میں ویاد کو بطور امیر البحر پینٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور متواتر دو ہفتے تک بوڑھے ویاد کو ماڈل بن کر کھڑا رہنے پر مجبور کیا۔ لاچاری میں ویاد نے جبراً حکم کی تعمیل کی مگر یہ تصویر جوان العمر شہزادی کی ناگہاں موت کے سبب مکمل نہ ہو سکی۔ یہ نامکمل تصویر ساؤ پالو کا قیمتی خزانہ ہے۔



چھوٹی لڑکی آرام کرسی پر

"میری کاسٹ"

وسطی ہند کے سب سے ... تھی
ایک دہشت ناک ... کی حیثیت سے مدھیہ پردیش کی
... مبل ندی کی وادی میں واقع ہوئی
... بہت سے عوام اس امر سے ناواقف ہیں کہ ان کی
... کے گھنے جنگلات میں کیا ہو رہا ہے! یہ علاقے بدنام
... جہاں اب بھی ٹولیاں لوٹ مار، رہزنی اور اغوا کی
... میں مصروف اور پولیس سے برسرپیکار رہتی ہیں۔
... انہوں نے سیاسی طاقت حاصل کر لی ہے۔ انتخابات میں
... امیدواروں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ باضابطہ
... وہ مذہبی ذہن رکھتے ہیں مگر نہایت بے رحم اور
... ہوتے ہیں۔ وہ وادی چمبل کے بدنام ڈاکوؤں میں روپ
... ان میں سے ایک تھا۔
... چمبل کے جنوبی کنارے پر مدھیہ پردیش کے دو
... اور مورینا واقع ہیں۔ اس کے قریب گوالیار دتیا

سندھیا نے ڈاکوؤں کے ایک گاؤں کو جلا دیا۔ بلحاظ روایت اور تاریخ ان علاقوں میں کوئی شخص بھی ڈکیتی اور رہزنی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ عام طور پر ڈاکو کو باغی سمجھا جاتا تھا۔ درحقیقت اس کے ساتھ ایک ہیرو کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔

[illegible]ء کی ابتدا میں اس علاقہ کے اندر تین منظم ٹولیاں کام کر رہی تھیں۔ بدنام ڈاکوؤں میں روپ رام شرما یا روپا برہمن لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں مصروف تھا۔ لکھن سنگھ "چندے" کے نام سے دیہات سے زبردستی روپیہ چھین رہا تھا۔ جو لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو گیا تھا۔ گبرا نے ناک کاٹنے کی بے رحم مہم شروع کر رکھی تھی کلا ... فاتح ... ایک بہادر پولیس افسر کا قتل کر کے پولیس سے بھاگ نکلا تھا۔

خصوری، پتا گوجر اور بارسی لعل بلا امتیاز زنا بالجبر قتل اور ڈکیتیوں میں مشغول تھے۔ حذایان کبھی گاؤں گاؤں کو لوٹ کر طاقت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ ان دو اضلاع میں مکمل بدنظمی



روپ رام شرما

ناک روپ رام شرما

محمد ... الدین صدیقی بی۔ ایس۔ سی عثمانیہ



... کے جنگلات پائے جاتے ہیں اور اس دریا کے شمالی
... اٹاوہ اور آگرہ (یوپی کے) اور بھرت پور اور
... (راجستھان کے) شہر واقع ہیں۔ اس علاقہ
... پناہ لیا کرتے تھے۔
... میں تعمیر ہوئی۔ آگرہ کی سڑک کے ساتھ
... وادیوں میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنے ہوئے تھے
... کے ڈاکو بے خبر تاجروں اور مسافروں کو اکثر
... شیر شاہ سوری نے ان قلعوں کو تعمیر
... کی نگرانی کے لئے ان میں مسلح فوجوں کو ٹھہرایا
... کے زوال اور بدنظمی کے بعد انگریزوں نے
... اس خطہ میں آباد ہو گئیں مگر
... نہیں کیا۔ گوالیار کے سندھیا حکمرانوں
... کی کوشش کی۔ ...

... کی سیول نظم و نسق تقریباً معطل ہو چکا تھا۔ سرکاری عہدہ دار سوائے عہدہ داران پولیس کے اپنے گھروں سے باہر جانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ دیہاتی اپنے گھروں کو ان قانون شکنوں کے رحم پر چھوڑ کر قریبی پہاڑیوں اور وادیوں میں راتیں جاگ کر گزارتے تھے۔ اس انتشار اور قانون شکنی کے باعث مقامی ڈاکوؤں کی ٹولیوں میں اضافہ ہوا جو گھروں کو لوٹتے اور راستوں پر رہزنی کرتے تھے۔

اسی وقت حکومت نے ۱۰ مئی ۱۹۵۸ء کو اسپیشل مخالف ڈکیتی آپریشن" کا قیام عمل میں لائی۔ ۱۲ سکٹر قائم کئے گئے چھ بھنڈ میں، چار مورینا میں اور دو ضلع گوالیار میں۔ ہر سکٹر کو ایک کمپنی کی قوت حاصل تھی۔ یہ پہلے سے قائم شدہ پولیس فورس کے علاوہ تھی۔ دو یا تین سکٹروں کا ایک زون (منطقہ) قائم کیا گیا شمالی حلقہ (رینج) میں ڈی آئی جی (ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس) کا

کو آئی جی (انسپکٹر جنرل پولس مدھیا پردیش) کی سپریم کمانڈ کے تحت اسپیشل کمانڈر بنا دیا گیا جو وقتاً فوقتاً اسپیشل ہیڈ کوارٹرز میں قیام کیا کرتا تھا۔ بارش کے زمانہ میں بلا وقفہ آپریشن جاری رہتا تھا۔

روپا کی کہانی دوسروں سے مختلف نہ تھی ۱۹۵۴ء میں سُنا گیا کہ دو کانسٹبلوں کو مان سنگھ کی جماعت نے جنگل میں گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔

ہرگز اس کا تصور نہیں تھا کہ روپا مان سنگھ کا جانشین اور اس کی جماعت کا لیڈر رہو گا۔ کانسٹبلوں کے خوفناک قتل کی چونکا دینے والی تفصیلات کا انکشاف ڈاکو لعل سنگھ نے کیا جسکو ارجا میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

جب کانسٹبلوں نے اپنے ہاتھ باندھے جانے پر مزاحمت کی تو مان سنگھ کے دوسرے بیٹے تحصیلدار سنگھ نے روپا کو آنکھ ماری کہ انکا کام تمام کر دے۔ روپا ان کو قریبی بالنس کے جنگل میں لے گیا اور درخت سے باندھ کر ٹامی گن سے ہلاک کر دیا۔

مان سنگھ چمبل وادی کا "رابن ہڈ" تھا کہ اس نے کسی بے گناہ کو کبھی ہلاک نہیں کیا ایک خیالی قصہ ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکو روپ رام شرما ۱۹۲۳ء میں آگرہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ چُپ رام ڈاکو مان سنگھ کا خاندانی پُجاری تھا۔ گاؤں کے ساہوکار اور اس کے خاندان کو جس نے قرضہ ادا نہ کرنے پر برسرِ عام گالی دی تھی) قتل کر کے مان سنگھ فرار ہو گیا۔ اور قانون شکن بن گیا۔ ۱۹۴۲ء میں روپا اس کی جماعت میں شریک ہو گیا۔

روپا ستارہ شناسی کی فطری صلاحیت رکھتا تھا علاوہ بہت ذہین اَن تھک اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں بڑی پھرتی تھی جسکی بدولت وہ مان سنگھ کا معتمد علیہ لفٹنٹ بن گیا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں ضلع بھنڈ میں ایک مقابلہ کے دوران مان سنگھ اپنے بیٹے صوبہ دار سنگھ کے ساتھ گولی کا نشانہ بن گیا مگر ڈاکوؤں نے پانچ پولس والوں کو ہلاک کر دیا انھوں نے روپا کی رہنمائی میں صحیح نشانہ لگایا تھا۔

مان سنگھ کی ٹولی منتشر ہو گئی تھی۔ مگر روپا نے ڈاکوؤں کو از سر نو منظم کیا ٹولی کے باقی لوگ بابو گوجر (فتح آباد آگرہ) سے جا ملے تاکہ گوجر فرقہ کی حمایت حاصل ہو جائے۔ مگر ان کے لیڈر بابو لوہاری کو پولس نے گولی کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا اور روپا سردار بن گیا۔

روپا اپنی ٹیلسکوپ لگی ہوئی رائفل سے چھپی ہوئی پولس پارٹی کے کسی آدمی کی کھلی کرن اُنگلی کو اڑا دے سکتا تھا۔ روپا کی ٹولی ڈاکوؤں کی ۱۳ ٹولیوں میں سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ ۱۹۵۷ء میں اُسنے بھنڈ اور مورینا میں انتہائی دہشت پیدا کر دی۔ صرف موضع انبا ضلع مورینا میں اس نے ۲۵ خوفناک جرائم کا ارتکاب کیا۔

اس زمانہ میں لکھن سنگھ کی ٹولی روپا کے ساتھ تھی انکی متحدہ طاقت ۔۔ تک پہنچ گئی۔ اُنھوں نے آگرہ مالی پور سرحد پر یوپی پولس کے سب انسپکٹر اور ایک کانسٹبل کو ہلاک کر دیا۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو بھنڈ میں پولس کے ساتھ ایک مقابلہ میں روپا شدید زخمی ہو گیا اور کئی ماہ تک اونٹ کی پیٹھ پر پھرتا رہا۔

بالآخر ۱۲ مئی ۱۹۵۸ء کو مسٹر بی جی گھاٹے انسپکٹر جنرل پولس کی سپریم کمانڈ میں مخالف ڈکیتی آپریشن مہم شروع کی گئی۔

اس مہم کے دوران پولس نے روپ رام شرما کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس کے بعد روپا اور لکھن سنگھ کی متحدہ قوت کمزور اور منتشر ہو گئی ✻

دلچسپ و عجیب



جنرل سر آرتھر سلوگٹ کے دل کے بیچوں بیچ گولی لگی تھی ۱۸۹۸ء میں گولی لگنے کے بعد بھی جنرل ۳۱ سال زندہ رہے اور ۷۲ سال کی عمر میں مرے۔



پَروں کی داڑھی امریکن شخص ہنکل کی ٹھوڑی میں گولی لگ گئی تھی۔ ٹھوڑی کے گوشت پر مرغی کی کھال چڑھا دی گئی تھی۔ اب اس کی داڑھی کی جگہ مرغی کے پَر نکلتے ہیں۔

مونا لیزا کا خالق لیونارڈو

جس کا باپ پہلی تصویر دیکھتے ہی ڈر گیا تھا

رئیس الدین احمد

مونا لیزا دنیا کی وہ مشہور اور واحد تصویر ہے جسکے لبوں پر پھیلی ہوئی پراسرار مسکراہٹ کل بھی ایک معمہ تھی اور آج بھی ایک معمہ ہے۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لئے بھی معمہ ہی رہے گی۔ جتنی شہرت آرٹ کے اس بے مثال شاہکار کو ملی اتنی ہی شہرت اس کے خالق کو بھی ملی اور رہتی دنیا تک ملتی رہے گی۔ اس کی تخلیق کا سہرا لیونارڈو۔ ڈا۔ ونچی کے سر ہے جہاں تک اس کی پیدائش کا تعلق ہے وہ فلورنس کے قریب ونچی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ سر رشتہ جات کی تصدیق کرنے والا افسر تھا۔ وہ صرف چہرے کا ہی خوب صورت نہ تھا بلکہ بے پایاں حسین شخصیت کا مالک بھی تھا۔ اس دور میں لوگ لمبے چوغے پہنا کرتے تھے، اس وجہ سے لیونارڈو اکثر لائن دار گلابی رنگ کی گھٹنوں تک لمبی قمیص پہنا کرتا تھا۔

لیونارڈو کے ہاتھ کافی لمبے تھے، اسے چڑیوں سے بہت ہی زیادہ محبت تھی جس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ جب بھی وہ کسی جگہ چڑیاں فروخت ہوتی دیکھتا انھیں خرید کر آزاد کر دیا کرتا تھا۔ اسے گھوڑوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ان ایام میں جب اسے غربت کا دور گزر رہا تھا اس نے ہمیشہ کوشش کی کہ کسی طرح ایک گھوڑے کا مالک بن جائے، لیکن نہ بن سکا۔ اس ناامیدی کے باوجود اس نے گھوڑوں کی ایسی شاندار تصاویر پینٹ کیں کہ کوئی اور مصور ان کا مقابلہ کرنا تو درکنار ایسی تصویر بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ہنہنا اٹھیں گے۔ کہتے ہیں جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو اسکی کاپیوں پر ہر وقت تصویریں بنی ہوتی تھیں اور وہ حساب سے بہت گھبراتا تھا۔ ایک روز اس کا باپ اس کی بنائی ہوئی کچھ تصاویر اپنے ایک دوست کے پاس لے گیا جس نے تصاویر دیکھیں تو دنگ رہ گیا اور کہنے لگا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ایسی "پینٹنگ کرے گا" جیسی کوئی نہیں بنا سکا۔ لیونارڈو کا استاد ویرو کیو تھے ویروکیو اپنے دور کے سب سے قیمتی اور مشہور اسٹوڈیو کا مالک تھا۔

لیونارڈو کے بارے میں جب وہ جوانی کی حدود سے گزر رہا تھا ایک کہانی بہت مشہور ہے۔ ایک بار لیونارڈو کے باپ کے فارم میں رہنے والے ایک دیہاتی نے لیونارڈو سے گزارش کی کہ وہ ایک گول لکڑی پر جو انجیر کے درخت سے کاٹی گئی تھی ایک حسین تصویر پینٹ کر دے۔

اس کی آرزو سنکر لیونارڈو نے طے کر لیا کہ وہ اس لکڑی پر ایک ایسی تصویر بنائے گا جو اتنی ڈراؤنی اور خوفناک ہوگی کہ لوگوں کو اس پر حقیقت کا گمان ہوگا۔

اس نے اپنے کمرے میں لاتعداد سانپ، چمگادڑیں، پتنگے



لیونارڈو

اور کیچوے جمع کئے ان سب سے اس نے ایک ایسا خوفناک اور عجیب ماحول پیدا کیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ سانس کے ساتھ ہوا زہر آلود ہو کر آگ میں بدل جاتی ہے۔ لیونارڈو نے اس تصویر کو اس طرح پینٹ کیا تھا کہ ایک ناہموار اور تاریک ٹیلا ہے جس کا منہ کھلا ہوا ہے اور اس میں سے ڈکار کے ساتھ زہر نکل رہا ہے اور آنکھوں سے آگ کے شعلے اور نتھنوں سے دھواں خارج ہو رہا ہے۔ جب یہ تصویر مکمل ہوگئی تو لیونارڈو نے اپنے باپ کو بلایا۔ تصویر دیکھ کر اس کے باپ پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ فوراً ڈر کر واپس چلا گیا۔ کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ پینٹنگ نہ ہو بلکہ حقیقت میں کوئی عفریت ہے۔ یہ دیکھ کر لیونارڈو قہقہہ مار کر ہنس پڑا کیونکہ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اس کے بعد اس کے باپ نے ایک بساطی سے لکڑی کا ایک گول تختہ خریدا جس پر ایک خوبصورت پینٹنگ بنی ہوئی تھی وہ بہت معمولی قیمت میں اسے مل گئی۔ بعد میں لیونارڈو کی یہ پینٹنگ ایک بھاری قیمت میں فروخت ہوئی۔

جہاں تک لیونارڈو کی مشہور تخلیق طعامِ شب "The Last Supper" کا تعلق ہے وہ ملن کے چوک میں اس وقت کے مشہور بھکشو کی خانقاہ میں کھانے کے کمرے کی دیوار پر بنی ہوئی ہے۔ جب لیونارڈو یہ تصویر بنا رہا تھا تو اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ صبح سے شام تک کام کرتا رہتا، اس دوران نہ کچھ کھاتا نہ پیتا اور نہ ایک لمحے کو ہاتھ سے پنسل رکھ کر آرام کرتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ کبھی کبھی تین چار دن تک اسے بالکل ہاتھ نہیں لگاتا تھا جتنی تصویر مکمل ہو جاتی اس پر ناقدانہ نظر ڈالتا رہتا اور پھر دو ایک گھنٹے اس کی نوک پلک سنوارنے میں گزار دیتا۔

انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ اگرچہ اس تصویر کو بہت نقصان پہنچا ہے لیکن اب بھی یہ تصویر اس دیوار پر دیکھی جا سکتی ہے۔ پہلے اس تصویر کو دیوار کی نمی نے خراب کیا پھر ملن پر "نپولین" کے قبضے کے بعد اسکی فوج نے نقصان پہنچایا۔ گو نپولین نے فتح کے بعد فوج کو یہ حکم دیدیا تھا کہ اس تصویر کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے لیکن اس کا کمانڈر بہت لاپرواہ تھا، یہی وجہ تھی



مونالیزا



مسز سری چکرورتی

ہاتھ پھیر کر امراض دور کرنیوالی

ساحرہ

دنیا میں بہت سے ایسے عجیب و غریب مسئلے ابھرتے ہیں کہ نہ تو سائنس داں ہی حل کر پاتے ہیں اور نہ مذہبی علماء اور لوگ طرح طرح کی کہانیاں گڑھتے ہیں، قصے بناتے ہیں لیکن سب کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک کیپٹن جبار کا قصہ آپ واقعات میں پڑھ چکے ہیں جہاں سائنس کے بڑے آلات بھی زمین کے نیچے پانی کا کھوج لگانے میں ناکام ہو جاتے ہیں وہاں کیپٹن جبار منٹوں میں پانی کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ اب آپ اسی طرح کی ایک اور شخصیت شریمتی چکرورتی سے ملئے۔

شریمتی چکرورتی کے بارے میں لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں کوئی کہتا ہے وہ جادوگرنی ہیں، کوئی انھیں الیکٹرو ہپنوٹسٹ کہتا ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے یہ خود مسز چکرورتی کو بھی معلوم نہیں۔ ان میں ایک قدرتی صلاحیت اور طاقت ہے جسے وہ صرف انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرتی ہیں، انھیں یہ طاقت نہ تو کسی پیر فقیر نے دی ہے نہ انھیں خواب میں کوئی بزرگ نظر آتے ہیں اور نہ وہ کسی سنت سادھو کی چیلی ہیں۔

مسز چکرورتی ایک سیدھی سادی سی گھریلو بنگالی عورت ہیں جن کے ماننے والے اور جن کے لئے دعا کرنے والے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مسز چکرورتی نے دنیا بھر میں ہزاروں ایسے مریضوں کا علاج کیا ہے جن کو ڈاکٹر لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ ہڈیوں، دل، گردوں اور نروس سسٹم کی کمزوری اور دوسرے درد۔ یہ مسز چکرورتی چند دن کے اندر بغیر کسی آلے یا دوا کی مدد کے دور کرتی ہیں۔ بہت زیادہ الجھے ہوئے کیسوں میں وہ ڈاکٹروں کی مدد بھی کرتی ہیں۔

آپ سوال کریں گے کہ وہ یہ سب کیسے کرتی ہیں۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ جب مسز چکرورتی کے یہاں کوئی مریض پہنچتا ہے تو وہ اس سے آرام سے لیٹ جانے کو کہتی ہیں

اس درمیان وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی ہیں، ان کا ہاتھ آہستہ آہستہ مریض کے جسم پر گردش کرتا رہتا ہے جیسے ہی ان کا ہاتھ درد والی یا بیماری والی جگہ کو چھوتا ہے ہاتھ میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ بیماری اگر معمولی ہے تو ہاتھ ہلکے ہلکے کانپتا ہے لیکن اگر بیماری خطرناک اور پرانی ہے تو ہاتھ بہت تیزی سے کانپنے لگتا ہے، ہاتھ میں سے ہلکی ہلکی گرمی نکلتی ہے جسے مریض محسوس کر سکتا ہے۔ مریض کو اگر درد محسوس ہو تو مسز چکرورتی درد والی جگہ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی ہیں اور چند منٹ میں درد دور ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہتا ہے، بیماری اگر معمولی ہو تو تین چار روز کے علاج سے ہی ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن اگر خطرناک ہو تو ایک دو ہفتے بھی لگ جاتے ہیں۔

مسز چکرورتی کا کہنا ہے کہ جیسے ہی وہ درد والی جگہ کو چھوتی ہیں ان کے تمام جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑ جاتا ہے۔ کرنٹ کی ایک لہر بائیں ہاتھ سے شروع ہو کر جسم سے ہوتی ہوئی دائیں ہاتھ میں پہونچ جاتی ہے۔ کبھی کبھی انکو پورے جسم میں جھٹکا سا بھی لگتا ہے لیکن ان جھٹکوں سے انکی اپنی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جیسے جیسے مریض کا درد کم ہوتا جاتا ہے ان کے ہاتھ کا ارتعاش بھی کم ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ارتعاش بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

دہلی کے درجنوں اسپتال اور ڈاکٹر مسز چکرورتی سے مدد لیتے ہیں۔ ہزاروں مریض علاج کے لئے ان کے گھر پہونچتے ہیں لیکن وہ کسی سے کوئی فیس نہیں لیتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں گی دوسروں کے دکھ اور تکلیفیں دور کرنے کے لئے جو کچھ کر سکتی ہیں کرتی رہیں گی۔

مسز چکرورتی ایک فوجی کرنل کی بیوی ہیں، جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ مسز چکرورتی اپنے شوہر کے ساتھ دہلی کی ڈیفنس کالونی میں رہتی ہیں۔

۴۳ سالہ سری چکرورتی دنیا کے بیشتر ممالک کا دورہ کر چکی ہیں جہاں انھوں نے ہزاروں ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کے سامنے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مسز چکرورتی کو دنیا کے سامنے شام کے سفیر ڈاکٹر عمر ابوریشہ لائے۔ شروع میں مسز چکرورتی کو صرف ان کے جان پہچان والے اور رشتے دار ہی جانتے تھے۔ ڈاکٹر عمر کا علاج کرنے کے بعد انکو شہرت ملنی شروع ہو گئی۔ اب مسز چکرورتی کی شہرت دنیا کے بہت سے ملکوں میں پھیل چکی ہے اور وہاں کے بڑے بڑے ڈاکٹر اور سائنس داں مسز چکرورتی کو اپنے ملک آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسز چکرورتی سے علاج کے بعد مرض ایک بار پھر ابھر آتا ہے اس لئے مسز چکرورتی کا کہنا ہے کہ۔ مریض کو ان کے علاج کے ساتھ ساتھ ڈاکٹری علاج بھی جاری رکھنا چاہیئے۔

" میرا کام مرض کی صحیح صحیح تشخیص کرنا ہے مکمل علاج ڈاکٹروں کا کام ہے "۔

ویسے معمولی اور عام بیماریاں عام طور پر مسز چکرورتی کے علاج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہیں۔


فیشن
۱۹۷۱
مشرق میں


فیشن ۱۹۷۱
مغرب
میں

خواب جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا

مورخوں سے چنگیز خاں اور اس کی شخصیت نے سمجھنے میں یا تو غلطی ہوئی ہے یا جان بوجھ کر انھوں نے چنگیز خاں کے حقیقی حالات اور اس کے سیاسی تصورات سے چشم پوشی کی ہے۔ تاریخ میں جگہ جگہ ہمیں اس کی دہشت و بربریت کے واقعات ملتے ہیں جنہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی کثیر تعداد کے بل بوتے پر ہی ہر جگہ فاتح اور غالب رہتا تھا۔ حالانکہ حقیقت اسکے برخلاف ہے۔ ایک مشہور چینی سیاح اٹ سنگ اپنے سفرنامے میں چنگیز خاں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بلاشبہ اس کے ساتھیوں کی تعداد کم تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ہر مہم اور ہر معرکہ میں کامیاب رہتا تھا۔"

چنگیز خاں کو بھی سکندر اعظم کی طرح ساری دنیا پر حکومت کرنے کا بے پایاں شوق تھا مگر جو بات چنگیز خاں کو سکندر سے الگ کر کے ایک منفرد حیثیت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ چنگیز ساری دنیا کو صرف فتح کرنا چاہتا تھا بلکہ اسکی تنظیم کر کے اسے ایک ورلڈ اسٹیٹ (ایک متحد آفاقی ریاست) کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔

اگرچہ تیرہویں صدی عیسوی میں بیشتر اقوام عالم تہذیب و تمدن کی دنیا میں اپنا مقام بنا چکی تھیں لیکن ان میں ایک اچھی حکومت اور اچھے نظم و نسق کا فقدان تھا۔ ایسے وقت میں چنگیز اور اسکے منگول ساتھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ساری دنیا کو فتح کرنے اور اسے ایک متحد دنیا کا روپ دینے کے لئے چل دیتے ہیں۔ چنگیز خاں کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ ہر مفتوحہ ملک یا ریاست کو پوری پوری مذہبی آزادی دی جائے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس ملک کے کلچر، فنون لطیفہ اور روایات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ چنگیز خان ایسا آدمی علماء اور پنڈتوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ منگولوں کا دستور یہ تھا کہ وہ مفتوحہ ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ خود منگولوں کا ایک کوڈ آف لاء (مجموعہ قوانین) تھا جس کی وہ بڑی سختی سے پیروی کرتے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ منگول اپنے کوڈ آف لاء کو اپنے مفتوحہ ممالک پر کبھی مسلط نہ کرتے تھے۔ چنگیز خاں کا مقصد یہی تھا کہ الگ الگ تہذیبوں پر مشتمل ایک ورلڈ اسٹیٹ کی تنظیم کی جائے۔ جس پر منگول اور صرف منگول حکومت کریں۔

چنگیز خان نے ۴۰ سال کی عمر میں اپنی مہمات کا آغاز کیا اور جب وہ اپنے تمام منگول ساتھیوں کو منظم کر کے اپنی مہم پر روانہ ہوا تو اسکی عمر کافی ہو چکی تھی، وہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔

چنگیز خاں کے ابتدائی حالات کے بارے میں ہماری معلومات کم ہیں۔ مگر اس کی ابتدائی زندگی کا ایک صاف اور واضح واقعہ

آرتھر اس بورن

تلخیص:۔ سید عارف نعمانی

ایسا ملتا ہے جس سے ہمیں اسکے بے پناہ اقتدار کا اندازہ ہوتا ہے یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

چنگیز خاں کے لڑکپن کا ایک ساتھی اتفاق سے منگولوں کا ایک اعلیٰ مذہبی پیشوا بنا یا گیا۔ ایک دن نہ جانے کیوں اس پیشوا کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اسے وہ عزت نہیں ملی ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ لہٰذا اپنے اس غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے اُس نے چنگیز خان کے ایک بھائی کو پھانسی پر لٹکا دینے کا حکم جاری کیا۔ چنگیز کا بھائی بھاگ آیا اور چنگیز کے گھر میں پناہ گزین ہو گیا۔ مذہبی پیشوا بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا چنگیز کے



تھی ہیٹ پیشوا کا تقاضا تھا کہ اس کے احکامات کے مطابق چنگیز کے بھائی کو فوراً سولی پر لٹکا دیا جائے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس دور میں منگولوں کے قانون کے مطابق روحانی اقتدار کو شاہی اقتدار پر فوقیت حاصل تھی۔ چنگیز خاں کو مذہبی حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا تھا، وہ مجبور اور چپ چاپ پیشوا کے آگے کھڑا رہا۔ ایسے نازک اور فیصلہ کن موڑ پر چنگیز کی معمر ماں نے چنگیز کو بغاوت پر اکسایا اور اس سے کہا "دیکھو وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس نے بھی تمہاری طرح میرا دودھ پیا ہے، کیا تم اس ظالم پیشوا کو اس بات کی اجازت دے دو گے کہ وہ تمہارے تمہارے بھائی کو پھانسی پر چڑھا دے؟ یہ تم کیسے بادشاہ ہو؟ چنگیز نے اپنی ماں کی باتوں کو سنا۔ اب اس کے اندر ایک سرکش جذبے نے سر اٹھایا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ مذہبی پیشوا کو پھانسی پر لٹکا دیں یا اس کا گلا گھونٹ دیں یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ منگول اپنی عملداری میں خون دیکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ واقعہ ایک بڑے انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے چنگیز خود اس انقلاب کا محرک تھا۔ اس نے روحانی انقلاب کو چیلنج کر کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا تھا اور خود ایک مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے ابھر آیا تھا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد اس نے فرمان جاری کیا "خدا ایک ہے اور وہی زندگی اور موت کا دینے والا ہے۔ تمام مذاہب سچے اور تمام تہذیبیں قابلِ قدر ہیں۔ منگول ساری دنیا کو فتح کرنے اور اس پر حکومت کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہر منگولی ایک بہترین سپاہی ہونے کے علاوہ ایک آزاد آدمی بھی ہے۔ منگولوں کے لئے امن اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کے دشمن پوری طرح ان کے ماتحت نہ ہو جائیں۔ ہر مفتوحہ ملک کے مذہب، کلچر اور فن کا پورا پورا تحفظ ہو گا۔ پجاریوں اور عالموں سے ٹیکس وصول نہ کیا جائے گا! ورنہ ان سے کوئی جسمانی کام لیا جائے گا۔ چوری کرنے والے کو موت کی سزا دی جائے گی انہوں کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے جائیں گے۔ ہر فرد کو آزادی دی جاتی ہے کہ وہ جتنی چاہے اتنی بیویاں رکھے مگر شرط یہ ہے کہ ہر بیوی کو الگ مکان میں رکھا جائے۔"

منگول بڑے پُر اعتماد ہوتے تھے۔ ان کو ہر جگہ اپنی کامیابی کا یقین ہوتا تھا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا کو فتح کرنا ان کا ایک مقدس فریضہ ہے شکست کے امکانات پر منگول غور کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

چین منگولی حملہ کا سب سے پہلا نشانہ بنا۔ صدیوں سے منگول چین سے پُر امن تجارتی تعلقات قائم کئے ہوئے تھے مگر اب چنگیز کی رہنمائی میں انہوں نے چین پر حملہ کر دیا۔ ہر سال وہ ایک نہ ایک چینی شہر کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ چین جیسا مضبوط ملک کمزوری کا شکار ہو گیا۔ ملک بھر میں جب سیاسی انتشار پھیل گیا تو منگول آسانی سے چین پر قابض ہو گئے۔ چین میں منگولوں کو چند ایسے اسلحہ کا علم ہوا جن سے وہ واقف نہ تھے۔ منگول بڑی تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ وہ ہمیشہ ہلکے اور کم وزن ہتھیاروں کا استعمال کرتے تھے اور سواری کے لئے چھوٹے قد کے گھوڑوں کو استعمال میں لاتے تھے تاکہ دشمن یہ جان نہ سکے کہ وہ کس رُخ سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ان کا نشانہ ہمیشہ مخالف بادشاہ اور اس کی خاص فوج پر ہوتا۔ وہ بادشاہ اور اس کے محافظین پر اس طرح اچانک ٹوٹ پڑتے کہ انہیں دفاع کا موقعہ ہی نہ ملتا۔

منگولوں کی یہ عادت تھی کہ وہ پہلے ہی سے اپنی وحشت اور بربریت کے قصے مشہور کر دیتے تاکہ مقابلہ سے گھبرا کر مخالف بادشاہ ان کو حاکم مان لے۔ منگولوں کا ایک باقاعدہ محکمہ راز بھی تھا جس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ دشمن کی سیاسی حالت، اور اس کی فوجی طاقت کا پتہ چلائے۔

منگولوں کا دوسرا نشانہ ہندوستان تھا۔ منگول یکایک دلی میں گھس آئے۔ محمد بن تغلق جو اس وقت دلی کا سلطان تھا ان کی کارروائیوں سے گھبرا اٹھا۔ اس نے منگولوں سے اپنی کارروائی روکنے کی گزارش کی اور ایک کثیر رقم کے علاوہ سونے، چاندی اور جواہرات کے نذرانے دیئے۔ منگولوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان سے لوٹ گئی مگر خود چنگیز خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ رکا رہا۔ اس نے اپنے ایک جنرل کو روس کی طرف روانہ کیا یہ منگولی جنرل وہاں سے کامیاب واپس آیا منگول جنرل اور اس کے ساتھیوں کی برق رفتاری ہی ان کی کامیابی کا راز ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ چنگیز خاں کو موسم کا بھی بڑا خیال تھا حملے کے لئے اس نے موسم گرما کے بدلے موسم سرما کو منتخب کیا۔ جبکہ کریمیا کے میدان برف سے ڈھکے رہتے ہیں منگولی جنرل کو حکم تھا کہ وہ موسم بہار سے پہلے ہی وہاں سے لوٹ آئے۔

براعظم یورپ کا پہلا ملک جس پر منگولوں نے حملہ کیا وہ ہنگری تھا جو پورے براعظم میں ایک انسانی ڈھانگ کی طرح چلا گیا ہے۔ ہنگری کے دو شہر پولینڈ اور لتھونیا پر منگولوں نے پے در پے حملے کئے۔ شروع شروع میں اہل ہنگری کا خیال تھا کہ چنگیز خاں اور اس کے ساتھیوں کا مقصد ہنگری میں صرف لوٹ، غارتگری اور ہنگامے بچانا ہے مگر بعد میں ان کو پتہ چل گیا کہ چنگیز خاں ہنگری کو ہمیشہ کے لئے لنگڑا کر کے چھوڑنا چاہتا ہے۔ یورپ پر حملے کے تیسرے سال منگولوں نے بیک وقت ہنگری اور پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ منگولی فوجیں متوازی طور پر پولینڈ اور ہنگری میں داخل ہو گئیں منگولوں کے حملے سے گھبرا کر جرمنی کے حکمران نے تمام یورپ کے عیسائی ممالک کے حکمرانوں سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر حملہ آور کا مقابلہ کریں۔ مگر عیسائی ممالک اس وقت گروہ بندی اور فرقہ پرستی کا شکار تھے۔ چنانچہ جب جرمن حکمران کی اپیل کارگر ثابت نہ ہوئی تو اس نے تنہا چنگیز خاں سے مقابلہ کی ٹھانی اور ایک بھاری فوج کی تنظیم کر کے مقابلہ کے لئے نکل پڑا۔ جنگ کے پہلے ہی دن منگولی فوج جرمن فوج کو تتر بتر کرنے میں کامیاب ہو گئی مگر اصل کامیابی ابھی دور تھی منگولی فوج نے اس جنگ میں اپنی تمام صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور خاص طور پر تیر کمان کے وہ جوہر دکھائے کہ جرمن فوج میں دہشت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی کہ جرمن فوجوں نے اچانک منگولوں کے کیمپوں پر حملہ کر دیا مگر وہاں تمام منگولی کیمپ خالی پڑے تھے منگولی فوج راتوں رات پر اسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ اس واقعہ کے تیسرے دن منگولوں نے پورے ہنگری کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہنگری شعلوں کی نذر ہو گیا اور انہیں شعلوں میں کہیں شاہ ہنگری کی لاش بھی جل رہی تھی۔

چنگیز خاں اپنے مقصد میں ہر جگہ کامیاب رہا مگر اب اس کی عمر کے دن ختم ہو چکے تھے۔ ایک رات وہ ایسی نیند سویا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔

چنگیز کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام منگولوں میں پھیل گئی۔ منگولی اپنے تمام کام دھندے چھوڑ کر اپنے پایہ تخت قراقرم میں جمع ہونے لگے۔ ان کے سامنے اب ایک ہی مسئلہ تھا، چنگیز خاں کا جانشین کون ہو گا؟ انہیں اب ایک ایسے جانشین کو منتخب کرنا تھا جو چنگیز کے خاندان ہی کا فرد ہو اور چنگیز جیسا بہادر اور قابل بھی ہو۔ آخر کار منگول سرداروں نے قبلائی خان کو چنگیز کا جانشین مقرر کیا۔ دو صدی تک منگول حکمران رہے۔ قبلائی خان نے چین پر ایک بار پھر اپنا تسلط جمایا مگر چنگیز کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

منگول ایک وسیع سلطنت کے حکمران تھے مگر ان کے

ایک ووٹر کی سرگذشت

(طنزیہ)

ڈی۔ کے۔ کنول



میں نہ سادھو ہوں اور نہ شیطان۔ میرا نام فقیر چند ہے اور میرے باپ کا نام بھولا چند تھا۔ میں گنڈیریاں بیچا کرتا ہوں۔ اور میرا باپ بھی گنڈیریاں بیچا کرتا تھا۔ آزاد ہونے سے پہلے بھی ہمارا یہی پیشہ تھا اور آزاد ہونے کے بعد بھی یہی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ •

میں نہ سادھو ہوں اور نہ شیطان۔ میرا نام فقیر چند ہے اور میرے باپ کا نام بھولا چند تھا۔ میں گنڈیریاں بیچا کرتا ہوں، میرا باپ بھی گنڈیریاں بیچا کرتا تھا۔ آزاد ہونے سے پہلے بھی ہمارا یہی پیشہ تھا اور آزاد ہونے کے بعد بھی یہی ہے۔

میرا باپ بہت ہی بھولا تھا، شاید اسی لئے اس کے ماں باپ نے اس کا نام بھولا چند رکھا تھا۔ اس نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور بیچارہ مارا گیا۔ مرتے سمے اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اکھڑی اکھڑی سانسوں میں بولا:۔

"بیٹا فقیر چند میں جا رہا ہوں! تمھیں چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے جا رہا ہوں۔ زندگی بھر میں نے مکھیاں ماری ہیں (کیونکہ گرد اور مکھی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے) اس لئے میں کوئی جائداد نہ بنا سکا، مگر مرتے مرتے تمھارے لئے ایک ایسی جائداد چھوڑ رہا ہوں جسے حاصل کرنے کے لئے مجھے جان کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ جائداد "آزادی" ہے اسے کو سنبھال کر رکھنا۔"

اتنا کہہ کر اس کی آواز خاموش ہو گئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

میں نے اپنے مرحوم باپ بھولا چند کی آخری خواہش کے مطابق آزادی کو سینے سے لگایا۔ آزادی جو ایک چوسی ہوئی گنڈیری ہے، میں نے اس گنڈیری کی حفاظت کی اور ایک بھی مکھی کو اس پہ بیٹھنے نہیں دیا۔ میں نے محلے کے ایک ودیارتھی کو اس لئے پیٹا تھا کہ وہ پانی پی پی کر آزادی کو کوس رہا تھا، اور اس کے دانت توڑنے کے جرم میں مجھے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔

چودھری ظالم سنگھ جس نے ہمارے محلے سے الیکشن لڑا تھا ایک مرتبہ (الیکشن سے پہلے) میرے پاس آیا اور میرے پاؤں پکڑ کر بولا:۔

"بابو فقیر چند جی! میں عوام کے جائز مطالبات منوانے کے لئے، انھیں جائز حقوق دلانے کے لئے، بیروزگاروں کو روزی، بھوکوں کو پوری کچوری اور ننگوں کو کپڑا لتا مہیا کرانے کے لئے پارلیمنٹ میں جا رہا ہوں، آپ مجھے ووٹ دیں گے تو میں آپ کی سیوا کر سکوں گا۔ فقیر چند جی میں آپ کی ریڑھی کو بہت بڑی دوکان میں تبدیل کرا دوں گا۔ آپ مجھے ووٹ دیجئے ۔۔ آپ مجھے ووٹ دیں گے نا۔ بولو فقیر چند"؟

وہ رونے لگا۔ "اگر مجھے ووٹ نہ ملے تو میں مارا جاؤں گا میں برباد ہو جاؤں گا۔ میری ضمانت ضبط ہو جائے گی"۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے سر پر پیار بھرا ہاتھ پھیرا اور کہا:۔

"ظالم سنگھ نہ روؤ۔ میں تمھیں ہارنے نہیں دوں گا۔ میں تمھیں ووٹ دونگا۔ اطمینان رکھو"۔

وہ میرے پاؤں سے لپٹ گیا اور اس نے میرے تلووں کے چٹ پٹ کئی بوسے لے لئے ۔۔ ہائے لیڈری!۔

میں نے اپنا ووٹ ظالم سنگھ کو دے دیا۔ اپنے محلے میں اس کے حق میں پروپیگنڈا کیا۔ ظالم سنگھ کامیاب ہو گیا اور پارلیمنٹ میں پہونچ گیا ۔۔ اس روز کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا۔

پانچ برس بعد وہ میرے پاس پھر آیا اور ایک بار پھر میرے پاؤں پکڑ لئے اور تلوے چاٹنے لگا۔

"فقیر چند جی! آپ میرے ماں باپ ہیں، آپ ہی میرے بھگوان ہیں۔ پچھلے الیکشن میں مجھے آپ کے ووٹوں نے ہی جتایا تھا۔ اس بار بھی"۔

"اس بار آپ کا پروگرام (مینی فیسٹو) کیا ہے"؟

"سوشلزم"۔

"نہیں سیکولرازم۔ تم جنتا کے سیوک تھے۔ تم ننگوں کو کپڑا، بھوکوں کو روٹی اور بے روزگاروں کو روزگار دلانے گئے تھے نا"۔

"ہاں میں گیا تھا مگر میں خود بھوکا اور ننگا تھا اس لئے پہلے مجھے خود اپنے آپ کو ڈھانپنا پڑا۔ اپنا پیٹ بھرنا پڑا"۔

"تو تم اپنا پیٹ بھرتے رہو۔ اپنا تن کو ڈھانپتے رہو لیکن سوشلزم کو گالی نہ دو۔ جنتا کو دھوکا نہ دو۔ لوگ سیدھے سادے ہیں، بھولے بھالے ہیں اسی لئے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ تم لوگ

واقعات مشہود علی

مکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں، میرا باپ بھی بھولا تھا
ی لئے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

ظالم سنگھ رونے لگا۔ ■ مگر مجھے آنسو رو رہا تھا اور
سکرا رہا تھا۔ اس پر شماتت آمیز قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ اس
ہوئے آنسو مجھے دھوکا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ لیڈر ایک
ے ایکٹر جو نا ٹک کرنا جانتا ہے، سوانگ رچانا جانتا ہے
ں کی آنکھوں سے اصلی آنسو نہیں بلکہ گلیسرین کے آنسو
ہیں۔

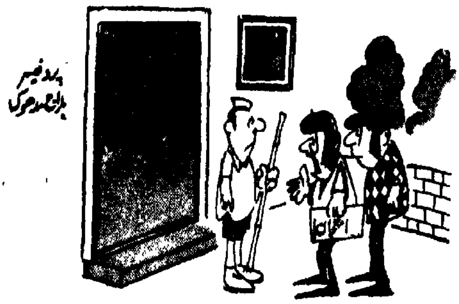
ظالم سنگھ کے مقابلے میں نہال چند نے الیکشن لڑا۔
میاب ہو گیا۔ میٹھے سبھاؤ، ٹھنڈے مزاج کا نہال چند
برسوں اہنسا کی سیوا کی تھی، جس نے بے روزگار اندولن میں
ے کھائے تھے (کیونکہ وہ خود بھی بے روزگار تھا) آزادی
طرح وہ کئی بار جیل بھی گیا تھا اس لئے ووٹ کا اصلی حقدار
ہی تھا۔

جب میرے چار ننگ دھڑنگ بچوں کی ماں نے
یہ پوچھا۔

"کیوں جی کب آئے گا یہ سوشلزم"!
"سوشلزم" میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "میرے
ادھڑ ننگ بچوں کی ماں، سوشلزم آئے گا اور بہت جلد
سوشلزم لانے والا نہال چند سوشلزم لے کر ہی آئیگا"
میری اکلوتی بیوی نے تھالی میرے سر پر ماری اور
پر ایک چپت مار کر بولی۔
"گھر میں آٹے دال کا کال ہے اور تم سوشلزم کی رٹ
ہے ہو۔ میں کہتی ہوں تم احمق ہو۔ گدھے ہو نہ گدھے"
خوب جلی کٹی سن کر میں اپنا سر سہلاتا ہوا باہر چلا گیا
دفعتاً مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ نہال چند سے پوچھا جائے
زم کب آئے گا۔

جب چپراسی نے مجھے نہال چند کے کمرے میں پہنچا دیا
چند نے میرے سراپا کا بغور جائزہ لیا اور میری طرف
اہوں سے دیکھ کر بولا۔
"کون ہو تم"!
"میں فقیر چند ہوں"
"فقیر چند! کون فقیر چند؟"
"میں آپ کی جنتا ہوں، میں نے آپ کو ووٹ
تھا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ سوشلزم
لائیں گے۔ میرے گھر میں آٹا دال نہیں، ایک طرف قرضدار
میری جان کے لاگو ہو چکے ہیں اور دوسری جانب میری بیوی
مجھے زندہ درگور کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ مجھے بتایئے کہ سوشلزم
کب آئے گا۔ کب آئے گا؟"
نہال چند کے تیور بدل گئے اور وہ میری طرف تیکھی
نظروں سے دیکھ کر بولا۔
"میں پچھلے چند مہینوں سے سوشلزم کے معنی تلاش کر رہا ہوں
ابھی تک مجھے سوشلزم کے معنی معلوم نہ ہو سکے اگر تمہیں اس کے
معنی معلوم ہوں تو مجھے بتا دو تاکہ میں آواز بلند کر سکوں"
میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے
لیکن میں انہیں پی گیا۔ میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ
پھیل گئی اور میں نہال چند کی طرف تحقیر اور نفرت بھری نظروں
سے دیکھتا رہا قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں ایک رنگین تتلی نہال چند
کے کمرے میں داخل ہوئی اور نہال چند کی طرف لپکی۔ نہال چند نے
اس انگریزی تتلی کو گود میں بٹھایا اور میری طرف ایسی نگاہوں
سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔
"کیوں کباب میں ہڈی بننا چاہتے ہو، سوشلزم کے
متوالے۔ سوشلزم ایک دھوکا ہے ایک فریب ہے۔ ڈھکوسلا
ہے۔ سوشلزم ایک نعرہ ہے عمل نہیں۔ ایک خواب ہے لیکن
حقیقت نہیں"

میں نے اپنے خوابوں کے کفن سے اپنی آرزوؤں کو ڈھانپا
اور ٹوٹا ہوا دل لے کر گھر پہنچا۔ دروازے پر میری بیوی کھڑی
تھی۔ میری سڑی بسی رانی مجھے دیکھ کر وہ میری جانب لپکی
اور میرے پاؤں پر گر کر بولی۔
"مجھے شما کر دو منے کے باپو، مجھے معاف کر دو اگر تم مجھے معاف
نہیں کرو گے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ گلے میں پھندا ڈال کر
خودکشی کر لوں گی"
"نہیں نہیں ایسا نہ کرنا منے کی ماں ورنہ میں رنڈوا ہو جاؤں گا
رنڈوا ہو جاؤں گا"
میں اپنی بیوی سے لپٹ کر رونے لگا۔ ایک شیرخوار بچے
کی طرح زار و قطار رونے لگا۔ میری بیوی نے اپنی پھٹی پرانی ساڑی
کے پلو سے میرے آنسو پونچھے اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔
"غم نہ کرو منے کے باپو۔ بھول جاؤ سوشلزم کو۔ بھول جاؤ
ان فریبیوں کو، پانچ سال بیت جانے دو۔ یہ لوگ پھر ووٹ
مانگنے آئیں گے۔ جس طرح ہمیں رلا چکے ہیں، تڑپا چکے ہیں اسی
طرح ہم بھی انہیں تڑپائیں گے انہیں رلائیں گے اگلے الیکشن میں
میں بھی کھڑی ہو جاؤں گی اور سوشلزم لے کر ہی دم لوں گی"
میں نے اپنی بیوی کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا۔ میری سڑی
بسی بیوی مجھے اس وقت بڑی دل آویز اور خوب صورت لگی۔
میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا"
■



کیا پروفیسر ہمیں نظر نہ آنے والی سیاہی کا راز بتائیں گے؟

چاند کا ایک کاجب آسمان پہ کرتار کی چلتی سڑک کے
کنارے کنارے کھڑے فلک بوس درختوں نے چاندنی کو اپنی لمبی
باہوں میں سمیٹ لیا اور وہ اپنے خیالوں میں شہلا کے خیالوں کی
چاندنی بنائے چلا جا رہا تھا۔ کرتار کی طویل سڑک پر پھیلی ہوئی چاندنی
کی چلمن سے سرکتا ہوا وہ انجانی دنیا میں پہنچ گیا جہاں سبھی اجنبی
تھے صرف ایک چہرہ جانا پہچانا تھا اور وہ اس چہرے کو دیکھ رہا تھا
جو غالب کا کوئی حسین تصور معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس جسم کو دیکھ
رہا تھا جو چاندنی میں بھیگا ہوا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا
جیسے چاندنی پگھل کر شہلا بن گئی ہو۔ تخیل کی دنیا میں انسان بھٹک
رہا ہو۔ کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہ تھی۔ کوئی بات اس پہ

کرتا تھا۔ جھیل خاموش تھی شہلا کی آنکھوں کی طرح۔ چاندنی
جھیل کے سینے پر رقصاں تھی وہیں وہ بیٹھ گیا۔ گزرے ہوئے
لمحوں کو سمیٹا یادوں کے کنول جھیل میں کھل اٹھے۔

"جھیل کتنی گہری ہے؟" ایک دن شہلا نے پوچھا تھا۔

"تمہاری محبت جتنی گہری ہے۔" گہرے سوال کا گہرا
جواب دیا گیا۔

لیکن انسان زندگی کے وسیع دائرے میں ایک ایٹم کی طرح
ہے۔ ایک ننھا سا ذرہ ہے جو وقت کے ریگستان میں پڑا تپ
رہا ہے۔ ریگستان میں اٹھتے ہوئے بگولوں کے سامنے اس ننھے سے
ذرے کی حقیقت کیا ہے؟ ہو سکتا ہے پوری دنیا ایک ایٹم ہو

لگا۔ پھر بھی اسے سکون نہ ملا۔ اس نے سگریٹ بجھا دیا اور چھوٹی
چھوٹی کنکریاں اٹھا کر دریا میں پھینکنے لگا۔ خاموش جھیل
میں ترنگیں پیدا ہونے لگیں۔ جب وہ انتظار سے بالکل اکتا
گیا تو تھکے ہارے جسم سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے چل پڑا۔
چاند آ گیا تھا۔ چکور ہی نہ آ سکا۔ اب چاند چکور کی تلاش
میں جا رہا تھا۔

آرکسٹرا گنگنا رہا تھا۔ کلب کے بلوریں فرش پر مرمریں جسم
مضبوط بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھرک رہے تھے۔ تسکین کی
تلاش میں جسم سے جسم لپٹے ہوئے تھے لیکن تسکین ملتی کہاں
ہے! پیاس بجھتی نہیں بڑھتی ہے۔ ان جسموں میں کیا رکھا

الف اے بادشاہ ٥١

زہر کی شیشی



اثر انداز نہ تھی۔ بس وہ تھا، اس کے حسین خیال تھے۔ عرصہ دراز سے
چلتی ہوئی اس دنیا میں کتنے طوفان اٹھے ہیں، کتنے انقلاب آئے
ہیں پھر بھی زندگی کا کارواں وقت کے کارواں کے ساتھ منزل کی طرف
بڑھتا ہی رہا ہے۔ لیکن منزل کہاں ہے؟ یہ کیسا فریب ہے
جو انسان اپنے آپ کو ہزارہا سال سے دیتا آ رہا ہے۔ یہ خاموش
طویل راستے کہاں جاتے ہیں کوئی بھی نہ جان سکا، ہزاروں
لوگ اس پہ آتے ہیں اور نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ اور وہ
ابھی راستوں پہ زندگی کی تصویر بنا رہا تھا۔ ہوا کا ایک لطیف
جھونکا آیا اور چاندنی کی چلمن جنبش کرنے لگی اور اسے محسوس ہوا
جیسے شہلا اپنے دلآویز رنگین چلمن کی اوٹ میں آ گئی ہو۔
وہ جھیل کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اکثر اپنی محبوبہ سے ملا

جو پورے یونیورس میں حرکت کر رہا ہو۔ وقت کے ہاتھوں زندگی
کی ناکامیاں کتنی دل شکستہ ہوتی ہیں لیکن وہ خیالوں کے
رنگین تانے بانے بنتا رہا۔ دل کی دھڑکنوں نے ساز چھیڑ رکھا
تھا اور ہونٹ محبت کے گیت گنگنا رہے تھے۔ لیکن دل کی
دھڑکنوں کا کیا بھروسہ کب تھم جائیں! دل کی رگیں کب پھٹ
جائیں کسے معلوم۔ پھر بھی وہ انتظار کر رہا تھا۔ لیکن انتظار کی
بھی حد ہوتی ہے، وہ انتظار سے اکتا رہا تھا۔ فضا کا سناٹا
چاندنی کا سکوت، جھیل کی خاموشی بے چین کر رہی تھی۔ آج
ہر شے گم صم تھی۔ شہلا جب آتی تھی تو اسے ہر شے بولتی
ہوئی محسوس ہوتی تھی، ہر طرف زندگی رقصاں ہوتی نظر آتی تھی
اس نے سگریٹ نکال کر جلایا اور فضا میں دھواں بکھیرنے

ہاں! ان میں نغمہ و رقص کی گہرائی میں اترو اور سوچو کر تم
کیوں ہو۔ موت پر ہمیشہ کے لئے قابض ہو جاؤ تاکہ زندگی
کے بندھنوں سے آزاد ہو جائے۔

وہ کلب میں داخل ہوا آرکسٹرا کی الجھی ہوئی دھنوں
الجھے ہوئے جسموں میں شہلا کو تلاش کیا۔ شہلا اجنبی بانہوں
میں گھری ہوئی رقص کر رہی تھی۔ اسے دل کی رگیں پھٹتی
محسوس ہوئیں وہ وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا تیزی سے
نکل آیا۔ عرصہ دراز سے خیالوں کا بت اپنی بے نور آنکھوں
سے بس ایک ہی خواب دیکھتا آ رہا ہے۔ نہ اندھیرا اجالا
اندھیرے اور اجالے سے گھری ہوئی زمانے کے نشیب
سے گزر رہی ہے۔ کبھی ٹھوکر کھا کر سنبھلتی ہے اور کبھی

ور کہانی ہے۔
سڑک کے کنارے اداس اور مضمحل ہو جاتا تھا
بکھری ہوئی زندگی میں ہنستے ہوئے آنسو روتی ہوئی
تھی۔ بھوک سے نڈھال بے جان سسکتے ہوئے جسم تھے

یہ دلدوں کا پھیلا ہوا بھیانک قہقہہ تھا۔ یہ کونسی دنیا ہے!
سا نظام ہے۔ فریبی دنیا کے سبھی لوگ دھوکے کے غلاف میں
ہوئے ہیں۔ انکی ہنسی ان کے قہقہے کھوکھلے ہیں صرف
یں پر یہ لرزتے ہوئے درد بھرے آنسو حقیقت ہیں لیکن عارضی
اکی ہر شے عارضی ہے زندگی کا ٹمٹماتا ہوا دیا ایکدن بجھ جائے
۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی وہ شہلا کے کمرے میں بیٹھا ہوا
کا انتظار کر رہا تھا۔ شہلا گنگناتی ہوئی داخل ہوئی اسے
کر پہلے ٹھٹکی پھر سنبھل کر بولی۔
"ہیلو اعظم!"
"آج تمہارا ہمرقص کون تھا؟"
"وہ میرا منگیتر ہے۔ کل ہی لندن سے آیا ہے اور اب
ہم لوگ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں"
"اپنے منگیتر کے بارے میں تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟"
"جب وہ لندن میں تھا تو اس نے میرے پاس ایک
بھی خط نہیں لکھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ مجھے بھول گیا اسلئے اسکے
بارے میں بتانا ضروری نہیں سمجھا"
"اور تم مجھے آج تک دھوکا دیتی آئیں"
"اس میں دھوکہ کہاں ہے اعظم میں نے تو تمہیں
اپنا دوست بنایا تھا"!
"دوست سے اقرار محبت نہیں کیا جاتا"؟
"کیوں نہیں! دوستی کی محبت کا اقرار کیا جاسکتا ہے"
"اور شادی کا"!
"میں نے ایسا وعدہ نہیں کیا"
"تمہارے خطوط اب تک میرے پاس محفوظ ہیں
شہلا" اعظم کی زہریلی آواز کمرے کے سناٹے میں شہلا کو
بڑی بھیانک لگی تھی۔
"اور وہ تصویریں بھی حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں جو تم
نے میرے ساتھ کھنچوائی تھیں" اور اس کے کچھ بولنے
سے پہلے ہی وہ کمرے سے جاچکا تھا۔
اب وہ تنہا کھڑی سوچ رہی تھی کیا اعظم اسے بلیک میل
کرے گا؟ تو پھر اس کا مستقبل کیا ہوگا اسے اپنا مستقبل
تاریک نظر آرہا تھا وہ اپنے بستر پر رات دیر تک کروٹیں بدلتی
رہی لیکن نیند نہ آئی اور جب صبح ہوئی تو اس کے ہاتھ
میں زہر کی شیشی کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں دیوانگی سی
تھی۔ ہونٹوں پر زہر سے بجھی ہوئی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
اس وقت عورت اپنے اصلی روپ میں کھڑی تھی جب وہ اپنا
مقام بھول جاتی ہے۔ اپنی زندگی سنوارنے کے لئے وہ کچھ نہیں
دیکھتی۔ وہ ہاتھ میں دبی زہر کی شیشی کو دیکھ رہی تھی جسکا ایک
قطرہ کسی کی سانسوں کا تسلسل توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔
اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی اس نے جلدی سے
اس ہاتھ کو پیچھے کر لیا جس میں زہر کی شیشی تھی۔ وہ دھیرے
دھیرے دروازے کی طرف بڑھی اور قریب پہونچ کر کواڑ کھول
دیا لیکن وہاں اعظم کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اعظم
اس کا ارادہ بھانپ گیا ہو۔ اس نے بغور اس کے چہرے کو
دیکھا اسکا چہرہ سپاٹ تھا۔
"شہلا" اعظم کی یہ آواز اسے بہت دور سے آتی ہوئی
محسوس ہوئی۔
"یہ دو لفافے ہیں، ایک میں تمہارے خطوط ہیں اور دوسرے
میں تصویریں" شہلا نے انہیں کانپتے ہاتھوں سے لے لیا۔
"شہلا" اس نے پھر کہا: "محبت جسم نہیں ایک پاک
جذبہ ہے، ایک مقدس خیال ہے جسے صرف دل کی دھڑکنیں
ہی سمجھ سکتی ہیں، پرکھ سکتی ہیں" اور وہ تیز تیز قدموں سے
چلا گیا۔ شہلا کے ہاتھ میں دبی ہوئی زہر کی شیشی چھوٹ کر
گری اور زہر فرش پر پھیل گیا اسے محسوس ہوا جیسے اعظم نے
اس کے حلق میں زہر کی پوری شیشی انڈیل دی ہو ■

گدھوں کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد

(مزاح)

...ویہ فاطمہ



آخرکار سالہا سال کے بعد گدھوں کی محنت رنگ لائی اور "گدھستان" آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد اس کا نیا نام "ڈنکی لینڈ" DONKEYLAND رکھا گیا۔ یہ نیا نام موڈرن قسم کے گدھوں نے تجویز کیا تھا۔ مسٹر جیکسن ڈنکی لینڈ کے پہلے صدر تھے۔ مسٹر جیکسن کو چونکہ اپنے وطن سے بیحد محبت تھی اسلئے انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے باغیوں یعنی ظالم قسم کے دھوبیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اور باقی دھوبیوں کو ان کے نرم رویّہ کے عوض "ڈنکی لینڈ" سے جلد سے جلد نکل جانے کا حکم دیدیا۔ ڈنکی لینڈ کے دھوبی جب قطار در قطار کپڑوں کی گٹھری لئے کوچ کر رہے تھے تو بہت سے فسادی اور شرپسند گدھوں نے ان پر دھاوا بول دیا اور قیمتی قیمتی کپڑوں کی گٹھری لیکر فرار ہوگئے۔ ویسے بھی ابھی نئی آزاد مملکت میں فسادیوں کیلئے کوئی قانون جاری نہیں ہوا تھا اس لئے گدھا پولیس نے ان فسادی گدھوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور انکی شرارت کو نظرانداز کردیا۔ گدھوں کی یہ شرپسندی صرف دھوبیوں تک ہی محدود تھی ورنہ ڈنکی لینڈ کے تمام گدھوں میں آپس میں اتفاق رائے تھا اور آزادی کے بعد ابتک گدھوں کی کسی جماعت نے نہ بغاوت کی کوشش کی اور نہ آپس میں خونریزی کی نوبت آئی جیسا کہ عام طور سے ہوتا آیا ہے، اسلئے یہاں کی امن پسندی سے متاثر ہوکر یہاں کے سرکاری اخبار "ڈنکی ٹائمز" کے ایڈیٹر مسٹر کلائیو نے ڈنکی لینڈ کو اپنے اخبار میں "پیس لینڈ" (PEACE LAND) کا خطاب دیدیا۔

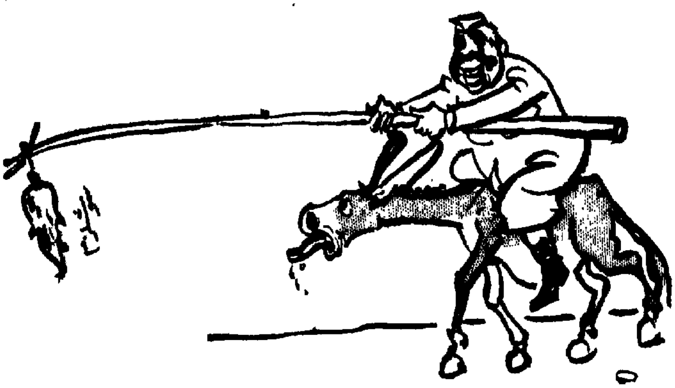
دھوبیوں کی آخری جماعت جب کوچ کرنے لگی تو ڈنکی لینڈ میں سرکاری تعطیل کا حکم دیدیا گیا۔ تعطیل کے روز "یوم گدھا" منانے کا بھی اعلان کر دیا گیا اتفاق سے اس روز اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔ تمام ڈنکی لینڈ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ڈنکی لینڈ کے دارالسلطنت کا نام (DON KEY CITY) ڈنکی سٹی رکھا گیا۔ اس شہر کو گدھوں نے رنگ برنگی جھنڈیوں اور بجلی کے قمقموں سے دلہن کی طرح سجایا تھا۔ تمام شہر کے گدھے اور گدھے کے بچے خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے خوشی کے مارے فضا میں ڈھینچوں ڈھینچوں کی صدائیں بلند کر رہے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو دولتیاں بھی جھاڑ رہے تھے۔

ڈنکی سٹی کے سب سے بڑے میدان "ڈنکی پارک" میں ایک بہت بڑا اور خوبصورت سا پنڈال بنایا گیا کیونکہ یہاں صدر ڈنکی لینڈ تشریف لانے والے تھے۔ سہ پہر ہوتے ہی تمام شہر کے گدھے چھوٹے چھوٹے جلوسوں کی شکل میں "انقلاب زندہ باد" "ڈنکی لینڈ ہے آزاد" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈنکی پارک میں جمع ہوگئے۔ شام کے ٹھیک چھ بجتے ہی صدر ڈنکی لینڈ کی کار ڈنکی پارک میں داخل ہوئی اپنے صدر کی کار کو دیکھکر مجمع بے قابو ہوگیا۔ منتظم گدھوں نے بڑی مشکل سے گدھوں کو قابو میں کیا اور کچھ ہی منٹ بعد صدر کار سے باہر آگئے وہ جدید طرز کے سوٹ میں ملبوس تھے انکی سامنے کی بائیں ٹانگ پر نئی گھڑی بندھی ہوئی تھی جسے دیکھکر ہر گدھا بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ صدر وقت کے بڑے ہی پابند ہیں صدر کو اپنے قریب دیکھکر گدھے ایک بار پھر نعرے لگانے لگے "صدر ڈنکی لینڈ زندہ باد"

صدر اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھ گئے۔ سب سے پہلے انھوں نے ڈنکی لینڈ کا قومی جھنڈا لہرایا۔ جھنڈا سفید رنگ کا تھا جس میں ایک گدھا ایک میدان میں گھاس پر لوٹتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ چھ بجکر دس منٹ پر صدر کی تقریر تھی اسلئے وہ اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالکر سیدھے مائیک پر آکر کھڑے ہوگئے۔ مسٹر کلائیو نے صدر کے گلے میں پھولوں کا گجرا پہنایا۔ (فوراً ہی نامہ نگار گدھوں کے کیمروں کا رُخ صدر کی طرف ہوگیا) صدر نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر مسٹر کلائیو کو دولتی جھاڑ کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور پھر مجمع سے مخاطب ہوئے۔

میرے پیارے ہموطنو! آج کا دن ہمارے لئے بہت ہی مبارک دن ہے۔ آج ہم نے ظالم دھوبیوں سے نجات حاصل کر لی۔ آج ہمیں ہمارا حق مل گیا وہ حق جسے ازل سے دھوبیوں نے چھین رکھا تھا۔ آج ہم "ڈنکی لینڈ" کی آزاد فضا میں سانس لے سکتے ہیں اور آزادی کی گھاس کھا سکتے ہیں۔ کل تک ہم انسانوں کے غلام تھے اُن کے لئے ہم محنت کرتے تھے اور بھوکے رہتے تھے اور پھر مرجاتے تھے۔ آج سے ہم اپنے لئے محنت کریں گے اور اپنے لئے ہی جئیں گے اب ہماری قسمت میں سوکھی نہیں ہری ہری گھاس ہوگی۔ مجمع نے پھر ایک بار "زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔

صدر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے پیارے بھائیو! اب ہمیں بھول جانا چاہئیے کہ ہم کبھی انسانوں کے غلام تھے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کی بجائے اپنے مستقبل کی طرف نظر رکھیں اور اپنے مستقبل کو زیادہ سے زیادہ شاندار اور روشن بنانے کی کوشش کریں۔ آیئے آج ہم عہد کریں کہ آج سے ہمارا ہر قدم ترقی اور منزل کیجانب بڑھے گا۔ آج سے ہمارا کبھی بھی پیشہ دھوبی ...



شری جگجیون رام نے کہاہے کہ ہندوستان ابھی سوشلزم کے لئے پوری طرح تیار نہیں ہے۔

گھڑی کا بوجھ نہیں بلکہ ڈنکی لینڈ کی ترقی کی ذمہ داری کا بوجھ ہوگا۔ میرے ڈنکی بھائیو! جب ہم ترقی کی منزل کیطرف گامزن رہیں گے تو تمام دُنیا کے گدھے یقیناً ہمارے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ اُس وقت ہمارا فرض ہوگا کہ ہم بھی تمام دُنیا کے گدھوں کی مدد کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھیں۔ چاہے اسکے لئے ہمیں "ایٹم بم" اور ہائیڈروجن بم" ہی کیوں نہ بنانا پڑیں۔ ہم ہر صورت سے دُنیا کے تمام گدھوں کی امداد کریں گے۔ مجمع نے جوش وخوشی میں ڈھینچوں ڈھینچوں کا نعرہ بلند کیا۔

صدر دو منٹ کیلئے خاموش ہو گئے جب مجمع کی ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز بند ہوئی تو انھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "بھائیو! آپ کو تو معلوم ہے کہ آج سے ہماری اپنی بحری، برّی اور ہوائی فوج ہوگی۔ میں اپنے سائنسداں گدھوں سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ ہماری تینوں قسم کی افواج کیلئے نئے نئے اور خطرناک سامانِ جنگ تیار کرنے میں ہماری زیادہ سے زیادہ مدد کریں گے۔ اگرچہ ہمارے یہاں ابھی اعلیٰ دماغ کے ڈنکی سائنسداں موجود نہیں ہیں پھر بھی ہم اپنے سائنسدانوں کی مدد کیلئے دوسرے ملکوں سے اعلیٰ دماغ سائنسدانوں کا اغوا کرائیں گے اور ضرور کرائیں گے کیونکہ ہم اُس وقت تک تمام اخلاق کو بالائے طاق رکھدیں گے جبتک کہ ہم خود کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت نہیں کہلوا لیتے دُنیا ہمیں پست اخلاق کہے بلا سے۔ دنیا سے ہمیں کچھ لینا نہیں ہمیں صرف اپنی ترقی مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ ہم اپنی بھلائی کیلئے دنیا میں خون کی ندیاں بہانے سے بھی نہیں چوکیں گے کیونکہ اب ہم انسانوں کے غلام نہیں رہے بلکہ اب ہم ساری دنیا کو اپنا غلام بنالیں گے۔ (مجمع سے بیشک بیشک اور ضرور ضرور کی صدائیں بلند ہوئیں) دنیا کے انسانوں نے ابتک ہمیں صرف ایک ہی رُخ سے دیکھا ہے اسلئے ہمیں بے وقوف اور احمق سمجھتے رہے ہیں اب وہ ہمارا دوسرا رُخ بھی جلد ہی دیکھ لیں گے کیونکہ اب ہم بھی انسانوں کی طرح وحشت اور بربریت پر اتر آئینگے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اب دنیا میں بھی سچائی، انسانیت اور اخلاق نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے اسلئے میرے ڈنکی بھائیو جب انسانوں میں انسانیت باقی نہیں تو ہم تو ہر لحاظ سے جانور ہیں ہمیں انسانیت دکھلانے کی کونسی غرض پڑ گئی ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم خود کو بھی اور اپنی نئی نسل کو بھی انسانیت نام کی چیز سے

واقعات مٹھو ملی

دور رکھیں تاکہ دنیا ہمارے قدموں میں ہو۔

اب صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آپس میں اتفاق اور اتحاد سے رہیں اور "ڈنکی لینڈ" کی ترقی کیلئے جان و مال کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔

صدر کی تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع نے جوش میں آکر پھر نعرے بلند کئے۔ اسکے بعد نائب صدر مسٹر دلیم تقویر کے لئے کھڑے ہوئے۔

"برادرانِ ڈنکی آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم نے صدیوں کی جد وجہد کے بعد آزادی حاصل کی ہے۔ اب ہمارے عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں اور کسی باغی یا کسی غیر ملکی گدھے کی چال میں آکر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جس سے ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے۔ میں نے آپ لوگوں کو اس لئے متنبہ کیا ہے کہ ہم پھر بھی گدھے ہیں یعنی احمق اور بیوقوف گدھے اور اپنے اس احمق پن سے ہم خود کو اور اپنی مادرِ وطن "ڈنکی لینڈ" کو کبھی بھی خطرے میں ڈال سکتے ہیں کیونکہ ہم خود کو اپنی زبان سے لاکھ عقلمند کہیں پھر بھی ہم اپنی فطری عادت (یعنی احمق پن) سے کبھی منھ نہیں موڑ سکتے اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم خود کو بہت ہوشیار رکھیں ویسے باغیوں کیلئے حکومت نے بہت سخت قانون نافذ کردیا ہے۔ اب میں حکومت کی طرف سے ایک اعلان کرتا ہوں جو ساری دنیا کے گدھوں کے لئے ہے" نائب صدر ایک منٹ کے لئے خاموش ہوئے۔ مجمع پر ایک خاموش نظر ڈالی اور پھر کہنا شروع کیا: "آج یعنی پہلی اپریل سے ڈنکی لینڈ میں گدھوں کی ایک بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جو تمام دنیا کے گدھوں کی فلاح وبہبود کے لئے کام کریگی۔ ہمیں اُمید ہے کہ تمام دنیا کے گدھے اس انجمن کے ممبر بن کر دانشمندی کا ثبوت دیں گے کیونکہ اسی میں اُنکی سلامتی ہے، ویسے اس انجمن میں ہر جانور خواہ وہ شیر ہو یا گیدڑ شریک ہوکر ممبر بن سکتا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، کیونکہ یہ دراصل جانوروں کی ہی انجمن ہے البتہ کوئی انسان اس کا ممبر ہرگز نہیں بن سکتا۔ اب اعلان ختم ہوتا ہے"۔ نائب صدر کی تقریر کے بعد فوجی گدھوں نے پریڈ کی، پریڈ کی سلامی لینے کے بعد صدر اور نائب صدر "ڈنکی ہاؤس" روانہ ہوگئے جہاں ڈنر کیلئے خاص قسم کی گھاس کا انتظام کیا گیا تھا۔

آج ہر گدھا خوش تھا تقریر سننے کے بعد گدھوں کی کوئی جماعت ہوٹلوں میں گھس گئی جہاں آج گھاس "فری" (FREE) تھی اور کوئی جماعت سینما ہال میں سینما دیکھنے کے لئے چل پڑی کیونکہ آج فلم بھی فری دکھائی جارہی تھی۔ ہر سینما میں ایک ہی فلم دکھائی جارہی تھی جس کا نام تھا "ساون کا گدھا" اس فلم کو اُس فلمساز گدھے نے فلمایا تھا جسنے اپنے ملک کی آزادی سے بڑی دلچسپی لی تھی اور جو بڑی مدت سے ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔

رات کے بارہ بجنے کے بعد "ڈنکی لینڈ" کے گدھے آزادی کی گہری نیند کے مزے لینے لگے اور اس طرح وہ انجمن وجود میں آگئی جو آگے چل کر بڑے بڑے کارنامے دکھانے والی ہے۔

روایتی شاعر اور فلمی شاعر

انداز بیاں اور

(عبدالبصیر نعیمی)

مرزا غالب نے اپنی شاعری کے بارے میں دعویٰ کیا تھا کہ ۔ ؎ ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کا یہ دعویٰ ہوسکتا ہے خود ان کے دور تک ہی درست رہا ہو۔ مگر آجکل اس دعوے کو حقیقت بھلا کیسے کہا جاسکتا ہے کیونکہ آج کا دور فلمی دور ہے۔ اور اگر غالب آج زندہ ہوتے تو چشم حیرت بنے دیکھتے ہی رہجاتے اور فلمی شعرا اپنا کام کرجاتے ہمارے فلمی گیت غالب سنکر بے اختیار کہہ اُٹھتے کہ میرا انداز بیاں اور ہو نہ ہو پر انکا ہے انداز بیاں اور

غالب کے ایک مُرید سے ملاقات ہوئی فرمانے لگے "غالب صاحب بہت بڑے ساعر ہیں۔ کھلم مرجا گالب میں وہ دھانسلو گیت لکھے ہیں کہ بس مجا آگیا"! اب انکی عقل کا ماتم کیجئے یا اپنے مقدر کو رو دیئے وہ تو حسب توفیق غالب کی تعریف کرہی گئے

صرف غالب ہی نہیں اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس نتیجہ پر پہونچینگے کہ قدیم شعرا کے مقابلہ میں فلمی شعرا کہیں زیادہ داد وتحسین کے مستحق ہیں۔ جو کام ادبی شعرا ساری زندگی نہ سکے وہ فلمی شعرانے چٹکی بجاتے ہی کر دکھایا۔ اب دیکھیے نا غالب فرماتے ہیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کتنی مایوسی اور کتنی بدنصیبی جھلکتی ہے اس شعر میں۔ بچے پڑھینگے تو ان کے نشو و نما پر ظاہر ہے برا اثر پڑیگا۔ ویسے بھی شعر کوئی ایسا کام کا نہیں۔ اس کے برخلاف فلم "دلی کا ٹھگ" کے شاعر محترم فرماتے ہیں ؎

سی اے ٹی کیٹ کیٹ معنی بلی، آر اے ٹی ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا
دل ہے تیرے پنجے میں تو کیا ہوا ہ

اور فلم "دل دیکے دیکھو" کے شاعر فرماتے ہیں۔ ؎

دو اکم دو، دو دونی چار ہ تھوڑا تھوڑا دیدے میرے دلکو قرار

یہ دو گیت کتنے کارآمد ہیں۔ موسیقی کے ساتھ لطف اٹھائیے اور کچھ سیکھنے کا موقع الگ۔ فرض کیجئے آپکے بچوں کو پڑھانے کے لئے معلم نہیں مل رہا ہے۔ آپ ذرا بھی نہ گھبرائیں اور نہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے فکرمند ہوں۔ بس یہ کیجئے کہ بازار سے یہ دو ریکارڈ خرید لایئے اور بچوں کو دیدیجئے۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہجائینگے کہ بچے صرف دو دن میں نہ صرف انگریزی فرفر بولنے لگے ہیں بلکہ پہاڑا بھی یاد ہوگیا ہے۔ اسے کہتے ہیں ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

صرف یہ ہی نہیں کہ فلمی شعرا قوم کے لئے معلوماتی گیت لکھ کر قوم کو اپنے احسان کے بوجھ سے دبا رہے ہیں بلکہ شاعری میں نئی نئی ترکیبوں کا استعمال فرماکر قدیم شعرا کی ارواح کو شرمسار بھی کرتے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر فلم "جوانی کی ہوا" میں شاعر موصوف فرماتے ہیں۔ ؎ ۔

چندا کے پاس اک تارا ہ ڈر ڈر ڈوار ڈر ڈارہ ۔

ملاحظہ فرمایا۔ ایسا سحر کا شعر قدیم شعرا بھلا کاہے کو کہہ سکتے تھے ہوسکتا ہے اس شعر کے لئے آپ کہدیں کہ یہ کوئی زیادہ نئی بات نہیں ہوئی۔ مطلب صاف ہے تو پھر فلم "آشا" کا یہ شعر دیکھئے۔

اینا مینا ڈیکا ڈین ڈائی ڈامنیکا ہ پھیکا پھیکا رولا ریکا رم پم پو

اب آپ کیا کہتے ہیں۔ بتایئے ہے نہ بالکل نیا فلسفہ اب اگر آپ یہ شکایت کریں کہ اس کا تو کچھ مطلب ہی نہ ہوا تو اس کا صرف یہ جواب ہے کہ فلسفہ ہر کسی کی سمجھ میں آجائے تو ہر کوئی فلاسفر نہ ہو جائے۔

ہمارے اکثر فلمی شعرا نے یہ سوچا کہ قدیم شعرا اپنی شاعری میں بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ کیوں نہ ان غلطیوں کی اصلاح کیجائے تاکہ قوم کے ساتھ ادب پر بھی احسان ہو۔ پس یہ سوچ کر چند فلمی شعرا نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور قدیم شعرا کی غزلوں پر اصلاح کرنی شروع کردی۔

مجاز لکھنوی نے اپنی نظم "خاتون مشرق سے خطاب" میں ایک شعر کہا۔ ؎ ۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

فلم "ماڈرن گرل" کے شاعر کو یہ شعر غلط معلوم ہوا اور انھوں نے اصلاح فرمائی۔

تیرے ماتھے پہ لہراتے ہوئے آنچل کا کیا کہنا
تو اس آنچل سے اک گھونگھٹ بنالیتی تو اچھا تھا

مجاز لکھنوی فرماتے ہیں۔ ؎ ۔

مجھ سے مت پوچھ تیرے عشق میں کیا رکھا ہے
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے

اور فلم "انارکلی" کے شاعر کہتے ہیں۔ ؎ ۔

مجھ سے مت پوچھ میرے عشق میں کیا رکھا ہے
ایک شعلہ ہے جو سینہ میں دبا رکھا ہے

مجاز اپنی ایک اور نظم میں کہتے ہیں۔ ؎ ۔

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکے تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

یہ تین مصرعے فلم "آرزو" کے شاعر کو بری طرح کھٹکتے ہیں اور وہ ان کو اس طرح فرماتے ہیں۔

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
کھلتے رہیں ہونٹوں کے گلاب اور زیادہ
تو عشق کے طوفان کو باہوں میں جکڑ لے
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

اور یہ سب کچھ سنکر یقیناً روح مجاز تڑپ اٹھی ہوگی اور سوچتی ہوگی کہ ہائے ہم نے بھی کیسی کیسی غلطیاں کی تھیں۔ خدا بھلا کرے فلمی شعرا کا ورنہ قیامت کے دن نجانے کیا منہ لیکر اُٹھتے

باقی ص ۴۲ پر

واقعات ہند دہلی

بندروں کا خوفناک انتقام

چیتا ایک بے رحم خونخوار درندہ ضرور تھا مگر مجھے ایکبار اس زخمی چیتے پر رحم آگیا جبکہ غضب ناک بندر اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر دی۔

محمد اکبر الدین صدیقی
بی۔ایس۔سی
(عثمانیہ)



افریقہ میں ہمارا مکان ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا جہاں بندروں کی ایک چھوٹی سی نوآبادی تھی۔ جنوبی افریقہ کے بندر شمالی افریقہ کے بندروں کی بہ نسبت بہت چلبلے اور شور مچانے والے تھے۔ یہ بندر ہر وقت چٹانوں پر کودتے اچھلتے رہتے تھے۔

دن بھر کی گرمی کے بعد شام کی ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اونچی اونچی چٹانوں پر نظر آنے لگتے تھے۔ بڑے بندر پہاڑی کی چوٹیوں پر مجسموں کی طرح بیٹھے نگہبانی کیا کرتے اور کسی خطرہ کی علامت پر سب کو چوکنا کر دیتے تھے۔ نوجوان بچے اچھلتے کودتے اور ان کی مائیں آپس میں لڑتی جھگڑتی اور بک بک کرتی تھیں۔ ننھے بچے پانی کے چھینٹے اڑاتے، بے تحاشہ بھاگتے اور ادھم مچاتے تھے۔

بہرحال ہم لوگ ان سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ اگر وہ وہاں نہ پائے جاتے تو ہمیں ذرا بے چینی ہوتی تھی۔ ان کے بچوں کو اونچی چٹانوں پر کھیلتے ہوئے دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ان کی شرارتیں بڑی دلچسپ اور لطف انگیز ہوا کرتی تھیں اور جب انہیں کھیلتے وقت طمانچہ لگایا جاتا یا چھیڑا جاتا تو ان کی خوفناک چیخوں سے ہمیں ڈر محسوس ہونے لگتا تھا۔

نگہبان بندر کسی خطرہ کی علامت پر "واخ" کی آواز نکالتے جس سے سارے بندر چوکنا ہو جاتے اور وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے ادھر اُدھر دوڑنے لگتے۔ اور بچے اچھل کر اپنی ماؤں کے سینے سے چمٹ جاتے تھے۔

رات کا اندھیرا شروع ہوتے ہی چیتوں اور شکاریوں کے خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے نوجوان بندر بچوں کو اپنی پناہ گاہوں کی طرف لے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اکثر اوقات زیادہ میل جول سے بے اعتنائی اور لاپروائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بندر ہم سے اور ہم ان سے مانوس ہو گئے تو وہ ہم سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ چپکے سے ہمارے باغ میں پہنچ جاتے اور پھلوں کو برباد کرنے لگتے تو ہم بھی خاموش رہ جاتے۔

میرے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام پیٹرک اور چھوٹے کا میک تھا۔ چلتے وقت بڑے لڑکے کی ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں چھوٹے بچے کے پاس ایک دوغلی نسل کے کتے کا بچہ تھا۔ یہ تینوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا کرتے اور مل کر وادی میں گھوما کرتے تھے۔

ایک روز صبح اچانک پپ (کتے کا بچہ) کے غائب ہو جانے پر تشویش لاحق ہو گئی۔ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر ہمارے ایک ملازم نے اس کا کھوج لگایا۔ ایک مقام پر چیتے

واقعات نئی دہلی

پاؤں کے نشانات، درخت کی چھال کے ٹکڑے اور بالوں کے گچھے پائے گئے۔ یہاں پر ایک خوفناک چیتا رہتا تھا۔ اب یہ شبہ ہونے لگا کہ اس چیتے ہی نے پپ کو اٹھا لیا ہوگا۔ چونکہ کتے کا گوشت چیتا بڑے شوق سے کھاتا ہے۔

پپ کی اس افسوسناک ہلاکت پر ہم سب ہی بہت پریشان تھے۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس حادثہ کے وقت تینوں کھلنڈرے ایک ساتھ نہ تھے۔ ورنہ خدا جانے میرے دونوں ننھے بچوں کا کیا حشر ہوتا۔

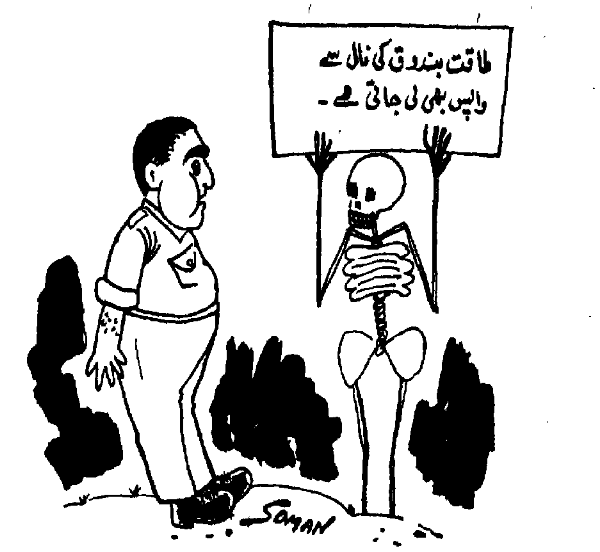
میرا بڑا لڑکا بیٹر بک ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ اور چھوٹے لڑکے کا روتے روتے بُرا حال ہوگیا تھا۔ اور اس کا پیٹ سسکیوں سے اُچھل رہا تھا۔ میری بیوی مجھے غصہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اب میں نے بندوق سے چیتے کا شکار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور چیتے کو پکڑنے کے لئے بون (لکڑی کا پنجرہ) بنانا ہی مناسب سمجھا۔ چونکہ چیتا نہایت طاقتور اور خوفناک درندہ ہوتا ہے۔ اس کو بون میں پکڑنا بھی آسان کام نہ تھا۔

میں نے بون تیار کروا کے اس کے اڈے پر رکھوا دیا۔ دو دن کے بعد خبر ملی کہ چیتا بون کو توڑ کر بھاگ گیا اور زخمی بھی ہوگیا۔ یہ سنتے ہی مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ چونکہ زخمی چیتا بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

میں اپنے دونوں بچوں کو گھر میں بند کر کے اپنی ۱۲ بور بندوق لیکر چیتے کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں مسلسل پانچ گھنٹے تک اسے تلاش کرتا رہا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ میں مایوس ہو کر گھر واپس ہوا لیکن شام کو جب میں باغ میں پودے لگا رہا تھا اچانک مجھے بندر کے "واخ" کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ چونکہ میں روزانہ ان کی ایسی آوازیں سننے کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر اس دفعہ ان کی آوازوں سے ڈر اور خوف کی بجائے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر بھی میں حالات معلوم کرنے کے لئے پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ دامن کوہ میں اُچھلتے کودتے اور چیختے چلاتے بندروں کا ایک سیلاب اُمڈا چلا آرہا تھا۔ وہ خوشی اور جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ وہ جھاڑی میں پتھر اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ مجھے وہاں چیتے کے کھانسنے اور غرانے کی آواز سنائی دی۔ میں ایک قریبی چٹان پر چڑھ کر اس کا نظارہ کرنے لگا۔



"کیا یہ بھی ماؤ نے کہا ہے"

چیتا جھاڑی میں بے بس اور لاچار پڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ طاقت لگا کر بون توڑ کر نکل تو گیا لیکن اس کوشش میں اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں زخمی ہوگئیں اور وہ مضمحل اور کمزور ہو کر گھسٹتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا۔ اس بے دم اور زخمی چیتے پر سارے بندر پتھروں کی مسلسل بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اب وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ اس میں جوابی حملہ کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔

مجھے چیتوں سے نفرت تھی اور ان سے ڈر بھی لگتا تھا۔ لیکن اس وقت اس مجبور اور زخمی چیتے پر رحم آرہا تھا اور مجھے خود پر اور اس بون پر بھی غصہ آرہا تھا کہ میں اس کی ہلاکت کا باعث بن گیا۔ اس کے بعد پھر میں نے کوئی بون نہیں بنایا۔

ادھر سارے بندر اپنے زخمی دشمن چیتے پر بڑی بے رحمی سے حملے کر رہے تھے وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ وہ غراتا اور اپنے اگلے پنجوں کو زمین پر مارتا تھا۔ پھر بھی اس کا غصہ اور غراہٹ اس قدر ہیبتناک تھی کہ حملہ آور بندر ڈر کے مارے رُک جاتے۔ پھر اس کے زخمی جسم کو نوچنے لگتے۔ زخمی چیتا خوفناک دہاڑیں مار رہا تھا اور بندروں کا خوفناک انتقام ہیبتناک منظر پیش کر رہا تھا۔

میں اپنی رائفل لانے کے لئے گھر کی طرف بھاگا مگر راستہ ہی میں میری بیوی سے مڈبھیڑ ہوگئی جو رائفل لیکر پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ یہ بڑی دلچسپ اور تعجب کی بات ہے کہ خوفناک مقامات پر عورتوں میں بھی کیسی زبردست ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مفاجاتی حالتوں میں از خود مناسب معقول کام کر جاتی ہیں۔

جب میں رائفل لیکر نشانہ پر پہنچا تو میری بیوی میرے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔ گولی ٹھیک نشانہ پر لگی اور چیتا تڑپ کر بجلی کی طرح جھاڑی سے باہر نکل پڑا۔ ہم ہیبت زدہ ہو کر گھر کی طرف بھاگنے لگے۔

ایک طرف بندر ہیبتناک چیخیں لگا رہے تھے تو دوسری طرف چیتا اپنی آخری دہاڑیں مار رہا تھا۔ یہ منظر اتنا خوفناک تھا کہ زندگی بھر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑی دیر بعد چیتے نے دم توڑ دیا اور سارے بندر انتقام لینے کے لئے اس کی نعش پر ٹوٹ پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر کے ہی دم لیا۔

چند دنوں کے بعد بندروں نے پھر اپنا پرانا کھیل شروع کر دیا۔ بڑے بندر چٹانوں پر بیٹھ کر نگہبانی کرتے تھے بچے ماؤں کے ساتھ کھیلتے۔ اچھلتے کودتے اور ان کے سینوں سے چمٹ جاتے۔

لیکن ہمارے کانوں میں اس وقت بھی زخمی چیتے کی دردناک چیخیں گونج رہی ہیں۔ جو بندروں کے خوفناک انتقام کا شکار بن گیا تھا۔

گزشتہ سے پیوستہ

حکیم بڈھن اور بھیروں کی روح

بہزاد لکھنوی

ہم دونوں پلنگ پر جاکر لیٹ گئے لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ میری سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آرہا تھا میں باوجود بھوت پریت پر یقین رکھنے کے اس حد تک بھوت یا شیطان کی قوت کا قائل نہیں تھا۔ ان ہی خیالات میں تھا کہ مجھے آخرکار نیند آگئی حسبِ عادت نمازِ فجر کے لیے اٹھا حکیم بڈھن بھی میرے اٹھنے کے ساتھ ہی تھوڑی دیر بعد اٹھ بیٹھے نجن صاحب البتہ بڑی دیر تک سو لیے۔ ناشتے کے ساتھ ہی نبو صاحب بھی باہر آئے اور ناشتہ میں شریک ہوئے ناشتہ کے بعد حکیم بڈھن نے کہا۔

"چچا، حقیقت یہ ہے کہ کوئی آسیب ہے جو آپ کے پوتے میں حلول کر گیا ہے اور وہ شب میں اٹھ کر سارے کا سارا کھانا کھا جاتا ہے اور بھابی کو بھوکا رہنا پڑتا ہے۔"

نبو صاحب نے کہا۔ "پھر کیا کیا جائے؟ میں کئی عاملوں کو بلا چکا ہوں وہ تو کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے بچہ کو کئی ڈاکٹروں کو دکھایا، اُن کا بیان ہے کہ خون کی روانی اور نبض کی رفتار وہی ہے جو ایک دو ماہ کے بچے میں ہونا چاہیے۔ بچے کے قد و قامت اور حرکات کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ قدرتی امر ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "ڈاکٹروں کو بکنے دیجیے، فی الحال ایک کام کیجیے، صبح اور شام پوتے کو ساتھ لے کر گھر سے باہر چلے جایا کیجیے اور اس کی عدم موجودگی میں بھابی کو دونوں وقت کھلا پلا دیجیے، لیکن شب کو کھانا حسبِ دستور اُن کے کمرے میں ضرور رکھوا دیا کیجیے۔ اس سے یہ ہوگا کہ بھابی کی قوتیں پھر عود کر آئیں گی۔"

نبو صاحب بولے۔ "لیکن اس بلا کے دفیعے کی کیا صورت ہوگی؟"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "فی الحال تو میرے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ بجائے عامل کے کسی کامل سے رجوع کیا جائے تب ہی کامیابی ہوگی ورنہ نہیں۔"

نبو صاحب روہانسے ہو کر بولے۔ "بھتیا سوائے تمھارے میرا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ مجھے روپے پیسے پر بڑا غرور تھا۔ لیکن یہ دولت بھی بے کار نظر آرہی ہے نہ مجھ کو کوئی کام کر رہی ہے اور نہ کوئی غم دور کر سکتا ہے۔ خدا کے لیے تم ہی واقعات ننھے دھلی کوئی فکر کرو۔ اخراجات کے معاملہ میں ہزار دو ہزار کے لیے میں بند نہیں ہوں۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "یہ بہزاد پیروں فقیروں کے بڑے معتقد ہیں اور واقف بھی ہیں میں اور یہ دونوں مل کر ادھر اُدھر تلاش کرتے ہیں آگے اللہ مالک ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک صاحب نے لکھنؤ میں مجھ سے ایک بزرگ کا تذکرہ کیا تھا جو کالپی میں رہتے ہیں۔ میں اور بہزاد دونوں آج ہی کالپی روانہ ہوں گے۔"

نبو صاحب اس گفتگو کے بعد زنان خانے میں چلے گئے۔ اور اندر سے ایک بند لفافہ حکیم بڈھن کو لا کر دیتے ہوئے گویا ہوئے۔

"بھتیا بڈھن اس وقت تو یہ موجود ہیں، جو میں دے رہا ہوں لیکن تمھیں میری قسم اخراجات کا خیال نہ کرنا اور فوراً ہی تار دے دینا انشاء اللہ اسی دن تار سے روپے پہنچ جائیں گے اور میں یہاں تمھاری ہدایات پر کاربند رہوں گا۔"

اسی رات کی گاڑی سے ہم دونوں کانپور پہنچے اور وہاں گاڑی بدل کر جی آئی پی ٹرین پر کالپی کے لیے روانہ ہوگئے۔

گاڑی کالپی صبح کے وقت پہنچی، ہم دونوں ٹھہر گئے مگر یہاں ہم کسی سے واقف نہ تھے بہرحال معلوم کیا کہ یہاں کوئی شاعر بھی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کا پتہ مل گیا جن کی خدمت میں ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہر کے کسی چائے خانہ میں ہوں گے۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

"یار شاعر اور چائے خانے کیا لازم و ملزوم ہیں؟"

میں نے کہا۔ "معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

ہم لوگ اُن کے گھر سے بازار پہنچے جہاں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ ہم لوگ چائے باز تو تھے ہی چائے خانے میں گھس پڑے۔ وہاں ایک صاحب ایک جانب بیٹھے ہوئے شعر خوانی کر رہے تھے۔ ہم دونوں ان کے اشعار کی تعریف کرنے لگے۔ وہ بولا ہماری طرف زیادہ راغب ہوگئے۔ غزل کے خاتمہ پر حکیم بڈھن نے میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سن کر وہ چونکے اور بولے۔

ارے یہ میاں بہزاد لکھنوی۔ ارے بھئی چائے لانا۔

چائے پیتے ہوئے جب حکیم بڈھن نے اپنی آمد کا

سب پسند آئی ہوگی۔
جناب یہاں تو کئی بزرگ موجود ہیں اور سب کے سب باکمال ہیں۔ آپ کس خاص بزرگ کی تلاش میں آئے ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے علاوہ صاحب جنات بزرگوں کے مشاہیر اولیائے کرام کے مزارات بھی ہیں، جہاں ہر روز زائرین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ آپ چائے پی لیں تو میں آپ کی رہنمائی کرتا ہوں۔"

میں حکیم بڑھن سے پوچھ نہیں سکا تھا کہ بغیر اتے پتے کے یہ کیلیا کا سفر کیوں کررہے ہو محض ایک صاحب سے کسی بزرگ کی کرامت سننے کے بعد یوں سفر کرنا کون سی عقلمندی ہے جبکہ ان بزرگ کا نام اور پتہ بھی نہیں معلوم ہے لیکن حکیم بڑھن کے کسی فعل میں دخل دینا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ لہٰذا کون بولتا۔ سفر با غرض ہو یا بے کار سیر سپاٹے اور تفریح سے خالی نہیں ہوتا۔ چائے نوشی کے بعد وہ شاعر صاحب غالباً خلیق تخلص تھا ہمیں لیے ہوئے کئی بزرگوں کے پاس پہنچے جو صورۃً اور اخلاقاً بھی واقعی بزرگ تھے۔ حکیم بڑھن نے سب سے اظہار مدعا کیا لیکن سب نے یہ کہا:۔

"ہم یہاں تو دعا کر سکتے ہیں لیکن اس کام کے واسطے سفر سے معذور ہیں۔ نہ ہم پیشہ ور ہیں نہ طالب شہرت۔"

چلیے صاحب چھٹی ہوئی۔ تقریباً پورا دن اسی میں تمام ہوا۔ اب حکیم بڑھن کی رائے ہوئی کہ رات کی گاڑی سے کانپور چلا جائے وہاں شاید کوئی بزرگ مل جائیں۔ مجال دم زدن کب تھی خلیق صاحب سے رخصت ہوکر ہم دونوں پیدل ہی روانہ ہوگئے۔ بازار سے اسٹیشن کا فاصلہ دو فرلانگ سے کم ہی تھا۔ ریل چھوٹنے میں ابھی کافی وقت تھا ہم دونوں خراماں خراماں چل رہے تھے کہ راستے میں لڑکوں کا شور سن کر رک گئے۔

لڑکوں کا ایک گروہ ایک مجہول الحواس قسم کے آدمی کے پیچھے تالیاں بجاتا تھا اور آوازے کس رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جھنجھلا کر رک کر ڈنڈا یا پتھر اٹھا لیتے ہیں تاکہ ان لڑکوں کو ماریں۔ ان کے پتھر اٹھاتے ہی لڑکے ٹھٹک جاتے ہیں اور جیسے ہی وہ آگے بڑھتے پھر لڑکوں کا شور بلند ہوتا۔ بلا ارادہ میں نے ان لڑکوں کو آگے بڑھ کر روک دیا تو ٹھٹک گئے۔ میں نے بڑھ کر ان صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے اشارے پر حکیم بڑھن ان کے برابر آگئے۔ اب ایک طرف میں درمیان میں وہ اور دوسری طرف حکیم بڑھن۔ ہم ان کی ہمراہی میں آگے بڑھے۔ لڑکے غالباً اب ان کو چھیڑنا خطرناک سمجھ کر جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ میں ان کو لے کر آگے بڑھا اور اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ایک چائے خانے میں داخل ہوگیا۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد میں نے ان پر نگاہ ڈالی۔ یہ ایک چالیس سالہ مخبوط الحواس قسم کے انسان تھے آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سر اور داڑھی کے بال بے تکان بڑھے ہوئے تھے وہ کرسی پر بیٹھ کر بولے:۔

"مسٹر کیا چائے پلاؤ گے۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "چائے بھی پیجیے اور ناشتہ بھی کیجیے پیسوں کی آپ فکر نہ کریں!"

انھوں نے میرے جواب پر مجھے بغور دیکھا اور میرے ہاتھوں کی گردش دیکھ کر قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"میاں تم کیا مجذوب ہو؟"

میں نے کہا: "جی نہیں، نہ مجذوب ہوں نہ سالک اختلاج کا مریض ہوں اور اسی کی یہ کیفیات ہیں۔"

وہ پھر ہنسے اور بولے "تم کو کیا پتا، ہاں جی چائے منگاؤ، پھر باتیں ہوں گی۔"

اتنے میں ہوٹل کا لڑکا چائے اور بسکٹ لے کر آگیا۔ تین پیالیاں تھیں جو اس نے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھ دیں۔ ان صاحب نے فوراً وہ دونوں پیالیاں جو ہمارے سامنے تھیں اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیں اور بسکٹوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ خدا کی پناہ جلدی جلدی انھوں نے سارے بسکٹ کھا لیے اور چائے کی پیالیاں یکے بعد دیگرے ایک ہی سانس میں چڑھا کے بولے:۔

"یار پان سگرٹ"

میں نے پانوں کا آرڈر دیا اور سگرٹ کا پیکٹ منگوایا تین عدد پان آئے تھے وہ بغیر ہم دونوں کا خیال کیے ہوئے ایک ساتھ منہ میں رکھ گئے اور سگرٹ کا پیکٹ کھول کر ایک سگرٹ سلگائی ـــ اور اس طرح دم مارنے لگے گویا چرس کی چلم پی رہے ہوں سگرٹ کی بساط ہی کیا تھی چند منٹ میں ختم ہوگئی تب دوسری نکالی اور پھر تیسری وہ چین اسموکنگ کررہے تھے۔ حکیم بڑھن ان کی ان حرکات سے متنفر نظر آرہے تھے ان کے چہرے پر عجیب آثار تھے۔ جب وہ صاحب پورا پیکٹ پھونک چکے تو قہقہہ مارتے ہوئے بولے:۔

"یار مجذوب! کہو کوئی ملا یا نہیں یا سارا دن خراب ہی ہوا؟"

ان کی اس بات سے میں اور حکیم بڑھن دونوں حیران رہ گئے۔ میں نے کہا۔

"حضرت کوئی بھی نہیں ملا!"

وہ پھر قہقہہ مار کر بولے:۔ "یار مجذوب ملتا کہاں ہے بھیریں کا مقابلہ ہے۔"

میں نے کہا "حضرت میں سمجھا نہیں۔"

وہ بولے:۔ "سمجھو گے کیا خاک۔ اجی پرانی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کسی نے بھیریں کو اس گھر میں بٹھا دیا ہے۔ اور بھیریں سارے خاندان کو ختم کرکے ہی واپس جائے گا!"

میں نے کہا: "جناب والا! اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے اہل اللہ کی حاجت ہے اسی کی تلاش میں ہم دونوں یہاں آئے تھے۔"

وہ پھر قہقہہ مار کر بولے:۔ "بھئی میں تو اہل سگریٹ ہوں (قہقہہ) کیا میں چلوں۔ لیکن یار مجذوب سگرٹیں پلانا پڑیں گی۔ اور صرف تمھارا مال کھاؤں گا (قہقہہ) مجذوب کا مال ان صاحب کا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ تشریف تو لے چلیں میں اپنا ہی مال کھلاؤں گا کسی اور کا نہیں۔"

وہ بولے: "چلو تو یار مجذوب گاڑی کا وقت ہوگیا ہے۔"

ہم تینوں باہر نکلے میں نے ایک دوکان سے پیڈرد سگریٹ کی پچاس ڈبیاں خریدیں اور اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی جلد ملی۔ انجن کے تین ٹکٹ خرید کر ہم تینوں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ ڈبا خالی تھا۔ وہ صاحب ایک سیٹ پر لیٹ کر فوراً سو گئے۔ خراٹے بلند ہونے لگے۔

حکیم بڑھن نے مجھ سے کہا۔

"بھتیا بہر او میرا تو دل ٹھک نہیں رہا ہے۔"

میں نے کہا: "مجھے یقین کامل ہے۔"

وہ بولے "یار تم خود بھی دیوانے قسم کے آدمی ہو اور
ہر ایک جاتے ہو جو دیوانہ ہو"
میں نے کہا۔ ان کو لیے چلتے ہیں اگر ناکامی ہوئی تو
نقصان ہے۔ کچھ تو بات بنے گی"
حکیم بڈھن نے کہا "ہاں کہنے کو بات ہو جائے گی۔
ن پور دوبارہ پلٹنا پڑے گا"
میں نے کہا "ابھی خدا جانے کتنی جگہ جانا پڑے
ان کان پور کو لیے پھرتے ہو"
حکیم بڈھن اور میں نے کھانے کے وقت ان کو جگانے
کوشش کی لیکن وہ جاگے ہی نہیں لہٰذا ہم دونوں نے کھا لیا
دراز وں کی چٹخنی لگا کر سو رہے۔ گاڑی تقریباً ایک بجے
پہنچی۔ شور و غل سے میری آنکھ کھل گئی۔ اٹھا۔ یہاں
بدلنا تھی میں نے پہلے حکیم بڈھن کو جگایا۔ اور پھر ان
صاحب کو۔ انھوں نے آنکھ کھولتے ہوئے کہا۔
"سگریٹ"
میں نے پورا پیکٹ حوالے کر دیا۔ کوئی پندرہ منٹ میں
سگریٹیں پھونک کر اٹھے اور بولے:۔
"کہو آ گئی جگہ مجذوب صاحب"
میں نے کہا "حضرت اب دوسری گاڑی بدلنا ہے
سویرے پہنچیں گے۔ گاڑی چار بجے چھوٹے گی"
وہاں وہ ہمارے ساتھ ہی اترے، دوسری گاڑی
کھڑی تھی۔ اس کے ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ہم
گھس گئے۔ خالی ڈبے میں میاں صاحب پھر ایک سیٹ
پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔
حکیم بڈھن نے کہا "یار بہزاد عجیب آدمی کو ساتھ لائے
اس کو سوائے سونے اور سگریٹ پینے کے اور کوئی
کام ہی نہیں ہے"
میں نے کہا "پھر آخر میں کیا کروں"
وہ بولے:۔ "مجبوری ہے"
گاڑی جس وقت اجگین پہنچی صبح ہو رہی تھی
میاں صاحب کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ اٹھے اور اٹھتے ہی
نعرہ مار کر بولے:۔
"یار مجذوب سگریٹ"
میں نے سگریٹ کا پیکٹ دیتے ہوئے کہا:۔
"حضرت گاڑی سے اتر کر بیٹھیے۔ دوسری گاڑی چل
دے گی"
وہ میرے کہنے پر اتر آئے۔ گاڑی چھوٹ بھی گئی۔
لیکن وہ برابر چین اسموکنگ کرتے رہے۔ میں باہر ایک
یکے کا انتظام کر کے جب واپس آیا تو وہ خالی پیکٹ پھینک
رہے تھے۔ میرے اشارے پر وہ باہر نکلے اور یکے پر
بیٹھتے ہوئے قہقہہ مار کر بولے:۔
"یار مجذوب ہوائی جہاز لے آئے، ہوائی جہاز۔ اب
مزہ آئے گا سفر میں"
یکہ روانہ ہوا اس ڈھائی گھنٹے کے سفر میں بھی وہ
بیٹھے ہی بیٹھے سوتے رہے۔ ان کے خراٹے صاف بتا رہے
تھے کہ وہ بے خبر ہیں لیکن مجھے حیرت یہ تھی کہ ان کی گرفت
یکے کے ڈنڈے پر بدستور سختی سے قائم تھی۔ میرا خیال تھا
کہ وہ کہیں دھچکوں سے گر نہ پڑیں لیکن وہ پتھر کی طرح اپنی
جگہ پر جمے ہوئے سوتے رہے یہاں تک کہ نبو صاحب کی
حویلی پہنچا۔
اس وقت دن کے نو بج رہے تھے نبو صاحب کو
خبر ملتے ہی وہ فوراً باہر آئے اور ان میاں صاحب کو دیکھ
کر کچھ اچھے آثار ان کے چہرے پر پیدا نہیں ہوئے۔ حکیم
بڈھن نے ان کو الگ لے جا کر کہا۔
"یہ صاحب بہزاد صاحب کی دریافت ہیں میری نہیں
ان کو ترائی کے لیے لائے ہیں"
وہ بولے:۔ "کیا حرج ہے مجبوری ہے"
حکیم بڈھن نے پوچھا:۔ "کیا ٹھاکر صاحب سے آپ
کی پرانی دشمنی ہے؟"
وہ بولے:۔ "کون ٹھاکر!"
حکیم بڈھن نے کہا:۔ "وہی ٹھاکر صاحب جنھوں نے
آپ کو لے جا کر جوگی سے گنڈا دلوایا تھا"
وہ بولے "بڑی پرانی بات ہے یہ زمینداری جس
پر میں قابض ہوں شاہی زمانے میں ان کے خاندان میں تھی
اور ان کے پردادا سے ضبط کر کے میرے پردادا کو دلوادی
گئی تھی اور یہ خاندان امارت میں ہم سے بہت کمتر ہو گیا تھا
میرے دادا اور ان کے دادا کے درمیان تو عداوت کھلم کھلا
رہی لیکن ان کے والد اور میرے والد کے درمیان ہمیشہ صلح
صفائی رہی۔ اور میرے زمانے میں تو ہم دونوں میں بھائی
چارہ ہے"
حکیم بڈھن نے کہا "ان میاں صاحب نے کابلی۔۔
اس بات کو ظاہر کر دیا تھا کہ پرانی دشمنی کی بنا پر بھیروں کو
اس خاندان پر مسلط کیا گیا ہے۔ حالانکہ میں نے اور بہزاد
نے ایک حرف بھی ان سے نہیں کہا تھا"
جب وہ لوٹے تو میاں صاحب سگریٹ کے کش پر
کش لگا رہے تھے۔ ناشتہ لگتے ہی بولے:۔
"یار مجذوب میں تو تمھارا مال کھاؤں گا ان کا نہیں"
میں نے کہا بہت اچھا ابھی منگاتا ہوں، لیکن یہ گاؤں
ہے یہاں چنوں کے سوا کیا ملے گا"
بولے:۔ "وہی منگالو"
میں نے مجبوراً چنے منگائے جن کو انھوں نے اس مزے
سے کھانا شروع کیا گویا پلاؤ زردہ کھا رہے ہیں۔ چنے
کھانے کے بعد انھوں نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا:۔
"یار مجذوب کیوں دیر کر رہے ہو ایک سفید مٹی کی
بوتل منگالو"
تھوڑی ہی دیر میں ایک سفید بوتل کسی شربت
کے رکھنے کی منگالی گئی۔
وہ بولے:۔ "اس کو گرم پانی سے دھلواؤ یار
مجذوب"
میں نے گرم پانی سے صاف کرادی۔
انھوں نے پہلی بار نبو صاحب سے خطاب کیا اور بولے

"دیکھو اگر بھیروں کو گرفتار کر لوں گا تو تمھارا پوتا
مر جائے گا۔ سمجھ لو۔ دراصل اس جوگی کے گنڈے کا یہ
موکل بھیروں ہے جس کو تمھارے خاندان کی تباہی کے لیے
مامور کیا گیا ہے"
نبو صاحب بے یقینی کے لہجے میں بولے:۔
"لیکن یہ میرے پوتے میں کیوں گھس گیا"
وہ بولے "حلول کہو حلول، بات یہ تھی کہ تمھاری
بہو کو قدرتی حمل تھا۔ پیدائش کے وقت بچہ پیدا ہوتے
ہی مر گیا تھا۔ اسی کے گرم جسم میں یہ ہنومان حلول کر گیا
گنڈا تمھاری بہو کے گلے میں تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ پہلے
ماں کو پھر باپ کو اور پھر تم کو چٹ کر جائے گا"
یہ کہہ کر انھوں نے زور کا قہقہہ مارا۔

"اگر تم کو دھوئے کا ہر جانا قبول ہو تو میں اسکو اتار دوں۔ میں تو ان جیتا مجذوب کی بدولت چلا آیا۔ ان کے ہاتھ بیٹوں پر خوب چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پھر قہقہہ مارا اور ایک نیا پیکٹ کھول کر پھر اسموکنگ شروع کر بیٹھے۔ نبو صاحب اور حکیم بدھن میں کانا پھوسی ہوئی پھر نبو صاحب نے کہا۔

"مجھے منظور ہے"

میاں صاحب بولے "تو ابھی ایک بکرا منگاؤ اور اس کو ابھی ذبح کراؤ میرے سامنے"

حکم کی دیر تھی ایک بکرا فوراً منگایا گیا۔ میاں صاحب کے حکم سے ایک کافی گہرا گڑھا کھودا گیا۔ جب بکرا ذبح ہو گیا تو میاں صاحب نے اس کی کلیجی نکلوا کر ایک کاغذ پر رکھ دی اور کچھ پڑھنے کے بعد زور زور سے تین تالیاں بجائیں اور بولے:۔

"بھیرپا جلدی حاضر ہو، بھیرپا جلدی حاضر ہو، بھیرپا جلدی حاضر ہو۔

نبو صاحب حکیم صاحب، میں اور تمام ملازمین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے جب نبو صاحب کا پوتا اپنے پیروں پر چلتا ہوا میاں صاحب کے سامنے آگیا۔ میاں صاحب نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"بھیرپا یہ تیری بھینٹ موجود ہے، کھالے اور اس بوتل میں اتر آ۔"

نبو صاحب کا پوتا تیزی کے ساتھ اس کلیجی کی طرف بڑھا اور اس نے کلیجی کو کھانا شروع کر دیا۔ بڑا گھناؤنا اور ڈراؤنا منظر تھا۔ سکتے کے عالم میں ہر ایک دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کلیجی کھا چکا تو میاں صاحب نے وہ بوتل اس کے منہ کے پاس لگا دی اور بولے:۔

"اب اتر آ اس میں۔"

ایک دھواں سا اس بوتل میں نظر آنا شروع ہوا جوں جوں دھواں سما رہا تھا نبو صاحب کا پوتا کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا جسم بے جان ہو کر گر پڑا اور میاں صاحب نے بوتل پر ڈاٹ لگا دی۔ ڈاٹ لگا کر اپنے ہاتھ ہی سے میاں صاحب نے اس گڑھے میں اس بوتل کو رکھ دیا اوپر سے بکرے کا سارا گوشت مع کھال سر اور پیر کے اس گڑھے میں ڈلوا دیا اور اوپر سے مٹی ڈلوا کر اس گڑھے کو پاٹ دیا مجھ سے بولے:۔

"یار مجذوب سگریٹ"

ان کی اس آواز سے ہم لوگوں کے تحیر کا عالم شکست ہوا۔

نبو صاحب فوراً پوتے کی تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مشغول ہو گئے۔ میں بھی میاں صاحب کو چھوڑ کر گھر میں گیا تاکہ میاں صاحب کے دوپہر کے کھانے کا انتظام کروں۔ میں جب باہر آیا تو میاں صاحب کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے ملازمین سے پوچھا تو سب حیران رہ گئے۔ کسی نے ان کو جاتے نہ دیکھا۔ گاؤں بھر تلاش کرنے کے لیے آدمی دوڑائے لیکن بے سود۔ ان کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ دوسرے دن صبح نبو صاحب نے حکیم بدھن کا اور میرا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم کو رخصت کیا۔ رخصتی کے وقت نبو صاحب نے ایک لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"بہزاد صاحب دراصل یہ ساری محنت آپ کی ہے یہ ناچیز نذر قبول فرمائیے۔"

حکیم بدھن کو مجھے نہیں معلوم کیا ملا۔ وہ شخص تو بڑے بھاری پیٹ کا آدمی تھا۔ جب وہ پیکٹ میں نے راستے میں کھولا تو اس میں ایک عدد سو کا نوٹ تھا۔ ■

بقیہ:۔ بھٹو سے انٹرویو

اور ارکان یا تو زمیندار ہیں اور یا پھر بڑے بڑے بزنس مین

بھٹو ــــ میں بالکل اسی طرح سوشلزم قائم کروں گا جس طرح مسز گاندھی نے ہندوستان میں کیا ہے۔

انقلابی ــــ یعنی کہ نعروں والا "سوشل ازم"

بھٹو ــــ لیکن ہمارا سوشلزم ہندوستان سے بہتر ہو گا کیونکہ عظیم چیئرمین ماؤ ہمارے دوست ہیں۔

انقلابی ــــ لیکن آپ کا سوشلسٹ پروگرام کیا ہو گا؟

بھٹو ــــ "غریبی ہٹاؤ" بھکو ووٹ دو ہندوستان مردہ باد وغیرہ وغیرہ۔

انقلابی ــــ لیکن ہندوستان مردہ باد کا سوشلزم سے کیا تعلق

بھٹو ــــ آپ جیسے صحافی ان چیزوں کو کیا سمجھیں گے ہمارے سوشلزم کی اصل بنیاد تو یہی ہے۔

انقلابی ــــ زبان کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں، ملک میں کون سی زبان رائج کی جائے گی۔

بھٹو ــــ اُردو۔

انقلابی ــــ لیکن اُردو تو صرف ملک کے ایک چوتھائی لوگوں کی زبان ہے جبکہ بنگالی آدھے سے زائد لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔

بھٹو ــــ ہم بنگالی کا اُردو کرن کر لیں گے مشرقی پاکستان کی زبان بنگالی ہی رہے گی کیونکہ ہم کسی پر کوئی چیز ٹھونسنا پسند نہیں کرتے۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ بنگالی کو لکھا اور بولا اُردو ہی میں جائے گا۔

انقلابی ــــ بالکل اسی طرح جس طرح بھارت کے کچھ لوگ مسلمانوں کا بھارتیہ کرن اور اُردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کی باتیں کر رہے ہیں۔

بھٹو ــــ آپ بالکل ٹھیک ہے۔

انقلابی ــــ آپ ہندوستانی لیڈروں میں کس کو پسند کرتے ہیں؟

بھٹو ــــ جی ہاں صرف ایک کو۔ پروفیسر بلراج مدھوک کو

انقلابی ــــ اس پسند کی وجہ۔

بھٹو ــــ ان کی باتیں اور تقریریں مجھے پاکستان میں مقبولیت حاصل کرنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔

انقلابی ــــ جس طرح آپ کی باتیں اور تقریریں بلراج مدھوک کو ہندوستان میں مقبولیت حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

بھٹو ــــ اس کے بارے میں آپ زیادہ جانتے ہوں گے۔

انقلابی ــــ اچھا بھٹو صاحب اب اجازت دیجئے۔ آپ کے وزیر اعظم بن جانے کے بعد میں آپ سے پھر ملاقات کروں گا۔

بھٹو ــــ مجھے آپ سے ملکر بہت خوشی ہو گی اصل میں مجھے انقلابیوں سے ملکر ہمیشہ ہی خوشی حاصل ہوتی ہے کیونکہ میں خود بھی انقلابی ہوں۔

انقلابی ــــ لیکن میں تو صرف نام ہی کا انقلابی ہوں ویسے بھی میرا تعلق کمیونسٹ پارٹی اندرا گاندھی سے ہے

بھٹو ــــ انقلابی صاحب آپ بہت بھولے ہیں۔ میں بھی تو صرف نام ہی کا انقلابی ہوں۔ ویسے یہ بات کسی سے کہئے گا نہیں۔

انقلابی ــــ اچھا شکریہ۔ آداب عرض ہے۔

بھٹو ــــ "ہندوستان مردہ باد"۔

واقعات تہذ علی

یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟" اس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا۔ اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔ میں اس گھڑی کا مشتاق تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔" اس نے مسترحمانہ لہجے میں کہا ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی۔

ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی، دونوں کی زندگی ایک مسلسل لطف و مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لئے وقف کر دی۔

وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری میں اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا، اس نے میری تصویریں بنائیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں، شام کو جب ہم باغ میں گشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اسے پہناتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے، یکایک زمانے نے ایسی کروٹ لی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے پردہ رکھتا تھا، میں نہ صرف اس کے رشتے داروں اور دوستوں کے سامنے ہوتی تھی بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے نقاب رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آجایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں فیروز جو اس کا شاید اشہور تھا ہم کو دیکھنے اکثر آتا رہتا تھا اور مقول اگر رہا کرتا تھا۔

فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی اس کی نفسانیت نے اسے انہیں اکثر سنی کی تھیں مگر جمال اس کی ہوسناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کیا کرتا تھا، شاعر یا مصور انسان کو میثیت کل کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھے جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھیں میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا رات کو آٹھ بجے جب کہ اس کی واپسی کا وقت تھا، میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے سے متصل ہے بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی، دفعتاً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ روشنی کیوں گم کر دی"، میں سوال ختم نہ کر پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں کہ کمزور سے کمزور دل میں مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں نے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ مگر کم بخت پر "ابلیس" کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا کہ ان میں اس واقعے کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی، اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے ہولناک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی، اس کے آنے میں تاخیر ہوئی، فیروز پھر میری سمت بڑھا تھا کہ میں جمال نے مجھے پکارا، فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی، میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا معلوم ہوتا تھا کہ جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے فیروز کی گرفت سے اپنے کو چھڑایا تھا۔

جمال اُف اُف کرتا ہوا اپنے اسٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی اتنا غضبناک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سُرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوشِ غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے بھوکے شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا۔

"دغاباز! تیری زندگی کا اب ایک ایک پل میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔"

پھر میں بیندار ایسا تھا کہ میں نے دغاباز کا خطاب پانے کے بعد اپنی برأت کے لئے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال انتہائی مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا، اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا، اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب کچھ ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا، اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور یہ ہو گیا کہ مجھ کو کسی دشمن نے قتل کر دیا لیکن جمال کی زندگی اتنی الم ناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اعتراف کر لیتا۔"

ناہید کے آنسو گرنے لگے، میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ آہ کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے اشارے سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا۔

آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی، یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہونے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا، میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی، میں نے جمال سے کہا کہ "کاش مجھے اس کا پارٹ ہی نصیب ہوتا"۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ۔۔!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی، وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھی۔ چلتے چلتے اس نے کہا۔

"ہاں ایک بات بھول گئی، جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے مجھے مار کر اس کو تسکین نہ ہوئی تو اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کر دیا۔ ؎

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

اس کو آخری وقت تک مغالطہ رہا، اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے۔

مَن کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بجور ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلّی نصیب ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی، آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں اگر آپ کا جی

چاہیے تو جاکر اس شیشے بخش کو بھی دیکھ لیجیے جس نے ناہید کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور جو اسٹوڈیو میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہے۔"

یہ کہہ کر نا ہید نے الوداع کہا۔ میں نے سمن زار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا اور اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا اسٹوڈیو رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر پڑی وہ ایک شکستہ صندوق تھا، اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ شیشہ بعض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں، ان میں ایک تم ہی ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں اس لئے کہ تم کبھی مجھ کو دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھو گی۔" میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرا دیا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی لیکن اس کا وہی جواب ملا جس کی مجھے امید تھی یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی مضحکہ اڑایا گیا۔ مجھکو افسوس ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں، میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے، میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجے پر نہیں پہونچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہیں ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطقی اپنے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا ہے اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ ضدین کا اجتماع اور نقیضین کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو بو علی سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔

اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اسکو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ نہ ہوگا ——— وہ خود فریبی کے ذریعے سے اپنے کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مایگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانے کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی بنائی نہیں ہے جسکا نام مجھے بتایا گیا بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جسکا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

بقیہ:۔ انداز بیان اور

جگر مراد آبادی کا ایک شعر ہے۔ ع۔

میرا نہ کچھ خیال کر برق نظر گرائے جا
میں یوں ہی ناز کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا

فلم "وہ کون تھی"، میں شاعر مکرم فرماتے ہیں۔

شوخ نظر کی بجلیاں دل پہ میرے گرائے جا
میرا نہ کچھ خیال کر تو یوں ہی مسکرائے جا

اقبال نے حسین ترانہ کی تخلیق کی اور ہندوستان کے بارے میں کہا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

فلم "پھر صبح ہوگی" کے شاعر جو خدا کے فضل سے کیونسٹ تھے بھلا یہ کیسے برداشت کر لیتے۔ سو جھٹ کہہ اُٹھے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا
جیبیں ہی اپنی خالی کیوں دے نہ ہمکو گالی
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

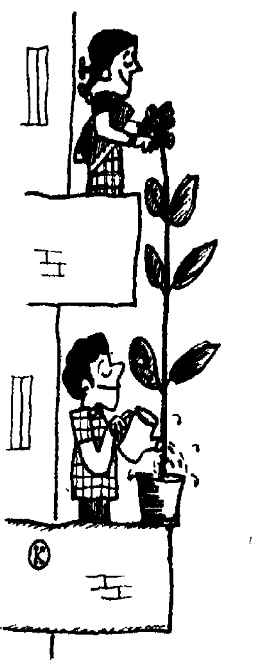
گویا اس طرح سے شاعر موصوف نے ترانے کو "سرخیا" لیا کہ سامع بس سنا کرے اور منہ سے اف بھی نہ کر سکے اس طرح کی سیکڑوں مثالیں آسانی سے مل جاتی ہیں جہاں ہمارے فلمی شعرا نے قدیم شعرا کی ارواح کو شرمندہ کیا۔ اب ایسے جانفشاں شعرا کو ادبی شعرا پر اگر ترجیح دیجائے تو کیا غلط ہوگا؟ ×

بقیہ:۔ گوتم گاندھی کا دیس

کہ حکومت نے سابق حکمرانوں کو پناہ دے رکھی ہے، اس وقت سے وہ ان کے خلاف ہو گئے ہیں۔

مدھیہ پردیش کی ۴ کروڑ ۱۶½ لاکھ کی آبادی میں ۴۴ فیصدی آبادی ہریجنوں پر مشتمل ہے اور اسمبلی کے ۲۹۶ ممبروں میں سے ان کے ممبروں کی تعداد ۱۳۱ ہے۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ مخالفت کی صورت میں وزارتی توازن خراب ہو سکتا ہے۔

ایک طرف کانگریس کے اندر اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف سابق حکمرانوں نے مدھیہ پردیش کے علاقے میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ پچھلے الیکشن میں سابقہ مدھیہ بھارت کے علاقے سے ان لوگوں کو جو کامیابی ہوئی ہے اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ جن سنگھ سابق حکمرانوں کی پشت پناہی کر رہا ہے اور ڈاکوؤں کے گٹھ جوڑ نے خاص طور سے ہریجن علاقوں میں خوف و دہشت کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں شاید ہریجن لوگ اپنا ووٹ ہی استعمال نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ حکمراں کانگریس کی بہت بڑی کمزوری کہلائی جائے گی۔





قارئین کے خطوط

بنگلادیش۔

محترمی تسلیم!

بانگلادیش کے معاملے میں آپ نے بہت ہی مناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ مشرقی بنگال میں پیش آنے والے واقعات واقعی بہت زیادہ شرمناک اور المناک ہیں۔ پاکستان جو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا ایک ایک کر کے تمام اسلامی اصولوں کو بھلا چکا ہے۔ اسلامی معاشرہ ہمیشہ ہی سے جمہوری بنیادوں پر کام کرتا رہا ہے۔ اسلام کی رو سے اکثریت کے منتخب نمائندے ہی کو حکومت کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ پاکستان میں غداری اور بغاوت شیخ مجیب الرحمن اور ان کے ساڑھے سات کروڑ حامیوں نے نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے اور ان کے حامیوں کی اقلیت نے اکثریت کے ساتھ بے انصافی کر کے کی ہے۔ ملک کا نظام چلانے کا حق دیسے تو سب ہی کو ہوتا ہے لیکن مشرقی پاکستان کے عوام کا اکثریت میں ہونا قیادت کا حق انھیں کو دیتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ عام طور پر تمام ہندوستانی اور خاص طور پر ہم مسلمان اس حقیقت کو اسلامی اور سیاسی نقطۂ نظر سے پہچانیں گے اور پوری طرح بانگلادیش کے عوام کی حمایت کرینگے۔ محمد جاب۔ لکھنؤ

جناب ایڈیٹر صاحب۔ تسلیم!

میں واقعات کا مطالعہ پہلے شمارے ہی سے کرتا آرہا ہوں۔ معاشی اور سیاسی مشکلات کے باوجود آپ نے واقعات کو جسطرح آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا ہے وہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔

ہر دردمند انسان کا دل پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے بیٹھا جا رہا ہے۔ مجھے آج اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ فلسطین میں ہزاروں بے گناہ فلسطینی مجاہدوں کا قتلِ عام ہی کیا کم تھا کہ سرزمین پاکستان پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا۔ تاریخ اس قتلِ عام کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

اپریل کے شمارے میں جناب سعادت صدیقی کا "فرقہ وارانہ فسادات" بہت پسند آیا۔ مسلمانوں نے ایک ہو کر اندرا ...

واقعات نئی دھلی

حکومت" کی پشت پناہی کی۔ اب وقت آگیا ہے کہ کانگریس اپنی آنکھیں کھولے اور وعدوں اور نعروں کی منزل سے آگے بڑھ کر واقعی کچھ کام کرے۔ حکیم بدھن کا سلسلہ بھی بہت دلچسپ ہے اسے جاری رکھیئے۔ خیر اندیش۔ نعیم الدین پلپٹر

سیلون اور بانگلادیش۔

اپریل کے شمارے میں "گولیوں سے دل نہیں جیتے جاتے" حقیقت سے بہت قریب ہے۔ نہ تو یحییٰ خاں گولیوں سے بنگالیوں کے دل جیت سکتے ہیں اور نہ مسز بندرانائیکے اپنے عوام کا۔ سیلون کے سلسلے میں حکومتِ ہند کی مذبذب پالیسی خود اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ ایک طرف تو کانگریسی حکومت بانگلادیش کے عوام کی حمایت کر رہی ہے اور دوسری طرف سیلون میں عوام کے قتلِ عام میں مسز بندرانائیکے کی مدد کر رہی ہے۔

خود سیلونی حکومت کا کہنا ہے کہ ستر ہزار سے زائد نوجوان باغی بن چکے ہیں۔ سیلون جیسے چھوٹے سے ملک میں ۷۰ ہزار نوجوانوں کا باغی ہو جانا کوئی معنی رکھتا ہے۔ ان نوجوانوں کو گاؤں میں رہنے والے زیادہ تر عوام اور مزدوروں کی حمایت حاصل ہے، اس طرح سے یہ تحریک بھی عوامی تحریک ہے۔ سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ سیلون کی عوامی تحریک کو دبانے میں ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑ رہی ہیں۔ جیتندر سنگھ آنند۔ جنڈی گڑھ

جناب والا۔ تسلیم۔

واقعات میں آٹھ صفحات کا اضافہ کر کے تو آپ نے ہم پڑھنے والوں پر احسان کیا ہی تھا اس کو تھوڑی سی ادبی چاشنی دے کر اس میں اور چار چاند لگا دیئے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ واقعات کے ذریعے ہمیں واجدہ تبسم جیسی افسانہ نگار کے شاہکار پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ تازہ شمارے میں "حکیم بدھن" اور "وہ آخری لمحہ" بھی بہت پسند آیا۔

اپریل کے پہلے شمارے میں جناب نازش پرتاپ گڑھی کی نظم "خونیں لمحوں کے نام" بہت پسند آئی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ہماری ملاقات نازش صاحب سے کراتے رہیں گے۔

ایک شکایت ہے کہ پرچہ وقت پر نہیں مل رہا ہے ہم لوگ ایک پرچہ ملنے کے فوراً بعد ہی دوسرے پرچے کا انتظار شروع کر دیتے ہیں اس لیے انتظار کی گھڑیاں کاٹنا ہمارے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔ آپ کے مخلص مداح۔ رفیق الدین انصاری۔ محمد شفیق جوتے والے۔ امین الدین انصاری۔ جمیل الرحمن صدیقی۔ گیا۔ (بہار)

محترمی! تسلیمات!

مئی کا شمارہ ملا۔ ماؤزے انقلابی کا انٹرویو بہت پسند آیا ماؤ کے چیلوں کے لیے ایک سبق ہے۔ اس مرتبہ مزاحیہ مضامین کی کمی ذرا کھٹکی۔ کارٹون بھی کم تھے اور ذرا خشک بھی۔ کارٹون زیادہ سے زیادہ دیجئے۔

ہندوستانی کرکٹ کے ننھے سے ہیرو سنیل گواسکر پر مضمون بھی بہت عمدہ ہے، اب دیکھئے ہندوستانی ٹیم انگلینڈ میں جا کر کیا کرتی ہے۔ فلموں پر اور جنسیات پر بھی مضامین دیجئے، دونوں موضوع آج کل کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی ہیں۔ ضمیر احمد۔ بمبئی

نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی۔

محترمی السلام علیکم۔

فلم انڈسٹری کے خداؤں کی بددیانتی نے آج کے نوجوان طبقے کو جو شدید نقصان پہونچایا ہے اس کی تلافی غیر ممکن معلوم ہوتی ہے جنسی معلومات عمر کے ایک خاص حصے میں انتہائی مؤثر اور مفید ہوتی ہیں لیکن عمر کے اس SPAN کو کم کرنے میں ہماری فلموں نے جو افسوسناک رول ادا کیا ہے، اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ نوعمر طبقہ اور خصوصاً بچے جنسیاتی طور پر اسقدر MATURE ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی طبعی عمر سے پہلے ہی ایک SLEEPING PARTNER چاہتے ہیں یا یوں کہیے کہ SENUAL GRATIFICATION ان کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہو گیا ہے جتنا ایک بالغ مرد کے لیے ہوتا ہے لیکن حالات اور وقت کے تقاضے اس کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ یہ طبقہ ابھی بالغ نہیں

باقی صفحہ ۵۰ پر

[illegible] اپنے [illegible] حکمران کہتے ہیں
[illegible] نے تھا اور اتنا ہی نہیں بلکہ وہ چینی تہذیب تمدن میں رنگ گیا۔

[illegible] شہنشاہ چنگیز خاں کچھ اور دن جیتا رہتا اور اس کے [illegible] کا خواب حقیقت کا روپ دھار لیتا۔۔

بقیہ۔ مونالیزا

جو اس نے اس ہال کو پہلے گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال کیا اور بعد میں گھاس کے لئے اسٹور روم بنا دیا۔ آج کل اس تصویر کی بہت نگہداشت کیجا رہی ہے تاکہ اسے مزید نقصان نہ پہنچنے پائے لیکن پھر بھی اب یہ تصویر خوابیدہ سی ہو کر رہ گئی ہے۔

لیڈی لیزا کو فلورنس میں پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ بے مثال حسینہ تھی اس لئے لیونارڈو کی خواہش ہوئی کہ اس کی مسکراہٹ کو صفحۂ قرطاس پر لایا جائے۔ لیڈی لیزا ہمیشہ لیونارڈو کے ساتھ رہتی۔ وقت گزاری کے لئے ہمیشہ ایسے ہی لوگ اسکے ساتھ رہتے تھے جو ہنستے گاتے اور باتیں کرتے رہیں تاکہ لیڈی لیزا خوش رہے اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہے۔

جب وہ پینٹنگ مکمل ہو گئی تو فرانس کے شہنشاہ نے اسے بھاری قیمت دے کر خرید لیا اور یہ تصویر آج تک حکومتِ فرانس ہی کی ملکیت ہے مگر ایک بار یہ انگلینڈ کے ہاتھوں پہنچتے پہنچتے رہ گئی۔

ایک بار بکنگھم (Buckingham) کا ڈیوک اپنی بیوی شہزادی "ہنریٹا میریا" سے ملنے فرانس گیا وہاں وہ اس تصویر کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ بادشاہ چارلس یہ تصویر اپنے داماد کو دیدیتا مگر لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ یہ فرانس کی حسین ترین تصویر ہے اور اسے ملک فرانس سے باہر نہ جانے دیا جائے۔

لیونارڈو اٹلی کے بہت سے شہروں میں رہا۔ وہ جنگ کے سلسلے میں قیصر بورگیا (Casal Borgea) کے ساتھ رہا اور بے پایاں آرٹ کے نمونے پیش کئے جو اس نے حرم میں ملکہ قیصر کی بیگم ایزابیل (Isabell) کے مختلف لباسوں میں بنائے۔ اس نے کچھ وقت روم میں پوپ کے لئے کام کرتے گزارا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام اس نے فرانس میں ہی گزارے

[illegible] رہا۔ وہ چیف انجینئر، چیف آرٹسٹ اور چیف مجسمہ ساز تھا۔ بادشاہ کے محل کے برابر اس کا بڑا مکان تھا جہاں اکثر بادشاہ فرانس آتا رہتا تھا۔ فرانسیس اس سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے اپنے دربار میں بے پایاں عزت دے رکھی تھی۔ ایک حکایت اسطرح بھی بیان کیجاتی ہے کہ:۔

"جب لیونارڈو کا انتقال ہوا تو کنگ فرانسیس اس کی بالیں پر موجود تھا اور جس وقت کنگ فرانسیس نے اسے اپنے سینے سے لگایا اس وقت لیونارڈو کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔"

لیونارڈو ایک مسلّم حقیقت تھا۔ ہے۔ اور رہے گا۔ اس نے آرٹ کی دنیا کو وہ سب کچھ دیا جو اس کے نام کو قیامت تک زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

بقیہ:۔ قارئین کے خطوط

ہوا ہے اور نہ SELF SUFFICIENT ہے۔ یہ نوعمر طبقہ زیرِ تعلیم ہے لیکن فلموں نے اسے اسقدر جنسی ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اب کسی بھی ذریعے سے اپنے اس جذبے کی تسکین کے متلاشی ہیں۔ ظاہر ہے جب وہ صحیح طریقے پر اس چیز کو حاصل نہیں کر پائیں گے جو کہ اس وقت ناممکن ہے تو غلط راہ اختیار کریں گے اور برائیوں کا پیش خیمہ ہوں گے۔

ان تمام باتوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، خود لذتی، ہم جنسی اور دوسری گندگیوں کی مثالیں ہمارے سامنے آئے دن آتی رہتی ہیں آج کل نوجوانوں کی اوسط تندرستی دیکھئے کہ وہ جسمانی طور پر کسقدر کمزور نظر آتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل بے حد ضروری ہے۔ فلم بینی تفریح کا ایک واحد اور مقبول ترین ذریعہ ہے، اور فلمیں دن بدن ننگی ہوتی جا رہی ہیں اور پھر ایسے وقت میں فلموں میں بوسہ بازی کی حمایت کرنے والوں کا کیا کہنا۔!

قارئین سے التجا ہے کہ وہ اس مسئلے پر اپنے قیمتی COMMENT ضرور دیں اور یہ بھی کہ اس مسئلے کو کیونکر حل کیا جا سکتا ہے۔؟

اور ہاں واقعات پڑھ کر لگا کہ اس پرچے کی واقعی بے حد ضرورت تھی۔ آپکا مخلص۔ شبیر ظفر (بھوپالی)

برادر محترم۔ خلوص بے کراں!

میں "واقعات" کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ اور بلاخوف تردید پورے یقین اور وثوق سے یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ "واقعات" کا ہر شمارہ گزشتہ شمارے کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر اور خوبصورت ہوتا ہے۔

رسالے کی مقبولیت روز افزوں ہے، وہ دن دور نہیں جب آپ کا یہ جریدہ ترقی کے بامِ عروج پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپکے عزم اور ارادے کو اور توانائی بخشے۔ آمین۔ آپکا بھائی۔

عدیل عباسی جامی چڑیا کوٹی۔

بقیہ:۔ اداریہ

امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حکومتِ ہند کو بانگلا دیش کی آزاد حکومت کے ساتھ گہری دلچسپی ہے اور وہ بڑی سنجیدگی سے اسے تسلیم کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔

مسز اندرا گاندھی کو بجا طور پر اس بات کی بھی شکایت ہے کہ بہت سے وہ ممالک جو جمہوریت کی دہائی دیتے ہیں اب بانگلا دیش کی جدوجہدِ آزادی کے معاملے میں خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خوشحال ممالک پناہ گزینوں کی مدد کرنے کے لئے بھی آگے نہیں بڑھے اور اس طرح تیس لاکھ کے قریب (جلد ہی اس تعداد کے ۵۰ لاکھ تک پہونچنے کا امکان ہے) پناہ گزینوں کا بار اکیلے ہندوستان پر پڑ گیا، لیکن مغربی ممالک کی یہ خاموشی سچائی پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ سچائی یہ ہے کہ مشرقی بنگال میں جمہوریت اور عوامی حقوق کو پامال کیا گیا ہے اور اگر ہندوستان نے ان کے تحفظ کیلئے کوئی قدم اٹھایا ہے تو اس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں یقین ہے کہ وہ کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے گا۔ وزیراعظم کے یہ الفاظ کہ۔ "جن لوگوں نے ہندوستان میں آکر پناہ لی ہے انھیں ہم نکال نہیں سکتے" ان کی ہمت و جرأت کے مظہر ہیں تباہ حال لوگوں کے حوصلے انکے ان الفاظ سے بلند ہوں گے اور وہ محسوس کرینگے کہ ابھی دنیا کے بعض گوشوں میں انسانیت اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ جو ممالک اس وقت خاموش ہیں وہ بھی اگر آج نہیں تو کل اپنی مہرِ سکوت توڑ دیں گے اور انھیں تسلیم کرنا ہوگا کہ جو فوجی حکام دوسروں کو غدار اور تخریب کار بتا رہے ہیں حقیقت میں وہ خود غدار اور تخریب کار ہیں۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب زمامِ اقتدار عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ "یقیناً ظلم کی شاخ نہ کبھی پھل دیا ہے نہ دیگی۔"

[illegible]

اختر بستوی

ترمیں کا خیال اگر آئے ذہن میں
قیدِ مقام کا نہ تصور رہے روا
جذبات قلب میں جو محبت کے جاگ اٹھیں
انعام اُن کا سارے زمانے کو ہو عطا
اک گوشۂ جہاں کا سنورنا بھی خوب ہے
لیکن ہے خوب تر کہ سنور جائے کائنات
اپنے وطن سے پیار بڑی بات ہے مگر
سب کے وطن سے پیار ہے افضل ترین بات

برسرِ اقتدار پارٹی کے نام

خلیل رنانی

پارلیمانی الیکشن میں جتا کر آپ کو ! !
ہے بخشی جاہ و حشمت اور حکومت کی زمام
سوشلزم اور عوامی خیر خواہی کے لئے
آپ اپنے ایک ایک وعدے کا کیجے احترام

فیصلہ کیجے مٹا دیجئے غریبی کی وبا ! ! !
ہو گی ہر مظلوم اور بیکس کی پوری آرزو
دیس کی بیٹی کا چھینے گا نہ اب کوئی سہاگ
کھیئے اب کوئی نہ لوٹے گا کسی کی آبرو

عہد کیجے اپنے دورِ حکمرانی میں یہاں
نفرت و بغض و حسد بڑھنے نہ پائے دوستو
ملک میں ہونے نہ پائے فرقہ وارانہ فساد
عظمتِ ہند و مسلماں مٹ نہ جائے دوستو

اب کبھی ظلم و تشدد کا نہ ہو کوئی شکار
احترامِ آدمیت لازم و ملزوم ہے
ہر عبادت گاہ کی پاکیزگی قائم رہے
فتنہ پرور شہریت کے حق سے بھی محروم ہو

عہد کیجے سرکشوں کا سر کچلنے کے لئے
ہند کے حکام کا پہلے بدلنا ہے مزاج
اب نہ غارت ہونے گا ملک کا امن و اماں
فیصلہ کیجے نہ بگڑے فرقہ ہند کی اور رواج

آپ کو راہِ ترقی میں بڑھانا ہے قدم
عام جنتا کا بنانا ہو گا جمہور کا راج
آپ کے کاندھوں پہ قومی ایکتا کا بوجھ ہے
عزم کیجے ہند کے امن پہ حرف آنے نہ پائے

ہر [illegible] کا سب کا [illegible] ہو کے لئے
[illegible] گرد [illegible] پھر بدلنا ہے [illegible]
[illegible]
[illegible]

قطعات

ساحل سلطانپوری

"انتقام"

کوئی اُمید، آرزو نہ گلہ — از غرض بے غرض ہی ملتا ہوں
انتقاماً تم زمانے سے — مثلِ تبسم بلب ہی ملتا ہوں

"حاصلِ عمر"

کوئی حسرت ہو آرزو کوئی — وجہِ مرگِ اُمید ہوتی ہے
میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی — آنسوؤں کی کشید ہوتی ہے

"غمگساری"

میرے اک دوست نے پوچھا — آپ رہتے ہیں کیوں اُداس اکثر
اتنا کہہ کر گئے ہیں سینے میں — نرم الفاظ کے سبب نشتر

"حوصلہ"

غم کی معراج پانے والے ہیں — تیری ہستی پہ چھانے والے ہیں
اے عروجِ نشاط دیکھ ادھر — تجھ کو ہم مسکرانے والے ہیں

"پیار"

پیار جانے جسے سمجھے [illegible] — آدمی ہو کے وہ فرشتہ ہے
[illegible] — پیار ہی وہ لطیف رشتہ ہے

"[illegible]"

[illegible] — [illegible] نہیں سکتا

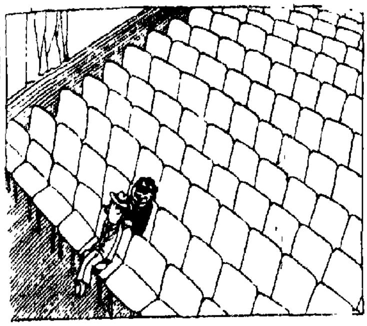
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS

MAY 1971 (SECOND HALF)

WAQIAT

REGD. NO. D

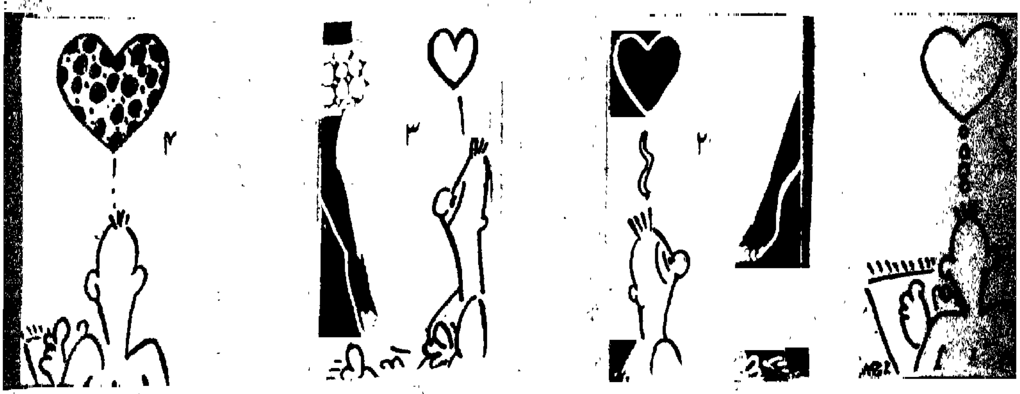
TELEPHONE



"معاف کیجئے گا۔ مہربانی کرکے آپ ذرا اپنا سر نیچے کرلیں۔"



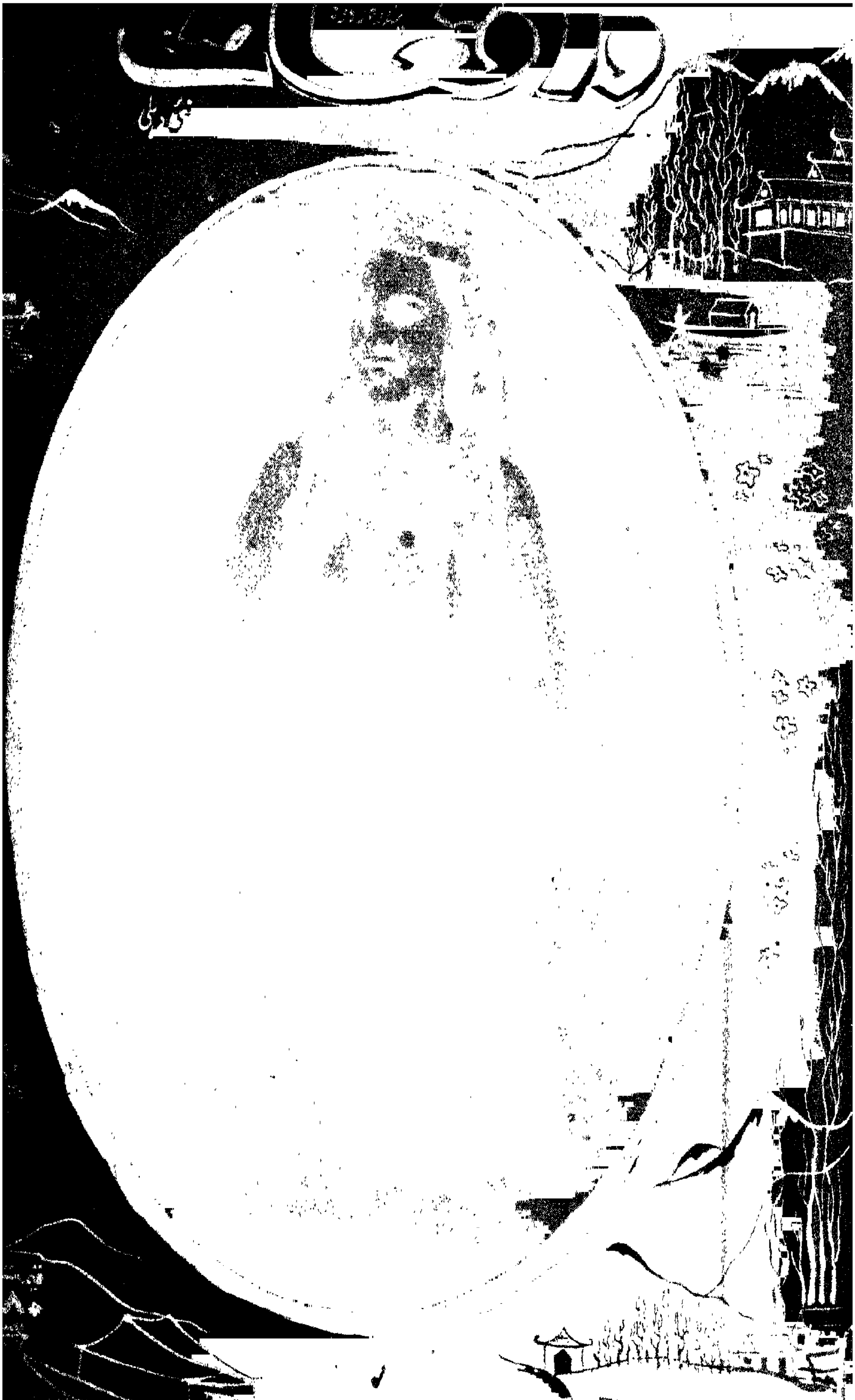
"اب پاکستان الزام لگائے گا کہ ہندوستان بارڈر پر ایک اور ڈویژن لے آیا ہے۔"










نئی دہلی

قیس رام پوری

اے مرے دیس کے معصوم مسلمان سنبھل

تجھ کو کیا ہو گیا جینے کی ادا بھول گیا — اس قدر بھٹکا کہ خود اپنا پتا بھول گیا
اپنے اسلاف کی تحقیق ہوئی تاریخ اٹھا — اور پھر سوچ کہ کیا یاد ہے کیا بھول گیا

کیا ہوا آج ترے قلب کا وہ سوزِ گداز — کانپ اٹھتا تھا کبھی جس سے دلِ فتنہ طراز
کیا ترے جسم میں اس خون کا قطرہ بھی نہیں — جو کہ پڑھواتا تھا تلوار کے سائے میں نماز

آج کیوں تیری زباں کرنے لگی مدحِ رقیب — آج کیوں کہنے لگا ڈگمگاتے لوگوں کو نقیب
کیا ہوئی آج وہ حق گوئی و بے باکی تری — جگمگا اٹھتی تھی سن سن کے جسے راہِ صلیب

عظمتِ کہنہ کو ایسے نہ گنوایا ہوتا — گنجِ بے مایہ کو یوں بھی نہ لٹایا ہوتا
دیکھ کس درجہ امنڈ آئے ہیں آنکھوں میں اشک — روحِ اسلاف کو اتنا نہ رلایا ہوتا

زندہ رہنا ہے تو یوں قصۂ پارینہ نہ بن — عزم کو راس بھی آجائے گا اک دن نیا چلن
صرف اک بار بس اک بار سینے کو سنبھال — رخ بدل دیں گی ترے واسطے رنگ و چمن

تو کسی پائے گنہگار کی زنجیر نہ بن — تو کسی مفلس و نادار کی تقدیر نہ بن
تجھ کو تاریخ کے صفحات پہ جینا ہے ابھی — صبح کا مہر تو بن، نالۂ شب گیر نہ بن

اے مرے دیس کے معصوم مسلمان سنبھل

غزل

ناظر الحسینی

مرا غرور تملوکِ بتاں کی نذر ہوا — ابھر کے ساغرِ بادہ کشاں کی نذر ہوا
سمجھ لیا تھا جسے اک امانتِ ہستی — وہ دردِ منتِ چارہ گراں کی نذر ہوا
تمہاری یاد نے بخشا تھا کچھ سکون مگر — کشاکشِ غمِ سود و زیاں کی نذر ہوا
جبینِ شوق میں برسوں سے بے قرار تھا جو — وہ ایک سجدہ ترے آستاں کی نذر ہوا
نظر نظر کا تصادم جو سانحہ تھا کبھی — حدیثِ سوزِ غمِ دیگراں کی نذر ہوا
مرا خلوص جو لبریز تھا محبت سے — وہ نازکیٔ دلِ دوستاں کی نذر ہوا

وہ سر فروش وہ دلدادۂ
نگار خانۂ ہندوستاں کی نذر

نئی دہلی
جولائی ۱۹۷۱ء
نصف اوّل
سال ۔۔۔۔ سولہواں شمارہ
مدیر
عبدالوحید صدیقی
صدر دفتر
۱ نظام الدین ایسٹ ۔ نئی دہلی ۱۳
ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵
قیمت ۸۰ پیسے ۔ سالانہ ۸ روپے
نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے
ہوں ان کے سلسلہ میں خط و کتابت
ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا
اختیار ہے۔
صفحات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ
ہے۔
میں شائع شدہ مضامین و واقعات
والے سے شائع کرنے کی عام
ہے۔
ادارتی امور متنازعہ کے فیصلہ کا
دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا
ناشر عبدالوحید صدیقی
طبع ۔
الجمعیۃ
آفسیٹ پریس
دہلی

ایک جرأتمندانہ قدم ایک نیک فال

یوپی میں اردو کی تعلیم کا انتظام

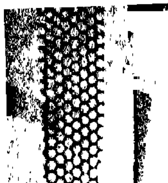
یہ امر موجب اطمینان ہے کہ وسط مدتی انتخاب میں کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اُردو کو اس کا آئینی حق دلانے کا جو وعدہ کیا تھا مرکزی حکومت اسکی روشنی میں اقدامات کر رہی ہے۔ گذشتہ ہفتہ وزیر اعظم ہند نے اُردو ایڈیٹروں کے ساتھ ملاقات میں انکشاف کیا کہ انھوں نے اُردو کو اس کا آئینی حق دلانے کے سلسلے میں بعض ریاستی وزرار اعلیٰ سے بات چیت کی ہے اور یوپی کے وزیر اعلےٰ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ ہر پرائمری اسکول میں خواہ اُردو کا کوئی طالب علم وہاں ہو یا نہ ہو ایک اُردو ٹیچر کا تقرر لازماً کیا جائے گا۔ یوپی کے بعد وزیر اعظم کو توقع ہے کہ بہار وغیرہ میں بھی ایسا ہی ہوگا۔

اب تک اُردو کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لئے پورے اسکول میں چالیس اور ایک کلاس میں دس طالب علموں کا ہونا ضروری تھا۔ یہ شرط اُردو کی تعلیم کے راستہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ اس شرط کی بنیاد پر مخالفین اُردو کو ایسا ماحول تیار کرنے کا موقع مل جاتا تھا کہ اُردو طلبار کی مطلوبہ تعداد ایک اسکول میں جمع نہ ہو سکے۔ نتیجہ میں شمالی ہند کی ان تمام ریاستوں میں اُردو ختم ہو گئی جہاں اُسنے جنم لیا تھا اور وہ پلی بڑھی تھی۔

وزیر اعظم ہند مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں ایک اہم اور بنیادی قدم اٹھایا۔ اگر ہر پرائمری اسکول میں ایک اُردو ٹیچر مقرر کرنے کی پالیسی کو ایمانداری کے ساتھ نافذ کیا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خواہشمند اپنی اس محبوب زبان سے محروم رہیں۔ اُمید ہے کہ اُردو ٹیچروں کی تقرری کے سلسلے میں جلد کوئی سرکاری اعلان کیا جائے گا اور ان اسکولوں کے دروازے اُردو تعلیم کے لئے کھولدیئے جائیں گے جو گذشتہ ۲۰ سال سے بند تھے۔

اُردو تعلیم عام ہونے اور اس کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد ہم یہ توقع بھی رکھ سکتے ہیں کہ اُسے دلّی، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش جیسی ریاستوں میں جہاں اُردو بولنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے اُردو کو دوسری زبان کا درجہ دیدیا جائے گا۔ آئین ہند میں اُردو کو ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک تسلیم کیا گیا ہے اس لئے اگر اسے ان علاقوں میں جہاں اس کے بولنے والے دس سے بیس فیصدی تک رہتے ہیں دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے کا اعلان کیا جائے تو یہ آئین کی منشا کے عین مطابق ہے لیکن سردست ہم ایسا ماحول نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آسانی کے ساتھ اسے دوسری زبان تسلیم کر لیا جائے — ہم وزیر اعظم ہند اور ریاستی حکومتوں کی ان مشکلات کو سمجھتے ہیں جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس طرح آج یہ بات تسلیم کی گئی کہ اُردو زبان کی تعلیم پر شرط و قید لگا کر بے انصافی کی گئی تھی اسی طرح کل یہ احساس بھی یقیناً پیدا ہوگا کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہ دینا ایک بہت بڑی آبادی کے ساتھ بے انصافی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جب اُردو تعلیم کا حاصل کرنا آسان ہو جائے گا اور اس کا دائرہ وسیع ہوگا تو اسے دوسری سرکاری زبان بنانے کا ماحول خود بخود پیدا ہو جائیگا۔ اور اُردو کے مخالفین خود محسوس کریں گے کہ اُردو ملک کا ایک بہت بڑا ورثہ ہے جو ضائع نہ ہونا چاہیئے۔ اُردو ایک خوبصورت اور دلکش زبان ہے اور جس طرح ہر خوبصورت اور دلکش چیز خود بخود دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اُردو بھی یقیناً دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ موجودہ حالات میں اُردو کی تعلیم عام کرنا ایک جرأت مندانہ اقدام ہے اور اسے ہم اردو کے لئے فال نیک سمجھتے ہیں۔



مکتوب قاہرہ

پھر غلط فہمیاں

شاہ حسین قاہرہ کا دورہ کرنیوالے ہیں

قاہرہ کے سرکاری حلقوں میں بتایا گیا ہے کہ اردن کے شاہ حسین عنقریب قاہرہ آنے والے ہیں جہاں وہ صدر متحدہ عرب جمہوریہ مسٹر انور سادات سے بات چیت کریں گے۔ اس سے قبل سعودی عرب کے شاہ فیصل قاہرہ کا دورہ کر چکے ہیں۔ انکے اور انور سادات کے درمیان بات چیت کے بعد خصوصی ایلچی کے ذریعے دونوں سربراہان مملکت کی طرف سے ایک پیغام شاہ حسین کو بھیجا گیا تھا اسی کے بعد شاہ اردن قاہرہ جا رہے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور اردن کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور دونوں ملکوں میں اب اتنا اشتراک و تعاون باقی نہیں رہا ہے جتنا کہ اس سے قبل چھ دن کی جنگ کے بعد پایا جاتا تھا۔ اس کی تصدیق شاہ حسین کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے حال ہی میں ایک امریکی نامہ نگار کو دیا ہے۔

انھوں نے کہا: چھ روزہ جنگ کے بعد ہم نے متحدہ عرب جمہوریہ کے ساتھ ملکر کام کیا۔ لیکن جب مصر نے راجرس پلان منظور کر لیا تو صورت حال تبدیل ہونے لگی۔ پلان میں تجویز کیا گیا تھا کہ اسرائیل اپنی محفوظ سرحدوں کے بدلے میں مقبوضہ علاقے خالی کر دے گا۔ یہ تجویز ہمارے لئے حیرت انگیز تھی۔ اس بارے میں نہ ہمیں پہلے سے اطلاع دی گئی اور نہ مشورہ کیا گیا۔ اس کے بعد سے مصر کے اور ہمارے درمیان کوئی تعاون نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں کہ ہمارے مصری دوست کیا کر رہے ہیں۔"

دراصل شاہ حسین نہر سوئز کے علاقے سے اسرائیلیوں کی جزوی واپسی کو عربوں کی کوئی کامیابی نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں اس سے اسرائیل کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جائے گا کہ اس کا طرز عمل تعمیری ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کرے گا اور عربوں کے مسائل درمیان میں لٹکے رہ جائیں گے۔

توقع کی جا رہی ہے کہ شاہ حسین اور انور سادات نئے حالات کی روشنی میں تفصیلی بات چیت کریں گے اور اس کا امکان ہے کہ وہ نہر سوئز کی واگذاری اور اسرائیل کے ساتھ عبوری تصفیہ کے سلسلے میں کسی پالیسی پر متفق ہو جائیں گے۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ امریکا کا سفارتی مشن قاہرہ پہنچا ہے تاکہ نہر سوئز کی واگذاری اور عبوری تصفیے کے سلسلے میں اپنی تجاویز پیش کرے۔ دونوں عرب سربراہوں کی بات چیت بڑی مفید ثابت ہوگی۔ اور اس سے وہ غلط فہمی دور ہو جائے گی جو اس وقت دونوں ملکوں میں نظر آتی ہے۔

سویوز-۱۱ کا حادثہ



شاہد صدیقی

تینوں خلاباز سویوز ۱۱ میں

پوری خلائی سائنس پر نظرثانی کی ضرورت ہے

[illegible] کو خلائی جہاز سویوز-۱۱ کو پیش آنے والا حادثہ [illegible] خلائی تاریخ کا تیسرا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ پہلا [illegible] حادثہ پیش آیا تھا جب ۱۹۶۷ء میں تین امریکی خلا [illegible] راکٹ کے اندر ہی جل کر ہلاک ہو گئے تھے [illegible] ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ کو روسی خلاباز کوماروف کو [illegible] کوماروف نے بھی اپنا خلائی مشن پوری کامیابی [illegible] کیا تھا۔ لیکن زمین پر اترتے وقت ان کے راکٹ [illegible] نے ٹھیک طرح کام نہیں کیا اور وہ ہلاک [illegible] سویوز-۱۱ کو پیش آنے والا حادثہ انسانی خلائی [illegible] سب سے بڑا حادثہ ہے۔

[illegible] روسی خلابازوں نے مرنے سے پہلے [illegible] پوری طرح کامیابی حاصل کر لی تھی۔ کمانڈر [illegible] فلائٹ انجینئر ولادی سلاو وکو [illegible] خلا میں جو تجربات کئے وہ خلائی سائنس میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۶ جون کو خلائی جہاز سویوز-۱۱ نے خلائی اسٹیشن سیلوت سے رابطہ قائم کیا۔ اور پہلی بار انسان خلا میں اڑنے والے کسی مصنوعی سیارے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد خلابازوں نے خلائی اسٹیشن میں انسانی اور پودوں کی زندگی پر بے وزنی کے اثرات پر کئی تجربے کئے۔ زمین کے ان زاویوں سے تصویریں لیں جن سے اب تک نہیں لی گئی تھیں۔ اس طرح خلابازوں نے ۲۴ روز کے عرصے میں کئی ایسے تجربات کئے جن کی مدد سے انسان کے لئے دوسرے سیاروں پر جانا اور خود اپنے سیارے زمین پر قدرتی آفتوں سے بچنا آسان ہو سکے گا۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اپنے مشن کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد خلاباز موت کے منہ میں چلے گئے۔

ایک قدم آگے کی طرف

یا ایک قدم پیچھے کی طرف؟

انسانی ترقی اور سماج کی معماری میں چند انسانوں کی موت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سے پہلے کہ انسان نے اڑنا سیکھا سیکڑوں لوگوں نے اڑنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوائیں۔ آج کی انسانی ترقی ان لاکھوں لوگوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے بغیر کسی لالچ کے انسان اور سائنس کی ترقی کے لئے دن رات کام کیا۔ اہمیت ہے تو ان سوالوں کی جن کے جواب اب ہمیں اس حادثے کے بعد ڈھونڈنے ہوں گے۔ ان سوالوں کے جواب پر ہی انسان کی خلائی ترقی کا دار و مدار ہو گا۔

- اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ یہ حادثہ کیوں پیش آیا؟
- حادثہ کسی تکنیکی کمزوری کی وجہ سے پیش آیا یا پھر اس کی وجہ انسانی جسم کی کوئی کمزوری ہے؟
- کیا انسانی جسم لمبے عرصے تک بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد زمین کی کشش میں نارمل ہو سکتا ہے؟

واقعات نئی دہلی



جیورجی
ڈبرووسکی



ولاڈی سلیو
ولکوڈ

وکٹر پٹساوئیو



کیا اس حادثے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے امریکا روس کو اپنے خلائی پروگرام میں کسی قسم کی بلی کرنی پڑے گی؟

ان میں سے زیادہ تر سوالات ایسے ہیں جن کے صحیح جوابا بالکمال ممکن نہیں ہیں۔ ان سوالوں کے جواب صرف وقت ہی دیئے جا سکتے ہیں جب روسی سائنس دا ل ت کو واضح کر دیں کہ خلابازوں کی موت کسی وجہ سے ۔ روسی سائنس دانوں نے جس تیزی سے پوسٹ مارٹم و مکمل کر کے لاشوں کو تجہیز و تکفین کے لئے دے دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ نتائج پر پہنچنے میں کامیاب ئے ہیں۔

لیکن اب تک ملنے والی معلومات کی بنیاد پر کچھ اندازے ئے جا سکتے ہیں۔ حادثے کی وجوہات کے طور پر کئی ریاں پیش کی جا رہی ہیں۔

زیادہ تر سائنس دانوں کا خیال یہ ہے کہ خلابازوں رت دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے ہوئی۔ ایک لمبے تک بے وزنی کی حالت سے وزن کی حالت میں داخل ے پر خلابازوں کے دل کو ایسا جھٹکا لگا جو ان سے برداشت نہ سکا۔

یا پھر خلائی جہاز کے آکسیجن سسٹم میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی خلاباز دم گھٹ جانے سے موت کا شکار ہو گئے۔

جس وقت خلائی جہاز زمین کی فضا میں داخل ہوتا ہے۔ قت ہوا کے ساتھ رگڑ (FRICTION) کی وجہ سے جہاز ری سطح بہت زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک خاص کے ذریعے اندرونی فضا کو نارمل رکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نظام میں کوئی خرابی ہو گئی ہو اور خلاباز جل کر مر گئے ہوں۔ ویسے جہاز کے اندر جلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

یا پھر اس کے پیچھے کوئی ایسی خاص وجہ ہو جس سے سائنس اب تک ناواقف ہے۔

اس سے پہلے سویوز۔۹ کے خلاباز نکولائی اور سوستیانوف خلا میں سب سے لمبے عرصے یعنی ۱۸ دن رہ چکے ہیں۔ واپسی کے سفر کو انھوں نے بہت تکلیف دہ بتایا تھا۔ زمین پر آنے کے کئی مہینے بعد تک یہ لوگ عام طریقے سے چل پھر نہیں پائے تھے۔ امریکن خلاباز آرم اسٹرانگ کی قوت سماعت ابھی تک نارمل نہیں ہوئی ہے اور وہ اب بھی اپنے کانوں میں راکٹ کا شور محسوس کرتے ہیں۔ اب تک سائنس دانوں کا تجربہ یہ تھا کہ خلائی بے وزنی سے انسانی جسم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس مرتبہ پہلی بار انسان ۲۴ دن تک خلا میں رہا۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک خاص عرصے کے بعد انسانی جسم میں کچھ اس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہوں کہ اس کے لئے واپس کشش ثقل میں آنا ناممکن ہو جائے۔

امریکن سائنس دانوں نے کہا ہے کہ وہ فی الحال اپنے پروگراموں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ خلابازوں کی موت کسی تکنیکی غلطی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ اس لئے جب تک یہ پتہ نہ چل جائے کہ اس حادثے کے پیچھے کیا وجوہات ہیں سائنس دانوں کو زیادہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لیکن ہو سکتا ہے کہ روس کو اپنے خلائی پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی کرنی پڑے۔ ویسے اس خلائی تجربے میں روسی سائنس دانوں کا مقصد تو کافی حد تک پورا ہو گیا۔ ان حادثات کے بعد دنیا بھر کے لوگوں کے ذہن میں جو بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کیا روس اور امریکا خلائی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے انسانی جانوں سے کھیل رہے ہیں؟

- **کیا وہ انسانوں کو تجرباتی چوہوں کے طور پر استعمال کر رہے ہیں؟**
- **کیا وہ اپنے جھوٹے وقار کی خاطر غیر دانشمندانہ خطرات مول لے رہے ہیں؟**

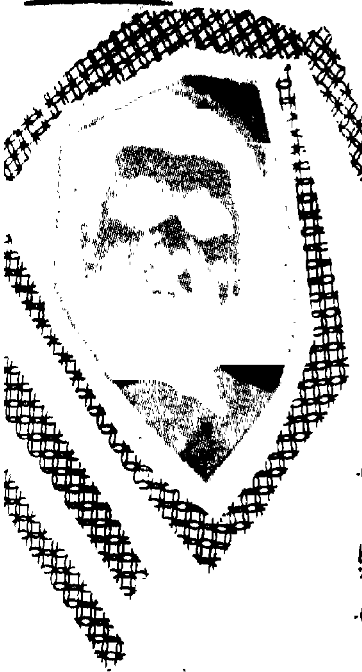
یہ بات اس سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابھی پچھلے ہی دنوں چاند پر جانے والے امریکی مشن کے تین خلابازوں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ سائنس داں ان خلابازوں کو بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

خلائی تجربوں کے دوران پہلے خلائی ہوا باز یوری گیگرن کی موت بھی اس ہی کہانی کی ایک کڑی ہے۔

ضروری ہے کہ بڑی طاقتیں ان حادثات سے کچھ سبق سیکھیں۔ اور خلائی تحقیقات کو اپنے وقار کی جنگ نہ بنائیں۔ مشترکہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں اور ایک دوسرے کی معلومات کا فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ کسی بھی بیرونی سیارے پر انسان کی فتح کسی ایک ملک کی فتح نہیں بلکہ پوری انسانیت کی فتح ہو گی۔ یہ فتح کسی ایک ملک کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہو گی بلکہ دنیا بھر کے ان اربوں انسانوں کی کوششوں کا پھل ہو گی جنھوں نے پچھلے ہزاروں برسوں میں ترقی کی طرف ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھایا۔ ✱

محمد علی کی فتح حق اور سچائی کی فتح ہے



امریکن عدالتوں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ رجعت پسند ہیں۔ اب تک ان کا کام عوام کے حقوق سے زیادہ جائداد اور جائداد رکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت کرنا رہا ہے۔ لیکن اب لگتا ہے کہ امریکی عدالتوں کے اندازِ فکر میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ جیسا کہ امریکن سپریم کورٹ نے بلیک پینتھر (امریکن کمیونسٹ تحریک) کو بری کرکے، نیویارک ٹائمز کے حق میں فیصلہ دے کے اور محمد علی کلے کو فوجی خدمات سے بری کرکے ظاہر کر دیا ہے۔

محمد علی کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اس نے جس طرح امریکا کے سرمایہ دار نظام اور وہاں کی جنگجو حکومت سے ٹکر لی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ امریکا میں ۱۸ سال سے زائد عمر کے ہر نوجوان کے لئے کم از کم دو سال کی فوجی خدمات انجام دینا ضروری ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں کلے نے لسٹن کو شکست دے کر اس سے بین الاقوامی ہیوی ویٹ چیمپین کا خطاب چھین لیا تھا۔ کلے کے مذہب کی تبدیلی کے اعلان کے فوراً بعد ہی سارا امریکا کلے کا دشمن ہو گیا۔ اسے چیمپین ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بے ایمانی کے الزامات لگائے گئے۔ لیکن ایک بار پھر جب اس نے لسٹن کو ایک ہی گھونسے میں ڈھیر کر دیا تو بین الاقوامی باکسنگ ایسوسی ایشن کو مجبوراً اسے ہی چیمپین ماننا پڑا۔

اس کا حق اس سے چھیننے کے اب دوسرے طریقے ڈھونڈے جانے لگے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ اُسے فوج میں بلا کر ویتنام بھیج دیا جائے۔ لیکن جب کلے فوجی خدمات کے لئے امتحان میں بیٹھا تو معلوم ہوا کہ ذہنی طور پر کلے فوجی خدمات کے لائق نہیں ہے۔ اخبارات نے اس پر بہت شور مچایا۔ ان کا کہنا تھا کہ کلے جیسا آدمی جو عمدہ شاعر اور بہت ہی حاضر جواب شخص ہے ذہنی طور پر ناکارہ نہیں ہو سکتا۔ ایک بار پھر ٹیسٹ لیا گیا اس بار پھر کلے ناکام رہا۔ لگ رہا تھا کہ کلے کے دشمنوں کی اسے ویتنام بھیجنے کی چال ناکام ہو جائے گی۔ لیکن جب تیسری بار کلے کا امتحان لیا گیا تو پتہ چلا کہ کلے اب تک ڈاکٹروں کو بیوقوف بنا رہا تھا۔ ورنہ وہ دماغی طور پر بہترین ذہن کا مالک ہے۔ لیکن اب کلے نے ویتنام کی جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

اس کا کہنا ہے کہ وہ کالے مسلمانوں کا مذہبی پیرو ہے اس لئے اسے فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اسے ویتنام کی جنگ سے بھی اختلاف تھا۔ جو بات آج پورا امریکا کہہ رہا ہے وہی بات آج سے پانچ سال قبل کلے کہہ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ویتناموں سے امریکنوں کی کوئی دشمنی نہیں۔ اس لئے وہ ان کا خون کرنے کے لئے ویتنام کیوں جائے؟۔ ویتنام کی عوام اپنے جائز حقوق کے لئے لڑ رہی ہے اور امریکا کو ان کے ان حقوق کو چھیننے کا کوئی حق نہیں۔

ویتنام کے عوام اپنے
جائز حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ امریکا کو
ان کے حقوق چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے

سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار نسلی نابرابری میں یقین رکھنے والے امریکن کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کلے سے چیمپین کا خطاب چھین لیا۔ لیکن دنیا جانتی تھی کہ اصل چیمپین کلے ہی ہے۔ اس کے بعد کلے کو پریشان کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے گئے۔ اس پر ہزاروں ڈالر فائن کیا گیا، درجنوں مقدمے چلائے گئے۔ لیکن اس نے ظلم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ کلے نے جس طرح ڈٹ کر پورے امریکن سماج کا مقابلہ کیا اس نے اس کی عزت کم کرنے کی بجائے اس میں اضافہ ہی کیا۔ آج کلے لڑنے مرنے والا ایک باکسر ہی نہیں بلکہ امریکا کے لاکھوں پسے ہوئے کالوں کا لیڈر بھی ہے۔

ویسے تو کلے نے درجنوں فتوحات حاصل کیں لیکن اس کی سب سے بڑی فتح ۲۸ جون ۱۹۷۱ کو ہوئی۔ یہ صرف کلے کی ہی فتح نہیں تھی بلکہ حق، انصاف اور سچائی کی فتح تھی۔ اپنے جائز حقوق کے لئے لڑنے والے لاکھوں امریکن عوام کے حقوق کی فتح تھی۔ ۲۸ جون کو امریکن سپریم کورٹ نے ۸-۰ کے فیصلے میں کلے کو فوجی خدمات سے بری کر دیا۔ حالانکہ پچھلے چار پانچ سالوں میں کلے کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود اسنے امریکن حکومت سے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔

مقدمہ جیتنے کے بعد جب اخباری نمائندوں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنی فتح کا جشن کب منائے گا۔ تو کلے نے جواب دیا کہ "وہ اپنی فتح کا جشن پہلے ہی منا چکا ہے" اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کے اور اس کا شکر ادا کر کے"۔

کلے اب ایک بار پھر فریزر سے ٹکر لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر خدا کی مدد اس کے ساتھ رہی تو وہ اس مرتبہ فریزر کو مارنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ کلے کی فتح صرف ایک شخص کی جیت نہیں بلکہ دنیا بھر کے پسے ہوئے مظلوم عوام کی جیت ہو گی۔ ہماری نیک خواہشات اس عظیم انسان کے ساتھ ہیں۔

واقعات نئی دہلی

اردو صحافت

نئے تجربات، اقدام کی دعوت دیتے ہیں

(محمد ولی رحمانی)

آزادی کے بعد ہندوستانی صحافت نے نمایاں ترقی کی۔ ہمارے ملک میں ایسے بہت سے روزنامے، ہفت روزے اور ماہنامے شائع ہو رہے ہیں جو عالمی صحافت کے اعلیٰ معیار کو چھوتے ہیں۔ اردو پریس نے بھی ترقی کی اور ہندوستان کے طول و عرض میں اتنے اخبارات نکلنے لگے کہ ۲۰ سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں اردو اخبارات و رسائل کا دوسرا نمبر ہے، ان کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ ایک دن وزارت نشر و اشاعت کی رپورٹ ہمیں یہ بتائے کہ سب سے زیادہ اخبارات اردو زبان میں چھپتے ہیں۔

اردو اخبارات و رسائل کی کثرت ان لوگوں کو بڑی آسانی سے دھوکا دے سکتی ہے جو حقیقی صورت حال سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ ہندوستان میں اردو کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اسے پھلنے پھولنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ خود وہ حضرات بھی جو حقیقت آشنا ہیں اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ کچھ بھی ہو تعداد کے اعتبار سے تو اردو کا نمبر دوسرا ہے۔

لیکن اگر اس مسرور کن تعداد کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کیا جائے تو مایوسی ہوگی۔ بلاشبہ اردو کے اخبارات و رسائل نے گنتی کے اعتبار سے بڑی ترقی کی ہے، لیکن اس کے باوجود اردو پریس ایک مضبوط پریس کی حیثیت نہیں رکھتا۔ نہ اس کی آواز میں جان ہے اور نہ اونچے ایوانوں میں اسے کوئی اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات کی اشاعت بہت تھوڑی ہے۔ سرکاری ریکارڈ کے ذریعے ہمیں ہندوستان بھر کے اخبارات کی تعداد اشاعت معلوم ہو سکتی ہے۔ یہاں ہندوستان کے کثیر الاشاعت اخباروں کی فہرست دی جا رہی ہے جس سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے پریس کی قوت سامنے آئے گی۔ یہ سرکاری اعداد و شمار واقعات نقی دھلی آنکھ بند کر کے یقین کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بسا اوقات اخبار والے اپنی مصلحتوں کی وجہ سے تعداد اشاعت زیادہ بتاتے۔ اس مرض میں ہر زبان کے اخبار والے مبتلا ہیں۔ اردو اخبارات شاید اس مرض کا کچھ زیادہ شکار ہیں۔ ایسے بھی اخبار مل سکتے ہیں جو پریس میں دس سو بھی نہیں چھپتے مگر رجسٹر پر روزانہ دس ہزار چھپتے اور ڈسپیچ ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی اردو روزنامہ ایسا نہیں ہے جس کی اشاعت اونچے درجے کے انگریزی یا ہندی روزنامے کے برابر ہو۔ یہی نہیں بلکہ اردو کا کوئی بھی اخبار اشاعت کے اعتبار سے کسی دوسرے درجے کے انگریزی روزنامے کے مقابلے میں نہیں چھپتا۔ ہندوستان بھر کے اردو روزناموں کا تجزیہ بتاتا ہے کہ چند کو چھوڑ کر کوئی بھی روزنامہ ایسا نہیں ہے جس کی اشاعت ۱۰ ہزار سے زیادہ ہو۔ عام طور پر اردو روزنامے چھ ہزار سے زیادہ شائع نہیں ہوتے اور ایسے بھی روزنامے ہیں جن کی اشاعت دو تین سو سے آگے نہیں بڑھتی۔

اور ہفت روزوں کی صورت حال کچھ کم مضحکہ خیز نہیں ہے ہزار سے اوپر چھپنے والے ہفت روزے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر چار پانچ سو کی تعداد میں ہفت روزے چھپتے ہیں اور خاصی تعداد ایسے ہفت روزوں کی بھی ہے جن کی طباعت صرف ساٹھ استر ہے۔ بہت سے ہفت روزے خالص برساتی قسم کے ہیں جو خاص موسم میں نظر آتے ہیں اور موسم ختم ہوتے ہی ان کی بساط سمیٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس کے پاس بھی کاغذ کے چند ٹکڑے، قلم پکڑنے کا سلیقہ اور بے کاری کا مشغلہ ہے وہ ایڈیٹر بن بیٹھا ہے۔ اس صورت حال نے اخبارات کی گنتی ضرور بڑھا دی ہے مگر اردو اخبار پڑھنے والوں کی گنتی میں نمایاں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ نہ کوئی اخبار مضبوط پریس کی شکل میں ابھر سکا۔

بلاشبہ آزاد ہندوستان میں اردو کی حیثیت سوتیلی بیٹی کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو اخبارات کے ساتھ حکومت کا رویہ اچھا نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ خود اردو والے طبقے نے بھی اردو صحافت کو آگے بڑھانے کی کوئی اچھی کوشش نہیں کی ہے بہت سے ایسے اردو روزنامے موجود ہیں جن کا ادارتی اسٹاف ایک یا دو افراد پر مشتمل ہے۔ اتنا مختصر اسٹاف جیسا روزنامہ نکال سکتا ہے

انگریزی روزنامے

۱۔ انڈین ایکسپریس۔ ۴۰۸۴۷۶
(دہلی، بمبئی، احمد آباد، بنگلور، مدراس، مدورائی اور وجے واڑہ)

۲۔ ٹائمس آف انڈیا۔ ۱۸۸۶۲۹
(دہلی، بمبئی اور احمد آباد)

۳۔ اسٹیٹسمین۔ ۱۶۶۸۳۵
(دہلی، کلکتہ)

۴۔ ہندو۔ (مدراس) ۱۴۲۵۱۱

۵۔ ہندوستان ٹائمس۔ ۱۲۲۸۶۴ (دہلی)

۶۔ امریتا بازار پتریکا۔ ۱۲۱۸۳۱
(کلکتہ اور کٹک)

دوسری زبانوں کے روزنامے

۱۔ دینا تھانتھی (تامل) ۲۶۴۶۵۹
(کوئمبٹور۔ مدراس۔ مدورائی۔ ترچناپلی، ترونلولی)

۲۔ ماتھر بھومی (ملایالم) ۲۲۰۵۴۱
(کالی کٹ اور ارناکلم)

۳۔ انند بازار پتریکا۔ (بنگلا) ۲۱۱۲۶۳۔ کلکتہ

۴۔ ملیالا منورما۔ (ملایالم) ۲۰۹۰۰۵
(کالی کٹ اور کوٹایم)

۵۔ نو بھارت ٹائمس (ہندی) ۱۶۸۵۲۷
(دہلی اور بمبئی)

۶۔ دنمانی۔ (تامل) ۱۴۱۸۴۹
(مدراس اور مدورائی)

بقیہ صفحہ ۵ پر



فردوس بر روئے زمین

کشمیر



آیئے باغِ کشمیر کی سیر کریں۔

دھرتی کا سورگ۔ بھارت کا تاج۔ پھولوں کا دلیش بے نظیر حسین و جمیل دوشیزاؤں کی دنیا۔ اندر کی نگری، دیوتاؤں اور دیویوں کی خواب گاہ۔ نوجوانوں کے خوابوں کا محل۔ دیش بدیش کے ہزاروں لاکھوں صاحبِ نظر اور صاحبِ دل سیاحوں کا مرکزِ نگاہ۔ خوب صورت جھیلوں اور دلکش باغات کا خطّہ عشق اور رومان پرور قدرتی مناظر کی مقدس سرزمین۔ نگاہوں کی جنت اور روح و قلب کو سکون بخشنے والا ہندوستان کے سر کا حسین تاج۔ کشمیر۔ جس میں جموں بھی شامل ہے۔

[illegible] ہزار مربع میل رقبے پر مشتمل ہے۔

جموں اور کشمیر کو جغرافیائی اعتبار سے چار حصّوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

شمال اور شمال مشرق میں ۱۰ اور ۱۵ ہزار فیٹ کی بلندی پر لداخ ہے۔ شمال مغرب میں گلگت کا پہاڑی خطّہ ہے جنوب میں جموں اور سری نگر کی ۸۴ میل لمبی وادی کشمیر واقع ہے۔ یہ وادیٔ کشمیر ہزاروں لاکھوں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کو گرمیوں کے زمانے میں دور دراز مقامات سے حسن، دلکشی اور رعنائی کی مقناطیسی قوت سے اپنی آغوش میں کھینچ لاتی ہے۔

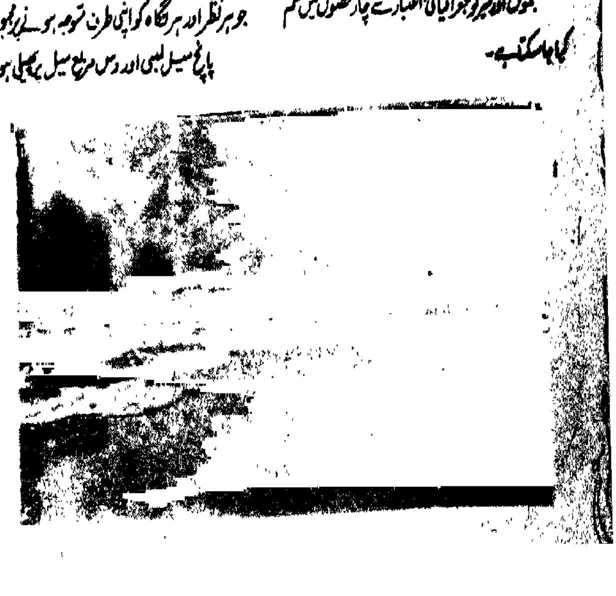
کشمیر کی ندیوں، جھیلوں، پہاڑی سلسلوں باغات اور رنگ برنگ کے نرم و نازک پھولوں میں بے پناہ سحر انگیز حسن ہے جو ہر نظر اور ہر نگاہ کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پانچ میل لمبی اور دس مربع میل پر پھیلی ہوئی ڈل جھیل سری نگر کے قریب واقع ہے۔ اسے ایک بند کے ذریعے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے بڑی ڈل، اور چھوٹی ڈل

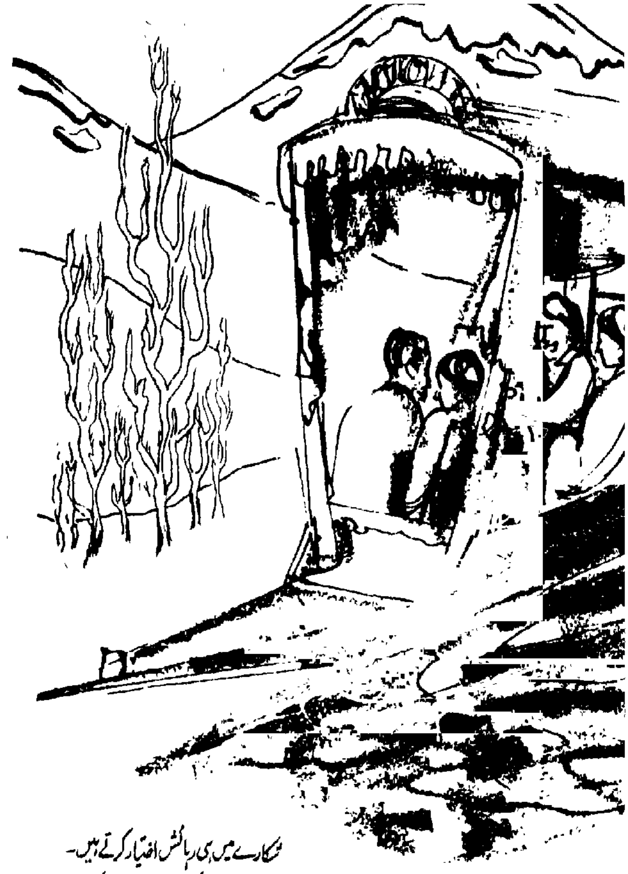
سری نگر سے ۲۵ میل کی دوری پر ولر جھیل ہے جس کا پانی اپنی شیرینی اور تازگی کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیان ۱۵ میل کی یہ وسیع جھیل ماہی مچھلی کے شکار کے لئے بھی کافی شہرت رکھتی ہے شکار کے شوقین سیاح اس جھیل میں مچھلی کا شکار کھیل کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ڈل جھیل کے بعد سب سے خوب صورت، دلکش اور نظر افروز جھیل۔ مانس بل، سری نگر سے ۱۸ میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہ جھیل ہمیشہ کنول کے پھولوں سے بھری رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نیلے آکاش پر بے شمار تارے بکھرے پڑے ہوں۔ یہ جھیل ہر سیاح کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

اتنا ہی نہیں، اس جھیل میں رنگ برنگ کے خوشنما چہچہاتے ہوئے پرندوں، بطخوں اور مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اور گروہ کے گروہ ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ جھیل چڑیوں کی بہت اچھی شکار گاہ ہے۔

ہرمکھ پہاڑ کے قریب ۱۴۷۱۱ فیٹ کی اونچائی پر واقع گنگا بل جھیل بھی سیاحوں کے لئے کم کشش کا باعث نہیں ہے۔



سری نگر میں برفباری کا ایک دلکش منظر



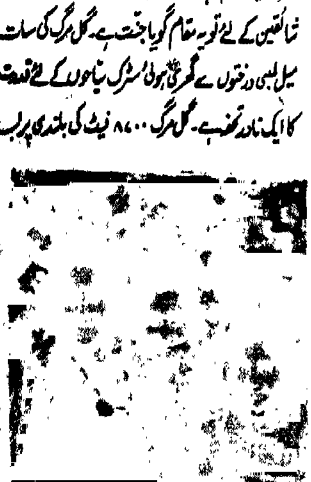
اس کے گہرے نیلے رنگ کے صاف شفاف پانی کو پی کر ساری تھکان دور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شیش ناگ، چاند سر اور ہوک ہیں۔ جھیلوں کے قدرتی مناظر بھی دل کو کافی لبھاتے ہیں ان جھیلوں کے علاوہ ۱۲ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع کوسر ناگ دونہ بھی کشمیر کے بے حد پرکیف اور روح افزا مقامات میں سے ایک ہے۔ ۵۰ فیٹ گہرے اس ردور میں ہمیشہ تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے ایک عجیب دل کش اور خوشنما منظر پیش کرتے ہیں جو دل پر عجیب کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔

سری نگر : —— جموں اور کشمیر کی راجدھانی ہے، اسکا شمار ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے خوب صورت ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ حسین شہر دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر بسا ہوا ہے۔ دریا شہر کے بالکل بیچ سے ہو کر سانپ کی طرح لہراتا ہوا بہتا ہے، آمد و رفت شکاروں کے ذریعے ہوتی ہے ایک سیاح شکارے میں بیٹھ کر پورے سری نگر کی سیر کر سکتا ہے۔ شکارے یک منزلہ بھی ہوتے ہیں اور دو منزلہ بھی، اکثر سیاح تو شکارے میں ہی رہائش اختیار کرتے ہیں۔

سری نگر میں مغل شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا ہری پربت کا قلعہ بھی ہے۔ یہ قلعہ تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے یہاں کے مغل باغات بھی دل کشی اور خوبیوں میں اپنی مثال آپ ہیں مغل بادشاہوں نے ان باغات میں جا بجا چشمے، نہریں کھدوائیں اور فوارے نصب کرا کے ان کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ ان باغات میں نشاط باغ، شالیمار باغ، نسیم باغ اور چشمۂ شاہی شہرت دوام کے حامل ہیں۔

نشاط باغ سری نگر سے سات میل کے فاصلے پر ہے ۱۶۳۰ھ میں شاہجہاں نے اسے لگوایا تھا۔ یہ باغ ۱۷۸۵ فیٹ لمبا اور ۱۱۰۷ فیٹ چوڑا ہے۔ باغ کے مرکزی حصے میں سنگ اسود سے بنا ہوا ایک نہایت خوب صورت تالاب ہے جس میں مسکراتے ہوئے کئی فوارے لگے ہوئے ہیں۔ ڈل جھیل کے بالکل قریب شالیمار باغ ہے۔ اس میں بھی بارہ دری، فوارے اور تالاب بنے ہوئے ہیں۔ ڈل جھیل کے ایک کنارے پر حضرت بل کا تاریخی مقبرہ ہے۔ اس مقدس زیارت گاہ کے پاس ہی شاہجہاں کا بنوایا ہوا نسیم باغ ہے۔ اس [illegible] میں سیکڑوں چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ یہ درخت باغ کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ شاہجہاں نے خود اس باغ میں ایک ہزار سے زیادہ چنار کے پودے لگوائے تھے۔ ویری ناگ اور اچھابل باغات اور چشموں کے سبب قابل دید مقامات ہیں۔

گل مرگ : —— کشمیر کا ایک نہایت پرکیف اور قابل دید مقام ہے۔ گولف کھیلنے والوں اور شہسواری کے شائقین کے لئے تو یہ مقام گویا جنت ہے۔ گل مرگ کی سات میل لمبی درختوں سے گھری ہوئی سڑک سیاحوں کے لئے قدرت کا ایک نادر تحفہ ہے۔ گل مرگ ۸۷۰۰ فیٹ کی بلندی پر ہے



دو رُخ

محمد فاروق نسیم



کرمی! تسلیم

دو رُخ ارسالِ خدمت ہے۔ توقع کے خلاف اور نادانستہ طور پر شاید قلم کہیں کہیں بہک گیا ہے لیکن خاص کر دوسرے رُخ کو بیان کرنے میں مجھے بڑا محتاط رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ اس رُخ کا تقاضہ یہ تھا کہ قلم کی نوک پر روشنائی نہیں بلکہ غلاظت لگا لی جائے لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ پھر بھی اگر کوئی لفظ تہذیب کے دائرے سے ذرا ہٹ گیا ہو تو نظر انداز کر دیجیے گا۔ دو رُخ میں نے دو مختلف کرداروں سے لیے ہیں۔ مضمون کے اندر کوئی تبصرہ نہیں ہے کیونکہ دونوں رُخ پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کے دماغ کی تمام ... ہی کھل جاتی ہیں۔ لاکھوں سوالیہ نشان نظر کے سامنے لرزنے لگتے ہیں ——

میں ان دنوں گاؤں اور قصبوں میں گھومتا پھر رہا تھا مقصد صرف تفریح تھا۔ شہر کے ماحول سے فرار، مشینی زندگی سے چھٹکارا اور مصنوعی روشنی سے دوری چاہتا تھا۔ سچ پوچھیے تو گردشِ روز و الم سے فرار چاہتا تھا۔

میں ایک پرفضا قصبے میں پہنچا۔ یہ قصبہ سطح سمندر سے تقریباً سات ہزار فیٹ بلند ہے۔ سرد اور سرسبز۔ مئی جون کی گرمی میں بھی ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالنے سے کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ سرسبز و شاداب پہاڑیاں۔ صنوبر، چنار اور سرو کے سدا بہار درخت۔ سفیدے کے لمبے لمبے درخت۔ پھر خود رو جھاڑیاں اور پھول۔ پہاڑی چشمے اور چشمے میں تیرتے ہوئے برسوں پرانے گھونگے۔ سب زندگی کے رموز کو آشکار کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل پر سے بوجھ اتر گیا ہے۔ ذہن بالکل صاف ہو گیا ہو۔ میں کسی بڑے پتھر پر جا بیٹھتا اور ماحول کی اس رنگینی کو ... اور روح میں اتارتا رہتا۔ ٹھنڈی ہوا سے

س طرح لگتی جیسے میں فطرت سے مل رہا ہوں۔ کبھی
ے کے متحرک پانی کو دیکھ کر نہ جانے کس سوچ میں کھو
ں خاموشی کو کبھی کسی چرواہے کی صدا توڑتی۔ وہ ڈھیلے
یں ملبوس، بانسری ہونٹوں سے لگائے ایسا پرسوز نغمہ
ا میرے جسم کا رواں رواں اس آواز میں ڈوب جاتا
ان وادی میں بانسری کی آواز کی بازگشت اور بھی کیف
ا کر دیتی۔ کس قدر زندگی تھی اس آواز میں۔ اکثر وہ چرواہا
ے گزرتا۔ اس کے دو چار دن بعد تو مجھے اس کا انتظار
لگا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ کسرتی اور سڈول بدن خوبصورت
دیہاتی لباس، سر پہ پگڑی، پاؤں میں چپل۔ ٹخ ٹخ کی مخصوص
بس پر اس کی بھیڑیں اپنا رُخ بدل لیتی تھیں اور میں سوچنے
انسان آج کل کتنا بدل گیا ہے۔ شہر میں اگر یہ لڑکا اسی
میں پہونچ جائے تو یقیناً لوگ اس پہ قہقہے لگائیں گے۔ کیونکہ
بہت ترقی کر چکا ہے اور یہ ابھی تک اسی پرانی ڈگر پہ چل
ہے۔ انسان چاند پر پہونچ گیا ہے اور یہ ابھی تک ڈھیلا
لا لباس پہنے اس سے بے خبر اس حسین وادی میں بھیڑیں
رہا ہے۔ اسے علم نہیں کہ انسان کتنی ترقی کر چکا ہے۔ اسے
انی مدارج کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں انسان نے ترقی کا
زینہ اس وقت طے کیا تھا جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تھی
سرا زینہ اس وقت طے کیا جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی
سرا زینہ اس وقت طے کیا جب ہیروشیما پر بم گرایا گیا۔ اور یہ
ہے کہ یہ سب کچھ انسان نے اپنی ترقی کا ثبوت دینے کے لئے
بار پھر انسانیت کی ترقی بڑھ گئی۔ پہلے اور دوسرے زینے کے
رمیان برسوں کا وقفہ تھا۔ لیکن تیسرے زینے کے بعد انسان نے
نی جلدی سیڑھیاں طے کیں کہ عقل حیران رہ گئی۔ ویت نام کی
ہوائیں اور فلسطین کے خانماں برباد ابھی تک اس ترقی کو حیرت
سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ چرواہا اس ترقی یافتہ انسان کو دیکھ
لے تو یقیناً دنگ رہ جائے۔

خیر میں اسے دیکھتا اس کی سادگی نے مجھ پر گہرا اثر کیا
اور پھر ایک دن میں چشمے پر بیٹھا پانی کی روانی دیکھ رہا تھا کہ
مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری
آنکھیں خیرہ ہو گئیں —— قدرتی حُسن کا انمول شاہکار۔ ایک
دوشیزہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ لمبی اور ڈھیلی قمیص، پورے پائنچوں
کی شلوار، کھجور کے پتوں کی چپل۔ سر پر موٹی سی چادر۔ بالوں میں
موتی۔ ماتھے پر جھومر نما زیور، کانوں میں بالے۔ ہاتھ میں موتیوں

سے جڑے ... [illegible]
باتوں ہونٹ۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی جھینپ گئی اور کچھ میں
بھی کترا گیا۔ پرایا شہر نہ کوئی دوست نہ آشنا اگر کوئی اونچ نیچ
ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی
اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔

وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر شاید واپس ہوئی جب اس کے
قدموں کی آواز دور ہو گئی تو میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ایک پتھریلی
ڈھلان پہ سے اتر رہی تھی۔

میں وہیں بیٹھا اس کے حسن کا جائزہ لے رہا تھا۔ کس قدر
نکھار تھا اس کے حسن میں۔ جیسے شبنم سے دھلا ہوا پھول، صدف
سے نکلا ہوا انمول موتی۔ وہی آب و تاب وہی نکھار۔ میں شہر کا
رہنے والا، مصنوعی آرائش و زیبائش کا عادی، اس موتی کو دیکھ کر
دنگ رہ گیا۔

پھر چشمے پر جانا میری عادت بن گئی بے اختیاری طور پر
شام کو میرے قدم چشمے کی طرف اٹھ جاتے اور وہ لڑکی اکثر چشمے پر آتی۔
آہستہ آہستہ تکلفات کے پردے اٹھنے لگے۔ حجاب کم ہوتا گیا

ایک دن وہیں سے بیٹھے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا"

"ریشماں" زندگی سے بھرپور باریک آواز گونجی۔ جیسے دریا میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"کہاں رہتی ہو"؟ میرا دوسرا سوال تھا۔

"پہاڑی کے پیچھے" وہی دل کش آواز پھر گونجی۔

"یہاں کیوں آتی ہو"؟ سوال بے تکا سا تھا اس لئے
میرا دل دھڑکنے لگا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری اور پھر چہرہ
سرخ ہو گیا۔ کان کی لویں تک لال ہو گئیں نظریں جھک گئیں اور
وہ چادر کا کونا مروڑنے لگی۔

میں نے سوال دہرایا تو وہ الٹے قدموں بھاگ گئی۔

میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔

دوسرے دن وہ پھر وہاں پر موجود تھی۔ اس دفعہ میں
اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ وہ سہمی سمٹائی کھڑی تھی۔ جوں جوں میں
نزدیک پہونچ رہا تھا اس کا رنگ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے
لمحے میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دم چونک
پڑی اور پھر کسمسا کر میرا ہاتھ شانے پر سے گرا دیا۔ میں آگے بڑھا
اور اس دفعہ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ہاتھ ہٹاؤ" اس نے کہا۔

میں نے کہا "ریشماں ایسی بھی کیا بے مروتی"

ریشماں نے کہا "بابوجی میں ایک دیہاتی لڑکی ضرور ہوں
لیکن اپنے جسم کو ہاتھ لگانے کی اجازت کسی مرد کو نہیں دے
سکتی۔ میرا جسم کوئی غیر مرد نہیں چھو سکتا۔ تم غلط فہمی میں پڑ گئے
تھے بابوجی میں اس محبت کی قائل ہوں جس کے درمیان شرم کا
پردہ رہے۔ میرے کندھے پہ سے ہاتھ ہٹاؤ میں جا رہی ہوں۔ تم نے
میرے جسم کو چھو کر میری بے عزتی کی ہے"

"ریشماں" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"چھوڑ دو مجھے" دفعتاً اس کا چہرہ بدل گیا۔ اس کی آواز
میں بادل کی گرج تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیرنی غصے میں آگئی
ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ چلی گئی۔

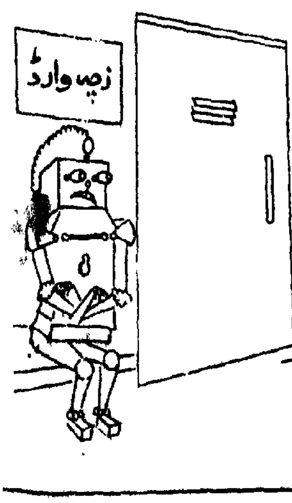
اس کے بعد بارہا میں اس چشمے پر گیا لیکن وہ نہ ملی۔ وہ
شرم و حیا کی پتلی نہ جانے کہاں جا چھپی تھی۔ میں اس سے معافی
بھی نہ مانگ سکا۔ اس کے دل سے اپنے متعلق پیدا ہونے والے
غلط تاثرات کو بھی دور نہ کر سکا۔

دوسرا رُخ

کیفے بٹر فلائی میں میرا آنا جانا تھا۔ شام کو تھکے ہوئے
ذہن سے وہاں چلا جاتا اور رات گئے تک وہاں دوستوں کے
ساتھ گپ شپ ہوتی رہتی۔ ہوٹل کا معیار بہت اونچا تھا، اونچے
طبقے کے لوگ ہی آتے جاتے تھے۔ ان میں مرد بھی ہوتے اور عورتیں
بھی۔ میرے کچھ دوست شراب سے بھی شغل کرتے تھے اور بارہا
مجھے بھی اس کے لئے مجبور کر چکے تھے لیکن میں نے شراب کو ہاتھ
نہ لگایا تھا۔ بس ایک ضد سی تھی شراب کے ساتھ۔ میں چائے
یا کافی پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ میرے دوستوں میں سے کئی دوست
عورتوں سے بھی مراسم قائم کئے ہوئے تھے۔ ان گرل فرینڈ کی
موجودگی میں تو ان کی شراب نوشی انتہا کو پہونچ جاتی۔ شاید وہ
صنف مخالف پر اپنے "پلکڑ" ہونے کی دھاک بٹھانا چاہتے تھے

نازو سے میری ملاقات یہیں ہوئی۔ وہ بھی اتفاقاً۔
وہ شاید اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ہماری میز پر آگئی تھی۔ اس کی
وہ سہیلی خالد کی گرل فرینڈ تھی۔ اس کی سہیلی تو خالد سے
بات چیت کرنے لگی اور نازو میری طرف متوجہ ہو گئی۔ ہم باتیں
کرتے رہے اس کے بعد ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں — نازو
دانستہ یا نادانستہ طور پہ میری طرف جھکتی چلی گئی لیکن اس کے
باوجود میں یہ کہنے میں قطعاً عار نہ محسوس کروں گا کہ میں نے اس سے

کالا مینشل بند ہونے سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اس کی کمی کو نہ چھو سکی۔
ایک روز میں میز پر تنہا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا کہ نازو نازو نمانے آئی اور بولی۔
"تو ساجد آج اکیلے ہو؟"
"جی نازو۔ بس یونہی" میں نے کہا "آؤ بیٹھو"
"کہیے کیسے مزاج ہیں" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"اللہ کا شکر ہے"
"کمال ہے آپ تنہا ہو کر بھی وقت گزار لیتے ہیں۔ ایسے مجمعے میں جیسے کوئی بات ہی نہیں"
"اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، میں ویسے بھی تنہائی پسند ہوں۔ صرف ہنگاموں پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔ ہنگاموں میں شامل نہیں ہونا چاہتا"
"عجیب بات ہے" اس نے کہا۔
"آپ سنائیے" میں نے بات جاری رکھنے کے لئے کہا۔ "کہیے کیا پئیں گی، کافی یا چائے"!
نازو نے کہا "مسٹر ساجد چائے اور کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔ اور پھر اس ماحول میں جہاں چاروں طرف رنگینی ہو۔ موسیقی ہو"؟
"تو پھر" میں نے حیرت سے پوچھا۔
اس نے کہا "اور مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ ایسے لونچے ہوٹل میں صرف چائے پر اکتفا کرتے ہیں"
"آپ کیا پیجئے گا محترمہ" میں نے مسکرا کر پوچھا۔
"شیری۔ شیمپین۔ ووڈکا۔ رم۔ بیئر۔ وسکی، کچھ بھی سہی" اس نے شراب کی دوکان پر کام کرنے والے سیلزمین کی طرح سارے نام سنا دیے۔
میں نے پوچھا "وسکی چلے گی"؟
"ضرور چلے گی" اس نے کہا۔
"خالص یا سوڈے کے ساتھ" میں نے وضاحت چاہی۔
"سوڈا بھی" اس نے کہا۔
میں نے آرڈر دیا۔ اس نے وسکی کی چسکیاں لیں اور چند لمحے بعد وسکی اس کی آنکھوں میں پہنچ گئی۔ ایک تو ویسے ہی بڑی بڑی آنکھیں، پھر اس پر وسکی کا نشہ۔ دو آتشہ والی بات تھی۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں اور کہا۔
"تم بھی پیا کرو، ڈیر ساجد"
"مجھے تو نشے میں تو پینے والوں کو دیکھ کر ہی جھوم اٹھتا ہوں" میں نے معذرت چاہی۔
"جب پی نہیں سکتے تو اتنی اونچی سوسائٹی کیوں move کرتے ہو" اس نے لپک کر پوچھا۔
"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اس سوسائٹی پر تمہاری اجارہ داری ہے تو بلا خوف و خطر مجھے اس سوسائٹی سے نکال دو"
اِدھر نازو نشے میں ڈوبی اُدھر موسیقی کا ریکارڈ بجنے لگا۔ فقاف جوڑے آہستہ آہستہ پھسل کر ڈانس فلور پر پہنچنے لگے۔ نازو کا دل بھی مچل گیا۔ اس نے خمار آلود نظریں اٹھائیں اور کہا۔
"چلو ہم بھی ناچیں گے"
"کیا اس کے بغیر لطف ادھورا رہ جائے گا"
"ساجد تم سمجھتے کیوں نہیں۔ جب تم زندگی کے اس رخ سے محظوظ ہونا چاہتے ہو، لطف اندوز ہونا چاہتے ہو، تو پھر یہ تکلف کیسا؟"
"خیر جیسی تمہاری مرضی" میں اٹھ کھڑا ہوا۔
میں نے اس کی کمر میں ایک ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ناچتے ہوئے جوڑوں میں شامل ہو گیا۔
نازو نشے میں ضرور تھی لیکن اس کے قدم صحیح پڑ رہے تھے۔ اسے ڈانس میں کمال حاصل تھا۔ کوئی قدم بھی غلط نہ پڑا تھا۔ میں نے ازراہِ تعریف کہا۔
"تم بہت اچھا ناچ لیتی ہو"
"اور نچانے والے کے متعلق کیا خیال ہے"؟
"اس کے بارے میں لاعلم ہوں۔ جب یہ بات میرے علم میں آئے گی تو رائے دیدوں گا"
"بڑے خشک قسم کے آدمی ہو"
"خشک نہیں بلکہ انتہائی خشک" میں خشک پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ صرف میری طرف گھور کر رہ گئی۔
چند لمحوں بعد نازو کا تنفس بدل گیا، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی، آنکھوں میں پڑے ہوئے ڈورے پھیل گئے۔ نشے میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "ساجد"
"ہوں" میں نے کہا۔
"میں چاہتی ہوں تم گستاخیاں کرو۔ جارحانہ اور ظالمانہ گستاخیاں" اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔
"کیا یہ بھی ناچ کا جزو ہے" میں نے پوچھا۔
"تم کس قدر خشک ہو" اس نے طنز کا تیر چلایا۔ "تم آخر مجھے کیوں نہیں"!
میں نے کہا "نازو میں سب سمجھتا ہوں لیکن افسوس کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ میں جذبات کے دھارے میں بہنے کا قائل نہیں ہوں، کیونکہ اگر میں تمہاری باتیں مانتا چلا گیا تو جب تمہارا نشہ اترے گا اس وقت تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے گا"
"تم کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ "زندگی میں مسرت کے لمحات بہت کم آتے ہیں اور تم انہیں بھی ضائع کر دینا چاہتے ہو"؟
میں نے کہا "ان مواقع سے آپ ہی فائدہ اٹھائیے"
وہ بہت مچلی، تڑپی۔ جھلائی پھر ایک بربط کی شکل اختیار کر گئی وہ نغمے اٹھنے کے لئے صرف میری انگلیوں کی طلبگار تھی۔ لیکن میں ان تاروں کو نہ چھیڑ سکا۔ جب اس کے جذبات میں بہت زیادہ ہلچل مچی، تو میں نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر آ گیا۔ میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ لیکن ندامت کے احساس کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ نازو نے مجھے عورت کا ایک ایسا رُخ دکھایا تھا کہ اس رُخ کو میں اپنے ذہن سے جلد از جلد محو کر دینا چاہتا تھا۔ میں بھول جانا چاہتا تھا نازو کو۔ اس کی تڑپ کو۔ اس کی جھلاہٹ کو۔ اس کی نشیلی آنکھوں کو۔ کیونکہ —— مجھے ڈر ہے کہ مجھے عورت سے نفرت ہو جائے گی۔
اس کے بعد میں کبھی کیفے ملفر فلائی میں نہ گیا۔



واقعات نقاد ملز

کتوں کے ذریعہ سراغرسانی



ع۔ع جامی

ابتداء میں صرف چند یورپین ممالک میں کتوں کے ذریعہ سراغ رسانی کا کام لینے کا تجربہ کیا گیا۔ نتیجہ توقع سے زیادہ حوصلہ افزا رہا۔ اب تو دنیا کے اکثر و بیشتر ملکوں میں کتوں کے ذریعہ جاسوسی کا کام لیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں مدراس کے محکمہ پولیس نے جاسوس کتوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اس دستہ میں ۹ تربیت یافتہ جاسوس کتے تھے۔ اس وقت تقریباً ہر صوبے میں پولیس ڈپارٹمنٹ کے تحت کتوں کو سراغ رسانی کی تربیت دی جاتی ہے اور ہر صوبے کے محکمہ پولیس کے پاس جاسوس کتوں کے مختلف اسکواڈرن موجود ہیں۔

موقع واردات پر جب مجرم چالاکی سے ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑتا جس کی بنا پر اس کا صحیح پتہ لگایا جا سکے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی انگلیوں کے نشان بھی مٹا کر فرار ہو جاتا ہے اور عقل انسانی مجرم کا صحیح پتہ لگانے میں ناکام نظر آنے لگتی ہے تو یہ تربیت یافتہ جاسوس کتے مجرم کی جسمانی مہک کو سونگھ کر جو موقع واردات کی فضا میں لہراتی رہتی ہے۔ مجرم کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر کتے اپنے مالک کے بہت وفادار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مالک کی خوشی حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ صرف اسی ایک خصوصیت کی بنا پر کتوں کو جاسوسی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ کوشش کی جائے تو دیسی کتے بھی کچھ باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ــــ

ہندوستان کی آب و ہوا اور یہاں کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جاسوسی کے لئے السیشین، برڈور، رٹری دریا بکر اور ڈوبرمین ذات کے کتے زیادہ سودمند تصور کئے جاتے ہیں۔

ڈوبرمن گٹھے ہوئے، چکنے اور چمکیلے جسم والا، چست و چالاک قسم کا کتا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ۱۸ ویں صدی میں جرمنی کے ایک شخص، مسٹر ڈوبرمین نے کتوں کی چار مختلف قسموں کے میل اور اختلاط سے خاص طور پر فوج اور پولیس کے کام آنے کے لئے ہی اس نسل کی افزائش کی تھی۔

صبر، ہوشیاری، فرمانبرداری، اپنے مالک کے حکم کی بجا آوری کی چستی اور تندہی کا جذبہ ڈوبرمین میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

عام طور پر چھ ماہ کے پلوں کو ٹریننگ کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ نر پلوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ انتخاب سے پہلے ہر پلے کی جسمانی بناوٹ، صحت، عادات، اہلیت، کمیت اور رنگ کو دھیان میں رکھتے ہوئے خوب جانچ کرلی جاتی ہے۔



سراغرساں کتے کو ٹریننگ دی جا رہی ہے

صرف کتوں پر ہی نہیں بلکہ تربیت دینے والے کی ذاتی اہلیت اور قابلیت پر بھی کامیابی منحصر ہوتی ہے۔

کتوں کی کارکردگی کی کل مدت چھ ماہ سے آٹھ سال تک ہوتی ہے۔

معمولی حالات میں کتے کو تربیت دینے والا جب تک ٹریننگ مکمل نہ ہو جائے بدلا نہیں جاتا۔ ان کتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور انکو کارآمد بنانے کا انحصار تربیت دینے والے پر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ تربیت



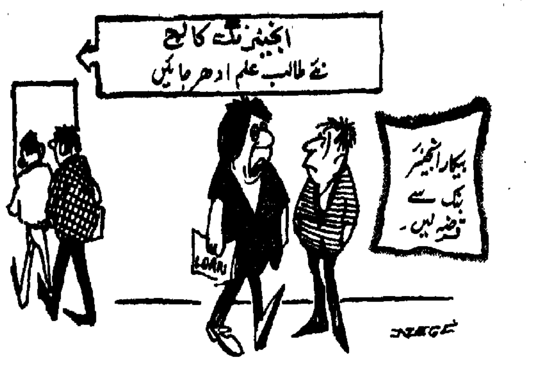
۔۔۔ وہ اپنی تمام خوبیاں، خود صحت مند اور ذہین ہو اور اس کے دل میں کتوں کے لئے سچا پیار ہو تاکہ وہ آسانی سے کتوں کو اپنے سے مانوس کر سکے۔

سراغ رسانی کا کام شروع کرنے سے پہلے کسی کتے کو ۔۔۔ او کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اسی عرصہ میں پٹے اور بغیر پٹے کے ساتھ ساتھ چلنا، حکم دینے پر بھونکنا، بیٹھنا، کھڑے ہونا، جھکنا، پاس آنا، واپس جانا اور اپنی جگہ پر ٹھہرنا وغیرہ دی باتوں کے علاوہ پیچھا کرنا، چھپی ہوئی چیز دل یا مجرموں کی لاش، کسی آدمی یا سامان کی رکھوالی کرنا، مطلوبہ شخص کو پہچان لینا، اپنے مالک کی حفاظت اور مرحلہ سر کرنے کے وقت راستے کی رکاوٹوں کو ہمت اور جرأت سے دور کرنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں کتے کو رفتہ رفتہ نہایت نرمی سے سکھائی جاتی ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ تربیت دینے والے کی کسی حرکت یا برتاؤ سے کتے کے دل میں ڈر یا بغاوت کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں۔

اگر کسی بھولے بھالے دیہاتی کو بمبئی یا کلکتہ جیسے شہر میں رکھ کر اگر دیا جائے تو وہ فطری طور پر وہاں کی بھیڑ، سواریوں ۔۔۔ آمد و رفت اور ہجوم کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائے گا۔ جاسوس کتوں کے ساتھ بھی کہیں ایسی ہی صورت پیش نہ آئے ۔۔۔ انہیں کبھی کبھی بھیڑ اور ہجوم سے بھری اور سواریوں کی آمد و رفت سے پر سڑکوں پر ٹہلایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے عادی ہو جائیں اور وقت پڑنے پر اپنے حواس نہ کھو بیٹھیں۔

کتے کی لاپروائی اور سستی کو کسی طرح کی ڈھیل نہیں دینی چاہیئے۔ حکم ہمیشہ ایک انداز اور بلند آواز میں دینا چاہیئے۔ آواز بدل کر مختلف طریقے سے حکم دینے سے کتا غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اپنی حیوانی فطرت کے سبب بگڑ سکتا ہے۔

اگر کبھی کسی غیر معمولی وجہ سے کسی کتے کا تربیت دینے والا تبدیل کیا جاتا ہے تو نیا تربیت دینے والا ۱۵ یا ۲۰ دن تک کتے کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے کی عادات سے واقف ہو جائیں۔ اچھی تربیت اور مشق سے کتے میں خود اتنا اعتماد اور بھروسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خطرناک حالات میں یہاں تک کہ بندوق کی گولیاں چلنے پر بھی اپنی ڈیوٹی پر بہادری اور جرأت سے ڈٹے رہتے ہیں اور اپنے کام کو کبھی ادھورا یا نامکمل نہیں ۔۔۔



میں نے پہلے سال میں داخلہ لیتے ہی قرضے کیلئے درخواست دیدی ہے تاکہ پاس ہو جاؤں تو قرضہ مل جائے

چھوڑتے۔

ایسے کتے کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنے مالک کا حکم مانے اور اس کے ہاتھ سے دیا ہوا کھانا کھائے۔ کسی اجنبی کا نہ حکم نہ مانے بلکہ حکم عدولی کرے اور کسی غیر شخص کی دی ہوئی کوئی چیز نہ کھائے۔

اگر کوئی کتا حکم عدولی کرتا ہے تو اسے جسمانی تکلیف نہیں دی جاتی اور نہ اسے زدکوب کیا جاتا ہے۔ اس طرح کتے کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ تربیت دینے والا صرف اپنے آواز کے اتار چڑھاؤ سے اپنی ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ غلطی سرزد ہونے کے کچھ دیر بعد اگر کتے کو ڈانٹا جائے تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آئے گا کہ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ جس وقت کتا غلطی کرے اسے اسی وقت ڈانٹنا چاہیئے۔ حکم کی پوری پوری تعمیل کے بعد کتے کی پیٹھ یا سینا تھپتھپا کر اسے ضرور شاباشی دینی چاہیئے۔ رفتہ رفتہ کتا اس قدر ٹرینڈ ہو جائے گا کہ بغیر بولے ہوئے صرف اشارہ یا سیٹی کی آواز پر ہی کام کرنے لگے گا۔

جاسوسی کے کام کے لئے ایک تربیت یافتہ کتا آسانی کیساتھ اپنے مالک کی مدد سے چودہ فٹ اونچی دیوار پر چڑھ سکتا ہے سترہ فٹ لمبی کھائی یا نالا پھاند سکتا ہے۔ ساڑھے چار فٹ تک کی رکاوٹ کو چھلانگ لگا کر پار کر سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ایک منزل اونچے مکان سے نیچے کود سکتا ہے۔

ٹریننگ کے بعد ان جاسوس کتوں کے کھانے پینے اور صحت کا پورا خیال کیا جاتا ہے۔ ہر کتے کی میڈیکل رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔

ہر روز صبح کے وقت اور باہر سے لوٹنے کے بعد کتے کی آنکھ، ناک، کان، اور پیر صاف کئے جاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن دانت اور کام ختم ہونے پر ہر شام اُن کا جسم برش سے صاف کیا جاتا ہے۔ ایسے کتوں کو مہینے میں صرف ایک دو بار نہلایا جاتا ہے۔ روزانہ نہلانے سے اُن کے جسم کا چمڑا کٹ جاتا ہے اور بیماری میں مبتلا ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ایک جاسوس کتے کے کھانے پر روزانہ ۵ روپے سے کم خرچ نہیں ہوتا۔ کھانا وقت مقررہ پر ہی دیا جاتا ہے۔ نہ پہلے اور نہ بعد میں۔ اس سے کتے میں وقت سے کھانا کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور دوسروں سے پھر وہ کوئی چیز نہیں کھاتا۔

مجرم کی تلاشی یا کسی کا پیچھا کرنے کے لئے باہر جانے سے پہلے کتے کو قلیل مقدار میں ضرور کچھ کھلا پلا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی بھوک اور پیاس پر قابو رکھے۔ گرمی کے زمانے میں تربیت دینے والے اپنے ساتھ گلوکوز کا پانی رکھتے ہیں اور جب کتا دوڑ بھاگ نے کے بعد ہانپنے لگتا ہے تو وہی پانی پلا کر اُسے تر و تازہ رکھا جاتا ہے۔

درحقیقت ایسے کتوں کو تربیت دینے والا ہی اُن کا سب کچھ ہوتا ہے۔ مالک۔ استاد۔ دوست۔

واقعات ہند دہلی



ریس کا
چال چلاؤ

جے سنجیوا ریڈی کے استعفےٰ اور تارا کیشوری سنہا کی تنقید نے نیم جاں کر دیا

ڈت نہرو نے ایک بار کہا تھا "تاریخ ان شہزادوں
ں اور مہارانیوں کی کہانی ہے جنہوں نے الگ تھلگ زندگی
خاص فضا میں محصور رہے"
ہرو جی کے یہ جملے جن میں مختلف ادوار کی مشترکہ دھڑکنیں
ہی ہیں آج سنڈی کیٹ کانگریس کے لیڈروں پر اتنے
آتے ہیں کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کے لئے کہے گئے
جب اخباروں میں سنڈی کیٹ کانگریس کے بمبئی میں
ہونے والے اجلاس کی خبریں نظر سے گزریں تو میں

نے سوچا کہ گزشتہ چناؤ میں کمر ٹوٹنے کے اسباب پر غور، زمانے
کی بدلتی قدروں کو مدنظر رکھ کر پارٹی پروگرام میں تبدیلی،
ملکی حالات کا جائزہ لے کر جنہوں نے الیکشن کے بعد نیا روپ
دھارن کیا ہے، سنڈی کیٹی چودھری اندھیری (بمبئی) کے
ودھیا بھون کی چھتوں کے نیچے مل بیٹھ کر کچھ نئے فیصلے کرینگے۔
مگر جب اجلاس میں زیر بحث آنے والی تجویزوں، اور اٹھائے
ہوئے سوالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ان جنادری بینڈ لو
اور راج سنگھاسن کے چاہنے والوں کی ذہنی حالت ہنوز ویسی

ہی ہے جیسے لکھنؤ اجلاس سے قبل یا الیکشن میں حصہ لیتے
وقت تھی۔ البتہ اس تجویز کا خیر مقدم کیا جائے گا جو انہوں نے
کسی محاذ میں شامل نہ ہونے کے متعلق پاس کی تھی۔
اجلاس میں پاس ہونے والی یہی ایک تجویز ایسی تھی جسے حالات
کے مطالعے کا لازمی نتیجہ اور عوامی شعور کے بدلتے دھاروں کا
اولین تقاضہ کہا جا سکتا ہے۔
باقی دو تجویزیں جو مخالفین اور موافقین کے شور و ہنگامے
کے بیچ پاس ہوئی تھیں ان میں اس کے علاوہ اور کوئی خاص






لیا۔ اتو لیہ گھوش — سینے میں چبھنے والے | بہتر یہ ہے کہ انہیں باہر نکال پھینکا جائے | اور حالات کا سختی سے مقابلہ کیا جائے | تاکہ پھر سے دو دلے نصیب ہو سکیں

بات نہیں تھی کہ شریمتی اندرا گاندھی کو تمام مصیبتوں کی جڑ، موجودہ تکالیف اور دشواریوں کی ذمے دار، نیز لپکتے ہوئے داخلی اور خارجی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہنے والی شخصیت کے خطابات سے نوازا گیا۔

گزشتہ سال دسمبر کے ابتدائی ہفتے میں اتر پردیش کی راجدھانی میں سنڈی کیٹی راج بہادروں کا اجلاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں بحث و مباحثہ سننے اور لیڈروں کی تقاریر کے لئے مقتنی بھی میٹنگیں ہوئیں ان میں عوام سے زیادہ پولیس والے تھے۔ وجہ ظاہر ہے کہ سنڈیکیٹی لوگ اندرا جی کی مخالفت میں اتنے منہ پھٹ اور گستاخ ہو گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا انہیں عوام کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر سی۔ بی گپتا نے جو مجوزہ اجلاس کے کرتا دھرتا تھے عوام کے تیور دیکھ کر اپنے اور عوام کے درمیان پولیس کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اس کے باوجود امین الدولہ پارک میں تقریر کرتے ہوئے جب مسٹر مرارجی نے حسب عادت اندرا جی پر کیچڑ اچھالا تو اتنا ہنگامہ ہوا، اتنے نعرے کسے گئے کہ انہیں اپنا لہجہ قابو میں رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

دراصل یہ سنڈی کیٹی لیڈروں کی غلطی نہیں تھی انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ماضی میں اقتدار میں شریک ہونے کی حیثیت سے عوام ان کی ہر بات کو سو فیصد صحیح سمجھ لیں گے اس لئے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لئے وہ ہر اس اقدام پر آمادہ تھے جو انہیں منزل مقصود سے ایک انچ بھی قریب کر دیتا ہو۔ اسلئے جب صدارتی انتخاب میں انکے نمائندے نیلم سنجیوا ریڈی کو شکست ہوئی تو انتقام لینے کی غرض سے مسز اندرا گاندھی کو ذلیل کرنے کی مہم شروع کی۔

یہی وجہ تھی کہ جب شیو نرائن اور نول کشور جیسے لوگوں نے دونوں کانگریس میں مفاہمت کا رزولیوشن پیش کیا تو پورا ہائی کمان ان پر برس پڑا۔ پھر اسی ہائی کمان نے نجلنگپا جی کو پورا اختیار دیا کہ اندرا سرکار کو مٹی میں ملانے کے لئے کسی بھی پارٹی سے گٹھ جوڑ کریں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مرارجی ڈیسائی سے لے کر ہائی کمان اور سنڈی کیٹ کے ہر ممبر نے سنڈی کیٹ کانگریس کو ایک مضبوط فعال تحریک اور سیکولر عوام کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی مگر مرارجی ڈیسائی نے جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی سے سانٹھ گانٹھ کا مشورہ دے کر غیر شعوری طور پر اس امر کا اعتراف کر لیا کہ بغیر فرقہ پرست اور رجعت پسند (PRE - LOCKED) جماعتوں کے تعاون کے اقتدار حاصل نہیں کر سکتے ——— اسی شہر لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۵ء میں کانگریس کے دو اجلاس ہوئے تھے، اس وقت بھی کانگریس میں دو گروپ تھے جس کے لیڈر تحریک آزادی کو اپنے پروگرام کے مطابق ترتیب دینا چاہتے تھے، مگر ان اجلاس کے اختتام پر نہ صرف ان میں مفاہمت ہو گئی بلکہ آپسی تنازعات کو ختم کر کے جنگ آزادی میں ایک دوسرے کے ساتھ شامل بھی ہو گئے۔ غالباً لکھنؤ کی اسی خوبی سے متاثر ہو کر شیو نرائن اور ان کے دوستوں نے دوستی کی بات منہ سے نکالی تھی مگر...

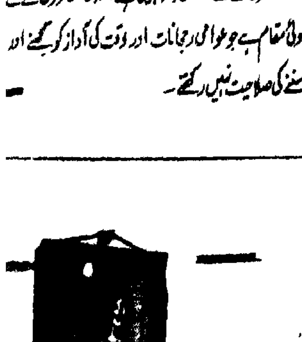
چنانچہ اسی تاریخ ساز غلطی کا نتیجہ تھا کہ اس وقت جتنا فاصلہ سنڈی کیٹ کانگریس کے لیڈروں اور عوامی امنگوں میں تھا کم و بیش اتنا ہی فاصلہ بمبئی اجلاس کے بعد عوام میں اور ان میں رہ گیا ہے۔

اگرچہ ان لوگوں نے آپسی تعلقات اور بدگمانیوں کو ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر لیڈروں کی روایتی تنگ نظری اور سیاسی غیر دانشمندی کی وجہ سے ناکام رہے البتہ اپنے بے زبان مگر وفادار سکریٹری مسٹر صادق علی کو صدر نامزد کر کے پھوٹ کو کم کرنے کی کوشش کی، مگر اسی اجلاس کے ایک ہفتے بعد پرانے سنڈی کیٹی سنجیوا ریڈی نے ہائی کمان اور اس کی ممبر شپ سے اپنا استعفیٰ روانہ کر کے پارٹی لیڈروں کے فیصلے کو جس طرح ٹھکرایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ رہے ہیں۔

سنجیوا ریڈی نے اپنے استعفیٰ نامے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ سنڈی کیٹی ہائی کمان کے فیصلوں کو نہ صرف غلط اور فرسودہ تصور کرتے ہیں بلکہ اس پالیسی کو بھی ناپسند کرتے ہیں جو اس اجلاس میں معاشی اور سیاسی قرارداد کے متعلق پاس ہوئی تھی۔ اگرچہ اس استعفیٰ کو مسٹر صادق علی نے "سنجیوا پر دباؤ کا نتیجہ" کہا تھا مگر اخباری نمائندوں کے پوچھنے پر بھی دباؤ ڈالنے والوں کا نام نہیں بتلایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنڈی کیٹی چودھریوں میں نہ صرف صحت مند سیاسی شعور کا فقدان ہے بلکہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں سے بھی ناواقف ہیں۔ دراصل اسی ذہنیت نے ان کی حالت ریگستان کے اس ناتجربہ کار مسافر کی طرح بنا دی ہے جو راستہ بھٹک کر سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ اس اجلاس کے دو روز قبل پیش آیا۔ آٹھ دن کے مکمل آرام کے بعد اندرا جی کی بے رحم نقاد شریمتی تارکیشوری سنہا نے ایک خط تمام اخبارات میں شائع کرایا جس میں سنڈیکیٹی بہادروں کی تنگ نظری، کوتاہی اور غلط فیصلوں پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان کی فرسودہ پالیسی اور غلط رہنمائی پر سخت تنقید کی تھی۔ اس تنقید کا مطلب بھی یہی تھا کہ اجلاس یا پالیسی وضع کرتے وقت ان حقائق کو سامنے رکھا جائے جن کی کوکھ سے حالات کو اتھل پتھل کرنے والے واقعات نے جنم لیا ہے۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے مسز سنہا کے بیانات کو نہ صرف حیرت اور تعجب کا باعث قرار دے کر اپنے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا بلکہ پاس ہونے والی تجویزوں کے ذریعے ثابت بھی کیا کہ ان میں وہ تدبر، فہم اور اونچ نیچ کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے جو اتحاد باہمی (CO-ORDINATION) کو قائم رکھنے اور ملک کے پیش آمدہ مسائل (RISING PROBLEMS) کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

سنجیوا ریڈی کا استعفیٰ اور شریمتی تارکیشوری سنہا کی تنقید یہ بدلتے رجحانات کو نظر انداز کرنے یا ان پر پردہ ڈالنے کی بجائے سنڈی کیٹی لیڈروں اور ہائی کمان کے معزز ممبروں کو چاہیے کہ وہ غور کریں کیونکہ وقت گزشتہ واقعات کے نتائج کی ایک تاریخ مرتب کر رہا ہے جہاں بدلتی قدروں کو تانگے کی دیوار کے اندر بند کرنے والوں کے لئے مطلق جگہ نہیں ہے، نہ ہی ان لوگوں کے لئے کوئی مقام ہے جو عوامی رجحانات اور وقت کی آواز کو سمجھنے اور سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔



ہٹلر کا نائب

ہیس



گزشتہ دس مئی کو ہیس نے اپنی قید کے تیس برس
ے کرلئے۔ وہ پوتھا جرمن لیڈر ہے جو قید تنہائی بھگت
ہے۔اس وقت اس کی عمر ۷۷ برس ہے۔ کسی زمانے
وہ ہٹلر کا نائب تھا اور جرمنی میں اس کا طوطی بولتا تھا
اس وقت برلن کے ایک فوجی جیل خانے میں جس کی
الی برطانیا، امریکا، فرانس اور روس کی فوجیں کرتی
، اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔

جون ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا اور دوسری جنگ عظیم کو
شروع ہوئے پورے دو برس گزر چکے تھے کہ ہیس اچانک
پراشوٹ کے ذریعے اسکاٹ لینڈ میں جا اترا۔ وہ برطانیا
اور جرمنی میں صلح کرانے کے لئے گیا تھا تاکہ دونوں ملکر
روس پر حملہ کرسکیں لیکن برطانوی حکومت نے ہیس کو نا
، ایک دیہی حویلی مثیٹ پیلیس میں قید کردیا۔ اس حویلی
دیکھ کر اسے سیونک میں اپنا گھر یاد آتا تھا۔

برطانیا کے فوجیوں نے ہیس کے ذہن پر کڑی توجہ دی
لہ اس کے دماغ کی صفائی میں لگ گئے تاکہ اس سے نازیوں
کے خفیہ راز معلوم کرسکیں۔ برطانوی سراغ رسانوں کو توقع
تھی کہ شہری ہنگاموں سے دور دیہات کی خاموش فضا میں
وہ ہیس سے نازی جرمنی کے خفیہ راز معلوم کرسکیں گے۔

اسکاٹ لینڈ میں اترنے کے بعد ہیس کے چند ابتدائی
ہفتے بڑے ہیجان آمیز گزرے تھے اور اس نے ذہنی قلعے میں
بڑا سکون محسوس کیا تھا۔ مثیٹ پیلیس میں ڈرائنگ اور
میوزک روم کے دروازے ایک خوبصورت پارک کی طرف کھلتے
تھے جس میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ان
ہی پھولوں میں محصور ہیس کچھ لکھا کرتا تھا لیکن وہ پھولوں میں
ہی نہیں بلکہ کانٹے دار تاروں اور پہرے داروں میں بھی محصور
تھا جو سیکڑوں کی تعداد میں محل کے چاروں طرف تعینات تھے
جس کا شاید اسے علم نہ تھا اور وہ غالباً یہ بھی نہ جانتا تھا کہ
اس محل کے چاروں طرف خندقیں بھی کھود دی گئی ہیں تاکہ
نہ تو وہ فرار ہونے کی کوشش کرے اور نہ کوئی اسے قتل کرسکے۔
مثیٹ پیلیس میں اسے ایک سال قید رکھا گیا اور اس کی
زبان سے جو لفظ بھی نکلا وہ ریکارڈ ہوگیا۔ مکان میں ہر
جگہ پوشیدہ طور پر مائکروفون لگا دیے گئے تھے۔ ہیس کے
لئے پہلی منزل پر دو کمرے مخصوص کردیے گئے تھے جن کی
کھڑکیاں گولی پروف تھیں۔

ہیس سے خفیہ باتیں اگلوانے کا چوہے بلی کا کھیل جاری
رہا اور برطانوی سراغرسانوں کی ایک ٹیم کرنل فرینک فولے
کی قیادت میں کام کرتی رہی۔ کرنل فولے مغربی جرمنی میں
پاسپورٹ افسر رہ چکے تھے اور جرمن زبان بڑی روانی
سے بولتے تھے۔ فولے اور کیپٹن ڈگلس پرسیول اسکے دوست
بن گئے تاکہ اس کے راز معلوم کرسکیں۔ ہر رات کو لندن سے
ایک شخص موٹر سائیکل سوار ان سوالات کی ایک فہرست لیکر
آتا جو حکومت دریافت کرنا چاہتی تھی اور ہر صبح وہ پرانے
زمانے کے کم سے کم ۸۰ ریکارڈ لے کر واپس لندن چلا جاتا۔
کہتے ہیں چرچل مسٹر ہیس کے ان ریکارڈوں کو پوری طرح
سنا کرتے تھے۔

لیکن ان میں سے انگریز سراغرسانوں کو کچھ نہ مل سکا
سوائے اس وارننگ کے کہ گوئرنگ نے دنیا کا سب سے زیادہ
مضبوط اور عمدہ فضائی بیڑہ بنا لیا ہے جو برطانیا کو تباہ
کرسکتا ہے اور جرمن یو بوٹیں انگریزوں کو بھوکا ماردیں گی
اور انھیں جرمنی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

آخر میں برطانوی وزیروں نے ہیس سے انٹرویو
لئے۔ پہلے لارڈ سائمن نے ان سے ملاقات کی اور اس کے
بعد لارڈ چانسلر نے سر آئیون کرک پیٹرک بھی ان سے ملے
جو برلن میں برطانوی ڈپلومیٹ رہ چکے تھے اور جو ہیس سے
متعارف تھے۔ بعد میں چرچل نے لارڈ بیور بروک کو اس سے
ملاقات کرنے کے لئے بھیجا۔

ہیس نے تجویز کیا کہ برطانیا کو چاہئے کہ وہ جرمنی کے
ساتھ صلح کرلے اور اس سے ملکر روس پر حملہ کرے جس کی طرف
سے حقیقی خطرہ ہے۔ لارڈ سائمن کے ساتھ ملاقات کے بعد

جو تیس برس سے جیل کاٹ رہا ہے

[illegible] ہوئی تھا اور وہ [illegible] پریشان رہا۔

کیپٹن پرسیول نے اس سے کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا مشن ناکام ہو گیا۔" ہیس نے کوئی جواب دیے بغیر کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا اور بولا:-

"میں سمجھتا ہوں وہ اب مجھے واپس بھیج دیں گے۔"

کیپٹن نے اسے یاد دلایا کہ ہٹلر نے اسے غدار قرار دے دیا ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ اگر وہ واپس گیا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ ہیس پر خاموشی طاری ہو گئی۔

کچھ دن بعد اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

جوالیوں کو رات کے دو بجے اس نے ڈاکٹر ہنری ڈکس کو طلب کیا۔ ایک سارجنٹ نے جو ڈیوٹی پر تھا دروازہ کھولا تاکہ ڈاکٹر ہیس کے کمرے میں جا سکے۔ لیکن جوں ہی ڈاکٹر ہیس کے کمرے میں داخل ہوا ہیس پھرتی کے ساتھ دروازے سے نکل گیا۔ اس وقت وہ جرمن فضائیہ کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہیل ہٹلر کا نعرہ بلند کیا اور مکان کے فرش پر نیچے چھلانگ لگا دی۔

ایک دوسرا سارجنٹ جو زینے پر چڑھ رہا تھا، اس نے اپنا ریوالور نکال لیا اور قریب تھا کہ وہ فرش پر پڑے ہیس پر گولی چلا دے لیکن ڈاکٹر ڈکس چلائے۔

"گولی نہ چلانا۔"

ہیس بچ گیا۔ صرف اس کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا اور چار ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ اس کے بعد سے اس کے کمرے میں ایک فوجی کی ڈیوٹی لگا دی گئی جو دن رات وہاں رہتا تھا۔ اس کے پاجامے کی ڈوری اس سے لے لی گئی اور اسے چھری کانٹے سے کھانے کی اجازت نہیں تھی۔

موسم گرما کے دن آئے تو ہیس کا طرز عمل بدل گیا۔ وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ کئی دن تک اس نے بھوک ہڑتال رکھی۔ کہتا تھا: "میں اس لئے کھانا نہیں کھاتا کہ مجھے زہر دیا جائے گا۔"

برطانوی سراغ رسانوں نے ماہرین نفسیات کی خدمات حاصل کیں اور ان سے کہا کہ وہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا کر [illegible] معلوم کرنے کے لئے نئے طور طریقے اپنائیں۔ ہیس ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔" لیکن وہ یہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

وہ صرف نازی رازوں کو افشا نہ کرنے کے لئے یہ بہانا کر رہا تھا۔

جنگ کے بعد ہیس نے اپنی بیوی کے نام ایک خط میں لکھا "سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مجھے نشہ آور دوائیں دی جاتیں اور نشے کے وقت مجھ سے بہت سے سوالات کے جوابات حاصل کئے جاتے۔ اس طرح مجھے دو خطرات کا سامنا تھا۔ اوّل یہ کہ میں ان رازوں کو افشا کر دیتا جو ایک جرمن کی حیثیت سے مجھے ہر حالت میں راز ہی رکھنے چاہئیں تھے، اور دوئم یہ کہ یادداشت کھو جانے کا جو عذر کیا تھا اس کا بھانڈہ پھوٹ جاتا۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اپنے آپ کو بے ہوش کرنے کے باوجود میں اپنی قوت ارادی سے اپنے ہوش کو قائم رکھ سکا، حالانکہ انھوں نے معمول سے زیادہ نشیلی اشیاء کھلائی تھیں۔

ہر سوال کے جواب میں میں پاگلوں کے انداز میں بول کر یہی کہہ دیتا کہ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔" یہ بڑا عجیب ڈراما تھا جو پوری طرح کامیاب رہا۔ انھیں پکا یقین ہو گیا کہ میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔

بہت دنوں بعد جب میں نے اپنی اس حیلہ گری کی بات ڈاکٹروں کو بتائی تو انھوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا، لیکن جب میں نے تمام سوالات دہرائے اور بتایا کہ میں بالکل ہوش میں تھا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ انھیں اچھی طرح سے بے وقوف بنایا گیا تھا۔"

مشیدے پیلیس میں ایک سال کی پوچھ گچھ کے بعد ہیس کو جون ۱۹۴۲ء میں ویلز کے مینڈف کورٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک رہا۔ یہ پورا دور ہیس کے لئے دہشتناک تنہائی کا دور تھا۔ اسے ہسپتال کے احاطے میں ایک بنگلے میں قید رکھا گیا۔

کچھ عرصے بعد اسے ایک افسر اور دو پہریداروں کی موجودگی میں گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی۔ پھر کبھی کبھی اسے کار میں بھی سیر کرائی جانے لگی۔

اس کی ایک پسندیدہ جگہ "وہائٹ کیسل" تھی۔ یہ چاروں طرف پانی سے بھرپور خندق سے محصور تھا۔ جب موسم صاف ہوتا تو وہ اس خندق میں کسی ٹیلے پر پہونچ جاتا اور وہاں گھنٹوں بیٹھا لکھتا اور تصویر کشی کرتا رہتا۔ ہیس نے اس محل کے نگراں مسٹر جونس سے دوستی کر لی اور ملاقات کے آخری دن اسے اپنا حاصل [illegible] تحفہ دیا۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہ سیر تفریح اچانک بند ہو گئی کیونکہ اس افواہ پر کہ اوٹو اسکورزنی نام کا جو شخص سولینی کو فرار کرا لے گیا تھا وہی ہوائی جہاز کے ذریعے مینڈف کورٹ سے ہیس کو اڑا لے جانے کی کوشش میں ہے۔ لیکن جیسے جیسے اتحادی آگے بڑھتے گئے اور جرمنی کو شکست کا یقین ہوتا گیا ہیس کو نکال لے جانے کے امکانات ختم ہوتے گئے اور جب اتحادیوں کی فتوحات کی خبریں آئیں تو وہ بد دل اور بالکل مایوس ہو گیا۔

۱۹۶۷ء میں جب ہیس کا لڑکا اولف برطانیا پہنچا تاکہ اپنے باپ کے زمانۂ جنگ کی یادداشتوں کو قلمبند کرے تو ڈاکٹر جونس نے اس سے کہا:-

"تمہارے والد ہر روز صبح اخبارات پڑھا کرتے تھے اور افریقی مہم کی ناکامی تک پڑھتے رہے اور اس کے بعد انھوں نے جنگ کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا۔ صرف ان خطوط کو ضرور پڑھتے رہے جو ان کو گھر سے موصول ہوتے تھے۔"

جب ہیس جرمنی سے بھاگ کر آئے تھے تو ان کا لڑکا صرف تین برس کا تھا۔ باپ کی عدم موجودگی ہی میں اس نے پرورش پائی۔

"اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح میرا چھوٹا لڑکا مجھے ڈیڈی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔" ہیس نے کہا "باپ کی نگرانی کے بعد وہ اپنی ذہانت کو خود ترقی دے سکے گا یہ موقع مجھے نہ مل سکا تھا۔"

جب لڑائی کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تو ہیس نے اس اعلان کو دلیرانہ طور پر سنا اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آخر تک ہٹلر کا وفادار رہا۔

۱۹۴۲ء میں روسیوں کو جب معلوم ہوا کہ ہیس اس لئے برطانیا پہنچا تھا تاکہ برطانیا کو جرمنی کے ساتھ مل کر روس پر حملہ کرنے کی ترغیب دے سکے تو اس نے مطالبہ کیا کہ ہیس پر "مجرم ہٹلری گروہ" کے لیڈر کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے۔

۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو آخر "روز حساب" آ پہنچا اور ہیس کو ایک برطانوی ہوائی جہاز میں ایک برطانوی مسلح گارڈ کی نگرانی میں جرمنی بھیج دیا گیا جہاں نورمبرگ میں اس کے خلاف جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا

ماقعات نقد دھلی

بلاوا

ساحر لدھیانوی



دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو!
اٹھو اے مظلوم انسانو!

دھرتی کے ان داتا تم ہو — جگ کے پران ودھاتا تم ہو
دھنیوں کی خوشحالی تم سے — کھیتوں میں ہریالی تم سے
اونچے محل بنائے تم نے — شاہی تخت سجائے تم نے
ہیرے، لعل نکالے تم نے — نیزے بھالے ڈھالے تم نے
ہر بگیا کے مالی تم ہو — اس سنسار کے والی تم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنا لو — آگے بڑھو، ہتھیار سنبھالو

اٹھو اے مظلوم انسانو!
جاگو اے مزدور کسانو!

ﺫھرتی کانپ رہی ہے
چرے ڈھانپ رہی ہے
ی جوالا پھوٹ پڑی ہے
ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے
رہے ہیں کال کے گھیرے
اپنے سرخ پھریرے
ک جنتا کے سینک
کے ناشک، ستیہ کے رکھشک
کے عادی ظلم کے پالے
لٹیاؤں کے اُجالے
وکے گی تم کو شاہی
بہادر سرخ سپاہی

جاگو اے مزدور کسانو!
اٹھو اے مظلوم انسانو!
دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے رُ

اخبارات نے مشرقی بنگال میں ہونے والے ظلم کی مذمت کی

اردو اخبارات و صحافیوں کا سیمینار

اردو ایڈیٹروں نے حالات حاضرہ کا جائزہ لیا

(واقعات کے نمائندہ خصوصی کے قلم سے)

مشرقی بنگال سے پناہ گزیں اگر اسی طرح آتے رہے جیسا کہ اب تک آتے رہے ہیں تو برصغیر ہندو پاک کے امن کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ متفقہ رائے جس کا اظہار ہندوستان کے اردو ایڈیٹروں کے سیمینار (مجلس مذاکرہ) میں کیا گیا۔

یہ سیمینار اس لئے طلب کیا گیا تھا تاکہ بنگلادیش سے متعلق پیدا شدہ مسائل کی روشنی میں تازہ حالات کا جائزہ لیا جائے اور ان شکوک و شبہات کو دور کیا جائے جو اردو پریس کے بارے میں بعض حلقوں میں نظر آتے ہیں۔

آل انڈیا اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرز فیڈریشن اور پریس ایشیا انٹرنیشنل قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اسّی سے زیادہ اردو ایڈیٹروں اور صحافیوں کو ایک جگہ جمع کر کے وقت کے اہم ترین مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ سیمینار کے انعقاد کے سلسلے میں کنوینر صاحب کو حکومت ہند کے پریس انفارمیشن بیورو کا بھی پورا تعاون حاصل رہا اور خود پرنسپل انفارمیشن بیورو جناب ... صاحب بہ نفس نفیس سیمینار کی بحثوں میں شریک رہے اور انھوں نے حالات حاضرہ پر اردو ایڈیٹروں کے خیالات کو ... کے ساتھ سنا اور اردو اخبارات کی جو مشکلات زیر بحث آئیں ان سے بھی وہ واقف ہوئے۔

سیمینار جو گیان بھون کے ایک کمیٹی روم میں منعقد ہوا ... روز ۲۵ - ۲۶ - اور ۲۷ جون تک چلا۔ افتتاحی اجلاس ... مشرقی بنگال کے مشہور ادیب پروفیسر نہار رنجن رائے ... مقررین میں حیات اللہ صاحب انصاری (قومی آواز لکھنؤ) جناب تابش (پاسبان بنگلور) اور مسز نندنی ست پتی (وزیر اطلاعات) شامل تھیں۔

اردو ایڈیٹروں کو مسٹر حیات اللہ انصاری نے جو نصیحتیں فرمائیں ان میں سے بیشتر ایسی تھیں جن پر اردو اخبارات پہلے ہی سے عمل پیرا ہیں، لیکن ان کے ان الفاظ پر سب کو حیرانی ہوئی کہ "اردو جرنلسٹ کچھ بہک گئے ہیں"۔ علاوہ ازیں انھوں نے حالات کی ایک ڈراؤنی شکل پیش کر کے جس طرح اردو جرنلسٹوں کو ایک خاص پالیسی پر چلنے کی تلقین فرمائی وہ بھی حاضرین کو ایک عجیب اور غیر جمہوری بات نظر آئی۔ اس لئے کہ اردو جرنلسٹ اگر بنگلادیش کی آزادی کی حمایت اور پاکستانی فوج کے ہاتھوں عوام کے قتل عام کی مذمت کر رہے ہیں تو کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستانی فوج کے مظالم شرمناک اور قابل مذمت ہیں۔

وزیر اطلاعات مسز نندنی ست پتی نے افتتاحی اجلاس میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا عمومی طور پر خیر مقدم کیا گیا اور ان کے الفاظ کی عمومی طور سے تائید کی گئی کہ اس نازک موقع پر جبکہ پوری قوم ایک سنگین بحران سے گزر رہی ہے حکومت کو "مکمل قومی پشت پناہی" کی ضرورت ہے۔ بے احتیاط تحریروں کا نام لے کر انھوں نے جو یہ بات کہی کہ "حکومت کو بعض ناخوشگوار اقدامات کے لئے مجبور نہ کیا جائے" اسے عمومی طور پر ایک دھمکی سے تعبیر کیا گیا۔

اس قسم کے الفاظ وزیر اطلاعات نہ کہتیں تو اچھا تھا کیونکہ ... لئے کھیا گیا اور پر ذکر آیا، اس سیمینار کو طلب کرنے کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ اردو اخبارات کے بارے میں بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں انھیں دور کیا جا سکے۔ جب اردو اخبارات خود ہی ضبط سے کام لے رہے ہوں اور مشرقی بنگال میں انسانیت کے قتل عام پر ان کے جذبات دوسروں سے بھی زیادہ شدید ہوں تو ناخوشگوار اقدامات کے الفاظ سے ان کی گوشمالی کرنا ایک بے معنی بات ہے۔



پاسبان (بنگلور) کے جناب کے، ایم عظیم تابش نے یہ کہہ کر حقیقت میں اردو پریس کی ترجمانی کی کہ اردو اخبارات قومی دھارے میں برابر کے شریک ہیں اور اس وقت بنگلادیش میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر انکی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان سے کسی قسم کا مطالبہ کرنا حب الوطنی اور قوم پرستی پر عدم اعتماد کا اظہار کرنا ہے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی (ایڈیٹر واقعات) اور دوسرے متعدد ایڈیٹروں نے بھی مشرقی بنگال میں عوامی مظالم کی مذمت کی اور صاف کہا کہ جنرل یحییٰ خاں کی فوجی حکومت نے اسلام

ڈر یا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانیت کے ناطے کر

کی تاریخ پر ایک بدنما داغ لگایا ہے۔ اور یہ کہ مشرقی بنگال میں جو بہیمانہ مظالم ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں وہ دنیائے انسانیت پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔"

ایسے ہی خیالات کی روشنی میں سیمینار کے اختتام پر جاری شدہ



متفقہ اظہار رائے سے متعلق بیان میں اس "شرارت آمیز" پروپیگنڈہ کی مذمت کی گئی جو بعض مفاد پرستوں کی طرف سے ہندوستان اور دوسرے مقامات پر اُردو پریس کے خلاف جاری ہے۔"

تاہم اُردو پریس کے بارے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے ایسے اخبارات کی خواہ وہ اُردو کے ہوں یا دوسری زبان کے مذمت کی گئی جو قومی امنگوں کی عکاسی کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"

اس سے بھی آگے بڑھ کر پاکستان کی "جنگجویانہ پالیسی" کو اس کے لئے خطرہ قرار دیتے ہوئے حکومت سے کہا گیا "اب وقت آگیا ہے کہ وہ عالمی برادری اور خاص کر بڑی طاقتوں کو خبردار کردے

کہ وہ اپنے فوجی مفادات کے تحفظ کے لئے بادلِ نخواستہ ضروری اقدامات کرنے کے لئے مجبور ہے۔"

سیمینار کا بڑا مصروف پروگرام تھا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ منتخب ایڈیٹروں کی ملاقات بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ تھی۔ یہ ملاقات شروع دن ہی شام ۴ بجے پارلیمنٹ ہاؤس کے ایک وسیع کمرے میں ہوئی۔ جہاں وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں اخبارات سے اپیل کی کہ وہ عوام کی صحیح طور پر رہنمائی کریں اور حیثیتِ بنیادی یکجہتی کے مقصد کو اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری اصل دشمن غریبی ہے اور جب تک یہ غربت دور نہ ہوگی ہماری بہت سی مشکلات باقی رہیں گی۔"

قدرتی طور پر وزیر اعظم نے بنگلا دیش کے مسئلے کو بڑی اہمیت دی اور اگرچہ انھوں نے ۶۰ لاکھ پناہ گزینوں کی آمد پر تشویش ظاہر کی لیکن مولانا عبدالوحید صدیقی کے سوال کے جواب میں اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ خواہ کوئی غیر ملک مدد کرے یا نہ کرے، ہم اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ ان پناہ گزینوں کی آمد کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹ سکیں۔

وزیر اعظم نے انکشاف کیا کہ شروع میں مشرقی بنگال سے صرف مسلمان آنا شروع ہوئے تھے لیکن بعد میں غیر مسلم بھی آئے اور انکی تعداد بڑھ گئی۔

مشرقی بنگال میں غیر بنگالیوں کے ساتھ مبینہ بُرے سلوک کے بارے میں جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا۔ شروع میں ایسی خبریں آئی تھیں کہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ جن میں بہار اور اتر پردیش کے لوگ شامل تھے زیادتی کی ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ہم اس کی بھی مذمت کرتے ہیں اور ہم ہر طرح کے قتل کی مذمت کرتے ہیں۔

اس ملاقات میں جو چھوٹی سی پریس کانفرنس بن گئی تھی وزیر اعظم کو اُردو اخبارات کی خستہ حالی اور خود اردو کے ساتھ امتیازی سلوک کی طرف توجہ دلائی گئی۔ پاسبان کے ایڈیٹر جناب تابش صاحب نے وزیر اعظم کو بتایا کہ انکی ریاست میسور میں ایک ہزار اُردو کے اسکول ہیں لیکن خود ان کے گھر میں اُردو ختم ہو رہی ہے۔" دوسرے اصحاب نے کہا۔ جب اُردو کا بیس (Base) ہی ختم ہو گیا تو اُردو کہاں رہے گی؟ لیکن وزیر اعظم نے خوشخبری سنائی کہ ان کے گھر (یوپی) میں اُردو کا Base ختم نہیں ہو رہا ہے بلکہ وزیر اعلیٰ مسٹر کملاپتی ترپاٹھی کے ساتھ بات چیت کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اب یوپی کے ہر پرائمری اسکول میں خواہ اُردو پڑھنے والے بچے ہوں یا نہ ہوں ایک اردو ٹیچر ضرور رکھا جائے گا۔"

سیمینار میں جن دوسرے ذمے داروں کے خیالات سننے میں آئے ان میں مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ مسٹر کے۔سی۔ پنت شامل تھے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو پریس نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور آج بھی ہندوستانی جرنلزم میں اُردو اخبارات و رسائل کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات و رسائل اردو میں ہی شائع ہوتے ہیں۔

مسٹر اندر جیت گجرال وزیر مملکت برائے ورکس اینڈ ہاؤسنگ نے اردو ایڈیٹروں سے اپیل کی کہ وہ نئے خیالات اور سوسائٹی کے بدلتے ہوئے رجحانات پر اپنے اخبارات و رسائل میں روشنی ڈالیں۔

سیمینار کے آخری اجلاس میں اخبارات کو پیش آنے والی مشکلات بھی زیر بحث آئیں اور اس سلسلے میں کاغذ کے کوٹے اور سرکاری اشتہارات کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اردو جرنلسٹوں کی حالت زار کا معاملہ محمد سلیمان صابر (الجمعیۃ) نے اٹھایا اور اپیل کی کہ اردو اخبارات میں کام کرنے والے جرنلسٹوں کو حکومت کے منظور کردہ شیڈول کے مطابق اجرتیں ملنی چاہئیں۔ آپ نے کہا کہ اگر اخبارات اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ مناسب اجرتیں نہیں دے سکتے تو بہتر ہے کہ وہ بند کر دیئے جائیں۔ کم اخبارات رہ جائیں تو کوئی بات نہیں لیکن وہ اچھی حالت میں نکلنے چاہئیں تاکہ کام کرنے والے اردو صحافی اچھی حالت میں رہ سکیں اور اچھے مضامین لکھ سکیں۔"

آپ کی اس تجویز کو عام طور پر پسند کیا گیا لیکن تشدید

باقی صفحہ ۷ پر

واقعات نئی دہلی

اسرائیل

بُرے دن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں سے لڑے بغیر ہی اسرائیل کے بُرے دن قریب آرہے ہیں۔ اس کی اقتصادی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ سالانہ آمدنی میں صرف ۰ فیصدی کا اضافہ ہے لیکن اس وقت غیر ملکی قرضہ دو ارب ساٹھ کروڑ روپے تک پہنچ چکا ہے۔ اس میں ایک ارب ۲۰ کروڑ ڈالر کا صرف اسی سال کا تجارتی نقصان شامل ہے۔ آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ جنگی مقاصد پر خرچ کیا جا رہا ہے اور اسی لئے جتنے ٹیکس اسرائیل میں لگائے گئے ہیں کسی ملک میں نہیں لگائے گئے۔

۲۰ فیصدی آبادی غربت کی زندگی گزار رہی ہے (اسرائیل کے آٹھ ممبروں پر مشتمل خاندان کی آمدنی اگر ۴۵ ڈالر ماہوار سے کم ہو تو وہ غریب سمجھا جاتا ہے) جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ سال سے اب تک تل ابیب (آبادی ۸ لاکھ) میں ۱۲۵ چوریوں کی وارداتیں ہوئی ہیں پرس چھین کر لے جانے کے واقعات عام ہو گئے ہیں اور ۰۰ ۴ طوائفیں سڑکوں پر نظر آتی ہیں۔

سب سے بڑی مصیبت یہ آئی ہے کہ کالے اور گوروں میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایشیائیوں اور افریقیوں کی تعداد اگرچہ ساٹھ فیصد کے ہے لیکن اقتدار گوروں کے ہاتھوں میں ہے جو صرف ۴۰ فیصدی ہیں۔ اس امتیازی سلوک کے خلاف "بلیک پینتھرس" کے نام سے ایشیائی اور افریقی یہودیوں نے اپنی ایک تنظیم قائم کی ہے۔ تاکہ ان کے خلاف جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں ان کو ختم کرایا جا سکے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام مخالفانہ مظاہرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تنظیم کا لیڈر ایک ۲۰ سالہ نوجوان سعدیا مرسیانو ہے جو مارسلز (فرانس) میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کا باپ مراکش سے ترکِ وطن کر کے اسرائیل کی طرف جا رہا تھا۔ اسرائیل میں اس کی پرورش یروشلم کے مصرارہ علاقے میں ہوئی جو سلم (گندہ) کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۰ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا لیکن اپنی سات ماہ کی ملازمت کا تقریباً نصف حصہ اس نے جیل میں گزارا اور پھر بعد میں اسے نااہل قرار دے کر فوج سے نکال دیا گیا۔ بعد ازاں وہ اپنے علاقے

باقی صفحہ ۰ پر



سعدیا مرسیانو

میں عربی بولنے والے نوجوانوں کے ساتھ وقت گزاری کیا کرتا تھا اور اسی لئے کئی جرائم میں پولیس نے اسے مشتبہ قرار دے کر گرفتار کیا۔

لیکن آخر کار اس نے غیر یورپین باشندوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک جماعت بنا ڈالی جسے "بلیک پینتھرس" کا ہی نام دیا گیا ہے، جو امریکا میں کالوں کی جماعت کو دیا گیا ہے۔ سعدیا مرکا دعویٰ ہے کہ اس وقت اس جماعت کے ممبروں کی تعداد ۹ ہزار ہے۔

اس جماعت کی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اسرائیل کے پولیس منسٹر ہلیل کو (یہ ایک عراقی یہودی ہے ———) کو اقرار کرنا پڑا کہ اسرائیل کو اب تین محاذوں پر خطرہ درپیش ہے۔ ایک دفاعی محاذ، دوسرا اقتصادی اور تیسرا سماجی اور ان کے خیال میں دو آخر الذکر محاذوں پر صورتِ حال زیادہ سنگین ہے۔ آئندہ یہ صورتِ حال اور زیادہ سنگین ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ غیر یورپین یہودیوں کو جن میں مقامی عرب یہودی بھی شامل ہیں، یہ احساس اب شدت سے ستانے لگا ہے کہ یورپ اور امریکا سے آنے والے جس اسرائیل میں بود و باش اختیار کئے ہیں وہ اسرائیل اور ہے اور جس میں وہ خود رہتے ہیں وہ اسرائیل اور ہے۔

اوکی ناوا

غیر اطمینان بخش معاہدہ

امریکہ نے اوکی ناوا جزیرہ جاپان کو واپس کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ یہ دستخط واشنگٹن اور ٹوکیو میں ایک ساتھ منعقد ہونے والی تقریبات میں ہوئے۔ واشنگٹن میں اس وقت صبح ۸ بج کر ۱۰ منٹ اور ٹوکیو میں شب کو ۹ بج کر ۱۰ منٹ ہوئے تھے۔ گویا واشنگٹن میں ناشتے پر کافی پی جا رہی تھی اور ٹوکیو میں شب کو فرانسیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہو مقصد دونوں تقریبات کا ایک ہی تھا یعنی کہ اوکی ناوا کی واپسی سے متعلق معاہدے پر دستخط کرنا۔

اوکی ناوا جزیرے پر امریکا نے دوسری جنگِ عظیم میں قبضہ کر لیا تھا اور اب ۲۶ برس بعد اس کی واپسی عمل میں آرہی ہے۔ واشنگٹن میں امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس نے سو مہمانوں کے روبرو معاہدے پر دستخط کئے۔ اور ادھر ٹوکیو میں وزیر خارجہ جاپان مسٹر کیچی آئیچی نے دستخط کئے۔ ٹیلی ویژن پر یہ سب کارروائی ایک دوسری جگہ اور پورے امریکا اور پورے جاپان میں دیکھی جا رہی تھی۔ اسے لاکھوں کروڑوں لوگوں نے دیکھا (مصنوعی سیارے کے ذریعے جو امریکا نے ۹ سال قبل فضائے آسمانی میں پہنچایا تھا اب ہر جگہ کے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنا ممکن ہو گیا ہے۔)

واشنگٹن میں دستخط کرنے کی اس تقریب میں مسٹر نکسن شرکت نہیں کی۔ حالانکہ اوکی ناوا کے معاہدے میں انھوں نے ذاتی دلچسپی لی تھی۔ سرکاری طور پر بتایا گیا کہ چونکہ وہ سربراہ حکومت ہی نہیں بلکہ سربراہِ مملکت بھی ہیں۔ اس لئے وہ صرف اسی صورت میں آسکتے تھے جب دوسری طرف ٹوکیو میں شہنشاہ جاپان بھی تقریب میں حصہ لیتے۔

اوکی ناوا کا جزیرہ جاپان کے پانچ سو میل جنوب مشرق میں جاپانی جزیرے کیوشو اور فارموسا کے درمیان واقع ہے اور اس کے علاقے میں بڑی جنگی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں امریکا کے نیوکلیائی اسلحے کے اڈے واقع ہیں۔ کافی عرصے سے جاپانی باشندے اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

وزیر اعظم جاپان نے معاہدے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ بحر الکاہل میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ لیکن عوام کی ایک بڑی تعداد واپسی سے متعلق معاہدے پر مطمئن نہیں



معاہدے پر دونوں ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے

جس وقت معاہدے پر دستخط ہو رہے تھے اس وقت بھی ۸ ہزار جاپانی اس بات کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے کہ معاہدے میں اوکی ناوا سے نیوکلر یا ایٹمی ہتھیاروں کے اڈے ہٹالینے کی شرط موجود نہیں ہے۔ ان مظاہروں کے دوران پولیس کے ساتھ تصادم بھی ہوئے جن میں بہت سے لوگ مجروح ہو گئے۔ ان میں پولیسمین اور طلبا شامل تھے۔ چھ سو اشخاص گرفتار کئے گئے۔ مخالف پارٹیوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جاپانی پارلیمنٹ میں اس معاہدے کی تصدیق کی مخالفت کریں گی۔ ان کا مطالبہ ہے کہ معاہدے میں ایٹمی اڈے ہٹالینے کی وضاحت ہونی چاہیے۔

دوسری طرف امریکی سینیٹ کے بعض ممبران بھی ناخوش ہیں۔ خاص طور پر جنوبی ریاستوں کے ممبران۔ انھوں نے کہا کہ اگر جاپان نے اپنے کپڑے کی برآمد پر روک نہ لگائی تو وہ اس معاہدے کی تصدیق کرنے کی مخالفت کرینگے۔ (غالباً اگلے سال مارچ میں اس کی تصدیق کیجائیگی۔)

۴۵۴ مربع میل کے اس جزیرے میں امریکا کے ۸۸ فوجی اڈے ہیں جن پر نیوکلر اسلحہ نصب ہے۔ ایک اعلیٰ امریکی افسر نے کہا۔ اگرچہ معاہدے کے بعد امریکا کا جزیرے کے صرف کلرحصے پر کنٹرول رہ جائے گا لیکن وہ تمام فوجی اڈے باقی رہیں گے جو ضروری ہیں۔ جاپان صرف ۴۶ چھوٹی چھوٹی تنصیبات کو اپنے کنٹرول میں لے گا اور آئندہ پانچ سال کے دوران ان کا ۳۲ کروڑ ڈالر معاوضہ ادا کرے گا۔ لیکن باقی تنصیبات بدستور امریکی کنٹرول میں رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ اوکی ناوا پر سے امریکہ کی بالادستی ختم ہو گئی ہے لیکن اس کا حلقۂ اثر متاثر نہیں ہوا ہے۔

میکسیکو

طلبا کا قتل

میکسیکو شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کے درمیان ایک آزاد ریپبلک ہے۔ رقبہ ۷۶۱۳۷۵ مربع میل اور آبادی تقریباً ۴۸۳۸۱۰۰۰ ہے۔ سولہویں صدی میسوی سے ۱۸۱۰-۱۲ کی انقلابی جنگ تک جس میں مختلف اوقات میں امریکا، آسٹریا اور فرانس ملوث رہے اس پر اسپین کا قبضہ رہا اور بالآخر ۱۸۶۷ء میں آسٹریا کے شہنشاہ فردیناند کے قتل کے بعد موجودہ جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ سینیٹ کے ۶۰ ممبر چھ سال کے لئے اور ایوانِ عام کے ۲۱۰ ممبر تین سال کے لئے منتخب کیے جاتے ہیں۔

میکسیکو تند و تیز مظاہروں کا گڑھ رہا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اتنے زبردست مظاہرے ہوئے کہ وہاں منعقد ہونے والے اولمپک کھیل خطرے میں پڑ گئے تھے۔

ابھی گزشتہ ہفتے دس ہزار طلبا نے انقلاب کی عظیم یادگار کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ اس بات کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے کہ جن ۸۰ طلبا کو اکتوبر ۱۹۶۸ء کے مظاہروں میں گرفتار کیا گیا تھا وہ ابھی تک نہیں چھوڑے گئے ہیں (ان مظاہروں میں پچاس اشخاص کی جانیں گئی تھیں) مظاہرین ابھی مشکل سے نصف میل ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ پولیس نے ان کا راستہ روک لیا۔ یکایک جیسے کہ کسی کے اشارے پر نوجوانوں کی ٹکڑیاں اس موقع پر نمودار ہو گئیں۔ یہ سب نوجوان جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں تھیں خاکستری رنگ کی بسوں سے اتر کر آئے تھے جو وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ فیلکونس فیلکونس کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ دراصل ایک جماعت ہے جو بائیں بازو کے رجحانات کے حامل طالبعلموں کے خلاف غالباً سرکاری طور پر بنائی گئی ہے۔ ان نوجوانوں نے طالب علموں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اور ابھی طالب علموں کی پٹائی جاری تھی کہ نوجوانوں کی ایک اور پلٹن آئی، وہ سب پستول اور چھوٹی مشین گنوں سے مسلح تھے۔ انھوں نے اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ ان کا طرزِ عمل بالکل فوجیوں جیسا تھا۔

طلبا ادھر اُدھر بھاگے اور بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے مکانوں کے دروازے کھول کر انھیں پناہ دی۔ لیکن چند ہی منٹوں میں ۸ طلبا ہلاک ہو چکے تھے۔ فیلکون نوجوانوں نے اس کے بعد قریب کے ایک ہسپتال پر حملہ کیا جہاں مجروح طالبعلموں کو داخل کیا گیا تھا۔ وہ ان سب مجروح طالب علموں کو جو اٹھا سکتے تھے اپنے ساتھ فیلکون ہیڈکوارٹر لے گئے جہاں اندیشہ ہے کہ مزید طالب علموں کو قتل کر دیا گیا ہوگا۔

یہ فیلکون کون ہیں ؟

صدر میکسیکو کے ایک ترجمان نے اس کا الزام دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلبا کے ایک گروپ پر عائد کیا ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کو شبہ ہے کہ اس معاملے میں سٹی گورنمنٹ ملوث ہے اور غالباً اسی لئے طلبا نے شہر کے میئر کو الگ کر دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

اٹلی

پھر فاشزم کی طرف

اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے اپنے آخری ایام میں شمالی اٹلی کی پہاڑیوں میں اپنی نام نہاد ریپبلک قائم کی تھی تو اس کے ایڈی کانگ میں ایک اخباری ایڈیٹر جارجیو الیمرانتے بھی شامل تھا۔ مسولینی کی گرفتاری اور پھر اسے پھانسی دی جانے کے بعد الیمرانتے روپوش ہو گیا اور ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ صابن فروخت کرتا تھا اور ریلوے اسٹیشنوں پر سوتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں یہ سمجھ کر کہ فاشزم کا قلع قمع ہو چکا ہے اٹلی نے مسولینی کے غیر اہم ساتھیوں کو عام معافی دیدی۔ الیمرانتے اب روم واپس آ گیا جہاں اس نے اپنے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔ کافی دن اس نے حصہ نہیں لیا لیکن اب یکایک فاشزم کا جذبہ اس کے اندر عود کر آیا۔ اور دو ہفتے قبل جب اس کی نئی فاشی جماعت اٹالین نوشل موومنٹ (M.S.I.) صوبائی اور میونسپل انتخابات میں سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی تو سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

لوگوں کو پریشانی ہے کہ جس قسم کے حالات اٹلی میں اس وقت تھے جب مسولینی کو کامیابی حاصل ہوئی تھی، ایسے ہی حالات مختلف قسم کی ہڑتالوں کی بنا پر جو گزشتہ دو برس سے چل رہی ہیں، اس وقت پیدا ہو گئے ہیں۔ عوام میں اس بات سے سخت ناراضگی ہے کہ حکومت ابھی تک حالات کی اصلاح نہیں کر سکی ہے۔ سسلی میں ایک خاتون ووٹر نے کہا۔ ہم ان ہڑتالوں سے

دس سال کی جنگ نے امریکنوں کو یہ سبق دیا کہ ویت نامیوں کو ہرانا ناممکن ہے

نے عوام کے جرائم سے تنگ آگئے ہیں۔ فاشی حکومت میں یہاں کے کسے کمہات کو اپنے گھروں کے تالے بند کرنا نہیں پڑتے تھے" روم کے ایک ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

" یہاں بہت سی باتیں غلط ہو رہی ہیں۔ ہم امن سے رہنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ سخت قسم کے قوانین بنائے جائیں ایم ایس آئی۔ صرف ایسی تنظیم ہے جسکے رہنما جانتے ہیں کہ ملک کا نظم و نسق کس طرح چلایا جاتا ہے۔"

بلاشبہ کولمبو (وزیر اعظم اٹلی) کی تین پارٹیوں پر مشتمل کولیشن اٹلی کا نظم و نسق چلانے میں ناکام رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب عوام کی نظریں سولینی کے چیلے المیرانتے کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ویتنام
حقیقت سامنے آگئی

آج دنیا کی بہادر ترین قوموں میں ویت نامیوں کا نام سرفہرست آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں کل ملاکر تمام یورپین قوموں نے جتنی بہادری کی قربانی نہیں دی، اس سے کہیں زیادہ جانیں ویتنام میں ضائع ہو چکی ہیں۔

پچھلے دس سال میں ویتنامیوں نے فرانسیسیوں، جاپانیوں اور امریکنوں سے جس طرح لوہا لیا ہے اس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ ویت نامیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی امنگ، حوصلہ اور آزادی کی خواہش کے سامنے ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ہتھیاروں کی کوئی حقیقت نہیں۔ ویت نام کے گوریلے، ویت کانگ والوں نے امریکی سامراجیت کا منہ توڑ جواب دے چکے ہیں۔ ہتھیاروں سے تو لڑے ہی ہیں اور روس سے معمولی مقدار میں جو ہتھیار آتے ہیں ویت کانگ انہیں استعمال نہیں کرتے۔ ان ہتھیاروں کو شمالی ویت نام کی باقاعدہ فوجوں کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔

سامراجی طاقتوں نے ہمیشہ آزادی، جمہوریت اور تہذیب کا نام لے کر دنیا بھر کی کمزور قوموں کو لوٹا ہے۔ دنیا کو تہذیب سکھانے کے نام پر یورپ کے لوگوں نے امریکا، افریقہ اور



الزبرق

ایشیا کے کئی کتنا زیادہ تہذیب یافتہ چین اور ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں اور ان قوموں کو یورپ کا (WHITE MEN'S BURDEN) کہا کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی زیادہ مقدار میں بننے والی چیزوں کے لئے مارکیٹ ڈھونڈنے ان ملکوں میں آئے تھے۔ تاکہ ایک طرف یہاں سے خام مال حاصل کر سکیں دوسری طرف اپنا مال بیچ کر یہاں کی دولت سمیٹ سکیں۔ آج کے یورپ اور امریکا کی ترقی اسی بین الاقوامی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ آج بھی بند نہیں ہوئی ہے بلکہ اسی طرح جاری ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کو آزادی اور جمہوریت کا نام دیا گیا۔ دراصل یہ جنگ بھی بہت سے سامراجی ملکوں کے درمیان اس بات پر ہو رہی تھی کہ کونسی مارکیٹ کس کے پاس رہے گی۔ یعنی افریقہ، امریکا، اور ایشیا کے کس ملک کو لوٹنے کھسوٹنے کا حق کس طاقت کے پاس رہے گا۔ اس لڑائی میں جاپان بھی سامراجیوں کی اس جنگ میں شامل ہو گیا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک بڑی سامراجی طاقت بن چکا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سامراجیوں نے ایشیا، افریقہ کے ملکوں کو لوٹنے کا ایک دوسرا بہانہ تلاش کر لیا یعنی کمیونزم کا ہوا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے زیادہ تر ملکوں کے عوام اپنے ملکوں میں کمیونزم اور سوشلزم چاہتے ہیں تاکہ وہ سرمایہ داری اور سامراجیت کے اس جوئے کو اتار پھینکیں۔

لیکن امریکا اور دوسری سامراجی طاقتیں ان کی خیرخواہ اور ہمدرد بن کر انہیں کمیونزم سے بچانے کی کوششیں کر رہی ہیں ان بدنصیب ملکوں میں سے ایک ملک انڈوچائنا بھی تھا جسے آپ اور ہم ویتنام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہاں امریکا اور اس کے ایجنٹوں نے اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لئے عجیب عجیب چالیں چلیں۔ خود ہی لوگوں کا قتل عام کرایا اور پھر یہ الزامات لگائے کہ کمیونسٹوں نے یہ قتل کرائے ہیں۔ خود شمالی ویت نام پر حملے کئے اور الزام لگایا کہ شمالی ویت نامی جنوبی ویتنام پر حملے کر رہے ہیں۔ امریکی، ویتنام پر حملوں کا جواز تلاش کرنے کے لئے، وہاں اپنی فوجوں کو اتارنے کے لئے اور وہاں کے عوام کا قتل عام کرنے کے لئے ایک کے بعد ایک جھوٹ بولتے رہے۔ لیکن ویتنامی عوام جانتے تھے کہ سچائی کیا ہے۔ اسلئے وہ ظلم سہتے رہے، موت سے مقابلہ کرتے رہے لیکن انھوں نے کمیونسٹوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

امریکی معیشت کا سارا انحصار جنگ پر ہے جس کو انگریزی میں (War Based Economy) کہا جاتا ہے دنیا میں اگر جنگ نہ ہو۔ امن اور شانتی پھیل جائے تو امریکا کی معیشت چار دن میں تباہ ہو جائے۔ ہزاروں کارخانے جو ہتھیار بناتے ہیں بند ہو جائیں۔ مزدور بے کار ہو جائیں۔ اور آج امریکا دنیا کی لوٹ کھسوٹ کے بل پر سب سے زیادہ دولت مند ملک ہونے کا جو دعویٰ کرتا ہے، اپنا سارا وقار کھو بیٹھے اس لئے امریکا کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں جنگ چلتی رہے اور اگر جنگ نہیں ہوتی تو امریکا جنگ کراتا ہے اپنے عوام کو اور دنیا کے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے امریکا کے واسطے ضروری ہے کہ وہ اپنے ان ناپاک ارادوں پر خوبصورت الفاظ اور خوبصورت خیالات کے پردے ڈالے۔ اس لئے وہ جمہوریت کا نام لے کر لڑتا ہے، آزادی کا نام لے کر لڑتا ہے اور کمیونزم کے خلاف جنگ کا نام لے کر لڑتا ہے۔

امریکی عوام اور دنیا کے وہ ملک جہاں خود بھی سامراجی طاقتوں کا غلام تھے، امریکا کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ لیکن سوشلسٹ اور سوشلزم کی طرف بڑھتے ہوئے دوسرے ملک جانتے ہیں کہ

پچھلے بیس سال سے امریکی حکمراں اپنے عوام اور ساری دنیا کو بیوقوف بنا رہے ہیں



ویت نامی اپنا لہو بہا کر بہادری کی ایک تاریخ لکھ رہے ہیں

حقیقت کیا ہے۔

پچھلے بیس سال سے امریکی حکمراں اپنے عوام اور ساری دنیا کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں آئزن ہاور اور کینیڈی سے لے کر نکسن تک سب کے کچے چٹھے کھل گئے۔

ان رازوں کو کھولنے والا تھا، امریکی جنگی محکمہ پینٹاگون کا ایک اہم رکن ڈینیل الزبرگ۔ الزبرگ نے پنٹاگون کے ٹاپ سیکریٹ کاغذات کی ۴۰ جلدیں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور بہت سے دوسرے اخبارات کے حوالے کر دیں۔ جیسے ہی ان کاغذات پر مشتمل مضامین نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونا شروع ہوئے، پورے امریکا اور پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ نکسن حکومت نے گھبرا کر ان کاغذات کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ الزبرگ کی گرفتاری کا وارنٹ نکال دیا گیا۔

لیکن جو باتیں دنیا بہت پہلے سے جانتی تھی کہ امریکی عوام ان میں سے بہت سی باتیں جان گئے تھے۔ اس لئے امریکا میں ان سیکرٹ کاغذات کی اشاعت کا معاملہ شروع ہو کر مقدمہ سپریم کورٹ کے سامنے آیا اور سپریم کورٹ نے ان کاغذات کی اشاعت کی آزادی دے کر ثابت کیا کہ امریکا میں اخبارات آزاد ہیں۔

لیکن امریکا میں اخبارات عوام کی ملکیت نہیں ہوتے

جبکہ ورنہ ہندوستان اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی طرح وہاں بھی تمام بڑے اخبارات چند سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں اور ہمیشہ انہی کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کل تک یہی اخبارات ویتنام میں امریکی مداخلت کی حمایت کر رہے تھے کیونکہ امریکی سرمایہ دار کو اس میں اپنا مفاد نظر آ رہا تھا۔ یہ اخبارات ویتنامیوں کے "قاتلوں" کو قومی ہیرو بنا کر پیش کر رہے تھے، ویتنام میں امریکا کے ہر ظلم و ستم کو جائز قرار دے رہے تھے۔ لیکن پچھلے دس سال کی جنگ نے انھیں یہ سبق دیا کہ ویتنامیوں کو ہرانا ناممکن ہے۔ اس کے بجائے کہ امریکا ویت نام سے کوئی فائدہ اٹھائے وہ وہاں جانی اور مالی دونوں قسم کے نقصانات اٹھا رہا ہے۔ اس لئے اب امریکی سرمایہ دار نے محسوس کیا کہ بہتر ہوگا ویت نام سے باہر نکلا جائے اور دنیا کے کسی دوسرے علاقے میں اپنے ہتھیاروں کی مارکیٹ ڈھونڈی جائے۔ اس بات کو محسوس کرنے کے بعد سرمایہ داروں کے اخبارات نے ویت نام جنگ کی مخالفت شروع کر دی جس کی ایک کڑی تازہ ترین امریکی فوجی رازوں کی اشاعت ہے۔

الزبرگ نے بھی یہ کاغذات انسانیت اور انصاف پسندی کے تعلق سے شائع ہونے کے لئے نہیں دیئے ہیں۔ بلکہ اس کا کہنا ہے کہ اب امریکا ویت نام میں نقصان اٹھا رہا ہے اس لئے اسے وہاں سے باہر آ جانا چاہیے۔ ورنہ کل تک خود الزبرگ اس جنگ کی حمایت کر رہا تھا۔

امریکی اخبارات اور جنگ کے مخالف لیڈر بھی اسی بات پر زور دے رہے ہیں کہ جنگ منافع بخش نہیں ہے اس لئے اب امریکیوں کو ویتنام سے واپس آ جانا چاہئے۔ اس میں امریکیوں کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں حق۔ انصاف۔ انسانیت جیسے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس میں ہر چیز کو نفع نقصان کے پیمانے پر ناپا جاتا ہے۔

ان کاغذات میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہی تمام باتیں ہیں جن سے دنیا پہلے ہی واقف تھی۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اب امریکی عوام کو اپنی حکومت کی دروغ گوئی کا پتہ



امریکی عوام کی نظر میں ایشیا کسی مچھر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے

چل گیا ہے۔ اب وہ جان گئے ہیں کہ امن اور انسانیت کی باتیں کرنے والے کینیڈی۔ جونسن اور نکسن جیسے بڑے بڑے لوگ کس طرح پوری پوری قوموں کے مستقبل سے کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ جان گئے ہیں کہ سچے وہ نہیں بلکہ روس، چین دوسرے سوشلسٹ ممالک اور ویت نام کے بہادر عوام ہیں۔ ظلم کمیونسٹ نہیں بلکہ امریکن کر رہے ہیں۔ دنیا کے امن اور شانتی کے راستے کی رکاوٹ سوشلسٹ ممالک نہیں بلکہ امریکا اور دوسرے سامراجی ممالک ہیں۔

امریکی اخبار نیوز ویک لکھتا ہے کہ ابھی تو امریکن عوام کو جو واقعات کا بھی علم نہیں ہوا ہے۔ اگر پوری طرح سچائی ان کے سامنے آ جائے تو انھیں پتہ چلے گا کہ امریکن فوج نے کس طرح لاکھوں انسانوں کا قتل کیا ہے، ہزاروں عورتوں کی عصمتیں لوٹی ہیں۔ اور کروڑوں بچوں کو اپنی سنگینوں پر اچھالا ہے۔ آج دنیا حقیقت سے واقف ہے، کل امریکن عوام حقیقت جان جائیں گے۔ آج امریکا میں صرف نوجوان ہی کمیونزم کی طرف مائل ہیں۔ کل وہاں کے بوڑھے بھی کمیونزم میں یقین رکھنے لگیں گے۔ اس وقت امریکن حکومت کو سوچنا پڑے گا کہ وہ کمیونزم سے کہاں کہاں لڑے۔؟

دنیا میں جنگ نہ ہو تو امریکا کی معیشت چار دن میں تباہ ہو جائے



مسائل

فرقہ وارانہ امن

وزیراعظم ہند مسز اندرا گاندھی کو جو ملک کی وزیر داخلہ بھی ہیں سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ ملک میں امن و امان قایم رہے اور شرارت پسندوں کو اس بات کا موقع نہ ملے کہ وہ شرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزینوں کے نام پر کسی طرح کی بھی اشتعال انگیز کارروائی کر سکیں۔

سخت کارروائی کریں اور مشتعل ہجوموں پر فائرنگ کرنا ضروری ہو تو اس میں تامل نہ کریں۔ اسی کے ساتھ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے افسروں کو خبردار کر دیں کہ اگر وہ فرقہ وارانہ تشدد کو دبانے کے لیے سخت کارروائی کرنے میں ناکام رہے تو فرائض کی انجام دہی / میں اس کوتاہی پر ان کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا اور انھیں سزا دی جائے گی۔ ریاستوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ پولیس ایکٹ کی اس دفعہ سے بھی

فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانیوالوں کیخلاف سخت اقدامات کیئے جائیں گے

مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ شرارت پسند لوگ اپنی شرارت آمیز سرگرمیوں میں اس لئے مصروف نظر آتے ہیں کہ اب تک انھیں اپنی حرکتوں کی بالکل سزا نہیں ملی یا اگر ملی ہے تو بہت کم مل سکی ہے اولاً اس لئے کہ ان کے خلاف شہادتوں کا ملنا مشکل ہوتا ہے اور دوم اس لئے کہ عدالتی ضابطہ کے تحت مقدمات کے فیصلوں میں بہت کچھ تاخیر ہو جاتی ہے اور اس طرح انصاف کا خون ہو جاتا ہے۔

اس خامی کو دور کرنے کیلئے مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کو ایسے اختیارات دینا چاہتی ہے جس سے کہ وہ فساد زدہ علاقوں میں مجرموں کو سزا دینے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کر سکیں۔ یہ عدالتیں مقدمات کی محض سرسری سماعت کرنے کے بعد ان کے فیصلے کر سکیں گی اور جو تاخیر اس وقت ہوتی ہے وہ نہ ہوگی۔ توقع ہے پارلیمنٹ کے اجلاس رواں ہی میں ایک بل اس مقصد کے لئے پیش کیا جائے گا اور ریاستی حکومتوں کو امن و امان قایم رکھنے کے لئے ضروری اختیارات مل جائیں گے۔

انھیں ریاستوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ جیسے ہی فرقہ وارانہ تشدد کے آثار نمایاں ہوں وہ فوراً واقعات نپٹنے لگیں

فائدہ اٹھائیں جس کے تحت ان علاقوں پر تعزیری جرمانے کیئے جا سکتے ہیں جہاں فسادات ہوں۔

فرقہ وارانہ امن قایم رکھنے کے لئے مرکزی حکومت کا یہ بروقت اقدام ہے بشرطیکہ ریاستی حکومتوں اور ان کے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں نے ایمانداری سے کام لیا۔ بعض اوقات ایمانداری سے کام نہ کرنے کی بنا پر قوانین خود مظلومین کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا اب تک امن کی برقراری کے لئے بھی اندرا سرکار قابل مبارکباد ہے۔ اور آئندہ امن کی برقراری کے لئے وہ جو کچھ کر رہی ہے اسے بھی ہم ایک مستحسن اقدام سمجھتے ہیں۔

بچوں کی فلاح بہبود

بچوں کی مناسب غذا کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اس لئے کہ بچوں کی نشو و نما اور ان کی ذہنی کیفیت کا دارومدار بہت کچھ غذا پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کے نشو و نما پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے کمزور نہ رہ جائیں۔

اس کے برعکس ہمارے یہاں ہندوستان میں زبانی جمع خرچ تو بہت کچھ کیا جا چکا ہے، بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق مختلف کمیٹیاں اپنی سفارشات بھی پیش کر چکی ہیں لیکن عملی میدان میں ابھی تک کچھ نہیں کیا جا سکا ہے اور قومی پیمانہ پر بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی مہم نہیں چلائی گئی ہے۔

مرکزی ویلفیئر منسٹر نے حال ہی میں ریاستی ویلفیئر منسٹروں کی کانفرنس میں جو دلی میں منعقد ہوئی اس بات پر زور دیا تھا کہ بچوں کے لئے قومی پالیسی وضع کی جانی چاہئے اور اس سلسلے میں ایک جامع قرارداد منظور کی جانی چاہئے۔

دراصل ایسا بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا جتنا جلد بچوں کی بھلائی کے لئے قومی پیمانہ پر مہم شروع کی جائے گی اتنا ہی اس ملک کے لئے بہتر ہوگا۔ آج کے بچے ہی کل کی قوم بنیں گے اور اگر بچپن ہی سے ہم نے اپنے بچوں کی طرف توجہ نہ دی تو یوں سمجھئے کہ اپنی قوم کو خراب کرنے کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر ہوگی۔

بنگال

جمہوریت سے مذاق

جمہوریت کا ایک بہت دلچسپ اصول ہے اور وہ یہ کہ جب تک جمہوری حکومت سرمایہ داروں یا انکے ہی خواہوں کے ہاتھ میں رہتی ہے سرمایہ دار اس کے گن گاتے رہتے ہیں لیکن جیسے ہی عوام اپنے ووٹ کا استعمال کر کے حکومت اپنے نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل کرتے ہیں، سرمایہ داروں کے ایجنٹ، قانونی یا غیر قانونی طریقے سے جمہوریت کا خون کرنے

ہندوستان میں آج بھی کروڑوں بچے ننگے بھوکے ہیں

بنگال ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جہاں ہمیشہ جمہوریت کے ساتھ مذاق - ہوتا رہا ہے

...ہوگئے۔ جمہوریت کے ساتھ مذاق کرنے والوں کی ہندوستان میں کمی نہیں۔ بنگال ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جہاں یہ مذاق ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔

مغربی بنگال اسمبلی کے اجلاس میں ابھی کچھ ہی دن باقی تھے کہ بنگال کے وزیر اعلیٰ شری اجے مکرجی نے گورنر سے اسمبلی ختم کرنے کی مانگ کی حالانکہ گورنر صاحب جانتے تھے کہ اسمبلی کا اجلاس چند روز بعد ہی ہونے والا ہے لیکن پھر بھی انھوں نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور ایک بار پھر مسئلہ ختم کر دیا گیا۔ شری مکرجی کا کہنا تھا کہ سیاست میں حالات

کچھ اس قسم کے ہیں کہ ان کے لئے حکومت کا چلانا ممکن نہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنی نااہلیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔

دوسری طرف مارکسٹ لیڈر مسٹر جیوتی باسو کا کہنا ہے کہ اسمبلی اس لئے ختم کی گئی کیونکہ اجے مکرجی جانتے تھے کہ نئے اجلاس میں اکثریت ان کا ساتھ نہیں دے گی۔ اور ان کی حکومت ختم ہوجائے گی۔ دوسری طرف اگر شری مکرجی حکومت چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے تو گورنر کو جیوتی باسو سے حکومت بنانے کے لئے کہنا چاہیے تھا۔ صدر راج نافذ کرنا اسی وقت مناسب ہوتا جب جیوتی باسو بھی حکومت بنانے میں ناکام ہوجاتے۔

جیوتی باسو کو تشکیل حکومت کی دعوت نہ دے کر گورنر نے خواہ مخواہ اعتراضات کے لئے موقع فراہم کر دیا۔

ایک ایسے موقعے پر جبکہ بنگال میں لاکھوں پناہ گزین آئے ہوئے ہیں۔ مغربی بنگال میں سیاسی عدم استحکام قابل افسوس ہے۔ گورنر نے ایک بار پھر الیکشن کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن آئندہ الیکشن کے بعد بھی کوئی مضبوط حکومت بن سکے گی۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں کس حد تک اپنے فرائض کو محسوس کرتی ہیں۔ ■

پنجاب

گورنر کی اہلیت کا امتحان

پنجاب میں بادل وزارت کے خاتمہ اور صدر راج کے قیام کے بعد سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے اور تمام سیاسی پارٹیوں نے آئندہ انتخابات کے پیش نظر ازسر نو منظم ہونا شروع کر دیا ہے۔

اکالی دل پنجاب میں سب سے بڑی پارٹی سمجھی جاتی تھی لیکن ہر کمالے را زوالے کے اصول کے مطابق پورے عروج پر پہونچنے کے بعد وہ اب روبہ تنزل ہے کسی زمانہ میں سکھوں کے واحد لیڈر آنجہانی ماسٹر تارا سنگھ سمجھے جاتے تھے اور انھوں نے موقع بے موقع اپنی تلوار گھما کر سکھوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا لیکن ان کی لیڈری آخر میں کاغذ کی ناؤ ثابت ہوئی اور سنگھاسن سنت فتح سنگھ کے قبضہ میں آگیا لیکن اب ان کا آخری دور بھی ماسٹر تارا سنگھ کے آخری دور کی شکل اختیار کر رہا ہے اور سنت جی کے چیلے محسوس کر رہے ہیں کہ ایک ایک کر کے ان کے ساتھی ان سے الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اسی لئے بعض اکالیوں نے یہ پتہ لگانا بھی شروع کر دیا ہے کہ کیا پنجاب میں کانگریس اکالیوں کے ساتھ کسی قسم کا انتخابی گٹھ جوڑ کر سکتی ہے۔

دوسری طرف گرنام سنگھ کی قیادت میں باغی اکالی بڑے پیمانہ پر منظم ہو رہے ہیں اور ایسے امکانات پائے جاتے ہیں کہ پھر وہاں اکالی دل اور ماسٹر اکالی دل بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔ ایسا ہوا تو سنت اکالی دل کی شکست یقینی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کامیابی کا سہرا گرنام سنگھ اکالی دل کے سر بندھ جائے گا۔ گرنام سنگھ کے کردار سے عوام اچھی طرح واقف ہیں وہ کبھی ماسٹر تارا سنگھ کے ساتھ تھے، پھر سنت جی کو گرو مان لیا اور اب خود گرو بن بیٹھے۔

دو سرداروں کی اس "کھٹ پٹ" میں یہ یقینی طور کہا جاسکتا ہے کہ پنجاب کے عوام اپنے بچنے کی "جھٹ پٹ" یہ صورت نکالیں گے کہ وہ ایک قومی اور سیکولر جماعت کو اپنا لیں گے۔ جو نئی کانگریس کے علاوہ کوئی اور جماعت نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے ایک فرقہ وارانہ جماعت کے ایڈمنسٹریشن کا مزہ چکھ لیا جس سے کرائیں کرپشن اقربا پروری اور نا انصافی کے علاوہ کچھ نہ ملا اب وہ نئی جماعت کو آزمائیں گے۔ جس سے یقیناً وہ بہت سی امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔ پارلیمانی الیکشن میں جو رنگ دیکھنے میں آیا اس سے یہ اندازہ ہوا کہ پنجاب میں بھی اب ہوا کا رخ بدل گیا ہے

دریں اثناء دیکھنا ہے کہ بادل وزارت پنجاب کے نظم و نسق میں گندگی کا جو ملبہ چھوڑ گئی ہے اسے گورنر ڈی سی پاوٹے کس طرح صاف کراتے ہیں پنجاب کی کوئی ایسی پارٹی نہ تھی جس نے بادل وزارت پر کرپشن کے الزامات عائد نہ کئے ہوں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے تو اعلیٰ پیمانہ پر تحقیقات کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ گورنر صاحب تحقیقات کرائیں یا نہ کرائیں انھیں بہر حال نظم و نسق میں اہم تبدیلیاں ضرور کرنی ہوں گی کیونکہ اس کے بغیر نہ تو نئی سیاسی فضا پیدا ہوسکے گی جو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے ضروری ہے اور نہ عوام کا وہ اعتماد بحال ہوسکے گا جو بادل وزارت کی بدنظمی کی وجہ سے نظم و نسق پر سے اٹھ گیا تھا۔

دیکھنا ہے کہ گورنر اس اعتماد کو بحال کرنے کے لئے کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ اس وقت نظم و نسق سے متعلق ان کی صلاحیتوں کا امتحان ہے۔ *

کیا پنجاب میں کبھی کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہوگی

فلم نگری کے جھروکے سے

ادھیکار



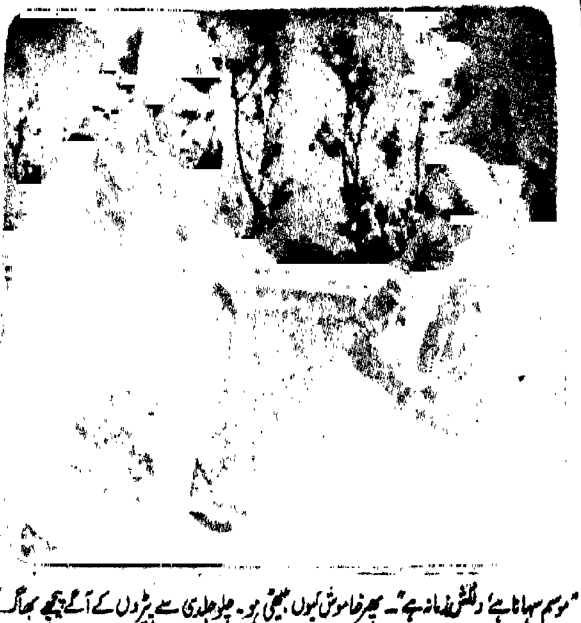
فیض دکنی

فلم آج کے دور میں محض ایک تفریحی مشغلہ ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی میدان میں بھی یہ ایک اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ اشوک کمار کی ادھیکار، اس کا ایک عملی ثبوت ہے۔

ادھیکار کی سب سے بڑی خوبی اس کی کہانی ہے جہاں تک کہ کہانی نویس آر۔ ایس۔ ورما کی کہانی کا تعلق ہے۔ پلاٹ اور کردار ڈرامائی عناصر کے اعتبار سے بھرپور ہیں مگر اسکرپٹ، ڈائریکشن اور فلم کو دلچسپ بنانے کے سلسلے میں جو چھوٹے بڑے حربے استعمال کئے گئے ہیں خاص کر تفریح طبع کی غرض سے تبسم اور اس کے بوائے فرینڈ پر فلمائے گئے مناظر غیر معیاری ہیں حتیٰ کہ فلمی دنیا کی زرق برق رقاصہ ہیلن کا رقص بھی اس بار پھیکا پھیکا اور بے رنگ ہے۔ اسی طرح فلم کا پہلا گانا، پارک اور سوئمنگ پول کے مناظر بھی بھونڈے اور بھدے ہیں انکی وجہ سے ایک لحاظ سے فلم کچھ حد تک جھول دار اور بوجھل ہو گئی ہے لیکن پروڈیوسر۔ ایس۔ نور اور ڈائریکٹر ایس۔ ایم۔ ساگر نے جس خوبی اور قرینے سے آج کل کے سستے غیر مہذب اور جنسی شہوت انگیز مناظر سے پاک صاف ایک نکھری ستھری فلم بنائی ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

فلم کی کہانی، ہمارے عام گھریلو اور سماجی مسائل کے ارد گرد گھومتے ہوئے بھی بڑی دلچسپ اور اثر انگیز ہے اور اس اثر و تاثر میں بنے خاں بھوپالی کے دلچسپ رول میں پران نے مزید اضافہ کیا ہے۔ بنے خاں بھوپالی کا یہ کامیاب اور مثالی کردار، پران کی فلمی زندگی کے چند یادگار کرداروں میں سے ایک ہے ایک سیدھے سادے شریف النفس مسلمان دوست کی حیثیت سے خلوص و محبت اور وفاداری کا ثبوت دینا خاص کر ایک ہندو جوان تنہا و نہتا لڑکی کو اپنی بہن بنا کر ہر طرح سے اس کی حفاظت کرنا۔ یہ سب نہ صرف فلم کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ قومی یکجہتی کے سلسلے میں ہمارے گنگا جمنی تہذیب کے ہندوستانی سماج پر بھی اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

ہیرو دیب مکرجی نے شاید ہی کہیں متاثر کیا ہو۔ مگر نندا نے ایک تعلیم یافتہ گھر گرست اور آدرش وادی عورت کے اونچے مقام و مرتبہ سے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے



"موسم سہانا ہے دلکش زمانہ ہے"۔ پھر خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ چلو جلدی سے پیڑوں کے آگے پیچھے بھاگ کر محمد رفیع اور لتا کی آواز میں ایک ہٹ گیت گائیں۔ دھرمیندر اور آشا پاریکھ فلم "میری دھرتی میرا دیش" میں

اپنے کردار کو خوب نبھایا ہے۔ [illegible]
کی ستائی ہوئی ایک معصوم لڑکی کے [illegible] فنکارانہ
صلاحیتوں کو خوب اجاگر کیا ہے۔ [illegible] کہیں
[illegible] رول [illegible] ہے۔

[illegible] دو گانوں کے جیسے "کوئی مانے یا نہ مانے کل [illegible] آجائے" اور "یہ عام آدمی کالا اوروں کے کام آئے" (قوالی) جو فلم کا [illegible] دینے میں راہل دیو [illegible] نے زیادہ محنت نہیں کی ہے۔ مکالمے، فوٹو گرافی [illegible] ہے مگر بحیثیت مجموعی ادھیکار، خاصی [illegible] ہر شخص کے دیکھنے کے قابل فلم ہے، اور [illegible] اس سے ترغیب حاصل کریں تو ہمارے [illegible] قومی یکجہتی، انسان دوستی، سارے مذاہب کی عزت و احترام کے سلسلے میں آج کے ہندوستان کی بہت بڑی سماجی اور قومی خدمت ہوگی۔

نئی فلمیں

میرے سجنا

کمل جیت پروڈکشن کے تحت ایک نئی فلم "میرے سجنا"

نہیں — یہ منظر فلم "آدھی رات" کا نہیں ہے۔ بلکہ سنجیو کی آنے والی فلم "دور ہٹ جا [illegible]" کا ہے۔ فلم کے [illegible] ہیں [illegible] اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہے۔

کی شوٹنگ جاری ہے۔ [illegible]
متعلق ہے۔ راکھی اور نوین نشچل، اجیت اور [illegible] اس کے
اہم کردار ہیں۔ ہدایت ڈائریکٹر برج کے تفویض ہے۔ گیت
مجروح کے ہیں اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال دے رہے ہیں۔

گورا اور کالا

ششکر موونیر کمبز سے ڈبل رول کی ایک اور دلچسپ فلم "گورا اور کالا" میں راجندر کمار اور ہیما مالنی کو لیا گیا ہے۔ راجندر کمار نے اس فلم میں دو بھائیوں کا ڈبل رول ادا کیا ہے جو ہر اعتبار سے مختلف ہیں۔ دوسرے اداکاروں میں ریکھا، پریم ناتھ، مدن پوری، سلوچنا، رندھیر قابل ذکر ہیں۔ موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہے۔

شرمیلی

سوبودھ مکرجی پروڈکشن کی یہ "شرمیلی" گلشن نندہ کی کہانی پر مبنی ہے جس میں ششی کپور اور راکھی ہیڈنگ رول ادا کر رہے ہیں۔ کاسٹ میں ان کے علاوہ نذیر حسین، نریندر ناتھ، افتخار، سلوچنا، کندن، دلاری وغیرہ کو لیا جا رہا ہے۔ فوٹو گرافی این۔ وی سری نواس کی ہے۔ نیرج کے گیت ہیں۔ اور۔ ایس۔ ڈی۔ برمن کی موسیقی ہے۔

بے ایمان

سوہن لال کپور ایک بڑی کاسٹ کی فلم "بے ایمان" بنا رہے ہیں جس کی ہدایت بھی خود ہی دے رہے ہیں۔ حال ہی میں دس دن تک اسکی شوٹنگ کی جا چکی ہے۔ جس میں منوج کمار، راکھی، بلراج ساہنی، ناظمہ، پریم چوپڑا اور پران نے حصہ لیا۔ "بے ایمان" کی کہانی سچن بھومک نے لکھی ہے۔ ویدراہی نے مکالمے لکھے ہیں اور ورما ملک کے گیتوں پر شنکر جے کشن موسیقی ترتیب دے رہے ہیں۔



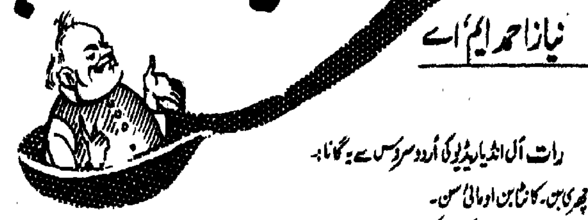
ڈیڈی پوچھ رہے ہیں "لڑکا پسند ہے؟" لڑکی کہہ رہی۔ یوگیتا بالی اور اوم پرکاش فلم "پرلانہ" میں۔
نوین نشچل اور امیتابھ بچن فلم کے دوسرے اداکار ہیں



امیتابھ بچن کا مقام نئے آنیوالے اداکاروں میں سب سے بلند ہے۔ بچن کی پہلی فلم "سات ہندوستانی" تھی۔ جس نے ایک ہندوستانی کے رول میں بہت متاثر کیا۔ "آنند" میں ڈاکٹر بھاسکر کے رول میں بچن نے جان ڈال کر ظاہر [illegible] ان میں سنجیدہ اداکاری کی قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں۔ فلم "پیار کی کہانی" میں بچن ہیرو بن کر آ رہے ہیں۔ اداکاری عمدہ [illegible]

چمچہ گیری بھی ایک فن ہے

نیاز احمد ایم اے



رات آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس سے یہ گانا:

"چھری بن۔ کانٹا بن اومائی سن۔

سب کچھ بن کسی کا چمچا نہ بن"

سنا تو سگا اپنے مرحوم بزرگ کی یاد آگئی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ چمچا گیری انسان ہی کی طرح قدیم ہے۔ انسان جب پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا تب بھی چمچے مختلف شکل میں موجود تھے۔ بہر حال کہنے کا یہ مطلب ہے کہ چمچا گیری ایک قدیمی فن ہے، گو اس کا پرانے زمانے میں زیادہ رواج نہیں تھا۔ اِدھر دو تین صدیوں میں اس فن نے کافی ترقی کی ہے۔ چمچا گیری تو بالکل جدید نام ہے ورنہ اس کے مختلف زمانوں میں مختلف نام تھے۔ "ہم نشین" مصاحب، بی حضوری، حاشیہ بردار، اور خیمہ بردار وغیرہ۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ پہلے جتنا بڑا شاعر ہوتا تھا اتنا ہی بڑا چمچا مانا جاتا تھا۔ چنانچہ اردو کے ایک بلند آہنگ شاعر نے صاحب کے کف دوست کی چکنی ڈلی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ یہ صرف شاعرانہ تعلّی نہیں تھی بلکہ اس میں چمچا گیری کا عنصر بھی شامل تھا۔

عام طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ چمچے اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لئے غلط باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ سچی بات زبان سے نکل گئی تو چمچے کی حجامت بن جاتی ہے جیسا لکھنؤ کے نواب کے دربار میں ایک "ہم نشین" شاعر کا حال ہوا۔ اتنا بڑا شاعر گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور اول جلول بکتا تھا۔

پرانے زمانے میں چمچوں یا حاشیہ برداروں میں ایک طرح کی وضعداری ہوا کرتی تھی اور اُردو قصیدے کی طرح ربط و تسلسل اور حفظ مراتب کے پابند ہوتے تھے کیونکہ ان کی باقاعدہ تنخواہ مقرر تھی اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ لیکن

آج کل کے چمچے جدید شاعری کی طرح بالکل غیر مربوط اور بے ڈول واقع ہوئے ہیں۔ نہ وضعداری، نہ عہد وفا کا پاس بلکہ چھوٹے بڑے مصرعے والی نظم کی طرح ناہموار کردار سے مزین جب تک باس کے سر پر چاندنی جلوہ فگن رہی ساتھ ساتھ رہے جہاں تاریکی نے ڈیرا جمایا کسی دوسری روشنی کی طرف لپکے۔ میرے دادا نے اپنے دادا سے سنا تھا اُنھوں نے بھی کسی سے سنا ہی ہوگا کیونکہ وہ بے چارے اتنے مالدار نہیں تھے کہ باتنخواہ حاشیہ بردار رکھتے۔

"ایک بڑے آدمی کے یہاں ان کا چمچا دوپہر کے وقت پہنچا گھر میں خبر کی۔ صاحب ڈکارتے ہوئے برآمد ہوئے۔ چمچے نے کہا: "کوئی لذیذ غذا کھائی گئی ہے کیا بڑی خلاصہ ڈکار آرہی ہے!"

انھوں نے کہا۔

"آج آلو کی ترکاری بنی تھی" چمچا جھٹ سے بولا۔

"حضور کے یہاں آلو کی بنی ہوئی ترکاری کے سامنے مرغ مسلّم ہیچ ہے" صاحب نے کہا۔

"ذرا گرم ہوتا ہے" چمچا بولا۔

"گرم۔ ارے صاحب آگ ہوتا ہے آگ"

خیر یہ تو پرانی باتیں تھیں، بہت پیسے والے لوگ ہی چمچے رکھتے تھے۔ مگر آج کل تو جس نے سال میں پانچ دس ہزار کما لیا دو چار چمچے آگے پیچھے رہنے لگے کیونکہ اس زمانے میں چمچوں نے تنخواہ کی قید اٹھا لی ہے۔ اب یہ چمچے کی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے باس سے کتنا اینٹھ لیتا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتادوں کہ آج کل کے "ممدوح" باس کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ہمارے شہر میں دو بھائی غلہ بیچتے ہیں [illegible] میں بنتی نہیں دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ان کے یہاں بھی ان "ذات شریف" کی کمی نہیں ہر وقت چار چمچے رہتے ہیں۔ اگر کسی چمچے کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو فوراً صاحب کے پاس جاکر کہتا ہے۔

"آج میں فلاں ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ آپ کے "دشمن میاں" آئے اور آپ کے بارے میں غلط سلط بکواس کرنے لگے۔ میں نے بھی وہ لتاڑا اتنی کھنچائی کی کہ ان کی [illegible]"

باس بولے "اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا"

چمچے نے دیکھا کہ لوہا خوب تپ گیا ہے تو جھٹ اپنا مطلب بیان کرنے لگا۔

"پار سال گھر بنوایا تھا مگر پتہ نہیں کیا خامی رہ گئی چھت ٹپکنے لگی۔ دو بوری سمنٹ کی ضرورت ہے کہیں مل نہیں رہا ہے"

باس نے کال بیل دبائی۔ نوکر حاضر ہوا۔

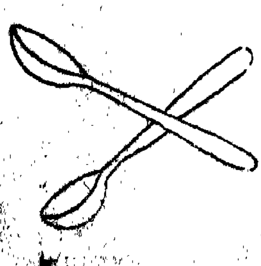
"ان کو دو بوری سمنٹ دے دو"

اس قسم کے واقعات آئے دن ہمارے شہر میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور چمچے بڑے فخر سے یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ:

"میں نے فلاں صاحب سے اتنا اینٹھ لیا"

آج کل کے باس چمچوں کی رائے کو ذرا اہمیت نہیں دیتے بلکہ عموماً ان کے خلاف ہی کرتے ہیں پتہ نہیں اس میں کیا بھید ہے، واللہ اعلم۔ دیکھئے اگر آپ کو کسی کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ فلاں کا چمچا ہے تو خدا کے لئے اس کو چمچا کہہ کر مخاطب نہ کیجئے گا ورنہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہوجائے گا۔ ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ تم فلاں کے معاملات میں کافی دخیل ہو تو وہ بہت خوش ہوگا اور مجھے خدشہ ہے کہ کہیں آپ کو چائے یا کوکا کولا کی پیشکش نہ کردے۔

بہر کیف آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس نے تمام بالغوں کو بروقت آگاہ کردیا ہے اب باپوں کو سوچنا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کو چھری کانٹا بناتے ہیں یا چمچا۔





تصویر ـــ میری رضیہ

وہ دیوانہ وار سفید ہیولے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

انوار صدیقی

کہر کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی دسمبر کی وہ آخری رات بہت زیادہ سرد تھی۔ سردی کی لہر نے سر شام ہی سے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔۔۔ لوگ اپنی اپنی کوشش گھروں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ سڑکیں سنسان ہو کر رہ گئی تھیں کبھی کبھی کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز کسی گوشے سے ابھرتی اور پھر ہوا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا الیکٹرک پولز میں لگے ہوئے دودھیا بلب بھی گہری دھند میں سہمے سہمے نظر آ رہے تھے۔ ہوا کے تیز جھکڑوں نے طوفانی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج کی رات شہر پر کوئی بھیانک قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

ماڈل کالونی کی تیسری شاہراہ بھی گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن بائیں جانب والی ساتویں عمارت کی دوسری منزل پر ابھی تک زندگی کے کچھ اثرات موجود تھے۔

فلوریسنٹ لائٹ کی روشنی میں وہ کمرہ کسی کی خواب گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چیز انتہائی سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ دیواروں پر جا بجا خوبصورت مناظر والی پینٹنگز کے فریم نظر آ رہے تھے۔ سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے خواب گاہ کے مشرقی حصے میں بنے ہوئے آتش دان میں لکڑیوں کی آگ روشن تھی جس کی لپٹ سے اٹھنے والے شعلوں کا عکس اس نوجوان کے چہرے پر بھی لہرا رہا تھا جو آتش دان کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر بھاری نائٹ گاؤن موجود تھا۔ چہرے کے تاثرات بوجھل بوجھل سے لگ رہے تھے۔

قد و قامت کے اعتبار سے وہ ہٹا کٹا نظر آ رہا تھا۔ کشادہ پیشانی پر بے شمار شکنیں موجود تھیں۔ آنکھوں میں پھیلی ہوئی ویرانی اس کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی! اپنی کرسی پر ساکت و جامد بیٹھا وہ مسلسل بڑی دیر سے آتش دان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں کو ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہا تھا!۔

خواب گاہ میں موت کی سی خاموشی طاری تھی لیکن پھر اچانک نوجوان اس طرح چونکا جیسے وہ دستک بیرونی دروازے کے بجائے اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے ابھری ہو۔۔۔ اس کی نگاہیں آتش دان میں رقص کرتے ہوئے شعلوں سے ہٹ کر دروازے پر جم گئیں۔ کھٹ!۔ کھٹ دروازے پر دوسری بار دستک کی آواز ابھری اور پھر نوجوان کسی حساس اور چالاک چیتے جیسے انداز میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اس نے سیدھا ہاتھ گاؤن کی جیب میں ڈال کر اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے بھرے ہوئے ریوالور کے دستے پر مضبوطی سے جمایا پھر قدم بڑھاتا ہوا دروازے کے قریب آ گیا۔ ایک ثانیے کے لیے رکا پھر الٹے ہاتھ سے لائٹ گرائے اور جھپٹ کر بائیں جانب والی دیوار سے چپک گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک تنومند جوان بڑی لاپروائی سے قدم بڑھاتا ہوا خواب گاہ کے اندر آ گیا اس کے جسم پر سیاہ پتلون اور بھاری جیسٹر موجود تھا۔ سر پہ فلٹ ہیٹ تھی اور ہاتھوں میں چرمی دستانے نظر آ رہے تھے۔

دیوار سے چپکے ہوئے فرد نے جیسے ہی آنے والے کو دیکھا اس کے چہرے پر نظر آنے والا کھنچاؤ یکلخت ختم ہو گیا سیدھا

تہ ریوالور سکوٹ سے ہٹ کر جیب سے باہر آگیا۔ اس
۔ ایک طویل سانس لی تھی جیسے کسی بڑے خطرے سے چھٹکارا
گیا ہو۔

"اوہ!... تم یہاں موجود ہو" چیسٹر والے نے گھوم کر
جوان کو دیکھا پھر اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ
بھر آئی "سمجھا!... دستک کی آواز سنکر تم کو شاید پھر اسی خطرے
احساس ہوگیا ہوگا جس نے تمہارے اعصاب کو بہت دنوں سے
بلڈر رکھا ہے، کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں"۔

نوجوان نے جواب دینے کے بجائے دوبارہ ایک سرد
ہ بھری پھر دروازے کو لوٹ کر کے دوبارہ اپنی آرام کرسی
۔ آگیا! ایکبار پھر اس کے چہرے پر الجھن اور تفکرات کے ملے
لے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے! نوواردنے کپڑے
بدل کئے اور پھر وہ بھی آتشدان کے قریب رکھی ہوئی دوسری
رسی پر آگیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اپنے گرد وہم کا جال بن رہے ہو۔
. وارد نے اپنے ہاتھوں کو آگ پر تاپتے ہوئے نوجوان کو مخاطب
یا" میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بھی تم سے کسی قسم کا انتقام لینے
۔ تلے ہونگے۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے شیرازی" نوجوان نے لرزتی ہوئی
ازسے جواب دیا" وہ خبیث بوڑھا ابھی تک مجھے اپنی بیٹی
قاتل سمجھ رہا ہے۔ رضیہ کی موت جن حالات میں پیش آئی
ں وہ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس نے بارہا مجھے
ن پر اس بات کی دھمکی بھی دی ہے کہ جب تک وہ رضیہ کی موت
بدلہ مجھ سے نہ لے لے چین سے نہیں بیٹھیگا۔

"آئی سی" نووارد جسے شیرازی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا
خت سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھے ہوئے
گار بکس کو کھولا پھر ایک سگار نکال کر جلایا اور اس کے

"اگر تم مجھے دماغی ہونے کا طعنہ نہ دیتے تو شاید آج
بھی میں اپنی زبان بند رکھتا" نوجوان نے اپنے نچلے ہونٹ
چباتے ہوئے کہا" تمہاری جگہ اگر کسی دوسرے انسپکٹر کو
تفتیش پر معمور کیا جاتا تو ممکن تھا میں اسے پہلی ہی ملاقات میں
تفصیلی حالات سے آگاہ کر دیتا لیکن تم میرے دوست ہو
اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ذاتی مشاہدوں اور تجربات
کی روشنی میں اپنی رپورٹ مرتب کرو۔ دوستی کی آڑ لے کر
میں تمہاری ہمدردیوں کو نہیں حاصل کرنا چاہتا۔

نوجوان کے چہرے پر کرب کی سنجیدگی مسلط ہوگئی! اس
نے نظر پھر کر انسپکٹر شیرازی کو دیکھا پھر اٹھ کر اس دروازے
کے قریب آگیا جو بائیں باغ کی سمت بالکونی میں کھلتا تھا۔
دروازہ کھول کر وہ بالکونی میں آیا پھر ماحول سے بے نیاز ہوکر
ریلنگ پر کہنیاں جمائیں اور بائیں باغ کے اس حصے کی طرف
دیکھنے لگا جہاں رات کی رانی کا پودا اس وقت بھی مہک
رہا تھا۔

سردی کی شدت ہر لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔

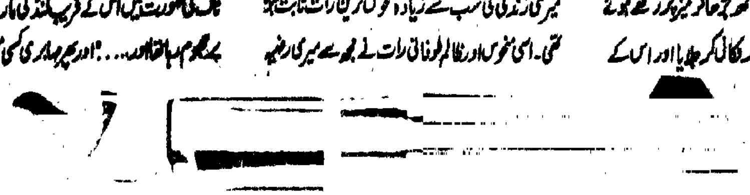
"اُف... میرے خدا... انسپکٹر شیرازی نے جھرجھری
لیتے ہوئے اپنے آپ سے کہا پھر تیزی سے اٹھا اور لمبے لمبے
قدم اٹھاتا ہوا بالکونی میں آگیا" پلیز صابری۔ رحم کرو اپنی
حالت پر کیا تمہیں ٹھنڈ کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے ساتھی
گاڈ! کیسی سرد اور طوفانی رات ہے"

"وہ بھی ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی انسپکٹر" صابری
نے دردناک لہجے میں کہنا شروع کیا" اس رات بھی سرد ہوا
کے جھونکے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے
تھے میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتا اس لئے کہ وہ رات
میری زندگی کی سب سے زیادہ منحوس ترین رات ثابت ہوئی
تھی۔ اسی منحوس اور ظالم طوفانی رات نے مجھ سے میری رضیہ

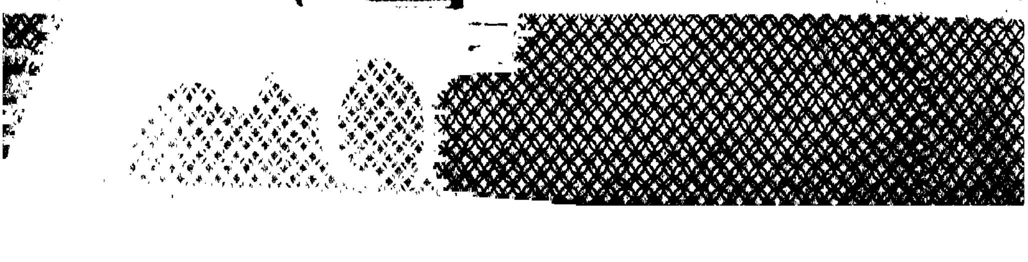
کر چھین لیا تھا" آخری جملہ کہتے وقت صابری کا پورا جسم شدید
مجنوں کی طرح کانپ اٹھا۔ پتا نہیں وہ سردی کا احساس تھا
یا رضیہ کی موت کا بھیانک تصور جس نے اس کے پورے وجود
کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔

"صابری! کیا یہ حقیقت ہے کہ رضیہ کی موت کا باعث
رات کی رانی کا پودا ہی ثابت ہوا تھا"

"ہاں میرے دوست! وہ بڑی محبت اور ارمانوں
سے وہ پودا خرید کر لائی تھی۔ نہ جانے کیوں رات کی رانی کے
اس منحوس پودے کو دیکھ کر مجھے ایک انجانے خوف کا احساس
ہوا تھا میں اس احساس کو کوئی نام نہیں دے سکتا لیکن میں
نے رضیہ سے کہا ضرور تھا وہ اس پودے کو تلف کر دے مگر
وہ میری بات کو ہنس کر ٹال گئی!... اس نے خود اپنے ہاتھوں
سے اس پودے کو لگایا اور پھر اس طرح کی نگہداشت کرتی
جیسے اُسے پودے سے گہری عقیدت ہو اور پھر صابری
کی آواز غمناک ہوتی چلی گئی! اس نے رندھی ہوئی آواز میں
تھوڑے توقف کے بعد کہا" اس طوفانی رات میں ہم جلد
ہی سو گئے تھے۔ لیکن!... اف میرے معبود! کس قدر کربناک
انداز میں چیخی تھی رضیہ! اس کی چیخ کی آواز سن کر میں بیدار
ہوا پھر جب میں نے اس کے بستر کو خالی پایا اور دروازہ کھلا
دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی مافوق قوت نے میرے
جسم کی تمام قوتوں کو جکڑ رکھا ہے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں
کہ میں کس طرح بے تحاشا دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا پائیں
باغ میں پہنچا تھا!... جانتے ہو وہاں میں نے کیا دیکھا جیسے
میری زندگی!... میری روح اسی رات کی رانی کے پودے
کے قریب بے حس و حرکت تھی اور موت کا دیوتا ایک کالے
ناگ کی صورت میں اس کے قریب کنڈلی مارے بیٹھا اپنی فتح
پر جھوم رہا تھا اور..." اور پھر صابری کسی معصوم بچے کی



زنگین طویل کش لینے کے بعد کہا" تم نے آج سے قبل مجھے
بات نہیں بتائی تھی۔



...ک کر رونے لگا۔

...پکٹر شیرازی بڑی مشکلوں سے اسے سہارا دیکر ...س نے بالکونی کا دروازہ بند کیا اور صابری کے ...ٹھ گیا۔ مگر وہ ابھی تک اس کے ہونٹوں کے درمیان ...تھا۔ صابری کی سسکیوں کی آواز بہت دیر تک ... پھر اچانک وہ اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا اور دروازے ...کر کے تیز تیز پلکیں جھپکانے لگا جیسے کچھ سننے کی ...سا ہو انسپکٹر شیرازی اسے متحیرانہ انداز میں گھورنے لگا ...م نے کچھ سنا؟ صابری نے شیرازی کی طرف دیکھ کر ...رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ رضیہ کی روح پائیں ...ھرہی ہے۔ وہ مجھے آواز دے رہی ہے، سنو ...!...

...تمہارا وہم ہے۔ شیرازی نے کچھ دیر بعد الجھے ہوئے ...ہا۔ مجھے طوفانی ہواؤں کی شائیں شائیں کے علاوہ ...ری آواز نہیں سنائی دے رہی...

...تم مت یقین کرو میرے دوست... لیکن میں رضیہ ...روح کو بارہا پائیں باغ میں رات کی رانی کے پودے ...بھٹکتا دیکھ چکا ہوں اور اکثر... صابری نے اچانک ...مکمل چھوڑ دیا... ایک بار پھر وہ ایسی پوزیشن میں آگیا ...مدھم آواز کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

یار خدا کے لئے ہوش میں آجاؤ... میں پھر کہتا ہوں ...کچھ تمہارا وہم ہے۔

...ہش... آہستہ بولو انسپکٹر... صابری نے ...ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شیرازی کو خاموش کرنے کا اشارہ ...پنجوں کے بل چلتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب آگیا ...انسپکٹر شیرازی نے اسے بڑی آہستگی اور خاموشی کے ...ٹ گراتے دیکھا... دوسرے ہی لمحے صابری باہر ...تھا۔ شیرازی کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے ...سے اٹھا اور دبے قدموں چلتا ہوا بالکونی میں کھلنے ...دروازے کے قریب گیا اور اسے کھول کر تیزی سے ...گیا... خوابگاہ کی روشنی ہر چند کے ناکافی ...س کی وجود اس نے پائیں باغ میں ایک سائے ...کے قریب بیٹھے دیکھ لیا... سرتاپا سفید لباس ...ایک انسانی ہیولا رات کی رانی کے پودے ...انسپکٹر شیرازی اگر آج کی رات بھی

رضیہ کی بے چین روح مجھے نظر آگئی تو میں کل صبح اپنی رپورٹ کو مرتب کر کے حکام کے سامنے پیش کردوں گا۔

"تم جب چاہو یہاں رہ کر واقعات کا مطالعہ کرسکتے ہو" صابری نے اپنی نظر میں آتشدان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہٹا کر شیرازی کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا "جہاں تک میری رضیہ کی روح کا تعلق ہے وہ اب میری خواہشات کے تابع نہیں ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ آج رات بھی تم کو نظر آجائے!... ویسے اب تک یہی ہوا ہے کہ وہ ہر رات بڑی پابندی سے رات کے کسی حصے میں پائیں باغ میں ضرور آتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات کی رانی کے پودے سے اس کے گہرے لگاؤ کا نتیجہ ہو جو رات کو اسے وہاں آنے کے لئے مجبور کردیتا ہو۔

"میں بھی اسی نتیجے پر پہونچا ہوں۔" انسپکٹر شیرازی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ "آج کی رات بھی بے حد سرد ہے!... سردی کی لہر جیسے رگ و ریشے میں سرایت ہوتی جارہی ہے!... کیا اس وقت میں تم کو کافی کے ایک گرما گرم بیکر (BEAKER) کے لئے زحمت دینے کی جسارت کرسکتا ہوں"

"میں خود بھی اس وقت کافی کی خواہش کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا!... تم بس دو منٹ انتظار کرو میں ابھی بنا کر لاتا ہوں۔" صابری نے کہا پھر اٹھ کر ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

انسپکٹر شیرازی پھر کسی گہری سوچ میں گم ہوگیا! دوبارہ وہ اس وقت چونکا تھا جب دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے گیارہ کے عمل کا اعلان کیا تھا۔ ایک منٹ بعد صابری اپنے ہاتھوں میں کافی کے بیکر تھامے دوبارہ خواب گاہ میں داخل ہوا!... کافی کے ایک ہی گھونٹ نے انسپکٹر شیرازی کے اعصاب کو خاطر خواہ سکون بخشا تھا۔

وقت بڑی سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ کافی ختم کرکے انسپکٹر شیرازی نے پاؤں پر پڑے ہوئے کمبل کو گھسیٹ کر اوپر کیا پھر قریب رکھی ہوئی گول میز سے انگریزی رسالے کو اٹھا کر ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔ صابری نے آتشدان کے قریب رکھی ہوئی لوہے کی سلاخ کو اٹھایا اور سلگتی ہوئی لکڑیوں کو ریدنے لگا۔ خوابگاہ میں ایک بار پھر بوجھل سکوت طاری ہوگیا لیکن یہ سکوت دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

صابری کے ساتھ انسپکٹر شیرازی بھی چونک کر کرسی پر سیدھا ہوگیا۔ وہ کسی قسم کی آہٹ ہی تھی جس نے دونوں کو چونکا دیا! صابری کی آنکھوں میں دہشناک اداسی کہل کر گہری ہونے لگی! چند لمحات تک وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر اچانک اس نے شیرازی سے مدہم آواز میں کہا۔

"سنا تم نے... قدموں کی آہٹ!... شاید میری رضیہ کی بے چین روح پائیں باغ میں ٹہل رہی ہوگی۔"

"ٹھہرو!... انسپکٹر شیرازی نے تیزی سے کمبل گھسیٹ کر علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج میں بھی تمہارے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔"

"نہیں!... نہیں میرے دوست تم میرے ساتھ مت چلو ورنہ وہ غائب ہوجائے گی" صابری نے ملتجی نظروں سے شیرازی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میرے سوا کسی اور کو دیکھ کر وہ ہمیشہ نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔"

انسپکٹر شیرازی کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے تھے لیکن ٹھیک اسی وقت پائیں باغ کی جانب سے ایک گرجدار آواز ابھری تھی "میں کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا"

"یہ!... یہ کون تھا" صابری نے حیرت سے پوچھا پھر تیزی سے سانس روکے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اچانک ایک دوسرا ہیولا بھی اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پہلے سائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"صابری... شیرازی نے سوچا پھر جھپٹ کر بالکونی کی خواب گاہ میں آیا!... مغربی گوشے میں بچھی ہوئی مسہری کے تکیے کے نیچے سے اپنا سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں دبایا پھر دوڑتا ہوا خواب گاہ میں سے نکلا اور نیچے جانے والے زینوں پر اترنے لگا۔ لیکن پائیں باغ میں پہنچ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رات کی رانی کے پودے کے قریب سبزے پر صابری چت پڑا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

سفید پوش ہیولا غائب ہوچکا تھا۔ شیرازی نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر صابری کی نبض ٹٹولی جو تیزی سے چل رہی تھی۔

۲

دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی صابری چپ چپ سا نظر آرہا تھا! اس کے چہرے پر کسلمندی کے تاثرات موجود

تھے۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں جیسے گزشتہ رات وہ ایک منٹ کے لئے بھی سو نہ سکا ہو۔ انسپکٹر شیرازی اپنی کرسی پر بیٹھا خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صابری خود ہی گزشتہ رات پائیں باغ میں پیش آنے والے واقعات پر روشنی ڈالے گا لیکن نہ جانے کیوں صابری کی طویل خاموشی نے اسے الجھن میں ڈال دیا!... سفید پوش ہیولا اس وقت بھی اس کے ذہن میں محفوظ تھا!... اس نے اپنی آنکھوں سے اسے رات کی رانی کے قریب کسی بد روح ہی کی طرح بھٹکتے دیکھا تھا۔

ناشتے کی میز پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر انسپکٹر شیرازی ہی نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"صابری! تمہارے لئے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس عمارت کو خالی کر کے کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔"

"کیوں..." صابری اس طرح چونکا تھا جیسے انسپکٹر شیرازی کی تجویز سے اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا ہو۔

"غلط مت سمجھو!... شیرازی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "حالات کے پیش نظر تمہارا یہ اقدام بے حد مناسب ہوگا! گزشتہ رات کے واقعات سامنے آنے کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔"

"اوہ!..." صابری نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر درد ناک آواز میں بولا "میرے دوست! تم شاید یہ مت سمجھ بیٹھے ہو کہ رضیہ کی بھٹکتی ہوئی روح میرے دل و دماغ پر کوئی غلط اثر ڈال رہی ہے! لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے! مجھے اسکی بے چین روح کو دیکھ کر صدمہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک میرے لئے بے چین ہے!... میری وابستگی کے لئے یہی کیا کم ہے کہ میں اسے دیکھ سکتا ہوں!... اگر میں نے تمہارے مشورے کو قبول کر لیا تو رضیہ کی روح کو اذیت ناک صدمہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے! میں اپنا مشورہ واپس لیتا ہوں" انسپکٹر شیرازی نے دبی زبان میں کہا پھر چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

صابری کے چہرے پر بڑی دہشت ناک افسردگی مسلط تھی۔

"دو چار روز کے اندر میں اپنی رپورٹ مرتب کر کے افسران کی خدمت میں پیش کر دوں گا" شیرازی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا "اسی رپورٹ کی ایک کاپی انشورنس کمپنی کو بھی روانہ کر دی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میری تفصیلی رپورٹ دیکھ کر تمہارے خسر بھی مطمئن ہو نگے اور پھر تمہاری پریشانیوں میں تھوڑی سی کمی ہو جائے گی۔"

"شاید..." صابری نے رندھی ہوئی آواز میں کہا پھر کرسی کی پشت سے ٹیک کر خلاء میں گھورنے لگا۔

"کیا یہ درست ہے کہ تم نے رضیہ کے والدین کو اسکی موت کی اطلاع تجہیز و تکفین کے بعد کی تھی۔"

"ہاں!... اس وقت مجھے اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ میں کسی کو مطلع کرتا!... ویسے بھی وہ لوگ شروع سے میرے مخالفین میں سے تھے!... رضیہ سے وہ محض اس لئے ناراض تھے کہ اس نے مجھ جیسے ایک معمولی اسٹنٹ سے شادی کیوں کر لی"

"جانتے ہو تمہارے خسر نے تفتیش کے سلسلے میں مجھے کیا تجویز پیش کی تھی۔"

"کیا...؟"

"انھوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں مرحومہ کی لاش کو قبر سے نکلوا کر اسکا پوسٹ مارٹم کراؤں" انسپکٹر شیرازی نے سپاٹ لہجے میں کہا پھر صابری کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بولا "جانتے ہو میں نے کیا جواب دیا تھا!... میں نے انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ اگر مناسب سمجھا گیا تو یہ کاروائی بھی ضرور کی جائے گی۔"

"اب تم کس نتیجے پر پہنچے ہو..." صابری نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا اب بھی...."

"نہیں!... شیرازی نے تیزی سے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

!... یہ درست ہے کہ رضیہ طبعی موت نہیں مری لیکن بہر حال!... میں پورے طور سے مطمئن ہوں کہ اس کی موت میں کسی سازش کا ہاتھ نہیں۔"

صابری نے تشکرانہ انداز میں انسپکٹر شیرازی کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"عمارت کی تبدیلی کا مشورہ میں واپس لے چکا ہوں لیکن رات کی رانی کا وہ پودا..." انسپکٹر شیرازی ایک لمحے کے لئے رکا پھر گہری سنجیدگی سے بولا "میرا قیمتی مشورہ ہے کہ تم اسے اپنی پہلی فرصت میں اکھاڑ پھینکو ورنہ...."

"ممکن ہے کہ وہی کالا ناگ جسنے میرے سکون کو ڈس لیا تھا کسی روز میرے وجود کو ختم کر دے گا" صابری نے جملہ مکمل کر دیا پھر اس کی آنکھیں دہشتناک انداز میں چمکنے لگیں "میرے دوست!... میں تمہارا یہ مشورہ بھی قبول نہیں کر سکتا!... ممکن ہے تم اسے میری دیوانگی سے تعبیر کرو لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اس دن کا بڑی بے چینی سے منتظر ہوں جب موت کا وہ دیوتا مجھے بھی میری رضیہ سے ملا دیگا۔"

"فی الحال میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تمہارے تھکے ہوئے ذہن کو سکون کی سخت ضرورت ہے۔" انسپکٹر شیرازی نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا پھر اٹھتا ہوا بولا "میں اب جا رہا ہوں! دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار مت کرنا ممکن ہے میری واپسی شام سے پہلے نہ ہو سکے۔"

انسپکٹر شیرازی یہ کہہ کر ایڑیوں کے بل گھوما پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا ڈائننگ روم سے باہر نکلتا چلا گیا۔ صابری نے دوبارہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

۳

انسپکٹر شیرازی اپنے آفس میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا!... اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی!... ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک رُک کر کچھ سوچتا پھر دوبارہ ٹہلنے لگتا!... یہ کیفیت تقریباً سپرنٹنڈنٹ تک طاری رہی پھر اچانک کسی خیال کے تحت وہ تیزی سے اپنی ریوالونگ چیئر پر آگیا!... اب وہ اپنے ماتحت سارجنٹ غوری کو دیکھ رہا تھا جو بہت دیر سے اس کے آفس میں موجود تھا۔

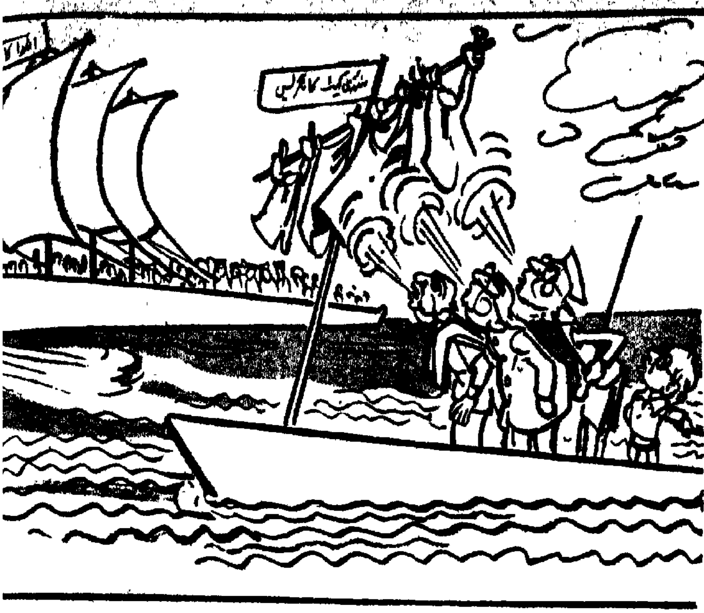
"آج رات تمہیں صابری کے مکان کی نگرانی کرنی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اندھیرا پھیلتے ہی پائیں باغ میں کسی ایسی محفوظ جگہ میں چھپ کر بیٹھ جاؤ کہ کوئی دوسرا تمہیں دیکھ نہ سکے۔"

"رائٹ سر..." سارجنٹ غوری نے مستعدی سے جواب دیا "میں بہت محتاط ہو کر پلاننگ کروں گا لیکن آپ کسی خاص نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔"

"ہاں!... مگر کسی حد تک!... اس کی تصدیق کے لئے میں تم کو یہ کام اہم سونپ رہا ہوں!... تمہیں وہاں چھپ کر کسی ایسی روح پر نظر رکھنی ہوگی جو سرتاپا سفید لباس میں ملبوس پائیں باغ میں اکثر راتوں کو ٹہلتی نظر آتی ہے۔"

"لیکن سر!... کیا آپ روح کے وجود کے قائل ہیں۔"

"اگر روح تمہیں نظر آجائے تو تم اسے روکنے کی کوشش کرو گے!... ہر ممکن کوشش۔ شیرازی نے سارجنٹ غوری



...کو نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ہوسکتا ہے یہ خرافات ہی ہوں ہم اس کیس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں۔

...شبہات میں سرگرم خفیف سی جنبش دی ...چاہتا تھا کہ میز پر رکھے ہوئے ... اور انسپکٹر شیرازی کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوگئی۔

"ہیلو!...." انسپکٹر شیرازی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے ... کہا پھر اچانک سنبھل کر بیٹھ گیا.... ...میں انسپکٹر شیرازی بول رہا ہوں!— جی ہاں ... گڈ.... یہ اطلاع میرے لئے اہم ثابت ہوسکتی ہے ... اب تک میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی!.. ٹھیک ہے اگر میں نے مناسب سمجھا تو اسے بھی دیکھ لوں گا ...مجھے افسوس ہے کہ محترم آپ ایک بے بنیاد خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دے رہے ہیں!.... درست فرمایا آپ نے میں اس کی تردید نہیں کروں گا لیکن فرائض کی ادائیگی کے وقت ... میں نے اپنوں اور پرایوں کی تمیز کو کبھی بھی ملحوظ نہیں رکھا.... تھینکس!" انسپکٹر شیرازی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا پھر ایک زوردار جھٹکے سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

"کس کا فون تھا سر....؟"

"رضیہ کے والد کا.... اس کا خیال ہے کہ صابری چونکہ ... دوست ہے اس لئے میں کیس کے کچھ اہم پہلوؤں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میرے لئے کوئی اور ہدایت بھی ہے؟"

"نہیں اب تم جا سکتے ہو" انسپکٹر شیرازی نے بدستور ... ہوئے لہجے میں کہا پھر اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگا۔

اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات ... رہے تھے۔

۴

شروع جنوری کی وہ رات اگرچہ طوفانی تھی لیکن حد ... سرد تھی۔

صابری حسب سابق اس وقت بھی آتشدان کے قریب ... کرسی پر بیٹھا لکڑیوں کے اوپر رقص کرتے ہوئے ... کو خالی ذہن سے گھور رہا تھا.... دوسری طرف انسپکٹر ... کسی گہری سوچ میں غرق تھا!.. خواب گاہ

میں بوجھل سکوت طاری رہا پھر انسپکٹر شیرازی کی آواز ماحول کے سکوت کو چیرتی ہوئی ابھری تھی۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں صابری کہ تم نے اپنی چھت کے نیچے رہ کر حالات کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع فراہم کیا!... لیکن اب میری تفتیش مکمل ہو چکی ہے!.... ...سے دروازے کی طرف لپکا لیکن ابھی وہ دروازے سے باہر ہی نکل رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی پھر کوئی بڑی کربناک آواز میں چیخا!

انسپکٹر شیرازی کی نگاہیں چمک اٹھیں پھر وہ بھی صابری کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا زینوں کو طے کرتا ہوا پائیں باغ میں آگیا جہاں سارجنٹ غوری سبزے پر گھٹنوں کے بل بیٹھا کچھ دیکھ رہا تھا۔

"رضیہ!.... میری روح!... میری زندگی" صابری سارجنٹ غوری کے قریب پہنچ کر ہذیانی انداز میں چلایا پھر تیزی سے جھک کر اس جسم سے لپٹ گیا جو سفید لباس میں ملبوس بے حس و حرکت پڑا تھا۔

انسپکٹر شیرازی نے جیب سے اپنا سروس ریوالور نکالا پھر صابری کی پشت پر آکر کرخت لہجے میں بولا۔

"مسٹر صابری!... روح کا فریب اب ختم ہو چکا ہے۔ میں تم کو دھوکا دہی اور جعلسازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں تم نے اپنی بیوی کی موت کا جھوٹا ناٹک رچا کر انشورنس کی بھاری رقم کا وصول کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب ہو سکا۔

صابری پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیرازی کو گھورنے لگا۔

"میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے شروع سے لیکر اخیر تک بڑی شاندار اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دو موقعوں پر تم سے چوک ہوگئی۔" شیرازی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس روز ناشتے کی میز پر جب میں نے لاش کے پوسٹ مارٹم کا فرضی تذکرہ کیا تھا تو تمہارے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور آج!.... آج بھی میں نے اپنے اسی شبے کی بنا پر تم سے کہا تھا کہ اگر رضیہ کی بے چین روح مجھے نظر آگئی تو میں اپنی رپورٹ کل مکمل کر دوں گا۔

کانی کا مطالبہ بھی محض ایک بہانہ تھا!... میں اس طرح تم کو اس بات کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا کہ اگر میرے شبہات درست ہیں تو تم رضیہ کو روح کے فریب کا ڈراما اسٹیج کرنے کے لئے ضرور اکسا ؤ گے اور وہی ہوا۔ جو میں نے سوچا تھا۔"

پھر انسپکٹر شیرازی کے اشارے پر سارجنٹ غوری نے آگے بڑھ کر صابری کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں! رضیہ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس سبزے پر پڑی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ✻

نکسن سے انٹرویو



انقلابی کے قلم سے

وھائٹ ہاؤس کا ایک گوشہ لان میں ایک سیب کے درخت کے نیچے نکسن بیٹھے ہوئے خلا میں گھور رہے ہیں۔ چہرے پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ سکریٹری دبے پاؤں انکے قریب آتا ہے اور ہلکے سے کھنکارتا ہے۔ نکسن چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ سکریٹری مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ سے پوچھتا ہے۔

ہمارا نعرہ ہے: دنیا بھر کے چورو! ایک ہو جاؤ ———

ہمارا کام بھی دنیا بھر کے لوگوں کو لوٹنا ہے ——— •

"کیا بات ہے حضور! کیا طبیعت ناساز ہے یا پھر ٹریسیا سے جدا ہونے کا غم آپ کو کھائے جا رہا ہے"۔

نکسن۔ "اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس درخت پر جو لال سیب لٹک رہا تھا اسے کون کھا گیا میں نے بہت دنوں سے اس پر نظر لگا رکھی تھی۔

سکریٹری۔ "آپ کے دلاں ایڈولاکے سے آئے تھے ان کی نظر اس سیب پر پڑی اور وہ توڑ کر کھا گئے"۔

نکسن۔ "بہر حال اب یہ بتاؤ کہ اس وقت تم میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟"

سکریٹری۔ "حضور ایک ہندوستانی اخبار کا نامہ نگار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ ہم کئی بار اسے بھگا چکے ہیں لیکن وہ پھر بھی نہیں مانتا۔ اب اسنے باہر دھرنا دے دیا ہے۔ کہتا ہے اگر اسے آپ سے نہیں ملایا گیا تو وہ بھوک ہڑتال کر کے جان دے دے گا"۔

نکسن۔ بھوک ہڑتال سے خیر وہ مریگا تو نہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں ہندوستانیوں کو بھوکا رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ انہیں جتنا زیادہ بھوکا رکھا جائے ان کی صحت اتنی ہی زیادہ اچھی رہتی ہے۔ تاہم اسے جلدی سے بلاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

(پانچ منٹ بعد) سکریٹری ایک دبلے پتلے پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس شخص کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ شیو بڑھی ہوئی ہے، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں، ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے، بغل میں ایک بوسیدہ سی کاپی اور پنسل دبی ہوئی ہے وہ شخص قریب آکر ٹوکری زمین پر رکھ دیتا ہے اور ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے۔

نکسن۔ (ٹوکری کی طرف اشارہ کر کے) اس میں کیا ہے؟

اخباری نامہ نگار (انقلابی) اس میں حضور کے لئے کچھ آم

نکسن خوش ہو کر ٹوکری پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جلدی سے ٹوکری کھول کر ایک آم نکالتے ہیں اور اسے چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ آم کا رس اڑ کر انقلابی کے کپڑوں پر پڑتا ہے۔ جسے انقلابی چاٹنا شروع کر دیتا ہے (کیونکہ کئی روز سے بھوکا ہے)۔

نکسن۔ (آم چوستے ہوئے) ہاں بولو کیا کام ہے۔

انقلابی۔ حضور انٹرویو لینا ہے۔

نکسن۔ اوہ! میں سمجھا تھا کہ تم کچھ ڈالر مانگنے آئے ہو خیر پوچھ لو۔

انقلابی۔ سنا ہے کہ آپ کا ارادہ دوبارہ صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کا ہے۔

نکسن۔ ہاں کیونکہ ابھی ملک کو میری سخت ضرورت ہے۔

انقلابی۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ اس مرتبہ آپ کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ آپ نے ویتنام میں جنگ ...

...ستے اسے بڑھاوا دیا۔ آپ نے امریکی فوجوں کو مار کھانے
...لئے کمبوڈیا اور لاؤس بھی بھیج دیا۔ اب امریکی اتنی زیادہ
...ر کھا چکے ہیں کہ ان میں اور مار کھانے کی سکت نہیں۔
...نے اسرائیل کی اندھی حمایت کر کے مشرق وسطیٰ میں امن
...م اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آپ کے دور حکومت میں
...روزگاری بڑھی ہے۔ مہنگائی بڑھی ہے۔ ڈالر کا وقار
...میں ختم ہو گیا ہے۔ ان حالات میں بھی کیا ملک کو آپ کی
...ضرورت ہے؟

...کسن۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ مجھ سے بہتر
...ی اس کرسی کے لئے امریکا میں کوئی دوسرا نہیں۔ امریکا
...میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے عقلمند لوگ پیدا ہونا ہی
...بند ہو گئے ہیں۔ اس لئے مجھ سے بہتر صدر ڈھونڈنا امریکی
...عوام کے لئے ممکن نہیں کیونکہ اب یہاں جو عقلمند پیدا بھی
...ہوتے ہیں وہ کامیڈین بن جاتے ہیں۔

انقلابی۔ یعنی اندھوں میں کانا راجا۔

نکسن۔ ہاں جیسے موشی دایان۔

انقلابی۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کا ملک دنیا بھر میں ہمیشہ
...عوام دشمن اور انسانیت دشمن حکومتوں کا ساتھ دے؟
...افریقہ میں آپ جنوبی افریقہ اور رھوڈیشیا کی حکومتوں کا

امریکی اخبارات اور امریکی کانگریس شور مچا رہی ہے۔ سب
کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش کے لوگوں پر کیا جانے والا ظلم بند ہونا
چاہئے۔ اسی سلسلے میں آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

نکسن۔ اُن کے شور مچانے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ شور
مچاتے رہے اور ہم ویتنام میں عوام کا قتل عام کرتے رہے۔
یہ لوگ شور مچاتے رہے اور ہم جنوبی افریقہ کی گوری حکومت
کی امداد کرتے رہے۔ اب یہ لوگ شور مچاتے رہیں گے اور
ہم پاکستان کی مدد کرتے رہے گے۔

انقلابی۔ لیکن ظلم و تشدد سے عوام کو دبایا تو نہیں
جا سکتا۔ آپ ۲۵ سال سے ویتنام کے عوام پر ظلم کر رہے
ہیں لیکن انھیں دبانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

نکسن۔ وہاں ہم سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے
کہ عوام کچھ طاقت حاصل کرے انھیں اتنا مارنا چاہئے کہ ان
میں منھ کھولنے کی بھی سکت نہ رہے۔ ہم نے یہ غلطی پاکستان
میں نہیں دُہرائی۔ وہاں عوام کو اتنا مارا گیا کہ اب دس سال
تک ان میں سر اٹھانے کی بھی سکت پیدا نہیں ہو گی۔

انقلابی۔ کیا اس مسئلے سے ہند و پاک میں جنگ کے امکانات
نہیں بڑھ جائیں گے۔

نکسن۔ بالکل بڑھ جائیں گے۔ ہم تو چاہتے ہی یہی

اگر دنیا میں جنگ نہیں ہو گی تو ہمارے ہتھیار کون خریدے گا۔ ہماری فیکٹریاں بند ہو جائیں گی۔ لاکھوں امریکی بیروزگار ہو جائیں گے

ملک کی حالت پھر سے بہتر ہو جائے گی۔

انقلابی۔ بالکل بجا فرمایا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو
اپنے ملک سے اتنی زیادہ محبت ہے۔ واقعی آپ جیسا
شخص ہی امریکا کا صدر بن سکتا ہے۔

نکسن۔ اچھا اب ہمیں بھوک لگ رہی ہے اس لئے تم
اب باہر کی ہوا کھاؤ۔
تم ہمیں اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ابھی ہم ہارورڈ
یونیورسٹی کے صدر کو فون کرتے ہیں کہ تمہیں ایک سال
کے لئے وزیٹنگ پروفیسر لگا لیا جائے۔

انقلابی۔ جی!! بہت بہت شکریہ۔

نکسن۔ تم کمیونسٹ تو نہیں ہو۔

انقلابی۔ حضور آج تک تو تھا لیکن اب نہیں رہوں گا۔

امریکا میں دوسری جنگ عظیم کے بعد عقل مند لوگ پیدا ہونا ہی بند ہو گئے ہیں!

ساتھ دے رہے ہیں جو کالوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ایشیا میں
آپ عوام دشمن جنوبی ویتنام حکومت اور پاکستان کا ساتھ
...دے رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں آپ غاصب اسرائیل کا ساتھ
...دے رہے ہیں۔

...کسن۔ جی ہاں یہ بالکل ضروری ہے۔ ہمارا نعرہ ہے۔
...دنیا بھر کے چورو ایک ہو جاؤ۔ ہمارا کام ہی دنیا بھر کے لوگوں
...کو لوٹنا ہے۔ غریب اور کمزور ملکوں کی کمزوری سے فائدہ
...اٹھانا ہے۔ خود اپنے ملک میں ہم کئی سو سال سے کالوں پر
...اور ریڈ انڈینوں پر ظلم کرتے آئے ہیں۔ اس حالت میں
...دنیا بھر کے ظالموں اور عوام دشمن حکومتوں کا ساتھ دینا کیا
...ہمارا فرض نہیں ہو جاتا۔

انقلابی۔ بجا فرمایا۔ بنگلا دیش کے مسئلے پر تمام امریکی عوام

ہیں۔ آپ خود ہی دیکھئے نا اگر دنیا میں جنگ نہیں ہو گی تو
ہمارے ہتھیار کون خریدے گا۔ ہماری ہزاروں فیکٹریاں
بند ہو جائیں گی۔ لاکھوں امریکی بے روزگار ہو جائیں گے۔
دنیا میں خوشحالی پھیل جائے گی۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک
ہم سے بھیک مانگنا چھوڑ دیں گے یعنی ہماری ساری اہمیت
ختم ہو جائے گی۔ خود ہمارے ملک میں بے روزگاری کی وجہ
سے سوشلزم آ جائے گا۔ ان حالات میں ہماری بھلائی اسی میں
ہے کہ کہیں نہ کہیں جنگ چلتی ہی رہے۔ اگر کبھی جنگ نہیں
ہو گی تو ہمیں کرانی پڑے گی۔
میرا دعویٰ ہے کہ اگر پاکستان اور ہندوستان
میں جنگ چھڑ جائے تو ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی بے روزگاری
چند مہینوں میں ختم ہو جائے۔ اور معاشی طور پر ہمارے

نکسن۔ ٹھیک ہے۔ ویسے بھی ہم نے ہندوستان میں
اپنے سفیر کو حکم دے رکھا ہے کہ جس پر بھی تمہیں کمیونسٹ
ہونے کا شبہ ہو اسے امریکا کی سیر کرا دو۔ اور اُسے
اتنا کھلاؤ پلاؤ کہ وہ کمیونزم کو بھول جائے۔

انقلابی۔ آپ نے ٹھیک کہا مجھے اگر آپ جیسے لوگوں
کی خدمت کا موقع مل جائے تو میں کبھی بھول کر بھی کمیونزم
کا نام نہ لوں۔

نکسن۔ آم چوستے ہوئے اندر [illegible] جاتے ہیں۔ انقلابی
بغل [illegible] دبا کر خوشی سے اچھلتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

نوٹ:۔ انقلابی چونکہ ابھی کچھ دن امریکا میں رہے
گا اس لئے اس نے ہم سے کہا ہے کہ وہ ہمارے لئے امریکا
کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر بھیجے۔

(ادارہ)

اردو یونیورسٹی
کے قیام کی تجویز

اُردو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ چینی اور انگریزی کے بعد اُردو ہی دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے اقوام متحدہ کی کانگریس (United Nation Congress) نے اپنے "نیشنل ڈیفنس ایکٹ، ٹائٹل ۲ سیکشن ۶۰۱ (ب) National Defence act 'Title VI Section 601) کے تحت اُردو کو متحدہ اقوام کی اہم ترین زبانوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ اس فہرست میں روسی، جرمن اور جاپانی زبانوں کے نام اُردو کے بعد سلسلے وار آئے ہیں۔ پاکستان۔ فجی۔ کینیڈا جنوبی اور مشرقی افریقہ۔ برطانیا۔ عدن۔ عراق۔ افغانستان ماریشس۔ برما۔ سنگاپور۔ ملایا اور انڈونیشیا میں اردو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ یونیسکو UNESCO کے ۱۹۵۴ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں ۱۶ کروڑ اُردو بولنے والے موجود ہیں۔ دنیا کے سبھی اہم ملکوں سے اُردو میں پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ برصغیر کے علاوہ اُردو کتابیں برطانیا۔ افریقہ و سنگاپور میں بھی چھپتی ہیں اور ان ممالک سے متعدد اردو اخبار و رسائل بھی نکلتے ہیں۔ ہند و پاک کے علاوہ اُردو تعلیم اور ریسرچ کی سہولتیں امریکا۔ برطانیا اور روس میں بھی مہیا کی گئی ہیں۔

ہندوستان اردو کا گھر ہے جہاں اس کا جنم ہوا ہے۔ یہیں وہ پھلی پھولی ہے اور یہیں سے دور دراز ملکوں تک پھیلی ہے۔ ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۴ کروڑ تیس لاکھ کے قریب ہے۔ بلکہ "ملاپ" دہلی کے مطابق اُردو بولنے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ اُردو بولنے والے ہندوستان میں ہی رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس کی ترقی اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری ہندوستانی عوام پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اُردو نے اپنا ورثہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب سے حاصل کیا ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں اردو نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اُردو کا نعرہ "انقلاب زندہ باد" ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہونچا اور اس نے عوام کے دلوں کو گرما دیا جس سے تحریکِ آزادی کو بڑی تقویت ملی۔ اردو نے عوام کو جگایا۔ ان کے دلوں میں انقلاب کی چنگاری پیدا کی۔ بہتر سماج بنانے میں مدد دی۔ اردو ہماری قومی یکجہتی کی جیتی جاگتی علامت ہے۔ اگر اُردو کو ختم کر دیا گیا تو یہ ہماری قوم اور ہمارے ملک کا ایک عظیم نقصان ہوگا۔

دستور

ہمارا دستور تمام ہندوستانی زبانوں اور ان کے رسم الخط کے تحفظ اور ان کی ترقی کا یقین دلاتا ہے۔ اردو اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے اسکے دامن میں علم و ادب کا ایک عظیم خزانہ چھپا ہوا ہے۔ وہ ہمارے ملک کے سیکولر ہونے کی علامت ہے اور ہمارے ملک کے کم از کم دو کروڑ تیس لاکھ عوام کی مادری زبان ہے لیکن پھر بھی آزادی کے بعد اسے اس مقام سے محروم کر دیا گیا جو اسے دہلی۔ یوپی۔ بہار۔ مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش میں حاصل تھا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے گھر میں جہاں وہ پیدا ہوئی۔ اجنبیوں کا سا برتاؤ کیا گیا اور اسے ہندوستان کے لسانیاتی نقشے پر کوئی بھی صوبہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اردو بولنے والے طبقے کی معاشی پسماندگی نے انھیں مایوس کر دیا ہے۔ وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور خود کو بہت ہی حقیر محسوس کرنے لگے ہیں۔ آزادی کے بعد مختلف لسانی اور تہذیبی حلقوں میں خوشی، مسرت اور زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی لیکن اُردو بولنے والے طبقے کو محرومی، مایوسیوں اور ناانصافی کے سوا کچھ نہ ملا۔ تہذیبی ترقی میں ان کا

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اسرار عظمت

کوئی حصہ نہ رہا جس کے لئے ایک زبان کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کی ہر دوڑ میں وہ پیچھے رہ گئے۔ ملک میں ان کی حیثیت ایک بے تعلق، خشک، مایوس اور ذہنی طور سے منتشر طبقے کی سی ہو گئی۔

کسی ملک کی ترقی وہاں دی جانے والی تعلیم پر منحصر ہوتی ہے اور دنیا کے سبھی بڑے ماہرینِ تعلیمات اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ تعلیم و تربیت اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی جب تک وہ مادری زبان کے ذریعے نہ ہو۔ تعلیم کی جڑیں ملک کی تہذیب میں گہری نہ ہوں تو وہ کسی کام کی نہیں رہتی۔ تعلیم کا مقصد صرف چند کتابوں کو ہضم کر لینا نہیں بلکہ اچھی شخصیتیں بنانا، فرد اور سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور طالب علموں کو سماج و ملک کی ذمہ داریاں قبول کرنے کا اہل بنانا ہے۔

ایک عمل

کوئی بھی زبان ایک ایسے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے جس کے ذریعے سماج اپنی تہذیبی اقدار کا تحفظ کرتا ہے جس سے ملک کو اپنی قومی انفرادیت برقرار رکھنے اور اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ملٹن نے ایک بار کہا تھا کہ:

"تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک کو شکست دے کر ایسی صورت میں ترقی سے روک دیا گیا ہو جب اس کے عوام اپنی زبان سے محبت کرتے ہوں اور اسکے تحفظ کے لئے کوشاں ہوں۔ انسان کی ذہنی زندگی کی تربیت کے لئے جو انسان کی صحیح زندگی ہوتی ہے۔ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

جاپان نے مغربی علوم سے استفادہ کرنے اور عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو سکھانے کے لئے ضروری سمجھا کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ یہی جاپان کی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان آج تخلیقی میدان اور صنعتی ترقی میں دنیا کے کئی ممالک سے آگے ہے۔

قومی تعلیم کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کے لئے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ یہ ایک اہم قدم

سیدھا، آسان اور فطری اصول ہے کہ اس کی تشریح کے لیے لمبے چوڑے دلائل کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اتنا آسان اور فطری ہے جتنا کہ چلنے کے لیے پیروں کا استعمال یا دیکھنے کے لیے آنکھوں کا استعمال۔ لیکن ہمارے ملک میں گزشتہ ۱۳۰ برس کی غلط تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اس آسان اور فطری اصول کی بھی تشریح کرنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کہتے ہیں کہ جرمنی میں ان کے سفر کے دوران ان کی ملاقات چرچ کے ایک کارکن سے ہوئی اس نے ان سے پوچھا: "آپ کے ملک میں کونسی زبان ذریعۂ تعلیم ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "انگریزی"، وہ شخص بولا "میرے خدا آپ لوگ ایک ہزار برس میں بھی ترقی نہ کر سکیں گے"

ترقی کی رفتار

ہندوستان میں ترقی کی رفتار بہت ہی سست ہے عوام کی ایک کثیر تعداد ان پڑھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے لوگوں کو ان کی مادری زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کی وہ سہولت بہم نہیں پہنچائی جس کے وہ مستحق ہیں۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی، جس نے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا تھا اور جس کا مقصد کم تنخواہ والے کلرک اور انگریزی جاننے والے ایسے طبقے کی تخلیق کرنا تھا جو انگریزی سامان خرید سکے۔ ہماری یونیورسٹیوں نے وقت کا چیلنج قبول نہیں کیا اور الگ تھلگ ہاتھی دانت کے مناروں میں مقید رہیں۔ ان میں وقت کا چیلنج قبول کرنے کی ہمت اور سکت نہیں تھی کیونکہ وہ ۱۸۳۵ء سے ۱۹۵۴ء تک غلط پالیسیوں کا شکار رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹیاں قومی روایات اور تہذیبی دھارے سے کٹ گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی تعلیم نے ہم کو روشنی بخشی ہے لیکن اس روشنی کا ہم ایک ایکسپریس ٹرین کی روشنی سے مقابلہ کر سکتے ہیں جو چھوٹے دیہاتوں سے گزرتے ہوئے لوگوں کو ایک لمحے کے لیے روشنی دیتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے انھیں پھر تاریکی میں چھوڑ جاتی ہے جبکہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے چند مسافر روشنی سے مسلسل استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یا اس طریقۂ تعلیم کا مقابلہ بانس کے گنے سے بھی کیا جا سکتا ہے جس پر متعدد جوڑ ہوتے ہیں لیکن اوپر صرف چند پتیاں ہی ہوتی ہیں۔"

جہاں تک ہماری پرائمری تعلیم کا تعلق ہے ہندوستانی دستور نے اس کے لیے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ہماری مادری زبان اُردو ہے، جب تک ملک کا دستور قائم ہے دنیا کی کوئی طاقت بھی ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔ پرائمری کے بعد وسطانی اور فوقانی تعلیم کے مراحل آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ طالب علموں کو ان سطحوں پر مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت سے محروم کر دیا جائے جب کہ تعلیم کی یہ تینوں سطحیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ ایجوکیشن کمیشن (Education Commission) نے اپنی ۱۹۶۴ء-۱۹۶۶ء کی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ چونکہ اسکول میں تعلیم کا ذریعہ صوبائی یا مادری زبانیں ہیں تعلیم کی اونچی سطحوں پر بھی انھیں زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہئے۔ (صفحہ ۱۳)۔ ایموشنل انٹیگریشن کونسل (Emotional Integration Council) نے بھی جون ۱۹۶۶ء میں اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا۔

مادری زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح تک ذریعہ تعلیم بنائے بغیر یونیورسٹیوں کے دانشوروں اور عوام میں ربط پیدا کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں اور ایسا کرنا قومی اتحاد اور سوشل جمہوریت کے قیام کے لیے بیحد ضروری ہے۔

حقوق کا انسداد

ایجوکیشن کمیشن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندی اور انگریزی کی خاطر دوسری زبانوں کے ترقی کرنے کے حقوق کا انسداد نہ کیا جائے کیونکہ غیر ہندی علاقے کے لوگوں کی ہندی کبھی بھی مادری نہیں بن سکتی اور نہ انگریزی کی وہ حیثیت ہمیشہ کے لیے برقرار رہ سکتی ہے جو آج اسے حاصل ہے۔ ایک عام آدمی کی ضروریات مدنظر رکھتے ہوئے ایسا ہونا ضروری ہے (صفحہ ۱۴) ایجوکیشن کمیشن نے آگے چلکر لکھا ہے۔

"اردو اگرچہ عام معنوں میں کوئی صوبائی زبان نہیں ہے لیکن یہ ایک "کل ہند اہمیت" کی زبان ہے اور یہ ضروری ہے کہ اُردو کی "ہمت افزائی" کی جائے"۔ (صفحہ ۱۵) کمیشن مذکور نے اپنی رپورٹ میں ان جملوں کو انڈر لائن کیا ہے۔

اُردو کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ اُردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کیے جائیں تاکہ اردو بولنے والے طبقے کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ (صفحہ ۲۹۲)

اسی طرح آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی (All India Congress Working Committee) کا جو اجلاس اگست ۱۹۴۹ء میں ہوا اس نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کو علاقائی یا صوبائی حیثیت دے کر یونیورسٹی تک تعلیم اُردو میں دینے کی سہولت دی جائے بعد میں ایک قرارداد (مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۵۴ء) میں بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ اُردو کو جو دستوری اعتبار سے قبول کی ہوئی زبان ہے ہماری قومی زندگی میں ایک اہم مقام دیا جانا چاہئے ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء کی قرارداد میں پھر مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر زور دیا گیا کہ اُردو چونکہ ایک اہم قومی زبان ہے اس لئے ان کا فرض ہے کہ اس کی ترقی اور نشر و اشاعت کے لئے سامان بہم پہونچائیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۶۵ء کے ایک حکمنامے میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ حکومت ہند کی ملازمتوں کے لئے امتحانات تمام صوبائی اور قومی زبانوں میں لئے جائیں اور امتحان دینے والے کو اس بات کا حق ہو کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی قومی یا صوبائی زبان کا انتخاب کر سکے۔

"آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی" کی منظور کی ہوئی ان قراردادوں کی تائید وقتاً فوقتاً "یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن" "نیشنل انٹیگریشن کونسل" "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن" اور "پبلک سروس کمیشن" کے علاوہ "وزارت تعلیمات" نے بھی کی۔

حکومت ہند کا ریزولیوشن

اس سلسلے میں سب سے اہم حکومت ہند کا ریزولیوشن ہے جو ۱۸ جنوری ۱۹۶۸ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے منظور کیا۔ یہ ریزولیوشن زبانوں سے متعلق ہماری حکومت کی پالیسی کا چارٹر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری ۱۴ زبانوں کی ترقی کیلئے بھی ہر ممکن اقدام کیے جائیں۔ ریزولیشن میں کہا گیا کہ:

"ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب کی ترقی تعلیمی تہذیبی اور تمدنی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا لوگ اپنی تخلیقی قوتوں کا استعمال نہ کر سکیں گے تعلیمی معیار بلند نہ ہوگا، عوام علم و ادب کے دھارے سے کٹے رہیں گے۔ اور دانشوروں اور عوام کی درمیانی خلیج اگر وسیع نہیں ہوگی تب بھی موجود ضرور رہے گی"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں سے ایک کو ذریعۂ تعلیم کے لئے منتخب کرنا چاہئے۔ انگریزی کے انتخاب کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (آفیشیل لینگویج کمیشن رپورٹ ۱۹۵۶ء کے تحت صفحات

[illegible]

۹۹،۹۴ اور ۱۰۱)

اسی ریزولیشن پر عملدرآمد بھی شروع ہو گیا ہے گجرات میں گجراتی زبان ہی تعلیم کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح تامل ناڈو میں تامل۔ آندھرا کے اُردو کالجوں میں اردو میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ پونا اور کرناٹک یونیورسٹیوں نے بھی اپنی صوبائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا ہے پنجاب میں بھی ایسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے جہاں پنجابی تعلیم کا ذریعہ ہے۔

اب اردو بولنے والے طبقے کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کونسی زبان کو تعلیم کا میڈیم بنانا پسند کرے گا۔ دستور کے آٹھویں شیڈول، میں لکھی ہوئی ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب اسے کرنا ہوگا۔ وہ اردو کا انتخاب کرینگے یا آسامی، بنگالی، ہندی یا کنڑ کا؟ واضح ہو کہ ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں سے ایک کا اسے انتخاب کرنا ہے، جن میں انگریزی شامل نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اردو بولنے والے اُردو کا ہی انتخاب کریں گے کیونکہ اُردو ان کی مادری زبان ہے اور سارے ملک اور ملک کے باہر بولی اور سمجھی جانے والی ایک اہم زبان ہے۔ اسی زبان سے ہم اپنے سماجی، تہذیبی اور تمدنی معیار کو پہونچ سکتے ہیں۔ اپنے اندر چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کو استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے تہذیبی و تمدنی ورثے کو ملک کے طول و عرض میں پھیلا سکتے ہیں۔ یہ عوام کا زمانہ ہے ہمیں عوام کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا ہم ان پر کوئی ایسی زبان زبردستی نہیں لاد سکتے جو ان میں سے صرف چند کی مادری زبان ہو۔

اردو یونیورسٹی

ان مقاصد کے حصول کے لئے اردو یونیورسٹی کے قیام کی اشد ضرورت ہے جو نئے ہندوستان میں سائنسی علوم اور فنون کے اہم مرکز کی حیثیت رکھے۔ یہ یونیورسٹی ہماری ملی جلی تہذیب کا حسین اظہار ہوگی۔ اس کا مقصد متحرک ہندوستانی سماج کی تخلیق ہوگا۔ یہ یونیورسٹی ایسے افراد پیدا کرے گی جو مضبوط اخلاق اور تخلیقی فکر کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ اس یونیورسٹی کے ذریعے نئی زندگی اور نئے عہد کا آغاز ہوگا۔ علمی ترقی کی قدیم روایات کو زندہ کرنا ممکن ہوگا۔

جمہوریہ ہند کا مستقبل ہمارے نوجوان شہریوں پر منحصر ہے جو تعمیری انداز میں سوچ سکیں اور نئے نئے خیالات اور تخلیقی قوتوں سے مالا مال ہوں۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ:۔

" تم اگر ایک نئی قوم بنانا چاہتے ہو تو نئے بچے پیدا کرو "

اس مقصد کے حصول کے لئے ایسی ہی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس میں ہماری مادری زبان تعلیم کا ذریعہ ہو، جو ہماری ملی جلی تہذیب کا اظہار ہو اور جس پر ہم سب فخر کر سکیں۔ جو ایشیا کے حسن، ہندوستان کے روحانی سکون اور جدید دنیا کے سائنسی علوم کو ایک ہی دھاگے میں پرو دے۔ اُردو کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے جس سے ہم میں تخلیقی فکر جاگ اٹھے گی۔

وسیع امکانات

حصول آزادی کے بعد ترقی کے اتنے وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ ان حدود کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ یہی بات اردو کے بارے میں بھی ہے۔ تعلیم کا شوق اسقدر تیز رفتار سے عام ہو رہا ہے کہ کوئی عجیب بات نہیں۔ دہلی شہر میں جہاں سات یونیورسٹیاں موجود ہیں، آٹھویں یونیورسٹی قائم کیجائے۔ اس سے اردو بولنے والوں کی اس اہم ضرورت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دو کروڑ تیس لاکھ لوگوں کے لئے ایک یونیورسٹی کا قیام بے حد ضروری ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے اگر ہم پچاس سال کے لئے اپنی ضروریات کا گراف اتاریں تو محسوس ہوگا ہمارا مطالبہ بے حد ضروری اور اہم ہے اردو یونیورسٹی کا قیام ناگزیر ہے۔

ہندوستان میں ہماری پہلی ذمہ داری ایک متحرک ہندوستان اور متحرک ہندوستانیوں، کی تخلیق ہے۔ اس مقصد کے حصول میں اُردو ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے کیونکہ اُردو ایک انڈو آرین زبان ہے۔ اس نے سیکولر ماحول میں جنم لیا ہے اور سیکولر ماحول میں ہی پروان چڑھی ہے۔ ہندوستان کا کارواں بھی سیکولرزم اور جمہوریت کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ دونوں باتیں متوازی ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ متضاد ہندوستانی زبانوں میں اُردو کا جو اہم مقام ہے وہ اسے یوں ہی اتفاقاً حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے ضروریات کا ایک تاریخی عمل رہا ہے۔ اردو کا یہ مقام صدیوں کا تاریخی پس منظر لئے ہوئے ہے۔ اردو کھڑی بولی سے بنی ہے اور اس میں اسّی فیصد الفاظ سنسکرت سے لئے گئے ہیں۔ (جواہر لال نہرو ــ The Discovery Of India) ۲۰ فیصد الفاظ فارسی، عربی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی سے آئے ہیں۔ باقی آئندہ

واقعات نئی دھلی









ہندوستان کی قلوپطرہ شہزادی گوبند کور

ریاست کپورتھلہ کی شہزادی گوبند کور کو ہندوستان کی کلوپیٹرا کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ اپنے بے مثال حسن و جمال اور اپنی بے پناہ جنسی بوالہوسی کے اعتبار سے گوبند کور کلوپیٹرا سے مکمل طور پر مماثلت رکھتی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مصر کی کلوپیٹرا کی داستانِ حیات کو دنیا بھر میں زبردست شہرت حاصل ہو گئی اور ہندوستان کی گوبند کور کے واقعات کی اتنی بڑے پیمانے پر تشہیر نہ ہو سکی۔ یوں تو دیوان جرمنی داس نے اپنی انگریزی کتاب مہاراجہ میں ہندوستان کی اس جنس زدہ ملکۂ حسن کے کردار کو بھرپور طریقے پر بے نقاب کیا ہے لیکن اردو داں طبقہ ابھی اس کی تفصیلات سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔

شہزادی گوبند کور کپورتھلہ کے مہاراجہ نہال سنگھ کی بیٹی تھی جس کی پرورش شاہی عیش و آرام کے ماحول میں

شہزادی گوبند کور حد درجہ عیاش طبع تھی اور اس کی جنسی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ اس کا بدصورت اور کمزور شوہر اسے جنسی آسودگی دینے سے قاصر تھا۔ وہ خوبرو اور تندرست و توانا مردوں کو مختلف بہانوں سے اپنے محل میں بلوا کر انہیں اپنے بستر کا ساتھی بنایا کرتی تھی۔ محل کے دروازے پر پہرہ دینے والے فوجیوں کو بھی وہ نہیں چھوڑتی تھی اور جب کہیں سے کوئی اور مرد دستیاب نہیں ہوتا تھا تو انہیں کے ساتھ شب بسری کرتی تھی۔ اس کا شوہر ان حرکتوں سے واقف تھا اس لئے وہ دل برداشتہ ہو کر محل سے باہر ایک بارہ دری میں رہنے لگا تھا اور ان دونوں کے درمیان زن و شوہر کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔

گوبند کور کے لاتعداد معاشقوں میں سے دو معاشقے انتہائی سنسنی خیز ثابت ہوئے۔ اول ریاست کے وزیراعظم

انھوں نے گوبند کور کی ایک کنیز مولو کو زبردست رشوت دیکر پیغام رسانی کا وسیلہ نکالا۔ محبوبہ کی طرف سے پیامِ محبت کا جواب حوصلہ افزا ملا۔ پھر دو دلوں کے ملن کی صورت یہ نکالی گئی کہ دیوان خانے سے شہزادی کے محل تک ایک زمین دوز سرنگ کھودی گئی جس میں سے گذر کر منزلِ وصل تک رسائی ہونے لگی۔

غلام جیلانی نے ریاستی مقدمات سننے اور ان پر اپنے فیصلے دینے کا ایک انوکھا طریقہ اپنا رکھا تھا۔ وہ حضرت دیوان خانے میں اپنی نشست گاہ میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے پردہ پڑا ہوتا تھا۔ جسکے پیچھے

ریاست کپورتھلہ کی شہزادی گوبند کور کو ہندوستان کی کلوپیٹرا کا لقب دیا جا سکتا ہے اپنے بے مثال حسن و جمال اور بے پناہ جنسی بوالہوسی کے اعتبار سے وہ کلوپیٹرا سے مماثلت رکھتی تھی —•

بڑے ہی ناز و نعم کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ تو بلاشکن حسن و جمال کی ملکہ تھی اور کچھ اس قسم کی جنسی کشش رکھتی تھی کہ اُسے دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔

گوبند کور کے والد نے اس کی شادی کرتارپور کے ایک رئیس اور معزز شخص سے کر دی تھی لیکن گوبند کور اس شرط پر شادی کے لیے رضامند ہوئی تھی کہ وہ کرتارپور میں نہیں رہے گی بلکہ اس کے شوہر کو بھی اس کے ساتھ کپورتھلہ ہی میں رہنا پڑے گا۔ چنانچہ مہاراجہ نہال سنگھ نے بیٹی اور داماد کی اقامت کے لئے شاہی محل کے نزدیک ہی ایک چھ منزلہ محل تعمیر کرا دیا تھا۔ جس میں گوبند کور بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کے اس رہائشی محل میں داخلے کے لئے صرف ایک ہی داخلہ تھا جس پہ ہر وقت مسلح فوجی پہریدار تعینات رہتے تھے۔

غلام جیلانی سے، اور دوئم، ریاستی فوج کے ایک عہدیدار کرنل وریام سنگھ سے۔ (جنسی بوالہوسی کا جذبہ ہندو، مسلمان، یا سکھ میں تمیز نہیں کرتا۔)

کپورتھلہ ریاست کے وزیراعظم غلام جیلانی ایک خوبصورت اور دراز قد انسان تھے۔ ریاست کے دستور کے مطابق وہ دیوان خانے کے ایک حصے میں وزرا کی میٹنگ بلوایا کرتے تھے اور وہیں بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ گوبند کور کا محل دیوان خانے کے سامنے تھا۔ ایک دن غلام جیلانی نے اُسے محل کی سب سے اوپری منزل پر بال سکھاتے ہوئے دیکھا اور فی الفور اس کے تیرِ نظر کا نشانہ بن گئے۔ اُسی روز سے وہ شہزادی سے ملنے کی ترکیبیں ڈھونڈنے لگے چونکہ شاہی گھرانے کی خواتین سے ملاقات ایک امرِ دشوار تھا اس لئے انھیں اس سلسلے میں بڑے بڑے جتن کرنے پڑے۔



ریاست کے دیگر وزرا اور کارندے بیٹھا کرتے تھے۔ ہر وزیر اپنے محکمے کے مقدمات کی تفصیل اور ان کے بارے میں اپنی تجویزیں سُنایا کرتے تھے۔ اور غلام جیلانی صاحب فیصلے یوں صادر فرمایا کرتے تھے کہ جب وہ کسی مقدمے کی بابت "ہاں" کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں مقدمہ پیش کرنے والے کی تجاویز سے اتفاق ہے اور اگر وہ خاموش رہیں تو پھر وزیرِ موصوف کی رائے

واقعات تھا دھلی

و منسوخ سمجھا جائے۔ گوبند کور کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہوتا یہ تھا کہ اُدھر تو مقدمے سُنائے جا رہے ہیں اور اِدھر غلام جیلانی سرنگ سے گزر کر شہزادی کے محل میں پہنچ چکے ہیں یا اُسے اپنے ہمراہ لاکر وہیں دیوان خانے میں پردے کے پیچھے دادِ عیش دے رہے ہیں۔ ان کی مسلسل خاموشی کی وجہ سے زیادہ تر مقدمات کے بارے میں وزرا کی رائیں منسوخ ہو جاتی تھیں۔ مگر انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے گناہ پھانسی پانے لگے اور سنگین سے سنگین جرم کرنے والے بے داغ چھوٹنے لگے حکومت کی آمدنی گھٹنے لگی اور خزانہ خالی ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ وزرا اور عوام دونوں وزیر اعظم سے متنفر ہوتے گئے۔

وزیر اعظم غلام جیلانی ہر سنیچر کو جالندھر جاکر اپنے کنبے والوں کے ہمراہ چھٹی کا دن گزارا کرتے تھے کپور تھلہ سے جالندھر تک کا فاصلہ بارہ میل کا تھا جسے وہ گھوڑے گاڑی بیٹھ کر طے کیا کرتے۔ یوں تو سرنگ کے ذریعے موصوف گوبند کور سے روز ہی ملا کرتے تھے مگر یہ ملاقاتیں اتنی طویل نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ شب و روز کی قید سے بے نیاز ہوکر خود کو آغوشِ محبوب میں مکمل طور پر غرق کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ پلان بنایا کہ گوبند کور کو اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ جس گاڑی میں بیٹھ کر وہ سفر کیا کرتے تھے اسے دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ گاڑی کے درمیانی حصے میں یعنی اگلی اور پچھلی سیٹ کے بیچ میں ایک بکس بنا ہوا تھا جس میں گھوڑوں کے لئے چارہ رکھا جاتا تھا۔ اور وہ بکس ان جگہوں پر کھولا جاتا تھا جہاں گاڑی سفر کے دوران گھوڑوں کو آرام دینے کے لئے رک جاتی تھی۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سنیچر کے دن وزیر اعظم غلام جیلانی کی روانگی سے کچھ دیر قبل شہزادی گوبند کور اپنے محل سے ایک جھاڑو دینے والی عورت کے بھیس میں، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے نکلی اور جاکر گاڑی کے اسی بکس میں چھپ گئی جو چارہ رکھنے کے لئے بنا ہوا تھا۔ (اس معاملے میں وہی کنیز اس کی ہمراز تھی جس کے ذریعے سب سے پہلے غلام جیلانی نے پیغام رسانی کی تھی) حسب معمول گاڑی وزیر اعظم کو لیکر روانہ ہوئی اور جیسے ہی وہ شہر کی حدود سے باہر نکلی، وزیر اعظم نے بکس کھول کر شہزادی کو نکال لیا اور اپنی باہوں میں لیکر بوس و کنار شروع کردیا۔ اس طرح پورا راستہ پیار و محبت کے کھیل میں کٹا اور جالندھر میں تمام رات شراب و ساغر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وصل یار میں گذری۔ پھر تو یہ دونوں کا معمول بن گیا اور کئی ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن گوبند کور کی رازدار کنیز کی وجہ سے بات کھل گئی اور ریاست کے ایک معمر وزیر رام جس صاحب کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اپنی مالکہ کی طرح وہ کنیز بھی عشق کی ماری ہوئی تھی۔ اسے شاہی خانساماں امانت خاں سے محبت تھی۔ ایک دن اس نے یہ راز اپنے عاشق کو بتادیا۔ امانت خاں نے اسے اپنے خاص دوست علی محمد سے کہہ ڈالا جو رام جس صاحب کا ایک معتمد ملازم تھا۔ علی محمد نے اس راز کو اپنے آقا تک پہنچا دیا۔ ریاست کے تمام وزرا غلام جیلانی سے ناراض تھے مگر کوئی ایسی بات ان لوگوں کو نہیں مل رہی تھی جس کی بنا پر وہ لوگ ان کے خلاف کسی طرح کا اقدام کرا سکیں۔ رام جس صاحب نے اس راز سے واقف ہوتے ہی وزرا کی ایک خفیہ میٹنگ کی اور وزیر اعظم کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ اگلے سنیچر کو پہلے ہی سے ایک فوجی دستہ شہر کے باہر تعینات کر دیا۔ حسب معمول جب وزیر اعظم صاحب گوبند کور کے ہمراہ اپنی گاڑی میں سوار ہوکر جالندھر کے لئے روانہ ہوئے اور شہر کی حدود سے نکلنے کے بعد جب انھوں نے محبوبہ سے چوما چاٹی شروع کی تو سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ نتیجے میں غلام جیلانی صاحب تو ریاست بدر کر دیے گئے اور گوبند کور کو اس کے محل میں اس طرح مقید کر دیا گیا کہ کئی ماہ تک اسے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ ملی۔

گوبند کور کے انگنت معاشقوں میں سے دوسرا سنسنی خیز معاشقہ غلام جیلانی کے ریاست بدر ہونے کے کچھ دنوں بعد شروع ہوا۔ کرنل وریام سنگھ شہزادی گوبند کور کے محل کے فوجی کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں اس کے حسن پر نظر پڑی تو دل دے بیٹھے۔ انھیں بھی محبوبہ سے ملنے کے لئے بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے نامہ و پیام کا ذریعہ گوبند کور کی ایک دوسری کنیز بنی جسکا نام بسنتی تھا اور ملاقات کا طریقہ ایسا نکلا جو بڑا ہی دشوار گذار تھا۔ گوبند کور کے محل کی حدود میں ایک کنواں تھا جس سے محل کے مکینوں کے استعمال کے لئے پانی نکالا جاتا تھا۔ اتفاق سے محل کی باہری دیوار ہی اس کنوئیں کی دیوار بھی تھی وریام سنگھ نے اس دیوار میں باہر سے شگاف پیدا کیا اور اندر سے گوبند کور نے پانی کھینچنے والی رسی پھینک دی جسے پکڑ کر وہ حضرت کنوئیں میں لٹک گئے۔ بعد ازاں شہزادی نے اپنی معتمد کنیزوں کی مدد سے انھیں کھینچ نکال لیا۔ اسی ترکیب سے کرنل صاحب روز شب میں گوبند کور تک پہنچنے لگے اور ساری ساری رات اس کی مرصع خواب گاہ میں گذارنے لگے۔

دو سال تک وریام سنگھ اور گوبند کور کی یہ روما ن پرور شبانہ ملاقاتیں اس طرح جاری رہیں کہ زمانے والوں کو خبر نہ ہو سکے لیکن آخر کار ریاست کے وزیر داخلہ سردار دانشمند صاحب کو اسکی بھنک مل ہی گئی چونکہ وہ وریام سنگھ سے پہلے ہی سے عداوت رکھتے تھے اس لئے انھوں نے اس راز سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ رات کو جیسے ہی بیچارہ عاشق محبوبہ کے محل میں داخل ہوا دانشمند صاحب کے مخبروں نے اسے اطلاع دے دی اور انھوں نے ریاست کے آئی جی اور بارہ سپاہیوں کو ساتھ لیکر محل پر دھاوا بول دیا۔ پولیس والے ابھی باہری دروازے پر زور آزمائی کر رہے تھے کہ گوبند کور اور وریام سنگھ کو ان کی آمد کی اطلاع مل گئی اور وہ دونوں ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے فرار ہوگئے جس کا آخری سرا محل سے باہر سو گز کے فاصلے پر ایک کنوئیں میں تھا۔ انھوں نے ساری رات اسی کنوئیں کے ٹھنڈے پانی میں گذاری اور صبح تڑکے وہاں سے بھاگ نکلے۔ پاپیادہ سفر کرتے ہوئے دونوں نے ریاست کپور تھلہ سے بیس میل دور جاکر ایک گاؤں میں قیام کیا جس کا نام کلیان تھا۔ یہ گاؤں انگریزی حکومت کے زیر اختیار تھا جس میں کپور تھلہ کی پولیس اُن پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ چونکہ دونوں اپنی تمام دولت سے محروم ہو چکے تھے اس لئے وہ اسی گاؤں میں ایک کچے مکان میں رہنے لگے اور محنت مزدوری کرکے زندگی گذارنے لگے۔ کرنل وریام سنگھ کھیتوں میں کام کرتا تھا اور شہزادی گوبند کور گوبر سے کنڈے بناتی تھی اور اپنے عاشق کے لئے خود ہی کھانا تیار کرتی تھی۔

اس طرح گوبند کور کو کلوپٹرا تو ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن مصر کی کلوپٹرا نہیں بلکہ ہندوستان کی کلوپٹرا کیونکہ وہ بہرحال ایک ہندوستانی عورت تھی۔ ✖

واقعات نئی دہلی

ہندوستان کے ڈاکو



سید نجمی امروہوی

ابھی حال میں موزنیا (مدھیہ پردیش) کے دو مشہور ڈاکو نتھو سنگھ اور موہر سنگھ نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سامنے جاکر اپنے جرم کا اقبال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک شرط بھی تھی اور وہ یہ کہ انکے تمام جرائم کی سزا جو ان سے اب تک سرزد ہوچکے ہیں پھانسی کی صورت میں نہ دی جائے۔ اس کے برعکس انھیں عمر بھر قید خانے میں رہنا گوارا نہ ہوگا۔

اس اطلاع کا تعلق دہلی میں نوادرات کے تاجر شری بی آر شرما سے ہے وہ خاصی طویل جدوجہد کے بعد کچھ ہی دنوں پہلے اپنے رشتے داروں کے توسط سے ۲۵ ہزار روپے کی رقم کی ادائگی کے بعد ڈاکو نتھو سنگھ کے چنگل سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ گوالیار سے تقریباً ساٹھ میل دور موزنیا کے آس پاس کسی مقام پر پورے چار ماہ غیر قانونی قید میں گزار چکے ہیں۔ ان ڈاکوؤں نے انھیں اپنی قید سے رہا کرنے کے بدلے میں پہلی مانگ آٹھ لاکھ روپے کی کی تھی لیکن بعض حالات کے تحت یہ رقم بعد میں کم کردی گئی۔ ڈاکوؤں میں اقبال جرم کرنے کی خواہش کا جذبہ اور مسٹر شرما کو آزاد کرنے کے لئے مطلوبہ رقم میں تخفیف اس بات کا ثبوت ہیں کہ جرائم پیشہ لوگوں کی دنیا میں بھی سب کچھ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔

یہ لوگ اب اپنے مفلس پڑوسی علاقوں سے نکل کر اپنے مخصوص شکار کی تلاش میں دہلی اور دوسری جگہوں پر بھی جانے لگے ہیں۔ مسٹر شرما کے اغواء کی داستان بڑی دلچسپ اور پراسرار ہے۔ وہ ان خطرناک ڈاکوؤں کے نرغے میں دہلی کے ہی رہنے والے دو ٹیکسی ڈرائیوروں کی سازش سے پہنچے تھے۔ ان میں کا ایک ڈرائیور کچھ دنوں تک نتھو سنگھ کی سرپرستی (قید) میں رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لئے چھ ہزار روپے نقد دینے کے ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ کسی نہ کسی موٹی آسامی کو پکڑ کر لانے میں اس کی پوری پوری مدد کرے گا۔

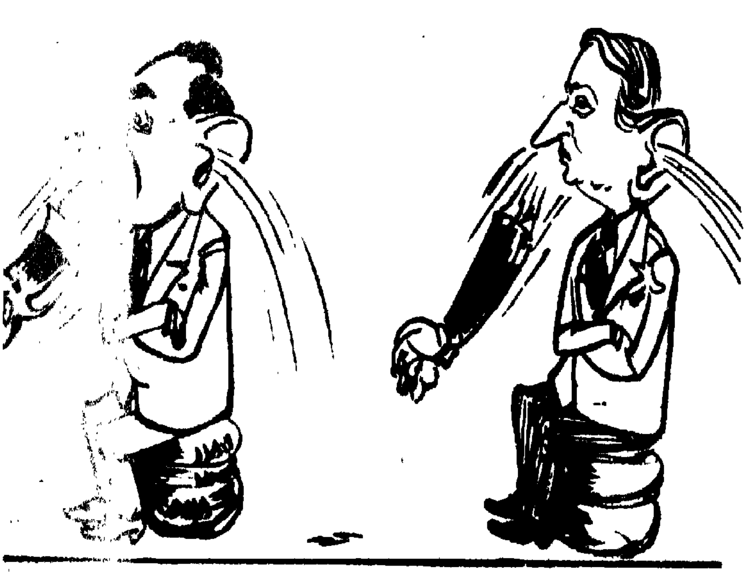
شرما جی نے بتایا کہ وہی ٹیکسی ڈرائیور چند ماہ پہلے ان کی دوکان پر آیا جو "جور باغ" میں واقع ہے۔ اس نے ابتدائی بات چیت میں انھیں یہ بتایا کہ گوالیار کا ایک ریٹائرڈ [آفیسر] اپنے کچھ نوادرات فروخت کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے بغیر کسی شک و شبہ کے اسی وقت اپنے دوست مسٹر رمیش کو اس ٹیکسی ڈرائیور کے ہمراہ روانہ کردیا تاکہ وہ ان نوادرات کا معائنہ کرسکیں اور قیمت کا اندازہ بھی لگا سکیں۔

اس کے بعد مسٹر رمیش کی ٹیکسی گوالیار ہوتی ہوئی شیو پوری کے ایک گھنے جنگل کی طرف روانہ ہوگئی جہاں اس وقت ڈاکو نتھو سنگھ کی عارضی قیام گاہ تھی۔ جب وہ وہاں پہنچ گئے تو رمیش کے سینے پر بندوق رکھ دی گئی اور اس [کو] لئے مجبور کیا گیا کہ وہ شرما جی کو گوالیار بلانے کا [خط] تحریر کرے۔ ... وہ گوالیار کے لئے روانہ ہوگئے اور وہاں نتھو سنگھ نے انھیں بھی اغواء کرلیا۔

پھر انھوں نے بتایا کہ گوالیار پور سے تقریباً ... میل دور چلنے کے بعد چار آدمی خاکی وردی پہنے اور [ہاتھوں] میں لئے ان کے ساتھ ہوگئے۔ ان ہی لوگوں نے ان کے [ہاتھ] کپڑے کے ٹکڑوں سے باندھے۔ وہ ان کے ساتھ تین میل تک گھنے جنگلوں میں چلتے رہے جب وہ ایک خاص مقام پر پہنچے تو ڈاکو نتھو سنگھ کے کیمپ میں ان کی ملاقات ان کے دوست مسٹر رمیش سے بھی ہوگئی اور تب جاکر انھیں تمام حالات سے آگاہی ...

پاکستان کو اب ہتھیار بالکل نہیں دیے جائیں گے۔ پکی بات۔





سورن سنگھ اور جے پرکاش نرائن جہاں بھی گئے انکی باتوں کو غور سے سنا

وہاں مہمان نوازی کے طور پر سب سے پہلے انھیں دودھ
س دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ باور کرایا گیا کہ وہ اپنے
ہیں انھیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

دوسرے دن جائداد اور نقدی کے بارے میں ان سے
ات پوچھے گئے۔ پوری تفصیل بتانے کے بعد انھیں مجبور
دہ اپنے بھائی کو جو لکشمی نگر میں رہتے ہیں آٹھ لاکھ
کے لئے خط لکھ کر دیں۔ اس کے بعد ڈاکو نتھو سنگھ کے
نے دو بار خفیہ طور پر ان کے بھائی سے دہلی میں ملاقات
ن انھی دنوں ان میں سے ایک آدمی مقامی پولیس کے
گرفتار کرلیا گیا اور بعد میں گوالیار پولیس نے بھی ایک
ے تین اور آدمیوں کو پہچان لیا۔

ادھر مسٹر شرما کے بھائی ڈپٹی ہوم منسٹر شری کے۔ سی
سے بھی ملے اور ان تمام کوششوں کے نتیجے میں ۲۵ ہزار
کی ادائگی کے بعد شرما جی کو آزاد کردیا گیا۔ یہ رقم اصل
یہ رقم کا بہت چھوٹا حصہ تھی اور اس کی ادائگی مسٹر شرما
ھائی کے ذریعے ڈاکوؤں کے کیمپ میں پہونچ کر کی گئی تھی۔

رہائی کے بعد ڈاکوؤں کی روزمرہ کی زندگی اور انکے
ے طور طریقے بیان کرتے ہوئے شرما جی نے اخبار نویسوں
یا کہ وہ لوگ صبح سویرے پوجا پاٹ کے لئے اٹھ جاتے ہیں
دیوی یا دیوتا کی پوجا نہیں کرتے بلکہ صرف اپنی رائفل
کرتے ہیں جو انکی روزی کا خاص اوزار ہی نہیں ان کی
محافظ بھی ہے۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ڈاکو
نکھو شادی شدہ ہے اور تین بچوں کا باپ بھی ہے۔ انکی
اور بچے گوالیار میں کسی جگہ رہتے ہیں۔ وہ ان کے پاس
ال کم سے کم دو بار ضرور جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اسکے
ہلک ہتھیاروں سے لیس کوئی نہ کوئی آدمی اس کے
گارڈ کی شکل میں ہوتا ہے۔ ان دنوں بیوی کے حاملہ ہونے
سے وہ کافی جلدی جلدی گوالیار کے چکر لگاتا رہتا ہے

آخر میں انھوں نے یہ بات بھی بتائی کہ ڈاکو خانہ بدوشوں
زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا کیمپ ایک جگہ پر بہت کم
کے لئے رہتا ہے۔ کھانے وغیرہ کا انتظام پاس کے
ادا کردیتے ہیں جنھیں ضرورت کے مطابق روپیے دیدیے
ہیں۔ اکثر جگہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ پولیس کے آدمی
ان کو گاہے بگاہے خبر کرنے کے لئے موجود رہتے لیکن گاؤں
اور پولیس سے اچھے تعلقات ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی

زندگی سے مطمئن نہیں رہتے۔ روزمرہ کے معمولات میں معمولی سے
معمولی احتیاط سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ ضرورت سے زیادہ
چوکنا زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر رات
کے وقت وہ اپنے خیموں میں معمولی روشنی تک نہیں جلاتے۔

مسٹر شرما کے بیان کے مطابق وسط مدتی انتخابات میں
ان ڈاکوؤں نے کچھ مخصوص سیاست دانوں کی مدد بھی کی تھی۔
ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں کی طرف
سے ایسی دھمکیاں دی گئیں کہ فلاں مخصوص امیدوار کو ووٹ

دیے جائیں۔ نتھو سنگھ جیسے ڈاکو اپنی علاقائی حد
ہیں۔ آخر میں انھوں نے مال کی تقسیم کے بارے میں
لوٹ کا ساٹھ فیصدی مال گروہ کا سردار یعنی ڈاکو
لے لیتا ہے اور بقایا حصہ دوسرے ممبران کو ان کی را
کے مطابق تقسیم کردیا جاتا ہے۔ نتھو سنگھ کی طرح ہر
باخبر اور دور اندیش ہوتا ہے۔ طبیعت کے لحاظ
حساس ہوتے ہیں، ان کا اپنا ضمیر ہوتا ہے، وہ لوگ
کبھی بے حرمتی نہیں کرتے اور نہ کبھی معصوم بچوں پر

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچیئے!

کیا آپ اس بچے کی پرورش اچھی طرح نہیں کرنا چاہیں گے؟



آپ چاہیں گے کہ اُسے عمدہ، اچھی خوراک، کپڑے، کھلونے اور کتابیں ملیں۔ لیکن اگر اگلا بچہ جلدی ہو جاتا ہے تو یہ سب آپ کے لئے آسان نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے؟

دنیا بھر میں لاکھوں لوگ یہی کر رہے ہیں۔ وہ اگلے بچے کی پیدائش اس وقت تک ٹالتے ہیں جب تک وہ اس کے لئے خود تیار نہیں ہو جاتے۔ نرودھ کی مدد سے آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ربڑ سے بنا ہوا نرودھ حمل روکنے کا وہ ذریعہ ہے جو دنیا بھر میں ... اس کا استعمال نہایت آسان ہے۔ اس سے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ آج ہی ایک پیکٹ کیوں نہ خرید لیں۔

یہ ہر جگہ ملتا ہے - 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان



▼ نرودھ

لاکھوں میں مقبول بے ضرر اور آسان

.... کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ

اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔

سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔

لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو

زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔

اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے

بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مُفت مشورے

اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے

دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے

ہو سکتی ہے۔

خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے

پُرمسرت دن



قارئین کے خطوط



غیر بنگالیوں کا قتل

محترم جناب مدیر صاحب۔ سلام مسنون

واقعات پڑھنے کا موقع کئی بار ملا، اور یہ خوشی ہوئی کہ آپ نے ترقی کی جانب ایک اور قدم بڑھایا، جو خدا کرے کامیاب ہو۔ اور بھلا کامیاب کیوں نہ ہوگا، کیونکہ ناکامی ان لوگوں کی قسمت میں ہوتی ہے جن کا حوصلہ پست ہے۔

بہرکیف غرض لکھنے کی یہ ہے کہ ماہ مئی کا نصف دوم شمارہ پڑھا جس میں آپ نے بنگلہ دیش پر شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق بہت سی باتیں لکھی تھیں، اور پھر اس ماہ یعنی جون کا نصف اول شمارہ میرے سامنے ہے جس میں بلراج مدھوک جیسے کٹر جن سنگھی کی معلومات جناب بیالال نذیر انصاری صاحب نے لکھی ہے۔

آج مدھوک جی ایک حلقے کے مانے ہوئے اور قابل احترام لیڈر ہیں اور ان کی عزت بھی خوب ہے بلکہ ہر پڑھا لکھا کوئی ان کے نام نامی سے واقف ہے۔ لیکن یہی شخصیت دوسرے اقلیتی فرقے کی طرفداری کا سے دور ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ بھلا کسی ایک حلقے یا کسی ایک فرقے کو خوش کر کے کوئی جہاں تک لیڈر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے اور پھر ایسا شخص اگر وزیر اعظم بنے تو ہولاکو، چنگیز، ہٹلر یا ہلاکو وغیرہ کی داستان دہرانے اور کچھ کر ہی کیا سکتا ہے۔

ہاں تو عرض یہ ہے کہ آپ نے بنگلہ دیش پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس مضمون سے ذرا مشابہت رکھتا ہے اور اس مدھوک جی جیسے کردار سے مسٹر شیخ مجیب الرحمٰن کا کردار بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اُدھر شیخ جی سوائے بنگالی کے اور کسی کو برداشت نہیں کر سکتے اور اِدھر مدھوک جی مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکتے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجیب میاں سے کئی درجہ بہتر مدھوک جی ہیں کیونکہ ان کے نقطۂ نظر ایک پہلو سے نظر آتے ہیں وہ یہ کہ کم از کم مدھوک جی ہندو دھرم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اگر وہ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے یا اس نظریے کے تحت رام راج قائم کریں، یا اکھنڈ بھارت بنائیں بہت حد تک درست ہے چونکہ اکثریت تو انہی کی ہے، اگر وہ چاہیں تو انھیں ایسا کرنے کا حق ہے اور اس پر ہم اقلیتی فرقے اگر واویلا مچائیں تو نامناسب ہی ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کو ناقابل برداشت سمجھا اور سیاسی یا اتفاقی پوزیشن دینے سے انکار کیا اور اکھنڈ بنگلہ دیش کی آواز بلند کی اور اس کو عملی جامہ پہنایا بھی تو وہ اس طرح کہ اپنے ہی بھائی کا جو کندھے سے کندھا ملا کر پاکستان حاصل کرنے میں ساتھ تھا قتل عام کرایا اور وہ بھی اس طرح کہ شاید ہٹلر کی فوج اور اسرائیل کی فوج بھی اتنی تعداد میں مسلمانوں کا خون نہ بہا سکی ہوگی۔

آپ نے شیخ جی کو نہ جانے کن کن خطابوں سے نوازا ہے اور آپ جیسے کچھ کرسی کے خواہاں مستند مسلم صاحب اقتدار حضرات نے بھی ان کو کافی اچھالا ہے جو میری ہی نظر میں کیا، بلکہ ہندوستان اور دنیا کے جتنے بھی مسلم باشندے ہیں سب ہی کی نگاہ میں ناقابل تحریر ہے۔ دیکھیے تو نام مسلمان کا ہی رکھ چھوڑا ہے لیکن وہ شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جو اپنے ہی بھائیوں کا خون کرے جبکہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون حرام ہے۔

جو مظالم عوامی لیگیوں نے ڈھائے، اس کو سن کر اور دیکھ کر قیامت بھی شرما جائے، پھر بھلا مدھوک جی جو کئی اعتبار سے مجیب میاں پر فوقیت رکھتے ہیں کہ کم از کم انھوں نے زبان سے تو بہت کچھ کہا ہے اور یہ تو ضرور ہی انسانی ہمدردی کے تحت بولتے کہ یہاں کے جتنے مسلمان ہیں وہ سب پاکستان چلے جائیں یا پھر ہندو دھرم کے تحت رہیں ... ایک اچھا سا انداز ہے اور مسلمانوں کو ہندوستان سے چلے جانے کا کافی وقت انھوں نے دیا، مگر ایسا نہ ہو کہ اگر مسلمان جانے سے انکار کریں تو یہاں کی ہندو آبادی عوامی لیگیوں کی طرح مسلمانوں کا قتل عام کریں جن کا مظاہرہ ہم آپ دیکھ چکے ہیں مختلف صوبوں میں اور پھر روزانہ دیکھنے کا موقع ملتا ہی رہے گا۔

رہا مجیب میاں کے ساتھ ہمدردی کا سوال تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں۔ اس لیے کہ سب سے پہلے مجرم تو وہ اس لیے ہیں کہ انھوں نے پاکستان سے الگ ایک بنگلہ دیش بنانے کی غداری کی، دوئم یہ کہ غیر بنگالیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے سوئم یہ کہ غیر بنگالیوں کو قتل کروانا شروع کیا اور ہندوؤں کا ساتھ دے کر اپنے ہی بھائیوں کا قتل عام کروایا۔ بھلا اس طرح کے کردار کا آدمی، ظالم، غدار اور منافق کے سوا اور کچھ کہلانے کا مستحق ہے۔ اگر ہم ہندوستانی مسلمان بنگالی مسلمان کی ہمدردی رکھتے ہیں اور پناہ دے کر ہر طرح کی امداد دینے کے لیے تیار ہیں اور اپنے ہم وطن سے اپیل کر کے ہر طرح سے حمایت کرتے ہیں تو کیا وہ بنگالی مسلمان نہیں ہے۔ کیا وہ رسول کی امت نہیں ہے کیا اس پر اسلامی مذہب کے فتوے نافذ نہیں ہوتے۔؟

تو پھر کیوں انھوں نے اپنے ایک قرآن، ایک خدا، ایک رسول کے پابند بھائی کو گولیوں سے چھلنی کرا دیا جو نہتے بھی تھے اور معصوم بھی۔ نہ اقتدار میں تھے نہ اکثریت میں۔ نہ ظالم تھے نہ فوجی تھے بلکہ سوائے انھی ہاں میں ہاں ملانے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اور پھر یہ کہ جب شیخ مجیب میاں اپنے ہی بھائی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے تو پھر ایسا شخص وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھے۔؟

اب تو مشرقی پاکستان کی کل کہانی آپ کے سامنے آچکی ہے اور پاکستان کو کار ماعیتر آرہا شیر کرنے والے مجیب میاں پر لوگ سدھار گئے، اور شاید اس سے متعلق آپ کے سامنے بہت سے مضامین آگئے ہوں جن کے مقابلے میں یہ حقیر سا خط آپ کو ناگوار گزرے لیکن میں پابند ہوں آپ کو اس خط سے یاد کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اس کو قابل اشاعت سمجھیں گے اور میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو اپنے واقعات میں جگہ دے کر مجھے شکریے کا موقع دیں گے۔

میں اس امید پر کہ اردو جریدے ہم مسلمانوں کی زبان اور آواز کے ترجمان ہوتے ہیں اور ہر کس و ناکس کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کرتے ہیں، آپ کو یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔

خیر اندیش محمد محمود رضا دربھنگہ

اور یہ بھی حقیقت ہے

محترمی! آداب عرض

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ بعض لوگ چند غیر بنگالیوں پر ہونے والے نام نہاد مظالم کا سہارا لے کر لاکھوں بنگالیوں پر ہونے والے ظلم کو کیوں جائز قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا اس لئے کہ وہ لوگ خود بنگالی نہیں ہیں یا پھر وہ بنگالیوں کو انسان سے کم درجے کی کوئی چیز سمجھتے ہیں جس پر ظلم کرنا یا قتل کرنا جائز ہے۔ مشرقی بنگال کے لوگ زیادہ تر غریب اور پسے ہوئے تھے۔ وہ لوگ پاکستان میں اس لئے شامل ہوئے کہ ان کا مستقبل سنور سکے، وہ اپنے آپ کو انسان کہنے کا حق حاصل کر سکیں۔ لیکن ہمارے جاننے والے لوگ اور پنجاب سے آنے والے سرمایہ داروں نے ان کے تمام معاشی نظام پر قبضہ کر لیا۔ جو لوگ مشرقی پاکستان جا چکے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تمام جوٹ انڈسٹری، ٹکسٹائل انڈسٹری، پیپر انڈسٹری وغیرہ پر مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ پاکستان کے بائیس سرمایہ داروں میں سے ایک بھی بنگالی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں سے جانے والے لوگوں نے ان کے پچھڑے پن کا فائدہ اٹھا کر تمام پولیس اور سرکاری نوکریوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ بنگالیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں تہذیب سکھائی ہے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ پورے برصغیر میں سب سے زیادہ بہتر معاشرت بنگال ہی کی ہے۔

مجھے ان لوگوں کے انسان ہونے پر شبہ ہوتا ہے جو چند لوگوں کے قتل پر تو پریشان ہیں لیکن لاکھوں لوگوں پر فوجیوں، پولیس اور جاگیرداروں سے ہونے والے قتلِ عام کو خدائی قہر کا نام دیتے ہیں اور اگر بنگال میں دو چار غیر بنگالی مر بھی گئے ہیں تو اس کی ذمے داری یحییٰ خاں کی حکومت پر ہے۔ حکومت بے بس نہیں تھی، تمام ملک پر یحییٰ کی فوجوں کا قبضہ تھا۔ ان کی لاکھوں فوج مشرقی بنگال کے شہروں میں دندناتی پھر رہی تھی۔ سول نافرمانی کرنے والوں پر جگہ جگہ گولیاں کی بوچھاڑ کی گئی۔ صرف ۲ مارچ کو چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں ہزاروں پرامن مظاہرین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جبکہ مذاکرات چل رہے تھے۔

فوج نے ۱۵۰ آدمیوں کو ٹونگی میں جلا کر ہلاک کر دیا تھا۔ سول نافرمانی کے دوران اگر بنگالی غیر بنگالیوں کا قتل کر رہے تھے تو فوج کہاں تھی؟ پاکستان ریڈیو کیوں خاموش تھا؟ ہندوستان میں ان کے چاہنے والے اخبارات کیا کر رہے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ بنگال میں ہونے والے واقعات نے نام نہاد نظریے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا ہے، اور یہ حقیقت سامنے آگئی ہے کہ قومیں معاشی، تہذیبی، جغرافیائی بنیادوں پر بنتی ہیں نہ کہ مذہب کی بنیاد پر۔ اگر قومیں مذہب کی بنیاد پر بنا کرتیں تو آج تمام مسلم ملک جو متحد ہو رہے ہوتے شاہ حسین ہزاروں فلسطینیوں کا خون نہیں کرتے۔ ترکی اور ایران مسلمانوں کے دشمن ملک اسرائیل کو تسلیم نہ کرتے اور اس کا ساتھ نہ دیتے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں جنگ نہ چلتی۔ لیکن سر دست حقیقت یہ ہے کہ قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنتیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں جو لوگ اس دو قومی نظریے میں یقین رکھتے تھے ان کی سیاست کی بنیادیں ہل کر رہ گئی ہیں۔ جن بنیادوں کو لے کر مسلم لیگ نے پاکستان بنوایا تھا خود پاکستان کے حکمرانوں نے ان بنیادوں کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ لیکن جو لوگ پچھلے تیس چالیس سال سے اس تھیوری پر یقین رکھتے آئے ہیں ان کے لئے اس حقیقت کو ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے اب وہ اپنے اس غلط طریقہ فکر پر پردہ ڈالنے کے لئے بہاری مسلمان اور بنگالی مسلمان کا ہوا کھڑا کر رہے ہیں۔ قتل چاہے بنگالی کا ہو یا بہاری کا، مسلمان نے مسلمان کا قتل کیا ہے اس بات سے ہی دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے ہندوستانی مسلمان اپنے ذاتی مفاد یا اپنے چند رشتے داروں کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر بنگلا دیش کے مسئلے کا مطالعہ نہیں کریں گے۔ وہ اس مسئلے کو تاریخی حقائق اور شعور کی روشنی میں دیکھیں گے۔ ایک انسان کی حیثیت سے دیکھیں گے، ایک مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں گے اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے دیکھیں گے۔

آپ کا۔ محمد فارخ۔ دہلی۔

یحییٰ اسلام اور جمہوریت کے غدار ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم

آپ نے اپنے اداریہ "باغی اور غدار کون" میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ کسی ایک برائی کو دوسری برائی کا جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ باغی ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بغاوت آئینی حکومت سے کی جاتی ہے، عوام کی منتخب حکومت سے کی جاتی ہے۔ یحییٰ خاں کو پاکستان کے عوام نے منتخب نہیں کیا۔ وہ صرف عوام کے حقوق دبا کر صدر بن بیٹھے ہیں، اس حالت میں ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے جمہوری اور اسلامی حقوق کے لئے لڑے۔ اسلام نے مسلمانوں کو اپنے میں سے اپنا امیر چننے کا حق دیا ہے۔ یحییٰ خاں نہ تو جمہوریت کی رو سے، نہ اسلامی رو سے اور نہ ہی انسانیت کی رو سے پاکستان پر حکومت کرنے کا کوئی حق رکھتے ہیں۔ غداری ساڑھے سات کروڑ بنگالیوں نے نہیں کی بلکہ حکومت کے مخالفین چند فوجی حکمرانوں نے کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج مغربی پاکستان کے لوگوں کو حقائق کا علم ہو جائے تو وہ بھی اپنی اس جابرانہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

میری اور میرے دوستوں کی دعا ہے کہ پاکستان میں جلد از جلد جمہوری، آئینی اور اسلامی حکومت قائم ہو جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا حق نہ چھین سکے جس میں چند لوگ پورے ملک کے مستقبل کے ساتھ نہ کھیل سکیں۔

مخلص۔ محمد بابر الدین۔ نیو یارک (امریکہ)۔

انقلابی کا انٹرویو

بھائی صاحب، آداب عرض

گزشتہ شمارے میں آپ نے جو زایان کا انٹرویو شائع کیا تھا وہ بھی انقلابی کے قلم سے اپنی جگہ آپ ایک بڑا ہی دلچسپ اور [illegible] تھا پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ آپ کا شائع کردہ انٹرویو [illegible] حقیقت سے نزدیک تر ہوتا ہے، اس کے لئے میں آپ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کا۔ محمد طلیل، بنگلور

واقعات [illegible] رہے۔

[illegible] تسلیمات

ویسے تو آپ کے کالم سے شائع ہونے والے بھی [illegible] میرے خیالات [illegible] [illegible] ہوں لیکن [illegible] انداز [illegible]

[illegible]

[illegible] دونا [illegible] ہیں [illegible]

خبر گرم۔ [illegible]

واقعات [illegible]

بقیہ :- صحافیوں کا سیمینار

بورے عملی جامہ نہ پہن سکے۔ اس لیے کہ اردو کے بیشتر اخبارات ایسے ہیں جن کے ساتھ ناشرین کے ذاتی مفادات وابستہ ہیں۔

دلی میں اردو ایڈیٹروں کا یہ سیمینار جو اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا بے حد کامیاب خیال کیا جا رہا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے کنوینروں مسٹر اے۔ ستار شیر دلانی صدر آل انڈیا اسمال نیوز پیپرز فیڈریشن اور مسٹر منور ما دیوان (ایڈیٹر پریس ایشیا انٹرنیشنل) کے سر ہے۔ انھوں نے اور ان کے ساتھی جناب ظفر پیامی صاحب نے اور پریس ایشیا انٹرنیشنل کے دوسرے کارکنوں نے سیمینار کو کامیاب بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ اس سے اردو ایڈیٹروں کو نہ صرف حالات حاضرہ اور خود اپنے مسائل کا جائزہ لینے کا موقع ملا بلکہ وہ ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور بنگلا دیش کے سلسلے میں جو وقت کا سب سے اہم اور بڑا مسئلہ ہے، اُردو اخبارات کی ایک واضح پالیسی سامنے آگئی۔

اب کوئی اُردو اخبارات کی طرف انگلی اٹھا کر نہیں کہہ سکتا کہ ان کا راستہ قومی دھارے سے الگ ہے۔

بقیہ :- اردو پریس

اس بات کو بھی کہنا فضول ہے۔ اردو پریس کے معیار کو بلند کرنے کے لیے سرمایہ اور سلیقہ کی ضرورت ہے۔ تھوڑا سا سرمایہ اور سلیقے کے چند افراد۔ اچھا اور معیاری روزنامہ نکال سکتے ہیں اور ایسا روزنامہ جلد ہی عوام کی نظروں میں جگہ پا سکتا ہے۔

ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے اردو داں ایسے افراد ضرور ملیں گے جو مشترکہ سرمائے سے معیاری روزنامہ نکال سکیں گے۔ ہندوستان کے مختلف اہم شہروں سے ایسے روزنامے نکل سکتے ہیں جو انگریزی روزناموں کے مقابلے میں رکھے جا سکیں۔ ابھی عام طور پر اردو پریس لیتھو کا رہین منت ہے جس کی طباعت بے شک کم خرچ تو دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی پڑھنے والوں کی نگاہ میں اس کا وزن بھی کم ہی ہوتا ہے۔ لیتھو کی جگہ آفسیٹ کی طباعت کا طریقہ اپنایا جائے تو بہت سی دشواریاں آسانی کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں۔ ایسے اخبار ابتدا میں خود شوادول سے گزرے گا لیکن اگر چلانے والا چلائے تو ایک آدھ سال میں اپنے پیروں

پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عام اُردو داں حضرات اردو پڑھنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہاں وہ ایسے اخبار کو پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس میں اچھے مضامین، سلیقہ اور حسن ذوق کی کمی ہو۔

"اردو ڈائجسٹوں" نے حال کے چند برسوں میں خوشگوار نتیجے پیش کیے ہیں۔ "واقعات" کی کامیابی بھی اُردو صحافت کو پڑھنے والوں کے مزاج سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ نئے تجربات اقدام کی دعوت دیتے ہیں۔ ایسا اقدام جو اُردو صحافت کو باوقار بنائے اور مضبوط اُردو پریس کو جنم دے۔

بقیہ :- کشمیر

جاتا ہے۔ یہاں سے پوری وادی کشمیر کا دلفریب نظارہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ گل مرگ کے پاس ہی کھلن مرگ نام کا ایک مقام ہے۔ ننگل نالا اور فیروز پور نالا بھی قریب ہی ہے۔ یہ جگہیں مچھلی کے شکار کے لیے کافی مشہور ہیں۔

پہل گام ـــــ ہر وہ سیاح جو کشمیر کی سیاحت کرتا ہے یہاں ضرور آتا ہے۔ کشمیر جا کر پہل گام نہ جانا کشمیر کی نامکمل سیاحت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ سات ہزار فیٹ کی بلندی پر بسا ہوا یہ پرسکون اور جاذب نظر مقام سیاحت کے نقطہ نظر سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں مشہور و معروف ہے۔ اسے عالمی شہرت حاصل ہے۔ پہل گام اور ملن کے درمیان لدر ندی ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کا مرکز سمجھی جاتی ہے۔ پہل گام سے صرف ۱۸ میل کے فاصلے پر شیش ناگ جھیل اور گلیشیر ہے۔ ۱۱ میل کی دوری پر تارسر جھیل ہے۔ اس کے علاوہ کاسر ناگ کوکر ناگ سونا مرگ وغیرہ بھی وادی کشمیر کے نہایت دلچسپ اور قابل نظارہ مقامات ہیں جہاں پہونچ کر بڑی روحانی اور قلبی خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔

امرناتھ ـــــ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے۔ یہاں ہر سال ہندو زائرین ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں۔

پہل گام سے امرناتھ تک صرف پیدل یا گھوڑے پر جانا ممکن ہو سکتا ہے گھوڑے کے علاوہ کوئی دوسری سواری وہاں تک نہیں پہونچ سکتی۔ یہاں کا شیو مندر بہت مشہور ہے۔ اس مندر میں قدرتی طور پر برف کی بنی ہوئی شیولنگ مخصوص صورت ہے اس کا درشن کرنے کے واسطے جولائی اور اگست کے مہینوں میں ہزاروں تیرتھ کرنے والے سادھو سنت اور جوگی دور دراز مقامات سے آ کر یہاں جمع ہوتے ہیں۔

پہل گام سے امرناتھ تک کے راستے میں چندن باری اور شیش ناگ کا پڑاؤ جیسے اہم مقام بھی ہیں۔ ان کو دیکھے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ چندن باری برف کا پل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک عجیب کیف و سرور کا احساس ہوتا ہے۔ چھری بھوانی اور مٹن وغیرہ جگہیں ہندوؤں کی مذہبی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقامات بھی کافی اہم ہیں۔

ضلع اودھم پور میں دلشیر دل دیوی کا نہایت قدیم مندر ہے۔ یہ مندر ۵۲۰۰ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

کشمیر کی گھریلو صنعت، دستکاری اور کشیدہ کاری کے انمول نمونوں کو ایک سیاح کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہاں کی ہاتھ کی بنی ہوئی خوب صورت، دلکش اور دیدہ زیب قیمتی شالیں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کشمیری قالین بھی لاجواب ہوتے ہیں۔ اخروٹ کی لکڑی پر کشمیری فنکار اتنے پرکشش نقش و نگار بناتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ان بے جان لکڑی کے ٹکڑوں میں کسی نے جان ڈال دی ہو۔

کشمیر کی سیاحت مکمل کرنے کے بعد زبان سے بے ساختہ یہ پکار اٹھنے کے لیے ایک صاحب دل اور صاحب نظر پسند مجبور ہو جاتا ہے۔

خطۂ کشمیر تیرے کوہساروں کو سلام
تیری وادی کے حسین دلکش نظاروں کو سلام۔

اگلے شمارہ میں

مشرقی بنگال کے حالات کی نزاکت اور متضاد بیانات اور اطلاعات کے پیش نظر مدیر دوام مولانا عبدالوحید صدیقی نے موقع پر پناہ گزینوں کے کیمپوں اور ان کے حالات کا بچشم خود معائنہ اور مطالعہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ تقریباً ایک ہفتہ تک مختلف کیمپوں کا معائنہ کرنے کے بعد دہلی واپس آ گئے ہیں۔ آئندہ شمارہ میں ان کے مشاہدات و تاثرات کی قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائیگی۔ (ادارہ)

ایک رات اور

فیض احمد فیض سے معذرت کے ساتھ

ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات!

یہ سیہ رات جو ناگن کی طرح کالی ہے
کتنے مظلوم غریبوں کا لہو چاٹ چکی
اس کے سائے میں نجانے کتنی ہی جانیں گئیں
کتنے معصوم ارادوں کا گلا کاٹ چکی!

چھن گیا کتنی ہی پاکیزہ نگاہوں کا حجاب
لٹ گیا کتنی ہی دوشیزہ بہاروں کا شباب
چند لمحے ہی مگر اور ہیں خونی حالات
ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات

آتش و خون کی برسات گزر جائے گی
ان الم ناک اندھیروں کا فسوں ٹوٹے گا
شب کے تاریک دریچے سے سحر جھانکے گی
وقت کے ہاتھ پہ یوں رنگ حنا پھوٹے گا

زندگی سازِ تمنّا پہ غزل گائے گی
تیرے افسردہ لبوں پر بھی ہنسی آئے گی
جو گزرنے ہوں گزر جائیں وہ ہم پر صدمات
ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات

پھر ضیا بار فضاؤں سے محبت کی شراب
اتنی برسے گی کہ بہہ جائیں گے نفرت کے محل
مردنی صبح کے ہونٹوں پہ تبسم ہوگا،
زندگی وقت کے ہر تار پہ چھیڑے گی غزل

تیرے افسردہ لبوں پر بھی ہنسی آئے گی
پھر کسی ہاتھ سے شمشیر نہ اٹھ پائے گی
صبح کے ہونے تلک اور ہے یہ رنگِ حیات
ایک رات اور مرے دوست! فقط ایک ہی رات

[illegible]

غزل

تر سنبھلی

شہر کی بھیڑ میں ملتا نہیں چہرا کوئی — اب کسے اپنا کہے کس کو پرایا کوئی؟
اپنے دل میں بھی کبھی سوچتا آتا کوئی — زندگی کیسے گزارے گا اکیلا کوئی
سونا سونا سا پڑا ہے مری یادوں کا نگر — کاش اس راہ سے ہو کر بھی گزرتا کوئی
ربطِ باہم ہی نے مفہوم دیا ہے ورنہ — حرف معنیٰ ہی نہیں رکھتا اکیلا کوئی
ہر ورق آج بھی سادہ ہے کتابِ دل کا — یہ تمنا ہی رہی نقش ابھرتا کوئی
کھائے جاتا ہے یہ تنہائی کا اسکنجہ — اس بھرے شہر میں کاش اپنا بھی ہوتا کوئی
ہر طرف یوں تو بہت بھیڑ ہے انسانوں کی — مجھ کو لیکن نہ نظر آیا شناسا کوئی

بیٹھی بیٹھی سی ہے یادوں کی کسک دل کے قریب
اے قمر بخش گیا درد کی دنیا کوئی

غزل

رضی بھوپالی

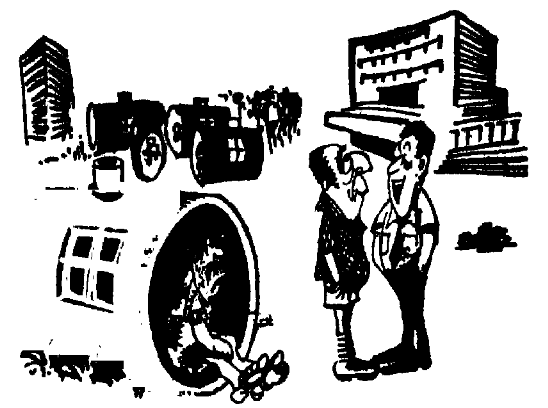
سوالِ حسن دیکھیں کوئی شمعِ انجمن دیکھیں — وہ دیوانے کہاں جو اب مرا دیوانہ پن دیکھیں
حقیقت میں وہی ہیں آشنائے لذتِ منزل — جو ہر ہر گام پر قید و قفس دار و رسن دیکھیں
جنونِ عشق نے ایسا کیا بے گانۂ ہستی — نہ مجھ کو راہبر دیکھے نہ مجھ کو راہزن دیکھیں
نہیں ہر خار میں پھولوں کی رعنائی نظر آئے — چمن کو جب بہ اندازِ چمن اہلِ چمن دیکھیں
ستم تو کل کا اہلِ گلشن نے بہت دیکھا — جلے آشیاں کی شاخِ گل کا بانکپن دیکھیں
طلبِ انتظارِ روز روشن میں جو بیٹھے ہیں — نمودِ صبح کی تاریک ذرّوں میں کرن دیکھیں
ہم ان کے چراغاں ہیں فروزاں بے لگن ان کی — جو منزل بعد میں طوفاں سے پہلے موجزن دیکھیں

رضی حیرت ہے فنکاروں کو غیرت کیوں نہیں آتی
جو اپنے سامنے برباد ہوتا اپنا فن دیکھیں

JULY 1971
(FIRST HALF)

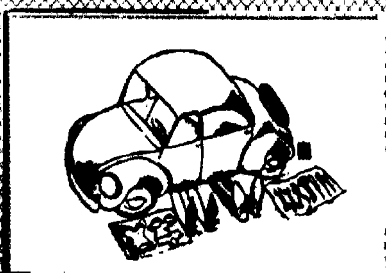
WAQIAT

REGD. NO. D
TELEPHONE :



"منسٹر صاحب نے جو پہلا کام کیا ہے وہ رہنے کے لائق پائپ ڈالنے کا کیا ہے"

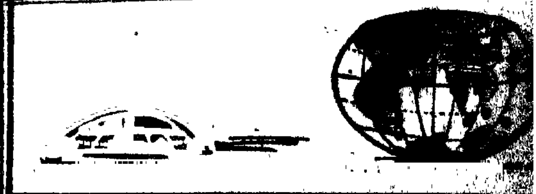






۱۵۰ میل؟ ۱۵ میل کے دس ٹکٹ خریدو






واقعات
بنگلا دیش کے پناہ گزینوں کی
AUG 1971



ملاقات نقوی دہلی

تلوار اور اتحاد

شاہ فیصل گذشتہ ماہ متحدہ عرب جمہوریہ کے دورے پر گئے تو انھوں نے صدر انور سادات کو ایک قیمتی تلوار پیش کی۔ شاید اس کا مطلب تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ عربوں کے حقوق کی بحالی اور مقامات مقدسہ کی واپسی کے لئے عرب ممالک مل کر تلوار اٹھائیں اور اپنے تمام وسائل کو ایک جگہ مجتمع کر لیں۔

شاہ فیصل شروع سے ہی عرب اتحاد کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کی سرگرمیوں کا دائرہ عالم اسلام کے اتحاد تک وسیع رہا ہے۔ عرب اتحاد کی کوششوں میں مرحوم صدر ناصر کو ہمیشہ ان کا تعاون حاصل رہا اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اب وہ صدر انور سادات کی معاونت کر رہے ہیں۔

لیکن یہ دنیائے عرب کی بدقسمتی ہے کہ ان کی یہ کوششیں ابھی تک بارآور نہیں ہو سکیں اور ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا جب عرب ممالک فخر کے ساتھ کہہ سکیں کہ ہم سب ایک ہیں۔ بات بات میں غلط فہمیاں، بات بات میں تنازعات اور بات بات میں مسلح تصادم یہ عربوں کا طرز عمل رہا ہے اور ان کی وہ توانائی جو عرب حقوق کی بحالی اور مقامات مقدسہ کی واپسی کے لئے مشترکہ دشمن کے خلاف خرچ ہونی چاہئے تھی ایک دوسرے کے خلاف خرچ ہوتی رہی ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کہ اندرونی خلفشار اور فوجی انقلابات عربوں کے لئے مقدر ہو کر رہ گئے ہیں۔ عراق، شام، مصر، لیبیا، الجزائر اور سوڈان وغیرہ سب ہی فوجی انقلابات کا شکار ہو چکے ہیں اور اب مراکش بھی ان ہی کی صف میں شامل ہو گیا ہے اگرچہ وہاں فوجی انقلاب ناکام ہو گیا اور شاہ حسن بال بال بچ گئے لیکن بہرحال دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ اندرونی خلفشار سے کوئی عرب ملک بچا ہوا نہیں ہے۔

اردن نے اس خلفشار میں تمام دوسرے ملکوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور ایسا نظر آتا ہے جیسے کہ اس نے فلسطینی فدائیوں کا قلع قمع کرنے کو اپنا منصب سمجھ لیا ہے۔ یہ وہ فلسطینی فدائی ہیں جنھوں نے اسرائیل کا ناطقہ بند کر دیا تھا اور جو طویل چھاپہ مار جنگ لڑ کر اپنے دشمن کا کچومر نکال سکتے تھے لیکن جو کام اسرائیل نہ کر سکا اسے خود اردن انجام دے رہا ہے۔ وہ فدائین کے خلاف بکتر بند دستے اور فضائی طاقت استعمال کر رہا ہے اور دنیا تماشہ دیکھ رہی ہے، حتیٰ کہ وہ عرب لیگ بھی تماشہ دیکھ رہی ہے جو عربوں کو ایک پلیٹ فارم جمع رکھنے کا وسیلہ ہے۔ کیا زمانہ میں پہنچنے کی یہی باتیں ہیں۔

یہ موقع تھا کہ تمام عرب ممالک اپنے باہمی تنازعات اور اندرونی خلفشار کو کسی آئندہ وقت کے لئے اٹھا رکھتے اور اپنی پوری طاقت اپنے مشترکہ مقاصد کی تکمیل میں لگا دیتے اس لئے کہ اتحاد و یکجہتی ہو تو انسان تلوار اور اسلحہ کے بغیر بھی دشمن سے لڑ سکتا ہے لیکن اگر اتحاد نہ ہو تو تیز سے تیز تلوار بھی ناکارہ ہو جاتی ہے۔

خدا کرے عرب طاقتیں اس حقیقت کو محسوس کریں اور پوری طرح متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو کامیابی یقیناً ان کے قدم چومے گی اور وہ عربوں کے لئے ان حقوق کو حاصل کر سکیں گے جنھیں اسرائیل نے امریکہ کی پشت پناہی سے غصب کر رکھا ہے۔

آگ اور پانی

ایک امریکی کالم نویس کو اس بات پر حیرت تھی کہ صدر امریکا مسٹر نکسن بنگلہ دیش کے معاملہ پر خاموش ہیں۔ مگر پھر اس نے خود ہی اس خاموشی کی یہ وجہ دریافت کر لی تھی کہ چونکہ صدر نکسن اور ان کے مشیر عملی انسان ہیں اس لئے وہ پاکستان میں صرف جنرل یحییٰ خاں سے "معاملہ" کریں گے کیونکہ وہاں اس وقت ان ہی کا عمل دخل ہے۔

وہ معاملہ کیا تھا اس وقت کسی کو معلوم نہ ہو سکا لیکن ڈاکٹر کیسنجر نکسن کے مشیر نے صدر یحییٰ کے اشتراک سے جو کھیل کھیلا اور راولپنڈی سے ایک جاسوس کی طرح پیکنگ پہنچ کر جس طرح ماؤزے تنگ اور صدر نکسن کے درمیان ملاقات کا انتظام کیا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ معاملہ کیا تھا اور بنگلہ دیش کے مسئلہ پر امریکا کیوں خاموش تھا۔

دراصل جنگ ویت نام میں حصہ لینے کی بنا پر امریکا ان حالات میں پھنس گیا ہے ان سے نکلنے کی ضرورت سمجھ رہا تھا کہ کمیونسٹ چین کے ساتھ مصالحت کے ... جائے لیکن اس کے لئے اسے ایک بچولیا کی ضرورت ... دونوں کی ملاقات کے لئے راہ صاف کرنے میں مدد ... اور پاکستان اسے ایک بچولیا مل گیا اس نے جو پالیسی ... ہے شاید یہ اسی کا صلہ ہے کہ مسٹر نکسن اور ان کے مشیر ... یہ کہ بنگلہ دیش کے معاملہ میں خاموش ہے بلکہ امریکی کانگریس کے بہت سے ممبروں کی سخت مخالفت کے باوجود ... کو اسلحہ بھی مہیا کر رہے ہیں اسلحہ کی یہ سپلائی ایک تشویشناک معاملہ ہے جس کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے اس ... تو نکسن ماؤزے تنگ ملاقات کی خبر جہاں سے میشین نظریے ... نے بین الاقوامی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی ہے یہ ایک سنسنی خیز خبر ہے جس پر ہلچل پیدا ہونی ہی چاہئے تھی۔ دو ایسی طاقتوں کا قریب آنے کے لئے تیار ہو جانا کوئی معمولی نہیں ہے جنھیں نظریاتی اعتبار سے بعد المشرقین ہو۔ یہ حقیقت میں آگ اور پانی کا میل ہے اس کا بین الاقوامی سیاست پر گہرا اثر پڑے گا خاص طور سے ایشیا اور مشرقی ایشیا کی سیاست پر جہاں دونوں طاقتیں اپنا اثر قائم رکھنا چاہتی ہیں۔

شاہ فیصل صدر سادات کو تلوار پیش کر رہے

قارئین کے خطوط

[illegible] اندھیروں سے باہر آؤ۔

محترم صدیقی صاحب۔ سلام و نیاز

[illegible] واقعات نے ایک دم دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے [illegible] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں میں پھر سیاسی [illegible] کا آغاز ہوا ہی چاہتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد [illegible] نہیں رہی۔ مسلمان اب تک اندھیرے میں ہی ٹکریں مار رہا ہے۔ یہ بیمار قوم ایک کٹھ پتلی کی مانند [illegible] کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ جہاں اب تک [illegible] آپ نے واقعات کے ذریعے پھر [illegible] جناب سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

آپکا خیر خواہ۔ عتیق اللہ۔ (ایجنی)

[illegible] مایوس کن۔

مولانائے محترم۔ تسلیمات

[illegible] واقعات کا تازہ شمارہ ملا جو جون کا نصف اول ہے [illegible] کے لئے [illegible] [illegible] اور اس کے اوپر [illegible] کو انداد کی سوغات [illegible] [illegible] بالکل صحیح لکھا ہے کہ نیا بجٹ قطعی مایوس کن [illegible] کے بارے میں [illegible] [illegible] اندرا گاندھی سے [illegible] [illegible] صاحب نے کیا ہے [illegible] [illegible] [illegible] جو [illegible] کا اعلان کیا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] مسائل حل ہو جائے گا۔ اب [illegible] کا انقلاب ہے [illegible] وقت [illegible] بھی بہتا اور بدنی کے ساتھ ہو جائے گا۔ والسلام مخلص۔

رشید الدین۔ (جہانگیر)

حقیقت کیا ہے ؟

محترم ایڈیٹر صاحب۔ تسلیمات

آپکا اداریہ "باغی یا غدار کون ؟" نظر سے گزرا۔

جہاں آپ اسلامی جمہوری نظام کے حامی نظر آتے ہیں وہیں آپ اسلام کی قوت اتحاد کو پامال کرتے ہوئے اسلام کے اصولِ اتحاد سے منحرف بھی نظر آتے ہیں۔ اسلام بلا امتیاز، زبان و نسل اور رنگ ہر مسلمان کو آپس میں بھائی بھائی کہتا ہے اور اسلام کی نظر میں ایک مسلمان کا قتل کرنے والا دوسرا مسلمان، مسلمان نہیں بلکہ کافر ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اس بات کو جانتے ہوئے بھی کالعدم عوامی لیگ کے دہشت پسندوں کے منافقانہ روش کے مداح ہیں تو یہ محض آپ کی کوتاہ علمی کا باعث ہے۔

حقیقتاً آپ کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مجیب کے دہشت پسندوں اور غنڈوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ کونسا غیر اسلامی اور وحشیانہ سلوک کیا۔ ویسے کہانی تو نہایت ہی دردناک اور ناقابل بیان ہے، مگر پھر بھی چند باتیں عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ آپ کی غلط فہمی کا علاج ہو سکے۔ مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک سے ہی مجیب کے دہشت پسند حامیوں نے غیر بنگالیوں کو چن چن کر ختم کرنا شروع کر دیا۔ کشتیا میں جمعے کی نماز کے وقت نماز میں سجدہ ریز مسلمانوں پر محض زبان کی بنا پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے ایک خاصی تعداد کو ہلاک کر دیا۔ قصبہ [illegible] کے غیر بنگالیوں اور کنبے کے سارے افراد کو گرفتاری کے بعد نہایت ہی ایذا رسانی کے بعد موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ بعض مقامات مثلاً سانتاہار، دیناجپور، میمن سنگھ وغیرہ کے مرد، عورت اور بچوں تک کو نہ بخشا گیا اور انہیں بڑی ہی سفاکی اور بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

[illegible] اور چاٹگام کے غیر بنگالی مردوں کو گرفتاری کے بعد نہایت ہی بے دردی سے پیٹتے ہوئے کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ سب کچھ [illegible] [illegible] مجیب کے دہشت پسند حامی [illegible] انصار اور [illegible] [illegible] [illegible]۔ اس بات کا ثبوت مہیا کرنے والے بہار اور بنگال میں سرحد پار کر آئے ہوئے غیر بنگالی [illegible] یتیم [illegible] [illegible] والی تفاصیل کو حذف کر کے محض اس بات کا ذکر کیا ہے کہ غیر بنگالی مسلمانوں کو اپنی ہی قوم کے دہشت پسند بنگالیوں نے کس طرح قتل عام کیا۔

مزید یہ کہ مجیب کی تقاریر اسلام کے اصول کے منافی تھیں مجیب کہا کرتا تھا: قرآن لیبوں کی بھات۔ آمرا ہو تھم باگالی، تار پوجا کیچو نا (قرآن چاہئے یا بھات۔ ہم پہلے بنگالی ہیں بعدہ جو کچھ بھی)

ہم پاکستان کی فوجی کارروائی کی مذمت اسی وقت کر سکتے تھے جبکہ دہشت پسند بنگالیوں نے اپنے ہم مذہبوں پر محض زبان کے اختلاف کی بنا پر ایسے مظالم نہ کئے ہوتے جو جمہوری تحریک کے منافی ہیں۔ اس معاملے میں ہندوستان کے اخبارات اور عوام کا جو رویہ رہا ہے وہ نہایت ہی افسوسناک ایک طرفہ رویہ ہے آج تک کسی اخبار نے تصویر کے دوسرے رُخ کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا اور غیر بنگالیوں پر فوجی کارروائی سے پہلے ڈھائے ہوئے مظالم کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

کیا جمہوری تحریک کے لئے ایک فرقے کو مظالم کا نشانہ بنانا آپ کے نزدیک تحسین آمیز اقدام ہے۔ آج وہ غیر بنگالی جن کے لئے مشرقی پاکستان کی زمین تنگ ہو گئی ہے ہماری ہمدردیوں کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دہشت پسند بنگالیوں کے مظالم آپ کی نظر میں ستودہ صفات کے حامل بن جائیں اور جب ان کے ظلم کے خلاف کارروائی کی جائے تو وہی ظالم مظلوم بھی بن جائیں، نیز ساری ہمدردیوں کے سزاوار بھی۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں پاکستان کی فوجی کارروائی خدائی قہر کی ایک شکل ہے، اور جب خدا کا قہر نازل ہوتا ہے تو ظالموں کے ساتھ کچھ اچھے لوگ بھی اسکی لپیٹ میں محض اس وجہ سے آ جاتے ہیں کہ انہوں نے ظلم کے خلاف صف آرائی کیوں نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے انصاف پسند عوام مجیب کی نام نہاد جمہوری تحریک کے حامی نظر نہیں آتے اس لئے کہ اس تحریک میں غیر بنگالیوں کے قتل عام کی سازش اور علاحدگی پسند گھناؤنے رجحانات کا غلبہ تھا۔ اسلام وحدت و اخوت کی تعلیم دیتا ہے۔ وحدت و اخوت کو پارہ پارہ کرنے والے اسلام کے [illegible] [illegible] ظالم ہے، ظالموں کو ظلم کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ فقط

محمد قاسم [illegible]

بنگلادیش کے پناہ گزینوں کی آنکھوں دیکھی رپورٹ



ناقصات علی

۶۰ لاکھ کے بند — !!



پاکستانی فوجیوں کی بربریت کا شکار ایک کمسن لڑکی

۱۰ لاکھ، ۲۰ لاکھ، ۳۰ لاکھ ——— ۶۰ لاکھ - ہندستان ہے؟ یا اور بھی کچھ - نگر والانے اندرا گاندھی کا نام اور اسٹیٹ بینک سے ساٹھ لاکھ روپیہ حاصل کرنے کے لئے یہ خبر بہت دلچسپ تھی۔ دلچسپ اس لئے کہ مطالبہ پورے ساٹھ لاکھ کا تھا۔ وفشنوکی موری کی ... اور اسے پورے ۶۰ لاکھ میں بیچ دیا گیا۔ ہم نے ... اس لئے دلچسپی کہ معاملہ پورے ساٹھ لاکھ ... لیکن اسے کیا مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزینوں میں ہماری دلچسپی صرف اس لئے ہے کہ وہ ساٹھ لاکھ ہیں ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کے لئے اس کی اہمیت ... ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کے ... ساٹھ لاکھ بندوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ ... بندوں کی اہمیت کا احساس مشرقی بنگال اور ہندستان ... سے ہزاروں میل لمبے بارڈر پر جاکر ہوتا ... بھوکوں، مردوں، عورتوں اور بچوں کی دردبھری چیخیں بار ... کر اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں۔

... اور ... بدنصیبوں کے لئے یہ ساٹھ لاکھ ... نہیں بلکہ ساٹھ لاکھ کہانیاں ہیں۔ ہر کہانی ظلم و ستم ... سے رنگی ہوئی۔ انھیں معصوم بچوں اور ... عورتوں میں تقسیم کی ہوئی۔

... کا ... کر کے ... کر دیا ... انسانیت کا جنازہ نکالا ہے ... اجیروں، ماؤں اور خواتین کا

میں بھی اور لوگوں کی طرح دہلی میں بیٹھا ہوا، ان اوپر کی طرف بڑھتے ہوئے ہندسوں کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اسلام، انسانیت اور جمہوریت کے ساتھ ہونے والے اس مذاق کو دیکھ کر میرا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن مجھے پورے مسئلے کی صحیح اہمیت کا احساس پناہ گزینوں کے کیمپ کا دورہ کرنے کے بعد ہی ہوا۔ اس دورے میں ہندستان بھر کے مسلم اخبارات کے ایڈیٹر شریک تھے۔ مولانا محمد مسلم (دعوت۔ دہلی) مولانا سید احمد باکز (الجمعیۃ دہلی) جناب احمد سعید ملیح آبادی (آزاد ہند کلکتہ) جناب شہریار عابدی (اردو ٹائمز بمبئی) جناب غفران اللہ انصاری (سیاست جدید۔ کانپور) جناب قمر الحسن (ندیم بھوپال) جناب وجیہ الدین (پیغام کانپور) سید مہدی نظمی (پیام مشرق دہلی) سید انیس الرحمن (ملک و ملت۔ دہلی) نیز کشمیر کے اردو اخبارات کے دس مدیران شریک تھے۔ اس پانچ روزہ دورے میں ہمیں اسلام پور سب ڈویژن مغربی دیناج پور، جلپائی گوڑی، بہرو باڑی اور مانک گنج وغیرہ کے پناہ گزین

کیمپوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

کیمپوں کا دورہ کرنے کے بعد ایک بات کا اندازہ ہوا کہ جن کیمپوں میں ہم گئے وہاں کے پناہ گزینوں کا تعلق مشرقی بنگال کے اندرونی علاقے سے خال خال ہی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق بارڈر کے اس پار پچاس میل کے اندر اندر کے علاقے سے تھا۔ لیکن ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو کئی کئی سو میل کا سفر طے کرکے مصیبتیں جھیلتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ آج بھی سرحدیں کھلی پڑی ہیں، جسکا دل چاہے وہ ہندوستان آسکتا ہے اور جس کی مرضی ہو وہ واپس جاسکتا ہے۔ کم از کم ہندوستان کی طرف سے ان لوگوں کی واپسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

آنے والوں میں چار قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے وہ جنکے پاس نہ تو مشرقی بنگال میں ہی کچھ تھا اور نہ یہاں کچھ ہے۔ اگر ان کو کھانے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا رہے تو ان کے لئے مشرقی اور مغربی بنگال، دونوں برابر ہیں۔ ان لوگوں کو واپس جانے کا کوئی ایسا زیادہ شوق نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کی مشرقی بنگال میں اپنی زمینیں تھیں، مکان تھے، مویشی تھے، دولت تھی۔ اور اب جنکے پاس تن ڈھکنے کو کپڑا تک نہیں ہے۔ ان لوگوں میں واپس جانے کا جذبہ زیادہ ہے۔ تیسرے نمبر پر وہ لوگ ہیں جو ہندوستان آتے وقت اپنا سارا اثاثہ سمیٹ لائے ہیں۔ بلکہ کچھ تو ایسے بھی ہیں جو اپنے ساتھ نہ صرف گھر کا سارا فرنیچر بلکہ اپنا لکڑی کا بنا ہوا گھر تک بیل گاڑی پر لاد لائے ہیں۔ کیونکہ ان کے گاؤں سرحد سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اس لئے واپس جاتے وقت یہ لوگ ایک بار پھر اپنی ساری دولت لاد کر واپس اپنے گاؤں لے جائیں گے۔ آخری نمبر پر آتا ہے بنگلا دیش کا پڑھا لکھا نوجوان طبقہ۔ اس طبقے میں جذبۂ آزادی اور مادرِ وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان لوگوں کا ارادہ اپنے خون کی آخری بوند تک ملک کی آزادی کے لئے بہانے کا ہے۔ ان کے پاس اپنے علم کے علاوہ اور کوئی دولت نہیں ہے۔

پناہ گزین کب اور کس طرح واپس جائیں گے؟ اس سوال کو اٹھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس

واقعات نمبر ۱۰



بڑے بوڑھوں کو بھی نہیں بخشا گیا

سوال کا جواب حاصل کریں کہ پناہ گزین اپنا وطن، اپنا گھر بار، دھن دولت چھوڑ کر ہندوستان کیوں آئے۔ ہم نے اس سلسلے میں سیکڑوں لوگوں سے سوالات کئے، گفتگو کی بحث کی۔ لیکن سب نے ایک ہی کہانی سنائی، ایک ہی جواب دیا کہ مغربی پاکستان کی فوجوں کے ظلم و ستم کا۔ امین الحق نے جو جناح پور گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھے بتایا کہ فوجیوں نے جناب خادم الاسلام ہیڈ ماسٹر پلٹا پاؤں ہائی اسکول اور ان کے بھائی ظہیر الاسلام کو نہایت بے رحمانہ طریقے پر بے دردی سے مار ڈالا۔ رہیا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رحیم الدین احمد نے بتایا کہ "وہ پاکستانی فوجوں کے ظلم و ستم

سے گھبرا کر ہندوستان بھاگ آئے۔ ان کے [illegible] جس کی آبادی ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی اب [illegible] کو چھوڑ کر زیادہ تر لوگ یا تو مارے گئے ہیں یا [illegible] بھاگ گئے ہیں۔ مولانا عبدالاوّل صاحب [illegible] میں امامت کرتے تھے رو رو کر بتایا کہ :

وہ جان و مال کی قربانی کو برداشت کر سکتے [illegible] لیکن جب سڑکوں پر ننگا کرکے ان کی عورتوں کی [illegible] لوٹی گئی تو ان کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ پاکـ[illegible] فوجیوں نے عورتوں کے ساتھ آوارہ کتوں سے [illegible] سلوک کیا۔

دس دس بیس بیس فوجیوں نے مل کر ایک ایک عورت کی [illegible] لوٹی اور پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

فوجیوں نے شروع میں تو بغیر کسی تفریق کے پوری [illegible] آبادیوں کا قتلِ عام کیا۔ لیکن بعد میں یہ قتل زیادہ منظم [illegible] ہوکیا جانے لگا۔ تمام پڑھے لکھے نوجوان لوگوں کو بلا [illegible] مذہب و ملت گولی سے اڑا دیا گیا۔ فوج عوامی لیگ اور [illegible] پاکستان رائفلز کے ممبروں اور حمائتیوں کی لسٹ لے کر [illegible] میں آتے تھے۔ ان لوگوں کو ڈھونڈ نکالنے میں وہ الیکشـ[illegible] شکست کا منہ دیکھنے والی جماعتوں کے ممبروں اور غیر [illegible] کی مدد حاصل کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے ممبروں [illegible] سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی مدد کرنی پڑتی تھی، ورنہ یہ فوج [illegible] عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھا کر لیجاتے تھے۔

عوامی لیگ کے ممبروں اور ایسٹ پاکستان رائفلز [illegible] جوانوں کو دیکھتے ہی بے دریغ گولی مار دی جاتی تھی۔ [illegible] کے گھروں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ ان کی عورتوں کو سر [illegible] بے عزت کیا جاتا تھا اور بعد میں خود ان جماعتِ اسلامی [illegible] کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

[illegible] لہا کر گاؤں سے جماعت اسلامی کے امیدوار ڈاکٹر [illegible] کے لڑکے کو بھی اب پاکستانی فوجوں کے ظلم و ستم سے تنگ [illegible] ہندوستان میں پناہ لینی پڑی ہے۔

ہندوستان آنے والے پناہ گزینوں میں سب [illegible] اور بربریت کا شکار نہیں ہوئے۔ ان [illegible]

...ہراس کے باعث ہندوستان بھاگ آئے۔ انکا ...انھیں اپنی جان ومال کا اتنا خوف نہیں تھا جتنا کر ...کیوں کی عزت کا تھا۔ ایک بلڈے پناہ گزین نے ...بتایا کہ کس طرح اس کے سامنے اس کی پانچ جوان ...کی عزت لوٹی گئی۔ اس کی ایک لڑکی کی عمر صرف آٹھ ...سے کئی نوجوانوں نے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ ...نے ان لڑکیوں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے بعد ان کی ...کے درمیان سنگینیں اتار دیں۔ اسی قسم کی ہزاروں ایسی ...سننے کو ملیں جن کا تذکرہ کرنا کسی بھی انسانیت دوست ...کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

...کیمپوں میں جس چیز کو دیکھ کر سب سے زیادہ ...وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں محبت ...تھی۔ یحییٰ خاں کی بندوقوں اور ٹینکوں نے ...فرقوں کو ملا دیا تھا۔ دو قومی نظریہ لاکھوں ہندؤں ...مسلمانوں کی لاشوں کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔

...جن کیمپوں میں ہم گئے وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ...تعداد کافی تھی۔ شروع میں ہندوستان آنے والے پناہ گزینوں ...میں ... کی تعداد ستر فیصدی تھی۔ لیکن بعد میں یہ تعداد ... اسلام پور کے علاقے میں مقامی آبادی ستر فیصدی ... مشتمل ہے۔ اسلام پور کے ایم ایل اے نے ... کہ مقامی آبادی پوری طرح حکومت کی مدد کر رہی ہے ... لوگ مصیبت کے ... میں ان کا ہاتھ نہ بٹاتے ... اس مسئلے سے نپٹنا ناممکن ہو جاتا۔ حالانکہ غریب ... مقامی لوگ معاشی طور پر بری طرح متاثر ہو رہے ... ہیں ... اور جس جذبے کے ساتھ وہ ان ... پناہ گزینوں کی مدد کر رہے ہیں اس کی جتنی ... ہے۔

... لوگ ایسے بھی ... پناہ گزین ... ہیں۔ لیکن یہ لوگ مقامی نہیں ... میل کا سفر طے کر کے ... کے لئے یہاں پہنچے ... ان لوگوں نے پاکستان

کا روپیہ تیس پیسے تک میں خریدا ہے۔ تانبے کے برتن ۶-۷ روپے فی سیر کے حساب سے خرید کر پندرہ بیس روپے کے حساب سے فروخت کئے۔ ہندوستان میں دھان کا بھاؤ ۳۵-۴۰ روپے فی من ہے جب کہ ان بنیوں نے پناہ گزینوں سے دھان ۱۵ روپے فی من کے حساب سے خریدا۔ نمک دال۔ چاول اور دوسری ضروری اشیا کی بلیک کی اور اسے دگنے تگنے داموں پر بیچا۔ لیکن ان ضمیر فروش سرمایہ داروں کو کوئی عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ مقامی آبادی بلاتفریق ہندو مسلم ان سے نفرت کرتی ہے اور انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اب حکومت بھی ان کی اس لوٹ کھسوٹ کو روکنے کے لئے اقدام کر رہی ہے اور اس پر کافی حد تک قابو بھی پا لیا ہے۔

شیخ مجیب الرحمن نے اپنی ہر تقریر اور اپنے ہر بیان میں یہ کہا کہ ان کا مقصد ملک میں ایک سیکولر حکومت قائم کرنا ہے جہاں ہندو مسلمان، بنگالی غیر بنگالی بلاتفریق مذہب وملت چین سے رہ سکیں۔ جہاں انھیں زندگی کی بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں۔ ۷ مارچ کو شیخ نے عوام سے پر امن عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے کے لئے کہا۔ اس تحریک کا پانچ نکاتی پروگرام عوام کے سامنے رکھا گیا۔ اس پروگرام کا ایک پوائنٹ یہ تھا۔

"میری عوام سے گزارش ہے کہ وہ تحریک کو پر امن طریقے پر پورے ڈسپلن کے ساتھ چلائیں۔ میں عوام کو یاد دلاؤں گا کہ جو لوگ تشدد پر اترنے کی کوشش کریں گے وہ پوری تحریک اور عوام کے دشمن ہیں۔ وہ تحریک کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچائیں گے۔"

اس کے بعد بھی شیخ اپنے گرفتار ہونے تک اپنی ہر تقریر میں لوگوں سے پر امن رہنے اور بنگالی غیر بنگالی کے ساتھ ایک سا سلوک کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

بہت سے لوگوں نے غیر بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کے مسئلے کو اٹھایا اور خود مجھے بھی اس طرف سے تشویش تھی۔ اس لئے میں نے کچھ غیر بنگالیوں سے کیمپ میں ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے بتایا گیا کہ کیمپ میں کوئی غیر بنگالی پناہ گزین نہیں ہے۔ اسلام پور میں ہمارے بنگلا آفس رہا ہوا



یہ مظلوم لوگ کہاں واپس جائیں۔ یحییٰ خاں کے مشرقی پاکستان میں جہاں ہندوؤں کی گردنیں انکا انتظار کر رہی ہیں۔

ہے ان کے سکریٹری جناب کبیر سمنت سے ہماری ملاقات ہوئی جو ہندوستان آنے سے پہلے کسٹمز کمشن کنٹرکشن تھے۔ یہاں ہماری ملاقات ایس ایم رضا (اگزیکیٹو انجینئر) اور جناب عالم گیلانی ایم۔ اے (اکنامکس) سے بھی ہوئی۔ ان سے بہاری بنگالی کے مسئلے پر سوال کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ مشرقی بنگال میں عدم تعاون کی تحریک کے دوران کوئی بنگالی غیر بنگالی فساد نہیں ہوا۔ ہمارے ذہن میں بنگالی، بہاری کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ الیکشن میں عوامی لیگ نے غیر بنگالیوں کو بھی ٹکٹ دیا۔ جناب ظہیر الدین

بدلہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن جہاں بھی عوامی لیگ یا ایسٹ پاکستان رائفلز کے ممبر موجود تھے انھوں نے لوگوں کو اس قسم کی غلطیاں کرنے سے روکا۔ اور انھیں بار بار یاد دلایا کہ ان کی لڑائی غیر بنگالیوں سے نہیں بلکہ مغربی پاکستان کی فوجی حکومت سے ہے۔

بہر حال اگر ایک غیر بنگالی پر بھی کسی قسم کا ظلم ہوا ہے تو وہ قابل مذمت اور افسوسناک ہے۔ خود پناہ گزینوں کو اس بات پر افسوس تھا۔ انھوں نے کہا کہ اول تو ایسا کہیں بھی بڑے پیمانے پر نہیں ہوا اور اگر کہیں اکا دکا ایسے واقعات پیش بھی

پوری دنیا اور انسانیت کا مسئلہ ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس وقت اس پورے مسئلے سے نپٹنے کا بوجھ صرف ہندوستان کے کاندھوں پہ آ پڑا ہے۔ ہندوستان اس سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے کر رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کے وسائل محدود ہیں اس لئے پناہ گزینوں کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا نہیں ہو پا رہا۔ کیمپوں میں ڈاکٹروں اور والنٹیروں کی کمی ہے۔ بہت سی کانگریسی خشریاں، کچھ دوسری پرائیویٹ ہندوستانی مشنریاں اور مقامی مسلمان ہندو وہاں کام کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی



والنٹیر ایک بیمار عورت کو بچے جنوانے کے لئے ہسپتال لے جا رہے ہیں کیمپوں میں ڈاکٹروں کی کمی ہے

ہو کر بہاری رہنما کلاک کے لیڈر میر پور کے علاقے سے عوامی لیگ کے ٹکٹ پر جماعت اسلامی کے غلام اعظم صاحب کو شکست دے کر کامیاب ہوئے۔

بہت سے پناہ گزینوں سے سوالات کے بعد اس بات کا اندازہ ہوا کہ کچھ غیر بنگالیوں کا قتل ہوا تو ضرور ہے لیکن یہ قتل مغربی پاکستان کی فوجی کارروائی کے بعد ہوا۔ ایک ادھیڑ عمر پناہ گزین محمد عیسٰے نے بتایا کہ فوجی کارروائی کے فوراً بعد ڈھاکا کے ان علاقوں میں جہاں غیر بنگالیوں کی اکثریت ہے بنگالیوں کا قتل شروع کر دیا گیا۔ جب اس قتل کی خبریں دوسرے علاقوں میں پہونچیں تو وہاں لوگوں نے غیر بنگالیوں سے اس کا قصاص لینا شروع

آئے ہیں تو وہ محض وقتی جوش اور جذبے کی وجہ سے پیش آئے ہیں۔ پھر پاکستانی جہازوں کی بمباری نے بھی بنگالیوں کے ساتھ بہت سے غیر بنگالیوں کو بھی موت کی آغوش میں پہونچا دیا۔ کیونکہ بم بنگالی اور غیر بنگالی میں تمیز نہیں کرتے۔

کیمپوں کا انتظام بہت اچھے ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ اتنا بڑا ہے کہ اس سے آسانی سے نمٹنا ممکن نہیں۔ لیکن جس خوبی اور خوش اسلوبی سے مغربی بنگال کے افسر اس مسئلے سے نپٹ رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ یہ مسئلہ صرف ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ

ہے کہ دوسری جماعتیں بھی آگے بڑھ کر اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔

کیمپوں میں دواؤں اور کپڑوں کی کمی بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ بہت سی عورتیں صرف اس وجہ سے گھروں سے نہیں نکل سکتیں کہ ان کے پاس پہننے کو کوئی کپڑا نہیں ہے۔

البتہ پناہ گزینوں کو فی الحال کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہے ہر پناہ گزین کو پیٹ بھر کھانا مل رہا ہے۔ انھیں چاول، دال اور سبزیاں وغیرہ دی جاتی ہیں۔ پکانے کی ذمے داری



لاکھوں، کروڑوں بنگالی عوام مادرِ وطن پر خون کا آخری قطرہ تک بہادینے کے لئے تیار ہیں۔

ہے۔ سر چھپانے کے وقتی جگہ بھی تقریباً سب کو مل گئی ہے جان درست ہونے والی بارشوں نے تمام نظام کو درہم برہم کیا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔

پناہ گزینوں نے بتایا کہ وہ کیمپوں کے انتظام سے مطمئن ہیں وہ ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی عوام کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے انھیں اپنے ملک میں پناہ دی اور دوسری ضروریات زندگی مہیا کیں۔

اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا رفیوجی واپس جائیں گے؟ اور اگر جائیں گے تو کن حالات میں اور کب۔ بنگلہ آفس میں جب جناب اکبر حسین سے یہی سوال کیا تو انہوں نے اس کا جواب تفصیل سے دیا۔

انہوں نے کہا کہ ہمارا پاکستان سے علیحدہ ہونے کا ارادہ نہیں تھا۔ ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان صرف حقوق کی برابری چاہتے تھے۔ ہم اپنے حقوق مانگ رہے تھے اور ہم نے اپنے ان حقوق کے لئے جمہوری طریقوں کا استعمال کیا تھا۔

لیکن اب مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے خود ہی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دس، بیس لاکھ بنگالی عوام کے قتل کے بعد ہمارے جذبۂ آزادی کو کچل دیں گے تو یہ انکی خام خیالی ہے۔ پاکستانی حکمرانوں نے خود ہم پر جنگ تھوپی ہے، اور اب جبکہ ہم میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں تو ہمارے پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم آخری دم تک لڑیں گے۔ اس وقت تک لڑیں گے جب تک اپنے وطن کو پاکستانی فوجوں کے شکنجے سے آزاد نہ کرالیں۔

ہم یحییٰ خاں کے مشرقی بنگال میں واپس نہیں جائیں گے۔ ہم مجیب الرحمٰن کے بنگلا دیش میں واپس جائیں گے۔ ہم تشدد میں یقین نہیں رکھتے، لیکن ہمیں جنگ پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہمیں بندوق اٹھانے پر مجبور کیا گیا ہے، اور ظلم کے خلاف ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہم ظلم کے تابوت میں آخری کیل نہ ٹھونک دیں۔

"ہمیں پاکستان کے عوام سے کوئی دشمنی نہیں ہے ہماری لڑائی وہاں کے حکمرانوں سے ہے۔ ہماری دعا ہے کہ پاکستان کے عوام کو بھی جلد سے جلد ان ظالم حکمرانوں سے نجات مل جائے تاکہ وہ اپنے جمہوری حقوق حاصل کر سکیں۔

ہم آزاد بنگلا دیش بنانے کے بعد پاکستان کے ساتھ ملکر رہیں گے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلا دیش مل کر ایک دوسرے کی ترقی و فلاح کے لئے کام کریں گے۔"

پانچویں جماعت کے ایک طالب علم عین الحق نے جس کی عمر مشکل سے بارہ سال ہوگی، ہمیں پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ بتایا کہ وہ اب "سوادھین بنگلا دیش" ہی میں واپس جائے گا، وہ آخری دم تک اپنے بھائیوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑتا رہے گا۔

ایک نوجوان محمد اسماعیل نے بتایا کہ وہ پاکستانی

حکمرانوں کی یقینی دہانی پر سرحد پار کر کے مشرقی بنگال گیا لیکن وہاں اس کا استقبال کرنے کی بجائے فوجیوں نے

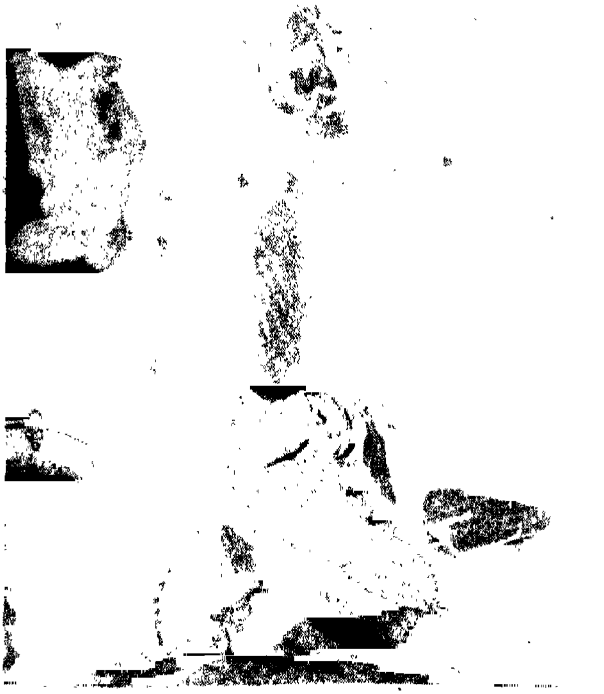
اسے پکڑ لیا اور بُری طرح مارا (اس کے سارے جسم پر مار کے نشان پڑے ہوئے تھے) اس نے بتایا کہ پنجابی فوجیوں نے تمام گاؤں لوٹ لئے ہیں، لوگوں کو لوٹ لیا ہے۔ گاؤں میں صرف چند جنگلی کتے اور گدھ منڈلاتے رہتے ہیں۔ بہت سی بنگالی عورتوں کو فوجیوں نے پکڑ رکھا ہے۔ دن رات مار مار کر ان سے کام کراتے ہیں اور رات کو ان کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں۔ جو عورت ذرا بھی احتجاج کرتی ہے اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

چند دوسرے پناہ گزینوں نے بھی بتایا کہ پاکستانی حکمرانوں کی یقین دہانیاں فریب ہیں۔ جو لوگ سرحد پار کر کے واپس جاتے ہیں ان کے لئے جان بچا کر واپس آنا ناممکن ہو جاتا ہے اور ان میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جو اپنی جان بچا سکے ہیں اس لئے فی الحال ان کے لئے واپس جانے کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہے۔ اگر وہاں عوام کے نمائندوں کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ واپس جانے کو تیار ہیں۔

پاتھا گوڑا کیمپ میں ہماری ملاقات ٹھاکر گاؤں سے ریاستی اسمبلی کے لئے منتخب ہونے والے عوامی لیگ کے نمائندے جناب فضل الکریم سے ہوئی۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے نمائندے ڈاکٹر اسماعیل کو ۲۹ ہزار ووٹوں سے شکست دی تھی۔ جب فضل الکریم صاحب سے واپسی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بھی وہی جواب دیا۔ یعنی واپسی آزاد بنگلہ دیش میں ہی ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب مجیب کے چھ نکاتی پروگرام پر سمجھوتے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انھوں نے مزید کہا کہ واپسی اسی وقت ممکن ہے جب کہ کم از کم تین شرطیں پوری کر دی جائیں۔ پہلی شرط ہے شیخ مجیب الرحمن اور دوسرے عوامی لیگ کے لیڈروں کی رہائی۔ دوسری عوامی لیگ کی سربراہی میں حکومت کا قیام اور تیسرے بنگلہ دیش میں اقوام متحدہ کی فوجوں کا تعین۔ پناہ گزین اقوام متحدہ کی فوجوں کی دیکھ ریکھ میں ہی وطن واپس جائیں گے۔

سب سے بنگلہ آفس میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ انھوں نے نتولیا کے مقام پر تحریک کا مرکز اور ٹریننگ سینٹر قائم کیا ہے جہاں نوجوانوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دی جا رہی ہے۔

واقعات شہرلی



کیا یہ عمر اتنی مصیبتیں جھیلنے کی تھی ---؟

بنگلہ دیش کا ایک ایک نوجوان اس وقت مادر وطن پر جان نثار کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ کہتے وقت جناب رضا صاحب اور جناب عالمگیر صاحب کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو ان کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کر رہی تھی۔

[redacted]

ہم کلکتے واپس گئے تو معلوم ہوا کہ کلکتے میں بنگلہ دیش کے نمائندے جناب حسین علی ہمارے منتظر ہیں۔ جناب حسین علی پہلے کلکتے میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے لیکن بعد میں انھوں نے بنگلہ دیش حکومت کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کر دیا تھا۔ حالانکہ ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے پھر بھی طے پایا کہ جناب حسین علی سے فوراً مل لیا جائے۔ وہاں باتوں نے ایسا طول کھینچا کہ رات کے بارہ بج گئے۔

مجیب نگر کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ علاقہ مشرقی بنگال میں ہی ہے۔ یہ علاقہ تین طرف سے ہندوستانی بارڈر سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں مکتی فوج کا قبضہ ہے اور حکومت کا انتظام عوامی لیگ کے ہاتھ میں ہے۔

اس علاقے کا محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ پاکستانی فوج کے لئے یہاں حملہ کرنا بہت مشکل ہے اگر انھوں نے اس علاقے میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ خود ہی بہت بُری طرح سے گھر جائیں گے۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ مجیب نگر ایک متحرک مرکز ہے۔

مسٹر حسین علی کی قیام گاہ پر ہماری ملاقات جناب طاہر الدین ٹھاکر ممبر نیشنل اسمبلی، جناب خلیل الرحمن ایم اے، جناب مودود علی بیرسٹر ڈھاکا ہائی کورٹ، جناب

میں کیا گیا۔ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ذمے دار یحییٰ اور بھٹو ہیں۔ مجیب الرحمٰن نہیں۔

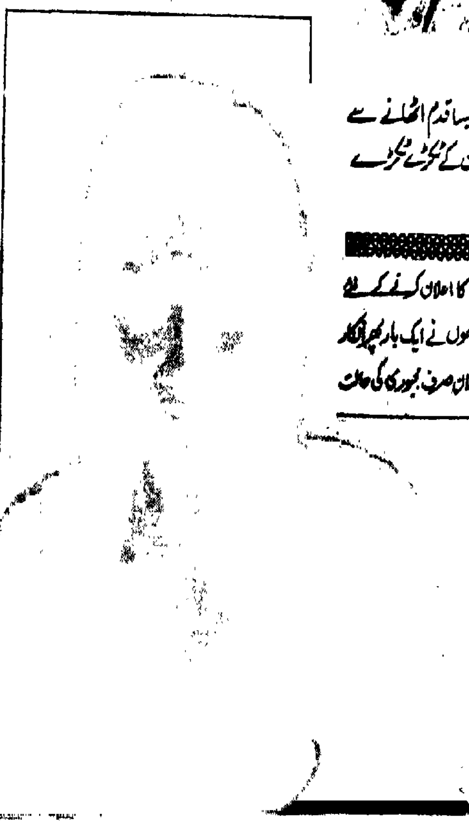
جناب طاہر الدین ٹھاکر نے بتایا کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے بعد بنگلا دیش میں ایک سیکولر حکومت قائم کی جائے گی جہاں ہندو مسلمان، بنگالی غیر بنگالی مل جل کر رہیں گے۔ ان کے معاشی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حکومت پاکستان نے اب سمجھوتے کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔ انھوں نے اسلام کے نام پر ہمیشہ بنگالی عوام کو لوٹا ہے اور اپنی تجوریاں بھری ہیں۔

جیسا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی تقاریر سے اور ان کے چھ نکاتی پروگرام سے ظاہر ہے عوامی لیگ کا ارادہ پاکستان میں ایک سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنے کا ہے۔ بنگلا دیش ایک غیر جانب دار اور سیکولر ملک ہوگا۔

سید حسین علی سے بات چیت کے دوران سید بدرالدجیٰ اور جناب غلام یزدانی پر جاسوسی کے الزام



یہ بچے غلامی کی زندگی نہیں بلکہ ایک آزاد ملک میں آزادی کی زندگی گزاریں گے۔



ہم جان کے خوف سے نہیں بلکہ اپنی عورتوں کی عصمت بچانے کے لیے بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں

تھا۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے ایسا قدم اٹھانے سے انکار کر دیا کیونکہ خود ان کا پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

۷ مارچ کو ان پر آزادی کا اعلان کرنے کے لیے ایک بار پھر زور ڈالا گیا، لیکن انھوں نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ آزادی اور علیحدگی کا اعلان صرف مجبوری کی حالت

...پولیس انچی اور جناب رفیق الاسلام سابق فرسٹ ...ہوئی۔

...جناب حسین علی اور دوسرے لوگوں سے مختلف ...پر بہت تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جناب مودود علی نے ...یکم مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا ...میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اجلاس ملتوی کرنے ...انصافی تھا کہ یحییٰ خان بھٹو کے سامنے جھک گئے ...شیخ مجیب اور عوامی لیگ سے زیادہ بھٹو کی ...کو اہمیت دیتے ہیں۔ شیخ نے پرامن عدم ...یک پر ہی اکتفا کیا۔

...افواج، پولیس اور انصار کا اصرار تھا ...آزادی کا اعلان کر دیں کیونکہ اس وقت مغربی ...صرف ایک ڈویژن بارکوں میں موجود تھا جس ...پاکستانی افواج بڑی آسانی سے نپٹ سکتا

...بدی



کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ حکومتِ مغربی بنگال نے انھیں پاکستان کے لئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا ہے، جبکہ کمیونسٹ پارٹی مارکسٹ کا جس سے ان دونوں کا تعلق تھا کہنا ہے کہ یہ ایک سیاسی نظربندی ہے۔ بنگال کی برسرِاقتدار جماعت نے اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے یہ چال چلی تھی۔

سابقہ فرسٹ سکریٹری جناب رفیق الاسلام چودھری نے بتایا کہ سید بدر الدجی سابق ممبر پارلیمنٹ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ انھوں نے کبھی ان کے متعلق کچھ کاغذات کسی کے حوالے کئے ہیں۔

بہت سے پارلیمنٹ کے ممبروں نے بھی اس سلسلے میں انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔ حکومت کو اس سلسلے میں فوری اقدام کرنا چاہئے۔ اور اگر ان لوگوں پر لگائے ہوئے الزامات غلط ہیں تو انھیں فوراً رہا کر دینا چاہئے۔

مشاہدات کے نتائج

میں نے پناہ گزینوں کے حالات اور تاثرات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد حسبِ ذیل نتائج اخذ کئے ہیں۔

واقعات نئی دہلی

- ساٹھ لاکھ سے بڑھ کر اب ستر لاکھ پناہ گزیں ایک حقیقت بن چکے ہیں۔ اور یہ پناہ گزین صرف اس وقت واپس جا سکتے ہیں جب بنگلا دیش کو مکمل آزادی مل جائے۔
- موجودہ حالات میں مشرقی بنگال کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل نظر نہیں آتا۔ شاید بنگلا دیش کے عوام مسئلے کو صرف بندوق کی نال ہی سے حل کر سکیں گے۔
- تحریک کی لیڈر شپ آہستہ آہستہ اعتدال پسند لوگوں سے نکل کر انتہا پسند کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔ جو مکمل آزادی سے کم کسی بھی شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔
- حالانکہ جنرل یحییٰ خان نے ہندوستان کو جنگ کی دھمکی دی ہے، لیکن مستقبل قریب میں جنگ کی کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ سرحدوں کے دونوں طرف دور دور تک پاکستانی یا ہندوستانی فوجوں کا نام و نشان نہیں ہے۔
- ہندوستان کے لئے پناہ گزینوں کا بار طویل عرصے تک برداشت کرتے رہنا ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کا کوئی فوری حل نہ ڈھونڈا گیا تو یہ ہندوستان کی پوری معیشت کو لے ڈوبے گا۔
- بنگلا دیش کی تحریک مکمل طور پر سیکولر ہے۔ کچھ لوگ اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بنگلا دیش کے عوام پر اس پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی فوجوں کے مظالم کا شکار ہوئے ہیں۔ فرقہ وارانہ یا مذہبی بنیاد پر پاکستان کے قیام کا نظریہ اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ظہیر حسن

کانگریس الیکشن کے بعد

لوک سبھا کے وسط مدتی چناؤ ہوئے اب تقریباً چار ماہ ہو چکے ہیں۔ ان چار مہینوں میں ایسی کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی جسے سوشلزم کے راستے کا سنگ میل کہا جا سکے سوائے جنرل انشورنس کے قومیائے جانے کے۔ لیکن اس اقدام سے عام لوگوں کا خاطر خواہ فائدہ ہونے کی امید کم ہی ہے۔ کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فسٹو میں جو وعدے کئے تھے وہ صرف سیاسی وعدے ثابت ہوئے انہیں پورا کرنے کی اب تک نہ تو کوشش کی گئی اور نہ کانگریس اب اس قسم کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ اندرا گاندھی نے اپنے مشہور زمانہ نعرہ "غریبی ہٹاؤ" کی بنا پر الیکشن تو جیت لیا لیکن حقیقتاً غریبی کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی۔ آج ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جمہوریت میں یہ بات انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے کہ کسی سیاسی جماعت کو قطعی اکثریت حاصل ہو جائے۔ پچھلی لوک سبھا میں جبکہ اندرا گاندھی کو قطعی اکثریت حاصل نہیں تھی اور وہ حکومت چلانے کے لئے دوسری جماعتوں سے مدد لینے پر مجبور تھیں، تب کانگریس پارٹی کے بہت سے اقدامات سوشلزم کے اصولوں کے مطابق تھے۔ اس وقت اندرا گاندھی نے جو کچھ کیا اور جس قسم کے بیانات دیئے وہ صرف بائیں بازو کی جماعتوں کو خوش رکھنے کے لئے تھے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان جماعتوں کی حمایت کے بغیر وہ حکومت نہیں چلا سکیں گی۔ [illegible] وسط مدتی چناؤ نے نئی کانگریس کو بھاری اکثریت [illegible] وہ تمام وعدے جو کانگریس نے عوام سے کئے [illegible] کی بنا پر انہیں اکثریت حاصل ہوئی تھی، غائب [illegible] نے بھی [illegible] کرنا شروع کر دیا جو اس سے پہلے نہرو نے کیا تھا یعنی صرف لفاظی۔

کانگریس کا الیکشن مینی فسٹو یقیناً ایک ایسی دستاویز تھی جس کی حمایت ہر ترقی پسند شہری کو کرنا چاہئے تھی۔ کانگریس نے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے وعدے کئے تھے، اس نے غریبوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے

اندرا گاندھی نے اپنے مشہور زمانہ نعرہ "غریبی ہٹاؤ" کی بنا پر الیکشن تو جیت لیا لیکن حقیقتاً غریبی کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی

کی قسمیں کھائی تھیں، اس نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کا یقین دلایا تھا۔ اس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کا کوئی حل تلاش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی بھی بات کی تکمیل نہیں ہو پائی اور پہلا جھٹکا تو اس وقت لگا جب بجٹ سامنے آیا۔ یہ بجٹ نہ تو پہلے بجٹوں سے مختلف ہے اور نہ سوشلزم کے اصولوں پر بنایا گیا ہے بلکہ انتہائی سیاسی انداز سے تیار کیا گیا ہے۔ چوہان صاحب نے ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کی ہے تاکہ انھیں کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹاٹا اور برلا جیسے سرمایہ داروں نے اس بجٹ کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس کی وجہ سے عام انسان کی بنیادی ضرورتوں کی اشیاء پر ٹیکس بڑھ گئے ہیں اور عوام پر اخراجات کا بار ڈال دیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ملک کی حالت اتنی ابتر ہے کہ اس میں فوری طور پر کسی طرح کی تبدیلی لانا مشکل ہے لیکن اس نظریہ کی بنا پر تبدیلی لانے کی کوئی کوشش بھی نہ کرنا، عوام سے غداری کرنے کے مترادف ہے۔ سوشلزم ہمارا نصب العین ہے اور اسے پانے کے لئے ہمارا قدم اسی کی راہ میں بڑھنا چاہئے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج تک اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لوک سبھا کے پانچ چناؤ ہو چکے ہیں اور پانچوں بار کانگریس کو لوک سبھا میں حکومت بنانے کا موقع ملا۔ ۱۹۶۲ء کا چناؤ نہرو دور کا آخری چناؤ تھا۔ نہرو کے زمانے میں کانگریس بآسانی اکثریت حاصل کر لیا کرتی تھی اور یہ بات اس لیڈر کی ہر دلعزیزی کا بیّن ثبوت ہے لیکن صرف عوام میں ہر دلعزیز ہو جانے سے ملک کے مسائل حل نہیں ہو جاتے۔ نہرو کی شخصیت بڑی آسان پسند

چوہان صاحب نے ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کی ہے تاکہ انھیں کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ ٹاٹا اور برلا جیسے سرمایہ داروں نے اس بجٹ کا خیر مقدم کیا ہے۔



اندرا جی کا "سوشلزم"

صرف نعرے یا کچھ عمل بھی ــــــ؟

تھی۔ وہ کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خطرات قبول کرنے کے عادی نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی دو ٹوک بات نہیں کی ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے کے بیشتر مسائل آج سر اُبھار رہے ہیں۔ نہرو کے بعد مختصر عرصہ کے لئے شاستری جی آئے۔ اُنکا مختصر دور بڑا ہنگامہ خیز رہا۔ ان اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں پاکستان سے جنگ بھی ہوئی اور اس طرح اندرون ملک کے انتظامی کام پیچھے پڑ گئے اس وجہ سے شاستری جی کی انتظامی صلاحیتوں کو پرکھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ ۱۹۶۷ء کا عام چناؤ کانگریس کے اقتدار کے لئے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوا۔ کانگریس کو کئی ریاستوں میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور لوک سبھا میں بھی وہ معمولی اکثریت کی بنا پر حکومت بنا سکی۔ اس کے بعد کئی اہم واقعات رونما ہوئے اس عرصہ میں اندرا گاندھی نے کئی ایسے کام کئے جن کی وجہ سے وہ عوام میں بے انتہا مقبول ہو گئیں۔ بینک نیشنلائیزیشن، مرار جی ڈیسائی کی وزارت سے علیحدگی، جیب خاص کو منسوخ کرنے کی سعی وغیرہ ایسے اقدامات تھے جن کی بنا پر اندرا گاندھی عوام کے سامنے ایک باہمت اور دانشمند لیڈر کے روپ میں

واقعات کے تناظر میں

آ گئی تھیں کانگریس کی پھوٹ کے بعد حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور کانگریس کے لئے مشکل تھا کہ وہ آسانی سے حکومت چلا سکے۔ ایسے نازک وقت میں بائیں بازو کی جماعتوں نے اندرا گاندھی کا ساتھ دیا۔ لیکن آج ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بیشتر لیڈر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ اندرا گاندھی بھی اپنے پیشرووں سے کچھ زیادہ مختلف ثابت نہیں ہوئیں۔ الیکشن کے فوری بعد دہلی کے سیاسی حلقوں میں یہ بات بہت زیادہ سنی گئی کہ اندرا گاندھی کی شاندار فتح سے فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتوں کا نقصان تو ہوا ہی لیکن ساتھ ہی بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

اندرا گاندھی کی اس کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کا ہے

اندرا گاندھی نے مسلمانوں کے لئے بہتر رویہ اپنایا تھا اور ان کی جان و مال اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کیا اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا گیا ہے؟ یقیناً نہیں

گیا تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ نہ تو اس زبان کی ترقی کے لئے کچھ کیا گیا اور نہ اُسے کسی ریاست میں دوسری زبان کا درجہ دیا گیا بلکہ مختلف زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لئے دی جانے والی امداد میں اُردو کو صرف ایک لاکھ روپے دیئے گئے دوسری زبانوں کو ملنے والی امداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے حکومت کا اُردو سے یہ رویہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے اُردو ملک کی دوسری زبان ہے اور اس کو صوبائی زبانوں سے کم امداد دی جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اس سے ہمدردی کا دم بھی بھرا جاتا ہے کیا اسی کا نام کانگریسی سیاست ہے یا اسے ریاکاری کہا جائے۔

اب ۱۹۷۲ء میں صوبائی الیکشن ہونے والے ہیں یہی کانگریسی لیڈر پھر "غریبی ہٹاؤ" "سوشلزم لاؤ" قسم کے نعرے لے کر

عوام کے سامنے آئیں گے پھر وہی جھوٹے وعدوں کی بھر مار ہو گی اور اقلیتوں کو سبز باغ دکھلائے جائیں گے۔ اب یہ بات عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ یا تو پھر دھوکا کھا جائیں یا کانگریس کی اس ریاکارانہ سیاست کی دھجیاں اڑا دیں جو پچیس سال سے انھیں دھوکا دیتی آ رہی ہے۔ لیکن دوسری بات کی اُمید



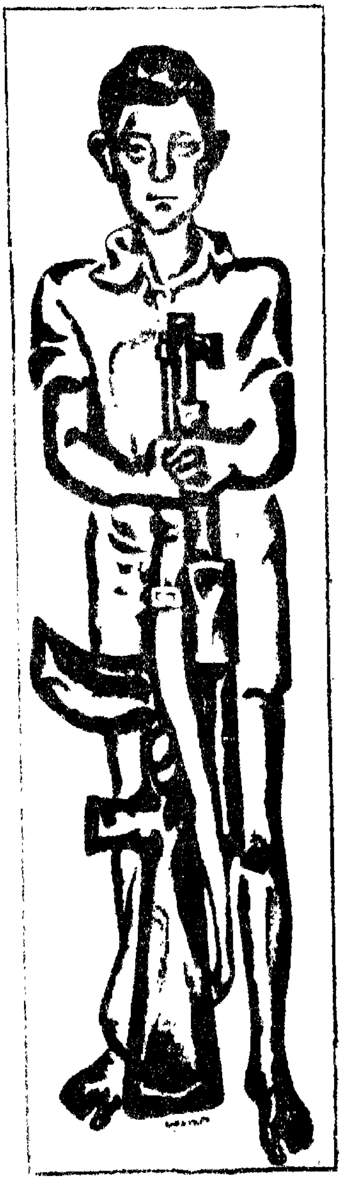
چوان ــــ جگجیون رام ــــ اور گجرال ــــــ کانگریس میں سوشلزم کے علمبردار ــــــ

یہ صحیح ہے کہ چار ماہ کا وقفہ بہت کم ہوتا ہے اور اتنے کم عرصے میں حکومتی پالیسیوں کی افادیت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن پھر بھی حالات بدلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ علی گڑھ یونیورسٹی پر سے ابتک آرڈیننس نہیں ہٹایا گیا اور نہ مستقبل قریب میں اس طرح کے کسی اقدام کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فسٹو میں اُردو زبان سے ہمدردی کا ڈھونگ رچایا تھا اور اسے اس کا جائز مقام دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اندرا گاندھی نے بھی اپنی کئی تقاریر میں اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تذکرہ

کم ہے۔ کیونکہ اندرا گاندھی کی موجودہ بے پناہ مقبولیت کانگریس کی فتح کی ضامن ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت سیاسی شعور سے بے بہرہ ہے غریب لوگ کانگریس پارٹی میں اندھا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس جماعت کو حکومتی مشنری کی بھی امداد حاصل ہے اور اس طرح انھیں پروپیگنڈہ کرنے کی سہولتیں ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر کانگریس کا الیکشن میں فتح یاب ہو جانا یقینی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ موجودہ حالت ابھی تبدیل ہونے والی نہیں۔ ابھی کافی عرصے تک ہندوستان سوشلزم کو اپنانے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ سوشلزم ــــ جی ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی

ٹی میں اسرائیلیوں کی وحشت وبربریت کا ننگا ناچ

سنسان سڑک، نہ اس پر کوئی راہ گیر نہ کوئی گاڑی نہ
کار، دوکانیں بند مسلح سپاہیوں کا گشت، اور خوف د



دہشت کا ماحول یہ ہے وہ غزہ جہاں ہر وقت چہل پہل تھی اور
جہاں زندگی تھی۔ آج وہ زندگی اسرائیلی درندوں نے چھین لی
ان صہیونیوں نے چھین لی جنھوں نے اب سے چار سال قبل اس پر

بحر روم کے ساحل پر مصری سرحد سے ملحق تقریبا ۱۰ از ۲۵ میل کی پٹی غزہ کی پٹی کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم فلسطین کی تجویز کے تحت اس علاقہ کو اقوام متحدہ نے نئی عرب ریاست میں شامل رکھا تھا۔ اس میں غزہ کا شہر بھی شامل ہے جو اسرائیلی سرحد سے صرف چھ میل دور ہے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں جب مصر، عراق، اردن، لبنان اور شام کی فوجوں نے مجوزہ ریاست اسرائیل کے قیام کو روکنے کے لئے فوجی کارروائی کی تھی تو غزہ کی اس پٹی کو مصر نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ فلسطین کے دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تقریباً دو لاکھ فلسطینی پناہ گزین بھی غزہ کی پٹی میں ہی اقامت گزین ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کیا تو اسرائیلیوں نے غزہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اقوام متحدہ کے فیصلے اور بڑی طاقتوں کے دباؤ کی بنا پر یہ علاقہ اسے خالی کر دینا پڑا۔ غزہ پٹی اور اسرائیلی سرحد کے درمیان اقوام متحدہ کی فوجیں تعینات کر دی گئیں۔ اور ایک مصری گورنر کی دوبارہ تقرری عمل میں لائی گئی۔ لیکن مئی ۱۹۶۷ء میں مرحوم صدر ناصر کی ہدایت پر اقوام متحدہ کی فوجوں نے غزہ خالی کر دیا اور مصری فوجیں محاذ پر پہونچ گئیں۔ جون ۱۹۶۷ء میں چھ دن کی جنگ لڑی گئی اور ایک مرتبہ پھر غزہ کی پٹی اسرائیلیوں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ اب نہر سویز تک کے پورے صحرائے سینائی پر اسرائیل ہی کا قبضہ ہے۔ اس علاقہ میں اسرائیلیوں کی وحشت و بربریت نے تاریخ کے تمام مظالم کو مات کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود غزہ کے لوگوں کی تحریک مزاحمت جاری ہے اور انھوں نے آزادی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے ان کی جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ وہ اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین دشمن کے قبضہ سے نہ چھڑا لیں گے۔

غزہ
کی پٹی
ں عربوں نے
آزادی
کے لئے
جان کی بازی
لگا دی ہے



جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ایک ایک انچ زمین سے دشمن کو نہ نکال دیا جائے

اور بزدلانہ حملہ کرکے غزہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

تین تین اور چار چار کے گروپ میں اسرائیلی سپاہی اب غزہ میں گشت کرتے ہیں، اور محلوں، گلیوں اور چھتوں تک پر ان حریت پسندوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جن کی جنگ آزادی بدستور جاری ہے اور جو مجبور و مقہور ہونے کے باوجود موقع پاتے ہی تاک لگا کر دشمن کے سپاہیوں کو اپنے دستی بموں کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔

سنہ کا تقریباً نصف سال غزہ میں کرفیو میں گذرا اور ۱۹۷۱ء کے تمام ابتدائی مہینوں میں پناہ گزینوں کے شتی کیمپ پر ۲۴ گھنٹہ کا کرفیو نافذ رہا۔

صرف کرفیو ہی نہیں غزہ کے باشندوں کو اسرائیلیوں کے جن مظالم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ہزاروں لوگوں کو نظر بند کر دیا گیا ہے۔ اتنی تعداد میں لوگ نظر بند کیے گئے ہیں کہ جیلوں میں جگہ باقی نہیں رہی ہے جس کی وجہ سے ساحل سمندر پر ایک نظر بندی کیمپ کھولا گیا ہے۔ جس کے نزدیک اسرائیلی سپاہیوں تک کا جانا ممنوع ہے۔ وہاں سے دلوں کو لرزا دینے والی چیخ پکار کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

ایک نظر بندی کیمپ ریگستان سینائی کے دسطی علاقہ نال میں قائم کیا گیا ہے جس میں بتدریج توسیع کی جا رہی ہے اس کیمپ میں ان عورتوں اور بچوں کو رکھا گیا ہے جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ مطلوبہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں۔ ان مطلوبہ لوگوں کے مرد رشتہ داروں کو جن میں ان کے بھائی، بھتیجے اور چچیرے بھائی وغیرہ شامل ہیں۔ ریگستان سینائی کے ضلع الورودیس میں واقع ایک دوسرے کیمپ میں رکھا گیا ہے۔ ان لوگوں کا قصور یہ ہے کہ وہ مشتبہ اشخاص کے رشتہ دار ہیں۔

اب فوجی کیمپوں اور ان کے ملحوظی علاقوں میں جس طرح تلاشیاں لی جاتی ہیں اس سے بھی اسرائیلیوں کی وحشت و بربریت آشکار ہوتی ہے۔ بعض اوقات عورتوں کو تلاشی کے بہانے بالکل برہنہ کر دیا جاتا ہے اور اس برہنگی کی حالت میں انھیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا جاتا ہے ایسا ہی سلوک انھوں نے ان عرب نرسوں کے ساتھ کیا جو ہسپتال جا رہی تھیں ایسا ہی برتاؤ وہ بڑی بڑی سڑکوں پر کرنے لگے

لیکن بین الاقوامی مداخلت کے نتیجہ میں بڑی شاہراہوں پر ایسا کرنا بند کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں اور محلوں میں اب بھی اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ عورتوں کے زیورات اور ان کی گھڑیاں وغیرہ دن دھاڑے چھین لی جاتی ہیں اور بعض اوقات گھر کا تمام سامان تباہ کر دیا جاتا ہے۔

ایک ڈاکٹر نے جو غزہ کی پٹی میں کام کرتا تھا بتایا کہ ایک شخص میرے پاس لایا گیا جس کی ٹانگوں میں زخم تھا اسکی ایک ٹانگ بےکار ہو چکی تھی میری تجویز تھی کہ اگر اسے اسرائیل کے اشکلان ہسپتال میں بھیج دیا جائے تو اس کی دوسری ٹانگ بچ سکتی ہے، لیکن اسرائیلی فوجیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا نتیجہ میں اس کی دوسری ٹانگ بھی ضائع ہو گئی۔

اور اسی قسم کے مظالم ہیں جو غزہ کے باشندوں پر توڑے جا رہے ہیں کسی بھی عرب باشندے کی زندگی محفوظ نہیں۔ پچھلے دنوں سرحدی دستوں کے سپاہیوں کو جنھیں گرین بیرٹ کہا جاتا ہے، پولیس کے فرائض انجام دینے کے لئے غزہ کی پٹی میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ سپاہی اپنے مظالم کیلئے عام طور پر بدنام ہیں۔ سڑکوں پر فائرنگ کرنا، پر امن شہریوں کے مکانوں پر حملہ کرنا اور فائرنگ کرنا ان کے لئے عام بات ہے۔ کفر قاسم میں حال ہی میں انھوں نے ۴۹ اشخاص شہید کر دیا۔ جو فوجی افسر (کرنل شادمی) اس قتل عام کے لیے ذمہ دار تھا۔ اس پر اس حرکت کے لئے

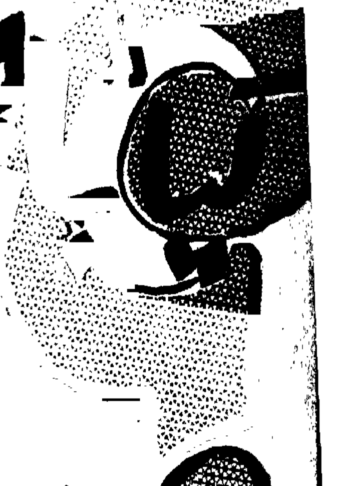
صرف ایک گورا (ایک سینٹ) جرمانہ کیا گیا۔

لیکن ان تمام مظالم اور وحشت و بربریت کے باوجود اسرائیل کے خلاف سب سے زیادہ جذبہ غزہ میں پایا جاتا ہے۔ غزہ کے لوگ اسرائیل کے خلاف ایک لڑائی لڑ رہے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حریت پسندوں کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ گھات لگا کر اسرائیلیوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اپنے ان حملوں میں وہ بموں اور رائفلوں سے کام لیتے ہیں۔

غزہ کے لوگوں کی جنگ آزادی حقیقت میں تمام عربوں کے لئے حوصلہ افزا ہے۔ اسرائیلی قابض حکام کی ان انتقامی کارروائیوں کے باوجود غزہ کے باشندے دشمن سے ٹکر لے رہے ہیں اس سے ان کی جرأت کا پتا ہے ان کی یہ تحریک آزادی اپنے پیچھے ایک طویل تاریخ رکھتی ہے۔ برطانوی انتداب کے دور میں تمام فلسطینیوں میں غزہ کے لوگ بھی شامل ہیں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، اور آج بھی یہ جنگ لڑ رہے ہیں اور اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔



اسرائیلی فوج عرب مکان میں گھس کر اس کے مکینوں کو پریشان کر رہے



"بنگلہ دیش" کو تسلیم کر لیا جائے

اسرار عظمت

بانگلا دیش کی ٹریجڈی کو شروع ہوئے اب تقریباً پانچ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس قلیل عرصے میں قتل وغارت گری کے جو رکارڈ وہاں قائم کئے گئے ہیں انھیں دیکھ کر مہذب دنیا تھرا اٹھی ہے۔ اس قتل عام میں عورتوں اور بچوں تک کو نہیں بخشا گیا۔ عورتوں پر وہ ظلم کئے گئے جنہیں دیکھ کر شیطان بھی شرما جائے۔ پاکستانی فوجیوں نے ظلم وستم کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے جنہیں سن کر لرزہ ساطاری ہو جاتا ہے چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی قتل وخون کے اس بازار کو دیکھ کر شرما گئی ہوں گی۔ ہٹلر بھی سڑکوں پر سڑتی ہوئی ان انسانی لاشوں کو دیکھتا تو کانپ اٹھتا۔ لاکھوں بے گناہ مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بھی پاکستانیوں کی خون کی پیاس نہیں بجھی ہے، اور شاید اس وقت تک نہ بجھے گی جب تک ایک بھی بنگالی زندہ رہے گا۔

اس وحشیانہ قتل عام کو دیکھ کر کوئی بھی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، چاہے وہ کسی بھی نسل، قوم اور رنگ سے تعلق رکھتا ہو، دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہتا ہو۔ پھر ہندوستان اور بنگالیوں کا خون کا رشتہ ہے۔ ملک کی سرحد کی یہ چھوٹی سی لکیر دلوں کے ٹکڑے نہیں کر سکتی ... تقسیم کر سکتی ہے۔ اس فرضی لکیر کے وجود ... مسئلے کو حل کرتے وقت ہندوستان

کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ ہندوستان کی ذرا سی لغزش بھی بین الاقوامی سطح پر اس کی پوزیشن کو سخت نقصان پہنچا سکتی ہے۔

اس مسئلے پر ہندوستان کو بڑی طاقتوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جو اس مسئلے پر یا تو بالکل خاموش ہیں یا مبہم اور ناقابل فہم رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ ملک ہر اعتبار سے ہندوستان سے زیادہ دولت مند اور طاقتور ہیں۔ اپنے کسی مسئلے کے حل کے لئے انھیں دوسروں پر منحصر نہیں رہنا پڑتا اگر بانگلا دیش کے مسئلے پر وہ کوئی غلط اقدام کر بھی جائیں تو انھیں اس قدر شدید نقصان نہ پہنچے گا جتنا کہ ہندوستان کو پہنچنے کا امکان ہے۔ کیونکہ ہندوستان کو اپنے معاشی مسائل صنعتی ترقی، غرض کہ ہر مسئلے کے حل کے لئے دوسرے ملکوں کی طرف پرامید نظروں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے پر ان طاقتور اور خود کفیل ممالک کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ بانگلا دیش کے سلسلے میں کوئی غلط اقدام کر کے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

ہندوستان کی سرحدیں بانگلا دیش اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کو اس سلسلے میں فیصلہ کرنے سے قبل کافی غور وخوض کرنا ضروری ہے۔ اس کے کسی بھی غلط اقدام سے برصغیر کا امن وسکون درہم برہم ہو سکتا ہے چین جو ہندوستان کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہے بانگلا دیش کو ہندوستانی امداد ملتے ہی پاکستان کی امداد میں اضافہ کر دے گا وہ کسی صورت میں بھی یہ برداشت نہ کر سکے گا کہ اس کے "حلقۂ اثر" میں ہندوستان اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کرے ساتھ یہ تو بھی جانتے ہیں کہ پاکستان کو اپنے آقاؤں سے ذرا سی شہ مل جائے تو وہ ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ حالانکہ اس نے

آنے سے ہماری اس بے پناہ محبت میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے جو ہمیں اپنے بنگالی بھائیوں سے ہے۔ اپنے بھائیوں کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر ہم لوگوں میں جو ردِ عمل ہوا ہے وہ بالکل مناسب اور فطرت کے عین مطابق ہے۔

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اس نے جنگ آزادی کی، خواہ وہ کسی ملک کی بھی ہو، ہمیشہ حمایت کی ہے۔ چنانچہ بانگلا دیش کے جمہوریت پسند عوام کی آزادی کی جدوجہد میں بھی وہ ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے، جو انسانیت کا تقاضا ہے۔

اِدھر کچھ عرصے سے بڑے شور وزور سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان بانگلا دیش کو تسلیم کرے اور اس کی امداد کرے۔ یہ مطالبہ کرنے والوں میں عوام، طلباء، ادیب شاعر، مفکر، مدبر، لیڈر اور سیاستداں سبھی شامل ہیں۔ آئے دن مختلف سماجی اور تہذیبی اداروں کی طرف سے مسز اندرا گاندھی کو یادداشتیں دی جاتی ہیں۔ ہر روز اخبارات میں کسی نہ کسی اہم شخصیت کا بیان شائع ہوتا ہے جس میں وزیر اعظم سے اپیل کی جاتی ہے کہ بانگلا دیش کو تسلیم کرنے میں ہندوستان پہل کر کے دوسرے ممالک کے سامنے ایک اچھی مثال قائم کرے۔

جہاں تک بنگالی عوام کا تعلق ہے، ہماری محبت اور ہمدردی بالکل فطری ہے۔ اور یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ بنگالیوں کو اس عذاب اور پاکستانیوں کے ظلم وستم سے بچانے کے لیے فوری اقدامات کئے جائیں اور ان کی جدوجہد آزادی میں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ لیکن بانگلا دیش کو تسلیم کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ ہے جسے حل کرنے میں سیاسی سوجھ بوجھ اور سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ سیاسی پالیسی کی بنیاد محض جذبات پر نہیں



یا عالم
کریکٹ
ایک
باجہ
ما نقاب کے
ساتھ۔

ر ایسا کیا تو سب سابق سے تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑیگا
لبن یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کو
ی شدید مالی اور جانی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا۔
ین اور پاکستان کی پچھلی جنگوں نے جو برے اثرات ہندوستان
ا معیشت پر ڈالے ہیں وہ ابھی تک پوری طرح دور نہیں
ر سکے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر پھر جنگ ہوئی تو ہندوستان
نعتی ترقی میں پھر کم از کم دس سال پیچھے چلا جائے گا خورد
ِش کی اشیاء، کپڑے اور دیگر ضروری چیزوں کی قیمتوں میں
ا اضافہ ہوگا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کو چینی امداد کی صورت میں "توازنِ طاقت"
ی خاطر اب ہندوستان کو چین مخالف ممالک سے امداد ملنے
ی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ چین آج کل مغربی ممالک کے
لئے ہوا بنا ہوا ہے۔ اور مغربی ممالک اس کوشش میں ہیں
ین سے کسی معاملے میں نہ الجھیں۔ بانگلا دیش میں پاکستان
ی بربریت کے باوجود مغربی ممالک کی خاموشی یا لاتعلقی اس
ت کا ثبوت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں چین کے بڑھتے
ہوئے اثرات کو دیکھ کر مغربی ممالک کچھ مرعوب سے ہو گئے
یں اور انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ چین کے اس بڑھتے ہوئے
ر کو روکنے کی کوشش کرنے کی بجائے چین سے سمجھوتہ کر لیں
مریکا جو چین کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتا تھا چین سے
علقات استوار کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اور اب ایسا
حسوس ہونے لگا ہے کہ اگلے چند برسوں میں عالمی سیاست
ی کوئی غیر معمولی تبدیلی رونما ہوگی۔

اور اگر یہ فرض بھی کر لیا گیا کہ برصغیر میں طاقت کے
توازن کی خاطر کوئی ملک ہندوستان کو امداد دینا شروع کر دیگا
تب بھی ہندوستان کو جو غیر معمولی نقصانات ہوں گے انھیں
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ بانگلا دیش یا
ہندوستان اور پاکستان کی جنگ میں چین اور دنیا کی کوئی
دوسری بڑی طاقت شامل ہو جائے گی تو برصغیر دوسرے ویتنام
میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیونکہ جب دو بڑی قوتیں جنگ میں شامل
ہوتی ہیں وہاں پھر جنگ کا فیصلہ کسی ایک کے حق میں ہونا ناممکن
ہو جاتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ ہندوستان جیسا غریب اور تباہ حال
ملک کسی ایسی جنگ میں الجھ گیا جو ویت نام کی طرح طول پکڑ جائے
تو۔۔۔۔۔ اس کا تصور ہی لرزہ براندام کر دینے کے
لئے کافی ہے۔

بانگلا دیش کو تسلیم کر لینے سے ہندوستان کا دوسرا بڑا
نقصان یہ ہوگا کہ شرقِ وسطیٰ اور دوسرے مسلم ممالک ہندوستان
کے خلاف ہو جائیں گے۔ یہ ممالک ابھی اتنے روشن خیال نہیں
ہوئے ہیں کہ بانگلا دیش کو تسلیم کر لینے کو ایک انسانی (بلکہ
مذہبی بھی) فریضہ سمجھ سکیں۔ وہ پاکستان کو ہی حق پر سمجھتے ہیں۔
ایک مسلم ملک ہونے کی حیثیت سے ان ممالک میں پاکستان کی ویسے
بھی بڑی اچھی پوزیشن ہے۔ پاکستان ان ممالک میں ہندوستان کے
خلاف ایسا پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے جس سے وہاں کے عوام
پہلے سے ہی ہندوستان سے متنفر ہیں۔ بانگلا دیش کو تسلیم کرنے
اور اُسے فوجی امداد دینے کی صورت میں پاکستان سے ہندوستان
کی جنگ یقینی ہے اور اس صورت میں یہ مسلم ممالک اس مسئلے کو
"اسلام کے تحفظ" کا مسئلہ بنا لیں گے، اور ہندوستان کے خلاف
وہاں نفرت کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ اس صورت میں ان مسلم
ممالک سے ہندوستان کی تجارت کا متاثر ہونا یقینی ہے۔ اس
سے جو بھاری نقصان ہندوستان کو پہنچے گا اس کے برے
اثرات ہندوستان کی معیشت پر مرتب ہوں گے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس آزمائشی وقت میں ہمکو
مسز اندرا گاندھی کی قیادت حاصل ہے۔ شاید ان سب گمبھیر
مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور سچویشن کی نزاکت کو محسوس
کرتے ہوئے انھوں نے باوجود غیر معمولی سیاسی اور اخلاقی دباؤ
کے، بانگلا دیش کو اب تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ
بانگلا دیش کے عوام کے تحفظ کی خاطر ہندوستان کے
کروڑوں عوام کے مفاد کو خطرے میں ڈالنے کا ان کو کوئی حق
نہیں ہے۔ یقین ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی غیر دانشمندانہ
قدم نہ اٹھائیں گی۔

بانگلا دیش کے لئے ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ انکے
لئے اپنی عمیق ہمدردی اور محبت کا اظہار کریں۔ ان پر ہونے
والے مظالم کی تشہیر کر کے ان کے حق میں عالمی رائے کو متحرک
کرنے کی کوشش کریں ــــ لیکن جہاں تک بانگلا دیش
کو تسلیم کرنے اور اُسے فوجی امداد دینے کا تعلق ہے، ہم اس
سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اگر ہم اس سلسلے میں اپنی حیثیت
سے زیادہ کچھ کرنے کی کوشش کریں بھی تو یہ ہمارے ساتھ ساتھ
خود بانگلا دیش کے حق میں بھی ضرر رساں ثابت ہوگا۔ جب تک
بڑی طاقتیں اس معاملے میں دخل نہ دیں، یہ مسئلہ ہرگز ہرگز
حل نہیں ہو سکتا۔

تھوری

آخر جون اور آغاز جولائی
ہندوستان بھر
ممتاز مسلم صحافیوں کی جس جماعت نے
پناہ گزینوں سے
براہ راست ان کے حالات
مطالعہ کیا ——
میں سے بعض محترم صحافیوں نے اپنے تاثر
ہماری درخواست پر واقعات کے لئے
عنایت فرمایا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ
شائع کر رہے ہیں —— ادارہ

مشرقی پاکستان کے ستم رسیدہ پناہ گزین

مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۷۰ لاکھ کے قریب ہو چکی ہے۔ سب سے بڑی تعداد بنگال میں ہے پھر آسام اور تریپورہ میں ایسے لوگ بہار میں ہیں اور کچھ مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر میں منتقل کئے گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس تعداد میں نصف سے زیادہ کیمپوں میں مقیم اور باقی اپنے طور پر بستیوں اور قصبوں میں قیام پذیر ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں پر آنے والوں کا چونکہ شمار نہیں ہو سکا اسلئے ان اعداد کی صداقت پر پورا اعتماد کرنا مشکل ہے پھر کیمپوں کے باہر جو تعداد رہ رہی ہے اس کے سلسلے میں تصدیق کرنا اور بھی مشکل ہے تاہم پناہ گزینوں کی کمی بیشی کا اصل سوال کی سنگینی پر اثر نہیں پڑتا۔ جو لوگ بھی بھاگ کر ترک وطن پر مجبور ہوئے ہیں انہوں نے یہ اقدام یقیناً بے بسی کے عالم میں کیا ہے اور اس لیے وہ ہندوستان کے ہر شہری کی امداد و ہمدردی کے مستحق ہیں۔

ہماری حکومت ان بے گھر پناہ گزینوں کو راشن دے رہی ہے ان کے لیے عارضی مکانات بنا دیے گئے ہیں علاج کا بھی کافی انتظام کیا گیا ہے لیکن یہ اعانت ... سکتے ہیں اور نہ یہ پناہ گزین اس سے بہت دیر ... سکتے ہیں اسلئے اصل سوال یہ ہے کہ ان پناہ گزینوں

بنگلادیش کے بارے میں اردو کے ممتاز صحافیوں کے تاثرات

کے مسئلے کا کیا حل ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق کیمپ میں رہنے والے ۹۹ فیصد لوگوں کا یہی خیال ہے کہ اگر ان کے جان و مال کی حفاظت کا یقین ہو تو وہ اپنے وطن واپس جانے کیلئے تیار ہیں۔ ان کیمپوں میں پاکستانی فوجوں کے ہاتھوں براہ راست جبر و قہر کا شکار ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی البتہ زیادہ تر لوگ وہ تھے جو فوج کی آمد کا سن کر گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں فوج نے گھیرے میں لے کر ہندوستان کی طرف دھکیل دیا اور جتنا سامان وہ ہاتھوں اور کندھوں پر لا سکتے تھے لے آنے دیا۔ ان سب افراد کو فوج سے خطرہ ہے اور برابر یہ داستانیں اب بھی ان کے وطن سے آنے والوں کے ذریعے کانوں میں پہنچ رہی ہیں کہ اگر وہ اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان کا حشر اچھا نہیں ہوگا۔ اس حالت میں ان کا واپس جانا قطعاً محال نظر آتا ہے جب تک کہ کوئی

ایسا حل نکالا جائے جس میں انہیں اعتماد ہو اور وہ عزت اور احترام کے ساتھ انہیں ان کے گھروں تک لے جا کر بسا سکے۔

راقم السطور کے خیال میں اصلاح کی ایسی اقوام متحدہ ہو سکتی ہے یا پھر کوئی ایسا ملک جس پر حکومت پاکستان اور حکومت ہند دونوں کو اعتماد ہو یہ کام مسلمانان ہند کے کسی غیر سرکاری وفد کے ذریعہ بھی انجام پا سکتا ہے اور ہم سے یہی آخری بات زیادہ تعلق رکھتی ہے کتنا اچھا ہوتا اگر مسلمانان ہند کے ذمہ دار لیڈروں پر مشتمل کوئی غیر سرکاری وفد پاکستان جاتا اور واپسی کے اس مسئلے کو اطمینان بخش طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا۔

ہند پاک تعلقات اس وقت کشیدگی کے نقطۂ عروج پر ہیں۔ مگر اس تلخی کو بہرحال کم ہونا چاہیے۔ اور اس کا آغاز اسی طرح ہو سکتا ہے کہ پناہ گزینوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہو۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کے عوام کی امنگیں پوری ہوں تو انکا بھی امکان اسی وقت ہے جب وہ باشندے اپنے وطن واپس ہوں اور وہیں رہ کر پُرامن جدوجہد کریں ان عوام کی امنگوں کو زیادہ عرصے تک دبایا نہیں جا سکتا اور جب بھی جمہوری نظام وہاں قائم ہوگا انکی تمنائیں پوری ہو کر رہیں گی۔ ہاں جلا وطنی کے عالم میں ان کی تکمیل آسان نہیں۔ ان پناہ گزین بھائیوں اور بہنوں کی حالت بہت دردناک ہے اور وہ ہماری ہمدردیوں کے پورے پورے مستحق ہیں۔ اس وقت انہیں کپڑوں، دواؤں، ڈاکٹروں اور رضاکارانہ خدمت انجام دینے والے کارکنوں کی شدید ضرورت ہے۔ اور انکی یہ ضرورت جلد از جلد پوری کی جانی چاہیئے۔ اس وقت جگہ جگہ امدادی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں انکے ساتھ تعاون کی ضرورت ہے اور کمیٹیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی امداد لیتے وقت مدات مقرر کریں تاکہ جو شخص جس ضرورت کو زیادہ اہمیت دے اس کی رقم وہیں صرف کی جا سکے۔ محمد مسلم (ایڈیٹر سہ روزہ دعوت دہلی)

ہمیں ہماری مسکراہٹیں واپس کرو

لٹے ہوئے ان قافلوں کو میں نے دیکھا ہے جو مشرقی بنگال سے پاکستانی فوجیوں کی بربریت اور بہیمیت کا شکار ہو کر تہذیب و شرافت اور اخلاق و انسانیت کو حیرت بھری نگاہوں سے تک رہے تھے —— ان قافلوں کی دردناک داستانوں سے انسانیت و شرافت کے مدعی بہرے بنے، بہت کوشش کی گئی کہ یہ جگر خراش کہانیاں "پدما" اور "میگنا" کی گہرائیوں میں خاموش ہو جائیں، کوئی نہ جانے —— لیکن اتنا بڑا گناہ کہاں چھپایا جا سکتا ہے "انسانیت کے قتل" پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیسے

کامیاب ہو سکتی ہے — دنیا نے جان لیا ہے کہ مشرقی بنگال میں مغربی پاکستان کے بے دماغ فوجی حکمرانوں کی دہشت پسندانہ پالیسی نے تباہی و بربادی کے ایسے الاؤ جلائے ہیں جن میں سب کچھ جل چکا ہے، اس انسانیت سوز آتشزنی میں جان و مال، عزت و آبرو، سبھی کچھ تو راکھ کا ڈھیر بن گئے — جب انساں بکھر گئی، عصمتوں کا تقدس تار تار ہو گیا، اور جب ماؤں کی گودیں ویران ہو گئیں، پالنے سونے پڑ گئے، اور سہاگ کی چوڑیاں عفت و شرافت اور معصومیت کے خون میں نہا کر ٹوٹ گئیں — تو پھر باقی کیا رہا —

لیکن کیا انصاف کی طاقتیں ظلم و بربریت کی اس بھیانک خون آشام سفاکی پر خاموش رہ سکیں گی؟ کیا ظلم و گناہ کی اس بدترین انسانیت سوز شرمناک کارروائی برداشت کر لیا جائے گا.. — نہیں، ہرگز نہیں — تاریخ کی عدالت میں یہ جرم کبھی بخشے نہیں گئے، کبھی معاف نہیں کیے گئے۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے کہ ظلم کی بنیادوں سے مزاحمت کی قوتیں ابھری ہیں۔ جبر کی سطوت سے انھوں نے پالا لیا ہے، اور بالآخر مظلومیت کی پکار کو فتح حاصل ہوئی ہے، ظفر و کامرانی نے اس کے قدم چومے ہیں۔

اور پھر — بربادیوں کے خاکستر میں ابھی چنگاریاں باقی ہیں، جو ظلم و جبر کے لیے آتش فشاں بننے کو مچل رہی ہیں — میں نے ان نوجوانوں کو دیکھا ہے، جو تباہی و بربادی پر دل گرفتہ ضرور ہیں، لیکن جن کے دلوں میں ولولہ ابل رہا ہے۔ میں نے ان کے وہ تیور بھی دیکھے ہیں، جن کے عزم و ارادے کا استحکام بڑی سے بڑی ظالمانہ قوت کے لیے شکست و ریخت کا سامان پیدا کر سکتا ہے — کیا بچے، کیا بوڑھے اور کیا جوان سبھی تیار ہیں۔ سبھوں نے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ پاکستانی بربریت کے جنگی سسٹم کو ختم کرنے کے لیے — مشرقی بنگال کے عوام کی مرضی کی امنگ کے شعلوں کو زیادہ دیر دبایا نہیں جا سکتا — ان کے استحصال پر پاکستانی حکمرانوں کی کرسی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی — ظلم سے بڑی ہوئی کوئی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ اسے گرنا ہے، اور اس کے کھنڈر پر عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کی نئی تعمیر ہونی ہے —

کوئی بتلائے کہ کیا یہ کہنا جرم ہے کہ "ہمیں ہمارا حق دیجیے" "ہمیں ہماری محنت دیجیے" اور ہمیں ہماری مسکراہٹیں واپس کر دو" — شیخ مجیب الرحمن نے اور ان کے ساتھیوں نے مشرقی بنگال

کے عوام نے اور اس کے سوا کیا کہا تھا؟ — اس جرم کی اگر یہ پاداش ہے تو مشرقی بنگال کے عوام شیخ مجیب الرحمن کی قیادت میں یہ گناہ بار بار کرتے رہیں گے اور اس وقت تک کرتے رہیں گے، جب تک کہ ظلم کی تقدیر اپنے کیے کی سزا نہ پائے اور مظلومیت کی پکار فوجی آمریت کے نشے کو چکنا چور نہ کر دے۔

سید احمد ہاشمی (الجمعیت دہلی)

جہاں انسانیت سرنگوں ہو گئی

مغربی بنگال کے اسلام پور سب ڈویژن میں اصل آبادی سے ۱۴ میل دور مشرقی بنگال کی سرحد سے متصل ناگر ندی کے کنارے سوداگنی کیمپ میں سرحد پار سے لٹ پٹ کر آئے ہوئے تباہ حال لوگ ۲۰ ہزار کی تعداد میں پناہ گیر ہیں۔ جن کو الگ الگ جھونپڑوں میں ٹین کے چھپر والی چٹائیوں سے بنے مکانوں میں رکھا گیا ہے۔ جھونپڑوں کی قطار در قطار چلی گئی ہے۔ ہر جھونپڑے میں ایک خاندان آباد ہے۔ اور جو سرحد پار کر ان جھونپڑوں میں پناہ گیر ہونے کے بعد اپنے جان و مال اور اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت و آبرو کے سلسلے میں کسی خوف اور اندیشے میں مبتلا نہیں اور تمام کٹھنائیوں کا سامنا کرنے کے باوجود اس یقین کی شمع اپنے دل میں روشن کیے ہوئے ہیں کہ ان کا پیارا وطن اُن کا "سونا بنگلہ دیش" ضرور آزاد ہو گا۔ اور وہ اپنی دلکش اور سرسبز سرزمین پر جا کر دوبارہ عزت، فخر اور سکون کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار سکیں گے۔ یہ بھولے بھالے لوگ نہ تو سیاست کی شعبدہ بازیوں کا شکار ہیں یا زبان و مذہب کے نام پر کسی سے نفرت کرنے والے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ انہیں ایسی کسی بات کا پتا ہی نہیں، مگر پھر بھی پاکستانی فوج نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے، ان کی بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں، اب وہاں کوئی جاندار شے حرکت کرتی نظر نہیں آتی۔ انسانی جانوں کا بے دریغ اتلاف، تباہی اور غارتگری کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ پناہ گزینوں کی حالت بگڑ کر پاکستانی فوج کے خلاف ان کے دل میں پلنے والی شدید نفرت کا اندازہ ہوا۔ انہیں اس کا غم کم تھا کہ بہت سارے لوگ بے تصور مارے گئے انہیں سب سے زیادہ غصہ اس پر تھا کہ ان کی ماؤں بہنوں کی آبرو لوٹی گئی۔ اور ظالم مندہ صفت فوجیوں کا کلیجہ کبھی نہیں پسیجا۔ فوج جس جس گاؤں سے گزری، آتشزنی و غارتگری کا سلسلہ قائم کرتی چلی گئی۔ جو بھی گولی کا نشانہ بن گیا، کیا عالم کیا جاہل، کیا سیاستداں اور کیا ان پڑھ کسان۔ فوج نے کوئی تمیز نہیں رکھی۔ گھروں کو پھونک دیا گیا اور سامان لوٹ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے گاؤں والے بھی

خوف و دہشت کے عالم میں بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ یہ سوداگنی کا کیمپ بہت ہی صاف ستھرا تھا۔ مقامی ایڈمنسٹریشن کے کارکنوں اور خود پناہ گزینوں نے بڑی محنت سے اس کیمپ میں صفائی رکھی ہے۔ ان پناہ گزینوں سے مل کر مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ پاکستان کی فوجی حکومت سے ان کے دلوں میں جو نفرت بیٹھ گئی ہے اسے کوئی طاقت دور نہیں کر سکتی۔ ان کو بس اسی سے اطمینان ہو سکتا ہے کہ ان کا بنگلہ دیش آزاد ہو جہاں ان کی اپنی حکومت ان کے جان و مال اور عزت کی ضمانت دے سکے گی۔ انھیں اس بات کا شدت سے انتظار ہے اور اسی صورت میں وہ اپنے وطن واپس جانے کا عزم مصمم دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کی ٹولی کے انسانیت سوز مظالم پر بلاشبہ پوری انسانیت شرمسار اور سرنگوں ہو گئی ہے۔

شمس الزماں (آنند بازار پتریکا، کلکتہ)



[illegible]

ایڈگر ایلن پو اپنی شاعری اور پُراسرار کہانیاں لکھنے کے سبب انگریزی ادب میں ایک منفرد مقام کا مالک ہے۔ اسے امریکی ادب کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اسے ورجینیا یونیورسٹی سے اس لئے نکال دیا گیا کہ وہ شراب اور جوئے کی علت میں بُری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ بعد میں ویسٹ پوائنٹ اکیڈمی میں اس کا بار بار کورٹ مارشل کیا جاتا اور انجام کار اسے وہاں سے اس بنا پر نکال دیا گیا کہ وہ ملٹری کے تمام ضوابط نظر انداز کر کے اپنے کوارٹر میں بیٹھا شعر لکھتا رہتا تھا اور کبھی پریڈ پر حاضر نہ ہوتا تھا۔

پو ابتدائی زندگی میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ تمباکو کے ایک

کا خیال ہے کہ وہ بھی نیم پاگل تھا۔ وہ عمر میں اپنی بیوی سے دوگنا تھا۔ وہ ۲۶ برس کا تھا اور اس کی بیوی ۱۳ سال کی۔ لوگوں کی پیش گوئیوں کے مطابق اس کی شادی کا رشتہ جلد قطع ہو جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہ ہوا اور وہ بڑی کامیاب بیوی ثابت ہوئی۔ پو اپنی بیوی کی پرستش کرتا تھا اور اس کی غیر فانی محبت نے اس سے بعض ایسی نظمیں لکھوائیں جو انگریزی ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور جنہوں نے انگریزی ادب میں ایک نیا اضافہ کیا۔

ایڈگر ایلن پو نے ایسی کہانیاں اور نظمیں لکھیں جو ادبی خزانہ تصور کی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ان غیر فانی شہ پاروں کے

پو اپنی نظموں کے پہلے مجموعے "زاغ" پر دس برس تک محنت کرتا رہا۔ وہ اس مجموعے کی نظموں پر بار بار نظر ثانی کرتا۔ اس کے باوجود اس نے مجبوراً یہ مجموعہ فقط دو پونڈ میں فروخت کر دیا۔ بالی وڈ کا نامور ایکٹر جون میری سور اپنی ایک منٹ کی خدمات کا معاوضہ اس سے زیادہ لیتا تھا۔

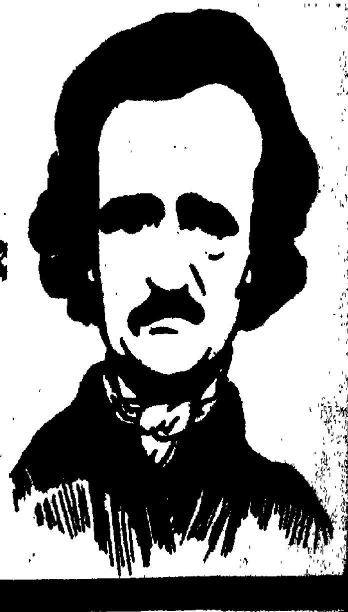
پو کو "زاغ" کے فقط دو پونڈ ملے لیکن حال ہی میں پو کا اصلی مسودہ ایک لاکھ پونڈ میں فروخت ہوا ہے۔ ایسا کیوں؟ اس لئے کہ ہماری عظیم شخصیتیں اپنی زندگی میں تو فاقے کرتی ہیں لیکن جب وہ مر جاتی ہیں تو ان کے شہ پاروں کو لوگ گراں قیمتوں پر خریدنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

ایڈگر ایلن پو

دنیا کے نامور مصنفین سے ملاقات

۲

چھبیس برس کی عمر میں وہ اپنی
بیوی سے دوگنی عمر کا تھا۔ اسے اپنی دس برس
کی محنت کا معاوضہ صرف دو پونڈ ملا



سوداگر نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا لیکن تاجر بھی اس کی عیب جوئی کے باعث اس کے خلاف ہو گیا اور اس نے پو کو گھر سے نکال دیا۔ اسے اپنی جائیداد سے الگ کر دیا اور اپنے وصیت نامے میں لکھ گیا کہ اسے اس کے سرمائے میں سے حصہ نہ دیا جائے۔

پو کی شادی کی کہانی غریب صورت اور کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نے اپنی چچا زاد بہن ورجینیا کلم سے شادی کی۔ اس وقت وہ مفلوک الحال تھا۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اسے آمدنی کی امید تھی۔ وہ عام شراب نوشی کرتا۔ وہ گویا ایک روگی تھا اور بعض لوگوں

غرض اسے اتنے پیسے بھی نہ ملتے تھے کہ وہ دو وقت کا کھانا بھی خرید سکے۔ مثلاً اس نے دنیا کو ذیل کی بے مثال نظم دی۔

بہت سے کمرے کے دروازے کے پاس
پالاس کے مجسمے پر
کوا ابھی تک بیٹھا ہے
وہ اڑنے کا نام نہیں لیتا
اس کی آنکھیں نیند میں ڈوبے کسی عفریت
سے مشابہ ہیں
اس کے سر پر لیمپ کی روشنی
فرش پر اس کے سائے کو نمایاں کر رہی ہے

نیویارک میں گرینڈ کنکورس میں وہ مکان ابھی تک موجود ہے جہاں پو اور اس کی بیوی ورجینیا رہا کرتے تھے۔ سو برس پہلے جب پو نے وہ مکان کرائے پر لیا تو اس کی حالت بہت خستہ تھی اور وہ گرنے کے قریب تھا لیکن اب وہ بلند قامت خوبصورت عمارتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں اس کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا اور اس کے قریب سے ندی بہتی تھی۔ اور جب جنوب سے ہوا چلتی تو پھولوں کی مہک سے ماحول مہک جاتا اور ہر طرف شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ سنائی دیتی۔ تو پو جگہ جگہ کا ذرہ ذرہ معلوم ہوتا۔ پو نے مکان کے اندر ایک سنگ مرمر کا ایک لیمپ لٹکا رکھا تھا

بقیہ صفحہ

ارشاد پنجتن جس کا جسم ایک مصور کا برش ہے

شاہد صدیقی



ارشاد پنجتن پتنگ اڑا رہے ہیں

اسکول سے واپس آتے وقت ہماری بس کناٹ پلیس سے گزرا کرتی تھی۔ کناٹ پلیس میں ہر دو قدم پر لال بتی لگی ہوئی ہے۔ بس ذرا چلی اور لال بتی روشن ہو گئی۔ بس کو رک جانا پڑا۔ ہم لوگ باہر گردن نکال کر سڑک پہ لگے ہوئے بے شمار پوسٹروں کو دیکھنے لگتے تھے۔ ان پوسٹروں میں ایک دن ہمیں ایک بڑا عجیب پوسٹر نظر آیا۔ پوسٹر پہ ایک انسان کی بڑی مضحکہ خیز شکل بنی ہوئی تھی۔ جس کے نیچے موٹے موٹے حرفوں میں انگریزی میں لکھا ہوا تھا "ارشاد پنجتن آپ کے شہر میں" پورے کناٹ پلیس کی دیواریں اس پوسٹر سے چھپی پڑی تھیں۔ اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن نام کچھ ایسا عجیب و غریب تھا کہ ذہن سے چپک کر رہ گیا۔

کئی سال بعد پہلی بار ارشاد پنجتن سے ملنے کا اتفاق دہلی کے سپرو ہاؤس میں ہوا۔ چھوٹا سا قد۔ دبلا پتلا جسم۔ گھنگریالے بال۔ چھوٹا سا چہرہ، شکنوں اور جھریوں سے بھرا ہوا۔ بڑی سی ناک۔ یہ تھے دنیا کے مشہور مائم (Mime) آرٹسٹ واقعات ...

ارشاد پنجتن۔

آپ میں سے کتنے ہی لوگ مائم لفظ پڑھ کر چونکے ہوں گے۔ آیئے آپ کو پہلے اس عجیب و غریب آرٹ کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔ مائم نہ تو ڈراما ہے، نہ ڈانس اور نہ مونو ایکٹنگ۔ یہ ان سب سے علیحدہ ایک آرٹ ہے۔ اس میں آرٹسٹ کے پاس صرف ایک اوزار ہوتا ہے، اور وہ اوزار ہے اس کا جسم۔ آرٹسٹ نہ تو قسم قسم کے لباس پہنتا ہے، نہ اسٹیج پر کسی قسم کی سیٹنگ ہوتی ہے اور نہ کوئی موسیقی۔ خالی اسٹیج ہوتا ہے جس پر آرٹسٹ جسم سے چپکا ہوا لباس پہن کر آتا ہے۔ لیکن یہ آرٹسٹ کا کمال ہوتا ہے کہ چند ہی لمحوں میں آپ کو اس کے چاروں طرف دیواریں، فرنیچر اور ہر وہ چیز نظر آنے لگتی ہے جو آرٹسٹ آپ کو دکھانا چاہتا ہے۔ وہ پتنگ اڑاتا ہے تو آپ کو پتنگ نظر آتی ہے۔ وہ گھوڑا سواری کرتا ہے تو آپ گھوڑا دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کا بوسہ لیتا ہے تو آپ کو واقعی اس کا محبوب نظر آنے لگتا ہے۔ وہ کمرے میں بیٹھتا ہے تو آپ کو اس کے چاروں طرف رکھا ہوا فرنیچر نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن ٹھہریئے! ہم نے شاید کچھ غلط کہا۔ آپ کو ان میں سے کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ آپ ان چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔ آرٹسٹ اپنے جسم کی حرکتوں سے آپ کو ان چیزوں کا احساس دلاتا ہے۔ وہ فرضی پتنگ اس خوبصورتی



ارشاد پنجتن کے آرٹ کو سمجھنے کے لئے ان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھنا ضروری ہے

سے اٹھاتا ہے کہ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں پتنگ اور اس کی ڈور موجود ہے۔ وہ اپنے کو جیل کی کال کوٹھری میں بند کر لیتا ہے تو آپ کو لگتا ہے جیسے واقعی اس کے چاروں طرف اونچی اونچی مضبوط دیواریں ہیں اور وہ ان سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہے۔ لیکن باہر نکل نہیں سکتا۔

ارشاد پنجتن صحیح معنی میں ہندوستان کا پہلا مائم آرٹسٹ ہے۔ ارشاد کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ۱۹ سال کی عمر میں اس نے حیدرآباد فلائنگ کلب سے گراؤنڈ انجینئر کا کورس پاس کیا لیکن وہ فلموں میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے بمبئی چلا گیا اور وہاں خواجہ احمد عباس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں ارشاد کو مائم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے شوقیہ مائم کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۵۸ء میں اس کی ملاقات اتفاقیہ طور پر فرانس کے مشہور مائم آرٹسٹ تھیوسے ہوگئی۔ تھیوسے ارشاد نے بہت کچھ سیکھا۔ دہلی میں ارشاد دنیا کے مشہور مائم آرٹسٹ مارسل مارسیو سے ملا۔ آج سے دس سال پہلے وہ پہلی بار اسٹیج پر آیا۔ اس کے آرٹ کو اتنا زیادہ پسند کیا گیا کہ اس کے بعد اس نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے آرٹ کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ارشاد ابھی اپنے آرٹ سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے بہتر آرٹ کی تلاش میں بیس روپے لے کر دنیا کے سفر پر نکل پڑے۔ وہ پاکستان، افغانستان، عراق، شام، ترکی، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، آسٹریلیا اور جرمنی ہوتے ہوئے فرانس پہنچے۔ جہاں ان کے گرو مارسل مارسیو رہتے تھے۔ ارشاد نے مارسل مارسیو سے باقاعدہ تربیت لینے کی خواہش ظاہر کی لیکن مارسیو نے انھیں بتایا کہ وہ اب اس اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں جہاں تربیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

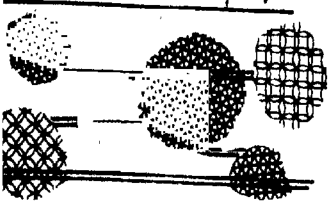
جن لوگوں نے ارشاد کو اسٹیج پر دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ وہ کس طرح صرف اپنے جسم، منہ اور آنکھوں کے استعمال سے ایک دندان ساز کی دوکان کا منظر پیش کرتا ہے کیونکہ ارشاد نے بھارت ناٹیم کی تعلیم بھی حاصل کی ہے اس لئے جسم اور آنکھوں کا استعمال دنیا کے دوسرے مائم آرٹسٹوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ ارشاد راشن کی دوکان کے باہر لگی ہوئی لائن کا منظر بہت عمدگی سے پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح ڈرامے میں دیکھنے والوں کے لئے تمام الفاظ سننا بہت ضروری ہیں۔ اسی طرح مائم میں ان کے لئے آرٹسٹ کے جسم کی معمولی سی حرکت کو دیکھنا بھی بہت ضروری ہے۔"

راشن کی لائن والے مائم میں ارشاد اسٹیج پر آتے ہی ایک بہت ہی گھبرائے ہوئے شخص کا کیرکٹر پیش کرتا ہے جو تیزی سے راشن کی دوکان کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اچانک رک جاتا ہے اور اس کی نگاہ اس طرح سے دوڑتی ہے جیسے معلوم ہو کہ اس کے سامنے ایک بہت لمبی لائن لگی ہے اس کے چہرے کے تاثرات اور ڈھلکا ہوا جسم اس کے ناامید ہو جانے کا تاثر دیتا ہے۔ پھر اسی طرح لائن میں لگے لگے دوکان تک پہنچنے کے وقت تک لائن میں لگے ہوئے لوگوں سے جھگڑے اور پھر آخر میں دوکان کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس آدمی کی جسمانی حالت کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔

بچے اور تتلی کا مائم بھی ارشاد نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ایک ایسے بھوکے انسان کا تصور بھی جسے کئی روز کے بعد کھانے کو ملا ہو ارشاد نے حقیقت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ارشاد کا جسم ایک ایسا برش ہے جس کی مدد سے وہ منٹوں میں اسٹیج پر تصویریں بناتا چلا جاتا ہے۔ آپ ان تصویروں کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں یعنی محسوس کرتے ہیں۔

ارشاد کے آرٹ میں مزاح کا عنصر بھی کافی حد تک شامل ہوتا ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت پر لوگ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے ہر مائم کے خاتمے کے بعد ایک لمبے عرصے تک ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہتا ہے۔ لیکن ارشاد کا مزاح ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مزاحیہ حرکات سے اس کو تالیاں اور قہقہے تو زیادہ مل جاتے ہیں لیکن اس سے اس کے آرٹ میں حقیقت کا رنگ کم ہو جاتا ہے۔ ایک مائم آرٹسٹ کی سب سے بڑی خوبی اس کے جسم کی ہر جنبش کا حقیقت سے قریب تر ہونا ہے۔ "تتلی اور لڑکا" میں ارشاد نے ایک دس گیارہ سال کے لڑکے کی حرکات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ایک تتلی کو دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوتی ہے، وہ کیسے اس کے پیچھے بھاگتا ہے، تتلی ہاتھ نہ آنے پر اسے کس طرح مایوسی ہوتی ہے اور جب تتلی ہاتھ آجاتی ہے تو وہ کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن جب تتلی مر جاتی ہے تو بچے کی کیا حالت ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا مطالعہ ارشاد نے بہت گہرائی سے کیا ہے لیکن اس میں مزاح پیدا کرنے کے ... بگڑ وہ Over Act کر گیا ہے۔

ارشاد اگر چاہے تو وہ اپنے آرٹ کے ذریعے ہمارے موجودہ سماج کے انتشار اور موجودہ انسان کے ذہنی خلفشار کو بہت خوبصورتی سے پیش کر سکتا ہے۔ اس آرٹ سے شاید اس کے مداحوں میں تو کمی آجائے لیکن وہ موجودہ اسٹیج آرٹ میں ایک اہم مقام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ ویسے آج بھی ارشاد کا شمار دنیا کے چند گنے چنے مائم آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ ■









اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا سوچیے!
کیا آپ اس بچے کی
پرورش اچھی طرح
نہیں کرنا چاہیں گے؟
یں گے کہ اُسے دودھ، اچھی خوراک، کپڑے، کھلونے اور کتابیں بھی ملیں۔ لیکن اگر اگلا بچہ جلدی ہو جاتا ہے تو یہ سب آپ کے لیے
نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے؟
یں لاکھوں لوگ یہی کر رہے ہیں۔ وہ اگلے بچے کی پیدائش اس وقت تک ٹالتے ہیں جب تک وہ اس کے لیے خود تیار نہیں
نیرودھ کی مدد سے آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ربڑ سے بنا ہوا نیرودھ حمل روکنے کا وہ ذریعہ ہے جو دنیا بھر میں مقبول ہے
استعمال نہایت آسان ہے۔ اس سے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ آج ہی ایک پیکٹ کیوں نہ خریدیں۔
ملتا ہے - 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)
جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان
NIRODH
نیرودھ
لاکھوں میں مقبول بے ضرر اور آسان

ممالک جہاں ہر سال فوجی انقلاب آتے ہیں مراقش کی ناکام بغاوت

ٹیلی ویژن کی نظر سے

ر اکش
ناکام انقلاب

ء ۱۰ جولائی ہفتہ کے دن کا واقعہ ہے۔ شام کے سات
اور بحیرہ روم کی لہریں رابعہانی سے پندرہ میل دور سیکریٹ
شاہی سے ٹکرا رہی تھیں۔ محل کے اندر بڑی چہل پہل تھی۔
ار غیر ملکی سفرا، اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی افسران اور دیگر
لوگ وہاں جمع تھے۔ وہ سب شاہ حسن کی ۴۲ ویں سالگرہ
میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ایک پرلطف محفل تھی خوبصورت گارڈن اور شاہی سوئمنگ
قریب جہاں ہری ہری دوب محل کو شہرا رہی تھی مشروبات کا دور
تھا۔ شاہ حسن کو مبارکباد دی جا رہی تھی۔ اور تمام شرکا محفل
ہرے کے ساتھ بے تکلف مصروف گفتگو تھے۔

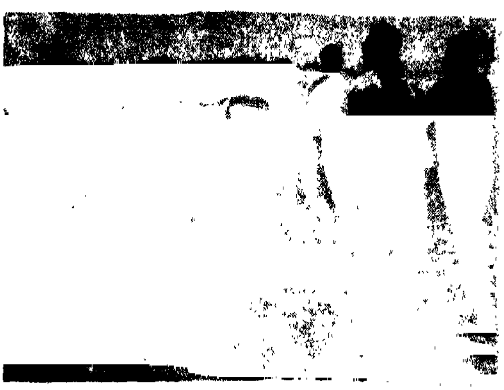
ٹھیک اس وقت جب تمام لوگ کھانے میں مشغول تھے،
کی آواز سے محل گونجنے لگا۔ مہمانوں کے چہروں پر خوشی و مسرت
نمایاں ہونے لگے۔ اس لیے کہ انھوں نے اس فائرنگ کو
سالگرہ کی تقریبات کا ایک حصہ سمجھا تھا۔ اور سچ پوچھو تو ابتدا
فائرنگ نے محفل کے رنگ کو دوبالا کر دیا تھا۔

لیکن جب فائرنگ مسلسل ہوتی رہی اور کچھ لوگوں کو زمین پر گرتے
لیا تو سب کے ہوش اڑ گئے۔ خود شاہ حسن بھی پریشان ہوئے
اس کے کہ وہ کوئی حکم دیتے چند نوجوان فوجی آئے اور انھیں
ر ایک کمرے میں لے گئے جہاں وہ دو گھنٹے تک یوں ہی
بند رہے۔

گولیاں چلتی رہیں، محل شاہی میں لوگ زخمی ہو ہو کر گرتے رہے
کم تھا تھا کم موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اور بہت
سے مجروح ہو گئے۔ ہلاک شدگان میں تین فوجی جنرل تھے۔ بغاوت کے
۴۴ سالہ لیڈر جنرل محمد مدبوح بھی کسی غلطی کی بنا پر خود اپنے ہی
آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ جنرل شاہ کا بہت زیادہ مقرب تھا۔
اور محل شاہی کے فوجی امور کا انچارج اور ملٹری ٹریننگ اسکول کا ڈائریکٹر
تھا۔ بغاوت میں حصہ لینے والے زیادہ تر وہی سپاہی تھے جو فوجی ٹریننگ
حاصل کر رہے تھے۔ اس جنرل نے شاہ حسن کو بچا کر نکال لے جانے
اور باغیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن شاہ حسن
اس کی عیاری کو تاڑ گئے اور اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا پھر چند ہی
منٹ میں وہ اپنے ہی سپاہیوں کی گولی لگنے سے زمین پر تڑپنے لگا۔
شاہ حسن کسی طرح محفوظ رہے اور شمالی افریقہ کی ان کی بادشاہت کا
قصہ مسلط ہونے سے بال بال بچ گیا۔



مراقش کے شاہ حسن



دعوت کے بعد مہمان ساحل کے کنارے کنارے بھاگ رہے ہیں

شاہ حسن اب تک ایک مطلق آمر رہتے چلے آئے ہیں اور گو یہ
انھوں نے ملک کی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کافی اقدامات کیے
ہیں لیکن ۱۹۶۵ء میں انھوں نے مراکش کا آئین معطل کر کے ملک
میں ایک طرح سے ڈکٹیٹری قائم کر دی سال گذشتہ انھوں نے
ایک پارلیمنٹ قائم کی لیکن جو آئینی ڈھانچہ بنایا اسے بہ مشکل ہی
جمہوری کہا جا سکتا ہے۔

بہدی بن برکا اپوزیشن کے مشہور لیڈر تھے لیکن ۱۹۶۵ء
میں شاہ کے ایجنٹوں نے ان کا اغوا کر لیا بعد میں شاہ نے انھیں قتل
کرایا اور گذشتہ ماہ ۱۹۳ ان اشخاص پر جو ان کے نظام حکومت پر نکتہ چینی
کرتے تھے اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا کہ انھوں نے شاہ کو قتل کرنے
کی سازش کی تھی۔

شاہ کے خلاف کافی عرصہ سے مواد پک رہا تھا۔ خاص طور پر
اس لیے کہ شاہ شروع ہی سے مغرب نواز رہے ہیں اور ۱۹۶۷ء میں انھوں
نے اسرائیل کے خلاف عرب ملکوں کی امداد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

بعد سوڈان کی بغاوت کامیاب — اور پھر ناکام

...عدیشاہ کے تو بیدور نے پاکستانی فوج کا ناطقہ بند کیا ہے

...بغاوت ناکام ہو جانے کے بعد یہ قدرتی تھا کہ شاہ بہت سخت ...ی کاروائی کریں تمام ان افسروں کو جنھوں نے بغاوت میں حصہ ...سرسری سماعت کے بعد گولی سے اُڑا دیا گیا۔ اور ابھی تک ...لوگوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے اور ان پر مقدمات چلائے جا ...ہیں۔

...لیکن شاہ حسن جو بھی اقدامات کریں اس حقیقت سے کوئی ...یں کر سکتا کہ بغاوت کا منصوبہ تیار کرنے والوں نے شاہ حسن ...یشن کو کمزور کر دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ توقع بھی باقی نہیں ...ہے کہ مراکش میں جمہوری اصلاحات نافذ ہوں گی۔ بس کی مطلق العنان ...اخلہ جنرل محمد معظم کو وسیع اختیارات دینے کے معنی یہ ہیں کہ ...ل قریب میں اصلاحی اقدامات کی کوئی توقع نہیں۔ لیکن اصلاحی ...ت نہ کرنے اور عوام کی امنگوں کے مطابق نظام حکومت میں ...ی نہ کرنے کے خطرناک نتائج بھی ظہور میں آسکتے ہیں۔ ●

سوڈان

ایک انقلاب اور

سوڈان فروری ۱۹۵۳ء میں آزاد ہوا تھا لیکن ...نہ سال کے اس قلیل عرصہ میں وہاں چوتھی بار فوجی ...ب آیا ہے۔ پہلا انقلاب ۱۹۵۰ میں آیا جب جنرل ...سپریم کونسل کے صدر اور وزیر اعظم بن گئے ایک ...ا عرصہ تک سیاسی بحران رہا اور بالآخر اپریل اور ...۱۹۶۰ء میں دستور ساز اسمبلی کے لئے انتخابات عمل ...ئے اور ان کی جگہ اسماعیل الازہری صدر اور ...حمد محبوب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ حکومت امہ ...ٹی این یو پی (نیشنل یونینسٹ پارٹی) کی مخلوط ...یتی اور الازہری نے ۱۴۷ مقابلہ شدہ سیٹوں میں سے ۸۵ ...اخر الذکر نے ۵۲ سیٹیں حاصل کی تھیں کمیونسٹوں ...سیٹیں ملی تھیں۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں محبوب کی جگہ ...صادق المہدی وزیر اعظم بنائے گئے جو اُمہ پارٹی

کے اکثریتی گروپ کے لیڈر تھے لیکن جنوب میں سیاسی بے چینی بدستور موجود رہی اور دسمبر ۱۹۶۶ء میں اچانک کمیونسٹ انقلاب آگیا۔ نتیجہ میں پارٹی کو توڑ دیا گیا اور ایک نئے دستور کا نفاذ عمل میں آیا ۱۹۶۷ء میں این۔ یو۔ پی کولیشن سے الگ ہو گی اور اسمبلی نے محبوب کو نئی کولیشن حکومت بنانے کی دعوت دی ہے۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں عام انتخابات عمل میں آئے جس میں این۔ یو۔ پی کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ملا ڈیموکریٹک یونین پارٹی کی حیثیت سے جس میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی بھی شامل تھی اس نے ۱۰۱ سیٹوں پر قبضہ کر لیا۔ باقی سیٹیں مختلف پارٹیوں نے حاصل کیں اسمبلی کی ۲۳۲ سیٹوں میں سے صرف ۱۹۷ کے لئے مقابلہ ہوا تھا۔ لیکن ڈیموکریٹک یونین کی حکومت زیادہ دن نہیں چل سکی اور ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کو کمیونسٹوں کی امداد سے کرنل جعفر النمیری نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ ایک قومی انقلابی کونسل کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر خود کرنل نمیری تھے۔ ابوبکر عبداللہ سابق چیف جسٹس وزیر اعظم مقرر کئے گئے۔ اور جنرل عطا نائب وزیر اعظم بنائے گئے۔ لیکن بعد میں کرنل نمیری سے اختلافات کی بنا پر وہ الگ ہو گئے اور اب انھوں نے کرنل نمیری کی حکومت کا تختہ الٹ کر زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ نئی حکومت کی پالیسی کیا ہو گی اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن ۳۵ سالہ جنرل ہاشم عطا نے اعلان کیا ہے کہ وہ سب کے ساتھ دوستی کی پالیسی پر چلیں گے جنرل عطا سوڈان کی انقلابی کونسل کے سابق کمیونسٹ ممبر تھے اس لئے تمام ایسی جماعتوں پر سے جو کمیونسٹوں کے زیر اثر ہیں پابندی کا ختم کیا جانا قدرتی تھا۔ انھوں نے ریڈیو سے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ انقلاب ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کے انقلاب کی اصلاح کے لئے کیا گیا ہے تاکہ جنرل نمیری کی ڈکٹیٹر شپ کو ختم کیا جا سکے۔

سوڈان اگرچہ افریقہ کی سب سے بڑی مملکت ہے اور اس کا رقبہ نو لاکھ ۶۷ ہزار مربع میل کے قریب یعنی ہندوستان سے صرف تین لاکھ مربع میل کم ہے لیکن اس کی آبادی (۱۹۶۷ء کی مردم شماری کے مطابق) ایک کروڑ سولہ لاکھ ۲۵ ہزار ہے جس میں ۷۰ فیصدی لوگ کھیتی کرتے ہیں۔

سوڈان ۶۰ برس تک مصر کے زیر نگیں رہا جبکہ ۱۸۸۴ء میں مہدی نے بغاوت کر کے اعلان آزادی کر دیا۔ لیکن اس کے مظالم خود اسے لے ڈوبے اور ۱۸۹۸ء میں مصری اور برطانوی فوجوں نے کھوئے ہوئے علاقہ کو واپس لے لیا بعد ازاں مصر اور برطانیہ کا سوڈان پر اقتدار رہا دونوں ملکوں کے جھنڈے وہاں لہرایا کرتے تھے۔ لیکن ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء دونوں ملکوں نے سوڈان کی خود مختاری سے متعلق تجویز کی تصدیق کر دی اور یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو وہ آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں آگیا۔

سوڈان ۹ صوبوں پر مشتمل ہے جس میں سے شمال کے چھ صوبوں کی پوری آبادی مسلمانوں (سنی) پر مشتمل ہے اور جنوبی صوبوں میں غیر ترقی یافتہ بت پرستوں کی اکثریت ہے دوسرے لوگوں میں عیسائی چرچوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں ان جنوبی صوبوں کو جون ۱۹۶۹ء میں اندرونی خود مختاری دی گئی تھی اور نئی فوجی حکومت نے بھی اس کا اعادہ کیا ہے۔ لیکن اب ایسا نظر آتا ہے کہ عرب وفاق میں سوڈان کی شرکت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ جنرل نمیری کا ہونا اگر اس بات سے متفق تھے کہ مصر لیبیا اور شام کے وفاق میں شامل ہو جائیں۔ انھوں



جنرل نمیری

ایک بار پھر حکومت پر قابض

...بی کی ایم نے ساری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے

فوجی اور نازی جنگ سے متعلق بات چیت میں کافی دلچسپی لی تھی لیکن بعد میں اور شاید اندرونی خلفشار کی وجہ سے ملک کو اس میں شرکت نہ کر سکے تھے اور اب نئے سیاسی انقلاب نے ان کے تمام اسکیموں پر پانی پھیر دیا۔

پاکستان

مجاہدوں کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں

"مجھے آپ کو بتاتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ فوج نے اب مشرقی پاکستان کی صورت حالات پر پوری طرح کنٹرول کر لیا ہے" یہ وہ الفاظ ہیں جو صدر پاکستان نے اپنی آخری تقریر میں حال ہی میں پاکستانی عوام سے کہے تھے لیکن حالات کا اگر صحیح طور پر جائزہ لیا جائے اور خود پاکستانی حکمرانوں کے بیانات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم ہوگا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مشرقی پاکستان میں ابھی تک امن نہیں۔ آزادی پسندوں کی سرگرمیاں ابھی گھٹی نہیں بلکہ بڑھی ہیں۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ غیر ملکی نامہ نگار کہہ رہے ہیں جو اس وقت مشرقی بنگال میں ہیں جو مختلف مقامات پر گھوم پھر کر حالات کا اندازہ لگا رہے ہیں۔ چھاپہ ماروں کی تعداد اس وقت تیس ہزار کے قریب ہے۔ یہ چھاپہ مار ایک منصوبے کے تحت جنگ کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے پاکستانی فوجوں کا ناطقہ بند کر دیا ہے حالات کس حد تک سنگین ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل ٹکا خاں اپنی چار ڈویژن فوج کو ناکافی سمجھ رہے ہیں اور انھوں نے مزید دو ڈویژن کے لئے درخواست کی ہے۔

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ فوجی حکمراں کتنی ہی فوج بلا لیں مجاہدوں کے حوصلوں پر اثر پڑنے والا نہیں ہے اس وقت صورت یہ ہے کہ ڈھاکہ تک میں آئے دن دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور گولیاں چلتی رہتی ہیں۔

گذشتہ پیر کی شب کو ایک زور کا دھماکا ہوا جس نے پاور ہاؤس کی تنصیبات کو نقصان پہونچا کر پورے شہر پر تاریکی مسلط کر دی اس تاریکی میں مزید دھماکے بھی ہوئے اور گولیاں بھی چلیں۔ دوسرے شہروں میں صورت اس سے بھی زیادہ خراب ہے مواصلات کے نظام کو بالکل معطل کر دیا گیا ہے جگہ جگہ پل تباہ کر دئے گئے ہیں اور سڑکوں اور ریل کی پٹڑیوں کو نقصان پہنچایا ہے جہاں کہیں موقع ملتا ہے چھاپہ مار حملہ کرتے ہیں



مکتی فوج کے جوان فوجی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔

یہ چھاپہ مار کون ہیں؟

وہ بنگالی جنہیں پاکستانی حکمراں ناکارہ قرار دیکر فوج کیلئے نااہل سمجھتے تھے جنہیں فوج میں کبھی بھی دس فیصدی سے زیادہ نمائندگی نہیں دی گئی لیکن آج مکتی فوج سو فیصدی بنگالیوں پر مشتمل ہے اور وہ ایک کامیاب چھاپہ مار لڑائی لڑ رہی ہے ایک مغربی ڈپلومیٹ نے کہا "ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ مکتی فوج ایک سنگین فوجی خطرہ ثابت ہوگی لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک طویل اور عرصہ دراز تک جاری رہنے والی چھاپہ مار لڑائی کا پہلا مرحلہ ہے"

بغاوت کو کچلنے کے لئے پاکستانی فوج نے ظلم وتشدد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا یہی سلوک مکتی فوج والے بھی ان لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں جو ان کے خیال میں ملک کے باغی ہیں اور جو فوجی حکمرانوں سے تعاون کر رہے ہیں۔ نیویارک کے نامہ نگار مسٹر جینکنس نے لکھا کہ دو بنگالی افسروں غلام سرور ملا اور عبد الحمید کے بارے میں لکھا ہے کہ مکتی فوج نے انھیں تنبیہ کی کہ اگر فوج کے ساتھ ان کا تعاون جاری رہا تو انھیں ختم کر دیا جائے گا۔ دونوں نے محافظین کی ایک دیوار اپنے چاروں طرف کھڑی کر لی لیکن اس کے باوجود ایک ہی ہفتہ کے اندر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

حمید کو سرراہ دن دہاڑے گولی مار دی گئی اور غلام کے مکان پر اچانک حملہ کیا گیا اور مکتی فوج والے اس کو اپنے ساتھ لے گئے لیفٹیننٹ ٹکا خاں نے اس کے خلاف بہت سخت انتقامی کاروائی کی جینکنس کا کہنا ہے کہ دوسرے دن صبح جو مزدور ملوں میں کام کرنے کے لئے کھلنا جا رہے تھے انھوں نے ستر لاشیں ریلوے اسٹیشن کے سامنے پڑی دیکھیں ان سب کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور پھر ہر شخص کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ ۴۸ گھنٹے تک یہ لاشیں اپنی جگہ پڑی رہیں تاکہ ہر شخص ان کو دیکھ کر "عبرت" حاصل کرلے۔ لیکن اس قسم کے ہزار واقعات بھی ہو جائیں گے تو شاید اب عبرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ ایک مغربی ڈپلومیٹ کے بیان کے مطابق "یحییٰ خان" اور فوجی حاکم کا خیال تھا کہ وہ بنگالیوں کو خوفزدہ کر دیں گے اور وہ اپنی سرگرمیوں سے باز آجائینگے لیکن اسکا نتیجہ الٹا نکلا ہے۔ وہ بیشک خوفزدہ ہیں اور فوج سے براہ راست مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن ان کے اندر فوجی حکمرانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ اس سے قبل کبھی اتنی نفرت

پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہر بنگالی یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ وہ صرف تشدد کے ذریعہ ہی اپنی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس اثنا میں جنرل یحییٰ خاں نے اپنے جس نام نہاد آئین کا اعلان کیا ہے اس کی طرف کسی بنگالی نے توجہ نہیں دی ہے۔ اپنی جس تقریر میں صدر یحییٰ خاں نے اس آئین کا اعلان کیا اس پر بلاشبہ لوگوں کی نظریں تھیں اور یہ توقع کی جا رہی تھی کہ شاید یحییٰ خاں ایسا حل پیش کر سکیں جس سے بنگلا دیش کے لوگ مطمئن ہو سکیں لیکن اس تقریر پر عام بنگالیوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ تقریر نہیں تھی بلکہ یہ ایک فوجی حکم تھا۔"

اس قسم کا تبصرہ کرنے کے لئے بنگالیوں کے پاس وجہ جواز موجود ہے جنرل یحییٰ بجائے اس کے کہ وہ بنگالیوں کو مطمئن کرتے کہ متحدہ پاکستان میں ان کا مستقبل محفوظ ہے انھوں نے بنگالی لیڈروں کو ملعون کرنا شروع کر دیا اور شیخ مجیب الرحمٰن پر الزام عائد کر دیا کہ انھوں نے ملک کو تقسیم کرنے کی سازش کی تھی۔ اس وقت سازش کی تھی یا نہیں اس پر تحقیق بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس وقت حالات اس منزل پہ پہونچ گئے ہیں کہ بنگالی عوام مکمل آزادی سے کم پر رضامند ہوتے نظر نہیں آرہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سمجھوتہ کا وقت گذر گیا [illegible] کر لیا ہے کہ وہ ایک لمبی گوریلا جنگ [illegible]

واقعات نئی دہلی

ہی جنگ جیسی کہ ویٹ نام میں لڑی جا رہی ہے۔

کیا فوجی حکمران اس طویل گوریلا جنگ کا مقابلہ کر سکیں گے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب آنے والے دنوں میں ملے گا۔ ●●

جس سے قدرتی طور پر امریکی حکام پریشان ہیں۔

جنگ ویتنام یوں کہیے کہ امریکہ کیلئے "ایک درد سر بن گئی ہے۔" اور اب یہ جنگ نہ نگلے بن رہی ہے اور نہ اگلے۔ جنگ میں شریک رہتا ہے تو ساری دنیا سارے امریکی عوام خلاف، اور جنگ سے علیحدگی اختیار کرتا ہے تو بے روزگاری کا خطرہ ــــ امریکی وزیر دفاع فوجوں کی واپسی کے لیے ایک سال کی مدت طلب کر رہے ہیں کیا اس مدت میں کوئی اور محاذ جنگ کھولنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔؟ ●

امریکا

نہ اگلے بنے نہ نگلے

امریکہ میں اب ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ امریکی حکومت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ ویٹ نام سے اپنی تمام فوجیں واپس بلالے۔

اس وقت بحث یہ نہیں ہے کہ امریکہ اپنی فوجیں واپس بلائے یا نہ بلائے بلکہ سوال یہ ہے کہ انہیں ایک سال میں بلایا جائے یا نو مہینہ میں یا پھر اس سے بھی کم عرصہ میں۔ وزیر دفاع مسٹر لیرڈ چاہتے ہیں کہ انھیں ایک سال کا موقع دیا جائے جبکہ امریکی کانگریس کے دوسرے ممبروں کا کہنا ہے کہ تمام فوجیں نو ماہ کے اندر اندر واپس بلالی جائیں۔

فوجوں کی واپسی کے بعد امریکی حکومت کے لیے نیا مسئلہ پیدا ہوگا کہ گیارہ لاکھ ۱۵ ہزار افسران اور سپاہی بے روزگار ہو جائینگے۔ اس وقت بھی سابق بے روزگار فوجیوں کا تناسب قومی بے روزگاری [illegible] گذشتہ زیادہ یعنی ۴ء۱۲ فیصدی ہے۔ مزید [illegible]

ترکی

افیون کی پیداوار پر پابندی

مغربی ترکی کی پہاڑیوں اور میدانوں میں افیون کی کاشت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح ہمارے یوپی یا پنجاب میں غلّہ کی۔ گذشتہ چار سو برس سے دنیا کی بہترین قسم کی پوست ترکی میں پیدا ہو رہی ہے افیون کی یہ پیداوار ترکی کے ۸۰ ہزار کسانوں کا خاص ذریعہ معاش ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ حکومت ترکی ان افیون کے ذریعہ سالانہ دس لاکھ ڈالر کا زرمبادلہ کماتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ افیون اندرون ملک خواب آور یا نشیلی اشیاء کی تیاری میں استعمال نہیں کی جاتی۔ ترکی میں کسی کے "افیمی" بننے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ خام افیون کا بڑا حصہ یعنی ۱۵۰ ٹن کی کل پیداوار میں سے تقریباً ۹۰ ٹن پیداوار خاص طور پر فرانس کو برآمد کر دی جاتی ہے۔ جہاں اس میں سے مارفین (ست افیون) اور دوسری نشیلی اشیاء تیار کر کے ان سب کو امریکا بھیج دیا جاتا ہے۔

امریکا پریشان ہے کہ وہ اپنے ملک میں ان نشیلی اشیاء کی درآمد کو کس طرح روکے۔ اندازہ یہ ہے کہ ۸۰ فیصدی افیونی اشیاء کی نکاسی ترکی ہی سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا نے حکومت ترکی کو اس طرف متوجہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں حکومت ترکی نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۷۲ء کے وسط تک پوست کی کاشت بند کر دے گا۔

وزیر اعظم ترکی مسٹر نہت ارم کے اس فیصلہ کا امریکا میں خیر مقدم کیا گیا ہے اور اسے ان کے ایک جرأتمندانہ اور مدبرانہ فیصلے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ نے حکومت ترکی [illegible]

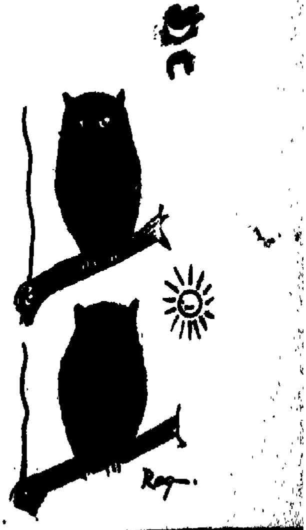


بنگلادیش کے مجاہد ایک پاکستانی فوجی کو گرفتار کر کے لیے جا رہے ہیں

برادری کے مفاد کے لئے کیا گیا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شہروں میں چھوٹے بچے افیم کے اثر سے ہلاک ہو رہے ہیں تو ہم حکومت ترکی کے اس فیصلہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے دوسرے ملکوں سے بھی ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ بھی بین الاقوامی ذمہ داریوں کو محسوس کریں گے۔

نشیلی اشیاء کی عادت کا مسئلہ امریکا میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ گذشتہ ماہ وائٹ ہاؤس میں نشیلی اشیاء سے متعلق ایک کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ترکی میں مامور امریکی سفیر مسٹر ولیم جے۔ ہینڈلے نے شرکت کی۔ سفیر موصوف نے بتایا کہ ترکی شروع ہی سے افیون کی پیداوار پر پابندی لگانے کے لئے تیار تھا لیکن "اب دیکھنا یہ ہے کہ افیون کی پیداوار پر پابندی عائد کرنے سے ترکی کی معیشت پر جو اثر پڑے گا اس کا ازالہ کرنے کے لئے امریکا کس حد تک مدد کر سکتا ہے۔"

وزیر اعظم ترکی نہت ارم نے اعلان کیا ہے کہ افیون پیدا کرنے والے کسی کسان کو مالی نقصان سے زیر بار نہ ہونے دیا جائے گا۔ ۱۹۷۲ء کے وقت کا تعین اس لئے کیا گیا ہے کہ اس دوران افیون کی جگہ دوسری اشیاء کی فصل پیدا کرنے کے تجربات کئے جائیں گے۔



کہتے ہیں کہ جب اُلو بے وقوف ہوتا ہے۔؟



راجستھان

سیکولر پالیسی

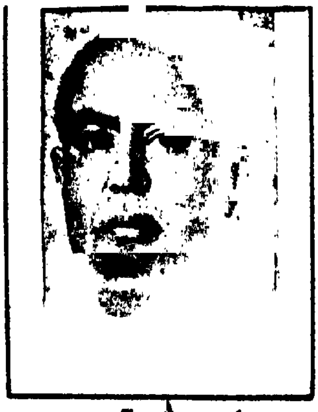
کہتے ہیں

ن مانگے موتی ملے ۔ مانگے ملے نہ بھیک
بالکل یہی حال راجستھان میں دیکھنے میں آیا جہاں
ں ممبران اسمبلی کے مختلف گروپوں کے جوڑ توڑ اور
نے امیدواروں کو وزارت اعلیٰ کی کرسی دلانے کی
نام کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں اور قرعہ
سٹر برکت اللہ خاں کے نام نکلا۔ ان کا نام نہ تو کسی
پر تھا اور نہ خود مسٹر برکت اللہ نے اس کی خواہش
کی تھی۔ انھیں بن مانگے "موتی" مل گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ان کا نام پیش کیا گیا تو
لے سے منظور کر لیا گیا حالانکہ اس سے قبل امیدوار
سے جو کنویسنگ ہو رہا تھا اس سے یوں ظاہر ہوتا
ب راجستھان میں کانگریس نام کی کوئی چیز باقی نہ
۔ اس صورت حال کو دیکھ کر سوتنتری، جن سنگھی
راجگان اس طرح خوش ہو رہے تھے کہ وہ ایک مرتبہ پھر
لے والے ہیں اور راجاؤں کے راجستھان کی تکمیل
کے ہاتھوں ہونے والی ہے لیکن بیچاروں کا خواب
مندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس سب کا کریڈٹ مسٹر سکھاڈیا
نھیں پارٹی کا ہمدردی طرح اعتماد حاصل رہا ہے۔
ن سلسلہ کر دی ہے تجاوی اور لے سکھا ہوں سے
ان کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے ان کی کسی
نام کی سفارش نہ کی تھی اسے امید تھی کہ مسٹر سکھاڈیا
کالم کے مشورے سے جس نام کی سفارش کریں گے
رٹی منظور کر لے گی۔

مسٹر برکت اللہ کا نام وزارت اعلیٰ کے امیدوار کی
شکل میں...

کے لئے ایک دھماکے سے کم نہ تھا لیکن مختلف گروپوں کے جوڑ توڑ اور رقیبانہ سرگرمیوں سے وہ اتنے تنگ آچکے تھے کہ انھوں نے ایک ایسے امیدوار کا دلی خیر مقدم کیا جو اب تک کی تمام سرگرمیوں سے بے تعلق رہا تھا ان کی غیر جانبداری انصاف پسندی ان کے کام آگئی۔ اتفاق رائے سے مسٹر برکت اللہ کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں صرف مسٹر سکھاڈیا ہی کا نہیں بلکہ تمام ممبران کا اعتماد حاصل ہے اور اس لئے عام طور پر سمجھا جا رہا ہے کہ ان کی حکومت



برکت اللہ خاں

ایک مضبوط حکومت ہوگی جو تمام مسائل سے بحسن و خوبی نمٹ سکے گی۔ سیاسی کارکنوں کے خیال میں ان کے انتخاب سے ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ راجستھان میں ان فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کی حوصلہ شکنی ہوگی جن کی سرگرمیاں پچھلے دنوں ریاست میں کافی بڑھ گئی تھیں۔ مسٹر برکت اللہ اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لحاظ سے ان کی کامیابی حقیقت میں سیکولر پالیسی کی کامیابی ہے کانگریسی حلقوں کے خیال کے مطابق مسٹر سکھاڈیا جنھیں وزیر اعلیٰ کا تعاون حاصل رہے گا ریاست میں کانگریس کے استحکام کے لئے بڑا مفید کام کر سکیں گے اور آنے والے انتخابات میں جس کے اب چھ ماہ باقی رہ گئے ہیں کانگریس ایک مضبوط و مستحکم جماعت بن کر سامنے آسکے گی۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر برکت اللہ کی تقرری بطور وزیر اعلیٰ اگرچہ عارضی ہے لیکن اس کے بڑے مفید نتائج نکلیں گے۔

بہار

پرگتی شیل ودھایک بھی خطرے میں

مختلف ریاستوں میں جہاں کہیں بھی ودھایک دل کی حکومت بنی وہ ساجھے کی ہنڈیا ثابت ہوئی اور بیچ چوراہے پر پھوٹ گئی۔ لیکن اس مرتبہ بہار میں صرف ودھایک دل ہی کی نہیں بلکہ "پرگتی شیل ودھایک" یعنی کہ ترقی پسند ودھایک دل کی حکومت بنی۔ لیکن "ترقی پسندی" کی ایسی دوڑ لگی کہ چلتی گاڑی پٹری پر سے اتر گئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے اعلان کر دیا کہ وہ وزارت کی حمایت نہیں کرے گی کیونکہ اس وزارت نے دیہی زمین کی اور شہری جائیداد کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے سے متعلق بل اسی سیشن میں منظور نہیں کئے۔

وہ تو کہئے اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا ورنہ اس اجلاس میں دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ تاہم کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ اجلاس میں صف آرائی نہ ہوگی اور اگر کچھ دن کے لئے پرگتی شیل ودھایک دل کی حکومت قائم بھی رہی جس کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں تب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس دل میں کمیونسٹ پارٹی شامل رہ سکے گی۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کانگریس پر الزام لگا رہی ہے کہ اس نے مفاد پرستوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے ہیں اور کانگریس نے کمیونسٹ پارٹی کو اس بات کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ وہ...

زبردستی منوانا چاہتی ہے ــــ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں
کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ بدعنوانیوں کے الزامات کا کمیشن بھی
دستیاب ہو جائے کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان اشتراک کی کوئی
صورت باقی نہ رہے اور چونکہ پانچ ان وزارت میں کانگریس
اور کمیونسٹ ہی دو خاص بڑی پارٹیاں ہیں اس لئے ان
دونوں میں اختلاف کی صورت میں وزارت کا قائم رہنا مشکل
ہوگا اس کا قائم رہنا اس لئے بھی مشکل نظر آ رہا ہے کہ پی ایس پی
کے ممبروں کو حکمراں کولیشن سے الگ ہو جانے کی ہدایت کی گئی
ہے اگرچہ امکان یہ ہے کہ نصف ممبر حکمراں کولیشن کے
مقابلے میں خود پی۔ایس۔پی سے الگ ہو جانے کو ترجیح دیں
اور اس کے بعد شاید کانگریس میں شامل ہو جائیں لیکن اس
صورت میں بھی یہ وزارت خطرہ سے نہ بچ سکے گی۔ ●

جامعہ اسکول آف سوشل ورک

ایک مستحسن اقدام

حصولِ آزادی کے بعد مسلم اقلیت میں جو جمود پیدا ہو گیا
تھا اس کا احساس اب خود اقلیت کو ہو رہا ہے یہ اس بات
کی علامت ہے کہ اس جمود کو ختم کرنے کا وقت آگیا ہے
اور یہ جمود اب ختم ہو کر رہے گا۔ نوجوانوں میں اس وقت
ہم جو جوش و خروش دیکھ رہے ہیں اس سے ان کے عزائم
کا پتہ چلتا ہے اگر ان کی صحیح قیادت کی جائے تو کوئی وجہ
نہیں ہے کہ وہ کسی میدان میں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں تک
ضروری وسائل کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں صرف انھیں مجتمع
کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے بالکل ساز گار ہے
اگر عملی قدم اٹھایا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ وسائل
مجتمع نہ ہو سکیں۔

اس سلسلے میں جامعہ اسکول آف سوشل ورکس کی
سرگرمیاں بہ نظرِ استحسان دیکھی جائیں گی گذشتہ سال
اکتوبر میں اس اسکول کے زیر اہتمام ایک سیمینار (مجلس
مذاکرہ) کا انعقاد عمل میں آیا تھا جس میں مسئلہ کے مختلف
پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا اور نتیجہ میں ایک ایڈہاک کمیٹی قائم
کر دی گئی جو ایک ایسی تنظیم کے قیام کے لئے تجاویز مرتب
کرے گی جو قومی فلاحی کاموں کے حصے کے طور پر مسلم
اقلیت کے لئے فلاحی کام کر سکے۔ اس مقصد کی تکمیل
کے لئے کل ہند مسلم فلاحی کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام
بھی ہے جس کے لئے ایک مستقل کمیٹی مسٹر [illegible] (وزیر
صحت آندھرا) کی صدارت میں قائم ہو چکی ہے اور ایک
اور کمیٹی ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ نگر) کی صدارت میں قائم
کی گئی ہے جو یقین ہے کہ اگست کے دوسرے ہفتہ تک اپنا
کام مکمل کر لے گی اور اس کے بعد غالباً کانفرنس طلب کر لی
جائے گی۔

کانفرنس کے فیصلوں کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل
از وقت ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اب صرف کانفرنس
کا انعقاد ہی کافی نہیں ہے بلکہ جو بھی فیصلے کئے جائیں انہیں
عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ یہ عمل اور
جد و جہد ہی ہے جس کی بدولت ایک انسان کامیابی و
کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ ●

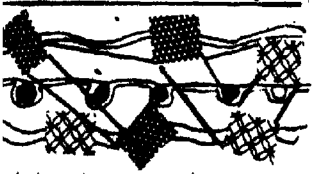
کیرالا

سوشلزم بدستور تقسیم رہے گا

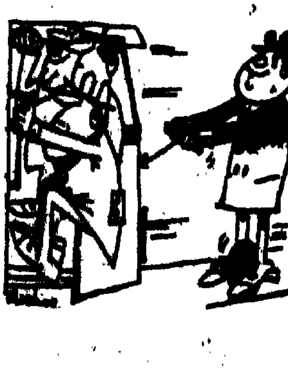
سمیکت سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ ادغام پرجا سوشلسٹ
پارٹی کو کچھ راس نہیں آ رہا ہے۔ بہار میں بھی چند باغی سامنے
آگئے اور انھوں نے حکمراں اتحاد والے الگ ہونے سے انکار
کر دیا اور کیرالا میں بھی ہائی کمان کی یہ ہدایت ردی کی ٹوکری
کی نذر کر دی گئی کہ حکمراں متحدہ محاذ سے پرجا سوشلسٹ
ممبران الگ ہو جائیں۔

"باغی ممبران" کی دلیل یہ ہے کہ سمیکت سوشلسٹ
پارٹی کے ساتھ الحاق کے معنی پرجا سوشلسٹ پارٹی
کے وجود کو ختم کرنا اور ان لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا
ہے جنھوں نے اندرا سرکار کو ہٹانے کی پالیسی بنائی ہوئی ہے۔
کیرالا کے ۱۳۳ ممبروں کے ایوان میں اگرچہ پرجا سوشلسٹ
ممبروں کی تعداد صرف ۳ ہے لیکن طاقت کا توازن اس
کے ہاتھ میں ہے۔ ارناکلم میں حال ہی میں جو ریاستی
کنونشن منعقد ہوا اس میں ۷۰ ہم [illegible] میں سے
صرف ۱۲ ایسے تھے جو موجودہ حکومت سے ناطہ توڑنے
کے حق میں تھے۔ باقی سب کا مشورہ [illegible] تھا کہ حکومت
[illegible] کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

لیکن ہائی کمان نے کنونشن کے فیصلہ کو نظر انداز
کر دیا اور آٹھ ریاستی لیڈروں کو پارٹی کی پرائمری
ممبرشپ سے الگ کر دیا۔ ۶ اگست کو بلند شہر میں نیشنل
ایگزیکیٹو کا اجلاس ہوگا اس میں اس کارروائی کی توثیق
کی جائے گی۔ اس اثنا میں کیرالا کے ریاستی لیڈر ایک
الگ آل انڈیا پرجا سوشلسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈال
رہے ہیں اور انہیں امید ہے اسے بہار اور بنگال کی یونٹوں
کا تعاون حاصل ہوگا۔ اور اس طرح سوشلزم متحد ہونے
کی بجائے بدستور تقسیم رہے گا۔ جو کچھ بھی ہو وزیر اعلیٰ
مسٹر اچھوتا مینن خوش ہیں کہ پرجا سوشلسٹ ممبروں کی
علیحدگی کے امکان پر کیرالا کانگریس کی طرف سے وزارت
میں شمولیت کے لئے جو دباؤ ڈالا جا رہا تھا اس میں اب
کمی ہو جائے گی۔ ●







اُردو یونیورسٹی کا خاکہ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

گذشتہ سے پیوستہ — اسرار عظمت

سیکولر مزاج

اردو یونیورسٹی خود کو کسی مذہبی جماعت سے منسلک نہیں کرے گی۔ اردو مزاج کے اعتبار سے ایک سیکولر زبان ہے۔ مسلمان ہندو، سکھ اور عیسائی سب نے اس کی ترقی میں برابر کا حصہ لیا ہے اور یہی سیکولر مزاج اردو یونیورسٹی کی امتیازی خصوصیت ہوگا۔ اس یونیورسٹی کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہوں گے جو اپنی اس مادری زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو۔ پھر چاہے وہ شخص کسی بھی مذہب، ذات، نسل یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

اس یونیورسٹی کا مقصد صرف اُردو ہی کی تعلیم دینا نہ ہوگا بلکہ یہ یونیورسٹی دوسری زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کرے گی ہی نہیں بلکہ اس یونیورسٹی میں دنیا کے تمام علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ مثال کے طور پر ہم بیکن کو بھی پڑھ سکتے ہیں۔ انگریز بیکن کو انگریزی میں ہی پڑھتے ہیں لاطینی میں نہیں۔ اسی طرح ہم بھی بیکن کو اُردو میں پڑھیں گے۔ ہم اپنی یونیورسٹی میں مغرب کے دور کا نظامیہ نصاب رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے جس طرح انگریز شاپن ہاور اور نطشے کو انگریزی میں پڑھتے ہیں ہم بھی ان کو اُردو میں پڑھیں گے۔ اگر ہم پرانے دہلی کالج سر سید سائنٹفک سوسائٹی، تھامسن سول انجینئرنگ کالج رڑکی، میڈیکل کالج آگرہ، عثمانیہ یونیورسٹی اور ان دوسرے متعدد اداروں کی مثالیں سامنے رکھیں جنہوں نے کسی زمانے میں اردو کو میڈیم بنایا تھا تو ہم محسوس کریں گے کہ اُردو کی صرف ادبی روایات ہی عظیم نہیں ہیں بلکہ اس میں جدید علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

اُردو کو مزید بہتر بنانے کے لئے ایسے باصلاحیت اساتذہ کا انتخاب کرنا چاہیے جو اُردو میں بہترین نصابی کتابیں لکھنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیں۔ حکومت ہند نے ترقی اُردو بورڈ کے لئے ایک کروڑ روپے کی منظوری دی ہے تاکہ اُردو میں کالج اور یونیورسٹی کی معیاری کتابیں شائع کی جا سکیں یہ کتابیں یا تو کسی دوسری زبان سے ترجمہ کی ہوئی ہوتی ہیں یا اردو میں ہی لکھی ہوئی ہیں۔

حکومت اس بات پر بھی غور کر رہی ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں اچھی کتابیں لکھنے والوں کو پی۔ ایچ۔ ڈی Ph. D کی ڈگری سے نوازا جائے۔ یہ سبق ہماری حکومت نے مغربی ملکوں سے سیکھا ہے۔ حکومت ترجموں سے زیادہ نئی لکھی جانے والی کتابوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔ نصابی کتابوں کے بعد سب سے خراشدہ اصطلاحوں کے ترجمے کا ہے اس سلسلے میں ترقی اُردو بورڈ کافی مستعدی دکھا رہا ہے۔ مختلف اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت ان کے تاریخی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب اقدامات کئے جاتے ہیں۔ جہاں ضروری سمجھا جاتا ہے انگریزی یا بین الاقوامی اصطلاحوں کو بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کس قسم کی ہو؟

یہ ایک اہم سوال ہے کہ اُردو یونیورسٹی "ریزیڈینشیل" (Residential) ہو یا عام یونیورسٹیوں کی طرح دور دراز علاقے کے کالجوں کو بھی اس سے منسلک کیا جائے۔ ریزیڈینشیل یونیورسٹیوں میں یونیورسٹی سے منسلک تمام کالج اور دیگر ادارے، ہوسٹل وغیرہ یونیورسٹی کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ اس پورے علاقے کو یونیورسٹی کیمپس کہتے ہیں۔ میری اپنی رائے میں اُردو یونیورسٹی کو عام یونیورسٹیوں کی طرح ہونا چاہیے اس میں شک نہیں کہ ریزیڈینشیل یونیورسٹیوں میں ایک خاص قسم کا ماحول ہوتا ہے جس کی وجہ سے قومی اتحاد کو تقویت ملتی ہے لیکن اردو یونیورسٹی کو ریزیڈینشیل نہ بنانے کی صورت میں ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ سارے ہندوستان کے اُردو کالجوں کو اس سے منسلک کیا جاسکے گا۔ اس طرح وسیع پیمانے پر قومی تہذیب کی تعمیر ہو سکے گی۔

اُردو یونیورسٹی کے طالب علموں کو اُردو پڑھنے پر بالکل مجبور نہ کیا جائے گا بلکہ انگریزی اور ہندی ضروری مضامین کی حیثیت سے رکھی جائے گی۔ مادری زبان کا اچھا علم رکھنے والا اس کی مدد سے بڑی آسانی سے دوسری زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ بالینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن وہاں کے بچے عام طور پر اپنی مادری زبان ڈچ کے علاوہ فرانسیسی، جرمن اور انگریزی بھی جانتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایک بچے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تین زبانیں جانے۔ سب سے پہلے اسے اپنی مادری زبان آنی چاہئے۔ مادری زبان جاننے سے یہ مراد نہیں کہ وہ اسے ٹوٹے پھوٹے انداز میں بول اور سمجھ سکے، بلکہ اسے اپنی مادری زبان پر پورا عبور ہونا چاہئے۔ اسے اپنی مادری زبان سے اس قدر قریب ہونا چاہیے کہ وہ اسکے دماغ کا ایک حصہ بن جائے۔ مادری زبان کے علاوہ صوبائی زبان کا جاننا ضروری ہے جس میں سرکاری کام ہوتا ہو۔ جہاں تک ہندی کا سوال ہے، ملک کی کوئی دوسری زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں ہے جتنی کہ اردو۔

اگر ہم اپنے ملک کی جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کرانا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے اور قریب آئیں۔ دستور کی دفعہ نمبر ۳۵۱ میں لکھا ہے کہ ہندی کی بہت ترقی ہونی چاہیے۔ اور اسے اسقدر جامع ہونا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے تمام طبقوں کے کلچر کے اظہار کا ذریعہ بن جائے۔ یہاں اُردو کے لئے بھی بہت سی سہولتیں اور مواقع ہیں۔ اُردو جو الفاظ کے لحاظ سے بہت امیر ہے اور جو عوام کی ایک کثیر تعداد میں استعمال کی جاتی ہے، ہندی کو اور اس کے ترقی کے دھارے کو متاثر کر سکتی ہے۔ مادری اور سرکاری زبانوں کے جاننے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم کو کسی ایک یورپین زبان پر پورا عبور حاصل ہو تاکہ جدید علوم و فنون سے متعلق ہمیں معلومات حاصل ہوتی رہیں اور ہم دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔ اس لحاظ سے انگریزی سیکھنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ سائنس اور صنعتی ترقی کی دنیا کے ایک بڑے حصے میں یہی زبان استعمال ہوتی ہے۔

جدید علوم

کسی بھی حکومت کی یہ ایک اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عوام کے لئے دنیا کے نئے علوم کے دروازے وا کر دے اور انھیں سہولتیں بہم پہونچائے تاکہ وہ جدید علوم سے استفادہ حاصل کر کے تہذیب و تمدن کی اس دوڑ میں دنیا کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ اہم ترین کام حکومت اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ عوام کو مالی امداد نہ دے۔ جدید سائنس پڑھنے میں کافی اخراجات ہوتے ہیں اور حکومت کی مالی امداد کے بغیر عوام کی اکثریت کے لئے سائنس پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ اعداد و شمار سے ثابت ہو چکا ہے، پہلے سائنس کے ایک گریجویٹ پر جتنے اخراجات آتے تھے وہ رقم اب پانچ فیصد ہر سال بڑھ رہی ہے یہ اضافہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے مسلسل ہو رہا ہے۔ اردو دو کروڑ بیس لاکھ لوگوں کی مادری زبان ہے جن میں تقریب

لوگوں کی اکثریت ہے۔ کشمیر کو چھوڑ کر اردو کسی اسٹیٹ کی علاقائی زبان بھی نہیں ہے، اس لئے اُردو کے تحفظ، اس کی ترقی اور اس کے ذریعے تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کی تمام ذمہ داریاں مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہیں۔

ہماری تاریخ میں پہلی بار ایک قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا ہے جس کو ملک کی ترقی سے دلچسپی ہے اور جو عوام کے خیالات اور انکی خواہشات کے مطابق کام کرتی ہے، اس لئے ہم امید کرتے ہیں کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کی ذمہ داری حکومت ہند ایک قومی ذمہ داری سمجھ کر قبول کرے گی، کیونکہ اردو یونیورسٹی صرف ایک اونچے معیار کی مرکزی یونیورسٹی ہی نہ ہوگی بلکہ یہ ایک قومی اہمیت کا حامل ادارہ ہوگا۔

غالب نے کہا ہے۔" وہ دل جو اپنے چاہنے والوں کی پرواہ نہیں کرتا، آسمانی عنایتوں کے باوجود مسرور نہیں ہو سکتا۔" اردو بولنے والے لوگ انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کرتے جب کہ اب ان کے لئے اُردو میں ہی تعلیم حاصل کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن نے آل انڈیا سروسز کے لئے تمام امتحانات اُردو میں دیے جانے کی سہولت بہم پہنچائی ہے اور اسی لئے ہوا ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کو یونیورسٹی کی کتابیں اُردو میں شائع کرنے کے لئے ایک کروڑ روپے کی امداد دی گئی ہے۔

معاشی مسئلہ

یہ ایک بہت ہی قابلِ ذکر بات ہے کہ آج ہم لوگ ہر اہم چیز کو دولت کی ترازو میں تول کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہمارا یہی عمل جاری رہا تو ہم بہت جلد غیر مہذب ہو جائیں گے ہم اپنی مادری زبان میں تعلیم لیتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ ملازمتوں کے دروازے ہمارے لئے بند ہو جائیں گے۔ ایسی ذہنیت صرف اُردو والوں میں ہی نہیں ہے بلکہ دوسری زبان والے بھی اسی زاویے سے سوچتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم تعلیم و تربیت کے ان اونچے عناصر کی پرواہ نہیں کرتے جو زندگی کو بامعنی اور بامقصد بناتے ہیں۔ اور ہم اس کی اہمیت کو بھی نہیں سمجھتے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ہماری اور ہماری قوم کی تہذیبی زندگی پر کیا اثرات پڑتے ہیں۔

روزی کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ بارہویں صدی عیسوی سے جدید یونیورسٹیوں کی بنیادیں رکھی جانے لگی ہیں ماہرین تعلیمات نے ہمیشہ ملازمتوں کے مسئلے پر نظر رکھی ہے لیکن ہماری تہذیبی و تمدنی ضرورتیں اور فنی حیثیت بھی کوئی کم اہم نہیں ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ ایسا کہہ دینا کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ فلاں زبان پڑھنے سے بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ یہ ایک معاشی مسئلہ ہے اور ملک کی ترقی، ملک میں بنائی جانے والی اشیاء، درآمد برآمد اور دوسری متعدد باتوں پر اسکا انحصار ہے نہ کہ یونیورسٹی میں پڑھائی جانے والی زبانوں پر۔

صنعتی ہندوستان میں ہندو اور مسلم، آسامی اور بنگالی ہندی اور اُردو اور دوسری اسی قسم کی جو متعدد تفریقات ہیں انھیں ختم ہونا چاہئے۔ جب صنعتی ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی، تب شاید "کام کرنے کی اہلیت" کے علاوہ دوسری تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیا جانے لگے گا۔ کسی بھی ڈاکٹر یا انجینئر کو محض اسی خصوصیت کی بناء پر کسی دوسرے ڈاکٹر یا انجینئر پر ترجیح دی جائے گی۔ اور اس وقت یہ بات قطعی غیر اہم سمجھی جائے گی کہ کسی ڈاکٹر یا انجینئر نے اپنی تعلیم اُردو میں حاصل کی ہے یا کسی اور زبان میں۔ اہم سوال یہ ہوگا کہ وہ اپنے کام میں کس حد تک مہارت رکھتا ہے۔ چونکہ اردو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اس لئے اُردو میں تعلیم حاصل کئے ہوئے یہ ڈاکٹر اور انجینئر سارے ہندوستان میں جذب کئے جا سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ اپنے کام میں ماہر ہوں اور اچھی طرح کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح اُردو یونیورسٹی میں سارے ہندوستان سے طالب علم لیے جائیں گے جس کی وجہ سے قومی اتحاد کو تقویت پہنچے گی۔ یہ بات کسی دوسری صوبائی زبان والی یونیورسٹی میں نہیں پیدا ہو سکتی کیونکہ عام طور پر اُردو کو چھوڑ کر کوئی بھی دوسری صوبائی زبان دوسرے صوبوں میں نہیں بولی جاتی، اس لئے کسی بھی صوبائی یونیورسٹی میں دوسرے صوبوں کے طلباء نہیں آتے۔ جبکہ اُردو کیساتھ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ اُردو سارے ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ اس لئے اُردو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے سبھی صوبوں کے طلباء آئیں گے۔

پہلا قدم

اگر اُردو یونیورسٹی قائم ہو گئی تو ہمارے اس مطالبے میں زور پیدا ہو سکے گا کہ اُردو کو کسی صوبے میں صوبائی زبان کی حیثیت دی جائے اور اُردو یونیورسٹی کی وجہ سے تمام صوبوں میں اُردو کی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا جس کی وجہ سے اُردو کی ترقی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی کا قیام اُردو کو علاقائی یا صوبائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرانے میں ہمارا پہلا قدم ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ حکومت ۴ کروڑ ہمارے لوگوں کی روزگار کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دے گی۔

میری یہ بھی خواہش ہے کہ اُردو یونیورسٹی اپنی تعلیمی پالیسیوں میں دہلی، بنارس، کیمبرج اور ہارورڈ یونیورسٹی کی طرح خود مختار رہے۔ حکومت سے مالی امداد قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ہمیں چاہیے کہ حکومت کو اس ذمہ داریوں کا احساس دلائیں۔ اگر اردو بولنے والے لوگوں کو آزاد فضاء میں سانس لینے کا، اپنے انداز میں سوچنے سمجھنے کا اور ملک و قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے اپنے انداز میں جدوجہد کرنے کا حق ہے تو اُردو یونیورسٹی کو چاہئے کہ اپنی تعلیمی پالیسیوں کے سلسلے میں کسی قسم کا بھی دباؤ یا اثر قبول نہ کرے۔ اگر ہم نئے ہندوستان کی ترقی میں یقین رکھتے ہیں اگر یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد تعلیم یافتہ اور مہذب بنے تو اُردو یونیورسٹی ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ اُردو بولنے والے اُردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ اس یونیورسٹی کی بنیادیں ان کی اپنی خواہشات اور ان کی اپنی تمناؤں پر ہوں گی۔ یہ یونیورسٹی صحیح تعلیمی اصولوں پر کھڑی ہوگی۔ ان اصولوں پر جن پر ملک و قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان اصولوں سے عوام کی ایک کثیر تعداد کی بھلائی ہوگی اور یہ اصول جمہوریت کے مقاصد سے ہم آہنگ بھی ہیں۔

اُردو یونیورسٹی ایک خواب بھی ہے اور ایک حقیقت بھی۔ جو قومیں خواب دیکھنا چھوڑ دیتی ہیں وہ مر جاتی ہیں اور وہ قومیں بھی جن کی نظریں ستاروں سے بہت پیچھے رہتی ہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایسے ہی خواب دیکھے تھے جو بعد میں حقیقتوں کا روپ دھار گئے۔ آئنسٹائن کہتا ہے کہ:۔

"اخلاقی قوت اور قوت ارادی دو ایسی قوتیں ہیں جن پر کوئی فتح حاصل نہیں کر سکتا۔"

اگر ہم اُردو یونیورسٹی کے قیام کا ارادہ کر لیں اور اپنے ارادوں کو اس مقصد کی طرف متوجہ کر کے جدوجہد شروع کر دیں تو اُردو یونیورسٹی حقیقت کا ایک روشن مینار بن کر ظاہر ہوگی۔



یار بہزاد! کیا خواب ہوتے ہیں

بہزاد لکھنوی

حکیم بدھن کے لیے مرلقا کا ساتھ مصیبت ہوئی۔ وہ اپنی ہے چیک کر رہ گئے تھے اور اُن کا عالم یہ ہوگیا کہ وہ دن رات میں شاید چند گھنٹے گھر کے باہر رہتے ہوں۔ ورنہ ماہ لقا تھیں وہ تھے اور مکان۔ میں نے بھی جانا آنا بہت کم کر دیا تھا۔ فیکٹری تو اب تھی نہیں جس میں روزانہ حاضری ضروری تھی۔ میری شہرت بھی بڑھ رہی تھی اور مجھے مہینے میں ایک مشاعرہ بیرونی ضرور مل جایا کرتا تھا۔ جس کی فیس سے میری گزر اوقات ہو رہی تھی۔ ایک دن حکیم بدھن سویرے ہی سویرے میرے گھر وارد ہوئے اور مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ مجھے دیکھتے ہی مرلقا نے کہا۔

"ایسے بے مروت کو گھر کیوں لائے جس کے دل سے تمہاری محبت بالکل دور ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھابی یہ بات نہیں ہے۔ میں حکیم بدھن کا ویسا ہی نیاز مند ہوں جیسے پہلے تھا۔ لیکن مجھے حکیم بدھن کی تباہی دیکھی نہیں جاتی۔"

وہ چیخ کر بولیں۔

"ان کو کون تباہ کر رہا ہے؟ کیا یہ چوٹ مجھ پر ہے۔"

میں اتنا صاف گو نہیں ہوں لیکن اس وقت خدا جانے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے کہا۔

"جی ہاں بھابی آپ پر۔"

ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور وہ مجھ سے بولیں۔

"میں ان کو کیوں کر تباہ کر رہی ہوں صاف صاف بتاؤ ورنہ میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گی۔"

میں نے کہا۔ "تو مہربانی فرما کر میری صاف گوئی معاف کیجئے گا۔ شمشیر جو ماہانہ اخراجات ہوتے ہیں، اپنی کاپی پر لکھتا رہتا ہے۔ ان اخراجات کو دیکھ کر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔"

وہ بولیں۔ "اس حرامزادے کو تو میں آج ہی نکال دوں گی وہ کون ہوتا ہے اخراجات لکھنے والا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دھوبی پر بس نہ چلا اور گدھیا کے کان اینٹھ دیئے۔ وہ تو حکیم بدھن کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔"

حکیم بدھن نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔

"یار بہزاد کچھ تفصیل تو بتاؤ۔"

میں نے کہا۔

"تم بھابی اور شمشیر تین آدمی اس گھر میں رہتے ہو [illegible] کے لئے زائد سے زائد ڈیڑھ سیر آٹا پکنا چاہئے [illegible] تم دونوں کم خور ہو۔ اس لئے پانچ تین سیر آٹا [illegible] تم تینوں کے لئے زائد سے زائد ڈیڑھ پاؤ گوشت کا [illegible] دال اور پاؤ بھر چاول دونوں وقت کے لئے [illegible] ہیں۔ لیکن میں حساب دیکھتا ہوں کہ روزانہ ایک سیر گوشت [illegible] سیر دال اور تین پاؤ چاول پکتے ہیں؟"

وہ جل گئیں اور بولیں۔

"میں تمہاری طرح کنجوس مکھی چوس نہیں ہوں۔ مجھے اہل محلہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میری کئی سہیلیاں ہیں۔ انہیں روزانہ کھانا بھیجتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بہت خوب۔ میری رائے میں یہ بہت سی گنوا لیجئے تو سہیلیوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔ اور ہاں جناب بھابی جان آپ پان بہت زیادہ کھاتی ہیں۔ اور حکیم بدھن اتنے پان بازار سے منگوا لیتے ہیں۔ چھ سیر چھالیا دو سیر کتھا ایک سیر تمباکو اور ایک ڈھولی پان روز استعمال ہوتا ہے۔"

وہ مارے غصے کے بے حال ہو کر بولیں۔

[illegible] ہیں کسی بڑے گھرانے سے نہیں ہوں۔ پھوپھیا آنے کے [illegible] جو نقصان وہ ہوتا ہے میں اتنا نرخ واتی [illegible] چار سیر کے تین سیر رہ جاتی ہے۔ کتنا بکوا کے [illegible] چھیچڑے دلواتی ہوں اور اتنا دعلواتی ہوں [illegible] دیتا ہے۔ رہا تمباکو تو میری سہیلیاں اکثر پوچھے [illegible] آدھ پاؤ سے کم دینا میں اپنی توہین سمجھتی ہوں [illegible] دو سو پان کی اوقات ہی کیا ہے۔ چار چار [illegible] ایک گلوری بنتی ہے۔

[illegible] کہا۔

"[illegible] اوقات سے میں بے خبر تھا ورنہ اعتراض نہ کرتا۔ [illegible] دن ڈومنیوں اور میراثنوں کا ناچ کس تقریب [illegible] ہوتا ہے؟"

وہ بولیں۔ "بہزاد بھائی آپ اپنی حدود تک رہیے۔ [illegible] کے دوست ہیں۔ ان کے دوست رہیے میرے [illegible] نہ اٹھایئے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا فرمانا بجا ہے آپکے اصرار پر میں نے [illegible] لیکن میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ حکیم بڑھن [illegible] نہیں ہے۔ جائداد وہ اپنے لڑکوں کے نام منتقل [illegible] نگر کی کمائی کی آمدنی ہے جو چل رہی ہے اور [illegible] کب تک چلتی رہے گی۔ میں اجازت چاہتا ہوں [illegible] حکیم بڑھن کا دوست ہوں اور انہی کا دوست [illegible] ہے اور اس گھر کے پان اور چائے پر میرا [illegible]"

[illegible] گھر چلا آیا۔ حکیم بڑھن مجھے روک نہ سکے۔ [illegible] خاموش بیٹھے رہے۔ قریب شام کے وہ میرے [illegible] بولے۔

"[illegible] معاف کرو۔ میری وجہ سے تم کو بہت کچھ سننا [illegible] جتنے اعتراضات کئے سب کے سب [illegible] مجھے اس عورت نے اُلو کھلا دیا ہے کہ میری [illegible] نہیں۔ میرا حال وہی ہے۔

[illegible] باغباں دیکھا کئے

آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

میں نے کہا۔ "بیٹا ابھی کیا ہے جب بھیک مانگنے کی نوبت [illegible] یہ شاعری کا بھوت اُترے گا۔"

حکیم بڑھن نے کہا۔ "یار اتر رہا ہے میرے پاس اب کل پانچ سو روپے رہ گئے ہیں۔ میں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ کل اثاثہ بیوی کے نام لکھ دیا ہے۔ تم سے ڈر کے مارے نہیں کہا۔ کہ مجھ کو کھا جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "استاد ان پانچ سو سے اور مزہ کر لو۔ مجھے دیکھو دُجیت نگر کی کمائی میں نے بینک میں جمع کرا دی ہے۔ گھر کے خرچ کا ایک معیار رکھا ہے وہ ہر مہینے بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں اور ہر وقت شاعری کی کمائی خاموشی سے لاکر بینک میں داخل کر دیتا ہوں۔"

وہ بولے۔ "یار میرے تم ہو تو بڑی سودائی لیکن بڑی عقلمندی سے گزارا کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہاری طرح جامدانی کا انگرکھا دو پلڑی ٹوپی اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر اور ہاتھ میں ریشمی رومال لے کر چوک کے چکر لگا سکتا ہوں۔ لیکن کتنے دن؟ لہٰذا میں نے اپنی وضع نہیں بدلی۔"

وہ بولے۔ "یار ناصح بننے کے بجائے کوئی ترکیب بتاؤ کہ کسی ذریعے سے آمدنی ہو اور گاڑی آگے چلے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمہاری تباہی نہیں دیکھ سکوں گا۔ بہرحال میرا اندوختہ تمہارے لئے حاضر ہے تم جب کہو میں حاضر کر سکتا ہوں۔"

وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگے اور بولے۔

"یار تم واقعی سچے دوست ہو۔"

—— (۲) ——

پندرہ دن گزر گئے نہ میں حکیم بڑھن کے وہاں گیا نہ حکیم بڑھن میرے ہاں آئے۔ سولہویں دن سویرے ہی سویرے حکیم بڑھن آدھمکے۔ میں ناشتہ کر رہا تھا وہ ناشتے پر میرے ساتھ بیٹھ گئے اور ناشتے کے بعد بولے۔

"یار بہزاد۔ تم تو صوفی ہو۔ یہ بتاؤ کیا خواب سچے ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ خواب کی نوعیت پر موقوف ہے۔"

وہ بولے۔ "آج ایک ہفتے سے روزانہ خواب میں ایک شاہی زمانے کے امیر کو دیکھتا ہوں جن کی مونچھوں کے بال سفید ہیں۔ وہ پرانے زرکار لباس میں ملبوس ہیں۔ ان کی کمر سے ایک مرصع تلوار لٹکی ہوئی ہے اور وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ صولت نگر آؤ اور صولت محل میں آکر مجھ سے ملو۔ اگر یہی خواب میں روزانہ نہ دیکھتا تو میں تم سے کبھی نہ کہتا۔"

میں نے کہا۔ "اس خواب میں جان ہے لیکن صولت نگر نام کا کوئی محلہ لکھنؤ میں موجود نہیں ہے۔ تمہارے پاس رقم کتنی رہ گئی ہے؟"

وہ بولے۔ "یار کل سو روپے رہ گئے ہیں تمہاری بھاوج نے چار کے جشن صحت میں مجھے چار سو روپے دینا پڑے۔"

میں نے کہا۔ "وقت تو ضائع ہو گا لیکن شہر میں ادھر ادھر گھوم کر بڑے بوڑھوں سے صولت نگر کا پتا پوچھ کر دیکھو شاید کوئی بتا سکے میرے خیال میں یہ بہت مدتوں پہلے کا کوئی محلہ ہے جس کا نام بھی بدل کر اب کچھ اور ہو گیا ہو گا۔"

وہ بولے۔ "یار تمہارا خیال تو صحیح ہے لیکن یہی روپے ہیں جن میں ساری تفتیش کے اخراجات ہونے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار پاگل ہو گھنٹوں کے حساب سے ایک یکہ کر لو اور دور دراز محلوں کا رخ کرو شاید کامیابی ہو جائے اور گھنٹوں کے حساب سے یکہ بھی سستا پڑے گا۔"

حکیم بڑھن نے کہا "یار یکے پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہونہہ پشتینی نواب۔ جب ہی یکے پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تمہارے والد محترم تو قارورے دیکھا کرتے تھے تم کہاں کے نواب آئے ہو۔"

حکیم بڑھن نے کہا۔

"بات سچی ہے لہٰذا ہم خالی جناب حکیم بڑھن صاحب تم کو معاف کرتے ہیں چلو یکہ کر دو۔"

ہم دونوں نخاس آئے۔ میں نے ایک جان پہچان والے کا یکہ گھنٹوں کے حساب سے طے کر لیا اور شہر سے باہر کا رخ کیا یکہ گول دروازے سے ہوتا ہوا ٹھاکر گنج کی طرف روانہ ہوا ٹھاکر گنج پار کرتے ہی مجھے دور سے ایک بڑے میاں نظر آئے جن کی کمر جھکی ہوئی تھی اور وہ لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ میں نے یکہ رکوایا اور ان کی طرف لپک کر سلام کیا وہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر سیدھے ہوئے اور بولے۔

"عمر دراز ہو جیتے رہو بیٹا۔ مجھ سے تمہارا کیا کام ہے؟"

میں نے کہا۔ "چچا حضور ایک بات معلوم کرنا ہے۔ شہر لکھنؤ کی [illegible] ہے اسی لئے میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔"

وہ بولے۔ "کیا بات ہے بیٹا؟"

میں نے کہا۔ "لکھنؤ میں کوئی محلہ صولت نگر بھی ہے؟"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے اور بولے "بیٹے نہیں بیٹے۔ کبھی تھا۔ میں نے اپنے دادا سے سنا تھا [illegible]

تقریباً ایک میل چلنے کے بعد ایک ٹوٹا ہوا شاہی احاطہ پڑتا ہے۔ جس کے درمیان شاہی محل کی ایک محراب رہ گئی ہے، وہی صولت نگر کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام شکور آباد ہے۔ اس احاطے میں کافی تعداد میں کچے مکانات بنا کر غریب غربا آباد ہو گئے ہیں۔"

میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یکے پر آ بیٹھا اور یکے والے کو آگے چلنے کو کہا۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ "کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا۔ "صاحبزادے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کچھ پتا تو چلا ہے۔ اگر وہ محلہ مل جائے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھو۔"

یکہ کوئی پندرہ منٹ بعد اس جگہ پہنچا جہاں ایک پرانے زمانے کا ایک شاہی احاطہ بنا ہوا تھا۔ جس کے درمیان ایک محراب نظر آ رہی تھی۔ میں نے یکہ رکوا دیا اور حکیم بڈھن کے ساتھ احاطے میں داخل ہوا۔ اس احاطے کا دروازہ تو باقی نہیں تھا لیکن ادھر ادھر کی دیواریں بتا رہی تھیں کہ کسی زمانہ میں یہ بڑا پھاٹک ہوگا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے چاروں جانب کچے مکانات کی قطاریں دیکھیں جن کے درمیان تنگ تنگ گلیاں چھوڑ دی گئی تھیں۔ ہم دو نئے آدمیوں کو دیکھ کر تمام اہل محلہ باہر نکل آئے اور ایک شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کو کس کی تلاش ہے؟"

میں نے کہا۔ "بھائی میرے ایک غریب دوست کو تھوڑی سی جگہ درکار ہے۔ وہ بھی کچا مکان بنا کر رہنا چاہتے ہیں۔ یہاں کی زمینیں بکتی ہیں یا یونہی جو چاہے مکان بنا لے۔"

وہ بولے۔ "جناب یہاں اب رتی برابر بھی زمین نہیں ہے صرف وہی محراب باقی رہ گئی ہے جو مبارک حسین کی ملکیت ہے۔ وہ اس محراب کے برابر میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں لیکن شاید وہ محراب بیچنا پسند نہ کریں حالانکہ محراب میں اتنی گنجائش ہے کہ ایک اچھا مکان بن سکے۔"

میں محراب کی طرف بڑھا۔ حکیم بڈھن جو ہنوز حیران تھے ان کی سمجھ میں میری یہ کارروائی نہیں آ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد ہم محراب کے پاس جا پہنچے۔ یہ محراب لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس محراب کے اوپر لکھوری گنبد بھی تھا اور اس کا فرش بھی لکھوری اینٹوں سے ہی بنا ہوا تھا۔ اندر واقعی اتنی جگہ تھی کہ ایک مکان بن سکے۔ میں نے برابر کے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ ایک لڑکا باہر نکلا اور بولا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مبارک حسین صاحب ہیں؟"

وہ بولا۔ "جی ہاں موجود ہیں۔ میں اطلاع دیتا ہوں۔"

چند منٹوں کے بعد ایک ادھیڑ عمر کے قبول صورت آدمی باہر نکلے وہ بنیان اور لنگی میں ملبوس تھے۔ ایک مدیا حقہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حقہ زمین پر رکھ کر دوڑے اور مجھ سے بغل گیر ہو کر بولے۔

"میرے ایسے نصیب کہاں کہ بہزاد سا شاعر مجھے نوازے۔"

میں نے کہا۔ "یہ آپ کی بندہ پروری ہے۔ یہ میرے ہمراہ جناب حکیم بڈھن صاحب ہیں ان سے ملئے۔"

وہ حکیم بڈھن سے بھی گلے ملتے ہوئے بولے۔

"آپ اور بہزاد ایک دوسرے کے ہمزاد ہیں۔ سارا شہر جانتا ہے۔ بہزاد مجھے پہچان نہیں رہے ہیں۔ امریکن مشن نمبر ایک مڈل اسکول میں ان کے ساتھ ایک ہی درجے میں پڑھتا تھا اور یہ مجھے برکو برکو کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔"

مجھے وہ دن یاد آ گئے اور میں نے دوبارہ بڑھ کر ان کو گلے لگایا اور کہا۔

"واقعی تمہاری یادداشت کا جواب نہیں ہے۔"

وہ بولے۔ "دو منٹ ٹھہرو۔ میں اندر سے چارپائی لے آؤں اور تمہاری بھاوج سے چائے اور کبابوں کے لئے کہہ دوں۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول کے زمانے میں بھی تم کبابیے کی دکان پر سب پیسوں کے کباب کھا جایا کرتے تھے۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے اور دو بانس کی کھٹیاں لے کر باہر نکلے۔ لڑکے کے ہاتھ میں دو دریاں تھیں جو کھاٹوں پر بچھا دی گئیں۔

ہم دونوں بیٹھ گئے۔ مبارک نے میرے ہاتھ میں حقہ دیا تھماتے ہوئے کہا۔

"کیسے آنا ہوا بھیا۔"

میں نے کہا۔ "یار صاف صاف بات تو یہ ہے کہ نہ تم مجھے یاد تھے نہ تمہارا مکان۔ مدتیں ہو گئیں کہ ساتھ چھوٹا ہوا ہے۔ بلکہ اگر تم نہ پہچانتے تو میں تم کو پہچانتا بھی نہیں۔ دراصل ہم لوگ محلہ صولت نگر کی تلاش میں نکلے ہیں اور سننے میں کیا ہے کہ یہی محلہ صولت نگر ہے۔"

مبارک نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ نام تو تین سو برس قبل کا ہے آج کل اس کا نام شکور آباد ہے اب تو یہ شکور آباد کے نام سے مشہور ہے۔ تم نے نہ جانے کیونکر پتا چلا لیا۔ اب بتاؤ کہ تم کو صولت نگر کی کیوں تلاش ہے۔ تم جس جگہ بیٹھے ہو یہ ایک زمانے میں صولت محل تھا۔ دبیر الدولہ، نظام الملک صولت جنگ کا محل تھا۔ میں ان کی اولاد میں سے تنہا باقی رہ گیا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کچھ اور تفصیل بتا سکتے ہو؟"

وہ بولے۔ "کیوں نہیں صولت جنگ بہادر شجاع الدولہ کے سپہ سالار تھے۔ اور حافظ رحمت خاں کے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ یہ انہیں کی چالیں تھیں جن کی وجہ سے شجاع الدولہ کامیاب ہوئے اور یہی نہیں شجاع الدولہ پر ایک روہیلہ سردار نے ایسا حملہ کیا تھا کہ اگر صولت جنگ درمیان میں آ جاتے تو شجاع الدولہ قتل ہو جاتے۔ اسی کے صلے میں شجاع الدولہ نے ان کو دبیر الدولہ، نظام الملک اور صولت جنگ کا خطاب دے کر یہ تمام اراضی ان کو دے دی تھی۔ مال غنیمت میں سے بھی بہت کچھ ان کے ہاتھ لگا تھا۔ انہیں نے یہاں محل بنوایا جس کی یادگار یہ محراب نظر آ رہی ہے۔ یہی ان کی خواب گاہ تھی جیسا کہ امرا کا قاعدہ ہے یہ بھی عیاشی میں مبتلا تھے۔ دولت لٹی اور بری طرح لٹی ان کے بعد ان کی اولادوں نے بھی اٹھانا شروع کیا۔ کمانا کسی کو نہ آیا جائیداد بکتی رہی، خرچ ہوتی رہی، لٹتی رہی۔"

میں نے کہا۔ "افسوس۔"

وہ بولے۔ "افسوس کاہے کا بھیا لکھنؤ کا ہر نواب اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ یہاں تک کہ جب میں پیدا ہوا تو خاندان میں صرف والدہ رہ گئی تھیں اور آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ محلسرا کی کڑیاں اور ملبہ بیچ بیچ کر انہوں نے گزر اوقات کی۔ ان کے انتقال کے بعد میرے ہاتھ صرف احاطے کی زمین اور یہ محراب باقی رہ گئی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے کیا کیا؟"

وہ تلخ ہنسی کے ساتھ بولے۔

"وہی کیا جو باپ دادا نے کیا تھا۔ احاطے کی زمینیں فروخت کر رہا تھا اور روٹیاں کھا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کب تک چلتا۔ آخر کار زمین میں سے ایک بیسہ بھی نہیں بچی ہے۔ اب میرے پاس بجز اس محراب کے اور کوئی چیز قابل فروخت نہیں ہے۔ اس کو بھی بیچوں گا اگر کوئی خریدار مل گیا۔ تم جانتے ہو ہم نوابین بغیر توڑے اور بلاؤ کے نوالہ ہی نہیں توڑتے۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہاری صاف گوئی کا ممنون ہوں لیکن تم سے ایک التجا ہے اگر تم وہ قبول کر لو۔"

لے۔ "تیار تیر کچھ ہونے منظور ہے۔ یار تم میرے
ہو کہیں میں تمہاری بات رد کر سکتا ہوں"
ز کہا۔ "میں اور حکیم بڈھن ایک رات اس محراب
چاہتے ہیں"
لے۔ "بس اتنی سی بات ایک رات نہیں دس راتیں
ب شرط ہے تمہیں کرایہ ادا کرنا پڑے گا"
نے کہا۔ "بتاؤ میں تیار ہوں"
لے۔ "کرایہ یہ ہے کہ شام کا کھانا آپ دونوں
یں کھائیں گے۔ گلاوٹ کے کباب زعفرانی پراٹھے
ڑے آپ دونوں کو ٹھونسنا پڑیں گے۔ ورنہ آپ
ہو سکتے"
نے کہا۔ "پاگل ہو گئے ہو تمہاری غربت کا حال
خواہ مخواہ کیوں پیسے برباد کرو گے۔ ارے دال اور
وگی"
لے۔ "تم شاہ ہو کر ایک نواب کی توہین کر رہے ہو
کہتے ہیں جو لنگوٹی میں پھاگ کھیلتا ہے"
نے کہا۔ "یار یہ کرایہ بہت زبردست ہے"
لے۔ "تو آج کہیں اور سو رہو۔ میرے پاس
لا ہے"
کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ دو بستر تیار ملنے چاہئیں
ب لوٹا لیک مراد گا سرہانے ہونا ضروری ہے اور
ئی چھوٹا بچہ بھی ہے"
سلے۔ "ماشاء اللہ ہے ڈیڑھ سال کا ہے اور
ش ہے۔ ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ بے اختیار پیار
ہے"
نے کہا۔ "لے کر آؤ نا"
ر چلے گئے۔ میں نے حکیم بڈھن سے دس دس کے
اپنی جیب میں رکھ لیے اتنے میں وہ بچے کو لیکر
بے حد قبول صورت اور موٹا تازہ تھا مجھے دیکھ کر
ر کر میری گود میں آگیا۔ میں نے جیب سے دو
کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ مبارک بولے
نا یہ کیا"
نے کہا۔ "میں اپنے بھتیجے کو سلام کرائی دے
کون ہو"
لے۔ "یار چوٹ کر گئے استاد" پھر کبھی بھگو
بلی

گا۔ رات کے آٹھ بجے تک آجاؤ گے نا"
میں نے کہا۔ "ہاں"

(۳)

حسین آباد کے گھنٹا گھر میں آٹھ بج رہے تھے جب ہم لوگ مبارک کے مکان پہنچے۔ مبارک نے واقعی اہتمام کیا تھا۔ محراب کی زمین کا فرش دھلا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ادھر اُدھر دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر سوتی قالین اور تکیے بچھے ہوئے تھے سرہانے ایک میز تھی جس پر لالٹین صراحی گلاس اور لوٹا رکھا ہوا تھا مبارک ہم دونوں کو دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوئے محلے کے دو ایک حضرات اور بھی آ گئے جو غالباً مدعو تھے۔ اندر سے مبارک نے لاکر دسترخوان بچھایا جس پر کھانا چن دیا گیا۔ گلاوٹ کے کباب، زعفرانی پراٹھے اور شاہی ٹکڑوں کے علاوہ ستارہ پلاؤ بھی تھا اور قورمہ بھی۔ محلے کے حضرات بھی شریک طعام ہو گئے۔ گیارہ بجے تک حکیم بڈھن کے لطائف اور ظرائف اور قہقہے بازیوں میں وقت اس طرح گزر گیا کہ پتا بھی نہ چلا۔ گیارہ بجے کے بعد مبارک پانوں کی ڈبیا میرے حوالے کرنے کے بعد چلے گئے۔

ہم لوگ شہر کے رہنے والے تھے جہاں ساری رات چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں کے سناٹے سے طبیعت گھبرانے لگی۔ تقریباً بارہ بج رہے تھے کہ میں تو سو گیا۔ حکیم بڈھن نے مجھے تین بجے رات میں جھنجھوڑ کر کہا۔

"اٹھو اور جلدی سے چھالیا اور تمباکو پھانکو تاکہ تمہارا دماغ صاف ہو جائے۔ میں نے ابھی ابھی جو خواب دیکھا ہے مجھے حرف بحرف یاد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح ہوتے ہی میں بھول جاؤں"

میں نے بٹوے سے چھالیاں اور تمباکو نکال کر پھانکی، کتھا اور چونا چاٹا اور کہا۔

"سناؤ تم نے کیا خواب دیکھا ہے"

وہ بولے۔ "عجیب خواب تھا مجھے وہی صاحب نظر آئے جن کا تم سے پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے "میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم یہاں تک پہنچ گئے۔ اب سنو میرا نام صولت جنگ ہے۔ میں ہی شجاع الدولہ کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ میرے سگڑ پوتے نے تم سے یہ بیان کیا کہ میں نے شجاع الدولہ کی جان ایک روہیلہ سردار سے بچائی تھی۔ سراسر غلط ہے۔ ان کی جان اپنی جان دے کر تمہارے سگڑ دادا سید بہادر حسین نے بچائی تھی۔ لیکن چونکہ میں بھی برابر ہی تھا اور روہیلہ سردار کی تلوار سے ان کو مارنے کے بعد قریب مرگ تھے یہ اعزاز

مجھے مل گیا جس کے صلے میں میرے خطاب نوابی ہو گئے میں نے بھی اس بات کو چھپا لیا۔ لیکن میرا ضمیر برابر مجھے ملامت کرتا رہا۔ میں نے اس ضمیر کی ملامت کے تحت کچھ زیورات اور کچھ اشرفیاں اس خزانے سے زمین میں دفن کر دیں کہ میں سید بہادر حسین مرحوم کی اولاد کو دے دوں گا۔ لیکن عیش و عشرت میں پھنس کر میں نے کوئی تگ و دو اس خاندان کو تلاش کرنے کی نہ کی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ میں تباہ ہوا۔ میری اولاد میرے بعد برباد ہی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ یہ ایک لڑکا مبارک رہ گیا ہے جس کو غالباً اب اور بھی تباہ ہونا پڑے میرے ضمیر کی خلش نے مجھے چین نہیں لینے دیا۔ میری روح اس خاندان کی متلاشی رہی۔ یہاں تک کہ مجھے معلوم ہوا کہ تم اس خاندان کے جانشین ہو۔ میں ایک ہفتے تک تمہارے خواب میں اسی لیے آتا رہا کہ تم کسی طرح یہاں تک پہنچ جاؤ۔ تم وہ دفینہ تم کو بتا دوں تم نکال لو اور میرے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ لیکن اتنا ضرور کرنا کہ تھوڑا بہت میرے بچے مبارک کو بھی دے دینا تاکہ یہ اس سے کچھ تجارت کر لے اور اپنی گزر اوقات کر سکے۔

میں نے کہا۔ "دفینہ کہاں بتایا ہے؟"

وہ بولے۔ "جہاں میری چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ بالکل یہیں۔ قد آدم نیچے ایک صندوقچہ ہے!"

میں نے کہا۔ "صبح ہونے دو تمہیں مبارک کو حصہ دینا بھی ہے لہٰذا اس کو اس راز میں شریک کر لو۔ اور نہ کھدوائی ہم دونوں کے بس کی چیز نہیں ہے"

وہ بولے۔ "ٹھیک کہتے ہو بہزاد"

صبح ناشتا لے کر جب آئے تو حکیم بڈھن نے ان سے اپنا خواب بیان کیا۔ وہ اچھل پڑے اور بولے۔

"حکیم صاحب واقعی کچھ دنوں میں میری نوبت فاقوں کو پہنچ جائے گی۔ اگر یہ خواب سچا ہے تو شاید میری زندگی بن جائے رازداری کی ترکیب یہ ہے کہ میں یہ محراب آپ کے ہاتھ بیچ ڈالوں اور مزدوروں کو بلا کر آپ کھدائی کا کام شروع کرائیں۔ جب قد آدم سے ایک فٹ زمین باقی رہ جائے تو پھر رات کے وقت ہم آپ اور بہزاد بھائی پھاوڑے بازی کریں"

ہم نے کہا۔ "بہت معقول تجویز ہے"

اس دن پچیس روپے میں حکیم بڈھن نے وہ محراب خرید لی۔ اور دوسرے ہی دن تین مزدور لگا کر کھدائی کا کام شروع کرا دیا۔ محلے والوں کو کوئی شک پیدا نہ ہوا۔ دو دن میں تقریباً قد آدم سے کچھ کم گہرا فرش کھد چکا تو حکیم بڈھن نے رات

امریکا کے صدر رچرڈ نکسن



نکسن کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں چیز ان کی ناک ہے جو کبھی بار کٹ چکی ہے اور کٹتی رہتی ہے۔ ناک کو چھوڑ کر باقی چہرہ مہرہ اچھا خاصا ہے اس لئے انھیں کم از کم بدصورت نہیں کہا جا سکتا۔ نکسن کا شمار امریکا کے بدنام سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ صدر آئزن ہاور کے زمانے میں امریکا کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آئزن ہاور کے ریٹائر ہونے کے بعد کینیڈی کے مقابلے میں الیکشن لڑا تھا لیکن سخت ناکامی کا سامنا ہوا۔ نیویارک کے گورنر کے الیکشن میں بھی ناکام ہونے کے بعد نکسن کچھ دن خاموش بیٹھے رہے۔ اس کو نکسن کی خوش قسمتی کہئے یا امریکنوں کی بدقسمتی کہ رابرٹ کینیڈی کی موت کے بعد نکسن وہائٹ ہاؤس میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

نکسن کا شمار امریکا کے سب سے زیادہ غیر مقبول صدروں میں ہوتا ہے۔ بہت معمولی ذہن اور معمولی شخصیت کے مالک ہیں۔ اگر برطانیہ میں ہوتے تو شاید کبھی پارلیمنٹ کے ممبر بھی نہ بن پاتے۔ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا جس کا انھیں بہت افسوس تھا۔ لیکن چین کے حالیہ دورے کا اعلان کر کے نکسن نے بہت غیر معمولی کام کیا ہے۔ پچھلے بیس سال سے جس چین کو امریکا تسلیم تک نہیں کرتا تھا، آج اس کے سامنے جھکا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس میں مسٹر نکسن کے کچھ اپنے ذاتی مفاد بھی پوشیدہ ہیں۔ نکسن نے اعلان کیا ہے کہ وہ اگلے صدارتی انتخاب میں ضرور شریک ہوں گے لیکن یہ وہ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کے لئے کامیاب ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ کچھ ایسے اقدام کریں جس سے ان کا نام نہ صرف امریکا تک بلکہ دنیا بھر میں روشن ہو جائے۔ چین جانے کا ان کا اعلان اسی کی ایک کڑی ہے۔

امریکنوں کی ویتنام میں چلتے چلتے یہ حالت ہو گئی ہے کہ اب وہ ہر قیمت پر ویتنام سے باہر آنا چاہتے ہیں۔ نکسن بھی اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ اگر انھوں نے آج کل امریکا کو ویتنام سے باہر نکال پھینکا جائے گا۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اس کا سہرا ان ہی کے سر کیوں نہ رہے۔ دیکھئے اب چین جا کر وہ کیا گل کھلاتے ہیں۔ - -

مکان کی کھدائی کا کام جاری تھا ...

مبارک اور حکیم بدھن دونوں کھودتے تھے اور مٹی باہر پھینکتا تھا۔ حکیم بدھن کو جو کھودنا تھا وہ جگہ خواب میں بتا دی گئی تھی۔ چنانچہ دو گھنٹے کی محنت سے ایک صندوقچہ ابھرا۔ اوپر کی مٹی ہٹانے کے بعد ایک مضبوط رسی اس کے ... میں باندھ کر ہم دونوں نے زور لگایا۔ صندوقچہ زیادہ بھاری تھا۔ آسانی سے نکل آیا۔ صندوقچہ پر ایک موٹا سا قفل لگا ہوا تھا جس کو ... معمولی چوٹ سے کھول لیا گیا۔ صندوقچہ کھلا اندر ایک ... اشرفیوں کا ڈھیر تھا اور ایک طرف سونے کے زیورات کا۔

حکیم بدھن نے کہا۔

"مبارک صاحب نصف اشرفیاں اور نصف زیور آپ ... لیں اور نصف میرا حق ہے۔"

مبارک نے کہا۔ "نہیں آپ جو اپنی خوشی سے دے دیں ... میرا ہے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "میں بخوشی نصف حصہ دے ... رہا ہوں۔"

(۴)

پہلے لال رستوگی حکیم بدھن کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس نے سامان جانچنے کے بعد کہا۔

"بھیا بدھن میں تم سے بے ایمانی نہیں کروں گا اس مال کی قیمت پندرہ ہزار سے زیادہ تم کو نہیں ملے گی اور تم کہیں اور بیچ بھی نہ سکو گے۔ اس لئے کہ دفینہ سرکاری ملکیت ہوتا ہے سرکار تم سے سب چھین لے گی۔"

حکیم بدھن نے پندرہ ہزار قبول کر لیے اور گھر آ کر ایک ہزار ... سمجھاتے ہوئے کہا۔

"... تمہاری جھونپڑی کے باپ کے ... ہے ... خرچ ... ہے ... فضول خرچ ہے ... بہت ... کے ... تمہارے ... درست ... ہے۔"

... میں خوش ... نہیں ہوں۔

نامہ نگار دل

... طرف سے بنگلا دیش ... حالات و واقعات پر

ایک رپورٹ

نازش پرتاپ گڈھی

[illegible]

بنگلا دیش میں چاروں جانب

وہ موت اور بیکسی کا لہو ہے

وہاں کے دشمن کا لہو ہے

... کا اور ... کا لہو ہے

... وہ ... کا ... کا

[illegible]

اسلامی قدروں کا لہو ہے

[illegible]

لال قلعہ سے قطب مینار تک

پارلیمنٹ کے اجلاس میں کوئی دن نہیں جاتا جب بنگلا دیش کا کسی نہ کسی نوعیت سے ذکر نہ کیا جاتا ہو۔ اس سے معاملہ کی سنگینی کا اظہار ہوتا ہے۔ وزیر خزانہ مسٹر چوہان نے کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کی میٹنگ میں اعلان کر کے ممبروں کو چونکا دیا کہ 60 کروڑ روپے کی جو رقم پناہ گزینوں کے لئے بجٹ میں رکھی گئی تھی وہ خرچ ہو چکی ہے اور اب وہ اجلاس سرما کے اختتام سے قبل ایک اور ضمنی بجٹ اس مقصد سے پیش کریں گے تاکہ پناہ گزینوں کے اخراجات کے لئے مزید ٹیکس کے ذریعہ رقم حاصل کی جا سکے۔

ہندوستانی عوام جو پہلے ہی ٹیکسوں کے بار میں دبے ہوئے ہیں مزید ٹیکسوں کی خوشخبری سن کر یقیناً پریشان ہوں گے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نظر نہیں آتا کیونکہ مصیبت زدہ پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کا انتظام ہندوستان خود اپنے وسیلوں سے کرے۔ دنیا کا ضمیر بنگلا دیش کے نام پر نہیں جاگ سکا اس لئے اب زیادہ بوجھ خود ہندوستان کو ہی برداشت کرنا پڑے گا۔

بنگلا دیش کا معاملہ وزارت خارجہ کے مطالبات کی بحث کے دوران بھی زیر بحث آیا اور اگرچہ انہوں نے بنگلا دیش کو تسلیم کرنے اور اس معاملہ کو اقوام متحدہ میں اٹھانے کی تجویز کو مسترد کر دیا لیکن انہوں نے بنگلا دیش کے کاز کی پوری طرح حمایت کی اور اعلان کیا کہ "ہندوستان اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ ہر ملک کے باشندوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کا اطلاق بنگلا دیش کے لوگوں پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ویٹ نام یا فلسطین کے باشندوں پر ہو۔"

مسٹر سورن سنگھ وزیر خارجہ نے اس بات پر تشویش … پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کی جا رہی ہے اور دوسرے ملکوں سے اپیل کی کہ وہ پاکستان پر شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ مصالحت کرنے کے لئے دباؤ ڈالیں کیونکہ صرف وہی بنگلا دیش کے عوامی لیڈر ہیں۔ یہ بات وزیر خارجہ نے جنرل یحییٰ خاں کی اس پیشکش کے سلسلہ میں کہی کہ وہ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یحییٰ خاں کی پیشکش محض دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ ہند اور پاکستان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ خود پاکستان اور بنگلا دیش کا معاملہ ہے اور بنگلا دیش کے مسئلہ پر شیخ مجیب الرحمن ہی بات چیت کرنے کا حق رکھتے ہیں جن کے خلاف اب پاکستانی حکمراں مقدمہ چلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں صرف پارلیمنٹ ہی میں تشویش ظاہر نہیں کی گئی بلکہ پارلیمنٹ سے باہر بھی اس تشویش کا اظہار کیا گیا اور اس سلسلہ میں منعقدہ دو کنونشنوں نے پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر اس مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کرنے پر زور دیا۔ ان دو کنونشنوں میں سے ایک جمعیۃ علماء صوبہ دہلی اور دوسرا فرقہ پرستی کے خلاف محاذ کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور دونوں میں مسٹر مودود ایڈوکیٹ ڈھاکا ہائی کورٹ نے جو شیخ مجیب الرحمن کے وکیل رہ چکے ہیں۔ شیخ صاحب کے بارے میں مختلف ممالک سے اپیل کی کہ وہ ان کا تحفظ کریں۔ لیکن ابھی تک پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر پر بدستور نخوت کا بھوت سوار ہے۔ جو آج نہیں تو کل انہیں لے ڈوبے گا۔

یحییٰ خاں نے اپنے ایک انٹرویو میں ہندوستان کے خلاف اعلان جنگ کرنے کی جو دھمکی دی ہے ہندوستانی وزیر خارجہ اس کا بھی تذکرہ کیا اور انہوں نے پاکستان کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو ہندوستان اس کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے تیار ہے۔

بین الاقوامی سیاست میں امریکہ اور چین کے سربراہوں کی مجوزہ ملاقات کے بارے میں جو اعلان کیا گیا ہے اس کا ذکر بھی پارلیمنٹ میں آنا یقینی تھا۔ بعض ممبروں کو بین الاقوامی سیاست میں اس تبدیلی کے اندر ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی نظر آئی لیکن دوسرے ممبروں نے کہا کہ یہ تو ہندوستانی پالیسی کی عین کامیابی ہے اس لئے کہ ہندوستان کا ہمیشہ یہ موقف رہا ہے کہ 75 کروڑ کی آبادی والے ملک چین کو الگ تھلگ نہیں رکھا جا سکتا۔ اور اب اگر مسٹر نکسن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ انہیں چین سے مفاہمت کرنا چاہئے تو یہ گویا انہوں نے ہندوستان کی پالیسی کے مطابق اقدام کیا۔

بنگلا دیش کے معاملہ میں ہر جماعت اور ملک کا ہر فرد حکومت ہند کے موقف کا حامی ہے وہ بین الاقوامی حالات کو سامنے رکھ کر جو بھی قدم اٹھا رہی ہے یا اٹھائے گی پورا ہندوستان اس کی پشت پناہی کرے گا لیکن جن سنگھ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی کٹیا الگ بنا رہا ہے۔ خبر ہے کہ وہ بنگلا دیش کے نام پر کوئی تحریک شروع کرے گا۔ اسٹنٹ بھی چل رہا ہے لیکن عام دماغ کے ہر شخص نے بھی اس اسٹنٹ کے بارے میں سنا وہ ہنس دیا اور پوچھنے لگا کہ جو لوگ خود انسانیت کے دشمن ہیں اور جن کا عملی کردار خود اپنے ملک میں انسانیت دشمنی کا ہو انہیں کیا واقعی بنگلا دیش کے ان انسانوں سے ہمدردی ہو سکتی ہے جو پاکستانی فوجوں کے مظالم کا شکار ہوئے ہیں۔



یہ واقعہ میں نے داروغہ مبارک علی سے سنا تھا جو لشکر کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ اُن کا انتقال پاکستان جا کر ہوا۔ مقامات کے نام وہی ہیں البتہ افراد کے نام بدل دیئے گئے ہیں۔ ان واقعات سے کوئی ہولناک کہانی مرتب ہوتی ہے یا نہیں یہ فیصلہ قارئین کرام ہی کریں گے۔ (ص۔ ج)

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں بہ سلسلہ روزگار سندھیا اسٹیٹ میں بہ حیثیت ٹیچر ملازم تھا اور لشکر میں تعینات تھا میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں نوجوان خون دوڑ رہا تھا۔ چھوٹے موٹے خطرے کو دھیان میں نہ لاتا تھا۔ حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اور میرے ملنے جلنے والوں میں سب ہی قسم کے افراد تھے۔ نوکر پیشہ بھی اور تاجر حضرات بھی بلا امتیاز مذہب و ملت دوستوں میں ہندو، مرہٹے، مسلمان سب ہی شامل تھے۔ خاص ملنے والوں میں کوئی سات یا آٹھ افراد ہوں گے۔ مگر ان سب میں جیلر صاحب سر فہرست تھے سب لوگ اپنی اپنی ڈیوٹیوں اور نجی کاروبار سے فراغت پاتے تو انہی جیلر صاحب کے مکان پر جا پہنچتے ہر ایک کے ذوق کی چیز ان کے یہاں موجود تھی۔ مثلاً مجھے ہی لے لیجئے۔ کتابیں پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ چنانچہ ان کی خاصی بڑی لائبریری کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔ کچھ احباب شطرنج وغیرہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے لئے جیلر صاحب کے یہاں معقول انتظام تھا۔ یہ فالتو اوقات میں پچیسی، شطرنج وغیرہ میں ایسے مشغول ہو جاتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی خود جیلر صاحب کو تین شوق تھے۔ کتب بینی، شطرنج اور شکار بڑے بذلہ سنج اور وضع دار انسان تھے۔ جو بات کہہ دیتے اس پر ہمیشہ قائم رہتے۔ جو عہد کر لیتے اسے ہمیشہ نبھاتے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی اس طرح خوش و خرم گزارتے چلے جا رہے تھے۔ شادی سے ہمیشہ بچتے رہے نتیجۃً کنوارے تھے۔ ہوٹل بازی کا رواج تو اب جا کر ہوا ہے۔ ان دنوں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ عموماً اپنی چیزیں خود پکاتے تھے اور کھاتے تھے جیلر صاحب بھی اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ غرض ان کی معیت میں دن ہنسی خوشی گذر رہے تھے۔ زندگی کو نہ کوئی روگ تھا نہ ملال۔

اچانک میرا تبادلہ وہاں سے ایسے مقام پر کر دیا گیا جو شہر سے کوسوں دور تھا اور جنگل کے قریب سڑک کے کنارے واقع تھا۔ سندھیا اسٹیٹ ریلوے کا اسٹیشن پنیار آبادی سے کافی فاصلے پر تھا۔ اسٹیشن پر ایک بابو صاحب تعینات تھے جو بیک وقت اسٹیشن ماسٹر

تھا جہاں پانچ منٹ کی موجودگی میں سٹیشن ماسٹر یا بکنگ کلرک کے فرائض کی چیز سے سکے۔ یہاں ہمیشہ اہتمام رہتا تھا کہ مسافروں کو قسمت جانے تو سب تھا شخص جس جانے والا تھا جس کے فرائض میں ٹکٹ والی کی نگرانی اور دیکھ بھال ٹوٹ پھوٹ کی مرمت وغیرہ شامل تھی۔ مجھے سٹیشن کا دفتر سرخ مزدور اور قلی۔ اس مقصد کے لئے ہی ملائی تھی ریتی بینڈ اور ٹکٹ کے درمیان ایک پختہ سڑک موجود تھی جس پر کہ دو وقت رات کے پچھلے پہر کے ساتھ ہی بند ہو جایا کرتی تھی کیونکہ شیروں کی گشت شروع ہو جایا کرتی تھی ان حالات میں جیلر کو بھی مستقل سکونت لکھنے میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے روزانہ یہاں سے آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا جیسے اسٹیشن سے متصل ایک کیبن تھا جس کے چاروں طرف اونچی باڑ تھی اور جسے اسٹور اور سکونت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

گرمیوں میں ایک روز جیلر صاحب نے دعوت کی ... جیلر صاحب نے فوری مجھے ... ایک ...

"آؤ ... تمہاری پسند کی چیزیں پکائی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک صاحب کو تم سے ملنے کا اشتیاق ہے ان کی آمد بھی ... ہو جائے گی اور تمہارے قیام کا مسئلہ بھی شاید تو حل ہو جائے گا۔"

چائے ... کے بعد ... دن باقی سکا ... وقت پر ان کے یہاں جا پہنچا کھانا دسترخوان پر چنا جا چکا تھا ... تولیا وغیرہ سب قرینے سے اپنی جگہ رکھے ہوئے تھے بس کھانے کی دیر تھی ایک اور صاحب بھی بیٹھے تھے۔ چست پاجامہ بند گلے کا کرتا اور کوٹ پہنے ہوئے تھے ... ہوئے تھے۔ لمبا قد آور اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک تھے۔ مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔ حقہ پینے میں مشغول تھے۔ جیلر صاحب کے ساتھ دسترخوان پر منتظر بیٹھے تھے۔

معاف کیجئے دیر ہو گئی۔ خواہ مخواہ آپ کو زحمت اٹھانی پڑی۔ میں نے معذرت چاہی۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ آپ سے ملو، ٹھاکر کشن سنگھ ... اسٹیٹ کے مالک مشہور شکاری، بڑے خلیق اور انسان دوست ... پر کرم فرما ہیں ... آئے ہیں مجھ سے فرد ... ہیں۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ جیسے ناشر کہتے ہیں یہاں ... ملازم ہوں ... میں نے ... ٹھاکر صاحب نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ کھانے میں انواع و اقسام کی چیزیں تھیں۔ کم از کم دس بارہ ڈشیں ہوں گی مگر تھیں سب بہت ہی مزے دار۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ ٹھاکر صاحب لطیفے سناتے رہے۔

"پنڈال کب جا رہے ہو؟" جیلر صاحب نے سوال کیا "کل کسی گاڑی سے یا پھر ٹرالی سے چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"قیام کا کوئی بندوبست ہوا یا نہیں۔ وہ تو بڑی اجاڑ سی جگہ ہے کیسے گزارا کرو گے؟"

"اول تو کیبن میں رہوں گا اگر وہ غیر محفوظ ہوا تو پھر آبادی میں کوئی جگہ کرائے پر لے لوں گا میرے خیال میں تو زیادہ بات ٹھیک رہے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" جیلر صاحب نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گئے میں نے ٹھاکر صاحب کو دیکھا وہ اطمینان سے کافی کی ایک دوسری گرم پیالی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"چائے، قہوہ یا کافی کی پیالی اگر لب دوز اور لب سوز ہو تو لطف دوبالا ہو جایا کرتا ہے۔" انہوں نے چسکی لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "آپ بھی لیجئے نا۔"

"جی ہاں، مگر میری تو ابھی یہی ختم نہیں ہوئی۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے قیام کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔" جیلر صاحب نے مہر سکوت توڑی۔ "تم ٹھاکر صاحب کی حویلی میں رہنا تمہارے ساتھ بال بچے تو ہیں نہیں ایک کمرہ کافی ہوگا۔ کیوں ٹھاکر صاحب ٹھیک ہے نا؟" ٹھاکر صاحب چونک پڑے۔

"جی ہاں آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پوری حویلی اپنے استعمال میں لائیں جیسے چاہیں رہیں۔ گو میں نے کسی وجہ سے حویلی کا تذکرہ مناسب نہ سمجھا تھا اب مجھے خجالت ہو رہی ہے۔ بھگوان جانے آپ کیا سمجھیں گے۔"

"ارے صاحب تکلف برطرف کوئی خاص بات ہو تو بتا دیجئے۔ اتفاق سے یہ بھی یہیں بیٹھے ہیں اور یہ بھی کوئی حل نکال ہی لیں گے۔" جیلر صاحب نے کہا۔

"اچھا تو سنیئے۔" ٹھاکر صاحب نے کہنا شروع کیا "پنڈیر کا وسیع و عریض قلعہ شاید آپ نے دیکھا ہو۔ آپ کے اور ہمارے شاہان سلف کی یادگار ہے۔ مرہٹوں اور انگریزوں کی ایک مشہور لڑائی کا مقام بھی یہی ہے ... قلعے کی حفاظت کے بعد سے اس قلعے کا کوئی پرسان حال نہ تھا یہ اجاڑ ہو گیا۔ یہاں تھوڑی سی آبادی اس کے چاروں طرف رہ گئی تھی۔ میں نے قلعے سے ملحق حویلی جو دراصل قلعے کا ایک حصہ ہی سمجھو گا۔ انتہائی خستہ حالت میں خرید لی۔ پھر اس کی دوبارہ مرمت کرائی کچھ اضافہ کیا تب وہ اس قابل ہو سکی کہ کوئی شریف آدمی اس میں رہ سکے۔ میرا خیال تھا کہ اسے چھوٹے سے عجائب گھر میں تبدیل کر دوں۔ آپ جانتے ہی ہیں مجھے قدیمی نوادرات سے بہت ہی لگاؤ رہا ہے۔ میں ایسے نوادرات جمع بھی کرتا رہا ہوں۔ کھدائی کے دوران مجھے چند چیزیں دستیاب ہوئیں۔ جنہیں میں نے اسی حویلی کے ایک کمرے میں بحفاظت رکھ چھوڑا ہے۔ خیر یہ تو تمام جزئی باتیں ہیں۔ حویلی بن کر تیار ہوئی تو میں نے ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ علاوہ ازیں شہر میں سے بیشتر افراد نے اس میں شرکت کی غربا اور مساکین میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ لوگ خوشی خوشی آئے اور چلے گئے۔ صرف میں، میرے اہل خاندان اور نوکر چاکر رہ گئے۔ رات کو وہیں سونے کا اہتمام کیا گیا یہ حویلی میں ہماری پہلی رات تھی۔ اس کمرے کو جس میں چند اشیاء رکھی ہوئی تھیں میں نے بند ہی رکھا کوئی ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا۔ میں بہت تھک چکا تھا، گھر کے دوسرے افراد بھی سو چکے تھے اچانک شیر کے گرجنے اور دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ میرے نوکر گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور انہوں نے سب کو اٹھا دیا۔ دھاڑنے کی آواز دم بدم قریب آتی گئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ حویلی کے اندر سے آ رہی ہو۔ اب ہم کیسے ... آتی تھی ہم سب بندوقیں اور تلواریں لئے بیٹھے رہے۔ میں نے بدحواسی میں دو چار فائر کر دئے۔ شیر کی آواز تو آنی بند ہو گئی مگر آہ و فغاں، دھینگا مشتی اور ہنسی ٹھٹھوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور صبح تک جاری رہا۔ جیلر صاحب ایک ہولناک آواز تو میں قیامت تک نہیں بھول سکتا ایسی آواز جیسے کسی کا گلا دبانے پر نرخرے سے نکلتی ہے۔ پھر انتہائی خوفناک قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ میری بیوی بچے رات بھر ڈر کے مارے سہمے رہے۔ صبح ہونے پر میں نے دیکھا کہ حویلی کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں اور وہ کمرہ بھی جسے میں نے خود تالا لگا کر بند کیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز جوں کی توں تھی۔ انجانے خوف سے ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے آبادی میں بڑے بوڑھوں سے بہت کچھ استفسارات کئے مگر ہر ایک نے نفی میں جواب دیا۔ انہیں نہیں معلوم۔ میرے بیوی بچے اور بیشتر نوکر تو اسی

مستقل

ی سے چلے گئے مگر ہر شب ڈھائی بجے وہ آواز پھر سنائی دیتی۔ یہ اس کا معمول
بن گیا تھا۔ میں نے پنڈتوں کو بلایا۔ انھوں نے منتر پڑھنا شروع کیا۔
وہ پڑھتے رہے۔ اچانک رات میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس
نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹھاکر صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے
سگار کی لے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا۔ ؟" بیک وقت ہماری زبان سے نکلا۔ ٹھاکر
ہمارا حد سے بڑھا ہوا اشتیاق دیکھ کر مسکرائے۔

ہوا یوں کہ حویلی کی فضا اور ہوا انتہائی گرم ہو گئی۔ بیٹھنا
دشوار ہو گیا۔ پنڈتوں نے سوچا کہ شاید گرمی کئی من لکڑی کے
جلنے سے ہے۔ انھوں نے بجائے قریب بیٹھنے کے دائرہ
بڑا کر دیا مگر گرمی کسی طرح کم نہ ہوئی۔ میں ابھی تک باہر پنڈتوں
سے گرد و گھومتی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ جو گرمی کی شدت
سے گھبرا کر دور جا بیٹھے تھے لیکن اب گرمی ناقابل برداشت
ہو گئی تو میں اپنے کمرے میں جا لیٹا۔ اچانک کسی کے رونے اور چلانے کی
آواز دھیمی دھیمی سی سنائی دی۔ پھر وہ آواز بتدریج بڑھنے
لگی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آواز قریب کے کمرے سے آ رہی ہو۔
صورت حال معلوم کرنے کی غرض سے قدم باہر نکالا ہی
تھا کہ ایک مہیب چیخ کی آواز کو نجی ساتھ ہی الاؤ کی آگ بلندی
تک پہنچی یہ دیکھ کر ایک پنڈت نے ایک کرگمی کا مٹی اس میں ڈال
دیا جس میں سے ایک زبردست دہکتا ہوا شعلہ آسمان کی طرف
لپکا اس کا رنگ نارنجی ہو گیا اس نارنجی روشنی میں ایک
دھندلی انسانی شکل نمودار ہوئی۔ چند ثانیے بعد وہ آگ کے
شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ یکایک ہی الاؤ جل اٹھا اب وہ پہلے جیسی
روشنی نہ تھی۔ میں نے دیکھا پنڈت خوف سے تھر تھر کانپ رہے
تھے اور اپنا کاروبار بند کر رہے ہیں۔ میں ان کے گرو رگھو جی کے
پاس گیا اور ان سے کہا کہ یہ سب کیا ہے۔ منتر کیوں نہیں پڑھے
جا رہے۔
"بھگوان کی اچھا یہی ہے ہم بدروحوں کو بھگا سکتے ہیں۔
آتما کی کشش کو نہیں مار سکتے۔ آپ اس حویلی میں رہنے کا خیال
چھوڑ دیں۔" اس نے کہا "اب ہم کسی ایک کمرے میں ابھی چلے جائیں گے
لیکن آپ اور سب لوگ بھی چلے جائیں گے۔" تب میں نے انھیں کمرہ
دے دیا جس میں وہ تمام بند ہو گئے۔ خود وہ رات میں نے جاگتے گزاری
صبح ہوتے ہی نہ صرف وہ لوگ بلکہ میں بھی شہر چلا گیا جس کے
بعد حویلی اسی طرح بند پڑی ہے یہی وجہ تھی کہ میں نے اب
تک شادی نہ کی۔

تک زبان نہ کھولی تھی ورنہ آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے ٹھاکر
صاحب نے اپنی داستان ختم کی۔
"ٹھاکر صاحب معاف کیجئے وہ چیزیں کیا تھیں جو آپ کو
کھدائی کے دوران دستیاب ہوئی تھیں کہ آپ بتانا بھول گئے یا نشہ
آپ نے ذکر نہیں کیا۔" میں نے پوچھا۔

"چیزیں کیا تھیں۔ ؟" انھوں نے میرا سوال دہراتے
ہوئے جواب دیا۔ "پیتل کی ایک مورتی کا لوٹا کا شیرا اور سفید چکنی مٹی
(جسے پنڈول کہتے ہیں) کا ایک سر۔ بس یہی تین چیزیں ملی تھیں جنھیں
میں نے ایک کمرے میں شیشے کے کیس میں وہیں رکھ چھوڑا ہے۔"
"مٹی کے سر کی آپ کچھ تشریح کرنا پسند کریں گے۔" میں نے
ایک اور سوال کیا۔

"بس وہ مٹی کا بنا ہوا سر ہے عام انسانی سروں کی طرح
کا کاریگری کا جیتا جاگتا نمونہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایسی
کوئی بات تو نہیں جو تشریح طلب ہو یا جسے آپ پوچھنا چاہیں۔"
ٹھاکر صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اب چلنا
چاہیئے۔ "مگر ناصر صاحب اب آپ کا کیا خیال ہے۔" انھوں نے مجھ
سے پوچھا۔ جیلر صاحب نے بھی میری طرف سوالیہ نظروں سے
دیکھا۔ "میں بخوشی اس حویلی میں رہنے کو تیار ہوں۔
بہ حیثیت مسلمان میرا عقیدہ ہے کہ موت صرف ایک بار آتی ہے
بھوت، پریت اور روح کشش ہمارے نزدیک سب اوہام ہیں۔"
میں نے جواب دیا۔
"خوب اچھی طرح سوچ لیجئے، بھگوان نہ کرے آپ کو کوئی نقصان
پہنچے۔ جیلر صاحب آپ بھی انھیں سمجھایئے۔"
"میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ جیلر صاحب ایک مسلمان
ہونے کے ناطے یہی کہیں گے جو میں نے ابھی کہا ہے۔ اگر کوئی مافوق
الفطرت بات ہوئی تو میں وہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہروں
گا۔ جیلر صاحب بھی میرے ہمراہ چلیں تو لطف دوبالا ہو جائیگا۔
کیوں جیلر صاحب۔" میں نے پوچھا۔
"کیوں نہیں بھائی سچ پوچھو تو تم نے میرے منہ کی بات
چھین لی۔ میری خاموشی کو بزدلی پر محمول مت کرنا مجھے یہ
ایک موقع فراہم ہوا ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتا ٹھاکر صاحب
آپ چابی بھجوا دیجئے گا۔" جیلر صاحب نے کہا۔
"چابی سارے آپ لوگ وہاں پہنچیں تو میں میرا ایک نوکر
وہاں موجود ہوگا۔ ہو سکتا ہے ایک ہفتے کے اندر میں خود آپ
لوگوں کے پاس چلا آؤں۔" ٹھاکر صاحب نے جاتے ہوئے کہا۔

"فرزند تشریف لائیں۔ پیارا زندہ صحبت باقی۔" روانگی
میں اگرچہ ایک دن باقی تھا لیکن میری مہم جو فطرت حویلی پہنچنے
کے لئے بیقرار ہونے لگی۔ چونکہ جیلر صاحب کو تیاری کے لئے
وقت چاہئے تھا میں نے کوئی اصرار نہیں کیا اور اپنی تیاری کے
سلسلے میں گھر چلا گیا۔

دوسرے دن دوپہر سے قبل ہم حویلی پہنچ گئے۔ جہاں
ایک بوڑھے مگر صحت مند آدمی نے ہمارا استقبال کیا۔
"میرا پورا نام جگناتھ ہے۔ مگر لوگ جگن کہتے ہیں۔ آپ بھی
اس غلام کو اسی نام سے مخاطب کیجئے۔" اس نے اپنا تعارف
کراتے ہوئے کہا۔
"بہت خوب جگن! کیا تم ہمیں یہاں کے قلعے کی سیر کرا سکتے
ہو۔ ؟" جیلر صاحب نے فرمائش کی۔
"کیوں نہیں، یہاں دو قلعے ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے
پہ۔ ایک بریگی کا قلعہ ہے اور دوسرا اینار کا قلعہ۔ اول الذکر قلعہ
ناہروں (شیروں) کا مسکن ہے۔ وہاں جانے کی بات چھوڑیئے
رہا یہ قلعہ تو اس کی سیر کیا مشکل ہے۔ چلئے۔"
پھر اس نے ہمیں قلعے میں خوب گھمایا پھرایا۔ مہاراجوں کے
کمروں سے لے کر فوجی بارکوں تک دیوان عام، دیوان خاص
اور محل سرا بھی دیکھ لئے۔ جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر تھے تقریباً کئی
سو سال پرانا قلعہ تھا۔ امتداد زمانہ نے اس کی دیواریں خستہ کر دی
تھیں جگہ جگہ سے پلستر ادھڑا ہوا تھا۔ ہم اس فصیل پر گئے
جس سے ملحقہ عمارت ہماری قیام گاہ بننے والی تھی۔ ایک جگہ کی
نشاندہی کرتے ہوئے جگن نے بتایا۔
"وہ نرکنڈ ہے اور اصل میں لفظ نرک کنڈ ہے کہتے ہیں
یہاں ایک راجکمار نے رقابت کے جوش میں کسی راجکماری کا
گلا گھونٹ کر قتل کر دیا تھا اور اپنے رقیب کو اس نرکنڈ میں
پھونک دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن یہاں رہنے والوں کو اکثر
پراسرار آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔"
"کیا تم نے کبھی ایسی آوازیں سنی ہیں۔" جیلر نے پوچھا۔
"اپنی ۶۰ سالہ زندگی میں کئی بار ایسا اتفاق ہوا۔" جگن نے
جواب دیا۔
"مگر ٹھاکر صاحب نے تو ہمیں یہ واقعہ نہیں سنایا۔"
جیلر صاحب نے پوچھا۔
"اس لئے کہ میں نے انھیں یہ واقعہ سنانے کی ضرورت
محسوس نہ کی۔ نہ کسی کا ڈالنے کی ہمت ہوئی کہ انھیں

پھر سُننے، اچھا صاحب [illegible] داخل ہونا ہے ساڑھے پانچ بجے سے پہلے ہمیں حویلی میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ باہر کتوں کی طرح پھرنے لگیں گے۔"

حویلی تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہ لگا۔ کہیں دور سے فیر کے دھماکے کی آواز آ رہی تھی۔ دو منزلہ حویلی میں تین اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ صرف سامنے کے رُخ پر صدر دروازہ تھا۔ بیچ میں بہت بڑا صحن تھا جس میں ایک طرف پرانی باؤلی تھی جو ڈھک دی گئی تھی۔ ہمارا بڑا کمرہ صدر دروازے کے برابر تھا اس کے بالکل دوسرے سرے پر وہ کمرہ تھا جس میں تینوں اشیاء رکھی ہوئی تھیں جگن ہمیں لیکر کمرے تک گیا اس نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ یہ کمرہ بالکل صاف تھا۔ دیواروں پر البتہ کہیں کہیں جالے نظر آ رہے تھے۔ شیشے کی ایک الماری میں کچھ نوادرات جھانکتے ہوئے نظر آئے۔ وہی پیتل کی مورتی، کاٹھ کا شیر اور سفید چکنی مٹی کا بنا ہوا سر جو واقعی انسان کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا۔ جیلر صاحب اس سر کو بغور دیکھتے رہے پھر بولے "ناصر اس سر کو اس کمرے میں لے چلو میں کچھ تفصیل سے دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بے چون و چرا شیشے کا وہ کیس الماری سے نکال لیا جس میں سر موجود تھا۔

جگن خوف زدہ ہو کر باہر نکل گیا اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے تالا لگا کر چابی جیب میں رکھی ہی تھی کہ جگن چلایا۔

"وہ دیکھئے وہ۔ آپ کے کمرے میں ―― بچاؤ…. بچاؤ۔" اس نے اشارہ کیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر چند قدم جا کر گر پڑا۔ شام کا جھٹپٹا تھا جیلر صاحب کے ہاتھ میں کیس تھا۔ میں نے لپک کر جگن کو اٹھایا وہ بے ہوش ہو چکا تھا اسے کمرے میں لا اور جیلر صاحب جگہ جگہ دیکھتے جاتے پھر چل پڑے۔

"کیا دیکھ رہے ہیں" میں نے پوچھا۔

"یہ نشان۔ پاؤں کے نشان۔ دو چھوٹے دو بڑے" انھوں نے جواب دیا۔ میرے دل میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ نشان ہمارے کمرے تک پہنچ کر غائب ہو گئے تھے۔ کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ تھی۔ فرش پر جگن کو لٹا کر میں نے ٹارچ ہاتھ میں لی۔ جیلر صاحب نے کیس کارنس پر رکھا ہی تھا کہ اچانک لیمپ گل ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک مہیب چیخ کے ساتھ دھماکا ہوا۔ میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ اندر چلا یا کون ہے۔ سامنے آئے۔ او بچے ہتھیار کیوں استعمال کرتا ہے۔ میں لیمپ جلانے کی غرض سے دو قدم ہی چلا ہوں گا کہ لیمپ روشن ہو گیا۔ ہم نے کواڑ بند کر دیئے اور جگن کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ جلد ہی اُسے ہوش آ گیا۔

"میں کہاں ہوں صاحب۔" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ "وہ سر کٹا آدمی کہاں ہے جو اس کمرے میں آیا تھا۔"

"نہیں یہاں کوئی نہیں آیا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جو بیٹھے ہیں۔ جاؤ سو جاؤ۔" جیلر صاحب نے اور میں نے عشاء کی نماز پڑھی۔ میں تو لیٹ گیا البتہ جیلر صاحب عملیات پڑھتے رہے۔ انھوں نے چاروں طرف حصار کھینچ دیا اور پھر لیٹ گئے۔ نہ جانے کب مجھے اور انھیں نیند آ گئی۔

رات میں کسی وقت میری آنکھ کھلی۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ پھر لگا جیسے دو تین شخص آپس میں دھینگا مشتی کر رہے ہوں۔ پھر کسی کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔ یکایک ایک مہیب چیخ سُنائی دی۔ ساتھ ہی کسی کے ہولناک قہقہے کی آواز بھی۔ اچانک دروازہ کھلا ہوا کا ایک سرد جھونکا اندر آیا اور لیمپ بجھ گیا جیلر صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے انھوں نے بندوق سنبھال لی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ کمرے سے باہر دیکھا وہاں کچھ بھی نہ تھا لیمپ پھر روشن کر دیا گیا اور رات بھر جاگتے رہے جگن گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا ہم نے اسے نہیں اٹھایا۔

صبح ہوئی تو جگن نے ہم سے رخصت چاہی۔ ہم نے اجازت دے دی۔ وہ شہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔ شام کو چار بجے کے بعد جب واپس آیا تو جیلر صاحب غائب تھے ―― شیشے کے کیس پر نظر ڈالی تو عجیب ہی صورت نظر آئی۔ وہ مٹی کے سر کے بجائے ایک انسانی سر تھا۔ عورت کا کٹا ہوا سر۔ نک نقشہ خوبصورت تھا۔ زمانے کی دست برد سے نہ صرف اس کا چہرہ بلکہ بال تک محفوظ تھے۔ کارنس کے نیچے سفید چکنی مٹی کا ڈھیر تھا قریب ہی چاقو پڑا ہوا تھا جس سے مٹی کھرچی گئی تھی ―― دن بھر جیلر صاحب یہی کرتے رہے مگر اب کہاں گئے میں نے سوچا۔ معاً قدموں کی آہٹ سُنائی دی جیلر صاحب کا ہنستا ہوا چہرہ کمرے میں نمودار ہوا ان کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جو خون اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ خنجر کا دستہ بڑا خوبصورت بنا ہوا تھا۔

"یہ آپ نے کہاں سے لیا۔" میں نے پوچھا۔

"باؤلی کے پاس سے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "اس سے بہت کچھ مدد ملے گی۔" جیلر صاحب نے شیشے کا کیس وہیں کارنس پر بھاری رہنے دیا اور خود اپنا اور میرا پلنگ ایک کونے میں لے گئے دروازے کی چٹخنی لگا کر تالا ڈال دیا گیا۔ لیمپ بجھا دیا گیا۔ یہ اہتمام کر کے وہ بندوق لے کر بیٹھ گئے۔ میں ٹارچ لے کر قریب ہی بیٹھ گیا۔

"دیکھو جب تک میں نہ کہوں ٹارچ مت جلانا۔" رات کے بارہ بجے ہوں گے دروازے پر دستک ہوئی پھر کسی نے دروازہ جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ اچانک کسی کی گھٹی گھٹی دبی دبی چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ پھر کسی نے دروازے کو متعدد بار دھکے دیئے۔ کمرہ جیسے لگا زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پھر ایک زوردار دھماکے سے دروازہ کھل گیا۔ آگ کے شعلے کارنس کی طرف لپکے۔ چھن سے ٹوٹنے کی آواز کمرے میں گونجی وہ شعلے کمرے میں گردش کرنے لگے اور تیزی سے نارنجی دھوئیں میں تبدیل ہونے لگی۔ ہلکی دودھیا روشنی کمرے میں پیدا ہوئی اس میں ایک عورت و مرد کا ہیولا نمودار ہوا اور پھر دھوئیں کے مرغولوں میں تبدیل ہو کر دروازے کے راستے باہر نکل گیا پھر ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا دروازے کے پٹ زور سے بند ہو گئے لیمپ روشن کیا گیا تو مہربات ناقابل یقین تھی۔ دروازہ بند تھا اس میں بدستور تالا لگا ہوا تھا۔ شیشے کا کیس جو گر کر ٹوٹ گیا تھا کارنس پر جوں کا توں موجود تھا۔ خنجر اور سر غائب تھا۔ بس اسی بات سے پتا چلتا تھا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا وہ خواب نہ تھا۔

جگن کے بیان کی روشنی میں جیلر صاحب کو واقعات کی کڑیاں ملانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

راجکماری اور ان کا منگیتر جب رقیب روسیاہ کے غیظ و غضب اور حسد کا نشانہ بن گئے۔ تب بھی رقیب کے انتقام کی آگ سرد نہ ہوئی اس نے راجکماری کا سر کاٹ کر سفید چکنی مٹی کی تہیں چڑھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ راجکماری کی روح اپنے سر کو جسم سے جدا دیکھ کر ہمیشہ بے چین رہے۔ وہی ہوا صدیاں گزر گئیں قلعہ کھنڈر بن گیا جو ملبہ زمین بوس ہو گیا سر مٹی میں دفن ہو گیا مگر راجکماری کی روح اپنے سر کی تلاش میں بے چین رہی آج وہ سر مل گیا تھا اور وہ خنجر بھی جس سے قتل کیا گیا تھا مدتوں کے بعد آج اس کی بے چین روح کو قرار آ گیا تھا۔

*

ایک کلرک کی سرگزشت

ڈی۔ کے کنول



جی ہاں میں ایک کلرک ہوں۔ وہ بھی لوئر ڈویژن۔ میرا نام کنگال چند ہے جو میرے لئے موزوں اور مناسب ہے میرا باپ مایا چند بھی کلرک ہی تھا۔ وہ کلرک ہی پیدا ہوا تھا اور کلرک ہی مرگیا۔ اس لئے کلرکی مجھے ورثے میں ملی ہے۔

میری ماہانہ آمدنی (اوپر والی نہیں) ڈیڑھ صد روپیہ ہے جس سے میں چار بدنصیب بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ اپنی کلوتی بیوی کے ناز و نخرے برداشت کرتا ہوں، اس کی جھڑکیاں سنتا ہوں۔ کیونکہ وہ ایک لوئر ڈویژن کلرک کی بیوی ہے اور ہر لوئر ڈویژن کلرک کی بیوی کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے خاوند کو گھوڑکے جھڑکے۔

میرے پڑوس میں ایک اپر ڈویژن کلرک رہتا ہے۔ خوشی رام۔ اس کے گھر میں ریفریجیریٹر ہے۔ ریڈیوگرام ہے ٹیپ ریکارڈر ہے۔ درجنوں سوٹ اور درجنوں ٹائیاں ہیں۔ اس کی بیوی کوئلے سلگاتے وقت اپنے نصیبوں کو نہیں کوستی بلکہ فلمی گانے گاتی ہے۔ اور نت نئی ساڑیاں پہنکر وہ محلے کی عورتوں کو جلاتی رہتی ہے۔

خوشی رام چونکہ اپر ڈویژن کلرک ہے اس لئے وہ افسروں کا لاڈلا ہے۔ وہ اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ پیتا ہے اور دھواں لوئر ڈویژن کلرک کے منہ پر اڑاتا ہے۔ وہ دیر سے دفتر آتا ہے اور پہلے نکل جاتا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی اسکی شکایت کرے۔ وہ افسروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا ہے اور بل اپنی جیب سے چکا دیتا ہے۔ اس کی بیوی کلب کی ممبر ہے اور وہ ہر روز کلب جاتی ہے اور بیرے کو دو دو روپے ٹپ دے دیتی ہے۔

اقصات نئی دہلی

میری بیوی گیلی لکڑیاں جلاتی ہے اور لکڑیوں سے اٹھنے والے دھوئیں سے اس کی بینائی اس قدر کمزور ہوگئی ہے کہ اب وہ مجھے پہچاننے میں بھی دھوکا کھانے لگی ہے۔ میں نے اس کے لئے نظر کی عینک بنوائی۔ اس کی عینک بنوانے کے لئے مجھے سو روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ جب وہ گیلی لکڑیاں جلاتی ہے تو میرا بائی کا یہ دوہا گاتی ہے۔

لکڑی جل کوئلا بھئی۔ کوئلا جل بھیا راکھ
میں پاپن ایسی جلی۔ کوئلا بھئی نہ راکھ

جب وہ یہ دوہا گاتی ہے تو اس کی آواز میں اسقدر سوز ہوتا ہے کہ مجھ پر رقت طاری ہوجاتی ہے۔ ہائے میری رکمنی جو بابل کے گھر سے بھرپور جوانی اور بھرپور شباب لیکر آئی تھی۔ سب اس گھر پر نچھاور کر گئی۔ جب وہ اس گھر سے ارتھی میں سوار ہوکر نکلے گی تو ہڈیوں کا ڈھانچا لے کر ہی جائے گی اور اسکا مردہ مجھ سے کہے گا "دیکھو جی! تمہارے گھر سے کچھ بھی لے کر نہیں گئی۔ پھر نہ کہنا رکمنی تمہارا کچھ لے گئی ہے۔ ایک پنجر ہڈیوں کا لے جارہی ہوں۔ یہ بھی نہ لیتی، پر کیا کروں چتا جلانی پڑے گی۔ وہاں کچھ نہ کچھ ہونا ہی چاہیے"

میں جواب میں ہچکیوں کے بیچ میرا بائی کا یہی دوہا گانے لگوں گا۔

لکڑی جل کوئلا بھئی۔ کوئلا جل بھیا راکھ
میں پاپن ایسی جلی۔ کوئلا بھئی نہ راکھ

نہ جانے میرا جنم کیسی بری ساعت کو ہوا تھا۔ میری جنم کنڈلی بھی بتاتی ہے کہ میرا جنم کسی اشبھ (منحوس) گھڑی کو ہوا تھا۔ ہنگائی اور تنگ دستی میرے پیچھے یوں لگی ہے جیسے قاتل کے پیچھے پولیس۔ اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ مجھے نوکری سے جواب مل چکا ہے۔ مگر میں اس کتے کی طرح ہوں جو مالک کے ڈنڈے کھانے کے باوجود بھی اسی کے دروازے پر دم ہلانے چلا آتا ہے۔

چھٹی لینے کے لئے مجھے ہزاروں جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنی بیماری کا بہانہ کبھی رکمنی کی بیماری کا۔ کبھی نانی کی قبر اکھیڑ ڈالی۔ نہ جانے کتنی مرتبہ نانی کو نانا کو، دادی اور دادا کو مار چکا ہوں۔

ایسا کیوں ہے۔ خوشی رام میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور میں بھی ایک انسان ہوں۔ یہ ایک پر کرم اور ایک پر ستم کیوں ہے۔

میرا باپ مایا چند جس کرسی پر بٹھا گیا تھا۔ یگ بدلے۔ دنیا بدلی، مگر میں وہاں سے نہیں ہلا۔ شاید مرتے دم تک مجھے اسی کرسی کے ساتھ چپٹا رہنا پڑے گا۔

بقیہ صفحہ ۵۰

...الدین ۔ دہلی

س ۔ مسلمانوں کو صحیح لیڈری کب نصیب ہوگی۔؟

ج ۔ یہ تو مسلمانوں کے عقل و شعور پر منحصر ہے کہ وہ کب تک خود ساختہ لیڈروں کو مرغ و ماہی پیش کرتے رہیں گے اور کب تک ترقی کے راستوں کو تاریک بنائے رکھیں گے دراصل لیڈر خود پیدا نہیں ہوتے بلکہ قوم پیدا کرتی ہے

س ۔ ہندوستان کے کچھ مشہور اشخاص نے غالب ہی کو اپنا موضوع کیوں بنا لیا ہے ۔؟ جب کہ اردو ادب میں بہت سی ایسی شخصیات بھی ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے

ج ۔ دراصل غالب کے نام پر حکومت سے زرا معقول خیرات مل جاتی ہے ۔ ورنہ یہ بات تو ان لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ غالب کی زندگی کے ہر گوشے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب مزید قلم طرازی کی ضرورت نہیں ہے۔

...اللہ شریف ۔ بہار

س ۔ آزادی کے بعد اب تک ہندوستان میں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا جا چکا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی انسانیت جو اب نام نہاد بنگلہ دیش پر جاگ اٹھی ہے وہ کہاں دفن ہو گئی تھی ؟۔

ج ۔ ہندوستانیوں کے سیکولر اور ترقی پسند حلقوں نے ہمیشہ ان فسادات کے خلاف آواز اٹھائی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر ہندوستانی اپنی جاہلیت اور غریبی کی وجہ سے جذبات میں بہہ کر فرقہ پرست لیڈروں کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ فرقہ پرستی سے لڑنے کی ذمہ داری ہم سب کی ہے اور اس سے لڑنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم اور ذہنی بیداری پیدا کی جائے اور ان کے معاشی حالات کو بہتر بنایا جائے ۔

س ۔ جب ہم خود کشمیر ، ناگا لینڈ ، میزو لینڈ کو فوج کے بل بوتے پر کنٹرول کر رہے ہیں تو پاکستان کو کیونکر الزام دے سکتے ہیں کہ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کو فوج کے بل بوتے ... ؟

پر کچل رہا ہے ؟۔

ج ۔ ان میں سے کسی علاقے میں حکومت فوج کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔ یہاں پر لوگوں کی جمہوری حکومتیں قائم ہیں ویسے بھی کسی ایک برائی کو دوسری برائی کا جواز نہیں بنایا جا سکتا ۔

میر احمد علی قیصر ۔ کریم نگر

س ۔ نواب آف پٹودی دوبارہ کھیل کے میدان میں کیا بن کر آئیں گے ؟۔

ج ۔ کرکٹ کے بعد نواب صاحب نے سیاست سے کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ انھوں نے اور انکی والدہ نے جن سنگھ اور سوتنتر جیسی فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتوں کا سہارا لیا لیکن اس کھیل میں وہ بری طرح ناکام ہوئے اب نواب صاحب کا ارادہ پیسے سے کھیلنے کا ہے۔ یعنی وہ بزنس شروع کر رہے ہیں ۔

محمد وسیم الدین ۔ کلکتہ ۱۳

س ۔ مشرقی پاکستان میں مکتی فوج کے سورماؤں نے جو نہتے اور مظلوم غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا ۔ اس پر آپ خاموش کیوں ہیں ؟۔

ج ۔ ظلم بہر حال ظلم ہے ۔ ہم نے سیلون میں ہونے والے ظلم ، بنگلہ دیش میں غیر بنگالیوں اور بنگالیوں پر ہونے والے ظلم کی مخالفت کی ہے ۔ لیکن آپ ہزاروں بے گناہ ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام کا جواز چند غیر بنگالیوں پر کئے گئے ظلم میں تلاش نہیں کر سکتے ۔ کوئی ایک شخص اس قتل عام کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ اس کی جڑیں پچھلے ۰ سال کی ہند و پاک کی تاریخ میں کہیں تلاش کرنی پڑیں گی ۔

غلام رسول ۔ کلکتہ

س ۔ یحییٰ خاں بنگالیوں کے لئے تیمور اور مجیب الرحمٰن غیر بنگالیوں کے لئے ہلاکو خاں ہے ؟

ج ۔ نہ یحییٰ خاں تیمور ہیں اور نہ مجیب الرحمٰن ہلاکو ۔ جھگڑا معاشی ہے ، کسی شخص کا نہیں بلکہ دو طبقوں کا ہے سرمایہ داروں کا اور غریبوں کا ۔ مسئلہ معاشی ہے اسلئے اس کا کوئی معاشی حل ہی ممکن ہے ۔

س ۔ مغربی پاکستان کی مسلم ملٹری نے مشرقی پاکستان کی مسلم آبادی پر قتل ، عصمت دری اور لوٹ مار کو جائز جانا ۔۔۔۔۔۔ مشرقی پاکستان کی مسلم آبادی نے مہاجرین غیر بنگالی آبادی پر قتل ، عصمت دری اور لوٹ مار کو جائز سمجھا ۔

ج ۔ اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ ، یہ تو شاید وہی جانتے ہیں جن پر یہ ظلم ہوا ہے ۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہوا برا ہوا ۔ اب ان مظلوم لوگوں کی مدد کرنا ہمارا اور آپ کا فرض ہے ۔

سید ارشد علی ۔ رامپور

س ۔ ایک خیال ہے کہ نئی دہلی کو صرف سجانے کے لئے جو رقم خرچ کی گئی ہے وہ کئی چھوٹے شہروں کی ترقی کے لئے کافی تھی ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟۔

ج ۔ جی ہاں یہ خیال درست ہے ۔ اور یہ بھی درست ہے کہ چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع شدہ دولت کی اگر مناسب تقسیم ہوتی ۔ تو کروڑوں ہندوستانیوں کی حالت سدھر سکتی تھی ۔ لیکن کیا آپ سرمایہ داروں کی حکومت سے کسی بہتری کی توقع رکھتے ہیں ؟۔

س ۔ کفایت شعاری کس حد تک ہونا چاہئے ۔

ج ۔ جس حد تک بھی ہو بہتر ہے ۔ لیکن یہ نسخہ اختیار کرتے وقت دماغ کو حاضر رکھنا چاہئے ۔ ویسے اس سلسلے میں یہ واقعہ سن لیجئے ۔

" ایک صاحب شام کو دفتر سے گھر واپس آئے تو غیر معمولی طور پر ہانپ رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے ۔ بیوی کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ آج ۲۵ پیسے کی کفایت کی ہے ۔ اور وہ یہ کہ گھر میں بس نہیں بلکہ بس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آیا ہوں ۔ بیوی نے منہ بنا کر کہا ۔ یہ کہاں کی کفایت ہے ۔ اگر ٹیکسی کے پیچھے بھاگ کر آتے تو پانچ روپے کی کفایت ہوتی ۔

میری ترقی کی فائل بننے کے ... سفر پر نکلی تھی ساٹھ سال چند پر پہنچ گیا مگر میری فائل ڈائریکٹر کی ٹیبل تک نہ پہنچی۔ میری فائل کو ایک میز سے دوسری میز تک جانے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ نہ جانے اس فائل کا سفر کب ختم ہونے کو آئے گا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں پرموشن کی حسرت لئے ہی مر جاؤں گا۔ اور باقی حسرتوں کی طرح یہ حسرت بھی حسرت ہی رہے گی۔

ہمارے محلے میں افسر لال رہا کرتا تھا۔ اس کی ماں اکثر میری ماں سے ملنے آیا کرتی تھی اور میری ماں سے کہا کرتی تھی "میرا لال بہت بڑا افسر بنے گا۔ اس کے دائیں بائیں موٹریں ہی موٹریں ہوں گی۔ اس کی جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کوئی بڑا افسر بنے گا" میری ماں جوابًا کہتی:۔

"تیرا بیٹا اگر افسر بنے گا تو میرا لال کوئی للو جا نہیں بنے گا۔ وہ بھی کوئی بڑا افسر بنے گا۔ اس کی جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کوئی بہت ہی بڑا بابو بنے گا۔ اس کے آگے پیچھے سرکاری کاغذ ہی کاغذ ہوں گے"

جیوتشی کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ افسر لال محکمہ ٹریفک میں ملازم ہو گیا اور ایک ایسے چوک میں اس کی ڈیوٹی لگ گئی جہاں چاروں اطراف گاڑیاں ہی گاڑیاں دوڑتی بھاگتی رہتیں۔ افسر لال ان گاڑیوں کو ہاتھ دکھا دکھا کر راستہ دیتا تھا ـــــــ میں ایک سرکاری محکمے میں کلرک بھرتی ہوا۔ ہیڈ کلرک: آگے پیچھے فائلیں ہی فائلیں۔

آزادی کی بدولت ملک نے کس قدر نمایاں ترقی کی ہے مگر ابھی تک کسی سائنسداں نے کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کی جو فائل کو ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل تک پہونچا سکے۔

جس طرح کوئی سائنسداں ایسی مشین ایجاد نہ کر سکا اسی طرح یہ آزادی بھی ہمارے دلوں میں حب الوطنی اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا نہ کر سکی۔ خوشی رام آزادی کے گن گاتا ہے کیونکہ یہ آزادی اس کے لئے رحمت بن کر آئی ہے۔ جبکہ یہاں تو زمانے بھر کے جور و ستم مجھ پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ خوشی رام کے گھر میں آسودگی اور خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ میرے گھر میں زمانے بھر کی تیرگیوں اور شکستوں نے ڈیرہ جما رکھا ہے۔ جب خوشی رام کا پسندیدہ پروگرام یہ نغمہ گاتا ہے "جھوم لو۔ جھوم لو" تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے خوشی رام کا ... مجھ پر پھبتی کس رہا ہو۔ میری مجبوریوں کا مذاق اڑا رہا ہو۔ مختصراً یہی ہے میری سرگزشت۔ ▬

بقیہ سایہ ...

لیکن اس میں اتنا حوصلہ کہ وہ ایسا کرنے کی بھی سکت نہیں تھی بعض اوقات تو وہ کئی ماہ کا کرایہ ادا ہی نہ کرتا۔ اس کی بیوی بیمار تھی، اسے تپ دق ہو گئی تھی، بیوی کا علاج تو ایک طرف رہا اس کی پرہیزی کی غذا کے لئے بھی پو کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے بعض اوقات وہ کئی دن کچھ کھائے پیئے بغیر گزار دیتے۔ جب ان کے باغ میں گیندے پر پھول آتے وہ انہیں ابال کر کئی کئی دن اپنی گزر اوقات کیا کرتے۔

جب ہمسایوں کو معلوم ہوا کہ پو اور اس کی بیوی بھوکے مر رہے ہیں تو وہ ان کے لئے کھانا لاتے۔ کتنی قابل رحم بات ہے ان سب تلخیوں کے باوجود پو کے پاس گیت لکھنے اور ورجینیا کے پاس محبت کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اسی لئے اپنی مفلسی کے باوجود وہ خوش تھے۔

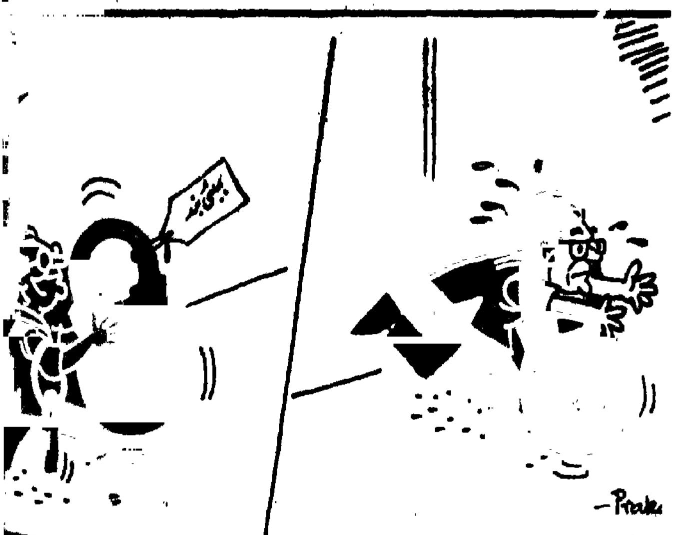
ورجینیا نے اسی مکان میں وفات پائی۔ اپنی موت سے کئی ماہ قبل وہ علالت کی حالت میں کھاٹ پر لیٹی رہتی۔ اس کے تن پر اتنے کپڑے بھی نہ ہوتے کہ اسے گرم رکھ سکیں۔ جب وہ زیادہ سرد ہو جاتی تو اس کی ماں اس کے ہاتھ اور پو اس کے پاؤں ملنے لگتا۔ پو اپنے پرانے فوجی کمبل سے اس کا کانپتا ہوا جسم ڈھانپ دیتا۔ رات کے وقت وہ بلی کو اس کے پاؤں کے درمیان سونے پر مجبور کرتا۔

جب وہ فوت ہو گئی تو پو کے پاس تجہیز و تکفین کے لئے ایک آنہ بھی نہ تھا۔ تو ہمسایوں نے مل کر یہ رسم ادا کی۔

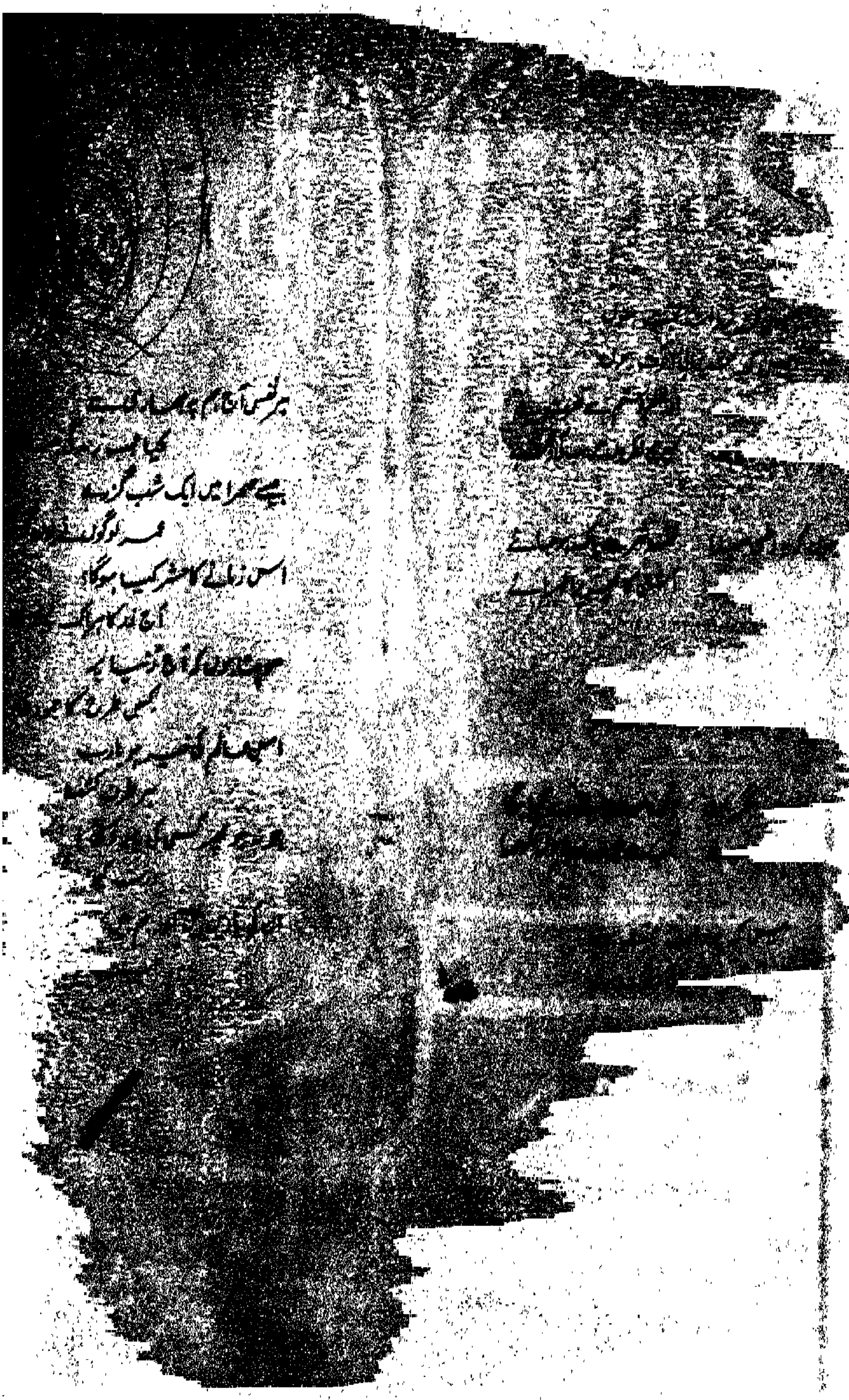
کئی برس پہلے نیویارک کی حکومت نے وہ مکان خرید کر اسے ایک زیارت گاہ بنا دیا ہے۔

ورجینیا جنوری میں فوت ہوئی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ موسم بہار آتا اور چلا جاتا۔ چاند سیب کے درختوں پر لٹکتا رہا، اور ستارے مغربی افق پر ٹمٹماتے رہے۔ لیکن پو بیٹھا اپنی بیوی کی محبت میں جلتا رہتا۔ اس تپش کی بدولت اس نے ایک ایسی پیاری نظم لکھی۔ جو محبت کا لازوال تحفہ ہے۔

"چاند جب بھی آیا
اپنے ہمراہ اپنا بل بلی کے حسین خواب لے کر آیا
ستاروں کی چمک سے
مجھے اپنا بل بلی کی
خوبصورت آنکھوں کی چمک یاد آ گئی
میں ساری رات اندھیرے کی چادر میں ملفوف
سمندر کے کنارے
اپنی زندگی، اپنی پیاری بیوی کی قبر میں
اس کے پہلو میں سویا رہتا ہوں"



بمبئی میں ایس۔ ایس۔ پی کا بمبئی بند ناکام ہو گیا۔



اس زمانے کا حشر کیا ہوگا

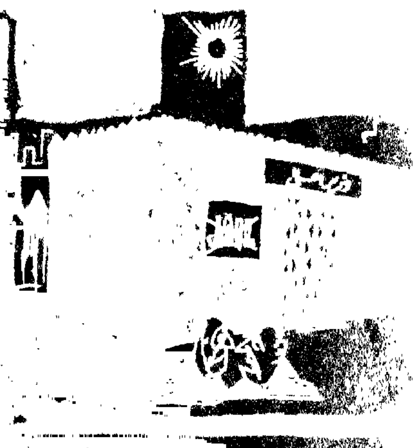


ہم نے اپنی امن پسند پالیسی پر عمل کرتے ہوئے
سوامی جی کے ہاتھ میں سے تلوار لے کر زردہ پکڑا دیا ہے











واقعات
پندرہ روزہ
نئی دہلی



واقعات

پندرہ روزہ نئی دہلی

آگست سنہ ۱۹۷۱ء

نصف اوّل

دوسرا سال ۔ اٹھارھواں شمارہ

مدیر

عبدالوحید صدیقی

دفتر

بی۔۱ نظام الدین ایسٹ ۔ نئی دہلی

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

ایک کاپی کی قیمت ۵۰ پیسے سالانہ ۱۸ روپے

مضامین نثر و نظم خواہ کسی نوعیت سے وصول ہوں ان کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مدیر کو کلی اختیار ہے۔
مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

واقعات میں شائع شدہ مضامین "واقعات نئی دہلی" کے حوالے سے شائع کرنے کی عام اجازت ہے۔

انتظامی او مطالبتی امور متنازعہ کے فیصلے کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا۔

مدیر طابع اور ناشر عبدالوحید صدیقی
مطبع الجمعیۃ آفسیٹ پریس۔ دہلی ۶



ساحل سلطانپوری

"اس سے پہلے بھی زمیں
خونِ انساں سے ہوئی ہے لالہ رنگ
ہاتھ ظلم و جبر کے
اس سے پہلے بھی اٹھے، خنجر براں لئے
اس سے پہلے بھی جلے گلشن کئی
اس سے پہلے بھی لٹے آنگن کئی
ہیروشیما، ناگاساکی، ویتنام
کوریا، ارضِ فلسطیں
ہر جگہ انسانیت کچلی گئی
ہر جگہ تہذیب کو روندا گیا
قتل ہوتے ہی رہے اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وفا
آج بنگلا دیش میں
ظلم کا عفریت پھر
پی رہا ہے آدمیت کا لہو
کل مگر

یہ لہو
یہ عورتوں، بچوں کا، بوڑھوں کا، جوانوں کا لہو
یہ لہو محنت کشوں کا اور کسانوں کا لہو
ایک سیلِ بیکراں بن جائے گا
اور یہ لاشوں کا ڈھیر
دیکھتے ہی دیکھتے آتش فشاں بن جائے گا
اس گھڑی
جب نہ ہوگی کوئی بھی جائے اماں
تنگ ہوگی یہ زمیں ۔ دُور ہوگا آسماں
ظلم جائے گا کہاں تب ؟

[illegible]

یہ کیسی ہے بزمِ خرد کی تجلّی ؟
اندھیروں کا کوئی مسیحا نہ پایا
ہر اک سمت خوف و خطر کا ہے پہرا
ہر اک سمت قاتل ہر اک سمت رہزن
کئی قافلے لٹ گئے بے بسی میں
جدھر دیکھئے ہے لٹیروں کا مسکن
کہاں ظلم آرائیوں کی نمائش
کہاں آگ اور خون کی وارداتیں
چمن کے نگہباں ہی صیاد نکلے
ستم کے ارادوں کی سنگین گھاتیں
حجابات کے سلسلے ختم کردو
نئی روشنی لاؤ شمس و قمر سے
یوں ظلمت کدوں میں نہ اب منہ چھپاؤ
کہ ذوقِ نظر لے لو حسنِ سحر سے
تمہیں سب مسیحائے دوراں کہیں گے
غموں کی اذیت کو محدود کردو
یہ آنسو تہہ خاک ہونے نہ پائیں
ستم کی حدیں آج مسدود کردو
کوئی ماں نہ پھر روئے
کوئی باپ ڈھونڈے نہ لا

دستور میں ترمیم
دستور کے خلاف!

انسان کے وضع کردہ قوانین یا ضابطے کسی وقت بھی خامیوں سے پاک نہیں رہے ہیں۔ ان میں حالات کے مطابق ہمیشہ ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ اس لیے اگر ہندوستان کے دستور میں ترمیم و تنسیخ ہوتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن تعجب کی یہ بات ضرور ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں میں احساسِ برتری حد سے تجاوز کر رہا ہے اور وہ سپریم کورٹ کی اتھارٹی کو چیلنج کر رہے ہیں۔ حالانکہ سپریم کورٹ ہندوستان کی سب سے بڑی عدلیہ ہے اور اسے وہی درجہ حاصل ہے جو برطانوی دور میں لندن کی پریوی کونسل کو حاصل تھا۔

عدالت کا احترام آج سے نہیں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اس زمانے سے ہوتا آیا ہے جب مطلق العنان بادشاہ اپنے اشارۂ چشم و ابرو سے جس شخص کی چاہتے گردن اڑا دیا کرتے تھے لیکن انھوں نے بھی کبھی اپنے زمانے کی عدالتِ عالیہ کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا۔ تاریخ میں ایسی شہادتیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے ظالم اور جابر بادشاہ عدالت میں آکر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے تھے اور عدالت کے فیصلوں کا احترام کرتے تھے۔ خود ہمارے اس زمانے میں صدر جمہوریۂ ہند نے جو ملک کے سربراہ ہیں، سپریم کورٹ کا احترام کیا اور جب ان کے خلاف الیکشن پٹیشن کا مقدمہ سماعت کے لیے پیش ہوا تو عدالتِ عالیہ کے احترام میں وہ خود بنفس نفیس اسی طرح عدالت میں حاضر ہوئے جس طرح کوئی عام شہری حاضر ہو سکتا تھا۔

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج پارلیمنٹ میں معدودے چند کو چھوڑ کر ہر ممبر سپریم کورٹ کو مطعون کر رہا ہے۔ دستور میں ترمیمی بلوں پر بحث کے دوران انھوں نے زیادہ زور اسی پر صرف کیا کہ سپریم کورٹ پر واضح کر دینا چاہیے کہ وہ سپریم نہیں

واقعات ... بل

دفعات میں جن میں بنیادی حقوق بھی شامل ہیں ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل ہے۔

اپنے "حقوق" کے بارے میں ممبرانِ پارلیمنٹ کے جذبات اس وقت اس قدر مشتعل نظر آتے ہیں کہ اگر ہم کچھ کہیں تو شاید وہ اُسے سُننا بھی گوارا نہ کریں اور ممکن ہے وہ ہمیں سابق حکمرانوں اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ قرار دے دیں کیونکہ بنیادی حقوق میں ترمیم کا فی الحال خاص مقصد سابق حکمرانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہے جو سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق بنیادی حقوق کے دائرے میں آتے ہیں لیکن محض جائدادوں کے خاتمے کو سامنے رکھ کر جلد بازی میں کوئی ایسا قدم اٹھانا جس سے آئندہ چل کر خطرناک نتائج برآمد ہونے کا خدشہ ہو کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

سپریم کورٹ کا واضح فیصلہ ہے کہ پارلیمنٹ کو بنیادی حقوق میں ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ فیصلہ اب بھی قائم ہے اور اگر اس فیصلے کے باوجود پارلیمنٹ نے ترمیم کر ڈالی تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہوگا کہ وہ اپنے سامنے سپریم کورٹ کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ سپریم کورٹ کا وقار گر جائے گا بلکہ عوام کے اس اعتماد کو بھی ٹھیس پہونچے گی کہ ملک میں عدلیہ کا ایک ایسا ادارہ موجود ہے جو اس بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ کوئی بھی قانون ساز اسمبلی کوئی ایسا قانون وضع نہ کر سکے جو ہندوستان کے آئین کے خلاف ہو۔ ریاستی قانون ساز اسمبلیوں نے گذشتہ برسوں میں کتنے ہی قانون پاس کیے جنھیں سپریم کورٹ نے بنیادی حقوق کے خلاف سمجھ کر کالعدم قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کا یہ طرزِ عمل متعلقہ طبقوں کے لیے اطمینان کا باعث تھا۔ اس سے ہندوستان کی سیکولر ڈیموکریسی پر اُن کا اعتماد اور پختہ ہو گیا لیکن بنیادی حقوق میں ترمیم کا چکر چلا کر اگر سپریم کورٹ کو بے اثر بنا دیا گیا تو ریاستوں میں کیا ہوگا، اس بارے میں کچھ کہنا عبث ہے۔

ہم نے جیسا شروع میں کہا، انسان کے بنائے ہوئے قوانین احکامِ خداوندی نہیں ہیں کہ ان میں ترمیم نہ ہو سکے۔ اگر دستور میں حالات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تو یہ ترمیم ضرور ہونی چاہیے۔ مگر یہ ترمیم صرف ایک دستور ساز اسمبلی ہی کر سکتی ہے، قانون ساز پارلیمنٹ

خاص دستور کے تحت تشکیل پائے اور اس دستور کی وفاداری کا حلف اٹھائے، وہی پارلیمنٹ اسی دستور کی ان دفعات کی دھجیاں اڑا دے جن کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے کہ ان میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔

حکومت یا پارلیمنٹ کی اکثریت اگر یہ محسوس کرتی ہے کہ بنیادی حقوق سے متعلق دفعات میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے تو اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے یا اس مسئلے پر کم از کم ریفرنڈم کرایا جائے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ کسی ایک پارٹی نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر دستور میں ایسی ترمیم کر ڈالی جو بنیادی نوعیت کی تھی۔ کوئی ایک پارٹی، خواہ اس کی کتنی ہی اکثریت کیوں نہ ہو قابلِ اعتراض طریقے پر اگر کوئی دستوری ترمیم کرے گی تو وہ اس الزام سے نہیں بچ سکتی کہ اس کا طرزِ عمل آمرانہ ہے۔ اور کسی ایک پارٹی کا آمرانہ طرزِ عمل کسی فرد کے آمرانہ طرزِ عمل سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بنیادی حقوق سے متعلق دفعات میں ترمیم خاص طور سے اس لیے کی جا رہی ہے کہ کہ سابق والیانِ ریاست کی جائدادیں ختم کی جا سکیں لیکن بنیادی حقوق میں جائدادوں ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تقریباً ایک درجن دوسری باتیں بھی ہیں جن کا تحفظ کیا گیا ہے مثلاً اظہارِ خیال کی آزادی اور کلچر و مذہب کی آزادی، پیشہ کی آزادی اور مذہبی اور خیراتی مقاصد کے لیے ادارے قائم کرنے کی آزادی وغیرہ

ہمیں کانگریس گورنمنٹ پر بھروسہ ہے اس لیے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی ہمیشہ علمبردار رہی ہے اور اس سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرے گی جس سے اقلیتوں کے حقوق سلب ہوتے ہوں۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہمیشہ کانگریس گورنمنٹ ہی برسرِ اقتدار رہے گی اور کوئی ایسی پارٹی برسرِ اقتدار نہیں آئے گی جس کا اقلیتوں کے معاملے میں رویہ معاندانہ ہو، بلکہ جو اکثریت اور اقلیت کے سوال ہی کو بے معنی سمجھتی ہو اور سب کو ڈنڈے کے زور سے ایک رنگ میں رنگنے پر یقین رکھتی ہو۔

بنیادی حقوق میں ترمیم کا حق لے لینے کے بعد کبھی حکومت اور کوئی بھی قانون ساز اسمبلی کسی ایک و

بقیہ صفحہ

ب بم شاہ حسن کے قدموں میں آکر گرا...

شاہ مراکش کی ۴۳ ویں سالگرہ کی تقریبات میں تین
ہیتوں نے حصہ لیا تھا ان کی زبانی اب اس قتل عام کی تفصیلات
رہی ہیں جو شاہ کے موسم گرماں کے محل میں ہوا تھا۔ بلوطہ
ہ اور اسی طرح کے اونچے اونچے درختوں میں محصور یہ محل رباط
رہ میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے سکرات میں واقع ہے۔
سالگرہ کے موقع پر محل میں جو ضیافت ہو رہی تھی اس میں
قراد اعلیٰ فوجی یا غیر فوجی حکام اور دیگر سرکردہ لوگ پانچو کے قریب
ں شریک تھے۔ شاہ کے خدمتگار مثلاً درزی اسب کے
طالوی، موچی اور ڈاکٹر (تین فرانسیسی اور ایک آسٹریلین)

بہترین قسم کی سالمن مچھلی تک۔
اٹلی کے سفیر اسید بوگلیت دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔ اسی
لیے وہ لانچ میں ایک زردشتی آرام کرسی پر دراز ہو کر "بیڈ پر لیسیل"
نامی رسالہ پڑھ رہے تھے۔ دوسرے تمام مہمانوں کو حفظ مراتب
کے ساتھ ضیافت میں بٹھایا گیا تھا۔ شاہ حسن اپنے سات سالہ ولیعہد
سیدی محمد کے ساتھ جو پانچ بچوں میں سے ایک ہیں ایک خصوصی
شامیانے میں ما حضر تناول فرما رہے تھے۔ قریب ہی تیونس کے
صدر مسٹر حبیب بورقیبہ کے صاحبزادے مسٹر حبیب بورقیبہ جونیئر

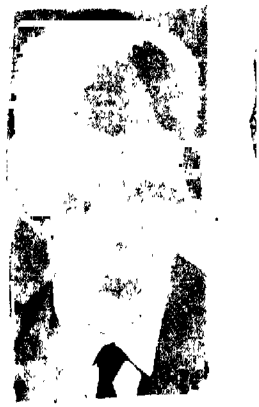
جا رہی ہے لیکن اطالوی سفیر نے جو کہ فوجی سپاہی رہ چکے تھے،
پہچان لیا کہ یہ رائفل کی گولیاں چلنے کی آواز ہے۔ اور پھر فوراً ہی
اس فائرنگ نے ایک دہشتناک شکل اختیار کر لی۔
امریکی سفیر مسٹر ڈبلو. راک ویل شاہ کی طرف بڑھ رہے
تھے کہ انھوں نے ایک مہمان کو اپنے سامنے خون میں لت پت
زمین پر گرتے دیکھا۔ اس کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک اور
مراکشی مہمان زخمی ہو کر اطالوی سفیر کے قریب اس طرح گرا کہ
اس کی خون آلود انگلیوں کے نشانات ان کی قمیص پر پڑ گئے۔

رباط کی ایک چٹھی

شاہ کے محل میں

قتلِ عام کی کہانی

شرکائے ضیافت کی زبانی



شاہ حسن ـــ دوم

ضیافت میں مدعو تھے۔ اسلامی روایات کے مطابق عورتیں شریک
نہ تھیں۔
دوپہر کا وقت تھا اور آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک
رہا تھا اگرچہ بحر اوقیانوس کی طرف سے آنے والی پرنم ہواؤں نے
اس کی تمازت کو کافی کم کر دیا تھا۔
محل میں ایک شاندار ضیافت ہو رہی تھی، جس میں انواع و اقسام
کے کھانوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ بھیڑ کے بھنے ہوئے گوشت سے لیکر

تشریف فرما تھے۔
محل شاہی کے گارڈ کے کمانڈر جنرل محمد مدبوح جو شاہ
حسن کے قریب ترین مصاحبین میں تھے مہمانوں کی تواضع کرنے
میں پیش پیش تھے۔ لیکن چہرے سے مسرت و شادمانی کے ان
جذبات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا جو ایسے مواقع پر ہوا کرتا تھا، شاید
اس لیے کہ بغاوت کے اصل لیڈر وہی تھے۔
اچانک محل کے دروازے کے قریب سے پپ پپ پپ کی
آوازیں سنائی دیں۔ اکثر مہمانوں نے سمجھا کہ یہ آتشبازی چھوڑی

اس شخص کے منہ سے خون آ رہا تھا اور فوراً ہی وہ موت کے آغوش
میں تھا۔
اب محل میں صرف رائفلیں ہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی توپیں
بھی چل رہی تھیں اور دستی بموں کے دھماکے بھی ہو رہے تھے۔ بہت
سے مہمان اس افراتفری میں شاہ کے کمرے یا ساحل سمندر کی
طرف بھاگے لیکن ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایک دستی بم
شاہ کے قدموں میں آکر گرا جسے حبیب بورقیبہ جونیئر نے بڑی جرأت

... لیکن حبیب بورقیبہ جونیئر نے اسے وہاں سے ہٹا دیا



سولی پر چڑھنے سے پہلے ہر باغی کو شاہ کے ہاتھ کا بوسہ لینے پر مجبور کیا گیا۔

سے کام لیکر اٹھایا اور دوسری طرف اٹھا کر پھینک دیا۔ شاہ کی جان بچ گئی۔ محل پر ہر طرف کیڈٹ نظر آرہے تھے جنھیں تیس موٹر ٹرکوں میں بھر کر محل میں پہنچایا گیا تھا۔

اس گڑبڑ اور انتشار میں شاہ حسن کسی طرح تخت شاہی والے کمرے میں پہنچ گئے اور وہاں سے ایک اور کمرہ یا غسل خانے میں چلے گئے، یہی موقع تھا جب انھوں نے اپنے محل کے گارڈ کے کمانڈر جنرل مدبوح سے بات چیت کی تھی۔ اس بات چیت کی صحیح تفصیل نہیں معلوم لیکن کہا جاتا ہے انھوں نے شاہ کو کسی محفوظ مقام پر لے جانے اور باغیوں کے ساتھ بات چیت کرانے کی پیشکش کی تھی جسے شاہ نے نامنظور کر دیا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد مسٹر مدبوح کو گولی لگی اور وہ زمین پر گر گئے۔ ان ہی کے آدمیوں نے غالباً غلطی سے انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔

باغیوں نے مہمانوں کو چمکتی دھوپ میں زمین پر لٹا دیا بعد ازاں دیوار کے سہارے کھڑا کیا اور اس کے بعد انھیں گولی کا نشانہ بنایا۔ شاہ کے بھائی پرنس مولائے عبداللہ کے بازو میں گولی لگی لیکن انھیں نشانہ بنانے والوں نے اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ انھیں زمین پر پڑا دیکھ کر سمجھے کہ وہ ہلاک ہو چکے ہیں۔

لیکن اس ہنگامہ کے باوجود یہ دیکھنے میں آیا کہ باغی نوجوان کیڈٹ شاہ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اکثر تو یہ باغی

شاہ کی پناہ گاہ پر قابض ہو گئے اور دوسرے مہمانوں کے ساتھ انھیں باہر نکالا۔ اس وقت وہ اپنے سر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے تھے ایک نوجوان سپاہی جو گھبراہٹ کے ساتھ اپنی رائفل کے گھوڑے پر انگلی رکھے ہوا تھا بادشاہ کو الگ لے گیا جہاں اس نے شاہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا جسے دیکھ کر شاہ حیران اور متعجب رہ گئے۔ کیڈٹ نے کہا ہم سے کہا گیا تھا کہ محل میں ایک سازش ہو رہی ہے۔ جس کا مقصد بادشاہ کی جان لینا ہے نیز یہ کہ باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہے اور آپ کی جان خطرے میں ہے ہم محل میں اسلیئے داخل ہوئے تاکہ آپکو بچا سکیں۔



تجہیز و تکفین کے موقع پر
حسن اور حسین

لڑائی جس تیزی سے شروع ہوئی تھی اسی تیزی سے ختم بھی ہو گئی۔ وفادار سپاہی بڑی تعداد میں محل میں پہنچ گئے انھوں نے باقی باغیوں سے ہتھیار رکھوا لیے ۲ گھنٹے کی لڑائی میں ۲۵ مہمان اور شاہ حسن کے عملہ کے ۷۵ اشخاص ہلاک ہوئے۔ مرنے والوں میں تین فرانسیسی ڈاکٹر اور بلجیم کے سفیر مارشل ڈوبرے بھی شامل تھے اسکے علاوہ ۱۶۰ باغیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان میں جنرل مدبوح بھی شامل تھے۔ مجروحین کی تعداد ۱۳۰ تھی۔

جو سفارتی نمائندے ضیافت میں شرکت کے لیے گئے تیزی کے ساتھ واپس رباط پہنچے تاکہ اس ناکام بغاوت میں دنیا کو بتا سکیں سکرات کے محل سے نکلنے کے بعد ایک نھوں نے دیکھا کہ مراکشی مجمع سے ٹرک پر مچھلیاں لیے بیٹھے تھے ضیافت کے ساتھ انھیں فروخت کر رہے تھے۔ شاید بغاوت کے ناکام ہو جانے کا انھیں کوئی علم نہ تھا۔

یہ بغاوت کیوں ہوئی؟

اس بغاوت کا نیم ملکوں میاں ہونی ظرفی میں رایک حد سے بڑھ جانے والا کرپشن ہے جو اعلیٰ طبقوں میں پایا جاتا ہے زراعت تک رشوت خوری میں مبتلا ہیں۔ خبر ہے کہ جنرل مدبوح نے شاہ کو اس طرف توجہ دلائی تھی لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہ کی آخر بغاوت کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

بغاوت ناکام ہو گئی لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ طرح کی بغاوت نہ ابھرے گی جب تک شاہ کا ڈکٹیٹرانہ طرز عمل ہے بغاوت کی تلوار ہر وقت لٹکی رہے گی۔ عام نوجوانوں کو یہ یقین ہے کہ ایک دن آئے گا کہ زمام اقتدار ہم اپنے ہاتھوں میں لیں گے اور شاہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیں گے۔"



ادفقیر — حسن کا دایاں بازو۔ جو اپنے ظلم و تشدد کے لیے مشہور ہے۔

...... خوشیوں کا دن۔ ماں کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اس کا بیٹا گریجویٹ ہوگیا۔

سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوّں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کرسکتے۔

اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوّں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مُفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹرس سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

خاندانی
منصُوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لیے

پُرمسرّت دن



جیکی کنیڈی جو

آج کروڑوں میں کھیلنے والی

جیکی اوناسیس ہے



دنیا کا سب سے زیادہ خرچ کرنیوالا جوڑا

۲۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کا ہنی مون

روزانہ ۴۰،۰۰۰۵ ڈالر کا خرچ

سابق صدر امریکا آنجہانی کنیڈی کی زندہ دل بیوی جیکی (JACKIE) نے جب ایرسٹاٹل سکراٹیس اوناسس (ARIS ISTOTLE SOCRATES ONASSIS) سے شادی کرلی تو برطانوی اخبار نے جلی حروف میں یہ سرخی لگائی تھی کہ :

"جیکی ایک بلینک چیک سے شادی کر رہی ہے"

کس قدر سچائی ہے اس سرخی میں۔ آج جیکی اور ایری اسقدر روپیا خرچ کر رہے ہیں کہ تاریخ میں کرۂ ارض پر آج تک شاید ہی کسی جوڑے نے اتنا روپیا خرچ کیا ہو۔ ان کا سالانہ شخصی خرچ ——— ۲۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر ہے۔ یہ ملکہ الزبتھ اور پرنس فلپ کیلئے برطانوی حکومت کے خرچ سے کہیں زیادہ ہے۔

ایری اپنے اور اپنی نئی بیگم جیکی کے لئے اس انداز سے روپیا بہا رہا ہے کہ زار روس بھی ہوتا تو یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگتا۔ اور جیکی کے تزک و احتشام کو دیکھ کر مصر کی مشہور زمانہ ملکہ قلوپطرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر بھی جیکی کی تعیش پسند زندگی۔ کے مقابلے میں قلوپطرہ کے خرچ میں کچھ رفاہی پہلو نکل آتا تھا۔ جیکی اور ایری کے اس بے دریغ اور بے حساب خرچ سے انھیں کسی مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ صرف

جہازوں سے ایری کی سالانہ آمدنی ۵۰،۰۰۰،۰۰۰ کے علاوہ مختلف صنعتوں میں اس کے مختلف حصے ؛

چند برس پہلے ایری نے ایک اخبار نویس کی درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کردیا تھا کہ " میرے نہیں ہے۔ میرے وقت کی قیمت دو ہزار ڈالر فی

بہرحال جیکی اور ایری کے روزانہ پانی کی طرح کے باوجود وہ اپنے زمانہ ضعیفی کے لئے بھی بہت کرتے ہیں۔ کئی ملکی اور غیر ملکی ماہرین مالیات کا مسٹر اوناسس اپنے تمام حصے کاروبار سے ہٹالیں ۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ تا ایک بلین ڈالر ہوگی۔ اگر کم از کم ڈالر ہی کو لیا جائے اور انھیں کسی دوست پڑوسی، میں رکھا جائے تو اس سے ۵٪ کی عام شرح سود ۲۵،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کی آمدنی ہوگی۔

آیئے اب ذرا اوناسس کے محلات، ملازم لوازمات پر بھی نظر ڈالیں۔ مانٹے کارلو۔ (MONTE میں ایک شاندار ولا ہے جہاں سات ملازمین ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ پیرس میں ایک خاص کو

خود انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں تامل ہوا۔

جب سے جیکی نے اوناسس سے شادی کی ہے وہ اسکے سارے محلات کو نئے سرے سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی خواہشمند ہے۔ شادی کے آٹھ مہینے بعد ہی جیکی نے ایتھنز کے محل گلی فاڈا (GLY-FADA) کی ازسرِنو آرائش و زیبائش کا کام شروع کروا دیا اور اس سلسلے میں نیویارک کے شہرہ آفاق آرائش کار بلی بالڈ ون کی خدمات حاصل کی گئیں جو دنیا کا انتہائی گراں ٹھیکیدار ہے۔ اس محل کی آرائش کے خرچ کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے لئے جو اعلیٰ قسم کی سیٹریں خریدی گئی ہیں وہ دس ہزار ڈالر کی ہیں اور چونکہ مسٹر ایری عجلت میں تھے اسلئے انھیں بذریعہ ہوائی جہاز ایتھنز بھیجا گیا تھا۔ جدید مصری کرسیوں اور صوفوں پر جو خرچ آیا وہ ۲۲۰۰۰ ڈالر ہے۔ خود مسٹر ایری کے لئے جو خاص قسم کی کرسیاں اور صوفے خریدے گئے ان کی قیمت ۱۴۶۶ ڈالر ہے جو گلی فاڈا کے لئے خریدی گئیں اشیاء میں سب سے کم قیمت ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس محل کی آرائش کی لاگت تقریباً ۵۰٫۰۰۰ تا ۱۲۵۰٫۰۰۰ ڈالر ہوگی۔

جیکی کا یہ واحد خرچ طلب پروگرام نہیں ہے بلکہ یہ تو محض ابتدا ہے۔ وہ تو اسکارپیس میں بالکل جدید طرز کا ایک شاندار بنگلا بنوانے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔ اس پر تقریباً ۶۰۰٫۰۰۰ ڈالر کا خرچ آئے گا۔



ویڈیو (MONTEVIDEO) میں ایک شاندار محل اور ... ہیں۔ ایتھنز کے شہر گلی فاڈا میں ایک خوب صورت ولا ... ذکر۔ نیویارک میں جیکیز ففتھ ایونیو۔ پانچ ملازمین۔ ... میں ایک ذاتی جزیرہ اسکارپیس اور ۷۲ ملازمین ... خوبصورت جہاز کرسٹینا (CHRISTINA) ۶۵ آدمی ... جہاز راں اور ایک ہمہ وقتی ڈاکٹر۔

اگر یہ سب ناکافی ہوں تو دنیا کے مشہور ہوٹلوں جیسے ... نیویارکس پیئرے (NEW YORKS PIERRE) اور لندن ... ڈزس میں مستقل کمرے بھی ہیں۔

مسٹر اوناسس کی ہر ایک کوٹھی میں ان کے کپڑے اور ... ہدایات کی تمام چیزیں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں تاکہ وہ کسی بھی ... کہیں سے بھی کسی جگہ جا کر رہ سکیں۔ بہت جلد ہی جیکی ... قیمتی ملبوسات اور دیگر ساز و سامانِ آرائش سے بھی ہر قیام گاہ ... وابستہ کیا جائے گا۔

... بعض الوصول کے مطابق ایری کے ۲۰۲ ملازمین ہیں جنکی ... ماہانہ خرچ ۶۰٫۶۰۰ ڈالر ہے۔ ایری کے بیشتر ملازمین ... ادائیگی

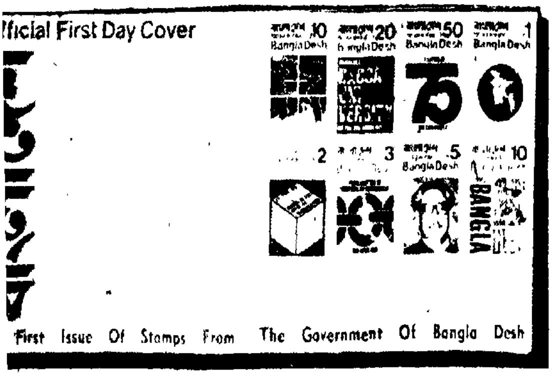
اور متعلقہ لوگوں کے خور و نوش اور بے روزگاری بھتہ وغیرہ کے سلسلے میں ماہانہ ۲۵٫۲۵۰ ڈالر کا خرچ آتا ہے۔ ان کے علاوہ ملک کے ہر چرچ اور خیراتی اداروں سے ہمیشہ امداد، عطیات اور چندوں کی اپیلیں آتی ہی رہتی ہیں۔

اب یہ حقیقت عام ہو چکی ہے کہ جیکی نت نئی چیزیں خریدنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ نہ صرف اپنی ذات کے لئے بلکہ آئے دن اپنے بنگلوں کی نت نئے انداز سے آرائش اور سجاوٹ کا ذوق اب اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ کہا جاتا ہے



بنگلادیش کے ڈاک ٹکٹ

محمد شاہد عظیم





مسٹر بمن ملک اور جسٹس ابوسعید چودھری وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی (درمیان میں) برطانیہ کے سابق پوسٹ ماسٹر جنرل مسٹر جان اسٹون ہاؤز ممبر پارلیمنٹ کو برطانوی دارالعلوم میں بنگلادیش اسٹامپس کی نوٹو کاپیاں پیش کر رہے ہیں۔

بنگلادیش کے ڈاک ٹکٹ کے اجرار کی خبر ساری دنیا میں دلچسپی سے پڑھی گئی۔ یہ خبر ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے شائقین کے لئے نہایت ہی نئی تھی اور حیرت انگیز بھی کیونکہ ابھی حریت پسند بنگلادیش میں ایک طویل جنگ لڑ رہے ہیں۔

ایک ایسی حکومت کے ڈاک ٹکٹ جاری ہونے والے تھے جسے ابھی دنیا کے کسی بھی ملک نے تسلیم نہیں کیا ہے، جس کی کوئی راجدھانی بھی نہیں ہے نہ خود کی اپنی کرنسی ہے اور نہ ڈاک و تار کا انتظام لیکن ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ جمہوری حکومتوں کے ڈاک ٹکٹ نہ صرف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ انتہائی قیمتی اور نایاب ہو جاتے ہیں۔

کاغذ کے ان حقیر ٹکڑوں کی قیمت کئی ہزار روپے بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ بے چینی کے ساتھ ۲۹ جولائی کے منتظر تھے جو صرف دو دن بعد تھی۔

واقعات نئی دہلی

جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ ڈاک ٹکٹ کا ایک عام مصرف یہ ہے کہ انھیں خطوط پر چسپاں کرتے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے اور وہ منزل پر پہونچنے کے بعد بے کار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دراصل ڈاک کے ٹکٹ ایک خاموش سفیر کا رول انجام دیتے ہیں۔ وہ کام جو اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن انجام نہیں دے سکتے ڈاک کے ٹکٹ انجام دیتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں یمن کے شاہ پرستوں سے لے کر آسام کے میزو باغی تک اسے آزما چکے ہیں۔ بنگلادیش کی انقلابی حکومت نے بھی اس سفیر کو آزمانے اور بنگلادیش کی جدوجہد آزادی کے پیام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بالآخر ۲۶ جولائی کو بنگلادیش کے ۸ ڈاک ٹکٹ اور خصوصی لفافہ (فرسٹ ڈے کور) کی اجرائی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ ٹکٹ ۲۹ جولائی کو جاری ہونے والے تھے۔ یعنی صرف دو دن بعد۔

۲۹ جولائی کا دن آ پہنچا۔ بنگلادیش مشن کلکتہ پر انھیں خریدنے کے لئے قطاریں لگ گئی تھیں۔ مکمل سیٹ کی قیمت ۲۲ روپے ہونے کے باوجود شائقین نے ہزاروں سیٹ خرید لئے۔ جو لوگ وہاں نہیں پہونچ سکے انھوں نے قبل از وقت قیمت روانہ کر کے اپنے ٹکٹ محفوظ کرا لئے۔ بیرونی ممالک سے بھی بے شمار آرڈر۔

ان ٹکڑوں کو ڈیزائن عالمی شہرت یافتہ مسٹر بمن ملک نے جنھوں نے برطانوی پوسٹ آفس کے لئے ۱۹۶۹ء میں گاندھی میموریل ڈاک ٹکٹ کا ڈیزائن تیار کیا تھا اور جو دو گولڈ میڈل حاصل کر چکے ہیں تیار کیا ہے اور انھیں لندن کی ایک فرم نے چھاپا ہے۔

بنگلادیش مشن کے سربراہ مسٹر حسین علی کے مطابق بنگلادیش کی حکومت آئندہ بھی لندن میں ایسے ہی نئے یادگاری ٹکٹ جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ ان کی فروخت سے ہونے والی آمدنی بنگلادیش پر صرف کی جا سکے۔ بنگلادیش کی کرنسی جاری کرنے کے سوال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مسٹر حسین علی نے ۲۶ جولائی کو کلکتہ میں بتایا کہ قبل ازیں ان ٹکٹوں کی اشاعت اس لئے ممکن نہ ہو سکی کہ حکومت کی ساری توانائیاں بنگلادیش پر قابض پاکستانی فوجوں سے مقابلہ کرنے پر صرف ہو رہی تھیں۔ حکومت بنگلادیش کو قوی امید ہے کہ ہندوستان سے

...ممالک کو خطوط کی ترسیل کے لئے ممکنہ سہولتیں فراہم ... انھوں نے بتایا کہ بنگلا دیش کے ڈاک ٹکٹ کو ڈاک ... بین الاقوامی یونین (U.P.U) سے منظور کرانے کی بھی ... کی جارہی ہے۔



...گلا دیش کے رنگا رنگ اور خوب صورت ٹکٹ آٹھ مختلف ...سکے ہیں جن کے ذریعے بنگلا دیش کی جدوجہد آزادی کو ...ہے۔ دس پیسے کی قیمت کے ٹکٹ پر جو نیلے قرمزی ...ائی رنگوں میں ہے، بنگلا دیش کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ زرد ...ور گہرے سبز رنگ کا بیس پیسے والا ٹکٹ ڈھاکا ...ا میں قتل عام کی کہانی سناتا ہے۔ ۵۰ پیسے کی مالیت ...چار رنگوں میں ہے جس پر ۷۵ کا ہندسہ نمایاں ہے ...یش کی ۷۵ کروڑ آبادی کو ظاہر کرتا ہے۔ بنگلا دیش...



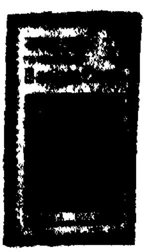




...کی مالیت کے ٹکٹ کا پس منظر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات ہیں جن میں عوامی لیگ نے ۹۸ ووٹ حاصل کئے تھے۔ سبز گہرا سبز اور نیلے رنگ کا ٹکٹ جس کی قیمت ۳ روپے ہے ۱۷ اپریل کو پاکستان سے علیحدگی اور آزاد بنگلا دیش کے قیام کے اعلان کو ظاہر کرتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا پورٹریٹ، سنہرے نارنجی اور گہرے بھورے رنگ کے ٹکٹ پر بنایا گیا ہے۔ اس ٹکٹ کی قیمت ۵ روپے ہے۔ اس سیٹ کا آخری یعنی آٹھواں ٹکٹ جس کی قیمت دس روپے ہے اور جو سنہرے، گہرے نیلے اور شوخ قرمزی رنگ میں ہے، اس کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ بنگلا دیش امداد کا خواہاں ہے۔ ▬







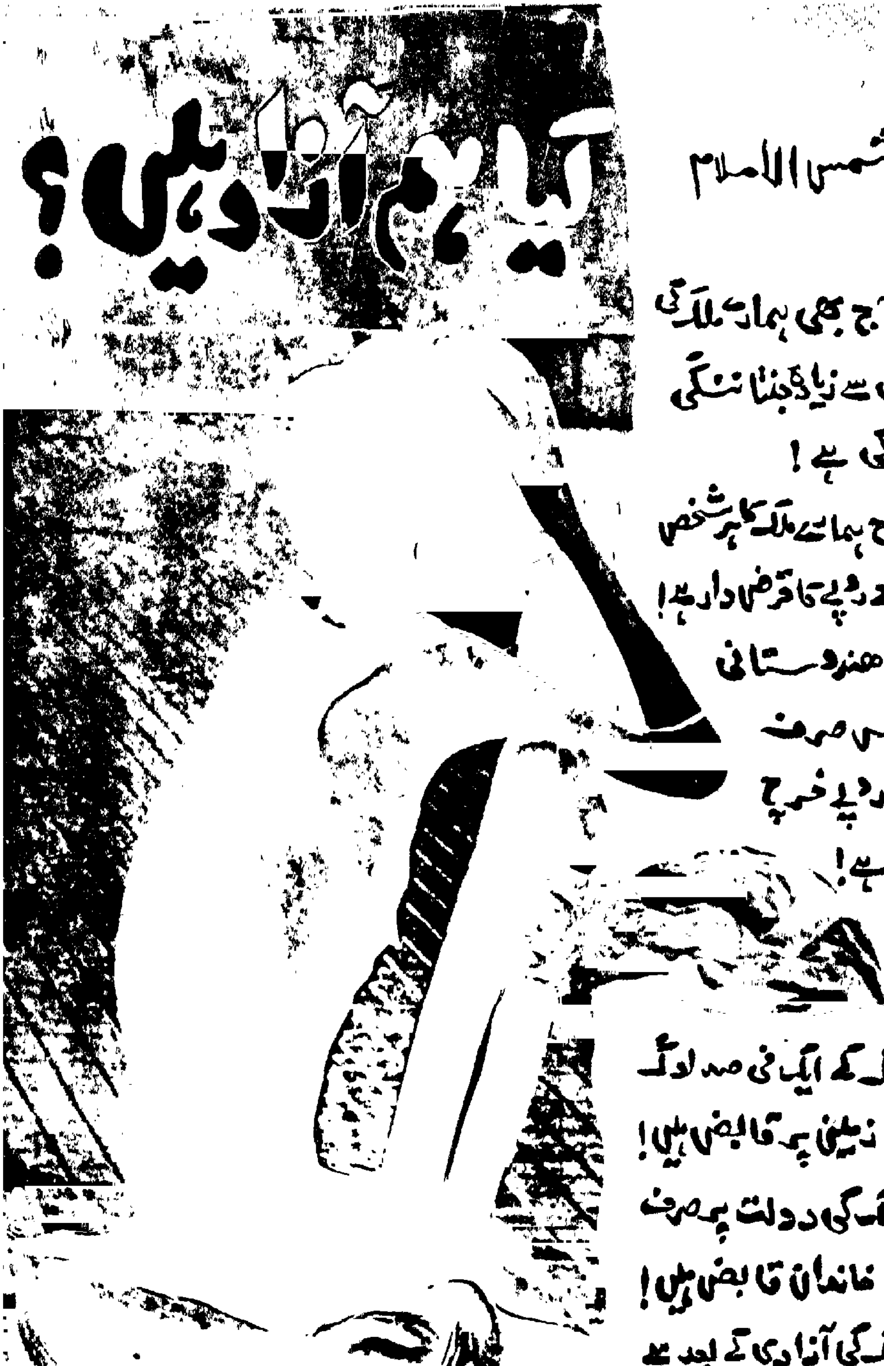


...آزادی ایک روپے کی مالیت کے ٹکٹ پر تین رنگوں ...و قرمزی اور سبز رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔ دو روپے...



کیا ہم آزاد ہیں؟

شمس الاسلام



• آج بھی ہمارے ملک کی آدھی سے زیادہ جنتا ننگی بھوکی ہے!

• آج ہمارے ملک کا ہر شخص 275 روپے کا قرض دار ہے!

• ہر ہندوستانی فی کس صرف ۲۸ روپے خرچ کرتا ہے!

• ملک کے ایک فی صد لوگ ۴۸٪ زمین پر قابض ہیں!

• ملک کی دولت پر صرف ۷۵ خاندان قابض ہیں!

• ملک کی آزادی کے بعد سے آج تک 7500 ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں—

لیکن پھر بھی کیا ہم آزاد ہیں...؟

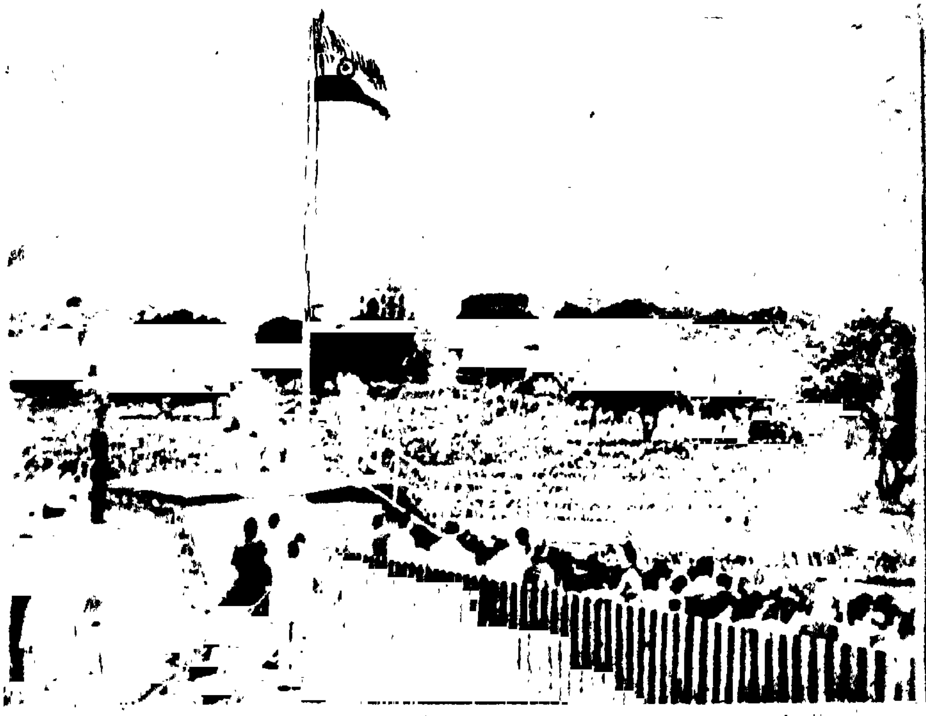
[illegible]
[illegible] طاقت کی بنیاد کو مجھ لیتے کا جذبہ
[illegible] کو تیز کر دیں۔ پستی کی گہرائیوں سے اٹھا پڑتی
[illegible] بلند ہو جاتی ہیں۔ وہ آزادی ہی تو ہے جس نے
[illegible] قوم کو ترقی کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا
[illegible] ملک اس سے دوستی کا خواہشمند ہے۔ لیکن
[illegible] نہیں ملا کرتی۔ آزادی [illegible] نہیں جاتی بلکہ اسکے
[illegible] چھینی جاتی ہے۔

[illegible] تاریخ جدوجہد آزادی کی داستانوں سے بھری پڑی

کیلئے۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے بزدل قومیں ہمیشہ غلام بنی رہتی ہیں۔ الجزائر نے آزادی حاصل کی سو وہ انہیں تحفتہً نہیں دی گئی۔ اس قوم نے اپنے دس لاکھ سپوتوں کی قربانی دے کر ایک لمبی جدوجہد کے بعد ہی آزادی حاصل کی۔ فلسطین ہی کو لیجیے، حالانکہ انہیں آزادی ملنے کی امید دور دور تک نہیں ہے لیکن آزاد رہنے اور باعزت زندگی گزارنے کی خواہش فلسطینیوں کو قربانی دینے پر مجبور کر رہی ہے۔

کیوبائی عوام نے آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے ظلم و ستم برداشت کئے۔ اور انھیں ان گنت قربانیاں دینے کے بعد

ہندوستانیوں کو بھی جو آزادی چوتھائی صدی پہلے ملی کسی کی طرف سے دان میں نہیں ملی۔ یہ ہمیں بھیک میں نہیں ملی تھی اسکے لئے ۴۰ کروڑ عوام نے کندھے سے کندھا ملا کر محنت کی تھی ظلم سہے تھے اور جانیں گنوائی تھیں۔ یہ بات بالکل واضح ہو جانی چاہیے کہ ہمیں آزادی اہنسا نے نہیں بلکہ قربانیوں نے دلوائی تھی۔ یہ آزادی مادر وطن کے ان جیالے بیٹوں اور بیٹیوں کی دین تھی جو نہ جانے کہاں کہاں اپنی ہی سرزمین پر خاک میں مل گئے۔ خون بہا تب جا کر آزادی ملی۔ نہ جانے کتنے بھگت سنگھ اور سولی پر چڑھے تو ہمیں آزادی نصیب ہوئی اور جب آزادی ملی تو ہم چالیس کروڑ ہندوستانی



[illegible] گنگا دھر تلک نے ۱۹۱۸ء میں کہا "دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی حکمراں نے انسانی جذبے سے متاثر ہو کر اپنی مرضی سے اپنی سلطنت کا اظہار کر دیا ہو یا اپنی حکومت رعایا کے سپرد کر دی ہو۔ واقعات نے ان الفاظ کو ہمیشہ سو فیصدی صحیح ثابت

آزادی کی دولت کا وصال حاصل ہوا۔

آج جو کچھ بھی ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، بنگلہ دیش، اور لاطینی امریکا میں ہو رہا ہے، وہ کیا ہے؟ وہاں کے عوام آزادی چاہتے ہیں۔ وہ سب غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ آزادی کے ساتھ زندہ رہنا ان کا ایمان ہے۔

اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے تھے۔ یہ آزادی کی ہی خوشی تھی کہ ہم نے تقسیم ہند کے فوراً بعد رونما ہونے والے قتل عام کو حوصلہ اور ہمت کے ساتھ برداشت کیا۔

جب ہندوستانی عوام آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے اور دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے بڑے سامراجی ملک انگلینڈ سے

لوالے رہے تھے تب قومی لیڈر شپ نے انہیں یقین دلایا تھا کہ آزاد ہندوستان میں ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جائے گی جہاں حقیقی معنوں میں عوام کی حکومت ہوگی۔ معاشی اور سماجی نابرابری ختم کر کے مساوات پر عمل کیا جائے گا۔ سب کو برابر کے حقوق دیئے جائیں گے کوئی بھوکا نہیں رہے گا، کسی کی جان غیر محفوظ نہ ہوگی سب لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کی جائے گی۔ یہ سب وعدے پنڈت نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد اور سردار پٹیل وغیرہ جیسے کانگریسی لیڈروں نے اپنی بہت سی تقریروں اور تحریروں میں کئے۔ ان سب کے علاوہ آئین ہند کے دیباچے میں بھی وعدہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر شہری کو سماجی معاشی اور سیاسی انصاف مہیا کیا جائے گا۔ ہر شہری کو تحریر و تقریر کی اور مذہبی آزادی ہوگی۔ سب کو برابر کے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ لیکن آج پورے ۲۵ سال گزرنے کے بعد کیا نظر آ رہا ہے۔ ساری امیدیں اور توقعات خاک میں مل گئیں۔ سارے وعدے جھوٹے ثابت ہوئے۔ آج کے ہندوستان میں نابرابری، ناانصافی اور بے ایمانی کا دور دورہ ہے جس ملک کی آزادی کے وقت یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ وہاں معاشی مساوات ہوگی۔ وہاں آج یہ حالت ہے کہ ۵۰ فیصدی عوام کے لئے دوسرے وقت کی روٹی کھانا مشکل ہے شہری علاقوں میں ۴۰ فیصدی عوام بے روزگار ہیں۔ ۴۴ فیصد عوام کی ماہانہ آمدنی صرف ۱۸ روپیا ہے۔ ہر ہندوستانی فی کس ۲۸ روپے مہینہ خرچ کرتا ہے۔ ہندوستان کا دیہی علاقہ جہاں کل آبادی کا ۷۰ فیصدی حصہ رہتا ہے، وہاں حالت یہ ہے کہ ۸۵ فیصدی لوگ مزدوری کی حد سے گری ہوئی زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہیں۔ ہم نے آزادی کے وقت معاشی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ لیکن آج پورے ۲۵ سال کے بعد بھی یہ حالت ہے کہ گاؤں میں دو کروڑ لوگوں کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ ۶ کروڑ لوگوں کے پاس کل زمین کا ایک فیصد حصہ ہے۔ ۲۷ کروڑ ۲ لاکھ لوگ صرف ۱۶ فیصدی زمین کے مالک ہیں جبکہ ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگوں کے پاس سب سے بڑا حصہ یعنی کل زمین کا ۸۴ فیصدی ہے۔ کیا معاشی مساوات اسی کا نام ہے؟ ایک طرف تو ہندوستانی عوام کو یہ غربت ملی ہے اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کو شاندار ترقی حاصل ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ کس تیزی سے ہندوستان کے ۲۰ بڑے سرمایہ دار گھرانوں کا سرمایہ بڑھا ہے:۔

واقعات نئی دہلی

	سرمایہ دار گھرانے کا نام	مونوپلی انکوائری کمیٹی کے مطابق ۶۴-۱۹۶۳ء میں کل سرمایہ (کروڑوں میں)	انڈسٹریل لائسنسنگ پالیسی انکوائری کمیٹی کے مطابق ۱۹۶۶ء میں کل سرمایہ	۶۸-۱۹۶۷ء میں کل سرمایہ	۶۴-۱۹۶۳ء کے سرمایہ پر ۱۹۶۸ء میں فیصد اضافہ
۱۔	برلا	۲۹۲،۷۲	۴۵۷،۸۴	۵۷۵،۶۰	٪۹۶،۶
۲۔	ٹاٹا	۴۱۷،۴۲	۵۰۵،۳۶	۵۸۴،۶۳	٪۳۹،۹
۳۔	مارٹن برن	۱۴۹،۶۱	۱۵۳،۰۶	۱۷۴،۲۹	٪۱۶،۵
۴۔	بنگور	۷۷،۹۱	۱۰۴،۳۱	۱۲۴،۸۱	٪۶۰،۳
۵۔	اے سی سی	۷۷،۳۶	۸۹،۸۰	۱۰۵،۸۴	٪۳۶،۸
۶۔	تھاپر	۷۱،۹۰	۹۸،۸۰	۱۰۳،۳۰	٪۴۳،۷
۷۔	ساہو جین	۶۷،۶۹	۵۸،۷۵	۷۹،۶۸	٪۱۷،۷
۸۔	برڈ ہیلز	۶۰،۱۷	۶۸،۶۲	۷۸،۶۲	٪۳۰،۸
۹۔	جے۔ کے	۵۹،۲۰	۶۶،۸۴	۷۸،۷۵	٪۳۳
۱۰۔	سورج مل ناگر مل	۵۷،۳۷	۹۵،۶۲	۱۰۷،۳۴	٪۸۷،۱
۱۱۔	والچند	۵۵،۱۷	۸۱،۱۱	۸۶،۲۴	٪۵۴،۷
۱۲۔	شری رام	۵۴،۶۸	۷۴،۱۳	۱۰۷،۴۱	٪۹۶،۴
۱۳۔	سکندیا	۴۶،۹۶	۵۵،۹۸	۶۵،۴۴	٪۳۹،۴
۱۴۔	گوئنکا	۴۶،۹۵	۶۵،۳۴	۴۶،۵۵	٪۲۷،۵
۱۵۔	مفت لال	۴۵،۹۱	۹۲،۷۱	۱۳۵،۸۷	٪۱۹۵،۹
۱۶۔	سارابھائی	۴۳،۱۶	۵۶،۷۱	۷۲،۵۸	٪۶۸،۲
۱۷۔	انڈیلوپول	۴۱،۹۸	۴۶،۷۵	۵۴،۱۲	٪۲۹،۲
۱۸۔	آئی۔سی۔آئی	۳۵،۸۹	۵۰،۰۶	۵۱،۱۱	٪۳۸،۵
۱۹۔	کلک	۴۱،۵۰	۵۱،۰۷	۶۲،۱۰	٪۴۹،۶
۲۔	کلاچند	۳۵،۱۳	۳۷،۲۲	۳۹،۷۲	٪۱۳،۱
					٪۵۴،۶

۱۹۴۷ء میں برلا کا کل سرمایہ صرف ۳۷ کروڑ روپے تھا جو ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر ۹۵۰ کروڑ روپے تک پہونچ گیا ہے جبکہ ٹاٹا کا کل سرمایہ ۱۹۷۰ء میں ۹۰۰ کروڑ روپے ہے۔

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان ۲۰ خاندانوں کی دولت میں ۶ سال میں کل ملا کر ٪۵۴،۶ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ حیرت میں نہ پڑیے گا اگر آپ کو یہ بتایا جائے کہ آج ہمارے ملک کی تقریباً ۶۰ فیصدی دولت پر صرف ۲۰ خاندان قابض ہیں۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ان گھرانوں کی تعداد جن کا سرمایہ ۲۰ کروڑ یا اس سے زیادہ تھا صرف ۳۳ تھی۔ آج یہ تعداد بڑھ کر ۵۰ سے تجاوز کر چکی ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور دوسری طرف تمام ہندوستان غریب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی قوت خرید نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔ اس کا اثاثہ چھن کر اجارہ داروں

ئے پہونچ چکاہے۔ کیا ہم نے ایسا ہی شانتی سماج بنانے
دی حاصل کی تھی۔ کیا آزادی کا مقصد یہ تھا کہ ایک
سے نجات دلاکر دوسرے معاشی طبقے کو بھوکے ننگے
عوام پر مسلط کر دیا جائے۔ کیا جنگ آزادی حاصل
کی آزادی کے لئے لڑی گئی تھی۔؟۔ یا یہ لڑائی تھی
طبقوں کے درمیان کہ کون حکومت کرے اور کون اپنے

قائم کرنے کی اجازت مل رہی ہے۔

کیا ہم اسی طرح سے اجارہ داری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔
کیا حقیقی طور پر ہم معاشی مساوات لانا چاہتے ہیں؟۔ ایک طرح
سے دیکھا جائے تو سوشلزم آرہا ہے۔ لیکن یہ سوشلزم اجارہ دارو
اور سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان سب
کو برابر کر دیا جائے۔

سرمایہ دار ممالک سے ہندوستان کے معاشی معاہدے

ملک کا نام	۶۰-۱۹۵۷ء	۶۶-۱۹۶۰ء
امریکا	۸۱	۳۶۹
انگلینڈ	۲۲۳	۴۸۰
مغربی جرمنی	۷۹	۲۹۰
جاپان	۵۱	۱۶۵
دوسرے سرمایہ دار ممالک	۲۶۶	۴۳۵



مہاتما گاندھی کے خواب کیا کبھی شرمندۂ تعبیر ہوں گے ۔؟

حالانکہ حکومت کی طرف سے اس بات کا بار بار اعلان کیا
جاتا ہے کہ ہم ملکی صنعت پر غیر ملکی سرمائے کا اثر کم کرنا چاہتے
ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ غیر ملکی سرمائے کو ملک
سے نکال باہر کر دیا جائے گا لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا غیر ملکی
سرمایہ ہندوستان میں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ انگریزی روزنامہ
اسٹیٹسمین کے مطابق حالانکہ حکومت نے اس بات کا
فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان صنعتی میدانوں میں جس کے لئے بھارت میں ہی
سوجھ بوجھ (Technical Know how) موجود ہے
غیر ملکی اشتراک سے کوئی صنعت قائم نہیں کی جائے گی۔ لیکن ایسی
بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں اس فیصلے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے



ات سے دستبردار ہو۔؟
آج ہمارا ایک اور نعرہ ہے۔ سوشلسٹ سماج کی تعمیر
اس سوشلسٹ سماج کی بنیاد کیسے پڑے گی۔ وہ بھی ملاحظہ
پچھلے آٹھ مہینوں میں ہماری سوشلسٹ حکومت نے بیسیوں
خاندانوں کو ۷۰ لائسنس اور جاری کیے ہیں۔ انگریزی
اسٹیٹسمین کے مطابق
مونوپلی ایکٹ اور گورنمنٹ کی نئی لائسنس پالیسی کے باوجود
کی صنعتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور انھیں نئی صنعتیں

مولوی برکت اللہ ان لاکھوں لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے طرح طرح کی
قربانیاں دیکر ملک کو آزاد کرایا۔

ہمیں غیر ملکی حکومت سے تو نجات مل گئی لیکن غیر ممالک
کے معاشی ہتھکنڈوں سے ہم نجات حاصل نہیں کر سکے۔ غیر ملکی
سرمائے کا اثر ہماری ملکی معیشت پر بڑھتا چلا گیا۔ جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ ہم معاشی میدان میں پھر یورپین ممالک کے غلام بن کر رہ گئے۔
ان ممالک نے کس طرح ہندوستان کی معیشت پر تسلط جمایا ہے
وہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہو جائے گا۔

یہ چیز اس بات سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ۱۹۵۷ء میں ان معاہدوں کی کل تعداد ۱۴۰ تھی جبکہ ۱۹۷۱ء میں یہ بڑھ کر ۲۵۰۰ تک پہونچ گئے ہیں۔

اسی اخبار کا نامہ نگار آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے کے اشتراک (Foreign Collaboration) کو گھٹایا نہیں جا رہا ہے بلکہ غیر ملکی کمپنیاں حکومت ہند کے بڑھاوا دینے پر اور زیادہ سرمایہ ہندوستان میں لگا رہی ہیں۔ چائے کی صنعت میں تو یہ حالت ہے کہ ساری ۱۲۴ کمپنیاں غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جس حساب سے یہ کمپنیاں ہندوستان کی دولت نفع کی شکل میں لوٹ کر لیجا رہی ہیں اس پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیے۔

روزنامہ اسٹیٹسمین کے مطابق اوسطاً ان کمپنیوں نے ۷۰-۱۹۶۹ء میں ۳ء۵ فیصد نفع کمایا۔ ان میں سب سے زیادہ نفع امریکن کمپنیوں کو حاصل ہوا۔ ان کی نفع کی درنر ۹ء۶٪ تھی اس کے بعد انگریزی کمپنیوں کا نمبر آتا ہے جنہیں ۵ء۱٪ نفع حاصل ہوا۔ اس طرح ہم ابھی تک اپنی دولت اور سرمایہ غیر ممالک کے حوالے کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کا سونا سمٹ کر یورپ پہنچ رہا ہے۔ دادا بھائی نوروجی نے آج سے تقریباً ۷۵ سال پہلے جب ہم غلام تھے (DRAIN THEORY) پیش کی تھی۔ اس میں انھوں نے بتلایا تھا کہ کس طرح ہماری دولت تجارت کے ذریعے انگلینڈ اور یورپ کی طرف بہائی جا رہی تھی۔

آج حالات بہت مختلف معلوم نہیں دیتے۔ آج بھی ہمارے ملک کی دولت یورپ کو DRAIN کی جا رہی ہے ان حالات میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ معاشی طور پر ہم آزاد ہیں۔ کیا اس غلامی کو آزادی کہتے ہوئے دل نہیں دکھتا۔

جنگِ آزادی کے دوران اور کی لڑتے وقت اور اس کے فوراً بعد ہندوستانی عوام سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ آزاد ہندوستان کی بنیاد جمہوری اصولوں پر رکھی جائے گی۔ جمہوریت پھلا اور پھولا ہوگی۔۔۔ اور ہم سب نے یقین کر لیا تھا کہ ہماری جمہوریت دنیا کی جمہوری تاریخ میں سب سے بڑا تجربہ ہوگی۔ لیکن افسوس کبھی خیالِ خام ہی رہا۔ ہندوستانی لیڈرشپ نے جمہوریت کا سبق بھلا دیا اور وہ گھناؤنی حرکتیں کیں کہ جمہوریت کا سر شرم سے جھک گیا Internal Security ایکٹ اور Preventive Detention ایکٹ کی موجودگی میں آج ہندوستانی جمہوریت سسکیاں لیتی ہوئی لب دم ہے۔ یہ دونوں کالے قانون، کالے قانونوں کی تاریخ میں بدترین مثالیں ہیں۔ یہ اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں۔

گاندھی جی کی تعلیمات یاد رفتہ ہو گئیں۔ ان کی تصویر تو پوجی جاتی رہی لیکن اپنے افکار و اعمال میں ہمارے لیڈروں نے اس کے



ہم نے نہ جانے کتنے بہر دیالوں کی قربانیاں دے کر ملک کو آزاد کرایا ہے

بالکل برعکس کیا۔ ہم جیسے جیسے سماج وادی نعروں اور ڈھول کو بڑھاتے گئے عوام اور لیڈروں کے درمیان فرق بھی بڑھتا گیا عام لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہ ملی جبکہ گورنروں اور وزیروں نے ان گھروں، محلوں اور کوٹھیوں میں رہنا شروع کیا جن کی دیکھ بھال پر ہی کروڑوں روپیا خرچ ہوتا ہے۔ ہماری لیڈرشپ کے مطابق اس سے پہلے کہ ہندوستان میں روٹی اور بھوک کا مسئلہ حل ہو جمہوریت کا آغاز ضروری تھا۔

عوام سے یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ آزادی کے بعد نابرابری اور ناانصافی کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ نکلا۔ پچھڑے ہوئے طبقات کے لوگ ابھی تک وہیں ہیں جہاں وہ پہلے تھے۔ عوام کے ایک بڑے حصے کے ساتھ چھوت چھات برتی جاتی انھیں کنوؤں سے پانی نہیں بھرنے دیا جاتا۔ انکو عبادت گاہ میں جانے سے روک دیا جاتا ہے۔ ابھی تک اچھوتوں کو زندہ پکڑ کر جلایا جاتا ہے۔ آج آزادی کے ۲۵ سال بعد بھی ہر بھنگی کالونیوں کی حالت بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ آزادی سے پہلے تھی ابھی تک اقلیتوں کو جائز حقوق نہیں مل سکے۔ غیر اطلاعات کے مطابق آزادی کے بعد سے اب تک تقریباً ۔ مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں۔ ابھی تک گرو گولوالکر کی کتاب "Bunch of Thought" بازاروں میں بکتی ہے۔ آزادی نے اقلیتوں کو کیا دیا ہے؟ سیدھا سا جواب "کچھ نہیں"۔

یہ سب زندہ حقائق ہیں۔ بہت ہی افسوسناک اور شرمناک۔ آزادی کے بعد بھی ہم آزاد نہیں ہوئے۔ سماجی، سیاسی اور آزادی ابھی تک ایک خواب ہی ہے۔ دنیا میں کم ممالک ایسے جہاں کے عوام عام طور پر اپنی آزادی سے اس قدر مایوس اکثر لوگ یہی سوال کرتے ہیں۔ "یہ کیسی آزادی ہے آخر کیا ملا"؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ شاید وقت اس کا جواب دے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ وقت کب آئے گا۔ جب ہم معنوں میں آزاد ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے ۵۵ کروڑ ملکر سوشلزم اور معاشی و سماجی برابری کے خوابوں میں کا رنگ بھر دیں گے۔ وہ وقت اب شاید بہت دور نہیں عوام بیدار ہو رہے ہیں اور یہ بیدار عوام بہت جلد ہی صحیح عوامی جمہوریت کی بنیاد ڈال دیں گے۔



اپولو ۱۵ کا مشن

"میری خواہش تھی کہ ہم یہاں بیٹھتے اور کچھ دیر یہاں کے چٹانی ٹکڑوں سے کھیلتے۔ یہ کتنے صاف شفاف اور چکیلے ہیں۔"

یہ الفاظ اپولو ۱۵ کے خلاباز۔ ڈیوڈ آر اسکاٹ (۳۹ برس) نے کہے جب وہ اور ان کے ساتھی جیمز بی ارون (۴۱ برس) چاند کے ایپی نائن نامی پہاڑی سلسلے تک اپنی چاند کار میں پہنچے چاند کی سطح کو اپنے پیروں سے روندنے کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ انسان نے اس کی سطح پر چاند گاڑی چلائی۔ یہ کار آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی جا سکی۔ ٹیلی ویژن پر خلابازوں نے بتایا کہ: "ایسا معلوم ہوتا ہے، ہم پہاڑی علاقوں میں چل رہے ہیں یہ چل کیا رہے ہوں گے اچھل رہے ہوں گے اس لئے کہ چاند پر زمین کی طرح سڑکیں نہیں ہیں۔ لیکن سائنسدانوں نے چاند کار کو اس انداز پر بنایا ہے کہ وہ جھٹکوں کو برداشت کر سکے

اپولو ۱۵۔ ۲۶ر جولائی کو صبح ۹ بج کر ۱۵ منٹ پر خلا میں داغا گیا تھا اور اس کے مشن کی مدت ۱۲ دن، ۷ گھنٹے اور ۱۲ منٹ تھی۔ پچھلے تمام تجربات کے مقابلے میں یہ تجربہ سب سے زیادہ کامیاب رہا اور اس میں کئی نئی باتیں دیکھنے میں آئیں۔ مثلاً پہلی بار چاند کار چاند پر لیجائی گئی۔ پہلی بار ایک انسان بردار خلائی جہاز سے ایک غیر انسان بردار مصنوعی سیارہ چھوڑا گیا جو چاند کے مدار میں ایک سال تک گردش کرتا رہے گا۔ اور خلاباز پہلے سے زیادہ دیر تک چاند پر رہے۔

چاند پر خلابازوں نے صرف چٹانیں ہی جمع نہیں کیں بلکہ انھوں نے چاند کی سطح پر سوراخ بھی کیے۔ تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ چاند کے اندرونی حصے میں کتنی گرمی ہے۔ اسکاٹ دس فیٹ گہرے سوراخ کرنا چاہتا تھا لیکن پہلا سوراخ وہ صرف پانچ فیٹ سے کچھ زیادہ کر سکا اور دوسرا سوراخ ۳ ۱/۲ فیٹ سے زیادہ نہ ہو سکا۔ خلاباز اپنے اس کام میں جٹے ہوئے تھے کہ کنٹرول روم سے انھیں ہدایت کی گئی کہ وہ اور زیادہ خطرہ مول نہ لیں۔

خلابازوں نے ۲۰ جولائی کو چاند پر اترنے اور ۲ اگست کو واپس روانہ ہونے کے درمیان جو دن گزارے وہ اس کرہ کی ۴ ۱/۲ ارب سال کی تاریخ میں "عجیب ترین" تھے۔ اور اسی کے ساتھ ان خلائی مسافروں نے دنیا میں بے شمار لوگوں کے لیے ہفتے کے آخری دنوں میں جو پروگرام پیش کیے وہ نہایت ہی غیر معمولی تھے۔

انھوں نے ایک ٹیلی ویژن شو پیش کیا جس میں خود چاند کا کام سب سے نمایاں رہا۔ قریب قریب پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ٹیلی ویژن دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے تاریخ کی تشکیل ہوتے دیکھی، اور انھوں نے خلاباز ڈیوڈ اسکاٹ اور جیمز بی ارون کو چاند پر پیچیدہ آلات نصب کرتے اور ان پر کام کرتے دیکھا۔

اپولو ۱۵ کے مشن کی نمایاں خصوصیت ایک ٹیلی ویژن کیمرہ تھا جسے بذریعہ ریڈیو زمین سے کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ جب یہ ٹیلی ویژن کیمرہ دائیں بائیں یا کبھی کبھی پورے دائرے میں گھومتا تو زمین پر دیکھنے والوں کو ایسے وسیع مناظر دیکھنے کو ملتے جنہیں آج سے پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھا۔ لوگوں نے ایپی نائن پہاڑیوں کی فلک بوس چوٹیاں دیکھیں جن کے دامن میں دونوں خلاباز مختلف تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

جس دوران خلاباز اسکاٹ اور ارون چاند پر تھے۔ ان کے تیسرے ساتھی خلاباز الفریڈ ایم۔ وارڈن چاند کے مدار میں کمان گاڑی میں چکر لگا رہے تھے اور الگ اپنے مشاہدات میں مصروف تھے۔ وہ چاند۔ زمین اور ستاروں کا براہ راست عینی اور آلاتی مشاہدہ کر رہے تھے۔

اپولو ۱۵ کے مشن میں جو طریقے اپنائے گئے وہ یقیناً ان تکنیکوں کا پیش خیمہ ہیں جو اس صدی کے بقایا حصے میں لازماً وسیع پیمانے پر استعمال کی جائیں گی۔

واقعات نئی دہلی



اس نے بارہ سو کتابیں لکھیں اور اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ ۵۰۰ بچوں کا باپ ہے!

دنیا کے نامور مصنفین سے ملاقات ۲

الیگزینڈر ڈوما

سب سے زیادہ ہر دل عزیز مہماتی کہانی کون سی ہے؟ رابنسن کروسو؟ ڈون کیخوتے؟ خزانے کا جزیرہ؟" نظری طور پر اس بارے میں ہماری رائیں مختلف ہیں۔ لیکن میں تو صرف "تین بندوقچی" کے حق میں ووٹ ڈالوں گا۔

"تین بندوقچی" کا شمار تقریباً ایک صدی سے سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں ہے۔ اس وقت بھی سیکڑوں لوگ جنہوں مختلف زبانوں میں اس ناول کو پڑھ رہے ہوں گے۔

ناول نویسی کی صنف میں "تین بندوقچی" کا مصنف الیگزینڈر ڈوما ایک عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے یہ شیخی بگھارنے میں بڑا

واقعات نئی دہلی

مزا آتا تھا کہ وہ پانچسو سے زیادہ بچوں کا باپ ہے۔ ممکن ہے اس نے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کچھ زیادہ ہی رعایت سے کام لیا ہو۔ لیکن اپنے مٹاپے اور بے تکے چہرے مہرے کے باوجود وہ عورتوں کو موہ لینے کا گُر جانتا تھا۔ اس نے بار بار یہ دعویٰ کیا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ لیکن اس سلسلے میں اس کی لاف زنی کچھ بے طرح بڑھ گئی تھی اور ایک محبوبہ نے اس کی سب ہیکڑی نکال دی۔ اُس نے اپنے سرپرست سے کہا کہ وہ ڈوما کے تمام قرضے قرض خواہوں لو زیادہ رقم دے کر خرید لے۔ اُن دنوں مقروض آدمی کو جیل بھیجا جا سکتا تھا۔ چنانچہ عظیم عاشق ڈوما کو شائستگی کے ساتھ مطلع کر دیا

یا جیل چلا جائے۔ ڈوما نے شادی کر لی۔

ڈوما کی شکل و صورت بھی عجیب تھی۔ اس کی رگوں چوتھائی خون تو گوروں کا تھا اور ایک چوتھائی حبشیوں کا دادی جزائر غرب الہند کے ایک گنے کے فارم پر حبشن یا حیثیت سے رہتی تھی۔ اس کا نام میری ڈوما تھا۔ اس اور جاہل عورت نے گمنامی کی زندگی گزاری اور اسی دفن ہوئی۔ اس بچاری نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سو کہ اس کے پوتے کی شہریار اور شاعر اور امراء تعظیم و تکریم اور وہ اس کا نام چار دانگ عالم میں روشن کرے گا۔

ڈوما اپنی حبشی دادی سے خاصی مشابہت رکھتا ویسے اس کا رنگ تو بالکل گورا تھا۔ اور آنکھیں جزائر کے آسمان کی طرح نیلی تھیں۔ لیکن اس کے ہونٹ مو نتھنے چوڑے اور چپٹے تھے۔

اس نے تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہو کر میر ڈوئل لڑے۔ اس کے بال تھے تو گیندے کی طرح زر بالکل اپنی حبشی دادی پر گئے تھے یعنی گچھے ہوئے گھونگھریا

خوش خوراک ہونے کے باعث وہ ہر قسم کی میٹھی چیا یا مرغ وغیرہ بھوننے میں اتنا ہی مشہور تھا جتنا ناول لکھ قابلیت میں۔ وہ بیک وقت مچھلی کی کئی پلیٹیں، کئی بچے تیتر، نصف درجن کے قریب مختلف سبزیاں اور بہت کھا جایا کرتا تھا۔ جب وہ کھانے پر آتا تو اس قدر کھا اگر مشہور زمانہ بسٹو بسمارک اسے دیکھ لیتا تو... شرمن لیکن اپنی اس پرخوری کے باوجود اس نے نہ تو کبھی شراب یا نہ کبھی سگریٹ پی تھی۔ جب وہ لکھنے میں مصروف ہو کی بھی پروا نہ کرتا۔ بعض دفعہ تو کھانا تناول کرنا بھی بھو جب وہ کام میں مصروف ہوتا اور کوئی دوست ملنے آجا فقط اپنا بایاں ہاتھ دراز کر کے اُسے خوش آمدید کہتا۔ اور میں مشغول ہو جاتا۔

لیکن وہ جس قسم کا کاغذ یا قلم استعمال کرتا تھا۔ اسے انتہائی جذباتی ہوتا۔ مثلاً وہ ناول صرف نیلے کاغذ پر اور فا کے قلموں سے لکھا کرتا تھا۔ شعر لکھتے وقت وہ زرد کاغذ قسم کے قلم استعمال کرتا۔ کسی رسالے کے لیے مضمون لکھ وہ گلابی کاغذ کے سوا کوئی دوسرا کاغذ استعمال نہ کرتا۔ خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ اسے کبھی نیلی سیاہی استعمال نہ کی

...دیکھے ...کر لیتا۔

...داہیات؟ جی ہاں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ آپ اسپر ...میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس نے زندگی میں کیا کچھ کیا۔ ...کوئی ایک سو ڈرامے لکھے ہی ناول اور تاریخی کتابیں ...لیکن آج جب اس کی تمام نگارشات جمع کی گئی ہیں تو ... جلدیں بنی ہیں۔ ذرا سوچیے! بارہ سو جلدیں۔ اگر جون ...ی، جارج برنرڈ شا، رابرٹ لوئس سٹیونسن، ایچ۔ جی ویلز ...یلنگ، امیری رو برٹس، ایج ہارٹ اور زین گرے ان ...تھوں کی نگارشات جمع کر لی جائیں تب بھی ڈوما نے ...ان سے دو گنا لکھا ہے۔

...ن نے قلم سے زیادہ پونڈ کمائے اپنے زمانے کے ...منف سے بہت زیادہ! درحقیقت ادبی تاریخ میں شاید ہی ...مصنف نے اپنی نگارشات سے اتنا روپیہ کمایا ہو۔ اس کے ...زندہ اس قدر غریب تھا کہ جب اس کا پہلا ڈراما اسٹیج ہونے ...والا تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اپنی قمیص کیلئے ...نیا کالر خرید کر اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے واقعہ ...شرکت کر سکے۔

اس عظیم ڈرامہ نگار کو اپنی ماں سے بے حد پیار تھا۔ اسکا ...ڈرامہ اسٹیج ہونے سے تین دن پہلے اس کی ماں فالج کا ...شکار ہو گئی۔ لہٰذا پیرس میں اپنی عظیم کامیابی کی پہلی رات کے ...دوران ڈوما اپنے ڈرامے کے ہر ایکٹ کے اختتام پر بھاگ بھاگ ...ماں کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا کہ اسے کسی چیز کی ...ضرورت تو نہیں ہے۔ اور اس رات جبکہ سارے پیرس میں اسکا نام ...گونج رہا تھا، وہ ایک چٹائی پر اپنی ماں کے قدموں میں سو گیا۔

ڈوما کے ناولوں کے کردار اسکے نزدیک بیحد حقیقی تھے ...وہ ان کے خواب دیکھتا اور ان کے متعلق یوں باتیں کرتا جیسے ...وہ بالکل حقیقی ہوں۔ وہ ان کے متعلق ایسے شوق اور رغبت ...سے لکھتا کہ آج بھی ایک سو سال بعد آپ کو محو کر دیتے ہیں یہ ...بات کردار نگاری کرتے وقت وہ کہانی میں اس قدر محو ہو جاتا کہ ...زور زور سے قہقہے لگانے اور اپنے کرداروں سے مذاق کرنے لگتا ...جیسے وہ اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہوں۔ بہت سے مصنفوں ...کیلئے لکھنے کا عمل اذیت ناک ہوتا ہے۔ مگر ڈوما کے ساتھ معاملہ ...بالکل برعکس تھا۔ اسے لکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

...سے کبھی اس نے ایک وقت میں ... ناول لکھے ... وہ ہر روز قسط وار اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ اسکے پاس اتنا وقت نہ ہوتا کہ اپنی کتابیں پڑھ سکے۔ لیکن اسکے پاس اتنا وقت ضرور تھا کہ تلواروں اور پستولوں سے بیس ڈوئیل لڑ سکے۔

جوں جوں وہ بوڑھا ہوتا گیا، وہ شراب عورتوں اور موسیقی کی طرف مائل ہونے لگا۔ نہیں نہیں میں نے غلط کہا ہے۔ اس نے تو شراب ہی پی، اور نہ موسیقی کی طرف راغب ہوا لیکن وہ لڑکیوں کا بے حد متوالا ہو گیا تھا۔

پیرس میں اگر کوئی خوبی ہے تو یہ ہے کہ بڑا وسیع القلب شہر ہے۔ اس شہر میں خواہ کچھ بھی ہوتا ہے، لوگ توجہ نہیں دیتے۔ لیکن پیرس جیسے شہر تک میں ڈوما کی حیات معاشقہ ایک سنسنی خیز واقعہ بن گئی تھی۔ انجام کار اس کے عشق سے تنگ آ کر اسکا بیٹا بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت اس کا ایک دوست ملنے آیا تو اسے لڑکیوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک اس کے گھٹنے پر بیٹھی تھی دوسری لڑکی اس کے قدموں پر بیٹھی تھی ایک اور لڑکی اس کے سر پر جھکی اس کے موٹے موٹے ہونٹ چوم رہی تھی اور ان تینوں لڑکیوں نے اس قدر لباس نہ پہن رکھا تھا کہ کسی کے سامنے آ سکیں۔ لوگ اس کی دولت لوٹتے اور اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔

ڈوما نے اپنا بڑھاپا مفلسی اور تنہائی میں گذارا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اسے اپنے زیورات حتیٰ کہ اوور کوٹ تک گروی رکھنا پڑا۔ اس کا بیٹا اگر اس کی مدد نہ کرتا تو اسے بھوکوں مرنا پڑتا۔

موت سے تھوڑی دیر پہلے اس کے بیٹے نے دیکھا کہ وہ اپنا مشہور ناول "تین بندوقچی" پڑھ رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے پوچھا۔ "ابا! آپ کو یہ ناول کیسا لگ رہا ہے؟" "اچھا ہے" اس نے مختصر جواب دیا۔

اچھا ہے؟ میں بھی یہی کہوں گا۔ اگر آپ تفریح طبع کے خواہاں ہیں تو یہ ناول پڑھیے۔ اس ناول کے بعد آج تک لاکھوں ناول لکھے گئے ہیں مگر وہ سب اس کے سامنے ماند پڑ گئے ہیں۔ "تین بندوقچی" ایک غیر فانی ناول ہے۔ آج سے دو سو سال بعد بھی آپکے بچوں کے بچے پھر انکے بچوں کے بچے رات کی خاموشی میں مزے سے یہ ناول پڑھ رہے ہوں گے۔



سارے گاؤں میں اس کا نام چرچا ہے۔ اگر رامپور کے چھوٹے سے گاؤں میں اخبار ہوتا تو یہ خبر جلی سرخی سے چھپتی۔

بسنتی کی ہمت کی سب داد دیتے ہیں.... عمر پچاس کے لگ بھگ.... دُھن کی پکی.... سلائی مشین خرید رکھی ہے۔ گاؤں کے بنک نے اسے قرضہ دیا تھا۔ پڑوسیوں کے کپڑے سی کر وہ گھر کا خرچ چلانے میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے.... کتنی ان تھک ہے۔

گھر کے کام دھندے سے فارغ ہو کر وہ کپڑے سیتی ہے۔ کیوں نہ ہو، جھونپڑی میں بجلی لگی ہوئی ہے۔



بجلی دیہات میں بھی پہونچ چکی ہے.... چھوٹے چھوٹے کارخانے.... مشینیں.... پمپ وغیرہ.....

یہ سب اسی کی کرامات ہے اور تو اور اب کولہو بھی بجلی سے چلتا ہے۔ تیلی نے بیل فروخت کر دیئے ہیں۔ اب اس کا لڑکا پالی ٹیکنیک میں پڑھتا ہے۔ کون جانے کسی دن وہ تیل کے لئے کھدائی کرنے لگے۔

آج، کل سے بہتر ہے *
کل، آج سے بھی بڑھ کر ہوگا۔

* "آج کا بھارت" کتابچہ کی مفت کاپی کے لئے، ڈی۔ اے۔ وی۔ پی، بلاک نمبر ۲ ، پی ٹی آئی بلڈنگ، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی۔۱ کو لکھیے۔

بسنتی رات میں سلائی کرتی ہے



ریت کی دیوار

موپاساں

ناوک حمزہ پوری

سفید داڑھی والے ایک بوڑھے فقیر نے ہم سے بھیک مانگی۔ میرے دوست جوزف داوراں نے اس کی ہتھیلی پر پانچ فرانک رکھ دیے۔ مجھے متعجب دیکھ کر کہنے لگے "اس غریب بوڑھے نے ایک یاد تازہ کر دی جو تمہیں سناتا ہوں۔ اگر۔۔۔ خیر، وہ قصہ آپ سے کہہ دوں، تو؟"

میرے ماں باپ ہاورے کے رہنے والے تھے۔ وہ امیر نہیں تھے۔ بس کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میرے والد دفتر میں ملازم تھے۔ خوب محنت کرتے اور گھر دیر سے لوٹتے لیکن پھر بھی زیادہ پیسے انہیں نہ مل پاتے تھے۔ میری دو بہنیں تھیں۔ جس افلاس میں ہماری زندگی بیت رہی تھی اس سے ہماری ماں بہت دکھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ والد کو بہت سخت سست سناتی اور بری طرح کوستی۔ ایسے موقعوں پر میرے والد کی صورت بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج بھی ان کی صورت یاد کر کے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ ایک لفظ بھی بولے بغیر وہ اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرنے لگتے تھے۔ ان کی اس بے بسی کے کرب کو میں محسوس کر سکتا تھا۔

ہر مد میں ہم بڑی کفایت شعاری برتتے تھے۔ کبھی کھانے کی دعوت ہم منظور نہیں کرتے تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ بدلے میں دعوت دینا ہوگی۔ دوکانداروں کے ہاں بیچ باچ لینے کے بعد جو چیزیں بچ جاتی تھیں انہیں میں سے ہم اپنے کھانے پینے کی چیزیں خرید سکتے تھے۔ میری بہنیں اپنے کپڑے خود سی لیتی تھیں اور پندرہ سنٹائم کے کسی گوٹے کے لئے گھنٹوں بحث و مباحثہ کرتی تھیں۔ ہمارے کھانوں میں گھٹیا چربی دار شوربہ رہتا تھا۔ جب کبھی میں اپنا پتلون پھاڑ آتا تو گھر میں محشر خیز ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

لیکن ہر اتوار کو ساحل پر ٹہلنے کے لئے جانے کو ہم لوگ اپنے سب سے بڑھیا کپڑے پہنتے تھے۔ فراک کوٹ، ٹوپ ہیٹ اور دستانے پہن کر میرے والد میری ماں کی بانہہ میں بانہہ ڈال کر شان سے چلتے تھے۔ میری ماں بھی خوب سج دھج کر نکلتی تھی۔ میری بہنیں تو سب سے پہلے ہی جانے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ لیکن ٹھیک چلنے کے وقت والد کے کوٹ پر لگے کسی دھبے پر کسی کی نگاہ پڑ جاتی اور تب ماں اپنے دستانے اتار کر اور چشمہ لگا کر انہیں صاف کرنے میں لگ جاتی۔ والد کھڑے دھبے کے صاف ہونے کا انتظار کرتے رہتے۔

غرضیکہ ہم لوگ بڑی سج دھج کے ساتھ روانہ ہوتے بہنیں بہ ۔۔۔ گر بانہہ میں بانہہ ڈالے چلتیں۔ وہ شادی کے لائق ہو گئی تھیں۔ اور یہ بات پورے شہر کو جتا دینا چاہتی تھیں۔ میں اپنی ماں کے بائیں اور والد ان کے دائیں چلتے تھے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ان اتواروں کو میرے ماں باپ کتنے اہتمام سے نکلتے تھے وہ اپنے چہروں پر سنجیدگی طاری کئے رہتے۔ چلتے تو بالکل نپے تلے ڈگ بھرتے ہوئے۔ جسم بالکل سیدھا تنا ہوا۔ پاؤں اکڑے ہوئے جیسے ان کی چال ڈھال پر کسی اہم بات کا انحصار ہو۔

اور ہر اتوار کو جب ہم لوگ دور دریش سے آتے ہوئے کسی جہاز کو دیکھتے تو ہمارے والد بول اٹھتے "جہاز پر اگر ژول ہو تو مزہ آ جائے۔ واہ!"

میرے چچا ژول کسی وقت خاندان کے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ لیکن اب ہم لوگوں کے لئے امید کی آخری کرن تھے۔ اپنے بچپن سے ہی میں ان کے بارے میں سنتا آیا تھا۔ میرے تصور میں ان کی شکل اتنی واضح تھی کہ مجھے یقین ہے کہ پہلی نظر پڑتے ہی میں ان کو پہچان گیا ہوتا۔ ان کے امریکا جانے سے پہلے کی ان کی زندگی کے بارے میں ذرا ذرا رتی رتی جان چکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے کوئی بڑی رقم برباد کر دی تھی جسے غریب خاندان کے لئے بڑا عذاب ماننا چاہیے۔ امیر خاندان کے ستی زندگی گزارنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "بے وقوفی کر رہا ہے" ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے "پاجی یا شریر" کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن غریب خاندان میں جب کوئی نوجوان اپنے ماں باپ کو ان کی پونجی میں ہاتھ ڈالنے کے لئے مجبور کرتا ہے تو وہ کمینہ کہا جاتا ہے حالانکہ دونوں معاملے یکساں ہیں، لیکن دونوں میں فرق کیا جانا مناسب ہے کیونکہ کسی بھی فعل کی اہمیت اس کے نتیجے سے ظاہر ہوتی ہے۔ قصہ مختصر چچا نے اپنے حصے کی آخری کوڑی تک اڑا کر ۔۔۔

واقعات نئی دہلی

[illegible]

ن الا تھا اور ایک دن وہ بادھسے نیو یارک جانے

، جہاز سے امریکا چلے گئے۔

چچا ٹمٹی نے وہاں پہونچتے ہی کوئی تجارت شروع کر کی

لد ہی ایک خط لکھا کہ وہ خوب کما رہے ہیں اور اُمید

ہیں کہ انھوں نے میرے والد کا جتنا نقصان کیا ہے

کی تلافی کر دیں گے۔ اس خط نے میرے گھر میں بڑی

ل مچا دی۔ چچا ایک عجیب کیریکٹر ایک نکھٹو آوارہ نوجوان

ایک شریف ایماندار اور ہمارے خاندان کی ساری عظمتوں

شان بن گئے۔ اسی درمیان میں ایک جہاز کے کپتان

بھی خبر دی کہ انھوں نے ایک بڑی دوکان لے لی ہے

دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔

دو سال کے بعد ایک دوسرا خط پہنچا۔ خط میں لکھا تھا

ارے فلپ! میں بخیریت ہوں میرے لئے مطلق فکر

رنا۔ تجارت بھی خوب چل نکلی ہے۔ کل میں ایک لمبے سفر

جنوبی امریکا کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ

ئی برسوں کے بعد تمھیں میرا خط ملے۔ تم فکر مند نہ ہونا۔

ولت کمانے کے بعد میں ایک بار ہاور ے ضرور آؤں گا

امید ہے کہ اس میں کچھ زیادہ عرصہ نہ لگے گا اور تب ہم

ی عیش کے دن گزاریں گے۔

وہ خط ہمارے لئے مذہبی آیت بن گیا تھا۔ ذرا سا

ہی بہانہ ملنے پر اسے نکال کر پڑھا جاتا اور لوگوں کو دکھایا جاتا

س سال تک چچا ٹمٹی نے اپنی کوئی خیریت نہ لکھی، لیکن

رت کے اس طویل بہاؤ نے میرے والد کی امیدوں کو

ور بڑھاوا ہی دیا۔ میری ماں بھی اکثر کہتی تھیں: "جب

ٹمٹی آئیں گے تو زندگی کچھ اور ہی ہوگی۔ یہی تو ایک ایسا

آدمی نکلا ہے، نہ دنیا میں کچھ ترقی کی ہے"

بڑے بڑے کاسے

جہازوں کو موٹی کچھار لگاتے، نزدیک آتے دیکھتے تو کہا

رتے تھے "اگر اس جہاز سے اترے تو کتنا مزہ آجائے"

وہ تب ایسا لگتا تھا کہ رومال ہلاتے ہوئے اب آگئے ہی

یہ چچا جہاز سے اترنے والے ہیں۔

چچا کی واپسی کا میرے والد کو اتنا یقین تھا کہ

انھوں نے اسی بھروسے پر کئی منصوبے باندھ رکھے تھے۔

انھیں کے روپوں سے والد نے ایک مکان خریدنا بھی طے

کر لیا تھا۔ اب یہ قسم کھا کر کہنے کی ضرورت نہیں کہ والد صاحب

نے مالک مکان سے بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

میری دونوں بہنوں میں سے بڑی بہن اس وقت

اٹھائیس برس کی تھی اور چھوٹی ۲۶ برس کی۔ ان کی شادی

ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے گھر کا ہر

فرد متفکر تھا۔ آخر چھوٹی بہن کے لئے ایک رشتہ نکل آیا

وہ کرانی تھا۔ امیر نہ تھا لیکن معزز تھا۔ میرا اپنا ہمیشہ

یہی یقین رہا ہے کہ چچا ٹمٹی کے اس خط نے جسے میرے

ہونے والے بہنوئی نے ایک شام دیکھ لیا تھا، اس کے

ردو بدل کو دور کر دیا تھا اور شادی کر گزرنے کو تیار

بھی کر دیا تھا۔

وہ رشتہ بڑی خوشی سے ہم نے جھٹ پٹ منظور کر لیا

طے ہوا کہ شادی کے بعد سارے لوگ جرسی کی سیر کرائیں

ہے یہاں جرسی کی سیر ایک غریب خاندان کی سب سے

بڑی آرزو ہوتی ہے۔ وہ کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔

بس سمندر کو اسٹیمر سے پار کرنا ہوتا ہے، اور چونکہ وہ جزیرہ

انگریزوں کا ہے، ایک بار آپ وہاں پہونچے نہیں کہ گویا

آپ بدیس چلے گئے۔

جرسی کا یہ سفر ہم پر سنک کی طرح سوار ہو گیا، ایک

خواب جس کی تعبیر کا ہم بڑی بے قراری سے انتظار کر رہے

تھے۔ اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔

میں آج بھی ساری باتیں جوں کی توں دیکھ رہا ہوں

جیسے یہ ساری باتیں ابھی کل ہی ہوئی ہوں۔ گرین ویلے

کی گھاٹ پر جہاز کا تیار کھڑا رہنا۔ والد صاحب کا بڑی

مستعدی سے ہمارے تینوں بکسوں کو لادنا۔ ماں کا

گھبراہٹ کے ساتھ غیر شادی شدہ بہن کا ہاتھ پکڑے

رہنا۔ یہ بے چاری دوسری بہن کی رخصتی کے بعد سے

مرغی خانے کے آخری چوزے کی طرح اداس رہتی تھی۔

تھا اور میں گھوم گھوم کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ آخر

وہ کر کیا رہے ہیں۔

ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے تھے۔ جہاز نے سیٹی

دی اور سبز چکنے مرمر کی طرح چکنے سمندر پر بیٹھ گیا

جن لوگوں کو سفر کا بہت کم موقع ملتا ہے انھیں لوگوں

کی طرح ہم لوگ کناروں کو اوجھل ہوتے ہوئے بہت

دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میرے والد کی توند ان کے

فراک کوٹ کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔ اچانک ان کی

نظر دو خوبصورت نوجوان عورتوں پر پڑی جن کے لئے دو مرد

گھونگے خرید رہے تھے۔ میلا کچیلا بوڑھا چاقو سے گھونگوں

کے چھلکے اتار کر مردوں کے ہاتھ میں دے رہا تھا جسے وہ

عورتوں کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ اور وہ بڑی نفاست

سے کھا رہی تھیں۔ چھلکوں کو وہ چمکدار رومال میں پکڑے

ہوئے تھیں اور ذرا آگے کی طرف سر کو جھکا کر کھا رہی

تھیں۔ تاکہ کپڑے گندے نہ ہو جائیں۔ پھر انھوں نے

عجیب ڈھنگ سے جھک کر پانی پیا اور چھلکوں کو سمندر

میں پھینک دیا۔

ایسا لگتا تھا کہ میرے والد کو یوں چلتے جہاز پر

گھونگے کھانا بڑا اچھا لگا۔ وہ میری ماں اور بہنوں

کے پاس پہونچے اور پوچھا کہ کیا وہ ان لوگوں کے لئے بھی

کچھ گھونگے خریدیں۔ میری ماں خرچ کا خیال کر کے ذرا

ہچکچائیں لیکن بہنوں نے فوراً ہاں کہہ کر للچائی ہوئی

نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میری ماں نے تاسف

بھرے لہجے میں کہا: "مجھے ڈر ہے کہ اس سے میری طبیعت

خراب ہو جائے گی۔ ہاں تم چاہو تو بچوں کے لئے خرید سکتے

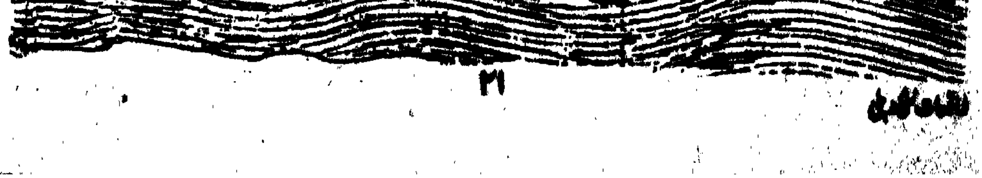
ہو۔ لیکن دیکھو انھیں بھی زیادہ نہ کھلانا، ورنہ انکی طبیعت

خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔" تب میری طرف مڑ کر والد

نے کہا: "جوزف کو ضرورت نہیں ہے۔ لڑکوں کی عادت

بگاڑنی نہیں چاہئے۔" اس لئے میں ماں کے پاس ہی رک

گیا اور اس دو نظری پر دل ہی دل میں کڑھتا رہ گیا۔ میں



نے دیکھا کہ والد بڑی لڑکی کے ساتھ اپنی دونوں لڑکیوں اور داماد کو اس میلے کچیلے ملاح کے پاس لے گئے۔

پہلی دونوں عورتیں ابھی ابھی وہاں گئی تھیں۔ والد نے میری بہنوں کو بتانا شروع کیا کہ کس طرح پانی کو چھلکنے سے بچانا چاہیئے۔ یہ بتانے کے لئے انھوں نے گھونگھے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں عورتوں کی نقل کرنے میں پانی سے ان کا فراک کوٹ بالکل بھیگ گیا اور میں نے والدہ کو بڑبڑاتے سُنا: "اچھا ہوتا کہ وہ خاموش ہی رہتے ہوتے۔"

لیکن اچانک والد کے چہرے پر فکر کی لکیریں اُبھر آئیں وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ گھونگھے بیچنے والے کو خوب غور سے دیکھا اور بجلی کی سی تیز رفتاری کے ساتھ ماں کے پاس چلے آئے۔ وہ بالکل پیلے پڑگئے تھے اور انکی آنکھوں سے عجیب مایوسی جھانک رہی تھی۔ بہت دھیمے لہجے میں انھوں نے میری ماں سے کہا:

"یہ کیسی قیامت کی بات ہے کہ گھونگھے بیچنے والا نُرنے سے بہت ملتا جلتا لگتا ہے۔" ماں نے چونکتے ہوئے پوچھا: "کون نُرنے۔"

"میرا بھائی اور کون۔ ہاں سچ! اگر مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ امریکا میں ہے اور خوب دولت بٹور رہا ہے تو میں کہتا کہ یہ آدمی نُرنے ہی ہے۔"

"واہیات بات ہے۔" ماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ وہ نہیں ہے تو پھر ایسی بے ہودہ بات نہیں نکالنی چاہیئے۔"

والد اپنی بات پر اڑے رہے۔ "کلیسی ذرا تم خود جاکر اپنی آنکھوں سے تو دیکھ آؤ تاکہ اطمینان ہو جائے۔"

وہ اٹھ کر لڑکیوں تک گئیں۔ میں بھی اس آدمی کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ بوڑھا گندا اور جھری دار تھا۔ اپنے کام پر سے اس نے اپنی نگاہ کبھی اوپر نہیں اٹھائی۔ ماں لوٹ آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ جلدی جلدی اور تقریباً ہانپتے ہوئے اس نے والد سے کہا:

"میرا خیال ہے یہ وہی ہے۔ ذرا جاؤ اور کپتان سے اس کے بارے میں پوچھو۔ لیکن ہوشیار رہنا۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ بھکاری سا آدمی پھر ہمارے سر آپڑے۔"

میرے والد کپتان سے ملنے چلے تو میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ میری حالت بھی عجیب ہوکر رہ گئی تھی۔ لمبا دبلا اور بڑی بڑی مونچھوں والا کپتان پل کے نیچے اوپر بڑی شان کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ میرے والد انکساری کا لبادہ اوڑھے اس کے پاس پہونچے۔ بیچ بیچ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے والد نے اِدھر اُدھر کے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ "جرسی کیسی ہے، اس کی آبادی کتنی ہے۔ وہاں کی مٹی کیسی ہے۔ وہاں کی خاص پیداوار کیا ہے؟" جیسے کئی سوالات کیئے۔ گفتگو میں ان کا انہماک دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے اہم مسئلے پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔

جس جہاز اسپریس پر ہم لوگ سوار تھے اس کے بارے میں باتیں ہوئیں پھر جہاز کے عملے پر گفتگو ہوئی اور آخر میں والد نے ذرا تنی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ "وہ اس طرف آپ کا ایک گھونگھے بیچنے والا ہے۔ وہ تو عجیب مضحکہ خیز لگتا ہے کیا آپ اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟"

کپتان اس طویل گفتگو سے پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ اس نے ذرا تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ ایک پرانا فرانسیسی بھکمنگا ہے۔ پچھلے سال امریکا میں تھا۔ میں نے اسے اس کے دیس واپس بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں میں اس کے کچھ رشتے دار ہیں لیکن یہ ان کے پاس جانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس پر ان کا کچھ قرض ہے شاید۔ اس کا نام نُرنے ہے۔ ہاں نُرنے راوداں یا اسی طرح کچھ اور۔ امریکا میں کسی وقت وہ پیسے والا تھا ـــ لیکن اب ذرا اسے دیکھئے تو ـــ"

میرے والد پیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان کا گلا رندھ گیا تھا اور آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں۔

"اچھا یہ بات ہے۔ ٹھیک ہی ہے۔" وہ بڑبڑائے "مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کپتان۔" اور وہ وہاں سے چلدیئے۔

کپتان انکی طرف تعجب سے دیکھتا رہ گیا۔ ماں کے پاس والد ناگفتہ بہ حالت میں پہونچے اور اپنا سیٹ پر تقریباً گرتے ہوئے بڑبڑائے:

"یہ وہی ہے۔ یہ وہی ہے۔ ہم اب اس دنیا میں جی کر کیا کریں گے۔ کتنی بڑی مصیبت ہے۔" ماں ناراض ہوتی ہوئی بولی:

"میں جانتی تھی کہ وہ گرہ کٹ کبھی کچھ نہ کر پائے گا ـــ راوداں خاندان کے لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔" والد اپنی پیشانی پہلے جیسی سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ جیسا کہ وہ ماں کے کوسنے پہ ہمیشہ کیا کرتے تھے۔

"جوزف کو پیسے دیدو تاکہ وہ گھونگھے کے پیسے دے آئے۔" ماں کہتی گئی۔ "اس بدنصیب کے ہمیں پہچان لینے کی دیر ہے، تب جہاز پر اچھا تماشا ہو جائے گا۔ ہم لوگ اس طرف چلیں اور جو کچھ بھی ہو ہم اس آدمی کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔" ماں اٹھی۔ مجھے پانچ فرانک دیئے اور دونوں وہاں سے ہٹ گئے۔

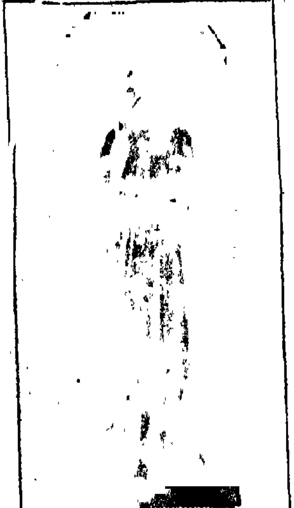
میری بہنیں جو والد کی راہ دیکھ رہی تھیں تعجب میں پڑگئیں۔ میں نے کہا۔ جہاز کے ہلنے ڈولنے سے ماں کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ گھونگھے والے سے میں نے پوچھا کہ اس کے کتنے پیسے ہوتے ہیں۔ اس کو "چچا" میں تقریباً کہہ ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے پانچ فرانک دیے اور اس نے باقی ریزگاری لوٹا دی۔ میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی وہ ایک غریب جھری دار ملاح کا ہاتھ تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر تکان، درد اور محرومیوں کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ میرے چچا ہیں۔ میرے والد کے حقیقی بھائی۔ میرے حقیقی چچا۔ میں نے اسے پچاس سنٹائم ٹپ بھی دیدیے اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

"خدا آپ کو خوش رکھے بڑے بابو!" اس نے ٹھیک بھکاریوں کے سے انداز میں کہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ امریکا میں ضرور اس نے بھیک مانگنے کا کام کیا ہوگا۔

میری بہنیں میری اس سخاوت پر متعجب ہوئیں







"ٹائمز اسکوائر کی تتلیاں"

امریکا

ٹمز اسکوائر۔ فاحشگی کا مرکز

حشگی کسی ایک یا دوسرے ملک کے لئے مخصوص نہیں ہے مار اور غریب ملک کا بھی سوال نہیں ہے۔ ہندوستان میں لیس گی اور جرمنی میں بھی۔ امریکا کے ان شہروں میں بھی ت پرستی ہے اور لاکھوں کروڑوں ڈالر کا لین دین ہوتا احشگی پر بڑی بڑی سماجی پابندیاں لگا دی گئیں۔ لیکن کیا یں ذرا فرق آیا ہو۔ اس کے برعکس اس بیماری کو جتنا وششش کی گئی اتنی ہی بڑھتی گئی۔ قانون سازوں سے رن شکن ہوشیار ہیں۔ اور وہ اپنے بچنے کی صورت نئی نئی سے نکال لیتے ہیں۔

حشگی ہندوستان کی طرح امریکا میں بھی ممنوع ہے لیکن ہیں۔ خاص نیویارک کے "نیویارک ٹائمز اسکوائر" میں ہ دبلا کا اپیل کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے شہ عورتوں کا دن دہاڑے جھگٹ لگے گا جو بلا خوف رں سے باتیں کرتی نظر آئیں گی۔

لے دنوں ان کا زور اتنا بڑھا کہ تاجروں، سیاحوں اور مقامی باشندوں کا چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا۔ ہر طرف جال بچھے ہوئے تھے جن سے نکلنا بڑے ہوشیار آدمی ہی کا کام تھا۔ ایک بڑے ہوٹل کے سامنے ایک شخص کو اس لئے قتل کر دیا گیا کہ اس نے بیسواؤں کی کچھ رقم روک لی تھی۔ ایک جرمن کو جو مغربی جرمنی کی کابینا کا ممبر رہ چکا تھا فاحشہ لڑکیوں کی ایک ٹولی نے لوٹ لیا ہے اور اسی قسم کے واقعات روزانہ پیش آنے لگے اور جب فاحشگی حد سے زیادہ بڑھی تو پولیس بھی حرکت میں آگئی اور ایک اعلیٰ پولیس افسر کیپٹن ڈینیل میک گووان کو فاحشگی پر کنٹرول سے متعلق ڈائرکٹر مقرر کر دیا گیا۔ جس نے پورے علاقے میں سادہ کپڑوں میں ملبوس سپاہیوں کو گشت پر مامور کر دیا اور ان میں سے بہت سوں کو عمدہ کیمرے دیدیے تاکہ وہ گاہکوں کو ترغیب دینے والی لڑکیوں کے فوٹو موقع پر لے سکیں۔

بہت سی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں اور اس طرح شارع عام پر فاحشگی کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ آخر میں پولیس نے فرضی دلالوں کا ایک گروہ تیار کیا جس نے بڑے پیمانے پر فاحشہ عورتوں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ اس چہار جہتی یلغار سے گھبرا کر تتلیوں نے نیویارک ٹائمز اسکوائر سے اڑنا شروع کر دیا۔ جو دولت مند تھیں (بعض لڑکیاں تین سو یا اس سے بھی زیادہ ڈالر روزانہ کما لیتی ہیں) انھوں نے لوس اینجلس، سان فرانسسکو اور اٹلانٹا جیسے شہروں کی طرف رخ کیا جو آب و ہوا کے لحاظ سے بہت اچھے شہر سمجھے جاتے ہیں۔ جو ذرا غریب تھیں وہ مان ہٹن کے مشرقی سمت چلی گئیں۔ لیکن زیادہ تعداد ان کی تھی جنھوں نے اپنے گھروں ہی میں بند رہ کر چھٹیاں گزارنے کو ترجیح دی۔

بظاہر بہت بڑی آفت ختم ہو گئی۔ نیویارک کے شہریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹائمز اسکوائر میں انھیں اب دام فریب میں

الاکولی … با۔ وہ اہل روپوش ہو گئے اور لڑکیوں کے زرق برق کا … ی مفقود ہو گئیں۔ کچھ لوگوں کے خیال رُت بے رونق ہو گیا۔

بے رونقی عدالت میں بھی نظر آئی جہاں کچہری کے ایک بتایا کہ پہلے روزانہ … تک رنڈیوں کے مقدمے یہاں آتے تھے لیکن پندرہ برس میں آج پہلی بار یہ صورت … کہ ایک مقدمہ بھی نہیں۔

… سماجی اصلاح پر سب خوش تھے۔ اخبارات کو بھی … لکھنے کے لئے بڑا اچھا مسالہ مل گیا لیکن چند ہی … یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ بالکل ایسی ہی پسپائی تھی جیسی کہ دوسری … مختلف مورچوں پر اتحادیوں کو ہوئی تھی۔ بازارِ حسن … بار آگئی اور ایک مرتبہ پھر اسکوائر پھر دل جسپیوں کا … گیا۔ وہی اشارے، وہی سودے بازی، وہی دلال اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی انگی کاریں۔

اس قسم کی سماجی برائیاں محض قانون سے نہیں دبا کرتیں … کے لئے قوم کے ایک ایک فرد کے ضمیر کو بے دار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لائبیریا

مقبول ترین ڈکٹیٹر چل بسا

مسٹر ٹب مین کا پورا نام ولیم ویکینات شادرچ ٹب مین تھا لیکن اپنی ریاست لائبیریا کے پندرہ لاکھ باشندوں کے لئے محض سیدھے سادے "اولڈ ڈیڈی" تھے۔ لائبیریا کی ریاست مغربی افریقہ میں سیرالیون اور آئیوری کوسٹ کے درمیان واقع ہے اور اس کا رقبہ ۴۳ ہزار مربع میل ہے۔ پندرہ لاکھ کی آبادی میں پندرہ ہزار کے قریب امریکی نژاد حبشی ہیں۔ انہی امریکی حبشیوں نے جو امریکا میں غلام تھے لیکن آزاد کر دیے گئے تھے، یہ ریاست ۱۸۲۲ء میں قائم کی تھی۔ زمین امریکی نوآبادیاتی سوسائٹی نے مقامی سرداروں سے



ٹب مین

خریدی تھی۔

ریاست کا دستور قدرتی طور پر امریکی طرز کا ہے اور ریاست کی زبان انگریزی ہے۔ مسٹر ٹب مین کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وہ ۲۷ برس تک اپنے ملک کے صدر رہے اور صرف ان کی موت انھیں ان کے عہدے سے الگ کر سکی۔ وہ گزشتہ ہفتے لندن کے ایک اسپتال میں ایک غدودی آپریشن میں پیچیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے چل بسے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔

وہ اپنے ملک کے مالکِ کل تھے۔ ساٹھ لاکھ ڈالر کے محل میں رہتے تھے جو روشنی سے بقعۂ نور بنا رہتا تھا لیکن اس کے باوجود عوام میں گھلے ملے رہتے تھے اور عوام کے ساتھ اکثر قومی رقص میں حصہ لیا کرتے تھے۔

مسٹر ٹب مین نے جن کی حکومت بڑی مستحکم تھی، مقامی حبشیوں اور امریکی نیگروؤں میں فرق کو دور کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی اور اس مقصد کے لئے تعلیم کو عام کیا اور بہت سی اصلاحات جاری کیں۔

اپنے زمانۂ نظم و نسق میں انھوں نے اپنی ریاست کے بجٹ کو دس لاکھ ڈالر سے ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر تک پہونچا دیا۔ انھوں نے اپنے ملک میں سڑکیں تعمیر کرائیں اور ریلوے نظام قائم کیا۔ لیکن یہ سب کچھ انھیں پریس کی آزادی کا گلا گھونٹ کر کرنا پڑا۔ شاید افریقہ کے مزاج کے پیشِ نظر ایسا کرنا ضروری تھا، ورنہ شاید ان کی ریاست اتنی ترقی نہ کر سکتی تھی جتنی کہ اس وقت کی ہے۔

بعض زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کو ٹب مین کے آمرانہ نظامِ حکومت سے شکایت ہوتی تھی اور وہ اس پر سخت اعتراض کرتے تھے لیکن ووٹنگ میں نتیجہ ۹۹ فیصدی ٹب مین کے حق میں نکلتا تھا۔ عوام کے دلوں پر اس کا قبضہ تھا۔

نئے صدر کے لئے عام انتخابات آئندہ جنوری میں ہوں گے اور اس وقت تک ٹب مین ہی کا سکہ چلے گا۔

مشرقِ وسطیٰ

عربوں کا افسوس ناک انتشار

"اگر ہم خود کو متحد نہیں کرتے تو کبھی سرزمینِ عرب سے صیہونیوں کو نہ نکال سکیں گے۔"

یہ الفاظ گزشتہ ہفتے صدر متحدہ عرب جمہوریہ مشیر سادات نے ایک اجتماع میں کہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے جو انھوں نے اس طرح کی اپیل کی ہو۔ وہ شروع سے عرب اتحاد پر زور دیتے رہے ہیں۔ عرب فیڈریشن کے لئے ان کی کوششیں اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ لیکن گزشتہ چند ہفتوں میں مشرقِ وسطیٰ میں جو حالات دیکھنے میں آئے وہ اس امر کا مظہر ہیں کہ عرب ممالک سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنا انتشار ختم نہیں کر سکتے کوئی عرب ملک ایسا نہیں جہاں اندرونی خلفشار نہ ہو اور جہاں ریشہ دوانیاں اور بغاوتیں نہ ہوں اور جہاں خود عرب ایک دوسرے کو بندوق کا نشانہ نہ بنا رہے ہوں۔ سوڈان ہو کہ مراکش، اردن ہو کہ عراق، سب ہی جگہ باہمی تنازعات اور ہوسِ اقتدار پائی جاتی ہے اور ان ملکوں کی پوری توانائی کسی تعمیر پر نہیں بلکہ خود اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے پر خرچ ہو رہی ہے۔ سوڈان میں جنرل نمیری کے خلاف بغاوت ہوئی اور میجر ہاشم العطا نے صدارتی گارڈ اور ایک ٹینک …

سے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ یہ کارروائی اتنی تیزی کے ساتھ عمل میں آئی کہ میجر ہاشم عطا نے بڑے فخر کے ساتھ ام درمان ریڈیو سے اعلان کیا کہ صرف ۴۵ منٹ میں انقلاب مکمل ہو گیا اور اب ملک میں ایک جمہوریت کا قیام عمل میں آ گیا ہے۔

لیکن جتنی تیزی کے ساتھ یہ انقلاب آیا اتنی ہی تیزی کے ساتھ جوابی انقلاب آیا۔ اور لیبیائی فوجوں کی مدد سے صرف چار دن بعد میجر ہاشم العطا کے انقلاب کو ناکام بنا دیا گیا۔ ۴۱ سالہ جنرل نمیری پھر برسرِ اقتدار آ گئے۔ پہلا انقلاب کسی خون خرابے کے بغیر ہوا لیکن دوسرے انقلاب میں خرطوم کی سڑکیں اور گلیاں لاشوں سے پُر تھیں اور ہسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

عطا نے جنہیں ان کے دو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گزشتہ سال نومبر میں سات افراد پر مشتمل حکمراں انقلابی کونسل سے الگ کر دیا گیا تھا، ۳۴ سالہ لفٹیننٹ کرنل ابوبکر النور عثمان کو نئی انقلابی کونسل کا صدر اور خود کو نائب صدر نامزد کیا تھا۔ انکا کہنا تھا کہ انقلاب اس لئے لایا گیا ہے تاکہ عام گرانی کم ہو سکے۔ کمیونسٹوں اور دوسرے لوگوں کو آزادی نصیب ہو سکے اور جنوبی سوڈان کے غیر مسلم باغی خود مختاری حاصل کر سکیں۔

میجر ہاشم کو اپنے اس انقلاب میں سوڈان کی کمیونسٹ



جنرل نمیری
کامیابی ـــــ لیکن کس قیمت پر؟

پارٹی کی حمایت حاصل تھی جو افریقہ میں سب سے مضبوط جماعت ہے اور جس کے سرگرم ممبروں کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے۔ فوج میں بھی کم از کم ڈھائی سو افسران کمیونسٹ نواز ہیں اور دو لاکھ ٹریڈ یونینسٹ کمیونسٹ پارٹی کے حامی ہیں۔

جس وقت ہاشم کا انقلاب کامیاب ہوا لفٹیننٹ کرنل النور عثمان، میجر فاروق عثمان حمداللہ اور کمیونسٹ لیڈر عبدالخالق محجوب کے بھائی میجر محمد محجوب عثمان لندن میں تھے۔ انہیں خرطوم سے کہا گیا اور وہ تینوں اپنے معاونین کے ساتھ بی۔ او۔ اے۔ سی کے جہاز میں خرطوم کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ جہاز لیبیا کے علاقے میں پرواز کر رہا تھا اور مالٹا کے ایر کنٹرول سے اسکا رابطہ تھا کہ کیپٹن رلے نوبر کو بنغازی کے ہوائی اڈے کا ایک پیغام ملا جس میں انہیں ہدایت کی گئی کہ بنینا کے ہوائی اڈے پر اتر جاؤ ورنہ ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔

سواریوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک جیٹ طیارے کو جہاز کا پیچھا کرتے دیکھا ہے۔

جہاز میں ۱۰۹ مسافر تھے۔ نوبر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے اور نہ اس بات کے لئے تیار تھے کہ یوں جھک جائیں۔ کرنل نور اور میجر حمداللہ خود اپنے آپ کو لیبیا کے حکام کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لندن ڈیلی ٹیلی گراف کے نامہ نگار کے بیان کے مطابق جو اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے، میجر حمداللہ نے فرسٹ کلاس کے پیشِ خدمت کو طلب کیا اور بولے:

"قذافی (سربراہِ لیبیا) کا ملک "خشک" ہے۔ لاؤ ایک اور بوتل لے آؤ"

ہوائی جہاز علی الصبح بنینا کے ہوائی اڈے پر اترا۔ سیکورٹی افسر اور ایک سپاہی آگے بڑھے۔ انھوں نے کرنل سے دس منٹ بات کی۔ نور نے پائلٹ سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز سے اتر رہے ہیں۔

پائلٹ: "کیا آپ اپنی مرضی اور کسی جبر کے بغیر جا رہے ہیں؟"

"جی نہیں" سالنور نے جواب دیا۔ "ہمیں زبردستی لے جایا جا رہا ہے"

لیبیا کے فوجی، کرنل النور عثمان اور میجر حمداللہ کو



صدر قذافی اور سادات ـــــ عرب وفاق کے حامی

...وں کی بنا پر مسٹر محجوب کو نہیں اتارا گیا۔ اس کے بعد
... وفادار فوج نے ہاشم کا تختہ الٹ دیا اور جلد
... نمیری پھر برسرِ اقتدار آگئے۔ ہاشم عطا کی فوج نے

ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ روس تک نے اس پر اظہارِ ناراضگی
کیا ہے۔ نمیری کا اعلان ہے کہ :
"ہر کمیونسٹ کو پکڑو اور قریب کی پولیس کے حوالے کردو۔"

انھیں کا بنا کردے۔
مسٹر محجوب قاہرہ کے گریجویٹ تھے اور ان کا شمار ملک کے
بہترین دانشوروں میں ہوتا تھا۔ ایسی شخصیتیں آنے والے زمانے
میں عرصہ تک پیدا نہ ہو سکیں گی۔

جنرل نمیری مصر، لیبیا اور شام کے مجوزہ وفاق میں سوڈان کی مخالفت کی بنا پر شامل نہیں ہو رہے تھے لیکن اب انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ بہت جلد عرب وفاق میں شامل ہونے والے ہیں۔



اگر ہم خود کو
متحد نہیں کریں گے
تو کبھی سرزمین
عرب سے صیہونیوں
کو نہیں نکال
سکیں گے۔
"سادات"

...لیڈر نے ... سوڈانی عوام سے اپیل کی ہے۔
... مدافعت کر رہی ہیں۔ آخر وقت تک انقلاب
... ہو۔

... بعد جنرل نمیری ... ٹیلی ویژن کے سامنے نمودار
... آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور خرطوم کی سڑکوں
... نے ہاشم کے انقلاب کی ناکامی کی خوشی میں مظاہرے کئے
... جوابی انقلاب کی کامیابی پر فرطِ مسرت سے

... نے لیبیا کے سربراہ قذافی سے ٹیلیفون پر بات
... کی مدد کے لئے شکریہ ادا کیا۔ اسی قسم کا پیغام
... عرب جمہوریہ کے صدر مسٹر انور سادات کے

... نے کامیاب ہونے کے بعد خوف و دہشت کا ایک

کمیونسٹ غدار ہیں :

ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ کمیونسٹوں کا یہاں بھی ایسا ہی قتلِ عام ہوگا جیسا کہ انڈونیشیا میں ہوا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کمیونسٹوں کے چوٹی کے لیڈروں کو یا تو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ہے یا تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ نمیری نے مقدمات کی سماعت کے لئے چار ٹریبونل مقرر کر دیئے ہیں تاکہ تیزی کے ساتھ مقدمات فیصل ہو سکیں۔ ہاشم عطا اور تین دوسرے باغیوں کو دوسری صبح ہی گولی مار دی گئی۔ اس کے بعد النور اور حمداللہ کو بھی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر عبدالخالق محجوب کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ہاشم کے انقلاب سے چند روز قبل وہ غالباً السوب کی مدد سے جیل سے فرار ہو گئے تھے اور بلغاریہ کے سفارت خانے میں پناہ لی تھی۔ وہ انقلاب میں کسی مرحلے پر بھی سامنے نہیں آئے لیکن ان پر الزام تھا کہ بغاوت کا پورا منصوبہ

یوگنڈا

ظلم و زیادتی کا ننگا ناچ



ڈیڈی امین۔ تیرنے کے لباس میں

حیران : ...

... ایسا ہی ایک ...
... کے ... مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس ملک کے
... کے قریب قبیلوں میں سے یہ قبیلہ سب سے زیادہ پسماندہ
... ہے۔ اس کی آبادی دو لاکھ ۲۸ ہزار ہے۔ اس کی غذا ...
خون اور دودھ کا ... ہے اور اس کے پاس ... کے گلے



کراموجونگ قبائلی۔ جن کی غذا منجمد خون اور دودھ کا مکسچر ہے۔

کے سوا کوئی اور دولت نہیں۔ عورتیں کھال کا کوئی معمولی سا پردہ جسم پہ ڈال لیتی ہیں لیکن مرد لوہے کی ٹوپی، بالیاں اور گردن میں تانبے کی مالا کے علاوہ کوئی اور چیز پہننا پسند نہیں کرتے۔

اس بات سے پریشان ہوکر کہ اس قسم کے رہن سہن سے یوگنڈا کو سب سے زیادہ پسماندہ ملک سمجھا جائے گا صدر جنرل عیدی (”بڑے ڈیڈی“) امین نے حکم جاری کیا کہ قبائلی لوگوں کو چاہیے کہ وہ قمیص پاجامہ اور جوتے پہنیں۔ لیکن کراموجونگ قبیلہ کو یہ حکم ”ظلم و زیادتی کا ننگا ناچ“ نظر آیا اور جب اس حکم کو پڑھ کر سنایا گیا تو لوگوں نے اسے سننے تک سے انکار کر دیا اور وہ شور غل میں دب کر رہ گیا۔ جنرل امین نے یہ حکم جاری کرتے ہوئے قبائلیوں سے کہا تھا کہ ”برہنگی نہ تم لوگوں کے مفاد میں ہے، اور نہ ملک کے مفاد میں“۔ جن لوگوں نے کپڑے پہن لیے ناراض قبائلیوں نے انہیں پیچھے سے پھاڑ ڈالا۔ اور اس سلسلہ میں مراتو شہر کے قریب جو ایک ضلع کا صدر مقام ہے اتنا بڑا فساد برپا ہوا کہ اسے دبانے کیلئے فوج کو طلب کرنا پڑا۔

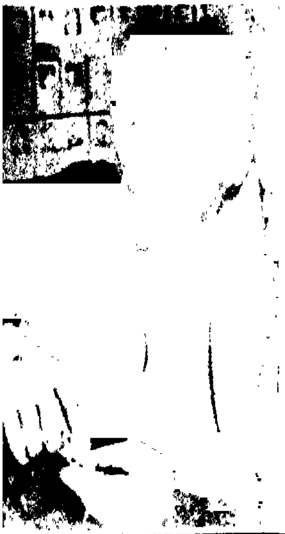
جنرل امین جنہوں نے گذشتہ جنوری میں ایپولٹن اوبوٹے سے اقتدار چھینا تھا خود اس علاقے کا دورہ کرنے پہنچے اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ پوشاک پہنیں۔ کچھ قبائلیوں کی سمجھ میں ان کی بات آ گئی لیکن چند ہی دن بعد جیعنہ پھوٹ پڑا جس سے اس قدیم قبائلی کی عادت کی تصدیق ہو گئی کہ ان کے کپڑوں میں ہتھیار پوشیدہ ہیں۔ مذکورہ قبیلے کے صرف ۲۰ آدمیوں کو اب تک کپڑے پہننا سکھایا گیا ہے مگر یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مراتو میں فساد برپا کرنے پر چھ چھ ماہ کی سزا دی گئی ہے اور وہ جیل کے کپڑے پہنتے پھر رہے ہیں!

اردن

کیا شاہ حسین فلسطینی مجاہدوں کو ختم کرکے دم لیں گے؟

سوڈان کے خلفشار کے بعد دیکھئے اردن میں کیا ہوا اور وہاں کس طرح ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا گلا کاٹا۔ جو کچھ ہوا اس پر اسرائیل خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ ایک اسرائیلی افسر نے کہا: ”ہمیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن فدائین کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ اور خود عرب حکومتیں ان کا قلع قمع کر دیں گی۔ آخر کار اردن نے یہ کر دکھایا“

اسرائیل کو اس صورت حال پر خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔



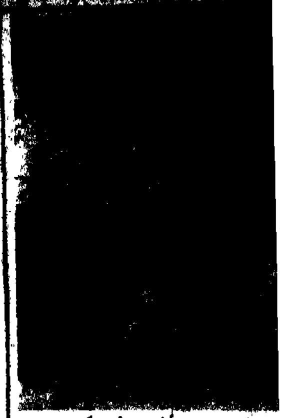
جارج حباش۔ حسین کا دشمن نمبر۔ I

کر دیے گئے اور ۲۳۰۰ کو گرفتار کرکے پوچھ گچھ کے لئے عمان لیجایا گیا جہاں ۱۵۰۰ کو غیر مسلح کرکے اردن، شام، لبنان اور دوسرے عرب ملکوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی کہ اردنی افسروں کے خیال میں وہ اچھے فدائین تھے، کیونکہ یاسر عرفات کی تنظیم الفتح سے تھا جو شاہ اردن سے لڑنا نہ چاہتی تھی۔ باقی ۸۰۰ کا تعلق انتہا پسند جارج حباش کی تنظیم سے تھا

اس لئے کہ یہ عرب فدائین ہی تھے جو اسرائیل کے لئے موجب تشویش تھے اور جو اس پر مسلسل ضربیں لگا کر اس کی فوجی طاقت کو کمزور کر رہے تھے۔ انہیں اور زیادہ مضبوط بنانے اور انہیں جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی ضرورت تھی لیکن اردن نے جو شروع سے ان کے خلاف تھا ان سب کا قلع قمع کر ڈالا۔ جس اسرائیل کے اردن کا ایک ہوائی جہاز بھی نظر نہیں آیا اس نے کمزور فدائین کو بمباری کا نشانہ بنایا اور امریکی ٹینکوں کے ذریعے ان کے اڈے تباہ کر ڈالے جو شمالی مغربی اردن میں واقع تھے۔ ایک ہفتے سے بھی کم عرصے کی لڑائی کے دوران ایک ہزار سے زیادہ



اسرائیل میں کسی جگہ گرفتار شدہ فلسطینی مجاہدوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔



مجاہدین کو صرف اسرائیل حملے سے نہیں بلکہ دنیا
تمام سامراجی طاقتوں سے ٹکر لینی ہے۔

سالار جنگجو وزیر اعظم وصفی تل نے تربیت فدائین قرار دیا
جیل خانے میں ڈال دیا۔

اردنی افسران اپنی اس کامیابی پر خوش تھے۔ لڑائی کے وقت
نامہ نگار عملے سے جنہیں میدان جنگ میں جانے کی اجازت نہ تھی
افسروں نے ایک ایسے وقت جبکہ مطلع صاف تھا قہقہہ
لگایا

"یہ توپوں کی آواز جو آپ سن رہے ہیں، یہ حقیقت میں بجلی
کی ہے" اور پھر ایک افسر نے بڑے طنزیہ انداز میں
"جلد ہی بارش ہوگی"

یہ وہی بزدل افسران تھے جو بیت المقدس کو اسرائیل
والے کرکے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے اور جنہیں آج تک
طرف کا رخ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

لیکن کمزور فدائین کے خلاف وہ شیر ہو گئے اور جب
ان کا صفایا نہ کر پائے سے نپٹے۔ فدائین کے ساتھ اردنی
افسروں نے ظالمانہ اور بزدلانہ سلوک کیا اس سے ظاہر ہے کہ
ت سے فدائین نے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی بجائے
اسرائیل میں داخل ہو کر ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دی۔

گولیاں چلتے جب دریائے اردن اور اس کے معاون دریا
ہو کر گئے وہ جبل جیسے علاقے میں صبح نمودار ہوئے اور اسرائیل

لے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فلسطین کو آزاد کرانے کی قسم
کھائی تھی اور جنہوں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر اپنی جان کی
بازی لگا دی تھی۔ لیکن آج وہ اردن کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی
کی بنا پر اسرائیل کے روبرو ہتھیار ڈالنے کے لئے مجبور ہو گئے۔
ایک فدائی نے غصے میں کہا۔

"ہم نے عرب بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی بجائے
اسرائیلیوں کے ہاتھوں شہید ہونا پسند کیا"

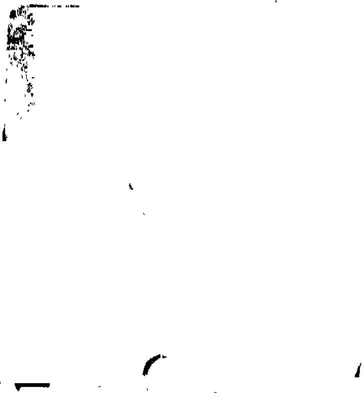
افسروں نے ۹۶ فدائین کو دریا پار کرتے دیکھا تو وہ حیران رہ گئے
یہ فدائین تھکے ہوئے اور بھوکے نظر آ رہے تھے۔ اسرائیلی انہیں
ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر نابلس میں کسی جگہ پوچھ گچھ کے لئے
حسین نے عرب ممالک کے احتجاج اور نکتہ چینی کی پروا
کئے بغیر چھاپہ ماروں کو کچل دیا اس وقت وہ بہت خوش ہیں
لیکن ان کی یہ خوشی کسی وقت بھی رنج میں بدل سکتی ہے۔ اس لئے
کہ اب بھی شام میں بتیس ہزار اور لبنان میں ڈھائی ہزار فلسطینی

شاہ حسین جن پر امریکا، اسرائیل اور پاکستان کی مدد سے فلسطینی مجاہدوں کے قتل کا الزام ہے۔





فدائین موجود ہیں جو اسرائیل پر ضرب لگانے کے لیے تیار ہیں۔ حال ہی میں عرب ممالک بشمول مصر، شام و لیبیا کے سربراہوں کی جو کانفرنس تریپولی میں ہوئی، اس میں جنرل قذافی کے بقول۔ اردن کے بارے میں ایک خفیہ قرارداد منظور کی گئی ہے جسے مناسب وقت پر عملی جامہ پہنایا جائے گا۔



عرفات اور ابو مدین ——————
الجزائر کے انقلابی عوام فلسطین کے انقلابی عوام کے ساتھ ہیں

یہ خفیہ قرارداد یقینی طور پر فدائین کی بھرپور امداد سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ایسی قرارداد اس سے قبل منظور کر لی جاتی اور فدائین کو پوری طرح مسلح کیا جاتا تو فلسطینیوں کی ایک بڑی طاقت کو بچایا جا سکتا تھا۔

پاکستان

دھوبی گھاٹ......

"بھٹو ایک ایسے شخص کا اخلاقی کردار ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس ملک میں جمہوریت کا ایک مند علمبردار ہے۔ لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے منہ سے نکلے الفاظ پر قائم رہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مبادا اس پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے۔ جو شخص مارشل لا حکام کے ڈر سے خاموش ہو سکتا ہے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نازک وقت پر ملک کی رہنمائی کر سکے گا۔" مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی پیپلز پارٹی کے صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے متعلق یہ الفاظ کسی اور نے نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے مشہور اخبار "امروز" نے لکھے ہیں۔

مسٹر بھٹو نے تہران کے ایک با اثر اخبار "کیہان" کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ بات چیت ہونی چاہیئے" یہ بیان بی بی سی سے بھی نشر ہوا جس نے بین الاقوامی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ ابھی ۲۴ گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ اعلان کیا گیا کہ مسٹر بھٹو نے اپنا دوسرے ملکوں کا دورہ ملتوی کر دیا ہے۔ وہ افغانستان اور شاید ترکی اور چند دوسرے ملکوں کا دورہ کرنے والے تھے۔

مسٹر بھٹو کس طرح غیر ملکی دورہ پر گئے اس کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کہتے ہیں کچھ دنوں سے مسٹر بھٹو کے قریبی حلقے اس بات کا پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ مسٹر بھٹو ایران، افغانستان اور ترکی وغیرہ کا دورہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ وہاں کے لوگوں کو اپنے ملک کی صحیح صورت حال سے باخبر کر سکیں۔ خود صدر یحییٰ خان نے اس بیان کی تائید کی۔ اس وقت مسٹر بھٹو نے سمجھا کہ انہیں بڑی ترکیب سے جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہا کہ میرے باہر جانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ لیکن دو ہی دن بعد انھوں نے اعلان کیا کہ وہ ایران اور بعض دوسرے مسلم ملکوں کا دورہ کریں گے اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ کابل میں اپنی پارٹی کی ہائی کمان کی میٹنگ طلب کریں گے اور نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر عبدالولی خاں سے بھی ملاقات کریں گے جو اس وقت کابل میں تھے (عبدالولی خاں خان عبدالغفار خاں کے صاحبزادے ہیں)

دونوں آخر الذکر باتوں سے سیاسی حلقوں میں کچھ شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا اور جب مسٹر بھٹو نے شیخ مجیب الرحمن سے بات چیت کرنے کی تجویز پیش کی تو شبہات غالباً یقین میں بدل گئے یہاں اس بیان کے ۲۴ گھنٹے بعد ہی اعلان کیا گیا کہ مسٹر بھٹو نے اپنے مزید دورہ کا پروگرام منسوخ کر دیا ہے۔ غالباً انہیں وطن لوٹنے کی ہدایت کی گئی ہوگی۔ مسٹر بھٹو اتنے خائف ہوئے کہ کراچی پہنچے پر اس بیان ہی سے منحرف ہو گئے اور کہا کہ "بی بی سی نے میرا بیان غلط طور پر نشر کیا ہے۔" حالانکہ اگر یہ بیان غلط طور پر نشر کیا گیا تھا تو تہران میں ہی اسکی تردید کر سکتے تھے ۴۸ گھنٹے بعد اس کی تردید کیوں کی؟ صاف ظاہر ہے کہ وہ فوجی حکام سے خائف ہو گئے اور انھوں نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

مسٹر بھٹو جن پر پاکستان کے موجودہ حالات کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ سے اس لیے پریشان ہیں کہ صدر یحییٰ خاں حقیقت میں ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے دنوں صدر یحییٰ خاں کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں اور یہ اعلان کہ آئندہ بھی وہ ملتے رہیں گے اس بات کی علامت ہے کہ دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ اختلافات یہی اسباب جبکہ صدر یحییٰ خاں نے اپنے ایک تقریر میں اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی ایک جماعت یا ایک فرد کو اقتدار منتقل نہیں کریں گے اس سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ مسٹر بھٹو کی تمام توقعات پر پانی پھر گیا ہے وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ عوامی لیگ پر پابندی لگانے اور عوامی لیگ کے لیڈروں کو گرفتار یا نظر بند کر دینے کے بعد صدر یحییٰ خاں اقتدار ان کے سپرد کر دینگے۔

ایک اور خطرہ یہ بھی درپیش ہے کہ پچھلے عام انتخابات کے نتائج ہی کو منسوخ کر دیا جائے اور فوجی حکمران جو آئین پاکستان کے عوام پر مسلط کر رہے ہیں اسکے مطابق عام انتخابات کرائے جائیں ابھی حال میں مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے صدر مسٹر عبدالقیوم نے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے یہ قانونی نکتہ پیدا کیا کہ قومی اسمبلی کے عام انتخابات اسلئے عمل میں آئے تھے تاکہ عوامی نمائندے ایک دستور تیار کر سکیں اور جبکہ یہ دستور ماہرین کے ذریعہ تیار کیا جا رہا ہے پچھلے عام انتخابات خود بخود منسوخ ہو جاتے ہیں۔ اگر مسٹر عبدالقیوم کی جو اسوقت صدر یحییٰ خاں کے غیر سرکاری ترجمان سمجھے جاتے ہیں بات مان لی گئی تو مسٹر بھٹو کو مغربی پاکستان میں نئے سرے سے انتخاب لڑنا ہونگے اور اس بار یہ یقینی ہے کہ وہ اتنی سیٹیں ہرگز نہ لے سکیں گے جتنی کہ پچھلے عام انتخابات میں انہوں نے حاصل کی تھیں اول اس لیے کہ مشرقی بنگال کے حالات کیلیے پاکستان کے عوام کسی حد تک ان کو بھی ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔ دوم اسلیے کہ اگلے الیکشن میں تینوں مسلم لیگیں جو پہلے علیحدہ تھیں اب ایک مسلم لیگ کے طور پر انتخاب میں حصہ لیں گی۔

اگر ایسا نہ ہوا اور نئے کنام نہاد دستور کے تحت عام انتخابات صرف مشرقی پاکستان میں کرائے گئے تو ۱۶۷ حلقوں سے جو ضمنی انتخابات عمل میں آئیں گے ان میں سے یقینی ہے مسلم لیگ سو سیٹوں پر قبضہ کر لے گی مغربی پاکستان میں پہلے ہی اسکے ممبروں کی تعداد اچھی خاصی ہے ایسی حالت میں مسٹر بھٹو جن کے ممبروں کی تعداد اتنی بے حقیقت رہ جائیں گے۔

مسٹر بھٹو کو آج یقیناً اس بات پر افسوس ہوگا کہ اگر وہ ان حالات میں شیخ مجیب الرحمن سے سیاسی مصالحت کر لیتے اور ان کے ساتھ تعاون کرتے تو آج پاکستان کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں اقتدار مسٹر بھٹو کو بھی ملنے والا نہیں ہے۔

بھٹو صاحب اب نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

بمبئی

ہندوستان کی رانی

سب کا شہر

جہاں سب بکتا ہے

کھلے عام کالا کاروبار ہوتا ہے

سان فرانسسکو کی طرح جو امریکا کی رانی کہلاتا ہے ہم بمبئی کو بھی ہندوستان کی رانی کہہ سکتے ہیں۔ ایک خوب صورت شہر جس سے وسیع سمندر کی لہریں ٹکراتی ہیں۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے جب اس سمندر پر نظر پڑتی ہے تو خدا کی شان نظر آتی ہے۔ قدرتی مناظر نے بمبئی کو قدرت نے اس طرح مالا مال کیا ہے کہ دور دور سے لوگ انہیں دیکھنے کے لئے وہاں پر پہونچتے ہیں۔

بمبئی ایک رنگا رنگ شہر ہے۔ میٹرو پولیٹن سٹی جہاں بھانت بھانت کی شکلیں اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی شہر ہے جہاں ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ پوری دنیا کی نمائندگی ہے۔

ہر جگہ کی طرح بمبئی میں بھی ہر طبقے کے لوگ رہتے ہیں یہاں سرمایہ دار بھی ہیں اور مزدور و محنت کش بھی۔ یہاں بڑی اونچی عمارتیں بھی نظر آئیں گی اور ان لوگوں کی جھونپڑیاں جو دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو اپنی سب آمدنی شراب، چرس اور بھنگ میں اڑا دیتے ہیں۔ یہاں غربت اور امارت دونوں ہیں۔ دونوں میں تعاون باہم ہے۔ یہاں گدال چلانے والے مزدوروں سے لے کر فلمی دنیا کے مشہور ستارے تک جمع ہیں۔ کوئی عالیشان فلیٹ میں سوتا ہے اور کوئی سڑک کی پیٹری پر۔

بمبئی ایک کاروباری شہر بھی ہے۔ یہاں ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہے۔ جائز بھی اور ناجائز بھی۔ "سفید" بھی اور "کالا" بھی دوسرے ملکوں سے مال آتا ہے اور جاتا ہے۔ تجارت، برآمد، درآمد کے بڑے بڑے کروڑپتی اور لکھ پتی تاجر بمبئی میں ملیں گے جو لاکھوں کروڑوں کا لین دین کرتے ہیں۔ بعض ایسی برادریاں ملیں گی جو کاروبار ہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں خواہ کیسا ہی کاروبار ہو مگر ہو نفع بخش۔ اس معاملے میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں۔ ان سب کا واحد مقصد بس پیسے کمانا ہے اور اس میں وہ ایک دوسرے سے خوب تعاون کرتے ہیں۔

ایک منافع خیز کاروبار ہے قحبہ خانے چلانا۔ یہ ایسی ٹولیوں اور گروہوں (گانگسٹروں) کا کاروبار ہے جو ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ ان کی پشت پناہی سود خور پٹھانوں اور منافع خور مارواڑیوں دونوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ دونوں کو پیسہ چاہیے اور قحبہ خانوں کے مالکوں سے خوب پیسہ ملتا ہے۔

قحبہ خانے چلانا اور فاحشہ لڑکیوں یا عورتوں کے ذریعے کمائی کرنا قانوناً جرم ہے۔ لیکن دنیا میں ایسا کونسا جرم ہے جو نہیں ہوتا۔ بمبئی اس معاملے میں سب سے آگے نظر آتا ہے اس لئے نہیں کہ بمبئی کی پولیس کسی دوسری جگہ کی پولیس کے مقابلے میں کمزور یا نااہل ہے۔ بلکہ اس لئے کہ قانونی عدالت میں سزا پائے بغیر ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور قحبہ خانے کے گانگسٹروں کو سزا دلانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں

اور بعض عورتیں اس کا شکار ہو جاتی ہیں

یہ شکوہ وہ خود پولیس کرا چی تک پہنچا چکی ہیں۔ قحبہ خانوں کے کاروبار کا انحصار لڑکیوں پر ہے۔ یہ لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں؟ کسی ساہوکار، مارواڑی یا سود خور سے پوچھئے، وہ جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کرے گا: کیا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟!

اس کا آسان طریقہ غنڈوں نے دریافت کیا ہے۔ وہ گلیوں میں جاتے ہیں اور لڑکیوں اور عورتوں پر نظر رکھ کر اپنا من پسند شکار منتخب کرتے ہیں اور پھر ان کے قرضے کی رقم کا چارہ ڈال دیتے ہیں۔ خود اسے قرض لینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کی کسی سہیلی یا کسی رشتے دار یا کسی "ہوائی فرینڈ" کے ذریعے اس پر دباؤ ڈالتے ہیں اور بعض اوقات اس کے شوہر تک کو قرض لینے کے لئے دام فریب میں پھانس لیتے ہیں۔

اگر عورت کسی وجہ سے قرض لے لیتی ہے تو اس سے کاغذ لکھوایا جاتا ہے جس میں نہ تاریخ لکھی جاتی ہے اور نہ رقم۔ سود اتنا لگایا جاتا ہے کہ اس کی ادائیگی ایک شخص کے لئے ممکن نہیں رہتی۔ جب ایسا ہو تو عورت پر ڈورے ڈالے جاتے ہیں اور اسے سمجھایا جاتا ہے کہ اگر وہ "بازارِ حسن" میں اپنا حسن فروخت کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو اس کے سارے دلدر دور ہو سکتے ہیں۔ قرض لی ہوئی رقم سے سیکڑوں گنا زیادہ کمائے گی۔ وہ اگر رضامند ہو گئی تو اسے ایک "قدیم ترین پیشے" کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اگر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا تو غنڈوں کے گروہ کے پاس اپنے آدمی موجود ہیں جن کے ذریعے اس عورت پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اسے دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اور اگر عورت یا اس کے اعزا پولیس میں شکایت کرتے ہیں تو دھمکیاں دینے والے غائب ہو جاتے ہیں۔ پٹھان، مارواڑی یا ان کے ایجنٹ موقع پر

یہ پہلے سے تیار کئے ہوئے کاغذات پیش کر کے انہیں بہت ڈرا دھمکا کر رکھا جاتا ہے۔

یہ کاغذ بالکل قانونی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں سود خور ساہوکار کے لائسنس کا نمبر لکھا ہوتا ہے جس کے تحت یہ گروہ اپنا کاروبار کرتا ہے۔ دھمکیاں دینے والوں اور ساہوکاروں یا ان کے ایجنٹوں میں بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اور پولیس شبہ رکھنے کے باوجود ان لوگوں کا کچھ نہیں کر سکتی۔

بمبئی شہر کے علاوہ غنڈوں کا گروہ بنگلور، مدراس، جے پور اور کلکتے سے لڑکیوں کو لاتا ہے۔ جب کوئی لڑکی باہر سے آتی ہے تو کسی ایک یا دوسرے قحبہ خانے میں رکھا جاتا ہے۔ "لانے والے" کو سپلائی شدہ مال کی کوالٹی کے مطابق ایک ہزار سے پانچ ہزار روپے تک دے دیے جاتے ہیں۔ لڑکی کو کپڑوں اور بناؤ سنگھار کے لئے پیشگی روپے دے دیے جاتے ہیں۔ پرانے طریقے پر ایک نیا سرکاری کاغذ لکھوایا جاتا ہے، لیکن اس مرتبہ کسی نئے ساہوکار کے نام پر۔ ایک مرتبہ لڑکی کے قحبہ خانے میں پہنچنے کے بعد اس کا وہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا ہے کیونکہ قحبہ خانوں کے مالکان ایسے طریقے اپناتے ہیں جن کے بعد لڑکی کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ قحبہ خانے کے علاوہ اس کے لئے اور کوئی بہتر جگہ نہیں ہے۔ یہ لڑکی کبھی اپنے قرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی حالانکہ وہ اس رقم سے جو اس پر خرچ کی جاتی ہے سیکڑوں گنا زیادہ کما کر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ لڑکیاں ایک قحبہ خانے سے دوسرے قحبہ خانے کے ہاتھ فروخت بھی کر دی جاتی ہیں۔ مویشیوں سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اس سودے بازی میں کسی مرحلے پر بھی لڑکی بول نہیں سکتی اور نہ وہ کچھ پوچھ سکتی ہے۔ ان کی قیمت ان کی خوبصورتی اور جسمانی صحت کے مطابق حاصل کی جاتی ہے۔

قحبہ خانے کے مالکان لڑکیوں کے ذریعے کمائی ہوئی رقم میں سے نصف حاصل کر لیتے ہیں اور باقی نصف میں سے لڑکیاں کچھ اپنی ذات کے لئے لے سکتی ہیں۔ انہیں تم محٹروں یعنی غنڈوں اور بدمعاشوں کی ٹولیوں کا معاوضہ سمجھا جاتا ہے۔



چند سکوں کے عوض نیپال کی کتنی عورتوں اور بیٹیوں کو خریدا جاتا ہے

راشد نذیر علی

جیب ان قحبہ خانوں کو چلاتے ہیں۔ لیکن کا ثبوت قابل دکیوں کے ذریعے اس طرح تیار کرلئے جاتے ہیں کہ پولیس عدالت میں یہ ثابت نہ کرسکے کہ ان لوگوں کی گزر بسر فحاشی کی کمائی پر ہے جو تعزیرات ہند کے تحت ممنوع ہے۔

کانگسٹروں کے اپنے حلقے اور اپنی اپنی سرحدیں ہوتی ہیں جن کی خلاف ورزی پر ان کے درمیان جنگ ہو جاتی ہے۔ پتہ چلا ہے کہ پچھلے دنوں دو بندوقچی پٹھانوں کو پاکستان سے درآمد کیا گیا۔ پولیس کے بیان کے مطابق ایک مخالف لیڈر کا خاتمہ کرنے کے لئے کہا گیا۔ ایک شخص کو گولی ماردی گئی اور دوسرا زخمی ہوگیا۔ پولیس نے انھیں متعدد دوسرے اشخاص کے ساتھ گرفتار کرلیا اور قتل کی سازش کرنے کا الزام لگایا لیکن سیشن میں سازش کا الزام ثابت نہ ہوسکا اور صرف بندوقچیوں کو مختلف مدت کی سزائیں دی گئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مجروح شخص نے سیشن کی عدالت میں یہ بیان دے کر مقدمے کو خود کمزور کردیا کہ "مجھے اب کچھ یاد نہیں"۔

قحبہ خانے شہر کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ارون بجروا (یوسف دلال) حیدرآباد کا اندھیری میں ورسوا روڈ پر چار قحبہ خانے چلا رہا ہے۔ یہاں سے سو روپے پر فلم ایکسٹراز اور ڈانسر مل سکتے ہیں۔ آنرا اور نارئیدا سی چھ قحبہ خانوں پر کنٹرول کرتے ہیں جہاں ۵۰ روپے فیس لی جاتی ہے۔ کھیرولیٹ میں تین قحبہ خانے ہیں جن پر منشی لوا کا کنٹرول ہے۔ یہاں کی فیس تیس روپے ہے۔ اس علاقے میں اور بھی قحبہ خانے ہیں جہاں گاہک کی حیثیت دیکھ کر اسے لوٹ لیا جاتا ہے۔ باندرا لنکنگ روڈ پر درجنوں قحبہ خانے ہیں جن پر مختلف پٹھانوں اور مارواڑیوں کا ہاتھ ہے۔

ملاڈ کے بازار کے قریب میں ایک خصوصی قحبہ خانہ ہے جسے کیلاش دیوی نام کی ایک عورت چلاتی ہے۔ یہاں وہ بارہ یا تیرہ سال کی نابالغ لڑکیاں مہیا کرتی ہے۔ اور گاہکوں سے ایک رات کے پانچ سو سے لے کر ایک ہزار روپے تک فیس لیتی ہے۔ یہ لڑکیاں راجستھان سے لائی جاتی ہیں اور گاہک زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو عنفوان شباب سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ دیوی جی کو پچھلے دنوں شہر کے بعض عالیشان رہائشی ہوٹلوں میں بھی آتے جاتے دیکھا گیا۔ اس کے کاروبار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

فیس دے کر گاہکوں کی جنسی بھوک مٹاتے ہیں جبکہ مدھو اور قربان کیمپس کورنر کے قحبہ خانے میں پچاس روپے سے سو روپے تک وصول کرتے ہیں۔ وولرلی کے ملک اور حسین نے ایک نیا اور عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ لڑکیوں کے فوٹو دکھاتے ہیں۔ جب کوئی گاہک کوئی فوٹو منتخب کرلیتا ہے تو کسی ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا جاتا ہے۔ اس کا معاوضہ گاہک سے پانچ سو روپے سے ایک ہزار روپے تک وصول کیا جاتا ہے۔ لیمنگٹن روڈ کے بہتہ اور جمعہ کے ہاں رہائشی عورتیں ہیں لیکن گاہکوں کو مطمئن کرنے کے لئے انھیں باہر سے بھی بلا لیا جاتا ہے۔ فیس تیس روپے سے پچاس روپے تک وصول کی جاتی ہے۔

وارڈن روڈ پر ایک قحبہ خانہ خاص سرکاری ملازموں کے لئے کھولا گیا ہے۔ اسے ایک عورت "میری" کیلے بی چلا رہی ہے۔ وہ افسروں سے مقررہ فیس نہیں لیتی بلکہ

پینندھ روڈ پر ایک شخص ۔۔۔ شراب خانہ چلا رہا ہے جہاں ایک شب کی عیاشی کی فیس ۲۰ سے ۵۰ روپے تک ہے۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے قحبہ خانے بمبئی شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بمبئی عجیب بستی ہے۔ ہر قسم کے لوگ یہاں بستے ہیں۔ فلمی دنیا نے قحبہ خانے کے اندر "مال" کی سپلائی کا مسئلہ کافی حد تک حل کردیا ہے۔ اس لئے کہ فلمی دنیا کی ٹھکرائی ہوئی بہت سی لڑکیوں کو جب اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے تو بہت سے گانگسٹر جو نئی لڑکیوں کی تاک میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں ان کی رہنمائی ان گندے مقامات کی طرف کرتے ہیں جہاں پہونچ کر وہ اپنی پوری زندگی خراب کرلیتی ہیں۔

مہاراشٹر کی حکومت نوجوان لڑکیوں کی زندگی کو یوں کب تک تباہ ہونے کی اجازت دیگی

معاملہ پٹ گیا۔
اب
پکڑے ہوئے
پٹھان دلال کو
اس کا کیش
لے گا۔ اور
اس طوائف
کو
چند سکے۔

بقیہ: بیدرت کا جولیٹ

نے واشنگٹن کو دو فرانک دے دیئے تھے کہ اس نے حیرت سے کہا۔

تم نے تین فرانک خرچ کر دیئے۔ اب تو تم بھوکے ہو گے!

یاس مسٹا شن میں نے اسے ٹپ میں دے دیئے

ہے ٹھیک کہا۔

پاگل ہو۔ اس آدمی کو اس ناکارے کو تم نے ششتا شن دے دیئے۔

والے نے جس طرح تعالی کا تعارف کیا تھا اس نے کہا، سن کے ماں کی طرف مجھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ وہ چپ ہو گئیں۔ ماحول پر بوجھل سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہمارے آگے افق پر سمندر سے ایک بھورا سا سایہ اٹھتا نظر آیا۔ یہی جرسی تھا

جیسے ہی ہم زینے پر پہونچے، میرے دل میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک بار میں پھر اپنے چچا کو دیکھ آؤں۔ ان کے پاس جا کر ہمدردی کے کچھ الفاظ ہی ان سے کہوں۔ لیکن چونکہ اب وہاں پر کوئی گھونگھا کھانے والا نہ تھا اس لئے وہ

غالب جہاں تھے اس میں شبہ نہیں کہ وہ تیسرے درجے کی بدبودار کوٹھری میں چلے گئے ہوں گے جہاں لوگوں نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔

ہم لوگ سینٹ پاموں کے راستے سے لوٹے کہ کہیں راہ میں کہیں ان سے پھر ہماری مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔

راستے بھر میری ماں گھبرائی گھبرائی سی رہیں۔

میں نے پھر کبھی اپنے چچا کو نہیں دیکھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو داور اس نے کہا۔ آپ کبھی کبھی مجھے بھیک منگوں کو پانچ فرانک دیتے ہوئے دیکھتے ہوں گے۔

ضرورت کے وقت دوست ہی کام آتا ہے



"یحییٰ خان کا خیال ہے کہ مجیب الرحمٰن کو پھانسی دی جائے گی" ایک خبر



غلط روش

بعض مفاد پرست پارٹیاں بنگلہ دیش کے مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش میں مصروف ہیں اور وہ ہند کے بعض مقامات پر فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی ہیں۔ اس قسم کی صورتحال انتہائی افسوسناک ہے۔ اس سے بنگلہ دیش کے کاز کو سخت نقصان پہونچے گا اور پاکستان کو فرقہ وارانہ بنیاد پر پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جائے گا۔

بنگلا دیش کی تحریک کی ہندوستان اگر حمایت کر رہا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے کہ اس کی بنیاد سیکولرزم پر ہے مشرقی بنگال کے عوام ایک ایسا سماج قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں سب لوگوں کو بلا تخصیص مذہب و ملت یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اسی بنیاد کو لے کر وہ آگے بڑھے اور اسی بنیاد پر انھوں نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی ہندو مسلمان سبھی لوگوں نے شانے سے شانہ ملا کر اس تحریک میں حصہ لیا اور الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔

اور اس کے بعد سبھی ہندو مسلمان فوجی مظالم کا شکار ہوئے اور دونوں ہی نے ہندوستان آکر پناہ لی۔ تمام پناہ گزیں کیمپوں میں ہندو مسلمان ایک ساتھ بھائی بھائیوں کی طرح حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اس نازک موقع پر بھی کچھ پارٹیاں اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دیتی ہیں تو یہ ایک غلط روش ہے اور یہ ملک کی اور پوری قوم کی بدقسمتی ہے۔ تاہم خوشی کی بات ہے کہ اس معاملہ میں نہ صرف یہ کہ مرکزی حکومت بلکہ ریاستی حکومتیں بھی پوری طرح چاق و چوبند ہیں اور امن و امان قائم رکھنے کا عزم رکھتی ہیں امید ہے کہ وہ ان فرقہ پرستوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں گی [illegible] پاکستان کی فرقہ وارانہ پالیسی کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔

[illegible]

بنگال

دہی حالت بے ڈھنگی

مغربی بنگال کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ جو بے ڈھنگی حالت عرصے سے چل رہی تھی وہی اب بھی ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ مار دھاڑ اور قتل کے واقعات نہ ہوتے ہوں۔ اس وقت تک اگر مرکزی حکومت کو کسی کا اس وقت بنگال پر کنٹرول ہے کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے تو یہ کہ اس نے ریاست کی تمام ۲۰ پارٹیوں کو ایک چار نکاتی پروگرام پر متفق کر لیا ہے۔ جو یہ ہے (۱) قتل اور دہشت انگیزی کی پوری قوت سے مذمت کی جائے (۲) تمام سیاسی پارٹیوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ قتل اور خونریزی کے سلسلے کو بند کر دیں (۳) ایڈمنسٹریشن کو چاہیے کہ وہ قتل کے واقعات کا پوری جرأت کے ساتھ انسداد کرے (۴) حکومت کو چاہیے کہ وہ ایڈمنسٹریشن کے تمام عناصر کے خلاف خواہ وہ پولیس ہو سخت قدم اٹھائے جو جرائم کو روکنے میں تساہل سے کام لیں اور اپنا فرض ادا نہ کریں۔

مختلف سیاسی پارٹیوں کی طرف سے اس پروگرام کی منظوری کے بعد امید بندھی ہے کہ بنگال میں امن قائم ہو سکے گا۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ قتل و غارتگری میں حصہ لینے والے کسی ایک یا دوسری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے بعد بھی امن قائم نہ ہوا اور قتل و غارتگری کی سیاست چلتی رہی تو حکومت کو کھوج لگانا ہوگا کہ اس کے تار کہاں سے کہاں ملے ہوئے ہیں یہی نہیں بلکہ مجرموں کے خلاف سخت اقدامات بھی کرنے ہوں گے۔ اس لیے کہ لاتوں کے بھوت اکثر باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ ■

یو پی

صنعت اور زراعت

چند ماہ قبل وسط مدتی انتخابات کے دوران اندرا کے حق میں جو ہوا چلی اس کے نتیجے میں یوپی کی گپتا کی حکومت کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اور ٹی این سنگھ کی جگہ مسٹر کملا پتی ترپاٹھی برسراقتدار آگئے جو ایک فلاسفر بھی ہیں اور جرنلسٹ بھی۔ وہ تین ماہ سے برسراقتدار ہیں اور اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انکی حکومت ایک مستحکم حکومت ہے۔ مخالفین کے دم خم بالکل ختم اور ان کے وسیلے پست ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں کہ مسٹر کملا پتی ترپاٹھی کو چیلنج کر سکیں۔



سدھارتھ شنکر رے۔ مغربی بنگال پر فوج کی حکمرانی

لیکن ایک معاملہ میں مسٹر کملا پتی ترپاٹھی بدقسمت ہیں کہ انہیں اقتدار کے بھوکے دھاندلی لیڈروں کی طرف سے ایک تباہ شدہ معیشت وراثت میں ملی ہے۔ گزشتہ دس برس سے ریاست میں کوئی بڑی ترقیاتی اسکیم شروع نہیں ہوئی نتیجہ میں ایک طرف ریاست کی معیشت اپنی جگہ قائم رہی اور دوسری طرف بے روزگاروں کی فوج بڑھتی گئی۔

یو پی بنیادی طور پر ایک زرعی ریاست ہے۔ اس لیے ریاستی حکومت کو خوراک کے معاملے میں خود کفیل بنانے کیلیے زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی۔ لیکن سابقہ حکومتیں خام اپنے عدم استحکام کی بنا پر اس طرف زیادہ توجہ نہ دے سکیں لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ ترپاٹھی گورنمنٹ اس طرف خصوصی توجہ دے

اسکیموں کو بروئے کار لایا جائے [illegible] ہیکٹر زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہوسکے۔ یوپی میں قابل کاشت رقبہ ۲۱،۱۹۵ لاکھ ہیکٹر ہے۔ فی الوقت اسکا پروگرام ہے کہ ۱۰ لاکھ ہیکٹر مزید رقبہ کو زیر کاشت لایا جائے ۱۹۷۰-۷۹ء میں یوپی میں زرعی پیداوار ۱۳،۳ لاکھ ۱۴ ہزار ٹن تھی اور ۱۹۸۰ء کیلئے اسنے ۹۰ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے کسانوں کو فراخدلی کے ساتھ قرضے دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

تریاٹھی گورنمنٹ زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی کی طرف بھی توجہ دے رہی ہے کیوں کہ وہ سمجھتی ہے کہ بے روزگاری کے مسئلہ پر قابو پانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ریاست کے تمام حصوں میں صنعتوں کا جال بچھا دیا جائے۔ سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ قرضہ جات، زمین، مکانات، خام اشیاء اور بجلی کا کسی تاخیر کے بغیر انتظام کیا جائیگا۔

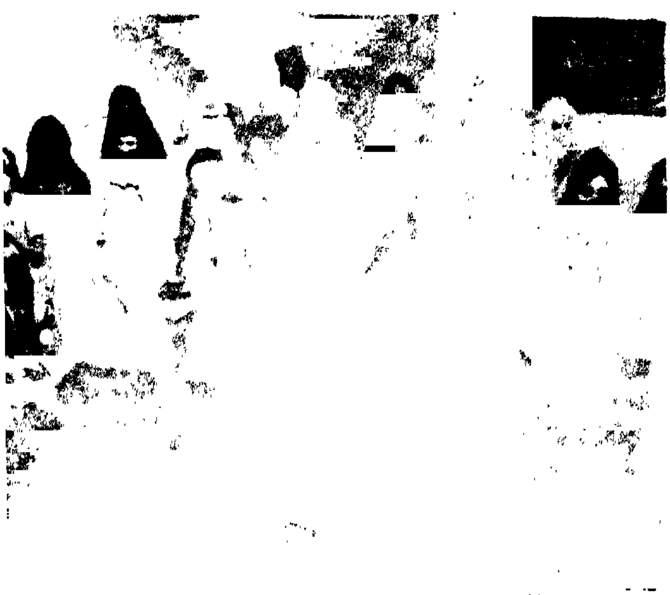
وزیر مملکت برائے صنعت و حرفت نے اعلان کیا ہے کہ صنعت و حرفت شروع کرنے والوں کی درخواست پر فوراً توجہ دی جائے گی اور ہم ۴۵ دن کے اندر کارروائی کو مکمل کردینگے" لیکن اس قسم کے اعلانات ماضی میں بھی ہوتے رہے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ان پر کس حد تک ایمانداری کے ساتھ عمل ہوتا ہے اگر عمل ہوا تو یقین ہے کہ یوپی کی ریاست بہت حد تک اپنی ضرورتوں کو پورا کرلے گی اور جلد ہی یوپی بھی دوسرا پنجاب بن جائیگا۔ جو نہ صرف زرعی میدان میں بلکہ صنعتی میدان میں بھی باقی ریاستوں سے آگے ہے۔

[illegible] کر رہے ہیں۔ [illegible] بھی ہزاروں ایسے نکلے ہیں جن کا سر سے کوئی وجود ہی نہیں ہے تیز جو لوگ گرفتار ہیں ان کی ضمانتوں کی راہ میں طرح طرح کی اڑچنیں ڈالی جارہی ہیں۔ انصاف کے اس خون پر سب حیران ہیں۔ سچ پوچھئے تو پولیس نے اپنے رویہ سے دہشت گردی کا ایسا ماحول پیدا کردیا ہے کہ اس علاقے میں اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ بھلا پاسوان کی حکومت کیا کررہی ہے اور اس نے مصیبت زدوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے کیا قدم اٹھائے ہیں یہ ابھی معلوم نہ ہوسکا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جس طرح ہمارے نام نہاد قومی پریس نے مذکورہ دیہات کے واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دی اسی طرح شاید پاسوان صاحب کی وزارت بھی انھیں کوئی اہمیت نہیں دے رہی ہے بھولا پاسوان صاحب کانگریس پارٹی کی حمایت سے وزارتِ اعلیٰ کی گدی پر براجمان ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کانگریس کب تک اس بے انصافی کو دیکھتی رہے گی۔

[illegible] کرتے ہوئے اپنے والنٹیروں کو گرفتار کرلیا۔ یہ والنٹیروں کے بھی تھے اور باہر سے بھی آئے ہوئے تھے۔ شہر میں انھیں ٹولی ٹولیوں میں جلوس دیکھا جاسکتا تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان والنٹیروں کو ستیا گرہ میں حصہ لینے کے مقابلہ میں راجدھانی میں سیر سے زیادہ ہی دلچسپی تھی بلکہ ستیاگرہ کو بھی ایک سیر ہی سمجھتے تھے اور اسے سیر ہی سمجھ کر انھوں نے اس میں حصہ لیا۔ ایک نام نہاد والنٹیر سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا "دلی تک آنے کا کرایہ بلا تھا۔ ریل میں خوبصورت علاقے دیکھتے اور آج کل کے موسم برسات کی ٹھنڈی ہوا کھاتے چلے آئے اور اب بیسیوں میل میں پھیلی ہوئی دلی کو مفت دیکھنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر آرام سے سیر کرتے اور نئے نئے نگروں کو دیکھتے وہاں تک اس کے ساتھ چلے جائیں۔ دو چار دن کے لیے تہاڑ لے گئی تو کوئی کروڑ کی عمارت دیکھنے کو ملے گی۔

وزیر اعظم کی کوٹھی کے باہر۔ نماز کا ایک منظر۔ جو بنگلادیش کو منوانے کے سلسلے میں جن سنگھ کے مظاہرے کا حصہ تھی

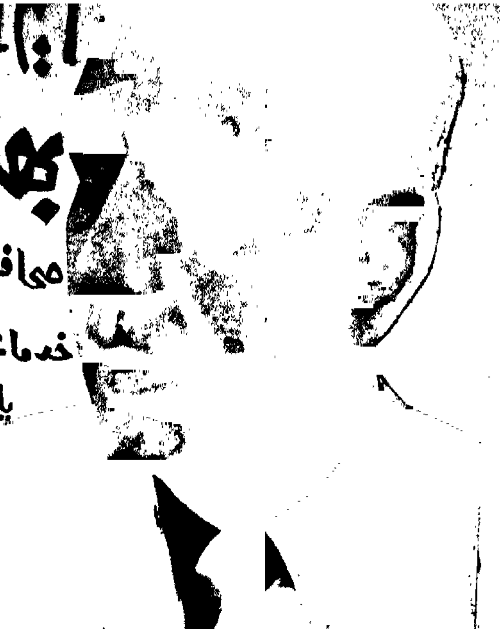


بہار

انصاف کا خون

ایک ایسے زمانے میں جب کہ حکومت کی تمام تر توجہ بنگلادیش سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے مسائل کو حل کرنے کی طرف لگی ہوئی ہے بہار کی حکومت کی پیشانی پر کلنک کا یہ ٹیکا لگا ہے کہ ضلع مظفرپور کے تین دیہات۔ اوا پور۔ سولانگر اور ماگپور میں فرقہ وارانہ ہنگامہ برپا ہوا اور پولیس نے شرپسندوں کی حوصلہ افزائی کرکے انھیں اقلیتی افراد کو تباہ و برباد کرڈالنے کی کھلی چھٹی دیدی اور اب انھیں اقلیتی افراد کو جو مظالم کا شکار ہوئے انھیں واقعات کی دہلی

بھاردواج صحافتی دنیا جنکی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔



یا ڈیوٹی فوراً سپرد کر سکتے ہیں۔ آیا ہیں گے۔ مطلب یہ

ہے بے ہودہ ہوتی ہے۔"

لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ ستیہ گرہ کیوں ہو رہا ہے۔ پناہ گزین بنگال میں ہیں جہاں ان کی خدمت کی ضرورت ہے نہیں روٹی کپڑے اور مکان کی ضرورت ہے اور دوسری ضروری اشیاء ان کے لیے درکار ہیں۔ جن سنگھ اس کیلیے کچھ نہیں کرتی یقیناً اس لیے کہ اس میں تفریح یا سیر کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ حقیقی خدمت کا سوال ہے اور جن سنگھ ظاہر ہے سب کچھ کر سکتا ہے خدمت نہیں۔ خدمت کرنا اس نے کانگریس جیسی سنستھاؤں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

ستیہ گرہ کے اس اسٹنٹ کی اہمیت جتانے کے لیے دلی میں پوسٹروں کی وہ بھرمار کی گئی ہے کہ توبہ بھلی کبھی ہندوؤں سے اس کی اپیل کی جاتی ہے اور کبھی مسلمانوں کو ہوشیار و خبردار کیا جاتا ہے۔ اور کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ مظاہرین کے جلوس میں شامل ہوں اور وزیر اعظم کی کوٹھی پر نماز جمعہ ادا کریں۔"

لیکن یہ سب ہوائی باتیں ہیں حقیقی نہیں حقیقی بات تو یہ تھی کہ اس موقع پر حکومت کے ہاتھ مضبوط کئے جاتے تاکہ آزادی پسند بنگالیوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے اور جلد ایسے حالات پیدا ہو جاتے کہ بنگلہ دیش کی حکومت کو ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک بھی منظور کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے۔ لیکن جن سنگھ کو واقعہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے دلچسپی نہیں ہے اور اسے اس سے بھی دلچسپی نہیں ہے کہ پاکستان کی حکومت مشرقی پاکستان کے عوام کو اقتدار منتقل کرے گی یا نہیں انہیں صرف دلچسپی ہے اسٹنٹ چلانے سے کیونکہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ آج کل اسٹنٹ چلانے ہی سے ایک جماعت مضبوط بنتی ہے۔

لیکن یہ اس کا خیال خام ہے۔ آج کل اسٹنٹ چلانے والوں سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو اس قسم کے اسٹنٹوں کو سمجھتے ہیں۔

بھارتی بھرکم وزن قد، ہنس مکھ چہرہ، مسٹر ایم ایل بھاردواج مدہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق ان "زندہ دلان پنجاب" سے ہے جو آزاد ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے میں سب سے آگے نظر آتے رہا۔ مگر کسی بے جا رعایت کے طفیل نہیں بلکہ اپنی محنت اور لگن سے۔ بھاردواج صاحب بھی شروع سے محنتی اور انتھک کام کرنے والے رہے ہیں اور ان کی اسی محنت نے انھیں جرنلسٹ کی کرسی سے انفارمیشن بیورو کے پرنسپل افسر کی کرسی تک پہنچایا۔

تقسیم کے نتیجے میں وہ دلی آئے اور انفارمیشن بیورو سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت وزارت امور خارجہ سے ان کا تعلق تھا۔ شام کو عام طور پر ان کا کمرہ نامہ نگاروں سے بھرا رہتا تھا۔ بلاشبہ اس لیے کہ وہ امور خارجہ اور خاص طور سے پاکستان کے بارے میں خبریں حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے جس کے ساتھ اس وقت بھی ایسی ہی کشیدگی تھی جیسی کہ آج کل ہے۔ لیکن اسلئے بھی کہ بھاردواج جیسا ہنس مکھ اور ملنسار سرکاری ترجمان کوئی اور نہ تھا۔ نامہ نگاروں کے لیے بھاردواج صاحب کا کمرہ دلچسپیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ درمیان میں کچھ عرصہ کیلیے بھاردواج صاحب نے پریس بیسٹرار جیسے ذمہ داری کے عہدہ پر بھی خدمات انجام دیں لیکن وہ پھر پریس انفارمیشن بیورو میں واپس آ گئے اور اسی دفتر سے ریٹائر ہوئے۔

پریس انفارمیشن بیورو کے بارے میں نامہ نگاروں میں گرچہ کبھی کبھی مخالفانہ رجحان دیکھنے میں آتا ہے اور وہ اسے "ایجیٹ پریس انفارمیشن بیورو" کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں لیکن اخباری نمائندوں میں بھاردواج صاحب کا ہمیشہ احترام رہا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خود ایک جرنلسٹ رہے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ تعلقات عامہ کی بنیاد حقیقت میں ذاتی تعلقات پر ہے۔ اخباری دنیا کے لوگوں میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جن کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات نہ ہوں۔ پریس انفارمیشن بیورو کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود ہر سینیر یا جونیر اخباری نمائندے کے لیے ان تک رسائی کوئی مشکل نہ تھی انکے دروازے سب کے کیلیے کھلے رہتے تھے۔ ان کی اسی سادہ مزاجی نے اخباری برادری میں انھیں مقبول عام بنا دیا تھا۔

بھاردواج صاحب کا آئندہ پروگرام کیا ہوگا۔ اسکی وضاحت انھوں نے نہیں کی لیکن یقین ہے کہ وہ پروگرام ضرور بنائیں گے۔ اسلئے کہ وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں بلکہ جوانوں سے زیادہ کام کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنے ہی خواہوں کا یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ وہ سیاست میں پڑ کر کسی قانون ساز اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے، لیکن بہرحال ان کے تمام دوست احباب اس وقت کے منتظر ہیں جب وہ مرکزی حکومت میں ہوں گے اور قومی حکومت ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائیگی۔

واقعات نئی دہلی

گوا میں صحافت

جب پرتگالیوں کو گوا سے نکال باہر کیا گیا تھا اس وقت گوا میں صرف ۵ روزنامے شائع ہوتے تھے۔ یہ روزنامے وہ ستے آرکار تھے۔

لیکن اس کے برخلاف اب صرف چند لاکھ افراد پر مشتمل چھوٹی سی آبادی کے اس شہر میں مختلف قسم کے کوئی ۲۰ روزنامے اور رسالوں کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ گوا کے باشندوں میں اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کا جذبہ بڑھا دیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے گوا کے عوام کو اخبارات اور رسائل سے کتنی دلچسپی ہے۔

ایک ایسے علاقے کے عوام سے جہاں مشرق میں پہلی بار گٹن برگ کے پریس ایجاد کرنے کے تقریباً سو سال بعد چھاپہ خانہ قائم کیا گیا تھا یہی توقع کیجا سکتی تھی۔

پرتگالی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے بعد گوا کے عوام میں اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور پیدا ہوا اور ان کے دلوں میں اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش اور تحریک پیدا ہوئی۔ اسی خواہش کے زیر اثر انھوں نے معمولی سی ترغیبات کی بنا پر نئے اخبار جاری کئے۔

پرتگالی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کی آہنی گرفت کی وجہ سے گوا میں صحافت زبوں حالی کا شکار رہی ہے۔ لیکن آنے والے برسوں میں اس بات کی امید ہے کہ گوا کے اخبارات عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے اور عوام تک خبریں پہنچانے کا عمدہ ذریعہ بنیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ گوا کے تاجر تجارت کے بارے میں اپنے قدیم اور روایتی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کریں اور تجارت میں اشتہار بازی کی اہمیت کو سمجھیں۔

جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی زمانۂ سابق میں گوا کی صحافت میں بے باکی اور جرأتمندی کی چند علامات نمایاں ہوئیں۔ اس لئے کہ وہ ایک غیر ملکی قوم کی ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی ہے۔ فرانسس لوئس گومس، پیڈرو افانسو، اور منزیز گنترا جیسے ادیبوں اور مقرروں نے اپنی تقریروں، پمفلٹوں اور صحافت کے ذریعے آہستہ آہستہ لیکن پر اثر طریقے پر پرتگال کی ظالم حکومت کے خلاف جنگ کی ہے۔

گوا کی صحافت کی داستان حیات پرتگالی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کی طویل داستان ہے۔

گوا میں سب سے پہلی چھاپے کی جدید مشین عیسائی پادریوں نے گوا پر پرتگال کے مکمل قبضے کے ۴۰ سال بعد نصب کی۔ اس مشین کی تنصیب سے پہلے گوا میں لکڑی کے ذریعے چھپائی کا قدیم طریقہ رائج تھا۔ جو بے حد غیر موزوں تھا۔ یہ طریقہ اس زمانے میں ایشیا کے سبھی ترقی یافتہ ممالک میں رائج تھا۔

ہندوستان کے تمام حصوں میں چھپائی اور صحافت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ اس کے برخلاف پرتگال کے پنجۂ استبداد میں پھنسا ہوا یہ علاقہ مختلف وجوہات کی بنا پر اس سلسلے میں کافی پسماندہ رہا۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ حکومت نے صحافت پر زبردست پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ان پابندیوں کی وجہ سے صحافت برباد ہو کر رہ گئی۔ وہ حکومت کا آلۂ کار بن گئی اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ اسکا فرض انسانی حقوق اور سچائی کے تحفظ کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا ہے۔

۱۶ ویں صدی عیسوی میں گوا ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان تعلق کی ایک اہم کڑی بن گیا تھا۔ یہاں سب سے پہلا چھاپہ خانہ عوام کو عیسائی مذہب کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ عیسائی مبلغین نے دیکھا کہ اہل مشرق کو عیسائی بنانے اور ان میں عیسائی مذہب کے اصول کو عام کرنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ چنانچہ ابتدائی مطبوعات کے موضوعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا تک جو کتابیں چھاپی گئیں وہ مذہبی اور فلسفیانہ تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم کانکلوسس فلاسفیکاس تھی جسے جان ڈی بسٹا نے ۱۵۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ کمپنڈیو اسپرچول ڈا وی ڈا کرسٹا جسے گوا کے سب سے پہلے آرچ بشپ کاسپر ڈی لیو نے ۱۵۶۱ء شائع کیا تھا اور کولوکیس دوس سمپلیس اے ڈروگس جسے ۱۵۶۳ء میں گارسیا ڈی اورٹا نے شائع کیا تھا۔

ان مطبوعات میں جو ۱۶۰۰ء کے بعد منظر عام پر آئیں ٹراٹاڈو کانٹرا اوس جوڈیوس۔ (یہودیوں کے خلاف معاہدہ) CONSTITUTIONI (دستور) پرائمیرو کونسیلو پروونشیل (سب سے پہلی صوبائی کونسل) پرانا کرسٹا (عیسائی پران) جارڈم دی پاسٹورس (چرواہوں کا باغ) یہ کتاب کونکنی زبان میں ہے اور ایک کونکنی زبان کا قواعد جسکا نام آرٹے ڈی لنگوا نارسہے اور جسکا مصنف فادر تھامس اسٹیفنس ہے، قابل ذکر ہیں۔

جیسے جیسے سیاسی شعور ترقی ہوتا گیا اور قومی احساسات

[illegible]
گوا میں عیسائی مذہب [illegible] اور چھاپہ خانہ [illegible] ایسی
کتابیں شائع ہوئیں جن سے غیر ملکی حکمرانوں اور عیسائی پادریوں
کے وجود کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

عظیم گوائی ادیبوں کے یہ تحریری کارنامے سیاسی استبداد کا شکار ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ ان تحریروں کو ان لوگوں نے تلف کر دیا جن کے مفادات ان کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئے تھے۔ اپنے آپ کو چاروں طرف خطرات میں گھرے ہوئے محسوس کرنے کے بعد پرتگالی حکمرانوں نے مناسب یہ سمجھا کہ گوا میں ہر قسم کی اشاعتوں پر پابندی کا قانون نافذ کر دیں۔ اس طرح انھوں نے حکومت کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کی کوشش کی۔

اسی زمانے میں فرانسیسی انقلاب کی وجہ سے سارے یورپ میں آزادی اور مساوات کے نئے سیاسی تصورات کی اشاعت عمل میں آ رہی تھی۔ اس کا اثر جلد ہی گوا میں بھی محسوس کیا گیا۔ ان نئے رجحانات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے دنیا میں ہر جگہ آزادی کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ ان حکومتوں کو سب سے اچھا سمجھا جانے لگا جو عوام کو اپنے اعتماد میں لیں۔ ان نئے حالات کے زیرِ اثر پرتگالی حکمرانوں نے مناسب یہ سمجھا کہ کتابوں رسالوں اور اخباروں پر سے پابندی اٹھا لی جائے۔

۲۲ر دسمبر ۱۸۲۱ء میں گوا کا سب سے پہلا ہفتہ وار گزٹ اڈی گوا شائع ہوا۔ سیاسی اور دوسرے موضوعات پر آزادانہ اظہارِ خیال کے روز افزوں جذبے کے نتیجے میں دستوری حکومت اور نظم و نسق کے بارے میں عوام کے خیالات میں جلا پیدا ہوئی۔ گوا کے تعلیم یافتہ عوام نے سیاسی اصطلاحات اور سیاسی آزادیوں کے لئے ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کیا۔ لیکن حکومت ان آمنیوں پر عوام پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑی جو اس کی نظر میں قوم کے دشمن تھے۔ ان کے ترقی پسندانہ خیالات نے پرتگالی حکومت کو متزلزل کر دیا۔

سیاسی استبداد اور قید و بند کے خوف سے ان میں بہت سے لوگوں نے گوا سے بھاگ کر بمبئی میں پناہ لی جہاں اخبارات جاری کئے گئے اور سیاسی آزادی کے حصول کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ان کے باغیانہ جذبات نے پرتگالیوں کے سیاسی استبداد کے خلاف ایک طویل جنگ کی داغ بیل ڈال دی۔

[illegible]
اور ان اخبارات پر سنسر کر ۱۹۳۶ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان شائع ہوئے سنسر نے بند کر دیا۔

ان میں "کرانیکا کانسٹی ٹیوشنل ڈی گوا"، "نایکوڈی لیوسی تانیا"، "اودی لیباٹے"، "اے بائیلونیکا ڈی گوا"، "والو آ برز ویڈر"، "اوانسائیکلو پیڈیکو"، "اوکامپیلا ڈورو"، "اوکورلیو ڈی نووا گوا" اور "دی وسٹا السٹریٹیو" وغیرہ شامل ہیں۔

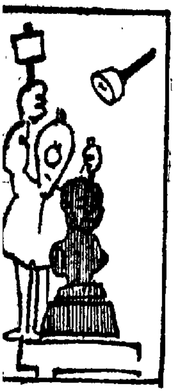
سرکاری اخبار "بولے تم ڈو گورنو ڈو ایسٹاڈو ڈا انڈیا" جسے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا گیا تھا ۱۹۶۲ء تک مسلسل پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

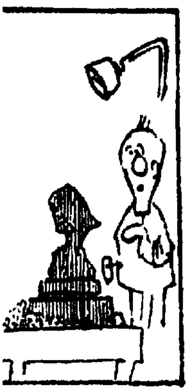
۱۸۵۹ء میں "الٹرامار" نامی روزنامے کی اشاعت نے گوائی صحافت میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اخبارات کے لئے لکھنے والوں کی بصیرت میں اضافہ کیا اور انھیں ایک اہم مقصد سے روشناس کرایا بلکہ ان میں اپنی تحریروں کے ذریعے عوام کے حقوق کا مطالبہ کرنے کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کے بعد کم از کم کوئی ۹۶ روزنامے اور ہفتہ وار شائع ہوئے لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے یا تو وہ مالی نقصان کی وجہ سے بند ہو گئے یا پھر پرتگالی حکومت کی نامناسب پابندیوں کا شکار ہوئے۔

آخر کار جب پرتگالیوں کو گوا سے نکال باہر کیا گیا تو اس وقت گوا میں صرف ۵ اخبار شائع ہو رہے تھے جن کا معیار بہت پست تھا۔ ان کے نام "دی ہیرالڈو"، "ڈیاریو ڈا نائٹے"، "اے انڈیا پورچوگیزا" اور "اے ویدا" ہیں۔ پرتگالی حکومت کے خلاف ایک اداریہ لکھنے کی وجہ سے "اے وور ڈا انڈیا" نامی اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اس کے ایڈیٹر نے بھاگ کر بمبئی میں پناہ لی تھی۔

کونکنی زبان میں شائع ہونے والے ایک مذہبی ماہنامے کی اشاعت پر جسے پلار نامی مقام کے پادری شائع کرتے تھے ۱۹۶۰ء میں پرتگالی گورنر نے تین ماہ تک پابندی لگا دی۔ لیکن اس طرح کی رکاوٹیں اور ناساز گار حالات کے باوجود گوائی صحافت کا یہ کارواں برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس کا یہ عظیم سفر آزادی کی اس منزل کی طرف جاری رہا جس کے لئے ہمارے آبا و اجداد نے اپنے گھر اپنے خاندان اور اپنی زندگیاں تک قربان کر دی تھیں۔









آخری گدھے سے ملاقات



قیصر رضا

میں اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا سامنے سے جاتی ہوئی ایک حسین جمیل سی نازک اندام کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیڈی کپڑے میں کسا اس کا جسم ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کپڑے پھاڑ کر باہر نکل پڑے گا۔ وہ کچھ ہی دور گئی تھی کہ ایک گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا ایک گدھی کا پیچھا کئے چلا آرہا تھا۔ وہ اس گدھی سے عشق لڑانا چاہتا تھا اور گدھی اپنی دولتی جھاڑتی انکار کرتی بھاگی جا رہی تھی۔ وہ گدھا بار بار اپنی چھاتی پر ہاتھ مار مار کر یہ گیت گا رہا تھا۔

رُک جا او جانے والی رُک جا، میں تو عاشق ہوں ترے حسن کا

میں اس گدھے کو انسانوں کی طرح گاتا دیکھ کر چونک گیا اور دوڑتا ہوا اُس گدھے کو پکارنے لگا۔

"ارے! او میاں گدھے. ذرا سنو گے بھائی"

اس گدھے نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی! میں میاں نہیں بلکہ میں تو ایک ہندو دھوبی کا گدھا ہوں اس لئے مجھے مہاشے کہہ کر بلایئے"۔

میں بھی گدھے کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا اور پھر پکار کر کہا "اجی مہاشے گدھے صاحب! ذرا رکئے تو آپ سے ایک ضروری کام ہے"۔ وہ دوڑتا ہوا بولا "بھائی میرے واقعی دلی

میں تو ابھی نہیں آؤں گا کیونکہ مجھے ابھی اس گدھی سے عشق لڑانا ہے۔ عشق لڑانے کے بعد ہی آؤں گا"۔ میں نے اسے پھر آواز دی اور کہا "میرے دوست! تمہیں صرف عشق لڑانا ہے جیسی گدھی چاہو گے میں مہیا کر دوں گا۔ جمشید پور میں گدھوں کی کمی نہیں ہے۔ بوڑھی چاہو گے تو بوڑھی، جوان چاہو گے جوان، شادی شدہ چاہو گے تو شادی شدہ، بچے والی چاہو گے تو بچے والی۔ مگر میری بات تو سنو!"

گدھی تیز تیز دوڑ رہی تھی اور وہ گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا اور . . . . . .

رُک جا او جانے والی رُک جا، میں تو عاشق ہوں ترے حسن کا

گاتا ہوا پیچھا کر رہا تھا۔ اس لئے میں بھی چلاتا ہوا تیزی سے دوڑنے لگا مگر ہر لمحہ دونوں کی دوری بڑھتی ہی جا رہی تھی گدھا دور ہوتے ہوئے بولا

"میرے دوست! ابھی تو مجھے اسی کنواری گدھی سے عشق لڑا لینے دو اس کے بعد تمہارے پاس آؤں گا

اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند راہ گیروں نے یہ سمجھ کر میں اس گدھے کا مالک دھوبی ہوں مگر وہ لاخیرہ گدھا اپنے مالک

چلا گیا اور سوچنے لگا کہ اس بولنے والے گدھے سے کس طرح ملا جائے، کمبخت کہاں ملے گا۔؟ میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا مسلسل دو گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا کہ عشق لڑانے کے بعد اب واپس آئے گا اور تب واپس آئے گا۔ مگر کمبخت گدھا نہیں آیا۔

وہ سنیچر کی اک شام تھی۔ بقول اختر اورینوی "سنیچر کی شامیں خصوصاً فلم کدوں میں ہندوستان کے شہریوں کے لئے مسرت نہیں بلکہ فریب کا سامان مہیا کرتی ہیں"۔

اس شام میں نٹراج میں ایک فلم دیکھنے گیا۔ فلم کے شروع ہونے میں کافی دیر تھی اس لئے ٹکٹ لے کر میں ریگل گراؤنڈ کی طرف چلا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں میدان میں بہت بڑا مجمع لگا ہوا ہے میں بھی اس مجمع کی طرف بڑھا۔ دیکھا وہی انسانوں کی طرح بولنے والا گدھا مجمع کے بیچ میں کھڑا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہے اور وہ کہہ رہا ہے۔

"بھائیو! نہ میں امریکی سی۔آئی۔ اے کا ایجنٹ ہوں نہ روس کی تاس خبر رساں ایجنسی کا کوئی کارکن، نہ چین کے بائیں بازو والا کمیونسٹ اور نہ خالص کانگریسی ہی بلکہ میں تو صرف ہندوستان کا ایک باسی یعنی ہندوستانی ہوں ہندوستان کے صوبہ یوپی میں پیدا ہوا، بمبئی میں پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔ کبھی میں رستم بھائی کے ریس کا گھوڑا بنا، کبھی سیٹھ بھسوڑی مل کا گرد کبھی فلم کا پروڈیوسر، کبھی فلم کی ہیروئن سے عشق لڑایا، کبھی جان گنواتے گنواتے بچا۔ کبھی نیفا کی سیر کو نکلا کبھی میں نے اپنے پیٹ میں ٹھرے کی چھ چھ بالٹیوں کو ماہم کریک کے کراس سے بلا روک ٹوک کچھ دئے بغیر اسمگل کیا۔ اور اب آپ کے سامنے جمشید پور کے ایک پارک میں کھڑا ہوں۔

"ایک مرتبہ میں ہندوستان کے مشہور و معروف افسانہ اور ناول نگار کرشن چندر سے ملا۔ انھیں اپنی کہانی سُنائی۔ انھوں نے میری کہانی لکھ کر ہزاروں روپیہ کمایا۔ اور اوپر سے مجھ پر احسان بھی جتایا۔ میں اُن کے افسانے کا ہیرو بنا۔ اور آپنے دل میں دبی چنگاری کو کرید کر نکالا اور شروع سے آخر تک سارا قصہ سنایا۔ جسے انھوں نے آپ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اسے آپ میں سے بہت سے لوگوں نے پڑھا بھی ہوگا کرشن چندر کی طرح میں بھی عظیم ہو گیا۔

ں کی طرح [illegible]

ا ہی ہوتا ہے۔ [illegible]......"

مجمع سے ایک مترنم آواز ابھری "اسے عظیم ڈنکی اپنے
گدھا کہہ کر اپنی توہین مت کرو۔ تم تو ایک عظیم ڈنکی
دھا ایک پھیکی مسکراہٹ ہنسا اور بولا "محترمہ ڈنکی
ی خچر اور گدھا ہوتا ہے۔ مگر ہاں ہندی اور انگریزی
ضرور ہے۔ انگریزی لفظ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، ہم
کو بھلا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"تو جی ہاں میں اپنی کہانی سُنا رہا تھا کہ میں گدھا... اوہ
دی۔ میں ڈنکی ڈنکی ہی رہ گیا۔ لاکھوں ہاتھ آیا اور ریس
میں سب گنوا دیا۔ پھر کنگال ہو گیا تو سوچا کہ اب بمبئی
مزہ نہیں رہا۔ اس لئے سے

ے دل کہیں اور چل ۔ اب تو بمبئی کی دنیا سے دل بھر گیا
یں بمبئی سے بھاگا لیکن ادھر کچھ ایسی بپتا آن پڑی
میں پھر بمبئی جانا چاہتا ہوں اور اپنی کہانی کرشن چندر
نا کر انکی بالنسری سے اپنے لئے ایک پکار اگ نکلوانا
ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس بمبئی جانے کا
ی نہیں ہے جو جاؤں اور اپنی کہانی کرشن جی کو
اؤں۔ اپنا دُکھ سنا کر آپ لوگوں سے کچھ مدد مانگ
دل۔ میری مدد کیجئے، بھگوان آپ کی مدد کرے گا۔"
مجمع آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ مگر خاص طور پر لڑکیاں
ں۔ اتنے میں ایک حسین سی پیاری سی لڑکی نے سوال کیا۔
"آپ انسانوں کی طرح بولنے کیسے سیکھ گئے؟"
گدھے نے پھر کہنا شروع کیا۔
"شروع ہی سے میں انسانوں کے ہمراہ رہا۔ مگر انسانوں
ہمراہ تو سبھی گدھے رہتے ہیں، وہ کیوں نہیں بولتے؟
ے نے خود ہی سے سوال کیا اور خود ہی بولنے لگا: "مجھے
اس قسم کا ماحول ملا کہ میں انسانوں کی طرح بولنے
ا۔ نزدیک ہی ایک کتاب والا تھا جو جوزف ڈی سوزا کے
ہاں اکثر کھڑا رہا کرتا تھا۔ میں اکثر اس کے بک اسٹال
چلا جاتا۔ کتابوں کے ٹائٹل کو پڑھنا شروع کیا اور آہستہ
آہستہ پڑھنا اور لکھنا دونوں سیکھ گیا۔ گدھوں نے میری اس
ہاری کو دیکھ کر مجھے گدھے سماج سے نکال باہر کر دیا۔
ی گدھی مجھ سے عشق نہیں لڑاتی۔ خواہ وہ چمارن یا
[illegible]

[illegible] ہے مجھے [illegible] کر رہ گیا نہ گھر کا نہ
گھاٹ کا۔ نہ انسان ہی مجھے اپنے پاس بیٹھنے دیتے ہیں
اور نہ گدھے اپنے سماج میں شامل کرتے۔"
مجمع میں سے ایک مترنم آواز پھر ابھری
"آپ اخبار وغیرہ بھی پڑھ لیتے ہیں"؟
"جی ہاں!"
"تو پڑھ کر دکھایئے؟" ایک بنگلا اخبار گدھے
کے سامنے رکھ دیا گیا۔
گدھے نے کہا: "زمانہ کا حال دیکھ دیکھ کر اور فاقہ
پر فاقہ، پیدل پہ پیدل چل چل کر میری آنکھوں کی روشنی
کم ہو گئی ہے۔" ایک صاحب نے فوراً اپنا چشمہ اُتار کر
گدھے کی آنکھوں پر لگا دیا اور کہا اب دیکھئے۔
گدھے نے اخبار کو دیکھا اور کہا: "بہت خوب! اس
سے تو صاف نظر آتا ہے۔ مگر یہ تو بنگلا اخبار ہے میں اُردو
اچھی طرح جانتا ہوں اور ہندی بھی۔ کیونکہ ہندی تو ہماری
راشٹر بھاشا ہے اور انگریزی بھی تھوڑا بہت۔"
داڑھی والے ایک مولوی صاحب نے اُردو کا اخبار
سامنے رکھ دیا اور بولے: "اب تو پڑھیئے۔"
گدھے نے فراٹے کے ساتھ اخبار کی موٹی سُرخی کو پڑھ
دیا تب مجمع نے جانا کہ گدھا بھی پڑھ لیتا ہے۔ پھر گدھے
نے اُن چشمے والے بابو کو مخاطب کیا جنھوں نے اپنا چشمہ گدھے
کی آنکھ پر لگا دیا تھا۔
"بھائی جان! آپ اپنی عینک لے لیجئے۔"
وہ عینک والے بھائی جان بولے: "جی نہیں اب
آپ ہی رکھئے آپ کی آنکھوں پر پورا اترا ہے۔ اخبار وغیرہ
پڑھنے میں آپ کو آسانی ہو گی۔ رکھیئے! میں دوسرا خرید
لوں گا۔"
گدھے نے کہا: "آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے رحم کھا
کر اس غریب پر مہربانی کی۔" اور پھر بولا: "آپ لوگ میری
کچھ مدد کر دیجئے۔ تاکہ میں بمبئی پہنچ جاؤں۔"
مجمع نے کہا: "ڈنکی صاحب آپ روپیہ کہاں رکھیں گے
یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور ڈھے ہی چھرے مار ہیں اور جیب کترے
بھی یہاں بہت زیادہ ہیں وہ آپ سے روپے چھین لیں گے اور
آپ اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

مجمع کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اور جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو
وہ زور سے بولا "ہاں بھائی جان! آپ ہی آیئے، روپیہ جمع
کر لیجئے اور مجھے گاڑی پر بٹھا دیجئے گا۔"
مجمع میں سے کسی نے کہا: "ڈنکی صاحب! آپ کو ان پر
پورا اعتماد ہے؟"
"ہاں بھائی ہاں" گدھے نے جلدی سے کہا۔
اور پھر روپے پیسے کی بارش سی ہونے لگی۔ اٹھنی چونی
ایک آدھ کا نوٹ وغیرہ۔ جس سے جو بن پڑا اس نے دیا ہو
چلا گیا۔ لڑکیوں نے بھی خوب دل کھول کر گدھے مہاشے کو
پیسے دیئے اور جب پورا میدان صاف ہو گیا تو گدھے نے
کہا: "بھائی جان ذرا گنیئے تو کتنے روپے ہوئے؟"
میں نے سبھی نوٹوں اور ریزگاریوں کو گنا تو وہ سب
کل ملا کر ستاسی روپے چار آنے تھے۔
"یہاں سے بمبئی کا کرایہ کتنا ہوگا؟" گدھے نے دریافت کیا۔
"یہی چالیس اور پچاس کے بیچ۔"
"تب ٹھیک ہے" گدھے نے پھر کہا: "ایک چھوٹا سا منی
پرس خرید لیجئے۔ میں اسے اپنے منہ میں دبائے رہوں گا۔
نہیں تو کوئی روپیہ چھین لے گا اور ہاں! ذرا آپ اتنی
تکلیف کیجئے کہ اسٹیشن تک چل کر ٹکٹ کٹا کر مجھے بمبئی کی
ٹرین پر سوار کرا دیجئے گا۔ میں چلا جاؤں گا۔ آپ کی بہت
مہربانی ہو گی۔"
میں نے کہا: "میرے یار میرے پاس تو سینما کا ایک
روپیہ چھ پیسہ کا ٹکٹ ہے۔ میرا ایک پکچر برباد ہو جائے گا۔"
"اسے بلیک کر دو، نفع بھی ہو جائے گا۔" گدھے نے بڑے
ہی مزے میں منہ چلاتے ہوئے کہا۔
میں نے ٹکٹ خرید دام میں ہی ایک تماشبین کو دے دیا اور
ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن آ گیا۔ ٹکٹ کٹایا اور ٹرین میں گدھے
کو بٹھا کر کہا۔ "اچھا! ڈنکی برادر اب تم جاؤ بائی بائی۔"
گدھے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "معاف کر دو گے
بھائی۔ اُس دن تم نے مجھے بلایا تھا مگر میں نے اُس گدھی کے
عشق لڑانے کے چکر میں نہیں سُنا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب
بھی نہیں ہو سکا۔"
گاڑی نے سیٹی دی اور وہ آنکھیں صاف کرکے ہانپنے
لگا۔ [illegible]

املی کا آسیب زدہ درخت

ایک سچی کہانی

رشید الدین۔ بی اے

ناگپور تعلقہ پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ ایک نواب کا مستقر تھا اور بہت ہی متمدن اور آباد قصبہ تھا اور یہ بات چنداں غلط بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ ناگپور میں آج بھی بڑے بڑے مندر موجود ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں عالیشان عمارتیں تھیں۔ خود نواب کے محل کے کھنڈر بھی موجود ہیں جسے عرف عام میں ڈیوڑھی کہتے ہیں۔ نواب کا ایک دیوان تھا اس کا مکان آج بھی ٹوٹی پھوٹی حالت میں ندی کے کنارے کھڑا ہے جس میں سنا ہے کہ باون دروازے تھے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام باون دروازے والی کوٹھی پڑ گیا اور اب کثرتِ استعمال سے بطور اختصار صرف کوٹھی رہ گیا ہے۔ یہاں سے بہنے والی ندی قریب ہی کی پہاڑیوں سے نکلتی ہے۔

اس ندی پر آبپاشی کے لئے کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا بند باندھا گیا تھا مگر اب تو وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور آبپاشی کا کام نہیں دے سکتا۔ تاہم اس گئی گزری حالت میں بھی وہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس نے ندی کے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جس کے دائیں بائیں سے ندی نے اپنا راستہ بنا لیا ہے۔ ندی کے ایک کنارے پر خوب صورت اور قدیم گردیزی مندر ہے جس کی اونچائی کی مناسبت سے اسے اونچا مندر کہا جاتا ہے۔ اونچے مندر کے پیچھے ایک کھلا میدان ہے جہاں گاؤں کے جانور وغیرہ ٹھہرتے ہیں، بچے کھیلتے ہیں اور کبھی کبھی خانہ بدوش لوگ وقتی طور پر

اگر اپنے ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔

اس میدان کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اس میدان اور کھیتوں کے درمیان املی کا ایک بڑا ہی قدیم گھنا درخت ہے جس پر چمگادڑوں نے اپنے ڈیرے جما لئے ہیں۔ اور الو بیٹھے اپنا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کا عام خیال ہے کہ یہاں کوئی بھوت رہتا ہے اور مغرب کے ذرا بعد سے لے کر صبح ہونے تک اس راستے پر اس کا قبضہ رہتا ہے تب کوئی شخص اس کے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس لئے گاؤں کے وہ لوگ جنہیں اپنے کھیتوں سے لوٹتے ہوئے دیر ہو جاتی وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف سے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں اور اگر مغرب کے بعد لوٹنا پھر جانا ہو تو وہ بھی ایک لمبا چکر کاٹ کر جاتے ہیں۔ یہ روایت برسہا برس سے چلی آ رہی ہے مگر کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ بھوت نے کسی کو بالقصد پکڑا ہو یا بھوت کسی کو ستایا ہو۔ مگر اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس بات کا اتنا چرچا ہو گیا ہے کہ کوئی رات میں ادھر سے گزرتا ہی نہیں اس لئے کسی واقعے کے پیش آنے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

کسی زمانے میں ناگپور ایک بڑا قصبہ تھا مگر آج افلاس زمانہ سے وہ ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے جہاں کے لوگوں کا پیشہ یا تو محنت مزدوری ہے یا پھر کھیتی باڑی۔ برسات اور سرما کے موسم میں یہاں کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں مگر گرما کے موسم میں انہیں کوئی کام نہیں رہتا کیونکہ ان دنوں کھیت [illegible] نہیں بویا جا سکتا۔ ان دنوں بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ چوپال میں بیٹھے چلمیں پیتے ہیں، پرانے راجاؤں، نوابوں اور گاؤں کے متمول لوگوں کے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ نوجوان شادی شدہ لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ گھروں میں ہوتے ہیں اور جو نوجوان شادی شدہ نہیں وہ ندی کی ریت پر بیٹھے گپیں ہانکتے ہیں۔

ان میں کبھی کبھی آپس میں کشتیوں کے ذریعے طاقت کے مظاہرے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی بہادری آزمانے کے لئے شرطیں بندھ جاتی ہیں۔ شرطیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں کہ رات کے دس بجے (جی ہاں، گاؤں میں دس بجے کو بہت زیادہ رات تصور کیا جاتا ہے) کوئی اونچے مندر میں جا کر دیوی کے درشن کر آئے یا دیوان کی کوٹھی کا ایک چکر لگا آئے یا نواب کی ڈیوڑھی میں اگے ہوئے ایک مخصوص پودے کا پتا توڑ لائے مگر ناگپور کے نوجوانوں میں اس قسم کی شرط کبھی نہیں بندھی کہ کوئی گاؤں کے باہر والے املی کے درخت کے نیچے سے ہو آئے۔ اگر کوئی نوجوان اپنی بہادری منوانے پر بہت زیادہ مصر ہی ہو تو اس سے کہا جاتا کہ وہ رات کو املی کے درخت کے نیچے سے ہو آئے اور یہ سن کر وہ نوجوان اپنی ساری بہادری بھول کر ایکدم خاموش ہو جاتا۔

ایک مرتبہ ناگپور میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے جس کا نام ساونت تھا اچانک ہی گاؤں کے سب لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ ایک بار انجانے میں وہ رات کے وقت اس درخت کے نیچے سے ہو کر آیا تھا اور چوپال میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں نے اسے ادھر سے آتے بھی دیکھا تھا۔ اسی وقت گاؤں کے مکھیا نے (جس کے یہاں وہ مہمان آیا ہوا تھا) اس کے یہ بتانے پر کہ وہ املی کے درخت کے نیچے سے آ رہا ہے اسے سخت تنبیہ کی تھی۔

ساونت قریب کے ایک گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور بہت [illegible] باک تھا، اپنے گاؤں میں بھی وہ بہادری کے لئے بہت مشہور تھا اور جب [illegible] ناگپور کے نوجوانوں سے اس کی دوستی بڑھی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ساونت دنیا میں کسی چیز سے ڈرتا ہی نہیں۔ ابتدا میں انہوں نے اس کی باتوں کو محض اپنی بڑائی پر محمول کیا۔ مگر جب انہوں نے اس کی بہادری کا عملی طور پر امتحان لیا تو وہ واقعی اس کے قائل ہو گئے۔

اسے سب سے پہلے اونچے مندر میں بھیجا گیا۔ اندھیری رات
میں اکیلے ایک ویران مندر میں جانا بڑے دل گردے کی بات تھی
وہ وہاں سے ہشاش بشاش واپس لوٹا۔ پھر اسے نواب کی
ڑھی کے ویران کھنڈروں میں بھیجا گیا جہاں سے اس نے
ور نشانی ایک مخصوص پودے کا پتا بھی لاکر دکھایا۔ اسے
ت میں ویران کوٹھی میں بھیجا گیا، وہ قندیل لے کر وہاں پہونچ
اور اس ویرانے میں ایک شیطان کی طرح گھوم کر واپس
یا۔ ایک کھڑکی میں سے (جو ندی کی طرف کھلتی تھی) قندیل ہلاکر
نے ساتھیوں کو بتا بھی دیا کہ وہ وہاں پہونچ چکا ہے۔ اس
پر گاؤں کے بہت کم نوجوان پورے اترے تھے۔

ساونت بہت قدآور اور طاقتور انسان تھا۔ اس کے
ہمت اور طاقت دونوں کی فراوانی تھی، کشتیوں میں بھی
اس نے ناگپور کے تمام نوجوانوں کو ہرا دیا اور ایک دن باتوں
اتوں میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ رات کے وقت وہ اکیلا
کے درخت کے نیچے جاکر بھی آ سکتا ہے۔ بعض نوجوانوں نے
اس کی ہمت اور طاقت سے جلنے لگے تھے بات کو طول دیا
کبھی بھی وہاں نہیں جا سکتا، اور اگر جائے گا بھی تو بھوت
نیچے سے زندہ نہیں آسکتا کیونکہ آج تک کسی مائی کے لال
وہاں جانے کی ہمت نہیں کی۔ ساونت نے انھیں بتایا کہ
ایک بار رات کے وقت ہی اس درخت کے نیچے سے گزر چکا ہے
لوگوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ اگر وہ واقعی بہادر ہے تو آج اور ابھی
وقت املی کے درخت کے نیچے ہو آئے۔ اس وقت رات
ن رہے تھے، ساونت فوراً تیار ہو گیا، مگر سوال یہ تھا
واقعی وہ وہاں گیا تھا، اس کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ گاؤں
ملی کے درخت کو مقدس سمجھتے تھے اس لئے اگر اس سے املی کا
سے کہا جاتا تو وہ کسی بھی املی کے درخت سے توڑ
اگر اس کے پیچھے پیچھے جاکر نگرانی کی جاتی تو پھر اس کے لئے
جانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ آخر بہت سوچنے کے بعد یہ
نکالی گئی کہ ساونت اپنے وہاں جانے کے ثبوت میں املی
درخت کے تنے میں ایک کیل ٹھونک کر آئے جسے دوسرے دن
اگر سب لوگ دیکھ لیں گے۔ ایک نوجوان دوڑ کر اپنے گھر سے
لے آیا سب لوگوں نے غور سے کیل کی ساخت دیکھی اور
وہ کیل ساونت کو تھما دی گئی جسے لے کر وہ بڑے اطمینان
[illegible]

روانہ ہو گیا جس کے آگے املی کا درخت تھا۔

ادھر ندی کی ریت پر بیٹھے ہوئے تمام نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ برسوں سے چلی آنے والی روایت کا آج فیصلہ ہونے والا تھا۔ بہت سارے لوگ ندی پر بیٹھ کر ہی اس سے اپنے بدن میں کپکپی محسوس کر رہے تھے۔ کافی دیر ہو گئی مگر ساونت نہیں آیا حالانکہ یہ سارا عمل بمشکل آدھے گھنٹے کا ہو سکتا تھا۔ بعض نوجوان سمجھے کہ شاید بھوت اور ساونت میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ دو گھنٹے گزر گئے اب تو سب کو تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا ہو سکتا ہے کہ وہ گھر جاکر مزے سے سو رہا ہو اور ہم یہاں بے وقوف بن رہے ہوں۔ بات معقول تھی چنانچہ ایک صاحب کو مکھیا کے گھر بھی اسے دیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد سے باہر ہی ہے۔ اب تو تمام نوجوان بہت سٹپٹائے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں کے بڑے لوگوں کو اس کی اطلاع دینی چاہیے اور پھر سب کے ساتھ املی کے درخت کے نیچے جاکر دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ وہ ندی سے اٹھ کر چوپال میں آئے، خوش قسمتی سے گاؤں کے کچھ بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ وہاں موجود تھے جن میں مکھیا شامل تھا، انھوں نے انھیں پورا قصہ سنایا، اور لوگ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ لاٹھیاں اور لالٹینیں ساتھ لی گئیں۔ گاؤں کے کچھ آوارہ کتے بھی ساتھ ہو گئے اور ناگپور کے بوڑھے، ادھیڑ اور جوان لوگوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مع کتوں کے آسیب زدہ املی کے درخت کی جانب بڑھا۔ لوگ اشلوک پڑھنے لگے تاکہ اگر بھوت ہو بھی تو بھاگ جائے۔

املی کے درخت کے کچھ قریب پہونچ کر انھوں نے دیکھا کہ ساونت تنے کے قریب اوندھے منہ پڑا ہے۔ "شاید بھوت نے اسے مار ڈالا ہے"۔ تمام لوگوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا۔ مگر کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ تمام جسموں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ کتوں نے دور سے کوئی سفید سی چیز دیکھ کر بھوں بھوں کا شور بلند کیا۔ گاؤں کے بہادر نوجوان مارے ڈر کے ایک دوسرے کی آڑ لینے لگے۔

رات کے وقت چمگادڑیں تو سب جا چکی تھیں مگر اُلوؤں کے چیخنے کی آوازیں املی کے درخت سے نکل کر تمام جنگل میں وحشت پھیلا رہی تھیں۔ درخت کے بالکل قریب جاکر تمام لوگ رک گئے کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھے۔ نوجوان تو سب سے پیچھے تھے۔ آخر گاؤں کا مکھیا ہی لالٹین لئے آگے بڑھا سکے پیچھے گاؤں کے کچھ اور بوڑھے ہو گئے، پھر ادھیڑ عمر کے لوگ اور سب سے پیچھے نوجوان۔ بوڑھے مکھیا نے کپکپاتے ہاتھوں سے ساونت کے الٹے جسم کو سیدھا کیا کسی نے لالٹین اس کے منہ کے آگے کر دی۔ سب نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں ساکت و جامد تھیں۔ وہ مر چکا تھا۔

"کیا گبرو جوان تھا!" بوڑھے مکھیا سے نہ رہا گیا۔ بعض لوگ مارے خوف کے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ کہیں بھوت آکر انھیں نہ دبوچ لے۔

"چلو اب اٹھاؤ بھی چودھری کی مٹی کا تودا۔ جو ہونا تھا سو وہ ہو چکا۔" گاؤں کے مکھیا کو گم سم کھڑے دیکھ کر ایک بوڑھے نے کہا۔ کچھ آدمی لاش کی طرف بڑھے مگر اسی اثنا میں درخت پر سے ایک زوردار کی چیخ سنائی دی اور تمام لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ کوئی اُلو اپنے پر پھڑپھڑاتا روشنی کو دیکھ کر اڑ گیا۔ لوگوں نے زور زور سے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ بمشکل تمام مکھیا لالٹین لے کر آگے بڑھا اور اس نے مرے ہوئے ساونت کی گردن کو سیدھا کیا جو ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ اس کو دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ آگے بڑھے اور لاش کو اٹھانا چاہا۔ مگر یہ کیا ـــ؟ وہ تو املی کے درخت کی جڑ سے چمٹی ہوئی تھی۔ "بھوت اپنا شکار کبھی کسی کے حوالے نہیں کرتا" یہ سب کے دل میں ایک ہی خیال آیا۔ مکھیا نے جب لالٹین قریب لے جاکر دیکھا تو ساونت کی دھوتی ایک کیل میں پھنسی ہوئی نظر آئی جو املی کی جڑ میں ٹھنکی ہوئی تھی اور اس وجہ سے اس کی لاش اس سے چمٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

تمام چیزوں پر غور کرنے کے بعد وہاں موجود لوگوں کو اس نتیجے پر پہونچنے میں دیر نہیں لگی کہ ساونت نے گھبراہٹ یا سہواً املی کے درخت کی ابھری ہوئی جڑ میں کیل ٹھونکتے ہوئے اپنی دھوتی کا خیال نہیں رکھا اور وہ کیل کے ساتھ املی کی جڑ میں دھنس گئی۔ جب وہ کیل ٹھونک کر جانے کے لئے اٹھنے لگا تو دھوتی کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکا اور اس خیال سے کہ بھوت نے پکڑ لیا ہے اور یہاں بھوت موجود ہے تو مارے خوف کے اس کی جان نکل گئی۔

اور دوسرے دن ناگپور کی آسیب زدہ املی کے درخت پر پڑے ہوئے برسوں کے اسرار کے پردے اٹھ گئے۔ اور لوگ آزادی سے رات میں بھی اس املی کے درخت کے نیچے سے گزرنے لگے۔

چوروں کی انجمن

البرٹ ڈکرپنے

خورشید حیدری

جولائی کی گرمیوں کی ایک شام تھی۔ ماسکو شہر گرمی کی سے جل رہا تھا۔ یہ علاقہ اپنی سردی کے لئے تمام عالم میں ہے مگر اس علاقے میں تھوڑی سی بھی گرمی ناقابلِ برداشت ہے۔ سمندر سے آنے والے بادِ سموم کے جھونکے چہروں کو رہے تھے۔ سمندر کے کنارے پتھروں کی قدیم طرز کی ایک میں وکیلوں کی فرم کا ایک دفتر تھا جہاں کچھ وکیل صاحبان مقدمے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ اس فرم کا ایک سینئر ایک کرسی پر بے دلی سے بیٹھا سامنے رکھی ہوئی فائلوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کے دل میں یہ خیال چکر لگا رہا وہ کب گھر پہنچے اور کب کپڑے اتار کر غسل کرنے کے ٹب لیٹے۔ غسل خانے کے ٹھنڈے پانی کا تصور اس کو اس کے عالم میں بے چین کئے ہوئے تھا۔

"جناب! آپ سے سات آدمی ملنا چاہتے ہیں۔" اردلی نے اطلاع دی۔

سینئر وکیل نے اپنے ساتھیوں کے چہروں کو سوالیہ نظروں دیکھا گویا ان سے پوچھ رہا ہو۔ "کیوں! یہ سات آدمی کیوں ہیں؟" مگر ان کے چہروں پر سوائے بیزاری کے اور کچھ نہ سب خاموش ہی رہے۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور یکے بعد دیگرے سات آدمی داخل ہوئے۔ سب سے آگے ایک مضبوط، ہنس مکھ اور خوش پوش آدمی تھا۔ آنکھوں پر سنہرے فریم والا گہرے رنگ کا چشمہ تھا۔ ہاتھوں میں بھورے رنگ کے دستانے تھے۔ انگلیاں قیمتی انگوٹھیوں سے مزین تھیں۔ گلے میں ایک پتلی سی طلائی زنجیر۔ دائیں ہاتھ میں سنہرے منہ والی چھوٹی سی ہلکی چھڑی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک قیمتی رومال۔ اس کے برعکس باقی چھ آدمی میلے کچیلے اور گندے لباسوں میں تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے عیاری اور چہروں پر جرم کی بھیانک داستانیں لکھی ہوئی تھیں۔ خوش پوش آدمی جو بظاہر ان چھ آدمیوں کا لیڈر نظر آ رہا تھا سینئر وکیل کے آگے بڑے ادب سے جھکا اور یوں گویا ہوا۔

"جناب محترم! ہم لوگ "یونائیٹڈ ریسوٹ فارکوف اینڈ اوڈیسہ" کی تنظیم "چوروں کی انجمن" کے نمائندے ہیں۔"

وکیل صاحبان اپنی اپنی جگہوں پر بری طرح کسمائے۔ سینئر وکیل نے حیرت سے انکی جانب دیکھا۔

"کون سی انجمن؟"

"جناب! "چوروں کی انجمن" سنجیدگی سے جواب ملا۔ "مجھے تنظیم کی جانب سے یہ عزت بخشی گئی ہے کہ میں ملک کے نامور وکیلوں کے آگے اپنی تنظیم کے کچھ مسائل رکھوں اور انصاف طلب کروں۔ امید ہے کہ آپ لوگ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔"

"خوب۔ بہت خوب۔" سینئر وکیل اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"جناب من! میں اپنی صاف گوئی کے لئے آپ سے معافی چاہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے مگر اس قیمتی وقت میں سے ہمیں بھی کچھ وقت ملنا چاہئے۔"

"کہو بھئی کیا کہنا چاہتے ہو۔" سینئر نے بیزاری سے کہا۔

"شکریہ جناب کا۔ آپ کو علم ہوگا کہ کچھ دنوں سے چند گھٹیا اخباروں نے ہمارے خلاف مہم چلا رکھی ہے۔ ہمیں غنڈے بدمعاش اور سماج کے ناسور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم قانون کی نظروں میں سماج کے دشمن ہیں ـــــ لیکن جناب من کیا یہ ظلم نہیں کہ ہمیں ایسے خطابات سے نوازا جاتا ہے جو ہم سے اور ہماری فطرت سے بعید ہوں۔" خوش پوش آدمی کچھ دیر کیلئے رکا۔

وکیلوں نے استعجابیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا خاموش خاموش آنکھوں میں متعدد سوالات تھے۔

"جو کچھ بھی کہنا ہو صاف صاف کہو۔"

"جناب!" خوش پوش چور نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں یہاں اخلاقیات پر بحث نہیں کروں گا اور نہ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالوں گا لیکن پھر بھی یہاں ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوگا کہ ہم ظالم نہیں ہیں۔"

"فرض کیجئے کہ ایک ایسے آدمی کی موت ہو گئی ہے جس نے غریبوں کا خون چوس چوس کر دولت جمع کی ہے۔ اس کی موت کے بعد دولت ایک ایسے شخص کے پاس چلی جاتی ہے جو گنوار، اجڈ اور جاہلِ مطلق ہے۔ مگر غریبوں کے حق میں جابر اور ظالم ہے۔ اسے غریبوں پر ظلم کرنے سے راحت ملتی ہے۔ غریبوں کے آنسوؤں پر قہقہے لگاتا ہے۔ انکی آہوں پر خوش ہوتا ہے اور انکو ستانے کے لئے روز نت نئے ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ہم نے اس کی دولت چھین کر کیا اس کے ظلم و ستم کی آندھی کو نہیں روک دیا؟

میرے عاقل بزرگ۔ مجھے علم ہے کہ آپ کا وقت انتہائی قیمتی ہے لیکن آپ نے ہمیں کچھ وقت دے کر ہماری انجمن پر عظیم احسان کیا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ

ہم ظلم و ستم کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ ہم لوگ اپنے فن میں ماہر ہیں ... افسوس کہ سماج نے ہمیں کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ سماج ... ہمارے فن کے اعتبار سے ہمیں ... فنکار ... خطرات سے کھیلنا ہی ہماری ... ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں خطرات سے کھیلنا ہی بڑی مردانگی ہے سماج تو اپنی حفاظت کے لئے قانون، پولیس، بندوق، پستول اور جدید ترین ہتھیاروں کا اپنے گرد ایک حصار قائم کئے ہوئے ہے۔ ہر طرح کی حفاظت اس کے ہمراہ ہے مگر اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کیا ہے۔ صرف ذہانت اور دلیری ہی نا۔ یا کچھ اور بھی ہے؟" کچھ دیر کے لئے وہ رکا۔

"محترم جناب! یہ سچ ہے کہ ہم بھیڑیے ہیں۔ مگر خونی نہیں۔ ہم شیر ہیں مگر گوشت خور نہیں۔ ہم سانپ ہیں مگر زہریلے نہیں۔

[illegible] کے لئے خونخوار کتے مقرر ہیں۔ اگر ہم اس چور سے کو نہیں کھا جائیں گے تو یہ کتے اسے چیر پھاڑ دیں گے۔"

جناب والا! ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم علم نفسیات کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔ قدم قدم پر ہمیں علم نفسیات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کے لئے سالہا سال گزار دیتے ہیں پھر بھی ہمیں غنڈوں، بدمعاشوں اور لفنگوں کی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے کیوں۔ آخر کیوں؟!

"ہم جیب تراش چور نہیں صرف چور ہیں۔ میں آپ کی اجازت سے اپنے فن کے کچھ نمونے پیش کرنا چاہوں گا۔ تاکہ آپ حضرات بھی ہمارے فن کا اعتراف کر کے ہماری فنکاری کا لوہا مان لیں اور ہمارے فن کے اعتبار سے ہمیں سماج میں ایک ممتاز مقام دے سکیں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"اے شیلسوف ادھر آؤ۔" جواب میں ایک گٹھیلے بدن کا مضبوط آدمی آگے بڑھا۔

"مہربانِ من! یہ ہماری تنظیم کا ایک ادنیٰ سا ممبر ہے جو سیف (تجوری) توڑنے میں ماہر ہے۔ افسوس، اس وقت یہ کوئی بڑا کارنامہ پیش نہ کر سکے گا کیونکہ اپنے مخصوص اوزار ہمراہ نہیں لایا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ ملاحظہ فرمائیے۔"

"کیا وہ دروازہ مقفل ہے؟" خوش پوش نے سینئر سے سامنے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ہاں، ہے تو۔" سینئر نے دلچسپی سے جواب دیا۔

"اچھا تو شیلسوف تم۔۔۔۔" اس نے شیلسوف کی طرف مبہم سا اشارہ کیا۔

کیوں نہیں جناب، ابھی لیجئے، یہ تو ایک معمولی سا کام ہے۔" شیلسوف بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔

شیلسوف دروازے کی جانب بڑھا۔ چند ساعت تک وہ دروازے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا، پھر اس نے جیب سے ایک پتلا سا چمکدار اوزار نکالا اور تالے کے سوراخ میں اسے ڈال کر آہستگی سے گھمایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ بغیر کسی آواز کے کھل گیا اور وکیلوں کے منہ بھی حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"اتنا مضبوط تالا اور اتنی آسانی سے کھل گیا؟!" کسی نے کھلنے کے لئے حیرت ظاہر کی۔

"کیا تالا پھر سے بند کیا جا سکتا ہے؟" سینئر نے سوال کیا۔ "کیوں نہیں شیلسوف کیا خیال ہے۔" لیڈر شیلسوف کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

جواب میں شیلسوف خاموشی سے دروازے کی جانب بڑھا اور پھر اسی عمل کو دہراتے ہوئے دروازے کو اپنی جانب زور سے کھینچا۔ دروازہ ایک بار پھر سے بند ہو گیا۔

"حضور والا۔ اب میں ایک نو آموز فنکار کو آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ یہ ایک جیب کترا ہے، ذرا اس کے ہاتھ کی صفائی ملاحظہ فرمائیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس فنکار کو داد و تحسین سے نوازیں گے۔ ویسے تو اس کا نام تورد شسکی ہے، مگر ہم اسے پیارسے یاشا کہتے ہیں۔"

"یاشا!" لیڈر نے یاشا کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "کیا آپ حضرات میں سے کوئی صاحب بطور تجربہ خود کو پیش کریں گے؟" لیڈر نے پوچھا۔

وکیلوں میں سے ایک ٹھگنے سے قد کا وکیل آگے بڑھا۔ یاشا نے گلے سے اپنا اسکارف نکالا اور اسے اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا۔ لیڈر نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں تو صاحب! آپ کسی مجمع، یا کسی بھرے بازار، عدالت یا عبادت گاہ میں ہیں، ایسا تصور کیجئے۔ یہ آپ کو ایک نظر دیکھتا ہے۔ اس کی ایکس رے ٹائپ نظریں یہ بھانپ لیتی ہیں کہ آپکا پرس کس جیب کی زینت ہے۔ یہ نوجوان آپ سے آکر پوچھتا ہے "صاحب آپ کے پاس ماچس ہوگی؟" آپ ماچس نکالتے ہیں، آپ کی ٹائی پن بہت قیمتی ہے۔ یہ آپ کو باتوں میں لگا لیتا ہے۔ آپ جھکتے ہیں پھر مسکراتے ہیں اور۔ اور۔ اور۔ بس۔ دو انگلیاں اپنا کام کر گئیں ہیں۔ آپ اس نوجوان کی باتوں پر مسکراتے ہیں۔ مگر یہ مسکراہٹ شکست خوردگی کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔"

"یاشا! الگ ہٹ جاؤ۔" لیڈر نے یاشا کو حکم دیا۔ "اور ہاں وکیل صاحب آپ کی گھڑی کہاں ہے؟"

ٹھگنے قد والا وکیل اپنی جیبوں کو بے چینی سے ٹٹولتا ہے مگر وہاں تو گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی۔

"جنابِ من! دیکھا آپ نے آپ کی سونے کی گھڑی کس صفائی سے غائب ہو گئی۔ یہ انسانی دماغ کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ دو ماہر اور مشاق پتلی پتلی انگلیاں اور ایک شوخ رنگ کا اسکارف۔"

"یاشا۔ وکیل صاحب کی گھڑی واپس کر دو۔" وکیل صاحب گھڑی لیتے ہوئے بڑبڑائے۔ "واقعی کمال ہے مجھے تو گھڑی جانے کا پتہ تک نہ چلا۔"

"ہاں تو صاحبان! اب میں۔ لوگیک بینکوں اور بڑی بڑی دوکانوں پر بھی اپنے کام کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔"

سینئر وکیل نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا۔ "ہم نے آپ کے فن کا لوہا مان لیا۔ آپ کے ہنر کے قائل ہو گئے مگر وقت کم ہے اور ہمارے وقت کی قیمت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہے تو بتائیے۔"

"بہت اچھا حضور والا، جو حکم۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہم لوگ فنکار ہیں، اپنے فن میں ماہر ہیں۔ ہم اچھی اور عمدہ رسموں کی قدر کرتے ہیں، مذہب کے ہم پابند ہیں، صحت مند خیالات رکھتے ہیں۔ ہم عورتوں کے دلال نہیں اور نہ انہیں غلط راستوں پر چلا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ہم معصوم بچوں کا اغوا نہیں کرتے اور نہ ماؤں کی گود اجاڑتے ہیں۔ ہم غداری کر کے ملک و قوم کا سودا نہیں کرتے ہم انصاف و ظلم میں تمیز کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ پھر ہمیں غنڈوں کی صف میں کیوں کھڑا کیا جاتا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے آپ لوگ ہم پر لگائے جانے والے غلط اور بے بنیاد الزاموں کی دھجیاں بکھیر دیں۔ میں اپنی تنظیم کی جانب سے حضور کا ممنون ہوں کہ آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت دیا اور ہمارے خیالات سنے۔"

یہ کہہ کر خوش پوش چور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک وکیلوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی پھر سینئر وکیل نے کہنا شروع کیا۔

"ہم لوگ آپ کے فن اور آپ کے خیالات سے محظوظ ہوئے میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ لوگوں کے خلاف بے بنیاد الزامات کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہم سب آپ کی انجمن سے پورا پورا تعاون کریں گے۔"

سینئر نے خوش پوش لیڈر سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور وہ ساتوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔

دوسرے وکیل بھی گھر جانے لگے۔ سینئر وکیل نے بھی گھر جانے کے لئے اپنے کوٹ اور ہیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہیٹ غائب تھا اس کی جگہ ایک میلی سی بھدے رنگ کی پرانی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔

"یاشا!" سینئر نے باہر جاتے ہوئے لیڈر کی آواز سنی۔

"لعنت ہے تم پر۔ تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" ساتھ ہی خوش پوش لیڈر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سینئر صاحب کا ہیٹ تھا۔

"محترم جناب! میں معافی چاہوں گا کہ میرے ایک ساتھی نے غلطی سے جناب کا ہیٹ اٹھا لیا ہے۔ یہ پرانی ٹوپی مجھے واپس دے دیجئے۔"

"شکریہ!" وہ ادب سے قدرے جھکا اور مسکراتا ہوا پر وقار انداز میں باہر نکل گیا۔

بمبئی کا سراغرساں

گوردیال سنگھ والیہ



گرگام میں فرینچ پل کے شمال میں ایک کرائے کا بنگلا لے کر میں رہتا تھا۔ میری بیوی کافی عرصے سے پتھری کے موذی مرض میں مبتلا تھی۔ اس سال میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی اچھے ہسپتال میں ہوشیار اور تجربہ کار سرجن کے ذریعے آپریشن کروا کر اُسے روز روز کی تکلیف سے نجات دلوائی جائے۔ لہٰذا کافی غور و خوض اور خط و کتابت کے بعد میں نے وکٹوریہ جوبلی ہسپتال امرتسر میں اُس کے علاج معالجے کا انتظام مکمل کر لیا۔ گو بمبئی جیسے بڑے شہر میں بھی اچھے ہسپتالوں اور تجربہ کار سرجن ڈاکٹروں کی کمی نہیں تھی مگر مریضہ کی تیمارداری جس خوش اسلوبی سے بہتر طور طریقے سے امرتسر میں ہو سکتی تھی۔

بدھ وار کی رات کو میں اپنی بیوی کے ساتھ بوری بندر کے اسٹیشن کو روانہ ہوا۔ جاتے وقت بنگلے کے ہر ایک دروازے پر میں نے مضبوط تالے لگانے کا خاص خیال رکھا تھا۔ اور سینٹرل بینک کا دیوالہ نکل جانے پر میرا کسی بینک پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اپنے پاس کے چار پیسے دوسروں کو قرض دے کر پھر انھیں کا منہ دیکھتے رہنا میرا اصول نہیں تھا اور پھر اس کے ہیں لے کر دینا ذرا مشکل سا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اسی بات کو سوچ کر میں نے بیس ہزار روپے کا کھرا سونا خرید کر تجوری میں رکھ چھوڑا تھا۔ سفر کی تیاری کرتے وقت تجوری میں چابی لگا کر تین بار اس کا امتحان کر لیا اس کے چھید پر کاغذ چپکایا اور آخر آخری بار اس پر حسرت کی نگاہ ڈالی اور روانہ ہوا۔

سات دنوں کے بعد واپس آنے پر میں نے دیکھا تو کھلا پڑا ہے اندر جا کر دیکھا تو سارا سامان اِدھر اُدھر ہوا تھا اور تجوری کھلی پڑی تھی۔ اندر کا سارا قیمتی غائب تھا۔ میں وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔ جیسے میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا اور میں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اور کیا نہ کروں۔ میرے حواس ہی اڑ گئے تھے۔ سوائے گہری سانسیں لینے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ کمرے میں دو چار مجری آم کے چھلکے اور دو کاغذ کے پرزے نظروں کے سامنے پڑے ہوئے مجھے چڑا رہے تھے۔

...را شہر جاکر انگریزی، مراٹھی، ہندی اور اُردو کے روزانہ اخبارات میں چوری کا ایک نوٹس چھپوا دیا۔

دو ہزار روپے نقد انعام

...گھر پر واقع گرگام میں تین چار دنوں کے اندر اندر ...نی خیز چوری ہوئی ہے۔ اس لئے مجھے ایک نہایت تجربہ ...س کی مدد چاہئے جو کہ فن سراغ رسانی میں ماہر ہو اور ...کا جلدی پتا لگا سکے۔ کامیابی کے بعد مبلغ دو ہزار ...لو ر انعام پیش کئے جائیں گے۔"

...لت رام بنگلہ نمبر ۳۴ گرگام بمبئی ۴"

...کام کرنے کے بعد میں فوراً گھر لوٹ آیا۔ سفر کی تھکاوٹ ...کے باوجود بھی فکر کی وجہ سے نیند اچھی طرح سے نہیں آ...ئی۔ آخر کسی طرح آنکھ لگ گئی۔

...ل الصباح "سیٹھ دولت رام، دولت رام صاحب" ...از سن کر میں جاگ اُٹھا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ ایک شخص ...وٹ پہنے آنکھوں پر قیمتی فریم کا چشمہ لگائے سامنے ...یٹھ دولت رام کا پتا پوچھ رہا تھا۔

"...اُن سے کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

...صاحب کچھ پرائیویٹ قسم کا کام ہے۔"

"...کیا مجھے معلوم نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا۔

...اور نے صاحب آپ نے میرا ڈیڑھ منٹ کا انمول وقت ...رد یا۔" گھڑی کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

...یک دم مجھے اپنے نوٹس کی یاد آ گئی جو کہ میں نے متعدد اخبارات ...دیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا آپ کوئی جاسوس ہیں؟"

"...اوہ نہیں ... کیا شری دولت رام آپ ہی ..." اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

...کہ ہاں آئیے جناب ..." پھر اسے اندر لے جا کر میں ...دکھائے۔" یہی وہ کمرہ ہے اور یہی تجوری۔ اس میں میرا سارا ...تھا۔ چوری کا پتہ کیسے لگایا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔"

...سراغ رساں نے سارے کمرے کا سرسری طور پر جائزہ ...پھر جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ...ری ہو جانے کے بعد آپ نے اس کمرے کا سامان اٹھوا یا ...؟"

"نہیں صاحب! سارا سامان جوں کا توں ہے۔" میں نے "آپ کا چوری کا پتا ضرور چل جائے گا۔ کیونکہ چوری کا پتہ لگانے میں چوری کی خاص جگہ کے سامان کا جائزہ اور مشاہدہ کرنے سے کافی مدد ملتی ہے۔ اگر آپ نے واقعی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا تو آپ کا مال جلد ہی واپس مل جائے گا۔

یہ کہکر اُس نے تجوری کے اوپر ایک مربع انچ پر جمی ہوئی دھول اکٹھی کی اور جیب سے ایک چھوٹا سا خوشنما ترازو نکال کر دھول کا وزن کیا۔ پھر ڈائری میں کچھ لکھ کر کہا "ایک گھنٹے میں ایک انچ کے تیس ہزار دیں حصے کے حساب سے آپ کے ہاں چوری شکروار (جمعہ) کی رات کو دو بج کر ساڑھے بائیس منٹ کے آس پاس ہوئی ہوگی۔"

میں یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ اب تک میں نے صرف رابرٹ بلیک اور جیمز بانڈ کے بارے میں سنا تھا۔ سنا نہیں بلکہ پڑھا تھا۔ اب ہندوستان میں بھی ایسے تیز طرار اور انوکھی عقل والے سراغ رساں کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "قابل فخر ہے یہ بھی، جہاں ایسے قابل جاسوس نے جنم لیا۔"

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے کمرے میں پڑے ہوئے آم کے چھلکوں کا مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ پھر جیب سے ایک شیشہ نکال کر اُن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد زور سے قہقہہ لگا کر اس نے کہا "یہ چوری شاید تین آدمیوں نے ملکر کی ہے۔ اس میں ایک عورت بھی شامل ہے اور ایک پچپن سال کی عمر کا آدمی ہونا چاہیئے۔"

میری حیرانی کی حد ہو گئی۔ میں نے پوچھا "صاحب آپ نے یہ کیسے جانا؟"

اس نے کہا "دیکھئے ان آم کے چھلکوں پر تین طرح کے دانتوں کے نشانات ہیں۔ اس لئے دو آدمی یقیناً بوڑھا ہوگا۔ اور جو عورت اُن کے ساتھ تھی وہ کافی خوبصورت ہوگی۔ شاید وہ کوئی طوائف قسم کی ہوگی کیونکہ اپنے چہرے کو دیکھنے کیلئے اس نے بار بار آئینہ پونچھا ہے۔ اس پر مٹی کی تہہ نظر نہیں آتی اور یہ دیکھئے آئینے کے سامنے پڑی ہوئی کنگھی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ عورت کے بال سیاہ اور گھنگھریلے ہیں ان لوگوں نے سامان کی بانٹ بھی یہیں کی ہے۔ بانٹ کرتے وقت ان میں مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ یہاں کے بکھرے ہوئے سامان کی حالت دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے۔ مار پیٹ کے ہوئی جس سے اس کتاب پر خون کے دھبے ابھی تک موجود ہیں۔ سونا آپ نے ایک پرانے مگر اُجلے کپڑے میں باندھ کر رکھا تھا؟ سراغ رساں نے لاپرواہی سے کہا۔

ہاں! میں نے جواب دیا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" وہ سونا میں نے ایک پُرانی دھلی ہوئی چادر میں لپیٹا تھا۔"

"وہ زیر لب مسکرایا "نشانات جناب نشانات۔ میرا کام چھوٹے چھوٹے نشانات سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔"

میں نے دانتوں تلے انگلی دباتے ہوئے کہا "آپ نے تو کمال کر دیا لیکن یہ تو بتلایئے کہ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ خون اُس بوڑھے ہی کا ہوگا؟"

"اجی جناب خون کے چھینٹوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی نحیف اور بوڑھے شخص کے خون کے ہیں۔ جوان لوگوں کے خون سے اُن کا رنگ مختلف ہے۔"

تب میں نے پوچھا "وہ یہاں سے کب گئے ہوں گے؟"

اُس نے کمرے میں پڑے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا "وہ یہاں سے صبح چار بج کر تیس منٹ والی میل گاڑی سے پونا گئے ہیں۔"

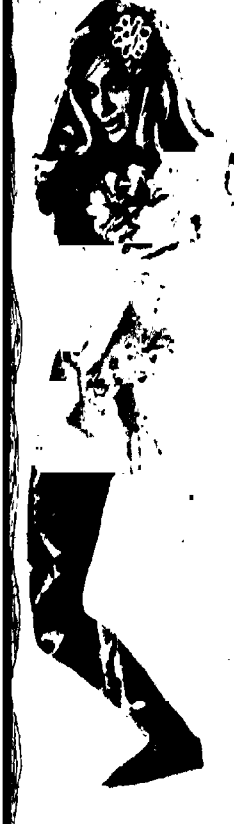
میں نے پوچھا "صاحب آپ کوئی جادوگر تو نہیں؟"

"حد ہو گئی! یہ تو ایک بچہ ڈیٹیکٹو بھی بتا سکتا ہے پھر میں تو اس کام میں کافی ایکسپرٹ ہوں۔ دیکھئے یہ کاغذ کا پرزہ اس پر انھوں نے روپوں پیسوں میں کچھ حساب لکھا ہے۔ یہ رقم انھوں نے ٹکٹ کا خرچ نکالنے کے لئے لکھی ہے پہلے لکھی ہوئی ایک رقم انھوں نے کاٹ دی ہے پھر دوسری رقم جو انھوں نے لکھی ہے وہ پہلی سے قریب قریب دوگنی ہے۔ اتنا کرایہ یہاں سے صرف پونا جانے میں ہی صرف ہو سکتا ہے اُن کا سفر سیکنڈ کلاس میں ہوا ہوگا۔ سیٹھ جی آپ مجھے فی الحال پانچ سو روپے دیجئے میں ان نادان چوروں کا پیچھا کر دوں گا۔"

گھڑی دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پونا گاڑی جانے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ میں نے جلدی سے یہاں وہاں سے روپے اکٹھے کرکے پانچ سو کی گڈی اس کے حوالے کر دی اور وہ فوراً ٹیکسی میں سوار ہو کر چل دیا۔

اس حیرت انگیز سراغ رساں کو گئے ہوئے آج پورے چھ مہینے ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اس کا پتا نہیں چلا۔ ٭

واقعات نئی دہلی



ہیلن اور کیبرے ڈانس

ہندوستان کے مایۂ ناز پروڈیوسر ڈائریکٹر محبوب اور بجرے نام کی فلموں میں سے ایک تھی۔ اس فلم صیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس فلم ں مزاج اور انداز کی اداکارہ نادرہ کو فلمی دنیا میں ۔ اس زمانے کی مشہور رقاصہ "ککو" اپنے پرانے انداز بنگ رقص کے ساتھ فلمی دنیا سے رخصت ہو رہی تھی ہ بھی تھا کہ اپنے وقت کی پسندیدہ رقاصہ "ستارہ" ں کے فلم بیں طبقے کے دلوں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ مگر ایسا بھی آیا کہ پسندیدگی اور مقبولیت کا یہ مقام سالوں ب پھر پرے بعد کی رقاصہ ککو کو مل گیا پھر زمانے رخ بدلا کہ ہندوستان کے پردۂ سیمیں کی زرق برق نے اپنے جاذب نظر خد و خال، متوازن جسم اور بے رنگ لرت کے بدولت ستارہ سے زیادہ مقبولیت اور ککو شہرت حاصل کی۔ آج بھی ہندوستان کے تقریباً ہر خطے کھنے والے کسی بھی اچھی اردو یا ہندی فلم میں ہیلن کے رقص کو دیکھنے کے اسقدر مشتاق اور عادی ہو گئے ہیں وجہ سے ہیلن نظر نہ آئے تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے ی خوبصورت انگوٹھی کا کوئی نگینہ گم ہو گیا ہو۔

ہیلن کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ ایک تو وہ فطری رقاصہ ہ قدرت نے رقص کی بے پناہ صلاحیت ودیعت کی ہے ے یہ کہ وہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی رقصوں پر یکساں ہے کہ آج تک اس کے فنی کمال میں نہ کوئی جھول پیدا ہ اور نہ کسی بے لطفی کا احساس ہوتا ہے۔ کلاسیکی رقص سے ے ڈانس تک ہر جگہ ہر سطح پر ہیلن تقریباً ہر فلم اور ہر رقص ۔ دل کش روپ اور ایک دل آویز انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے ے ڈانس سے متعلق ایک حالیہ گفتگو میں ہیلن نے جن باتوں ر کیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رقص کو ایک فن اور ایک دونوں خیال کرتی ہے۔

فن میں جہاں وہ فنی خصوصیات کی قائل ہے وہیں پیشے یشے کی مصلحتوں کی منکر بھی نہیں۔ آج کل کے سستے اور ی قسم کے کیبرے اور کیبرے ڈانسرز کے بارے میں ایک ے کا جواب دیتے ہوئے ہیلن نے کہا۔

"سڑکوں پر یا کھیتوں میں مزدوری کرنے اور کچھ کمانے کھانے کی نیت سے کپڑے ادھر ادھر کرنے یا ... پھینکنے والوں اور پیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے کی غرض سے سوئمنگ سوٹ زیب تن کرنے والی حسیناؤں کو ایک صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔"

باکس آفس فارمولے کی فلموں میں جا اور بے جا کیبرے ڈانس میں کم و بیش عریاں اور نیم عریاں جسموں کی نمائش کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے ہیلن نے کہا۔

"اگر دیکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بات ایک ہی معلوم ہوتی ہے مگر دراصل اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی بھی ہوشیار ہدایت کار یا پروڈیوسر یہی چاہے گا کہ اس کی فلم باکس آفس پر کامیاب ہو اور اس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اس لئے وہ ایسی ہی چیز پیش کرے جس کی بازار میں مانگ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی بھی فنکار یا ڈانسر کے پیش نظر یہ چیز رہتی ہے کہ وہ اپنے رول یا اپنے پارٹ میں جو چیز بھی پیش کرے وہ کچھ اس انداز سے اور اس طرح پیش کرے کہ سبھی لوگوں کی توقعات پوری ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ مقبول ہوں۔"

ہیلن نے اس بات کا اعتراف کیا کہ کیبرے ڈانس بے حیائی سے عریاں جسم کی نمائش یا بھونڈے اور بھدے انداز میں غیر فنکارانہ طور پر کولھے مٹکانے، کمر لچکانے جنسی جذبات ابھارنے کی غیر مہذب کوشش ہی نہیں بلکہ رقص کا ایک خاص فن ہے جو کافی مہارت، ریاضت اور سلیقہ چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں ہیلن نے فلم "انتقام" کے اپنے رقص کی مثال دی جو جذبات انگیز ہونے کے باوجود بھی غیر مہذب نہیں۔ کم و بیش عریاں حالت میں کسی جذبات انگیز کیبرے ڈانس کے لئے کیمرے کے سامنے آنے میں کسی قسم کے حجاب یا ہچکچاہٹ کے متعلق ہیلن نے بڑے دلچسپ انداز میں یہ بتایا کہ:

"برسوں سے پیشے ... کے فن کے مظاہرے میں حجاب یا ہچکچاہٹ کی کیا بات ہے۔ رہا کپڑوں کا معاملہ۔ وہ جیسے بھی ہوں جسقدر بھی ہوں۔ زرق برق ہوں یا رنگا رنگ ہوں۔ ان سب باتوں کا انحصار رقص کے موقع محل پر ہوتا ہے۔ کیونکہ پیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے والی حسینائیں ساڑیاں پہن کر کس طرح تیر سکتی ہیں۔

تلخ و شیریں

ظفر اللہ خاں سکلاسپوری

سیاست ایک ویران تھیٹر ہی سہی لیکن اس تھیٹر کے
یٹیج پر اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرنے والے مشاق کردار بڑے دلچسپ
ہوتے ہیں۔ ویسے انکی زندگی ایک ضخیم خشک ناول جیسی ہوتی ہے
لیکن اس ناول کے بعض صفحات پر کہیں نہ کہیں تلخ و شیریں واقعات
ری کی نگاہ کا مرکز ضرور بنتے ہیں۔ ایسے ہی چند صفحات کی تلخیص
یش خدمت ہے۔

چرچل ——— "ہاؤس آف کامنس" میں ایک
م مباحثے کے دوران ایک مقرر سامعین کو بڑی دیر سے بور کر رہا
چرچل نے دیکھا کہ ایک معمر ممبر پارلیمان آلہ سماعت لگائے بڑی
اری اور اداسی سے تقریر سن رہا ہے۔ مسٹر چرچل کی رگ ظرافت
ک اٹھی اس نے اپنے دوست انتھونی ایڈن کو مخاطب کرتے
ے بلند آواز میں کہا۔

"کون ہے وہ بے وقوف جو ایک عظیم قدرتی عنایت سے
دہ نہیں اٹھا رہا ہے" چاروں طرف قہقہے بکھر گئے اور تقریر
ہی لمحوں میں ختم ہو گئی۔

برنارڈ شا نے جو چرچل کے گہرے دوست تھے
ایک ڈرامے کی نمائش کے دن چرچل کو ایک لفافے میں شو
ٹکٹ روانہ کئے۔ ساتھ ہی یہ پیغام درج کر دیا۔
میرا کھیل دیکھنے ضرور آؤ اور اپنے کسی دوست کو بھی
لیتے آنا۔ اگر تمہارا کوئی دوست ہو"
چرچل بھلا کیسے چوکتا۔ اس نے شکریے کے ساتھ وہ
لوٹا دیئے۔ اور ساتھ ہی یہ جواب لکھ کر رکھ دیا۔ "آج مصروف
دوسرے شو میں ضرور آؤں گا۔ اگر دوسرا شو بھی
کیا جائے"

خروشچیف ——— مئی ۱۹۶۴ء کو اسوان ڈیم کی تعمیر
کے پہلے مرحلے کے اختتام پر حکومت مصر نے اسوان میں ایک
تقریب منعقد کی اس میں روس کے سابق وزیر اعظم خروشچیف
اور عراق کے سربراہ عبدالسلام عارف بھی شریک تھے ———
خروشچیف نے اپنی تقریر میں کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ عرب اپنا یہ نعرہ ترک کر دیں کہ "اے
عربو! متحد ہو جاؤ" اور اس کے بجائے یہ نعرہ اپنائیں کہ۔
اے محنت کشو متحد ہو جاؤ" مصر کے سوشلسٹ لیڈروں نے
اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ مگر عبدالسلام عارف نے اسی تقریب
میں تقریر کرتے ہوئے اس نئے نعرے کی مخالفت کی اور اسے
عربوں کی عربیت پر ایک حملہ سمجھا۔ عبدالسلام عارف نے جب اپنی
تقریر کا آغاز تمام مقررین کے برعکس حمد و ثنا سے کیا اور ایمان و اسلام
پر زور دیا، قرآن کی آیات کا حوالہ دیا تو مصری عوام نے اس پر خوب
تالیاں بجائیں۔ خروشچیف بھی تالیوں میں شریک ہو گئے لیکن ترجمان
نے جب ان کے کان میں تقریر کے اس حصے کا مفہوم بتایا تو ان کی
پیشانی پر شکن آگئی اور انھوں نے منہ بسور کر ہاتھ پشت کی جانب
کر لیے اور سر ہلا ہلا کر اپنی غلطی کی تلافی کرنے لگے۔

شیر بنگال مولوی فضل الحق چودھری جن کے متعلق مولانا
ظفر علی خاں مرحوم نے کہا تھا۔
"میں فضل الحق کے حق میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ دوں
کہ اس کو دیکھ لینے ہی سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے"
وہ ۱۹۳۸ء میں متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ایک دن
وہ ریل گاڑی سے چٹاگانگ تشریف لے جا رہے تھے انکی ہر دلعزیزی
کا یہ عالم تھا کہ جب کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو لوگ ہزاروں اور
لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر ان کے ڈبے کو گھیر لیتے اور آپ
ہر ایک کے ساتھ مصافحہ یا معانقہ کرتے۔ یہ سلسلہ رات تک جاری
رہا۔ آدھی رات کے قریب آپ نے گارڈ کو بلا کر کہا :-
"اب مجھے پریشان نہ کیا جائے کیونکہ میں بہت تھک گیا
ہوں" اتنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ پلیٹ فارم پر لوگوں
کا ہجوم اپنے محبوب لیڈر کے دیدار کے لئے بیتاب تھا اس ہجوم
میں ایک ستر سالہ بوڑھا بھی تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک مدھم سی
لالٹین اور بغل میں چھاتا اور چھڑی تھی۔ یہ بوڑھا چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔
"خدا کے لئے مجھے فضل الحق کی ایک جھلک دیکھ لینے دو۔ میں اسے
دیکھنے کے لئے ۲۵ میل کا سفر طے کر کے آرہا ہوں"
جب یہ آواز فضل الحق کے کان میں پہونچی تو آپ دروازہ
کھول کر پلیٹ فارم پر کود پڑے اور دیر تک اس بوڑھے سے
بغلگیر رہے۔ دونوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

ترکی کے شہید ملت۔ مجاہد اعظم انور پاشا نے عربی تعلیم حاصل
کرنے کے بعد ترکی فوج کے تیسرے جیش میں داخلہ لیا جو ترکی
سلطنت کے یورپی حصے میں متعین تھا۔ آپ عثمانی فوج کا ایک
فرد ہونے پر بڑا فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف
مسٹر ای۔ ایف۔ نائٹ نے ترکی کی بیداری پر ایک کتاب
لکھتے ہوئے انور سے انکی تصویر حاصل کی اور پوچھا کہ تصویر
کے ساتھ کونسی عبارت موزوں رہے گی۔ تو آپ نے کہا۔ بس
اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ :-
"یہ وہ فرد ہے جسے عثمانی فوج کا ایک فرد ہونے
کا فخر حاصل ہے۔ جو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے
میں آزاد سلطنت عثمانیہ کی حقیقی محافظ ہے"

کی اکثریت سے اقلیتوں کے اسکولوں، کالجوں اور خیراتی اداروں کو ختم کر سکتی ہے۔ ممکن ہے ایسا نہ کیا جائے لیکن خدشات تو بہر حال ہیں۔ ان خدشات کو دور کرنے کے لیے پارلیمنٹ نے کیا سوچا ہے؟

وزیر اعظم نے اقلیتوں کو جو یقین دہانی کی ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ان یقین دہانیوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں — اُردو کے بارے میں ہمارے آنجہانی وزرا اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری اور اب خود مسز اندرا گاندھی نے کتنی یقین دہانیاں کیں، لیکن کیا کبھی ہماری مرکزی، یا کسی بھی ریاستی حکومت نے ان یقین دہانیوں کی طرف توجہ دی۔ ان سب کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا حد یہ ہے کہ وسط مدتی انتخابات تک کی یقین دہانیوں کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا گیا پھر کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی حقوق میں ترمیمات سے متعلق وزیر اعظم کی یقین دہانیوں کی کوئی حیثیت باقی رہے گی۔

بنیادی حقوق میں ترمیم کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ عوام سے اس کا فیصلہ حاصل کیا جائے۔ اور اگر پارلیمنٹ خود اپنی "برتری" ظاہر کرنے پر تلی ہوئی ہے تو کم از کم ایسے بنیادی حقوق کے بارے میں جن کا تعلق خصوصی طور سے اقلیتوں کا تحفظ کرنا ہے، سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو قبول کر لیا جائے کہ وہ ناقابلِ ترمیم اور ناقابلِ تنسیخ ہیں۔ اس قسم کے واضح اعلان کے بغیر اقلیتوں میں ہر وقت بے اطمینانی کی کیفیت رہے گی اور ایک سیکولر ڈیموکریسی کے لیے یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ اقلیتیں غیر مطمئن رہیں۔ ●●



ریل کا کرایہ بڑھنے سے اب پنکھے اور بلب چراتے وقت اب ضمیر کو تکلیف نہیں ہوتی۔



• چین کو اقوام متحدہ میں نیشنلسٹ چین کی جگہ دی جائے گی ایک ...

...تکلیف ... نشانہ ... مشکار کے لیے نکلا تو ...
...شخص آگیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے حبس میں ڈال دیا
...شکار مل گیا تو اسے چھوڑ دیں گے، ورنہ سوچیں گے"
...اتفاقاً اس دن خلیفہ کو بے حد شکار ملا۔ شام کو واپس
...نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کانے کو حبس سے نکلوایا
...اور کہا۔
"اللہ تم آج میرے لئے مسعود ثابت ہوئے" یہ سن کر کانا
..."اے امیر المومنین گستاخی معاف سارا صبح آپ نے
...صورت دیکھی اور میں نے آپکی۔ میں آپ کے لئے مسعود
...اور آپ میرے لئے اس قدر منحوس ثابت ہوئے کہ میں
...بعد میں سڑتا رہا"
...خلیفہ نے یہ گستاخی خوشدلی سے برداشت کرتے ہوئے
..."تمہارے دن کا آغاز برا تھا لیکن انجام برا نہیں ہے۔
...بھی تمہارے لئے مسعود ہی ثابت ہوئے" اس کے بعد اسے
...انعام دے کر رخصت کیا۔

...۱۹۶۷ء کو شاہ حسین ایک بے حد خفیہ دورے پر قاہرہ
...فوجی ہوائی اڈے الماظہ پر جمال عبدالناصر نے
...استقبال کیا۔ صدر ناصر کے چاروں نائب صدر اور وزیر اعظم
...محمود صدقی سلیمان بھی موجود تھے۔ اس وقت مصر اور
...کے تعلقات میں قدرے تلخی پائی جاتی تھی۔ صدر ناصر
...مسکراتے ہوئے حسین سے پوچھا:
"آپ نے یہ سفر مخفی رکھا ہے۔ کیا کوئی خاص رکاوٹ تھی؟"
"نہیں لوگوں کو زود یا بدیر پتہ چل ہی جائے گا" حسین
...جواب دیا۔ پھر ناصر نے پوچھا۔
"آپ مسلح اور فوجی وردی میں نظر آرہے ہیں"۔
"میرے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ کپڑے
...نے آٹھ دس دن پہلے سے پہن رکھے ہیں" شاہ حسین
...جواب دیا۔ پھر صدر ناصر نے پر مذاق لہجے میں کہا۔
"آپ کا یہ دورہ خفیہ ہے۔ اگر ہم آپ کو گرفتار کر لیں تو
...ہے گا؟"
"مجھے تو خیال تک نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے"!
...حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر شاہ حسین اور صدر ناصر
...بلند آہنگ قہقہوں سے الماظہ ایرپورٹ گونج اٹھا۔ ●

...ات نئی دہلی

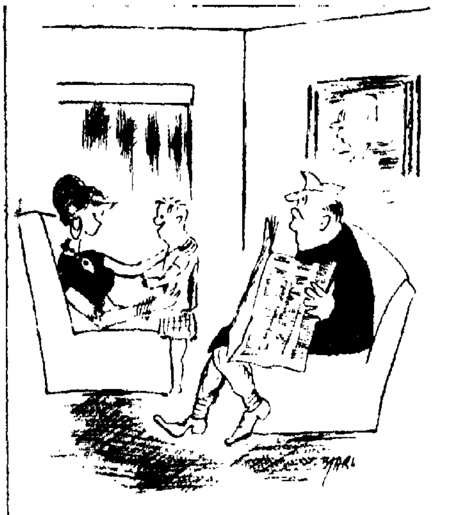
ریاست جموں اور کشمیر ــــ ترقی کی ایک جھلک

- جموں اور کشمیر ہندوستان کی ان چند ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں تعلیم کنڈر گارٹن سے لیکر پوسٹ گریجویٹ تک مفت ہے۔ ۶ سے ۱۱ سال کے درمیان کی عمر کے ۳۰٪ ، ۸۷ لڑکے اور ۶٪ ، ۲۲ لڑکیاں اسکول جاتی ہیں. جبکہ تعلیم پر فی کس خرچہ ۵۱ - ۱۹۵۰ میں ۸ پیسے سے ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں ۲۰ روپے تک پہنچ گیا ہے۔ یہ خرچہ پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے جو کہ صرف ۱۸ روپے ہے۔
- حفظانِ صحت پر فی کس خرچہ ۱۹۴۷ء میں ۴ پیسے سے بڑھ کر اب ۱۰ روپے ۵ پیسے تک پہنچ گیا ہے۔
- آج ریاست میں ہر پانچ ہزار آدمیوں کے لئے ایک ڈاکٹر ہے جبکہ ۱۹۴۷ء میں ۳۲ ہزار آدمیوں کے لئے صرف ایک ڈاکٹر
- ریاست میں بجلی کی پیداوار ۱۹۴۷ء میں ۴ MWS سے بڑھ کر اب ۳۵ ، ۴۰ MWS تک پہنچ گئی ہے۔
- آٹھ ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے جنگلات ایک خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ریاست کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ۶۷ - ۱۹۶۶ء میں یہ آمدنی ۷۰ ، ۴ کروڑ تھی جبکہ ۷۰ - ۱۹۶۹ء میں یہ بڑھ کر ۲۰ ، ۵ کروڑ روپے ہوگئی۔ اندازہ ہے کہ ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں ۷۵ ، ۶ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔
- پھلوں کی برآمد ۶۱ - ۱۹۶۰ء میں ۲۲۰۶۴ ٹن تھی جبکہ ۱۹۷۰ء میں یہ ایک لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہوگئی۔
- زراعت کے میدان میں ریاست کے اندر ایک قسم کا انقلاب آگیا۔ ۶۹ - ۱۹۶۸ء کے آخیر تک تقریباً ۱۱۰۰۰۰ ، ۱ ایکڑ سے زراعت کے کام میں لائی جانے لگی۔ بہتر بیجوں اور عمدہ کھاد کے استعمال سے غلے کی پیداوار بھی بڑھ گئی. منتخب علاقوں میں دوہر مشینوں کا استعمال بھی کیا گیا۔ ۷۰ - ۱۹۶۹ میں ۹۰۹ لاکھ کوئنٹل زائد غلہ پیدا ہوا. ریاست کی کل آمدنی کا ۳۰٪ حصہ زراعت سے حاصل ہو
- فی کس آمدنی (۵۶ - ۱۹۵۵ء کی قیمتوں پر) ۵۱ - ۱۹۵۰ء میں ۱۸۸ روپے سے بڑھ کر ۶۹ - ۱۹۶۸ء میں ۲۹۹ روپے تک
- پہلے پلان سے لے کر ۷۱ - ۱۹۷۰ء تک ریاست میں کل ۲۰۲۸۱ کروڑ روپیہ لگایا جاچکا ہے۔ چوتھے پلان میں ۱۵۸ کروڑ لگانے کی تجویز ہے۔
- ریاست میں آنے والے سیاحوں کی تعداد ۱۹۴۷ء میں ۴۳۰۰۰ ، سے بڑھ کر ۱۹۷۰ء میں ۱۲۱۰۰۰ تک پہنچ گئی میں ۳۳۲۰۰۰ لاکھ یاتریوں نے جموں کے شری ویشنو دیوی مندر کی زیارت کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

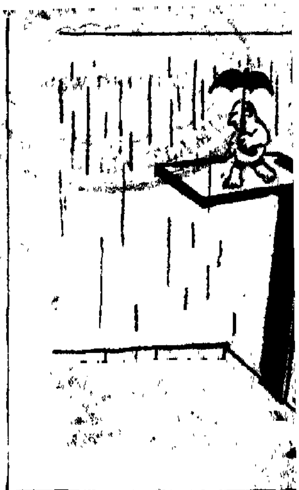
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS R. N. NO. 10881

AUGUST 1971 (FIRST HALF) **WAQIAT** REGD. NO. D. 629

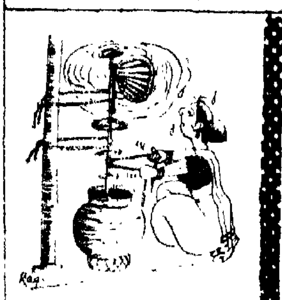
TELEPHONE : 619885



"آج ہم نے پہلے ہی دن اسکول میں ب سے بم اور ت سے توپ پڑھا ہے"

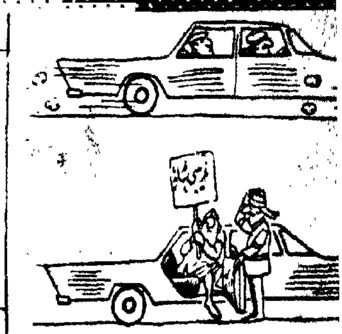


ش آجائے تو چھتری لگا کر نہائیے



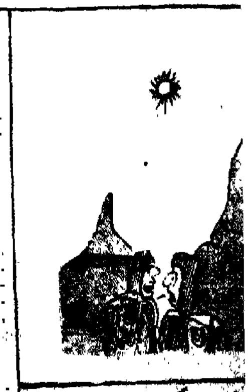


ایک پنتھ دو کاج





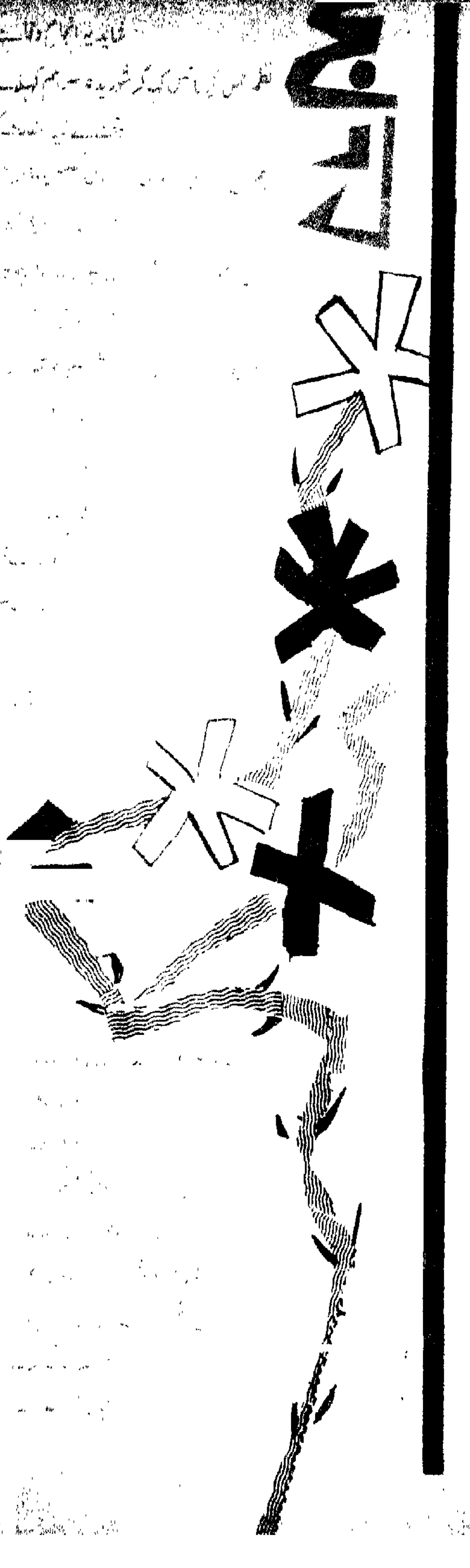
جب سے میں نے کمروں میں تصویروں کی جگہ بیلن اور جھاڑو وغیرہ ٹانگے ہیں ان کے دوستوں نے آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔



اصول گیا تھا



واقعات
نئی دہلی
کیا



واقعات

پندرہ روزہ نئی دھلی

آگست ۱۹۷۱

نصف دوم

دوسرا سال ۔ انیسواں شمارہ

مُدیر

[illegible]

صدر دفتر

ڈی ۔ ۱۰۱ نظام الدین ایسٹ ۔ نئی دہلی ۱۳۔

ٹیلیفون ۶۱۹۰۹۵

ایک کاپی کی قیمت ۸۰ پیسے ۔ سالانہ ۸ روپے

مضامین نثر و نظم ہمراہ کسی ذریعہ سے وصول ہوں ان کے سلسلہ میں خط و کتابت کرنے کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مدیر کو کلی اختیار ہے۔

مضامین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہے۔

انتظامی اور اداراتی امور متنازعہ کے فیصلہ کا اختیار صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا

مدیر طابع اور ناشر عبدالوحید صدیقی

مطبع ۔ وشنو آفسٹ پرنٹرس

کیا ہندوستان/پاکستان میں جنگ ہوگی؟

فوجی طاقت میں ہندوستان کی برتری



۱۹۶۶ء کی جنگ کا خاتمہ تاشقند معاہدے کے بعد ہوا ــــ فوجی جوان ــ شاستری اور ایوب تاشقند میں کوسیجن کے ساتھ۔

"کیا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوگی؟" یہ سوال سیاسی حلقوں میں پوچھا جا رہا ہے۔ پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ خاں نے گزشتہ ہفتے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں کہا "ہندوستان کے ساتھ ایک مکمل جنگ بہت قریب ہے۔ صبر و ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

خطرے سے آگاہ حلقوں کے خیال میں یہ عین ممکن ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے سے متصادم ہوجائیں۔ لیکن دونوں ملکوں کی راجدھانیوں میں غیر ملکی ڈپلومیٹوں کا خیال ہے کہ لڑائی کے امکانات "ففٹی ففٹی" ہیں۔

لڑائی کا یہ خطرہ اقوام متحدہ تک میں محسوس کیا جا رہا ہے اور اس لئے سکریٹری جنرل او تھانٹ نے سلامتی کونسل کو انتباہ کیا ہے کہ ہندوستان کی سرحد پر خونچکاں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ کسی وقت بھی بڑھ کر جنگ میں تبدیل ہوسکتی ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیا ہے لیکن ... کے الفاظ میں "صبر و ضبط کی حد ہوتی ہے"۔

صبر و ضبط جب ایک حد کو پار کر جاتا ہے ... چھڑ جاتی ہے ورنہ لڑائی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ اس سے میدان جنگ میں جان و مال کے ساتھ ہر لڑنے والے ملک کی پوری معیشت بھی تباہ ہوجاتی ہے اور آنے والے طویل زمانے تک اس کی ترقیات ختم ہوجاتی ہیں۔ جیتنے والا ملک بھی ہار جاتا ہے اور جو ہارتا ہے وہ مر جاتا ہے۔

۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ میں دونوں طرف کے ... ہزار آدمی ہلاک اور گیارہ ہزار کے قریب مجروح ہوئے۔

صرف ہندوستان کو پچاس کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ نقصان پاکستان کا بھی ہوا ہوگا اور اس کے بعد ترقیات کے معاملے میں کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی اسے صرف دونوں ملکوں کی حکومتیں ہی سمجھ سکتی ہیں۔ اس کے باوجود اگر جنگ کا خیال دل میں لایا جائے اور کہا جائے کہ مکمل جنگ قریب ہے تو اسے پاگل پن ہی کہا جائے گا۔

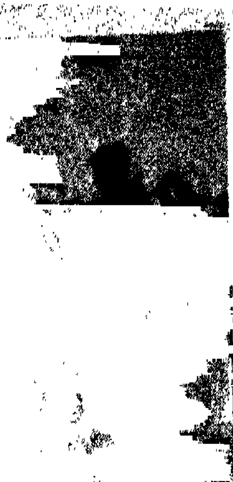
جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی یوم آزادی کے دن لال قلعے کے تاریخی چبوترے سے اعلان کر چکی ہیں کہ "ہماری پالیسی امن و آشتی کی پالیسی ہے اور ہم کسی کو دھمکی نہیں دیتے۔ لیکن دھمکی دے کر ہمیں مرعوب بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

جنگ اگر تھوپ دی جائے تو یقیناً اس کا مقابلہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ کوئی ملک بھی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی آزادی اور سلامتی خطرے میں پڑ جائے۔ وزیر دفاع کہہ چکے ہیں کہ اگر کمتی فوج کی سرگرمیوں کو روکنے کے بہانے پاکستان نے کوئی جارحانہ قدم اٹھایا تو اس کا دندان شکن جواب دیا جائے گا اور بڑے پیمانے پر جنگ چھڑ جائے گی۔

پاکستان کے فوجی حکمراں اگر اس وقت جنگ کی طرف مائل نظر آتے ہیں تو بظاہر اس کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں۔ اول یہ کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان نے اپنی فوجی طاقت تقریباً دوگنی کرلی ہے اور دوم یہ کہ امریکا اور چین اس کی برابر حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ امریکا اسلحہ مہیا کر رہا ہے اور ... پاکستان کی حمایت کا دم بھر رہا ہے اور اسے نقدی اور قرضہ کی مدد بھی دے رہا ہے۔

لیکن ہندوستان کی حکومت بھی ...





شہید ... ہندپاک سرحد کا معائنہ کر رہے ہیں

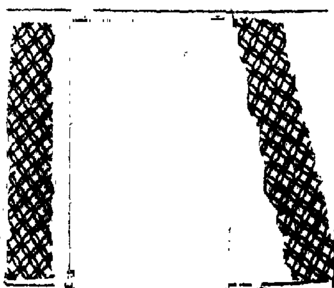
ہے اور اسی لئے بھی اپنے حالات کے پیشِ نظر استقامات کرلئے گئے ہیں۔ وزیرِ دفاع مسٹر جگجیون رام نے تو حال ہی میں یہاں تک کہا ہے کہ ہندوستان کی فوجی طاقت سے پاکستان کی فوجی طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہندوستان کو ہر لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔

آیئے دونوں ملکوں کی فوجی طاقتوں کا مختصراً جائزہ لیں تاکہ یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ پاکستان کتنے پانی میں ہے۔

پاکستان کی بری فوج تین لاکھ ہے جبکہ ہندوستان کی نو لاکھ ہے۔ دو پیدل ڈویژنوں کو چھوڑ کر جنہیں اس وقت پاکستان چین کی مدد سے منظم کر رہا ہے۔ پاکستان کے پاس اس وقت گیارہ ڈویژن پیدل فوج ہے جس میں سے چار ڈویژن اس وقت مشرقی پاکستان میں ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی فوج پندرہ ڈویژنوں پر مشتمل ہے اور دس ڈویژن فوج اس کے علاوہ ہے جو شمال کے پہاڑی علاقوں میں تعینات ہے۔

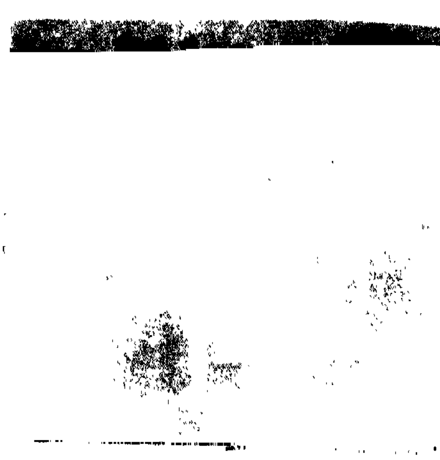
۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کے چھ ڈویژن مغرب میں اور ایک ڈویژن مشرق میں تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس وقت کے ہندوستانی کمانڈر انچیف جنرل جے این چودھری کے بیان کے مطابق مغربی محاذ پر ہندوستان کی فوج تقریباً اتنی ہی تھی جتنی کہ پاکستان کی تھی لیکن اس بار ایسا نہیں ہو سکے گا کیونکہ پاکستان کا ایک تہائی حصہ بنگلہ دیش میں رہنے کے لئے مجبور ہوگی۔ بکتر بند فوج کے معاملے میں پاکستان کی طاقت تقریباً برابر ہے۔ ہندوستان کے پاس دو بکتر بند ڈویژن ہیں۔ لیکن اس سے ہندوستان کو نفسیاتی طور پر اس کمی کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا جو گزشتہ جنگ میں پاکستان کے پیٹن ٹینکوں کے مقابلے میں کرنا پڑا تھا۔ توپ خانے میں پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کا پلڑا بھاری ہے۔ پاکستان کے پاس ۹ سو اور ہندوستان کے پاس تین ہزار توپیں ہیں۔

جہاں تک فضائی طاقت کا تعلق ہے ہندوستان کے پاس اس وقت لڑاکا ہوائی جہازوں کے تیس اسکواڈرن (ایک اسکواڈرن میں ۱۲ سے ۲۶ تک طیارے ہوتے ہیں) موجود ہیں۔ جبکہ پاکستان کے پاس ۱۶ یا ۱۷ اسکواڈرن ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کے پاس ۲۵ اور پاکستان کے پاس صرف دس اسکواڈرن تھے۔ لیکن ہندوستان کے ان ۲۵ اسکواڈرنوں کے بارے میں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے کہ گیارہ اسکواڈرن ویمپائر اور مسٹیر جیسے پرانے قسم کے طیاروں پر مشتمل تھے جبکہ پاکستانی اسکواڈرنوں میں ایف۔۸۶ اور سوپر سونک ایف ۱۰۴ قسم کے طیارے شامل تھے۔ اس کمی کو اب مِگ ۲۱ حاصل کر کے دور کر لیا گیا ہے لیکن سالِ گزشتہ پاکستان نے فرانس سے ۵۶ مِرج (MIRAGE) قسم کے طیارے حاصل کر کے اپنے فضائیہ کو نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا ہے۔ ان طیاروں کی رفتار آواز کی رفتار سے دوگنی ہے۔ اور انکی مار کا دائرہ بھی ۸۶۰ میل تک ہے جبکہ مِگ۔۲۱ کا دائرہ صرف ۳۷۵ میل تک



محدود ہے اور اس کی رفتار بھی مقابلتاً کم ہے۔ اس لحاظ سے پاکستانی فضائیہ کو کسی قدر برتری حاصل ہے۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کے تیار کردہ نات طیاروں نے جس طرح پاکستان کے سیبر جیٹ طیاروں سے ٹکر لی ہے اگر اسے اور ہندوستانی ہوا بازوں کی اعلیٰ ٹریننگ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یقیناً مرج طیارے ناقابلِ شکست ثابت نہیں ہونگے۔ ہندوستان کے پاس مِگ طیاروں کی تعداد سرکاری طور پر ۱۵۰ بتائی گئی ہے۔ ہندوستانی فضائیہ کے جوانوں کی تعداد ۹۰ ہزار ہے جبکہ پاکستان میں ۱۵ ہزار ہے (دو ہزار جوان ریزرو میں ہیں)

بحریہ میں ہندوستان کی طاقت پاکستان سے کہیں







کہا جاتا ہے کہ صدر نکسن نے چین کے دورے کا پروگرام صدارتی انتخابات جیتنے کے لئے بنایا ہے

غزل

اطہر نفیس

دشت منزل ہوں، منزل آشنا ہوں
شکستہ تنگ اسیرِ راہ ہوں
وہ جیسا لگوں ہے جس سے بچھڑ کر
خود اپنے شہر میں تنہا ہوا ہوں
مری آنکھوں کی خشک و تر میں جھانکو
کبھی صحرا، کبھی دریا نما ہوں
چمن میرا نہیں، پھر بھی چمن میں
میں تنہا رنگ و نکہت آشنا ہوں
بہت سے سانس کی توقیر کرنا
بڑی مشکل سے میں زندہ ہوا ہوں
نہ جانے کس لئے ہے ناز مجھ کو
نہ میں مہا ہوں نہ کچھ تجھ سے بڑا ہوں
تمہارا کیوں نہیں کوئی کہ اب میں
کہاں ہوں کس طرف کو جا رہا ہوں
میں اس گزرے ہوئے لمحہ کا ہمسر ہوں
جو مجھ سے کہہ گئے میں بے وفا ہوں
ہوائے کوئے جاناں حقیقت سے
سوا ہے سرخ کچھ ایسا ہوا ہوں

نکلا دو سے ہوا اب سلا دو
بہت راتوں کا میں جاگا ہوا ہوں

جس سے کہ بین الاقوامی دنیا میں اس کی ساکھ خراب ہو۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ جس وقت مشرقی بنگال میں پاکستان کی لڑنے والی صرف ۱۴ بٹالین فوج تھی اور چار بنگالی بٹالینوں نے شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا تھا اس وقت حکومت ہند مکتی فوج کی مدد کر دیتی یا خود آگے بڑھ کے فوجی کارروائی کرتی تو مشرقی پاکستان کا وجود نقشے سے مٹ چکا ہوتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا الزام اپنے سر نہیں لیا۔ اس کے باوجود پاکستان ہندوستان پر اس کے داخلی معاملات میں مداخلت کا الزام لگا رہا ہے اور کشیدگی پیدا کر کے بنگلا دیش کے معاملے کو ہند اور پاکستان کے درمیان معاملہ بنانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر پاکستان نے سرحد کے دونوں جانب آبزرور مقرر کرنے کی تجویز منظور کی اور اسی مقصد سے گذشتہ ہفتے جنرل یحییٰ خاں نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ کے نام چٹھی لکھ کر تجویز پیش کی کہ سلامتی کونسل اپنی ایک کمیٹی مقرر کرے اور اس کے ممبر دونوں ملکوں کا دورہ کر کے کشیدگی کم کرائیں۔

لیکن یہ واضح طور سے پاکستان اور بنگلا دیش کے لیڈروں کے درمیان معاملہ ہے، اور جیسا کہ حال ہی میں امریکی سنیٹر ایڈورڈ کنیڈی نے نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ:۔

"شیخ مجیب الرحمن کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے عام انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔"

جس لیڈر نے زبردست اکثریت حاصل کی اور جو اپنے دیش کا واحد لیڈر ہے اسے جیل میں ڈال کر اس کے خلاف خفیہ فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے اور ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈا کر کے بین الاقوامی دنیا سے کشیدگی کم کرانے کے لئے کہنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ مسئلے کا ایک حقیقی سیاسی حل تلاش کرنے ہی سے صورتِ حال بہتر ہو سکے گی۔ اور مسٹر کنیڈی کے الفاظ میں:۔

"سیاسی حل قطعی ممکن ہے" عوامی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرنے کی بات اگر پاکستان کی فوجی جنتا "آج نہیں تو کل سمجھے گی۔ اور نہیں سمجھے گی تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا ہوا۔



یہ کسی فلم کا سین نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی دوسری جنگ کا ایک منظر ہے

ہے۔ ہندوستانی ٹینکوں کی تعداد ۲۰ ہزار اور پاکستانی
تعداد ۹۳۰۰ ہے۔ ہندوستان کے پاس ۱۶ ہزار ٹن
کا ایک طیارہ بردار جہاز موجود ہے جب کہ پاکستان
میں اس قسم کا کوئی جہاز موجود نہیں ہے۔ ہندوستان
کے پاس دو کروزر (جنگی جہاز) ہیں اور پاکستان کے پاس صرف
کروزر (بابر) ہے۔

پاکستان کے پاس سب سے مہلک ہتھیار اس کی آبدوز کشتیاں ہیں اور وہ اٹلی اور فرانس سے اس قسم کی آبدوز کشتیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہندوستان کے پاس بھی چار ہی آبدوز کشتیاں ہیں۔ بنگلا دیش کی حمایت ہونے کی بنا پر پاکستانی بحریہ کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے کہ بحریہ میں بنگالیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ہندوستان کو پاکستان کے مقابلے میں ہر لحاظ سے برتری حاصل ہے۔ لیکن قطع نظر اسکے کہ طاقت میں برتری کس کو حاصل ہو سکی ہے۔ جنگ میں دونوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر ہندوستان بڑی محتاط پالیسی پر چل رہی ہے اور ملک کے مطالبے کے باوجود اس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا ہے

شمع دہلی

معاہدۂ امن ایک تاریخی اق

کوسیگن اور اندرا گاندھی

ہندوستان اور روس کے درمیان حالیہ معاہدۂ امن اس بات کا ضامن ہے کہ ہندوستان نے پہلی بار اپنی خارجہ پالیسی میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ لکیر کے فقیر نہ بنتے ہوئے ہندوستانی حکومت نے حالات کے تقاضے کو سمجھا اور اس طرح اس تاریخی معاہدے کا قیام عمل میں آیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاہدہ تاریخ میں اپنی قسم کا ایک ہی معاہدہ ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ کچھ اخبارات نے اس معاہدے کو فوجی معاہدے کا نام دیا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدے میں باہمی فوجی تعلقات سدھارنے پر کافی زور دیا گیا ہے لیکن معاہدہ صرف فوجی تعلقات پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ معاہدے کی عبارت پر ایک نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دونوں ملکوں کے درمیان تکنیکی، سائنسی، تعلیمی ادبی، صحت عامہ، پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور کھیل کے میدانوں میں بھی تعلق بڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس معاہدے میں کل ملا کر بارہ دفعات ہیں اور ان میں سے صرف تین دفعات میں دونوں ملکوں کے فوجی اور دفاعی معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ حالانکہ اس معاہدے میں روس کی طرف سے یہ یقین بھی دلایا گیا ہے کہ ہندوستان پر حملے کی صورت میں وہ اس کی مدد کرے گا۔ لیکن دونوں میں سے کسی پر کوئی مستقل پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ سرکاری ترجمانوں نے اس بات کی بھی شدت کے ساتھ تردید کی ہے کہ اس معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد ہندوستان ایک غیر جانبدار ملک نہیں رہا۔ معاہدے کی دفعہ IV میں روس کی طرف سے اس بات کا واضح اعتراف کیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان

واقعات نئی دہلی

کی غیر جانبدارانہ پالیسی کا احترام کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندوستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی نے عالمی امن کو برقرار رکھنے میں بہت مدد کی ہے۔

اس معاہدے کو ہم صرف فوجی معاہدہ اس لئے بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے تحت نہ تو کسی غیر ملک کو ہندوستان میں فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور نہ غیر ملکی فوجوں کو سرزمین ہند پر آنے کی اجازت دینے کا خیال ہے۔ اس معاہدے میں صرف اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت میں روس ہندوستان کو ہتھیار اور جنگی ضروریات کی دوسری چیزیں فراہم کرے گا۔

یہ معاہدہ موجودہ حالات میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ امریکا اور چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات اور پاکستانی ڈکٹیٹر یحییٰ خان کی "مکمل جنگ" کی دھمکی نے اس معاہدے کی جلد تکمیل کرانے میں مدد کی۔ اس معاہدے کے ذریعے روس نے ہندوستان کی حمایت میں یحییٰ خاں کو یہ وارننگ دی ہے کہ ہندوستان کے خلاف "مکمل جنگ" کی صورت میں روس چپ نہیں رہے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کو روس کے ساتھ معاہدۂ امن کی ضرورت کا احساس اس وقت اور زیادہ ہوا جب کہ امریکا اور چین کے تعلقات نے ایک دلچسپ موڑ لیا اور صدر نکسن نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی چین کا دورہ کریں گے۔ روس اور چین سے تعلقات پر مسز اندرا گاندھی کے مشیر اعلیٰ مسٹر ڈی۔ پی۔ دت (پرو وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی) نے اس معاہدے کا ذکر مسٹر گرومیکو کے دہلی آنے سے کئی ہفتے پہلے ہی کر دیا تھا۔ "ہندوستان ٹائمز" میں اپنے ایک مضمون "چین وامریکی تعلقات اور ہندوستان" میں انھوں نے لکھا تھا کہ جب امریکا اور چین قریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں تو ہمیں روس سے اپنے تعلقات اور زیادہ بڑھا لینا چاہئیں۔ انہیں کے الفاظ میں۔ امریکا اور چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے سب سے زیادہ سوویت یونین پریشان ہے۔ ایشیا میں روسیوں کے زیادہ دوست نہیں ہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ہمارے اور روسیوں کے مفادات ایشیا بالکل ایک سے ہیں۔ ہندوستان کو اس موقع ... اٹھانا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ دونوں کے ... زیادہ صحت مند اور باہمی تعلقات قائم ہوں۔

اس معاہدے کا خیر مقدم ساری دنیا میں کیا گیا ... ہندوستان میں ایک دو سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر ... تقریباً تمام گروپوں نے اسے خوش آئند کہا۔ امریکا میں ملا جلا ردعمل ہوا۔ عام طور پر امریکی اخبار اس ... سے پریشان نظر آتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں نکسن کی غلط پالیسی نے اس معاہدے کو جنم دلوایا اور اس طرح ... نے ہندوستان کھو دیا۔" اب امریکا کے عوام اور ... کانگریس میں بھی یہ احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ ... کی طرف امریکا کی پالیسی غلط ہے۔ خود سینیٹر ایڈو... نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں روس سے معاہدہ کر ... ہندوستان نے بہت صحیح قدم اٹھایا ہے۔ لگتا ہے ... اور روس کی طرف ہندوستان کا جھکاؤ دیکھتے ہوئے ... نکسن کو ہندوستان کی طرف اپنے رویے پر نظر ثانی ...

موجودہ حالات میں روس سے ہندوستان کا ... ہندوستان کے حق میں فائدہ مند نظر آ رہا ہے۔ اب ... اس بات کی ہے کہ ہندوستان چین کی طرف بھی دو... اٹھائے تاکہ اس کی شمالی سرحدیں محفوظ ہو سکیں۔ ... وقت دنیا کے تمام بڑے غیر جانبدار ممالک جیسے کہ ... یوگوسلاویہ وغیرہ کا جھکاؤ روس ہی کی طرف ہے ... اب ہندوستان بھی شامل ہو گیا ہے۔ ہندوستان کو ... سامراجی طاقتوں کی خوشامد چھوڑ کر آزادی کی جنگ ... قوموں کی مدد کرنی چاہئے۔ اس طرف پہلا قدم ہندوستان کا شمالی ویت نام کی عوامی جمہوریت کو تسلیم کرنے ... اس صورت میں یہ ممالک بھی کھل کر ہندوستان ... کے لئے سامنے آ جائیں گے۔



امریکا کے ... نکسن کا دورہ چین

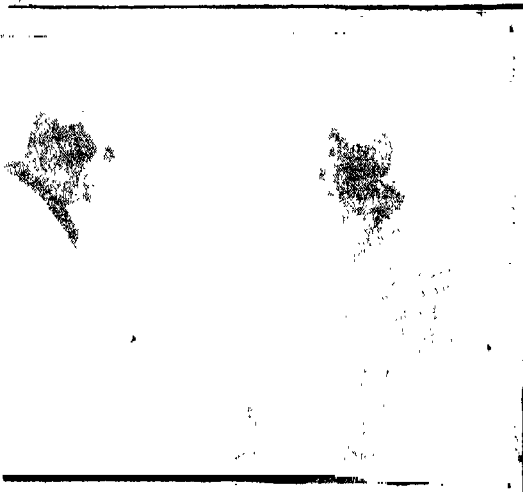
...ن الاقوامی سیاست پر اسکے اثرات

شاھد صدیقی

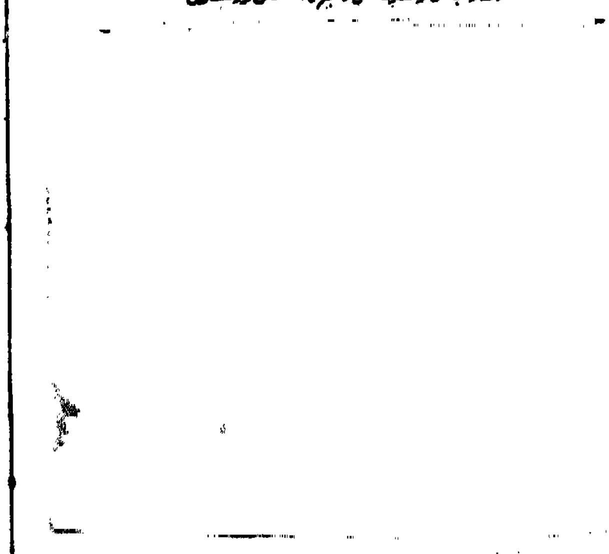
کی پوری بین الاقوامی سیاست کا انحصار اس دورے پر ہے

حریت پسندوں کی فتح

سوال یہ ہے کہ آخر اس دورے کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم وجہ ہے۔



کیسنجر۔ چاؤ این لائی کے ساتھ



امریکا واپس لوٹنے پر نکسن کیسنجر کا استقبال کر رہے ہیں

...ک بار پھر ہمیں انسان چاند پر گئے۔ یہ اس سال کی ...اہم خبر ہے ؟۔ لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔ پوری دنیا ...ور پوری دنیا کے اخبار انسان کے چاند کے سفر سے زیادہ ...صدر نکسن کے چین کے سفر کو اہمیت دے رہے ہیں۔ ...ہی دہلی

اور واقعی یہ سفر پوری دنیا کے لوگوں کے لئے ہوگا بھی چاند کے سفر سے زیادہ اہم۔ نکسن کے اس دورے کا اثر نہ صرف امریکا اور چین کے تعلقات بلکہ پوری بین الاقوامی سیاست پر پڑے گا اس دورے کا اثر وقتی نہیں بلکہ بہت دور رس ہوگا۔ کل

امریکہ اور دوسری سامراجی طاقتوں کا سوشلسٹ اور عوامی طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینا“ آج بیس سال سے امریکا اور دوسری سامراجی طاقتیں چین کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھیں چین کے ایک بہت چھوٹے سے جزیرے کو جہاں امریکا کی پٹھو حکومت قائم تھی اصل چین تسلیم کیا جاتا تھا جبکہ ستر کروڑ کی آبادی والے عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا تھا امریکا اور اس کے ساتھی ملک پچھلے بیس سال سے چین کو اقوام متحدہ کا ممبر بننے سے رد کرتے رہے۔ حفاظتی کونسل پر چین کی جگہ تائی وان کی حکومت کو دی گئی۔

امریکا کمیونزم کو روکنے کے نام پر ویت نام، کمبوڈیا لاؤس اور کوریا کے عوام پر ظلم ڈھاتا رہا۔ ایٹم بم کو چھوڑ کر دنیا کا کوئی ایسا مہلک ہتھیار نہیں ہے جو امریکا نے ویت نام کے حریت پسند عوام پر استعمال نہ کیا ہو۔ پچھلے دس سال میں ویت نام پر اتنے بم گرائے گئے جتنے پوری دوسری جنگ عظیم میں جرمنی، جاپان، انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور امریکا نے ملکر نہیں برسائے تھے۔ پوری پوری آبادیوں کو زہریلی گیس چھوڑ

ملکوں میں موت کی نیند سلا دیا گیا۔ لیکن ویتنام کے بہادر عوام اپنے جائز حقوق کے لئے، اپنی آزادی کے لئے اور اپنے ملک میں ایک جائز سوشلسٹ حکومت قائم کرنے کے لئے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکر لیتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امریکا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اب امریکا کے سامنے صرف یہی باعزت راستہ رہ گیا ہے کہ وہ خاموشی سے ویت نام سے باہر نکل جائے اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ویتنام کے عوام کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ دوسری حالت میں ویت نام کے انقلابی عوام امریکی فوجوں کو بے آبرو کر کے اپنے کوچے سے ان کو باہر کریں گے۔

پینٹاگون پیپرز کے سامنے آنے سے یہ بات پوری دنیا پر ہی نہیں بلکہ خود امریکی عوام پر بھی اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ ویتنام، لاؤس، کوریا اور کمبوڈیا میں جنگ کے ذمے دار سوشلسٹ یا کمیونسٹ ممالک نہیں بلکہ امریکا اور دوسرے سامراجی ممالک تھے۔

امریکا اور دوسرے سرمایہ دار ممالک نے ہمیشہ سوشلسٹ ممالک پر جنگجو ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن خود امریکی کاغذات اور فائلوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بھڑکانے والی تمام کاروائیاں امریکا نے کی تھیں۔ سوشلسٹ ممالک کو مجبوراً جنگ میں کودنا پڑا۔ لیکن امریکا اور دوسری سرمایہ دار طاقتیں، اخبارات اور نشر و اشاعت کے ذرائع پر اپنے کنٹرول کی وجہ سے پوری دنیا میں غلط پروپیگنڈا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اب جب کہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ امریکا کے چہرے سے جمہوریت اور شخصی آزادی جیسے خوبصورت الفاظ کا نقاب اٹھ گیا ہے اور سرمایہ دار طاقتوں کا حقیقی روپ اپنے اصل رنگ میں برہنہ ہو کر دنیا کے سامنے آ گیا ہے۔

نکسن چین کی دعوت پر چین نہیں جا رہے ہیں بلکہ پہلے انھوں نے اپنے خاص نمائندے مسٹر کیسنجر کو پاکستان کے ذریعے چین بھیج کر چینی رہنماؤں سے ملنے کی درخواست کی اور چینی لیڈروں کے اس درخواست کے منظور کر لینے پر نکسن نے چین کے دورے کا اعلان کیا۔

مغربی اخبارات کے مطابق چینی لیڈروں نے نکسن کی درخواست اپنی کچھ شرطیں منوانے کے بعد منظور کی ہے۔ نیویارک کے پبلشر ولیم ایٹ وڈ نے لکھا ہے:

"چواین لائی نے نکسن کے دورۂ چین کے لئے یہ شرط رکھی تھی۔ تائیوان سے تمام امریکی فوجوں کی واپسی اور تائیوان کے مسئلے کو عوامی جمہوریہ چین کا اندرونی مسئلہ تسلیم کیا جانا۔"

جاپانی اخبار۔ اساہی شمبن لکھتا ہے:

"صدر نکسن کے خاص ایلچی کیسنجر نے ایک بہت اہم بات منظور کر لی ہے یعنی۔ چین صرف ایک ہے اور عوامی جمہوریہ چین پورے چین کی نمائندگی کرتا ہے۔"

چین کی معاشی ترقی

امریکا کے چین کے آگے جھکنے کی ایک اہم وجہ چین کی معاشی ترقی بھی ہے۔ آج سے چند سال پہلے تک مغربی ماہرین معاشیات کا کہنا تھا کہ چین معاشی طور بہت پچھڑا ہوا ہے اور اس کی معاشی حالت کا مستقبل قریب میں سدھرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن آج وہی لوگ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ انڈسٹری اور دوسرے تمام میدانوں میں چین نے بہت ترقی کی ہے۔ چین کا بہتر اور سستا مال آہستہ آہستہ افریقی ایشیائی اور لاطینی امریکا میں امریکی مال کی جگہ چھینا جا رہا ہے۔



گھبراؤ مت جانِ من ـــــ تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی نہیں آسکتا ـ

اس کے علاوہ ویت نام میں ہر روز کے ہونے والے خرچے نے بھی امریکا کی کمر توڑ دی ہے۔ تازہ ترین ڈالر کا بحران اسی جنگ کا نتیجہ تھا۔

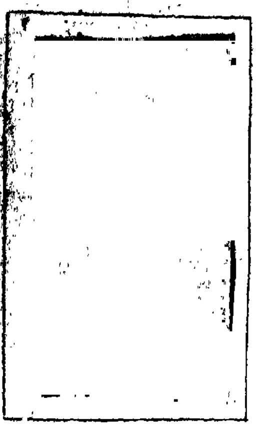
ان تمام وجوہات نے ملک امریکا کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ روس کے علاوہ بھی دوسرے سوشلسٹ ممالک سے تعلقات ہموار کرے۔

چین کی یہ جیت صرف چین کی ہی فتح نہیں بلکہ لاطینی امریکا افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے پسے ہوئے عوام کی جیت ہے۔ یہ جیت صرف ویتنام کے بہادر عوام ہی کی نہیں بلکہ بنگلہ دیش کے مظلوم عوام کی بھی جیت ہے۔ ویتنامی عوام نے امریکا جیسی ناقابل تسخیر طاقت کو ناکوں چنے چبوا کر پوری دنیا کے حریت پسند عوام کے سامنے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ انھوں نے دکھا دیا ہے کہ اگر عوام میں جوش اور جذبہ ہو تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ آج پاکستان اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی حکومتوں کو امریکا چاہے کتنے بھی ہتھیار کیوں نہ دے وہ وہاں کے بہادر عوام کو جھکنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت جلد امریکا اور دوسری سامراجی طاقتوں کو دنیا بھر کے آزادی پسند عوام کے جذبۂ آزادی کے سامنے جھکنا ہوگا۔ بہت جلد بنگلہ دیش آزاد ہوگا، فلسطین آزاد ہوگا، جنوبی افریقہ اور روڈیشیا آزاد ہوں گے اور پوری دنیا کے جمہوریت پسند اور آزادی پسند عوام آزاد ہوں گے۔

ویتنام، کمبوڈیا اور لاؤس کے عوام کے ہاتھوں امریکا کی ہار سامراجیت کے تابوت میں ٹھونکی جانے والی پہلی کیل ہے۔ باقی کیلیں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے عوام مل کر ٹھونکیں گے۔

خوبصورت سر چرا لیا گیا

ایم۔ اے
مذاق



ہو ایک دفعہ ایک جل پری ساحل پر آئی اور ایک شہزادے کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ یہ زمین کا رہنے والا اور وہ سمندر کی رہنے والی۔ عہد و پیماں ہوئے مگر شہزادہ جلد ہی ایک دوسری زمینی عورت کے عشق میں پڑ کر جل پری کو بھول گیا۔ جب جل پری کو شہزادے کی بے وفائی کا علم ہوا تو وہ غم کے مارے سمندر کی ہواؤں اور لہروں میں گھل مل گئی اور اس کی روح آج بھی بھولے بھٹکے خوابیدہ ننھے منے بچوں کو اپنے مشفق ہاتھوں سے ساحل پر پہنچا دیتی ہے۔" یہ کہانی تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے ہنس کرسچین اینڈرسن نے لکھی تھی۔

۱۹۰۹ء میں ننھی جل پری، ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ جل پری کا رول اس وقت کی مشہور بیلے رقاصہ ہیلن پرائس نے ادا کیا۔ ایک لکھ پتی کارل جیکب سن، جو آرٹ کا قدر داں تھا، نے یہ ڈراما دیکھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس جل پری کو یادگار بنا دیا جائے۔ چنانچہ مجسمہ بنانے کے لئے ڈنمارک کے مشہور مجسمہ ساز ایڈورڈ اِرکسن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور رقاصہ ہیلن پرائس کو بطور ماڈل تقریباً مجسمہ ساز کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ اس مجسمے کی تیاری میں تقریباً تین سال لگے۔ یہ مکمل برونز (کانسے) کا بنا ہوا ہے۔ اگست کی چوتھی تاریخ کو یہ تاریخی مجسمہ کوپن ہیگن کے ساحل پر ایک بڑے پتھر پر نصب کر دیا گیا۔ وہی غمگین چہرہ منتظر نظریں ساحل پر جمی ہیں کہ شہزادہ لوٹ آئے۔



جلد ہی یہ مجسمہ عالمگیر شہرت حاصل کر گیا۔ ملاح یہاں آتے اور جل پری کا آشیرواد حاصل کرتے کہ ان کا سفر کامیابی سے طے ہو۔ حسین و جمیل جوڑے یہاں آتے کہ عشق کی لافانی یادگار کے سامنے اپنے عشق کو پائیدار کریں۔ دل جلے اور مسخرے نوجوان بھی جل پری سے مذاق کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی جیتی جاگتی پری ہے جو سب کو خوش رکھنا چاہتی ہے۔ وہ کون شخص ہوگا جو ڈنمارک آیا ہو اور جل پری سے ملے بغیر چلا گیا ہو۔ لاکھوں لوگ اس کا دیدار کرتے تھے۔ یہ ڈنمارک کی ایک شانی اور خیر مقدمی جل پری تھی۔ سیاح جل پری کی یاد کے لئے چھوٹے چھوٹے برونز کے مجسمے خرید کر لے جاتے تھے۔

نصف صدی تک یہ سوگوار ہمدرد جل پری اپنی جگہ رہی۔

لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۶۲ء کی رات ڈنمارک اور دنیا کے لئے حیرت اور غم و غصے کی رات تھی۔ اس رات کسی پتھر دل نے معصوم و سوگوار جل پری کا خوبصورت سر کاٹ لیا۔ یہ کام اس قدر صفائی اور مہارت سے

کیا گیا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مجسمے کا خالق سر بنانا بھول گیا ہو۔ یہ خبر آناً فاناً آگ کی طرح پھیل گئی۔ ساحل کوپن ہیگن پر اتنا ہجوم ہوا کہ پولیس کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ لوگ یوں سوگوار تھے کہ گویا ان کا عزیز چل بسا ہو۔



ایف۔ بی۔ آئی، اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور عالم جاسوس اس انوکھی چوری کا پتہ نہیں لگا سکے اور نہ چوری کی اصل وجہ سمجھ میں آسکی۔

کٹے ہوئے سر والے مجسمے پر کپڑا ڈھانک دیا گیا۔ پھر یہ چار ٹن وزنی پتھر مجسمے کے ساتھ ڈنمارک کی رائل فونڈری (Royal Foundry) لیجایا گیا جہاں چھ ہفتے کی جانفشانی کے بعد دوبارہ سر لگایا گیا۔ اور ساحل پر نصب کر دیا گیا۔ اس کی [illegible] بت دوبارہ سر تراشنے والا مجسمے کے خالق ایڈورڈ اِرکسن کا بیٹا پال راسمن تھا۔

با عرب ممالک
ہ روس کے
علقات خراب
وجائیں گے۔؟



سادات اور پدگورنی ——— ہم دوست ہیں۔

اسرار عظمت

ال ہی میں کمیونسٹوں نے سوڈان میں انقلاب
وشش کی تھی لیکن سازش ناکام ہوگئی جنرل نمیری
لد پر حالات پر قابو پا لینے کے بعد کمیونسٹوں کو قتل
ع کر دیا۔ اس سازش کے بانی عبدالخالق، کرنل نور
دالله وغیرہ کو پھانسی دے دی گئی۔ اور دوسرے
لیڈروں کے علاوہ بہت سے عام کمیونسٹوں کو بھی
ے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹوں
ی سازش ناکام ہوگئی۔ سوڈان میں کمیونسٹوں کے اس
ہ کے خلاف روس نے شدید احتجاج کیا لیکن جنرل نمیری
ہ کوئی توجہ نہیں دی بلکہ جواباً انھوں نے دھمکی دی کہ
ن سے تمام روسیوں کو نکال باہر کریں گے۔ انھوں
سازش کی ذمہ داری بلغاریہ پر عائد کی ہے اور روس
ا معاون قرار دیا ہے۔ ماسکو اور صوفیہ سے اپنے
کو انھوں نے فوری واپس بلا لیا۔
سوڈان سے کمیونسٹوں کا خطرہ عارضی طور پر تو ٹل گیا
ی مستقبل میں ایسی ہی سازش کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے
وڈان میں کمیونسٹوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے
ملک میں تو کمیونسٹوں کا اچھا خاصہ اثر ہے ہی لیکن
ی بھی ان کا اثر تیزی سے پھیل رہا ہے خیال ہے
ہ عرب ممالک کے قریب کمیونسٹ ہیں سوڈان
ک سے تیس ہزار کمیونزم کی حامی ہے
ی دنیا

اس لیے صورت حال تشویشناک ہے ویسے اکثریت کمیونزم مخالفوں کی ہے اور عوام کمیونسٹوں سے سخت نفرت کرتے ہیں لیکن دو لاکھ ۶ ہزار کی اس اقلیت کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

روسی کمیونسٹوں کی اس ناکام سازش سے چینی کمیونسٹوں کی اس سازش کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو چھ برس قبل انڈونیشیا میں کی گئی تھی۔ لیکن جنرل سوہارتو نے فوج کی مدد سے بروقت اس سازش کو کچل دیا۔ اور بعد میں انھوں نے چن چن کر کمیونسٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس سازش کی ذمہ داری کھلے الفاظ میں چین پر رکھی گئی اور چونکہ انڈونیشیا میں چینی کثیر تعداد میں مقیم تھے اس لیے کمیونسٹوں کے اس قتل عام کو دوسرے الفاظ میں چینیوں کا قتل عام کہا جا سکتا ہے چینیوں کی یہ سازش بے نقاب ہونے کے بعد نہ صرف انڈونیشیا بلکہ مشرق بعید کے جنوبی علاقے کے دوسرے ممالک میں بھی چین کا اثر کم ہو گیا۔ اسی قسم کی صورت حال سے روس آج مشرق وسطیٰ میں دوچار ہے۔ سوڈان کے علاوہ مراکش لیبیا اور مصر میں بھی روس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مصر کے صدر انورالسادات نے جنھوں نے حال ہی میں روس کے صدر پودگورنی کے ساتھ روس اور مصر کے پندرہ سالہ دوستانہ معاہدہ پر دستخط کیے ہیں اپنی ایک تقریر میں کہا ہے "اپنے دوست ملکوں کے داخلی معاملات میں کسی دوسرے ملک کی مداخلت کو ہم برداشت نہیں کر سکتے" یہ صحیح ہے کہ انھوں نے کھل کر روس کا نام نہیں لیا لیکن ظاہر ہے کہ اشارہ روس کی طرف ہی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے

اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی ایک دہائی میں روس نے عرب ممالک سے اور خصوصاً مصر سے جو اچھے تعلقات قائم کیے تھے وہ جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ مشرق وسطیٰ میں روس کا اثر اس قدر تیزی سے کم ہوا ہے کہ دوسری جنگ کے بعد اب تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

لیکن چند حقائق پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وقتی طور پر مشرق وسطیٰ میں روس کا اثر کم ہونے کے باوجود مستقبل قریب میں عرب ممالک کے ساتھ روس کے تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ اور عنقریب روس پھر سے عرب ممالک کا اعتماد حاصل کرے گا۔ یا کم از کم عرب ممالک اس پر اعتماد کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

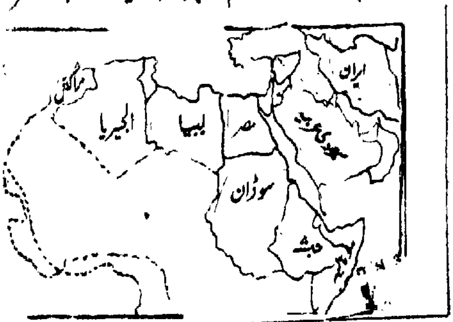
مصر میں ۱۹۵۴ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد صدر ناصر نے کمیونسٹوں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں اور کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا تھا۔ اس لیے روس ان سے ناراض ہو گیا تھا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ مصر سے ناراضگی اس کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے آہستہ آہستہ اس نے اپنا رویہ تبدیل کیا اور مصر سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مصر کے مشہور اسوان بند کی تعمیر میں امریکی امداد کے بند ہونے کے بعد روسی امداد کا بحال ہونا دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ صدر ناصر نے بھی روس کے دوستی کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو قبول کر لیا۔ اور مصر میں کمیونسٹوں کے تعلق سے انھوں نے اپنے رویے کو قدرے تبدیل بھی کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ سابق کمیونسٹ پارٹی کے کئی لیڈروں کو انھوں نے ملک کی واحد برسر اقتدار جماعت عرب سوشلسٹ یونین میں بھی شامل کر لیا

...سا... کے تعلقات مضبوط ہونگے۔
... کے بعد جب انور السادات صدر بنے
...ک میں کمیونسٹ عناصر کے بڑھتے ہوئے
...ئے علی صابری اور دوسرے اکو نواز
...ند کردیا۔ روس کو اس پر سخت تشویش ہوئی
... کی قیادت میں روسی لیڈروں کا ایک وفد
... اس نے انور السادات کے سامنے روسی
... کے پندرہ سالہ معاہدے کی تجویز رکھی جو

کوششوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ روس کی طرف سے اسلحہ اور دیگر جنگی سامان کی فراہمی اور ٹیکنیکی امداد بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ روس عرب ممالک سے تعلقات کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔

عرب ممالک بھی اسلحہ اور ٹیکنیکی امداد کے لیے روس کے محتاج ہیں جبکہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب سے نہر سویز بند کردی گئی ہے مغربی ممالک کو بڑی تجارتی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس عرصے میں مغربی ممالک کا مجموعی طور پر

سکتا۔ انور السادات نے دھمکی دی ہے کہ اگر سال رواں کے اواخر تک سمجھوتہ نہ ہوسکا تو طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ مشرق وسطیٰ کی صورت حال تشویشناک ہے اور جنگ اگرچہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے عرب ممالک اور خصوصاً مصر روس سے تعلقات خراب کرنا نہیں پسند کرے گا تاکہ روس بدستور اسے اسلحہ اور ٹیکنیکی امداد فراہم کرتا رہے۔ ادھر روس بھی عرب ممالک کی امداد کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے اور ہر قیمت پر عرب ممالک میں اپنا اثر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ گویا دانتوں کو چنوں کی ضرورت



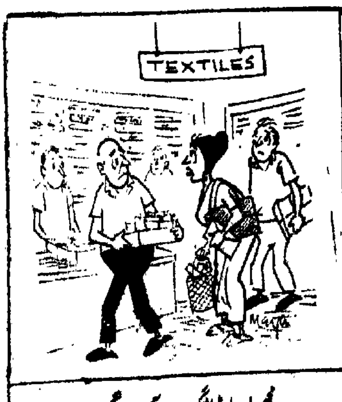


بائیں سے دائیں۔ کوسیجن۔ پدگورنی اور دیگر روسی لیڈر

... کرلی۔ روس کے اس طرز عمل سے ... ہر حال میں اچھے تعلقات کا خواہاں ... ظاہر ہے کہ روس نے یورپ کے کمیونسٹ ... اب تک کسی ملک سے بھی اس قسم کا معاہدہ ... ایک غیر کمیونسٹ ملک سے روس کا ایسا ... ثبوت ہے کہ وہ ہر قیمت پر مصر سے اچھے ... ہے۔ ایسے غیر کمیونسٹ ملکوں کو جن میں

نوسو کروڑ روپوں کا نقصان ہوچکا ہے۔ اس لیے مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کوشاں ہے کہ کسی نہ کسی طرح جنگ کا خطرہ ٹل جائے اور نہر سویز تجارتی جہازوں کے لیے کھول دی جائے لیکن اسرائیل نے امریکہ کی تمام پیش کشوں کو ٹھکرادیا ہے۔ اگر یہی صورت حال کافی عرصے تک رہی تو مغربی ممالک کی معاشیات پر بڑا اثر پڑنے کا خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے روس اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں،

ہے اور چنوں کو دانتوں کی۔ روس کے خلاف نفرت اور غصے کی لہریں تمام عرب ممالک کے عوام میں اٹھی ہیں لیکن سوڈان کے علاوہ کسی ملک نے بھی سفارتی سطح پر کوئی کارروائی روس کے خلاف نہیں کی۔ سبھی ملکوں کے سربراہ مصلحتاً سفارتی سطح پر کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ عوام کے سامنے کی ہوئی تقریریں سفارتی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں اس لیے یہ سوچنا فضول ہے کہ روس کے تعلقات عرب ممالک سے بگڑ جائیں گے۔



مجھے بار بار ڈارلنگ مت کہو۔ یہ لوگ ہمیں غیر شادی شدہ سمجھیں گے۔



...کے درمیان ہونے والا معاہدہ۔ ٹائمز (نیویارک) کے کارٹونسٹ کی نظر میں۔

طریقے پر ہر کسی کی طرف سے کوئی انحراف نہ ہو۔ اس کے علاوہ

خلیجِ فارس کا علاقہ

چھ عرب امارتوں کا فیڈریشن

بحرین نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا

[illegible] اسٹیٹ کے بارے میں [illegible] تقریباً ۴ سال سے اس سلسلے میں بات چیت [illegible] بالآخر کامیاب ہوئی۔ جن ریاستوں کے حکمرانوں نے اس معاہدے پر دستخط کئے ان کے نام یہ ہیں:
۱۔ ابوظہبی۔ ۲۔ دبئی۔ ۳۔ الشارقہ۔ ۴۔ عجمان۔ ۵۔ ام القوین اور ۶۔ الفجیرہ۔

چھ ریاستوں پر مشتمل اس علاقے میں یہ ایسی وفاقی اسٹیٹ ہوگی جس میں آئینی اعتبار سے تمام بنیادی اجزائے ترکیبی موجود ہوں گے۔ اس کا عربی نام "دولت الامارات العربیہ" ہوگا۔ اس کے قیام کے بارے میں جو اعلان ہوا اس سے پوری دنیائے عرب میں خصوصیت کے ساتھ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی اس لئے زیادہ ہوئی کہ اتحاد کے قیام کے لئے دبئی میں جو میٹنگ جاری تھی اس میں آخر وقت تک اختلاف موجود تھا۔

نئی اسٹیٹ کے قیام سے متعلق اعلان میں بتایا گیا کہ نئی اسٹیٹ کے عبوری دستور میں دستخط کئے جا چکے ہیں اور ضروری قوانین کی تیاری کے لئے کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں۔ رقبہ (۳۲ ہزار مربع میل) اور آبادی (مجموعی طور پر صرف دو لاکھ) کے لحاظ سے یہ ریاستیں بہت چھوٹی ہیں اسی لئے ماضی کی اپنی پوری تاریخ میں خلافتِ عثمانیہ کے کمزور ہونے تک یا تو کسی نہ کسی عرب ملک یا کسی حملہ آور کے ماتحت رہی ہیں۔ اس وقت بھی انھیں برطانیا کا تحفظ حاصل تھا اور وہی ان ریاستوں کے امورِ خارجہ کے لئے ذمے دار تھا۔ لیکن اس نے جنوری ۱۹۶۸ء میں اعلان کیا کہ وہ ۱۹۷۱ء کے اختتام تک اس علاقے کو خالی کر دے گا۔ اس لئے انھوں نے ایک وفاق قائم کر لیا ہے تاکہ برطانوی انخلا سے جو طاقتی خلا پیدا ہوگا اس کی کسی حد تک تلافی ہو سکے۔ برطانیا کو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۹۲ء کے معاہدوں کے تحت ان ریاستوں کے تحفظ کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

راس الخیمہ کی ایک اور چھوٹی ریاست ہے جو ابھی وفاق میں شامل نہیں ہوئی ہے۔ اس کی یہ وجہ بتائی گئی ہے کہ اس کی طرف سے کچھ ترمیمات پیش کی گئی تھیں جو منظور نہیں کی گئیں۔ مثلاً ایک ترمیم یہ تھی کہ تیل پیدا کرنے والی حکومتوں کی [illegible]

اس اتحاد میں شریک ہو جائے گا۔ ابوظہبی کے حاکم شیخ زاید بن سلطان آل نہیان اتحاد و یکجہتی کے سلسلے میں بڑی نمایاں دل چسپی لے رہے ہیں اور خلیج فارس کی تمام ریاستوں کے اتحاد پر زور دے رہے ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے اس نئی عرب اسٹیٹ کو فوجی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ اس کی اہمیت میں اس کے بری، فضائی اور بحری مواصلات کا بڑا دخل ہے کیونکہ اس اسٹیٹ کا علاقہ جزیرہ نمائے عرب سے بحرِ ہند میں داخلے کے لئے ایک اہم گزرگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نومولود اسٹیٹ کی سرحدیں عمان سے ملی ہوئی ہوں گی۔ ابوظبی ریاست سے شروع ہو کر خلیج کے ساحل عرب کے طول میں پھیلی ہوں گی۔ دوسری طرف خلیج کے مدخل سے گزر کر خلیج عمان کے ساحل پر واقع ریاست بحیرہ تک پھیلی ہوں گی۔

اقتصادی اعتبار سے یہ نئی ریاست دنیا کے مالدار ترین ممالک میں سے ایک ہوگی۔ اس لئے کہ یہ علاقہ آمدنی کے قدرتی ذرائع سے مالا مال ہے۔ اندازہ ہے کہ ایک فرد کی آمدنی کا سالانہ اوسط ڈھائی ہزار ڈالر ہوگا۔

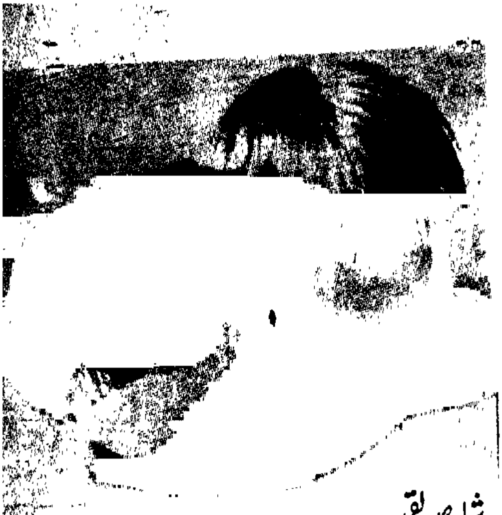
راس الخیمہ کے علاوہ بحرین اور قطار کی دو اور ریاستیں ہیں جو ابھی تک فیڈریشن میں شامل نہیں ہوئی ہیں۔ اوّل الذکر کے متعلق یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ جلد شامل ہو جائے گی۔ لیکن دوسری دو ریاستوں کی شمولیت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

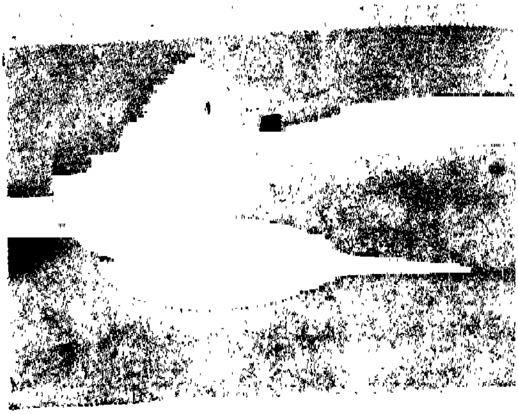
اس کے برعکس بحرین نے ۱۵ راگست کو اپنی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا اور اس کی اس آزادی کو ایران، متحدہ عرب جمہوریہ اور امریکا تک نے تسلیم کر لیا۔ دوسرے ممالک بھی توقع ہے اسے تسلیم کر لیں گے۔

بحرین مجوزہ فیڈریشن میں اس لئے شامل نہ ہو سکا کہ مجوزہ وفاقی کونسل میں اس نے مناسب نمائندگی کا جو مطالبہ کیا تھا اسے مسترد کر دیا گیا۔ اسے شاید اس لئے منظور نہ کیا گیا کہ اس طرح کونسل دراصل سب ریاستوں کی نہیں بلکہ بحرین کی کونسل بن کر رہ جاتی اور اس میں دوسری ریاستوں کی کوئی آواز نہ ہوتی، اس لئے کہ اکیلے بحرین کی آبادی دوسری ریاستوں کی مجموعی آبادی کے برابر ہے۔ یعنی دو لاکھ سے زیادہ

بقیہ صفحہ ۔۔

راس الخیمہ کو اصرار تھا کہ ووٹنگ بالاتفاق ہو جب کہ دوسرے نمائندوں نے اکثریت کی بنیاد پر ووٹنگ کو منظور کر لیا۔





آپ گنجے سر پر بال اُگا سکتے ہیں

شاہد صدیقی

۔شیر، دریائی گھوڑے، مگرمچھ، بلی، گھونس، بارے انپ کی چربی لے کر اسے ملا لیجئے اور آہستہ آہستہ اپنی چاند ے۔ یہ تھا گنجے سر پر بال اگانے کا پہلا محفوظ نسخہ۔ جسے پانچ ہزار سال پہلے کسی گمنام مصری نے لکھا اور جو آج بھی ایبس پائیپرس میں محفوظ ہے۔

اس نسخے میں صرف ایک کمزوری ہے (تمام چیزیں نے کی دشواری کے علاوہ) اور وہ یہ کہ یہ کامیاب ہے۔ لیکن بہت سے گنجے کئی سو سال تک اس نسخے پر نے کی کوشش کرتے رہے۔

یران میں (۶ سو سال قبل مسیح) بچے کے مونڈن کے رہبی پیشوا بہت سی دعائیں پڑھتے تھے تاکہ بچہ کبھی و۔بی قبیلے کے کچھ نبابی جادوگر ڈاکٹروں نے قبیلے ار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بال کٹوانے کے بعد ہمیشہ ن کھایا کرے تو وہ کبھی گنجا نہیں ہوگا۔ اس عمل دار کے بال تو محفوظ نہ رہ سکے البتہ وہ بہت مرا۔

یا کے دولت مند ترین آدمی روک فیلر نے بال اگانے نئی دوائی۔

کی دواؤں پر کروڑوں ڈالر خرچ کر دیئے لیکن اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور مجبور ہو کر اسے وگ کا سہارا لینا پڑا جو اس کے سر پر ۵۰ سال تک جمی رہی۔

آج امریکا کے ۴۳ فیصدی مردوں اور ۸ فیصدی عورتوں کو بالوں کے اڑنے کی شکایت ہے۔ یہ امریکن بال محفوظ رکھنے کی دواؤں پر اتنے روپے خرچ کرتے ہیں جتنے تمام طبی تجربات اور معلومات پر بھی نہیں ہوتے۔ یہ لوگ کروڑوں ڈالر طرح طرح کے لوشن، تیل، کریم، دواؤں، انجکشنوں، بجلی کے تولیوں، لیمپوں، گرم گدوں اور طرح طرح کے شعاعی اور بجلی کے علاجوں پر صرف کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں سے معلوم کیا جاتا ہے کہ ہیٹ پہنا جائے یا نہ پہنا جائے۔ سر کو دھوپ لگنے دی جائے یا نہ دی جائے۔ بالوں کو جلدی جلدی کٹوایا جائے یا بالکل نہ کٹوایا جائے۔ بالوں کو دھویا جائے یا نہ دھویا جائے اور اگر دھویا جائے تو کس چیز سے۔ صابن، شیمپو یا صرف سادے پانی سے۔ شادی کی جائے یا زندگی بھر کنوارے ہی رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تمام قدیم اور جدید تدبیریں اور ترکیبیں ایک بال بھی اگانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ جن کے سر ابھی تک محفوظ ہیں اپنے بالوں کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ خاص طور پر تیس سال کی عمر سے اوپر کے ۱۸ میں سے آٹھ آدمی، جن میں سے تین بالکل گنجے، تین آدھے گنجے اور گنجے ہونے کی منزل کی طرف گامزن ہیں ہر وقت اس فکر میں گھلتے رہتے ہیں۔

حالانکہ انسانی جسم کے لئے بالوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے پھر بھی بالوں کو عورت کی خوبصورتی کی نشانی اور مرد کی طاقت اور جوانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پھر گنجے آدمی کو لوگ چین بھی نہیں لینے دیتے۔ شاعر، سیاستدان، ناول نویس، مزاح نگار، آرٹسٹ غرضیکہ سب مل کر ہر وقت چمکتی چاند والوں کی مانگ کھینچنے کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر شاعر، آرٹسٹ اور سیاستدان خود بھی گنجے ہوتے ہیں۔

جب بال گرنے شروع ہوتے ہیں تو مرد بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں اور ان کی راتوں کی نیند تک اڑ جاتی ہے۔ بہت سی دوائیاں استعمال کرنے کے بعد انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے گرتے ہوئے بالوں کو صرف ایک چیز روک سکتی ہے اور وہ ہے زمین۔

گنجوں نے پریشان ہو کر اب جگہ جگہ اپنے کلب اور ایسوسی ایشن بنالی ہے۔ پچھلے دنوں دہلی میں گنجوں کی بین الاقوامی انجمن کی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت نیم گنجے ڈاکٹری وزیر اندر کمار گجرال نے کی۔

گنجوں کا کہنا ہے کہ گنجا ہونا انسانیت کی نشانی ہے۔

بقیہ صفحہ ۔۔ پر



شہزادی زیب النساء کی حاضر جوابی

تاریخ کے صفحوں پر مغل شہنشاہوں اور خواتین کی بیشمار جانیاں بکھری پڑی ہیں۔ شاہانِ مغلیہ کی چھ نسلوں نے ہندوستان پر تین سو سال تک حکومت کی ہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں سے تاریخ ہند کے اوراق منور ہیں۔

شہنشاہ بابر کی خود نوشت سوانح حیات "تزک بابری" کا ہفتواں ادبیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ ہمایوں خود شاعر و ادیب تھا۔ اس نے نہایت خوبصورتی پیار اور خلوص سے ہندوستان کے دلکش مناظر کے گیت گائے ہیں۔ صرف اکبر اعظم ہی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن علم حاصل کرنے کا اسے بےحد شوق تھا۔ اس کے دربار میں عالم و فاضل، شاعر و ادیب، مصور و مورخ کی قدر کی جاتی تھی۔ اور انھیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔

واقعات نئی دہلی

۱۶۰۵ میں جب اکبر کا دور ختم ہوا تو جہانگیر تخت نشین ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر نے بھی مختلف زبان کے شعرا و ادبا کی سرپرستی فرمائی۔ بعد ازاں شاہجہاں کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے۔ شاہجہاں کو حسنِ تعمیر کی نفاست بہت پسند تھی چنانچہ وہ عالموں، شاعروں، مصوروں اور سنگ تراشوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے شاہی خزانے سے انعام و اکرام دیا کرتا تھا۔ شاہجہاں کے انتقال کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کا عہد شروع ہوا۔

شہزادی زیب النساء شہنشاہ اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی تھی۔ جو فارسی زبان کی مایۂ ناز باکمال شاعرہ تھی جس کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور علمی و ادبی کارناموں کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُور دراز ملکوں تک پہونچ چکی تھی۔ شہزادی نہایت ہی خوبصورت اور ذہین تھی۔ جو باتیں ایک سراپا حُسن عورت میں ہونی چاہئیں وہ سب اس میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ طبع سلیم، ذہن رسا، فکر بلیغ اور نکتہ سنج اس سے بہتر شاہی خاندان میں کوئی عورت نہ تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب اور ملکہ دلرس بانو اپنے دوسرے بچوں سے زیادہ اس کی ناز برداری کیا کرتے تھے

مورخین کے بیانات سے زیب النساء کی ذہانت و ذکاوت اور اس کے ادبی ذوق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ و ادب کی چند معتبر کتابوں مثلاً "بحر الفصاحت" "کنز الادب" سے شہزادی کی حاضر جوابی کے چند دلچسپ واقعات پیش ہیں۔

(۱) ایک خادمہ کا شوہر فوج میں ملازم تھا۔ اور وہ حد درجے کا پست ہمت اور بزدل تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے شوہر کی جرأت و شجاعت کے افسانے بیان کرتی تھی ایک مرتبہ میدانِ جنگ سے اطلاعات موصول ہوئیں تو اس خادمہ نے حسب عادت کہا میں نے سنا ہے کہ آج میرے شوہر نے میدان جنگ میں سیکڑوں دشمنوں کے سر کاٹ لیے۔

شہزادی نے مسکرا کر کہا۔

ہاں ضرور کاٹے ہوں گے۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

(۲) ایک مرتبہ شاہی باغ میں ایک سڑک بن رہی تھی۔ اور وہاں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ (اس راستے سے آہستہ جایئے) ایک دن زیب النساء گھوڑے پر سوار ہو کر اُسی راستے سے گذر رہی اور گھوڑے کو اس قدر تیز بھگایا کہ بے قابو ہو کر گر پڑی۔ بادشاہ بہت ہی فکر مند ہوا۔ اور اُسی وقت بغرض عیادت شہزادی کے کمرے میں داخل ہو کر زیب النساء سے مخاطب ہوا بیٹی کیا تم نے یہ اعلان لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ کہ اس راستے سے آہستہ چلیے۔

زیب النساء نے کہا۔

جی ہاں! ابا حضور اعلان پڑھا تھا مگر میں نے سمجھا کہ یہ اعلان اُن لوگوں کے لئے ہے۔ جو پیدل چلتے ہیں۔

(۳) ایک استانی زیب النساء کو تاریخ ایران پڑھا رہی تھی کمرے میں ایران کا نقشہ آویزاں تھا۔ استانی نے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دیکھو یہ ایران کا نقشہ ہے۔ بتاؤ اس میں شیراز کہاں ہے؟ زیب النساء نے نقشے کی طرف دیکھ کر کہا شیراز ایک بڑا شہر ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اتنے چھوٹے نقشے میں آجائے۔

(۴) ایک رئیس کی بیوی اکثر زیب النساء کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی۔ اس عورت کو اپنے متعلق یہ غلط فہمی تھی کہ وہ ایک باکمال شاعرہ ہے اور اس کا کلام لاجواب ہے۔ حالانکہ اس کے اشعار نہایت مہمل اور بے معنی ہوتے تھے۔ شہزادی اس کے اشعار سننا بالکل پسند نہ کرتی تھی۔ ایک دن وہی خاتون حاضر ہوئی اور کہنے لگی شہزادی صاحبہ آج میں نے ایک بہترین نظم آپ کو سنانے کے لئے لکھی تھی لیکن اتفاق سے جس کاغذ پر نظم تحریر کی تھی میرے بچے نے اس کاغذ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔

زیب النساء نے کہا! تمہارا بچہ پیٹ ہی سے سخن شناس پیدا ہوا ہے۔

(۵) ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب اپنی جائے نماز پر دو اشرفیاں بھول گیا۔ اور زیب النساء نے وہ اشرفیاں اٹھا لیں ملکہ دلرس بانو بھی اُن اشرفیوں کو دیکھ چکی تھیں ملکہ نے زیب النساء سے کہا بیٹی زیب النساء! تمہارے والد کی جائے نماز پر دو اشرفیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ غائب ہیں۔ جائے نماز کے قریب تم گئی تھیں یا میں۔ سوائے ہم دونوں کے کسی اور کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ اشرفیوں کو ہاتھ لگائے۔ زیب النساء نے کہا۔

امی جان! بیت مضطرب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایک اشرفی آپ دبا رکھ دیجئے اور ایک میں رکھ دوں۔

(۶) ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک ایرانی عورت ملکہ دلرس بانو کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اس نے ملازمت کے لئے درخواست پیش کی۔ ایرانی عورت حد سے زیادہ سیاہ فام تھی ملکہ نے دریافت کیا۔ تو ایران کی رہنے والی ہے۔ لیکن رنگ اس قدر سیاہ کیوں ہے زیب النساء اس موقع پر موجود تھی۔ اس نے فوراً کہا۔

امی جان! جملۂ رات کی تاریکی میں پیدا کیا ہے چنانچہ

ٹھنڈے شعلے

سلیم عادل



مکرمی و محترمی صدیقی صاحب سلام و خلوص

زیرِ نظر داستان ٹھنڈے شعلے " میری اپنی اختراع نہیں ہے بلکہ واقعی قصہ سندیلا کے بزرگوں کی زبانوں سے صدیوں سے سنی جاتی رہی ہے اور آج بھی وہاں کے بزرگ اس قصے کو بڑے وثوق اور بڑی عقیدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ میں نے جو کچھ مختلف اشخاص کی زبان سے مختلف انداز میں سنا ہے اسے اپنے لفظوں میں پیش کر رہا ہوں۔

سلیم عادل۔

عشق کے دو متوالے شہیدوں کی یہ حسرت انگیز داستان صدیوں سے سندیلا کی بستی میں زبان زدِ خاص و عام ہے اور مختلف زبانوں سے مختلف انداز میں سنی جاتی ہے۔ بنگال کے مشہور مصنف اور عظیم کردار نگار جناب سپیندر مجومدار نے محبت کے بارے میں کہا ہے۔

" یہ وہ جذبہ ہے جو آپ ہی اپنی تقدیر ہے اور اپنے مستقبل کے نقوش خود کھینچتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انجام کی پروا کئے بغیر شعلوں کو ہوا دیتا رہتا ہے "

کوئی نہیں جانتا کہ اس عجیب و غریب داستان میں کتنی حقیقت ہے اور گزری ہوئی صدیوں نے اس میں پرپُر اسرار کہاں تک مبالغے کی آمیزش کی ہے۔ لیکن جب میں اس داستان کو لکھنے بیٹھا ہوں تو میں نے تھوڑی دیر کے لئے اسے حقیقت تسلیم کر لیا ہے تاکہ جو کچھ بھی میں نے سنا ہے اسے انصاف کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں۔

وہ نہایت شرمیلا، معصوم اور خاموش صفت تھا۔ اس کی کم گوئی اس کے ہم جماعتوں میں ایک داستان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب طالبِ علم چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے معلم سے درس لیا کرتے تھے اور استاد کے بعد دوسرا درجہ دیا جاتا تھا۔ سندیلا کے ایک حکیم صاحب جو معلم بھی تھے اور لپھنکر داس کی وجہ سے اور بستی کے لوگ ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ وہ حکیم صاحب کا شاگرد تھا۔ اور چونکہ بیحد ذہین اور منکسر المزاج تھا اس لئے حکیم صاحب اس پر مہربان تھے۔

اس کا نام رضوان لیکن اپنے رکھ رکھاؤ میں اتنا سادہ اور نیک تھا کہ لوگ اسے مولوی کہہ کر پکارتے

اقصات نئی دہلی

[illegible]

سی قیص اور سادات منش تھا۔ آٹھ برس سے
تھا کہ صبح ناشتہ کرنے کے بعد بستہ بغل میں
سے نکلتا اور سر جھکائے ہوئے ٹھیک وقت پر
کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوا حکیم صاحب
پہنچ جاتا۔ حصولِ علم کے ساتھ ہی حکیم صاحب کے
کا ہاتھ بٹانا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ رضوان کو
حکیم صاحب کے یہاں سے واپسی میں بہت دیر ہو گئی
تھا اس کے جسم پر صرف ایک باریک کرتا اور پاجامہ تھا
کانپ رہا تھا۔ یہ بھی بالکل اتفاق تھا کہ خلافِ
تبدیلی مرتب راستہ طے کرتے ہوئے اس کی نظریں
کے چبوترے کی طرف اٹھ گئیں۔

ہی حلوائی کی نوجوان لڑکی تارا کھڑی ہوئی تھی۔
دن بھر مانجتے مانجتے تھک کر یوں ہی ستانے کے لئے
پر نکل آئی تھی۔ راکھ اور کالک میں لتھڑے ہوئے
ہاتھ پیر بھی چاندنی میں چمک رہے تھے۔ رضوان کی نظریں
سے ٹکرائیں اور وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا ہی
کیوپڈ تیر چلا چکا تھا۔ رضوان محسوس کر رہا تھا جیسے
چاندنی سمٹ کر چبوترے پر اتر آئی ہو یا پھر وہ ضیا
کی یہ کرنیں اس نوخیز حسینہ کے چہرے سے پھوٹ
کائنات پر بکھر رہی ہوں۔ وہ بے خودی میں ٹکٹکی باندھے
دیکھتا رہا۔ تارا کی نگاہیں بھی اس کے چہرے پر جم کر
رہیں۔ دونوں خاموش تھے اور بت بنے ہوئے
ایک دوسرے کے دل میں اتر جانے کی
کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اضطراری طور پر تارا کا
ہاتھ کر پیشانی تک چلا گیا اور اس کی چوڑیاں گنگنا اٹھیں
چوڑیوں کی کھنک پر چونکا۔ کچھ دیر تک جھلملاتی ہوئی
خلا میں گھورتا رہا پھر سر جھکا کر خاموشی سے
راستے پر چل پڑا۔

گھر پہنچ کر وہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا
جسم پسینے سے اس طرح شرابور تھا جیسے ابھی تک وہ کسی
دریا میں نہا رہا ہو۔ ماں نے اسے آواز
دی [illegible]

[illegible] اس کے
پاس پہنچ جانے کا عادی تھا۔

"کیا بات ہے رضوان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟"
ماں نے سوال کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا ہی تھا
کہ چونک پڑی۔

"ارے تو تو پسینے میں نہایا ہوا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟" وہ
رضوان کا جسم ٹٹولنے لگی۔

"میں پگھل رہا ہوں امی۔ میرے اندر سویا ہوا جہنم جاگ پڑا
ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بخار ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب سے دوا کیوں نہیں لیتا
آیا؟" ماں نے اسے چپٹا لیا۔

"یہ بخار نہیں ہے امی۔ میری آزمائش کا دور شروع ہو رہا
ہے۔ خدا نے مجھے زبردست آزمائش میں ڈال دیا ہے۔"

صبح اٹھا تو رضوان کی طبیعت ٹھیک تھی۔ جیسے رات بھر
میں وہ اپنی ذہنی کشمکش پر قابو پا گیا ہو۔ اپنے معمول کے مطابق
اس نے ناشتے کے بعد کچھ کتابیں بغل میں دبائیں اور حکیم صاحب
کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ چندر کے گھر کے قریب پہنچ کر اس کے
قدم خود بخود رک گئے اور نظریں چبوترے پر جا ٹھہریں۔ تارا
وہاں مجسمِ انتظار بنی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ چند لمحوں تک ساکت
و سامت کھڑا ہوا اس ملکوتی حسن کے پیکر کو تکتا رہا۔ دونوں
کی نظریں ایک دوسرے کے پرسکون چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔
لیکن عجیب بات تھی کہ نہ تو رضوان کی آنکھوں میں تارا کے لئے کوئی
اضطراب تھا نہ تارا کی نگاہوں میں کسی قسم کا سوال۔ ایسا لگتا تھا
جیسے سوال و جواب کی حدود کو وہ ایک ہی جست میں پار کر گئے
ہوں۔ ایک ہی نگاہ نے دونوں کو عشق کی اس منزل سے آگے
پہنچا دیا ہو جہاں تک عقل راہ نمائی کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد
رضوان نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے لیکن
رضوان کے دستور میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہر صبح حکیم صاحب
کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کچھ دیر چندر کے گھر کے
سامنے کھڑا ہوتا جہاں حسبِ معمول تارا اسے کھڑی ہوئی نظر آتی
دونوں کی نظریں ٹکراتیں اور کچھ دیر تک خاموش سوال و جواب
ہوا کرتے۔ اس کے بعد رضوان اپنی راہ چلا جاتا اور تارا گھوم کر
گھر کے اندر داخل ہو جاتی۔ لیکن اس طویل عرصے میں دونوں میں
[illegible]

رفتہ رفتہ ان گونگے عاشقوں کی بات محلے میں پھیلتے پھیلتے
بازار تک پہنچ گئی۔ ساری بستی میں چرچے ہونے لگے کہ رضوان
چندر کی مہ پیکر تارا پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اب لوگوں کی یہ چہ میگوئیاں
کانا پھوسی کی حد سے گزر کر بلند بانگ طعنوں تک پہنچ گئی تھیں۔
لوگ چندر پر لعنت ملامت کی بوچھار کر رہے تھے لیکن وہ بیچارا
کیا کر سکتا تھا اس نے ایک مرتبہ بھی تو تارا کو رضوان سے قریب
ہوتے ہوئے یا رضوان کو تارا سے گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا
تھا۔ حد یہ تھی کہ کوئی اس بات کا شاہد نہ مل سکا جو کہتا کہ
دونوں نے کبھی دور ہی سے ایک دوسرے کو اشارے کئے ہوں
دوسری طرف رضوان بھی نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ
اس کے مخالف ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ تو خود حکیم صاحب
بھی اس پر کافی برہم ہوئے۔ لیکن رضوان کے ابرو پر کوئی بل
نہیں تھا۔ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح خاموش و پرسکون تھا۔ اس کا
یہ اطمینان ہی دراصل اس کے مخالفوں کو غصہ دلانے لگا تھا
وہ ہر ایک طنز اور سرزنش کو سنکر خندہ پیشانی سے مسکرا دیتا
تھا۔ لیکن اپنے اصول میں اس نے کوئی فرق نہیں آنے دیا۔
حکیم صاحب کی سرزنش جب حد سے بڑھ گئی تو ایک دن اس
نے کہا:۔

"میرے محترم بزرگ! میری مجال نہیں کہ آپ کے سامنے
زبان کھولوں۔ آپ ہی کی پاپوش کے طفیل مجھے جنت کی بشارت
ملی ہے۔ آپ کا غصہ بجا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت
خود بخود آپ کے سامنے سورج کی طرح روشن ہو جائے گی
اس لئے میں چپ ہوں۔" حکیم صاحب نے غور سے اس کی طرف
دیکھا اور چپ ہو گئے۔

اسی دن کچھ دیر کے بعد ایک واقعہ رونما ہوا کہ حکیم صاحب
کی آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئیں اور آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھانے لگا۔ ہوا یوں کہ وہ مولوی کو کوئی نسخہ لکھوا رہے
تھے کہ اچانک ایک لمبی "سی" کی آواز کے ساتھ قلم رضوان
کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے رضوان؟" حکیم صاحب حیرت
سے اسے دیکھنے لگے۔

"انگلیوں میں سوزش ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں
جل گیا ہوں۔ جیسے سرا ہاتھ کھولتے ہوئے تیل میں ڈوب گیا



خاندانی
منصوبہ بندی
عام تعلیم کے



کالے شیطان کی اولاد ہوتے ہیں

لڑکی جس نے رنگ بدل لیا۔

برطانیہ کے ایک اخبار کی رپورٹر مس اینتھیا ڈسکن نے کالوں کے ساتھ گوروں کا برتاؤ دیکھنے کے لئے کچھ دن کیلئے اپنا رنگ بدل لیا اور لندن کی سیر کی۔

بات حیرت انگیز ضرور ہے لیکن سائنسی معلومات رکھنے والوں کے لئے زیادہ اہم نہیں۔ آج جبکہ عورت کو مرد میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور مرد کو عورت میں تو رنگ تبدیل کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ امریکا میں کالے لوگوں کی کافی بڑی تعداد ایسی موجود ہے جو دواؤں کے استعمال سے اپنے کالے رنگ کو بھورے یا گندمی رنگ میں تبدیل کرلیتے ہیں ——— اینتھیا کو برطانیہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کے مسائل سے کافی دلچسپی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان کے مسائل کا مطالعہ باہر سے نہیں بلکہ ان کے اندر جاکر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کام کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنا رنگ تبدیل کرے۔

رنگ کی تبدیلی کے لئے اینتھیا نے پورٹوریکو میں ڈاکٹر لارنس فلیشر سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر فلیشر نے جو کھال کی بیماریوں کے بہت بڑے ماہر ہیں اینتھیا کو کھانے کو کچھ گولیاں دیں۔ اینتھیا نے چھ روز بارہ کیپسول کھائے اور گھنٹوں دھوپ میں بیٹھ کر گذارے۔ اینتھیا کا رنگ کچھ ہی دنوں کے بعد حیرت انگیز طور پر گورے سے گہرا سانولا ہوگیا۔ اینتھیا نے اپنے بال اور بھویں کالی رنگ لیں اور اب وہ مکمل ہندوستانی لڑکی بن چکی تھی۔

لندن واپس آکر اینتھیا ایک ہندوستانی لڑکی کے بھیس میں ہندوستانیوں کے علاقے میں رہنے لگی۔ اس طرح اس نے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو پیش آنے والے بہت سے مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کیں بہت سے سبق سیکھے اور تجربات حاصل کئے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے اس سے محبت تک کا اظہار کیا مگر اکثر گوروں اور دوکانوں میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مکان حاصل کرنے میں اسے بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عورت نے اسے کالے شیطان کی اولاد بتایا۔ اینتھیا نے اپنے تجربات کو قسط وار لندن کے کچھ اخبارات میں شائع کیا۔ جسے لوگوں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔

لیکن کچھ دن بعد اینتھیا پھر اپنے اصلی رنگ میں لوٹ آئی اور اسے ایک بار پھر ہندوستانی سے انگریز بن جانا پڑا۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے اپنا ہندوستانی رنگ روپ زیادہ پسند تھا۔

اکثریتی طبقے کے لوگ کبھی اقلیتوں کے مسائل



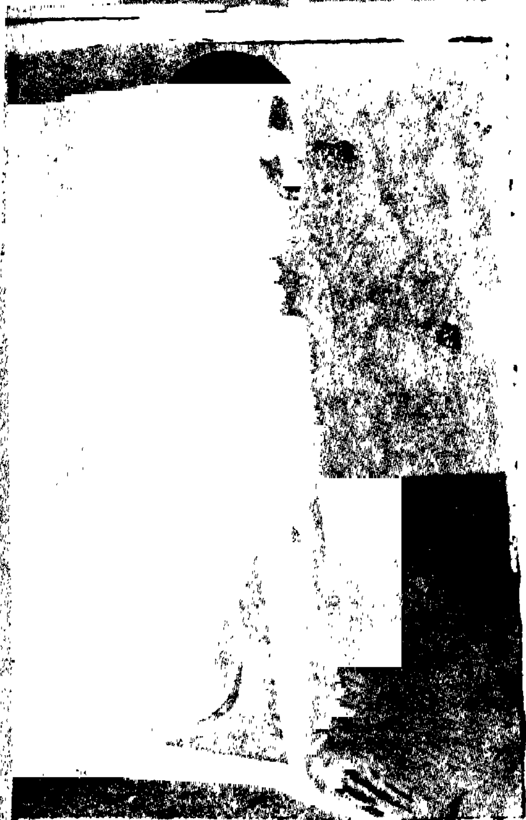
ہندوستانی لڑکی کی صورت میں میری ملاقات بہت سے ہندوستانی لڑکوں سے ہوئی۔ وہ لوگ میرا اصل روپ نہیں پہچان پائے دو تین نے تو محبت تک کا اظہار کردیا۔

کیونکہ ہندوستانی بہت زیادہ غریب ہوتے ہیں اس لئے بہت
زیادہ تول مول کے بھی عادی ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی خریداری
کرتے وقت خوب بھاؤ تاؤ کیا۔





جس طرح چاند گرہن کے موقع پر چاند آہستہ آہستہ کالا پڑتا جاتا ہے۔
بالکل اسی طرح میرا رنگ بھی دھیرے دھیرے کالا ہوتا چلا گیا۔



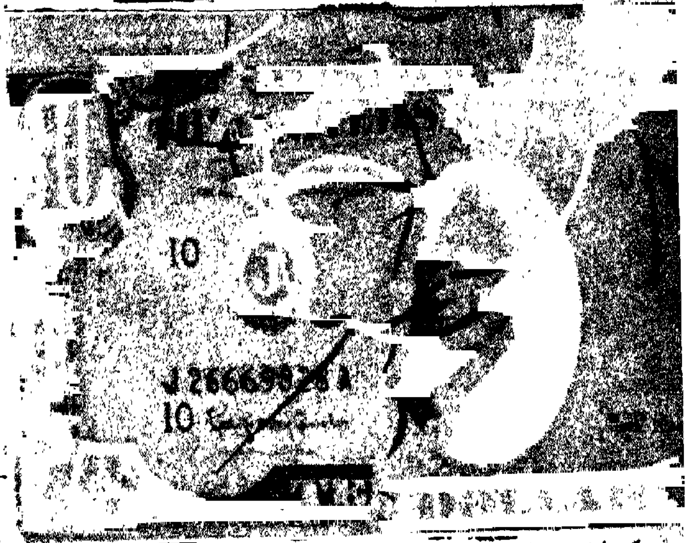


اس ساری بلاؤز کے اندر کیا میرے ہندوستانی ہونے میں کچھ شک ہے؟

کمال تو ہندوستانی ہے لیکن کپڑے۔۔۔؟

دنیا دو ہفتہ کی نظر میں

ڈالر ڈپلومیسی



کناڈا کے وزیر اعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ امریکا کے ساتھ رہنا گویا ہاتھی کے ساتھ رہنا ہے کہ وہ کتنا ہی دوست اور کتنا ہی خلیق بن جائے مگر بہرحال ہے پھر بھی جانور ہی۔ جب بھی چھینکے گا یا دھاڑے گا ہر آدمی چونک پڑے گا۔

امریکا ڈالر کے معاملے پر چوکا ہے اور اس نے تمام دنیا کو چونکا دیا ہے۔ تمام بین الاقوامی مارکیٹوں میں ایک ہلچل مچ گئی ہے۔ ہر ملک اپنی اپنی اقتصادی حالت کا جائزہ لے رہا ہے۔ باہم مشورے ہو رہے ہیں۔ یورپین مارکیٹ تک میں الٹ پلٹ ہو گئی ہے کیونکہ کسی معمولی بلی کی آواز نہیں بلکہ یہ ہاتھی کی چنگھاڑ تھی۔ ورنہ کوئی دوسرا ملک اپنی کرنسی میں رد و بدل کرتا ہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں امریکا نے یہ کارروائی اس لئے کی ہے تاکہ ڈالر کی بگڑتی ہوئی حالت کو بچایا جا سکے۔ اور بین الاقوامی دنیا میں امریکا کی ساکھ کو نہ گرنے دیا جائے۔ بعض ممالک کے خیال میں یہ قدم قدر زر میں کمی کے مترادف ہے۔ صاف اس لئے نہیں کہا گیا کہ اس سے امریکا کی ساکھ گرتی۔

ایسے اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

دراصل گذشتہ ۲۰ برس سے امریکی تجارت کا توازن مجموعی طور سے اس کے حق میں نہ تھا اسے امریکا برداشت کرتا آ رہا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں جب اس نے دیکھا کہ تجارتی توازن ہر ماہ امریکا کے خلاف جا رہا ہے تو امریکی ماہرین اقتصادیات کے کان کھڑے ہوئے۔ اور ایک ہفتے کے طویل مشوروں کے بعد صدر نکسن نے اقتصادیات کے میدان میں وہ دھماکہ چھوڑا کہ سب بھونچکے رہ گئے۔

اپنی اقتصادی حالت کو درست کرنے کے لئے امریکا نے کئی اقدامات کئے ہیں۔ مثلاً انھوں نے ڈالر کو سونے میں تبدیل کرنے کے لئے امریکا کے ۳۷ سالہ وعدے کو کالعدم قرار دے دیا۔ اب غیر ملکی خزانے اور سنٹرل بینک ڈالر کو ... سونے کی فی آونس ۳۵ ڈالر کی قیمت میں کوئی تبدیلی کا اعلان نہیں کیا۔ یہ قیمت ۱۹۳۴ء میں روزویلٹ نے مقرر کی تھی)

۲۔ ایسی درآمدات پر جن پر ڈیوٹی لگتی ہے دس فیصدی کا سرچارج وصول کیا جائے گا۔

۳۔ ۹۰ دن تک تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

۴۔ اس وقت جو غیر ملکی امداد (سالانہ تقریباً ۱½ ارب ڈالر) دی جا رہی ہے اس میں دس فیصدی کی تخفیف کی جائے گی۔

۵۔ چالو مالی سال کے اخراجات کے بجٹ میں ۴ ارب ۷ کروڑ ڈالر کی کمی ہوگی۔ اس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں ۵ فیصدی کی تخفیف شامل ہے۔

نکسن صاحب کہتے ہیں اس سے ان کا مقصد ملک کی اقتصادیات کو بہتر بنانا ہے۔ لیکن ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سیاسی اعتبار سے وہ اپنی بگڑتی ہوئی پوزیشن کو بچا سکیں۔ ایک دھماکا انھوں نے چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر کیا تھا اور دوسرا دھماکا اب اقتصادی دنیا میں کیا ہے اور ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے وہ وزیر اعظم ہند کی نقل کر رہے ہوں جنہوں نے پچھلے دنوں ہندوستانی اقتصادیات کو مضبوط کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے تھے اور پورے ہندوستان کی ہمدردی حاصل کر کے اپنی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم کر لیا تھا۔

شاید مسٹر نکسن بھی اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء کے صدارتی الیکشن میں اگر خود نہ بچ سکیں تو کم از کم ڈالر کو بچا لے جائیں۔

اس ڈالر کو ویت نام کی جنگ کھا گئی اور جو بچا ہے اسے اب بنگلا دیش کھا جائے گا۔

مراکش

وعدے ہی وعدے

گزشتہ ماہ مراکش میں انقلاب لانے کی کوشش ان نوجوانوں کی تھی جو ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن سے سخت نالاں تھے۔ خود شاہ حسن نے اپنی ڈرامائی تقریر میں اقرار کیا ہے کہ

واقعی ملک بدعنوانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اصلاحی اقدام کریں گے۔ اور انھوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اچانک اپنی کابینہ کو برخاست کر دیا۔ ان میں ان کے معتمد وزیر داخلہ محمد عفکیر بھی تھے جنھوں نے بغاوت کو انتہائی سختی کے ساتھ کچل دیا تھا۔

شاہ حسن نے ملک میں وسیع پیمانے پر اصلاحات جاری کرنے کا بھی فیصلہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ بے زمینوں کو زمین دیں گے اور عوام کے لئے بڑے پیمانے پر تعلیم کا انتظام کریں گے (تاکہ وہ محض ٹیلی ویژن پر اپولو کو نہ دیکھیں بلکہ خود بھی خلاباز بن سکیں۔) نیز ایسے اقدامات کریں گے کہ کرپشن کا قطعی طور پر خاتمہ ہو سکے۔

ملک میں موجودہ برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے شاہ حسن نے مراکش کی سیاسی پارٹیوں، یونینوں، ممتاز شخصیتوں اور عام لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی اپیل کی۔ لیکن دوسرے ہی دن شاہ نے محمد کریم لمرانی کی قیادت میں ایک نئی کابینہ کے قیام کا اعلان کر دیا اور ترقی پسندوں کے متحدہ محاذ کو نظر انداز کر دیا۔ انھیں کابینہ میں کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس طبقۂ امراء سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کو وزیر اعظم بنا کر محمد عفکیر کو وزیر دفاع بنا دیا جس سے کہ عوام انکی سخت گیرانہ پالیسی کی بنا پر بے حد نفرت کرنے لگے ہیں۔

محمد عفکیر کی وزارت میں شمولیت کا عوام یہ مطلب لے رہے ہیں کہ شاہ نے اصلاحات کا جو وعدہ کیا ہے وہ محض ایک فریب ہے۔ جب تک حسن پارلیمنٹ کو توڑنے اور اپوزیشن کے مطالبات کو منظور کرنے اور رفتہ رفتہ اپنی مطلق العنان "شہنشاہیت" کو ایک "آئینی شہنشاہیت" میں بدل دینے کے لئے اقدام کریں گے اس وقت تک عوام مطمئن نہیں ہوں گے اور نئی حکومت اس سے زیادہ مقبول نہ ہو سکے گی جتنی کہ پہلی حکومت تھی اور جس کے خلاف "بغاوت" بس یوں سمجھیے کہ شاہ کی خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی۔

لیکن مراکش جیسے چھوٹے سے ملک کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیشہ ہی بغاوت کو دبایا جا سکے گا۔ پچھلی بغاوت چند ناراض فوجیوں کی طرف سے کی گئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ ناراضگی عوامی ہے اور عوام کا سیلاب جب طوفانی شکل اختیار کرتا ہے تو بڑی سے بڑی شہنشاہیتوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔

شمالی آئرلینڈ

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے

برطانوی حکومت تشدد کے ذریعے آئرش عوامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اسمیں ناکام ہو چکی ہے۔

انگریز نے ہندوستان آکر ہندو مسلمانوں کو لڑایا۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اپنائی اور اس پالیسی کے طفیل ہندوستان دو سو برس تک رندناتا رہا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ جو انگریز ہندوستان میں آکر لڑاتا تھا وہ اب خود اپنے گھر میں لڑ رہا ہے۔ گویا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ایک طرف پروٹسٹنٹ ہیں اور دوسری طرف کیتھولک دونوں عیسائی ہی ہیں لیکن دونوں الگ الگ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور شمالی آئرلینڈ میں اسوقت یہ صورت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔

آئرلینڈ کی ایک لمبی کہانی ہے ۱۱۵۲ء تک آئرلینڈ میں کئی بادشاہوں کی سلطنتیں تھیں۔ ایک بادشاہ نے اینگلو نارمنوں کی مدد حاصل کی اور پہلی بار انگریزوں کو جزیرے پر آنے کا موقع مل گیا۔ لیکن آئرش باشندے ہمیشہ انگریزوں کے خلاف رہے۔ خاص طور سے انگلش چرچ کے معرض وجود میں آنے کے بعد وہ اور زیادہ مخالف ہو گئے کیونکہ وہ بدستور کیتھولک تھے۔ اس لئے بھی نفرت تھی کہ ملک کی نصف آمدنی انگریز جاگیرداروں کو چلی جاتی تھی وہ انگلینڈ میں رہتے تھے اور کسان ان کے لئے کام کرتے تھے۔ انیسویں صدی کا ہی زمانہ تھا جب آئرلینڈ کے کیتھولک باشندے بڑی تعداد میں امریکہ کے لئے ترک وطن کر گئے تھے (آنجہانی صدر امریکہ مسٹر کنیڈی کے خاندان والے بھی غالباً اسی زمانے میں امریکہ پہونچے تھے)

۱۹۲۰ء میں جب آئرلینڈ آزاد ہوا تو شمالی آئرلینڈ کو اس سے الگ کر دیا گیا۔ وہاں پروٹسٹنٹوں کی اکثریت ہو گئی تھی کیونکہ کراموِیل نے شمالی کاؤنٹیز کو کیتھولکوں سے خالی کرا لیا تھا۔

شمالی آئرلینڈ براہ راست انگلینڈ کے ماتحت ہے اگرچہ وہاں صوبائی حکومت قائم ہے جس کی راجدھانی بلفاسٹ ہے۔ یہ صوبائی حکومت بے حد متعصب ہے اور کیتھولک باشندوں کے ساتھ امتیاز برتتی ہے۔ دو سال قبل برطانیہ کی لیبر حکومت نے صوبائی حکومت کو تیار کیا تھا کہ کیتھولک باشندوں کی بے چینی دور کرے اور انھیں ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں حصہ دے۔ لیکن وہاں پر یونینسٹ پارٹی کی حکومت ہے جو کیتھولکوں کے معاملے میں بیحد متعصب ہے اس پارٹی میں کیتھولکوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ یونینسٹ پارٹی کے والنٹیروں کی اشتعال انگیز پریڈیں ہوتی ہیں جن میں نفرت کا پرچار ہوتا ہے۔ نتیجے میں اس پارٹی کی حکومت میں کیتھولک اپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے لگے ہیں اور بڑی تعداد میں جنوبی آئرلینڈ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی انتہا پسند کیتھولک حکومت سے

... ناشندے اُمیدلیٹنے کے خلاف مسلح ... گئے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ دو سال سے حکومت ... کر رکھا ہے۔ مثال کرنا کے مصداق وہ جانی ... ہماری قیمت سے تنگ ہو رہے ہیں۔ بلفاسٹ ... کی حالت اس وقت بالکل ایسی ہے جیسی انگریز ... میں ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کے وقت ... تی تھی۔

... پروٹسٹنٹ محلّوں کو چھوڑ کر آ رہے ہیں اور پروٹسٹنٹ ... محلوں سے منتقل ہو رہے ہیں اور مکانوں کو آگ ... ہیں۔ بعض اوقات لوگ خود ہی اپنے مکانات کو ... آگ لگا دیتے ہیں۔ جب سے حکومت نے ... مقدمہ چلائے بغیر عرصۂ غیر معین کے لئے نظربند ... قانون نافذ کیا ہے سارے مشتبہ لوگ بڑی تعداد میں ... لئے گئے ہیں اس وقت سے صورتِ حال اور زیادہ ... گئی ہے۔

... آئرلینڈ کی ریپبلک نے حکومتِ برطانیہ کو تنبیہ کی ... صورتِ حال درست نہ ہوئی اور تارکینِ وطن کا ... اسی طرح آتا رہا تو وہ شمالی آئرلینڈ کے سول ... لڑنے والوں کی حمایت کرنا شروع کر دے گی۔ ... وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ہیتھ نے اسے ملک کے اندرونی ... شمالی آئرلینڈ کی مداخلت سے تعبیر کیا ہے اور سخت ... کہا ہے کہ وہ اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑائے۔

... ایک زمانہ تھا جب آئرلینڈ کے باشندے تاجِ برطانیہ ... وفادار تھے اسی لئے آئرش ریپبلک سے الگ رہے ... اب وہ اس ریپبلک سے ملنے کے لئے بے چین ہیں اور ... مقصد کے لئے انھوں نے مسلح گوریلا جنگ کی سرگرمیاں ... شروع کر دی ہیں۔ حکومت تشدد سے تحریک کو کچلنے کی ... کوشش کر رہی ہے۔ لیکن یقیناً وہ تشدد سے آئرش عوام ... آزادی کے جذبے کو نہ دبا سکے گی۔ بلکہ صرف انھیں مطمئن ... اور حکومت میں ان کا جائز حصہ دے کر ہی انھیں اپنے ... ساتھ رکھ سکے گی۔

... ت شمیم ...

اردن

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی

اردن ایک مرتبہ پھر امریکا کی گود میں چلا گیا ہے ایک ایسے وقت جبکہ عرب ممالک نے اس کا عملی بائیکاٹ کر دیا ہے اور شام نے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی ختم کر لئے ہیں یہ قدرتی تھا کہ وہ مغرب کے ان ممالک کی طرف امداد کے لئے دیکھے جو اب تک اس کی عرب دشمن سرگرمیوں کو شہ دیتے رہے ہیں۔

تازہ خبر یہ ہے کہ امریکا نے ڈیڑھ سو کے قریب لڑاکا ہوائی جہاز اردن کو دیئے ہیں تاکہ اگر شام کی طرف سے حملہ ہو تو اسکا مقابلہ کیا جا سکے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے جب شاہ اردن نے امریکا سے امداد حاصل کی ہے۔ بلکہ ہر ایسے موقعے پر جبکہ وہ عرب اتحاد کے حلقے کو توڑ کر باہر آئے ہیں۔ انھوں نے امریکا اور برطانیہ کی سرپرستی حاصل کی ہے۔



فلسطینی فدائیوں کو جو آزادیٔ فلسطین کے لئے قربانیاں دے رہے تھے انھوں نے جس طرح ختم کیا ہے اس کو عرب دنیا کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ شام کو مقابلتاً غصہ اس لئے زیادہ ہے کہ وہاں پہلے ہی سے بیس ہزار کے قریب فدائین موجود ہیں۔ اور وہ بے قرار ہیں کہ انھیں اردن کی طرف بڑھنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ ایک رجعت پسند اور مغربی ممالک کے نمک خوار نام نہاد بادشاہ کی بادشاہت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں۔

اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر ہی غالباً شاہ حسین امریکا کے سامنے ہوائی جہازوں کے لئے گڑگڑائے ہوں گے تاکہ ان بے وطن فلسطینی باشندوں کا جنھوں نے اپنے وطن کی واپسی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے خوف دلانے کا جو ناپاک بخار ابھی ان کے اندر باقی ہے اسے نکال سکیں لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی جلد وقت آ رہا ہے جب مشرقِ وسطیٰ کی سیاست سے اردن کی شہنشاہیت کے ناسور کو نکال پھینکا جائے گا۔ اور اس کے بعد اس مشترکہ دشمن سے ٹکر لی جائے گی جو بالواسطہ طور پر اردن کو استعمال کر کے اپنے شیشے کے محل میں بیٹھا ہوا قہقہے لگا رہا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ

تین بچوں کی عرب فیڈریشن

نیل ڈیلٹا کے ایک قصبے دمن ہور میں ایک مصری خاتون نے بیک وقت تین لڑکوں کو جنم دیا۔ اس نے ایک کا نام رکھا انور سادات۔ دوسرے کا قذافی اور تیسرے کا اسد۔ جس دن یہ تین بچے تولد ہوئے اسی دن اور غالباً ٹھیک انکی ولادت کے وقت مصر، لیبیا اور شام کے سربراہ (انور سادات، قذافی اور حافظ الاسد) دمشق میں اپنے ملکوں کی مجوزہ فیڈریشن کے دستور کی نوک پلک درست کر رہے تھے۔ شاید قدرت دنیائے عرب کو عملاً بتانا چاہتی تھی کہ تینوں ملک ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور عرب فیڈریشن حقیقی معنوں میں انکی ماں ہے۔ اب تینوں کو ملکر رہنا اور ماں کے حکم پہ چلنا چاہیے۔

آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ تینوں عرب ملکوں کا اتحاد ایک پختہ اتحاد ہوگا اور یہ ٹوٹے گا نہیں بلکہ اس میں دوسرے عرب ممالک بھی شامل ہو جائیں گے۔ کم از کم ایک ملک سوڈان اس میں شامل ہونے کے لئے بالکل تیار ہے۔ دوسرے شاید ابھی تیار نہ ہوں اور اپنی آزادی کو عرب اتحاد کے اوپر قربان نہ کریں۔ لیکن ایک دن آئے گا کہ وہ اس عرب اتحاد میں شامل ہونے کے لئے مجبور ہوں گے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ نہ صرف یہ کہ اسرائیل سے اپنے مقبوضہ علاقے واپس نہیں لے سکتے بلکہ اپنی آزادی کا تحفظ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔



عمر کی قید

دستور میں مذکور ہے کہ ہندوستان کے سب شہریوں کا درجہ مساوی ہے۔ اور سب کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ لیکن عملی میدان میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ زیادہ تر کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں کو ہی آگے بڑھنے اور اچھی ملازمتیں حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے غریب طبقے کے لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر پبلک سروس کمیشن کے تحت ہونے والی ملازمتوں کے امتحانات کے لیئے ۲۴ برس عمر کی شرط ہے۔ لیکن بہت سے غریب بچے جنہیں میٹرک کے بعد ہی کوئی کام تلاش کرنے اور والدین کی مدد کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے دو چار سال کے وقفے کے بعد اپنے تمام حقوق کو محروم ہوجاتے ہیں۔

قانون کا ڈنڈا سب کے لیے یکساں بنایا گیا ہے اور اس میں ایک خاندان کے حالات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ نتیجے میں مالدار گھرانے کے بچے جو سرپٹ دوڑتے ہوئے آتے ہیں سرپٹ ہی دوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں اور ایک غریب بچہ ۲۴ سال کی قید میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

غالباً اسی صورتِ حال کی اصلاح اور غریب بچوں کی پریشانی کے پیشِ نظر کیرالا جیسی چند ریاستی حکومتوں نے سروس کمیشن کے انتخابات میں بیٹھنے کے لیئے ۲۴ سال کی عمر کو بڑھا کر ۳۰ سال کر دیا ہے۔ اس لیئے کہ ۲۴ سال کی قید جن توقعات کے ساتھ لگائی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئیں۔ ۳۰ سال کی عمر تک غریب بچوں کو اپنے دلوں کی حسرت نکالنے کا موقع ملے گا اور وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ انکی اہمیت اور قابلیت قانونی پابندیوں کی نذر ہوگئی۔

لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک یونین پبلک سروس کمیشن نے عمر کے معاملے میں نرمی نہیں کی۔ جس قسم کی گزیٹڈ پوسٹوں کے لیئے یہ امتحانات ہوتے ہیں ان کے لئے تیس سال کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس عمر میں اضافہ کرکے پبلک سروس کمیشن نہ صرف یہ کہ غریبوں کے ساتھ انصاف کرے گا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ قابل اشخاص کو منتخب کرسکے گا۔ اسے جلد عمر میں اضافے کا اعلان کرنا چاہئے۔

واقعات نئی دہلی

آندھرا پردیش

برہمانند ریڈی کی وزارتِ اعلیٰ خطرے میں

آندھرا کے وزیر اعلیٰ مسٹر برہمانند ریڈی نے ۱۹۶۹ء میں جبکہ تلنگانہ سے متعلق ایجی ٹیشن اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا اعلان کیا تھا کہ اگر علیحدگی پسند لوگ الگ تلنگانہ ریاست کا مطالبہ ترک کر دیں تو وہ وزارتِ اعلیٰ کی گدی سے الگ ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اس وقت یہ محض ایک فرضی تجویز نظر آتی تھی لیکن آج ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ وہ ایک سیاسی حقیقت نظر آرہی ہے۔

الگ تلنگانہ ریاست کی تحریک کے لیڈر ڈاکٹر چنا ریڈی اور مرکزی لیڈروں کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کے نتیجے میں اوّل الذکر الگ تلنگانہ ریاست کا مطالبہ ترک کرنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں بشرطیکہ تلنگانہ کے لئے ایک الگ پردیش کانگریس کمیٹی قائم کر دی جائے اور ریاستی لیڈر شپ کو بدل دیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ دس برس تک ریاست کا وزیر اعلیٰ تلنگانہ کے علاقے کا ہونا چاہیے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مرکزی حکومت اس مطالبے کو منظور کرنے والی ہے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر ریاستی لیڈر شپ میں کھلبلی مچ گئی ہے اور اب وزیر اعلیٰ کے لئے مشکل ہو رہا ہے کہ وہ اپنے وعدے سے کس طرح پھریں۔ ریاستی لیڈروں کی دلی میں آمد و رفت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں مسٹر برہمانند ریڈی کو ریاست میں رکھنے کے حق میں ہیں۔ کانگریس اسمبلی پارٹی کے ممبروں کی اکثریت بھی اس بات کی حامی ہے کہ اس مرحلے پر قیادت میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے۔ تاہم آندھرا سے منتخب ہوکر آنے والے ممبران پارلیمنٹ کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ریاستی پارٹی کے ممبروں کی اکثریت کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں۔ تلنگانہ کے علاقے سے جو ۱۴ ممبر منتخب ہوکر آئے ہیں ان میں سے دس تلنگانہ سمتی سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری طرف خود تلنگانہ سمتی میں اس بات پر بے چینی نظر آتی ہے کہ ڈاکٹر چنا ریڈی محض لیڈر شپ کی تبدیلی سے تلنگانہ کے مطالبے کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں لیکن توقع ہے کہ مسٹر چنا ریڈی سمتی میں اکثریت کی حمایت حاصل کرسکیں گے۔ ان حالات میں مرکزی حکومت کو فوری طور پر کوئی دلیرانہ اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ حالات ایسے پیدا ہوچکے ہیں کہ آندھرا کی تقسیم کو رد کیا جا سکتا ہے لیکن صرف اس طرح کہ مسٹر برہمانند ریڈی کو وزارت اعلیٰ کی قربانی دینا ہوگی۔ تاہم یقین ہے کہ اس قربانی کا بدلہ انھیں مرکز میں کسی عہدے کی صورت میں مل جائے گا۔

مہاراشٹر

شیوسینا کی باسی کڑھی میں ابال

شیوسینا کی باسی کڑھی میں پھر ابال آیا ہے اور اس نے پھر مہاراشٹری اور غیر مہاراشٹری کے سوال پر ہنگامے کھڑے کرنا شروع کر دیے ہیں۔ ایک مشہور بینک کے سامنے شیوسینا کے والنٹیروں نے اس بات کے خلاف مظاہرہ کیا کہ بھرتی کے معاملے میں مہاراشٹریوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس مظاہرے کے بعد شیوسینا کے والنٹیر دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگے اور خاص قلب شہر میں پٹریوں پر بیٹھے خوانچے والوں پر حملے اور ان کے سامان کی لوٹ مار کرتے گئے۔ یہ خوانچے والے زیادہ تر کیرالا کے رہنے والے ہیں جن کے کان شیوسینا والے وقتاً فوقتاً مروڑتے رہتے ہیں۔

اس قسم کی حرکتیں شیوسینا کے کارکنوں نے لوک سبھا کے وسط مدتی الیکشن سے پہلے کی تھیں اور انھوں نے ریاست

[illegible] جن سنگھ کو بھی اس کے ساتھ [illegible] سمجھا جاتا ہے کہ سال گذشتہ بھیونڈی اور جلگاؤں میں فسادات برپا کرانے میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ لیکن جب لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات عمل میں آئے تو دونوں میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ شیو سینا نے جنرل کریاپا کی حمایت کی اور جن سنگھ نے اپنے امیدوار کی۔ دونوں ناکام ہو گئے اور شیو سینا تو ایسی بھاگ کر گھر میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ اس کے والنٹیر تتر بتر ہو گئے۔ ان کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہو گئے اور حوصلے بھی پست ہو گئے۔

لیکن اب جبکہ اگلے برس کے شروع میں اسمبلی کے عام انتخابات عمل میں آنے والے ہیں، شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے نے اپنی جنگجویانہ یا جنونانہ وطن پرستی کے نام پر اپنی بکھری ہوئی طاقت کو پھر سے مجتمع کرنا شروع کر دیا ہے اور بینک کے سامنے مظاہرہ کر کے غریب خوانچے والوں کو اپنی جنونانہ جارحیت کا نشانہ بنایا ہے۔ فرقہ پرست جماعتیں فرقہ پرستی پر کاربند ہو کر ہی اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن وزیر اعلیٰ مسٹر نائک کو توقع ہے کہ جس طرح شیو سینا کو لوک سبھا کے وسط مدتی الیکشن میں منہ کی کھانی پڑی اسی طرح اسے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں بھی شرمندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ عوام سمجھ گئے ہیں کہ جارحانہ اور جنونانہ فرقہ پرستی یا علاقائی وفاداری میں انتہا پسندی کی گاڑی زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتی۔ ▬

بہار

سیلاب سے تباہی

بہار میں سیلاب سے ۱۶ لاکھ سے زیادہ اشخاص متاثر ہوئے ہیں اور وہ ایک ہی رات میں گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بارہ لاکھ مرد عورتیں اور بچے اسکولوں، دھرم شالاؤں، سرکاری عمارتوں اور خیموں میں پناہ گیر ہیں باقی چار لاکھ یا تو سڑکوں پر پڑے ہیں یا ریلوے لائنوں اور اسی قسم کے دوسرے مقامات پر۔

جن لوگوں نے سیلاب کے علاقے نہیں دیکھے ہیں وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کتنی زبردست تباہی آئی ہے گنگا سون اور پون پون دریاؤں نے سیکڑوں دیہات کو ڈبو دیا ہے۔ مکانات کی چھتوں تک پانی بھرا ہوا ہے۔ دریائے گنگا کے ہمین سو میل کی گزرگاہ میں ہر جگہ تباہی آئی ہوئی ہے



بہار کے سیلاب زدہ علاقے کا ایک فضائی فوٹو۔

سیکڑوں پشتے ٹوٹ گئے ہیں، سڑکیں تباہ ہو گئی ہیں اور نہری نظام معطل ہو گیا ہے۔ سرکاری عمارتیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں، کنویں اور ٹیوب ویل خراب ہو گئے ہیں، بہت سے دیہات میں اسّی سے نوّے تک مکانات گر گئے ہیں۔ نوّے فیصدی مکئی اور ۶۵ فیصدی دوسری فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ آٹھ ہزار مربع میل کے علاقے میں چاول کی بوائی ممکن نہ ہوگی اس لئے کہ پانی بہت دھیمی رفتار سے اتر رہا ہے اور دھان کے پودے دستیاب نہیں ہیں۔ انسان اور جانور دونوں بھوکے مر رہے ہیں۔ صرف نقصان کا اندازہ ایک ارب روپے لگایا گیا ہے۔ ہریانہ اور پنجاب سے جانوروں کو چارہ بھیجنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن جب تک وہ پہونچے گا شاید مویشیوں کی بہت بڑی تعداد تباہ ہو چکی ہوگی۔

تمام سیلاب زدہ علاقوں میں قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ حکومت نے ۲۳۲ بلاکوں میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیا گیا ہے اور امداد پہونچانے کے سلسلے میں تمام ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

انتظامی مشنری کو اس سلسلے میں زیادہ مشکل اس لئے پیش آ رہی ہے کہ سیلاب اچانک آیا۔ جب سیکڑوں دیہات دریائے گنگا کی لپیٹ میں آئے اس وقت کابینہ کے گیارہ ممبروں میں سے نو دہلی میں امداد کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ کابینہ میں توسیع پر مشورہ کرنے کو دہلی آئے ہوئے تھے۔ بہت سے کانگریسی لیڈر بھی پٹنہ سے باہر تھے لیکن اب انتظامی مشنری کے کام میں کافی تیزی آگئی ہے۔ پھر بھی امداد بڑی حد تک کم ہے۔

سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے بروڈلی کے تیل صاف کرنے کے کارخانے کو بند کر دینا پڑا ہے کیونکہ دریائے گنگا کا پانی علاقے میں پھیل گیا ہے۔

حکومت بہار کو صورت حال پر قابو پانے کے لئے بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہوگی اس وقت اس نے مرکز سے ۱۳۴ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے کی امداد طلب کی ہے تاکہ ایک طرف سڑکوں، پشتوں اور سرکاری عمارتوں کی مرمت کی جا سکے اور دوسری طرف سیلاب زدہ لوگوں کو مدد

دی جائے گی۔ اس میں سے ۲۳ کروڑ روپے کی رقم صرف سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کی مرمت کے لئے درکار ہوگی۔

یہ ایک ایسی زبردست تباہی آئی ہے جو انسان کیلئے عبرتناک ہے لیکن انسان اس صدی اتنا مادہ پرست بن گیا ہے کہ وہ کسی چیز سے عبرت نہیں پکڑتا۔

یوپی

منصف کو پیٹ ڈالا

یوپی ریاست بھی خوب ہے، کہنے کو پسماندہ ریاست ہے اور اب اس پر فخر کرتی ہے لیکن ایک معاملے میں سب سے آگے نظر آئی ہے یعنی سرکاری نظم و نسق میں ممبران اسمبلی، ان کے اعزا اور سماجی ورکروں کی مداخلت بے جا۔ پہلے خبر آئی تھی کہ افسروں کے تبادلے جو کسی زمانے میں انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر ہوا کرتے تھے اب سیاسی مصلحتوں کا نشانہ بن کر رہ گئے ہیں۔ وزیروں اسمبلی کے ممبروں اور اعلیٰ سول افسروں کا بیشتر وقت ان ہی تبادلوں کے سلسلے میں صرف ہوتا ہے۔ افسران پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔

معاملہ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ پچھلے دنوں جب کانگریس اسمبلی پارٹی کی میٹنگ ہوئی تو کئی ایسے ممبروں نے جو صاف ستھرا نظم و نسق چاہتے تھے اس معاملے کو اٹھایا اور پارٹی کے بیشتر ممبروں کی طرف سے تبادلوں کے سلسلے میں مداخلتِ بے جا کی مذمت کی۔ ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اس بار معلوم ہوتا ہے کہ وزیروں کا واحد کام بس یہ رہ گیا ہے کہ تبادلوں کا حکم دیں یا انہیں روکیں" یہی نہیں بلکہ اس نے تجویز کیا کہ اگر تبادلوں کا معاملہ اتنا ہی اہم ہے تو اس مقصد کے لئے ایک الگ وزیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے"

ایک اور ناراض ممبر جو شاید گھر کا بھیدی بھی تھا بولا کہ "ان میں سے بعض بعض دلال بن کر رہ گئے ہیں، تبادلے کراتے ہیں یا تبادلے رکواتے ہیں اور اس کے لئے پیسے وصول کرتے ہیں"

وزیروں نے اعتراف کیا کہ ان کا ۸۰ فیصدی وقت اسمبلی یا پارٹی کے ممبروں سے تبادلے رکوانے یا تبادلے کروانے کے سلسلے میں گزر جاتا ہے۔ ودھان سبھا میں الزام لگایا گیا کہ پچھلے دنوں تک سیتاپور میں دو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے، ان میں عادت ہی بدل

سے ایک کا تبادلہ چیف سکریٹری نے کیا تھا اور دوسرا تبادلہ مبینہ طور پر وزیر اعلیٰ کے کسی رشتے دار کے ذریعے عمل میں آیا تھا۔ اسی طرح میرٹھ میں دو ایگزیکٹو اور گورکھپور میں دو سول سرجن ایک ہفتے سے زیادہ مدت رہے۔ جس کا داؤ چل گیا وہ رہ گیا اور دوسرا چلتا بنا۔ ہر ملازم جہاں غیبی یافت ہو پہونچنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس کے لئے ایم۔ ایلوں اور ان کے عزیزوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ غالباً اسی صورتِ حال سے متاثر ہو کر ایم۔ ایل۔ اے، صاحبان اور ان کے بیٹے پوتوں اور اعزاء کے دماغ چڑھ گئے ہیں اور اب وہ کسی افسر کی حیثیت ہی نہیں سمجھتے۔ گزشتہ دنوں (۹ اگست) اسمبلی میں سوالات کے گھنٹے میں اس بات پر بڑا ہنگامہ ہوا کہ ایک ایم۔ ایل۔ اے، کے بیٹے اور ایک ممبر پارلیمنٹ کے بھائی نے ملکر ایک منصف کو پیٹا ہے۔ نائب وزیر داخلہ آر کے دویدی نے اس واقعے کی جو ۲۶ جون کو ہوا تھا تفصیل بتائی اور ممبران کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ "سی۔ آئی۔ ڈی، معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے" لیکن ممبران اس بات پر ناراض ہوئے کہ وزیر موصوف نے متعلقہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبروں کے نام نہیں بتائے، اور آخر میں اسپیکر کی مداخلت پر انہیں نام بتانے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ممبر پارلیمنٹ کا نام ہے مسٹر کرشن چندر پانڈے اور اسمبلی کے ممبر کا نام ہے مسٹر دھنش دھاری پانڈے۔ دونوں کے بارے میں یقین ہے کہ واقعے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن دونوں کے عزیزوں نے ایک بُری حرکت کر کے انہیں بدنام ضرور کیا ہے"

ایک کے بھائی اور دوسرے کے بیٹے نے ملکر اگر ایک منصف کو پیٹا تو یقیناً یہ ہمت انہیں اسی لئے ہوئی کہ ان کا تحفظ کرنے والے موجود ہیں۔

سی۔ آئی۔ ڈی، کیا رپورٹ دیتی ہے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے، لیکن الزام کے صحیح ثابت ہونے پر اگر مجرمین کو سزا نہ ملی اور ان کا تحفظ کیا گیا تو قدرتی طور پر اس کا نظم و نسق پر اثر پڑے گا۔

جمہوریت اور آزادی کے معنے یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو ہر قسم کے قانون اور ضابطے کی گرفت سے آزاد کر لے اگر مسٹر کملا پتی ترپاٹھی نے اس سلسلے میں فوری قدم نہ اٹھایا تو انکی حکومت بدنام ہو کر رہ جائے گی جس کے نتیجے میں سیاسی ہوا کا رخ پلٹ سکتا ہے۔

وزیر اعظم کا مجوزہ دورہ

یہ اعلان غیر متوقع نہیں ہے کہ وزیر اعظم ہند مسز گاندھی کچھ یورپین ملکوں کا دورہ کریں گی۔ روس بھی جائیں گی اور امریکا بھی۔ بنگلا دیش سے آنے والے پناہ گزینوں کے نتیجے میں جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اس سے دنیا کو واقف کرانے کے لئے مختلف وزرا مختلف ممالک کا دورہ کر رہے ہیں۔ ممبران پارلیمنٹ تو چاہتے تھے کہ وزرا کے علاوہ ان کے بھی کچھ وفود دنیا کے بعض ممالک میں جائیں۔ اگر وزیر شہری فضائیہ ڈاکٹر کرن سنگھ، اسپیکر مسٹر ڈھلون کی دو جمبو جیٹوں کے لئے درخواست منظور کر لیتے تو شاید یہ وفود اس وقت دنیا کی سیر کر رہے ہوتے۔ لیکن ممبران پارلیمنٹ کی یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور شاید آئندہ کی توقع بھی ختم ہو گئی، کیونکہ وزیر اعظم کے دورہ کرنے کے بعد شاید دوسرے وفود کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ضروری اطلاع

انگلستان کی مشہور عالم کرکٹ ٹیم پر ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی شاندار تاریخی فتح کی دلچسپ کہانی اور انگلستان میں اُن کے کھیلے ہوئے تمام میچوں کی مکمل روداد۔

تصویروں کے ساتھ

واقعات کے آئندہ شمارے میں پڑھئے

(ادارہ)

لال قلعہ سے — قطب مینار تک



دہلی میں ایڈورڈ کنیڈی اور اندرا گاندھی

سینیٹر کنیڈی

سینیٹر ایڈورڈ کنیڈی آئے اور چلے گئے۔ انھوں نے [illegible] میں پناہ گزینوں کے کیمپوں کو دیکھا۔ مشرقی [illegible] چاہتے تھے لیکن فوجی حکمرانوں نے اس علاقے [illegible] ان کے لئے بند کر دیئے۔ مجبوراً وہ نئی دلی واپس [illegible] اور وزیر داخلہ سے باتیں کیں۔ ایک [illegible] اپنے خیالات ظاہر کئے اور چلے گئے۔ [illegible] امریکی کانگریس کے ان ممبروں میں [illegible] کہ جب تک مشرقی بنگال میں حالات [illegible] وقت تک کسی قسم کی امداد پاکستان کو [illegible] جب وہ بول رہے تھے [illegible] کی نمائندگی کر رہے تھے۔ امریکی کانگریس یا دوسرے معنوں میں امریکی عوام سینیٹر کنیڈی کے ہی ہم خیال ہیں۔ کانگریس نے پاکستان کیلئے بطور خاص ۴ کروڑ ۵۵ لاکھ ڈالر (۳۳۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے) کی امداد کو روکنے کے حق میں رائے دی لیکن نکسن ایڈمنسٹریشن نے کانگریس کے اس فیصلے کو نظر انداز کر دیا۔ پورا امریکی پریس بھی ایڈمنسٹریشن کی موجودہ پالیسی کے خلاف ہے۔ نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ جیسے اخبارات سرکاری پالیسی کی مذمت کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ہندوستان یا برطانیہ میں پارلیمنٹ اس طرح کا کوئی فیصلہ دے دیتی یا چوتھا رکن حکومت "مخالف بن جاتا تو وہاں کے وزیر اعظم کو اپنی گدی چھوڑ دینی پڑتی۔ لیکن امریکا کے صدر ہیں کہ نہ عوامی مانند دیا کی سن رہے ہیں اور نہ پریس کی۔ کسی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ امریکی آئین نے انھیں عملاً ڈکٹیٹر بنا دیا ہے۔

ابراہیم لنکن نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ "جو عوامی حکومت عوام کے ذریعے عوام کے لئے کام کرے۔ وہی جمہوری حکومت ہوتی ہے۔ لیکن آج ایسا معلوم ہوتا ہے امریکا میں جمہوریت کی قدریں بدل گئیں ہیں اور وہاں کی جمہوریت "نکسن کی حکومت، نکسن کے ذریعے، نکسن کے لیے" بن کر رہ گئی ہے۔"

واشنگٹن میں ہندوستان کے سفیر مسٹر ایل۔ کے جھا نے ٹیلی ویژن انٹرویو میں نکسن ایڈمنسٹریشن پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن امریکی عوام کے بارے میں کہا کہ "وہ ہمارے دوست ہیں۔ دراصل یہ اس بات کے اظہار کا ایک ڈپلومیٹک طریقہ ہے کہ مسٹر نکسن عوام کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔

مسٹر کنیڈی جس انداز سے نئی دلی کی پریس کانفرنس میں بول رہے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ امریکی عوام کے حقیقی نمائندے وہی ہیں۔ دراز قد، بڑا سر، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ۔ وہ بالکل اپنے مقتول بھائی مسٹر کنیڈی سابق صدر کے مشابہ نظر آرہے تھے اور سچ پوچھئے تو امریکی صدر کی طرح بول رہے تھے۔ بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ۔

ایک نامہ نگار اپنے دوسرے ساتھی سے آہستگی سے بولا: "یہ امریکا کے مستقبل کے صدر معلوم ہوتے ہیں۔"
دوسرا: "مگر ان کے خاندانی افراد انھیں صدارتی الیکشن کب لڑنے دیں گے، ان کے دو بھائی تو صدارتی چکر میں پھنس کر جان بحق ہو چکے ہیں۔"

کنیڈی خاندان ایک آئرش نژاد ہے اور کیتھولک ہے امریکا کی تاریخ میں پہلی بار کیتھولک عیسائی صدر بنا اور وہ گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ دوسرا بھائی ابھی صدارت کے لئے لڑ ہی رہا تھا کہ اسے بھی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے خاندان والے کہتے ہیں کہ ہم بے صدارت ہی اچھے ہیں۔ سینیٹر بن کر ہی کام کرتے رہو۔ اور سینیٹر کی حیثیت سے ایڈورڈ کنیڈی اس وقت

ی کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں اس کا اظہار انھوں
ں کانفرنس میں کر دیا۔ یہ کتنی بڑی انسانی خدمت ہے
نے اعلان کیا کہ وہ فوجی حکمرانوں کو جو اس برصغیر
کے خرمن امن کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اسلحہ
ں میں نہیں ہیں اور اس کے لیے برابر امریکی سینیٹ
رہیں گے۔

جن سنگھ کا تحفہ گندگی

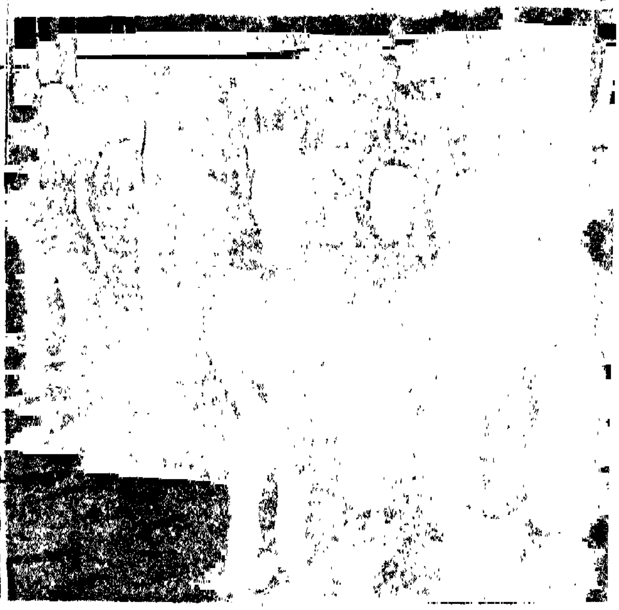
دلّی میں اس مرتبہ مچھروں کی بھرمار ہے۔ فصیل کے اندر کا شہر اس وبا سے محفوظ رہا کرتا تھا لیکن جن سنگھ کے ایڈمنسٹریشن کے جہاں دوسرے تحائف دلّی والوں کو ملے ہیں ان میں ایک محلّوں کی گندگی اور اس گندگی کے طفیل مچھروں کا تحفہ بھی ملا ہے۔

جس طرح جن سنگھ پھوٹ پھیلاتا ہے اسی طرح مچھر ملیریا پھیلاتا ہے۔ چنانچہ دلّی میں ملیریا کا زور شروع ہو چکا ہے اور کارپوریشن ابھی اسکا مقابلہ کرنے کی صرف تیاریوں میں مصروف ہے۔ اگر تیاریوں میں بھی وہ مصروف نہ ہوتی تو اس کا کوئی کیا بگاڑ لیتا۔

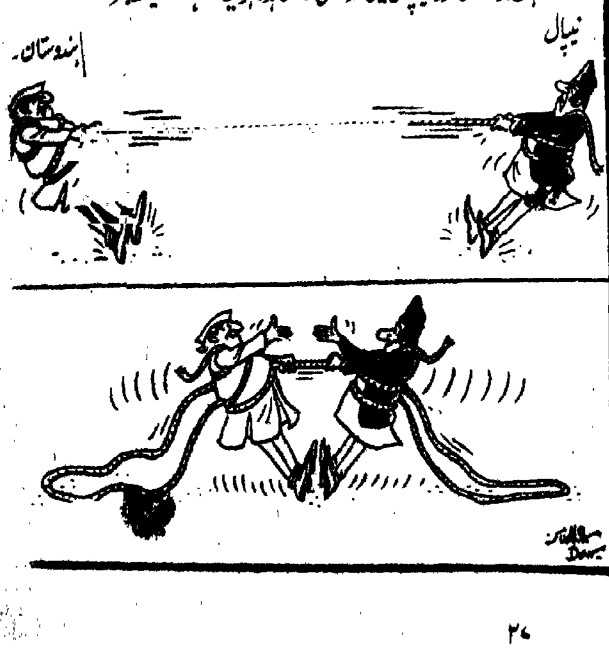
محلّوں میں گندگی، جگہ جگہ گڑھے۔ ان میں پانی اور مچھر۔ اللہ کی پناہ۔ ایک جن سنگھی ممبر کارپوریشن کو توجہ دلائی گئی تو فرمانے لگے۔

"یہ حکومت کے خاندانی منصوبے کی حوصلہ افزائی ہے۔ دلّی کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔"

دہلی میں خوب صورت فوارے تو بن گئے لیکن پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ ذرا سی بارش میں تمام شہر پانی اور گندگی سے بھر جاتا ہے۔



ہندوستان اور نیپال میں دوستی کا معاہدہ ہوگیا ہے - ایک خبر



رحمٰن پر مقدمہ شروع ہوگیا ہے - ایک خبر



شیخ مجیب کے خلاف مقدمہ

امی لیگ لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف مقدمے تک حکومت پاکستان خاموش تھی عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں۔ ایک سماں ایجنسی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شیخ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور مقدمے کا ڈھونگ کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے رچایا جارہا ہے۔ لب پہلی بار پاکستان نے اپنی مہر سکوت توڑی ہے کیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف گذشتہ کی پہلی پیشی ہوئی اور انھوں نے اپنی وکالت لئے تین وکلاء کے نام پیش کئے جن میں مسٹر بروہی کا نام سرفہرست تھا۔ چنانچہ حکومت نے رابطہ قائم کرکے انھیں مقدمے کی پیروی کرنے دی اور وہ شیخ سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

شیخ کے خلاف اس مقدمے پر اس وقت ساری دنیا ہی ہوئی ہے اور دنیا کا کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جو ناپسندیدگی کا اظہار نہ کررہا ہو۔

لمی سیاستدانوں کی دلچسپی اور تشویش کا اس بات لگایا جاسکتا ہے کہ جب مسٹر ایڈورڈ کینیڈی سے پریس کانفرنس میں کسی نامہ نگار نے اس بارے سوال نہ کیا اور جب منٹ کی پریس کانفرنس ختم تو انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا اور خود ہی جلسے میں اظہار خیال کرکے حکومت پاکستان کے نکتہ چینی کی۔

مسٹر ایڈورڈ کینیڈی ہوں یا کوئی اور عالمی سیاستدان شیخ کے بارے میں اس لئے اعتراض ہے کہ شیخ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ہردلعزیز لیڈر ہیں اور کے الفاظ میں ان کا قصور صرف یہ ہے کہ انھوں انتخابات میں زبردست اکثریت حاصل کی تھی۔ ایسی

اکثریت کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے باوجود ان پر وہ لوگ مقدمہ چلائیں جو عوامی نمائندے نہیں ہیں۔ اس سے بڑی اور کوئی زیادتی نہیں ہوسکتی۔

شیخ کے خلاف مقدمے پر جن ممالک یا جن عالمی سیاستدانوں نے تشویش کا اظہار کیا، انھیں پاکستانی حکمرانوں نے مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس انھوں نے سوڈان اور مراکش جیسے ان ملکوں کی مثال دے کر جہاں فوجی لیڈروں نے مخالف فوجی لیڈروں کو گولی کا نشانہ بنایا اپنے اقدام کو جائز قرار دینے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ انھوں نے بہت نرم پالیسی اختیار کی ہے۔ لیکن شاید انھیں نہیں معلوم کہ مذکورہ ممالک کے فوجی لیڈروں میں جنہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا، اور شیخ مجیب الرحمٰن میں بڑا فرق ہے اول الذکر نمائندے نہیں تھے اور نہ انھوں نے الیکشن لڑکر اپنی ہردلعزیزی اور عوام کے نمائندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن مسلمہ جمہوری طریقے پر منتخب ہوکر آئے تھے اور انھیں اقتدار حاصل کرنے کا پورا حق تھا لیکن جب اقتدار کی منتقلی کا وقت آیا تو انھیں گرفتار کرکے ان پر مقدمہ بھی چلانا شروع کردیا گیا۔ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور جمہوریت کا خون ہے جسے جمہوریت نواز دنیا کسی حالت میں معاف نہیں کرے گی۔

اگر پاکستانی حکمرانوں نے دنیا کی تاریخ پڑھی ہے تو وہ محسوس کریں گے کہ جب کبھی کسی قوم کے ہیرو کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے تو اس سلوک سے وہ قوم مری نہیں بلکہ اور زیادہ طاقتور بن کر ابھری ہے۔ وقتی طور پر توپوں اور سنگینوں کے ذریعے کسی قوم کو دبایا جاسکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں ہوسکتا۔

رفتہ رفتہ جس طرح مشرقی پاکستان کے باشندے مرکز کی فوجی حکومت سے بغاوت کررہے اور مختلف ممالک میں تعینات بنگالی ذمہ داران حکومت اپنے عہدوں سے الگ

ہوکر بنگلادیش کی حکومت کے ساتھ اظہار وفاداری کررہے ہیں، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی ہردلعزیزی کسی طرح بھی کم نہیں ہوئی ہے اور بنگالی عوام کے دلوں پر بدستور ان کا قبضہ ہے۔ ایسے شخص کے خلاف مقدمہ چلانا اور اس کے ساتھ مفاہمت کی کوئی بات چیت نہ کرنا فوجی حکمرانوں کی سیاست وتدبر کے دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ وہ جو کچھ کررہے ہیں اسے بےتدبیری اور دھاندلی تو کہا جاسکتا ہے دانشمندی نہیں اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ موجودہ حکمرانوں کے حق میں کچھ اچھا نہیں نکل سکتا۔ حالات کو معمول پر لانے کا اس وقت صرف ایک ہی طریقہ تھا، وہ یہ کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف مقدمے کو واپس لیا جاتا اور ان کے ساتھ بات چیت کرکے بنگلادیش کا کوئی ایسا حل نکالنے کی کوشش کی جاتی جس سے مشرقی بنگال کے عوام مطمئن ہوسکیں، اور اس حل کی کنجی صرف شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس ہے۔ لیکن پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی یہ کتنی نادانی ہے کہ یہ اسی شخص کو مارنے کی فکر میں ہیں جو انھیں اس دلدل سے نکال سکتا ہے جس میں وہ اس وقت پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ مجیب کو درمیان میں سے ہٹاکر مشرقی بنگال کے مسئلے کو حل کرسکیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے۔ شیخ کے خلاف فوجی حکومت کے کسی غلط اقدام سے عوامی جذبات اس قدر مشتعل ہوسکتے ہیں کہ صرف مشرقی بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے پاکستان کا وجود خطرے میں پڑسکتا ہے۔ لیکن شاید پاکستان کا فوجی ٹولہ اس وقت بہرہ گونگا بن گیا ہے۔ انسان کی عقل پر جب پردہ پڑجائے تو وہ کسی کی بات نہیں سنتا بلکہ اسے خودکشی کرنے میں مزہ آتا ہے۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف کارروائی نہیں کررہے ہیں بلکہ خود اپنی موت کو آپ دعوت دے رہے ہیں۔

ایف۔اے۔بادشاہ

میں اپنے سامنے کھڑی شخصیت کو قتل کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ میرے لئے اجنبی ہے پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ ایک عرصے سے میں اسے قتل کر دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، لیکن اس کے لئے میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ نہ جانے کیسے پیدا ہو جاتا ہے کہ میں آج تک اس کا خاتمہ نہ کر سکا۔ میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں اس کے خدوخال مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ چہرے پر بنی ہوئی لمحوں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ویسے اس کا سارا وجود بھیگی بلی کی طرح ہے۔ ماحول سے خوف کھایا ہوا سہما سہما سا رہتا ہے۔ مجھے اس کی بزدلی سے ہی نفرت ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔

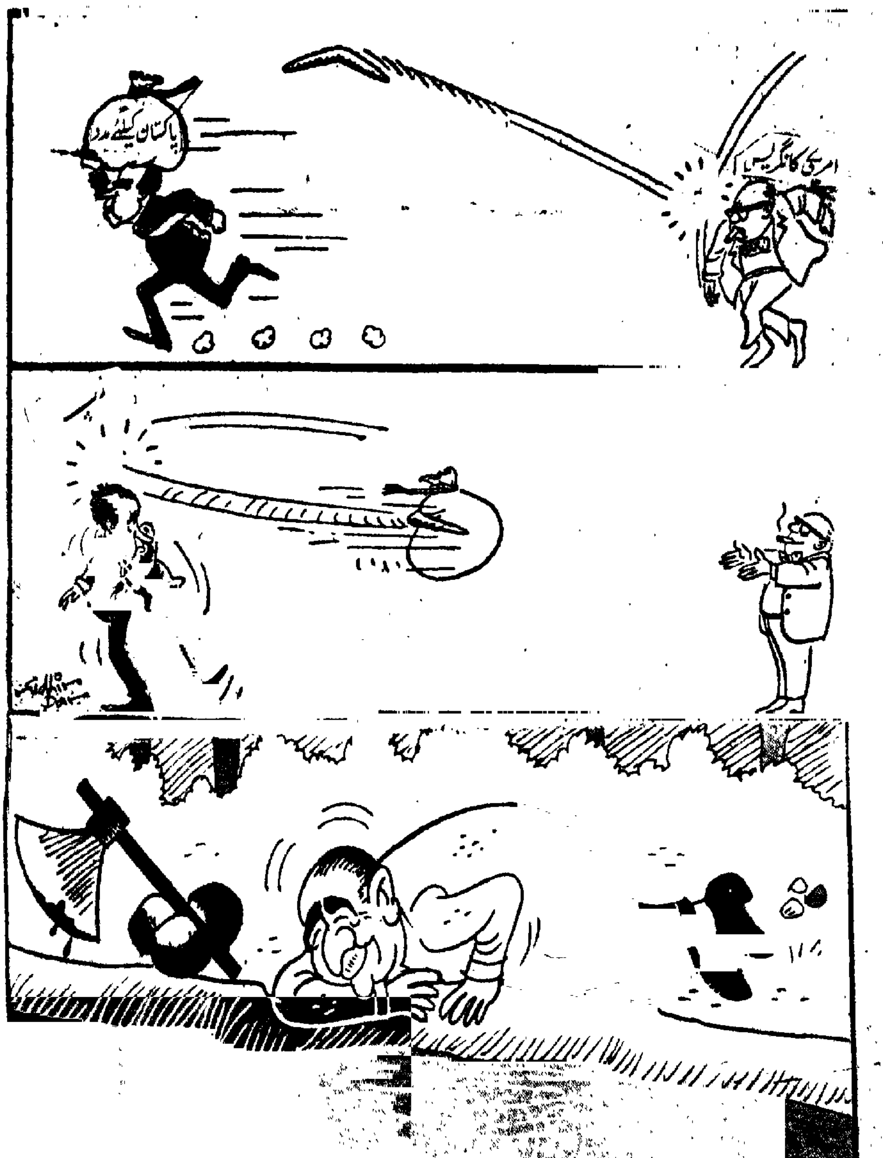
ازل سے وسیع و عریض صحرا میں بھٹکا ہوا مسافر آج بھی ہونٹوں پر وہی پرانی تشنگی لئے عمر کی آخری دہلیز پر کھڑا ہانپ رہا ہے اور اس کی ڈولتی ہوئی پرچھائیں پانی پہ۔ بنا عکس نہیں صرف سراب ہے۔ اور آج تک یہ اسی سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ خود فریبی میں مبتلا، زمانے والوں سے ہراساں، اپنوں سے نظریں چرائے غیروں سے دہشت زدہ نہ جانے کون سی منزل کی سمت چلا تھا کہ سفر کے اختتام پر بھی منزل کا دور تک پتا نہیں۔ شعلوں کا رقص جب سرد ہوتا ہے تو راکھ کا ڈھیر آگ لگنے کی گواہی دیتا ہے۔ طوفان گزر جانے کے بعد اجڑے ہوئے مکانات اس کی داستان کہتے ہیں۔ سمندر کی بھیانک لہریں موت کے کھیل سے تھک کر جب ساکت ہو جاتی ہیں تو زخم خوردہ ساحل ان کے پاگل پن کا نشان بن جاتا ہے لیکن اس بدنما ہیولے کے پیچھے صرف ریت ہی ریت ہے جس پر ایک ننھا سا دھبہ بھی نہیں۔ کون کہے گا کہ یہ اس طویل مسافت سے آ رہا ہے۔ کون مانے گا کہ اتنے لمبے سفر میں اس کا کوئی ہمسفر نہ تھا۔ وہ صلیب جو صدیوں پہلے کھو گئی تھی آج ملی بھی تو اس پر ایسا عیسیٰ چڑھا ہوا تھا جس کا کوئی شناسا نہیں کوئی پجاری نہیں۔ وقت کے کینوس پر بنی ہوئی یہ دھندلی تصویر آج بھی ایسے فنکاروں کی منتظر ہے جو اس کے رنگ کو گہرا کر سکتے ہوں۔ اس کی خاموشی کو زبان دے کر اس کے وجود کا بھی لوگوں کو احساس دلا سکتے ہوں۔ لیکن ریگستان میں کہیں بھی سایہ دار درخت نہیں۔ صرف دھوکا ہی دھوکا۔ فریب ہی فریب۔ اور یہ خود کو ہی دھوکا دیتا آیا ہے۔ اپنے آپ سے ہی فریب کرتا رہا ہے۔ اس امید پر کہ کوئی اسے دھوکا نہیں دے گا۔ کوئی اس کے ساتھ فریب نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے یقین پر خراشیں پڑتی ہی رہیں اور امید کی کمزور روشنی اندھیرے کے سمندر میں ڈوبتی ہی چلی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے اپنے ہونٹ سی لئے۔ چہرے پر حماقتوں کا غلاف ڈال لیا۔ لوگ اسے بیوقوف سمجھنے لگے۔ بہن اسے بیوقوف بنانے لگی۔ وہ بہن جو اس سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی اسے بدھو سمجھتی۔ وہ دوست جس کا اس نے بچپن کے معصوم لمحوں میں بھی ساتھ دیا تھا اور جوانی کے سخت دنوں میں بھی اسے حماقتوں کا مجسمہ سمجھتا تھا۔ اور یہ چپ چاپ دوستی کے پاک دامن پر غلاظت کی پڑتی ہوئی ان چھینٹوں کو دیکھ رہا تھا اور بہن اور دوست کے بیچ نامہ بر کا کام کر رہا تھا۔ بالکل انجان کی طرح جیسے کچھ نہ جانتا ہو۔ کچھ نہ سمجھتا ہو۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی لیکن لوگ اس سے شکایت کرنے چلے آتے تھے۔ یہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوا لیکن اسے دیکھتے ہی لوگوں کے ماتھوں پر بل پڑ جاتے اور یہ مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے قریب سے گزر جاتا تھا جیسے پیچ پیچ کوئی بڑا گناہ کر کے آ رہا ہو۔ ایسی حالت میں میری خواہش ہوتی کہ اسے چلتی ہوئی ٹرین کے آگے دھکیل دوں یا اسے بھاری پتھروں سے جکڑ کر دریا کے حوالے کر دوں۔

میں اس کی بے وقوفی کے وہ دن آج تک فراموش نہیں کر سکا جب یہ امتحان کے دنوں میں اپنے نوٹس (notes) دوستوں کو دے دیا کرتا تھا اور اپنے پڑھنے کے لئے کچھ نہ رکھتا۔ وہ نوٹس جن کو تیار کرنے میں مہینوں لگ جاتے دن رات ایک کر کے کئی کتابوں کے مطالعے کے بعد کوئی نوٹس بنتا تھا، اور اتنی جگر سوزی سے تیار کئے ہوئے نوٹس اس سے دوست چھین لے جاتے اور بعض تو ایسے غائب ہوتے کہ پھر نظر نہ آتے۔ اور یہ صرف اپنے آپ پر جھنجھلا کر رہ جاتا۔ کسی سے کچھ نہ کہتا۔ کچھ نہ پوچھتا۔ اور اگر اس کے بعد بھی کوئی نوٹس لینے آ جاتا تو یہ بغیر کچھ کہے نوٹس دے دیتا۔ اس میں انکار کی عادت نہ ہونے کے باعث یہ لوگوں کے لئے مذاق بن گیا! اس کی بے لوث خدمت کے جذبات مجروح ہوتے رہے زندگی آہستہ آہستہ بربادی کی طرف بڑھتی گئی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگی رہی۔ اس کے ہونٹ اس وقت بھی وا نہیں ہوئے جب اس کے خوابوں نے سسک کر دم توڑا تھا۔ اس کے سامنے سے اس کی آرزوؤں کا جنازہ گزرا!! اپنی تمناؤں کی لاش کو کاندھا بھی نہ دے سکا۔ کسی کے ہو جانے کا خوف تھا۔ ڈر تھا کہ اس کی ایک ہلکی سی لغزش سے بھی سماج کی گندی انگلیاں اٹھیں گی اور اس کے دل کی پر زور دھڑکنوں میں پوشیدہ خوب صورت تصویر پر غلاظت کا کیچڑ اچھال دیں گی۔ فریم ٹوٹ جانے کے بعد تصویر نہیں کھونا چاہتا تھا۔ خاموش۔ چپ چاپ آگ کے شعلوں میں گھرا جلتا رہا۔ آگ جو اس کے دل سے اٹھی تھی اور سارے وجود پر چھا گئی اپنے ہی احساسات کے تیزابی اثر سے گھلتا رہا اور اف تک نہ کی۔ اس کا یہ آخری خواب بھی جب ریت کی دیوار ثابت ہوا تو اس نے تنہائیوں کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ لیکن تنہائیوں میں تلخیوں کا سارا زہر میں پیتا رہا۔ اس کی خاموشی کا سارا دکھ میں نے سہا۔ کمرے کے اندھیرے میں روشنی کی لکیر ڈھونڈتا رہا لیکن ایک ہلکی سی کرن بھی ہاتھ نہ آئی۔ صرف گھٹن بڑھتی گئی۔ تاریکی میرا گلا دبا رہی تھی۔ میری سانسیں رک رہی تھیں اور میں چیخ رہا تھا۔ لیکن کوئی آواز میری طرف نہ لپکا۔ دل و دماغ کے بند دریچوں پر کسی نے دستک نہ دی۔ کوئی ہاتھ سہارا دے

... کے گرد ... بندھا ہوا ہے اور
... کا تعصب میں جکڑا ہوا جسم وقت کے ٹوٹ جانے کا
... لیکن میں اس سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دینا چاہتا
... ابدی نفرت سے نجات مل جائے۔ اس کے باوجود
... شدید نفرت کرتا ہوں۔ اس کے لئے میرے دل ..
... کا جذبہ نہ جانے کہاں سے آجاتا ہے۔ شاید اسلئے
... اپنی شخصیت ہے۔ میرا اپنا وجود ہے۔
لیکن آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنا وجود ختم کر دونگا

دھرتی پر ... سے کوئی ناطہ نہیں ...
لئے نہیں۔ کوئی ... کوئی ... نہیں تو یوں ...
گیا۔ پیار مرنے سے ایک بد ... ہے۔ اب تو زندگی کے
ایسے موڑ پر ہوں جہاں کوئی امنگ باقی نہیں رہتی۔ جذبات
سرد ہو جاتے ہیں۔ سامنے دھندلکا پھیلا ہوتا ہے۔ کمزور و
ناتواں جسم کو صرف ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔
جس کے ذریعے آدمی بچی ہوئی زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ لیکن
میرے پاس صرف دیواروں کا سہارا ہے۔ اور میں جو زرد

... کی زندگی ... اس لئے خودکشی کی نیند
سلا دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔
لیکن — میں جانتا ہوں کہ میں صرف سوچ سکتا ہوں کچھ
کر نہیں سکتا۔ آج تک صرف سوچتا ہی تو آیا ہوں۔ کہاں کچھ
کر سکا۔ بزدل ہی جو ٹھہرا۔ اور اب تنہائیوں سے لپٹ کر
رونا چاہتا ہوں۔ ایسے وقت میں جب آنسو بھی ساتھ
نہیں دیتے ہیں۔



...کانگریس نے
...ان کو دی جانے
...م امداد پر
...کر دی ہے۔
...ایک خبر

...یحییٰ خان نے
...ہے کہ بنگلادیش
...نے کے بعد
...ستان اور زیادہ
...ط ہو گیا ہے۔
...خبر



روشن آرا نیر

صبح کاذب کا اُجالا آسمان کے بیضوی کناروں پر پھیلنے لگا تھا۔ ہر جگہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سید باڑے قدیم عمارتوں میں بھی کہیں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ شکست ت کے باوجود سید باڑے کی شان دم بخود کر دینے کیلئے جگہ کافی تھی۔ کہتے ہیں کسی نواب نے ایک شب کے قیام دولت باڑہ بنوایا تھا۔ اور سیدوں کی خدمت سے خوش ایک بہت بڑی جاگیر بھی عطا کی تھی۔ اس وقت یہاں کی تہذیب کا بول بالا تھا اور روح القدس کی برکتوں سارا محلہ خوشحال تھا۔ مگر یہ ماضی کی باتیں تھیں سید باڑے کے ماضی سے لوگوں کی عقیدتیں اب بھی وابستہ تھیں بلکہ قابلِ رہائش کوٹھریوں کو کرائے پر اٹھا دیا گیا تھا۔ پہلے جن کوٹھریوں سے تلاوتِ کلامِ پاک کی روح پرور آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اب ان سے فلمی نغمے ابھرتے رہتے تھے۔ ترقی پسندوں نے باڑے کو وہ رنگ دیا تھا جسکا تصور کرتے ہی ہمیں اپنی سسکتی تہذیب اور پسماندہ اخلاق کا شدید احساس ہوتا ہے۔

زینت بیگم تلاوت کے بعد کوٹھری سے باہر آئیں۔ اور انھوں نے آنگن میں دیکھا۔ صبح کی تازہ ہوا میں پھول کے پودے جھوم رہے تھے۔ اسی لیے آنگن کے آخری سرے پر بنی ہوئی ملازم کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اور صاف رنگ کا ایک نیم بالغ چھوکرا باہر آیا۔ اس نے نیندیا سی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ وقت کا احساس ہوتے ہی اس نے جلدی جلدی کرتے اور پائجامے کی سلوٹوں کو دور کیا اور نل سے پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ قمیص کے دامن سے منہ پونچھتا باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ زینت بیگم نے پکارا :۔

"شوکت"

ت نئی دہلی

...نے چونک کر انکی طرف دیکھا۔ زینت بیگم پلنگ پر بیٹھی تھیں شلوار اور قمیص پر انھوں نے ہلکی گلابی کشمیر[ی] چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ انکے قریب جا کر بولا۔

"جی چھوٹی بیگم۔"

"تو آج پھر دیر سے اٹھا ہے۔ جا جلدی سے چولہا سلگا [اور ناشتہ بنا] دے۔" زینت بیگم نے کہا۔ "میں بھی آتی ہوں [ور]نہ سید صاحب کو باہر جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

شمو گردن ہلاتا ہوا چلا گیا اور تیزی سے کام نبٹانے لگا۔ [بیچ بیچ] میں وہ چور نگاہوں سے زینت بیگم کو دیکھ لیتا تھا۔ ... زینت بیگم نہ جانے خلاء میں کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہ [اس] کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اُسے اپنی چھوٹی بیگم سے بڑی انسیت [تھی]۔ بڑی بڑی آنکھیں اور سرخی مائل رنگت والی چھوٹی بیگم پر [اسے] بے حد ترس آتا تھا۔ خوبصورتی کے علاوہ ان کے اندر بہت [سی] خوبیاں بھی تھیں۔ پھر بھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ [کبھی کبھی] شمو کے دل میں آتا کہ وہ اس کی وجہ چھوٹی بیگم سے [پوچھے] لیکن پھر اپنی حیثیت کا احساس ہوتے ہی وہ اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیتا۔ وہ دو سال سے باڑے [میں] ملازم تھا۔ ان دو سال کے عرصے میں اس نے گھر کے ہر [فرد] کے لئے ایک خاص نظریہ قائم کیا تھا، اور زینت بیگم کے [لئے] اس کے دل میں کافی عقیدت تھی۔ اس عقیدت کی وجہ [زینت] بیگم کا خلوص اور اخلاق تھا۔

[سید] صاحب بیدار ہو چکے تھے۔ سید باڑے کے مالک [کو سید] صاحب کہا جاتا تھا اور یہ سلسلہ اب بھی قائم تھا حالانکہ [اس لقب] کا اب کوئی وقار نہیں رہا تھا۔ وہ کوٹھری سے [نکل] کر بولے۔

"ناشتہ جلدی لے آ رے شمو۔"

"ابھی لایا حضور۔" شمو جواب دے کر تیزی سے ناشتے کی سینی لے کر بھاگا۔ سید صاحب ناشتے سے فارغ ہو کر باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی وہ پانی گرم کرنے لگا۔ کوئی بھی موسم ہو بڑی بیگم نیم گرم پانی سے غسل کرتی تھیں۔ ان کی عادتیں کسی نواب زادی سے کم نہ تھیں۔ مخاطب کرنے کا انداز بھی [شاہانہ] تھا۔ باہر سے آئی ہوئی عقیدت مند عورتوں کے ساتھ [بیٹھ کر] گپ شپ لڑانے کے علاوہ انھیں اور کوئی کام نہ تھا۔ دونوں بچے [زیادہ تر] شمو کی نگرانی میں رہتے تھے۔ زینت بیگم کا رتبہ [بھی] ان سے کم نہیں تھا۔ مگر بڑی بیگم کی نگاہوں میں انکی کوئی وقعت نہ تھی اور یہی وہ خاص وجہ تھی جس کے سبب شمو کو سخت نفرت تھی۔ خاموش کھوئی کھوئی سی رہنے والی چھوٹی بیگم پر اسے بے حد ترس آتا تھا۔ اس کے دماغ میں ہمیشہ یہی بات رہتی "آخر ان کی شادی کیوں نہیں ہوتی" اور ایک بار اتفاق سے اس نے بڑی بیگم کی باتیں سن لیں جن سے کچھ حقیقتیں اس پر ظاہر ہو گئیں۔

بڑی بیگم اس روز سید صاحب پر اس لئے بگڑ رہی تھیں کہ وہ زینت بیگم کا رشتہ باہر سے لائے تھے۔ بڑی بیگم کو یہ رشتہ اس لئے ناپسند تھا کہ لڑکے کی ماں سیدانی نہیں تھی اور سید باڑے کا یہ ایک قدیم اصول تھا کہ وہ لڑکیوں کا رشتہ خالص سید لڑکوں سے کرتے تھے۔ لڑکوں کو تو خیر یہ آزادی تھی کہ وہ اپنی پسند کی شادی وہ باہر سے بھی کر سکتے تھے۔ لڑکی کی شادی اگر کسی صورت سے نہیں ہوتی تو باہر سے آئے ہوئے ان رشتوں پر توجہ دی جاتی جہاں ماں باپ دونوں خالص سید ہوتے۔ وہ زمانہ اور تھا جب یہ رسم پروان چڑھی ہوگی لیکن اب اس نئے دور میں جب کہ ذات کی کوئی قید نہیں رہی تھی، خالص سید کہاں سے آتے؟

دن چڑھ آیا تھا۔ بڑی بیگم ناشتہ کر چکی تھیں، زینت بیگم بھی اپنی کوٹھری میں جا چکی تھیں۔ وہ چائے لے کر زینت بیگم کی کوٹھری کے پاس آیا اور بولا:۔

"چھوٹی بیگم چائے لایا ہوں۔"

"اندر لے آ، شمو۔"

شمو اندر داخل ہوا۔ زینت بیگم پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں انھوں نے پیالا لے لیا۔ شمو کھڑا رہا تو زینت بیگم نے سمجھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے پوچھا:۔

"کیا بات ہے شمو۔ تجھے کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں چھوٹی بیگم۔" شمو کے منہ سے یکایک نکلا۔ جس بات کی کرید اس کے دل میں ایک عرصے سے تھی، اور آج جب کہ یہ موقع خود چھوٹی بیگم نے دیا تو وہ اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا وہ ہمت کر کے بولا:۔

"مگر ڈر لگتا ہے۔ آپ غصہ نہ ہو جائیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں غصہ نہ کروں گی۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ۔" زینت بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"چھوٹی بیگم۔" شمو نے کہا۔ "یہ خالص سید کسے کہتے ہیں؟"

زینت بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگیں شمو یہ کیوں جاننا چاہتا ہے۔

شمو کے معصوم چہرے پر تجسس اور خوف کی جھلک تھی۔ زینت بیگم کو وہ ایک ایسے معصوم ضدی بچے کی طرح لگا جو ہر نئی بات جاننے کے لئے مچل جاتا ہے۔ مگر اس کے آگے بھی تو ممکن ہے وہ کچھ جاننا چاہے۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتی رہیں اور پھر دھیرے سے بولیں:۔

"خالص ایک کفن ہے جو ارمانوں کی لاش پر ڈالا جاتا ہے" پر تو یہ سب جان کر کیا کرے گا شمو؟۔

"چھوٹی بیگم۔ ایمان کی بات کہوں۔"

"ہاں ضرور کہہ۔" زینت کی دلچسپی بڑھی۔

"چھوٹی بیگم محلّے میں کتنی برات آتی ہیں۔ آپ کی عمر کی ساری لڑکیاں بیاہی گئیں۔" شمو نے ایک ایک کر کہا۔ "مگر آپ کی شادی نہیں ہوتی، حالانکہ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ اور پھر آپ کسی ہیروئن سے کم خوب صورت بھی نہیں۔"

شمو کے سوال نے زینت بیگم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا سوال تھا لیکن اس کے اندر جو طاقت تھی اس کی دھمک سے وہ کراہ اٹھیں انھیں محسوس ہوا جیسے شمو نے ان کے چہرے پر بھرپور طمانچہ مار دیا ہو۔ ایسا سوال کر کے اس نے زینت بیگم کو بے نقاب کر ڈالا تھا۔ ایک ملازم کی یہ ہمت! ان کے چہرے پر غصے کی سرخی سی آ گئی۔

چھوٹی بیگم کا چہرہ دیکھ کر شمو کا رنگ اڑ گیا۔ مگر اس کے بھولے چہرے کو دیکھ کر دھیرے دھیرے زینت بیگم کا غصہ اتر گیا اور چہرے کی سرخی کی جگہ ایک عجیب قسم کا پھیکا پن چھا گیا انھوں نے کہا۔

"تو بہت باتونی ہو گیا ہے رے شمو۔ لیکن ۔۔ یہ ہیروئن کیا ہوتی ہے؟"

"یہ خوب رہی" شمو کا حوصلہ واپس آیا تو اس نے چہک کر کہا۔

"آپ ہیروئن نہیں جانتیں۔ اجی فلم میں کام کرنے والی خوب صورت عورتوں کو ہیروئن کہا جاتا ہے۔"

فلم کے متعلق زینت بیگم کی معلومات صفر کے برابر تھیں ان کی دنیا تو بس سید باڑے کی چار دیواری تک محدود تھی اور اس چار دیواری سے آج تک ان کے قدم باہر نہیں نکلے تھے۔ انھوں نے پوچھا۔

رسالے دیکھ کر چھوٹی بیگم" شمّو جلدی سے بولا۔
"پروفیسر صاحب کی لڑکیاں مجھ سے برابر رسالے منگواتی ہیں اور تین چار بار فلم بھی دیکھی ہے میں نے۔"

شمّو کے اندازِ بیان نے زینت پر اثر ڈالا۔ اور قدرتی طور پر ان کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ ان کے دل میں آیا۔ آخر وہ رسالے کیسے ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھنا چاہئے۔ انھوں نے کہا۔

" پیسے لے کر آج ایک رسالہ لا دینا۔ لیکن دیکھو خبردار جو کسی کے سامنے ذکر کیا۔"

"قسم لے لیجئے چھوٹی بیگم۔ زبان میں کیڑے پڑ جائیں جو کسی سے کہوں۔"

شمّو کے جاتے ہی زینت بیگم خیالوں میں گم ہو گئیں ــــ

زینت بیگم کو اگر ایک حنوط شدہ لاش کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ ایک زندہ لاش ہی تو تھیں جس کے جذبات اور ارمان مر چکے تھے۔ وہ خود سیّد باڑے کے کھنڈر سے کم نہ تھیں۔ اگر وقت نے باڑے پر اثر ڈالا تھا تو خاندانی اصولوں نے عفریت کی طرح انکی جوانی کو نگل لیا تھا۔ وہ ایک صاف ستھرے خیالات کی لڑکی تھیں عمر کے ساتھ ساتھ انکی آنکھیں کھلتی گئیں اور جب انھیں سیّد صاحب اور بڑی بیگم کی نیت کا احساس ہوا تو بڑی حیرت ہوئی۔

باہر والوں کے لئے سیّد باڑے کی چہار دیواری سنگِ کوہلی کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر چہار دیواری کے پیچھے بھائی جان اور بھابی جان کی ناپاک حرکتوں سے زینت بیگم کو سخت نفرت ہو گئی۔ اُن لوگوں نے اِن کے جذبات کی کوئی قدر نہ کی تھی۔ خاندانی روایت پر مٹتے ہوئے اُن لوگوں سے زینت کو اسلئے نفرت تھی کہ روایت کی آڑ میں انھوں نے ڈھکوسلا کر رکھا تھا۔ دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ سیّد باڑے کا کوئی حصے دار باہر سے آئے۔ اور خاندان میں کوئی لڑکا تھا نہیں جس سے شادی کر کے یہ دولت بچائی جاتی۔ زینت بیگم ایک مجبور اور بے کس لڑکی تھیں۔ تلاوت اور احکامِ خداوندی کے لئے انھوں نے اپنی جوانی وقف کر دی تھی انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ زندگی کو دنیاوی اصول کے تحت گزاریں۔ نہ تو وہ خودکشی کر سکتی تھیں اور نہ غلط قدم اٹھانے کی ان میں ہمت تھی وہ تو جیسے موت اور حیات کے بیچ میں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے خواب کے محل کھنڈر ہو گئے تھے اور ان میں ان کے جذبات اور احساسات دفن ہو چکے تھے۔ کبھی آنے والی برائیوں کے خیالات انھیں بے چین کر ڈالتے اور وہ دیر تک پلنگ پر کروٹیں بدلتیں اور آنسو بہا کر رہ جاتیں۔

شمّو کی باتوں نے آج زینت بیگم کو بے چین کر ڈالا تھا۔ سوئے ہوئے جذبات میں چنگاری پڑ گئی تھی اور جذبات و ارمان سلگنے لگے۔ وہ جن باتوں کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھیں اب اس کی یاد سے وہ عجیب قسم کی بے چینی محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ انھیں خیالوں میں غرق تھیں کہ شمّو آ گیا۔ زینت بیگم کے دل میں آیا اُسے منع کر دیں اور سختی سے ڈانٹ دیں تاکہ پھر کبھی وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ مان لیا وہ رسالے پڑھ لے اور اسے بہت ساری باتوں کا علم ہو جائے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ وہ اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلنے لگیں گی۔ لیکن پھر انھوں نے سوچا۔ پڑھنے میں نقصان ہی کیا ہے۔ وہ تو پہلے ہی سے جلتی آ رہی ہیں اور اب بھی جلتی رہیں گی۔ انکی قسمت میں کوئی سویرا تو ہے نہیں۔ اور یہ سوچتے ہی انھوں نے پوچھا۔

"کتنے پیسے دوں؟"

"ایک روپیہ چار آنے۔"

پیسے لے کر شمّو چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ آیا اور قمیص کے اندر سے ایک رنگین رسالہ نکال کر اُنکے سامنے رکھ دیا۔ اس کے جاتے ہی زینت بیگم نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا اور بے چینی کے ساتھ رسالہ دیکھنے لگیں۔ سب سے پہلے ہی صفحہ پر ایک تصویر دیکھ کر ان کا دل دھڑک اٹھا۔

ایک دلکش عورت نیم عریاں لباس میں بستر پر لیٹی مسکرا رہی تھی۔ لیٹنے سے اس کا سینہ عریاں ہو گیا تھا۔ زینت بیگم نے دل میں کہا۔ "ہائے اللہ کیسی بے شرم عورت ہے۔" انھوں نے دوسرا صفحہ الٹا، پھر تیسرا اور چوتھے صفحے کی تصویر دیکھ کر ان کا چہرہ مارے شرم کے سُرخ ہو گیا۔ ایک مرد ایک ایسی عورت کو سینے سے لپٹائے ہوئے تھا جس کی پنڈلیاں اور بانہیں ننگی تھیں۔

زینت بیگم کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ تصویر کے ساتھ تحریریں پڑھنے لگیں۔ اس طرح وہ کتاب کے ایک ایک لفظ کو پڑھ گئیں۔ جب وہ ان تحریروں کو پڑھتی تو انھیں ہر بار نئی لذّت ملتی تھی۔ اس وقت انکا چہرہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ انکی نس نس میں چنگاریاں پھوٹتی رہتی تھیں۔

زینت بیگم کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ شمّو سے کتابیں منگوائیں رسالات کے ڈھیر لگتے تک اس کا سلسلہ [illegible] اور ہیجان انگیز کہانیوں نے ان کی نگاہوں سے وہ پردہ ہٹا [illegible] جو ایک مدت دراز سے نے ڈال رکھا تھا۔ شمّو نے گناہ و ثواب۔ مگر اس نے زینت بیگم کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا تھا۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جس کے لئے کوئی محدود نظریہ [illegible] اسے تو وہی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں جنھیں ایسی دنیا پانے کی تمنائیں ہوتی ہیں۔ اور نئی دنیا کے احساس سے زینت بیگم کے جذبات لبریز پیمانے کی طرح چھلکنے لگے۔ دل چاہتا ان ہی تصویروں کی طرح وہ اپنے کو بھی کسی افسانے کے ہیرو کی طرح کسی کی مضبوط بانہوں میں جکڑ [illegible] اور اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر وہ دنیا کو بھول جائیں۔ جہاں صرف وہ تنہا تھیں۔ اور ایسے وقت جب زینت کو یہ خیال آتا کہ یہ گناہ ہے تو ان کا دل کانپ [illegible] اپنے باغیانہ خیالات سے وہ ڈر جاتیں۔ پھر انکا دل کہتا۔ "تمھیں خوف ہے تو ثواب نے تمہاری زندگی میں یہ خوفناک خلا کیوں قائم کر رکھا ہے۔ کیا دیا تھا ثواب نے انھیں [illegible] تڑپ اور آہوں کے سوا انکی زندگی میں اور تھا ہی کیا۔ اگر ایک وہ گناہ کر لیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اور یہ سوچتے ہی وہ دوبارہ کتابوں کی دنیا میں کھو جاتیں۔

زینت بیگم کھڑکی سے لگی آنگن میں دیکھ رہی تھیں۔ [illegible] میں کوئی بارات آنے والی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر بج رہا تھا۔ اس وقت بے حد اداس تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کاش ان کی بھی بارات آتی اور کوئی انھیں سپنوں کے دیش میں لے جاتا۔ یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ انکی نظر غسلخانے میں گئی۔ شمّو نہا رہا تھا وہ اپنے کھردرے بدن کو مل کر نہانے میں مصروف تھا۔ پرکشش جسم گوری گوری بانہیں اور چوڑی چھاتی دیکھ کر زینت کو پہلی بار احساس ہوا کہ شمّو بھی ایک مرد ہے۔ یہ سوچتے ہی آنکھوں میں ایک انجانی چمک چھا گئی۔ جس دن سیّد صاحب کو اس کے مرد ہو جانے کا یقین ہو جائے گا اسی دن شمّو ہمیشہ کے لئے اس چہار دیواری سے باہر کر دیا جائے گا۔ کیوں نہ اس سے قبل ہی وہ شمّو کو اپنی بانہوں میں جکڑ لے۔؟

یہ سوچتے ہی زینت بیگم کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ دیر تک شمّو کو دیکھتی رہیں اور اس وقت چونکیں جب شمّو نہا کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

زینت بیگم اپنی کوٹھری میں آئیں اور دیر تک پلنگ پر [illegible]

[illegible]
[illegible] کے بعد [illegible]
[illegible] آواز [illegible] کہا۔
[illegible]
[illegible] بیگم۔"
[illegible] کی آواز آئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ قمیص پاجامہ
[illegible] کے پاس کھڑا ہوا۔ زینت بیگم کی نگاہوں کو
[illegible] کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ اُسے بڑی پیاری نظروں
[illegible] دیکھتی رہیں۔
[illegible] سب سو جائیں تو چپکے سے آنا۔ تجھ سے ایک
[illegible] ہے۔"
[illegible] شمو نے کسی قدر تعجب سے جواب دیا اور چلا گیا
[illegible] تھی سید صاحب کی کوٹھری کا دروازہ بند
[illegible] کنڈی لگا کر اس نے چاروں جانب
[illegible] اطمینان ہو گیا تو وہ دبے پاؤں زینت
[illegible] کی طرف بڑھا۔ وہ ان کے کہنے کے مطابق جانا
[illegible] اس طرح رات کے ایک حصے میں چپکے سے بلانے پر
[illegible] حیرت ہوئی تھی۔
[illegible] بیگم دروازے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسکو
[illegible] انھوں نے کہا۔
[illegible] کواڑ بند کر دے۔"
[illegible] پھر حیرت ہوئی۔ کہنے کے مطابق کواڑ بند کر کے وہ
[illegible] قریب گیا۔ لیمپ کی ہلکی روشنی کوٹھری میں پھیلی ہوئی تھی
[illegible] آئینے سے ٹکرا کر روشنی کا عکس ان دونوں پر پڑ رہا
[illegible] محسوس کیا کہ چھوٹی بیگم بہت خوش ہیں۔ ان کے
[illegible] رہا ہوش ہے۔
[illegible] ایک بار کہا تھا۔" زینت بیگم نے شمو سے کہا۔
[illegible] لگتی ہوں۔"
"[illegible] چھوٹی بیگم۔" شمو نے جھٹ جواب دیا۔ "جھوٹ
[illegible] کہتا ہوں۔ آپ تو ہیروئن ہیں۔"
[illegible] کی بات سے وہ قہقہے لگا رہیں۔ ایک فلمی پرچے
[illegible] ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں
[illegible]
[illegible] اس تصویر کی طرح ہوں۔"
[illegible]

[illegible] نے سوچا چھوٹی بیگم اب لباس کہاں سے لائیں گی؟
لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے بکس سے
ویسا ہی لباس نکالا۔ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ پچھلے دنوں
انھوں نے کپڑا کیوں منگوایا تھا۔

زینت بیگم پردے کی اوٹ میں کپڑے بدل رہی تھیں
شمو نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ بھلا اس میں اتنی ہمت کہاں
تھی کہ چھوٹی بیگم کی طرف دیکھتا۔ وہ تو ایک ملازم تھا اور ایک
ملازم کی حیثیت کیا ہوتی ہے وہ بخوبی جانتا تھا۔ مگر اس
کے باوجود وہ ایک مرد تھا۔ مالک۔ نوکر اور احترام، خوف
کے باوجود وہ نفس پر قابو نہ رکھ سکا۔ اپنے تجسس کو نہ روک
سکا جو مرد کے اندر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی عورت
لباس تبدیل کرتے وقت جسم کے کسی حصے سے ننگی ہو جائے۔
اس نے چور نگاہوں سے آئینے میں دیکھا۔ وہ جمپر اتار کر بلاؤز
پہن رہی تھیں۔ اُف کس قدر خوب صورت تھا جسم۔ پھر شلوار
اتار کر وہ اسکرٹ پہننے لگیں۔

زینت بیگم لباس بدل کر مسکراتی ہوئی اس کے سامنے
آئیں تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ وہ تو تصویر
سے بھی زیادہ حسین تھیں۔ گلے کے نیچے سے جذبات کی وہ دہلیز
شروع ہوتی تھی جہاں شمو کی معصوم نگاہیں اٹک گئیں۔ شمو
کے اندر دھیرے دھیرے گرمی بڑھنے لگی۔ "یہ کیسی گرمی ہے؟"
وہ سوچنے لگا۔ چھوٹی بیگم کو اس لباس میں دیکھ کر اس کے
اندر یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوہِ
آتش فشاں کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ چھوٹی بیگم ہر لمحہ اس سے
قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کا بدن تپ رہا تھا۔
اس نے بدن چھوا اور گھبرا کر کہا۔

"آپ کو تو بخار ہے۔"

"شمو" چھوٹی بیگم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "یہ تو
ایک زمانے سے ہے۔"

شمو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ اس سے دم بدم
سٹتی جا رہی تھیں۔ اس پر بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا تو زینت بیگم
نے بہت ہی جذباتی آواز میں کہا۔

"شمو۔ تو بدھو ہے کیا؟"

بدھو۔ نہیں وہ بدھو تو نہیں۔ چھوٹی بیگم نے تو اسے کبھی

[illegible] ہیں۔ ان کا جواب [illegible] سادہ
وہ ایک دم سے چھوٹی بیگم کی باتوں کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کانپ
گیا۔ اس نے دل میں کہا

"نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے"
وہ خون سے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ چھوٹی بیگم سے دور
بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہ حق تو خالص سید کو ہے اور وہ تو
ایک نچلے طبقے کا فرد تھا۔ یہ گناہ ہے۔ یہ گناہ ہے۔ وہ اپنے
سے جنگ کر رہا تھا، کہ بڑی بیگم کی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہی
تھیں۔ شمو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"چھوٹی بیگم میں جاتا ہوں۔"

"فوراً آ جانا۔" زینت بیگم نے اسے سرخ سرخ آنکھوں
سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تیرا انتظار کروں گی۔"

وہ جواب دیے بغیر تیزی سے کوٹھری سے نکل گیا۔
زینت بیگم نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ان کی حالت اس وقت
ٹھیک ایسے انسان کی طرح تھی جو شدید پیاس سے بے چین ہو
اور کنویں کے پاس [illegible] بھی پانی نہ پی سکے۔ وقت کے ساتھ
جذبات کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ہیں تو ایسے انسان کے
قدم کسی وقت بھی ڈگمگا سکتے ہیں۔ اس وقت نہ اُسے خاندانی
وقار کا خیال رہتا ہے اور نہ گناہ و ثواب کا احساس۔ یہی
حالت زینت بیگم کی تھی۔ مگر اب اگر ان کی جلتی آنکھیں دروازے
پر تھیں تو کان آہٹ پر۔

لیکن شمو نہیں آیا۔ وہ دیر تک انتظار کرتی رہیں اور
بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے جانے کب نیند آ گئی۔ صبح بڑی بیگم
کے پکارنے پر ان کی نیند ٹوٹی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے بدلنے
لگیں۔ اسی دوران [illegible] رات کی باتیں یاد آئیں تو چہرہ سرخ
ہو گیا۔ وہ شمو سے بے حد خفا تھیں۔ انھوں نے دل میں فیصلہ
کیا کہ شمو کو خوب جھاڑیں گی۔ اس سے بات نہیں کریں گی۔
زینت بیگم باہر آئیں تو بڑی بیگم نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"ناشتہ جلدی سے تیار کرو۔ شمو بھاگ گیا ہے۔"

"کب۔" انھوں نے دھڑکتے ہوئے دل سے چہار دیواری
کی جانب دیکھا جو اوروں کے لئے سنگِ موسیٰ کی حیثیت رکھتی تھی
تو اس کے واسطے سنگِ زنداں سے کم نہ تھی۔

زینت بیگم کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ان کا دل
چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ ■

عبدالصبر نعیمی

بنگلا دیش کی حسین اداکار

اب بمبئی میں



کابیری چودھری اپنے دو بچوں کے ساتھ۔

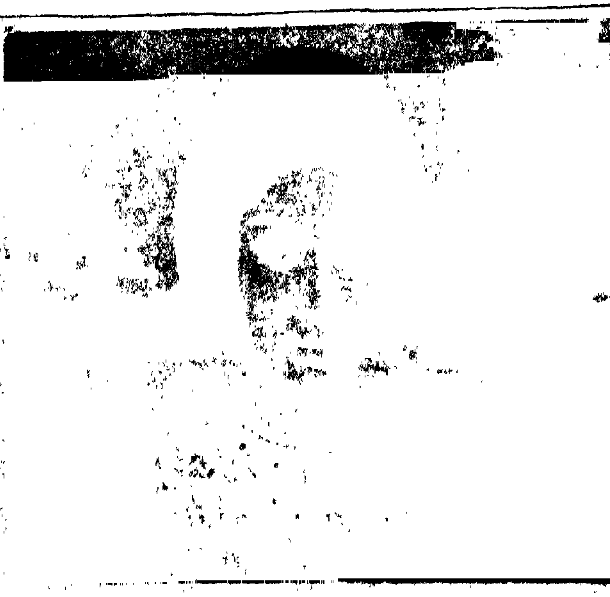
بنگلا دیش کی حسین اداکار کابیری چودھری بھی دوسرے بنگالی رفیوجیوں کی طرح ہندوستان چلی آئی ہے کابیری چودھری کے ہمراہ اس کا شوہر اور دو بچے ہیں۔ کابیری ڈھاکہ سے کس طرح فرار ہوئی اور کیسے کیسے دکھ جھیل کر ہندوستان کی سرزمین تک پہنچ سکی یہ سب بذات خود ایک فلمی کہانی معلوم ہوتی ہے اور اس حقیقی کہانی کو فلمساز، ہدایت کار، اداکار آئی۔ ایس۔ جوہر اپنی نئی فلم "جے بنگلا دیش" میں پیش کر رہا ہے۔

کابیری بنگالی اداکارہ ہے مگر اس کی مقبول فلمیں اردو میں بنی ہیں۔ ابتدا میں وہ اردو سے بالکل ناواقف تھی مگر فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد دھیرے دھیرے اس نے اردو سیکھنی شروع کر دی اور اس طرح وہ بنگلا اداکارہ سے اردو اداکار بن گئی۔ کابیری اب تک پچاس فلموں میں کام کر چکی ہے جن میں سے مشرقی پاکستان میں نمائش کے لئے تیار ہوئی ہیں سب سے زیادہ مشہور و معروف اردو فلم جس نے سرے دریا جاگے نہ پانی بہانہ "تیتا" اور "شکار" جس نے دریا جاگے نہ پانی ... فلمی میلے میں دکھائی گئی تھی۔ کابیری کا زیادہ تر فلموں میں ہیرو رزاق نے کام کیا ہے جو بقول کابیری پاکستانی ... ہے۔ ہندوستانی فلم "گنگا دھنا" کی کہانی ... میں کابیری نے مرکزی رول ادا کیا ہے۔

چٹاگانگ میں پیدا ہونے والی اداکار کابیری چودھری رقص کی ماہر ہے۔ اس نے فی الحال آئی۔ ایس۔ جوہر کے علاوہ کسی کی فلم میں کام کرنے کا کنٹریکٹ نہیں کیا ہے۔ وہ کہتی ہے ہندوستان کا عظیم ہدایت کار ستیا جیت رائے ہے میں ان کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ایسے وقت میں جب کہ میں بے سہارا ہو چکی ہوں مجھے سہارا دیا۔ وہ عالمی شہرت کے ہدایت کار ہیں اگر میں ان کی کسی فلم میں کام کروں تو یہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہوگی۔

اداکاری اور رقص سے تعلق رکھنے والے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا: "ہمارے بنگال میں اداکاری یا رقص کا کوئی اسکول نہیں ہے ہم سب کچھ خود ہی سیکھتے ہیں۔ میں نے بھی اداکاری اور رقص کی تعلیم خود ہی حاصل کی۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ انسان جب کسی کام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ خود بخود اس کام کا ماہر ہو جاتا ہے۔

کابیری چودھری فی الحال بمبئی میں "جے بنگلا دیش" کی تکمیل میں مصروف ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد یہ فلم مکمل ہو جائیگی۔



راکھی کی اداکاری کے بارے اگر زیادہ کچھ نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ ویسے راکھی آج کی مقبول ترین اداکاروں میں سے ہے۔ راکھی اس وقت آدھی درجن سے زائد فلموں میں کام کر رہی ہے۔ یہ سین ہے فلم "شرمیلی" کا۔





اقتباسات ...

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ایک تاریخ ساز دن تھا کیونکہ



اس دن دو سو سال کی غلامی کے بعد ... آزادی نصیب ہوئی ... لاکھوں کے ... اور ... برِ صغیر ... تقسیم ... کے علاوہ کوریا، ملائیشیا، انڈونیشیا ... بھی آزادی کی سالگرہ اگست ہی میں ... خروش سے مناتے ہیں۔ اگست ۱۹۶۲ء میں ... ۱۹۴۷ء ...

پہلی جنگِ عظیم ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ... اختتام تک ہوئی ان دونوں جنگوں میں (۹) لاکھ انسانوں کو اپنی جانیں ...



... Atlantic Charter ...

... اگست ۱۹۴۱ء ...

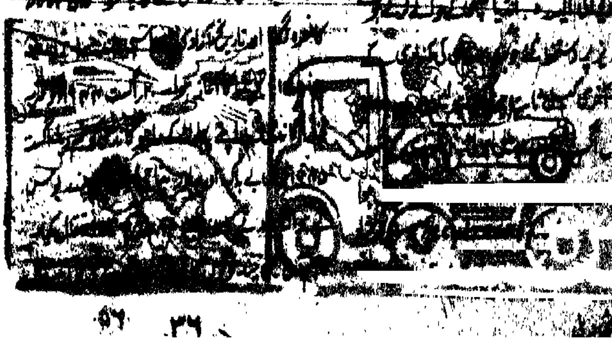
... اگست ۱۹۴۵ء ...

Dont Die ...

اگست ۱۹۶۶ء ... اگست ۱۹۶۵ء ...

حاصل کیا۔ ... اگست کو منائے ہیں ...

... دونوں خطوں میں جنگ کے امکانات ... نہیں کیا جا سکتا۔ •



اپٹون سنکلر

دنیا کے نامور مصنفین سے ملاقات



دنیا کی اتنی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں کہ ان میں سے اکثر کے نام اُسے خود بھی نہیں آتے

اپٹون سنکلر نے ۸۰ کتابیں اور پانچ سو سے زائد کتابچے لکھے ہیں۔ اس کی کتابوں کی بیس لاکھ جلدیں جرمنی [illegible] اور تیس لاکھ جلدیں روس میں فروخت ہو چکی ہیں۔ اسکے [illegible] اصلاح پر مبنی ناولوں نے انقلاب روس لانے میں ایک [illegible] مدد کی ہے۔ اگرچہ وہ ایک امریکن تھا لیکن امریکا [illegible] بجائے اس کی کتابیں یورپ میں زیادہ مقبولِ عام ہیں۔ [illegible] دن میں فرنچ ریویرا پر ایک بک اسٹال پر گیا۔ وہاں اپٹون [illegible] سنکلر کی کتابیں دوسرے تمام انگریز اور امریکی ادیبوں کی [illegible] کتابوں سے زیادہ موجود تھیں۔ اس کی کتابیں ۴۴ زبانوں [illegible] میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

اپٹون سنکلر نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ ان زبانوں [illegible] وہ اکثر کے نام سے ناواقف تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہ [illegible] کہ وہ کن ملکوں میں بولی جاتی ہیں۔ آج کل کے زمانے [illegible] اس کی کتابیں دوسرے تمام مصنفین سے زیادہ پسند [illegible] کی جاتی ہیں۔

سنکلر نے ۱۶ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور [illegible] ساٹھ برس تک لکھتا رہا۔ اس نے لاکھوں کی تعداد [illegible] صفحات سیاہ کئے ہیں۔ اس نے اتنے الفاظ لکھے ہیں کہ اگر نئی اور پرانی بائبلوں کو ملا دیا جائے تو ان کے الفاظ سے بھی زیادہ۔

اپٹون سنکلر کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا وہ دنیا سے افلاس ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ تجربات کی بناء پر وہ جانتا تھا کہ مفلسی کس قدر بے رحم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک زمانہ اس پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ وہ چھ سال مفلسی کے ظالم پنجے میں گرفتار رہا۔

اس کا باپ ایک شراب فروش، اور خود بھی زبردست شرابی تھا۔ جب وہ لڑکا ہی تھا تو وہ رات کے وقت اپنے باپ کی تلاش میں ایک شراب خانے سے دوسرے شراب خانے میں گھوما کرتا۔ اور پھر وہ اپنے شرابی باپ کو کسی شراب خانے سے اٹھا کر اپنے بازوؤں کے سہارے آہستہ آہستہ گھر لے آتا اور اسے اس کے بستر میں لٹا دیتا۔ اسکی ماں اپنے شرابی خاوند کی جیبیں ٹٹولتی اور جس قدر نقدی ملتی اسے چھپا لیتی تاکہ اگلے دن وہ اس [illegible] پکا سکے۔ وہ اسقدر غریب تھے کہ انھیں ٹوٹے پھوٹے اور اندھیرے مکانوں میں رہنا پڑتا تھا۔ اسقدر غریب کہ انھیں مسلسل مکان تبدیل کرنا پڑتا، کیونکہ وہ مکان کا کرایا دینے سے قاصر رہتے تھے۔

بڑا ہو کر اپٹون سنکلر شراب کے سخت مخالف ہو گیا۔ وہ شراب کے خلاف گھنٹوں لیکچر دیتا رہتا۔ باپ کی زندگی کا اس پر یہ ردِعمل ہوا کہ سنکلر بڑا ہو کر چائے تک نہ پیتا تھا۔ اور نہ کبھی اس نے سگریٹ کو ہاتھ لگایا۔

دس سال کی عمر سے پہلے اسے اسکول جانے [illegible] موقع نہ ملا۔ اس نے لکھنا پڑھنا خود ہی سیکھا۔ اسکول [illegible] سے پہلے اس نے بہت سے مشہور انگریز ناول نگاروں کے کئی ناول پڑھ لئے تھے اور اسی طرح انسائیکلوپیڈیا کا [illegible] حصہ ازبر کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہائی اسکول کی [illegible] فقط دو سال میں ختم کر لی۔

جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اس کے باپ [illegible] نہ تھا۔ اس کی والدہ اس کے پاس رہا کرتی تھی اور [illegible] سارا [illegible] خرچ بھی سنکلر ہی برداشت کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے سستے [illegible] قسم کے رسالوں کے لئے کہانیاں اور ناول لکھنے شروع کر دیئے اور اس طرح اپنے اور اپنے کالج کے اخراجات کو پورا کرنے لگا۔ وہ ہر رات ایک کہانی یا ناول کا ایک باب لکھتا۔ ایک مہینے میں وہ دو ناول مکمل کر لیتا۔ اس کے علاوہ اسے یونیورسٹی

اشتیاق دہلی

ما لک کے تقسیم کی ساعتوں کی ... ہوئی تھی۔ ... کام ... ایک ڈگری کو اس قدر کام ... ہوتا ہے۔

کالج سے نکلنے کے بعد وہ بچوں کے رسالوں کے لیے مختلف قسم کی کہانیاں لکھ کر ... ہفتہ کمانے لگا۔ اس وقت اس کی عمر بیس برس سے کم تھی اور یہ آمدنی اس کے لیے ضرورت سے زیادہ تھی۔ لیکن اپٹون سنکلر پیسوں کی خاطر ناول اور کہانیاں نہ لکھتا تھا۔ اس کے اندر ایک تند جذبہ کارفرما تھا۔ وہ ظلم اور ناانصافی کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا تھا وہ اسی جذبے کے تحت اپنی بیمار بیوی، بیمار بچے اور ساری آمدنی کو چھوڑ کر نیوجرسی چلا گیا اور وہاں ایک خیمہ نصب کر کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف پروپیگنڈا ناول لکھنے لگا۔ ایسے ناول جو دنیا کی اصلاح کر دیں۔ وہ وہاں پانچ برس رہا اور اس عرصے میں اس نے پانچ ناول لکھے۔ ان پانچ ناولوں سے پانچ برس تک اسے صرف دو سو پونڈ آمدنی ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں چالیس پونڈ سالانہ۔ یعنی صرف ڈھائی شلنگ روزانہ۔

وہ ... تنگدستی کا شکار رہا۔ ایک دن اس کی بیوی ایک دکان پر گئی اور وہاں سے ایک میز پوش خرید لائی۔ ... جب اس ... کو اس فضول خرچی کا پتہ چلا تو اس نے ... کہ میز پوش فوراً واپس کر آئے۔ اس میز پوش کی قیمت ... ڈھائی شلنگ ... سے ... کا ... تھا۔

اس کے چھٹے ناول کا نام جنگل تھا۔ اس ناول نے ایک سنسنی پیدا کر دی اور اس کا معاوضہ اسے چھ ہزار پونڈ ملا۔ ... اس نے نیوجرسی میں دریائے ہڈسن کے کنارے ایک ایسی بستی بسانے پر صرف کر دیا جو ادیبوں اور ... کے لیے وقف تھی، اور جہاں انہیں ضروریات زندگی سستے داموں مل سکتی تھیں۔ سنکلر کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ اس کے پیچھے اس طرح بھاگتا جیسے بلڈ ہاؤنڈ بلی کے پیچھے بھاگتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ اس نے وائلن سیکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ ہر روز آٹھ گھنٹے وائلن بجانے لگا اور ... سال تک مسلسل بجاتا رہا۔ جب اس کے ہمسایوں نے اس سے شکایت کی تو وہ اپنا وائلن لے کر جنگل میں نکل گیا اور وہاں ... کے سامنے سارا دن وائلن بجاتا رہتا۔

اپٹون سنکلر نے مجھے بتایا کہ وہ چار مرتبہ قید ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ اس جرم کی سزا میں اسے ۸ گھنٹے قید کیا گیا کہ وہ اتوار کے دن ٹینس کھیل رہا تھا۔ دوسری مرتبہ اسے تین دن تک قید رکھا گیا کہ وہ نیویارک میں جون ڈی راک فیلر کے دفتر کے سامنے خاموشی سے گھوم رہا تھا۔ تیسری مرتبہ اسے قید کرنے کی یہ وجہ تھی کہ اس نے بائبل کی ایک جلد ایک سپاہی کے ہاتھوں فروخت کی تھی۔ چوتھی مرتبہ وہ ریاستہائے متحدہ امریکا کا دستور ایک آدمی کی اجازت کے بغیر اس کے باغ میں پڑھ رہا تھا۔

میں نے تم سے شادی کرنے کے بعد اپنی صرف ایک چیز کھوئی تھی۔
یعنی۔ بنیادی حقوق۔



ہے۔" رضوان اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہوا پرسکون لہجے میں بولا اور حکیم صاحب جھک کر اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگے۔

"اوہ واقعی یہاں چھالے ابھر رہے ہیں۔" حکیم صاحب چیخ پڑے۔

پھر انہیں اپنا چالیس برس کا تجربہ ناکام ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ کیونکہ رضوان کا مرض ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ کچھ دیر وہ رضوان کی انگلیوں پر ابھرنے والے چھالوں کو دیکھتے رہے پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔

"اچھا رضوان۔ تم اپنی انگلیوں پر یہ دوا لگالو اور گھر جاؤ سیدھے گھر ہی جانا بیٹے۔ میں کچھ دیر کے لئے تنہائی چاہتا ہوں۔" تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے کہا اور رضوان خاموشی سے اٹھ کر رخصت ہوگیا۔

لیکن آج حکیم صاحب پر حیرتوں کے پہاڑ ہی ٹوٹ پڑنے والے تھے۔ ابھی رضوان کو گئے ہوئے مشکل سے بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب نے دیکھا چندر حلوائی اپنی لڑکی تارا کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے سنبھال کر لا رہا تھا۔ تارا کی انگلیوں پر موٹے موٹے چھالے ابھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے جیسے وہ تکلیف کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ چندر نے حکیم صاحب کو بتایا کہ پکوان تلتے ہوئے تارا کی انگلیاں تیل میں ڈوب گئیں۔

مولوی صاحب سکتے کے عالم میں تارا کی انگلیوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور انکی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑ رہی تھیں رضوان کا جملہ اب بھی انکے کانوں میں گونج رہا تھا۔ "جیسے میں جل گیا ہوں۔" پھر ان کے ذہن میں رضوان اور تارا کے خاموش عشق کی بازگشت ٹھوکریں مارنے لگی۔

"خداوند! کیا ایسا بھی ممکن ہے میرے معبود! آج ہی تو اس نے کہا تھا کہ حقیقت خود بخود سورج کی طرح روشن ہو جائے گی ...... روشن ہو جائے گی۔" بدحواسی میں بڑبڑاتے ہوئے انھوں نے اپنا سر تھام لیا۔

"جی حکیم صاحب! مجھ سے کچھ کہا آپ نے۔" گھبرایا ہوا چندر حکیم صاحب کی بڑبڑاہٹ پر ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"نہیں چندر۔ تم سے کچھ نہیں کہا۔ میں تو... میں تو بس یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔" کہتے ہوئے انھوں نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور تارا کی طرف متوجہ ہوگئے۔

تارا کی انگلیوں پر مرہم کا لیپ کرتے وقت ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ لیپ کرنے کے بعد انھوں نے کن انکھیوں سے تارا کو دیکھا تو اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بھولے پن اور آنکھوں میں تیرتی ہوئی معصومیت کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر وہ اس انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے تنہائی میں چندر سے گفتگو کرنا چاہتے ہوں۔

"چندر!" مطب سے باہر آکر انھوں نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا:۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری بستی میں کوئی بہت ہی عجیب واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ ایک حادثہ سمجھ لو۔ ایسا حادثہ جو اگر بخیر و خوبی گزر گیا تو سندیلے کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دے گا۔ ورنہ...... ورنہ قیامت بھی ٹوٹ سکتی ہے ہم لوگوں پر۔"

"میں نہیں سمجھا حکیم صاحب۔ آپ عالم ہیں بہت دور کی بات سوچ سکتے ہیں، لیکن وضاحت کیجئے اپنی بات کی۔" چندر بوکھلا گیا۔

"تم ہندو ہو چندر۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندو اور مسلمان کے ڈھکوسلے ختم ہونے کو ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم تارا کی شادی رضوان کے ساتھ کر دو۔ وہ رضوان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔" حکیم صاحب نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں حکیم صاحب یہ کیسے ممکن ہے۔ برادری میں رہی سہی عزت بھی ختم ہو جائے گی۔ ویسے بھی کیا کم بدنامی ہو چکی ہے۔"

"یہ دنیا میرے سامنے بھی ہے دوست۔ مگر شاید تم یقین نہ کرو گے کہ تارا کی تقدیر بدل رہی ہے۔ اور مستقبل میں کوئی ایسا معجزہ رونما ہونے والا ہے جسے دیکھ کر تمہاری آنکھیں حیرت سے پھٹ جائیں گی۔ دلوں کی دھڑکنیں بند ہو جائیں گی۔ چندر! بندر میرے بیٹے۔ تقدیر کے اس چکر کو سمجھنے سے میں بھی قاصر ہوں۔ میرا علم، عقل اور میرا تجربہ سب حیران ہیں۔ تم یقین کرو گے چندر، لیکن جب تمہاری تارا کی انگلیاں تیل میں ڈوب رہی تھیں تو یہاں میری آنکھوں کے سامنے رضوان کی انگلیوں پر چھالے ابھر رہے تھے۔ عشق کی گرمی جہنم کی تپش سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو جسم راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

"میں مر جاؤں گا حکیم صاحب! میرا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ بچا لیجئے حکیم صاحب۔ میری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ہی ہمارے سب کچھ ہیں۔ ہمارے آڑے وقت پر کام آتے ہیں۔ کوئی ترکیب بتائیے۔" چندر حکیم صاحب کے پاؤں پکڑے ہوئے گڑگڑا رہا تھا۔

"اٹھو جاؤ دوست۔ تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی بھی دخل نہیں دے سکتا۔ میں حالات کو جان گیا ہوں اس لئے دخل دے کر اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتا۔ تم خود اگر کچھ کر سکتے ہو تو سوچو اور انجام کے منتظر رہو۔" حکیم صاحب نے کہا اور مطب کے اندر چلے گئے۔

تارا پر پابندی لگا دی گئی۔ وہ گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی لوگ دیکھ رہے تھے کہ اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صبح کے وقت وہ ہر ایک کو اپنے چبوترے پر کھڑی نظر آتی اور رضوان راستے سے گزرتے ہوئے چند منٹ کے لئے وہاں کھڑا ہو کر تارا کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا۔ دونوں کی خاموش نظریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی رہتیں۔ اس کے بعد رضوان وہاں سے ہٹ جاتا لیکن کسی کی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر رضوان کو روک دیتا۔ چندر نے جب سے حکیم صاحب کی زبانی سنا تھا اس وقت سے ہر وقت وحشت زدہ سا رہتا اور اس کا رنگ کسی یرقان زدہ شخص کی طرح پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

ایک دن چپکے سے تارا کی شادی ہوگئی اور وہ اس طرح اپنے سسرال چلی گئی کہ محلے والوں تک کو خبر نہ ہو سکی۔ جب یہ بات چندر نے حکیم صاحب سے بتائی تو وہ صرف ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

لیکن لوگوں نے دیکھا کہ رضوان پر تارا کی شادی کا ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح مطمئن نظر آتا تھا۔ اس کے مشاغل میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حد یہ تھی کہ وہ اب بھی چندر کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند لمحوں کیلئے ٹھہر کر چبوترے پر اسی طرح نظریں گاڑ دیتا جیسے تارا وہاں موجود ہو۔

لوگوں میں ایک بار پھر کانا پھوسی شروع ہوگئی تھی لیکن اس بار افواہوں کا رخ بدلا ہوا تھا۔ بستی میں یہ خبر گرم ہونے لگی تھی کہ رضوان پاگل ہوگیا ہے۔ تارا کی شادی نے اسے سڑی بنا دیا ہے۔

چندر کو یہ افواہیں پاگل کئے دے رہی تھیں۔ اسکا گھر سے باہر نکلنا دشوار ہوگیا تھا۔ ایک دن تو اس کی پریشانی اتنی بڑھی کہ صبح ہی صبح اس نے حکیم صاحب کے گھر جاکر انکے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑا کر رونے لگا۔

حکیم صاحب [illegible] بات [illegible]
[illegible]
[illegible] میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ
[illegible] خود دلاتے ہیں۔ خیر اٹھو آج میں تمہارے
ساتھ چلوں گا۔ شاید تمہارے کچھ کام آ سکوں۔"
رضوان کا گھر جب آیا تو حکیم صاحب چندر کے گھر کے
سامنے اپنے عصا کا سہارا لئے کھڑے ہوئے تھے۔
"حضور یہاں !!! میں حیران ہوں۔" وہ حکیم صاحب کو
[illegible] ہوا بولا۔
"[illegible] آج آنا ہی پڑا مجھے چندر سے جو مدد چاہئے"
حکیم صاحب [illegible] شا بولے۔ رضوان نے کوئی جواب
نہیں دیا۔ وہ تو اب چندر کی طرف متوجہ تھا اور جیسے اسے
[illegible] کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہ گیا تھا۔
"[illegible] اب تو بس اب رحم کرو۔ میں برادری میں
[illegible] کہیں کا نہیں رہا۔ اب یہاں کیا رکھا ہے جو
[illegible] میری زندگی تو تم نے برباد کر ہی دی۔ اب تارا کی
[illegible] میں بھی کانٹے بونے کا ارادہ ہے کیا ؟" چندر اچانک
[illegible] کے سامنے آتا ہوا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ لیکن رضوان
[illegible] جواب نہیں دیا۔ وہ تو بس ایک طرف گھورے جا رہا تھا
[illegible] کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں اور چندر کو ایسا
[illegible] اس کی آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپک گیا ہو۔ ایک ہی
[illegible] اس کی آنکھیں کھلیں اور رضوان کی نظروں سے ٹکرا کر
[illegible] گئیں۔
"یا۔۔۔۔۔ و۔۔۔ حکیم صاحب" وہ حلق پھاڑ کر
اور چکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے رضوان کی آنکھوں میں
[illegible] کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ رضوان چندر
[illegible] تھا۔ اس نے آہستہ سے چندر کا ہاتھ پکڑ کر
اٹھایا اور بولا۔
"[illegible] میں آؤ چندر۔ تم نے جو کچھ دیکھا ہے اسے بھول
[illegible] میرا اس بڑا لوک میں تمہیں کچھ پہنچا دوں۔" لیکن چندر
[illegible] بیٹھا تھا۔ ہکلا ہکلا کر اس نے حکیم صاحب
[illegible] کھولنے چاہا۔ حکیم صاحب خاموش رہے
[illegible] چندر کو وہیں چھوڑ کر رضوان کے ساتھ لوٹ آئے
[illegible] ہوئے کچھ سوچ رہے تھے ان کا نفس تیز تھا۔
[illegible]

"بات ہو تو دیکھ لو [illegible]
کس کو دیکھے جاؤ گے۔"
"تارا کو۔ وہ بہت بیمار ہے۔" رضوان نے کہا اور حکیم صاحب
خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔
لکھنؤ پہونچ کر رضوان تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ منزل
اس کی نظر میں تھی مگر وہ راستے سے ناواقف تھا۔ آہستہ سے
ایک یکہ بان کو آواز دے کر اس نے کچھ سکے اس کے ہاتھ پر
رکھے اور خود یکے پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔
"کہاں چلئے گا حضور" یکہ بان نے پیسے گن کر خوش
ہوتے ہوئے سوال کیا۔
"جہاں بھی تمہارا گھوڑا پہونچا دے چلو۔ منزل دور نہیں
ہے۔" رضوان نے کہا۔ اور گھوڑا آگے بڑھنے لگا۔
کافی دیر گلیوں اور کوچوں کے چکر کاٹنے کے بعد گھوڑا
ایک جگہ ٹھہر گیا۔ رضوان نیچے اترا۔ یکہ جا چکا تھا۔ سامنے ہی
ہوئی ایک چھوٹی سی خوب صورت عمارت کی طرف اس نے نگاہ
ڈالی۔ کوٹھے کے چھجے پر جالی پکڑے ہوئے تارا اس کے
سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں سڑک پر اسی طرح
جمی ہوئی تھیں جیسے بہت دیر سے کسی کی منتظر رہی ہو۔ اس کا
رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور جسم پر لپٹی ہوئی ساری ایسی
لگ رہی تھی جیسے کسی درخت کی سوکھی ہوئی شاخ پر کوئی چیتھڑا
جھول رہا ہو۔
دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ذہنوں میں بجلیاں کوندنے
لگیں، دھماکے ہونے لگے اور زبانیں گنگ ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ تارا
بے چین ہونے لگی۔ چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے وہ چکرا کر گر پڑے گی۔ رضوان نے نظریں ہٹا لیں
اور وہاں سے ہٹ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔
دوسرے دن وہ سر جھکائے ہوئے حکیم صاحب
کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پرسکون و سنجیدہ
تھا۔ دیکھنے والے کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نے چند
گھنٹے قبل اپنی محبوب کو کس زدہ حالت میں دیکھا ہوگا۔ حکیم صاحب
بار بار اس انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگتے جیسے ہزار ہا سوالات
ان کے ذہن میں کلبلا رہے ہوں۔ لیکن رضوان سے کچھ پوچھنے کی
ہمت ان میں نہیں تھی۔ وہ تو اب جیسے اس سے ڈرنے لگے تھے
پھر رضوان ہی بولا۔
"حضور میں نے جب اسے دیکھا تو وہ مجھے ہلدی کی طرح

زرد اور سوکھی ہوئی شاخ کی طرح بے جان نظر آئی۔ اگر میں زیادہ
دیر تک اسے دیکھتا رہتا تو اس کا جسم میری نظروں کی تاب
نہ لا کر سلگ اٹھتا۔ میرے محترم علاج کی مدت ختم ہو چکی ہے
اب اسے صرف آپ کی عنایتوں اور دعاؤں کی حاجت ہے۔"
یہ جملے رضوان نے اتنے ہی سکون سے بیان کئے تھے جیسے
کسی دلچسپ داستان کا کوئی حصہ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ لیکن
حکیم صاحب اس کی آنکھوں میں اور بھی کچھ پڑھ رہے تھے
وہ محسوس کر رہے تھے جیسے رضوان کی آنکھوں سے شعلے نکل
نکل کر ان کے جسم میں جذب ہو رہے ہوں۔
رضوان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد چندر ہاتھ جوڑے
ہوئے حکیم صاحب کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے بتایا کہ رضوان
ہی نے اسے حکیم صاحب کے پاس بھیجا ہے۔
ہاں میں نے تمہیں بلایا ہے چندر۔ بیٹھ جاؤ اور میری
باتوں کو غور سے سنو۔
"تارا کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب اسے واپس
آنا ہے۔ تم اسے جا کر لے آؤ۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور ہے
چندر۔ قدرت کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں ہے۔ ہم سب
بے بس ہیں۔ اب بدنامی اور نیک نامی کے ڈھکوسلوں کو بھول
جاؤ اور اسے بلا لو۔ کیونکہ محبت کی اس انوکھی داستان
کو امر ہونا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تارا کے عاشق
کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے عشق کے شعلے دیکھے ہیں اور اپنے
جسم میں ابھی تک اس کی گرمی محسوس کر رہا ہوں" حکیم صاحب
نے چندر کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا اور چندر کی گھگی بندھ گئی۔
اب وہ رضوان سے اسی قدر خوف زدہ ہو گیا تھا۔
لیکن چندر کو کہیں جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔
دوسرے دن تارا کو اس کا شوہر خود ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس
نے کہا تھا کہ تارا کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے
یہ قدم اٹھانا پڑا۔
چندر جب حکیم صاحب کے سامنے حاضر ہوا تو خوف و
ہراس سے اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ تارا اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ
سوکھے ہوئے پتے کی طرح زرد اور نحیف تھی۔ آکر وہ سر جھکائے
ہوئے حکیم صاحب کے سامنے بیٹھ گئی۔
حکیم صاحب نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ طویل سانس لے کر
وہ چھت کو گھورنے لگے۔ تارا کی حالت کسی سے مخفی نہیں تھی۔ انھوں
نے کن انکھیوں سے رضوان کی طرف دیکھا جو کسی گہرے سوچ میں تھا

اس قدر آہستہ سے نکلی تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب نے چندر کو رخصت کر دیا۔ چندر کے چلے جانے کے بعد وہ رضوان سے مخاطب ہوئے۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"تمہارا علم کیا کہتا ہے رضوان۔ کیا تارا اچھی ہو جائیگی؟" انھوں نے پوچھا۔

"مشفق استاد! آپ کے علم کے سامنے میری عقل ناقص ہے۔ میں تو آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ وہ صرف دعاؤں کی محتاج ہے۔ مجھے تو بس راکھ کے ڈھیر نظر آ رہے ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز میں مسکراتے ہوئے کہا جیسے اس پر تارا کی حالت کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ حکیم صاحب کی بات کا جواب دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

دوسرے دن جب وہ آیا تو اس کا چہرہ اسقدر پرسکون تھا جیسے وہ دنیا کے تمام غموں سے نجات پا گیا ہو۔ لیکن اس کے اطمینان نے حکیم صاحب کا اضطراب اور بڑھا دیا۔

"چندر ابھی تک دوا لینے نہیں آیا رضوان؟" رضوان کو دیکھ کر انھوں نے سوال کیا۔

"اب وہ دوا کس کے لئے لے جائیگا حضور؟" اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

"کک... کیا مطلب؟" حکیم صاحب کا سانس گلے میں پھنس گیا۔ "کیا تارا...... نہیں نہیں وہ زندہ ہے۔ اگر مر گئی ہوتی تو چندر کے گھر میں طوفان مچ گیا ہوتا۔"

"کیا چند اکھڑی ہوئی سانسیں زندگی کی ضامن ہیں۔ تارا کب کی مر چکی ہے۔"

"تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں چبوترے پر اس کی لاش کھڑی ہوئی رکھی تھی۔" رضوان نے کہا۔ پھر قبل اس کے کہ حکیم صاحب کچھ کہتے ان کے کانوں میں بھونچال سا آ گیا۔ قریب ہی گریہ وزاری کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

حکیم صاحب نے محسوس کیا جیسے انھیں اب غش آیا ہی چاہتا ہے۔ وہ رضوان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ جس نے ابھی ابھی اپنی محبوبہ کے مرنے کی خبر انھیں نہایت پرسکون انداز میں سنائی تھی اور اس وقت نہایت اطمینان سے ان کے سامنے سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ذہن پر اتنا بوجھ پڑ گیا تھا کہ حکیم صاحب کو اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

[illegible]

"نہیں نہیں۔ یہ تارا کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ محبوبہ کی موت کا اظہار اتنے پرسکون انداز میں۔ ناممکن۔ خداوند قدوس میرے معبود۔ مجھ ضعیف پر رحم کر۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔" حکیم صاحب اپنے آپ بڑبڑا رہے تھے۔ پھر وہ آنکھیں بند کر کے مسند پر نیم دراز ہو گئے اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

"حضور تارا آپ کی مریضہ تھی۔ کیا آپ اس کی آخری رسوم میں شریک ہو کر اس کی روح کو سکون نہ بخشیں گے؟" یکایک رضوان نے خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا اور حکیم صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔

"رضوان۔ تیرا یہ اطمینان مجھے مار ڈالے گا۔ یعنی تیرے اوپر اس کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ تیرا لہجہ اسقدر ٹھنڈا اور خشک ہے جیسے کوئی بنجر چٹان بول رہی ہے۔"

"آپ گھبرائے ہوئے ہیں۔ لیکن میری مجال نہیں کہ آپکو استقلال کا درس دوں۔ میرے مشفق تحمل سے کام لیجئے۔ روح کی آنکھیں جب کھلتی ہیں تو ساری حقیقتیں آئینہ بن جاتی ہیں۔ آیئے اب چلیں۔ میں مطب بند کرتا ہوں۔ آپ کو ابھی بہت سے کام انجام دینا ہیں اور وقت بہت کم ہے۔" رضوان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور کھڑا ہو گیا۔

چندر کی نظر جیسے ہی حکیم صاحب پر پڑی اس نے دوڑ کر ان کے قدم پکڑ لئے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ غم سے پاگل ہو رہا تھا۔

"آپ یہاں ہیں حکیم صاحب۔ آپ کی آنکھوں نے وہ سب کچھ پہلے ہی دیکھ لیا تھا جسے سوچ کر میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ تارا کے لئے دعا کیجئے حضور۔ آپ کی دعائیں اس کی آتما کو شانتی دے سکتی ہیں۔" وہ ان کے قدموں پر لوٹتا ہوا بولا۔

"صبر کرو چندر! تارا صرف تمہاری ہی بیٹی نہیں تھی۔ مروں سے تو کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ کون جانتا ہے کہ اسے اتنی جلدی کیوں اٹھا لیا گیا اور ہم ناکارہ بوڑھے اپنی جوان اولاد کو مرتے دیکھنے کے لئے کیوں زندہ رکھے گئے ہیں۔ کون جانے کہ ابھی ہمیں اور کیا کیا دیکھنا پڑے۔" حکیم صاحب تھرتھرائی ہوئی آواز میں بولے اور ان کے آنسو داڑھی سے ٹپکنے لگے۔

تین بجے تک تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور تارا کی ارتھی کو شمشان گھاٹ کی طرف لیجایا جا رہا تھا۔ حکیم صاحب رضوان کے کندھے کا سہارا لئے ہوئے ڈگمگا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔

چار بجے کے قریب جب چتا میں آگ لگائی گئی تو ذرہ ذرہ شمشان بھومی کانپ اٹھی۔ چندر۔ بیٹی کی چتا میں جانے کے لئے مچل رہا تھا۔ حکیم صاحب کی داڑھی سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی لوگوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چتا سے اٹھتے ہوئے شعلوں نے ماحول پر ہراس کی چادر پھیلا رکھی تھی۔ گریہ وزاری کے شور سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اس ماحول میں بھی ایک آدمی سارے غموں سے بے نیاز پرسکون تھا۔ رضوان چتا سے کچھ فاصلے پر خاموش بیٹھا ہوا نیم وا آنکھوں سے اس انداز میں چتا سے اٹھتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں سے آگ کی ساری حرارت کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لے گا۔

رفتہ رفتہ شعلے ختم ہوئے اور انگاروں پر راکھ چھا گئی۔ بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے اور کچھ لوگ اب جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ لیکن رضوان اس اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا جیسے اب اسے اٹھ کر کہیں نہیں جانا ہے۔ رات کافی بڑھ چکی تھی اور چاند کی زرد روشنی میں پوری کائنات بجائے خود ایک چتا معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہاں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ محض ایک راکھ کا ڈھیر تھا جس کے کنارے کچھ لوگ ابھی تک بیٹھے سسکیاں لے رہے تھے۔

کافی دیر بعد حکیم صاحب ایک کراہ کے ساتھ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھے۔ چندر بھی ان کے ساتھ ہی دھوتی کے ایک کونے سے اپنا چہرہ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ حکیم صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے رضوان کی طرف کچھ اشارہ کیا اور چندر آہستہ آہستہ رضوان کی طرف بڑھنے لگا۔ دھیمی چاندنی میں بیٹھا ہوا رضوان کوئی مجسمہ لگ رہا تھا۔

"چلو بیٹا۔ یہاں کیا رکھا ہے اب۔ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔ میری دنیا لٹ گئی۔ کاش میں نے دھرم کرم کا چکر چھوڑ کر پہلے ہی حکیم صاحب کی بات مان لی ہوتی...... مگر نہیں۔ مجھے تو تنگ بھر رونا تھا۔ پھر میری سمجھ میں حکیم صاحب کی بات کیسے آتی۔ اٹھو بیٹا۔ اب یہ غم تو زندگی کے ساتھ ہے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے رضوان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مگر... مگر۔ اوہ۔ ہراس ہراس وہ لمحے بھر کو سارے غم بھول گیا۔ دہشت زدہ آنکھوں سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا جس پر راکھ کے ذرے چپک کر رہ گئے تھے۔

"حکیم صاحب۔" اس کی چیخ بڑی کربناک تھی خوف و دہشت

ہر آنکھ نمناک تھی، ہر جسم لرز رہا تھا، ہر دل ڈوب رہا تھا لیکن حکیم صاحب اس وقت مطمئن نظر آ رہے تھے۔ جیسے یکایک ان کی روح کی آنکھیں کھل گئی ہوں اور حقیقت کے پردے الگ ہو گئے ہوں۔ وہ بہت دیر تک بیٹھے چندر کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور اس کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرتے رہے۔ اب وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جب چندر کو ہوش آیا تو انھوں نے بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ کہا۔

سنبھل جاؤ چندر۔ پرسکون ہو جاؤ۔ سیلاب گزر چکا ہے۔ رضا کی روح کو سکون مل گیا ہے۔ تقدیر کے فیصلے ہمیشہ اٹل ہوتے ہیں چندر ـــ تمہیں یاد ہے نا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مستقبل قریب میں اس زمین پر کوئی ایسا معجزہ رونما ہونے والا ہے جس کی مثال تاریخِ عالم میں نایاب ہوگی اور جسے انسان کی عقل سمجھنے سے قاصر رہے گی۔ دیکھو یہ داستان امر ہو گئی، میں آج بہت خوش ہوں۔ میرے سامنے رسم و رواج، مذہب، برادری، اونچ نیچ کے خود ساختہ ڈھکوسلوں کا طلسم آنِ واحد میں ٹوٹ گیا۔

ہم سب ایک ہیں چندر۔ ہمارا باطن ایک ہے، تم نے دیکھا کہ وہ دونوں کس قدر ایک تھے۔ ان پر سچائی کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اب اٹھو میرے دوست۔ ہمت سے کام لو اور راکھ کے ان دونوں ڈھیروں کو ملا کر ایک کر دو۔ ہاں ایک ہی جگہ۔ دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن ہونا ہے۔ دونوں کی ایک ہی یادگار قائم ہو گی تاکہ شہیدانِ محبت کی یہ داستان امر رہے اور جب کوئی متوالا ان کی قبر پر پھول چڑھانے آئے تو اس کے دل سے کدورت کے دھبے مٹ جائیں۔ ذات، پات اور رنگ، نسل کا جادو مٹ جائے اور اس کی روح کے چراغ جل اٹھیں۔

ہم سب کا ایک ہی مذہب ہے دوست۔ محبت۔ کیونکہ یہی ایک لافانی چیز ہے جو مر کر بھی نہیں مرتی ـــ

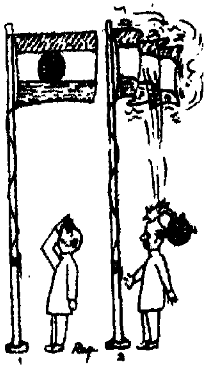
حکیم صاحب نے یہ کہہ کر چندر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

وقت ان کے لیے تھا اتنا سکون ... جیسے اپنے عشق کی آگ میں جلنے سے پہلے رضوان نے انھیں اپنی ساری روحانی اساس انھیں سونپ دی ہو۔

صدیاں بیت چکی ہیں لیکن عشق کے ان دو متوالوں کی کہانی آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

بنگلہ دیش تحریک

کتنا بے ربط مصوّر کا چلا موئے قلم
آج بارِ نگہِ شوق ہے تصویرِ حرم
خوگرِ لطفِ مسرّت کو بتاؤں کیونکر
ایک نعمت ہے جہاں میں تپشِ اندوزیِ غم
تیری شاطگیِ فکر کے ہاتھوں اے دوست
پڑ گئے اور بھی کچھ گیسوئے بنگال میں خم
کچھ نرالے ہیں تری بت شکنی کے انداز
ضرب سے تیری ہوئے اور طرحدار صنم
رنگ لائی ہے بالآخر تری ظلمت خود ہی
شمعِ انصاف کی لَو اور ہوئی ہے مدھم
ایک ہنگامۂ محشر ہے بنامِ جمہور
عسکریت ہے نئے ڈھنگ سے مصروفِ کرم
اختیارات کی تشریح نہ کر جبر کے ساتھ
راہِ پرخار میں اٹھے ذرا محتاط قدم
فرد کے ہاتھ میں آئینۂ کردار تو دے
جمعیت کیوں کرے حیراں نظری کا ماتم
اصل میں معرکۂ روح و بدن ہے درپیش
تیرے افکار کا محور ہے عرب یا کہ عجم
طوقِ لعنت ہمہ در گردنِ اولادِ کلیم
تاجِ زرّیں بسرِ شعبدہ گرمی بینم





جھنڈا اسلامی

وہ بھی یار عجیب زمانہ تھا

بہزاد لکھنوی

حکیم بدھن بُرے پھنسے



مرحوم لکھنؤ کے شب و روز اور حکیم بدھن کی سرگزشت

بے کار مباش کچھ کیا کر   پ   کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر

یہ شعر کس کا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں اس کی کیا شانِ نزول ہے میں قطعی لاعلم تھا۔

ایک دن حکیم بدھن کہہ بیٹھے کہ یہ ان کے پر دادا مرحوم و مغفور کا شعر ہے۔ اب ان سے اس کے معنی اور مطلب کا پوچھ لینا آسان کام نہ تھا۔ یہ مجھ فقیر کی ہی ہمت تھی کہ پوچھ بیٹھا وہ بولے۔

"استاد ابھی نہیں کسی دن تم کو اس کے معنی بتاؤں گا

ہوالوں کر دلجیت نگر کی واپسی پر

جو کر بیٹھے تھے روائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ہم دونوں جب شناس ہوتے دن صاحب کے ہوٹل پہنچے تو وہاں اگر ہوا رہا تھا۔ نہ ہوٹل کا پتا تھا اور نہ خریداروں کا معلوم یہ ہوا کہ کسی دشمن نے دوتن صاحب کے ہوٹل کو آگ لگا دی اور آ شان سے آگ لگی کہ اندر کا فرنیچر جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ہماری واپسی سے ایک ماہ پیشتر وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

ہم دونوں نے سوچا کہ اب یہ فیکٹری بازی ختم کی جائے دونوں اللہ کے فضل سے کافی کما لائے تھے۔ لہٰذا یہ روز روز کی جھک جھک سے نجات ہی اچھی چیز ہے چنانچہ حکیم

بدھن نے کہا۔

"بھیا بہزاد! اب کٹرہ ابوتراب والے مکان ہی میں برائے نام فیکٹری کھلی رہنے دو۔ اگر کوئی گاہک آیا تو دیکھا جائے گا۔"

میں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ دل جیت نگر سے لائی ہوئی دونوں انگوٹھیاں میں نے اپنے دوست رام پرشاد رستوگی کے حوالے کیں۔ اس نے مجھے تین ہزار کی رقم ان کے عوض دیتے ہوئے کہا۔

"بھیا بہزاد اس رقم کو دفن کر دو۔"

میں نے کہا۔ "کیا زمین میں گاڑ دوں؟"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔

"واہ رے شاعر! ایک ذرا سی بات سمجھ میں نہ آئی۔ ارے بھائی یہ رقم بینک میں جمع کرا دو۔ میں تمہارا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ تمہیں چیک بک اور پاس بک مل جائے گی۔ اپنی ضرورت کا روپیا ہر مہینہ نکال لو۔ باقی کو ہاتھ نہ لگاؤ ورنہ تم ہی کو تکلیف ہو گی۔ یہ روپیا اڑ کر برابر ہو جائے گا۔"

بات معقول تھی میری سمجھ میں آ گئی اس کی دکان کے سامنے ہی بینک تھا۔ میں نے رقم جمع کرا کر ساٹھ روپے نکال لئے اور چلا آیا۔

واپسی پر جب میں حکیم بدھن کے ہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ ایک مکان کی خریداری کی بات چیت کر رہے ہیں۔ دو ہزار پر طے ہوا اور حکیم بدھن مالک مکان کو لئے ہوئے رجسٹری آفس چلے گئے۔ شام کو ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا بدھن ابھی ایک عدد مکان کے مالک بنے ہیں۔ دوسرے سویرے ہی وہ مجھے لئے ہوئے اپنے نئے مکان پہنچے۔ مکان مرزا جعفر کے باغ میں واقع تھا۔ خاصی بڑی حویلی دو ہزار میں سستا مل گیا تھا۔ وہیں حکیم بدھن نے ایک ٹھیکیدار کو بلوا کر اس کی مرمت اور صفائی کا ٹھیکہ دے دیا۔

ایک ہفتے کے بعد جب ہم دونوں پہنچے تو واقعی دیکھنے کے لائق تھی۔ مرمت اور صفائی نے اس کو بنا کر دیا تھا۔ اسی دن نیا فرنیچر بھی پہنچ گیا۔ غالباً حکیم بدھن آرڈر دے چکے تھے۔ وہ فرنیچر سلیقے سے لگنے سے مکان منہ سے بولنے لگا۔

دوسرے دن جب میں وہاں پہنچا تو شمشیر کے علاوہ تین چار ملازم اور نظر آئے اور لکھنؤ کے بے فکروں کا مجمع حکیم کو گھیرے بیٹھے ہوئے نظر آیا جو حکیم بدھن کی ہر بات پر سبحان اللہ کے نعرے بلند کر رہا تھا اور حکیم کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ ان کے لئے کھانے پک رہے تھے

تھی کہ حکیم بڈھن کا سا سمجھدار آدمی ان لوگوں میں کیونکر پھنس گیا ہے۔ یہ لوگ دل چلے مشہور تھے اور ہر نودو لیتے کے پاس پہنچکر اس کو تباہی کی منزل پر پہنچا کر دم لیا کرتے تھے۔ میں سمجھ گیا۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

والی منزل سامنے آرہی ہے۔ دلبیت نگر سے لائی ہوئی دولت آخر کار اڑنا ہے۔ لہٰذا میں بھی خاموش رہا۔ دن بھر تاش گنجفہ پچیسی اور خدا جانے کیا کیا کھیل ہوتا رہا۔ رات کو گانے بجانے کی محفل قائم ہو گئی جس میں حکیم بڈھن شمع محفل بن گئے میں کھانا کھا کر اپنے گھر چلا آیا لیکن مجھے حکیم بڈھن کی تباہی کا افسوس تھا۔ حکیم بڈھن نے کبھی مجھے اپنے رازوں میں شریک نہ کیا تھا اس کا پتا نہ تھا کہ ان کو کتنی رقم ہاتھ لگی ہے اس حویلی کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک مکان تھا جس میں کوئی آغا تقی رہا کرتے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت حکیم بڈھن کے مصاحبین کھانا کھا کر سونے کے لئے کمروں میں چلے گئے میں نے گنگنا شروع کیا

آغا تقی کے باغ میں گچھا انار کا
چھاتی پیٹ کے مر گیا لڑکا سنار کا

وہ بازاری شعر تھا جس کو لکھنؤ کا بچہ بچہ چیخ کر گایا کرتا تھا۔ آغا جی کا باغ چونکہ ملحق تھا لہٰذا میں بھی خدا جانے کیوں یہی شعر گنگنانے لگا۔ یکایک حکیم بڈھن نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

ظالم! تجھے کیونکر پتا چل گیا ہے ارے اس شعر کے آخری مصرع میں اگر بجائے لڑکا سنار کا کے لڑکا حکیم کا ہو جائے تو حقیقت ہو جائے گی۔

میں نے فوراً کہا۔

"یہ کونسی بڑی بات ہے لو سنو
آغا تقی کے باغ میں خوشہ انیم کا
چھاتی پیٹ کے مر گیا لڑکا حکیم کا

وہ بولے۔ "یار اب تم سے کیا چھپاؤں برابر کے مکان میں جو آغا تقی رہتے ہیں ان کے یہاں ایک صورت ہے ایک آفت ہے۔ اک جلوہ ہے اک تجلّی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اسے صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ خوبصورت عورت ہے۔"

وہ بولے۔ "خوبصورت؟ استاد اگر ایک نظر دیکھ لوگے تو بے ہوش ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "پھر کیا ارادے ہیں۔"

وہ بولے۔ "یار شادی تو کرنا ہے سوچتا ہوں پیام دے دوں اور اس کے لئے تم سے زیادہ موزوں آدمی مجھے نظر آتا نہیں۔ ان نئے دوستوں پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے میں آج شام کو آغا تقی سے مل کر ان کا عندیہ لے لوں گا۔ دیکھوں گا کیا کہتے ہیں؟"

حکیم بڈھن نے بڑھ کر میرے قدم پکڑ لئے اور کہا۔

"یار کامیاب آنا ورنہ مر جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "اللہ مالک ہے شام ہونے دو مجھ سے آغا تقی کی ملاقات تو نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ انھیں راضی کر لوں۔"

مجھے شام کا دو بجانا دوبھر ہو گیا۔ حکیم بڈھن گھڑی کو گھڑی گھڑی دیکھتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے۔

"یار کب پانچ بجیں گے۔"

باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسماۃ روزانہ شام پھول چننے کے لئے باغیچے میں آجاتی ہیں اور ہمارے بھائی حکیم بڈھن چھپ کر ان کی دیدار بازی کیا کرتے ہیں۔ وہیں سے یہ مرض عشق لگا ہے۔

شام کے پانچ بجے میں مکان سے نکل کر آغا تقی کے مکان پہنچا وہ دروازے کے باہر مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے دو تین مونڈھے خالی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بغور دیکھا۔ آغا جی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں رنگ سیاہی مائل تھا۔ بشرے سے چالاکی اور مکاری صاف نمایاں تھی۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر تقریباً کھڑے ہو گئے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد ایک مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"فرمایئے! کیسے تکلیف کی؟"

میں نے کہا۔ "میں جناب آغا تقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

وہ بولے۔ "یہ ناچیز ہی کا نام ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو ایک بات عرض کروں"

وہ بولے۔ "فرمایئے فرمایئے۔"

میں نے کہا۔ "میرا نام بہزاد لکھنوی ہے۔"

وہ میرا نام سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولے۔

تو آپ بہزاد صاحب ہیں میں بڑا نام سنتا تھا۔ ماشاءاللہ شہر میں آپ کی شاعری کی بڑی شہرت ہے میں تو مشاعروں میں جاتا نہیں ہوں۔ عرصہ ہوا یہ شوق چھوڑ چکا ہوں لیکن پھر بھی آپ کی شہرت میرے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ آپ کی بندہ نوازی ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔"

وہ بولے۔ "اب خدا کے لئے آپ تکلف چھوڑیئے اور مجھے صاف صاف بتایئے کہ میرے لائق کیا خدمت ہے۔"

میں نے کہا۔ "آغا صاحب! بات یہ ہے کہ برابر کے مکان میں جو صاحب آکر فروکش ہوئے ہیں میں ان کا دوست ہوں۔"

وہ بولے۔ "میں جانتا ہوں یہ حکیم بڈھن ہیں حکیم سید اولاد حسین کے صاحبزادے خود یہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آغا صاحب میں ان کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"او" وہ چھوٹتے ہی بولے۔

"کہیں میرے گھر پیام لے کر تو آپ نہیں آئے ہیں مجھے معلوم ہے حکیم بڈھن تین نکاح کر چکے ہیں اور تینوں کو طلاقیں دے چکے ہیں۔"

میں نے کہا "جناب آغا صاحب ان طلاقوں کے ساتھ واقعی بدحالات ایسے تھے کہ حکیم بڈھن صاحب مجبور ہو گئے ورنہ کون پسند کرتا ہے کہ اپنا بسا بسایا گھر برباد کر دے۔"

وہ بولے۔ "یہ تو میں سمجھتا ہوں اب تک جتنے واقعات میں نے سنے ہیں وہ یک طرفہ ہیں اور حکیم بڈھن کے کردار کو ایک ظالم کا کردار ثابت کرتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی بات دوسری جانب سے بھی ہو گی جس کا کسی نے اظہار نہیں کیا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ آدمی سمجھدار ہیں۔ حکیم بڈھن سید ہیں۔ کماؤ ہیں سیدھے آدمی ہیں۔"

وہ بولے۔ "ان باتوں کا علم مجھے بھی ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر ان کی طرف سے یہ معروضہ پیش کروں گا کہ آپ ان کو شرف غلامی عطا فرما دیں۔"

وہ بولے۔ "بہزاد صاحب میں برا نہیں مانتا جہاں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے آتے ہیں۔ لیکن میری ایک ہی لڑکی ہے۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر اس کے معاملے میں قدم اٹھانا ہے یہی وجہ ہے کہ ماشاءاللہ پچیسویں سال میں داخل ہو چکی ہے لیکن میں نے ہزاروں پیام رد کر دیئے۔ میں سوچ لوں سمجھ لوں آپ پرسوں جواب کے لئے تشریف لائیں۔"

میں نے کہا۔ "میں بے حد ممنون ہوں۔"

وہ بولے۔ "بہزاد صاحب میں صاف انکار کر جاتا لیکن ... جیسا مشہور و معروف آدمی پیام لے کر آئے تو انکار ... کشش ہی نہیں رہ جاتی۔"

بولے۔ "خدا حافظ۔ پرسوں اسی وقت کرم فرمائیے انشاء اللہ ... آپ مل جائے گا۔"

میں ان سے رخصت ہوا اور جوں ہی حکیم بڈھن کے وہاں ... بڈھن بے چینی سے میرا انتظار دروازے پر کر رہے تھے ... دیکھتے ہی بولے۔

"جلد بتاؤ شیر کہ بھیڑ؟"

میں نے کہا۔ "یا آدھے شیر آدھے بھیڑ۔"

وہ بولے۔ "ارے صاف صاف بتاؤ میرا دم نکلا جا رہا ہے ... شاعری فرما رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میری خاطر سے پیام منظور کر لیا ہے لیکن ... بتائی جائیں گی۔"

حکیم بڈھن کی باچھیں فرطِ مسرت سے کھل گئیں اور بولے۔

"تمہیں میری جان کی قسم وہ جو جو شرطیں کہیں وہ منظور ... خواہ مجھے بھیک ہی کیوں نہ مانگنا پڑے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا گھبراؤ مت ابھی چار بجے ہیں پرسوں کا ... انتظار کرو۔"

خدا خدا کر کے پرسوں کا دن آ ہی گیا۔ حکیم بڈھن صبح سے ... پیچھے پڑے رہے کہ میں جاؤں اور شرطیں معلوم کر آؤں۔ ... کسی طرح پانچ بجے شام سے پہلے جانے پر رضامند ... شام کے پانچ بجتے ہی جب میں آغا تقی صاحب کے ... وہ میرے منتظر تھے ایک مونڈھے پر بانوں کا ... مسند رکھا ہوا تھا مجھ دیکھتے ہی تپاک سے بولے۔

"تشریف لائیے جناب بہزاد صاحب۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ ... وقت کے انتہائی پابند ہیں۔ ابھی ابھی چھوٹے نواب کی حویلی ... پانچ کا گجر بجا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آغا صاحب وقت مقرر تھا لہٰذا قبل آنا ... نا معقول تھا۔"

وہ بولے۔ "پان نوش فرمائیے۔ پھر میں آپ کو آپ کی بات ... جواب دوں گا۔"

پھر پان کھلانے کے بعد انھوں نے کہا۔

"بہزاد صاحب! آپ سے کوئی پردہ نہیں ہے یہ میری ... اکلوتی بیٹی ہے اور ماشاء اللہ سے صورت شکل خانہ داری ... ماشاء اللہ سب میں ...

اور سلیقے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اگر آپ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں تو حیران رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "کیوں نہ ہو آخر آپ کی صاحبزادی ہیں۔"

وہ بولے۔ "یہی وجہ ہے کہ مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے اور ماشاء اللہ اس وقت اس کی عمر پچیس سال ہو گئی لیکن میں نے ہزاروں پیام ٹھکرا دیئے میں اس کا مستقبل تاریک نہیں دیکھ سکتا۔"

میں نے کہا۔ "درست ہے۔ آپ کی محبت کا تقاضا بھی یہی ہونا چاہیئے۔"

وہ بولے۔ "بہزاد صاحب نوابین کے پیام آئے میں نے انکار کیا۔ میں جانتا ہوں نواب صاحبان اپنی بیویوں سے دو تین ماہ کے بعد بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور بازاری تفریح میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "درست فرمایا۔"

وہ بولے۔ "امرا کے پیام آئے۔ مجھے امرا کا حال معلوم ہے یہ حضرات ایک بیوی پر قناعت نہیں کرتے۔ میں اپنی بیٹی پر سوت کیوں گوارا کرتا۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے بہت اچھا کیا۔"

وہ بولے۔ "درمیانی حضرات کے پیام آئے لیکن ان کے وہاں میری لڑکی کا کوئی تحفظ ممکن نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "درست ہے۔"

وہ بولے۔ "بہزاد صاحب! حکیم بڈھن کئی عورتوں کو طلاق دے چکے ہیں۔ میں ہرگز ان کا پیام منظور نہ کرتا لیکن آپ آئے ہیں لہٰذا مجھے منظور کرنا پڑ رہا ہے۔ میری پہلی شرط یہ ہے کہ وہ یہ حویلی مع ساز و سامان میری لڑکی کے نام لکھ دیں دوسری شرط یہ ہے کہ مہر پانچ ہزار روپے معجل ہوگا نکاح ہوتے ہی یہ رقم ادا کرنا ہوگی۔ میری تیسری شرط یہ ہے کہ میں روز اپنی لڑکی کو دیکھنے آؤں گا۔ حکیم بڈھن مانع نہیں ہوں گے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ نکاح میں کوئی دھوم دھڑکا نہیں ہوگا۔ کل پانچ آدمیوں کے ساتھ حکیم بڈھن آئیں گے حقیقت یہ ہے بہزاد صاحب میری مالی حالت کمزور ہے اور میں شادی بیاہ کے بے جا اخراجات اٹھانے کے قابل نہیں ہوں یہ آپ سے کہہ رہا ہوں آپ حکیم بڈھن سے نہیں کہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اور کوئی شرط ہے؟"

وہ بولے۔ "نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا جواب میں کل اسی وقت پیش کروں گا"

یہ کہہ کر میں ان سے رخصت ہوا۔ حکیم بڈھن بیقراری کے ساتھ دروازے کے باہر میرا انتظار کر رہے تھے مجھ سے شرطوں کا معاملہ سنتے ہی بولے۔

"تم نے وہیں یہ شرطیں منظور کیوں نہ کیں میں تم کو اجازت دے چکا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پاگل نہ بنو۔ دو ہزار کی حویلی ہے چار پانچ سو میں تم نے مرمت کرائی ہے اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے ہزار بارہ سو کا ساز و سامان بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پانچ ہزار روپے نقد کا بھی معاملہ ہے۔ پھر تمہیں دلہن کے زیورات اور جوڑوں میں بھی ہزار بارہ سو روپے خرچ کرنا ہوں گے۔ میں کیونکر بغیر سمجھے بوجھے اقرار کر آتا۔"

وہ بولے۔ "استاد تم سدا کے کنجوس مکھی چوس ہوا رے کمبخت میری تو جان پر بنی ہے اور تو اخراجات جوڑ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا! اس وقت تم تو ع۔ش۔ق کے پھندے میں ہو اور مال بھی حرام ہی کا تمہارے ہاتھ لگا ہے لہٰذا تم بے دردی سے تباہ کرنا چاہتے ہو۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"تم اپنے صوفی پن اور ملا پن کو کنارے رکھو میاں یہ شرطیں فوراً منظور کر لو۔ تم نے ایک بار مجھ سے میرے پردادا مرحوم کے ایک شعر کے معنی پوچھے تھے اور وہ شعر یہ تھا۔

بیکار مباش کچھ کیا کر
کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر

تقریباً تین بیویوں کو طلاق دے چکا ہوں۔ تین کپڑوں کو ادھیڑ چکا ہوں۔ اب چوتھا کپڑا سی لینے دے۔ اپنے پردادا کی وصیت کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔"

میں نے کہا۔ "واہ بیٹا ارے تباہ ہو جاؤ گے۔"

وہ بولے۔ "تم پرواہ نہ کرو۔"

چنانچہ دوسرے دن میں نے جا کر شرطیں منظور کر لیں اور ایک ہفتے کے بعد عصر و مغرب کے درمیان نکاح طے پایا۔ یہ ہفتہ بڑی گہما گہمی میں گزرا۔ حکیم بڈھن نے سات عدد سونے کے زیورات جنت تیار کرائے گھر پر درزیوں کو بٹھا کر سات بھاری جوڑے سلوائے اور نکاح کے دن پانچ مصاحبین اور پیچھے

عین وقت مقررہ پر ہم آغا تقی کے مکان پر پہنچے۔ حکیم بڈھن اطلس کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے اور نادری صافہ میں بہت حسین لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جو سہرا بندھا تھا وہ پانچ روپے کی لاگت کا تھا۔ ہم چھ آدمی جوں ہی پہنچے آغا صاحب خود پیشوائی کے لئے دروازے پر بڑھے ہمیں اندر لے جایا گیا۔ اندر صحن پار کرنے کے بعد ایک دالان میں سفید چاندنی کا فرش لگا ہوا تھا۔ جس پر ایک زرکار مسند بچھی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کے علاوہ چھ سات آدمی اور بھی تھے جن کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ دو مولوی صاحبان بھی تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی ایک وکیل اور دو گواہ اندر دلہن سے اجازت لینے کے لئے گئے۔ ان کے باہر آتے ہی نکاح پڑھا دیا گیا۔

نکاح کے اختتام پر آغا تقی صاحب کی طرف سے تمام مہمانوں کی خدمت میں گرما گرم کشمیری چائے اور شیرمالیں پیش کی گئیں۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت آ گیا۔ مولوی صاحبان اور دیگر حضرات رخصت ہو گئے۔ حکیم بڈھن کو زنان خانے میں طلب کیا گیا۔ باہر دلہن کو لے جانے کے لئے میں نے پالکی اور کہاروں کا بندوبست کر لیا تھا۔

مغرب کے آدھ گھنٹے بعد حکیم بڈھن دلہن کو گود میں لئے ہوئے پالکی تک آئے۔ دلہن سوار کی گئی اور ہم چھ براتی دولہا کے ساتھ منٹوں میں حویلی پہنچ گئے۔ حکیم بڈھن نے دولہن کو اتروا لیا۔ اور زنان خانے میں لے گئے۔ سوائے میرے پانچوں براتیوں کو رخصت کر دیا گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جہیز کے نام سے کوئی شے بھی آغا صاحب نے نہیں دی تھی۔ غریب سے غریب بھی کم از کم گیارہ برتن ضرور دیتا ہے۔ حکیم بڈھن دلہن کو اندر پہنچا کر باہر آئے۔ اندر دو تین خادمائیں ملازم رکھ لی گئیں تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بولے۔

"بہزاد! آج میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے میں کئی ماہ سے جس عورت کے عشق میں تڑپ رہا تھا اللہ نے مجھے وہ عطا کر دی ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"لیکن استاد قیمت بڑی تگڑی دینی پڑی۔ تقریباً دس ہزار کا ٹیکا آخر تم کو پڑ ہی گیا۔ اور مزید یہ کہ گیارہ عدد برتن بھی تم کو جہیز میں نصیب نہ ہوئے۔"

وہ بولے "یار تم اپنی جلی کٹی باتوں کو چھوڑو۔ میں جہیز لے کر کرتا بھی کیا۔ اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا دل خوش کر لو۔ تو میں اب چلوں نا۔"

وہ بولے۔ "جاؤ خدا حافظ لیکن سویرے ہی سویرے آ جانا۔"

میں مرزا جمعہ کے باغ سے پیدل ہی گھر کو روانہ ہوا۔ سر شام گھر جانے کا عادی نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے کوفت سی ہوئی میں بغیر ارادے کے سعادت گنج مڑ گیا۔ وہاں ایک شاعر رہتے تھے۔ فراق مجھے کئی بار بلا چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج ان پر احسان بھی رکھ دوں اور وقت بھی کاٹ لوں۔ میں نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ وہ باہر نکلے اور مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ جلدی سے گھر میں گئے اور باہر دو مونڈھے لا کر بولے۔"

"بھیا بہزاد آج تو تم کو کھانا کھا کر ہی جانا ہو گا میں نے کوفتے پکوائے ہیں اور کڑھی کھا کر مزہ آ جائے گا۔"

میں نے تکلفاً کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے بھیا فراق۔ لیکن تمہارا نمک کھانے میں مجھے عذر نہیں ہے۔"

وہ بولے۔ "یہ آج تم کو اتنی جلدی حکیم بڈھن نے کیسے چھوڑ دیا؟"

میں نے کہا۔ "آج حکیم بڈھن نے نکاح کیا ہے۔ چوتھا نکاح۔ لہٰذا مجھے چھٹی مل گئی ہے۔"

وہ بڑے اشتیاق سے بولے۔

"کہاں کیا ہے نکاح؟"

میں نے کہا آغا تقی صاحب کی صاحبزادی سے ابھی ابھی نکاح ہوا ہے۔"

فراق نے دو زانو بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھیا۔ آغا تقی صاحب کی کوئی لڑکی ہی نہیں ہے مجھے خوب معلوم ہے۔ وہ میرا دور کا عزیز ہے اور اوّل نمبر کا چار سو بیس ہے۔ وہ اتنا بڑا کمینہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ دوسروں کا نکاح کر دیتا ہے۔ پھر میاں بیوی جب دونوں ہاتھوں سے اُسے لوٹ لیتے ہیں تو بیوی آغا تقی کے گھر جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ نکاح کرنے والا دعویٰ نہیں کر پاتا اس لئے کہ شادی شدہ عورت سے نکاح کرنا جرم ہے۔ لہٰذا لٹ لٹا کر خاموش ہو جاتا ہے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔

"تو حکیم بڈھن غریب پھنس گیا۔"

وہ بولے۔ "اندر کیا؟"

میں نے کہا۔ "اس نے عورت کے نام ... سامان لکھوا لی ہے۔ اور پانچ ہزار روپے نقد مہر کے ... وقت وصول کر لئے ہیں۔"

وہ بولے۔ "ارے توبہ۔ آغا تقی نے پہلے ... کر دیا۔ وہ ایسی شادی میں گھر بند ... لوگ ... بھی اس سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بارات میں ... پسند نہیں کرتا۔ یہ اس کی بڑی چالاکی ہے۔ لیکن ... بلا کی حسین ہے خدا خوش سلیقہ وہ حکیم بڈھن کا دل ... لے لے گی۔ روزانہ آغا تقی آئیں گے اور ان کی گھر ... تھوڑی تھوڑی سی حوالے کرتی جائے گی تاکہ اک دم ... کا اندازہ نہ ہو سکے۔ یہ کھیل زیادہ سے زیادہ چار پانچ ... چلے گا اور پھر چڑیا اڑ کر اپنی ڈال پر بیٹھ جائے گی۔ تم ... طرح سے حکیم بڈھن کو سمجھاؤ کہ جتنا گیا ہے اس پر صبر کر ... آئندہ لٹنے سے بچیں۔"

میں نے کہا۔ "یار فراق یہ ناممکن ہے حکیم بڈھن ... بن جتلا ہیں کہیں سے اس کو دیکھ لیا ہے میری بات ... اعتبار نہ کریں گے۔ خواہ مخواہ میری دوستی میں بھی ... پڑے گا۔"

وہ بولے۔ "تو تم فاتحہ پڑھ لو اور میری بات ... چھ مہینے کے اندر اندر حکیم بڈھن کوڑی کوڑی کو ... ہو جائیں گے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فراق کا لڑکا باہر آیا اور ...

"دسترخوان تیار ہے۔ اندر تشریف لائیے۔"

میں اور فراق دونوں اندر پہنچے۔ صحن میں تخت ... پر دسترخوان چنا ہوا تھا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کوفتے ... خوب تھے کڑھی بھی بے مثل پکی ہوئی تھی لیکن ... نہ کھا سکا کیونکہ میرا دماغ حکیم بڈھن میں الجھا ہوا ... کھانے کے بعد جب گھر پہنچا تو مجھے رات بھر ہول ... نہ آئی۔ حکیم بڈھن میرا دوست تھا اور اس کی تباہی ... لئے پریشانی کا باعث تھا۔

سویرے ہی ناشتے کے بعد جب میں حکیم بڈھن کے ... پہنچا تو وہ میری آواز سنتے ہی باہر نکل آئے۔ مجھے ... گلے لگانے کے بعد بولے۔

"استاد واقعی میری قسمت کھل گئی ہے ..."

[illegible] سے کہہ دیا ہے کہ بھلا
[illegible]

[illegible] کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ دالان میں تختوں کا [illegible] تھا جس پر ایک گداز جسم کی بے حد حسین عورت [illegible] کی جالی کی سرخ رنگ قمیض پہنے ہوئے [illegible] رہی تھی۔ مجھے [illegible] میں نے گھونگھٹ نکال لیا۔ حکیم بدھن نے مجھے [illegible] تخت پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

[illegible] تمہاری بھاوج۔ اور میں واقعی خوش نصیب [illegible] میرا ساتھ ہو گیا۔"

میں نے بھی اعتراف کیا۔

"واقعی بھائی میری امیدوں سے زیادہ بہتر نظر آ رہی [illegible] مبارک کرے میں تمہاری پہلی بیویاں دیکھ چکا ہوں [illegible] کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کہاں رہا [illegible]"

میری باتوں پر مساۃ مسکرائیں اور بولیں۔

"بھائی بہت بڑھا چڑھا کے بنا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بھابی میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ آپ میری تعریف [illegible] زیادہ ہیں۔"

وہ بولیں۔ "کھانا کھا کر جایئے گا۔ میں ابھی شامی کباب کہ انہیں پسند ہے اور ارہر کی دال پکانے جا رہی ہوں [illegible] میرے ساتھ کا مزہ بھی چکھ لیجئے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "بھابی آپ کھانا پکائیں گی آپ کسی نوکر لیں کس واسطے ہیں۔" حکیم بدھن نے کہا۔

"بھیا ہزار دفعہ میں نے لاکھ روکا۔ مانتی ہی نہیں کہتی ہیں مجھے کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔"

[illegible] بھیا یہ گھر دیاں کیا پکائیں گی۔"

میں نے کہا بھابی۔ پہلے ہی دن کی دلہن کام کاج کرتے ہوئے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔"

وہ بولیں۔ "بس بیٹھے رہیئے۔ آخر میرا وقت کیسے گزرے گا"

[illegible] اور حکیم بدھن کے ساتھ باہر نکل آیا۔ [illegible] عشق کا یہ عالم تھا کہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد [illegible] رکھاتے تھے یہ عالم دیکھ کر پھر [illegible] حکیم بدھن کو آغا تقی کی اس چالبازی سے [illegible]

عالی ظرف [illegible] دوسرے یہ کہ حکیم بدھن خود بھی چالاک تعلیم اور سمجھدار آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ اس جال سے نکل جائے گا۔

دوپہر کے وقت جب میں اور حکیم بدھن کھانے کے لئے اندر داخل ہوئے تو آغا تقی بھی موجود تھے۔ دستر خوان پر ہم تینوں مرد بیٹھ گئے۔ واقعی کھانا بے حد لذیذ تھا۔ میں نے ایسا لذیذ کھانا کم کھایا ہوگا۔ کھانے کے بعد میں اور حکیم بدھن باہر آ گئے۔ حکیم بدھن رات بھر کے جاگے تھے لہٰذا ان کو نیند نے گھیر لیا۔ اور میں ان سے رخصت ہو کر شام کو آنے کا وعدہ کر کے گھر آ گیا۔

شام کو جوں ہی پہنچا حکیم بدھن میرے منتظر تھے اور مسرتوں سے اتنا پھولے ہوئے تھے کہ سوائے اپنی بیوی کے ذکر کے ان کو کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر میں گھر چلا آیا۔

دو ماہ اسی عالم میں گزر گئے۔ ایک دن حکیم بدھن نے مجھ سے کہا۔

"بھیا سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری بھاوج کو زیورات سے اتنا عشق کیوں ہے۔ میں کئی کئی جوڑ زیورات بنوا کر دے چکا ہوں۔ لیکن ہر روز کوئی نہ کوئی فرمائش ٹھکتی ہی جا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور کپڑوں کے شوق کا کیا حال ہے۔"

وہ بولے۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی دو مہینے میں چوبیس جوڑے بنوا کر دے چکا ہوں اور اب میں ڈر رہا ہوں کہ میری مالی حالت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ میں اس وقت تلک کے ساتھ روپیہ خرچ کر سکوں۔"

میں نے کہا۔ "کیوں۔ کیا ساری دولت ختم ہو گئی۔"

وہ بولے۔ "تم سے کیا پردہ ہے بنک میں دو چار سو روپے پڑے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "استاد تم ذرا میرے ساتھ خاص تک چلو۔ دو مہینے سے تم نے گھر کے باہر قدم نہیں نکالا ہے مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

وہ گھر کے اندر گئے۔ انگرکھا پہنا اور بیوی سے اجازت لے کر میرے ہمراہ باہر نکلے۔ میں ان کو لئے ہوئے سیدھا فراق کے گھر گیا۔

فراق مجھے اور حکیم بدھن کو دیکھ کر کھل گئے۔ خاطر تواضع

[illegible] کے لئے [illegible] کیا

"بھیا بدھن تم بری طرح تباہ ہو چکے ہو۔ تم ایک جال میں پھنس چکے ہو۔ مجھے نکاح کے بعد ہی علم ہو چکا تھا لیکن مجھے تم سے کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ تم پر ایک ایسا جادو تھا اور یہ غلبہ بھی ایسا جس کے تحت تم میری بات کا یقین نہ کرتے۔"

وہ گھبرا کر بولے۔ "یار صاف صاف بتاؤ آخر کیا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ فراق بیٹھے ہیں میں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ تم نے جس مساۃ سے نکاح کیا ہے وہ آغا تقی کی بیٹی نہیں ہے۔"

انہوں نے حیرت سے کہا۔ "ہائیں یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں حقیقت کہہ رہا ہوں۔ شادی میں جتنے ان کی طرف سے لوگ شریک تھے۔ وہ سب کے سب چار سو بیس ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شادی میں تمہاری طرف سے کل پانچ آدمی بلائے گئے تھے۔"

وہ بولے۔ "بھائی یقین نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اتنے بڑے چالاک، اتنے بڑے سمجھدار ہونے کے بعد تم نے یہ غور نہ کیا کہ تحریر تم سے لکھوائی گئی۔ پانچ ہزار روپے نقد مہر کے وصول کر لئے گئے۔ اس کے علاوہ زیورات کی فرمائشیں کپڑوں کی فرمائشیں کرنے کے بعد تمہیں دیوالیہ کر دیا گیا ہے کس لئے۔؟"

وہ بولے۔ "یار بات تو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "گھر کی بیویاں کیا شوہروں کو اس طرح لوٹتی ہیں جس طرح تم لوٹے گئے ہو۔" حکیم بدھن نے کہا۔ "تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہاری بھاوج آغا تقی کی بیٹی نہیں آغا تقی کی بیوی ہے۔" میں نے کہا۔ "فراق کے ہاتھ میں حلف دے کر پوچھ لو۔" فراق نے کہا "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مساۃ آغا تقی کی بیوی ہے آغا تقی کی لڑکی نہیں۔ آغا تقی کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔ اور حکیم صاحب آپ پہلے تقی نہیں جو لوٹے گئے۔ آپ کا نمبر تیسرا ہے۔ پہلے نواب چھجو صاحب تھے۔ دوسرے مرزا صاحب عالم تھے۔ دونوں کو فقیر کرنے کے بعد تیسرا دارآپ پر مارا گیا ہے۔"

حکیم بدھن نے سر پکڑ لیا اور بولے۔

"یار واقعی اب میری سمجھ میں ایک بات آ رہی ہے۔

روزانہ آغا تقی آتے ہیں اور میں نے بغور دیکھا ہے کہ جاتے وقت"

ے ہاتھ میں ایک تھیلا ضرور رہتا ہے آتے وقت وہ خالی ہاتھ
ہیں۔"

فراق نے کہا۔ "جی ہاں وہ آپ کا گھریلو سامان ہے۔ جو
تھوڑا کرکے منتقل ہوتا ہے۔ یہ احتیاطی تدبیر ہے۔ آپ نے
زیورات بنائے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی سیٹ آپ کے
ہو۔ آپ نے جتنے جوڑے بنائے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی
جوڑا آپ کے گھر میں ہو۔ آپ نے جتنے برتن خریدے ہیں۔
سے سوائے ضروری برتنوں کے اور سب آغا تقی کے ہاں
چکے ہوں گے یہی اگلے دو صاحبان کے ساتھ بھی ہوا تھا۔۔
م صاحب آغا تقی میرے عزیز ہیں۔ مجھے ان کے گھر کے رتی
ے کا حال معلوم ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بھائی فراق صاحب! مجھے اس کا
نہیں ہے کہ میں لٹ گیا۔ میرے پاس حلال کی کمائی نہیں تھی
ل تھی۔ حرام ہی میں چلی گئی۔ میں ہزاروں بار کا کرا چکا
لیکن مجھے افسوس یہ ہے خود ستائی معاف میرا جیسا سمجھدار
یسا معاملہ فہم کیوں کر اتنا بڑا دھوکا کھا گیا۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا! یہ عشق کا کھیل ہوتا ہی ایسا
۔۔۔۔ وہ بولے۔

استاد بہزاد اب میرا آخری حملہ دیکھ لو۔ ابھی اللہ کا شکر
رے پاس چار پانچ سو روپے ہیں۔ وہ روپے کر میں
ہیں پردیس چلے چلتے ہیں تاکہ میرا غم غلط ہو جائے۔ کہو
بہزاد میرے ساتھ چلنے کے لئے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹا یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو۔
قدم پیچھے ہو میں دو قدم آگے۔

یہ سنکر حکیم بڈھن کھڑے ہو گئے اور مجھے سینے سے لگا کر
ہر تک روتے رہے۔ اور بولے۔

بہزاد تم سے مجھے یہی توقع تھی۔ اب میرے ساتھ چلو۔
آغا تقی رات کے کھانے پر خاص طور پر مدعو ہیں۔ ان
کی چیزیں پکائی گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی چل
نے میں شریک ہو جاؤ۔ اس کے بعد دیکھ لو کہ میں کس
ن کو شرمندہ کرتا ہوں۔

مجھے کیا عذر تھا حکیم بڈھن کے ساتھ واپس ہوا۔
موشی سے کٹا۔ گھر پہنچتے ہی حکیم بڈھن مجھے لئے ہوئے
گئے۔ آغا تقی گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہوئے تھے حکیم
نے کہا۔
نئی دہلی

"میں بہزاد کو بھی لیتا آیا ہوں۔ آج بڑے سال پکے ہیں
سا نے سوچا کہ اس جنونی شاعر کو بھی کھلا دوں۔"

یہ کہہ کر حکیم بڈھن نے قہقہہ مارا۔ میں ڈر گیا۔ قہقہہ بڑا ہی خوفناک تھا۔ کھانا چنا گیا۔ متعدد چیزیں تھیں۔ حکیم بڈھن نے اصرار کرکے بیوی کو بھی دسترخوان پر بٹھایا۔ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ میں نے دیکھا کہ حکیم بڈھن نے اصرار کرکے مجھے بھی خوب کھلایا اور خود بھی سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد جب سب پان کھا چکے تو حکیم بڈھن نے کہا۔

"آغا صاحب! آپ واقعی صاحب کمال آدمی ہیں اور اتنے بڑے صاحب کمال کہ آپ اپنی نکاحی بیوی کا نکاح دوسروں کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ آپ دیوث ہیں دیوث کمائی کے لئے یہ راستہ وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن میں غیرت حیا اور شرم نام کو بھی نہیں ہوتی۔ معاف کیجئے گا آپ میں بھی بالکل شرافت نہیں ہے آپ سے چور اچکا ڈاکو بہتر اور جیب کترا افضل ہے۔ وہ اپنی آبرو نہیں بیچتا۔ آپ نے جس انداز سے مجھے بے وقوف بنایا۔ مجھ حکیم بڈھن کو۔ وہ آپ کا کمال ہے۔ میں داد دیتا ہوں آپکی یہ بیوی بھی صاحب کمال ہیں کہ متعدد مردوں کی بیوی بننے کے بعد بھی آپ کی وفادار رہیں۔ آپ دونوں ایک ہی خمیر سے بنے ہوئے ہیں۔

یہ کہہ کر حکیم بڈھن نے تھوڑا سا پانی پیا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آغا تقی اور مساۃ دونوں کے چہرے اترتے ہوئے تھے۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

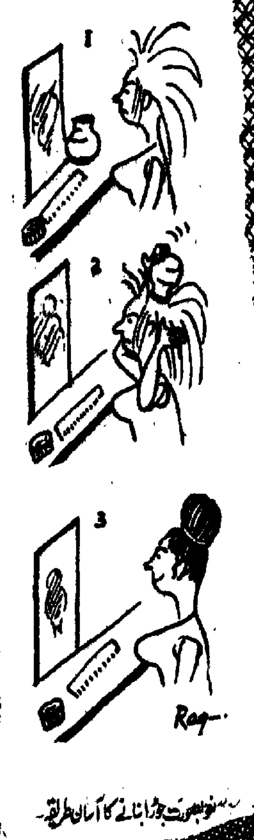
"اگر میں چاہوں تو بدمعاشوں کو بلوا کر آپ کا اور آپ کی ان بیوی جمال پری کا حلیہ بگاڑ دوں۔ ناک کٹوا دوں۔ جو دولت آپ چالاکی سے مجھ سے حاصل کر چکے ہیں میرے پاس بھی حرام ہی میں آئی تھی۔ مثل مشہور ہے۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ مجھے اس کا کوئی ملال نہیں ہے۔ لے جایئے۔ میں صبح محض اپنے کپڑے وغیرہ لیکر یہ حویلی چھوڑ دوں گا اس لئے کہ یہ حویلی آپ کی ہو چکی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ میں اس کا انتقام لوں گا۔ اور ایسا انتقام لوں گا آپ موت مانگیں گے اور آپ کو موت نہیں آئے گی۔ آپ نے اچھے گھر بیعانہ دیا ہے۔

آغا تقی کچھ بولنے ہی والے تھے کہ حکیم بڈھن نے کہا۔

"خاموش بیٹھے رہیے ایسا نہ ہو میرا پیمانہ چھلک جائے۔ مہربانی فرما کر اپنی پری جمال بیوی کو جو آپ کوا با حضور تی ہیں اپنے ہمراہ لے جایئے۔ میں رات ان کی موجودگی میں بسر کرنا نہیں چاہتا۔ زیورات آپ پہلے ہی پار کر چکے ہیں۔ کپڑوں کے جوڑے آپ پہلے ہی لے جا چکے ہیں۔ میں اس گھر سے کوئی شے نہیں لوں گا بجز اپنے کپڑوں کے۔ صبح نو بجے آکر اس حویلی میں اپنا قفل ڈال دیجئے یا اس میں قیام کیجئے۔ یہ آپ کی مرضی۔ جایئے اس وقت میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جایئے۔ آپ دونوں صاحبان دور ہو جایئے۔"

وہ دونوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد حکیم بڈھن نے اندر جاکر ہارمونیم اٹھایا۔ صحن میں بیٹھے اور گانا شروع کیا۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا۔ ہم ناتواں دیکھا کئے۔



خوبصورت جوڑا بنانے کا آسان طریقہ۔

گنجے سر پر بال اگ سکتے ہیں

رنگ جو جانور جتنا زیادہ جنگلی ہوتا ہے اس کے اتنے ہی زیادہ بال ہوتے ہیں۔ زیادہ بال ہونا جنگلی پن کی نشانی ہے اس کے علاوہ امریکا کے مشہور ڈاکٹر سورمن براؤن کا کہنا ہے کہ گنجوں کو بال والوں کی بہ نسبت کینسر ہونے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ہارمن یینگ نے ۲۰ سال کے مطالعے کے بعد کہا کہ زیادہ تر عالم گنجے ہوتے ہیں جبکہ بے وقوفوں کے ساتھ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اب گنجوں کا دواؤں اور تیلوں پر سے اعتبار اس قدر اٹھ گیا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کو یہ پتا نہیں ہے کہ آج گنج کے کئی علاج ممکن ہیں۔

گنج دور کرنے کا پہلا کامیاب تجربہ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر نورمن نے نیویارک میں کیا تھا۔ ڈاکٹر نورمن نے بال اگانے کے لئے بالکل وہی طریقہ استعمال کیا ہے جو مالی بنجر زمین پر گھاس اگانے کے لئے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نارمن نے بنجر بالوں والے حصے میں کچھ بہت ہی باریک سوراخ کئے اور بالوں والے حصے میں سے کچھ بال نکال کر ان سوراخوں میں گاڑ دیے۔ خوش قسمتی سے یہ تجربہ کامیاب رہا اور تین مہینے کے اندر اندر پچاس میں سے پندرہ مریضوں کے سر پر نئے بال اگنے شروع ہو گئے۔ یہ بال بالکل پرانے بالوں کی طرح تھے اور مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم تھے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر کلیگ مین اور ڈاکٹر پاپا نے بال اگانے کے معاملے میں ایک قدم اور اٹھایا۔ انھوں نے حادثاتی طور پر ایسی دوا دریافت کر لی جو تیس تیس سال پرانے گنجوں کے سر پر بال اگا سکتی تھی۔ ڈاکٹر پاپا بالکل مختلف چیز پر تجربہ کر رہے تھے لیکن جب انھیں اپنے ہارمون ڈرگ ٹیسٹو سٹورون کی مدد سے بال اگانے میں کامیابی حاصل ہوئی تو انھوں نے کچھ قیدیوں کے سروں پر اس کا تجربہ شروع کر دیا ان قیدیوں کی عمر ۳۸ اور ۸۰ سال کے درمیان تھی۔ ان میں کچھ قیدی ایسے تھے جو تیس تیس سال پرانے گنجے تھے حیرت انگیز طور پر چند مہینوں کے اندر اندر ان کے سر بالوں سے بھر گئے ایسے سر جن پر بالوں کا نام و نشان بھی نہ تھا بالوں سے بھر گئے۔ اس تجربے میں ایک اور بات کا بھی اندازہ ہوا کہ بالوں کے اگنے یا نہ اگنے پر عمر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بوڑھے اور جوان دونوں ہی کے اس ہارمون کی مدد سے بال اگائے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر پاپا کے تجربات ابھی جاری ہیں اور بہت جلد انکی بنائی ہوئی یہ دوا بازار میں عام ملنے لگے گی۔ پھر جلد ہی بنجر سروں پر بال لہرانے لگیں گے لیکن ۔۔۔ آپ کی اور ہماری تفریح کا ایک عمدہ ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ بہر حال ڈاکٹر پاپا کے تجربات دنیا بھر کے گنجوں کے لئے خوشی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

بحرین کی آزادی

بحرین پر ایران کا قبضہ رہا ہے اور اس پر اس کا بدستور مطالبہ بھی تھا لیکن سال گزشتہ جب اقوام متحدہ کے ایک تحقیقاتی مشن نے اپنی رپورٹ پیش کی کہ اس ریاست کی زبردست اکثریت آزاد رہنا چاہتی ہے، تو ایران نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ اور اب اس نے آزاد بحرین کو تسلیم کر لیا۔ یہ اس کی فراخدلی کا ثبوت ہے۔ بحرین کے موجودہ امیر شیخ عیسیٰ بن سلمان آلخلیفہ کے ایران کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات ہیں۔ بحرین عرب لیگ میں شمولیت کے بعد اسکا پندرھواں ممبر ہوگا۔

اگر بحرین اور قطار دونوں فیڈریشن میں شامل ہو جاتے تو نہ صرف یہ کہ خلیج کے علاقے میں یہ حکومت تعمیر و ترقی کے سلسلے میں شاندار رول ادا کر سکتی تھی بلکہ عالم عرب کے وسیع تر اجتماعی مفادات کے سلسلے میں دوسرے عرب ملکوں کے شانہ بشانہ چل کر عرب دنیا کے لئے مزید قوت و توانائی کا باعث بھی بنتی۔ (قطار کی آبادی ۸۰ ہزار ہے) لیکن اب طاقت تقسیم ہو گئی اور اس علاقے کی تمام نو ریاستوں کا مشترکہ فیڈریشن معرض وجود میں نہ آ سکا۔

اگر عرب امراء اپنے ذاتی مفادات کو خیر باد کہہ کر باہمی مفادات کو پیش نظر رکھیں تو یقیناً سب ایک کڑی میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج نہیں تو کل یہ وقت آئے گا جب تمام ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہو جائیں گی۔

جو کچھ ہو۔ اس علاقے میں آزاد حکومتوں کا ابھرنا خلیج فارس یا خلیج عرب کی تاریخ کا ایک انتہائی عظیم واقعہ ہے۔

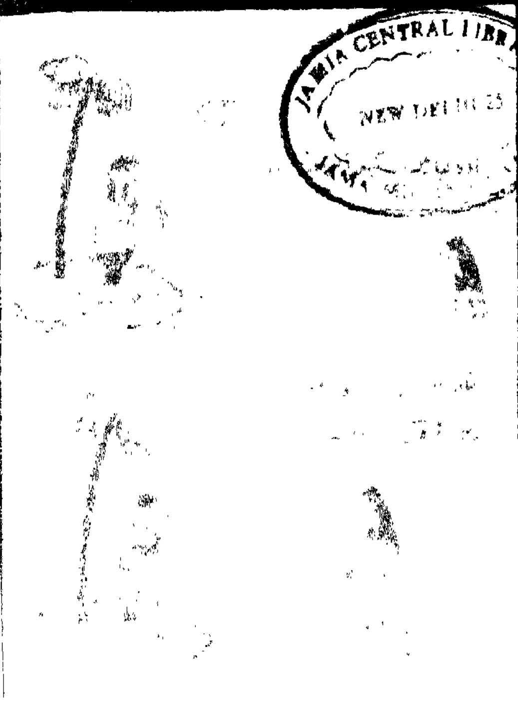
مرکزی وزیروں نے
۱۵ اگست
اپنی تنخواہوں میں
دس فیصدی
کمی کا اعلان
کیا ہے۔
ایک خبر



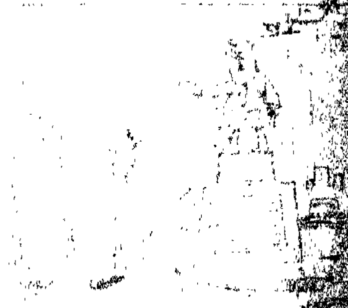
اسباب زبوں حالی

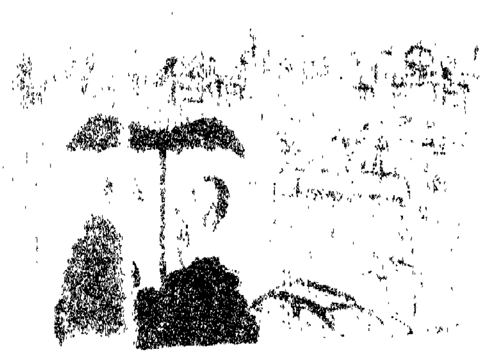
WAQIAT

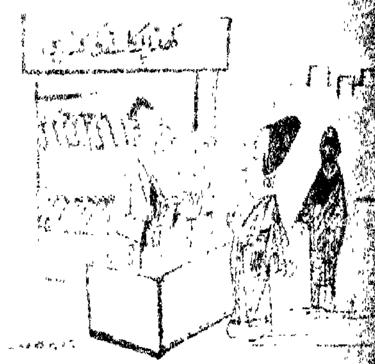
AUGUST 1971
(SECOND HALF)
REGD. NO. D-
TELEPHONE . 619035











بہت اچھی کتاب ہے مادام۔ گھر پر کھانا
نہ پکانے کی ۱۰۰ وجوہات۔


ٹیم کی
شاندار فتح

مے کشی رخصت ہوئی [illegible]
پھیر لیں ساقی نے آنکھیں ہم سے پیمانہ گیا
کیا عنایت ہے کہ وہ خود ہم سے فرمانے لگے
آپ کے رنج و الم کا ماجرا جانا گیا
شاد جب تک [illegible] حادثہ [illegible] تھا
ہو گیا جب [illegible] دل کا [illegible] گیا
بڑھ گیا ان کا تغافل [illegible]
رفتہ رفتہ بزم میں تشریف فرمانا گیا

[illegible]

زیست کے [illegible] | [illegible] دل کا [illegible]
میری تعظیم کر کے [illegible] | [illegible]

دل لگتا ہے [illegible] | [illegible]
آپ [illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] نظم خواہ کسی ذریعے سے وصول [illegible] کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے [illegible] کوئی ادارہ ذمہ دار نہیں ہے [illegible] کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے [illegible] کو اختیار ہے۔
[illegible] مسودات کو محفوظ رکھنے کا [illegible] دار نہیں ہے۔

[illegible] شائع شدہ مضامین [illegible] کے حوالے سے شائع [illegible]

عرب وفاق اتحاد کی طرف ایک اہم قدم

مصر، لیبیا اور شام کے وفاق کے قیام کے سلسلے میں تمام ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور یقین ہے کہ اسی ماہ اس کے قیام کا باضابطہ طور پر اعلان کر دیا جائیگا مشرقِ وسطیٰ میں عرب وفاق کے قیام کی یہ خبر حقیقی معنوں میں ایک دل خوش کن خبر ہے کیونکہ یہ عرب اتحاد کی طرف ایک اہم اور ٹھوس قدم ہے۔ لیکن عربوں کی انفرادیت پسندی کی جو روایت ہمیشہ سے رہی ہے اس کے پیش نظر وفاق کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

اسی قسم کی ایک کوشش مرحوم صدر ناصر نے کی تھی جب ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کے الحاق کے نتیجے میں "متحدہ عرب جمہوریہ" کا قیام عمل میں آیا تھا یہ جمہوریہ تین برس بھی نہ چل سکی اور اس کے بعد محض نام کی "متحدہ عرب جمہوریہ" رہ گئی ایک متحدہ عرب جمہوریہ کی بات نہیں، عربوں کے باہمی تنازعات کو ختم کرنے کے بارے میں جو سمجھوتے ہوئے وہ کتنی بار ٹوٹے۔ بارہا دیکھا گیا کہ عرب ممالک ایک دوسرے کے خلاف میدان میں آ گئے۔

لہٰذا فوجی انقلاب اور قتل و غارت گری اور باہمی دشمنی یہ عرب ممالک کی خصوصیتیں بن کر رہ گئی ہیں، اسی لئے جب عرب اتحاد سے متعلق کوئی خبر سامنے آتی ہے تو مختلف حلقوں کی طرف سے اس پر شکوک و شبہات ایک قدرتی امر ہے۔

لیکن آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بار جو وفاق قائم ہو رہا ہے اس کی بنیادیں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ اس کی تائید میں کئی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اول یہ کہ تینوں ملکوں کے عوام نے ریفرنڈم میں ۹۶ فیصد سے ۹۹ء۹ فیصد تک [illegible] ووٹ دے کر ثابت کر دیا ہے [illegible] عرب [illegible] ممالک [illegible] اور عرب ممالک کی منتشر طاقت کو مجتمع کرنے کے حق میں ہیں دوم یہ کہ وفاق کا جو آئین وضع کیا گیا ہے وہ ایک ڈھیلا ڈھالا جمہوری آئین ہے اور اس میں ہر ملک کی آزادی و خود مختاری کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ تینوں ملکوں کی خارجہ پالیسی یکساں ہوگی ان کا جھنڈا اور ترانہ بھی ایک ہوگا لیکن ہر ایک ملک اقوامِ متحدہ کا الگ الگ ممبر رہ سکے گا۔ آئین میں سب سے بڑی یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ قومی اسمبلی میں تینوں ممبر ملکوں کو ساوی نمائندگی دی گئی ہے۔ ہر ملک اپنے ۲۰-۲۰ ممبر اسمبلی میں بھیجے گا اور اس طرح وفاق میں شامل ملکوں میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہ کی جا سکے گی۔ آبادی کے لحاظ سے مصر شام سے چار گنا اور لیبیا سے تین گنا بڑا ہے لیکن محض عرب اتحاد کی خاطر وہ اپنی عددی اکثریت کا سوال زیرِ بحث نہیں لایا یہ اس کی بہت بڑی قربانی ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ عرب اتحاد اس کے لئے ہر چیز پر مقدم ہے۔ تینوں ملکوں کے سربراہوں۔ انور سادات۔ کرنل قذافی اور حافظ الاسد نے تمام عرب سوشلسٹ اور جمہوری ملکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ وفاق میں شامل ہونے کے لئے قدم اٹھائیں۔ یہ اپیل صرف سوشلسٹ اور جمہوری ملکوں ہی سے کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جن ملکوں میں شاہی حکومتیں قائم ہیں ان سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ وفاق میں شامل ہو کر اپنی آمریت کو ختم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔ لیکن سوشلسٹ اور جمہوری حکومتیں بھی ابھی خاموش نظر آتی ہیں۔ "عرب اتحاد کی علمبردار" عراق کی حکومت نے تو وفاق کی مخالفت کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہے لیکن ایک وقت آئے گا جب دوسری عرب طاقتیں بھی وفاق کی طرف آنے کے لئے مجبور ہوں گی۔ اور محسوس کریں گی کہ وہ اپنی متحدہ طاقت ہی کے ذریعے ایک جارح قوت کو اپنی سرزمین سے بے دخل کر سکتی ہیں۔ نئی وفاقی حکومت اپنی آبادی اور وسائل کے لحاظ سے ایک بڑی حکومت ہوگی۔ وہ اس وقت چار کروڑ ۲۰ لاکھ یعنی تقریباً نصف عربوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اگر سوڈان اس میں شامل ہو گیا جیسا کہ توقع ہے جلد شامل ہو جائے گا تو وہ عرب اکثریت کی نمائندہ حکومت ہوگی اور اس لحاظ سے عربوں کے مسائل میں زیادہ قوت کے ساتھ بول سکے گی نئی حکومت نہ صرف مشرقِ وسطیٰ بلکہ پورے ایشیا میں بھی ایک بڑی طاقت بن سکتی ہے بشرطیکہ وفاق میں شامل سب ممالک پوری طرح متحد رہیں اور اپنے ذاتی مفادات کو درمیان میں نہ آنے دیں۔

قدرتی طور پر اسرائیل اور امریکا وفاق کے قیام سے بے چین ہیں اور اس پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ انھیں بے چینی اس لئے اور زیادہ ہے کہ نئی حکومت نے اسرائیل کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت یا سمجھوتہ نہ کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ اس کے دوسرے معنے یہ لئے جا سکتے ہیں کہ اگر اسرائیل نے عرب علاقے خالی نہ کئے اور اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کی برابر خلاف ورزی کرتا رہا تو وفاقی حکومت طاقت کے ذریعے تمام علاقے واپس لینے کے لئے قدم اٹھائے گی۔ اس کے معنی ایک اور جنگ کے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں ممالک پہلے سے اس کے لئے تیار ہیں اور جنگ کے امکانات کو سامنے رکھ کر ہی انھوں نے اپنے وفاق کی داغ بیل ڈالی ہے۔ لیکن شاید اسرائیل سے نمٹنے سے پہلے وفاقی حکومت کو اردن کی شاہی حکومت سے نمٹنا پڑے جو بقول انور سادات "اسرائیل کے خلاف عرب محاذ" سے الگ ہو گئی ہے اور جس نے اپنی فوجیں اسرائیلی سرحد سے ہٹا کر شامی سرحد پر لگا دی ہیں۔ کرنل قذافی کا یہ نشری اعلان کہ عرب وفاق مراکش اور اردن کے لوگوں کی نجات کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وفاقی حکومت کے ذریعے شاید شاہی حکومتوں کے خلاف کارروائی کی جائے جو قذافی کے خیال میں عرب اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں وفاقی حکومت کے مقابلے میں اردن یا مراکش کی کوئی فوجی طاقت نہیں۔ لیکن اگر امریکہ یا برطانیہ نے ان ممالک سے اپنے مقصد کیلئے کام لینا چاہا تو وہ وفاقی حکومت کے لئے بہت سی پریشانیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ حقیقت میں یہ عرب لیڈروں کے تدبر کا امتحان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس امتحان میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔

خطوط

بنگلہ دیش اور ہندوستانی مسلمان

مکرمی۔ تسلیم

"واقعات" کا جولائی ۱۹۷۱ء کا نصف دوم شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں بنگلہ دیش سے متعلق آپ کے کسی سابق اداریے پر محمد قاسم صاحب کا نہایت جذباتی مراسلہ نظر سے گزرا۔ اسی مسئلے کے بارے میں بعض مطبوعہ سوالات کا اندازہ بھی ہوا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ نے سوالات کے جوابات بڑے توازن وقار اور بصیرت کے ساتھ دیے ہیں۔ غالباً آپ کے اس اداریے کا بھی یہی مقصد ہوگا جس پر محمد قاسم صاحب معترض ہیں۔

اس طرح کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی جذباتی انداز اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اس سے کیا فائدہ۔ مسئلے کو ہمیشہ عملی اور معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آج بنگلہ دیش میں جو کچھ ہو رہا ہے بلاشبہ اس کی اصل ذمے داری مغربی پاکستان کے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہی سے مغربی پاکستان کے ارباب اقتدار کا مشرقی بنگال کے عوام (بشمول مسلم اکثریت) کے ساتھ جو غیر منصفانہ برتاؤ رہا اس میں "اسلامی اتحاد" کا ... پاکستان کے عام انتخابات ... عوامی لیگ کو ... کامیابی حاصل ہو گئی تھی اس کے بعد عدل و انصاف کے کسی بھی معیار کے مطابق جنرل یحییٰ خاں کو یہ حق تھا کہ وہ اقتدار فوراً انھیں منتقل نہ کر دیتے۔ جب یحییٰ خاں کی فوجوں نے مشرقی بنگال پر چڑھائی کی تو اس سے پہلے کسی اعلامیے یا نشریے میں یہ بات کہی گئی تھی کہ یہ فوجیں غیر بنگالی مسلمانوں پر بنگالیوں کے مظالم کو روکنے یا ان کا بدلہ لینے کے لئے وہاں بھیجی جا رہی ہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ محض ایک AFTER THOUGHT ہے جو خود اپنے مظالم پر پردہ ڈالنے کے لئے پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے ایجاد کیا ہے۔ عوامی لیگ کے نام نہاد دہشت پسندوں کے مبینہ مظالم کی جو روداد محمد قاسم صاحب نے لکھی ہے اگر وہ صحیح بھی ہو تو کیا عوامی جوش کے غلط راستہ اختیار کرنے اور منظم فوجی ظلم و تعدی کے پلڑے انصاف کی ترازو میں مساوی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا نام محمد قاسم صاحب نے جس طرح لکھا ہے وہ بھی سخت تکلیف دہ اور غیر مہذبانہ ہے جو تقسیم ہند سے پہلے کے مسلم لیگی طرز کی یاد تازہ کرتا ہے، اور انھوں نے قرآن اور اسلام کے بارے میں جو خیالات شیخ کی طرف منسوب کئے ہیں وہ تو خالصاً پاکستانی پروپیگنڈے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

اگر پاکستان کی فوجی کارروائی خدائی قہر کی ایک شکل ہے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ خدائی قہر کا یہ سلسلہ بہت دراز ہوگا اور کہیں جا کر رکے گا نہیں۔ کیا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کے سواد اعظم نے مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے علمائے اسلام کی جو بے حرمتی کی تھی اس کی وجہ سے ان پر "قہر الٰہی" "فرقہ وارانہ فسادات" کی صورت میں نازل ہوتا رہتا ہے اور اس لئے فساد کرنے والے اس وبال سے بری الذمہ ہیں؟ لیکن جو لوگ قانون الٰہی کے رموز سے ذرا بھی آشنا ہیں وہ اس قسم کے لاطائل دلائل کو ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح عدالت کے بعد ایک اور عدالت بھی تو ہے جہاں اصلی اور حقیقی انصاف ہونے والا ہے۔ اگر محمد قاسم صاحب کے نزدیک شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے حامیوں کو سزا ملنی ہی چاہیے تھی جو جنرل یحییٰ خاں اور ان کے فوجیوں نے دیدی تو اس عدالت میں جہاں جھوٹی توجیہات ذرا کام نہیں دیں گی بلکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ ہو کر رہے گا۔ نہ معلوم کس کس کے چہرے قرآنی وعید کے مطابق سیاہ ہو کر رہیں گے۔ اس دن سے اور اس دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

"اللہم احفظنا من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا"۔

نیاز مند ریاض الرحمٰن شیروانی۔ علی گڑھ

"واقعات" جانبدار ہے۔

محترمی ایڈیٹر صاحب۔ تسلیمات

آپ کے ادارے سے جتنے بھی پرچے نکلتے رہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان جیسا ہندوستان میں ایک پرچا نہیں نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے تمام پرچوں کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کرتا ہوں اور جب تک شروع سے آخر تک نہیں پڑھ لیتا سکون میسر نہیں آتا ہے۔

میں آپ کو ایک قابلِ احترام شخصیت اور بے باک صحافی سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جو کچھ بھی لکھتے ہیں غیر جانبداری سے لکھتے ہیں، لیکن میں دو تین ماہ سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ جانبداری سے کام لے رہے ہیں اور بنگلہ دیش کے جھوٹے واقعات کو اچھال کر لکھ رہے ہیں اور ہمارے محبوب رسالے "واقعات" کو داغدار کر رہے ہیں۔ حالانکہ بنگلہ دیش کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بنگلہ دیش ... تو پھر ہندوستانی ... ہندوستان کے ...

ہی کا سامنا ہے۔ وزیراعظم شیخ مجیب الرحمٰن ہندوستان ہی کا لیڈر ہے احساس کے ساتھ ہی آپ بھی حکومت کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں اور بنگلا دیش بنگلا دیش چلا رہے ہیں، شیخ مجیب الرحمٰن کی تعریف و توصیف کر رہے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلا دیش میں کیا کیا گل کھلائے ہیں اور غیر بنگالیوں کا کس طرح قتل عام کیا ہے، کس طرح معصوم لوگوں پر ظلم کا پہاڑ توڑا ہے۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آخر ان معصوم غیر بنگالیوں کا کیا قصور تھا کہ ان کے خاندان کا صفایا کر دیا گیا۔ انکی معصوم دوشیزاؤں کی آبرو لوٹی گئی، ان کی عورتوں کا حمل چاک کیا گیا اور شیر خوار بچوں کو نیزوں اور بھالوں پر اچھالا گیا۔ ان کے نوجوان مردوں کو مشین گنوں سے بھون دیا گیا اور ضعیفوں کو پاؤں پکڑ کر گھسیٹا گیا۔ آخر شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھیوں نے غیر بنگالیوں پر اس قدر ظلم کیوں کیا۔؟ آپ خاموش کیوں ہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔ آج تک آپ نے ان مظلوموں کے متعلق کیوں نہیں لکھا۔! کیا آپ کی زبان ان مظلوموں کے لئے گنگ ہو گئی تھی۔ کیا آپ کے ہاتھ کو کچھ ہو گیا تھا کہ آپ غیر بنگالیوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھ رہے تھے۔ بتلایئے آپ ان سب باتوں کا کیا جواب دیں گے۔

کیا آپ کو صرف بنگالیوں سے محبت ہے اور غیر بنگالیوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ اس قدر جانبداری سے کام لیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ آئندہ کے لئے غیر جانبدار بن جایئے۔ آپ کا اپنا۔

محمد ہمایوں صدیقی۔ دربھنگا

ہندوستانی سماج واد ــــ عوام سے مذاق

مکرمی۔ تسلیم

ملک کو آزادی ملے ہوئے تقریباً ۲۵ سال گزر چکے ہیں۔ آزادی سے پہلے عوام کو بہت سے سبز باغ دکھلائے گئے تھے جو حقیقت نہ بن سکے۔ دیہی علاقوں میں جیسی افراتفری زمینداری کے دور میں تھی وہی آج بھی ہے بلکہ آج کل تو گاؤں میں بے روزگاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ چند لوگوں نے فرضی ناموں کے ذریعے ہزاروں ایکڑ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہمارے حکمراں بھی اسی زمیندار اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے آج تک امید ہے۔

ہر بجٹ میں عوام پھنسے۔ نئے ٹیکس لگائے گئے۔ تمام نئے لائسنس چند سرمایہ داروں کو دیے گئے۔

بنگال میں آج بھی جمہوریت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے ۹۵ فیصدی ووٹ حاصل کرنے والی جماعت کو منظم سازش کے ذریعے حکومت سے محروم رکھا گیا۔ جمہوریت کے ساتھ مذاق دیکھنا ہو تو ہندوستان میں دیکھا جا سکتا ہے ہماری حکومت کو بنگلا دیش سے سبق حاصل کرنا چاہئے وہاں پاکستان کی فوجی حکومت نے عوام کے حقوق کو سلب کیا، ان پر ظلم ڈھائے تو مجبوراً عوام کو ایسی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے پڑے۔ وہ دن دور نہیں جب ہندوستانی عوام خوابِ غفلت سے جاگیں گے اور ملک میں اسی طرح کا انقلاب لے آئیں گے۔

آج ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ ملک میں سماج واد کا نعرہ لگانے والی سرمایہ داروں کی بھور سر اقتدار جماعت کی پول کھولی جائے۔ باقی تمام کام ہندوستانی عوام پورا کر دیں گے۔ آپکا۔ (ڈاکٹر) محمد قاسم بہار شریف

"واقعات" سیاسی شعور پیدا کر رہا ہے۔

مکرمی صدیقی صاحب۔ سلام و نیاز

"واقعات" کا اجرا کر کے اردو داں طبقے کو آپ دنیا کے سیاسی حالات سے جس طرح واقف کرا رہے ہیں وہ لائقِ ستائش ہے۔ دراصل اس طبقے کو شعوری اعتبار سے بیدار کر کے اصلیت تک پہونچانے کی شدید ضرورت ہے ہم میں سے بعض حضرات صرف روزناموں کے مطالعے تک اپنے ذہنوں کو محدود کر کے عالمی حالات و واقعات سے قطعی ناواقف رہتے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں وہ سیاسی شعور پیدا نہیں ہو سکا جس سے کسی طبقے کی سیاسی بیداری کا پتا لگایا جاتا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ "واقعات" کے ذریعے آپ اس گہرے شعور کو پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں جو ایک بیدار قوم کے لئے ضروری ہے ــ آپکا۔ عزیز انددری

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ سلام و نیاز

یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا کہ آج "واقعات" ہی وہ واحد پرچا ہے جو قوم پر چھائے ہوئے برسوں کے جمود کو توڑنے کے لئے کوشاں ہے اور بہت حد تک کامیابی سے آپ جیسی بلند مرتبت، عالی دماغ اور قابلِ ہستی بخشی ہے قابلِ پرستش ہے وہ شخصیت جسے واقعات کی شکل میں صورِ اسرافیل پھونکنے کا مبارک اعزاز بخشا گیا ہم سب آپ کی آواز کے ساتھ ہم آواز اور بارگاہِ ایزدی میں کامیابی کے لئے دعاگو ہیں۔ ناچیز۔ ایم سیٹھ

محترمی۔ السلام علیکم۔

"واقعات" پر نظر کئی ماہ قبل بک اسٹال پر پڑی تھی اس کے بعد اکثر و بیشتر نظر سے گزرتا رہا ہے۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کے سیاسی موضوعات بالخصوص مسلمانوں کے مسائل سے متعلق پالیسی ہے ــ بنگلا دیش کے المیے کے بارے میں "واقعات" کا جو رویہ ہے وہ یقیناً بہت صحیح۔ ایماندارانہ اور قابلِ ستائش ہے۔ کئی بار سوچا کہ اس کے بارے میں آپکو مبارکباد کا خط لکھوں آج خدا خدا کر کے وہ موقع ملا۔ مخلص۔ محمد سلیم

"واقعات" کو واقعات ہی رہنے دیں۔

محترمی۔ السلام علیکم

ایک گزارش ہے۔ شاید کہ شرف قبولیت بخشیں ــ "پندرہ روزہ واقعات" اگر صرف واقعات ہی رہے تو کیا حرج ہے۔ آپ تو اس کو تصویروں سے مزین کر کے تصویری البم بنا دیتے ہیں۔ آپ سے آپ کے حساس اور ... ہونے کی وجہ سے میری التجا یہی ہے کہ اس پرچے کو بازاری بنا کر مخربِ اخلاق لٹریچر میں شامل نہ کریں۔ امید ہے آئندہ احتیاط برتیں گے۔ واقعات کا ایک خریدار

محترمی۔ سلام و خلوص۔

جولائی کا شمارہ نظروں سے گزرا۔ بہت پسند آیا آپ کی محنت قابلِ تعریف ہے جو قلیل مدت میں ایسے پرچے کو منظرِ عام پر لائی جس کی اشد ضرورت تھی۔ "واقعات" میں ہر پہلو سے وابستہ واقعات ملتے ہیں، حتیٰ کہ آپ نے فلمی دنیا کو بھی اس میں سمویا ہے جسکا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں ہر مزاج کے پڑھنے والوں کو محظوظ کیا جائے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کی کوششوں کی تعریف کروں بلکہ صرف اتنا کہہ کر اپنے قلم کو روکتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں جب "واقعات" تمام پرچوں سے زیادہ مقبولیت حاصل کرے گا۔ آپ کا۔ اقبال

قبرص

نشستند و گفتند و برخاستند

قبرص کے یونانیوں اور ترکوں کے درمیان تنازعے کو حل کرنے کے لئے گزشتہ تین سال سے بات چیت ہو رہی ہے۔ دونوں کے درمیان اب تک ۲۴ بیٹھکیں (پیرس کی امن کی بات چیت سے ۴۴ زیادہ) ہو چکی ہیں لیکن ہر میٹنگ "نشستند و گفتند و برخاستند" پر ختم ہو جاتی ہے۔ یونانی نمائندہ گلیفکوس اور ترک نمائندہ رؤف دنکتاش تین سال سے ایک ساتھ بیٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان گئے ہیں اور ان کی دشمنی "دوستانہ دشمنی" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ لیکن کیا مجال کہ اپنے اپنے موقف سے ہٹ جائیں۔ دونوں ذہین و ہوشیار ہیں اور دونوں نے قانون کی تربیت برطانیہ میں پائی ہے۔ دونوں تمباکو نوش ہیں اور خوب باتیں کرنے والے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو جب خط لکھتے ہیں تو "ڈیر گلیفکوس" اور "ڈیر رؤف" سے خطاب کرتے ہیں لیکن کیا مجال کہ ان کے اپنے اپنے موقف میں تبدیلی آجائے۔ دونوں ابھی تک کوئی ایسا آئینی حل نہ نکال سکے کہ جزیرے کے پانچ لاکھ یونانی اور ایک لاکھ ۱۸ ہزار ترک کس طرح دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگ بھی دوستانہ دشمنی سے اس قدر تنگ آگئے ہیں کہ کہنے لگے ہیں کہ اب مسئلہ بات چیت کے ذریعے نہیں بلکہ طاقت کے ذریعے میدان جنگ میں ہوگا۔"

واقعات نمبر ...

ترکوں کا ... یونانیوں کو ... گئے ترک یونانیوں کی ذہنیت کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ لوگ "جیسے کو تیسا" کی بات سمجھتے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔

۸۵ سالہ پادری میکاریوس اور ان کے ساتھی اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ پورے جزیرے کیلئے ایک حکومت رہنی چاہیئے جو ظاہر ہے اکثریت کی حکومت ہوگی جس میں میکاریوس کے کہنے کے مطابق اقلیت کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ لیکن ترک کہتے ہیں کہ ہم "تحفظات" پر یقین نہیں رکھتے ہم اپنی حکومت الگ چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے جزیرے کو تقسیم کیا جانا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انتظامی مشنری الگ الگ ہو اور دونوں حصوں کی ایک مشترکہ پارلیمنٹ بنا دی جائے جس میں دونوں حصوں کے نمائندے خود مختار حصوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ... کو ... ہمارا وجود اس وقت خطرے میں ہے۔"

اور اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکوں نے ضروری اقدامات شروع کر دیئے ہیں اور اس مقصد کے لئے ترک لڑکیوں تک کو فوجی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ کیونکہ ترک سمجھتے ہیں کہ اگر بات چیت ناکام رہی تو میدان جنگ میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس مرتبہ ترکوں کو غفلت میں نہ رہنا چاہیئے۔

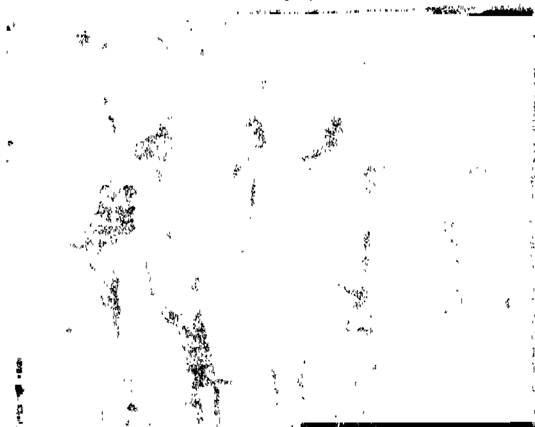


بولیویا

ایک انقلاب اور

بولیویا نے ۱۸۲۵ء میں اسپین سے آزادی حاصل کی تھی اس کے بعد سے اب تک ۱۸۰ بغاوتیں ہو چکی ہیں جن میں سے بیشتر کامیاب ہو چکی ہیں۔ گزشتہ سال اگست میں پچاس سالہ جنرل جوآن تورے اچانک انقلاب لا کر اور بائیں بازو کی حکومت قائم کر لی۔ اس وقت دائیں بازو کا فوجی گروپ الفریڈو اووانڈو کینڈیا کو ان کے عہدہ صدارت سے الگ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ تورے نے خاموشی کے ساتھ فضائیہ کی حمایت حاصل کی اور محل میں داخل ہو گئے۔ لیکن گزشتہ ہفتے تورے کو ایک انقلاب کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ بغاوت اس وقت شروع ہوئی جب تورے نے تیس فوجیوں اور غیر فوجیوں کو اس الزام میں گرفتار کیا کہ انہوں نے ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی۔ اس پر سانتا کروز کے مشرقی شہر میں دائیں بازو کے افسران نے بغاوت کر دی اور وہ ملک کے ۹ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں فوج کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان باغیوں نے جنرل ہوگو بینزر کو اپنا صدر منتخب کر لیا انہیں ایک ہفتہ قبل ہی تورے کے حکم سے ... کیا گیا تھا۔



قبرص کی ترک لڑکیاں جو اپنی اور قوم کی حفاظت کے لئے فوجی ٹریننگ حاصل کر رہی ہیں۔

لاپاز میں تورے نے عہد لیا تھا کہ وہ آخر تک "اپنی حکومت کا دفاع کریں گے اور فسطائیوں کی بغاوت" کو کامیاب نہ ہونے دیں گے انھیں بائیں بازو کے فوجیوں کی حمایت حاصل تھی اور وہ ریل اور سڑک کے ایک اہم جنکشن اورورو پر جو لاپاز کو ٹین کی کانوں کے تمام اہم مرکزوں کو باہم ملاتا ہے کنٹرول کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن میدان جنگ میں دائیں بازو کے فوجیوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ راجدھانی لاپاز کی جنگ میں ملٹری اکیڈمی کے کیڈٹ باغیوں کے ساتھ مل گئے اور تورے کی وفادار فوجوں کی قوتِ مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ یہی وقت تھا جب باغی فوجوں کے نمائندے نے تورے کو الٹی میٹم دیا کہ "استعفےٰ دیدو" لیکن تورے نے جواب دیا کہ "تم یہاں سے میری لاش ہی کو نکال سکو گے۔" تاہم جب باغی ٹینک صدارتی محل کی طرف بڑھے تو وہ وہاں سے نکل کر پیرو کے سفارت خانے میں چلے گئے اور پناہ لے لی۔ آخر میں باغیوں نے انھیں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پیرو جانے کی اجازت دیدی۔

کوئی عرب ملک ہوتا تو شاید صدر اس طرح ملک چھوڑ کر باہر نہ جاسکتا تھا۔

بائیں بازو کے فوجی ولالکوسے پر قبضہ کرنے کیلئے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔

شمالی آئرلینڈ

بدستور احتجاج مظاہرے اور کشیدگی

واقعات نئی دہلی

پر گزشتہ سے پیوستہ ہفتے کی بات اسی وقت وہ حاملہ تھیں بس لے پیدل چلنے کی بجائے لاؤڈ اسپیکر والی کار پر سوار

غیر شادی شدہ ممبر پارلیمنٹ — جو حاملہ ہے —

"او ہو، ہم برطانوی سپاہیوں سے نفرت کرتے ہیں جی ہاں ہم نفرت کرتے ہیں۔ ہم نفرت کرتے ہیں" یہ تھے وہ نعرے جو چار سو کیتھولک عورتیں اور لڑکیاں لندن ڈیری (شمالی آئرلینڈ) میں اس وقت لگا رہی تھیں جب پروٹسٹنٹ لوگ شمالی آئرلینڈ میں یونین جیک لہرائے جانے کی سالگرہ کی تقریب منا رہے تھے مظاہرے کی قیادت ۲۳ سالہ برناڈیٹ ڈیولین کر رہی تھیں وہ مڈاسٹر کے حلقے سے پارلیمنٹ کی سب سے کم عمر ممبر ہیں۔

تھیں (گزشتہ ہفتے ان کے ہاں لڑکی تولد ہوئی ہے جس کے باپ کا نام انھوں نے بتانے سے انکار کردیا)

برطانوی سپاہیوں کے خلاف عوام کے اندر کتنا جذبہ پایا جاتا ہے اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ لڑکے تک پتھر اور بوتلیں جمع کرتے ہیں اور جب بھی کوئی برطانوی سپاہی نظر آتا ہے اس پر پھینک دیتے ہیں۔

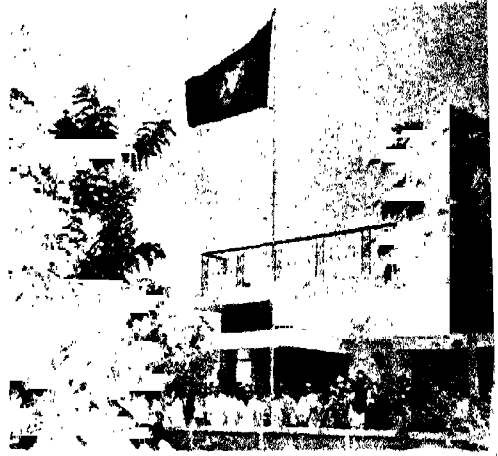
کیتھولکوں میں یہ غم و غصہ جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے اس لئے ہے کہ شمالی آئرلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر برین فولکنر نے احتناعی نظربندی کا قانون نافذ کردیا ہے اور کسی شخص کو بھی مقدمہ چلائے بغیر نظربند کیا جاسکتا ہے۔ برناڈیٹ نے اعلان کیا ہے کہ ہم اس قانون کے خلاف اتنی گرفتاریاں دیں گے کہ ہمارے جیلوں میں جگہ نہ رہے گی۔

ناراضگی اور کشیدگی گھٹنے کی بجائے اور بڑھتی جا رہی ہے، دھماکے اور فائرنگ روزانہ کا معمول بن کر رہ گئے ہیں۔ بیلفاسٹ کے ایک مزدور نے جب سنا کہ اس کا باپ مارا گیا تو وہ بولا "خدایا یہ ملک تو اب جہنم بن گیا" ایک ۶۰ سالہ کیتھولک پادری جو کسی دم توڑتے شخص کے پاس آخری مذہبی رسوم انجام دینے کے لئے پہونچنے کی کوشش کر رہا تھا ہلاک کر ڈالا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس شخص کے پاس وہ پہنچنا چاہتا تھا وہ بچ گیا۔

وزیر اعظم جمہوریہ آئرلینڈ نے شمالی آئرلینڈ کی اس صورتِ حال پر تشویش ظاہر کی ہے اور حکومتِ برطانیا کو لکھا ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک خاموش بیٹھے نہیں دیکھتے رہیں گے۔ برطانوی حکومت بھی سخت ناراض ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ کئی برطانوی سپاہی سرحد کی فائرنگ میں مارے جا چکے ہیں۔ حکومتِ برطانیا نے اس بات کا سخت نوٹس لیا ہے اور وزیر اعظم مسٹر ہیتھ نے اس بات پر ناراضگی ظاہر کی ہے کہ وزیر اعظم جمہوریہ آئرلینڈ نے انھیں جو مراسلہ لکھا ہے اس میں انھوں نے سپاہیوں کے ہلاک ہونے پر اظہار افسوس تک نہیں کیا۔

برطانیا ہمیشہ دوسروں کی آگ میں کودا کرتا تھا۔ اب خود اس کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

بنگلہ دیش مشن



دہلی کے بنگلہ دیش مشن میں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے۔

لیجئے دہلی میں اب "بنگلہ دیش ہائی کمیشن" بھی بن گیا۔ گزشتہ ہفتے جب موتی باغ کے قریب آنند نکیتن کی عمارت پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا گیا۔ یہ بنگلہ دیش مشن تھا لیکن اب بنگلہ دیش کی حکومت نے اسے "بنگلہ دیش ہائی کمیشن" کا نام دیا ہے۔ اس کے انچارج ہیں مسٹر کے۔ ایم شہاب الدین۔ یہ وہی ڈپلومیٹ ہیں جنہوں نے پاکستان ہائی کمیشن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان میں سیاسی پناہ لی تھی۔ جو انہیں مل گئی۔ بنگلہ مشن پر انھوں نے ہی بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا تھا۔ جھنڈا لہرانے کی یہ دلچسپ تقریب تھی بڑے بڑے لوگ اس میں شامل تھے لیکن سرکاری افسر اس میں شامل نہیں تھے اس لئے کہ ابھی بھارتی حکومت نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا ہے اور جب تک اسے تسلیم نہ کیا جائے حکومت ہند عملاً اس سے لاتعلق رہے گی۔ لیکن بنگلہ دیش کے ڈپلومیٹوں کو ہندوستان کی اخلاقی ہمدردیاں حاصل ہیں۔

پاکستان بنگلہ دیش کے مشن کے قیام سے ناخوش ہے۔ اس کے خلاف اس نے ایک احتجاج بھی دے مارا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہندوستان بنگلہ دیش کے حریت پسندوں کو کچھ نہ کرنے دے۔ لیکن کیا خود پاکستان اس پوزیشن میں ہے کہ وہ بنگلہ دیش کی سرگرمیوں کو روک دے؟ بنگلہ دیش میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ وہ جو کچھ خود نہ کر سکا اسے ہندوستان سے کرانا چاہتا ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے۔

قابلِ رحم حالت :۔

پاکستان ہائی کمیشن والوں کی حالت آج کل بہت قابلِ رحم ہے۔ بنگالی ملازمین ایک ایک کرکے اس سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مسٹر امجد علی پانچویں بنگالی ہیں جو ہائی کمیشن کی عمارت کو خیرباد کہہ کر باہر آگئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی ریحانہ اور تین ماہ کی چھوٹی بچی کے ساتھ اس کا فوٹو کھنچوانے کی اجازت لے کر باہر نکلے۔ پاکستان انٹیلی جنس کا آدمی ان کے ساتھ تھا لیکن انھوں نے ایسا چکمہ دیا کہ وہ دیکھتا رہ گیا۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہائی کمیشن میں شاید اور بھی بنگالی ہیں جو باہر آنے کے لئے تڑپ رہے ہیں اور یقین ہے جب بھی موقع ملے گا وہ باہر آ جائیں گے۔ ان کا نعرہ یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے ہم اپنی خدمات بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کے حوالے کر دیں۔

مظاہرے :۔

ایک طرف اندرون ہائی کمیشن بے چینی ہے اور دوسری طرف اس کے باہر لوگوں کی یلغار ہے۔ جتنے مظاہرے اب تک ہو چکے ہیں شاید ان کی گنتی کرنا بھی مشکل ہو۔ تازہ مظاہرہ بمبئی کے اردو اخبارات کے ایڈیٹروں نے کیا ہے۔ اس سے قبل آندھرا کے اردو اخبارات کے ایڈیٹروں نے کیا تھا۔ دلی کے اردو اخبارات ابھی میدان میں نہیں آئے۔ شاید اس لئے کہ حالیہ اردو سیمینار میں جو قرار داد منظور ہوئی تھی بنگلہ دیش کی حمایت کے لئے وہ اسے کافی سمجھتے ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنانا چاہتے بلکہ سب زبانوں کے اخبارات کے ساتھ جس دن سب اخبارات کے ایڈیٹر اپنی "قلمی جنگ" کے ساتھ ہائی کمیشن پہونچ کر نعرے لگانا ضروری سمجھیں گے اس دن اردو اخبارات کے ایڈیٹر ان کی قیادت کریں گے۔

مقابلے :۔

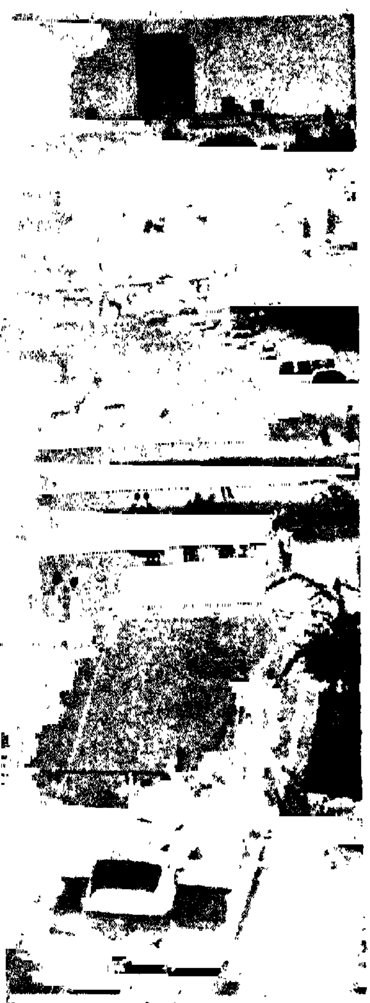
آپ نے بہت سے مقابلوں کے نام سنے ہوں گے دوڑنے کا مقابلہ۔ مضامین لکھنے کا مقابلہ، ہنسی ہنسنے کا مقابلہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عمارتوں کا مقابلہ کبھی نہ سنا ہوگا۔ ایکطرف لاکھوں کروڑوں عوام ہیں جو اپنی جھونپڑیاں تک نہیں ڈال سکتے۔ لیکن دوسری طرف نئی دلی کی فلک بوس عمارتیں جو بننی شروع ہوئیں تو بنتی ہی چلی جارہی ہیں اور کناٹ پلیس تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے سات آٹھ منزل تک کسی نے نوٹس ہی نہ لیا لیکن جب پندرہ اور بیس منزلوں تک نوبت جا پہونچی اور اب نئی دہلی میونسپل کمیٹی کی ۳۲ منزلہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی تو وزیر اعظم تک کو تشویش پیدا ہونے لگی۔

ان کناٹ پلیس عمارتوں میں ایک نیا سماں ہو گی وہ بار
آئے گی تو کہاں چلے گی۔ ٹریفک کہاں سے گزرے گا؛
یہ ہے وہ سوال جو سب کے لئے پریشان کن ہے۔
کناٹ پلیس کا سارا سکون جاتا رہے گا اور بڑے فوارے
کی خوبصورتی کے باوجود اس کی خوبصورتی فضا میں
پہونچ کر غائب ہو جائے گی۔
دیکھیں اس خوب صورتی کو بچانے کے لئے ماہرین کیا
نسخہ تجویز کرتے ہیں۔





۱۹۶۰ء کے بعد لکھنؤ میں اتنا زبردست سیلاب کبھی نہیں آیا۔ اوپر کی تصویر میں لکھنؤ یونیورسٹی کی بلڈنگ سیلاب کے پانی میں گھری ہوئی نظر آ رہی ہے۔ نیچے حسین آباد امام باڑا۔ جہاں ۶-۶ فیٹ پانی بھرا ہے



کناٹ پلیس کا ایک منظر۔ اونچی اونچی عمارتیں جس کی خوبصورتی دیمک کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔



کناٹ پلیس کے موجودہ نقشے کا ایک ماڈل



ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی تاریخی فتح



کپتان واڈیکر

شاہد صدیقی

انگلستان کے پچ پر انگلستان کو عبرت ناک شکست

۱۹۳۲ء میں پہلی بار ہندوستانی کرکٹ ٹیم، کرکٹ ملک یعنی انگلینڈ میں کھیلنے کے لئے گئی۔ اس وقت ہندوستان کے لئے یہ بات بڑی قابلِ فخر تھی کہ اسے انگلینڈ جیسے ملک سے زور آزمائی کا موقع ملا۔ اس کے بعد ہر سال یا تو انگلینڈ کی ٹیم ہندوستان آتی رہی یا ہندوستان کی ٹیم انگلینڈ جاتی رہی۔ ہندوستانی کھلاڑی ہندوستان میں تو انگلش ٹیم کا مقابلہ کر لیتے تھے لیکن انگلینڈ پہنچ کر ان کی حالت بگڑ جاتی تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ انگلینڈ کا موسم اور وہاں کرکٹ کھیلنے کے حالات ہیں۔ انگلینڈ کا موسم اور وہاں کے پچ ہندوستان سے بالکل مختلف ہیں۔ ابھی دھوپ نکلی ہوئی ہے تو منٹوں میں سارے میدان میں پانی بھر گیا۔ جو پچ آدھ گھنٹے پہلے بلے باز کی مدد کر رہی تھی، بالر کی مدد کرنے لگی۔ دوسرے انگلینڈ میں پچیں تیز بالروں کے لئے بنائی جاتی ہیں جن کی ہندوستان میں کمی ہے۔ اس لئے ہندوستانی ٹیمیں ان پچوں کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتیں۔ انگلینڈ میں کرکٹ کو کھیل سمجھ کر نہیں بلکہ پیشے کے طور پر کھیلا جاتا ہے۔ تین تین مہینے تک مستقل کھیل ہوتا ہے۔ کھلاڑی کو صرف اتوار کی چھٹی ملتی ہے ہندوستانی کھلاڑیوں کو بھی انگلینڈ جاکر اسی طرح کھیلنا پڑتا ہے جس کے وہ عادی نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی ہفتوں میں ہمارے کھلاڑیوں کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور وہ جلدی سے جلدی واپس بھاگنے کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔

ان حالات میں ہندوستانی کرکٹ ٹیموں کا انگلینڈ میں ناکام رہنا کوئی زیادہ تعجب خیز بات نہیں تھی۔ ۱۹۳۲ء کے بعد ہندوستان نے انگلینڈ میں ۲۲ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ جن میں سے زیادہ تر میں ہندوستان ناکام ہوا یا پھر وہ ڈرا ہو گئے۔ اب تک ہندوستان اور انگلینڈ نے ۴۰ ٹیسٹ میچ کھیلے ہیں جنہیں سے چار ہندوستان جیتا، ۱۸ انگلینڈ جیتا اور ۱۸ ڈرا ہوئے ہندوستانی کھلاڑیوں کی ہمیشہ سے یہ تمنا رہی تھی کہ انگلینڈ کو خود انگلینڈ میں ہرایا جائے لیکن ہمیشہ ہوتا اس کے برخلاف تھا۔ ٹیسٹ میچ میں ہرانا تو ایک طرف رہا، ہندوستانی انگلش کاؤنٹی ٹیموں سے بھی مات کھا جاتے تھے۔ اور ہار بھی معمولی نہیں ہوتی تھی، ہندوستان کے لئے دس وکٹ یا ایک اننگز سے ہارنا معمولی بات تھی۔

واڈیکر کی ٹیم بہتر تھی۔ اس مرتبہ جب ہندوستانی ٹیم انگلینڈ جانے کے لئے تیار ہوئی تو سب کا اندازہ تھا کہ یہ ٹیم پہلی ٹیموں سے کافی بہتر ہے۔ چند ہی ہفتے پہلے یہ ٹیم ویسٹ انڈیز جیسی طاقتور ٹیم کو ہرا چکی تھی۔ ویسٹ انڈیز کو ہندوستانی ویسٹ انڈیز میں تو دور رہا خود ہندوستان میں بھی ہرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ موجودہ ویسٹ انڈیز ٹیم کافی کمزور ہے اس لئے اسے ہرانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہندوستانی ٹیم کی عظمت کا اقرار اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب یہ ٹیم اس وقت کی سب سے زیادہ مضبوط ٹیم یعنی انگلینڈ کو ہرا دے۔ بہتر ٹیم ہونے کے باوجود کسی کو یقین نہیں تھا کہ ہندوستانی انگلینڈ کو ہرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ چند مہینے پہلے ہی انگلینڈ آسٹریلیا جیسی طاقتور ٹیم کو بری طرح سے شکست دے چکا تھا۔ انگلینڈ کے پاس النگورتھ جیسا ہوشیار کپتان اور اسنو جیسا طوفانی بالر موجود تھا۔ اور اس کی بیٹنگ بھی جتنی مضبوط اب تھی شاید پچھلے کئی برسوں میں کبھی نہیں تھی۔ ۱۹۶۸ء سے انگلینڈ ۲۵ ٹیسٹ میچ کھیل چکا تھا جن میں سے اسے ایک میں بھی شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔



سارڈیسائی نے ہندوستان کی پہلی باری میں ۵۰ رن پورے کئے تو تماشائی انہیں مبارک باد دینے کے لئے پچ پر آگئے۔ ڈیسائی انہیں بیٹ سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہندوستانی اسپنرز کسی سے کم نہیں ہیں لیکن ہندوستانی کھلاڑیوں نے انگلینڈ پہنچتے ہی اپنا شاندار کھیل دکھا کر تمام ڈھینڈ کر دیئے۔ شروع ہی سے ہندوستانی کھلاڑیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کی ٹیم کسی بھی طرح انگلینڈ سے کم نہیں ہے۔ اگر انگلینڈ کے پاس دنیا کے بہترین تیز بالر ہیں تو ہندوستان کے پاس بھی بیدی، راگھون، چندر شیکھر اور پرسنا کی شکل میں دنیا کے بہترین اسپنرز (SPINER) موجود ہیں۔ لارڈز میں پہلا ٹیسٹ کھیلنے سے پہلے ہندوستان نے مختلف کاؤنٹی ٹیموں سے ۸ فرسٹ کلاس میچ کھیلے۔ جن میں سے چار برابر رہے اور چار میں ہندوستان نے فتح حاصل کی۔ یہ بات بذات خود بہت ہی عجیب اور انوکھی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے عام طور پر ہندوستان کاؤنٹی ٹیموں کے مقابلے میں بھی بری طرح سے شکست کھا جاتا تھا۔ لارڈز کے پہلے ٹیسٹ میں بھی ہندوستان آخری روز تک انگلینڈ پر چھایا رہا لیکن آخری دن کمزور بیٹنگ کے ہندوستان نے جیتا ہوا میچ ہاتھ سے نکال دیا، اور ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرا ٹیسٹ بارش کی نذر ہو گیا۔

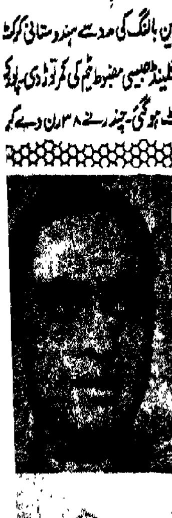
آخری اور تاریخی ٹیسٹ۔ تیسرے ٹیسٹ میں پہلے دو میچوں کی طرح واڈیکر ایک بار پھر ٹاس ہار گیا۔ انگلینڈ نے بیٹنگ شروع کی۔ ابھی پانچ رن بھی نہیں بنے تھے کہ لکہرسٹ جیسا عظیم بلے باز سولکر کی گیند پر بولڈ ہو گیا لیکن اس کے بعد جیمسن اور ایڈرچ جم کر کھیلے اور اسکور ۱۱۱ تک پہنچا دیا لیکن ایک بار پھر ہندوستانی اسپنرز انگلش بلے بازوں پر چھا گئے۔ اور کچھ ہی دیر میں ۱۴۳ رن دیکر ۵ وکٹ لے لئے۔ ۱۷۵ پر چھٹا وکٹ نکلا تو خیال ہوا کہ انگلینڈ کی ٹیم زیادہ سے زیادہ سوا دو سو یا ڈھائی سو رن بنا کر آؤٹ ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور ناٹ اور ہٹن فیلڈ میں میخوں کی طرح گڑ گئے کچھ ہی دیر میں انگلینڈ خطرے سے باہر نکل چکا تھا اور اگلے دن انگلینڈ ۳۵۵ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا۔

ہندوستانی اوپنرز گواسکر اور منکڈ انگلینڈ کے تیز بالروں کے آگے جم نہ پائے اور ذرا ہی دیر میں گواسکر سنو کی گیند پر اور منکڈ پرائس کی گیند پر آؤٹ ہو گیا۔ ۲۱ رن پر ہندوستان کے دو کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے لیکن سارڈیسائی اور کپتان واڈیکر نے آکر کھیل کو ذرا سنبھالا دیا۔ دونوں جم کر اعتماد سے کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ اسکور ۱۱۴ پر پہنچ گیا۔ اب ہندوستان کی حالت ذرا محفوظ ہو چکی تھی لیکن فوراً ہی پھر بلے بازوں کی لائن لگ گئی۔ سارڈیسائی ۵۴ رن بنا کر انڈر ووڈ کی گیند پر بولڈ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی وشوا ناتھ بھی بغیر کوئی رن بنائے ہوئے انڈر ووڈ کا شکار ہو گیا۔ چائے سے ۵ منٹ پہلے واڈیکر کو بھی انڈر ووڈ نے آؤٹ کر دیا۔ واڈیکر نے ۴۸ رن بنائے تھے۔ اس طرح چائے کے وقفے تک ہندوستان کا اسکور ۵ وکٹ پر صرف ۱۲۵ ہو سکا۔ ہندوستان کی حالت انگلینڈ سے بھی زیادہ خراب تھی اور اس سے باہر نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمنٹیٹر بار بار فالوآن کی بات کر رہے تھے۔

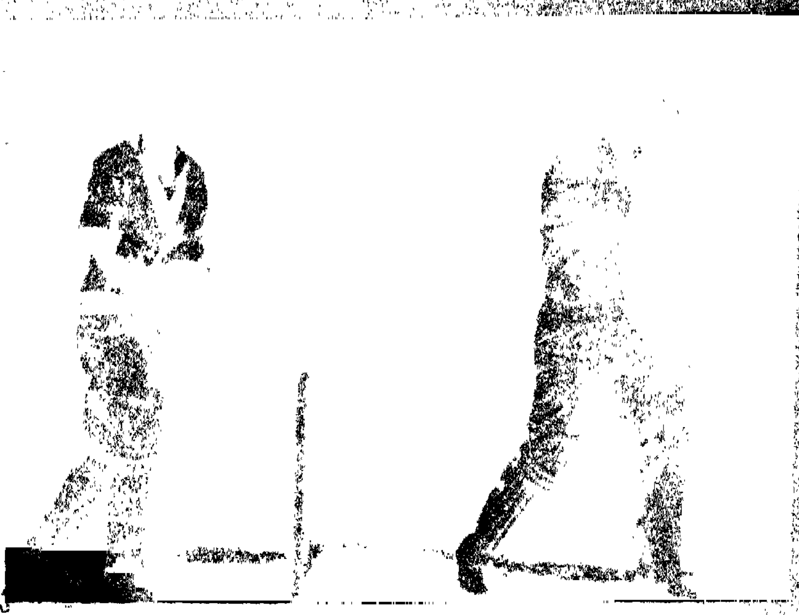
سولکر اور انجینیر نے کھیل میں جان ڈال دی۔

لیکن اب بمبئی کے واڈیکر اور سارڈیسائی کی جگہ بمبئی ہی کے سولکر اور انجینیر نے سنبھال لی۔ دونوں نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا لیکن دونوں ہی دن ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے آؤٹ ہو گئے۔ سولکر نے ۴۴ اور انجینیر نے ۵۹ رن بنائے۔ اگلے دن عابد علی اور راگھون نے ملکر اسکور میں ۵۰ رن کا اضافہ کیا اور ہندوستان ۲۸۴ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا، حالانکہ ہندوستان فالوآن سے بچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن میچ اور ۷۱ رن کی لیڈ کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ ہندوستان شاید یہ میچ ہار جائے گا اور اس طرح ہندوستان کا انگلینڈ میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ جیتنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

چندر نے کھیل کا رخ پلٹ دیا۔ لیکن ذرا سی دیر میں کھیل کا رخ ہی بدل گیا۔ انگلینڈ کا پہلا وکٹ ۲۴ پر گرا، جب جیمسن ۱۶ رن بنا کر رن آؤٹ ہو گیا۔ لنچ ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے اس لئے چندر شیکھر کو ایک اوور اور دیا گیا۔ تمام لوگ یہ سوچ کر کہ اس ایک اوور میں کیا ہو سکتا ہے لنچ کے لئے اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے لیکن چندر نے لگاتار دو گیندوں میں ایڈرچ اور فلیچر کو آؤٹ کر کے انگلینڈ کے ہوش گم کر دیئے۔ اس دن کو اگر چندر شیکھر کا دن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے بعد ایک بھی کھلاڑی چندر شیکھر کی گیند نہ کھیل سکا بہترین فیلڈنگ اور بہترین بالنگ کی مدد سے ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ذرا ہی دیر میں انگلینڈ جیسی مضبوط ٹیم کی کمر توڑ دی پوری ٹیم صرف ۱۰۱ رن بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ چندر نے ۳۸ رن دے کر



سارڈیسائی



لکھوسٹ ایک گیند پر اسکوائر کٹ لگا رہے ہیں پیچھے انجینئر کھڑا ہے

۶ وکٹ سے تھے۔ رنگھون نے ۴۴ رن دے کر دو وکٹ اور بیدی نے ایک رن دے کر ایک وکٹ لیا۔ ہندوستانی بالروں نے صرف ۴۵ اووروں میں انگلینڈ کی پوری ٹیم کو آوٹ کر دیا۔

کامرانی کا سفر:۔ اب ہندوستان کو میچ جیتنے کے لئے ۱۷۳ رنوں کی ضرورت تھی۔ انگلینڈ نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور ہندوستان کو اس سے کم اسکور پر آوٹ کرنے کے لئے کمر باندھ لی تھی۔ انگلینڈ کی بہترین بالنگ اور فیلڈنگ دیکھتے ہوئے ہندوستان کا ۱۷۳ رن بنانا بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ لیکن ہندوستانی بلے بازوں نے جس قسم کے کھیل کا مظاہرہ کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ابھی دو رن بھی نہیں بنے تھے کہ گواسکر سنو کی بال کا شکار ہو گیا۔ ۳۷ رن پر ہندوستان کے دو وکٹ نکل چکے تھے لیکن ایک بار پھر سارے کھیل کا بوجھ ہندوستانی کپتان واڈیکر اور سردیسائی نے اپنے کندھوں پر سنبھال لیا واڈیکر نے دونوں رنگز اور پوری سیریز میں بہترین کھیل کا مظاہرہ کر کے کپتانی کا حق پوری طرح سے نبھایا۔ بدقسمتی سے واڈیکر ۴۵ رن بنا کر رن آوٹ ہو گیا۔ لیکن اس نے سردیسائی کا ساتھ وشواناتھ نے دیا۔ سردیسائی بہت خوبی اور احتیاط سے آہستہ آہستہ اسکور فتح کی طرف کھینچتا رہا۔ سردیسائی نے ۱۲۰ منٹ میں ۴۰ بہت ہی قیمتی رن بنائے۔ ابھی اسکور ۱۲۴ ہی تھا کہ سردیسائی آوٹ ہو گیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد وشواناتھ بھی انڈر ووڈ کی گیند پر ۳۳ رن بنا کر آوٹ ہو گیا۔ جس وقت سولکر آوٹ ہوا ہے اس وقت ہندوستان کو جیتنے کے لئے ۲۹ رنوں کی ضرورت تھی اور اس کے پانچ کھلاڑی آوٹ ہو چکے تھے۔ ویسے ۲۹ رن زیادہ نہیں ہیں لیکن اس وقت جس قسم کے حالات تھے ان میں یہ بھی پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں انجینئر بھی آوٹ ہو گیا تو باقی کھلاڑیوں کے لئے جتنا مشکل ہو جائے گا۔ انگلستان نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور اس کی پوری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح ہندوستان ہار جائے لیکن انجینئر کے پُر اعتماد کھیل نے جلد ہی ظاہر کر دیا کہ اب ہندوستان کو جیتنے سے کوئی نہیں روک سکتا ابھی جیتنے کے لئے صرف تین رن ہی چاہئیں تھے کہ وشواناتھ آوٹ ہو گیا۔ اب اس کی جگہ عابد علی نے لی اور خوش قسمتی سے جیت کا ہاتھ مارنے کا شرف عابد علی کو حاصل ہوا۔ عابد نے لکھوسٹ کی دوسری گیند پر ہی زوردار چوکا لگا کر ہندوستان کا اسکور ۱۷۴ پر پہنچا دیا۔۔۔ اس طرح ہندوستان ۱۹۷۱ء کی سیریز کا تیسرا اور آخری ٹیسٹ چار وکٹ اور ایک رن سے جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔

فتح کی وجہ ٹیم اسپرٹ تھی:۔ اس شاندار فتح میں اچھی بالنگ، عمدہ فیلڈنگ اور پُر اعتماد بیٹنگ کے علاوہ ملے جلے مضبوط ٹیم ورک کا بھی کافی دخل تھا۔ ہندوستان کی اسپن بالنگ تو ہمیشہ سے اچھی تھی ہی لیکن اب ہندوستان نے بیٹنگ اور فیلڈنگ کے میدان میں بھی بہت ترقی کی ہے۔ سولکر، عابد، رنگھون، واڈیکر اور گواسکر کا شمار دنیا کے بہترین فیلڈروں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اس جیت میں کپتان واڈیکر کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ کھلاڑیوں کے ساتھ واڈیکر کا برتاؤ بہت ہی دوستانہ ہے۔ جس کی وجہ سے کھلاڑیوں میں اعتماد اور ٹیم اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ پوری ٹیم ایک ہو کر جیتنے کے لئے کھیلتی ہے۔ یہ واڈیکر کی پیدا کی ہوئی ٹیم اسپرٹ ہے جس کی بدولت آج ہندوستان ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ جیسی طاقتور ٹیموں کو ہرانے میں کامیاب ہوا ہے۔

دنیا کے عظیم ترین کرکٹ کھلاڑی سر ڈان بریڈمین نے ہندوستان کی فتح پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ ہندوستانی کرکٹ ٹیم اس وقت دنیا کی سب سے عمدہ ٹیم ہے۔ دوسرے اخبارات اور کھلاڑیوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ انگلینڈ کے اخبارات نے بھی کھل کر ہندوستانی ٹیم کی تعریف کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان نے انگلینڈ کے خلاف یہ سیریز اپنی محنت اور عمدہ کھیل سے جیتی ہے۔ ہندوستانی ٹیم انگلش ٹیم سے ہر چیز میں بہتر تھی۔

۱۹۷۱ء کا سال ہندوستانی کرکٹ کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ یہ عظیم فتح پورے ہندوستان کے لئے قابل فخر ہے۔ ہمیں امید ہے آئندہ بھی ہما

کھلاڑی ... عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرتے رہیں گے
وشواناتھ اور گواسکر دونوں نے انگلینڈ کے اس دورے میں ایک ایک
ہزار رن پورے کرتے ہیں۔ انجینئر، سولکر اور وشواناتھ نے
بھی عمدہ بلے بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انجینئر کو اگر اس

وقت کا سب سے عمدہ وکٹ کیپر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا
ویسے اس کی بیٹنگ بھی اب پہلے کے مقابلے میں بہت سدھر
گئی ہے۔ گواسکر کے کھیل کو رنوں سے نہیں تولا جاسکتا۔ انگلینڈ
کے تمام اخبارات کی رائے ہے کہ گواسکر کا شمار بہت جلد

ہی دنیا کے گنے چنے بلے بازوں میں ہونے لگے گا۔ واڈیکر
اپنے فرائض کو جس طرح سے نبھایا ہے اس کا ذکر کرنا ہی
ہے۔ کپتانی کے بھاری بھرکم بوجھ کے باوجود واڈیکر نے اپنی
بیٹنگ یا فیلڈنگ پر کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔

تیز بالروں کی کمی :- حالانکہ ہمارے پاس چندر شیکھر
راگھون، بیدی اور پرسنا جیسے بہترین اسپنرز موجود ہیں لیکن ا
بھی تیز بالروں کی کمی سختی سے محسوس کی جارہی ہے۔ یہ بات
طے ہے کہ ہندوستانی ٹیم اپنے کو پہلے نمبر پر اس وقت تک
قائم نہیں رکھ سکے گی جب تک کہ چند اچھے تیز بالر ٹیم میں
نہ لیں۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں کچھ اچھے تیز بالر سامنے آ جائیں
اگر ایسا ہوا تو یہ ہندوستانی کرکٹ کے حق میں بہت بہتر
اور اس وقت دنیا کی کسی بھی ٹیم کے لئے ہندوستان کو شکست
دینا بہت مشکل ہوجائے گا۔

تاریخی تصویر۔ عابد علی (چہرہ کالا ہوگیا۔
چوکا مارنے کے بعد بھاگ رہا ہے ۔ ۲۱
چوکے نے ہندوستان کو فتح نصیب کرائی



چین اور ہندوستان ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ
بڑھانے کی کوشش کررہے ہیں ــــــ ایک خبر۔

ہند روس

ہندوستانی ڈپلومیسی کا شاہکار

ہند روس معاہدہ ہندوستانی ڈپلومیسی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت اور موقع کی نزاکت کے پیش نظر وزیر اعظم اندرا گاندھی کا یہ اقدام نہ صرف برمحل ہے بلکہ دور اندیشی، حکمت عملی، تدبر اور سیاسی بصیرت کا غماز ہے۔ داخلی سیاست میں وزیر اعظم کی قوت فیصلہ اور اچھی قیادت کا ملک قائل ہے ہی، خارجہ پالیسی میں بھی اس پیش قدمی سے ان کی کارکردگی کی زبردست صلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ ہندوستانی خارجہ پالیسی میں لچکیلا پن وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔

اس بیس سالہ معاہدے پر ۹ اگست کو سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کی طرف سے سوویت وزیر خارجہ اے اے گرومیکو اور جمہوریۂ ہند کی جانب سے ہندوستان کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے دستخط کیے جس کے ذریعے دونوں ملکوں کے درمیان امن، دوستی اور تعاون کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ گزشتہ پندرہ سولہ سال سے ہی ہندوستان اور روس کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ لیکن اب انکا باہمی تعاون ایک نئی رفتار اختیار کرلے گا۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روس نے نازک وقتوں میں بارہا ہندوستان کی مدد کی ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر کے معاملے میں اینگلو امریکی طبقہ بندی کی سامراجی سازشوں کو روس نے اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں ویٹو یا حق نامنظوری کا استعمال کر کے ناکام بنا دیا۔ ہندوستان کو اس کی حفاظت کیلئے وقتاً فوقتاً فوجی امداد ہی نہیں دی بلکہ مِگ لڑاکا طیارے بنانے کا کارخانہ قائم کرنے کے اسباب و ذرائع مہیا کیے۔ مزید براں روس نے آب دوز کشتیوں سے بھی ہندوستان کی مدد کی۔ بھلائی اور بوکارو میں اسپات کے بھاری کارخانوں کی تعمیر میں تعاون کیا، نیز بھوپال اور ہری دوار میں بجلی سے متعلق بھاری کل پرزے بنانے کے کارخانوں کے قیام میں ہندوستان کا ہاتھ بٹایا۔ پھر معدنی تیل کی دریافت اور معدنی تیل صاف کرنے کے کارخانے کی تعمیر میں بھی اشتراک عمل سے کام لیا جس کے نتیجے میں ہندوستان معدنی تیل کی پیداوار کے معاملے میں خود کفیل ہونے کی سمت آگے بڑھ رہا ہے اور معدنی تیل کی پیداوار کے عالمی نقشے پر ایک مقام حاصل کرتا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں چین کے حملے کے وقت روس نے کچھ تاخیر ہی سے سہی لیکن چین کی پالیسی پر نکتہ چینی کی اور ہندوستان کو چینی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے شبے چلانے والے فراہم کئے۔ آج بھی روسی بار بردار طیارے لداخ کی سرحد پر تعینات ہندوستان کی فوج کو رسد بہم پہونچاتے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ نے ہر موقعے پر پاکستان کو بمبار اور لڑاکا طیارے دے کر ہندوستان کے خلاف جنگی کارروائی کے لئے برانگیختہ کیا۔ ہند روس تعلقات میں عارضی اور مختصر عرصے کے لئے تناؤ اس وقت پیدا ہو گیا تھا جب روس نے پاکستان کو اسلحہ فروخت کرنے کی ٹھان لی تھی، لیکن جلد ہی یہ کھنچاؤ ختم بھی ہوگیا۔ ... نے ایک سال سے زائد عرصہ ہوا پاکستان کو کسی طر... فوجی مدد دینے سے گریز کیا ہے۔

بنگلا دیش کے معاملے میں روس کا رویہ تقریباً ہ... کی طرح ہمدردانہ ہے۔ روس نے پاکستان کے حکمرا... یہ بات واضح کردی ہے کہ وہ نسل کشی کے سدباب ا... کے مناسب سیاسی حل کی حمایت میں ہے۔ ہندوست... جانب سے بھی بارہا سیاسی حل کا مطالبہ کیا جا چکا ہے... بنگلا دیش کی تحریک آزادی کے پس منظر میں ... معاہدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی رو سے ... اور بھارت جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی ... اسلام آباد، واشنگٹن اور پیکنگ کی گھبراہٹ اس ... ثبوت ہے کہ ان کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ... اور ہندوستان کے خلاف اب وہ اپنے جارحانہ ا... کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا سکیں گے کیونکہ پاک... اور امریکا کی مشترکہ سازشوں کا مقابلہ کرنے کے ... ہندوستان اکیلا نہیں رہ جائے گا۔ اگر ہندوستان ... یا پاکستان حملہ کرے گا تو ایسی حالت میں روس ... ہندوستان کی مدد کرے گا، پھر اگر امریکا یا چین ... پر حملہ کر بیٹھے تو روس اور ہندوستان دونوں ... کریں گے۔ بھارت پر کسی طاقت کے حملہ کرنے کے ... ہوں گے کہ اس کو ہندوستان اور روس دونوں ...

واقعات تبی دیں

[illegible]
[illegible] معاہدے کے
کے لئے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا فیصلہ بھی کیا جا سکے
یہ معاہدہ فوجی معاہدوں جیسے شمالی اوقیانوس معاہداتی تنظیم "نیٹو" جنوب مشرقی ایشیا معاہداتی تنظیم "سیٹو" اور مرکزی معاہداتی تنظیم "سینٹو" یا روس کی رہنمائی میں کئے ہوئے معاہدے وارسا سے مختلف ہے کیونکہ اس میں یہ بات نہیں ہے کہ بھارت پر حملہ روس پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ لیکن دونوں ملکوں کے درمیان امن و سلامتی کے اس تاریخی معاہدے کی دفعہ ۹ میں کہا گیا ہے:۔

"معاہدے میں شریک ہر ایک عظیم فریق یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ کسی تیسرے فریق کو جو عظیم فریقین میں سے کسی ایک سے مسلح تصادم میں مصروف ہو کوئی بھی مدد دینے سے احتراز کرے گا۔ ایسی صورت میں جبکہ دونوں میں سے ایک فریق پر حملہ ہو یا حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو معاہدے میں شریک عظیم فریقین فوراً آپس میں صلاح و مشورہ کریں گے تاکہ ایسے خطرے کو دور کیا جائے اور اپنے ملکوں کے امن اور سلامتی کو یقینی بنانے کی غرض سے مؤثر اقدامات عمل میں لائے جائیں۔"

یہ معاہدہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عالمی سیاست میں ایک نیا موڑ لائے گا۔ ایسے معاہدے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ امریکا اور چین کی شہ پر پاکستان کے فوجی آمر جنرل یحییٰ خاں ہندوستان کو بار بار جنگ کی دھمکی دے رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان تنہا رہ جائے گا اور اس لئے خوفزدہ ہو جائے گا۔ اسی خیال سے متاثر ہو کر امریکا نے بھی یہ دھمکی دی تھی کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی اور چین میدان جنگ میں پاکستان کی حمایت میں اترا تو امریکا ہندوستان کی مدد کے لئے نہیں آئے گا۔ اس معاہدے سے صورت حال بدل چکی ہے اور پاکستان کے علاوہ امریکا اور چین بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر بھارت پر حملہ ہوا تو روس بھارت کی مدد کو ضرور آئے گا۔

روس اور بھارت کے درمیان یہ معاہدہ دراصل بھارت [illegible] کے خلاف ایک طرح کی [illegible]
[illegible]

ان دونوں ملکوں پر حملہ کرنے والے کو دونوں میں سے کوئی ملک بھی اسلحہ بہم نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اور چین جب ہندوستان پر حملہ کریں گے تو روس انہیں کسی طرح کے ہتھیار برآمد نہیں کرے گا۔

یہ معاہدہ ہندوستان ہی کے حق میں مفید نہیں بلکہ اس سے روس کو بھی فائدہ پہونچے گا۔ روس کچھ عرصے سے اپنی سرحد پر چینی جارحیت کے خطرے سے متردد ہے۔ امریکی صدر مسٹر نکسن کے مجوزہ دورۂ چین سے روس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ اس معاہدے کی رو سے روس پر چینی حملے کے دوران بھارت روس کا ساتھ دے گا۔ ہندوستان جنوب کی سمت میں چین کا مقابلہ کر سکتا ہے اس لئے چین جنوب کی سمت سے اپنی ساری فوج ہٹا کر روس کے خلاف صف آرائی نہیں کر سکے گا۔

اس معاہدے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اب ہندوستان نے غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور سوویت روس کے فوجی بلاک میں داخل ہو گیا ہے۔ معاہدے کے ذریعے کسی بھی طرح ہندوستان نے خود کو سوویت روس کے فوجی بلاک سے منسلک نہیں کیا ہے۔ اس باہمی معاہدے کے ذریعے ہندوستان کی آزادی، اقتدار اعلیٰ اور علاقائی سالمیت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آئی۔

یہ معاہدہ کسی تیسرے ملک کے خلاف نہیں ہے۔ معاہدے میں کوئی ایسی دفعہ یا شرط نہیں ہے جو کسی بھی دوسرے ملک کے خلاف ہو۔ دراصل یہ معاہدہ جنگ کے امکانات کو دور کرتا ہے اور ہندوستان کی امن کی پالیسی کو کمزور اور ناکام ہونے سے بچاتا ہی نہیں بلکہ اس کے دائرۂ اثر کو وسیع کرتا ہے اور ایشیا اور ساری دنیا میں امن کی قوتوں کو مضبوط بنانے میں معاون ہے۔ صحیح معنوں میں یہ معاہدۂ امن ہے نہ کہ دفاعی معاہدہ۔ معاہدے کی دفعہ ۴ میں روس نے ہندوستان کی عدم وابستگی کی پالیسی یعنی فوجی معاہدوں کے معاملے میں اس کے غیر جانبدارانہ رویے کا احترام کرتے ہوئے اسے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ غرضیکہ اس معاہدے اور ہندوستان کی عدم وابستگی کی پالیسی کے درمیان تضاد نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ ہندوستانی ڈپلومیسی کا تازہ ترین شاہکار ہے۔ ہندوستان کے چوبیس سالہ آزاد سیاسی وجود میں روس کے ساتھ ہمارا یہ معاہدہ سیاست خارجہ سے متعلق سب سے اہم قومی فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے۔



[illegible] آپ کی مدد کر سکتا ہے

ت واشنگٹن

کب کون آئے گا جب فاحشائیں تائب ہو جائیں گی

محترم۔ تسلیمات

واقعات کی گذشتہ سے پیوستہ اشاعت میں امریکا میں فحاشی کے بارے میں جو مضمون شائع ہوا ہے وہ یہاں کی اصل صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے کچھ اور تفصیلات مہیا کی ہیں جو مجھے یقین ہے کہ قارئینِ "واقعات" کے لئے باعثِ دلچسپی ہوں گی۔

واقعات کے نمائندے کے قلم سے

امریکا میں فاحشاؤں کی صحیح صحیح تعداد بتانا تو ناممکن ہے لیکن اندازہ ہے کہ انکی تعداد پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی مختلف رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آبادی کے لحاظ سے ان کا تناسب یکساں چلا آرہا ہے

امریکا میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو ہر ... پر ریسرچ کرتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر الفریڈ کنسے نے جو اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اب سے ۲۳ برس پہلے فحاشی کے ... کے بارے میں لکھا تھا۔

"ہم نے جن لوگوں سے انٹرویو لئے ان میں سے ۶۹ فیصد ... تھے جو کم از کم ایک بار کسی طوائف کے کمرے پر جا چکے تھے ... سے بیس فیصدی تک وہ تھے جو سال میں کئی کئی بار ... ریسرچ کرنے والے امریکنوں نے جو سماجی امور میں ... کو بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے ... ہے کہ جنسی کاروبار کے واقعات کی سالانہ تعداد ... لاکھ ہے جن میں روزانہ ۲۰ کروڑ ڈالر کا ... ہے۔

... کہ امریکا کی سب ہی ریاستوں میں بدکاری ...

قانوناً جرم ہے لیکن ایسی کوئی ریاست نہیں جو دعویٰ کر سکے کہ وہاں اس قانون کی پابندی کی جاتی ہے۔ سان فرانسسکو میں بعض سڑکیں ایسی ملیں گی جہاں بیسوائیں چلتے پھرتے مردوں کو روک کر اپنا تعارف کرانے لگتی ہیں۔ شاید ایسے ہی واقعات کے پیشِ نظر گذشتہ ماہ کیلی فورنیا میں بدکاری کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ ریاستی اسمبلی کے بعض ممبروں کا کہنا تھا کہ جب قانون کی خلاف ورزی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو مناسب یہی ہے کہ قانون کو بدل دیا جائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے یہ بھی دلیل دی کہ ... کرنے سے آئی بے دخلی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ گلیوں اور محلوں میں پھیل گئی ہیں اور سیفلس کے واقعات ۴ سو سالانہ سے بڑھ کر چھ ہزار تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن یہ تحریک ریاستی اسمبلی میں مسترد کر دی گئی کیونکہ ممبروں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ اس سے بہت سی دوسری پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ...

... نے کہا کہ یہ مردوں کی ایک تفریح ہو سکتی ہے لیکن اس سے جو اخلاق و کردار بنے گا اس کی ہمیشہ مذمت کی جائے گی۔ بدکاری عورتوں کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور خاص طور سے غریب عورتیں بالکل ہی قعرِ مذلت میں گر جاتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جس کا ذکر جارج برنارڈ شا نے اپنے ناٹک "مسز وارنس پروفیشن" میں کیا ہے کہ ہمارا سماج عورتوں سے سخت بے انصافی کرتا تھا ان سے بے انتہا کام لیا جاتا تھا اور بہت کم اجرت دی جاتی تھی نتیجے میں وہ اپنے جسم اور روح کو زندہ رکھنے کے لئے بدکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔"

لیکن کیا۔ ایسی بات نہیں ہے پھر بھی یہ بدکاری ہے ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نشیلی اشیا کی لت اپنے پیچھے لگا رکھی ہے۔ اس لت کو پورا کرنے کے لئے انھیں کثیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے ...



[illegible]
فاحشائیں ۱۸ ویں صدی کے ایک آرٹسٹ کی نظر میں۔

کچھ فاحشائیں (چہرے چھپائے ہوئے ہیں) گرفتار کر کے لیجائی جارہی ہیں۔

کثیر رقم انھیں صرف بدکاری کے ذریعہ ہی مل سکتی ہے۔ ایک سابق مس ڈنمارک نے صرف ایک رات کی تفریح کے لئے پندرہ سو ڈالر فیس وصول کی تھی۔

بوسٹن کے ساؤتھ اینڈ بازار میں ایک نیگرو فاحشہ تک پندرہ ڈالر فیس وصول کرتی ہے۔ تاہم مالی ضروریات کے علاوہ بعض دوسری نفسیاتی وجوہ بھی ہیں جن کی وجہ سے عورتیں اپنے آپ کو فروخت کرتی ہیں۔ جنسی سیاست میں کیٹ ملیٹ لکھتے ہیں:۔

" جب مالی ضروریات سے فحاشی کا تعلق نہ ہو تو اُسے ایک نفسیاتی لت قرار دیا جاسکتا ہے جس کی بنیاد خود اپنے آپ سے نفرت ہے "

جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لئے حکومت کی طرف سے سخت اقدامات کئے جارہے ہیں جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہے کہ سال میں ایک لاکھ کے قریب فاحشاؤں کو گرفتار کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بیماری اسقدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس پر قابو پانا مشکل نظر آتا ہے۔ جدید تہذیب نے اس کے پھیلاؤ میں بہت کچھ مدد دی ہے اور خاص طور سے ان رسائل اور اخبارات نے جو برہنہ اور نیم برہنہ فوٹو شائع کر رہے ہیں اور جو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے فوٹو البم کی زینت بن رہے ہیں۔

پھر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اس برائی سے سخت پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ بدکاری کے سب اڈے ختم ہو جائیں۔ مجھے متعدد ایسے مذہب پرست لوگوں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا جو بدکاری اور بڑھتی ہوئی فحاشی پر بے چین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔ بائیبل میں صاف طور پر بدکاری کی مذمت کی گئی ہے اور ہر حال میں بدکاری کو ختم ہو جانا چاہئے۔

متعدد اصلاحی تنظیمیں بھی ہیں جو فحاشی کو ختم کرنا چاہتی ہیں لیکن امریکا جیسے ماڈرن ملک میں اگر فحاشی ختم ہوگئی تو یوں سمجھئے کہ وہ اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔ مگر کچھ لوگ ہیں جو مایوس نہیں ہیں۔ انھیں امید ہے کہ جس طرح ۱۸ ویں صدی میں نیپلز میں فاحشاؤں نے جنسی بے راہ روی سے توبہ کی تھی اسی طرح آج کی فاحشائیں بھی تائب ہو جائیں گی اور اس طرح سوسائٹی کی ایک بہت بڑی برائی دور ہو سکے گی۔



[illegible]

اُن کا بیٹا گریجویٹ ہوگا

سب ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن کنبہ بڑا ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مختلف طریقے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی بہتر تعلیم کے لئے

پُر مسرّت دن



عبدالناصر

لڑکی جس کا قد ساڑھے سات فٹ ہے



[illegible]
کی حکومت کا سب سے اہم کام ہے۔ حکومت کا مشری
ات اس کے لئے شاید زیادہ ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے
یادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ لیکن غذائی قلت کا ایک بہت
سئلہ آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ حکومت نے اس
کو حل کرنے کے لئے ہر بڑے شہر میں راشن سسٹم شروع
ہے۔ ہر انسان کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا یا چھوٹا کیوں نہ ہو
قدر مقدار میں راشن فراہم کیا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے
سے لوگ بھی موجود ہیں جو ایک ہفتے کا راشن ایک ہی وقت
ہضم کر سکتے ہیں۔ ایک ایسی ہی لڑکی آجکل دہلی میں موجود
ہے۔ اکیس سال کی شیلا جس کا قد سات فٹ ۵ انچ ہے۔
نہ کے ایک قریبی گاؤں کی رہنے والی ہے، وہ تقریباً ۴ کلو
ول اور دو کلو دال ایک ہی وقت میں ہضم کر جاتی ہے۔

شیلا کی کہانی بہت ہی دلچسپ ہے۔ وہ ایک سیدھی
سادی دیہاتی لڑکی ہے جس کا کام جانوروں کا چرانا اور ان کی
دیکھ بھال کرنا تھا۔ ۱۶ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی
گئی۔ اس وقت وہ ایک عام قسم کی سیدھی سادی دیہاتی لڑکی
تھی لیکن شادی کے دو سال بعد ہی اس نے اپنا دیو قامت
نکالنا شروع کیا اور اس کی غذا ایک عام آدمی کی غذا
سے بڑھ کر چار پانچ کلو چاول روزانہ تک پہنچ گئی نتیجے میں
اس کے شوہر نے پریشان ہو کر اس کو گھر سے نکال باہر کیا
ان سال تک وہ اپنے والدین کے پاس رہی لیکن اس دوران
گاؤں کے لوگوں کے لئے ایک درد سر بن چکی تھی۔ اس کا
دیو قامت قد دیکھ کر لوگ ڈر جایا کرتے تھے۔

پریس اور خبروں میں شیلا کی شہرت پچھلے مہینے سے
شروع ہوئی جب وہ اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ دہلی علاج
کے لئے آئی لیکن بیان نہیں VAGRANCY ACT کے
تحت گرفتار کر لیا گیا۔ تب پتا چلا کہ اس کے غیر معمولی جسم اور قد
کا ڈاکٹری معائنہ کیا گیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ نہ صرف
[illegible] بلکہ اس کے جسم کا بایاں حصہ
بھی تقریباً بالکل بے کار ہو چکا ہے چنانچہ اس کو پہلے
[illegible] اور بعد میں پنت اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔
[illegible]

پہلے اس کے اس مرض کو دور کیا گیا۔ لیکن ایک سوال جو سب
ڈاکٹروں کے لئے درد سر بنا ہوا ہے وہ یہ ہے آیا رسولی
کا آپریشن کیا جائے کہ نہیں۔ اگرچہ جسم کے دوسرے حصوں
میں رسولی پھیلنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن دماغ کے اندر
ہی اس کی بڑھوتری اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔
اس کے جسم کا ایک حصہ تقریباً بیکار ہو چکا ہے۔ ایک آنکھ کی
بینائی بالکل ختم ہو گئی ہے اور دوسری آنکھ سے صرف ایک
فٹ دور کی چیزیں دیکھ سکتی ہے۔ آپریشن کے بعد اس کا جسم
ٹھیک ہو سکتا ہے، آنکھوں کی بینائی واپس آ سکتی ہے اور
اس کے غیر معمولی بڑھتے ہوئے قد کو بھی روکا جا سکتا ہے۔
Neuro-Surgeon ڈاکٹر چہا نے ایک انٹرویو
کے دوران بتایا کہ "یہ کیس اگرچہ لاعلاج نہیں ہے لیکن اس
سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسا کیس نہیں دیکھا گیا"۔ ۔۔۔ کے

ایک ڈاکٹر نے ابھی حال ہی میں ایک ایسے ہی کیس کے بارے
میں بتایا کہ ایک چند سال کے بچے کا قد ۵ فٹ نو انچ ہے۔
ایک امریکی Dr. Cushing نے بتایا کہ "بلغمی رسولی
کے ۳۳۳ کیسوں میں سات کیس ایسے ملے جن میں مریض غیر معمولی
لمبے ہو چکے تھے۔"

بہر حال شیلا دہلی کے لوگوں کے لئے ایک تماشا بن گئی ہے
ہزاروں لوگ اب تک اس دیو قامت لڑکی کو دیکھ چکے ہیں۔ شیلا
خود بھی آپریشن کے لئے ڈاکٹروں سے پوچھتی رہتی ہے۔ اسپتال
کا عملہ بھی اس کیس میں بڑی دلچسپی لے رہا ہے۔ ایک بہت
بڑا کمرہ شیلا کے لئے خالی کر دیا گیا ہے اور دو بڑے بڑے
بیڈوں کو ملا کر ایک بیڈ بنا دیا گیا ہے اور اس کے لئے
سپیشل جاکٹ اور پیٹی کوٹ سلوائے گئے ہیں۔ ▬

کنکریٹ کی
دیوار برلن کے بھوت
کا جادو ابھی نہیں ٹوٹا

محمد سلیمان صابر

چند برس پہلے جب میں نے ایک پریس پارٹی کے ساتھ برلن کی دیوار کا چکر لگایا تو جرمن قوم کی بے بسی پر پیار آگیا۔ ملک تقسیم ہونے تو سنا تھا، خود ہمارا ملک دو حصّوں میں تقسیم ہوا لیکن ایک شہر کے دو حصّے جرمنی میں ہی آکر دیکھے یا پھر بیت المقدس کے دو حصّے تھے (جس کے دوسرے حصّہ پر بھی اب اسرائیل نے قبضہ کر لیا ہے) کنکریٹ کی چھ فیٹ سے بھی زیادہ اونچی اس دیوار نے مکانوں تک کو تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مکان کا اگلا حصّہ اگر شرقی شہر میں واقع ہے تو اس کے عقبی حصّے کا تعلق مغربی شہر سے ہے۔ لوگ دیوار کے گرد کھڑے ہو کر اچک اچک کر دوسری طرف دیکھتے ہیں اور دل مسوس کر رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کیسی دنیا ہے جو دو دلوں کو ملنے نہیں دیتی۔"

دیوار کے ساتھ ان لوگوں کی قبریں ہیں جنہوں نے دیوار پار کرنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں۔

۲۸ میل لمبی یہ دیوار جسے شرقی جرمنی کے فوجیوں نے اب سے دس برس پہلے چند گھنٹوں کے اندر کھڑا کر دیا تھا، ایک بدہیئت اور بدنما دیوار ہے اگرچہ تصاویر میں اسکی بدہیئتی اور بدنمائی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس دیوار نے سیکڑوں ہزاروں خاندانوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ اپنے ہی وطن میں اور اپنے ہی شہر میں لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ چند منٹوں کا فاصلہ وہ برسوں میں طے نہیں کر سکتے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے روتے ہیں تڑپتے ہیں۔ حقیقت میں یہ انکی تڑپ ہی تھی جس نے ان کو دیوار پھاندنے یا اس کے نیچے سے سرنگ لگا کر مغربی برلن میں پہنچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ دس برس کے اس عرصے میں ۲۸ ہزار کے قریب لوگ دیوار کے پار پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ۲۲۴ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ وہ یا تو پہرے داروں کی بندوقوں کا نشانہ بن گئے یا کسی مکان کی چھت سے مغربی حصّے کی طرف کودتے وقت جان بحق ہو گئے۔ انھوں نے ایک مجبور و بےکس زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ جن جگہوں پر انھوں نے دم توڑا وہاں لوگ آج بھی پھول چڑھاتے ہیں اور دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرنے والے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

میں نے جب جرمنوں کو اپنے مرنے والے شہریوں کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے دیکھا تو ہٹلر کا وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ طوفان کی طرح اٹھا تھا اور طاقت کے نشے نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ اس نے ہر کمزور قوم کو پامال کر ڈالا فرانس تک نے اس کی غلامی قبول کر لی۔ ہٹلر فخر سے اعلان کیا کرتا تھا۔ "میں آریہ ہوں۔ میری قوم سب سے افضل و برتر ہے اور صرف مجھ ہی کو حکومت کرنے کا حق ہے اور کسی کو نہیں۔" اس کی طوفان خیز پیش قدمی اور کامیابی سے شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی برتر قوم سے تعلق رکھتا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ساری دنیا پر چھا جا۔ لیکن اس کا یہ غرور اور تکبر اسے لے ڈوبا اور ایک ایسا آیا کہ وہ برلن کے ایک تہہ خانے میں اپنی محبوبہ ایوا براؤن کے ساتھ خودکشی کر کے اپنی قوم کو ان ہی کا غلام بنا گیا جو اس کی نظر میں اس کی قوم کے مقابلے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔

میری خواہش تھی کہ میں ہٹلر کا وہ تہہ خانہ دیکھوں اس نے زہر کی شیشی اپنے منہ میں انڈیلی تھی لیکن جرمن گائڈ نے اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر دیوار کے پار کے شرقی حصّے میں ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ "یہ ہٹلر کی آرام گاہ ہے۔" اس تہہ خانہ کی [illegible] تھی ——— اور جب ہم شرقی برلن میں پہنچے [illegible] ٹیلے کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا [illegible] کی پوری عمارت [illegible]

واقعات نئی دہلی

شرقی حصے میں واقع ہیں ۔۔۔۔

ریکنڈ ہاؤس جو قوم کے پہلے سرکاری دفاتر جو انہ جنگ کی بمباری سے اس طرح ٹوٹے پھوٹے پڑے ہے جیسے کہ ان پر آج ہی بمباری ہوئی ہو۔ روسیوں نے میں شاید اس لئے دوبارہ تعمیر نہ ہونے دیا ہوگا تاکہ نک باشندوں کو معلوم ہو سکے کہ جنگ کیا چیز ہے۔ یہ بات ۱۹۶۱ء کی ہے۔ اب نہیں معلوم کہ مسمار شدہ ان عمارتوں کی جگہ دوسری عمارتیں وجود میں آئیں یا نہیں۔

جرمن قوم جو جنگ جنگ کا نعرہ لگاتی تھی اس کے لئے جنگ وہ تباہی لائی کہ تاریخ میں ایسی جنگ کی تباہی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اسی تباہی و بربادی اور بے کسی و مجبوری کا ایک حصہ یہ تھا کہ صرف جرمنی ہی دو حصوں میں تقسیم نہ ہوا بلکہ اس کی راجدھانی برلن شہر کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا گیا جہاں ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے ساری دنیا یا کم سے کم پورے یورپ کو اپنے تسلط میں لانے کے خواب دیکھے تھے۔ ۳۰ لاکھ آبادی والے اس شہر میں ۲۰ لاکھ مغرب میں اور دس لاکھ مشرق میں "نظر بند" کر دیئے گئے۔ یہ نظر بندی آج تک چل رہی ہے لیکن اسے جرمنوں کی خوش قسمتی کہئے یا بین الاقوامی حالات کا اقتضاء کہ چار وہ ممالک جو اپنے آپ کو بڑے کہتے ہیں۔ امریکا، روس فرانس اور برطانیہ۔ وہ سترہ اٹھارہ ماہ کی تگ و دو اور نازک بات چیت کے بعد ایک سمجھوتے پر متفق ہو گئے ہیں جس میں انھوں نے مغربی برلن کے باشندوں کے مشرقی برلن اور مشرقی جرمنی کے ۱۱۰ میل لمبے راستے سے گزر کر مغربی جرمنی آنے جانے اور ایک دوسرے حصے میں ٹریفک کے گزرنے کے حق کو تسلیم کر لیا ہے اب تک روس کے اس موقف کی بنا پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا کہ یہ معاملہ صرف جرمنیوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن گذشتہ موسم بہار میں اس نے اپنا یہ رویہ تبدیل کیا اور افہام و تفہیم کے جذبے کے ساتھ بالآخر چاروں مذکورہ ملکوں کے سفراء نے تیس ماہ تک ۳۳ گھنٹے کی لگاتار میٹنگوں کے بعد ایک سمجھوتے پر دستخط کر دیئے۔ متعلقہ حکومتیں اس سمجھوتے کی تصدیق کریں گی اور اس کے بعد دونوں جرمن حکومتیں سمجھوتے کی روشنی میں تفصیلات طے کریں گی۔ سمجھوتے کے تحت مغربی برلن کی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہاں روس اپنا قونصل خانہ قائم کر سکے گا جس میں عملے کے لوگ زیادہ سے زیادہ ۲۰ ہوں گے لیکن برلن سے مغربی جرمنی کی حکومت کے تعلق کو تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بات مان لی گئی ہے کہ وہاں اس کے دفاتر برقرار رہیں گے جن میں کام کرنے والوں کی تعداد ۲۳ ہزار کے قریب ہے۔ یہی نہیں بلکہ مغربی جرمنی کی پارلیمنٹری کمیٹیوں اور سیاسی پارٹیوں کو شہر کے مغربی حصے میں جمع ہونے اور اپنے جلسے کرنے کا حق حاصل ہوگا نیز بیرون ملک مغربی برلن کے باشندوں کی نمائندگی مغربی جرمنی ہی کی حکومت کرے گی اور مغربی برلن کے باشندے مغربی جرمنی کی حکومت کی طرف سے جاری کردہ پاسپورٹوں پر سفر کریں گے۔

مغربی جرمنی یا مغربی برلن کے باشندوں کو وہ سب کچھ نہیں ملا جو وہ چاہتے تھے۔ یعنی دیوار نہیں ٹوٹی۔ لیکن بہرحال اس سمجھوتے کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ اس وقت تک جو بحرانی کیفیت یا کشیدگی چل رہی تھی اس کے ختم ہونے میں مدد ملے گی، ایک دوسرے علاقے کے اندر آ جا سکیں گے اور اگر متحدہ جرمنی نہیں تو دو جرمنی الگ الگ بین الاقوامی برادری میں آہستہ آہستہ اپنا صحیح مقام حاصل کر سکیں گے۔

اس سمجھوتے کی اصل کنجی اگرچہ روس نے دیا جس نے یورپ میں کشیدگی کو کم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا لیکن مغربی جرمنی کے چانسلر مسٹر ویلی برانٹ کو بھی اس سمجھوتے کا کچھ کم کریڈٹ حاصل نہیں ہے جنھوں نے روس کے خلاف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، روس کا دورہ کیا اور ایسی فضا پیدا کی کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے قریب آ گئے لیکن مغربی جرمنی کا ایک جنگ باز طبقہ اس سمجھوتے کے اب بھی خلاف ہے شاید ہٹلر اور مسولینی کے جانشین ابھی موجود ہیں جو صرف مغربی جرمنی میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ پھیل گئے ہیں اور وقت کی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تاہم ویلی برانٹ کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ انھوں نے اپنے عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کرا دیا کہ "جرمن قوم ایک شکست خوردہ قوم ہے" اور ایک شکست خوردہ قوم مفاہمت ہی کے ذریعے مراعات حاصل کر سکتی ہے، لڑ کر اسے کچھ فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔

مغربی جرمنی کو اس سمجھوتے سے بڑا فائدہ پہونچے گا اور بقول لارڈ میئر مغربی جرمنی "یہ معاہدہ برلن کے باشندوں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے" اور وہائٹ ہاؤس (امریکا) کے پریس سکریٹری رانلڈ زیگلر کے قول کے مطابق:۔

"جب آخری سمجھوتے پر دستخط ہو جائیں گے تو دنیا کی کشیدگی دور کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی" ■

دیوار کے ساتھ ساتھ
ایک بوڑھی عورت
اس وقت کی یادوں
میں گم ہے جب دنیا
میں یہ دیوار نہیں
تھی۔

"ہٹلر کو اس کے غرور و تکبر نے مارا
طاقت کے نشے نے اسے پاگل بنا دیا تھا"
جرمن قوم جنگ کا نعرہ لگاتی تھی۔
لیکن جنگ اس کے لئے جو تباہی لائی
اس کی مثالیں کم ملتی ہیں"

ترقی پذیر ملکوں میں بے روزگاری کا مسئلہ

ایوب ظفر

تقریباً تمام ترقی پذیر ملکوں میں بے روزگاری کا مسئلہ روز بروز سنگین اور پیچیدہ ہوتا جارہا ہے تمام حکومتیں پریشان ہیں کہ ہر سال اسکولوں اور کالجوں سے فارغ ہو کر نکلنے والی خوبصورت نسل کو کہاں اور کیسے کام پر لگائیں۔ بے کاری کے نتیجے میں بغاوت پر آمادہ نوجوان قانون کے لئے ایک چیلنج بنتے جارہے ہیں۔ ٹریڈ یونینیں الگ پریشان ہیں کہ اس مسئلے کو کس طرح حل کریں۔ صنعت کار نئی منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ پیداوار کو بڑھائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کام پر لگایا جاسکے۔

ماہرین اقتصادیات نے کم ترقی یافتہ ملکوں کے بارے میں لکھا کہ جیسے جیسے انکی صنعتیں بڑھیں گی ملازمت کے مواقع بھی بڑھتے جائیں گے لیکن تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ برخلاف اس کے صنعتوں کا فروغ اور ترقیاتی اسکیموں کے باوجود بے روزگاری بھی روز افزوں ہے۔

اصولاً اقتصادی ترقی سے سب سے پہلے غریبوں کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن عملاً بہت بڑی تعداد اس فائدے سے محروم رہتی ہے۔ کمیشن آن انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ کے صدر مسٹر پیرسن نے اپنی رپورٹ میں یہ وضاحت کی ہے کہ غیر ملکی امداد سے جو ترقیاتی پروگرام شروع کئے گئے ہیں ان میں سماجی بہبودی کے تصور کو جگہ نہیں مل سکی اور یہ سمجھنے میں غلطی ہوئی کہ اقتصادی فروغ کے ساتھ ملازمت کے مواقع خود بخود فراہم ہوں گے۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر [illegible] میکنامارا نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اقتصادی ترقی [illegible] کاری کا مکمل حل نہیں ہے۔

[illegible] ضروری ہے کہ اس مسئلے کا تمام پہلوؤں [illegible]

سے جائزہ لیا جائے۔ اقتصادی پروگراموں کے ساتھ سماجی ضروریات کو شامل کئے بغیر سماجی اور اقتصادی استحکام پیدا نہیں ہوگا۔ بے روزگاری کے ضمن میں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم بے روزگار کسے کہہ سکتے ہیں۔ مغربی اصطلاح میں وہ شخص جو لیبر فورس کا ممبر ہو یعنی کام کرنے کے لائق ہو۔ مرد، عورت، بچے سبھی کام کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔ لیکن دیہی زندگی اور شہری زندگی میں ایک بہت بڑا امتیاز ہے۔ عورتیں باہر کے کاموں کے علاوہ گھروں کے کام کاج دیکھتی ہیں۔ بچوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ والدین کے زیر کفالت ہوتے ہیں۔ اب نوجوانوں کا طبقہ رہ جاتا ہے۔ اس طبقے میں بڑی تعداد ایسی ہے جو تعلیمی دور سے فارغ ہو چکی ہے یا تعلیم حاصل نہیں کرتی۔ تعلیم یافتہ طبقے میں اکثریت ایسی ہے جو اپنی تعلیمی قابلیت اور معیار کے مطابق ہی معیاری کاموں کی خواہاں ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو حالات سے مجبور ہو کر کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی بے روزگاری کے زمرے میں رکھنا ہوگا۔ ایک مکمل صنعتی ملک میں حکومتیں بے روزگاری کا الاؤنس دیتی ہیں، لیکن غیر ترقی یافتہ یا نیم ترقی پذیر ملکوں میں اس قسم کے افراد کی فوج جو اپنے طور پر گزر بسر کے لئے کوئی بھی کام کرنے لگتی ہے مسئلہ ان کا ہے۔ اقتصادی ترقی کا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے۔

دیہی علاقوں میں بے روزگاری کا سبب ایک تو یہ ہے کہ زمین کو کاشت کے لئے پورے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ روائتی طور پر سال میں ایک دو بار فصل اگا کر لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو قطعی بے زمین ہیں۔ شہری علاقوں میں بے [illegible]

[illegible] کی تلاش میں شہر کی طرف [illegible] اور وسائل کی کمی کے سبب بے کار ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اسکولوں کی تعلیم مکمل کر کے یا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ یونیورسٹی اور کالجوں سے فارغ التحصیل کو تیسرے درجے میں رکھئے۔ ان کے علاوہ ایک بہت بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خود کار (SELF-EMPLOYED) ہیں یا نیم بیکار ہیں۔ ان میں وہ لوگ ہیں جو پھیری کرتے ہیں۔ بار برداری کا کام کرتے ہیں۔ ٹیکسی اسٹینڈ کی دلالی کرتے ہیں یا جوتے پر پالش کرتے ہیں۔ خوانچہ فروش ہیں یا چھوٹی موٹی دستکاری میں مصروف ہیں۔

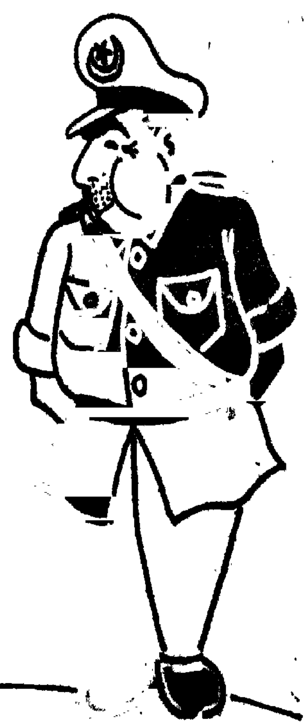
ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک فلاحی اسٹیٹ کی حکومت مسائل کو حل کرنے کا پروگرام طے کر سکتی ہے دیہاتوں میں زمین کی ملکیت اور نظام میں تبدیلی لا کر یہ زمین بے زمین لوگوں میں تقسیم کی جائے۔ بے کار اور غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لایا جائے۔ کوآپریٹو طریقے سے کھیتی اور دستکاری کے کاموں کو فروغ دیا جائے۔ دیہی علاقوں میں ترقیاتی اسکیمیں چلائی جائیں، سڑکیں، نہریں، کنویں وغیرہ تعمیر کرائے جائیں۔ زراعت کے جدید طریقے اپنا کر زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کی مہم چلائی جائے۔

شہری علاقوں میں بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے سے پہلے شہر و دیہات کے مابین روابط کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں معیار زندگی پست ہے اور جہاں کثرت آبادی کے تحت زمین کے ٹکڑے روز بروز چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتے جارہے ہیں لوگ بہت کم دیہات میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اگر شہر میں یہاں نسبتاً بھی ملازمت کا چانس ہوتا ہے تو لوگ دیہات کو خیر باد کہہ کر نکل پڑتے ہیں، اس لئے شہری بے روزگاری کے مسئلے سے نپٹنے سے پہلے حکومت کو چاہئے کہ وہ دیہاتوں میں لوگوں کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کی کوشش کرے۔ دیہاتوں میں دستی صنعتوں کے کام کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ گھریلو دستکاری اور چھوٹے پیمانے کی انڈسٹری کھولنے کا مقصد لوگوں کو متوجہ کیا جائے تاکہ شہر پر آبادی کا بار کم ہو سکے۔

پلاننگ کمیشن [illegible]

قدم اٹھانے [illegible]

آپ سے ملئے!



کہ ہلاکو چنگیز خان کی نسل سے ہوں۔ نادر شاہ
نے دلی میں قتلِ عام کیا تھا اور یحییٰ خان نے بنگال میں
جو قتلِ عام اپنی حیثیت بڑا قتلِ عام تھا لیکن بنگلہ دیش
کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جو باپ نہ کر سکا
اسے بیٹے نے پورا کر دیا۔ تاریخ میں ان کا نام "روشن"
رہے گا۔ اس قتلِ عام پر یحییٰ خان کا سر اونچا ہو گیا
ہے۔ اپنے فوجیوں پر انھیں کتنا فخر ہے۔ فرماتے ہیں:۔
"جب میرے سپاہی مارتے ہیں تو بڑی "صفائی" سے مارتے
ہیں۔" اس صفائی کا مظاہرہ صرف نہتے لوگوں پر ہوتا ہے
جن کے ساتھ "جنگ" میں بقول ان کے "پھول نہیں پھینکے جاتے"
بے شک پھول نہیں گولے پھینکے جاتے ہیں۔ اور ان گولوں
نے نہ جانے کتنے بے گناہوں کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔
یحییٰ خان کے حوصلے بہت کچھ بڑھے معلوم ہوتے
ہیں اپنے بڑھے ہوئے ان "حوصلوں" کی بنا پر ہی شاید
انھوں نے وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی پر "لفظی گولے"
پھینکے ہیں اور ہر قسم کے اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر
اپنی فوجی بولی میں مسز گاندھی پر خوب لے دے کی ہے
اور فرمایا ہے: "ان کے اندر ان کے والد جیسا تدبر نہیں
ہے۔" اس حد تک ہی کہتے تو غنیمت تھا اس سے آگے
بڑھ کر کہتے ہیں: "یہ مسز گاندھی اگر ملیں تو میں ان

سے کہوں گا "شٹ اپ" آپ ہ
ٹانگ نہ اڑائیں اور ہمیں اکیلا چھوڑ دیں
ساری دنیا کو للکار رہے تھے اور کہہ رہے
"اگر ہندوستان نے پاکستان کا کوئی
مکمل جنگ شروع کر دوں گا۔"
مگر انھوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہندو
کا کوئی حصہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہندو
کا کوئی حصہ لینے کی ضرورت نہیں ہے
نہیں لیتا۔ پاکستان تو خود ہی ختم ہوتا نظر آ
بنگلہ دیش میں تو وہ یقیناً ختم ہی ہو چکا
کے زور سے آخر کب تک حکومت کا کاروبار
بنگالیوں کے دلوں پر تو حکومت حقیقت میں
(شیخ مجیب الرحمٰن) کی ہے جس کے بارے
تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کہتے ہیں:
"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔"
نے اتنا تسلیم کر لیا کہ وہ زندہ و سلامت
یقیناً زندہ و سلامت رہیں گے خواہ پاک
یا نہ رہے۔
یحییٰ خان اگر پاکستان کو زندہ رکھنا
تو شیخ سے بات کریں۔ اس کے علاوہ کو
نہیں۔ شیخ بنگالیوں کے دلوں کا بادشاہ



شیخ مجیب الرحمٰن کے مقدمے کا قانونی جائزہ

از: جسٹس ایم ماج گوپالن اینگر

ترجمہ: سلمان ہاشمی

حکومت پاکستان کے شیخ مجیب الرحمٰن پر مقدمہ دائر کرنے کے [illegible] پر جن خیالات کا اظہار ہوا ہے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ اس مقدمے کے ذریعے انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کا استحصال کیا گیا ہے جبکہ دوسرا خیال اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ یہ مسئلہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے جسکا بین الاقوامی قانون سے کوئی تعلق نہیں۔

زیر نظر مضمون میں ان خیالات پر اظہار رائے نہ کرتے ہوئے میں ان ہی پہلوؤں پر اپنے تاثرات پیش کروں گا جو قانونی طور پر بحث کا موضوع ہیں۔ اس مسئلے کو پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دینے کے باوجود جو نکات سامنے آئے ہیں ان پر غور کرنا ہر قانون دان اور دانشور کے لئے بہت ضروری ہے۔

آج آزاد دنیا کا ہر صاحب شعور انسان شیخ مجیب الرحمٰن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے۔ مقدمہ تو دائر کیا گیا ہے مگر ان پر کیا الزامات عائد کئے گئے ہیں اس کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں کی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانا۔ اس الزام کے تحت ان پر مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں اس گناہ کے لئے انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت جو سزا مقرر ہے وہی سزا پاکستان پینل کوڈ میں بھی ہے کیونکہ برصغیر کی تقسیم کے بعد وہاں بھی یہی قانون نافذ ہوا تھا۔

سفید جھوٹ:

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی شب میں مجیب کی گرفتاری کے [illegible] پاکستان کے خلاف پر تشدد تحریک شروع کرنے کا [illegible] اور ان کے [illegible] شیخ [illegible] الزام

بھی کہ عوامی لیگ کے ممبران اپنے مخالفین کا قتل عام کر رہے تھے۔

اگرچہ الزامات عائد کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ بات سراسر جھوٹ ہے، مگر مجیب الرحمٰن کو پر تشدد تحریک شروع کرنے کا ذمے دار قرار دینے کے لئے یہ جھوٹ ناگزیر تھا حالانکہ ۲۵ مارچ کی شام تک صدر یحییٰ خاں مجیب الرحمٰن سے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ ۲۵ مارچ سے قبل ہی عوامی لیگ والوں نے قتل عام شروع کیا تھا ایک خطرناک بہتان ہے اسکے علاوہ مشرقی پاکستان میں موجود کسی بھی غیر ملکی نامہ نگار نے قتل عام کی اطلاع نہیں دی پھر یحییٰ خاں نے اپنی نشری تقریر میں ملکی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے صرف یہی کہا تھا کہ عوامی لیگ کے چھ نکات ملکی سالمیت اور اندرونی سلامتی کو نقصان پہنچانے کا باعث ہیں اس لئے پارٹی لیڈر مجیب الرحمٰن کو غدار وطن قرار دیا جاتا ہے۔

خبروں کے ان ذرائع کا مطالعہ کرنے پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان پر مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ ابھی حال ہی میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود مقدمہ کھلی عدالت میں اسی لئے پیش نہیں کیا گیا کہ ان پر عائد کردہ الزامات کو صحیح ثابت کرنا دشوار ہو جاتا۔ یہ سب سوچ کر فوجی حکمرانوں نے بند کمرے میں کارروائی انجام دینے کا فیصلہ کیا۔

خدشہ بجا ہے:

اب بند کمرے کے مقدمے کو لیجئے۔ اگر شیخ مجیب الرحمٰن پر عائد کردہ الزامات سچ ثابت کرنا ہوتا تو کھلا عام کیا جاتا بلکہ پوری دنیا کے لوگ بھی [illegible] [illegible] میں جو الزامات عائد کئے [illegible] [illegible] فوجی [illegible]

[illegible] [illegible] ساتھ کامل کرنے کے [illegible] ہو سکتا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ یہ مقدمہ عام عدالت میں نہیں بلکہ فوجی عدالت میں پیش ہوا ہے۔ اس عدالت میں ان کے حسب منشا فیصلہ ہو یہ فوجی صدر یحییٰ خاں کی اسکیم ہے۔ اسی اسکیم کے تحت گذشتہ ماہ ایک غیر ملکی نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر پاکستان نے کہا کہ:

"شیخ مجیب کی جان کو خطرہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ انہیں پھانسی کی سزا ہو جائے۔"

اس کا یہی مطلب ہوا کہ فوجی عدالت کو جس نہج پر فیصلہ دینا ہے وہ یحییٰ خاں کی مرضی کے مطابق ہو۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مقدمہ ایک فراڈ ہے؟

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ان کی مرضی کے مطابق وکیل فراہم نہیں کیا گیا۔ پاکستان کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی وکیل یہ نہیں چاہے گا کہ مجیب کا دفاع کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالے لہٰذا جب وکیل ہی اپنی پسند اور مرضی کا نہ ہو تو کارروائی کس ڈھنگ سے انجام دی جائے گی نیز فیصلہ کس نہج پر کیا جائے گا اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وکیل انکی مرضی کا ہوتا تو عائد کردہ الزامات کو غلط ثابت کرنا مشکل نہیں تھا لیکن جب مقدمے کی بنیاد ہی جھوٹے الزامات پر استوار کی گئی ہو تو انصاف کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

یہ مقدمہ ایک دردناک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہے کیونکہ چارج شیٹ میں جو الزامات عائد کئے گئے ہیں انہیں سچ ثابت کرنا فوجی ٹولے کا مقصد ہے۔ ایسی حالت میں اگر مجیب الرحمٰن اپنے دفاع کی بھرپور کوشش کریں تو بھی کامیابی ممکن نہیں۔

میرا خیال ہے کہ مقدمے کا فیصلہ سنانے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کو پھانسی کی سزا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

فلمی تبصرہ

میرا گاؤں میرا دیش

عبدالبصیر نعیمی

"میرا گاؤں میرا دیش" راجستھان کے ایک گاؤں کی کہانی ہے۔ ہیرو دھرمیندر ایک مجرم ہے جو چھ ماہ کی جیل کاٹ کر گاؤں آیا ہے۔ ایک ریٹائرڈ صوبیدار جینت اس کو اپنا بیٹا بنا لیتا ہے اور دھرمیندر اس کے کھیتوں میں کام کرنے لگتا ہے۔ جینت کے مکان کے قریب ایک ٹھاکر رہتے ہیں جن کی بیٹی آشا پاریکھ اکثر جینت کے لئے کھانا لیکر آجاتی ہے۔ دھرمیندر اور آشا پاریکھ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ اسی گاؤں میں ایک پگلی بھی رہتی ہے جس کے بیٹے کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے۔ پگلی دھرمیندر ہی کو اپنا بیٹا سمجھنے لگتی ہے۔ گاؤں میں اکثر ڈاکو گھس آتے ہیں اور قتل و خون کا بازار گرم کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایک دن ڈاکو آتے ہیں اور لوٹ مار کرتے وقت آشا پاریکھ کے باپ کو قتل کر کے چلے جاتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کو جانتے ہیں لیکن پولیس کے سامنے اس خوف سے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں کہ ڈاکو انکو مار ڈالیں گے۔ دھرمیندر گاؤں والوں کی غیرت کو للکارتا ہے اور انھیں ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لئے اکساتا ہے۔

ڈاکوؤں کا سردار دھرمیندر سے انتقام لینے کیلئے ایک طوائف (لکشمی چھایا) کو گاؤں میں بھیج دیتا ہے مگر طوائف دھرمیندر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ کافی دھائیں دھائیں اور ٹھائیں ٹھائیں کے بعد ڈاکوؤں کا سردار (ونود کھنا) گرفتار ہو جاتا ہے اور ہیرو کو ہیروئن مل جاتی ہے۔ طوائف ونود کھنا کی گولی کا شکار ہو جاتی ہے۔"

[illegible] دھماکے کے مکالمے جاندار ہیں مگر کہیں کہیں [illegible] کی تسکین کے لئے معیار سے گر جاتے ہیں۔ خاص طور پر ابتدا میں دھرمیندر اور آشا پاریکھ کے درمیان [illegible] مکالمے ادا کرتے ہیں ان میں [illegible] ہے۔ اداکاری کے لحاظ سے تمام اداکار مناسب ہیں۔ دھرمیندر [illegible] جوہر دکھائے ہیں۔ [illegible]

نہ جانے اتنے اچھے اداکار کو کیوں موقع نہیں دیا جاتا ہے۔ لکشمی چھایا بھی مٹی بالی کے کردار میں اچھی رہی ہے۔ ہدایت کار راج کھوسلا نے ہدایت کاری کے اچھے جوہر دکھائے ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی اور آنند بخشی کے گیت جاندار ہیں مگر گیتوں کی دھنوں میں لکشمی کانت پیارے لال کی پچھلی دھنوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر "سونا لے جا رے۔ چاندی لے جا رے" گیت، فلم "دو راستے" کے گیت "بندیا چمکے گی" کی یاد دلاتا ہے۔ پس منظر کی موسیقی اچھی ہے۔

مجموعی اعتبار سے راج کھوسلا کی فلم "میرا گاؤں میرا دیش" ایک دلچسپ فلم ہے جو باکس آفس پر ضرور کامیاب ہوگی۔

پروانہ

رات کو جب شمع جلتی ہے تو سیکڑوں پروانے اس کی آگ میں جل مرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ "پروانہ شمع سے پیار کرتا ہے" اور کوئی کہتا ہے کہ "وہ رات کے اندھیرے کا عاشق ہے اور شمع کو دشمن سمجھ کر اسے بجھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اپنا وجود ختم کر ڈالتا ہے" لیکن فلم "پروانہ" ان دونوں کہانیوں سے یا روایات سے مختلف ہے۔

اس میں ایک شمع (یوگیتا بالی) ہے اور اس شمع کے دو عاشق (پروانے۔ نوین نسچل اور امیتابھ بچن) ہیں۔ پروانہ نمبر ایک برسوں سے شمع کا خاموش عاشق ہے۔ لطف یہ ہے کہ شمع اس کی محبت سے لاعلم ہے مگر شمع کا ماما (اوم پرکاش) واقف ہے۔ پروانہ نمبر ۱ شمع سے کبھی نہ کہہ سکا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے مگر اس کے ماما سے کہہ دیتا ہے۔ ماما جانتے ہیں کہ شمع اور پروانے کے چکر میں کسی دوسرے کا گزر نہیں ہو سکتا اس لئے وہ کہتے ہیں کہ پروانہ نمبر ۱ خود ہی شمع سے اظہار عشق کر ڈالے۔ ادھر ایک [illegible] پروانہ نمبر ۲ محبت کر کے شمع سے سب کچھ [illegible]

[illegible] ہے پیدا ہو گیا ہے [illegible] پروانہ نمبر ۲ سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگتا ہے۔ جب سارے سگریٹ ختم ہو جاتے ہیں تو پروانہ نمبر ۱ شمع کو اپنے گھر لے جاتا ہے اور شمع کی تصاویر اور مٹی کی مورتیاں دکھا کر اظہار کرتا ہے کہ وہ برسوں سے اس سے پیار کرتا چلا آیا ہے مگر اب وہ شمع اور پروانہ نمبر ۲ کے راستے میں نہیں آئے گا۔

شمع اور پروانہ نمبر ۲ کی منگنی ہو جاتی ہے۔ [illegible] دونوں کو پیار سے لپٹے دیکھ کر پروانہ نمبر ۱ تڑپ اٹھتا ہے اور شمع کے ماما سے کہتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنے پیار کی قربانی نہیں دے سکتا۔ ماما مجبوری ظاہر کرتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پروانہ نمبر ۱ مجبور ہو کر ماما کو دھمکی دیتا ہے کہ "محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے اور وہ کسی طرح بھی شمع کو حاصل کر کے ہی رہے گا"۔ ماما غصہ ہو کر پروانہ نمبر ۱ کو گھر سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیتا ہے۔

اب یہاں سے سسپنس شروع ہوتا ہے۔ ماما اپنے کمرے میں مردہ پایا جاتا ہے۔ اس کا خون کس نے کیا؟ تمام ثبوت پروانہ نمبر ۲ کے خلاف ملتے ہیں اور اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ آخر میں جب راز کھلتا ہے تو عوام محسوس کرتے ہیں کہ انھیں بے وجہ دھوکا دیا گیا۔

جہاں تک کہانی کا تعلق ہے اس میں کوئی نیا پن نہیں مگر قتل کا پلان نئے ڈھنگ سے بنایا گیا ہے جو فلم کو کچھ دیر کے لئے خوبصورت بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اداکاری میں امیتابھ بچن نے تمام اداکاروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور خاص طور پر مکالموں کی ادائیگی میں کمال ہی کر دیا ہے۔ نوین نسچل بس ٹھیک ہے۔ یوگیتا بالی کہیں بھی متاثر نہ کر سکی۔ اوم پرکاش جیسے منجھے ہوئے ایکٹر کو ضائع کر دیا گیا ہے۔ شتروگھن سنہا اپنے مختصر سے رول میں کامیاب ہے۔

مدن موہن کی موسیقی بے جان ہے۔ صرف ایک گیت مقبول ہو سکتا ہے۔ نغمہ نگار کیفی اعظمی نے [illegible] تحریر کردہ "محمد بشیر البشیر" جیسے [illegible] نوین نسچل پر کشور کمار کی آواز بہت بھدی لگتی ہے۔ ایک گیت میں محمد رفیع کی آواز دل پر اثر کرتی ہے۔

مجموعی طور پر پروانہ ایک معمولی فلم ہے [illegible]



ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ یہ مذاق کب تک چلتا رہے گا؟

"یحییٰ خاں کی حکومت بنگلا دیش کے عوام کے [illegible] خون میں کھیل کھیل رہی ہے وہی ناٹک مہاراشٹر کی [illegible] نے مہاراشٹر کے مسلمانوں کے ساتھ کھیلا ہے" یہ بات [illegible] نہیں بلکہ بمبئی کے مشہور اردو بلٹز نے اپنے [illegible] میں لکھی ہے۔ اخبار نے اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار [illegible] بھیونڈی کے فساد میں ستائے ہوئے بے گناہ مسلمانوں [illegible] مقدمات میں پھنسایا گیا اور ان کے خلاف سازشی [illegible] پریشان کیا گیا۔

[illegible] فرقہ وارانہ فساد ۱۹۷۰ء میں اس [illegible]

> شرپسندوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ جب کبھی کسی جگہ کے رہنے والوں کی اطمینانی کیفیت کو ختم کرنے کے لئے فرقہ وارانہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں تو جلوس پر پتھر پھینکنے کا افسانہ گڑھتے ہیں۔

بھیونڈی میں بھی یہی سب کچھ ہوا۔ فساد برپا کرنے کے لئے شیو جینتی جلوس کو منتخب کیا گیا، اسے سنگباری کا نشانہ بنایا گیا۔ اور پھر وہی سب کچھ ہوا جسے قلم لکھتے ہوئے لرزتا ہے۔ احمدآباد کے بعد سب سے بڑا [illegible] ہوا۔ وہ شہر جو ہزارہا غریب بنکروں اور کاریگروں کی بستی ہے تباہ و برباد ہو گیا۔ اقلیتی فرقہ کی بڑی آبادی تباہ ہو گئی۔ [illegible] پولیس کی طرف سے بھی مظالم کے پہاڑ [illegible] اور [illegible] کے قریب آدمی گرفتار کر لئے گئے (اس بارے میں تفصیلی مضمون واقعات کے دسمبر کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے [illegible] حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ [illegible]

کو اس میں ماخوذ کر دیا گیا

سی آئی۔ ڈی کی رپورٹ تھی کہ ابراہیم مدھو کی قیادت میں ۱۱ اپریل کو فساد برپا کرنے کی سازش تیار کی گئی تھی اور ایک میٹنگ میں ابراہیم مدھو نے اشتعال انگیز تقریر کر کے مسلمانوں کو بھڑکایا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے یہ دلچسپ کہانی بھی گڑھی کہ جب ابراہیم مدھو تقریر کر رہے تھے تو میٹنگ میں ایک گائے گھس آئی جس پر لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ یہ دیکھ کر ابراہیم مدھو نے کہا "تم لوگ ایک گائے سے بھاگ رہے ہو اگر دس ہندو آ گئے تو کیا کرو گے" یہ الزام بھی سی آئی۔ ڈی نے لگایا کہ ابراہیم مدھو نے شیو جینتی کے جلوس پر [illegible] مسلمانوں کو حملہ کرنے کا اشارہ دیا اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جلوس پر پتھر برسائے۔

سی آئی۔ ڈی کی اس رپورٹ [illegible] کیس کی عمارت کھڑی کی گئی [illegible] بتاتے ہیں کہ یہ ایک [illegible] داستان [illegible] نہ رکھتی تھی۔ [illegible] جس اقلیت کو [illegible]

...میں انصاف کا خون

بھیونڈی کے سات سو مسلمانوں پر ابھی تک مقدمے چل رہے ہیں

...ساد برپا کرنے کے لئے کوئی سازش کر سکی۔ اگر
...ی کے ۷۲۳ مسلمانوں نے فساد کی سازش تیار کی تو
...جا سکتا ہے کہ یہ لوگ کیا فائدہ حاصل کرنے کی توقع
... تھے؟ اور جو فساد ہوا اس میں ان لوگوں کو کیا
...ہونچا؟

لیکن ان سوالوں سے قطع نظر خود سرکاری گواہوں
...ران کمیشن کے روبرو اس الزام کی تردید کر دی کہ مسلمانوں
...ساد کی کوئی سازش تیار کی تھی۔ ایک پولیس انسپکٹر جہانگیر
...ران کمیشن کے روبرو یہ سنسنی خیز انکشاف کرکے سب
...تے میں ڈال دیا کہ سی۔ آئی۔ ڈی کو میرے نام سے جو بیان
...ادہ میری موجودگی میں دیا گیا اور نہ کبھی مجھے پڑھ کر
...لیا۔ دوسرے گواہوں نے بھی ایسے ہی بیانات دیئے
...اضح طور پر کہا کہ ابراہیم مرحوم نے کوئی اشتعال انگیز تقریر
...ہی کی تھی۔

اپنے کیس کی کمزوری دیکھ کر حکومت نے سازش کے
...یس کو واپس لے لیا۔

مقدمہ واپس لے کر حکومت نے گویا بالواسطہ خود بہت
...ے انصافی سے کام لیا ہے۔ پہلے اس نے سازشی کیس
...ا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اس میں ملوث کرکے
...ن کو پریشان کیا اور اب وہی مقدمہ واپس لیکر کریڈٹ
...حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بہت خوب! ادہی
...ج بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہی لے ثواب الٹا۔

سوال یہ ہے کہ جن ۷۲۳ مسلمانوں کو سوا برس تک
[illegible]

دکھایا جاتا ہے اقتصادی بار نہ دی جاتی، مالی نقصان سے
قطع نظر جو لاکھوں تک پہنچتا ہے صرف مقدمہ کے چکروں میں
بھیونڈی کے مسلمانوں کے اب تک اکتالیس ہزار روپیہ خرچ
ہو چکے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں اس لئے کہ ابھی سات سو افراد
ایسے ہیں جنہیں اگرچہ ضمانت پر چھوڑنے کا کرم کیا گیا ہے لیکن
عنقریب ان کے خلاف سیشن میں مقدمات شروع ہونے والے
ہیں (ڈھائی سو رہا ہو چکے ہیں اور دو ہزار کو جنہیں کرفیو کی
خلاف ورزی میں پکڑا گیا تھا، جرمانہ کرکے چھوڑ دیا گیا ہے۔)
مقدمات شروع ہونے کے بعد کب تک ملزموں کو کچہری کی خاک
چھانی پڑے گی اور کتنی رقم کیلئے انہیں زیر بار ہونا پڑے گا
کوئی نہیں کہہ سکتا، یہ سب ایک طبقہ کو اجاڑنے اور برباد
کرنے کی باتیں ہیں۔ اس طرح اگر قوم کا کوئی حصہ پریشان
ہوتا رہے گا تو کیا اس کی معیشت کبھی ٹھیک ہو سکے گی ——
اور کیا اس سے بالآخر ملک کی مجموعی معیشت متاثر نہ ہوگی —
بھیونڈی کے لوگ کپڑا تیار کرکے پیداوار کو بڑھانے اور
ملک کی معیشت کو مستحکم کرنے پر لگے ہوئے تھے۔ اگر آج ان
کے وسائل ختم ہو جانے کی بنا پر اس پیداوار میں رکاوٹ پڑ گئی
تو یہ نقصان کس کا ہے؟

کیا یہ صرف ان ہی لوگوں کا نقصان ہے جن کے کارخانے
تباہ و برباد کر دیئے گئے اور جن کے پاور لوموں کو اکھاڑ پھینکا گیا، یہ
اس ملک کا بھی نقصان ہے جس کی اقتصادیات کو مستحکم کرنے میں
وہ لوگ لگے ہوئے تھے۔

فساد کے بعد فساد زدہ لوگوں کی خاص پریشانی اپنے کاروبار
کو بحال کرنے کی تھی۔ حکومت کا فرض تھا کہ وہ تباہ شدہ لوگوں
کی فراخدلی کے ساتھ مدد کرتی۔ انہیں اس قابل بناتی کہ وہ پھر
سے اپنا کاروبار شروع کر سکتے لیکن پولیس کی بے ایمانی دیکھو
کہ جو طبقہ تباہ و برباد ہوا اسی کے کاندھوں پر الزام دھر دیا گیا
اسی سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف مقدمات قائم کرکے
انہیں کچہری کی الجھنوں میں پھانس دیا گیا تاکہ
ان کی بربادی میں جو کسر باقی ہے وہ پوری ہو سکے اور
[illegible]

یہ مقدمات اسی سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس کا کارنامہ
تھیں جس نے سازش کیس گھڑا تھا۔ سازش کیس کے جھوٹا
ثابت ہو جانے کے بعد کون ان کے چلائے ہوئے مقدمات پر یقین
کرے گا۔

> معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ باور نہیں کر سکتا
> کہ جس اقلیت کو یہ معلوم ہو کہ فساد اس کے لئے تباہ
> کن ہوگا وہ فساد برپا کرنے کے لئے سازش کریگی۔

ان مقدمات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ انصاف کا
جو خون اب تک ہوتا رہا ہے وہ بند ہو سکے۔ حکومت مہاراشٹر
جتنا جلد ان مقدمات پر نظر ثانی کرے گی اتنا ہی جلد وہ
ناانصافی کے ان دھبوں کو دھو سکے گی جو اس کی پیشانی
پر لگ گئے ہیں۔ اور اگر ان مقدمات پر نظر ثانی نہ کی گئی اور
بے سوچے سمجھے ان مقدمات کو جاری رکھا گیا تو ایک عام آدمی
یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ اس شہر کے اقلیتی طبقہ کو برباد کرنے
کی جو سازش پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی نے تیار کی تھی اس میں
خود حکومت بھی شریک تھی اور اسی لئے وہ بھیونڈی کا تماشہ
خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔

> یہ مقدمے پولیس کی سازش کا نتیجہ ہیں
> مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری نائک کو
> فوراً مستعفی ہو جانا چاہیے۔

> ۱۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں
> اس وقت ملتے ہیں جب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتے ہیں۔
> ۲۔ جن سے محبت کی جائے ان کے ساتھ راست باز
> رہنا بہت مشکل ہے۔

قبر کی

خال

مجھے قبر میں اتار کر میرے عزیز و اقارب ابھی قبرستان کی چار دیواری سے باہر بھی نہ گئے تھے جس کا اندازہ یوں ہوا کہ قبر کے اوپر سے تازہ مٹی جھڑ جھڑ کر میرے جسم کو میلے رنگ سے ملنے لگی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی اور میں مردہ سے زندہ میں تبدیل ہو گیا۔ میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہے اور میرے حلق سے گویا چیخ سی نکل گئی۔ میں فوری طور پر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ چیخ کس قسم کی تھی مگر بعد میں اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ یہ چیخ ڈر کی تھی۔ مجھے خود پر سخت افسوس ہوا کہ میں کتنا بزدل اور ڈرپوک ہوں کہ ایک لوہے کی سلاخ دیکھ کر ڈر گیا اور ڈر کے مارے چیخ نکل گئی۔ افسوس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ چیخ نے بھی دم توڑ دیا اور آواز قبر کے خانے سے باہر نہ نکل سکی۔ ورنہ قبرستان کے سارے مردے جاگ جاتے اور اپنی اپنی قبروں سے نکل کر کفن پھاڑ کر سر پر پیر رکھ کر میری قبر کے چاروں طرف حالات سے آگاہی کے لیے کھڑے ہو جاتے جیسا کہ عموماً میری زندگی میں واقع ہوا ہے۔ میں جب بھی اپنی بیوی سے روٹھ کر چیخ کر محلے کے لوگوں کو اکٹھا کر لیا کرتا اور لوگوں سے انصاف کراتا جو عموماً میرے حق میں ہوتا تھا۔

میں اپنی ناکامی پر آنسو بہانے لگا۔ میرے جسم سے پسینے کے ابشار پھوٹنے لگے۔ میں نے رومال تلاش کیا مگر زنجیر نما کوئی چیز نظر آسکی میں نے کفن پھاڑنا چاہا مگر اس دفعہ بھی مایوسی ہوئی۔ اس وقت مجھے اپنے عزیزوں پر سخت غصہ آنے لگا کہ ظالموں نے کتنا مضبوط کفن سلوایا ہے۔ جیسے وہ جانتے ہوں کہ میں پھٹے والی زندہ دلی کا بکٹر ہوں۔ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ زندگی میں کبھی اچھا کپڑا نصیب نہ ہو سکا اور مرنے کے بعد بھی ... کی طرح مضبوط کپڑے کا کفن میرے مقدر میں نہ رہا۔

مردہ جسم پر لپیٹ کر زندہ دلی کا ثبوت دے دیا۔

میں اپنے ہوش و حواس درست کرنے لگا۔ منتشر اور پریشان ذہن کو یکجا کرنے لگا تاکہ منکر نکیر کے سوالوں کا جواب ترکی بہ ترکی دے سکوں ویسے میں نے مرنے سے قبل جبکہ کسی کو علم نہیں ہوتا ایک پلان ترتیب کیا تھا۔ ایک ترکیب سوچی تھی اور ذہن میں ایک خیال بسایا تھا کہ جب میری قبر میں منکر نکیر تشریف لائیں گے تو نٹور لال کی طرح ایسا جھٹکا دوں گا کہ وہ الٹے پاؤں واپس چلے جائیں گے اور پھر کبھی میرے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکیں گے جیسے:۔

میں قبر میں مردے کی طرح لیٹا ہوا ہوں گا۔ منکر نکیر دبے پاؤں میرے پاس آئیں گے اور پیار و محبت سے ٹھیک اس طرح جگائیں گے جس طرح ایک ماں اپنے شیر خوار بچے کو اور نئی نویلی دلہن اپنے شوہر کو جگاتی ہے۔ میں ایک نوخیز دوشیزہ کی طرح انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہوں گا۔ بلی اور دبیر لوہے کی سلاخ دیکھ کر ذرہ برابر بھی پریشان نہ ہوں گا اور خود پر خوف و دہشت کا شائبہ تک نہ چھانے دوں گا۔ شاعروں کی طرح دشاعروں سے معذرت کے ساتھ) خالص زنانے انداز میں جسم میں لوچ پیدا کر کے کمرے اچکا کر انگڑائی لے کر ۹۰ ڈگری کے زاویہ پر موڑ کر منکر نکیر کی خدمت میں کسی بادشاہ کے پیشہ ور شاعر کی طرح بیٹھ جاؤں گا۔ منکر نکیر میری اس دلبرانہ ادا پر بھجنا جائیں گے اور آپس میں کبھی ایسے دیکھیں گے گویا وہ گونگے ہیں یا زبان نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

پھر میں ہوٹل کے بیروں، صاحب کے نوکروں اور وزیر کے چمچوں کی طرح کورنش بجا لانے کی غرض سے دست بستہ ہو کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ میری زبان کو شیریں زبانی میں حضور کی تشریف آوری کی کرم نوازی سے ... آنکھوں کا شرف حاصل ہے۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہیں گے۔

میں نے حضور کے بہت چرچے سنے ہیں کیا جناب عالی کا اسم مبارک میاں فلاں ہے۔

میں سفید جھوٹ بولتے ہوئے برجستہ کہہ دوں گا۔

یہ ناچیز حقیر فقیر اس لائق کہاں کہ لوگوں کی زبان پر خاک کے چرچے ہوں ویسے یہ غلام میاں ڈھکانے لگانے کا گنہ گار ہے۔

وہ جھٹ سے اپنی عبا قبا میں سمیٹیں گے اور چشم زدن میں خود جکڑے ہو جائیں گے۔ میں بتیسی نکال کر قہقہوں سے قبر کا سارا ماحول روشن کر دوں گا۔

جیسے:۔

میں قبر میں نیند سے سویا ہوا ہوں اور خراٹے لے رہا ہوں گا۔ منکر نکیر حضرت وحی کی طرح نازل ہو جائیں گے اور خاتمہ کی غرض سے مجھے جگائیں گے۔ میں تیور بدلتے ہوئے چہرے پر ناگواری ظاہر کرتے ہوئے اٹھ جاؤں گا۔ جیسے میں انکے کان پر احسان عظیم کر رہا ہوں۔ میں حضرت ابابیل کی طرح ایک ہاتھ سے ابابیلی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے دائیں بازو کی مچھلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ... کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤں گا۔

وہ مجھ سے سوال پوچھنے کی کوشش کریں گے۔ میں زور سے ... دوں گا۔ وہ ... لوہے کی سلاخ سے مارنے کی دھمکی دیں گے۔ میں ... کی طرح ... دلا کر ٹال دوں گا۔ وہ غصے سے گھوریں گے۔ میں ... کی طرح ... وہ ... کے ... کی ...

[illegible] ات کی فہرست

[illegible] حقیقت سے

[illegible] کر دوں گا میرے ... والا چلے گی

[illegible] شہادت ... نہیں ہوں گی اور میں سزا کا مستحق

[illegible] دیا جاؤں گا ... شکست تسلیم کرنے والا نہیں

[illegible] گواہی کیسا ... کرو گا ... ٹھا دیا

[illegible] سے ہیں دونوں طرف سے کے ممبر ان ہوں گے میرے

[illegible] تو میری حمایت کریں گے ... ممبر ... کسی

[illegible] کی شکنجے سے راضی کر لوں گا جیسا ... سیاسی

[illegible] زندگی میں ہوا ... گواہی ... اپنا فیصلہ سنا دے

اور مجھے بے قصور ثابت کر کے مخالفین پر ہتک عزت

[illegible] جرم میں چارج شیٹ لگا دے گا پھر میری وجے ... گی

[illegible] لن کی ہار۔

جیسے؛

میرے اپنے پرائے، رفیق و رقیب، دوست دشمن،

[illegible] ایسے غیرے نتھو خیرے مجھے قبر میں لٹا کر اوپر سے تختے

[illegible] کی مٹی سے ڈھک کر اپنے ایک مقدس فریضہ کی تکمیل سمجھ

[illegible] تشریف لے گئے اور میں قبر کے تاریک گوشے میں دل کے

[illegible] غ جلائے سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے قوم کے لیے نصیحت

[illegible] کالم لکھ رہا ہوں منکر نکیر حضرات بیچ میں مخل ہو گئے۔

[illegible] ری طور پر میں برا مان گیا۔ برا ماننا بھی کیوں نہیں جبکہ

[illegible] ایک کام کر رہا ہوں اور دوسرا آدمی کباب میں ہڈی

[illegible] گیا۔ میں طیش میں آ گیا اور قلم کی تحریک کا سر کچلنے پر مجبور

[illegible] گیا۔ میری گرم گرم تیز تیز چلتی ہوئی سانس نے کاغذ کے

[illegible] ے کو مرغ بسمل کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دیا۔ میرے دل

[illegible] ظالم نے جنم لیا میرے ہاتھ نے تڑپتے ہوئے کاغذ کے

[illegible] کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر بائیں جیب سے ... روشنائی

[illegible] قلم ... اور کاغذ ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قدم مل کر کے ... کیسی [illegible]

[illegible]

ہم اصل بات کے ... معلوم ... نہیں

سے پوچھا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" میں نے پوچھا

"میرے پاس فہرست ہے۔" جواب ملا

"باپ رے باپ" میری زبان سے نکلا

"تمہارے ابا جان نکسل کے شبہ میں جیل میں قید ہیں۔"

"ہاں"

"تمہارا بھائی ایک لڑکی کا خون کرتے پکڑا گیا اور پولس

کی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

"ہاں"

"اس لیے تم بھی نکسلی ہو"

"نہیں بالکل نہیں؟"

"تم جھوٹ بولتے ہو"

"ارے واہ کیا زبردستی ہے۔"

"تمہارا باپ نکسلی تمہارا بھائی نکسلی اس لیے تم بھی نکسلی۔"

"حضرت میں تو ایک افسانہ نگار ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نکسل باڑی کے ہوتے ہوئے افسانہ نگار کیسے ہو گئے"

"یہ ایک لمبی داستان ہے جس کو سنانے کے لیے نہ میرے

پاس وقت ہے اور نہ سننے کے لیے آپ کو فرصت ہو گی۔"

میں نے مزید سمجھاتے ہوئے اور چہرے پر رنج و ملال

کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

میں یہ جانتا بھی نہ تھا کہ مستقبل قریب میں افسانہ نگار

بن جاؤں گا۔ مجھے تو یہ بھی امید نہ تھی کہ ڈیڑھ سو روپے پر

معمولی کلرک کی نوکری بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر بھلا ہو اس

قوم کا اور قوم کے نالائق سپوتوں کا جن کی غلط روش زندگی

اور سماج کی بگڑی ہوئی حالت نے مجھے افسانہ نگار بننے پر مجبور

کر دیا تا کہ میں اپنی زور بیانی سے اوراق سیاہ کر دوں اور قوم

کی تقدیر بدل سکوں مگر قسمت نے ایک ڈرامائی کھیل کھیلا جس

کے نتیجہ میں افسانہ نویس اور طنز نگار بن گیا مگر قوم کی قسمت نہ

بدل سکا میں خون جگر سے اوراق سیاہ کرنے میں منہمک رہا

خون جگر ... اور جسم و جاں کا ... قلم میں بھر کر تحریری

تحریک میں جان ڈالتا رہا ... قوم ... زندہ لاش

سے ... نہ ہوئے۔ مجھ پر غصے نے غلبہ کر لیا میری انا نے مجھے

... کر دیا۔

"اگر ... سے ... ہوتے تو تم کس سے کس ... "

لہٰذا میں فوراً اس سے ... ہو گیا اور میں ... کر کے اس

کو قبر میں آرہا تاکہ ابدی نیند سو سکوں مگر یہاں بھی ... کے ...

نے سونے نہیں دیا اور قلم کاغذ سنبھال کر قطار ہو گیا۔

پھر منکر نکیر حضرات میری حالت زار پر ترس کھاتے

ہوئے رفو چکر ہو جائیں گے لیکن ...

اب پتہ چلا کہ حقیقت اور خیال میں بہت فرق ہوتا ہے۔

میں یہ لوہے کی سلاخ دیکھ کر نروس ہوا جا رہا تھا اور

وہ لوہے کی سلاخ پکڑے قہر آلود نگاہوں سے گھورے

جا رہے تھے (میرا نروس ہونا بھی حق بجانب تھا کیونکہ میں

خالی ہاتھ تھا اور وہ ہتھیار سے لیس۔

انہوں نے جلدی جلدی کئی سوال کر ڈالے اور میں ایک لفظ بھی

نہ سن سکا۔ ذہن پر زور دیا تو معلوم ہوا کہ ذہن کی فیکٹری بند

ہے اور مزدور ہڑتال پر ہیں۔ یادداشت پر زور دیا کیونکہ

یادداشت کی بنیاد پر میں ہزاروں سال کی تواریخ فوراً

بیان کر دیا کرتا ہوں) تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے

کرمچاری چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ اور گیٹ پر سنتری

سے پہرہ دینے والا دربان اونگھ رہا ہے۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میں پل صراط پر ہوں اور

ذرا سی جنبش ہست نیست کا فیصلہ کر دے گی ابھی میں اسی

محسوس ہی سے گذر رہا تھا کہ اچانک ایک آواز پردہ

سماعت سے ٹکرائی ؎

تیری ہستی اور نیستی میں فرق ہی کیا ہے

اور میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ میرا جسم ۱۰۵

ڈگری فیرن ہائیٹ کے بخار میں مبتلا مریض کی طرح جلنے لگا۔

پیشانی سے جو تقدیر کی لوح محفوظ ہے پسینے کے آبشار

پھوٹنے لگے۔

فوراً میرے ذہن کے ایک کونے میں ہلچل مچی معلوم

ہوا کہ ایک ملازم ہڑتال کی پرواہ کیے بغیر کام پر چلا آیا پھر

میرے من کے مندر میں گھی کا چراغ جلا اس ملازم

نے کہا۔

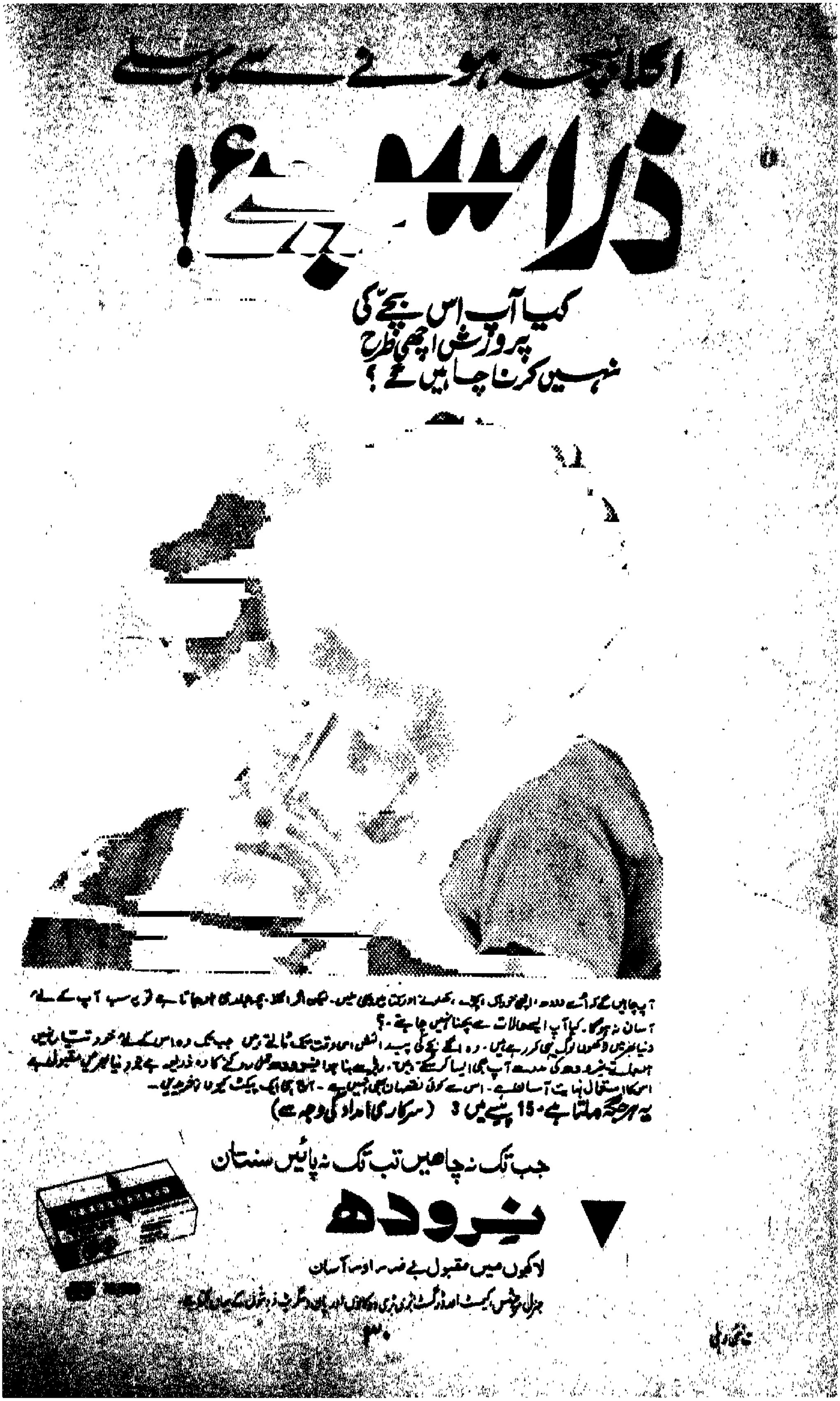
"میں حضرت شاعر ہوں"

میں نے اس کے ایما پر ایک شعر باآواز بلند نغمہ میں

رہائی و آزادی واسطے ہمیشگی بحضور منکر نکیر عرض کیا ؎

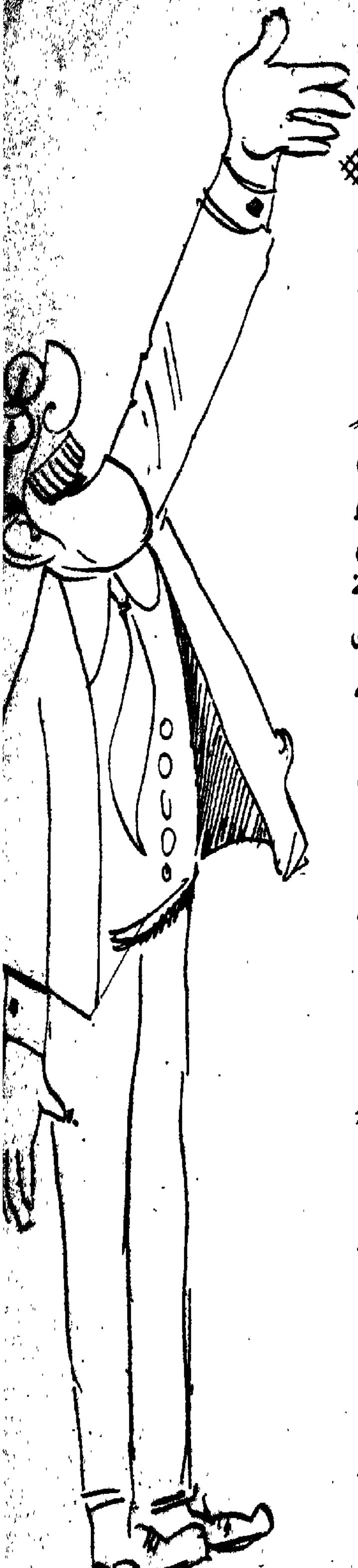
دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر

لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا



اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا سوچئے!
کیا آپ اس بچے کی پرورش اچھی طرح نہیں کرنا چاہیں گے؟
یہ ہر جگہ ملتا ہے 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)
جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان
نرودھ
لاکھوں میں مقبول بے ضرر اور آسان

۳۰



کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

طنز و مزاح

یعقوب سروش

بکواس کرنے اور آنسو بہانے میں بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں اس راکٹ کے دور میں مستقل آرٹ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ہم اپنے بارے میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم آنسو بہانے کے آرٹ کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا بھی یہی حال ہو۔ لیکن اتنی بات ہم برملا کہیں گے کہ آنسو بہانے کے فن کا تعلق شاعر کی زبان میں اولادِ آدم کی اس صنف سے ہوتا ہے جن کی کمر پتلی ہوتے ہوتے جاسوسی کردار کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ جن کی آنکھیں سحر طراز، جھکے ابرو خنجر اور جن کے رخساروں میں شفق کا خون ہوتا ہے۔ جمہور کا خیال ہے کہ شاعروں کی راتیں بڑی روپہلی، رنگین اور سہانی ہوتی ہیں۔ جب ایلائے شب کا کتھک ڈانس شروع ہو جاتا ہے تو ان کا دل طبلے کی تھاپ سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکتا ہے گردشِ جام و سبو غمِ دوراں کو فراموش کر دیتی ہے۔ کیف و مستی کے اس عالم میں وہ ہوں گے اور ان کا غمِ جاناں — اختر شماری سے فرصت ملتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آئے گا — اور فراقِ جاناں پر کوئی نظم جنم لے گی، اس نظم کی کوئی تعریف کرے گا، کوئی بکواس کہہ دے گا سیل

ہمارے بھی ایک شاعر نما دوست یا دوست نما شاعر ہیں۔ جسم سے بھاری بھرکم۔ جب شعر سنانے پر آتے ہیں تو منہ سے پیک کی پھوار شروع ہو جاتی ہے۔ بنارسی زردے کی تیز خوشبو سے ساری فضا مہک اٹھتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام سے زیادہ بنارسی زردے کا اشتہار دے رہے ہیں۔ اگر آپ ان کے اشعار کی داد نہ دیں گے تو وہ ایسے [illegible] آپ کے [illegible] کو [illegible] سلام کریں گے [illegible]

کشکول کے عنوان پر ایک بلینک ورس لکھی ہے۔ ہم نے ان کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی نظم پر بے لاگ تنقید و تبصرہ شروع کر دیا۔ وہ غصے سے جز بز ہو گئے۔ آثار و قرائن سے پتا چلتا تھا کہ ہم اب پٹنے ہی والے ہیں۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمارے ایک دوسرے دوست کا کہ انھوں نے ثالثی کا پارٹ ادا کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ پھر اس کے بعد ہم نے قسم کھائی کہ ہم اپنے آپ کو سارے شاعر طبقے سے نہ سہی کم از کم ان شاعر نما دوست یا دوست نما شاعر سے الگ رکھیں گے لیکن ہماری یہ قسم بار بار ٹوٹتی ہے کیونکہ ان کے اور ہمارے مراسم چھوٹ نہیں سکتے۔ قسم کھانے اور قسم توڑنے کا تجربہ تو آپ سب کو آئے دن ہوتا ہوگا۔ مثلاً کسی افسردگی کے عالم میں یہ قسم آپ کھا لیتے ہیں کہ سگریٹ نوشی نہیں کریں گے کیونکہ اس سے کینسر ہونے کا خطرہ ہے۔ یا کسی فلم کو ایک بار ہی دیکھیں گے یا اپنی فیشن کو ترک کر دیں گے، یا شہر کی بارونق سڑکوں پر گھومنے والی الہڑ اور شوخ دوشیزاؤں کے بے حجاب جلوں سے اپنی آنکھوں کو نہ سینکیں گے۔ مگر قسم ہے آپ کو اپنے ہی سرِ عزیز کی سچ سچ بتائیے کہ کتنی دیر تک آپ کی یہ قسم بقیدِ حیات رہی۔ سرمئی شام آتے ہی کیا آپ کے قدم بھٹکنے نہیں لگتے۔ کیا آپ کی آنکھیں ان ٹکڑیوں کا تعاقب نہیں کرنے لگتیں جن کے حسن و جمال کا [illegible] نام۔ صرف بکھرے ہوئے بھورے بھورے بال، چمڑی کی طرح چڑھا ہوا ڈائجسٹ لباس، بے لوث بے مزہ اور بے کیف — اور اسی طرح کیا آپ اپنے فلم شہر کے انٹرولوں میں ریس کا جو چلانے چلانے لگے [illegible] کہ کوئی امریکی حسن اگر [illegible] آیا ہو تو آپ کے [illegible] ہے۔

یہاں آنے کی غرض [illegible] بکواس کرنے اور آنسو بہانے میں [illegible] تعلق ہے۔ یہ دونوں اب آرٹ کی

... اڑ کے ہوئے فائن آرٹ ... جانے لگے ... بعد ... کی منزل خود بخود آجائے گی کیونکہ ... میں ہر جدید ایبسٹریکٹ آرٹ کی طرف مائل ہے ... فیشن ہو یا تنگ موری والی پتلون یا ... جیسے بو شرٹ ہوں یا الجھے بال۔ کیبرے ڈانس یا ... سب ایبسٹریکٹ آرٹ کے زندہ ... ہیں ... تو ٹھہرئیے!

بکواس کرنے اور آنسو بہانے کے فائن آرٹ کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی کو مرعوب کرنا ہو یا شکست دینا ہو۔ اس خلائی دور میں ہر شخص ایک دوسرے پر رعب ڈالنا ضروری سمجھتا ہے۔ جنتا اپنے حلقے کے امیدواروں پر رعب ڈالنا ضروری سمجھتی ہے کیونکہ ہار جیت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ جیتنے کے بعد امیدوار جب نیتا بن جاتا ہے تو وہ خود اپنے حلقے کی جنتا پر رعب ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس ناری یُگ میں بیویاں اپنے شوہروں کو مرعوب کرکے بے چاروں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہیں اور جب امتحان ہال کے نگران کار کی سختیوں سے برافروختہ ہو کر نقل کرنے والا طالب علم نگران کار کو چھرا گھونپ دیتا ہے تو دوسرے تمام نگران کار اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ نگرانی کو سو سلام کرکے نقل کرنے والوں کی مدد میں اپنی جان کی امان سمجھتے ہیں۔

لیکن ذرا ٹھہرئیے، ہماری بکواس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم آپ کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بستر پر کھٹمل قابض ہو گئے ہیں۔ کانوں میں ہمارے پہلوان شاعر کی آزاد نظم کے اشعار گونج رہے ہیں، نیند کا کوئی کلومیٹر دور تک پتا نہیں ہے، اس پریشانی کے عالم میں ہم کاغذ قلم لے بیٹھے ہیں کہ چلو کچھ دیر کے لئے بکواس ہی سہی!!

خدا کی کارسازی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے کھٹمل جیسے سرخ کیڑوں کو کیوں پیدا کیا۔ سفید دودھ جیسا پلنگ پوش میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ جدھر دیکھو ادھر سرخ ... ہیں۔ ہم سرمایہ دار بھی تو نہیں جو ہمارے خون کے پیچھے پڑ گئے ہیں یہ موذی جانور۔ جی تو دل چاہتا ہے کہ ان کے خلاف "سول وار" شروع کر دی جائے۔ ساری دنیا کے بڑے بڑے ... ہیں ... عظیم الشان ... جلسے منعقد کئے جائیں اور سارے عوام متحد ہو کر کھٹملوں کے خلاف ایک سخت ترین قرارداد پاس کریں۔ نیویارک۔ واشنگٹن۔ لندن۔ ٹوکیو دہلی۔ اسلام آباد۔ اور قاہرہ کے بڑے بڑے اخبارات کھٹملوں کے خلاف ولولہ انگیز اداریے لکھیں۔ اگر یہ تحریک کوہ ہمالیہ اور انڈیز سے کوہ ہمالیہ تک، بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک چل پڑے تو انسان کا نصیب ہی جاگ جائے۔ اس لئے جمہوری مملکتوں کے سربراہوں کو اگر یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ فیملی پلاننگ کی تحریک کو چھوڑ کر "کھٹمل کشی" کی خارجہ پالیسی اختیار کریں تو ہم حق بجانب ہوں گے۔ دنیا کی تمام سیاسی پارٹیاں، ریپبلکن پارٹی سے لے کر کنزرویٹو پارٹی تک برسرِ اقتدار کانگریس پارٹی سے لے کر جن سنگھ تک سب کے سب اس مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو ہمارا یقین ہے دنیا کے تھکے ہارے باسیوں کو میٹھی نیند آئے گی۔

اوہ!! ہم نہ جانے کیا کیا بکواس کر گئے۔ یہ خیال ہمیں ایک دم اس لئے آیا کہ ایک کھٹمل نے زور سے ہمیں کاٹ لیا۔ کم بخت نے سرخ خون بڑے مزے سے پی لیا۔ آجکل خون بنتا ہی کہاں ہے۔ ہماری غذاؤں میں ملاوٹ کی اتنی بہتات ہے کہ پاک صاف خون بلڈ بینک میں بھی نہیں ملتا۔ اگر ہم یہ اندیشہ ظاہر کریں کہ انسان بھی اب اصلی نہیں رہا، وہ بھی سر سے پاؤں ملاوٹ میں ڈوبا ہوا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ ملاوٹ کا یہ خون جو کچھ بدن میں رہتا ہے اس میں سے تقریباً دو تہائی ان ہی کھٹملوں کے حوالے ہو جاتا ہے۔ روایت کی جاتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد سیروں غذا ہضم کر جاتے تھے۔ گھی میں ڈوبتے تھے اور دودھ میں نہاتے تھے۔ اب ان کے پوتوں پڑپوتوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ ملاوٹ کی غذا کھاتے کھاتے قبرستان کی تیاری کرنے لگ جاتے ہیں۔ کینسر۔ السر۔ ہارٹ اٹیک اور سیریلم ہیمرج کی شکل میں دوسری دنیا کا پاسپورٹ اور ویزا جلد ملنے لگتا ہے۔ آدھی بھوک مرتی ہے آدھی تڑپتی ہے۔ تڑپتی ہوئی آدھی بھوک، جنسی بھوک کا الاؤ دہکا دیتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک مرطل، ننھا منا بچہ اس دنیائے رنگ و بو میں چیختا چلاتا آنکھیں کھول دیتا ہے۔ حالانکہ چاروں طرف فیملی پلاننگ کے نعرے۔ بسوں دیواروں، ریسٹورانوں، پوسٹروں پر لکھے ہوئے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور کھٹمل میں ایک رسہ کشی ... ہے اور دونوں ... کی ... لیکن ہماری حیثیت سے ہم کھٹملوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلی قسم میں وہ کھٹمل داخل ہیں جن کا رنگ سرخ و سفید ہوتا ہے۔ یہ بڑے بھاری بھرکم ہوتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی ڈکشنری میں ان کا تعلق بورژوا طبقے سے بتایا جاتا ہے بزرگوں کا خیال ہے کہ ان کے پاس ڈالروں کی جھنکار ہوتی ہے نئے نئے پلان بنتے ہیں نئے نئے معاہدے اور میثاق وجود میں آتے ہیں۔ نیوکلر بموں، نیپام بموں اور ایٹم بموں کی شکل میں یہ ساری دنیا کو کاٹتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کا بہایا ہوا خون ہیروشیما اور ناگاساکی میں دکھائی دیتا ہے کبھی ویت نام کی جنگلوں میں اور کبھی سینائی کے ریگستانوں میں۔ کھٹملوں کے اس گروہ میں وہ چالاک کھٹمل بھی اپنے آپ کو شامل کر لیتے ہیں جن کا سورج کبھی کا ڈوب چکا ہے۔

دوسری قسم کے کھٹمل زرد، لاغر اور جوشیلے واقع ہوئے ہیں۔ ان میں طوفانوں کا سا جوش، دریا کا سا استقلال۔ شیر کی سی بہادری۔ لومڑی کا سا فریب اور چٹانوں کی سی سختی ہے۔ یہ کاٹتے جاتے ہیں اور "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگاتے جاتے ہیں۔ خون بھی سرخ ہوتا ہے اور انقلاب کا نعرہ بھی سرخ۔ صدیوں تک ان پر بے ہوشی طاری تھی۔ اس وقت دنیا چین کی بنسری بجا رہی تھی۔ اب یہ جاگے ہیں تو دنیا کا چین اپنی ٹوٹی ہوئی بنسری کو ڈھونڈ رہا ہے۔

یہ دراصل دو قسم کے کھٹمل ہی بحر و بر میں فساد مچا رہے ہیں۔ دنیا والوں کے خون سے غالباً ان کا جی بھر گیا ہے کیونکہ وہ مریخ اور چاند میں بسنے والی مخلوق کا خون چوسنے کے منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔ خفیہ معاہدوں اور فوجی معاہدوں کے ذریعے خون چوسنے کی طاقت کو متوازن کر رہے ہیں۔

بہرحال ہمیں اس دن کا شدید انتظار ہے جس دن کوئی ایک نتیجہ نکل آئے گا۔ یا تو دونوں کھٹمل ہلاک ہو جائیں گے اور ساری دنیا میٹھی نیند سو جائے گی، یا بوڑھا بھاری بھرکم کھٹمل، نوعمر کھٹمل کو کان پکڑ کر بٹھا دے گا، یا نوعمر اور جوشیلا کھٹمل بوڑھے کھٹمل کو ایک ہی ... مار کر ہلاک کر دیگا یا پھر یہ دونوں گرما کی کسی ٹھنڈی رات میں دوستی کی ... بڑھائیں گے۔ اس وقت یہ کھٹمل ہمیں کاٹیں گے اور نہ نیند آنے کی شکایت باقی رہے گی۔ پھر ہم آپکو ایسے ... بکواس سے پریشان بھی نہیں کریں گے

دو ٹکا کی محفل سے

اختر بستوی

فی البدیہہ مصرعے

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی طرف سے مجھے دعوت نامہ ملا کر ۲۳ جون کو ساڑھے تین بجے دن میں وہاں پہنچ کر اپنا تازہ کلام ریکارڈ کرادوں۔ چنانچہ میں بستر باندھا اور ایک روز قبل ہی لکھنؤ میں وارد ہو کر لالہ پارک ویو ہوٹل کا ایک کمرہ آباد کر دیا۔ دوسرے دن جب میں تین بجے دن میں ریڈیو اسٹیشن جانے کے لیے نکلا تو میرے ہمراہ جناب والی آسی اور جناب سعادت علی صدیقی بھی تھے جنھیں میں نے اصرار کر کے ساتھ چلنے کے لیے رضامند کر لیا تھا۔ اس روز دھوپ بہت ہی تیز تھی۔ اور گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ اتفاق سے لکھنؤ جیسے بڑے شہر میں اس وقت ہمیں کوئی رکشا نہ مل سکا اور ہم تینوں کو ریڈیو اسٹیشن تک پیدل ہی جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریکارڈنگ روم میں داخل ہوتے وقت ہم سب پسینے میں شرابور تھے۔ اور ہمارے چہرے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ وہاں شفاعت علی صدیقی صاحب میرے منتظر تھے (جنھیں ریکارڈنگ کے فرائض انجام دینے تھے) اور ان کے پاس ہی کیف احمد صدیقی بھی تشریف فرما تھے۔ (جنھیں میرے ساتھ اپنی غزلیں ریکارڈ کرانا تھیں) ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی کیف احمد صدیقی نے کہا۔ ع

"اختر کے ساتھ حضرت والی بھی آئے ہیں"

والی آسی نے جواباً فرمایا۔ ع

"اور دونوں اپنے ساتھ سعادت کو لائے ہیں"

شفاعت صاحب ہمارے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے

"لیکن بفیضِ موسمِ گرما یہ حال ہے

تینوں کے چہرے سرخ ہیں اور تمتمائے ہیں"

تشریح

[illegible] بستی کے نوجوان شاعر جناب شکیل احمد شکیل شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وکیل بھی ہیں چنانچہ ان کے بے تکلف دوستوں [illegible] کو جب ان کا نام لینا ہوتا ہے تو صرف شکیل ہی نہیں کہتے بلکہ "شکیل وکیل" کہا کرتے ہیں۔ ایک بار موصوف ایک قتل کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ ان کے ایک گواہ کو اپنے بیان میں یہ جملہ کہنا تھا "ملزم نے مقتول کو حلق دبا کر ہلاک کر ڈالا" لیکن وہ بے چارہ عدالت میں پہنچ کر ایسا نروس ہوا کہ گھبراہٹ میں یوں بول گیا "ملزم نے مقتول کو حلق دبا کر حلاق کر ڈالا" مخالف وکیل ذرا پُر مذاق آدمی تھے۔ انھوں نے مسکرا کر شکیل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیوں وکیل صاحب بھلا حلاق کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

شکیل صاحب بھی جواباً مسکرائے اور بولے "تعجب ہے آپ کو اتنی سی بات بھی نہیں معلوم! اجی حضرت جب کسی کو حلق دبا کر مار ڈالا جاتا ہے تو اسے "حلاق" کرنا کہتے ہیں۔

نقطہ اور گپتا

کانگریس پارٹی جب شروع شروع میں دو حصوں میں بٹی تو ملو پی اسمبلی کے ممبروں میں سے جو حضرات "اندرا گروپ" میں چلے گئے ان میں قاضی جلیل عباسی اور رام کمار شاستری بھی شامل تھے سی بی گپتا مخالف گروپ کے لیڈر تھے۔ رام کمار شاستری صاحب نے اس زمانے میں یہ روش اختیار کر لی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت گپتا جی کو بُرا بھلا کہا کرتے تھے اور اس کے لیے عجیب و غریب طریقے اپنایا کرتے تھے مثلاً۔ ان کے بچے اگر کسی قسم کا بے ہودہ پن کرتے تھے تو انھیں یوں ڈانٹتے تھے "نالائقو! یہ کیا گپتا پن کر رہے ہو؟" یا اگر کسی شخص کے بارے میں انھیں یہ کہنا ہوتا تھا کہ اس نے بڑے چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا تو اسے یوں کہتے تھے "بھئی فلاں شخص نے بڑے گپتا پن کا ثبوت دیا" اسی زمانے کی بات ہے کہ ایک روز قاضی جلیل عباسی صاحب بغرض ملاقات ان کے گھر تشریف لے گئے۔ جلیل صاحب کا نام اگر ہندی رسم الخط میں لکھا جائے اور اس کے نیچے غلطی سے ایک نقطہ لگ جائے تو جلیل کے بجائے ذلیل پڑھا جاتا ہے۔ آج کی معلومات میں جس دن ہندی کے ایک اخبار میں موصوف کا نام چھپتے وقت یہ حادثہ گزر چکا تھا [illegible] وجہ سے ان کے بے تکلف دوست احباب انھیں چھیڑتے رہتے تھے [illegible] مثال کے طور پر اگر کسی دوست کو ان کی کوئی بات ناگوار [illegible] تھی تو وہ کہتا تھا کہ "یار جلیل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] نام کے نیچے نقطہ لگ گیا ہے" — ہاں تو میں عرض کر [illegible] کہ جلیل صاحب رام کمار شاستری کے دولت خانے پر تشریف لے گئے۔ وہاں کسی ایسے سیاسی مسئلے پر گفتگو چھڑ گئی جس کے [illegible] میں شاستری صاحب کی رائے جلیل صاحب کی رائے سے مختلف [illegible] کچھ دیر تک تو ان دونوں میں خوب گرما گرم بحث ہوتی [illegible] آخر رام کمار شاستری صاحب مصنوعی غصے سے بپھر کر بولے [illegible] "جلیل بہت الٹی سیدھی باتیں نہ کرو، ورنہ لگا دوں گا نقطہ اور [illegible] جاؤ گے گپتا"

لکھنؤ پیروں میں

ایک بار میں گونڈہ گیا تو اپنے عزیز دوست محمد علی صد[illegible] کے یہاں ٹھہرا جو اس زمانے میں بسلسلۂ ملازمت وہاں مقیم [illegible] ان کے دوستوں میں جو لوگ شام کو ملنے آیا کرتے تھے ان میں [illegible] صاحب مقبول احمد مقبول بھی تھے جو انتہائی باذوق آدمی تھے لیکن ان کی ایک خاص ادا یہ تھی کہ وہ گفتگو ہمیشہ بھوجپوری یا [illegible] زبان میں کیا کرتے تھے۔ اور لہجے کو جان بوجھ کر گنوارو بنا لیتے تھے۔ دو ایک دن کے بعد میں ان سے خاصا بے تکلف ہو گیا۔ ایک روز حسبِ معمول وہ شام کو ملاقات کے لیے تشریف لائے تو پیروں میں بہت ہی نفیس قسم کا ناگرا پہنے ہوئے تھے جسے [illegible] مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے کہا "واہ جناب واہ! بولتے [illegible] بھوجپوری زبان ہیں اور پہنتے ہیں لکھنوی ناگرا!"

مقبول صاحب نے خلاف توقع بہت ہی شستہ اور [illegible] "حضور! میں لکھنؤ کو منہ لگانا نہیں چاہتا، اب وہ [illegible] لانے کے بجائے ہمیشہ پیروں ہی میں رکھتا ہوں۔"

[illegible]ان جنگ میں بیت بازی

[illegible] دن ہوئے [illegible] گیا تو [illegible]

اختر [illegible] صاحب سے ملنے کے لیے [illegible] جا [illegible] وقت میرے ساتھ چند احباب بھی تھے جس وقت ہم لوگ ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہو رہے تھے ہماری نظر سامنے ہی لگے ہوئے ایک بڑے سے بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا: "رکت دان ، مہادان۔ فوجی جوانوں کے لیے خون دیجیے" اس بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے ایک بے تکلف دوست نے کہا: "اختر صاحب! کیوں نہ آپ بھی تھوڑا سا خون دے ڈالیے"

ابھی میں ان کو جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ محمد ابراہیم [illegible] صاحب چیخ کر بولے: "ارے اختر صاحب کہیں ایسا غضب نہ کر ڈالیے گا۔ آپ اپنا خون فوجی جوانوں کے لیے ہرگز نہ دیجیے گا ورنہ مصیبت ہو جائے گی"

سب نے متحیر ہو کر ان کی طرف دیکھا اور ایک صاحب نے پوچھا "کیوں؟"

[illegible] صاحب نے جواب دیا: "دوستو! یہ ٹھہرے شاعر اگر ان کا خون کسی سپاہی کی رگوں میں پہنچ گیا تو وہ میدانِ جنگ میں [illegible] بازی کرنے کے بجائے بیت بازی شروع کر دے گا۔"

ہم قافیہ

[illegible]

ایک مشاعرہ تھا اس میں شریک ہونے کے لیے [illegible] جب میں [illegible] کے اسٹیشن پر اترا تو مشاعرہ کمیٹی کے رضاکار نے بتا دیا کہ باہر کار میں انور مرزاپوری صاحب بیٹھے انتظار کر رہے ہیں میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن کی عمارت سے باہر گیا تو دیکھا کہ انور صاحب کار سے منہ نکالے جھانک رہے ہیں۔ میں نے لپک کر کہا: "اخاہ انور صاحب بھئی خوب ملاقات ہوئی"

انھوں نے فرمایا "میں صرف گھنٹے قبل ایک ٹرین سے اترا تو مجھے معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ایک اور گاڑی آنیوالی ہے چونکہ یہاں سے قصبہ کافی فاصلے پر ہے اس لیے میں نے سوچا کہ اتنا لمبا راستہ تنہا طے کرنے کے بجائے اس ٹرین کو بھی دیکھ لوں۔ اگر اس سے کوئی شاعر دوست آ جائے تو اس کے ساتھ قصبے تک کا سفر ذرا دلچسپ رہے گا۔ دل میں یہ بھی دعا کرتا رہا تھا کہ کوئی عمدہ آدمی اترے تاکہ حقیقتاً لطف آئے۔ کیونکہ یہ ایک شاعر کی دعا تھی اس لیے شاعرانہ طور پر مقبول بھی ہوئی۔ انور کے ساتھ چلنے کے لیے اختر آیا۔ یعنی خدا نے ایک ہم قافیہ بھیج دیا۔"

شبہ سے بالاتر

بنارس میں محمود احمد ہنر کی رہائش گاہ پر شام کو حسب معمول [illegible]

[illegible] یہاں رکھا ہوا [illegible] کتاب [illegible] پڑھ رہا تھا۔ آپ لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تو انھوں نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی پھر جب [illegible] سب چلے گئے تو میں آ کے [illegible] لگا [illegible] کتاب نہیں ملی"

حفیظ بنارسی بولے: "یار وہ تو بہت ہی پرلطف کتاب ہے"

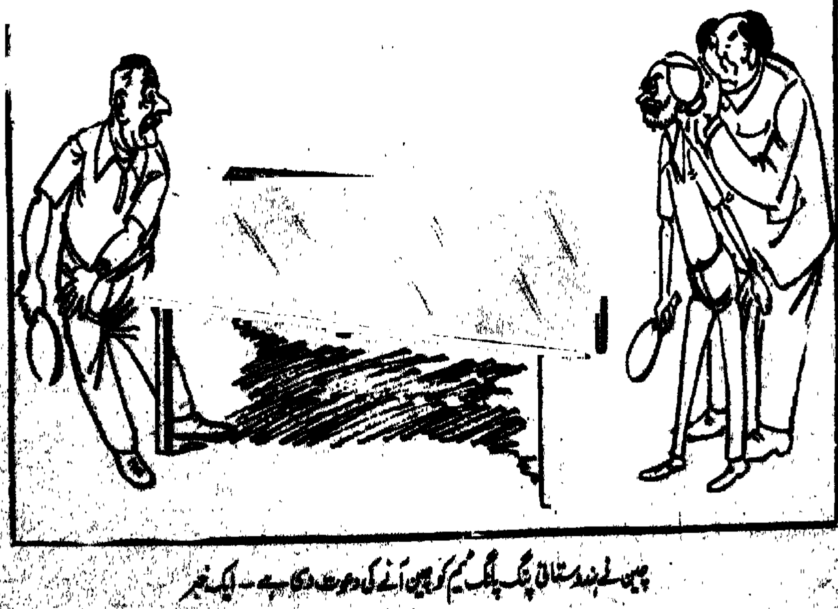
ہنر صاحب نے کہا: "ہاں بھئی اسی لیے تو اس کے غائب ہونے کا افسوس ہے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ اسے کون لے گیا ہوگا لیکن چونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے اس لیے نام لینا مناسب نہیں سمجھتا"

ہنر صاحب کے ایک سیدھے سادے گریجویٹ دوست جنھیں لوگ اکثر و بیشتر مذاق کا نشانہ بنایا کرتے تھے، بولے "کہیں آپ کا اشارہ میری طرف تو نہیں ہے"

ہنر صاحب نے فرمایا "جی نہیں آپ کے متعلق تو شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا"

حفیظ بنارسی نے پوچھا "کیوں؟"

ہنر صاحب نے جواب دیا "بھئی وہ کتاب انگریزی میں تھی اس لیے ان کے بارے میں شک بیکار ہے۔ ہاں اگر اس کے ساتھ [illegible] بھی غائب ہوتی تو سوچا جا سکتا تھا" اس پر دوستوں کی محفل میں یکلخت قہقہہ پڑا اور وہ بے چارے جھینپ کر رہ گئے۔ ●



چین نے ہندوستانی پنگ پانگ ٹیم کو چین آنے کی دعوت دی ہے ۔ ایک خبر

بلائے ناگہاں

ہمایوں قدیر

[illegible]
یک [illegible] ہیں کہ [illegible] سپیکر سے [illegible] ایک جانب کی سمت سے [illegible] آواز [illegible] ہے۔" بیدردی بالما تجھکو میرا من یاد کرتا ہے" اور کبھی دوسری سمت کا دوسرا ٹکڑا کانوں کو پھاڑتا، دماغ کو چاٹتا اور جوش و حواس کے خرمن پر بجلیاں گراتا ہوا سنائی دے رہا ہے۔

" جادو گرسیاں چھوڑ میری بیاں"

اب آپ ہی غور کیجئے۔ چار گھنٹے سے سخت عذاب میں مبتلا ہوں کبھی طبلہ پر گھمو گھر قسم کی تھاپ کبھی ڈھولک کی دھن دھن کبھی پیانو کی ٹن ٹن، کبھی سارنگی کی ریں ریں، کبھی شہنائی کی پیں پیں کبھی۔ کبھی۔ اف کیا کروں کہاں جاؤں۔

اس وقت اس "جادو گرسیاں" اور "بیدردی بالما" نے اس قدر زچ کیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ میرے کسی دماغ چاٹو یا بڑ بولے دوست کی آواز نہیں کہ جب اذیت اپنی انتہا کو پہنچنے لگے تو پیٹ میں شدید درد کا بہانہ کرکے اس کی حد سماعت سے دور ہو جاؤں۔ سنا ہے کہ صور اسرافیل صرف چند منٹوں ہی کے لئے پھونکا جائے گا۔ مگر یہ آواز۔ خدا کی پناہ، چار گھنٹوں سے میری سماعت پر مسلط ہے۔ اور اب تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اس بے پناہ گھن گرج سے صور اسرافیل کے زیر و بم حسین ہوں گے۔

یہ بات نہیں کہ مجھے فلمی گیتوں سے نفرت ہے۔ میں فلمیں دیکھتا ہوں اور فلمی گیت بھی بڑے شوق سے سنتا ہوں۔ اکثر رات کو جب آخری شو دیکھنے کے بعد پیدل اور تنہا گھر واپس لوٹتا ہوں تو راستہ کٹ جانے کے خیال سے کوئی فلمی گیت گنگنا ہی لیتا ہوں۔ رات کے وقت اندھیری سڑکوں پر جب تخیل کے پیدا کردہ سائے بھوت بن کر کبھی آگے اور کبھی پیچھے ظاہر ہوتے ہیں تو اس وقت یہ فلمی گیت بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں اگرچہ ایسے مواقع پر گنگنائے جانے والے گیت کی نے کبھی کبھی تبدیل بھی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی انگریزی گیتوں کی دھنوں سے بھی مشابہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نامعقول انگریزیت سے قطع نظر مقصد تو بہر حال حل ہو ہی جاتا ہے۔ حقیقت میں ایسے مواقع پر فلمی گیتوں کی افادیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

[illegible] ہمارے [illegible] کے وقت [illegible] ایک [illegible] گیت [illegible] اختیار کر گئی۔ [illegible]

حلق سے کئی آوازیں بہ یک وقت مختلف سروں اور مختلف والیوم کے ساتھ نکلنے لگیں اور یقین جانئے کہ ہم محض اس فلمی گیت کے باعث کتوں کے حملے سے محفوظ ہو گئے۔ دراصل ہمارے منہ سے نکلنے والی ان عجیب اور ہیبت ناک آوازوں کو سن کر سارے حملہ آور کتے اس درجہ خائف ہو گئے کہ ہم کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھ کر ہمارے سامنے سے دم دبا کر بھاگ گئے۔

اگر اس قسم کے حالات سے کبھی آپ کو بھی سابقہ پڑا ہو تو آپ یقیناً ہماری اس بات کی تائید کریں گے۔ ایسے موقعوں پر ان فلمی گیتوں کے لکھنے والوں اور ان کے لئے موسیقی تیار کرنے والوں کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ مگر اس کے برعکس موجودہ حالات میں۔؟

آپ ہی سوچیے کہ مجھے کسی کلو، بدھو یا خیراتی کی شادی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو یہ بلاخواہ مخواہ میرے سر پر مسلط کر دی گئی۔ ٹھیک ہے اگر کسی کی شادی ہے اور اس کو فلمی گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو میری دعا ہے کہ وہ تمام عمر فلمی گانے ہی سنتا رہے لیکن اپنے اس نامعقول شوق کی بنا پر کسی شریف آدمی کو اس درجہ تنگ کرنا کہاں کی شرافت ہے کہ وہ بے چارہ تنگ آکر عالم بالا کی طرف کوچ کر جانے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دے۔

ذرا ایک پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔ طبیعت پر جبر کرکے لکھنے کے لئے بیٹھا تھا۔ مگر جگہ جگہ ذہن بہک گیا اور نتیجے کے طور پر فلمی گیتوں کا ایک ایسا شاندار مرقع تیار ہو گیا کہ جس کو [illegible] ہر کسی کے دل [illegible] کی خواہش انگڑائی لے سکتی ہے۔ (ملاحظہ [illegible] بیگم یہاں پہلے ہی اس

ادارے سے چھوڑ کیا جا رہا ہے۔)

"انسان نے بڑی تیزی سے ارتقاء کی منازل کو طے کیا وحشی سے مہذب بننے میں اس کو کچھ زیادہ عرصہ نہ لگا، کیونکہ جب دل ہی ٹوٹ گیا۔ ہم جی کر کیا کریں گے۔ ڈارون کی تھیوری کے مطابق سب سے پہلے اس کی دم غائب ہو گئی۔ بندر سے انسان بننے کی سب سے پہلی سیڑھی پر اس کے۔۔۔ کہتے تھے استاد ہمارے، نام تھا جنکا چھندر، انسان تھا پہلے حیوانیت کے جانے سے انسانیت کے جانے میں آنے کے [illegible] نے۔۔۔۔۔۔ یہ دنیا گول ہے اوپر سے پول ہے۔۔۔۔"

اب آپ ہی سوچیے کہ کسی بہت ہی سنجیدہ سے مضمون کا ایک پیراگراف لکھنے کے بعد غلطیوں کے امکانات کے پیش نظر اس پر دوبارہ نظر ڈالی جائے اور وہ پھر اس طرح کا نکلے تو بیچارے لکھنے والے کی کیا حالت ہو گی۔ حالانکہ لکھتے وقت اسکو بالکل ہی محسوس نہیں ہو پایا کہ وہ انسان سے نسل در بندر سے استاد چھندر پر چھلانگ لگا چکا ہے، اور اب دنیا کے گول ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔

ایک اہم انٹرویو میں تاریخی حقائق کے متعلق سوالات کے جوابات دینا تھے۔ لہٰذا اس بیکار وقت میں میں نے چاہا کہ تاریخ پر ہی نظر ثانی کر لوں۔ لیکن کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد میں ان حقیقتوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

" سکندر کی محبوب ملکہ نورجہاں تھی۔

بابر نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے۔

شیر شاہ سوری شاہجہاں سے شکست کھا کر بنارس بھاگ گیا تھا"

اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ جب حالات اس قسم کے ہوں تو ایک شریف آدمی دو چار قتل کرنے کے بعد پھانسی پر چڑھ جانے تک کے خیالات پر تو آسانی سے غور کر ہی سکتا ہے۔

خدا میری مغفرت فرمائے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسا نامعقول ذوق رکھنے والے حضرات کا اور اپنا سر ایک کر دوں

اب آپ بھی اجازت دیجئے، کیونکہ حالت یہ ہے کہ بیچارا صبح کو اٹھ لاؤ کے چوکھٹے سے آؤٹ ہو رہا ہے۔ اور اگر ایسے میں کوئی ناشائستہ بات قلم سے نکل گئی ہو تو اس کے لئے معاف فرمائیے گا۔ خدا جانے ابھی اور کتنی دیر تک صبر و تحمل کے اس جان لیوا مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ خدا حافظ۔ ■

اخبار پڑھنے والے ایسے بھی



جمیل بہرام

پہلے عام لوگوں کو صرف اخبار پڑھنے کا شوق تھا خرید کر پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ بازار کے ایک سرے پر بیٹھے ہوئے دوکاندار نے دو آنے کا نقصان برداشت کر کے اخبار خریدا ابھی وہ سرخیاں بھی اچھی طرح نہ دیکھ پایا تھا کہ بغل میں بیٹھنے والے دوکاندار نے اس سے پرچہ مانگ لیا اور پھر اپنے ایک اور ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ اس طرح اخبار نے امریکا کے "بے ملکے سفیر" Ambassador at large کی طرح پورے شہر کا چکر لگایا اور باہمی خیر سگالی کا سلسلہ ہموار کیا۔ مختلف ہاتھوں کی نرمی اور گرمی سے گزرنے کے بعد شام تک اخبار کی جگہ اس کے کھنڈر باقی رہ جاتے۔ اس کا دامن تار تار ہو جاتا اور اُسے اپنے نحیف و نزار جسم کو سمیٹ کر کسی گوشۂ گمنامی میں روپوش ہو جانا پڑتا۔ یوں گویا وہ اس عالمِ فانی سے رخصت ہو جاتا۔

اس قسم کا تجربہ سفر میں اکثر پیش آتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ بس میں یا ریل کے ڈبے میں کسی مسافر نے اخبار خریدنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ ہاکر سے ملی ہوئی ریزگاری کا پوری طرح جائزہ بھی نہ لے پایا تھا کہ دوسرے اخبار پر پل پڑے اور اس کے مختلف حصے پورے ڈبے میں پھیل گئے۔ اب حالت یہ ہے کہ باہر کا صفحہ سب سے اگلی سیٹ پر براجمان ہے اور درمیانی صفحہ کسی پچھلی سیٹ پر سفر کر رہا ہے۔ اخبار خریدنے والا جھک کر کبھی ایک صفحے پر کوئی سرخی دیکھ لیتا ہے کبھی گردن بڑھا کر دوسرے صفحے پر حسرت کی نظر ڈالتا ہے۔ جب اپنی منزل قریب پاتا ہے تو اٹھ کر اپنے اخبار کے ٹکڑے جمع کرتا ہے اور گھر پہنچ کر پھٹے ہوئے خط کے پرزوں کی طرح ان ٹکڑوں کو باہم ملا کر اپنے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک نیوز ایجنٹ کا کہنا ہے کہ بازاری اخبار بینوں میں جب اس خاموش مطالعے سے شوق کی کچھ تشنگی پیدا ہوئی تو وہ اطمینان کے نئے نئے افق تلاش کرنے لگے۔ انھوں نے اخبار کے ہاکر کی آوارہ گردی کو روکنے کا اعلان کیا اور ہاکر سے ایک انوکھی ساز باز کی۔ ان باہمی کاوشوں نے ایک ایسی صورت حال پیدا کی کہ ہاکر صبح حسب سابق اخبار دے جاتا۔ کسی ایک خوش قسمت کو نہیں بلکہ ہر دوکاندار کے ہاں ایک ایک پرچہ پھینک جاتا۔ ترکیب استعمال اس نسخے کی یہ تھی کہ اسے احتیاط سے پڑھا جائے تاکہ اخبار کا تن بدن میلا نہ ہو۔ شام کو ہاکر پھر ظاہر ہوتا اور یہ سارے اخبارات واپس لے جاتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہر دوکاندار سے ایک آنہ یا دو پیسے وصول کرتا۔ یہ گویا دن بھر اخبار کو استعمال کرنے کا کرایا تھا۔ اس انتظام سے دو فائدے تھے۔ اول یہ کہ ہر قاری اپنا اخبار پڑھتا اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی نوبت نہ آتی، دوم یہ کہ ہاکر کے پاس اخبار بھی واپس آجاتے اور اپنے ساتھ ایک حقیر رقم بھی لے آتے۔ اخبار وہ صحیح سالم ایجنسی کو لوٹا دیتا اور پیسے اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے گھر لے جاتا۔

بہر حال مانگ کر اخبار پڑھنے والے اب بھی ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انھیں اپنا علم اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کا اس قدر شوق ہوتا ہے کہ اخبار خریدنے والے سے کہیں زیادہ وہ اخبار کی آمد کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ بار بار بچے کو وہاں روانہ کر کے استفسار کرتے ہیں کہ اخبار آیا یا نہیں۔ یہ لوگ چونکہ باقاعدگی سے اخبار مانگ کر پڑھتے ہیں اس لئے ہمارا تجربہ ہے کہ مطالعے کے بعد اخبار لوٹا ضرور دیتے ہیں۔

ایک صاحب جو اخبار بینوں کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اپنی پارٹی کے موقف کی وضاحت میں فرمانے لگے کہ اخبار مستعار لے کر پڑھنے والے زیادہ باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں، اس لئے کہ انھیں اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ابھی چند لمحوں بعد اخبار ان کے ہاتھ سے نکل کر مالک کے پاس پہنچ جائے گا اور پھر انھیں اس کے مطالعے کا موقع نہیں ملے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان لائبریری سے حاصل کی ہوئی کتب زیادہ مستعدی اور توجہ سے پڑھتا ہے اور جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اس کی ذاتی لائبریری [illegible]

[illegible] ہے جہاں پر صاحب [illegible] مطالعہ زیادہ دلچسپی سے کر سکیں۔

دفتروں میں کام کرنے والے اخبارات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی غرض سے انھیں اپنے ساتھ گھر لے جاتے ہیں تاکہ اہلِ خانہ مطالعے کی برکات سے محروم نہ رہیں اور چھوٹے بڑے سب یکساں طور پر اس دولتِ خداداد سے بہرہ اندوز ہوں۔ بعد میں یہ اخبارات بڑی احتیاط سے تہہ کر کے الماری میں رکھ دیے جاتے ہیں تاکہ مناسب مقدار میں ہو جائیں تو ردی میں بیچے جا سکیں اور اس طرح بچوں کی کاپیاں کتابیں خریدنے میں آسانی ہو۔ جتنا کسی کا ذہن رسا ہوتا ہے اتنا ہی وہ کسی چیز سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے استعمال کو نئی صورتوں میں ڈھال کر اپنے مفاد کو پائیداری بخشتا ہے۔

اخبار کے مضامین کے انتخاب میں ہر شخص کی دلچسپی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ شاپنگ کے خواہش مند حضرات کے لئے اشتہارات وافر مقدار میں مہیا کئے جاتے ہیں۔ تعلیم، غیر تعلیم یافتہ اور نصف تعلیم یافتہ اور بے کار حضرات کے خالی اسامیوں کی نوید ہوتی ہے۔ علم کے پیاسوں کے درس و تدریس کے سرچشموں کا پتا درج ہوتا ہے۔ بعض [illegible] و لاعلاج امراض کا مکمل اور تسلی بخش علاج کرنے والے معالج کا سراغ ملتا ہے۔ [illegible] کے شائقین حضرات کے لئے معمہ بازی کا سامان ہوتا ہے۔ فلم بین طبقہ اخبارات کی ورق گردانی اس لئے کرتا ہے کہ نئی فلموں کے افتتاح کا پتہ چل سکے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکے کہ کونسی فلم کا کونسا ہفتہ جا رہا ہے۔

بعض اخبارات چھاپنے والوں نے قارئین کو اخبارات کے صفحات پر تصاویر کی تلاش میں سرگرداں پایا تو رنگ برنگ اور نیم برہنہ تصاویر کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کر [illegible] بتوں کا بھلا ہو۔ اب ضرورت نہیں ہے کہ کسی ایسے [illegible] کی تصویر ہی چھپے جس نے نقش [illegible] لگانے کی [illegible] ہو یا قوم کو [illegible] کی اشد ضرورت کا [illegible]

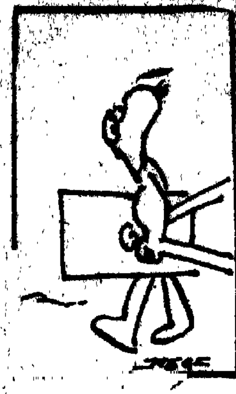
لائے جاتے تھے بلکہ وہ ساتھ ہی بتا دیا
لئے اور انکے خیالات عالیہ بھی انٹرویو کی صورت میں چھاپے
۔ تصویر کی اشاعت کا یہ اہتمام نہیں اختتام پذیر نہیں
اگر یہ صاحب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلینڈ جا رہے
اور وہ حضرت بیرون ملک جا کر ایم۔ اے کرنے کا ارادہ
ہے رہے بلکہ یہ بات بھی نہایت اہم بھی جاتی ہے کہ ہر جلسے کی تقریب
شرکت کرنے والی حسین و جمیل خواتین کی تصاویر کی اشاعت کا
بندوبست بھی ضرور کیا جائے جو مقصد ہو سکے پرچے میں انہیں نمایاں
مقام ملنا چاہئے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کا نام لکھا جائے یا نام و
ان کے لئے پتا درج کیا جائے یا بتایا جائے کہ ان معزز مہمانوں
تصویر کس خوشی میں چھپ رہی ہے۔ بس یہی ظاہر کر دینا کافی
سمجھا جاتا ہے کہ یہ دو خواتین ہیں اور انکی یہ تصویریں ہیں۔ دل میں
کوئی خاص بات نہیں جو تحریر کی جائے۔

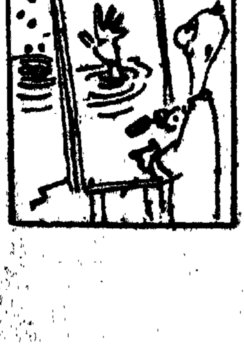
شوکت تھانوی مرحوم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں اخبار
پڑھتا ہوں تو فوراً اشتہارات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور بہت
اشتیاق سے ایک ایک اشتہار کا بالتفصیل مطالعہ کرتا ہوں
جب سارے اشتہارات دیکھ لیتا ہوں تو ابتداء سے از سرِ نو
مطالعہ شروع کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصہ پہلے ایڈیٹر
حضرات قابلیت اور لیاقت اشتہارات کی دل پذیری پر صرف
کرتے ہوں اور انہیں انتہائی دلکش بنا دیتے ہوں۔ آج کل تو
اخبارات میں سوائے تصاویر کے اور کوئی چیز دامن دل اپنی
جانب نہیں کھینچتی۔ انسان، اخبار ہاتھ آتے ہی تصاویر دیکھنے
دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ پھر ورق الٹ کر خبروں پر ادھر ادھر نظریں
دوڑاتا ہے اور پھر تصویریں دیکھنے لگتا ہے۔ گویا تازہ ترین اور اہم
خبریں کے روپ میں ڈھل گئی ہے۔ بعض اخبارات میں آجکل
تصویر کا ایک الگ عنوان بھی قائم کر دیا گیا ہے اور اب لوگ ایک
دوسرے سے یہ بھی خبر کیا ہے دیکھ جائے یہ پوچھنے لگے ہیں کہ

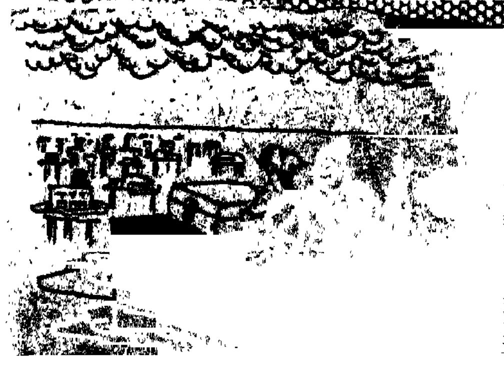
عام قارئین تو ہر نئی بے نقدی کا ثبوت دیتے ہیں اور
ایسی دلکش اور دلفریب تصاویر دیکھنے کے بعد اخبار ادھر اُدھر
پھینک دیتے ہیں مگر بھلا جو لطف تراشوں کا جو ان نادر و نایاب تصاویر
کی قدر جانتے ہیں اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں
اور یادگار کے طور پر اپنے سیلون کی دیوار پر چسپاں کر لیتے ہیں۔ اب
حالت یہ ہو گئی ہے کہ بار بر سیلون اچھے بھلے تصویر خانے بن گئے ہیں
گاہک تصویریں دیکھنے میں لگا رہتا ہے اور حجامت بن جاتی ہے۔

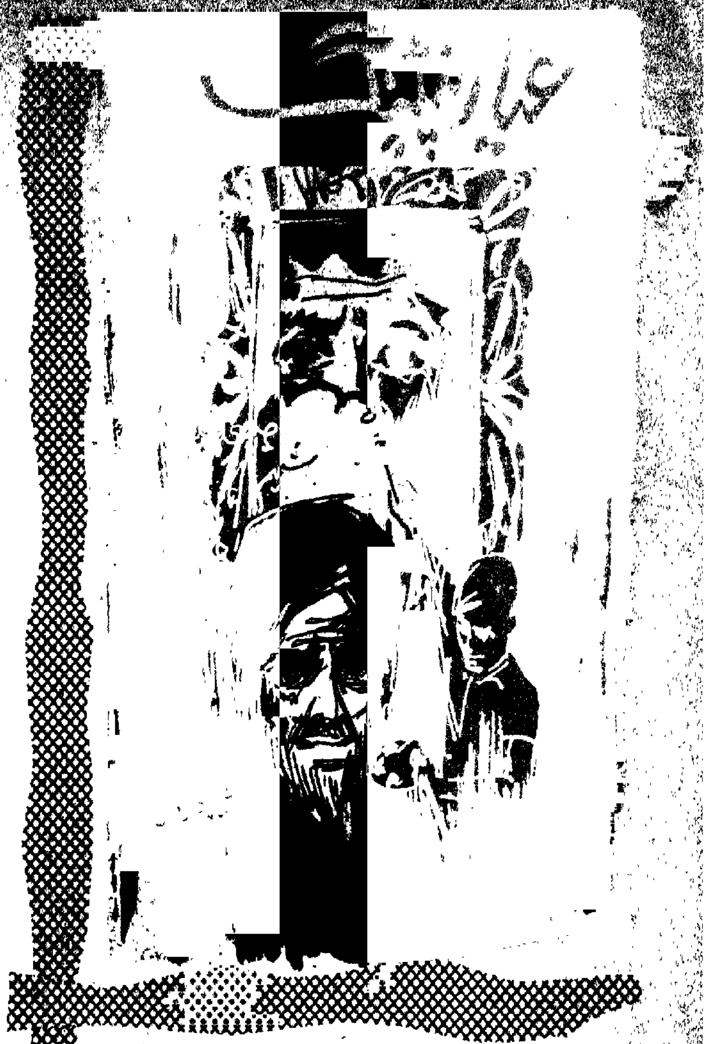
اخبار فی زمانہ اتنے ضخیم ہوتے جا رہے ہیں اور مختلف موضوعات
کی بھرمار اور تصاویر کی بوقلمونی سے اتنے لا محدود ہو گئے ہیں کہ جب
قاری کا سامنا کسی اخبار سے ہوتا ہے تو بے چارے کو کچھ سوجھتا
ہی نہیں کیا پڑھے اور کیا نہ پڑھے، کیا دیکھے اور کیا نہ دیکھے۔
بہر صورت جب اسے اسی طرح کا ایک نیا ہفت خواں طے کرنا پڑتا
ہے تو اپنی مختصر زندگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ دن دور
نہیں جب اخبارات کے ساتھ ساتھ یا انکی اشاعت سے پہلے لوگ اخبار یا
کے خلاصہ جات اور MADE EASY بھی چھاپا کریں گے۔
اس طرح قاری کی مشکل کچھ آسان ہو جائے گی۔

کچھ اخبارات واقعی اتنے متنوع اور طویل مضامین اپنے
دامن میں لئے طلوع ہوتے ہیں کہ ان کو اخبارات کا نام دینا
مسخرہ پن دکھائی دیتا ہے۔ قاری حیران ہوتا ہے کہ اگر یہ اخبار
ہیں تو رسائل کسے کہتے ہیں اور اگر رسالے ہیں تو اخبارات کیونکر ہوئے
شاید اسی الجھن کو دور کرنے کے لئے بعض ہفت روزہ رسائل
نے اپنا نام اخبار رکھ لیا ہے تاکہ اس قسم کے بے معنی اعتراضات
نہ کئے جا سکیں۔ البتہ بعض ایڈیٹروں نے یہ دعویٰ ضرور کیا ہے
کہ اس دور میں جب رسالے موٹی موٹی کتابوں کی شکل میں
نمودار ہونے لگے ہیں انصاف کا تقاضا ہے کہ اخبار رسالے بن کر
نکلیں۔ خدا جانے پھر اخبارات کی جگہ کونسی چیز لے گی۔ ■







پرویز پرانے بازار کی اس تنگ سی گلی میں مڑتے ہی چونک کر ٹھہر گیا۔ سامنے کی دکان میں بیسیوں کیسی لوگ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر اچک اچک کر دیوار پر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرویز بھی جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر رک گیا اور جیسے ہی اس نے یہ دیکھا کہ یہ تو وہی دکان ہے جس کا مالک ہر ماہ مصوری کے نمونوں کی نمائش کا انتظام کرتا ہے تو وہ فوراً ہی دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دیواروں پر ہر طرف وہی روایتی قسم کی تصویریں تھیں کہیں بے ہنگم سی مرد مار عورتیں اُلٹے سیدھے رنگوں کے کپڑے پہنے رقص کرتی دکھائی گئی تھیں۔ کہیں عجیب و غریب جھاڑ جھنکاڑ قسم کے درختوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کو نمایاں کرکے منظر کشی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پرویز کا دل آرٹ کی اس تذلیل پر ... دکھ ... ابھی ...

باہر نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ نہ جانے کہاں سے دکان کا مالک آن ٹپکا۔

"دیکھیے جناب! ذرا اس طرف دیکھیے۔ بالکل نئے اور اچھوتے شاہکار ہیں"۔

پرویز کا جی چاہا کہ وہ اسے بتا دے کہ وہ خود ایک باکمال مصور ہے اور آرٹ کے ان شاہکاروں کو بخوبی پرکھ چکا ہے۔ مگر پھر اس نے یونہی اس دکاندار کا دل رکھنے کی خاطر فرش پر کونے میں پڑی کچھ گرد آلود تصویروں کو اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔

اچانک اس کی آنکھیں حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس سے جگمگا اٹھیں۔ اس نے بڑی تیزی سے تصویر کی گرد صاف کی ...

... تصویر ... اس ...
تصویر کے حسن پر ...
پتھریلے اور جامد تھے اس کے چہرے پر ... تھا جیسے وہ دولت سے حقیقی کی حد تک محبت کرتا ہو جیسے وہ نوٹوں کے ڈھیر دیکھ کر خوش ہوتا ہو ساتھ ہی اس کے چہرے سے ... کا اندازہ بھی ہوتا ہے شاید مصور ... بنا ... تھا جب ہی وہ اسے آخری ٹچ نہ دے سکا۔ پھر بھی تصویر اپنی جگہ مکمل تھی۔ پرویز کو اس غیر متوقع دولت کے مل جانے کی بہت خوشی تھی۔ اس نے دکاندار سے اس کی قیمت دریافت کی۔ دکاندار نے اس کی دلچسپی تاڑتے ہوئے تصویر کی ... راز جان لیا اور بولا۔

"لے جائیے صاحب بہت کم قیمت ہے اس کی صرف پچاس روپے"۔

پرویز نے ... کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔

"میں پچپن روپے میں یہ تصویر خرید لوں گا"۔ پرویز نے مڑ کر دیکھا۔ اسی جیسے حلیے کا ایک ادھیڑ عمر شخص نہ جانے کب پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"ساٹھ روپے"۔ پرویز نے قیمت لگائی۔

"ستر"۔ وہ آدمی چلایا۔

"نوے"۔ پرویز جوش میں چیخا۔

دکاندار کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ یہ تصویر جو اس نے بیکار سمجھ کر الگ رکھ دی تھی اس کی یہ قدر و قیمت۔

"پچانوے"۔

پرویز نے لمحہ بھر کو سوچا۔

"سو"۔ یہ اس کی آخری بولی تھی۔ اب اگر اس شخص نے مزید ہمت دکھائی تو اسے محروم ہو جانا پڑیگا۔ اس کی کل کائنات سو روپے کی رقم تھی۔ اسے ابھی اپنے کمرے کا تین ماہ کا کرایہ ادا کرنا تھا۔

پرویز نے ڈرتے ڈرتے اس شخص کی طرف دیکھا اور وہ ... جھکائے واپس جا رہا تھا۔ اس نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا

"لاؤ یہ تصویر میری ہے اور یہ سو روپے"۔

اس ...

...

[illegible]
...آنکھوں میں ... ایک عجیب سی کیفیت
...کر رہا تھا۔ ... تصویر کی آنکھیں خوب تھیں ... کسی بوڑھے
آدمی کی آنکھیں ... پرویز نے بے ساختہ ...
ہاتھ پھیر کر دیکھا مگر وہ تو بالکل سطح تھا۔ اور وہ خوف
زدہ ہو کر مکان سے بھاگ کھڑا ہوا اور ... پہلے ہی گھبرا
کر نکل بھاگے تھے۔ وہ بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ اسے یہ بھی فکر نہ
تھی کہ اس کی قیمت ادا کر چکا ہے۔ وہ اسی طرح دوڑتا رہا اور
...میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ سامنے والے ہوٹل کا ملازم لڑکا
...اس کا کام کر دیا کرتا تھا جیسے اس کا منتظر ہی تھا۔ ...
صاحب! وہ مالک مکان آئے تھے کہنے لگے کرایہ دو
ورنہ سامان باہر پھینک دوں گا۔"

پرویز نے ہاتھ ہلا کر اطمینان سے جواب دیا۔

"اس سے کہہ دینا کہ فکر نہ کرے مجھے رقم مل چکی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا فوراً ہی اسے خیال آیا کہ ساری رقم تو دکان دار کو دے چکا ہے چشم زدن میں سارا واقعہ اس کے سامنے آ گیا۔ میں بھی بے وقوف ہوں خواہ مخواہ وہم سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا۔ خیر کل جا کر رقم واپس لے لوں گا۔ مجھے اتنی فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے۔

کمرے کی کھڑکیوں میں سے چاندنی پرویز کے بستر، فرش اور سامنے کی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں زبانِ حال سے اپنے مالک کی غربت اور بے کسی پر اظہارِ افسوس کر رہی تھیں۔ اچانک پرویز کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ عین درمیان میں وہی بوڑھے آدمی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

پرویز نے فوراً چیخ کر ملازم لڑکے کو آواز دی۔

"میرے کمرے میں کوئی آیا تھا۔۔؟"

"نہیں تو۔ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ مالک مکان نے بھی ہوٹل ... آ کر مجھے کہہ دیا تھا۔ جب سے چابی میرے ہی پاس رہی ..."

پرویز حیرت زدہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور باہر جھانکنے ... لڑکے کے جانے کے بعد اس ... تصویر پر نظر ڈالی۔ چاندنی ... اور اس ... آنکھوں کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

[illegible]

پر لیٹ گیا مگر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب بھی بوڑھے کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں۔ اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو دور پھینکا اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنی غربت کا نقشہ، مالک مکان کے تقاضے اور اس کی ادھوری تصویریں گھوم رہی تھیں۔ یہ سوچتے سوچتے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ تب اس نے دیکھا کہ تصویر کا فریم یوں ہٹ گیا جیسے دروازہ کھل جائے اور اس سے بوڑھا نکل کر اس کے بستر کے قریب آنے لگا۔ پھر وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ پرویز کا سانس رکنے لگا اس نے چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جائے مگر اس کا جسم تو جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی آنکھیں مردہ ہوتی ہوئی آگ کی طرح سرد روشن تھیں۔ اور وہ اپنی تمام تر مقناطیسی قوت کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھ سے مت ڈرو۔" بوڑھے نے کہا۔ پرویز کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے لب مسکرا رہے ہوں۔

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میں تو تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم اب تک جو کچھ کرتے رہے ہو وہ بڑی حماقت تھی۔ آخر اس طرح وقت گنوانے سے کیا فائدہ؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح تم ایک عظیم مصور بن جاؤ گے یا تمہیں کوئی اور فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ ہاں ایک فائدہ ضرور حاصل ہو گا۔ بوڑھے کے چہرے کی جھریوں میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ "تم ایک دن کسی پل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لو گے۔ یہ حماقت ختم کر دو۔ دنیا کی ہر چیز فائدے کے لئے ہے۔ وقت کی قدر سیکھو دن رات میں بے شمار تصاویر بناؤ۔

یہ تنگ و تاریک کمرہ چھوڑ کر کوئی اچھا سا فلیٹ لو مجھے تم اچھے لگتے ہو اس لئے میں تمہیں یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ میں تمہیں دولت بھی دوں گا۔ تم میرے پاس آؤ۔" ایک بار پھر بوڑھے کے لبوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ پرویز نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اور بالآخر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر بوڑھے کی شبیہ دھندلی ہوتے ہوئے دوبارہ فریم میں جا کر غائب ہو گئی۔ پرویز ان عجیب و غریب واقعات کے بارے میں سوچتے سوچتے پھر سو گیا۔

صبح کی صبح مالک مکان نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی آنکھ کھلی۔ مالک مکان کے ساتھ پولیس انسپکٹر بھی تھا۔

"انسپکٹر صاحب آپ قانونی کارروائی کیجئے۔"

"کیا بات ہے، تو جناب آپ کے ذمے کتنے مہینوں کا کرایہ واجب الادا ہے؟"

"ابھی ہاں لیکن اگر میرے پاس اتنی رقم نہ ہو کہ کرایہ ادا کر سکوں تو۔؟"

"تو پھر مالک مکان کو حق ہو گا کہ وہ آپ کے سامان میں سے کچھ اشیاء فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے"

"آپ جو بھی چاہے یہاں سے لے سکتے ہیں۔" انسپکٹر نے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا۔

"ہاں یہ ادھوری تصاویر بھی بری نہیں ہیں۔ اور دیکھا ہے... کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی تصویر ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر تصویر کے قریب گیا۔ اس نے کاغذ ہٹا کر اسے دیکھا اور آنکھوں کی حیرت انگیز چمک سے متاثر ہو کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے فریم کو پکڑ رکھا تھا۔ اچانک فریم پر دباؤ پڑا اور بوسیدہ لکڑی چٹخ گئی۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر نیچے گرا اور ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے بہت سارے سکے زمین پر گرے ہوں۔ تینوں نے چونک کر نیچے دیکھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس ایک پیسہ نہیں پھر یہ سونے کے سکے کہاں سے آئے؟"

"یہ سکے میرے مرحوم والد کی امانت ہیں۔ بہرحال تم اپنا کرایہ تو وصول کر لو۔"

یہ کہہ کر اس نے چند سکے ان کی طرف اچھال دیئے۔ مالک مکان اور انسپکٹر کا رویہ یکسر بدل گیا۔ مالک مکان نے کہا کہ یہ تو سب مذاق تھا۔ مگر اب پرویز ان سب باتوں سے اکتا چکا تھا۔ اس نے اس مکان کو خیرباد کہہ کر اسی دن ایک آراستہ و پیراستہ فلیٹ خرید لیا۔ اس مکان میں آئے ہوئے اسے دوسرا ہی دن تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی اور ایک مہذب اور فیشن ایبل خاتون کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

"میں آپ کو زحمت دینے آئی ہوں۔" خاتون نے بڑے پرتکلف لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ کی فنی مہارت کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔" (پرویز کے لئے یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ وہ اتنی جلدی اتنا مشہور ہو چکا ہے) "میں آپ سے اپنی لڑکی کی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔"

لڑکی نے اپنا چہرہ پرویز کی طرف پھیرا۔ پرویز کو چہرے کے تاثرات پڑھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس نے لڑکی کے زرد چہرے کو دیکھا اور فوراً اندازہ لگا لیا کہ لڑکی کو

[illegible] اور [illegible] کرتی ہے۔

[illegible] آپ فوراً کام شروع کر دیں۔ خاتون بولیں۔ ہم [illegible] ایک گھنٹا بیٹھ سکتے ہیں۔

پرویز نے جلدی جلدی رنگ، اٹھنے کے برش اور [illegible] تصویر کشی کے لئے تیار ہو گیا۔

"[illegible] فری کے بارے میں کچھ بتا دوں تاکہ آپ کو [illegible] کچھ مدد مل سکے۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ بے [illegible] نظر آتی ہے۔ آنکھوں ہی میں کیا بلکہ تمام نقوش میں [illegible] میری فری بڑی جذباتی لڑکی ہے [illegible] کچھ لوگ پڑھنے نہیں دیتی۔ (مصور نے لڑکی کی طرف دیکھا) [illegible] لڑکی کی آنکھوں میں وہ تاثر کہیں نظر نہیں آیا) میں چاہتی ہوں کہ آپ فری کی تصویر ایسی بنائیں کہ وہ کسی کھلی جگہ پر کسی ہرے بھرے درخت کی سائے میں کھڑی ہو اور کسی طرح یہ احساس نہ ہو کہ لڑکی تقریبوں میں شرکت کرنے کی بے حد شوقین ہے۔ میں تقریبات کی طویل اور تھکا دینے والی [illegible] سے سخت بیزار ہوں۔"

پرویز کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان جذبات کو کس طرح ہم آہنگ کرے۔ بہرحال اس نے اپنی مشکل پسند طبیعت کی وجہ سے جلدی اس کا حل تلاش کر لیا۔ پھر اس کا برش تیزی سے کینوس پر حرکت کرنے لگا۔ وہ اپنے کام میں بالکل غرق ہو چکا تھا۔ اور تصویر کے خد و خال کو ایسے پیچ دینے میں منہمک تھا جو کسی بھی بدنما چہرے کو دلکشی عطا کر سکتے ہیں۔ اب وہ کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن لڑکی کچھ ایسی مضطرب تھی کہ اس کے چہرے پر کوئی مستقل تاثر نہیں رہنے پاتا تھا۔

"میرا خیال ہے آج اتنا کافی ہے۔" خاتون اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پرویز جھنجلا گیا اب تو اس کی طبیعت جولانی پر تھی۔ وہ تصویر مکمل کر کے ہی اٹھنا چاہتا تھا۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ دو مرتبہ میں تصویر مکمل کر لیتے ہیں۔" خاتون تصویر کے قریب گئیں۔

"ٹھیک ہے آپ نے تو ابتدائی خاکہ بنایا ہے، ہم کل اسی وقت پھر آئیں گے۔"

پرویز [illegible] سوچتے ہوئے خاتون کو جاتے دیکھتا رہا [illegible]

[illegible] جہاں سکون ہے [illegible] وہ پچھلے [illegible] کام کرنے کا عادی تھا۔ [illegible] تک میز [illegible] مشغول رہا اور پھر [illegible] پریشان ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے [illegible] کینوس پر حرکت کر رہا [illegible] اس نے [illegible] کے ہاتھوں سے [illegible] پرویز [illegible] کر تمام [illegible] اس نے پچھلے سولہ برس سے اتنا پیار کبھی محسوس نہیں ہوا تھا پھر اس نے [illegible] نے اشارہ کیا کہ وہ [illegible] باقی ماندہ دولت نکال لے۔

پرویز ہڑبڑا کر اٹھا اور تصویر کے پاس پہنچ کر فریم کا ایک حصہ الگ کر ڈالا۔ مگر وہ تو بالکل خالی تھا۔ تھک ہار کر اس نے پھر کام کرنے کی ٹھانی۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ محنت کو اپنا شعار بنائے گا۔

اسی کمرے میں وہی گزشتہ روز والی خاتون، اپنی لڑکی کے ساتھ داخل ہوئی۔ پرویز نے پھر اس لڑکی کی تصویر کو مکمل کرنا شروع کر دیا۔ لڑکی کے چہرے پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں جس سے اس کے تمام خد و خال واضح ہو گئے تھے۔ مصور کا فن عروج پر تھا۔ وہ ذرا ذرا سی چیز پر توجہ دے کر اپنی مہارت کا ثبوت دینا چاہ رہا تھا کہ اچانک خاتون نے پھر مداخلت کی۔

"بس اتنا کافی ہے۔"

یہ کہہ کر خاتون تصویر کے نزدیک آئیں۔

"اوہ میرے خدا۔! یہ آپ نے کیا کیا ہے۔" خاتون بگڑ گئیں۔ "آپ نے فری کو بالکل زرد رو بنا دیا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بنا دیئے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ [illegible] کی مریض ہو۔ خدا کے لئے اس تاثر کو جلد ختم کیجئے۔ یہ فری کا چہرہ ہرگز نہیں ہے۔ ہم کل پھر آئیں گے۔"

پرویز نے برش پھینک دیا اور ویسے ہی بھوکا سو گیا۔ دوسرے دن وہ جلدی اٹھا اور اس نے سابقہ کینوس کا [illegible] سیاہ رنگ بھرنا شروع کر دیا۔ پھر وہی خاتون اپنی لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

"[illegible]"

[illegible]

[illegible] فری [illegible] کہ [illegible] وہ [illegible] ہو گئی۔

پرویز [illegible] تھا۔ وہ باہر روانہ کو تصویر [illegible] مگر وہ دولت بہا [illegible] نہیں۔ [illegible] اس کام [illegible] معلوم نہیں تھا۔

اس دوران مصور [illegible] ایک [illegible] آگیا۔ وہ خاتون [illegible] لڑکی [illegible] تھی۔ اب [illegible] تصویر بنانے والے [illegible] بہت [illegible] ہے [illegible] کی تصویر [illegible] نے مسرور کر دیا۔ [illegible] تصویر بنانے والا [illegible] کے شوق سے [illegible] کو [illegible] اس کے شاہکار نظر آنے لگے مگر در حقیقت کا [illegible] اور [illegible] تمام تصویر [illegible] مکمل [illegible]

[illegible] ایک دن اس نے اپنی [illegible] ایک نمائش میں شاہکاروں پر [illegible] دیکھا۔ یہ اس کی ایک ہم وطن کی [illegible] کی نمائش تھی [illegible] ملک سے باہر تعلیم حاصل کر رہا تھا [illegible] محنت کر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اس

[illegible]

[illegible] اس خیال

[illegible] وغیرہ۔ مگر

[illegible] آخر اس کی [illegible]

[illegible] ہو گیا۔

پھر [illegible] بے حس و حرکت [illegible] ایک بار پھر تیز کا شکار [illegible]

[illegible] نقصان [illegible] ڈھیر تھے [illegible] دوبارہ زندہ کر دیں گا۔" پھر اس نے کینوس اٹھایا اور برش کی مدد سے ایک [illegible] خوردہ فرشتے کی تصویر بنانے لگا۔ یہ اس کی ذہنی [illegible] کیفیت کی صحیح غماز تھی۔ مگر آہ۔ اس کا برش اب حقیقت [illegible] بہت دور جا چکا تھا۔ اس پر نمائش اور دکھاوے کا رنگ [illegible] چڑھ چکا تھا۔ وہ جو بھی تصویر بناتا وہ ایک ہی روپ [illegible] پیش کرتی۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے اور [illegible] ایک خوفناک بیماری نے گھیر لیا۔ تین ہی [illegible] دنوں میں اس کا حلیہ بدل گیا۔ اب وہ پرویز نہیں بلکہ اس کا سایہ معلوم ہوتا تھا۔ مردہ اور زرد۔

تیمار دار اور عیادت گزار اس کے قریب آتے تو اسے [illegible] تصویروں کے روپ میں نظر آتے۔ اسے دیوار سے [illegible] آنکھیں گھورتی [illegible] اب اس کی حالت سے [illegible] تھے۔ [illegible] بہت [illegible] آنکھوں والا [illegible] مگر وہ تصویر [illegible]

[illegible] ہو گئی۔ اور وہ عالم [illegible] چل بسا۔

اس بڑی سی عالیشان عمارت میں آج ایک مصور کے تمام شاہکاروں کا نیلام ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی شاندار کاریں گھر کے سامنے قطاروں میں کھڑی تھیں۔ سب لوگ اتر کر اندر جا رہے تھے۔ ابھی نیلام کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ کچھ لوگ تصاویر دیکھ رہے تھے۔ کچھ صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک تصویر کے آگے بڑی بھیڑ تھی۔ اچانک مجمع میں ہل چل مچ گئی۔ جب کسی نے چلا کر کہا: "میں اس تصویر سے واقف ہوں۔" سب لوگ اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ ایک سنجیدہ اور باوقار شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جو سب کو اپنی طرف متوجہ پایا تو کہنے لگا: "اس تصویر سے ایک عجیب کہانی وابستہ ہے۔" لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

کئی سال پہلے کا ذکر ہے کہ جب یہ شہر اتنا ترقی یافتہ اور خوشحال نہیں تھا یہاں غریبوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں جنھیں دو وقت کی روٹی کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ اسی زمانے میں یہاں ایک دولتمند رہتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لوگوں کو قرض دینے میں بڑا سخی ہے۔ لوگ اپنی ضرورت کے وقت اگر اس سے قرض حاصل کرتے جس پر وہ بہت کم شرح سے سود لیا کرتا تھا لیکن جب بھی لوگ رقم واپس کرنے آتے تو معلوم ہوتا کہ رقم کئی گنا بڑھ چکی ہے حساب لگایا جاتا۔ تو تخمینہ صحیح ثابت ہوتا۔ کئی طریقوں سے کھوج لگایا گیا۔ مگر اس کی جعل سازی کو گرفت میں نہیں لایا جا سکا۔

اسی زمانے میں میرے والد ایک عظیم مصور کی حیثیت سے شہر میں پہچانے جاتے تھے لیکن فن کے باب میں ان کی عظمت بھی انہیں معاشی ابتری سے بچا کر نہ رکھ سکی۔ وہ ہر وقت [illegible] رہتے مگر [illegible] نے بھی انہیں اس سود خور کے آگے ہاتھ پھیلانے سے باز رکھا۔

اور تب ہی [illegible] کی گھڑی آ پہنچی جب اس حیرت انگیز کہانی کا آغاز ہوا۔ گھر میں پیسے کی سخت ضرورت تھی بہت [illegible] انھوں نے [illegible] کے پاس جانے کی ٹھانی۔ [illegible] انھوں نے [illegible]

دروازہ کھولا اور ان کو لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچی جہاں بڈھا بستر علالت پر دراز تھا۔ میرے والد کو دیکھتے ہی وہ بیقرار ہو گیا اور بولا: "آؤ جناب میں آپ ہی کا منتظر تھا۔" مجھے حیران ہوئے وہ تو توقع کر رہے تھے کہ وہ ایک سود خور کے روپ میں ان سے ملے گا۔ مگر اس وقت تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خود ان سے کچھ طلب کر رہا ہو۔ "میری تصویر بنا دیجئے۔" میرے والد اس خواہش پر بہت حیران ہوئے انھوں نے کہا یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ اس وقت تو آپ خدا سے لو لگائیں۔ مگر بڈھا ضد کئے گیا۔ تنگ آ کر وہ راضی ہو گئے۔ ملازمہ نے انھیں کینوس اور برش وغیرہ لا کر دیئے ان کا خیال تھا کہ آئندہ یہ چہرہ پھر کسی شاہکار میں استعمال کر سکیں گے۔

بڈھے کی زندگی لمحہ بہ لمحہ مختصر ہو رہی تھی۔ میرے والد نے جلدی جلدی خاکہ بنایا اور بہتر یہی سمجھا کہ پہلے آنکھوں کا عکس منتقل کر لیں۔ کہیں بوڑھے کی آنکھیں بند نہ ہو جائیں۔ مگر یہ کام بہت مشکل تھا۔ ان آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا جسے بیان کرنا مشکل ہے وہ ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد کامیاب ہو ہی گئے۔ مگر جب انھوں نے خود اسے [illegible] تو خوفزدہ ہو گئے۔ ان آنکھوں میں ایک زندہ [illegible] کی آنکھوں کی چمک تھی۔ خوف زدہ ہو کر وہ دروازے کی سمت بھاگے مگر بوڑھے نے اچانک بستر سے اٹھ کر اپنا استخوانی ہاتھ ان کے کندھے پر رکھ کر ان سے تصویر مکمل کرنے کی درخواست کی۔ والد نے انکار کر دیا۔ تو اس نے جھک کر ان کی قمیص کے دامن کو بوسہ دیا۔ اور التجا کرنے لگا۔ مگر جب والد اس کے باوجود تیار نہ ہوئے تو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "مجھے اپنے بچوں کا واسطہ اپنی بیوی کا واسطہ۔ خدا کے لئے تصویر کو مکمل کر دیں۔ میں آپ کو ایک راز سے آگاہ کرتا ہوں:" موت کی پرچھائیوں کا رقص اور تیز ہو چلا تھا۔ "کہیں آپ اس راز سے کسی اور کو آگاہ نہ کر دیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔ اگر آپ مجھ پر رحم کرنا نہیں چاہتے تو میں اب مزید درخواست نہیں کروں گا۔ میں بہت جلد مرنے والا ہوں۔ مگر میری خواہش ہے کہ جب تک کہ دنیا قائم ہے تب تک زندہ رہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اگر میری تصویر بنا دی جائے تو میں زندہ رہوں گا۔ میری [illegible] آپ [illegible]

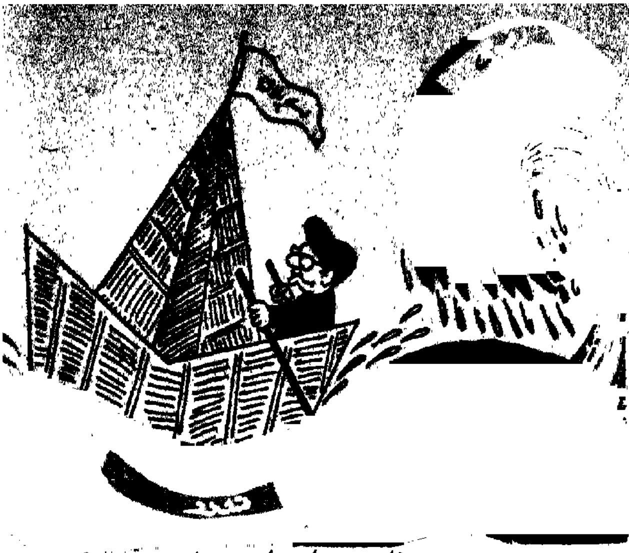
کہ جب آپ تصویر مکمل کر لیں گے تو وہ بوڑھا دوبارہ
زمین پر رہے گا۔ انہوں نے مکمل کر لی تھی۔ رنگ مکمل کر دیے
میرے والد کے ہاتھ سے برش چھوٹ کر گر پڑا۔ ان کے رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی
تھی: "اگر تم میری خواہش پوری نہیں کرتے تو میری
یہ تصویر ۔۔۔" پھر اس کا دم اکھڑ گیا۔ میرے
والد پھر وہاں لمحہ بھر کو نہ ٹھہرے اور بھاگتے ہوئے باہر
نکل گئے۔ اس دن میرے والد تمام دن باہر گھومتے رہے اور
اس حادثے کو بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔ رات گئے گھر
لوٹے تو انھیں کمرے میں سب سے پہلے اس بوڑھے کی تصویر
ملی۔ بیوی بچوں نے لاعلمی ظاہر کی کہ یہ تصویر کس طرح وہاں
پہنچی۔ میرے والد بہت پریشان ہو گئے۔ وہ بہت مذہبی
خیالات کے انسان تھے۔ انھوں نے ایک دن ایک عالم کو گھر
بلایا اور اسے یہ قصہ سنانے لگے۔ میری والدہ بھی وہیں موجود
تھیں۔ اچانک وہ بیٹھے بیٹھے گر پڑیں اور جب ڈاکٹر
آئے۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

میرے والد اب اور بھی اداس رہنے لگے۔ کئی دن پریشان
رہنے کے بعد ایک بار پھر انھوں نے اسی عالم سے سب کچھ
کہہ ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ میں اور میرا بھائی دوسرے کمرے میں
کھیل رہے تھے۔ درمیانی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ والد
صاحب عالم کے قریب بیٹھے تھے۔ ابھی انھوں نے
کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ دھڑام سے کچھ گرنے
کی آواز آئی۔ اور جب تک میں کچھ سمجھ سکوں۔ میرا بھائی
کھڑکی سے نیچے گر کر دم توڑ چکا تھا۔ نچلی منزل کے پختہ فرش
پر اس کے اعضا بکھرے پڑے تھے۔

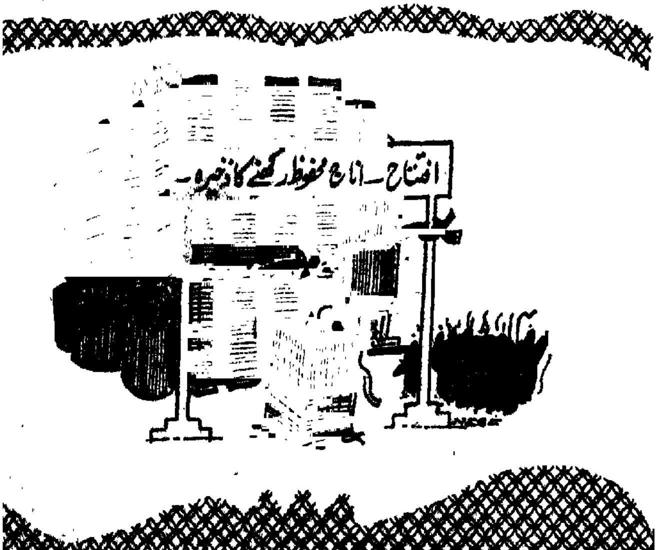
اس حادثے نے میرے والد کو اور بھی مفلوج کر دیا
تھا۔ تب انھوں نے دنیا داری ترک کر کے عبادت میں وقت
گزارنا شروع کر دیا۔ مجھے ایک فوجی اسکول میں داخل کر
دیا۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب لیفٹیننٹ حاصل
کر کے واپس پہنچا تو وہ ایک عبادت گزار شخص بن چکے تھے
تب ہی انھوں نے ایک دن مجھے اپنے پاس بلا کر یہ ساری
داستان سنائی اور بولے: "میں نے خدا سے دن رات یہ دعا
مانگی ہے کہ اس خبیث کی تصویر بنا کر جو گناہ کیا ہے وہ
معاف کر دیا جائے۔ تب مجھے یہ بشارت ہوئی کہ اس کا
جادو اثر اب ختم ہو چکا۔ اب تمھیں کوئی بھی نقصان نہیں
پہنچ سکتا۔" یہ سب کچھ بتا کر وہ سجدے میں گر پڑے۔

اب ان کا انتقال ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ میں نے
یہ داستان کسی کو نہیں سنائی۔ گو مجھے اس پر یقین نہیں ہے
پھر بھی کوئی احساس مجھے روکتا تھا۔ آج میں پہلی بار آپ
کے سامنے یہ راز فاش کر رہا ہوں کیوں کہ میرے والد نے
مجھے بتایا تھا کہ جو کچھ اثر اس میں باقی رہ گیا ہے وہ بیس سال
میں ختم ہو جائے گا۔ اور آج پورے بیس سال ہو چکے ہیں۔"

وہ شخص چپ ہو گیا تو لوگ جو یہ عجیب داستان
سنتے مبہوت ہو گئے تھے۔ چونک کر تصویر کی طرف
ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا
آنکھیں حیران کن چمک کر رہی تھیں۔ اور تصویر پر ایک
سا چھایا ہوا ہے۔ اور جب وہ اس کے قریب پہنچے
کر حیرت سے تصویر کی جگہ ایک ۔۔۔



مسٹر سدھارتھ شنکر رے نے کہا ہے کہ وہ مغربی بنگال میں حالات
معمول پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ۔ ایک خبر





محمد حسن ہاشمی

انگلستان کی سیکرٹ سروس کا چیف آفیسر کلیمر اپنے [illegible] میں بیٹھا بے چینی سے "چارلس" کا منتظر تھا۔ کمرے کے سکوت [illegible] انٹرکام کا بزر چیخ پڑا۔ اس کی سکریٹری اس سے مخاطب تھی [illegible]ب چارلس" پہنچ چکا ہے" چیف نے اطمینان کی سانس لی۔ دوسرے [illegible] لمحے "چارلس" چیف کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"چارلس" تیئیس سالہ خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا جسم [illegible]انہ حسن کا پیکر تھا۔ اس کی آنکھیں چمکیلی اور اعضا مضبوط [illegible] ہر وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرتی رہتی اور [illegible] وقت بھی وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا شمار سیکرٹ سروس کے [illegible] ہوشیار افراد میں ہوتا تھا۔

"چیف کلیمر نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا چارلس کو کچھ علم تھا کہ کسی اہم مسئلے کی وجہ سے چیف [illegible]

[illegible]

مسکراتے ہوئے کہا۔

"چارلس مجھے اچھی طرح معلوم ہے ان دنوں تم ایک کیس کی تفتیش میں مصروف ہو۔ لیکن ایک بہت اہم معاملے میں تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔" چارلس خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

کلیمر کچھ دیر تک آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ پھر گویا ہوا۔

چارلس بہتر یہ ہے کہ میں تمہیں شروع سے سب کچھ بتا دوں۔ میں تمہیں محکمے کا ایک بہت اہم راز بتانا چاہتا ہوں۔ جسے صرف چند خاص لوگ ہی جانتے ہیں۔ کلیمر کہہ رہا تھا۔ محکمے کی سب سے اہم فائل ایکس (XII) کے متعلق تمہیں علم ہوگا۔ یہ انتہائی خفیہ فائل ہے ..... اور یہ فائل کہاں ہے یہ اب تک یہ راز تھا۔ دراصل ایکس فائل ہمارے محکمے کی دو لڑکیوں کے دماغ میں پوشیدہ ہے۔"

یہ سن کر چارلس حیران رہ گیا۔ چیف نے مسکراتے ہوئے کہا حیرانی کی کوئی بات نہیں چارلس یہ سب کچھ [illegible]

[illegible] صرف فائل کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا لیکن پھر بھی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اکثر غائب ہو جاتی ہے۔ محکمے کے سیکورٹی والوں نے ہمیشہ اس کی نگرانی کرنی چاہی۔ لیکن ہر دفعہ انہیں ناکامی ہوئی۔ آج بھی تین دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ آئی ہے اس عرصے میں وہ کہاں رہی یہ بات کسی کے علم میں نہیں۔ کلیمر اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"چارلس تم ان لڑکیوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے [ا]ن کی قیمت کروڑوں پونڈ سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے دماغ [م]یں ہمارے سائنسدانوں کی برسہا برس کی کوشش کے فارمولے محفوظ ہیں۔ اور یہ سب کچھ میرے ایما پر ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب سے محفوظ طریقہ ہے۔"

وہ ابھی کچھ اور کہنے والا تھا کہ درمیان میں انٹرکام پر اس کی سکریٹری نے "ڈسٹن" کی آمد کی اطلاع دی۔ ڈسٹن نے بارہا چارلس کے مددگار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

کلیمر نے چارلس کو مخاطب کیا۔ میں نے تمہاری مدد کیلئے ڈسٹن کو بھی بلوالیا ہے۔ اور اسی وقت ڈسٹن کمرے میں داخل ہوا۔ چیف نے ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو کی اور اس سے مخاطب ہوا۔

اس وقت دونوں لڑکیاں لیبوریٹری میں موجود ہیں۔ بہتر ہے تم بھی ان دونوں کو دیکھ لو۔ کیونکہ اب تک ان کی حفاظت کی خاطر "سیکرٹ سروس" میں ان کی شمولیت کو ہمیشہ راز میں رکھا گیا تھا۔ اور صرف چند خاص آدمیوں کے علاوہ ان دونوں کے متعلق کسی کو علم نہیں تھا۔

لیبوریٹری کے استقبالیہ پر ہی انہیں لیبوریٹری کا انچارج مل گیا۔ وہ کلیمر ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید کلیمر نے اسی سے فون پر بات چیت کی تھی۔ چند کمروں سے گزرتے ہوئے وہ لیبوریٹری میں داخل ہوئے جہاں ہلکا سرخ بلب روشن تھا۔ لیبوریٹری کا ایک گوشہ ابھی تک تاریکی میں تھا۔ سنبھلتے ہوئے وہ لوگ تاریک گوشے کی جانب بڑھے جہاں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ خاموشی سے وہاں بیٹھ گئے۔ لیبوریٹری انچارج انہیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد لیبوریٹری کا دوسرا اندرونی دروازہ کھلا۔ اور چارلس نے دیکھا دو حسین لڑکیاں آپس میں گفتگو کرتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ چارلس ان دونوں کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکیاں واقعی حسین تھیں۔ چارلس نے غور سے دیکھا۔

وہ ایک تھا شکل و صورت بات کرنے کا انداز آواز ایک دوسرے سے حیرت انگیز حد تک مشابہ تھی۔

کلیمر نے سرگوشی کی۔ "داہنی طرف والی لڑکی کا نام تائیرا ہے۔ یہی لڑکی اکثر غائب ہو جاتی ہے اور دوسری ہے اسکی جڑواں بہن ٹیکل۔"

دونوں لڑکیاں لیبوریٹری میں پڑی میز کے قریب کھڑی تھیں۔ دروازہ پھر کھلا اس دفعہ داخل ہونیوالا ایک مرد تھا سفید لباس میں ملبوس بوڑھا ڈاکٹر لیبوریٹری میں داخل ہو رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ اور دوسرے میں پنسل تھی میز کے قریب پہنچ کر ڈاکٹر نے لڑکی سے کچھ کہا۔ جواباً لڑکی بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ کلیمر نے چارلس سے سرگوشی کی۔

"ڈاکٹر ٹیکل اس سے کسی فارمولے کے متعلق دریافت کر رہا ہے۔"

سیکرٹ سروس کا چیف آفیسر چارلس بتا رہا تھا۔

"ایکس ۱۱ دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ فارمولے کا نصف حصّہ تائیرا کے دماغ میں ہے اور نصف "ٹیکل" کے دماغ میں یہ لڑکیاں بہترین فائل ہیں انھیں خود علم نہیں کہ ان کے دماغ میں اتنے اہم فارمولے رکھے گئے ہیں۔ انھیں پہلے ہپناٹائز کیا جاتا ہے اور اس کے بعد فارمولا ذہن نشین کرا دیا جاتا ہے۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ دسمبر کی سرد رات تھی پورا شہر سنسان تھا۔ چارلس کی سیاہ امپالا کوستار کی چکنی سڑک پر تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔ اسٹیرنگ پر بیٹھا چارلس بہت دور سرخ لائٹ پر اپنی نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ شام ہی سے وہ تائیرا کے تعاقب میں تھا۔ مختلف مقامات پر وقت گزارنے کے بعد اب وہ شہر سے باہر جا رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں شہر کی حدود سے باہر نکل چکی تھیں۔ تعاقب جاری تھا۔ چارلس نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں۔ آگے ایک قصبہ تھا۔ چارلس پہلے بھی یہاں اکثر اپنی تعطیلات گزارنے آیا کرتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹے پل کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

یکایک اگلی گاڑی رُک گئی۔ چارلس نے بھی رفتار کم کر لی قریب پہنچ کر اس نے دیکھا۔ پل کے دوسری طرف تائیرا کی گاڑی سے ایک گاڑی ٹکرا گئی تھی گاڑی کا اگلا حصّہ تھوڑا پچک گیا تھا اور داہنی جانب کی لائٹ بھی ٹوٹ گئی تھی تائیرا کو دو تین آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ وہ شخص جس کی گاڑی تھی کافی غصّے میں تھا۔ چارلس کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ کچھ ٹھنڈا

تائیرا" اس کے قریب پہنچ گئی۔ بڑی مشکل سے چارلس نے رقم دیکر "تائیرا" کو ان سے چھٹکارا دلایا۔

تائیرا کی گاڑی سڑک کے کنارے لگا دی گئی اور وہ بھی چارلس کی کار میں آ گئی۔ چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"قریب ہی ریسٹوران ہے۔ میں نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ لہٰذا رات گزارنے کا انتظام بھی کرنا ہے اگر آپ میرا ساتھ دینا چاہیں تو بہت بہتر ہے ورنہ اگر آپ کو کہیں پہنچنا ہے تو میری گاڑی حاضر ہے۔"

تائیرا نے جواب دیا۔ "نہیں اب رات میں کہیں جانا ٹھیک نہیں۔ آیئے ریسٹوران میں چلتے ہیں۔ مجھے جہاں جانا ہے وہاں صبح کو چلی جاؤں گی۔"

دوسرے دن تقریباً صبح نو بجے چارلس بیدار ہوا اس نے دیکھا بستر پر وہ تنہا پڑا ہے۔ وہ رات بھر اس کے قریب ہی تھی۔ ابھی تک بستر اس حسین لڑکی کے جسم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس نے انگڑائی لی رات کی تھکان ابھی تک برقرار تھی اس نے سمجھا شاید تائیرا ڈرائنگ ہال میں ہو۔ جب وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ ریسٹوران کے مالک نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے ہی یہاں سے جا چکی۔ چارلس کو غصّہ آ گیا ساری محنت برباد گئی۔ لڑکی پھر غائب تھی۔ چارلس نے ٹیلی فون پر کلیمر کو اطلاع دی کہ تائیرا پھر غائب ہو گئی ہے کلیمر نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"چارلس اسے تلاش کرو وہ جہاں بھی ہے اسے تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہیں ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا ہے۔" اتنا کہہ کر کلیمر نے لائن بند کر دی۔

ایک ہفتہ سے چارلس اس کی تلاش میں تھا لیکن ابھی تک تائیرا کا کوئی سُراغ نہیں ملا تھا۔ چارلس گم سُم بیٹھا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے وشنی مخاطب تھا۔

"جناب دوسری لڑکی کو بھی اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن ہم لوگوں کی بروقت مداخلت نے ان کے ارادے کو ناکام بنا دیا۔ تعاقب کے باوجود حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ویسے میں نے ان میں سے ایک شخص کو پہچان لیا ہے۔ اسے اکثر "زاگورا" کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔" اتنا کہہ کر وشنی نے لائن بند کر دی۔

"زاگورا"... چارلس زیر لب بڑبڑایا تو گویا اس میں "زاگورا" کا ہاتھ ہے۔

زاگورا کے متعلق سب کو معلوم تھا وہ ایک بہت بڑا ماہر علم نجوم اور روحانیت ہے۔ شہر کے اونچے طبقے کی عورتیں اس کی بے انتہا معتقد اور اس کے حکم کی غلام ہیں۔ زاگورا بہت کم کہیں باہر دیکھا گیا تھا اس کے معتقدین خود اس کے پاس جاتے تھے۔ اور وہاں کیا ہوتا تھا یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ سرکاری حکام کا خیال تھا کہ زاگورا غیر ملکی ایجنٹ ہے اور سوسائٹی کے اونچے طبقے کی عورتوں پر اپنا جادو چلا کر حکومت کے راز اڑایا کرتا ہے۔ مستقل نگرانی کے باوجود پولیس اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی اور بغیر کسی ثبوت کے اس پر ہاتھ ڈال دینا مشکل تھا کیونکہ بڑے بڑے افسران کی بیویاں اسکی معتقد تھیں لہٰذا اس سے روحانیت کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا دوسری طرف اس کا چیف کہہ رہا تھا۔

"چارلس، زاگورا کے متعلق بھی کچھ اہم اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ تم فوراً یہاں آ جاؤ کیونکہ وشنی کے بیان کے مطابق "ٹیکل" کو اغوا کرنے والوں میں زاگورا کا بھی ایک آدمی شامل تھا اور مجھے شک ہے کہ تائیرا "زاگورا" کے چکر میں پھنس گئی ہے۔"

کلیمر کے دفتر میں داخل ہوتے ہی چارلس کی نظر عمر رسیدہ شخص پر پڑی۔ چیف نے اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"چارلس: یہ مسٹر کارڈن ہیں فرانس میں ہماری سیکرٹ سروس کے نمائندے۔ ان کی اطلاع کے مطابق "زاگورا" دو دن قبل فرانس پہنچا ہے اور یقیناً تائیرا ابھی وہیں ہے تمہیں فوراً ان کے ساتھ فرانس جانا ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں "ٹیکل" کی نگرانی "وشنی" کے سپرد رہیگی۔ فرانس میں تمہیں اپنے طور پر اس کیس کو نمٹانا ہے۔ ویسے مسٹر کارڈن تمہیں ہر طرح کی مدد پہنچائیں گے۔"

ایئر فرانس کا طیارہ محو پرواز تھا اگلی نشست پر صرف دو شخص بیٹھے تھے چارلس اور کارڈن۔ کارڈن نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر چارلس، میں سمجھتا ہوں آپ زاگورا کو اس سے قبل اس کے متعلق ساری معلومات حاصل کر لیں ویسے آپ کی ذہانت سے مجھے پوری امید ہے کہ زاگورا

متعلق آپ کو کامل معلومات حاصل ہوں گی پھر بھی ہو سکتا ہے میری معلومات آپ کے لئے سودمند ثابت ہوں اور ویسے بھی سفر کاٹنے کے لئے اس سے دلچسپ اور کون سا موضوع ہوگا۔

چارلس کے ایماء پر کارڈن نے کہنا شروع کیا۔

" ہم اگر زاگورا کو صرف یہ کہیں کہ وہ فطرتاً تخریب پسند ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ یورپی ممالک کے اہم راز دوسرے ملکوں تک پہنچائے اور مختلف ممالک کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دے اگر دو ممالک کے تعلقات آپس میں بہتر ہو رہے ہوں اور یہ بہتری اگر زاگورا کے خیال میں غلط ہو تو تعلقات کی بہتری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر سب سے بڑی مشکل اس راز کو جاننا ہے کہ زاگورا اصل میں کس ملک کا ایجنٹ ہے اور وہ کون اشخاص ہیں جو اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ زاگورا جہاں بھی جاتا ہے اس کے ساتھ ایک منظم جماعت ہوتی ہے۔ جس میں جاسوس بھی ہوتے ہیں اور بدمعاش بھی۔ زاگورا کی جماعت سے منسلک لوگوں کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ انھیں بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں ان کا مقام اعلیٰ سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ انھیں ہر قسم کی سہولیت بہم پہنچائی جاتی ہے اور یہ سارا کام اتنے منظم طریقے سے انجام پاتا ہے کہ آج تک "زاگورا" پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا ہے۔ زاگورا کا کوئی ایجنٹ اگر گرفت میں آتا ہے تو خاموشی سے خودکشی کر لیتا ہے۔

کارڈن نے دوسری سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا زاگورا بہت عیاش ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں کی اونچی سوسائٹی میں مقام پیدا کر لیتا ہے پھر اونچی سوسائٹی کی عورتیں اس کی معتقد بن جاتی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ زاگورا ان عورتوں کو جبراً اپنے دباؤ میں لا کر اپنے لئے کام لیتا ہے لیکن یہ غلط ہے عورتیں اور لڑکیاں جو کچھ بھی کرتی ہیں وہ خود اپنی مرضی سے کرتی ہیں۔ زاگورا کا قرب حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جاتی ہیں ابھی حال ہی میں ایک عورت نے جو یہاں کے سب سے بڑے تاجر کی بیوی تھی، دم توڑتے وقت صرف اتنا کہا تھا۔ زاگورا میرے آقا! ڈاکٹروں کی رائے میں یہ ہارٹ فیلیور کا کیس تھا۔ موت سے قبل اس پر ہنسی کا دورہ پڑا اور ہنستے ہنستے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ یہ بھی زاگورا کے معتقدین میں سے تھی۔ کارڈن نے ... زور دیتے ہوئے کہا جہاں تک مجھے ... معلوم ہے یہ بڑے ... کی قسم کا زہر ... جاتا ہے جس ... میں ایک خاص قسم کا پاؤڈر ملا ہوتا ہے جس کے استعمال سے انسان ہنستے ہنستے اپنی جان دے دیتا ہے۔ کارڈن نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا "ابھی تک یہ بات زاگورا کے ریکارڈ پر نہیں آسکی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ زاگورا قاتل بھی ہے"۔

تھوڑی دیر بعد طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا ائرپورٹ سے باہر آ کر چارلس نے ٹیکسی لی اور "زاگورا" کے محل کی جانب ہو لیا۔ اس کے پاس "زاگورا" کی ایک معتقد عورت کا تعارفی خط تھا جو اسے کارڈن نے دیا کیا تھا۔ ٹیکسی شہر سے نکل کر ویرانے کی جانب بڑھ رہی تھی دور پہاڑی پر چارلس نے بڑا سا سفید دھبا دیکھا۔ پہاڑی پر محل کا بڑا مینار دور ہی سے نمایاں تھا۔ محل کے آگے خوبصورت درخت اُگے ہوئے تھے اور ایک طرف چشمہ بہتا تھا جو پاس ہی واقع جھیل سے جا ملتا تھا۔ محل کی پشت پر پہاڑی کی بڑی چوٹی سایہ کئے ہوئے تھی۔ محل تک سڑک پتھر کاٹ کر بنائی گئی تھی۔

ٹیکسی نے اسے محل کے پھاٹک پر اتارا اور واپس ہو گئی پھاٹک پر مسلح پہرے دار تعینات تھا۔ تعارفی خط دکھانے کے بعد اندر جانے کی اجازت ملی ایک فرلانگ چلنے کے بعد اسے تین لڑکیاں نظر آئیں جو اس کے استقبال کو موجود تھیں تینوں نے قدرے خم ہوتے ہوئے اس سے درخواست کی عظیم زاگورا کے دیدار سے پہلے غسل ضروری ہے اور پھر آناً فاناً انھوں نے چارلس کے کپڑے اتار ڈالے۔ صورت حال ایسی اور اتنی جلدی رونما ہوئی تھی کہ چارلس کچھ سمجھ نہ سکا وہ مادر زاد برہنہ کھڑا تھا اس کے کپڑے لڑکیوں کے قبضے میں تھے اور وہ تینوں اس قدر سنجیدہ تھیں گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ ان میں سے ایک نے اس کا بازو پکڑا اور سوئمنگ پول کی جانب اشارہ کیا چارلس نے بھی اسی میں بھلائی سوچی اور تالاب میں کود گیا۔ اچھی طرح نہا چکنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو ان میں ہی سے ایک لڑکی اس کے لئے تولیہ لئے کھڑی تھی بدن خشک کرنے کے بعد اسے نیلے رنگ کا ایک ریشمی گاؤن پیش کرتے ہوئے لڑکی نے کہا آپ کے کپڑے احتیاط سے رکھ دیئے گئے ہیں مقدس زاگورا سے ملاقات کے وقت آپ کو اسی پوشاک میں جانا ہوگا۔ لڑکی اسے لئے ہوئے ایک نفیس کمرے میں آئی یہاں عجیب قسم کی مدہوش کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ فرش پر بیش قیمت قالین بچھا تھا اور دیواروں پر مصوری کے نادر نمونے ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ چارلس کو احساس ہوا کہ ہر ایک چیز کو گھور رہا تھا کمرے کا پورا ماحول اسے مسحور کئے دے رہا تھا لڑکی اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر جا چکی تھی اسے اس وقت ہوش آیا جب "زاگورا" اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے جھک کر نظریں اٹھائیں۔ تو دیکھا زاگورا پادریوں جیسی پوشاک پہنے تمکنت سے کھڑا تھا ہندو پنڈتوں کی طرح اس کے سر کے بال کٹے ہوئے تھے اور درمیان سے بالوں کی ایک لمبی سی لٹ پیچھے گردن کی جانب لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کا تقدس تھا اور اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک تھی۔ باوجود کوشش کے چارلس اس سے نظریں ملانے سے قاصر رہا مسکراتے ہوئے زاگورا نے کہا "میرے بیٹے ہماری معتقد نے لکھا ہے تم روحانی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو"۔

" ہمیں بڑی خوشی ہے لیکن اس کے لئے تمہیں کچھ دن ہمارا مہمان بننا پڑے گا۔ چارلس کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ وہ اس وقت خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ زاگورا کہہ رہا تھا میرے بیٹے تمہیں اس مقدس فریضے کے لئے قربانیاں پیش کرنی ہوں گی تم یہاں نئی، نئی چیزیں دیکھو گے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ان ساری باتوں سے تمہاری روح کو تسکین ملے گی۔ اسے دوسری جانب متوجہ پا کر زاگورا نے کہا میری طرف دیکھو بیٹے۔ چارلس نے دیکھا زاگورا کی آنکھیں اس کے ذہن میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں وہ سمجھ رہا تھا کہ زاگورا اسے ہپناٹائز کرنا چاہ رہا ہے وہ اپنی پوری قوت ارادی سے مدافعت کر رہا تھا۔ زاگورا نے مسکراتے ہوئے تالی بجائی اور دوسرے ہی لمحے ایک عجیب الخلقت انسان کمرے میں داخل ہوا ایسا انسان چارلس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس کا سر چپٹا جیسا تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا وہ کسی ہاتھی کی طرح مضبوط تھا۔ رنگ اتنا سیاہ کہ تاریکی کا جزو لیکن آنکھیں معلوم ہوتا تھا چہرے پر دو دہکتے ہوئے انگارے رکھے ہیں زاگورا نے کہا میرے بیٹے گھبراؤ نہیں یہ میرا خاص غلام ہے یہ دنیا کی کوئی زبان نہیں سمجھتا سوائے میرے حکم کے میں نے اسے منگولیا سے خریدا تھا اس کی شکل قدیم مصری دیوتا سے ملتی جلتی ہے یہ کسی ارنے بھینسے کی طرح مضبوط اور کتوں سے زیادہ ذکی الحس ہے۔ ویسے یہ چڑیلوں کے سدھانے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا زاگورا کے اشارے پر اس جانور نما انسان نے میز پر شراب سجا دی بہترین نفیس قسم کی شراب کے بعد زاگورا اسے لئے ہوئے

[illegible] چارلس کے [illegible] رنگین لڑکیاں نیم برہنہ لباس پہنے کھانے کی میز پر موجود تھیں۔ [illegible] نے غور کیا ان میں ہر ملک اور ہر نسل کی لڑکیاں شامل تھیں۔ اور سب کھانے سے چارلس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی [illegible] شاہزادے کا مہمان ہو لیکن ان لڑکیوں میں [illegible] موجود نہیں تھی۔ کھانے کے بعد ایک لڑکی نے چارلس کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں اس کے کپڑے ایک طرف احتیاط سے رکھے تھے چارلس نے تلاشی لی ساری چیزیں جوں کی توں موجود تھیں حتیٰ کہ اس کا ریوالور تک ویسے ہی اس کے کوٹ کی جیب میں پڑا تھا۔

آدھی رات گزر جانے کے بعد چارلس آہستگی سے اپنے کمرے سے نکلا پتلی سی راہداری سے ہوتا ہوا وہ داہنی جانب مڑ گیا بڑے سے کمرے میں نیلی روشنی ہو رہی تھی۔ چھپ کر چارلس نے دیکھنا شروع کیا۔ کمرے کا عجیب ہی منظر تھا مقدس "گرو زناگورا" برہنہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور گرو پر اس وقت شیطان سوار تھا۔

چارلس غور سے ایک ایک لڑکی کو دیکھ رہا تھا لیکن ان میں بھی تائیرا نہیں تھی چارلس بڑے انہماک سے یہ کھیل دیکھ رہا تھا یکایک آہٹ ہوئی اور چارلس جھپٹ کر دوسری جانب ہو گیا اس نے دیکھا ایک لڑکی زناگورا جیسا لباس پہنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر ساری لڑکیاں ادب سے ایک جانب ہو گئیں۔ زناگورا نے کھڑے ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے اسے کپڑوں سے آزاد کیا اور اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اسی وقت چارلس نے دیکھا ایک سایہ راہداری سے گزرا یہ زناگورا کا خاص غلام جانور نما انسان (بلیک) تھا اسے دیکھ کر چارلس کو پسینے چھوٹ گئے شاید اس کو پتا چل گیا تھا کہ چارلس اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اب وہ اس کی تلاش میں تھا۔ بلیک دوسری جانب مڑ گیا۔ اسے مڑتا دیکھ کر چارلس بھی خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا بہت دور ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بلیک نے وہاں کھڑے ہو کر کمرے کی آہٹ لی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو تیزی سے چارلس اس کمرے کے پاس پہنچا جہاں ابھی بلیک کھڑا تھا۔ چارلس نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں راہداری سنسان پڑی تھی اس نے شیشوں سے جھانک کر دیکھا سامنے مسہری پر تائیرا سو رہی تھی نیند میں اس کا بدن [illegible]

[illegible] پھر تائیرا کو اٹھنے سے پہلے تو وہ حیران [illegible] پھر جھپٹ کر دروازہ کھول لیا کمرے میں داخل ہوتے ہی چارلس نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنی خوشی سے یہاں آئی ہو۔ "نہیں" تائیرا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "تو نکل چلو" چارلس نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا وقت بہت کم ہے۔ زناگورا کو شاید اب تک اطلاع مل چکی ہو۔ چارلس نے سوچا راہداری سے نکلنا بہت مشکل ہے اس نے کمرے کی دوسری طرف روشندان سے فرار ہونا بہتر سمجھا احتیاط سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے مسہری کو دیوار سے لگایا اور دوسرے [illegible] روشندان سے باہر اس کی گردن تھی وہ اس وقت لان میں آسانی سے اتر سکتا تھا۔ واپس کمرے میں آ کر پہلے اس نے تائیرا کو چلنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے خود آیا نیچے پہنچ جانے کے بعد وہ تیزی سے دوڑتا ہوا تائیرا کو لئے جھاڑیوں میں چھپ گیا اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تائیرا کو بانہوں میں سمیٹے ہوئے تھا۔ تائیرا خوف سے کانپ رہی تھی۔ محل کی چار دیواری سے باہر پہنچنا ناممکن سی بات تھی اب ایک ہی راستہ تھا پھاٹک کا، چارلس چھپتا ہوا پھاٹک تک پہنچ گیا۔ تقریباً دس گز دور محل کا پھاٹک تھا۔ اس نے تائیرا کو وہیں جھاڑیوں میں چھپے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا تم یہیں انتظار کرو میں آگے جاتا ہوں اگر میں آواز دوں تو آ جانا اور اگر مجھے مصیبت میں گرفتار دیکھو تو خاموشی سے محل میں واپس چلی جانا۔ پھاٹک پر سنتری کھڑا تھا چارلس نے ایک پتھر اٹھایا اور جھاڑیوں میں اچھال دیا پتھر کی آواز سن کر سنتری چوکنا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف آ رہا تھا چارلس پوری طرح تیار تھا سنتری کے قریب آتے ہی اس نے جھپٹ کر ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور ریوالور کا دستہ تیزی سے اس کے سر پر مارا۔ سنتری بے جان ہو کر جھاڑیوں میں لڑھک گیا چارلس ہانپ رہا تھا اور تائیرا اس کے قریب کھڑی دہشت سے کانپ رہی تھی اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "تمہیں تو چوٹ نہیں آئی" چارلس خاموش! چارلس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کی ابھی خطرہ موجود ہے۔ اسی وقت محل میں کسی کے چیخنے کی آواز آئی [illegible] ابھی تم موجود نہیں ہے۔ چارلس [illegible]

[illegible] چاہتا تھا چارلس نے [illegible] تم فرار ہونے میں کامیاب ہو سکو گے [illegible] ورنہ گرفتار کر لائی گئی ہے۔ اسی لئے چارلس [illegible] تائیرا دہشت سے چارلس سے چمٹ گئی اور چارلس کے سر پر ایک زبردست چوٹ لگی اور وہ لڑکھڑا کر بلیک کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

آنکھ کھلی تو چارلس نے دوبارہ خود کو اسی کمرے میں پایا زناگورا اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "صبح بخیر چارلس" تم یہ سمجھ رہے تھے زناگورا کی آنکھوں میں دھول جھونک دو گے یہ تمہاری خام خیالی ہے تمہارے متعلق ہمیں پوری خبر تھی۔ ہم خود تمہاری تلاش میں تھے اور تم نے ہماری مشکل آسان کر دی خود میرے قدموں میں چلے آئے۔ غصے میں زناگورا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ چارلس تمہیں یہ جان کر واقعی دکھ پہنچے گا کہ میں نے تمہارے لئے موت کا حکم دے دیا ہے خوف سے چارلس کی زبان گنگ تھی اس کا واحد سہارا ریوالور بھی اب اس کے پاس نہیں تھا۔ سر سے ابھی تک بہت تکلیف تھی خون کافی مقدار میں نکلا تھا اور چارلس کو نقاہت محسوس ہو رہی تھی اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا نہ معلوم تائیرا کس حال میں ہے پھر خود ہی اس نے اپنے خیال کی تردید کر دی اسے اچھی طرح معلوم تھا جب تک زناگورا تائیرا کے ذہن میں قید فارمولے کو حاصل نہیں کرے گا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ زناگورا کہہ رہا تھا۔ چارلس تم نے کبھی پارسیوں کو دیکھا ہے؟ تمہیں معلوم ہے وہ اپنے مردے کو گوشت خور پرندوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں نے بھی تمہارے لئے ایسی ہی موت کا انتظام کیا ہے لیکن اس میں ایک جدت ہے گوشت خور پرندے تمہارے متحرک جسم کی بوٹیاں نوچیں گے میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ بلیک پرندوں کو سدھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اس نے اس کام کے لئے گوشت خور پرندے سدھائے [illegible] ہیں۔ مجرم کو "زناگورا" کے انتقام کا بھینٹ چڑھانے [illegible] کے بدن میں [illegible] تصور ہی لرزا دینے والا تھا زناگورا کے چہرے [illegible] [illegible]

واقعات نئی دہلی

[illegible]
[illegible] چہرے سے قریب [illegible] تھا اس
[illegible] سے [illegible] نے
چند گھنٹوں [illegible] کر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا
چلا گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو [illegible] نظر آیا وہ [illegible] تک
لیٹا تھا اس نے اٹھنا چاہا لیکن نہ اٹھ سکا اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے سینے پر رکھے تھے اور اس کے دونوں پاؤں بھی سخت ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے نظریں گھمائیں وہ ایک کھلی چھت پر پڑا تھا اس کی داہنی جانب کچھ فاصلے پر ایک بند دروازہ تھا دوسری طرف ایک درخت کی شاخ چھت پر جھول رہی تھی۔ گویا شراب یا بے ہوشی کی دوا ملا کر زاگورا نے اسے یہاں ڈلوا دیا تھا ابھی وہ صورت حال سے نبٹنے کے لئے تیار بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک بہت بڑا پرندہ اس پر جھپٹتا ہوا نکل گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، اتنا خوفناک پرندہ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہاتھوں سے مدافعت کر رہا تھا اور پرندے اس پر حملہ کر رہے تھے۔ ایک نے اس کے سینے پر چونچ ماری اور گوشت کی بوٹی لے اڑا۔ تکلیف سے چارلس دیوانہ ہو گیا وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ چلا رہا تھا لیکن بے سود دوسرے حملے میں اس کے بائیں ہاتھ میں پرندے کی چونچ نشتر کی طرح چبھی اس دفعہ دو تین پرندوں نے بیک وقت حملہ کیا اس نے پھر بے قراری سے اپنے ہاتھ گھمائے ایک کی چونچ چھیلتی ہوئی اس کے چہرے پر پڑی اور دوسرے نے اس کے ہاتھ پر حملہ کیا چارلس کی قسمت اچھی تھی پرندے کی چونچ نے ہاتھ میں بندھی ہوئی ڈوری کی گرہ کھول دی تھی چارلس کے ہاتھ پر رسی ڈھیلی ہوتی معلوم ہوتی اس نے ہاتھ اٹھا کر دیکھا اور خوشی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے موت سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ تیار تھا اس نے ہاتھ آزاد کئے اور پھر دونوں پیروں کو آزاد کیا اس کی قمیض خون سے تر ہو رہی تھی ہاتھ میں بھی بہت تکلیف تھی لیکن اس وقت ایک لمحہ قیمتی تھا اسے اٹھتا دیکھ کر پرندے بھی دور ہٹ گئے شاید اس سے خوف زدہ ہو گئے تھے تیزی سے اٹھ کر چارلس دروازے کی طرف لپکا [illegible] بند تھا [illegible] وہ

[illegible]
[illegible] شاید [illegible]
اسے ایک [illegible] کہ وہ یہاں لایا گیا ہو گا مکان
کچھ [illegible] دیوار پر کھڑکی [illegible]
کیسے [illegible] پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ چارلس نہیں سمجھ سکا وہ کہاں ہے لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ یہ جگہ یقیناً شہر سے دور اور خود زاگورا کے محل سے بھی دور ہو گی۔ ورنہ اسے بے ہوشی کی حالت میں یہاں نہیں لایا جاتا چارلس جانتا تھا یہاں بلیک بھی موجود ہو گا۔ اور اس وقت اس کی آنکھیں اس کی تلاش میں تھیں۔ ملازمین کی کوارٹرز کی جانب سے اسے دھواں اٹھتا دکھائی دیا چارلس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ چھپتا چھپاتا اس طرف بڑھنے لگا۔ وہ نہتا تھا اس نے زمین پر ادھر ادھر نظر دوڑائی جلد ہی اسے ایک بڑا سا پتھر مل گیا اس نے پتھر اٹھایا اور دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ کوارٹر کا کواڑ آدھا کھلا ہوا تھا اسے بلیک کی پشت نظر آئی نہ معلوم کس قسم کے کاغذات تھے جنہیں وہ بیٹھا جلا رہا تھا چارلس نے اپنی پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر اس کے سر پر دے مارا ایک بھیانک چیخ کے ساتھ بلیک کا بھیجا فرش پر بکھر گیا اس کا جسم فرش پر اچھل رہا تھا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اُف کتنا بھیانک نظر آ رہا تھا وہ اسکے چہرے کی ہئیت اتنی خوفناک ہو گئی تھی کہ دیکھ کر خوف معلوم ہونے لگتا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے ملک کے سفارت خانے میں بیٹھا سیکرٹ سروس کے چیف آفیسر کلیمر سے گفتگو کر رہا تھا۔ اسکی بات سن کر ایجنٹ نے کہا اچھی بات ہے چارلس یہاں سے چند ایجنٹ آج ہی تمہاری مدد کو پہنچ رہے ہیں یہ سب لوگ اسی ہوٹل میں ٹھہریں گے جہاں تمہارا قیام ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق جیکل بھی ابھی تمہارے ساتھ ہو گی لیکن اس کے دوسرے ساتھی اس کے لئے اجنبی کی طرح ہوں گے وہ دور سے اس پر نگاہ رکھیں گے اور تمہیں صورت حال سے آگاہ کریں گے جیسا کہ تم نے خدشہ ظاہر کیا ہے۔ زاگورا کے آدمی شکار ہو لے کے دوسرے نصف حصے کے لئے جیکل کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گے اگر وہاں پہنچنے سے قبل ایسا کیا گیا تو مداخلت کی جائے گی ورنہ وہاں تم خود صورت حال سے نبٹو گے۔ کلیمر سے گفتگو کے بعد چارلس ہوٹل [illegible] آ کر بستر پر گر گیا۔ اس کے زخموں میں تکلیف

رات کے کھانے کے بعد چارلس اپنے کمرے میں اپنے [illegible]
کے ساتھ بیٹھا تھا جیکل بھی وہاں موجود تھی۔ چارلس انہیں سمجھا رہا تھا تم سب جیکل کو ایک پل کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ زاگورا کے آدمی اسے اغوا کرنے کی کوشش کریں گے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے ہم زاگورا تک پہنچیں گے کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بلیک کے فرار کے بعد زاگورا اب تک یہاں موجود نہیں ہے۔

دو دن گزر گئے اور کچھ نہیں ہوا جیکل بے فکری سے گھومتی رہی لیکن کوئی بھی اس کے پیچھے نہیں تھا۔ اسی رات ایک شخص جیکل کا تعاقب کرتا ہوا ہوٹل میں آیا۔ چارلس کے ساتھیوں نے آپس میں اشارے کئے چارلس نے بہت غور کیا لیکن اس شخص کو اس نے پہلے زاگورا کے محل میں نہیں دیکھا تھا۔ جیکل جس میز پر بیٹھی تھی اسی کی برابر والی میز پر وہ بھی آ بیٹھا چارلس نے جیکل کو اشارہ کیا اور وہ دوبارہ باہر کو چلی گئی دروازے تک پہنچتے وقت اجنبی بھی اس کے قریب پہنچ گیا پورچ میں آ کر اجنبی جیکل سے چپکا کھڑا کچھ کہہ رہا تھا چارلس نے دیکھا کہ اس کا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ہے اور جیب کا ابھار کچھ نمایاں ہے۔ پوری بات اسکی سمجھ میں آ گئی کھیل اب اس کی مرضی کے مطابق شروع ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیکل اس اجنبی کے ساتھ کار میں بیٹھی شہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور دور دور آبادی کا نام نہیں تھا۔ چارلس کی کار برابر اگلی کار کے تعاقب میں تھی اس کے ساتھ اس کے باقی ماندہ ساتھی بھی تھے۔ اور سب اسلحوں سے لیس شہر سے دور جا کر اگلی کار جنگل کی طرف مڑ گئی پھر اس کار کا رخ کچے راستے کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور چل کر کار تاریکی میں ایک جگہ رک گئی اگلی کار کو رکتے دیکھ کر چارلس نے بھی اپنی کار [illegible] کی کار ٹیلوں میں کھڑی کر دی۔

کار جہاں رکی تھی وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اجنبی جیکل کو لئے تیزی سے مکان میں داخل ہو گیا چارلس نے اپنے سارے ساتھیوں کو مکان کے گرد پھیلا دیا ان سب کے پاس اسٹین گنیں تھیں چارلس نے بھی کار سے اسٹین گن نکالی اور مکان میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ مکان کے پشت کی دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ چارلس نے اسٹین گن کندھے سے لٹکائی اور ٹوٹی دیوار کے سہارے اوپر چڑھنے لگا [illegible] سے

[illegible]

شدہ انسان بغیر حرارت کے بھی زندہ رہ سکتے ہیں چونکہ یہ تجربہ پہلی بار ایک کیڑے پر زندگی کے آثار ملنے سے کیا گیا تھا۔ چارلس نے دروازے سے کان لگائے اندر کچھ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور اس نے زاگورا کی آواز پہچان لی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ کہہ رہا تھا ٹھیک ہے جیک سارا کام ہو چکا ہے۔ ہم صبح سویرے ہی ان دونوں بہنوں کو لے کر یہاں سے لندن چلے جائیں گے اور وہاں ہمارے سائنسدان جلد ہی ان پر تجربہ شروع کر دیں گے۔ اسی لمحے چارلس نے غصے سے دروازے کو دھکا دیا اور دندناتا اندر پہنچ گیا۔ یہاں زاگورا کے علاوہ اجنبی تائیرا اور نیکل موجود تھیں۔ تائیرا اور نیکل کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ چارلس کو دیکھ کر زاگورا اٹھ کھڑا ہوا اور اجنبی اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جا رہا تھا کہ اسٹین گن کی گولیوں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ زاگورا دم بخود بیٹھا تھا۔

چارلس نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا زاگورا تم نے دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں جو نہ کیا ہو لیکن ہمیشہ قانون کی گرفت سے بچتے رہے اور اگر کبھی تمہیں گرفتار کیا جائے تو اپنی مقبولیت کی وجہ سے تم باعزت رہا ہو جاؤ گے میں تم پر کوئی جرم ثابت نہیں کر سکوں گا۔ زاگورا اس کی بات سن کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے چارلس نے کہا مجھے معلوم ہے کہ تم قاتل بھی ہو اور تم نہ جانے کتنی زندگیوں کا خون کر چکے ہو اس لئے میں تمہیں معاف بھی نہیں کر سکتا اور یہی بہتر ہے کہ تمہارا کام تمام کر دوں۔ تم اب تک اپنے ہی انتقام پر نازاں تھے۔ آج میں تم سے انتقام لوں گا۔ جس کے لئے مجھے اپنی زندگی داؤ پر لگانی پڑی۔ زاگورا اور اس کی انگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی۔ زاگورا کا بے جان جسم فرش پر لڑھک گیا تائیرا اور نیکل دہشت سے خاموش تھیں۔

دوسرے دن ایئر فرانس کا طیارہ تیزی سے بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔ اور چارلس تائیرا کے ہاتھوں پر سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ■

مرسلہ: [illegible] علی

خلیفہ ہارون رشید کے عہد کی ایک المیہ داستان

حیدر راحت

خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں ایک عرب اپنی حسین و جمیل بیٹی کو بے سہارا چھوڑ کر چل بسا۔ یہ لڑکی بے حد حسین اور الہڑ تھی۔ اسے اس کے چچا نے بے حد ناز و نعم سے پالا۔ اس لڑکی کا نام لطیفہ تھا۔ اس کے چچا کی سوائے ایک لڑکے کے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ لڑکے کا نام واصف تھا۔ واصف لطیفہ کا ہم سن اور ہم مکتب تھا۔ دونوں ایک ساتھ رہتے تھے اور پرورش پاتے تھے۔ لطیفہ جوں جوں جوان ہوتی گئی اس کی شگفتگی اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس پر خطر دور کے شروع ہوتے ہی جسے عہد شباب کہتے ہیں۔ لطیفہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی وہ واصف سے بے پناہ محبت کرنے لگی۔ اس کے چہرے سے شگفتگی اور بشاشت غائب ہوتی گئی۔ وہ اظہار محبت سے خوف کھاتی تھی۔ واصف کی صورت کو دور سے ہی دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ اس کا چچا اس کا یہ حال دیکھ کر بہت سٹپٹایا، علاج کے لئے اطباء کی طرف رجوع کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار اس کی چچی نے جو تجربہ کار اور زمانہ شناس خاتون تھیں مرض کو سمجھ لیا۔ اس نے اپنے شوہر سے اس امر کا ذکر کر دیا۔ آخر کار لطیفہ اور واصف کی شادی کر دی گئی، پھر کہاں کا مرض اور کہاں کی بیماری۔ اس کے گل رخسار اب پہلے سے بھی زیادہ شگفتہ ہو گئے، نرگسی آنکھوں میں بے پناہ رسیلا پن پیدا ہو گیا۔ واصف بھی لطیفہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا ہمیشہ اسے آراستہ اور پیراستہ رہنے کی تاکید کرتا۔ لطیفہ نے بھی اپنے شوہر کے ہر حکم کی تعمیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اس نے ایسا بننا سنورنا اور نکھرنا شروع کیا کہ جنت کی حور اور کوہ قاف کی پری کو بھی دو قدم پیچھے چھوڑ دیا۔ مگر افسوس! لطیفہ کی اس محبت نے حسرت و ناکامی کی شکل اختیار کر لی اس آرزو مندی کی زندگی کو چند ہی برس گزرے تھے کہ واصف سخت بیمار پڑا اور کچھ ہی دنوں کے بعد لطیفہ کو داغ مفارقت دے گیا۔ غرض اب اس کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ روزانہ

[illegible] جب لطیفہ [illegible] محبوب شوہر کی قبر پر بیٹھی اشک فشانی کر رہی تھی کہ عرب کے ایک مشہور شاعر اور مورخ اصمعی کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ لطیفہ کو اس حالت میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کی رگ تجسس پھڑکی، وہ ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا لطیفہ نے ایک دردناک الیہ گیت گانا شروع کیا۔ اصمعی شام تک اسی درخت کی آڑ میں چھپا رہا، یہاں تک کہ رات ہو گئی اور غم نصیب لطیفہ زار و قطار روتی ہوئی قبر سے اٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئی۔

اصمعی نے یہ تمام واقعہ ہارون رشید سے جا کر جوں کا توں بیان کر دیا۔ خلیفہ ہارون رشید نے پوری داستان کو سن کر کہا "آہ دنیا میں سبھی نعمتیں حاصل ہو سکتی ہیں لیکن ایسی وفا شعار بیوی نصیب والوں کو ہی مل سکتی ہے" پھر ہارون رشید نے اصمعی کے سامنے لطیفہ سے اپنی شادی کی تجویز رکھی اور شادی کی تمام کارروائیاں مکمل ہو گئیں۔

لیکن افسوس خلیفہ ہارون رشید نے لطیفہ کی قدر تو کی لیکن اس نے یہ نہیں جانا کہ ایک ایسی محبت والی بیوی جس کی ایک بار ہو چکی سوائے اس کی ہو چکی پھر اس کے بعد کسی دوسرے کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہو سکتا۔

گورنر بصرہ نے لطیفہ کو دس ہزار درہم پیش کئے اس کے چچا نے بعد شوق قبول کیا اور نہایت اہتمام کے ساتھ گورنر بصرہ لطیفہ کو لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔

اب لطیفہ سے اس کے محبوب کی پیاری قبر بھی چھین گئی جو اس کے جینے کا سہارا تھی۔ جس کے سامنے وہ بناؤ سنگھار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی۔ وہ خلیفہ ہارون کی دلہن بننے جا رہی تھی، لیکن اس کا دل مرحوم محبوب کی یاد سے لپٹا ہوا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ ابھی محل کے پھاٹک تک ہی پہنچی تھی کہ ناگہاں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ سب انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ اصمعی اور ہارون رشید دونوں ہی اس جہیز کا اندازہ [illegible] افسوس [illegible] اصمعی کہتا ہے کہ لطیفہ کے کوچ کر جانے کا خلیفہ [illegible] کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ لطیفہ کی یاد خلیفہ کے دل سے مرتے دم تک نہیں بھلائی جا سکی، اور جب بھی لطیفہ کی یاد آتی تو خلیفہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔

معصوم آنسو

زبیدہ سلطانہ

[illegible]
اہٹ ... [illegible] ... اس کی [illegible]
لازوال ... [illegible] ... لفظوں میں بیچاری
ت کو اور بھی پست کرتے رہتے تھے۔ ایک نے کہا اس
م کا شریف ... قابل اصلاح ہوتا ہے۔ دوسرا بولا۔ جیسے
ت نے اسے بنا دیا۔ دلیر یا شرمیلا، سست یا پھرتیلا، سنجیدہ
ند وہ ویسے ہی تمام رہتے ہیں۔ کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ حریص
رص یا بخیل کے بخل کا تدارک ہو گیا ہو۔ مگر چند اشخاص اس
ہ کے شاہدوں کو فطری اور غیر مبدل ماننے کو تیار نہ تھے۔ ایک
کہا۔ اگر آپ صاحبان ایک منقلب بخیل کو دیکھنا چاہتے ہیں تو
آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ سب تجسس اور استعجاب آمیز نگاہوں
ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ "وہ یہیں آپ کے سامنے موجود
ہے" اسی شخص نے کہا۔ حاضرین کا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔
اس نے کہنا شروع کیا۔

"اور وہ میں خود ہی ہوں۔ میری طرف دیکھئے" یہ ایک
مشہور اور مقبول عام ڈرامانویس تھا اور سخاوت اور دریا دلی
اس کی امتیازی صفات تھیں اس لئے وہ جملہ پورا بھی نہ کرنے
پایا تھا کہ چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

"ناممکن۔ ناممکن۔ ناممکن"

ایک آدمی نے ہنس کر کہا "آپ امید کر سکتے ہیں کہ ہم اس
بات پر یقین کر لیں گے"

"بے شک!" اس نے متانت سے جواب دیا "بخدا میں
سچ کہتا ہوں میں واقعی بے حد کنجوس آدمی تھا اس نوع کا
ایک بدترین فرد۔ اگرچہ اب مجھے اطمینان ہے کہ میں ایسا نہیں
ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اس کا قصہ سناؤں جو ایک بچی
کے آنسوؤں سے ظہور پذیر ہوا"

حاضرین نے ڈرامانویس کے گرد حلقہ باندھ لیا اور اس
نے اپنے بیان کی تصدیق میں کہنا شروع کیا۔

"کوئی دو برس ہوئے کہ ... ایک مشہور ڈراما ... کلکتے
... ایک ... [illegible] ... ایک روز صبح کی ڈاک سے مجھے
[illegible] ... ایک ... خبر کی
[illegible]

... اور اس کی ... [illegible] ... اس کے باعث
حالت ... [illegible] ... چند سو روپیہ ان کی مفلوک الحالی کو
دیکھ کر بھیج دینا آپ کے لئے کوئی بڑی بات نہیں۔ امید ہے کہ یہ
خبر ملتے ہی آپ ان کی مدد کریں گے یا بذات خود تشریف لا کر
ان کے موجودہ اور آئندہ آرام کا خاطر خواہ انتظام کریں گے
نیچے ایک مقامی ڈاکٹر کے دستخط تھے۔

معالج کے خط سے میرے دل میں جذبۂ ترحم پیدا ہونا تو کجا
الٹا اپنی بھاوج کے خلاف دیرینہ غصّے اور حقارت کے خوابیدہ
جذبات از سر نو جاگ اٹھے۔ اب سے کوئی چھ برس قبل میرے
بہادر اور قابل جانثار بھائی نے جو ڈوب کر راہی ملک عدم
ہو گیا مجھے خط لکھا اور ایک ماہی گیر بنگالی لڑکی سے شادی کرنے
کی اجازت چاہی۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں کنجوس تھا بدترین
قسم کا کنجوس۔ میں جانتا تھا کہ اگر شادی کی اجازت دیدی
تو بھائی شادی کے اخراجات بھی طلب کرے گا اور جو پیسہ اس طرح
صرف ہو گا اس کے واپس آنے کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ
لڑکی غریب ماہی گیر کی بیٹی ہے۔

چنانچہ میں نے بظاہر اپنے خاندانی افتخار اور سچ پوچھئے
تو اس کے پردے میں فطری بخل کی بنا پر اسے جواب دیا کہ نیچ
قوم کی ایک مفلس اور قلاش لڑکی سے شادی کرنا سراسر حماقت
اور موجب ننگ و عار ہے اور اسے فہمائش کی کہ ہرگز ہرگز ایسا نہ
کرے۔ لیکن میرا عزیز بھائی وعدے کے پکے اور بہادر مرد کی
طرح اپنے عہد و پیمان سے نہ پھرا اور اس مفلس لڑکی سے
شادی کر لی جسے وہ چاہتا تھا۔

میری بھاوج گو ایک نیچے طبقے کی تھی لیکن فطرتاً عالی ظرف
اور خوددار خاتون تھی۔ اس نے میری اس تحریر کو ناپسندیدگی کے
ساتھ ہمیشہ یاد رکھا یہاں تک کہ خاوند کی وفات کے بعد انتہائی
شکستہ حالی کی حالت میں بھی اس نے ایک مدت تک میرے سامنے
دست سوال دراز کرنا گوارا نہ کیا۔ مگر اپنی اکلوتی ... کی
... [illegible] ... برداشت کر سکی ... [illegible]
[illegible]

کاتب بیا ... [illegible] ... ہو گیا اور اس نے بار کر لیے معالج
کے ذریعے اپنی بے کسی کی داستان مجھ تک پہنچائی۔ مجھے میرے مطلب
حقیقت سے گنگ کانوں نے حقارت سے سنا اور کوریا طمن دل نے
اس کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن ساتھ ہی ... [illegible]
کے غیر کی دعوت میرے لئے صبر کا تفریح رسالہ تھی۔ ممکن تھا کہ
میں وہاں پہنچنے میں تاخیر کرتا۔ اپنی آمد کا تار بھیجا اور جتنی جلد
ہو سکا روانہ ہو گیا۔

آپ سن کر متعجب ہوں گے جب میں کلکتے کے مشہور ہوٹل
انجم کے سامنے گاڑی سے اترا تو ایک شخص پہلے میرے
متعلق پوچھ رہا تھا اور یہ وہی ڈاکٹر تھا جس نے میری بھاوج
کے لئے امداد طلب خط لکھا تھا۔ جواب نہ پا کر پہلے سے
خیال کیا میں بذات خود آؤں گا اور ایک متمول مصنف ہونے کے
ناطے بلاشبہ سب سے بڑے مقامی ہوٹل میں اتروں گا۔ اس
خیال کی بنا پر وہ کئی مرتبہ یہاں آ کر میرا پتا پوچھ چکا تھا۔ میں
نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن شاید وہ مجھے پہچانتا تھا۔
دیکھتے ہی بڑے تپاک کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر
نہایت خندہ روئی سے کہنے لگا۔

"آپ تشریف لے آئے، شکریہ! آپ نے اندازہ کر لیا
ہو گا کہ حالت خطرناک ہے، جی ہاں آپ کا خیال بالکل درست
ہے۔ چند دن کی تاخیر ان کا کام تمام کر دیتی۔

آپ نے بہت اچھا کیا، میں آپ سے بہت بہت خوش
ہوا۔ وہ کہے جا رہا تھا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا
تھا۔ بھلا میرا وہاں جانا تو اپنے کاروباری سلسلے سے تھا۔
اس مطلب کے لئے، مگر میں ہر شخص کے سامنے اس حقیقت
کو کیسے ظاہر کروں؟ وہ تو مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیتا
تھا اور پھر جب میں کچھ کہنا چاہتا تھا تو کوئی چیز جیسے میری
زبان پکڑ لیتی تھی اس کی پرتوقع نگاہوں کے سامنے مجھے اظہار
حقیقت کی تاب نہ رہی اور میں خاموش ہو رہا۔ اگرچہ میرا ارادہ
تھا کہ سامان ہوٹل تک چھوڑ کر سیدھا ... [illegible]
[illegible]

چارہ نہ تھا۔ وہ ایک نہایت ہی کثیف اور مفلس کوچے کی پیچ در پیچ گلیوں میں سے گزرتا ہوا مجھے ایک تنگ و تاریک مکان کے اندر لے گیا۔ یہ میری بھاوج کا مکان تھا۔ مریضہ کا کمرہ مفلسی اور فلاکت زدگی کا بدترین نمونہ تھا۔ تاہم سب سے پہلی چیز جو میری آنکھوں کے سامنے آئی نہایت خوب صورت اور دلآویز تھی۔ مریضہ کی پٹی سے لگی ہوئی اس کی حسین بچی کھڑی تھی — بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ننھی سی حور، اس کے سیاہ گھنگریلے مگر الجھے ہوئے اور گرد آلود بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے — معصوم چہرے پر بچپن کی شگفتگی اور ماحول کی پیدا کی ہوئی قبل از وقت سنجیدگی کی آمیزش نے ایک ایسی پر درد کیفیت پیدا کر دی تھی کہ دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی تھی۔ ایک نظر دیکھتے ہی اس خوشرو معصومہ کو گود میں لینے کے لئے میرا دل بے اختیار تڑپ اٹھا مگر میں نے فوراً ہی اس کو سختی کے ساتھ دبا دیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر مریضہ سے کچھ کہا۔ جب میں بستر کے قریب گیا تو نحیف و نزار خاتون نے اٹھنے کی کوشش کی جسے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے ضعف نے پورا نہ ہونے دیا۔ اسکے مرجھائے ہوئے سانولے چہرے کا وقار آزردگی اور ندامت کے مشترک نقوش بنا رہے تھے کہ اپنے وقار اور خودداری کو شکست دے کر مجھ سے امداد کی استدعا کرنے میں اس کی روح نے کتنا بڑا صدمہ برداشت کیا ہے اور ایسا کرنے کے لئے میرے سامنے اپنی سب سے زبردست اور مدلل مجبوری پیش کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی کمزور انگلی سے اپنی بچی کی طرف اشارہ کیا اور بڑی نحیف اور گلوگیر آواز میں کہا:۔

"دیکھئے — اس کے لئے — تھوڑے دنوں بعد یہ دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ اسے —" اور بڑھتی ہوئی رقت نے اسے خاموش کر دیا۔

مجھے ندامت کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ اس پر درد استدعا نے بھی میرے پتھر دل پر کچھ اثر نہ کیا اور میں نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

"آپ کو ایسے خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔ آپ ابھی کم عمر ہیں اور آپ کے معالج نہایت قابل اور رحم دل معلوم ہوتے ہیں، نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے" حالانکہ کوئی مجھ سے کم خود غرض شخص ہوتا تو اتنا اضافہ ضرور کرتا کہ آپ کی خبرگیری کے لئے آپ کا یہ بھائی موجود ہے جو آپ کی ہر خدمت بجا لانے کو تیار

میں تو اس پیش آمدہ مصیبت اور اس کے اخراجات سے بچنے کی کوئی آسان تدبیر سوچ رہا تھا۔

ننھی لڑکی جو اس وقت تک ٹکٹکی باندھے منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی میرے قریب آئی اور مینا کی سی میٹھی آواز میں کہنے لگی۔

"کیا آپ بیٹھ نہ جائیں گے! اس طرح تو میں آپ کو پیار بھی نہیں کر سکتی آپ مجھ سے لتنے لمبے ہیں!"

میں قریب پڑی ہوئی ایک ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ننھی میری گود میں آ بیٹھی۔ اس نے اپنی ننھی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور پھر میرے رخسار پر آہستہ سے ایک بوسہ دے کر بولی۔

"آپ میرے ابا بنیں گے؟ میں آپ کو بڑا ہی پیار کرونگی کیا آپ بھی ویسے ہی اچھے ہیں؟" ذرا میرا جواب ملاحظہ ہو۔ اس کے متواتر سوالوں سے گھبرا کر میں نے اس پھول سی بچی کے پر خلوص بازوؤں کو قدرے سختی سے اپنی گردن سے الگ کر دیا اور اسے گود سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ وہ جیسے سن ہو گئی اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سہمی ہوئی سی خوبصورت آنکھیں حسرت و نا امیدی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے سے ایک جگر پاش آہ اٹھی جس نے ان ننھے ننھے ہونٹوں کو نیم وا کر کے اسے حسرت اور مایوسی کی مکمل تصویر بنا دیا اور دو سوئے سوئے آنسو پھول جیسے رخساروں پر آہستہ آہستہ لڑھکتے ہوئے نظر آئے۔ آہ اس زبان بے زبانی نے اس کے جذبات کی ایسی ترجمانی کی جو اس بھولی گڑیا کی مینا کی سی میٹھی باتوں سے برتر تھی — اف، میں نے دیکھا اور میرے دل پر غضب کا دھچکا سا لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا اس کی پر نم آنکھوں میں میرے مرحوم بھائی کی سوگوار روح بیٹھی ہوئی مجھ پر نفرین کر رہی ہے۔ میں کانپ اٹھا۔

جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر میری قلب ماہیت کر دی اور ایک آن واحد میں میری مکروہ شخصیت اور میرے اندر کی وحشیانہ اور ننگ انسانیت اصلیت کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ کسی غیر معلوم قوت نے مجھے مرعوب کر دیا میں خود اپنی حرکات کے لئے ایک احساس تنفر کے زیر اثر کانپ اٹھا اور فوراً اس ننھی حور کے سامنے اعتراف شکست کیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے آغوش میں لے لیا اور اس کے اشک آلود رخساروں کے بوسے لینے لگا اسے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ننھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم میری پیاری بیٹی ہو میں ہمیشہ تمہاری خبرگیری کروں گا۔"

اس خوشی کو میں کن لفظوں میں بیان کروں جو میری بھاوج کو میرے اس وعدے سے ہوئی۔ اس وقت تک وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے خاموش پڑی تھی۔ اور مایوس سی تھی مگر میرے لفظوں نے اس پر عجیب کیفیت طا کر دی۔ اس کی اضطراری کیفیت پر میں اور ڈاکٹر دونوں گئے مگر تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور کم سی آواز میں کہا۔

"بھائی — میرے عزیز بھائی — میرے خیالات نے آپ کس قدر غلط نقشہ میرے دماغ میں قائم کر رکھا تھا میں چاہتی ہوں مجھے معاف کر دیں۔ اس کے اظہار ممنونیت — میرے ضمیر پر پنج نیشتر کا کام کیا اور مجھے ایسی روح اذیت پہونچائی کہ سخت ترین لعن طعن و ملامت بھی نہ پہونچا تھی۔ میں نے جلدی سے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے ڈاکٹر سامنے نقل مکان کا خیال پیش کیا کہ مریضہ کے لئے کسی ا اور فرحت بخش مکان کا بندوبست ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر کام اپنے ذمے لیا کیونکہ ایک اجنبی کی حیثیت سے شاید خدمت کو بطرز احسن انجام نہ دے سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے دوسرے ہی دن ہمارے لئے برلب دریا ا خوبصورت اور پر آرام وہ بنگلہ لے لیا اور ہم فوراً وہاں منتقل کوئی تین مہینے تک ہم وہاں رہے۔ میں نے حتی المقدور دیکھ بھال میں کوئی فروگذاشت نہ کی مگر مشیت ایزدی کہ تیسرے مہینے کے اخیر میں وہ نہایت سکون و اطمینان کے اپنی ننھی بچی کو میرے سپرد کر کے ہمیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت تب سے میری ننھی حور میرے دل کا آرام اور چین بن کر پاس رہتی ہے۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے اور اس کی ز زندگی۔ کیا اس کا مجھ پر کچھ تھوڑا احسان ہے؟ اس ملکوتی آنسو۔ ایک معصومہ کی صفائے روحانی سے نکلے وہ پاکیزہ موتی جنہیں میرے تہی دامن دل نے اپنی گہرا جذب کر لیا تھا۔ وہ آنسو میرے لئے باران رحمت تھے ... سے میرا ... مردہ زمین کی طرح اجڑا پڑا تھا جی اٹھا ... وہ ... دل کی مرجھائی ہوئی کھیتی کے لئے ایسے ہی تھے جیسے غنچہ کو شگفتہ کرنے کے لئے شبنم کے جاں بخش قطرے کھلا کر پھول بنا دیتے ہیں۔ اس کی دلفریب مہک اور

غزل

نکہت کی کوئی صورت بہم نہیں ہوتی — تمہارا کا یاد قیامت سے کم نہیں ہوتی
فراق یار میں کاٹی ہے رات آنکھوں میں — ہر ایسی رات شبِ غم سے کم نہیں ہوتی
لو آئے جلتے ہیں اپنے نصیب ہی اکثر — ہماری قسمت نگاہِ کرم نہیں ہوتی
جو میکدے ہی میں مل سکے ساقی — تو پھر ضرورتِ دیر و حرم نہیں ہوتی

پڑھی ہے ہم نے تیری داستانِ غم ناز
بغیر خونِ جگر یہ رقم نہیں ہوتی

آسماں اور زمیں چاند ستارے بدلے
پیچ تو ہے گنگا کے بہتے ہوئے دھارے بدلے
زندگی کے جو پرانے تھے سہارے بدلے
وقت کے ساتھ ہی انداز ہمارے بدلے

حوصلے بڑھ گئے سینوں میں نئے دل آئے
پھاوڑے لیکے پہاڑوں کے مقابل آئے

عصرِ نو میں نئی تعمیر اٹھانا ہے ہمیں
طاقتیں عشق و محبت کی دکھانا ہے ہمیں
جذبۂ حب وطن کام میں لانا ہے ہمیں
شان بھارت کی اسی طرح بڑھانا ہے ہمیں

جانِ شیریں بھی گنوا دیں گے وہ آزاد ہیں ہم
کاٹ ڈالیں گے پہاڑوں کو وہ فرہاد ہیں ہم

اب نہ پابند کسی کے ہیں نہ مجبور ہیں ہم
دیکھتا ہے ہمیں عزت کی نظر سے عالم
اس نئے دور کی آزاد فضاؤں کی قسم
کام آئے نہ وطن کے تو اکارت ہے جنم

دیدۂ مادرِ گیتی کے لئے نور ہیں ہم
فخر ہم کو ہے کہ ہم قوم کے مزدور ہیں ہم

اب ارادہ ہے کہ اس خاک کو گلزار کریں
اپنے ہاتھوں سے علاجِ دلِ بیمار کریں
آئینہ بند ہر اک کوچہ و بازار کریں
ایسی تصویر بنا دیں کہ سب پیار کریں

مجاہد سے خطاب

غلامی کی فضا کو برباد کر دے
نظر کو فکر کو آزاد کر دے
تمدن نیا ختم ایجاد کر دے
دلوں کو محبت سے آباد کر دے
وفا کے کرشمے دکھاتا چلا جا

نہ تصویر رنج و الم زندگی ہے
نہ تفسیر آیات غم زندگی ہے
غزالانِ صحرا کا رم زندگی ہے
حسینوں کے گیسو کا خم زندگی ہے
یہ گیسوئے ہستی سجاتا چلا جا

نیاز ک... (؟)

(FIRST HALF) W IAT REGD. NO. D 1





80

لاکھ یوں شعلوں کے بھڑکتے ہوں الاؤ
امن کا پھول ان آنچوں سے نہیں جل سکتا
آگ اگلتی ہوئی ... توپوں سے ...
لشکرِ امن کی یلغار نہیں رک سکتی
دھرتی اور گگن کے پھیلے ہوئے اجیالوں میں
زیست کی چلتی ہوئی دھارا نہیں رک سکتی
یہ شگوفے یہ حسیں نار یہ ... بہار
یہ چٹکتی ہوئی کلیاں یہ ...
یہ دمکتے ہوئے آنچل یہ ... ہوئے ہونٹ
یہ ... یہ مخمور گلابی آنکھیں

[illegible]
یہ ابھرتا ہوا تہذیب و تمدن کا ...
یہ شفق زار یہ ہنستے ہوئے ...
یہ بہاریں کہ جو ... فضا
یہ ... گیت چہکتے ہوئے ...
زندگی کے کبھی طوفان نہیں رک ...
جنگ کا سامنا ... کبھی ...
[illegible]

مصنف
نظام الدین الیث ...
قیمت ۹۵ ...
لکھنے کے ساتھ ساتھ ...

[illegible]

غزل

[illegible]

اداریہ — واقعات نئی دہلی

جنگ کا ماحول

پہلی جنگ عظیم کا آغاز بھی یورپ سے ہوا تھا اور دوسری جنگ کا بھی، لیکن اس مرتبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ ایشیا میں لڑی جائے گی، دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہی سے ایشیا کے حالات ایسے تشویشناک چل رہے ہیں کہ اگر ابھی تک ایشیائی ملکوں کی لڑائیاں یا جھڑپیں کسی بڑی جنگ میں تبدیل نہیں ہوئیں تو یہ محض قدرت کا کرشمہ ہے

جنگ کا ماحول اس وقت خاص طور سے دو میدانوں میں ہے۔ ایک مشرق وسطیٰ میں اور دوسرا برصغیر ہند و پاک میں۔ دونوں علاقوں میں گذشتہ بیس سال کے زائد عرصہ سے کشیدگی موجود ہے۔ یہ کشیدگی کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ دونوں علاقوں میں تین تین خاصی بڑی لڑائیاں بھی ہوئی ہیں، لیکن ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تمام مسائل بدستور موجود رہے بلکہ کچھ نئے مسائل پیدا ہوگئے، کشیدگی اور دشمنی بڑھ گئی اور آئندہ کی لڑائیوں کے لئے نئی بنیادیں قائم ہوگئیں۔

یورپ کے ممالک امن چین سے اپنی ترقی میں لگے ہوئے ہیں پرانی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ جرمنی اور فرانس کے درمیان ان کی روایتی دشمنی جس پختہ دوستی میں تبدیل ہوئی ہے وہ دوسروں کے لئے ایک سبق ہے۔ مغربی جرمنی اور روس ایک دوسرے کے کتنے بڑے دشمن تھے لیکن آج دونوں ملکوں کے لیڈر ایک دوسرے ملک کا دورہ کر رہے ہیں اور چانسلر مغربی جرمنی مسٹر ولی برانٹ کے الفاظ میں جو حال ہی میں روس کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں، دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہت کچھ بہتری پیدا ہوگئی ہے خود جرمنی کے دو حصوں مغربی اور مشرقی جرمنی کے درمیان گذشتہ دس برس سے کتنی زبردست دشمنی تھی کہ برلن شہر کے بیچوں بیچ سمنٹ کی دیوار کھڑی کر دی گئی اور ایک ہی شہر کے رہنے والوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا لیکن اب دوستی کا جذبہ اس حد تک اُبھرا ہے کہ مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی کی الگ حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے اور اگر مغربی جرمنی کے ساتھ ساتھ مشرقی جرمنی کو بھی اقوام متحدہ کا ممبر بنا لیا جائے تو اسے اس پر اعتراض نہیں ہے۔

یہ یورپ کی حالت ہے وہاں بچھڑے ہوئے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، پرانی عداوتیں ختم کی جا رہی ہیں "ناٹو" اور "وارسا پیکٹ" کے ممالک ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لئے بے چین ہیں اور یورپین سلامتی کے استحکام کے لئے ایک نمائندہ کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی ہیں، لیکن اس کے برعکس ایشیا میں مختلف ممالک ایکدوسرے کے دشمن بلکہ خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ انکے درمیان بداعتمادی کی فضا ہے اور وہ اس بات کے لئے تیار نہیں کہ ایک میز پر بیٹھ کر بات چیت کر لیں اور اپنے تمام مسائل کو افہام و تفہیم اور رواداری کے جذبہ کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ بڑی طاقتوں کے محتاج ہیں اور بڑی طاقتوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اپنے زیر اثر ممالک کے درمیان ایسی کشیدگی باقی رکھیں کہ اسے جب چاہیں جنگ میں تبدیل کرا دیں تاکہ ان کی وہ چپقلشیں جن کا دار و مدار جنگ اور کشیدگی پر ہے برابر چلتی رہیں۔ چھوٹے ممالک اگر باہم دست و گریباں نہ ہوئے تو بڑے ممالک میں تیار شدہ اسلحہ کی کھپت کہاں ہوگی؟ اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کا کیا مصرف باقی رہ جائے گا؟

کبھی کبھی اسلحہ کی دوڑ کا رونا رویا جاتا ہے تخفیف اسلحہ کی باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن معاملہ جو کا توں رہتا ہے جنیوا میں تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کا سلسلہ دس برس سے بھی زیادہ عرصہ سے قائم ہے لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ اسلحہ کی دوڑ اور بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ کشیدگی میں بھی اضافہ ہوگیا، ایشیا خاص طور سے اس کی لپیٹ میں زیادہ آیا۔ ایشیائی ممالک جن میں اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک اور ہند اور پاکستان شامل ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہوں جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ امریکہ جیسے سامراجی ممالک انہیں اور شہ دے رہے ہیں اور ہتھیار مہیا کر کے ان کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ مبادا وہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر ان کی معیشت کو کمزور کر دینے کا باعث بن جائیں جس کی بنیاد فوجی ساز و سامان کی تجارت پر ہے۔

سامراجی ملکوں کی ان چالوں کو اگر ایشیائی ممالک نہیں سمجھتے تو یہ دنیا میں سب سے بڑے براعظم کے باشندوں کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ ایشیا اس وقت جنگ کی لپیٹ میں ہے اور اگر ایشیائی ممالک نے ابھی ترقیات میں یورپ اور دوسرے مغربی ممالک کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیچھے ہیں حالات کو نہیں سمجھا تو وہ کسی اور کا نہیں بلکہ خود اپنا نقصان کریں گے جنگی یا دفاعی معاملات پر جو کثیر رقمیں ایشیائی ممالک بشمول ہند اور پاکستان خرچ کر رہے ہیں کاش وہ ان ملکوں کے بھوکے ننگوں کا پیٹ بھرنے کے لئے خرچ کی جا سکتیں، ایسا ہوتا تو ہم اب تک کہیں آگے پہنچ چکے ہوتے۔ کاش اب بھی ایشیائی قومیں حقیقت شناسی سے کام لیکر جنگ کے راستہ سے ہٹ کر...



مادر پاکستانی قوم کی

فاطمہ جناح کا فرمان

خون دینے سے ڈرتے ہو تو آزادی کے گیت کس لیے گاتے ہو —؟

انسانیت کی تاریخ اربوں انسانوں کی عزت، ہمت اور جنگ کی تاریخ ہے۔ ایک طرف قدرت سے جنگ اور دوسری طرف ان لوگوں سے جنگ جو کروڑوں لوگوں کے پھل کو اکیلے ہی ہڑپ کر جانا چاہتے تھے۔ تاریخ کے آغاز سے موجودہ دور تک پورا معاشرہ دو حصوں میں بٹا رہا ہے۔ ایک وہ لوگ تھے جن کے ہاتھ میں طاقت اور دولت تھی دوسرے وہ جن کے پاس دولت نہیں تھی۔ جو لوگ دولت اور حکومت پر قابض تھے انھوں نے کبھی اپنی دولت اور حکومت رضاکارانہ طور پر نہیں چھوڑی۔ عوام کا ایک طبقہ مسلسل جنگ کے بعد ہی اس طاقت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ غلام معاشرے کی جگہ جب زمیندارانہ معاشرے نے لے لی تب بھی پوری دنیا میں جنگ ہوئی۔ زمیندارانہ نظام کی جگہ جب سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ساتھ جمہوریت آئی تو اسے بھی بادشاہت اور زمینداری کے خلاف جنگ کرنی پڑی، اور جب موجودہ دور میں دنیا کے بہت سے ملکوں نے غلامی سے نجات پائی تب بھی آزادی انھیں تحفے میں نہیں ملی۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے انھیں جنگ کرنی پڑی۔ ہزاروں قربانیاں دینی پڑیں تب کہیں جاکر وہ حکمراں طبقے کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آج بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں آزادی کی یہ جنگ جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ ملک آزاد نہ ہو جائیں۔

تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ کہنا بے وقوفی ہوگا کہ معاشرے کو یا اس وقت کے نظام کو پرامن طریقوں سے بدلا جاسکتا ہے۔ معاشرے کو بدلنے کے لیے عوام کو ان لوگوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے جن کے ہاتھوں میں حکومت اور دولت ہے۔ اور یہ جنگ ہمیشہ ہوتی ہے۔ وہ تقریروں اور نعروں کی جنگ نہیں ہوتی۔ پاکستان میں بھی کچھ اسی طرح کی حالت ہے۔ پچھلے ۱۵ سال سے حکومت پر فوج کا قبضہ ہے۔ پہلے تو یہ فوج ملک کو بدعنوان سیاست دانوں سے چھٹکارا دلانے آئی تھی۔ لیکن ایک بار طاقت ہاتھ میں آنے کے بعد یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ حکومت عوام کے ہاتھوں میں لوٹا دے۔ عوام نے جب کبھی اس حکومت کے خلاف آواز اٹھائی [illegible]
[illegible]

...مکو جمہوریت اور آزادی کے سبز باغ دکھائے
...ن کو کہا سنے گئے لیکن فوجی حکمرانوں کا اقتدار عوام
...نمائندوں کے حوالے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر
...یسا کردیتے تو یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہوتا۔
...تاریخ گواہ ہے کہ جس طبقے کے ہاتھ میں حکومت
...ہے اس نے کبھی اسے رضاکارانہ طور پر چھوڑا
...نہیں ہے۔

> مجھے بتاؤ، کیا تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود ہے کہ حکمرانوں نے عوام کے غصب کردہ حقوق خوشی خوشی عوام کو لوٹا دیے ہوں۔
>
> (مادر پاکستان)

یہ پاکستانی عوام کی بھول تھی کہ وہ فوجی ڈکٹیٹروں
...پرامن طریقوں سے ہٹانے کے خواب دیکھ رہے تھے
...ن فوجی ڈکٹیٹروں نے خود پاکستانی عوام کی آنکھیں
...ھول دیں، اور انھیں بتا دیا کہ الیکشن اور پارلیمنٹ سب
...ھوکا ہیں۔ اگر وہاں کے عوام، عوامی حکومت قائم کرنا
...اہتے ہیں تو انھیں برسراقتدار طبقے کے خلاف ہتھیار
...ٹھانے ہوں گے۔ عوامی لیگ کی غلطی صرف اتنی تھی کہ
...وہ اکثریت میں آکر حکومت کی دعوے دار بن بیٹھی۔ اگر
بھٹو کی پیپلز پارٹی اکثریت میں آتی تو یقیناً فوجی ڈکٹیٹر
...اس کا بھی یہی حشر کرتے۔ اگر مجیب الرحمٰن کے خلاف
...غداری کا الزام لگ سکتا ہے تو یہی الزام بغیر کسی
ہچکچاہٹ کے بھٹو کے خلاف بھی لگایا جا سکتا تھا۔
ویسے بھی بھٹو کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔
انکا کمیونسٹ ہونا ہی انکی اور انکی جماعت کی گوشمالی
کے لئے کافی تھا۔ تاہم اب مجیب کے بعد حکومت کے
سب سے بڑے دعوے دار بھٹو ہی ہیں اور یقیناً
بہت جلد یحییٰ خان انکو بھی وہی سبق دینے والے
ہیں جو وہ مجیب اور عوامی لیگ کو دے رہے ہیں۔

ملک کے سچے بہی خواہ اور علمبردار سیاست داں
...س طرح ملکی سیاست کی رگ رگ سے واقف ہوتے
...ہیں اس کا اندازہ مادر پاکستان محترمہ فاطمہ جناح کے
...ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۱۹۶۷ء
...

ان کے الفاظ کتنے سچے تھے اس کا اندازہ آج بنگلہ دیش میں ہونے والے حالات کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ آج بنگال کا ایک ایک باشندہ مادر پاکستان کے دیے ہوئے سبق پر عمل کر رہا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے کہا تھا

"اگر پاکستان کے عوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو انھیں خون دینا ہوگا۔ غاصبوں سے حق لینا آسان نہیں ہوتا ہے۔"

اور آج مادر پاکستان کی روح مطمئن ہوگی کہ مشرقی بنگال کے کونے کونے میں، چپے چپے پر خون بہہ رہا ہے ——
عوام کا خون —— غاصبوں کے ہاتھوں

مشرقی بنگال کے بہادر عوام محترمہ فاطمہ جناح کے فرمان پر عمل کر کے پاکستان کی تاریخ اپنے خون سے لکھ رہے ہیں۔ بنگالی غدار نہیں ہیں بلکہ وہی پاکستان کے اور وہاں کے عوام کے سچے ہمدرد ہیں۔ کیونکہ آج صرف وہی جان اور مال کی قربانیاں دے کر پاکستان کو فوجی غاصبوں کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

> اور آج مادر پاکستان کی روح مطمئن ہوگی کہ مشرقی بنگال کے کونے کونے میں چپے چپے پر خون بہہ رہا ہے۔ عوام کا خون غاصبوں کے ہاتھوں۔ مشرقی بنگال کے بہادر عوام محترمہ فاطمہ جناح کے فرمان پر عمل کر کے پاکستان کی تاریخ اپنے خون سے لکھ رہے ہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح سے انٹرویو لیتے ہوئے جب سوال کیا گیا:

"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ پاکستان کے عوام سچی آزادی سے کیوں محروم رہے، وہ اپنے ملک کے حاکم کیوں نہ بن سکے؟"۔ تو مدیر "اردو ڈائجسٹ" الطاف حسین قریشی لکھتے ہیں کہ اس سوال سے

محترمہ کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھیں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، ان کے بازو جوانوں کی طرح تن گئے، صوفے کے دونوں بازوؤں پر ان کے

...آواز میں کہا:۔

پاکستان کے عوام نادانی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ان کے حاکم جو انکی مرضی کے بغیر عنانِ اقتدار سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے تھے خود بخود اختیارات عوام کو منتقل کر دیں گے۔ یہ خود فریبی قوم پر فالج کی صورت میں نازل ہوئی اور اس کے ہر عضو کو ناکارہ کر گئی۔ مجھے بتاؤ، کیا تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود ہے کہ حکمرانوں نے عوام کے غصب کردہ حقوق خوشی خوشی لوٹا دیے ہوں۔

انگلستان کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ لہو سے رنگین تاریخ۔ وہ تاریخ جس میں صدیوں خون بہا عوام کا خون۔ ظالم حکمرانوں کا خون۔ وہاں کے عوام نے آزادی، جمہوریت اور بنیادی حقوق خون دے کر حاصل کئے ہیں۔ اگر خون نہ بہتا تو آج انگلستان آمریت کے جنگل میں سسک رہا ہوتا۔ بادشاہوں نے استبداد کی روش پر تلواروں کی مدد سے چلنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن عوام نے قدم قدم پر مزاحمت کی، انکی جائدادیں ضبط ہوئیں، ان کے گھر بار لٹے، انکو سولی پر لٹکایا گیا، فوج بھی میدان میں کود پڑی لیکن عوام نے بنیادی حقوق کا پرچم اٹھائے رکھا۔ اگر پاکستان کے عوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو انھیں بھی خون دینا ہوگا۔ غاصبوں سے حق واپس لینا کچھ آسان نہیں۔ خون دینے سے ڈرتے ہو تو حقیقی آزادی کے گیت کس لئے گاتے ہو؟"

(اردو ڈائجسٹ لاہور۔ اگست ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۴)

دنیا دور بین کی نظر میں

یمن

فرعون مزاجی آخر کار رنگ لائی

"میں تمہارا وزیر اعظم بول رہا ہوں لائن کاٹ دو" "اور میں حسن الحرازی ہوں، آپ خود کیوں نہ اسے کاٹ دیں"

یہ سوال و جواب اس وقت ہوئے جب گزشتہ ہفتے سال حسن العمری (وزیر اعظم یمن) نے اپنے کسی گارڈ سے بات کرنے کے لئے ٹیلیفون اٹھایا۔ اتفاق سے لائن حسن الحرازی سے جا ٹکرایا جو اپنے کسی دوست سے بات چیت کر رہے تھے۔ پہلے انھوں نے سمجھا کہ انکا دوست ہی اپنے آپ کو وزیر اعظم بتا کر مذاق کر رہا ہے اس لئے انھوں نے قہقہہ لگایا۔ لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ ٹیلیفون پر کوئی تیسرا شخص بھی مداخلت کر رہا ہے تو ٹیلیفون پر دونوں میں خوب ترش کلامی ہوئی۔ حسن العمری نے الحرازی کا پتا معلوم کیا اور اس بیوقوف نے غصے میں اپنا پتا بتا دیا۔ دراصل اسے یقین نہیں تھا کہ ٹیلی فون کی دوسری جانب واقعی وزیر اعظم یمن موجود ہیں۔

وزیر اعظم حسن العمری اپنی تیز مزاجی کے لئے مشہور ہے۔ بعض اوقات خود اس کے ایڈی کانگ اس کا غصہ دیکھ کر دفتر سے بھاگ جاتے تھے۔ اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ اسکا یہ سلوک تھا تو دارالحکومت صنعاء کے ایک معمولی فوٹو گرافر کی کیا حقیقت تھی۔ چند ہی منٹوں میں فوجی سپاہیوں نے الحرازی کی دوکان کو گھیر لیا اور اسے کھینچ کر فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گئے جہاں لوہے کی موٹی سلاخوں سے اسے مار لگائی گئی۔ حسن العمری وہاں خود موجود تھا۔ اس نے فوجیوں کو حکم دیا "اس بدمعاش کو قتل کر دو" لیکن فوجیوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر خود حسن العمری نے ایک سپاہی سے رائفل چھینی اور الحرازی کے سر میں گولی داغ کر انھیں موت کی نیند سلا دیا۔



العمری بیروت روانہ ہونے سے پہلے ہوائی اڈے پر

وحشت و بربریت کی یہ خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ الحرازی کے رشتے داروں نے اعلان کیا کہ "جب تک العمری کے خلاف کارروائی کرنے کا یقین نہ دلایا جائے گا ہم الحرازی کی میت کو نہ دفنائیں گے"

انھیں حکومت کی طرف سے یقین دلایا گیا بلکہ صدر عبدالرحمن العریانی نے ارادہ ظاہر کیا کہ وزیر اعظم کو انکے جرم کی پاداش میں عام پبلک کے سامنے تختہ دار پہ لٹکایا جائے گا۔ مجلس شوریٰ کے ممبروں کی اکثریت بھی چاہتی تھی کہ حسن العمری کو عبرتناک سزا دی جائے کیونکہ انسانوں کو اس طرح ہلاک کر دینا جیسے جانوروں کو بھی ہلاک نہیں کیا جاتا ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن قبائلی لیڈروں نے جو وزیر اعظم سے ہمدردی رکھتے تھے انھیں جلاوطن کرنے پر رضامند کر لیا۔

انکی فرعون مزاجی آخر کار رنگ لائی

حسن العمری ۱۹۶۷ء میں برسر اقتدار آئے تھے اور اس عرصے میں کئی بار کسی مسئلے پر اپنے ساتھیوں سے اختلاف رائے ہونے کی بنا پر مستعفی ہوئے اور ہر مرتبہ بیروت یا قاہرہ بھاگ گئے اور اپنی شرطوں پر واپس آئے۔

عام لوگ شاید یہ سوچیں کہ وہ ایک مرتبہ پھر واپس آجائیں گے۔ لیکن اب ایسے حالات ہیں کہ انکی واپسی ممکن نظر نہیں آتی۔ وہ اس وقت اپنے بارہ سال کے لڑکے کے ساتھ بیروت میں ہیں اور سنا ہے کہ تیز مزاجی کا بھوت اب بھی کبھی کبھی ان پر سوار ہو جاتا ہے۔

البتہ وہ اپنی حرکت پر کچھ پشیمان ضرور ہیں لیکن انکی یہ پشیمانی اب انھیں پھر یمن واپس نہ لا سکے گی۔

مسٹر حسن العینی جمہوریہ یمن کے نئے وزیر اعظم مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ حسن العمری کی وزارت میں وزیر خارجہ تھے۔

وزارت خارجہ کا محکمہ اب بھی انھوں نے اپنے پاس ہی رکھا ہے۔

مشرق وسطیٰ

مشرق وسطیٰ کے حالات خراب ہو رہے ہیں اور کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ ہفتے نہر سوئز کے علاقے میں اسرائیلیوں نے ایک مصری ہوائی جہاز کو گرا کر گویا جنگ جیسی صورت حال پیدا کر دی۔ مصری کب خاموش رہنے والے تھے انھوں نے بھی ایک اسرائیلی ہوائی جہاز گرا لیا۔ جس پر اسرائیل نے چراغ پا ہو کر جارحانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اور دونوں ملکوں نے اپنی اپنی فوجوں کو نہر سوئز کے علاقے میں تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

ابھی باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی ہے لیکن حالات ایسے ہیں کہ کسی وقت بھی جنگ کا بگل بج سکتا ہے۔

صدر انور سادات کے الفاظ ہیں۔

"اب جنگ کو زیادہ عرصے تک نہیں ٹالا جا سکتا"

کے مذاکرات کے ناکام ہونے کی صورت میں اس کے
ہ کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ عرب ممالک فوجی اقدام
اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لیں۔
لیکن کیا عربوں کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنے
ئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں ؟" اسکا جواب
والے زمانے میں ملے گا۔ لیکن مصر کے تیور بتا رہے
ر وہ اسرائیل کے لئے تر نوالہ نہیں ہے۔ اسرائیلی
لو راکٹ سے گرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جدید ہتھیاروں
مسلح ہے اور اسرائیل سے زبردست ٹکر لینے کے
یار ہے۔ اسے اس کی بہت بڑی قیمت دینا ہوگی
اس سے بھی بڑی قیمت اسرائیل کو ادا کرنا پڑیگی
اسی ماہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس
وع ہو رہا ہے جس میں دیگر اہم مسائل کے علاوہ
رق وسطیٰ کا اہم مسئلہ بھی معمول کے مطابق زیر بحث
گا۔ اگر اس سال بحث کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ
ور اقوام متحدہ کا ادارہ یا بڑی طاقتیں کوئی اطمینان
ن فیصلہ کرنے میں ناکام رہیں تو حالات بتا رہے
شرق وسطیٰ میں انتہائی سنگین صورت حال
وجائے گی۔

ترکی

قسطنطنیہ کا بڑا حرم سرا

رکی کے سلاطین عثمانیہ کا دائرۂ حکومت بڑا وسیع تھا
سے ریانا تک پر پورے چار سو برس انکی حکومت کا ڈنکا
یورپ کی ہر بڑی طاقت عثمانی سلطنت ... سے
، نظم و نسق کے جو جوہر انھوں نے دکھلائے اس
یا پر ان کا سکہ بٹھا دیا۔
ن جب وہ عیاشی میں پڑے اور حکومتی ذمے داریوں
ن ہوئے تو قدرت نے انھیں ایسی سزا دی کہ انکے
ملک کی آزادی کو قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ ان سلاطین
یوں کی جیتی جاگتی تصویر قسطنطنیہ کا وہ حرم سرا ہے



قسطنطنیہ کے حرم سرا کا ایک اندرونی منظر۔
تصویر ۱۸۸۵ء

ہفتے سیاحوں کے دیکھنے کے لئے کھول دیے گئے ہیں۔
کسی زمانے میں یہ حرم سلاطین عثمانیہ کی داشتاؤں کا مسکن تھا اور وہ یہاں دادِ عیش دیا کرتے تھے۔
سترھویں صدی کا ایک سلطان ابراہیم "پاگل" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے پاگل پن کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اپنا زیادہ وقت اپنے محل کے قریب باسفورس میں مچھلیوں کے لئے سمندر میں اشرفیاں پھینکا کرتا تھا۔ اس کے حرم میں ایک ہزار ایک داشتائیں تھیں۔
لیکن اپنے پاگل پن کے باوجود ابراہیم اور ۲۴ دوسرے سلطانوں نے اپنے محل کو آرٹ اور آرکیٹکچر کے بہترین نمونے میں تبدیل کر دیا اور اسی لئے آج ان کے محل اور حرم کے کمرے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز سمجھے گئے ہیں۔ وہاں سیاح سلاطین عثمانیہ کے زمانے کے وہ نوادرات دیکھیں گے کہ وہ حیران رہ جائیں گے۔ ترکی کی حکومت اس محل کو دلچسپی کے ایک اہم مرکز میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اردن

فدائین کو اردن کا دورہ کرنے کی پیشکش

اردن نے جدہ کانفرنس میں فدائین کو اردن کا دورہ کرنے اور اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مشترکہ محاذ بنانے کی پیشکش کی ہے۔ جس اردن نے امریکا کی مدد سے فدائین کے خلاف ایسی سخت کارروائی کی کہ ان کے تمام اڈے ختم کر دیے تھے اس کی طرف سے اس قسم کی پیش کش حیرت ناک نہیں ہے۔ کیونکہ
"اسکو بھولا نہ چاہئے کہنا۔ صبح جو جائے اور آئے شام"
اگر اب بھی اردن اس بات کو محسوس کرلے کہ فدائین اسرائیل کے خلاف جنگ کے لئے ایک قیمتی ہتھیار ہیں تو وہ اسرائیل کے خلاف اپنے مورچے کو بہت کچھ مضبوط بنا سکتا ہے۔ جنگِ فلسطین میں کامیابی حقیقت میں فدائین ہی کے تعاون سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ شاہ اردن اسرائیل سے لڑتے لڑتے خود فدائین سے لڑ پڑے اور جو کام اسرائیل کیلئے ممکن نہ تھا وہ خود انھوں نے پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا۔
سعودی عرب اور مصر کے توسط سے اردن اور فدائین کے درمیان صلح کی بات چیت جاری ہے۔ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں اس بات چیت کی بڑی اہمیت ہے۔

گوتم و گاندھی کا دیس



طالب علموں کی "زندہ دلی" بسوں کو آگ لگادی

پارلیمنٹ کا اجلاس نہ ہونے کے باوجود راجدھانی میں کچھ واقعے اچھی خاصی دلچسپی رہی اور اگر تھوڑی کمی واقع ہوئی تو وہ طالب علموں نے پوری کردی۔ پوچھیے تو ان طالب علموں ہی سے دلی کی رونق ہے دلی کے طلبا بہت دلچسپ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ زندہ دل بھی۔ زندہ دل اس لئے ہیں کہ کسی نے انکے کان میں کہہ دیا ہے کہ "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" انہوں نے اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ تانوڑ توڑ دی، ڈی ٹی یو کی بسوں کو آگ لگاتے رہے اور چلتی بسوں پر سنگباری کی اور ایک دن جو دل میں آیا کئی بسوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ اور صرف اسوقت چھوڑا جب یقین حاصل کرلیا کہ حکام ان کے لئے زیادہ بسیں چلائیں گے۔ لیکن بسیں ہیں کہاں جو زیادہ تعداد میں چلائی جا سکیں گی۔ وہی رفتار بے ڈھنگی جو روز اول سے بدستور موجود ہے، اور خدا معلوم کب تک رہے گی۔ بلکہ ہمیں تو خدشہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ رہے گی اس لئے کہ اگر ڈی، ٹی، یو نے مزید بسیں چلانے کی ہمت بھی کی تو اس دوران میں اسی حساب سے آبادی بھی بڑھ جائے گی اور معاملہ وہیں رہے گا جہاں پہلے تھا اور پھر وہی سنگباری اور بسوں کو آگ لگانے کے واقعات۔ یعنی ہمارے طلبا اپنی زندہ دلی کو باقی رکھیں گے۔

ایک زندہ دلی کا مظاہرہ طالب علموں نے کیا اور دوسری زندہ دلی جن سنگھی ایڈمنسٹریشن کے ڈائرکٹریٹ تعلیمات نے دکھائی۔ اور بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ اس نے چھٹے درجے سے سنسکرت کو لازمی زبان قرار دے دیا ہے۔

سنسکرت کو کیوں لازمی کیا گیا؟ کیا وہ کسی صوبے یا ریاست کی زبان ہے؟ کیا کسی علاقے میں بولی جاتی ہے؟ جواب ملا کہ "وہ سب زبانوں کی ماں ہے۔ ماں سے سب زبانوں کا تعلق رہے اس لئے سنسکرت کو لازمی کیا گیا"

آپ نے بہت اچھا اقدام کیا۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک بہن کو چوٹی پر پہونچا دیا اور دوسری بہن یعنی فارسی کو زندہ درگور کردیا۔ اسے اختیاری مضامین تک سے نکال دیا۔ اور پھر کیا ڈائرکٹریٹ کے نام نہاد ماہرین تعلیم بتائیں گے کہ جس بچے یا بچی کو ہندی کی ٹھیک طور پر شدھ بدھ بھی نہ ہو کیا اسے ایکدم سنسکرت کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ یہ سنسکرت نوازی نہیں بلکہ "سنسکرت دشمنی" ہے۔ اس لئے کہ جس طالب علم پر اس کی اہلیت کا لحاظ کئے بغیر سنسکرت کو زبردستی تھوپنے کی کوشش کی جائیگی اسے اس زبان سے دلچسپی نہیں نفرت پیدا ہوگی۔

جن سنگھی ایڈمنسٹریشن سنسکرت کو ٹھونس کر حقیقت میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش میں ہے وہ چاہتا ہے کہ ایک طرف سنسکرت کو فروغ حاصل ہو اور دوسری طرف اردو ایک زبان کی حیثیت سے ختم ہوجائے۔ اس نے اردو میڈیم ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کررہا ہے کہ خود اردو والے پکار اٹھیں کہ اس اردو میڈیم کو ختم کرو۔

اردو نصاب کی کتابیں مہیا نہ کرکے حقیقت میں دلی ایڈمنسٹریشن نے ایک طبقے کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے سے انکار کیا ہے۔ ماہرین قانون بتائیں کہ کیا یہ دستور ہند کی کھلی خلاف ورزی نہیں ہے؟

اور سنئے۔ اعلان یہ ہے کہ اُردو کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اس کی تعریف بھی کی جاتی ہے کہ وہ بڑی خوبصورت زبان ہے۔ لیکن اسی راجدھانی میں بلکہ خاص پارلیمنٹ کے قریب واقع کچہری میں ایک مجسٹریٹ صاحب ہدایات جاری فرمارہے تھے کہ "کوئی درخواست بھی اردو میں نہ لی جائے"

اردو کے ساتھ اس قسم کی بے انصافیاں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جب تک اردو کو سرکاری حیثیت نہ دی جائے گی اور اسے دوسری سرکاری زبان قرار نہ دیا جائے گا اسکا تحفظ نہ ہوسکے گا سہولتیں مہیا کرنے کی بات محض "ڈھونگ" ہے، اور اس ڈھونگ کے پردے میں اُردو کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔

تصحیح فرمائیے

جولائی نصف اوّل کے "واقعات" میں جناب اختر بستوی کے مضمون "گوبند سرور" پر موصوف کا اسم گرامی کاتب کے سہو سے نہیں لکھا گیا۔

پروفیسر صاحب سے ڈاکٹر صاحب تک

ہندوستانی مسلمانوں کو بھارتیانے کا مسئلہ

"میرا ہندو دوست تو ہندوستان کو اپنا مذہب سمجھنے پر خواہ مخواہ مجبور تھا۔ میں مجبور نہیں تھا لیکن میرا ایمان میری مجبوری بن چکا تھا۔ وہ مجبوری اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اس لیے سیکولرزم اور جمہوریت کے ساتھ میری وابستگی اور اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنے آپ کو داؤں پر لگا دینا میرے ہندو دوست کے لئے اتنا نہیں جتنا میرے ایمان کا جزو بن چکا ہے۔"

مسلمانوں کے ایک "دوست" ہیں پروفیسر بلراج مدھوک۔ بیچارے مسلمانوں کے بارے میں اتنے زیادہ پریشان رہتے ہیں کہ دن رات مسلمان ان کے دل و دماغ پر بھوت کی طرح سوار رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو یہ بات ثابت کرنے کا خبط ہے کہ وہ صرف نام ہی کے نہیں بلکہ کام کے بھی پروفیسر ہیں۔ اس لیے وہ وقت بے وقت مختلف نئی نئی تھیوریاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ یہ تمام تھیوریاں ہوتی بھی مکمل طور پر نئی (ORIGINAL) ہیں۔ اس لیے مان لینا پڑتا ہے کہ واقعی مسلمانوں کے یہ ہمدرد صرف نام ہی کے پروفیسر نہیں بلکہ سچ مچ پروفیسر ہیں۔ ان پروفیسر صاحب کا ایک شوق الیکشن لڑنا بھی ہے۔ کئی بار الیکشن لڑا جس میں سے ایک آدھ بار کامیاب بھی ہوئے۔ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد کچھ اس طرح سے پھولے کہ خوف محسوس ہونے لگا کہیں یہ جلد ہی پھٹ نہ جائیں۔ اور ایسا ہی ہوا بھی۔ ۱۹۷۱ء کے انتخاب میں بیچاروں کے پرزے پرزے ہو گئے۔ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد پروفیسر صاحب نے ایک تھیوری رکھی تھی یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے "بھارتیا کرن" کی تھیوری۔ پہلے تو پروفیسر صاحب زبانی ہی شور مچاتے رہے لیکن پھر "پبلک کے بے حد اصرار پر" انہوں نے بھارتیا کرن کے بارے میں انگریزی میں ایک کتاب لکھ ماری — "INDIA NISATION"

لیکن اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب مسلمانوں کا بھارتیا کرن کرتے، جنتا نے ان کا [illegible] الیکشن میں ناکام ہونے کے بعد ہمارے پروفیسر صاحب



پروفیسر بلراج مدھوک

سے ایک اندھا پن کی حیثیت عوام کے سامنے رکھی۔ یعنی نظر نہ آنے والی سیاہی کی کہانی ـــــ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے پروفیسر صاحب بھی اس نظر نہ آنے والی سیاہی کی طرح غائب ہو گئے ہیں۔ اور عوام کو کچھ دنوں کے لیے اس بے سُرے باجے سے نجات مل گئی ہے۔

یہ تو تھی پروفیسر صاحب کی بات۔ ہمارے ایک اور دوست ہیں ڈاکٹر عابد رضا بیدار انہوں نے بھی ایک کتاب لکھی ہے' اردو میں "سیما کی تلاش ـــــ ہندوستانی مسلمانوں کے بھارتیا کرن کا مسئلہ" ڈاکٹر بیدار نے مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر بیدار ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں مسلمانوں سے سچی ہمدردی ہے۔ لیکن یہ ہمدردی کوئی جذباتی درد نہیں بلکہ باشعور لگاؤ ہے ڈاکٹر بیدار نے اپنی کتاب میں بہت سی باتیں کہی ہیں جو حالانکہ کڑوی ہیں پھر بھی کافی حد تک سچی ہیں۔ ڈاکٹر بیدار کا کہنا ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ ـــ دوسرے تمام ملک دشمن اور انسانیت دشمن عناصر جیسے کہ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس وغیرہ کا بھی بھارتیا کرن ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو اپنے آپ کو ہندیانا ہوگا نہ کہ ہندوانا۔

ہندیانے کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں۔

"میں ہندوستانی مسلمان، ہر اس مسئلے کو جو میرے ملک کے سیکولر خوش حال جمہوریہ بننے میں رکاوٹ ڈالتا ہو، سلجھانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا چکا ہوں۔ یہ بازی میں نے اس وقت لگائی تھی، جب پاکستان بنا تھا، اور میرے لیے پاکستان کھلا ہوا تھا۔ میں وہاں زیادہ ترقی کر سکتا تھا، اور سب سے بڑھ کر، اپنے مذہب کی ہدایات کے مطابق حکومت اور سیاست کو ڈھالنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن میں وہاں نہیں گیا اس لیے کہ شعوری طور پر میرا ایمان سیکولرازم اور جمہوریت کے ساتھ تھا۔ میرا ہندو دوست تو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے پر خواہی نخواہی مجبور تھا۔ میں مجبور نہیں تھا، لیکن میرا ایمان میری مجبوری بن چکا تھا، وہ مجبوری اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اس لیے سیکولرازم اور جمہوریت کے ساتھ میری وابستگی اور اس ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اپنے آپ کو داؤں پر لگا دینا میرے ہندو دوست کا اتنا نہیں جتنا میرے ایمان کا جزو بن چکا ہے۔ اور اسی لیے میں ہر اس ننھی کرن کی طرف لپکتا ہوں جو اس گھور اندھیرے میں مجھے ذرا سا بھی راستہ دکھا سکتی ہے، ہندیانے کی بات بھی مجھے کچھ ایسی ہی لگی۔"

ڈاکٹر عابد نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک حد تک مسلمانوں کو اپنے رہن سہن اور طریقۂ فکر میں تبدیلی لانی ہوگی اس کے لیے انہوں نے بعض بہت ہی ٹھوس دلائل اور مثالیں دی ہیں۔ ان کی اس بات سے ہمیں بھی اختلاف نہیں ہے کہ تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تبدیلی کس قسم کی ہوگی اور اسے کون لائے گا۔ یہ مسئلہ بہت ٹیڑھا اور غور طلب ہے۔ اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اس پر پوری قوم، قوم کے لیڈروں، دانشوروں، مفکروں اور ہمدردوں کو سوچنا ہوگا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ تبدیلی نہ تو جن سنگھ کے کہنے سے آئے گی اور نہ یہ مسئلہ قوم کو لعن طعن کرنے سے حل ہوگا۔ یہ تبدیلی اگر لائے گا تو خود مسلمان لائیگا۔ اس بات کا فیصلہ بھی مسلمان ہی کرے گا کہ یہ تبدیلی کس نوعیت کی ہوگی۔ اس کی 'سیما' یا حد کیا ہوگی، اور یہ تبدیلی کب لائی جائے گی۔ کسی سیاسی جماعت یا لیڈر کو ان مسائل کے حل ڈھونڈنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اگر مسلمان اس قسم کی کوئی تبدیلی لائیں گے تو وہ خود انکے اپنے فائدے کے لیے ہوگی نہ کہ جن سنگھ یا کانگریس کو خوش کرنے کے لیے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر بیدار کا تعلق مسلمان قوم سے ہے اور انہیں قوم سے پوری ہمدردی ہے، لیکن قوم سے ان کا خطاب ایک ایسے مفکر کے انداز میں ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی سے چوٹی کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو خطاب کر رہا ہو۔ اگر ہمیں قوم کے مسائل کو حل کرنا ہے تو ہمیں ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ ان میں رہ کر ان کی نفسیات کو سمجھنا ہو ڈر، خوف، شبہ، جذباتیت اور اندھی تقلید کی ج نفسیات پچھلے پچاس سال میں بنی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہم بہت سنبھل کر قدم اٹھائیں۔ کہیں ایسا نہ کہ ہماری کسی سچی مگر کڑوی بات سے عوام کے جذ کو ٹھیس پہنچ جائے۔ اور وہ ہماری بات ہی سنـ چھوڑ دیں۔ عام طور پر ہوتا بھی کچھ اسی طرح ہے کبھی قوم کا کوئی سچا ہمدرد بھی قوم کی کسی غلطی کوتاہی کی طرف اشارہ کرتا ہے تو عوام اس بات سننے سے پہلے ہی اس پر حکومت کا ایجنٹ ہو کا الزام لگا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو اس بات کی شکایت ہے۔ جو کسی حد تک صحیح بھی۔ اور ہمیں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ ڈ بیدار لکھتے ہیں۔

"سوچ بچار کرنے والے طبقے میں سے کچھ تو اس خاموش رہے کہ اگر کوئی ایسی بات کہی جائے جو مسلما کے جذبات کو ٹھیس لگاتی ہو اور انہیں خوش نہ ہو تو سیدھا سادا ایک لیبل سرکار پرستی کا لگا دیا جا اور چھاگلاجی کی جانشینی کا افتخار بخش دیا جاتا۔ دوسری طرف کچھ لوگ اس لیے خاموش رہے کہ ا کے خیال میں بات تو ٹھیک ہے، لیکن اصل اہمیـ اپنی انفرادیت کو بچائے جانے کی ہے۔ اور یہ کہ ا وقت میں عمارت کی ایک اینٹ بھی تم نے کھسـ تو پوری عمارت آن گرے گی، دو ایک نے اقبال ک بھی دلائی کہ بحرانی دور میں تقلید ہی راہ عمل۔ جس سے روایت اور وراثت کا تحفظ ہو سکتا۔

میں نے پچھلے پیراگراف میں ایک بات کہی تھ ایسی بات نہ کہی جائے جس سے مسلمانوں کے جذبا ٹھیس پہنچے۔ اس سے میرا مطلب تھا کہ سچی بات کہا تو ضرور جائے لیکن اس طرح کہا جائے کہ اس کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اور یہ بھی ایک حقیقـ ہے کہ جس فرد کو بھی قوم یا ملک سے سچی ہمدرد ہوگی وہ سچی بات کہنے میں ہچکچائے گا نہیں۔ چاہے بولنے کے لیے قوم وقتی طور پر جذبات میں بہہ کر ا سے نفرت ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ اسی بات کو ڈاکٹر

نے آگے صاف کیا ہے۔" اپنی ذاتی فکر ہو تو پُرخلوص
فکر اس بات کی پروا نہیں کیا کرتا کہ اس پر کونسا
بل لگ جاتے گا۔ دل کی آگ اسے یہ سوچنے کی مہلت
ہی کب دیتی ہے۔ اور اتفاق بخت سے اگر حکومت
وقت کے لیے ایسے شخص کی کوئی بات پسندیدہ
ٹھہرے بھی تو زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ اسکی
کوئی دوسری بات سخت ناپسندیدہ قرار دیدی
جائے گی۔ محض اسلیے کہ ایسا شخص اپنے قلم کو گروی
نہیں رکھے گا۔"

میرے خیال میں مسئلہ صرف مسلمانوں کو
ہندیانے کا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں غلط بوسیدہ
اور مفاد پرست لیڈروں سے آزاد کرانے کا بھی ہے۔
ان میں سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے
کا ہے۔ ان میں یہ احساس پیدا کرنے کا ہے کہ
وہ صرف ایک مسلمان ہی نہیں، ایک ہندوستانی
ہی نہیں بلکہ ایک انسان بھی ہیں، وہ انسان جو
مزدور ہے، جو کسان ہے، جو ٹیچر ہے، قلم کار ہے،
یعنی ایک لفظ میں جو مظلوم ہے۔ اور اگر وہ ایسے
انسان ہیں تو پھر ان کا کوئی "کرن" کرنے کی
ضرورت نہیں۔ وہ ایک سچے مسلمان بھی ہیں۔
اور ایک سچے ہندوستانی بھی۔ مسلمانوں کو اس
حقیقت کا احساس کرنا ہوگا کہ ان کا تعلق اقلیت
سے نہیں بلکہ اکثریت سے ہے۔ اس اکثریت سے
ہے جو ننگی بھوکی ہے، جو بے روزگار ہے، جو ہندوستان
کو آزادی ملنے کے باوجود بھی آزاد نہیں ہے۔ اور
مسلمان اس طبقے کے سب سے زیادہ پسے ہوئے
حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے یہ مسلمان کا فرض
ہے کہ وہ نہ صرف خود صحیح راہ پر چلے بلکہ دوسرے
پسے ہوئے لوگوں کو بھی راستا دکھائے۔ ہندوستان
کی اس غریب مظلوم اکثریت کی لیڈرشپ مسلمانوں
کو اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔ اس لیے کہ وہ اسی
اکثریت کے سب سے زیادہ پسماندہ طبقے سے تعلق
رکھتے ہیں۔

آسام میں نئی تیل رفائنری لگانے کے لیے
تحریک شروع ہوتی ہے۔ پانچ لاکھ لوگ اس
تحریک میں اپنی گرفتاری دیتے ہیں۔ تحریک ایک
معاشی تحریک ہے جس سے صوبے کے تمام غریب
اور پسماندہ عوام کا بھلا ہوگا۔ اس لیے عوام بڑھ
چڑھ کر اس کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی دینے
کے لیے تیار ہیں۔ میرے ایک دوست مجھ سے سوال
کرتے ہیں کہ ان پانچ لاکھ لوگوں میں کتنے مسلمان
تھے؟ جب کہ آسام میں مسلمانوں کی بہت بڑی
تعداد رہتی ہے۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں!!

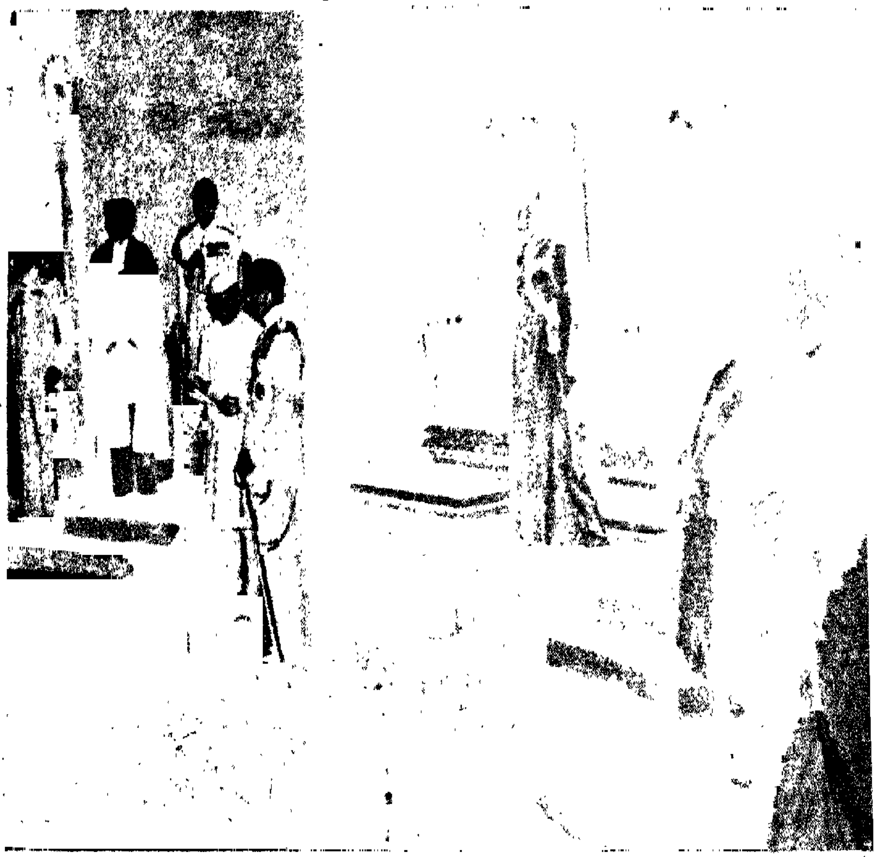
حیدرآباد سے ہمارے ایک دوست آتے
ہیں۔ ان کے ساتھ وہاں کے کچھ دوسرے مسلم لیڈر
ہیں جن میں سے ایک اسمبلی کے ممبر بھی ہیں میں
ان سے سوال کرتا ہوں کہ "تلنگانا تحریک کے بارے
میں تلنگانا کے مسلمانوں کا کیا رویہ ہے؟ (یہ ان
دنوں کی بات ہے جب تلنگانا تحریک شباب پر
تھی۔) وہ بہت فخر کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ
مسلمانوں کو اس تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
میں ان سے پوچھتا ہوں ایسا کیوں ہے؟ تو وہ
جواب دیتے ہیں کیوں کہ یہ مسلمانوں کی تحریک نہیں ہے۔
میں ان سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مسلمانوں
کی تحریک کیوں نہیں ہے؟ کیا تلنگانا میں رہنے والے
مسلمان تلنگانا کا ایک حصہ نہیں ہیں؟ کیا تلنگانا کے
مسائل ان کے مسائل نہیں ہیں؟ کیا تلنگانا کی تحریک
معاشی طور پر پچھڑے ہوئے لوگوں کی تحریک نہیں
ہے؟ کیا یہ تحریک تلنگانا کی معاشی بحالی کے لیے
نہیں ہے؟ اس کا جواب شاید کچھ اس طرح سے
دیا جائے کہ اگر تلنگانا کی معاشی ترقی ہوگی تو اس
سے مسلمانوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ ان کے ساتھ تعصب
اسی طرح قائم رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب مسلمان
کسی تحریک کو اپنی تحریک نہیں سمجھیں گے، کسی علاقے
کو اپنا علاقہ نہیں سمجھیں گے، وہاں کی خوشحالی
کو اپنی خوشحالی نہیں سمجھیں گے تو وہاں کے
دوسرے لوگ تحریک کے نتیجے میں ملنے والے پھل میں
انہیں کس طرح حصہ دار بننے کی اجازت دیدیں گے؟
میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان تلنگانا یا
کسی دوسرے تحریک میں کوئی حصہ لیتے ہی نہیں۔
یقیناً ایسے ہزاروں مسلمان ہیں جو اس طرح کی تحریک
کو اپنی تحریک اور اس کی کامیابی کو اپنی کامیابی
سمجھتے ہیں۔ قصور تو کچھ ہمارے لیڈروں کا ہے۔
جو ہمیں اس قسم کی تحریک سے دور رکھنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ان تحریکوں میں شامل
ہونے کی حالت میں ان تحریکوں کے لیڈر ہمارے
لیڈر بن جائیں گے نہ کہ ہمارے زنگ خوردہ قائد۔

مسئلہ کا اصل حل اس وقت ہی ممکن ہے
جب ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ ہمیں ہر حال میں یہیں
رہنا ہے۔ ہم نے ۱۹۴۷ء میں یہاں رہنے کا فیصلہ
اپنی مرضی سے کیا تھا، ہم پیدا یہیں ہوئے اور
مریں گے بھی یہیں، ہمیں اپنے جائز حقوق بھی یہیں
حاصل کرنے ہیں۔ یہ حقوق ہم اکیلے رہ کر نہیں بلکہ
ہندوستان کے دوسرے مظلوم باشندوں کے ساتھ
ملکر حاصل کرینگے۔ اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے
لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی نہیں چوکینگے۔

اس وقت ہماری آواز صرف مسجد اقصیٰ کے
مسئلے ہی پر نہیں اٹھے گی بلکہ بنگلادیش کے مسئلہ پر
بھی اٹھے گی، اردن میں فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم
کے خلاف بھی اٹھے گی۔ مراکش اور ایران میں عوامی
حقوق کے کچلے جانے کے خلاف بھی اٹھے گی، امریکہ
میں کالوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف بھی اٹھے
گی، ویٹ نام کے بہادر عوام کے لیے بھی اٹھے گی۔
غرض کہ ظلم کے ہر اٹھتے ہوئے ہاتھ کے خلاف اٹھیگی۔
پھر کسی میں ہمت نہ ہوگی کہ وہ ہمارے بھارتیانے
یا ہندیانے کی بات کرے۔ اور اگر کوئی ایسی بات
کرے گا بھی تو اس کی بات پر کوئی کان نہ دھریگا۔
پھر ہمارے "قائدین" کو پانچ پانچ، دس دس کی
ٹولیاں بنا کر پاکستان ایمبیسی کے باہر دکھاوے کے
مظاہرے کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔
ان کی آواز ظلم کے خلاف سارے ہندوستان سے
اٹھنے والی آواز کا ایک حصہ ہوگی۔ ایک ایسا حصہ
جسے حکومت کے اشارے پر مختلف لباس پہننے کی
ضرورت نہ ہوگی۔ اور یقیناً یہ آواز خود ایسی حکومت
کے خلاف بھی ہوگی جو انسانیت نواز نہ ہو۔ ★

رِٹ — عوام کے لیے اہم آئینی قانون

محمد رضی الدین معظم



۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آں جہانی جواہر لال نہرو ہندوستان کے آخری گورنر جنرل سے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کا حلف لیتے ہوئے

دنیا کے جمہوری نظام میں عوام کو ہر قسم کی آزادیاں FREEDOMS حاصل ہوتی ہیں جنہیں اصطلاحی زبان میں بنیادی حقوق FUNDAMENTAL RIGHT کہا جاتا ہے جس کا ذکر ان ممالک کے متعلقہ آئین یا دستور میں پایا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں آئین یا دستور کے ذریعہ ان حقوق کی ضمانت بھی دی جاتی ہے۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے ماہرین قانون نے بھی آئین کی تیاری کے وقت ان حقوق کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہوئے ان کا واضح طور پر تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح ہمارے آئین میں ان کے حذف کر دئے جانے یا ان حقوق میں

کار کی گنجائش قانون رٹ کے ذریعہ فراہم کی گئی ہے۔

قانون رٹ WRIT کا مقصد دراصل اڈمنسٹریشن (انتظامیہ) کی غلطیوں کا تدارک ہوتا ہے۔ اور اس طرح انتظامیہ کو عوامی حقوق کی قربانی دیئے بغیر عمدہ کارکردگی کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

ابتدا سے ہی رٹ کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن تیرہویں صدی عیسوی سے اس کی افادیت بہت زیادہ ہوگئی ہے، برطانیہ کے بادشاہوں خصوصاً ٹیوڈر حکمرانوں کے عہد میں رٹ آج کی طرح عوام کے حقوق کی حفاظت کا ضامن تھا۔ آپ چونکہ ابتداءً

PREROGA TIUE WRITS کہا جاتا تھا اور ان کا اجرا کیا جانا بادشاہوں کے اختیار تمیزی پر منحصر تھا۔ دھیرے دھیرے دنیا کے مختلف ممالک میں رٹ کسی نہ کسی صورت میں نافذ ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کو محدود پیمانے پر ہی سہی اٹھارہویں صدی عیسوی سے یہ طریقہ حق و انصاف انگریزوں نے اپنے مطلب کے لیے جاری کیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی سے ویلفیر اسٹیٹ کا واضح تصور ابھر آیا۔ جسکے باعث حکومتی مشنری میں بیحد توسیع ہوگئی اور انہیں جامع ترین اختیارات حاصل ہوگئے۔ اس طرح عوام کے حقوق کے لیے رٹ لازمی

. ماہرین قانون نے بھی ہمارے دستور میں
دی حقوق کے ساتھ ساتھ رٹ کے لیے جو نہ
ف اڈمنسٹریشن اور ایگزیکیٹو کے خلاف بلکہ
یلیٹو کے تحت حتیٰ کہ دیگر مقاصد کے لیے بھی
ی کو ضروری سمجھا اور اس کی اہمیت وافادیت
مدنظر دستور کے آرٹیکل ۳۲، ۲۲۶ (226 /
ART) میں عوام کو اس کا حق دلایا تاکہ وہ .
یم کورٹ اور علاقائی ہائی کورٹ میں موزوں
ی داخل کرنے کا حق حاصل کر سکیں۔ اسی طرح
ری آزادیوں میں دخل کا بنیادی حق متاثر
یکے قانونی حق کو سلب کرنے یا ان پر کسی قسم کی
ید عائد کرنے وغیرہ پر رٹ کی درخواست
WRIT PETITIO) دی جا سکتی ہے۔ یہی نہیں
حقوق کے سلسلہ میں ہمارے آئین کے پارٹ
(PART : III) میں مندرجہ حقوق کے علاوہ
ی ہائی کورٹ اپنے وسیع اختیارات کے تحت
ر ــــ امور پر بھی غور کر سکتی ہے۔ رٹ کے لیے
ر قوانین کی طرح کوئی خاص علیٰحدہ قانون
نود نہیں بلکہ رٹ کی درخواستیں ہمارے آئین
آرٹیکل کے تحت ہی گزرانی جا سکتی ہیں۔ گو
سلسلہ میں انتظامی نوعیت کے کچھ قواعد بعض
ستوں میں لاگو ہیں چھوٹا رٹ کے لیے سب سے
بات درخواست گزار کا نجی معاملہ ہونا ضروری
اور پھر حق اس کا اپنا حق ہونا چاہئے۔ ہائی کورٹ
سپریم کورٹ میں چھ اقسام کی رٹ پیش ہوتی ہیں
ہر قسم کے قوانین کو چیلنج بھی کیا جا سکتا ہے۔ گرجا
کے پادری کو چرچ کی تعمیر اور اس کے مجاورکو
اکرنے کے لیے دیئے گئے عطیہ کی رقم پر انکم ٹیکس
ہر دن نے ٹیکس لگا دیا جسکے خلاف رٹ منظور کی
یونیورسٹی کے باضابطہ قوانین کی بھی غلط تاویلات
باعث اکثر رٹ کی درخواستیں داخل ہوتی ہیں۔
آباد یونیورسٹی کے چانسلر نے ایک ریٹائر ہونے
لے پروفیسر کو کونسل کی اکثریت سے محروم کرنا چاہا۔
خلاف رٹ داخل کی گئی اور منظور کی گئی۔
سرکاری دفاتر کے اسٹاف کی رٹ بھی وافر

تعداد میں ہوئی ہیں جن میں درخواست گزار کو وجہ
نمائی کا نوٹس نہ دینا SHOW CAUSE NOTICE
انصاف کے اصولوں کے خلاف عمل کرنا، جلد نہ فیصلے
کرنا، شہادت قبول کئے بغیر فیصلے کرنا، دشمنی سے حق
متاثر کرنا، برطرف کرنا یا تنزل کرنا، قابل ذکر ہیں۔
دشمنی کی حد تک تو منسٹر بھی آتے ہیں۔ ایک بار بہار
کے یونیورسٹی منسٹر کے خلاف لائسنس کے منسوخ کرنے میں
دشمنی کا جواز اٹھایا گیا تھا۔ جبکہ متذکرہ منسٹر نے ایک
فرم کے معائنہ کے بعد قانون کے تحت لائسنس منسوخ
کردیا تھا۔ اسکی رٹ اسی بنا پر منظور کر لی گئی۔
جن حالتوں میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ رٹ
کے ذریعہ حقوق میں مداخلت نہیں کرتے بعض کا ذکر
آئین میں خود موجود ہے اور بعض ہائی کورٹ یا سپریم
کورٹ نے وضع کئے ہیں۔ مثال کے طور پر آرٹیکل ۷۳
(ART = 73) کی رو سے صدر و نائب صدر کے
انتخابات کے اعتراضات صرف سپریم کورٹ کو سننے
کا اختیار ہے اور اسکے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ
پیش نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح آرٹیکل ۷۴ (ART)
کی رو سے صدر کو وزراء نے کیا رائے دی تھی، رٹ
کے ذریعہ کسی عدالت میں اٹھایا جا سکتا ہے۔
پارلیمنٹ اور لیجسلیچرس میں ہونے والی کارروائیوں
کو یا ان کے کام کی انجام دہی کے خلاف رٹ جاری
نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح اسپیکر کے فیصلہ پر نظر
ثانی کرنے یا پارلیمنٹ میں پیش کردہ کسی قانون کو
روکنے (جو کتنا ہی غیر قانونی کیوں نہ ہو) کے لیے رٹ
پیش نہیں کی جا سکتی۔ مزید یہ کہ ایوان بالا کے لیے
علما، سائنسدانوں، ادیبوں وغیرہ کا انتخاب اختیاری
ہوتا ہے۔ اسکے خلاف بھی رٹ قابل سماعت نہیں
ہوتی۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی کے اراکین کو ایوان
میں مخصوص آزادی حاصل ہے۔ ان کو بھی رٹ
کے ذریعہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح صدر جمہوریہ
نیز گورنروں کے سرکاری کاموں کے خلاف بھی
رٹ کے ذریعہ TUDICIAL REVIEW
ممکن نہیں۔
رٹ اپنی اہمیت افادیت اور دائرہ عمل کے

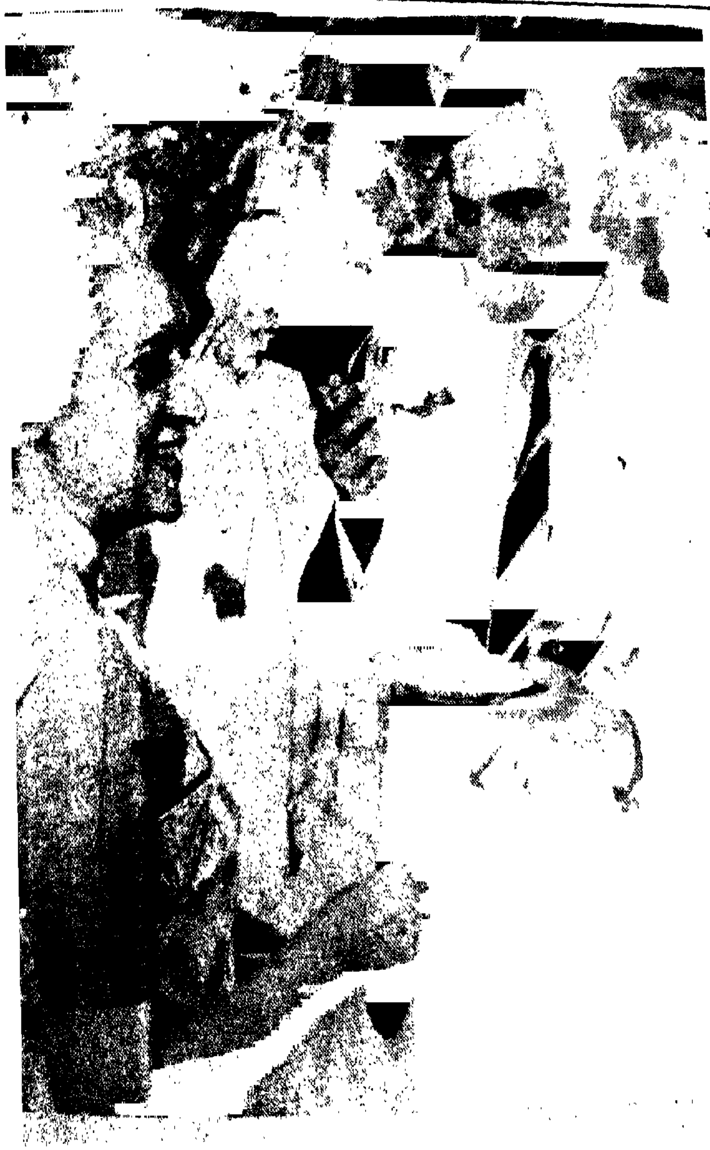
تحت الگ الگ ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں۔
CERTIORARI رٹ جو جوڈیشیل ایکٹس
JUDICIAL ACTS کی غلطیوں کے لیے (جن سے
بنیادی حقوق متاثر ہوتے ہیں) پیش کیا جا سکتی ہے۔
اور اسکی عملداری نیچے کی عدالتوں، ایڈمنسٹریٹیو
ٹربیونل، لوکل اتھارٹی اداروں، آفیسروں منسٹروں
اور ڈپارٹمنٹس پر ہوتی ہے جو انکے اختیارات کے غلط
استعمال اور انصاف رسانی کے منافی کام کرنے قانون
یا حقائق و ریکارڈ بالا کے بالائے طاق رکھ کر حکم جاری کرنے
پر اجرا کی جاتی ہے۔ اسکو عام طور پر سرشوری رٹ کے
نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
سرشوری رٹ کی طرح PROHIBITION
رٹ بھی ہے جو متذکرہ دفاتر اور ادارہ جات وغیرہ
کے خلاف اسوقت منظور کی جاتی جبکہ غیر قانونی، غیر
اختیاری یا غیر مجازی طور پر کی جانے والی کارروائیوں
کو فوری روکنا متصور ہوتا ہے۔ اور ـــــــ
MANDAMUS رٹ پبلک ڈیوٹی کے فرائض کی
تکمیل کرنے کے لیے جاری کی جاتی ہے اور اسکی اجرائی
کے بعد اس رٹ میں بتلائے ہوئے حکم کے ذریعہ طریقہ
کار انجام دینا پڑتا ہے HABEAS CORPUS
رٹ بھی شخص کو غیر قانونی طور پر حراست میں رکھنے پر
جاری کی جاتی ہے ـــــ QUO-WARRANTO
رٹ عوام کے اس حق کی تکمیل کا ذریعہ ہیں جو کسی عوامی
خدمت کے عہدہ پر غیر موزوں شخص کے تقرر کے خلاف
عوام کو حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ـــــــ
QUO-WARRANTO رٹ پیش کیا جا سکتی ہے۔
رٹ کی درخواستیں سوا روپیہ کے رسوم پر داخل
کی جاتی ہیں۔ یہ ابتداءً ہائی کورٹ سماعت کے لیے
قبول کرتے ہیں۔ اور اگر ہائی کورٹ موزوں سمجھے تو
اسکے ذریعہ حکم التوا بھی جاری کیا جاتا ہے ـــ فریقین
کو نوٹس دیا جاتا ہے اور فریقین کی بحث کی سماعت
کے بعد فیصلہ دیا جاتا ہے جسکے خلاف اپیل کی گنجائش
بھی فراہم کی گئی ہے۔ سپریم کورٹ اس سلسلہ میں
اپیل کے لیے بعض صورتوں میں رٹ سماعت کے
لیے قبول کرتی ہے۔

★ ★

کرکٹ کے فاتحوں کا شاندار استقبال

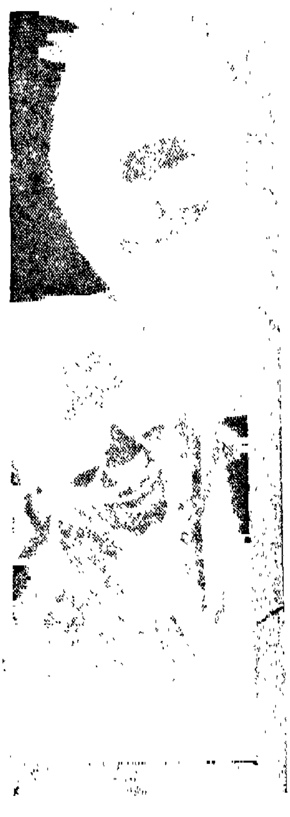


پالم ہوائی اڈے پر ایر انڈیا کے "مہاراجا" نے کھلاڑیوں کا استقبال اس دل چسپ بینر سے کیا۔



دہلی میں فاتح ٹیم کو مسز گاندھی نے ریسپشن دیا۔
اجیت واڈیکر اور مسز گاندھی کسی دل چسپ
مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں۔

پالم ہوائی اڈے پر بیدی اپنی بہن کے ساتھ ↓





امریکا کی بدعہدی

جس نے ہزاروں انسانوں کو موت کی بھٹی میں جھونک دیا

وہ محض اس بنا پر ہار گئے کہ امریکا نے ان سے جو وعدہ کیا تھا سیاست کی تیز تلوار نے اس کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور انھیں میدانِ جنگ میں امریکی سربراہوں کی یقین دہانی کے باوجود ہوائی تحفظ فراہم نہ کیا جا سکا۔ انھوں نے اپنی تمام تر خوش فہمیوں کے ساتھ جنگ مول لی اور انجام کار ہار گئے۔

یہ اتوار کی صبح تھی کیوبا کے پناہ گزینوں کا یہ فوجی دستہ جسے ریاستہائے متحدہ امریکا نے تربیت دی تھی۔ اسلحے سے لیس خفیہ طور پر آہستہ آہستہ سمندری راستے سے فیڈل کاسترو کے کیوبا پر حملہ آور ہونے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ صدر کینیڈی نے چند گھنٹے قبل اس دستے کو حملہ کرنے کے لئے آخری اجازت دے دی تھی۔

اس حملے سے صرف ایک دن قبل ۱۵ اپریل ۱۹۶۱ء کو امریکا کے بی۔ ۲۶ بمباروں نے اچانک حملہ کر کے فیڈل کاسترو کی چھوٹی سی ہوائی طاقت کو تہس نہس کر دیا تھا اور اب کاسترو کے پاس صرف سات ہوائی جہاز باقی رہ گئے تھے۔ کیوبا پر دوسرے ہوائی حملے کی تاریخ ۱۷ اپریل کی صبح مقرر ہوئی۔ اس ہوائی حملے کے ساتھ ہی یہ بھی طے پایا تھا کہ کیوبا پر چھاپہ بردار فوج اتار دی جائے تاکہ کاسترو کی باقی ماندہ ہوائی طاقت

بھی دبایا جا سکے۔ امریکا کی ہوائی کمک کے بلبوتے میں تعینات کے بھروسے پر ہی حملہ آور دستہ آگے بڑھتا رہا اور دوشنبہ ۱۷ اپریل کی صبح کو ساحل پر اتر گیا۔ ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل کاسترو مخالف کیوبیوں کا یہ دستہ آہستہ آہستہ خلیج خنزیر (Bay of Pigs) تک پہونچ گیا۔ یہی مقام تصادم کے لئے مقرر تھا۔

تصادم کے وقت حملہ آوروں کا پلہ بہت بھاری تھا۔ کاسترو فوجوں کو شروع میں بھاری نقصان پہنچا۔ کاسترو کے پاس ہوائی طاقت نہیں کے برابر تھی اور اس کے دبابوں کی اہمیت امریکا کے ہوائی حملوں کے سامنے ایسی ہی تھی جیسے کسی شکاری کے سامنے پانی کے کنارے بیٹھی ہوئی بے فکر بطخیں ہوں۔ جنگ جاری تھی اور حملہ آوروں کا یہ دستہ بڑے بھروسے کے ساتھ امریکا کی ہوائی کمک کا انتظار کر رہا تھا۔

اتوار کی صبح امریکا کے بی۔ ۲۶ بمباروں کا چھوٹا سا مگر طاقتور دستہ خلیج خنزیر سے پانچ میل دور ایک ہوائی اڈے پر حملہ کرنے کے لئے اڑان بھرنے کو بالکل تیار کھڑا تھا۔ ان ہوائی جہازوں کو اڑانے کے لئے بھی کیوبا کے ہوا باز مقرر کئے گئے تھے لیکن یہ ہوائی جہاز بروقت اڑان نہ بھر سکے کیونکہ عین وقت پر صدر کینیڈی نے ان کی اڑان پر پابندی لگا دی تھی۔

دوشنبے کی صبح جب حملہ شروع ہوا تو ہوائی تحفظ کا سوال اٹھا۔ واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے وہ غیر فوجی سربراہ جنہوں نے اس حملے کا نقشہ مرتب کیا تھا پریشان ہو کر صدر کینیڈی کے پاس دوڑے اور صدر سے استدعا کی کہ وہ اپنے سابقہ فیصلے پر نظرثانی کریں یا فوراً کوئی نیا فیصلہ کریں۔ انھوں نے صدر کو مشورہ دیا کہ امریکا کے ایک ہوائی جہاز بردار بحری بیڑے کو فوراً حملہ آوروں کی مدد کو پہونچنے کی ہدایت دی جائے۔ اس وقت وہ بحری جہاز اپنے ہوائی جہازوں سے لدے ہوئے بالکل تیار کھڑے تھے اور ایک اشارے پر حملہ آوروں کی مدد کو پہونچ سکتے تھے۔

اس حملے کا نقشہ مرتب کرتے وقت صدر آئزن ہاور اور ریاستہائے متحدہ کے چیف آف اسٹاف نے یہ طے کیا تھا کہ امریکا کاسترو مخالف کیوبیوں کے حملے کے دوران مکمل ہوائی تحفظ فراہم کرے گا لیکن صدر کینیڈی نے اس وقت بھی اس اسکیم کو ویٹو کر دیا تھا اور بضد تھے کہ کاسترو مخالف اور حامی

صدارت میں امریکا کی براہِ راست کسی کی پشت پناہی نہ ہونے کے اختلافِ رائے کی بنا پر حملہ آور کو ہوائی تحفظ دینے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو ایجنسی کے کام دوسرے بہانے تلاش کرنے لگے تاکہ انکو راہِ راست سے ہٹایا جا سکے لیکن ۱۷ اپریل کو پھر صدر نے اپنے سابقہ فیصلے کو دہراتے ہوئے کہا کہ حملے میں ہوائی جہاز شرکت نہ کریں گے۔

ایک طرف صدر کینیڈی اپنے فیصلے پر اڑے ہوئے دوسری طرف باغی کیوبائی کاسترو فوجوں سے نبرد آزما انھیں پتہ نہیں معلوم تھا کہ خلیج خنزیر سے ایک ہزار میل دور واشنگٹن میں صدر کینیڈی بحیثیت مقتدرِ اعلیٰ انکی قسمت کے بارے میں عجیب اور بھیانک فیصلہ کر چکے ہیں، انھوں نے ہوائی تحفظ کی فراہمی کے سابقہ فیصلے کو بدل دیا تھا۔

ہوائی کمک کی عدم موجودگی نے حملہ آوروں کو عجیب مشکل میں پھنسا رکھا تھا۔ کاسترو نے اپنے باقی ماندہ ہوائی جہاز میدان میں بھیج دیا تھا۔ یہ کاسترو جیٹ جو امریکا میں بنے تھے حملہ آوروں پر بمباری کرنے لگے۔ بمباری کر کے کاسترو حامی فوجوں نے حملہ آوروں کے پانچ بحری جہازوں کے بیڑے میں سے دو جہازوں کو غرقاب کر دیا۔ ان جہازوں میں سے ایک تو وہ تھا جس پر حملہ آور دستے کے اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا دوسرا جہاز رسل و رسائل کا واحد ذریعہ تھا۔ کاسترو کے جیٹ جو اب ہوائی حملوں سے محفوظ تھے میدان میں آکر تباہی مچانے لگے۔

ان حالات کی خبر جب امریکا پہونچی تو وہاں کے فوجی اور غیر فوجی رہنماؤں میں کھلبلی سی مچ گئی اور ایک مرتبہ پھر صدر کینیڈی کو حالات سے آگاہ کرنے اور انھیں جلد ہی کوئی نیا فیصلہ دینے پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی، اس بار صدر کچھ نرم ہوئے اور انھوں نے محدود ہوائی کمک دینے پر رضامندی ظاہر کی، لیکن بدقسمتی سے موسم بہت خراب تھا اس لئے فوری طور پر جہازوں کی اڑان میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ پھر یہ طے ہوا کہ منگل کی صبح کو یہ ہوائی جہاز کیوبا پر حملہ کرنے کے لئے اڑان بھریں گے۔

منگل تک حملہ آوروں کی حالت بگڑتی ہی رہی پھر بھی وہ ایک موہوم سی امید پر ہوائی تحفظ کے بغیر دشمن کا مقابلہ [illegible] کرتے اور مرتے رہے۔ لیکن اب انھیں کاسترو کی فوجوں نے کافی پیچھے دھکیل دیا تھا۔ ۱۸ اپریل کی رات کو حملہ آور جنگ بازوں کے سر پر بدقسمتی کا ایک طوفان خیمہ زن تھا۔ انکی حالت بے حد ابتر ہو چکی تھی، انھیں اب تک ایک لمحے کا بھی آرام میسر نہ ہوا تھا مسلسل فائرنگ کرتے رہنے کی وجہ سے ان کی انگلیاں سوج گئی تھیں۔ بھوک اور پیاس نے انھیں جانکنی کی حالت کو پہونچا دیا تھا۔ پھر بھی کسی خوش گمانی کی بنا پر انکے حوصلے بہت بلند تھے۔

جنگ کی اس صورتِ حال کی اطلاع جب صدر کو پہونچائی گئی تو وہ وہائٹ ہاؤس کی ایک ضیافتی پارٹی میں مشغول تھے پھر بھی یہ اطلاع پاکر انھوں نے مہمانوں سے اجازت چاہی اور اپنے فوجی اور غیر فوجی معاونوں سے مشورہ کرنے چلے گئے۔ انکے معاونوں نے پھر ایک مرتبہ یہی رائے دی کہ حملہ آور کیوبائیوں کو ہوائی مدد ملنا ضروری ہے۔ اس بار پھر صدر نے ان کا مشورہ مانتے ہوئے یہ حکم دیا کہ بدھ کی صبح ایک گھنٹے کے لئے امریکا کا ایک ہوائی بیڑہ اس مقصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ایک گھنٹے کے اس ہوائی پروگرام میں حملہ آوروں کو فضائی تحفظ دینا، انھیں ضرورت کی چیزیں فراہم کرنا اور ساتھ ہی کیوبا کے ہوائی جہازوں پر شدید وار کر کے انھیں تباہ کرنا شامل تھا لیکن صدر اب بھی اس بات سے متفق نہ تھے کہ کیوبا کے زمینی مورچوں کو بھی نشانہ بنایا جائے۔

یہ فیصلہ ہوا بھی تو بدقسمتی سے بہت دیر میں، اور ساتھ ہی مکمل طور پر اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا کیونکہ کیوبا کے ہوائی جہازوں نے دخل اندازی کر کے حملہ صحیح وقت پر نہ ہونے دیا اور ساتھ ہی نشریات میں بھی مسلسل رخنہ اندازی ہوتی رہی۔ حملے کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ ہوا بازوں کو صرف ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا جو اتنے بڑے کام کو انجام دینے کے لئے نہیں کے برابر تھا، اور یہ وقت بھی مسلسل کیوبائی جہازوں کی خلل اندازی کی وجہ سے نکل گیا۔

۱۹ اپریل کی شام تک حملہ پورے طور پر ناکام ہو چکا تھا، حالانکہ حملہ آوروں نے کاسترو کی فوجوں کو کافی نقصان پہونچایا تھا اور امریکی تخمینے کے بموجب کاسترو کے دو ہزار فوجی کام آئے تھے جب کہ حملہ آوروں کی طرف صرف سو جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ لیکن ثابت قدمی کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جنگ کسی توقع کی بنا پر لڑی جاتی ہے۔ امریکا کی طرف سے ہوائی مدد کی امید ختم ہوتے ہی حملہ آوروں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور ان کی اب تک کی ثابت قدمی اور بہادری ان کا مذاق اڑاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ سارے کے سارے سلامت اور زخمی حملہ آور کاسترو کے قیدی ہو گئے۔ لاشوں کو سڑنے یا پرندوں کی غذا بننے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

امریکا کے جن فوجی سربراہوں نے اس حملے کو ترتیب دیا تھا ان کا کہنا ہے کہ فتح کا پانسہ صرف ایک بال کے برابر فرق سے پلٹ گیا۔ اگر ابتداً ہوائی طاقت کو بروئے کار لے آیا جاتا تو کاسترو کے باقی ماندہ ہوائی جہازوں اور دبابوں کو آسانی سے تباہ کیا جا سکتا تھا، اس طرح حملہ آوروں کا دباؤ کاسترو فوجوں پر رہ جاتا، ساتھ ہی کاسترو کی فوج میں جو پھوٹ پڑ گئی تھی اس میں اضافہ ہو جاتا اور اس صورتِ حال کو دیکھ کر کیوبا کے اندر چھپے ہوئے باغی جو فتح کی خوش کن خبر کا انتظار کر رہے تھے خود بھی اندرونی طور پر کاسترو سے برد آزمائی کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن انھیں مجبوراً روپوش ہی رہنا پڑا کیونکہ انھیں حملے کا انجام معلوم ہو چکا تھا۔

وہائٹ ہاؤس میں موجودہ ریکارڈ میں صدر کینیڈی کے اس فیصلے کا جو جواز موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر نے محض اس خوف سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر وہ ہوائی حملے کی کھلی اجازت دے دیتے تو اس سے بہت اہم خطرہ یہ پیدا ہوتا کہ لاطینی امریکا کی عوامی رائے اور اقوام متحدہ کی خصوصی رائے امریکی پالیسی کی طرف سے خراب ہو جاتی، اور شاید اسی خطرے کے پیشِ نظر ابتدا ہی سے اس بات پر ہمیشہ زور دیا گیا کہ امریکا اپنے کسی کمزور پڑوسی کے خلاف طاقت کا استعمال نہ کرے گا۔ اسٹیٹ سکریٹری ڈین رسک بھی صدر کے پرزور حامی تھے اسی لئے اس حملے کے دوران نہ امریکا کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف نے کوئی سرگرمی دکھائی اور نہ اعلیٰ فوجی عہدے داران ہی میدانِ عمل میں آ سکے حالانکہ ان سب کی رائے یہی تھی کہ جب امریکا ہی نے نقشہ مرتب کر کے کیوبا پر حملہ کروانے کا فیصلہ کیا ہے تو اسے عملی طور پر ان باغیوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ لیکن اخیر تک ان کے مشوروں کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور صرف امریکی خفیہ ایجنسی اور وہائٹ ہاؤس کی مرتبہ پالیسی پر ہی عمل کیا گیا جس کا نتیجہ ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوا اور چند ہی دنوں میں ہزاروں مظلوم بلا مقصد وہائٹ ہاؤس کی چہار دیواری کے اندر مرتب کیے ہوئے کاغذی نقشے کی بھینٹ چڑھ گئے۔

محمد غلام رسول

برطانیہ میں فٹ بال



ازمنہ وسطیٰ میں بغرض تفریح ایک قسم کا کھیل کھیلا جاتا تھا
ی حد تک فٹ بال سے مشابہت رکھتا تھا لیکن اس دور
ہ اس کھیل کی کوئی تنظیمی شکل تھی اور نہ اسکے قاعدے قانون
دیکھا جائے تو منظم شکل میں فٹبال کھیلنے کی ابتدا ایک صدی
ہی ہوئی جبکہ اسے دو مختلف طریقوں سے کھیلنے لگے۔ ایک
میں کھلاڑی صرف پیروں کا ہی استعمال کرتے تھے لیکن
ے طریقہ میں نہ صرف پیروں کا استعمال ہوتا تھا بلکہ کھلاڑی
کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے اور پکڑتے بھی تھے۔

طریقۂ اول آج دنیا میں انتہائی مقبول ہے۔ جسے دنیا
ل کے نام سے جانتی ہے اس طریقہ کی ابتدا ۱۸۵۵ء میں
رج میں ہوئی تھی۔ دوسرے طریقہ کی ابتدا RUGBY SCHOOL رگبی اسکول میں ہوئی اور ۱۸۵۹ء میں اسے BLACKHELTH FOOTBALL CLUB نے اپنایا تھا جب سے اس کھیل کو رگبی فٹبال کہا جانے لگا۔

فٹ بال ایسوسی ایشن۔

انگلینڈ میں یوں تو کھیل کود کی ترقی و ترویج کیلئے بہت سی تنظیمیں ہیں۔ لیکن فٹبال کے کھیل کی نگرانی اور ترقی کیلئے ایک علیحدہ تنظیم ہے جسے نہ صرف جزائر برطانیہ کے ہی عوام بلکہ دنیا بھر کے اسپورٹس کے شائقین فٹبال ایسوسی ایشن (F.A) کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور آج یہ عالم ہے کہ ساڑھے تین سو سے زائد فٹ بال کلب اس تنظیم سے منسلک ہیں۔ جن میں مستقل ممبر کلب ۲۰۰ سے زائد ہیں اور باقی کلبوں کی حیثیت عارضی ہے۔ ذیل میں F.A کے اغراض و مقاصد پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) F.A کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ عوام الناس میں فٹبال سے دلچسپی بڑھائی جائے اور زیادہ سے زیادہ اسے مقبول بنایا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے متعلق قوانین کا احترام کیا جائے اور اس کی خلاف ورزی کسی بھی صورت میں نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ کسی بھی کھیل کے قوانین و شرائط کی پابندی کھلاڑیوں کا فرض اولین ہے۔

(۲) مذکورہ ایسوسی ایشن کا دوسرا اہم مقصد ملک کے ہونہار اور باصلاحیت کھلاڑیوں کو کوچنگ اور موزوں تربیت دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایسوسی ایشن کی جانب سے

است نئی دہلی

تقریباً ۱۰ ہزار پونڈ کی کثیر رقم سالانہ صرف کی جاتی ہے۔ اور کھلاڑی مذکورہ تربیت کے بعد نہ صرف ملک کی قومی ٹیم میں اپنا مقام حاصل کرتے ہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت سے حامل ہو جاتے ہیں۔

(۱۳) (F.A) فٹبال ایسوسی ایشن ہر سال متعدد ٹورنامنٹ اور فٹبال کے مقابلوں کا انعقاد کرتی ہے۔ جن میں چند اہم ٹورنامنٹ یہ ہیں۔ امیچر کپ AMETURE CUP نیشنل یوتھ کمپٹیشن (NATIONAL YOUTH COMPETITION) لیکن سب سے زیادہ اہمیت اور ملک گیر مقبولیت کا جو مقابلہ وہ فٹ بال ایسوسی ایشن چیلنج کپ ہے۔ اسے شائقین F.A. CUP کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

فٹ بال ایسوسی ایشن تمام ٹورنامنٹ اور مقابلوں کے اختتام پر اچھے کھلاڑیوں کا انتخاب کرتی ہے جن سے انگلینڈ کی قومی فٹبال ٹیم بین الاقوامی مقابلوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ انگلینڈ کی فٹبال ٹیم دنیا میں ایک بہت بڑی طاقتور ٹیم مانی جاتی ہے۔ ۱۹۶۶ء کے ورلڈ کپ فٹبال ٹورنامنٹ میں اسی ٹیم نے چمپین شپ حاصل کی تھی اور اس مرتبہ ۱۹۷۰ء کے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں انگلینڈ کی ٹیم نے بہتر کھیل کا مظاہرہ کیا۔

انگلینڈ کی طرح اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور ویلس میں بھی فٹبال کی نگرانی کے لئے علیحدہ علیحدہ تنظیمیں ہیں جن کے نام بالترتیب
Scottish football association
Irish football association اور
Football association of Wales.
[illegible] F.A کے اغراض و مقاصد کی کم و بیش پیروی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان میں کئی علاقائی اور صوبائی ایسوسی ایشنس ہیں جن سے منسلک کلبوں کی تعداد تقریباً پچیس ہزار ہے۔

ان تمام تنظیموں کے علاوہ انگلینڈ اور ویلس کے تقریباً ۹۰ پیشہ ورانہ فٹبال کلبوں پر مشتمل ایک الگ تنظیم ہے جو FOOT BALL LEAGUE کہلاتی ہے۔ اس لیگ کے زیر اہتمام انگلینڈ اور ویلس میں خصوصی نوعیت کے متعدد پیشہ ورانہ مقابلوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح اسکاٹ لینڈ میں اسکاٹش فٹبال لیگ میں ۳۷ کلب بحیثیت ممبر شامل ہیں۔ اور آئرلینڈ میں بھی ایک آئرش فٹبال لیگ ہے۔ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں جو فٹبال لیگ ہیں یہ ہر سال اپنے ممالک میں لیگ چمپین شپ کے مقابلوں کا انعقاد کرتی ہیں۔ جن میں لیگ سے متعلقہ ٹیمیں شرکت کرتی ہیں۔ ان ٹیموں کو دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے مقابلوں کے درمیان گروہوں کی ٹیم کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا پڑتا ہے۔ مقابلوں کے اختتام پر سب سے زائد پوائنٹس حاصل کرنیوالی ٹیم کو چمپین ٹیم کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ ان مقابلوں کے دوران تقریباً ۳ کروڑ شائقین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور جس سے آمدنی ۵۰، ۶۰ لاکھ پونڈ کے درمیان ہوتی ہے۔

انگلستان میں F.A کی جانب سے جو F.A CUP ٹورنامنٹ کا انعقاد ہوتا ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ طور پر جاری رہتا ہے۔ FA CUP کا فائنل لندن کے قریب واقع ویمبلی اسٹیڈیم WEMBLEY STADIUM میں کھیلا جاتا ہے۔ اس اسٹیڈیم میں ایک لاکھ شائقین کے لئے گنجائش ہے اسیطرح اسکاٹش کپ کا فائنل گلاسگو میں۔ HAMPDEN PARK ہیمپڈن پارک میں کھیلا جاتا ہے۔

انگلستان میں پیشہ ور کھلاڑیوں کی بنسبت شوقیہ کھلاڑیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ شوقیہ کھلاڑیوں کی تعداد بشمول اسکولی طلبا اور نوجوں کے ۲ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ جبکہ پیشہ ور شوقیہ کھلاڑی صرف سات یا آٹھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔ انگلستان میں ایک پابندی یہ ہے کہ شوقیہ کھلاڑیوں کی ٹیمیں پیشہ ور کھلاڑیوں کی ٹیموں کے ساتھ مقابلوں میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیشہ ور کھلاڑیوں کی تربیت مخصوص طریقے سے کی جاتی ہے اور ان پر ایک کثیر رقم صرف کی جاتی ہے۔ شوقیہ کھلاڑیوں کی ٹیموں کیلئے ایک علیحدہ ٹورنامنٹ ہوتا ہے جو فٹبال ایسوسی ایشن امیچر چیلنج کپ کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طرح انگلستان میں رگبی فٹبال (جسے RUGGER بھی کہا جاتا ہے) کی نگرانی کے لئے بھی ایک رگبی فٹبال یونین ہے۔ اس یونین کا قیام ۱۸۷۱ء میں عمل میں آیا تھا چونکہ رگبی فٹبال کا کھیل موجودہ فٹبال کے کھیل سے قطعی مختلف ہے۔ اس لئے اس کے قواعد و قوانین بھی فٹبال کے قواعد و قوانین سے قطعی مختلف ہیں۔ رگبی ٹیم میں بجائے گیارہ کھلاڑیوں کے پندرہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، ویلس آئرلینڈ اور فرانس کی رگبی فٹبال ٹیموں کے مابین وقتاً فوقتاً بین الاقوامی سطح پر مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ لندن تو رگبی فٹ بال یونین کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ انگلینڈ کی رگبی فٹبال ٹیمیں اکثر نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کا دورہ کرتی ہیں۔ اور اس کے جواب میں ان ممالک کی ٹیمیں بھی انگلستان کا دورہ کرتی ہیں۔ ان بیرونی طرز کے مقابلوں کے علاوہ بھی RUGGER کے متعدد ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ جن میں کاؤنٹی چمپین شپ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے درمیان ہونے والے سالانہ مقابلے بھی عوام کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

انگلستان کے شمالی علاقوں میں رگبی فٹ بال لیگ کے مقابلے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اس مقابلے کیلئے ہر ٹیم میں ۱۲ یا ۱۳ کھلاڑی شامل رہتے ہیں۔ اس مقابلے میں پیشہ ور اور شوقیہ کھلاڑیوں کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ اس مقابلے کے علاوہ انگلستان کا سب سے بڑا مقابلہ رگبی لیگ چیلنج کپ RUGBY LEAGUE CHALLENGE CUP کا فائنل ہے جو کہ ویمبلی اسٹیڈیم میں کھیلا جاتا ہے اسکی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ کئی سال سے اس اسٹیڈیم میں فائنل دیکھنے کے لئے ۹۵ ہزار شائقین موجود رہتے ہیں۔

جزائر برطانیہ کے مختلف ممالک کی فٹبال اور رگبی ایسوسی ایشن کی کارکردگیوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس معیار کی ایک بھی فٹ بال ایسوسی ایشن ہمارے ملک میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کے نوجوان ابھرتے ہوئے کھلاڑیوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے ملک میں کوئی باقاعدہ تربیتی کیمپ نہیں لگتا۔ بیشمار کھلاڑی خواہ وہ کسی بھی کھیل سے تعلق رکھتے ہوں ایسے ہیں جنہیں مستقبل میں کوئی بھی سہولت میسر نہیں ہوتی جسکی وجہ سے انکی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ملک کی قومی فٹبال ٹیم جو کہ بین الاقوامی مقابلوں کیلئے منتخب کی جاتی ہے کبھی پہلے راؤنڈ یا دوسرے راؤنڈ سے آگے نہیں بڑھتی۔ آج سے دس سال قبل ہماری قومی فٹبال ٹیم نے روم اولمپک میں نمایاں کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

کاش کہ ہمارے ملک میں بھی غیر ممالک جیسی سہولتیں میسر ہوں تو عجب نہیں کہ عالمی فٹبال میں ہندوستان بھی اپنا مقام بنا لے۔

—

سقاط حمل اب قانونی طور پر جائز قرار دیدیا
ہے۔ یہ نیا قانون ۲ اگست کو لوک سبھا میں
ت رائے سے پاس کیا گیا۔ راج سبھا پہلے ہی
تجویز کے حق میں رائے دے چکی تھی۔ اس تجویز کے
تھے صحت اور فیملی پلاننگ کے وزیر ڈاکٹر ڈی پی
دھیائے۔ جب سے یہ قانون پاس ہوا ہے طرح
ح کی چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں۔ بعض لوگوں
ل ہے کہ اس نئے قانون سے عوام کے اخلاق
ت بُرا اثر پڑے گا جب کہ بعض لوگ اسے ایک
ضرورت سمجھتے ہیں۔

یہ موضوع کافی غور و توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے اصحابِ فکر و نظر اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ سنجیدہ اور اہم مضامین کو غیر جانبداری سے "واقعات" کے کالموں میں جگہ دی جا سکے۔ (ادارہ)

گیا ہے۔ یورپ اور امریکا سے ہزاروں کی تعداد میں لڑکیاں محض اسی مقصد کے لئے برطانیا آنے لگی ہیں۔ امریکا میں اس سلسلے میں مختلف صوبوں میں مختلف

"ہم کم خرچ پر اسقاطِ حمل کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔" سویڈن میں بھی اسقاطِ حمل قانونی طور پر جائز ہے۔ سنگاپور میں عرصے سے اس کی مخالفت کی جا رہی تھی لیکن ۱۹۷۰ء میں وہاں بھی اسقاطِ حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا۔

فرانس میں معزز خواتین کا سنسنی خیز انکشاف

پچھلے دنوں فرانس کی کئی معزز خواتین نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں انھوں نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی اس جرم میں ملوث رہ چکی ہیں۔ فرانس میں اسقاطِ حمل اب بھی جرم ہے اور وہاں اسقاطِ حمل کو قانونی حیثیت

اسقاطِ حمل کی آزادی

مرار عظمت

ممالک میں اسقاط حمل

یا کے تقریباً سبھی ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک
س مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے کہ اسقاط حمل کی
، ہونی چاہئے یا نہیں؟۔ کچھ ممالک میں اس
میں عوام کو کافی "چھوٹ" دے دی گئی ہے
کچھ ممالک میں اسے جرم سمجھا جاتا ہے اور سخت
یں دی جاتی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں برطانیا میں
حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا
ب بھی وہاں اس قانون کی مخالفت جاری ہے
کا کہنا ہے کہ اس نئے قانون کی وجہ سے اب
ے اخلاق ... کرداری اور فحاشی کا اڈا بن

قانون نافذ ہیں۔ نیویارک میں اسقاط حمل پر کوئی پابندی نہیں جبکہ منی سوٹا میں یہ ایک سنگین جرم ہے لیکن وہاں کچھ ایسی باتیں ہیں جو ہمارے ملک کے لوگوں کے لئے حیرت انگیز ہیں۔ وہاں ایسی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے کہ اس میں عورتوں کو اس سلسلے میں تمام معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

جاپان میں اس سلسلے میں پوری "چھوٹ" دی گئی ہے اور ایک اندازے کے مطابق وہاں ہر سال دس لاکھ عورتیں اس سہولت سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یوگوسلاویہ میں تو اسقاطِ حمل کے لئے اخبارات میں اشتہارات شائع ہوتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ

دلانے کے لئے آئے دن تحریکیں چلائی جاتی رہتی ہیں۔ یہ پمفلٹ اسی قسم کی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اس "اعتراف" پر فرانس کی ۳۴۳ معزز خواتین کے دستخط ہیں جن میں ملک کی مشہور ادیب، شاعر اداکار اور متعدد دوسری معزز خواتین شامل ہیں۔ اس میں سے سیمون ڈی لو، مارگریٹ ڈیوراس فرینکوئس ساگان، کرسچین روچیفرڈ، جان مورو اور کیتھرین ڈینیوب قابلِ ذکر ہیں۔ اس انکشاف نے فرانس میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اب اسقاطِ حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ اس تحریک

یاہ ... کی ہولے ہے جو مشہور فرانسیسی
ژاں ... سارتر کی ساتھی ہے۔
اوتر نے اپنے ناول " سیکنڈ سیکس" میں اسی قسم
ات کا اظہار کیا ہے۔ اس مسئلے پر تبصرہ
ہوئے کمیونسٹوں کے روزنامہ " ایل یومینیتے"
ھا ہے:۔
ب تک صرف حسبِ خواہش بچوں کو جنم دینے
نہیں دی جاتی ملک ترقی نہیں کر سکتا"
یک اور مشہور روزنامے نے لکھا ہے:۔
س سلسلے میں فوری کوئی اقدام نہ کرنا چاہیئے
س مسئلے کو جڑ سے سلجھانے کی کوشش کی جانی
ہیئے"

اسقاطِ حمل ہمارے ملک میں۔

اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کے دو ارکان نے حمل کو قانونی حیثیت دینے کی مخالفت کی تھی۔ وہ دو ارکان رنجن درما اور بند دمتی داس تھے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

" ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں میں اسقاطِ حمل کو بہت بڑا گناہ بتایا گیا ہے اس لئے ہمارے ملک میں اسقاطِ حمل کی اجازت قطعی نہیں دی جانی چاہیئے"

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ قدیم کتابیں جو آج سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال قبل لکھی گئیں کیا آج کی زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں تب یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک نہیں ہے بلکہ یہاں کئی مذاہب اور فرقوں کے لوگ رہتے ہیں اور یہاں کوئی مذہبی حکومت نہیں بلکہ سیکولر حکومت ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں لکھے ہوئے قوانین دیگر مذاہب کے لوگوں پر بھی لادنے کی کوشش کی جائے۔ اگر رنجن درما کے زاویئے سے سوچا جانے لگے تو سارے ہی قوانین بدلنے پڑیں گے اور ایک ہندو حکومت کا قیام کرنا ہوگا۔ اسطرح ایسے قانون نافذ کرنا ہوں گے جو ہزاروں سال قبل بنائے گئے تھے، اور اس وقت وہ ٹھیک بھی تھے لیکن اب اگر انھیں نافذ کر دیا گیا تو ہندوستان ہزاروں



اسقاطِ حمل کے آپریشن کا ایک منظر

سال پہلے کے دور میں چلا جائے گا اور ظاہر ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ تو درکنار خود ہندو بھی اسے پسند نہ کریں گے۔ اس لئے کسی مسئلے کو صرف قدیم مذہبی کتابوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرنا درست نہ ہوگا۔

اس تجویز کی مخالفت میں شریمتی ہندومتی داس نے جو بحث کی وہ قدرے جاندار تھی۔ انھوں نے کہا کہ:۔

آج کا ہندوستان تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے ان ممالک سے قطعی مختلف ہے جہاں اسقاط حمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جنسی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ میں ہم ابھی اس درجے کو نہیں پہونچے ہیں جہاں جاپان اور مغرب کے چند ممالک پہونچ چکے ہیں۔ اسلئے اگر ہمارے ملک میں اس قسم کی "چھوٹ" دے دی گئی تو ہمارا ملک اخلاقی طور پر دیوالیا ہو جائے گا۔ بدکردار لوگ اس قانون کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

لیکن کیا اخلاقی اعتبار سے اپنے ملک کو دیگر ممالک سے بلند سمجھنا خوش فہمی نہیں ہے۔ جنسی بے راہ روی میں ہندوستان کسی بھی مغربی ممالک سے پیچھے نہیں ہے بلکہ ہمارے بعض بڑے شہر تو مغربی شہروں سے کچھ آگے ہی ہیں۔ اسٹرپٹیز اور دوسرے قسم کے عریاں رقص جو بہت سے مغربی ممالک میں قانونی طور پر بند کر دیئے گئے ہیں، بمبئی، مدراس، کلکتہ اور دہلی کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ عوامی زندگی سے قریب ہیں انھیں بداخلاقی، بدکرداری اور ناجائز جنسی تعلقات کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

اگر اسقاط حمل کو جائز قرار نہ دیا جائے تب بھی بدکار لوگ اپنا مقصد پورا کر ہی لیتے ہیں، غیر قانونی طور پر ہی سہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں ہر سال ۲۰ لاکھ ایسے معاملے ہوتے ہیں، اور کچھ ذمے دار لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تعداد ۲۰ لاکھ نہیں بلکہ ۱۲۰ لاکھ ہے۔ ماں بننے والی عورتوں میں سے ۳۰ فیصدی حمل ساقط کر دیتی ہیں۔ ویسے ان عورتوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں [illegible] اکثر مجبور

کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے ایک سروے کے مطابق شادی شدہ عورتوں میں حمل ساقط کروانے والی عورتوں کی تعداد ۵ء۳ فیصد تک تھی۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ حمل ساقط کروانے والی عورتوں میں ۱۰ سے ۲۰ فیصدی تک غیر شادی شدہ ہوتی ہیں

متعدد مسائل کا حل:۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہ اسقاط حمل کو اگر قانونی طور پر جائز قرار دے دیا جائے تب بھی ایسی عورتیں اپنا مقصد پورا کر ہی لیتی ہیں اسلئے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ اس نئے قانون سے عوام کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس کے خلاف اس نئے قانون سے متعدد مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات جائز حمل کی صورت میں بھی بچے کی پیدائش سے ماں کے جسم پر یا ذہن پر خطرناک اثرات پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے اور کبھی کبھی طبّی وجوہات کی بنا پر پیدا ہونے والے بچے کی جسمانی یا ذہنی صحت مشکوک ہو جاتی ہے ان دونوں صورتوں میں بچے کی پیدائش کی بجائے حمل ساقط کر دینا مناسب ہوتا ہے۔ پہلے ایسے حمل ساقط کرنے کے لئے بھی بڑی قانونی پیچیدگیوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا لیکن اب ایسے مسائل آسانی سے حل ہو جایا کریں گے۔ اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں جب حمل ساقط کرنا ناگزیر ہو جائے۔ اس لئے اس قانون سے نقصان کی بجائے فوائد زیادہ ہیں۔ جسطرح سانپ کا زہر انسانی زندگی کے لئے انتہائی خطرناک بھی ہے اور وہی زہر مختلف قسم کی دواؤں میں استعمال ہو کر انسان کو نئی زندگی بھی بخشتا ہے اسی طرح یہ نیا قانون مضر بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔ اہم چیز یہ قانون نہیں بلکہ اسے برتنے کا شعور ہے۔

ماہرین کی رائے:۔

اس قانون پاس کئے جانے سے قبل مقررہ کمیشن نے پچاس اہم ڈاکٹروں سے اس سلسلے میں گفتگو کی تھی ان میں سے اکثریت نے اسے ایک مناسب قانون اور ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ:۔

" چونکہ ملک میں اسقاط حمل ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہے اس لئے یہ کام چوری چھپے ہوتا ہے۔ نصف

عورتیں جن میں اکثر مظلوم اور مجبور بھی ہوتی ہیں، نیم حکیموں کے ہتّھے چڑھ جاتی ہیں اور اکثر اپنی صحت بلکہ جان تک گنوا بیٹھتی ہیں۔ جو عورتیں حمل ساقط کرانے آتی ہیں ان کے کئی مسائل ہوتے ہیں۔ وہ بخوشی ایسا نہیں کرتیں بلکہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتی ہیں ان مجبور و بے کس عورتوں کو مکمل سہولتیں ملنی چاہئیں

بڑھتی ہوئی آبادی کا مطالعہ کرنے کے لئے جو بین الاقوامی ادارہ قائم کیا گیا ہے اس کے چیرمین ڈاکٹر اگروال نے کہا کہ یہ نیا قانون آبادی پر قابو پانے کے سلسلے میں ایک موثر قدم ہوگا۔

جسٹس کھوسلا نے کہا کہ "اگرچہ اسقاط حمل کا تصور بڑا ہی گھناؤنا ہے لیکن چند صورتوں میں یہ فعل ناگزیر ہوتا ہے اور اسقاط حمل کی آزادی سے کئی مظلوم، مجبور اور بے بس عورتوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں، کئی زندگیاں تباہ ہونے سے بچائی جا سکتی ہیں۔ اس قانون سے ان ماؤں کو سہولت ملے گی جو غیر ضروری بچوں کے بوجھ سے بچنا چاہتی ہیں۔ ان کنواری ماؤں کو سہولت ملے گی جو نہیں چاہیں گی کہ ان کے کئے ہوئے گناہ کا کفارہ انکے معصوم اور بے گناہ بچوں کو ادا کرنا پڑے۔

بچے اسی وقت نعمت ہیں جب وہ خوشی سے اور اپنی خواہش سے پیدا کئے گئے ہوں۔ ان چاہے بچے دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہیں۔ اپنے ماں باپ، اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے ہی نہیں بلکہ خود اپنے لئے بھی۔

کیتا خروشچیف

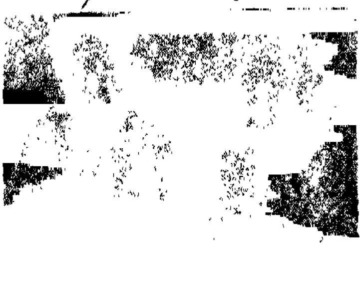
س صدی کا عظیم ترین سیاستدان

سپریم سوئیٹ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ پورا
عوام کے نمائندوں سے بھرا ہوا تھا۔ نکیتا خروشچیف
ئے ہوئے اسٹالن کی غلطیوں اور اس کے ظلم
پول کھول رہے تھے۔ ابھی خروشچیف نے اپنی بات
بھی نہیں کی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی ـــــ "جب
الن یہ سب کر رہے تھے تب آپ کہاں تھے ـــ"
وشچیف بولتے بولتے رک گئے اور پھر گرج کر بولے
ون ہے یہ بدتمیز؟" پورے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ خروشچیف
ایک بار پھر پوچھا "سوال کس نے پوچھا تھا؟" سامنے
ے سب خاموشی سے بیٹھے رہے۔ اس پر خروشچیف نے
نس کر کہا "دوست میں اُس وقت تمہاری
گہ پر تھا۔"

۱۹۵۳ء میں اسٹالن کی موت پر روسی کمیونسٹ
رٹی کے فرسٹ سکریٹری بننے سے پہلے نکیتا خروشچیف
ے روس کے باہر شاید ہی کوئی واقف تھا۔ لیکن
۱۹۵ء سے ۱۹۶۴ء تک خروشچیف نہ صرف روس
سیاست پر بلکہ پوری دنیا کی سیاست پر چھائے
ہے۔ خروشچیف نے نہ صرف روس کی سیاست کو
ر بین الاقوامی سیاست کو بھی بہت سے نئے موڑ
ئے۔ روس میں اسٹالن کی سخت گیر پالیسی کو ختم



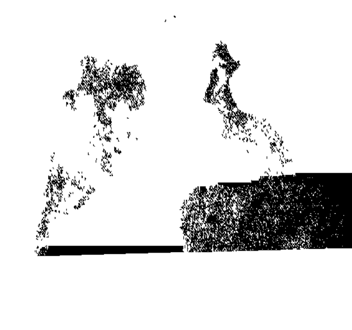
کریملن میں اسٹالن کے ساتھ ([illegible])



[illegible] کے ساتھ ([illegible])



کاسترو کے ساتھ



خروشچیف ہی کے دور میں روس خلائی دوڑ میں
امریکہ سے آگے نکل گیا۔

خروشچیف نے کئی بار دنیا کو جنگ عظیم کے دہانے
میں پہونچنے سے روکا۔ خروشچیف نے ہی سامراجی
طاقتوں کے ساتھ بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل
کرنے کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ ان کی اسی پالیسی
کی وجہ سے چین اور روس میں نظریاتی اختلافات
پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری بین الاقوامی
کمیونسٹ تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

جون کینیڈی سے ملاقات کے بعد خروشچیف سیدھے
چین گئے جہاں انہوں نے چیرمین ماؤزے تونگ
سے ملاقات کی اور انہیں اپنی نئی پالیسی کے بارے
میں سمجھایا۔ کہا جاتا ہے کہ خروشچیف کی باتیں سننے
کے بعد ماؤ نے کہا کہ "سامراجی طاقتیں کاغذی شیر
ہیں۔" اس کے جواب میں خروشچیف نے کہا "لیکن اس
کاغذی شیر کے دانت ایٹمی ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ
خروشچیف سے اس بات چیت کے بعد ماؤ نے انہیں
باہر نکل جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

خروشچیف نے جہاں روس کو بہت کچھ دیا وہاں
انہوں نے کچھ غلطیاں بھی کیں۔ خروشچیف کے والد
ایک کھان مزدور تھے اور خود خروشچیف نے بہت
سخت زندگی گزاری تھی۔ اپنے بارے میں ان کا
کہنا تھا کہ "میں نے اسی وقت سے کام کرنا شروع
کر دیا تھا جب سے کھڑا ہونا سیکھا تھا۔" خروشچیف
کا ڈیل ڈول اور چہرہ مہرہ بالکل روسی کسانوں جیسا
تھا۔ ان کے بات کرنے کا طریقہ کچھ اس قسم کا تھا کہ
عوام ذرا ہی سی دیر میں ایسا محسوس کرنے لگتے تھے
کہ وہ عوام ہی کا ایک حصہ ہیں۔

کومت چھینی گئی تو ان پر الزام تھا کہ انہوں نے
تالن کی طرح اپنی شخصیت کو ضرورت سے زیادہ
بھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے زیادہ سے
یادہ طاقت اپنے ہاتھوں میں جمع کر لی! انہوں نے
ہین کے ساتھ روس کے نظریاتی اختلاف کو
اؤ کے ساتھ اپنا ذاتی اختلاف بنا لیا۔ امریکہ اور
دوسرے سرمایہ دار ممالک کی طرف ان کی پالیسی
ضرورت سے زیادہ نرم تھی۔ ان میں سے بہت
ے الزامات میں کافی حد تک سچائی بھی ہے۔ اپنے
دورِ حکومت کے آخری چند برسوں میں خروشچیف
ں اس قسم کی بہت سی خرابیاں پیدا ہونی شروع
ہوگئی تھیں۔



فرصت کے
اوقات میں
کتب بینی



صدر نکسن کے ساتھ
جنہیں وہ بالکل ناپسند
کرتے تھے۔

پھر بھی یہ گول مٹول ہنس مکھ لیڈر روسی اور
بین الاقوامی سیاست پر ایک عرصے تک نہ مٹنے والی
چھاپ چھوڑ گیا ہے۔

خروشچیف اپنے آخری دنوں میں سیاست سے
الگ ہی رہے لیکن انہوں نے یہ دن کافی آرام
سے گزارے۔ ماسکو کے قریب ایک گاؤں میں
حکومت کی طرف سے ایک عمدہ مکان، کار
مہیا کر دیے ہوئے تھے۔ ان کے دوست اور
رشتہ دار ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کے
گھر والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے آخری دن بہت
سکون اور خوشی کے ساتھ گزارے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ۷۷ برس کی عمر میں دنیا کے

اس عظیم سیاست داں اور مدبر کی موت ہوگئی۔
لیکن خروشچیف ان شخصیتوں میں سے ہیں جن کی
چھاپ بساطِ سیاست ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ★



راجندر سنگھ بیدی کی دستک

فلمی دنیا

ابوالفیض

کا

اہم تجربہ۔ ایک سنگ میل۔ یا۔ ایک سوا

راجندر سنگھ بیدی اردو ادب کے ایک مایہ ناز افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کے مقام سے ساری اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ دوسرے فنکاروں کی طرح، بیدی کا فلمی دنیا کی طرف رُخ کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ فنکار، فن کی تخلیق اور اس کی بہتر سے بہتر پیش کش کیلئے نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کی تلاش میں رہتا ہے اس جدید ترقی یافتہ دور میں دوسری باتوں کے علاوہ ہماری تہذیبی، سماجی اور قومی زندگی کی تہذیب و ترتیب، اس کی اصلاح اور اس کی تعمیر کے لیے، مادی اور مالی وسائل کے ساتھ ساتھ فکر و دانش اور جاں سوزی کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کامیاب فلم کے پروڈکشن کے لیے ان دونوں عناصر کا حسن ترتیب سے اکٹھا ہونا ضروری ہی نہیں لازمی بھی ہے۔ ان میں سے کسی ایک عنصر کی کمی سے بھی فلم گویا ایک ایسا خام تصور بن جاتی ہے جس میں اگر نقش ہو تو رنگ نہ ہو اور رنگ ہو تو نقش نہ ہو۔

"دستک" کی پیش کش، راجندر سنگھ بیدی کا واقعی ایک جرأت مندانہ اقدام ہی نہیں بلکہ معرکہ بھی ہے۔ مالی حیثیت سے کم مائگی اور طرح طرح کی حوصلہ شکن دشواریوں کے باوجود بیدی نے اپنے ایک نہایت موثر اور رگ احساس کو جھنجھوڑنے والے افسانے کو سلولائیڈ پر اسی خوبی اور اسی کامیابی سے پیش کیا ہے جس طرح ان کا قلم فنکارانہ شان اور فنکارانہ عظمت سے، سفید کاغذ پر جاندار اور معنی خیز الفاظ اور جملے بکھیر جاتا ہے۔ ماحول کی سچی عکاسی احساسات و جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ، فنکارانہ حسن لطافت اور نقّادانہ حسن بصیرت بھی۔

فلم کی کہانی، ہندوستانی دیہی علاقے کے ایک نوجوان حمید کی شادی اور پھر بمبئی جیسے پُر فن شہر میں جہاں وہ ملازم ہے، کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقلی سے شروع ہوتی ہے۔ حمید (سنجیو کمار) جو کسی کمپنی میں ایک معمولی ملازم ہے۔ راست باز اور شریف النفس ہے مجبوری کے عالم میں اور انجانے میں اس نے ایک ایسا مکان کرایہ پر لے لیا جس میں اس سے پہلے کوئی طوائف (شکیلہ بانو بھوپالی) رہتی تھی ایک ایسے بدنام ٹھکانے پر ایک شریف نوجوان رہنا کس قدر دشوار اور تکلیف دہ ہے اس کا اندازہ فلم دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے مکان دار انور حسین) کی مجرمانہ کوشش کی تاک جھانک اور تیکھی نظریں، گا جانا۔ یہ سب کچھ ایک نوشادی شدہ کے لیے اور خاص کر حمید کی بیوی سلمیٰ سلطان) کے لیے جس کو، دن میں گ پڑتا ہے۔ کس قدر غضب ناک مسئلہ شدت اور گہرائی سے پیش کرنا راجندر ہی حصہ تھا۔

یہ مختصر فلم، کہانی کی روانی کے سا ہے مگر سطحی ذوق رکھنے والے یا عام



دستک کا ایک سین

رمولا فلموں کا ذوق رکھنے والے تماشائیوں کے لیے
بی اکتاہٹ کا باعث بن جاتی ہے لیکن اس میں
تو بیدی کا کوئی قصور ہے اور نہ فلم ہی کا بلکہ اس
ذمہ دار خود تماشائیوں کا معیارِ ذوق، اور پسند
ہے۔ کہانی کے ہر موڑ پر احساسات و جذبات کے
وج اور تلاطم کو بیدی نے اسی کامیابی سے پیش
یا ہے جو کہ ان کے قلم کا طلسم ہے۔ خاص کر سلمیٰ
جان لیوا تنہائی گھٹن، گھبراہٹ اور نفسیات
شدید کش مکش اور ایسے عالم میں گائے جانے
ے ایک گیت کے پس منظر میں پیش کیے گئے
لمحے، جن کی مثال اس سے پہلے کبھی نہیں ملتی؛
یقیناً ہماری فلم انڈسٹری کے کامیاب تجربے ہیں۔
اتھ ہی شہری زندگی کی الجھنیں، کالے دھندے
نتروں کی بدعنوانیاں، مکانوں کی قلت اور حوصلہ
کن کرائے اور بگڑیاں، مسلمانوں کو کرایہ پر بھی مکان
دینے کا انسانیت سوز رجحان، شہری زندگی کے غیر
انی عادات و اطوار۔ دوسری طرف دیہی زندگی
خلوص و پیار اور کیا کیا کچھ —— یہ نہ صرف
نی بلکہ ہدایت کاری کی بھی جان ہے۔

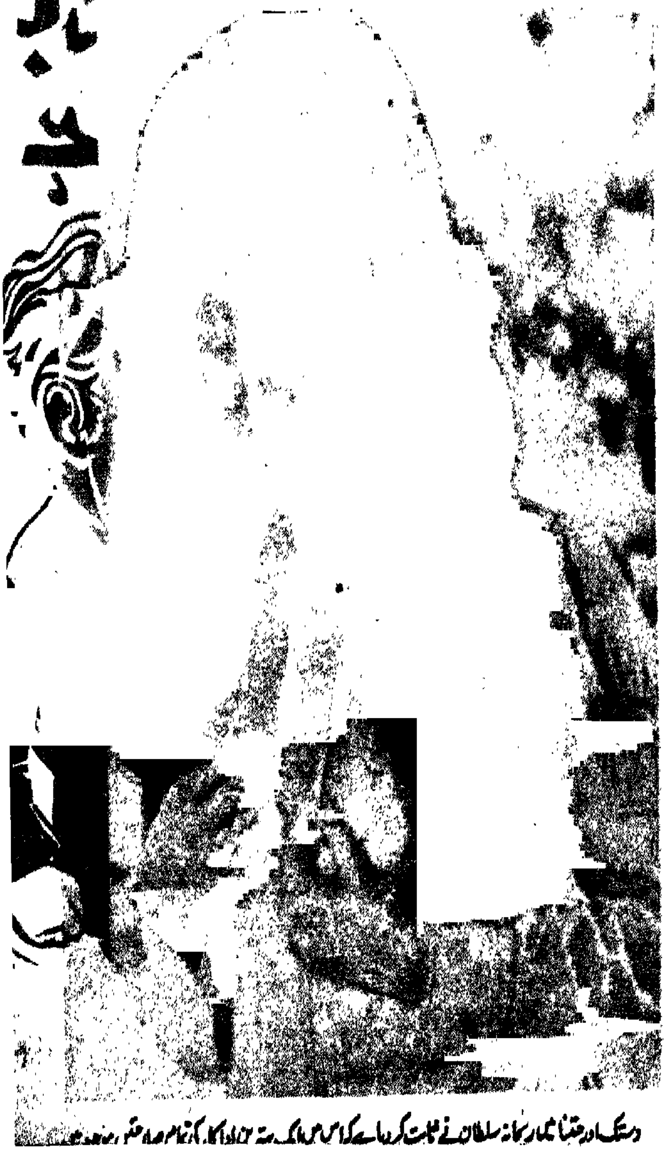
لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوصف
ستک" کو علمی، ادبی حلقے، دانشوروں اور فنکاروں
ہٹ کر تمام لوگ کیوں زیادہ پسند نہیں کرتے؟

دراصل اعلیٰ قدریں، اعلیٰ معیار ہی کی دین
تی ہیں جو اعلیٰ ظرفی اور اعلیٰ ذوقِ نظر کی طلب گار
تی ہیں۔ عوام میں کچھ ہی افراد یا ایک خاص طبقہ
ان معیاروں پر پورا اتر سکتا ہے۔ یعنی عوام معیار
ام کی باتوں سے بڑی حد تک بے بہرہ ہی رہتے
ں، اور ان سے اس قسم کے ذوق کا مطالبہ کرنا
میری نظر میں ایک طرح کی زیادتی ہے۔ اور
فلمیں (خواہ وہ کسی افسانوی یا تاریخی کتاب یا
نی پر مبنی ہوں فلمیں ہی ہوتی ہیں۔ ان کے بعض
اضے، کچھ ضرورتیں اور چند مصلحتیں بھی ہوتی
ں۔ زندگی کے تعلق سے کسی بھی حقیقت پسندانہ
طۂ نظر رکھنے والے فن کار، ادیب یا شاعر یا پروڈیوسر
ڈائریکٹر کو ان جزو پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

جہاں تک کہ فلم کے حقیقی فنی پہلو کا تعلق ہے
سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان نے بیدی کی کہانی کے
کرداروں کو اپنی پوری فن کارانہ صلاحیتوں سے
اجاگر کیا ہے۔ کاروباری پنواڑی کے روپ میں
انور جبین اور طوائف کے کردار میں شکیلہ بانو بھوپالی
نے بھی اچھی اداکاری کی ہے۔ رنجو مہیندر، دھن موہن
کرشن اپنے مختصر اور خاموش کردار میں ناکام نہیں
ہیں۔ موسیقی بھی گوارا ہے۔ خاص کر "ہم ہیں متاعِ
کوچہ و بازار کی طرح" والی غزل کی دھن بڑی
پیاری ہے۔ مجروح کا کلام کم سہی مگر وقیع ہے۔

سارے مکالمے تو نہیں مگر چند مکالمے یقیناً
ہیں۔ فلم بندی میں بیدی صاحب ... ناظر
کی بجائے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ ... تو
"دستک" اس سے زیادہ کامیاب ہوتی۔

بحیثیت مجموعی راجندر سنگھ بیدی کی ا...
پہلی کامیاب پیش کش کو ہندوستان ...
میں بہا تو خیر نہیں مگر قابلِ قدر تجربہ اور ایک اہم
سنگ میل ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن
کے ارباب حل و عقد اور عوامی حلقوں ...
کے لیے ایک غور طلب سوال بھی ہے۔



دستک اور فلم میں ریحانہ سلطان نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ایک [illegible]

لیتے تھے کہ پانی زیادہ مقدار میں مہیا کیا جائے اور ہسپتالوں کا انتظام ہو۔ لیکن ایک عرب بزرگ کا کہنا تھا کہ "۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل لڑائی میں عربوں کی جو جائدادیں ختم ہوئی ہیں وہ واپس دلائی جائیں" اس پر دایان بولے۔ مہربان میں ایک مصروف آدمی ہوں اور میرے پاس ماضی کی تاریخ سننے کا وقت نہیں ہے۔

دایان کے پاس ۲۳ برس پہلے کی تاریخ سننے کا وقت نہیں ہے لیکن فلسطین پر اپنے ڈھائی ہزار سال کے حق کو دہراتے ہوئے انکی زبان نہیں تھکتی۔ یہ سب طاقت کے کرشمے ہیں۔ اگر عربوں کی کوئی منظم طاقت ہوتی اور وہ کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم ایک مشترک دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو گئے ہوتے تو آج حالات کا رخ دوسرا ہوتا اور موسٹی دایان کو "ماضی کی تاریخ" سننے سے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ عربوں کو بے بس سمجھتے ہیں اس لئے اگر انکی فوری ضرورت کے مسائل پر توجہ دے لی تو یوں سمجھ کر انھوں نے عربوں پر بہت بڑا احسان کر دیا۔

حالات کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ مقبوضہ عرب علاقوں کے لوگوں کی ایک خاصی تعداد اپنے آپ کو بے بس سمجھنے لگی ہے۔ اردنی دریا کے مغربی کنارے پر رہنے والے عربوں کو اردن اور اردن کے اڈوں سے لڑنے والے فدائین سے بڑی توقعات تھیں، لیکن حسین کی ظالم بدو فوج کی ظالمانہ کارروائیوں سے جو فدائین کے خلاف کی گئی تھیں ان کے دل ٹوٹ گئے۔ نتیجے میں اسرائیل کی ان کوششوں کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی جو وہ عربوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے شروع سے کرتا رہا ہے۔

> حکمراں قوم کو ہر جگہ ایسے "ہم کار" مل جاتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کیلئے قومی مفادات کو قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اسرائیلی حکومت کو بھی ایسے "ہمکار" مل گئے ہیں اور ان میں خاص طور سے "مذہبی رہنما" شامل ہیں۔

عرب امور سے متعلق شعبے۔

مختلف محکموں میں اسرائیل نے پہلے ہی "عرب امور سے متعلق خصوصی شعبے" قائم کر رکھے ہیں اور شعبوں کو چلانے کے لئے اسرائیل بہت سے عربوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ حکمران قوم کو ہر جگہ ایسے "ہم کار" مل جاتے ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے لئے قومی مفادات کو قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں اسرائیلی حکومت نام نہاد مذہبی رہنماؤں کو جن میں مسلمان عیسائی اور دروزی شامل ہیں خریدنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

۷۰ سال کے محمد علی جباری "ان ہی رہنماؤں" میں سے ایک ہیں۔ کسی زمانے میں وہ اردن کی حکومت میں وزیر رہ چکے ہیں اور ۱۹۴۰ء سے ہیبرون کے میئر چلے آرہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں تقسیم فلسطین کے بعد اگرچہ انھوں نے مغربی اردن کے علاقے کو اردن کے ساتھ ملانے کی تحریک چلائی تھی لیکن جنگ جو عرب اس بات کو کبھی نہیں بھولے کہ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے ہیبرون میں اسرائیلی فوجوں کا استقبال کیا تھا۔ اس کے بعد ہی سے مسٹر جباری، موسٹی دایان کے مقربین میں شامل ہیں اور دایان انھیں ایک دانشور کہتے ہیں۔ دو ہفتے قبل جب جباری تل ابیب پہونچے تو انکا وہاں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور انہیں تل ابیب کے میئر یہوشوا رابنووشنر کا مہمان بنایا گیا اور موسٹی دایان نے ان سے گھل مل کر باتیں کیں۔

مسٹر جباری پر دایان کو خاصا اعتماد ہے۔ اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ گزشتہ ماہ انھیں ۲۳ شہروں اور دیہات کے سربراہوں کی ایک میٹنگ منظم کرنے کی اجازت دیدی۔ اس میٹنگ کا مقصد لبنان کی اس اپیل کے خلاف احتجاج کرنا تھا جس میں عرب لیگ سے مغربی ساحل کی سبزیوں، پھلوں اور مصنوعات کا اس بنیاد پر بائیکاٹ کرنے پر زور دیا گیا تھا کہ عربوں کے اس سامان میں اسرائیلی سامان

کے دوران یہ اپنی نوعیت کی پہلی میٹنگ تھی جس کے لئے اسرائیلی حکام کی طرف سے سخت ہدایت تھی کہ اس میں سیاست زیر بحث نہ لائی جائے۔

> حریت پسند فلسطینیوں نے طے کیا ہے کہ خوف و ذلت کے طلوے پر وہ آزادی کی "خشک روٹی" کو ترجیح دیں گے۔ خاص تل ابیب میں بموں کے دھماکے ظاہر کر رہے ہیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔

اس میٹنگ کے بعد جباری صاحب نے دایان کا اس حد تک اعتماد حاصل کر لیا ہے کہ اب انھیں سیاسی بحث و مباحثے کے لئے میٹنگ طلب کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ لیکن جباری صاحب کی مشکل یہ ہے کہ انھیں اپنے مطلب کے لیڈر نہیں مل رہے ہیں۔ عرب لیڈر اس قسم کی میٹنگ میں شرکت سے جھجک رہے ہیں اول اس لئے کہ اس قسم کی میٹنگ کا انتظام دایان کے نمک خواروں کے ہاتھوں میں ہے اور دوسرے اس لئے کہ چھاپاماروں نے سیاسی بحث پر خود اپنی پابندی لگادی ہے اور مغربی ساحل کے عرب لیڈروں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر وہ اسرائیلیوں کے آلۂ کار بنے تو انھیں اس کا نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

چھاپامار اعلان کے حامی عرب اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جباری صاحب کا مقصد بقول خود اسرائیل کے فوجی قبضے کو ختم کرنا ہے۔ امریکی نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے ساحل اور بیت المقدس (یروشلم کا عرب حصہ) کے لئے اقوام متحدہ کی پانچ سال کی نگرانی اور اس کے بعد اپنی حیثیت کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دینے کی تجویز پیش کی۔ لیکن فلسطینی حریت پسند اس طویل عمل کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اسرائیل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے چین ہیں اور خاص تل ابیب میں بموں کے دھماکے ظاہر کرتے ہیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ دہشت پسند جان کی بازی

ایڈسن ارانٹیس دونا سیمنٹو
(EDSON ARANTES DONA SEIMENTO)

ہے۔ اس تیس سالہ نوجوان کھلاڑی کی پیدائش ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ریو ڈی جینرو (جنوبی امریکا) سے ۲۰۰ میل مغرب بمقام ٹریس کوراکوس (TRES CORACOES) حبشی خاندان میں ہوئی۔ یہ سابق پروفیشنل فٹ بالر "ڈوون ڈن ہو" (DON DIN HO) کی تین اولاد میں سب سے بڑا ہے۔ پیلے کی عمر جب چار سال کی تھی اس کے والد کو گھٹنے میں سخت چوٹ آئی اور فٹ بال کھیل کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا۔

ناقابلِ تلافی حالات کے تحت پیلے فیملی کو ٹریس کوراکوس سے ہجرت کرکے یہاں سے مغرب کی جانب ایک بڑے شہر "باؤرو" (BAURU) میں قیام پذیر ہونا پڑا۔ ظاہر ہے جس گھر میں فٹ بال کھیل کا ماحول رہا ہو وہاں اس سے دلچسپی اور شوق پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ شروع ہی سے شہنشاہِ فٹ بال پیلے نے پھٹے پرانے موزوں کی بال بناکر ننگے پاؤں کھیلنا شروع کیا۔ اس زمانے میں لوگ اس کو "ڈوون ڈن ہو" کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔

دوسرے لاطینی امریکنوں کی طرح اس نے بھی فٹ بال کو اپنی زندگی کا ایک اہم جزو سمجھا اور "باؤرو" کی ایک نوجوان ٹیم میں کھیلنا شروع کیا وہاں اس کی ملاقات ولڈی مار ڈی بریٹو (VEL-de-mor-de-Brito) سے ہوئی۔ وہ اسے لے کر سانٹوس کلب میں آیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی۔ ہم منٹ پریکٹس کے بعد پیلے نے ایک کنٹریکٹ پر دستخط کئے۔ پہلے انٹرنیشنل کھیل کے بعد ہی اس نے ایک لاکھ ملین اسٹرلنگ تک یورپین ٹیم کی پیش کش کو ٹھکرادیا اور آج تک اپنے محبوب کلب سانٹوس سے منسلک ہے۔

اس کھلاڑی نے ۱۹۵۰ء سے سانٹوس میں کھیلنا شروع کیا اسنے ریٹائر ہونے تک ۱۰۸۶ گول بنائے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے گول سخت ترین بین الاقوامی مقابلوں میں اسکور کئے ہیں۔

۱۶ سال کی عمر میں پیلے برازیلین انٹرنیشنل کھلاڑی بنا۔ اس ہیرو شاندار کھلاڑی نے بین الاقوامی فٹبال مقابلوں میں وہ چیزیں پیش کیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ شاندار گول بنانے والا پیلے جس کے دونوں پیر دل میں غضب ناک شاٹ زبردست بال کنٹرول۔ بال میں شاٹ لگانے کے بعد بجلی کوندجانے والی کیفیت ان تمام اوصاف کی سند کے لئے برازیلین پوسٹل اسٹامپ موجود ہے۔ اس عظیم کھلاڑی کا کہنا ہے کہ:۔

"کھلاڑی کا گول پوسٹ پر صحیح شاٹ یقینی گول کی دلیل ہوتی ہے۔"

۱۹۵۸ء سے پیلے نے ۴ بار ورلڈ کپ مقابلوں میں شرکت کی جن میں سے تین بار برازیل ورلڈ کپ ہولڈر رہا۔ اس کے کارنامے کو دنیا کے ہر بڑے اخبار کی شاہ سرخیوں کی جگہ دی۔ شہزادوں، سیاست والوں، پارلیمنٹرین میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ عظیم کھلاڑی ہونے کی وجہ سے دولت مند ممالک نے اپنے شہر کی سڑکوں کے نام بدل کر پیلے کے نام پر رکھے۔ یادگاریں تعمیر کیں۔ نیشنل ٹورسٹ ایکزیبیشن کا ایک حصہ پیلے کی تصویروں کا ہے۔ صدر برازیل نے پیلے کو "قومی ملکیت" قرار دیا ہے۔ اس کی زندگی پر ایک فلم بھی ریلیز ہونے والی ہے۔

کھیل کے میدان کے علاوہ وہ میدان عمل میں بھی اپنی شریک حیات روزمیری (ROSE MAARY) کے لئے بہت اچھے شوہر اور دو بچوں (لڑکیاں کیلی کرسٹنا (۴ سال) اور ایڈسن ہو (۹ ماہ) کے لئے اچھے والد ہیں۔ انکی شادی ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ وہ مقامی بینک میں پبلک ریلیشن آفیسر (PUBLIC RELATION-OFFICER) ہیں۔ اس کے علاوہ ایک الاسٹک فیکٹری کے مالک بھی ہیں۔ مستقبل قریب میں پیلے ڈرامے میں اداکاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ ایک برازیلین میگزین کی اشاعت کے تحت پیلے ۲۱ ہزار اسٹرلنگ ماہانہ آمدنی کے مالک ہیں۔

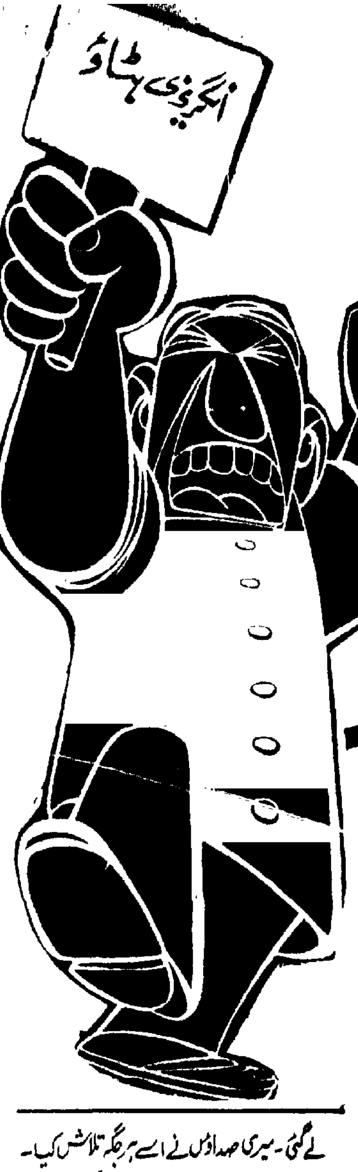
بعد پیلے نے "ماراکانا" اسٹیڈیم میں یوگوسلاویہ انٹرنیشنل کے خلاف کھیلتے ہوئے ہاف ٹائم کے وقفے پر ایک لاکھ اڑتیس ہزار فٹ بال تماشائیوں کے سامنے بین الاقوامی فٹ بال مقابلوں سے اپنی علیحدگی کا اعلان اپنی مشہور جرسی نمبر ۱۰ اتار کر ایک بچہ "امراؤ" کے ہاتھ میں دے کر کیا۔ اس وقت پورا اسٹیڈیم "علیحدہ نہ ہو، علیحدہ نہ ہو" کی صدا سے گونج اٹھا۔

بین الاقوامی فٹ بال مقابلوں سے علیحدگی کے بعد وہ مزید تین سال تک اپنے محبوب کلب سانٹوس کی طرف سے کھیلتا رہے گا، اس کے بعد پورے طور پر ریٹائر ہوجائے گا۔

ظفر احمد جاوید



جۂ حرارت جب نقطۂ انجماد سے نیچے آتا ہے تب
نے لگتا ہے۔ لیکن میرے جسم کا درجۂ حرارت
تو نہیں پھر بھی لہو نسوں میں منجمد ہوتا ہوا محسوس
ہے۔
لت پہونچنے سے تازہ بہتے ہوئے خون کی سُرخی سیاہی
جاتی ہے اور ہوا کے سیل میں آنے سے خون جمنے
ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار یہ منظر دیکھا تھا اگر
آنکھوں میں یہ منظر تکرار کے ساتھ اب تک کیوں
ہے؟۔ شاید یہ بات صحیح ہے کہ آدمی اپنی طبعی موت
لے بھی ہزاروں بار مر چکا ہوتا ہے۔ میرا یہ احساس میرا
نہیں ہو سکتا ۔ کہ ۔ میں مر چکا ہوں۔ کس کو معلوم
دوں کی قوتِ احساس زندوں کی بنسبت زیادہ شدید
یادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی اس تجربے کا اظہار
بار صرف ایک بار کر سکتا تو شاید یہ حقیقت
نہ رہتی۔
لیکن یہ موت کیسی ہے کہ وہ مر کر بھی جی رہی ہے۔
کی بھی تو کئی اقسام ہوتی ہیں۔ اس کی موت کس
ے میں آتی ہے یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے۔
موت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وقت ایک ایک
ایک ایک لمحے کا سفر طے کر کے موت اور زندگی کو
دوسرے سے ملاتا ہے اور اس میں برسوں لگتے
یہ الگ بات ہے کہ ہر لمحہ انسان اپنے اندر مرتا رہتا
مگر مکمل موت میں تو برسوں لگ جاتے ہیں لیکن
کی موت نہ لمحوں کی موت تھی نہ برسوں کی۔ لمحوں لمحوں
مٹتا ہوا آدمی پوری طرح مدت پر جا کر بکھر جاتا ہے
کی موت کچھ ایسی ہی تھی جیسے تیز آندھی میں کوئی
سبز شاخ سے ٹوٹ کر گرے اور شاخ سے
ہو جانے کے باوجود زرد نہ ہو۔ زندگی اور موت
یانی منزل۔ اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب
سی طرف سے دلوں میں نفرت کی آندھیاں چلنے
یں۔
جیسے جیسے دن ڈھلتا ہے اسایا بڑھنے لگتا ہے
میرے سارے وجود کو اپنی آغوش میں دبوچ
ہے۔ میں کانپ اٹھتا ہوں۔ ہنگاموں میں گھر جاتا
چاروں طرف صرف شور ہی شور سنائی دیتا ہے



ناسور

حسن رہبر

خوف۔ دہشت۔ سراسیمگی۔ عجب بھیانک منظر ہے
فضاؤں میں پھیلی ہوئی سسکیاں اور آہ و زاری دماغ
پر پے در پے ضربیں لگا رہی ہیں۔
لمبے چھرے کی نوک سے خون ٹپک رہا ہے۔
انگریزی ہٹاؤ تحریک کا میں مخالف ہی سہی، پھر
بھی میں نے اس کی حمایت میں نکلنے والے جلوس کا ساتھ
دیا۔ لمبا جلوس اونچے نعرے لگاتا ہوا عام شاہراہوں
سے گزرتا رہا۔ راہ میں جہاں بھی انگریزی میں لکھے سائن
بورڈ۔ پوسٹر یا نیم پلیٹ ملے۔ تارکول پھیر پھیر کر انکی
ہیئت بدل دی گئی۔ لیکن راستے میں ایک جگہ جب
جلوس کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ہجوم مشتعل ہو گیا
نیا خون ۔ نئی جوانی ۔ آن واحد میں آدمیت کے جو
صدیوں پرانے رشتے تھے ٹوٹ گئے۔ اور شدید
طوفان میں بڑے بڑے پیڑ اکھڑ گئے، شاخوں اور
پتوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ہوا نے کچھ نہ چھوڑا ۔
سب کچھ گرد و غبار بن کر اڑ گیا۔ سائے اتنے طویل
ہوئے کہ ہر چیز سیاہی کی تہہ میں چھپ گئی۔
اور وہ ایک برگ نوخیز۔ سنا ہے۔ ہوا اسے کہاں اڑا کر
لے گئی۔ میری صداؤں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔
اس کی بازیافت تو نہیں ہوئی مجھے اپنی بازگشت ملی اور
تب مجھ میں کا وہ فنکار مر گیا جو خوب صورت علامتوں
اور دل کش استعاروں کا اسلوب رکھتا تھا۔
میرا اور اسکا رشتہ کتنا گہرا اور نزدیکی تھا۔ اسکی
گمشدگی نے ذہن میں بگولے بھر دیے۔ اب تو کچھ بھی
باقی نہ رہا تھا۔ جسطرف نگاہ اٹھتی چیزوں کی ہیئت
بدلی بدلی سے لگتی۔ ہر شے سُرخ خون میں ڈوبی نظر
آتی۔ پتا نہیں منظر بدل گیا تھا یا میری نظر۔
ساری بستی چھان ماری۔ اپنے پرایوں سے
معلوم کیا لیکن اس کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا تھک
ہار کر ٹرین سے واپس ہو رہا تھا کہ اچانک میرے

اب ڈھونڈھ انھیں

بنگالی کہانی

رناتھ ٹیگر
رجمہ
رشید شیخ

جود نہ رہنے پر جو ہوتا ہے، ٹھیک وہی
کان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سامنے کے
، چبوترے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ کنوئیں
ن ٹوٹ گئی ہے۔ مکان کا اندرونی حصہ بھی
ز نہیں۔ باورچی خانہ مرمت طلب ہے۔
یں داخل ہوتے ہی مرگانک موہن بابو
ب آن واحد میں تاڑلیا۔ اس کے فوراً بعد
مالی پر بگڑنا شروع کیا "یہ سب بھی تو نہیں
تو پھر تیرے رہنے سے کیا فائدہ؟ ہر ماہ
یہ جو بھیجتا ہوں، وہ کس لئے"؟
پکے بالوں کو کھجلاتا ہوا بولا "بابو! میرا تو
ور نہیں ہے، میں تو سب دیکھتا ہوں"
ن بابو نے اسے پھر ڈانٹا "خاک دیکھتے ہو؟
لیا یہی حالت ہوتی؟"
ا شوہر کا یہ طیش کھڑکی میں سے جھانک کر
ی تھی۔ اس بار وہ برآمدے میں آکھڑی
لہجے میں، طنزیہ شیرینی لیے ہوئے بولی "یہ
ا ہو رہا ہے؟ ابھی تو گاڑی سے اترے
ی سامان بھی نہیں کھلا۔ اور تم مکان کے
پنے لگے"؟
ن بابو بیوی کی طرف دیکھ کر لمحہ بھر کیلئے
ا ہو گئے۔ پھر غصّہ کو ضبط کرتے ہوئے
بولے "چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہا کر
یں اور پھر گھر بنائیں تو تم بھی تڑپ

اٹھتیں۔ تب تمہارے دل میں بھی مکان کی ایک ایک اینٹ، ڈھانچے کی ایک ایک ہڈی کے مول کی ہوتی۔"

نیلیما بولی "باپ رے! کلکتے میں تمہارا ایک تین منزلہ مکان ہے۔ یہ دوسرا۔ دونوں مکانوں کی ہر ایک اینٹ کو ڈھانچے کی ہڈی سمجھنے سے تو میں رہی۔ انسان کے پنجر میں کیا اتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟ موہن بابو بولے "تم مذاق اڑالو۔ میری دولت کا احساس تمہارے دل میں ہے ہی نہیں۔ مکان کا نام بے کار ہی "نیلیما" تھے رکھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ اس بار معمار سے کہہ کر میرا نام مٹا دو۔"

موہن بابو وہاں سے ہٹ گئے۔ نیلیما میں بس یہی ایک بات ہے۔ غصہ آتے ہی بس "مٹادو"۔ جیسے مٹا دینا اتنا آسان ہی تو ہے!

نیلیما بسترے وغیرہ کھول چکی تھی۔ جھاڑ پونچھ کر سامان ترتیب سے رکھ دیا تھا اور غسل کرکے کھانا پکانے میں جٹ گئی تھی بیوی کے سلیقے کو دیکھ کر موہن بابو بہت مطمئن ہوئے! آج کل شاید ہی بیوی پر کبھی نظر جاتی ہے ۳۲ سال سے دیکھتے آرہے ہیں۔ اب تو عادت سی پڑگئی ہے۔

اولاد نہیں ہے۔ نیلیما کا پچاس سالہ جسم اب بھی سڈول ہے۔ مقابلتاً ذرا سخت اور مردانہ لگتا ہے۔ اولاد کے بغیر ہی کیوں! ایک خاص عمر کے بعد عورت اور مرد سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ یکسانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر کیا محبت اور رفاقت کا احساس بھی بڑھتا ہے؟ موہن بابو کی سوچیں یہیں آکر دم توڑ دیتی ہیں!

دنوں کے ساتھ ساتھ آپس کے تفرقے بڑھ رہے ہیں۔ اولاد کا نہ ہونا ہی کیا اس کی وجہ ہے؟ یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ اولاد والے جوڑوں کو بھی موہن بابو نے لڑتے جھگڑتے دیکھا ہے۔ صرف اور صرف نفسانی خواہش نے ان کا ناطہ بنا رکھا ہے۔ وکیل ہیں، خود ہی نے کئی جوڑوں کو قانون کے سہارے جدا کیا ہے۔ لیکن انتہائی خوفناک تنازعوں کے باوجود ان کا اور نیلیما کا ملاپ باقی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا دکھاوا کون جانے!

موہن بابو آگے بڑھ آئے "لاؤ کچھ مدد کردوں! سبزی کاٹ دوں یا مسالا پیس دوں؟ کہاں ہے سِل بٹّا؟"

"رہنے دو، اتنے ناز اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے"! موہن بابو نیلیما کی ناراضگی کو تاڑ گئے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک خادمہ ساتھ آجاتی لیکن موہن بابو نے انکار کر دیا۔ دو ہی تو جانیں ہیں، وہ بھی بوڑھی۔ خود ہی سارا کام کیا جاسکتا ہے۔ ہاتھ کا کھانا زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ خادمہ کا خرچ بڑھ جاتا بس۔ وہ ویسے ہی بہت موٹی ہے اور یہاں کی آب و ہوا اسے اور کاہل بنا دیتی۔ اس لیے دونوں ہی آئے ہیں۔ کوئی جھنجھٹ ساتھ ہی نہیں لائے۔

"فکر نہ کرو، کھانا پکانے سے اُوب جاؤ تو مجھے کہنا میں بھی ہاتھ بٹاؤں گا مجھے یہاں کام ہی کیا ہے؟ نہ عدالت نہ مؤکل!" موہن بابو بولے۔

نیلیما چڑ کر بولی "بڑا افسوس ہے۔ تعطیل میں بھی کلکتہ کی عدالت یہاں لے آتے تو اچھا تھا

پھوڑ دیا گیا تھا۔ چوروں کی طرح ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے انکے سامنے سے ہٹ گیا۔

موہن بابو کی آتش غضب ابھی سرد نہ ہوئی تھی۔ سوچنے لگے "پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر! موہن کو تم جانتے نہیں ہو میاں!"

دوپہر میں سلیل رسی اور بالٹی لے آیا۔ موہن بابو خوش ہوئے۔ زبان کتنی ہی چلائے لیکن در اصل ان سے ڈرتا ہے۔ ان کی بات ٹالنے کی ہمت چھوکرے میں نہیں ہے۔

آج سہ پہر میں ان کی نظر برآمدے کے سامنے لگے شریفوں کے پیڑ پر گئی! کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بڑے بڑے پھل، پکے، ادھ پکے سب غائب! مالی کہیں نظر نہیں آیا۔ اندر جا کر بیوی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ مطالعہ میں مصروف تھیں "اچھا تو کتاب پڑھی جا رہی ہے۔ ادھر کیا ہو گیا، پتہ ہے؟ شریفے کے پیڑ میں ایک بھی پھل نہیں ہے"! نیلیما ہنس پڑی "ہیں جی ہیں! ان کے لیے تمہیں خاک چھاننی نہیں پڑے گی۔ وہ دیکھو! چارپائی کے نیچے اشارہ کر دیا۔ موہن بابو جھانکنے لگے۔ سچ مچ وہاں ڈھیر سارے شریفے پڑے تھے "لیکن بڑے بڑے پکے پھل کہاں گئے؟ سب یہی ہیں کیا؟ نیلیما بولی "سب کیوں ہونگے؟ کچھ سلیل لے گیا ہے۔ اسی نے تو توڑے ہیں! اس کا ایک دوست آیا تھا، وہ بھی کچھ کھا گیا ہے"!

موہن بابو بولے "اچھا کیا۔ اور کسی کو نہیں بلا سکا کیا؟ خود تو درویش ہیں اور چلے ہیں خیرات کرنے! نیلیما بولی "اے بس کرو ہائے ہائے! ساتھ لے جاؤ گے کیا"؟ موہن بابو مسکرا کر بولے "لیکن جانتی ہو، دولت انسان سے پیاری ہے"! نیلیما بولی "لیکن کیوں"؟

موہن بابو نے کہا، ذرا سوچو! یہ میز کرسیاں، پلنگ، الماری، میں جتنے دن ہوں، اتنے دن رہیں گے۔ یہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ محبت اور خلوص سب ڈھکوسلے ہیں۔ دنیا دی دولت ہی امر ہے۔

محبت کے قائل نہیں موہن بابو۔ انسان کی چاہت میں رکھا ہی کیا ہے؟ وہ ایک پریم کے مجسمے کو روز چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ ریتا اپنوں سے بے غرض محبت کرتی ہے۔ روز ہی سب ٹہلنے جاتے ہیں۔ آج دیوگھر، کل سمل تلا، تو پرسوں مدھوپور۔ جس دن کہیں جاتے، اس دن موہن بابو کے مکان ہی کو مدھوپور بنا لیتے ہیں۔ مکان ہی کیوں، سارا سنسار ہی ان لوگوں کے لیے مدھوپور ہے۔ کبھی کبھار موہن بابو رشک وحسد کے مارے جل اٹھتے ہیں۔

ریتا موہن بابو کے برآمدہ میں بچے کو شانے سے لگائے ہوئے گھوم گھوم کر لوری گاتی ہے۔ اور اس وقت وہ موہن بابو کو یشودھا کا اوتار دکھائی دیتی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کا روپ بدل جاتا ہے۔ شوہر کے ساتھ کیا کد کڑے لگاتی ہے لڑکی! کمرے کے اندر بھی اور کمرے کے باہر بھی! موہن بابو کے سے ساٹھ سالہ بزرگ کی موجودگی کا انہیں جیسے احساس ہی نہیں ہوتا! کرایہ پر تو صرف دو کمرے لئے ہیں لیکن اچھل کود اور شرارت ایسی کرتے ہیں جیسے سارا مکان ہی ان کا ہے۔ نوعمر سلیل بالکل بچہ بن جاتا ہے پیڑوں پر چڑھنا، پتے نوچنا، ٹہنیوں کو جھنجھوڑنا اسے بہت بھاتا ہے۔ موہن بابو سوچتے "کاش! اس کے ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں اور کم از کم چھ ماہ بستر پر پڑا رہے" لیکن ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ اور بیوی تو کم بخت جیسے وحشی ہرنی ہو! پشت پر موٹی سی چوٹی جھلاتی ہوئی، کمر میں آنچل اڑس کر کبھی میاں کے پیچھے دوڑتی ہے تو کبھی میاں کو اپنے پیچھے دوڑاتی ہے۔ کچے پکے پھلوں کے لیے چھینا جھپٹی۔ ایک دن تو دیکھا کہ ایک ہی امرود کو دونوں منہ لگائے کاٹ رہے ہیں!

ان لوگوں کا ایک دوست بھی ہے۔ منحنی سا جسم، لمبوترا چہرا، بڑا تیز ہے۔ اس کے ساتھ بھی ریتا کی خوب بنتی ہے۔ ... کے ساتھ شوخیاں جیسے اور بڑھ جاتی ہیں بھاگ دوڑ چھینا جھپٹی، ہنسی مذاق سب کچھ چلتا ہے۔ ایسے غیر قانونی محبت کے رشتے موہن بابو کو نہیں سہا...

وہ تھے تو پندرہ روزہ کرایہ دار لیکن نیلیما ان سے روحانی رشتہ جوڑ بیٹھی تھیں۔ ریتا گوشت پکاتی اور "ماسی ما" کو دیتی۔ ماسی ما ریتا کے بغیر مچھلی نہیں کھاتی۔ کبھی کبھار ان کی سبزی موہن بابو کی تھالی میں بھی پڑتی ہے "یہ کیا ہے! مچھلی کا سر ہے، کھا کر دیکھو، ریتا نے بنایا ہے" "اوں ہوں یہ سب مجھے مت دو" "او ہو! کھاؤ نا، لڑکی کھانا اچھا پکا لیتی ہے"!

اس دن نیلیما سلیل کے ننھے کو گود میں لیے آ کھڑی ہوئی "کتنا خوبصورت بچہ ہے دیکھو تو! "تمہیں دیکھو۔ میرے لیے سب بچے یکساں، ماس لوتھڑے ہیں" "اری ماں یہ کیا کہتے ہو۔ اگر اولاد ہوتی تو ہم نانا نانی بن جاتے۔ لیکن بھگوان بھی شکر خورے کو ہی شکر دیتے ہیں۔ تم نہ بچوں کو چاہو نہ انسانوں سے پیار کرو۔ تمہیں صرف چاہئے روپے۔ تمہارا اتنا روپیا کون کھائے گا؟" موہن بولے "کیوں میں کھاؤں گا"!

اسی درمیان ایک اور آفت ٹوٹی۔ موہن نے محسوس کیا کہ ان کے پھول غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض اوقات ریتا شوق سے ایک دو پھول اپنے بالوں میں لگا لیتی تھی لیکن باغ اجاڑنے کا حق اسے کس نے دیا؟ ریتا کے گلدان میں پھول بستر پر پھول تھے اور اسکے بالوں میں ایک بڑا سا گلاب چمک رہا تھا۔ اس سرخ گلاب کو دیکھ کر موہن بابو کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن بولے ہنس کر ہی "آج تمہارے بیاہ کی سالگرہ ہے" ریتا دھیرے سے بولی "جی نہیں" موہن بابو نے "پھر باغ اجاڑ کر گھر کیوں بھر لیا ہے؟ کلیاں کہیں توڑی جاتی ہیں؟" "کلی تو ایک بھی نہیں ہے موہن جی سب پھول ہیں"!

ت ھوٹ ہیں ہی کی ییمانے چھپیاں فل جاتی تھیں، موہن بابو کو۔ وقت کس ائیں یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ تاش س نہ جوا، سگریٹ نوشی بری لگتی تھی عورتوں ر بھاگتے تھے۔ اپنی بیوی کے علاوہ انہوں دوسری عورت کے جسم کو چھوا تک نہ بڑے ہی بے حس اور بدشوق!

مہ پہر کو باغ میں گھوم رہے تھے اور شریفے ر دے لدے درخت دیکھ رہے تھے۔ لیسا جھاڑ جھنکاڑ ہو رہا ہے باغ۔ روشوں دونوں جانب لگے گلابی اور زرد موسمی ں کی ٹہنیوں کو چھانٹنا ہوگا۔ درختوں ستہ پر ٹریس پاس کیا ہے، ان کا بھی رنا ہوگا؟

یک اجنبی نوجوان مکان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ن خالی ہے"؟ موہن بابو خوش ہو کر بولے ہاں، کتنے کمرے چاہئیں؟ نوجوان "ایک فی ہے۔ ہم دونوں اور ایک ننھا۔" موہن ٹھیک ہے۔ پھر بھی جب گھومنے کے لیے یں تو ذرا آرام سے رہئے۔ میرے پاس جو ے خالی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے منسلک ایک لیا تو دوسرا لینا ہی ہوگا۔" نوجوان " ہے، دونوں ہی لے لوں گا۔ کرایہ کتنا ہوگا؟" بابو ہنس کر بولے "پہلے پسند تو کیجئے کمرے۔ بعد میں طے ہو جائے گا۔" کمرے نوجوان کو گئے۔ مشرق اور مغرب میں بڑی بڑی کھڑکیاں صاف ستھرے وسیع کمرے۔ لیکن کرایہ کی بات جوان کی بھنویں سکڑ گئیں "دو کمروں کے روپے . . . . . کچھ کم . . . . ." "جی نہیں۔ کم ہی کہا ہے۔ اس سیزن میں یہاں مکان کل ہے۔" "میں صرف پندرہ روز رہوں گا۔ یہ کچھ . . . . ."

ی نہیں، آپ دو ہفتے قیام کریں یا ایک۔ مہینہ بھر کا ہی دینا ہوگا۔ یہاں یہی قانون نوجوان "ٹھیک ہے لیکن کمرہ میں کوئی کچھ کرنا ہو تو کہہ دیں۔" موہن بابو "اس کی فکر نہ کیجئے۔ میں سب انتظام کروا دوں گا۔ آپ اپنی فیملی لے آئیے۔"

اس کے چلے جانے کے بعد نیلیما شوہر سے بولی۔ "یہ کیا ہنگامہ مچا رہے ہو؟" موہن بابو بولے ہنگامہ کہاں مچایا؟" نیلیما نے کہا "کرایہ دار کیوں رکھ رہے ہو؟ کلکتہ میں ان کی آفت تو لگی ہی رہتی ہے۔ یہاں کچھ دنوں کے لیے سکون سے رہنے آئی ہوں اور تم یہاں بھی انہیں میرے سر پر مسلّط کر رہے ہو۔" موہن بابو کہنے لگے "کمروں کو یوں ہی رکھنے سے کیا ہوگا بھلا؟ مکان کی مرمت میں بھی تو خرچ ہوتا ہے۔ اس کے لیے کچھ روپیہ اگر آجاتا ہے تو فائدہ ہی ہے۔ نقصان نہیں۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر موہن بابو ہنسے اور بولے "اس کے علاوہ اکیلی منہ لٹکائے بیٹھی رہو گی۔ ان کے آنے سے کوئی بات چیت کرنے والا تو ملے گا۔ نیلیما نے جواب دیا، بات چیت کے لیے تم کیا کم ہو؟" موہن بابو بولے "میں؟ میں تو صرف اب تمہارے جھگڑے کا ساتھی رہ گیا ہوں۔ مدعی اور مدعا علیہ ہی ہیں ہم دونوں۔"

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ آ گئے۔ نوجوان بہت تندرست تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں سوٹ کیس۔ ساتھی تھی ایک دراز قد چھریری خوب صورت لڑکی جس کی گود میں بچہ تھا۔ پیچھے سر پر بستر اور صندوق لئے قلی تھا۔

ان کے کمرے میں جانے کے کچھ لمحوں بعد ہی اپنے کمرے میں جا کر موہن بابو ریوینیو سٹیمپ لگا ہوا ایک سادہ کاغذ لے آئے اور ہنس کر بولے "کچھ خیال مت کیجئے گا۔ ٹرینزیکشن ابھی ہی ہو جانا اچھا ہے۔ میں اسی لیے ہر چیز تیار رکھتا ہوں۔" نوجوان نے بیگ سے ساٹھ روپے نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دئے۔ موہن ہنس کر بولے، "اچھا آپ کا نام تو ——" "سلیل دت" اس کے بعد دراز قد لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے۔ "کو پسند آیا آپ کو؟" رینا ہنس کر بولی "ہاں۔"

لڑکی کا سڈول اور چھریرا بدن اس کے نو بیاہتا ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اسی درمیان وہ ایک لڑکے کی ماں بھی بن گئی۔ شاید پرانے خیالات کے ہیں یہ لوگ۔

دوسرے دن سے مکان کی مرمت میں لگ گئے موہن بابو۔ مزدوروں اور بڑھئیوں سے کام لینے میں انہیں بڑا مزا آتا تھا۔ وہ سامنے بیٹھ کر کاموں کی نگرانی کرتے اور ضرورت پڑنے پر ان کا ہاتھ بٹاتے اور ان کے جوش میں اضافہ کرتے۔

صبح کی سیر سے لوٹے ہیں موہن بابو۔ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ اچانک ان کی نظر کنویں سے پانی بھرتے ہوئے سلیل دت پر پڑی۔ "پانی بھر رہا ہے، بھرلے۔ پانی نہیں بھرے گا تو کیا کھائے پئے گا۔ منہ کس طرح دھوئیگا لیکن موہن بابو کی بالٹی سے کیوں؟ ایک بالٹی بھی نہیں مل سکی اسے"؟ موہن بابو چائے کا کپ خالی کر کے برآمدہ سے کنوئیں کی طرف بڑھے۔ "ارے سلیل بابو پانی بھر رہے ہیں؟" سلیل "ہاں موہن بابو۔ آپ کا کنواں بہت اچھا ہے۔ بہت پانی ہے" موہن بابو دل ہی دل میں ہنسے۔ چھوکرا سوچتا ہے کہ اسی طرح پر چالوں گا۔ بولے "بہت پیسہ خرچ کر کے بنوایا ہے۔ آس پاس کے کسی مکان میں اتنا گہرا کنواں آپ کو نہیں ملے گا۔ لیکن آپ کے پاس کیا اپنی بالٹی ڈوری نہیں ہے؟" سلیل بولا "بالٹی تو ہے لیکن ڈوری نہیں ہے۔" موہن بابو ہنس کر بولے "تو خرید لیجئے۔ بازار میں میرے واقف کار کی ایک دکان ہے وہ سستے میں دے دیں گے۔" سلیل بولا "اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ سوچا تھا رہنا ہی کتنے دن ہے جو یہ سامان کروں اس سے تو اچھا تھا کہ ڈوری بالٹی کا کرایہ دے دوں۔" موہن بابو فوراً جواب نہ دے سکے۔ شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے رہے اس کی طرف۔ ان نگاہوں کی تاب

موہن بابو ہنستے چلے گئے۔ سوچا اس موسم میں بیاہ تو نہیں اسلیے شادی کی سالگرہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ممکن ہے یہ ان کی پہلی محبت کا دن ہو۔ نیلیما نے بھی تو بتایا تھا کہ ان لوگوں نے پریم ویواہ کیا ہے۔

موہن بابو کے گھر بجلی نہیں ہے۔ اور کرسی بھی بس ایک ہی ہے خود اسپر براجمان ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی ملاقاتی کو کرسی پیش نہیں کرتے۔ ان کی بکواس بھگت سے تو سو جانا بہتر ہے۔ ایک چائے کا کپ بھی پیئے بغیر ٹلیں گے نہیں۔

میز کی طرف بڑھتے ہی ٹھٹک گئے موہن بابو۔ میز پر پھولوں اور پھلوں کا انبار لگا تھا۔ یہ سب کس نے دیئے ہونگے؟ مقدمہ جیت جانے پر اکثر موکلوں سے قیمتی تحفے وصول کیے ہیں۔ ان پھولوں پھلوں اور ساگ سبزی جیسے PERISHABLE چیزوں کے لیے انکے دل میں کوئی موہ نہیں ہے۔ "یہ کس نے دیئے ہیں؟" موہن بابو نے پوچھا۔ نیلیما بولی "مجھے تنگ نہ کرو، یہ سب تمہارے باغ کے پھل پھول ہیں۔ رینا سب واپس دے گئی ہے۔" موہن بابو بھڑک کر بولے "واہ! کیا صفائی دی ہے چوری کا مال واپس کر دینے سے ہی جیسے قانون معاف کر دیتا ہے۔ اسکی نظر میں چور بے گناہ ہو جاتا ہے!"

نیلیما چپ رہ گئی۔

موہن بابو باہر آئے، رینا کے کمرہ میں حسب معمول موسیقی کی محفل جمی تھی۔ رینا جیسی گرہستن کے ساتھ ایک دوست بھی رہتا ہے! کوئی گا رہا تھا "تو مار گھرے باتی۔ تو مار گھرے ساتھی" کہیں جیسے یہ گانا سنا تھا۔ کہاں؟ ٹھیک یاد نہیں کر پائے وہ!

اس وقت دونوں برآمدے خالی تھے۔ آس پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ آدمی ہی کیا، کیڑے مکوڑے بھی نہیں تھے، گہری تاریکی۔ تاریکی ہی تاریکی! کیا تاریکی ہی حقیقت ہے؟

قریب ہی اسٹیشن ہے، وہاں کچھ روشنی ہے۔ لوگوں کی چہل پہل ہے۔ ایک گاڑی آ کر کئی منٹ رکی رہی۔ اسکے بعد وہ پھر تاریکی کا ایک حصہ بن گئی۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں۔ یہ لمحہ بھر کا آرام جیسے ایک نازک سا ریشمی لمس ہو! موہن بابو نے سوچا "ہم لوگ ایک دوسرے کو شاید لمحہ بھر کے لیے چھوتے ہیں۔ اسکے بعد کوسوں دور کا فاصلہ! بیوی ہو یا بیٹا یا رفیق۔ ہمارا ملاپ وہی پل بھر کا! درمیان میں جو نہیں ملتے ان میں لامحدود فاصلے حائل ہو جاتے ہیں۔"

آسمان کی طرف دیکھا موہن بابو نے۔ ان گنت تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ کتنے پراسرار، بے نام اور اجنبی سے! لیکن تعجب تو یہ ہے کہ جیسے وہ پراسرار وجود انہیں ہاتھوں کے اشارے سے بلا رہے ہیں۔ وہ انسے پوچھتے ہیں "کیوں؟ کیوں؟ یہ قید کیوں؟ خواہشات کے طلسمی سلسلے اور دنیا کی چاہت کیوں؟ یہ تنہائی کیوں؟ روح کا کھوکھلا پن کیوں؟

لیکن یہ سب سوالات بیہانگی ٹرینوں کی مانند ہیں۔ ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ اسٹیشنوں پر نہیں ٹھہرتے۔ اوں! قربانی، قربانی! قربانی کی عظمت کے گن سبھی کو گاتے دیکھا عمل کرتے نہیں۔ بلندیوں کی معراج کو پانے کے لیے نفس کو مارنا ہوگا۔ اوپر اٹھنا ہوگا اس دلدل سے۔ لیکن یہ سب کیسے کروں؟ وکالت کی پریکٹس میں بالوں پر سفیدی آ گئی۔ یہ قربانی بھی کیا کسی طرح کی پریکٹس ہوتی ہے؟ اس عمر میں کیا نئے سرے سے "جونیئر" ہونا ممکن ہے؟

بیوی بلانے آئی۔ کھانا لگ گیا تھا۔ بیوی سے پوچھا "کہاں تھیں اتنی دیر تک"؟

نیلیما بولی "رینا کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ کل صبح ہی چلے جائیں گے وہ لوگ۔"

"کس ٹرین سے؟ بنارس ایکسپریس سے"؟

"ہاں شاید۔"

چلو ہم لوگ بھی کل چلے جائیں۔ "نا بھئی! اتنی جلدی میں نہیں جا سکوں گی۔ سامان سب پھیلا پڑا ہے۔" موہن بابو بولے "تو مغلسرائے سے چلو۔ سہ پہر کی گاڑی ہے"؟

نیلیما بے زاری سے بولی "دیکھا جائیگا۔"

کھانا ختم ہونے کے بعد ٹارچ ہاتھ میں لے کر پھر باہر نکلے موہن بابو۔ گھوم گھوم کر انہوں نے کئی بڑے بڑے شریفے اور رام دور دیکھے اور ڈھیرے سے توڑ لیے جیسے اپنے ہی باغ میں چوری کر رہے ہوں۔ موسمی پھول بھی چنے۔ اور ان کا ایک گلدستہ بنایا۔ اب تک تو ردیپوں کا ہی گچھا باندھا ہے انہوں نے۔ پھولوں کے گلدستہ کا یہ پہلا موقع تھا۔

کمرے میں آئے۔ ایک خوبصورت سبز رنگ کی نئی باسکٹ میں ان سب چیزوں کو رکھا۔ وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بچوں کا کوئی بھی کھلونا کمرہ میں نہیں تھا۔ میز پر قانون کی کچھ کتابیں تھیں اور کچھ فائلیں۔ ایک رنگین کاغذ کا ٹکڑا دبا پڑا تھا۔ اسے باسکٹ میں ڈال دیا۔ اور تھا انکے چشمے کا ایک کیس۔ اس دن رینا کا ننھا اسے جھپٹ جھپٹ کرے رہا تھا۔ بہت طیش آیا تھا موہن بابو کو۔ بہت دنوں سے بے کار پڑا تھا۔ اسے بھی باسکٹ میں رکھ لیا۔

اسکے بعد نیند آ گئی صبح ہی آنکھ کھلی۔ نیلیما اٹھ چکی تھی۔ بیوی سے کہا "چلو ہم لوگ انہیں سی آف کر آئیں۔ بنارس ایکسپریس صحیح وقت پر آ رہی ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنا ہوگا۔ کل تو دو گھنٹے لیٹ تھی" نیلیما بولی "کن لوگوں کو سی آف کروگے؟"

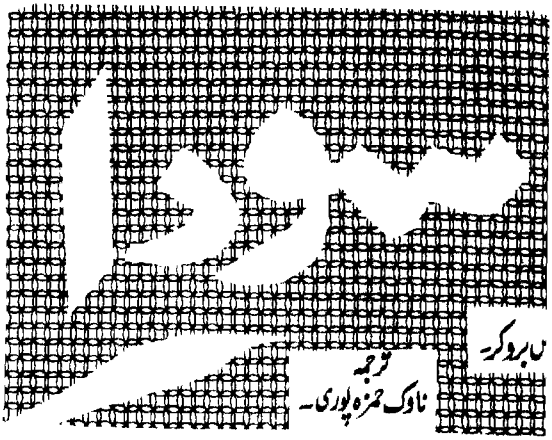
موہن بابو نے کہا "کیوں؟ وہی تمہاری بہنا بہو وغیرہ کو۔"

نیلیما اری ماں! وہ لوگ تو آدھی رات تب ہی چلے گئے۔"

موہن بابو بولے "یہ کیوں؟ رات میں تو کوئی گاڑی نہیں تھی؟" نیلیما نے کہا "اے بس رہنے دو۔ پنکج بہت چالاک لڑکا ہے۔ وہ کہیں سے ایک جیپ لے آیا تھا۔ اسی میں وہ لوگ گئے ہیں مدھوپور۔ اس کے بعد خوب گھومیں گے اور پھر کلکتہ"!

موہن بابو کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بید کی ٹوکری کو مسلسل دیکھتے رہے!

★ ★ ★



ن بروکر
ترجمہ
ناوک حمزہ پوری



گلاب داس بروکر



وینو بھائی بولے۔ اگر آپ کو ایسی ہی تمنا ہو تو مجھ سے بے تکلف کہئے۔ حسین سے حسین پریاں خدمت میں حاضر کردوں گا۔ ایکدم فرسٹ کلاس کلچرڈ۔ اس سے آپ کے ارمان بھی پورے ہونگے اور دامن بھی داغدار نہ ہوگا۔

ل سے تین یا چار سیڑھیاں طے کر پایا ہونگا کہ سیٹھ جی
ی پکار سنکر کھڑا ہوگیا۔ دیکھا وہی میری طرف چلا آ رہا
ی بول پڑا۔
ے آپ مجھے پہچان نہیں پا رہے ہیں۔ پہچانیں گے
بھلا بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کی پروا ہی کب
"
اف کیجیے گا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے لیکن
ے یہ یاد نہیں آرہا ہے۔"
ئی بات نہیں کوئی بات نہیں"۔ اس نے ہنستے ہوئے

کہا۔ صاحب میں آپ کے صرف پانچ منٹ لینا چاہتا ہوں"۔
"لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں رک نہیں سکتا۔ مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔"
"نہیں سیٹھ جی ایسا نہ کہیں۔ صرف پانچ منٹ کے لئے میری بات سن لیجئے۔"
میں نے سوچا کہ بار بار اس مردود سے ملنے کی بجائے یہی اچھا ہوگا کہ آج اس سے نمٹ ہی لیا جائے۔ اس لئے میں نے پوچھا۔ کہئے کیا کام ہے"۔ اس نے کہا۔
"میری لڑکی اس بار بھی پاس ہوگئی۔"

"خوشی کی بات ہے۔" میں نے فوراً جواب دیا۔
"اب یوں لگتا ہے کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں، میں اسی کے لئے آیا ہوں۔ فیس کا تو کسی صورت سے انتظام ہوگیا ہے لیکن کتابوں کے لئے کچھ پیسے گھٹ رہے ہیں۔"
تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں
"آپ مدد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا صاحب! آپ کی مدد کے بغیر میری لڑکی بھٹک جائے گی۔"
"دیکھو جی۔ میں نہ تمھیں جانتا ہوں اور نہ تمہاری لڑکی کو ان فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے"
اتنا سننا تھا کہ اس نے اپنی جیب سے پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا
"یہ میری لڑکی کی تصویر ہے۔"
میری نگاہ خود بخود تصویر کی طرف گئی۔ وہ ایک خوبصورت حسین و نازک لڑکی کی تصویر تھی۔
"لیکن میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا"۔ تصویر جیب میں رکھتے ہوئے اس نے عاجزی سے کہا۔
"دیکھئے سیٹھ جی۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ آپ کس کی

مدد کریں گے کچھ سنبھلو تو آپ کو کتنا ہی ہوگا؟ میں نے پنڈ چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"اچھا کتابوں کی مدد میں کر دوں گا۔ میرے پاس بہت سی پرانی کتابیں ہوں گی۔"

"کتابوں کا انتظام ہو گیا ہے صرف نقد مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن ابھی آپ نے کہا تھا کہ فیس کا انتظام ہو گیا ہے اور۔۔۔ خیر چھوڑیے۔ لیکن روپے میرے پاس نہیں ہیں۔"

"آپ یقین کیجئے آپ کے روپے مفت ضائع نہیں ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کونسی بات ہے۔"

"یعنی کیا مطلب۔"

"یعنی والی کچھ نہیں۔" اس نے میرے بہت قریب آکر کہا۔ "اس لڑکی کا نام لیلا ہے۔ عمر بیس سال ہے۔ اس سے ایک اور بڑی بھی ہے اس کا نام شیلا ہے۔"

"یہ سب کیا بکواس ہے۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

"بکواس نہیں حقیقت ہے۔" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ کبھی غریب خانے پر تشریف لا ئیے، ذرا چائے وائے چلے گی اور اس کے بعد شیلا سیانی لڑکی ہے، سب کچھ سمجھتی ہے پرکھا ہے پری۔"

اتنا سننا تھا کہ میرے غصّے کی حد نہ رہی، میں نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"چپ رہ۔ پاجی۔ شیطان کمینے۔"

میں چل پڑا لیکن وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پھر وہ کہنے لگا۔

"صاحب! بات یہ ہے کہ۔۔"

"کچھ نہیں مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا، میں مجبور ہوں۔"

"خیر کوئی بات نہیں آپ کچے دل کے آدمی ہیں مجھے صرف پانچ روپے دے دیجئے۔"

"میں کچھ نہیں دوں گا۔"

"تو ایک ہی روپیہ دے دیجئے۔"

"کہہ دیا کچھ نہیں دوں گا۔"

"لیکن کچھ نہ کچھ تو آپ کو دینا ہی ہے۔"

جب میں نے دیکھا کہ بدمعاش بغیر کچھ لیے ٹلے گا نہیں تو میں نے

دالغنات نئی دہلی

تو ایک روپیہ تھما کر اس سے نجات حاصل کی۔

زینے سے اتر کر جیسے ہی موٹر کے پاس پہونچا کر سامنے سے وینو بھائی آتے دکھائی دیے۔ آتے ہی نستے کی۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے وینو بھائی؟"

"سب ٹھیک ہے، اچھا وہ آدمی جو ابھی آپ سے مل کر گیا ہے اسے آپ جانتے ہیں کیا۔" وینو بھائی نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"نہیں تو۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"سالا ایک نمبر کا کائیاں ہے۔ کہاں آیا تھا؟"

"لڑکی کی پڑھائی کے لئے مدد چاہتا تھا۔"

"تو آپ نے کیا کیا۔"

"کیا کرنا تھا۔ کورا جواب دے کر واپس کر دیا اور کیا کرتا۔"

"بس ٹھیک کیا وہ حرامی بڑا گندا آدمی ہے۔"

"آپ کیسے جانتے ہیں اسے؟"

قصہ طویل ہے لیکن خیر۔۔۔ وینو بھائی کہنے لگے

"یہ سالا آپ جیسے شریفوں کو بہکا کر گھر لیجاتا ہے، اس کی دو کنواری لڑکیاں ہیں، جوان اور خوب صورت، ایک کالج میں پڑھتی ہے دوسری گھر پر ہی رہتی ہے۔ آنے والے کو دونوں لڑکیوں کے ساتھ چھوڑ کر خود وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔"

وینو بھائی ذرا چپ ہوئے تو میں نے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر۔"!

وینو بھائی نے بات آگے بڑھائی۔ "مت پوچھیے یہ بمبئی ہے، یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ بدمعاش تھوڑی دیر بعد لوٹ آتا ہے اور شور مچانے لگتا ہے۔" بھلے آدمی آپ بھی آستین کے سانپ ہی نکلے۔ میں نے شریف سمجھ کر ذرا گھر میں بٹھا کیا دیا کہ حضرت میری معصوم لڑکیوں کی عصمت لوٹنے پر آمادہ ہو گئے۔ کیا آپ نے اس مکان کو رنڈی خانہ سمجھا ہے۔۔۔ شور سن کر کچھ لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں، یہ لوگ بھی بدمعاش غنڈے ہی ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بھی بالکل جھینپی ہوئی ہیں سسکیاں بھرنے لگتی ہیں۔ بس پھر کیا ہے آپ جیسے شریف آدمی سَو دو سَو روپے دے کر اپنی عزت بچا کر بھاگ نکلنے کو ہی غنیمت جانتے ہیں۔"

"ایسی بات ہے۔" میں نے تعجب ظاہر کیا۔

"جی ہاں اللہ کا شکر ادا کیجئے جو آپ اس کے پھندے سے بچ نکلے۔ پھنس گئے ہوتے تو پیسوں کی بربادی تو ہوتی ہی

سماج میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتے۔"

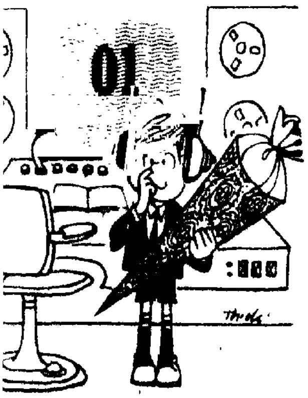
آپ ٹھیک کہتے ہیں وینو بھائی۔ آپ نے مجھے ان باتوں سے آگاہ کیا اس کے لئے میں آپ کا عمر بھر شکرگزار رہوں گا اتنا سن کر وینو بھائی میرے اور نزدیک چلے آئے، دھیمی آواز میں بولے:۔

"اگر آپ کو ایسی ہی تمنا ہو تو مجھ سے بے تکلف کہیے حسین سے حسین پریاں خدمت میں حاضر کر دوں گا۔ ایک دم فرسٹ کلاس، کلچرڈ۔ اس سے آپکے ارمان بھی پورے ہو اور دامن داغدار بھی نہ ہوگا۔"

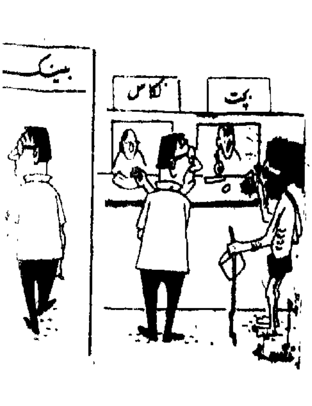
مجھے یوں لگا جیسے آسمان زمین سب گھومنے لگے ہو میں ایک ٹک وینو بھائی کو دیکھتا رہ گیا۔ اتنے میں وینو بھ پھر بولنے لگے:۔

"جی ہاں ایک سے ایک بڑھ کر چھوکریاں پیش کر سکتا ہو اس پر طرہ یہ کہ خطرہ ذرا بھی نہیں۔ بولئے کیا کہتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ بت سا۔ دیوار کی طرح۔



مستقبل کے اسکول کی ایک جھلک





میں ایک منسٹر ہوں

ہمایوں قدیر

جی ہاں! چونکئے مت۔ عرف عام میں آپ بھی مجھے اسی نام سے جانتے ہیں اور اچھی طرح پہچانتے بھی ہیں۔ لیجئے آج آپ کے بیحد اصرار پر میں اپنی رام کہانی سناتا ہوں۔ اس کہانی کی سچائی ثابت کرنے کے لئے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ کرسیٔ وزارت کی قسم یہ کہانی بالکل سچی ہے۔

میرے منسٹر بننے کی کہانی بڑی طویل ہے اور طویل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی بھی ہے کہ جسکو سناتے ہوئے ہر شریف آدمی کو شرم محسوس ہوگی کیونکہ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ شرم اور شریف آدمی کا ساتھ چولی دامن کا ہوتا ہے۔ اگر شریف آدمی شرمائے نہیں تو اسکو شریف ہی کون کہے۔

ہاں تو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میں حلقہ ۔۔۔۔۔ سے اسمبلی کے لئے کامیاب ہوا۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ کامیاب کیسے ہوا۔ تو جناب یہ سوال ذرا ٹیڑھا ہے لیکن میں اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں تاکہ کہیں آپ میری دیانتداری اور ایمانداری پر شک نہ کرنے لگ جائیں۔

ہوا یوں کہ میرے مقابلے پر میرے حلقۂ انتخاب میں ایک سرپھرا لیڈر کھڑا ہوا۔ میں نے پہلے تو اس کو ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی دی۔ وہ دھمکی کیا تھی۔ یہ میں اس وقت نہیں بتاؤنگا کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو ڈر ہے کہ قانون کی زد میں آجاؤنگا (اس لئے اس ضمن میں مجھے معاف فرمایئے گا کیونکہ قانون کی زد میں نہ آپ آنا چاہتے ہیں اور نہ میں۔)

لیکن وہ شخص بھی ایک ہی سرپھرا تھا۔ میری اس دھمکی کو ایسے ہضم کر گیا جیسے آپ دودھ سے بھرا ہوا گلاس منٹوں میں ہضم کر جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی

واقعات نئی دہلی

نہیں نکل رہا ہے تو مجبوراً انگوٹھا ٹیڑھا کرنا پڑا۔ چنانچہ میں نے اس کو سبز باغوں کے ساتھ سبز نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں بھی دکھائیں۔ بس پھر کیا تھا۔ نوٹوں کی ان سبز قطاروں کو دیکھ کر اس سرپھرے کی آنکھوں میں سبزی چھا گئی اور اس کے بعد وہ لگا میرے اسٹیج سے میرے حق میں تقریریں کرنے۔

پہلے میں اس کی نظر میں سماج کا بہت بڑا مجرم تھا تو اب دیوتا ہوگیا۔ پہلے ذخیرہ اندوز تھا تو اب ان داتا بن گیا۔ پہلے بے رحم تھا تو اب غریبوں کا ہمدرد اور سب سے بڑا سہارا بن گیا۔ پہلے قانون کا باغی تھا تو اب جمہوریت کا رکھوالا قرار پایا۔ غرض ہرے ہرے نوٹوں نے وہ کرشمہ کر دکھایا جو بڑی سے بڑی دھمکی سے نہ ہوسکا۔

ہمارے ملک کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تو ہے کہ ہم لوگ شانتی پسند ہیں۔ جو کام شانتی اور امن سے ہوسکتا ہے بھلا اس کے لئے دھینگا مشتی اور آپس میں جوتم پیزار کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو اگر کسی چیز کی حاجت ہے یا آپ اپنا کوئی کام کرانا چاہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ کسی پر رعب جمایا جائے یا دھونس گانٹھی جائے چپکے سے متعلقہ مرد کی جیب میں امن و شانتی کا ایک ہرکارا حسب حیثیت و توفیق سرکا دیجئے اور پھر اس امن کے ہرکارے کی کرامات دیکھئے۔ واہ کتنے عظیم ہیں امن و شانتی کے یہ نوٹ۔ بظاہر کاغذ کے معمولی، حقیر اور بے بضاعت ٹکڑے لیکن ایسے طاقتور کہ کٹر سے کٹر دشمن بھی اگر انکی صرف ایک جھلک دیکھ پائے تو آپ کا دم بھرنے لگے۔

میں اصل موضوع سے ذرا بہک کر لیکچر بازی پر اتر آیا تھا کیونکہ ایک وزیر کے لئے بات بات پر لیکچر دینا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ خیر آمدم برسر مطلب۔ اس سرپھرے کے بعد میدان میں میرے مقابل جتنے بھی حریف باقی بچے تھے وہ بیچارے پہلے ہی لنگڑے اور لولے تھے۔ لہٰذا میرا ایک ہی سیاسی دھکا برداشت نہ کر پائے اور چاروں خانے چت زمین پر گر پڑے۔ تو صاحب اس طرح میں اسمبلی پہنچا۔

اسمبلی میں مجھے ایک عجیب و غریب تماشا نظر آیا۔ وہاں ہر شخص خواہ وہ تربوزی توند کا مالک ہو یا خربوزی اپنے طور پر جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ اکثریتی پارٹی کے سارے ممبر ہر وقت اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح منسٹری ہاتھ آجائے۔ منسٹروں کی یہ خواہش کہ بس کیبنٹ رینک کے وزیر ہو جائیں۔ اپوزیشن کی بینچوں پر بیٹھنے والا ہر فرد اس فکر میں غلطاں تھا کہ کسی صورت حکمراں پارٹی کو ایوان حکومت سے ناک آؤٹ کر دے اور خود اپوزیشن کے لیڈر اس چکر میں تھے کہ کسی طرح حکمراں جماعت کے دس پندرہ افراد کو توڑ موڑ کر اپنی حکومت قائم کر لیں۔ غرض ایک طرفہ تماشا تھا۔ نیچے سے اوپر تک ریشہ دوانیوں اور چکر سازیوں کا ایک ایسا سمندر لہریں لے رہا تھا کہ جس کا کوئی اور نظر آتا تھا اور نہ چھور۔

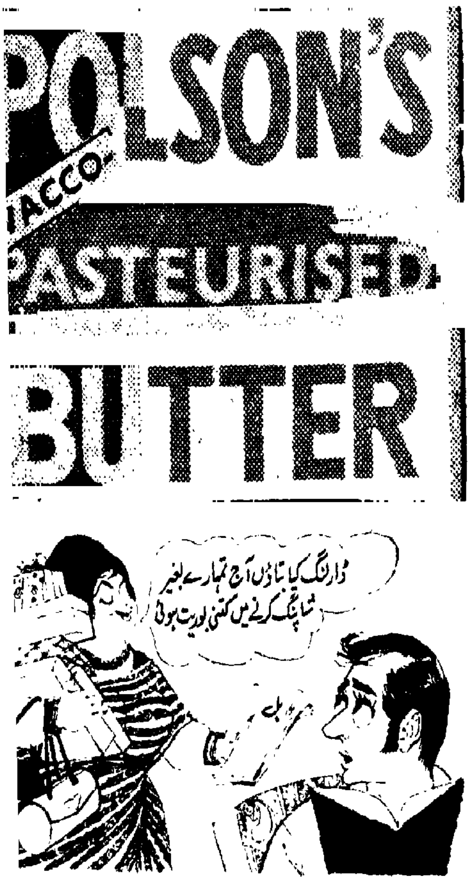
اس سمندر کی لہریں گنتے گنتے خوش قسمتی سے ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے محسوس کیا کہ اب اس سمندر میں جوار بھاٹا آیا ہی چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے خیالات کی کمند لگائی اور اس میں ایک ایسے گروپ کے لیڈر کو پھنسا لیا جو میری دانست میں اس طوفان کے بعد وزارت بنا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ طوفان آیا اور اپنے ساتھ اچھے اچھوں کو بہا لے گیا مگر اپنی حکمت عملی کے باعث میں نہ صرف اس طوفان کی زد میں آنے سے بچ گیا بلکہ یہ میرے لئے وزارت کی آرام دہ گدی کا پیغام لے کر آیا۔

اب صاحب اگر آپ یہ پوچھیں کہ اپوزیشن کے اس لیڈر کو میں نے کتنی مقدار میں مسکا لگایا اور کن کن ترکیبوں سے اسکو رام کیا۔ تو جناب میرا یہ ایک قیمتی راز ہے جسکو میں ہرگز ظاہر نہیں کرسکتا کیونکہ اگر میں نے اسکو افشا کر دیا تو پھر ہر کوئی اس پر عمل کر کے منسٹر کی گدی حاصل کرسکتا ہے ——— تو صاحبو! یہ ہے میری رام کہانی لوگ کہتے ہیں کہ میں نے مفت میں کرسیٔ وزارت حاصل کی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے لئے کسقدر لیاقت سوجھ بوجھ اور بصیرت کی ضرورت ہے۔ یہ اصل واقعات میں نے نہایت صاف گوئی سے کام لے کر آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں کیونکہ اکثر لوگ ہم وزیروں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم کبھی سچ نہیں بولا کرتے اور ہر وقت ایک تین تیرہ کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔

امید ہے کہ میری اس صاف گوئی، سچائی، دیانتداری اور ایمانداری سے متاثر ہو کر آپ مجھ خاکسار ہی کو دوبارہ منسٹر کی گدی کا اصل اور صحیح حقدار سمجھیں گے اور مجھ کو ووٹ دے کر جمہوریت کی بنیادوں کو ملک میں مزید مستحکم بنائیں گے۔

مکھن لگانا سیکھیے

جمیل احسن شاہجہانپوری



اگر آپ خودداری کی بلند مگر سنگلاخ چوٹی سے چند قدم نیچے اترنے کو تیار ہوں تو آئیے آپکو کامیابی اور ترقی کی ایک آسان راہ دکھائیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ انسانوں کی بہت کم تعداد اپنی شخصیت اور ذات سے کلی طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ انسانوں کی اکثریت اپنی بڑی سے بڑی کامیابیوں اور اختیارات کے حصول کے باوجود پوری ذہنی آسودگی حاصل نہیں کرپاتی۔ تقریباً ہر انسان اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی ذات، صفات اور کامیابیوں کی بار بار تعریف و توصیف کر کے یقین دلاتے رہیں کہ وہ ایک لاجواب شخصیت اور بے مثل انسان ہے۔

احساس کمتری کے جراثیم کے ڈنکوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ خوشامد کی قلفی بار بار چھڑکوانا پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے مطلق العنان شہنشاہ تک اپنے دربار و

ان کو یقین دلایا جاتا رہے کہ ان کا ہر فعل و عمل لاجواب ہے۔ اسی لیے شاعر قصیدے لکھتے رہے ہیں۔ آج بھی دولت مند اور بلند مرتبوں پر فائز انسانوں کے گرد آپ کو ایسے لوگ ضرور ملیں گے جو محض خوشامد کر کے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس انسانی کمزوری سے آپ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کامیابی اور ترقی کے مختلف زینوں میں خوشامد سب سے آسان اور مختصر زینہ ہے۔ لیکن اس میں پھسلن بہت ہے۔ اگر آپ نے ایک بھی غلط قدم رکھا تو انجام کار آپ سب سے نچلی تہہ پر نظر آئیں گے اور آپ پر ہنسنے والوں میں نہ صرف تماشائی بلکہ اس راہ کے مسافر بھی شامل ہوں گے۔

خوشامد کے لیے ایک وسیع مطلب والا لفظ "مکھن بازی" کی ابتدایوں تو "زیادہ ذہین اور عقلمند"

طالب علمانہ زندگی میں اس ہنر کو سیکھنے
ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور
نصابوں کے طالب علموں کو جن میں س
(SESSIONAL MARKS) ہوتے ہیں۔ مکھ
کے ماہرین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ علم
مکھن سب سے اچھا ہوتا ہے اور وہاں
تربیت یافتہ طالب علم اس آرٹ کے ما
مکھن بازی کا استعمال آپ والدین سے
استادوں تک اور محبوبہ سے لے کر افسروں
ہی پر کر سکتے ہیں۔ مکھن بازی کے مبتدی کو
پہلے اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ مکھن
نہ زیادہ ہو نہ کم۔ مکھن صرف اتنا لگنا چاہیے
آئے نہ انگلیوں پہ چپکے بس اتنا ہو کہ کھپ جا
اسی میں ہے کہ اس فعل کو شروع کرنے سے

ره کیفیت ہو اسی پر مکھن لگائیے جن لوگوں
انا ہو ان ہی پر مکھن لگائیے جس سے کوئی
مل نہ کرنا ہو ان پر مکھن اور وقت برباد نہ
پ کے شکار کو اس بات کا احساس ہو جاتا
اس پر مکھن لگا رہے ہیں تو یہ آپ کے اناڑی
ت ہے، اور اس صورت میں آپ کو خاطر
رہ پہونچنے کی امید کم رہجاتی ہے۔

وقت کئی آدمیوں پر مکھن لگایا جانا ایک
مئلہ ہے اور اس کی اجازت صرف اسی
میں دی جا سکتی ہے جب وہ لوگ ایک
ے سے قطعی غیر متعلق اور نا آشنا ہوں، اگر
دبہ یا استادمیں سے کسی کو بھی معلوم ہو گیا کہ
ں دوسرے افسر، لڑکی یا استاد پر بھی مکھن لگا
ں تو آپ کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔
ے افسروں یا استادوں پر بیک وقت مکھن
والوں کی عقل پر صرف ماتم ہی کیا جا سکتا
پر مکھن لگانا ہو اس کو یقین دلائیے کہ آپکی
ں دنیا میں صرف وہی شخص قابلِ تقلید و
ت اور توصیف ہے۔ باقی سب اس کے آگے
ں۔ اس کے لیے آپ اسکے طور طریقوں کی نقل
ع کر دیجئے مثلاً اگر وہ پان کھاتا ہو، شکار کھیلتا
ونچھ رکھتا ہو، نسوار سونگھتا یا ٹوپی پہنتا ہو
ر خرافات میں مبتلا ہو تو آپ بھی ان کو اختیار
یجئے، اگر یہ شخص استاد یا افسر ہے تو اس کی ذہانت،
، انصاف پسندی، قابلیت اور پرکشش شخصیت
عریف کیجئے، خواہ وہ ان سب سے بالکل ہی محروم
پ کی ہنرمندی اسی میں ہے کہ اس کے اعمال،
لوں اور باتوں کی مثال دیدے کر ان اوصاف کا
ثابت کر دیجئے۔ اس کے معمولی مذاق پر زور شور
ہنسئے اور خوب داد دیجئے، جن لوگوں سے اس کی
ت اور مخالفت ہو ان کی برائیاں کیجئے۔ اس کی
بیوں کی خوب شہرت کیجئے۔ اور اس کی موجودگی
دوسرے لوگوں سے اس کا بار بار ذکر کیجئے جیسے
ی کی کامیابی ہو، اپنے آپ کو کمتر اور اس کو عظیم تر
ے گھر کی سبزی لانے سے بچے کھلانے تک کی
خدمات سرانجام دیجئے۔ (بچہ اگر شیر خوار ہو تو ہر وقت
چوکنا رہئے) اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی طرف
باتوں کا رُخ کبھی نہ جانے دیجئے۔

استادوں کے گھر کے جتنے چکر لگائے جائیں اتنا ہی
وہ خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں گھریلو کام
کرانے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ نئی پروفیسروں پر مکھن
لگانے میں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔
لیکن ان کی سنک سے بددل نہیں ہونا چاہئے۔ پھلوں
اور گھی وغیرہ کو بازار سے خرید کر اور اپنے گھر کا بنا کر
استادوں کو خوش کرنا آسان کام ہے۔ یاد رکھئے ہر
استاد کا ایک کمزور ترین پہلو ہوتا ہے۔ وہ ہے اسکی
بیوی۔ اگر آپ بیوی سے سفارش کرا سکیں تو استاد
اس سفارش کو ٹالنے کی ہمت کبھی نہیں کر سکے گا۔

افسروں والے معاملہ میں ہر فیصلے اور حکم پر "بہت
بہتر" اور "جی حضور" کہنا بہترین پالیسی ہے اپنے آپ
کو افسر سے زیادہ لائق اور قابل کبھی نہ ظاہر کیجئے بلکہ
اگر آپ اپنی لیاقت کو بھی افسر کی لیاقت بنا دیں تو
وہ یقیناً بے حد خوش ہو گا۔ افسر کی رائے اگر آپ کو
احمقانہ معلوم ہو تو بھی اس سے بحث نہ کیجئے۔ افسر سے
ضد بحث کر کے آپ کبھی کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتے
ہیں۔ اپنی کارکردگی سے حاصل شدہ کامیابیوں کو
بھی افسر کے نام منسوب کرنے کا ایثار اگر آپ کر سکیں
تو یاد رکھئے کہ ہوشیار ترین اور سنجیدہ ترین افسر بھی
اس مکھن کے اثر سے بچ نہیں سکے گا۔ افسر کی غلطیاں
نکال کر اس کو شرمندہ کرنا اپنے پیروں پر کلہاڑی
مارنے کے برابر ہے، اس سے باز رہئے۔ افسر جس چیز کو
پسند کرتا ہو اس کے سامنے اس چیز کے گن گائیے۔
اور جب وہ اسی چیز کو ناپسند کرنے لگے تو آپ بھی فوراً
بدل جائیے۔ آخر آپ افسر کے نوکر ہیں بینگن کے نہیں
دوسرے لوگوں کے سامنے افسر سے بے تکلفی کا اظہار
نہ کیجئے بلکہ اپنے خادم ہونے کا اظہار کیجئے۔

عورتوں پر مکھن لگانا مردوں پر مکھن لگانے سے
زیادہ آسان ہے۔ انپر مکھن جلد اور آسانی سے پھیلتا
ہے، چونکہ عورتیں عقل و فہم سے تہی دامن ہوتی ہیں
اس لیے انکی عقل مندیوں، ذہانت اور فراست کا
ذکر ان کو انتہائی خوش کرتا ہے۔ (تاش اور ذکر
(عورت کی) کی مناسبت سے ان کے حسن، ذہانت،
انتظامی قابلیت اور سلیقہ کی تعریف کیجئے۔

شادی شدہ عورتیں آپ پر اعتماد قائم ہونے کے
بعد جلد ہی اپنے شوہروں کی بدسلیقگی، لاپرواہی
اور بے اعتنائی کی شکایت کریں گی۔ اس وقت
ان کی مظلومی اور بے قدری پر آنسو بہائیے اور
دبی زبان سے ان کے شوہروں کی مذمت بھی کیجئے
مگر سخت احتیاط سے کام لیجئے، یاد رکھئے کہ شادی
شدہ عورتوں کو خالہ یا چچی کہنے سے بہتر ہے کہ آپا،
بہن جی یا زیادہ سے زیادہ بھابھی کہئے۔ اگر آپ
عورت کی پکائی ہوئی ہر چیز کی مبالغہ آمیز اور شور و
غل مچا کر تعریف کرنے کو تیار رہیں تو سوائے بے حد
کنجوس گھروں کے ہر جگہ آپ کی خاطر و مدارات ہونے
میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہر گھر میں ہر کھانے کی تعریف
کرتے ہوئے کہئے کہ "اتنا لذیذ کھانا تو کبھی کھایا ہی
نہیں" بشرطیکہ وہ کھانا نوکرانی کا پکایا ہوا نہ ہو۔
جس گھر کی مرغیوں کے انڈے کھانے کا آپ کو شوق
ہو اس گھر کی مالکہ سے ہر ملاقات پر مرغیوں کی
مزاجی کیفیت اور خیر و عافیت دریافت کرتے رہا
کیجئے۔ دھیان رہے کہ جو وقت عورت اپنی پڑوسن
یا شوہر سے لڑ رہی ہو اس وقت آپ کی غیر موجودگی
بہتر ہے۔ ایسے مواقع پر غائب ہو جائیے۔

غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنے حسن کے ذکر سے
زیادہ کسی چیز سے خوش نہیں ہوتی ہیں۔ ان پر مکھن
لگانے کے لیے حسن کی تعریف لازمی ہے، اس کے
علاوہ ان کی زبانی ان کی سہیلیوں کی برائیوں
کا ذکر، ممی اور پاپا کی تعریف، بے حد چھوٹی چھوٹی
معمولی غیر اہم باتوں کے طویل قصے اور انکی فرمائشوں
کی فہرست کا صبر و شکر سے سننا بھی مکھنوں کے
برابر ہے۔ اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپکی محبوبہ
آپ کی بیوی میں تبدیل ہو جائے تو مکھن لگانا بند
کر دیجئے کیونکہ سب سے کم فائدہ اور سب سے
زیادہ نقصان بیوی کو مکھن لگانے کی حماقت
سے ہوتا ہے۔ ★★

لکھنؤ کے شب و روز

حکیم بڈھن کی ہنگامہ خیزیاں

بہزاد لکھنوی



واضح رہے کہ اب سے چالیس برس قبل سراغ رسانی اور جاسوسی کے فن کو اتنا عروج نہیں تھا اور نہ ایسے آلات تھے جیسے اس دور میں ہیں۔ پھر ایک شوقیہ سراغ رساں اپنے بل بوتے پر کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ یہ کہانی قدیم مشرقی ماحول میں گھوم رہی ہے اگر کچھ صاحبان اسے محض تخیلی کہانی سمجھیں تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

بہزاد لکھنوی

ببّا صاحب کا چائے خانہ سلامت تھا۔ چائے ویسی ہی مزیدار تھی۔ میں اور حکیم بڈھن باقاعدگی کے ساتھ آ رہے تھے۔ فیکٹری کے اوقات کی پوری پابندی کی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن خریدار کا پتا نہ تھا۔ خدا جانے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دن حکیم بڈھن نے مجھ سے کہا:۔

"یار بہزاد۔ کیا فیکٹری کسی نے کیل دی ہے!"

میں نے کہا:۔

"میں وہم نہیں پالتا، لیکن حالات کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔"

وہ بولے "تمہیں تعجب ہوگا آج دو مہینے سے ایک پیسے کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ اپنے پاس سے خرچ کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "یار فکر کیوں کرتے ہو۔ اللہ مالک ہے ایک در بند سو در کھلے۔"

وہ جل کر بولے "یار کیوں سلاّ پن کی باتیں کرنے لگے ہو!"

میں کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ جنّا صاحب چائے خانے میں داخل ہوئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور حکیم بڈھن کے پاس لپک کر پہونچ لیے۔

جنّا صاحب کبھی اس فیکٹری کے خریدار تھے لیکن کئی برس سے مشاعرے ترک کر چکے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ نواب وزن صاحب کے پاس مصاحبت میں ملازم ہو گئے ہیں۔ وہ کچھ دیر حکیم بڈھن سے کانا پھوسی کرتے رہے، یکایک حکیم بڈھن ان کے ہمراہ کھڑے ہو گئے، مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے فیکٹری سے باہر آ گئے۔ جنّا صاحب کے اشارے پر ایک تانگا آ گیا۔

جنّا صاحب اور حکیم بڈھن پیچھے بیٹھے میں کوچوان کے برابر بیٹھ گیا۔ تانگا اکبری دروازے سے ہوتا ہوا محمود نگر اور محمود نگر سے منصور نگر کی چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ چڑھائی تمام کرنے کے بعد بائیں جانب نوبستہ والی سڑک پر روانہ ہوا اور تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک عالیشان حویلی کے سامنے رک گیا۔ راستے بھر حکیم اور جنّا صاحب میں کوئی گفتگو نہ ہوئی سارا راستہ خاموشی

ہی میں کٹ سا اب جنا صاحب نے پیشوائی اختیار کی۔ عالیشان پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا صحن نظر آیا جو ایک بہت چوڑے دالان پر ختم ہوا۔ دالان میں کچھ حضرات بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ جنا صاحب اور ہم لوگ جب دالان کے پاس پہونچے تو میں نے دیکھا کہ دالان میں دودھیا سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے جا بجا گاؤ تکئے قرینے سے لگے ہوئے ہیں۔ ہم تینوں آدمی جوں ہی اندر داخل ہوئے دو باوردی ملازمین نے پیشوائی کی۔ ہم کو عزت کے ساتھ بٹھانے کے بعد فوراً کشمیری بالائی دار چائے اور شیرمالیں پیش کی گئیں۔

چائے کے خاتمے پر پانوں کا خاصدان پیش کیا گیا۔ پان کھانے کے بعد میں نے نظر دوڑائی۔ دالان کے داہنی جانب ایک شہ نشین تھا جو ایک ریشمی پردے سے بندھا ہوا تھا۔ میں پان کھا کر پنسل نکالنے کی فکر میں تھا کہ وقت گزاری کروں۔ جنا صاحب اور حکیم بدھن دونوں خاموش رہنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ یکایک شہ نشین کا پردہ ہٹا اور ایک باوردی ملازم نے آواز لگائی:۔

"ہوشیار باادب! حضور نواب دام اقبالہٗ نزول اجلال فرما رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ شہ نشین کے بیچ میں ایک کارچوبی مسند بچھی ہوئی ہے جس پر ایک کارچوبی ہی گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے ایک صاحب نکلے جن کے ہمراہ دو خوبصورت خواصیں تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں سونے کا خاصدان تھا اور دوسری کے ہاتھ میں سونے کا اگالدان۔ ان صاحب کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ گٹھے ہوئے جسم کے ایک پچاس سالہ انسان تھے۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل تھا جس پر چیچک کے اتنے گہرے داغ تھے کہ چہرہ بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مونچھ اور داڑھی دونوں منڈی ہوئی تھیں۔ بالوں میں بیچ سے کنگھی تھی۔ چار پٹیاں ایک مانگ میں اور چار دوسری مانگ میں تھیں۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ دونوں کلوں میں پانوں کی گلوریاں تھیں۔ ان کے ہونٹ مِسّی مالیدہ نظر آتے تھے۔ وہ

نیچے سے انکی سفید ریشمی بنیائن جھلک رہی تھی۔ وہ جو پاجاما پہنے ہوئے تھے وہ شروع تھا۔ چوڑے۔ ان کے پیروں میں لال رنگ کی مخملی جوتی تھی۔

سب لوگ انکی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے اور جھک جھک کر تسلیمیں بجالانے لگے۔ نواب صاحب تسلیمات تسلیمات، آداب آداب کہتے ہوئے گاؤ تکئے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ خواصوں نے ان کے سامنے خاصدان اور اگالدان رکھ دیئے اور واپس چلی گئیں۔

میں ان کے نام سے واقف تھا ان کے متعلق شہر میں بہت سے افسانے مشہور تھے۔ انکا اصلی نام سید دلدار علیخاں تھا لیکن یہ نواب ددّن صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ یہ آخری بادشاہ کے بھائی کی اولاد میں سے تھے، بڑے وثیقے داروں میں سے تھے۔ انکی املاک شہر میں بہت زیادہ تھیں اس کے علاوہ یہ لاتعداد گاؤں کے مالک تھے۔ میں کبھی ان کے ہاں نہیں گیا تھا۔ انکا ایک مخصوص حلقہ تھا اور یہ شہر میں کنجوس کہے جاتے تھے۔

یکایک ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:۔ "حضور جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔"

نواب صاحب نے انتہائی مترنم آواز سے جواب دیا:۔

"خان صاحب فرمائیے۔ میں نے جان بخشی۔"

وہ بولے:۔ "حضور! نواب اکبر شکوہ بہادر سے کنکوے کے میدان کی تاریخ سر پر آگئی ہے، اگلے اتوار کو مقابلہ ہونا ہے۔ گومتی کے کنارے اس طرف حضور اور ڈالی گنج کے نواب اکبر شکوہ پیچ لڑائیں گے۔ اس میدان کے لئے اخراجات کی ضرورت ہے۔"

نواب صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "ارے بھئی۔! اب تک خان صاحب آپ نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔"

وہ بولے:۔

"حضور رستم ثانی (بٹیر) کی بیماری سے بے حد پریشان

خدا خدا کر کے کل اس کا غسل صحت ہوا ہے تب میری ہمت پڑی کہ میں حضور کے گوش گزار کروں۔"

نواب صاحب نے کہا۔

"بھئی خاں صاحب اللہ نے بڑا فضل کیا ورنہ میں تو کہیں کا نہ رہتا۔ میں آپ کی نمک حلالی سے بہت خوش ہوں۔ آپ داروغہ صاحب سے پانچ سو روپئے لے لیجیے اور اتوار کے لئے پورا سامان ہونا چاہیئے۔ ہماری طرف سے لڑانے والوں اور تماشائیوں کے لئے شامیانہ اور ان کے لئے صاف قسم کا کھانا تیار ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ کسی اچھے طائفے سے بھی کہہ دیجیے گا اور ضرورت ہو تو اور لے لیجیے۔"

وہ بولے "حضور یہ رقم کافی ہے۔ کنکوے اور ڈور سے تو کئی کوٹھریاں بھری ہوئی ہیں خریدنے کی کوئی حاجت نہیں ہے محض اوپری اخراجات کے لئے ضرورت ہے"

وہ سلام کر کے بیٹھے ہی تھے کہ نواب صاحب کی جنا صاحب پر پڑی۔ انھیں دیکھتے ہی نواب صاحب نے مترنم آواز میں کہا:۔

"دربار اس وقت برخاست ہو رہا ہے۔ آپ حضرات اپنی عرضیاں شام کو پانچ بجے پیش کریں ... تخلیہ.....!"

لفظ تخلیہ کے ساتھ ہی دربار کا ہر شخص باہر روانہ ہو گیا صرف ہم تینوں بیٹھے رہ گئے۔ جب آخری آدمی بھی چلا گیا تو نواب صاحب کے اشارے پر جنا صاحب ہم دونوں کو ساتھ لے کر شہ نشین تک گئے۔ مسند کے قریب پہونچتے ہی ہم تینوں نے جھک کر تسلیمیں بجا لائیں، خود نواب بھی نیم قد تعظیم کے لئے اٹھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی انھوں نے حکیم بدھن سے کہا:۔

"حکیم صاحب میں آپ کی تشریف آوری کا ممنون ہوں۔" حکیم بدھن نے کہا۔

"میرے لئے اس سے بڑھ کر فخر کا اور کیا مقام ہے کہ آپ جیسی ہستی نے مجھ کو یاد فرمایا۔"

نواب صاحب نے میری طرف نگاہ کرتے ہوئے "آپ کی تعریف؟"

جنا صاحب نے جواب دیا۔

نواب صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔
"تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ حکیم بدھن کے ہمزاد ہیں ان کے بغیر حکیم بدھن کوئی کام ہی نہیں کرتے۔"

ہم تینوں نے بھی نواب صاحب کے قہقہے میں ساتھ دیا۔ نواب صاحب نے کہا۔

"حکیم صاحب میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں جو پراسرار ہے۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر جب جنا صاحب سے کیا تو انھوں نے چھوٹتے ہی آپ کا نام اور آپ کی سوجھ بوجھ کا تذکرہ مجھ سے کردیا۔ میں مشتاق ہوا اور میں نے آپ کو زحمت دی۔"

حکیم بدھن نے کہا :۔

"گو میں کسی قابل نہیں۔ لیکن اگر کسی صورت سے بھی آپ کے کام آسکوں تو یہ میرے واسطے باعثِ صد افتخار ہوگا۔"

وہ بولے۔ "صاحب معاملہ عجیب بے ہیدہ ہے، ایک کاغذ چوری ہوگیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو دوبارہ کیونکر حاصل کروں۔"

حکیم بدھن نے چھوٹتے ہی کہا :۔

"حضرت گنج کوتوالی میں نصراللہ خاں تھانیدار حال ہی میں بدل کر آئے ہیں۔ میں جانتا ہوں بڑے عمدہ سراغرساں ہیں منٹوں میں جرائم کا حال معلوم کرلیتے ہیں۔ آپ انکو بلوالیں۔"

نواب صاحب بولے :۔

"حکیم صاحب میں پولیس کو بلوا کر اپنی بدنامی نہیں چاہتا اور اپنے اہلِ خانہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا اور معاملہ کچھ اس قدر پراسرار ہے کہ شاید کوئی بھی نہ سمجھ سکے۔"

حکیم بدھن نے کہا :۔ "حضور والا جب تک آپ تفصیل سے واقعہ بیان نہ فرمائیں کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

وہ بولے :۔ "مجھے تو بیان کرنا ہی ہے۔ رہا رازداری کا معاملہ تو میرا ایمان یہ ہے کہ آپ تینوں حضرات شریف ہیں، یہاں کی بات یہیں چھوڑ کر تشریف لیجائیں گے۔"

حکیم بدھن نے کہا :۔ "آپ اس سے اطمینان رکھیں۔"

وہ بولے :۔

"حکیم صاحب! میرے والد ماجد کو انتقال کئے بیس سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے مرتے وقت مجھے لوہے کی ایک چھوٹی سی تجوری دیتے ہوئے کہا تھا

اس تجوری میں میری ساری زندگی موجود ہے۔ میرے مرنے کے بعد تم ان کاغذات کو پڑھ لینا۔"

میں نے ان سے تجوری کی چابی لے لی اور وہ فوراً ہی انتقال کر گئے۔ مجھے ان کے انتقال کے بعد جائداد کے معاملات اور خاندانی تنازعات سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ میں اس کو کھول کر دیکھتا یہاں تک کہ میں انکی وصیت بھی بھول گیا۔ بہرنوع میں نے وہ تجوری آرام گاہ میں اپنے سرہانے رکھوادی اور وہ اب تک وہیں موجود ہے۔"

حکیم بدھن نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا :۔

"اور اس کی چابی۔"

نواب صاحب بولے :۔

"اس کی چابی میں نے اپنے گھر میں حوالے کردی تھی جو ہمیشہ ان کے ازاربند میں بندھی رہتی ہے وہ بہت محتاط خاتون ہیں سال گزشتہ میں نے وہ تجوری کھولی — اندر والد مرحوم کی چند بیاضیں تھیں۔ ایک دیوان تھا غزلوں کا۔ ایک بیاض تھی نوحوں اور سلاموں کی۔ میں نے چند قلمی مرثیے بھی دیکھے۔ ایک بیاض ان سب کے علاوہ تھی جس میں والد مرحوم کے معاشقے تھے۔ حکیم صاحب میں نے انکو تھوڑا تھوڑا پڑھ کر چھوڑ دیا۔ مجھ کو شرم آئی۔ ان کتابوں کے علاوہ ایک روغنی کاغذ تھا جس پر ایک چڑیا کی تصویر اس انداز سے بنی ہوئی تھی کہ دور سے وہ ۸۴۰ کا عدد نظر آتی تھی۔ یہ معما میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے وہ کاغذ سب بیاضوں کے اوپر رکھ کر تجوری کو مقفل کردیا۔ کچھ دنوں ۸۴۰ کے سلسلے میں فکرمند رہا پھر بات دماغ سے نکل گئی۔"

حکیم بدھن نے کہا :۔ "۸۴۰ کا معاملہ پراسرار ہے۔"

نواب صاحب بولے :۔

معاف فرمائیں، میں تو اس کو والد صاحب مرحوم کی پینک کا ثمرہ سمجھتا ہوں۔ اللہ بخشے بہت شوقین تھے پینیا بیگم کے۔ لیکن پرسوں جب میں نے اتفاقاً تجوری کھولی تو وہ روغنی کاغذ لاپتا تھا۔ تمام بیاضیں موجود تھیں میں حیران رہ گیا۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ "نواب صاحب کہیں آپ نے کاغذ کسی دوسری جگہ تو نہیں رکھدیا تھا اور آپ کے میں تجوری میں رکھنا یاد رہا ہو۔"

وہ بولے :۔ "جی نہیں حکیم صاحب میں اس بات حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں نے وہ کاغذ تجوری میں رکھا، کہیں اور رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

حکیم بدھن نے تحیر آمیز لہجے میں کہا :۔

"اور چابی بیگم صاحبہ کے پاس ہی رہی۔"

وہ بولے :۔ "جی ہاں یہی وجہ ہے کہ میں پولیس کو نہیں چاہتا۔ وہ بیگم صاحبہ سے سوالات کریں گے، ملا سے سوالات کریں گے۔"

حکیم بدھن نے کہا :۔ "جی ہاں یہ تو ہوگا۔"

وہ بولے :۔ "حکیم صاحب اصولاً تو مجھ کو بھی پریشان نہ ہونا چاہئے۔ ایک مہمل کاغذ ہے جو میرے لئے بے ہے۔ اس کی گمشدگی یا بازیابی سے مجھے کیا نقصان کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔"

میں نے کہا :۔ "حضور نواب صاحب! آخر وہ بے اور مہمل کاغذ یقینی کچھ معنی اور حقیقت رکھتا ہوگا ورنہ اس کو کیوں چرانا؟"

وہ بولے :۔ "بہزاد صاحب آپ نے میرے دل کہدی میں اس بھید کو جاننا چاہتا ہوں اور اس کے اخراجاتِ کثیرہ کے لئے تیار ہوں۔ اسی لئے میں نے صاحب کو زحمت دی۔"

حکیم بدھن نے کہا۔

"نواب صاحب کیا اس کا امکان ہے کہ میں تجوری کو ایک نظر دیکھ لوں۔"

نواب صاحب نے کہا :۔

"جی ہاں۔ جی ہاں کوئی دشواری نہیں ہے۔ نشین سے ملحق میری آرام گاہ ہے میں بیگم کو ہٹوائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر نواب صاحب نے تالی بجائی ایک قبول صورت خواص اندر داخل ہوئی حکیم بدھن کا

خواص کو دیکھنے میں محو ہو گئے۔ نواب صاحب نے

سے کہا۔

"ذرا بیگم صاحبہ سے کہو کہ صحن میں تشریف لے جائیں ان حضرات کے ساتھ آرام گاہ میں آرہا ہوں۔"

وہ بولی: "حضور عالیہ تو اس وقت کوٹھے پر تشریف رہا ہیں۔ آرام گاہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ چلیے تشریف لے چلیے۔"

نواب صاحب کے ساتھ ہم لوگ ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ آرام گاہ بڑی سکلّف تھی۔ چھت پر کئی قیمتی جھاڑ اور دیواروں پر فانوس آویزاں تھے۔ زمین پر دبیز قالینوں کا فرش تھا۔ بائیں جانب دو نوادر مسہریاں بچھی ہوئی تھیں جو قدیم آرٹ کا نمونہ تھیں۔ ان مسہریوں کے سرہانے ایک آہنی تجوری رکھی ہوئی تھی۔

نواب صاحب نے کہا۔

"یہی وہ تجوری ہے حکیم صاحب"

حکیم بڈھن نے کہا:۔

"اور اس کی چابی"!

نواب صاحب کے اشارے پر ایک نازک اندام خواص اندر داخل ہوئی اور چند ہی لمحوں میں ایک چابی لے کر واپس آئی۔

حکیم بڈھن نے چابی لے لی۔ اس کو دیکھا۔ چابی پر گلاب کا پھول بنا ہوا تھا۔ حکیم بڈھن نے نواب صاحب سے اجازت لے کر اسے تجوری میں لگا دیا۔ تجوری میں بھی قفل کا نشانہ گلاب کے پھول جیسا تھا۔ چابی اس میں لگی اور تجوری کھل گئی۔ واقعی اس تجوری میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہ تھا۔ نواب صاحب بولے:۔

"میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں نے وہ موٹی کاغذ ان کتابوں کے اوپر رکھا تھا۔"

حکیم بڈھن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا آتشی شیشہ مل سکے گا۔"

نواب صاحب کے اشارے پر نازک قدم خواص ایک آتشی شیشہ لیے ہوئے آئی جو ایک ہینڈل کے ساتھ آویزاں تھا۔ حکیم بڈھن نے وہ آتشی شیشہ لے کر بیاقصول کو اندر سے دیکھا اور کہا۔

"ذرا ... واقعی، وہ کاغذ چرایا گیا ہے، آپکا

گمان صحیح ہے۔"

وہ پراشتیاق لفظوں میں بولے:۔

"یہ آپ نے کیسے جانا حکیم صاحب؟"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"بہت معمولی بات ہے آپ اس کو ملاحظہ فرمائیں اس پر کتھے چونے کا ہلکا سا نشان ہے۔ چور غالباً چھالیا تمباکو کھانے کا عادی تھا اور انگلیوں سے کتھہ چونا چاٹتا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں کرنے کے لئے چٹکی سے کتھہ چونا چاٹا تھا۔ اس کی انگلیوں کا پورا نشان جلد پر نمایاں ہے۔"

میں نے کہا:۔

"ممکن ہے یہ نشان پرانا ہو۔"

حکیم بڈھن نے کہا: "نہیں بہزاد پرانے کتھے چونے کا نشان سوکھ کر کب کا ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ تازہ ہے اور غالباً چار پانچ دنوں سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا ہے۔"

نواب صاحب نے کہا:۔

"حکیم صاحب آپ کی سوجھ بوجھ نے میرا دل خوش کر دیا اور مجھے پر امید کر دیا ہے۔"

وہ بولے: "میرا کام خدمت کرنا ہے براہ کرم اپنے والد کی وہ ڈائری جس میں انکی زندگی کے واقعات ہیں اور یہ چابی مجھے عاریتاً دے دیجئے اگر مجھ پر اعتماد ہو۔"

نواب صاحب نے کہا:۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حکیم صاحب۔ آپ بشوق ڈائری بھی لے جائیں اور چابی بھی اور اخراجات کے لئے فی الحال سو روپے قبول فرمائیں۔"

ہم تینوں دس منٹ بعد محل سرا سے باہر نکلے سواری کا دور دور تک پتا نہیں تھا پیدل چلتے ہوئے مظفر نگر کی چڑھائی تک آئے جہاں سے ایک یکے پر میں اور حکیم روانہ ہو گئے۔ خاں صاحب وہیں ٹھہر گئے محمود نگر کے پاس حکیم بڈھن نے مجھے اتارتے ہوئے کہا: "یہ لو کنجی اور مرزا دینا کی مسجد کے نیچے جو دو تین دوکانیں ہیں وہ چابی بنانے والوں کی ہیں۔ ان سے اس کنجی کی ایک نقل بنوالو۔"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پانچ روپے کا نوٹ دیا اور چلے گئے۔ کوئی پانچ منٹ کی مسافت پر مرزا دینا کی مسجد تھی اس کے نیچے دو دوکانیں واقعی موجود تھیں کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا میں جوں ہی پہلی دوکان میں داخل ہوا ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے میں نے وہ کنجی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا:۔

"اس کی ایک نقل مجھے بنا دیجئے۔"

کنجی ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے اور بولے:۔

"تمہیں چھٹن صاحب نے بھیجا ہوگا۔ پہلے میرا بقیہ روپیہ لے آؤ پھر بناؤں گا۔"

میں نے پوچھا: "کون چھٹن صاحب"

وہ چڑ کر بولے:۔

"کون چھٹن صاحب۔ کیا بھولے بن رہے ہیں۔ وہ چھٹن صاحب جو میوے والی سرائے کے پھاٹک کے داہنی طرف شالوں کی مرمت کرتے ہیں، جن کے دونوں کلوں میں گلوریاں ٹھنسی رہتی ہیں اور جو کولہے مٹکا مٹکا کر چلتے ہیں۔"

میں ان سے واقف تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ یہ چابی لے کر نہیں آئے ہوں گے۔"

انھوں نے کہا۔ "ناممکن۔ یہی چابی تھی۔ دیکھ لو داہنی طرف غلطی سے مجھ سے ذرا سی ریتی لگ گئی تھی اس کا نشان بھی موجود ہے۔ ابھی پانچ روز ہوئے مجھ سے دو روپے پر دوسری کنجی بنوائی۔ مجھے ایک روپیہ ٹکا کر دوسرا روپیہ قرض کر گئے۔ اور آج تک صورت نہیں دکھلائی۔ آج تم کو بھیجا ہے۔ میں یہ چابی ہرگز نہیں دوں گا۔"

معاملہ ٹیڑھا تھا۔ میں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر انکو دیا اور کہا۔

"آپ چابی بنائیے۔ دو روپے اس کے اور ایک بقیہ لے لیجیے۔"

وہ فوری کام میں مشغول ہو گئے میں سامنے چائے خانے میں بیٹھ کر وقت گزاری کرنے لگا۔ کوئی آ گھنٹے میں وہ چابی بن کر تیار ہو گئی۔ میں چابی اور

دو روپے لے کر حکیم بڈھن کے پاس پہنچا۔ میں ڈر رہا تھا کہ شاید حکیم بڈھن ایک روپیا فالتو خرچ کرنے پر کچھ جز بز ہوں لیکن وہ یہ واقعہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے:۔

"بہزاد تم نے بڑا کام کر لیا۔ اب بھیا میرا ایک کام اور کر دو۔"

میں نے کہا:۔ "وہ بھی بتا دو۔"

وہ بولے:۔ "سیدھے نو بستے چلے جاؤ۔ وہاں کسی ایسے مقام پر بیٹھو جہاں سے نواب ددّن صاحب کی گلی سامنے ہو۔ سہ پہر کے وقت میرے خیال میں نازک قدم خواص کی ڈیوٹی ختم ہو گی، جب اس کو سڑک پر دیکھو تو اس سے کافی فاصلے پر اس کا تعاقب کرو اور دور سے اس کا مکان دیکھ کر آ جاؤ۔ یہ دو روپے وقت گزاری کے لئے رکھ لو۔"

کام واقعی تکلیف دہ تھا لیکن مجبوراً مجھے جانا پڑا۔۔۔ نو بستے میں لبِ سڑک ایک چائے خانے میں بیٹھ کر میں نے وقت گزاری شروع کر دی۔ چار بجے تک انتظار کرتے کرتے مجھے سخت کوفت ہونے لگی تھی کہ اتنے میں نازک قدم بہ ہزار انداز گلی سے نکل کر سڑک پر آئی اور محمود نگر کی طرف روانہ ہوئی۔ میں نے بھی کافی فاصلہ دے کر دوسری پٹی پر تعاقب شروع کیا۔ اصغر کبابی کی دوکان پر وہ رکی اس نے کباب خریدے اور داہنی جانب مڑ گئی۔ یہ سنگی بیگ کا علاقہ تھا۔ مڑتے ہی وہ تھوڑی دور جا کر ایک مکان کے سامنے جا کر رکی۔ اس نے کنڈی کھٹکھٹائی اور مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ مجھے یہ فکر ہوئی کہ یہ اسی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کے مکان میں داخل ہوئی ہے۔ میں سامنے لکڑی کی ٹال پر گیا۔ ٹال پر ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اکنی پھینکتے ہوئے کہا:۔

"یار یہاں کوئی نواب صاحب کے یہاں کی خواص رہتی ہے؟"

وہ بولا:۔ "وہ کیا سامنے کا مکان ہے۔ اور نازو نام ہے اس کا۔"

میں وہاں سے سیدھا حکیم بڈھن کے پاس پہونچا اور ان کو پوری روداد بتانے کے بعد تھک کر کرسی پر گر گیا۔

حکیم بڈھن نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"[illegible]

کے باوجود آدمی کام کے نکلے۔ اب تم گھر جاؤ۔"

میں اپنے گھر چلا آیا۔ دن بھر تکان کے باعث بیٹھک میں چارپائی پر لیٹ گیا میری آنکھ لگ گئی۔ میں بمشکل آدھ گھنٹا سویا ہوں گا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ حکیم بڈھن مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میرے بیدار ہوتے ہی بولے۔

"یار بہزاد معاف کرنا ایک ضروری کام نکل آیا اور اس کو ابھی کرنا ہے۔"

میں تاؤ کھا کر اٹھ گیا اور وہ بولے:۔

"یار غصہ تھوک دو اور نخاس سے آمد و رفت کا ایک یکّا لے کر نظیر آباد چلے جاؤ۔ جاپلنگ مارٹ کے مقابل جو عمارت ہے اس کی پہلی منزل پر بنگالی کلب کا دفتر ہے وہاں جا کر میرا ایک خط دو اور جو کچھ وہ دیں اسے لے کر فوراً چلے آؤ۔"

میں باہر نکلا۔ یکّا لیا اور فوراً نظیر آباد پہونچا بنگالی کلب کا دفتر بآسانی مل گیا وہاں جو صاحب تھے انھوں نے رقعہ پڑھ کر مجھ سے کہا۔

"بیٹھ جائیے آپ کو دس منٹ انتظار کرنا ہو گا۔"

دس منٹ کے بعد وہ ایک چھوٹی سی اٹیچی لئے ہوئے واپس آئے اور میرے حوالے کر دی۔ میں سیدھا گھر آیا حکیم بڈھن چائے زہر مار کر رہے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہوئے لپکے۔

"یار اندر سے آئینہ لے آؤ اور ایک لوٹے میں پانی۔"

مطلوبہ چیزیں آنے کے بعد انھوں نے اٹیچی کھولی، اس میں سے کچھ روغن نکالے اور اپنے چہرے پر ملنا شروع کئے۔ ایک دوا نکالی۔ سفید بالوں کی مصنوعی داڑھی چپکائی پھر اٹیچی میں سے ایک عبا نکالی اور ایک چوڑا پاجامہ نکالا اور پہن کر تیار ہو گئے۔ ان کا حلیہ دیکھ کر میں بے اختیار قہقہے مار رہا تھا۔ میرا غصہ فرو ہو گیا میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"واہ صاحب زادے کیا بہروپ دھارا ہے۔"

وہ بولے:۔ "استاد اندھیرا ہو چکا ہے، اب مجھ کو گلیوں ہی گلیوں سنگی بیگ کے احاطے لے چلو۔"

میں ان کے ہمراہ ہو لیا۔ گلیوں ہی گلیوں ہوتے ہوتے وہ نازو کے مکان کے سامنے نکلے اور مجھ سے کہا:۔

"مکان کے دائیں طرف کھڑے ہو جاؤ اس انداز سے کہ لوگوں کی نظر تم پر نہ پڑے۔"

مجھے بتا کر انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے نازو کی آواز آئی:۔

"کون صاحب ہیں؟"

"میں چھبّن کا باپ ہوں۔"

حکیم بڈھن کی آواز میں لرزش تھی میں ان کی اداکاری پر حیران رہ گیا۔

فوراً دروازہ کھل گیا اور نازو کی آواز آئی:۔

"آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی اندر سے پلنگ لا رہی ہوں۔"

باہر مکمل اندھیرا تھا۔ میونسپلٹی کی لالٹین بہت دور بنّے صاحب سنار کے مکان کے قریب لگی ہوئی تھی یکایک حکیم بڈھن کی آواز آئی۔

"بیٹی یہ پچیس روپے قبول کر لو چھبّن میاں نے بھیجے ہیں۔" وہ بولی:۔

"مجھ سے تو پچاس کا وعدہ کیا تھا انھوں نے، اور پچیس کیوں بھیجے ہیں۔ میں تو نہ لوں گی۔"

حکیم بڈھن نے کہا: "بیٹی ذرا سے کام کا یہ معاوضہ کم نہیں ہے۔"

وہ بولی:۔ "چچا جان بیگم کے ازار بند میں سے کنجی اڑا، پھر دوبارہ ازار بند میں باندھ کر تجوری کھولنا اور تجوری سے کاغذ لا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے جان جوکھوں کا کام کیا ہے۔"

حکیم بڈھن نے جلدی سے کہا:۔

"مجھے اتنی تفصیل معلوم نہیں تھی۔ میں جا کر اس کو سمجھاتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو دو چار روز میں وہ رقم آ جائے گی۔ خدا حافظ۔"

حکیم بڈھن جب اصغر کبابی کی دوکان پر پہونچ گئے تو میں گلی سے باہر نکلا۔ چند منٹوں میں میں نے حکیم بڈھن کو جا لیا اور پوچھا:۔

"استاد یہ تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ وہ کاغذ نازو نے چرایا ہے اور چھبّن کی تحریک تھی۔"

وہ بولے:۔ "یار تم بھی کہو گے کہ میں آدمی ہوں۔ خواہ دو کتنے ہوتے ہیں۔ ارے بھئی چار ہی تو ہوتے ہیں

ں کا مطلب ہے کہ چابی ہوانے والا چمن ہے اور تجوری
مالی کس کی ہو سکتی ہے۔ سوائے نانڈو کے اور کون
ا ہے۔ تجوری سے کاغذ کون اڑا سکتا ہے۔ باہر والا
و ہی نہیں سکتا۔ اس مفروضہ کی بنا پر میں نے یہ
کھیلا اور تم نے دیکھا کہ میرا نظریہ کتنا ٹھیک نکلا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

وہ بولے۔ "میں تمہارے گھر سوؤں گا۔ مجھے نواب کی
ں پر صاحب، میرے گھر میں تمہاری بھاوج مجھ کو
ے نہیں دیں گی۔"

میں نے کہا۔ "اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات
تی ہے۔ یہ تو تم مجھے عزت بخش رہے ہو استاد۔"

گھر پہونچ کر میں نے دو پلنگ صحن میں ڈلوا دیے۔
ت پر نیچے سونے کے لئے چلے گئے تھے۔ کھانے کے بعد
م بدھن نے لالٹین کی روشنی میں وہ بیاض پڑھنی
روع کی اور تقریباً آدھ گھنٹے پڑھنے کے بعد بولے۔

یار بہزاد۔ اس بیاض میں محض بیس صفحوں میں نواب
ن صاحب کے والد نے ایک بے سر و پا واقعہ لکھ مارا
کا کوئی مقصد اور کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ معمولی
عاشقی کی داستان ہے، اس کو آخر ایک بیاض میں
محفوظ کرنے کا سبب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ باقی تقریباً
تی صفحات بیاض میں سادے پڑے ہوئے ہیں جن پر
ایک حرف بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ واقعہ نامکمل
وتا تو میں کہتا کہ آگے کچھ اور لکھنا مقصود تھا لہٰذا
وراق سادے چھوڑ دیے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یار کیوں دماغ کھپا رہے ہو۔ یہ امراء صحیح الدماغ
کب ہوتے ہیں۔ اپنی دماغی اپج میں کچھ سوچا ہوگا۔"

حکیم بدھن جواب دینے ہی والے تھے کہ ان کا ہاتھ
بے خیالی میں بیاض کے پاس رکھے ہوئے پانی کے گلاس
سے ٹکرا گیا۔ گلاس پورا الٹ گیا اور بیاض کے اوراق
بھیگ گئے۔

حکیم بدھن نے بے حد تعجب سے کہا۔

"یار یہ بڑا برا ہوا۔"

میری نگاہ جوں ہی بھیگے ہوئے اوراق پر پڑی
مجھے سادے اوراق پر کچھ حروف نمایاں نظر آئے

میں نے کہا۔

"یار دیکھو تو یہ اوراق کسی کیمیائی محلول میں ڈوبے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بھیگنے کے بعد ان پر عبارت
نمایاں ہو گئی ہے۔"

حکیم بدھن نے گھبرا کر ان کاغذات کو دیکھا۔ وہ
عبارت کچھ یوں تھی:۔

مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے ایک ایسا جرم
ہو گیا ہے جس کی تلافی میرے امکان میں نہیں
ہے۔ مجھے اس جرم کی سزا مل گئی ہے، میں
بھگت رہا ہوں۔ واقعہ یوں ہے کہ جب
میرے والد کا انتقال ہوا اور میں جائداد
پر قابض ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد
کا ایک لڑکا ایک مسماۃ سے بھی ہے جن کو
ایک دور دراز مقام پر والد ماجد نے رکھ چھوڑا
ہے۔ ان مسماۃ کے ساتھ نکاح یا متعہ کا کوئی
ثبوت نہیں ہے اور نہ میں نے اس کی چھان
بین کی۔ وثیقہ اور جائداد میں بلا شرکت
غیرے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نکاح کی خبر
مجھے نبا صاحب نے دی تھی جو چوک میں دو شالوں
کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ اس خاندان سے
بھی واقف تھے۔ ان کا منہ بھرنے کے بعد میں
نے انھیں کے ذریعے اس خاندان کو اسقدر
دھمکایا کہ وہ لوگ کہیں دور دراز مقام پر چلے
گئے، لیکن میرے ضمیر پر اس حق تلفی کا بار
رہا اور اس احساس نے اسقدر شدت اختیار
کی کہ میں بے چین رہنے لگا۔ میں نے اس
خاندان کو تلاش کرایا لیکن مجھے اس کا کوئی
پتا نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ میں ایک ایسے مرض
کا شکار ہو گیا کہ جسکا کوئی حکیم علاج نہ کر سکا
میرے جسم پر ایک بڑا سا سرخ رنگ کا داغ
پڑ گیا جس میں ہمہ وقت آگ سی لگی رہتی تھی۔
بعض اوقات جلن اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ مجھے
کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ اس مرض نے مجھے
یہ یقین دلا دیا کہ میں نے جو جرم کیا ہے قدرت
کی طرف سے اس کی یہ سزا مجھے ملی ہے۔

اس احساس نے اسقدر شدت اختیار کی کہ
مجھے ایک لمحہ بھی سکون ملنا دشوار ہو گیا۔ میں نے
آخر کار طے کیا کہ کسی نہ کسی طرح حق دار کو اسکا
حق ملنا ہی چاہیے لیکن میرے سامنے میری
واحد اولاد دو تن کا مسئلہ بھی تھا۔ میں اسکو
کیونکر باور کراتا کہ اس کے ایک چچا کو جس کے
پاس کوئی ثبوت جائز اولاد ہونے کا نہیں
ہے میں نے آدھی جائداد تقسیم کر دی۔ باوجود
یہ جاننے کے میں مہینوں اس مسئلے پر غور
کرتا رہا، آخر کار ایک ترکیب ذہن میں آئی میں
نے اس جائداد کی قیمت کا اندازہ لگایا۔ مجھے
اتفاقاً تہہ خانے کے ایک طاق میں چھوٹی سی
صندوقچی مل گئی۔ میں اس وقت بالکل تنہا
اس صندوقچی میں کچھ ہیرے اور یاقوت
تھے۔ میں نے ان جواہرات کو بیچا۔ آپ شاید
یقین نہ کریں گے کہ انکی جو قیمت مجھے ملی وہ
میری کل جائداد کی قیمت کی لاگت تھی۔ میں نے
اس کو غیبی اشارا سمجھا اور میں نے وہ تمام رقم
سونے کی شکل میں ایک صندوقچے میں محفوظ کی
اور اس کو اپنے ہاتھوں سے ایک ایسے مقام
پر محفوظ کیا جسکا مکمل پتا ۸۴۰ میں نے میں
نے اس مقام کی تصویر بھی بنائی اور ایک
مومی کاغذ پر اپنے ہاتھوں سے اتاری، اس
کام کے بعد آپ یقین نہ کریں گے کہ میں نے اس
داغ کی تکلیف میں انتہائی کمی محسوس کی۔
وہ داغ جسکا علاج لکھنؤ میں کوئی نہیں
کر سکا تھا۔ میرے احساسات میں کمی
ہوئی۔ لیکن ابھی بڑا مسئلہ تھا حق دار کو پہچاننے
کا۔ میں نے نبا صاحب کو بلایا اور ان سے صرف
اتنا کہا۔

"نبا صاحب میں نے اپنے بھائی کے لئے
جائداد کی نصف قیمت سونے کی شکل میں محفوظ
کر دی ہے۔ اس کا پتا ہے ۸۴۰۔"

اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس خاندان
کا پتا چلائیے اور میرے بھائی سے صرف اتنا

مل لیں اور دڈن سے صرف موم کی کاغذ کی تصویر مانگ لیں انکی امانت ان تک پہونچ جائے گی۔"

ض میں یہاں تک تو عبارت موجود تھی اس کے بعد روف کچھ کٹے ہوئے تھے میں نے اور حکیم بڈھن نے بہت شش لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔ آخرکار حکیم بڈھن نے مک ہار کر کہا۔

"آپ کیا سمجھے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں سمجھے" وہ زوردار قہقہہ رتے ہوئے بولے۔

"تم سے خدا سمجھے۔ یار معاملہ روز روشن کی طرح اف ہو چکا ہے، تھوڑی سی کڑیاں اور ملانا ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے بھی اپنی صفائی میں شریک فرمالیں بڑی عنایت ہوگی۔"

وہ بولے "استاد لکھنوی ہوتے ہوئے بھی تم منو والوں سے بے خبر ہو۔ ارے ظالم یہ چھپن صاحب والے نے تصویر چرائی ہے نبا صاحب کے صاحبزادے یا نبا صاحب کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ لا مرتے وقت وہ یہ راز صاحبزادے پر کھول گئے با اور صاحبزادے کی نیت خراب ہو گئی ہے۔"

یں نے کہا۔

"لیکن اس ۸۰ ۸ کا حل کیا ہوگا؟"

وہ بولے "یہ تو بہت آسانی سے سمجھ میں آپکا لیکن بتاؤں گا نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے غرض بھی نہیں ہے معلوم کرنے، اب پروگرام کیا ہے؟"

وہ بولے "کل نواب دڈن سے ملنا ہے۔"

میں اور حکیم بڈھن جب نواب دڈن کے پہونچے دربار برخاست ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے را ہی ہم دونوں کو تخلیے میں طلب کرلیا اور حکیم بڈھن پورا بیان سننے کے بعد بولے

حکیم صاحب آپ واقعی صاحب کمال ہیں، جتنا جو کچھ کہا تھا آپ اس سے کہیں بڑھ کر نکلے۔ مجھے والد صاحب کے فیصلے سے کوئی انکار نہیں۔ انھوں نے

چھپا دیا گیا۔ یہ تو سوچیں اس کا ہے کہ انھوں نے میرے پیش نظر ایک حقدار کو کیوں محروم کیا اور اس جرم کی سزا آتما جات بھگتی ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا "نواب صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے دادا کس گاؤں میں زیادہ آیا جایا کرتے تھے؟"

نواب صاحب نے کہا:

جب دادا جان مرحوم کا انتقال ہوا میری عمر دس سال تھی۔ ان کو بٹیروں کے شکار کا بڑا شوق تھا وہ اکثر گنیش پور گاؤں میں زیادہ جایا کرتے تھے اور قیام بھی زیادہ تر وہیں رہا کرتا تھا۔ حکیم بڈھن نے کہا:

"نواب صاحب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس خاندان کو تلاش کروں۔"

وہ بولے:

آپ بصد شوق تشریف لے جائیں اور اخراجات کے لئے یہ دو سو روپے کی رقم اور قبول فرمالیجئے۔ گنیش پور نیپال کی ترائی میں ہے اور اب تک میری ہی ملکیت ہے۔ میں ضلع دار کو ایک رقعہ بھی لکھے دیتا ہوں۔

رات کے نو بجے والی گاڑی سے ہم لوگ گونڈے روانہ ہو گئے۔ صبح پہونچتے ہی بہرائچ کی گاڑی تیار ملی اس پر بیٹھ کر ہم ساڑھے سات بجے گنیش پور اترے۔ اسٹیشن سے اترتے ہی ہم دونوں ضلع دار کے گھر پہونچے جس کو حکیم بڈھن نے نواب صاحب کا پرچا دے دیا۔ پرچا پڑھتے ہی اس نے انتہائی خاطر تواضع کرنا شروع کر دی۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن انتہائی زرخیز۔ حکیم بڈھن کے سوالات پر اس نے کہا:

"آپ پرانی باتیں پوچھ رہے ہیں میں ایک بڈھے کو بلوائے لیتا ہوں اس سے آپ کو صحیح صحیح معلومات مل جائیں گی۔ لیکن وہ دوپہر کے بعد آسکے گا۔ گاؤں میں سب سے بوڑھا آدمی ہے۔"

حکیم بڈھن خاموش ہو رہے دوپہر کا وقت بہت اچھا گزرا۔ شہری ہنگامی زندگی کے بعد گاؤں کی پرسکون زندگی مزہ دے گئی۔ سہ پہر کو پانچ بجے ایک بیل گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ ضلعدار نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب۔ وہ دیکھئے گلو چچا آگئے۔"

لیجئے میں بیل گاڑی سے ایک اسّی سالہ آدمی اترا باوجود اس عمر کے وہ صحت کے اعتبار سے جوانوں سے بہتر تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی حکیم بڈھن نے اس سے سوالات کئے، ان کے جواب میں اس نے کہا۔

"حکیم جی بات بہت پرانی ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے مکان کے پاس بھوپال کا ایک خاندان آکر بس گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور ایک جوان لڑکی۔ ان صاحب نے یہاں کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ دیہات میں پردے وغیرہ کا کوئی رواج نہیں ہے۔ اسی لڑکی پر نواب صاحب کی نظر پڑ گئی پھر کیا ہوا مجھ کو نہیں معلوم۔ نواب صاحب ان کے گھر میں آنے جانے لگے۔"

حکیم بڈھن نے کہا:

"کیا نواب صاحب نے نکاح کر لیا تھا؟"

وہ بولے "ٹھیک سے معلوم نہیں ہے صاحب لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس لڑکی سے نواب صاحب کے ایک لڑکا ہوا جسکا نام ذوالفقار تھا۔ وہ لڑکا بارہ یا چودہ سال کا تھا کہ نواب صاحب گزر گئے اور اس واقعے کے ایک ماہ بعد وہ خاندان واپس چلا گیا اس کے بعد سے اب تک ان کی کوئی بھی اطلاع نہیں ملی۔"

حکیم بڈھن نے پھر پوچھا۔

"کچھ ان کا اتا پتا یاد ہے؟" وہ غور کرنے کے بعد بولے:

"کسی شہر کو بتاتے تھے جسکا نام ہردا تھا اس کے علاوہ کچھ یاد نہیں۔"

گفتگو یہاں تمام ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی ہم دونوں پہلی گاڑی سے روانہ ہو گئے اور تقریباً ڈھائی بجے رات کو ہم لکھنؤ پہونچے۔ حکیم بڈھن بجائے شہر جانے کے سیدھے چار باغ اسٹیشن اتر پڑے۔

[illegible] بیٹھ جائیں گے۔

نے کہا: "تمہیں ٹھیک سے پتا بھی ہے یا خواہ مخواہ بات کو طول دو گے"

وہ بولے: "یار مجھے اچھی طرح یاد ہے جھانسی اور لکھنؤ کے درمیان ایک اسٹیشن ہے جہاں کی جامنیں مشہور ہیں۔ گلاب جامنوں ہی کی وجہ سے وہاں پر ٹرین ٹھہرتی ہے۔ مجھے بھی صرف اسٹیشن یاد ہے۔"

مجھے کوفت تو بہت ہوئی لیکن کیا کرتا، بات ماننی پڑی۔ ساڑھے پانچ بجے ٹکٹ خرید کر ہم ایکسپریس میں جا بیٹھے۔ میں تو ٹرین میں بیٹھتے ہی سو گیا جب میری آنکھ کھلی تو ٹرین کالپی اسٹیشن پر تھی وہاں ہم نے اور حکیم بڈھن نے کھانا کھایا اور گاڑی ساڑھے نو بجے جھانسی پہونچ کر ختم ہو گئی۔ اسٹیشن پر ٹرین ہی میں رات کاٹنے کے بعد صبح ایکسپریس میں یہ ڈبا اٹیچ ہو گیا گاڑی ہر دا پہنچی دن کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ واقعی پلیٹ فارم پر ہر طرف گلاب جامن بیچنے والوں کا مجمع تھا۔ ہم دونوں نے گلاب جامنیں کھانے کے بعد باہر کا رخ کیا اسٹیشن شہر سے ملا ہوا تھا۔ ہم لوگ بازار میں آئے۔ بازار میں ایک ہوٹل میں چائے کا آرڈر دے کر ہم انتظار کر رہے تھے کہ ایک نوجوان ایک میز سے اٹھ کر ہماری میز کے پاس آیا اور حکیم بڈھن سے بولا۔

"کیا آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں؟"

حکیم بڈھن نے کہا: "جی ہاں! میری وضع قطع ہی کہے دے رہی ہے"

وہ بولا: "صاحب آپ کی وضع قطع ہی دیکھ کر میں بے چین ہو گیا۔"

یہ ایک تیس پینتیس سال کا شریف صورت آدمی تھا، پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا تھا اس کا لباس بھی شیروانی اور پاجامہ تھا۔

حکیم بڈھن نے کہا: "میں آپ کا بیحد ممنون ہوں گا نہیں کہ [illegible] جس کا نام [illegible] ہے اور وہ اس سے قبل بہرائچ کے ضلع میں ایک گاؤں میں رہتے تھے"

وہ صاحب چونکے اور بولے:

"جناب آپ میرے والد مرحوم کو پوچھ رہے ہیں میں نے سنا ہے کہ میرے دادا کوئی بہت بڑے لکھنؤ کے نواب تھے لیکن والد مرحوم نے کبھی ان کا تذکرہ کھل کر نہ کیا"

"کیا ان کا انتقال ہو چکا ہے"

"جی ہاں۔ کوئی دس برس ہوئے۔ مجھے اپنی والدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ میرے والد اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ان کے نانا گھبراہٹ سے کام نہ لیتے تو ہم لوگ تنگ دست نہ رہتے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے مجھے تعلیم دلوائی اور آج اللہ کے فضل سے میں اسکول میں ماسٹر ہوں"۔

حکیم بڈھن نے کہا۔

میں اسی خاندان کی طرف سے آیا ہوں جس کی بے پروائی کے ہاتھوں آپ کے والد ماجد نے عسرت میں زندگی کاٹی۔ لیکن آپ مجھ پر اعتبار کریں اور لکھنؤ ایک ہفتے کے لئے چل سکیں تو شاید آپ کی زحمتوں کی تلافی ہو جائے"

وہ راضی ہو گیا۔ اس کا نام مختار تھا۔ وہ ہم کو اپنے گھر لے گیا۔ چھوٹا موٹا سا آرام دہ گھر تھا جہاں ہم دونوں کو دو دن مہمان رکھنے کے بعد مختار نے دس دن کی چھٹی لی اور ہمارے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

نواب ددن صاحب مختار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مختار بھی نواب ددن صاحب کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور جب حکیم بڈھن نے اس دفینے کا حال سنایا تو ددن صاحب نے کہا۔

"حکیم صاحب آپ کا تمام بیان حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے، لیکن یہ ۰،۴۰۸ کا حل کیونکر معلوم ہو کہ میرے بھائی مختار کو ان کا حق مل سکے، یوں بھی میں انکی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں"

حکیم بڈھن نے کہا۔

نواب صاحب یہ معما سب سے زیادہ آسان ہے یہ عدد ۰،۴۰۸ نہیں بلکہ آٹھ اور چالیس ہے"

نواب ددن نے کہا۔

"تسلیم کرلیا لیکن اس کا حل کیا ہے"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"آپ اپنے والد مرحوم کی عبارت پڑھئے۔ انھوں نے بیاض میں صاف صاف لکھا ہے کہ انھوں نے تن تنہا یہ صندوقچہ دفن کیا ہے"

ددن صاحب نے کہا:

"اور وضاحت فرمائیے"

حکیم بڈھن نے کہا۔

یہ ظاہر ہے کہ تن تنہا وہ دور نہیں جا سکتے تھے اپنے محل سے آٹھ گز کے فاصلے پر کے حساب سے انھوں نے لفظ "آٹھ" لکھا ہے۔

نواب ددن نے پوچھا: "اور پھر لفظ چالیس سے کیا مراد ہے"؟

وہ بولے: "اگر آپ بغور تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہاں ایک عمارت تھی جسکا نام چالیس درہ تھا اور جو امتداد زمانہ سے مٹ مٹا کر میدان کی شکل اختیار کر گئی ہے"

"نواب ددن صاحب یہ جملہ سن کر اچھل پڑے اور جلدی سے بولے:

"ابھی رات کے گیارہ نہیں بجے ہیں، گیس کا ہنڈا منگوا لیجئے، ہم سب ابھی چلتے ہیں"

حکم کی دیر تھی۔ ہنڈا منٹوں میں آ گیا۔ ہم سب جب حویلی کے باہر نکلے اور میدان میں پہونچے تو ہمیں تھوڑی دور پر ایک لالٹین جلتی ہوئی نظر آئی۔

نواب ددن نے غصے سے کہا:

"یہ میری ملکیت میں کون شخص داخل ہو رہا ہے"

ہم لوگ تیزی سے بڑھے اور دیکھا لالٹین ایک تازہ کھدے ہوئے گڑھے کے کنارے رکھی ہوئی تھی، یہ گڑھا کافی چوڑا اور گہرا تھا۔ میں نے ہنڈے کی روشنی گڑھے میں ڈالی۔ چھبن صاحب اندر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔

"مجھے نکالو۔ سانپ نے مجھے ڈس لیا ہے۔ ارے میں مر رہا ہوں"

باقی صفحہ ۵۰ پر

یں میں پڑے سے بگولوں نے خطرناک صورت اختیار کرلی
مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ اپنے ساتھیوں
کے ساتھ مل کر میں نے ڈبے سے چن چن کر مسافروں
کو پھینکنا شروع کر دیا۔ کسی کو دروازے سے اور کسی
کو کھڑکی کے ذریعے باہر دھکیل دیا۔ جب ہمارا ڈبہ
ت لوگوں سے صاف ہو گیا تو میں نے باہر جھانک کر
دیکھا نیچے خون میں لت پت کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں
مجھے اطمینان سا ہوا۔ ہم نے رادھا کا بدلہ لے لیا تھا۔
اب میں خوش تھا۔ بہت خوش۔

چیزوں کی پراسرار ہیئت اپنے اصلی رنگ پر آئی
تھی کہ رادھا لوٹ آئی۔ بالکل لٹی پٹی۔ ٹوٹی ہوئی
بکھری ہوئی۔ اپنے آپ سے غافل۔ زمانے سے بے خبر۔
گھر والوں نے دیکھا تو چھاتی پیٹ لی۔

اس تیز طوفان میں ایک تیز پتے ایک برگِ سبز
کو پناہ دی تھی۔ مریم نے رادھا کو اپنے آنچل میں چھپانا
چاہا تھا مگر سپاہیوں کے سناٹے میں مریم کو مریم ہونے
کی سزا ملی اور وہ اپنے محور و مرکز سے ہمیشہ کے لئے الگ
کر دی گئی تھی لیکن رادھا بھی اس کی لپیٹ میں آگئی۔
رادھا اس اعلان کے باوجود کہ وہ رادھا تھی بچ نہ سکی۔
طوفان جب اٹھتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسکی
راہ میں کس کا گھر ہے۔

میری نگاہوں میں تکرار کے ساتھ وہ منظر رقص
کر رہا ہے۔ تازہ بہے ہوئے خون کی سرخی سیاہی میں
بدلتی جا رہی ہے۔ اور ہوا کے سیل میں آنے سے خون
جمنے لگا ہے۔ آدمی طبعی موت سے پہلے بھی کئی مرتبہ
مرتا ہے۔

بقیہ بھٹو

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کبھی کوئی غاصب کسی
کا حق بخوشی اس کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اسے غاصب
سے چھیننا پڑتا ہے۔ شاید کل تک بھٹو صاحب بہت
سی غلط فہمیوں کا شکار رہے لیکن اب وہ تمام
غلط فہمیاں دور ہو چکی ہونگی۔ بھٹو کی جذباتی تقریروں
اور بھڑکانے والے بیانات میں بریک لگ گیا ہے
غالباً اب انھوں نے جذبات سے زیادہ عقل سے کام
لینا شروع کر دیا ہے امید ہے کہ وہ عقل سے کام
لے کر فوجی حکمرانوں کی چالوں کو پوری طرح سمجھیں گے
اور اپنے عوام کی حقیقی آزادی کے لئے جنگ شروع کرینگے
آزادی نہ صرف فوجی حکمرانوں کے شکنجے سے، بلکہ سرمایہ
داری سے، اجارہ داری سے، غربت اور بھوک بیماریوں
اور سیلابوں سے جو آج بھی اس برصغیر کے عوام
پر اسی طرح مسلط ہیں جس طرح سیاسی آزادی سے
پہلے تھے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر نہ صرف بنگلا دیش کا مسئلہ
بلکہ کشمیر اور ہند و پاک کے تمام دوسرے مسائل
اپنے آپ حل ہو جائیں گے اور پھر بھٹو کو اپنی لیڈری قائم
رکھنے کے لئے جذباتی تقریروں کی ضرورت نہیں پڑیگی

بقیہ حکیم بدھن۔ ۹۴۰

ملازمین نے جلدی سے اسکو باہر نکالا۔ اندر ایک صندوقچہ
نظر آیا لیکن اترنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ حکیم بدھن
بے خطر گڑھے میں اتر گئے اور بولے:۔

"میں سانپ کا عامل ہوں مجھے سانپ کا کوئی ڈر
نہیں ہے۔ دوسرے میں مجرم نہیں ہوں۔ چھبن نے
جرم کیا اس کو سزا مل گئی۔"

یہ کہہ کر انھوں نے صندوقچہ اوپر اٹھا لیا اور نواب
صاحب اور ملازمین نے ہاتھ بڑھا کر وہ صندوقچہ
باہر نکال لیا۔

اس صندوقچے میں سے کیا نکلا۔ مجھے معلوم
نہ ہو سکا۔ صندوقچہ کھلتے وقت صرف تین آدمی۔
نواب صاحب۔ مختار اور حکیم بدھن۔ حکیم بدھن
کو کیا ملا مجھ کو نہیں معلوم۔ اس بارش کی کچھ چھینٹیں
مجھ پر بھی آگئیں۔

علی

نیا گیت

کالی گھٹا لہرائی سکھی ری — کالی گھٹا لہرائی
برکھا رت پھر آئی سکھی ری — برکھا رت پھر آئی

بنگلا دیش کی اجلی دھرتی — خون سے ہو گئی لال
بگیا بگیا آگ لگی ہے — جل گئی اک اک ڈال
قدم قدم پر لاش پڑی ہے — جگہ جگہ بھونچال
موت کے ڈر سے بھاگ رہے ہیں — نر ناری اور بال

موت ہے سر پہ چھائی سکھی ری — موت ہے سر پہ چھائی
برکھا رت پھر آئی سکھی ری — برکھا رت پھر آئی

خونی سنگینوں کے بل پر — پاپی اور چنڈال
لوٹ رہے ہیں لاج کی پونجی — بانٹ رہے ہیں کنگال
اب کچھ بھی محفوظ نہیں ہے — عزت، جان نہ مال
[illegible] — گونج رہے گا ڈھال

باپ بچا نا بھائی سکھی ری — باپ بچا نا بھائی
برکھا رت پھر آئی سکھی ری — برکھا رت پھر آئی

کب بچے [illegible] — کالی گھٹا گھنگھور
طوفانوں میں گھر جلے — [illegible]
مظلوموں کے خون کی [illegible] — [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بشریت [illegible]
[illegible]
[illegible] کے [illegible]

[illegible] انسان کا مقصد [illegible]
[illegible] فضاؤں میں رچا ہے ہر سو
[illegible] پیار سجائے ہے دکاں
[illegible] دھرتی پہ کہیں بہتا ہے انساں کا لہو

[illegible] کہ حالات بدل جائیں گے
[illegible] چمن، اپنی بہاراں ہوگی
[illegible] تعمیر کے پس منظر میں
[illegible] ہولی صبح گلستاں ہوگی

[illegible] ہر شاخ چمن سونی ہے
[illegible] تخریب ہے عیاری ہے
[illegible]
[illegible] ہے افلاس ہے بیماری ہے

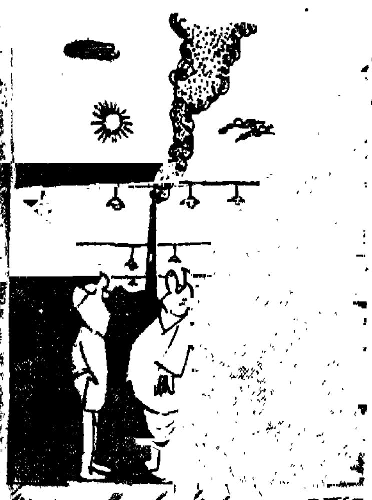
[illegible]

SECOND HALF

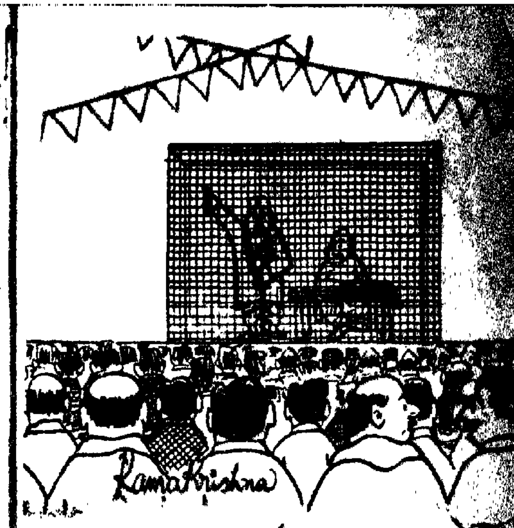
WAQIAT

REGD. NO.

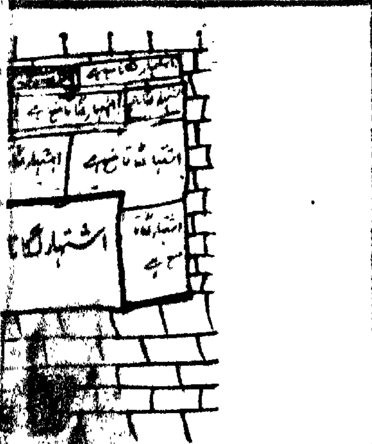
TELEPHONE : ......



جب سے دورکیلا فیکٹری کی چھت گری ہے ہم نے فی
ہی بنانا چھوڑ دی ہے تاکہ چھت گرنے کا کوئی خطرہ

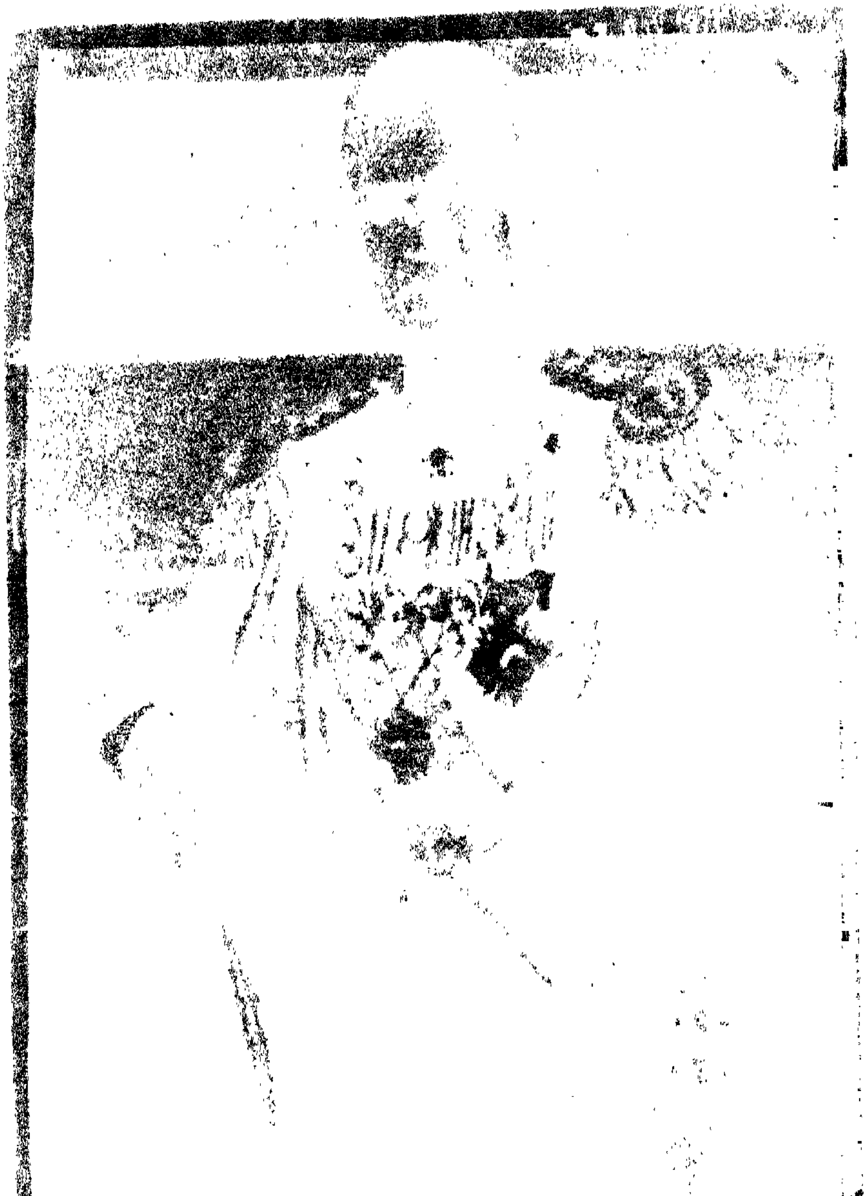


کیونکہ مہاشے جی کا تعلق جن سنگھ سے ہے اسلئے ——









واقعات ایرانی شہنشاہیت

کی ڈھائی ہزار سالہ

[illegible]

اکتوبر ۱۹۶۱ء

قیمت دو ۳

سال — تیسواں شمارہ

مدیر

عبدالوحید صدیقی

دفتر

[illegible] نظام الدین ایسٹ نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون ۲.۲۰۰ [illegible]

قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۸ روپے

[illegible] نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے
[illegible] ان کے سلسلے [illegible]
[illegible] ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
[illegible] کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا
[illegible] اختیار ہے۔
[illegible] مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ
[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] عبدالوحید صدیقی

شب وصل کا جادو

ترستے ہوئے ہونٹوں سے کوئی بول رہا ہے
ساغر میں مئے تند [illegible] رول رہا ہے
ہونٹوں پہ [illegible] اور حلاوت کا [illegible] انداز
شبنم کی کٹوری میں [illegible] گھول رہا ہے
الفاظ ہیں [illegible] کی [illegible]
جیسے کوئی [illegible] کی گرہ کھول رہا ہے
مکھڑے پہ [illegible] شب وصل کا جادو
کچھ بول سکے [illegible] بول رہا ہے
[illegible]
[illegible] کے [illegible] کا در کھول رہا ہے
پلکوں کے قفس میں [illegible]
[illegible] کی منگیں لئے پر تول رہا ہے
[illegible] شرق میں [illegible]
[illegible] ریشم کی گرہ کھول رہا ہے
[illegible]
[illegible]

[illegible]

اداریہ

ایرانی شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن

ایران نے شہنشاہیت کے قیام کا ڈھائی ہزار سالہ جشن اتنے بڑے پیمانے پر منایا ہے کہ ایران ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی تاریخ میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ سو کروڑ ڈالر کی رقم اس جشن پر خرچ کر دینا ایران ہی کے دل گردے کی بات ہے۔ شاید کسی جمہوری ملک میں اس قسم کا اسراف نہ ہوسکتا تھا لیکن شاہِ ایران اپنے ملک کے شہنشاہ ہیں، وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کس کو ہمت ہے۔؟

ایرانی حکومت کے ایک سرکاری ترجمان کا بیان ہے کہ "یہ جشن اتنے تزک و احتشام سے اس لئے منایا گیا کہ اہلِ ایران اپنے ماضی سے باخبر ہوجائیں اور دنیا والے بھی جان لیں کہ ایران کیا ہے اور وہ کن پالیسیوں پر عمل پیرا ہے۔" لیکن ایران کے جمہوریت پسند اس سے متفق نہیں ہیں۔ اس کا اظہار ان اشتہارات سے ہوتا ہے جو تہران پر گرائے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک "باغی گروہ" کی حرکت تھی جس نے ایک ہوائی جہاز کرائے پر لے کر اشتہارات گرائے۔ لیکن "باغی گروہ" جو کچھ کہہ رہا ہے جمہوریت پسند دنیا میں اس کی تائید ہی کی جائے گی۔ ایران جیسے غریب ملک میں جہاں ایک امریکی نامہ نگار کے خیال کے مطابق "اگر آپ پہاڑیوں میں چلے جائیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے زمانۂ قدیم کے ایران میں پہونچ گئے"۔ اس اسراف کو مجموعی طور پر اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ بلاشبہ جو سڑکیں اور ہوٹل وغیرہ اس موقع پر تعمیر کئے گئے ہیں ان سے ایرانی عوام کو فائدہ پہونچے گا اور ملک کی معیشت کے استحکام میں مدد ملے گی، لیکن بیشتر رقم محض وقتی کروفر پر ہی خرچ کی گئی۔ مثلاً یہ کہ شاہی گارڈ کے ہر سپاہی کی وردی پر ۱۲ سو ڈالر خرچ کئے گئے، یا معزز مہمانوں کے لئے ۲۵۰ مرسیڈیز کاروں کا انتظام کیا گیا۔ جمہوریت پسندوں کا کہنا ہے کہ یہ رقم عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاسکتی تھی۔

ایران کے موجودہ شاہ، محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں بلاشبہ ایران نے بہت کچھ ترقی کی ہے اور انھوں نے بہت سی اصلاحات جاری کی ہیں، خاص طور سے کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے انھوں نے بڑے ٹھوس اقدامات کئے۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ایک فرمان کے ذریعے اعلان کیا کہ "میری ذاتی ملکیت میں جتنی بھی زمینیں ایسی ہیں جن میں دو ہزار سے زیادہ گاؤں ہیں انکو لے زمین کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔" خود شاہِ ایران کے بیان کے مطابق ۱۹۶۰ء تک ۲۵ ہزار کاشتکاروں میں تقریباً پانچ لاکھ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔ ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا، تعلیمی میدان میں اہم قدم اٹھائے گئے، اقتصادی ترقی کے لئے مفید منصوبے تیار کئے گئے اور اب پورے بجٹ کا ۴۰ فیصد دفاع کے لئے وقف کیا جا رہا ہے تاکہ خلیج فارس سے برطانیہ کے انخلا کے بعد کوئی دوسری طاقت اس خلیج پر آکر قبضہ نہ جما سکے۔ لیکن جیسا کہ ایک مغربی مبصر نے کہا "یہ سب کچھ "ون مین شو" (ایک آدمی کا تماشا) ہے۔" ایرانی امور پر شہنشاہ کی گرفت اتنی مضبوط رہی ہے کہ ایران کا ایک ایڈیٹر تک یہ یقین کرنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ "شہنشاہ ہی ایسی ذات ہے جو عوام کی حالت کو بہتر اور اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ ایرانی ہونے پر فخر کرسکیں۔" شہنشاہیت کا جو ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا گیا ہے اس کا ایک اہم مقصد اسی قسم کے خیالات و رجحانات کو تقویت دینا ہے۔

لیکن محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایران نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو اور گزشتہ دس سال کے اندر معاشی طور پر ایران کی حالت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہوگئی ہو اس سے مطلق العنانیت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور انفرادی آزادی سلب ہوئی ہے حالانکہ شاہِ ایران انفرادی آزادی کے حامی ہیں اور اس کے لئے جمہوریت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی خود نوشت کتاب "وطن کے لئے میرے عزائم" میں لکھتے ہیں: "انفرادی آزادی صرف وہیں حاصل ہوسکتی ہے جہاں جمہوری طرز کی حکومت ہو یعنی اس طرح کی حکومت جس میں عوام کے ہاتھوں میں تمام انتظامی اور ادارتی امور ہوں۔" لیکن اس کے باوجود حیرت ہے کہ انھوں نے اپنے ملک میں جو جمہوری ڈھانچہ بنایا ہے اس میں بھی انفرادی آزادی نظر نہیں آتی۔ ہاں خود ان کے اپنے آہنی پنجہ کی گرفت ضرور مضبوط ہوتی ہے۔ کسی ایسے ملک میں جہاں مخصوص طریقے پر انتخاب کرایا جاتا ہو، جہاں سیاسی جماعتوں پر پوری طرح کنٹرول ہو، جہاں پریس پر کڑا سینسر ہو، اور جہاں مخالفین کو بڑی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا ہو، سب کچھ ہوسکتا ہے جمہوریت نہیں ہوسکتی۔ جمہوریت اس وقت قائم ہوگی جب اقتدار حقیقی معنوں میں عوام کے سپرد ہوگا، اور کوروش اعظم کی (جس کی ڈھائی ہزار سالہ یادگار منائی گئی) رواداری اور صلح جوئی کو اپنایا جائے گا جس کے لئے وہ تاریخ میں مشہور ہے۔ پُرشکوہ جشن مناکر شہنشاہیت کی بنیادیں محض عارضی طور پر مضبوط کی جاسکتی ہیں مستقل طور پر نہیں۔ اور جشن کے خلاف پمفلٹوں کی بارش اس امر کا مظہر ہے کہ جمہوری جذبات اندر ہی اندر فروغ پا رہے ہیں اور جمہوریت پسندوں سے شاہِ ایران جو خود بھی اپنے کو جمہوریت نواز کہتے ہیں جتنی جلد مصالحت کرلیں گے اتنا ہی ایران اور ایرانی عوام کے لئے بہتر ہوگا۔



شاہ فیصل کو فوجی شہر خاس مشیت میں فوجی تنصیبات دکھائی جا رہی ہیں۔

سعودی عرب میں مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا شہر

جسکا افتتاح شاہ فیصل نے کیا

سعودی عرب کے شاہ فیصل نے گزشتہ ماہ اپنی مملکت کے جنوبی حصے میں ایک فوجی شہر خاس مشیت کا افتتاح فرمایا ہے۔ سعودی عرب کے وزیر زراعت و آب ہز ایکسیلنسی شیخ حسن المصری کے الفاظ میں اس شہر کا منصوبہ ان بہت سے منصوبوں میں سے ایک ہے جو سعودی عرب کی حکومت نے ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے عوام کی خوشحالی کے لئے شروع کئے ہیں۔

جنوبی حصہ ملک میں ایک اہم چھاؤنی کے قیام سے نہ صرف یہ کہ یہاں کے لوگوں کو اپنے دفاع کے سلسلے میں یک گونہ اطمینان ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ مطمئن ہیں کہ ترقی کی دوڑ میں وہ کسی حصہ ملک کے باشندوں سے پیچھے نہ رہیں گے۔

جنوبی عرب میں ایک اہم فوجی چھاؤنی کا قیام وزیر مواصلات محمد عمر توفیق کے الفاظ میں نظریہ اسلام کے تحفظ کے لئے ایک اہم قدم ہے۔ فوجی ضروریات کی تمام تنصیبات اس شہر میں موجود ہیں اور وہیں جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں چھاؤنی کا افتتاح کرنے کے بعد جب شاہ فیصل جدہ جانے کے لئے روانہ ہوئے تو انھوں نے جنوبی صوبے کی مسلح افواج کا شکریہ ادا کیا اور انکے فوجی معیار کی تعریف کی۔

شاہ فیصل کے اس فوجی شہر میں مسلح افواج نے جس نداز میں پریڈ کی اس پر پرنس بدالدین عبدالعزیز ... نیشنل گارڈس نے اپنے پورے اطمینان کا اظہار کیا اور فوجی شہر کے بارے میں کہا کہ یہ ایک بہترین شہر ... افواج سعودی عرب کے لئے اطمینان و سکون کا باعث ... اس شہر کے قیام سے اس علاقے کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا خاس مشیت کے اس فوجی شہر کو پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑا فوجی شہر قرار دیا گیا ہے۔

سعودی عرب کے سرکردہ اخبارات نے اس شہر ... کا خیر مقدم کیا ہے اور اس کے لئے حکومت کو مبارک ... ہے۔ المدینہ رقمطراز ہے کہ ...

واقعات نئی دہلی

"شہر کی تعمیر پر جو لاکھوں کروڑوں ریال خرچ کئے گئے ہیں اس سے پورے ملک کو فائدہ پہنچے گا اور اس سے پورے ملک کی حفاظت ہوگی"

جن دوسرے اخبارات نے نوتی شہر کے افتتاح کا خیر مقدم کیا ہے ان میں الندوۃ، الیمامہ، البلاد، اور عکاظ شامل ہیں۔

شہر میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ شاندار عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ سڑکیں بنوائی گئی ہیں، اسپتال اور اسکول قائم کئے گئے ہیں، اور آب پاشی کے لئے بند اور دوسری اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔

البلاد لکھتا ہے: "یہ شہر دوسرے شہروں جیسا نہیں ہے۔ شاہ عرب بھی دوسرے شاہوں جیسے نہیں ہیں، جو تحفہ سعودی عرب کے لوگوں کو دیا گیا ہے وہ بھی بے مثال ہے اور جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ایک معجزہ ہے۔"

برناقابل قبول ہیں۔ مصر جس اعتدال پسندی سے کام لے رہا ہے اس کا اقرار برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈگلس ہیوم تک نے کیا ہے جو حال ہی میں اس ملک کے دورے پر گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے میزبان (مصری) مستقل معاہدہ امن کے حق میں ہیں۔ لیکن جب تک اسرائیلیوں کا یہی رویہ نہ ہو کسی سمجھوتے کا امکان نہیں۔ اس وقت ایسا نظر آتا ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کی کامیابی کا جو نشہ انھیں چڑھا تھا وہ ابھی تک نہیں اترا ہے۔ وہ اپنے اس نشے میں کسی کی نہیں سن رہے ہیں اور اقوام متحدہ کے فیصلوں تک کو پامال کر رہے ہیں۔ نتیجے میں صورت حال خراب اور ایسی ہوتی جا رہی ہے جسے زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

کو لازمی طور سے یا تو امن کے ذریعے حل کرنا ہوگا یا پھر جنگ کے ذریعے ــــ امن کے ذریعے مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ تو کیا پھر جنگ کے ذریعے اسے حل کیا جائے گا؟ اس کا انحصار روس کے رویے پر ہے اس لئے کہ جنگ لڑنے کے لئے جن ہتھیاروں کی ضرورت ہوا ان میں مصر یا عرب وفاق خود کفیل نہیں ہے بلکہ روس کا محتاج ہے اور اب تک کا تجربہ ہے کہ اس کی امداد وقت پر نہیں بلکہ بعد از وقت پہونچتی ہے۔

۱۹۶۷ء کی جنگ میں اگر روس صدر ناصر کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالتا تو اسرائیل کو اچانک حملہ کر کے مصری فضائی بیڑے کو قطعی طور پر تباہ کر دینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔



مشرقِ وسطیٰ

کیا مسئلہ جنگ کے ذریعے طے ہوگا؟

مصریوں اور اسرائیلیوں کے درمیان اگرچہ کسی نئی جھڑپ کی کوئی خبر نہیں آئی ہے لیکن فضا میں کشیدگی بدستور موجود ہے۔ وزیر اعظم روس مسٹر کوسیگن نے گذشتہ ہفتہ رباط میں ایک لنچ کے موقع پر جس کا اہتمام وزیر اعظم مراکش مسٹر کریم لمرانی کی طرف سے کیا گیا تھا، خبردار کیا کہ مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال بہت سنگین ہے اور کسی وقت بھی اس علاقے میں جنگ کے شعلے بھڑک سکتے ہیں۔"

صورتِ حال کی اس سنگینی کے لئے انھوں نے اسرائیل کو ذمے دار قرار دیا جو مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرنے میں اپنے جارحانہ رویّے پر قائم ہے اور انھیں خالی کرنے کے لئے ایسی شرائط پیش کر رہا ہے جو عربوں کے لئے قطعی طور

متحدہ عرب وفاق کے صدر مسٹر انور سادات صورتِ حال کی اس سنگینی کے پیش نظر روس کے دورے پر گئے ہیں جہاں وہ روسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کریں گے اور انھیں مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے کے اپنے منصوبے سے مطلع کریں گے۔

مصری وفد میں حافظ محمد اسمٰعیل قومی سلامتی کے مشیر، محمد عبدالسلام الزیات سکریٹری جنرل عرب سوشلسٹ یونین اور وزیر خارجہ ڈاکٹر محمود ریاض جیسی سرکردہ شخصیتیں شامل ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ بات چیت فیصلہ کن ہوگی۔

پچھلے دنوں مسٹر انور سادات نے اعلان کیا تھا کہ یہ سال مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن سال ہوگا اور مسئلے

واقعات نئی دہلی

عرب وفاق

اسرائیل کے خدشات

عرب وفاق کے قیام کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ مصر کے صدر انور سادات اس وفاقی حکومت کے پہلے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔ وہ دو سال تک اس عہدے پر فائز رہیں گے اس کے بعد وفاق میں شامل کسی دوسرے ملک کا سربراہ عرب وفاق کا صدر منتخب کیا جائے گا۔ طے یہ کیا گیا ہے کہ وفاق میں شامل ہر ملک کا سربراہ وفاقی حکومت کا سربراہ منتخب کیا جا سکے گا۔

قاہرہ کو عرب وفاق کی راجدھانی بنایا گیا ہے

مصر کے نائب صدر مسٹر حسین الشافعی نے بتایا کہ مصر، شام اور لیبیا کے سہ رکنی وفاق کی پارلیمنٹ آئندہ نومبر میں قائم ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد وفاق کے دوسرے اداروں اور شعبوں کے قیام کے لئے بھی مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔ آئین کے تحت وفاقی پارلیمنٹ ساٹھ ممبروں پر مشتمل ہوگی اور اس میں ہر ممبر ملک کے بیس بیس نمائندے ہوں گے ـــ یہ ممبران ہر ملک کی عوامی مجلسوں سے منتخب کئے جائیں گے۔ شام میں پہلے ہی عوامی مجلس موجود ہے جو اپنے نمائندے منتخب کرے گی۔ مصر کی عوامی مجلس اسی ماہ قائم ہونے والی ہے

لیبیا میں بھی پارلیمنٹ قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے لیکن اس کے لئے ابھی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی ہے۔

عرب وفاق (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) نصف سے زائد عربوں کی نمائندگی کرے گا۔ اس کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ اور رقبہ ۲۹ لاکھ ۳۴ ہزار مربع میل ہوگا۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کی تیرھویں نمبر کی مملکت ہوگی۔ سمندر پر واقع ہونے والے متوسط ممالک میں جن کی تعداد بارہ ہے اس وفاق کو تیسرا درجہ حاصل ہوگا۔

جغرافیائی اعتبار سے وفاق میں شامل تینوں ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہیں۔ اس طرح یہ وفاق دو بازوؤں پر مشتمل ہے۔ ایک چھوٹا بازو شام ہے جو مثلث نما ہے اور دوسرا بڑا بازو مستطیل شکل کا لیبیا اور مصر کا ہے جن کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہیں۔ دونوں بازوؤں کے درمیان خشکی کا راستہ نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت ان کے درمیان ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف مقبوضہ فلسطین اور اس کے ارد گرد کا کچھ علاقہ ہے۔ لیکن زمین کا مذکورہ فصل وفاق کی کمزوری کا باعث نہیں ہے اس لئے کہ زمینی فصل علاقے کی جغرافیائی ترتیب کا اصل جزو نہیں بلکہ ایک عارضی چیز ہے جسکا جلد یا بدیر ختم ہونا ایک فطری امر ہے۔

وفاقی اسٹیٹ کو قدرت نے اپنے وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ یہاں عمدہ روئی کی پیداوار سالانہ پانچ لاکھ ٹن ہے۔ پوری دنیا میں جو ریشہ دار روئی پیدا ہوتی ہے یہ اس کا نصف ہے۔ اجناس کی پیداوار کا تناسب اسّی لاکھ ٹن ہے۔ اس کے علاوہ پیٹرول کی جو دولت پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار تقریباً سترہ کروڑ بیرل ہے۔ یہ پیٹرول زیادہ تر لیبیا کے علاقے میں نکلتا ہے لیکن مصر کے مغربی علاقے میں بھی جو لیبیا کی سرحد سے ملتا ہے، پچھلے دنوں بڑی مقدار میں تیل برآمد ہوا ہے جس سے اس نقصان کی بڑی حد تک تلافی ہو گئی ہے جو نہر سوئز کے بند ہونے سے ہوا ہے۔ ان سب چیزوں کی پیداوار سے مجموعی طور پر سالانہ آمدنی سات ارب مصری پونڈ ہوگی۔

یہ امر قدرتی ہے کہ اسرائیل عرب وفاق کے قیام سے کافی پریشان ہے۔ حال ہی میں اسرائیلی حکومت کی طرف سے جو بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا ہے کہ "عرب وفاق جنگ کی طرف ایک قدم ہے۔"

اس کے برعکس صدر سادات نے گذشتہ ماہ کے آخر (۳۱ اگست) کو اپنی ایک گھنٹے کی ٹیلی ویژن تقریر میں کہا کہ "عرب کنفیڈریشن، عرب اتحاد اور آزادی کی جنگ کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

وفاق میں شامل تینوں ملکوں کے سربراہ چاہتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کا جلد از جلد کوئی نہ کوئی حل نکلنا چاہئے۔ دمشق کے ایک اخبار "البعث" کو انٹرویو دیتے ہوئے نائب صدر مسٹر حسین الشافعی نے صدر انور سادات کے اس اعلان کو دہرایا کہ:

"اس سال کے ختم ہونے سے پہلے مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنا ہے۔"

انھوں نے بتایا کہ اس وقت مصر کے پاس آٹھ لاکھ کی مضبوط فوج موجود ہے جو پورے طور پر معرکے کے لئے تیار ہے۔ اقوامِ متحدہ میں مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل نکالنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، اگر وہ کامیاب نہ ہو سکیں تو بہت ممکن ہے کہ یہ معرکہ اسی سال ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء کا سال مشرقِ وسطیٰ کے لئے ایک فیصلہ کن سال ہوگا۔ ■

جاپان | ڈھائی ہزار سالہ روایت ٹوٹ گئی

ستّر سالہ شہنشاہ جاپان ہیروہیٹو نے جو اپنے شاہی خاندان کے ۱۲۴ ویں شہنشاہ ہیں غیر ملکی دورے پر روانہ ہو کر اپنے ملک کی پرانی روایات کو توڑ دیا۔ ۲۶۰۰ برس کے عرصے میں وہ پہلے شہنشاہ ہیں جو جاپان سے باہر نکلے ہیں۔ انکی ۶۸ سالہ ملکہ ناگاکو ان کی شریکِ سفر ہیں۔ شہنشاہ نوجوانی کی عمر میں جب وہ ولیعہد تھے باہر کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیکن انکی ملکہ نے زندگی میں پہلی بار اپنے وطن سے باہر قدم نکالا۔

شہنشاہ کو اپنے ملک سے باہر نکلنے اور ڈھائی ہزار سالہ روایت کو توڑنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ ایک قیاس یہ ہے کہ امریکا نے جاپان کو تجارتی میدان میں جو آنکھیں دکھانا شروع کی ہیں اور اس نے غیر ملکی تجارت پر دس فیصدی سرچارج لگا کر اپنے قریب ترین ساتھی جاپان کو جو زک پہنچائی ہے اس کی بنا پر جاپان یورپ میں نئے دوستوں یا ساتھیوں کو تلاش کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے اور اس کے لئے فضا پیدا کرنے کی غرض سے شہنشاہ کو سات یورپی ممالک کے دورے پر بھیجا گیا ہے۔ اس دورے کے لئے ان سے بہتر کوئی اور شخصیت نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ وہ سیاست سے الگ رہنے کے باوجود مملکتِ جاپان اور جاپانی عوام



اتحادی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

راستے میں وہ الاسکا کے ہوائی اڈے ایلمنڈورف پر اترے جہاں امریکی صدر مسٹر نکسن نے انکا پرتپاک خیر مقدم کیا شہنشاہ سومنٹ تک وہاں رہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا باتیں ہوئیں لیکن یقین ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کو قائم رکھنے کا مسئلہ ضرور زیر بحث آیا ہوگا۔

شہنشاہ ہیرو ہیٹو جہاں کہیں گئے انکا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن کہیں کہیں انکی کار پر پتھر بھی پھینکے گئے۔ غالباً یہ حرکت ان جاپانیوں کی تھی جو اپنے ملک سے باہر رہنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ وہ شہنشاہ پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں گے کہ اب شہنشاہیت کا زمانہ ختم ہوگیا ہے، اور اب کسی بادشاہ یا شہنشاہ کو اپنے محل کی بالکونی پر آکر محض درشن ہی کے لئے نہیں بلکہ پتھر کھانے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔

شہنشاہ جاپان سال میں دو مرتبہ یعنی ۲ جنوری اور ۲۹ جولائی کو اپنے محل کی بالکونی پر آکر اپنی رعایا کو اپنے درشن کراتے ہیں اور انکا سلام قبول کرتے ہیں۔ ■

کیا ہیرو ہیٹو جنگی مجرم ہیں؟

حسن اتفاق دیکھئے کہ عین اس وقت جب شہنشاہ جاپان سرزمین امریکا پر قدم رکھ رہے تھے ایک سرکاری مطبوعہ کتاب میں انھیں جنگی مجرم قرار دیا گیا تھا۔ کتاب کا نام ہے "جاپانی شہنشاہ کی سازش" اس میں صاف کہا گیا ہے کہ ہیرو ہیٹو نے ذاتی طور پر پرل ہاربر پر حملے کی حمایت کی تھی۔ وہ پھانسی کے پھندے سے صرف اس لئے بچ گئے کہ جنرل میک آرتھر کو جاپان پر اتحادی قبضے کے دوران امن و انتظام قائم رکھنے کے لئے ایک بین الاقوامی اقتدار اعلیٰ کی ضرورت تھی۔

کتاب کے لکھنے والے ۴۳ سالہ ڈیوڈ برگامنی ہیں جو "لائف" میگزین کے نامہ نگار رہ چکے ہیں۔ وہ امریکی والدین سے جاپان میں پیدا ہوئے اور انکا بچپن جاپان ہی میں گزرا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں انکا کافی وقت جاپان کے قید خانے میں گزرا۔

۱۹۶۵ء میں برگامنی ٹوکیو واپس پہونچے اور چھ سال تک انھوں نے وہاں ہزاروں جاپانی دستاویزات کا مطالعہ کیا اور سیکڑوں سابق افسروں سے انٹرویو لئے۔

۱۲۳۹ صفحات پر مشتمل ان کے مضمون میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ "شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے کس طرح جاپان کو مغرب کے خلاف جنگ میں ملوث کیا۔"

ایک صدی سے زیادہ عرصہ قبل جب کوموڈور پیری کے جنگی جہاز خلیج ٹوکیو میں داخل ہوئے تھے تاکہ امریکی تجارت کے لئے جاپان تک راستہ کھول دیں۔ تو اس وقت کے جاپانی شہنشاہ کومی نے اسکا بڑی سختی سے مقابلہ کیا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ ایسی ہی پالیسی ہیرو ہیٹو کی تھی، اور انھیں ایشیا کو سفید فام لوگوں سے پاک رکھنے کا مشن اپنے جدامجد سے ورثے میں ملا تھا۔

اسکالر برگامینی کے خیال کے مطابق ۱۹۲۱ء میں جب اپنے باپ کی علالت کی بنا پر ہیرو ہیٹو ریجنٹ مقرر کر دیے گئے تو انھوں نے نوجوان افسروں کے ایک دستے کی تنظیم کی اور اس میں خاص طور سے میجر ہجکی ٹوجو کو شامل کیا اس دستے کا فرض شاہی تخت سے صادر ہونے والے احکام کو بجا لانا تھا۔ مسٹر برگامینی لکھتے ہیں کہ:۔

جنگ شروع ہونے سے دو سال قبل ہیرو ہیٹو نے ذاتی طور پر اپنے جنرل اسٹاف کو جنگ کا منصوبہ تیار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اس منصوبے کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ وزیر جنگ مسٹر ٹوجو تک کو اسکا علم نہ تھا انہیں صرف حملے کے دو ماہ قبل اس وقت علم ہوا جب وہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔"

مصنف کے خیال کے مطابق اس منصوبے کا واحد ہیرو ہیرو ہیٹو تھا جس نے تمام بڑے بڑے فوجی احکام پر دستخط کئے۔ حتیٰ کہ اپنے چچا پرنس اساکا کو اس بات کے لئے اعزاز عطا کیا کہ اس نے چین میں ایک نمایاں کام انجام دیا اور اس کی قیادت میں چینی فوجوں نے پیکنگ کی طرف یلغار کرتے ہوئے ڈیڑھ لاکھ غیر مسلح چینیوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ لیکن جنگ ختم ہوئی تو شہنشاہ اور اس کے مصاحبین نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ جنگ کی ذمے داری ایک فوجی ٹولے پر تھی۔ اتحادیوں نے بھی اس پر یقین کر لیا اور انھوں نے ۲۸ اعلیٰ افسران کے خلاف مقدمات چلائے جن میں سے سات کو پھانسی دیدی گئی۔

بنارس ہندو یونیورسٹی | لاقانونیت | انتشار | اور ہنگامے۔

بنارس: ہندو یونیورسٹی ایک مرتبہ پھر طالب علموں کی ہنگامہ آرائی کی بنا پر عرصۂ غیر معینہ کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ شاید دیوالی کے بعد کھل سکے گی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر شری مالی چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ۱۲ ہزار کے قریب طلبار اپنا دھیان تعلیم کیطرف رکھیں لیکن یونیورسٹی کے اندر بعض جماعتوں کے سیاسی اکھاڑوں نے انکے لئے کام کرنا مشکل کر دیا ہے۔

ودیارتھی پریشد جو آر۔ ایس۔ ایس کی تنظیم ہے پہلے ہی یونیورسٹی کے بعض ذمہ داروں کیلئے پریشانی کا باعث تھی کہ نام نہاد سوشلسٹ راج نرائن کے حامی طلبار نے آر۔ ایس۔ ایس کی تنظیم کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ یونیورسٹی کو بند کر دینا ناگزیر ہوگیا۔

آر۔ ایس۔ ایس والے اس لئے ناراض ہیں کہ وائس چانسلر یونیورسٹی کیمپس میں انکی عمارت کو مسمار کرانے اور یونیورسٹی کے اندر آر۔ ایس۔ ایس کی شاکھائیں قائم کرنے پر پابندی لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آر۔ ایس۔ ایس کے نوجوانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے لیکن دوسری طرف ڈاکٹر شریمالی طلبار میں ڈسپلن قائم رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے بعض طلبار کے خلاف قدم بھی اٹھایا ہے۔ انھوں نے ۵۰ طلبار کو جن میں آر۔ ایس۔ ایس کے سرکردہ لیڈر شامل ہیں یونیورسٹی سے خارج کر دیا ہے، پولیس کے دستے متعین کر دیے گئے ہیں اور دفعہ ۱۴۴ کے تحت ہر قسم کے جلوس اور مظاہرے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ شہر میں بھی بھاری پولیس کا گشت جاری ہے اور ۱۴ طلبار گرفتار کر لئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر شریمالی کے بیان کے مطابق ۱۲ ہزار طلبار میں سے مٹھی بھر ایسے طلبار ہیں جو یونیورسٹی میں ہنگامہ اور فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی کیمپس سے لاقانونیت کو ختم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر کچھ اور طالب علموں کا اخراج عمل میں آیا تو بھی

باقی صفحہ

واقعات نئی دہلی

...انی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال

مالک رام

لیج صفحۂ دنیا پر ایسا کوئی دوسرا ملک نہیں، جو ایران
ج اس بات کا دعوٰی کر سکے کہ اس میں پچھلے ڈھائی ہزار
سے ایک ہی نظامِ حکومت قائم ہے۔ ایران میں اس
زمانے میں ملوکیت کا دور دورہ رہا ہے۔ اسکی ابتدا
ش سے ہوئی۔ کوروش اپنی بزرگی اور دادو دہش
عث کوروش اعظم کہلاتا ہے۔ شیراز اسکا پایۂ تخت
یہاں تختِ جمشید کے کھنڈر اور آثار آج بھی زبانِ
سے اس کی سطوت و عظمت کی داستان بیان کرتے
۔ اس کا زمانۂ حکومت حضرت عیسٰی سے ۵۵۰ سال

پہلے ہے اور وہ ۵۲۹ قبل مسیح تک حکمران رہا۔ جس خاندان کی اس نے بنیاد رکھی، یہ ہخامنشی کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے گیارہ بادشاہوں نے دو سو سال تک حکومت کی۔ کوروش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنی سلطنت کے تمام باشندوں کو، مذہب و ملت کی تفریق کے باوجود، پوری آزادی اور حفاظت عطا فرمائی۔ یہ غالبًا دنیا کا پہلا منشورِ آزادی ہے۔ ہخامنشیوں نے ایران سے باہر ایشیائے کوچک تک اور یورپ میں بلقان تک کے علاقے پر اپنا تسلط وسیع کر لیا تھا

آہستہ آہستہ سلطنتِ ہخامنشی کمزور ہوتی گئی اور بالآخر یونانیوں نے اسکندر مقدونی کی قیادت میں ایرانی جوا کندھوں سے اتار پھینکا۔ اسکندر نے مصر اور ایشیائے کوچک پر قبضہ کر لینے کے بعد ایران پر حملہ کر دیا اور ۳۲۹ ق م میں ملک کو فتح کر کے اسے نذرِ آتش کر دیا۔

اسکندر چاہتا تھا کہ وہ ہخامنشی خاندان کا وارث تسلیم کر لیا جائے تاکہ وہ ان کی وسیع و عریض سلطنت پر قابض ہو سکے۔ اسی لیے اس نے اس خاندان کے



شہنشاہ ایران کی اپنے اہل خاندان کے ساتھ ایک یادگار تصویر

آخری تاجدار داریوش سیوم کی بیٹی سے شادی کرلی۔ لیکن اس کی آرزو بر نہ آئی۔ تاخت و تاراج کرتے ہوئے وہ مشرق میں ہندوستان تک چلا گیا۔ وہاں سے واپس لوٹا تو، بابل میں ایک جشن میں بہت زیادہ شراب پی جانے سے بیمار پڑ گیا۔ اسی میں ۳۲۳ ق م میں اس کی موت ہوگئی۔

اسکندر کی موت کے بعد اس کی وسیع سلطنت کے تین ٹکڑے ہوگئے، جن پر اس کے جرنیل حکمرانی کرنے لگے۔ ایران جرنیل سیلوکس نیکاتور کے حصے میں آیا۔ لیکن یونانی زیادہ عرصے تک ایران کو اپنے قبضے میں نہ رکھ سکے۔ اشکانی خاندان نے انھیں نکال باہر کیا اور ملک پر خود قابض ہوگئے۔ یہاں ان کی حکومت کوئی پونے پانچ سو سال یعنی ۲۲۴ عیسوی تک رہی۔ حضرت مسیح اسی خاندان کے پندرھویں بادشاہ فرہاد پنجم کے عہد (۲ ق م تا ۴ عیسوی) میں پیدا ہوئے اور ایک دوسرے بادشاہ اردوان سوم کے زمانے میں عیسائیت کا وسیع پرچار عمل میں آیا۔ اشکانی خود زردشتی دین کے معتقد اور پیرو تھے۔

رفتہ رفتہ اشکانی امراء کے اندرونی اختلاف اور مذہبی (زردشتی) طبقے کی مخالفت نے اس حکومت کی جڑیں کمزور کردیں اور اس کا زوال شروع ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ اردشیر بابکان نے بغاوت کردی۔ اس نے آخر اشکانی بادشاہ اردوان پنجم کو معزول کرکے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اردشیر ساسانی خاندان سے تھا؛ اور یہ لوگ بنی اسرائیل نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔

ساسانی خاندان (۲۲۴ء۔ ۶۵۱ء) میں بعض مشہور بادشاہ ہوئے ہیں۔ بہرام گور اسی خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باپ یزدگرد اول نے اس کی کمسنی میں پرورش کے لئے اسے اپنے ماتحت ایک عرب امیر کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ یہ شاہی محل کے ناز و نعم سے دور صحرا میں رہ کر دلیر، شجاع اور جفاکش بن سکے۔ بہرام شہسواری اور تیراندازی، پہلوانی اور شکار کے فنون میں یکتائے زمانہ تھا۔ وہ خاص طور پر گورخر کے شکار کا بہت دلدادہ تھا، اسی لئے اسکا نام بہرام گور پڑ گیا۔ خیام نے بھی ایک رباعی میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

آں قصر کہ بہرام درو جام گرفت
آہو بچہ کرد و روبہ آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتے ہمہ عمر
دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

نوشیروان (خسرو اول) بھی اسی خاندان کا گل سرسبد تھا، جو اپنے داد و عدل کے باعث عادل کہلایا۔ پیغمبر اسلام اسی کے عہدِ سلطنت (۵۳۱ء۔ ۵۷۹ء) میں پیدا ہوئے تھے، اور اسی مناسبت سے ایک حدیث میں اس کا نام بھی آیا ہے۔ خسرو پرویز (۵۹۰ء۔ ۶۲۰ء) اسی نوشیروان کا پوتا تھا، جس کا نام فارسی ادب میں شیریں کے ساتھ شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ ان دونوں کی داستانِ محبت بیان کرنے میں متعدد ادبا و شعراء نے اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔

نیز یہ وہی خسرو پرویز ہے جس کے نام حضرت رسولِ کریمؐ نے خط لکھ کر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ خسرو اس پر بہت خفا ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ عرب کے بے غیر مہذب ملک کے کسی شخص کو اسے یوں خطاب کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ خسرو نے خط پڑھ کر چاک کردیا اور نامہ بر سے جو اسے لے کر آیا تھا کہا کہ "جاؤ یہی ہمارا جواب ہے"۔

اس واقعے کے ۱۴ سال بعد مسلمانوں نے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران پر حملہ کردیا۔ اس وقت یہاں کا حکمراں یزدگرد سیوم تھا۔ خدا کی شان، اپنے زمانے کی یہ عظیم الشان سلطنت ان صحرائی عربوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی، ساسانیوں کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور تختِ کیان پر ان بادیہ نشینوں کا قبضہ ہوگیا۔

فردوسی مسلمان ہونے کے باوجود اپنی قوم پرستی اور ایرانِ قدیم سے اپنی محبت پر پردہ نہیں ڈال سکا۔ چنانچہ جہاں اس واقعے کا ذکر آیا ہے، کہتا ہے:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو

ساسانیوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں زردشتی مذہب کے فروغ کی بہت سعی کی تھی۔ اس ملک پر اب مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تھا، ایرانیوں نے زردشتی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا۔ یہ نیا دور کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ اوائل میں تھوڑی تھوڑی مدت کیلئے بہت سے خاندانوں نے یکے بعد دیگرے یہاں حکومت کی ہے۔ طاہری آئے (۸۲۳ء۔۸۷۲ء) صفاری آئے (۸۶۸ء۔ ۹۰۰ء) سامانی آئے (۹۰۱ء۔ ۹۹۸ء) زیاری آئے (۹۲۸ء۔ ۱۰۴۰ء) بویہی (دیلمی) (۹۹۳ء۔ ۱۰۵۵ء)، اور سب سے آخر میں غزنوی آئے (۹۷۶ء۔ ۱۰۴۰ء) اور ہر ایک اپنی نوبتِ پنج روزہ بجا کر چلا گیا۔ یہ زمانہ فارسی علم و ادب کی ترقی کے پہلو سے سنہری زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی سامانی عہد ہی میں پیدا ہوا۔ فردوسی طوسی (شاہنامے کا مصنف) سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا۔ مشہور فیلسوف اور ریاضی دان اور ہیئت دان البوریحان بیرونی بھی اسی عہد میں پیدا ہوا۔ فارسی کی شہرۂ آفاق کتاب "قابوس نامہ" کا مصنف ایک زیاری شاہزادہ تھا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا اپنے زمانے کا سب سے بڑا طبیب اور فلسفی تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی دانشگاہوں میں اسکی کتابیں نصاب میں شامل تھیں۔ ان کے تراجم یورپ کی مختلف زبانوں میں ہوچکے ہیں، اور اس کا نام آج تک دنیا بھر میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے؛ وہ دیلمی دربار سے وابستہ تھا۔

غزنویوں کے زوال کے بعد سلجوقی آئے۔ یہ نسلاً ترک تھے۔ اسلام کے بعد ایران میں سب سے بڑی حکومت ان سلجوقیوں نے ہی قائم کی (۱۰۳۷ء۔ ۱۱۵۷ء) ان کی قلمرو ترکستان سے بحیرۂ روم کے پورے علاقے پر تھی یورپ کی صلیبی افواج سے مسلمانوں کی پہلی مڈبھیڑ سلجوقی عہد ہی میں ہوئی۔

سلجوقی عہد کئی لحاظ سے بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ عمر خیام جس کی رباعیاں مشرق و مغرب کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں، ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں ہوا ہے۔ آج بیشتر دنیا اسے صرف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ اس کے علاوہ بہت بڑا ریاضی دان اور ہیئت دان بھی تھا۔ اس نے ایران کی تقویم کی اصلاح کی شیخ الموت حسن بن صباح بھی جس نے اسماعیلی فرقے

کی بنیاد رکھی۔ اور جس کے فدائیوں نے ایشیا اور یورپ کی بعض نامور ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کا معاصر تھا۔

اس سلسلے کا آخری مشہور خاندان خوارزم شاہی کہلاتا ہے (۱۱۲۷ء۔ ۱۵۲۱ء) ان کے معاصر فارسی کے دو ایسے شاعر اور ادیب ہوئے ہیں جنکا جواب آج تک ایران پیدا نہیں کر سکا۔ اوّل مولانا جلال الدین رومی جن کی تصنیف مثنوی معنوی، دنیائے اسلام میں فارسی قرآن کے نام سے مشہور ہے، اور دوسرے شیخ سعدی شیرازی جن کی گلستان اور بوستان کی خوشبو ایران سے نکل کر چار دانگ عالم کے مشام کو آج تک معطر کر رہی ہے۔

خوارزمیوں کا تختہ چنگیزی (ایلخانی) مغلوں (۱۲۲۰ء۔ ۱۳۳۵ء) کے ہاتھوں الٹ گیا۔ اس کے بعد ۱۳۸۱ء میں تیمور گورگان تاتاری آیا۔ تیمور کا نام اس لحاظ سے مشہور ہے کہ اس کے ہاتھوں خلقِ خدا کا جتنا خون بہایا گیا شاید اور کسی کے ہاتھ سے نہ بہا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک شہر اصفہان میں اس کے مقتولوں کی تعداد ستر ہزار تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نظم و انتظامِ مملکت میں یگانۂ روزگار تھا۔ ایک وقت تھا کہ تیمور کی سلطنت ایک طرف سائبیریا سے خلیج فارس تک اور دوسری طرف دریائے سندھ سے دمشق تک تھی اور کسی جگہ بھی نظم و نسق میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ علم اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں متعدد مساجد اور مدارس قائم کئے، جن کی دیکھ بھال حکومت کے ذمے تھی۔ فارسی غزل کا بہترین شاعر حافظ شیرازی ایلخانیوں اور تیمور کے زمانے میں ہوا ہے بلکہ ایک روایت کے مطابق اس کی تیمور سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ یہاں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بانی ظہیر الدین بابر اسی تیمور کی نسل سے تھا۔ تیموریوں کا ۱۵۰۵ء تک دور دورہ رہا۔

تیموریوں کے جانشین صفوی تھے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ صفی الدین شیعیان اثنا عشر کے چھٹے امام حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد میں تھے۔

ملکہ فرح دیبا

شیخ صفی الدین کا مقبرہ اردبیل میں ہے۔ صفوی خاندان کے بزرگ اسی باعث شیعیوں کے مذہبی پیشوا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جب تیموریوں کی طاقت کمزور ہوئی تو صفویوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی قوت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسماعیل صفوی نے کچھ قبائل کی مدد سے جو بعد کو قزلباش کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۵۰۲ء میں صفوی خاندان کی حکومت کی بنا ڈالی۔ انھیں کے عہد میں یورپی حکومتوں نے ایران کے معاملات میں دخل اندازی شروع کی۔

مسٹر انتھونی جان کنسن انگریزی تاجر ملکہ انگلستان الیزبتھ کی طرف سے اس خاندان کے دوسرے بادشاہ شاہ طہماسپ اوّل کے عہد میں آئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی شاہ طہماسپ اہمیت رکھتا تھا۔ بابر کے جانشین ہمایوں کو جب شیر شاہ سوری نے شکست دی ہے اور وہ یہاں سے ایران گیا ہے تو اس نے اسی طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ بعد کو اس نے طہماسپ ہی سے فوجی کمک حاصل کرکے اپنا تاج و تخت واپس لیا تھا۔ اس کے تقریباً ایکسو سال بعد شاہ عباس دوم کے زمانے میں دربارِ ایران میں روسی سفیر تعینات ہوا تھا۔

صفویوں کے آخری زمانے میں ایک فوجی سردار نادر قلی افشار بہت طاقت پکڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی شجاعت اور کارکردگی سے شاہ خراسان کی فوج میں بہت ترقی کی۔ لیکن جلد ہی وہ اس کی ملازمت سے کنارہ کش ہو گیا۔ چندے بعد اس نے اپنا ایک جتھا بنا لیا اور انھیں ساتھ لے کر شاہ طہماسپ دوم کی خدمت میں حاضر ہوا جو افغانیوں کی دست اندازیوں سے تنگ آ چکا تھا اور کسی طرح اپنی موروثی طاقت ان کے چنگل سے واپس لینے کی فکر میں تھا۔ طہماسپ نے خیال کیا کہ نادر اس کے مقصد کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ اس نے نادر کو سپہ سالاری کے عہدے پر سرفراز کر دیا۔ نادر نے اپنے زورِ بازو سے افغانوں کو تو ملک سے مار بھگایا، لیکن اب اس کی طاقت اس درجے تک پہونچ چکی تھی کہ اس نے اپنے شاہ طہماسپ کا نائب السلطنت ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ کی نااہلی سے حکومت کا کاروبار روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا، خلقِ خدا تنگ آ چکی تھی۔ بالآخر خواص و عوام نے متفقہ نادر سے

بقیہ صفحہ [illegible]

بین الاقوامیت اور ہندوستانی مسلمان

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

یہ مضمون ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی کتاب "سیما کی تلاش۔
ہندوستانی مسلمانوں کو بھارتیانے کا مسئلہ"
میں سے اخذ کیا گیا ہے۔ مضمون بہت غور طلب ہے اس لیے قارئین واقعات کی خاص
توجہ کا مستحق ہے

ڈاکٹر بیدار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان بین الاقوامی رہ کر بھی
پوری طرح ہندوستانی ہے۔ بین الاقوامیت اور ہندوستانیت دو ایسے دائرے ہیں
جن میں ٹکراؤ ممکن ہی نہیں

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر گری لال جین جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات پر ماہر خصوصی کا درجہ حاصل کر لیا ہے اپنی ایک تازہ تحریر میں لکھتے ہیں :-

" جن سنگھ کے اس نظریے میں اب لوگوں کو اچھا خاصا وزن محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ فرقہ اپنے قومی تشخص کے بجائے اپنے اسلامی تشخص سے زیادہ دل چسپی رکھتا ہے "

معروف قوم پرست ادیب پاکستان میں ہمارے سابق ہائی کمشنر شری پرکاش کا کہنا ہے کہ :-

" مسلمانوں میں بھاری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمان پہلے ہیں اور ہندوستانی بعد میں۔ یہ بھاؤ نا ہے جس نے پاکستان کو جنم دیا "

ایڈیٹر پرتاپ مسٹر نریندر کا کہنا ہے کہ :-

" یہ وہ لوگ ہیں جنکا دھرم اس دیش سے باہر شروع ہوا اور جو کسی نہ کسی کارن اس دیش سے باہر کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو باہر سے پریرنا (انسپریشن) لیتے ہیں چاہے راج نیتک معاملات پر ہو اور چاہے دھارمک اور چاہے ادھیاتمک۔ یروشلم میں الاقصیٰ کی مسجد کو ایک جنونی عیسائی نوجوان آگ لگانے کی کوشش کرتا ہے اور ہندوستان کے مسلمان تڑپ اٹھتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں گلیوں اور بازاروں میں جلسے کرتے ہیں جلوس نکالتے ہیں اور ان میں نعرے لگاتے ہیں :- جو ہم سے ٹکرائے گا وہ چور چور ہو جائے گا " یہ وہ دشٹی کون ہے جو فرقہ پرستی کی بنیاد ہے ... ان ہندوستانی مسلمانوں کو ودیشوں میں رہنے والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہمدردی ہے بہ نسبت ان ہندوؤں کے جن کے ساتھ انھیں اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کی موجودگی میں کیا سورگیہ مولانا محمد علی کے وہ الفاظ یاد نہیں آتے جب انھوں نے کہا کہ " حقیر سے حقیر مسلمان کو بھی آپ گاندھی جی پر ترجیح دیں گے " ان الفاظ کا اگر کچھ مطلب ہے تو یہ کہ مسلمانوں کے لئے انکا دھرم پہلے ہے انکا دیش بعد میں "

بلراج مدھوک نے گنگا جل اور گنگا جمنا کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایک دوسری طرح اس رخ کو چھیڑا ہے کہ :-

" جو گنگا جل سے نفرت کرتے ہوئے بدیشی چیزوں کو رٹ لگاتا، ملک کے باہر اعتقاد رکھتا ہے۔ اس طرح کا جذبہ مٹانا ہوگا۔ مسلمانوں کے دلوں میں گنگا جمنا یا دوسرے متبرک دریاؤں کے لئے وہی احترام ہونا چاہئے جو بھارت کے دوسرے طبقوں کے دلوں میں ہے۔ دراصل بھارتیہ کرن ان سنسکاروں کا ہی دوسرا نام ہے۔ جہاں تک الگ سنسکرتی کا تعلق ہے، سنسکرتی کسی ملک کی ہوتی ہے، مذہب کی نہیں۔ سارا یورپ عیسائی ہے مگر جرمنی اور فرانس کے نواسیوں کی سنسکرتی الگ الگ

پلٹن بازار دہرہ دون کی خوبصورت مسجد

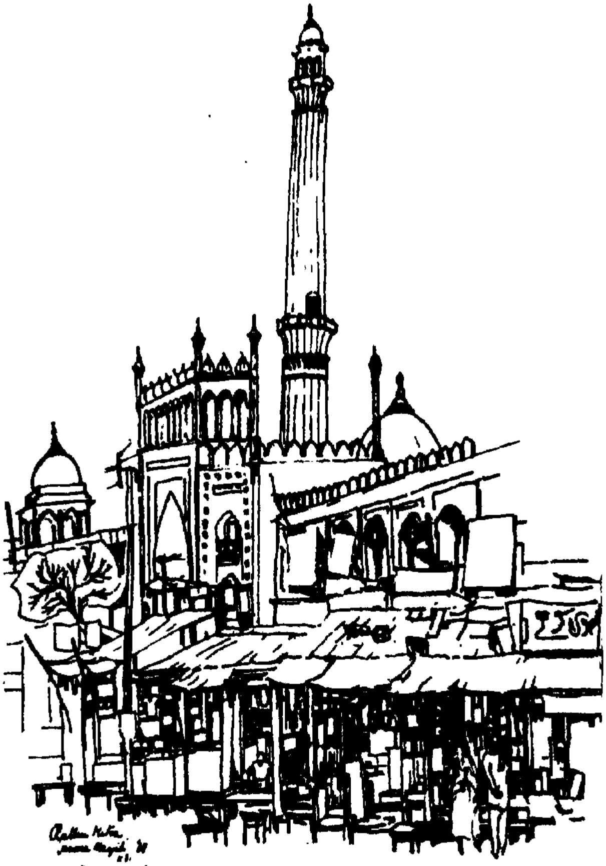


ہے۔ اسی طرح مغربی ایشیا میں سب مسلمان ہیں مگر ترکی اور عرب کی اپنی اپنی الگ الگ سنسکرتی ہے۔ اسی طرح بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی وہی سنسکرتی ہے جو بھارت میں رہنے والے دوسرے طبقوں کی ہے۔ بھارتیہ کرن کا یہ مطلب ہے کہ ہر بھارتی اپنے آپ کو پہلے بھارتی جانے بعد میں کچھ اور۔ عام طور پر بہت سے لوگ اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھاشا سے پیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک سے باہر دوسرے ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے ممبر بھی ہو سکتے ہیں، مگر ہمیں راشٹر کی نشٹھا میں رکاوٹ نہیں اس بات کا دھیان ضرور رکھنا چاہیے۔ غرضیکہ بھارتیہ کرن کا مطلب ہے راشٹریہ بھاونا جگانا۔"

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے، باوجود بلند بانگ دعوؤں کے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر رہے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا۔ مختلف جذبوں کی نوعیت کا۔ انکی گہرائی یا پھیلاؤ کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔ پان اسلازم کے سلسلے میں یہی ہوا ہے بات قطعی بے بنیاد بھی نہیں، لیکن ہونے کو جو دیو قامتی عطا کر دی گئی ہے، وہ اپنی جگہ پر ہے، اور اگر میں ہندو دوستوں کے جذبات اور اسلامی رشتے کی نوعیت دونوں سے واقفیت کا حقیر سا دعوی کرنے کے بعد عرض کروں کہ میرے دوستوں کے شکوک و شبہات، اندیشے اور ڈر واقعی کم ہیں، خیالی زیادہ تو غلط نہ ہوگا۔

اگر دو دائرے کسی جگہ بھی ٹکراتے نہیں اور پھر بھی اس پر اصرار کیا جائے کہ تم یا تو اس دائرے میں رہ سکتے ہو یا اس دائرے میں تو اسے سوائے اس کے کہ بدنیتی پر محمول کیا جائے اور کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تم پانی پسند کرتے ہو یا ہندوستان۔ اور اس کا جواب میں یہ دوں کہ مجھے پانی بھی پسند ہے اور ہندوستان بھی، اور اس پر تم پھر کہو کہ نہیں یہ بتلایئے بہتر کیا ہے تو میں اسے حماقت کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہنے لگے کہ تمہیں کونسی چیز بہتر لگتی ہے، آم یا برف کا پانی یا تم ان دونوں امور میں کسے ترجیح دو گے، سونے کو یا کھانے کو۔

پان اسلامیت کا ایک جز ہے، اور بس جذبہ ہی واقعات کی کسوٹی



بھولا بھائی پٹیل بر دہلی کی جامع مسجد جو چاروں طرف سے کباڑی بازار سے گھری ہوئی ہے۔
جامع مسجد شاید دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

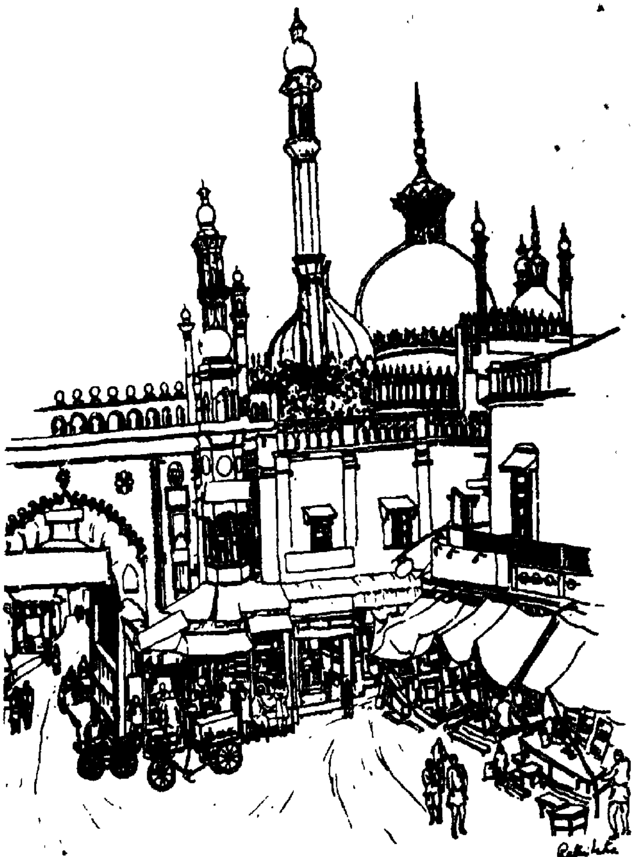
ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے آپ مثلاً افرو ایشیائی جذبہ تشکیل دینا چاہ رہے ہیں۔ اور آپ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ اوّل الذکر جذبے کو آخر الذکر میں ڈھال دیجیے۔ اس طرح یہ آپ کے لئے ایک سرمایہ بن جائے گا۔

اس بات کو سمجھانے میں ذرا مشکل پڑے گی کہ ہندوستان کے مسلمان کا باہر کے مسلمان سے کیا رشتہ ہے۔ جو لوگ ہندو یا جین انداز زندگی کو مت سمجھتے ہوں انکی سمجھ میں اس بات کا آنا آسان نہیں ہے کہ کمیونزم یا اسلام کی طرح کوئی آئیڈیا بھی مذہب یا امت ہو سکتی ہے جس میں اور قومیت میں یا تو سرے سے کوئی رشتہ ہی نہیں یا پھر سرے سے ٹکراؤ ہی نہیں۔

جس نے نمک کا مزہ نہ چکھا ہو وہ اس کا مزہ بتا ہی نہیں سکتا۔ سمجھ بھی نہیں سکتا کوئی اسے سمجھا بھی نہیں سکتا۔

اسلام کو ماننے کے بعد جغرافیائی حد بندیاں اس کیلئے ہیچ ہو جاتی ہیں۔ وہ نہ کسی نسل سے وابستہ رہتا ہے، نہ فرقے سے نہ قوم سے نہ سرزمین سے۔ اسکا تو کوئی خون کا رشتہ بھی نہیں رہتا۔ نہ اسکے کسی خاص جھنڈے سے نسبت باقی رہتی ہے۔ وہ کسی بھی ملک کی فتح یا شکست پر خوش یا غمگین نہیں ہوتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہ نکالئے کہ میں رامپور میں رہتا ہوں تو مجھے اس سے نفرت ہوگی (میرے تو رونگٹے رونگٹے میں میرا ملک بس گیا ہے) یا یہ کہ ہندوستان کے مقابلے میں عراق یا مصر سے زیادہ محبت کروں گا۔ نہیں کوئی اسکی طرف دیکھے گا تو میں اس کو گولی مار دوں گا۔



رام پور کی جامع مسجد ۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ مزیّن مسجد

مطلب اگر ہے تو صرف اتنا کہ اپنے گھر، محلہ، شہر اور ملک کے ساتھ ساتھ تصوراتی طور سے مسلمان پوری دنیا کا شہری بھی ہے۔ اور یہ میرے خیال میں کوئی برائی کی بات نہیں سیکھنے کی بات ہے۔

نہرو سے ذاکر حسین تک اور رسل سے رادھا کرشنن تک سب اس انسانی تصور کو عام کرنے میں لگے رہے کہ "ہم سب ایک ہیں" اور یہ کہ یہ رنگ و نسل اور ملک و ملت کی دیواریں جہاں تک اور جتنی تیزی سے گرائی جا سکیں گرا دو۔ لیکن محدود اور تنگ نظر والے انسان دوستوں پر حاوی آتے رہے۔ جاتے جاتے رسل نے یہ دل دوز جملے یوں ہی نہیں لکھے تھے۔

"سکھایا تو یہ جاتا ہے کہ اپنے ملک سے محبت کرو لیکن صرف اپنے ملک سے اور کسی سے نہیں، اور [illegible] وجود میں صرف انہیں کو نمایاں مقام دیا [illegible] جنہوں نے بدیشیوں کو مارنے میں سب سے زیادہ صلاحیت اور اہلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ آدمی کا یہ تصور کہ سب ایک ہی خاندان ہے، عام کرنے اور سکھانے کے لئے اتنی ہی محنت کی ضرورت ہے جتنی اس کے قطعی مخالف تصورات پر صرف ہو رہی ہے۔ اس کے لئے نئے انداز کی تعلیم سے نئے اخلاقی اقدار کو جنم دینا ہوگا جس سے یہ خواب کبھی حقیقت بن سکے کہ دنیا میں چار سو امن و سلامتی کا دور دورہ ہو۔"

ہم سب بنیادی طور سے انسان ہیں، اور سب ایک ہیں، الگ الگ گروہوں میں ہم اس لئے منقسم ہوتے رہے کہ اس سے پہچان میں آسانی ہو جاتی ہے اور اس طرح GROUP PERSONALITY کے اظہار میں سہولت ہو جاتی ہے۔

قومیت ہماری شخصیتِ اجتماعی کے اظہار کا ایک محدود وسیلہ ہے جس طرح اس سے محدود تر سطح پر شہر اور محلہ اور خاندان کے ساتھ وفاداریوں کا بھی ایک درجہ ہے

اب دو باتیں ہیں۔

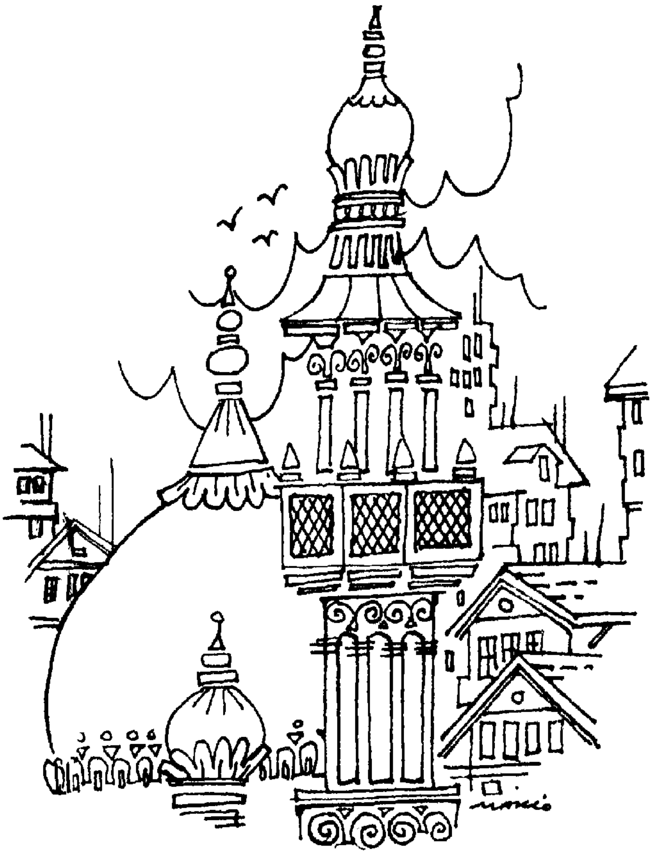
ایک تو یہ کہ اپنے خاندان کے ساتھ میری وفاداری ریاست کے ساتھ وفاداری سے کہیں ٹکراتی ہی نہیں، اور دوسرے یہ کہ اگر کسی کو اپنے یا کسی دوسرے کے معاملے میں ایسا محسوس ہوتا ہے تو یہ بات صاف ہے کہ چھوٹی وفاداری کو کسی بھی طور سے بڑی وفاداری سے ٹکرانا نہیں چاہئے۔ نہ اس کے آڑے آنا چاہیے۔ بس یہ ایک تنہا کسوٹی ہے۔ باقی پوری آزادی ہے جو جسے چاہے اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنائے۔

اب مسئلہ اس شکل میں آتا ہے کہ:۔

ہم پہلے ہندوستانی ہیں یا پہلے انسان ہیں۔ میرے خیال میں رادھا کرشنن کی اس معاملے میں تنہا آواز نہیں ہوگی اور کوئی احمق ہی ہوگا جو اپنی انسانیت کے شرفِ برتر کو ہندوستانیت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اگر کہیں ایسی قربانی کا موقع آ پڑے۔ لیکن اس سے بھی پہلے کیا واقعی کسی ایسے ٹکراؤ کا امکان بھی ہے۔؟

غالباً نہیں۔ اور یہ امر کہ ہندوستانیت کے ساتھ عالمیت بھی پہلو بہ پہلو کسی کے ذہن میں جنم لے چکی ہو، نہ بعید از قیاس ہے نہ قابلِ گرفت۔ اگر ہے تو قابلِ ستائش ہی ہے۔ ہندوستانیت انسانی تہذیب اور تاریخ کے بڑھتے ہوئے سمندر میں کوئی اہم دھارا نہیں۔ یہ کوئی نظریہ نہیں کوئی فکر نہیں۔ یہ تو ہمارا سہارا ہے، ہمارا گھر ہے ہمارے سانس لینے کی فضا ہے، ہمارا پیار ہے، ہماری نیند ہے، ہماری دوستی ہے، ہمارا درد ہے، ہمارا خواب ہے۔ لیکن یہ تازہ افکار کا سرچشمہ اور ترقی پذیر معاشروں کی بنیاد تو نہیں ہو سکتا۔ کپڑے کو آپ صرف پہن سکتے ہیں کھا نہیں سکتے۔ روٹی کو کھا سکتے ہیں پہن نہیں سکتے۔ ہر دو چیزوں کی میرے نزدیک اہمیت ہے۔ اور کوئی ایک دوسرے سے ٹکراتا نہیں۔

ہندوستانیت اور عالمیت کے یہی دو دائرے ہیں جن میں امتیاز نہ کر سکنے کے باعث قومیت کے خول میں گھرے ہوئے ذہن عالمی نظریوں کے حاملوں کو ہندوستانیت کا نقیض جانتے ہیں۔ عالمی نظریوں سے کسی کی وابستگی رشتے داری



نہیں میرے باپ نے اسلام ایجاد نہیں کیا۔ نہ بھوپیش گپت کے دادا نے کمیونزم کی تخلیق کی تھی۔ اگر میں یا بھوپیش اپنی ہندوستانیت کو عزیز جانتے ہوئے اس بات پر اصرار کریں کہ اسلام کے عالمی نظریے یا کمیونزم کے عالمی نظریے دونوں کا نصب العین انسان کو انسانیت کی سطح پر متحد کرنا ہے اور اس کے لئے انھوں نے کچھ اصول وضع کیے ہیں، تو ان اصولوں سے اختلاف کر کے کچھ اور عالمی اصول برتر انسانی معاشرہ کی تخلیق و تشکیل کے لئے بھی پیش کر سکتا ہے اور ان پر اصرار کر سکتا ہے۔ دوسروں کو انکی طرف دعوت دے سکتا ہے لیکن کسی بھی عالمی نظریے پر غیر ہندوستانی کا لیبل لگا کے ملک بدر تو نہیں کر سکتا۔ نظریے انسان کی مشترک ملکیت میں کسی کے باپ دادا کی جاگیر نہیں ہوا کرتے۔ نظریوں کا کسی ارضی رشتے کے ساتھ ٹکراؤ نہیں ہوا کرتا۔ اور نظریات وافکار پیدا کرنا اور انکو اپنانا یا اختلاف کرنا انسان ہی کا شرف ہے۔ پتھر اور جانور اس سے محروم ہیں۔ نظریوں سے اختلاف کرنا اس کا حق ہے لیکن نظریوں سے آنکھیں چرانا یا انھیں زندہ دفن کرنا انسانی شرف و عظمت کی دلیل نہیں انسان کے اندر چھپے ہوئے جانور کی پستی کی دلیل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم اب تک اقبال بمقابل حسین احمد مدنی کے دوراشتی دور میں چل رہے ہیں جب کہ یہ محض ذہنی شق ہے عملی وجود ہی نہیں رکھتا۔ آج کوئی ایسی بات کرتا ہے تو مجھے اس کی مثال بالکل ایسی لگتی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ نارنگی اچھی ہے یا اسلام۔ یا پھر ہندوستان عزیز ہے یا کرکٹ۔

> یہ اپنے پڑوسی سے زیادہ سمندر پار سے یا دور دراز سے آئڈنٹی ٹی کی مصنوعی کوشش۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ یہاں کوئی پیار سے بات کرنے والا نہیں ملتا۔ آپ کے دوار پر کھٹکھٹانے والا جب دروازہ پیٹتے پیٹتے تھک جائے، اور دروازہ نہ کھلے تو اب وہ ایسی جو کم آپ بھی نہیں کہ بندگی میں گھٹ کر رہ جائے اور دوار کا کتا بن کر دم ہلاتا رہے۔

یہ قربانی اسلام کا وہ پہلو ہوا جس کی آج ہمیں ہی

واقعات نئی دہلی

نہیں پورے جہاں کو ضرورت ہے۔ لیکن جب یہ حدود سے اس طرح بڑھنے لگیں کہ اپنے پرائے کو فوقیت دی جانے لگے تو جان لیجیے مگر کچھ فتور ہے۔ اور اس لیے اسکی فکر کرنی ہوگی۔ مسلمان عالمی نقطۂ نظر ضرور رکھے گا لیکن اس کے پیر تو اپنی زمین پر ہی ہوں گے۔ پھر وہ زمین کہاں کی ہوگی۔ اور اپنی زمین سے تو جانور کو بھی پیار ہوتا ہے انسان تو بڑی چیز ہے۔ تصوراتی یا نظریاتی طور سے البتہ اظہار میں بعضوں کے یہاں کچھ ایسی بات بھی نکلی اور اب بھی نکلتی ہے جیسے کہ ISLAMIC IDENTITY کو NATIONAL IDENTITY پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کا اپنا فائدہ دوسری IDENTITY میں ہے، پھر بھی یہ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ یہاں اکثریت کو تھوڑا سا سوچنا چاہیئے کہ کیا وہ ایسے ہی برادرانہ رویے کے حامل رہے ہیں، جیسے ہونا چاہیئے۔ اکثریت کی رواداری مشہور رہی ہے لیکن وہ اسی قدر اپنی ناروداری کے لئے بھی بدنام حد تک معروف رہے ہیں۔ وہ بیرونی اثر سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے بھوت پریت سے۔

رشتہ ناتہ بھی کرتے ہیں تو اپنے پڑوسی یا رشتہ دار کے بجائے ۲۵ میل دور کے خاندان سے۔ مسلمان ان کے لئے نوٹس آمرطہ کہنے کی چیز نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ نتیجے میں وہ اپنے مذہب والوں پر جا پڑتا ہے۔ ۵۰ سال پہلے خلافت کی احمقانہ تحریک اسی طرح چلی (افغانستان کی ہجرت بھی اسی کا ایک باب تھا۔) اب پچاس سال بعد رباط قسم کے مواقع پر لاکھوں کے جلسے جلوس کا سلسلہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

مرے طائرِ نفس کو نہیں باغباں سے رنجش\
ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

> ہم پہلے ہندوستانی ہیں یا پہلے انسان۔ میرے خیال میں رادھا کرشنن کی اس معاملے میں تنہا آواز نہ ہوگی۔ اور کوئی احمق ہی ہوگا جو اپنی انسانیت کے شرفِ برتر کو ہندوستانیت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو۔

اپنے پڑوسی سے زیادہ سمندر پار سے یا دور دراز علاقوں



سہارنپور کی جامع مسجد بھی مغل فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

ے آئیڈنٹٹی کی مصنوعی کوشش۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ یہاں کوئی پیار سے بات کرنے والا نہیں ہوتا آپ کے دوار پر کھٹکھٹانے والا جب دروازہ پیٹتے پیٹتے تھک جائے اور دروازہ نہ کھلے تو وہ اب ایسی جوئے کم آب بھی نہیں کہ بندگی میں گھٹ کے رہ جائے اور دوار کا کتا بن کے دم ہلاتا رہے۔

اور بات رابطہ ہی کی نہیں۔ جماعتِ اسلامی اور تبلیغی تحریک کا اور انکے واسطے سے ظلمت پسند علماء کا غیر معمولی اثر و نفوذ۔ یہ سب آزاد ہندوستان میں کیا ظاہر کرتے ہیں۔ یہی ناکہ دوار ابھی تک بند ہے۔ میں تو اُردو کے لئے بھی مسلمانوں میں حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا جوش و خروش اور اسی کے ساتھ ہندی کے لئے نفرت کا جذبہ (جسکا وہ اظہار نہیں کرتے ہیں) یہ بھی اسی امر کی علامت سمجھتا ہوں کہ ان کے وجود کو خوش آمدید نہیں کہا جا رہا ہے اس لئے THEY ARE INCREASINGLY JEALOUS OF IDENTITY۔ اور پھر بند دوار سے EXTRATERRITORIALISM پر IDENTITY اس کے نوسے بلند ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کی واقعی نوعیت اور گہرے یا کھلے پن سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں ہوتی۔

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی سنجیدگی اور تفصیل سے اس مسئلے پر اس طرح سوچنا چاہیئے کہ وہ کون سا نقطہ ہے جہاں پان اسلام یا جذبۂ اخوتِ اسلامی غلط موڑ لے لیتا ہے اور کہاں تک وہ حدود ہیں جو صحیح بلکہ ناگزیر ہیں۔ اور اگر امور بہت صاف نہیں ہیں تو سر جوڑ کے اس سلسلے میں وضاحت کے ساتھ سوچنا ہوگا کہ :-

HOW TO EVOLVE A NEW PAN-ISLAMISM ?

> مسلمانوں کو بھی سنجیدگی سے اور تفصیل سے اس مسئلے پر اس طرح سوچنا چاہیئے کہ وہ کونسا نقطہ ہے جہاں پان اسلام یا جذبۂ اخوتِ اسلامی غلط موڑ لے لیتا ہے، اور کہاں تک وہ حدود ہیں جو صحیح بلکہ ناگزیر ہیں۔

پان اسلام کا وہ متوازن رخ جو ہم ہندوستانی مسلمان اختیار کر سکتے ہیں دو بنیادوں پر مبنی ہوگا:-

اوّل تو یہ کہ الہامی سلسلۂ مذاہب میں اسلام تاریخی طور سے آخری مذہب ہے۔ اس لئے قدرتی طور سے اپنے عہد تک کی ساری اچھی اقدار کو اس نے اپنے اندر سمو لیا ہے اور خدا اور انسان کے رشتے سے ہٹ کر انسانی سطح پر ان اقدار میں سب سے اہم اخوت اور مساوات کی اقدار ہیں۔ تو ہم جب بہت اونچے ہو کے اپنے بین الاقوامی کردار کی عظمت کے بلند بانگ دعوے کریں تو اس وقت یہ کیوں بھول جائیں کہ مسلمانی رشتے سے آگے بڑھ کر خود اسلام ہی کا سکھایا ہوا ایک انسانی رشتہ بھی ہے۔ اور اگر اسلام کی بخشی ہوئی عالمی نظر کو ہم واقعی کچھ اہمیت دیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے رباط کے مسئلے پر، اور مسجدِ اقصیٰ کے معاملے پر لاکھوں آدمیوں کے سمندر کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں منظم احتجاج پر اکسایا لیکن ویتنام کے مسئلہ پر من حیث الملت آج تک صدائے احتجاج بھی بلند نہیں ہو سکی ہے؟ یا تو اپنے پان اسلامی جذبہ کو بین الاقوامی کا مقدس نام دے کر دستبردار نہ کیجئے یا پھر اسے صحیح معنے میں انسانیت کا خادم بنائیے۔ ظلم اور جبر کہیں بھی ہو وہ مسلمان کا غم ہے۔ اور اسلام انسانیت کی آواز ہے

واقعات نئی دہلی

اس سے کم درجے کے اسلام پر راضی ہوجانا، اسلام کی صحیح تعلیمات کی توہین کرنا ہے۔

> کپڑے کو آپ صرف پہن سکتے ہیں کھا نہیں سکتے روٹی کو کھا سکتے ہیں پہن نہیں سکتے۔ ہر دو چیزوں کی میرے نزدیک اہمیت ہے اور کوئی ایک دوسرے سے ٹکراتا بھی نہیں۔

دوسرے درجے پر یہ بات آتی ہے، اس درد کے رشتے، یا انسانی رشتے میں پروئے ہوئے قریب ترین وہی لوگ ہیں جو ایک ہی راستے سے اس رشتے میں بندھ گئے ہیں۔ ان میں ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک قبلہ۔ ایک طریق عبادت اور روزہ رکھنے کا انداز مشترک ہوگا۔ چھٹی صدی ہجری سے پہلی جنگ عظیم تک ان سب کی تاریخ میں ایک باب مشترک باب ہوگا۔ ان کے مذہبی ادب کا پورا ورثہ مشترک ہوگا۔

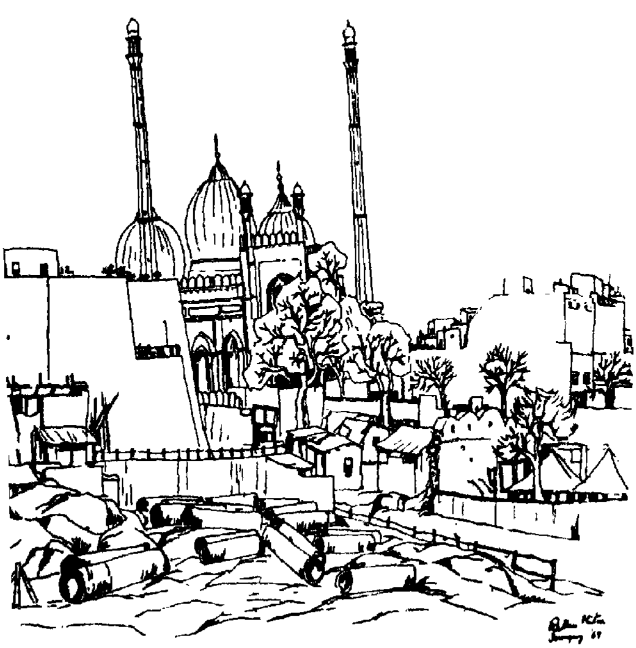
لیکن بس اتنا ہی۔ اس کے آگے داڑھی اور لباس سے لے کر کھانے اور گانے تک میں ان میں آپس میں کوئی قدر مشترک نہیں ہوگی۔ تاہم جس حد تک اشتراک ہے اُسے ہندوستانی مسلمان اپنے ملک کے فائدے کے لئے کام میں تو لا ہی سکتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے ملک کو فائدہ ہو اور ان مسلمان ملکوں کو بھی (تباہی کا سامان کسی کے لئے نہ ہو!) مشترک سیاسی پالیسیوں اور تجارتی امور میں اسکا وجود ہر دو اطراف کے لئے رحمت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی پان اسلامی کے جذبے کے ایک حصّہ میں پاکستان بھی آجاتا ہے۔

میں ہندوستانی مسلمان، اس ملک کی فضاؤں اور ہواؤں کا اس کی تاریخ اور تقدیر کا ایک ناگزیر حصّہ بن چکا ہوں۔ مگر جب ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں کہ ہمیں واقعی اپنا بنا لو۔

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

تو میں ٹھٹک کے سوچنے لگتا ہوں کہ اپنانے میں کیا کھوٹ ہے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ میر عرب کے ملک کا بادشاہ میرے وطن پر حملہ کردے تو میں اسے خوش آمدید کہوں گا۔ میرے گھر ہی کو کوئی چھینے لگے یا میرے شہر پر برابر کے شہر والے دھاوا بول دیں تو اس تک کو تو میں گوارا کروں گا نہیں۔ پھر اپنا ملک کیسے کوئی جیتے جی دے سکوں گا۔ پھر کھوٹ کہاں ہے۔

واقعات نئی دہلی



زینت مسجد دریا گنج دہلی۔ اس میں نسوانی نزاکت ہے۔ اسے ایک مغل شہزادی نے بنوایا تھا۔

> عالمی نظریوں سے کسی کی رشتے داری نہیں۔ میرے باپ نے اسلام ایجاد نہیں کیا، نہ بھوپیش گپتا کے دادا نے کمیونزم کی تخلیق کی تھی۔

پاکستان میں میرے جگری دوست، قریبی عزیز اور ساتھی ہیں۔ الگ ملک ہوتے ہوئے بھی اسکا تصور نہیں ہوپاتا کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔ وہاں کی حکومت کی احمقانہ پالیسیوں کی اور بات ہے لیکن وہاں کے عوام کے لئے دل محبت سے اسی طرح دھڑکتا ہے جیسے خود اپنے دیس کیلئے کبھی جی نہیں چاہتا کہ دنیا کی کوئی آفت اور برائی وہاں کے لوگوں پر آئے کہ وہ اپنے ہی جگر کے ٹکڑے ہیں۔

جب ہندو پاک جنگ ہوئی تو پاکستان کی فتحمندی کے لئے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا۔ ہندوستان کی فتحمندی کے لئے بھی دل سے دعا نہ نکلی۔ جی چاہا تو بس یہی کہ دونوں اپنی اپنی سرحدوں پر لوٹ جائیں اور امن ہوجائے۔

اب جب کوئی کہتا ہے کہ آخری معرکہ تو ابھی ہونا ہی ہے تو دل رونے لگتا ہے اور جب کوئی کہتا ہے زمین پر لکیر کھینچے دو، دلوں کو کیوں تقسیم کرتے ہو تو دل بڑھ جاتا ہے۔



چوک مسجد لکھنؤ۔ لکھنوی نزاکت کا شاہکا

شاید کھوٹ یہاں ہے، یا شاید اپنے ہی وطن اور اپنے ہی لوگوں کے لئے محبت ـــــ محبت کی کمزوری سے جسے کھوٹ سمجھا جاسکتا ہے!۔ اس کے حل کی دو ہی صورتیں ہیں۔ نفرت یا محبت۔ نفرت ایسی کہ پاکستان اور پاکستانیوں کا ایک ایک نقش، ایک ایک یاد اس میں بھسم ہوجائے۔ اور پھر صرف بارود کی بو باقی رہ جائے۔ اور یا پھر محبت ایسی کہ اس مشن پر جان ہتھیلی پر رکھ لی جائے کہ دونوں ملکوں کو دوست بنانا ہے۔

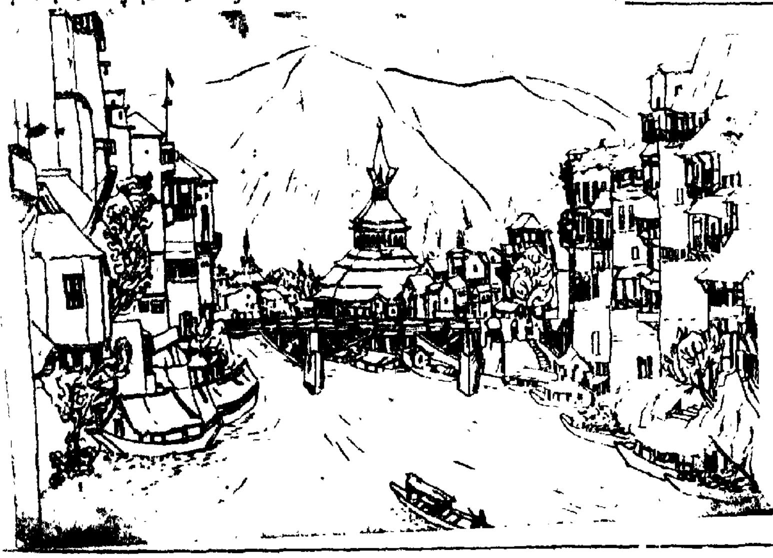
ظلم وجبر کہیں بھی ہو، وہ مسلمان کا غم ہے، اس لئے کہ وہ انسان کا غم ہے، اور اسلام انسانیت کی آواز ہے۔ اس سے کم درجے کے اسلام پر راضی ہوجانا، اسلام کی صحیح تعلیمات کی توہین کرنا ہے۔

طرف بغیر حکومت کے اقدام کا انتظار کئے آٹھ دس مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جو اپنے کو اس کام کے لئے وقف کردینے کا اعلان کرے اور کم سے کم ایک سال کے لئے وہ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہوں پر مسلسل چکر لگائے۔ مجھے نہیں معلوم دونوں حکومتیں اور سرحدی آر پار قواعد کس حد تک رخنے ڈال سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کچھ من چلے جو کچھ عرصے کے لئے اپنے گھروں کی طرف سے بے پروا ہوسکیں اس کام کے لئے تیار ہوجائیں تو راستے کی مشکلات دور ہونا کوئی بہت دشوار گزار مرحلہ نہیں ہوگا۔

کام مشکل ہے لیکن کرنے کا ہے۔ اس لئے کرنے کا ہے کہ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ سارے مسئلوں کی تہہ میں یہی کارفرما ہے۔ بعضوں کا تو تجسس یہی ہے کہ اصل

جب ہندوپاک جنگ ہوئی تو پاکستان کی فتحمندی کے لئے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا۔ ہندوستان کی فتحمندی کے لئے بھی دل سے دعا نہ نکلی۔ جی چاہا تو بس یہی کہ جلد سے جلد دونوں اپنی اپنی سرحدوں پہ لوٹ جائیں اور امن ہوجائے۔

مسئلہ نفسیاتی ہی ہے۔ تقسیم کی توہین اور سُبکی، اس میں سب سے پہلے آتی ہے جس کے زخم کافی بھر چلے تھے اور خانہ بدوش پناہ گزین نئے گھروں میں بس کے بہت کچھ بھول چکے تھے کہ ۱۹۶۵ء کی ہندوپاک آویزش نے سب کچھ از سرِ نو تازہ کردیا۔ اور پھر اب تو یہی طے سا ہوگیا ہے کہ ایک آخری فیصلہ کن ہندپاک معرکہ تو ہونا ہی ہے۔ ■



شاہ ہمدان کی مسجد۔ سری نگر۔ یہ مسجد بڑے بڑے لٹھوں سے تعمیر کی گئی ہے



مجھے اندازہ ہے کہ پاکستان کی حکومت (نہ کہ عوام!) اور ہمارے عوام کا ایک خاص طبقہ (نہ کہ حکومت) اس بات کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے کہ یہ مشن کامیاب ہو لیکن کرنے کا کام ہے تو یہی ہے۔

اس کی ایک صورت تو یہی ہے کہ میری حکومت پاکستان میں اپنا اگلا سفیر (اتنے ہندوستانی مسلمانوں میں سے کوئی ایک تو ایسا قابلِ اعتماد ہوگا ہی جسے وہ اس کے لئے منتخب کرسکے۔) کسی ایسے مسلمان ہی کو مقرر کرے جو اس مشن کی خاطر اپنی جان دیدینے کا تہیہ کرچکا ہو۔ دوسرے



۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو لدھیانہ میں تقریر کرتے ہوئے سرسیدؒ نے فرمایا:۔ "میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اُس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو سرسید اور ان کے رفقاء کی تاریخ آفریں خدمات کی زندہ یادگار ہے۔ جسے ہمارے اسلاف نے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا۔ جو آزاد ہندوستان میں مسلمانانِ ہند کی تمناؤں کا مرکز اور ہندوستانی سیکولرازم کی زندہ تصویر ہے۔ آج ایک بھیانک دور سے گزر رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی بنیاد فرقہ پرستی پر ہرگز نہ تھی۔ اس کے دروازے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کیلئے بھی ہمیشہ کھلے رہے۔ مگر فرقہ پرستوں نے اس پر ہمیشہ بے بنیاد الزامات لگائے۔ ان بے بنیاد اور بے لگام الزاموں سے جب مسلم یونیورسٹی کی دیواریں لرزنے لگیں تو وزیر تعلیم شری مالی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جو پروفیسر جی۔سی چٹرجی۔ پروفیسر آر۔ داریا جناب کرتار سنگھ ملہوترا۔ جناب آر۔بی نائک۔ جناب بی۔ایم سعید اور جناب شاہ میری جیسے غیر جانبدار افراد پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں نے تمام حالات کی تحقیق کی اور اپنی رپورٹ میں کہا:۔

"مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا ڈسپلن دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں کافی بلند ہے۔ طلباء کی یونین۔ کھیلوں

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

عبدالبصیر نعیمی



عبدالبصیر نعیمی

کے کلب سیال کونسلیں اتحاد اور اتفاق سے کام کرتی ہیں۔ طلباء میں غیر متعلق باتوں کے بارے میں مطالبات پیش کرنے اور دباؤ ڈال کر منوانے کا ذہن نہیں پایا جاتا۔ ہم خصوصیت سے اس بات سے متاثر ہوئے کہ طلباء کی تنظیموں نے ہمارے سامنے نہ کوئی عرضداشت پیش کی اور نہ کوئی مطالبہ کیا۔ یہ چیز اس کے برعکس ہے جو بنارس ہندو یونیورسٹی اور دوسری جگہوں میں ہوتی ہے"

اس رپورٹ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی فرقہ پرستی کا گڑھ ہرگز نہیں ہے جیسا کہ چند مسلم دشمن لوگ سمجھتے ہیں۔ بدقسمتی سے جناب چھاگلا وزیر تعلیم بنے تو مسلم یونیورسٹی کے دشمن بن بیٹھے اور ۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء کے ایک ناخوشگوار حادثے کو بنیاد بنا کر ایک غیر منصفانہ آرڈی نینس مسلم یونیورسٹی پر مسلط کر دیا گیا۔

اس آرڈی نینس کا مطلب کیا تھا۔ جناب چھاگلا نے الزام لگایا کہ "یونیورسٹی میں وائس چانسلر کو قتل کرنے کی باقاعدہ سازش کی گئی"۔ اس الزام کے دو حصے ہیں۔ نمبر ۱۔ تیاری۔ نمبر ۲۔ سازش۔ اس حادثے کے بعد جتنی بھی رپورٹیں پیش کی گئیں ان میں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ طلباء چاقو، چھری، یا پستول سے لیس تھے۔ اگر طلباء غیر مسلح تھے تو بھلا یہ کس طرح ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ قتل کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔ اب رہی بات سازش کی تو ڈاکٹر ضیاء احمد اور ان کے ساتھیوں نے کافی تحقیقات کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس احتجاج میں اساتذہ کی شرکت ثابت نہیں ہوتی ہے اگر سازش ہوتی تو اسلحہ ہونا ضروری تھا۔

اگر سازش بھی نہیں تھی اور قتل کی تیاریاں بھی نہیں تھیں تو پھر آرڈی نینس کیوں نافذ ہوا۔ آرڈی نینس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مسلم یونیورسٹی میں طلباء سے لے کر اساتذہ تک یونیورسٹی کورٹ سے لے کر یونیورسٹی کونسل تک یونیورسٹی کا ہر گوشہ بے حد خراب ہو چکا ہے اس لئے پوری مشین کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔

۹ جون ۱۹۶۵ء کو ایوان پارلیمنٹ میں وزیر تعلیم مسٹر چھاگلا نے فرمایا کہ "میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کوئی بات نہیں کہ یونیورسٹی میں عام حالات کے بحال ہوتے ہی اس کے دستور کو بحال کر دیا جائے"۔

نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر نے فرمایا "مختلف اقسام کی غلط فہمیوں کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آرڈی نینس ہرگز مسلم یونیورسٹی کے کردار (اقلیتی واقامتی) اور اس کی تعلیمی خود مختاری پر اثر انداز نہیں ہوگا"۔

ان تمام یقین دہانیوں کے باوجود آرڈی نینس نے مسلم یونیورسٹی کے کردار کو مسخ کر دیا۔ یہ آرڈی نینس کیا تھا۔ ایک تازیانہ تھا جو مسلمانوں کی متاع پر لگایا گیا۔ اس آرڈی نینس کی رو سے یونیورسٹی کورٹ وزیٹر (صدر جمہوریۂ ہند) کی مشاورتی کمیٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ یونیورسٹی کورٹ کے اکیاون ممبروں میں سے ۳۰ ممبر وزیٹر کے نامزد ہیں۔ ایگزیکیٹو کونسل کے چیرمین وائس چانسلر بنے۔ ان کے علاوہ ۹ ممبروں میں سے سات ممبر وزیٹر نے نامزد کئے۔ اس کونسل کو یونیورسٹی کے متعلق تمام اختیارات دے دیئے گئے۔ دوسرے الفاظ میں مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں سے چھین لیا گیا۔

مسلمانوں نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہے حالانکہ ۱۹۲۰ء میں جب ایم۔ اے۔ او کالج کے لئے مسلم یونیورسٹی بل مرکزی اسمبلی میں پیش ہوا اس وقت وزیر تعلیم نے اپنی تقریر میں کہا تھا:۔

"یہ نیا تجربہ جسے حکومت اور مسلم قوم کا اعتماد حاصل ہے مسلم قوم کی ترقی کا باعث بنے گا، اور سرسید کی اعلیٰ امیدوں کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا"

"اس بل کو پیش کر کے ہم ایک تعلیمی اقامتی یونیورسٹی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ جدید طرز کی یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود مسلمانانِ ہند کی ترقی کی تاریخ میں اہم پارٹ ادا کرے گا۔ مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کا قیام جس کے دروازے عالمگیر علم کے لئے کھلے ہوں مسلم قوم کی ترقی کی ضامن ہوگی"

لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے نے تمام بنیادی حقائق پر پانی پھیر دیا لوگ کہتے ہیں انصاف اندھا ہوتا ہے، لیکن اس قدر اندھا ہوتا ہے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ خود غرض لوگوں نے مسلم یونیورسٹی پر الزام لگایا کہ "مسلم یونیورسٹی پاکستان حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے، اور مسلم یونیورسٹی سے فارغ ہو کر طلباء پاکستان چلے جاتے ہیں"۔ اس کے بارے میں سابق وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ نے فرمایا تھا۔

"کچھ طلباء اگر پاکستان یا دوسرے ممالک کو گئے تو اس کا سبب روزگار کے مواقع کی کمی ہے — دوسرے لوگ بھی ملک کے باہر روزگار کی تلاش میں جاتے ہیں"

اگر مسلم یونیورسٹی کے طلباء روزگار کی تلاش میں پاکستان جاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی پاکستان حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہاں کے طلباء تو امریکا، عرب، کناڈا، تنزانیہ وغیرہ بھی جاتے ہیں تو کیا مسلم یونیورسٹی غیر ممالک حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔؟

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ہندو یونیورسٹی بنارس کے لئے یکساں ایکٹ کا ہونا لازمی ہے؟ جس وقت مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں پاس ہوا اس وقت دستور ہند مرتب نہیں ہوا تھا اور بنارس ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے یکساں قوانین بنائے گئے تھے۔ جب دستور ہند مرتب ہوا (آزادی کے بعد) تو دستورِ ہند کے آرٹیکل ۳۰(۱) کے ذریعے بنیادی حقوق کے تحت اقلیتوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور انکو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ اکثریتی فرقے کو اس قسم کا کوئی حق نہیں دیا گیا کیونکہ ایک جمہوری نظام حکومت میں اکثریتی فرقے کی تہذیب و زبان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اگر اقلیتی فرقے کے اپنے تعلیمی ادارے نہ ہوں تو انکی مقدس مذہبی روایات، تہذیب و تمدن اور زبان کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں رہتی۔ اس لئے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دستورِ ہند کے نفاذ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کی قانونی و آئینی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود بھی اگر کوئی یہ کہے کہ دونوں یونیورسٹیوں کے لئے یکساں قانون بننا چاہیے صرف ہٹ دھرمی ہے اور کچھ نہیں۔

۱۹۶۵ء سے لے کر آج تک مسلم یونیورسٹی کی کشتی طوفانی لہروں کے تھپیڑے برداشت کر رہی ہے۔ بار بار یقین دہانیوں کے باوجود مرکزی حکومت مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک مستقل بل کے مسئلے کو ٹال رہی ہے۔ آخر کب تک؟۔

اندرا کانگریس جب [illegible] اس وقت انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو انکا حق دلانے کی پوری کوشش کریں گی۔ ہم جانتے ہیں کہ وزیر اعظم [illegible]

[illegible]

جب کوئی فیصلہ کرلیتی ہیں اور مخالفتوں کی پروا کئے بغیر اس کو تکمیل کے مرحلے تک پہونچا کر دم لیتی ہیں۔ بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں انھوں نے بے پناہ جرات کا ثبوت دیا ہے مثلاً۔ بینکوں کو قومیانے کا مسئلہ، یا پریوی پرس (راجگان کا گزارہ) کو ختم کرنے کا مسئلہ۔ سپریم کورٹ نے ان کے ارادوں کے خلاف فیصلہ سنایا لیکن ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ تو پھر مسلم اقلیت کے مسائل پر صرف زبانی وعدہ کب تک۔؟

محترمہ اندرا گاندھی کو برسر اقتدار ہونے کے لئے ہماری مدد کی ضرورت تھی اور اس مقصد کے لئے اقلیت نے سردھڑ کی بازی لگا دی صرف اس امید پر کہ اندرا ہمارے حقوق کا تحفظ کریں گی ــــ مگر اقلیت کا بھروسا اب ڈگمگانے لگا ہے۔

جناب ظفر احمد صدیقی اپنے ایک مضمون بعنوان "سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

> مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت زندگی گزارنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ انکی نوخیز نسلیں اعلیٰ سائنس کی تعلیم اور جدید تعلیم اسلامی معاشرہ کے لئے سازگار ماحول میں حاصل کرسکیں۔ موجودہ حالات میں اس کی واحد ضمانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی ہے۔ مسئلہ محض ایک تعلیمی ادارے کے تحفظ کا نہیں بلکہ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ جدید تعلیم یافتہ نسلوں میں اسلامی شعار کے بقا و تحفظ کا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے پر ہمیں سنجیدگی سے دھیان دینا چاہئے۔"

ابھی حال میں بہار کے دورہ کے موقع پر محترم فخرالدین علی احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں حکومت کے جن ارادوں کا تذکرہ کیا اور جو یقین دہانی کرائی ہے ان سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔ راقم الحروف ان مذاکرات میں شریک رہا ہے جو شروع سے لے کر اب تک اولڈ بوائز کے نمائندگان اور مرکزی حکومت کے سربراہوں کے درمیان ہوئے۔ راقم الحروف بیگ کمیٹی کا ایک رکن تھا۔ بیگ کمیٹی نے ذیل کی سفارشات کی تھیں:۔

> ۱۔ بیگ کمیٹی کی سب سے اہم بنیادی سفارش یہ تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے جو دشواری پیدا ہوگئی ہے اس کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایکٹ کی دفعہ ا میں ضمنی دفعہ (۲) کا اضافہ کرکے یہ

واقعات نئی دہلی

وضاحت کردی جائے کہ یونیورسٹی کی ابتداء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قائم کردہ سمجھی جائے گی اور اسکا نظم و نسق بموجب آرٹیکل ۲۹-۳۰ دستور ہند ہوگا۔

> ۲۔ یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۵۱ء کی دفعہ ۸ کی رو سے یونیورسٹی افسران کے لئے (جن میں وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، رجسٹرار وغیرہ شامل ہیں) مسلمان ہونا ضروری نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ چیز مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے منافی ہے۔ لہٰذا الفاظ "To hold any office Therein" حذف کردیے جائیں۔
>
> ۳۔ ایکٹ کی دفعہ (۸-۱۲) جس کی رو سے یونیورسٹی کو کالجوں کے الحاق یا ان کے طلباء کو یونیورسٹی کے طلباء کے مساوی حقوق دینے کا اختیار دیا گیا ہے، منسوخ کردی جائے کیونکہ اس سے یونیورسٹی کا اقامتی کردار متاثر ہوگا۔
>
> ۴۔ چوتھی اہم سفارش یہ تھی کہ یونیورسٹی کورٹ میں مسلم نمائندوں کے غلبے کو قائم رکھنے کے لئے ۱۶ مسلم ممبران قانون ساز مختلف منطقوں سے لئے جائیں اور اولڈ بوائز کی نمائندگی میں اضافہ کردیا جائے۔"

اب تک جو اطلاعات ملی ہیں ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حکومت دفعہ ۱۲ (اے) کو حذف کرنے کے لئے تو آمادہ نظر آتی ہے لیکن بیگ کمیٹی کی بقیہ بنیادی سفارشات کو مطلق نظر انداز کر رہی ہے۔ محترم فخرالدین علی احمد صاحب سے لوک سبھا کے انتخاب سے دو تین ماہ قبل ان مسائل پر تفصیلی تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ تلخ نوائی معاف خود موصوف کا ذہن ان معاملات میں صاف نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے مجوزہ بل موصوف کے نزدیک قابل قبول ہو مگر محبّان مسلم یونیورسٹی کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔"

قومیانے کا جذبہ اگر ملک کی بہتری کے لئے ہو تو ایک بہترین قدم ہے۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اقلیت کے تعلیمی اداروں کو سرکار اپنی تحویل میں لے لے۔ آزادی کے بعد سرکاری اداروں میں اکثریت کی تہذیب و تمدن اور زبان حفاظت میں گھری ہوئی نہیں ہے اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے پاس اپنی تہذیب و تمدن کا صرف ایک یہی ادارہ رہ گیا ہے۔ اگر حکومت اسکو بھی اپنے اختیار میں لے لیگی تو اقلیت کی تہذیب مٹ جائے گی سکیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اس طرح سے حکومت اقلیت کی تہذیب و تمدن کو فنا کردینا چاہتی ہے ؟ اندرا سرکار کو اپنا وعدہ نبھانا چاہیئے جو اس نے الیکشن سے قبل کیا تھا۔ محترمہ اندرا گاندھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ انکی کانگریس کی فتح کے لیے کتنی ہی جگہ اقلیت نے جان و مال کی قربانی دی ہے۔ اقلیت نے طرح طرح کے مصائب اور تکلیف دہ حالات کو خاموشی سے برداشت کرلیا صرف اس امید پر کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی ہمارے حقوق ہمیں واپس کردیں گی۔ ہماری خوشیاں لوٹا دیں گی۔ مگر لگتا ہے اقلیت نے ایک حسین خواب دیکھا تھا اور جب آنکھ کھلی تو بدستور اندھیری رات تھی۔ ہندوستان کی مسلم اقلیت کے سامنے بس ایک ہی سوال ہے کہ ہم کب تک انتظار کریں ؟!

سرسید احمد خاں نے اپنے عزم و ارادے کا ایک بار اسطرح اظہار کیا تھا:۔

> "تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے! ہماری رائے میں اسکا جواب صاف ہے۔ استقلال استقلال۔ استقلال۔ ہمت۔ ہمت۔ ہمت۔ کوشش کوشش۔ کوشش ــ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہ کرنی چاہئے۔ اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ (Self Respect) کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔"

اور ہندوستان کے تمام مسلمان سرسید کے ان جملوں پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔



"ڈاکٹر۔ کبھی کبھی یہ اپنے ماں اور باپ میں فرق محسوس نہیں کر پاتا۔"

روسی جیمس بانڈوں کی واپسی

جاسوس دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں لیکن آج کل کی دنیا کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انکا پھیلاؤ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ نئے نئے ٹیکنیک، نئے نئے طریقے جاسوسی کے معلوم کر لئے گئے ہیں اور جاسوسی کے ان محکموں پر لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں برطانیا نے روس کے ۱۰۵ افسروں اور ڈپلومیٹوں کو اپنے ملک سے یہ الزام لگا کر نکالا ہے کہ وہ جاسوسی اور تخریب کے کاموں میں ملوث تھے اس کی توضیح برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ڈگلس ہیوم نے یہ فرمائی کہ :۔

برطانیا کو روس کی جاسوسی سرگرمیوں کا علم کیسے ہوا اور اس نے اتنی بڑی تعداد میں جسکی کہ ڈپلومیٹک دنیا میں مثال نہیں ملتی روسی نمائندوں کو اپنے ملک سے کیوں خارج کیا۔؟ اس کے بارے میں مغربی دنیا کے اخبارات و رسائل نے اپنے کالم کے کالم سیاہ کئے ہیں۔ ایک امریکی میگزین نے اس بارے میں جو تفصیلات بہم پہونچائی ہیں ان کے مطابق روس کے شعبۂ تجارت ۳۴ سالہ افسر اولگ لیالن (OLEG - LYALIN) نے برطانیا میں روس کے جاسوسی نظام کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ شخص بڑا لاابالی بتایا جاتا ہے کہ اسکے، مگر اصل میں وہ کے۔جی۔بی (KGB) میں کیپٹن کے عہدے پر مامور تھا۔ کے۔جی۔بی، روس کا ایسا ہی محکمۂ سراغرسانی ہے جیسا کہ امریکا کا مرکزی محکمۂ سراغ رسانی (C.I.A) غالباً "وائن اینڈ ویمن" (شراب اور عورت) کے چکر میں وہ برطانوی سراغ رسانی کے افسروں سے مل گیا اور اس نے برطانیا میں سراغرسانی کے روسی نظام کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

جاسوسی کی سرگرمیاں سب ہی ملکوں میں ہوتی ہیں اور ہر حکومت انھیں انگیز کرتی ہے لیکن جب معاملہ ایک حد



برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہیوم





کے۔جی۔بی، کے سربراہ - اینڈروپود

"ایسا روس کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کیا گیا ہے"

جواب میں وزیر خارجہ روس مسٹر گرومیکو نے کہا۔ "تعلقات کو بہتر بنانے کا یہ بہت اچھا انداز ہے" لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس اقدام سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر نہیں ہوئے بلکہ بگڑے ہیں۔ دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا اظہار روس کی جوابی کارروائی سے ہوتا ہے جو اس نے برطانیا کے اٹھارہ ڈپلومیٹوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے سلسلے میں کی۔

بڑا خرچیلا اور شراب اور عورت کا رسیا۔ کہتے ہیں اس کی کھانے کی میز پر ۸۰ پونڈ (۱۳½ سو روپے) کا بل اسکے لئے کوئی بات نہ تھی۔ اس کی بیوی اور اس کا سات سال کا بچہ ماسکو میں ہے لیکن برطانوی اخبارات نے لندن میں پانچ عورتوں کے ساتھ اسکا نام وابستہ کیا ہے۔ ایک اسرائیلی طالبہ، ایک چیک طالبہ، دو انگلش سکریٹریز اور ایک روسی شوخ حسینہ جو کسی دوسرے روسی افسر کی بیوی تھی۔

یہ روسی افسر بظاہر برطانیا سے لوکرے اور دوسرے سلے سلائے کپڑے خریدتا تھا تاکہ انھیں برطانیا سے برآمد

سے گزر جائے تو کسی بھی حکومت کے لئے وہ ناقابل برداشت ہے۔ چنانچہ ہیتھ (وزیر اعظم) ڈگلس ہیوم (وزیر خارجہ) لارڈ کیرنگٹن (وزیر دفاع) اور دوسرے اعلیٰ ذمہ دار ایک جگہ بیٹھے اور انھوں ۱۰۵ روسی افسروں اور ڈپلومیٹوں کو ملک سے نکال دینے کا فیصلہ کر دیا۔

اس سے قبل اس سلسلے میں روسی حکومت کو لکھا گیا تھا لیکن اس نے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی نتیجے میں روسی افسران برطانیا سے نکال دیے گئے۔ روسیوں کو ایک برطانوی باشندہ کم فلباؔ (Kim Philby) نے

جس نے ۱۹۶۳ء میں اپنے ملک سے غداری کر کے روس میں پناہ لے لی تھی، جس برطانوی ڈپلومیٹوں کے نام بتا دیئے جو برطانوی محکمہ سراغرسانی کے ایجنٹ تھے۔ یہ بھی روس سے نکال دیئے گئے۔

روس کے محکمہ سراغرسانی کے۔جی۔بی کے سربراہ اسوقت ۵۰ سالہ یوری اینڈروپوف ہیں جو کہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی لیڈر مسٹر برزنیف کے خاص آدمی ہیں ۶ فیٹ لمبے اینڈروپوف اپنی شقاوت قلبی کا ثبوت اس وقت اچھی طرح دے چکے ہیں جب ۱۹۵۶ء میں ہنگری میں بغاوت ہوئی تھی۔ وہ جاسوسی کے محکمے کے لئے بالکل موزوں ہیں، اس محکمے میں رحم دل لوگوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگرچہ روس میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جب بڑے پیمانے پر جلا وطن یا قتل کیا جاتا تھا۔ لیکن کے۔جی۔بی کا محکمہ روس میں اب بھی ایک مضبوط اور طاقتور محکمہ ہے اینڈروپوف کا بجٹ کتنا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس کے پاس تین لاکھ آدمیوں کی ایسی فوج ضرور موجود ہے جو روسی قیادت کا تحفظ اور ایک گروپ کے لئے دوسرے گروپ کی جاسوسی کرتی ہے۔ ہر جگہ اس محکمے کے آدمی نظر آئیں گے اور اس طرح کسی ادارے یا کسی شخص کی سرگرمیاں اس ادارے سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔

اس کے ۹ ہزار افسروں میں ۳½ ہزار غیر ممالک میں تعینات ہیں۔ امریکی حلقوں کی اطلاع تو یہ ہے کہ غیر ممالک میں روس کے جتنے افسر تعینات ہیں ان میں سے پچاس سے کچھ زیادہ فیصد کے۔جی۔بی، کے ایجنٹ ہیں۔ انکی سرگرمیاں بہت وسیع ہیں مثلاً وہ فوجی، سیاسی اور دوسری معلومات حاصل کرتے ہیں اور صنعتی تخریب کاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی ناکام۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں بیروت میں کے۔جی۔بی کے ایجنٹوں نے لبنانی فضائیہ کے ایک فرانسیسی ساخت کے مراج ۳۔ ۱۱۱ طیارے کو چرانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ایک لبنانی افسر کو ۲ لاکھ ڈالر (۴۰ لاکھ روپے) کی رقم اس بات کے لئے بطور رشوت پیش کی کہ وہ طیارے کو اڑا کر باکو میں لے جائیں لیکن افسر نے اس معاملے کی اطلاع اپنے سینئر افسر کو دیدی اور روسی ایجنٹ جو دو لاکھ ڈالر کا چیک بطور پیشگی ادا کرنے کے لئے آئے تھے موقع پر پکڑے گئے۔

روسی، مراج طیارے کو اس لئے اغوا کرنا چاہتے تھے تاکہ سوویت مگ طیاروں کے مقابلے میں اس کی افادیت اور طاقت کا اندازہ لگا سکیں۔

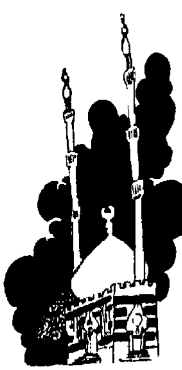
۱۹۷۰ء میں مغربی جرمنی میں ۶۸، روسی ایجنٹ پکڑے گئے، اس کے بعد بھی جرمنی گورنمنٹ کا اندازہ ہے کہ وہاں ۱۶ ہزار روسی جاسوس کام کر رہے ہیں۔

مغربی جرمنی میں جاسوسی سرگرمیاں جاری رکھنے کی کئی وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ تقسیم شدہ جرمنی کا حصہ ہے اور دوم دو لاکھ دس ہزار امریکی فوجوں کا اڈا ہے۔

مشرقی برلن کے ایک نواحی علاقے سے کبھی کبھی رات کو شارٹ ویو میں کوڈ الفاظ میں آواز سنائی دیتی ہے اور اسکا جواب جاسوس اپنے ٹرانسیٹر سے دیتے ہیں۔ سگریٹ کی تین ڈبیوں کے برابر والے ٹرانسیٹر سے بول بھی سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔

روس کے مقابلے میں امریکی محکمہ سراغرسانی (سی آئی اے) کے آدمیوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے، اور اس محکمے کا بجٹ تین ارب پچاس کروڑ ڈالر سالانہ کے قریب ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں سی۔آئی۔اے کے آدمی نہ ہوں۔

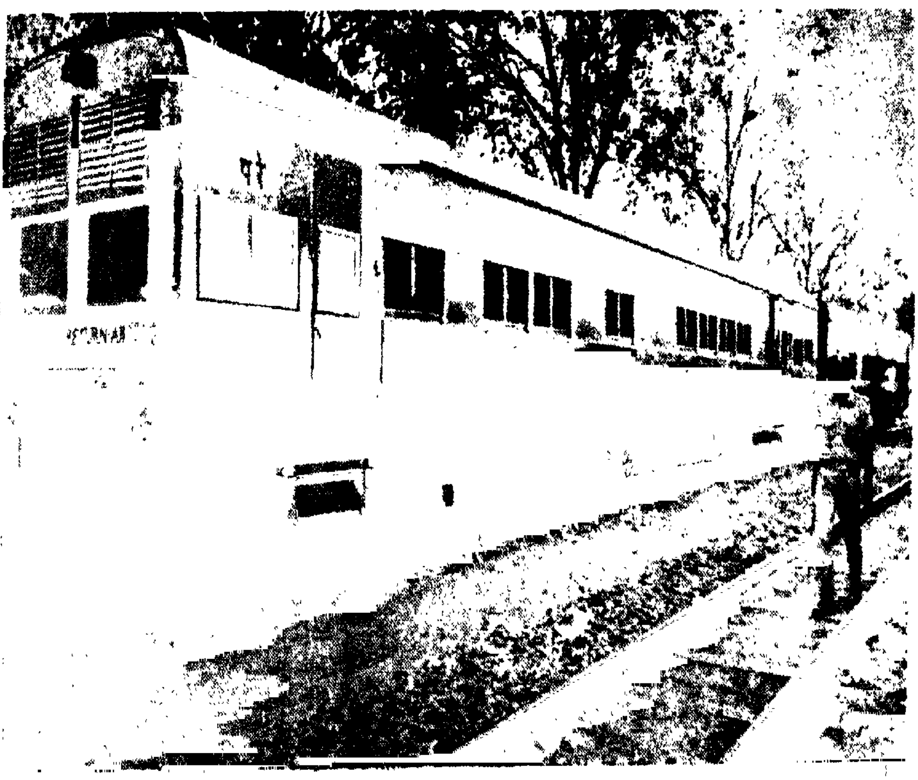
سی۔آئی۔اے کے یہ آدمی ہر طبقے کے لوگوں کو اپنے دام میں پھانستے ہیں اور انھیں بڑے بڑے لالچ دیتے ہیں۔ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں جاسوس نہ ہوں۔ جاسوسوں کا یہ جال ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ خاص کر بڑے ملکوں کا جو ایک ایک چپہ زمین کی پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ جاسوس ہر شعبۂ زندگی میں گھسے نظر آتے ہیں۔ دروغ بر گردن راوی، کہتے ہیں امریکی پنگ پانگ کی جو ٹیم پیکنگ گئی تھی، اس میں ۵۰ فیصدی سی۔آئی۔اے کے کھلاڑی شامل تھے۔







فلپائن کے صدر مارکوس کی بیگم شادی سے پہلے ایک معمولی ٹائپسٹ تھیں لیکن اب فلپائن کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز خاتون ہیں غالباً صدر مارکوس کے ریٹائر ہونے کے بعد مسز مارکوس ہی فلپائن کی صدر منتخب ہونگی تصویر میں مسز مارکوس صدر گری اور مسز گری کے ساتھ۔



پچھلے دنوں دہلی میں ایک بہت دلچسپ قصہ پیش آیا جب کہ ریلوے کے چیرمین مسٹر گنگولی نے ریل کے ایک ڈبے میں دھرنا دیدیا۔ مسٹر گنگولی دورے پر پونا جارہے تھے لیکن وزیر ریلوے کے حکم پر انکے ڈبے کو چلتی گاڑی سے علیحدہ کرکے دہلی میں لاکر لگایا گیا۔

واقعات نئی دہلی

دہلی میں دیوالی کے موقع پر درجنوں میلے لگتے ہیں۔ تال کٹورا گارڈن کا مینا بازار بہت مشہور ہے۔ یہاں بیچنے والی تمام لڑکیاں ہوتی ہیں، اس لیۓ قدرتی بات ہے کہ خریدنے والے سب مرد ہوتے ہیں۔

تصویر میں جُڑے ہوئے شیشوں کی دوکان کا ایک منظر ہے۔





ہمایوں رشید چودھری جو پاکستان ہائی کمیشن میں کونسلر اور چانسلری کے مہتمم تھے وہ بہت دشواری کے بعد ایمبسی سے باہر نکل آئے اور انھوں نے بنگلا دیش ہائی کمیشن میں پناہ لے لی۔

تصویر میں ہمایوں رشید، اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔



جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہٹو پہلے جاپانی شہنشاہ ہیں جو یورپ کے دورے پر گئے ہیں۔ جگہ جگہ ہیرو ہٹو کے خلاف مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔ امریکن ان پر الزام لگاتے ہیں کہ پرل ہاربر پر سیکڑوں لوگوں کے قاتل وہی تھے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں لاکھوں انسانوں کی موت کا الزام چچا سام کی پیشانی پر ہے۔





پین۔ٹی۔بوٹ (PAN-T-BOOT) نے اب پینٹ کی جگہ لے لی ہے۔ یہ عجیب و غریب پینٹ طرح طرح کے خوبصورت ڈیزائنوں میں آتی ہے اور جسم پر پوری طرح چپک جاتی ہے، یعنی اسکو پہننے کے بعد بھی آپ اپنے قدرتی لباس میں ہی رہتے ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پہننے کے بعد آپ کو جوتا پہننے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جوتا بھی اس کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔





ماؤزے تونگ کی موت کی تمام خبریں غلط ثابت ہوئیں پچھلے دنوں چیرمین ماؤ نے بہت گرم جوشی سے انتھوپیا کے
ہیل سلاسی کا استقبال کیا۔ ماؤ پہلے سے زیادہ صحت مند معلوم ہو رہے تھے۔



امن پائلٹ۔ یہ
امن پائلٹ سوانند سوا
وشنو۔ اپنے رنگ بر
چھوٹے سے پائیر جہاز
یہ دنیا بھر کے لوگوں کو
کا پیغام دیتے پھرتے
پچھلے دنوں انھوں
اپنے جہاز میں نہر سوئز پا
اور تمام علاقے پر پرچے
گرائیں، جن میں عرب
اسرائیل سے جنگ بند
کی درخواست کی گئی تھ

واقعات میں آپ ہر موضوع پر خط بھیج سکتے ہیں۔ تعریفی خطوط کی بجائے مختلف مسائل سے تعلق رکھنے والے خطوط کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ آپ کا صفحہ ہے اس لئے آپ بلا کسی جھجک کے اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں۔ خط لکھتے وقت ان باتوں کا خیال ضرور رکھئے :۔

۱۔ خط کاغذ کے ایک طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھنا چاہیے۔

۲۔ خط میں آخر میں اپنا پورا نام اور پتا صاف صاف لکھئے ورنہ خط شائع نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ خط میں گری ہوئی بازاری زبان استعمال نہ کیجئے۔ ہم آپ کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتے ہیں مگر غیر شائستہ خطوط شائع کرنا ہمارے لئے ممکن نہ ہوسکے گا۔

ادارہ

اعلان :۔ "ادارہ واقعات مختلف اوقات پر قارئین واقعات کی خدمت بہت سے مسائل رکھے گا جس پر قارئین کی رائے کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس مرتبہ کا مسئلہ ہے :۔

"کیا ہندوستانی مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت ہے؟"

آپ کی رائے زیادہ طویل نہیں ہونی چاہیے، ورنہ ہم اسے شائع کرنے سے قاصر رہیں گے۔"

آپ کے خط

محترمی جناب۔ آداب

میں واقعات کے ہر شمارے کا شوق سے مطالعہ کرتا رہتا ہوں در خاص طور پر "آپ کے خطوط" کا۔ آپ نے ایک لحاظ سے ان صفحات کو "فورم" بنا دیا ہے، جس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

میں بھی اس "فورم" میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے ذیل کے مراسلے کو شائع فرما کر ممنون کریں گے۔ بات کچھ کڑوی ہے مگر حقیقت کا ایک عکس ہے۔ مسٹر ہمایوں احمد صدیقی کے خط کو پڑھنے کے بعد اس مراسلے کو مرتب کرنے پر مجبور ہوگیا۔

"جناب شمیم احمد شمیم رکن پارلیمنٹ (کشمیر) نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جو ہند و پاک کے کسی بھی مسئلے پر پاکستان کی پالیسیوں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کو جائز قرار دیتا ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کا یہ وہی گروہ ہے جو پاکستانی حکمرانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بنگلا دیش میں فوج کی جانب سے غلط کردہ جنگ اور ظلم و ستم کو نہ صرف جائز بلکہ "مقدس جہاد" کی حد تک اسلامی طرز قرار دینے پر بضد ہے۔ اور یہ وہ گروہ ہے جو تقسیم کے بعد وطن کی محبت یا سیاسی نظریہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ مالی یا خاندانی مصلحتوں اور الجھنوں میں گرفتار ہو کر مجبوراً ہندوستان میں ٹھہر گیا ہے اور بنیادی طور پر تقسیم سے قبل کے پرانے فرسودہ انداز فکر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ان زبردست تبدیلیوں کو جو تقسیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی افق پر ہوئی ہیں سمجھنے اور اپنے خیال و عمل کو ان سے مطابقت دینے سے معذور ہے۔

میں اس گروہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان ناانصافیوں کی ابتدا کس طرف سے ہوئی اور آج ان ناانصافیوں کا ردِ عمل ان نام نہاد پاکبازوں اور ایمانداروں، مریض ذہنوں اور پتھر دلوں پر کچوکے لگاتا ہے تو جھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے پڑوسی ملک کو مورد الزام قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ صرف ان کی افلاس زدہ ذہنیت اور فرسودہ اندازِ فکر کی علامت ہے۔

یہ گروہ اور ان کے امام اپنے خود ساختہ فلسفے سے ایک عجیب دھندسا پھیلا رہے ہیں جس میں انھیں خود کوئی چہرہ صاف نظر نہیں آرہا ہے اور انکی شامت یہ ہے کہ اس دھندلکے کو روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ساد اس روشنی کو جو خود ان کے دل میں ہے محسوس کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہ "جہل مرکب" اس قدر راسخ ہوگیا ہے کہ بظاہر کوئی انسانی کوشش اسے دور نہیں کرسکتی۔

لیکن یہ دھند اور کہر چھٹ جائے گی۔ ایک نیا انسان آئے گا۔ ایک سورج جو ابھی مقید ہے افقِ زندگی پر نمودار ہوگا اور یہ نیا انسان جب سورج بن کر چمکے گا تو آج کے اندھیرے بھاگ بھاگ کر غاروں میں جا چھپیں گے اور چمگادڑیں جنکا آج راج ہے جھاڑیوں میں پناہ لیں گی۔ پھر عقاب اور شاہین جاگ اٹھیں گے۔ ٹیگور اور نذرل کے ترانوں سے فضا گونج اٹھے گی۔

آج بظاہر بنگلا دیش کے عوام کو شکست ہورہی ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حق ہمیشہ مغلوب ہونے کے بعد غالب آتا ہے۔"

نیازمند۔ ایم عزیز حسین۔ ایم ایس سی
عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد

واقعات نئی نسل۔

محترمی صدیقی صاحب! سلام و احترام

واقعات کا ہر شمارہ اپنی انفرادیت کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اردو صحافت میں آپ نے واقعات کا اجرا کر کے ایک اہم کام انجام دیا جو اردو کے دوسرے رسائل نہیں کر پائے، اور لوگ مجبوراً ان ہی کو خرید کر پڑھتے ہیں۔ لیکن اس طرح آپ نے واقعات کے ذریعے نئی نسل کے لئے بھی اُردو کی راہ ہموار کی ہے۔

تقریباً ایک سال سے برابر واقعات کا مطالعہ کر رہا ہوں سلیم عادل کا مضمون "ٹھنڈے شعلے" اپنی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ حضرت بہزاد لکھنوی کے قلم کا کیا کہنا، جو بھی لکھتے ہیں بہت خوب۔ شہزادی زیب النساء، ایشون سنکار بھی بہت خوب ہے۔ امید ہے کہ واقعات کی رفتار برابر بڑھتی رہے گی۔ آپکا اپنا۔ سلیم عمر لکھنؤ

بنگلادیش اور ہندوستانی مسلمان

مکرمی السلام علیکم

جناب ریاض الرحمان شیروانی کے مراسلے پر کمنٹری کا جواب حاضرِ خدمت ہے اشاعت کا کرم فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

"بنگلادیش اور ہندوستانی مسلمان پر لکھتے ہوئے ہمارے مراسلے پر عالیجناب ریاض الرحمان صاحب شیروانی، علی گڑھ نے جو اعتراضات فرمائے ہیں اسکا جواب دینا میرا اخلاقی فرض ہے۔ شیروانی صاحب کی نظر میں نام نہاد بنگلادیش بننے کی تمام تر ذمے داری مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جو انصاف کے نقطۂ نگاہ سے یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں متعدد وزارتیں بنیں اور بگڑیں جنکی تمام تر ذمے داری وہاں کے لیڈران پر عائد ہوتی ہے۔ جن میں ہمارے شیخ صاحب بھی گنے جاسکتے ہیں۔ آخر مجبوراً فوج کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ حالیہ الیکشن سے پیشتر جناب شیخ مجیب الرحمٰن اور مولانا بھاشانی صاحبان کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو منظم منصوبے کی قلعی خود بخود کھل جائے گی۔ کیا کوئی صاحب اقتدار اپنے ملک کے ٹکڑے کرنے کی اجازت دے سکتا ہے، جیساکہ چھ نکاتی پروگرام جناب شیخ مجیب الرحمان صاحب نے پیش کیا تھا جس میں ایک کروڑ ۵۸ لاکھ سے زائد مہاجرین کے تحفظ کا تذکرہ کہیں نہ تھا۔ میں مانتا ہوں کہ پاکستان کے حالیہ الیکشن میں جو عظیم کامیابی شیخ صاحب کو حاصل ہوئی تھی اس کی بنا پر فوجی حکومت کا فرض تھا کہ اقتدار انکے حوالے کر دیں۔ مگر جب یحییٰ خان برائے گفتگو جون ہی ڈھاکا پہونچے تو شیخ صاحب نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی کہ میں طاقت کے ذریعے اقتدار حاصل کرسکتا ہوں۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مہاجرین کے قتلِ عام کا بازار گرم کردیا گیا، خواہ اسباب جو کچھ بھی ہوں۔ مجبوراً فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ اس تباہی کی تمام تر ذمے داری ہر دو فریق پر عائد ہوتی ہے جیساکہ شیخ عبداللہ صاحب نے قبل الیکشن اظہار کیا تھا اور اسی کو مدِ نظر رکھکر الیکشن لڑنے کی خواہش ظاہر کی تھی کیا اسے ملک سے غداری کے نام سے پکارا جاسکتا ہے کہ آج مکتی فوج کو اتنا اسلحہ کہاں سے میسر آگیا جو روزانہ سیکڑوں تربیت یافتہ فوجیوں کو ہلاک کرتی پھر رہی ہے اور خود کبھی ہلاک نہیں ہوتی۔

دوسرے ایسے ہوائی اور بحری جہاز کہاں سے میسر آگئے جن کے سہارے آج وہ بحری اور ہوائی حملے کی دھمکی دیتی ہے۔ اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور کوئی تیسرا فریق ہے جو اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ جس کے بل پر آج وہ نازاں ہے۔

یہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے، اگر کسی تیسرے فریق نے اس میں ذرّہ برابر بھی مداخلت کی تو تیسری عالمی جنگ کی شکل میں یہ نمایاں ہوگا۔ اس میں مداخلت کی جرأت وہی حکومت کرسکتی ہے جسکا اسمیں ذاتی مفاد پنہاں ہو۔ اگر مغربی پاکستان کی حکومت قابلِ مذمت ہے تو عوامی لیگ کو بھی بخشا نہیں جاسکتا۔ اور یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک دونوں فریق گفتگو کے ذریعے طے کرنے کو تیار نہ ہوں۔ کیا حکومتِ بھارت کشمیر کے عوام یا لیڈران کو اسکی اجازت دے سکتی ہے کہ وہ خود مختاری کا اعلان کرکے اپنی الگ حکومت قائم کرلیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ شاید ہی کوئی بھارتی اسکو گوارا کرے۔ وہ مرجانا بہتر سمجھیں گے مگر یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ والسلام

(ڈاکٹر) محمد قاسم۔ محلہ کلس۔ بہرائچ۔

ظلم و بربریت کیخلاف آواز بلند کیجئے

محترمی۔ سلام و خلوص۔

ستمبر کا تازہ شمارہ نظروں سے گزرا، بہت پسند آیا۔۔۔۔ "ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ یہ مذاق کب تک چلتا رہے گا؟" خاص طور سے پسند آیا کیونکہ اس عنوان سے حکومت کو باخبر کیا گیا ہے کہ آج کے دور میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و تشدد کا برتاؤ ہو رہا ہے وہ حکومت کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ جب بھی کسی حکومت نے عوام کے ساتھ ظلم و بربریت کا سلوک کیا ہے وہ حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ اگر حقیقی معنوں میں اندرا گاندھی اپنی حکومت کو بچانا چاہتی ہیں اور ملک میں امن چین برقرار رکھنا چاہتی ہیں تو ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ شر پسندوں کی پالیسی کو اپنے ہی ہاتھوں سے کچل ڈالیں اور انکی شکل ایسی کردیں کہ آئندہ وہ کبھی اپنی منحوس شکل دنیا کو دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر وہ شر پسندوں کو رعایت اور چھوٹ دیتی رہیں تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہی لوگ انکی حکومت کے گرد منڈلانا شروع کردیں گے اور آہستہ آہستہ انکی حکومت کو کمزور اور کھوکھلا بناتے چلے جائیں گے۔ اور پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد حکومت کی کیا شکل ہوگی۔ بھیونڈی میں، مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے اس سے مہاراشٹر کی حکومت کو بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ عدالتی کارروائی کرکے حقیقت کو سامنے لانا چاہئے۔ اور بے جا طور پر وہاں کے لوگوں کو جو جانی اور مالی نقصان ہو رہا ہے اسے حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آخر میں مدیر واقعات سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کرتے رہیں تاکہ ہندوستان کا اقلیتی فرقہ حقیقت سے روشناس ہوتا رہے اگر وہ مسلسل اپنی اس خدمت کو انجام دیتے رہے تو قوم اور ملک پر بہت بڑا احسان ہوگا جو رہتی دنیا تک قائم رہیگا۔

اقبال عالمی ۔۔۔۔ رانچی



... کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹرس سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے



گیارسنگ



جمن خاں

گیارسنگ ہر اس بات کو کہتے ہیں جس کو عقل قبول نہ کرے۔ چنانچہ غلب۔ آپ سمجھتے ہیں ایک گیارسنگ کو کر الگ نہیں ہیں ازل سے آج تک ہر وہ بات گیارسنگ سمجھی گئی ہے جسے عقل نے قبول نہیں کیا۔ بجلی کا تخیل گیارسنگ تھا کہ ایک بٹن دبایا اور چار جانب روشنی پھیل جائے۔ ناممکن، خلاف عقل۔ لیکن جب یہ گیارسنگ سامنے آگئی، تو حقیقت بن گئی۔ ٹیلیفون کو لیجئے، ٹیلی ویژن کو لیجئے، سب گیارسنگ ہی تھے ابتدا میں اور اب کیا ہے۔ حقیقت، ناقابلِ انکار حقیقت۔ تو حضرات یہ بھی ایسی ہی ایک گیارسنگ ہے پڑھ لیجئے اور کہہ دیکھئے

جمن خاں

مجھے نہیں معلوم میرے ماں باپ کون تھے، کیا تھے۔ مجھے اپنا بچپن کچھ صحیح طور پر یاد نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں محض ایک اصطبل میں رہا کرتا تھا اور ایک بڈھا دونوں وقت مجھے روٹی کھلا دیا کرتا تھا جسکو میں نانا نانا کہا کرتا تھا وہ مجھے جمن کہہ کر بلایا کرتا یوں مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام جمن ہے۔ میں دس برس کی عمر تک اصطبل کے قریب بیٹھا ہوا زیادہ تر خاموش سوچا کرتا تھا۔ میں کیا سوچا کرتا تھا اب یہ مجھے قطعاً یاد نہیں ہے۔ صرف اتنا تو یاد ہے کہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں بہت کم شریک ہوتا تھا۔ اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ میری تندرستی حیرت انگیز تھی۔ میں دس برس کے سن میں ۱۴ برس کا ٹانٹھا اور مضبوط لڑکا نظر آتا تھا۔

ایک دن جب میں سو کر اٹھا تو میں نے بوڑھے کو مردہ دیکھا اصطبل کے لوگوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی اور مجھے زمیندار صاحب کے مکان پر پہنچا دیا جہاں میں زنان خانے میں کام پر لگا دیا گیا۔ مجھے اپنی زندگی کے اس انقلاب پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اصطبل کی زندگی میں بے کار رہتا تھا یہاں جھاڑو برتن اور خدمتگاری کے فرائض میرے ذمے آگئے۔ مجھے حیرت ہے کہ میں اور نوکروں کے برخلاف ہر کام کو دل لگا کر کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے چودھرائن کی گالیاں مجھے کبھی نصیب نہ ہوئیں چودھرائن صاحبہ کی زبان سے ہر شخص نالاں تھا، بجز میرے مجھ پر انکی زبان کبھی کھلی ہی نہیں۔ اور کھلتی کیوں۔ بے تعداد برتن جن کو دو ملازم مانجھتے مانجھتے تھک جاتے میں منٹوں میں مانجھ دیتا تھا۔ زنان خانے کی جھاڑو جسکو نوکر عذاب کہتے تھے میرے لئے کوئی دشوار شے نہ تھی۔

چودھری صاحب کے دو صاحبزادے گھر پر ہی تعلیم پاتے تھے جن کو پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر صاحب حویلی میں ہی مقیم تھے یہ دونوں لڑکے میرے ہی ہم عمر تھے اور ان دونوں کے پڑھنے کے وقت میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں اسی کمرے میں بیٹھا رہوں تاکہ پڑھنے کے وقت انکی ضروریات پوری کر دیا کروں۔ میں ماسٹر صاحب کو تعلیم دیتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ یہ دونوں لڑکے ابھی تک اُردو کا پہلا قاعدہ اور سَو تک گنتی ہی سیکھ رہے تھے۔ پڑھائی لکھائی سے انکو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہر نوع صبح و شام ان کی پڑھائی ضرور ہوتی تھی۔

ان بڑے اور چھوٹا بھیا کے ساتھ ڈیوٹی لگنے کے بعد میرے ہی دن جب میں نے ماسٹر صاحب کو الف سے ے تک کا سبق فر فر سنا دیا تو وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے سلیٹ پر لکھ کر بار بار مجھ سے حروف پوچھوائے اور میں نے پہچان دیا۔ یہی نہیں جب میں نے ان حروف کو سلیٹ پر لکھ کر بھی دکھایا تو انکو حیرت ہوئی۔ انھوں نے ایک ردی کاپی اور پنسل مجھے دیکر پڑھانا شروع کر دیا۔

چھوٹے اور بڑے بھیا تو وقت گزاری کیا کرتے تھے لیکن پڑھ میں تھا۔ مجھے چار ماہ میں اردو پڑھنے اور لکھنے پر حیرت ہوتی ہے اور یہی نہیں گنتی اور حساب بھی سیکھ گیا تھا۔ دس تک پہاڑے مجھے ازبر ہو گئے تھے میں سادی جمع ضرب اور تقسیم بھی کرنے لگا تھا۔ یہ ماسٹر صاحب نیک آدمی تھے انھوں نے مجھے پرانی کتابیں خود لا کر دیں اور میں پڑھنے لگا۔ میرا خط اردو اور انگریزی دونوں میں قدرتاً بے حد پاکیزہ ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ پختہ بھی باوجود اس کے کہ میں صرف اُن اوقات میں پڑھتا تھا جب دونوں بھیا پڑھتے تھے۔ لیکن میں تین سال کے عرصے میں اسکول لیونگ تک کی تعلیم حاصل کر گیا۔ تاریخ جغرافیہ آرٹ الجبرا، حساب اور انگریزی میں برق ہو گیا جبکہ ان تین برسوں میں دونوں صاحبزادے اُردو کی چوتھی کتاب تک پہونچے اور حساب میں مشکل روپے آنے پائی کی ضرب اور تقسیم تک پہونچے۔ ان کا عالم یہ تھا کہ ماسٹر صاحب کے سامنے کتابیں کھولے بیٹھے رہتے اور ایک گھنٹہ پورا ہونے کا انتظار کرتے۔ ماسٹر صاحب بھی ان حالات میں وقت گزاری پر مجبور تھے نہ کچھ کر سکتے تھے۔ دونوں صاحبزادوں کو کوئی پرواہ نہیں۔ ماسٹر صاحب کی تمام توجہ کا مرکز میں تھا۔ وہ مجھے

انھوں نے میرا داخلہ میری لاعلمی میں پرائیویٹ حیثیت سے اسکول لیونگ، کلاس میں خود اپنے پاس سے فیس دیکر کرا دیا۔ جب امتحان کی تاریخیں قریب آئیں تو ماسٹر صاحب نے مطلع کیا۔ امتحان شہر میں ہونا تھا اور شہر گاؤں سے ۱۵ میل کے فاصلے پر تھا۔ نہ جانے ماسٹر صاحب نے کیونکر ایک ہفتے کی چھٹی چودھری صاحب سے دلوا دی۔

چھٹی ملنے کی غالباً یہ وجہ تھی کہ میں نے ۴ برس میں ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی تھی۔ چودھرائن صاحبہ مجھ سے بے حد خوش تھیں۔

شہر پہونچ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، وہاں کے مقامات بازار اور چہل پہل دیکھ کر جو میرے تصورات سے بھی زیادہ حسین نکلیں میں نے ایک ہفتے میں آٹھوں پرچوں کا امتحان دے دیا اور نویں دن ماسٹر صاحب کے ساتھ واپس آگیا واپسی پر میں نے دیکھا کہ گھر کا سارا کام میری عدم موجودگی میں چوپٹ تھا۔ میں نے دو ہی دن میں تمام کام پھر سے درست کر دیا۔ یہ لکھنا میں بھول گیا کہ باوجود پندرہ سال کی عمر کے میں مکمل جوان نظر آنے لگا تھا میرے ہاتھ پیر چوڑے چکلے نکل آئے تھے میری مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ میرے برخلاف چودھری صاحب کے دونوں لڑکے ابھی تک لڑکے ہی نظر آتے تھے۔ کمزور ناتوان اور مرجھلے۔ واپسی کے ۱۵ دن بعد ہی میرا زنان خانے میں آنا جانا بند کر دیا گیا۔ میں جوان کھا گیا باوجود چودھرائن کی ضد کے چودھری صاحب نے اب مجھ سے پردہ کرانا ہی مناسب سمجھا۔ میں باہر آگیا اور بیرونی کام کرنے لگا۔ باہر بھی میری قدر و منزلت بڑھ گئی۔ سارے پلنے خدمتگاروں میں میں سب سے زیادہ محنتی ثابت ہوا۔

دو ماہ بخیر و خوبی گزر گئے میں اب بھی ماسٹر صاحب سے برابر پڑھتا رہا۔ وہ اب مجھے انگریزی کی غیر نصابی کتابیں دینے لگے۔ صاحبزادوں کی تعلیم کے وقت مجھے اپنی ڈیوٹی پھر بھی دینا پڑتی تھی۔

دو ماہ گزرنے کے بعد یونیورسٹی سے میرا نتیجہ چودھری صاحب کے پتے پر ڈاکیا لے کر آگیا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے امتحان کے پرچوں میں اپنا صحیح پتا لکھ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میری تباہی کا باعث بن جائے گا۔ وہ خط چودھرانی صاحب کے ہاتھ میں پہونچا۔ چودھری صاحب چونکہ بلوا کر خط پڑھوایا گیا تو چودھری صاحب کا غصہ ایکدم آسمان پر پہونچ گیا۔ میں یونیورسٹی بھر میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تھا چودھری صاحب نے نہایت غصے میں مجھے بلایا اور کہا۔

"کیوں بے جمن اب تیری یہ مجال ہوگئی کہ تو امتحان پاس کرے اور بالو بنے۔ حرامزادے تو اپنی اوقات بھول گیا"!

میں نے کہا:"حضور یہ تو کوئی ناراضگی کی بات نہیں ہے آپ کے ٹکڑے کھا کر اگر میں کوئی عزت حاصل کر لوں تو اس میں حرج کیا ہے"۔

میرے خوشامدانہ جملوں نے بھی ان پر کوئی اثر نہیں کیا اور وہ گرج کر بولے۔

"حرامخور تو نے کتابیں کہاں سے پائیں تجھے پڑھایا کس نے؟ اور تیری فیس کس نے بھری؟"۔

میں کیا کہتا۔ مجبوراً میں نے کہا۔

میں نے ماسٹر صاحب سے پڑھا ہے۔ کتابیں بھی انھوں نے ہی مجھے دی ہیں اور فیس بھی انھوں نے اپنے پاس سے بھری ہوگی مجھے نہیں معلوم"۔

وہ بولے۔

جبھی میرے لڑکے ابھی تک نہیں پڑھ پائے۔ وہ تجھے پڑھاتے رہے، میرے لڑکوں پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ بھی حرامخور نکلے اور تو تو سب سے زیادہ حرامخور نکلا۔ تو میرے لڑکوں سے بڑھ کر بننا چاہتا ہے۔ کہاں ہیں وہ ماسٹر صاحب بلاؤ۔

اتفاق سے ماسٹر صاحب ایک ماہ کی چھٹی پر گئے ہوئے تھے ان کے نہ ملنے پر چودھری صاحب نے کہا۔

"تمہاری سزا یہ ہے کہ فوراً یہ گاؤں چھوڑ دو اور نکل جاؤ تم کو ایک پیسا بھی نہیں ملے گا اور نہ کوئی سامان۔ جاؤ اور بالو گیری کا کمال دکھاؤ۔ نکلو۔ کوئی ہے!!"

دو خدمت گار آگے بڑھے جن کو دیکھ کر چودھری صاحب نے غصہ سے کہا:۔

"اس نمک حرام کو اسٹیشن لے جا کر بلا ٹکٹ ریل میں بٹھا دو خبردار بھاگنے نہ پائے اور خبردار اس کے ساتھ کوئی سامان نہ جانے پائے نہ بستر، نہ کپڑے، اور ہاں اسکی تلاشی لے کر اگر کوئی پیسا اسکی جیب میں ہو تو چھین لو"۔

میری تلاشی لی گئی۔ میرے پاس تھا کیا۔ تنخواہ تو ملتی نہیں تھی، چوری میں کرتا نہ تھا۔

پہونچے۔ اتفاقاً گاڑی کا وقت بھی تھا۔ انھوں نے ایک ڈبے میں مجھے بٹھا دیا۔ ان میں سے ایک نے دو روپے مجھے دیتے ہوئے کہا:۔

بیٹا اس کو رکھ لو۔ کام آئیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں بے خطا نکالا گیا ہے۔

میں نے بادل ناخواستہ وہ دو روپے رکھ لئے۔ ٹرین چل پڑی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ریل کہاں جا رہی ہے سب سے زیادہ پریشانی بلا ٹکٹ ہونے کی تھی گاڑی غالباً ڈاک تھی کئی کئی اسٹیشن چھوڑ کر رک رہی تھی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ صبح جب گاڑی ایک بڑے جنکشن پر رکی تو ایک داڑھی والے ٹی ٹی آئی ڈبے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی اور مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"باہر آجاؤ۔ تم بلا ٹکٹ معلوم ہوتے ہو"۔

میں باہر آگیا۔ میرے اترتے ہی گاڑی نے وسل دی اور روانہ ہوگئی وہ مجھے لئے ہوئے گیٹ پر آئے اور بولے۔

"باہر نکل جاؤ صورت سے شریف معلوم ہوتے ہو پولیس میں دے کر کیا کروں"۔

میں باہر نکل گیا اسٹیشن غالباً شہر کے اندر ہی تھا باہر نکلتے ہی مجھے بھرا پرا بازار نظر پڑا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں ایک ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ جا بجا میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں ایک خالی میز پر بیٹھ گیا اور میں نے اپنی جیب کے پیش نظر ایک کپ چائے اور دو بسکٹوں کا آرڈر دیا۔

یکایک سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے تین آدمی لپکتے ہوئے میرے پاس آئے اور برابر کی کرسیوں پر بیٹھ گئے یہ تینوں خوش پوشاک اور درمیانے قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے دو معمر اور ایک نوجوان تھا۔ نوجوان نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"ارے بھیا جمیل تم یہاں کہاں۔ کب آئے"؟

میں نے حیرت سے کہا۔

"جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام جمیل نہیں جمن ہے"۔

انھوں نے کہا:"یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ تم سلطان بھیا کے بیٹے ہو میں پہچان گیا ہوں۔ آخر ایسی

بھی کیا دشمنی ہے کہ سلطان بھیا نے تم کو یہاں بھیجتے ہوئے عزیزوں کا پتا نہیں دیا۔"

میں نے کہا۔ "جناب والا میں بخدا کہتا ہوں کہ آپ غلط فہمی میں ہیں۔ میں سلطان صاحب سے بھی ناواقف ہوں۔ آپ یقین کیجیے۔"

وہ بولے: "تم لاکھ جھوٹی قسمیں کھاؤ مجھے یقین نہیں آسکتا۔ چلو چلو گھر چلو۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ تم یہاں آؤ اور عزیزوں میں نہ ٹھہرو۔"

ان دو معمر صاحبان نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں حیران رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں خاموش رہا۔ چائے آتے ہی میں نے چائے پینا شروع کردی۔ ان صاحبان کی بھی تواضع کی لیکن وہ چائے پی چکے تھے۔ چائے کا بل اس نوجوان نے بہ اصرار خود ادا کیا اور مجھے زبردستی ساتھ لے کر ایک تانگے پر بیٹھ گیا۔ دونوں معمر صاحبان بھی ہمراہ رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے مگر تن بہ تقدیر چلتا رہا۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ تانگا تقریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد کچھ گلیوں میں مڑا اور ایک گلی کے آخر میں ایک مکان کے پاس ٹھہر گیا۔ یہ مکان بے حد پرانے قسم کا تھا۔ غالباً شاہی زمانے کی یادگار تھا۔ بڑا سا دروازہ کھلتے ہی اندر ایک چھوٹا سا احاطہ نظر آیا جس کے جھاڑ جھنکاڑ صاف بتا رہے تھے کہ مدتوں سے یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ اسی جھاڑ جھنکاڑ میں اس مکان کا دروازہ نظر پڑا جس کی سیڑھیاں پتھر کی تھیں اور دروازے میں زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ میں حیران حیران یہ نظارہ کرتا رہا۔ دنیا کا تجربہ نہ ہونے پر بھی مجھے کچھ پراسراریت نظر آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے واسطے قطعی اجنبی ہوں۔ یہ کیوں مجھ سے زبردستی شناسائی ظاہر کر رہے ہیں۔ مجھے کیوں لائے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آرہا تھا کہ میرا نقصان کیا ہے۔ میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میرا مقصد حیات صرف پیٹ پالنا اور کہیں رہ پڑنا ہے۔ میں جسم کا توانا اور بے حد مضبوط تھا۔ باوجود عمر ۱۵ سال ہونے کے میں ۱۸۔ ۱۹ سال کا کڑیل جوان لگتا تھا۔ خوف اور ڈر سے قطعی ناآشنا تھا۔ تنہائی، کم آمیزی اور خاموش طبعی کے باعث مجھ میں ایک قوت موجود تھی جس کا نام اطمینان تھا۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نوجوان نے دروازے کا قفل کھولا۔ کچھ دیر اندر کی بند ہوا کے نکلنے کا انتظار کیا اور پھر مجھے اندر لے کر داخل ہوا۔ یہ ایک ڈیوڑھی تھی جس میں بند ہوا کے باعث حبس کی کیفیت تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر مجھے ایک بہت بڑا صحن نظر پڑا جس کے چار جانب دالان در دالان تھے۔ سامنے کی طرف دالان کے بعد ایک بڑا کمرہ تھا۔ وہ کمرہ مقفل نہیں تھا صرف دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ وہ کمرہ گھر اندر سے کافی سجا سجایا تھا، لیکن تمام سجاوٹ پرانے قسم کی تھی۔ ایک طرف ایک مسہری بچھی ہوئی تھی جس میں قیمتی قسم کا قالین بچھا ہوا تھا۔ چھ عدد پتلے پتلے تکیے سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ اسی مسہری سے ملا ہوا تختوں کا ایک بڑا چوکا تھا جس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ صدر میں ایک زرنگار مسند تھی اور ایک زرنگار گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ دیواروں پر پرانے قسم کے دیواری لیمپ آویزاں تھے۔ اس نوجوان اور ان معمر آدمیوں نے ایک دستی جھاڑو لے کر تختوں کا چوکا اور مسہری جھاڑی۔ محض گرد تھی۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہا۔

بھیا جمیل یہاں آرام سے بیٹھو اور جب تک جی چاہے قیام کرو۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے، میں ابھی تمہارے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔

میں نے کہا۔

"جناب والا۔ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، میرا نام جمیل نہیں جمن ہے۔ میں ایک غریب لڑکا ہوں اور ملازمت کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

وہ بولا: "اجی اب بے وقوف بنانا چھوڑو۔ میں تم کو پہچان گیا ہوں۔ تم کو بہر نوع یہاں ٹھہرنا ہے خواہ تم جمیل ہو یا نہ ہو۔"

میں خاموش ہو رہا۔ وہ دونوں معمر آدمی میرے پاس ہی بیٹھے رہے، وہ نوجوان چلا گیا، جس کا نام بعد میں مجھے سلیم معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر میں سلیم کھانا لے کر پلٹا۔ ایک سینی میں سالن۔ دال۔ چاول اور کھیر تھی۔ میں رات سے بھوکا تھا۔ میں نے ان تینوں کے ساتھ خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد جب میں نے پھر سلیم کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تو وہ بولا:۔

"اس مسئلے پر میں کچھ نہ سنوں گا۔ تم میرے قریبی عزیز ہو اور جب تک تم کو ملازمت نہیں مل جاتی تم کو یہیں قیام کرنا ہوگا۔ میں جو کچھ دال دلیا ہوگا پیش کر دیا کروں گا اب سو جاؤ۔ دوپہر ہو چکی ہے، موسم گرم ہو گیا ہے اور لو چلنا شروع ہو گئی ہے۔"

میں چار و ناچار قسمت پر شاکر ہو کر خاموش ہو گیا اور اسی مسہری پر لیٹتے ہی سو گیا۔ میری آنکھ قریب ۵ بجے شام کو کھلی۔ ان دو معمر آدمیوں میں سے مجھے ایک آدمی تختوں پر سوتا ہوا ملا۔ دوسرا غالباً میرے سونے کے بعد چلا گیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مجھے تنہا دیکھ کر بولا:۔

"کیا دُلّے میاں چلے گئے"

میں نے کہا:۔

"اگر آپ کی مراد دوسرے صاحب سے ہے تو وہ کہیں نظر نہیں آرہے ہیں غالباً چلے گئے"

وہ صاحب یہ سن کر ایکدم سے اٹھ بیٹھے اور بولے:

"یہ اچھا ہوا کہ دُلّے میاں چلے گئے۔ میں صبح سے اس کوشش میں تھا کہ کسی صورت سے تنہائی ملے تو میں تم کو حالات سے باخبر کروں۔ تم بڑی جان جوکھم میں پھنسنے والے ہو جس طرح بھی ممکن ہو یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

میں نے کہا: "اس کا اندازہ تو مجھ کو بھی ہے کہ ایک عجیب غلط فہمی کی بنا پر میں یہاں روکا گیا ہوں لیکن کسی مصیبت کا اندازہ مجھے واقعی نہیں ہے۔"

وہ بولے: "میاں جمن! غلط فہمی کوئی نہیں ہے، تم کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے، تم سے زبردستی کی ملاقات اور زبردستی کی عزیز داری کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ ان کا اس میں ایک بڑا مقصد ہے۔"

میں نے کہا: "اگر زحمت نہ ہو تو بیان کیجیے۔"

وہ بولے:۔ "ابھی وقت ہے سات بجے شام سے پہلے سلیم اور دُلّے میاں پلٹیں گے نہیں، وہ لوگ لڑکی لینے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ مجھ سے ان کو یہ امید ہی نہیں کہ میں تم کو خبردار کر دوں گا۔ اس لئے مجھے تمہاری نگرانی کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ میں پھر تم سے کہتا ہوں ابھی وقت ہے تم بھاگ کر اپنی جان بچا لو ورنہ بڑی مصیبت کا شکار ہو جاؤ گے۔

میں نے کہا:۔

"بھاگ جاؤں۔ کہاں بھاگ جاؤں۔؟ میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے مجھے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھے پورا بتا دیں۔ مجھے جانا تو ہے ہی، اگر واقعی کوئی مصیبت

بنے تو میں یقینی چلا جاؤں گا۔"
س شخص کے اصرار میں بھی کوئی چھپا ہوا مقصد
رہا تھا۔
رلا :" میاں اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو
پے مجھ سے لو میں ابھی دیے دیتا ہوں، تم کہیں
تی ۶ ½ بجے ایک گاڑی نیلم نگر کو جائے گی اس پر
میں بہانہ کر دوں گا کہ میں پاخانہ کرنے گیا ہوا تھا
چلیے"۔

س کی یہ بات اور بھی تشکوک نظر آئی، میں نے کہا۔
کرم پورا واقعہ بیان کیجئے ابھی تو ساڑھے چھ بجنے میں
وقت ہے"۔

بولے :" معاملہ یوں ہے کہ یہ حویلی ڈنے میاں کی ہے
ان کے بھتیجے ہو، ڈنے میاں کے علاوہ اس حویلی کے
ھوڑی سی جاگیر بھی ہے۔ یہ حویلی ڈنے میاں کے سگڑ دادا
شاہی زمانے میں اس قصبے میں جو کبھی شاہی قلعہ تھا
قلعدار تھے اور بے حد ظالم و جابر آدمی تھے۔ انھوں
آدمیوں کو اسی حویلی کے ایک تہہ خانے میں قتل
ان کا ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ اس لڑکی پر اس
ایک نامی گرامی پہلوان عاشق ہو گیا اس نے جب
صاحب کی لڑکی کے لیے پیغام بھیجا تو وہ آگ
گئے"۔

میں نے پوچھا۔" پھر کیا ہوا ؟"
بولے :" پھر کیا ہوا۔ قلعہ دار صاحب اس پہلوان
رہ گئے اس لیے کہ اس کے مقابلے میں کوئی بہادر اور
ری ان کی ساری فوج میں نہ تھا۔ اسی دھونس سے
ھوں نے اس کا پیغام قبول کر لیا۔ لیکن یہ ان کی چال تھی
رات سے کر اسی حویلی میں آیا۔ نکاح سے پہلے باراتیوں
ربت پلایا گیا اس میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملی ہوئی
ا کو پیتے ہی پہلوان اور اس کے باراتی بے ہوش ہو گئے
ہی کے عالم میں ان سب کو قید کر لیا گیا اور ان کے
ہی لڑکی کا نکاح ایک دوسرے سردار سے کر دیا گیا
سالار تھا"۔

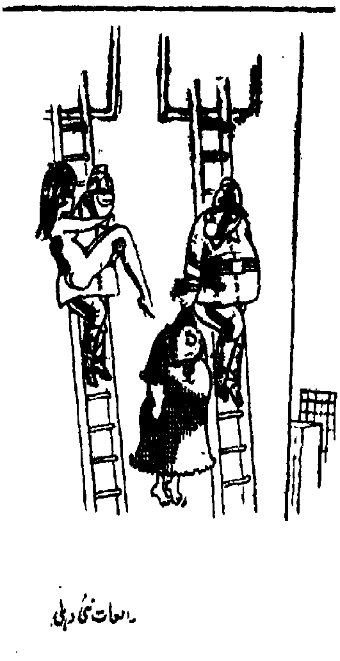
نے کہا :- پھر کیا ہوا۔
ہ بولا :- پہلوان اور باراتی قید کی حالت میں نکاح کے
نظر کو دیکھتے رہے۔ نکاح کے بعد ایک ایک باراتی اس

پہلوان کے سامنے تہہ خانے میں قتل کیا گیا۔ اس پہلوان کا نمبر
آخری تھا۔ قتل ہونے سے پہلے پہلوان نے کہا۔
" اپنے قتل ہونے کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے قلعہ دار صاحب
لیکن یہ یاد رکھئے کہ میرے مرنے کے بعد میرا بھوت آپ کو
آپ کے بعد آپ کی اولاد، اور اولاد در اولاد سے انتقام لیتا
رہے گا۔ آپ کی اس لڑکی اور اس کے بعد آپکی اولاد میں
جب کسی لڑکی کی شادی ہوگی تو اس کا شوہر میرے انتقام کا
شکار ہوتا رہے گا"۔

قلعہ دار صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔" اگر میری اولاد
میں ہونے والی لڑکی کی شادی نہ کی جائے تو ۔۔؟"
وہ بولا :" ۱۵ سال کی عمر ہوتے ہی اگر لڑکی کی شادی نہ کی گئی
تو وہ لڑکی اندھی ہو جائے گی اور آپ کے خاندان پر ایسی بلائیں
نازل ہوں گی کہ آپ کی روح قبر میں آرام نہ پائے گی"۔
میں نے کہا :-
" عجیب بات ہے"!
وہ بولے عجیب سے عجیب تر۔ قلعہ دار صاحب نے اس کی
اس بات کو بکواس سے زیادہ نہ سمجھا اور اس کو قتل کرا دیا۔ اسی
رات اس پہلوان کے بھوت کی بات سچ نظر آئی۔
وہ سپہ سالار جس کی شادی ہوئی تھی صبح کو دلہن کے پہلو
میں مردہ پایا گیا اور سب سے زیادہ حیرت خیز بات یہ دیکھی گئی کہ
اس سپہ سالار کے تمام بال سفید ہو گئے تھے اور باوجود اس کی
نوعمری کے اس کی مونچھیں اور داڑھی بھی نمایاں نظر آئیں جو
بالکل سفید تھیں"۔
میں نے حیرت سے کہا :-
" لاش کے داڑھی اور مونچھیں نکل آئیں اور کل بال سفید"!
وہ بولا :- ہاں بھیا۔ اور اس دن سے یہ واقعہ آج تک
ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قلعہ دار کی بیٹی تا عمر بیوہ بیٹھی رہی۔ قلعہ دار
کے بعد اس کا بیٹا قلعہ دار ہوا، اس کے بھی دو اولادیں ہوئیں ایک
لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی پندرھواں سال لگتے ہی مکمل عورت
ہو گئی اور جب ۱۵ سال کی عمر میں اس کی شادی کی گئی تو اس
کے شوہر کا بھی وہی حال ہوا اور قلعہ داری بھی شاہی حکم سے
چھن گئی محض جاگیر داری رہ گئی"۔
میں نے کہا۔
" یعنی وہ بھی پہلی رات ہی مر گیا، اس کے بال بھی سفید
ہو گئے۔ اور قلعہ داری بھی جاتی رہی"؟

وہ بولا۔" ہاں اس کے بعد ڈنے میاں کے دادا جاگیر دار
ہوئے۔ ان کے بھی دو اولادیں ہوئیں۔ ایک ڈنے میاں کے باپ
اور پھوپھی۔ ڈنے میاں کے باپ تاکر میاں نے اپنی لڑکی کی شادی
ہی نہ کی۔ ۱۵ سال کی عمر میں وہ بھی جوان ہو گئی تھی۔ پندرہ سال
ہوتے ہی لڑکی ایک دم نابینا ہو گئی اور یہی نہیں بلکہ اس پر
فالج کا اثر بھی ہو گیا"۔
میں نے حیرت سے کہا۔" ارے"!
وہ بولے۔" ہاں بھیا۔ یہی نہیں بلکہ جاگیر پر بھی تباہی آ گئی
ساری فصلیں ٹڈیوں کی نذر ہو گئیں۔ لگان کی ادائیگی، اور
اخراجاتِ خانہ کے سلسلے میں جاگیر کا بڑا حصہ بکا"۔
میں نے پوچھا۔" پھر کیا ہوا"۔
انھوں نے کہا۔ اس دن سے اس گھر پر آفتوں کی بھرمار
شروع ہو گئی مجبوراً جاگیر کے حصے بکنا شروع ہو گئے
یہاں تک کہ ڈنے میاں کا دور آ گیا۔ ڈنے میاں کے والد نے
ایک نکاح خفیہ کر لیا تھا جس سے سلیم کے والد ہوئے
تھے لیکن ان کو خاندان میں کسی نے قبول نہیں کیا، وہ غربت
غربت ہی کے عالم میں سلیم کو چھوڑ کر مر گئے۔ ڈنے میاں نے
سلیم کو لے کر پال لیا"۔

(اس کے بعد کی داستان آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)



مشرقی بنگال

تاریخ کے آئینے میں

جنید عالم مظفر پوری

آج سارا مشرقی بنگال خود مختاری کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اب تک لاکھوں لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ لیکن ان لاکھوں سرفروشوں کی قربانیوں اور ان گنت مصائب کے باوجود بھی مشرقی بنگال کے عوام ڈکٹیٹر حکومت سے نبرد آزما ہیں۔

مشرقی بنگال میں بغاوت کی یہ آگ کوئی نئی نہیں ہے صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں بھی شدید مظاہرے ہوئے تھے۔ سرکاری احکامات کی خلاف ورزیاں کی گئی تھیں۔ عمارتوں کو خاکستر کیا گیا تھا۔ ریلوے لائنوں کو اکھاڑا گیا تھا، لیکن کیا صدر ایوب خاں نے بھی یحییٰ خاں کی طرح کوئی وحشیانہ قدم اٹھایا تھا؟ ان کے ہاتھ میں بھی یحییٰ خاں کی طرح فوجی قوت تھی۔ وہ بھی اپنے مخالفین کو فوجی قوت سے سرنگوں کر سکتے تھے لیکن انھوں نے تدبر سے کام لیتے ہوئے اپنے مخالف پاکستانیوں کو فوجی قوت سے نہیں دبایا بلکہ خاموشی سے صدارت کا منصب یحییٰ خاں کو تفویض کر کے عہدے سے دستبرداری اختیار کر لی۔

اس کے برخلاف صدر یحییٰ خاں نے مشرقی بنگال کی سول نافرمانی کی تحریک سے برانگیختہ ہو کر اور حسبِ مرضی معاملات طے نہ ہونے کی بنا پر ۲۵ مارچ سے اپنے ملک کے ایک حصے میں ایسا خونی ڈراما کھیلنا شروع کیا جس میں اب تک بے شمار لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور ۹۰ لاکھ سے زیادہ لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہیں۔

زیر نظر مضمون میں آج میں یحییٰ خان کے ظلموں کی داستان سنانے نہیں جا رہا ہوں بلکہ میں اس مضمون میں مشرقی بنگال کی

واقعات نئی دہلی

قدیم مسلم تاریخ پر روشنی ڈالنے کی سعی کروں گا تاکہ قارئین یہ جان لیں کہ ابتدا میں مسلمانوں نے کس زمانے میں اس پر قبضہ کیا تھا۔ تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محمد بن بختیار خلجی کے حملے سے قبل تقریباً ۱۶ ہندو راجاؤں نے لگ بھگ ساڑھے چار ہزار سال تک مشرقی بنگال پر حکمرانی کی ہے

اسلامی تاریخ میں بنگال کو فتح کرنے والا سب سے پہلا شخص جرنیل محمد بن بختیار خلجی تھا۔ یہ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں جرنیل کے عہدے پر فائز تھا۔ قطب الدین ایبک اس وقت سلطان شہاب الدین غوری کی جانب سے نائب السلطنت تھا۔ اسی زمانے میں قطب الدین ایبک کو بہار و بنگال کی تسخیر کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ بختیار خلجی نے ۱۱۹۷ء میں دو سو سواروں کے ساتھ پہلے بہار پر حملہ کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس نے بہار پر فتح و نصرت کا جھنڈا نصب کر دیا۔ اس کے بعد جلد ہی اس نے بنگال کو بھی فتح کر کے دہلی کی مرکزی حکومت سے ملحق کر دیا۔ بختیار خلجی کے اس عظیم کارنامے پر اسے اعلیٰ درجے کا خلعت عطا کیا گیا اور بنگال و بہار کا حاکم بھی اسی کو بنا دیا گیا۔

قطب الدین ایبک کو سب سے زیادہ خوشی بنگال کی تسخیر پر ہوئی کیونکہ یہ سب سے بڑی اور مضبوط حکومت تھی۔ لیکن اس بات سے آپ کو سخت حیرانی ہوگی کہ خلجی نے بنگال جیسی ریاست کو صرف اٹھارہ آدمیوں کے ذریعے فتح کیا تھا۔ اس نے کس طرح فتح حاصل کی اس کی کہانی آپ بھی سماعت فرمائیے۔

محمد بن بختیار خلجی نے بنگال پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک فوج تیار کی۔ فوج کی تیاری کے بعد اس نے بنگال کی راجدھانی ندیا کی طرف رخ کیا۔ نکلا تو اس برق رفتاری سے کہ ساری فوج پیچھے رہ گئی۔ صرف اٹھارہ آدمی خلجی کے ہمراہ تھے۔ اسی طرح وہ راجا رائے لکشمن کے قلعے کے پاس پہونچ گیا۔ فوج کا انتظار کئے بغیر اس نے قلعے کے محافظوں پر حملہ کر دیا اسے یقین تھا کہ راجا اس کے ساتھیوں کی قلیل تعداد کا کوئی خیال نہ کرے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ بہت بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے تبھی تو اس بہادری سے حملہ کر رہا ہے اور اسکا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔

حملے کے وقت راجا رائے لکشمن قلعے کے اندر کھانے میں مصروف تھا۔ باہر سے لوگوں کی چیخ پکار جب اس کے کانوں میں پہونچی تو حواس باختہ ہو کر محل کے عقبی دروازے سے فرار ہو گیا اور راجہ کی ساری فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں خلجی پورے بنگال پر قابض ہو گیا۔ اب خلجی بنگال اور بہار دونوں کا حاکم تھا لیکن اس کے باوجود بنگال کے حاکم برائے نام ہی مرکزی حکومت کے وفادار رہے۔

بنگال کے حاکموں کی خودسری جب حد سے تجاوز کر گئی تو بادشاہ غیاث الدین بلبن کو ان کی سرکوبی کا خیال پیدا ہوا چنانچہ غیاث الدین بلبن نے اپنے فرزند بغرا خان کو بہار و بنگال کا حاکم نامزد کیا اور بنگال و بہار کے خود مختار حکمراں طغرل خان کو سخت سزا دی۔ بغرا خاں کے بعد اس کے جانشین زمانہ دراز تک بنگال و بہار پر حکمرانی کرتے رہے لیکن وہ بھی تقریباً خود مختار ہی رہے۔

مذکورہ بالا سطور پڑھنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں بنگال و بہار کے جتنے بھی حکمراں ہوئے ان سبھوں میں خود مختاری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس لئے وہ کبھی بھی مرکزی حکومت کے فرمانبردار نہیں رہے۔

سلاطین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دورِ حکومت تک تو بنگال کے حاکموں نے زبانی اطاعت میں کوئی کمی نہیں کی مگر سلطان محمد تغلق کی حکومت میں زبانی اطاعت نام کی بھی کوئی شے نہ رہی۔ سلطان محمد تغلق کے دورِ حکومت میں بنگال کا حاکم قدر خاں تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد اسکے نائب فخر الدین نے ۱۳۴۰ء میں بنگال پر قبضہ کرکے مکمل خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنا دارالسلطنت سنار گاؤں کو بنایا لیکن فخر الدین چند ہی سال حکومت کر سکا کیونکہ بنگال کی حکومت کا ایک دوسرا دعویدار پیدا ہوگیا تھا۔ اس شخص کا اصلی نام ملک الیاس تھا لیکن اس نے اپنا لقب شمس الدین اختیار کرکے فخر الدین پر حملہ کر دیا۔ اور جنگ میں فخر الدین کو شکست دیکر خود بنگال کا خودمختار بادشاہ بن بیٹھا۔ اس طرح شمس الدین بہار و بنگال کا اوّل خودمختار بادشاہ ہوا جس نے ۱۳۴۰ء میں مرکزی حکومت سے بغاوت کرکے اپنی ایک آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ ۱۶ برس بڑی بے فکری سے حکومت کرنے کے بعد ۱۳۵۷ء میں شمس الدین اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا لیکن اس کے دورِ حکومت میں ایک بار بھی مرکزی حکومت نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ البتہ فیروز شاہ تغلق نے ایک بار بنگال پر حملہ کرکے اسے شکست دی تھی۔ لیکن فیروز شاہ تغلق کے بنگال سے واپس جاتے ہی وہ پھر برسرِ اقتدار آگیا۔

سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سکندر شاہ تخت نشین ہوا۔ سکندر شاہ کے بعد غیاث الدین بادشاہ بنا۔ اس کے بعد سلطان السلاطین تخت پر بیٹھا۔ سلطان السلاطین کے انتقال کے بعد اس کے خوردسال بیٹے سلطان شمس الدین نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسکا نگران کینس نامی ایک ہندو مقرر ہوا۔ ۱۳۸۶ء میں سلطان شمس الدین بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ سلطان کی وفات کے بعد کینس ہی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کینس پوری طرح بنگال کی حکومت پر چھایا ہوا تھا نیز عوام کو بھی کینس کے راجا بننے پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ کینس نام کا ہندو تھا، اس کے عقائد بڑی حد تک اسلامی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سات سال حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا تو اسکی تجہیز و تکفین اسلامی ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ کینس کا لڑکا جیت مل تو مکمل مسلمان تھا۔ اسکا لقب جلال الدین تھا۔ کینس کے انتقال کے بعد وہی تخت نشین ہوا۔ تقریباً ۱۰ برس حکومت کرنے کے بعد جلال الدین اللہ کو پیارا ہوگیا۔ چنانچہ ۱۴۳۱ء میں اس کا لڑکا سلطان احمد تخت پر بیٹھا۔ لیکن سلطان احمد کے بعد سابق شاہی خاندان کے ایک فرد ناصر الدین کو بنگال کا حکمراں بنایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان احمد کی کوئی اولاد نہ تھی۔ جب ناصر الدین بھی ۱۴۶۸ء میں انتقال کر گیا تو اس کے لڑکے باربک شاہ نے بنگال کی باگ ڈور سنبھال لی۔ باربک شاہ کے انتقال کے بعد یوسف شاہ، سکندر شاہ اور سلطان فتح شاہ نے بھی حکومت کی۔

سلطان فتح شاہ کے دورِ حکومت میں خواجہ سراؤں اور حبشیوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں چنانچہ یہ بادشاہ خواجہ سراؤں کے ایک سردار کے ہاتھوں قتل ہوا اور خواجہ سراؤں کے سردار نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ لیکن بھلا حبشی قوم کب خاموش رہنے والی تھی۔ حکومت سنبھالنے کے چند ہی روز بعد ملک اندیل حبشی نے خواجہ سراؤں کے سردار کو قتل کر دیا اور خود اقتدار پر قابض ہوگیا۔ اس کے بعد کئی حبشی تخت نشین ہوئے۔ حبشیوں کا آخری بادشاہ شیدی بدر تھا۔

۱۵۵۸ء میں پہلا بنگالی بادشاہ امیر محمود بنگالی تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۸ برس حکومت کی لیکن جب شیر شاہ سوری حملہ آور ہوا تو حکومت چھوڑ کر ہمایوں کے پاس بھاگ گیا۔ شیر شاہ کے امرائے سلطنت میں سے سلطان بہادر نے ۱۵۷۶ء میں بنگال پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ بھی زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ سلیمان کرانی نامی ایک شخص سلطان بہادر کی حکومت کا تختہ الٹ کر خود حکمراں بن بیٹھا۔

بنگال کے خودمختار بادشاہوں کا خاتمہ ۱۵۷۷ء میں اس وقت ہوا جبکہ سلیمان کرانی کے لڑکے داؤد خان کو اکبری لشکر نے تخت سے اتار کر بنگال کو مغلیہ حکومت سے ملحق کر دیا تھا۔

۱۳۴۰ء سے ۱۵۷۷ء تک (تقریباً ڈھائی سو برس) جتنے بھی بادشاہوں نے بنگال پر حکومت کی ان سبھوں میں خودمختاری کا جذبہ کارفرما تھا۔

راقم الحروف کے اس مضمون کا مقصد بھی یہی ہے کہ قارئین یہ جان لیں کہ مجیب الرحمٰن نے جو آج خودمختاری کا نعرہ بلند کیا ہے یہ بنگال کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ گذشتہ واقعات کو دہرا رہی ہے۔

اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے تک تو بنگال مغلیہ حکومت کے ماتحت رہا لیکن اس کے بعد انگریزوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ قاسم بازار اور کلکتے میں انگریزوں نے قلعے تعمیر کر لئے تھے۔ محبِ وطن سراج الدولہ سے انگریزوں کا اس طرح بڑھنا نہ دیکھا گیا۔ چنانچہ سراج الدولہ نے انگریزوں کو کلکتے اور قاسم بازار سے نکالنے کے لئے تحریک چلائی۔ یہ تحریک کچھ ہی دنوں کے بعد جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو انگریزوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ جنگ میں انگریز فتحیاب ہوئے اور سراج الدولہ قتل کر دیا گیا۔

سراج الدولہ کے بعد بنگال میں کئی نام نہاد بادشاہ تخت نشین ہوئے مگر یہ سب نام کے بادشاہ تھے۔ اس کے بعد انگریزوں نے نام نہاد مغل بادشاہ، شاہ عالم سے ۲۶ لاکھ روپے سالانہ پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی مختاری حاصل کر لی۔

بنگال بہار اور اڑیسہ کے مختارِ مطلق بننے کے بعد انگریز رفتہ رفتہ پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے لیکن دن بدن انکی حکومت مستحکم ہونے کی بجائے کمزور ہی ہوتی چلی گئی۔ آخر ۱۹۴۷ء کو انگریز ہندوستان سے چلے گئے لیکن جاتے جاتے ہندوستان کو دو حصوں میں بانٹ گئے۔ ایک حصہ ہندوستان اور دوسرا حصہ پاکستان کے نام سے موسوم ہوا۔

ملک کی اس تقسیم کے وقت بنگال کو بھی دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ مغربی بنگال۔ اور مشرقی بنگال۔ مغربی بنگال ہندوستان کے حصے میں آیا اور مشرقی بنگال پاکستان میں چلا گیا۔

آج اسی مشرقی بنگال میں خودمختاری اور آزادی کی تحریک چل رہی ہے۔ پاکستان بھی دو حصوں میں منقسم ہے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہاں کی کل آبادی ساڑھے سات کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ مغربی پاکستان کی کل آبادی ساڑھے چار کروڑ ہے۔ اس لئے مغربی پاکستان کے حکمراں اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ ۷۱/۲ کروڑ کی اکثریت کو ۴۱/۲ کروڑ کی اقلیت کے ذریعے سرنگوں کرنا ایک فعل عبث ہے۔

واقعات نئی دہلی

ہندوستانی فلم ڈائریکٹر کی سُنہری تمغے سے عزّت افزائی



فلم یادِ وطن کا یاس انگیز احساس پیدا کر رہی تھی اس کا روپ اور انداز پُراثر تھا۔ کیمرے سے گاؤں کی فلم اُتاری تھی جو ایک آبائی گھر کے گرد پروان چڑھا تھا۔ کہیں کسی کے چہرے پر اُتاری گئی تھی تو کہیں کسی منظر کی۔ اِس سے ایک بصری تاثر جارہا تھا۔ اِس طرح گاؤں اور اُس کے قدیم گھر کے بارے خاموش کہانی بیان کی جارہی تھی۔

یہ فلم تھی آشیانہ جسے اٹیلانٹا فلمی میلے میں (جو حال اٹیلانٹا 'جارجیا' میں منعقد ہُوا تھا) طلائی تمغہ اور اسکی ڈائریکٹر شمع حبیب اللہ کو خصوصی جیوری اعزاز ملا تھا۔ پروگرام مطابق یہ فلم امریکہ میں ٹیلی ویژن پر بھی دکھائی جائیگی۔

مس حبیب اللہ نے بتایا کہ یہ نہایت ذاتی قسم کی فلم ہے۔ گھر میرے کُنبے کا ہے اور یہ میرے لیئے کچھ معنی رکھتا ہے اُسے جب چھوڑا تھا تو میں ابھی ایک بچی تھی۔ میرا ب سے انگلینڈ میں مقیم ہے۔ میں کوئی بیس برس کے بعد اپنے آبائی گھر گئی تھی اور اُسی کا نتیجہ یہ فلم ہے۔

فلم آشیانہ مکمل کرنے میں تین برس لگے اور یہ امریکی اداکار کی امداد سے تیار کی گئی تھی۔

لندن میں سکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مس حبیب اللہ کے ایک کالج میں داخل ہُوئی۔ انہوں نے کہا کہ "میں نے اپنی ڈگری کے لیئے امریکی تاریخ کا نصاب لیا تھا۔ اور عمومی طور پر صدر ریگن کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں جس کا مجھے علم نہ ہو۔" لیکن ان دنوں بھی مجھے فلمیں بنانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ لہٰذا میں نے یونیورسٹی میں ایک فلم یونٹ شروع کیا۔ اگرچہ یہ محض ایک مشق تھی لیکن تھی بڑی عظیم الشان۔

فلموں میں اُن کی دلچسپی اُس وقت مزید بڑھی جب وہ اپنے کُنبے کے ایک دوست فلم اداکار سیلوین ڈگلس کے ساتھ قیام کرنے کیلئے نیویارک گئیں۔ "اِنہی دنوں میں نے ورجینیا کی جارج واشنگٹن یونیورسٹی کی شاخ ایرلی فاؤنڈیشن میں شمولیت کی۔ فاؤنڈیشن میں سب قسم کی کانفرنسیں ہُوتی ہیں۔ جن کے نتیجے میں تعلیمی فلمیں تیار ہوتی ہیں۔

"ہم نے معیشت کے متعلق ایک فلم تیار کی۔ اُس وقت اِس موضوع کو اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی جتنی اب ہے۔ ہوائی آلودگی کے متعلق ہماری فلم کو واشنگٹن ایمی العام حاصل ہوا جو ٹی وی کے "آسکر" اعزاز کے برابر ہے۔ ہم نے کینسر کی تحقیق اور جراحی سے اعضا لگانے کی فلمیں بھی بنائی ہیں۔"

کسی کام کی سپردگی کے سلسلے میں اُنہیں ہندوستان واپس آنے کا موقع مِلا۔ اُنہوں نے نیویارک میں جیمز آئیوری اور اسمٰعیل مرچنٹ سے مُلاقات کی۔ اور اُن کی ہند امریکی فلموں کی مہم "گورو" "لورسی ٹائیگرز" میں شامل ہوگئیں۔

مس حبیب اللہ نے بتایا کہ میں نے اِن دونوں کاموں کے سلسلے میں ہندوستانی فلم سازی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ یہاں فلم سازی کے طریقے امریکی فلم سازی کے طریقوں سے بہت مختلف ہیں۔ سہولیات اور ساز و سامان بھی بہت زیادہ مختلف ہے اور آپ لیبارٹریوں اور ماہروں کی نسبت خود پر زیادہ انحصار رکھنا سیکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ان تمام ضابطوں اور ترتیبوں میں سے گذری ہوں۔

اِس نوعمر ڈائریکٹر کی سب سے بڑی خواہش ہندوستان کی آئندہ ٹیلی ویژن منڈی کے لیئے تعلیمی فلمیں تیار کرنا ہے۔ لیکن اِس اثنا میں وہ اشتہاری فلموں میں مصروف ہیں۔ اُنہوں نے مُسکرا کر کہا کہ "میں نے کوکا کولا کے متعلق اپنی فلم کے لیئے بھی اعزاز حاصل کیا ہے۔"

مس حبیب اللہ کی صلاحیتیں اُن کے باصلاحیت کُنبے کی روایات کے مطابق ہیں۔ اُن کی والدہ نامور مصنفہ عطیہ حسین ہیں جن کی تازہ ترین کتاب "سن لائٹ آن اے بروکن کالم" (SUNLIGHT ON A BROKEN COLUMN) بھی اُن کے آبائی گھر سے متعلق ہے۔ اُن کے بھائی وارث حسین ہالی وُڈ کے ایک کامیاب فلم ڈائریکٹر ہیں جن کی تازہ ترین فلم میں شرلے میک لین کام کرتی ہے اور جو ایک ناول "دی پوزیشن آف جول ڈیلینی" (THE POSSESSION OF JOEL DELANEY) پر مبنی ہے۔

واقعات نئی دہلی

عقل حیران ہے

ہی زندگی کے چند عجیب و غریب واقعات

اری زندگی میں بعض مرتبہ ایسے عجیب و
واقعات پیش آتے ہیں کہ عقل انسانی حیران و
ددرہ جاتی ہے بعض لوگ ان واقعات کو
ت پر محمول کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں بلکہ
ل یقین ہے کہ ایسے معاملات میں نہ صرف اللہ
کا فضل وکرم اور اس کی مدد شامل حال
ہے بلکہ بسا اوقات وہ ہماری کوتاہیوں،
یوں اور خامیوں پر پردہ ڈال کر ہمیں دنیا کی
ں میں رسوا ہونے سے بھی بچا لیتے ہیں اسی لیے
ریعت کی زبان میں ستار العیوب کہا گیا ہے
زندگی میں بھی چند اسی قسم کے واقعات پیش
مکن ہے ان کا اعادہ قارئین کے لیے دلچسپی کا
ث ہو۔

یں اسٹیشن پر پہنچا تو دور انجن کا دھواں نظر
تھا۔ گاڑی پانچ سات منٹ میں یہاں پہنچنے
تھی لیکن ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ابھی اچھی خاصی
لگی ہوئی تھی اور ٹکٹ خریدنا محال نظر آرہا تھا۔
ی کے قریب مجھے ایک شناسا نظر آئے، میں جلدی سے
کے قریب پہنچا اور انہیں پیسے دیکر کہا کہ ایک
ٹ میرے لیے بھی خرید لیں۔ وہ ٹکٹ لیکر آئے تو فرمانے
کہ ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں چلئے
وقت اچھا گزرے گا ہم دونوں صرف اگلے
اسٹیشن تک جا رہے تھے، جو یہاں سے صرف دس گیارہ میل کے فاصلے پر تھا ہم نے ٹکٹ تیسرے درجے کا خریدا تھا اور میرا ٹکٹ بھی انہیں کے پاس تھا۔ ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو گاڑی بالکل قریب آچکی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف جانے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ آئیے آگے چلتے ہیں اگلے ڈبوں میں راستے کا گرد وغبار ذرا کم آئے گا۔ ہم اگلے ڈبوں کی طرف جا رہے تھے کہ کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا، میرے ایک دوست انٹر کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھے ہوئے مجھے بلا رہے تھے میں نے اپنے ہم سفر سے کہا کہ آپ کہیں چل کر بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں، میں ان دوست کے پاس پہنچا تو وہ دریافت کرنے لگے کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے، میں نے انہیں بتایا کہ اگلے اسٹیشن تک جا رہا ہوں فرمانے لگے یہیں آجائیے میں نے کہا ہمارے پاس تھرڈ کلاس کے ٹکٹ ہیں، کہنے لگے بیٹھ بھی جائیے، کون پوچھتا ہے، اور پھر سفر ہی کونسا لمبا ہے۔ میں متردد سا ہوا لیکن انکے اصرار پر انکے ساتھ بیٹھ گیا۔ انسے باتوں میں ایسا مصروف ہوا کہ میں یہ قطعی بھول گیا کہ میری حیثیت اب اس مسافر کی سی ہے جو بغیر ٹکٹ لیے سفر کر رہا ہو، گاڑی چلی تو مجھے اپنی حیثیت کا احساس ہوا اور وہ بھی اس وقت جب اگلے ڈبوں کی طرف مجھے ایک ٹکٹ چیکر نظر آیا۔ گاڑی کے ڈبے ایک ایک کرکے سرکتے رہے اور چیکر صاحب کھڑے دیکھتے رہے لیکن جونہی ہمارا ڈبہ انکے سامنے آیا وہ لپک کر اس میں سوار ہو گئے۔ انٹر کلاس کا یہ ڈبہ جس میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے پورا ڈبا تھا اور اس میں مجھ سمیت سات آدمی موجود تھے، پہلی نشست پر میں اور میرے دوست اور دو صاحبان بیٹھے ہوئے تھے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ دوسری سیٹ پر جو صاحب تشریف فرما تھے وہ مجھے نہیں جانتے تھے، تیسری سیٹ پر ہمارے اسٹیشن ماسٹر اور انکے نائب باتوں میں مصروف تھے، یہ حضرات بھی مجھے بخوبی جانتے تھے میں نے اپنی جیب پر نظر ڈالی جس میں سات روپے موجود تھے۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ میں پچھلے جنکشن سے اگلے جنکشن کا کرایہ بخوبی ادا کر سکتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میری عزت خطرے میں تھی، پانچ چھ واقف حضرات کی موجودگی میں بغیر ٹکٹ پکڑے جانا یہ ایک ایسا حادثہ تھا جو مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ پیش آرہا تھا میں بظاہر ایک رسالے کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا لیکن میرا دل اندر ہی اندر شرم سے کٹا جا رہا تھا کہ یہ لوگ کیا خیال کریں گے، بہرحال ٹکٹ چیکر صاحب نے

۔۔۔نے پہلے مسافر کا ٹکٹ دیکھا پھر ہمارے دوست کی باری آئی، لیکن ہمیں وہ صاحب صاف نظر انداز کر گئے، ہماری بجائے انہوں نے ان صاحب کا ٹکٹ طلب کیا جو درمیانی نشست پر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے ہماری خوش قسمتی ملاحظہ فرمائیے یا ان صاحب کی بدنصیبی کہ ان کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ نکلا اس ٹکٹ کو دیکھ کر چیکر صاحب فرمانے لگے کہ آپ کا ٹکٹ تیسرے درجے کا ہے اور آپ درمیانہ درجے میں سفر کر رہے ہیں آپ اب اپنا ٹکٹ اسی درجے کا بنوا لیجئے، یہ کہکر متعلقہ کاغذات انہوں نے جیب سے نکالے ایک لمحہ انکو ملاحظہ کیا، پھر رقم طلب کی اور ٹکٹ بنانے لگے۔ اسوقت نصف سے زیادہ سفر طے ہو چکا تھا۔ ٹکٹ بنانے کے بعد چیکر صاحب ہمارے اسٹیشن ماسٹر صاحب اور ان کے نائب سے باتیں کرنے لگے۔ پانچ سات منٹ بعد یہ سفر تمام ہوا اگلے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو ہم بھی بڑے اعتماد کے ساتھ چیکر کے ساتھ گاڑی سے اُتر گئے اگرچہ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ واپسی پر ہم نے پہلے سفر کا کفارہ یوں ادا کیا کہ ٹکٹ انٹر کلاس کا لیا اور بیٹھے تھرڈ کلاس میں۔ اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ وہی ٹکٹ چیکر صاحب ہمارے ڈبے میں پھر تشریف لے آئے میرا ٹکٹ ملاحظہ فرمایا تو کہنے لگے "عجیب بات ہے کہ لوگ اب انٹر کلاس کا ٹکٹ خرید کر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں"۔ میں نے انہیں اپنا قصہ سنایا تو وہ ہنسنے لگے اور فرمانے لگے واقعی میں خود حیران ہوں کہ میں نے آپکو چیک کیوں نہیں کیا؟"

گزشتہ رمضان شریف کا ذکر ہے، میرا قیام ان دنوں بسلسلۂ ملازمت ایک معمولی سے قصبے میں تھا، اس قصبے میں اشیائے ضرورت کی چند دکانیں موجود تھیں۔ دودھ اور گھی بھی ان دکانوں پر مل جاتا تھا لیکن ناقص اور ناخالص پھر ان دکانوں پر صفائی کا نام ونشان تک نہ تھا، دیہات میں دودھ اور گھی کیلئے عام شہرت یہی ہے کہ یہ چیزیں شہروں کی نسبت یہاں عمدہ اور خالص مل جاتی ہیں لیکن اس نگری میں اس سہولت کا بھی فقدان تھا۔ اس لیے میں دودھ بجائے بازار سے خریدنے کے یہیں کے ایک زمین دار گھرانے سے منگا لیا کرتا تھا اور کبھی اپنی ضرورت کیمطابق مضافات سے خرید لیتا۔ اس روز دسواں روزہ تھا جب میں فرائض سے فارغ ہوا تو اسوقت پانچ بجنے والے تھے اور روزہ افطار کرنے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ گھی صبح سحری کے وقت ختم ہو چکا تھا لیکن دن میں مجھے بوجہ مصروفیت خیال ہی نہ آیا کہ آج گھی ختم ہو چکا ہے۔ میرے ملازم کو بھی نہ جانے کیا کام آ پڑے تھے کہ وہ بھی اپنے گھر سے ابھی ابھی آیا تھا۔ میں نے اس سے جلدی سے سبزی منگوائی، آٹا گندھوایا اور دودھ لانے کیلئے بھیج دیا ساتھ یہ بھی کہا کہ گھی بالکل ختم ہو گیا ہے اگر کہیں سے اچھا گھی مل سکے تو لیتا آئے۔ تھوڑی دیر میں ملازم واپس آیا اور کہنے لگا کہ گھی تو اچھا ملتا نہیں اور دودھ اسلیے نہیں لا سکا کہ زمین دار کی بھینس بیمار ہے، یہ خبر سنکر تو طبیعت کو بڑی کوفت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اپنی ناشکر گزاری پر نادم ہوا اور سوچا کہ کیا میں ایک روز وقت روکھا سوکھا کھا کر روزہ نہیں رکھ سکتا جب کہ اللہ کے کتنے ہی بندے ایسے ہیں جنہیں یہ روکھی سوکھی روٹی بھی باقاعدگی سے میسر نہیں۔ میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ وہ جلدی سے پہلے روٹی پکا لے اور اس کے بعد تھوڑی سی چٹنی بنالے۔ گزارا ہو جائے گا۔ ملازم نے توے پر پہلی روٹی ڈالی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی ملازم دروازہ کھولنے کے لیے باہر گیا جب وہ واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ اسنے پلیٹ میرے سامنے رکھدی، میں نے دیکھا کہ پلیٹ میں بھنا ہوا قیمہ اور مٹر اور دو چپاتیاں پڑی ہوئی تھیں، میں نے ملازم سے دریافت کیا کہ کون صاحب تھے کہنے لگا میں نہیں جانتا، میں نے روزہ افطار کیا دونوں چیزیں بڑی مزیدار پکی ہوئی تھیں میں انسے لطف اندوز ہوتا جاتا تھا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا جاتا تھا کہ اس ذات کریم نے غیب سے یہ سامان نعمت بہم پہنچایا، وہ پلیٹ دو دن تک میرے پاس پڑی رہی، تیسرے روز ایک صاحب آئے اور پلیٹ طلب فرمائی، میری انسے ایسی کوئی شناسائی بھی نہ تھی۔ میں نے ہنس کر ان صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے یہ کرم کیسے فرمایا فرمانے لگے کہ ایسے ہی دل میں آگیا تھا ورنہ کوئی خاص بات نہ تھی، میں نے انہیں صورت حال سے مطلع کیا تو وہ بے چارے حیرت زدہ سے ہو گئے۔

سرکاری ملازمت کے قواعد وضوابط کے تحت ایک سرکاری ملازم اس امر کا پابند ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے بعد بھی اپنے اس مقام سے جہاں وہ بسلسلۂ ملازمت تعینات ہے کسی دوسرے مقام کو خواہ عارضی طور پر ہی سہی نقل مکانی نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ افسر مجاز سے اپنے اس اقدام کی اجازت پیشگی طور پر حاصل نہ کرلے، سرکاری ملازم اس اصول کو عموماً توڑتے رہتے ہیں لیکن میں اپنے تمام عرصۂ ملازمت میں اس اصول کا سختی سے پابند رہا تاہم ایک دفعہ مجھے بھی اپنے ایک بچے کی شدید علالت کے پیش نظر یہ اصول توڑنا ہی پڑ گیا، میں اپنے افسر اعلیٰ سے رخصت کی اجازت تو ضرور حاصل کر لیتا لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میں ٹیلی فون ہی پر ایسا کروں کیونکہ ٹیلی فون کرنیکے وقفے میں میری گاڑی نکل جانے کا خدشہ تھا اور اگلی گاڑی مجھے غیر معمولی تاخیر سے ملتی، خیر میں گھر پہنچا، بچے کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا اب اسکی حالت قدرے اطمینان بخش تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھا تھا کہ مجھے اچانک ایک ایسا کام یاد آگیا جو یہاں کے میرے ہم محکمہ دفتر سے متعلق تھا، میں اس دفتر پہنچا تو وہاں ایسی باقاعدگی کے آثار نظر آئے جو کسی اعلیٰ افسر کی آمد آمد کی خبر دے رہے تھے، میں ذرا آگے بڑھا تو اس دفتر کے سربراہ نظر پڑے، انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے لبوں پر انگلی رکھ لی تا کہ میں چپ رہوں۔ پھر ملحقہ کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور آہستہ سے فرمانے لگے کہ افسر اعلیٰ دورے

ئے ہوئے ہیں اور اندر آرام فرما رہے ہیں۔
نے یہ صورت حال دیکھی تو وہاں سے اسلئے
لوٹنا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے ان سے کہا
ے کی علالت کے سلسلے میں آیا تھا وہ ٹھیک
اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں عنقریب
والی گاڑی سے واپس چلا جاؤں، اس پر
نے لگے چونکہ افسر اعلیٰ ابھی شام کی گاڑی سے تشریف
ا رہے ہیں اس لیے میں اس گاڑی سے نہ جاؤں
ح سویرے لوٹ جاؤں، مجھے انکے اس مشورے پر
طمینان نہ ہوا، اور میں گھر ہوتا ہوا اسٹیشن کی
چل پڑا، لیکن وہاں پہنچ کر میں نے پھر اپنا پروگرام
ل کرلیا۔ گاڑی آئی اور چلی گئی، اب دل نے
گرام یہ بنایا کہ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ
ہوا نہر کے پل پر پہنچ جاؤں جو وہاں سے کوئی
میل کے فاصلے پر تھا، کچھ دیر وہاں آرام کروں
ھنڈا ہونے پر گھر آجاؤں، چنانچہ میں نہر کے پل پر
گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا، میں نے کپڑے اتار ڈالے
آرام سے نہر کے کنارے لیٹ کر ایک رسالے کا
مطالعہ کرنے لگا۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد سورج غروب
گیا، میں اٹھا اور ریلوے لائن کے متوازی راستے
چل پڑا اور آہستہ آہستہ گھر پہنچ گیا، اس واقعے
تیسرے روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے افسر اعلیٰ سے
ازت حاصل کرکے گھر پہنچا، گھر کے کاموں سے
رغ ہوکر میں مقامی دفتر گیا تو اس دفتر کے نائب
ربراہ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ آپ تو اس روز
پس جانے کے لیے کہہ رہے تھے لیکن ہم نے آپ کو
ی شام کو نہر کی طرف سے آتے ہوتے دیکھا۔ انکے
ں جملے پر سربراہ صاحب بھی ہنسنے لگے اور کہنے لگے
اس شام کو ہم دونوں اور ہمارے افسر اعلیٰ سیر
غرض سے اسی طرف گئے تھے جدھر سے آپ آرہے
تھے ہم دونوں نے آپکو دیکھ لیا اور پہچان لیا، لیکن
عجب ہے کہ افسر اعلیٰ جو ہمارے ہمراہ ہی تھے آپکو
دیکھ سکے اور نہ پہچان سکے، حالانکہ ہمارے اور
یکے راستوں کے درمیان فاصلہ سو ڈیڑھ سو گز کا
تھا، اور آپ متواتر پانچ منٹ تک ہماری نظروں
کے سامنے رہے، انکی یہ باتیں سنیں تو میں بڑا حیران
ہوا کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ میں نے بھی ان تینوں
صاحبان کو بالکل نہیں دیکھا تھا حالانکہ فاصلہ
بہت ہی کم تھا، وقت جھٹپٹے کا تھا اور تاریکی نے
ماحول پر اپنا تسلط قائم نہیں کیا تھا۔

سخت گرمی کا موسم تھا غالباً جولائی کا مہینہ تھا۔
اور جمعے کا دن تھا، دفتر میں اس روز میرے پاس
کام اسقدر زیادہ تھا کہ جب میں نے اسے ختم کیا
تو اسوقت ایک بجنے کو تھا اور دفتر کے تمام اہل کار
جا چکے تھے، میں نے جلدی جلدی دفتر بند کیا، اور
اپنی سائیکل کا رخ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پچھلے
پہیئے کی ہوا نکل چکی ہے، ہوا بھروانے لگا تو شوں شوں
کی آواز آنے لگی، پنکچر درست کرنیکا سامان میرے
پاس موجود نہ تھا۔ جیب پر نظر ڈالی تو وہ بھی خالی
تھی، ہمارا دفتر چھاؤنی کے علاقے میں واقع تھا اور
وہاں دکانیں نہ ہونے کے برابر تھیں تاہم سائیکلوں
کی مرمت کرنیکی ایک دکان میرے علم میں تھی جو یہاں
سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی، قہر درویش کے
مصداق میں لو میں جلتا ہوا اس دکان پر پہنچا، دکان
کھلی ہوئی تھی اور ایک لڑکا وہاں کام کر رہا تھا۔

دکان کے مالک جن سے میری تھوڑی بہت علیک
سلیک تھی، جمعے کی نماز کیلئے جا چکے تھے، میں نے لڑکے
سے پنکچر لگانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ
پیسے پھر ملینگے، اسپر لڑکے نے کہا کہ استاد صاحب نے ادھار
کرنے کے لیے منع کیا ہے لہٰذا وہ پنکچر لگانے سے معذور
ہے، میں نے حالات کے پیش نظر اصرار بھی کیا لیکن
لڑکا اصول کا پکا نکلا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا، مایوس
ہوکر میں سائیکل لیکر چل پڑا، میں ابھی چند قدم ہی
چلا تھا کہ ذرا فاصلے پر مجھے کوئی چیز سڑک پر چمکتی ہوئی
دکھائی دی، میں نے قریب جاکر دیکھا تو یہ ایک بالکل
نئی چونّی تھی، میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا، اسے پلنے
میں جو خوشی حاصل ہوئی وہ کچھ نہ پوچھئے، بہرحال
خدا کا شکر ادا کیا، سائیکل کو لوٹایا اور پھر اسی دکان
پر لے گیا، میں نے جاتے ہی لڑکے کے ہاتھ پر چونّی رکھ
دی اور کہا کہ بھائی اب تو پنکچر بنا دو۔

دو ڈھائی سال کا ذکر ہے میرا لڑکا عبدالنعیم جسکی
عمر تین سال تھی۔ اچانک گم ہوگیا، بہتیرا تلاش کیا
مگر نہ ملا اور اس سعی ناکام میں، چار پانچ گھنٹے گزر
گئے۔ میری پریشانی کی انتہا نہ رہی اور دل میں طرح
طرح کے وہم آنے لگے، اسکی والدہ کا مجھ سے بھی برا
حال تھا، آخر میں منادی کرنے والے کے گھر
پہنچا، وہاں معلوم ہوا کہ ٹاؤن کمیٹی گیا ہوا ہے میں
نے ٹاؤن کمیٹی جانیکی بجائے ایک مرتبہ پھر لڑکے کی
تلاش میں شہر کا چکر لگایا وہ نہ ملا آخر میں پھر منادی
کرنے والے کے گھر پہنچا، وہ ابھی تک ٹاؤن کمیٹی سے
واپس نہ آیا تھا مجبوراً میں بھی ٹاؤن کمیٹی گیا اور
اسے سرسری طور پر تلاش کیا وہ نہ مل سکا تو ٹاؤن
کمیٹی سے نکل کر اب منادی کرنیوالے اور لڑکے
دونوں کو تلاش کرنے لگا مگر ان دونوں کو نہ ملنا
تھا نہ ملے، تھک ہار کر میں پھر منادی کرنیوالے کے
گھر پہنچ گیا۔ لیکن وہاں سے اب بھی یہی معلوم ہوا
کہ وہ ٹاؤن کمیٹی گیا ہوا ہے۔ آخر ایک مرتبہ پھر ٹاؤن
کمیٹی گیا اس مرتبہ وہ مجھے مل گیا، میں نے دیکھا کہ وہ
اور ٹاؤن کمیٹی کا ایک چپراسی دفتر کے باہر کھڑے
ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے جاتے ہی اس سے
کہا کہ میرا بچہ پانچ گھنٹے سے گم ہے منادی کردو۔
بجائے اسکے کہ منادی کرنیوالا بچے کے کوائف مجھ سے
دریافت کرتا چپراسی میری طرف متوجہ ہوا، اور
مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپکے لڑکے کی عمر کیا ہے اور اسکا
لباس کیسا ہے، میں نے بتایا تو کہنے لگا کہ آپ کا بچہ
میرے گھر پر موجود ہے، آئیے آپ اسے لیجائیے، پھر
منادی کرنیوالے کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا کہ میں
اس سے کافی دیر سے منادی کرنے کیلئے کہہ رہا تھا
مگر اسکا مطالبہ تھا کہ منادی کرنیکا معاوضہ مبلغ
دو روپے میں پیشگی ہی اسے اپنی جیب سے ادا کردوں
حالانکہ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ جس کا بچہ گم ہوا
ہے میں یہ رقم اس سے دلادوں گا مگر یہ نہیں مانتا
تھا اچھا ہوا کہ آپ خود ہی آگئے میں نے اللہ تعالیٰ
کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے بڑا کرم کیا اور
مزید پریشانیوں سے بچا لیا۔ ★★

واقعات نئی دہلی

۳ پارسل

کہانی: آشا کرن



موھنی اور اس کے پتی دیپک جوں ہی

اٹری پر چڑھے سرلا کے بنگلے کی بتیاں جلتی ہوئی نظر آئیں
یں اطمینان ہوگیا کہ سرلا ان کے انتظار میں جاگ رہی ہے۔
کتنا پیارا ہے سرلا کا گھر،" موہنی بولی: "دور تو بہت
ہ لیکن اس میں ملائیت کافی ہے۔"

"لیکن یہاں اس علاقے میں جو رہے اس کے پاس
رہونا ضروری ہے ورنہ کچھ دن میں لوگ یہاں آنا
ھوڑ دیں گے۔"

"کبھی ہو ہی نہیں سکتا، سرلا کے ہاں تو دوست
یشہ بھرے رہتے ہیں۔"

"نوجوان لڑکے ہی ہوتے ہیں سرلا نہیں سرلا کو ان میں
یا خوبی نظر آتی ہے میرے الفاظ یاد رکھو، ایک دن
ی کھٹائی میں پڑ جائے گی، اس عمر میں نوجوان لڑکوں
ں گھرے رہنا بہت خطرناک ہے۔"

اب وہ بنگلے کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے، گیٹ کھلا
ا تھا، وہ اندر داخل ہوکر روش پر چلنے لگے، روشنیوں
ں نہایا ہوا سفید پتھروں کا یہ بنگلہ بہت خوبصورت
ل رہا تھا۔

دیپک نے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی کی طرف دیکھا
ر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

بیل کی آواز نے نوجوان آدمی کو چونکا دیا، اس
نے جلدی سے بلب بجھا دیا، جو کوئی بھی ہے واپس
لا جائے لیکن ایک بلب بجھانے سے کیا ہوتا ہے،
رے بنگلے میں بتیاں جل رہی تھیں۔

بیل دوبارہ بجی، نوجوان نے اپنے حواس درست
یئے، دروازہ تو کھولنا ہی پڑے گا، کہیں آنے والا
شتبہ نہ ہو جائے، بنگلے کا پچھلا دروازہ، پہاڑی کی
مت نکلتا تھا، اگر وہ لوگ کچھ بھانپ لیں تو اس کو
آسانی پکڑا جا سکتا تھا۔

نوجوان نے لاش کندھے پر اٹھائی، اچانک
وفے کی لٹکی ہوئی جھالر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا
س نے لاش جلدی سے صوفے کے نیچے دھکیل دی اور
ھالر پھر لٹکا دی۔ اب لاش کا سر اور ہاتھ وغیرہ میز
ر پڑے تھے، نوجوان نے بالوں سے پکڑ کر سر اٹھایا اور
سے قریبی میز کی دراز میں ڈال دیا۔ ٹانگوں کے کچھ

حصے صوفے کے نیچے ڈال دیئے۔ میز پر خون پھیلا ہوا
تھا، نوجوان نے ایک کشن اٹھا کر میز کو رگڑ ڈالا،
در کشن الٹا کرکے صوفے پر رکھ دیا۔

بیل بہت زور سے بجی اور بجتی چلی گئی، اب میز
پر صرف ایک ہاتھ رہ گیا تھا، اس نے جلدی سے وہ
ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا، اس سے زیادہ
محفوظ تو کوئی جگہ نہ تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو باہر ایک مرد اور عورت
کو کھڑے پایا، ان کے چہروں پر فکر جھلک رہی تھی۔

"سرلا اندر ہیں؟" مرد نے پوچھا۔

"نہیں!"

"ہم ان کے دوست ہیں، آپ شاید منوہر ہیں۔"

"اوہ! یس! میں منوہر ہوں" نوجوان بولا۔

"مگر ہیں! یہ منوہر کون ہے۔"

"سرلا کہاں ہے؟"

"وہ! جی وہ ذرا شہر گئی ہیں۔"

"انہیں دیر تو نہیں ہو جائے گی۔"

"پتا نہیں مجھے معلوم نہیں۔"

"اچھا تو ہم انتظار کرلیں گے۔" عورت نے کہا۔

نوجوان کو جال کی ڈوریاں اپنی گردن میں
کستی ہوئی محسوس ہوئیں۔

وہ دونوں دروازے میں سے گزر کر ہال میں
سے ہوتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے آئے اور
بڑے آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، نوجوان کا
ارے بے چینی کے برا حال تھا۔ سرلا کے جسم کا کوئی
ٹکڑا تو نظر نہیں آرہا۔

صوفے کے نیچے سے خون کا ایک دھبہ نظر آرہا
تھا۔ اُف! اب کیا ہوگا، نوجوان نے جلدی سے
آگے بڑھ کر پیر خون کے دھبے پر رکھ دیا، اب وہ
باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور دھیرے دھیرے پیر سے
فرش کو رگڑ بھی رہا تھا۔

"کمرہ ذرا کباڑ خانہ بنا ہوا ہے۔" وہ بولا: "اس
وقت ہمیں کسی مہمان کے آنے کی توقع نہیں تھی۔"
اسے سارا دھیان اپنی گفتگو کی طرف لگانا تھا اور
صوفے کے نیچے جو کچھ بھی پڑا تھا، اس کے ذہن سے
نکال پھینکنا تھا، اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے
ورنہ وہ پکڑا لیا جائے گا۔"

"لیجیے سگریٹ پیجیے۔" مرد نے سگریٹ کیس نوجوان
کی طرف بڑھایا اور ماچس کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

نوجوان نے جھٹ خود اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب
میں ڈال کر ماچس تلاش کی، اس کا ہاتھ سرلا کے یخ
بستہ نرم گوشت سے ٹکرایا، اس کا پورا جسم کانپ گیا۔

ماہنامہ "نیم" دہلی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید!" عورت نے ہمدردی سے پوچھا۔ "سرلا آپکی دیکھ بھال کرتی ہوگی۔"

"جی ہاں! بڑی مہان عورت ہیں وہ۔" نوجوان بولا اور سرلا سے اپنی جدوجہد کا منظر اس کے ذہن میں تازہ ہوگیا۔ وہ سرلا کی گردن پر اس وقت تک ضرب لگاتا رہا تھا جب تک سر کٹ کر دھڑ سے الگ نہ ہوگیا تھا، اب وہ مرچکی تھی۔ اب وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، کسی کو نہیں۔

خون اس کے جوتوں کی ایڑیوں میں چپک گیا تھا

مرد اور عورت اب خاموش ہوچکے تھے، پھر مرد نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا، اپنی پتنی سے کچھ سرگوشیوں میں کہا اور نوجوان سے کہا۔

"سرلا کافی دیر کے لئے گئی ہیں کیا؟"

"پتا نہیں! میرا خیال ہے کہ آپ کا انتظار کرنا فضول ہے، آپ ان کی عادت تو جانتے ہی ہیں۔"

عورت مسکرائی۔ "انتظار کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہم تو یہاں ٹھہرنے آئے ہیں، سرلا نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"ٹھہرنے ــــ"

"شاید وہ بھول گئی ہوں۔"

"حیرت ہے۔"

"تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، فوراً چلے جاؤ۔" نوجوان اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا، اس کا ہردے کتنی بُری طرح دھڑک رہا تھا، اگر یہی حالت رہی تو وہ تو مارا جائے گا۔

گھنٹی پھر بجی۔

"ہمارا سامان آیا ہوگا۔" مرد بولا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی، نوجوان نے جلدی سے اپنا پیر خون کے دھبے سے ہٹا لیا۔

ہال میں سامان گھسیٹے جانے کی آواز بلند ہو رہی تھی، نوجوان نے جلدی جلدی چاروں طرف دیکھا، خون کا دھبّا اب بھی نظر آرہا تھا اس نے جیکٹ اتاری اور صوفے کے بازو پر ڈال کر اسے اس طرح لٹکایا کہ دھبّا چھپ گیا۔

"آپ کس کام میں لگ گئے؟" عورت نے کمرے میں آکر پوچھا۔

"بس ذرا چیزوں کو ڈھنگ سے رکھ رہا تھا۔"

"آپ شاید زخمی ہیں، دیکھیے کتنا خون نکلا ہے۔"

واقعی اس کے ہاتھوں اور پتلون کے گھٹنوں پر خون لگا ہوا تھا۔

"جی ہاں، میرے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی تھی۔"

وہ گھبرا سی گئی۔ "لائیے ذرا میں دیکھوں۔"

"جی نہیں۔ میں خود ڈریسنگ کرلوں گا۔"

"تکلف مت کیجئے۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔" کہہ کر عورت سرلا کا سا ہمدردانہ چہرہ لئے آگے بڑھی، اس کی آنکھوں میں سرلا جیسی شفقت نظر آرہی تھی۔

اس نے عورت کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ رہنے دیں۔" اس کا لہجہ بڑا تند تھا۔

وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلا گیا، قمیص اس کی پیٹھ پر چپک رہی تھی، خون آستینوں میں سے اندر تک چلا گیا تھا، وہ کتنا ڈرا ہوا تھا، اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے ورنہ ــــ

مرد اور عورت دونوں کھانا کھا رہے تھے، وہ بڑے حیران تھے، آخر سرلا، اب تک کیوں نہیں آئی تھی، نوجوان اوپر کمرے میں تھا۔

"مجھے یہ نوجوان پسند نہیں آیا۔"

"بہت کم عمر ہے۔" عورت بولی۔

مرد اپنی جگہ سے اٹھا، اس کا ہاتھ لگتے ہی نوجوان کی جیکٹ نیچے گر پڑی۔

"اوہ! بے چارے کی جیکٹ۔"

"تھرڈ کلاس سی تو ہے۔"

عورت نے آگے بڑھ کر جیکٹ اٹھالی اور صوفے کی پشت پر ڈال دی

"میری جیکٹ کو ہاتھ مت لگائیے۔" نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔

"یہ نیچے گر گئی تھی۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"آپ میری چیزوں کو ہاتھ مت لگائیے۔ میں یہ بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔"

"آئی ایم سوری" ۔عورت بولی

نوجوان نے جیکٹ اٹھائی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، ہاتھ محفوظ تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے وہ اوپر بیڈروم میں سونے چلے گئے، اور نوجوان نیچے ہی رہا، جب اسے اطمینان ہوگیا کہ اب وہ دونوں سوچکے ہیں تو اس نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں تالا لگایا۔

تین بجے تک وہ لاش کے ۱۲ ٹکڑے کرچکا تھا لاؤ اب نہیں وہ باندھ رہا تھا، پھر اس نے آری اور چاقو دھو کر میز کی دراز میں ڈال دیئے۔

اتنے میں اوپر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔

میز پر ۱۲ پارسل پڑے تھے۔ سرلا کے نرم نرم گوشت کے ۱۲ پارسل۔

اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، ورنہ وہ بچ کر نہ نکل سکے گا۔

قدموں کی آواز اب سیڑھیوں کی طرف آرہی تھی، اس نے تالا کھول کر چٹخنی گرا دی اور جلدی جلدی پارسل صوفے کے پیچھے ڈال دیئے۔ وہ ہال میں داخل ہوا۔

"میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔" عورت بولی، وہ سرلا کی طرح بول رہی تھی۔

"نہیں میں جاگ رہا تھا۔"

"سرلا کے بارے میں پریشان ہوں گے۔"

سرلا کے بارے میں پریشان تھا۔"

عورت نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"اس کمرے میں مت جایئے۔"

وہ حیران ہوگئی۔

"مجھے شما کر دیجئے۔ اس سمے میرا ذہن بڑا پریشان ہے۔"

عورت دروازہ کھول کر اندر چلی گئی، ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔

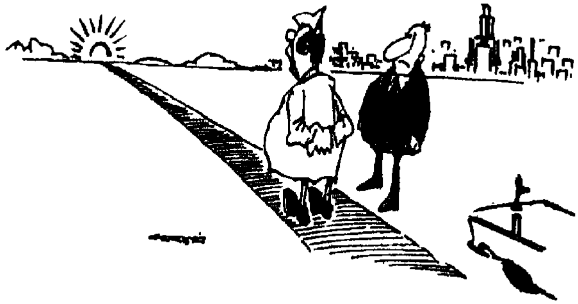
"میں آپکے لئے چائے بناتی ہوں۔" وہ بولی۔

وہ تو خود اسے کمرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا اس نے سر ہلا دیا۔ وہ رسوئی کی طرف چلی گئی، کہیں رسوئی میں تو کوئی دھبّا وغیرہ نہیں ہے۔ نہیں۔ ذرا سا بھی نہیں۔ اسے پورا یقین تھا۔

اس نے پھر صوفے کی طرف جھانک کر دیکھا پارسل اسی طرح پڑے ہوئے تھے۔

ـہ میں مرد کمرے میں داخل ہوا، اسکی آنکھیں
ربھری ہوئی تھی۔
ہ کہاں ہے؟"
رلا ـــ سرلا ـــ نوجوان بے جان لاش کی طرح
ہو گیا، اس کے پیر کانپنے لگے، اسے بتا دو کہ
یکی ہے، بتا دو، تو سب کچھ ختم ہو جائے۔
پ نے میری پتنی کو دیکھا ہے۔"
دہ۔"
درہوئی کی طرف بڑھتا چلا گیا، چائے کا پانی سن
ہا تھا، نوجوان کرسی پر بیٹھ گیا، ہر چیز بالکل درست
فی، پھر ڈر کا ہے کا۔
ں نے سگریٹ نکالی، جیکٹ کی جیب میں سے
کال کر سگریٹ سلگائی اور جب ماچس واپس رکھنے
ے خیال آیا کہ جیب میں تو ایک چیز اور بھی تھی۔
رلا کا ہاتھ، سرلا کا مردہ ہاتھ۔"
ے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، ورنہ وہ پکڑا
گا۔

ہاتھ کہیں گم ہو چکا تھا۔
وہ نیچے جھک کر ہاتھ تلاش کرنے لگا، فرش پہ صوفے کے نیچے۔ کہیں بھی نہ تھا۔
"ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟ مرد دروازے میں کھڑا پوچھ رہا تھا۔
"جی نہیں جیب میں سے ایک چیز گر گئی تھی، وہ ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
تو سب کچھ ٹھیک تھا، ہاتھ سامنے نہیں تھا کہیں کسی کرسی کے پیچھے یا میز کے نیچے گر گیا ہوگا، اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے ورنہ ـــ"
وہ دونوں چائے لئے ہوئے اندر آئے، میز پر چائے رکھی اور کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے اور پینے دنوں کی باتیں کرنے لگے، جب وہ اسی طرح آدھی رات کو اٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔
دو چہرے اسے دیکھ رہے تھے۔
مرد کا ہاتھ، بیوی کے ہاتھ پر، کرسی کی پشت پر لٹکا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی کشن پر سرلا کا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔
انہوں نے اب تک سرلا کا ہاتھ نہیں دیکھا تھا ابھی تک نہیں۔
اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، ورنہ وہ پکڑ لیا جائے گا، اسے اس طرح برتاؤ کرنا تھا جیسے سرلا کا ہاتھ وہاں تھا ہی نہیں، وہ اسے وہاں سے اٹھا تو نہیں سکتا تھا، اسے تو چپ چاپ بیٹھ کر چائے پینا تھی۔
اسے اپنے اوسان بحال رکھنا تھے، اپنی توجہ مرکوز رکھنی تھی۔
کشن پر چائے دودھ، شکر، یہی چیزیں تو سامنے تھیں، چائے اور دودھ تو اس کے قریب تھا، پھر ـــ شکر دان عورت کے ہاتھ میں تھا، اس نے شکر ڈال کر اسے میز پر رکھ دیا۔
وہ آگے جھکا، وہ اس سے کیا مانگنا چاہ رہا تھا۔
شکر! شکر! اسے شکر ہی تو چاہئے تھی۔
"ذرا ہاتھ ادھر بڑھائیے گا!"
اور پھر وہ بیک وقت ہنسنے اور رونے لگا عورت کے ملنے سے کشن پر رکھا ہوا ہاتھ، عورت کی گود میں جا پڑا۔



روبلوں کی ایک اور بربادی۔
سورج تک جانے والی اس
سڑک کی کیا ضرورت تھی؟۔



"لگتا ہے کالج یہیں کہیں
آس پاس ہے۔"

درخواست کی کہ وہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس پر ۱۷۳۶ء میں وہ شاہ طہماسپ کی جگہ تخت نشین ہو کر نادر قلی سے نادر شاہ افشار بن گیا۔ یہی نادر ہے جس نے ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ہندوستان پر حملہ کیا اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور جس کی سپاہ نے قتل عام کر کے دلی کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہادی تھیں۔ لیکن نادر شاہ کے بعد اس کا کوئی قابل جانشین پیدا نہیں ہوا۔ اس کے بعد تھوڑی مدت کے لئے کریم خان زند اور اس کے خاندان کے بعض امرار نے بھی ایران پر حکومت کی۔

افشاریوں اور زندیوں کی حکومت کے بعد ۱۷۷۹ء میں یہاں قاچاری خاندان برسر اقتدار آیا۔ اس خاندان کا بانی آغا محمد خاں قاچاری تھا۔ شروع میں وہ زندی خاندان ہی کا ملازم تھا۔ لیکن اپنی دماغی قابلیت اور قوت ارادی کے باعث بہت جلد اپنے ساتھ کے تمام امیروں پر غالب آگیا۔ اور جب کریم خاں کی وفات کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی اور اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا تو اس نے تمام مخالفوں کا قلع قمع کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اب تک ملک کا پایۂ تخت کبھی تیسفون (مداین) کبھی، شیراز، کبھی کرمان رہا تھا۔ آغا محمد خان نے پہلی مرتبہ ایران کے شمال کے ایک قصبے تہران کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کے بعد یہ شہر روز بروز ترقی کرتا گیا، حتیٰ کہ یہ آج ایران کا سب سے بڑا شہر بن گیا ہے۔ اس وقت بھی ملک کا دارالخلافہ یہی ہے۔

قاچاری عہد اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یورپ کے مختلف ملکوں نے ایران میں اپنی ریشہ دوانیاں اسی زمانے میں شروع کیں۔ انگریز ہندوستان میں پہونچ چکے تھے۔ یورپ میں ان کے سب سے بڑے حریف فرانسیسی تھے اور یہاں کا حکمراں نپولین انکا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اسی طرح روس بھی انگریزوں کی ایشیا میں ترقی کو روکنا چاہتا تھا۔ اب گویا انگلستان اور فرانس اور روس میں رسہ کشی شروع ہو گئی اور تینوں نے ایران [illegible] جمانا چاہا۔ یہ کشمکش مدتوں جاری رہی۔ آخیر میں فرانسیسی اپنے حریفوں کے مقابلے میں ناکام رہے اور ان کا ایران میں اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد انگریزوں اور روسیوں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمالئے۔ یہ اس خاندان کے چوتھے حکمران ناصر الدین شاہ کے زمانے میں ہوا۔

یورپی ممالک کے اثر و نفوذ کا البتہ ایک فائدہ ہوا کہ یہاں ریل، ڈاک، تار، ٹیلیفون، اخبار وغیرہ کا رواج ہو گیا فوج بھی مغربی طریقے پر تربیت یافتہ ہو گئی۔ لیکن یہ سب چیزیں خرچ چاہتی تھیں۔ چونکہ ملک میں کافی دولت نہیں تھی اس لئے ایران کو ان ملکوں سے قرض لینا پڑا اور اسے چکانے کے لئے ناصر الدین شاہ کے جانشین مظفر الدین شاہ کو انھیں ایران میں غیر معمولی حقوق دینا پڑے۔ مثلاً شمال و جنوب میں ملکی درآمدات پر تمام محصول کے وصول کرنے کا حق روسیوں کو دے دیا گیا اور جنوب میں تیل کے چشموں سے تیل نکالنے کا ٹھیکا انگریزوں کے حوالے ہو گیا، اسی طرح بحیرۂ خزر میں ماہی گیری کا حق بھی روسیوں کو ہی دینا پڑا۔

اس سے لوگوں میں بے چینی پھیلنے لگی اور ملک کے مختلف حلقوں نے حکومت کے ان اقدامات کی سخت مخالفت کی۔ پوری کوشش کے باوجود یہ اضطراب کسی طرح کم نہ ہوا اور بادشاہ کے خلاف تحریک روز افزوں زور پکڑتی چلی گئی۔ بالآخر محمد علی شاہ آخری قاچار تاجدار اپنے بارہ سالہ بیٹے احمد شاہ کے حق میں دستبردار ہو گئے چونکہ احمد شاہ کو تعلیم کی ضرورت تھی اس لئے نوجوان بادشاہ اپنا بیشتر وقت یورپ میں گزارنے لگے۔ یہاں ملک کا خزانہ خالی تھا۔ فوج کو مہینوں تنخواہ کی شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں انھوں نے قزاقی اور رہزنی کا پیشہ اختیار کیا۔ ہر طرف قحط اور وبا کا دور دورہ تھا۔ مرکزی حکومت کمزور اور بے بس تھی اور کوئی اقدام کرنے سے قاصر تھی، دور دست علاقے خود مختاری اور آزادی کے خواب دیکھنے لگے غرض ایران تباہی کے غار کے کنارے پہونچ گیا۔

ایسے میں رضا خاں سپہ سالار افواج نے ملک کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح ۱۹۲۵ء میں موجودہ پہلوی دور شروع ہوا۔

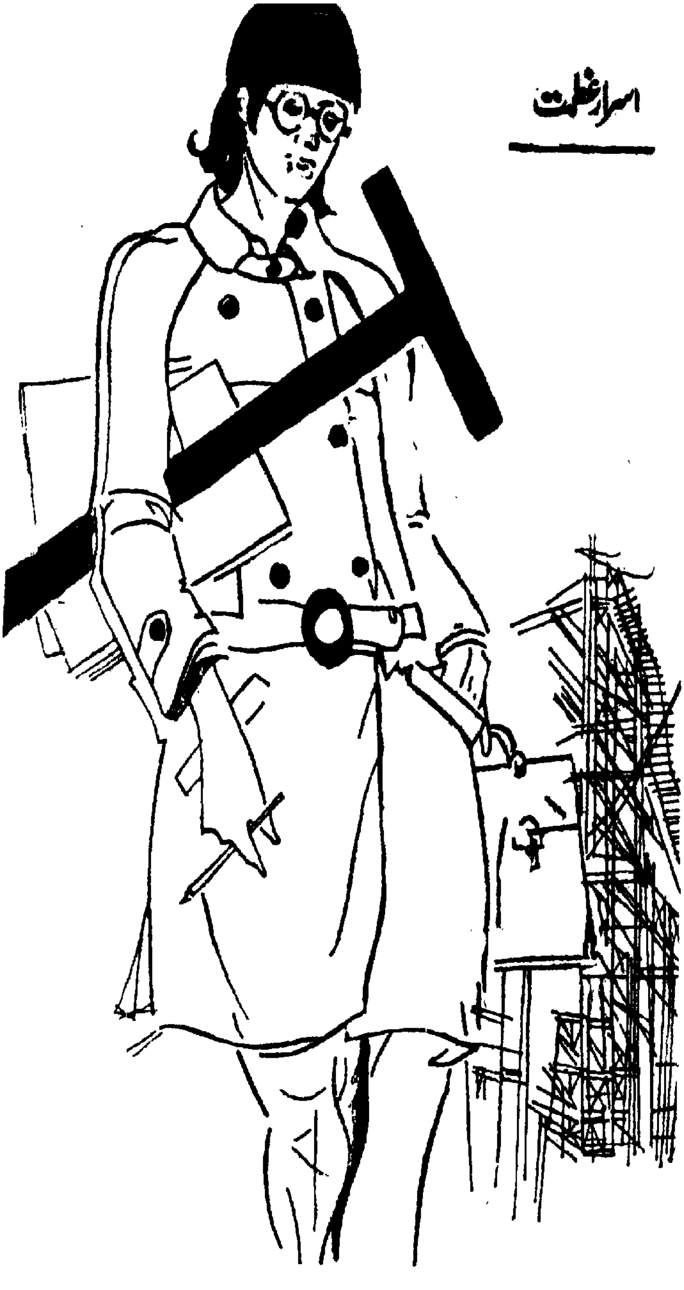
رضا شاہ پہلوی نے اپنے سولہ سالہ دور حکومت میں زندگی کے ہر ایک شعبے میں اصلاح جاری کی۔ صنعت و حرفت اور تجارت، دستکاری اور بنکاری، فوجی تنا... اور داخلی امن، طبی امداد اور تعلیم، وسائل نقل و حر... ریل اور تار، سڑکیں ـــــ غرض کوئی میدان ان... نگاہ دور رس سے بچا نہیں۔ انھوں نے ہر جگہ ترقی روّیہ اختیار کیا۔

ایران نے دوسری عالمی جنگ میں کوئی حصہ نہیں... اور وہ غیر جانبدار رہا۔ اس کے باوجود انگریزوں اور روسیوں نے اس پر جرمنی کی طرفداری کا الزا... اپنی فوجیں ملک میں اتار دیں۔ اس پر رضا شاہ پہلوی... ۱۹۴۱ء میں اپنے فرزند جلیل یعنی موجودہ شاہنشاہ ایر... محمد رضا شاہ پہلوی کے حق میں دستبرداری دے د...

موجودہ دور حکومت میں واقعی ملک میں انقلاب... ہے۔ عہد حاضرہ میں زندگی کی رفتار بہت تیز ہو گئی... جب تک تمام حصوں میں ترقی نہ ہو اور وہ بھی موزوں... پر اور یکساں پیمانے سے، ملک بحیثیت مجموعی آگے نہیں... سکتا۔ اسی لئے ایران کے موجودہ حکمراں محمد رضا شا[ہ] نے تمام شعبوں پر برابر کی توجہ کی ہے۔ جو کام ان... والد رضا شاہ پہلوی کے زمانے میں شروع ہو چکے... ان میں مزید سرگرمی پیدا کر دی ہے اور جن پر وہ اپنے... زمانۂ حکومت میں توجہ نہیں کر سکے تھے ان میں اب کا... شروع ہوا ہے۔ مثلاً پہلوی عہد سے پہلے پورے... میں ریل کی پٹری صرف ۲،۸ کیلو میٹر تھی، آج یہ... کیلو میٹر تک پہونچ چکی ہے۔ ہوائی جہازوں کے اتر... پہلے کوئی انتظام ہی نہیں تھا۔ اب ملک میں دو بین... ہوائی اڈے ہیں، دو درجۂ اوّل کے اور چودہ درجۂ... کے۔ خود ایرانی ہوائی کمپنی وجود میں آگئی ہے یہی حا[ل] بندرگاہوں اور کشتی رانی کا ہے۔ بحیرۂ خزر اور خلیـ... کی تمام پرانی بندرگاہوں کو زمانۂ حال کی ضروریات... مطابق بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح کا زبردست انقلاب صنعت و حر... کے میدان میں ہوا۔ آج ملک میں ۱۰،۲۰۰ کارخانے... جن میں دو لاکھ سے زیادہ کاریگر کام کرتے ہیں۔ تیل کی... ملک کی سب سے بڑی دولت ہے ایسے مدتوں غیر ملکی... مفاد کے لئے استعمال ہوتی رہی لیکن بالآخر ۱۹۵۰ء... نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اگرچہ اب بھی بیرونی کم...

بقیہ صفحہ



ڈوبنے سے پہلے

اسرار عظمت

نیلوفر جب اپنی سہیلی کے گھر سے گھر لوٹنا ڈھل چکی تھی۔ سورج کو رات کا تاریک اژدھا نگل پوری طرح نگل چکا تھا۔ آج اگرچہ چاند کی چودہ تاریخ تھی لیکن کالے کالے دیو پیکر بادلوں میں چاند نے کسی مقروض شخص کی طرح منہ چھپا لیا تھا اور رات کی تاریکی قبر کی تاریکی کو مات دے رہی تھی۔ برکھا کی سرد ہوائیں ہڈیوں کے گودے تک کو ٹھٹھرائے دے رہی تھیں۔

اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ پھر بھی اس پر کپکپی طاری تھی۔ آج شام ہی سے موسم کے تیور خراب تھے۔ اس لیے سرِشام ہی سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں بازار ویران ہو گئے تھے۔ اور اکا دکا جو دکانیں کھلی رہ گئی تھیں اب وہ دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں ایک جگہ ٹھہر کر اس نے چاروں طرف طائرانہ نظریں ڈالیں لیکن دور دور تک کسی ٹیکسی یا آٹو رکشا کا پتہ نہ تھا، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں اب ہلچل سی مچ گئی تھی بجلی کی تیز تلوار رہ رہ کر ان کے سینوں کو چاک کرتی اور بادل ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑنے لگتے۔ اب اس نے مزید رکنا مناسب نہ سمجھا اور پیدل ہی چل پڑی۔ لیکن ابھی وہ نصف فاصلہ بھی طے نہ کر پائی تھی کہ بادلوں کی چادر پھٹ گئی اور موسلا دھار بارش نے اسے پل بھر میں سر سے پیر تک بھگو دیا۔

جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچی تو سردی سے اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے کپ بورڈ میں سے برانڈی کی بوتل اٹھائی اور دو ایک پیگ پی کر خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔

اس کی خواب گاہ سے ملا ہوا دوسرے فلیٹ کا بیڈ روم تھا۔ درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ جسے لوہے کی پٹیاں ٹھونک کر مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے پڑوس کا کمرہ اس کے لیے باعث عذاب بنا ہوا تھا۔ اس میں نیا نیا شادی شدہ جوڑا ٹھہرا تھا۔ دونوں رات گئے تک قہقہے لگاتے اور باتیں کرتے رہتے اور نیلوفر کی نیند حرام ہو جاتی وہ لاکھ کوشش کرتی کہ اس کے خیالات نہ بھٹکنے پائیں لیکن پڑوس کی سرگوشیاں اسے بے چین کر دیتیں۔ وہ اپنے آپ کو نہ روک سکتی تھی ایسا لگتا

جیسے کوئی مقناطیسی قوت کھڑکی میں موجود ہے۔ جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اس کے قدم خود بخود کھڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ کھڑکی کی جھریوں سے دوسری طرف جھانکنے لگتی۔ پھر وہ ہلکی ہلکی سی نیلی روشنی کے پس منظر میں جو کچھ دیکھتی وہ اسکے تن بدن میں آگ لگا دینے کے لیے کافی ہوتا۔ اسکے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں، سانس پھولنے لگتی۔ گلا خشک ہو جاتا اور اس کا دل ایک انجانی سی آگ میں جلنے لگتا۔ وہ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیتی اور دوڑ کر بستر پر گر جاتی تکیے کو پوری قوت سے سینے میں بھینچ لیتی۔ اور سونے کی کوشش کرتی لیکن پڑوس سے سنائی دینے والی سرگوشیاں جیسے جلتے پر تیل کا کام کرتیں، اور اس کے دل و دماغ میں لگی ہوئی آگ ہر لمحہ بھڑکتی ہی جاتی۔ وہ اس طرح تڑپتی جیسے اسے بستر پر نہیں انگاروں کی سیج پر لٹا دیا ہو۔ لیکن آخر کار جب پڑوس کی سرگوشیاں سناٹے کے اتھاہ ساگر میں کھو جاتیں تو نیند کی دیوی اسے بھی اپنی آغوش میں لے لیتی۔

آج بھی جب اس نے بتی بجھا کر چادر کھینچ لی تو پڑوس سے ایسی ہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے لاپرواہی سے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں لیکن جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو کان اور زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ وہ پڑوس سے آنے والی ہلکی سے ہلکی آواز کو اس طرح صاف سن رہی تھی جیسے کوئی اسکے کانوں کے قریب بول رہا ہو۔ دھیمی دھیمی سرگوشیاں طوفانی ہوا کی طرح اس کے کانوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے کانوں میں کوئی جادوگر سحر پھونک رہا ہو۔ آہستہ آہستہ اس پر ایک پُراسرار قوت غالب آتی جا رہی تھی۔ اپنے آپ سے کشمکش کرنے کی قوت اس میں ہر لمحہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور جب پڑوس کے کمرے سے سوئچ آف کرنے کی ہلکی سی چٹ کی آواز سنائی دی اور کھڑکیوں کی جھریوں سے کمرے میں داخل ہونیوالی نیلی سی لکیر بھی غائب ہو گئی تو اس کی قوت مدافعت بھی پوری طرح ختم ہو چکی تھی۔ وہ غیبی قوت اب پوری طرح اس پر غالب آ چکی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنے بستر پر لیٹی اپنے دھڑکتے دل کی صدا سنتی رہی، پھر اٹھ کر پنجوں کے بل چلتی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی ایک آنکھ کھڑکی کی جھری سے جا لگی۔ کچھ عجیب سا منظر تھا جیسے نیلے کاغذ پر ایک تصویر کھینچ دی گئی ہو۔ دو گلے ملتے ہوئے طوفان کی تصویر، ایک دوسرے میں سمائے ہوئے انسانوں کی تصویر۔

آج وہ خلاف معمول بہت دیر تک وہاں کھڑی رہی، اور جب وہ وہاں سے ہٹی تو اس کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، اور وہ اس طرح ہانپ رہی تھی جیسے میلوں کا سفر اس نے دوڑ کر طے کیا ہو، اسکی سانسیں آندھیوں کی طرح چل رہی تھیں۔ اور سینہ اس قدر تیزی سے پھول پچک رہا تھا جیسے ساری دنیا کے لوگ بیک وقت اس کے پھیپھڑوں سے سانس لے رہے ہوں۔ خون پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اسکی رگوں میں گردش کر رہا تھا اور آنکھیں تپ کر انگارا ہو گئی تھیں۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے پے در پے کئی گلاس چڑھا لیے۔ اور تکیے کو مضبوطی سے بھینچے ہوئے لیٹ گئی۔ وہ اتنی زور سے تکیے کو بھینچے ہوئے تھی جیسے اسے اپنے آپ میں سمو لینا چاہتی ہو۔ لیکن آج یہ طوفان پوری شدت کے ساتھ ابھرا تھا۔ اور اس پر قابو پانا اسے ناممکن سا لگ رہا تھا۔ کچلے ہوئے جذبات کا سرکش دھارا اسکے قدم اکھاڑنے کے لیے کوشاں تھا۔ گلا گھونٹ گھونٹ کر ذہن کی عمیق گہرائیوں میں دفن کی ہوئی خواہشات بھوت بن کر نکل آئی تھیں۔ اور حصار باندھے اسکے گرد رقص کر رہی تھیں۔ اور اس حصار کو توڑنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسنے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ ایسے موقعوں پر ٹھنڈے پانی کا غسل مفید ہوتا ہے۔ وہ تکیہ پھینک کر غسل خانے میں گھس گئی۔ کپڑے اتار کر جب وہ شاور کھولنے لگی، سانچے میں ڈھلا، اپنا دودھیا جسم اسے بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ شاور کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ اور خود اسکے نشیب و فراز میں بھٹکنے لگے۔ جب بھی اس کی انگلیاں جسم کے کسی حصے کو چھوتیں تو اسے ایسا لگتا جیسے سارے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی ہو۔ اسے عجیب سی لذت محسوس ہوتی۔ اور اس لذت سے اسکی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ اور وہ سوچنے لگتی کہ کاش اس کی انگلیاں اتنی نرم و نازک ہونے کے بجائے سخت کھردری ہوتیں۔

طوفان اب اسے دور اُڑا لایا تھا۔ سرکش جذبات کے تیز و تند دھارے نے اسکے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔ اور وہ اس سیلاب میں بہنے لگی تھی۔ خواہشات کے بھوتوں نے اس پر پوری طرح فتح پا لی تھی۔ غسل کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ باہر نکلی۔ نائیلون کا پتلا سا گون جسم پر ڈالا اور شہزاد کو فون کرنے لگی۔ شہزاد جو اپنی بے راہ روی کے لیے کالج میں ہی نہیں بلکہ سارے شہر میں مشہور تھا۔

شہزاد کیا تم فوراً میرے کمرے میں پہنچ سکتے ہو؟ وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی، اور دوسری طرف شہزاد کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی جا رہی تھیں اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کل تک جو لڑکی اس سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتی تھی آج اسے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اور وہ بھی رات کے گیارہ بجے؟

تھوڑی دیر بعد نیلوفر کے کمرے کی لائٹ بھی آف ہو چکی تھی۔ اور وہ شہزاد کی بانہوں میں جکڑی ہوئی کیف و سرور کی انجانی سی دنیا میں کھو گئی تھی۔ شہزاد نے اسے پوری قوت سے اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ بے جان تکیے اور جاندار سینے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس کے دماغ میں مکمل تاریکی چھا گئی تھی۔ اور گناہ و ثواب کے تمام احساسات ختم ہو گئے تھے۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے پڑوس کے کمرے سے کچھ آوازیں آ رہی ہوں۔

"میں اب آپ کے پاس نہیں آؤں گی" بیوی شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"کیوں؟"

بقیہ صفحہ [illegible]

۱-۲-۳-۴



والے کے پیچھے لگا ہوا بٹن دباتے ہی چھت کی کھڑکی کھلی اور سرخ سرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے گرنے لگے

دو قیسی یوشیدا نے آخری مرتبہ تمام چیزوں کا جائزہ
دلو کی ناک میں نالی لگی ہوئی تھی۔ خون کی بوتل بھی اپنی جگہ
دی تھی۔ رولو کی نبض دھیمے دھیمے انداز میں چل رہی
۔ وہ بے ہوش تھا اور اسکی دائیں کنپٹی پر ایک گہرا سا گھاؤ
یوشیدا نے چمٹی اٹھا کر دائیں طرف رکھی ہوئی بوتل میں سے
عنصر ریڈیم کا ایک ٹکڑا نکالا۔

چند سال پیشتر یوشیدا نے لندن ٹائمز میں ایک سائنسی رپورٹ
تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ [illegible] آثار قدیمہ کے مطالعہ
میں حیرت انگیز طور پر [illegible] ثابت ہوئے ہیں۔ دراصل
کا عنصر کی ایک قسم ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت ذرات خارج

کرتا رہتا ہے اور جتنے ذرات کم ہو [illegible] اس کی عمر معلوم
کی جا سکتی ہے۔ زمین کی جس پرت میں وہ عنصر پایا جاتا ہے اسکی
عمر کا اندازہ بالکل ٹھیک طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی
پرت اگر جانوروں کی ہڈیاں اور انسانی کھوپڑیاں وغیرہ برآمد
ہوں تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس دور سے تعلق رکھتی تھیں۔

اس خبر کو پڑھتے ہی یوشیدا کے ذہن میں ایک عجیب خیال
پیدا ہوا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان لمبے لمبے اور تھکا دینے
والے طریقوں کے بجائے انسان خود ماضی میں سفر کر سکے اور
ہر دور کا نقشہ کھینچ دے۔

کئی سال کے طویل عرصے کے بعد یہ منزل آ پہنچی تھی کہ
یوشیدا کے دوست ماہر آثار قدیمہ رولو نے خود کو تجربات کے لئے
پیش کر دیا تھا۔ یوشیدا نے اس کے جسم میں مختلف دوائیں
انجکشن کے ذریعے داخل کر کے اس کے سر کا آپریشن کیا تھا
اور ریڈیم کا کوئی ٹکڑا داخل کرنا ہی کا منتظر تھا

سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق یہ ٹکڑا کئی کروڑ سال
پرانا تھا اور یوشیدا کا نظریہ تھا کہ یہ عنصر جسقدر پرانا ہوگا
اس دور کے حالات معلوم ہو جائیں گے۔

یوشیدا نے دائیں ہاتھ سے خون پہونچانے والی نلکی کا کارک
کھولا اور دوسرے ہاتھ سے ریڈیم کا ٹکڑا اس گھاؤ کے اندر
رکھ دیا۔

ریڈیم کے گوشت سے مس ہوتے ہی رولو کی حالت میں
تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ اس کی رنگت زردی مائل سفید سے
بدل کر سیاہ پڑنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پیشانی
اور ٹھوڑی پر خوب بال اُگ آئے ہوں۔ سر کے بال بھی اپنے
آپ بکھر گئے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں، ناک کی ہڈی کچھ
اور ابھر آئی تھی۔ جبڑے پھیل گئے تھے اور دانت نظر آنے
لگے تھے لیکن لمبے لمبے دانت تھے، اور اس کے منہ سے عجیب
سی آواز نکل رہی تھی۔

"خی... خی خی... خوں... خوں... خی خی..."

سفید چادر کے نیچے چھپے ہوئے ہاتھ حرکت کر رہے تھے
یوشیدا نے چادر ہٹا دی۔

اف... دونوں ہاتھ سیاہ بالوں سے اٹے ہوئے تھے
اور ناخن یوں لمبے لمبے ہو گئے تھے جیسے یہ انگلیاں کسی انسان
کی نہیں بلکہ گوریلے کی ہوں۔

یقیناً یہ ابتدائی انسان تھا جو بول نہیں سکتا تھا۔

یوشیدا کی تجربہ گاہ ایک مربع میل کے احاطے میں پھیلی
ہوئی تھی چاروں طرف بہت اونچی دیوار تھی جس کے اوپر
خار دار تار لگے ہوئے تھے جن میں رات کے وقت برقی کرنٹ
دوڑتا رہتا تھا۔

پانچ کمرے یوشیدا کے لئے مخصوص تھے جن میں کسی
پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہ تھی

ان ہی پانچ کمروں میں سے ایک میں یوشیدا اسوقت
بے ہوش رولو کے ساتھ موجود تھا۔ رولو کو تین گھنٹے سے
سے پیشتر ہوش نہیں آ سکتا تھا اور ہوش آنے سے پہلے
اسکا بیان یہ بتا دیا جانا ضروری تھا کہ رولو اب آج

سے چار کروڑ سال پہلے کی دنیا میں پہونچ چکا تھا۔

لوشیدا نے مصنوعی طور پر چار کروڑ سال قبل کے ماحول کو پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اور رونو نے ملکر چاروں کمروں کو مختلف انداز سے ترتیب دیا تھا۔ ایک کمرے میں درختوں اور گھاس پھوس کی مدد سے کروڑوں سال پہلے کا ماحول دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح باقی تین کمروں میں پتھر کا دور اور دھات کا دور وغیرہ تھے۔

لوشیدا نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے خون پہونچانے والی نلکی کا کارک بند کیا، نلکی علیحدہ کی اور اسٹریچر کو دھکیلتا ہوا کمرہ نمبر ۲ کی طرف چلا۔

اسٹریچر کو بٹن دبا کر نیچے لانے کے بعد اس نے رونو کو اٹھا کر گھاس پر لٹا دیا اور اسٹریچر دوبارہ پہلے کمرے میں رکھ دیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ابتدائی دور کا انسان کیسی حرکات کیا کرتا تھا۔

بے ہوشی کے تین گھنٹے مکمل ہو گئے تو رونو کی پتلیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لوشیدا دروازے کی آڑ میں کھڑا اسکا جائزہ لے رہا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی رونو نے حلق سے نعرہ بلند کیا۔

نماؤ ۔ نماؤ ۔ نماؤ، نماؤ ۔

شاید اسے بھوک لگی تھی۔ لوشیدا نے اس کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ دروازے کے پیچھے لگا ہوا بٹن دباتے ہی چھت پر بنی کھڑکی کھلی اور گوشت کے سرخ سرخ ٹکڑے گرنے لگے۔ رونو نے لپک کر دو ٹکڑے اٹھائے۔ انھیں سونگھا اور نیچے پھینک دیا اور پھر زور سے چیخا۔

"نماؤ ۔۔ نماؤ نماؤ"

اور چاروں طرف ہاتھ مارنے لگا۔ پھر اس کے لمبے لمبے ہاتھ ایک درخت سے ٹکرائے اس نے کچھ پتے توڑے اور کھا کر چبانے لگا بیچ بیچ میں رک کر وہ حلق سے عجیب عجیب آوازیں بھی نکالتا۔ "تی ۔ خا ۔ تی ی ۔ نو"

اس کے کھانے کی رفتار دیکھ کر لوشیدا کو تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ کمرے کے درختوں کا صفایا نہ کر دے لیکن آخر اس نے گوشت کیوں پھینک دیا تھا۔ شاید وہ اس کے ذائقہ سے ناآشنا تھا یا ممکن ہے وہ جانوروں کو پکڑ کر انھیں ہلاک کر کے فوراً کھانے کا عادی ہو۔

یہ سوچ کر لوشیدا آہستہ آہستہ باہر کی طرف کھسکنے لگا اس نے مویشیوں کے باڑے میں جا کر ایک بکرے کی رسی کھولی اور اسے ہنکاتا ہوا کمرہ نمبر ۲ میں لے آیا۔ گائے کو اندر دھکیل کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اندر سے دروازے پر جھاڑیاں چسپاں کی گئی تھیں اور دیواروں کا بھی یہی حال تھا۔

لوشیدا نے دروازے میں بنے ہوئے سوراخ سے جھانکا تو اندر کے خوفناک منظر نے اسے دہلا دیا۔

رونو نے گائے کو دیکھتے ہی پہلے جیسا نعرہ مارا تھا۔

"نماؤ ۔ نماؤ ۔ آ ۔ ہا"

پھر اس نے اپنا کر گائے کی گردن دبوچ لی اس کا جبڑا کھل گیا۔ رونو نے داہنا ہاتھ گائے کے حلق میں اندر تک گھسیڑ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ چیر ڈالا۔

ذرا سی دیر میں گائے کا دم نکل گیا اور رونو اپنے تیز تیز دانتوں سے اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ لوشیدا کراہیت سی محسوس کر کے وہاں سے ہٹ گیا۔

ایک ہفتہ تک ابتدائی انسان کی حرکات و سکنات کا تفصیلی مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے بعد جب لوشیدا نے اپنی رپورٹ تیار کر لی تو دروازے کے اسی سوراخ سے بے ہوش کر دینے والی گیس اندر داخل کر کے رونو کو بے ہوش کر دیا اور اسے اٹھا کر پھر اسٹریچر کے ذریعے کمرہ نمبر ۳ میں لے گیا۔

ریڈیم کا ۱۸ لاکھ سال پرانا ٹکڑا جوں ہی رونو کی کنپٹیوں پر بنے ہوئے نشان میں رکھا گیا اس کے چہرے اور جسم کے سیاہ بال جھڑنے لگے۔ اب اس کی پیشانی بھی نسبتاً چوڑی ہو گئی تھی یہ دور پتھر کا دور تھا۔ جب انسان پتھروں کے اوزار بناتا تھا۔

کمرہ نمبر ۳ میں پتھروں کا ڈھیر جمع کر دیا گیا تھا۔ رونو کو اس کمرے میں پہونچانے کے بعد لوشیدا نے کاغذ پنسل سنبھال لی اس کا خیال تھا شاید اس دور کا انسان گفتگو کرنا سیکھ چکا ہو۔

رونو نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے اپنے جسم کی طرف دیکھا۔ اس دور میں شاید انسان کو اپنی برہنگی کا احساس ہو چکا تھا کیونکہ رونو ہاتھوں سے جسم چھپا کر ایک درخت کی جانب دوڑا اور چار بڑے بڑے پتے توڑ کر رکھے ۔ اور ایک بیل کی پتلی سی شاخ کی مدد سے انھیں کمر پر باندھ لیا ۔ پھر اس کی نظر ایک طرف پڑے پتھروں کے ڈھیر پر پڑی ۔ اس نے فوراً دو پتھر اٹھائے اور انھیں آپس میں رگڑنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک کر دیکھتا اور پھر رگڑنے لگتا۔ جب پتھر نوکیلے ہو گئے تو اس نے انھیں ایک طرف رکھ دیا یہ شاید اس دور کا ہتھیار تھا پھر اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بے ہنگم سی صدا بلند کی۔ لوشیدا کو اس کے نوکیلے دانت دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔

"باوان ۔ بورتیا ۔ باونات"

اب وہ اس طرح ڈکرا رہا تھا جیسے بھوکی بھینس ڈکراتی ہے لوشیدا نے بکری کو اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا رونو نے بکری کو دیکھتے ہی نوکیلا پتھر اٹھایا اور پتھر تاک کر مارا ۔

پتھر کی نوک بکری کے سر میں گھس گئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔

رونو نے اسی پتھر کی مدد سے بکری کے حلق میں شگاف سا بنایا اور خون پینے لگا۔

اچھی طرح سیر ہو جانے کے بعد اس نے بکری کی کھال ادھیڑی اور اسے جسم پر لپیٹ لیا۔ گوشت کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر بڑے بڑے پارچے بنا کر ایک طرف رکھ دیے ۔ شاید ۱۸ لاکھ سال قبل کا انسان گوشت سکھا کر محفوظ کرنے کا طریقہ جانتا تھا۔

اگلے ہفتے میں لوشیدا کو ۱۸ لاکھ سال قبل کے انسان کے بارے میں حیرت انگیز معلومات حاصل ہوئیں۔ اس دور میں انسان اجتماعی زندگی گزارنے لگا تھا۔ یہ لوگ دبلے پتلے اور پستہ قد ہوا کرتے تھے۔ وہ اوزاروں سے کام لینے والے پہلے انسان تھے۔ ان کی گفتگو بہت ٹوٹی پھوٹی اور ذخیرۂ الفاظ محفوظ تھا۔

دوسرے ہفتے رونو اپنے سر میں دھات کے دور کا ریڈیم رکھے کمرہ نمبر ۴ میں بے ہوش پڑا تھا اور لوشیدا اس کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔

رونو ... ل اب بھی لمبے اور گھنے تھے جسم کا روواں البتہ کافی کم ہو چکا تھا۔ اب اس میں پوری طرح انسان کی شباہت پیدا ہو گئی تھی لیکن موجودہ دور کے انسان سے وہ اب بھی مختلف تھا۔

کمرہ نمبر ۴ میں درختوں اور گھاس پھوس کے بجائے ایک کھوہ سی بنائی گئی تھی۔ اس کھوہ کے اندر تاریکی تھی اور لوشیدا نے لوہے کا ایک کلہاڑا خاص طرز کا بنوا کر وہاں پر رکھ دیا تھا جو بالکل ابتدائی دور کا کلہاڑا معلوم ہوتا تھا۔ اور احتیاطاً اس نے رونو کو لباس پہنا دیا تھا۔

لیکن اس مرتبہ ایک عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ رونو کی رنگت ایسی سیاہ ہو گئی جیسے افریقی باشندوں کی ہوتی ہے۔

یوشیدا کو معلوم تھا کہ یہ لوگ گوشت خور ہوتے تھے اس لئے اس نے اپنا گائے پہلے ہی کمرے میں چھوڑ دی تھی کھوہ کے باہر ادھر اُدھر منہ مار رہی تھی۔

ردنو اٹھا۔ اٹھ کر کھوہ سے باہر آیا۔ یوشیدا کو معلوم تھا کہ ردنو کو شدید بھوک لگی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کو کچھ کھائے پیئے چھ گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔ لیکن یوشیدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ردنو نے گائے کی طرف مطلق توجہ نہ دی اور کلہاڑا لے کر ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ کبھی کھوہ میں جاتا کبھی باہر آتا۔

جب بہت دیر اسی طرح چکر لگاتے ہو گئی تو یوشیدا نے یہ خیال کیا کہ ممکن ہے۔ دھات کے دور کے آدمی گوشت بھون کر کھاتے ہوں۔ اس وقت کمرہ۔ بکر میں آگ میں تھی۔ یوشیدا نے عالم بیتاب جاکر فریج میں سے گوشت نکالا۔ جلدی جلدی بھون کر اسے چھت کے میکنزم کے ذریعے کمرے میں گرا دیا۔

ردنو نے ایک گرا ایک ٹکڑا اٹھایا اسے سونگھا اور جھلا کر دور پھینک دیا۔

یوشیدا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے، ادھر ردنو نے اچھل پھاند شروع کر دی تھی۔ شاید یہ کسی قسم کا رقص ہو۔

تھوڑی دیر میں وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ کلہاڑا اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس کی سانس دھیمی ہوتے ہوتے بہت آہستہ ہو گئی تب یوشیدا کو تشویش ہونے لگی کہیں ردنو کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ وہ کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر سکے گا۔ ردنو اس کا بچپن کا ساتھی تھا دونوں ہی جاپان کے صف اوّل کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے شہنشاہِ جاپان نے کئی بار انکی خدمات کو خطابات سے نوازا تھا اور اب وہی ردنو بے دم سا ہو کر گر پڑا تھا۔

یوشیدا بے چین ہو کر کمرے میں چلا گیا اور ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر وہ ردنو کے قریب پہنچ کر نیچے بیٹھ گیا۔

آہٹ پا کر ردنو نے آنکھیں کھولیں۔ سرخ سرخ خون میں ڈوبی ہوئی آنکھیں۔ یوشیدا کو دیکھتے ہی ان میں چمک سی ابھری اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یوشیدا جانے کیوں سہم کر کھڑا ہو گیا۔ ردنو نے بھی جمپ لگائی اور کلہاڑا اٹھا کر یوشیدا کی طرف لپکا۔

جب وہ کلہاڑا اس پر سے بلند کئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا تب یوشیدا کی سمجھ میں آیا کہ ردنو دراصل پتھر کے عہد کے آدم خور قبائل میں پہنچ گیا ہے۔

بقیہ۔ ڈوبنے سے پہلے

"جی... جی... جی... وہ میں"

وہ خاموش ہو گئی شاید کچھ کہتے ہوئے شرما گئی تھی۔

"میں ماں بننے والی ہوں" وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

آواز اگرچہ دھیمی تھی لیکن نیلو فر کو ایسا لگا جیسے اس کے ذہن پر ہتھوڑا پڑا ہو۔ اس کا سارا وجود جھنجھنا گیا اور وہ جیسے طویل نیند سے یکایک جاگ گئی۔ طوفان رک گئے۔ جذبات کا سیلاب ماند پڑ گیا۔ اور اس کے قدم زمین پر جم گئے اس کے دماغ میں پھیلی ہوئی تاریکی ایک دم ختم ہو گئی اور اس کا دماغ منور ہو گیا۔ خواہشات کے بھوت بھاگ کر اپنی اپنی قبروں میں جا سوئے اور وہ انکے حصار سے آزاد ہو گئی۔

وہ تڑپ کر شہزاد کی گرفت سے نکل گئی کرسی کے ہتھے پر پڑا ہوا تولیا اسنے اپنے سینے پر ڈال لیا۔

"تم..... تم کمرے سے نکل جاؤ شہزاد" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"مگر" شہزاد نے کچھ کہنا چاہا۔

اسکی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ پڑی۔

"میں کہتی ہوں کمرے سے نکل جاؤ، ورنہ ——— ورنہ میں شور مچا دوں گی"

اور پھر ——— وہ جلتے ہوئے جہاز کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی ذات کی تہوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

★ ★

بقیہ۔ ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال

ہی تیل کشی اور اس کی صفائی کا کام کرتی ہیں لیکن اب اس کے منافع کا تین چوتھائی ایران اور اس کے باشندوں کے حصے میں آتا ہے۔ آج ایران اپنا مال براہِ راست بین الاقوامی منڈیوں میں ... کرنے کا مجاز ہے جب کہ پہلے یہ اس کے لئے غیروں کا دست نگر تھا۔

ایران کے خام تیل کی صفائی کے لئے دوسرے ملکوں کی شرکت میں وہاں کارخانے بھی تعمیر کئے۔ اسی طرح کا ایک کارخانہ مدراس (ہندوستان) میں بھی قائم ہو چکا ہے۔

لیکن سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جسے انقلاب سفید شاہنشاہ کا نام دیا گیا ہے اس کے نتیجے میں آج ایران کے عوام زندگی کے ہر شعبے میں سرگرم عمل ہیں۔ زمین اور کارخانوں اور صنعتی اداروں کی ملکیت، انتخاب کا قانون اور عورتوں کا حق رائے دہندگی، تعلیم و تدریس پر ہر ایک کا حق (جس کے لئے ...) ... لئے سپاہ ہدایت کی تنظیم ہوئی) عدالتی نظام غرض ہر میدان میں ہر ایک شہری بلا امتیاز برابر کا حصے دار بنا دیا گیا ہے۔

بقیہ بنارس یونیورسٹی

کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

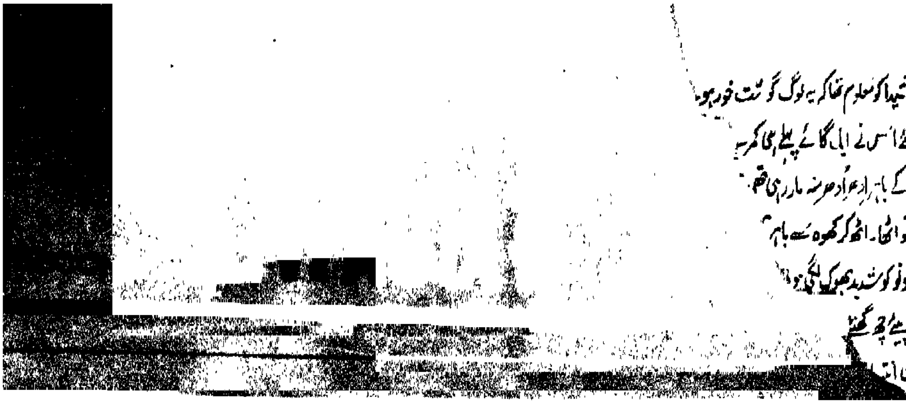
اس وقت سماج وادی یووجن سبھا کا راج ... پارہ پارہ کئے دینا کی کوشش کر رہا ہے ... ہے کہ اس طرح وہ اسٹوڈینٹس یونین پر قبضہ ... کے انتخابات ۲۸ نومبر کو ہونے والے ہیں۔ ... کے ساتھ اس گروپ کا گٹھ جوڑ اس چار جماعتی گٹھ جوڑ ... والا ہے جو لوک سبھا کے عام انتخابات سے قبل ہوا تھا۔ لیکن جس طرح اس چار جماعتی گٹھ جوڑ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اسی طرح یقین ہے کہ یونیورسٹی میں گٹھ جوڑ کرنے والوں کو ناکامی ہوگی۔

... چانسلر ڈاکٹر شریمالی اگر اپنی مضبوط پالیسی پر قائم رہے اور انتشار پسندوں کا ڈٹ کر مقابلہ ... کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہوں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کافی بدنام ہو چکی ہے۔ اگر ڈاکٹر شریمالی اس کی اس بدنامی کو نیک نامی میں تبدیل کر سکے تو یہ انکی بہت بڑی کامیابی ہوگی

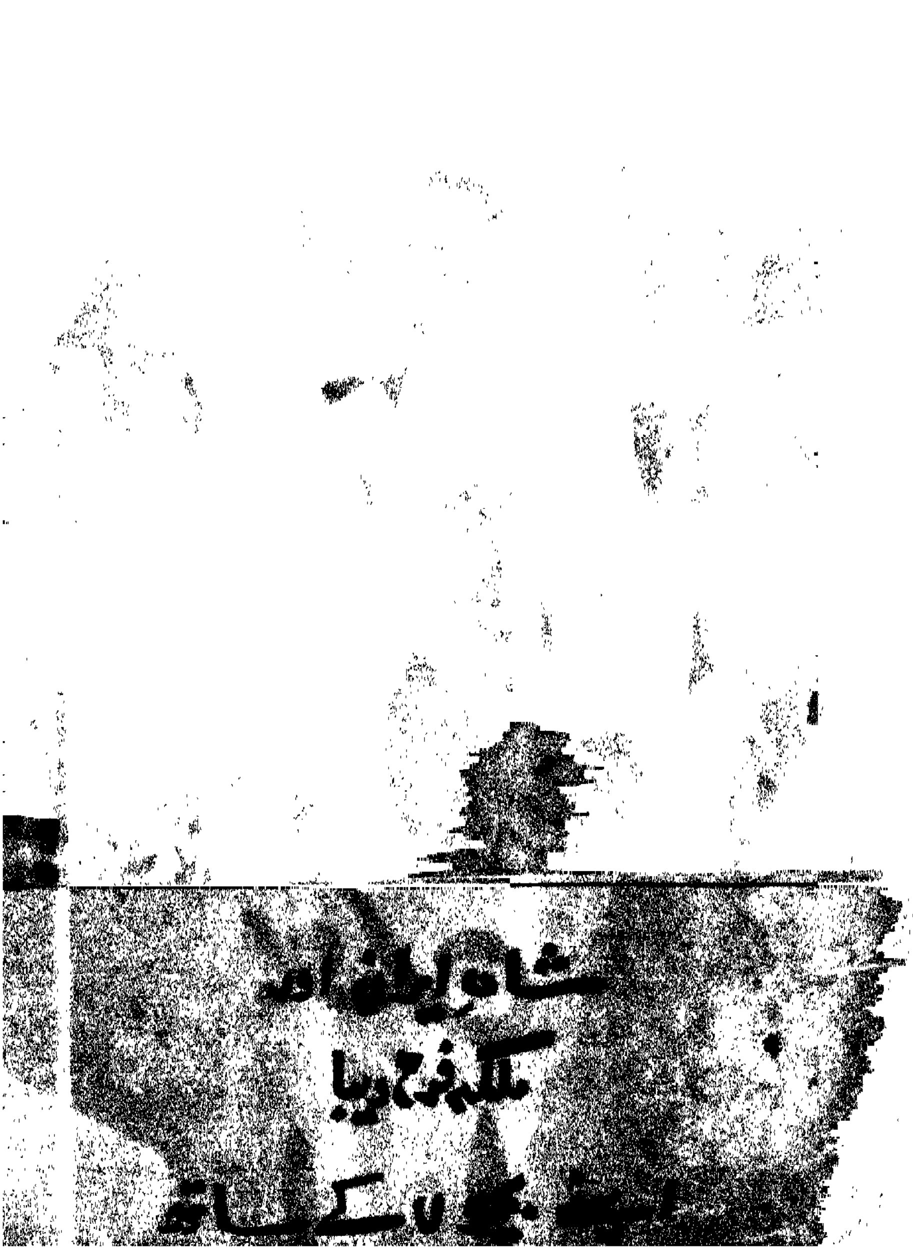
اگست

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ
دیار حسن کی بے صبر خواب
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی
بہت قریں تھا حسینان نور کا

وہ میں فیض راولپنڈی سازش
کیس میں گرفتار کر لیے گئے اور تقریباً پانچ
سال قید رہے۔ فیض جدید دور کے ان
شعرا میں سے ہیں جنہوں نے بین الاقوامی شہرت
حاصل کی ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے
نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے اور ادبی حلقوں
کی امامت بھی کی ہے۔
فیض کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نقش
فریادی، دست صبا، زنداں نامہ



یو شیدا کو معلوم تھا کہ یہ لوگ گوشت خور ہو
اُس لئے اُس نے ایک گائے پہلے ہی کمرے
جو کھوہ کے باہر اِدھر اُدھر منہ مار رہی تھی
دونوں اٹھا۔ اٹھ کر کھوہ سے باہر
تھا کہ دونوں کو شدید بھوک لگی ہو
کھائے پیئے پڑ گئے
حیرت کی انت
کی بات



شاہ ایران اور
ملکہ فرح دیبا
اپنے بچوں کے ساتھ

واقعات

نئی دہلی



چست لباس — آج ہمارے
شئ ایک مسئلہ کی شکل اختیار
کر گیا ہے۔ جس کا ذکر آتے ہی
ہر طرح کے سوالات ہمارے ذہنوں
میں اُبھرتے ہیں جنکا تعلق نہ صرف
انسان کی تہذیب، نفسیات، اخلاق
اور سماج سے ہے بلکہ بڑی حد
تک ... ت سے بھی ہے۔

قیمت 80 پیسے

بیخود دہلوی

بیخود دہلوی کا اصل اسم گرامی سید وحید الدین تھا۔ ۲۰ رمضان ۱۲۷۹ھ کو بھرت پور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم دہلی میں پائی۔ زانوئے تلمذ حضرت داغ کے سامنے تہ کیا۔ داغ کے چیدہ چیدہ شاگردوں میں انکا شمار ہوتا ہے انکی تصانیف میں گفتارِ بیخود اور شہسوارِ بیخود قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی کتاب ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی اور دوسری ۱۳۳۸ھ میں۔



تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

شمع مزار تھی، نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لئے
کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدے کی رسوائیاں ہوئیں
نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگذار تھا

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

• بیخود دہلوی

جنگ اور مسلمان

۳۲ سال پہلے ہٹلر نے اپنے سیاسی وجود کو باقی رکھنے کے لئے "جرمن ریخ" کے نام پر عالم انسانیت کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا لیکن ہٹلر نے جنگ شروع کرنے سے پہلے جرمنی کو صنعتی اور اقتصادی اعتبار سے کافی مستحکم بنالیا تھا۔

آج ۳۲ سال بعد پاکستان کے جنرل یحییٰ خاں نے بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے "اسلام" کے نام پر جنگ چھیڑی ہے لیکن پاکستان کو صنعتی، اقتصادی، فوجی اور اخلاقی اعتبار سے مضبوط و مستحکم ملک بنانے کے بعد نہیں بلکہ اسے کمزور سے کمزور تر بنانے کے بعد۔

ہٹلر اور جنرل یحییٰ خاں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کو اپنے عوام کی مکمل حمایت حاصل تھی اور ثانی الذکر اپنے عوام کی اکثریت کی حمایت سے محروم ہے، ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہٹلر نے اپنی نسل کے لوگوں کا خون بہاکر اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کی کوشش نہیں کی تھی جبکہ یحییٰ خاں نے خود اپنوں ہی کے خون سے اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہم یحییٰ خاں کا ہٹلر سے موازنہ نہیں کرنا چاہتے کہ تاریخ خود اس کا فیصلہ کرے گی کہ انہیں کون اچھا تھا اور کون برا۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پاکستان بڑی بے دردی سے اسلامی اصولوں اور اسلام کی اعلیٰ قدروں کو پامال کرنے کے بعد بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسلام ہی کا نام لیکر اصل مسئلہ کو عوام کی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاکستان کی پروپیگنڈا مشینری موجودہ لڑائی کو اس انداز میں کفر و اسلام کی لڑائی ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے گویا سارا اسلام پاکستان میں ہے اور سارا کفر ہندوستان میں، جیسے پاکستان بننے سے پہلے دنیا میں اسلام تھا ہی نہیں اور پاکستان کے ختم ہونے کے بعد دنیا سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ جبکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے اور اسلام کے نام پر پاکستان میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا ہے اس کی کوئی اور مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہ ملے گی۔

کیا یہی اسلام ہے کہ اپنے ہی بھائیوں کے سر قلم کئے جائیں؛ —— اپنی ہی بہنوں کو سربازار رسوا کیا جائے —— اپنے ہی بچوں اور اپنی ہی ماؤں اور بیویوں کو در در کی خاک چھاننے پر مجبور کیا جائے؟ اور کیا یہی اسلام ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کہی جانے والی ریاست میں شراب و کباب عام ہو، عصمت فروشی اور اغوا، ثواب ہو، ناچ رنگ کی محفلیں جمانا کار خیر سمجھا جائے، اور کوئی شخص تو اتنا کھائے کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے لیکن دوسرا شخص اس کے پڑوس میں دانے دانے کو ترسے؟

اسلام بازیچۂ اطفال نہیں، یہ ایک طرز حیات ہے جس میں فرائض ہی فرائض ہیں، ماں کے فرائض، باپ کے فرائض بھائی کے فرائض، پڑوسی کے فرائض —— حقوق ہی حقوق ہیں —— انسانی حقوق جن کو کچل کر، جنہیں فراموش کرکے اور جنہیں نظر انداز کرکے اسلام ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ پاکستان کے حکمرانوں کو اسلام کا نام لینا زیب نہیں دیتا۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کا مقدس نام پاکستان والے کیوں لیتے ہیں۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں، خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن کو مشکوک بناکر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں —— لیکن اب ہندوستان بدل چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا مسلمان بھی بدل چکا ہے، اس نے محسوس کرلیا ہے کہ وہ پاکستان جو حسین نعروں اور دلکش اصولوں کے پردے میں بنایا گیا تھا، دراصل چند خان بہادروں، سروں، نوابوں، راجاؤں اور رئیس زادوں کی شکارگاہ ہے جہاں غریب مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہندوستان کی رجعت پسند طاقتیں بھی پاکستان کے وجود کو باقی رکھنے میں اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ کافی اہم کردار ادا کر رہی تھیں لیکن وسط مدتی انتخابات کے بعد اس ملک میں ان طاقتوں کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے اس لئے اب پاکستان کے حکمرانوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے جنگ کے سوا کوئی اور راہ نہیں نظر آ رہی ہے اسی

او بات

دسمبر ۱۹۷۱ء

نصف دوم

سال —— پچیس واں شمارہ

مدیر

بدالوحید صدیقی

صدر دفتر

۱۰، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی ۱۳

ٹیلیفون —— ۶۱۹۰۹۵

پی کی قیمت ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپے

ین، نثر و نظم خواہ کسی ذریعہ سے
ل ہوں، ان کے سلسلہ میں خط و کتابت
ہ کی ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
مواد کو شائع کرنے یا شائع نہ کرنے کا مدیر
اختیار ہے۔
ین کے مسودات کو محفوظ رکھنے کا ادارہ
دار نہیں ہے۔

ات میں شائع شدہ مضامین و واقعات
ہلی" کے حوالے سے شائع کرنے کی عام
ت ہے۔

امی اور ادارتی امور متنازعہ کے فیصلہ کا
ر صرف نئی دہلی کی کسی عدالت مجاز کو ہوگا۔

ئین کار —— ای روز —— بہزاد راہی
—— طابع و ناشر: عبدالوحید صدیقی ——
وعہ: بیبل آرٹ پریس، رود گراں، فراشخانہ دہلی

لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔

پاکستان کی عددی طاقت ہندوستان کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اقتصادی طور پر وہ آج بھی امریکا، برطانیا اور فرانس کا طفیلی ہے، حب الوطنی کے فقدان کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ پورا بنگلا دیش پاکستان کے حکمرانوں سے بدظن ہوچکا ہے اور مغربی پاکستان بھی بلوچوں، سندھیوں، پنجابیوں پٹھانوں اور "مہاجروں" کے خانوں میں تقسیم ہوچکا ہے۔ فوجی اعتبار سے بھی پاکستان دوسروں کا محتاج ہے ان حالات میں پاکستانی حکمرانوں نے ہندوستان سے جنگ چھیڑ کر خود ہی اپنی ریاست کی تباہی کا انتظام کرلیا ہے۔

ہم ان لوگوں میں ہیں جنہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی حبُّ الوطنی پر کبھی شبہ نہیں رہا ہم نے ہمیشہ ہندوستانی مسلمانوں کے ردیّہ کو کرب کے اظہار کی علامت سمجھا ہے لیکن ہندوستان میں رجعت پسندوں کے خاتمہ کے بعد اب اس کرب کا بھی خاتمہ ہوچکا ہے۔ ہاں چند ظلمت پسند، مفاد پرست اور جاہل افراد جو بدقسمتی سے مسلمانوں کی قیادت کے دعویدار ہیں انہیں گمراہ کرسکتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خلاف حکومت کی کارروائیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا اس موقع پر اگر خود مسلمان اچھے اور بُرے کی تمیز کرلیں اور ان عناصر کو اپنی صفوں سے خارج کردیں تو ہم پورے یقین کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آنے والا دَوران کے لئے انتہائی شاندار دَور ہوگا۔ اگر اسّی لاکھ سکھ ہندوستان کی قسمت میں دخیل ہوسکتے ہیں تو ۹۰ اکروڑ مسلمان کیوں نہیں ایسا کرسکتے؟ اس سوال پر خود مسلمان غور کریں اور اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کریں ہمیں اس سے انکار نہیں کہ انہیں وقتی طور پر مشکلات کا سامنا ہوسکتا ہے لیکن بنگلا دیش کی آزادی کے بعد ہندوستانی سیاست کا جو نقشہ اُبھر رہا ہے اس میں یہ مشکلات خود بخود دور ہوجائیں گی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا اور یہ دور یقینی طور پر نفرت و تعصب کے بطن سے جنم لینے والے فسادات، اشتعال انگیز نعروں اور تشدّد آمیز ہنگاموں سے پاک ہوگا کیونکہ بنگلا دیش کی آزادی کے ساتھ ہندوستان میں جس نئی سیاسی فکر کو استحکام حاصل ہوگا اسمیں اس قسم کی تخریبی اور نفرت انگیز سیاست کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی

آزاد بنگلا دیش کے قیام کے بعد

جس وقت یہ سطور سپردِ قلم کی جارہی ہیں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان زبردست تصادم جاری ہے۔ مشرقی محاذ پر پاکستان کی فوج تقریباً پسپا ہوچکی ہے۔ لیکن مغربی سیکٹر کی صورت حال واضح نہیں ہے پھر بھی اتنا کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کو اس محاذ پر بھی ہزیمت کا سامنا ہے اسی اثنا میں سلامتی کونسل میں دوبار روس کا ویٹو جنگ بندی کی دو قراردادوں کو ناکام بنا چکا ہے۔ لیکن جنرل اسمبلی نے جنگ بندی کی قرارداد منظور کرلی ہے، ادھر پاکستان میں نورالامین اور ذوالفقار علی بھٹو بالترتیب وزیراعظم اور نائب وزیراعظم و وزیر خارجہ نامزد کئے جاچکے ہیں۔ ان کی نامزدگی کا سبب واضح طور پر یہ ہے کہ پاکستان "سول گورنمنٹ" کے پردے میں بنگلا دیش کے مسئلہ کو چھپانا چاہتا ہے۔ قیاس تو یہی ہے کہ جنرل اسمبلی کی قرارداد بے اثر رہے گی لیکن آنے والے پندرہ دن چند حیرت انگیز واقعات سے پُر ہوں گے۔

حکومت ہند بنگلا دیش کی عوامی جمہوری سرکار کو تسلیم کرچکی ہے۔ بھوٹان نے ہندوستان کی پیروی کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ روس بھی اس حکومت کو تسلیم کرلے لیکن مشرقی یورپ کے ممالک بالخصوص مشرقی جرمنی کی حکومت عوامی جمہوریہ بنگلا دیش کو یقینی طور پر تسلیم کرلے گی اور اگر جنگ بندی ہوتی بھی ہے تو یہ مشرقی بنگال میں کافی اندر، اور مغربی پاکستان میں سرحد سے کافی دور پاکستان ہی کے علاقے میں ہوگی۔

امریکہ کی شکل بگڑ گئی

دنیا کے کسی اور ملک میں امریکہ کی شکل چاہے جیسی ہو کم از کم ہندوستان میں آئندہ پندرہ بیس برسوں تک امریکہ کی بگڑی ہوئی شکل نہ بدل سکے گی۔

آج ہندوستان میں امریکہ کے حکمرانوں کے خلاف نفرت کا وہی جذبہ پیدا ہوگیا ہے جو پاکستانی حکمرانوں کے خلاف ہے اور روس نے سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں

... ہندوستا
اپنی جگہ بنالی ہے۔

سفارتی حلقوں کا خیال ہے کہ امریکہ نے گھڑی پر پاکستان اور چین کا ساتھ دے کر ان تم کو ملیامیٹ کردیا ہے جو اس نے اقتصادی تکنکی امداد کی شکل میں اب تک ہندوستان پر کئے تھے یہ سمجھا جارہا ہے کہ صدر نکسن نے ڈلز کی اس مُردہ کیا ہے جس کا مقصد برصغیر میں سرد جنگ کو مواد جنگ میں بدلنا اور اس علاقہ میں دائمی اضطر کے امریکی مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔ اسی پالیسی پیکٹ کو جنم دیا تھا اور یہی پالیسی سیٹو کے قیام کا

امریکہ نے ہندوستان کی اقتصادی امداد کا اعلان کیا ہے۔ قدرتی طور پر امریکہ کے اس اعلا میں کچھ بے چینی پائی جاتی ہے لیکن ہندوستان کی یہ رہی ہے کہ وہ مادّی امداد کے سوتے کھلے رکھنے امداد دینے والے ملک کا طفیلی نہ بنے گا اس لئے ا بند ہونے سے کچھ پریشانیاں تو پیدا ہوسکتی ہیں لیکن کے ارادوں اور پائے استقلال میں کوئی جنبش نہ

جن سنگھ کی مایوسی

ہندوستان میں جن سنگھ کو امریکی مفادات کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ جن سنگھ کے قائدین دیش کے پردے میں سامراجی پٹھوؤں کا رول اس خوبصورتی ادا کر رہے تھے کہ ان پر شک کرنے والوں پر فوراً غدا لگ جاتا تھا لیکن اب جن سنگھ کی حالت ایک ایسی کشتی جو جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہو اور طوفانوں کے تھپیڑے کرنے کی سکت نہ رکھتی ہو۔ پاکستانی حملہ سے پہلے ج حکومتِ ہند کے خلاف وسوسے پیدا کر رہی تھی اور بیانات بھی دے رہی تھی جن سے یہ شبہ ہو کہ ہند جارحیت کرنے والا ہے۔ جنگ کے بعد جن سنگھ کے توپ خانے کا گولہ بارود بالکل ختم ہوگیا ہے اور د کے ذریعہ اپنے سیاسی وجود کو برقرار رکھنے کی کوشش

ملی، پنجاب، یوپی اور مدھیہ پردیش میں جن سنگھ کی
نڈہ مشینری پوسٹروں اور پمفلٹوں کے ذریعہ عوام کو
ش بھگتی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ خون دینے والوں
بڑی فہرستیں شائع کی جا رہی ہیں۔ جیسے صرف جن سنگھ
لک کے حصہ میں ساری حب الوطنی آگئی ہے اور دوسرے
ں نعمت سے محروم ہیں۔

دھکے رہے نہ ادھر کے رہے

وک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں نے سابق دیسی ریاستوں
ں کے وظائف اور دیگر مراعات ختم کرنے کا بل منظور
ے۔ اب یہ بل ریاستی اسمبلیوں کے سامنے پیش ہوگا۔
لیا جاتا ہے کہ ریاستی اسمبلیاں بدلے ہوئے حالات
ں دپیش کے بغیر پارلیمنٹ کے اس فیصلہ کی توثیق
،۔ اس کے بعد صدر جمہوریہ ہند کے دستخط ہونگے
قانون کی شکل اختیار کرے گا۔ ہندوستان میں
کو عملی شکل دینے میں سابق والیانِ ریاست
اور دیگر مراعات ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتی
منٹ میں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی نے اس بل کی
ت نہیں کی جس سے عوام ایک بار اور ان کی ظلمت
قف ہو گئے ہیں۔ ابتداء میں جب سابق راجاؤں
طور پر ان مراعات سے سبکدوش ہونے کی بات
کے امکانات تھے کہ انہیں کچھ معاوضہ بھی دیا جائیگا
جائیگا کیونکہ نئے قانون میں معاوضہ کی کوئی شق
راجاؤں نے "افہام و تفہیم" سے کام لیتے
مراعات سے سبکدوشی کا اعلان کر دیا
میں کبھی ان کا وقار بڑھتا اور حکومت
معاوضہ دیتی لیکن وسط مدتی انتخابات
تھے کہ ملک کی ترقی پسند قوتوں کو وہ
کو برسرِ اقتدار لے آئیں گے اور ان
اری رہے گا لیکن وقت بڑا بے رحم
راجاؤں کا یہ حال ہے کہ سہ
منم: نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے



اردن کے وزیر اعظم کا قتل

اردن کے شاہ حسین جو الامکھی کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں فی الحال قاہرہ میں ان کے وزیر اعظم مسٹر وصفی تل کو ہلاک کئے جانے کے واقعہ پر اس کے علاوہ کوئی اور تبصرہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ ایک بڑے دھماکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر وصفی عرب لیگ کی دفاعی کونسل میں شرکت کے لئے قاہرہ گئے تھے۔ جہاں انہیں فلسطینی مہاجروں کے لئے غضبناک فدائین نے ۲۸ر نومبر ۱۹۷۱ء کو اسوقت گولیوں کی بارش کر کے موت سے ہمکنار کر دیا جب وہ کانفرنس سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں جا رہے تھے۔

اس سلسلہ میں جن فلسطینیوں کو گرفتار کیا گیا ہے انہیں اس واقعہ پر ندامت کا ذرہ برابر احساس نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ فلسطینیوں کے کاز سے غداری کرنے والوں سے انتقام لینے کے منصوبہ کی پہلی کڑی ہے اور فلسطینی کاز سے غداری کرنے والے کسی بھی شخص کو نہ چھوڑا جائے گا۔"

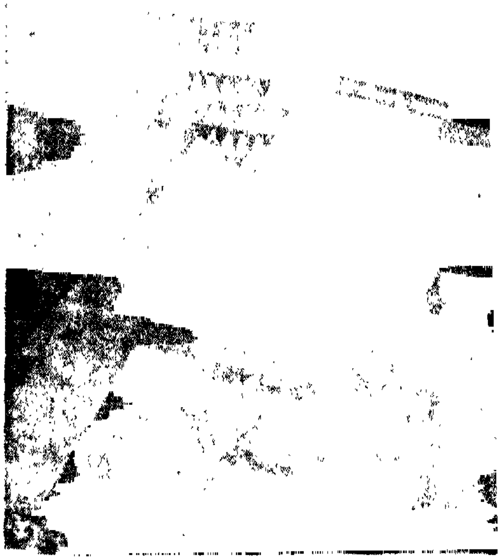
ظاہر ہے کہ اس واقعہ کا عرب دنیا پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بہت سے عرب حکمرانوں بالخصوص شاہ حسین نے اب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اگر انہوں نے فلسطینی مہاجروں سے لاپروائی برتی تو ان کی حکومت کی اور خود ان کی خیریت نہیں ہے۔ مصر کے صدر سادات نے اس المناک واقعہ کی سخت مذمت کی ہے مگر شاہ حسین کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے۔ اور ان کے اس احساس نے شدت اختیار کر لی ہے کہ ان کے اقتدار کو حقیقی خطرات لاحق ہیں۔

یہ دنیا کا غالباً پہلا واقعہ ہے کہ کسی ملک کے وزیر اعظم کو

کارروائی فلسطینی مہاجرین کے ساتھ اور زیادہ سخت ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی بڑی فوجی کارروائی کر کے فلسطینیوں سے اس قتل کا انتقام لیں لیکن کیا کوئی حکمراں اپنے ملک کی آبادی کے اکثریتی طبقہ کے خلاف ظلم و ستم کا چکر چلا کر اطمینان سے حکومت بھی کر سکتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسی کے جواب پر اس ہاشمی سلطنت کا انحصار ہے۔ گزشتہ اگست میں شاہ حسین نے فلسطینی مہاجرین کے خلاف جو مسلح بغاوت پر آمادہ تھے اور گوریلا جنگ کے ذریعہ اردن کی بادشاہت کی چولیں ہلانے میں مصروف تھے سخت اقدامات کئے تھے۔ ان اقدامات ہی کے نتیجہ میں لیبیا، شام، عراق اور چند دوسرے عرب ملکوں نے اردن سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے اور اردنی حکومت کے اقدامات کی شدید مذمت کی تھی۔ خود مصر کے صدر سادات نے بھی شاہ حسین پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ اور اسی وقت سے اردن اور مصر کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ اب مسٹر وصفی کے قتل پر صدر سادات کے مذمتی بیان اور اظہار تاسف و معذرت کے باوجود تعلقات کی کشیدگی بڑھے گی جس کے نتیجہ میں یقینی طور پر اسرائیل کو میدان جنگ میں سزا دینے کی خواہشات بھی مجروح ہوں گی

چونکہ اسرائیل کے حکمرانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اردن میں کسی ایسی حکومت کو برداشت نہ کریں گے جو فلسطینی فدائین یا ان کے مددگاروں کی ہو اس لئے اگر شاہ حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش ہوتی ہے تو اسرائیل کی مداخلت اور اس کے نتیجہ میں نئی جنگ

دلّی کی ڈائری



▶ نمائش کی خاص عمارتوں کے ماڈل۔ قومی ہال اور تین چھوٹے ہال جہاں ہندوستان کی رفتار کے مختلف مناظر کی عکاسی کی جائیگی۔

ایشیا-۷۲ - ہندوستان کی سب سے بڑی نمائش

تلک برج سے شروع ہوکر متھرا تک جانے والی سڑک شمار دہلی کی سنسان ترین سڑکوں میں ہوتا ہے۔ اس سڑک کے نوں طرف دہلی کا کل اور آج پوری فیاضی سے بکھرا ہوا ہے۔ ں برج سے ذرا آگے بڑھتے ہی سڑک کے ایک طرف سپریم کورٹ عظیم الشان عمارت ہے اور اس کے سامنے دور دور تک پھیلا ا نمائش کا میدان۔ نمائش کے میدان سے لگی ہوئی ہلکا صاحب ی درگاہ ہے جس سے ذرا آگے پرانا قلعہ ہے۔ اس کے بارے میں ہا جاتا ہے کہ پہلے یہاں کوروؤں کا قلعہ تھا۔ بعد میں یہاں ہمایون نے اپنا قلعہ تعمیر کیا جسے شیرشاہ سوری نے آخری شکل دی جہاں کبھی پہلے ایشین کھیل ہوتے تھے اور جو ہندوستان میں اپنی قسم کا واحد اسٹیڈیم ہے۔ قلعے سے لگا ہوا بالکل ماڈرن انداز پر بنا ہوا دہلی کا چڑیا گھر ہے جسے ہندوستان کا سب سے بڑا اور خوبصورت چڑیا گھر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چڑیا گھر سے ذرا آگے بڑھتے ہی دہلی کا سب سے مہنگا رہائشی علاقہ سندر نگر شروع ہوجاتا ہے۔ سندر نگر میں اگر آپ بہت خوش نصیب آدمی ہیں تو تین کمرے کا مکان ۳ سے ۴ ہزار روپے مہینے تک کرایہ پر حاصل کرسکتے ہیں۔ ایک کمرے کی برساتی کا کرایہ ۸ سو روپے سے اوپر ہی ہوتا ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کر ہندوستان کا دوسرا رخ ــ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سیکڑوں جھگیاں پھیلی ہوئی ہیں جن کے درمیان میں کھڑا ہوا ہمایون کا مقبرہ ہمیں اس بات کی یاد دلا رہا ہے کہ ہندوستان کے لوگ آج بھی وہیں ہیں جہاں آج سے ہزار سال پہلے تھے (یہ اور بات ہے کہ ہندوستان بذات خود کافی ترقی کرچکا ہے) ہمایون کے مقبرے کے سامنے سڑک کے دوسری طرف حضرت نظام الدین اولیا کا مزار ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کی چوکھٹ پر سیکڑوں شہنشاہوں کے سر جھکے لیکن جو آج خود اپنی بوسیدہ دیواروں کے بوجھ تلے دبی جارہی ہے۔ یہاں بھی آزاد ہندوستان پوری طرح اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ ایک طرف نظام الدین کی خوبصورت کالونی ہے اور دوسری طرف بستی نظام الدین ہے جس کے ہر بوسیدہ اور بدبودار مکان کی دیوار پر لکھا ہوا ہے "غریبی ہٹاؤ"۔ سنا ہے کارپوریشن اس بستی کو ہٹانے کے بارے میں غور کررہی ہے!!

اس طرح دہلی کی یہ شہ ... رہ متھرا روڈ میلوں دوڑتی چلی گئی ہے۔ دنیا اور اپنے وجود سے بے خبر ــ اس کے پاس اپنے سینے پر تیرنے والی کاروں کے لئے بھی اتنی ہی جگہ ہے جتنی کہ اپنے کلیجے سے لپٹ کر سونے والے ہزاروں بے گھر لوگوں کے لئے۔

جیسے ہی سڑک ذرا آگے بڑھتی ہے بڑی بڑی فیکٹریوں اور دھواں اڑاتی ہوئی چمنیوں کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ فیکٹریوں اور جھونپڑیوں کا یہ سلسلہ (کیونکہ بڑی بڑی فیکٹریوں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے) ہریانا میں فریدآباد تک چلا گیا ہے۔

بات ذرا کچھ لمبی کھنچ گئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سڑک اپنی خاص سچویشن کی وجہ سے عام طور پر سنسان رہتی ہے۔ جہاں ذرا شام ہوئی سڑک سونے کی تیاری شروع کردیتی ہے۔ نمائش گراؤنڈ میں ۱۹۶۴ء میں بین الاقوامی نمائش لگی تھی۔ اس کے بعد سے یہ میدان سونا اور اجاڑ پڑا ہے۔ میدان میں درجنوں خوب صورت عمارتیں بکھری ہوئی ہیں جو آہستہ آہستہ دیمک اور بہتے ہوئے وقت کی نذر ہوتی جارہی ہیں لیکن اب اس سڑک پر ایک بار پھر گہما گہمی شروع ہوگئی ہے ــ وجہ ہے ۱۹۷۲ء میں ہونے والی ایشین نمائش جو ہندوستان میں اب تک ہونے والی نمائشوں میں سب سے بڑی ہوگی۔ دن رات لگ کر نمائش کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ سوئی ہوئی عمارت کو پھر سے جگانے کی کوشش کی جارہی ہے، مٹی ہوئی تصویروں میں پھر رنگ بھرے جارہے ہیں لیکن یہاں صرف گزرے ہوئے کل کو نہیں جگایا جارہا ہے بلکہ آنے والا کل بھی تعمیر کیا جارہا ہے۔

ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے نمائش پر کروڑوں روپے خرچ کیا جانا چاہئیں یا نہیں۔ یہ تو ایک سیاسی سوال ہے جس کا جواب دینے کی کوشش یہاں نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ نمائش کا پروگرام بن چکا ہے اور اس کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ اس لئے ہمیں اس بات سے دلچسپی ہے کہ یہ نمائش کس قسم کی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہم نے مسٹر محمد یونس سے ملاقات کی جو اس نمائش کے مہتمم خاص ہیں۔ آپ وزارت تجارت میں سکریٹری اور اسٹرنگ کمیٹی کے چیرمین ہیں۔ یونس صاحب نے ہمیں پورے میدان میں سیر کرائی۔ ہر جگہ مشینی رفتار سے کام ہورہا ہے۔ پرانی عمارتوں اور سڑکوں کو توڑا جارہا تھا۔ اس کی جگہ نئی عمارتوں کی بنیادیں رکھی جارہی ہیں۔ یونس صاحب نے ہمیں بتایا کہ اس مرتبہ ایسی عمارتیں بنائی جائیں گی جو مستقل قائم رہیں اور ہمیشہ کام آتی رہیں۔ دہلی کا شمار دنیا کے اہم ترین شہروں میں ہوتا ہے اس لئے یہاں کسی ایسی جگہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں ہر سال مختلف قسم کی نمائشیں اور میٹنگیں وغیرہ کرائی جاسکیں اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ایک بہت بڑے کمپلیکس کی تعمیر کی جارہی ہے۔ اس کمپلیکس میں ایک بہت بڑا "قوموں کا ہال"، "انڈسٹریل کا ہال"، "اسمبلی ہال"، ریسٹورانٹ، تھیٹر، خوب صورت باغ اور نمائش کا مرکزی دفتر ہوگا۔ نمائش کی

یت اس لئے زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ ۱۹۷۲ء میں ہندوستان
آزادی کی سلور جوبلی منائی جارہی ہے۔ اس موقع کا خاص
یلین "ہندوستان کا ارتقاء" ہوگا۔ اس میں تصویروں
موں اور فلموں کے ذریعے ہندوستانی تاریخ کی عکاسی
جائے گی۔ اسے بنانے کے لئے ہندوستان کے بہترین آرٹسٹوں
ئنروں اور معماروں کی مدد حاصل کی جارہی ہے۔ اس
ین کے چاروں طرف باہر کی دیواریں، فلمی اسکرین کا کام
یں گی جن پر ہر وقت ہزاروں انسانی جسموں اور چہروں کی
ویریں بدلتی رہیں گی۔ اس پویلین میں یہ دکھایا جائے گا کہ
ندوستان کتنا مختلف ہونے پر بھی ایک ہے۔ اس نمائش کا
سرا خاص پویلین جواہر لال نہرو پویلین ہوگا جس میں نہرو اور
رو کے ہندوستان کی عکاسی کی جائے گی۔

اب تک ۵۴ ملک اس نمائش میں حصہ لینے کی دعوت
طور کرچکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے تمام ملکوں کو اس نمائش
حصہ لینے کی دعوت دی گئی ہے۔ لیکن اب تک چین کو دعوت
نہیں بھیجا گیا۔ امید ہے کہ جلد ہی چین کو بھی دعوت نامہ
ج دیا جائے گا کیونکہ بغیر چین کے حصہ لئے "ایشیا ۔۔۔ ۷۲ء"
مکمل رہے گی۔ آج تک ہندوستان کی کسی نمائش میں
تنے زیادہ ملکوں نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ ان تمام ممالک کے
یلین الگ الگ ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے
ختلف صوبوں، بڑے بڑے اداروں اور کمپنیوں کے پنڈال
لیحدہ لگیں گے۔ نمائش میں درجنوں تھیٹر، ریسٹورانٹ،
ں کے کھیل کود کے سامان اور ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بھی
گا۔ ہوٹلوں میں ہندوستان کا ہر کھانا ملے گا۔ یونس صاحب
نے بتایا کہ مسز گاندھی نمائش میں بذات خود دلچسپی لے رہی ہیں
وہ چاہتی ہیں کہ یہ نمائش ایک نمونہ بن جائے، ایک یادگار ہو جائے
س میں دکھایا جاسکے کہ ہندوستان نے پچھلے پچیس سال میں کتنی
رقی کی ہے۔

نمائش کے میدان میں ابھی نئی خوبصورت عمارتیں تو
ہیں کھڑی ہوئی ہیں البتہ یہاں کام کرنے والے مزدوروں
جھگیوں کی قطاریں ضرور لگ گئی ہیں۔ میں جھگیوں کے پاس
سے گزرا تو مزدور شام کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے
ینٹوں پر ابلتا ہوا ان کا کھانا، درجنوں بیماریوں کے شکار ان
کے بچے۔ ٹھنڈ میں سکڑتی ہوئی ان کی عورتیں اور سر دہواؤں میں
لڑتی ہوئی ان کی جھونپڑیاں چیخ چیخ کر ہندوستان کی ترقی اور
خوش حالی کا اعلان کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا
واقعی ہمیں دنیا کو دکھانے کے لئے ایک نمائش کی ضرورت
ہے۔ ایسی نمائش جہاں ہندوستانی نہیں بلکہ ان کی خوبصورت
تصویریں ہوں۔

کھیل کا کھیل:

دہلی میں کھیلوں کے ساتھ بھی کھیل کھیلا
جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ڈی۔ سی۔ ایم فٹبال ٹورنامنٹ کے منتظمین
نے فٹبال کے شائقین کے ساتھ ایک کھیل کھیلا۔ فٹبال
طاقت کا کھیل ہے اور طاقت کے استعمال میں اس کے شائقین
بھی کچھ پیچھے نہیں رہتے۔ فٹبال میچوں میں دنیا کے ہر ملک میں
جھگڑے ایک عام چیز ہیں۔ دہلی کے دہلی کلاتھ مل فٹبال ٹورنامنٹ
میں محمڈن اسپورٹنگ کلکتہ اور بارڈر سکورٹی فورس کے
درمیان کچھ جھگڑا ہوا جو بہت جلد تماش بینوں کا باہمی جھگڑا
بن گیا۔ ریفری راؤ نے محمڈن کے حق میں گول دیا لیکن بارڈر
سکورٹی فورس نے اور کچھ تماش بینوں نے ریفری کا فیصلہ
ماننے سے انکار کر دیا۔ تماش بینوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔
اور کھیل ملتوی کر دیا گیا۔ ہوسکتا ہے ریفری غلط ہو لیکن
کھلاڑیوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ریفری کے فیصلے کا
احترام کریں۔ کھلاڑی تو ایک طرف رہے۔ خود ڈی۔ سی۔ ایم
کے منتظمین نے فیصلے کا احترام نہیں کیا اور میچ دوبارہ کھلانے
کا فیصلہ کر لیا۔ محمڈن نے دوبارہ میچ کھیلنے سے انکار کر دیا
جس کے نتیجے میں بی۔ ایس۔ ایف کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

ٹورنامنٹ کے منتظمین کے فیصلے کے پیچھے جو کہانی ہے
وہ کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ منتظمین ہمیشہ مقبول ٹیموں
سے زیادہ سے زیادہ میچ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمڈن
اس وقت ہندوستان کی مقبول ترین ٹیم ہے اور اس کے میچوں
میں منتظمین کو سب سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ بی۔ ایس۔ ایف
اور محمڈن کا کھیل ملتوی ہونے کی صورت میں منتظمین کو آمدنی
کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ محمڈن کے ایک میچ میں منتظمین
کو تقریباً ۴۵ ہزار روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ محمڈن نے
منتظمین کی اس حرکت کو دیکھ کر ان سے ۵ ہزار کی جگہ جو ان
کے لئے منظور کئے گئے تھے، ۸ ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا جو منتظمین
نے دینے سے انکار کر دیا۔ محمڈن نے اس بنا پر کھیل میں حصہ لینے
سے انکار کر دیا اور بی ایس ایف کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

کھیل ملتوی ہو جانے کی صورت میں ہار جیت یا گول کے
صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ ال انڈیا فٹبال فیڈریشن کو کرنا چاہئے
تھا لیکن ڈی سی۔ ایم نے اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے غلط
راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی جو اس قسم کے ٹورنامنٹ کے
لئے خطرناک ہے۔ موہن بگان نے پہلے ہی اس ٹورنامنٹ
میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے۔ اور اب شاید بنگال کی دوسری دو
مقبول ٹیمیں ایسٹ بنگال کلب اور محمڈن اسپورٹنگ بھی اس
میں حصہ لینا چھوڑ دیں گی۔

بال یوگیشور کے چیلے ۔۔۔ اہنسا کے پجاری؟

پچھلے کچھ دنوں سے دہلی کے ہر گلی کونے اور پتھر پر نیلی، کالی
اور لال سیاہی سے کچھ جملے لکھے نظر آرہے ہیں۔ جملے کچھ اس قسم کے
ہیں "پالم چلو ۔۔۔ بال بھگوان آرہے ہیں" یا "رام لیلا میدان
میں امن بم پھٹنے والا ہے ۔۔۔ بال بھگوان آرہے ہیں" یہ جملے
ہندی، اردو اور انگلش تینوں زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں۔
۱۲ سالہ بال یوگیشور دنیا کے سفر کے بعد۔ دنیا کو امن کا پیغام دینے
کے بعد ۔۔۔ ہندوستان واپس آئے تھے۔ دہلی کے ہندی اور
روزنامہ نو بھارت ٹائمز نے بال بھگوان سے ہوائی اڈے پر
لیا ہوا ایک انٹرویو شائع کیا جس سے بھگوان کے بہت سے
چیلے ناراض ہو گئے۔ چیلوں کی ایک بھیڑ نے بہادر شاہ ظفر
روڈ پر واقع ٹائمز آف انڈیا اور نو بھارت ٹائمز کے دفتر پر حملہ
کر کے درجنوں لوگوں کو زخمی کر دیا۔ دفتر کے شیشے توڑ ڈالے
فائل اور دوسری چیزیں نکال کر پھینک دیں۔ ایک درجن سے
زائد لوگ (جن میں دفتر کا چوکیدار بھی شامل تھا) بہت بری طرح
زخمی ہوئے۔ اگلے روز ایک کانسٹبل محمد لطیف زخموں کی تاب
نہ لاکر جاں بحق ہو گیا۔ چوکیدار کی حالت ابھی تک خطرے میں ہے
چیلوں کے خلاف قتل کا الزام درج کر لیا گیا ہے۔ کچھ
گرفتاریاں بھی عمل میں آئی ہیں۔ پولیس کی طرف سے محمد لطیف
کی بیوی اور بچے کو ڈھائی ہزار روپے دیئے گئے ہیں صحافیوں
کی انجمن نے بھی اس حملے کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ انہوں
نے کہا ہے کہ اگر اس طرح کی حرکتیں ہوتی رہیں تو اخباروں کی
آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔

امن کے پجاریوں کا یہ کارنامہ دیکھنے اور کچھ دوستوں سے
ملنے میں بھی ٹائمز آف انڈیا کے دفتر گیا۔ کارنامہ دیکھ کر یقین
آگیا کہ جو کچھ سنا تھا واقعی سچ ہے۔ کانوں سنی جھٹلائی جاسکتی
ہے پر آنکھوں دیکھی نہیں۔

ہھر کبھی پشیماں نہ ہوئے۔ بہادر وہ ہے جو
ست کو خندہ پیشانی سے تسلیم کر لے اور دوبارہ کامیابی
رنے کی سنجیدہ کوشش کرے۔ جو لوگ اپنی کھلی ہوئی
کو بھی کسی کیمیائی عمل کا نتیجہ قرار دیں اور آنکھیں بچتے
ی حقائق کا مطالعہ نہ کریں انہیں دور اندیش کون
گزشتہ وسط مدتی انتخابات کے دوران ملک کی
پسند طاقتوں نے برسر اقتدار آنے کا ایک حسین خواب
تھا لیکن جب بیلٹ بکس کھلے تو اس حسین خواب کی
بھیانک تعبیر برآمد ہوئی۔ رجعت پسندوں کو زبردست
امنا کرنا پڑا اور اس شکست کی خفت مٹانے کے لیے
نے طرح طرح کے بہانے تراشے۔ سب سے پہلے شیو سینا کے
اکرے صاحب نے یہ اعلان فرمایا کہ رجعت پسندوں کو یہ
ت روسی بیلٹ پیپروں کی وجہ سے ہوئی۔ دہلی میں شری
مدھوک نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بڑے کروفر
ستھ فرمایا کہ ان بیلٹ پیپروں پر ایسا کیمیائی عمل کیا گیا تھا
ت پسندوں کے لیے لگائی جانے والی مہریں اڑ گئیں۔
نگریسی امیدواروں کے نام کے خانے میں پہلے سے لگائے
، نہ نظر آنے والے نشانات اُبھر آئے ـــــ اس طرح
ں نے اپنے حامیوں اور ہمدردوں کے حوصلے بلند کرنے
شش کی۔

لیکن میسور اور دہلی کی ہائی کورٹوں نے جب یہ فیصلہ
ہ یہ سب غلط ہے کہ بیلٹ پیپروں پر کوئی کیمیائی عمل کیا
ھا، تو ایک بار پھر ان رجعت پسندوں اور ظلمت پرستوں
لے چانٹوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اب سنا گیا ہے کہ شری
مدھوک دہلی ہائی کورٹ کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں
ظاہر ہے کہ عدالتیں انصاف کرنے کے لیے ہیں نہ کہ ان
ں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو تمناؤں کو
نت کا نام دیتے ہیں۔ جو لوگ عدالتوں کے فیصلوں کا

بھی احترام نہ کر سکیں ان سے کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کا احترام کریں گے۔ دراصل رجعت پسندی نام ہی ہے "ہٹ دھرمی" اور ضد کا اور نئے ہندوستان میں ان چیزوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

جرم و سزا : جرائم کے سلسلہ میں ضوابط کی اصلاح کے لیے اس اصول کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو۔ اس لیے لا کمیشن کی اس سفارش کو بروقت اور برمحل سفارش کہنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے کہ اقدام خودکشی کو جرم نہ قرار دینا چاہیئے۔

تعزیرات ہند پر چونکہ انگریزوں کی زبردست فکری چھاپ ہے اس لیے ہمارے ملک کے بہت سے قوانین اور ضابطے فوری تبدیلی اور ترمیم کے متقاضی ہیں۔ انہی ضوابط میں خودکشی کی کوشش کو جرم قرار دینے کا ضابطہ بھی شامل ہے مروجہ قانون کے مطابق خودکشی کی کوشش کرنے والا ایک سال کی قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستحق ہے۔ حالانکہ خودکشی کوئی جرم نہیں ہے یہ ایک ایسی کوشش ہے جو انسان کسی دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے خلاف کرتا ہے۔ تعزیرات ہند نے اس حقیقت کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے کہ خودکشی صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے یا جو دماغی مریض ہوتے ہیں، حالات کی سختیاں، مقصد کے حصول میں ناکامی اور امید پر یاس کا غلبہ یہیں وہ اسباب جو کمزور ـــ دل و دماغ کے لوگوں کو خودکشی پر ابھارتے ہیں اسلیے ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کی جائے اور یاس کا شکار ہونے والوں کا علاج کیا جائے۔

گجرات اور دوسرے علاقوں میں جو سروے کیا گیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ خودکشی کرنے والوں میں بڑی تعداد ان عورتوں کی ہوتی ہے جو ناخوشگوار ازدواجی زندگی کی وجہ سے شدید مایوسی کا شکار ہو جاتی ہیں لہٰذا اس قسم کی اصلاحات نافذ کی جانی چاہئیں کہ ہندو میرج ایکٹ کے تحت شادی کی عمر بڑھا دی جائے اور بچپن کی شادیوں پر پابندی کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ لا کمیشن نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ موت کی سزا برقرار رکھی جائے۔ ہمارے خیال میں یہ سفارش بھی ایسی ہے جسے مان لینا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں دہشت انگیزی اور تشدد پسندی کا ماحول ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ مارنے اور مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، اگر موت کی سزا نہ رہی تو قتل کے واقعات بڑھ جائیں گے ـــــ بلاشبہ پھانسی کا تصور بہتوں کو دوسروں کی جان لینے سے روکنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ اس لیے اس تصور کو باقی رکھنا ابھی ضروری ہے۔

کہانی جنتر منتر روڈ کی : ۱۶ / نومبر کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر ۷۔ جنتر منتر روڈ کو نئی دہلی کے ایک مجسٹریٹ مسٹر اے جی کاٹنگ کے حکم سے "سر بمہر" کر دیا گیا اور اب عدالت ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ ۱۹۴۷ء سے غیر منقسم کانگریس کا "صدر مقام" رہنے والی یہ تاریخی عمارت کس کو ملے گی۔ ۷۔ جنتر منتر روڈ کو سر بمہر کرنے کا حکم عدالت نے پرانی کانگریس کے جنرل سکریٹری مسٹر منو بھائی پٹیل کی درخواست پر دیا ہے۔

جس وقت عدالت کا ایک کارندہ پولیس کی ایک ٹکڑی کے ساتھ عمارت میں تالا لگانے کے لیے پہنچا۔ اس وقت مسٹر صادق علی صدر پرانی کانگریس عمارت کے ایک رہائشی کوارٹر میں عمارت پر نئی کانگریس کے کارکنوں کے قبضے کے خلاف بھوک ہڑتال پر تھے۔

عدالت کے اس فیصلہ کے بعد انہوں نے اپنا چار روزہ برت توڑ دیا اور کہا کہ "جس مقصد کے لیے انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کی تھی وہ کافی حد تک حاصل ہو گیا ہے"

چونکہ یہ معاملہ اب عدالت کے دائرہ اختیار میں چلا گیا ہے اسلیے اس کے محاسن پر بحث نہیں کی جا سکتی لیکن یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی روشنی میں کانگریس وہی ہے جس کے صدر مسٹر سنجیویا ہیں۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ انتخابی نشان کے کیس میں دیا ہے۔ الکشن کمیشن نے وسط مدتی انتخابات سے کچھ پہلے "دو بیلوں کی جوڑی" کا نشان اندرا کانگریس کو دیا گیا تھا جس کے خلاف پرانی کانگریس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ پھر یہ نشان "منجمد" کر دیا گیا تھا۔ اور نئی اور پرانی دونوں کانگریسوں نے نئے نشانات سے کر الکشن لڑا تھا۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ پرانی کانگریس پر ایک اور ضرب سے کسی طرح کم نہیں۔ اب کم از کم یہ بات تو طے ہی پا چکی ہے کہ اصل کانگریس ہونے کا اس کا دعویٰ غلط تھا۔ اگر پرانی کانگریس کے لیڈروں میں کھلاڑیوں کی اسپرٹ ہوتی تو وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی دستوریا

صادق صاحب کا انتقال

سید میر قاسم

واقعات کی آخری کاپیاں پریس جارہی تھیں کہ وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر خواجہ غلام محمد صادق کے انتقال کی اطلاع ملی۔ موصوف گزشتہ ایک ماہ سے چنڈیگڑھ کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں زیر علاج تھے۔ صادق صاحب سیکولرزم اور سوشلزم کا ایک اہم ستون تھے انہوں نے ہمیشہ فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے خلاف خود کو سرگرم عمل رکھا اور ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان سے قریب تر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ فروری ۱۹۶۴ء میں ریاست کی زمام حکومت سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنی متوازن آزادانہ اور نرم پالیسی کے ذریعہ کشمیریوں اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو پہلے سے زیادہ مستحکم بنایا اور ظاہری رکاوٹوں مثلاً وزیر اعظم اور صدر ریاست کے عہدوں کو ختم کرکے ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح وزیر اعلیٰ اور گورنر کے عہدے قائم کئے ——— وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ۱۲ر دسمبر کو رام لیلا میدان میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے ٹھیک ہی کہا ہے کہ صادق صاحب ہماری جنگ آزادی کے ایک بڑے رہنما تھے ——— ان کے جانشین سید میر قاسم بھی مضبوط ارادوں کے انسان ہیں اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ صادق صاحب کے انتقال سے ریاست میں جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ جلد پورا ہو جائے گا۔

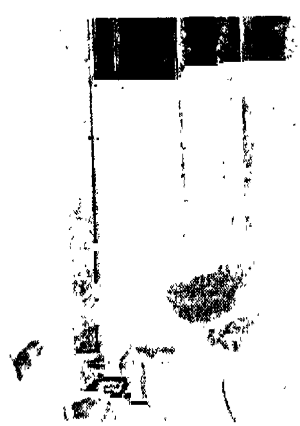
کا خود ہی احساس کر لیتے اور پیچھے ہٹ جاتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اب بھی عدالتوں کے چکر کاٹ رہے ہیں مگر سوال یہ ہے عدالتوں کے فیصلوں کی بنیاد پر وہ اپنے سیاسی وجود کو کب تک برقرار رکھ سکیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ سیاسی مقبولیت عوامی طاقت سے حاصل ہوتی ہے۔ عدالتی فیصلوں سے نہیں اس لئے اب بھی وقت ہے کہ پرانی کانگریس کے "بزرگ رہنما" اپنی حکمت عملی بدلیں

وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم رہ کر اپنا "امیج" نہیں بنا سکتے انہیں حال کے مسائل کو سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ اور درخشاں مستقبل کا صاف نقشہ بنانا ہوگا کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے وہ ماضی کی زندگی میں خود کو جکڑ کر زندگی گزارنا نہیں پسند کرتے اور حال کو بہتر بنانے اور مستقبل کے سنوارنے کے متمنی ہیں۔

●●●



جنتر منتر روڈ پر عدالت کے حکم سے تالا لگانے کا منظر



واقعات کا نیا دو

واقعات کا یہ شمارہ غیر معمولی تاخیر سے ش
ہو رہا ہے لیکن واقعات کو ناظرین کی خواہشات
پسند کے مطابق بنانے کے لئے یہ تاخیر ناگزیر تھی
ہمیں امید ہے کہ ناظرین ہمیں اس تاخیر کے لئے مع
فرمائیں گے۔

آپ دیکھیں گے کہ زیر نظر شمارہ میں کچھ انق
تبدیلیاں کی گئی ہیں اور بہت سے نئے دلچسپ عنوا
کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ہم کچھ اور تبدیلیاں بھی کرنا چا
تھے لیکن مزید تاخیر شاید آپ کے صبر کے پیمانہ کو لبریز
اور حالات بھی اس کے متحمل نہ ہو سکتے، اس لئے ہم
یہی مناسب سمجھا کہ جلد از جلد واقعات آپ کے ہاتھ
میں پہنچ جائے لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ شما
شمارہ سے بھی کہیں زیادہ بہتر دلچسپ اور پرکشش ہو
ہمیں یقین ہے کہ آپ اس شمارہ کے سلسلہ میں اپ
سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وا
حالات کے تقاضوں کے مطابق آپ سب کی خدمت
لیکن اس کے لئے آپ کے تعریفی خطوط سے زیادہ آپ
بے لاگ تبصروں کی ضرورت ہے تاکہ ہم ان تبصروں ک
میں واقعات کو آپکی توقعات کے مطابق بنا سکیں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ موجودہ حالات میں
معیاری جریدے کو باقاعدگی سے جاری رکھنے کیلئے فوا
عزائم اور بے پناہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ
اور وسائل اس وقت تک کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جب
ہمیں اپنے سرپرستوں، خیر خواہوں اور ہمدردوں
مکمل تعاون نہ حاصل ہو، ہمیں یقین ہے اور ہم
وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعاون ہمیں پہلے
ملتا رہا ہے اور آئندہ بھی ملتا رہے گا۔

انشاءاللہ اب "واقعات" پابند
وقت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا
گا اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش
جاری رکھی جائیں گی۔ ●●

ایک فوجی بغاوت

• ٹائم میگزین (نیویارک)

آج کل ہم بنگلا دیش کے مسئلے پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہیں اور اپنے اردگرد کے دوسرے بہت سے اہم ترین حالات تک سے ناواقف ہیں۔ حال ہی میں تھائی لینڈ میں فوجی بغاوت ہوئی لیکن اس اہم مسئلے پر ہماری کوئی توجہ نہ مبذول ہوئی۔ اس واقعہ پر "ٹائم میگزین" (نیویارک) نے ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے: "فوجی بغاوت تیزی کے ساتھ اور خون خرابے کے بغیر وجود میں آئی۔ خصوصی فوجی دستوں اور چند ٹینکوں نے بنکاک میں نیشنل سیکورٹی کمان کے اردگرد مورچے سنبھال لئے اور تھائی لینڈ کے باشندوں سے کہا گیا کہ وہ ریڈیو پر ایک خصوصی اعلان سننے کا انتظار کریں۔ پھر انھیں یہ خبر سنائی گئی:

تھائی لینڈ کے تین سالہ آئین اور پارلیمنٹ کو کالعدم قرار دیدیا گیا ہے اور وزیر اعظم تھانوم کتی کاچورن کی قیادت میں ایک فوجی حکومت برسر اقتدار آگئی ہے۔ ظاہری امن وسکون کیلئے فوجی حکومت نے سخت فوجی ضوابط نافذ کر دیئے ہیں۔ سارے ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ سرسری سماعت کے بعد موت تک کی سزا دینے کے احکامات جاری کر دیئے گئے اور ۵ سے زیادہ افراد کے سیاسی اجتماع کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ نئی حکومت عملی طور پر اسی ٹولی سے مشابہ ہے جو سابقہ حکومت پر قابض تھی۔ اس میں نرم گفتار وزیر اعظم تھانوم کے ساتھ ہی سخت مزاج پرپھاس چاروساتھین بھی شامل ہے جو رائل تھائی آرمی کمانڈر انچیف ہونے کی وجہ سے ملک کا سب سے طاقتور شخص ہے۔ بظاہر تو امریکا سے تھائی لینڈ کے پرانے دوستانہ تعلقات میں کوئی ضعف پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے لیکن وزیر اعظم تھانوم نے اسوقت تک امریکی سفیر لیونارڈ کو ٹیلی فون پر فوجی بغاوت کا سبب نہیں بتایا جب تک ریڈیو پر اسکا اعلان نہیں ہوگیا۔ اس فوجی بغاوت کا خاص سبب تھانوم نے یہ بتایا ہے کہ اب چین اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا ہے اور تھائی لینڈ کے تیس لاکھ چینی — آبادی کا دسواں حصہ — اس کا خاص اثر قبول کریں گے لیکن انکی اصل خفگی پارلیمنٹ کے خلاف تھی جس کے بہت سے ارکان نے دھمکی دی تھی کہ اگر کابینہ نے ان کے ۵۰ ہزار ڈالر سالانہ بھتوں کو دوگنا نہ کر دیا تو وہ فوجی بجٹ منظور نہ ہونے دیں گے۔ یہ فوجی انقلاب ایسے وقت میں آیا ہے جب تھائی لینڈ کی معیشت میں امریکا کے فوجی اخراجات اور امداد میں کمی کی وجہ سے ضعف آرہا ہے اور اس ملک کی خاص برآمدی اشیاء ربر، ٹین اور چاول کے دام گر رہے ہیں۔ جرائم جن میں رہزنی اور آبروریزی کے واقعات شامل ہیں بڑھ رہے ہیں۔

برطانیہ نے گھٹنے ٹیک

• (انڈین ایکسپ

حکومت برطانیا اور روڈیشیا کی سفید فام حکو

درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس پر سب سے بھرپور تبصرہ

کے وزیر اعظم مسٹر ایان اسمتھ نے معاہدے کے خیر مقد

میں کیا ہے۔ انکی خوشی جائز بھی ہے کیونکہ عملی طور پر ا

کی وجہ سے روڈیشیا میں سفید فام اقلیت کی برتر

بنانے میں مدد ملے گی۔ مسٹر اسمتھ نے بہت ہوشیاری کے

کو سمجھوتا قرار دیا ہے درا صل وہ برطانیا کی طرف سے

کا اقدام ہے۔ سر ایلک ڈگلس ہوم نے سیلسبری میں مس

سے مذاکرات کے لئے لندن سے روانہ ہونے سے قبل ا

تھا کہ روڈیشیا سے جو بھی معاہدہ ہوگا وہ چھ سال قبل بر

سے پیش کردہ ۵ نکات کی حدود ہی میں ہوگا۔ لیکن اب

آئی ہیں کہ برطانوی وزیر خارجہ کے دورۂ روڈیشیا

سے قبل ہی معاہدے کا مسودہ تیار کیا جا چکا تھا حالانکہ

کو برابر یہی اطلاع دی جاتی رہی کہ ابھی تک برطانیا اور ر

کے درمیان بہت سے نازک سوالات پر اختلافات پایا

معاہدوں کی شرطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور ۵ نکا

اہم اصولوں کو قطعی ٹھکرا دیا گیا ہے لیکن اکثریت کی حک

لئے جب تک کوئی میعاد مقرر نہ ہو اسوقت تک رفتہ ر

اکثریت کی حکومت کی راہ ہموار کرنے کی بات بالک

افکار و آثار

مصر کی طاقت میں اضافہ

• نیوز ویک (نیویارک)

جب سے گزشتہ گرمیوں میں امریکا نے اسرائیل کو فینٹم طیاروں کی فراہمی روکی ہے تب ہی سے یروشلم کی حکمراں ٹولی امریکا کا ذہن بدلنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے۔ اسرائیلیوں نے فینٹم کے سوال کو اپنی مہم کے طور پر سیاسی رنگ دینے کی بھی کوشش کی اور امریکا میں آباد یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارے لیکن ابھی تک وہائٹ ہاؤس اس زبردست دباؤ کے سامنے نہیں جھکا ہے۔ حال ہی میں اس دباؤ کو کم کرنے کی واضح کوشش کے طور پر وزیر خارجہ ولیم روجرس نے ایک میگزین انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ "اسوقت فینٹم طیاروں کی ڈلیوری ضروری نہیں ہے کیونکہ روس نے مصر کو اپنی مغربی امداد میں "ضبط" کا مظاہرہ کیا ہے"۔

لیکن ان کے اس انٹرویو کی اشاعت کے چند دنوں بعد ہی وزیر خارجہ نے خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر یہ تسلیم کر لیا کہ روسیوں نے مصر کو فوجی امداد دینے میں احتیاط اور ضبط کا مظاہرہ قطعی نہیں کیا ہے۔ دفتر خارجہ نے یہ بیان اس اطلاع پر دیا کہ حال ہی میں روسی پائلٹوں نے "چھ تا آٹھ" ٹی یو ۱۶ بمبار طیارے مصری ہوائی اڈوں پر پہنچائے ہیں اور ان سے نہ صرف اسرائیل کی زمینی تنصیبات بلکہ امریکا کے چھٹے بیڑے کیلئے بھی خطرہ ہے۔ مصر کے اسلحہ خانے میں ان طیاروں کے اضافے کے حوصلے پست ضرور کئے ہیں لیکن اکا دکا اسرائیلی ہی یہ کہتے ہیں کہ ملک فوجی اعتبار سے مصر سے پیچھے ہے۔ ایک اسرائیلی فو... کا کہنا ہے کہ "اس کے نتیجے میں صرف یہ ہوگا کہ اگر جنگ چھڑی تو ہم جیت تو جائیں گے لیکن ہمارا خون زیادہ بہے گا اور یہ واشنگٹن کے سر ہوگا"۔







بیسور کو آزاد کرانے کے بعد ایک ہندوستانی ٹینک ڈھاکا کی جانب بڑھ رہا ہے

◀ گریٹر کیلاش نئی دہلی میں عوامی جمہوریہ بنگلا دیش کی چانسری بنگلا دیش کا پرچم لہرایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے جو خوشی سے ناچ رہے تھے۔

نئی دہلی میں بنگلا دیش مشن کے چیف کی اہلیہ ہندوستان کی ◀ جانب سے بنگلا دیش کی عوامی جمہوریہ کو تسلیم کرنے کے اعلان کے بعد بنگلا دیش مشن میں شیخ مجیب الرحمٰن کی فوٹو کی گلپاشی کرتے ہوئے

ہے۔ ملک کی پارلیمنٹ میں افریقی باشندوں کی (جو اکثریت میں ہیں) نمائندگی بڑھانے کے لئے جو ضوابط طے کئے گئے ہیں وہ انتہائی الجھے ہوئے ہیں۔ موجودہ ریپبلکن آئین نے افریقی ووٹروں کے لئے جائداد اور آمدنی کی شرطیں لگا رکھی ہیں۔ برطانوی وزیر خارجہ کو سٹر اسمتھ سے افریقیوں کے لئے جو واحد رعایت حاصل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اب افریقی ووٹروں کے لئے آمدنی اور تعلیم کی شرطیں ہوں گی۔ معاہدے کی رو سے افریقی نمائندوں کی تعداد میں اضافے کی رفتار المناک حد تک سست ہو گئی ہے اور پچاس لاکھ سیاہ فام باشندوں کے نمائندوں کی تعداد پانچ لاکھ سفید فام اقلیت کے نمائندوں کی تعداد کے برابر ہی ہو سکے گی۔ اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اگر برطانیا نے اس معاہدے کی روشنی میں سفید فام روڈیشیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا تو سلیسبری کی حکومت ان قواعد میں مزید ترامیم کر کے افریقیوں کو نقصان پہونچانے والے اقدامات نہ کرے گی۔ ساتھ ہی جب روڈیشیا قانونی طور پر آزاد ملک بن جائے گا تو وہ آزادانہ اقدامات کریگا

اور برطانیا سے کسی معاہدے کا پابند نہ رہ جائے گا لیسے روڈیشیا کے افریقی باشندوں کو انکے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہاں اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ سیلسبری میں جو معاہدہ ہوا ہے اسکا صحیح جواب اقوام متحدہ کی سیاسی کمیٹی نے برطانیا کی مذمت کر کے دیا ہے کہ وہ روڈیشیا

کی سفید فام اقلیتی حکومت کو ختم کر کے افریقی اکثریت اقتدار سپرد کرنے کی کوشش کرنے سے منکر ہے۔ اب برطا جو معاہدہ کیا ہے وہ دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے ہے اور ا معاہدے کے بعد افریقی باشندوں کو اس بات پر یقین ہ کہ وہ اپنے حقوق صرف طاقت کے استعمال سے ہی چھین

پھول اور کانٹے

ہائٹ ہاؤس نے صدر یحییٰ خاں پر دباؤ ڈالا ہے کہ
ی کے لیڈروں سے بات چیت کریں۔

لین جنرل صاحب تو مورچہ پر جانے کا اعلان کر چکے
ت چیت کیسے شروع ہوگی۔

رانتی دل نے دوسروں کے تعاون سے ایک نئی
ہ کا اعلان کیا ہے۔

ائی کانگریس والوں کو یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے
ہ اور فوراً چرن سنگھ سے مل کر اس بیل کو منڈھے
ی کوشش کرنا چاہئے تاکہ سیاسی جمود انہیں ناکارہ
ے۔

سٹر چوان کو امید ہے کہ صارفین کی زبردست تحریک
ھنے سے روکے گی۔

لیکن مسٹر چوان کو ہوشیار رہنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ
نہیں ہی ہڑپ کر جائیں۔

ارلیمنٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ چھ ریاستوں میں
ا قربانی کے واقعات ہوئے۔

میں خوش ہونا چاہئے کہ کم از کم ایک میدان میں تو
ں سب سے آگے ہے۔

—— صدر یحییٰ خاں نے کہا ہے کہ چین پاکستان کی مدد کریگا۔

★ لیکن یہ امداد اقوام متحدہ میں ہمدردی کی تقریروں کے انجکشن ہی ہوں گے اور صرف ہمدردی کے انجکشن کسی کی طاقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

—— غازی آباد میں جن سنگھ کے اجلاس میں پارٹی کے صدر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے اعلان کیا ہے کہ جنگ کی صورت میں ان کی پارٹی حکومت کی مکمل حمایت کرے گی۔''

★ معاف کیجئے باجپئی جی! اندرا سرکار کو آپ کی حمایت نہ چاہئے کیونکہ ۱۹۶۵ء میں آپ کی حمایت کا نمونہ دیکھا جا چکا ہے۔ آپ کا کام غلط فہمیاں پھیلانا ہے۔ لگے رہئے اس کام میں۔ بھگوان بھلا کرے گا۔

—— جن سنگھ شہری جائدادوں کی حد مقرر کرنے کے حق میں ہے۔

★ لیکن سرمایہ داروں کی تجوریوں کی بھی کوئی حد مقرر کی جائے، یہ اسے تسلیم نہیں ہے کیونکہ اس کا کام ہی ان تجوریوں کی وسعت سے چلتا ہے۔

—— تامل ناڈو کی ڈی ایم کے سرکار نے حکم دیا ہے کہ مندروں میں ''ارچنا'' کے لئے تامل زبان استعمال کی جائے۔

★ جن سنگھ والوں کے لئے اب ہندی میں نماز ادا کرنے کا حکم دینے کے لئے آسانی پیدا ہو جائے گی۔ دیکھئے لسانی تعصب ہمیں کہاں لے جاتا ہے۔

—— دہلی میں ایک بیوی نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا۔

★ یہ بھی ترقی کی ایک علامت ہے۔ کتا تو انسان کو کاٹتا ہی ہے، اہمیت اس واقعہ کی ہوتی ہے کہ آدمی کتے کو کاٹ لے۔

—— جیل میں تصادم کی تحقیقات کلکتہ کا ایک جج کریگا۔

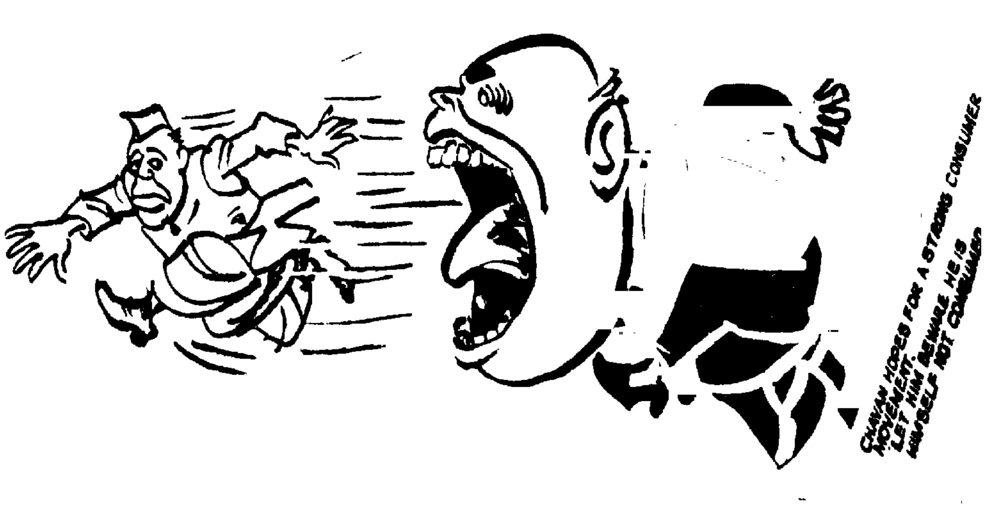
★ جیل سے جج کا کیا تعلق؟ یہ کام تو کسی قیدی کے سپرد کرنا چاہئے جو جیل کے حالات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔

—— دہلی پولیس نے فیصلہ کیا ہے کہ پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران اخباری نمائندوں کو جرائم کے اعداد و شمار نہ بتائے جائیں گے۔

★ فیصلہ مناسب ہے لیکن کیا دہلی پولیس پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران جرائم کو بھی روک سکے گی؟

—— جن سنگھ کی لیڈر شپ کا ایک طبقہ سابق دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کے وظائف ختم کرنے کا حامی ہو گیا ہے۔

★ ضرورت کے لئے لوگ مذہب تک بدل لیتے ہیں اس لئے اگر سیاسی فائدہ کے لئے کچھ جن سنگھیوں نے اپنا بنیادی نظریہ بدل دیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ حیرت تو اس وقت ہوگی جب جن سنگھ والے رجعت پسندی ترک کر کے ترقی پسندی کی راہ اختیار کریں گے۔ ★



مشرقِ وسطیٰ میں جنگ کا بگل بجنے لگا



مشرقِ وسطیٰ میں گزشتہ چند ماہ کی خاموشی بالکل ایسی خاموشی تھی جیسے کہ طوفان سے پہلے ہوا کرتی ہے۔ یہ بات صدر انور سادات کے اس بیان سے ظاہر ہوگئی ہے جس میں انھوں نے اعلان کیا ہے کہ "اب اسرائیل کے ساتھ جنگ ناگزیر ہے"

دراصل اب سے چند ہفتے قبل جب انھوں نے مصری فوجوں کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کیا تھا اسیوقت ڈپلومیٹک حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ صدر انور سادات کوئی اہم قدم اٹھانے والے ہیں۔

عید کے موقع پر وہ نہر سوئز کے علاقے میں پہونچے، مصری دفاعی مورچوں کا جائزہ لیا اور فوجی جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "جنگ کی گھڑی آپہونچی ہے اپنے ملک کا دفاع کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

صدر انور سادات کا یہ اعلان ان کے اس عزم کا اعادہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کا مسئلہ اسی سال کے اختتام تک پُر امن طریقے پر یا جنگ کے ذریعے حل ہو جانا چاہیے۔ گزشتہ جولائی میں انھوں نے اس سال کو ایک فیصلہ کن سال قرار دیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ موجودہ غیر یقینی صورتِ حال کو زیادہ عرصے نہیں چلنے دیا جاسکتا۔ ہر حالت میں اسی سال کے دوران مسئلے کا حل نکلنا چاہئے۔ اس وقت شاید انکے اس اعلان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور نام نہاد بڑی طاقتیں یوں ہی معمولی سی کوششیں کرکے رہ گئیں۔

امریکا نے چار بڑی طاقتوں کے "دھڑے" سے الگ ہوکر ایک انقلابی قدم اٹھایا اور امریکی وزیرِ خارجہ دکھاوے کے لئے قاہرہ اور تل ابیب بھی گئے لیکن معاملہ جوں کا توں رہا مسٹر راجرس چپ سادھ کر بیٹھ گئے اور مشرقِ وسطیٰ کے مطلعِ سیاست پر خاموشی اور سکون کے بادل چھا گئے۔

اس دوران افریقی اتحاد کی تنظیم میں کچھ حرارت ضرور پیدا ہوئی جس کے ایک وفد نے جو سینیگال کے صدر لیوپولڈ سینگھور کیمیرون کے صدر احمد واحد جو، نائجیریا کے صدر یعقوب گوواں اور زئیر (سابق کانگو) کے صدر جوزف موبوٹو پر مشتمل تھا اسرائیل اور مصر دونوں ملکوں کا دورہ کیا۔

ان چاروں سیاستدانوں کا خیال تھا کہ عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان صلح صفائی کرانے کے لئے ان پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ افریقہ کے ایسے بہت سے ممالک ہیں جن کے دوستانہ تعلقات اسرائیل کے ساتھ بھی ہیں اور عرب ممالک کے ساتھ بھی۔ سینیگال کے صدر لیوپولڈ سینگھور نے کہا: "جب آپ کے دو دوستوں کے درمیان اختلافات ہوں تو سب سے بڑی ذمے داری آپ پر ہے کہ ان میں صلح صفائی کرا..."

اس خیال سے افریقی تنظیم کی طرف سے ایک وفد دونوں ملکوں کے دورے پر بھیجا گیا لیکن اس دورے کے بعد کچھ پتا نہ چلا کہ صلح کے میدان میں کس حد تک پیش رفت ہوئی۔ فضا میں ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔

اور اب اس خاموشی کو صدر انور سادات نے اس دھماکے سے توڑا ہے کہ "اسرائیل کے ساتھ جنگ ناگزیر ہے"۔ انھوں نے اپنی تمام بری اور فضائی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دیدیا ہے اور پُر امن کوششوں کے سلسلے میں امریکا کے ساتھ اپنے تمام رابطے ختم کر لئے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ امریکا نے اپنی پالیسی بدل لی ہے اور اب وہ اسرائیلی مقاصد کے لئے کام کر رہا ہے۔

صدر سادات کے اس اعلان پر امریکا میں تشویش کا اظہار ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اظہار تشویش کے علاوہ امریکا کے بس میں اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اسرائیل کو اس بات کیلئے رضامند نہ کرسکا کہ وہ نہر سوئز کی واگذاری کیلئے بات چیت کرنے سے قبل مقبوضہ علاقوں کو خالی کردے وہ اسے رضامند کر بھی نہ سکے گا بلکہ یقین ہے کہ اسرائیل کو مزید فینٹم طیارے مہیا کرنے پر رضامند ہو جائے گا جنکے لئے اسرائیل مطالبہ کر رہا ہے اسلئے کہ ۱۹۷۲ء صدارتی انتخاب کا سال ہے جب امریکا میں ہر پارٹی یہودی وو... کے لئے روایتی طور پر "اسرائیل نواز" بن جاتی... بھی اسرائیل نواز تھے اور اب اور بھی بن جائیں گے۔

سادات کے اعلانِ جنگ پر امریکا نے ابھی... اٹھایا ہے لیکن افریقہ کے چار دانشور دورے د... پہونچے جہاں انھوں نے صدر سادات اور وزیر... ڈاکٹر محمد فوزی سے خصوصیت کیساتھ بات چ... تنازعہ کو پُر امن طور پر حل کرنے کے لئے کچھ تجاویز... لیکن خبر ہے کہ مصری لیڈروں نے صاف کہہ دیا کہ... اسرائیل اقوامِ متحدہ کے نمائندہ ڈاکٹر گنار یار... فروری کے سوالنامے کا تسلی بخش جواب نہ دے... عرب علاقوں کو خالی نہ کرے گا اس وقت تک ا... بات چیت نہیں ہو سکتی نہ کسی تجویز پر غور ہو سکتا...

لیکن کیا اسرائیل ان شرائط پر بات چیت کر... تیار ہو جائے گا۔؟

وہ بات چیت کے لئے نہیں جنگ کے لئے تیا... اسی تیاری کے سلسلے میں وزیر اعظم اسرائیل مسز گو... کے دورے پر روانہ ہو رہی ہیں۔

یہ ایشیا کی بدقسمتی ہے کہ یورپین ممالک با... جنگیں بڑھا رہے ہیں اور ایشیائی ممالک اپ... خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

یا
ندوستان
ار
سلمان

ظہیر محسن



حال ہی میں "عصری ہندوستان اور مسلمان" کے موضوع پر ایک آل انڈیا سروے کروایا گیا تھا جس کے بعد بہت سی چونکا دینے والی باتیں سامنے آئی ہیں اس سروے کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ فرقہ واریت کا زہر ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے خون میں رچ بس گیا ہے، دونوں فرقوں کے لوگ معاشی مشکلات سے دوچار ہیں لیکن مسلمان معاشی طور پر کچھ زیادہ ہی پست ہیں۔ ایک سال تک ملک کے مختلف حصّوں میں گھومنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ نام نہاد مسلم سماجیات کے ماہروں کو حقیقت کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ اپنے بنگلوں میں بیٹھ کر ایک ایسے فرقے کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہیں جس کے مسائل بہت زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہیں۔ یہ اسکالرز اونچے اور تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں بھوک، احتیاج، بے غیرتی اور پولیس کی ناانصافیوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں جبکہ عام مسلمانوں کے لئے یہ دن رات کی باتیں ہیں۔ ان اسکالرز میں اگرچہ بہت سے مسلمان بھی ہیں لیکن انہیں ان معنوں میں مسلمان نہیں کہا جاسکتا جس سے ایک پریشان حال اور پچھڑے ہوئے طبقے کے معنی مقصود ہوں۔ یہ لوگ صاف ستھرے بنگلوں میں رہتے ہیں اپنے بچّوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، گھریلو بات چیت تک میں انگریزی کا استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی "خوبیاں" ان کے رہن سہن میں پائی جاتی ہیں جن کے بارے میں ایک عام مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے ان اسکالرز کے طریقۂ زندگی سے قطعاً نفرت نہیں ہے۔ مجھے اعتراض ہے تو صرف اتنا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے اتنی دُور ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسلم سماجیات کے ماہر کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ جو کچھ بھی مسلمانوں کے متعلق لکھتے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی میں لکھتے ہیں جبکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت انگریزی سے ناواقف ہے۔ یہ ایک طرح کی سعئ لاحاصل ہے۔ اگر انہیں مسلمانوں سے واقعی دلچسپی ہے اور یہ اس فرقے میں کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اس فرقے کی زبان ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کریں نہ کہ کسی دوسری زبان میں۔ اس کے علاوہ ان اسکالرز نے کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ مسلمانوں کے حقیقی مسائل کو جاننے کے لئے ان کی گندی بستیوں میں جاکر صورتِ حال معلوم کی جائے۔ کسی بھی فرقے کے سماجی اور معاشی مسائل کے متعلق لکھنا اور صوفوں پر بیٹھ کر کسی افسانے کا پلاٹ مرتب کرنا دو جداگانہ کام ہیں پہلے کام کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کو حقیقت کا پوری طرح اندازہ ہو اور وہ جو بھی بات لکھے، پوری ذمّہ داری سے لکھے۔ افسانہ لکھنے کے لئے یہ سب کچھ ضروری نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں، جو چاہیں وہ لکھ سکتے ہیں بلہ

ہندوستان کے کسی بھی فرقے کے مسائل کو عمومی حیثیت نہیں دی جاسکتی اور یہی حال مسلمانوں کے مسائل کا بھی ہے۔ اب تک بہت سے لوگوں نے تمام ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ ایک ہی زاویۂ نگاہ سے لیا ہے۔ اس طرح کا رویہ نہ صرف غلط ہے بلکہ خطرناک بھی ہے — کیونکہ اُتر پردیش کے مسلمان کے مسائل کیرالا میں رہنے والے مسلمان سے قطعی مختلف ہوں گے۔ اس چیز کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلمان بہت زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں لیکن اس سے کیا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ زور صرف اس بات پر دیا جاتا ہے کہ مسلمان کیا ہیں، یہ جاننے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے کہ وہ ایسے کیوں ہیں، یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ مسلمان تعلیمی میدان میں بہت زیادہ پیچھے ہیں لیکن تعلیمی پچھڑے پن کا تعلق معاشی پچھڑے پن سے ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان کٹّر قسم کے مذہبی لوگ ہوتے ہیں اسی لئے وہ جدید تعلیم حاصل نہیں کرتے بلکہ صرف دینی تعلیم پر ہی زور دیتے ہیں۔ یہ پوری طرح صحیح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ معاشی پریشانیاں انہیں تعلیم کی طرف راغب ہی ہونے نہیں دیتیں۔

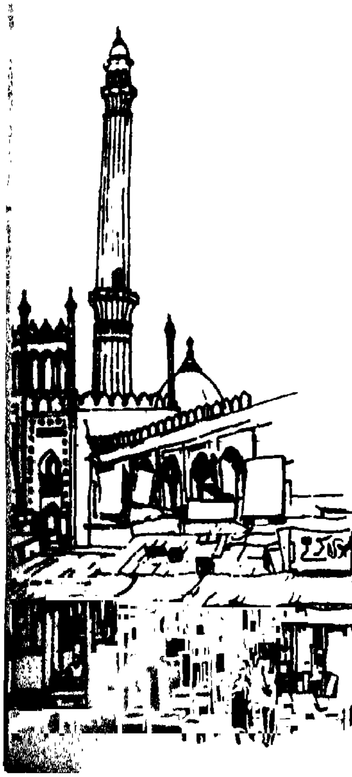
مسلمان آج کے ہندوستان کا شاید سب سے غریب طبقہ ہے۔ چھ افرادِ خاندان کی اوسط آمدنی مشکل سے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کے قریب آتی ہے۔ جب میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول کیوں نہیں بھیجتے تو انہوں نے جو جواب دیا وہ نہ صرف چونکا دینے والا تھا بلکہ افسوس ناک بھی۔ اس جواب کو سننے کے بعد مسئلہ کا بالکل نیا پہلو سامنے آیا۔ انہوں نے کہا

کہ ہم بچوں کو اسکول میں پڑھانے کی سکت نہیں رکھتے اس لئے نہیں کہ ہم معمولی سی فیس یا کتابوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے بلکہ ایک بچے کو اسکول میں بھیجنے کے بعد ہم اس کی آمدنی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ایک کم عمر کا لڑکا مختلف قسم کے کام کرسکتا ہے مثلاً پالش کرنا، اخبار بیچنا یا ہوٹلوں میں نوکری کرنا، جس سے وہ کم از کم آٹھ بارہ آنے یومیہ کما لیتا ہے اس طرح اس کے خاندان کو بیس پچیس روپیہ ماہوار کی آمدنی ہوجاتی ہے۔ اب اگر وہ اسی لڑکے کو اسکول میں پڑھاتے ہیں تو نہ صرف اخراجات بڑھ جائیں گے بلکہ انہیں اس لڑکے کی آمدنی ملنی بھی بند ہوجائے گی۔ اس طرح یہ ان کی معاشیات کا مسئلہ ہے جو ان کے بچوں کی تعلیم کے آڑے آرہا ہے نہ کہ ان کی کٹر مذہبی ذہنیت ـــــ جیسا کہ بہت سے لوگ سوچتے ہیں۔

اسی ضمن میں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا سوال بھی آتا ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے، اس کا سیکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ اسے سیکھے بغیر جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنا ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسکولوں میں مادری زبان پڑھائی جانی چاہئے۔ تعلیمات کے ماہروں کا خیال ہے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے بچے کی دماغی صلاحیت تیز رہتی ہے اور وہ ان خیالات کو جنہیں وہ سوچتا رہتا ہے بہ آسانی بیان بھی کرسکتا ہے۔ آجکل کے کانونٹ اسکولوں میں صرف انگریزی ہی میں تعلیم دی جاتی ہے اور طالب علم کی مادری زبان کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری تہذیبی جڑیں کس قدر کھوکھلی ہوچکی ہیں! اسی کے ساتھ اُردو زبان کی ترقی و ترویج اور اُردو کے مدارس کے قیام کا مسئلہ ہے۔ بیشتر مقامات پر اُردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ آندھرا پردیش اور یو۔ پی میں اردو کو خاص مقام دینے کے صرف وعدے کئے گئے ہیں لیکن ان وعدوں کو عملی صورت دینے کی فرصت کسی کو نہیں۔ یہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے اور اس کی ذمہ داری حکومت کے ساتھ ساتھ محبانِ اُردو پر بھی عائد ہوتی ہے جو حکومت تک صحیح طور سے نمائندگی نہیں کرتے۔

نصابی کتابوں اور خصوصاً علم تاریخ کی کتابوں میں غلط بیانی سے کام لینا آجکل عام ہوگیا ہے۔ جب سے مسٹر اوک نے تاج محل کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ تاج محل شاہ جہاں نے نہیں بنوایا تھا بلکہ یہ ایک راجپوت راجہ کا محل تھا تب سے اس قسم کے بہت سے "تاریخ داں" پیدا ہوگئے ہیں جو مغلوں کے دورِ حکومت کو بہت زیادہ مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خصوصاً اورنگ زیب نشانہ بنایا جاتا ہے اور غلط قصّوں سے فرقہ دارانہ جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ بچّوں کے ذہنوں کو گندگی سے بھر دینے کی یہ کوشش یقیناً مضرت رساں ہے۔ اس طرح یہ تاریخ داں ان بادشاہوں سے انتقام نہیں لے سکتے بلکہ خود اپنی آنے والی نسل کو اندھیرے میں رکھ رہے ہیں۔ جب تک ہمارے بچوں کو اپنی صحیح تاریخ معلوم نہ ہوگی وہ ہندوستان کو صحیح طور پر کس طرح سمجھ سکیں گے۔ آج اسکول کی یہ کتابیں پڑھ کر ایک بچہ صرف ہندو اور مسلمان ان دو لفظوں میں سوچتا ہے اور اس کا ذہن نفرت اور تعصب کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور یہی نفرت آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں پھوٹ پڑتی ہے۔

معاشی پچھڑے پن سے ہندو بھی اتنے ہی پریشان ہیں جتنے کہ مسلمان۔ یہ مسئلہ کسی ایک فرقے کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ جب تک ملک معاشی طور پر مستحکم نہیں ہوجاتا تب تک وہاں کے عوام کی معیشت کس طرح سدھر سکتی ہے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے معاشی پچھڑے پن کی کچھ خاص وجوہات بھی ہیں اور ان وجوہات کا تعلق ہماری تاریخ کے چند ناخوشگوار واقعات سے ہے۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے دورِ حکومت میں مسلمان معاشی طور پر اتنے زیادہ پریشان نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں۔ اس زمانے میں زمین داری قائم تھی اور انگریزوں کی نظرِ کرم کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت اس زمین دارانہ ماحول میں خوشحال تھی لیکن آزادی کے بعد نقشہ بالکل بدل گیا۔ زمین داری سسٹم ختم کردیا گیا اور مسلمانوں کو بیشتر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان بحیثیت ایک اسلامی "ملک کے صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کی پوزیشن بہت زیادہ نازک ہوگئی ـــ زمین داری کے زمانے میں مسلمانوں نے آنے والے دنوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ انہوں نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور نتیجہ میں وہ سائنسی اور ٹکنیکل علوم میں پیچھے رہ گئے۔ اس لئے انہیں ملازمتیں حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں کچھ تو اس لئے کہ انہوں نے ضروری تعلیم حاصل نہیں کی اور کچھ پاکستان بن جانے کی وجہ سے ان پر بلاوجہ شک کیا جانے لگا ہے۔ آج ہمارے لیڈر اگر یہ کہہ دیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ملازمتوں کے حاصل کرنے میں تعصب نہیں برتا جاتا ہے اور اس سیکولر ہندوستان میں سب کو برابری کے حقوق حاصل ہیں تو اس سے کام نہیں بنتا۔ اس سروے کے دوران اکثریت نے (جن میں ہندو بھی شامل تھے) اس بات کا اقرار کیا کہ مسلمانوں کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ملازمتوں میں خصوصاً پولیس اور فوج میں انہیں نہیں لیا جاتا۔ کیا مسز اندرا گاندھی اس بات سے انکار کرسکتی ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے انہیں پولیس اور فوج میں ملازمتیں دی جائیں تبھی وہ ملک کی ترقی میں صحیح طور پر ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس سکھ رجمنٹ ہے مراٹھا رجمنٹ ہے حتیٰ کہ بہار رجمنٹ بھی ہے لیکن افسوس مسلمانوں کی کوئی رجمنٹ نہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ



اس بات پر سنجیدگی سے غور کرے اور مسلمانوں کی ایک علیحدہ ریاست قائم کرے۔ بی۔ ایم۔ کول نے بھی اپنی حالیہ تصنیف (CONFRONTATIONS WITH PAKISTAN) میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یونین پبلک سروس کمیشن کے جو امتحانات ہوتے ہیں ان میں بھی مسلمان امیدواروں کو بہت کم کامیاب کیا جاتا ہے اور وہ اچھے عہدے حاصل نہیں کر پاتے۔ آزادی کے بعد ہونے والے تمام I.A.S امتحانات کی فہرست اٹھا کر دیکھی جائے تو پتا چلے گا کہ ان میں مسلمان امیدواروں کا اوسط فیصد ایک سے بھی کم ہے۔ یہ کارنامہ ہے اس ذہنیت کا جو مسلمانوں کو اپنا تاریخی دشمن سمجھے ہوئے ہے اور انہیں معاشی میدان میں پچھاڑ دینے کے درپے ہے۔



جہاں تک مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی اقتدار کو بچانے کا سوال ہے تو یہ مسئلہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک سی نوعیت کا نہیں ہے کیونکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی ایک تہذیب نہیں ہے۔ اُردو کے مسئلہ کو لیجیے، یہ یو۔پی، بہار اور آندھرا پردیش کے مسلمان کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے لیکن تامل ناڈ، کیرالا اور بنگال کے مسلمان کے لئے یہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہندوستان میں اردو کے ساتھ سوتیلی اولاد کا سا سلوک کیا جانے لگا ہے۔ کانگریسی حکومت اس کے ساتھ تعصب کا برتاؤ جاری رکھے ہوئے ہے اور اسے وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی یہ زبان مستحق تھی۔ اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ میرے نزدیک صرف یو۔پی کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ مسلمان ہندوستان کے ہر حصے میں آباد ہیں اور وہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں، پھر ان کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ مسلمانوں کی جذباتیت نہیں تو اور کیا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کو پورے ملک کے مسلمانوں کے وقار کا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ اس طرح کی جذباتیت یقیناً مضر ہوتی ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ حکومت اس یونیورسٹی کے ساتھ جانب دارانہ رویّہ اپنائے ہوئے ہے اور اس پر آرڈی نینس کا نفاذ غیر جمہوری ہے لیکن اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دے کر جذبات میں بہنا غیر عقلی ہے۔ اس کے لئے اس یونیورسٹی کے طلباء اور یو۔پی کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ حکومت سے اپنی بات منوالیں۔

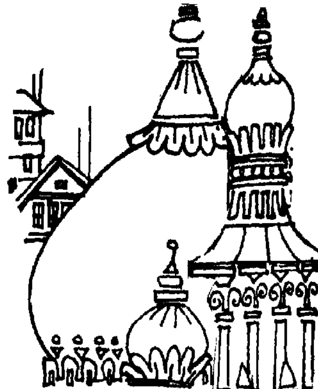
مسلم پرسنل لا کا تعلق یقیناً ملک کے تمام مسلمانوں سے ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم اور نازک مسئلہ ہے اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ غور و خوض کے بعد کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات کی خواہاں ہے کہ ان کا علیحدہ قانون رکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کا تعلق شریعت سے ہے اور شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمانوں کا اس طرح سوچنا بالکل صحیح ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کا جذباتی ہونا غیر فطری نہیں۔ عملی طور پر بہت کم مسلمان چار شادیاں کرتے ہیں اور اکثر جائداد وغیرہ کے جھگڑے بھی شرعی قانون سے طے نہیں کئے جاتے لیکن علیحدہ قانون کے لئے ان کی یہ ضد صرف اس لئے ہے کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور مذہب نام ہے اندھے اعتقاد کا۔

جب ایک شخص سے یہ پوچھا گیا کہ کیا چار شادیاں کرنے کے رواج کو ختم کر دینا چاہیے تو اس نے بہت دلچسپ بات کہی۔ اس نے رائے دی کہ چار شادیاں کرنے کے قانون کو ہندوؤں پر بھی لازم کر دینا چاہیئے اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ اگر ایک شخص چار عورتوں سے شادی کرتا ہے تو اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ آٹھ یا دس بچوں کا باپ بنے گا۔ اب اگر یہی چار عورتیں چار مختلف گھرانوں میں جائیں گی تو ہر ایک سے اوسطاً پانچ پانچ بچے پیدا ہوں گے اور اس طرح ان چار عورتوں سے پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد بیس یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ اس طرح اس شخص کے نزدیک چار شادیاں کرنے کا قانون ایک طرح سے بڑھتی ہوئی آبادی کا حل ہے! یہ تعجب خیز منطق ایک عام مسلمان کے ذہن کی نشاندہی کرتی ہے جو زندگی کے ہر اصول کو شریعت کے چوکھٹے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ملک کے نامور اسکالرز میں بھی اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ کھلم کھلا پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کریں۔ بدرالدین طیب جی نے اپنی تصنیف (THE SELF SECULARISM) میں تبدیلی کی بات کی تو ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ تبدیلی مسلمانوں کی مرضی سے کی جانی چاہیے نہ کہ حکومت کی مرضی سے۔ اے۔ اے۔ اے فیضی نے بھی مکمل تبدیلی کی وکالت نہیں کی بلکہ چند تبدیلیاں کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ کس قدر اہمیت کا حامل ہے اور مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ حکومت مسلمانوں سے ربط پیدا کرے۔

آئے دن کے ہندو مسلم فسادات مسلمانوں کا ایک اہم اور پریشان کن مسئلہ ہے اور اس ضمن میں مسلمان بہت کم قصوروار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فساد صرف ایک فرقے کی شر پسندی سے نہیں ہوتا لیکن ایک فرقے کی حد سے بڑھی ہوئی شر پسندی دوسرے فرقے کو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ فساد کرے۔ حکومت نے اگر یہ کہہ دیا کہ ملک کے تینتیس بڑے فسادوں میں سے بائیس کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی تو کیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فسادی ہیں؟ اگر ایک پتھر مار دینے پر، یا کسی گائے کو معمولی زخم لگ جانے پر یا کسی مسلمان لڑکے کی ہندو لڑکی سے شادی ہو جانے پر ہزاروں آدمیوں کا قتل و خون ہو سکتا ہے اور لاکھوں کی املاک جلائی جا سکتی ہے تو اس میں زیادہ قصور کس کا ہے! پتھر مارنے والے کا یا قتل و خون کرنے والے کا؟ یہ کہنا بھی

درست نہ ہوگا کہ مسلمان فرقہ پرست نہیں ہیں۔ فرقہ پرست ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی لیکن ہندوؤں کی فرقہ پرستی اپنے اندر تخریبی ذہنیت لئے ہوئے ہے اور مسلمان اکثر اپنے بچاؤ کی خاطر جھگڑا کرتے ہیں۔ اکثریت کی فرقہ پرستی اقلیت کی فرقہ پرستی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ دس انسانوں کا ایک ساتھ پاگل ہوجانا ایک انسان کے پاگل ہونے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی ہمارے ملک کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ اس نے ملک کے تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اس طرح ملک کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس لعنت کو بڑھاوا دینے میں آر۔ایس۔ایس اور جماعتِ اسلامی دونوں کا ہاتھ ہے۔ آر۔ایس۔ایس کی فرقہ پرستی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس جماعت کے کارندے ہندوستان میں رام راجیہ کا قیام چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندو طریقہ زندگی میں ڈھالنے کی فکر میں ہیں۔ گرو گولوالکر فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان رام کو اپنا ہیرو ماننے لگیں تو فرقہ وارانہ فسادات خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ اپنے مذہبی عقائد کو کسی دوسرے فرقے پر زبردستی ٹھونسنے کی یہ کوشش فسادات کا باعث بنتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کے کارندے اپنے آپ کو فرقہ پرست نہیں سمجھتے اور اگر انہیں فرقہ پرست کہا جائے تو وہ اس بات کا ثبوت مانگتے ہیں کہ کب اور کس فساد میں جماعتِ اسلامی کا ہاتھ تھا یا کبھی جماعت نے ہندوؤں کے خلاف کسی قسم کا پروپیگنڈا کیا ہے؟ ان کا یہ کہنا یقیناً درست ہے لیکن فرقہ پرستی کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ جماعت کے کارندوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں لیکن کیا کبھی انہوں نے ہندوؤں کی بھلائی کے لئے بھی کوئی کام کیا ہے؟ جماعتِ اسلامی (ہند) کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کا جماعتِ اسلامی (پاکستان) سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کیونکہ دونوں جماعتوں کے مقاصد ایک ہیں، دستور ایک ہے۔ دونوں حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتی ہیں پھر بھی یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں! پاکستان میں جماعتِ اسلامی الیکشن میں حصہ لیتی ہے یہاں نہیں لیتی۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ یہاں جماعت کو خطرہ ہو؟



کامیابی کی اُمید نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی دراصل جمہوری طرزِ حکومت میں یقین ہی نہیں رکھتی۔ اس بات کا اظہار مولانا مودودی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کیا تھا جو مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند دہلی سے شائع کی گئی ایک کتاب "دعوتِ اسلامی" میں شامل ہے۔ اس تقریر میں مولانا نے صریحاً اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ سیکولرزم، قوم پرستی اور جمہوری اُصولوں میں یقین نہیں رکھتے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں کو مٹا کر دوسرے اسلامی اصول قائم کیے جائیں۔ اس طرح جو جماعت سیکولرزم اور جمہوریت میں یقین ہی نہ رکھتی ہو۔ (جو ہمارے دستور کی بنیادی باتیں ہیں۔) اور جمہوری طرزِ حکومت کو ختم کرنا چاہتی ہو ایسی جماعت ملک اور قوم کے لئے یقیناً خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

ان باتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے آج جب آر۔ایس۔ایس اور جماعتِ اسلامی دونوں پر پابندی لگانے کی باتیں کی جارہی ہیں تو ایسی زیادہ غلط بھی نہیں ہیں۔ پابندی لگ جانے کے بعد دونوں فرقوں کے لوگوں کو ان جماعتوں کی نسطائی تعلیمات سے نجات ملے گی اور ملک میں قومی یکجہتی کے لئے راستہ ہموار ہوسکے گا۔ قومی یکجہتی ایک قومی دھارے میں زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اگر دونوں فرقے اپنی جنڈوں پر اڑے رہیں اور بظاہر ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہیں تو اسے قومی یکجہتی نہیں کہا جاسکتا اور نہ اس طرح ایک قومی تہذیب کا جنم ہوسکتا ہے۔ اس کیلئے دونوں فرقوں کو اپنا کچھ نہ کچھ قربان کرنا ہوگا تب کہیں ہم مستقبل میں ایک ایسی نسل کو جنم دینے میں کامیاب ہوں گے جو ان فرقہ وارانہ جھگڑوں سے کوسوں دُور ہو۔ ★★

کچھ آپ کے بارے میں

- انسانی جسم میں اتنی بجلی ہوتی ہے کہ اس سے تقریباً ساٹھ تک ۲۵ واٹ کا ایک بلب روشن رہ سکتا ہے۔
- انسان کے بال اس کے خون کے شریانوں کی نشاندہی کرتے ہیں جس شخص کے بال چمکیلے نہیں ہوتے اس کے خون کی گردش سست ہوتی ہے۔
- ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا موٹاپا کم کرنے کے لئے مفید ہوتا ہے کیونکہ سردی سے جسم کی توانائی گھٹتی ہے اور جسم یہ توانائی فاضل چربی سے حاصل کرتا ہے اسطرح چربی صرف ہونے سے موٹاپا بھی کم ہوجاتا ہے۔
- قوتِ گویائی میں زیادہ تر تین یا آٹھ سال کی عمر کے درمیان خرابی پیدا ہوتی ہے۔
- چونکہ خوف کے نتیجے میں دورانِ خون کا نظام متاثر ہوتا ہے اور انسان کی کھال سکڑ جاتی ہے اسلئے کھال سکڑنے سے خوف کی وجہ سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔
- خوف اور تفکرات سے انسان کے دانت کمزور ہوجاتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹروں نے نیوجرسی کے ایک شخص کی مثال دی کہ جس کے مضبوط دانت اس کی بیوی کی شدید علالت کے دوران تین ہفتوں میں کمزور ہوگئے تھے۔
- انسان کا کاٹنا کتے بلی اور گھوڑے کے کاٹنے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ انسانی منہ میں زیادہ اقسام کے اور زیادہ تعداد میں خطرناک جراثیم ہوتے ہیں۔
- جب آپ سوجاتے ہیں تو آپکا دماغ کچھ چھوٹا ہوجاتا ہے اور جسم کچھ بڑا ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ سوتے ہیں تو آپ کے جسم میں زیادہ خون جاتا ہے اور دماغ میں کم خون پہونچتا ہے۔
- ایک دن میں آپ جتنی ہوا نکالتے ہیں اسکا وزن اس دن آپ نے جتنا کھانا کھایا ہو اس سے زیادہ ہوتا ہے۔
- اگر آپ کے دماغ میں خون کی روانی ۴۵ سیکنڈ بند رہنے کے بعد دوبارہ شروع ہوجائے تو آپ کے دماغ کی رگیں اس قدر متاثر ہوجائیں گی کہ آپ اگر پاگل نہ ہوئے تو کم از کم سنکی ضرور ہوجائیں گے۔



اس کی سہیلیاں
راز کو
جاننا چاہتی ہیں
سنیتا اپنے خاوند اور بچوں کے تئیں اپنے فرض کو
پہچانتی ہے۔
وہ جانتی ہے کہ صحت مسرت کی کنجی ہے۔
بچوں کی پیدائش میں وقفہ ہونے پر۔
بچے صحت مند ہوتے ہیں
ماں تندرست رہتی ہے۔
خاوند کی طرف بہتر توجہ
دی جاتی ہے۔
باقاعدہ جانچ پڑتال کے لئے وہ بچوں کو
قریب ترین صحتی مرکز میں لے جاتی ہے۔
اس کی سہیلیاں اس پر اور اس کے کنبے پر رشک کرتی ہیں۔
davp 71/344

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو !

• نقی ظریفی

کس کے نمائندہ

ایک دفعہ کی بات ہے کہ بنگال کے گورنر جناب آر جی کیسی راج بھون میں مہاتما گاندھی سے گفتگو کرنے میں اس طرح محو تھے کہ وہ کھانا بھی کھانا بھول گئے۔ گاندھی جی رخصت ہونے لگے تو گورنر کیسی انکے پیچھے پیچھے انھیں پہونچانے آئے۔ مگر راج بھون کے بڑے ہال سے گزرتے وقت برٹش گورنر کو بڑا تعجب ہوا۔ راج بھون کے تقریباً سبھی کارکن، مالی۔ باورچی۔ خبر بردار اور دھوبی جن کی تعداد دو سو تھی پرامن دو لمبی قطاروں میں کھڑے تھے۔ انھوں نے اپنے پیارے باپو کو مؤدبانہ سلام عرض کیا، ان میں سے کچھ ننگے بدن تھے کچھ ایسی پوشاکیں پہنے تھے جن میں گورنر کے سامنے آنا غیر مہذبانہ تھا گورنر کیسی نے مسکرا کر کارکنوں کی طرف اشارہ کیا اور باپو سے بولے :۔

"یہ دیکھئے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ان سب کو آپ کی خوشی آمدید کے لئے یہاں نہیں بلایا تھا" باپو جواب میں صرف مسکرا دیے۔ دوسرے دن گورنر کیسی نے کہا۔

مجھے زندگی میں پہلی بار تعجب ہوا۔ کیونکہ راج بھون کے زیادہ تر کارکن مسلمان ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ گاندھی جی نے اس دیش کے سلمانوں کے دل میں اسطرح کیسے جگہ بنالی۔

میرا فائدہ ملک کا فائدہ

ستّر سالہ ہربت سنگھ گریٹا مزدور تھا۔ جنوبی افریقہ میں ستیا گرہ کی جنگ چھڑی تو گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو جیل جانے کیلئے کہا۔ اس وقت جیل جانے والوں کی قطار میں ایک بڈھا ہربت سنگھ گریٹا بھی چپ چاپ آکھڑا ہوا گاندھی جی نے اس سے دریافت کیا "تم بوڑھے ہو بھلا تمہارے جیل جانے سے کیا فائدہ ہوگا"

بوڑھے کے چہرے کی جھریاں یک بیک تن گئیں۔ اس نے کہا۔ "جب آپ سب مرد، عورت اور جوان جیل جا رہے ہیں تب میں باہر رہ کر کیا کروں گا۔ میں قطار سے الگ ہو جاتا ہوں تو بھی میرا فائدہ کیا اور نقصان کیا۔ فائدہ تو ملکی بھائیوں کو ہونا چاہئے" اور بعد میں اس بوڑھے کو جنوبی افریقی سرکار نے سخت سزا دی ۔۔۔ ہربت سنگھ گریٹا نے ہنس ہنس کر جیل کاٹی اور جیل میں ہی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

میں کچھ نہیں لیتا

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں ہندی ستیاگرہیوں کا قافلہ لے کر نیٹال سے ٹرانسوال کی طرف کوچ کیا تھا۔ راہ میں کچھ لیسے ایماندار اور ہمدرد گورے بھی ہندیوں کی تکلیف صبر و استقلال اور انکی محبت سے متاثر ہو اٹھے۔ ایک جگہ پر چند گوروں نے گاندھی جی کو دودھ، انڈے اور سردی سے بچے کیلئے گھروں میں رہنے کی جگہ کی پیشکش کی۔ گاندھی جی نے اس پیشکش کو منظور کرنے میں مجبوری ظاہر کی تو گورے اور بھی ہمدردانہ گزارش کرنے لگے۔ اس پر گاندھی جی نے نرمی سے کہا :۔

"انڈے تو میں کھاتا نہیں۔ رہا دودھ اور کمرے میں رہنے کا سوال تو میں اس سفر کے دوران کوئی ایسی چیز بھی قبول کرنے سے قاصر ہوں جسے اپنے ساتھیوں کے لئے مہیّا نہ کرسکوں ۔۔۔ وطنی بھائی میری رہنمائی پر اعتماد کر کے ساتھ آئے ہیں اور انھیں تکلیفوں میں چھوڑ کر خود کوئی آرام اٹھانا میرے اصول و مذہب کیلئے دھوکا دہی ہوگا۔

بیرسٹری کا شوق

بائیس سالہ جوان حسین داؤد جنوبی افریقہ میں پرورش پاکر جوان ہوا۔ وہ ایک ہندوستانی تاجر کا نور نظر تھا۔ اس کی پیدائش تو ہندوستان میں ہوئی لیکن ہوش سنبھالنے سے قبل ہی وہ جنوبی افریقہ چلا گیا مگر اپنے وطن کی پیاری زمین اور اس کے باشندوں (ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی) کی خدمت کا جذبہ اس کے دل میں موجزن رہا۔ خدمت کا یہ شوق جب پروان چڑھا تو حسین نے بیرسٹری پڑھنے کے لئے انگلینڈ جانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ایک دن گاندھی جی نے اس سے دریافت کیا "بیرسٹری کا یہ شوق تم پر کیوں سوار ہوگیا، کیا وکالت کر کے پیسے کمانا ہیں ؟" حسین نے قدرے سنجیدہ ہو کر جواب دیا "کمانا ہوتا تو میں والد کیطرح تجارت نہ کرتا۔ میں بیرسٹر بن کر وہی کمائی کروں گا جو آپ نے کی ہے۔ میں قانون پڑھوں گا اور اس کے ذریعے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی خدمت کروں گا"

وائسرائے گھر جائے گا

کیبنٹ مشن ہند کی آزادی دینے کے منصوبے پر غور و خوض کرنے دلّی پہونچا تو دیش کے بہت سے سیاستدانوں اور شہریوں میں کوئی خاص امنگ نہ دکھائی دی۔ کیبنٹ مشن کو برٹش گورنمنٹ کی ہندی خواہشوں کو ٹالنے اور جھٹلانے کے لئے متعدد بار کی ہوئی کوششوں کی ایک کڑی سمجھا جاتا تھا۔ مشن کے ایک ممبر سر اسٹیفرڈ کرپس مضبوط خیالات اور صاف طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ ہندیوں کے دل میں بیٹھی ہوئی غلط فہمی کو دور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

دلّی میں ایک دن مشہور تاجر شری گھنشیام داس برلا نے اپنے گھر پر کیبنٹ مشن کے تینوں ممبروں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ دوستانہ اور اخلاقی گفتگو کے دوران شری برلا نے ممبروں سے کہا :۔

" اس بار ہر آدمی کو یقین ہے کہ آپ لوگ ہند چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ لیکن اگر وائسرائے نے آپ کے ساتھ تعاون نہ کیا تو آپ کیا کریں گے ؟"

سر اسٹیفرڈ کرپس نے ہنس کر کہا۔ "اگر ایسا ہوا تو ہم وائسرائے کو اپنے ساتھ ہی واپس لیتے جائیں گے"

ہنسی میں کہی ہوئی کرپس کی بات مستقبل میں سچی ثابت ہوئی ہند کی آزادی کا کام ٹھیک ٹھیک نہ کر سکنے کی بنا پر وائسرائے لارڈ ویول کو واپس بلا کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔

دنیا کی طاقتور ترین خاتون رہنما

اندرا گاندھی

• ناوک حمزہ پوری



حال ہی میں لندن کے ایک مشہور خبر ڈیلی مرر نے
میں مسز اندرا گاندھی کو دنیا کی ہر دلعزیز اور طاقتور ترین خاتون
قرار دیا ہے۔ اس نے مزید لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی حسن کے صحیح خ
کو اجاگر کرتی ہیں اور بڑی سلیقہ مند خاتون ہیں۔ وہ رشتی و نرمی
سیاست کو سلیقے سے استعمال کرنے کا ہنر ان کو آتا ہے۔
ڈیلی مرر کی اس رائے کو مشہور ادیب و صحافی ویلیس ہینگ
کی اس پیشین گوئی کی روشنی میں دیکھئے جو اس نے پنڈت نہرو کے جا
فہرست ترتیب دیتے ہوئے برسوں پہلے کی تھی۔ ہینگن نے "نہرو
کے بعد کون" کے جواب میں ان کے جانشینوں میں یوں تو مرار جی
کرشنا مینن، لال بہادر شاستری، یشونت راؤ چوہان، اندرا گا
جے پرکاش نارائن، ایس کے پاٹل اور بی۔ ایم کول جیسے کئی نام گ
تھے۔ لیکن اندرا گاندھی کے متعلق لکھا تھا کہ ان کے بات کر
ڈھنگ اور صوفے پر بیٹھی ہوئی ساری کے پلو درست کرنے کے
میں بڑی سبھاؤ کی جھلک ہوتی ہے۔ اگر یہ ہندوستان کی وزیر
بن گئیں تو دنیا کی طاقتور ترین خاتون ہوں گی۔ کہتے ہیں کہ شریمتی
کو خطرات سے کھیلنے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک
کی جان بچانے کے لئے وہ چلتی ٹرین سے کود پڑی تھیں۔ خود ان کا
ہے کہ میری ساری زندگی حالات کی سختیوں کے آغوش میں پلی
میں کمزور پڑ جاتی تو میری زندگی کا چراغ بچپن میں ہی گل ہو جا
ویسے تو سیاست شریمتی اندرا گاندھی کی گھٹی میں پڑی
لیکن ان کی عوامی زندگی کا آغاز اور سیاست میں ان کی فعال
۱۹۵۸ء میں شروع ہوئی جب انہیں کانگریس کی باضابطہ رکن
گئی۔ ایک سال بعد ۱۹۵۹ء میں ہی انہیں کانگریس کا صدر منتخ

ق ہی کہئے کہ اس وقت ان کی عمر تقریباً وہی تھی جو
لاہور سیشن میں کانگریس کا صدر منتخب ہوتے وقت
نہرو کی تھی۔
یسے انقلابی سال میں فیروز گاندھی کے ساتھ ان کی
ری کے معاملے میں بھی یہ اپنی رائے پر جمی رہیں اور چند
بید اختلاف کو کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا۔ یاد رہے بات ہے
نیال میں ان کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشگوار ثابت

ں سے انہیں بے حد پیار تھا۔ ماں کے مقام کو وہ خو
ہیں کہ آزادی کے قبل ہی نہ صرف یہ کہ گووند وبھ پنت
ماہ پر مہاتما گاندھی نے بھی انہیں اتر پردیش کی
از کی رکنیت کے لئے انتخاب لڑنے کا مشورہ دیا تھا
نے یہ تجویز مسترد کردی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب
ں اور دوسرے بڑے لوگوں کے لئے بھی قانون کی حیثیت
ں اندرا گاندھی نے صاف کہہ دیا کہ ان کے بچے چھوٹے
لک کے پیار کی ضرورت ہے۔
اندرا گاندھی وقت کی بڑی پابند ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ بی کی
رہتی ہیں۔ اور ہر کام وقت پر اور پورے انہماک سے
ی ہیں۔
لی پختگی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ بینکوں کے قومیانے
مہاراجاؤں کے جیب خرچ کا تصفیہ ہو وہ جوبات طے
ا پر اٹل رہتی ہیں اور دشواریوں سے ہراساں ہونے
اریوں پر ہر ممکن صورت سے قابو پانے کی کوشش کرتی
مانہ وہ تھا جب سنڈیکیٹی لیڈر انہیں "بے چاری بچی"
ر دستاویز" کہا کرتے تھے۔ آج وہی لوگ انہیں ضرورت
ا تور بلکہ تاناشاہ کہتے نہیں تھکتے۔
جنگ کے حالات میں مسز گاندھی کو ملک کی تمام
ر تمام افراد کا مکمل اعتماد حاصل ہے اور وہ انتہائی
کے ساتھ رہنمائی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔
ہنہیں ہیں۔ عزم کی پختہ ہیں اور ارادوں کی مضبوط
پاک جنگ کے دوران انہوں نے عوام کو کھو کھلے
ں دیئے ہیں۔ نہ ہی مضحکہ خیز بیانات جاری کر کے
یذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس نازک
ا بڑی سلامت روی کے ساتھ وہ ملک کی رہنمائی



فرما رہی ہیں۔
اندرا گاندھی کی دوسری خصوصیت ہمیشہ فیصلانہ ہم آہنگی
کے لئے کوشاں رہنا بھی رہی ہے۔ یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ ملک کو
اس نازک وقت میں جتنا زیادہ اس کی ضرورت ہے اتنا اس سے پہلے
نہیں تھی۔ اور موجودہ ہندوستانی لیڈرشپ میں کسی فرد واحد میں
ہندوستان کو متحد رکھنے کی جتنی صلاحیت اندرا گاندھی میں ہے اتنی
شاید کسی دوسرے میں نہیں ہے۔

کھیل



دلی کا ڈیورنڈ فٹ بال ٹورنامنٹ رفتہ رفتہ تجارتی مصلحتوں کی نذر ہوتا جارہا ہے۔ ۴۲ سال پہلے جب اس ٹورنامنٹ کا آغاز ہوا تھا تو اسے فٹ بال کے شائقین کے لئے تفریح کا اور ملک کے مشہور و معروف فٹ بال کلبوں کے لئے اپنے جوہر دکھانے اور اپنے کھیل کو بہتر بنانے کا بہترین ذریعہ سمجھا گیا تھا اور بہت کم مدت میں اس ٹورنامنٹ نے قومی ٹورنامنٹوں میں اپنی جگہ بنالی تھی لیکن گزشتہ تین برسوں سے یہ ٹورنامنٹ اپنی کشش کھوتا جارہا ہے اور گمان غالب ہے کہ اگر ہندوستان سے باہر کی ٹیموں کو لانے کا موجودہ رجحان جاری رہا تو ۲-۴ سال بعد ہندوستان کی ٹیموں کے لئے اس ٹورنامنٹ میں کوئی کشش باقی نہ رہ جائے گی اور غالباً غیر ملکی ٹیموں کو خوش کرکے کپڑے کی تجارت کو فروغ دینے کے اس رجحان کی وجہ سے گزشتہ سال ہندوستان کے چند مشہور و معروف کلبوں نے اس ٹورنامنٹ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دلی والوں کو خوش کرنے والا فٹ بال کا کھیل اب صرف کلکتہ ہی میں رہ گیا ہے۔ کلکتہ کی ٹیمیں شارٹ پاسس کمبی نیشن، ڈراج، حسین چالوں اور صاف ستھرا کھیل پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں جبکہ پنجاب کی ٹیموں میں یہ خصوصیات نہیں ہیں وہ بہت رف گیم کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اپنا دماغی توازن کھو دیتی ہیں۔ ریفری کے ہر فیصلہ پر آتش زیرپا ہو جاتی ہیں اور کھیل کے میدان کو گویا میدان کارزار سمجھ لیتی ہیں۔ راقم الحروف نے پنجاب کی چند معروف ٹیموں کا کھیل دیکھا ہے اور اب تو یہ حالت ہے کہ ان ٹیموں کے کھیل کو دیکھنا تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ ان ٹیموں کے گنے چنے کھلاڑی مثلاً اندر سنگھ اور گورکرپال ایسے ہیں جو صاف ستھرا کھیل پسند کرتے ہیں لیکن اکثریت ایسے کھلاڑیوں کی ہے جو تکنک سے زیادہ قوت پر تکیہ کرتے ہیں۔

اسی طرح دلی کے بکثرت شائقین بھی کھلاڑیوں کی اسپرٹ سے محروم ہیں۔ وہ کھیل نہیں دیکھتے بلکہ تمناؤں کو حقیقت کی شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور ان کی اسی ذہنیت نے اس سال دلی کلاتھ مل فٹبال ٹورنامنٹ کی خامیوں میں ایک خامی کا اضافہ کیا۔

میرا اشارہ ٹورنامنٹ کے محمڈن اسپورٹنگ کے اخراج کی جانب ہے۔ یوں تو محمڈن اسپورٹنگ میں صرف لفظ محمڈن سے ایک فرقہ کیساتھ اسکے تعلق کا اظہار ہوتا ہے جبکہ اس کے کھلاڑیوں کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم کھیل کے معاملات میں بھی سیاست کے میدان والی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر ہمارے ریفری (خاص طور پر دہلی کے ریفری) دو چار کو چھوڑ کر سب کے سب "ماشاء اللہ" ہی ہیں۔ یہ حالات کو سنبھالنے سے زیادہ حالات کو بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زیربحث ٹورنامنٹ میں لیڈرز کلب جالندھر اور محمڈن اسپورٹنگ کے درمیان مقابلہ میں جہاں شائقین کی ذہنیت کو مورد الزام قرار دیا جاسکتا ہے وہیں ریفری کے رویہ کو بھی زیربحث لایا جاسکتا ہے جس کے فیصلے نے حالات کو ابتر کردیا۔

محمڈن نے لیڈرز کے مقابلہ میں اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے لیڈرز کے خلاف ایک گول کرلیا۔ ریفری نے گول مان بھی لیا۔ لیکن شائقین کے شور و غل اور اپنی مقبولیت گھٹنے کے خیال سے اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی جانبداری تھی اور کوئی بھی اچھی ٹیم اس قسم کی جانبداری کو برداشت نہیں کرسکتی۔ محمڈن نے ریفری کے فیصلہ کو مان بھی لیا لیکن ریفری نے کھیل ہی منسوخ کردیا اور ٹورنامنٹ کمیٹی نے دوسرے دن جب محمڈن سے کھیلنے کو کہا تو اس نے اس ناانصافی کی وجہ سے کھیلنے سے انکار کردیا۔ میرا خیال ہے کہ ایسے ٹورنامنٹوں میں ہندوستان کی اچھی ٹیموں کو حصہ نہ لینا چاہئے جن کا مقصد ایسا لنکا یا نیپال کو خوش کرنا ہو۔ اور جن کے ریفری رواداری برت سکتے ہوں۔

ایمان کا تاج کلب تیسرے سال بھی فائنل جیت کر کپ پر قابض ہوگیا ہے اس سے ڈی سی ایم کے آقاؤں کو تو خوشی ہوسکتی ہے لیکن غیرجانبدار شائقین کو ذرہ برابر خوشی نہیں ہوسکتی۔

ہاکی : بارسلونا میں عالمی ہاکی کپ ٹورنامنٹ میں پاکستان کے ہاتھ ہندوستان کی ہار کے بعد ایک بار پھر ہم باہمی چپقلش کا شکار ہوگئے ہیں۔ ہاکی فیڈریشن کے ذمہ دار عہدیداران کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ اس شکست کے لئے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایا جارہا ہے۔ حالانکہ یہ بحث و مباحثہ بالکل غیر ضروری ہے۔ "ہم ہار گئے" یہ ایک حقیقت ہے اور چونکہ کھیل میں ایک فریق کی ہار اور دوسرے فریق کی جیت ہوتی ہی ہے اس لئے ہمیں اپنی ہار کو کھلاڑیوں کی طرح تسلیم کرکے سنجیدگی کے ساتھ اس شکست کے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ اور جو خامیاں اس شکست کے جلو میں آتی ہیں انہیں دور کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہئے۔ جہاں تک ہندوستان کے کھیل کے طریقہ کا سوال ہے مجھے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ کھیل کے موجودہ طریقے میں جو ۱-۲-۳-۵ سسٹم کہلاتا ہے معمولی سا رد و بدل کیا جاسکتا ہے لیکن اس سسٹم کو بالکل ترک کردینے کا مشورہ مجھے

ہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کے کھیل کا علم ایک
ں ہے اگر سسٹم میں کوئی خرابی ہوتی تو پاکستان کو بھی چیمپین نہیں بننا تھا
ملمان ٹیموں میں سے کوئی ٹیم جیت جاتی جن کا سسٹم بدلنے کا مشورہ
یا جا رہا ہے۔ بارسلونا میں تین سرفہرست ٹیمیں پاکستان، ہندوستان
ر کینیا کی تھیں اور ان تینوں ٹیموں کے کھیل کا طریقہ قریب قریب یکساں
ہے۔ اس لئے میں پھر یہی کہوں گا کہ اگر کھیل کا یہ سسٹم غلط ہوتا تو اس سسٹم
و اختیار کرنے والی ٹیمیں سب پر برتری کیسے حاصل کر سکتی تھیں۔
ان دو شہادتوں سے سسٹم کی خرابی کا دعویٰ غلط ثابت ہو رہا ہے تیسری
شہادت حال ہی میں برطانیا کے خلاف ہندوستان نے اپنی ست کے
چاروں میچ جیت کر پیش کی ہے۔ بد قسمتی سے ۱۹۶۸ء ہی سے جب پاکستان
نے میکسیکو میں ہندوستان سے اولمپک اعزاز چھینا تھا ہمارے کھلاڑیوں
کا معیار بلند نہیں ہوا ہے۔ میں یہ تو نہیں مانتا کہ سلکشن کے وقت سفارشوں
اور جانبداری سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہاکی
فیڈریشن سنجیدگی کے ساتھ اچھی ٹیم بنانے کی کوشش نہیں کر رہی ہے
اور مختلف ریاستوں اور دفتروں کو نمائندگی دینے کی کوشش میں اکثر ایسے
کھلاڑیوں کو لیا جاتا ہے جن سے بہتر کھلاڑی بھی موجود ہوتے ہیں۔
لیکن انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں مل پاتا۔ ●





اصل میں دلی تو وہی ہے جو فصیل کے اندر آباد ہے جسے عرف عام میں پرانا شہر کہا جاتا ہے اور یہ پرانی دلی ابھی تک قدیم روایات کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہی بہشتیوں کی صدائیں۔ "ٹھنڈا ہے میٹھا ہے، جی بھر کے پیو۔" وہی قلعی گر، سوئے تانبے کے کٹوروں کی کھنک، وہی نہاری اور حلیم کی خوشبو، وہی پراٹھوں اور سیخ کے کباب کی مہک اور وہی تانگے اور تانگے والے جو "ذرا ہٹ کے، ذرا بچ کے" کی صدا لگاتے ہوئے اس گنجان آبادی میں زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح کھینچے جا رہے ہیں لیکن اس پرانی دہلی میں تانگے والے دو طرح کے ہیں۔ ایک تانگے والا تو محمد احمد ہو سکتا ہے جو سیلم پور کی گندی بستی میں زندگی گزارتا ہے۔ جامع مسجد سے فراش خانے تک دن بھر اپنا تانگا ہانکتا ہے اور ہمیشہ یہی سوچتا رہتا ہے کہ کس طرح اتنی رقم کمالے کہ اپنی جوان بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ لیکن تانگے کا کرایہ نکال کر وہ اتنی بھی رقم نہیں بچا پاتا کہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے۔ پھر اپنی بیٹی کو دلہن کیسے بنا سکیگا۔

محمد احمد ان تمام تانگے والوں کی نمائندگی کرتا ہے جو مفلس اور کنگال ہیں۔ جو زندہ ہیں محض امیدوں کے سہارے، جو مرنا چاہتے ہیں لیکن موت نہیں آتی۔ جو مزدور ہیں، محنت کش ہیں اور حالات کی سختیوں کا شکار ہیں۔

دوسرا تانگے والا محمد شفیع ہو سکتا ہے جو شوق کی تسکین کیلئے گھوڑا پالتا ہے۔ محمد شفیع ان تانگے والوں کی نمائندگی کرتا ہے جو خوشحال ہیں کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں کا کاروبار کرتے ہیں اور شام کو اپنے کاروبار سے فرصت پانے کے بعد رنگین تہہ بند اور چکن کا کرتا زیب تن کر کے سیر کے لئے اپنے تانگوں پر نکلتے ہیں، جو اپنے تانگوں کی دوڑ میں ہر ہفتہ ہزاروں ہارتے اور جیتتے ہیں جو اپنے گھوڑوں کی شکست کو اپنی شکست سمجھتے ہیں اور لکھنؤ کے بانکوں کی طرح بات بات پر اکڑ جاتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے دلی ایڈمنسٹریشن قدیم روایات کو زندہ رکھنے میں لگی ہوئی ہے اور اس سلسلے میں دہلی اسپورٹس کونسل ہر سال تانگا دوڑ بھی کراتی ہے اور اس دوڑ میں بے چارہ محمد احمد حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے پاس اپنا گھوڑا اور اپنا تانگا نہیں ہوتا۔ اس میں حصہ لیتے ہیں محمد شفیع جیسے تانگے والے جو اس دوڑ کے لئے سال بھر تیاری کرتے ہیں۔ اس کو "چیتک دوڑ" کا نام دیا گیا ہے چیتک مہارانا پرتاپ سنگھ کے گھوڑے کا نام تھا۔ دوڑ بدرپور سے راج گھاٹ تک ۲۲ کلومیٹر لمبے راستے پر ہوتی ہے۔ اس سال محمد شفیع کے گھوڑے جھونے اول آکر "دلی چیتک" کا خطاب حاصل کیا۔ اس نے یہ فاصلہ ۴۴ منٹ ۲۰ سیکنڈ میں طے کیا۔ چمن میاں کے گھوڑے موتی نے دوسرا اور روپ چند کے گھوڑے راجکمار نے تیسرا مقام حاصل کیا۔

دہلی والے بڑے زندہ دل ہیں۔ وہ اس دوڑ میں بھی اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مقابلے میں اترنے والے گھوڑوں کے مالکان کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، انہیں کافی جوش و خروش ہوتا ہے اور وہ کسی بھی نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح "تیار" ہو کر جاتے ہیں۔

اس مقابلے میں محمد شفیع کو ۱۵۰۰ روپے نقد اور "چیتک" کی سونے کی مورتی۔ چمن میاں کو ایک ہزار روپے نقد اور "چیتک" کی چاندی کی مورتی۔ اور روپ چند کو ۵۰۰ روپے نقد اور "چیتک" کی کانسے کی مورتی بطور انعام ملی۔

لیکن محمد احمد تو تماشائیوں کی بھیڑ میں کھڑا "زندہ دلی کا جلوہ" ہی دیکھ سکا۔



فیشن ایک سماجی برائی ہے

تحریر:
محمد [illegible]



عورت کو قدرت نے نہ صرف کشش اور جاذبیت کا مرکز بنایا ہے بلکہ سماج میں بھی اُسے ایک ممتاز مقام بخشا ہے ہر دور اور ہر سماج میں عورت کو اونچے سے اونچا مقام دیا گیا ہے۔ عورت کے بغیر انسانی زندگی ادھوری اور بے مزہ سمجھی جاتی ہے —— لیکن فیشن کی دوڑ میں آج کی عورت جس تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے اس نے ایک سماجی مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ہمارے ملک میں زیادہ لوگ ایسے ہیں جنہیں غریب کہا جا سکتا ہے، ان کے مقابلہ میں بہت کم لوگ صحیح معنوں میں امیر ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ سماج انہیں مسائل سے اثر پذیر ہوگا جن کا تعلق زیادہ لوگوں سے ہے۔ موجودہ معاشرہ میں عورت نے جس ماڈرن فیشن کو اپنایا ہے —— وہ ہے چست لباس۔ یہ فیشن کسی خاص طبقہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر سب ہی پر برابر کا پڑ رہا ہے۔ ہر عورت کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حسین اور پُرکشش دکھائی دے یہ جذبہ قدرتی ہے لیکن قدرت کا یہ اصول بھی تو ہے کہ جب بھی کوئی بات حد سے گزر جاتی ہے تو اچھی ہوتے ہوئے بھی وہی بات بُری اور نقصان دہ بن جاتی ہے۔ عورت کا خوبصورت اور پُرکشش نظر آنے کا جذبہ آج حد سے تجاوز کر کے ایک سماجی برائی کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

جب ہم اس مسئلہ کو نفسیاتی پہلو پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواتین کا شوق کیوں بڑھ رہا ہے؟ ہر عورت نقل کے فن میں ماہر ہوتی ہے۔ آج فیشن کی نقل کرنا تو ایک رواج سا بن گیا ہے یہ شوق اس وقت بڑھتا ہے جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کا جائزہ لیتی ہے اپنی ماں، بہن اور بھاوج کی طرف دیکھتی ہے اور جب اسکول یا کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں کسی کلاکار کے آرٹ کا اشتہار بنی ہوئی اپنی استانی یا لکچرار کو دیکھتی ہے تو دل ہی دل میں فیصلہ کر بیٹھتی ہے کہ آج وہ کسی طرح اسی طرز کے کپڑے سلوائے گی اور جدید فیشن کے فن میں مہارت حاصل کرے گی۔ کلاس روم میں اس کی نظر اپنی کتاب پر نہیں لیکچرر کی نئے انداز سے بنی ہوئی زلفوں پر ہوتی ہے —— آ

مذاق کا موضوع بن گئی ہے۔ اور اس کے لئے ہر حالت میں وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس جدید فیشن کے باعث درمیانی طبقہ کو بے حد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

جب کوئی ایسی لڑکی جس کا تعلق امیر طبقہ سے ہے ـــــ جدید فیشن کو اپناتی ہے تو فیشن کے نام پر وہ ہزاروں روپے صرف کرتی ہے لیکن اس کی نقل جب ایک درمیانی طبقہ کی لڑکی کرتی ہے تو اسے عجیب قسم کے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو پہلی قطار میں کھڑا کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے ذرائع بھی تلاش کرے۔ چنانچہ ایسی کئی مثالیں ملیں گی کہ جدید فیشن کی دلدادہ کتنی ہی ایسی لڑکیاں سوسائٹی گرل بن کر رہ گئی ہیں۔

قومی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کی بنیادیں لرز رہی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان نے بے شمار ایسی خواتین کو جنم دیا ہے جنہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اپنا ایک اہم ممتاز و منظم مقام بنایا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کا کردار آج بھی ہمارے لئے ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ ان کی زندگی کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے بلند خیالات و جذبات سے اپنی زندگیوں کی مضبوط بنیاد قائم کی تھی ـــــ لیکن اس کے برعکس آج کی معزز خواتین اپنی تمام تر توجہ صرف فیشن پر ہی مرکوز کئے ہوئے ہے۔ کلاس روم میں، گھر میں، راہ چلتے اس کی زندگی کا مقصد صرف سجنا سنورنا ہی رہ گیا ہے۔ پھر ہم اس سے یہ امید کیسے کر سکتے ہیں کہ اپنے بلند کیریکٹر اور بلند خیالات سے وہ قوم کی تعمیر ترقی میں اہم پارٹ ادا کرے گی۔

سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی فیشن کا پورا پورا



کے بلاؤز کے کٹ اور ساڑی کے ڈھال پر ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں سے بھی وہ نیا پن حاصل کرتی ہے اُسے عملی شکل میں بدلنے کے لئے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر گھنٹوں ریہرسل کرتی ہے۔ اسی طرح ہر لڑکی فیشن کی دوڑ میں سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے کسی بھی کالج یا ایسے دوسرے ادارے میں آپ چلے جایئے ـــــ ہر لڑکی آپ کو نمائش میں رکھا ہوا "ماڈل" نظر آئے گی۔ اس سے شخصیت کا اصل وقار پس پشت جا پڑتا ہے۔ اور سطحیت غالب آجاتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی صدیوں پرانی تاریخ جس عورت کی پوجا کرتی آئی ہے آج وہ عورت

پڑتا ہے۔ جب ہم قومی کیرکٹر کی بات کرتے ہیں تو اس کے لئے صاف الفاظ میں ہم نوجوانوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن کبھی اس عظیم ترین مسئلہ کی گہرائی میں جانے کی کوشش ہم نے کی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارا اس ڈھنگ سے سوچنا کسی حد تک درست بھی ہو لیکن اس بات سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نوجوانوں کی اس کمزوری کا سبب عموماً نئی تہذیب و فیشن کی دلدادہ یہ عورت ہی ہے۔ عورت اور مرد میں ایک دوسرے کے لئے کشش و جاذبیت غیر قدرتی نہیں۔ ہر دور میں عورت کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ صنف مقابل کے لئے کشش کا باعث بنے۔ اس جذبہ کی نفسیاتی تعبیر بھی یہی ہے کہ وہ مرد کو راغب کرنے کے لئے ہی زیادہ بنتی اور سنورتی ہیں مگر اس کی کوئی حد ہو اور سماجی اقدار کو ملحوظ رکھ کر عورت اس ہتھیار کا استعمال کرے تو ایسا حسن اور یہ جاذبیت گنگا کی طرح مقدس سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو یہی مقدس جذبہ ہوس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آج کی عورت جب شوکیس کا ماڈل بن کر ایک مخصوص انداز میں کسی نوجوان کے سامنے سے گزرتی تو اس کا دل بیتاب ہو اٹھتا ہے۔ ہوس کی آنکھیں نہیں ہوتیں اور ہوس سے اندھا انسان اپنے جذبات کی تسکین کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے آج کی عورت میں وہ کشش نہیں ہے جو گنگا کی طرح مقدس ہو بلکہ ایک ایسی کشش ہے جس کی تہہ میں ہوس انگڑائیاں لیتی ہے

آج جدید فیشن کی روشنی میں ہمیں ایک نہایت اہم سماجی مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے۔ اور یہ مسئلہ ہے روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی کا۔ درمیانی طبقہ گرانی سے پسا جا رہا ہے۔ کئی مقامات پر اناج اس قدر گراں ہے کہ قحط کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود فیشن کی دوڑ کی رفتار مدھم نہیں پڑی۔ بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا مرض بن گیا ہے جو حملہ کئے بغیر نہیں رکتا۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ فیشن پر تو ہم ہزاروں روپے صرف کر سکتے ہیں لیکن ضروریات زندگی کا جہاں سوال پیدا ہوتا ہے وہاں ہم شور و غل برپا کر دیتے ہیں۔ اگر ہم سادہ زندگی گزاریں تو کیا فیشن پر خرچ ہونے والی رقم سے ہم اپنی نصف ضروریات زندگی کو پورا نہیں کر سکتے۔ پرکشش اور جاذب نظر رہنے کے سیکڑوں ذرائع ہیں جو یقیناً کم خرچ اور آسان ہیں۔ گرانی کے اس اہم مسئلہ پر فیشن کی روشنی میں نہایت سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہئے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو ازدواجی زندگی ہے۔ آج کتنی خواتین ایسی ہیں جو باوجود شادی شدہ ہونے کے ناکام ازدواجی زندگی کی شکایت کرتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی [illegible] سنجیدگی سے غور کیا ہے کہ ازدواجی زندگی کی ناکامی کی اصل وجہ کیا ہے؟ اپنے شوہر سے آپ مطمئن کیوں نہیں ہیں؟ اپنے آپ کا نفسیاتی جائزہ لیجئے تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس ناکامی کی دراصل بنیادی مرض فیشن ہے۔ شادی سے قبل آپ کی تمام تر توجہ فیشن ہی پر مرکوز رہتی تھی۔ ہر لمحہ آپ کی یہی کوشش رہتی تھی کہ فیشن میں سب لڑکیوں کو مات کر دیں۔ پھر آپ کی جان پہچان والی کسی لڑکی کی شادی کسی ایسے نوجوان سے ہو جاتی ہے جو امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے ـــــ جس کے پاس اپنی موٹر کار ہے۔ لیکن جس کے پاس اتنے ذرائع نہیں کہ اپنی بیوی کی خواہشات کی تکمیل بآسانی کر سکے۔ جب آپ اسے اس رنگ میں دیکھتی ہیں تو نہ صرف اس کی نقل کرنا چاہتی ہیں بلکہ دو قدم اس سے بھی آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اپنے تصور میں آپ ایک ایسے شوہر کی خواہش کرتی ہیں جو جان پہچان والی لڑکی کے شوہر سے بھی زیادہ امیر ہو۔ اپنے اس تصوراتی شوہر کو ایک باقاعدہ شکل دے کر آپ اسے اپنے ذہن میں اچھی طرح محفوظ کر لیتی ہیں ـــــ لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے ـــــ کیونکہ آپ نے اپنی جان پہچان والی لڑکی کی صرف نقل کی ہے جبکہ آپ کا تعلق ایک اوسط گھرانے سے ہے۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ جب آپ اپنی ازدواجی زندگی میں قدم رکھتی ہیں تو اپنے شوہر کو ویسا نہیں پاتیں جیسے شوہر کو آپ نے اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے۔ جس کے بنا پر آپ کے نفسیاتی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون آپ اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھ رہی ہیں۔ پھر دل ہی دل میں اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ اپنے نیم خدا شوہر نامدار کو بھی کوسنے لگتی ہیں۔ دراصل آپ نے اپنے آپ کو اس قابل تو بنایا ہی نہیں کہ حالات سے سمجھوتا کر سکیں کیونکہ اس پر کبھی آپ نے غور ہی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے شوہر سے ـــــ اپنی ازدواجی زندگی سے بالکلیہ آپ غیر مطمئن ہو جاتی ہیں اور اپنے آپ پر یہ کلہاڑا مار کر اپنی مقدس ازدواجی زندگی کو خواہ مخواہ ناکام بنانے کا سبب بنتی ہیں۔

اب ذرا فیشن اور صحت کے اثرات پر غور کیجئے۔ جہاں تک نفسیاتی صحت کا تعلق ہے اس کا ذکر آپ نے اوپر پڑھ لیا جسمانی صحت، حسن و دلکشی میں اضافہ کرتی ہے اگر جسمانی طور پر آپ صحتمند نہیں ہیں تو فیشن کے بنیادی ذرائع بھی آپ کو حسین و دلکش نہیں



سکتے۔ لیکن آج فیشن کے جن ذرائع کا استعمال آپ کرتی ہیں ان سے خود ہی اپنی جسمانی صحت و دلکشی کو آپ برباد کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلے ہم چست لباس ہی کو لیتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ اسی وقت تندرست رہ سکتی ہیں جب آپ کے جسم میں خون کا دوران نارمل ہو اور اس فعل میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اسی طرح سانس کے فعل کی بھی خاص اہمیت ہے۔ سانس کے ذریعے آپ تازہ ہوا اور آکسیجن اپنے جسم میں داخل کرتی ہیں جو نہ صرف آپ کے خون کو صاف کرتی ہے بلکہ آپ کے مختلف جسمانی اعضاء کی خوراک بھی ہے۔ سانس کے ذریعہ ہی آپ کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے جسم سے خارج کرتی ہیں جو اپنے ساتھ جسم کی گندگی کو باہر لے آتی ہے۔ اس طرح سانس کا یہ فعل نہایت اہم ہوتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب آپ چست لباس پہنتی ہیں تو اس کا دباؤ دل اور تمام جسم کے دوسرے اعضاء پر پڑتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ چست لباس پہن کر خون کے قدرتی دورے اور فعل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ خون بآسانی جسم میں گردش نہیں کر سکتا اور کئی ایسے اعضاء میں خلل پڑ جاتا ہے جنہیں خون دستیاب نہیں ہوتا کیونکہ خون ہی دراصل مختلف اعضاء کی پرورش کرتا ہے۔ کئی بار معمولی معمولی بیماریاں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ آپ اپنے حسن کو مکمل طور پر کھو بیٹھتی ہیں۔

اب ذرا سانس کے فعل پر غور کیجئے۔ آپ جتنا اونچا سانس لیں گی اتنی ہی زیادہ آکسیجن آپ کے جسم میں داخل ہو کر خون میں شامل ہوگی اور اعضاء کی پرورش قدرتی طور پر ہو سکے گی اور اتنی ہی زیادہ کاربن ڈائی آکسائڈ سانس کے ذریعہ جسم سے خارج ہوگی۔ اور خون کی باقاعدہ صفائی ممکن ہوگی۔ اس کے برعکس جب آپ تنگ و چست لباس زیب تن کرتی ہیں تو اس کا دباؤ سب سے پہلے پھیپھڑوں پر پڑتا ہے۔ نتیجتاً آپ گہرا سانس لینے کے قابل نہیں رہتیں جس کے سبب نہ آکسیجن زیادہ مقدار میں جسم میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ کاربن ڈائی آکسائڈ خارج ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اعضاء کی پرورش صحیح طور پر نہیں ہونے پاتی وہیں خون میں گندگی باقی رہ جاتی ہے جو بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ گہرا سانس لینے سے پھیپھڑوں کی ورزش بھی ہوتی ہے اور چھاتیوں کے دودھ پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ چست لباس کے باعث ان فعال میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ چست لباس

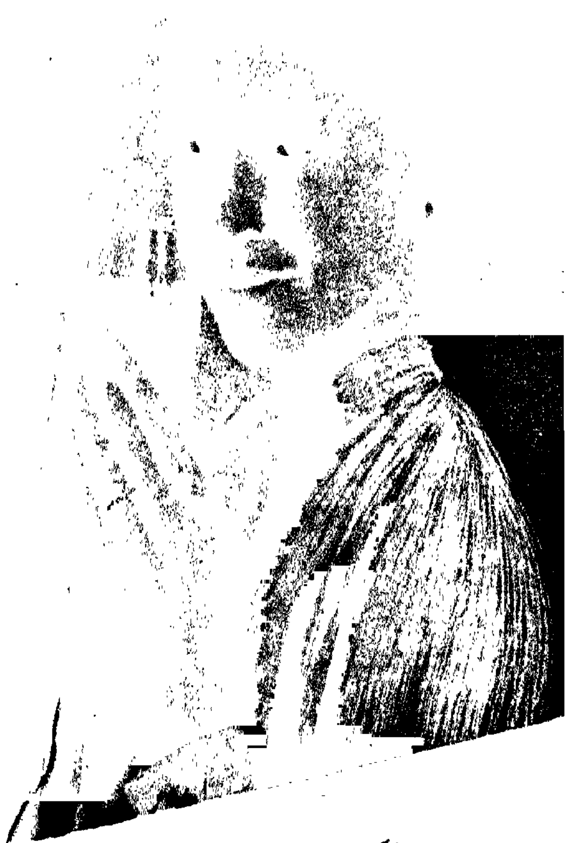


کے زیادہ دباؤ کی وجہ سے اعضاء کی مکمل نشوونما بھی ناممکن ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ اپنے آپ کو زیادہ حسین و دلکش بنانے کے لئے آپ مختلف اشیاء کا استعمال کرتی ہیں جیسے پاؤڈر، کریم، اسنو، لپ اسٹک، خوشبویات وغیرہ۔ ان اشیا کے استعمال کے بارے میں ایک تحقیقی رپورٹ قابلِ ساعت ہے۔ یورپ کی جہاں ان اشیاء کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے ایک ممتاز لیڈی ڈاکٹر ڈی ایس جیرہا کہتی ہیں کہ ان اشیاء کے استعمال سے وقتی طور پر اپنے حسن کو دوبالا کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے نتائج انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے دوررس نتائج انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں —— ان کے متواتر استعمال سے جلد کی مختلف بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور چہرہ کالا اور بدنما ہو جاتا ہے۔ چونکہ ان اشیاء کا استعمال زیادہ تر چہرہ ہی پر کیا جاتا ہے اس لئے ان کا اثر چہرے پر ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے مزید ایسے کیس کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں اپنی بدصورتی دور کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ خوشبودار تیل اور عطر استعمال کرنے سے نہ صرف بال کمزور ہو کر گرنے لگتے ہیں بلکہ نزلہ زکام وغیرہ۔ مختلف بیماریاں دماغی کمزوری کی وجہ سے شدت اختیار کر جاتی ہیں۔

اب ذرا ایک مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ ڈائٹنگ بھی آج ایک فیشن بن گیا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں ڈاکٹروں کے ماہرین کے عالمی جلسے میں ایک ہی سوال کو زیادہ لوگوں نے پوچھا کہ آج کل کونسی بیماری کے مریض آپ کے پاس زیادہ آتے ہیں تو ان ماہرین میں سے ہر ایک کا کہنا یہی تھا کہ "مرض تو وہی ہیں جو آج سے پچاس سال قبل بھی ہوتے تھے۔ ہاں اب ایک ڈائٹنگ کا مرض ضرور نیا پیدا ہو گیا ہے —— اور اس بیماری میں زیادہ تر نوجوان کنواری لڑکیاں مبتلا ہیں —— یہ معلوم کر کے میری آنکھوں کے سامنے آجکل کی —— بہت سی نوجوان لڑکیوں کی مثالیں گھومنے لگیں جنہوں نے جان بوجھ کر ڈائٹنگ کے مرض کو سینہ سے لگا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ آج کل مائیں یہ شکایت کیوں کرتی ہیں کہ اس کی لڑکی کچھ کھاتی نہیں۔ کیوں ہر روز گھروں میں اس بات پر جھگڑا ہوتا ہے کہ ناشتہ پر لڑکیاں دودھ اور مکھن کو چھوتی تک نہیں۔ ایک سوکھا توس اور کم دودھ کی چائے آج کی لڑکیوں کا محبوب ترین ناشتہ بن چکا ہے۔ دوپہر اور رات کے کھانے کا وقت آتا ہے تو نوالوں کی گنتی شروع ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر میں ذرا سا کام کریں، اسکول یا کالج میں تھوڑا سا پڑھ لکھ لیں یا کھیل کود لیں تو ان لڑکیوں کو اتنی تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے کہ چکر آنے لگتے ہیں۔ والدین پریشان ہو کر ڈاکٹروں کے پاس بھاگتے ہیں۔ ڈاکٹر ایسی لڑکیوں کو دیکھ





کی اکثر یہی کہتے ہیں کہ ان میں خون کی کمی ہے انہیں طاقت والی خوراک کھانی چاہئے۔ مریضہ چونکہ خوراک کھانا نہیں چاہتی اس لئے اسے دواؤں پر گزر بسر کرنی پڑتی ہے جو ظاہر ہے مہنگا نسخہ بھی ہے اور اتنا سود مند بھی نہیں۔ دوا غذا کی جگہ کہاں لے سکتی ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ کہیں کہ لڑکیوں کو خوبصورت نظر نہیں آنا چاہئے یا اپنے جسم کا خیال نہیں رکھنا چاہئے۔ خوبصورت جسم لڑکی کے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔ موٹاپا حسن کا بھی دشمن ہے اور صحت کا بھی لیکن آج کل کی لڑکیاں اس حسن کو محض پتلا پن سمجھ کر اپنی صحت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہیں۔ وہ یہ بھول رہی ہیں کہ اچھی صحت سے بڑھ کر کوئی حسن نہیں

سوچنے کی بات ہے کہ انسان اچھی طرح کھائے پئے اور خوب ڈٹ کر محنت کرے تو اسے موٹاپا دور کرنے کے لئے ڈائٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ میں نے اکثر گھرانوں میں دیکھا ہے کہ دھان پان نظر آنے کی تمنائی لڑکیوں سے اگر کہا جائے کہ وہ گھر کا کام کاج کریں تو وہ ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ گھر میں جھاڑو سے صفائی کرنا انہیں اچھا نہیں لگتا لیکن جب

وہ بیوٹی سیلونوں میں پہنچتی ہیں تو انہیں دبلا پتلا کرنے کیلئے ماہرین حسن ان سے سخت قسم کی ورزش کراتے ہیں سو سو بار اٹھک بیٹھک کرائی جاتی ہے رسی پھندوائی جاتی ہے اور دوڑیں لگوائی جاتی ہیں۔ ان مرحلوں کو وہ ہنسی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ تمام ورزشیں گھر کا کام کاج میں مصروف ہونے سے پوری نہیں ہو سکتیں؟ درحقیقت ہم ہر چیز میں مغرب کی نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ڈائٹنگ کے معاملہ میں بھی ہم نقالی میں پیچھے نہیں رہے لیکن ہم یہ بھول گئے ہیں کہ مغرب والوں کے سر سے ڈائٹنگ کا بھوت اترے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ فیشن اور دوسرے معاملات میں ہم مغرب کی نقل اس وقت کرتے ہیں جب وہ اسے چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ آج مغرب میں حسین لڑکی کا تصور ایک دبلی پتلی زرد چہرے والی بیمار سی لڑکی کا نہیں ہے۔ اب وہاں تو حسن کا مطلب ہے اچھی صحت۔ ایسی لڑکی ہی کو حسین سمجھا جاتا ہے جس کے گال بھرے بھرے ہوں جسم سے صحت جھلکے۔ مغربی رسالوں میں بھی اشتہار دیکھنے میں

آتے ہیں کہ زیادہ دودھ پینے سے حسن نکھر آتا ہے۔ حسین لڑکیوں کے ہاتھ میں دودھ کی بوتلیں، مکھن یا کریم کے ڈبے دکھائے جاتے ہیں۔ آج مغربی لڑکے ان لڑکیوں سے محبت اور شادی کرنا پسند نہیں کرتے جن کی صحت اچھی نہ ہو لیکن اس کے برعکس ہماری ہندوستانی لڑکیاں جسم کو سینک سلائی بنانے کے لئے ہر وقت فیشن ماڈلوں یا فلم ایکٹریسوں کی طرف دیکھتی ہیں۔ چونکہ فلاں ماڈل نے چست لباس پہنا ہوا تھا اور دیکھنے والی خود بھی ویسا لباس ہی پہننا چاہتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اپنے جسم کو اتنا پتلا بنائے۔ یہی حال فلم ایکٹریسوں کی نقل کرنے والیوں کا ہوتا ہے لیکن نقل کرنے والیاں یہ بھول جاتی ہیں کہ فیشن ماڈلوں یا فلم ایکٹریسوں کا تو پیشہ ہی یہی ہے کہ وہ اپنے جسم کو پتلا رکھیں۔ لیکن ایک معمولی لڑکی جسے گھر کا کام کاج بھی کرنا چاہئے اور کالج کی پڑھائی یا پھر نوکری کس طرح اپنے جسم کو اتنا ہی دبلا پتلا رکھ سکتی ہیں۔ لڑکیاں اس اندھی دوڑ میں قدرت کے تمام اصول نظرانداز کر کے اندھا دھند ڈائٹنگ کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ آج یہ مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب اگر کسی لڑکی کی صحت اچھی ہوتی ہے اور وہ ڈائٹنگ کرنے والی لڑکیوں کی طرح سوکھی لکڑی نہیں ہوتی تو اسے موٹا یا بھدا کہہ کر چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اچھی بھلی صحت والی لڑکیاں بھی ڈائٹنگ کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ آج ڈائٹنگ اس اصول پر قائم ہے کہ انسان کو اپنا جسم کپڑوں کی تراش کے مطابق ڈھالنا چاہئے حالانکہ اب تک ہم یہی سنتے آئے تھے کہ لباس جسم کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اگر آپ کی خوراک چڑیا سے زیادہ نہیں ہے تو پھر لذیذ کھانے کے مقابلے آپ کے لئے بیکار ہیں۔ کیونکہ ہر روز صبح سویرے وزن کرنا اچھا ہے۔ مگر فاقہ کر کے وزن گھٹانے سے۔ اکثر اوقات دعوتوں میں یہ سنا گیا ہے کہ خواتین مشروب سے پیٹ بھر لیتی ہیں تاکہ کھانے کے لئے جگہ ہی نہ رہے۔ حال ہی میں حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور شادی کے دوسرے روز شوہر کو معلوم ہوا کہ ان کی بیوی صرف ہوا اور پانی پر جیتی ہے۔

اب آپ بخوبی اندازہ لگا سکتی ہیں کہ فیشن آپ کی خوبصورتی کا راز ہے یا آپ کی جسمانی و نفسیاتی زندگی کا دشمن۔ نہایت سنجیدگی سے اس اہم ترین مسئلہ پر غور و فکر کیجئے اور ایسا راستہ اپنائیے جس سے آپ کے اوصاف زندہ رہیں اور آپ ایک صحت مند خاندان، قوم اور سماج کی بنیاد قائم کر سکیں۔ ••

داؤدی بوھرا

مسلمانوں کا ایک منظم فرقہ

• احمد مصطفیٰ راہی

• زیرِ نظر مضمون کی ترتیب میں یہاں بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے وہیں تھوڑی بہت مدد پی رائٹ جونیر کے ایک مضمون سے بھی کافی لی گئی ہے۔ مسٹر جونیر ہندوستان کے مختلف مسلکوں کے طرزِ حیات اور آدابِ زندگی پہ گہری نظر رکھتے ہیں اور ان مسلکوں کے متعلق ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں کو سند سمجھا جاتا ہے۔ •

دنیا کے مسلمان مختلف اکائیوں میں بٹے ہوئے ہیں ایسی ہی ایک اکائی داؤدی بوہرہ مسلمانوں کی بھی ہے بدقسمتی سے عام مسلمانوں کو ایک ہی درخت کی متعدد شاخوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں اور ان کے درمیان تعصب اور غلط فہمیوں کی دیواریں حائل ہیں۔ داؤدی بوہرہ مسلمانوں کے سلسلہ میں بھی عام طور بوہرہ مسلمانوں کی معلومات بہت کم ہیں اور لے دے کر وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ "وہ گول سنہری ٹوپیاں اوڑھتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں"۔

اگر آپ داؤدی بوہرہ مسلمانوں کا قریب سے جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کم معروف لیکن انتہائی منظم اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے۔ عام طور پر دوسرے اسمٰعیلیوں کی طرح مثلاً خوجہ مسلمانوں کی طرح بوہرہ مسلمان بھی قرآن





بوہروں کے موجودہ مذہبی پیشوا تقدس مآب ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین صاحب

کے ظاہری معنوں کے پس پشت پوشیدہ معنوں پر عقیدہ رکھتے ہیں اور بارہویں صدی میں مصر اور سولہویں صدی میں یمن میں اقتدار سے محروم ہونے کے بعد انھوں نے تقیہ کر کے اپنے باطنی عقیدہ کو چھپائے رکھا۔ تقیہ اس عمل کو کہتے ہیں جو انہیں انتہائی خراب حالات میں اپنی حیثیت و شخصیت اور عقائد پر پردہ ڈالنے اور انہیں پوشیدہ رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔

عام مسلمانوں اور بوہروں کے درمیان امتیاز کو سمجھنے کے لئے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ عملی طور پر مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلاف کا آغاز امت کی مذہبی قیادت کے سوال پر ہوا تھا۔ بوہرہ مسلمانوں کا پورا نام "شیعہ اسمٰعیلی طیبی داؤدی مسلمان" ہے یہ وہ مسلمان ہیں جو (۱) دوسرے شیعوں کی طرح پہلے تین منتخب خلفاء پر حضرت علی کو افضلیت دیتے ہیں اور انہیں وارث رسولؐ سمجھتے ہیں (واضح رہے کہ حضرت علیؓ، رسول اللہ صلعم کے چچیرے بھائی اور ان کی بیٹی بی بی فاطمہ زہرا کے شوہر تھے۔) (۲) جو ساتویں امام کی حیثیت سے اسمٰعیل کے دعووں کو برحق مانتے ہیں (۳) جو مستعلی کو مصر کا جائز فاطمی خلیفہ سمجھتے ہیں (۴) جن کا عقیدہ یہ ہے کہ امام طیب تقریباً ۱۱۳۰ء میں ایک داعی مطلق کو امام کے دوبارہ ظہور کے وقت تک اپنا نائب بنا کر پردہ غیب میں چلے گئے تھے اور (۵) داؤدی وہ ہیں جو ۱۵۸۹ء میں سلیمان ابن حسن کے مقابلہ میں جسے سلیمانی بوہروں کی بنیاد رکھی تھی، داعی داؤد ابن قطب شاہ کی قانونی وراثت کو تسلیم کرتے ہیں۔

دینی فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں بوہرہ مسلمانوں اور عام مسلمانوں کے درمیان بہت کم فرق ہے۔ وہ دن میں ۵ وقت کی نمازیں تین بار میں پڑھتے ہیں یعنی ظہر اور عصر کی نماز اور مغرب و عشاء کی نماز الگ الگ نہیں پڑھتے بلکہ ساتھ پڑھتے ہیں، چونکہ ان کا امام پردۂ غیب میں ہے، اس لئے جمعہ کی نماز کے بعد خطبہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر ماہ کے آغاز کا تعین کرنے کے لئے چاند کے طلوع و غروب ہی کا سہارا لیتے ہیں، اور مرنے والے کو دفن کرتے وقت اس کے ہاتھ میں ایک "رقعہ" رکھ دیتے ہیں۔

ہندوستان میں:- ہندوستان میں پہلا اسمٰعیلی مبلغ ۱۰۶۱ء میں مسلمانوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے ۲½ سو سال پہلے بہت پُرامن اور پُرسکون طور پر گجرات میں آیا تھا۔ ۱۵۳۹ء میں داعی طیبی کا مرکز بھی یمن سے ہندوستان منتقل ہو گیا تھا اس کے بعد پھوٹ پڑی اور خوجوں اور بوہروں (جو اسمٰعیلی شاخ ہی کا حصہ ہیں) کے دو الگ الگ فرقے بن گئے۔ اسمٰعیلی مبلغوں کی کوشش سے بڑی تعداد میں ہندوؤں نے اپنا مذہب بدلا اور وہ بوہرہ مسلمان بن گئے تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی ہے کہ شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں مغربی ہندوستان کے ہندوؤں نے اتنی بڑی تعداد میں اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سُنی مبلغین کے مقابلہ میں اسمٰعیلی مبلغین ہندو رسم و رواج کے سلسلہ میں زیادہ سخت نہیں تھے اور انہوں نے رواداری کا مظاہرہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ اب بھی بوہروں کے یہاں ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج پر بالخصوص شادی کے سلسلہ میں ہندوؤں کی روایات پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شادی کی دعوت میں بوہرہ دلہن کچا ناریل توڑتی ہے۔ بوہروں کو تجارت کا فن ورثہ میں ملا ہے۔ حالانکہ بنکاری اور انشورنس کے سلسلہ میں اُن کو رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اسلام سود لینے اور دینے کی مخالفت کرتا ہے لیکن ان کو شروع ہی میں قدامت پسند ہندوؤں پر یہ عارضی فوقیت حاصل ہو گئی کہ سمندر پار کا سفر ممنوع نہیں رہ گیا تھا اور انہوں نے انیسویں صدی ہی میں پوری دنیا سے کاروبار شروع کر دیا تھا۔

بوہرے مسلمانوں کے بعض فرقوں کی طرح خاندانی نجابت اور شرافت کے مصنوعی فخر کا بھی شکار نہیں ہیں۔ وہ لیکن دیگر شرافت، صفائی، تعلیم اور سخت محنت کرنے کی صلاحیتوں سے لیس ہیں اور چونکہ کاروبار میں کامیابی کے لئے یہ صلاحیتیں انتہائی ضروری ہیں اسی لئے وہ کامیاب کاروباری ہیں۔ گجرات میں اپنے مستقر (سورت، کھمبات، بھڑوچ، احمد آباد اور کپڈوانج وغیرہ) سے نکل کر داؤدی اور سلیمانی دونوں فرقوں کے بوہروں نے برطانوی راج کے بعد انیسویں صدی میں بمبئی کے لئے ہجرت شروع کر دی تھی۔ جلد ہی سورتیوں نے جہازی تجارت کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور دوسرے علاقوں سے آنے والوں نے درآمد و برآمد کی تجارت میں پارسیوں کے بعد دوسرا مقام حاصل کر لیا۔ اور پھر ان لوگوں نے بحیرہ ہند، خلیج فارس، مشرقی افریقہ۔ لنکا۔ برما۔ تھائی لینڈ۔ ہانگ کانگ اور جاپان کی بندرگاہوں تک کا سفر کیا اور اپنی تجارت کو خوب چمکایا۔ ان کے بعد بمبئی آنے والے بوہروں نے ہارڈویئر، رنگ و روغن۔ صابن۔ چمڑے۔ پلمبنگ۔ اسٹیشنری اور سوڈا واٹر کے اپنے روایتی کاروبار میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ ان کے کاروباری اداروں کے نام ایسے ہیں کہ متعصب لوگوں کو ملکیت کا علم نہیں ہو پاتا۔ بوہرہ مسلمان ان چند مسلمانوں میں ہیں جن کی عرفیت بالکل دیسی ہے اس لئے روزگار اور کاروبار میں ان کے ساتھ مذہبی تعصب برتے جانے کا بہت امکان رہتا ہے۔

ہندوستان اور سمندر پار کے ملکوں میں داؤدی بوہرو
ر کا اندازہ تین لاکھ سے دس لاکھ تک لگایا جاتاہے
ران بوہروں میں رفتہ رفتہ داڑھی اور ٹوپی کا رواج
ا ہے اور وہ عام مروجہ لباس زیب تن کرنے لگے
لئے بمبئی میں اب رفتہ رفتہ ان کی انفرادی شخصیت
امتیاز ختم ہوگئی ہے لیکن بوہرہ عورتوں کی اکثریت
روایتی لباس زیب تن کرتی ہے۔

ں پہلے ہی یہ بتا چکا ہوں کہ بوہروں اور خوجوں میں
ہم ہے اور وہ تمام مسلم فرقوں میں سب سے زیادہ
، بوہروں کے ہاں نجات صرف اسی وقت ممکن ہے
ا تا اس کے رسول حضرت محمدؐ تا حضرت علی تا ائمہ تا
ب امام کے ساتھ پردۂ غیب میں ہیں) تا داعی المطلق
اؤں کے پورے سلسلہ پر عقیدہ رکھے اسکے داعی (جنہیں
اجی کہا جاتا ہے) کے بعد ماذون کا درجہ ہے جو عام
ی کے ولیعہد ہوتے ہیں۔ پھر مکسر، شیوخ اور مُلا ہوتے
نا کے نمائندوں یا عاملوں کا انتخاب شیوخ میں سے
ہے جو تقریبات میں سیدنا کی نمائندگی کرتے ہیں اور
برہ وصول کرتے ہیں تمام بوہرے میثاق یا حلف کے
نا کی وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اس کی خلاف ورزی
دں پر جرمانے کئے جاتے ہیں اور برات تک سے کام لیا
عام طور پر تمام بوہرے سیدنا سے وفاداری کا عہد کرتے
۔ ایک بڑے اور منظم فرقہ کی رکنیت حاصل کرکے وہ نہ
سیاسی بلکہ مالی فائدہ میں بھی رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو
ے دیئے جاتے ہیں۔ کاروبار میں قرض کی سہولیات حاصل
۔ خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ انجمن شیعیان علی سیفی
ل۔ برہانیہ کالج آف کامرس۔ طاہرہ وظائف۔ طلبکے
سیفی ہسپتالوں۔ سورت والا مسافر خانہ۔ کوآپریٹو بنک
ی اداروں سے تعاون ملتا ہے۔

بہروں سے نجی ٹیکسوں کی وصولیابی کا سسٹم بہت اچھا
یں عام طور پر شادی اور موت کے وقت سارے کے
صول ہوجاتے ہیں۔

لے بوہروں کے داعی کا مرکز سورت میں تھا لیکن سیدنا
ف الدین نے جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک داعی مطلق
مرکز بمبئی منتقل کردیا تھا، وہ ارادے کے پکے اور لاتعداد



مرحوم ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین جو نصف صدی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک بوہروں کی مذہبی قیادت فرماتے رہے

خوبیوں کے مالک تھے اس لئے ان کے دور میں بوہروں نے خوب ترقی کی اور انہوں نے اپنے فرقہ کے اوقاف کو اپنے قابو میں کرنے کے بعد داعی مطلق کے اختیارات کو حقیقت کا روپ دیا۔ آجکل ان کے صاحبزادہ سیدنا محمد برہان الدین اس منظم برادری کے داعی ہیں۔

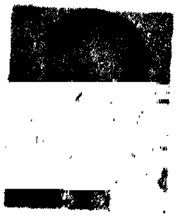
ابتدا میں سیدنا طاہر سیف الدین نے بوہرہ رسم و رواج میں تبدیلیوں کی سخت مخالفت کی لیکن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے اپنے ماننے والوں میں بہت سی جدید تبدیلیاں برداشت کرلیں۔ بوہرہ بچوں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کردیا اور عورتوں میں پردہ کم ہوگیا۔

ایک صدی قبل داعی مطلق کے سوال پر بوہرہ فرقہ میں زبردست پھوٹ پڑگئی جس کے نتیجہ میں کئی گروہ پیدا ہوگئے تھے جن میں مہدی باغ والے اور اڑتالیس والے کافی مشہور ہوئے۔ حال ہی میں ایک تنظیم پرگتی منڈل نے اس فرقہ میں کافی بے چینی پیدا کی لیکن اس منڈل کے اثرات محدود ہیں اور موجودہ داعی مطلق سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین کی قیادت پر بوہروں کی واضح اکثریت کو مکمل اعتماد ہے۔ سیدنا طاہر سیف الدینؒ کے مزار پر آج بھی بمبئی کے بوہرہ محلہ میں ہزاروں عقیدتمندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

سلیمانی بوہرے:- بوہروں میں ۹۰ فیصدی داؤدی ہیں اور ۱۰ فیصدی کے قریب سلیمانی ہیں۔ ان دونوں کے رسم و رواج اور عقائد تقریباً یکساں ہیں اور ان کے درمیان بنیادی اختلافات ۱۵۹۱ء میں ۲۶ ویں داعی داؤد بن عجب شاہ کے انتقال کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کے بوہرے داؤد بن قطب شاہ کو اپنا ۲۷واں داعی سمجھتے ہیں جبکہ سلیمانی بوہرے جن کے روحانی پیشوا کا مرکز یمن میں ہے سلیمان بن حسن کو ۲۷واں داعی مانتے ہیں۔ سلیمانی زیادہ تر یمن میں آباد ہیں اور ہندوستان میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ داؤدی بوہروں کے داعی ملاجی کی طرح ہندوستان کے ہوتے ہیں لیکن سلیمانی بوہروں کا ہمیشہ

بارگاہ ایزدی میں دست بدعا رہیے





▲ یحیٰی سی مرچنٹ



▲ بدرالدین طیب جی

◀ ڈاکٹر دائی نجم الدین



عبدالطیب
اسماعیل
جی

ڈاکٹر سالم علی

▼ آصف فیضی

یمن ہوتا ہے۔ صرف ایک بار جب علی بن محسن کا جو ۴۰ ویں سلیمانی داعی تھے، انتقال ہوگیا تھا۔ ایک ہندوستانی غلام حسین کو جو بمبئی کے رہنے والے تھے سلیمان بوہروں کے داعی مطلق کا عہدہ ملا تھا لیکن ان کا موجودہ داعی عربی النسل ہے اور وہ یمن میں رہتا ہے۔ جن مقامات پر کافی تعداد میں سلیمانی بوہروں کی آبادی ہے وہاں وہ اپنے نمائندے مقرر کرتے ہیں اور یہ نمائندے چیف ملّاجی صاحب کی نیابت میں مذہبی امور انجام دیتے ہیں۔

سلیمانی بوہرے زیادہ تر کاروبار کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے آرٹ، قانون، طب اور تعلیم کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور امین طیب جی کا خاندان سرفہرست ہے۔

بوہرہ حضرات چاہے وہ داؤدی ہوں یا سلیمانی حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے بے انتہا عقیدت رکھتے ہیں اور زندگی میں ایک بار نجف اور ایک بار کربلا کی زیارت کرنے کے لئے ہر وقت بے چین سے رہتے ہیں۔

یہ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور اختلافات سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔

قابل ذکر ہستیاں :- ڈاکٹر دائی نجم الدین جو علمی کلچر، تاریخ اور علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں، بوہرہ علماء میں بہت ممتاز ہیں۔ وہ بہت سے عوامی اوقات کے رکن ہیں اور سورت میں الازہر (مصر) کے خطوط پر قائم "الجمعیۃ الصوفیاء" کے روح رواں ہیں۔ مشہور آرکیٹکچر یحیٰی سی مرچنٹ، ممتاز تاجر اور صنعت کار عبدالطیب اسمٰعیل سفطی پارلیمنٹ کے ممبر اور جنگ آزادی کے مانے ہوئے سپاہی صالح عبدالقادر، بمبئی مرکنٹائل کو اپریٹیو بینک کے روح ر[illegible] زین جی۔ رنگون والا مشہور پینٹر اور فلمساز طیب مہتہ[illegible] مواصلات کی دنیا کے گنے چنے ماہروں میں شمار ہونے[illegible] امیر ابراہیم حسین۔ شاہ حبشہ ہیل سلاسی کے دست[illegible] اسمٰعیل محمد علی کنگا۔ بمبئی کی سماجی زندگی میں اہم مقا[illegible] والے اور ہندوستانی کرکٹ کی ترقی میں پیش پیش ہو[illegible] وار مشہور معمار اور سماجی خدمت گار شیخ محمد علی، اللہ بخ[illegible] اورنگ آباد کی سیاسی و علمی سرگرمیوں کی جان ذوالفق[illegible] چند ایسے نام ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ ان پر نہ صرف بوہروں کو بلکہ پورے ہندوستان کو ناز ہے۔ سلیمانی بوہ[illegible] میں بدرالدین طیب جی، محمد فدا حسین آرٹسٹ، خط شناس ظفر آرنخ علی اور تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھنے آصف اے۔ اے فیضی کی شہرت پوری دنیا میں ہے۔

رسم و رواج :- بوہرے عام طور پر اپنے فرقہ کے شادی کرتے ہیں۔ نکاح یا تو ہز ہولی نس پڑھتے ہیں؛ دولہا اور دلہن پہلے عامل سے یہ سند حاصل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فرقہ کو تمام واجبات ادا کرائے ہیں پھر شاد[ی کی] تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اجتماعی شادیاں بھی ہوتی ہیں جو "سمو لگن" کہلاتی ہیں۔ مہر ۱۱ روپے مقرر ہے۔

بوہرہ دولہن اپنے چچا کی رہنمائی میں اپنے نئے [گھر میں] داخل ہوتی ہے جو ایک دیا جلا کر زمینی راستہ دکھا[تا ہے۔] دولہا اور دولہن کے دائمی اتحاد اور رفاقت کی [علامت کے] طور پر دونوں کو ایک دوپٹہ میں باندھ دیا جاتا ہے۔

▼ آرٹسٹ، مقبول فدا حسین





بوہروں میں شادی سے پہلے مذہبی رہنما سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے



بوہرہ فرقہ میں بوقت عقد مذہبی رہنما یا اس کے نمائندے کی موجودگی لازم ہے

ہے بلکہ خالص ہندوؤں کی رسم ہے اسی طرح
ود رسم پر عمل ہوتا ہے۔ داخلہ کے دروازہ پر دولہن
ن دولہن کے سر پر پانی سے بھرا ہوا ایک تانبے
اتارنے کے لئے گھماتی ہے۔ دولہن اپنی ساس
پیروں کو اپنی آنکھوں، ماتھے اور ہونٹوں سے
ہے۔

ولادت کے چھٹے دن اس کا نام رکھنے کی رسم
ہے۔ بچے کی چچی خالص گھی کا دیا رکھ کر ایک
زعفران کا پانی چھڑکا ہوا سفید کپڑوں کا جوڑا
تا ہے۔ ۲۱ ویں دن عقیقہ کی رسم ادا کی جاتی
بال کاٹے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بکری کی
تی ہے۔ سالگرہ کے موقع پر بچے کے سر سے ناریل
ہے۔ بچوں کو گھوڑے پر سوار کرنے کی رسم بھی ادا
اور اسے دولہا بنا کر رنگا رنگ جلوس کی شکل
اتا ہے۔ جب بچہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو——
ملاّجی صاحب سے وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے
کی تقریب کہتے ہیں۔ عام طور پر بہت سے بچوں
کو ملاّجی کی خدمت میں لے جا کر یہ رسم ادا کی جاتی
اس موقع پر بچہ پابندی سے نماز پڑھنے، ملاّجی کے
ضابطۂ اخلاق پر عمل کرنے اور ملاّجی کے مخالفوں
ترک کرنے کا عہد کرتا ہے۔ اگر وہ لڑکا ہے تو وہ ایک
بچے ملاّجی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ عہد کرتا ہے

اور اگر وہ لڑکی ہے تو ایک ڈوری پکڑ کر جس کا ایک سرا ملاّجی صاحب کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وفاداری کا عہد کرتی ہے عہد کرنے کے بعد بچے ملاّجی صاحب کے قدموں کو بوسہ دیتے ہیں——

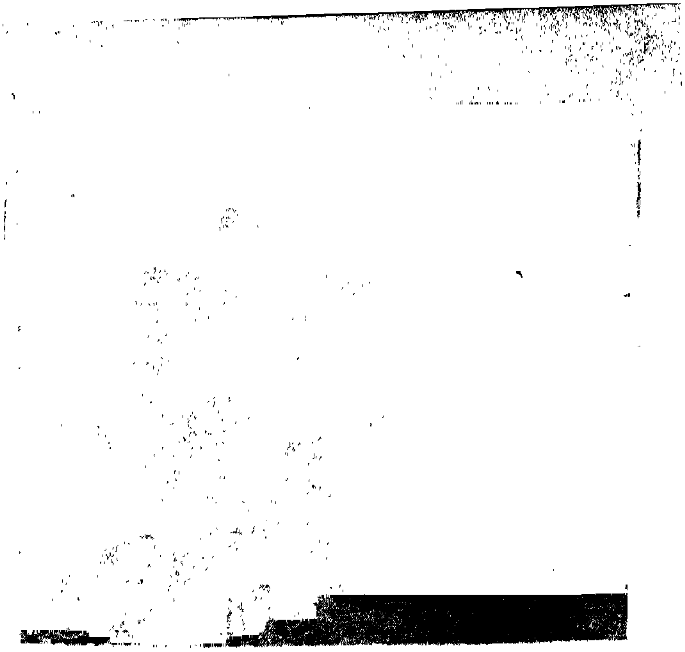
مرنے کے بعد متوفی کی قبر میں ایک "رقعہ، چٹھی" رکھنے کا رواج ہے جو ہیڈ عامل کا جاری کیا ہوا ہوتا ہے۔

ایک روایت:۔ آجکل کے تمام بوہرے کسی زمانہ میں ہندو برہمن تھے اور تقریباً ۹۰۰ سال قبل دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

روایت ہے کہ ۱۸ ویں داعی کے زمانہ میں دو مبلغین ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ یہ تھے مولائی احمد اور مولائی عبداللہ کھمبات میں جہاز سے اترنے کے بعد مولائی عبداللہ جو بہت بڑے عالم تھے وہاں کے لوگوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے وہیں ٹھہر گئے تھے۔ ان کی ابتدائی تبلیغی کامیابیوں کے سلسلہ میں بہت سی روایات بیان کی جاتی ہیں ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک خشک کنویں کو میٹھے پانی سے بھر کے وہاں کے کاشت کاروں کے دل جیت لئے تھے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ کھمبات کے ایک سمندر میں ایک فولادی ہاتھی ہوا میں معلق تھا۔ جیسے انہوں نے زمین پر گرا کر کچھ پجاریوں کو اپنے دائرۂ عقیدت



آرتی اُتارنے کا رواج بوہروں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ کرتی پیلی کے روٹے کے ذریعے آتاری جاتی ہے



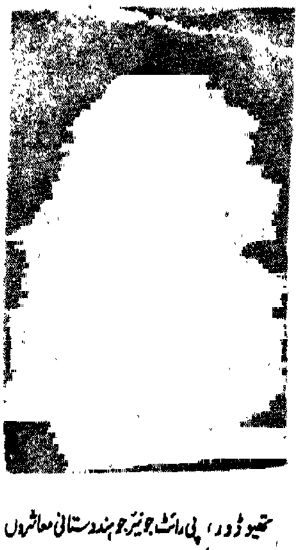
بوہروں کی ایک مذہبی تقریب میں (دائیں سے بائیں) مرحوم سیدنا طاہر سیف الدین، اور پنڈت جواہر لال نہرو، موجودہ مذہبی قائد سیدنا برہان الدین اور دوسرے

میں شامل کر لیا تھا۔

اس کے بعد وہ پٹن کے لئے روانہ ہو گئے جو اس زمانہ میں گجرات کی راجدھانی تھا۔ شہر کا راجا سدھ راج جے سنگھ (۱۰۹۴ء–۱۱۴۳ء) نے اس اجنبی کو پکڑ لانے کے لے مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا لیکن ان سپاہیوں نے دیکھا کہ ان کے چاروں طرف آگ کی دیوار کھنچی ہوئی ہے اس لئے وہ پریشان ہو کر واپس چلے گئے اور انہوں نے راجا کو سارا قصہ بتایا پھر خود راجا گیا اور مولائی عبداللہ کے حکم پر آگ کی دیوار ہٹ گئی اور راجا آگے بڑھ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر راجا بہت حیران ہوا اور اس نے مولائی عبداللہ سے کہا کہ وہ اپنے مذہب کی فضیلت کے ثبوت میں کوئی اور کرامت دکھائیں۔ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی اور راجا کی ایک مقدس ترین مورتی "نے اعلان کیا کہ "سچا مذہب عربوں کا ہے"۔ مورتی کے منہ سے یہ فقرہ سننے کے بعد راجا اور اس کی رعایا مسلمان ہو گئی۔

تیسری روایت کھمبات میں مولائی عبداللہ کے ورود کے سلسلہ میں ہے۔ اس زمانہ میں گجرات کے لوگوں کو اسلام کے پیغام کا کوئی علم نہیں تھا اور ان کی اکثریت ایک ہندو سادھو پر عقیدہ رکھتی تھی۔ مولائی عبداللہ نے یہ سوچ کر ہندو سادھو کی کھلی ہوئی مخالفت خطرناک اور ناممکن ہے

خود کو سادھو کے چیلوں میں شامل کر لیا۔ چونکہ وہ ذہین آدمی تھے اس لئے جلد ہی انہوں نے عوامی زبان سیکھ لی اور سادھو کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس سے بحث شروع کر دی۔ ان کی بحث اتنی مدلل تھی کہ سادھو کے بہت سے چیلے مسلمان ہو گئے۔ بالآخر راجا سدھ راج کو یہ اطلاع ملی کہ اس کا منتری بھی مسلمان ہو گیا ہے۔



تھیوڈور، پی رائٹ جونیئر جو ہندوستانی معاشروں پر گہری نظر رکھتے ہیں



بھنڈی بازار (بمبئی) میں مرحوم طاہر سیف الدین کے مزا
خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بوہرے



مرحوم سیدنا طاہر سیف الدین کے جنازے کا جلوس

راجا نے اپنے منتری کو نماز پڑھتے دیکھا تو اس سے کیا کہ وہ کیا کر رہا ہے اس نے جواب دیا کہ وہ قالین نیچے سانپ تلاش کر رہا ہے۔ اسی وقت ایک گوشہ سانپ نمودار ہوا اور یہ کرامت دیکھ کر راجا اسی مسلمان ہو گیا لیکن اس نے اسے راز ہی رکھا ا سے پہلے اس نے حکم دیا کہ اسے مسلمانوں کی طرح جائے۔ سدھ راج کے دونوں جانشین کمار پال (۱۱۴۳ء–۱۱۷۲ء) اور اجے پال (الیعقوب) (۱۱۷۲ء–۱۱۷۶ء) اور سدھ جین گورو ہیم اچاریہ ترمل بھی مسلمان ہو گئے۔ ا مبلغین اور ان کے ہاتھوں سب سے پہلے مسلما والوں، کنوئیں کے مالک اور اس کی بیوی کے مز میں ہیں اور ہندوستان کے بوہرے ان کی زیا ہیں۔ کنوئیں کا مالک کاکا اکیلا اور اس کی بیوی کے نام سے مشہور ہیں۔

جن سنگھ

ہندو راشٹر سے سوشلزم تک

• واقعات کے مبصر کے قلم سے

ئے آخری ہفتے میں یوپی کے صنعتی شہر غازی آباد میں بھارتیا
جلاس میں ہونے والی بحث اور فیصلوں سے یہ اندازہ لگانا
ہے کہ گزشتہ وسط مدتی انتخابات میں ترقی پسند قوتوں کے
ہار کے بعد جن سنگھ اپنے سیاسی وجود کو بحال رکھنے اور
ت میں دوبارہ پاؤں جمانے کے لئے اب نئے ہتھکنڈے
روائی ہے۔

مرول کا خیال ہے کہ جن سنگھ کے غازی آباد اجلاس سے
ملا وہ ہندو راشٹر سے سوشلزم کی طرف آ رہی ہے اور دہلی
ضار نے جو اس پارٹی کا بڑا ہمدرد سمجھا جاتا ہے جن سنگھ
اس تبدیلی کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اب اسے
ی "میں مسز سبھدرا جوشی کو شامل کر لینا چاہئے۔ اور
ے صدر محمد اسمٰعیل صاحب کو اپنا نائب صدر بنا لینا چاہئے
نا ہوں کہ جن سنگھ کے بنیادی مقاصد میں کوئی تبدیلی
۔ اس کا دل نہیں بدلا ہے۔ اس کی روح میں کوئی تغیر
لا ہے۔ اور اس کا باطن پہلے ہی جیسا ہے۔ اس نے یہ
ب کے نام پر اقتدار نہیں حاصل ہو سکتا۔ اور عوام کو
ے نعروں کے بغیر سیاسی استحکام حاصل کرنا ناممکن ہے
اہری رنگ روپ کو بدلا ہے۔ دراصل شراب وہی پرانی
ول اور لیبلوں کو بدل دیا گیا ہے جس کی تصدیق خود
صدر شری اٹل بہاری باجپئی نے اجلاس کے اختتام
بان سے کر دی ہے کہ "کچھ سجنوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ جن سنگھ
ارٹی بن گئی ہے۔ ان کی پارٹی نہ تو بائیں بازو کی بن رہی ہے
لی بلکہ سیدھے اور درست راستہ پر چل رہی ہے۔
نگھ نے راجاؤں کے وظائف بند کرنے، بنکوں کو قومی
لئے جانے اور جنرل انشورنس کے نیشنلائزیشن کی زور
ہ کے اب تک تو یہی ثبوت دیا ہے کہ اس کا راستہ نہیں بدلا
یچھے اٹل بہاری باجپئی کی وضاحت کو من و عن تسلیم کر لینے
ت نہیں نظر آتی۔

جن سنگھ اب خود کو اس نئے سوشلسٹ بنا کر پیش کر رہی
ے کے عوام سوشلزم اور سیکولرزم کے علاوہ کچھ پسند نہیں کرتے
ر عمل میں جو فرق ہے اسے سب محسوس کرتے ہیں۔ خاص
ان کے غریب عوام نے اب اس بات کو اچھی طرح محسوس
قوں میں زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہتی ہیں جو مذہبی
باہمی افتراق پیدا کرنے والی کہانیوں اور افسانوں کو
جزو ایمان سمجھتی ہیں۔

عوام نے یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ سرمایہ دار دنگی طرف لے اپنے مفادات کی حفاظت اور لوٹ کھسوٹ کے لئے نفرت کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔ اور انہوں نے یقین کر لیا ہے کہ جن سنگھ نے انتہائی اہم سوشلسٹ اصلاحات کی مخالفت کر کے گویا سرمایہ داروں کے کاز کی حمایت اور عوام کے کاز کی مخالفت کی ہے اسلئے وہ اس سے دور ہو گئے ہیں۔

جن سنگھ کی ہندوستان میں ترقی اور ترویج میں وسط مدتی انتخابات سے پہلے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ڈھیلی ڈھالی پالیسی نے بڑی مدد دی تھی۔ اس پارٹی نے اپنی تنظیم، مظاہروں، جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ کم از کم شمالی ہند میں برسر اقتدار طبقہ اور پارٹی کو جس کی قیادت "بڑھوں" کے ہاتھ میں تھی کافی مرعوب کر رکھا تھا ان میں کچھ پر پاکستان کے حملے کے وقت اور نام نہاد گئوکشی بند کرانے کے لئے پارلیمنٹ پر زوردار مظاہرے کر کے جن سنگھ نے اپنی دھاک جما دی تھی لیکن وقت کی رفتار تیزی سے بدلی ہے اور اب ملک پر ایسے عناصر کی حکومت ہے جو کسی معاملہ میں بھی جن سنگھ کو منہ لگانے کے لئے تیار نہیں نظر آتی۔ اس لئے جن سنگھ کو اپنا چولا بدلنا پڑا ہے لیکن اس کی وسوسہ انگیز سیاست نہیں بدلی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی باطنی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو "بنچ آف تھاٹ" کو آسمانی کتاب سمجھتے اور اپنے دماغ کو "آریہ" اور "غیر آریہ" کے خانوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔

بنارس میں دین دیال اپادھیائے (جن سنگھ کے سابق صدر) کی موت کو پراسرار بنانے اور ڈاکٹر فریدی اور مسلم مجلس مشاورت کو قتل کی سازش میں ملوث قرار دینے کی کوششیں جن سنگھ کی اسی وسوسہ انگیز سیاست کا ایک جزو تھیں اور بنگلا دیش کو تسلیم کرنے کا مطالبہ بھی اسی انداز میں کیا گیا کہ ایک طرف مرکزی حکومت کے لئے مسائل پیدا کئے جائیں اور دوسری طرف عوام کو حکومت کے خلاف وسوسوں اور شکوک و شبہات میں مبتلا کیا جائے۔ غازی آباد اجلاس میں جو قرارداد بنگلا دیش اور ہند پاک تعلقات کے سلسلہ میں منظور ہوئی ہے اس کا ایک ایک لفظ منافقانہ ہے۔ اس قرارداد میں یہ ۹ نکاتی مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان ایٹمی طاقت بنے، دفاعی طاقت دگنی کی جائے۔ نیوی کو بحر ہند کے علاقہ میں سب سے مضبوط بنایا جائے۔ سلامتی کونسل میں ہندوستان کے لئے مستقل جگہ حاصل کی جائے۔ دفاعی ملازمین کی شرح تنخواہ پر نظر ثانی کے لئے ایک خصوصی پے کمیشن مقرر کیا جائے۔ جنگ کے خطرہ کی انشورنس سکیم شروع کیجائے۔ تخریبی کارروائی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں اور مسز گاندھی کی حکومت یہ حلف لے کہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گی جب تک مقررہ تاریخ تک عام پناہ گزین اپنے وطن کو واپس نہ ہو جائیں۔ ایک ہی سانس میں اتنے بہت سے مطالبات کر دینا آسان ہے۔ لیکن ان تمام توقعات کی تکمیل کرنا کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ خود جن سنگھ کے لیڈروں کو بھی ہے۔ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں ہوں بلکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے ایک ساتھ یہ سب کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا جب یہ نہ ہو سکے گا تو وہ عوام سے کہیں گے کہ حکومت کمزور ہے۔ قیادت نکمی ہے۔ دیش کی باگ ڈور جن سنگھ کو سونپی جائے۔

اس قرارداد میں وسوسہ انگیزی اس جملہ سے عیاں ہے کہ جنرل کونسل کو افسوس ہے کہ حکومت ہند حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو اقدامات کر رہی ہے وہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مکتی واہنی کو محدود امداد دینے کی اس کی موجودہ پالیسی غیر ضروری طور پر بنگلا دیش کے مصائب میں اضافہ کر رہی ہے اور پناہ گزینوں کی تعداد بڑھا رہی ہے۔

جن سنگھ والوں کو میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ وسوسہ انگیزی کی راہ ترک کر دیں اور صرف اقتدار حاصل کرنے یا برسر اقتدار طبقہ کو رسوا کرنے ہی کے لئے لمبے چوڑے مطالبات نہ کریں بلکہ اپنے انداز فکر کو مثبت بنا کر خود کو اندر سے بدلیں ورنہ ان کی حالت آئندہ پانچ سال میں اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔

امیر خسرو اور موسیقی

[illegible]



اس سرزمین سے حضرت امیر خسرو جیسا صاحب ذوق، کامل اور جامع صفات شخص اب تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ استاد غزل شیخ سعدی سے مانے ہوئے ہیں لیکن اگر کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ ہوا ہے تو وہ حضرت امیر خسرو ہیں۔ ان کے کلام کی فصاحت، روانی اور خاص کر سوز و گداز جس میں تصوف کی چاشنی بھی شامل ہے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یوں تو ہر اہل زبان کو اپنی زبان کا غرہ ہوتا ہے لیکن اہل ایران اس معاملہ میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ کسی غیر ایرانی کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن حضرت امیر خسرو کے سامنے انہیں بھی جھکنا پڑا۔ تذکرہ نویسوں اور خسرو کے سوانح نویسوں نے ان کے حالات، کلام اور تبصرے میں اس امر کو بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ فن موسیقی کے بھی نہ صرف استاد کامل بلکہ موجد تھے۔ لیکن کسی نے تفصیل سے یہ نہیں لکھا کہ آپ نے کیا کیا اختراعات اور ایجادات کیں۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی ترویج اور ترکیب میں کون کون سے راگ ایجاد ہوئے۔ اس مختصر مضمون میں تمام تفصیلات کا بیان کرنا ممکن نہیں تاہم ناظرین کی تفریح طبع کی غرض سے بعض حالات درج کئے جاتے ہیں:۔

حضرت امیر خسرو دہلی کے سات بادشاہوں کے درباروں میں ملازم رہے۔ جہاں علاوہ ہندوستان کے عربی اور عجمی موسیقار بھی ملازم تھے۔ اور اس حالی کو محسوس کر کے کہ ہندی راگوں میں جو اس وقت رائج تھے خمسہ، غزل، رباعیات اور حمد و ثناء گانے کی گنجائش مطلق نہیں ہے۔ بذات خود عربی، عجمی اور ہندی موسیقی سے واقفیت حاصل کر کے بارہ راگ ایجاد کئے جن کے نام یہ ہیں:

راگ رنگولہ، راگ غنم، راگ باغزر، راگ سرپردہ، راگ فرغانہ، راگ نیلف ــــــ راگ موافق، راگ عشاق ــ راگ ایمن، راگ سازگری اور راگ مجیب یا مجیر۔

یہ راگ ایسے مقبول ہوئے کہ ہندوستان کے ہر حصہ سے بکثرت موسیقار دہلی میں آکر سیکھتے اور مجالس حال و قال میں شریک ہوتے آج جو موسیقی ہند و پاکستان میں مقبول ہے وہ امیر خسرو ہی کی مرہون منت ہے۔

امیر خسرو کے زمانے کا سب سے بہتر موسیقار نائیک گوپال تھا جس کے تقریباً بارہ سو شاگرد تھے۔ جب سلطان علاء الدین نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو اپنے دربار میں طلب کیا۔ یہ موجود رہتے۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ یہ کمال دکھائیں۔ امیر نے کہا کہ میں مغل ہوں آپ پہلے گائیے مناسب ہے۔ نائیک گوپال نے کئی راگ گائے اور ہر راگ پہ کہہ کر ٹوک دیا کہ یہ تو میری ایجاد ہے۔ اور جب امیر خسرو نے راگ سنائے تو نائیک گوپال حیرت زدہ رہ گیا۔ چونکہ خسرو عجم سے بھی واقف تھے اس لئے ہندی اور عجمی موسیقی کو ملا کر نیا عالم پیدا کر دیا۔

نائیک گوپال دکن سے آیا تھا اور مدتوں خسرو کی صحبت میں رہ کر کمال حاصل کیا۔ مطلع العلوم میں مذکور ہے کہ ساو نے بھی جو اسی زمانہ کا ماہر فن تھا خسرو کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ دھرما تھ پنڈت لکھتے ہیں کہ امیر خسرو فی الواقع ہندی اور عجمی راگوں کے ماہر تھے۔ افسوس ہے کہ جو جامع اور مکمل تین کتابیں انہوں نے موسیقی پر لکھی تھیں وہ انہیں کی زندگی میں بلووں اور قتل و غارت گری کی نذر ہو گئیں۔

امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا اور اس کے قواعد مرتب کئے۔ مردنگ کو ڈھولک میں تبدیل کیا۔ ایرانی تنبورے کی ایجاد کیا اور ان سب کے بھی قواعد مقرر کئے۔ گانے کی صنف، مجیر، غزل، غارہ، خیال، قول، قلبانہ، ترانہ، دھرپد، نقش و نگار، کافی، قوالی کا بھی اضافہ کیا۔ اسی کے پیر حضرت نظام المشائخ نے ان کو مفتاح السماع عطا فرمایا تھا۔

عبد الحمید لاہوری نے بھی بادشاہ نامہ میں تصریح کی ہے کہ ہند کی موسیقی کو عروج پر پہنچانے میں امیر خسرو کا بڑا حصہ ہے۔ ورنہ امیر سے قبل ہندی گانے صرف مندروں اور عبادت تک ہی محدود رہتے اور ان کا مدار گیتوں، چھند، دھرپد راگوں تک ہی محدود تھا اور یہ طرزیں مسلمانوں کے مذاق سے مختلف تھیں۔ ان کی بجائے قول، قلبانہ اور قانون وغیرہ جو آج بھی مقبول عام ہیں۔ بوعلی سینا، سلطان حسین کے بعد بھی یہ فن لطیف مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔

امیر خسرو کی جدت پسند طبیعت تقلید اور پیروی سے بے نیاز تھی۔ مشکل سے مشکل بحر میں بلا تکلف شعر کہتے تھے۔

برصغیر میں مسلمانوں نے ہر فن میں صاحب کمال پیدا کئے ہیں!

اجزائے اعظم ہے۔ بحر، عروض اور قوافی کے بعد تال قدیم کا نمبر آتا ہے۔ چونکہ ڈھولک اور طبلہ امیر خسرو کی ایجاد ہے اس لئے خسرو نے ان کے بجانے کے قواعد بھی مقرر کئے۔ مثلاً پشتو، زد بحر قوانی، سول فاختہ، جھپ تالا، سواری، آڑا چوتالا، جھومر، ننانی سواری، دادستان سہ، فرد وسعت، تید، پہلوان، پٹ تال، چپک تال وغیرہ کل اٹھارہ ہیں۔ اس کے بعد ان کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان ٹھیکوں کے نام فارسی ہیں۔

امیر خسرو نے جب ستار ایجاد کیا تو اس میں صرف تین تار تھے اس لئے اس کا نام ستار تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ چار تاروں کا اور اضافہ کیا۔

امیر خسرو ہمہ صفت موصوف تھے۔ اگر آپ ان کو میدان عمل میں دیکھنا چاہیں تو وہ میدان کارزار میں ایک بہادر سپاہی تھے جو اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ شاہی درباروں میں بلحاظ قابلیت کا ہم پلہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ حلقہ مشائخ میں ایک ممتاز صوفی کی حیثیت حاصل تھی۔ شاعری میں ان کا ثانی کوئی نہ تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ فارسی میں چار لاکھ شعر کہے ہیں اردو اور ہندی شاعری میں بھی کئی دفتر لکھے مگر بدامنی کے بھینٹ چڑھ گئے۔ علم التواریخ کا بھی شوق تھا جس کی جھلکیاں جا بجا ان کی تصانیف میں پائی جاتی ہیں۔ رمل اور نجوم سے بھی واقف تھے۔ موسیقی میں جس قدر خسرو کے بعد ماہرین فن پیدا ہوئے انہوں نے ان کے راگوں کا نہ صرف اتباع کیا۔ بلکہ تان سین وغیرہ نے نائک ہونا بھی تسلیم کیا جو اس زمانے کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ واضح رہے کہ محفل سماع کی صحبتیں بزرگوں کی تفریحی مشاغل نہ تھے بلکہ حمد و ثنا اور رموز عشق الٰہی کے اشعار سے جنکو لطف و سرور حاصل ہوتا تھا اسکو عبادت کا درجہ حاصل تھا برخلاف اس کے اس آخرت فراموش دور میں جبکہ نفسانی خواہشات نے راگ رنگ اور لہو و لعب کو انسانیت کے لئے مستقل فتنہ بنا دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اکابر اور اسلاف کے مشاغل موسیقی کے واقعات کو کبھی جیلہ و طبیعتیں حجت بنا کر اخلاقی حدود سے نہ گزر جائیں۔

حضرت امیر خسرو کے والد سیف الدین مغل ترک تھے اور گمان غالب ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں ہزارہ چین قبیلہ کے ساتھ ہندوستان میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ جسے مومن آباد بھی کہتے ہیں آن کر آباد ہوئے تھے۔ سلطان تغلق کے دربار میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ حضرت امیر خسرو اپنے پیر نظام الدین اولیاء سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ پیر کے وصال کے چھ ماہ بعد خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

●●



انسانی زندگی پر ستاروں کی گردش کا کافی اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر کافی تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ جدید سائنس بھی اس حقیقت سے منکر نہیں ہے کہ شب و روز کی گردش کے نتیجہ میں موسموں کی تبدیلی وغیرہ کا انسانوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوئی غیب داں نہیں ہیں۔ غیب کا حال صرف خدا کو معلوم ہے۔ ہم تو صرف اپنی معلومات کی بناء پر یہ پیش گوئی شائع کر رہے ہیں۔

آپ کے ستارے



• قیس شناس

۱۶ر دسمبر سے ۳۴ر دسمبر تک پندرہ دن آپ کے لئے کیسے ہوں گے۔ اپنے نام کا پہلا لفظ دیکھ کر معلوم کیجئے۔

ا۔ ع۔ ل۔ ن :۔ اتوار کا دن خطرناک ہے۔ دوستوں سے زیادہ توقع نہ کیجئے۔ غیر متوقع امداد ملنے سے کوئی پرانا کام پورا ہوگا۔ حکام سے اچھے تعلقات رہیں گے۔ ان کے مشوروں پر عمل کریں۔

ب۔ پ۔ م :۔ سفر سے گریز کریں۔ کوئی خوشخبری ملے گی۔ کاروبار میں منافع ہوگا۔ گھر کے حالات خوشگوار ہوں گے۔ خرید فروخت میں نقصان کا ڈر ہے، پڑوسی سے اذیت کا خدشہ ہے۔

ہ۔ ح۔ ھ۔ و :۔ رشتہ داروں سے خوشی حاصل ہوگی۔ محبت میں ناکامی کا امکان ہے، جلد بازی سے بچیں منگل کے دن اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کی کوشش کریں۔ صحت ٹھیک رہے گی لیکن سنیچر کے دن نقصان کا اندیشہ ہے، یہ پندرہ واڑہ آپ کیلئے ملے جلے اثرات کا حامل ہے۔

ث۔ س۔ ش۔ ص :۔ اتوار کے دن چند نئے مسائل پیدا ہونے کا امکان ہے۔ دوشنبہ اور منگل خوشگوار ہیں۔ بگڑا کام بننے کی امید ہے۔ دوستوں سے فائدہ کی امید ہے کسی خاص دوست سے برسوں بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔ افسران سے تعلقات رہیں گے۔ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیجئے۔ اخراجات میں کمی ہوگی۔

د۔ ڈ۔ ر۔ ڑ۔ ط :۔ خوف ستائے گا۔ دشمنوں سے گزند پہنچنے کا اندیشہ رہے گا۔ دوستوں سے بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ رات کو سفر نہ کریں۔ بیوی سے تعلقات میں کشیدگی ہو سکتی ہے۔ محبت میں ناکامی ہوگی۔ آپ جس کو اپنا قریبی دوست سمجھتے ہیں وہی آپ کے خلاف کسی خطرناک سازش میں شامل ہو سکتا ہے، اس لئے محتاط رہئے۔ کاروبار میں مندا چلے گا۔ منافع کم ہوگا اخراجات بڑھیں گے۔

ز۔ ظ۔ ض۔ ی :۔ صحت اچھی رہے گی۔ دوستوں سے مدد ملے گی۔ دشمن زیر ہوگا۔ منگل کے دن مالی معاملات طے کرنے کی کوشش کریں۔ لوگ بعض معاملات میں آپ سے اختلاف کریں گے۔ بیوی سے سنیچر اور اتوار کو جھگڑے کا اندیشہ رہے گا۔ اخراجات کم ہوں گے لیکن سفر میں احتیاط برتیں۔

ج۔ چ۔ خ۔ غ۔ ف :۔ کچھ نئے واقعات رونما ہونے کا امکان ہے۔ سیاسی سرگرمیوں میں نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ کوئی غمناک اطلاع آ سکتی ہے۔ مختصر سفر کریں۔ کاروبار میں جی جان سے لگے رہیں، صحت کا خیال رکھیں، بزرگوں سے شفقت ملے گی۔ بچوں کی طرف سے فکرمند رہیں گے۔ دوستوں سے مدد ملے گی۔ کچھ غیر ضروری اخراجات ہوں گے۔ چوری کا ڈر نہیں ہے۔

ت۔ ٹ۔ ق۔ ک۔ گ :۔ دولت ملے گی۔ محبت میں کامیابی ہوگی۔ آمدنی کے ساتھ خرچ بھی بڑھے گا۔ تنگدستی کچھ کم ہوگی۔ سفر میں فائدہ ہوگا۔ مصروفیت بڑھ جائے گی۔ دوستوں سے نقصان کا اندیشہ ہے لیکن اتوار کو سفر نہ کریں تو اچھا رہے گا۔ غیر متوقع حالات رونما ہوں گے۔ سوموار اور منگل کے دن خوشیوں کے ہوں گے۔ ایام ملے جلے اثرات کے ہوں گے۔●

طنز و مزاح

بارہ بنکی کا چور

• پروانہ ردولوی

چوروں کے متعلق آپ نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ایک دو چور پکڑے بھی ہوں اور اگر گستاخی معاف فرمائیں تو یہ بھی عرض کر دوں کہ خود آپ بھی چور یا سابق چور ہو سکتے ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ چوری کے سلسلے میں فنکاری کے ساتھ زندہ دلی شرافت، متانت، سنجیدگی اور رحمدلی میں ہمارے بارہ بنکی کے چور بھائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہمارے اس بھائی نے سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، انکم ٹیکس آفس اور مرکزی وزارتوں کے دفتروں سے چوری کی ہے اور اسکا دعوی ہے کہ، ان دفتروں سے کوئی بھی فائل نکلوانا ہو تو جتنے کا معاملہ ہو اس کا ۱۰ فیصدی مجھے دید دیں فائل نکال کر دیدوں گا۔" بارہ بنکی کے اس پچیس سالہ چور کا نام ہے "پرتاپ سنگھ" اور عرفیت ہے پرتاپ اور اسے دہلی کے وسطی علاقہ کی پولیس نے صرف ۳۸ چوریوں کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔

آج کل بھائی پرتاپ سنگھ بڑی دیانتداری کے ساتھ پولیس کو وہ جگہیں دکھا رہے ہیں جہاں جہاں انہوں نے چوری کی تھی اور بڑے فخر کے ساتھ چوری کر کے دکھا بھی رہے ہیں۔ بارہ بنکی کے اس چور سے جب یہ پوچھا گیا کہ جناب آپ نے خود کو اس ٹریڈ میں کیوں

سنٹرل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ۔ وزارت سماج کلیان۔ وزا[رت] محنت و روزگار۔ وزارت دفاع اور وزارت قانون۔ ٹیلی فون ا[ور] راشٹرپتی بھون تک میں کر چکا ہوں لیکن واقعی سب ہی [بغیر] اطلاع یا نوٹس کے نکال دیتے ہیں۔"

میرا بھائی پرتاپ عام چوروں کی طرح ظالم اور بے رحم

ناظرین واقعات کو دعوت دی جاتی ہے کہ کسی حقیقی واقعہ پر مبنی ایسی ہی مزاحیہ واردات اگر ان کے علم میں ہو تو ہمیں ارسال فرمائیں۔ ہم بخوشی شائع کریں گے۔ (ادارہ)

ڈالا تو اس نے مسکرا کر جو جواب دیا وہ ہمارے معاشرہ پر بھرپور طنز بھی ہے اور بارہ بنکی والوں کی ذہانت کا ثبوت بھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

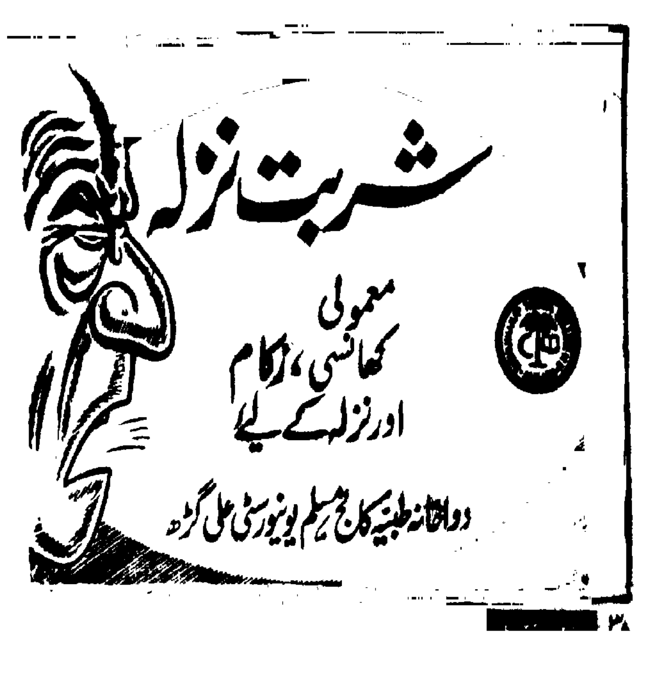
"صاحب کیا کرتا کہیں کوئی نوکری نہیں دیتا جتنے بھی "اپائنٹمنٹ لیٹر" ملتے ہیں اُن پر انگریزی میں صاف صاف لکھا ہوتا کہ "تمہاری نوکری ایکدم عارضی ہے کسی بھی وقت بغیر کسی نوٹس کے نوکری ختم ہو سکتی ہے"۔ نویں جماعت میں دو بار فیل ہو گیا گھر والے ڈانٹتے رہتے تھے۔ بھاگ نکلا۔ پھر دوبارہ گھر کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ دلی آکر شاستری بھون میں چوکیداری کر کے راجستھان بورڈ سے میٹرک یا مزدور اور چوکیدار کی نوکری سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کے دفاتر — ڈائرکٹوریٹ جنرل ہیلتھ سروس۔ سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ سروس۔

ہے۔ چونکہ وہ بارہ بنکوی ہے اس لئے ہر کام میں کوئی نہ کوئی نیا پیدا کرتا ہے، اس کا فلسفہ چوری یہ ہے کہ کسی کے گھر سے کوئی نہ لو کیونکہ صبح چوری کا علم ہونے پر گھر والے رو نے پیٹنے ہیں اسلئے میں ہاتھ کی صفائی دکھاؤ تاکہ بابو لوگوں کو جو عام طور پر گھر سے بیویوں سے لڑ کر آتے ہیں تفریح کا ذریعہ ملے اور کچھ ٹینس کردہ صحت ٹھیک کر لیا کریں لیکن ایکبار اسے ایک ذخیرہ اندوز پہ غصہ آگیا تھا اس لئے اس نے "غیر سرکاری چوری" کر لی تھی۔ پرتاپ ہی کی زبان سے یہ واقعہ سنئے اور بارہ بنکی والوں کی سمجھ پر سر دُھنئے۔

"ایک بار میں شاستری بھون کی تیسری منزل پر کینٹین میں گیا اور ایک روپیہ کا نوٹ دے کر ایک پنامہ سگریٹ اور ماچس مانگی کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی نے جو بڑی بدشکل تھی لیکن خود کو بڑی حسین سمجھتی تھی بڑی ادا سے کہا "چینج نہیں ہے"، اور نوٹ واپس کر دیا مجھے غصہ آیا اور اسی روز رات میں کینٹین میں گھسا اور ایک بڑ[ے] سگریٹ اور جیبوں وتھیلوں میں ریزگاری بھر کر چلا آیا۔ دوسرے دن ریزگاری لے کر بس میں بیٹھا تو ایک مسافر سے کنڈکٹر کا ریزگاری کے لئے جھگڑا ہو رہا تھا بغل کے ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آخر یہ ریزگاری کہاں چلی گئی ہے۔ میں نے ڈٹ کر کہا "اس سلسلہ میں مجھ سے مت پوچھئے"، اور قطب روڈ پر جا کر ترازو تول کر چوری کی ہوئی ساری ریزگاری نوے روپے میں بیچ دی۔

دیکھا آپ نے بارہ بنکی کے چور کی ذہانت کتنی خوبصورتی سے ریزگاری کے مسئلہ پر مدلل روشنی ڈالی ہے۔

ایک بار میرے بھائی پرتاپ سنگھ کو وگیان بھون کی صفائی دکھانے کی سوجھی رات کو پیتل کی کنڈیاں اتاریں۔



نے پھر کھانا کھایا، دفتر کھول کر سستانے کو جی چاہا، ٹھنڈی ہوا
اور سگریٹ پیتے پیتے نیند آگئی۔ صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی اور جب
کھڑکی سے باہر دیکھا تو کاریں ہی کاریں اور پولیس ہی پولیس۔ بھائی
پرتاپ نے سمجھا کہ پکڑے گئے لیکن جہاں کے گدھے تک اپنی ذہانت
آزما چکے ہیں وہاں کا چور بھلا کب چوکنے والا تھا۔ اس نے کپڑے
کا ٹکڑا اٹھایا اور شیشے پونچھنے لگا۔ اسی طرح وہ پہلی منزل تک
آیا اور پیچھے کی ایک کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگا۔ لیکن رات کو
چھپائی ہوئی گٹھڑیاں لے آیا۔ جن کا وزن پندرہ من نکلا۔

آپ سوچیں گے کہ بھلا ایک آدمی اتنا وزن کیسے اٹھا سکتا ہے
لیکن یاد رکھئے کہ یہ بارہ بنکی کا چور تھا۔

ایک دن بھائی پرتاپ کے دل نے کہا یار سپریم کورٹ میں ہاتھ
صفائی دکھاؤ جب مانوں کہ تم بارہ بنکی کے فنکار ہو اور وہ سپریم
کورٹ کی طرف چلا گیا۔ عدالت میں بہت بڑا تالا لگا ہوا تھا۔ اس
نے ہاتھ کے لوہے کے موٹے ڈنڈے میں کپڑا لپیٹا اور تالے کے
بیچ میں اسے ڈال کر دبایا۔ پل بھر میں تالا کسی حسینہ کی نازک کلائی
کی طرح ٹوٹ گیا۔ پرتاپ کہتا ہے کہ بھلا تالا بھی کوئی رکاوٹ
ہے۔ لوہے کی چھڑ اور تھوڑا سا تیزاب بھی ساتھ ہے تو منٹ بھر میں
تالا کھل جائے گا۔

ایسا لگتا ہے کہ بارہ بنکی والے جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس
میں قسمت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے۔ ایک بار بھائی پرتاپ وگیان
بھون کے ''سی'' بلاک سے ایک ٹائپ رائٹر لے کر کھمبے کے
سہارے نیچے اتر رہے تھے کہ ٹائپ رائٹر ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا
نیچے آکر دیکھا کہ چوکیدار صاحب سو رہے تھے اور ان کے سر کے
بالکل قریب ہی ٹائپ رائٹر آکر گرا تھا۔ بھائی پرتاپ یہ منظر دیکھ
کر گھبرا گئے کہ اگر تھوڑی گڑبڑ ہو جاتی تو چوکیدار کی جان چلی جاتی۔ پھر
وہ ٹائپ رائٹر اٹھا کر چل دیئے۔ اور چوکیدار صاحب خواب خرگوش
ہی میں مبتلا رہے۔

پرتاپ سنگھ نے پولیس کو ہنس ہنس کر بتایا کہ جب میں
ٹائپ رائٹر لے کر بھاگ رہا تھا تو ۵۔۶ چوکیدار چور چور کرتے
میرے پیچھے دوڑے مگر میں پہچانا نہ جا سکا۔ ابھی صاحب اسب
چور چور کرتے ہیں نزدیک کوئی نہیں آتا۔

بارہ بنکی کے اس ستم ظریف میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری
ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے پاس پیسے چاہے جتنے ہوں
وہ کھانا ہمیشہ گوردوارے میں کھاتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اتنے
پریم سے کوئی کھانا نہیں کھلاتا۔

پرتاپ کے دل میں دفتر کے بابوؤں کے لئے محبت کوٹ کوٹ
کر بھری ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ بارہ بنکی والے ہوتے ہی غریب
پرور ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دفتروں سے ٹائپ رائٹر اسی لئے
چوری کرتا ہوں تاکہ بابو لوگوں کو خوشی ہو اور وہ کم از کم ایک دن کی
چھٹی مفت مار دیں۔

بارہ بنکی کا یہ چور ـــــ میرا بھائی پرتاپ اب گرفتار ہو گیا ہے
لیکن اسے امید ہے کہ جیل سے یہ کچھ اور فنکاری کر سکے گا۔ اور اس
کی یہ امید بھی ہمارے جیلوں کی حالت پر بھرپور طنز سے کسی طرح
کم نہیں ہوگی

●●



دنیا کا حیرت انگیز پرندہ فن فٹ

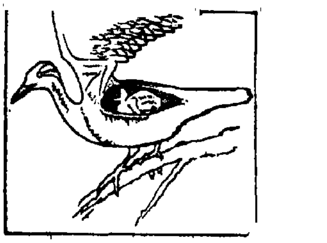
بچوں کو تھیلی میں رکھ کر اڑتا ہے

جنوبی اور وسطی امریکا کے دریاؤں اور پہاڑی ندیوں
کے قریب سب سے الگ تھلگ خاموشی کی زندگی گزارنے والے
آبی پرندہ ''فن فٹ'' کے متعلق ایک فطرت شناس میکسیکن مسٹر
الوارینز نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ اس پرندہ کے جسم میں ایک
تھیلی ہوتی ہے جس میں یہ اپنے بچوں کو رکھ کر اڑتا رہتا ہے۔

الوارینز کے اس انکشاف نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے
کیونکہ اب تک کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کوئی پرندہ بھی کنگارو کی
طرح اپنے بچوں کو اپنے جسم میں بنی ہوئی تھیلی میں چھپا سکتا ہے۔

الوارینز نے ''فن فٹ'' کے متعلق یہ حیرت انگیز بات کافی جدو
جہد اور چھان بین کے بعد معلوم کی۔ ''فن فٹ'' کے عادات واطوار
کا جائزہ لینے کی مہم پر روانہ ہونے کے بعد اس نے جنوبی میکسیکو
کی ایک ندی کے کنارے ایک ویران جگہ پر ''فن فٹ'' کا ایک
گھونسلا دیکھا جس میں دو انڈے رکھے ہوئے تھے۔

ایک دن انڈے سے بچے نکلنے کے بعد جب وہ پھر اس
گھونسلے کی طرف گیا تو ایک نر ''فن فٹ'' جو ندی میں تیر رہا تھا
بڑی تیزی سے اڑتا ہوا گھونسلے پر آگیا اور چند لمحوں کے بعد ہی
گھونسلے سے اڑ کر دوبارہ ندی میں چلا گیا اور طویل ڈبکی مار لی
الوارینز جب گھونسلے کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر سخت حیران ہوا کہ
گھونسلے میں انڈے کے چھلکے تو پڑے ہیں لیکن ان سے نکلنے والے
بچے نہیں ہیں۔ گھونسلے میں مادہ ''فن فٹ'' بھی موجود تھی۔ اتفاق
سے نر ''فن فٹ'' پانی سے نکل کر سطح پہ تیرنے لگا۔ الوارینز نے
دوربین سے اس نر ''فن فٹ'' کو غور سے دیکھا تو اس کے
پنکھ کے نیچے سے دو ننھے ننھے سر نظر آئے۔ پہلے تو الوارینز کو
اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا لیکن ''فن فٹ'' تیر کر کنارے پہنچ
گیا تھا اور وہ بمشکل ۲۰ گز کی دوری پہ تھا۔ اب دونوں سر
بالکل صاف نظر آرہے تھے جو ''فن فٹ'' کے دونوں بچوں کے تھے
ایک ملاح کی مدد سے الوارینز نے نر ''فن فٹ'' کو پکڑ لیا یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت



سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ نر ''فن فٹ'' کے بائیں پنکھ کے نیچے
ایک تھیلی ہے جس میں دونوں بچے آرام سے بیٹھے ہوئے چوں چوں
کر رہے ہیں۔

الوارینز اب یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ کیا مادہ
''فن فٹ'' کے بھی تھیلی ہوتی ہے یا اس کا کام صرف انڈے دینا
ہے اور بعد کی تمام خدمات نر کے ذمہ ہوتی ہیں؟ وہ یہ پتا بھی
لگائے گا کہ نر ''فن فٹ'' کتنے دنوں تک اپنے بچوں کو تھیلی میں رکھتا
ہیں اور مادہ ''فن فٹ'' بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کیوں نہیں سنبھال سکتی

۴۱ سالہ بال کرشنا ساونت کا اسٹوڈیو بمبئی کے ساتھ میلوں تک پھیلا ہوا ساحل ہے۔ ساونت ہر روز ساحل کے کنارے بچھی ہوئی ریت پر مجسمے بناتا ہے۔ کبھی کبھی تیز لہریں آتی ہیں اور اس کے آرٹ کو بہا لیجاتی ہیں۔ ساحل کے کنارے آنے والے لوگ ساونت کے کام کو دیکھتے ہیں اور اسے کچھ پیسے دے جاتے ہیں۔ اچھے دنوں میں ساونت کو پانچ چھ روپے روز کی آمدنی ہو جاتی ہے۔

ساونت کا باپ مہاراشٹر کے شہر ستارہ میں مجسمہ سازی کا کام کرتا تھا۔ ساونت کو بچپن ہی سے مٹی کے مجسمے بنانے کا شوق تھا اور اب اس نے اس شوق کو پیشہ بنا لیا ہے۔

ساونت کو اس بات کی شکایت ہے کہ لوگ اس کے آرٹ کی قدر نہیں کرتے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک تھرڈ کلاس گانے والا بھی گا بجا کر مجھ سے زیادہ پیسے جمع کر لیتا ہے۔ میں سارے دن کڑی دھوپ میں محنت کر کے ریت میں جان ڈالتا ہوں لیکن پھر بھی مجھے کچھ نہیں ملتا۔ برسات کا موسم میرے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

وہ ریت میں جان پھونک دیتا ہے

"حکومت سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ غریبوں کی ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مجھے اپنا کام شروع کرنے کے لئے کچھ پیسہ ادھار چاہئے لیکن میں بینکوں کے چکر لگاتے لگاتے تھک گیا اور مجھے کچھ نہیں ملا۔ اس کی بجائے ہماری جھونپڑیوں کو اجاڑ دیا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ریت پر نہرو کے خاندان کی تصویریں بنائیں، رات کو کسی نے تمام تصویریں خراب کر دیں۔ لینن کی سو سالہ برسی کے موقع پر میں لینن کی تصویر بنا رہا تھا اسی دن مجھے ایک شخص نے آکر دھمکی دی کہ اگر میں نے لینن کی تصویر بنائی تو وہ میری جھونپڑی میں آگ لگا دے گا۔ ہندوستان میں اس طرح آرٹ کی قدر کی جاتی ہے۔"



لیکن صرف ساونت ہی کیوں، ہندوستان کے گاؤں گاؤں کونے کونے میں ایک سے ایک اچھا آرٹسٹ، کاریگر پڑا ہوا سڑ رہا ہے۔ اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا ہے۔ چند لوگ ان گدڑی کے لعلوں آرٹسٹوں کو چند سکوں میں خرید کر کروڑوں بناتے ہیں۔ ٹورسٹ بھوکے مرتے ہیں اور آرٹ کے دلال عیش کر رہے ہیں۔

مسلم خواتین اور موجودہ سماج

•عبدالبصیر نعیمی

اس ترقی کے دور میں جہاں دوسرے بہت سے مسائل انسان کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں وہیں خواتین کی آزادی بھی ایک عظیم مسئلہ بن کر سامنے آئی ہے۔ مغربی ممالک میں جہاں عورت کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے اس کے بھیانک نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کئے دنیا بھر کی خواتین نے مغربی خواتین کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھان لی ہے۔ ظاہر ہے عورت بھی انسان ہے۔ اس کے بھی جائز حقوق ہیں جو اس کو ملنے ہی چاہئیں مگر بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی تقلید کرنا دانشمندی تو نہیں ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اس ملک میں عام بیداری پیدا ہو۔ مرد کے ساتھ عورت بھی اپنے فرائض کو جانے اور ملک کی ترقی کے لئے مردوں کے ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر جدوجہد کرے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے فرائض فراموش کر کے مردوں کے فرائض انجام دینے کی کوشش کرے کیونکہ عورتوں کا دائرہ عمل مردوں کے دائرہ عمل سے مختلف ہے۔ اور عورتوں کو یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ چند

۲۷ اور ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پونا میں مسلم خواتین کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے۔ مسلم خواتین کو بھی وہ بہت سے حقوق جو بقول ان کے دوسرے فرقوں کی خواتین کو حاصل ہیں ملنے چاہئیں اس کانفرنس میں مسلم خواتین کے مسائل پر غور کیا جائیگا اور کچھ نام نہاد حقوق کے حصول کے لئے پروگرام مرتب کیا جائے گا۔ اس کانفرنس کا مقصد اس مراسلے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے جو مورخہ ۲۱ نومبر کے "ہندوستان ٹائمز" میں چار خواتین کی طرف سے شائع ہوا۔ اس مراسلہ میں یہ چار مسلم خواتین فرماتی ہیں۔

"آزادی کے ۲۵ سال گزر جانے کے بعد بھی مسلم خواتین ابھی تک جدید اخلاقی سانچے میں نہیں ڈھل پائی ہیں کیونکہ ان کو جدید سماجی معاشی اور مساوی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہندو کوڈ ۱۹۵۶ء کی رو سے ہندو خواتین کو شادی، طلاق اور وراثت کے معاملہ میں مردوں کے مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے (ہندو عورتوں کے) سارے مسائل سلجھ چکے ہیں مگر مسلم خواتین کی خود اعتمادی اور ان کے مسائل کے حل کے بارے میں اب تک کوئی ضمانتی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مسلم شوہر اپنی بیوی کو صرف تین بار "طلاق" کی گردان کر کے علیحدہ کر سکتا ہے۔ اور اس سے ہمیشہ کے لئے سبکدوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے بدلے میں اسے صرف تین ماہ کا خرچہ برداشت کرنا ہوگا۔ ایک مسلم مرد ایک وقت میں چار چار بیویاں رکھ سکتا ہے مگر مظلوم مسلم عورت اپنی طلاق کے سلسلے میں بھی کوئی رائے تک نہیں دے سکتی۔ وراثت کے معاملہ میں بیٹی بھائی کے مقابلہ میں آدھے حصہ کی مستحق ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جائے تو اسے اپنے بچوں کے ولی ہونے کا بھی حق نہیں ملتا ہے۔ چاہے بچے کمسن ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسرے ترقی پسند فرقوں کے برخلاف مسلمانوں میں کئی شادیوں اور طلاق کا رواج ہے نتیجے کے طور پر مسلم خواتین کی حالت ہندوستان میں قابل رحم ہے اور تقریباً آج بھی غیر قانونی طور پر غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خود کی وراثت کے سلسلے میں بیوہ مرحوم شوہر کی جائداد کا صرف چوتھا حصہ



ہی پا سکتی ہے اگر اس کے بچے ہیں تو صرف آٹھویں حصہ کی مستحق ہے۔ حکومت ہند کو بہت پہلے ایسا قانون پاس کرنا چاہئے تھا جس کی رو سے عورت اور مرد کو مساوی حقوق حاصل ہوتے۔ اور یہ قانون تمام فرقوں کے لئے ہوتا۔ بہرحال مسلم ووٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ حکومت ہند کی انصاف پسند پالیسیوں میں اعتماد رکھتے ہیں۔ اور مسلم سیاسی جماعتوں سے کسی قسم کی توقع بیکار ہے۔ مسلم خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے خود میدان میں آنا ہوگا۔

اب وقت آگیا ہے کہ اپنی حالت سدھارنے کے لئے مسلم خواتین متحد ہو کر آگے بڑھیں اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔ انڈین سیکولر سوسائٹی اور مہاراشٹر مسلم ستیا شودھک منڈل ۲۷-۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پونا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس میں مسلم خواتین کی سماجی اور معاشی حالت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے گا اور اس سلسلے میں پروگرام مرتب کیا جائے گا کہ ہم کو کیا کیا قدم اٹھانے چاہئیں حالانکہ اس کانفرنس کے دروازے صرف مہاراشٹر کی مسلم خواتین کے لئے ہی کھلے ہیں لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کانفرنس ہندوستانی مسلم خواتین کی آزادی کے سلسلے میں ایک نیا باب کھولے گی۔ اس میں دوسرے صوبوں کے مبصرین بھی شامل ہو سکتے ہیں۔

ہم مہاراشٹر میں رہنے والی تمام مسلم خواتین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے محترمہ مریم شیخ سے منڈل آفس کے پتہ پر رجوع کریں۔

منجانب: محترمہ مریم شیخ۔ شمیم اطہر۔ نجمہ شیخ۔ شاہین اطہر۔

پونا میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ نمبر ایک "مسلم" اور نمبر دو "خواتین کے حقوق"۔ مسلم خواتین کے لئے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں ابتدا میں اس چیز پر غور کریں جس کے نتیجہ میں ان پر "مسلم" کا لیبل چسپاں ہوتا ہے۔ یعنی اسلام۔

اسلام سے پہلے عورت کو محض پیر کی جوتی سمجھا جاتا تھا عرب میں لڑکی پیدا ہوتے ہی قتل کر دی جاتی تھی۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے عورت کو موجودہ مقام دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسری قوموں نے بھی عورت کو عزت دی۔ اسلام پر بے بنیاد الزام لگایا گیا ہے کہ ایک مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے مگر عورت طلاق کے مسئلہ پر اپنی رائے تک نہیں دے سکتی یکسر تنگ نظری کی مثال ہے۔ اسلام نے طلاق کو کبھی بہتر نہیں سمجھا۔ اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جتنا بھی ہو سکے میل قبول کرتے رہو۔ اگر ساتھ رہنا بہت ہی مشکل اور تکلیف دہ ہو جائے

ترقی تو ہوئی ہے...



* **قومی آمدنی**

1960-61ء

13,292 کروڑ روپے

1969-70ء

17,955 کروڑ روپے

اضافہ

35.1 فیصدی

* **فی کس آمدنی**

1960-61ء

306.3 روپے

1969-70ء

339.4 روپے

اضافہ

10.8 فیصدی

لیکن

آبادی میں اضافہ
اقتصادی ترقی کی راہ میں
بھاری رکاوٹ بنا ہے۔

* 1960-61ء کی قیمتوں کے مطابق

تو مناسب ہے الگ ہو جاؤ۔ جہاں مرد کو اختیار ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے دے وہیں عورت کو بھی حق دیا گیا ہے کہ وہ بھی مرد سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اسلام نے صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ اگر۔

۱۔ شوہر اپنی بیوی کو ماں یا بہن سمجھنے لگے۔

۲۔ شوہر بیوی پر بے بنیاد الزام لگائے۔

۳۔ شوہر چار سال سے غائب ہو۔ اور بیوی کو پتہ نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔

۴۔ شوہر دو سال تک بیوی کے جملہ اخراجات نہ اٹھائے۔

۵۔ شوہر شادی کے وقت سے لے کر موجودہ وقت تک نامرد ہو۔

۶۔ شوہر دو سال سے خطرناک قسم کی بیماریوں کا شکار ہو۔

۷۔ عورت کی شادی نابالغی کے دور میں اسکے والد یا سرپرست نے کر دی ہو۔

۸۔ شوہر کا رویہ بیوی کے ساتھ ظالمانہ ہو۔

۹۔ شوہر بیوی کو غلط قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔

۱۰۔ شوہر کی کئی بیویاں ہوں مگر سب کے ساتھ مساوی سلوک نہ کرے۔

۱۱۔ شوہر بیوی کو مذہبی احکام کی تعمیل سے روکے۔

تو بیوی قانونی طور پر اپنے شوہر سے طلاق لینے کی مجاز ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ چار چار بیویاں رکھنے کی اجازت کے باوجود بہت ہی کم ایسے مرد ملتے ہیں جو ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم خواتین کا ایک حق ایسا ہے جو انہیں دوسرے فرقوں کی خواتین سے ممتاز کرتا ہے۔ یعنی حق مہر۔ ہندو شوہر اگر بیوی کو طلاق دیتا ہے تو بیوی گھاٹے میں ہی رہتی ہے۔ مگر مسلم مرد اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اسے بیوی کا مہر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور مہر کی رقم کے لئے مسلم خاتون آزاد ہے کہ وہ جتنا چاہے نکاح کے وقت مقرر کر سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بیوی کو شوہر کی جائداد میں مساوی حصہ نہیں ملتا ہے۔ اس باب میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ شوہر کی جائداد سے مہر کی شکل میں اچھا خاصا حصہ پہلے ہی وصول کر لیتی ہے۔ اس کے بعد مساوی حصہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ ایک باپ اپنی اولاد پر جتنا بھی خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایک بینک کی سی ہے۔ بینک میں آپ روپیہ جمع کرتے ہیں۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب آپ تمام روپیہ معہ سود کے وصول کر لیتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے پر روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اور بیٹا جب کسی قابل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کرتا ہے۔ اپنی دولت اس پر خرچ کرتا ہے۔ اس کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ مگر ایک بیٹی کو یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو اپنی سسرال چلی جاتی ہے۔ اور والدین سے اس کا تعلق تقریباً ختم سا ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اسے والدین کی جائداد میں حصہ ملتا ہے۔ لڑکے کو صرف والدین ہی کی جائداد میں حصہ ملتا ہے جبکہ عورت کو والدین کی جائداد سے اور شوہر کی بھی جائداد سے حصہ ملتا ہے۔ اس طرح سے عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ حصہ پاتی ہے۔ اور اسے کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا حالانکہ لڑکے کو والدین کا قرضہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ جو ہو سکتا ہے بہن کی شادی کے سلسلے میں لیا گیا ہو۔

اس طرح مسلم خاتون تمام تفکرات سے آزاد کر دی گئی ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی وہ یہ کہے کہ اسے جائز حقوق نہیں ملے تو یہ صرف اس کی ہٹ دھرمی ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا حقیقت میں عورت مرد کے برابر ہے اور اسے مرد کے برابر حقوق ملنے چاہئیں؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں ”میں مرد اور عورت کی مساوات کا مطلق حامی نہیں ہوں۔ قدرت نے ان دونوں کو جدا جدا خدمتیں تفویض کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادہ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے ـــــ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری رائے میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا۔ اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی“ (مکتوبات اقبال بحوالہ پیام اقبال۔ مرتبہ پروفیسر ... نظر ۳۸)۔

قدرتی طور پر عورت مرد میں جو فرق ہے اسے بھلا کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ آج عورت ہر اس کام کو کرنے کی آرزو رکھتی ہے جس کو مرد کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہیری کیمپ بل نے لندن انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین میں تقریر کرتے ہوئے کہا ”عورت کے پھیپھڑے مردوں سے چھوٹے اور خون کے جراثیم مردوں سے کم ہوتے ہیں۔ عورتوں کے جسم میں آگ اسقدر تیزی سے نہیں جلتی ہے۔ اس سے صاف طور واضح ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ محنت و مشقت کا کام نہیں کر سکتیں“۔

اس لئے اسلام نے مسلم خواتین کو گھروں کی رانی بتایا ہے مرد باہر کے سخت کام کرنے کے لئے اور عورت اپنے بچوں کی پرورش کرنے کیلئے ہے۔ مگر آج مغربی خواتین کی تقلید میں مسلم خاتون بھی اپنے بچوں کو صرف اس لئے اپنا دودھ پلانے سے کترانے لگی ہے کہ کہیں اس کی جسمانی خوبصورتی پر اثر نہ پڑے۔

ہندوستانی نام نہاد ترقی پسند خواتین حقوق کے سلسلے میں اکثر مغربی ممالک میں بسنے والی خواتین کا حوالہ دیتی ہیں کہ وہاں عورت مرد کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ آج کل نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور ان کا تخریبی حرکات کو اپنانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو بچپن میں وہ پیار نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ بچے کا ابتدائی اور سب سے پہلا مکول آغوش مادر ہے۔ یہیں پر بچہ پہلی بار آنکھ کھول کر دنیا کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ ابتدا میں وہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے ماں کو جو کچھ بھی اور جس طرح بھی کرتے دیکھتا ہے اسی طرح وہ خود بھی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اسے اس ابتدائی دور میں ماں کا پیار نہ ملا تو اس کی روح ہمیشہ پیار کے لئے ترستی رہتی ہے۔

مغربی ممالک میں جہاں عورت کو مرد کے مساوی حقوق حاصل ہیں عورت مردوں کے شانے سے شانہ ملا کر دفتروں میں، ملوں میں اور کارخانوں میں کام کرتی ہے اور بچوں کی پرورش ایک عظیم مسئلہ بن کر آیا ہے۔ شام کو ماں تھک ہار کر کام سے واپس آتی ہے اس وقت اس قابل ہرگز نہیں ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے لئے تھوڑا سا وقت نکال سکے۔ اور بچہ ماں سے مایوس ہو کر پیار کی تلاش میں گھر سے نکلتا جہاں اس جیسے اور بہت سے بچے مل جاتے ہیں۔ بچہ میں اچھائی کے مقابلے میں برائی سیکھنے کا زیادہ رجحان موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ بری حرکتوں میں ایک عجیب قسم کا سکون، آرام اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ جب بچہ کو ایسے بچے مل جاتے ہیں تو وہ جلد برائی کی سمت راغب ہو جاتے

واقعات اپنے نئے روپ میں

آپ کے سامنے ہے ـــ اس کے متعلق ہمیں اپنی رائے لکھئے۔ اور مخلصانہ مشوروں سے نوازیئے۔ ہم ارباب نظر کے نیک مشوروں کو بقدر طاقت و استطاعت عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں کمی نہ کریں گے۔ (ادارہ)

...ھان کی پیاسی روح پیار کی جستجو میں بھٹکتی رہتی ہے اور وہ بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے امیر ترین ممالک میں جہاں سب کچھ مل جاتا ہے مگر بچوں کو ماں کا پیار نہیں ملتا۔ ...وں میں عام طور پر بے چینی پائی جاتی ہے۔ نوجوان طبقہ اس پیار اور سکون کو جسے بچپن میں ماں کی آغوش سے نہ پا سکے ہپی بن کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں ہرے رام ہرے کرشنا کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور کہیں تخریبی حرکات اپناتے نظر آتے ہیں۔ اور زندگی بھر بے چین رہتے ہیں۔

اگر مغربی خواتین کی تقلید میں ہندوستانی عورت بھی ان کے ہی نقش قدم پر چل نکلی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے ہندوستانی نوجوان بھی اپنا ملک چھوڑ کر جنگلوں میں سکون کی تلاش میں بھٹکتے پھریں گے۔ آج عورت کے سر پر جو مساوی حقوق کا بھوت سوار ہے یہ ایک دن ملک کو برباد کر سکتا ہے۔ آئرلینڈ کی مشہور خاتون مضمون نگار میڈم مارگریٹ نارمن لا اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں "عورت دنیا میں سکون و اطمینان پیدا کرنے کے لئے آئی تھی۔ لیکن ہم دیکھتی ہیں کہ یورپ کی عورت دنیا کے ہنگاموں اور بے چینی کا سبب بنی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مردوں کی بے بسی قابل رحم ہے کہ عورت جو کبھی مردوں کے زخموں پر مرہم رکھا کرتی تھی آج مردوں کے سینوں کا زخم بن گئی ہے یہ سب موجودہ تہذیب و تمدن کی لعنت ہے ۔۔۔ اگر یورپ کی عورت نے اپنے آپ کو یونہی رکھا اور ان میں عورت کی اعلیٰ صفات نمایاں نہ ہو سکیں تو میں نہیں سمجھتی کہ یورپ کی آئندہ نسلیں ملک کے لئے کیا مفید ہو سکتی ہیں اور ایک شریف عورت اور فاحشہ میں کیا فرق رہ جائے گا ۔۔۔ میری آزاد خیال بہنیں یقینی طور پر مجھ سے ناراض ہوں گی۔ اگر میں ان سے صاف صاف کہہ دوں کہ تم نے عورت کو دنیا میں ذلیل کر دیا ہے۔ تم نے اس بلند وقار کو خاک میں ملا دیا ہے جو بنی نوع انسان کی ترقی کا سب سے بہتر ذریعہ تھا۔"

مغربی خواتین بھی اپنی آزادی کے نتائج سے باخبر ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اس حد سے زیادہ بڑھی ہوئی آزادی کے نتائج سے خوف زدہ ہیں۔ ایسے حالات میں مسلم خواتین کانفرنس کے لئے بہترین موقع ہے کہ وہ اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کون کون سے عمل ہیں جن پر چل کر وہ ملک کی خدمت کر سکتی ہیں۔ اگر ان کی نظر میں مسلم خواتین کی ترقی و آزادی کا یہ مطلب ہے کہ اپنے مفاد کے لئے بڑے سے بڑا قدم اٹھایا جائے۔ اپنے فرائض کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مردوں کی برابری کے دعوے میں مردوں کی ذمہ داریاں اٹھائی جائیں۔ ہندوستانی سیتا اور مریم کے تقدس کو چھوڑ کر مغربی خواتین کی طرح سڑکوں پر وہ عمل کرانے کی اجازت دو، کا نعرہ بلند کرنے لگیں۔ اگر وہ قرآنی حکم سے نافرمانی کرنا چاہتی ہیں تو اس کانفرنس کو مسلم خواتین کانفرنس کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ مسلم ہیں اس وقت تک ان پر لازم ہے کہ وہ ایسے کام کریں جس سے ملک و قوم کے لئے ترقی کی راہ کھلے نہ کہ پیچیدگیاں پیدا ہوں۔

مسلم خواتین کو اپنا مرتبہ پہچاننا چاہئے اور اس کے بعد کوئی قدم اٹھانے میں ہی بھلائی ہے۔ خدا کرے پونا میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں مسلم خواتین ان باتوں پر بحث کریں جو خود ان کے علاوہ ملک کے لئے نیک ثابت ہوں۔ ایسی باتیں جن سے ملک کے نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی دور ہو۔ اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ کہنا پڑے۔ ع

اپنی ہستی کا بھی انسان کو عرفاں نہ ہوا
خاک پھر خاک تھی اوقات سے آگے نہ بڑھی

یہاں بھی اضطراب ہے وہاں بھی انتشار ہے — نہ شہر میں سکون ہے نہ شانتی ہے گاؤں میں
لٹے لٹے سے قافلے چمن چمن بہار کے — روش روش خزاں زدہ گھٹن سی ہے ہواؤں میں
نظر نظر چبھن چبھن، نفس نفس جلن جلن — بسی ہے دشمنی کی دھوپ شفقتوں کی چھاؤں میں
تھکے تھکے سے حوصلے کٹھن کٹھن سے مرحلے — لگے ہیں بے بسی کے زخم ولولوں کے پاؤں میں
ہے موج موج اک بلا کہ اب یقیں ہے موت کا — نہیں ہے کوئی حوصلہ ہمارے ناخداؤں میں
اُجاڑ اُجاڑ مجلسیں اُداس اُداس تذکرے — نہ محفلوں میں روح ہے نہ زندگی بھاؤں میں
نہ ولولے نہ جستجو نہ حسرتیں نہ آرزو — نہ حسن میں ہے دلبری نہ شوخیاں اداؤں میں
رواج ہیں، محض روایتیں ہیں اور کچھ نہیں — اگر نہ رنگ ہو خلوص کا بھی کچھ وفاؤں میں
خدا کو سونپ دو ہر اک مریض کو کہ ان دنوں — شفا نہیں دواؤں میں اثر نہیں دعاؤں میں
یزیدیوں کے ہاتھ اب بھی خوں سے ہیں رنگے ہوئے — ہیں حق پرست آج بھی شہید کربلاؤں میں
قدم قدم پہ منتظر ہیں نت نئی مصیبتیں — ہر ایک آدمی گھرا ہوا ہے ابتلاؤں میں
نظر میں بدگمانیاں تو دل میں بے یقینیاں — سکون و ضبط جل چکا ہے وقت کی چتاؤں میں

اے راہی کس طرح ملیں ہمیں یقیں کی منزلیں
نہیں شعورِ رہبری جب اپنے رہنماؤں میں

● محبوب راہی

عشق اِدھر ہے چاک گریباں حسن اُدھر سو سو بل کھائے
محوِ فغاں بلبل کو پاکر، پھول ہنسے غنچے مُسکائے
عقل پر اپنی سیٹھ مگن ہے بنجر کھیت ہوا دہقاں کا
آج یہاں ہر چیز گراں ہے ارزاں ایک ہوا انساں کا
کیا اپنا احوال سنائیں، ہم سے روٹھ گئی ہے قسمت
چارہ گر و دم ساز ہمارے، رنج و محن دکھ درد مصیبت
شمس نظر جس شخص پہ ڈالو درد مجسم پیکر بے جاں
جیسے کوئی وہ مرغِ قفس ہو آنکھ ہراساں روح پریشاں
ننھے ننھے بچے روئیں، کس ڈائن نے چلایا جادو
ماں کی چھاتی سوکھ گئی ہے سوکھ گئے آنکھوں میں آنسو
گاندھی روئے، گوتم روئے، سیتا روئے، مریم روئے
چنڈالوں کے ہاتھوں پڑ کر ستیہ اہنسا ہر دم روئے
جانے کیوں رشیوں کی دھرتی ڈوب گئی پاتال میں جاکر
اور چھپا بھگوان گگن میں ہم دکھیوں سے آنکھ بچاکر
پیتم اتم کس دیش بسے ہو اب بھی بہرِ خدا آجاؤ
جان بس آنکھوں میں اٹکی ہے ایک جھلک اپنی دکھلاؤ
شاید بیچ بھنور سے نیا ساحل تک ہلکورے کھاکر
آن لگے، جیون مسکائے آشاؤں کی منزل پاکر

● شمس بمبئی گرامی

غزل

کفن بدوش چلے بن کے جاں نثار چلے
جسے ہو زندگی پیاری وہ سوئے دار چلے

چلے ہیں اہلِ جنوں پوچھنے مزاجِ خرد
جسے ہماری روش پہ ہو اعتبار چلے

ہر ایک آدمی اپنی جگہ خدا ہو جائے
جو آدمی کا ہر اک شے پہ اختیار چلے

دیا ہے سبکو بہاروں نے کچھ نہ کچھ تحفہ
ہم اپنے ساتھ لئے حسرتِ بہار چلے

یہ ذکر تھا مرے دل کا کسی کی بات نہ تھی
یہ کیا ہوا کہ سبھی چشمِ اشکبار چلے

شعورِ فن نہیں میراث تاجداروں کی
یہاں اسی کی چلے جس کا اختیار چلے

لہو کی بات، شبِ خوں کی بات، قتل کی بات
تمہاری بات چلے، اور بار بار چلے

کوئی نہیں ہے تو محسن ہمیں سہی منصور
مگر شہر میں کہیں رسمِ گیر و دار چلے

● محسن جلگانوی



پھول کی آغوش میں کلی

پرتھوی راج کے پوتے اور راجکپور کے بیٹے رندھیر کپور (ڈبو) کی شادی ۶ نومبر کو اداکارہ ببیتا سے ہوگئی۔ گویا ایک پھول کی آغوش میں وہ کلی آگئی جس کی مہک اب کپور خاندان میں نئی مہک پیدا کرے گی۔ اب وہ غسل ماہتاب کے لئے اردن جائے گا۔

شادی سے پہلے رندھیر اور ببیتا نے باقاعدہ عشق کی پینگیں بڑھائی تھیں اور ایک دوسرے کا جیون بھر ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ فلمی شادیاں اکثر کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں۔ لیکن کپور خاندان میں یہ روایت نہیں ہے اس لئے امید کی جاتی ہے کہ یہ شادی بھی پائیدار ثابت ہوگی اور دو جوان دلوں کی دھڑکنیں ہمیشہ ایک دوسرے کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

شادی کی اس تقریب پر پرستان کی کسی شادی کا گمان ہوتا تھا۔ گھر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ مہمانوں میں غریب چوکیدار بھی تھا، اور مہاراشٹر کے گورنر اور متعدد وزراء بھی شامل تھے۔ فلمی دنیا کی تمام اہم شخصیتوں کی موجودگی میں شیوسینا کے بانی لیڈر بال ٹھاکرے کی موجودگی موقع پر موجود کچھ لوگوں کو عجیب سی لگی۔ لیکن کپور خاندان صرف فلم سازی و اداکاری ہی میں منجھا ہوا نہیں ہے بلکہ سیاسی داؤ پیچ سے بھی بخوبی واقف ہے اس لئے بال ٹھاکرے کی موجودگی زیادہ حیرت انگیز نہیں کہی جاسکتی۔

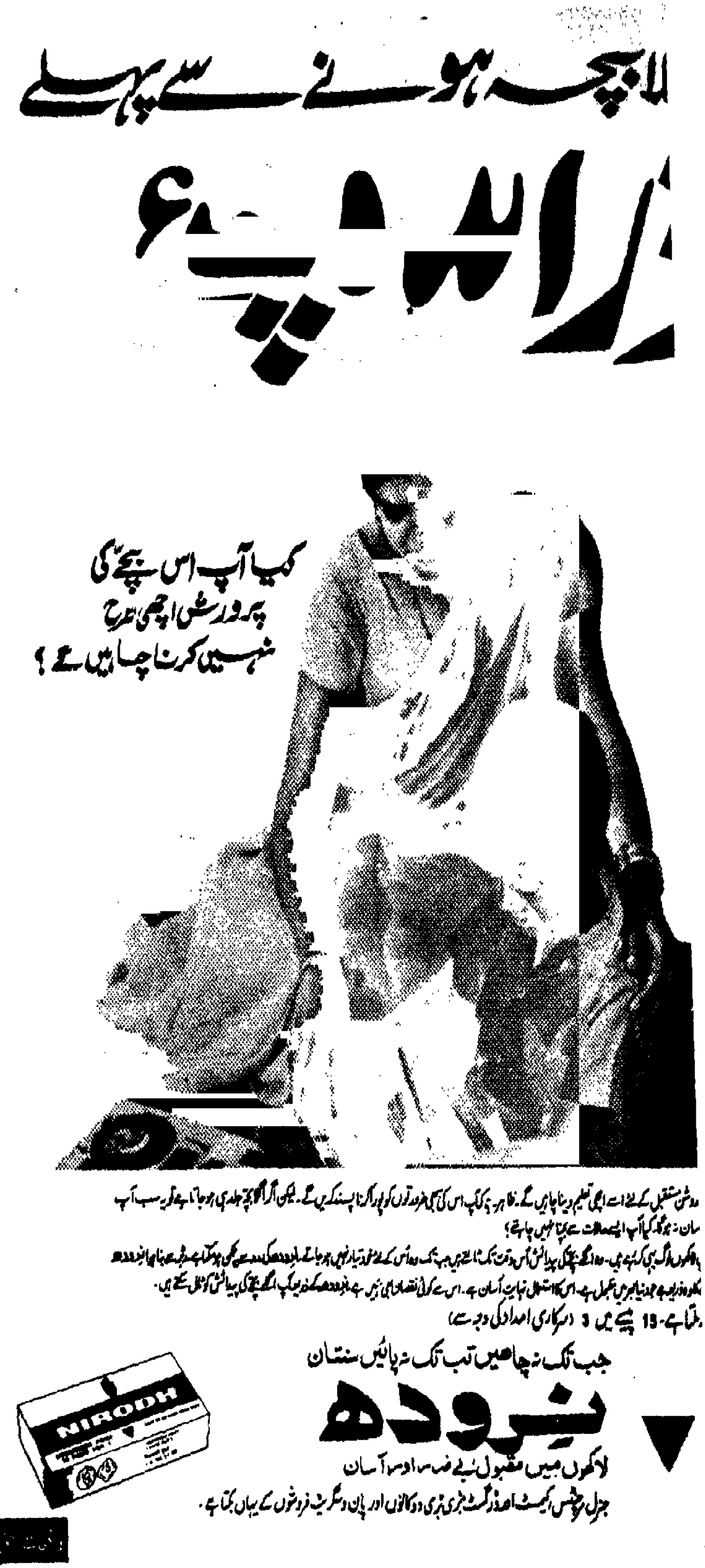
کپور خاندان کو اس خوشی کے موقع پر مبارکباد دینے والوں میں بہت سے سفارتی نمائندے بھی تھے۔ نواب پٹودی خاص طور پر دولہا کو مبارکباد دینے آئے تھے کہ ان کی بیوی شرمیلا ٹیگور کی کپور خاندان سے پرانی دوستی ہے۔ سائرہ سے دلیپ کی شادی کے بعد ببیتا سے رندھیر کی شادی ہی فلمی دنیا کی سب سے شاندار شادی کہا جاسکتا ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں مہمانوں نے شرکت کی۔ دعا ہے کہ دو اداکاروں کی یہ نئی جوڑی مسرت و شادمانی کے ساتھ زندگی گزارے۔ ●



دیوکی بوس چل بسے

مشہور بنگالی فلم ڈائرکٹر مسٹر دیوکی بوس اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے ۷ ارنومبر کو کلکتہ میں اپنے مکان پر انتقال کر گئے۔

مسٹر بوس کی عمر ۷۳ سال تھی۔ اور ۱۹۵۷ء میں انہیں پدم شری کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ دیوکی نے زیادہ تر نیو تھیٹر کے لئے فلمیں بنائیں۔ انکی مشہور فلمیں پورن بھگت (۱۹۳۳ء) زلزلہ کے بعد اور ودیاپتی (۱۹۳۷ء) تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے خود اپنی ایک فلم رتن دیپ میں ہدایت دی تھی۔ دنیا میں ان کی موت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے کا پر ہونا ناممکن ہے۔


لا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا ٹھہریے
کیا آپ اس بچے کی
پرورش اچھی طرح
نہیں کرنا چاہیں گے ؟
روشن مستقبل کے لئے اسے اچھی تعلیم دینا چاہیں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس کی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنا پسند کریں گے۔ لیکن اگر اگلا بچہ جلد ہی ہو جاتا ہے تو یہ سب آپ
سان نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے؟
ملتا ہے۔ 15 پیسے میں 3 (سرکاری امداد کی وجہ سے)
جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان
نرودھ
لاکھوں میں مقبول بے ضرر اور آسان
جنرل مرچنٹس، کیمسٹ اور ڈرگسٹ، بڑی بڑی دکانوں اور پان و سگریٹ فروشوں کے یہاں بکتا ہے۔
NIRODH


WAQIAT